بابا محمد یحییٰ خان

# لے بابا ابابیل

اک گھر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے تھا

آن فقیر سے کہا کہا چارن راشی ہوئے تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برکت

رحمت
پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger
رحمت دا مینہہ پا خدایا ، باغ سُکا کر ہریا
بوٹا آس اُمید میری دا کردے میوے بھریا

بابا محمد یحییٰ خان

قال تیری نہ میری گل

# لے بابا ابابیل

نثرنامہ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

920.02 Muhammad Yahya Khan, Baba
Lay Baba Ababeel / Baba Muhammad Yahya Khan. Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2016.
1068pp.
1. Urdu Literature - Autobiography.
I. Title.

نگارشات
● ساجد خان
● محمد نور الحسن

تہیم اللہ خان
● ولایت

سرورق ولوگو ڈیزائن
● مرزا ... قریشی
● قمر عباس

کمپوزنگ
● محمد منصور ...

تصویریں
● محمد راشد سلیم
● زین شاہ
● احمد علی

اہتمام
● محمد عمران خان
● وسیم عباس خان
● رحیم اللہ خان
● نعیم عباس



2016

● افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

بابا محمد یحیٰی خان

موبائل: 0300-9417829,0333-9417829
0322-9417829,0312-9417829

نوٹ: چند نام و مقامات اور واقعاتی کوائف دیوان میں بغرض ترمیم "تخریج و تحسین" بدل دیے تھے... کوئی بھی مطابقت، مماثلت محض اتفاق ہوگی..!

ISBN-10: 969-35-2942-1
ISBN-13: 978-969-35-2942-5

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

صاحب
خُوشا بخت ؛ زمین کے نیچے قبروں میں بھی تابندہ اور فیض بار ہوتے ہیں۔
خُوار بخت ؛ زمین کے اوپر ایوانوں مکانوں میں مُردوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔
اس خُوشا بخت کے نام ...جو میرا "باباصاحبا" ہے..!

سپاس
بابا اشفاق احمد خان
بابا بُلھا شاہؒ • گلزار
گلابی جان • نُور جہاں
سید صاحب سرہند شریف • جامیؒ
روشن آراء بیگم • بابا سُبحان اللہ
ضیاء محی الدین • ف شین ڈن
بابا چھتری والا • عابدہ پروین
خیام • جگجیت سنگھ • کالی داس
ن و ف • ممتاز مفتی • رام رکھی
خواجہ معین الدین محبوب کوریجہ
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
خواجہ حسن نظامیؒ • حسن نثار
کمال امروہوی • عزیز میرٹھی
مسعود الرحمٰن گیلانی • تولہ رام
نصیر الدین شاہ • لائبل توف
میڈم گلوریا • شارق بٹل
مجاہد جتوئی
سید زین محی الدین گیلانی
سید صدق الدین گیلانی
مولوی عبدالسلام نیازی دہلویؒ
قدرت اللہ شہاب • بانو قدسیہ
ڈاکٹر اجمل نیازی • عکسی مفتی
ماہیم مبین خان

# پیشی

## اقبالی بیان

### میں اس نام نہاد کتاب کا مصنف !

- قاری کو خبردار کرتا ہوں کہ اس بھاری بھرکم معمول سے زیادہ ضخیم کتاب سے آپ کو کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ البتہ کچھ مال اعمال وقت و وقوف کے ویران ہونے کا احتمال بھرپور موجود ہے۔ یہ کوئی مذہبی فقہی مسلکی یا کوئی پُر اسرار علوم فنون فلسفہ و منطق پہ بھدی بھاری بھرکم ہوئی کتاب نہیں۔ وظیفے اوراد ٹونے ٹوٹکے بھی کہیں نہیں ہیں۔ بڑے بڑے علمی ادبی روحانی لوگوں کے اقوال و اعمال اور تذکرے بھی کہیں نہیں ملیں گے۔ اور نہ کہیں نئی اچھوتی تحقیقات سائنسی موشگافیاں پڑھنے کو ملیں گی کہ میں نہ تو کوئی مذہبی مسلک عالم دین ہوں اور نہ ہی دورِ جدید کی نئی ترقی یافتہ جہتوں کروٹوں سے آگاہی رکھتا ہوں۔

جیسے ناول افسانہ کہانی یا سفرنامہ بھی نہیں۔ اس میں روزمرہ کے مسائل و موضوعات نئی پرانی قدروں، زمانہ کی بدلتی کروٹوں قدروں اور کدورتوں پہ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی رنگین تحریریں ہیں۔ نہ اوّل نہ آخر!! اتنا پہاڑی نہ ثقالت بالالتزام نہ اہتمام و انتظام نہ شیرینی و کڑواری ... کہیں فنی پھبتی ہے تو کہیں ناک بھوں چڑھتی ہے۔ تاؤ آتا ہے کہیں پیار بھی پیدا ہوتا ہے۔ اکثر مضامین شروع تو ہوتے ہیں مگر آگے بڑھتے بڑھتے کہیں راستے میں ادھر اُدھر غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ میری بھول بھلکڑی ہے اور کچھ جہالت و کاہلی بھی۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ قاری کی طبیعت اوب گئی ہوگی۔ میں کچھ دے کر کسی اور طرف نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایسا بھی کہ میرے پاس مزید کچھ کہنے لکھنے کے لئے کچھ نہیں رہتا تو میں کوئی نیا رنگ گھول دیتا ہوں۔

میں نے بھی عصرِ حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق ذہنی قلم میدان میں دوڑانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ گئے گزرے وقتوں کے موسیقار، ادیب، شاعر، مفکر، فلسفی، جگت دان، اطباء وغیرہ عظیم اور حقیقی لوگ تھے۔ وہ اس ناہنجار دور

## اندیشۂ رسوائی نہ فکرِ توقیر..!

علمِ لدنی... الہامی، روحانی، تصوفی، باطنی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ کتابی اور اکتسابی دلیلوں سے حاصل ہونے والا علم نہیں، بلکہ غیب سے جو اترتا ہے لکھا نہیں ہوتا۔ کسی مذہب و مسلک سے بھی فقیری و درویشی کو جوڑا نہیں جا سکتا۔ حیوانِ ناطق یعنی انسان کے علاوہ کسی بھی دیگر حیوانِ مطلق کا صرف ایک خالق و مالک ہوتا ہے۔ کسی فرقے مسلک میں پھنسے بغیر ایک ہی رب کی تسبیح کرتے ہیں جس نے انہیں ذوق و تقویٰ کی بے بہا قوت و دولت سے بہرہ ور کیا ہوا ہوتا ہے۔ ___

مکشوف

## 2

میں ہوتے تو بہادر شاہ ظفر کی آخری عمر والا حساب ہوتا کہ کسی گھر کے بھیدی نے حکمرانوں کو ایک راز کی بات سمجھائی کہ زیر زمین گولی استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوٹھڑی کے سامنے بندی خانہ کا مہتر نفاست سمیت گزر جائے تو آپ کسی حکمہ الزام کی زد میں نہیں آئیں گے۔ چنانچہ یہ ترکیب کامیاب ٹھہری۔

رجب علی بیگ سرور، منشی پریم چند، ڈپٹی نذیر احمد، امیر حمزہ، ٹیگور، ابوالکلام آزاد، بہزاد لکھنوی، بڑے غلام علی خان، دیوان سنگھ مفتون، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، محمد رفیع، راجہ مہدی علی خان، عبدالرحمن چغتائی، شورش کاشمیری اگر اس دور کم سواد میں ہوتے تو قتل ہو جاتے۔

یہ دور بھی ایسے مطالبوں کا ہے عمرو اور عیار زبان پہ موسیقی نائیں، قصائیں، دادا کی فاتحہ پہ چلوائیں، جھگڑوں میں بلوائیں اور پرتگال کے ولندیزی عیسائیوں کا ہے۔ بیسیوں ڈھب میں پگڑی تو وہ تانے جس کے پاس ہو۔ میرے جیسے بے اولاد تو دھرتی پلیٹ سر پہ ڈال لیتے ہیں۔۔ کہاں کا پرندہ اور کہاں کی بے رنگی۔ اس سے غرض کس روسیاہ کو ہوگی؟ چڑھتے لکھنے لکھانے کی عادت تو بچپن ہی سے لگی ہوئی تھی مگر باقاعدہ مجھے اس طرف لگانے والے میرے بابا اشفاق احمد تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ہر کسی کو آگے بڑھنے کی بلاشیری دیا کرتے تھے۔ کسی میں ذرا سی بھی کوئی خوبی دکھائی دی تو اس کی خوب حوصلہ افزائی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ بے شمار خام پتھروں کو انہوں نے اپنی نظر کیمیا سے گوہر بنایا۔ اللہ کے خاص بندوں میں یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ عاموں کو خاص بنا دیتے ہیں۔

میرا طریقہ واردات کہہ لیں کہ قاری مطالعہ کے بہاؤ میں میری بچھائی ہوئی نئی پگڈنڈی پہ چڑھ جاتا ہے۔ نتیجہ میں وہ بڑی ایام کی بجائے گھوڑا شریف نکل جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو بات آخر ایک ہی ہے۔ شتر مرغ کر ذرا شریف بنا دیا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔۔ دراصل بات تو بھید کا پتہ ہونا ہے۔۔ بچپن میں میرا ایک محلے دار دوست جو عمر میں ہم سے بڑا تھا اپنے والد کے ہمراہ ممبئی ہو آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نزدیک پار کہیں پہنچنے کے لئے روپے پیسے سے زیادہ شوق آوارگی راہ ریل اور کسی طرح کے پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ جدھر کہیں ارادے وسیلے کا میل ہوا وہیں بندہ سفر کا قائل ہوا۔ وہ لپا تپا چند ہفتے ممبئی کیا ہو آیا تھا کہ محلے بھر کے لڑکے بالوں کی محفلیں سج گئیں۔ وہ ایک ایک چیز کو مزے لے کر سناتا۔

3

ٹرامیں ... دو چار گھوڑوں والی بگیاں، اینگلو انڈین، پال دیو کی فرفر انگریزی بولتی ہوئی بیبیاں ... بلاکوں میں اوپر نیچے چڑھتی اُترتی ہوئی بتیاں، ایکٹرز، فلمیں بننے کے کارخانے، سمندر کنارے لمبی لمبی سڑکیں، کناروں پر اونچے اونچے ناریل، پام کے پیڑ ... سمندر لانچیں، جہاز، انڈیا گیٹ، تاج محل ہوٹل، پانی کے اندر حاجی علی کا مزار، اِدھر اُدھر کے عجیب و غریب کھانے، بھیل پوری، پاؤ بھاجی، ڈوسا، بمبئی مٹھائیاں اور ناریل جل وغیرہ، اصل چیز اُس کا اندازِ بیان اور منظر نگاری تھی۔

مُنہ چاہت کھولے، آنکھیں کان اُس پر لگائے ... ہم سب لڑکے اُس کی لن ترانیاں سنا کرتے لگتا اُس کے ساتھ ہی ممبئی گھوم دیکھ رہے ہیں۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ چشمِ زدن میں انٹیل ہندر کی مارکیٹ اس شارع سے دوسری شارع پر پہنچ جاتا کہ حیرت ہوتی۔ وہ سننے دیکھنے والوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ چوپاٹی کے ساحل کی منظر نگاری کے دوران وہ اچانک بجلی کی سی سُرعت سے پارس روڈ کی بغلی گلیوں کی تنگ گندی کھولیوں میں پہنچ جاتا۔ جو عریاں جسموں اور غلیظ بیماریوں میں جکڑی ہوئی کسبیاں اور اصلی نقلی کھڈرے گھورنے والوں سے فحش کلامی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ میرا پہلا اُستاد تھا جس سے میں نے منظر اور موضوع کا کینوس بدلنا سیکھا۔

ماتا کرے مہنگائی آسمان چھونے لگی۔ اِس پچاسی پانچ سو ژولیدہ مجموعہ خرافات کی قیمت تو پانچ سو یں آسمان کے اوپر کی خبر لاتی ہے۔ جبکہ اِس خطیر رقم سے دو تین کپوت بچوں، ایک عدد اُس کی ماتا کے لئے برگر پیزا، چکن سوپ، آئس کریم، ایک ماہ کا موبائل فلیکس، پانچ دن کا پٹرول، شیشہ پینے میں دو گھنٹے کا معاوضہ .... ہاتا یا سردیوں کے فیچل، فیصل آباد، ملتان تک کا ہوائی سفر، چائینہ کا فون خریدا جا سکتا ہے۔ ایک چھوٹی موٹی تقریب بھگتائی جا سکتی ہے، یہ کچھ بھی نہ ہو تو کسی سماجی، رفاہی، فلاحی ادارہ کو عطیہ دی جا سکتی ہے تا کہ کسی حد تک مستحقین اور بہت حد تک ادارہ کے منتظمین کو تقویت پہنچ سکے اور آپ بھی عنداللہ ماجور ہوں۔ بہر صورت اگر یہ کتاب کہیں گلے پڑ ہی جائے تو ذوقِ شعری خاطر کہیں کہیں سے دو چار سطریں یا سو کے لگ بھگ صفحے پڑھنے میں کچھ حرج بھی نہیں کہ زندگی میں بہت سی چیزیں ہیں رشتے، تعلق، موسم، ملک، علاقے، طعام، قیام اور سیاستدان، حکومتیں، سسٹم جو ہمیں پسند نہیں ہوتے مگر ہم انہیں بہر طور برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔
اِس کتاب کا حال بھی کچھ اِس طرح ہی ہے کہ ردی میں بھی نہیں دیا جا سکتا اس سے بہتر ہے کہ آپ کی دوست نما دشمن

کسی سسرالی عزیز رشتہ دار ریٹائرڈ افسر، پٹواری، سکول ٹیچر، گرداور، محکمہ مال یا انہار کے کسی پرانے بابو کو تحفہ میں پیش کر کے اُس سے اپنا کوئی پرانا حساب چکا دیں۔

چارپائی، میز کرسی کے لنگ کا تدارک بھی اس سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر کچھ اور ہاتھ نہ لگے تو بطور ہتھیار بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی کوئی گھگل کریلا تامی معجون ہوتی تو ترکیب استعمال یوں ہوتی خالی پیٹ اور ذہن کتاب کو دیکھنے چھونے سے اجتناب کیا جائے۔ اسے ان پڑھ اور انتہائی پڑھے لکھے ہاتھ نہ لگائیں، درمیانے اور ذاودھو قسم کی تعلیم والے البتہ اسے چکھ لیں تو کچھ حرج نہیں۔ کتاب کے مضامین و مندرجات میں کسی قسم کا کوئی ربط، ضبط، منطق، مقصد حاصل نہ ہوگا کہ مصنف پرلے درجے کا ان پڑھ اور جاہل مُطلق ہے جسے محض تحیر پیدا کرنے کا خبط ہے۔ بے شمار حرف و لفظ تراکیب اجنبی سے ملیں گے جن سے آپ کی پہلی ملاقات ہوگی۔ سمجھ نہ آنے پر کوئی لغت مت کھولئے گا کہ لغت وہ چیز ہے جو کہیں موجود ہو کہ مصنف پرلے درجے کا گھڑتو اور لفنترو ہے۔

آخر میں، میں اکمل بھٹی، بہ طور مصنف، عرف بابا محمد یحییٰ خان، خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے انتہائی ایمانداری سے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ کتاب کا بیشتر اوراق میں نے نہیں، بلکہ صدیوں پہلے میرے ساتھ تخلیق ہونے والے ہمزاد نے بصد اصرار مجھ سے لکھوائے یا لکھوائے ہیں۔ وہ اک زمانے سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اصل میں وہ میری خجلساری، دھوکہ دہی کی حرکتوں سے عاجز آ چکا تھا۔ اب وہ خلقِ خدا کو میری دو نمبری سے بچا کر اپنی عاقبت سنوارنا چاہتا ہے۔ بخدا سمجھایا کہ میں نے تو پہلے ہی اپنی "لالی پاپی" اتار کر کے رکھ دی ہوئی ہے۔ مگر یہ تو میری تک لنگوٹی اتارنے پر مُصر تھا۔ سو جو کچھ الٹی بکواس ہوا اور جیسا ماحول تھا بن و عن لکھ دیا۔ اِس طرح میں اس ہماری کتاب کے سیاق و سباق، متن، محاسن و معائب اثرات و محسوسات، مناقب و عواقب اور اخلاقی، روحانی، سماجی یا عمرانی کسی بھی طرح کے نتائج کے معاملہ میں خود کو بری الذمہ محسوس کرتا ہوں۔

بابا محمد یحییٰ خان

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے

ایک اور کتاب ۔

پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں

بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

0307-2128068

@Stranger
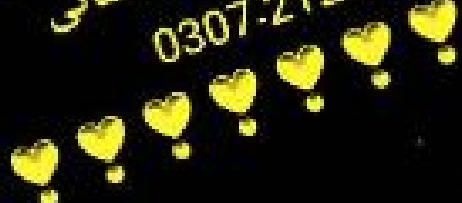
جو تجھ کو تیری ذات سے باہر نکال دے

وحشتِ جنوں میں ایسا قلندر تلاش کر

## ● باندازِ رُومی باطریقِ رازی......!

■ ایک وقت ہو گزرا میں عشق کو وہ عشق سمجھتا تھا جو پیار و محبت کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اک زمانہ کی قُلفی خواری گدھے سواری' بیزاری کے بعد سمجھ آئی کہ پیار و محبت بھرے پیٹ' بھرے کیسے کا مشغلہ ہے جبکہ عشق مختلف روگ ہے۔ اس کی بھی دو اقسام سننے پڑھنے کو ملتی ہیں۔ حقیقی اور مجازی! یہ تو یوں ہی ہوا جیسے کبوتروں میں لقّا اور شیرازی......!

یہ عشق حقیقی اور مجازی! لقّا اور شیرازی' اعلیٰ و تازی' سیاہ و سفید کی تیغ بازی' خودی و بے نیازی' عجمی و حجازی' محاسبی و نیازی' خارا شگافی و آئینہ درازی' کرگسی و شہبازی' ملنگی و قاضی! زندگی کا سفر ایسی ہی غلام گردشوں' غل سراؤں' شاہراؤں' پگڈنڈیوں...... خانقاہوں' حجروں' معبدوں کی خاک پھانکتے' نیچے اوپر اُلانگتے' اندر باہر تاکتے جھانکتے گزرا...... کوٹھوں' چوباروں' بالا خانوں تک بھی پہنچ رہی۔ مُجرے بھی دیکھے دھمالیں بھی ڈالیں...... رقصِ درویش بھی...... رقصِ بسمل بھی! کوڑے پڑے پور پور کٹے "حق اللہ علی مولا" کے نعرے اور چلّے بھی...... حرم کے پھیرے اور دہر کے گھیرے بھی...... کوئے یار کی رُسوائیاں' فُرقت کے عذاب اور قُربت کے ثواب...... آرزوئیں' تمنائیں اور خواب! مگر اصل حقیقت حجاب میں رہی...... کبھی سمجھ نہ آئی کہ اصل اور وصل کہاں سے شروع اور کدھر آخر ہوتا ہے......؟ سیدھے صاف رستے کے برے پہ بھی ٹیڑھ دکھائی دیتی ہے اور کہیں اُلجھی راہیں' کسی سُلجھی ہوئی زلف کی مانند بال بال ہوتی ہیں......؟ یہ سب درِ حجاب ہی تو ہے؟ کوشش بسیار کے باوجود سمجھ میں آنے والا......؟

عشق آمد ہر دو عالم کامیاب
عقل آمد دین و دنیا شد خراب

بابا محمد یحییٰ خان۔

## بند کھڑکی میں کھلی روشنی......!

▪ کچھ عرصہ پہلے بیشتر تنقید نگاروں کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ محمد یحییٰ خان دوسرے نثر نگاروں سے اس لیے بہتر لکھتا ہے کہ وہ مسلسل سفر میں رہتا ہے۔ فقیرانہ لباس پہنتا ہے اور لوگوں سے ڈر کر زندگی بسر کرتا ہے۔

لیکن ابھی چند دن گزرے...... آدھی رات کو مجھ پہ منکشف ہوا...... اچانک جیسے میرے سر پہ کسی نے سوئی ماری ہو۔ میری آنکھ کھلی ہوئی کھڑکی میں صبح کی روشنی تھی۔ یہ روشنی مجھ سے مخاطب تھی گویا کوئی پیغام دینے پہ مُصر ہو۔

احمق! بابا یحییٰ اس لیے نہیں لکھتا کہ وہ بے انتہا سفر کرتا ہے۔ لوگوں سے اس کے معاملے چلتے ہیں وہ جانتا زیادہ ہے اس لیے ایسا لکھتا ہے۔

بیوقوف! یہ سب کچھ تو کئی لکھنے والے لکھتے ہیں لیکن کسی کے قلم میں وہ جادو نہیں جو اس کے قلم میں ہے۔ اللہ! اُسے سیدھا SMS کرتا ہے وہ اللہ کے حکم، اُس کے اشارے اور اللہ کے اَمر سے لکھتا ہے۔ اسی لیے "پیا رنگ کالا"، "کاجل کوٹھا" جیسی تحریر کسی کی نہیں۔ اُسے اللہ کے ساتھ Direct رسائی ہے۔

وہ لکھتا ہے محبوب چاہے رنگ کا کالا ہو محبوب ہی رہتا ہے۔ اب "لے بابا ابابیل" بھی ایسا اَمر ہے جو باطن کے بند بند کھول دے گا......!

کشور ناہید

## کالی رات کی محبوبیت......!

■ مجھے نہ کبھی خواب میں یا حجاب میں
کسی بزرگ نے نصیحت کی یا موقع دیدار
دیا۔ یہ کیسی عجیب تحریر ہے بابا محمد یحییٰ خان
کی کہ جس کی ہر سطر میں مذہب عشق اور
عشق مذہب اِس عالم میں نازل ہوتا ہے
کہ وہ کبھی شکیلہ کی داستان سنانے لگتا ہے'
کبھی ازا بیلا کی' کبھی تصیبو کی۔ کمال یہ ہے
کہ تفصیل وا جمال اجمیر شریف کا ہو کہ بھنگی
کا وار علاقہ جو کبوتروں کا مسکن ہے۔
بابا محمد یحییٰ خان نے امریکہ سے چین
تک کی سرزمین کے سفر میں وہ معرفت
حاصل کی جو تحریر کی خوشنمائی لیے دماغ میں
اُتر کر' پہنچتی ہے۔ اب تو کالے رنگ'
کالے لباس اور کالی رات کی محبوبیت کو بھی
سکی ہو؟ میرے جیسے راستے میں کھو جانے
والے لوگ بابا جی سے استفسار کرتے ہیں
اتنی قوت کہاں سے آئی کہ سب دُنیا دیکھ کر
بھی فقر کو اپنا لباس بنایا......!

انتظار حسین

## اِک ہُنر اور بھی...!

■ ہم جعلی ڈگریوں کے زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔ سو اب قبولِ عام کی سند بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ ایسے بے اعتبارے زمانے میں بابا محمد یحییٰ خان کی نگارشات مجھے پڑھنے کے لئے ملیں۔ مَیں نے سوچا کوئی مضائقہ نہیں۔ چاول کا ایک دانہ چکھ کر بھی دیگ کے ذائقہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ سو مَیں نے دانہ چکھنے کی نیت ہی سے آغاز کیا تھا۔ مگر ہُوا یوں کہ پڑھتا ہی چلا گیا۔ اُدھر یہ صورت تھی کہ ۔

لکھتے رقعہ، لکھے گئے دفتر    شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

نثر خام ہو اور بیان بُودا ہو تو میرے حلق سے مشکل سے اُترتا ہے۔ اس بیان میں کچھ ایسی صفت تھی کہ اس کی روانی میں جیسے ہم بھی بہتے چلے جا رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ زبان اور بیان دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ بُنیادی چیز تو زبان ہے۔ لکھنے والے کی اس پر قدرت نہ ہو تو بیان میں لُطف کیونکر پیدا ہوگا۔

عموماً بیان میں لُطف پیدا کرنے کے لئے جو نسخے استعمال کیے جاتے ہیں اُنھیں بھی استعمال نہیں کیا۔ جعلی لکھنے والا شاعرانہ زبان لکھ کر سمجھتا ہے کہ فلک پہ تیر مار دیا۔ ایسا کوئی حربہ یہاں استعمال نہیں ہُوا ہے۔ نہ بہت رومانیت بگھارنے کی کوشش۔ نہ مقفیٰ زبان لکھ کر سمجھنا کہ ہم نے اُردوئے مُعلّیٰ لکھ ڈالی۔ حقیقت نگاری اپنی معاشرتی زندگی کا لوگوں کی چال ڈھال، طور طریقوں کا گہرا مشاہدہ۔ اس زور پر بیان جاری ہے اور کہانی کہی جا رہی ہے۔ اُن کے قلم میں کچھ اور قسم کا جادو ہے اور قلم رواں ہے کہ گُل پھول کِھلاتا چلا جاتا ہے۔ واہ واہ سبحان اللہ!

# قصرِ فریدؒ کا فقیر......!

■ بابا محمد یحییٰ خان سے میرا تعارف' ان کی کتابوں کے ذریعے ہوا... حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے سالانہ عرس مبارک جو ہر سال 7,6,5 ربیع الثانی کو کوٹ مٹھن شریف ضلع راجن پور میں منعقد ہوتا ہے' کی دعوت دے دی گئی۔ اس سے پہلے ایوان اقبال میں حضرت واصف علی واصفؒ کے سالانہ عرس مبارک کی تقریبات میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ظاہر ہے کہ تشنگی اور بڑھ گئی۔ بہرحال! بابا صاحب کوٹ مٹھن شریف عرس مبارک حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی تقریبات میں شریک ہوئے لیکن وہاں بھی خاطر خواہ گفتگو کا موقع نہ مل سکا۔ لاہور میں اُنہوں نے مہربانی کی اور غریب خانے (قصرِ فریدؒ) پر ڈیفنس لاہور میں تشریف لائے...... کافی دیر ملاقات رہی۔ جب مَیں نے ان کو بتایا کہ بابا جی! ہم آپ کے متاثرین میں سے ہیں تو وہ لفظ متاثرین سے بہت محظوظ ہوئے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اپنی زندگی میں جتنا اَدب بھی پڑھا ہے مَیں اس دَور کا بابا محمد یحییٰ خان کو سب سے بڑا فکشن رائٹر سمجھتا ہوں جس کے قلم میں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ تاثیر دی ہے کہ ایک بار آدمی کتاب شروع کرلے تو اس کے بعد وہ اس کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جتنی تحریر خوبصورت ہے اس سے بڑھ کر بابا محمد یحییٰ خان کی شخصیت متاثر کُن ہے۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے لکھاریوں نے بابا محمد یحییٰ خان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور جس نے جو بھی لکھا ہے' کم ہی لکھا ہے۔ کاش! میرے پاس بابا جی کے قلم جیسی طاقت ہوتی اور مَیں ان کی تحریر کی فنی خوبیوں اور ان کی شخصیت کی والہانہ ورنگی پر کچھ اور لکھتا۔ البتہ دل کی گہرائیوں سے مَیں ان کی درازیٔ عمر اور صحت کے لیے دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ شاید حضرت خواجہ غلام فریدؒ نے ایسے ہی کسی موقع کے لیے کہا ہے کہ ؎

جے یار فرید قبول کرے سرکار وی توں سلطان وی توں
نتاں کہتر کمتر احقر ادنیٰ لاشے لا امکان وی توں

## منفرد اُسلوب کا بابا......!

سرفراز اے شاہ

■ نرم گوئی اور عاجزی آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ منفرد اُسلوب آپ کی پہچان اور مشکل پسندی آپ کا تعارف ہے۔ گفتگو میں اُلجھاؤ اور سُلجھاؤ ندی کے دو کناروں کی مانند ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مشاہدہ اتنا گہرا اور حافظہ اتنا کمال کا کہ جو دیکھا' ذہن پر نقش ہو گیا' جو سُنا ہمیشہ کے لیے نہ صرف محفوظ ہو گیا بلکہ جب وہ تحریر میں آیا تو قاری نے محسوس کیا ہو گا وہ اس منظر، اس واقعہ کا خود بھی حصّہ تھا۔ وہ آنکھ جس نے مشاہدہ کیا۔ اس کی اپنی آنکھ تھی، جنھوں نے سُنا گویا اس کے اپنے کان تھے۔

بابا محمد یحییٰ خان عصری تقاضوں سے خُوب واقف اور نوجوانوں کے نبض شناس ہیں۔ یہی آج کی ضرورت ہے کہ نوجوانوں کو مذہب کی طرف مائل کیا جائے۔

بابا محمد یحییٰ خان کی پہلی کتابیں "پیا رنگ کالا" اور "کاجل کوٹھا"، "شب دیدہ" اپنے اندر کمال کی روانی اور دلچسپی رکھتی ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کی نئی کتاب "لے بابا اَبابِیل" بھی اس وزن پر لکھی گئی ہوگی کہ یہی ان کا فطری میلان ہے۔

اللہ تعالیٰ بابا محمد یحییٰ خان صاحب کے کمالات میں مزید برکت دے۔ آمین!

ڈاکٹر صغریٰ صدف

## ریاضت کے رَستے کا مُسافر...!

■ بابا محمد یحییٰ خان بھی ایک ایسی ہستی ہے جن کا ہر لمحہ خالقِ کائنات کی محبت کی سرشاری سے جُڑا ہوا ہے۔ اس محبت نے اُنھیں مخلوق کے دُکھ سُکھ کے قریب تر کر دیا ہے۔ وہ صوفی ہیں اور صوفی ہمیشہ محبوبِ حقیقی کی خوشنودی کے لیے اس کی مخلوق کا سہارا لیتا ہے۔ یعنی پہلے وہ خدمتِ خلق کے ذریعے مخلوق کو راضی کرتا ہے اور پھر خُدا کے حضور حاضر ہو کر اپنی محبت اور استقامت کا اعلان کرتا ہے۔

بابا محمد یحییٰ خان سے میری ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ شاید یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں سے ان کے بارے میں جانا مگر جب ملاقات ہوئی تو جانا کہ وہ صحیح معنوں میں ایک دَرویشِ عشق ہیں جن کے دل پر رَب کی تجلّی عیاں ہو چکی ہے۔ جن کی رُوح لطافت کی اعلیٰ منزلوں کی سیر کر چکی ہے مگر وہ ابھی تک ریاضت کے رستے کے مسافر ہیں۔

عام لوگوں کے معاملات میں اُن کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہاں اپنے دل کے اطمینان اور رُوح کی آسودگی کے لیے صوفیوں اور ولیوں سے بھی اُن کا خاص رابطہ رہتا ہے۔ وہ اپنے رُوحانی تجربات کو نت نئے موضوعات اور حرفوں کا لبادہ پہنا کر لوگوں کے دلوں پر دستک دیتے رہتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ نُور بانٹنے کی کاوش ہے۔ اگر آپ غور کریں تو ان کا ہر لفظ اُلوہی حقیقتوں سے جُڑا ہوا ہے اور رُوحِ مطلق کا سراغ لگاتا نظر آئے گا۔ دیکھنے پڑھنے والے کو ظاہری آنکھ کے ساتھ ساتھ باطن کی آنکھ کو بھی بیدار کرنا پڑتا ہے۔ پھر بابا محمد یحییٰ خان کے لفظ آپ کی توجہ کو نہیں بلکہ آپ کے دل کو اپنی سمت کھینچتے ہوئے محسوس ہوں گے۔

بابا محمد یحییٰ خان کی رَبِّ حقیقی کے ساتھ ساتھ نبی آخر الزماں ﷺ سے محبت اور عقیدت بھی مثالی ہے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ "محمد" لکھنے اور بولنے پر ہمیشہ اصرار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسی کو اپنی نسبت سمجھتے ہیں اور اسی پر اُن کو فخر بھی ہے۔ بابا محمد یحییٰ خان صاحب کو خدا نے خوبصورت لفظ تخلیق کرنے کا ہُنر بخشا ہے۔ ان کی عبارت پڑھ کر عجیب سُرور محسوس ہوتا ہے۔ خُدا کرے وہ اسی طرح خدمتِ خلق کے کاموں میں جُڑے رہیں، خُدا ان پر اپنی عنایات کے دروازے وا کرتا رہے اور ہم جیسے تشنگانِ علم و ادب ان کی شخصیت سے رہنمائی حاصل کرتے رہیں۔"

خواجہ محمد زکریا

## جدید طلسمِ ہوش رُبا کا مُصنّف......!

■ بابا محمد یحیٰی خان پہلے سیاہ پوشاک' سفید نورانی داڑھی سے متوجہ کرتے ہیں' پھر عجز سے موم کرتے ہیں اور پھر اپنی تخلیقات کے ذریعے آپ کا دل مضبوطی سے مٹھی میں لے لیتے ہیں۔ مَیں ان تینوں مدارج سے گزر رہا ہوں اور اَب اِن کے ہزار ہا مداحوں میں شامل ہو چکا ہوں۔ بابا جی ایک انوکھے صاحبِ قلم ہیں۔ آپ اِن کی ضخیم تصانیف میں سے کسی ایک کے چند صفحے پڑھ لیں تو آپ اتنے مسحور ہو جائیں گے کہ اسے پڑھتے ہی چلے جائیں گے۔ وہ اِس طرح اپنے سحر میں اَسیر کر لیں گے کہ آپ دُنیا و مافیہا کو فراموش کر کے اِن کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں گے۔ اندرونِ ملک بھی بیرونِ ملک' پہاڑوں' وادیوں' سمندروں' دریاؤں' چشموں' میدانوں' جزیروں' آبادیوں' ویرانوں میں جہاں چاہیں گے آپ کو لے جائیں گے۔ اِن کی تحریریں تخیّل' مشاہدہ اور تجربہ تینوں کا حیرت انگیز امتزاج ہیں۔ مافوق الفطرت واقعیت اور تحیر کا ایسا تال میل کسی اور کے ہاں کمتر دکھائی دیتا ہے۔

اگر آپ نے ضخیم کلاسیکی داستانیں پڑھی ہیں تو آپ کو یوں معلوم ہوگا کہ اب آپ ایک جدید داستان کی فضا کا جزو بن گئے ہیں۔ بابا محمد یحیٰی خان کی ہر قصہ در قصہ داستان مجموعہ ہے' ایک جدید طلسمِ ہوش رُبا' ایک وسیع عجائب خانہ ہے۔ ایک طلسمی حقیقت نگاری ہے جس کا ہر واقعہ متحیر و مبہوت کر دیتا ہے لیکن جب آپ کسی واقعے کی دلکشی میں گم ہو کر نقطۂ آغاز کو فراموش کر دیتے ہیں تو بابا جی آپ کو آغازِ داستان کی طرف لے جا کر آپ کے حافظے کو تازہ کر دیتے ہیں اور حیران کر دیتے ہیں کہ وہ انفرادی واقعات کی دلکشی کے ساتھ ساتھ پوری داستان کو مربوط کرنے کی کیسی بے نظیر صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی نثر کا آہنگ حیران کن اور تحیرزا ہے۔ یہ آہنگ پہاڑی ندیوں کی طرح تُندرَو ہے۔ لفظ پُرشکوہ ہیں' بعض جگہ خود ساختہ اور سنگلاخ بھی ہیں لیکن آہنگ کی تیزی میں اس طرح بہتے چلے جاتے ہیں کہ رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی اور روانی میں خلل نہیں آتا۔

بابا محمد یحیٰی خان کی تخلیقات کے مطالعے کے بعد اِنہیں عامل سمجھتا ہوں اور خود کو معمول۔

اختر شمار

# بابائے نثر و دانش......!

- بھرتری ہری نے ایک جگہ لکھا ہے:

"جن پر حقیقت کا انکشاف ہُوا' جنھوں نے "برہم" کو پہچان لیا' اِن کے لیے دُنیا کوئی کشش نہیں رکھتی' کہ سمندر کے پانی میں مچھلی کے ڈوبنے تیرنے سے کوئی لہر پیدا نہیں ہوتی......"

بابا محمد یحییٰ خان... دیئے کی لَو کی طرح داتا کی نگری میں ٹمٹماتا نظر آتا ہے۔ اس نے بدن پر رات کی شال اُوڑھ رکھی ہے' کون جانے' اُس نے اپنی "گُدڑی" میں کتنے ستارے ڈھانپ رکھے ہیں...؟ پنجاب کے دل لاہور میں داتا کے ساتھ جاگنے والا یہ بابا بھٹکی ہوا کی طرح' سانسوں کو معطر کرنے کی ڈیوٹی پر کسی ایک جگہ قیام نہیں کرتا...دُنیا بھر میں گھومنے والے بابے کو آنکھوں والوں نے اجمیر شریف کی گلیوں میں بھی ننگے پاؤں گھومتے دیکھا ہے۔ آج کل اِس کی کتابیں بھی دل والوں میں زیرِ بحث رہتی ہیں۔ وہ خود کتاب نما ہو کر کتاب سینے سے لگائے پھرتا ہے۔ احباب اِسے' بابائے نثر و دانش بھی کہتے ہیں۔ دل کی کتاب جب اُس پر مہربان ہو کر اُترتی ہے تو وہ سطر سطر "سانجھ" کر' سجا سنوار کر پوری کتاب ایک دُلہن کی طرح اپنے "کاجل کوٹھے" سے رُخصت کرتا ہے اور یُوں کتاب کی ڈولی پبلشر کے حوالے ہو جاتی ہے۔

بابا محمد یحییٰ خان اپنے نرالے اُسلوب کا آپ موجد ہے۔ اِس کی تحریروں میں ورق ورق پر صوفیانہ خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ فلسفہ یا غرابت کی بیساکھیاں بجا کر توجہ حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے فکر و اسلوب کی روشنی کے سبب اندھیروں میں دُور سے جگمگاتا دکھائی دیتا ہے۔ مَیں جب بابا جی کی تحریریں پڑھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی خوشبو جیسی باتیں دل دھرتی پر بارش کی بُوندوں کی طرح کِن مِن۔ کِن مِن' برس رہی ہیں۔ وہ محبت کے استعارے کی طرح اُدب و شعور کے آسمان پر ستارہ وار دَمک رہا ہے۔ تفکر و تدبر والوں کے لیے یہ تحریریں سکون اور مسرت کے ساتھ آگہی کی رحمت بن سکتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو بابا جی کی یہ تحریریں آنکھوں میں اُتار دیکھئے "جان ہو جائے گا...""

اصغر ندیم سید

# کہانی بھگت......!

■ الف لیلیٰ کی راتوں پہ پھیلی ہوئی کہانی ہے۔ بابا جی کی یہ کہانی لاکھوں میلوں پہ محیط ہے۔ اللہ کی جتنی زمین ہے اور جتنے افلاک ہیں یہ کہانی سب جگہ بابا جی کو اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے۔

کہانی ایک چھلاوہ ہے۔ اپنی چھب دکھا کر انھیں کو لبھاتی ہے۔ وہ اس کی سُندرتا پہ فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ لپکتے ہیں اور اس کی کھوج میں بھاگے پھرتے ہیں۔ چاروں اور، چاروں کھونٹ وہ ان سے کھیلتی ہے۔ کہانی چھلاوے سے کئی رُوپ لے لیتی ہے۔ ہر رُوپ میں بابا محمد یحییٰ خان اُس کے قریب میں آ جاتے ہیں۔ وہ انھیں بھگتے پھرتی ہے لیکن جی کا کھیل کھیلتے کھیلتے کہانی بابا جی کو باغوں میں محلوں میں گلی کوچوں میں چوباروں پہ بازاروں میں گھروں میں راہوں میں اور شاہراہوں پہ لے جاتی ہے۔

بابا جی بھی ایک ''کہانی بھگت'' ہیں۔ وہ بھی کہانی کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر کہانی سو رُوپ لیتی ہے تو بابا جی بھی ایک سو ایک رُوپ لے سکتے ہیں۔ ویسے تو ایک رُوپ اُنھوں نے اوڑھ بھی رکھا ہے۔ ''پیا رنگ کالا'' ایسا رُوپ ہے جو ان کے ساتھ کہانی کے ہر انداز میں چلتا ہے۔ بابا جی کہانی کو سو بھیس میں بھی پہچان لیتے ہیں' کہانی جو چاہے بہروپ لے لے۔ بابا جی اپنے عصا کے ساتھ اس کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اب کہانی کہاں جا سکے گی؟ کہانی چھلاوہ ضرور ہے اور اِدھر سے اُدھر جلوہ دکھائے گی لیکن بابا جی کے سامنے کہانی بھیگی بلّی بن جاتی ہے اور دبک کر بیٹھ جاتی ہے۔ بابا جی اُسے پُچکار کر لے آتے ہیں۔ بولنا سکھاتے ہیں۔ کہانی کو بولنا کہانی کار سکھاتا ہے۔ یہی کمال بابا جی کا ہے کہ وہ کہانی کو نہ صرف اپنے دام میں لاتے ہیں بلکہ اُسے بولنا بھی سکھاتے ہیں۔ میں اُن کا ایک نیاز مند قاری ہوں۔

بابا جی لاکھوں میل تک پھیلی کہانی کے ساتھ سفر میں رہتے ہیں۔ اب یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ کہانی چھلاوہ ہے یا بابا جی چھلاوہ ہیں۔ قاری بس اتنا جانتا ہے کہ ہزار داستان کا

طلسم کدۂ بابا جی کی کتابوں میں جلوہ گر ہے۔ کہانی اتنی سہولت میں بیان کر دینا ان کی جادوگری ہے۔ میرے لیے تو خود بابا جی ایک طلسم ہے۔ کہانی تو اُن کا دوسرا جنم ہے۔ ہم جنموں میں یقین نہیں رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی بندہ کسی اور میں سانس لینے لگتا ہے۔ اسی طرح کہانی بابا جی میں سانس لے رہی ہے اور بابا جی کہانی میں سانس لیتے ہیں۔

مَیں نے کئی بار سوچا، بابا جی کو دریافت کروں۔ بس ذرا دُور جا کر رُک جاتا ہوں۔ وہ آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ جتنی اجازت ہوتی ہے اتنا ہی جان پاتا ہے۔ کئی دفعہ بابا جی نے کھجوروں اور خوشبو کے تحائف بھیجے۔ تبرک سمجھ کے رکھ لیا۔ سوچا اللہ نے نعمت بھیجی ہے۔ اس میں بھی کوئی بھید ہے ورنہ مجھ جیسے گنہگار اور دُنیا دار میں کیا ہنر ہو سکتا ہے۔

وہ اپنی ٹنگل میں بھید چھپائے پھرتے ہیں۔ اشفاق احمد کی خدمت کرتے کرتے کہانی کے رازدار بن گئے۔ ایم ایف حسین جوتے نہیں پہنتے تھے۔ ایک بار انھیں اندرون شہر لے کر گیا تو لوگ اُنھیں سادھو بابا سمجھ کر جمع ہونے لگے۔ مَیں نے سمجھایا کہ یہ آپ کا مسلک ہے۔ اللہ کی زمین پر جوتا نہیں رکھتا پاؤں رکھتا ہے۔ زمین کی حرمت اور احترام کرتا ہے۔ زمین پر اکڑ کر بھی نہیں چلتا اور اگر جوتا چُرمُر اور چوں چوں کرتا ہے تو یہ غرور کی علامت ہے۔ ایسا جوتا نہیں پہننا چاہیے۔ زمین میلی نہیں ہوتی۔ زمین کو میلا ہم کرتے ہیں۔ وہ آلائش پاؤں سے لگتی ہے۔ اگر زمین تازہ مٹی کی طرح نئی نکور ہو تو اس پر پاؤں میلے نہیں ہو سکتے۔

ایم ایف حسین کے بعد بابا محمد یحییٰ خان بھی زمین کو محسوس کرتے ہیں۔ زمین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ زمین کو پاؤں میں لپیٹ لیتے ہیں۔ زمین بچے یا ماں کی طرح اُن سے لپٹ جاتی ہے۔ بابا جی جوتا کم پہنتے ہیں۔ ان کی کہانی بھی جوتے نہیں پہنتی۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی رہتی ہے۔

زندگی جیسی ہے ویسی دیکھنا مشکل ہے۔ زندگی جیسی ہونی چاہیے بابا جی اُس کا خواب دیکھتے ہیں۔ پھر خواب میں کہانی کا پیچھا کرتے ہیں۔ وہ کب خواب سے باہر آتے ہیں کب واپس چلے جاتے ہیں یہ طلسم جاری ہے اور ہم حیران یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

محمد پرویز کلیم

■ بابا محمد یحییٰ خان کون ہے اور وہ کیا چاہتا ہے؟
اس شہر میں بہت سی آنکھیں ان سوالات کا بوجھ اُٹھائے کو بکو دکھائی دیتی ہیں۔

کوئی کہتا ہے..... بابا ایک اَسرار ہے۔

کچھ کہتے ہیں...... بابا ایک کردار ہے جو اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں پہ منکشف ہونا چاہتا ہے۔

چند لوگ کہتے ہیں... بابا اور اس کی کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں فطرت کے سامنے ایک پکار ہیں، فریاد ہیں۔

جیسے بابا کہہ رہا ہو... مالک کو اور بتا میں نے اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھا دی۔

لیکن میں کہتا ہوں... بابا! مجاز اور معرفت کے درمیان اک ایسا پُل ہے آدمی اور انسان آپس میں مِل سکتے ہیں۔

مجھے تو کبھی یوں لگتا ہے جیسے بابا نے ایک ہاتھ دُنیا کی زُلفوں میں ڈال رکھا ہے اور دوسرے ہاتھ میں مخلوق اللہ کی تسبیح پکڑ رکھی ہے۔ سچ پوچھیے تو بابا کی تحریروں نے ہی مجھ کو بابا سے متعارف کروایا ہوا ہے۔

ایک بار بابا نے اپنے مزاج جیسی خوش خطی اپنی کتاب پہ فرما کر میرے نام ایک ایسا فقرہ لکھا جسے میں آج بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بابا کی اُلجھی ہوئی تحریریں پڑھ کر شاید کچھ لوگ "سُلجھ" جاتے ہوں گے۔

مجاز
اور
معرفت
کے
درمیان
پُل
......!

بابا سیاہ لباس زیب تن کر کے کالی رَوشنائی سے روشنی لکھ سکنے کا ہُنر رکھتے ہیں۔

مجھے لگتا ہے کالا رنگ اوڑھ کر بابا نے اپنی بُکل میں دھنک رنگ چھپا رکھے ہیں۔ شاید اکیلے میں بابا اِن دھنک رنگوں سے کھیلتے ہیں۔ عجب انسان ہیں، علامتی تجرید لکھ کر ہر اُس شخص کو اپنا اسیر کر لیتے ہیں جو اپنے شعور کی تیسری آنکھ کھول کر دُنیا میں جھانک رہا ہے۔ بابا کی تحریروں میں اُن کا کوئی بھی پیراگراف قاری کا ہاتھ پکڑتا ہے تو کتاب میں اِک دروازہ کُھل جاتا ہے اور پھر وہ بابا کے افکار کی وادی میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ پڑھنے والا ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چُھڑا کر واپسی کی راہ لیتا ہے۔ بابا کی تحریر پلٹ کر واپس جاتے ہوئے قاری کو آوازیں دیتی ہے لیکن وہ مُڑ کر اِس لیے واپس نہیں دیکھتا کہ کہیں وہ پتھر ہی نہ ہو جائے۔

بابا کی کوئی بھی کتاب پڑھ کر مَیں اِن کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں تو مجھے وہاں بیتی ہوئی صدیوں کی دُھول اُڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور دُھول میں مجھے بابا رقص کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور مَیں اکثر ڈر جاتا ہوں اور پھر اِس کے ہونٹوں پہ معصوم سی مسکراہٹ دیکھ کر میرا ڈر جاتا ہوں اور پھر اِس کے ہونٹوں پہ معصوم سی مسکراہٹ دیکھ کر میرا ڈر اور خوف دُور ہو جاتا ہے..... میرا خیال ہے کہ بابا محمد یحیٰی خان ایک ایسا لکھاری ہے جو دُنیا کو تین طلاقیں دے کر اِسی دُنیا کے لیے لکھ رہا ہے۔

## خواجہ غلام قطب الدین فریدی

آستانہ عالیہ حضرت محمد یار فریدی

بابا محمد یحییٰ خان ایک صاحب بصیرت اور حال مست درویش کا نام ہے جنہیں قدرت نے گراں قدر نعمتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہوا ہے مگر وہ اپنی پسندیدہ وضع قطع سے اُن خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور "تو برا حاجی گو" کی بجائے "یا رب ہمہ خلق را بہ من بدخو کن" کی راہ اپنائے رکھتے ہیں۔

بہت سے لوگ انہیں دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں اور انہیں ایک روایتی ملنگ سمجھتے ہیں جو علم و عمل سے عاری ہوتا ہے مگر اُن کی شخصیت کے سحر نے زورِ قلم اور جادو بیانی نے اُن کی ذات میں علم و آگہی کے اُن خزائن کی چغلی کھائی ہوئی ہے جو اُن کے اندر موجود ہیں اور جنہیں بابا محمد یحییٰ خان نے اپنے ملامتی روپ میں چھپایا ہُوا ہے۔

آپ اُن کی کسی کتاب کو کہیں سے پڑھنا شروع کر دیں جوں جوں پڑھتے جائیں گے دلکشی بڑھتی جائے گی اور اُن کے دِل سے اُٹھنے والی بات اِس طرح اپنا جادو جگاتی جائے گی کہ آپ گردوپیش سے بے خبر ہو جائیں گے۔

قاری کتاب پڑھتے ہوئے سوچنے پہ مجبور ہو جاتا ہے آخر اس پردہ ملامت میں کون ایسا غوّاص چھپا ہُوا ہے جو سادہ اِلفاظ کے ساتھ حقائق کے سمندر میں غوطہ لگا کر قیمتی جواہر نکال باہر لاتا ہے اور سب کو حیران کر دیتا ہے۔ اس مشکل سوال کا جواب حضرت خواجہ غلام فریدؒ ہی دے سکتے ہیں۔

ہر صورت وچ آوے یار
کر کر ناز ادا لکھ وار

محبت، خودداری، انکساری اور مہمان نوازی اِس مردِ درویش کا طرۂ امتیاز ہے جو درویشی کا اصل سرمایہ ہے اور اعلیٰ ظرفی نے تو اِن کی سادہ دلی کو اور حسین بنا دیا ہے۔ الغرض ان کی تحریر میں اُن کے "کاجل کوٹھے" سی شگفتگی، گہرائی، گیرائی اور خیال کی رعنائی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ اب "کے بابا آہا کلّ"... اللہ ہی اللہ!

چوہدری محمد امین سندھو

# ● مشک بوٹی......!

■ کتاب اور قلم سے وابستگی! حروف کو آنکھوں سے چومنا' بھینچنا' اِن کے معانی و محاسن کو سمجھنا میرا شوق ہی نہیں میرا یقین اور ذوق بھی ہے کہ کتاب اور صاحبِ کتاب' مالکِ علم و عرفان کی عطا ہوتے ہیں۔ یہ بھی میرے خالق و رازق کا کرم ہے کہ مَیں اِس سُنہری لڑی میں پرو دیا ہُوا ہوں جس کے لیے میرے کریم آقا ﷺ نے فرمایا۔ "مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

کالا رنگ! یہ میرے آقا ﷺ کی سوہنی کملی اور پیاری زُلفوں کا رنگ ہے۔ یہ رنگ مجھے خانقاہوں کے اُن حجروں کی زیارت کرواتا ہے جن سے وُہ چاند نمودار ہوئے جنھوں نے ظلمت کدوں کی اندھی اندھیری فضاؤں کو کلمۂ حق سے منوّر کیا۔ یہ رات کا رنگ ہے جس کے بطن سے صبح بیدار ہوتی ہے۔ تہجد سے نُور کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ یہ وہ کائناتی رنگ ہے جو پردہ پوش ہے سب کے راز چھپاتا ہے اور جس کو اللہ نے سب سے زیادہ اہمیت دی...... برتا اور پسند فرمایا۔"

بابا جی کے قلم میں وُہ برکت اور قوت ہے جو اللہ والوں کی صحبتوں اور خانقاہوں سے عطا ہوتی ہے۔ اِن کی سیاحت' اِن کے وجود کو مکمل کرتی ہے یہی وہ سفر' جو قلندر رنگے سے شروع ہُوا' پھر جہانوں کی گشت کے بعد "داستان سرائے" سے اپنا رُوحانی اور فکری رنگ وصول کر کے اپنے اگلے سفر پر رواں دواں ہے۔ بابا جی! فرد نہیں' اِک کارواں ہیں...... کائناتی رنگوں' رازوں کو کھوجتا ہُوا' رواں دواں......!

اپنی سرگزشت "شہاب نامہ" میں قدرت صاحب رقم طراز ہیں کہ مَیں دَرویشوں کی صف میں بیٹھا اپنے حصّے کے رُوحانی لنگر سے محض اس لیے ہاتھ دھو بیٹھا کہ میرے بائیں پہلو سے ایک کالے کُتّے نے اس میں مُنہ ڈال دیا تھا۔" بابا جی کی کتابوں "کاجل کوٹھا"، "شب زیدہ" اور "پیا رنگ کالا" کے مطالعہ سے نحوستوں' نحوروں' کالے رنگ' نجس پاک پلید' کمی کمین' نیچ ذات' قوم' جاہل اور بُردوں کے بارے' میری تمام غلط فہمیاں دُور ہو گئیں اور مَیں راست' مثبت رویّوں کی راہ آ لگا۔ مجھے یہ بھی محسوس ہُوا کہ بابا کی تحریر ایک مکمل تجارت ہے جو صرف رُوحانی کوڈ ورڈ سے سُلجھائی جا سکتی ہے۔"

• بانو قدسیہ نے بابا محمد یحییٰ خان کو کھوجنے اور بُوجھنے کا آفاقی نام دیا ہے۔

• بابا جی نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز' راہِ سلوک میں پڑنے والے پڑاؤ...... اور اِس دوران تربیت اور فیض پہنچانے والوں بابوں کے اذکار کو بڑی مہارت اور غیر روایتی انداز سے قاری تک پہنچایا ہے۔

افضال احمد

## آستانہ حیرت کا مسافر......!

■ بابا محمد یحییٰ خان کے محیر العقول مشاہدات' تجربات' جذبات' واقعات' خیالات' انکشافات پر مبنی اِن کی تحریریں قاری کو اپنی گرفت میں ایسے سمو لیتی ہیں کہ وہ مُدتوں اِن کے اثرات سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔ کتاب کی کہانی اور کردار آپ کے ساتھ ساتھ آپ کو اُس دُنیا میں لے جاتے ہیں جہاں پر زندگی رنگ و رُوپ بدلتی اور زمانے کے کَرم اور سِتم اِس انداز میں دکھاتی ہے کہ آپ خود ایک کردار کی طرح کتاب کی داستان میں شامل ہو جاتے ہیں اور پھر آپ کا سفر حیرت انگیز کرداروں کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ بظاہر تو بابا محمد یحییٰ خان ہماری طرح کے عام سے انسان نظر آتے ہیں مگر وہ رُوپ ایک فقیر' دَرویش کے تناظر میں ہوتا ہے! کالا جُبّہ' چادر۔ گلے میں منکے ہی منکے۔ ہاتھوں میں کمال کی خُوبصورت انگوٹھیاں پھر سب کمال ان کی آنکھوں میں ہے۔ بڑی آنکھیں اِن کے چہرے پر خوب جچتی ہیں۔ وہ آپ کو دیکھنے کے بعد آپ کو قوتِ گویائی سے محروم کر دیتے ہیں۔ آپ کے دِل میں جو کچھ بھی ہوتا ہے' آپ سب بُھول کر ایک ہی بات کہتے ہیں بابا جی دُعا کریں۔ دُعا ہی بابا جی کی شناخت ہے جو ہم سب کو پُرسکون رکھتی ہے۔

بابا جی یہ سب کچھ کیسے سوچتے ہیں وہ ہی سب سے حیران کُن ہے۔ عام زندگی میں بھی بابا جی کے ساتھ چلنا آسان نہیں ہے۔ اِن کی رفتار اور رفاقت میں توازن رکھنا آپ کا امتحان اور مزید تحریروں کی تلاش آپ کو ملامتی کے رُوپ میں آستانہ حیرت کے طواف کرواتی رہتی ہے۔

پھر پڑھنے والا بابا جی کی کتابوں اور خیالوں میں ایسا کھو جاتا ہے کہ باہر نکلنے کا راستہ نظر بھی آئے اور دل بھی چاہے تو بھی باہر نہیں نکلتا اور وہیں بسیرا کرنے کی خواہش دِل میں بسا کر بابا جی کی قربت کا خواہش مند رہتا ہے۔ اُمید ہے بابا محمد یحییٰ خان اپنی ایسی تحریروں سے اپنے قارئین کو لُطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتے رہیں گے۔

(سنگِ میل پبلی کیشنز)

رِیاض محمود

# بابا صاحبا کا کاکا......!

■ رُوحانی بابوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں' کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو پوشیدہ نہیں رکھتے اور خلقِ خدا کی مشکلات میں اللہ سے دُعا گو رہتے ہیں۔ اللہ ایسے بزرگوں کی دُعا کو قبول بھی کرتا ہے۔ یُوں اِن کا فیض ہر خاص و عام کے لیے جاری رہتا ہے۔ بابوں کی ایک دوسری قسم وہ ہے جو کسی نہ کسی رُوحانی مرتبے پر فائض تو ہوتے ہیں لیکن لوگوں کے سامنے خود کو آشکار نہیں کرتے۔ ایسے بزرگ دُکھی لوگوں کے لیے عملی کوشش بھی کرتے ہیں اور دُعا بھی' لیکن یہ سب کچھ ظاہر کیے بناہی ہوتا ہے۔

بابوں کی تیسری قسم میرے نزدیک اُن بابوں کی ہوتی ہے جو وضع قطع سے رُوحانی شخصیت نظر آتے ہیں لیکن اُن کے اعمال اُن کی ظاہری شکل و صُورت کے برعکس ہوتے ہیں۔

مَیں نے جب پہلی بار بابا محمد یحییٰ خان کو اشفاق صاحب کے ہاں دیکھا تو کچھ اندازہ نہ کر سکا تھا یہ کس ڈھنگ کے بابا ہیں۔ درمیانہ قد' سیاہ لباس' مکمل داڑھی' ہاتھوں میں مختلف پتھروں کی انگوٹھیاں' آنکھوں میں سُرمہ' کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ باباجی کس خانے میں فٹ ہوتے ہیں؟ لیکن جب مَیں نے اُن کی دانش سے بھرپور گفتگو سُنی' مزاج کی اِنکساری دیکھی اور لہجے کی ملاحت کو محسوس کیا تو میرے اندر سے آواز آئی کہ "یہ تو اصلی بابا ہے" اس کے بعد پھر باباجی سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں تو اُن کی صحرانوردی' مختلف علوم پر اُن کی معلومات اور اُن کی تحریروں کی بدولت مَیں اُن سے بہت متاثر ہُوا۔

باباجی رُوحانیت کے کس درجے پر فائز ہیں اس کے بارے میں نہ تو اُنہوں نے کبھی بتایا اور نہ ہی مَیں اپنی کم فہمی کے باعث اُن سے کبھی پوچھ سکا۔ البتہ بزرگانِ دین سے اُن کا جو عشق ہے جو اُنہیں کبھی حضرت داتا گنج بخشؒ، بابا فریدؒ، سلطان باہوؒ، میاں محمد بخشؒ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، شہباز قلندرؒ اور دوسرے بزرگوں کے مزارات تک لے جاتا ہے' وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

**ساجد خان**

## وہ سب سے منفرد اور انوکھے سے نظر آتے ہیں......!

■ مَیں بابا محمد یحییٰ خان کی شخصیت اور تحریر کا پرانا اسیر ہوں' ان کی تحریر اور اسلوب پڑھنے والوں کو اُردو زبان کی وُسعت کا اندازہ کرواتی ہیں۔ ان کے لفظوں کی مینا کاری سے اندازہ ہو سکتا ہے اُردو لشکری زبان کیوں ہے۔ کافی سال پہلے جب مَیں کینیڈا میں دَرس و تدریس سے وابستہ تھا تو اُس زمانہ میں میری بیٹی خوش بخت حنا خان' میرے لیے پاکستان سے کتاب "پیا رنگ کالا" لائی۔ مجھے اپنی بیٹی کے انتخاب پر حیرت تھی' وہ اس کتاب کی گرویدہ تھی۔ جب کتاب پڑھنی شروع کی تو اندازہ ہُوا' کیا کتاب ہے۔ حیرت اور حیرانگی کا سمندر اور جستجو کی تلاش کا ریگستان' جس میں قاری ایسا گم ہوتا ہے کہ کتاب کی کہانی' قصے' واقعات ختم ہو جاتے ہیں مگر پڑھنے والے کی تلاش زندگی' اُمنگ اور جستجو مزید بڑھ جاتی ہے۔

پھر مجھے صاحب تحریر کی تلاش شروع ہوئی' ایک دن کیا ہُوا لاہور گلبرگ کی وہ سڑک جو قذافی گراؤنڈ کی طرف جاتی ہے' وہ نظر آئے' مَیں نے کار ان کے قریب رُوکی اور بلند آواز کہا "بابا جی! بس بیٹھ جائیں۔" یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہُوا کہ بابا بھی میری کار میں بیٹھ چکے تھے اور مَیں نے کار کا رُخ قذافی سٹیڈیم کی طرف موڑ دیا۔ بابا جی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور میرا بھی حیرت اور خوشی کا سفر شروع ہُوا۔ ان کی شخصیت نرم خو' حلیم طبع' مہمان نواز' لنگر بردار کی شکل میں نظر آئی۔ میرے جیسے لوگ بابا محمد یحییٰ خان سے ملنے کے بعد ایک پُراَسرار سے روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بابا جی گُرو کا رُوپ اختیار کر لیتے ہیں پھر بھی بابا جی کا کھوج لگانا کافی دُشوار رہتا ہے۔ بابا جی دُعا پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ آپ کو منتر نہیں بتاتے۔ ہم جیسے دُنیا کے متوالوں کو پتھر نہیں مارتے' قیمتی پتھر نذر کرتے ہیں۔ ہم ان سے محبّت اور پیار کرتے ہیں وہ ملنگوں کو پہچانتے ہیں...ہم سے پیار کرتے ہیں۔ بابا جی کی توجہ اور سلوک مَن کو شانت رکھتے ہیں۔ اب بابا جی کی نئی کتاب "لے بابا ابابیل" سامنے ہے۔ کتاب کا نام بھی خوب ہے۔ اس کتاب نایاب نے خاصی محنت اور مشقت کروائی ہے۔ اِس کتاب کو سنوارنے میں سنگ میل پبلی کیشنز کے رُوح رواں اور میرے دوست جناب افضال احمد کا بہت سا حصّہ ہے۔

سلمیٰ اعوان

# اُسلوب کا فسوں......!

■ بابا محمد یحییٰ خان کے رُوحانی اور تصوف کے سلسلوں سے متعلق قصے کہانیوں کی جتنی بھی شکلیں میرے اردگرد کے ماحول میں رچی بسی تھیں اُن میں سے کسی نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا تھا۔ شاید میں بڑی قصیری کی کچھ اتنی قائل نہیں۔

مگر جب میں نے اُن کی کتابیں اور دیگر نگارشات کو پڑھا تو میں حیرتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گر پڑی۔

یہ کہانیاں تھیں یا شاہ پارے تھے۔ لفظ تھے یا صفحات پر بکھرے ہوئے موتی تھے۔ کرداروں کے خدوخال' اپنے ماحول' اپنی فطرت اور اپنے رویّوں کے ساتھ کسی مصوّر کا شاہکار معلوم ہوتے تھے جیسے پینٹ کرتے ہوئے اس فنکار کے مُوئے قلم سے مجال ہے کہ اُن سے متعلق بال برابر کوئی چیز پینٹ ہونے سے چھوٹ گئی ہو۔ ماحول کی تصویر کشی' اُسلوب کا فسوں سب کا جادو گویا جیسے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

"کاجل کوٹھا"' "پیا رنگ کالا" اور "شب دیدہ" تینوں نے مجھے جنّت جپھا ڈال لیا تھا۔ پوری پوری رات میں نے ان کے سحر میں گزاری۔ واقعات کا انوکھا پن کہیں اگر رُوکتا تھا تو بھی تحریر کی فسوں خیزی کا بہاؤ اتنا زورآور ہوتا کہ وہ گھسیٹ کر آگے لے جاتا۔

میں سوچنے پر مجبور ہوئی کہ یہ کوئی ہے جسے اس درجے کا کمالِ فن نصیب ہُوا ہے۔ جس کی پیشانی پر تحریر کر دیا گیا ہے کہ اچانک مطلعِ اَدب پر اُبھرے گا' لکھے گا اور چھا جائے گا۔ ایسا ہی ہُوا۔ وہ آیا۔ اُس نے لکھا اور وہ چھا گیا۔

ثمین عباس خان

## پیر گشت کی حدیثِ دیگری......!

■ بابا محمد یحییٰ خان کا یہ "دفترِ نوشت" جس میں علوم و فنون کی "دریوزہ گری" ہے۔ اُمیدوں کا تار کے رنگین قصے...... ایک ایسا مجموعۂ حرف و لفظ جس میں اساطیری، تہذیبی، تجریدی، تمثیلی اور طلسماتی تحاریر کے تحیّر تماشے ہیں۔

کتاب کے موضوعات ایک طرف، اس کے عنوانات ہی کمال کی آگاہی اور اِک طرفہ لطف دیتے ہیں۔ انوکھی ضرب الامثال، اچھوتی اصطلاحات، چٹپٹے چٹکلے، ترازو فقرے اور شاندار شوکتِ لفظی، خامے کی خوبیاں ہیں۔ صد ہا نئے الفاظ و محاورات، تراکیب و تشارح...... تعجب ہوتا ہے کہ اُردو زبان کے دامن میں کیسی کشادگی اور کشاکش ہے...... کہیں شانت جھیلوں سی خامشی...... کہیں عروشال ساگر جیسی گہرائی اور گیرائی...... لق و دق صحراؤں کی سنگینی! سنگلاخ پربتوں کی دہشت! پُراسرار جنگلات کی سرگوشیاں، جھرنوں، آبشاروں کی ترنّم ریزیاں...... یوں لگتا ہے ہم کتاب نہیں اِک کائنات کا نصاب دیکھ رہے ہیں۔

مضمون، موضوعات منفرد اور عام قوتِ مطالعہ سے ماورا ہیں۔ یہ کتاب مسلمان نہ کافر...... نہ ہی ناول، افسانہ، ڈرامہ، سفرنامہ کی ذیل میں آتی ہے۔ حیرت ہے کہ یہ اَرضی و سماوی بھی نہیں، ہجر و وصال کی حکایتیں بھی نہیں۔ حکمت و سائنس، مذہب و ادیان کی مباحث سے دور اور نہ رومان و فسوں، بس! ابھی آفاق کہیں پاتال، طبعیات و مابعد الطبعیات! یا یوں کہیے جو سامنے آیا قلم زد ہو گیا۔ کوئی شکل اور کوئی حد، آغاز و انجام نہیں...... ہاتھ کا قلم پناہ مانگتا ہے۔ علوم و فنون ہوں یا عشق و جنون، فلسفہ، طب یا منطق...... لگتا ہے بابا سب کے راکب ہیں۔"

"پیا رنگ کالا"، "کاجل کوٹھا"، "شب دیدہ" کے دس برس بعد "لے بابا ابابیل" جو "تحیّرِ مسکوتیت" کا ایک نادر نمونہ ہے۔ قاری کو نادیدہ جہانوں اور اَسرار و ماورائیت کے ان دیکھے ایوانوں میں لے جاتی ہے۔ جدھر تحیّر ہی تحیّر ہے۔

بابا! الفاظ و زباں شناس، صاحبِ قلم و قرطاس ہیں۔

دور باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود

## اَلف اللہ' بائے بابا......!

اَلف اللہ کی بجائے اَلف آم کی بات جب سمجھ میں نہ آئی تو ڈرتے ڈرتے قاری صاحب سے پُوچھ لیا...... اُنہوں نے موٹی موٹی سُرمہ لتھڑی آنکھوں سے گھورتے ہوئے فرمایا...... اَلف کا آم تو دِکھایا جا سکتا ہے' اَلف کا اللہ کیونکر دِکھائیں گے......؟

ماں کی گود سے جب بچّے کو زبردستی گھسیٹ کر' ٹاٹ مدرسہ یا پھوڑ مسجد میں پہنچایا جاتا ہے تو وہ دِن' وقت اُسے ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ میری اَوّلین یادوں میں خاص طور پہ یہ مدرسہ گھسیٹ کر لے جانے والا منظر ہمیشہ تازہ رہتا ہے...... گو یہ مدرسہ مسجد' یعنی ابتدائی پڑھائی لکھائی کا سلسلہ جلد ہی ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا پھر بھی تب کی یادیں باتیں میرے ذہن میں جگنوؤں کی مانند ٹمٹماتی رہتی ہیں کہ ان کے ڈانڈے آگے چل کر میری ہستی کا سامان بن گئے تھے......!

مَیں اپنی اوائل عُمری میں بدتمیز تو ہرگز نہ تھا البتہ تیکھا طَباع اور بے پناہ فطین ضرور تھا۔ بات سے بات نکالنا تو یوں تھا جیسے بچوں کے سکول میں کوئی عام سا جادوگر اپنے سر کے کالے ہیٹ سے چِٹا سفید خرگوش نکالتا ہے۔ ایسے ایسے سوال داغتا کہ اگلے کا جواب دیتے وقت حلق کا تھوک خشک ہو جاتا...... میرا یہی نُوکیلا پن' بات کرید نے کی عادت' بخیے پہ بخیا مارنے کی جُرأت ہی میری دُشمن بنی کہ اُستاد بدکتے تھے مجھے مُنہ لگانے سے گریز کرتے۔ میرے مکتب آنے پہ ناخوش اور غیر حاضر رہنے پہ فرحاں رہتے...... اَبا جی میری تعلیمی کارکردگی معلوم کرنے جو سُوئے مکتب آ نکلتے تو اُن سے یہی درخواست کی جاتی...... خان صاحب! صاحبزادہ کی علمی' فکری' ذہنی اور بے ذھرکی کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپ ان کی صلاحیتوں سے کسی اعلٰی درجہ کی دانش گاہ کو مستفیض ہونے کا موقع بہم پہنچائیں...... اَبا جی' اِس مشورے میں چھپے ہوئے طنز کو کمال تحمّل سے برداشت کر کے دکھاوے کی ہنسی میں اُڑا دیتے...... پھر اُن کا سارا غصہ میری جانِ ناتواں پہ اُترتا۔

پٹھان کا ٹھاہو یا سیو' بہر طور پٹھان ہی ہوتا ہے جن کی عقلی فکری صلاحیتوں کی بابت اگرچہ کم ظرف

لوگوں کی آراء صائب نہیں ہوتیں مگر میری ذاتی سمجھ کے مطابق' جو نمایاں اور نہفتہ اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں ان میں پائی جاتی ہیں وہ کسی دوجے میں کم ہی ہوں گی۔ اس کا قریبی اور ناقابلِ تردید ثبوت میری خود ذات تھی کہ بڑے بڑے نہلوں پہ میں اکیلا ہی دہلہ تھا!

مجھے بھلی طرح یاد ہے ٹاٹ مدرسہ میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک موٹے کاغذ کا ایک کارڈ تھمایا گیا تھا جس پہ شطرنج کی بساط کی طرح خانے بنے ہوئے تھے اور اُن میں موٹے موٹے عربی رسم الخط میں حروفِ تہجی نمایاں تھے...... حافظ قاری عبدالرحمٰن عرف حافظ منّے نے مجھے سامنے بٹھایا' بڑی بے دردی سے میری انگشتِ شہادت پکڑ کر حرفِ الف پہ رکھی اور کہا۔

''یا فتاح'' پڑھو۔ میں نے ''یا فتاح علماً کثیرہ'' بڑے الحان سے پڑھا...... حافظ صاحب نے میرے کان کی لو اپنی اُنگلیوں کے بڑھے ہوئے ناخنوں کی چٹکی میں بھرتے ہوئے کہا' میں نے تمھیں کیا پڑھنے کو کہا تھا اور تم نے کیا پڑھا؟...... درد سے بلبلاتے ہوئے میں نے جواب میں کہا۔

''یا فتاح علماً کثیرہ، پڑھا ہے...... کیا غلط پڑھا؟''

''غلط یہ تھا کہ میں نے تمھیں ایسا پڑھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ تم وہی پڑھو جو اُستاد پڑھائے......''

میرا کان ہلکا سا زخمی ہو چکا تھا اگر چند لمحے اور دبائے رکھتے تو اُن کے تیز بڑھے ہوئے ناخن آر پار ہو چکے ہوتے۔ اُن کے ایسے خطرناک ناخن دیکھ کر بلا ارادہ میرے مُنہ سے نکل گیا۔

''حافظ جی! ایسے بڑھے ہوئے ناخن تو مکروہ ہوتے ہیں اور ان سے کھانا پینا بھی اور آپ نے......؟''

اُنھوں نے میرے سر پہ دھول جماتے ہوئے کہا۔

''میں بھی جانتا ہوں بڑھے ہوئے ناخن مکروہ ہوتے ہیں مگر تمہارے جیسے شیطانوں کی گوشمالی کے لیے مجھے یہ مکروہ کام بھی مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔''

بس اسی روز سے ہم دو فریقین کے مابین ''روزِ اول گُربہ کشتن'' والا نوٹنکی ڈراما کھیلا جانے لگا۔

کسی گھر کی سوتنوں میں کیا سوتاپا ہوگا جو ایک پانچ چھ بالشت کے بچونگڑے اور پچاس جنموں کی بچ پچے ہوئے ختمی حافظ کے مابین تھا...... آپ کو شاید ختمی حافظوں کے بارے کچھ زیادہ معلوم نہ ہو۔ اکثر ختمی حافظ' وہ ذاتِ شریف ہوتے ہیں جو سوگ کی محفلوں' قُلوں' دسوؤں' برسیوں' چہلموں اور فاتحہ پہ' کچھ نقدی' کپڑے اور کھانے پھل پانے کی خاطر قرآن پاک کی بے دریغ اُلٹی سیدھی پڑھائی کر کے بستیوں کی بستیاں واصلِ قبرستان کر چکے ہوتے ہیں...... ان کے چہرے بے رَس و رَدوق' دانت مکروہ' دیدے حرص و ہوس کے فلیتے اور پیٹ اندھے کھو ہوتے ہیں۔ جن میں مُردار سڑے پھل اور رزق پنے کیڑے دھرے رہتے ہیں۔ اِن پیشہ وروں

کی گفتار اور رفتار نہایت تیز ہوتی ہے کہ یہ سارا دھندہ ہی تیز زبانی اور تیز گامی کا ہوتا ہے۔ کئی کئی قرآن اور ایک دن میں کئی کئی مُردوں کے لیے دُعائے بخشش...... ایک ختم قُل ادھر دُوسرا شہر کے اُس پار کوئی موچی کوئی کمہار ختمی حافظ ہر جگہ موجود ہر وقت تیار......!

علّامہ کو "خداوندانِ مکتب" سے بھی یونہی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُن کے ساتھ بھی شروع شروع میں یہی کچھ ہُوا۔ اس کے آگے سکول کالج اور یونیورسٹیوں میں بھی یہی طور طریقے مختلف شکلوں میں موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ "اقبال دیر سے آیا کرتا تھا......"

ہاں تو بات ہو رہی تھی میرے پہلے اُستاد حافظ مٹھے کی جنہوں نے "یا فتاحُ" کے ساتھ "علماً کثیرہ" پڑھنے پہ میرے کان کی نازک لَو قریب قریب چھید ڈالی تھی اور یہ سمجھایا تھا کہ وہی پڑھو یا کرو جو اُستاد بتائے...... اپنی من مانی نہ کرو...... اب میں حروفِ تہجی کی پٹی پڑھتے وقت "یا فتاحُ" تو با آواز بلند پڑھ لیتا مگر "علماً کثیرہ" دل میں دُہرا لیتا تھا۔"

زبان کی جڑ سے دل کے بڑے دروازے تک بمشکل آدھی پونی بالشت کا فاصلہ ہوگا...... مگر ان قریب ترین ہمسایوں کے کردار و افعال میں اکثر پکے دُشمنوں جیسا بُغض پایا جاتا ہے۔ ان کی کوئی کیمسٹری آپس میں نہیں ملتی۔ ان دونوں پہ قابُو اللہ کریم کے کرم اور کسی مُرشدِ کامل کی خصوصی توجہ سے ہی پایا جاسکتا ہے۔ جس کسی کو اس بے رگ اُتھری بوٹی اور سوا پاؤ رگ دار لوتھڑے پہ اختیار مل گیا سمجھو وہ شہر یار ہے!"

پہلے روز جو سبق ملا وہ اَلف آم اور بائے بکری تھا...... دونوں ہی اچھی چیزیں ہیں۔ آم چوس کے اُوپر سے بکری کے نرم نرم دُودھ کی کچی لسی' اس کی گرمی کو دُور کر دیتی ہے...... آم' وافر خون پیدا کرتا ہے جبکہ بکری کا دُودھ' کمزوروں میں طاقت اور صلاحیت کی کمی کا ازالہ کرتا ہے۔

بچے اکثر رٹا لگاتے رہتے ہیں۔ زبان' سبق یا پہاڑے دُہراتی رہتی ہے لیکن دل و دماغ کسی نئی شرارت کی سوچ میں مگن! جبکہ آنکھیں' کسی کھوج کھاٹ کی طرف اور ہاتھ کسی اُتر ہُتر میں لگے ہوتے ہیں۔ پڑھائی کی اسی بیگار میں اکثر یہی ہوتا ہے کہ بچہ کہیں اور ہوتا ہے دھیان کہیں اور...... بچے کو پتا ہی نہیں ہوتا ہے وہ کیا کہہ رہا ہے کیا سوچ اور کیا دیکھ رہا ہے۔ میں بھی یوں ہی دُہرا ہوتا......!

پھوڑ پہ بیٹھا' پٹی پکڑے سبق یاد کر رہا تھا...... دھپ دھپ دو کُھلے ہاتھ کی پڑیں' ساتھ ہی کان میں یہ الفاظ گھسے' اوئے کھوتیا! میں نے تجھے اَلف آم' بائے بکری کا سبق دیا اور تو اَلف ابا اور بائے بے بے کا رٹا لگا رہا ہے...... اُن کے تھپڑوں کی زد سے نکلتے ہی میں نے سبق پہ جو غور کیا تو واقعی وہ کچھ نہیں دُہرا رہا تھا جو اصل سبق تھا...... دل و دماغ ابا ہیں اور شہادت کی اُنگلی' اُوپر جمائے' خوب ڈر خوف سے اَلف آم' بائے بکری کی

واقعی میرے ساتھ کے بچّے 'طوطے طوطا، ذے ذخیرہ اور ایک آدھ تو یائے یکہ تک جا پہنچے تھے......
یعنی شاہدرہ، مرید کے اور گوجرانوالہ تک اور میں ہنوز داتا صاحبؒ کے پاؤں میں بھائی دروازہ ہی پھنسا ہُوا تھا۔
اَلف اور بائے سے ہی جان نہیں چھوٹ رہی تھی۔ ہر لفظ نت نئے لفظ الہام کی طرح اُترتے...... چند ایسے بھی کہ
جنہیں نہ تو کہیں سُنا نہ پڑھا اور نہ اُن کے مَعنی کا علم! میری ایسی نالائقی اور حرکتوں کی پاداش میں 'الگ ایک
کونے میں بٹھایا جاتا' تاکہ میں دیگر لائق اور اچھے بچوں کو خراب نہ کروں۔ بچّے پڑھنے کے دوران ایسی
دُزدیدہ نظروں سے دیکھتے جیسے میں انسانوں سے نہیں کسی جنوں کے ٹولے یا مہتروں کے قبیلے سے تعلق رکھتا
ہوں۔

حافظ منے کے مکتب مسجد میں میرا وہ آخری روز تھا جب مجھے اَلف سے اَویسؒ اور بائے سے بلالؓ کے
سبق کا رَٹا لگاتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ دھاڑ لگا کر وہی جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔
''کھوتے! اَب یہ اَویسؒ اور بلالؓ والی نئی بَخ کہاں سے نکال لی ہے؟ نکل جا یہاں سے 'تُو تو مجھے
پاگل کر دے گا بلکہ آدھا تو کر دیا ہُوا ہے۔ میں تیرے باپ سے خود ہی بات کر لوں گا۔''
میں 'پلا' چھُڑا کر...... چار حرف خود پہ بھیجتا ہُوا کچھ ایسی چھب سے وہاں سے اُٹھا کہ کیا کوئی کسی محفل
سے اُٹھا ہوگا؟ وہاں سے واپسی پہ میری چال میں کچھ ایسی لرزیدہ سی تمکنت تھی جیسے سکندر کی ہندوستان سے
واپس پلٹنے پہ تھی......!

بہت بعد میری بدھی میں نکتہ سمایا کہ کسی محفل مکتب میں بیٹھنا شاید کچھ ایسی عزت وتفاخر کی بات نہیں جو
کہ وہاں سے اُٹھانے اور دھکے دے کر نکالنے میں ہے...... دَرویشوں' ملامتیوں آشفتہ سَروں کی دانش کدوں'
دَرس گاہوں اور کسی جامع العلوم میں پذیرائی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ تو
کُوئے ملامت کے دَریوزہ گر ہوتے ہیں۔ اُن کے کشکولِ گدائی میں لعل و گوہر نہیں زنجیریں' کیل کانٹے' زہر کی
پُڑیاں' تیکھے کنکر' دُشنام و تشنیع' قہر رُسوائیاں' دَربدریاں اور عقوبتوں کی تعزیریں ڈالی جاتی ہیں......
گھر والوں کو مجھے کچھ بتانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی کہ بنیرے پہ بیٹھے کوؤں اور باہر گلی میں کتّوں
کتوروں نے بھونک بھانک کر میرے کچے چٹھے کھول دیئے تھے۔ یہی تو تھے جو میری طرح رُسوائیوں' پھٹکاروں
کے ٹھیکیدار...... میرے یار' وہ مجھ سے اور میں اُن سے...... دُکھ سُکھ سانجھا' کھانا پینا بھی اکٹھا...... ''دھول دھپّے
کے بعد بقصدِ عزلت' گھر والوں نے پوچھا۔ اَب کہاں پڑھنا مرنا ہے؟...... تیرے ساتھ کے تو تختی' پٹی سے
پکّے قاعدہ پہ لگ گئے۔ وہ سامنے نائیوں اور پچھلی گلی کے آرائیوں کے بُدھو سے بچّے یسرناالقرآن کی بسم اللہ بھی
شروع کر چکے ہیں۔ کچھ شرم کھا کر وہ دونوں تم سے کچھ ماہ چھوٹے بھی ہیں۔

میں نے جھلا کر جواب دیا۔ "یہ نائیوں آرائیوں کے پتّر بلاشک پکّے قاعدے یا یسرنا القرآن تک پہنچ جائیں' پر ان کے پاس پکا علم اور فہم القرآن نہیں ہے۔ ذرا انہیں میرے سامنے لائیں اور پوچھیں الف آم اور بائے بکری کے علاوہ اور کیا کچھ ہوتا ہے؟ نائی شاید الف سے استرا اور بائے سے بغل اور قصائی' الف سے اوجھڑی اور بائے سے بوٹی ہی بتا پائیں اس سے آگے ان کا علم ختم......"

ع "اوجھڑی دا پلاؤ پکایا سواد اُبدا گو بیا' چوہڑیوں مصلّی ہو یاتے بولی اُبدی اُو بیا"

ذرا سامنے والوں اور پچھلی گلی والوں کے بارے میں پرانے بزرگوں نے کیا کہا ہے وہ بھی سنیں۔

ع "صبر والا کتا تے بے صبرا نائی' عقل والا درزی تے بے عقلا قصائی"

اور وہ حافظ صاحب جن کی نظر میں میں دُنیا بھر کا احمق اور غبی ہوں' بلا کر ذرا پوچھیں کہ الف' بائے میں اور کیا کچھ اسرار پنہاں ہیں۔ علمُ الاسماء کی ساری برکتوں' حکمتوں' طاقتوں کا اصل منبع کہاں ہے؟ جبکہ اللہ' احمد' اسد اللہ' اہلِ بیت اور ازل ابد سب ہی الف میں الف ہیں تو مزید پڑھنے کا کیا محل باقی رہ جاتا ہے؟ آگے پڑھنا بھی پڑے تب بات کھلتے کھلتے دراز ہوتی ہے تو بلالؓ سے بہلول دانا، بایزیدؒ، بوعلی قلندرؒ، بہاؤالدین ذکریاؒ، بختیار کاکیؒ سے بلھےؒ اور باہوؒ تک پڑھ لیں...... آپ بتائیں' قرآن کیا الف' الحمدللہ اور بائے بسم اللہ سے ابتدا نہیں ہوتا؟...... ابتدا ہو یا انتہا' آگے پیچھے الف ہی الف ہوتا ہے۔

میری ایسی ادق گفتگو سن کر گھر والوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا۔

علمُ الاسماء سے عمیق دلچسپی اور ان کا باطنی ادراک مجھے ودیعت ہوا ہے۔ میرا ہتیر اور خمیر بھی کچھ ایسا ہے کہ میں پہروں' حروف ابجد کے اسراروں' بوالعجبیوں اور ان کی خفتہ حکمتوں میں ڈوبا رہتا ہوں...... ایک وقت ایسا بھی کہ مزید دیکھنے کا اذن ملا تو میں نے بادل نخواستہ کچھ آگے پیش رفت شروع کی...... دیکھا کہ علم و حکمت کی ہر گلی باب علم کی جانب کھلتی ہے۔ حروفِ تہجی کی ساری صورتیں' ترکیبیں' باطنی معنی اور برکتیں الف کی بنیادی ساخت سے ہی تشکیل پاتی ہیں۔ الف کا ابتدا میں ہونا' بے خم و خال ہونا اور ایسی اکبریت کا مظہر ہونا کہ ابتدا اور انتہا کی کوئی حد تعین نہ ہو سکے۔

الف' واحد خطِ کشیدہ' جسے جہاں تک چاہو دیکھو اور محسوس کر لو' کائنات کی ہر اک شے اس کی دسترس میں ہمتی سی دکھائی دیتی ہے۔ اس ساخت و ہیئت کا کوئی دُوسرا حرف' حروفِ تہجی میں نظر نہیں آتا۔ مجھے دکھائی دینے اور نہ دینے والی ہر شے میں الف دکھائی دیتا ہے اور بائے وہاں نظر آتی ہے جدھر جذب و جنوں ہوتا ہے...... ذات کی نفی ہوتی ہے' عجز و رجز ہوتا ہے...... خشیت و مشیت کے آگے سرخم ہوتا ہے...... دیدہ فہم اور توکّل و تدبّر میں کہیں بھی خم نہیں ہوتا......!

؎ علم و حکمت کا جنہیں شوق ہو' پڑھیں نہ اسے''
کوچۂ عشق میں کچھ بھی نہیں حیرت کے ہوا

یہ اِبتدائیہ اِس بابے کا ہے جس کا نام محمد یحییٰ خان ہے...... بابا کا لاحقہ' اُس نے خود ہی اپنے لیے وضع کر رکھا ہے کہ اُسے بابا کہلوانے کا اَزحد شوق ہے۔

میرا تعارف یہ ہے کہ مَیں اُس کا ہمزاد ہوں...... ہمزاد کو نُوری اِنسان یا ڈبل بھی کہا جاتا ہے...... گوشت پوست والا اِنسان دکھائی دیتا ہے مگر نُوری اِنسان' یعنی ہمزاد نظر نہیں آتا...... مگر میرے ساتھ معاملہ کچھ دِگر ہے۔ اِس بابے نے مجھے کچھ اِس طرح سے قابو کر رکھا ہے جیسے مَیں اِس کا ہمزاد نہیں وہ میرا ہمزاد ہو۔ میرا اور اُس کا کوئی حجاب نہیں...... وہ مجھے خُوب سمجھتا اور جانتا ہے اور مَیں جتنا اِسے جانتا اور سمجھتا ہوں میرا دعویٰ ہے کوئی اور یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میرا اِس کا صدیوں کا ساتھ ہے۔ مَیں اِس کی رگوں میں خون اور جبلّت میں جنون کی طرح جذب ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھ سے جان چھڑانے کی جستجو میں رہتا ہے کہ مَیں اِسے دھوکہ بازیوں' مکّاریوں اور غلط حرکتوں پہ آڑے ہاتھوں لیتا ہوں۔ وہ مجھ سے خوف زدہ تو نہیں البتہ بدکتا ضرور ہے۔ اِس کا بس چلے مجھے کہیں بیچ چوراہا گاڑ دے مگر یہ بھی یقین ہے کہ چند لمحوں کے بعد مجھے نکال بھی لے گا کہ وہ میرے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا...... کبھی مجھے اپنا محرم بھی سمجھتا ہے...... اور سچّی بات ہے کہ وہ میرا بھی محرم اور کارکرم ہے......!

عجیب بوبک بابا ہے' اِسے وَلی اللہ' فقیر درویش' عامل' عالم ادیب دانشور کہہ لیں یا پاگل بے وقوف' ابجد خواں' اجہل...... یہاں تک کہ آپ اسے لُپاڈُنیا چوپاٹیا اور گدھا گھوڑی یا کمینہ کُتّا ہی کہہ لیں تو اِس کے ماتھے پہ شِکن تک نہیں پڑے گی۔ زیادہ سے زیادہ چُپ شاہ بنا محویت سے کسی گہرے کھڈے میں اُتر لے گا اور آپ

کے زوبرو مار سیاہ سی کینچلی یعنی کالا پیرہن' سیاہ گلیم' عصائے درویش' چرمی کفش اور چند انگشترے مالا میں پڑی رہ جائیں گی' اصل بابا کہیں غائب ہو گا۔ پہلی ملاقات یا تصویر دیکھنے والے اسے کالے علم والا بابا' یا جنات خارج کرنے والے عامل سے کم زیادہ اسٹیمیٹ نہیں کرتے۔ گٹ اَپ ہی ایسا ہوتا ہے۔ قدرے پڑھے لکھے اسے پامسٹ' تعویذوں والا پیر' ماہر مسمریزم اور نہ جانے کیا کیا سمجھ لیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن کے ہاں وہ کوئی پہنچا ہوا گپت درویش ہے۔ ایک گہری نگاہ والے کی نظر میں وہ بنگلہ دیش کا جاسوس بھی ٹھہرا۔ کچھ اسے عشق میں چوٹ کھایا ہوا ناکام عاشق بھی کہتے ہیں۔

فرحت عباس شاہ اور اَبدال بیلا نے اس کا سلسلہ جنات سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ کیمیا گر بھی سمجھا جاتا ہے...... شاعر اَدیب مصوّر' دانشور اس لیے نہیں کہ وہ ٹُوٹے نہیں لگاتا۔ اپنی جینگی نہیں ہانکتا' اُدھار نہیں مانگتا۔ اپنا اور دُوجوں کا وقت برباد نہیں کرتا۔ ایک ہی رنگ ڈھنگ کا پیرہن' پیدل مارچ' کثرت سے سلام اور سر نیہوڑ کر کلام کرتا ہے......!

میں ایک زمانے سے اس کے قریب ہوں مگر کیسا بدنصیب! کہ اسے سمجھنے کے لیے اتنی سمجھ ہی کہیں سے میسر نہ ہوئی جتنی کسی کوّے اور کوئل کے مابین فرق جاننے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ نہ ایسا ادراک جو اَدرک کی گرہوں گانٹھوں کے بھید بھاؤ کھولنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے یہ کوئی بے گرہ' گانٹھ' بے جڑ' بے شاخ اور بے برگ بے ثمر و شجر ہے۔ جسے آدم حوا کے پیچھے زمین پہ لڑھکا دیا گیا تھا۔ تب سے اب تک یہ ٹُنڈ مُنڈ بصورتِ ہند طبقِ اَرض پہ اپنے خُور کے گڑھے کی تلاش میں جگہ جگہ لڑھک ڈھڑک رہا ہے اور امتدادِ وقت نے بدقت تمام اسے سیاہ پوش کر دیا ہے...... اُدھر سیاہ رُو وحوش پرندوں جانوروں کی سمجھ نہ آیا یہ پناہ گاہ ہے یا خود پناہ گزین ہے......؟

قیاس اغلب کہ ابھی بابا خود ہی اپنے آپ کو سمجھ نہ پایا ہے کہ سمجھ میں وہ شے اُترتی ہے جس کا کوئی انگ سنگ ہو یا سیدھا اُلٹا...... بقول بابا! وہ چِٹا اَن پڑھ اور فُل بٹا فُل جاہل مُطلق ہے۔ اس حساب سے اسے چیکوں پہ دستخط کی بجائے انگوٹھا لگانا چاہیے۔

میں اس سے لفظ مُطلق کا مَعنی پوچھ بیٹھا' جواب ملا...... ایسا مرد جس سے اس کی دوبارہ کی مطلقہ بیوی نے بُوجوہ تیسری بار بھی طلاق لے لی ہو۔ مزید تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا مُطلق کا مطلب مادر پدر آزاد یعنی ایسا مرد جو نکاح اور طلاق کی ضرورت ہی نہ سمجھتا ہو۔ مردِ مُطلق' منہ سے تین بار طلاق دُہرانے والے حیوانِ ناطق یعنی بولنے والے مرد ہوتے ہیں' جیسے بولنے والے طوطے...... جس کے گلے کی گانی سرخ جبکہ چمکنے والی گُلدم کی پیٹھ گدی لال ہوتی ہے...... پتا نہیں یہ لالی' اس کی کس مصروفیت کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہ بھی طوعاً کرہاً مان لیتا ہے کہ کچھ بار شتر کتب و صحائف اس سے سرزد ہوئے ہیں۔ میری ذاتی اور اس کے اکثر قاریوں کی رائے کے مطابق وہ کہیں سے اوراق پارینہ نقل کرتا ہے یا کسی اَدبی خزینے سے سرقہ صدقہ کرتا ہے اِس جیسا اَنٹاغفیل تو غلیل کے بچے نہیں کر سکتا جبکہ پچلیل لکھنے کے لیے وہ بچالیہ کے کسی ''پھوڑ'' مدرسہ میں دو چار بار نکالے جانے کی تہمت بھی نہیں لے سکا۔ اگر وہ کسی طرح سے کچھ لکھ ہی لیتا ہے تو وہ قلم قرطاس سے ہرگز کام نہ لیتا ہوگا کیونکہ جس طرح آشنا' نا آشنا حروف و الفاظ کی چولیں بٹھاتا' تراکیب و محاورات کے گلے ٹھوکتا اور مقبادلات کی کلیاں گھڑتا ہے یقیناً یہ کسی انشاء پرداز' ادیب و شاعر کا نہیں کسی منجی پیڑھی ٹھوکنے والے بڑھئی ترکھان کا کام ہے۔ ایسی کمال صنّائی' بالیدگی و ہشیاری سے حرف و لفظ کی مکھی پہ مکھی مارتا ہے کہ اِس کے داغ بھی کنارِ قرطاس پہ ٹنکے ستارے دکھائی پڑتے ہیں۔ عجب کا جو ماجو...... بھانت بھانت' بُھول بُھلیاں سا......!

ایک بار کوئی پوچھ بیٹھا...... حضرت! آپ کے ہاں زبان و بیان...... کوئی اُصول گرائمر فرہنگ کے کسی کُلیہ قاعدہ کا کوئی مسلمہ تصور بھی موجود ہے کہ نہیں...... ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا' بھان متی نے کنبہ جوڑا'' کے مصداق جو بھی اَنٹ شنٹ رُوبرو کر دیا۔ قاری بے چارہ دُنیا بھر کی لغات سامنے دھرے کھوجتا رہتا ہے۔ ملے تو وہ جس کا کوئی وجود ہو' آپ کے خود تراشیدہ الفاظ و املا کا اَتا پتا تو جنّات کی آہنگ و فرہنگ میں بھی نہیں ملتا۔ کسی بات و اِنکشاف کی کوئی سند' پرکار کا کوئی نقطہ اِرتکاز' رَسّی کا کوئی سِرا' دین و دھرم کا کوئی دُھرا' مسابقت و مطابقت کا کوئی کُھرا...... مولود کا کوئی والد' خالدہ کا کوئی خالد' قاری کو گھن چکر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسے ایسے اَدق الفاظ کہ دانتوں پسینہ آ جائے' چہرہ فق اور دِل دَھک دَھک...... کرموں کا قابو قاری زمان و مکان کی قید سے چھوٹتا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔

جواب دیا' سب کچھ بجا تسلیم! پر کیا کروں مجبور ہوں' گھر اور لکھنے کے لیے پلاٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور اِس پہ مستزاد علم و عقل' تجربات مشاہدات کے مسالہ جات' ہنر و قرینہ کے اینٹ رُوڑے' فکر و تجسّس کے باتھی گھوڑے' جبکہ مَیں اِن سے تہی ٹھہرا...... منہ زبان جو آیا کہہ دیا' لکھ مارا...... بِن سوچے سمجھے قلم خود بخود رَواں ہو جاتا ہے۔ سرکش گھوڑے کو لگام دو کھینچو وہ بھلا کہاں رُکتا سمجھتا ہے...... مَیں پھنسا جڑا کسی اناڑی سائیس کی مانند پیچھے گھسٹتا چلا جاتا ہوں۔ کہاں سے کِدھر' پُورب پہ پچھم...... کوہ کہ دمن' صحرا و سمندر' مسجد مندر' صنم کدے' بُت خانے' دَیر و حرم' دَم دَمیرتا ہوا بگٹٹ بھاگتا رہتا ہوں۔ ہوش ندارد' خروش و خوابیدہ...... فرخندہ کہیں آبدیدہ!

ملاحظہ ہوئی اِس کی لفاظی؟ کوئی پُوچھے نہ پُوچھے وہ خود کو چِٹّا اَن پڑھ بتانے میں کچھ باک روا نہیں

رکھتا بلکہ ایسے ہی جیسے نئے نئے ڈگری ہولڈر کسی نہ کسی بہانے اپنی تعلیم کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یہ بابا بھی ایسے کسی خطرناک قسم کے کمپلیکس میں مبتلا ہے۔ موقع بے موقع غیر ضروری طور پر اپنے اَن پڑھ بوڑھا' بھول بھلکڑا ہونے کا بودا اظہار کرتا رہتا ہے اور یوں کہ اسے ایسا ہی جانا اور سمجھا جائے...... میرے اندازے کے مطابق اس کا یہ طریقہ واردات نہ صرف روایتی سیالکوٹی' ہشیاری چالاکی' رنگ بازی پہ مبنی ہوتا ہے۔ بلکہ اپنی درویشی کمپنی کی مشہوری کا ایک تیر بہدف فارمولا بھی!...... اس کے رنگ ڈھنگ چونکہ شیر خواری سے ہی پُر اسرارانہ اور متحیرانہ چلے آ رہے ہیں اور آب گئے خواری کے اس عالم پیری میں بھی اس کی حرکی وارداتیں ویسی کی ویسی ہیں بلکہ اس سے میں مزید نکھار اور کھرج پیدا ہو گیا ہے۔ سادہ سیدھی بات بھی اس کے تکلم کے تکلے پہ چڑھ کر ایسی طرار تند کھینچتی ہے کہ کہیں تارابریشم سی لپک لشک اور کبھی تار عنکبوت کی چپک چپک کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ بات سے بات یوں نکالتا ہے' جیسے کوئی اُردو ایم اے کی طالبہ اپنے کورس کی کتابوں سے "یادوں کی بارات" نکالتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی ڈکشن نہیں اور نہ وہ کسی فنی اَدبی فرہنگی نالہ وئے کا پابند ہے......؟

پابندی یا جنابندی تو وہاں زیبا ہوتی ہے جدھر کسی کتب فکر و ہنر سے استفادہ ہو۔ کہیں زانوئے تلمذ طے کیے ہوں۔ کسی اَدبی گھرانے سے فیضیاب ہو۔ میری رائے میں کسی "فیض الرحمان" کو ان لاحقوں اور سندوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ وہ کسی جنم جنم کے راگی رَوگی جوگی کی طرح ہم نوا ہم نداو آوگراہ' اور ہمہ تسلیم ورضا ہوتے ہیں......!

بابا لکھتا ہے...... اَدب کی دُنیا اور قبیلہ قرأت و کلام میں بابا اشفاق احمد کو اس عصر کا بلند مرتبت داستان گو کہا جاتا ہے۔ کہنے والے تو کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں مگر وہ تو خود بھی اپنے بارے میں یہی کہتے تھے۔ اپنے شہرہ آفاق جریدہ کا نام" داستان گو' اپنی خوبصورت رہائش گاہ کا نام داستان سرائے رکھا۔

اے حمید نے ان پہ لکھی کتاب کا سرنامہ بھی یہی منتخب کیا۔ "داستان سرائے" جیسا کلاسیکی نام' بابا اشفاق احمد کی اپنی اُپج تھی جس میں اَساطیری اَدب ثقافت کی دُھندلی میٹھی چاندنی میں اَز منہ ماضی قریب وبعید کی جانب کھلتی ہوئی راہیں ہلکورے لیتی ہوئی دکھائی پڑتیں......!

پگ پگ برکتا ہوا قاری دیومالائی داستان سرائے میں اُتر جاتا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ پرانے زمانوں میں قافلوں کے ساتھ اُونٹ گھوڑے خچر کے علاوہ کتے بھی ہوتے تھے جو بیک وقت بہت سی خدمات سرانجام دیتے تھے...... نگہداشت' حفاظت' رہبری موسموں اور دیدہ اندیدہ دُشمنوں کی خبرداری...... مالک کو میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنا...... پاؤں میں لوٹنا...... معصوم معصوم شرارتیں' لاڈیاں...... اس کے التفات واکرام کا منتظر رہنا...... کیا کیا نہیں ہوتا......!

لمبی لمبی مسافتوں کے مابین' چھوٹے بڑے پڑاؤ' جدھر کہیں پانی' نخل ثمر و سبزہ کی سہولت ہوئی وہیں پڑاؤ پڑ جاتے۔ یہیں کہیں چھوٹے موٹے مسافر خانے' سرائیں' بھٹیار خانے بھی ہوتے یا وقتی طور پر وجود میں آ جاتے۔ تھکے ہارے مسافر' جانور آرام آسودگی کی خاطر اس عارضی سرراہے قیام گاہ میں جی پر چانے' تھکاوٹ دُور کرنے کی خاطر مختلف انداز اختیار کرتے۔ موسیقی' شعبدہ بازی' بازی گری' جسمانی کرتب وغیرہ یہیں قحبہ گری' قمار بازی' چور بازاری اور تجارتی لین دین بھی ہوتا۔ کمزور تھکے ہاروں یا بار برداری کی کمی بیشی کی خاطر قیام بڑھا بھی دیا جاتا۔ ذمہ دار مضبوط اعصاب کارندے' چور ڈاکوؤں سے خبردار رہنے کی خاطر شب بھر بیدار رہتے۔ ان قافلوں کی بھیڑ بھاڑ میں بدقماش بھی شامل ہو جاتے۔ جو ذرا چوکتے ہی اپنی کارروائی ڈال دیتے۔ ان سے چوکنا رہنے کی خاطر بیدار رہنا پڑتا ہے' رات کو بھی دن کا سماں رہتا۔ مختلف اشغال بپا رہتے۔ موسیقی' رقص' آلاتِ حرب و ضرب کے مظاہرے' جسمانی کرتب' آتش تماشے' شعبدہ گری......!

ان میں سب سے زیادہ جو صنف مقبول تھی' وہ داستان گوئی تھی۔ اس فن کے بڑے بڑے فنکار پیدا ہوئے' اس میں بڑا نام پیدا کیا۔ یہ ایک باقاعدہ پُر وقار پُر جمال فن ہے۔ جس کا اہل ہر کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے جس علمیت' کمال درجہ کی لسانی بیانی قابلیت' نمائندہ شخصیت اور غیر معمولی نطق و حافظے کی ضرورت پڑتی ہے وہ ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتی۔ ہر دور زمانہ کی چیدہ چیدہ کہانیاں' تواریخی حقائق رومانی عشقیہ قصے' دیومالائی داستانیں' جرأت شجاعت وفاداری کے واقعات وغیرہ کیا کچھ نہیں ہوتا۔

وہ داستان گو ہو ہی نہیں سکتا جو جگت جادوگر نہ ہو۔ جب زبانی فہمیدگی' انسانی سائیکی' زبان و بیان' مطالعہ و مشاہدہ اور عالمگیر علمیت کا حامل نہ ہو۔ حرف و الفاظ کے طوطے مینا اور شکرے بنا کر اُڑا نہ سکتا ہو؟ روایتی قصوں کہانیوں کے کرداروں کے گزرے مُردوں میں رُوح پھونک کر سامنے نہ لا سکتا ہو...... ہجر و وصال کی کیفیتوں' یار کے سراپے کی قیامتوں' حُسنِ جہاں سوز کی تابانیوں' شجاعت و سرفروشی کی داستانوں' میدان جنگ کی ہولناکیوں کی نگاہوں کے سامنے پھر جانے والی تصویر کشی نہ کر سکتا ہو؟

یہ بابا پیارنگ کالا بھی کوئی درجہ دوم' سوئم قسم کا گھٹیا سا داستان گو تو ہے۔ انگی بینگی نا قابل فہم' ہوا اور پانی پہ لہراتی لکھی ہوئی کافوری کہانیاں! خواہ مخواہ کا تحیر' فسوں خیزی' فضول ہی سنسناہٹ اور کپکپاہٹ پیدا کرنے کا بادشاہ! نظر بندی کی طرح لفظ بندی کا نیوں کمال درجہ استعمال کرتا ہے کہ بے چارہ قاری لفظ بہ لفظ سطر بہ سطر گھن چکر بن کر رہ جاتا ہے۔

بابا اشفاق احمد کے ہاں تو داستان گوئی علمیت رُوحانیت انسانیت اخلاقیت اور ایک بھرپور زندگی کی جامعیت کے جامہ میں تھی۔ جبکہ اس ننگ دھڑنگ ملامتی علامتی کے ہاں کے محض یاوہ گوئی ہے۔ قبر کنارے

لا میں لٹکائے بیٹھا ہے مگر دروغ' اختراع' تہمت طرازی سے باز نہیں آتا۔ اپنے لکھے بیان کیے ہوئے کسی قصے واقعہ کی کوئی سند' حجت' دلیل اس کے ہاں نہیں ملتی ہمیشہ ماضی شکیہ' احتمالیہ اور بعید کی بات کرتا ہے۔ کمبخت! ایسے ایسے خوش رنگ جاذب نظر' زجاج و زبرجد ملاحظہ میں لاتا ہے کہ نگاہیں خیرگی سے جگمگا اٹھتی ہیں۔''

ایسا گرگ باراں دیدہ کہ صدیوں کی کیلی' کسلمند کہر کے بیچ سے کوئی ایسی کہنہ کہانی نکال کر بیان کرے گا کہ سننے والا جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ یہ کوئی ہوائی سی داستان ہے۔ من و عن اس پہ یقین کر لیتا ہے۔ اس کا کمالِ حقہ' کمال حرف و الفاظ کے چناؤ اور املا فقروں کی چولیں بٹھانے میں ہے۔ لکھتے سمے وہ کوئی چنیوٹی انداز فکر کا کاری گر بن جاتا ہے جو اخروٹ کی خشک چوب کی نسوں رگوں کو یوں تراشتا خراشتا ہے کہ نتیجہ میں کوئی انچھوتا سا شاہکار منصۂ شہود پہ آ جاتا ہے۔''

وہ اپنی کج علمی اور جہالت کو ایسی مکاری سے چھپائے رکھتا ہے جس طرح کوئی پاپن اپنے پیٹ کو لکائے رہتی ہے۔ دیکھنے والے تو جان ہی جاتے ہیں کہ یہ رسولی یا پیٹ اپھارہ نہیں' اس کی کرتوت کا نقارہ ہے۔''

مکار اور موقع شناس ایسا کہ اس سے پیشتر کوئی زبان گرائمر واقعاتی تاریخی شواہد پہ گرفت کرے یہ خود ہی پیش رفتی سے اپنے منطق ابجد خواں ہونے کا اعتراف کر کے اپنے بچاؤ کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اکثر یہ کہہ کر بھی اپنا پلہ پاک کر لیتا ہے کہ میں تو قلم چھونے کا قرینہ نہیں رکھتا لکھنا تو بہت دور کا گھاٹ ہے۔ مجھ سے تو صرف سرزد ہوتا ہے چلمن پیچھے پردہ نشیں کوئی اور ہے۔ لیجئے ایک تیر سے دو نشانے..... اپنی جہالت بھی چھپا لی اور سہولت بھی پیدا کر لی۔ کہتا ہے کوئی نادیدہ ہستی لکھواتی ہے' میرے تو محض ہاتھ ہوتے ہیں۔''

جس طرح پسائی والی چکی کا ایک قطب (لوہے کی کلی) قائم ہوتا ہے اسی طرح زمانہ دوز وقت کی چکی کے بھی قطب' غوث' ابدال دائم ہوتے ہیں۔ جو اس رواں عصر کے روحانی اور دنیاوی نظام پہ گرفت رکھنے پہ فائز ہوتے ہیں۔ آگے درجہ بہ درجہ اولیا' سالک' صوفی وغیرہ' بالکل اسی طرح ہر دور میں دو نمبر پیر فقیر' درویش دریوزہ گر' منجم و رمال.....!

اسی طرح فلاسفر و دانشور' ادیب شاعر و صحافی بھی دو نمبر ہوتے ہیں۔ ڈمی اخباروں رسالوں کے ایڈیٹر و نمائندگان..... بے ننگ و نام ٹیلی چینلوں کے اینکر پروڈیوسر و ڈائریکٹرز..... محض کاغذوں اور اشتہاروں پہ قائم کی گئی ادبی اور ایوارڈ دینے والی تنظیمیں..... شیروں' چیتوں کے پیچھے پیچھے لکڑبگھے' گیدڑ' لومڑ..... کہ شیروں کے پریوار کے ناشتے کے بعد نخچیر کی باقیات کی صفائی بھی تو ضروری ہوتی ہے۔''

میرا یہ طویل تمہید باندھنے کا مقصد محض یہ تھا کہ بابا موصوف بڑوں کے شکار سے بچا کھچا' رہند کھیند کھا پی کر پہلوان بنے ڈکارتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں اول تو کچھ ہوتا نہیں اور اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ دوسروں

کی کتابوں سے کھینچا نکالا ہُوا...... وہ اپنے طور تسلیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ چوری کے لیے جس عقلِ تامہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے ہاں وافر حجم میں موجود ہے۔ مزید انکشاف ہُوا کہ دُنیا کا ہر لکھنے والا اپنے پیشروؤں سے متاثر ہوتا ہے۔ جب لکھتا ہے تو غیر شعوری طور پر اُنہیں کو نقل کرتا ہے یعنی نسخہ وہی ہوتا ہے محض پیکنگ بدل دی جاتی ہے۔ اِن کے افکار و خیالات کو نئے الفاظ و معنی کا لباس پہنا دیا جاتا ہے۔

اپنی بات کی تائید میں مزید ارشاد ہوا کہ موسیقی کی بُنیادی سُروں کی طرح حروفِ تہجی و اعداد کی اشکال و صوتی آہنگ' پیار و محبت کے اشارے کنائے۔ خوشی و الم کے اظہار یئے اخلاق و اخلاص' دوستی دُشمنی کے رویئے۔ انسانی فطرت و جبلت اور خصلت کی بُوالعجبیاں وغیرہ...... جہاں جہاں بنی نوع موجود ہے کم و بیش یہ کچھ ایک سا ہی ہے۔ بس! انسان اپنے وقت ماحول بساط اور ضرورت کے تحت اِن میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔

دُنیا کے تمام عُلوم' ہُنر و فن' ملائکہ' رجلِ غیب' ہاتفِ افلاکی' کُتب و صحائف' وحی الہام رؤیا، القائیت' کشف اور دیگر مردانِ حق و حکایت کے وسیلہ بالیلہ سے حضرت انسان تک پہنچ پائے...... سوا معدودے چند اَصحاب' باقی سب نے سینہ بہ سینہ اپنے پیشروؤں سے اکتسابِ علم و فن کیا...... ایک سوال کے جواب میں کہا! مالکِ حکمت و فضل نے مجھے اِسی علمیت و ادراکیت سے نوازا ہُوا ہے۔ میرے اندر کوئی ایسا جہانِ منور ہے جس سے پُھوٹنے والی بخشش کرنیں مجھے سرشار و شاداں رکھتی ہیں...... استغنائی اور اجتہادی بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ تخلیقی قوتوں میں ابتداع اور احداث کروٹیں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے...... لکھنے کی تحریک جنم لیتی ہے...... لکھتا ہی چلا جاتا ہوں۔ الفاظ' متن' ترتیب' تسلسل' حفظِ مراتب' اسلوب' صحیح غلط کچھ بھی تو سجھائی نہیں دیتا۔ جو بھی لکھا' اللہ اسی میں برکت ڈال دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ چند بار یُوں بھی ہُوا کہ لکھتے لکھتے اونگ آ گئی' وہی سامنے قلم ورق دھرے پڑے رہے...... پھر کہیں جو آنکھ اُچٹی' دیکھا کہ جدھر آخری لفظ لکھا تھا وہیں آ گئے' صفحے کے صفحے اپنی صفیں دُرست کیے ہوئے ہیں۔''

ملاحظہ فرمائی اس کی فراڈیاں؟ کس طمطراق اور دھڑلے سے کِذب کی فصل کاٹتا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے کِذب و صدق اور کہیں جھوٹ اور فریب ایسا حسین و معصوم دکھائی دیتے ہیں کہ ہزاروں سچائیاں اس پہ قربان کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہ حقیقت بھی کہ اس کی تحریروں میں جا بجا احساس ہوتا ہے کہ وہ بغیر دلیل اور وکیل اپنی تحریر کا مقدمہ پیش کرتا ہے۔ کسی واقعہ کہانی قصہ کی صحت پہ کوئی سند پیش نہیں کرتا۔''

کہا جاتا ہے کہ گناہ بظاہر بڑا دلفریب اور لذت آفرین ہوتا ہے اور طوائف کے ہاں دلکش ادائیں عشوہ و شکوہ' خود سپردگی کا دلفریب انداز' بہلاؤ' رِجھاؤ' رُوٹھنا مُسکانا ہی تو ہوتا ہے۔ عیش و عشرت کے دلدادہ خوش فکرے اِن ظاہری مصنوعی غمزوں پہ اپنا کچھ لُٹا دیتے ہیں۔

اِک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ طوائف اپنے حسن و شباب کی نقدی' سینت سینت کر خرچ کرنے کے باوجود تمام کر چکی ہوتی ہے۔ اَب عمر کے آخری پہر میں جب وہ خود کسی قابل نہیں رہتی تو طوعاً کرہاً نائکہ یعنی ڈیرہ دارنی بن جاتی ہے۔ اپنے ہاں نوخیز نُوچیوں کا اہتمام کر لیتی ہے' جو وہی کچھ کرتی ہیں جو وہ خود اپنے سنہرے دنوں کیا کرتی تھی۔ اس طرح وہ اپنا ماحول بھی قائم کیے رہتی ہے...... ڈیرے دفتر کا خرچہ بھی نکلتا رہتا ہے اور پرانے عشاق بوڑھے منہ مہاسوں سے ٹوٹے پھوٹے بتاشوں کا بھور چُور بھی چکھتی رہتی ہے۔

## ● نمکِ مُلتانی......!

لکھتا ہے...... اسلام آباد سے بذریعہ سڑک قریب آدھی رات لاہور پہنچا۔ ساتھ دو دوست جو حال ہی میں امریکہ سے آئے تھے۔ بے تکلف اور رندمشرب' کھانے چسکورنے کے شوقین...... شعروادب کے دلدادہ' محفلیں سجانے اور رتجگے منانے والے۔ میں دورانِ سفر اس مخمصے میں رہا کہ آدھی رات انہیں گھر لے جانے سے تو رہا! یہ ہاہوکرنے اور قہقہے اُڑانے والے آزاد پرندے ہیں۔ شریفوں کا محلّہ...... پانچ مرلے کے گھر میں یہ چائے پینے کی حدتک تو بیٹھ سکتے ہیں۔ شب بسری کے لیے گھر مناسب اور نہ یہ اس لائق......!

دو ہی صورتیں تھیں' شب بھر اِدھر اُدھر آوارہ گردی کی جائے مگر تھکاوٹ کی وجہ سے یہ بھی مشکل دکھائی دیا...... کسی ہوٹل میں آرام کیا جائے؟ یہ حضرات اگر پنڈی چکوال کے ہوتے تو میں انہیں لے کر سید حا داتا دربار میکلوڈ روڈ یا ریلوے سٹیشن کے کسی سرائے یا ہوٹل میں پہنچ جاتا مگر یہ تو نیوجرسی امریکہ سے آئے ہوئے شہزادے تھے' جو اسلام آباد سے لاہور میرے ساتھ آئے ہی کھانے پینے اور تفریح کے لیے تھے۔ جب داتا دربار' آوارہ گردی اور کسی ہوٹل میں کھانا پینا اور قیام وغیرہ ساری تجویزیں باطل ہوگئیں تو ایک عیش کوش دوست نے یونہی اشارہ دیا کیوں نہ شاہی محلّہ کسی طوائف کے ہاں باقی رات گزاری جائے...... کھانا اور گانا بھی وہیں ہو۔ دوسرے دوست نے جھٹ اس تجویز پہ صادکی مُہر لگادی۔ میں تو اُن کا میزبان تھا' سُن کر قدرے ٹھٹکا کہ یہ شہزادے اِدھر کے موجودہ حالات سے واقف نہیں ورنہ یہ آدھی رات' شاہی محلّہ میں کھانے اور گانے کے بارے میں خوش فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے ایک نے پوچھا۔

''کیا سوچ رہے......؟''

میں نے اُس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔

''اگر گھر اور ہوٹل جانا مناسب نہیں تو کسی طوائف کے ہاں اِس وقت پہنچنا کہاں کی مناسبت اور بہتری رکھتا ہے......؟''

اس نے ٹھنک کر جواب دیا۔

''مولوی صاحب! طوائف کا دروازہ تماش بینوں کے لیے کبھی بند نہیں ہوتا......اور اگر کبھی ہو بھی تو چاندی کی چابی سے اُسے کھلوایا جاسکتا ہے......''

مَیں اِس امریکہ پلٹ دوست کی دُرست بات سُن کر خاصا حیران ہوا کہ ایسی گہری بات اِس نے کِس پرانے پاپی سے پکڑی۔ چند ثانیے اس کی بات سے لُطف کشید کے بعد مَیں نے اُسے جواب میں بتایا۔

''یار! اسی طرح کی بات مجھے ایک شخص نے بتائی تھی کہو تو مَیں دُہرا دوں۔ ایک مرتبہ مَیں نے اُسے آدھی رات فون کیا' بتایا مجھے اسی وقت ایک اِنتہائی ضروری مشورہ کے لیے ملنا ہے۔ مجبوری ہے ورنہ اِس وقت بے وقت تم کو زحمت نہ دیتا۔ جواب ملا...... بھائی! مسرت ہوئی تم نے مجھے اس قابل سمجھا' بستر کی قبر میں کسی مُردے کی مانند پڑے رہنے سے بہتر ہے کسی کا کوئی کاج سنور جائے۔''

اور ہاں' سُنو! طوائف اور درویش کے دَر بند نہیں ہوتے' جن کے کھیسے میں رائج الوقت سِکّے کھنک رہے ہوں' جن کے سینے سوزِ تپاں سے دہک رہے ہوں' بلا کھٹکے آ جاسکتے ہیں۔

کھاگ طوائف! سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے تماشبین کی جیب کا پورا حساب اور درویش اپنے دَر پہ پہنچنے والے دوست کے دِل کی کتاب کا پورا حساب و نصاب ملاحظہ میں رکھتے ہیں۔ دونوں کو اپنے معاملت میں شمّہ بھر شکوک نہیں ہوتا۔''

اَب مَیں نے پوچھا۔ ''کہو' تم کس طوائف کے ہاں اُترنا چاہو گے...... کھیسے کے حساب والی یا دِل کی کتاب......؟''

وہ پاکستانی نژاد امریکی یُوں نگاہوں کے تیر تراز و کئے تک رہا تھا جیسے وہ کسی امریکن خفیہ ایجنسی کا افسر ہو اور میری کسی بات کو صحیح نہ سمجھتے ہوئے مَنہ ماری کر رہا ہے۔

''مانا تم امریکن نیشنل ہو' یہیں پیدا ہوئے' یہیں تعلیم و تربیت ہوئی مگر اِس حقیقت کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ تمہاری پاکٹ میں پڑے ڈالر' گاگل' کپڑے' جُوتے' کیپ' انداز و اطوار سب امریکن...... مگر تمہارا جسم وجود' سوچ فِکر اور رُوح مسلمان اور پاکستانی ہے۔ تم لوگ مذہبی جنون قوم پرستی اور وطن پرستی میں بُری طرح مبتلا ہو' تمہاری وفاداری پہ آنکھیں بند کر کے بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔''

''تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو...... کیا مَیں نے کچھ غلط کہہ دیا......؟''

بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا۔
''نہیں نہیں ...... تم نے کچھ بھی غلط نہیں کہا' بلکہ سو فیصد درست کہا ہے۔ بس اَب تم اس دَر درویش تک لے چلو......!''
صبح کاذب کی کالک میں ابھی کہولت شامل نہیں ہوئی تھی کہ ہم کوئے ملامت پہنچ چکے تھے۔ جدھر نمک ملتانی کی ایک نمک دانی تک میری رسائی تھی۔
طوائفوں کے بازاروں چوباروں کی رونق' تماش بینوں' ہجڑوں' مچھلیروں' تمبولیوں' کو چبانوں' ماشیوں سے ہوتی ہے اور فقیروں درویشوں ملنگوں کے ڈیروں کی رَمیا سَمیا...... کووں' کتوں' کبوتروں کی کاں کیوں...... ؤوں ؤوں چوں چوں...... وہاں ہوں غرغوں غٹر بو سے آسودہ ہوتی ہے۔''
''عبرت سرائے دہر'' کے سامنے' سائے سمیٹی سڑک کے بیچ دو اڑھائی کالے کتے آپس میں مستیاں کر رہے تھے۔ مؤذنِ اوّل کالے کاگے۔ بجلی کی تاروں پہ تیمم میں مصروف...... سید نور کی چھت پہ کبوتروں کے ڈربے اور چھتری قریب نیند کی بلی ابھی '' چھتے'' لگائی بیٹھی تھی۔ دار بھی کسی مقام سے دربار دکھائی دیتی ہے۔ داتاؒ کے دَر تلے خواجہ اجمیرؒ کے دروازے نیچے کھڑے ہو کر احساس ہوتا ہے کہ در و دل کی ولی کتنی دُور اَست...... فقیروں درویشوں کی کٹیاں' جھونپڑیاں' حجرے' ڈیوڑھیاں' شب کی تاریکی میں شیر کی آنکھوں کی مانند جل جاتی ہیں...... سحر میں جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی اور دن میں مانندِ آفتاب خیرگی پیدا کرتی ہیں۔ کوچۂ ملامت کے در و دیوار کسی گورستان کا محل وقوع دکھائی دیتے تھے۔ گاڑی رُکی تو میرے اس دوست نے تاریکی لتھیڑے ہوئے انگوری بیلوں میں لکی چھپی اقامت گاہ کی جانب حیرت سے نگاہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''یہی ہماری منزل ہے......؟''
مَیں نے جواب' اثبات میں سر ہلا کر دینا زیادہ مناسب جانا کہ غیر یقینی حالات میں اقرار یا انکار کے لیے زبان روک کر سر یا دیگر اعضاء کی حرکات و سکنات سے اظہار کر دینا زیادہ قرینِ مصلحت ہوتا ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ تولہ بھر کی زبان نہ ہلائی بیچ سیر کا سر ہلا دیا۔ ہے نا' عجیب بات؟ مگر کیا کیجئے کہ مجبوری' رنجوری' عقیدت و محبت' سیاست و حکومت' تعلق و تکلم...... تعمیل و تکمیل میں کچھ ایسے مقامات بھی آتے ہیں' زبان دانتوں کے شکنجے میں کسی کی کسی رہ جاتی ہے۔ چاہنے کے باوجود چپ کی چھپکی نہیں اُترتی۔ سر کی حرکات و سکنات کے تاثرات ہی ہوتے ہیں جو اس کے مافی الضمیر کی ترجمانی کرتے ہیں......
رات کے دورانیے کے کوئی نا آسودہ سے لمحات...... ٹھٹھری سہمی سی خامشی...... تاریکی کا بولتا ہوا جادو...... کچھ کھوجتے بوجھتے منتش کے بھیتر کی بھیک جب اکٹھی ہو جاتی ہے تو عجیب سی صُورتحال پیدا ہو جاتی

ہے۔ وہ بٹ بٹ اُدھر دیکھتے ممیایا۔

''اِدھر تو سکوتِ مرگ طاری ہے' کوئی رہتا بھی ہے یہاں؟...... ہر سو جھاڑ و جھری لگتی ہے......!''

''ہاں! چنگاری اور درد بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ باہر دکھائی نہیں دیتے پر اندر منگل مچایا ہوتا ہے۔ بجھی پڑی سرد راکھ اور اُجاڑ زرد روؤں سے خوف زدہ رہنا چاہیے۔ بند سوراخ' اندھے غار کنویں کہنہ اشجار کے گھاؤ زخم' جن میں زہریلے سانپ' زنبوری گرفت کاٹ ڈالنے والی مونچھوں والے ہریل طوطے' پیلی بھڑیں' گُمس کھیاں...... ذرا تنی کی مانند کترنے والے گلہریاں' چمگادڑیں' کوّے چیلیں کیا کچھ نہیں ہوتا؟ یہ اُجڑے درختوں' پرانی غاروں' بے آب کنوؤں' باولیوں' بند سوراخوں کی آ ہیں کراہیں وغیرہ ضرب' درد جیسیں ہی تو ہوتی ہیں۔''

دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی کہ کار کا دروازہ بند کرتے ہی درویش کے ''دردخانے'' کا در کسی بھوت بنگلے کے صدر دروازے کی مانند خود بخود کھل گیا۔ دُور کہیں کوئی اُلّو بولا چمگادڑ چیخی اور نہ دروازے کی خون منجمد کر دینے والی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔

ایک نوعمر باریش درویش نے اندر بابا کے حجرے تک راہ دکھائی۔ اس فراڈیے بابا نے نرم کمزوری مسکراہٹ سے ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے سامنے فرشی گدے پر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ میں تو خیر اس کا پرانا نخچیر تھا جبکہ یہ دونوں امریکہ سے آئے ہوئے میرے دوست' نئے بھارو تھے جن کا انجام سوچتے ہوئے مجھے ترس آ رہا تھا۔ مگر وہی بات کہ جس صید کے پتروں میں ہی پھنسنا اور کٹنا ہی لکھا ہو' لاکھ بچنے کے جتن کر لے وہ کسی نہ کسی طور صیاد کے دام میں پہنچ ہی جاتا ہے۔ بلکہ کٹنے کے لیے گردن خود ہی پیش کر دیتا ہے۔ یہ میرا دوست اگر طوائف کی بات نہ کرتا تو یہاں تک نوبت نہیں پہنچی'' آ بیل مجھے مار'' کے مصداق'' لے بابا مجھے پکڑ'' والا معاملہ تو اس نے خود ایجاد کیا۔ اب میں'' عطائی قسائی'' اور ایک بوکرے کا درمیانی معرکہ دیکھنے کے لیے تیار تھا۔ پہلے میں قسائی کی بابت کچھ بیان کرنا چاہوں گا بلکہ سے بیشتر قسائی کے بارے میں جو بزرگوں نے کہا وہ سن لیں۔

صبر مند کتّا' بے صبرا نائی...... عقلمند دھوبی بے عقلا قسائی...... حاشا قسائیوں سے مجھے کوئی کد نہیں اور نہ ہی قسائیوں میں کوئی بے عقلی کی حرکت دیکھی بلکہ ان کی عقل والی بیشتر حرکتوں کو رشک و تحسین بھری نظروں سے دیکھتا ہوں کہ وہ کس عقلمندانہ پھرتی اور کمال نظر بندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھیچھڑے اور فاضل چربی کے ساتھ چھوٹی سی بوٹی اُتار کر گوشت کاٹنے والی منڈھی کے پیچھے پھینکتے ہیں۔ ان کی اس عقلمندانہ ہنرمندی میں جس ہنر پہ زور ہے وہ چھیچھڑے کے ساتھ بوٹی اُتارنا اور پھر اسے یک جنبشِ انگشت چھپانے میں ہے...... ایک اور ان کی عقلمندانہ ہنرمندی جس پہ اکثر داد دینے کو دل چاہا وہ مشینی قیمہ نکالنا۔ آپ لاکھ تاکید کریں پیسے زیادہ

دیں یا لنگر کا تقدس یاد دلائیں' وہ جی جی کرتے جائیں گے مگر کریں گے وہی جو ان کی پُرکار انگلیوں نے خاندانی فطرت سے حاصل کیا ہوتا ہے۔

اکثر قسائیوں کی دکان پہ ناقص باسی گوشت' کان زبان' پائے' آلائشیں' اوجڑی کا قیمہ وغیرہ مشین کی اوٹ میں رکھا ہوتا ہے...... موقع کی مناسبت سے کچھ مشین کے اندر پہلے بھی ڈالا ہوتا ہے' جو گاہک کی نظر بندی کر کے ان کے قیمے میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ قسائی اور نائی اگر گاہک کو باتوں میں لگانے اور ان کا دھیان بٹانے کا فن نہ جانتے ہوں تو وہ موروثی کام کر ہی نہیں سکتے۔ قسائی جب گاہک کے لیے گوشت صاف کر رہا ہوتا ہے تو وہ گھر کی ہانڈی کے بندوبست کی طرف بھی دھیان دھرتا ہے۔ اسی طرح درزی کو بھی گاہک کے کپڑے سے اس کا جوڑا بنانے سے کہیں زیادہ اپنے بچے کے جوڑے کی فکر رہتی ہے۔''

ایک بھلے مانس کو اک زمانہ بعد کہیں نئے کپڑے سلوانے کی توفیق ہوئی۔ اپنی پسند کا کپڑا خرید کر وہ سلوانے کے لیے بازار پہنچا۔ شکل وصورت سے معقول دکھائی دینے والے ایک خیاط کے پاس حاضر ہوا۔ کپڑا سامنے رکھا اور ایک شریفانہ سا سوٹ سلوانے کی درخواست کی۔ خیاط اپنے موروثی دھندے کا ماہر اور زمانہ کشیدہ تھا۔ گاہک اور کپڑے کو غور سے دیکھا...... پیمانہ لے کر کپڑے کی پیمائش کی' فوراً گاہک کے قد وکاٹھ کا حساب جوڑا معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا۔ آپ کے جسم کی لمبائی چوڑائی کے مطابق کپڑا کم ہے۔ اس کپڑے سے ایک کُرتہ اور نیکر تو بن سکتی ہے' شلوار قمیص نہیں۔ گاہک نے حیران و پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ کپڑے والے نے تو کھلے ڈُھلے سوٹ کا کپڑا دیتے ہوئے کہا تھا۔ درزی کاریگر ہوا تو اس کپڑے سے سُوٹ کے علاوہ شلوکہ بھی نکال دے گا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اس میں میری شلوار قمیص بھی نکلنا مشکل ہے۔

درزی کمال ڈھٹائی سے بولا۔ جناب اپنا اپنا حساب کتاب ہوتا ہے' جدھر سے کپڑا خریدا ہے وہاں سے اس کاریگر کا پتا پوچھ لیں جو اس سے پُورا سوٹ اور شلوکہ تیار کر دے۔ گاہک شرمندہ سا ہو کر کپڑا اُٹھائے وہاں سے نکل لیا۔ ذرا آگے پہنچا تو پیچھے سے آواز آئی' بھائی صاحب! ذرا ادھر آئیں...... مڑ کر دیکھا تو بائیں نکڑ پہ درزی کی دوکان پہ بیٹھا ایک اُدھیڑ عمر شخص اُسے بُلا رہا تھا۔ بندہ! کبھی کبھی ایسے کام جو اس کے پروگرام میں شامل نہیں ہوتے کر گزرتا ہے یعنی لاشعوری طور پہ اس سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنے طور سے ہی خجل تھا چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس دکان کی جانب سرک لیا۔ غریب شریف سا درزی! اک خستہ حال مشین پہ سلائی میں مصروف تھا۔

''بھائی صاحب! آپ کو دیکھ رہا تھا آپ اس دکان پہ گئے اور کپڑے سمیت واپس بھی اُتر آئے۔ آپ نے ارجنٹ کپڑے سلوانے ہیں یا ریٹ پسند نہیں آیا؟''

اُس نے آہستگی سے جواب میں بتایا کہ کپڑے والے نے کپڑا کم دیا ہے۔ میرے سوٹ کے لیے آدھا گز مزید چاہیے اب میں دوبارہ کپڑے والے کے پاس جا رہا ہوں۔ درزی نے کپڑے کی پیمائش کی پھر اس کا ناپ لیا تو خوشخبری سنائی۔ کل آ کر آپ اپنا سلا ہُوا سوٹ لے جایئے گا۔

گاہک نے حیرانی سے دریافت کیا..... ''اِدھر نہیں' اُدھر ہاں! یہ کیا راز ہے.....؟''

درزی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اس کا بیٹا گیارہ برس کا ہے اور میرا ڈیڑھ برس کا.....!''

بس یہی درزیوں کا اصل راز اور فن ہے۔ قسائی پکانے کے لیے گوشت' درزی اور دھوبی پہننے کے لیے کپڑے کبھی نہیں خریدتے۔ اسی طرح مچھ مچھلی فرغانی مراثی' موسیقار اور مستریوں کے بچّوں کو بھی کوئی نہیں سکھاتا۔ یہ جماندرو ہی موروثی فن میں طاق ہوتے ہیں۔''

چاچا چراغ دین کہا کرتا تھا کہ جنت میں چند ایک ہی ہوں گے باقی سب اِدھر ہوں گے۔ سارے ان امیروں کے حلق میں پگھلا ہُوا سونا چاندی ڈالنے کے لیے بھٹی دہکانے پہ معمور ہوں گے جو دُنیا میں مال و دولت اکٹھا کرنے پر جُٹے رہے..... زکوٰۃ' خیرات' صدقات ادا کرنے میں بخل سے کام لیتے تھے۔ اپنے ملازموں' غریبوں' محتاجوں کا خیال نہیں رکھتے تھے جبکہ قسائیوں کو تیز چھریاں ٹُھرے دے کر اپنی ہی بوٹیاں کاٹنے پہ لگا دیا جائے گا۔''

در کھلا تنگے ہی جیسے باہر کی دُنیا باہر ہی رہ گئی۔ اندر' راجہ اندر کی سبھا جیسا سجاؤ تو نہ تھا البتہ چند باریش سیاہ پوش' زُلف دراز' تابندہ رُو غلمان موجود تھے۔ چیتھڑوں کی سیاہ قبر میں اس دَور کا سب سے بڑا فراڈیا نیم دراز یوں پڑا تھا جیسے کوئلے کی کان میں کھدائی کے دوران کوئی کھوہ کُھل گئی ہو؟ عمل مکافات کی راہ کا سنگِ میل' جو گڑا ہُوا ہی نہ ہو' دھے پٹ پڑا ہُوا ہو۔ اُلٹ نہ سیدھ..... سنگِ سِل پہ اگر مسکراہٹ ہویدا ہو سکتی ہے تو یہ بابا مسکرا رہا تھا! اب جو پتھر میں جونک لگی تو بابا نے خوش آمدید کہتے ہوئے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا۔

''لنگر اور عام طعام میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ یہاں لنگر تھا کچھ علیحدہ سا..... کسی خاص ہاتھوں کا تیار کردہ! یہ ہاتھ بھی اسی جادوگر کے ہوتے ہیں جو ہر روز بڑے اہتمام سے ایسا پُر اثر لنگر اک ظرفِ خشوع سے تیار کرتا ہے یوں جیسے زندگی کا آخری لنگر بنا رہا ہو۔

ایک چائے والے کے بارے میں سنا' وہ پوست کے ڈوڈوں کا پوڈر چائے میں ملاتا ہے۔ کسی نے دیسی کچے ٹکڑے کی خبر دی۔ بھنگ کی تگڑی کا بھی پتا چلا۔ پورے کراچی میں اس کی لاجواب چائے کی دھوم تھی۔ ہزاروں میں کماتا تھا' بہت سے دوکانداروں نے اس کے نسخے کی جاسوسی کرنے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے چائے خوروں' اُستادوں کو اُدھر سے چائے پلوائی سونگھائی' لیبارٹری ٹیسٹ بھی کروائے مگر اس

جادوئی چائے کے اجزائے ترکیبی کا کوئی سرا ہاتھ نہ لگا۔ حاسدوں نے بے پر کی اُڑائی کہ خواج خان چائے میں ہندوؤں کے مرگھٹ سے نکلے ہوئے مُردوں کے مسان مکس کرتا ہے کہ اس کی چائے پینے والے دو تین جوانوں نے ہندو لڑکیوں کو مسلمان کر کے شادیاں کر لیں ہیں اور یہ بھی کہ اُدھر کی چائے نوش انڈین فلمیں گانے اور ناریاں جُنون کی حد تک پسند کرتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود خواج خان کی چائے چلتی رہی اور حاسدین بھی اپنے مشن میں جُٹے رہے۔''

کبابوں' پاپڑوں' نکیوں شامیوں' پکوڑوں' پراٹھوں میں بھنگ کی 'تلدی اکثر ملائی جاتی ہے اور یہ اشیاء جانتے بُوجھتے ہوئے بھی بااہتمام کھائی جاتی ہیں۔ کیا عجب کہ یہ پیر پراگندہ بھی اپنے لنگر میں کسی جناتی ہڈیوں کی یخنی یا کوہ قاف کی جڑی بوٹیوں کی جوارش شامل کرتا ہو تب ہی اس کے ہاں لنگر کھانے پینے والے بیوی' بہن' بیٹی اور بی بی کے ہاتھ کا پکا پروسا ریل یا جیل کے کھانے کے برابر سمجھنے لگتے ہیں۔ ''ضعیف العقیدہ اور رقیق القلب'' جو اس کی اندھی عقیدت کے جالے میں پھنس جاتے ہیں' ان کے گھر والے اعلانیہ کہتے ہیں کہ اس بابے نے ہمارے بندوں بچّوں کو کسی بزرگ اُلّو کا بھیجہ کھلا کر اُلّو کا پٹھا بنایا ہُوا ہے۔ بابے کے علاوہ انہیں اور کوئی نظر ہی نہیں آتا اور نہ کسی اور کی سنتے ہیں۔

- نندی پور کا باجوہ......!

شاید ہی کسی نے پہلے یا موجودہ جنم میں اسے نماز روزہ کا پابند پایا ہو...... بہت سے حج عمرے بھی میری دانست میں وہ اسی طرح کرتا ہے جس طرح وہ پوری دُنیا کے ملکوں میں اُونٹ کی مانند منہ اُٹھائے گھومتا ہے۔ شادی خوشی' مرگ سوگ کی تقاریب میں شاید ہی شرکت کرتا ہو۔ کہتا ہے یہ سب فضول سا ہے وقت و وسائل کا ضیاع...... کسی بندے کے مرنے پر اظہارِ تعزیت بھی نہیں کرتا کہ قرضہ کی واپسی باعث طمانیت ہونی چاہیے نا کہ واویلا...... خوشی میں شامل ہوتے ہوئے کانپنے لگتا ہے تو با استغفار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ غم کہ خوشی ہو دونوں اصل میں ایک ہیں۔ دائیں بائیں کروٹ کی طرح ہیں۔ دونوں کو کمال تحمّل سے اور صبر و شکر سے اپنے جذب کا حصہ بنا لینا چاہیے۔''

بلّی' کتّا' کوّا' کبوتر کہیں کرب میں کراہتا بھی ہے تو باباد ہاڑیں مارنے لگتا ہے۔ گزر چکے ہوں تو باقاعدہ تجہیز و تکفین کا بندوبست کرتا ہے...... اس کا بس چلے تو سنگِ مرمر کا مزار' سنگی کتبہ لگوائے' جھنڈا' عرس دھمالیں قوالیاں ہوں۔ عجیب سمجھ میں نہ آنے والی توجیہیں پیش کرتا ہے۔ مثلاً متذکرہ بالا جاندار سوگنگ'

ڈرنک نہیں کرتے...... منہ میں پان نسوار گٹکا نہیں رکھتے...... بھنگ' چرس' مدک' افیون ڈوڈے استعمال نہیں کرتے۔ صمد گلو' پٹرول نہیں سونگھتے...... کھانسی کے شربت نہیں چسکتے۔ وہ کہتا ہے اگر ہم کچھ جانوروں سے ہی سیکھ لیں تو ایک بہتر انسان بن سکتے ہیں۔ جتنے جانور انسان نے پیٹ کا ایندھن بنائے ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی انہوں نے انسانوں کو نہیں کھایا۔ درندے سے درندہ جانور بھی انسان کو کھانے میں حیا اور اجتناب برتتا ہے کہ اس کے گرد پیکنگ بڑی بکی اور سواد بڑا غیر انسانی ہوتا ہے۔ کوٹ' مفلر' قمیص' بنیان' انڈرویئر' جرابیں' دستانے اور بوٹ چپل وغیرہ اتنے پردے تو پیاز کے بھی نہیں ہوتے......؟ جانوروں کی حمایت میں کہتا ہے۔ حیوان ناطق سے حیوان مطلق ہونا بدرجہا بہتر ہے کہ انسان کی طرح منافق اور غیر ضروری مذہبی نہیں ہوتے...... دُہرے معیار اور غیر ذمہ دارانہ رویے روا نہیں رکھتے۔ انسان کی طرح غیر فطری طرزِ زندگی اختیار نہیں کرتے۔ توکل اور تسلیم و رضا پہ کاربند رہتے ہیں۔ ننگے پیدا ہوتے ہیں' ساری زندگی ننگے ہی بسر کر دیتے ہیں اور پھر اسی حالت میں ان کی اخیر ہو جاتی ہے...... غسل کفن قبر پھول' خوشبو' پانی اور دعاؤں سے بے نیاز......! اور بے جا خرچہ نہیں کرتے؟

بابا بھی جانوروں کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ جتنی اور جیسی رب رب دیگر مخلوقات کرتی ہیں عام انسان اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

کنجوسی' ریا اور بدعہدی تو بہت بڑی بشری کمزوریاں ہیں۔ اللہ کی مخلوق کی داد رسی' مدارات' ان کی عزتِ نفس کا احساس اور ان کو لنگر کھلانا بہت بڑی عبادت گردانتا ہے۔ لنگر پکوا کر کھلانے میں وُہ معراج نہیں جو اپنے ہاتھوں پکا کر کھلانے سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ملامتی فقیر کہتا ہے۔ مگر اسے خاک پتا نہیں یہ ملامتی ہوتے کون ہیں؟ ملامتی تو وہ ہوتے ہیں جو گناہ کو ثواب سمجھ کر کرتے ہیں اور ثواب والے کام کو گناہ گردانتے ہیں...... مگر یہ عملاً ایسا نہیں کرتا' اس کی دانست میں غلط' غلط اور صحیح' صحیح ہے۔ وہ غلط صحیح' نیکی' بدی' محبت' نفرت کو کچھ ایسے انداز میں سرعت سے حرکت میں لاتا ہے کہ دونوں ایسی خوبصورتی سے باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں کہ ان کی علیحدہ علیحدہ کوئی شناخت نہیں رہتی۔ کوئی علیحدہ سا ہی فلسفہ بن کر رہ جاتا ہے جو نہ سمجھنے اور نہ سمجھانے کا......!

ہم جھوٹے ہیں ہر بات میں تم سچے ہو مہاراج
اپنا کر کے راکھیو ہمری بانہہ پکڑے کی لاج

یہ چرغل کمال درجہ کا نباض...... قیافہ شناس' نفسیات اور فطرت و جبلّت اس کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اس کے روبرو پتھر بولنے اور شیشے تڑخنے لگتے ہیں۔ اس کی نگاہ ملمع کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔

بندہ اس کے سامنے ہوتا پھر ہوزنہ اور بعد مخلص ذاروں کی شبیہہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر اس کا فن ملاحظہ ہو کہ جب مناسب سمجھتا ہے اسے ریورس میں ڈال دیتا ہے۔ اشرف المخلوقات کا جھانسہ دے کر پھر واپس لے آتا ہے۔ یقین دلاتا ہے کہ اگر تو چاہے تو مہ انجم تری گرد راہ بن سکتے ہیں......!

دعویٰ تو کرتا ہی ہے دیکھا بھی گیا ہے کہ دُنیا بھر کے عُلوم وفنون پہ منہ مارتا رہتا ہے۔ کہتا ہے مالک کُل نے مجھے وَدیعت کیے ہیں ایک ہزار ایک سو ایک طرف اور وہ اکیلا ایک جانب...... کہتا ہے آدھے تو اللہ کے اَمر سے میری گھٹی میں پڑے تھے...... باقی بابوں کا فیض اور جو رہ گئے وہ جہاں بھر کی جُگل خواری کا حاصل......!

کہتا ہے کُل آدم میں ہر علم وہنر کی پیوند لگائی گئی۔ دل ودماغ، اعصاب، عضلات کی مانند ہر بنی آدم میں خدائی تخلیقی اوصاف اور اَرضی وافلاکی علوم وفنون کا ادراک موجود ہوتا ہے۔ بس! ذرا کھوجنے اور اندر کا گھوڑا جوتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ باہر کی ضیاباریوں کو اندر کی اندھی اندھیری تاریکیوں سے فوکس کیا جاتا ہے۔ ظلمت کا سینہ چیر کر پھوٹنے والی کرنیں بڑی توانا تیز وتند ہوتی ہیں۔ جو تنویر کہلاتی ہیں...... ان کی خیرگی آنکھوں میں چوندھ پیدا نہیں کرتی چمک کی چیک چسپاں کرتی ہے۔ ایسی مقناطیس خصائل والی آنکھیں عالم منتہا تک رسائی رکھتی ہیں۔''

ایسی گنجلک گنج مایہ باتیں کرنے والے کی اپنی آنکھیں، آنکھوں کی ذیل میں نہیں آتیں۔ جُوں جُوں عمر دراز ہوتی جا رہی ہے اس کی چندی مُندی آنکھیں کناروں سے ویلڈ ہوتی جاتی ہیں۔ لگتا ہے کہ مزید کچھ دن گزرنے پہ بالکل پتلیاں سکڑ کر کسی بلونگڑے کی پتلیوں کی مانند سفید اور دُھندلی دُھندلی سی رہ جائیں گی...... ساتھ ہی کالے چٹے پیلے موتیے کی بہاریں بھی اُتری ہوئی ہیں۔ اس بابے کی ''عالم منتہا'' تک دیکھنے والی مقناطیس آنکھیں ایسی ہیں کہ عینک لگائے تو عینک والا جن جاپ پڑتا ہے اور بن عینک وہ ایسا مہاجر جن دکھائی دیتا ہے جیسے کوہ قاف سے چھوٹی بڑی اور ایک لمبوتری ایک گول' آنکھیں ہونے کی بنا پہ وہ بدر کر دیا ہو؟

جنوں کی آنکھیں گول ہوتی ہیں جبکہ اس کی ایک آنکھ میں کچھ بشریت بھی جھلکنے لگتی ہے۔ ایک آنکھ بڑی اور لمبوتری دوسری بائیں گول اور چھوٹی ہونے کی اصل وجہ لقوہ کا مبارک حملہ تھا جس نے چہرے کے بائیں جانب کی نسوں وریدوں میں سقم پیدا کر دیا ہے۔ نتیجہ میں آنکھ اور ابرو کی آبرو ماند پڑ گئی ہے۔ دیکھنے والے کو ان کا دایاں ڈیلہ ڈھلملا اور بایاں ڈیلہ ذرا دَنا دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے بایاں ڈیلہ سری لنکا ''آنکھوں کے بینک'' سے خیراتی فنڈ میں حاصل کیا گیا ہے۔ ایسے ڈیلے آنکھیں مختلف حادثات، خودکشی، طبعی اموات میں کام آنے والوں کی فرمائش پہ نکال کر محفوظ کر لی جاتی ہیں۔ دُنیا بھر کے اندھے حادثات میں آنکھیں کھونے والے یہاں سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ اگر دونوں آنکھیں یہاں سے حاصل کر کے لگوائی گئی ہوں تو ایک سی ہو سکتی ہیں اور

ایک تو لگوائی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ پہلی والی سے مختلف ہوگی۔ چھوٹی بڑی تو اکثر ہوتی ہیں۔ ایسا بھی کہ کسی مرد کو عورت کی آنکھ لگادی یا بچی کو کسی بابے کی ٹھوک دی۔

اس بابے کی دونوں چھوٹی بڑی علیحدہ علیحدہ کیفیات کی حامل ہیں۔ چھوٹی بائیں گول آنکھ جناتی تاثر پیدا کرتی ہے...... اس آنکھ کو آنکھ ملا کر دیکھنا بڑے مضبوط گردے پتے کا کام ہے۔ اس لیے سامنے بیٹھا ہوا اگر سیانا عقل والا ہے تو وہ دائیں آنکھ پہ نظر رکھے گا۔ کچھ صاحبِ اسلوب اسے آدھا بشر اور آدھا جن کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی بائیں لقوہ زدہ آنکھ ہے۔ کہتا ہے اس لقوہ نے مجھے تقویٰ کے کچھ علیحدہ سے معنی سے روشناس کروایا ہے۔''

اس کے منہ میں دانتوں کے دو چار ٹوٹے پھوٹے سے دانے باقی رہ گئے ہیں لیکن پیٹ کی آنتیں ماشاءاللہ کافی مضبوط ہیں...... کہتا ہے کہ دانت اور دوراتی اگر کھنڈے بھی ہو جائیں تو ان کا نعم البدل موجود ہے اگر اندر کی آنت اور منہ کی بانت کھنڈے لگ جاویں تو ان کا تدارک اللہ تبارک کے ہاں ہوگا کسی اور کے بس کی بات نہیں...... واللہ اعلم......!

یونہی ایک بار لاشعوری طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔ راسپوتین کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟...... کچھ دیر مجھے دزدیدہ نگاہی سے گھورتا رہا، پھر ادب کر بولا۔

''تم بہلول دانا کی بابت کیا جانتے ہو؟''

''سوال پہلے میں نے کیا ہے اس کا جواب دو......؟''

''میرے سوال میں ہی تمہارے سوال کا جواب ہے...... جب مجذوب کی اپنے مالک کے دامن پہ گرفت کمزور پڑ جاتی ہے تو اس کی جذب سے جنوں کی جانب مراجعت شروع ہو جاتی ہے۔ مجذوب کی منزل مولا مرشد کے نقشِ قدم پہ چلنے سے ہی طے ہوتی ہے۔ مجنوں منزل سے پہلے ہی بھٹک جاتا ہے اور کبھی منزل آشنا نہیں ہوتا۔''

راسپوتین، حسن بن صباح، نطشے وغیرہ مرشد آشنا نہیں تھے۔ منزل مسافت کا تعین یا تو قطبی تارا یعنی افلاک کی استعانتوں سے ترتیب و تشکیل پاتا ہے یا کسی سنگِ میل سے یا پھر سرِ راہ مسافروں مناظروں سے...... متذکرہ بالا اپنے اپنے مقام و عصر کی نابغۂ روزگار ہستیاں تھیں۔ علم و فضل دانش و بینش حکمت و قدرت میں یکتا! ان کے ہاں دل و دماغ کو مسخر کرنے کا ہنر بھی تھا۔

ان کی قدر و منزلت اور اثر و رسوخ میں بھی کچھ باک نہ تھا۔ ادھر شداد، نمرود، عمر خیام، جمشید، حکیم مخشب کے ہاں بھی حکمت و ریاضت کی کمی نہ تھی، کمی اگر تھی وہ مالک و مرشد کی تھی۔ وہ جو اقبالؒ نے کہا......

؎ اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

یہ مقام کبریا کیا ہے؟ مالک ارض وسما...... مالک یوم نشور کی پہچان...... ارض پہ لاکھ اہرام ومقابر تعمیر کرالو...... چاند ستارے بنالو...... پاتال تک کنویں اور اوج ثریا تک مینار تعمیر کرالو۔ معلّق باغات' رصدگاہیں' شہر' قلعے' پل' دیواریں تعمیر کرالو' اگر ز اس سمت درست نہ ہوئی تو سب کچھ عبث ہے۔ عبرت ناک داستانیں بن کر رہ جاتا ہے۔''

خواجہ بہلول دانے'' کی راس سمت درست تھی بلکہ وہ دوسروں کی بھی سمت راست کردیا کرتے تھے۔ راسپوتین بے سمتا بے زاسا تھا۔ ابلیس نے اُسے گود لیا ہوا تھا اس کے ہاں ارضی استغنا ئیں تھیں جو بے بال وپر کے پرندوں کی طرح محدود پرواز ہوتی ہیں...... کشش ثقل کے باہر ساکت ہوجاتی ہیں۔''

''داڑھی پہ برف پڑی ہوئی سر کے بالوں پہ کالک پتھی ہوئی؟'' میں نے اس کا کارن پوچھا۔

جواب دیا...... میں ان فضول باتوں میں نہیں پڑتا' یہ نظروں کا دھوکہ ہے۔ نہ میں نے کالے بالوں کی خواہش کی اور نہ کبھی داڑھی کو سفید کرنے کی کوئی کوشش کی۔ میں تو اپنے چہرے مہرے اور جسم کو دیکھتا ہی نہیں...... دیکھنے میں رکھا بھی کیا' سب کیڑے مکوڑوں کا کھاجا......!

زندگی اور موت کے بارے میں اس کی عجیب سی منطق ہے۔ بظاہر زندہ مگر خود کو مرا ہُوا کہتا ہے۔ وہ بابا اشفاق احمد کو ہر روز اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ کھلاتا ہے...... وہ آج بھی اس کی تحریریں پڑھ کر خوش ہوتے ہی شاباشی دیتے ہیں۔ اس قسم کی ناقابل یقین وفہم باتیں اکثر ہانکتا رہتا ہے۔ کچھ لوگ حیا کرتے ہوئے سُن کر خاموش رہتے ہیں کہ اس بڑھاپے میں کیا اس سے بحث کریں' جھوٹ سچ چھانیں پھٹکیں۔ چند سر پھرے جن میں' میں بھی شامل ہوں' بدو بدی اس سے سینگ پھنسا بیٹھتے ہیں اور پھر تڑوا بھی لیتے ہیں' کہ وہ ایسی ناقابل تردید توجیہات وتصریحات پیش کردے گا جسے جھٹلانا بس سے باہر ہوگا اور آپ لامحالہ آمنا وصدقنا کہنے پر مجبور کردیے جائیں گے۔''

شجر جب ثمر بار ہوتا ہے تو قدرے جھکائی لے لیتا ہے۔ کمال ہے جب یہ کوئی جہالت وحماقت کا' کارکرتا ہے تو اُٹھائی لے لیتا ہے...... ایسا اُٹھائی گیرو جو اُٹھانویں' اُٹھانوں میں اُستاد ہو۔ خیانت وخُردبرد کا خلیفہ...... نظر بندی کے ننانوے نقشوں کا نصاب تولیں......!

اس کے بڑے مہلک اور مؤثر مسالے' مسکینی میسنت اور مصنوعی معصومیت ہی نہیں جن کی مدد سے اپنے ملنے والوں کو متاثر کرلیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اچھے خاصے منہ ماڑ' بڑ بڑ مصنف' مولوی مقرر وغیرہ اس کی

عاجزی خاکساری لجاجت مُراثیوں مصلیوں کی مانند بات بات پہ ہاتھ جوڑنے اور گریہ مسکینی مکاری سے مات کھا جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کوئی اس کی دُم پہ پاؤں دھرے پَل سے پہلے پیر پکڑ لینا اُس کے لیے پیرِ تسمہ پا ثابت ہوتا ہے۔

● نکمّے پیروں کا مجھونا......!

بابا بُلّھے شاہ نے خود کو بُلھا بھلے ہی کہا ہے۔ ایک بھونڈ قسم کے بندے کا نام لبھا تھا...... پہلے زمانوں میں غریبوں دیہاتیوں اَن پڑھ لوگوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بُلھا' بھولا' مولا' نھا' فقیرا' شہابو' کالا' پھوجا' ذلا لبھا وغیرہ...... لبھا سے کسی نے اس کا نام پوچھا۔ اُس نے بیساختہ جواب دیا۔ لبھا! لبھا ہے نہ لبھاتے نہ لبھا؟ اس کا بھی یہی حال ہے اپنے نام کے بارے آؤ بھگت کرتا ہے۔ باپ نے جن کا نام ذکریا ہرگز نہ تھا' علامہ اقبال کے کہنے پہ پیدائش سے قبل ہی میرا نام یحییٰ رکھ دیا۔ ''بابا'' کا لاحقہ میں نے خود لگا لیا۔ یہ نہ لگاتا تو ''بھگت'' لگالیتا۔

مزید بتاتا ہے...... ایسا نہیں کہ مجھے یہ نام پسند نہیں' پس ذرا مذہبی اور پُرانا سا ہے پھر اس میں کسی کالے رنگ کا پیچ بھی نہیں۔ جب وہ قابلِ احترام بابرکت ہستیوں کا کسی نہ کسی اپنے سے تال میل جوڑے گا تو اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کو آپ کیا کہیں گے؟ مثلاً آپ اپنے بزرگوں کے دور کی کسی قابلِ ذکر واقعہ یا ہستی کا ذکر چھیڑ دیں تو پھر اس کی ذرفطیاں ملاحظہ فرمائیں۔

والد اور دادا جان کے بچپن کے چشم دیدہ واقعات ایسے مزے لے کر بیان کرتا ہے کہ سننے والا اس کے کذب کی دیدہ دلیری پہ قربان ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد' اقبال' قائداعظم' میر غالب' رابندر ناتھ ٹیگور' حکیم اجمل' گاندھی' خواجہ حسن نظامی' سید عطاء اللہ بخاری' قدرت اللہ شہاب' دیوان سنگھ مفتون' بیدی' بڑے چھوٹے بخاری صاحب وغیرہ' یہ تو اس کی نظر میں بچے کل کے لوگ ہیں۔ بطوط' ارشمیدس' خیام' رازی' رومی' جامی' سعدی' شیکسپیئر' ڈاروِن' آسکر وائلڈ' برنیڈرسل' ہٹلر بھی بچے پرسوں ترسوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بے چارے سقراط' بقراط' ارسطو' سکندر سے بہت پیچھے نوح' آدم تک مار کر جاتا ہے۔ بھلے مانس! اتنی اور ایسی چھوڑ جو کسی نہ کسی طرح کہیں فٹ بیٹھ جائے یا ماضی شکیہ میں کہیں آبرو کے ساتھ ضم ہو جائے۔

یونہی ایک بار بڑے اچھے لہجہ میں موسیقی پہ بات ہو رہی تھی ویسے اسے تو کوئی نہ کوئی ایسے موضوع' عنوان یا رسّی کا سرا چاہیے ہوتا ہے۔ ایسی بات کی بلّی جس کے پیٹ سے کوئی ''بتنگڑا'' نکال سکے...... موضوع

کوئی بھی جس کی ماں بہن ایک کر کے یا دو پانچ سنا کے اسے آسودہ کر سکے۔ عنوان جلی ہو خفی' انگشت زنی کرنا اپنا پیدائشی تصرف سمجھتا ہے۔ رسّی کا سانپ' رائی کا ہمالیہ' بانجھ کو ممالیہ...... مرگھٹ کو اُوشد ہالیہ...... بیر کے پیچھے چھالیہ اور روئی کے پھوہے کو پھالیہ بناتے ہے یہ اسی خوش فہمی' خود فریبی سے مبتلا ہوتا ہے جس طرح جنگلوں کے بندر ہوتے ہیں...... شدید جاڑے میں سوکھی ٹہنیاں' لکڑیاں شاخیں پتے اکٹھے کرتے ہیں' الاؤ کی شکل دے کر اردگرد ڈیرے جمائے اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں...... ہاتھ پاؤں بڑھا بڑھا کر فرضی آگ تاپتے ہیں اور اپنے تئیں سردی سے محفوظ رہتے ہیں۔''

دُعا کریں کہ خدا بندروں کو آگ جلانے کے طریقے اور ادرک کے سواد سے آشنا نہ کرے اور بندوں کو قدرے خدائی اوصاف تو بھلے دے مگر خدا بننے سے بچائے رکھے۔ بندر کے ہاتھ ولکنسن سورڈ کا کھلا اُسترا اور کسی نام نہاد زرد فکر اخبار نویس' اُدیب کے ہاتھ پارکر کا پن آ جائے پھر اللہ پاک ہی ہے جو اپنے معصوم بندوں کی گردنوں اور گریبانوں کو بچانے کی قدرت رکھتا ہے۔''

دعویٰ کے انداز میں بتاتا ہے کہ مَیں اپنے پہلے روحانی مرشد علامہ اقبالؒ سے براہِ راست فیضیاب ہوں اُن کے جسم کا پسینہ اور آنکھ کا آشوب مجھے نصیب ہُوا...... میری ذات کی ننھی سی کونپل اُن کی ایمان گاہ اور دُعا سے پروان ہوئی۔''

مَیں سمجھتا ہوں کہ ایسے اور اس سے بڑھ کر بھی بہت سے دعویٰ کئے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کوئی یہ دعویٰ بھی کر سکتا ہے...... مَیں سگا بیٹا ہوں' جاوید سوتیلا ہے...... وہ جو کہتے ہیں کہ بات کرنے کی حد ہوتی ہے مگر بکنے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ مَیں اس کی بکواس سے زچ ہو کر کہہ بیٹھا...... جاوید کے ہاں تو موروثی' قانونی اور شخصی شہادتیں' ثبوت موجود ہیں۔ کسی اور کے پاس اس اَمر کا کون سا ثبوت ہو سکتا ہے؟

ڈھٹائی اور مجرمانی چالاکی دیکھیں! کھٹ سے بولا۔

''ہم ملامتی فقیروں درویشوں میں قول و فعل' دلیل ثبوت' شادیاں شہادتیں نہیں دیکھی جاتیں۔ یہ سب علائقِ دُنیا! خود نمائی' خود فریبی کے اظہاریے تماشے ہیں...... (استغناء کے ساتھ) کوئی حتمی دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا فلاں اس کا باپ ہے یا فلاں اس کا بیٹا ہے۔''

درویشی لائن میں تو ہاں بھی' نہیں میں رکھی ہوتی ہے۔ اچھائی نیکی کہیں پلّے پڑ جائیں تو فوراً کالی چادر سے ڈھانپ دیا جاتا ہے کہ کہیں یہ فقیری ننگی نہ کر دیں۔ دیکھتے نہیں ہو کہیں سخت گٹھلی کو نرم میٹھے گودے نے چھپا رکھا ہے اور کدھر سخت کھردرے چھلکے نے آبِ حیات اور بہشت کا حلوا ڈھانپ کر محفوظ کیا ہُوا ہے...... خوبانی' آلوچہ' آڑو' کھجور' اخروٹ' ناریل' تربوز' چلغوزہ' بادام کبھی کھائے ہوں گے......؟

میں واپس اس جانب آتا ہوں جدھر ہمارے مابین موسیقی پہ بات چل نکلی تھی۔ موسیقی اس کے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک ہے۔ مگر کلاسیکی موسیقی میں اس کی واجبی سی دلچسپی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ معمولی سی شخصیت علمیت اور اہمیت کے آدمی کی شد و بدھ موسیقی کی ابجد سے کماحقہٗ واقفیت کیونکر ممکن ہو سکتی ہے' جبکہ یہ کسی موسیقار گھرانے والے ''خانصاب'' نہیں......؟ وہ تو ایسے ہی خان ہے جیسے ہم پشتینی نام نہاد مسلمان ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک بار ایک بات پتے کی کر گیا۔"

جھک کر کہنے لگا' اچھا ہے موسیقی کے بارے میں میرا علم سرگم کی اروہی امروہی سے زیادہ نہیں' میں خوش سُرے اور بے سُرے میں تمیز نہیں کر سکتا...... انگلیوں پہ ماترے نہیں گن سکتا۔ سُر لگنے پہ زانوں پہ ہاتھ نہیں مار سکتا' ورنہ یار لوگ تو مجھے ''یحییٰ خان'' کی جگہ خان صیب کہہ کر میرا کہروا بجا دیتے۔"

بات بات 'لقمہ لقمہ' گھونٹ گھونٹ' سانس سانس' اُسے الحمدللہ' سبحان اللہ! ماشاءاللہ کہنے کی بے ساختہ عادت ہے۔ وہ کسی ثواب یا جنت کی حوروں کی خاطر نہیں بلکہ حاضرین' معتقدین پہ اپنی درویشی کی دھار تیز کرنے کے لیے ایسے کرتا ہے۔ بزرگی نہیں مکاری اور اداکاری دکھائی دیتی ہے لیکن چونکہ گھر کا بھیدی ہوں اور اس کی فقیری درویشی کی ساری لنکا میرے رُوبرو رہتی ہے۔ اس خاطر وہ مجھے پرکھتا بھی ہے کیونکہ موقع بہ موقع میرے منہ سے سچ بھی نکل جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک بار میرے منہ سے نکل گیا......!

بار بار سبحان اللہ' الحمدللہ' ماشاءاللہ سُن سُن کر مجھ دوزخی کے کان جنتی ہو گئے ہیں۔ اگر تم اس مقدس کلمات کے ساتھ مزید ایک دو فقروں کا اضافہ کر لو...... تو تمہارے معتقدین میں خاطر خواہ اضافہ اور شہرت بھی دوچند ہو جائے گی۔ مجھے اچھا خاصا گھورتے ہوئے پوچھا...... بولو......؟"

میں نے ذم درست کرتے ہوئے کہا۔

''مولا خوش رکھے'' اور بھاگ لگے رہن'' اگر ساتھ کہہ لیا کرو تو حرج کچھ نہیں...... بلکہ فنکاروں میں پہچان خاصی ہو جائے گی اور خانصبی بھی مستند رہے گی۔ آنکھیں دکھاتے ہوئے تنک کر بولا۔

''جناب! ہمارے بڑکے افغانستان کی طرف سے آئے تھے۔ شام چوراسی یا پٹیالہ کی جانب سے نہیں......!''

● کوئے ''جدن'' سے نکلے تو سوئے ''روشن'' رواں ہوئے......!

میرا کہا سچ ہوا کہ ٹھیٹ موسیقی اور پکے راگ دھاریوں سے اس کا کوئی خاص لگاؤ جھکاؤ نہیں۔ موسیقی

کے متعلق اس کا علم اللہ وسائی سے ''الف'' ہو کر ملکہ ترنم نور جہاں تک ''بائے'' ہو جاتا ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں جو میں نے کلاسیکل موسیقی کے حوالے سے کیا تھا...... ارشاد کیا......!

دراصل میں شیر خواری سے ہی موسیقی کا گرویدہ تھا۔ جوں جوں بڑا ہوتا گیا۔ میرا موسیقی سے عشق بھی فراواں ہوتا گیا۔ میں سیالکوٹ کے کلاونتوں اور کن رسیوں کی محفلوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ راگ راگنیوں سے زیادہ سمجھ بوجھ میں آنے والے آلات موسیقی تھے۔ جب سازندے انہیں بہلا پھسلا ڈانٹ ڈپٹ یا ڈھول دھپے سے سُر میں لاتے تو میں خاصا محظوظ ہوتا لیکن اس وقت میری خوشی دیدنی ہوتی جب وہ کسی ڈھیٹ بے سرے طبلے کی بڈھے یا ہتھوڑی سے خبر لیتے...... کسی تنک چڑھی نگوڑی ستار جسا سارنگی یا تانپورے کے کان اینٹھتے۔ ڈھولک مردنگ کی تلاویں کھینچنے پہ بھی بڑا لطف آتا۔ پیچ سُرمنڈل کی تانتیں چابی سے کسی جاتی...... یہی سمجھ میں آیا تھا کہ مکتب کے اُستاد مولوی' نازک نازک بچوں کی کان مروڑیاں کیوں کرتے ہیں...... شاید یہ بھی بچوں کی تانتوں کی کھنچائی ہے۔ ان کی ریں ریں کی طرح سورنگی کی ریں بھیں بھی بھلی لگتی۔

گھر کے سامنے بجلی کے کھمبے سے کان گال ملا کر چھوٹے ہاتھوں سے گت دیتے اور ''ساون کے بادلوان سے یہ جا کہو'' گا نے موسیقی سیکھنے کی کوشش کی۔

بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں میں بادشاہ' ملکہ جادوگر' پہاڑ' جن اور طوطے کہیں نہ کہیں ضرور ہوتے تھے۔ پہاڑ اور طوطے پنجرے تو دیکھ رکھے تھے لیکن ابھی کسی زندہ بادشاہ ملکہ یا شہزادی سے واسطہ نہ پڑا تھا۔

انہی دنوں سُنا کہ لاہور میں ایک موسیقی کانفرنس ہو رہی ہے جس میں بڑے بڑے گائیک موسیقار اور سازکار حصہ لے رہے ہیں۔ خاص بات یہ کہ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم باہتمام شرکت کر رہی تھیں۔ میں بیوقوف محض ملکہ دیکھنے کے شوق میں لاہور پہنچ گیا۔ ذہن میں ملکہ چھائی ہوئی تھی...... سر پہ تاج ہوگا' لباس فاخرہ' ہیرے موتی' خوبصورتی اور تمکنت و وقار کا پیکر...... اور یہ بھی کہ موسیقی کی ملکہ ہیں۔ کانفرنس سے کئی روز پیشتر' دماغ میں ملکہ دیکھنے سننے کا تصور پلتا رہا۔''

آخر ایک دن لاہور پہنچ ہی گیا۔ پوری رات ملکہ دیکھنے کے شوق میں جاگتا رہا۔ اگلے روز وہاں پہنچا تو تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ تل دھرنے کو جا نہ تھی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے اُستاد گویے موسیقار جمع تھے اور سب سے بڑھ کر ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم! میں چھوٹا سا تھا کوشش کر کے کسی نہ کسی طور اندر پہنچ گیا۔ جوان بوڑھے' عجیب و غریب وضع قطع والے سازندے' موسیقار گویے...... اک نہ سمجھ میں آنے والا ماحول تھا۔ تان پلٹے' مُرکیاں...... عجیب ڈراؤنی شکلیں بنا بنا کر راگ داری ہوتی...... سچ تو یہ ہے کہ کئی بار ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی۔ طبلے پہ خوب مشقت ہو رہی ہے۔ ستار سُرمنڈل سنتور نے سماں باندھا ہوا۔ تانپورہ

نے تان اُٹھائی ہوئی ہے۔''

ایک بات سمجھ نہ آئی کہ گانے والے اُستاد کسی انترے کو چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ بار بار دُھرا دُھرا کر اس کی یو ماردیتے۔ ملکہ موسیقی کو دیکھنے کا خبط نہ ہوتا تو کبھی کا اِدھر سے بھاگ گیا ہوتا۔ یہاں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ کلاسیکل موسیقی کو سننا اور برداشت کرنا کس قدر مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ کسی شریف اور مذہبی آدمی کو کڑی سزا دینی مقصود ہو تو پکڑ دھکڑ' کسی پرانے بڈھے' بے ہیز تھے موسیقی کے اُستاد کی محفل میں باندھ دیا جائے' وہ پہلے اُلاپ پہ ہی اُدھڑ پدھڑ جائے گا اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے توبہ لے کر وہاں سے بھاگ لے گا۔''

مجھے ملکہ موسیقی کی دید شنید نے باندھ رکھا تھا...... دل میں طرح طرح کے وساوس کلبلا رہے تھے کہیں خدا خدا کر کے جب کلاونت گوئیے بھگت لیے تو ملکہ کی آمد کا اعلان ہوا۔

چوب دار نہ کوئی کنیز لونڈی...... جھنکار نہ کوئی نقارہ...... ایک مریل سا بوڑھا' سورنگی کو کسی بیمار بچے کی مانند گلے سے لگائے اسٹیج پہ آیا...... پیچھے طبلچی' تانپورے' سُرمنڈل والے بھی آبراجے...... ٹھیک ہے اکثر مینہ برسنے سے پہلے آندھی جھکڑ' ہوا' وڑولے بھی آتے ہیں...... سماں باندھنا اور ماحول بنانا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ سازندے بیٹھے تو مریل سا مرد ایک سُرخ گدا اور تکیہ اُٹھائے آیا اور درمیان میں رکھ کر چلا گیا۔ سازندوں نے ساز سُر کرنے کے لیے ٹھوکا ٹھوکی شروع کر دی۔ جب یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو منتظمین سے ایک سرکردہ اسٹیج پہ آیا اور ملکہ موسیقی اور اُن کے فن بارے کچھ بات چیت کی اور بہت سی تالیوں میں ملکہ موسیقی کی آمد کا اعلان کیا۔ میرا دل بلیوں اُچھل رہا' لگتا تھا سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آپڑے گا۔ یہ میری اضطراری کیفیت تھی۔ اب جو اگلا نظارہ دیکھا تو دل ڈوبتا رہ گیا۔ ایک کالی کلوٹی ناٹے قد کی فربہی مائل عورت...... معمولی سے دیہاتنوں جیسے لباس میں سٹیج پہ نمودار ہوئی...... تالیوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا' پورا پنڈال اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جوش وخروش کا یہ عالم کہ پورا ماحول روشن آرا کی پذیرائی میں عقیدت کی خوشبوؤں اور رنگوں میں ڈوب گیا۔ شاید میں اکیلا ہی تھا جو منہ پھاڑ کھولے متوحش نگاہوں سے اسٹیج دیکھ رہا تھا۔

یہ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم ہے؟؟ جس کی آن بان' شان وشوکت' حُسن وتمکنت دیکھنے کے لیے میں کئی راتوں سے بے چین رہا...... جس کی تانوں زمزموں سے حظ کشید کرنے کی خاطر میں نے سیالکوٹ سے لاہور تک کا سفر بغیر ٹکٹ' باؤ ٹرین سے طے کیا۔ حقیقت کو جھٹلانا میرے بس سے باہر اور صبر وشکر کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اب جو ملکہ نے اپنا ایجاد کردہ راگ زرتاش چھیڑا تو میرے چھکے چھوٹ گئے۔ کچھ پلے نہ پڑا...... میں راگ زرتاش کو تاش کا کوئی کھیل سمجھ رہا تھا جیسے گھڑوخ' منگ پتہ' رنگ بھابی' ڈھکی' فلاش' برج' بلیک جیک وغیرہ۔''

میں پچھلے تین گھنٹوں سے کلاسیکل موسیقی اور بھانت بھانت کے کلاونتوں کو برداشت کر رہا تھا۔ اب جو اس عظیم کلاکار کی کلا سنی اور دیکھی تو کلاسیکل موسیقی کی رہی سہی "عزت سادات" بھی جاتی رہی۔ روشن آراء بیگم ایسی مہان کلاسیکل گانے والی کہ بڑے بڑے اُستاد اس کی گائیکی انداز اور فن پہ دسترس کا لوہا مانتے تھے۔ اسٹیج پہ بیٹھی ہرگز اس اہل دکھائی نہ دیتی تھی...... لگتا تھا ابھی ابھی کپڑے دھو کر یا تنور پہ سے روٹیاں اُتار کر آئی ہے یا پھر گھر بھر بانجھے پونجھے کے بعد ذرا سستانے کی غرض ادھر آ بیٹھی ہے۔ سو انسان مشاہدے اور تجربے سے ہی سیکھتا ہے۔ مگر میرے لئے یہ سیکھ کچھ اچھا تجربہ اور مشاہدہ نہ تھی......"

میں اِک زمانہ کلاسیکل موسیقی اور اس کے مہان کلاکاروں سے بدکا رہا کہ یہ فن اور فنکار سننے والوں کے کان کند...... آنکھیں اُفسردہ دماغ وَرشت کر دیتے ہیں۔ کن رسیا بے چارہ سُروں تانوں گرہوں پھندوں سُرکیوں اور اَلاپوں کے سیاپوں میں سدھ بدھ ہار جاتا ہے۔ اس میں بھی "مولا خوش رکھے"، "واہ جی واہ"، "سبحان اللہ" جیسی خوبیاں سرایت کر جاتی ہیں...... یہاں تک کہ دھاڑی اور عطائی میں کوئی فرق روا نہیں رہتا۔ مجھے اللہ نے بچالیا اور اب میں "ملکہ" اور "موسیقی" دونوں سے مایوس ہو چکا تھا۔

## ● نغمہ جاوداں، نُور جہاں......!

"موئی ذریا موت تُوں موت اُگے کھڑی" کے مصداق بہت جلد میرا واسطہ ایک اور ملکہ سے پڑ گیا۔ یہ ملکہ ترنم نُور جہاں تھی۔ پہلی ملکہ روشن آرا بیگم محض موسیقی کی دُنیا کی ملکہ تھی۔ اس کا شوہر کوئی بادشاہ یا شاہ نہیں زمیندار تھا۔ کھیتوں باڑیوں والا...... جس نے اس عظیم فنکارہ سے کھیتی باڑی بھی کروائی اُپلے اور تنور بھی لگوائے...... لالہ موسیٰ کی کنک منڈی کے پچھواڑے ایک گلی کے تنگ سے مکان میں اس کی سکونت تھی......

اس دور کے بڑے بڑے موسیقی کے اُستاد گھرانوں والے گائیک اس تنگ سی گلی کے چھوٹے سے مکان میں اس کے ہاں حاضری دیا کرتے تھے...... نُور جہاں، نزاکت علی، سلامت علی، مختار بیگم، فریدہ خانم، فتح علی، امانت علی، مہدی حسن، طفیل نیازی، اقبال بانو، رفیق انور، استاد امراؤ خان صاحب، جھنڈے خان وغیرہ...... ان میں کئی ایک کو میں نے خود وہاں دیکھا۔ روشن آراء کی چوہدری احمد خان سے کوئی اولاد نہ تھی مگر اس نے شوہر کی پہلی بیوی سے اولاد کو اپنی جان کے ٹکڑے جان کر پالا......!

میں اِک زمانہ میں لالہ موسیٰ کے ساتھ کھاریاں میں بطور الیکٹریشن ایک امریکن کمپنی میں ملازم تھا۔ رہائش لالہ موسیٰ میں رکھی کہ اُدھر موسیقی کے تین فنکار رہتے تھے...... روشن آراء، عالم لوہار اور بالی جٹی......

چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا...... موسیقی کسی نہ کسی صورت میں میرے اندر موجود تھی۔ لاہور' ملتان روڈ کے فلم اسٹوڈیوز کے باہر گیٹ کے قریب بہت سے لوگ کھڑے رہتے ہیں۔ ان میں بہت دور دراز سے ایکٹرز دیکھنے کے شوق میں یہاں پہنچتے ہیں۔ جن میں دیہاتیوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ یہ لوگ جن میں اکثر خوبرو صحت مند نوجوان ہوتے ہیں جو ایکٹر' گلوکار بننے کے جنون میں یہاں پہنچتے ہیں۔ یہ لوگ اسٹوڈیو میں آتی جاتی کاروں میں جھانکتے رہتے ہیں کہ کسی ایکٹر پہ نظر پڑ جائے۔ ان میں کئی چوکیدار کی خوشامد کرتے ہیں' رشوت لگاتے ہیں کہ اندر جا کر ایکٹروں کی شوٹنگ ہوتی دیکھ لیں۔ یہ بھی اک جنون یا محرک ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا مگر بڑے لیے دیے میں...... کہ اس میں سفلہ پن نہیں تھا۔

بات روشن آرا بیگم کی ہو رہی تھی کہ وہ خود ایک ایسی ملکہ تھی جس کا شوہر بادشاہ نہ تھا' مولیاں گاجریں کاشت کرنے والا زمیندار تھا۔ اب دوسری ملکہ ترنم تھی جس کا شوہر نہ صرف شاہ تھا بلکہ مردانہ وجاہت کا پیکر...... شاہ نواز شاکر' شوکت تھانوی جیسے اعلیٰ لوگ اس کے دوست تھے۔ لقمان جیسا طباع تجربہ کار اس کا معاون تھا۔ لڈن میاں اس کے ساتھ لڈو کھیلتے تھے۔ امتیاز علی تاج' خالش' سعادت حسن منٹو جیسے ڈراما نویس' اداکار اُدیب اس کے حلقہ احباب میں تھے۔"

شوکت حسین رضوی' محض شاہ ہی نہیں شاہ خرچ' شاہ دماغ' شاہ دل اور شاہ گر بھی رہا۔ نور جہاں کو ملکہ بنانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ نور جہاں کے نیچے اس وقت بھی کیڈلک تھی جب اس کے آبائی شہر قصور میں گنتی کے دس بارہ تانگے تھے وہ اس سے شوفر سمیت گاڑی میں آتی تھی جب دلیپ کمار شوٹنگ کے لیے لوکل ٹرین کے ذریعے پہنچا کرتا تھا۔ غرضیکہ اسی ملکہ ترنم نے مجھے اس مایوسی اور محرومی سے نکال باہر کیا...... جو پہلے والی ملکہ اور اس کی اُوق موسیقی کی بناء پر واقع ہوئی تھی۔ نور جہاں ان دونوں میں یکتا تھی۔ وہ اس حقیقت اور راز سے آشنا تھی کہ عام و خاص میں ہر دلعزیز بننے کے لیے آپ کو عام فہم بھی بننا پڑے گا۔ خاص فہمی اپنے اور خاص حلقہ احباب تک محدود رکھو۔ دیہاتی سے انگریزی بول کر الفاظ' ذات' عزت ضائع نہ کرو...... اسے احساس کمتری میں مبتلا مت کرو۔ ملکہ بننے کے لیے ملکہ جیسے ظرف کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ملکہ اور اُردو بیگمی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے؟

بابا کو بریک دینے کی خاطر میں نے پھر شیرے والی اُنگلی لگاتے ہوئے کہہ دیا۔

"تم جانتے ہی ہو اس بڑے ظرف والی ملکہ ترنم اپنے اخلاق مقام کے باوجود فحش کلامی گالی گلوچ اور بازاری حرکات بھی اس کی ذات کا اک نمایاں حصہ تھیں۔ اِدھر ملکہ موسیقی روشن آراء کی کم از کم ایسی شہرت نہ تھی اس نے اپنی زندگی میں کوئی ایسی مثال نہیں چھوڑی اور نہ اس نے کوئی غیر معیاری چیز گائی۔ جبکہ تمہاری ملکہ نے

نخش گائیکی میں حد کر دی تھی۔"

بابا نے میری جانب ایسی قہر بھری نظروں سے دیکھا جیسے میں نے اسی نور جہان کے مقبول عام گانے "ونج چھس گئی اے کنج پاٹ گئی اے" کی ریکارڈنگ میں ڈھولکی پہ سنگت کی تھی۔ جھنجھلاہٹ سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"بدقسمتی سے تم نبفتہ مخلوق کے اس یبوست زدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہو جو ہمیشہ کسی کی اچھائی کی بجائے بُرائیوں کو ٹٹولتا رہتا ہے۔ بشری کمزوریوں سے کوئی بھی مبرا نہیں۔ وہ آسمان کے کسی برگزیدہ فرشتہ کے ہاں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ قصور کے بازار حسن میں ارباب نشاط کے ہاں اس کا جنم ہوا تھا۔ ایک جان کو سیکڑوں چیچڑ چمٹ جائیں تو کیا حال ہوگا؟...... دو خاوندوں سے اولادیں...... بھائی' بھتیجیاں بھتیجے' دیگر اہل خاندان اکثر نکمے' ذہنی مریض' بدحرام...... منشیات کے عادی رشتہ دار نوکر چاکر' موسیقاروں' سازندوں کے خاندانوں کے اخراجات...... وہ اکیلی جان......!

اس سے تعلق رکھنے والے ہر بندہ ہاتھ میں ٹوکا چھری تھامے ہوئے...... ہر کوئی کاٹنے کے چکر میں...... اس نے مرحوم نصرت فتح علی خان کی طرح خود کو اندر ہی اندر ختم کر لیا مگر کسی لواحق یا ضرورت مند کے خراجات بند نہیں کیے۔ وہ گلوکارہ تھی یہی اک کمائی کا ذریعہ تھا۔ کروڑوں کی جائیداد کا تیاپانچا کر کے اولاد میں تقسیم کر دیا...... گایا کمایا اور دوسروں کو کھلا دیا۔

ملامتی درویشوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماتھوں پہ اپنی اچھائیوں بھلائیوں کے جھنڈے نہیں ٹھوکتے۔ بلکہ کئی ایک شمشیر بُراں اپنے حلقوم میں اُتارے ہوئے ہوتے ہیں۔ مائی جی نے میرے لیے بھی دو گیت گائے تھے۔

"منڈیا سیالکوٹیا تیرے مکھڑے دا کالا کالا تل وے"

اور دوسرا......!

"نی کالا شا کالا...... میرا بابا جی سرکار نور جہاں نوں پرے کرو......!"

اب تم کہو گے کہ...... یہ تو فلمی گانے تھے اور پہلے گانے میں کسی سیالکوٹی خوبصورت منڈے کے چہرے کے کالے تل کی تعریف کی ہے جس پہ میڈم کا دل آ گیا تھا' کسی بڈھے بابے کی بات نہیں کی۔"

"کارزار عقیدت وعشق میں جوان یا بڈھے کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ یہاں جذب وجنون کا معرکہ رہتا ہے۔ ابلاغیات کی بات ہوتی ہے' غرائیات کی نہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں تمہارے سامنے ہیں۔ صوفیہ لورین اپنے شوہر سے قریب قریب اٹھائیس تیس برس چھوٹی تھی...... نور جہان اور اعجاز دُرانی سے اتنی

ہی بڑی...... عارفہ صدیقی اور اُستاد نذر حسین کے مابین' باپ بیٹی جیسا فرق...... یہاں طرفین کے سِن و سال نہیں گنے جاتے۔ قلب و نظر کے تقاضے اور حاصل حسب و حال دیکھے جاتے ہیں۔''

سُنی آپ نے اس پیرِ فرتوت کی باتیں' اس دَور کا سب سے بڑا دو نمبر داستان طراز' جھوٹا اور فتنہ انگیز...... لیکن جس پہ پیار بھی آئے' اعتماد کرنے کو جی چاہے اور اپنا سا بھی لگے......؟

لوگ جو اسے اندر سے نہیں جانتے اس کے کردار اور کرتوتوں' کریہہ ماضی سے واقف نہیں۔ محض اس کی جھوٹی سچی تحریروں' ٹی وی پہ تصویروں اور لچھے دار تقریروں سے متاثر ہیں۔ مجھے اُن پہ بہت ترس آتا ہے۔ فریب خوردہ اندھے عقیدت مند' اسے مستجاب الدعوات بھی سمجھتے ہیں جبکہ اکثر شاہ جی کہہ کر بھی مخاطب ہوتے ہیں۔ اس کا ردِعمل معترضانہ نہیں ہوتا بلکہ مشفقانہ ہوتا ہے۔ توجیہہ یہ پیش کرتا ہے کہ جانتے بُوجھتے ہوئے بھی اگر کوئی کاہلی خچر کو عربی گھوڑا کہنے پر مُصر ہو تو خچر کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ زہر ہلاہل کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی جو قند کہتا ہے' اُسے زبردستی اُسی کی کُند فروشی سے قتل نہ کرو کہ مکھی مکھن کی بجائے گند پہ بیٹھ کے زیادہ آسودہ رہتی ہے۔ ہمیشہ جی کہو کہ اسی میں مجھ ایسے فراڈیے کی خیریت ہوتی ہے۔ مجھ ایسے ہی کسی شاعر نے کہا......

جی کہنے میں بڑی کرامت ہے اس سے دُنیا مُرید ہوتی ہے

کسی ہوشیار وکیل' ڈاکٹر' عامل اور پولیس والے کی طرح یہ بھی کوئی انجام اپنے سر نہیں لیتا۔ دُعا دیتا ہے تو کہتا ہے' "اللہ آپ کے لیے بہتر کرتا ہے' جو ہوگا وہی آپ کے لیے بہتر ہوگا" عیاری ملاحظہ فرمائی...... سب کچھ اللہ پر ڈال کر خود نچنت ہو کے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ کوئی مرے یا جیے یہ گھول بتاشے پیے۔

سلطانی بھی عیاری ہے' دَرویشی بھی عیاری......

ہر اس موقع پرست کی مانند جو دُنیاوی طور پہ اپنے مقاصد کو حاصل کر لیتا ہے۔ اپنے کڑے وقتوں کے ساتھیوں کو غیر ضروری بڑھتے ہوئے بالوں کی طرح مُونڈھ کر رکھ دیتا ہے یا پرانے گندے کپڑوں کو اُتار پھینکتا ہے۔ یہ بھی اپنے سگے رشتہ داروں بچے کھچے بچپن کے ساتھیوں اور خاص طور پر اپنی بوڑھی بیوی کی بھابیوں' بھانجیوں' بھتیجیوں اور دیگر باقیات سے ملاقات والتفات نہیں کرتا۔ کہتا ہے' باپ اور بیوی دونوں اطراف کی رشتہ داری' قورمے کی طرح ہے پہلی دو چار بلٹیاں کھانے کے قابل ہوتی ہیں بعد اَزاں تلچھٹ میں مسالے کا ملغوبہ' ہڈیوں کی کرچیاں' دو چار چھچھڑے بے نس ورس بوٹیاں ہی بچتی ہیں۔ ان کا نفع نقصان سب برابر...... اُبلے دودھ کے پہلے ایک جوش ہی سے بالائی بنتی ہے۔ باقی دودھ کم سود...... جو کھرچن جوگا ہوتا ہے...... اس کی طوطا چشمی' خود غرضی کی انتہا ملاحظہ میں آئی؟

نماؤں' مولویوں' مداریوں' نامدریوں' مسخروں' مجنوں' ماشیوں' مخشیات فروشوں' ملاحوں' مردے غسلانے' کفنانے اور دبانے والوں اور مجبوروں' معشوقوں کو بہت پسند کرتا ہے کہ ان کے دم قدم سے جہان رنگ و بو میں رونقیں قائم ہیں...... ادھر مونگ' مسور ماش' منڑ مولیاں' مونگرے' مونگ پھلی وغیرہ کے ذکر سے ہی اس کا جی مالش کرنے لگتا ہے۔ پیٹ میں مروڑ اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مرغ ارضی' مرغ آبی' مرغ بادی' مرغ آتشی' مرغ بادنما' مرغ ملا' مچھلی' مرغن غذائیں وغیرہ خوب مرغوب ہیں...... خراب تب! جب یہ ہاتھ نہ لگیں۔''

ہر روز غسل لینے والوں کو بیمار سمجھتا ہے...... کہتا ہے ایسے لوگ نفسیاتی اور جنسیاتی مریض ہوتے ہیں...... پانچ وقت طہارت وضو کرنے والے کے لیے ہر روز نہانا کچھ ضروری نہیں ہوتا۔ البتہ نئے نئے چھینٹے والے اکثر اور پرانے ڈھول پیٹنے والے کچھ کچھ اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ بتاتا ہے کہ انسانی جسم بھی سنگترے مالٹے کے چھلکے کی مانند ہوتا ہے۔ ان پھلوں کی پھانکیں اس لیے رس بھری تروتازہ ہوتی ہیں کہ چھلکوں میں روغن موجود ہوتا ہے جو بیرونی موسمی فضائی اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہم نہاتے ہوئے خوب صابنوں لوشنوں سے جسم کا ستیاناس کرتے ہیں۔ پھر کھردرے تولیے سے اچھی طرح رگڑائی کر کے مساموں کو کھول دیتے ہیں...... اس عمل سے بال بھی جڑیں چھوڑ دیتے ہیں اور جسم...... بیرونی مضر اثرات سے محفوظ رکھنے والے قدرتی روغن' پالش سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہم تو اتنی سمجھ بوجھ بھی نہیں رکھتے جتنی پرندے' درندے اور دیگر جانور رکھتے ہیں۔ مچھلیاں' مرغابیاں اور دیگر آبی جانور ہوتے ہی سدا کے نالائق بیوقوف ہیں...... ان کے علاوہ اور جانور کو بھی بار غبت نہاتے دیکھا؟

یہ جانور' نام نہاد مہذب انسانوں کی طرح روزانہ نہا نہا کر اپنی جسمانی روغنیاتی قوتوں کا ناس نہیں مارتے۔ دلیل یہ ہے کہ جنگلی لوگ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے بلکہ ان پہ جوانی ہی بڑھاپے میں اترتی ہے۔ ڈاڑھی' لمبے بال' موٹا مختصر نیم لباس' ننگے پاؤں' ننگا سر' سفر' دال دلیا' درگزر کرنا' صبر و شکر والے لوگ ہی زندگی کا صحیح مقصد اور لطف حاصل کرتے ہیں۔''

اچھا فنکار اور اچھا انسان' اچھی ازدواجی زندگی کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ اچھے اور سچے فنکار اور انسان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اچھا فنکار' کبھی کسی کا اچھا ساتھی نہیں بن سکتا۔ وہ ایک ایسے مسافر کی مانند جو اپنی راہ کے علاوہ سب کچھ بھول چکا ہوتا ہے حتیٰ کہ منزل بھی منزل دکھائی نہیں دیتی۔ تن تنہا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی کہ وہ کہیں راستے میں ہی راست ہو جاتا ہے۔ یہیں اوپر کوئی قطبی تارا جگمگا اٹھتا ہے۔ جس سے پھر کئی بھٹکے ہوئے راستہ پکڑتے ہیں......!

کہتا ہے' روشنی ہو نہ ہو' ہوا ہر جگہ کسی نہ کسی طور موجود ہوتی ہے...... اسی طرح خدا کا تصور بھی ہر موجود میں موجود ہے۔ بادی النظر میں چاہے اُسی کا تصور کیسا بھی ہو؟ خدا کی اکائی اپنی ہے اور بندے کی دہائی اپنی' بندے کا اچھا ہونا اِس کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔ اچھے کے پاس اَنگنت خدشات و خوف ہوتے ہیں۔ بُرے گنہگار کے ہاں مالک کی رحمت اور بخشش کا تصور! جو اسے ایک لافانی استغناء سے ہمکنار کیے رہتا ہے۔ نیک پارسا لوگ' اپنی عبادتوں نیکیوں کا حساب رکھتے ہیں۔ بد گنہگار تو اپنے گناہوں کو ہی یاد نہیں رکھتے۔ صرف اُس کے فضل و کرم کی طرف دھیان دیتے ہیں...... مثال دیتا ہے۔ نور جہان سے کسی صحافی نے پوچھا...... میڈم! آپ نے آج تک کتنے گانے گائے ہیں...... میڈم نے حسبِ عادت تُرت جواب دیا۔ ''میں نے آج تک اپنے گانوں اور گناہوں کا حساب نہیں رکھا۔'' ایسا جواب' صرف اور صرف نور جہان ہی دے سکتی تھی۔ روشن آرا نہیں کہ وہ تو بیرے پہ کسی کوّے کو دیکھ کر سر کا دوپٹہ دُرست کر لیا کرتی تھی۔

کہتا ہے' بشر کے بشری تقاضے' اُس کی گِل میں گُندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی بشر اپنی اوقات سے بڑھ کر نہ تو کوئی بُرائی کر سکتا ہے اور نہ کوئی بھلائی...... اور جو کچھ اچھائی بُرائی اِس سے سرزد ہو جاتی ہے اِس کے لیے وہ مجبورِ محض ہوتا ہے۔ زمین کبھی آسمان نہیں بن سکتی مگر خاک تو اُڑا سکتی ہے۔ خاک اُڑے گی تو کہاں تک؟ آخر واپس زمین پر آ پڑتی ہے۔ ہاں خاک اکسیر ہو جائے تو سدرۃ المنتہا تک رسائی لے لیتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ بشر' بشر ہی رہے تو اِس کے حق میں بہتر رہتا ہے...... اِس کی بشری کمزوریاں کجیاں ہی اِس کا اصل اثاثہ ہیں...... اِس کا تفاخر ہیں۔ خدا اور بندے کے درمیان جو تفاوتی حد ہے' وہ بشر کی بشریت ہے جس کا خمیر خمیر' مٹی' پانی' آگ اور ہوا سے اُٹھایا گیا ہے۔ چاروں متضاد عناصر اِس کے کلبوت میں کبھی ایک ہی مقدار میں باہم یک جا نہیں ہوتے...... آپس میں کم و بیش رہتی ہے...... اگر اِس کی بیشی میں ایک حد سے زائد فاصلے بڑھ جائیں تو پھر بڑے خطرناک نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ نمرود' فرعون' شداد' دیگر خدائی نبوت وغیرہ کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے فاسق کذاب پیدا ہوتے ہیں۔ ''اَنا الحق'' کا آوازہ بھی اُبھرتا ہے۔ بشر' بشریت کے زیرو پوائنٹ کی جانب رہے تو قدرے بچت رہتی ہے۔''

اِس کا کہنا ہے' کاروان یا قافلہ' ضرورت مند' خوف زدہ' کمزور لوگوں کا گروہ ہوتا ہے۔ جو اپنے اپنے مقصد کے پورا ہونے پہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ آپس میں دوست نہیں ہوتے ہمسفر ہوتے ہیں۔ سفر میں اگر کوئی ساتھی ہے تو سفر کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ سفر محض راستہ طے کرنے اور منزل پہ خیریت سے پہنچ لینے کا نام ہی نہیں' سفر تو اِس راہ' راستے کا نام ہے جو کبھی طے نہ ہو' انجام پہ کوئی منزل بلند پہاڑ یا بند گلی نہ ہو۔ مسافر تو وہ ہوتا ہے جو راہ بن جائے یا پھر سنگِ میل......!

ایک سوال کا جواب ملتا ہے۔ سوکھی اور سستی کتابوں سے دکانیں' لائبریریاں بھری پڑی ہیں۔ اِدھر جگہ کم پڑ جائے تو کتب میلوں اور کتابوں کے کباڑیوں کے پاس فٹ پاتھوں پر پہنچ جاتی ہیں۔ لاہور پہنچنے والے داتا سرکارؒ، اقبالؒ اور دہلی میں نظام الدین اولیاؒ، بختیار کاکیؒ اور خسروؒ، غالب کے مزارات پہ حاضری سعادت سمجھتے ہیں۔ بڑے غلام علی خان' روشن آرا بیگم' شدھ اوکھا گاتے تھے۔ اِس میں ان کی زندگیاں کام آ گئیں...... لالہ عطاء اللہ نیازی اور نصیبو لعل' جواد احمد' ابرار الحق وغیرہ سوکھا گا کر زندگی کے کام آ گئے......!

کالی داس' بھگت کبیر' رابندر ناتھ' ٹیگور' میرا' خسروؒ، سعدیؒ رومیؒ، جامی، میاں محمد بخشؒ، بلھے شاہؒ، سلطان باہوؒ، شاہ حسینؒ، وارث شاہ ایسے سوکھے نہیں تھے۔ پر علم و اَدب کا بھرم یہی لوگ تھے۔

مزید بتانے لگا۔ کیا بچہ سوکھا جنم لیتا ہے؟...... امریکہ' انگلینڈ' آسٹریلیا کا ویزہ سوکھا لگتا ہے...... کیسے امیگریشن اوارے' سفارتخانے' روپے پیسے' جھوٹ سچ اور پیر فقیر' دعائیں' تعویذ گنڈے' منتیں درمیان میں لائی جاتی ہیں۔ کام کی کتاب' پکا ویزہ' سعادتمند بچہ کوئی سوکھے کام نہیں......!

قدرت اللہ شہاب کو اپنا نظریاتی و فکریاتی...... ممتاز مفتی کو اَدبی و بے اَدبی...... اشفاق احمد کو رُوحانی و وجدانی اُستاد مانتا ہے۔ بانو قدسیہ کے بارے میں اِس کا بیان نہ سمجھ میں آنے والا ہے۔ کہتا ہے' انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ جنم جنم سے اینٹیں بنا بنا بننے میں پکا رہی ہیں۔ کیسے کیسے پرشکوہ محلات' قلعے' مینارے' چوبارے' گنبد ڈیوڑھیاں اِن اینٹوں سے تعمیر ہوئیں...... کتنی نسلوں اور اصلوں نے اِن سے فیض اُٹھایا۔ چھپر چھاؤں میں آسودگی اور بالیدگی حاصل کی۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہر بڑے آدمی کی پُشت پہ کسی عقلمند طالع مند عورت کا ہاتھ ہوتا ہے...... اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی مثالی ازدواجی' اَدبی' مجلسی اور محبت و اطاعت بھری زندگی دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ہر کامیاب اور بڑی عورت کے پیچھے کسی بلند مرتبت' اعلیٰ ظرف و ذوق' مضبوط مرد کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔"

کہتا ہے' اشفاق احمد نے ضرورت اور فرصت میں لکھا...... بانو قدسیہ نے محبت اور محنت سے لکھا۔ ایک وقت آیا کہ ایک دوسرے نے مقابلے اور مبادلے میں لکھا...... ممتاز مفتی لکھتے لکھتے الکھ نگری اور یہ دونوں الکھ نرائن ہو گئے۔

مرد ہو کر ایک عورت کے پاؤں کے بوسے لیتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اِسے ایسا کرتے ہوئے ایک دیکھ رہا ہے یا ایک سو ایک؟...... بس وہ جھک کر اپنی آئیڈیل ماں کے بوڑھے پولے پاؤں کو چُوم لیتا ہے۔ کہتا ہے' صرف جنم دینے والی عورت کے پیروں میں ہی جنت نہیں ہوتی' ہر اِس عورت کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے جو ماں جیسی لگے۔

کہتا ہے ماں جی کے ہاں بلا بل کو قند اور مس خام کو کندن خاص میں کروٹ دینے کا قرینہ ملتا ہے......
ان کے پاؤں میرے لیے پارس ہیں۔ ضروری نہیں کہ جنم دینے والا تربیت بھی دے......!

عورتوں کے ذکر پہ بتاتا ہے جدن بائی جیسی مجلسی اور نرگسی عورت کہیں نہیں دیکھی...... مختار بیگم فریدہ خانم، عشرت جہاں بجو اور نور جہان سی شاہانہ عاشقانہ اور شوہرانہ مزاج خواتین کم ہی کہیں پیدا ہوئی ہوں گی...... نگار سلطانہ مینا شوری بیگم پارہ گھرانے کی باقیات میں سے سلمیٰ آغا ہیں۔ مدحو بالا مینا کماری پیاز پیاس اور پندار ذات کے معاملے میں ازلی بانجھ عورتیں تھیں۔ قسمت ان سے شاکی اور یہ اس سے شاکی رہیں۔''

دھنک جیسا ''شہزادہ'' مجلہ پھر کہیں پیدا نہ ہو سکا۔ سرور سکھیرا حسن نثار جیسے ''قلمروؤں'' سے میں نے بہت کچھ سیکھا...... تجمل حسین طفیل اختر نے قلم کمائی تو بہت کی لیکن کھا دوسرے گئے۔ منشی عرش لکھنوی کمال امروہوی عزیز میرٹھی ضیا سرحدی شوکت ہاشمی شاہد ریاض طفیل قیصر اب کہاں سے لائیں؟ سوچتا ہوں مشتاق احمد یوسفی بانو قدسیہ انتظار حسین ضیا محی الدین گلزار محمد پرویز کلیم جیسے مہ و انجم ڈوب گئے تو پھر کیا ہوگا؟

ایک دن حاضر ہوا تو بڑی افسردگی سے...... ''ہم جی کر کیا کریں گے جب دل ہی ٹوٹ گیا'' گنگنا رہے تھے۔ ایسی بیکلی افسردگی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

وجہ دریافت کی! کسی کنوئیں کے اندر سے بولے۔

''حضرت! ایمانداری سے بتائیں! جس اقلیم بے مہر و وفا میں کہیں بھی اماں نہ ملے قحط الرجال کا دور دورہ ہو زندہ رہنے کے بنیادی سہارے بھی الگ کئے جا رہے ہوں۔ تو مجھ ایسا درویش باکلیم کس بندے کو بھتیا اور کس ماسی کو منیا کہے؟...... نور جہان کی نمروں کی سہارے کرنا آسودہ سے کسی طور سمجھوتا کر لیا کرتے تھے۔ اقبال بانو کے توسط سے فیض سے فیضیاب ہو جایا کرتے تھے۔ اب مہر علی شیر علی کو سن کر گزارہ کرتے ہیں۔ گھرانوں کے بچے انڈیا پہنچ کر خوش رہتے ہیں۔ مہدی حسن لد گئے غلام علی پیسے کی جنجال میں اور فتح علی استاد نذر بڑھاپے کے حال میں باقی بچے دو چار بچے...... تو وہ پاپ میں پھنس گئے...... سرگم بھی انگریزی میں الاپتے ہیں۔ واہ رے نصیب! نصیبو لعل کے اور ہمارے...... فریدہ خانم کو مختار بیگم نسیم بیگم رانی بیگم اور نور جہاں آواز دے رہی ہیں۔ موٹاپے اور بڑھاپے نے راہ ماری ہوئی ہے...... بتاؤ اس حال و قال میں ہچکی یاد آئے تو کیا فاروق مینگل یاد آئے گا......؟

ایک اور انکشاف کیا۔ استاد نصرت فتح علی اور عابدہ پروین ایک ہی خمیر و ضمیر سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی باڈی ڈیزائننگ گرومنگ راگا کرافٹ کوالٹی سٹینڈرڈ سپر یچوئل انڈر سٹینڈنگ بھی یکساں تھی۔ ایک کو سندھ سدھایا گیا...... دوسرے کو پنجاب پہنچایا گیا۔ میری بڑی خواہش رہی کہ دونوں کو اکٹھا بیٹھے سنوں۔ ذرا

تصور میں لائیں کہ دونوں اکٹھے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں...... ایک دوسرے کو تھپیاں دے دے تانیں بھی لگا رہے ہیں پھر کیا نظارہ ہو اگر بعد از گائیکی ان کی سوموسٹائل کشتی کا مقابلہ بھی پروگرام میں شامل ہو...... جیسے میوزک کنسرٹ وو ڈنر ہوتا ہے۔ یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے......!

ایک بار کہا کہ مجھے جس گلوکار کی گائیکی پسند ہوتی ہے وہ دیر بدیر اللہ کو بھی پسند آ جاتا ہے۔ یعنی موسیقی کے معاملے میں مولا کریم اور مجھ مولوکین کا ٹیسٹ قریب قریب ایک سا ہے۔ دلیل یہ دیتا ہے کہ کالو قوال مدن لعل سہگل سے غلام فرید صابری پٹھانے خان تک سب ہی اللہ نے بلا لیے...... بالی جٹی اور عالم لوہار کی جوڑی بھلی لگی تو ان کو بھی بلاوا بھیج دیا۔ پھر ایک مولوی قوال اچھا لگا کہ قوالی کے شروع میں باقاعدہ تلاوت کرتا اور اُردو انگریزی فارسی عربی ہندی میں دھمال کر پیش کرتا ہے' اسے بھی فائرنگ کے ذریعے واپس بلا لیا...... بدرمیاں داد سے جی لگا اس کی بھی چھٹی کر دی۔ اب عابدہ پروین کو پسندیدگی اور چوری چوری سنتا ہوں کہ کہیں اللہ کو پتا نہ چل جائے...... اللہ ان کو میری پسندیدہ گلوکار ہونے سے محفوظ رکھے۔ نسیم بیگم زاہدہ پروین نور جہاں اقبال بانو غریبیاں بھی میری پسندیدہ ہونے کی سزا سے نہ بچ سکیں...... اس لیے مَیں اُستاد فتح علی خان اُستاد رئیس احمد خان اُستاد نذر خاں صاحب اُستاد حامد علی خان فریدہ خانم سے بدکا رہتا ہوں۔ مالک ان کا سایہ موسیقی کے سر پہ سلامت رکھے۔ لتا جی کے بارے میں کہتا ہے وہ مائی راگ ودیا کے گلے میں پڑا ہوا منگل سوتر ہے۔

مَیں نے جی کڑا کر کے ایک بار پوچھ لیا۔

''یا شیخ! کعبہ ترے آگے کلیسا تیرے پیچھے...... یورپ تیرے اُوپر افریقہ تیرے نیچے...... یہ کیمیا گری مجھے بھی سکھا دو...... یہ کرارے کرارے نوٹ کہاں سے آتے ہیں؟ چٹا سفید بٹ ہونے کے باوجود مجھے کوئی گوجرانوالہ گھسنے نہیں دیتا اور تم کالے کرتوتے جہاں بھر میں دندناتے پھرتے ہو' کوئی یہ تک پوچھنے والا نہیں' بابا خانہ خراب! منہ کتنے دانت ہیں......؟''

ظالم اک گھمبیری سنجیدگی سے بولا۔

''جب تم منبع نور و ثبات کے رُوبرو اپنی نفی کی سیاہ چادر اوڑھ لو گے تو یہ دُنیا اک کُتے کی مانند ترے پیروں میں لوٹے گی۔ ازل یا ابد فرش تا عرش ساری مسافتیں اڑھائی قدم پہ ہوں گی۔ جہاں بھر کی راحتیں سہولتیں دولتیں تمہارے دَر کی لونڈیاں بن جائیں گی۔''

ہمیشہ کی طرح کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ لیا۔

''یہ اپنی نفی کی چادر کیسے اوڑھی جاتی ہے......؟''

"یہ جاننے سمجھنے کے لیے تمہیں کسی مُنی مُنیچہ کو ماننا ہوگا....... کیونکہ مانے بن موہن نہیں مانتا......!"

"اس دور میں مُنی مُنیچہ کہاں.......؟"

اُس نے میرے دل کی جگہ سینے پہ اُنگلی چبھوتے ہوئے کہا۔

"یہاں.......!"

بیان کر چکا ہوں کہ وہ سرتاپا سفر ہی سفر ہے۔ سفر شرط ہے" مسافر نواز بجیرے" کے مقولے پہ سو فیصد ایمان رکھتا ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں کہا۔

"کم علم اور بے عقل لوگ سمجھتے ہیں کہ سفر بلا مقصد پیدل چلنے' سڑکیں ناپنے کا نام ہے جہاز' گاڑی' بس' ویگن' رکشہ پہ دھرنا دینے کا کام ہے۔ یہ تو محض کسی مقصد کی خاطر یا پاؤں پیر کھولنے کی ورزش ہوتی ہے۔ غرض مجبوری کا سفر حاجت ہے' عبادت نہیں۔ نہ ہی روشنی' ہوا' خوشبو اور بارشوں' بادلوں کی مانند کسی فطری' روحانی مقصد سے عبارت ہے۔ جھومتے بادلوں' مہار' گنگناتی بارشوں' پاگل خوشبوؤں' مست ہواؤں اور تیز کرنوں کی کوئی راہ یا منزل نہیں ہوتی۔ اسی طرح خیالوں' سوچوں' یادوں' جذبوں' نغموں کی بھی کوئی حدیں سرحدیں نہیں ہوتیں۔"

خلاؤں میں گھورتے ہوئے مزید گویا ہوا۔

"میں محض ارض کی مسافتوں کا ہی نہیں آفاق وافلاک کی رفعتوں کا بھی راہی ہوں۔ اگر نہیں جانتے ہو تو یہ دُنیا کائنات کون و مکاں' زمن و زماں سب مسافتیں ہی تو ہیں۔ کائنات کی ہر موجودات متزلزل و تغیر پذیر ہے' اسی طرح انسان کے ظاہر و باطن کا پورا انتظام بھی حرکت کی برکت سے بحال ہے' معمولی تعطل کا نام عارضہ اور مکمل معذوری کا مطلب' موت! جو بذاتِ خود ایک تعینی تعطل ہے۔"

میں نے اس کی فلسفیانہ گفتگو کے آگے سپر ڈالتے ہوئے کہہ دیا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا.......؟"

ڈانٹ پڑی ..... "تمہارے کچھ سمجھنے یا نا سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم بدقسمتی سے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہو جو سرِ راہ گڑے ہوئے پتھروں کی طرح ہوتے ہیں کہ آنے جانے والوں کی ٹھوکریں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں اور جو ٹھوکریں کھا کر بھی ٹھا کر نہ ہوا وہ ٹھوکر نیاز بیگ تک کیونکر پہنچے گا! سنگِ خارا' سنگِ خرطاسِ خام ہے؟

پتھروں کے ذکر سے یاد آیا...... اسے قیمتی حجرات سے لدا پھندا دیکھ کر لگتا ہے کہ حجرات سے اسے کوئی خاص روحانی لگاؤ رغبت ہے۔ اکثر یوں ہوا میں اس کی مالاؤں اور انگوٹھیوں کے مشاہدے میں مگن ہوں۔

معاً یوں لگا وہ نگینے دانے منکے مجھے گھور رہے ہیں۔ کچھ بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کے باطن سے کچھ گنگ نہ سے نقوش اُبھر کر سامنے آ جاتے ہیں' اپنی کسی جناتی زبان میں کچھ کہنے کی جستجو میں ہیں۔ وہ مجھے اس طرف متوجہ پا کر' انہیں ڈھانپتے ہوئے کہتا ہے۔

''جلوہ دیکھنے' نظارہ کرنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں ...... یہ باریک بات موسیٰ کی سمجھ میں بہت بعد آئی۔''

ایک فہم پرور شعر سنایا۔

اے دیکھنے والے اس درجہ گستاخ نہ بن بے باک نہ ہو
اس طرح لطافت جلوؤں کی مجروح نظر ہو جاتی ہے

حجرات کی جانب میری اس طرح بے باکی سے گھورنا اسے ناگوار گزرا تھا۔

دل گرفتگی کی کیفیت میں کہنے لگا۔

''میرے ان زیورات میں کیسے کیسے شرمیلے' حیادار معصوم اور کس بزرگی' مقام و اکرام کے جواہرات شامل ہیں۔ ان کے تشرفات' تصرفات اور منفرات تم پہ منکشف ہو جائیں تو اک بہت عرصہ عالم ششدری سے باہر نہ نکلو ...... جمال و جلال کی کمال کیفیات کے حامل یہ جواہر پارے بُنیادی طور پہ حجرات' بحر و بر کو وہ دو من ہی ہیں لیکن انہیں جواہریت کا شرف صبر' سختی اور کڑی آزمائشوں' لمبے زمانے بسر کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

قدرت نے مچھلیوں کی طرح انہیں بھی ہمہ اقسام و اشکال' خوبیاں' خوبصورتیاں اور رنگ و رُوپ دیئے۔ اعلیٰ ترین کیمیائی شفائی اور سعد اثرات کا حامل بنایا ...... جس طرح مچھلیوں میں چند اقسام منفی اثرات لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ اسی طرح حجرات میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا اگر اُتار نہ کیا جائے تو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں' سو ان کا راس آنا ضروری ہوتا ہے۔''

مختلف مواقع پہ ان قیمتی پتھروں کے بارے میں عجیب و غریب انکشاف کئے جو کبھی سُنے نہ پڑھے ......

کہتا ہے' ان میں نر اور مادہ بھی ہوتے ہیں' صحت مند اور بیمار و آزُردہ' خوش فکر ے اور متین و سنجیدہ بھی ...... یہ مر بھی جاتے ہیں اور اک لمبی زندگی بھی لیتے ہیں۔ مرنے سے مراد وہ اپنے خواص و خصائل سے تہی ہو جاتے ہیں۔ جیسے چندن کا ٹکڑا پڑے پڑے اک مدت کے بعد اپنی خوشبو سے اُتر کر محض چیز چوب بن کر رہ جاتا ہے۔

کچھ حجرات اپنے اگلے نئے جنم میں بھی پہنچ جاتے ہیں۔

کہتا ہے' جنات' بادشاہ' فقیر فقیہہ وقت اور کوتوال شہر کی طرح ان جواہرات کی دوستی اچھی نہ دشمنی! دونوں حالتوں میں جان و آبرو کا ڈھڑکا لگا رہتا ہے۔ پالتو اُونٹ' مُختے' طوطے' شیر' شیں سانپ کی طرح

ان کی فطرت و جبلت کے منفی پہلوؤں پہ نظر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ آنکھوں دیکھا ایک واقعہ سنایا۔

میں ایک گھنے جنگل سے گزر رہا تھا۔ اچانک بدبُو نے میرے قدم روک دیئے۔ دیکھا! بائیں جانب جھاڑیوں میں کسی متعفن مُردے کی باقیات پڑی ہیں۔ کیڑے مکوڑے مکھیوں نے اس پہ یلغار کی ہوئی ہے۔ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس کے قریب پہنچا۔ غور سے دیکھنے پہ معلوم ہوا کہ اس کے سر کے بہت سے حصے جنگلی جانوروں کی غذا بن چکے ہیں۔ ٹانگیں' بازو پیٹ کا صفایا ہو چکا تھا۔ باقی ماندہ میں سر گردن' سینے کا پنجر' ہڈیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ قیاس تھا کہ یہ واقعہ پچھلی رات' کسی پہر ہوا...... ورنہ اب تک اس کی نعش کا نشان بھی نہ ملتا۔ بدبو مکھیوں کیڑوں کے اس انبوہ اور کریہہ المنظر نعش کے قریب ٹھہرنا کچھ ایسا بھی آسان نہ تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی میری متجسسانہ طبع نے مجھے یہاں مزید رُکنے پہ مجبور کر دیا۔ خود رَو گھنی جھاڑیاں' مزید آگے بڑھنے میں مزاحم تھیں تاہم میں اپنے عصاء سے کچھ راہ بناتا ہوا چند قدم آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ لمبی لمبی جٹاؤں والا سر میری نظروں کے سامنے تھا..... گردن سینے کے پنجر کے ساتھ ہنوز جڑی ہوئی تھی۔ یہیں مجھے موٹے موٹے منکوں والی دو مالائیں بھی دکھائی دیں۔ جن میں بڑے بڑے کہربا' ابری اور زبرجد کے منکے صاف نظر آ رہے تھے۔ میرا تجسس مجھے اک دو قدم مزید آگے لے گیا۔ عصاء کی نوک سے جھاڑیوں کو مزید ہٹایا تو مکھیوں مچھروں نے مجھ پہ ہلّا بول دیا۔ درویش فقیر کے ہاں' آڑ' اوٹ کی کیا کمی؟ جھٹ دلق سے ہاتھ منہ ڈھک لیے۔"

کالا اشیاء رنگ بھی خوب ہوتا ہے' شر شیاطین' بلیات' بھوت پریت قریب تک نہیں پھٹکتے...... انسان کو ضرر پہنچانے والی ہر شئے' پناہ مانگتے ہوئے کہیں نا بُود ہو جاتی ہے۔ حسد رشک بدنظری کا حتمی توڑ...... کالا رنگ پہننے والے کے تو دشمنوں کا بھی منہ کالا ہوتا ہے...... ہر محکمہ میں کالی بھیڑوں کا وجود بھی شاید اسی لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ محکمہ بدخواہوں کی بدنظری سے بچا رہے۔ معصوم خوبصورت اکلوتوں کی مائیں بھی ان کے چہرے پہ توے کی کالک کا ٹیکا لگا کر انہیں اپنی جانب بدنظری سے تحفظ دے دیتی ہیں۔ نئی گاڑی بس کار کے پیچھے کالے کپڑے کا ٹکڑا باندھنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ تو تم پر حق نہیں اس رنگ کا چمتکار ہے۔

اس بوڑھے کی عادت ہے اچھا بھلا پٹڑی پہ پڑا ہوا اچانک اُتر جاتا ہے۔ پھر خبر ہی نہیں رہتی کہ رواں بات اب کس نئی سمت کی طرف مڑ گئی ہے؟ میں نے جرأت کر کے ٹوک دیا۔

''تم جنگل میں پڑے کسی بدنصیب کے ادھ کھائے مُردے کی بات کر رہے تھے یہ کالے رنگ کا منگل سُوتر بیچ میں کہاں سے آ ٹپکا......؟''

چونکہ میری بات درست تھی اس لیے محض قہر نگاہی سے کام لیتے ہوئے واپس تھڑے پہ آ گیا۔

''ہاں' بتا رہا تھا چادر سے منہ ماتھا ڈھانپ کر ایک جھری سے نعش کی باقیات دیکھنے لگا۔ گلے کی مالائیں تو پہلے ہی نظر آ چکی تھیں۔ اب میں عصا کی مدد سے جھاڑیوں کو کریدنے لگا۔ اسی دوران ایک کاسۂ جھولا' پاؤں کی کھڑاویں اور سادھی جمانے کا ترشول' جس پہ سادھو سنت' بازو نکالے مالا کی سمرن کرتے ہیں' بھی مل گئے۔ ظاہر یہ کوئی بدنصیب سادھو سنیاسی تھا جو سنیاس لے کر جنگلوں پہاڑوں میں جیون اَنت کر دیتے ہیں۔ یہ عقدہ ابھی حل طلب تھا کہ اس کے دیہانت کا کارن کیا ہے۔ میں پاگل بیوقوف' اپنا چینڈا اکھوتا کر کے اس تفتیش میں لگ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے کھوجتے مجھے ہاتھوں کی ہڈیوں میں تین چار انگوٹھیوں اور کلائی کا آہنی کڑا بھی مل گیا۔ کڑا انگوٹھیوں اور مالائیں وہاں سے اُٹھائیں' قریب ہی پانی کی ایک ڈاب تھی۔ دھو صاف کر کے اپنے جھولے میں رکھ لیں۔

رات گئے اپنے ڈیرے پہ پہنچا۔ وہی تینوں پتھروں والا پوٹلا جھنجھ کی کھپریل میں اڑوسا اور کچھ آرام کی غرض سے چٹائی پہ لیٹ گیا۔

تین پہر رات بیت چکی فضا میں اُمس گھٹن اور پیلا چاند گھیرے بادلوں کی اوٹ میں کہیں ڈبکا ہوا......

اچانک کسی نہ سمجھ میں آنے والی وجہ سے میری آنکھ اُچٹ گئی۔ ناگواری بو نتھنوں میں گھسی پڑی تھی۔ فوراً وہی جنگل میں مُردے والی بدبو یاد آ گئی۔ اُٹھ بیٹھا' اردگرد اک مہیب تاریکی اور نحوست سی چھائی ہوئی...... وہ ایک استغنائی سی بے نیازی اور یک گونہ طمانیت جو میری بے مایہ ذات کا حصہ ٹھہری...... اُکھڑی ہوئی تھی۔ من بے کل' موج اُچٹ...... میں توجہ سے اس کا کارن سمجھنے کی کوشش میں اپنے پاؤں کھڑا ہو گیا...... دیا روشن کیا' آلے دوالے نظر دوڑائی' فقیر کی کُٹیا میں تھا ہی کیا جس میں دھیان اُلجھتا؟...... مٹی کی مٹکی' دیا اور دھواں کھپریل کا بستر' ٹھونٹوں کا اُستر...... خس و خاشاک' لوٹا اور مسواک...... اِک عصا دُوجا کاسہ......!

بدبو کے منبع کی کھوج میں میں نے اپنی حسِ شامہ کو مہمیز لگائی...... تین قدم پہ چھپر کی کھپریل سے لگی ہوئی سیاہ کپڑے کی پوٹلی میرے روبرو تھی...... اس بدبُو اور نحوست کے کارن وہ پوٹلی اور اس کے اندر مرے ہوئے حجر تھے...... عام لوگ سمجھتے ہیں کہ پتھر چاہے پہاڑ میں ہو' سڑک پہ' کسی چکی' مورتی' بت' چٹو بٹہ...... سنگِ میل کی صورت یا قیمتی جواہرات کی شکل...... اَدنیٰ اعلیٰ سب سنگ یا سنگریزے ہی ہوتے ہیں جو سخت' انتہائی سخت بھی ہوتے ہیں اور جگوں کے جُگوں رہنے والے بھی...... ان کا شمار مخلوق مطلق ساکت میں ہوتا ہے۔ انہیں طبقِ اَرض کا توازن قائم رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا۔ ان کی کئی نحوستیں' سعد و نحس' زندگی یا موت کا حامل سمجھنا جہالت و توہمات ہے۔ نر مادہ' زندہ یا مُردہ کا تصور بھی فضول ہے۔ ان کی اہمیت' قدر و قیمت وغیرہ ان کی شفافیت' رنگ و حجم کے مطابق ہوتی ہے۔ مگر عوام الناس کی مندرجہ بالا اکثر معلومات حقائق پہ مبنی نہیں۔ حقیقت

یہ ہے کہ حجرات' اللہ سبحانہ تعالیٰ کی اِک قابلِ توصیف مخلوق ہیں۔ تمام آسمانی صحائف میں ان کا ذکر آیا۔ پیغمبروں' نبیوں' رسولوں اور دیگر بزرگوں کا حجرات سے رجوع و رغبت ثابت ہے۔ تمام مذاہب میں ان کی مقدس روحانی اہمیت مسلمہ ہے۔

قیمتی مقدس حجرات' مچھلیاں' پرندے' شہد' کھجور' زیتون' کلونجی' دودھ وغیرہ اللہ تعالیٰ کو بہت مرغوب ہیں۔ کتابِ مقدس میں ان کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا۔ نبی کریم صلعم نے اِن سے رغبت فرمائی' انگوٹھی میں جڑوا کر پہنا۔ اِسی طرح آلِ رسولؐ میں بھی انہیں باہتمام پہنا گیا۔ انسانوں کے علاوہ دوسری کئی مخلوقات بھی خصوصاً حجرات کی افادیت' روحانیت اور شفائی اثرات سے واقف ہیں اور ان سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔"

پرندوں کے گھونسلوں سے قیمتی جواہر ریزوں کا پایا جانا بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ مچھلیوں' مرغیوں' تیتروں' سرخابوں کے پوٹوں کے علاوہ' خرگوشوں' سانپوں' چوہوں کے بِلوں سے بھی کبھی کبھی دریافت ہو جاتے ہیں۔"

ایک زمانہ ہو گزرا مجھے اپنے باغیچے کے لیے کسی دوشاخہ سوکھے درخت کی ضرورت پیش آئی۔ جسے مَیں باغیچے کے ایک کونے میں گاڑ کر اس کی شاخوں سے مٹی کی ہانڈیاں لٹکانا چاہتا تھا۔ مقصد' چڑیوں قمریوں' بلبلوں کے دانہ پانی کا اِنتظام کرنا تھا۔ اِدھر اُدھر کے لکڑی کے ٹالوں پہ دیکھا بھالا مگر میرے مطلب کی کوئی چیز نہ ملی۔ میرا ایک بچہ ایمن آباد کا رہنے والا تھا جب اُسے میری ضرورت کی خبر لگی تو وہ مجھے ایک روز اپنے گاؤں لے گیا۔ جی ٹی روڈ سے اُتر کر ہم ایک ذیلی سڑک پہ آ نکلے۔ اِس کے گاؤں سے کچھ پہلے دائیں جانب ایک کھلے میدان میں لکڑیوں کا ایک بڑا گودام دکھائی دیا۔ ہر طرح کے چھوٹے بڑے سوکھے کٹے درختوں کے انبار لگے دکھائی دیے۔ وہاں پہنچے تو میری توقع کے عین مطابق اِس کا مالک پٹھان نکلا اور میری قسمت کہ وہ کٹر وہابی تھا۔ وہابی یا سُنی' شیعہ یا دیوبندی! یہ سب کے ذاتی مسئلے ہیں۔ میرا حال حلیہ کالا لباس' انگوٹھیاں منکے' ڈنڈا کاسہ اور لمبی دراز زلفیں دیکھتے ہی اُس نے منہ چڑھا لیا۔ منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔

مذہب مسلک اپنا اپنا مگر انسانیت تو سب کی سانجھی ہوتی ہے' تجھے میرے مسلک سے کیا لینا دینا۔ تو سوکھے کاٹھ کا بیوپاری...... جو جلانے کے کام آتی ہے۔ لکڑی جلے گی تو گرمی پیدا کرے گی۔ چولہا گرم ہوگا' بھٹیاں اور آوے تنور جلیں گے' روٹی پکے گی۔ اللہ کی مخلوق کو آسانیاں فراہم ہوں گی۔ تُو کس کس سے اس کا مسلک پوچھتا پھرے گا؟ اُس بیوقوف کے اس غیر انسانی رویے سے بہت دُکھ پہنچا۔ مَیں نے بھنّا کر اپنے بچے سے قدرے خفگی سے پوچھا......؟

"یار! اِس بھلے پٹھان کو کیا ہوا؟ کہیں اِس کی تم سے کوئی کد نہیں' مَیں تو اِدھر پہلی بار آیا ہوں۔"

اُس نے ہنس کر جواب دیا۔

''یہ بد مغز مشہور ہے' ملنگوں بھک منگوں سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہے۔ یہ تو اِدھر کسی کالے کوّے کتّے کو بھی پھٹکنے نہیں دیتا کہ یہ کالے منحوس پلید ہیں اور آپ تو سراپا ہی سیاہ ہیں۔''

مَیں نے غصّے سے جواب دیا۔

''بھائی! مَیں اِدھر تبلیغ کرنے نہیں آیا' لکڑی دیکھنے آیا ہوں۔ اِس کو کیا کہ غرض مَیں نے کیا پہنا ہے' میرے کپڑوں کا رنگ کیا ہے؟''

''یہ آپ کہہ رہے ہیں...... ناں! وہ وہابیوں کے علاوہ سب کو بدعتی سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں وہابیوں اور سُنیوں کا ریٹ الگ الگ ہے۔ ہمارے گاؤں کے کئی لوگ محض اس سے سستی لکڑی لینے کی غرض سے وہابی بن گئے ہیں۔ اس کے ہاں شلوار کے پائینچے اُوپر کر لیتے ہیں' واپسی پر پھر نیچے......!''

اِنہی باتوں میں ہم گودام تک پہنچ آئے۔ دو چار پٹھان لکڑیاں کاٹ چھانٹ رہے تھے اور مَیں اِدھر اُدھر اپنے مطلب کی لکڑی کے لیے نظر دوڑانے لگا۔ ایک طرف مسجد کے طور ایک تختہ بنا ہوا تھا۔ اس کے قریب پڑے بڑے بڑے سُوکھے ٹُنڈ مُنڈ سے درخت پڑے ہوئے تھے۔ اندر سے آواز اُبھری' گوہر مراد یہیں سے ملے گا۔''

مَیں اُدھر بڑھ آیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک پرانے سوکھے درخت کے ایک کٹے ہوئے حصے پہ نظر پڑی۔ عین میری مرضی مطلب کے مطابق...... مَیں نے قریب پہنچ کر ہر رُخ سے دیکھا' دوشاخ کے ساتھ نکلے ہوئے ٹھونٹھ...... نیچے تنے کی گرہیں...... دوشاخ کی جڑ کے پاس چھوٹا سا سوراخ...... جیسے کوئی جنگلی پرندے کا گھونسلہ رہا ہو۔ دیکھتے ہی پہلا خیال جو میرے دل میں آیا وہ یہی تھا کہ مَیں اِسے ہر قیمت پہ حاصل کر کے رہوں گا۔''

اذان کی آواز اُبھری...... پلٹ کر دیکھا تو وہی پٹھان...... اللہ کی بڑائی بیان کرتے ہوئے فلاح اور نجات کی جانب آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

پشتو نما عربی میں اذان کی ایک اپنی ہی کیفیت تھی...... اسی لمحہ یہ خیال بھی آیا کہ اللہ اور فلاح کی جانب دعوت دینے والا خود اللہ کے بندوں سے دُور رہتا ہے اور فلاح کی بجائے فساد و فتور کو ہوا دیتا ہے؟

تکبیر سے پہلے وضو تازہ کر کے ہم دونوں دو نمبر مسلمان امام کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ ہمارے دائیں بائیں صرف دو اور نمازی تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حضرتِ امام وہی پٹھان تھا اور دوسرے وہی مزدور جو لکڑیاں چیر پھاڑ رہے تھے۔ ہم دونوں چونکہ پہلے پہنچے تھے اس لیے عین امام کے پیچھے تھے۔ تکبیر بھی

مجھے ہی کہنا تھی۔ امام نے مڑ کر پیچھے قہر بار نظروں سے دیکھا اور بادل نخواستہ تکبیر کے لیے کہا۔ تکبیر کے اختتام پر اُس نے مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے تحکمیہ انداز میں کہا۔

''سر سے چادر اُتار کر ٹوپی پہنو......!''

مَیں ہکا بکا کہ اس وقت مَیں ٹوپی کہاں سے لاؤں اور کیا ٹوپی ہی نماز کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے...... کسی چادر وغیرہ سے سر ڈھانپا نہیں جا سکتا؟...... مَیں ابھی اسی مخمصے میں مبتلا تھا کہ پھر درشتگی سے حکم ملا۔

''اگر ٹوپی سے سر نہیں ڈھانپ سکتے تو پھر میرے پیچھے کھڑے نہ ہو۔ اوئے! اکبر خانا! تم اِدھر آ جاؤ۔''

دوبارہ تکبیر ہوئی اور نماز تمام ہوئی۔ یہیں میری معلومات میں اضافہ ہوا کہ صحیح نماز پڑھنے کے لیے سر پر چادر کی بجائے ٹوپی اور سُنّی کی بجائے وہابی ہونا کتنا ضروری ہے۔ مَیں اس پٹھان کو بتانا چاہتا تھا کہ مَیں خود بھی اصلی پٹھان ہوں اور وہابیوں کے ہاں پیدا ہُوا تھا اور اَب بھی مَیں ایک حِصّہ وہابی' دوسرا حصّہ سُنّی' تیسرا حِصّہ دیوبندی اور چوتھا حِصّہ شیعہ ہوں...... اچھی اچھی باتیں مَیں نے سب مسلکوں سے چُن لی ہیں اور ناپسندیدہ' نہ سمجھ میں آنے والی بالائے طاق رکھ دی ہیں۔ اسی طرح مجھے خالی خولی دال ماش' محض سبزی و ترکاری' صرف دھان جو یا فقط گوشت گاؤ دُم کی بجائے حلیم یا کھیم پسند ہے کہ اعتدال توازن باہمی میل ملاپ' چاروں ذائقوں اور فائدوں کا ایک حسین امتزاج قائم رہتا ہے۔''

مسجدیں' مندر' گرجے یا گوردوارے' سب ہی پریم اور پریتم دوارے ہیں۔ بھیڑیں بکریاں' کالی ہوں یا چِتّی' اِن کا گڈریا اور چارا باڑا ایک ہی ہوتا ہے۔ ہم تو مسلکوں کے نام پہ گواچی ہوئی بھیڑ بکریاں بن گئے ہیں' جو ایک دوجے کو ٹکریں مار مار کر لہولہان کر رہے ہیں۔''

اندازہ فرمائیں کہ یہ بوڑھا بھٹکتے بھٹکتے اور بکتے بکتے کدھر سے کدھر نکل گیا' گواچی ہوئی بھیڑ کا یہی حال ہوتا ہے۔ بات کر رہا تھا وہ سوکھی لکڑی کی جس کی تلاش میں اِدھر پہنچا تھا۔''

شومئی قسمت کہ نا کرا گودام کے مالک خان صاحب سے ٹکر گیا۔ وہ اپنی طبیعت کا ہاتھ ہولا رکھے ہوئے تھا کہ اپنا مطلب نکالنا تھا...... نماز کے بعد اُس نے بڑے خشوع و خضوع سے خان صاحب سے معانقہ اور مصافحہ کیا کہ کسی طرح اِن کے دل کی کدورت دور اور ضرورت قریب ہو۔ چہرے پہ کمال درجہ کی منافقانہ مسکراہٹ سجا کر اُس نے اُن کے حال احوال پوچھے پھر اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے عرض کی۔

''مجھے اپنے باغیچہ نما صحن میں پرندوں کے چوگے کی ہانڈیاں لٹکانے کے لیے دوشاخہ سوکھا ہوا ٹہن چاہیے۔ مسجد کے پاس ہی ایک لکڑی دیکھی ہے۔''

اُس نے میری بکواس کو سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے یہ سیاہ لباس پہ منکے وکنگے کیوں پہن رکھے ہیں۔تم جانتا ہے یہ جہنمیوں کے رنگ والا لباس ہے...... یہ منکے پتھر نشداد' نمرود اور کافر جوگی لوگ پہنتے ہیں۔تم کیسا مسلمان ہے؟ نماز بھی پڑھتا ہے اور پرندوں کو دانہ بھی ڈالتا ہے۔میں تم کو یہ لکڑی وکڑی نہیں دے گا...... تم ادھر سے جاؤ......!''

وہ مجھے ہکا بکا کر کے جانے لگا تو میں نے مزید عاجزی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب! اگر تمہارے پاس کوئی عیسائی یا ہندو لکڑی لینے آ جائے تو تم اُسے نہیں دو گے؟''

وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''اُس کو ضرور دوں گا...... مگر تم کو نہیں' اِتنا لمبا سفید داڑھی کا کچھ شرم کرو...... تم یہ منکے اور کالا لباس اُتار کر آ جاؤ...... یہ لکڑی فری لے جاؤ......!''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا...... اور کچھ لمحوں کے بعد ہم دونوں بھی وہاں سے اُٹھ آئے...... لیکن اَب ہمارا رُخ لاہور کی جانب نہیں تھا۔

رات میں نے اپنے بچے کے اصرار پر اُس کے گھر گزاری۔لکڑی والے خان کی ایک وجہ کے علاوہ اس بچے کے بزرگوں اور چند دیگر گاؤں کے لوگوں کا بے پناہ اصرار بھی تھا۔دوسرے روز ظہر سے پہلے ہم دونوں دوبارہ خان صاحب کے گودام میں موجود تھے۔خان صاحب نے ہمیں گرما گرم چائے پلائی اور حسبِ وعدہ وہ پوری کی پوری لکڑی جس کا وزن اڑھائی من کے قریب تھا ہمیں دے دی۔ارشاد فرمایا۔

''تم اب مسلمان بلکہ مومن دِکھائی دے رہے ہو۔''

سمجھ نہ آیا کہ بہت سے لوگ کسی کا کالا لباس دیکھ کر اُسے مومن سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ کسی کا سفید براق پہناوا دیکھ کر اُسے مومن کہتے ہیں۔شاید دونوں ہی اپنی اپنی جگہ دُرست ہوں گے۔میں ہی غلط کہ آدھا سیاہ اور آدھا سفید کیوں نہیں پہنتا تھا......؟

چائے پی کر ہم نے لکڑی وہاں سے نکلوا وزن کرانا چاہا تو خان بُری طرح بدک گیا کہ حسبِ وعدہ اس کی قیمت نہیں لے گا۔میں نے ایک دو مثالیں دے کر اُنھیں کاروبار اور تعلقات میں اعتدال رکھنے کے چند اصول بتائے اور بڑی مشکلوں سے قیمت اُس کی جیب میں ڈالی۔ٹرک کے ذریعے لاہور پہنچانے کا بندوبست کر کے میں نے اجازت طلب کی۔خان صاحب نے اپنے روپے کی ہلکی سی معذرت چاہی پھر ایک مکمل رسید تھماتے ہوئے کہا۔راستے میں محصول چنگی والے تنگ کرتے ہیں۔

واپس بچے کے گاؤں پہنچا۔کپڑے تبدیل کیے' سیاہ لباس' منکے' انگوٹھیاں' ڈنڈا کاسہ...... سب کچھ وہی پہلا حال حلیہ۔لاہور جانے کے لیے جب میں اُس کے گودام کے قریب پہنچا تو ایک منی ٹرک میں لکڑی لوڈ

کیے گودام کے باہر سڑک کنارے کھڑا تھا۔ پاس خان بھی موجود۔ میرا پہلے والا حلیہ دوبارہ دیکھا تو اُن کے چہرے پہ کئی رنگ اُبھرے ڈوبے۔ بادلِ نخواستہ بولے۔

''تم ...... تم نے پھر کافروں والا کالا لباس' منکے پہن لیا۔''

میں گاڑی سے باہر آیا ...... آہستہ سے کہا۔

''خان صاحب! سب رنگ اُس کے ہیں' وہ جیسے چاہے جسے رنگ دے۔ ایک حقیقت شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئے کہ اصل رنگ کالا ہی ہے۔ باقی سارے سورج کی آڑھی ترچھی شعاعوں کے عکس تماشے ......!''

وقت ہو گزرا ...... ہر عمل' فیصلے' انجام جزا و سزا کا ایک معینہ وقت ہے۔ کسی کی شادی بچپن میں ہی عمل میں آ جاتی ہے اور داڑھی نکلنے تک وہ دو بچوں کا باپ بن چکا ہوتا ہے اور ایسے ہی کوئی بوڑھا ہونے کو آتا ہے مگر بیاہ نہیں ہو پاتا۔ مقدمات کے اچھے بُرے فیصلے ہو جاتے ہیں مگر ان پہ عمل کسی اپنے وقت پہ ہی ہوتا ہے۔ سرکاری دفتروں میں ترقی کے آرڈر نکل چکے ہوتے ہیں مگر عملی طور پر گاڑی پھنسی رہتی ہے۔ منگنی ہو چکی ہوتی ہے لیکن لڑکی کی تعلیم ہی ختم نہیں ہوتی' ہو جاتی ہے تو لڑکی کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ پھانسی کا آرڈر ہو گیا ہوتا ہے مگر کچھ قانونی تقاضے یوں دراز ہو جاتے ہیں کہ قیدی چکی میں سڑتا رہتا ہے بالآخر سات سال بعد ہارٹ اٹیک سے اپنی منزل پہ پہنچتا ہے۔

## ● علم و حکمت کا جنہیں شوق ہو آئیں نہ اِدھر ......!

اک لمبا عرصہ اندر باہر کی کھے خواری میں مبتلا' ملکوں ملکوں گھومتا رہا۔ چھوٹے سے وقفہ کے لیے گھر آیا بھی تو اِدھر اُدھر کے توجہ طلب کاموں میں مصروف رہا' پھر وہی چکر ...... یہ مُنڈ منڈ سوکھا سڑا دوشاخہ ٹہن ڈہیں باغیچے کے ایک کونے میں پڑا نجل ہوتا رہتا کہ تلاش اور لانے میں تو بڑی عجلت دکھائی تھی۔ اب گھر لا کر کبھی حال تک نہیں پوچھا ...... دیمک چاٹ رہی ہے یا چیونٹیوں نے میرے کھوکھلے تنے میں ڈیرے بنا رکھے ہیں؟

موسم اور طبیعت کی نارسائی نے مجھے کچھ دنوں سے گھر میں محصور کر رکھا تھا۔ دھوپ میں ہلکی سی تمازت محسوس ہوئی تو میں چہل قدمی کی غرض سے باغیچے میں نکل آیا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس خشک درخت کے پاس پہنچا تو دیکھا۔ چیونٹیوں نے دوشاخ کی جڑ کے باہر بُھر بُھرے برادے کا ڈھیر لگا رکھا ہے۔ یہاں ایک بڑا سا سوراخ تھا یقیناً کسی طوطا مینا کا گھونسلہ ہوگا۔ انڈوں کے چھلکے بھرے پیلے پر بھی دکھائی دیئے۔ جھک کر قریب سے دیکھا تو درخت خاصا کھایا جا چکا تھا۔ لگتا تھا کسی شوگر یا ٹی بی کے مریض کی مانند اندر کھوکھلا ہو چکا ہے۔

افسوس ہُوا کہ اتنے جتنوں اور شوق سے اسے تلاش کر کے لایا تھا کہ باغیچے کے کونے میں کھڑا کریں گے۔ دوشاخے سے مٹی کی ہانڈیاں باندھیں گے...... بلبلیں چڑیاں قمریاں' دانہ دُنکا چگیں گی' پانی پئیں گی۔ ان کی چہچہاہٹ سے خُوب رونق لگے گی۔ افسوس کہ میری مصروفیت اور اس کی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ہو گیا۔ مُحض کھوکھلا کاٹھ' جو جلانے کے کاج کا ہی رہ گیا تھا۔ مَیں نے اپنی بے توجہی کا سارا غصہ اسی پہ ہی نکالا۔

ایک بچے کو فوراً کلہاڑی' آری لانے کا کہا۔ اب کیا تھا' دو چار کلہاڑی کی ہلکی سی ضربوں سے یہ سوکھا کاٹھ اُدھڑ پدھڑ گیا۔ جو دیکھا کھوکھلے تنے سے گھونسلوں کا اچھا خاصا کباڑ خانہ باہر نکل آیا۔ سوکھی گھاس' تنکے' پتے' دھاگے' رنگ برنگے پر' چھوٹے چھوٹے سفید نیلے خاکستری انڈوں کے چھلکے...... خشک بیٹیں' ننھی ننھی ہڈیاں شاید پرندوں کے مردہ بچوں کی تھیں۔ لڑکے' لکڑیاں اُٹھا کر لے گئے اور مَیں ایک گونا دلچسپی سے گھونسلے سے برآمدہ ساز و سامان کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی جلے ہوئے یا اُجڑے رین بسیرے کی باقیات میں کسی طرح کی کوئی زندہ یا سالم شے تلاش کرنے کی سعیٔ لا حاصل کرے لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ کہتا ہے کہ ایسے معجزات بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں کہ لامحالہ زبان پہ ''سُبحان اللہ'' آ جاتا ہے کہ تو جس پہ چاہے نار کو گلزار' قلزم کو شاہراہ بنا دے۔ مَیں اپنی واکنگ سٹک سے اُجڑے ہوئے آشیانے کی بڑی خبرداری سے پڑتال کر رہا تھا کہ ناگاہ کسی پرندے کے جسم کے نیلے اور خاکستری رنگین پروں کی ایک بھدّی سی گوٹ پہ نظر پڑی...... بنظرِ غائر وہ ایک اخروٹ سا دکھائی دیتی تھی...... بیٹوں کی غلاظت سے لتھڑی ہوئی۔

مَیں نے یونہی اسے چھڑی کی نوک سے علیحدہ کرتے ہوئے کاٹھ کباڑ سے باہر نکال لیا۔ پہلے تو غور کرتا رہا کہ یہ کیا چیز؟ پرندوں کے گھونسلوں میں کسی ٹھوس اور گول چیز کا کیا کام؟...... اپنی چونچ پنجوں میں تو وہ کوئی ایسی چیز اُٹھا کر لا نہیں سکتے۔ چھڑی کی نوک اس کے درمیان دھرتے ہوئے ہلکا سا دبایا تو وہ گوٹ دو قاش ہو گئی اور چار عدد ہلکے سبز مائل زمرد دانے مجھے اکھیاں مار رہے تھے۔ بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہایت احتیاط سے گوٹ سے علیحدہ کیا۔ سُبحان اللہ! ایسے شفاف' بے داغ' ہلکے سبز رنگ' اَن تراشے زمرد پہلے کہیں کم ہی دیکھے ہوں گے...... مزید سارے گھونسلے اور درخت کو اچھی طرح دیکھا بھالا مگر وہی گوہرِ مقصود تھے جو ہاتھ لگے' باقی کا ملبا اُٹھوا دیا۔ اس ساری کتھا کا حاصل وہ چند سوال ہیں جو ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا پرندوں اور چند ایک زمین پہ رینگنے والے جانوروں کے گھونسلوں' بِلوں' بھٹوں میں قیمتی پتھر پائے جا سکتے ہیں؟...... اس کا جواب ہاں میں ہے۔ ایسے مروارید' قیمتی پتھر' مرجان' زہر مہرہ...... پہاڑی کوؤں' سمندری بگلوں' مرغابیوں' گھڑیالوں' سنہری بچھوؤں اور چند ایک مچھلیوں کے معدوں' پوٹوں' منہ' اُگلوں' بیٹوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔''

## ● میں تیرا چراغ ہوں جلائے جا بجھائے جا......!

قازغستان کے پہاڑوں میں ایک سیمرغ قسم کا کمیاب پرندہ پایا جاتا ہے جسے مقامی لوگ ''سوقافی'' کہتے ہیں۔ انتہائی خوش رنگ' خوبصورت اور چھیل چھبیلا سا پرندہ ہے۔ اس کی آنکھوں کے اُوپر دو سینگ نما بالوں کے گچھے ہوتے ہیں۔ قدرت کی کوئی حکمت کہ اِسے کم دکھائی دیتا ہے۔ جُوں ہی سورج' مدھم ہُوا یہ اندھا ہوگیا۔ اس حالت میں واپس اپنے گھونسلے تک پہنچنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔''

یہ پرندہ پہاڑ کی اُونچائیوں پہ پتھروں کی دراڑوں میں گھونسلہ بنا کر رہتا ہے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے اگر واپس اپنے گھونسلے میں نہ پہنچے تو یہ کہیں بھی پڑ کر اگلی صبح کا انتظار کھینچتا ہے لیکن گھونسلے میں اس کی مادہ اس کے انتظار میں پاگل ہو کر تلاش میں نکلتی ہے وہ اس صُورت کہ اپنی چونچ میں ''چراغ شب'' پکڑتی ہے۔ چراغ شب' قازغستان کے پُراسرار پہاڑوں کے سنگ پاروں میں پایا جانے والا ایک انتہائی قیمتی اور نایاب گوہر دانہ ہے جو لعل بدخشانی کی مانند تاریکی میں ایک نامحسوس سی ضوفشانی پیدا کرتا ہے۔ سوقافی مادہ اسی کی مدد سے اِسے تلاش کرتی ہے اور واپس اپنے گھونسلے تک راہنمائی کرتی ہے۔ دن کی روشنی میں وہ چراغ شب' گھونسلے میں دھرا رہتا ہے اور ان کے بچوں کے کھیلنے کے کام آتا ہے۔ یہ چراغ شب ایک طرح کا روبی ہے جو صرف اور صرف وہیں ہوتا ہے اور بیش قیمت ہے۔''

بات بہت آگے سرک گئی۔ بتانا چاہ رہا تھا کہ قیمتی حجرات ضروری نہیں کہ سعد ہی ہوں یا وہ زندہ اور صحت مند ہوں۔ یہ زمرد جو مجھے اس لکڑی کے گھونسلے سے ملے۔ وہ سخت علیل اور پژمردہ تھے۔ ان کی علالت اور ترش روئی نے اس کم عمر' تر و تازہ درخت کو بھی بیمار کر دیا۔ درخت سوکھ کر کٹ گیا اور اُس خان کی تحویل میں پہنچ گیا۔ اس کی نحوست سے خان کا پارہ بھی ہر لحظہ تیز حار رہتا اور وہ اخلاقی طور پر بیمار ہو گیا تھا۔''

ہر شروع کا آخیر بھی ہوتا ہے' جیسے ہر کہانی اپنے انجام کو ساتھ لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی طرح ان اصل اصیل گہر دانوں کو اس درخت کے پرندے نے کہیں سے حاصل کر کے اپنے گھونسلے کی زینت بنایا لیکن حجرات کے مزاج کے مطابق انہیں ایسا ماحول نہ ملا جس میں وہ پنپ سکتے' خوش رہتے۔

یہ زمرد دانے ایک خاصے سفر کی صعوبت طے کرنے کے بعد اپنی منزل یعنی مجھ تک پہنچے تھے...... درمیان کے سارے آڑھے ترچھے مَراحل...... میرے اندر' درخت کی خواہش پیدا ہونا' لکڑیوں والے پٹھان سے اُوکھا سُوکھا ہونا...... ایک مدّت درخت کا پڑے رہ کر کھوکھلا ہونا...... یہ سب کچھ کیا تھا؟...... وہ مرحلے جو

مقام منزل تک رَوا ہوتے ہیں۔ اب آگے کے مرحلے ایک الگ رُوداد کہ مَیں نے کس طرح ان بیمار زمرد دانوں کی تفہیم بندی کی۔''

معلوم ہوا کہ جواہرات' عام چنوں بُنوں اور سڑکوں پہ پڑنے والے پتھروں کی مانند نہیں ہوتے۔ انسانوں کی مانند یہ بھی اپنی فطرت اور جبلّت رکھتے ہیں۔ یہ بیمار اور مر بھی جاتے ہیں۔ ان کے مرنے پہ اگر انہیں فی الفور دفن یا غرق نہ کر دیا جائے تو جس کے تصرف میں ہوتے ہیں اسے ہلکان کر دیتے ہیں۔ بیمار یا مرے ہوئے حجر کی شفائی اور کیمیائی مثبت لہریں اپنی سمت تبدیل کر کے منفی اور نحس و نجس اثرات کی جانب رجحان پکڑ لیتی ہیں...... تب خلل دماغ' ناکامی' بیماری' رسوائی' بربادی یا ناگہانی موت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور انجام بہر حال بہتر نہیں ہوتا۔''

بابا مزید اس بابت کہتا ہے۔ حجرات خاص' فقیر فقیہوں' شاہوں' حکمت دانوں...... موسیقاروں اور عالموں' کاملوں کے کام کی چیزیں ہیں کیونکہ یہ ایک دوسرے کی ظاہری باطنی کرامات سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ عام روزمرہ کے لوگ ان کی فروغت وفہامت اور افروزیت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ کمزور آدمی چادر تو اوڑھ سکتا ہے' بھاری کمبل لینے کا متحمل نہیں ہوتا کہ کمبل سے جان چھڑانا مشکل پڑتا ہے۔''

قیمتی حجرات کی دُنیا ہی الگ اور مُنفرد ہوتی ہے۔ ان کا عشق بندے کو بندۂ خدا بنا دیتا ہے۔ مچھلیوں کے بعد یہ سب سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنے والے ہوتے ہیں۔ انسان کے علاوہ یہ صفت صرف دوسری مخلوقات میں ہے جتنا کسی کو تشرف و تصرف ملا وہ اُتنا ہی شکر اور ذکر کرنے والا ہُوا۔

پیغمبروں' نبیوں' رسولوں' صحابہ کرامؓ' اولیاء کرام اور دیگر برگزیدہ بندوں کے ہاتھوں اور ان کے تصرف میں جو بھی حجرات ہوتے وہ انتہائی مُقدس' قیمتی اور بزرگ ہوتے ہیں۔ اسی طور بڑے بڑے شہنشاہوں' مجاہدوں اور عالموں' کیمیا دانوں کے جاہ و جلال' حشمت و تجمّر' مقامات و درجات کی سربلندی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں...... جیسے کچھ نگاہ کیمیا والے ان کی جستجو میں رہتے ہیں اسی طرح کچھ جود و سخا اور جذب و جزا والے اِن مَن موہنوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کی مَن مُرادوں کا پالن کر سکیں۔

## ● مَیں تیرا جُنوں تو میرا جُنوں......!

کہتا ہے' انسانوں کے علاوہ جنّات بھی ان حجرات سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ وہ اکثر اپنی بیماریوں اور افسردگیوں کا علاج ان سے کرتے ہیں۔ ان کی دوستی اگر کسی انسان سے ہو یا کسی بھی وجہ سے مہربان ہو

جائیں تو اظہارِ یگانگت کے لئے قیمتی جواہر تحفہ دیتے ہیں۔ لعل یمنی یا سنگِ سلیمانی...... خدا سمجھے' جھوٹ کہتا ہے یا سچ...... بتایا کہ میرے پاس میرے جنات دوستوں کے دیے ہوئے چند ایک جواہر دانے موجود ہیں۔

یاد آیا' ایک روز اُس کے ہاں بیٹھا بے سروپا کی سن رہا تھا۔ واضح رہے کہ میں اکثر اُس کے ہاں کھانا پینا کرنے جاتا ہوں۔ اُس کی "بے فضول" گپوں کو لذیذ بریانی کھڑے مسالے کے قورمہ اور لسی لذت والے رسیلے کبابوں کے صدقہ میں برداشت کر لیتا ہوں۔ کھانا ڈکار کر قہوہ چسک رہا تھا کہ ایک قد آور وجیہہ نوجوان' ملاقات کے لیے آیا۔ بابا نے بڑی تُرش روئی سے اُسے دُور کونے میں بیٹھنے کو کہا...... وہ بیچارہ کسی تنویم زدہ معمول کی مانند سر جھکا کے الگ سا اُدھر کونے میں بیٹھ گیا۔ میرے علاوہ اور بھی چھ سات اجنبی سے لوگ موجود تھے۔ ہم سب نے بابا کے اس کھردرے رَدیے کو محسوس کیا۔ مگر وہاں کالے باگھ کے بھٹ میں بولے کون؟...... اس نوجوان کے آنے سے اِس کی پہلے والی طاری شگفتگی کہیں غائب ہو چکی تھی۔ صاف دکھائی دیتا تھا بابا کا موڈ آف ہو چکا ہے۔ مَیں نے نظر اُٹھا کر اُس نوجوان کو دیکھا' اُس کا منہ بابا کا سا نیز ھا تھا۔ سر جھکائے خجل خجل سا بیٹھا۔ جیسے کسی غلط حرکت پہ پابندِ تعزیر ہو۔

چند ناخلف سے لمحے مزید گزر گئے تو بابا نے میرے علاوہ تمام لوگوں کو جانے کا حکم سنا دیا۔ بادلِ نخواستہ تمام اُٹھے اور باری باری بابا کے پاؤں چھو کر چلے گئے۔ اُس نوجوان کو پاؤں چھونے سے بھی رد کر دیا۔ اُن لوگوں کے اُٹھ جانے کے بعد بھی بابا کی طبیعت کا اضمحلال کم نہ ہوا تو مَیں نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"اس بچے کے آنے سے تمہارا موڈ کیوں آف ہو گیا......؟"

عجیب ہی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"آسمان سے محض رحمتوں کا نزول نہیں ہوتا...... بلیّات و آفات بھی اُترتی ہیں۔ کچھ بدنصیب رحمتوں کو چھوڑ کر بلاؤں کو گلے لگا لیتے ہیں۔"

جب حسبِ معمول میرے پلے کچھ نہ پڑا تو مَیں نے پُوچھ ہی لیا۔

"تمہارا اشارہ کن بدنصیب لوگوں کی طرف ہے؟"

"وہی جو نافرمان ہوتے ہیں...... جنہیں کہا کچھ جاتا ہے۔ وہ کرتے کچھ اور ہیں...... یہ تم نے اس ناخلف منحوس کو دیکھا' جس کے آنے سے ماحول میں اُجاڑ بھر گیا۔ اس میں ایسی نحوست سرایت کر گئی کہ جس شاہراہ پہ ہو لے دو چار ایکسیڈنٹ کروا دے...... نحوس مارے کو کئی بار منع کیا ہے......" "معاف کرو بی بلّی نیو ہا لنڈورا ہی بھلا"...... اِدھر آیا کر یہ اس کی سمجھ کے پردوں پر ایسا بھیگا پلا پڑا ہوا ہے کہ باز ہی نہیں آتا۔ کہتا ہے'

کوئی اور گھر بتا دیں تو مَیں یہ دَر چھوڑ دیتا ہوں۔''

''یہ ہمیشہ سے ہی ایسا ہے یا؟''

''نہیں' نہیں...... ایسا نہیں تھا۔ بس اک نافرمانی اُسے لے بیٹھی۔ دو اڑھائی سال پہلے کا ذکر ہے۔ مَیں نے اجمیر شریف عرس پہ جانا تھا۔ کوئی چار پانچ روز پہلے مَیں نے اُسے اپنی دس عدد انگوٹھیاں اور تین گلے کی مالائیں دیں اور مُون مارکیٹ اک سنار کے پاس بھیجا کہ ان کی صفائی دُھلائی کروا لائے۔ ایک آدھ بار پہلے بھی یہ وہاں اسی غرض سے جا چکا تھا۔ اب خدا جانے اُسے کہاں سے دیر ہوگئی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے دکان بند ہو چکی تھی۔

اُس نے اپنی جان بچانے کی خاطر جھوٹ بولتے ہوئے ٹیلی فون پر مجھے اطلاع دی' سنار کے پاس پہلے سے کچھ کام تھا' کل دوپہر کا وقت دیا ہے۔ تین مالائیں اور دس انگوٹھیاں جن میں بیش قیمت جواہر آویزاں تھے۔ وہ گھر لے گیا۔ خدا جانے اُس کے جی میں کیا سمائی...... یا وہ دوستوں میں شو بازی کرنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ گلے ہاتھوں پہن بلیئرڈ کلب چلا گیا۔ آدھی رات وہ انہیں پہنے ہوئے کھیلتا رہا...... کھیلتے کھیلتے اچانک اُس کی طبیعت خراب ہوئی اور وہیں ٹیبل پہ ڈھے گیا۔ دوستوں نے اُسے تھام پکڑ لٹا دیا۔ منہ سے جھاگ' ماتھے پہ تریلی' جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کسی کے کہنے پہ اُسے اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ معائنہ کرنے والوں نے حیران ہوتے ہوئے پہلے تو اُس کے مہنگے انگوٹھیاں اُتاریں۔ اُس کی حالت کے پیشِ نظر ایک دو مسکن انجکشن ٹھوکے...... دو گھنٹے بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا محض کسی چیز کے خوف و دہشت نے اِسے وقتی طور پہ بے ہوش کر دیا۔ گھر آیا تو بتایا! مجھ سے غلطی ہوئی کہ مَیں نے بابا سے جھوٹ بولا۔ دوسری حماقت یہ سرزد ہوئی کہ دوستوں میں اپنا نُور جمانے کے لیے انگوٹھیاں اور مالائیں پہن کر بلیئرڈ کلب چلا گیا۔ کچھ دیر تک ٹھیک رہا' پھر محسوس ہوا جیسے میرے گرد میرے دوست نہیں خوفناک صُورت جنّتے اور جن کھڑے ہوں۔ وہ میری جانب قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ گلا' گردن اور اُنگلیاں جیسے کسی شکنجے میں کَسی جا رہی تھیں۔ اِک دم تخت سے جھٹکنے لگے...... اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ دن اور آج کا دن وہ نارمل نہیں' گو اُس کی حالت اب پہلے سے بہتر ہے۔''

''اِس کا مطلب ہے کہ اُس کی حالت تمہارے تجرات کی وجہ سے ہوئی......؟''

''ہاں! ایسا ہی ہُوا۔ یہ میرے دوست ہیں' مَیں ان کا اور وہ میرے رَمز شناس ہیں...... آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ ہم اِک دُوجے کے موڈ' مزاج اور وقف' وقوف کا خیال کرتے ہیں۔ اِک کم سَواد

بے لطف ولذت نے اُنہیں زیب تن کر کے اُن کے موکلات کو بھڑکا دیا۔ جس سے اُس کی ایسی حالت ہوگئی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ یہ کم بخت جان سے نہ گزر گیا...... اب وہی خوف اور دیکھی ہوئی صورتیں اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور ان کے اثرات اُس کے اعصاب پہ بھی بھاری پڑے۔"

باتوں باتوں میں ایک مرتبہ بتایا ملائکہ کا انسانوں سے براہ راست رابطہ نہیں ہوتا (استثناء کے ساتھ) سوائے وقتِ موت کے' البتہ اکثر نفوسِ قدسیہ اور جنات رابطہ میں رہ سکتے ہیں۔ حجرات مقتدرہ وہ ہیں جن کا تعلق کرۂ ارض سے ہے اور حجراتِ مقدسہ وہ جو افلاک سے ہیں۔ اجرام فلکی' شمسی وقمری اور دیگر سیارہ بُروج' کہکشاؤں کے بطون سے آشکار ہونے والے شہابیے وافروزشیں وغیرہ...... حجرِ اسود' جنت کا سردار یاقوت' جسے خانہ خدا کی زینت وبرکت کے لیے زمین پہ اُتارا گیا۔ جیسے آسمانوں پہ اصلی خانہ کعبہ عین نیچے ارضی خانہ خدا......!

آپ نے سُنی اس کی باتیں...... وہ ایسی عجیب وغریب اَسرار بھری باتیں کہاں سے کھوجتا ہے؟ لگتا ہے کہ جنات اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر جاتے ہیں۔ مزے کی بات کہ اس سے انکار بھی نہیں کرتا۔ کہتا ہے' جب زمین پہ کچھ نہ تھا تب جنات تھے' جو انسانوں سے تعداد میں کہیں زیادہ...... جبکہ ملائکہ ان سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ ہر بشر کے ساتھ اِس کا نوری اور ایک ناری ہمزاد پیدا ہوتا ہے اور بہت کم ایسے بھی جن کے ہاں کئی کئی ہمزاد پابند ہوتے ہیں اور جدھر ان ہمزادوں پہ گرفت ہو ادھر جنات سے راہ ورسم بھی ہو سکتی ہے۔"

اس کا یہ بھی کہنا کہ اکثر مسلمان بزرگ جنات کی دسترس میں افلاکی استعانتوں کے حامل مقدس حجرات بکثرت ہوتے ہیں۔ ایسے پُراَسرار حجرات کا تعلق اور ماخذ پریوں کے دیس آذربائیجان' کوہ قاف' بحیرہ' جھیل سیف الملوک اور روس کے شمالی کوہستان ہیں...... جو جنات' دیوؤں اور ساحروں کے پسندیدہ مسکن ہیں۔ وہاں کے مقامی باشندوں میں چند ایک بوڑھوں کے ہاں مَیں نے ایسے حجرات مشاہدہ کیے ہیں جو ارضی نہیں افلاکی ہیں۔ افلاک کی پہنائیوں' بیکرانیوں میں جب جنات ایک حد سے تجاوز ہو کر دخیل ہوتے ہیں تو وہاں کی فضائی آوارہ گرد آلودگی جو سیارہ' نجوم کے شہابیوں' آفتابیوں اور ماہتابیوں پہ مشتمل ہوتی ہے۔ ان کے لیے رُکاوٹ اور قباحت کا سبب بنتی ہے۔ ان "شہابیوں' ماہتابیوں اور آفتابیوں" کا جو ذرہ ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو وہ افلاکی بلوریا گوہر مثال' ارضی معدنیات حجرات جیسا مگر استعانتوں اور تصرفات میں بڑھ کر...... جس کے اَسرار واثرات لازوال وبے مثال ہوتے ہیں۔"

ایک بار جب اُس نے اپنے چھوٹے سے حجرات کا ڈبا کھولا ہوا تھا۔ مجھے چند ننھے ننھے اَن تراشے چمکدار پتھر دکھاتے ہوئے بتانے لگا۔ یہ شب نُور کا دانہ ہے اور یہ حجر فلک! ایک الگ سی چمک دمک کے

بے ڈھبے سے پتھر کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے بتایا۔ یہ نایاب جواہر سنگِ سکندری ہے۔ یہ اتفاق سے ایک ایسے بزرگ جن کے ہاتھ لگ گیا جو سدِ سکندری کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ اسے نیچے دیوارِ سکندری کی ایک جانب سے نیلی روشنی پھوٹتی دکھائی دی۔ نیچے پہنچ کر دیکھا تو ایک خلا نظر آیا۔ جس کے اندر ایک روشن پتھر تھا۔"

جس کے بارے میں ایک روایت ہے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کے تخت سے علیحدہ کیا گیا تھا کہ اس میں بنفشی رنگ کی ایک لہر آر پار تھی۔ جس سے اس کے مقدس ہونے کا تاثر ملتا تھا۔ جنوں نے اسے علیحدہ کر کے اس کی جگہ ایک اور پتھر لگا دیا۔ کئی صدیاں سال یہ مقدس قیمتی پتھر، فلسطین میں کسی پہاڑ کی غار میں جنات کی حفاظت میں پڑا رہا۔"

ایک اور روایت کہ جنات نے حضرت سلیمانؑ کی کسی وصیت کے تحت اسے سدِ سکندری کے ایک ایسے مقام پہ نصب کیا گیا تھا جس کے عین اوپر دُب اکبر اور قطبی تارے کے کچھ اسرار تھے۔ اس مقدس پتھر سے کچھ ظاہری اور کچھ باطنی شعاعیں ہویدا ہوتیں، جن سے جنات رہنمائی حاصل کرتے...... واللہ اعلم بالصواب!

فراز بابا مجھے ان سنگِ سلیمان کی بابت بتا رہا تھا جو اسے ایک جن نے تحفتاً دیے تھے۔ بقول اس کے یہ سنگ ریزے پُراسرار اور مقدس اہمیت کے حامل ہیں۔ مزید میرے ایک استفسار پہ بتایا...... چونکہ وہ جگہ، جنوں اور نادیدہ مخلوقات کی گزرگاہ ہے۔ کبھی کبھی یہ ہستیاں وہاں اُتر کر اس کہنہ حجرات کی زیارت بھی کر لیتی ہیں۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام جو ان نُوری و ناری مخلوقات پہ اللہ کی جانب سے مقرر کیے ہوئے پیغمبر اور بادشاہ بھی تھے، یہ پتھر چونکہ اُن سے نسبت رکھتا ہے۔ شاید اس لیے ان کے نزدیک اس کی اہمیت ایسے ہی ہے جیسے مسلمانوں کے لیے حجرِ اسود کی ہے۔ میرا دوست جن جو ایک بار ادھر سے گزر رہا تھا...... اس حجر کی زیارت کے لیے نیچے اُترا...... اسے بوسہ دینے کی غرض سے آگے بڑھا...... دیکھا کہ اس پتھر کے نیچے چند ننھے منے ریزے پڑے ہوئے ہیں...... غور کیا تو معلوم ہوا یہ ریزے اسی حجرِ متبرک کے ہیں...... وہاں سے جُدا کیسے ہوئے اس کی وجہ سمجھ نہ آئی......؟

بابا ان مقدس ریزوں کو سمیٹنے لگا تو میں نے انہیں چھونے اور مزید دیکھنے کی درخواست کی۔ وہ بدِقت نیم رضامندی کے انداز میں بولا۔

"دیکھنے کی حد تک تو کوئی خرابی نہیں بلکہ عین سعادت ہے، مگر چھونے میں چنداں قباحت ضرور ہے۔ یہی تو تیری اور میری سمجھ کا فرق ہے۔ کبھی سپیرے کو دیکھا، کس آسانی اور بے خوفی سے سانپ کو گردن سے دبوچ لیتا ہے۔"

''یار! حد ہوگئی' زندہ و زہریلے سانپ اور بے ضرر و بے سکت سنگ ریزوں میں تمہارے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں' سانپ کاٹتا اور حرکت کرتا ہے جبکہ پتھر' چاہے وہ راستے کا ہو یا کسی کے تاج اور گلوبند میں جڑا ہوا' زہر بھرے دانت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس میں خود حرکتی ہوتی ہے۔''

''گوبر سائیں جی! (یہ القاب اس سے عطا ہوتا ہے جب مجھے انتہائی کوڑھ مغز جاہل کہنا مقصود ہوتا) مَیں آپ کی خدمت اسفل میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ حجرات زندہ بھی ہوتے ہیں...... بیمار و مردہ اور بچے جوان بوڑھے بھی۔ ان میں حرکیت بھی ہوتی ہے مگر ہم عجلت پسند اسے کچھ کم ہی محسوس کرتے ہیں۔ کسی پہاڑی راہ سے گزر لو یہی راہ پانچ دس برس بعد پہلے سے مختلف ہوگی۔ اس کرۂ ارض پہ کوئی بھی مخلوق ساکن نہیں...... جو جتنی تھمی دکھائی دیتی ہے وہی زیادہ حرکت پذیر ہوتی ہے۔ غور کرو کہ طبق ارض' کسی لمحہ سکوت پذیر نہیں ہوتی...... اس کی گود میں دھری مادیت کیونکر ساکن رہ سکتی ہے؟

حجرات اپنے مزاج کے مطابق ہی کسی سے دوستی کرتے ہیں یا پھر کوئی انہیں اپنے مزاج پہ ڈھال لے...... جیسے کسی شیر کی تربیت کی جاتی ہے۔ یہ گوہر ذرے' جن کو راس نہیں آئے تھے۔ میرے ہاں ان کے رنگ کا ڈھنگ تھا۔ انہیں اپنے مزاج کے مطابق ڈھالا اور خود کو اُن کی راہ پہ ڈال دیا۔

مزید بتاتا ہے کہ طبق ارض کی ہر مادی شئے' سورج سے براہ راست یا بالواسطہ استفادہ حاصل کرتی ہے۔ سورج کی روشنی یا چاند یا تاروں کی ضیاء باریاں نہ ہوں تو کسی شئے کو ظاہری طور پر دیکھا نہیں جا سکتا مگر حجرات خاص میں یہ خوبی ہے تاریکی میں مزید اجلتے ہیں اور جن میں یہ خوبی نہ ہو وہ ناقص و فاسق ہوتے ہیں لیکن ان جواہر خاص کی تابندگی دیکھنے کے لیے بھی چشم بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو تمہارے ہاں تو ہے ہی نہیں اور نہ کبھی ہو سکتی ہے؟''

مقابل کو دو کوڑی کا کرنے میں شاید اسے تسکین ملتی ہے۔ مگر یہ بھی حق ہے کہ کسی خانہ برانداز کے روبرو اسے خود کو از حد خراب و خاطی ثابت کرنے پر بھی اصرار ہوتا ہے۔ اُلجھنے پہ کسی کو پاجی کہہ دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا اور واقعتاً کسی حقیقی پاجی کو بھاوجی پکارنے پہ خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ مجھے پرلے درجے کا غبی اور کوڑھ مغز سمجھتے ہوئے بھی اپنی بدمغزی اور کاسۂ سر کی کاشت بڑھانے کے مشورے طلب کرتا رہتا ہے۔

آنکھوں میں کھلی ہوئی نیند کی مانند خراب سوال کرنا بھی اسی کی کمزوری یا عادت ہے۔ غبار شب میں آخری پہر مجھے طلب کر کے پہلو بٹھالیا اور خود خورد خورد خراٹے توڑنے لگا...... غصہ سے میری مت ماری گئی۔ گھٹنا ہلا کر طلبی کا مقصد پوچھ بیٹھا۔ جلا کر پپوٹوں کے پَٹ وا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تکلیف ہے' بیٹھے رہو' نیند آ رہی ہو تو لیٹ جاؤ...... مشکل ہے کہ ہمزاد' موکل میں توکل نہیں ہوتا'

بلایا ہے تو کوئی نہ کوئی بات ہو گی؟''

چند لمحوں کی خامشی کے بعد خود بخود ہی بڑبڑانے کے انداز میں پوچھا۔

''بھائی! یہ تو بتاؤ کہ اگر تم میری جگہ ہوتے اور مَیں تمہارا ہمزاد...... تو اس وقت کیسا سین ہوتا......؟''

پوچھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

میری تو کھوپڑی چٹخنے لگی۔ شب بیند جنے کا سماں اور ایسا سکتہ سوال؟...... اُٹھنے لگا تو رسانی سے بولا۔

''جواب تو دیتے جاؤ......؟''

اس اوٹ پٹانگ سوال کا کوئی جواب ہوتا تو دیتا' جان چھڑانے کی غرض کہہ دیا۔

''میرے پاس تو اس فضول سوال کا کوئی معقول جواب نہیں...... تمہارے ہاں کوئی ہو تو میری جانب سے تم ہی جواب دے دو؟''

کلائی پکڑ مجھے بٹھالیا۔ اسی طرح نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بتانے لگا۔

''میری آنکھوں کے آلنوں سے اَبابیلیں نکلتی ہوئی دیکھ رہے ہو؟''

غصہ تو بہت آیا لیکن اس کا اظہار شاید میرے بس میں ہی نہ تھا۔ مَیں نے جرأت کر کے اُسے اُٹھایا اور سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے کہا۔

''لو اب تم میرے مؤکل ہو...... پون صدی پیچھے پلٹو۔ مَیں تمہیں اَبابیلیں دکھاتا ہوں۔''

مَیں اُس کی چٹائی پہ پڑ گیا اور وہ وقت کی کھینچی ہوئی طناب کے ساتھ وہاں سے کہیں اوجھل ہو گیا۔

## ● مجھے سب یاد ہے وہ ذرا ذرا......!

وقت' روئی کے پھوؤں کی مانند بجلی سی سرعت سے عہدِ رفتہ کی جانب اُڑا جا رہا ہے۔ مَیں بے جسم و وُجود افلاک کی بیکرانیوں میں تحلیل' کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں...... اجرامِ فلکی' میرے جلو میں کہ مَیں ان سے وہ مجھ سے گزرتے جا رہے ہیں...... بنفشی اور دودھیا کرنوں کی ضوفشانی سے فضاؤں میں پھیلے ہوئے نور اُجالے...... یہ سفر لمحوں یا سال صدیوں کا کچھ احساس نہ ہُوا...... بس' کچھ اِشارے' ہلکی سی اُبھرتی ڈوبتی لہریں...... نجول بجلیوں کے سمندر میں مٹتی بنتی موجیں...... موہوم سے گرداب...... کا فوری خ بستگی کا احساس' سکون سکوت اور صدق سا......!

ہونے نہ ہونے کی پہلی کول سی کونپل مہدِ مادر میں پھوٹی...... ایک بیضۂ عالمِ بے کنار و کنار......

ٹُن ٹُن کی بازگشت...... کیسے کیسے نظارے' تسنیم وکوثر کے فوارے۔ گلستان و بوستان' نکہت' بادِ بہاری' نوع نوع کے اشجار واثمار' خوش گلو طیور...... آفتاب عالم تاب' مہتاب انجم رکاب...... قلزمِ بے کراں' آبشاریں' جھیلیں جھرنے' دریا' آب جوییں...... ہر سُو اک ہمہ ہمی' دمادمی...... نہ کوئی چنتا نہ کوئی غم...... علت نہ قلت' ضرورت نہ کدورت' راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

اک نقارہ کی دھم دھم نے بے چین کیا۔ ارد گرد ماحول جیسے سکڑنے لگا ہے۔ ہلکی ہلکی نمی' جس سے مَیں بھیگ سا گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج کچھ ایسا ہونے والا ہے جو پہلے نہ ہُوا۔ یہی ہُوا مجھے دھکے دے دے میرے گھر' میری دُنیا' میرے جہاں سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔ جدھر مَیں نے کئی یُگ بِتائے...... میری سوہنی دھرتی' میرا نیل گگن...... میرے سورج چاند تارے...... کھیت کھلواڑے' ندی نالے تالاب...... میرے بھجولی' لنگوٹیے' دوست غمگسار میرے ساتھ سہارے...... کوئی بھی تو نہ تھا جو مجھے لپک کر روک لیتا یا دو گام میرے ساتھ ہی ہو لیتا۔ ادھر کے سارے بندھن رشتے ناتے پل بھر میں اُدھڑ پدھڑ گئے تھے۔ کوئی روک' آسرا یا پکڑ نہ تھی جسے تھام کر مَیں اپنی جنت نہ چھوڑنے کا کوئی جتن کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مَیں مرغی کے کسی لجلجے رطوبت بھرے انڈے کی مانند پھسلتا ہوا' اک ایسی دُنیا میں آ پڑا...... جس کی ہر چیز میرے لیے انوکھی تھی۔

انہی لمحات میں' مَیں رونے واویلا سے آشنا ہوا۔ اک پوپلے منہ والی بوڑھی سی مخلوق نے میرے ساتھ کچھ ناروا سا سلوک کیا۔ میرے پیٹ کے درمیان سے میری ناڑی کاٹ دی۔ اک بدبودار کپڑے سے میرا جسم صاف کر کے ایک نیم بیہوش مہربان سی عورت کے پہلو میں ڈال دیا۔ جس نے کانپتے ہونٹوں سے میری پیشانی پہ بوسہ ثبت کیا۔ ایک بابے نے میرے کانوں میں لرزتی ہوئی نحیف آواز میں سرگوشیاں کیں۔ میرا اچرا ہوا منہ حلقوم صاف کر کے کوئی گاڑھی میٹھی سی چیز چٹائی...... مجھے سب یاد ہے وہ ذرا ذرا......!

مسجدوں میں جمعہ یا عیدین کی نماز کے بعد جس سرعت سے صفیں لپیٹی جاتی ہیں...... زندگی کے مختلف اَدوار کی چٹائیاں اور قلوں چالیسوؤں کی "نچوڑیاں" بھی کمال عجلت سے اُٹھائی جاتی ہیں۔ بے وقوف بندہ سمجھتا ہے پچاس' سو' ڈیڑھ سو سال جیا' جبکہ یہ عرصہ دو چار لرزیدہ سے لمحوں سے زائد بہر طور نہیں ہوتا......

اک پل میں بدل گئی دُنیا
حادثے بھی عجیب ہوتے ہیں

ہاں' حادثے ہمیشہ عجیب ہوتے ہیں کہ ان کے سرزد ہونے کے بعد بہت سی عجیب وغریب تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں...... میرے ساتھ پہلا حادثہ جو رونما تھا' میرے سر کے متعلق تھا جو پیدائشی طور پہ گول یا چپٹا نہیں بلکہ مصری یا سندھی تربوز کی طرح لمبوترا تھا۔ دائی دوبی (اصل نام فیضاں بی) کے مشورہ پہ ماں جی نے میری

گدی کے نیچے دابڑ چاولوں کی ایک پوٹلی بطور سرہانہ رکھ دی تھی اور منہ ماتھا اوپر آسمان کی طرف کر دیا تا کہ میرا لُبوترا پلپلا سر ڈب کر گول مٹول ہو جائے۔"

کسی جنگلی خرگوش یا بلی کے سات گھروں کے حاجی بلونگڑے جیسی میرے جسم کی پوٹ پہ سیاہ بالوں کی پشم منڈھی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ میں نے بندہ برادری میں نہیں کسی جنگلی جن کے ہاں جنم لیا ہے۔ اساطیری راگ راگنیوں "سروں الاپوں زمزموں کی تعلیم" میری مسلسل ریں ریں سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ آج تک کسی زچہ نے کسی بچے کے منہ کی باچھیں کانوں کی لووں تک اس حد تک چری ہوئی نہ دیکھیں نہ مرغے کی چونچ سُرخ جیب اور حلق کوّے کی لرزان کا ایسا منظر دیکھا ہو گا۔؟

بھالو بھدا جسم نیلا اور نہ چہرہ لال..... کھدّے کیکڑے کی ٹانگوں جیسی ٹانگیں ہوا میں پیڈل چلا چلا کر بھی بے حرونہ ہوتیں۔ ناف کی گانٹھ سُرخ پڑ کر سُوج جاتی اور جب پوتڑے کا چیتھڑا گیلے مُوتے سے بُو مارنے لگتا تو ماں مجھے سُوکھے پیڈال ڈول بڈول سی کھاٹ کی باہی جانب ہو لیتی۔

وقت کی لگن منی..... "لک چھپ جانا مکئی دا دانہ راجے دی بیٹی آ گئی جے"..... یعنی کہیں بھی 'لک چھپ جاؤ..... جاگتے رہو یا سو جاؤ' آسودہ نا آسودہ..... راجے کی بیٹی آ ہی جاتی ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں...... ہر "شروع" نامحسوس رفتار سے اپنے "آخر" کی جانب سرگرداں رہتا ہے۔ بندہ گھنے سائے میں سکون کی خاطر لیٹ جاتا ہے' لیٹے لیٹے "پُرسکون ہوتا ہے تو گہری نیند اوڑھ کر بے سُدھ پڑ جاتا ہے۔ اُدھر وقت کا سورج کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا ہے..... تمازت کی تندی اسے کچوکے دے دے کر بیدار کر دیتی ہے۔ دیکھتا ہے کہ سائے سرک گئے۔ منظر بدل گئے اور ماحول کا موڈ مختلف ہے۔ تب وہ جان پاتا کہ دکھائی اور بجھائی نہ دینے والے وقت میں کتنا دم ہوتا ہے۔؟

وقت کے اسپ رواں پہ بیدار بخت دم کی دم نیکی تو لے لیتے ہیں۔ کسی شجرِ ممنوعہ تلے خوابِ خرگوش کے مزے نہیں لوٹتے..... ریاض کے وقت فیاض صاحب اگر سوئے مرے رہیں تو سرسوتی' اپنے گُر گیان کی گاگریا کسی بے گھرانے والے کے ہاں بھی اُنڈیل سکتی ہے۔

عطائیوں نے بھی بڑی بڑی سبھائیں سجائیں اور کمائی ہیں۔ اصل گُر تو جاگنے اور مکتب سے بھاگنے والے کے ہاں ہوتا ہے؟ ڈنڈے کھانا' ڈنڈی مارنا اور جنوں سے جذب کے ڈانڈے ملانے سے ہی شوق و شغل کا اعتبار پیدا ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ پیدا ہوتے ہی میں پیدا گیر بن چکا تھا۔ ویسے بھی پہلوٹی کا سُرجن 'تکّے پہلو کا نہ پلٹنے کا بہلانے کا نہ ٹلنے کا..... ڈالو دائیں تو بائیں کی کنّی پڑ جاتا ہے۔"

میرا بھی یہی عالم کہ چارپائی کے سیرو پہ چادر کے پلٹے میں ماں نے ڈال کر جھولا دیا کہ اِدھر اُدھر کے

بکھرے کام سمیٹ لوں اور یہ بھیں بھیں کا باجا بھی کچھ باج ہونے لے لے۔ جونہی ماں کی گودگری گم پائی' نرگم شروع ہوئی۔ مائیں چونکہ ایسے شیر خوار اور خدائی خوار بچوں کی فرازیوں سے واقف ہوتی ہیں وہ بھی ٹنی اَن کر دیتی ہیں کہ خود ہی تھک ہار کر چپ پکڑ لے گا۔ ایسی صُورت پیدا کر لیں گی جیسے اِدھر موجود ہی نہیں۔''

یہ حکمت عملی اکثر کارگر ہو جاتی ہے۔ صدقے وارے پچ پچ نہ پا کر بچہ چپ سادھ لیتا ہے...... آخری حربہ گود بھر لینا یا جھولنے کو جھولا دینا بھی ہوتا ہے۔ چینڈو گم کوس یا مصروف مائیں افیون کی چونڈی بھی چُسا دیتی ہیں...... میری ماں نے یہ سب جائز ناجائز حربے آزما دیکھے مگر کچھ حاصل نہ ہُوا۔ تب اُس نے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا کہ روئے طوفان...... بندے اور شیطان کے معاملے جب کچھ سمجھ نہ آوے تو چپ اور صبر ہی بھلا!

کئی بار یوں بھی ہُوا' ماں مجھے کھاٹ کھٹولے کے جھولنے میں ڈال' لنگوٹ اور دُودھ کا کورم پور کے گھڑی دو گھڑی کمر سیدھی کرنے لیٹی... پیٹ ہلکا کرنے کی خاطر ہمسائی سے باتیں کرنے کوٹھے چڑھیں یا دروازے گلی' کسی پھیری والے سے بھاؤ تاؤ میں اُلجھ کر واپس لوٹی تو میں اُسے پلنے میں دکھائی نہ دیتا...... ڈھنڈیا پڑنے پہ کبھی اناج کے بھڑولے' چکی کے نیچے' چرخے کے تکلے کے پاس' ڈیوڑھی کے کونے پڑی گند کوڑے کی کنالی میں...... دو ایک بار کوٹھے پہ تنور کے اندر سے بھی برآمد ہُوا۔

کوٹھا سوتنے والی مہترانی ایک بار نہلا دُھلا کر مجھے لائیں تو کہنے لگی...... ''پتا نہیں کوڑے والی ٹوکری میں کیسے چلا آیا؟ کوڑا چھینٹے لگی تو یہ اندر لیٹا مسکرا رہا تھا۔'' ماں جی کے ہاں اگر دو چار بچے پہلے ہوتے تو یقیناً کوٹھا اُتارنے والی ماسی کو مجھے واپس لانے پہ انعام میں دے دیا ہوتا۔

یہ اچانک گم ہونے والا عُقدہ میرے والدین پہ کبھی نہ کھلا۔ عہدِ طفلی کہ پلنے سے نیچے اُترنا تو درکنار' ننھا بچہ خود سے کروٹ تک نہیں بدل سکتا۔ اونچائی سے نیچے اور پھر کسی کی نظر میں آئے بغیر' دُور نزدیک کی ایسی جگہوں پہ پہنچ لینا کہ کسی کو پتا بھی نہ چلے' یقیناً مجھ شیر خوار بچے کا غیر معمولی فعل تھا۔

کہتے ہیں کہ سُوئوں کے مُنہ جمتے وقت ہی تیکھے ہوتے ہیں اور بطخوں مرغابیوں کے بچے جماندرو پیراک ہوتے ہیں۔ اسی طرح' خاص طور پہ دُرویش اور مخنث بھی پیدائشی ہوتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں' شاعر' موسیقار' مصور' فلاسفر' لیڈر اور عاشق بھی کسی حد تک پیدائشی ہوتے ہیں۔ مگر نہیں! یہ کریکٹر اپنی پیدائش پہ محض نومولود ہوتے ہیں ان کے پاس کوئی ڈگری یا ثبوت نہیں محض کچھ فطری رجحان ہوتا ہے۔ باقی سب تربیت' حالات' ماحول اور کسی کی نظر و صحبت کا فیضان ہوتا ہے۔''

دُرویش اور مخنث جنم لیتے سے اپنا ثبوت اور سند ہاتھ میں لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ پہلی گواہی' جہاندیدہ دایہ کی ہوتی ہے۔ دایہ اگر مائیہ بھی ہو تو پہلی بار ناف ملنے پہ ہی پیٹ ہیجڑوں کی گن مُن لے لیتی ہے۔ چھ ماہا ہوگا یا

ماہئے تو یہ تک بتا سکتی ہے سٹ ماہا..... پورے دِنوں یا اوپر کچھ دن لے گا' نر دیا مادہ! اُلٹا پڑا یا سیدھا ہے۔ درویش ہے یا بادشاہ! سعد ہے یا نحس! اپنی اپنی سائنس اور حکمت' جسے اللہ عطا کر دے۔

ایسی لمبی تمہید باندھنے کا مقصد محض یہ بتانا تھا کہ مَیں شاید جماندرو درویش تھا۔ ہماری خاندانی دایہ جس کی مسیحا دستی سے ہمارے خاندان کی قریب قریب آدھی نسل اِس عالم ناپائیدار میں بسلامتی پیدا ہوئی۔ زچگی کے بعد میری ماں کو بیٹے کی مبارک دیتے ہوئے یہ خوشخبری بھی سنائی۔

''بی بی! ایک سو چھپن بچے میرے ہاتھوں پیدا ہوئے۔ یہ میرا آخری بچہ تھا۔ اس کے بعد مَیں نے دایہ گیری کا کام ہی چھوڑ دیا ہے۔''

میری ماں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

''ماسی! رَبّ خیر کرے۔ تیرے ہاتھوں میں بڑی برکت ہے۔ سارا شہر تیری عزت کرتا ہے۔ ابھی تو ایسی بوڑھی بھی نہیں ہوئی کہ یہ کام نہ کر سکے؟''

دائی ماسی نے ماں کو کوئی تسلی بخش جواب تو نہ دیا۔ اتنا کہا۔

''مَیں تجھے بتاؤں گی پر ابھی نہیں' تھوڑی دیر بعد جب تو اسے اچھی طرح دیکھ لوگی......!''

زچگی کے بعد زچہ نارمل نہیں ہوتی۔ وہ تھکی ہاری' ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے۔ نہ تو کچھ صحیح سے دکھائی اور سنائی دیتا ہے نہ کچھ سوچ اور محسوس کر سکتی ہے۔ دیر تک بے سُدھ و بے ساز پڑی رہتی ہے۔ وہ اس ترنگ میں بھی ہوتی ہے اس نے ایک بڑا مشکل مرحلہ کامیابی سے طے کیا۔ بچہ' نر ہو یا مادین' اس کے لیے کچھ فرق نہیں پڑتا لیکن فرق پڑتا بھی ہے' نر بچے کی پیدائش پہ اس کی مسرت و تفاخر کا کچھ ٹھکانا نہیں ہوتا' سرشار و مخموری فضاؤں میں اُڑنے لگتی ہے۔ نر بچہ پیدا ہو تو سب سے پہلے اُس کی نچلو دیکھی جاتی ہے۔

آن بان والے بادشاہ' راجہ مہاراجہ' وڈیرے' نوابین' خواتین' جاگیردار' منصب دار' عزت دار' اپنے بچوں کی پیدائش کے موقع پہ رازداری اور نگہداری کا خصوصی انتظام کرتے ہیں۔ دایہ کی ایک ایک حرکت پہ نظر رکھی جاتی ہے اور زچہ کے اردگرد' قابلِ اعتماد عورتوں کا پہرہ رہتا ہے۔ کمرے کے پاس ایک دیوارگیر کی اوٹ' بچے کا باپ اپنے معتقدین کے ہمراہ موجود ہوتا۔ اس دوران خاندان کی کوئی بزرگ یا نانی دادی' پیدائش کے ابتدائی اُمور پہ کڑی نظر رکھے رہتی۔ جونہی بچے کا سر اور آدھا جسم برآمد ہو جاتا۔ پیچھے تیار کھڑی کوئی عورت' دایہ کے سر منہ کو موٹے کالے کپڑے سے ڈھانپ دیتی ہے۔ دایہ اور مددگار عورت بقیہ کام' نیم تاریکی میں' بن دیکھے انجام دے کر بچہ دیوارگیر کی اوٹ کھڑے اس کے باپ کے حوالے کر دیتیں۔ جو نہایت عمیق نظری سے نومولود کے جسم' خصوصی طور پہ جنسی اعضا کا جائزہ لیتا۔ مطمئن ہونے پہ' زر و جواہر سے بھری پوٹلی کے ساتھ واپس

کر دیا جاتا۔ مبارک سلامت کے ساتھ شادیانے گونج اُٹھتے۔

کبھی کبھار آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگتے ہیں تو بغل میں دُبکے ہوئے معتقدِ خاص کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ سر جھکا کے چپ چاپ 'مولود کو اپنے مالک سے لے لیتا ہے اور پلک جھپکتے' بغلی کمرے میں گھس جاتا ہے۔ اس کمرے میں بھی اک زچہ خانہ کھلا ہوتا ہے۔ جدھر بہت سی عورتیں بچے' جننے کے لیے تیار پڑی ہوتی ہیں یا بچے جن چکی ہوتی ہیں۔ ان کے سوچنے سمجھنے' دیکھنے سننے کے حواس 'سریع الاثر ادویات سے معطّل کر دیے ہوتے ہیں۔ اسی دوران اپنے مطلب کا نر یا مادہ بچہ وہاں تبدیل کر لیا جاتا ہے اور اگر ایسا کرنا ضروری نہ ہو تو بچے کو مردہ ظاہر کر کے دفنا دیا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہُوا کہ وہاں موجود تمام لوگوں کو قتل کروا دیا جاتا تا کہ اصلی اور نقلی بچے کا راز کبھی نہ کھل سکے۔

مَیں کتنی بار سویا اور جاگا' وہ کیا کچھ کہتا سناتا رہا کچھ یاد نہ تھا چونکہ مَیں اُس کے کلبوت میں اور وہ میرے ہیولے میں ہمزاد تھا۔ مَیں اپنا کوئی حکم اس پہ مسلّط کرنے پر قادر نہ تھا۔ یہی بہتر کہ مَیں اُس کی لن ترانیاں 'ستا رہوں یا سننے کی اداکاری کرتا رہوں۔ نہایت محتاط انداز میں جرأت سے کہہ ہی دیا۔

"آپ اپنی کتھا سناتے سناتے تھک گئے ہوں گے۔ باقی داستان پھر سہی...... آپ میرے معزز ہمزاد ہیں' کچھ آپ کی بھی مصروفیات ہوں گی لہٰذا آپ......؟"

اُس نے مجھے قہر بار انداز سے گھورتے' ڈانٹ پلائی۔

"خبردار جو تم نے مجھے کوئی مشورہ دینے کی کوشش کی۔ مَیں تمہارا ہمزاد ہوں اور میرا خصوصی فرض ہے مَیں تمہارے متعلق لکھنے پہ تمہاری ہر ممکن مدد کروں۔ لکھنے اور پیار کرنے کا اپنا ایک بہاؤ اور خاص وقت ہوتا ہے۔ تمھیں انتہائی سعادت مندی اور غور سے مجھے سننا چاہیے۔ تاکہ تمھیں پڑھنے سننے والے تمہارے ظاہر و باطن کی چند خوبیوں اور بہت سی خرابیوں سے خُوب واقف ہو سکیں۔"

مَیں نے اپنا خشک حلق تر اور اُس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی خاطر یُونہی پوچھ لیا۔

"یہ تم نے پیدائشی مخنث اور دُرویش کی بات سنائی۔ مَیں اسے کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا۔ کہاں مخنث اور کہاں دُرویش؟ ان دونوں کی آپس میں کون سی قدر مشترک ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتاؤ کہ یہ بڑے لوگ اپنے بچوں کی پیدائش پہ اتنے متردّد اور محتاط کیوں ہوتے ہیں جبکہ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ پیدا ہونے والا کیا ہے' کیسا اور کیوں ہے......؟"

"تم کبھی کبھی کوئی اچھی بات بھی کر لیتے ہو۔ پہلے مَیں تیرے دوسرے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ نام نہاد بڑے لوگ جب خود کوئی بدی بُرائی کرنے پہ آتے ہیں تو خدا کا تصور یا خوف ان کے دُور دُور تک نہیں

ہوتا۔ جو ان کے مَن اور ظن میں آتا ہے' جوانی' دولت' طاقت اور زور و زعم میں کر گزرتے ہیں اور جب معاملہ اللہ کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے تو پھر مکافات عمل کا خوف ان پہ طاری ہو جاتا ہے' کہیں ان کی کرتوتوں کی پکڑ نہ ہو جائے۔ ایک اور وہم ان کے دماغ میں گھر کر جاتا ہے۔ کہیں لڑکی نہ پیدا ہو جائے...... سمجھ سے بالا ہے کہ لوگ لڑکیوں کی پیدائش پہ خوش کیوں نہیں ہوتے؟ جبکہ ان کی ماں' بیوی' بہن بھی کبھی لڑکیاں تھیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی نامعلوم خدشہ ان کے اعصاب پہ سوار رہتا ہے کہ کہیں بچہ' بدشکل' بداعضا' بدرنگ یا نحس پیدا نہ ہو جائے۔ نجومیوں' جوتشیوں اور مختلف علوم کے سیانے لوگ اپنے قریب رکھتے ہیں۔ پیدائش کے فوراً بعد ہر کوئی اپنے اپنے علم' حساب کتاب سے نومولود کی جنم پتری تیار کرتے ہیں۔ نئے' ستاروں بُرجوں اور موسم کے تجزیات ہوتے ہیں۔ اس کے منہ ماتھے' ناک آنکھوں اور سر سے شگن اُٹھائے جاتے ہیں۔ قیافے اندازے لگائے جاتے ہیں۔ جب ہر جانب سے بچہ اُوکے ہو جاتا ہے تب بچے کی آمد کا سرکاری دربار ی اعلان ہوتا ہے۔ بچہ اُوکے نہ ہونے کی صورت میں قتل کر دیا جاتا ہے...... یا بڑی رازداری و ذمہ داری سے کسی معتمد کو دے دیا جاتا ہے۔ صدیوں سے کم و زیادہ کچھ یوں ہی ہوتا آ رہا ہے۔''

''دُنیا بھر کی بادشاہتوں' ریاستوں' راجواڑوں' جاگیراروں حاکموں کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح اگر میرے پہلے سوال کا جواب بھی دے دو تو مجھے اس موضوع کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ وہی مخنث اور دُرویش والا سوال؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھ لیا۔

خموشی سے مجھے گھورتا رہا' پھر بادلِ نخواستہ معاندانہ لہجہ میں گویا ہوا۔

''تمہیں کبھی فرقان الحمید پڑھنے کی توفیق ہوئی ہو تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے صبر و شکر کرنے والوں کو بڑی بشارتیں دی ہیں۔ اگر تم میں بھی صبر و شکر کی خوخوبی آ جائے تو تمہارے بہت سے روحانی مسئلے حل ہو جائیں۔ میں اس کے بعد تمہارے پہلے سوال کی جانب ہی آ رہا تھا۔ خیر' میرے نصیب میں اگر تم لکھے ہی گئے ہو تو سوائے صبر اور کوئی چارہ بھی تو نہیں؟

اللہ کریم نے نوع نوع کی مخلوقات پیدا فرمائیں جن تک بنی نوع آدم کی رسائی ممکن نہیں (استثناء کے ساتھ) کچھ ایسی بھی جو اس کے آس پاس اور دائرہ اختیار میں ہیں مگر اس کی نظر اور علم میں نہیں۔ اللہ کی کائنات تو بہت دُور کی بات انسان تو ابھی تک اپنے جسم' وجود کی ظاہری باطنی کائناتوں' خود متعلقہ مخلوقات سے کماحقہٗ آگاہی حاصل نہ کر سکا۔ محض انسانی دماغ میں ایک سو ستر کائناتیں ہیں...... معدودے چند کے علاوہ' خاص و عام میں بھی دو چار سے زائد کوئی دریافت نہ کر سکا۔''

میں اس ہرزہ سرائی کو سن کر دل ہی دل حیران ہونے کے ساتھ شرمندہ بھی ہو رہا تھا کہ کس تجہندی

جنس سے واسطہ پڑا ہے۔ کچھ پوچھنے کے لیے زبان کھولنے ہی لگا تھا کہ اِدھر سے فوراً سرزنش قدمی ہوئی۔

"خبردار! پھر کوئی اڑنگا نہ لگانا۔ بات پوری ہونے نہیں دیتے اور اگلا سوال شروع...... پہلے مجھے بات ختم کر لینے دو......!

مَیں بتا رہا تھا کہ اللہ کی کائنات' اس کی مختلف مخلوقات' اس کی حکمتیں مصلحتیں' ان کے فائدے نقصانات کے بارے' وہی بہتر جانتا ہے۔ ہم اپنی ناقص عقل' نامکمل علم اور محدود دائرہ و ادراک و مشاہدات کی بناء پر اُس کے خدائی نظام کو نہیں سمجھ پاتے...... نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم اپنے ناقص فیصلوں کو ہی قولِ فیصل سمجھتے رہتے ہیں۔

انسان کی لکھی کتابوں میں علمِ لَدُنی نہیں علم دُنیا کے اُدھورے علوم کی فہرست' اشاریے اور اقتباسات ہوتے ہیں۔ محض ان کاغذی کتابوں میں انحصار کرنے والا طالبِ علم' علم کی رُوح سے استفادہ کرنے سے عاجز رہتا ہے۔ دُنیا کے مروجہ علوم کی ڈکشنریاں' سمندر جھاگ کی مانند ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والے مَعنٰی باطنی طور پہ بانجھ اور بے مَعنٰی ہوتے ہیں۔ جیسے آئینہ کا ایک رُخ' ایک مکمل آئینے کی تعریف نہیں ہوتا۔ بانجھ کے مَعنٰی ہیں عاجز' بے ثمر بے بشارت...... اب کسی بھی اچھی آہنگ میں درویش اور مخنث کے مَعنٰی دیکھو؟

مخنث بمعنیٰ ہیجڑا' زنانہ یا کھسرا ملے گا جبکہ مخنث تو وہ مخلوق ہے جس کی تخلیق کا اصل مقصد صرف اللہ جانتا ہے کہ علیم وخبیر ہے۔ نَر اور مادہ کے مابین کی یہ مخلوق علائقِ نفسانی سے یکسر بے نیاز ہوتی ہے...... بَدنی پلیدی' جو مرد و زن کے ہاں ایک باقاعدہ مصیبت ہے' یہ اس سے بھی مستثنٰی ہوتے ہیں...... آل اولاد کے بکھیڑے سیاپے نہیں ہوتے۔ یہ معصوم قدسی نفس مخلوق! فلسفہ اَرض وسما...... یعنی "الف لام میم' تیری رضا میری تسلیم" کی ایک انسانی تفسیر ہوتے ہیں۔"

اس کرۂ اَرض پہ جہاں کہیں عبادت گاہیں' معبد' مقدس مقامات' مقدس کتب خانے' مقدس یادگاریں موجود ہوئیں ان کے مجاورت' دیکھ بھال' صفائی ستھرائی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ قدرت نے انہیں مخنث کا اعزاز ماں کے پیٹ میں ہی عطا کر دیا۔ ان میں ایک نسل ایسی ہیں جن کی ریش نہیں ہوئی...... ان کا جسم غیر ضروری بالوں سے آلودہ نہیں ہوتا ہے...... آواز مہین' چال میں مٹک نہیں ہوتی۔ متمدن معاشروں میں یہ لوگ صاحبِ ثروت وجاہ' بڑے بڑے پُر وقار عہدوں پہ متمکن اور معاشرے میں اشراف کہلاتے ہیں۔ کوئی انہیں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ان کا تمسخر نہیں اُڑاتا۔

اب ان لوگوں کے منفی پہلوؤں پہ اگر ایمانداری سے نظر ڈالیں تو اس میں بھی ان کا ایسا قصور نہیں کہ سارا الزام انہیں پہ دھر دیا جائے۔ ان سے منسوب خرابیوں کا اصل ذمہ دار ہمارے معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو

اپنی شخصی اقتصادی، تعلیمی، اخلاقی اور جنسی ناآسودگی و ناہمواریوں کی دلدل میں گردن تک غرق ہو چکا ہے۔ ہماری گلیوں محلوں، کچی آبادیوں کا مخلوط ماحول بھی اس کا ذمہ دار ہے۔ ہماری ثقافتی، تفریحی روایتی لوک دلچسپیوں، کھیلوں، میلوں، ٹھیلوں کا فقدان بھی اس کی ایک وجہ ہے۔ ہم نے اپنی کمیونٹی سے انہیں علاقہ بدر کر دیا ہوا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیا کریں؟ کیا کوئی دکاندار، سٹور، بس ویگن والا، سیکورٹی کا ادارہ، بینک، ریلوے، پولیس، ایئر لائن، کوئی وکیل، ریسٹورینٹ وغیرہ ان کو اپنے ہاں ملازمت دیتا ہے؟ جواب نفی میں ہے...... لے دے کے ایک دو کام ہی رہ گئے جن کے کرنے سے یہ اپنا دوزخ بھر سکیں...... بچوں کی پیدائش، لوری، شادی بیاہ، تیل مہندی وغیرہ۔ یہ ان کو ودھائیاں مل جاتی ہیں۔ ایسے فنکشنوں کی کامیابی سے ان میں ماڈرن لباس و میک اپ کا رجحان بڑھا۔ ان کی چاندی دیکھ کر خوبصورت نازک لونڈے اس جانب راغب ہوئے۔ اچھے خاصے مرد، دو نمبر ہیجڑے بن کر روزی روٹی کمانے لگے۔ زنخے، کھسرے، ہیجڑے، ہومیوپیتھی، جنت کی چڑیاں...... مورتیں، کھدڑے، پھنتے، چھکے، سائیکلیں وغیرہ یہ سارے سلسلے، اصل مخنث کی دو، تین اور آرے چار نمبر کلوننگ ہیں...... اور ان میں ایسی کالی بھیڑیں شامل ہیں جن کی وجہ سے یہ مورد نفرت و تمسخر بن گئے۔ اصل مخنث خواجہ سرا، حد درجہ پاک طینت، پارسا ہوگا۔ ناچ گانا اس کا معاش نہ ہوگا۔ انہی درویش منشوں میں حاجی، نمازی، بڑے بڑے عبادت گزار اور نیک شعار ہوتے ہیں۔"

بات بہت بڑھ گئی بتاتا چلوں کہ زچگی کے وقت، فوری طور پر بچے کا معائنہ بھی اسی خدشہ کا اظہار ہوتا ہے۔ کہیں نومولود مخنث نہ ہو، جو خاندان کی بدنامی کا باعث بنے۔ اکثر ایسا کہ مخنث پیدا ہونے پر اسے مار دیا گیا۔ کوئی بڑا خدا ترس ہوا تو رازداری سے دولت کا لالچ دے کر کسی غریب کو دے دیا جاتا۔ درویش بھی ماں کے پیٹ سے درویشی لے کر آتا ہے۔ دونوں کی بیشتر قدریں مشترک ہوتی ہیں۔ مخنث کا پتہ، ماں کے پیٹ سے ہی مارا ہوا ہوتا ہے جبکہ درویش، دنیا کے جہنم میں پہنچ اس کا تہس نہس کر دیتا ہے۔ دونوں تارک الدنیا و لذات ہوتے ہیں۔ دونوں ہی نفی کا نمکدان ہوتے ہیں۔ ذرا سی "میں" نے کہیں سر اٹھایا جھٹ نمک چھڑک جلا دیا......!

دونوں ہی پیدائشی مختون ہوتے ہیں۔ کسی کے ختنے، کچھ حساب سے ہو گئے تو وہ درویش اور جس کے بے حساب، تو اسے مخنث بنا دیا۔ وہ جو چاہے بنا دے، کسی کا کیا زور؟...... وہ بے نیاز...... اُس کی وہی جانے؟ بندہ تو میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا تھو تھو کرتا۔ ذرا سی تنگی ترشی سے واسطہ پڑ جائے تو رب سے گلے شکوے کرنے لگتا ہے۔ میٹھا بادام چلغوزہ، مزے لے لے کر کھاتا ہے، لیکن کڑوا عجیب و غریب منہ بنا کر تھوک دیتا۔ ایک خان صاحب کا جی جامن کھانے کو چاہا۔ بڑے چاؤ سے جامن خریدے اور ایک درخت تلے بیٹھ کر کھانا شروع کر دیے۔ کھاتے دوران بے دھیانی میں ایک موٹا کالا سیاہ بھونڈ مکڑا، جامن جان کر منہ میں دھر لیا۔

دانتوں تلے نجوبڈ نے پھڑپھڑانا بھیس بھیس کرنا شروع کردیا...... خان صاحب نے اس پہ دانتوں کا مزید بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔ بھیس کرو یا چیں' جہاں میٹھے جامن کھائے وہیں ایک کڑوا بھی سہی...... سادے لوگ اکثر حکمت کی باتیں سمجھ لیتے ہیں مگر بزعم سیانے نہیں سمجھ پاتے۔

رابعہ بصریؒ اپنی خانقاہ میں مریدوں کے درمیان فروکش تھیں۔ اچانک سامنے دروازہ کی جانب نگاہ اُٹھی...... ایک نوجوان منہ لٹکائے' ماتھے پہ کپڑے کی پٹی باندھے کھڑا دکھائی دیا۔ آپ کچھ ساعتیں' تند بالا نظروں سے اُسے دیکھتی رہیں...... اشارہ سے پاس بلایا' بٹھایا۔ سر پہ پٹی باندھنے کی وجہ دریافت کی...... اُس نے جواب دیا' دو روز سے سر میں شدید درد ہے۔ بہت جتن کیئے پر افاقہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ آپ کے پاس دُعا کے لیے آیا ہوں...... مائی صاحبہ نے پوچھا...... تمہاری عمر کتنی ہے؟...... جواب ملا۔ بائیس برس...... مزید پوچھا...... بائیس برس میں کتنی بار ایسی تکلیف ہوئی؟...... اُس نے بتایا۔ صرف ایک بار......!

حیف ہے کہ بائیس برس صحت مند رہے اور کبھی ایک بار بھی مالک کی شکر گزاری کا جھنڈا نہ اُٹھایا...... ایک بار تکلیف ملی تو ماتھے پہ شکوے کا پھریرا باندھ لیا۔

انسان بڑا ناشکرا اور بے ظرف واقع ہوا ہے۔ احسان فراموشی' نسیاں' تلوّن اس کی رگ رگ میں بھرا ہوا ہے۔ میرے بابا جی رحمتہ اللہ علیہ' میری شرارتیں اور مستیاں' کمال تحمل اور فراخ دلی سے نہ صرف برداشت کرتے بلکہ فروگذاشت بھی کر دیتے تھے۔ میرے ہمعصر مرید' جو قریب قریب سب ہی عمر میں بڑے تھے مجھ سے اِسی وجہ سے جز بز رہتے۔

محلاتی سازشوں کی مانند خانقاہوں ڈیروں میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے' طریقہ واردات قدرے مختلف اختیار کیا جاتا ہے۔ قتل نہیں کیا جاتا' کسی کو زہر نہیں دیا جاتا۔ اس کی آنکھیں نہیں نکالی جاتیں۔ محض اندر ہی اندر کچھ کدورت پال لی جاتی ہے۔ بس! بابا جی سرکار بھی یہ کچھ جانتے تھے' لیکن نہ کبھی اُنہوں نے مجھے صبر کی تلقین کی اور نہ ہی اُنہیں' اندر صاف کرنے کے لیے کہا...... ہاں' موقع محل کے مطابق کبھی کبھی کچھ اشارے دے دیا کرتے۔ مثلاً جو بھی کرو' سامنے کرو' پیٹھ پیچھے کچھ نہ کہو۔ ایسے نیک اور اچھے نہ بنو کہ تمہیں منافقت کا سہارا لینا پڑے۔؟

معاف کر دینا...... خدائی وصف ہے یا پھر اِن باکمال اور منتخب لوگوں کا وطیرہ جو خشیت الٰہی سے تھر تھر کانپتے رہتے ہیں۔ معاف کرو اور نہ کسی سے معافی چاہنے کے حالات پیدا کرو۔ اِس طرح تمہارے معاملات اور حالات میں فلاح پیدا ہوگی۔ کسی کی بابت دل میں کدورت نفرت رکھنے سے لاکھ درجہ بہتر ہے تم سرِ بازار' اُس کے سر پہ گدھے کی لید پھینک کر اپنی نفرت کا اظہار کر دو...... مگر دل کا فرش صاف رکھو۔"

باباجی کی ایسی حکمت بھری باتیں سیدھی میرے دل و دماغ میں نقش ہو جاتی تھیں اور میں حتی المقدور ان پہ عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا۔ یہی وجہ کہ میں بجائے کسی احساس کمتری یا برتری کا شکار رہتا۔ دل ہی دل میں انہیں بے ضرر بشر سمجھ کر در گزر کرتا۔ بہت بعد جب میں کچھ عمر میں بڑا اور بہت آوارہ گرد ہو گیا...... اکثر کئی کئی روز غائب رہتا تو باباجی میری ہلکی سی سرزنش فرماتے تو میرے ساتھی بہت خوش ہوتے...... ایسے مواقع پہ باباجی بھی اُن کا ساتھ دیتے اور ہاں میں ہاں ملاتے"میں باباجی کی اس ادا کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ بہت بعد کسی کے پوچھنے پہ فرمایا۔تم کیا سمجھو کہ یہ محمد یحییٰ خان کیا ہے؟ اس کو فقیری درویشی' خدا نے ماں کے پیٹ سے عطا کی ہے...... یہ مختون ہے یعنی اس کے ختنے قدرتی ہوئے ہیں پھر اُنہوں نے مندرجہ بالا' مخنث اور ذرویش کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔"

اسی بات کو بڑھاتے ہوئے قصہ سناتا ہے۔ کہتا ہے...... کسی دوسرے شہر سے ایک شخص میرے پاس آیا کرتا تھا۔ تجارت پیشہ متمول شریف آدمی...... اپنی لمبی چوڑی برادری کا چوہدری...... گورنمنٹ کنٹریکٹر ملٹری کو خیمے ٹینٹ' رسے' بانس وغیرہ سپلائی کرتا تھا۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی' اگر کوئی کمی تھی تو وہ اولاد نرینہ کی...... پکا مسلمان ہونے کی دیگر نشانیوں میں ایک نشانی شادیاں بھی ہے۔ وافر دولت' صحت' شہرت و عزت مل جائے تو پھر کمی صرف کسی نئی شادی کی ہوتی ہے۔ اس معتبر شخص کی پہلے تین شادیاں ہو چکی تھیں' جن سے لڑکیاں ہی تھیں لڑکا نہیں تھا...... دلیل معقول موجود تھی...... ایک خوبصورت عورت کا رشتہ بھی دکھائی دیا۔ اسی حیص بیص میں تھے کہ کسی اصلی نجومی سے مٹھ بھیڑ ہو گئی...... غرض مند' ہر جگہ اپنی چتا ہی سامنے لاتا ہے۔ نجومی نے ہاتھ تکی دیکھ کر خوش خبری سنائی کہ چوتھی شادی سے اولاد دکھائی دیتی ہے...... لڑکی ہے یا لڑکا' یہ واضح نہیں کیونکہ لکیر آگے سے واضح نہیں لیکن یہ صاف ہے کہ اس بیوی سے آنے والی اولاد کا مقام بڑا اُونچا ہوگا۔ ایسی اولاد ہزاروں میں کہیں ایک آدھ ہی پیدا ہوتی ہے۔

چوہدری سلامت کو نجومی کی بات میں اولاد نرینہ کی گھات لگی محسوس ہوئی۔ جھٹ دو بول پڑھوائے اور تین بیویوں پہ چوتھی بیوی لے آئے۔ گھر میں مَن کی ریل پیل تھی۔ نوکر چاکر حویلیاں گاڑیاں...... نئی دُلہن کے چاؤ چونچلوں میں جب دو اڑھائی ماہ گزر گئے تو ایک رات دُلہن نے چوہدری صاحب کے کان میں" دن اُوپر گزرنے" کی نوید سنائی۔ خوشیاں' خوش رنگ پرندوں کی مانند ہوتی ہیں۔ خوش فہم بندے کی دُنیا نت رنگ! وہ بن پیئے ہی سرشار و شاداں رہتا ہے۔ سورج اس کی بغل اور چاند آستین سے طلوع ہوتے ہیں۔ اے کاش! یہ طلسم ہوشربا کی دُنیا سدا یونہی فرحت و فسوں خیز رہے تاکہ اس میں بسنے والوں کے چہروں پہ نومیدی کی تازگی کھلی رہے...... مگر ایسا تو فطرت کے خلاف ہے! کائنات کے مسلّم اُصولوں کے برعکس...... ایسا ہی ہو تو بشر

کا حشر نشر ہو جائے۔ ریگ گھڑی ذرہ ذرہ زیر ہو جاتی ہے اک بار پھر اپنا پہلو بدلنے کے لیے۔''

دایہ جو مائی نہیں تھی' ساتویں مہینے ہی بیٹے کی خوشخبری سنا کر جاپانی سوٹ' دس تولے چاندی کے کڑے' دس روپے' من گڑ شکر' نجوری گئی کی فرمائش سنا دی تھی۔ چوہدری نے حامی بھی بھر لی۔ دو کوری کنالیاں' دو گھوٹے میٹھا گڑ وا تیل......کوری واکل' کھدر گھوو میں ڈالنے جراثیم کش دوا......وارنے کے لیے پھکری کی ڈلیاں......ناڑو کاٹنے کے لیے چاندی کی قینچی......دو عدد لالٹین' چٹانے کے لیے شہد' خاکِ شفا' منگھانے کے لیے گھٹو اور صدقے کے بکرے مرغیاں برآمدے میں بندھی ہوئی تھیں۔ باشونائی کا سب انتظام مکمل تھا......مٹھائیاں اور پکوان تیار۔ علاقے کے ڈوم مراثی' کھسرے سب بیٹھے چوہدری کے آنگن میں ''چاند'' کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وقت یوں آہستگی سے سرک رہا تھا جیسے کسی نے اسے باندھا ہوا ہو۔

برآمدہ دالان' صحن رشتہ داروں اور نوکر چاکروں سے بھرے ہوئے تھے۔ دو کمرے آگے اندر' پرکھوں کے چنیوٹی چھت والے کمرے میں جس کے درمیان شہتیر پہ بمبئی طرز کا پرانا جھولا لٹک رہا تھا۔ خالص تانبے اور پیتل کی زنجیریں۔ پرانے ساگوان کی خوشبودار لکڑی کا تخت......تین اطراف اخروٹی چوب کی بغل گیری' اُوپر پیتل کے لٹکتے ہوئے لاٹو......تخت پہ دیسی کپاس کا تھپلا سا آتشی شنیل کا گدا......کمرے میں ہر شخص دم بخود سا' وقت کی کسی کروٹ کا منتظر......زچہ اپنے الگ کمرے میں دردِ زہ میں مبتلا تھی۔''

سیانے کہتے ہیں کہ ہر طرح کے آنے جانے کا وقت مقرر ہے۔ وہ زندگی ہو یا موت! غم یا خوشی......!

● سو لازم ٹھہرا......!

اک نسوانی گھٹی گھٹی سی چیخ نے اِدھر کے ماحول میں اک سنسنی سی پیدا کر دی تھی۔ موجود مرد و زن کے دلوں کی دھڑکنیں معمول سے زیادہ ہو گئیں۔ محتاط نگاہیں اور متوجہ کان' پچھلے کمرے کی جانب لگ گئے......وہ ساعت آ پہنچی تھی جس کا ہر کسی کو انتظار تھا۔ بچہ پیدا ہوا تھا لیکن اُدھورا......!

موتنے والی جگہ پہ چھوٹے بیر کی گٹھلی طرح ایک گلٹی سی تھی جس کا مطلب تھا بچہ مخنث ہے......اک خامشی' سناٹا طاری ہو گیا۔ چوہدری' ہکا بکا منہ آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ موجود دیگر لوگ بھی اک دوسرے سے نظریں چُرا رہے تھے۔

بچہ مُردہ پیدا ہوا یا زچہ چل بسی؟

منہ کھولنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ آنکھوں آنکھوں سب اک دوجے کو ٹٹول رہے تھے۔ چوہدری!

نے اپنے منشی' دو پہلی بیویوں اور ایک دو خانہ زادوں کے علاوہ سب کو باہر بھیج دیا۔
اعلان کروا دیا' بچہ مردہ پیدا ہُوا ہے۔ چوہدری نے اپنے ایک دو معتقدوں کو' کچھ سمجھایا اور باہر چلا آیا۔
ایک معصوم و مظلوم مخنث نومولود......! احتجاجاً وہ رویا چلایا تو بہت...... مگر موٹے کپڑے کی چادر میں
اُس کی فریادیں کسی کو سنائی نہ دیں۔ چوہدری کے حکم پہ فی الفور اُسے بڑی رازداری سے دُور ایک گاؤں روانہ کر
دیا گیا...... دو نوجوان مرد اور ایک عورت' جو اِسی گاؤں کے رہائشی تھے۔ بچے کو لے کر رات کے تیسرے پہر
اِدھر پہنچ آئے تھے۔"

کنارے اور بیچ دریا چھوٹے سے بیلے میں ملاحوں اور گوجروں کے ڈیرے تھے۔ یہیں بیلے میں
اک بے نام و نشاں شکستہ سی قبر! جس کے اِردگرد چند جھونپڑے اور ایک مٹی سرکنڈوں سے بنا حجرہ! اِدھر
ایک نیم مجذوب ننگا فقیر پڑا رہتا تھا۔ جبکہ جھونپڑوں میں مویشیوں کی رکھوالی اور دودھ دھونے والے گجر
رہتے تھے۔ بھنگ اور دیگر منشیات کا شغل بھی ہوتا...... کبھی کبھار کوئی جرائم پیشہ بھی اِدھر دکھائی دے جاتا۔
قبر کے پاس خستہ حال حجرے میں البتہ ایسا کوئی کام نہ ہوتا کہ مجذوب فقیر کے تصرف میں تھا۔ اِدھر
کے گجر اور ملاح' اسے بڑا مانتے تھے۔ تازہ دودھ' مکھن' روٹی پانی کا بندوبست اِنہی کے ذمہ تھا۔ اِس فقیر کے
آگے پیچھے کے بارے کسی کو کچھ علم نہ تھا...... کون ہے' کدھر سے آیا...... کس کا بیٹا یا بھائی؟ البتہ صرف دو
باتیں ایسی جو سب جانتے تھے۔ ایک یہ پیدائشی مخنث ہے۔ یہ جاننا بھی اِس لیے ممکن ہُوا کہ ننگا تھا۔
ایسے فقیر کے لیے ستر ڈھانپنا کچھ ضروری نہیں ہوتا...... دوسری بات کہ یہ "کرنی والا" سمجھا جاتا تھا'
ضعیف العقیدہ' توہم پرست لوگوں کی نظر میں "کرنی والا" وہ ہوتا ہے جو اَنہونی کو اپنی دُعا برکت سے ہونی
کر دے' بگڑی قسمت بنا سکتا ہو' پٹھی کو سیدھی' ناممکن کو ممکن اور ڈوبے بیڑے تار سکتا ہو۔ غریب الحال'
غریب الاعتقاد اور غریب العقل و علم لوگوں کو کسی نہ کسی "کرنی والے" کی اَشد ضرورت رہتی ہے۔ وہ سائنسی
ہے یا سیّد' کوئی جرائم پیشہ ہے یا صوفی سالک' اِس سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہوتی......؟
اِس مجذوب بابے کا مخنث اور بے ضرر ہونا بھی اِس کے حق میں بہتر ثابت ہُوا کہ رشتہ داروں' ساسوں'
نندوں اور بگڑے ہُوئے خاوندوں سے ستائی عورتیں' بلاتکلف بے دھیانی اِدھر آ جا سکتی تھیں۔ دریا کنارے
نزدیک دُور دیہہ گاؤں کے وسیبوں کا پیدل' کشتیوں اور گاڑیوں پہ اِدھر آنا جانا لگا رہتا تھا...... کرنی والا بابا' شاذ
ہی کسی سے کوئی بات کر لیتا ہو' ورنہ ہٹ ہٹ دُور خلاؤں میں گھورتا رہتا یا پھر کسی ٹہنی تنکے سے ریت ملی مٹی پہ'
کسی نہ سمجھ میں آنی والی بھاشا میں کچھ اکھر لکھتا رہتا۔"
صبح سے شام اور رات سے دن کرنا اس کی کسی اپنی منطق کے مطابق تھا۔ کسی سے کچھ مطلب غائت'

آنے کی خوشی نہ جانے کا غم یعنی کسی اندیشۂ سود و زیاں کا گذر اس گلی سے نہ تھا...... کبھی کبھی وہ کچھ آگے بہتے دریا کی جانب نکل جاتا...... دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دریا ہمیشہ اُس کے آگے پایاب ہی رہا...... سیلاب کا کمک کے دنوں میں خوش رہتا' کبھی چوڑے پاٹ' تند تیز لہروں میں اُتر جاتا...... بہتے سامان جانوروں' غرق ہوتے ہوئے لوگوں کو گھسیٹ کر کنارے تک لے آتا' کبھی چھوٹے بڑے سانپ اژدھے بھی نکال لاتا' اُن سے کھیلتا رہتا۔ اکثر نیولے' کر لے' سانڈے' گوہیں' کچھوے اس کے گرد گھومتے رہتے مگر کبھی نہ دیکھا سنا کہ کسی جانور نے ضرر پہنچایا ہو۔ جیسے وہ اُن سے اور وہ اس سے ہوں؟

غریب دھوبیوں کا ایک اپاہج لڑکا' جو کسی کام کاج جوگا نہ تھا۔ اپنی عسرت اور بھوک مٹانے کی غرض سے لڑھکتا ہوا دریا جانب آ جاتا۔ ادھر پہنچنے کا مقصد محض ایک دو مچھلیاں حاصل کر کے گھر کا چولہا گرم کرنا ہوتا۔ مگر اچھی اور بڑی مچھلیاں پکڑنے کے لیے جس سامان' ہمت' صبر اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے محروم تھا۔ ایک قدم اُٹھانے' بڑھانے کے لیے کسی نڈھال کینچوے کی طرح بل لینے پڑتے کہ دیکھنے والا اس کی حالت زار پہ ترس کھائے بغیر نہ رہتا۔"

ایک کاسنی سی سہ پہر بابا دریا کے نظارے میں مگن تھا۔ ناگاہ اسے دُور دوسرے کنارے یہ اپاہج لڑکا دکھائی دیا۔ بنسی پانی میں ڈالے عجب مایوسی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ دُھندلے سے چہرے پہ بھوک مفلسی گھنڈی ہوئی تھی...... خدا جانے کیا سوجھی؟ بابا ناک دبا کر وہیں پانی میں غائب ہو گیا۔

"بندہ وخواندہ و یا ناخواندہ' بھوک میں اُس کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھنا شروع کر دیتی ہیں کہ بھوک' جنس اور خود حفاظتی وہبی علوم میں سے ہیں۔"

بنسی کو بلکی سے کھینچ پڑی' لڑکا ہشیاری سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ دو بار جھٹکا لگنے پہ ڈھیل کرائی کہ کانٹا گلپھڑے کے اندر تک پہنچ جائے۔ ایسا ہی ہوا کہ کانٹا گلپھڑے میں پھنس چکا تھا مگر کس کے......؟

پتنگ بازی' عشق بازی اور ماہی بازی میں یہی کھینچ بڑھاوے ڈولے بڈولے ہی تو ہوتے ہیں۔ یہ تینوں شغل بازیچۂ اطفال نہیں' کار گروگھنتال ہیں......!

آسمان پہ تارا بنے تاوے کی ساری ثرت پھرت' تلاوان کے ترازو کی ترکیب سے ہی متحرک ہوتی ہے۔ عشق بازی عجب عشق پیچاں' عشوہ و غمزہ و عنوان اور ماہی بازی وگیری' ہشیاری و سمجھداری' صبر اور جبر گری! بابا' اُبھرتی ڈوبتی بنسی کے عین نیچے' کانٹا منہ میں لیے ڈوری کھینچنے کا انتظار کر رہا تھا...... ننھے ننھے بلبلوں کے غبارے اُوپر ٹوٹ پھوٹ رہے۔ ڈوری کی دوسری جانب زور پڑا تو لڑکا' اپنے شکستہ پاؤں پہ اُٹھنے کا

جتن کرتے ہوئے دُہرا ہو گیا۔ ڈوری دائیں ہاتھ پہ لپیٹے ہوئے اُس نے بابا کا کھینچا کرایا۔ تندی، تن تمبور ہو کر اِک لکیری بن گئی اور ہر لکیر کے پیچھے اِک فقیر ہوتا ہے۔"

فقیر پانی سے یوں ہُویدا ہُوا جیسے بحرِ ظلمات سے اَمر الیاس ظاہر ہُوا ہو۔ گھمبیر زلفوں اور ریش سے ٹپکتے ہوئے تسبیح دانے، مستی و مروت سے جل تھل نین کٹورے...... لبوں پہ رسیلی سی مسکراہٹ...... بابا، جس کے منہ میں بنسی کا کانٹا ہنوز پھنسا ہُوا تھا...... ڈوری کو ہاتھ میں پکڑے وہیں پانی سے نکل کر کنارے کی جانب بڑھنے لگا تو لڑکا مارے دہشت، وہیں بیہوش گر پڑا۔ بابا اسے اُٹھائے اپنے ڈیرے لے آیا۔ اُس کا علاج کیا اور کچھ ایسا کرم ہُوا کہ دُنیا ہی بدل گئی اور یوں غریب والدین نے اُسے بابا کا بالکا بنا دیا۔ بچہ بڑا ہُوا بابا کی خدمت کرتے کرتے یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

- تیرے ہتھ وچ ڈور وے سائیاں پتنگ دا کی زور وے سائیاں......!

چوہدری کے مخنث نومولود کو جو دو مرد اور ایک عورت ساتھ لائے تھے اُن میں ایک یہ مچھلی پکڑنے والا نیم اپاہج بچہ بھی تھا جو اَب بابا کے فیض سے صحت مند جوان بن چکا تھا۔ دوسرا جوان رعنا اور عورت، یہ آپس میں میاں بیوی تھے۔ ظاہر ہے کہ بابا کے ماننے والوں میں سے تھے۔ دونوں یہاں قریب ملّاحوں کی چھوٹی سی بستی میں رہتے تھے۔ عورت بھی لاکھوں میں ایک، مگر مرد ایسا کہ دیکھنے والے کی آنکھوں میں نُور چھپا کے مارنے لگے۔ کیا کہیے کہ ان کے ہاں پہلوٹی کے جس بچے نے جنم لیا وہ نرتھا نہ مادی...... اِن میاں بیوی اور ان کے بچے کے بارے طرح طرح کی باتیں آس پاس کے پنڈوں ڈیہوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کہانی کچھ حقیقت کے قریب اور سمجھ میں آنے والی لگتی تھی۔

یہ جوان ماچھیوں کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا...... سوہنا ماچھی! علاقہ میں اپنی خوش خلقی، مردانہ وجاہت اور ونجلی کی لَے کاری میں مشہور...... چیلے شہتوت کے پیڑ سا کاٹھ، کھلے ہاتھ پاؤں، مضبوط جبڑا، یاقوتی ہونٹوں کی اوٹ میں سپید موتی دانوں کی تسبیح...... آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے تو کسی جوگا نہ چھوڑے، اردگرد کی ہر چوتھی پانچویں جوان لڑکی اِس کے خواب دیکھا کرتی تھی۔"

چاندنی راتوں میں جب یہ بیلے والی جنگی کے باہر جھلنگی پہ پڑا اپنی ونجلی پہ لَب رکھتا تو جدھر جہاں تک اُس کی تانیں اُڑتیں، آ ہوں، گرم سانسوں سے فضاء میں آگ سی لگ جاتی۔ کمال ہے وہ ابھی تک جتی ستی

تھا۔ عورت کو سونگھنا تو دور کی بات' کبھی سیدھی آنکھ اٹھا کر میز ھی نظروں سے چھوا تک نہ تھا۔ آتے جاتے یا دریا پار کراتے ہوئے اکثر اکیلی دوکیلی لڑکیوں سے واسطہ پڑ جاتا۔ وہ ایسے موقعوں پہ حق باہو سرکار کا کلام ''الف اللہ چنبے دی بوٹی'' شروع کر دیتا...... کئی پکی پکی لڑکیوں نے اپنے حسن و جمال عشوہ و ادا...... لالچ دھمکیاں دے کر پھانسنا چاہا مگر اس کے من میں مرشد کی لگی ہوئی چنبے دی بوٹی نے ہمیشہ اس کی حفاظت کی۔''

آخری بھاری وار' پاس گاؤں کے ایک بڑے زمیندار کی اکلوتی بیٹی نے کیا۔ گھمنڈی خودسر خوبصورت مٹیار نے اسے پانے کی خاطر سردھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ کہیں سنت سہیلیوں میں بیٹھی اسے اپنی محبت میں مبتلا کر دینے کا دعویٰ کر بیٹھی۔ اپنے دھانس چھوڑتے حسن و شباب' باپ کی دولت و اختیارات اور اپنی معاملہ فہمی پہ بھی بڑا گھمنڈ تھا' سمجھتی تھی کہ یہ خوبیاں دنیا کی بہت بڑی طاقت ہیں۔ ان سے صحیح کام لے کر بڑا سے بڑا معرکہ سر کیا جا سکتا ہے۔''

حسن! مغرور' خودسر اور بے وقوف ہوتا ہے اور اگر کہیں کرم ہو جائے اور کچھ عقل' حیا اور صبر بھی مل جائے تو واقعی پھر حسن اک لازوال طاقت بن جاتا ہے۔ اس مغرور اور حسین وجمیل لڑکی کے ہاں ایسی ہی کوئی خوبی یا خرابی تھی۔ بن سوچے سمجھے بلند و بانگ دعوے تو بندے کو بندر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ کھلا بندر نہ مسجد کے باہر نہ مندر کے اندر......!

شکار کرنا اور شکار ہونا دو مختلف کار فضول ہیں...... دونوں کا مقصد' کسی کی جان گئی' کسی کی ادا ٹھہری'' ہوتا ہے۔ شکار کرنے کے لیے شکاری' شکار پور نہیں جاتے اور شکار ہونے کے لیے شملہ' شنگاگو یا شنگھائی بھی نہیں بلکہ شکار کو اپنے ہاں مدعو بھی کیا جاتا ہے۔ شکار ہونے کے بعد اپنے اوپر پاؤں دھروا کر تصویر بھی بنوائی جاتی ہے۔ سوتا بھوسا بھروا کر دیوان خانوں کو آرائش بھی دی جا سکتی ہے۔ اس کی پوستین' قالینوں پہ بچھانے میں بھی کوئی حرج نہیں...... کھوپڑی میں بھیجہ نہیں البتہ آنکھوں کے گڑھوں میں کانچ کے ڈیلے ڈال دیے جاتے ہیں۔''

اس خوبصورت' انا کی ماری بلا نے اسے شکار کرنے کی بجائے اس سے شکار ہونا پسند کیا۔ جیسے پیار و محبت' عشق معشوقی کے بعض کیس ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں گنگا الٹی بہتی نظر آتی ہے۔ ذوبحے کو مارنے کی بجائے خود مر جانے کو جی کرتا ہے۔ حاصل کرنے کی خواہش کے برعکس اسے کھونے کی تمنا ہوتی ہے۔ پھولوں کی طرح مسکرانے کی بجائے گیلے بھوسے میں دبی چنگاری کی مانند اندر ہی اندر دھکتے رہنے کی چاہ ہوتی ہے۔ اس طرح قلب و نظر کے چکر میں پھنسے کچھ خود پسند ایسے بھی' جو چاہتے ہیں کہ انہیں چاہا جائے۔

وہ خود آگے بڑھ کر پہل نہیں کرتے لیکن ایسے مواقع پیدا کرتے ہیں کہ معشوق خود محبوب بن کر منطقی انداز میں سامنے آ جائے۔

بلی چوہے کے کھیل میں یہی شکار کرنے اور شکار ہونے کی نرگسانہ فلاسفی کارفرما ہوتی ہے۔ سمجھ میں یہی آتا ہے کہ بلی محض تفریح کشید کرتی ہے یا شکار کا لطف لے رہی ہے...... اس کے مزاج و اوقات میں چونکہ نرگسیت اور تساہل پسندی کے عناصر شامل ہوتے ہیں لہٰذا وہ دوسری بلیوں سے ستیزہ کاری، مسٹنڈے بلوں کی جارحیت کو برداشت اور چڑیوں چنڈالوں چوہوں کے ساتھ اداکاری کرنا پسند کرتی ہے......؟

ادھر چوہا دیکھیں دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ وہ بلی کے رو برو کیسا "بھیگی بلی" بنا پڑا ہے۔ پر یہ میسنا اندر سے بڑا ہوشیار اور عیار ہوتا ہے۔ بلی جب تک سو چوہوں کا کورم پورا نہ کر لے اُسے حج کا ویزہ نہیں ملتا...... ایسے ہی کوئی چوہا جب تک پہلی اور آخری بار بلی سے چوہا بلی کا کھیل نہ کھیل لے۔ وہ کسی شتر کی تکمیل اچکے کسی تخل تک پہنچ نہیں پاتا۔ چوہے کے علاوہ منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر کسی کھلی آنکھوں والے کبوتر کی کایا پلٹ کرنا بھی بلی کے لیے خاصا دلچسپ ہوتا ہے۔ موش زبوجی اس کی فطرت گربہ میں شامل ہے جبکہ کار کبوتر کشی اس کی عیش عشرت ہوتی ہے۔

چوہے کے لیے بلی اس لیے بھی ضروری ہے کہ چوہا بلی کھیلنے کے بعد اس کی کٹی پھٹی نعش کے ٹھکانے کے لیے اس کے پیٹ کے جہنم سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں۔ کہنے کو تو کوے کتے چیلیں وغیرہ بھی اس کا تیا پانچا کرنے میں دریغ نہیں کرتے لیکن رغبت سے اسے کوئی نہیں کھاتا۔ اس کمینے رذیل کی شکل کان تھوتھنی دم وغیرہ اس قدر کریہہ المنظر اور طبیعت دق کرنے والے ہوتے ہیں کہ خوانخواہ ہی اسے کسی برے انجام سے دوچار کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

اس پہ نظر پڑتے ہی نیت میں خرابی اور ضد کا پیدا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے نجات اور گرفت کی خاطر روئے ارض پہ جتنے آلات طریقے ایجاد اور استعمال ہوئے وہ کسی اور موذی جانور کے لیے وجود میں نہ آئے۔ انسانی ذہانت و اختراع اس کے آگے عاجز ہوگئی مگر اس سے نجات حاصل نہ کر سکی۔ معلوم ہوا یہ بے ننگ و ناموس بے حد ذہین شاطر و چالاک اور پھرتیلا واقع ہوا ہے۔ پنجرے پھندے زہریلی گولیاں پاؤں چپکنے والے مادے بے سدھ کر دینے والے اسپرے۔ الیکٹرونک شعاعیں اور صوت کیمیکل خوشبوئیں بدبوئیں غرضیکہ کوئی بھی اکمل علاج اس عفریت کا حتمی توڑ ثابت نہ ہو سکا۔ یہاں تک بڑے بڑے عامل تعویذ دھاگوں جھاڑ پھونکوں والے جوجنات بھوت پریت کو ناکوں چنے چبوا کر دم لیتے ہیں جلا کر راکھ خاک کر

دیتے ہیں۔ ان کے سامنے وہ بھی چالو رہتے ہیں بلکہ اس سے اپنی لنگوٹیاں دھوتیاں بھی کتروا بیٹھتے ہیں۔ ایک شعر ہے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
یہ اتنا ہی اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اس شعر کا حشرات الارضی پہلو اِن چوہوں کی افزائش سے نمایاں ہوتا ہے۔ سانپ' مچھلی' بلی' خرگوشنی' کتیا اور چوہی وغیرہ جتنے چاہے بچے جنیں انہیں کوئی پوچھنے ٹوکنے والا نہیں۔ ''بچے دو ہی اچھے'' والا فارمولا ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ اس معاملہ میں یہ انسان سے کہیں زیادہ متوکل ہیں...... مگر ایک قدر دونوں میں مشترک ہے کہ ''جس روح نے آنا ہے اُسے کوئی روک نہیں سکتا''...... یہ جانور ایک جھال میں ناقابلِ یقین حد تک بچے تولد کرتے ہیں۔ گو ان کے بچے پیدائش کے وقت دیکھنے کے اہل نہیں ہوتے۔ اُن کی آنکھوں میں ایک چیک دار سفید مادہ ہوتا ہے جو دو چار دنوں میں خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور نومولود کچھ نہ کچھ دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اب فطرت ان کی مزید رہنمائی کرتی ہے اور جدھر منہ اُٹھا بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔

خرگوشنی' بلی' چوہی اور کتیا کے بچے بڑے سُست الوجود اور ماٹھے ہوتے ہیں جبکہ مچھلی' سانپ کے پونگ سنپولیے پیدائشی طور پہ ہی ایسے شوں شرک کر لیسدار انڈوں کی جھال سے آزاد ہوتے ہی منظر سے غائب ہونا شروع ہو جاتے ہیں جبکہ ان کی بینائی سرے سے ہوتی ہی نہیں...... زچہ انہیں روکنے کی کوشش میں پاگل ہی ہو کر ان پہ لپکتی ہے ظاہر ہے کہ محض منہ و زبان سے روکنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ بچے بھی ایسے نازک نعلوم سے' کہ اس ہڑبونگ میں پتا ہی نہ چلے کہ کہاں غائب ہو گئے؟ اب ان بھگوڑے بچوں کی اکثریت بھی بقا و فنا کے راستوں پہ مختلف حوادث اور حشرات الارض کا شکار ہو جاتی ہے۔

اللہ کی حکمت سے اس کھیپ میں سے بھی کچھ بچ جاتے ہیں جو اپنی عمرِ طبعی تک پہنچتے ہیں۔ اسی طرح کتیا اور بلی بھی اپنے پلوں بلونگڑوں کو مختلف وجوہات کی بناء پہ ہلاک یا زندہ ہی کھا جاتی ہیں لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔ خرگوشنی اور چوہیا کے گوتھنے سے بچے ہی ایسے ہوتے ہیں جن کے پچاسی فیصد بچ رہنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کے محفوظ بل ہوتے ہیں جدھر سے وہ اُس موسم میں ہی باہر نکلتے ہیں جب قدرے چلنے پھرنے یا خود کھانے پینے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

دُنیا میں چوہوں کی بہت سی اقسام موجود ہیں جن میں بیشتر اور قابلِ ذکر ایشیا میں پائی جاتی ہیں۔ روس' یورپ' امریکہ اور دُنیا کے سرد طبقات میں زیادہ تر چوہے خوبصورت پست جثہ اور سفید ہوتے ہیں۔ جن

کے ناک' کان' تھوتھنی اور پنجے گہرے گلابی...... کیوٹ' ماحول اور انسان دوست! ہمارے ہاں کے جاہل چینڈو گندے چوہوں کی طرح بلوں میں نہیں رہتے بلکہ چھوٹے چھوٹے کھلونا گھروں اور محبت کرنے والوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔"

چھوٹے بچوں کے اسکولوں نرسریوں میں' خرگوش' مینا' آسٹریلین چڑیاں طوطے' پالتو بے ضرر سانپ چھوٹی بطخیں کبوتر وغیرہ کے علاوہ جو سب سے کار آمد اور مقبول جانور ہوتا ہے وہ یہ سفید اور مختلف رنگوں کے خوبصورت ننھے ننھے چوہے ہوتے ہیں...... بچوں کی جیبوں' سکول بیگوں' شانوں' آستینوں' پڑھائی کے ڈیسکوں پہ بڑی آسانی و بے تکلفی سے پھدکتے دکھائی دیتے ہیں۔ بچے اور چوہے اک دوجے کی ذات سے یکسر بے نیاز' نرسری کے ماحول کا حصہ بنے ہوتے ہیں۔ ننھے ننھے سفید روئی کے پھوئے...... نرم نرم برف کے گولے...... معصوم سی صورت' پتلی سی سرخ دم...... کنچئی آنکھیں! یورپین بچوں کے لیے آسٹریلین طوطوں' سفید چوہوں اور خرگوشوں سے بڑھ کر کوئی اور جیتا جاگتا' دوڑتا پھدکتا کھلونا نہیں ہوتا۔

چوہوں کے علاوہ وہاں کئی اور قسم کے چوہے بھی ہوتے ہیں۔ جو اپنی جسامت' ہیئت کذائی' رنگ ڈھنگ اور افزائش کی بنا پہ صدیوں پرانا سرزد ہوتے بنے پڑے ہیں۔ چوہے کے وجود کرۂ ارض پہ بسنے والوں کے لیے کسی نہ کسی طور ضرور مفید ہوگا اور اس کی تخلیق میں خالق و مالک کی یقیناً کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی؟...... سائنس اور ماہرین حشرات الارض بھی ابھی تک اس کے متعلق کما حقہٗ جانکاری حاصل نہ کر سکے۔ اسے صرف تجرباتی آپریشنوں اور تجرباتی کارروائیوں تک ہی رکھا ہوا ہے۔"

نمایاں طور پہ چند جانور ایسے ہیں جن کے متعلق آسمانی صحائف اور دیگر قدیمی کتابوں' اساطیری قصوں کہانیوں میں کچھ پڑھنے سمجھنے کو مل جاتا ہے۔ سانپ' مچھر' ابابیل' کوا' ٹڈی' چیونٹی' دیمک اور شہد کی مکھی وغیرہ...... رینگنے' اڑنے والی یہ مخلوقات محض گوشت پوست والے جاندار ہی نہیں کہ جن کا مقصد اڑنا' رینگنا' کھانا پینا اور پھر مر جانا ہو...... ان میں دیگر جانداروں کے برعکس سریت' ما فوقیت' صدری ادراکیت اور جزوی الہامیت کے عنصر بھی موجود ملتے ہیں۔ رب کائنات کے عظیم بے جھول نظام میں' ہمارے طبق ارض کے بیشتر بنیادی حیاتیاتی تقاضوں کے تضیع و تزئین اور تطہیر کے سلسلے' ان سے وابستہ ہیں...... کتا' گدھ' گدھا' بلی اور چوہا بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن قدرے استثناء کے ساتھ......!

میں نے اس کی نان سٹاپ گفتگو سے لبالب ہوتے ہوئے' ہاتھ جوڑ کر استدعا کی۔

"آقا! میری کیا مجال کہ جرأت اظہار بیزاری کروں؟ پر کیا کروں میری قوت سماعت و برداشت' اپنی

حدِ انتہا سے بھی کہیں اُوپر جو ایک مقام "سدرۃُ الخبر" کہلاتا ہے' اُس سے بھی پَرے گزر چکی ہے۔ اس مقامِ خد پہ پہنچنے والے کے لیے برأت کے صرف دو راستے باقی بچتے ہیں۔ اپنے آقا سے پروانۂ آزادی کی درخواست کرے یا منظوری کی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی بجائے خود ہی کہیں پلاّ پاک کرلیا جائے۔ اَب جو راستہ آپ کو پسند ہو وہ اختیار کروں....؟"

بابا نے خلافِ توقع' بظاہر خُوش خُلقی اور کشادہ سامانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"مَیں تو پہلے ہی حیران تھا کہ تم اَب تک چٹخے کیوں نہیں؟ چُوہوں' کتّوں' بلّوں کے موضوعات پہ گھِن پیدا کردینے والی طویل گفتگو تم نے کیونکر ہضم کرلی؟ اللہ! تمہیں اس کا اجرِ عظیم عطا کرے۔ ہاں! تمہیں مجھ سے نجات حاصل کرنے کے متعلق سوچنا نہ چاہیے' کار قضا اگر ایسا کسی طور کر بھی لو...... تو دیر بدیر واپس میرے پاس ہی پہنچ آؤ گے کہ جو مزہ چھجّو دے چوبارے وہ نہ بلخ نہ بخارے......" خاموشی اور صبر سے سنو! علم' دو چار کتابیں پڑھنے اور چند ماہ و سال کسی مدرسے' یونیورسٹی میں گزار لینے کا نام نہیں...... مَیں تمہیں اس زمین یعنی کرۂ ارض کی مثال دیتا ہوں۔ اس کے وسیع و عریض سیناریو میں سمندروں' جھیلوں' پہاڑوں' صحراؤں' جنگلوں' میدانوں کو بھی شامل کرلو۔ اس کے باوجود اس کی حیثیت کائنات کے اُفق پہ ایک پشّہ کے پَر کے برابر بھی نہیں...... طبقِ اَرض کو فضیلت...... سجدہ گہِ آدم' مولد و مرقدِ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حرمِ پاک کے صدقہ میں ملی۔ یثرب بالآخر مدینہ منورہ اور مکّہ' بیت اللہ کے قالب میں ڈھل گئے۔ مدینہ منورہ میں انصاری اور مکہ مکرمہ میں بدّو آج بھی موجود ہیں۔ سیدنا بلالؓ کی غناء و ادا کے ارتعاش اَب بھی سماعت میں اِک الوہی آہنگ بپا رکھتے ہیں۔ صحنِ حرم میں اَبابیلیں آج بھی محوِ پرواز رہتی ہیں۔"

شاید تمہاری عقل کے کھانچے میں یہ بات آجائے علومِ لدُنی کا نزول' فطرت' حقیقت' معرفت اور صُحبتِ صالح کی موافقت سے نصیب ہوتا ہے مکتب و مدرسے سے ابتدائی اشارے تو ملتے ہیں مگر انتہائی اظہار یے نہیں کہ یہ کسی دَرِ دَرویش پہ دستک کی بھیک ہوتے ہیں۔"

مَیں بتاؤں مجھے ایک بند پوٹلا ملا تھا مگر اس کی گرہ کھولنے کے لیے ناخنِ تدبیر' اس ابتدائی مکتب کے مدرّس کے "لکیری فقیری علم" سے ملا جس نے مجھے پہلا سبق الف آم پڑھانے کی کوشش کی کہ ابتدائی مروجہ طریقہ ہی یہی ٹھہرا تھا۔ مادری بے علم کے لیے علم کی ابتداء الف آم اور بائے بکری! اور جو وہبی عُلوم کا جویاں ہوتا ہے اس کے لیے الف' اللہ اور بائے' بابا ہوتے ہیں۔"

مَیں نے اُوبتے ہوئے کہہ دیا۔

''شاید تم بھول گئے کہ بات' چوہدری کے مخنث بچّے' بیلے کے مجذوب بابے سے بڑھتی ہوئی نوجوان ملاح' اُس پہ نظر رکھنے والی بیلی خوبصورت عورت اور پھر بجو بے بلیوں' خرگوشوں' کتوں تک آ پہنچی ہے۔ اَب آگے کہاں سے کہاں...... کائنات افلاک اور طبق اَرض......؟''

''درمیان میں ٹوک دیتے ہو۔ اس سے نہ صرف آمد کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے بلکہ زیر بیاں موضوع بھی غیر دلچسپ ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے تب مَیں ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنے کی بجائے کسی اور سلسلے کو شروع کرنا بہتر خیال کرتا ہوں...... اَب بولو' مخنث بچّے سے شروع کروں یا بجو بیا کے بچوں سے؟ مجھے پتا ہے کہ تم بجو بیا کے بچوں سے زیادہ' اُس مخنث بچّے کی بابت سننا پسند کرو گے اور تمہیں سننا بھی چاہئے۔

یہ تو مَیں تمہیں اس سے پیشتر بتا چکا ہوں کہ انسانی بچّے ہی محض مخنث پیدا نہیں ہوتے۔ ان کے علاوہ بھی اور مخلوق ایسے خصائل کی حامل ہوتی ہیں۔ مثلاً شجر و حجر' چرند پرند و درند' طبقات اَرض' انسانی رشتے ناطے...... یہاں تک کہ وقت کے بہتے دھارے' لمحات اور پہر و پل بھی...... کہ ان سے محض وقت کے زیاں اور وہم و گماں کے جز' کچھ برآمد ہوتا دکھائی نہیں دیتا مگر قادرِ مطلق کے ہاں کچھ بنا مقصد و مصلحت نہیں ہوتا...... بلکہ یہ بھی کارخانۂ قدرت کا ایک نادر شہکار ہوتے ہیں۔''

بہت سی مخلوقات ایسی' جو انسانی بصیرت و بینش' فہم و ادراک سے ماورا ہوتی ہیں شاذ ہی کوئی لاکھوں میں ایسا ہوتا ہے جسے ربّ الحکمت و مصلحت نے چشم بینا اور وا دیٔ سینا سا سینہ بہ سینہ المضاعف اُلوہی علم ودیعت کیا ہوتا ہے۔ یہی وہ رجلِ رشید' جو ایسی اَجل مخلوقات کی بابت اِن رازو رسلم اور مقام و مقاصد سے آشنا ہوتا ہے جس سے دوسرے سارے نہیں ہوتے۔''

یہ تو اکثر لوگ جانتے ہیں کہ درختوں میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں اور شاید ہزاروں لاکھوں میں کوئی جو یہ بھی جانتا ہو کہ اِن میں مخنث بھی ہوتے ہیں؟...... چوپایوں میں خچر ہوتا ہے جو گدھے گھوڑے کے ملاپ سے معرضِ وجود میں آتا ہے اور ڈچرا بھی جو جنگلے گھوڑے یا گدھی اُونٹنی کے اختلاط کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اَب تو اسے پیدا کرنے کا رواج یا ضرورت نہیں رہی لیکن جب اَزمنہ بعید میں کاروانوں قافلوں کا دور دورہ تھا اس کی نسل کشی کا اہتمام بڑے اعلیٰ پیمانوں پہ ہوتا تھا کہ اُونٹوں کی رواں قطار کا سرخیل یہی ہوتا۔ اس میں بااعتماد قیادت و ریاضت کی بے پناہ صلاحیت کے علاوہ' عام اُونٹ سے کئی گنا زیادہ صبر برداشت کی اہلیت...... بدلتے موسم' بادِ سموم کی پیشگی اطلاع بہم پہنچانے میں اِک خداداد ملکہ حاصل ہوتا۔ ہیجڑوں بغلوں کی بُو اور رویں' زبردست دافع سمیات ہوتے ہیں۔ مخنث ہونے کے ناتے' عنفوانِ شباب کی خطرناک مستیوں' خوفناک بغلود

سے بچا رہتا ہے۔ ''شتر کینہ'' بھی نہیں کہ اس میں ''میں'' نہیں ہوتی مگر جہاں جان ہوگی وہاں ''میں'' تو ہوگی...... جان نمود سے تعبیر ہوتی ہے اور نمود اک ایسا پودا جو ''میں'' کے پانی سے سیراب ہوتا ہے۔''

میں نہ بولتا اگر وہ ''میں'' اور ''نمود و وجود'' وغیرہ کو اس بے دردی سے گھما پھرا کر پیش نہ کرتا۔ میں تو سلائی مشین کی پھرکی بن کر رہ گیا تھا جو ایک تنے مضبوط دھاگے کے پھیر میں پھنسی ہوئی کپڑے سی رہی ہوتی ہے پر کون جانے وہ خود کتنی اُدھڑی پدھڑی' گرم اور بے حال و بے وصال...... یہیں پھر میں نے ٹوک دیا۔

''تم اس مخنث بچے کے بارے کچھ کہہ رہے تھے......؟''

وہ خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔

''موٹر کار چلانے کے طریقوں سے تم واقف ہی ہو گے...... کسی راہ راستے پہ ڈالنے سے پیشتر انجن کو ایک دوبار ہلکے ہلکے اگنیشن دینے پڑتے ہیں۔ پھر دو چار ایکسیلیٹر کے جھٹکوں سے انجن کی کارکردگی کو رواں کیا جاتا ہے۔ کہانی سے پہلے مناسب سی تمہید...... باقاعدہ ملاقات سے پیشتر علیک سلیک' مصافحہ' معانقہ...... طعام سے اوّل پانی کے گھونٹ...... گائیگی سے پہلے گنگناہٹ' الاپ' سر تال کا تال میل...... محبت پیار سے پہلے کچھ چھیڑ چھاڑ' تکلف' تلوّن...... لڑائی جھگڑائی بھی پہلے کچھ تکرار و للکار کی متقاضی ہوتی ہے۔ اسی طرح کچھ عقل و فکر کی باتیں' قصے' واقعات وغیرہ بھی کچھ تمہید یہ تقاضے رکھتے ہیں۔ کپڑے کی سلوٹیں نکالنے کی خاطر' پانی سے وتر دینا' اچھے نتائج کا حامل ہوتا ہے...... خیر' یہ نازک معاملات ہیں جنہیں سمجھنے جاننے کے لیے کئی جنموں کی تپسیا درکار ہوتی ہے۔''

''دیکھ لو کہ یہ معمولی چھوٹی سی بات بھی سمجھانے کے لیے تم نے کتنی بڑی تمہید کا سہارا لیا ہے...... کیا یہ آسان اور مختصر سمجھایا نہیں جا سکتا......؟''

''بالکل سمجھایا جا سکتا ہے' بلکہ محض آنکھ کے اشارے اور ہلکی سی باطنی توجہ سے بھی یہ کام سر انجام دیا جا سکتا ہے مگر کوئی ایسا مقابل بھی تو ہو؟ تیر کے سامنے کوئی مضبوط ہدف...... ورنہ وہی ہوا میں تیر چلانے والی بات ہوتی ہے؟ تیر' گولی' بات' انہیں ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ میں اسی لیے کوئی قیمتی بات سنانے سے پیشتر تمہید باندھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے پورے سیاق و سباق کے ساتھ سنا اور سمجھا جا سکے۔'' ذرا سنجیدہ سے توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''غور کرو' یہ زنخوں' مخنثوں والا موضوع' جس پہ کوئی نام نہاد عالم' مولوی' دانشور' پیر وغیرہ بات تک کرنا پسند نہیں کرتا کہ ان کی نظر میں یہ انسانیت کے دائرے سے ہی آؤٹ ہیں...... بزعم خود اشرافیہ' یہ بھی نہیں جانتے' مخنث' خواجہ سرا یا زنخے' ہیجڑے' کھسرے ما بین فرق کہاں ہوتا ہے؟

مخنث' لفظ مذکر اور مونث کے درمیان کا ہے۔ جیسے برزخ...... جو نہ عالم ہستی ہے اور نہ عالم بالا......
جن و بشر میں ہی مخنث ہوتے ہیں جبکہ قدسیوں' ملائک اور رجال رشید یہ ذوات حمیدہ میں ان کا تصور نہیں ہوتا۔
مخنث جن و بشر یا چند دیگر مخلوقات میں انہیں پیدا کرنا بھی قدرت کے رازوں میں سے اک راز ہے۔ جو ہر کسی
پہ عیاں نہیں ہوتا...... قدرتی مخنث میں شہوانی تلذذ نہ نفسانی خواہشات کی خو بو؟ اس کے کلبوت کی کلا بتوں اور
وجود کی وریدوں میں وحدت' الوہیت کی ماورایت گندھی ہوتی ہے۔ صبر' سکت میں سجاؤ اور روحانیت جذب
کرنے کی ردا ہوتی ہے۔ دیکھنے کی شفافیت اور سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ انہیں خاص الخاص مقامات'
نوادرات' صحیفات' جن کے تقدس و تکریم کے تقاضے ارفع ہوتے ہیں یا جن کی حفاظت مقصود ہوتی ہے پہ مقرر کیا
جاتا ہے...... ہدایت' نقابت' وصایت کا وسیلہ بھی بنایا جاتا ہے۔
میں نے مکہ مکرم' مدینہ منورہ' کربلا معلیٰ' نجف اشرف' بغداد' شام' فلسطین' مصر' یمن ایسے بے شمار
مقدس مقامات مزارات' درس گاہوں' مسلکی فقہی مکاتیب پہ ان مخنثوں کو مقرر دیکھا ہے۔ ان کی تکریم و تحریم
دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ ذی قدر علماء فقہاء اور اساتذہ کے مقام پہ متمکن ہوتے ہیں۔ افسوس کہ ہم قدرتی
مخنثوں کو بھی ہیجڑوں' زنانوں اور کھسروں کی صف میں شامل کر کے اپنی بے علمی اور ناسمجھی کا اظہار کرتے ہیں۔
ہمارے بے ہنگم ناہموار معاشرے نے انہیں دھرتی کا بوجھ اور انسانیت کے نام پہ تہمت سمجھ لیا ہے جبکہ ان کی
فلاح و بہبود کے لیے حکومتی سطح پہ بہتر کام ہونا چاہئے اور انہیں ریاستی مشینری میں اک فعال پرزہ بنانا چاہئے کہ
یہ بھی اللہ کی مخلوق اور نبی پاکؐ کی اُمت میں سے ہیں۔''
قدرت کے راز کسی پرانے بند چوبی صندوق میں بند پُراسرار خوشبوؤں کی مانند ہوتے ہیں جو کسی
نمایاں تبدیلی کے ظہور پہ کسی خاص بندے کی نگاہ میں آجاتے ہیں۔ ہر کسے ناکس کا یہ نصیب نہیں ہوتا۔
جوگی' سنیاسی' سادھو' سنت جنگل جنگل صحرا صحرا خجل خراب ہوتے پھرتے ہیں۔ کام کی کوئی کیمیائی جڑی بوٹی'
گیان دھیان کے لیے کوئی دھیرا استھان...... منور جگن کی بھاؤنا کے لیے کوئی بندرا بانی اور بس جھلکار......
روپ اشکارا کے لیے کوئی نرالی ناگن ضروری نہیں نصیب ہو جائے۔ گدھوں کے گلوں میں ہیرے اور بڑے
بڑے تاجوروں کے دانتوں میں کریزے بتے دیکھے...... وہی کہ جسے چاہے وہ قادر مطلق جو بھی بنادے یہ اس کی
عطا اور رضا ہے۔''
نومولود میں سب سے پہلے زندگی دیکھی جاتی ہے جو اس کے رونے یا نہ رونے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔
اس کے بعد نر یا مادی کی دریافت ہوتی ہے۔ اگر بچہ نر ہے تو اس کے مکمل مردانہ اعضاء کی تصدیق ہوتی ہے۔

جسمانی خدوخال کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ سب کی ذرتی کے بعد مبارک سلامت کے آوازے لگتے ہیں۔
نوّے فیصد یہی ہوتا ہے۔ دس فیصد میں مُردہ بچے' زخمی' نامکمل اعضا' غیر معمولی وزن' قد' ہیئت و حال والے......
اُلٹے اور بچی اُبھی آنول' گرہن گزیدہ' کسی جانور سے مشابہ' دُم' سینگ' پورے دانتوں اور جھاڑ بالوں والے'
چپٹا' نگے' تن پیرے' دو جڑے ہوئے جسموں والے۔"

حیرانی کی بات کہ میں نے نومولود کو روتے ہوئے نہیں ہنستے ہوئے بھی پایا ہے۔ کتے اور بلی کی مانند
غُرّاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ایسا بھی ایک بچہ دیکھا جو پیدا ہوتے ہی کچھ کہنے کی کوشش میں ہونٹ ہلا رہا تھا۔
ایسی خرق الفطرت باتیں اور حرکات' اللہ کے برگزیدہ بندوں سے سرزد تو ہوئیں لیکن کبھی کہیں عام بچوں میں بھی
ایسی چیزیں نظر آئیں جو ماورائے معمول ہوتی ہیں اور پھر مشاہدہ میں آیا کہ ان ایسی غیر معمولی حرکات و شکلات
کے حامل بچے اپنی زندگی میں بھی دوسرے انسانوں سے علیحدہ ہی واقع ہوئے۔

دیکھنے میں آیا کہ بعض لوگوں کے ہاں بلائیں' شر شرار اور بُھوتنے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ پیٹ سے
نکلتے ہی عجیب و غریب ڈراؤنی آوازیں نکالتے ہوئے کہیں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں...... اُن کی آنکھیں بھی
ابھی پوری طرح کھلی نہیں ہوتیں۔ ایسے بچوں کو جنم دینے والی مائیں اور مددگار عورتیں اکثر بیہوش ہو جاتی
ہیں...... کئی کمزور دلی مر بھی جاتی ہیں۔ جبکہ ایسے بُھتنے بچے' اکثر دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اُوجھل بھی ہو جاتے
ہیں لگتا جیسے زمین نے اُنہیں چھپنے کے لیے جگہ دے دی ہو۔"

زچگی کے ایسے واقعات اکثر اُن عورتوں کے ہاں ہوتے ہیں جو تعویذوں گنڈوں اور دو نمبر عاملوں
پیروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں اور حمل کے دوران اُلٹے سیدھے ٹونکے استعمال کرتی ہیں۔ ناسمجھ مسلمان عورتیں
جو پاکی پلیدی' حرام و حلال کا خیال نہیں کرتیں اور اپنے شوہر کے علاوہ دوسرے مردوں سے ملتفت ہوتی ہیں
اُن کے ہاں بھی ایسی بلائیں' بُھوتنے' بچوں کی صُورت پیدا ہوتے ہیں جو اُن کے لیے شامتِ اعمال ثابت
ہوتے ہیں۔ ایسے بچے والدین کا مکافاتِ عمل ہوتے ہیں...... مشاہدے تجربے میں آیا کہ شمشان' پرانے
قبرستانوں' جنگلوں اور سنسان ویران جگہوں کے آس پاس رہنے والوں کے ہاں بھی ایسے بچے جنم لیتے ہیں۔
ریل کی پٹڑی کے قریب' سر بازار فلیٹوں' کرکٹ گراؤنڈ کے پاس' کارخانوں کے بیچ رہنے والوں کے ہاں بچے
اکثر ابنارمل پیدا ہوتے ہیں۔ منشیات استعمال کرنے والوں کے ہاں بھی بچے صحیح پیدا نہیں ہوتے۔ کسی کا تالو
غائب تو کسی کے دل میں سوراخ' پیدائشی شوگر کے مریض' اعضا نامکمل وغیرہ وغیرہ۔

کراچی کا میرا ایک عقیدتمند بچہ صالح اطوار خوشحال دولتمند میرے پاس فریاد لے کر پہنچا کہ میرے دو

بچے ابنارمل پیدا ہوئے جو چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو گئے۔ اب بیوی پھر حاملہ ہے دُعا کریں اللہ صحت مند بچہ دے۔
کراچی جانا ہوا تو وہ مجھے ترلے واسطے ڈال کر گھر لے گیا...... دوسرے مالے پہ اُس کا کشادہ سا فلیٹ تھا، گھر میں آسودگی تھی...... میاں بیوی جوان اور صحت مند...... آپس میں ہم آہنگی بھی...... سمجھ نہ آئی کہ اولاد ابنارمل کیوں پیدا ہوتی ہے۔ سرسری طور پہ اُن دونوں میاں بیوی کا جائزہ لیا۔ بظاہر کوئی وجہ سمجھ نہ آئی۔ کمرا جو میرے لیے مخصوص تھا بڑا آرام دہ اور پرآسائش تھا۔ آرام کی غرض لیٹا تو عجیب سی سراسراہٹ کانوں میں سنائی دی۔ غور کیا تو نیچے بڑے بڑے ہال تھے جن میں سٹے کا کاروبار ہوتا تھا۔ دھیما دھیما شور، عجیب سی بے چینی پیدا کر رہا تھا، پہلو پہ پہلو بدلتا رہا۔ جب بے چینی ایک حد سے بڑھ گئی تو اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔
گھر والے شاید نیچے بازار میں کچھ خریدنے کے لیے نکل گئے تھے۔ اک میز پہ دھری اخبار دکھائی دی۔ یہیں مجھے انڈین گٹکے کی کچھ پڑیاں بھی نظر آئیں۔ وہی پڑیاں جن کے مختلف نام ہیں۔ تمسی، رسیلی، بمبئی، فانوس، گوگو، گولڈن، سدا بہار، خدا جانے کیسے کیسے عجیب نام ہوتے ہیں۔ ادھر بھی ایسی پڑیاں پڑی تھیں۔ ایک پڑیا کھولی تو اندر سے تمباکو آلود سپاریاں نکلیں۔ خوشبو بھی! ایک دو کو کھولا، زبان پہ رکھا۔ اگلے ہی لمحہ ساری بات سمجھ میں آ گئی۔''

یہ زہر آلود سپاریاں، حد درجہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مختلف کیمیکلز سے انہیں نشہ آور بنایا جاتا ہے۔ ایک دو روپے کی پڑیا، منہ میں نسوار مانند دھرنے سے عجیب سا سکون حاصل ہوتا ہے۔ کافور اور پیرامنٹ کا ایسنس منہ زبان سُن اور ٹُن کر دیتے ہیں۔ مزید افیون کا ست اِسے سہ آتشہ بنا دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ جب آدمی اس کا عادی ہو جاتا ہے تو پہلے دانت اور آنت جاتے ہیں پھر تالو اور منہ کے اندر والی جبڑوں کی جھلی اور زبان کی سطح تباہ ہو جاتی ہے۔ حلقوم کا کوّا بیٹھتا ہے۔ نرخرے میں ورم اور سانس کی نالی میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوتی ہے۔ بات یہیں پہ ہی نہیں رُکتی آگے بھی بڑھتی ہے۔ مردانہ آزردگی کے علاوہ اعصابی تشنج پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر اس کے عادی مرد کی اولاد صحت مند پیدا نہیں ہوتی۔''

بچہ اچھا اور فرمانبردار تھا...... اس زہر کی پڑیا سے پرہیز اور فلیٹ سے منتقلی کا کہہ کر مَیں چلا آیا...... اب اس کے پانچ بچے ہیں۔ ماشاء اللہ تندرست خوبصورت...... تمباکو اور نہ محسوس ہونے والے شور سے نجات پاتے ہی اُس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ کہنے کا مقصد؟ تھوڑی سی لاعلمی سے نہ صرف ہم اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں بلکہ اپنی آئندہ نسل کی زندگیوں کو داؤ پہ لگا دیتے ہیں۔
مَیں ایک حقہ پینے والے مسجد کے پیش امام صاحب کو جانتا ہوں جو پانچ وقت نمازی متقی پرہیزگار اور

معتبر عالمِ دین ہے۔ مگر چہرے پہ نحوست' کلام اور دُعا بے اثر...... اولاد ناخلف اور بداطوار...... ہر لمحہ حالات اور مالی معاملات کے شاکی...... مجھ سے واجبی سی جان پہچان تھی۔ میرے سیاہ لباس' انگوٹھیوں' مالاؤں اور دراز زُلفوں کے متعلق اُن کے خیالات انتہائی معاندانہ تھے۔ یہاں تک کہ مجھے مسلمان تو کیا' انسان بھی نہ سمجھتے...... لیکن چونکہ محلّہ دار تھے اس لیے کہیں آمنا سامنا ہو جانے پہ بہ اَمرِ مجبوری پھیکی سی سلام دُعا ہو جاتی تھی۔ اسی طرح ایک بار ٹیلیفون کے دفتر ملاقات ہوگئی۔ بڑی منافقت سے مسکراتے ہوئے علیک سلیک فرمائی...... اُن کی ظاہری حالت خاصی پتلی دکھائی دی تو ازراہِ مروّت خیریت پوچھی۔ جواباً وہی حالات' اولاد کی نافرمانیوں کا رونا؟ نہ جانے کیسے اُن کے منہ سے نکل گیا۔

''باباجی! میرے لیے اور میری ناخلف اولاد کے لیے دُعا فرمائیں!''

مَیں حیران کہ ایک عالم فاضل کٹر وہابی' ایک بدعتی درویش' جسے وہ سرے سے بندہ نہیں سمجھتا' دُعا کے لیے کہہ رہا ہے۔ مَیں نے مزہ لینے کی خاطر یونہی کہہ دیا۔

''حضرت! آپ خفتہ'' شریف'' سے قطع تعلق فرمالیں اور اپنے علاوہ دوجوں کو بھی' بہت نہیں تو تھوڑا سا انسان سمجھ لیا کریں۔ اس ہدایت پہ عمل کریں تو چند دنوں میں اس کے مثبت اثرات ظاہر نہ ہوں تو فقیر کی گردن مار دیجیے گا...... اور ہاں' چہرہ مبارک پہ خشونت کی بجائے کبھی خوشی کو مترشح فرمالیا کیجئے کہ اس طرح اللہ پاک کی شکرگزاری کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔''

مجھے گھورتے ہوئے فرمایا۔

''مَیں نے دُعا کے لیے برسبیلِ ملاقات کہہ دیا تھا آپ تو نصیحت شروع ہو گئے......''

مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کبھی جاہل اور کافر کی بات بھی اکسیر لگتی ہے...... تجربہ شاہد ہے۔''

کئی روز بعد یوٹیلیٹی سٹور کے اندر ملاقات ہوئی۔ حضرت کھلے کھلے اور کھلے کھلے سے لگے۔ مَیں نے بہتیرا پہلو بچانا چاہا مگر دھر لیا گیا۔ علیک سلیک کے بعد بڑی اپنائیت سے بولے۔

''باباجی! خفتہ کیا توڑا سب معاملات ہی جُڑ گئے۔ کوئی چھوٹا سا عقیق مجھے بھی پہنا دیں......''

مَیں نے بھی کمال بے تکلفی سے جواب دیا۔

''مولانا! ہم تو آپ کے گھڑے کی مچھلیاں ہیں...... عقیق کی بجائے آپ کو کسی مخلص رفیق کی ضرورت ہے جو آپ کو مجری نگینے اور دُحات کی انگوٹھی کی مانند آپس میں جڑ کر ایک ہونے کے تشرفات سے آگاہ کرے؟''

میں بابے کا ہمزاد! پھر بے قابو ہو کر بول پڑا تھا!

''مُرشد! آپ بیلے والے مخنث مجذوب بابے کی بابت بتاتے بتاتے اچانک کسی مولوی کے پیچھے ہو لیے جو حقّہ نوش تھا۔ حقّہ تو ہماری ثقافت میں شامل ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہے۔ آپ کو جانے کیوں اس سے کد پیدا ہو گئی ہے جبکہ اس کے بہت سے فوائد بھی ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ اجتماعیت پیدا کرتا ہے۔ بے کار بوڑھوں کو مصروف رکھتا ہے۔ چولہا جلائے اور دل دہکائے رکھتا ہے۔ حقّہ نوش بحث کم کرتا ہے اور دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاتا کہ وہ اسے اپنے ہاں گھسنے نہیں دیتا۔''

حسب عادت کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے سٹھیایا ہوا اور باتوں کا گالڑ کہتے ہو...... مگر تم بھی مجھ سے کسی طور کم نہیں۔ دیکھ لو میری چھوٹی سی بات کو کیسے کیسے پُر پرزے نکال کر پیش کیا ہے۔ بھائی! بات میں بشارت اور بکارت نہ ہو تو وہ بات کم اور باتق زیادہ ہوتی ہے؟ خیر' چلو! وہیں بابے سے شروع کر لیتے ہیں...... صوفی منش کہتے ہیں۔ ''گذر گئی گذران کیا' جھونپڑی کیا مکان کیا؟'' ہم بھی کہتے ہیں...... ''مشکل کیا آسان کیا' شروع کیا درمیان کیا؟'' ...... ہاں تو! کہنا چاہ رہا ہوں کہ بابا مجذوب بھی حُقہ پیتا تھا۔ مگر اس کا حُقہ کم' کوئی لاحقہ زیادہ تھا۔ لوگ کہتے ہیں ملّاح کے حقّہ میں پانی نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں' ہوتا ہے مگر آب سلطانی نہیں ہوتا......''

## ● یارا سیلی سیلی......!

جلال پور جٹاں کے نواحی علاقے کے ایک گدڑی پوش کے ڈیرے پڑا تھا۔ ذات کا جولاہا مگر اوقات کا مَلّاح! بابا جوانی کے وقتوں سے دریائے چناب کے بیلوں میں خُود رو کھٹ بیریوں کے ڈنٹھل اور پتے جمع کیا کرتا...... اس سامان سے وہ کچے سُوت کے لیے اُودھا پکا رنگ بنایا کرتا تھا۔ اِس اُودھے رنگ والے سُوت سے بڑا اعلیٰ موٹا کھدّر تیار ہوتا ہے جسے عموماً درویش فقیر پہنتے۔ سائیں کانواں والی سرکار میاں محمد بخشؒ' بابا عبداللہ شاہ اور دیگر بزرگانِ عصر کے چولے' لنگوٹ' تہبند وغیرہ عموماً اسی جلال پوری اُودھے کپڑے کے ہوتے؟

میں اپنے اندر کی ایک اُلجھن میں پھنسا ہُوا' کسی کے اِشارے پہ جلال پور کے نواح اِس دریائی علاقہ میں پہنچا تھا۔ یکسر دین دُنیا سے علیحدہ یہ گم صم سا بابا' جنڈی کے جھنڈ کی ایک جھونپڑی میں پڑا تھا۔ ایک دو

مخبوط الحواس سے دیہاتی' چند لینڈی کتے' درختوں پہ لاتعداد کوّے' گلہریاں دیگر ویرانی جیلے کے پاک پلید جانور بھی اس کے آس پاس دکھائی دیتے تھے۔

میرا آنا' یہاں کے مکینوں کے لیے نہ آنے کے برابر تھا۔ ادھر نہ کوئی ٹیولیا' چکّی نہ بستر مصلی...... بس! تنہائی ویرانی اور اللہ ہی اللہ! ایک رات اور ڈیڑھ دن بیت گیا' بابے سمیت کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ......

"آئے ہو کس گلی سے کیا نام ہے تمہارا؟" اس دوران حاجات ضروریہ کے لیے قریب دُور نکلا تھا۔ جنگلی بیر اکٹھے کیے۔ ہاتھ چھلے' چلو کچھ منہ کا سواد کھٹا میٹھا ہوا وہ تو بعد میں معلوم ہوا منہ گلا خشک ہو کے لکڑ بن گئے ہیں۔ اسی غسرت' غربت اور فاقہ زدگی کی حالت میں جب تیسرا چوتھا دن بھی گزر گیا تو میں واپس جلال پور لوٹنے کی سوچنے لگا کہ ادھر مرنے پہ کوئی پوچھنے والا بھی نہیں سوجھتا...... اُدھر کم از کم کوئی مسافر سمجھ کر دفنا تو دے گا۔

عصر کے وقت ہلکی پھلکی بوندا باندی جو شروع ہوئی تو رات تک سے باندھے رکھا۔ سوچا' چلو سر پڑی رات کسی طرح گذارتے ہیں اگلی صبح نکلیں گے۔"

اب بابا کا وظیرہ سنیں۔ وہ اکثر ذخیرے میں کہیں چلا جاتا۔ پورا دن غائب رہتا۔ کہیں شام ڈھلے لوٹتا تو اس کے سر پہ اک بھاری سا گٹھڑ ہوتا جس میں ننھے ننھے سرخ خیالے بیر ہوتے۔ بیر نکال کر وہ مٹی کے بڑے سے مٹ میں ڈال دیتا...... وہیں پاؤں پسارے نیم دراز ہو جاتا۔ اک عجیب و غریب سا بانس کی نڑیوں کا حقہ گھسیٹ کر اس کی نے منہ میں رکھ کر گڑ گڑ شروع کر دیتا۔ اگر اس کی چلم اور نیچہ نہ ہوتا تو وہ کسی طور حقہ نہ تھا ازمنہ قدیم کے عجیب الحال فلک شناسوں کا کوئی فلکی پیمائش آلہ دکھائی دیتا تھا۔

پچھلے تین چار روز بھوک پیاس سے قطع نظر میں اسی بات پہ غور کرتا رہا کہ پانی آگ تمباکو سے بھی اس حقے سے بابا' کیا حاصل کرتا ہے؟ کش کھینچنے کی تہمت تو تھی مگر حاصل ضرب کچھ نہ تھا۔

یعنی وہی کہ "یارا کیلی بیلی بر ہا کی رات کٹے نہ" "یہ بھی کوئی حقہ ہے یہ بھی کوئی پینا"

میرے حساب سے میری آخری شب کا آخری پہر ہوگا کہ خالی بیر زدہ پیٹ میں جیسے مار پیٹ شروع ہو گئی۔ فاقوں کی بھی کئی اقسام ہیں مثلاً کبھی کبھی عید شب برأت کا فاقہ' جمعراتی فاقہ' عشری اور اٹھ پہری فاقہ' ظہوری فاقہ' مجبوری فاقہ' جبری فاقہ' فقیری فاقہ' خفیہ ی فاقہ' بیماری فاقہ' سرکاری فاقہ وغیرہ۔"

دانت کے درد کی لہر کی طرح' آنت کے درد کی لہر بھی بڑی ظالم ہوتی ہے۔ سونے دیتی ہے نہ رونے! فاقہ زدہ کسی نہ کسی طور خالی آنت کے خلاء کو پُر کرنا چاہتا ہے۔ اس حالت میں حرام حلال باسی تازہ' کچا پکا' ذائقہ مزہ' اپنا پرایا کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا...... یہی حال میرا کہ پیٹ میں کچھ ٹھونسنے کی خاطر میں دیوانہ وار

کچھ تلاش کر رہا تھا۔ جدھر دن کو کچھ کھانے پینے کو نہ ملے وہاں بھلا رات کے اندھیرے میں کیا دکھائی دے گا؟ کھوجتے کھوجتے میں بے دھیانا سا بابا کی جھونپڑی کی جانب بڑھ آیا۔

اسی اثنا، آنکھیں بھی اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی خوگر ہو چکی تھیں۔ ہلکی ہلکی چُس چُس کی چسکیاں سی سنائی دیں۔ غور سے دیکھا بابا لنڈے کی گٹھڑی سی بنا حقّہ پہ منہ دھرے بیٹھا ہے۔ یقیناً وہی خارجی ملاقتی کرامتی حقّہ تھا جسے میں تین چار روز سے بابے کا گوڈوں میں پیٹ دیئے...... بے پانی آگ تمبا کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ ڈمی ہو جو بابوں کی حقّہ کشی کی تربیت طور استعمال کیا جاتا ہو۔

میں بابا کے قریب کھڑا شاید یہ سوچ رہا تھا کہ پیٹ آسرے کے لیے کچھ التجا کروں۔ جیسے بھی تھا' میں اس کا مہمان تھا۔ میزبان' فقیر ہو یا اُمیر...... در پڑے مہمان کی مدارت اُس پہ واجب ہوتی ہے۔ تھوڑا بہت جو بھی ہو...... کم از کم اُسے بے نوالہ موت سے تو بچایا جائے۔ سچی بات کہ میں نے بابے سمیت اُن دو تین مجہولوں کو بھی کچھ کھاتے تُرکتے نہیں دیکھا تھا۔ میں دل ہی دل میں گجرات کے اس بے پیٹے صوفی کو کوسنے لگا' جس سے میں کسی ایسے رجل رشید کے متعلق پوچھ بیٹھا جو نفسِ مطمئنہ سے واصل ہو۔ مجھے کیا خبر کہ وہ مجھے ایک ایسے "رجل خسیس" کے ہاں لا اُتارے گا جو خود کھائے نہ کسی کو کھلائے۔"

کُتّے' بلّے' کوّے' کبوتر' چڑیاں چنڈالیں تو اللہ ڈیرے ہوتے ہیں لیکن بندے کے ڈیرے' بیٹھے ڈوم کو بھی دو وقت ٹکڑ کی ڈلی چاہیے ہوتی ہے کہ شکر شکرانہ بھی' شکر چائے بنا واجب نہیں ہوتا...... میں اس حیض بیص میں پڑا کھڑا تھا کہ میرے گھٹنے پہ ایک ہاتھ سرسرایا۔ وہاں بابا کے سوا کون تھا جو ایسا کرتا......!

بانچ گئے اندھیرے میں دیکھا۔ بابا مجھے بیٹھنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ نہ بھی دیتا تو میں خود ہی بھوک کے ہاتھوں نڈھال ہو کر ڈھیر ہونے والا تھا۔ تھپ سے میں اپنے پاؤں پہ گر چکا تھا۔ بابا نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند بیر میرے منہ میں زبردستی ٹھونس دیئے کہ وہ بیروں کی ڈھیری پہ ہی ڈھیر تھا۔

وہی سخت گٹھلی والے ننھے ننھے سرخ و سیاہ بیر گھٹے میٹھے! جن کے کھانے سے حلق جکڑا جاتا ہے۔ قدرے تلخ سی لیسدار رطوبت سے زبان' تالو سے جڑ جاتی ہے جو پچھلے تین دن اور چار راتوں سے میرا نصیب تھے۔ جن سے میں بیزار بلکہ آزار ہو چکا تھا...... لیکن اس وقت' منہ میں چند دانے میرے لیے وٹامنز کی سریع الاثر گولیوں کی طرح ثابت ہوئے۔ اک عجیب سی قوت سرشاری اور طمانیت دَر آئی تھی۔ میں گٹھلیوں تک نگل گیا تھا۔"

بابا نے دوسری خوراک بھی میرے منہ میں ڈال دی...... تیسری اور چوتھی تک میں پوری طرح

چاک وچوبند ہو چکا تھا۔ ایسے ہی بیر پچھلے چند دنوں سے بامرِ مجبوری ٹھونس رہا تھا...... جو یہاں کے مکینوں کی بھی خوراک تھے۔ سمجھ نہ آیا کہ جسم وجان رکھنے والا کوئی بندہ، محض بیروں پہ کیونکر زندہ رہ سکتا ہے؟...... میرے دائیں کان میں سرگوشی سی اُبھری۔

''بچے! تم واقعۂ معراج تو سنا ہوگا؟ اس میں سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر بھی! بیری کا وہ درخت جو روح القدس کا مسکن اور عرشِ بریں کا پہلا پڑاؤ...... جس کے آگے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی اور نہیں پہنچا۔''

یہ کہتے ہوئے بابے نے چند بیر مزید میرے منہ ڈالتے ہوئے مزید کہا۔

''ہم اُس بیری کے بیروں کو تصور میں لا کر یہ بیر کھاتے ہیں۔ جب کوئی انسان کسی چیز کو مان لیتا ہے۔ چاہے وہ ویسی نہ ہو جو اُس کا اصل ہے تب بھی وہ ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسے اصل ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ جزوِ جان اور اصلِ ایمان ہو جاتی ہے۔ نفسِ مطمئنہ کو سمجھنے کے لیے کسبِ حلال کی حقیقی بنیاد کو سمجھنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ چند بیروں سے اگر زندہ رہا جا سکتا ہے۔ ان کی برکت سے ایمانِ کامل حاصل ہو سکتا ہے تو پھر مزید کیا چاہیے؟''

میں نے پہلی بار براہِ راست زبان کھولی۔

''بابا! ہر شخص کے لیے یہ بیر کھانا یعنی ایسی طرزِ زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ کیا میں نفسِ مطمئنہ سمجھنے کے لیے یہ بیر کھایا کروں؟...... اور آپ والی طرزِ زندگی اختیار کر لوں۔ اس طرح یہ عجیب وغریب ساخفتہ کش کرنا شروع کر دوں؟''

''نہیں! ہر کسی کے لیے یہ بیر کھانے اور ایسا خفتہ پینا ضروری نہیں ہے۔ جیسے صاحبِ ارشاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ وعظ ونصیحت بیان وخطاب اختیار کرے کہ اُسے یہ صلاحیتیں عطا کی گئیں۔ صاحب الرائے، صاحبِ طریقت ومعرفت، صاحبِ جذب وحال، صاحبِ نظر وبصیرت کے اپنے اپنے میدان ومناظر ہیں۔''

''بابا! ہر شخص تو ایسی طرزِ حیات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ شاید مخصوص لوگوں کے عمل ہیں اور یقیناً وہ ایسا سبق وعلامیت ساتھ لے کر آتے ہیں۔ بیوی بچوں اور فکرِ روزگار میں پھنسا اور دُنیا کے بکھیڑوں میں دھنسا ہوا فرد بھلا ایسی پُرخار اور بظاہر بیکار زندگی کا کہاں متحمل ہو سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ سب کام شاید اُن افراد کے ہیں جن کے آگے پیچھے روکنے ٹوکنے' کہنے سننے والا کوئی نہ ہو۔ بابا! میرا اندازہ ہے کہ آپ کے بیوی بچے نہیں اور نہ کوئی ذمہ داری اور چنتا...... ورنہ آپ ادھر ویرانے میں یوں پڑے نہ ہوتے؟''

حقیقی اندھیروں کے خوگر مصنوعی روشنیوں میں آ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ گھُپ اندھیرے کلاسیکل میوزک کی مانند ہوتے ہیں۔ ان میں ذم وجیرج' شانتی اور اِک غیر معمولی سی شکتی کا احساس چھپا ہوتا ہے۔ یہ

پُرسکون شکتی جو مَنش میں گھمنڈ نہیں بلکہ گھمبیرتا اور گھلاوٹ کے رَس گھولتی ہے......
اس وقت بھی کیفیت میری تھی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ملگجے اندھیرے' لیکن ایسے روشن صاف اور بے سایہ کہ مخاطب منظر' بے سلوٹ دکھائی دے۔

● سدا رتھ کی سینڈھ......!

بابا کچے موہ کے ڈھلوں سے ڈھلا ہُوا سدا رتھ لگ رہا تھا۔ اس سے اُودھے اُودھے دُھوئیں کے لہریے اُٹھ رہے تھے۔ ایسا بھی کہ اس کے اَندر کی اَبابیلوں کے گھونسلے سُلگ اُٹھے ہوں...... یوں بھی کہ پرانے گڑ اور دیسی تمباکو کے سیم زدہ بیجوں پہ انگارے اُلٹ پڑے ہوں۔ وہ مجھے ہوا وَ ردلوں کی زد میں آیا ہُوا خس وخاشاک کا اُڑن گولا بھی جاپ پڑا جو گمسن گھیریوں کے رحم وکرم پہ کبھی اُوپر کبھی نیچے' اِدھر سے اُدھر ڈولتا بدولتا رہتا ہے۔ وہ گاہے' وہ ناڑا تو جو حقہ بھی کش لیتا جو آگ پانی تمباکو کے لازموں سے بے نیاز تھا۔
بے نیازی' اُس بڑے بے نیاز ہی کو زیبا ہے۔ وُہی اِس عظمت وحشمت کا سزاوار ٹھہرا...... وہ اپنی کمال بے نیازی سے اگر کسی کو اس کے چند ذرّے عطا کر دے تو اس کی شان بے نیازی ہی تو ہے۔ میری سمجھ میں' دَرویشوں فقیروں کی اس رَوایتی بے نیازی کو استغناء کہتے ہیں اور جس میں یہ دکھائی نہ دے وہ ابھی مِس خام ہے' لَو نہیں لوڑا ہے......؟
اِنسان' اپنی ظاہری باطنی حرکات وسکنات پہ کما حقہٗ قدرت نہیں رکھتا۔ چند اعمال وافعال' دانستہ ہوتے ہیں اور بیشتر سرزد ہو جاتے ہیں...... جن کے لیے وہ مَورد اِلزام نہیں ٹھہرتا' کیونکہ تار کہیں پیچھے سے ہلتی ہے۔
''بابا! یہ حقہ کہاں سے بولتا ہے؟'' پوچھنا چاہتا تھا مگر پوچھ نہ سکا...... بہت بعد کہیں سمجھ میں آیا کہ کسی دَرویش فقیر کے رُوبرو کچھ پوچھنا' تلاش یا طلب کرنا عبث ہی ہوتا ہے۔ وہ دَرویش اور فقیر ہی کیا؟ جو پوچھے بن بتائے نہ! اور مانگے بغیر دے یا دِلوائے نہ...... ہاں! یہ ضروری ہے کہ وہ اس کی ضرورت' ضروری سمجھتا ہے یا نہیں......؟
ایک ہلکا سا کش لیتے ہوئے خُود ہی کہنے لگا۔
''بہت سے پیڑ پَودے' پھلوں پھولوں کے بغیر بھی ہوتے ہیں...... اور چند ایک سائے سے بھی محروم' مگر کہلاتے وہ بھی پیڑ پودے ہی ہیں۔ اِنسان کی نقد منقل سمجھ' اگر کسی چیز' عمل کا جواز یا جواب حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے تو اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ چیز بیکار اور فضول ہے۔ کارخانہ قدرت میں بظاہر بیکار چیز بھی اپنا

ایک کامل وجود اور اہمیت رکھتی ہے۔ جیسے میرا یہ خفہ...... ایک زمانہ ہو گزرا کہ اس کے تمام لازمے موجود ہوا کرتے تھے۔ وہی چند لازمے جو انسان کی تکمیل میں استعمال ہوئے۔ مٹی آگ ہوا اور پانی وغیرہ۔ پھر ایک وقت ایسا بھی کہ مرشد کے حکم پہ آگ کی نفی کر دی مگر اس کا بولنا ختم نہ ہوا۔ پھر پانی بھی پانی پانی کر دیا اور بعد میں تمبا کو بھی باقی نہ رہا۔ مٹی کا منہ باقی رہ گیا تب اس کی بولتی بند ہوئی۔ یہ تو اس کے بانجھ ہونے پہ انکشاف ہوا کہ بولتی بند ہونے پہ کیا کیا کھلتا ہے؟"

میری سمجھ کچھ نہیں آ رہا تھا کہ بابا کیا کہہ رہا ہے؟ مگر یہ سلسلۂ وفا تو کچھ یونہی ہے کہ نہ سمجھ میں آنے والی بات کھٹ سے دماغ میں بیٹھ جاتی ہے اور جسے بیٹھنا چاہیے وہ بھاگ لیتی ہے۔

بابا بتا رہا تھا۔ "نفسِ مطمئنہ' استغنیٰ اور لاخوفی...... ہمہ دم رجوع' کامل تجرد سے حاصل اور اللہ کریم کے کرم سے نکھرتا ہے اور تم ابھی پیٹ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو؟ لو یہ اور بیر کھاؤ' اللہ کریم کا شکر بجا لاؤ جس نے ہمیں عرشِ بریں کا تحفہ عطا کیا......!"

گھپ رات' گھپ بات گھپ گھات اور گھپ مات میں بڑے گھپلے' گانٹھیں گرہیں گھماؤ ہوتے ہیں۔ بابا کی باتوں کے ایک کھڈے سے بمشکل نکلتا تو اگلی کھائی میں گر جاتا...... یہاں تک کہ اس کی ایک بات نے تو مجھے گہری دلدل میں دھکیل دیا تھا...... میں نے سوال کیا۔

"نفسِ مطمئنہ تو نفوسِ مطہرہ نبیوں ولیوں قطبوں کا وطیرہ ٹھہرا...... کیا کوئی عام انسان بھی اس مقام کا سزاوار ہو سکتا ہے؟"

"ہاں! شاید ایسے مخصوص افراد جو شکمِ مادر سے ہی مجرد پیدا ہوئے ہوں...... خواہشاتِ نفسانی' بندے کو نفسِ امارہ کے حصار سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتیں۔ ان سے مجرد کامل کے لیے ہی چھٹکارہ حاصل کرنا ممکن ہوتا ہے مردِ ناقص کے لیے نہیں۔"

"مجرد کامل سے مراد......؟"

وہ جو مادر پدر مخنث ہو...... اللہ کریم کی حکمتیں وہی جانے؟ ولی کامل' مردِ کامل' ایمان کامل' یقین کامل' مرشدِ کامل؟...... اس طبقِ ارض کے نیچے اور اوپر پہاڑوں' غاروں' سمندروں صحراؤں میں بہت سے جانے اور انجانے مقدس مقامات یوں ہیں کہ وہاں فرشتے رجل کامل اور کہیں مخنث کامل جن و بشر متعین ہوتے ہیں۔"

استعجاب و حیرت کی دلدل میں ڈوبتے ہوئے پوچھ لیا۔

"انسانوں میں مخنث تو ہوتے ہیں...... کیا جنات میں بھی پائے جاتے ہیں؟"

"جنات بھی انسانوں کی مانند اپنی ماؤں کے شکم سے جنم لیتے ہیں۔ جنوں میں بھی بچے' جوان' بوڑھے

تانیث و تذکیر ہوتے ہیں۔ جینا' مرنا' شادی بیاہ' تعلیم و تربیت' اچھائی بُرائی انسانوں کی طرح ہی ہوتی ہے۔ چند استثنائی تفاوات سے قطع نظر آگے پیچھے کی مخلوق ہیں مگر دونوں کا ذکر اکٹھا ہی ہوتا ہے۔ اللہ کریم نے ان دونوں کے مابین بہت سی اقدار و اقتضا میں ایسی مماثلت روا رکھی کہ ایک دوسرے کے لیے مختلف جنس ہوتے ہوئے بھی اک یگانگت درمیان قائم رہی۔"

معلوم ہُوا کہ قطع نظر جن و انس' دیگر مخلوقات میں بھی مخنثات کا وجود کچھ خالی اَز مصلحت نہ ہے۔ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ خصوصی طور پہ جنّ و انس اور عمومی طور پہ حیوانات ناطقات کا کچھ طبقہ' جن میں رُوحانیت' مجاہدات و ریاضت اور علومِ سرّی سیکھنے اور ان کا ذرق حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے وہ اپنے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے خود کو عارضی یا مستقل طور پہ نسل بڑھانے کے خصائل و رجحانات سے عاجز کر دیتے ہیں یعنی نہ ہوگا بانس نہ بجے بانسری۔

لامے' گیانی دھیانی' تپسوی' رشی مُنی' سادھو سنت' جوگی سنیاسی' عامل کامل' چلّوں ریاضتوں میں ڈوبے ہوئے بابے' اِس نفسانی شہوانی آزار سے مکتی پا کر اپنے دھیانے لگے رہتے ہیں۔ گو یہ جنسی صفت مرد کی شناخت اور شان میں شامل ہے مگر درویشی فقیری کے راستہ میں نوکیلے روڑے پتھر اور خاردار جھاڑ بھی! جس سے راہ کھوٹی اور منزل بھاری پڑ جاتی ہے۔

شاعری دو طرح سے وجود میں آتی ہے' آمد اور آورد...... یعنی اُوپر سے طاری ہوتی ہے یا خود طاری کی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کی جانب سے کسی مرد یا عورت کو زنانہ یا مردانہ صفات سے محروم رکھا جاتا ہے تو وہ مخنث ہوتا ہے اور اگر کوئی مرد یا عورت' دانستہ خود کو ان صفات سے علیحدہ کر لیتے یا مجتنب ہوتے ہیں اور مقصد ریاضت و عبادت میں یکسوئی حاصل کرنا ہو تو وہ تجرّد ہے جو نہ گناہ ہے نہ ثواب...... ! اس کے علاوہ جو کسی اور دُنیاوی یا شہوانی مقصد کی خاطر خود کو ایسا بنا لیتے ہیں وہ زنخوں ہیجڑوں زنانوں کھسروں کی ذیل میں آتے ہیں۔

خواجہ سرا' مردانہ صفات سے پچانوے فیصد محروم ہوتے ہیں...... نسل کشی کا وظیفہ ادا کرنے سے قاصر!...... نسائی رُجحانات محدود' مردانہ صفات زیادہ...... چہرہ' سینہ' بازو و ہاتھ بالوں سے محروم مگر جسم بُشتہ قوی...... یہ بدکاری کی جانب مائل نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی حرکات و سکنات میں سفلہ پَن ہوتا ہے۔ بادشاہوں کے حرموں' نوابوں کے محلسراؤں' دَرباروں' درس گاہوں' عدلیہ کے محکموں اور بڑے بڑے عسکری عہدوں پہ متمکن! کہ یہ اعتبار شعار' وفا کیش' بہادر اور اُمورِ سلطنت کے ماہر ہوتے ہیں۔

رُوحانی مجاہدت و ریاضت یا دینی دُنیاوی علوم و فنون کی تکمیل کے دوران کئی ایسے مراحل بھی آتے ہیں کہ کسی ہلکی سی نفسانی' ہیجانی شہوانی کیفیت کے باعث' برسوں کی محنت پہ نہ صرف جھاڑو پھر جاتا ہے بلکہ جان'

جانے کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔

## • خستگی سے آبلہ پائی تک......!

سرہند شریف میں مقیم ایک سید صاحب کی بابت سُنا کہ وہ جنوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے ہیں اور کئی ایک جن بچوں کو قرآن پاک حفظ بھی کروا چکے ہیں۔ جنوں کی شادیوں غمیوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ عمر خوردہ اور سدا کے بیمار...... اُن کی دیکھ بھال' کھانا پینا سب جنوں کے سپرد ہے لیکن اگر اُدھر کوئی اُفتاد آ پڑے یا ایسی پریشانی جس کا کوئی حل نکلتا دکھائی نہ دیتا ہو تو لوگ اُن سے ہی رجوع کرتے ہیں یعنی مستجاب الدعوات بھی ہیں۔''

مجھے یہ سب باتیں بتانے والے خود بھی ایک سید زادے اور حضرت نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کے سجادہ نشینوں میں سے تھے۔ میری اُن کے والد کے وقتوں سے یاد اللہ تھی۔ نظامی صاحب خود بھی عالم و عامل اور صاحب تصرف تھے۔ بڑے بڑے روحانی اور ریاضتی مراحل سے بافراد گزر چکے تھے۔ اپنی زبانی کبھی اعتراف تو نہ کیا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اُن کے اہل افلاک' جنات وغیرہ سے راہ و رسم ہے۔ اسی طرح' انہیں گاہے ماہے کریدتا رہتا کہ کبھی تو وہ اندر والی کوٹھڑی کا کوئی روزن کھولیں گے۔؟

دِلّی والے' خاص طور پہ نظامی سلسلہ' لڑ گئے' گانٹھ کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے مُٹھے پہ ہاتھ دھرنے تو نہ دیا لیکن اگلا گھر' یعنی سرہند شریف والے شاہ صاحب کا در ضرور دکھا دیا۔ چلو! کچھ تو حرکت برکت ہوئی۔ آم سے غرض تھی' پیڑ سے ملے یا آک سے! میں اُن کی کھوج میں سرہند شریف روانہ ہو گیا۔ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے' دھوپ دیکھے نہ بارش' دُھند دیکھے نہ خارش...... بھوک پیاس نیند سب بھول جاتا ہے۔ بس رہتی ہے دل کی اُمنگ' جو کسی بھی ڈھنگ پوری ہو؟

میں جس نیے' لوکل بس سے سرہند شریف پہنچا...... بارش چھما چھم تین تال بجا رہی تھی...... دِلّی سے سوار ہُوا تو سخت حبس اور گھٹن' تپتی دھرتی گرم بخارات نچوڑ رہی تھی...... اِدھر بھی یہی عالم کہ بارش کے باوجود' گھٹن' اُمس بھری فضا' تھکی تھکی سی ہوا...... میں بڑی بوجھل طبیعت لے کر بس سے اُترا۔ اگلے لمحے بارش کی بوچھار نے مجھے نہال کر دیا۔ میں کسی سائبان کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نمدار دھند میں جب کچھ دکھائی نہ دیا تو میں پاس ہی گھنے سے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔

سیانے کہتے ہیں کہ مُوسلا دھار بارش میں کہیں کوئی سائبان نہ ملے تو فوراً نیچے بیٹھ جاؤ۔ پورے بھیگنے

سے بچ جاؤ گے اور کچھ چیز بھیگنے سے بچانا چاہو تو اُسے گود میں سینے کے نیچے ڈھانپ لو۔ میں نے اپنا نیم بھیگا ہُوا سفری تھیلا گود میں رکھ لیا کہ اِس میں میری کتابیں' قلم کاغذ اور کچھ ضروری اشیاء ہوتی ہیں...... چادر کا تمبو میں نے اُوپر تان لیا تھا...... تمبو' چادر' درخت' پگڑی ٹوپی اور کسی کا شفقت بھرا ہاتھ...... کیسی طمانیت بھری حفاظت کا احساس پیدا کرتے ہیں؟

کبوتر کی طرح میں نے بھی خُود کو بارش کی بلّی سے محفوظ کر لیا تھا۔ کوئی بس چھپک کر میرے قریب سے گزرتی ہے۔ گدلے بارشی پانی کا ایک ریلا مجھے بُری طرح شرابور کر گیا تھا۔ میرا منہ سر ایک ہو گیا۔ داڑھی میں سجے یا نکوں میں داڑھی' سر کی زُلفیں لٹک گئیں جیسے برگد کی شاخیں لٹک رہی ہوتی ہیں۔

میں گوروداس پور کے کسی گو بند سیہاں کی تازے گُڑ سے بھری گٹھری بنا دھیرے دھیرے گھل رہا تھا۔ کانسی کی گھڑوی میں' تازہ گُڑ کی بھیلی' زرداں آڑ کے پانی میں ڈال کر توڑی یا ونڈے کی ڈھیرے میں دبا دیں...... رات کے کسی پہر نکال کر چکھیں تو بچی کے کنوارے پُور کا سواد ملتا ہے۔ سرگودوں میں دیے میں بھی کسی ایسی ہی کیفیت میں اُترا ہوا تھا۔ بارش میں شراب پینا' سات مذہبوں حرام ٹھہرا کہ بارش تو بنفسِ نفیس' اسم با مسمّیٰ شراب طہورہ ہے۔ لفظ بارش اُلٹا دو یا لفظ شراب معکوس کر لو' ہر دو صورت سے ارغوانی ٹپکنے لگتی ہے۔

میٹھی میٹھی بارش ہو یا میٹھی میٹھی چیز' دونوں کے سواد اور تاثیر میں بڑا گہرا گرمائش ہوتی ہے۔ بھڑکتی آگ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور دھیرج کی سلگن دیتی ہوئی آنچ تپا کر کندن بنا دیتی ہے۔ میں اس دوران پگھل رہا یا کندن بنا؟ یہ تو معلوم نہ ہو سکا اور نہ ہی وقت بیتنے کا احساس ہُوا۔ جب ذرا سرت پکڑی تو بارش تھم چکی اور آمد و رفت بھی شروع ہو گئی تھی۔

میں نے گرد و پیش پہ نظر ڈالی' ہر سو پگڑیاں ہی پگڑیاں! سکھ حضرات' وہی پنجاب کا وہی رنگ...... غربت' تنگ دامنی' اِک نا آسودگی جو کم و بیش ہر چہرے پہ مترشح تھی۔ اِک اپنائیت بھی جو سب کی سانجھی دکھائی دیتی تھی۔ زندگی کی سانجھ میں مسلک' مذہب بہت پیچھے رہ جاتے ہیں...... آدمیت اور انسانیت کی بنیادی قدریں بہت آگے تک بڑھتی ہوئی یہ درس دے رہی ہوتی ہیں کہ انسان کہیں بھی ہو' کہیں کا بھی ہو' کیسا بھی ہو ایک ہے۔ وہ مذہب و مسلک' قوم و ملت کی بناء پہ ایک دوسرے سے اغماض نہیں برت سکتا۔ اُسے رنگ و نسل' لسانی اور طبقاتی وجوہات پہ نفرت و عصبیت کا سزاوار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پتا نہیں میں ایسی اُوٹ پٹانگ باتیں کیوں سوچنے لگا تھا؟

میں نے اپنے پاؤں پہ اُٹھنے کی اپنی سی کوشش کی مگر شاید گیلے بھیگے میں مسلسل کچھ دیر اُکڑوں بیٹھنے سے ٹانگیں پاؤں سُن ہو گئے تھے۔ کچھ دیر سہلانے دبانے سے اُٹھا تو اس بھیگی بلّی کی مانند تھا جو اپنے بلونگڑوں کو

برسات سے بچانے کی خاطر' اپنے نیچے لیے بیٹھی رہی ہو۔"

مَیں نے اپنے بھیگے ہوئے تھیلے کو پھر سے کاندھے پہ لٹکایا اور اُن جنوں چہرے والے سید صاحب کی تلاش میں ایک جانب ہولیا۔ اپنی دائیں جانب بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کچھ دُور' مجھے ایک دکان پہ شرعی داڑھی والا' مسلمان نما شخص نظر آیا' جس کے سر پہ نماز والی بنگالی طرز کی جالی کی ٹوپی تھی۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو ایک کپڑے کی دکان! اُوپر گورکھی میں لکھا' معمولی سا سائن بورڈ' جس کے اُوپر والے دائیں بائیں کونوں میں چھوٹے چھوٹے حرفوں میں اللہ' محمد لکھا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ سائن بورڈ تو کسی مقامی سکھ پینٹر نے بنایا ہے مگر کونوں میں آڑھا ترچھا اللہ' محمد اِس مسلمان دکاندار نے اپنی مسواک سے لکھا ہے۔

مَیں اَب گورکھی اور عربی والے سائن بورڈ کے عین نیچے' برسات میں بھیگے کسی بَھو کے کالے ٹٹّے کی مانند' جو پچھلی ٹانگوں میں دُم دبائے کسی ہڈی بوٹی کی جستجو میں ہوٹل کے باہر کھڑا ہوتا ہے۔

یتیم یسیر دکھائی دینے والے مسلمان دکاندار نے جب اپنے جیسے خستہ حال اور کالے شا' بابے کو یوں کھڑا دیکھا تو اُس کے بے رنگ چہرے پہ کئی رنگ اُبھرتے ڈوبتے دکھائی دیے۔ میرے السلام علیکم کے جواب میں' اُس کے منہ سے وعلیکم سلام یوں پنکچر ہُوا...... جیسے وہ اپنا خفیہ کوڈ ورڈ' اپنے کسی خفیہ والے کو کچھ بتا رہا ہو۔ نگاہوں سے دائیں بائیں ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی! بولو...... کی سیوا کراں؟"

بوکھلاہٹ اُس کے چہرے کی ہانڈی سے پٹنے کی دال کی جھاگ کی مانند اُمڈی پڑی تھی۔ مَیں اس کی' بلیوں کے باڑے رہنے والے مرّیل چوہے سی زندگی پہ متاسف ہونے کے باوجود لطف اندوز بھی ہُوا کہ سائن بورڈ پہ اللہ رسول کو تو کونے لگا دیا...... اَب کسی مسلمان نما بندے سے بھی اتنا حجاب؟ بھئی! دکاندار ہو تمہارے لیے تو...... کیا امیر کیا فقیر' کیا صغیر کیا کبیر؟

مجھے اپنے حال میں گم اور اپنے سوال کا جواب نہ پاکر وہ پھر قدرے قریب آکر پوچھنے لگا۔

"مہاراج! حکم کرو...... کی سیوا کراں؟"

مَیں نے نیم مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بھائی! مَیں گاہک نہیں' مُسافر ہوں۔ سردست تو دِلی سے آیا ہوں...... کھرا پاکستانی' سیالکوٹ کا وسیک ہوں۔ اِدھر سرہند شریف' سلام کرنے اور ایک سید صاحب' جنھیں جنوں والا بابا کہتے ہیں اگر اُن کا کوئی تھور ٹھکانا معلوم ہو تو بتا دیں......؟"

اُس مسلمان دکاندار کی شاید شکل ہی ایسی تھی یا کوئی نفسیاتی' طبقاتی مذہبی مسئلہ؟ لگتا تھا اگلے لمحہ

پھوٹ پڑے گا...... چھوٹا مُگھنا سا تھا' جُھکے ہوئے اَبرو' ناک کی گھوڑی اِک طرف مُڑی ہوئی۔ ہونٹ موٹے اور باچھیں چِری' کناروں سے اُتری ہوئیں...... ٹھوڑی کی کھول کُھلی ہوئی' جیسے کسی نے دانستہ اُدھورا کٹ لگا کر چھوڑ دیا ہو...... سالخوردہ' ناخوردہ دریدہ دانت...... لگتا تھا کسی بُوڑھے بھیڑیئے سے بھیک میں لیے ہوں گے......؟ اللہ! یہ سرہند شریف کے دربانی مسلمان کا حال ہے' اندر بابا جنوں والے کا عالم کیا ہوگا؟ جن کی جنّوں سے گہری شناسائی کی شہرت سُن کر اِدھر پہنچا تھا۔''

میری سب باتیں اُس کی سمجھ میں آئی ہوں یا نہ آئی ہوں' لیکن دو باتیں وہ خوب سمجھا۔ ایک پاکستانی والی دُوجی بابا جنوں والے کی...... چتون چڑھاتے ہوئے بولا۔

''تمہارا حلیہ دیکھتے ہوئے ہی مَیں سمجھ گیا تھا۔ تم اِدھر اُسی منحوس جنّوں والے باوا لاڈلے شاہ کے لئے آئے ہو۔ اگر وہ شہر میں ہے تو عشاء کی نماز پہ درگاہ شریف کی مسجد میں کہیں مل جائے گا اگر جنگل والے جھونپڑے میں ہے تو جنگل کی جانب نِکل لو۔ وہاں بھی نہ ملے تو ستواندی پہ اشنان کرتا مل جاوے گا!''

میری جانب ہمدردی بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مزید بولا۔

''پہلی بار ملنے آئے ہو تو میرا مشورہ ہے جان ایمان بچا کے ہلکے ہلکے واپس لوٹ لو...... آگے تمہاری مرضی!''

مسجد' مندر' معبد' گوردوارہ' گرجے' پگوڈے' مزارات مقبرے' امام بارگاہیں وغیرہ اپنے میناروں گنبدوں' کلسوں' علموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ چلتے جاؤ' دیکھتے جاؤ یہ اپنی پہچان خود ہی کروا لیتے ہیں۔ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مَیں اس سڑیل بدمغزے کے مشورے سے بددل سا درگاہ شریف کی جانب چل دیا۔ اِدھر پہلے بھی ایک دو بار آیا تھا۔ مگر آج بارش یا اِس دکاندار کی وجہ سے یہاں ہر چیز' پہلی بار کی دیکھی لگ رہی تھی۔ ساتھ ہی ایک انجانا سا ترَدّد بھی اندر تیر رہا تھا...... اللہ خیر کرے' ابتدا ایسی دہلا دینے والی ہے انتہا کیسی رُلا دینے والی ہوگی؟

شوق' عشق اور جنوں...... بندے کو کن کن جنگلوں' بیلوں' صحراؤں کوہساروں اور سمندروں' ٹیلوں جنوں میں سرگرداں رکھتے ہیں۔ کچھ راہ راستے سُوئے مقتل کُھلتے ہیں' کچھ دَیر و حرم جانب' کچھ مکتب و مدارس میں...... ایسے بھی جو کُوئے یار سے آگے سوئے دار تک پہنچتے ہیں۔ کچھ دُنیا کے بکھیڑوں اور کچھ دین کے کھکھیڑوں میں...... کچھ پانے کے چکر میں اور کہیں کچھ کھونے کی فکر میں...... میرا شمار' کس قطار میں تھا؟ کچھ خبر نہ فکر و شعور کہ اتنی عقل تعلیم ہی نہ تھی...... جو سامنے آیا کر لیا' جدھر راستہ کُھلا چل دیئے۔''

میرے سامنے کُھلا بازار...... بارش نے سب کچھ جل تھل کر دیا ہوا تھا۔ کیچڑ' غلاظت' تعفن' دیہاتی

مذہبی ماحول...... میں بھی گوبر کا کیڑا بنا آگے کی جانب سرک رہا تھا۔

ہندوؤں کے مقابل، سکھوں میں اَدب، بڑوں کی تعظیم و تکریم اور عجز کچھ زیادہ ہوتا ہے شاید اس کی وجہ اُن کے سماجی اور مذہبی رویے ہیں...... اُن کے خلیہ لباس، کیس داڑھی بھی اُنہیں تہذیب میں رکھنے میں ممد ہوتی ہے۔ مسلمانوں سے ہم آہنگی کی بڑی وجہ بھی یہی اقدار ہیں جو باہم مشترکہ ہیں۔

سادھو سنتوں، فقیر درویشوں، سائیں ملنگوں میں، چاہے اُن کا تعلق کسی بھی مذہب فرقے، جتھے یا عقیدے سے ہو...... یہ قدر سانجھی ہوتی ہے کہ وہ انسان دوست ہوتے ہیں۔ فروعات سے بالا اپنے سچے رب کے آگے سیس نواتے ہیں...... اُس کی مخلوق کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں، سب کی خیر اور سب کا بھلا!

کوئی ننگا ہے تو کوئی لنگوٹیا...... بھدرا کیے ہوئے کوئی داڑھیل اور کوئی لِٹوں والا...... لال سرخ، نیلے پیلے، کیسری، ہرے کالے، بسنتی چولے، پگ گھنگھرو، کڑے، کالے کشکول، سنکھ، اک تارا...... علی علی، کہیں نِلی نِلی...... حق ہُو کہیں واہے گرو...... الکھ نرنجن کہیں ست نام کا بھجن...... ہری ہری کہیں شری شری...... نعرے کہیں بجے بجے...... دھمالیں کہیں رقص درویش، میلا دے تو کہیں عرس، دسہرہ ہے تو کہیں ہولی، محرم ہے کہیں بسنت...... سب تیرے سنت منت، مندراں والے سنگھاں والے۔ بلیاں شیراں، کانواں، کتیاں والے...... ڈبا پیر، ویرسپاہی، کاکی تاڑ، نوری بوری والی سرکار نوری کھیس، چادر والی سرکار! سب اللہ کے رنگ، سب اُسی کے حوالے، یہی اندھیروں میں اُجالے...... تیمن تالے! اللہ، محمد، علی والے......!

مکہ مدینہ اور نجف اشرف کے تھڑوں میں کھڑوں کے سنگ کھوٹے سکے بھی چلتے ہیں۔ پرانے شکستہ بجھے چراغوں کے عوض، نئے نور ظہور بھرے روشن دیے بھی دیے جاتے ہیں۔ کوئی چاہے کوئی مانگے تو......؟

مرشد، وہ ہوتا ہے جو جیتے جی مر کر شُدھ ہُوا ہو...... بُدھا! کچھ یونہی شُدھا نہیں ہُوا تھا۔ تن من ہارے بن، بن اُوڑ سدھارے بن...... بس پیالہ چڑھائے بن...... اُلٹا جام اُتروائے بن...... سیس اپنا کٹوائے بن...... پور پور کٹوائے بن، بُکھوا، مچھوے پہ چڑھ نہیں سکتا۔"

بابا شاید کسی ضرورت کے تحت چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا تو میں موقع پا کر ڈرتے ڈرتے پوچھ بیٹھا۔

"بابا! میں بہت دیر سے انتظار کر رہا ہوں کہ تم سرہند شریف والے سیّد صاحب، والا قصہ تمام کرو گے۔ مگر تم حسبِ عادت اِس دلچسپ قصّے کی بیچ میں لٹکا کر دوسری طرف نکل آئے ہو۔ مہربانی ہوگی تم اُدھر سے بات جوڑو جدھر تم ایک مقامی مسلم دکاندار سے سیّد صاحب کا پتا پوچھتے ہو۔ بات کو آگے بڑھا کر یوں بیچ چھوڑا ہے چھوڑنے والی عادت بہت بُری ہے۔"

بابا میرے اِس گستاخانہ تکلم پہ خاصہ جز بز ہوتے ہوئے گویا ہُوا۔

''معقول بات اگر غیر معقول انداز میں پیش کی جائے تو گستاخی کی ذیل میں آتی ہے۔ تم مناسب انداز سے احتجاج تو کر سکتے ہو مگر بے ادبی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ وہ جو اہل فارس کہتے ہیں۔

''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است!'' اس زبردست نصیحت پہ بھی کبھی تمہیں توجہ دینی چاہیے۔ مگر تم تو باامر مجبوری میرے خفتہ وجود کا ایک پرتو ہو...... تمہیں کسی سود زیاں کا احساس کیونکر ہو؟ بہر حال! بات تمہاری معقول ہے...... اس کے اعتراف میں مجھے کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔''

سچی بات یہ ہے کہ اس مجہول مسلمان دکاندار نے جس طرح قبلہ سید صاحب جنوں والے کو عام سے الفاظ سے پکارا تھا مجھے سخت ذہنی وقلبی اذیت ہوئی تھی۔ جس عظیم عامل و کامل کے حلقہ تلمذ و تعلق میں جنات اور اجسام لطیف وخفیف ہوں اُنہیں تو القاب وخطاب میں انتہائی اہتمام والتزام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب میں اس مجہول وجانگل کو بڑوں کا ادب محترم سکھانے سے تو رہا؟ چپ چاپ اس کے بتائے ہوئے کم اور سمجھائے زیادہ راستے پہ نکل لیا۔

شیر تو شیر ہوتا ہے جنگل میں ہو یا چڑیا گھر کے کسی پنجرے میں۔ اسی طرح پنجاب بھی پنجاب ہی ہوتا ہے وہ پاکستان کا ہو یا ہندوستان کا...... اِدھر یا اُدھر کے پنجابی بھی دو چار فضول سی علتوں کے علاوہ سماجی ثقافتی فکری فہامتی قدروں میں بے پناہ ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اسی طرح بازار گلیاں چوک چوبارے صفائی ستھرائی آمدورفت...... گاڑیاں جھگڑے لڑائیاں جھگڑے گالیاں گھوسڑے ٹریفک کی پریشانیاں اور لاپروائیاں...... عشق معشوقیاں دوستیاں دشمنیاں بھی باہم مشترک ہیں۔

چوکوں بازاروں میں بسوں موٹروں رکشہ موٹر سائیکل ریڑھوں سے بچتے ہوئے گزرتا ویسے ہی جیسے اِدھر قصور پسرور فیصل آباد وزیر آباد یا لاہور میں ہوں۔

دکانوں کے سائن بورڈ گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں سڑکوں بازاروں کے نام نمبر اگر ہندی گورکھی میں لکھے نہ ہوں...... بولی ٹھولی کرتے شخص اور سر کی پگڑی میں اگر علاقائی فرق واقع نہ ہو تو سب کچھ ایک سا ہی ہے۔''

ہندوستان اور پاکستان میں ایک فرق اور بھی ہے۔ ہندوستان میں خواتین کو دیدے پھاڑ پھاڑ کوئی نہیں دیکھتا جبکہ پاکستان میں عورت کے معاملہ میں ہمارے رویے مختلف ہیں۔ غیر ملکیوں! چاہے وہ ننگے ہی کیوں نہ ہوں...... کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اِدھر پاکستان میں یورپین تو کیا اکا دکا کوئی سکھ یا پنڈت برہمن دکھائی دے جائے تو دیکھنے کی خاطر پرے کے پرے جمع ہو جاتے ہیں۔

اِدھر گزرتے ہوئے میرے اردگرد سب لوکل لوگ ہیں اور میں ایک غیر ملکی...... شکل وصورت لباس

رنگ رنگ انگوٹھیاں منکے......داڑھی زلفیں......سب کچھ پکار پکار میرا مذہب، مُلک مسلک بیان کر رہے ہیں مگر کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس نے آنکھ بھر کر یا معنٰی خیز نظروں سے مجھے دیکھا ہو یا کوئی پراسرار اجنبی سمجھ کر کچھ مغائرت برتی ہو؟

اَب مَیں ایک پولیس چوکی کے سامنے رُک کر دروازہ پہ کھڑے سکھ سنتری سے لاڈلے شاہ کی جنوں والی "مسیت" کا پُوچھ رہا تھا۔ اس بھلے سے بھولے بھالے سنتری بادشاہ نے بڑے سبھاؤ سے مجھے سمجھا کر راہ پہ ڈالا۔ اس دوران کسی لمحہ بھی مجھے احساس نہ ہوا کہ مَیں اس کے لیے "غیر ملکی" پاکستانی اور مسلمان ہوں اور وہ میرے لیے سکھ اور ہندوستانی ہے لیکن اس واہگرو کے خالصے نے مجھے خالصتاً انسانی پروٹوکول دیا جبکہ ملک قوم مذہب اور نظریاتی اقدار کے تفاوت سے ہم دونوں ایک دُوجے کے سامنے الف لاّ ننگے کھڑے تھے۔

مَیں سمجھتا ہوں اِک اُدھورے مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی یا یہودی سے کہیں بہتر ایک اچھا انسان ہونا ہے اور وہ کسی کو کچھ اور دے نہ دے لیکن ایک اِنسان ہونے اور عزتِ نفس کے ساتھ جینے کا حق تو نہ چھینے۔

مَیں اُس کے سمجھائے اور بتائے ہوئے راستے چل پڑا۔ منزل تو فی الوقت ایک ہی ہوتی ہے جبکہ راہیں راستے اور پہنچنے کے انداز دگر بھی ہو سکتے ہیں۔ اِسی طرح راہرو تو ایک ہی ہوتا ہے مگر اُس کے رہبر ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسی ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی یا کسی جن یا غیر بشر کا رہبر، اُستاد کوئی مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور مسلمان دوسری جنس جانچ سے بھی فیض یاب ہو سکتا ہے۔ اصل چیز تو کسی اَمرِ حقیقت کا اِدراک ہے۔ کیا خوب کسی نے کہا۔

"اَمباں نال غرض اے بھاویں اَکاں نال لگن" یعنی اصل تو آموں کا حصول ہے چاہے وہ آک کے جھاڑ سے حاصل ہوں۔

راہیں راستے طویل ہوں یا مختصر، اپنے تناظر میں گوناں گوں بوالعجبیاں، دلچسپیاں، حیرتیں اور علم و اِدراک رکھتے ہیں۔ یہ پرندے، پَروا، صدائیں ندائیں......جوگی فقیر، سدا کے مسافر، مسافتوں کے سفیر!

آنکھوں میں بصیرت، کشادگی......طبیعت میں صبر تحمّل، برداشت و بردباری......فکر و فہامت میں فراست اور رزق و روزی میں کشادگی کی تمنا ہو تو راہِ شوق کے مسافر ہو کہ بنا اِس کے گوہرِ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

مَیں پھر اپنی لائنوں سے ہٹ گیا۔ بات وہی کہ مَیں سکھ پلیسے سے لاڈلے شاہ جنوں والے کی مسجد کا راستہ معلوم کر کے ایک ایسے بازار سے گزر رہا تھا کہ دیہاتی کستان، مرد و زن، رکشے، موٹریں، ریڑھے، وہی سب کچھ جو ہمارے پنجاب کے کلچر کا حصہ ہیں۔ شاید ہم یہ تمام کچھ چھوڑنا بھی چاہیں تو چھوڑ نہ پائیں۔

ہمارے ہاں سڑکوں گلیوں مارکیٹوں' بازاروں میں آوارہ مویشی نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ مگر اِدھر ہندوستان میں خوبصورت گائیاں سانڈ' بندر بڑی آزادی و بیباکی سے جگہ بہ جگہ گھومتے' بیٹھے لیٹے دکھائی دیتے ہیں۔ چونکہ انہیں ہندوستان میں مذہبی تحفظ حاصل ہے اس کارن ان کے تماشے نظارے دیکھتے دیکھتے مَیں اُس مندر کے قریب' اُودھ شالیہ تک آ پہنچا تھا۔ جس کے ساتھ والی گلی کے آخری موڑ پہ وہ مسجد تھی جس کے حجرے میں سیّد لاڈلے شاہ رہتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے "ہجر نا آشنا حُجرہ" ان میں رہتا تھا۔

مکین اور مکان کبھی یوں بھی اِک دُوجے میں ضم ہو جاتے ہیں کہ مکان کا "الف" اور مکین کی "یائے" اپنی اَبجدی اور معنوی پہچان سے انجان ہو جاتے ہیں۔ جو مکان اپنے مکین کی ہو بہو شبیہ نہ بن جائے اور جو مکین اپنے مکان کے دَر و دیوار کی تصویر نہ بن جائے۔ مکین سے مٹی چونے' سیمنٹ ریت' کھان گارے' لکڑی لوہے کی باس نہ آئے اور وہ مکان کیا؟ جس سے اُس کے مالک کے کردار' علم و عقل' پیشے پات' ظرف وصرف اور قبیلے خاندان کی کوئی خصوصی' خندہ خُوب نہ ہو؟

مسجد والی گلی میں داخل ہوتے ہی دائیں بائیں کی بدرُووں میں دو خنازیر اور کچھ پیارے سے ننھے خنزیرے' گند میں چغر چغر کرتے دکھائی دیے...... ان کی "سوَر مستیوں" سے مسرور ہوتا ہوا آگے بڑھا تو دیکھا کہ اِدھر تو ان کے پورے کے پورے کنبے دائیں بائیں کی گہری نالیوں میں گھُسے کھا پی رہے ہیں۔

اَب مَیں قدرے چونکا اور چوکنّا بھی ہُوا۔ اس لیے نہیں کہ مَیں نے کبھی سوَر نہیں دیکھے یا ان خوکوں کی خُوخصلت سے ناواقف ہوں۔ خُوک جب گندگی سے اپنی خوراک کھا رہا ہوتا ہے تو خاصی منہ زوری اور خوب بھگدڑی' بھد اُڑاتا ہے۔ چھینٹے دُور دُور تک اُڑتے ہیں۔ نیکوکار ہو بدکار' ہندو یا مسلم کوئی بھی اپنے کپڑے خراب کرانا پسند نہیں کرتا۔ مَیں بھی کوئی پاک صاف نیک نمازی نہیں لیکن اچھا بُرا جو بھی پہنا تھا۔ اسے موری کی گندگی سے بچانا تو میرا بنتا تھا۔ مَیں اسی نیت سے آگے ایک جگہ رُک لیا کہ بچت دیکھ کر گزروں گا۔

عقب سے سوروں کا ایک جوڑا' جو بُری طرح گندگی سے لتھڑا ہُوا تھا' بھاگتا ہوا آیا۔ ایک دائیں بغل' دُوجا بائیں جانب! مجھ سے بُری یا اچھی طرح جُڑ کر آگے نکل گئے۔ ان کا یہ برتاؤ اور اپنا ایسا حال دیکھ کر میری تو ہنسی نکل گئی۔ اپنے لباس اور احتیاط کی ایسی دُرگت دیکھ دیکھ' مَیں خوش ہو رہا تھا کہ اچھا ہوا میری اَنا اور پاکی پلیدی کے بیجا احساس کی مَٹکی بیچ گلی پھوٹی اور مَیں پَنیا بھرن سے چھوٹی......!

میرے ساتھ تو ہوتا ہی ایسا ہی ہے۔ اِدھر میرے اندر کوئی ہلکی سی اَنا کی جڑ پھوٹی' اُدھر اُسی لمحہ کوئی ایسا ہونا' ہوتا ہے کہ وہ جڑ جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ میرا مالک مجھ کینڈے میں رکھتا ہے۔ جو بھی اپنی ذات' اوقات' مات کی گھات میں رہتا ہے۔ اَمن امان اور مالک کے دھیان میں رہتا ہے۔

مَیں اِک سرشاری کے عالم میں نہال سا مسجد کے قریب پہنچ گیا۔ مسجد سے پہلے ساتھ ہی ایک پیپل درخت کے نیچے ایک تھڑا سا بنا ہوا تھا اس پہ سائیں بابا شرڈی والے کی ایک مورتی رکھی تھی ...... پھول' اگر بتیاں' لوبان اور دیگر آرتی اُتارنے کا سامان بھی ...... ایک لمبی ٹھگنوں اور بے تحاشا مونچھ داڑھی والا ننگا سادھو' پاس بیٹھا بجھے ہوئے کلیان پہ منہ دھرے ہوئے تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر الکھ نرائن کی جلی ماری اور سیس نوا کر سواگت کیا۔

ساتھ ہی چند قدموں کے فاصلہ پہ مسجد کا دروازہ تھا۔ ملحق بیت الخلاء بھی کھلا ہوا زنگیلا ٹین کا ڈھلکا ہوا پٹ! جس پہ ہندی میں کسی عوامی مقامی بیڑی کا اشتہار اور اس کے مقبول عام کا اندازہ اس بیڑیوں کے فاضل ٹکڑوں کے فضلے سے ہوتا تھا جو بیت الخلاء کے باہر اور اندر تک پھیلا ہوا تھا۔"

یہ نظارا دیکھ کر طبیعت مکدر ہونے ہی والی تھی کہ جھٹ' چند منٹ پہلے گلی میں سوروں والا واقعہ' اپنے آغاز و انجام سمیت نگاہوں میں گھوم گیا۔ فوراً ابلیس لعین پہ لعنت بھیجی کہ وہ پھر مجھے ورغلا کر میرے اندر کراہت پیدا کرنا چاہتا تھا۔"

اپنے آپ کو کینڈے میں لانے اور سزا دینے کی خاطر مَیں اس بیت الخلاء میں گھس گیا۔ کھلا ٹین کا پٹ بھیڑا تو انکشاف ہوا کہ اندر' چولہا نما جگہ' جس کے نیچے بدرو بہہ رہی تھی' سنبھل کر بیٹھنا پڑتا ہے اور "دورانِ کارکردگی" ٹین کی رسّی پکڑ کر رکھنی پڑتی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے بیڑی کے گھٹیا تمباکو' کو کشید کرنا پڑتا ہے کہ بدرو کی بدبو برداشت کی جا سکے۔ مگر میرا بیڑی تمباکو سے کیا تعلق؟ سدا کا مسافر' چلتا پھرتا سوداگر' سڑکوں کا شہزادہ و ڈرائیور ...... جوگی' سپیرا' سنتا ملنگ رمتا ...... ان کا "گھ موت" "پابندِ بیت الخلاء" نہیں ہوتا ...... نہ ہی کسی ننگ و ننگ کا تکلف تصور ان کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ موقع محل' وقت ضرورت کے تحت وہ اس "حاجتِ ضروریہ" سے کسی طور فراغت پا لیتے ہیں۔ قیسی' و نوانی' مبہم ڈھیلہ' مٹی' خاشاک تیمم کی سہولتیں کام آ جاتی ہیں۔"

سر پڑے وقت' حالات' ضرورت تقاضائے سے بخوبی نبٹنا' نبرد آزما ہونا ہی فقیر' مسافر اور کمانڈو کا کمال اور فن ہوتا ہے۔ موضوع بڑا دلچسپ اور طولانی ہے۔ تفصیل سے پھر کبھی سہی' اس وقت مسجد کے باہر مَیں بیت الخلاء میں' فراغت کے لیے "چولہے" پہ اُکڑوں بیٹھا تھا۔ ادھر آیا تو یہ سوچ کر تھا کہ اندر طہارت کے لیے کوئی نل وَل ہوگا ...... گندگی سے لتھڑے ہوئے لباس کو دھو نچوڑ لوں گا ...... مگر اندر' پانی تو کجا' کوئی مٹی ڈھیلہ تک نہ تھا۔ بیڑیوں کے فضلے سے تو استنجا' طہارت ہونے سے رہی۔ اس کی بھی ضرورت نہ پڑتی اگر سامنے مسجد' سید صاحب کا حجرہ اور جنوں کے حوالے سے ان سے ملاقات مقصود نہ ہوتی۔ بندوں سے تو جیسے تیسے نبٹا جا سکتا ہے۔ جنوں کے حوالے سے تو کچھ صفائی ستھرائی کی ضرورت تھی۔

میں بَول و بَراز سے تو کسی طور بچ لیا مگر کپڑے لتھڑے ہوئے تھے اسی اجتناب میں مَیں مسجد میں گھسنے اور سید صاحب جنوں والوں سے ملنے سے گریزاں تھا۔

ناگاہ وہ بھگت جس نے میرا سواگت کیا تھا۔ چند ایک گیروے کپڑے پکڑے میرے پیچھے آ کھڑا ہُوا۔

''مہاراج! اِدھر سامنے قریب ہی چھوٹی سی ندی متوا ہے۔ جل میں چندن گھلا ہوتا ہے۔ منش نہانے سے نہال ہو جاتا ہے...... پرنتو! میں اُدھر پدھار رہا تھا' آپ کی اچھیا ہو تو آپ بھی اُدھر دم دھار لیں...... اس سمے سیّد صاحب بھی اُدھر متوا ندی مل جاویں گے۔

مسجد کیا تھی؟ بس! اللہ کا گھر ہی تھا...... کسی مفلس کی طرح...... باہر اندر سے اندوہ ہی اندوہ...... اس کے باہر' سامنے مقدس پیڑ تلے بھی تو ایک استھان تھا...... شردھی والے سائیں بابا کا! اِدھر بھی تو اک عجیب طرح کا افلاس اور افتراق محسوس ہوتا تھا۔

ہم دونوں رحیم و رام والے' ایک ساتھ متوا ندی کی جانب چل دیے۔ خوشی اور دھیرج دیے ہوئے دیکھتے ہی دیکھتے ہم اس کے گھاٹ پہ پہنچ گئے۔ یہ کوئی دریا' یا ندی نہیں تھی۔ بس! ایک مناسب سی آب جو تھی۔ جو اندرونی کھیتوں کی پیاس بجھانے کی خاطر' بیچوں بیچ رواں دواں رہتی ہے۔ دیہاتی عورتیں بچے بوڑھے' گائے بھینسیں...... نہانے دھونے والے خوب مزے لیتے ہیں۔ آب جو جسے متوا ندی کہا جاتا تھا۔ متوا کے بھی دو چار معنٰی ہو سکتے ہیں۔ محبوب' پیارا' دلبر جانی' مہربانی وغیرہ...... مجھے بھی یہ ننھی سی مہربان ہی لگی تھی۔ میں اپنی ضروری اشیاء نکال کر کپڑوں سمیت اس کے اندر اُتر گیا تھا۔ خوب مزے لے لے کر نہایا' اُتارے بغیر کپڑے دھوئے' خوب نکھر نہار کر باہر نکلا تو مجھے ساتھ لانے والا شردھی بابا والا بھگت کہیں دکھائی نہ دیا۔ جبکہ وہ میرے ساتھ ہی متوا میں نہانے دھونے اُترا تھا۔

اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی...... کہیں موجود ہوتا تو دکھائی دیتا' کہیں چلا گیا ہوگا؟ کنگھا' سرمہ کر کے' میں بھی واپس مسجد کی جانب بڑھ گیا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ نہا دھو لیا...... کپڑے بھی صاف ہو گئے۔ اب جنوں والے لاڈلے شاہ صاحب سے مِل کر ملیں گے۔

متوا ندی' قدرے اُونچائی پہ تھی اس تک پہنچتے ہُے تو محسوس نہ ہُوا مگر اَب واپسی پہ ڈھلوان سے اُترتے ہوئے لگتا تھا کہ جیسے لڑھکتے ہوئے جا رہا ہوں۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے ہانپا سا لگ جاتا ہے جبکہ ڈھلوان سے اُترتے ہوئے ہنسی سے کھسکنے لگتی ہے...... گدگدی ہونے سے بھی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

پیچھے سے ایک آواز نے لپک لیا۔

''حضرت! حد ہوگئی بے مروّتی کی' ایک ساتھ اِدھر آئے تھے واپس بھی اکٹھے' ایک ساتھ چلتے۔ ایسی

بھی کیا جلدی تھی...... پیچھے کیا جن لگے ہیں؟ یہ نیم جنوں کا نہیں سب قیلولہ کر رہے ہیں۔''

مجھے تو جیسے ایمرجنسی بریک لگ گئے۔ ڈھلوان پہ میں اپنے پاؤں پہ یوں کھڑا تھا جیسے کسی نے مجھے پتھر سِل کر دیا ہو۔ چند ثانیے تو سمجھ نہ آیا آواز کہاں سے آئی ہے؟ میرا ادھر کون ایسا جو ایسی اپنائیت اور بے تکلفی سے تکلم کرنے کا یارا رکھتا ہو۔ میں تو ادھر شرجی بابا کے ایک بھگت کے ساتھ نہانے دھونے آیا تھا' وہ کدھر ہے؟

''پلٹ! تیرا دھیان کدھر ہے...... میر اللہ! تیرا بھگوان کدھر ہے۔ جن کدھر اور انسان کدھر ہے؟''

میرے متوا میرے میت رے

آ جا تجھ کو پکاریں میرے گیت رے

بارے یارے' جو پلٹ کے دیکھا تو نورانی چہرے مہرے والے بزرگ دھوتی' کرتہ' سر پہ کھتئی پگڑی' ہاتھ میں عصا...... خراماں خراماں' ڈھلوان پہ سنبھلے سنبھلے آ رہے ہیں۔ الٰہی! یہ بزرگ کون؟ مجھ سے کیا تعلق؟ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اسی اُدھیڑ بن میں ٹکے پاؤں کھڑا تھا کہ وہ خراماں خراماں مجھ تک آ پہنچے۔ مسکراتے ہوئے چہرے کے پیچھے کچھ شناختیں تھیں ایسی بھی کہ لگتا تھا کچھ کچھ جانا پہچانا سا ہے۔

مجھے بجوتروں کی مانند گھورتے ہوئے دیکھ کر بولے۔!

''حضرت صاحب! میرے ماتھے پہ سینگ اُگ آئے ہیں یا میری آنکھیں جنوں کی طرح گول ہیں؟''

جن' جن اور جن! جنوں کے حوالے سے میں ادھر پہنچا۔ جنوں والی مسجد' جنوں والے سید لاڈلے شاہ! اس سے آگے یہ اجنبی سے صاحب! جنوں کا ذکر' باتوں باتوں میں انہوں نے بھی کیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہر طرف جن ہی جن ہیں اور میں کہاں ہوں؟ یا پھر ان کے بارے سوچتے سوچتے' سنتے سنتے' کہتے کہتے میں خود بھی ایک جن بن چکا تھا۔ ویسے میری حرکتیں باتیں' کام تماشے...... اسی مخلوق جیسے ہی ہیں۔ جیسے بہت سے جن ایسے بھی ہیں جن کی بہت سی عادتیں قدریں' انسانوں جیسی ہوتی ہیں۔ یہی جنات ایسے ہوتے ہیں جو انسانوں کے کسی نہ کسی حساب کتاب میں قریب' رفیق' مددگار' دوست ہوتے ہیں۔

غیر معمولی انسانوں کی مانند غیر معمولی جن' پری' ابلا' نسا' چڑ اور اہلیان ارض و افلاک بھی موجود ہوتے ہیں۔ ان تک عامل کامل' فقیر' درویش' مرتاض حضرات کی رسائی ممکن ہے بلکہ ہوتی ہے۔

جب میری حیرت کم نہ ہوئی اور میں ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا تو ''الکہ نرائن'' کی جلی نے مجھے جھنجھوڑا...... اب میں جیسے غبار میں سے نکل کر اک واضح منظر دیکھ رہا تھا۔

یہ تو شرجی والے سائیں بابا والا بھگت ہے۔ ننگا' جو کلیاں کش کر رہا تھا۔ ماتھے پہ تلک' گلے میں جینئو...... میں سوچنے لگا۔ وہ کون تھا اور یہ کون؟

مسکراتے ہوئے فوراً جواب دیا۔

''ہم دونوں ایک ہیں...... بلکہ ہم تینوں ایک ہیں۔ یہاں تک کہ جو دکھائی دے رہے ہیں اور جو اوجھل ہیں...... سب ایک ہیں...... مالک ایک ہے' آگے سب ایک......!''

مَیں تین دن اُدھر مسجد کے حجرے میں رہا...... ہر روز راد ھے شیام کے سنگ 'متواندی نہانے جاتا۔ واپسی سید لاڈلے شاہ کے ساتھ ہوتی۔ اس دوران کبھی جرأت نہ ہوئی کہ مَیں جنوں کے بارے کچھ پوچھتا یا یہ کہ مجھے پوچھنے کی کچھ ضرورت ہی پیش نہ آئی۔''

● ساحرِالموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش......!

کرب کے اُستر پہ نوکیلے پتھر پڑے تھے۔ میرا سکون پاش پاش اور ذہن قاش قاش...... وینکوراٹلی! پانچ ستارہ ہوٹل کی ایک پرآسائش خواب گاہ میں بستر پہ لوٹ رہا تھا...... وجہ یہ رہی میرے روبرو دیوار پہ کسی مصور کی تخلیق کردہ ایک درمیانی سی تصویر آویزاں تھی...... یسوع مسیح! یروشلم کے ایک تنگ سی سیڑھیوں والے بازار میں اپنے زخمی شانوں پہ بھاری بھرکم صلیب' جس پہ اُنہیں چڑھایا جانا مُقلم ہوا تھا...... کاندھے پہ اُٹھائے سوئے مقتل روانہ ہیں۔ اُن کے ہمدرد دُشمن اور تماشا گیر سب ایک اژدحام کی صورت اُن کی جلو میں ہیں۔ یسوع کے چہرے پہ ایک عجیب پُر جمال طمانیت ہویدا ہے۔ پیشانی اور کان کی لَوویں' خون آلودہ...... کہ نکیلے زہریلے کانٹوں سے خاص طور پہ تیار کیا ہوا تاج' سر میں کُھبا ہوا ہے۔ صلیب اپنے بے ہنگم بوجھ سے پُشت کی جانب لٹکی پڑی ہے...... مگر اس کے باوجود رُوح اللہ کے پائے تسلیم واستقلال میں شمہ بھر لغزش نہیں۔

اس شہ پارے کا تخلیق کار یقیناً اٹلی کا کوئی نامور کہنہ مشق مصور ہوگا اور کٹر عیسائی بھی' ایسی حقیقت افروز اور پُراثر تصویر کشی کے لیے محض مصورانہ مشاقی ہی کافی نہیں' عقیدے کا جنون' فنی فکری تدبر اور فلسفۂ فنا و بقا کی نزاکت کو بھی گہرائی کے ساتھ سمجھنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ یسوع ناصری کے چہرے پہ کرب کی تہہ سے اُبھرتی طمانیت اور روشن آنکھوں کی تابانی...... ایسی رُوحانی کیفیت کی مظہر ہے جو متعینہ منزل پہ پہنچنے والے کامیاب فرد کا انعام واکرام ہوتی ہے۔

ذرا اس بابے کی دریدہ ذہنی ملاحظہ ہو؟...... اس شاندار ہوٹل میں خاص طور پہ وہ معزز ومحتشم مہمان قیام پذیر ہوتے تھے جو کلیسائی انداز فکر کی کوئی اہم شخصیت ہوتے یا جنہیں پوپ کی جانب سے کسی رُوحانی تقریب میں شرکت کی دعوت ہوتی۔ خدا جانے کہاں کوئی غلطی یا ردوبدل ہوا کہ روم میں محکمہ سیاحت نے

میرے حلیہ و حال کو دیکھتے ہوئے مجھے راہب یا عیسائیوں کے کسی غیر معروف سلسلہ کا کوئی پادری پروہت سمجھتے ہوئے۔ میری رہائش و آسائش کے 'انتظامات' برائے نام پیسوں میں اس جدید و جمیل ہوٹل میں کر دیے جبکہ مَیں ان کے ہاں کسی عالمی آوارہ گرد یتیم و نیسر کی حیثیت سے پہنچا تھا کہ کسی وائے ایم سی اے قسم کی سرائے میں رعائتی مراعات حاصل کر سکوں۔ بھلا ہو میرے کالے لباس' فقیری جھولے' دراز ریش' زلفوں اور مالاؤں انگوٹھیوں کا...... اس ظاہری گٹ اَپ ڈراما کاری سے مجھے اکثر اوقات ایسے بڑے فائدے حاصل ہو جاتے ہیں جو میرے تصور سے بھی باہر ہوتے ہیں۔ ایسے میں ایک پُر لطف واقعہ یاد آ گیا ہے۔''

کسی زمانے میں کراچی منگوپیر کی پہاڑیوں کا ایک وسیع سلسلہ موجود تھا۔ آج اِدھر جائیں تو سب کچھ بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے...... لمبے چوڑے پہاڑ غائب ہو گئے ہیں۔ جگہ جگہ پتھروں کے گودام' کارخانے' سنگِ مرمر کاٹنے کی مشینیں...... پہاڑوں کے پہاڑ' یوں ختم ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ ان پہاڑوں میں خانہ بدوش' مزدور یا پھر جرائم پیشہ قبیلے رہا کرتے تھے۔ عام لوگوں کا اِدھر گزر بہت کم ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ پولیس بھی اُدھر جاتے ہوئے کتراتی تھی۔ اِدھر کچھ ندی نالے بھی تھے۔ عامل اور کالا چِٹا علم کرنے والے حضرات' اِدھر اُلٹے سیدھے چلّے کاٹا کرتے تھے۔ مَیں بھی اِدھر جاتا رہتا تھا۔ مقصد' منگوپیر کے روضہ پہ حاضری اور وہاں کے مگرمچھوں کے لیے گوشت کا لنگر لے جانا ہوتا تھا۔ وہاں کی ویران پہاڑیوں میں کبھی کبھی ناقابلِ شناخت بوسیدہ انسانی لاشیں بھی پائی جاتی تھیں۔ ان گلی سڑی بے چہرہ لاشوں کا وہاں کیا عمل تھا۔ کون لوگ تھے جو انسانوں کو وہاں قتل کرتے تھے یا قتل کر کے وہاں پہنچاتے تھے وہ بھی اس طرح کہ لاش کے قابلِ شناخت جسمانی اعضاء' علیحدہ کر کے صرف اور صرف جسم ہی وہاں پھینکا جاتا...... اکثر ایسی نعشیں بھی دیکھنے میں آئیں کہ اُن کا موٹا موٹا گوشت' پیٹ بازو' پشت وغیرہ اُترا ہوتا۔ محض پنجر ہڈیاں باقی وہاں پڑی ہوتیں۔ گدھوں چیلوں اور دیگر مُردار خور جانوروں کے کام آتیں۔''

پولیس ان وارداتوں سے واقف ہونے کے باوجود' کوئی مؤثر کارروائی کرنے کے قابل نہ تھی۔ لمبا چوڑا پہاڑی کٹا پھٹا علاقہ' جس کا کوئی سر پیر ہی نہ تھا...... اِدھر کے جرائم پیشہ خانہ بدوش لوگ بھی کسی پولیس قانون سے کوئی تعاون نہ کرتے۔ بلکہ ان میں اکثر کرائے کے قاتل تھے۔ جو روپے پیسے کے لالچ میں' بندے کو اغواء کر کے اِدھر پہاڑوں کے ویرانوں میں لے جا کر قتل کر دیتے۔ ایسی ہولناک وارداتوں سے ان جرائم پیشہ عناصر کو دوہرا بلکہ تہرا چوہرا فائدہ ہوتا۔ بندہ مارنے کے بھی اچھے خاصے پیسے وصول کرتے۔ اُس کی کھوپڑی' دل' کلیجہ علیحدہ کر کے' کالے علم اور دیگر شیطانی عملیات کرنے والوں سے مُنہ مانگے دام جھاڑتے۔ لاش کی آنتیں سکھا کر' گلا گھونٹنے کی خونی رسیاں بن جاتیں۔ جو ان پیشہ ور قاتلوں کا ایک قابلِ بھروسہ ہتھیار

ہوتا جو بظاہر بے ضرر مگر کارکردگی بڑی خوفناک ہوتی۔ ایسے قاتل خود کو سامان ڈھونے والے مزدور حمال ظاہر کرتے...... اِن رسیوں ڈوریوں سے لکڑیاں کا گٹھیں باندھتے۔

اس گروہ کا عقیدہ اور طریقۂ واردات 'امیر علی ٹھگ' کے گروہ سے ملتا جلتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی کاروائیاں بڑے منظم طریقہ اور گروہی اُصولوں کے تحت اجتماعی طور پہ کرتے تھے۔ واردات سے قبل' سعد نحس کی فال نکالتے' کالی دیوی کے چرنوں پہ بھینٹ چڑھانے کی منت مانتے اور پُوجا پاٹ کا اہتمام کرتے۔

امیر علی ٹھگ' بڑا با اُصول' سخت گیر اور ایک اعلیٰ پایہ کا منتظم شخص تھا۔ بھیس اور چہرے مُہرے کی ہیئت بدلنے میں اُسے کمال درجہ مہارت حاصل تھی...... رحم کرنا' معاف کرنا اور ناکام ہونا اُس کے نزدیک بڑے قبیح فعل تھے۔ وُہ ان باتوں کو کسی سربراہ کے لیے بہت بڑا عیب' کمزوری گردانتا...... یہی وہ وجہ تھی کہ اس کا گروہ' بڑی بڑی وارداتیں ڈالتا اور کبھی پکڑا نہ گیا...... اس دَور کی انگریز حکومت اُس کی ہولناک کاروائیوں سے عاجز آ گئی تھی۔ امیر علی ٹھگ' حاجی نمازی بارلیش' غریبوں محتاجوں کی حاجات پوری کرنے والا شخص تھا۔ اُس کا نشانہ' بڑے بڑے دولت مند تاجر اور سیٹھ لوگ ہوتے۔ جن کے ہاں اندھی دولت ہوتی...... وہ اُن کا بار ہلکا کرتا تھا۔

یہ منگھو پیر پہاڑیوں اور اُس کے نزدیک دُور رہنے والے' جرائم پیشہ گھٹی' ڈراوڑے' سندھی بلوچی خانہ بدوش' بے مذہبے' بے طورے طریقے قبیلے تھے۔ جو انفرادی طور پہ کاروائیاں ڈالنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اُن کے ہاں کوئی خاص سرداری نظام نہ تھا۔ حرام حلال بہت دُور کی بات' چوہے گُھٹے' بلے اور اچھے بُرے جنگلی جانوروں کے علاوہ انسانی گوشت بھی چٹ کر جاتے تھے۔ ان کی عورتیں' مردوں سے کہیں زیادہ سفاک اور خطرناک تھیں۔ وہ دیگر ہتھکنڈوں کے علاوہ نسوانی ہتھکنڈے بھی بخوبی استعمال کرتی تھیں۔ شکار کو پھانس کر' پہاڑیوں پہ لے جاتیں اور لوٹ کھسوٹ کر اُن کا قصہ تمام کر دیتیں۔ لاش کے حصے بخرے کر کے مقتول کا نشان تک ختم کر دیا جاتا۔''

کہا جاتا ہے کہ شاید اِنہی غیر انسانی افعال کے سدِباب کے لیے حضرت منگھو پیر کو اِن پُرہول پہاڑیوں پہ بھیجا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی کی شہری آبادی' اِک خاصے دُور دراز فاصلہ پہ تھی۔ سمندر کے کنارے حضرت عبداللہ شاہ غازی تھے اور اِدھر پہاڑوں میدانوں کی طرف حضرت منگھو پیر تھے جو اپنے مُرشد کی خاص ہدایت پہ اجودھن سے تشریف لائے تھے۔''

یہیں بابا' ذرا کی ذرا دم دُرست کرنے کے لیے رُکے تو میں موقع ملتے ہی پھر گستاخی کر بیٹھا۔

''بابا! اگر آپ کو یاد نہ رہا ہو تو یاد دلا دوں کہ آپ گجرات دریا کے بیچ بیلے کے مجذوب' مخنث بابا کی بات چھیڑے ہوئے تھے۔ بعداً آپ سرہند شریف بھی تشریف لے گئے۔ اَب آپ بہر کتے بہر کتے کراچی'

بابا منگھوپیر کے پہاڑی سلسلوں تک آ پہنچے ہیں۔ بس! ذرا یاد دلایا ہے...... میرا کیا؟ کراچی لے چلیں یا کولا لمپور میں تو ازل سے آپ کے ساتھ بندھا ہُوا ہوں...... نوکر کی تے نخرا کی......؟"

بابا اَب شاید مجھے غصے سے گھورنا بھول گئے۔ رسانی سے بولے۔

"سب سے پہلے میں تمہاری غلطی دُرست کر دوں کہ تم میرے نوکر وکر نہیں ہو...... ساتھی اور دوست ہو۔ دوسری بات' میں اَن پڑھ' بُوڑھا بندہ ہوں کسی قرینے قاعدے کا پابند نہیں...... میرے ہاں ڈھیروں دھاگہ تو ہے مگر اس کا کوئی سرا اَنت نہیں' نہ کوئی شروع درمیان آخیر وغیرہ...... میری یادداشت کی پُوٹلیں بے حد ڈھیلی ہیں...... جُھومتے جُھومتے کدھر جھول لیتا ہوں' کچھ خبر نہیں ہوتی۔ لہٰذا تم صبر اور خود پہ جبر کا دامن مت چھوڑو! صبر کرنے سے درجات بلند جبکہ خُود پہ جبر کرنے والے کے مقامات مضبوط ہوتے ہیں۔"

میں نے کمال جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے ایک سوال پھر داغ دیا۔

"جان کی امان پاؤں' کیا آپ جناب تارڑ صاحب' عطاء الحق قاسمی صاحب' طارق اسمٰعیل ساگر اور ڈاکٹر یونس بٹ کی طرح دلچسپ سفرنامے' پُرمغز مزاح' جاسوسی ناول اور ہنستی مسکراتی کتابیں نہیں لکھ سکتے؟ جو قیمت میں ارزاں ہوں؟ آپ کی کتابوں کا سیاہ گٹ اَپ' سائز وزن' سرورق اور ضخامت و قیمت دیکھ کر بندے کی آنکھوں میں موتیا اُترنے کے خدشات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ہاتھوں میں رعشہ اور ذوقِ مطالعہ میں کمی واقع ہونے لگتی ہے...... اور کیا آپ' کتابوں کے نام دِن کے اُجالے میں تجویز نہیں کر سکتے؟ لگتا ہے نام تجویز کرنے کے لیے آپ آدھی رات کا وقت دیکھتے ہیں جو بھی کتاب' اس میں سیاہ اندھیرا ضرور شامل ہوتا ہے۔ کیا یہ سب خوامخواہ کا تجسّس و تحیّر پیدا کرنے کے لیے نہیں؟"

بابا نے کمال تحمّل سے میری باتیں سُن کر کہا...... گو میں تمہاری بیشتر باتوں کا شافی جواب پچھلی سطروں میں دے چکا ہوں۔ اَب تم نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے ہیں۔ ترتیب سے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ کچھ مشہور و معروف ادیبوں کا تم نے ذکر چھیڑا کہ آسان فہم لکھتے ہیں اور کُتب کی قیمتیں بھی قابلِ برداشت ہوتی ہیں۔ بالکل دُرست' تم اچھی طرح جانتے ہو یہ حضرات بہت پڑھے لکھے قابلِ قدر اور پرفیشنل لکھنے والے ہیں۔ ان کے مقابل میری حیثیت' ایک پَشّہ برابر بھی نہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی یہی ہے جبکہ میں پیشہ ور لکھنے پڑھنے والا نہیں ہوں اور نہ لکھنا میرا روزمرّہ ہے۔ جیسے خواب ہر رات دکھائی نہیں دیتے۔ کبھی کبھی کے سہانے سپنوں کی طرح مجھ پہ بھی مضامین اُترتے ہیں۔ میں مشینی ٹائپ رائٹر نہیں جو کھٹ کھٹ پرنٹ نکالتا چلا جاتا ہے۔ میں تو وہ مفلوک الحال مُنشی کاتب ہوں جو پہروں گھٹنوں میں سر دیئے پہلے قرطاس پہ حرف حرف اُتارتا رہتا ہے۔ لکھتے لکھتے جس کی اُنگلیوں میں میزھ آ جاتی ہے اور آنکھوں کی پلکیں بیلی پڑ جاتی

ہیں۔ لک کُبا ہو جاتا ہے۔"

تمہیں یہ بھی پتہ ہوگا کہ اندھیرے میں ریاضت و عبادت' چلّی مدہانی' دیے کی معدوم لرزتی روشنی میں لکھائی پڑھائی افضل اور منہ اندھیرے کا سفر' ظفر ہوتا ہے۔ اندھیروں میں جنم لینے والے روشن ضمیر اور نعرۂ تکبیر ہوتے ہیں۔ قطبی تارا کی سیدھ کے مسافر کبھی نہیں بھٹکتے...... باطنی روشنیاں' اندھیروں کے پروردہ شب زادوں کا نصیب ہوتی ہیں۔ شب دیدہ پرندے' شب زاروں میں کبھی نہیں بھٹکتے۔"

شبنم کیسی شرمیلی کہ رات کی اندھیری رُتوں میں بھی پانی پانی رہتی ہے۔ میری بھیگی بھیگی کتابیں' اُن کے سرنامے' مضامین' اندھیرے میں چپکے سے پڑھنے والی اُسی اوس کی اُوست ہیں۔"

مجھے بھی مہرولی' خواجہ قطب الاقطاب کی چوکھٹ کے درویش' بظاہر نابینا' دروں بینا نے بتایا' دکھایا تھا کہ ایک کجل سرمہ ایسا بھی' جو شبِ تار میں کھرل کیا جاتا ہے۔ ایسی شب' جس میں قمر گھٹ کر رہ گیا ہو کہ ستارے چھپ لیے ہوں۔ چالیس اندھی اندھیری راتیں...... سُرمہ کی تیاری میں صرف ہوتی ہیں۔ تب کہیں کجل کیمیائی' کور دیدہ کے لیے تیار ہوتا ہے کہ ماتھے پہ بھی سلائی کھینچ دو تو مدار افلاک سے پرے بھی نظّے پڑے...... آزمائش شرط ٹھہری!

مسافرت مہاجرت تاریکیوں کی اتھاہٹ اور قدموں کی گھڑ گھڑاہٹ کے دوران پیدا ہوئے بچے' اُلوہی ابلاغ و ادراک کی افزائش لیے ہوئے ہوتے ہیں...... اُن کی دریافتیں شناختیں اور ماتھوں پہ مُحکمی مہریں بھی خاص ہوتی ہیں۔ اُن کے خمیر' حدتِ مہر سے اُٹھے نہیں ہوتے اور نہ ہی اُن کی بلوغت و بصر میں بے بضاعتی کا عیب ہوتا ہے۔ میں اِسی قطار میں شامل ہوں۔

میری نظر' تاریک پہلوؤں پہ بطورِ خاص ہوتی ہے کہ ظفریابی کے زعم میں ناکامی و شکست کے اِمکانات پہ بھی کشادگی سے نظر رکھو' ہزیمت سے بچ لو گے۔ تدبّر اور حوصلہ' ظرف میں ضخامت بڑھے گی' آنکھ میں جھکول اور پھیپھڑوں میں پھپھولے نہیں پھٹے گا۔ شاید یہی وجہ کہ میں اپنی شکست پہلے ہی تسلیم کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہوتا ہوں جبکہ کامیابی کو ایک غیر متوقع حادثہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہوں۔

میں کتابیں بھی اِسی اُمید پہ لکھتا ہوں کہ انہیں خرافاتِ محض کہہ کر رد کر دیا جائے گا۔ نام اور دام بھی یوں اُڈک اور بھاری کہ چلو اِس طرح ہی ناکامی میں چنداں برکت پڑے گی۔ موضوع و مضمون بھی جان بوجھے مہمل اور اُدھورے چھوڑے...... زبان و بیان جناتی و افلاکی...... دھڑ نہ دُھرا' پاؤں نہ کُھرا...... سرورق' بار فلموں کے پوسٹروں جیسے...... سیاہ رنگ کی بھرمار...... جہاں بھر کی بلیاں' اُلّو' کوے' کنجریاں' کنجر' ہیجوے زنخے' سادھو سنت' شعبدہ گر' ساحر' ٹونے' جن' ناچ چڑیلیں' اکٹھی کیں...... کوئی تو بولے۔ مجھے پکڑے میرے

دروغ پہ گرفت کرے۔ تنقید ہو مجھے قابلِ گردن زدنی قرار دے......؟

کیا کہوں' منافقت' دروغ' بدلحاظی' نفسانفسی' بے صبری؟ مجھ پہ ہی کیا موقوف' شعبہ ہائے ریاست و سیاست' علوم و فنون...... محتسب و قانون' رہبرانِ وطن' باغبانِ چمن' سزاوارانِ صوت و لحن' خداوندانِ شعر و سخن' ہر جگہ موجود...... قاضی' فقیہہ' صوفی یا عالم...... سیّد' پیر' شیخ' خان' چوہدری' مولوی میاں جی ایک ہی تھیلی کے کھرے کھوٹے سکّے۔ جو وقت کے مطابق اپنی سیاسی شکلیں' ہیئت تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اَب تم ہی کہو کہ مَیں کیا کہوں؟ تم جانتے ہو چالیس چوروں کے درمیان بیٹھا ہوا حاجی نمازی بھی اکتالیسواں چور ہی کہلاتا ہے۔''

''بابا! یہ کتابوں کی گفتگو تو برسبیل تذکرہ درمیان میں آ گئی' اصل بات بیلے والے مجذوب بابا سے شروع ہوئی تھی جبکہ رواں بات حضرت منگھوپیر کی پہاڑیوں والے جرائم پیشہ قبیلوں کی تھی۔ بُرا نہ مانیے' محض یاددلانے کے لیے گستاخی سرزد ہوئی۔''

''ہاں ہاں! مَیں وہیں بابا منگھوپیر کی پہاڑیوں پہ آتا ہوں مگر اس سے پہلے مَیں چاہوں گا کہ تمھیں تمہاری کمال بے صبری کی داد دوں...... اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ تمہاری عجلت پسندی سولہ سطری منظوم افسانہ اور ڈیڑھ مصرع کی نثری نظم سننے کی ہی متحمل ہے تو مَیں اپنا اور تمہارا قیمتی وقت ضائع نہ کرتا۔ ہاں! مَیں وہیں منگھوپیر کی پہاڑیوں سے دوبارہ شروع کرتا ہوں۔ لیکن اس شرط پہ کہ تم اَب مداخلتِ بیجا سے کُلّی پرہیز کرو گے؟ شاید تمہارے علم میں ہو کہ مَرد' مگرمچھ' بُوڑھا' رانڈ اور بھانڈ' سانڈ سانپ' کُتّا' کوّا' اونٹ اَسپ' باگھ' بندر' پہلوان' قانون دان بوڑھاپے میں نہ صرف سٹھیائے بسرائے جاتے ہیں بلکہ یادداشت' برداشت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ شرمندہ سی رجولت کی جگہ کھولت آ جاتی ہے۔ کچی پکی نیند میں بڑبڑاتا...... مکھیوں مچھروں سے بیزار...... تنگ موت سے اُوازار...... نقاہت کی نگہبانی فراغت کی فراوانی...... یعنی بوڑھا' بُجھے بھٹ میں بھنایا ہُوا بھونگڑا...... جو وقت کی جلی بجھی ریگ میں پڑا موت کی چھلنی کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ بوڑھا مگرمچھ جو اپنی طبعی عمر کی دلدل کنارے کسی نیم مُردہ لاشے کی طرح ڈھیر ہوتا ہے...... مچھروں' مکھیوں' چھوٹے موٹے پکھوؤں' پرندوں اور بے اَوقاتے جانوروں کے ٹھونگوں پہ چُپ رہتا ہے۔

اَب آگے بُوڑھے سانڈ' بُوڑھی رانڈ' بھانڈ اور بوڑھے سانپ کی بھی سُن لو۔ بوڑھے سانڈ اور بھانڈ دونوں کی بپتا ایک سی ہوتی ہے۔ ان دونوں کو اگر مارتا ہے تو وقت! پورے باڑے کا بلوان' علاقہ بھر کی بھینسوں گائیوں کے دلوں کی دھڑکن' سہاگ تارا' پیرینہ سالی کی دلدوز کیفیتوں سے دوچار ہو کر' کھیت کھلواڑے کے کسی کونے میں' جس عالمِ بیزاری اور خودفراموشی میں ڈھیر ہوتا ہے اُسے قطعی' کیفیتِ نوم واستراحت نہیں کہا

جا سکتا۔ یہ تو وہی مرزا غالب والی بات کہ......

سنبھلنے دے مجھے اے ناتوانی کیا قیامت ہے؟

گائیاں بھینسیں تو کیا' اب تو کوّے چڑیاں بھی اس کے سینگوں سرین پہ نہیں بیٹھتیں...... البتہ پیٹ نیچے باہر اُلٹے سرخ سوجے پیڑو پہ اکّا دُکّا شوخ شارکیں ٹھونگے مارتی اکثر دکھائی دے جاتی ہیں۔ دراصل وہ ان بے حیا چیونٹوں' مکوڑوں کو چٹ کر رہی ہوتی ہیں جو شوق مہم جوئی میں اس پشولنگ پہ چڑھ دوڑے ہوتے ہیں۔ اس عرصۂ عبرت و غرلت کا دورانیہ اکثر محدود رہتا ہے کہ قصاب سے مول تول ہو رہا ہوتا ہے۔ جو اکثر ایسے ایک چھکڑے پہ لاد کر لے جایا جاتا ہے جس کے آگے بھی دو عدد کم و بیش ایسے ہی نجتے ہوتے ہیں۔''

اب بلکے سے تقابلی تفارق سے یہی سچوایشن کئی نسلیں ذکارے کسی مراثی بھانڈ اور مراثن رانڈ پہ بھی منطبق ہوتی ہے۔ طوائفوں' ہیجڑوں کی طرح ان کا بھی قریب قریب یہی حال رہتا ہے۔ ان کی نو عمری اور جوانی بڑی نشہ آور اور کھابے گیر قسم کی ہوتی ہے۔ اپنے موروثی فن و ہنر سے خوب نام اور مال کماتے ہیں۔ ایسے ایسے نوکیلے بھانڈ اور سُریلے مراثی پائے گئے جن کی دلچسپ جگتوں سے بڑے بڑے وزیر امیر محظوظ ہوئے۔ تحسین و آفرین سے نوازے گئے...... مگر کیا کیجیے کہ بڑھاپے' ان کے بھی عبرت ناک ہی ہوئے کہ بھیک مانگتے دکھائی دیے۔ بسیار خوری' منشیات' بسفلہ حرکات و گفتگو اور غیر صحتمندانہ رویے وغیرہ ان کے بڑھاپے کے تابوت کے لیے آخری کیل ثابت ہوتے ہیں۔''

کسی بھی قبیل کی بوڑھی رانڈیں اکثر و بیشتر سعدیہ و سعید نہیں سمجھی جاتیں۔ ایسی ہی سہاگی ہوتیں تو اپنے جیون ساتھی کا ساتھ کیوں چھوڑ جاتیں؟ یا وہ خود بالجبر و کراہا' ہاتھ چھڑانے پہ مجبور نہ ہوتے۔ مجھے تو سورگ یا نرگ باشی ہندوؤں کی دیوی سمان سُندر پتنیاں بڑی بھلی لگتی ہیں جو اپنے پیارے پتی دیو کے مانند پڑتے ہی' ستی ہونے کی تیاریوں میں جٹ جاتی ہیں...... ارتھی کے اگن پہ دھرنے سے پہلے ہی پورے سولہ سنگار' سونے چاندی سے لدی پھدی' اگن سنگھاسن پہ براجمان ہو لیتی ہیں یوں کہ مکھ پر کبھی بھر ملال یا مجبوری نہیں ہوتی۔ اک عجب سی کوملتا کھلی ہوتی ہے جو کسی آدرش کے مکمل ہونے پہ درشن دیتی ہے۔

''نہ تو رانڈ میں رہی' کوئی جتن رہانہ پری رہی......''

میں اچانک پھر قطع کلامی پہ مجبور ہوا۔

''گستاخی معاف! آپ' مصرعہ کی صحت پہ ذرا غور فرمالیں؟''...... جواب موصول ہوا۔

''آپ شاید دُرست کہہ رہے ہوں گے؟...... میں بوڑھوں بارے کچھ بول رہا ہوں اور میں خود ایک ''عین اکانکاتی بُوڑھا'' ہوں جو میرے اندرون لاہور سے نکلتا ہے لکھ کہہ دیتا ہوں...... میرے ہاں کسی شعر کے

ظاہری اوزان سے کہیں اہم' اُس کے باطنی معنیٰ کا حُسن ضرور ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا میرا فرمایا ہُوا ہی دُرست سمجھا جائے!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا! کیا کہہ رہا تھا کہ ہندو اور جاپانی' خودکش جانباز' میں دونوں کو سیلوٹ مارتا ہوں...... خود اختیاری موت؟ ہر کسی کے بس کی بات نہیں...... ہندوؤں میں شاذ ہی کوئی بزدل تھی ہوگی جو رانڈ ہوگی۔ اس کے برعکس اپنے ہاں' کاش ہی کوئی ایسی نِرّ عورت ہو جو اپنے مجازی خدا پہ یوں قربان ہونے کا جذبہ رکھتی ہو۔ ورنہ یُوں دیکھا ہے کہ جونہی خاوند نے کثرتِ تمبا کونوشی سے پیدا ہونے والی پھیپھڑوں کی جکڑن سے ذرا کھینچ کر سانس لیے۔ آنکھوں کو اُلٹ پلٹ' تکیہ پہ سر رکھا...... کئی بچوں کی ماں نے دو تین حسینہ کوئی کے فوراً بعد سورۃ یٰسین پڑھنے والی کو یاد کیا۔ جھٹ سے دماغ کی سکرین پہ جائیداد پلاٹوں کے کاغذات' بینک بک اور نقدی گھڑی اور موبائل فون کا خیال کرتے ہوئے اپنے بھائیوں کو بُلالیا...... اِدھر اُدھر ہم خیال ہمسائیوں کو اطلاع پہنچائی' برادری اکٹھی کر لی۔ اس دوران قدرے آرام کے بعد جو خاوند نے اگر آنکھ کھول لی تو صدقے واری' نذر نیاز' صدقہ!

ایسی خوش نصیب عورتیں' جو اپنے رانڈ ہونے کو خدائی اعزاز سمجھتی ہیں ہر گلی محلّے کالونی میں پائی جاتی ہیں۔ جوانی سے اُدھیڑ عمری اور پھر بوڑھاپے میں یہ اعزاز برقرار رکھنا اور اس دوران' اس کے جملہ سرکاری درباری' محلّہ مقامی مفادات' بزور'' رانڈ اندازی'' حاصل کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔

رنڈاپا' ان کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت تو ہوتا ہی ہے' علاقہ بھر کے لیے بھی ان کا وجود' بے شمار عائلی' سماجی' رُوحانی اور معاشرتی مسائل کا حل ہوتا ہے۔ معلوم پڑتا ہے کہ ماسی حاجراں' بیوہ نہ ہوتی۔ علاقہ اور اس شہر میں مقیم نہ ہوتی...... بوڑھی حاجن' کمیٹی وار بیچولی' ختم درود پڑھنے' کفن غسل کروانے والی...... فال قرعہ دَم اور خوابوں کی تعبیر بتانے والی...... خاوند کو قابو' نند کو بے قابو' دیورانی کو لُٹی' جیٹھانی کو گنجی کرنے والی...... اُٹھرا کی گولیاں...... زچگی کروانے والیاں اگر نہ ہوتیں تو یہ شہر علاقہ یتیم ہو کر رہ جاتا۔

ہندو ناری اپنے مرنے والے پتی کے ساتھ ستی ہو کر راکھ بن جاتی ہے۔ مسلمان عورت' اپنے مرنے والے شوہر کے ساتھ نہ مر کر' رانڈ بن کر اَمر ہو جاتی ہے بلکہ ایک ایسے اَمرت دھارا کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جو بیا جتا عورتوں کے جملہ مسائل کا حل ہوتا ہے۔

مرد حضرات بھی رانڈ ہوتے ہیں بلکہ کئی ایک تو جمع باندھ ہوتے ہیں چونکہ سرِ دست' ذکرِ جمیل رانڈ مسمات کا مقصود ہے لہٰذا مرد حضرات کا'' ذکرِ جلیل'' کسی اور موقع پہ۔''

ہاں تو کہہ رہا تھا کہ عورت رانڈوں میں سب سے خطرناک اقسام تنور والیوں اور مراثنوں کی پائی

گئی ہیں۔ سکت وعمل کی ساری زندگی بڑی جہالتی طنطنے میں گزرتی ہے مگر بوڑھاپا بڑے سیاپے لاتا ہے۔ مکافاتِ عمل کا یہ عالم کہ رُوڑی پہ پڑی گندگی بن جاتی ہیں۔ اپنے بیگانے سب ان کی کرتوتوں پہ مُنہ چھپاتے ہیں۔ جوانی میں بھانڈ خوب ہنستا ہنساتا ہے مگر بڑھاپا بڑا کڑا وقت لے کر آتا ہے' ایسا کہ دیکھنے سننے والوں کو رُلا دیتا ہے۔ کہنہ عمر اداکار' پہلوان' پولیس والے' بوڑھی نائکہ' بوڑھا ہیجڑا' بوڑھا وکیل آخرت کی آجرت میں خسارہ برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں پاتے کہ بیتے ہوئے اچھے وقت اور بُرے اعمال کی یادیں' ان کے لیے سوہانِ رُوح بن جاتی ہیں وہ بیٹھے بیٹھے خودبخود ہنستے اور روتے رہتے ہیں۔ ان کے کھنڈر چہروں پہ غروبِ زندگی کی پرچھائیاں لہراتی رہتی ہیں۔

ٹھنڈی چھاؤں اور سیدھے راستے کے بوڑھوں کے چہرے نرم و خُرم...... ٹیڑھی راہوں کے مسافر بوڑھوں کے چہرے' بوڑھے کا درخت کہ جس پہ سانپ چمگادڑیں' شکرے' اُلو وغیرہ تو ہوتے ہیں...... قُمریاں' چڑیاں اور عندلیبیں نہیں ہوتیں۔''

ہاں' کچھ یہ بھی کہ بوڑھے گدھے' ہاتھی اُونٹ اور گھوڑے چاہے کیسے بھی پیارے اور قیمتی ہوں۔ اس سے پیشتر کہ وہ خاموش اور خطرناک بڑھاپے سے آپ کو کوئی ضرر پہنچائیں۔ لازم ہے کہ آپ کوئی قابلِ ذکر گزند پہنچائے بنا انہیں واصلِ عافیت کر دیں...... یہی صورت حال اگر کسی دیرینہ ملازم بشمول کسی قریبی بزرگ' جن کی کفالت' علالت' غسالت اور جنازت' آپ پہ واجب ٹھہرتی ہو۔ ایسا موقع پیدا ہونے سے کچھ پہلے ہی انہیں زیارتوں پہ بھیج دیا جائے۔ دونوں جہانوں میں آسودگی ہوگی...... آپ کی اِدھر' اُن کی اُدھر......!''

بات جب اُڑتی ریت کی مانند بکھرتی ہوئی محسوس ہوئی تو اک نئے انداز سے مداخلت کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

''بابا! بڑھاپے کی لاکھ بُرائیاں ہوں گی...... کیا کوئی ایک آدھ خوبی بھی نظر آتی ہے؟''

جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے! ایک آدھ خوبی پہ کیا موقوف؟ بڑھاپا سیکڑوں خوبیوں کا مخزن بھی ٹھہرا...... جن زیرک اصحاب پہ بڑھاپے کے رازواَسرار وا ہو گئے وہ تو تختی سرور ہو گئے...... دین و دُنیا کی فلاح اُن کا مقدر بن گئی۔ خدا رسول نے عالمِ پیری کو ایک نعمت کہا...... فلک بوس عمارت' مکمل منہدم بھی ہو جائے تو اس کی بنیادیں قائم رہتی ہیں۔ مطلب یہ کہ جس بڑھاپے کی اساس میں رزقِ حلال کا اینٹ روڑا' محنت و ہمت کی ریت بجری' ایمانداری اور نیک نیتی کا پانی...... صبر و تحمل کا چُونا...... شکرگزاری اور خدمتِ خلق کا سیمنٹ شامل ہو اور تسلیم و رضا کا وتر لگا ہُوا ہو...... وہ بڑھاپا' بیت المقدس کی مانند عظیم و قدیم ہوتا ہے۔ آدم' نوح' ابراہیم' ذکریا' شعیب'

داؤد و سلیمان، یعقوب دیگر انبیاء و صحابہ کرام اولیائے کرام کے بڑھاپے...... سُبحان اللہ!"

فرمایا! کہ جس گھر میں کوئی بزرگ ہوتا ہے وہ گھر آفاقی بلیات اور شرِ شرار سے محفوظ رہتا ہے۔ طالع مند بزرگ کی زیارت، زیارتِ کوہِ طور کی طرح ہوتی ہے۔ کسی بزرگ کی خدمت کرنا، اُس کی جملہ ضروریات کا اہتمام کرنا...... وضو طہارت میں مدد کرنا بہت بڑے ثواب کا موجب ہوتا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت، کسی بزرگ کو سلام کرنا، دُعائیں لینا۔ سلامتی اور کامیابی کی ضمانت ہے۔ کئی نبیوں رسولوں، ولیوں، بادشاہوں، حکمرانوں کو حکومتیں، مراتب درجات، عہدے وغیرہ اُن کے بزرگوں کی طفیل ملے۔

دیکھا گیا ہے، گھر میں بلّی موجود ہو تو چوہے نہیں آتے بلکہ میں نے تو یہ بھی دیکھا کہ کچھ چوہے ایسے بھی کہ جن کے آنے پہ بلّی گھر چھوڑ کر کہیں نکل لیتی ہے یعنی کچھ بلّیاں بزرگ ہوتی ہیں اور کچھ چوہے بھی برگزیدہ، ایسی بزرگی، جسے بھی اللہ دے۔"

کچھ جہاندیدہ لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ، ایسے بزرگ نگہبانی، چوکیداری پہ رکھتے ہیں جن کے اعضائے رئیسہ تو کجا اعضائے غریبا بھی کام کاج کے نہیں ہوتے۔ بجی ہوئی آنکھوں میں دکھائی بھی کچھ کم ہی دیتا ہے۔ دیوار کے سہارے کے علاوہ کھڑا ہونا اُن کے لیے دُشوار...... سماعت بھی جواب دے چکی ہوتی ہے۔ مسلسل کھانسی، کانسی کی کٹوری کی طرح بج رہی ہوتی ہے۔ کھانسی کے ساتھ بلغم کا اخراج، مزید مصروفیت پیدا کر دیتا ہے۔ توجیح یہ کہ ایسے چوکیدار مسلسل بیدار رہتے ہیں یا بیدار بخت ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں چور ڈاکو قریب نہیں پھٹکتے...... گھر والے نیند کی گولیوں کے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں۔"

سیانے سمجھدار لوگ، باورچی خانہ کے لیے مصالچی، خانساماں، چُن چُن کر بوڑھے سے بوڑھا یا ایسی بوڑھیا کی تلاش میں رہتے ہیں جن کے ہاتھوں میں رعشہ، آنکھوں میں موتیا اور مُنہ دانتوں داڑھوں سے پاک ہو اور اگر کسی مرضِ معدہ میں مبتلا بھی ہو تو یہ اُس کی اضافی خوبی گردانی جاتی ہے۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے کہ ایسے باورچی، خانساموں کی دستبرد سے بوٹیاں، پستے بادام، گری کھوپا بچے رہتے ہیں اور یہ اپنی دندانی تحتگی اور آنتوں کی ضعیفی کی وجہ سے محض ہاتھوں کے ساگ، دال کی بڑیوں یا دودھ دہی سے ہی رغبت رکھتے ہیں۔ گھر والوں کی اس احتیاط کے باوجود کئی ایک بوڑھی مائیاں، بزرگ خانسامے، کچّے گوشت کی بوٹیاں، گھی تیل، مرچ مسالے، ایسے ایسے طریقوں سے نکال کر لے جاتے ہیں کہ اُنہیں داد کے ساتھ کچھ درہم بھی دے کر شاگردی اختیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

مَیں حتی الوسع دعوتوں سے پرہیز کرتا ہوں اور خاص طور پہ اُن گھرانوں کی دعوتوں سے، جن کے ہاں ہر گھریلو کام کاج کے لیے نوکروں کی ایک فوجِ ظفر موج پڑی ہوتی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اپنے گھر کے تمام کام

کاج' خاتون خانہ کو خود کرنا چاہئیں۔ جس کے بے شمار فوائد ہیں' خاص طور پہ اپنے بزرگوں' خاوند اور بال بچوں کے کھانے پکانے کے فرائض خود اپنے ہاتھوں سرانجام دینے چاہئیں۔ سمجھدار سلیقہ مند عورتیں' جنہیں اپنے گھرانے کی صحت' سلامتی...... خاوند کی توجہ پیار...... بچوں کا مستقبل عزیز ہوتا ہے وہ اپنا چولہا چوکا کسی قیمت پہ خانساموں ماسیوں ماسیوں کے سپرد نہیں کرتیں...... جو ملازم' معاوضہ پہ آپ کے ہاں پڑا ہوتا ہے وہ شاذ ہی اپنے کام میں مخلص ہو...... کھانے پکانے پہ مامور نوے فیصد ملازموں پہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کبھی کسی بھی وجہ سے آپ کو ضرر پہنچا سکتے ہیں۔''

کراچی کی ایک ارب پتی فیملی' جن کے کئی بنک اور ادارے' ملک اور غیر ممالک میں فعال ہیں...... ان کا ایک شریف سا شخص میرا عقیدتمند ہے۔ وہ بہت پہلے مجھے خواجہ اجمیری کی درگاہ پہ ملا تھا۔ بڑی دیگ کے پاس' ایک برتن میں نیچے گرا ہوا لنگر اکٹھا کر رہا تھا۔ جبکہ پاس ہی زائرین میں لنگر بھی تقسیم ہو رہا تھا۔ چاہتا تو وہاں سے لے سکتا تھا۔ مجھے اس کا نیچے فرش پہ گرے پڑے لنگر کا یوں عقیدت سے اکٹھا کر کے برتن میں ڈالنا' عجیب سا لگا...... لوگ ایسا بھی کرتے ہیں۔ بات عقیدت کی ہے لیکن یہ شخص کوئی صاحب حیثیت دکھائی دے رہا تھا اور پاکستانی بھی...... اس کے ہمراہ ایک مایوس مدقوق سا نوجوان اور ایک اُدھیڑ عمر خاتون بھی تھی جو یقیناً اس باوقار شخص کی بیوی تھی۔ خاتون سیاہ عبایہ میں ملبوس تھی' موٹی موٹی اُداس آنکھیں جیسے رو دینے پہ آمادہ ہوں۔ برتن بھر گیا تو ڈھکن دے کر وہ تینوں اندر مسجد کی جانب بڑھ گئے۔ میں اُنہیں ملکہ وکٹوریہ کی عقیدت کا وسنک تکتا رہا تھا۔''

میں اپنے ایک آدھ کام نپٹا کر' مسجد چلا آیا...... بغلی در سے داخل ہوتے ہی وہ تینوں مجھے روضہ شریف کی جانب والے کونے میں بیٹھے دکھائی دیے۔ وہ صاحب تسبیح پھیر رہے تھے اور خاتون' اپنے ہاتھ سے اُس نوجوان کو لنگر کھلا رہی تھی۔ ذرا نمادہ ہی برتن...... جس میں نیچے فرش پہ پڑا لنگر اکٹھا کیا گیا تھا۔''

میں سیڑھیاں چڑھ کر' مسجد اندر اپنی مخصوص جگہ پہ آ بیٹھا۔ نماز کے بعد' میں نہ جانے کیوں یہاں رُکا بیٹھا رہا...... سر جھکائے' میں کسی کیفیت میں تھا کہ کسی نے مجھے کچھ تھمانے کی غرض سے ہاتھ چھوئے...... وہی شخص' یمنی سرخ عقیق کی تسبیح' عطر کی خوبصورت شیشی...... پلاسٹک کی تھیلی میں یقیناً کچھ لنگر تھا...... نہایت ملائمت سے سرگوشی کے انداز میں گویا ہوا۔

''یہ معمولی نذرانہ قبول فرمائیں۔ خواجہ غریب نواز کا صدقہ' اس لنگر پہ شفا کے لیے دَم کر دیں۔''

نذرانے اور تھیلی پہ نظر ڈالنے کے بعد' اُس کے چہرے جانب دیکھا...... شفاف سنگِ مرمر کی فراخ لوح! جس پہ کاتبِ تقدیر نے شاید کچھ رقم کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اپنی بات کر کے شاید وہ مجھے دیکھنا یا مجھ سے نظر

ملانا بھول ہی گیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں لنگر کی پکڑی ہوئی تھیلی اور کان میرے کچھ شبد سننے کے منتظر تھے۔ میں اِس بھلے اِنسان' اُس کی خورشاکل بیوی اور نوجوان کے بارے سوچ رہا تھا کہ عقیدت بھی کیا اندھی چیز ہوتی ہے۔ پیروں فقیروں سے عقیدت رکھنے والے بھی کیا عجب بھولے منش ہوتے ہیں۔ ہر اُس شخص کو اپنا ملجا ماوا سمجھ لیتے ہیں جس کا حال حلیہ الگ سا ہو۔ میرا سیاہ پیرہن اور دیگر آلاتِ شعبدہ گری' انگوٹھیاں' منکے' عصا' مشکول زُلفیں' دراز ریش...... ایک اللہ والا دَرویش' کرنی والا بابا ثابت کرنے میں اور کیا کسر باقی رہ گئی تھی؟

مجھے بڑی شرم آئی۔ اِسے اللہ سے مانگنا چاہئے۔ خواجہ غریب نواز کو وسیلہ بنانا چاہئے' خواجہ کے دَر پہ اِس وقت بھی چالیس وَلی بیٹھے ہیں اُن سے دُعا کروانی چاہئے۔ میں گم صُم اپنے اُوپر لعن طعن کر رہا تھا۔ کیا ہُوا اور کیونکر؟...... کوئی بھنکا بھولا گندے پانی کا قطرہ' میری آنکھوں سے ٹپک کر اُس کی لنگر والی تھیلی پہ آ گرا......!

سات روزہ قیام کے دَوران وہ عصر کی نماز کے بعد' اسی جگہ ملتا۔ لنگر پہ دَم کرواتا اور بن کچھ کہے پوچھے چلا جاتا۔ آخری روز' وہ مجھے لفافہ تھما کر رُخصت ہو گیا۔"

میرا اکثر ایسے ہلکے بھاری لفافوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ کسی میں موٹی یا معمولی رقم' کسی میں اپنے حل طلب حالات اور جوابی لفافہ...... ایسے بھی لفافے' جو علاقہ کے تھانہ میں بھیجنے چاہئیں کہ اُن واقعات کا تعلق' دَست اندازیِ پولیس کے زُمرے میں آتا ہے۔ دَرویش کا کسی کی شادی طلاق یا جائیداد کے باہمی تنازعات سے کیا علاقہ؟ بچھڑے ہوؤں کا ملاپ...... عشق معشوقی کے چکر...... امیگریشن' امتحانات کی کامیابی' جنات وظیفوں چلوں کی بابت استفسارات...... تین جوان بچیوں کی شادی کے لیے امداد و دُعا۔ قرض کی ادائیگی کے لیے دُعائیں...... تحفہ میں کتابیں مانگنے والوں کے رُقعے' لفافے! غرضیکہ ہر نوع نوعیت کے پیغام آتے رہتے ہیں۔ شاذ ہی میں نے کبھی کوئی جواب دیا ہو؟ یہ نہیں کہ میں جواب دینا پسند نہیں کرتا...... کسی لفافے کے مندرجات' مجھے جواب دینے پہ اُکسائیں' مجبور کریں' جواز بنائیں...... کسی کے ذاتی معاملات' بودے کچے ذہن کے سوالات...... ایسی باتیں' جو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنی چاہئیں۔ مذہبی مسلکی مسائل' جو مجھ سے نہیں کسی عالم دین سے دریافت کرنے چاہئیں۔"

بات اُس بھاری لفافہ سے آگے بڑھی' جو اُس بھلے انسان نے دَرگاہ شریف کی مسجد میں' بولے ہاتھوں مجھے دیا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی' جو لفافہ دیکھ کر ہی نفسِ مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ اتفاق سے میرا شمار' اُن ذواتِ شریفہ سے ہے جو لفافہ دیکھ کر محض بھانپتے ہی نہیں بلکہ جان بھی لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ جواب مضمون بھی اُترا ہوا تیار ہوتا ہے۔"

بابا کہتا ہے' میں نے ایک بار شغل وشغلی تھوڑا سا سونا تیار کیا۔ شاید کچھ ضرورت بھی تھی تو عُلم کے

مطابق میں ایک پائی کے وزن کے برابر ہی تیار کر سکتا تھا۔ یہ میرا وہ زمانہ جہالیت تھا جب مجھ پہ جنون کی حد تک سونا بنانے کا شوق سوار تھا۔ میرے روز و شب اسی شغلِ بیکار میں گزرتے تھے۔ بالآخر چاچا گلزُ کزی قپیا اور ایک سنیاسی مہوّس کے فیضان سے کامیابی نصیب ہوئی۔ میں نے اپنے وسائل' کوشش سے پہلی بار بے عیب سونا کٹھالی سے نکالا جو وزن میں ایک ماشہ تین رتی تھا...... ہندو ساہوکار نے مجھے کھری چاندی کے دو روپے دو آنے تھماتے ہوئے کہا۔

''ایسا خالص سونا کہاں سے لائے؟ کسوٹی سندوری ہوگئی...... ان روپوں کی خالص چاندی بھی دانتوں تلے کٹ کٹا کر دیکھ لو......؟''

یکدم میرے دماغ کی کوئی گراری گڑگڑ کرنے لگی۔ سونے کے بدلے چاندی' یہ کہاں کی کیمیا گری ہے؟ اگلے جھٹکے سے خود بخود جواب بھی نکل آیا...... اصل اہمیت تو مُہر ٹھپنے کی ہے جو سکے کے دونوں اطراف ہوتی ہے۔ جو میرے جنگلی بیر کی گٹھلی سے بے ڈھبے سونے پہ نہ تھی...... بہت آگے نکل کر یہ بھی سمجھ میں آیا کہ اللہ اور بندے کے بنائے ہوئے سونے میں' نہ محسوس ہونے کے باوجود اک نمایاں فرق ہوتا ہے وہی سکہ رائج الوقت کی مُہر والا......!

رنگ' وزن' نرمی' پھیلنے سکڑنے' تاؤ کھانے اُڑنے پگھلنے اور راکھ پانی بننے کی تمام تر صلاحیتوں کے باوصف بھی' اللہ اور بندے کی صناعی میں فرق قائم رہتا ہے۔ اسے رہنا بھی چاہیے۔ شداد اور حسن بن صباح کی بنائی ہوئی جنتیں' حکیم نخشب کے تخلیق کردہ روشن چاند اگر ایسے ہی حقیقی اور اصل کا بدل ہوتے تو ہنوز قائم دائم رہتے۔''

بات' عمل' آغاز و انجام کا کوئی وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح ہدایت' فیض اور قبولیت کے لیے بھی کہیں کوئی روزن کھلا ہوتا ہے جس سوراخ کی راہ سے داخل ہونے والی کرنوں کے لیے چند لمحے آویز ہوتے ہیں۔ تھوڑے وقفے بعد زاویہ تبدیل ہوتے ہی روزن بلیک ہول بن کر رہ جاتا ہے۔ کیمیا گر وہی ہے جو ان روشن لمحوں کی پہچان کرتا ہے اپنی عقل علم و تجسس کے تاریک گوشے منور کر لینا جان جائے۔ کیمیا گری کا سارا عمل ساعتوں کی سلامتی و صواب پہ ہوتا ہے۔''

شاید ایسی کوئی ساعت' میرے لیے سعید ہوگئی تھی کہ میں اگلی کسی منفی انجام خیز ٹھوکر کھانے سے بچ گیا۔ مشاہدے کی ایک گرہ جب اور کھلی تو میں نے مزید تجربہ کے لیے ایک اور در کھولا۔

میرے کئی عشرے' صرف اُن خامیوں پہ نظر رکھتے ہوئے گزر گئے جن پہ صرف نگاہ کی پاداش میں مہوّس کو کسی نہ کسی طور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عشروں مہینوں کی محنت رائیگاں ہو جاتی ہے۔ سیمیا گری کی

نگری کے لوگ کہتے ہیں کہ منوں کے حساب تانبا' چاندی' ابرق' سیماب' شنگرف سہاگہ پہ چھاڑو پھر جاتی ہے لیکن کہنا مشکل کہ سیمیا صاف ہو جائے گی۔ سیکڑوں ہزاروں کے صرفے' شب و روز کی محنت شاق' اگر تولہ دو تولہ سونا بنا بھی لیا تو کیا فائدہ؟ یہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی کیمیا گری کے شوقین' اُس وقت تک باز نہیں آتے جب تک اُن کی عزت و شہرت' جسم و جان کے سارے اثاثے آخری ہچکی نہیں لے لیتے۔''

● کچھ آشفتہ سروں سے اَدب آداب سیکھے......!

کتاب ''کاجل کوٹھا'' میں جموں توی والے باوا بالی شاہ کے مزار کا ذکر کر چکا ہوں۔ عقیدت کے علاوہ میری ضرورت بھی کہ میں گاہے بگاہے وہاں حاضری دیا کرتا تھا۔ عرس میلے کے علاوہ بھی وہاں بارہ مہینے' سادھو سنتوں سپیروں سنیاسیوں اور باہر سے پہنچے ہوئے زائرین کے جمگھٹے لگے رہتے تھے۔ یہی سادھو سنیاسی فقیر' میری ضرورت ہے کہ کشمیر کے پہاڑوں' بندرابن' آسام' پنجاب' ہردوار' متھرا' کیلاس' نیپال' رنگون اور بنگال سے اِدھر پہنچتے اور کچھ ایسے سنیاسی سپیرے' جو کیمیاوی جڑی بوٹیوں اور سانپوں کی کھوج میں وادی وادی پھرتے رہتے اور موسم سرما بسر کرنے کی خاطر اِدھر آ براجتے۔ اِدھر کا ماحول' ان دین و دُنیا سے فارغ لوگوں کے لیے بڑا سازگار ثابت ہوتا۔ توی ندی کے وسیع و عریض کنارے' سہانا موسم' منشیات کی آزادی...... لنگر' و حمالیں' عقیدت والے اور آم کے آم گٹھلیوں کے دام...... یعنی کچھ کاروباری لین دین بھی ہوتا تھا۔ کشمیر کے خشک و تر میوہ جات اور مسالے...... کشمیری دُھسّے' چادریں...... غالیچے اور دریاں! قریب و جوار میں میدان' باغات کہ شب و روز کی بسر اوقاتی بھی وافر......!

زمین' آب و ہوا زرخیز ہو تو گھاس پات خود بخود اُگ آتے ہیں۔ دانے تنکے کو ہوں تو چرند پرند بھی پہنچ جاتے ہیں۔ میری طرح اور بھی بہت ہوتے جن کے مقاصد مختلف تو ہو سکتے ہیں مگر باوا بالی شاہ سے رُوحانی تعلق و شوق' قریب قریب سب کا ایک سا ہی ہوتا۔''

''کاجل کوٹھا'' میں قبر کے اندر لیٹے ہوئے اک تپسّ کاری کا ذکر کر چکا ہوں۔ ایک بار یہی بزرگ' درخت پہ اُلٹے لٹکے نظر آئے۔ اس طرح کے شعبدے تماشے' اِدھر جابجا دکھائی دیتے تھے جنھیں لوگ دلچسپی سے دیکھا کرتے...... اس ملنگ نے اپنے سوکھے سڑے بُنڈے کو ایک میلی سی کپڑے کی دھجی سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش کی ہوئی تھی۔ سر کی جٹیں' نیچے زمین کو چھو رہی تھیں۔ جب چاہتا جھول لیتا جب چاہتا ساکت ہو جاتا۔ ایک بار جب ساکت ہوا تو ذرا قریب سے دیکھنے کی خاطر' میں اُس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اُلٹا لٹکے ہوئے کو

سیدھے پاؤں پہ کھڑے بھی اُلٹے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنا اپنا زاویۂ نظر کہ کسے کوئی کس طرح دکھائی دیتا ہے؟
مجھے گھورتے دیکھ کر کھی کھی کی آواز نکالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کیا گھورتے ہو تم نے کبھی اُلٹا لٹکا بندر یا بندہ نہیں دیکھا؟ میں تو پیدا ہی اُلٹا ہوا تھا۔''

اُس کی بات کچھ سمجھتے' کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اُسے شاید میرا پیچھے ہٹنا اچھا لگا تھا...... کھی کھی کھنگارتے ہوئے زور زور سے جھولنا شروع کر دیا۔ جھولتے جھولتے اپنے سینے پہ رکھے ہاتھ کھولے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں وہیں پہلی جگہ آگے بڑھ آیا۔ میری سیدھی آنکھوں میں اپنی اُلٹی آنکھیں گاڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''لٹکن منڈپ پہ کسی سے بات کرنے سے دھیان گیان میں اُچٹ پڑتی ہے۔ پرنتو تم سے تو بات اَوش کرنی پڑے گی کہ تیرے مکھ ماتھے پہ اُچیت ذہن ذاموں کی کلپ چھایا سماوت ہے۔ اگر تم ہم کو شکروار' باوا گنج شکر کی شکر کا پرشاد کھلا دو تو ہم تمہیں باوا منتصو پیر کی کھیر کھلا دیں گے جو اُلٹ لٹک کر کھائی جاتی ہے۔''

میں نے اُس کی بات سُن کر دل ہی دل میں شکروار کے روز کا حساب لگا کر جواب دیا۔

''ان پانچ دنوں میں میں پاک پتن سے شکر تو آسانی سے لا سکتا ہوں لیکن اُلٹا لٹک کر باوا منتصو پیر کی کھیر کھانا' بڑا امیڑھا کام ہے؟''

تپسں کاری نے تُرت جواب دیا۔

''مگر اس بنا آگے راہ نہیں کھلتی۔ کُتے کا کھاجا پنیر اور کھیر نہیں' نہ کوّے کا چوگا' موتی موتکا...... مگر باوا بالی شاہ کے دَر کے کُتے اور کوّے یہی کچھ کھاتے ہیں...... جانتے ہو؟ بابا منتصو پیر کا کھتا مچھ' کیا کھاتا تھا؟...... یہ سب کچھ میں تمہیں شکر لانے پہ شکروار کو بتاؤں گا؟''

ایسی عجیب وغریب پُراسرار باتیں سن کر اندر ہی اندر دہل سا گیا تھا۔ ساکت باوا نے یہ کہہ کر پھر جھولنا شروع کر دیا' اس کا مطلب تھا وہ اَب مجھ سے مزید بات نہیں چاہتا۔ میں کافی دیر وہیں ننگے پاؤں کھڑا رہا کہ شاید باوا پھر نظرِ التفات کرے مگر وہ تو آنکھیں مُوندھے ایسے لٹک رہا تھا جیسے چلّہ معکوس کے تیسرے طبق میں ہو۔ پہلا کنواں' دوسرا دریا' تیسرا کاٹھو!''

میں مقررہ دن سے ایک روز پہلے ہی پہنچ آیا تھا۔ پکا سیر شکر اور شکر پارے' قصور شریف سے کھوئے والے اَندرسے اور نمک میرے ساتھ تھے۔ سیالکوٹ سے آخری گاڑی' سوا سات یعنی پورا گھنٹہ لیٹ روانہ ہوئی۔ جموں توی پہنچتے پہنچتے رات کے نو بج گئے۔ تانگے سے کچہری اپنی پھوپھی کے گھر پہنچا تو دروازہ پہ بڑا تالا' منہ چڑا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ پھوپھا مرزا صاحب بمعہ اہل وعیال صبح صبح ہی سیالکوٹ چلے گئے ہیں۔

اُب میرے لیے دو ہی راستے تھے سرائے دھرم شالہ یا باوا بالی شاہ کی دَرگاہ......!

مجھ ایسے گھر یا ہڑ دین و دُنیا سے فارغ اور جیب و کھیسے سے خالی 'ملنگ' عام حالات میں سراؤں ہوٹلوں سے ہٹ کر دَرگاہوں' مزاروں' مرگھٹوں ڈیروں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں کہ ایسی جگہیں نہ صرف ان کے مزاج و ماحول کے مطابق ہوتی ہیں بلکہ اِدھر اِن کے شوق و ذوق کی تسکین کے علاوہ پیٹ پوجا اور دَم دارو کا سامان بھی کسی نہ کسی طور میسر رہتا ہے۔"

میں دَرگاہ کی جانب پیدل ہی چل پڑا۔ رات کا پہر ہو...... دیوانے ویرانوں کا رُخ کر لیں تو پرواؤں کے رُخ خود بخود پھر جاتے ہیں...... ستاروں کی چلمنیں چقیں بھی اُس طرف سے اُٹھنے لگتی ہیں۔ طیوران شب خیز دیوانہ وار لپکتے ہیں۔ راہ کے شجر حجر اِس کا سواگت کرتے ہیں۔ اِک لمبا راستہ پلک جھپکنے میں طے ہو گیا۔

وقت اگر کہیں جھپکی بھی لے مگر فقر بخت جاگتا ہی رہتا ہے۔ مستوں' ملنگوں' مار سیاہ' ماہی' موہن دار اور منتظر کی آنکھوں پہ پپوٹے نہیں ہوتے۔ ان کی تو درشن پیاسی آنکھیں مرنے کے بعد بھی کھلی رہتی ہیں۔ ایسی ہی کچھ کیفیت یہاں دَرگاہ کے دَر و دیوار کی بھی تھی کہ جن کے قرب و جوار میں ہر ظاہری باطنی بینائی کہیں نہ کہیں لڑی بجڑی ہوئی تھی۔ جلے بجھے سُلگتے الاؤ...... راکھ راکھ خاک نشیں مست و ملنگ...... حق ہُو الکھ نرائن کے آوازے...... گھنگھروں کے چھنکارے' کلیانوں پہ اِنگارے...... سنکھ منکھ' اِکتارے...... لگتا تھا یوں جنوں کے جگنوؤں نے توی گھاٹ پہ رَچنا لگا رکھی ہے۔ جنگل میں منگل! اندھیرے اُجالے' وقت سے' جتیجو' مرتیو' ذیت ذھن کے جھنجھٹ سے الگ تھلگ' اِک ایسا سنسار! جدھر کرم دھرم کا کوئی بچار اور اپنے پرائے کی کوئی اُپکار نہ ہو۔ اپنی اپنی راہیں' اپنی اپنی منزلیں...... اپنی زمینیں اپنے آسماں...... میں اُدھر یوں وارد ہوا...... جیسے سوتے جاگتے' جنگل میں کوئی جیتا مرتا جنگل داخل ہوتا ہے۔"

کسی اُوشد حالیہ میں پڑے ہوئے روگی ہوں یا بندرابن کے جوگی...... سب ایک ہی عجب جان پڑتے ہیں۔ سری لنکا میں سب باون گزے اور متھرا کے سب ماوا پیڑے ایک ہی مزے کے ہوتے ہیں۔ جس مہا تما مہاشے کو دیکھا ایک سا ہی جاپ پڑا...... اِسی دیکھا دیکھی میں بھاڑ جھونکنا اپنا' اِدھر اُدھر چاند ماری کر رہا تھا کہ کہیں وہ اُلٹے پیڑ پہ لٹکے باوا دکھائی دے جائیں جنہوں نے گنج شکر کی شرط پہ مجھے باوا منکھو پیر کی کھیر کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ حیرت کہ یہ کھیر مجھے اُلٹا لٹک کر کھانی ہو گی ایسی ترکیب بھی مجھے وہی بتائیں گے؟

میں بیوقوف' گھن چکر بن سوچے سمجھے کہ منکھو پیر کی کھیر اُلٹ لٹک کر کھانے سے کیا حاصل؟ باوا کے کہے میں آ کر بھاگم بھاگ پاکپتن شریف' قصور شریف اور سیالکوٹ پہنچا...... کسی نہ کسی طرح اُن کی مطلوبہ اشیاء اکٹھی کیں اور آج شکر وار سے پہلے اِدھر پہنچ چکا تھا۔ پہلی ملاقات والی جگہ۔ لٹکن پیڑ خالی تھا۔ بہتیرا نیچے اُوپر دیکھا

مگر سوائے اندھیرے گھپ گھیرے کچھ نہ تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اب کہیں اور دیکھوں؟ ہنسی آئی کہ بادا سے ملاقات کا وقت کل شکروار کا طے ہے' ہو سکتا ہے وہ کہیں اور نکل گئے ہوں۔ کل پلٹ آویں...... سفر کی تھکاوٹ اور نیند کے غلبے نے مجھے وہیں پیڑ نیچے بیٹھنے اور پھر لیٹنے پہ مجبور کر دیا۔ شکر' نمک اور شکر پاروں والا پوٹلا' سرہانے بنا کر میں وہیں لمبا پڑ گیا تھا۔''

اُن وقتوں جموں توی ...... بندوں میں کوندے اور بندروں میں لُچھندر بہت زیادہ ہوتے تھے۔ کوندوں اور لُچھندروں میں ایسی مطابقت و مشابہت تھی کہ کبھی کبھی انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ سمجھنا مشکل پڑتا تھا۔ خاص طور پہ جموں اور اُودئی' رات کے لوگ اپنی ہر وہ شے جو بندروں سے بچانی ہوتی' دوہری حفاظت میں رکھ کر سوتے تھے۔ اس کے باوجود بدمعاش بندر شب خون مار جاتے تھے۔ آدھی رات گزر گئی ہوگی کہ نیند کے اُچٹنے میں مجھے اپنے سر کے نیچے کا پوٹلا کھسکتا ہوا محسوس ہوا۔ یقیناً یہ کوئی بندر تھا جو شکر پاروں اور اَندرسوں کی خوشبو پہ اِدھر لپکا تھا۔ اندھیرے میں دکھائی کیا دیتا' میں نے ہاتھ بڑھا کر بندر کا بازو پکڑ لیا۔ کھی کھی کرتا ہُوا وہ بازو چھڑانے کی بجائے مجھ سے لپٹ گیا۔ بدبو' پھچھاندے سے میرا تو دماغ اُلٹ گیا۔ اُس سے جان چھڑانے کی کوشش میں محسوس ہُوا کہ وہ کسی عام بندر کی بجائے کوئی لُچھندر ہے جو میرے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ نیچے مٹی' گھاس جھاڑیوں پہ خوب رگیدا رگیدی ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ لُچھندر مجھ سے پوٹلا چھین کر کھی کھی کرتا ہُوا اِسی پیڑ پہ چڑھ گیا جس کے نیچے ہماری کلا جنگ ہو رہی تھی۔''

''بندر اور قلندر (بندر والا) دونوں کا پیچھا کرنا عبث ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھ تو کر جاتے ہیں مگر ہاتھ نہیں آتے۔ یہی ان کی پہچان ہوتی ہے۔

اکثر مذاہب میں کچھ مسالک و فرقے ایسے بھی موجود ہوتے ہیں جو اپنے عجیب و غریب' سمجھ میں نہ آنے والے عقائد اور رسومات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ افریقی قبائل اور خاص طور پہ اِدھر ایشیا میں ایسی محیّر العقول رسومات و توہمات پائی جاتی ہیں کہ انسانی عقل ششدر رہ جاتی ہے۔ انسان ایک طرف تو چاند ستاروں' خلاؤں کہکشاؤں تک رسائی حاصل کرنے کا دعوے دار ہے اور دوسری جانب' جہالت و توہم کے گہرے کنوؤں میں اُترا ہُوا' انسانیت کا منہ چڑا رہا ہے۔

سُنی سُنائی بات' ہندوستان کی ایک پڑھے لکھے' متموّل' شہرت یافتہ خاندان کی ہے جس کا ایک ایک فرد' کسی نہ کسی شعبہ میں اپنی مثال آپ ہے۔ ایک اداکار کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ماں باپ کو کون نہیں جانتا؟ خود اس اداکار' اُس کی اداکارہ بیوی' اداکار بیٹے اور بین الاقوامی شہرت یافتہ اداکارہ بہو کے فنّی' سیاسی' کاروباری' شخصی قدوکاٹھ سے کون کاٹھ کا اُلّو واقف نہ ہوگا؟

یہ احمد آباد کا ایک اُونچے درجہ کا تعلیم یافتہ اور انتہائی روشن خیال گھرانہ مانا جاتا ہے۔ مگر کیا کیجیے توہم پرستی اور دھرم ذہنیت کا......؟

اداکار بیٹے نے اداکارہ سے شادی کا پروگرام بنایا۔ روشن خیال ماں باپ نے حسبِ روایت' کمال خوش دلی سے صاد کیا۔ شبھ گھڑی نکالنے کے پنڈت بیٹھے' جنم پتریاں' ملن لگن پتریاں' آسمانی زمینی حساب کتاب' زائچے بنائے گئے۔ مگر کہیں بھی ان کا ملاپ راس دکھائی نہ دیا۔ گھر والے ہر قیمت پہ اس ملن کو کامیاب بنانے پہ تُلے ہوئے تھے۔ اَن ہونی کو ہونی میں بدلنے کے لیے مزید تجربہ کار مہان پنڈت تلاش کیے گئے کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے کہ ان دونوں کے ناراض ستارے ایک ہو جائیں۔ پھر کیا تھا؟ ہندوستان بھر کے پنڈت' پجاری' ان کے ستاروں کے پیچھے پڑ گئے۔ کون سا مندر' استھان' مزار ایسا ہوگا جہاں منتیں نہ مانگی گئیں۔ خصوصی پوجا پاٹ نہ کرائی گئی۔ خیر خیرات' لنگر پرشاد نہ ہوا...... دور دراز' دشوار گزار سفر ہوئے۔ امیتابھ' جیا بھادری' بیٹا بہو نے ہر جاما تھا ٹیکا' سیس نوایا' مگر ان کے ستارے یکجا نہ ہو سکے۔

کہتے ہیں کہ دولت' محنت اور حکمت ناممکنات کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ بس ذرا تدبیر اور عقل کی ضرورت پڑتی ہے۔ کسی مہان پنڈت نے خوب راہ نکالی' اگر کنیا کا لگن پہلے کسی اور سے ہو...... بعد طلاق لے کر پھر بیاہ کرے تو پھر روٹھے ستاروں کا ملاپ ممکن ہے اور شبھ شگن بھی رہے گا...... اَب نیا سوال کھڑا ہو گیا کہ اس خوبصورت پری کے لیے ایسا شریف شوہر کہاں تلاش کریں جو شادی تو باقاعدہ اگن منڈپ پہ پھیروں کے ساتھ کرے مگر پتنی کو چھوئے بغیر' اگلے لمحے طلاق تھما دے' دیہاڑی وصول کرے اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو جائے مگر اس دور میں ایسا بھلا مانس سا شوہر کہاں سے ملتا؟

تلاش بسیار کے بعد ایک رضا کار ملا جس نے کمال فیاضی سے اپنی خدمات' اس شرط پہ پیش کیں کہ وہ اس کارِ خیر کے لیے کوئی معاوضہ تو قبول نہیں کرے گا لیکن شادی کر کے پتنی کو نہ چھونا' انتہائی بے غیرتی سمجھتا ہے البتہ بیاہ کی اگلی صبح خود بخود طلاق دے گا۔ اس خدشہ کے پیشِ نظر کہ نام نہاد رضا کار پتی شوہر' لگن کے بعد معاہدہ سے مُکر بھی سکتا ہے یا قانونی جنگ شروع کر سکتا ہے۔ یہ پروگرام ہی منسوخ کر دیا۔

پنڈتوں کو کوئی ایسی محفوظ ترکیب ڈھونڈنے کے لیے کہا گیا جس میں کوئی وقتی خاوند' اپنے خاوندانہ حقوق کو جارحانہ طور پہ استعمال نہ کر سکے۔ تلاش کرنے والوں کو تو بھگوان بھی مل جاتا ہے کوئی زبان نہیں مل سکتا تھا؟ کمال کی سو فیصد محفوظ ترکیب سامنے آئی کہ کنیا کا کسی شریف' معصوم سے پیڑ کے ساتھ لگن کر دیا جائے' چنانچہ ایک بھلے سے پیڑ کے نیچے اگنی منڈپ بنایا گیا' پنڈت بیٹھے...... پیڑ کے گرد اکیلی کنیا کے سات چکر لگوا کر کنیا دان کر دیا گیا۔

ارمانوں بھری رات پیڑ کے ساتھ بسر کر کے اگلی صبح ہی صبح کنیا تو اپنے میکے چلی آئی۔ پھر مناسب وقت میں اپنے نئے سسرال چلی آئی۔"

افریقہ اور نیپال میں کئی قبیلے ایسے ہیں جہاں لڑکیاں پہلے کسی جانور درخت' پتھر یا ندی نالے دریا سے شادی کا بندھن باندھتی ہیں۔ پھر اک مخصوص وقت گزارنے کے بعد کسی مرد سے شادی کرتی ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح اُن کے اندر حلول بلائیں اور دیگر شیطانی شر شرار اصل خاوند تک پہنچ نہیں پاتے۔

پاکستان میں بھی ایسی قبیح رسومات موجود ہیں۔ خوبصورت اکلوتی بیٹیوں کو بچانے کی خاطر بچپن سے ہی اُن کا بیاہ کسی غیر انسانی ہستی سے کر دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک سے نکاح تو بہت ہوتے تھے۔ کسی معصوم کو کسی مرحوم بزرگ کی رُوح سے بطور بیوی منسلک کر دیا جاتا ہے۔

مَیں نے ایک دُور دراز علاقہ میں ایک پانچ برس کی بچی کو دیکھا۔ جو اپنے شوہر کے پاس رہ رہی تھی۔ اُس کا شوہر ایک مینڈھا تھا۔ تھائی لینڈ میں کچھ قبائل اپنی پہلی بچی کو پیدا ہوتے ہی کسی ہاتھی کی بیوی بنا دیتے ہیں جو ساری زندگی اُس کی خدمت میں رہتی ہے۔ سانپوں' پنچھی واسیوں' کوچیوں ٹکڑوں میں بھی کچھ گوتیں ایسی ہیں۔ جو اپنی اولاد میں بچے بچی کی شادی پیدائش کے وقت ہی کسی بندر ریچھ یا بکرے کتے کُتی سے کر دیتے ہیں۔"

ناگپور سے خاصا دُور پچھم اوڑ ندی کنارے سانپوں کا ایک سیکڑوں برس پرانا مندر دیکھا۔ ہزاروں سانپ اِدھر اُدھر پڑے رہتے ہیں۔ یاتری اُن کی دودھ مٹھائیوں سے تواضع کرتے ہیں...... لیکن کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں سنا کہ اِدھر سانپوں نے کسی کو کاٹا ہو۔ بچے بالے اُن سے کھیلتے رہتے ہیں۔ یہاں عقیدتمند ایسی بالک بچیوں کو دان کرتے ہیں جنہیں سانپ نے کاٹا ہو یا جو کنیا سانپوں سے دلچسپی لیتی ہو۔ یہاں ناگ دیوتا کا بہت بڑا بت ہے۔ جس سے حقیقی سانپ لپٹے رہتے ہیں۔

ایک کہنہ سالہ پنڈتائین اِدھر مہان پجارن...... جو ایک بڑا اژدہا قسم سیاہ شیش ناگ اپنے گرد لپیٹے پڑی رہتی۔ بتایا گیا بچپن میں اس کا بیاہ ناگ کے ساتھ ہو گیا تھا۔ یہ خوفناک ناگ اس کا پتی دیو ہے' دونوں پچھلے نوے برس سے اک دُوجے کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سانولی سلونی سی داسیاں جو دیکھنے سے ہی ناگنیں لگتی ہیں اپنے اپنے ناتھ ناگوں کے ساتھ چہلیں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے پتی ناگ ان کے نیم برہنہ جسموں سے لپٹے رہتے ہیں۔ یہاں جدھر دیکھیں چھوٹے بڑے سانپ سرسراتے دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے وشواس ہے یہ تمام اسی بوڑھی پجارن مائی اور آگے اِن داسیوں کے پریوار ہوں گے۔ ایک سی رنگ رنگت' ناک منہ ماتھا' ایک ہی نقشہ...... آپ انہیں ماوے اور میوے بھرا دودھ پلاتے ہیں تو وہ بھی آپ

سے اپنا ڈولار بکھارتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ایسے چھوٹے معصوم بے ضرر سے کہ کئی یاتری انھیں ڈول ڈبے میں ڈالے اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔

میں کئی روز اِدھر پڑا رہا۔ صبح سویرے پوجا کے وہاں پہنچ جاتا۔ دودھ' مٹھاس' مٹھائی کا دونا تھامے' اپنے مخصوص استھان پہ بیٹھ جاتا۔ ایک کیوٹ بالک سا سانپ' مجھے دیکھتے ہی کہیں سے نکل آتا۔ بڑے پیار سے میرے ہاتھوں' پرشاد سویکار کرتا بعداً مجھ سے لپٹ جاتا...... کئی بار اُس نے میرا پُنہا لینے کی کوشش بھی کی...... مجھے شک گزرا' یہ کوئی ناگ نہیں' دل پھینک قسم کی نوعمر ناگن ہے جو ایسے التفات کا اظہار کر رہی تھی۔ میں بھاگ آیا تھا۔''

ناگ پور اور نینی تال کے درمیان' کالے کوسوں کا فاصلہ ہے۔ پہاڑ' ندی نالے دریا میدان وغیرہ۔ وہاں سے یہاں تک اگر ایک سیدھا خط کھینچ کر بیلی کاپٹر کے ذریعہ محض فضا میں سفر کیا جائے تو ناممکن ہے کوئی جاندار اتنی سرعت اور حفاظت سے پہنچ سکے۔ سنا تھا کہ سانپ بلّی کتا کبوتر کوا وغیرہ اپنے نہ سمجھ میں آنے والے قدرتی نظام کی بدولت اپنی منزل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ چاہے اُن کی منزل کیسی بھی کٹھن اور دور دراز کیوں نہ ہو اُن کے لیے کوئی دشواری نہیں ہوتی......!

میں دو روز کے بعد' تھکا ٹوٹا' اپنے پہاڑی مستقر پہ واپس پہنچا تھا...... اِدھر موسم سرد تھا۔ چونکہ میں نے اپنے چوکیدار کو بذریعہ ٹیلیفون اپنے پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے ہٹ کو گرم رکھنے کی اور کھانا تیار کرنے کی تلقین کر دی تھی۔ اس لیے پہنچتے ہی مجھے انتہائی تسکین اور گرم جوشی کا احساس ہوا۔ کمرا گرم اور بستر نرم! کئی روز سے نہانا موقوف تھا' چنانچہ سفری تھیلا پھینکتے ہی سیدھا غسل خانے گھس گیا۔ خوب نہایا دھویا۔ لباس تبدیل کر کے میں چوکیدار کے کوارٹر میں گرم گرم چپاتیوں اور آلو شوربے کا لطف لے رہا تھا' پیٹ بھر کر کھایا۔ قہوہ کا کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

کئی دنوں کی ڈاک جمع تھی...... چند ہی خط دیکھے ہوں گے کہ منظور میاں چوکیدار قہوہ لے کر آ گیا۔ تھکاوٹ' کھانے کا خمار اور کیف آور قہوہ کے سرور نے سرِشام ہی آنکھوں کے پپوٹے بھاری کرنا شروع دیئے۔ میں بید کی آرام کرسی سے اُٹھ کر لیٹنے کی خاطر اپنے پلنگ پہ آ گیا۔ گرم پانی کی بوتل بنانے کی غرض سے لحاف کا کونا اُٹھایا تو مارے خوف وحیرت' میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی...... وہی ناگن' جسے دو روز پہلے اُدھر ناگپور کے مندر میں دودھ مٹھائی کھلاتا پلاتا تھا میرے بستر پہ سکون سے لمبی لیٹی تھی جیسے وہ میرے انتظار میں ہو۔ میں ایک دو قدم پیچھے ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر گھبرائی نہ اُٹھ کر بھاگی...... بلکہ نہایت رسانی سے اٹکھیلی توڑتی ہوئی اک بانکی ادا سے گردن اُٹھائے پھن لہرانے لگی۔''

اُس مندر کے سانپوں کی ایک خاص پہچان یہ بھی تھی کہ اُن کے ماتھے پہ عین درمیان اک گول سا اُبھار تھا جیسے چپٹا سا سینگ یا بالوں کا گچھا سا ہو۔ یہ نشانی نہ ہوتی تو شاید میں اُسے کوئی عام سا سانپ سمجھتا جو اکثر بیشتر گھر گوداموں میں موسم بے موسم نکل آتے ہیں۔ پھر اُس کی اَدائیں اور انداز' کیونکر بھول سکتا تھا؟

اَب اگلی بات جو سمجھ وفہم سے بالا تھی کہ مجھ سے پہلے یہ ناگن یہاں تک کیسے پہنچی؟ اُڑن سانپ تو تھا نہیں جو پرواز کر کے یہاں پہنچ جاتا...... یہ بھی کہ اسے میرے ٹھور ٹھکانے کا علم کیسے ہوا؟ نینی تال کے مضافاتی پہاڑ...... دُور ایک چھوٹی سی نیلے پانیوں کی جھیل کنارے صنوبر کے پرانے درختوں کے بیچ لکڑی کے ہٹ تک رسائی' کچھ ایسی آسان نہ تھی۔ یہاں تو ڈاکیا بھی ہفتہ بعد آتا تھا۔ ناگپور سے ایک نادان سی ناگن کا اِدھر' مجھ سے پہنچ کر میرے بستر پہ استراحت کرنا میری سمجھ نہ آیا۔ بستر کے لحاف میں ایک اُبھار ضرور دکھائی دیا تھا جسے میں گرم پانی کی بوتل سمجھا تھا۔''

چوکیدار تولہ رام کو بلایا...... اُس کے پہنچنے سے پیشتر ہی وہ سیاہ ناگن اک اَدائے دلبری سے سرکتے سرکتے نیچے فرش پہ اُتری اور میرے پاؤں پہ سر رکھ دیا۔ تولہ رام کمرے میں آیا تو حسبِ عادت ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا یقیناً اُس نے نیچے فرش کی جانب نہیں دیکھا ہوگا ورنہ وہ یوں چپ کھڑا نہ رہتا۔ میں نے اُسے کٹورے میں دودھ لانے کے لیے کہا۔ وہیں سے کوئی جواب دیے بغیر وہ اپنے کوارٹر کی جانب چلا گیا۔''

متھرا کے پیڑے بڑے مشہور ہیں۔ دوسرا اہم استھان' بڑی دیوی کا مندر اور دیگر بہت سی جگہیں۔ دیوی استھان کچھ قریب ایک قدیمی جامع مسجد ہے۔ کبھی اس میں نمازیوں کی رونق رہتی ہوگی' خدا کا گھر بھی جاتی ہوگی مگر اَب اس کا خدا ہی حافظ تھا۔ نہ نمازیوں کے جمگھٹے' خق نخو اور نہ وہ رونق و اِنصرام' بلکہ اک عجیب سی اُداسی اور نوحہ گری اِدھر دکھائی دیتی ہے۔ میں متھرا' آگرہ جاؤں تو اِس'' بزرگ مسجد'' میں نماز کے لیے ضرور جاتا ہوں۔ اِس کے خستہ حالت' دَر و دیوار' جابجا اُکھڑا پلستر' جھکی ہوئی اینٹیں اور بیلیں دیکھ کر رونا آتا ہے۔ رنگ و روغن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حشرات الاَرض نے یہاں ڈیرے جما رکھے ہیں۔ چمگادڑوں اور دیگر پرندوں کی غلاظت جابجا پڑی دکھائی دیتی ہے۔

متھرا' ہندوؤں کا ایک بہت اہم شہر ہے۔ مندر' دھرم شالے جگہ جگہ ہیں۔ مگر ایک غار کے اندر دیوی کا استھان بڑی دھارمک منگلا کا حامل ہے۔ جس کے درشن کے لیے لاکھوں ہندو دُنیا بھر سے اِدھر پہنچتے ہیں۔ متھرا میں مسلمان بہت کم ہیں جو مکمل آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی تقاضے پورے کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ کچھ انتہا پسندوں کو اپنے مندر کے قریب اِس مسجد کا وجود بھی شاید پسند نہیں...... اِسی بناء پہ آئے دِن کوئی نہ کوئی کشیدگی کا سامان پیدا ہوتا رہتا ہے۔''

میرے اپنے طور طریق کچھ اس طرح کے ہیں کہ میں مذہب مسلک کو قطعی انسان کی ذاتی پسند یا ضرورت اور دلچسپی سمجھتا ہوں...... اور یہ بھی میرے ایمان کا حصہ ہے کہ بشر' کسی بھی مذہب مسلک فرقہ سے ہو۔ اگر اُسے اپنی ذات کا گیان ہے تو وہ اپنے مالک و خالق کو جانتا اور مانتا ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کا اظہار یا اقرار و انکار' کس انداز اور زاویہ فکر سے کرتا ہے؟

مجھے دیگر مذاہب میں بہت سی ایسی خوبیاں نظر آ ئیں جنہیں اپنا کر بہت کچھ سیکھا۔ کسی غیر مذہب کے پیروکاروں کو اُن کے انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اُنہیں اپنی عبادت گاہوں میں داخل ہونے سے روکنا چاہئے۔ میں گرودواروں' کلیساؤں' مندر معبدوں میں اکثر جاتا رہتا ہوں۔ مجھے آج تک کسی نے اندر داخل ہونے سے نہیں روکا۔ جبکہ میرے حال حلیہ' داڑھی لباس اور نشست و برخاست صاف صاف میرے مسلمان ہونے کی چغلی کھاتے ہیں۔ میں کسی مذہب' مسلک' فرقہ کے مقلدین' اِن کی رسومات ورَوایات' عبادت گاہوں سے ایسی مغائرت نہیں رکھ سکتا جو مجھے تنگ نظر' بے وسعت اور تعصب سے لتھڑا ہُوا' اک نام نہاد انسان یا مسلمان ثابت کرنے کا جواز بنے۔ انسان تو انسان' میں تو کسی معمولی گندے بُرے جانور سے بھی نفرت یا ناپسندیدگی کا تصور نہیں کر سکتا اور ڈر خوف بھی بہت دُور کی بات ٹھہری کہ یہ بھی کج علمی' بے یقینی بداعمالی اور رُوحانی رُوئیدگی سے محرومی کی بناء پہ انسانی لاشعور میں خیالی دُھوئیں دُھندلاہٹ کی مانند اُبھرتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔''

تو لہ رام' کٹورا لیے' دُودھ لیے حیران سا مگر خاموش کھڑا تھا۔ نیم تلچھے میں' میرے پاؤں کے پاس شاید اُس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ کٹورا لیتے ہوئے میں نے اُسے ہاتھ کے اشارہ سے جانے کی اجازت دی۔ وہیں پاؤں پہ اکڑوں بیٹھتے ہوئے' کٹورا اُس کے آگے دھر دیا۔ سانپ کے لفظ' تصور اور وُجود میں سریت ہوتی ہے۔ حیوانِ ناطق ہو یا حیوانِ مُطلق' اِس کو دیکھتے ہی خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ مگر میرا سارا ڈر خوف تو بچپن میں' میری مرشد چاچی نے نکال دیا ہُوا تھا۔ کہیں بے خودی میں چاچی کو چُوم لیا تھا اور وہیں اک خوبصورت کالے سانپ نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ چاچی نے بڑی آہستگی سے سانپ کو پَرے ہٹا دیا۔ تب سے سانپ' میرے لیے بہت بے ضرر تھے۔ زندگی میں کئی بار سانپوں اژدھوں سے واسطہ پڑا مگر کبھی بھی کسی نے زک نہیں پہنچایا۔

جنوں کی طرح چونکہ سانپ بھی نُور کی ایک قسم آتشِ سرئی سے تخلیق ہوئے۔ اِس لیے جہاں جدھر سریت ہو گی۔ خوف و خفیت بھی وہاں موجود ہو گی۔ ملائکہ' قدسیوں' جنات' رجال فلکی کے بعد سانپ ہی واحد حشراتِ اَرضی ہے۔ جس میں ارضی و فلکی سریت موجود ہے۔

جنت میں داخلہ اور موجودگی' اس کی ایک واضح دلیل ہے۔ یہ اپنی بدنی فطری' ہیئتی نادرانیت اور سمیت طلسمیت کی بناء پہ دیگر مخلوقات میں بہت نمایاں ہے۔ ایسی ہی کچھ خصوصیات چگادڑ' اُلّو' کوّے' کتے' بلی' گھوڑے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان سے ہٹ کر دوراور آفاقی پرندے اَبابیل اور ہُد ہُد بھی ہیں۔ نورانیدائی قسم یہ پرندے' اللہ اور اُس کے برگزیدہ پیغمبروں رسولوں کے درباری سرکاری اور عسکری پرندے ہیں۔

بات سانپ کی ہو رہی تھی جو اَب گردن ڈالے کٹورے سے دودھ پی رہا تھا۔ میری نظر میں دُنیا کا بہترین منظر' کسی نومولود بچّے کا اپنی ماں کی چھاتی سے دُودھ چسکنا ہو سکتا ہے۔ میں نصف صدی پہلے دیکھی ہوئی ایک پینٹنگ آج تک اپنی نگاہوں سے ہٹا نہیں سکا۔

میکسیکو کی ایک آرٹ گیلری کے توسّط سے کچھ فاضل' غیر اہم' مشکوک قسم کی پرانی پینٹنگز کی نیلامی کا اہتمام تھا۔ ہفتہ وار تعطیل بھی تھی...... رش کچھ زیادہ ہی تھا۔ عجیب وغریب تصاویر...... لگتا تھا کہ ان کے تخلیق کار یا تو سٹھیائے ہوئے ہوں گے یا پھر منشیات کے عادی' جنسی مریض اور یا پھر ظاہری باطنی بصارت سے محروم...... کینوس' گھوڑوں بیلوں اور دیگر جانوروں کی پوستوں پہ نئے پرانے کپڑے کاغذوں پہ بنی ہوئی پینٹنگز...... جیسے کسی پاگل خانے کی آرٹ کلاس سے سارا کاٹھ کباڑ اکٹھا کر کے یہاں آگ لگانے کی خاطر لا دھرا ہو۔''

قصہ کوتاہ کہ میرے سمیت سیکڑوں اور بھی پاگل' آرٹ لَوور اِدھر موجود تھے۔ میں بھی اُکتایا سا ایک کونے میں کھڑا' اس کاٹھ کباڑ کی نیلامی اُٹھنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ عجب حال! کہ ایک ایسی تصویر' جس کا کوئی سر پیر' سیدھا نہ ہوتا...... کچھ سمجھ نہ آتا کوئی انسان ہے جانور دریائی مخلوق یا سبزی ترکاری...... سیکڑوں ہزاروں میں بولی ختم ہوتی...... اور جو قدرے سمجھ عقل میں آتی وہ دو چار ڈالروں سینٹوں میں نکل جاتی۔''

سچ کہتے ہیں کہ یہ آرٹ کی دُنیا' نہ سمجھ میں آنے والی دُنیا ہے۔ سمجھ میں آ جائے تو وہ آرٹ نہیں ہوتا...... دیہاتی کنجڑے کے تکارے کا بَدّ بات ہوتا ہے۔ میں اُدھر اپنے میزبان کے ہمراہ کچھ لینے نہیں گیا تھا۔ بس ذرا تماشا دیکھنا مقصود تھا۔ اسی دیکھا دیکھی میں ایک ایسی پینٹنگ دیکھی...... جسے آج تک میں بھول نہیں سکا۔ یہ نہیں کہ کسی نامور پینٹر کے آرٹ کا کوئی نادر نمونہ یا قیمتی اعتبار سے کوئی یگانۂ روزگار شہکار تھی؟ لیکن یہ موضوعاتی اعتبار سے ایک فن پارہ ضرور تھی۔ لگتا تھا کسی نوآموز دیہاتی قسم' آرٹ کے طالبعلم نے علیحدہ سا کام دکھانے کی کوشش کی ہے۔''

منظر کچھ یوں تھا۔ ایک چتکبری سی بکری' ایک پگڈنڈی پہ نیم دراز ہے۔ کچھ پیچھے اُس کا ننھا سا بکروٹہ' حسرت بھری نظروں سے اِدھر دیکھ رہا ہے جدھر ایک کالا سانپ' اُس کی ماں کی پچھلی ٹانگوں کو جکڑے' اُس کے دُودھ سے لبالب تھن پہ منہ دَھرے مزے سے دُودھ چُسک رہا ہے۔ دس ڈالر سے بولی شروع ہوئی۔

بولی والا بوڑھا تصویر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ زاویے بدل بدل کر کسی عقل کے اندھے کو پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگوں میں کھسر پھسر جاری تھی لیکن لگتا تھا کہ یہ تصویر کسی کو پسند نہیں آئی کہ تیرہ ڈالر پانچ سینٹ پہ پہنچ کر بولی رُک گئی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میرے میزبان نے بیس ڈالر کے عوض یہ پینٹنگ حاصل کر لی۔ بعد میں اُس نے بتایا کہ میں نے یونہی کھجلانے کی خاطر ہاتھ سر پہ رکھا تو انہوں نے فوراً بولی میرے نام ختم کر دی۔"

بے ڈھنگے فریم اور میلے کینوس والی یہ پینٹنگ ہم گھر لے آئے۔ بیس ڈالر پانچ سینٹ بمع چار ڈالر سرچارج...... میرا دوست 'اس فضول خرچی' جو میری آرٹ سے دلچسپی اور اُس کے سر تک ہاتھ لے جانے والی حماقت سے ضائع ہوئے تھے خاصا جز بز تھا۔ اگر کسی لڑکی وڑکی وغیرہ کی کوئی تصویر ہوتی تو شاید اُس کو ان ڈالروں کے اس بہیمانہ قتل پہ کوئی ایسا افسوس نہ ہوتا۔ اُس نے یہ تصویر 'حاتم طائی کی قبر پہ لات مارتے ہوئے' مجھے گفٹ کر دی۔"

اگلے روز جب وہ دفتر چلا گیا تو میں پینٹنگ سامنے دھر کر بیٹھ گیا۔ پہلے سرسری نظر سے دیکھا کچھ خاص بات دکھائی نہ دی...... 'جُز' وہی بُز اور بچہ' دُودھ چُسکتا ہوا مار سیاہ......!

تصویر ہو یا چہرہ' منظر ہو یا منزل' قریب سے کچھ دکھائی دیتے ہیں اور دُور سے کچھ اور؟...... میں نے اُسے اَب کچھ فاصلہ پہ رکھ کر' کسی اور اینگل سے دیکھنا شروع کیا۔ میرے خدا! بکری کے چہرہ پہ ایک ایسی شفاف طمانیت کھلی ہوئی نظر آئی جس میں ایسی اَبدیت' آمیز تھی جیسی نروان حاصل ہونے پہ بدھا رتھ کے مکھڑے پہ دَر آئی ہوگی اور ذرا پرے دُور بز بچہ! ایک ایسی کیفیت کی تصویر بنا کھڑا تھا جو حقدار ہوتے ہوئے بھی اپنا حق' کسی دوسرے غاصب جابر کو بصد مجبوری و معذوری دینے پہ آمادہ ہو جائے۔

## ● ڈال کا چُوکا بندر اور بانس کا چُوکا نٹ کبھی نہیں سنبھلتا......!

کوئی بدنصیب عورت کسی جنگلی ریچھ کے ہتھے چڑھ جائے...... کوئی بچی بچی دو چار برس سائیکل چلا لے...... کوئی نوجوان لڑکی ڈیڑھ دو برس' گھوڑے یا شتر کی ننگی پیٹھ پہ سواری کر لے وہ پھر کسی مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی کا صحیح لطف حاصل کرنے کی اہل نہیں رہتی اور دُودھیل جانور (بشمول عورت) کا پستان' سانپ سونگھ لے یا منہ رکھ کر دُودھ چُسک لے تو وہ جانور یا عورت' پھر اپنے بچوں کو دُودھ پلانے میں وہ فرحت و طمانیت حاصل نہیں کر پاتے اور اُن کی دودھ دھارا میں ڈھکیل پڑ جاتی ہے۔ اُس کی بس میں پس شامل ہو جاتی ہے۔

سانپ کے تیز ننھے نوکیلے دانت' اُوپر زہر بھری غدودوں میں چڑھ جاتے ہیں۔ منہ پوپلا کر کے' کچھ ایسے انداز میں اپنی دوشاخہ زبان سے پستان کے گرد گدگدی کرتا ہے کہ رگ وپے سے لہو' دودھ کی شکل میں تبدیل ہو کر چشمے کی مانند پھوٹ پڑتا ہے۔

دودھ پینے کے یہ لمحات' سانپ اور جانور یا عورت دونوں کے لیے ایسے نشاط بیز اور پُرکیف ہوتے ہیں کہ گردوپیش سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ سرور اور خمار میں مست' انہیں ایک دوجے کی کچھ خبر نہیں رہتی۔ یہ نشیلی سی کیفیت' فراغت کے بعد بھی بہت دیر تک قائم رہتی۔ سانپ کا منہ دھرا ہوا پستان' بہت بعد تک سُرخ اور تنا ہوا رہتا ہے اور دوسرے تھنوں سے الگ سا نظر آتا ہے۔

سوال ہوتا ہے کہ جانور تو خیر جانور ہے سانپ تو تھن پہ منہ دھرنے کی اطلاع نہیں کرسکتا مگر عورت تو جان سکتی ہے کسی کو مدد کے لیے پکار سکتی ہے۔ بچہ' اُس کے پہلو میں ہوتا ہے پھر سانپ' کیونکر اُس کی چھاتیوں تک پہنچ جاتا ہے اور دودھ پی جاتا ہے۔ پہلے بھی اُوپر کہیں لکھ چکا ہوں کہ سانپ' اپنی جسمانی ہیئت میں تبدیلی پیدا کرنے پہ قادر ہوتا ہے۔ اُس میں طلسماتی سریت ہوتی ہے۔ اُس کی شش کار اور آنکھوں میں' مقابل کو مسخر کر دینے والی قوت ہوتی ہے۔ وہ جانور یا عورت کے قریب پہنچ کر سب سے پہلے اُس کی ظاہری حسیات' سماعت' نطق' اعصابی حرکت اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت سلب کرتا ہے۔ اپنی کارروائی ڈالنے سے پیشتر اپنے شکار کو مکمل طور پہ مسحور کر دیتا ہے جیسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا ہو۔ جس عورت کے تھن پہ سانپ نے منہ دھر دیا ہو وہ اُس تھن سے کسی بچے کو دودھ پلانے کے قابل نہیں رہتی اور نہ کوئی بچہ پیتا ہے ایسا تھن ہر وقت دودھ سے لبالب رہتا ہے یہاں اک پُرلطف بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ایسی عورت کو کبھی کم ہی احساس ہوتا ہے کہ اس کا دودھ سانپ پی جاتا ہے؟

میں نے اپنی کسی کتاب میں وش کنیا کا ذکر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ قدیم ہندوستان میں ٹھگوں کے مخصوص قبیلے ایسی وش کنیائیں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے خصوصی طور پہ تیار کرتے تھے۔ حاملہ عورت کو سانپ کا زہر' بڑی قلیل مقدار میں خوراک کے ساتھ دیتے رہتے' اُس کا بستر' لباس اور دیگر اوڑھنا بچھونا' سانپوں کی کینچلیوں سے اٹا رہتا۔ آس پاس' چھوٹی بڑی پالتو ناگنیں رینگتی رہتیں۔ اُن کے ہاں ایسے صدری نوسخے تھے کہ زچہ' مادہ بچہ ہی جنم دیتی۔ یہ مخصوص بچیاں اِنتہائی خوبصورت' نرم و نازک ہوتیں...... ناگنوں سی لچک و لپک' تیز و تندی اور آنکھوں میں اِک ساحرانہ سی چمک۔ دودھ کا پہلا گھونٹ' کسی ناگن کا ہوتا اُس کے منہ بٹانے پہ باقیماندہ دودھ' نومولود کو پلایا جاتا۔ انہی سانپوں کے درمیان لٹایا بٹھایا جاتا۔ اسی اہتمام' میں یہ لڑکیاں عنفوان شباب تک پہنچتیں۔ عورت کے رُوپ میں خوبصورت مگر خطرناک ناگنیں!

---

یہ خُنک قبیلے ان زہریلی ناگنوں کے ذریعے امیر کبیر عیاش لوگوں کو پھانستے۔ ایک مخصوص عرصہ یہ اُن کے ہاں رہتیں' اس دوران اپنے میٹھے زہر کو نامحسوس انداز میں ان کے رگ و پے میں منتقل کر کے کیفرِ کردار تک پہنچا تیں۔"

کہتے ہیں کہ سانپ اور چور کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔ ان کا نام سنتے ہی کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے اسی وجہ سے تولہ رام کو سانپ کی موجودگی کے بارے نہیں بتایا تھا۔ ناگن نے بڑے اطمینان سے دودھ پیا...... اظہارِ ممنونیت میں دو چار بار زبان نکالی' میری جانب دیکھا اور پاؤں پہ سے ہوتی ہوئی میری گردن تک پہنچ گئی۔ گردن کرد لپٹا لگا کر بائیں شانے پہ پھن پھیلائے کھڑی ہوگئی۔ آپ نے کرشن جی مہاراج کی مورتی یا تصویر دیکھی ہوگی...... اُن کے بازوؤں اور گردن پہ ناگ لپٹے دیکھے ہوں گے؟

سانپوں کی بے شمار اقسام ہیں' جنہیں بیان کرنے کے لیے پوری ایک کتاب چاہیے۔ مگر مجھے سرِدست صرف ناگوں کی ایک خاص قسم کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ سانپ اور ناگ میں ایک نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ عام سانپ محض رینگ سکتا ہے' ناگ کی مانند کھڑا نہیں ہوسکتا ہے۔ ایسے سانپ' زیادہ تر بے ضرر' ڈرپوک' بدرنگے' بدوضع ہوتے ہیں۔ درختوں' دریاؤں' جھیلوں' جوہڑوں' گھروں کی پرانی دیواروں' چھتوں' مویشیوں کے باڑوں میں رہتے ہیں۔ پرندوں کے انڈے بچے' جانوروں کا دودھ' چوہے چھپکلیاں' مینڈک' ان کی خوراک! جبکہ یہ خود چیلوں' نیولوں' شکروں کا من بھاتا کھاجا ہوتے ہیں۔ بچوں اور کتوں سے بھی ان کی دشمنداری! یہ برہمنوں کے آگے شودروں کی مانند ہوتے ہیں...... کمتر' رذیل اور احساسِ کمتری میں مبتلا...... لیکن دہشت تو ان کی بھی ہوتی ہے۔

ناگ کی مثال شیر ببر کی سی ہوتی ہے۔ جسامت و قدامت میں یہ گرانڈیل بھی ہوتے ہیں...... سفید' سرخ' مٹیالے' کتھئی اور چھپار نگت بھی' لیکن ان میں مار سیاہ قسم' بڑی خوبصورت اور ماورائی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ دیگر سانپوں کی طرح ہر جگہ نہیں ہوتے بلکہ پرانے کھنڈروں' قدیمی مندروں' شکستہ قلعوں' زمین دوز کمین گاہوں' باؤلی' گوہوں مٹھوں کے علاوہ دشوار گزار جنگلوں اور متروک عبادت گاہوں میں پائے جاتے ہیں۔

ان کی اقسام میں شیش ناگ' پدم ناگ' جوت ناگ' شری ناگ' امبھا ناگ' تیری' اگن' ترشل' کیسری' چندن' پران اور اشٹی ناگ ہیں۔ ہندوؤں کے پرانوں اور دھارمک کتھاؤں' راسوں' سوانگوں میں ان کے کردار ملتے ہیں۔ ہزاروں برس پرانے دیوتاؤں کے مجسموں کے ساتھ یہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ دیومالائی بتوں کے ساتھ ناگ دیوتا کے کئی کئی سر دکھائی دیتے ہیں جبکہ دھڑ صرف ایک ہی نظر آتا ہے۔ ناگ دیوتا کے مندر' ہندوستان اور دیگر ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان مندروں مٹھوں میں پوتر قسم شری ناگ پائے

اعصاب کو کسی حد تک شل کر دیتے ہیں۔ اگر جلد اس کا مناسب علاج نہ کیا جائے تو مزید خرابی پیدا ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔

مزے کی بات کہ مریض کو اپنے مرض کی سنگینی کا قطعی احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے کہ اُسے کسی سانپ نے اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ ایسی عورت یا دُودھ والا جانور زہریلے ہو جاتے ہیں۔ عورت کو اپنا دُودھ بچے کو نہیں پلانا چاہیے اور نہ ہی ایسے جانور کا دُودھ بطور خوراک استعمال میں لانا چاہیے۔''

## ● کوئی مشل نہیں ڈھولن دی' چُپ کر مہر علی اے جا نہیں بولن دی......!

ہم گولڑہ شریف خانقاہ' چھوٹے شاہ صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مریدین اور مریض آ جا رہے تھے۔ پیر صاحب حسب حال اُن کے لیے دُعا برکت فرما رہے تھے...... تعویذات کا فیض بھی جاری تھا۔ ہم دو چار عقیدتمند قدموں میں بیٹھے خانقاہی نظام کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ گو ہمارا مقصد' پیر صاحب کی زیارت اور کچھ اُن کی بلند مرتبت شاعری سے مستفیض ہونا تھا اور یہی کچھ ہم کر رہے تھے۔ اَدبی گفتگو' چٹکلے' اشعار اور کچھ ملکی حالات پہ باتیں! پیر صاحب کا کمال کہ وہ قطار میں کھڑے مُریدین سے مصافحہ' حال احوال' گھریلو باتیں' دُعائیں اور تعویذات بھی دے رہے ہیں اور ہم مہمانوں سے بھی گفتگو جاری ہے۔ کھلا پلا بھی رہے ہیں اور ساتھ ساتھ وہاں کے نظام پہ بھی نظر رکھے ہوئے ہیں۔

اچانک میری نظر' عورتوں کی قطار میں کھڑی ایک خوبرو عورت پہ پڑی۔ یہ نہیں وہ کوئی علیحدہ سی عورت تھی' اِس طور کی بہت سی عورتیں وہاں اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس عورت کی چھب ڈھب' آنکھوں کی پُراسرار چمک' سر کے بالوں کے لہریے وغیرہ مجھے کچھ اور بتا رہے تھے۔ اپنا شک دُور کرنے کی غرض سے مَیں نے اپنا زاویہ نگاہ بدل کر اُسے گہری نظروں سے تولا...... میرا شک دُور ہو گیا۔

وہ آدم زادی تھی مگر کسی سانپ کے زیر اثر یعنی سانپ کی سریت اور سُم' اپنا آپ دکھا رہا تھا۔ جس طرح سانپ پالنے والے سپیروں کے جسموں میں خون تو ہوتا ہوگا مگر زہریلا...... چھوٹا موٹا سانپ سنپولیا' بھڑ' مکھی' بچھو' چھچھوندر وغیرہ اُن کے لیے بے ضرر ہوتے ہیں...... سانپ کے مخصُوص دانتوں میں ہی زہر نہیں بلکہ اس کے جسم' ہڈیوں' آنکھوں' کینچلی' اُس کے نام اور تصور و تصویر میں بھی کسی نہ کسی طور' سمیت اور سریت موجود ہوتی ہے' جس کا اِدراک' کسی خاص الخاص کو ہی ہوتا ہے۔

فوری بتا رہا تھا کہ مجھے شک ہے کہ اس پہ کسی ہوائی چیز کا سایہ ہے یا پھر میری بڑی بھابی نے جادو ٹونہ کروا دیا ہے کیونکہ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ پیر صاحب نے اس عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تمہاری بیوی ہے؟“

”ہاں جی! میری بیوی ہے اور میری بچی کی لڑکی بھی —— اس کو بھی دیکھیں! جب سے رجب میں پیدا ہوا ہے یہ بھی کچھ کھوئی کھوئی سی ہے۔ ہنستی بولتی بھی کم ہے۔ لگتا ہے کہ اس پہ بھی کسی نے کوئی وار کروا دیا ہے۔“

پیر صاحب نے ایک سرسری سی نظر سے عورت کو دیکھا۔ جو ارد گرد سے بے نیاز کسی اپنی دھن میں تھی۔

بچے کو دم اور تعویذ حاصل کرنے کے بعد وہ تینوں منظر سے ہٹ گئے۔ بچے کو میں نے میٹھی گولیاں دی تھیں۔ جنہیں وہ جیب میں ڈالے میری جانب دیکھتا دیکھتا والدین کے ساتھ لنگر خانے کی جانب بڑھ گیا تھا —— اس سے پہلے کہ کوئی اگلا مرید یا مریض آگے بڑھتا —— میں نے پیر صاحب سے پوچھ لیا۔

”شاہ جی! اس عورت اور بچے کو کیا واقعی کسی سایہ یا جادو ٹونے کے اثرات ہیں یا کوئی ذہنی جسمانی عارضہ؟“

شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”اپنے لوگوں سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ یہاں خاص طور پہ پہاڑی اور دیہاتیوں کی اکثریت چونکہ ناخواندہ لوگوں کی ہے۔ اس لیے ان میں پیر پرستی تو ہم پرستی —— جادو ٹونے، تعویذوں گنڈوں پہ یقین اعتقاد ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہم بھی ان کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ کسی ہسپتال، ڈاکٹر، سپیشلسٹ کے پاس جانے کی بجائے پیروں عاملوں کے ہاں جانا زیادہ بہتر گردانتے ہیں۔ اب اگر یہ بھروسہ کرکے ادھر آ ہی جاتے ہیں۔ تو ہم بھی انہیں دعا برکت یا کوئی مجرب نسخہ شفا دے دیتے ہیں۔ اللہ ہماری شرم اور ان کا بھرم قائم رکھنے والا ہے۔“

بات ان کی درست تھی۔ صدیوں کی مثبت تبدیلیوں، سائنسی ترقیوں اور علم و فکر کی آسودگیوں کے باوجود دنیا کے بیشتر خطوں میں ابھی تک علم و آگہی کی وہ تنویر نہیں پھوٹی جو توہمات، جاہلانہ سوچوں اور بیجا رسومات، رویوں کے اندھیروں سے معصوم انسان کو نجات دلا سکے!

پیر صاحب کے جواب سے شاید میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ معذرت پیش کرتے ہوئے پھر پوچھ لیا۔

”شاہ صاحب! آپ نے قطعی درست فرمایا —— میں اس خوبصورت [illegible] عورت کے بارے آپ کی تشخیص بارے جاننا چاہتا ہوں جو بظاہر ہنستی بالکل تندرست دکھائی دیتی۔ نہ تو اس سے آپ نے کچھ پوچھا اور نہ ہی وہ کچھ بولی۔ خالی خالی نظروں سے ہٹ ہٹ دیکھتی رہی —— لگتا تھا جیسے ذہنی یا روحانی طور پہ مضطرب

تھی ۔۔۔ اور اس کا اکلوتا، کمزور، بیمار پہلوٹی کا بچہ۔"

پیر صاحب نے حسبِ معمول نرم مسکراہٹ سے میری بات سن کر کہا:

"حضرت! یہاں پر تو کتنے ہی اس طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ وہی رحمت اللہ کا فیض بنا رہتا ہے۔ کسی سے چند کہنے سننے کا وقت مل جاتا ہے۔ نسخے پڑھ جائیں تو ان دکھیا لوگوں کی کہانیاں بھی ختم نہیں ہوتیں۔ یہ عورت بھی ان بے شمار عورتوں کی طرح کسی نہ کسی آزار میں مبتلا تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ عورتوں کے مرض کوئی عورت ہی زیادہ سمجھ سکتی ہے مردوں سے نسخے اتفاق نہیں ہوتے۔ میں نے تعویذ کے علاوہ نقش بھی دے دیا ہے۔ اللہ کرم کرے گا۔"

"مگر میرا تجزیہ اور مشاہدہ دیکھا اور کہتا ہے۔ اس عورت کو نہ تو کوئی جسمانی تکلیف اور ذہنی یا روحانی عارضہ ہے بلکہ یہ اپنے زمانے میں ایک ایسی پریشانی میں پھنس چکی ہے جو شادی کی منصب کے ساتھ پیش آتی ہے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ موذن نے نمازِ عصر کا اعلان کر دیا ۔۔۔ شاہ صاحب گفتگو موقوف کرتے ہوئے اندرونِ خانہ چلے گئے اور ہم لوگ بھی نماز کی تیاری میں لگ گئے۔

نماز کے بعد شاہ صاحب درس دیا کرتے یا پھر مخصوص مریدین کو شرفِ ملاقات بخشا کرتے تھے۔ کچھ دیر مزید گفتگو ہوئی مگر اس مریض عورت کے متعلق وہ بات ادھوری ہی رہی جو اذان سے پہلے شروع کی تھی۔ اب نہ تو اس کا محل تھا اور نہ مزہ ۔۔۔ لہٰذا ہم اجازت لے کر لنگر خانے کی جانب اٹھ آئے ۔۔۔ جس کے بعد ہماری لاہور واپسی طے تھی۔

گولڑہ شریف درگاہ کا لنگر بھی کمال کا ہوتا ہے۔ مٹی کے برتن، سرکنڈوں کی چنگیریں ۔۔۔ فرشی نشست اور ماحضر! ہم تینوں درویش بھی دوسرے زائرین کے ساتھ بیٹھ گئے۔ سبحان اللہ! ایک دراز ریش بزرگ نے ہمارے آگے چنگیر بھر کے موٹی روٹی کے ٹکڑے اور مٹی کی رکابیوں میں پتلی پتلی سی دال رکھ دی ۔۔۔ لگتا تھا جیسے کھاتے کھاتے کسی کے آگے سے اٹھا لی۔ روٹی کے کناروں کے بچے ہوئے ٹکڑے جو اکثر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ کبھی سوکھی سخت روٹی کے چھلکے ۔۔۔ بس یہی کچھ تھا جو ہمارے دوپہر کے کھانے کا سامان تھا۔

نفسِ مطمئنہ کی لاگ لگی ہوئی ہو تو پھر اندیشۂ سود و زیاں نہیں رہتا اور نہ کوئی چیز اچھی بری یا پسند ناپسند ہوتی ہے۔ اسی خشوع اور موج میں بھیگے ہوئے تو ہم ادھر پہنچے تھے۔

گولڑے کی سرزمین میں جو تصوف اور اخلاص کی مہک ہے اس کا اندازہ وہیں پہنچ کر ہی ہوتا ہے۔ انسان بھی پیڑوں پودوں کی طرح کبھی کبھی سوکھنے لگتا ہے۔ اس کی شادابی متاثر ہوتی ہے۔ برگ و بار کملانے لگتے ہیں ۔۔۔ اگر انہیں وقت پہ سیراب نہ کیا جائے وہ محض جلانے کا ایندھن بن کر رہ جاتے ہیں۔ انسان بھی

اس کے والدین میری یہ حرکت دیکھ اور غڑپ غڑپ کھا بھی رہے تھے۔ فراغت کے بعد فوجی اپنی مخمل چادر سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"سائیں جی اللہ آپ کا بھلا کرے ۔۔۔ یہ کاکا تو چند قطرے پانی بھی نہیں پیتا تھا! آپ کے ہاتھ سے پتا نہیں کیسے کھا گیا ہے!؟ آپ اس کے لیے اور اس کی ماں کے لیے دعا کریں۔ میں ملازم آدمی ہوں' کئی کئی مہینے گھر سے باہر رہنے پہ مجبور ہوتا ہوں۔ کبھی چھٹی پہ گھر آتا ہوں تو ان ماں بیٹے کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں۔"

اپنی خوبصورت بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مزید کہنے لگا۔

"ذرا اسے بھی دیکھیں۔ گم صم رہتی ہے پوچھ پوچھ کر تھک آ گیا ہوں ۔۔۔ اپنی کسی تکلیف بیماری بارے بات ہی نہیں کرتی۔ نماز قرآن اور تو یہ جاگ بھی کرتی رہتی ہے۔ ذرا دیکھیں اسے کوئی ہوائی اثر ہے یا کسی نے کوئی الا بلا کروا یا ہوا ہے ۔۔۔؟"

میں نے ایک بار بھرپور نگاہ سے اس خاتون کی جانب دیکھا جو اسی کمال بے نیازی کی کیفیت میں غرق تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے درخواست کی کہ آپ بری امام سرکار حاضری دے آئیں اور واپسی پہ مجھے ساتھ لے لیں۔"

دراصل اس معصوم بچے کی حالت' اپنے ساتھ اس کا انس دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ میں ان غریب دیہاتیوں کی کچھ مدد کروں۔ میں اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ ان کی دستگیری نہ ہوئی تو انجام کیا ہو سکتا ہے۔ کرم تو اللہ کرتا ہے مگر بظاہر وسیلہ کوئی اور ہوتا ہے۔ اسی طرح ہی یہ نظام ہستی چل رہا۔ انسان ان باریکیوں اور قدرت کی حکمتوں' مصلحتوں کو کما حقہ سمجھنے جاننے سے عاجز ہے۔

اسلام آباد سے لوٹنے کے تین چار روز بعد مجھے احساس ہوا کہ دراصل اللہ کریم نے مجھے اصل میں ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے لیے ہی گولڑہ شریف بھیجا تھا جبکہ ظاہری طور پہ یہی تھا کہ ہم تین دوست گولڑہ شریف' بری امام اور حضرت شریف سلام کے لیے پہنچے تھے ۔۔۔ دوستوں کو بری امام روانہ کر کے میں ان کے ساتھ اوپر صحن کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

میرے ساتھ ایک اُلجھن ہمیشہ سے رہی ہے۔ کہیں کھڑا ہوں تو آس پاس لوگ جمع ہونے شروع ہو جائیں گے۔ کہیں پبلک پلیس بازار' بس جہاز' کہیں بھی جیسے گند کے پاس مکھیاں مچھر کیڑے مکوڑوں کا اجتماع لگ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ یہ کسی بزرگی یا چہرے کے نور ظہوری کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ اس کا بڑا سبب میری موٹی موٹی تازہ روز کار انگوٹھیاں' گلے کی مالا میں شیاہ کالا لباس چادر اور عصا کے علاوہ میری سفید براق دراز ریش ۔۔۔ کانی کالیں اور میری مکاری والا کاری ۔۔۔!

ساتھ یوں لگ کر بیٹھ گیا۔ جیسے وہ مجھ سے ہو اور میں اس سے ۔۔۔۔ اس کی ماں تھوڑا سی تذبذب کی کیفیت میں دیوار کے ساتھ آدھ سرا لیے بیٹھی تھی' جیسے وہ بالکل خالی الذہن ہو۔ دریں وہ تنہا' شوہر اور ۔۔؟ اسے تو شاید یہ بھی احساس نہ تھا کہ وہ کس ذہنی ہیجان سے کسی شخص کے آستانے پہ بیٹھی ہے۔ اسے تو ادھر سے مانگنے کا ڈھنگ بھی نہ آتا ہوگا! اور یہ بھی نہ پتہ ہوگی کہ یہاں انہیں بھی نوازا جاتا ہے جو کچھ نہیں مانگتے ۔۔ لیکن جھولیاں بھر بھر کے جاتے ہیں۔ فوجی نے کھڑے کھڑے عاجزی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی۔

"سائیں جی' ڈیڑھ ڈیڑھ بیٹ آ گیا ہے۔ فوج میں سگریٹ پینے کی بری عادت پڑ گئی ہے۔ صرف پانچ دس منٹ کی اجازت دیں۔ واش روم جانے کی بھی جلدی ہے۔"

مجھ سے ہاں نہ کا کوئی جواب لیے بغیر' وہ سامنے بائیں جانب کی سیڑھیاں اتر گیا۔

میں فوجی کی جھرجھری پہ غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک اس عجیب و قریب معدوم سے بچے نے میرے بائیں ہاتھ کی تیسری انگشت پہ مس امری کی انگشتری میں آویزاں سنگ فیروزہ پہ اپنے لب رکھ دیے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شیر خوار بچہ اپنی ماں کے دودھ والے چھاتی پہ منہ رکھتا ہے۔ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اسے اور اس کی ماں کو دیکھا جو تھوڑی بہم تذبذب کی کیفیت میں فرحاں تھی کہ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کا بچہ کیا کر رہا ہے؟

اس کے سونے بازو کی خاندانی غیر موجودگی کو پورا کرنے کی خاطر میں نے بچے سے اپنی انگشتری چھڑوا کر اس کا نام پوچھ لیا۔ بچہ بڑبڑا کر پہلے تو میری طرف دیکھنے لگا پھر میرے سوال کے جواب میں بولا۔

"باؤ باؤ ۔۔۔!"

ایسے میں وہ عورت بولی۔ "سائیں جی! ہم پیار سے اسے باؤ بلاتے ہیں۔ اس کا نام قربان علی ہے۔ اس کے ابے کا نام قربان علی باجوہ ہے۔"

میں نے کئی بار اسے بولتے دیکھا۔ بچے سے ہٹ کر اب میں اس ادھیڑ عورت کو غور سے تکنے لگا۔ اس عورت کو پہلی نظر دیکھتے ہی میرے اندر کے کل کھڑکنے شروع ہو گئے تھے کہ یہ عورت کسی ماورائی ذہنی الجھن میں پھنسی ہوئی ہے۔ پھر جب مزید اس کی آنکھوں میں جھانکا اور ناک کی کھوڑی پہ غور کیا تو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ اس سے آگے جب اس بچے کی کیفیت سامنے آئی تو پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی۔

میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ عورتوں کی کئی ایک اقسام ہیں۔ جن کا تذکرہ ویدوں' اپنشدوں' شاستروں پرانوں میں ملتا ہے۔ ان کی دھارمک کتھاؤں گاتھاؤں میں ناری اور پرش کے انسانی' نفسیاتی' جذباتی اور جنسی رویوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ کہیں کہیں یہ اخلاقی حدوں کو پھلانگتی بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سماجی' اشتراکی' باہمی میل ملاپ کو بھروسا' تعلق' شانتی۔ درمیان لگاؤ' ملاؤ' توجہ' سلوک وغیرہ سے بنیادی

آگاہی کا اصل منبع بھی یہی لوگ ہیں۔ نظر اور منظر کے بیچ کا پردہ ہمارے ہاں ہے اُن کے ہاں نہیں۔

تریا ویدوں میں ناریوں کی اقسام بیان ہیں۔ گیانی یوگیوں کے ہاں ایسا ادراک ہوتا ہے کہ ماتھا، گلا، آنکھیں، سایہ یا اُن کے لمس سے اُن کی بابت آگاہی حاصل کر لیں۔ تریا ودیا سے مجھ کو بھی دلچسپی رہی۔ کبھی کبھی کوئی ایسی خاتون بھی دکھائی دے جاتی ہے جو پہلی نظر میں ہی اپنا پورا تعارف کرا دیتی ہے۔ ذہن میں رہے کہ ہر عورت ایسی نہیں ہوتی یہ مخصوص ہوتی ہیں۔ سیکڑوں ہزاروں میں کوئی ایسی الگ سی ہو۔ کوئی ارفع یا اسفل خصلت و طبائع کی حامل ہوتی ہے۔ یہ کچھ قدرت سے ہو یا پھر شامت اعمال، اتفاق یا مکافات نیت!“

اس بچے کی ماں ناری کی ایک خاص قسم سے تعلق رکھتی تھی جس میں نسائیت اور شہوانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اس کے جسمانی اجزائے ترکیبی میں ایک ایسا بیتابی مہک دار عنصر ہوتا ہے جو اس کے سراپے سے جنگلی کی مہک مانند پھوٹتا ہے۔ جو جنس مخالف کے علاوہ حیوانات اور حشرات ارضی اور غیر مرئی مخلوق کے لیے بے پناہ ہیجانی اور شہوانی کشش کا باعث بنتا ہے۔ ایسی ناری ”تن کوری“ کی طرح کہیں ہزاروں لاکھوں میں ایک ہوتی ہے۔ ان کی عمر بھی نہایت مختصر اور زندگی بہت کٹھن گزرتی ہے۔

مختصر ہونا لازم نہیں مگر یوں بھی نہیں کہ جینا دوبھر ہو جائے۔ ایسی عورت کو مرد بھی ایسے مل جاتے ہیں جو اُسی کے قبیلے سے ہوتے ہیں۔ اصل پریشانی تو اس سے شروع ہوتی کہ جب ایسی عورت کا پالا کسی غیر انسانی ہستی سے پڑ جاتا ہے۔

اس بچے کی ماں کا واسطہ ایک ذوالطفین قسم کے سانپ سے پڑ گیا تھا۔ یہ بڑا مکار، عیار اور بہروپیا سانپ ہوتا ہے۔ اس بات کو اس طرح سمجھیں کہ جس طرح کوئی شیر کسی بھی وجہ سے آدم خور ہو جاتا ہے۔ انسانی خون ایسا منہ لگتا ہے کہ اسے پھر جنگل کے کسی جانور کا گوشت اور خون اچھا نہیں لگتا۔ جیسے ہرن، جنگلی وغیرہ بے دھڑک آگے پیچھے مستیاں کرتے رہتے ہیں مگر ”حاجی صاحب“ اُن کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ آدم خور درندے عورت کا شکار کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کسی مرد، بچے یا بوڑھے پر اس وقت دانت تیز کرتے ہیں جب وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں۔

آدم خور شیر کو دو دو دن اپنے پسندیدہ شکار کے لیے بھوکا پیاسا انتظار میں گھات لگائے دیکھا۔ اسی طرح ریچھ، گوریلا اور تیندوا بھی ہیں۔ بد قسمتی سے کوئی شہوانی عورت ان کی نظر میں آ جائے تو پھر ممکن نہیں کہ وہ ان کی گرفت سے بچ نکلے۔“

کسی بدوان کے لیے ایسی ناری دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے شیش ناگ دیکھ لیا ہو جس کے جوڑے سر پہ سنہری بالوں کے سینگ نما گچھے کی جڑ میں نہ دکھائی دینے والا اَز و پارنگت پدم سارنگ بیٹھا ہوتا ہے۔"

ناریوں کی دیگر اقسام ایسی ہیں جنہیں بادی النظر دیکھنے سے تعارف نہیں ہوتا۔ کچھی اَنسویا' سولکھنی' تارنی' تاپسی' پرمدا' سنچاری' پروچیک اور گن وتی وغیرہ لیکن موہنی ناگ کنیا اور تن کوری چھپی نہیں رہتیں۔"

ایسی عورت میَں نے کوئی پہلی بار نہیں دیکھی تھی مگر کیا کہا جائے کہ جب بھی دیکھا۔ یہی کچھ ہُوا...... خواہ مخواہ کی بے چینی' اُلجھن اور آلکس سی...... اُس کی اصلیت جانتے ہی' میرے نتھنوں میں اس کی جبلی خوشبو سرایت کر گئی تھی۔ مرائش کے تمباکو اور برازیلین کافی کو کو کی مانند تلخ مہک آوزرگ و پے میں اُترتی ہوئی۔ ہلکی سی غنودگی' دُھواں اور دُھند...... میَں گراں باری محسوس کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھ آیا تھا۔ پُرسکون ہونے کی خاطر میَں نیم دراز ہو گیا۔"

دوپہر سے ذرا پہلے' میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دوپہر کے کھانے کا بُلاوا تھا۔ کچے ناریل کے دُودھ میں پکائے گئے چاول' میری پسندیدہ ڈش...... ذہن کسی سلیٹ کی طرح صاف تھا۔ نیند اور موت' طبیعت صاف کر دیتے ہیں۔ میَس میں داخل ہوتے ہی دیکھا' وہ خوبصورت بلاؤ ہیں پہ دھری آگرہ کی اگربتی کی مانند سُلگ رہی تھی۔ اُس کے حُسنِ جہاں سوز کی تمازت نے اِک جہنم دہکا رکھا تھا۔ پتا نہیں وہاں پہ موجود دوسرے لوگ بھی کچھ محسوس کرتے تھے یا یہ عذاب بھگتنے کے لیے صرف میَں ہی رہ گیا تھا؟

اُف تیرے حُسنِ جہاں سوز کی پُرسوز کشش
نُور سب چھین لیا چشمِ تماشائی کا

دوسری چیز جس نے شدت سے اپنا احساس دلایا' وہی پُراسراری مہک' مشامِ جان سے گزر کر ہڈیوں کے گودے میں اُترتی ہوئی۔ اتفاق یا مَیس کا انتظام ہی ایسا تھا مجھے وہی نشست ملی۔ جس پہ بیٹھ کر صبح ناشتہ کیا۔ کھانا سامنے تھا مگر دکھائی نہ دیتا تھا...... وہ رُوبرو نہیں تھی پر خوب سُجھائی دے رہی تھی۔ معلوم ہُوا کہ محض آنکھ ہی نہیں دیکھتی دھیان اور وجدان سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر اَنگ اعضا' بلکہ رُوم رُوم بصارت بسر ہو سکتا ہے۔ بس! ذرا ان کی نہ دکھائی دینے والی آنکھوں میں جذب کا کجل سجانے کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔"

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے موجود لوگ' ان کیفیات کو محسوس کیوں نہیں کرتے۔ اُس کا ایک علیحدہ سا حُسن' اُس کی پُراسراریت' منفرد سی خُوشبو وغیرہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عام شخص' چاہے وہ دیگر علوم و فنون کا کیسا بھی عالم فاضل کیوں نہ ہو' مافوقیت اور اسرارِ علوی و ارضی کا طالبعلم نہیں ہوتا۔ درویشوں

فقیروں، بزرگوں اور خفتہ علوم کے طالبعلموں کے ہاں تحلیل نفسی اور تجمیل قلبی بدرجہ اُتم ہوتی ہے۔ اُن کا حسیاتی اعصابی بصری اور وجدانی نظام غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ میں نے ایسی صلاحیتیں ایسے افراد میں بھی بدرجہ اُتم موجود دیکھی ہیں جو عام سے انسان ہیں۔ نہ تو اُن کے پاس تعلیم ہے، نہ کسی اُستاد سے کچھ حاصل کیا۔ معمولی سے دیہاتی لوگ...... لیکن خفتہ قوتوں کے مالک کہ حیرت ہوتی ہے کہ اللہ کریم جس پہ چاہے کرم کر دے۔''

ماں کے پیٹ سے پیغمبری بھی ملی، ولایت نصیب ہوئی۔ قرآن کے حافظ پیدا ہوئے...... اُلوہی علوم کی تحصیل ہوئی...... نطق اور بصیرت بھی حاصل ہوئی۔ حشمت و شجاعت بھی لائے۔ خدائے لم یزل جسے چاہے، جو چاہے نواز دے، وہ بے نیاز ہے......!

اپنے ایم ڈی دوست سے معلوم ہوا کہ سینی ٹوریم، ورلڈ ٹی بی آرگنائزیشن کے تحت کام کرتا ہے۔ دُنیا بھر سے ڈاکٹرز، نرسیں، میڈیکل ٹیکنیشن اور دیگر متعلقہ لوگ جو ٹی بی اسپیشلسٹ ہوتے ہیں رضا کارانہ طور پہ ایک متعینہ عرصہ کے لیے یہاں پہنچتے ہیں۔ اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ ادھر غریب مفلوک الحال لوگوں میں ٹی بی کا مرض عام ہے۔ خاطر خواہ علاج فراہم نہ ہونے کی بناء پہ یہاں شرح اموات بہت زیادہ ہیں۔

سینی ٹوریم میں ایسے مریضوں کا علاج بلا معاوضہ ہوتا بلکہ جنگل کے اندر کچھ جگہیں ایسی بھی ہیں جدھر سے ٹی بی کے بوڑھے اور خستہ حال مریضوں کا یہاں تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ ہم موقع محل کے مطابق اپنی گشتی ٹیموں کو اُدھر جنگل کے اندر بھی بھیج دیتے ہیں۔ ہماری ایک ٹیم ایسی بھی ہے جو سال کے گیارہ مہینے جنگلوں میں گھومتی رہتی ہے۔ اُن کا کام ٹی بی کے مریضوں اور اُن کے کنبوں کو اس مرض بارے جملہ معلومات اور بچاؤ کے طریقوں کے متعلق آگاہی بہم پہنچانا ہے۔

میں ان لوگوں کی انسان دوستی، ان پسماندہ جنگلات میں، جہاں انسانی بنیادی ضرورتوں کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس طرح دُکھی اور بیمار مریضوں کی جملہ ضروریات کا خیال رکھنا اور بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کرنا۔ ان کے جذبہ ایثار سے بہت متاثر ہوا۔''

میں ادھر سٹاف میں مردوں سے زیادہ عورتیں دیکھ رہا ہوں...... کیا عورتوں میں دُکھی اور بیمار انسانوں کی خدمت کا جذبہ کچھ زیادہ ہوتا ہے یا کوئی اور وجہ؟...... ہاں! عورتوں میں کسی بیمار کی خدمت تیمارداری کا جذبہ فطری طور پہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ بیمار کو اپنی بہترین توجہ سے نوازتی ہے۔ اُس میں صبر، برداشت مردوں سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ بیالیس افراد کی تعداد میں تیس خواتین، جن میں سپیشلسٹ ڈاکٹرز، نرسز اور دیگر

ٹیکنیکل اسٹاف!...... مرد حضرات' یہاں کی بور زندگی سے بہت جلد اُکتا جاتے ہیں۔ اکثر بیمار بھی پڑ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں کوئی پب' کلب کیسینو وغیرہ کا تصور نہیں لیکن خواتین بڑی دلجمعی سے یہاں اپنا مقررہ وقت پُورا کرتی ہیں بلکہ یہاں رُخصت ہوتے سمے وہ بڑی دلگیر ہوتی ہیں جبکہ مرد حضرات' اِدھر سے یُوں بھاگتے ہیں جیسے جیل خانے سے آزاد ہوئے ہوں؟

مَیں دراصل اپنے مطلب پہ آنا چاہتا تھا۔ یہ تمہید تو محض' ایم ڈی کو گھیرے میں لانے کے لیے تھی۔

جب ہلکی سی زمین ہموار ہوگئی تو مَیں نے اپنے مطلب کا بیل کا پڑا اُتار دیا۔

''ڈاکٹر صاحب! مَیں تین چار روز سے میس میں دائیں جانب' میز کی آخری سیٹ پہ ایک اچھی سی خاتون کو سب سے الگ تھلگ چُپ چاپ دیکھ رہا ہوں' مجھے نہیں یاد کہ اُسے مسکراتے' کسی سے بات کرتے یا شریکِ گفتگو ہوتے دیکھا ہو۔ لگتا ہے وہ کوئی اجنبی سی خاتون ہے' محض کچھ وقت گزاری کی خاطر' مجبوراً اِدھر پڑی ہوئی ہے۔''

ایم ڈی صاحب میری اس بات پہ ہلکے سے خشمناک دکھائی دیے۔ شاید اُنہیں اپنے سٹاف کی ایک خُوبرو خاتون بارے میری دلچسپی' اچھی نہیں لگی تھی۔ میری بات اُن کے لیے ایسی غیر متوقع اور اُچانچک تھی کہ اپنے چہرے پہ یکدم اُبھرنے والی بدمزگی روک نہ پائے۔ وہ چند ثانیوں میں اپنی حیرت و حالت پہ قابو پا گئے تھے۔ بولے۔

''آپ نے گلوریا کی بابت صحیح کہا ہے یہ اینگلو انڈین خاتون گوا سے تعلق رکھتی ہے۔ ہالینڈ سے اس نے میڈیکل سائنس میں ماسٹر کیا ہوا ہے۔ اس کا انگریز باپ بھی ڈاکٹر تھا جب کہ ماں گوا سے تھی۔ نرسنگ میں کوالیفائیڈ تھی۔ یہ خاتون پہلی بار اِدھر آئی ہے۔ غیر شادی اور پکی رومن کیتھولک......!''

ایم ڈی صاحب' یہ سب ایسی سُرعت سے کہہ گئے جیسے جلد از جلد وہ سب کچھ اُگل کر فراغت پالینا چاہتے ہوں۔ اَب شاید میرے بولنے کی باری تھی۔''

''جس کام کے لیے اِدھر آئی ہے آپ اس سے مطمئن ہیں؟''

چند ساعتیں مجھے گہری نظروں سے تولنے کے بعد پوچھا۔

''مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں...... جبکہ اور بھی بہت لوگ اِدھر مُوجود ہیں......؟''

''ڈاکٹر صاحب! مجھے یہ بی بی ایکسٹرا اَبنارمل لگتی ہے۔ میرے اپنے مشاہدے علم کے مطابق یہ سنکھنی ٹائپ خاتون ہے...... یہ کسی نہ کسی طرح آپ کے لیے پریشانی پیدا کرسکتی ہے...... بلکہ مَیں کہتا ہوں' پریشانی پیدا کرچکی ہوگی؟''

ایم ڈی صاحب مجھے یوں آنکھیں نکالے دیکھ رہے تھے جیسے میں کسی دوسرے سیارے سے اُتری ہوئی کوئی مخلوق ہوں...... کافی دیر مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے' بمشکل گویا ہوئے۔

''یہ سنکھنی ٹائپ عورت کون ہوتی ہے......؟''

''ہوتی تو یہ دوسری عورتوں کی طرح ہی ہے مگر اس کے جبلّی' نفسانی اور شہوانی رویے عام عورتوں سے مختلف اور سوا ہوتے ہیں۔ وہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک' کہیں اور کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ اپنے علاوہ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے لیے بھی انجانے میں مشکلیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اُس کا جنم اور انت' دونوں ابنارمل ہوتے ہیں اور وہ اپنے بعد عجیب و غریب داستانیں چھوڑ جاتی ہے۔''

ایم ڈی صاحب مُنہ کھولے' آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے خاموش ہونے پہ وہ بادل نخواستہ بولے۔

''ہاں! یہاں بھی بہت دنوں سے کچھ ایسے ہی ہو رہا ہے۔ جب وہ ڈاکٹروں نرسوں کے گروپ کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔ میں پہلی نظر اُسے دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہو گیا تھا۔ یقین کریں جب میں پہلی بار تعارفی تقریب میں اس سے ہاتھ ملا رہا تھا تو نیچے سے میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ میں نے زندگی میں بے انتہا خوبصورت عورتیں دیکھی ہیں حتیٰ کہ میری بیوی' اُدھیڑ عمر ہونے کے باوجود بھی ایک حسین و جمیل عورت ہے مگر اس کے باوصف' میری حالت ایسی تھی کہ اُس کے روبرو یوں دست بستہ کھڑا تھا...... جیسے کسی سیارے سے اُتری ہوئی ملکۂ حسن ہو یا پھر کوئی ساحرہ' جسے اپنے مقابل کو آتشیں حُسن سے غسل دینے کا شوق ہو؟

ایک چیز کو نوٹ کرو کہ میں اپنی عمر اور پیشے کے ایسے مقام پہ ہوں' جہاں یہ مجھے تو جوانوں والی یا ایسی بازاری سوچ کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ مگر ایسے' جیسے میری عقل سوچ پہ پردہ پڑ گیا ہو...... میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کے سراپے میں کوئی ایسی شہوانی کشش اور حیوانی جذبات کو دوچند کر دینے والی مہک تھی جو جنس مخالف کو بکھا چھاڑ' سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ بس اُس کا دیوانہ بنا دیتی ہے۔''

میں اگر ایم ڈی کو نہ ٹوکتا تو وہ رُکنے والا کہاں تھا۔ ''ہم مُرشد تھے وہ وَلی نکلا'' معلوم پڑا کہ اِک میں ہی اُس عفیفہ شعلہ رُو کا پجاری نہ تھا اُس کا ایک جانو' مجھ سے پہلے بھی اِدھر موجود ہے۔

ہم ہی نہ تھے بے تاب و پریشاں ہجر کی لمبی راتوں میں
کیا کیا اپنے ساتھ ہُوا ہے حال نکلتے تاروں کا

میں نے ایم ڈی صاحب کو جو میرا عقیدت مند تھا' چلبلی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے علاوہ بھی کوئی اور سٹاف کا فرد اُس کا اَسیر ہُوا ہے یا اس کوچہ اُسیراں میں اکیلے آپ ہی

اس کے دیوانے ہیں؟"

"صرف ایک اور بھلے مانس پہ شک تو ہے پر اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ بھی اُس سے متاثر ہونے والوں میں ہوگا؟"

"کیا وہ بھی کوئی یہاں کا ڈاکٹر ہے......؟"

"نہیں وہ میرا ڈاکٹر ہے۔ جس سے مَیں اِس وقت بات کر رہا ہوں۔"

مَیں نے اُس کی بات کا مزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"مَیں یقیناً اُس میں دلچسپی لے رہا ہوں مگر میری یہ دلچسپی محض میرا مشاہداتی اور علمی تجسس ہے کہ علمُ الانسان اور خاص طور ایسے انسان' جو کچھ علیحدہ سی فطرت و جبلّت کے حامل ہوتے ہیں' میرا موضوع ٹھہرے ہیں۔ سپیرے' سانپوں سے بچنے کے طریقے جانتے ہوتے ہیں۔ تریاق منکے اُس کے جھولے میں پڑے ہوتے ہیں۔"

ایم ڈی نے بڑی برمحل چوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "پھر بھی سو میں ستاسی' سانپ کاٹے سے مرتے ہیں۔"

"مگر میرا شمار' سو کے ستاسیوں میں نہیں' باقی ماندہ تیرہ میں ہوتا ہے۔"

"ہاں! یہ کہو کہ یہ ڈاکٹر عورت' جس مقصد کے لیے اِدھر آئی ہے وہ پورا کر رہی ہے یا اُدھورا ہے؟"

"مَیں نے نوٹ کیا ہے اگر اُس کی ڈیوٹی دن میں ہے تو نارمل کام کرتی ہے...... اگر رات کی ہو تو اَپ سٹ رہتی ہے۔ ساتھی ڈاکٹروں اور مریضوں کو عجیب سی نظروں سے گھورتی ہے یا پھر اپنے دفتر میں بیٹھی' کھڑکی سے باہر جنگل کو دیکھتی رہتی ہے۔"

مَیں نے ایم ڈی کو ایک مثال دیتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! تم تو جانتے ہو کہ کوئی بھی مریض' ہر وقت اپنے مرض کی یکساں کیفیت میں نہیں ہوتا۔ کبھی اُسے اور دوسروں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ مرض سے نجات پا چکا ہے اُس کا چہرہ' موڈ' طبیعت دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ایسی حالت کئی کئی دن بھی رہ سکتی ہے اور کبھی یکبارگی یوں لگتا ہے کہ مرض اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور مریض اَب کچھ لمحوں کا مہمان ہے۔

منکشفی ٹائپ عورت کی جبلّت کی بھی کوئی ابتدا انتہا نہیں ہوتی کہ کب کہیں وہ اپنی جبلّتِ ثانیہ کے زیرِ اثر آ جائے اور کچھ بھی کر گزرے۔ لہٰذا تمہیں سخت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ویسے میرا مشورہ ہے اِس

سے پہلے یہ کوئی کارنامہ انجام دے' کسی نہ کسی طور اُسے واپس بھجوا دو......!''

## ● اَلکھ پُرش کی مَایا' کہیں دُھوپ کہیں چھایا......!

پُونم رات تھی' صحراؤں' میدانوں' مرغزاروں میں کِھلی ہوئی چاندنی' بچھی ہوئی رُوپا چادر کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ شاید اِسی لیے حویلیوں' بالا خانوں میں اور شہ نشینوں کے فرشوں پہ بچھی بے داغ چادریں چاندنیاں کہلاتی ہیں۔ موتیے کی کلیوں کی طرح پھیلی ہوئی چاندنی کا اپنا ایک سحر ہوتا ہے۔ چاندنی تو سمندروں کو پاگل کر دیتی ہے۔ انسانوں کی کیا بساط؟ عاشقانہ مزاج والے' پیار محبت کے بندے' ہجر و فراق کے مارے' جمال پسند اور نرگسی طبیعت لوگ' فنونِ لطیفہ سے متعلق افراد' بیمار و نزار' نفسیاتی و جنسی' رُوحانی اور ضعفِ قوم کے مریضوں کو مزید مجنون بنانے میں منفی کردار ادا کرتی ہے۔''

ہاں! کچھ نفسیاتی' ذہنی اور اعصابی امراض کا تیر بہدف علاج بھی ہے۔ چاندنی' جنگل' صحرا' سمندر اور اَرض کے حشرات بھی شدّت سے اثر انداز ہوتی ہے۔ چاندنی رات میں تناسُل پسند جانداروں میں زوجیت کی خواہش' بے تحاشہ سر اُٹھاتی ہے اور اپنی تکمیل چاہتی ہے...... سفلی اور ابلیسی استعانتیں گردش کرتی ہیں۔ قبرستانوں' شمشان گھاٹوں پہ بے چین نا آسودہ رُوحیں' ناراض آتمائیں' چمگادڑیں' بُوم' کرلے' مکڑے' سانپ' سنپولے' بُوزنے' ریچھ خُوب بدمست ہوتے ہیں۔

جیسے ذہ ابدا یار' جینے دیتا ہے نہ مرنے...... اِسی طرح دُودھیا' چِٹکی ہوئی چاندنی بھی سونے دیتی ہے نہ جاگنے...... آنکھیں میچو تو چُٹکیے لیتی ہے' آنکھیں کُھلی رکھو تو نقرئی غبار سے آنکھیں چُندھیا دیتی ہے۔ چودھویں سے لے کر ''کانا گوڑا'' لگنے تک میری حالت اُس مریض سی رہتی ہے جس کا سفید موتیے کا آپریشن ناکام ہو چکا ہو۔ رات ہو یا دن' اُس کی پُتلیوں کے پیچھے چَٹے پَٹے تِرولے تڑختے رہتے ہیں۔

بھسم کیا ہوا سونا' موتھو تو رات کو سکڑ کر سونے نہیں دیتا...... ناڑیوں میں نارنگ منڈی کے نَویں چاولوں کی چھاچھ بلونے لگتا ہے۔ مَیں چاندنی کی چاندی چاٹا ہُوا...... چاپے مکڑ کا چوچا' چاچی جموں والی کی مٹی لینے والا...... میرے دیدوں میں نیند کہاں؟

آسام کے گھنے جنگلوں میں چاندنی یُوں پھنس کر رہ جاتی ہے کہ بھلے چاند چُھپ جائے مگر چاندنی' درختوں پودوں پیڑوں کے ''جَن جَنّے'' سے نکل نہیں پاتی...... دُھند کُہر' گھنے جھاڑوں شاخساروں' مکڑیوں کے

جالوں خودرو پھولوں' کانٹوں میں کسی کنیا کی چھدری چنریا کی مانند اٹک کر رہ جاتی ہے۔ سینے کے پنجرے میں آہ و کراہ' دل میں پھنسی بے چین سی آرزو' دماغ میں کوئی بے کل سا خیال...... ذہن میں کلبلاتی ہوئی کوئی سوچ...... جنجالوں میں سسکتی ہوئی زندگی...... سرخ آنکھوں میں چبھو کے اکاتی ہوئی نیند بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

مجھے لگا جیسے چاندنی کچھ مدھم پڑ گئی ہے۔ چاند شاید کسی بدلی کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

کہیں کسی بھالو کے ڈکارنے کی آواز آئی۔ میں خاصا بیزار سا ہو کر برآمدے میں نکل آیا۔ جنگل کے قریب کی بستیوں آبادیوں شہروں کی تعمیراتی کاموں میں لکڑی زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ یہاں و سیکوں کے بس میں نہیں ہوتا ورنہ وہ اپنا لباس کپڑے' برتن ہانڈیاں' زیورات اور کھانا پینا بھی' لکڑی کا ہی کر لیں۔ لکڑی مضبوط' بھاری' کرموں سے محفوظ اور پھر مفت...... اس خاطر' فرنیچر' دیواروں' دروازوں کھڑکیوں...... چھت اور فرش بنانے کے لیے اس کا خوب استعمال ہوتا ہے۔ کمرے کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر باہر برآمدے کا فرش' چلنے پھرنے سے چر چر چیختا تھا شاید اس لیے کہ پُرانا ہوگا۔ وقت کی ہاتھوں اس کی چیں بول گئی تھی۔ اِدھر چلنے پھرنے سے جب اس کی چرچراہٹ کھلنے لگی تو میں جنگل کی باڑ جانب نکل آیا۔

فولاد کے کانٹے دار مضبوط تار شاہ بلوط کے بھاری کھمبوں پہ اس طرح لگے ہوئے تھے کہ اِدھر یا اُدھر سے کوئی بھی انسان یا جانور آر پار نہیں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ اس بنی نوریم اور عملے کے لیے حفاظتی تدبیر تھی۔''

مشاہدے میں آیا کہ جہاں کہیں انسان نے دیواریں اُٹھائیں وہ کبھی بھی سو فیصد کامیاب نہ رہیں۔ انسان کے شاطر ذہن نے اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیا۔ اس کا دماغ جب منفی طرزِ فکر اختیار کرتا ہے تو شیطان اس کی پوری پوری معاونت کرتا ہے۔ دماغ کے اُن پرانے پوشیدہ حصّوں تک اُس کی رہبری کرتا ہے جو نظامِ فطرت و سرشت کے تحت' حیوانِ ناطق کو ودیعت تو ہوئے مگر انہیں کام میں لانے کے لیے رَدّ و کد رکھا۔ تاکہ ان کی مضرت سے اللہ کی مخلوق محفوظ رہ سکے۔''

تاریخ بتاتی ہے کہ دیوارِ چین ہو یا سدِ سکندری' دیوارِ برلن ہو یا کوئی خندق' برج' باڑ' رکاوٹ' آہنی قلعہ یا فصیل سرحد کچھ بھی؟ انسانی عقل و تدبیر کے رُوبرو عاجز ہوئے۔ دُنیا کا کوئی سیکورٹی سسٹم' تجوری' تالا' بندی خانہ' ہتھکڑی' بیڑی' ہتھ لگام ایسی نہیں بنی' جس کا کوئی توڑ پیدا نہ ہوا ہو۔؟

یہاں بھی تعلیم اور تہذیب یافتہ انسانوں اور فطرت کے پروردہ حیوانوں کی دو مختلف دُنیاؤں کے مابین ایک حد' سرحد قائم کرنے کی کوشش میں کانٹے دار فولادی تاروں کی مضبوط باڑ بنائی گئی تھی۔ جو دیوارِ چین کی طرح' کالے کوسوں' طویل تو نہ تھی بلکہ اس کا رقبہ گولائی چوڑائی مشکل سے پانچ ایکڑ بھی نہیں ہوگا۔ مین گیٹ جو دُہرے پھاٹک والا تھا صرف ایک ہی تھا۔''

سے پہلے یہ کوئی کارنامہ انجام دے' کسی نہ کسی طور اُسے واپس بھجوا دو......!''

## ● اَلکھ پُرش کی مَایا' کہیں دُھوپ کہیں چھایا......!

پُونم رات تھی' صحراؤں' میدانوں' مرغزاروں میں کھلی ہوئی چاندنی' بچھی ہوئی رُوپا چادر کی مانند دِکھائی دیتی ہے۔ شاید اِسی لیے حویلیوں' بالاخانوں میں اور شہ نشینوں کے فرشوں پہ بچھی بے داغ چادریں چاندنیاں کہلاتی ہیں۔ مُوتیے کی کلیوں کی طرح پھیلی ہوئی چاندنی کا اپنا ایک سحر ہوتا ہے۔ چاندنی تو سمندروں کو پاگل کر دیتی ہے۔ اِنسانوں کی کیا بساط؟ عاشقانہ مزاج والے' پیار محبت کے بندے' ہجر و فراق کے مارے' جمال پسند اور نرگسی طبیعت لوگ' فنونِ لطیفہ سے متعلقہ افراد' بیمار و نزار' نفسیاتی و جنسی' رُوحانی اور ضعفِ نوم کے مریضوں کو مزید مجنون بنانے میں منفی کردار ادا کرتی ہے۔''

ہاں! کچھ نفسیاتی' ذہنی اور اعصابی امراض کا تیر بہدف علاج بھی ہے۔ چاندنی' جنگل' صحرا' سمندر اور اَرض کے حشرات بھی شدّت سے اثر انداز ہوتی ہے۔ چاندنی رات میں تناسُل پسند جانداروں میں رَجولیت کی خواہش' بے تحاشہ سر اُٹھاتی ہے اور اپنی تکمیل چاہتی ہے...... سِفلی اور اِبلیسی استعانتیں گردش کرتی ہیں۔ قبرستانوں' شمشان گھاٹوں پہ بے چین نا آسودہ رُوحیں' ناراض آتمائیں' چمگادڑیں' بُوم' کرلے' مکڑے' سانپ سنپولیے' بُوزنے ریچھ خُوب بدمست ہوتے ہیں۔

جیسے ذِابذا یار جینے دیتا ہے نہ مرنے...... اِسی طرح دُودھیا' چٹکی ہوئی چاندنی بھی سونے دیتی ہے نہ جاگنے...... آنکھیں میچو تو نچکے لیتی ہے' آنکھیں کھلی رکھو تو نقرئی غبار سے آنکھیں چُندیا دیتی ہے۔ چودھویں سے لے کر'' کانا گوڑا'' لگنے تک میری حالت اُس مریض سی رہتی ہے جس کا سفید مُوتیے کا آپریشن ناکام ہو چکا ہو۔ رات ہو یا دن' اُس کی پُتلیوں کے پیچھے چِٹے چِٹے تِر وَلے تڑختے رہتے ہیں۔

مجسم کیا ہوا سونا' سوکھو تو رات کو سکڑ کر سونے نہیں دیتا...... ناڑیوں میں نارنگ منڈی کے نوین چاولوں کی چھاچھ بلونے لگتا ہے۔ میں چاندنی کی چاندی چاٹا ہُوا...... چاہے گنگز کا چُوچا' چاچی جموں والی کی پٹّی لینے والا...... میرے دِیدوں میں نیند کہاں؟

آسام کے گھنے جنگلوں میں چاندنی یوں پھنس کر رہ جاتی ہے کہ بھلے چاند چُھپ جائے مگر چاندنی' درختوں پودوں پیڑوں کے'' جِن جپھے'' سے نکل نہیں پاتی...... دُھند کُہر' گھنے جھاڑوں شاخساروں' ٹکڑیوں کے

جالوں' خودرو پھولوں' کانٹوں میں کسی کنیا کی چھدری چنریا کی مانند اٹک کر رہ جاتی ہے۔ سینے کے پنجرے میں آہ و کراہ' دل میں پھنسی بے چین سی آرزو' دماغ میں کوئی بے کل سا خیال...... ذہن میں کلبلاتی ہوئی کوئی سوچ...... جنجالوں میں سسکتی ہوئی زندگی...... سرخ آنکھوں میں بچوکے لگاتی ہوئی نیند بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

مجھے لگا جیسے چاندنی کچھ مدھم پڑ گئی ہے۔ چاند شاید کسی بدلی کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

یہیں کسی بھالو کے ڈکارنے کی آواز آئی۔ میں خاصا بیزار سا ہو کر برآمدے میں نکل آیا۔ جنگل کے قریب کی بستیوں آبادیوں شہروں کی تعمیراتی کاموں میں لکڑی زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ یہاں وسیکوں کے بس میں نہیں ہوتا ورنہ وہ اپنا لباس کپڑے' برتن' ہانڈیاں' زیورات اور کھانا پینا بھی' لکڑی کا ہی کر لیں۔ لکڑی مضبوط' بھاری' کرموں سے محفوظ اور پھر مفت...... اس خاطر' فرنیچر' دیواروں' دروازوں' کھڑکیوں...... چھت اور فرش بنانے کے لیے اس کا خوب استعمال ہوتا ہے۔ کمرے کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر باہر برآمدے کا فرش' چلنے پھرنے سے چُر چُر چیختا تھا شاید اس لیے کہ پُرانا ہو گا۔ وقت کی ہاتھوں اس کی چیں بول گئی تھی۔ اِدھر چلنے پھرنے سے جب اس کی چرچراہٹ کھلنے لگی تو میں جنگل کی باڑ جانب نکل آیا۔

فولاد کے کانٹے دار مضبوط تار' شاہ بلوط کے بھاری کھمبوں پہ اس طرح لگے ہوئے تھے کہ اِدھر یا اُدھر سے کوئی بھی انسان یا جانور آر پار نہیں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کیٹی نوریم اور عملے کے لیے حفاظتی تدبیر تھی۔''

مشاہدے میں آیا کہ جہاں کہیں انسان نے دیواریں اُٹھائیں وہ کبھی بھی سو فیصد کامیاب نہ رہیں۔ انسان کے شاطر ذہن نے اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیا۔ اس کا دماغ جب منفی طرزِ فکر اختیار کرتا ہے تو شیطان اس کی پوری پوری معاونت کرتا ہے۔ دماغ کے اُن پرانے پوشیدہ حصوں تک اُس کی رہبری کرتا ہے جو نظامِ فطرت و سرشت کے تحت' حیوانِ ناطق کو ودیعت تو ہوئے مگر انہیں کام میں لانے کے لیے روک کر رکھا۔ تاکہ ان کی مضرت سے اللہ کی مخلوق محفوظ رہ سکے۔''

تاریخ بتاتی ہے کہ دیوارِ چین ہو یا سدِ سکندری' دیوارِ برلن ہو یا کوئی خندق' برج' باڑ' روکاوٹ' آہنائے قلعہ یا فصیل سرحد کچھ بھی؟ انسانی عقل و تدبیر کے رو برو عاجز ہوئے۔ دُنیا کا کوئی سیکورٹی سسٹم' تجوری' تالا' بندی خانہ' ہتھکڑی' بیڑی' تختہ لگام ایسی نہیں بنی جس کا کوئی توڑ پیدا نہ ہوا ہو۔؟

یہاں بھی تعلیم اور تہذیب یافتہ انسانوں اور فطرت کے پروردہ حیوانوں کی دو مختلف دُنیاؤں کے مابین ایک حدِ سرحد قائم کرنے کی کوشش میں کانٹے دار فولادی تاروں کی مضبوط باڑ بنائی گئی تھی۔ جو دیوارِ چین کی طرح' کالے کوسوں' طویل تو نہ تھی بلکہ اس کا رقبہ گولائی چوڑائی مشکل سے پانچ ایکڑ بھی نہیں ہو گا۔ مین گیٹ جو دُہرے پھاٹک والا تھا صرف ایک ہی تھا۔''

اندر کے لوگ' باڑ کی دوسری جانب دیکھ سکتے تھے۔ اُدھر کی خوشبوؤں' مختلف جنگلی جانوروں کی آوازوں' موسموں سے لطف اندوز یا بیزار بھی ہو سکتے تھے۔ دکھائی دینے والوں میں پرندے' مچھر' چوہے سانپ یا پھر جگنو تھے جو بلاتکلف باڑ سے ادھر پہنچ جاتے تھے۔ یہاں کے لوگ' کمروں کے اندر بھی' گرمی یا سردی' مچھر دانی ضرور استعمال کرتے تھے کہ ادھر جنگل کے کالے مچھر' اپنی حشر سامانی کی بناء پہ خاصے مشہور اور ایسے زہریلے ظالم' کہ جدھر کاٹ لیں' آگ لگادیں۔''

اَب بتایئے' جسم کے ننگے حصّوں پہ مچھروں سے بچاؤ کے لیے ناگوار بُو والا لوشن لگا ہو...... پاؤں میں جرابیں اور موٹے کپڑے کے سلیپر اور سر' گردن کان ہاتھ بازو ڈھکے ہوئے۔ ڈی سی کرنٹ سے ہچکیاں لیتے ہوئے زرد بیمار روشنی والے چھوٹے قمقمے چاند بھی' بدلیوں سے آنکھ مچولی کھیلنے میں مگن...... جنگل سے کسی ریچھ کے ڈکارنے کی دہلادینے والی آوازیں...... بھِیں بھِیں کرتا ہوا اکاّ دکاّ مچھر...... اِس ماحول میں بھلا خاک' کوئی چاندنی کا لطف اُٹھائے گا؟

ہم درویشوں کے ہاں بھی پہاڑی صحرائی گاڑیوں کی طرح' ایک سپیشل پانچواں گیئر ہوتا ہے۔ جس کا استعمال' اُس وقت کیا جاتا ہے جب حالات' وقت طبیعت اور ماحول' ناگزیر صورت حال پیدا کر دیں۔ اللہ کریم! اِس کے صدقے جنگل میں منگل کر دیتے ہیں...... ہر نا موافق' موافق بن جاتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا کہ ٹیڑھا اُلٹا' کب الف سیدھا ہو گیا۔؟

مَیں اِس سے پیشتر بھی بتا چکا ہوں یہ پانچواں گیئر' تیسرا کلمہ ہے۔ میرے بابا جی نے' اللہ کریم کے خزانے سے مجھے جو تین نعمتیں عطا فرمائی' اُن میں پہلی نعمت الحمدللہ ہے۔ ہر لقمہ' ہر گھونٹ' الحمدللہ کہنا...... رفتہ رفتہ جب یہ ورد' عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے تب یہ دل کی دھڑکن میں سما کر' ذاکر کو مجسّم الحمدللہ کر دیتا ہے۔ قلب کا جاری ہونا' یہی ہوتا ہے کہ بلا ارادہ' لاشعوری طور پہ خود بخود ذکر جاری رہے۔ اکثر نادان بلا سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں کہ الحمدللہ' جہری نہیں خفی' یعنی دل میں کہنا چاہیے۔

ہم کذب' لایعنی گفتگو' مغلظات' بیہودہ گیت گانے' فحش لطیفے وغیرہ تو بلند آہنگ کہنے سننے میں کچھ باک جھجک نہیں کرتے۔ اللہ کریم کی حمد و ثناء میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ دوست سمجھتے ہیں مولوی حاجی بن گیا ہے...... بعض یہ بھی سمجھتے ہیں کہ الحمدللہ' زبان سے ادا کرنے سے نمود و نمائش اور خود کو نیک پارسا ظاہر کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ بندہ' اپنے ماں باپ یا بیوی بچوں کو اچھا پیارا نہ کہے اور نہ کسی کی اچھی کارکردگی پہ تعریف کرے۔ کیا کسی بزرگ یا مالک کا' اسی کی عطا' مہربانی پہ شکریہ ادا کرنا بھی دکھاوا یا نمائش ہے۔ دراصل ہم نام اور ختنہ کی حد تک خود کو مسلمان سمجھتے ہیں؟''

میں نے جانا کہ دُنیا کی سب سے بڑی بُرائی یا انسانی بنیادی عیب احسان فراموشی ہے۔ صحیح معنوں شکر گزار نہ ہم خُدا کے ہوتے ہیں اور نہ کسی بندے کے بنتے ہیں۔ خدا اور بندہ تب یاد آتے ہیں جب ہم مُنہ تاک تک آزمائشوں مُصیبتوں کی دلدل میں دھنس چکے ہوتے ہیں۔ اللہ کریم! ہمیں احسان فراموشی سے بچا کر رکھے اور ہمیں اپنے شکر گزار بندے بننے کی توفیق' سمجھ عطا فرمائے۔

دوسری بے بہا نعمت' مجھے ''السلام علیکم'' کی عنایت ہوئی۔ جب سے یہ میرے روزمرہ کا پکا معمول بنی' میں علائق دُنیا' دولت' طمع' لوبھ ولالچ سے یکسر آزاد ہو گیا۔ السلام علیکم کی ادائیگی میں جتنا خلوص' مٹھاس نرمی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث شریف (قریب قریب مفہوم) کہ ''کثرت سے ایک دوسرے کو سلام کیا کرو...... اگر تم جان پاؤ کہ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ' کہنے سے کیا کچھ ملتا ہے؟ تو تم دُنیا کے تمام کام ترک کر کے صرف یہی عمل اختیار کر لیتے۔ اس عمل کے اَجر کا اندازہ اللہ کو ہے یا مجھے! اور مجھے یہ بتانے کی اجازت نہیں۔'' جتنا پکا یقین ہوگا اَجر بھی ایسے ہی ملے گا۔ جس مسلمان نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء میں یہ السلام علیکم کہنے کا عمل اپنایا۔ وہ میرے مُوجب ہر لحاظ سے غنی ہو گیا۔

تیسری نعمت' تیسرے کلمۂ پاک کی ملی۔ جس پہ یہ کلمہ کھل گیا...... دین و دُنیا کے تمام ظاہری باطنی علوم اُس پہ اظہر من الشمس ہو گئے۔ مشیت ایزدی اور خشیت ایزدی کے باطنی معنوں سے وہ واقف ہو گیا۔ اندھیرے اُجالے' زندگی موت' راحت و رنج' خوف و خشوع' سُود و زیاں' روزی و رزق کے جھنجھٹ سے آزاد...... مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر کاہل الوجود بن کر کسی کونے بیٹھ جاؤ...... الحمد للہ الحمد للہ کرتے رہو...... السلام علیکم کہتے رہو اور تیسرے کلمہ کا ورد کرتے رہو...... یہ دین ہے اور اس کے ساتھ دُنیا بھی ہے جو مشقت' دیانت' خدمت اور عبادت سے عبارت ہے......!''

خدا جانے؟ بابا کی نان سٹاپ گفتگو کا سلسلہ کب تک جاری رہتا۔ میں اس دوران کتنی بار سویا جاگا' یاد نہیں' سلسلۂ گفتگو کہاں سے شروع ہوا کدھر پہنچا۔ بس اتنا یاد کہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں اور میں کچھ سُن رہا ہوں۔ سچی بات کہ اس سے نہ تو اُنہیں کچھ غرض تھی اور نہ مجھے کچھ مطلب؟ مجھے چُھوا دیکھا بیٹھا سا دیکھ کر بولے۔

''سُنتے سُنتے تھک گئے ہو تو قدرے ستا لو میں بھی خشک حلق تر کر لیتا ہوں۔ ویسے تنکھنی عورت کی بات پہ تمہیں ہشیار رہنا چاہیے...... ایسی معلومات میرے سوا' کہیں اور سے نہیں مل سکتیں؟''

میں نے اُونگھتے ہوئے جواب دیا۔

''آمنا و صدقنا...... لاریب کہ تمہارے علاوہ اور کون ایسے لعل و گوہر اُجال سکتا ہے؟ چلیے! جو بھی تھا' دلچسپ تھا لیکن یہ بیچ میں تم آسام کے جنگلوں درمیان سنگی نوریم' تنکھنی عورت' چاندنی رات سے اُچک کر

اچانک کسی مسجد کے منبر پہ آ بیٹھے ہو؟ لگتا ہے تمہیں بھی اب نیند آ رہی ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو؟ عورت ہو چاہے وہ کوئی بڑھیا یا زلیخا اس کی بات پہ آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ دین دھرم کی بات پہ نیند عود آتی ہے۔ طبیعت بوجھل اور کان سن جاتے ہیں۔ ناراض مت ہو میں واپس اُسی جنگل کے سینی ٹوریم کی طرف لوٹ آتا ہوں......"

ہاں تو میں! باہر برآمدے میں کھڑا' بور ہو رہا تھا۔ ہوا بھی بند! ...... میں ٹہلتا ٹہلتا جنگل کی باڑ جانب بڑھ آیا۔ چار خانہ آہنی تار' قریب دس فٹ اُوپر' غلیل کے دستے کی طرح...... مضبوط لوہے کے تختے لگے ہوئے تھے کہ اُوپر کوئی چڑھ نہ سکے۔"

اسی دیکھا دیکھی میں باڑ کے ساتھ ساتھ ٹہلتا ہوا بائیں جانب نکل آیا جدھر لکڑی کے موٹے تنوں کے اُوپر' پانی کی ٹینکی اور اُس کے اُوپر وائرلیس کے ایریل اور سُرخ لائٹ لگی ہوئی تھی۔ یہ ٹینکی والی جگہ میرے گیسٹ روم سے کافی ہٹ کر سینی ٹوریم کے آخری کونے پہ تھی۔ ادھر باڑ کے برابر' پھولوں' سبزیوں کی پنیریوں کی کیاریاں اور کھاد تیار کرنے کا سامان پڑا تھا۔ ساتھ ہی لکڑی کا بنا ہوا ایک ہٹ بھی' جدھر زراعتی اوزار' گھاس کاٹنے کی مشینیں وغیرہ رکھی تھیں۔

پاس ہی سینی ٹوریم کا فُضلہ اور ٹی بی کے مریضوں کے زیرِاستعمال کپڑے پٹیاں جلانے کے لیے لوہے اور کنکریٹ کا ایک بھٹہ بھی بنا ہوا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ ادھر متعلقہ عملے کے علاوہ بھی کوئی ادھر آتا ہو۔ یہ جگہ ہی آؤٹ آف دے تھی۔"

میں نہیں جانتا کس پینک میں بے خبر سا' ادھر بڑھ آیا تھا۔ بس اتنا یاد کہ میں نے خود کو ٹینکی کے نیچے کھڑا پایا۔ کچھ پرے فضلہ جلانے والے بھٹے سے ہلکا ہلکا سرمئی دھواں نکل رہا تھا۔ یہیں مجھے آس پاس اک مخصوص مہک کا احساس ہوا۔ پہلے تو یہی سمجھا کہ بھٹے کے دھویں کی کوئی بدبو' خوشبو ہے...... غور کیا تو یہ کوئی اور ہی مہک تھی۔ ایسی مہک جو پختہ عورت کے سراپے سے اُس سمے پھوٹتی ہے جب وہ اپنی جبلّتِ ثانیہ کے تحت اپنی شہوانی خواہشات کے زیرِاثر ہوتی ہے۔"

آم' امرود' آڑو' آلوچہ' انناس' انگور' آلوبخارا' جب پک جاتے ہیں' ان کا شیریں مہک آور رس انہیں گدرا دیتا ہے تو ان کی خمار آلود بھینی بھینی مہک' قریب و دور تک پھیل جاتی ہے۔ انسان! اس مہکار کو بہت کم محسوس کر پاتا ہے جبکہ کچھ مخصوص پرندے اس مہک پہ دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے ہیں اور باغوں کے باغ تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ چیونٹیاں' مکھیاں' پروانے' مچھر' چوہے' چیلیں' کوے' گدھ' ان سب کی قوتِ شامہ اور دیگر حسیّں کمال کی ہوتی ہیں۔

ہرنوں میں چند اقسام ایسی کہ انسانی عقل ششدر رہ جاتی ہے۔ نافہ کالا' کستورہ ہرن ان کی مہک سے جنگل کے جنگل پاگل ہو جاتے ہیں۔ ہرنیاں دیوانہ وار لپکتی ہیں۔ سمندری سانپ بھی ایسے ہی ہے۔ مذکورہ امثال سے یہ مقصود ہے کہ بعض انسانی حیوانی' جنسی زاویوں کا تعلق بربریت اور اسراریت سے جُڑا ہوتا ہے۔

بشمول انسان! کچھ درندے' خزندے اور پرندے بھی ایسے جو ماورائی جنسی جبلت کے حامل ہوتے ہیں......

کتا' بندر' لنگور' گوریلا' ریچھ' خرگوش' سانپ' بکرا' مینڈھا' گھوڑا' گدھا' مچھلیاں' چڑے چڑیاں' چیونٹیاں وغیرہ ان میں رجولت پسندی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن کتے' بندر' لنگور' بن مانس' گوریلے کی رجولت پسندی میں کچھ عنصر ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی طور انسانی رجولت پسندی سے بھی لگا کھا جاتے ہیں۔

اس سنت جنسی دُنیا میں' میں نے کئی ایک واقعات سُنے اور چند ایک کا میں خود بھی شاہد ہوں کہ کچھ مخصوص جنسی طبع کی عورتوں کے انسانوں کی بجائے جانوروں سے روابط رہے۔ کچھ افراد ایسے بھی جو مخصوص حالات کے تحت' نفسیاتی جذباتی یا فطری طور پہ جانوروں سے ایک حد سے زیادہ اُنس رکھتے ہیں یا اُنہیں اپنے ساتھ رکھنے سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔ کتے' بلیاں ان میں اوّلین حیثیت رکھتے ہیں۔

پالتو جانور ویسے بھی انسانی مزاج' زاویں' طور و طریق سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اپنے مالک کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا' آگے پیچھے رہنا' میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنا' گود بیٹھ جانا' بستر پہ لیٹ جانا' پیروں سے لپٹتا جانا۔ اپنی انہی پیاری معصوم اور دلبرانہ اداؤں سے مالک کے دل میں ایک بے حد نرم گوشہ پیدا کر لیتے ہیں۔

خاص طور کتا' انسانی مزاج اور اقدار کے بہت حد تک قریب ہے۔ بلی میں نرگسیت زیادہ ہوتی ہے۔ جسمانی اور صوری لحاظ سے بھی وہ ایک ڈیکوریشن پیس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جبکہ کتے میں یہ کچھ نہیں ہوتا۔ سوا چند ایک مصنوعی نسلوں کے' باقی تمام کتوں میں مردانہ پن' بہادری' وفا اطاعت ہوتی ہے۔ سوائے رجولت پسندی کے اور اس میں بظاہر کوئی خرابی دکھائی نہیں دیتی۔

کتے کی اسی رجولت پسندی اور وفاداری واطاعت کی بنا پہ' بعض ایسی عورتیں' جن کی جنسی جبلت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے یا اُن کی زندگی میں کچھ ایسے ناقابلِ بیان حالات پیدا ہو گئے ہوتے ہیں کہ اُن کی نسائیت میں شہوانی ہیجان' اک جوار بھاٹا کی صورت پیدا ہو جاتا ہے' پالتو کتوں سے التفات پیدا کر لیتی ہیں۔

## ● اُصطرلابِ ارضی......!

چاند اور چاندنی میں بھی بے شمار اسرار اور راز چھپے ہوئے ہوتے ہیں' گو عام انسانوں سے ان کا کچھ

خاص تعلق نہیں ہوتا لیکن یہ اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔ دلپذیری ہوتی ہے' چٹکی ہوئی چاندنی' آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ فضا میں اک سحر سا طاری ہو جاتا ہے۔ چاندنی میں نہائی ہوئی ہر چیز اک ''چیزے دگر اُست'' بنی ہوتی ہے۔

آفتاب کی تمازت' تیزی اور خیزی آنکھوں میں جلن اور دل کی دھڑکن تیز کر دیتی ہے۔ ہر کوئی سایۂ عافیت کی تلاش میں ہوتا ہے...... جسم میں پانی کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ جسم سے پسینہ اور بدبو خارج ہوتے ہیں...... طبیعت مضمحل اور اعصاب ٹوٹنے سے لگتے ہیں۔

چاندنی میں خیالات میں پاکیزگی' طبع میں طمانیت اور روح میں بہجت سی ہویدا ہوتی ہے۔ قدرت' فطرت سے لگاؤ اور خیالات حمیدہ میں سچاؤ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مادیت سے ہٹ کر روحانیت کی جانب رغبت پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کو جی کرتا ہے...... گنگنانا مسکرانا اچھا لگتا ہے۔ اندر کے موسم سہانے ہو جاتے ہیں۔ کسی مرشد بابے' سائیں نے آنکھوں میں تصوف کے سُرمے کا سُرمچو پھیرا ہو تو پھر ایسا خوش بخت چاند کے پرے تک دیکھ سکتا ہے۔

چنداں مختلف اور منفی اثرات بھی ہوتے ہیں۔ منحصر ہے فطرت' جبلت اور ضرورت پہ کہ تلاش و جستجو کیا ہے۔ چکوے پپیہے کی طرح' چاند کی چاہت ہے...... موسلے کی مانند' چیونٹوں مُوروں کی' جو چاندنی سے لطف اندوز ہونے کی خاطر اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں اور اس کی خوراک بن جاتے ہیں۔ چنڈال چڑیلوں کی طرح' جو کسی راہرو کی راہ کھوٹی کرتے ہیں۔

کسی ذہنی نفسیاتی مریض کی کیفیت کی' جو خاص طور پہ پورے' آدھے یا گھٹتے ہوئے چاند کے سمے مزید بگڑ جاتی ہے۔ کچھ خودکشی بھی کر لیتے ہیں...... کچھ ایسی بھی جو اپنے حواس کھو کر کہیں کے کہیں نکل لیتے ہیں۔ ایسی بے سمت' انجانی اور اَن دیکھی جگہوں کی جانب' جدھر جانا پہنچنا' ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا۔ ایک اور عجیب بات کہ فاصلے' راہ کے نشیب و فراز' اڑچنیں' روکاوٹیں' دریا جنگل پہاڑ صحرا اور وقت کی اکائیاں...... سب کچھ ان کے آگے سمٹ اور بدل کر رہ جاتا ہے۔''

گھر سے ٹھیک ٹھاک' چاندنی کو انجوائے کرنے نکلے...... معلوم ہوا' دوسرے دن وہ دو سو میل دُور' کسی ایسی جگہ پائے گئے...... جو اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ وہ خود نہیں جانتے ہوتے کہ اس اجنبی شہر' صحرا یا میدان پہاڑ پہ کیونکر پہنچے......؟ پیدل' کسی ہوائی کھٹولے پہ کوئی جن یا ہوائی مخلوق اُنھیں اِدھر پہنچا گئی......؟ یا کہیں چاندنی کا اَسرار' طلسم اُنھیں چاندنی کی کرنوں میں تبدیل کر کے اِدھر لے آیا؟ اس کی توجیہ اتنی آسانی سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ مَیں بذاتِ خود کئی بار ایسی کیفیات سے ہو گزرا ہوں جنھیں بیان کرنا یا ان کے

سیاق وسباق کی کسی منطقی توجیہ کو ضابطۂ تحریر میں لانا ایک مشکل اَمر ہے۔''

اِنسان' جنّات کے علاوہ خفی مخلوق' چرند پرند دیگر جانور و وحوش حتیٰ کہ سمندر' دریا' پہاڑ' جنگل' آتش فشاں' آبشاریں' چشمے بھی چاندنی کے اثرات واسرار سے متاثر ہوتے ہیں۔ کنوؤں باولیوں کا پانی...... زیرِ زمین معدنیات' مائعات و بخورات...... کھیتوں میں کھڑی فصلیں...... اَشجار پہ سجے اثمار' رگوں میں دوڑتا ہوا خون اور جذب میں جھکولے لیتا ہوا جنون بھی......!

ایک بار تیتر' بٹیر' لڑی' چکوے' چکور جیسے چاندنی نواز اور شب خیز پرندوں کے علاوہ بھی ایک دو اجنبی سیک سے نیلے سیاہی مائل پرندے میرے دیکھنے میں آئے۔ تجسس بڑھا' مگر میری معلومات اور مشاہدہ انھیں جاننے سے عاجز رہا۔ اِدھر اُدھر کے اپنے خبطی پاگلوں سے ذکر بھی کیا تو کچھ پتا نہ چلا کہ یہ آبابیل سے کچھ بڑے' کبوترے پر اَسرار' چھوٹی لڑی کی طرح کے پرندے کیا ہیں؟ کسی جنگلی جہاز کی طرح اچانک سر پہ زن سے گزر جاتے ہیں۔ ان پہ نگاہ ہی نہیں ٹھہرتی کہ کچھ غور کیا جائے؟ لگتا ہے ان کے سامنے کوئی ٹارگٹ ہے' اُس کی جانب بڑھ رہے ہیں لیکن ایک بات اور ساعت دو ساعت' اِک مخصوص سی ذہک' شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ذہک جو ہوتی ہے وہ مہک سے ہٹ کے ایک مسحور کن سا احساس ثبت ہوتا ہے۔ ذہک اور مہک میں امتیاز کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں اور نہ ہی عام اِنسان اس تفاوت اور اس کی نفیس سی لطافت کو پہچان سکتا ہے۔

ذہک اور مہک...... نکہت اور نگہت...... بُو باس...... خوش بُو اور گُل بُو وغیرہ ان کے مابین وہی فرق ہوتا ہے جو' پیار اور محبت' قربت اور صحبت' نفرت وعداوت اور والد' باپ...... مکان اور گھر...... شریکِ حیات اور ہمسفر میں ہوتا ہے۔ جو جنوں اور عشق کے مابین پڑاؤ ڈالے ہوتا ہے۔ تعلق اور عقیدت میں فرق روا رکھتا ہے۔

بابا تو یہیں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اگر میں مداخلت' بے جا'' نہ کرتا۔

''بابا! جان کی امان پا کر عرض کروں...... سفر اپنی منزل کی جانب مسلسل بڑھنے کا نام اور کام ہے۔ اگر مسافر دورانِ سفر فضول قسم کی دلچسپیوں میں کھو جاتا ہے تو وہ اپنی کھری راہ کھوٹی کرتا ہے بلکہ اپنے مقصد اپنی منزل کے ساتھ زیادتی ہی نہیں' بددیانتی کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔ بابا! خدا کے لیے اپنی قاری کے ساتھ یہ بےجا زیادتی نہ کیا کرو۔ یقین کرو' یہ میرا تمھیں اِنتہائی مخلصانہ مشورہ ہے۔''

اس گرگِ باراں دیدہ نے حسبِ عادت مجھے خشمگیں نظروں سے نکالتے ہوئے' گردن ڈال کے خموشی اختیار کر لی۔ یہ اس کا پرانا بلکہ بوسیدہ جارحانہ طریقہ ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں تم سے بیزار ہوا اور تم اب مجھ سے مزید بکواس مت کرنا۔

میری مجبوری کہ میں اُسے کسی بھی قسم کی ناراضی کی حالت میں نہیں رکھ سکتا۔ جیسے بھی بن پڑے مجھے

اُسے منانا پڑتا ہے۔ اگر منانے میں میری طرف سے دیر ہو جائے تو وہ کمال حیرت سے خود پہل کر دیتا ہے...... مَیں جان بُوجھ کے وزن میں رہتا ہوں...... ہلکی پھلکی منت سماجت سے بڑھتے بڑھتے جب وہ دھمکیوں دھماکوں پہ آتا ہے تو پھر مَیں سپر ڈال دیتا ہوں۔

اس موقع پہ ہم دونوں اطراف سے کچھ بھی تو سرزد نہ ہُوا...... وہ خود ہی پسیجتے ہوئے سر اُٹھا کر کہنے لگا۔

''اگر تم پہلے سے تک میں کسی کو کچھ کہنے سمجھانے کا فن سیکھ لو تو تمہارے اور میرے بہت سے مسئلے آسانی سے حل ہو سکتے ہیں لیکن مَیں اور تم اچھی طرح جانتے ہیں...... نہ میری خو بدلے گی اور نہ تم اپنی ادا چھوڑو گے۔ خیر! تمہیں اگر میرا چاندنی جیسے خوبصورت موضوع اور اس کے اثرات وتشرفات پہ بات چیت کرنا پسند نہیں آیا تو مَیں واپس آسام کے اندرون جنگل میں ٹی بی کے اُس سینی ٹوریم میں واپس چلا جاتا ہوں۔ جدھر ایک منکشفی اینگلو انڈین ڈاکٹر عورت تھی۔ جس کے حُسنِ جہاں سوز میں وہی آتش زادی عذرا کے آتشیں حُسن کی سی کاٹ تھی جو اُسے مسلسل آتشیں غسل کرنے سے حاصل ہوئی تھی۔

اُسی کے ذکر سے بات آگے بڑھی تھی کہ وہ بھلا اپنی جبلّی خصلت اور مخصوص نسائی تقاضوں کے زیرِ اثر تھی۔ ایسی خال خاص خصلت و خُو کی پروردہ ایک علیحدہ ہی جنسی طرز کی حامل ہوتی ہیں۔ انگ انگ میں شہوت خود سپردگی! نگاہوں میں وزدیدگی...... اداؤں میں بلا کی بیباکی اور دم دم سے دارچینی کی سی خُوشبو دھانس چھوڑتی ہوئی۔

انسان تو انسان اس دھانس اور جنسی لہروں کو جانور اور دیگر نادیدہ ابلیسی استعانتیں تک محسوس کرتی ہیں۔ جیسے کُتّے بلیوں سانپوں خرگوشنیوں ہرنیوں کا ہوتا ہے۔ پورا ماحول اُن کی نامحسوس سی رجولی مہک سے بھر جاتا ہے۔ یہ ان کی فطرت و جبلّت کے تقاضے ہیں۔ جانور مصنوعی زندگی بسر نہیں کرتے وہ جنگل کے قانون کو سمجھتے ہیں اپنی جبلّت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں...... انسان بیک وقت حیوانِ ناطق حیوانِ ظریف مہذّب و متمدّن ہے اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا داعی ہے اپنے کئی نفسیاتی اور خود پیدا کردہ عوارض کا شکار ہو کر ایسی ایسی اَنہونی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے جن کا تال میل اس کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔

یہ بھی دُرست ہے کہ کچھ سلسلے ارضی و سماوی جادوئی جبروتی استعانتوں کا خمیازہ بھی ہوتے ہیں...... نہ ہونے کے برابر مگر جو ہوتے ہیں وہ بہت علیحدہ سے انسانی عقل و حیرت کو چکرا دینے والے!

کہا گیا کہ علم الانسان و حیوان...... ابھی تک اُدھورا ہے۔ انسانی عقل و بصیرت میں ابھی اس کا کما حقہٗ ادراک نہیں اُترا...... علم کوئی بھی ہو وہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ عصر اس میں خاطر خواہ تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔ سمندر کی گہرائیاں پنہائیاں آفاق کی وسعتیں خلائی بے کناریاں کبھی انسانی دائرہ پیمائش میں نہیں آ سکتیں۔''

وسیع و عظیم' شاندار اور پرشکوہ' کائنات میں مالکِ عظیم کا ایک بے مثل شہکار حضرت انسان بھی ہے۔ اس کے اندر اتنی اور ایسی ایسی کائناتیں ہیں کہ انسانی عقل و بینش ان کا تصور کرنے سے بھی عاجز ہے۔ اس مجموعۂ اضداد' مرکبِ خیر و شر' مجموعۂ علم و حکمت' خوگرِ خیال و خواب' صاحبِ جلال و جمال' بندۂ قیل و قال' پابندِ ماہ و سال میں ایسی حیرتیں' ایسے ابہام و توہم ہیں جنہیں سمجھا جانا تو در کنار تصور تک کرنا ممکن نہیں......!

شب و روز ایسے ایسے واقعات دیکھنے' سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں کہ بندہ مجسمۂ حیرت بن کے رہ جاتا ہے۔ میری زندگی تو شاید ہے ہی اس لیے کہ میں صبح و شام یہی کچھ دیکھتا رہوں......اللہ ہی جانتا ہے کہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہے؟

اسی واقعہ کو لے لیں' جو آسام کے جنگل میں میرے ساتھ پیش آیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے' کیا میں اسی سیاہ کو دیکھنے یا اس سے نمٹنے کے لیے اُدھر گیا تھا؟......نہیں! میں اُدھر اپنے ایک دوست کی دعوت پہ پہنچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے ویرانوں' پہاڑوں' جنگلوں' صحراؤں' سمندروں میں جانا' رہنا' اُن سے دوستی کرنا' باتیں کرنا یہاں تک کہ اُن سے رشتہ داری قائم کرنا اچھا لگتا ہے۔ انسانوں سے کہیں زیادہ میرے مراسم و تعلق ان سے ہیں جبکہ حجرات یعنی جواہرات سے تو جنوں کی حد تک میری "آئی لو یو" ہیں۔

اب میں اگر کہیں پہنچتا ہوں تو اپنی پوری ذات و اوقات کے ساتھ ہوتا ہوں......میری اچھائیاں بُرائیاں' میری سیرت بصیرت' شوق شغل میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں ایسا اُبلا اُبھرا ہُوا بندہ ہوں کہ کہیں چھپ لُک نہیں سکتا۔

اِدھر میڈیکل کیمپ میں اگر مجھے کوئی ایسی ہستی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا ظاہر باطن' میرے رُوبرو عیاں ہوتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرا سبجیکٹ بھی ہے تو میرا اس کی جانب متوجہ ہونا میرے لیے ایک ضروری امر بن جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی سپیرے کی موجودگی میں کوئی اچپلی سی خوبصورت ناگن کہیں سے نمودار ہو جاتی ہے تو سپیرے کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ اُس کا سامنا کرے۔ انجام جو بھی ہو لیکن بین بجا کر اس پہ ہاتھ ڈالنا' اُس کی پیشہ ورانہ ذمہ داری بن جاتا ہے۔ میری مثال بھی کچھ ایسے ہی تھی۔

اِدھر آج میری تیسری یا چوتھی رات تھی۔ سُبحان اللہ! چاندنی کی رُوپا رنگت اور ساگوان کی سلونی سی سگندھ نے سمے کی سَمیا میں سکتہ گھول رکھا تھا۔ لگتا تھا یہ جنگل کا حصہ زمین پہ نہیں اُوپر دودھیا بادلوں کی دُھند میں کوئی گم گشتہ جزیرہ ہے جو آکاش پہ تیر رہا ہے۔ چاندنی کے طلسموں نے ہر سُو خواب بکھیر رکھے تھے۔

انسان میں جتنے بھی حواس موجود ہیں' اُن کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی! جیسے ایک گہرائی ہوتی ہے اور دوسری گیرائی! ایک آنکھ ظاہری ہے دوسری باطنی! خوشبوؤں' بدبوؤں کو ناک بھی سونگھتا

ہے اور باطنی قوت شامہ بھی سونگھتی ہے۔ اللہ اور بندے کی بنائی ہوئی ہر وہ مشین جس میں بگاڑ پیدا ہونے کی صورت میں جان ایمان کے جانے کا خطرہ ہو...... ڈبل سسٹم بنائے گئے ہیں۔ ایک نظام مخدوش ہونے پہ دوسرا نظام خود بخود اس کی جگہ لے لیتا ہے۔''

مجھے ایک مخصوص برائے نام سی خوشبو نے چوکنا کر دیا۔ اندر کی سماعت نے بڑے ہلکے سے سگنل بھی موصول کیئے۔ میں خبردار ہو گیا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ میں نے ریچھ کی بے صوت کراہ نما آواز سنی...... یہ آواز بھی میرے اندر کی سماعت نے سنی تھی۔ کراہ سنتے ہی میں نے اپنے حسیاتی 'جسمانی' وجودی اور باطنی یعنی چاروں نظام 'خودکار کر دیئے۔

اس کی مثال ہوائی جہاز کی سی ہے جب جہاز کا پائلٹ 'غیر موافق موسم' بارش طوفان آندھی یا دُھند میں خود کو بے بس پاتا ہے تو وہ آخری چارہ کے طور' جہاز کا خودکار نظام بیدار کر دیتا ہے اور پھر سب کچھ خدا اور بندے کے بنائے نظام کے سپرد کر کے خود کو علیحدہ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ جب انسان اپنے علم ذہانت تجزیہ تدبیر و کوشش کو بے بس ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو کمال عجز سے اپنا معاملہ خدا' تقدیر اور ایسے موقع پہ کام آنے والے نظام کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ اللہ کی مشیئت و تقدیر کی امان میں ہوتا ہے۔''

ہماری بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں ''اللہ دے سپرد''...... ''اللہ دے حوالے'' یہ تین لفظ کتنا بڑا کام کرتے ہیں۔ یہ تقویٰ اور توکل کے تکیئے ہیں۔ جنہوں نے اِدھر ٹیک لگائی وہ عافیت دامن میں نک گئے۔ میں نے بھی خود کو خدا اور اپنے خودکار نظام کے سپرد کر دیا تھا۔

روشنی چاہے چاندنی ہو' کسی چہرے...... آفتاب یا اُمّ الکتاب کی...... وَلی یا نور و تجلّی کی...... آڑ اُوٹ کی متقاضی ہوتی ہے۔ جیسے کسی چاند چہرے کے لیے نقاب...... کسی سِرّ سراب' سوز اور سَم کے لیے حجاب ضروری ہوتا ہے۔ چاند کا بادلوں کی اُوڑ اور چہرے کا چلمن کی اُوٹ میں ہوتا یا رہنا...... کتنا اور کیسا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ تو کوئی نگاہ و اَدا والا ہی بتا سکتا ہے؟

اِدھر سمٹے ہوئے کھڑے ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میں نے پھر کراہتے ہوئے بھالو کی مدھم سی آواز سنی...... اس آواز میں اک عجیب سی فریاد' بلاوا اور کرلاہٹ تھی...... میں ابھی اس آواز کے سیاق و سباق پہ غور ہی کر رہا تھا کہ میری بائیں جانب' جدھر شاف کا بیرکس تھا...... ایک ہیولا اپنی جانب بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس کی رفتار میں تیزی و البانہ پن تھا۔ جیسے اُسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو۔ میں مزید سمٹتے ہوئے اُوٹ میں ہو گیا۔

اگلے چند لمحوں میں وہ بڑی سی سفید چادر والا ہیولا میرے سامنے سے خراماں خراماں گزرتا ہوا لکڑی

کے بوسیدہ ناور کی جانب بڑھ گیا۔ میں اب اوٹ سے نکل کر باہر دیوار کے سائے میں آ کھڑا ہوا تھا۔
سپید چادر، کھلی ہوئی چاندنی اور چاندنی کا حصہ ہی معلوم ہوئی۔ چند ثانیوں بعد وہ بھی میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ مزید جاننے کی خاطر میں بڑھتا ہوا کچھ اور آگے نکل آیا۔ ادھر اُدھر غور سے دیکھنے کے بعد بھی جب وہ ہیولا مجھے دکھائی نہ دیا تو میں آہستہ آہستہ ٹپ اُٹھاتا ہوا ناور کے پاس پہنچ گیا...... ادھر بھی کچھ نہ تھا۔
اچانک مجھے فضلہ جلانے والی بھٹی کے ساتھ باڑ میں اڑسی چادر اور نیچے بائیں پاؤں کا سلیپر دکھائی دیا۔
میرا شک درست ثابت ہوا...... یہ جو کچھ میرے سامنے پیش آیا اس کا ادراک مجھے پہلے دن سے ہی ہو چکا تھا لیکن یہ کچھ صاف نہ تھا۔ اب یہ چاندنی رات، شب کے بھیگے ہوئے دوسرے پہر کا آخری مرحلہ! جب چاند اپنی لیک چھپک میں ہلکی سی لہک بہک لاتا ہے۔ ایسی ہی پونم کی رات، ایسے پہر کے اختتام پہ اسے ''گوڑا لگتا'' شروع ہوتا ہے۔''
طوائف عہدِ جوانی میں ایسا عذاب نہیں ہوتی جتنی وہ عہدِ ''درمیانی'' میں ''ردِ ثواب'' ہوتی ہے۔ کڑاہی میں دودھ کناروں سے نہیں درمیان سے اُبلتا ہے۔ سورج بھی نصف النہار پہ اپنی جولانی دکھاتا ہے۔ کچا اور پکا، دونوں غلط، اصل صحیح تو کچ اور پک کے درمیانی دور! جوانی کی شادی شہزادی کی طرح...... اور عشق! مشک کی مانند...... اُدھیڑ عمری یعنی کچے پکے بال؟ مونا یا کا جال! پریم پال؟ راجہ اندر کی سبھا چوپال...... ! یہ اینگلو انڈین مہلا، جسے میں نے پہلے دن میس میں ڈائننگ ٹیبل کی آخری نشست پہ بیٹھے اپنے آپ میں مگن دیکھا، تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں اپنی تمام تر نام نہاد فضول سی بزرگی، درویشی، متانت وفطانت کے باوجود ریشہ خطمی ہو گیا تھا۔''
مرد تو مرد ہی ہوتا ہے وہ گیارہ سو برس کا بوڑھا ہو یا گیارہ ساعتوں کا نومولود بچہ! فقیہہ شہر ہو یا کوئی مجذوب فقیر...... وہ اوّل تا آخر، سوچ، نیت، خیال، رویے، سر سے پاؤں تک مرد ہی مرد ہوتا ہے۔''
ع گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے...... والی بات ہوتی ہے۔
ایک کہاوت ہے مرد کی آنکھوں اور عورت کی زبان سے جان، سب سے آخر میں نکلتی ہے۔

## ● برگِ نباط جو بگڑا تو برگِ حشیش بنا...... !

میرا ''آٹو پائلٹ'' لگا ہوا تھا۔ کوئی ارادہ، مقصد کچھ بھی تو نہ تھا اور نہ ہی کسی خطرے یا احتیاط کا احساس کہ رات کا یہ وقت، کھلی ہوئی چاندنی، آس پاس، دور دراز ہر نظر آنے والی شے پہ اک فسوں طاری...... باڑ اور

اس کے پار گھنا جنگل' کسی جنگلی بھالو کے کراہنے کی آوازیں......! وہ پُراسراری خوبصورت عورت' جو عورت اور ڈاکٹر سے پرے کوئی "حسین بلا" دکھائی دیتی تھی۔ اس ہئیت نے اُس کا باڑ کے اُدھر نکل جانا...... یہ سب کچھ بہت ہیجان خیز اور پُراسرار تھا۔ لیکن جب کسی معاملہ میں عقل و دانش کام کرنا چھوڑ دیں تو پھر بندۂ اللہ اور حالات کے سپرد ہوتا ہے۔ فی الوقت میرا ابھی یہی حال! کہ مَیں قدرے جھکتے ہوئے' باڑ کے شگاف میں داخل ہو چکا تھا اور یہ بھی ایک اَمرِ واقعہ! کہ مجھ سے پہلے ادھر ہی سے وہ شعلہ رُو بھی گزر چکی تھی۔

کہتے ہیں کہ آسمانی بجلی جدھر ایک بار گزر جائے تو وہ راستہ اس کے لیے کُوئے یار کی طرح ہو جاتا ہے۔ جنوں جب خیزاں ہوتا ہے تو اندیشۂ سود و زیاں' خدشۂ رسوائی' اس کے رو برو لرزاں رہتا ہے۔ جنگل تو وحشت و دہشت کے دنگل ہوتے ہیں۔ دن کے اُجالے میں سورج کی کرنیں اس کے اندر جھانکنے سے گریزاں ہوتی ہیں...... ہوائیں' پاگل خوشبوئیں بڑی ڈری ڈری سی قریب سے گزرتی ہیں...... کہ جنگل انہیں زبردستی جگنو بنا دیتا ہے۔ جنگل کی جبلت نہیں جبڑے ہوتے ہیں وہ پکڑتا نہیں جکڑتا ہے۔ اس کا جسم نہیں وجود ہوتا ہے۔ دفعہ یا تعزیر نہیں صرف قانون ہوتا ہے۔ اپنے فیصلے خود کرتا ہے...... اس کے ہاں باشندے نہیں ہوتے۔ درندے چرندے اور پرندے ہوتے ہیں۔"

مَیں باڑ پھلانگتے ہی انسانی معاشرے کی اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر جنگل کے ازلی' ابدی' حقیقی' فطری قانون کی عملداری میں داخل ہو چکا تھا۔ جدھر کسی سیاست' منافقت' ریاکاری' جعلسازی' اقربا پروری' کرپشن رشوت اور بھتہ خوری' بلیک میلنگ کا کوئی تصور نہیں...... گدھے' بچھڑے' ہرن' بیل گائے' زیبرے زرافے کے گوشت میں ملاوٹ نہیں ہوتی' پانی اور پھونک نہیں بھری جاتی۔ جدھر بے توقیر اور جعلی کرنسی نہیں ہوتی' مہنگائی نہیں اور نہ ہی گیس بجلی کے بل دُگنے تگنے آتے ہیں۔ غیر ملکی فرنچائز دکھائی دیتی ہیں اور نہ مہینوں برسوں پرانی غذائی اشیا کوئی استعمال کرتا ہے۔ جنگل میں بقا کا یہی اُصول ہے کہ جہاں آپ کا زور چلتا ہے' چلاؤ! جس میں قطعی کوئی لگی لپٹی نہیں ہے...... مقدمہ' نہ تھانہ' کچہری...... ساری بات زور اور زور کی ہے؟

چند ہی قدم آگے بڑھا تو گھاس پہ مجھے سلیپر کا دائیں پاؤں بھی پڑا ہوا نظر آیا۔ دراصل سلیپر کے "اپر" پہ مصنوعی نگینے لگے ہوئے تھے جو چاندنی میں چمک رہے تھے۔ مَیں نے اِسے نظر انداز کر دیا مگر یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ فتنہ ساماں "اَبلا پری" اس رُخ پہ ہی آگے کہیں گئی ہے۔ کچھ قدم مزید آگے بڑھا تو میرے نتھنوں نے ایک مخصوص وحشی سی بو محسوس کی...... ایسی بُو ریچھ' اونٹ' مارخور' کا لے بھیڈ و ترکش دُنبہ (چکی والا) یا جنگلی بیل بلّے سے خارج ہوتی ہے اور ایسے موسم یا دنوں میں جب وہ نسل افروزی پہ مائل ہوتے ہیں۔ یہی حال ایسے مرد و زن کا بھی ہوتا جن میں جنسی رجولت' بشری تقاضوں سے سوا ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال نو بکرے کی

ہے۔ جس کی بُو برداشت سے باہر ہوتی ہے اور اس حالت میں بڑی غلیظ حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔''

کھٹے خمیرے' بسے ہوئے آٹے سی بدبو! جو انسان و حیوان کی جنسی غدود میں ضرورت سے زیادہ ہیجان بپا ہونے سے عود آتی ہے اور پھر پسینہ اور سانس کے ذریعہ خارج ہوتی ہے۔ انسان کے علاوہ کچھ پرندوں جانوروں کی بھی قوتِ شامہ' اور جبلّی حیوانی صلاحیتیں' غیر معمولی ہوتی ہیں۔ موسم حالات' ارضی و فلکی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ' ان کی نفسانی خواہشات میں ہیجان پیدا ہونا ایک وقتی امر ہوتا ہے۔

چاندنی رات کا فسوں! ابنارمل افراد کو بے خود کر دیتا ہے۔ وہ آپے سے باہر ہو کر' غیر مرئی اثرات کے زیرِ اثر آ جاتے ہیں کہ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کر رہے ہیں یا اُن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

چاندنی رات میں وقت ٹھہر جاتا ہے۔ راہ' سفر' منزل' عمل' ارادہ' مقصد' مطلب کچھ بھی تو آپ کی توقع کے مطابق نہیں ہوتا۔ سراب کی طرح' خشک اندھی دلدل کی مانند!

مَیں ریگستان میں اک شکستہ پا' بھٹکے ہوئے مسافر کی مانند' کسی انجانی مسافت پہ تھا۔ مقصد' منزل انجام سے بے نیاز' آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا نہ راہ میں کسی گم دلدل کی فکر اور نہ بھٹک کر کسی اچھے برے انجام کا خطرہ؟...... بس! ایک ہی سودا کہ یہ خوبصورت عورت...... اس طرف' جنگل سمت...... کس مقصد کے لیے گئی ہے؟ کیسی بات' مَیں یہ سب کچھ اچھی طرح جانتا بھی تھا...... لیکن کیا کیجیے کہ انسان کبھی کبھی خود کو بھی اندھیرے میں رکھنا اور بے خبری کی چادر اوڑھے پڑے رہنا پسند کرتا ہے۔ جان بوجھ کر احمق بنا رہتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی خود تملذزی ہوتی ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک! جو بھی تھا' ہے اور ہوگا؟ مکمل پوری ہم' اس کے اندر فیڈ ہے کوئی کام لے یا نہ لے...... اسے استعمال کا ڈھنگ آتا ہے یا نہیں...... یہ الگ بات ہے؟

کچھ ہی دور آگے بڑھا ہوں گا کہ دلخراش سی غرغراہٹ نے مجھے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔ یہ خونخوار ریچھ کی آواز تھی۔ ایسی آواز جو کسی کی مداخلت یا ناپسندیدگی کو محسوس کرتے ہوئے نکلتی ہے۔ مجھے خبردار کیا گیا کہ مزید آگے نہ بڑھنا! واپس پلٹ جاؤ۔''

ویسے بھی آگے انتہائی گھنے درختوں کا ذخیرہ شروع ہو چکا تھا...... جنگلی چیڑ اور صنوبر! چیڑوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو پرانے اور چھتنار ہوتے ہیں اُن کی بڑھوتی تمام ہو چکی' یعنی اپنی بلوغت پوری کر چکے ہوتے ہیں۔ دوسری قسم چھوٹے یا بچے چیڑ ہوتے ہیں جن کا پھیلاؤ ابھی نیچے ہی ہوتا ہے۔ ان کی پھیلی ہوئی خاردار شاخیں' گزرتی ہوئی ہوا کو بھی زخمی کر دیتی ہیں۔ انسان یا کسی جانور کا گزرنا آسان نہیں ہوتا۔ ادھر پاس ہی رُک کر مَیں نے ناک سے فضا کو سونگھا...... دھیان دیا تو محسوس ہوا...... یہیں قریب ہی وہ عورت آشنا ریچھ اور شگفتی رجولت صفت' اینگلو انڈین مبلا مخواختلاط و وصال ہیں۔

''سونگھت'' بھی ایک بِدّیا ہے۔ ایک ایسا علم جو وہبی بھی ہوتا ہے اور موروثی بھی...... اسے سیکھا بھی جا سکتا ہے۔ اپنے دیہوں شہروں میں کھوجی ہوتے ہیں جن کے ہاں' کھوج لگانے کی بے پناہ موروثی طاقت یا فن ہوتا ہے۔ جدھر انسانی سائنسی' تُکّے اور آلات کام نہیں کرتے وہاں یہ اَن پڑھ سیدھے سادے دیہاتی کھوجی اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ اسی طرح سونگھنے اور ذہو تگّے بھی ہوتے ہیں...... یہ فنون و علم' کتابی اور اکتسابی نہیں بلکہ نسل در نسل اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے یعنی خداداد ہوتا ہے۔

جنگلی جانور درندے ہوں یا بے ضرر چوپائے' فطری بات ہے کہ وہ جنسی عمل کے دوران' انسان تو کیا کسی ہم جنس کو بھی اپنے قریب دیکھنا یا اس کی مداخلت پسند نہیں کرتے...... مشتعل ہونے پہ مرنے مارنے پہ تُل جاتے ہیں۔ جنگل کے دَسیکوں میں ریچھ ہی ایک ایسا جانور ہے جس کی رہت بہت اور زندگی بسر کرنے کے دیگر طور طریقے' عائلی قبائلی اور نفسیاتی جنسیاتی رَوّیے بہت حد تک انسان سے ملتے ہیں۔ حیران کن حقیقت یہ ہے کہ واحد جانور جسے آپ ایک درندہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اپنے قبیل سے ہٹ کر انسان کے بھی بے حد قریب آ جاتا ہے۔ خاص طور پہ خوبصورت عورتوں کے لیے اپنے اندر بے پناہ اُنسیت اور محبت کے جذبات محسوس کرتا ہے۔ اگر اسے کوئی عورت پسند آ جائے تو اُسے حاصل کرنے کی خاطر' یہ کچھ بھی کر سکتا ہے؟

ہالی وڈ کی شہرہ آفاق فلم ''کنگ کانگ'' اسی موضوع پہ تھی۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابیں' ناول اور فلمیں اسی موضوع پہ موجود ہیں اور کئی ایک ایسے آنکھوں دیکھے سچے واقعات بھی' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ریچھ یا بن مانس کسی عورت پہ فریفتہ ہوتا ہے تو اس کو حاصل کرنے کی خاطر' وہ کیا کچھ کر گزرتا ہے۔

امریکہ میں پرانے شکاریوں کے میگزین میں ایک شکاری کی سچی کہانی چھپی تھی...... آسام کے جنگلوں میں شکار کے دوران' اُسے ایک عورت کا سراغ ملا جو اک زمانہ سے ایک ریچھ کی کچھار میں اس کی بیوی کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔ یہ شکاری اُسے محسوس کرائے بغیر کئی دن اُس کی ریکی کرتا رہا اور ساتھ ساتھ اُس کی تصویریں بھی بناتا رہا۔ خوبصورت عورت' لباس سے بے نیاز! اُس کی وضع قطع بھی بدل چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں چہرے پہ ہلکے ہلکے بال تھے' بے تحاشا بڑھے ہوئے ناخن...... ریچھوں کی طرح غراتی بھی تھی۔

شکاری لکھتا ہے وہ گھر ہستن عورت کی طرح زندگی بسر کر رہی تھی...... اُس کا ریچھ شوہر جنگل سے پھل پھول اور دیگر کھانے پینے کا سامان لاتا...... اور بھی بہت سی باتیں! جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ شواہد ثابت کرتے ہیں کہ انسان اور غیر انسان' جن' جانور' ماورائی' طبیعاتی اور دیگر ارضی و افلاکی مخلوقات کے مابین ایسے معاملات ہوئے جو غیر فطری جبلّی اور غیر جنسی تھے' مگر کیا کہیے؟ یہ سب کچھ! جو سمجھ میں آتا ہے اور جو نہیں آتا...... تسلیم کیجئے بن کوئی چارہ نہیں۔'' ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے؟''

مخلوقات میں جو کچھ بھی اُس کی پہچان شناخت! اُس کے ظاہر و باطن اثرات و تشرفات اور خوشبو بدبو سے ہویدا ہوتی ہے۔ انسان ہو یا حیوان، حجر ہو یا شجر، سمندر، میدان، صحرا، جنگل، ذخیرے یا جزیرے، ارض و فلک، خلاء، ہوا...... جو کچھ بھی ہمارے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے موجود ہے؟ ہم سب کے اندر فیڈ ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں، جانتے پہچانتے ہیں۔ ہم سب آپس کی خُوؤں خوشبوؤں سے آشنا ہیں کہ ہم سب کی اساس "کُن" ہے۔

جیسے میں اُس کی "مانس بُو" کی زد میں تھا اسی طرح وہ بھی میری "جانس بُو" کے حصار میں تھا۔ ہم دونوں کے "جنٹل" قسم کے پیغام اِک دوسرے تک پہنچ چکے تھے۔ ایسے پیغام، جو کسی حتمی معرکہ کے بپا ہونے سے قبل اتمامِ حجت کے طور، تفہیم ایک دوسرے سے "شیئر" کرتے ہیں۔ اب ایک قدم بھی آگے بڑھنے کا مطلب ٹکراؤ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میرے پاس "یس اور نو" کے انتخاب کے لیے صرف اور صرف چند سیکنڈ تھے۔

آٹو پائلٹ نے میرے کرافٹ کا رُخ واپس کیمپ ٹوریم کی جانب موڑ دیا تھا۔ میں اُنہی قدموں پہ واپس پلٹ آیا...... میرا دماغ ایسا سُن ہو چکا تھا جیسے میں کئی برس برف زاروں میں منجمد رہنے کے بعد لوٹا ہوں۔ اسی آٹو پائلٹ نے مجھے میرے بیڈ پہ ڈال دیا۔ جدھر میں دن چڑھے تک بے سُدھ سا پڑا رہا۔ کسلمند سا اُٹھا کہ واش روم جانا تھا۔ انگڑائی توڑتے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ باہر نرم نرم دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ یہیں گزشتہ شب کی چاندنی، اس کی فسوں خیزی، وہ ابابیل، جو جنگل میں اُتر گئی تھی، جدھر ایک عورت آشام رہیچھ تھا؟

کچھ واقعات و معاملات، آغاز اور انجام...... لکھنے لکھانے یا بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتے...... یہ وہ نا آسودہ، نامحرم، نا خلف کتھائیں ہوتی ہیں جو بے کفن و قبر ہی کہیں دبا دی جائیں تو بہتر رہتا ہے۔"

● وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا......!

میرے پاس ایک گمنام لڑکی نے، کوئی پچاس صفحوں کا خط بھیجا۔ اُس کے پہلے صفحہ پہ التجا لکھی کہ میں اس خط کو ضرور پڑھوں۔ گو میں موصولہ خطوط بالکل نہیں پڑھتا، سیکڑوں خطوط پڑھنے کے لیے وقت اور حوصلہ چاہیے۔ لوگوں کے نجی معاملات میں جھانکنا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ میں شروع کی دو چار لائنیں بقصد وقت پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جو عام طور پہ ایک سے مضمون پہ ہی مبنی ہوتی ہیں یعنی مجھ سے اپنی عقیدت کا اظہار وغیرہ! ہاں، کوئی ایسا ملفوفہ خطوط، جو مجھ سے چمٹ جائے، میری تمام تر توجہ سمیٹ لے، مجبور کر دے کہ میں اُسے آخری لفظ تک پڑھوں۔ اُسے پھر میں نہیں، بلکہ وہ خود اپنے آپ کو پڑھتا ہے، میں صرف سُنتا ہوں۔

کوئی دیہاتی لڑکی تھی۔ نام اُس کا رانی فرض کر لیں۔ باپ فوجی تھا۔ مشقتوں کے دوران' دونوں ٹانگیں اور ایک بازو کٹوا' پنشن لے کر گھر بیٹھ گیا۔ ایک چھوٹا بیٹا اور ایک بڑی یہ رانی...... گھر کے ایک کمرے میں چھوٹی سی ہٹی ڈال کے زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ رانی گو ابھی شادی کی عمر میں نہ تھی مگر تھی تو ہاتھ پیروں والی قبول صورت لڑکی...... گھر میں کوڑے کوڑے غریبی' اوپر باپ اپاہج ہو کر چارپائی پہ پڑ گیا۔ ماں' اَن پڑھ' بھائی چھوٹا۔ بیساکھیوں کا سہارا لے کر باپ نے رانی کو دکان پہ بٹھا دیا۔ اس کا بیٹھنا تھا کہ اوباش لڑکوں نے آنا جانا شروع کر دیا۔ رانی نے باپ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں۔

نتیجہ یہ نکلا دو تین مہینوں میں دکان کی راس پونجی' کچھ تو گھر کھائی گئی' باقی اُدھار کھاتے نکل گئی۔ چند میٹھی گولیاں' چائے کی پڑیاں' چند سیر دالیں اور دو توڑے آٹا پڑا رہ گیا۔ دو تین ہفتوں میں یہ سامان بھی پیٹوں میں اُتر گیا۔ اس سے اگلے ماہ' ماموں نے پچاس ہزار مانگ لیے کہ اُس کا بیٹا باہر جا رہا ہے۔ شاید اُس کی نظر' ان کی دو بھینسوں پہ تھی۔ ایک دودھ والی' دوجی گابھن...... ان کے انکار پہ اُس نے منگنی توڑ دی بلکہ تعلقات بھی منقطع کر لیے۔

مصیبتوں پہ مصیبتیں...... باپ کی نوکری' ٹانگیں گئیں۔ چار پیسے جو ملے تھے وہ دکان کی ڈائن کھا گئی۔ منگنی ٹوٹی سو ٹوٹی' سگے ماموں نے بھی پچاس ہزار نہ ملنے کی وجہ سے منگنی توڑ کر اس کے ٹوٹے لنگڑے باپ کے نیچے سے بیساکھیاں بھی کھینچ لیں۔''

باپ کی معمولی پنشن اور دو چار کلو دودھ سے پانچ پیٹوں کو بھرنا' جب مشکل پڑا تو رانی نے والدین کی مخالفت کے باوجود تین ماہ کا ابتدائی کورس مکمل کر کے خاندانی منصوبہ بندی کے محکمہ میں نوکری کر لی۔ اپنے علاقہ کے گاؤں میں گھر گھر جا کر انہیں بچوں کی غیر ضروری پیدائش کے بارے آگاہی بہم پہنچانا اُس کا کام تھا۔ اس نوکری میں چونکہ گھریلو عورتوں سے رابطہ اور واسطہ تھا اس لیے' اسے کوئی مشکل پیش نہ آئی اور زندگی کی گاڑی' لڑکھڑاتے ہی سہی' کسی نہ کسی طور گھسٹنے لگی۔''

رانی! دس جماعتیں پاس' قرآن پاک پڑھی ہوئی' صوم وصلوٰۃ کی پابند...... قبول صورت جوان لڑکی تھی۔ ماموں کے بیٹے عاطف کے ساتھ' بچپن ہی سے اس کا جذباتی لگاؤ تھا۔ مہینے بعد جب چھٹی پہ گھر آتا تو اِدھر پھوپھی کے گھر بھی ضرور چکر لگاتا۔ اگلی فصلوں کی کٹائی پہ ان کی شادی کا پروگرام تھا۔ اچانک اس کا باہر جانے کا پروگرام بن گیا۔ چار لاکھ میں بات ہوئی تھی۔ جمع پونجی اور کچھ قرض حاصل کرنے کے بعد بھی پچاس ساٹھ ہزار کم پڑ گئے تو ماموں نے اپنی بہن کو بھینسیں بیچ کر پچاس ہزار فراہم کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کے انکار پہ اُس نے منگنی توڑ دی اور کسی اور انتظام سے رقم کا بندوبست کر کے لڑکے کو یونان بھیج دیا۔ وقتی طور پہ

عاطف کو بھی اپنی پھوپھی کا انکار بُرا لگا تھا۔ اُن کی بیٹی کے ساتھ شادی طے تھی آخر اُن کو بھی کچھ جتھ پاؤ مارنا چاہیے تھا۔ بھینسیں پھر خریدی جا سکتی تھیں۔ منگنی ٹوٹنے کا اسے رنج ضرور ہوا تھا مگر وہ باپ کے موقف کو درست بھی سمجھتا تھا۔"

فیصلے غلط ہوں یا درست زندگی اپنے منطقی انجام کی جانب افتاں و خیزاں بڑھتی رہتی ہے۔۔۔۔ گو صحیح یا غلط فیصلوں کے اثرات بھی ساتھ ساتھ ظاہر ہوتے رہتے ہیں مگر رواں وقت کا مرہم ان زخموں کے نشانوں کو ساتھ ساتھ مندمل بھی کرتا رہتا ہے۔ یہی زندگی کا اصول ہے۔ انسان وقتی طور پہ شدت محسوس کرتا ہے آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو کر گزری باتوں کو بھول جاتا ہے۔ یہ کچھ نہ ہو تو انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا ہمیشہ سلگتا رہے۔۔۔۔ جل جل کر کوئلہ ہو جائے۔ زندگی رہٹ سے کتنی مشابہہ ہے۔ خالی ٹنڈیں پانی میں اُترتی ہیں۔۔۔۔ لبالب بھری ہوئی اُوپر پہنچتی ہیں۔ پیاسوں کو سیراب کر کے نیچے پھر اُوپر۔۔۔۔ خالی اور بھرے کا چکر ہی زندگی ہے۔۔۔۔ ان دونوں کی ٹنڈیں بھی خالی ہو چکی تھیں۔ وقت انہیں بڑی تیکھی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

رانی نے بڑی جانفشانی سے اس فیلڈ میں اپنے لیے جگہ بنائی تھی۔ محکمہ اور متعلقہ عملہ اس کی عزت کرتا تھا۔۔۔۔ اُس کا کام ہی مختلف دیہاتوں میں پہنچنا اور گھروں میں عورتوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے بارے آگاہی دینا تھا۔ وہ لگے بندھے پروفیشنل انداز میں ہی بریف نہیں دیتی تھی بلکہ فطرت صحت کے اصولوں خدا رسول اور قرآن زمانہ عورت اور اُس فعال کردار کے متعلق بھی ضرورت کے مطابق بات کرتی تھی۔۔۔۔ اس کے علاوہ وہ اُن کے دیگر گھریلو مسائل بھی شیئر کرتی۔ غرضیکہ وہ گردو نواح میں بڑی وقعت اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا۔ بھائی تیسری سے چوتھی جماعت آ گیا۔ کچھ پیسے جمع کر کے باپ کو تین پہیوں والی سائیکل بھی لے دی۔ موسم بدلنے پہ اندر پیٹی کے بستروں کو دھوپ بھی دکھا دی تھی۔ ماں نے ہمسائی سے کوٹھے کی لپائی کے لیے بھی کہہ رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹنڈوں میں اَب کچھ پانی آنے لگا ہے۔ اگر کوئی ٹنڈ خالی تھی تو وہ عاطف کے نام تھی۔۔۔۔!

لگ بھگ ایک سال بیت چکا تھا۔ ماموں نے تو کبھی مُڑ کے بھی نہ دیکھا۔ عیدیں شبراتیں بھی خالی گزر گئیں۔ یونان والے عاطف نے نہ کوئی خط پتر نہ ٹیلیفون! وہ تو جیسے بھول ہی چکا تھا کہ کبھی وہ رانی نام کی کسی لڑکی سے بھی واقف تھا۔ اتفاق سے جو اُس کی پھوپھی زاد بھی تھی شادی کا وعدہ کیا تھا۔ کتنی اپنائیت دی۔ ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اپنے سچے پیار کی یادگاری کے لیے کتنے تحفے دیئے تھے۔ اس کی چھنگلی میں ابھی تک اُس کا پہنایا ہوا چھلا موجود تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی۔ کیا پیار محبت وعدے رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جب چاہا انہیں توڑ دیا جائے تو پھر انسانیت اپنائیت اور آپس کی رشتہ داری کیا چیزیں ہیں؟

ماموں کو اپنے جوان بیٹوں' موٹر سائیکل' اپنی زمین کا مان تھا۔ ہمارے پاس تو صرف جینسیں تھیں۔ اُن کے دودھ سے چار افراد کا گزارہ ہوتا تھا۔ اگر ہم ان کو بھی بیچ دیتے کہ اس کا بیٹا' یوتان چلا جائے تو پھر ہم کھاتے کہاں سے؟ وہ بھی تو اپنی موٹر سائیکل یا زمین بیچ سکتا تھا؟...... یہی کچھ سوچتے اور اپنے بیگانوں کے دہرے معیار پہ آنسو بہاتے بہاتے' وہ اپنے اندر ہی اندر بہت گہری ڈوب جاتی۔ کوئی سہیلی یا رشتہ دار لڑکی بھی تو ایسی نہ تھی جس سے اپنا غم ہلکا کر سکتی' اپنے دل کی بات بتا سکتی؟

وقت' سُرعت کے پر باندھے اُڑتا جا رہا تھا۔ قدرت کے اپنے رنگ' فطرت کے اپنے ڈھنگ...... نامعلوم احساس کے ساتھ' ہر شے تغیر پذیر ہوتی ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا' بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔ بڑے' بڑھاپے کی جانب سرک جاتے ہیں اور بوڑھے قبر کے سرہانے جا کھڑے ہوتے ہیں۔ دو تین سردیاں گرمیاں گزری ہوں گی کہ نئی کئی اَب اچھی خاصی دِکھنے دکھائی دیتی تھی۔ چھوٹا بھائی مجید' ساتویں کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ فوجی باپ کی ایک آنکھ کا آپریشن ہو چکا تھا۔ ماں نے بھی عینک لگوائی تھی۔ ان مثبت تبدیلیوں کے ساتھ ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ رانی اَب عنفوانِ شباب کی پریشان کُن منزل میں داخل ہو چکی تھی۔"

دیہاتی لڑکیاں جوان پہلے ہو جاتی ہیں اور بڑی بعد میں...... مگر اس کے ساتھ اُلٹ معاملہ ہوا تھا۔ گھر کی پریشانیوں اور معاشی بوجھ نے اِسے وقت سے بہت پہلے بڑا کر دیا جبکہ ذہنی اور جسمانی طور پہ جوان اَب ہوئی تھی۔ چھریرے بدن پہ ایسی بہار چھائی اور آنکھوں میں ایسا خمار اُترا کہ چلتا پھرتا مے خانہ بن گئی۔ حجاب تو وہ شروع سے ہی لیتی تھی مگر اب لگتا تھا کہ اُس کے شباب کے چکارے' اَب سرتاپا کالی عبا کے بس کی بات نہیں رہے۔ لعل گدڑی میں ہو یا جگنو بند مٹھی میں' چکارے مارے بنا نہیں رہتے۔ پردے اور حجاب میں' شباب تو اور قیامت توڑ ہو جاتا ہے۔ خود کو احساس بہت بعد میں ہوتا ہے۔ دوسروں کو پتا پہلے چل جاتا ہے۔ "ریشماں جوان ہو گئی ہے" کے آوازے نعرے گلی گلی لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔"

اپنے گاؤں کے پاس والے تیسرے پنڈ' پیدل ہی جا رہی تھی۔ کرامتے ماچھن نے بلوایا تھا۔ آٹھ بچوں کے بعد نویں بچے کی ابتدائی صورت تھی...... رانی' بڑے طیش میں تھی' پچھلے آٹھویں بچے کی پیدائش پہ ہاتھ جوڑے تھے کہ اَب یہ بچوں والا سلسلہ بند کر دے تیرے رحم میں کینسر کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ یہ چینڈو مرد' عورتیں کب مانتے ہیں؟ اُن کا تو یہی ایمان ہے کہ جس روح نے آنا ہے وہ آ کر ہی رہتی ہے۔ اولاد کی پیدائش بند کرنا کفرانِ نعمت ہی نہیں گناہِ کبیرہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ وہ اِسی طیشم طیش میں جلدی جلدی پگ اُٹھائے جا رہی تھی کہ آج کرامتے ماچھن کی خوب خبر لے گی۔

صبح صبح کا وقت' راستہ بھی شارٹ کٹ' شارعِ عام نہ تھا کہ آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

پیچھے سے ایک موٹر سائیکل تیزی سے آیا' اس کے قریب پہنچ کر آہستہ آہستہ اس کے برابر چلنے لگا۔ ایسے اوباشوں سے اکثر ایسی لڑکیوں کا واسطہ پڑتا رہتا ہے جو اپنی ضرورتوں کے ہاتھوں' باہر کہیں کام نوکری کرنے پہ مجبور ہوتی ہیں۔ سکول کالج کی لڑکیاں بالیاں بھی ایسے آوارہ لڑکوں سے نالاں ہوتی ہیں...... اکثر لڑکیاں' ان کے منہ نہیں لگتیں یہی کوشش ہوتی ہے کہ یہ ٹل جائے۔ کچھ منہ ماری بھی کر لیتی ہیں۔ بہر حال' یہ کچھ ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا...... رانی کو محسوس ہو گیا کہ کوئی آوارہ لڑکا' خالی رستے کا فائدہ اُٹھا کر' چھیڑنے کی عادت پوری کرنا چاہتا ہے۔ رانی نے اُس کی جانب دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا اور نہ ہی اپنی رفتار میں فرق ڈالا...... وہ پتا نہیں کیا کچھ کہتا رہا جبکہ یہ زیرِ لب تیسرا کلمہ پڑھتی رہی۔ لڑکے نے آگے بڑھ کر موٹر سائیکل ترچھی کر کے اسے رُکنے پہ مجبور کر دیا۔ رانی کی نظر اچانک جو اس کے چہرے پہ پڑی تو وہ حیرت و پریشانی سے گھبرا سی گئی۔ اچانک اُس کے منہ سے نکلا۔

''تم! کب آئے......؟''

وہ بت بنی اُس کے بدلے ہوئے چہرے کو تک رہی تھی۔ جس پہ اب گھنی مونچھوں کا اضافہ تھا' بالوں کا اسٹائل بدلا ہوا...... جسم نکھرا نکھرا سا...... جین اور ہاف شرٹ میں وہ' وہ عاطف ہی نہیں تھا جو تین برس پہلے اوکاڑہ کی ٹیکسٹائل مل میں مشین آپریٹر تھا۔ شلوار قمیص اور چپل کے علاوہ بھی کچھ نہ پہنا تھا۔ اٹھائیس سو تنخواہ میں اُس نے کیا کیا خواب نہ دیکھے ہوں گے...... اُس کا ایک خواب' اسی رانی کے ساتھ شادی بھی تھا' جس کا اب راستہ روکے کھڑا تھا۔

''میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں...... میرے ساتھ چلو' کہیں علیحدہ بیٹھتے ہیں۔''

رانی نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

''میں اپنی ڈیوٹی پہ ہوں۔ سامنے والے گاؤں جا رہی ہوں۔ اس طرح میرا راستہ روک کر مجھے بات چیت کے لیے مجبور کرنا تمہارے لیے مناسب نہیں۔ کچھ بات ہی کرنی ہے تو گھر آؤ۔ وہاں میری ماں سے جو کہنا ہے کہو۔'' اتنا کہہ کر وہ جانے لگی تو عاطف نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم نے منصوبہ بندی والوں کی نوکری کر لی ہے۔ گاؤں گاؤں جا کر' عورتوں کو بچے پیدا کرنے سے روکتی ہو۔ یہ منصوبہ بندی والیاں اچھی نہیں ہوتیں...... پیسے لے کر حمل ضائع کرتی ہیں۔ اس منصوبہ بندی کی آڑ میں خود بھی عیاشی کرتی ہیں' مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارے بھی کئی لوگوں سے تعلقات ہیں۔ میں تمہیں ایسے نہیں کرنے دوں گا۔''

رانی کو یوں لگا جیسے عاطف نے اُس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُنڈیل دیا ہو۔ آنکھوں میں

انگارے سے بھر گئے۔ جٹے کا سارا خون اُس کے ہاتھ بازوؤں میں اُمڈ آیا...... اک جنون تھا جو اس پہ طاری ہو گیا۔ بغل کا دو داؤں والا سرکاری بیگ زمین پہ پھینکا۔ بازو چھڑا کر اک طوفانی تھپڑ اُس کے جبڑے پہ لگایا۔ اچانک غیر متوقع حملے سے بوکھلا کر وہ بے سُدھ نیچے گر پڑا بھاری موٹر سائیکل اُس کے بازو پہ آ پڑی۔ کڑک کر کے بازو ٹوٹ گیا۔ ہائے ہائے کرتا ہُوا لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ٹینکی سے پٹرول رِسنا شروع ہو گیا۔ اُس کے کپڑے بھیگ رہے تھے۔"

سچائی صبر یقین 'کمزور کو بھی زور آور بنا دیتے ہیں۔ ظلم استحصال اور بے انصافی 'بڑے بڑے رُستموں اور حاکموں کو بزدل اور برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اُس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اک غریب مسکین پینڈو لڑکی اُس کے ساتھ ایسا سلوک بھی کر سکتی ہے۔ وہ بھی اس کی سابقہ منگیتر اور پھوپھی زاد......؟

رانی نے ہاتھ جھاڑ کر اپنا بیگ اُٹھایا۔ اُس کے مُنہ پہ تھوکتے ہوئے اپنی چھوٹی اُنگلی سے چھلا اُتارا 'اُس کے مُنہ پہ پھینکتے ہوئے کہا۔

"تم آج یہ ذلیل حرکت نہ کرتے اور بغیر تحقیق کیے مجھ پہ ایسے گھٹیا الزام نہ لگاتے تو یہ تمہارے پیار کی نشانی 'مَیں ساری زندگی اپنی اُنگلی سے نہ اُتارتی۔ تم سو شادیاں بھی کر لیتے 'مَیں پھر بھی تمہاری رہتی...... مگر نہیں تم اس قابل نہ تھے۔ تم جس قابل ہو وہ مَیں تمہارے ساتھ کرنے جا رہی ہوں۔ موٹر سائیکل سمیت اسی پٹرول سے تمہیں اور تمہاری گھٹیا ذہنیت دونوں کو یہیں جلا کر بھسم کر دوں گی۔ مکّار! تم نے اس جگہ کا فائدہ اُٹھانا چاہا جس پہ آمد و رفت نہیں ہوتی۔ مَیں بھی یہی فائدہ اُٹھاؤں گی۔ جب تک کسی کو خبر ہو گی تم اپنے انجام کو پہنچ چکے ہو گے۔

مرنے سے پہلے یہ بھی سُن لو۔ تم لوگوں نے منگنی اس لیے توڑ دی کہ ہم نے تمہیں باہر جانے کے لیے بھینسیں بیچ کر پچاس ہزار نہیں دیے۔ تم اور تمہارا مطلب پرست باپ کیا یہ نہیں جانتے تھے کہ میرا باپ معذور ہو چکا ہے۔ جو چار پیسے ملے تھے وہ دوکان کھا گئی۔ کوئی اور کمانے والا نہیں۔ ہم لوگ جئیں گے کیسے؟ اتفاقاً تم لوگوں نے منگنی توڑ کر ہم سے مرنا جینا ختم کر دیا۔ تین سال سے کسی نے ہماری خبر نہ لی۔ ہم جیتے ہیں یا مر چکے ہیں؟ باپ تو چارپائی سے ہل نہیں سکتا۔ مجھے ہی کچھ کرنا پڑا 'یہی آسان اور میری تعلیم کے مطابق کام تھا۔ اگر مَیں اس طرح چار پیسے کما کر گھر کی گاڑی کھینچ رہی ہوں تو اس میں بھی آپ لوگوں کو کیڑے دکھائی دیے۔ تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا۔ اب مَیں اچھا کر کے کھاتی ہوں یا تمہاری گندی ذہنیت کے مطابق بُرا کر کے کماتی ہوں آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ کہہ کر اُس نے بیگ میں سے ماچس نکالی۔ اس سے پیشتر کہ وہ سلگاتی 'جانے کیسے عاطف موٹر سائیکل

کے نیچے سے نکلا اور مخالف سمت بھاگ کھڑا ہوا۔

عاطف کے باپ نے بھی وہ کچھ سوچا تھا جو ایک پاکستانی باپ' موجودہ حالات میں اپنے کسی جوان بچے کے بارے سوچ سکتا۔ کھاریاں کے ایک ایجنٹ سے جو بھی انسانی اسمگلنگ کا دھندا کرتا تھا۔ چار لاکھ میں معاملہ طے کیا تھا۔ دو لاکھ پہلے اور دو لاکھ وہاں پہنچ کر...... رُوٹ وہی' کراچی' ایران' ترکی اور پھر یونان...... اسے خونی رُوٹ بھی کہتے ہیں۔ اس لیے ناکامی کی صورت میں موت ملتی ہے۔ ایران' ترکی تک تو خیریت رہتی ہے آگے یونان تک سمندر اور پہاڑی علاقہ میں دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں اور اگر کوئی پہنچ بھی گیا تو گمنام چوروں کی طرح ہی وہاں رہے گا۔ جب بھی پکڑا گیا تو سیدھا ڈی پورٹ ہو کر واپس کراچی...... جدھر پھر ذلالت' جیل' رشوت...... تین برس بعد' دوسرے چار بھگوڑوں کے ساتھ عاطف بھی پکڑا گیا۔ باپ اُسے کراچی سے چھڑا کر لایا' چالیس پچاس ہزار رشوت دے دلا کر عاطف گھر واپس آ گیا تھا۔ یہ تو خیر ہوئی کہ اس عرصہ میں اُس نے کسی بھی طرح پانچ چھ لاکھ گھر بھجوا دیا تھا۔ چلو فائدہ نہ ہوا تو نقصان بھی نہ ہوا؟

عاطف میں کچھ تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں۔ سگریٹ نوشی تو خیر کوئی بُرائی نہیں سمجھی جاتی...... وہ شراب پہلے چکھتا تھا اب پینے لگا تھا۔ آزادی ہو کوئی نگاہ رکھنے والا بھی نہ ہو۔ شراب اور سگریٹ کا ساتھ ہو...... جسم میں فالتو خون بھی ہو تو عورت نہ ہو' یہ گرائمر کچھ سمجھ میں آنے والی نہ تھی۔ مطلب یہ کہ برخوردار عاطف میاں' وہاں خاصے سرگرم رہے۔ اب پاکستان آنا پڑا تو سگریٹ کے علاوہ دیگر خرافات کا حصول مشکل پڑا۔ اچھے کو اچھے بُرے کو بُرے ٹکر جاتے ہیں۔ پہنچتے ہی نئے پرانے دوستوں میں اُٹھنا بیٹھنا شروع ہوا...... باپ کو اس کی نئی بُرائیوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ چونکہ وہ باہر سے اچھی خاصی رقم بھیج چکا تھا۔ اس صدقے چشم پوشی کرتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ اسے ادھر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروا دے گا۔ نیا موٹر سائیکل لے کر دیا۔ لاہور سے اچھی خاصی شاپنگ کروائی۔ ٹیلیفون' گھڑی' فیشنی دھوپ والا چشمہ کہ گاؤں میں عزت بنی رہے۔

میاں بیوی نے بیٹھ کر اس کی شادی کا بھی سوچا۔ پہلے تو یہ تھا کہ اس کی ماں نے اپنی پڑھی لکھی بھانجی لانے کا پروگرام بنایا کہ پچاس ہزار اُنہوں نے دیئے تھے۔ عاطف نے پیسے بھیجے تو ماں نے کچھ زیور بھی بنالیا تھا۔ اب یہ ڈی پورٹ ہو کر واپس آیا تو اس کے بگڑے لچھن دیکھ کر لڑکی والے نال مٹول کرنے لگے۔ لڑکی' عاطف سے زیادہ پڑھی لکھی اور سمجھدار تھی۔ ان ہی کے گاؤں کا ایک اور لڑکا' جو اس کے ساتھ ڈی پورٹ ہوا تھا۔ اس کی زبانی کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں جن سے عاطف کے ماں باپ تو لاعلم تھے مگر لڑکی والوں کے علم میں آ گئیں۔ عاطف کو وہاں جوا کھیلنے کی لت پڑ گئی۔ شروع شروع میں اُس نے خاصی رقم جیتی اور پاکستان والدین کو بھیج دی۔ پھر کبھی جیت کبھی ہار...... جو رقم وہ پاکستان بھیج چکا تھا وہ تو باپ کے قبضہ میں پہنچ گئی اور جو بار

کے کھاتے میں گئی وہ ادھر اُدھر کا قرض تھا۔ اب اگر وہ اُدھر رہتا تو کسی نہ کسی طور وہ وہاں کا قرض چکتا کر دیتا۔ بدقسمتی کہ وہاں سے نکال دیا گیا۔ قرض جوں کا توں قائم رہا۔ لڑکی کے گاؤں والے لڑکے نے بھی اس سے خاصے پیسے لینے تھے جو اس نے باپ سے لے کر ادا کرنے تھے۔ باپ نے اس کی رقم سے زمین خرید لی تھی وہ خود بھاگ تھا بلکہ اس کو امیگریشن والوں سے چھڑانے پہ چالیس ہزار اُٹھ گئے...... موٹر سائیکل اور شاپنگ پہ علیحدہ والا کھ سوا لاکھ نکل چکا تھا اور یہ رقم بھی اس نے بینک والوں سے سُود پہ لی تھی۔

دوپہر کے بعد رانی گھر لوٹی تو اُس کا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے کوئی بھاری مشقت کا کام بھی نہیں کیا تھا۔ بے اختیاری میں صرف ایک بھرپور تھپڑ ہی تو جڑا تھا۔ چار پائی پہ بیٹھتے ہی نیم دراز سی ہوگئی۔

"ماں! مجھے ایک پیالی چائے بنا دے اور میرے بیگ سے دو ٹکیاں اسپرین کی بھی دے دے۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" ماں چولہا گرم کرنے لگی تو یہ پھر بولی۔ "پتا چلا ہے کہ تمہارا عاطف 'خیر سے آیا ہوا ہے۔"

ماں پھونکنی سے چولہے میں راکھ اُڑاتی ہوئی لاپروائی سے بولی۔

"اب عاطفا آئے یا جائے کیا فرق پڑتا ہے۔ پر تمہیں کدھر سے پتا چلا؟"

اُس نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کیے جواب دیا۔ آج صبح صبح وہی میرے متھے لگا تھا۔ سڑک سے جانے کی بجائے میں چھپڑ کی طرف سے نکل گئی کہ دھوپ تیز ہونے سے پہلے پہلے پنڈ پہنچ جاؤں گی۔ آگے اُعواناں دے رقبے کی طرف سے موٹر سائیکل پہ آیا میرا رستہ روک کر کہنے لگا۔ میرے ساتھ چل کوئی ضروری بات کرنی ہے؟"

ہکی بکی سی ماں پوچھنے لگی۔ "پھر کیا ہوا......؟"

"وہی جو آج کل نویں پیسے والے کرتے ہیں۔ میری بانہہ پکڑ لی اور زبردستی موٹر سائیکل پہ بٹھانے لگا۔ میں نے ہتھ چھڑا کر ایک زوردا تھپڑ مار دیا۔"

ماں نے چار پائی پہ اُس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"پھر......؟"

"پھر پتا نہیں کیا ہوا؟ میں نے کیا کہا اور اُس نے کیا سنا؟ پھر اُٹھ کر بھاگ گیا۔"

"بھاگ گیا...... کدھر......؟"

"اگر وہ وہاں سے اُٹھ کر نس نہ جاندا تو ایس وقت تک اُہدیاں ہڈیاں سڑ کے سواہ ہوگئی ہوتیں۔ میرا تھپڑ کھا کے نیچے ڈگ پیا تے موٹر سائیکل وی اُوہدے اُتے ڈگ پئی۔ پٹرول لیک ہوگیا سی میں ماچس جلا

کے پٹرول تے سٹن والی ساں کہ اُٹھ کے بچ گیا۔''

''ہائے نی وچیئے! کی کرن گی نہیں......؟''

''بے بے! توں اگے اگے ویکھیں ' میں اُنہاں نال ہور کی کی کراں گی؟ اچھا ہو یا وہ سڑیا نہیں۔ میں انشاء اللہ تیرے پیکیاں نوں اکٹھے ہی ساڑاں گی۔''

''نہ نہ وچیئے! رب کولوں ڈر...... منگنی توڑن دی ایڈی وڈی سزا......؟''

''ماں! منگنی توڑن دی سزا نہیں میرے اُتے جھوٹے بہتان لان دی سزا اے۔ کہندا میں نوکری دی آڑ وچ بدکاری کرنی آں۔ دس ماں! میں کی کرنی آں؟...... دس......؟'' وہ پھس پھس رونے لگی تھی۔

کرۂ ارض پہ ابھی بہت سی جگہیں ' صحرا ' سمندر ' پہاڑ اور جزیرے ایسے ہیں جو ابھی دریافت ہونا باقی ہیں اور چند ایسے بھی انسان جنہیں کبھی دریافت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ قدرت کے کارخانے میں سب کچھ انسان کے دائرہ اختیار میں نہ ہے۔ جو چیز اس کے دائرہ ادراک سے ماورا ہے وہ قدرت کا راز ہے۔ قادر مطلق جیسے چاہے جب چاہے اپنے کسی بندے پہ وہ راز کھول بھی دے وہ بے نیاز ٹھہرا......!

انسان بھی کبھی خود کو مکمل طور پہ دریافت نہیں کر پاتا۔ اس کے اندر کئی دُنیائیں ' جہان ' ارض و سما ' چاند سورج ستارے پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ ہی اس کے قابو میں ہوتا ہے باقی تمام خزانے اس کے فہم و ادراک سے اوجھل رہتے ہیں۔ جس طرح پہاڑ ہیں ' کسی سے سونا کسی سے تانبا چاندی...... کوئلہ ہیرے جواہرات بھی...... کچھ پہاڑ گیس تیل سے بھرے پڑے ہیں...... کسی سے سنگ مرمر ' کسی سے سنگ خارا...... کالے ' چٹے ' سرمئی ' سبز ' اودے بھی مگر ہوتے سب ہی پہاڑ ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی مختلف فطرتیں ' سرشتیں ' خصلتیں ' عادتیں ' جبلتیں ہوتی ہیں۔ کچھ مثبت طرز فکر کی حامل اور کچھ منفی انداز عمل کی متقاضی!

ان کی بھی آگے کئی کئی جہتیں اور پرت ہیں۔ کب کیا کھل جائے ' انسان کس وقت ' کس جہت کے زیر اثر ہوتا ہے۔ یہ کوئی نہیں جان پاتا؟ بیٹھا بیٹھا انسان ' کوئی ایسی حرکت یا عمل کر بیٹھتا ہے جس کی اس سے دور دور تک توقع نہیں ہوتی یا کبھی اچانک اس میں ایسی تبدیلی آتی ہے جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔ ڈرپوک ' بزدلوں اور کمزوروں سے ایسے کارنامے سرزد ہو جاتے ہیں کہ دیکھنے سننے والے یقین نہیں کرتے۔ غبی کند ذہن غیر حاضر لوگ بڑے بڑے اَدق سوالوں کا درست جواب دے دیتے ہیں۔ اسی طرح بڑے شریف صوم و صلواۃ کے پابند حاجی نمازی لوگ ' ایسی کوئی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ جو سنتا ہے ' منہ میں انگلیاں داب لیتا ہے۔ انسان ذریافتوں کا نام ہے۔ غلط صحیح ' اچھی بری یہ الگ مسئلہ ہے!

رانی نے اُس عاطف والے معرکہ میں جو اپنے کردار کی خوبصورتی دکھائی۔ انسانی اور خونی رشتوں

کے تقدس کو جس طرح پیش کیا۔ جس ایمانی طاقت اور انسانی جرأت کا مظاہرہ کیا...... ایک دیہاتی' کمزور' معمولی تعلیم یافتہ اور پس ماندہ کنواری لڑکی سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ رانی نے موقع کے مطابق اپنی اندر کی مطلوبہ قوت دریافت کر لی تھی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کئی لڑکیوں پہ جن آتے ہیں۔ عامل لوگ جن نکالتے ہیں۔ لڑکی جو چٹی ان پڑھ ہوتی ہے غیر ملکی زبانیں فر فر بولتی ہے۔ اس کی آواز کسی ذہنگ قسم کے جن کی لگتی ہے۔ وہ آنکھیں نکال نکال' بڑے غیر مانوس انداز میں گفتگو کرتی ہے کہ دیکھنے والے' واقعی اس میں کسی جن کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اصل قصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لڑکی یا فرد جانے ان جانے میں اپنے اندر کی ایک ایسی فریکوئنسی کی زد میں آ جاتے ہیں جس سے وہ پہلے واقف نہیں ہوتے۔ ایسی مطلوبہ فریکوئنسی' کوشش یا مشق کرنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی خود بخود بھی عود آتی ہے۔

## • درویشی یا خسروی......!

تھائی لینڈ کے ایک آشرم میں ایک رشی سے ملاقات ہوئی۔ وہ باطنی علوم کا ماہر تھا۔ نحیف و نزار...... کھانا پینا' سونا جاگنا جیسے اُس کے ہاں تھا ہی نہیں لیکن ہر وقت چاک و چوبند' مسکراتا چہرہ' محبت پیار' خلوص و خدمت اُس کا وطیرہ تھا۔ میں جب اُس کٹیا میں پہنچا تو وہ ایک ننھے سے چیتے کے بچے کو دودھ پلا رہا تھا جبکہ چیتا اور چیتی ذرا دور بیٹھے اپنے دوسرے بچوں سے کھیل رہے تھے۔

میں نے پوچھ لیا۔ ''یہ کیا؟ یہ دودھ پلانے کا فریضہ تو اس کی ماں کا ہے۔''

مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔ ''ماں اور اس کی فریکوئنسی آپس میں نہیں ملتی' مجھ سے مل گئی ہے۔ اس طرح ماں کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔ وہ دوسرے بچوں کو خوشی خوشی دودھ پلاتی ہے پر اس کو تنی جاتی ہے۔ بس اس سے نہیں بنتی۔ اگر اسے میں' ماں سے الگ نہ رکھوں تو بہت ممکن ہے وہ اس کو ہلاک کر ڈالے۔''

میرا اگلا سوال تھا۔ ''کیا بگڑی ہوئی فریکوئنسی سیٹ کی جا سکتی ہے یا بنی ہوئی کو بگاڑا جا سکتا ہے؟''

اُس کا جواب تھا۔ ''ہاں! ایسا تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔ انسانی جسم میں گردن سے لے کر تالو تک کا حصہ بہت حساس اور اثر انگیز ہوتا ہے۔ پورے اعصاب' اذہان' وجود' جنس' نفاست' خباثت' لطافت' شرافت وغیرہ کی ساری وائرنگ' کنپٹی' گدی سے ہو کر گزرتی ہے۔ نالی بند پھٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ سپلائیاں بحال رکھنے سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔''

میں نے یہ مشق بہت دن وہاں رہ کر سیکھی۔ باکی آسن میں بیٹھ کر دونوں آنکھوں کے نیچے اُوپر کے پپوٹے اُلٹے کر لیے جاتے ہیں۔ تھوم کی تُریوں کی طرح سُرخ سُرخ پپوٹے سخت ڈھکن دیتے ہیں۔ پھر دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے کانوں کے سوراخ بند کر کے پہلی اُنگلیوں سے کنپٹی کو دبایا جاتا ہے۔ پہلے پہل تو پتا نہیں چلتا بعد جب کچھ مشق ہو جاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے اُنگلیوں کے نیچے ایک موٹی سی رگ پھڑ پھڑا رہی ہے۔ بس یہی رگ ہے جسے اگر کنٹرول کرنا آ جائے تو ذہنی فریکوئنسیوں کے بڑے نظارے ہوتے ہیں۔

ایک دن وہ مادہ چیتا مہا آتماجی کی گود میں سر رکھے لاڈ پیار کر رہی تھی۔ میں نے یونہی کہا۔

''انسان اور حیوان' دونوں کا فریکوئنسی سسٹم ایک سا ہوتا ہے یا مختلف؟''

جواب دیا۔ ''صرف تھوڑے سے فرق کے ساتھ' ایک سا ہی ہوتا ہے۔ جیسے انسان اور حیوان دونوں جاندار ہوتے ہیں لیکن تھوڑے فرق سے...... لو میں تمھیں ایک مشاہدہ کراتا ہوں۔ اُنھوں نے اپنے دونوں ہاتھ' مادہ چیتے کے کانوں پہ رکھے...... انگوٹھوں سے کانوں کے سوراخ بند کیے اور اُنگلیوں سے کنپٹی پہ بوجھ ڈالا۔ اس عمل سے لگتا تھا کہ وہ سو گئی ہے۔ تھوڑی دیر اُنگلیوں سے سہلانے کے بعد اُنھوں نے ہاتھ ہٹا کر اس کے سر پہ دو چار چپتیں جمائیں۔ وہ یکدم بیدار ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ ادھر اُدھر بچوں کو تلاش کرنے لگی۔ پہلے بچے تو اس کو دکھائی دیے۔ یہ اُلٹی فریکوئنسی والا بچہ' اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ مہا آتماجی نے اُسے دانستہ اپنے پاؤں میں چھپا رکھا تھا۔ دیوانہ وار اُسے ڈھونڈتی ہوئی وہ مہا آتماجی کے پاس پہنچی اور پاؤں سونگھنے لگی۔ بچہ' ماں کا التفات پا کر خوشی سے باہر نکل آیا۔ یہ اُسے منہ سے پکڑ کر باہر جنگل کی طرف بڑھ گئی۔

## • میں بھی رانی تو بھی رانی' کون بھرے گا پانی......؟

رانی اس دن کے بعد کچھ سے کچھ اور ہو گئی تھی' مایوسی' زندگی سے اُلجھن' اپنی غریبی' کم مائیگی' عورت بننے کا احساس' یکسر کہیں اُڑنچھو ہو گئے تھے۔ اُس کی اس تبدیلی کو گھر والوں کے علاوہ' ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں اور گاؤں کے دیگر لوگوں نے بھی واضح طور پہ محسوس کیا تھا۔ اب وہ ہلکی سی ہلکی بات کو بھی شدت سے لیتی تھی۔ اُس کی عزتِ نفس والی رگ اب کچھ زیادہ ہی پھڑکنے لگی تھی۔''

ایک روز ڈیوٹی سے واپس گھر لوٹی تو ایک حیران کن منظر' اُس کا منتظر تھا۔ متروک ماموں جان بمعہ ممانی صاحبہ اور چھوٹی بیٹی فرزانہ' چارپائی پہ براجمان ہیں ماں' مہمان نوازی میں جتی ہوئی ہے۔ والد صاحب بھی اپنی پہیوں والی کرسی پہ بیٹھے بات چیت میں مصروف ہیں۔ وہ یہ سین دیکھ کر دروازے کے نیچ کھڑے میں ہی

کسی بھیانک تصویر کی طرح گڑی کی گڑی رہ گئی۔ غضب و غیض کی بھسم کر دینے والی لہریں اس کے گرد ہالہ کیئے ہوئے تھیں۔ خفتے کی نے ہٹاتے ہوئے ماموں نے پہل کی......!

''آ گئی میری دھی رانی! ادھر آ' جیون جوگی' ڈوں بتاں سالاں وچ ای کنی وڈی ہوگئی اے؟''

اُس کا تو میٹر ہی گھوم چکا تھا۔ وہیں سے دھاڑی۔

''ماں! انہاں ظالماں قصائیوں نوں اج اے گھر کیویں یاد آ گیا؟''

ماں اُٹھ کر اُس کے پاس آ کر کہنے لگی۔

''دھی رانی! غلطیاں بندیاں کولوں ہو جاندیاں نے۔ ماما اے! بے اَج خود چل کے معافی منگن اتھے آ گیا اے' تے کج سانوں وی خیال کرنا چاہیدا اے۔'' وہ رانی کا ہاتھ پکڑ کر مامے کے پاس لے آئی۔

''پتر! مامے نوں سلام کر......!''

ماموں خود ہی اُٹھ کر اُس کے سر پہ ہاتھ دھر کر کہنے لگا۔

''ہم بڑی مصیبت میں ہیں عاطف کی جھوٹی شکایت کر کے' شریکاں نے وہاں سے نکلوا دیا ہے۔ یہاں کچھ دن پہلے شریکاں دشمناں نے اس پہ حملہ کروا دیا تھا۔ موٹر سائیکل بھی چھین لی اور مارا پیٹا بھی...... پتر! منگنی توڑ کر ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ پتا نہیں ایسا ہم سے کیوں ہو گیا؟ جو ہو گیا سو ہو گیا' ہمیں معاف کر دے! وہ جو کہتے ہیں صبح کا بھولا' شام واپس گھر آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے...... انشاءاللہ' ہم ٹوٹے رشتے اور دل پھر سے جوڑ لیں گے۔''

رانی' ماموں کی باتیں کانوں سے تو سن رہی تھی پر دل ہی دل میں ہنس بھی رہی تھی کہ لالچی اور غرض مند لوگ' اپنے مطلب نکالنے کے لیے کیسے کیسے پینترے بدلتے ہیں؟ ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنانا' شاید اسی کو کہتے ہیں...... وہ اپنی عبا اور چادر اُتارتے ہوئے بولی۔

''خدا کے لیے اَب تو جھوٹ بولنا بند کر دیں۔ آپ اور آپ کا بیٹا لاکھ بُرے سہی ہوں میری ماں تو آپ کو اچھا ہی کہے گی کہ آپ اس کے اکلوتے بڑے بھائی ہیں۔ رہا میرا باپ! تو اس حال میں ہی نہیں کہ اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہہ سکے۔ اَب رہی مَیں! تو مَیں نے اتنے دُکھ سہے ہیں کہ اَب مجھ میں منافقت کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔ مجھے بہو بنانے کا خیال' دل سے نکال دیں۔ مَیں اس قابل ہی نہیں کہ آپ جیسے عزت دار کے گھر کی عزت بن سکوں۔ آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ مَیں خاندانی منصوبہ بندی میں کام کرتی ہوں...... اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہم عورتوں کو کیسے کیسے مشورے دیتے ہیں۔ ہماری کوئی عزت نہیں کرتا۔ جس گھر جاتے ہیں وہاں کے مرد ہوس بھری نظروں سے ہمیں دیکھتے ہیں۔ ہم کہیں جا رہے ہوں تو ہم پہ

آوازے کسے جاتے ہیں۔ بیہودہ اور فحش جملے سننے کو ملتے ہیں۔ ہم لاکھ خوبصورت اور شریف ہوں کوئی ہمارا رشتہ لینے نہیں آتا۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات بتاؤں' مَیں اپنے کام کے سلسلے میں ایک گاؤں جا رہی تھی۔ صبح کا وقت' شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا کہ دُھوپ نکلنے سے پہلے اُدھر گاؤں پہنچ جاؤں۔ سنسان راستے پہ پیچھے سے ایک موٹر سائیکل والا آیا۔ مجھے زبردستی روک لیا کہ میرے ساتھ چلو۔ مَیں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ خوبصورت جوان' پینٹ شرٹ' عینک پہنے ہوئے کوئی شہزادہ لگ رہا تھا۔ میرے انکار پہ میرا بازو پکڑ لیا مجھے زورا زوری موٹر سائیکل پہ بٹھانے لگا۔ رب نے ہمت دی' مَیں نے اُسے' کس کے تھپڑ مارا۔ وہ بوکھلا کر بازو کے زور پہ گرا' اوپر موٹر سائیکل بھی آ پڑا' اُس کا بازو نکل گیا' ٹینکی سے پٹرول لیک ہونے لگا تھا۔ خیال آیا کہ اس بے غیرت کی موت' آگ سے لکھی ہے۔ مَیں نے فوراً ماچس نکالی...... پتا نہیں وہ کس طرح اُٹھا اور بے دریغ' بڑی سڑک کی جانب بھاگ گیا۔ ٹوٹا ہُوا بازو' اُس نے دوسرے ہاتھ سے تھاما ہُوا تھا۔ اُس بے غیرت نے اپنے نئے موٹر سائیکل کو بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ اُس کا دُھوپ والا چشمہ وہیں رہ گیا جو مَیں اس واقعہ کی یاد کے طور لے آئی اور موٹر سائیکل کا نمبر بھی......"

ماموں' بڑی گہری توجہ سے سُن رہا تھا' آخر بولا......!

"اُس بے غیرت کو تو پولیس کے حوالے کر دینا چاہئے تھا۔ مجھے اگر مل جائے تو مَیں اپنے ہاتھوں اُسے آگ لگا دوں۔ تمہارے پاس موٹر سائیکل کا نمبر ہے تو تھانے جا کر اُس کا پتا کرواتے ہیں اور جوتے پڑواتے ہیں۔ لاؤ مجھے نمبر دو' مَیں خود کچھ کرتا ہوں۔"

رانی نے کاغذ پہ لکھا ہوا نمبر اور دُھوپ کا چشمہ' ماموں کے حوالے کیا تو ماموں کی حالت دیکھنے والی تھی۔ اُسے چُپ لگ گئی!

رانی نے مزید بتایا کہ اُس بے غیرت' حرامزادے نے شراب بھی پی ہوئی تھی۔"

ماموں ممانی اس کے بعد جیسے کسی کنویں کے پانی میں ڈوب گئے تھے۔ زبان دانتوں تلے دبائے' نظریں چُرائے چُرائے سے جیسے کوئی رنگے ہاتھوں دھر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جتنی دیر یہ لوگ اِدھر رہے کھِچل کھِچل سے ہی رہے۔ شام سے کچھ دیر پہلے' جاتے وقت ہزار روپے مجھے دینے چاہے۔ مَیں نے واپس کر دیئے۔ اُن کے اُٹھنے کے بعد ماں نے کہا...... رانی بڑوں سے بدتمیزی نہیں کرتے۔ رانی نے تڑت جواب میں کہا۔

"تمہارا بھتیجا' میرے ساتھ جس تمیز سے پیش آیا تھا' اُس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ مَیں نے وہی کچھ بتایا جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا۔ کچھ بڑھایا' چڑھایا تو نہیں اور نام بھی نہیں لیا۔ اس میں

اگر اُسے اپنے بیٹے کی تصویر نظر آتی ہے تو ٹھیک ہی نظر آتی ہوگی۔"

مزے کی بات کہ عاطف نے اس واقعہ کو بالکل بدل کر اپنے باپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس سانحہ سے ایک روز پیشتر وہ اپنے دوست کی شادی میں شرکت کا بتا کر بارہ کوس دور ایک گاؤں میں پہنچا تھا۔ ایسا پکے پیروں کا جھوٹا اُس بے پر کی فاختہ اُڑائی کہ بیس ہزار روپے بھی باپ سے لے لیے بتایا ایک میرا بڑا اچھا ہمدرد دوست ہے اُس نے مجھ سے یورپ لے جانے کا وعدہ کیا ہے۔ اٹلی میں اُس کے بھائیوں کے شوارما کے کاروبار ہیں۔" بھولے ماں باپ اپنی سادگی میں مکار اولاد کے چکر میں آ جاتے ہیں۔ نئے کپڑے نیا موٹر سائیکل اور بنک سے نکلوائے ہوئے نئے نئے نوٹ جیب میں ڈالے بڑا ہشاش بشاش گھر سے نکلا تھا۔ شادی وادی کا تو محض بہانہ تھا۔"

اصل میں اُس گاؤں کے زمیندار امیر گھرانوں کے چند ایک اوباش لڑکے اس کے نئے نئے دوست بنے...... ان میں دولڑکے وہ بھی جو اس کے ساتھ ڈی پورٹ ہو کر آئے تھے۔ باقی دوسرے وہ جن کے لیے راوی نے عیش ہی عیش لکھا' پانچوں عیب شرعی اور مادر پدر آزاد......!

گاؤں سے ہٹ کر ایک کشادہ اور محفوظ حویلی ان کی آماجگاہ تھی۔ محفوظ اس لیے کہ گاؤں والوں کی نظر میں یہ ایک ایسا دفتر' جدھر سے لوگوں کو باہر کے ملکوں میں ملازمت کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ ہر وقت' ایک دو موٹر کاریں یا موٹر سائیکل کھڑے نظر آتے تھے۔ آنے جانے والوں میں زیادہ تر نوجوان' اَپ ٹو ڈیٹ...... چند کڑی نگاہوں والے ملازم بھی جو نمبرداری اور چوکیداری پہ مامور تھے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور؟ باہر سے کسی خوشحال چند کی صاف ستھری پکی حویلی دکھائی دینے والی اس عمارت کے بیچوں بیچ زمین دوز' ایک عالیشان عیش وعشرت کے ہر سامان سے آراستہ' بڑا سا ہال اور ایک علیحدہ کمرا جو حوالات تھا۔ ان تک رسائی کے لیے اندر اور باہر خفیہ راستے تھے لیکن ان راستوں پہ چل کر' اس عشرت گاہ اور عقوبت گاہ تک پہنچنے والے بہت کم تھے۔ دراصل نیچے کی کمین گاہ' کسی سے چھپنے لکنے کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی اور نہ اِدھر کوئی جرائم پیشہ لوگ' قانون سے بچنے کے لیے پناہ لیتے تھے۔

باپ دادا کے وقتوں میں یہ جگہ دراصل' بطور گودام' استعمال ہوتی تھی۔ ان کے مرنے کے بعد حالات بدلے اور ناخلف اولاد نے اس جگہ کو اپنی عیش و عشرت کے لیے وقف کر لیا۔ زمیندار چھوڑ کر کسی نہ کسی طور' اٹلی میں جا بسے تھے۔ بظاہر کاروبار کھانے پینے' شوارما' کبابوں کا' مگر پس پردہ' اصل دھندہ انسانی اسمگلنگ تھا۔ علاقے کے سیدھے سادے' معمولی پڑھے لکھے جوان' جو باہر جا کر اپنا مستقبل بنانے کے چکر میں ہوتے...... ان کی ہمدردی کے سنہرے جال میں پھنس جاتے' اپنی زمینیں' مویشی بیچ کر ان کی مطلوبہ رقم فراہم کرتے اور یہ

اُنہیں ملکوں ملکوں ذلیل وخوار کرتے' کرواتے' جعلی کاغذات پاسپورٹوں اور ناموں کے ذریعہ باہر بھجوا دیتے۔ پانچ بھائیوں میں دو چھوٹے غیر شادی شدہ' جو نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے خوبرو تھے۔ انہوں نے ادھر گاؤں میں ہی اڈّہ بنا لیا ہوا تھا' گھر میں بھینس بندھی ہو تو باہر سے دودھ لانے کی کیا ضرورت؟ یہاں کا سارا ہیر پھیر' لین دین' کام دھندہ انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔ سال میں ایک آدھ بار اٹلی یورپ کا چکر بھی لگا آتے یعنی اس غیر قانونی کاروبار کے اصل حرکتی پُرزے یہی تھے۔

عاطف کو بھی اُنہوں نے ہی باہر بھجوایا تھا۔ مگر بدقسمتی سے عاطف' وہاں غلط لوگوں میں بیٹھنے اُٹھنے لگا تھا۔ شروع کا کچھ عرصہ دل لگا کے محنت کی' گھر بھی پیسے بھیجے' قرضہ بھی اُتارا۔ پھر دھیرے دھیرے اُس میں ایسی بُرائیاں پیدا ہو گئیں جو صحت' اخلاق کے علاوہ جیب' عزت اور ایمان کو بھی کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ نیا نیا پیسہ' آزادی' جوانی' غلط صحبت وغیرہ وا یسا رنگ لائیں کہ شراب' پانی کی طرح پینے لگا۔ سگریٹ تو پہلے سے ہی پیتا تھا اب جوئے میں بھی ہار جیت کرنے لگا۔ دیکھا دیکھی یہاں کی ایک بدچلن عورت سے بھی تعلقات بڑھا لیے کہ کاغذی شادی کر کے' یہاں قانونی طور پہ قیام کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ اس پیشہ ور بدقماش عورت کا کام ہی بیوقوف غیر قانونی پاکستانیوں کو لُوٹنا تھا۔ وہ نام نہاد شادی کی آڑ میں کمائی کا ایک بڑا حصہ اس سے بٹورنے لگی تھی۔ شراب' جوا اور دیگر عیاشیاں بھی اس کے سر چڑھ کے کرتی یہاں تک کہ ایک ناجائز بچّی بھی اس کے نام کر کے' اُس کا خرچہ بھی اس پہ ڈال دیا تھا۔

عیاشیوں' بدقماشیوں میں دولت' پَر لگا کر اُڑتی ہے۔ آئی چلائی ایسی کہ کمائی آدھ پاؤ' خرچے صرفے ڈیڑھ سیر' وسائل کم اور شیطانی شغل بہتر...... ظاہر ہے کہ ان میں توازن رکھنے کے لیے چار و ناچار' غیر اخلاقی غیر قانونی حربوں پہ مجبور ہونا پڑتا ہے لیکن اصل بدقسمتی تب شروع ہوتی ہے جب ناجائز وسائل وحصول سے دھڑا دھڑ دولت آنی شروع ہو جاتی ہے۔ نادان بندہ سمجھتا ہے کہ قسمت مہربان' بندہ پہلوان ہے۔ پتا تب پڑتا ہے جب چمن میں ہر سُو داستانِ حسرت بکھری پڑی ہوتی ہے۔"

روشن دنوں کی تلاش میں اس کی بداعمالیوں' بے اعتدالیوں' جوئے کے قرضوں کے انبار لگتے چلے گئے...... اُدھر دو نمبر کاغذی گوری بیوی اور اُس کی نطفہ' نا تحقیق بچّی کے مسائل میں ایسا اُلجھا کہ ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔ غصّہ' ذہنی تناؤ ایسا بڑھا کہ ادھر ایک مقامی بدقماش سے اُلجھ بیٹھا' وہ اُس کی کاغذی بیوی کا کوئی سابقہ بوائے فرینڈ تھا۔ عاطف نے ٹکر مار کر اُس کا نتھنا کھول دیا۔ معاملہ پولیس تک جا پہنچا...... نتیجہ یہ نکلا' اس پہ بیک وقت تین چار مقدمات بن گئے۔ جن میں غیر قانونی طریقے اور بوگس کاغذات پہ یہاں پہنچنا...... بغیر لائسنس ڈرائیونگ کرنا...... نشے کی حالت میں دنگا فساد اور ایک شخص کو شدید زخمی کرنا۔ مرے پہ سو دُرّے

کے مصداق' اُس فاحشہ عورت نے بھی' کھا چاٹ کر اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرادی تھی۔ پولیس نے نصف شب چھاپہ مار کر اسے اور اس چار پانچ ساتھیوں کو' جوا کھیلتے ہوئے' شراب اور گانجے کے نشہ میں دُھت گرفتار کر لیا۔ ان کے قبضے سے پاکستانی چرس' گانجا ہیروئن وغیرہ بھی برآمد ہوئیں...... کورٹ میں پیش ہوئے' کچھ عرصہ جیل میں اور بالآخر ڈی پورٹ کر دیے گئے۔ جنہوں نے' اُنہیں اِدھر پہنچایا تھا' اُن کے اچھے خاصے واجبات ابھی' اس کے ذمہ تھے اور وہ رقوم بھی جو عاطف میاں نے قرض لے کر پاکستان بھیجیں یا جوئے میں ہاری تھیں۔

پاکستان پہنچنے پہ ان کے لیے جیل تیار تھی وہ تو بہتر ہُوا کہ چالیس پچاس ہزار کے حربے خرچے سے ان کی جان بچ گئی۔ یہاں سب یہی جان پائے کہ یونان والوں نے قانون سخت کر دیا ہے۔ غلطی سے پکڑے اور واپس وطن آ گئے ہیں۔ کاغذات اور ویزے صحیح کرنے کے بعد بہت جلد واپس چلے جائیں گے۔ نکالے جانے کی اصل وجوہات کا سوائے چند متعلقہ لوگوں کے اور کسی کو پتا نہ چل سکا۔

عاطف کے والدین کے پاس' ابھی اس کے بھیجے ہوئے پیسوں میں کافی رقم موجود تھی اور وہ اِن کے بل بوتے پہ اس کی شادی کسی اچھی جگہ کرنے کی سوچ رہے تھے۔ مگر اس دوران' اُنہیں احساس ہُوا کہ اس کے لچھن کچھ ٹھیک نہیں۔ سگریٹ کی بُو' اس کے کپڑوں' منہ سے محسوس ہوتی' شراب کا بھی شک تھا۔ جب دیر سویر دوستوں سے مل کر گھر پہنچتا تو اس کے قدم بہکتے ہوئے لگتے۔ آمنا سامنا کرنے سے اجتناب کرتا...... بد بُو کے بھبکے اُٹھ رہے ہوتے۔''

## ● چاندنی دیرپا نہیں ہوتی......!

اِن ڈی پورٹ ہونے والوں کی آمد سے حویلی کی رونق میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا تھا۔ جُوا' چرس' شراب تو روزمرہ کے معمولات میں شامل تھے۔ اکثر بیشتر' دو نمبر لڑکیاں بھی' باہر جانے کی آڑ میں یا کسی کی بہن بھابی کے رُوپ میں آتی جاتی رہتیں۔ نزدیک دُور کے دیہاتوں کی ایسی نئی نئی بھولی بھالی لڑکیاں' جو کسی لڑکے کے جھوٹے پیار میں پھنسی ہوتیں' اُن کو بھی بدقسمتی کسی طرح' ان بھیڑیوں کے زمین دوز بھٹ میں لے آتی۔ کئی ایسے باہر ملکوں میں جانے کے بیتاب لڑکے' جو پوری رقم کا بندوبست نہ کر سکتے۔ اُن کے لیے یہ بھی سہولت تھی کہ وہ کسی لڑکی کا انتظام کر کے اِدھر لائیں۔

ٹارگٹ کلنگ کی طرح یہاں ''ٹارگٹ گرل'' کا چلن بھی بڑھ چکا تھا۔ آس پاس کے علاقوں کی کوئی

خوبصورت کڑی جوان دونوں بھائیوں کی نظر میں آ جاتی۔ اُسے عیاشی کے لیے حاصل کرنا' ان کے وقار کا مسئلہ بن جاتا۔ یہاں ایسا بھی ہوا کوئی سُورما ''ٹارگٹ کڑی'' کسی نہ کسی طرح اِدھر لانے میں کامیاب ہوا' وہ کچھ ہی دنوں میں باہر بھجوا دیا گیا۔

اس طریقے کے تحت اِدھر لائی یا آئی ہوئی لڑکی عورت سے ''اجتماعی باریابی'' ہوتی۔ یعنی ایک ''نار'' اور نو زناکار...... مغل اعظم کے دربار کے نورتنوں کی طرح' یہاں اعظم مغل اور ناظم مغل کے مشترکہ دربار میں بھی نورتن تھے۔ مغل اعظم کے نورتن' اپنے اپنے علم وفن کے نادرِ روزگار' زرنگار گوہر جو ہر تھے مگر اس چینڈو دربار کے نورتن بھی اپنے اپنے فن وکمال میں یکتائے روزگار تھے۔ باصر' عرف بصرا...... کتنے کے شوقین مرغے کو کلغی کی آرائش اور پیٹ کی آلائش' پروں اور پنجوں کی جڑوں سمیت' آگ پانی دکھائے بغیر دَم پخت کرنے کا ہنر جانتا تھا...... کلائنٹ میں ملک سے باہر پہنچ کر دولت عزت بنانے کی خواہش کو کچھ اس انداز سے ہوا دیتا کہ وہ ابتدائی فیس' پاسپورٹ اس کے قدموں میں رکھ کر زیور زمین بیچنے چل دیتا۔ بصرا' یورپ یونان سے دلچسپی رکھنے کا انچارج تھا۔

دوسرا رتن' مسکین عرف مسکینا مصلی' اس کے لمبوترے چہرے پہ ایسی گہری مسکینی تھی' لگتا تھا کہ سوچ کر کے بھی آنکھ اُٹھا' چوہے کو نہ دیکھے۔ ''میں تے مسکین بندہ آں'' اس کا تکیۂ کلام تھا۔ سعودیہ' دبئی' شارجہ قطر اس کے کھاتے میں آتے۔ سعودیہ میں مزدوری کرنے والوں کے سَر پہ باندھنے والا عربی رومال' چندی آنکھیں' پیلے ڈِڈُو دانت اس کا شناختی کارڈ تھے۔ بس ایک خوبی تھی شراب نہیں پیتا تھا۔ صرف اس سے نکلی کرکے نسوار ڈھرتا...... یہ نئے پھنسنے والوں کو غلط سلط آیتیں مفت میں حج عمرے کی نوید' اسلامی شرعی ماحول' کھجوروں اور آبِ زم زم کے فائدے سنا سنا کر ثوابِ دارین حاصل کرنے میں یکتا تھا۔ اس کا ڈسا ہوا' پانی نہیں آبِ زم زم مانگتا تھا۔ اپنے بدنام علاقہ تکیۂ کلام سے خوب فائدہ اُٹھانا جانتا تھا اور اپنی غلطی کوتاہیوں' کمزوریوں پہ بطور ڈھال استعمال کرتا بھی آتا تھا۔ کمال کا کمال کہ ''اجتماعی باریابی'' میں' اپنی باری پہ ''مصروبہ'' سے گویا ہوتا۔ ''میں تے مسکین بندہ آں' میرے نال کوئی زیادتی نہ کرنا۔''

تیسرا انمول اور بے تول رتن پرویز کھوکھر تھا۔ اپنے پرائے چھوٹے بڑے ہر کوئی اسے ''چاچا حرام دا'' کہہ کے مخاطب ہوتے اور اگر کوئی غلطی یا اپنی کسی مادی یا اخلاقی مجبوری سے' اُسے پرویز صاحب کہہ دیتا' اوّل تو اُسے اپنے کانوں پہ ہی یقین نہ آتا اور اگر آ بھی جاتا تو وہ شخص اس کی نظر میں مشکوک ہو جاتا۔ اس بیک نیم کا گفٹ' دراصل اُسے اپنے سوتیلے باپ کی جانب سے' عالمِ شیرخوری میں مراحمت ہوا تھا۔ نکاح کے وقت یہ اپنی دلہن ماں کی گود میں دودھ چُسک رہا تھا۔ اس کے سوتیلے دولہا باپ نے اس عمرو عیار' فطرت بچّے کو دیکھتے

ہی ''حرام وا'' کے گرانقدر القاب سے نواز دیا تھا۔

وہ وقت اور یہ وقت' لیاقت' یعنی اس کے سوتیلے باپ' لیاقت کھوکھر نے اسے ''بیچا حرام وا'' کہہ کر ہی پکارا..... دس جماعتیں' اس نے رُل کھل کے پاس کر ہی لیں۔ شاطر شیطانی دماغ' حساب کتاب میں ریشم کا کیڑا..... بول تول میں چھلکا اچھول..... بندہ جانچنے ناپنے ماپنے میں پورا رتی ماشہ تولہ کھوجا شیخ..... یہ اس کاروبار میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہر کلائنٹ سے کوئی نہ کوئی رشتہ قائم کر لیتا۔ کوئی بھائی' بھتیجا' چاچا' بابا' ماموں' خالو..... کہیں کبھی کسی کچے کلائنٹ کے ہمراہ' اس کی ماں' بہن بیوی اگر آ نکلتیں' تو وہ بھی کوئی نہ کوئی رشتہ قائم کروا کر ہی جاتیں۔''

چوتھا رتن' بابو انور باجوہ تھا۔ یہ بلا کا قانونی ذہنیت اور قابلیت کا چلتا پھرتا پُرزہ تھا۔ باقاعدہ قانون تو اس کے خاندان میں کسی نے پڑھا نہ ہوگا یہ کیا پڑھتا؟ روزی رزق کا ٹھنڈا ہوا' بائیں ٹانگ سے معذور ایک بوڑھے وکیل کے ہاں بطور منشی' چھ سات برس کام کیا..... مزید بھی کر سکتا تھا مگر کیا کیجیے کہ وہ وکیل ایک رات ایسا سویا کہ اگلی صبح جاگا ہی نہیں۔ اس کے باوجود یہ وہاں سے بھاگا بھی نہیں۔ وکیل کی اکلوتی' کلوٹی اور بے حد موٹی بیٹی' فرح! جو کسی معقول مرد سے شادی کے اہل نہ تھی' اس پہ نگاہ رکھتی تھی۔ وکیل صاحب کے پیش نظر بھی شاید یہی خواہش رہی ہوگی کہ یہ نیم خواندہ' نیم چینڈ ' جینٹ شرٹ پہننے کا شوقین نوجوان' گھر داماد بن کر ان کا بڑھاپا آسان کر دے گا۔ مگر یہ تو یہاں محض ٹھکانے اور مختانے کی خاطر پڑا ہوا تھا۔ شادی وادی سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ دفتر خالی ہوا تو یہ ایک دوسرے وکیل کے پاس ملازم ہو گیا۔ اس وکیل کی شہرت' فراڈ' جعل سازی' عشیات' دھوکہ دہی کے مقدمات نبٹانے میں تھی۔ یہ خود بھی شرابی کبابی اور شبابی تھا۔ شکل وحلیہ سے وکیل کم' سٹہ اور رذیل زیادہ لگتا تھا۔ ہر وقت ہلکے ہلکے نشہ میں رہتا۔ اس کا تکیہ کلام'' کوئی مسئلہ نہیں'' تھا۔ ہر بات کے جواب میں پہلے یہی کہتا۔ اس کے سارے کارندے بھی' اسی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

رہی سہی کسر' انور باجوے کے شامل ہونے سے پوری ہو گئی۔ یعنی ادھر سب ایک سے ایک بڑھ کر اُستاد تھے۔ اصل تربیت' اس کی ادھر ہی ہوئی تھی۔ یہ انسانی اسمگلنگ والے' کسی نہ کسی طور' اسے وہاں کچہری سے نکال کر اپنے ہاں لے آئے۔ یہ کلائنٹ کے ذومیسائل کاغذات' بنک کے جعلی اکاؤنٹ' تعلیمی فنی' کریکٹر اور صحت کے سرٹیفکیٹ' غیر ملکی کرنسی' ویزوں ٹکٹوں کے بندوبست کا ذمہ دار تھا۔ جھوٹ' منافقت' چاپلوسی اور وقت موقع کے مطابق' حالات پیدا کر لینا اپنی کسی غلط حرکت کو کسی نہ کسی طور یا دلیل سے صحیح ثابت کر دینا' اس کا اَدنیٰ سا کمال تھا۔''

اس فراڈیے وکیل کے ہاں بھی اس نے تین چار برس نکال لیے۔ اس دوران اس نے ایسے

پڑ پڑ زے نکالے کہ اس کا باس وکیل بھی ایک وقت میں اس سے مشاورت کرنا ضروری خیال کرتا۔ اس کے پاس اگر باقاعدہ ایل ایل بی کی ڈگری اور لائسنس ہوتا تو یہ اپنے وقتوں کا کامیاب ترین وکیل ہوتا۔ بس کیا ہوا' کہ کچھ زیادہ کے چکر میں اس نے بھی اپنا دانہ پانی سمیٹا اور ادھر' گاؤں میں ریکروٹنگ کے دھندے میں دھنس آیا۔ یہاں ایسا کیش اور عیش' جس کا کبھی وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے ڈاکومنٹ پہ ایک کو ایک سو گیارہ' لکھ کو لکھ' مجرم کو محرم' دائیں کو بایاں' دسمبر کو نومبر' چنگیز کو چیمہ' شبیر کو بشیر' سیالکوٹ کو شاہ کوٹ بنانے میں ید طولی حاصل تھا۔ ہر محکمہ میں ماننے جاننے والے' جو اس جادوگر کے اک اشارے پہ ہر ناممکن کو عین ممکن بنانا جانتے تھے۔ منشیات' جوا اور عورت اس کی کمزوریاں تو تھیں مگر دیکھنے سونگھنے سے ایسا معقول شریف سا جوان دکھائی دیتا۔ جس میں انسانی ہمدردی اور بھلائی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ بات چیت بھی بڑی رسیلی' دل موہ لینے والی...... ایسی ٹھنڈی آگ' دیکھنے تاپنے سے سکون' مگر قریب ہونے سے جلا کر خاکستر کر دے۔

پانچواں رتن' کرامتا بے وسایا تھا۔ بے وسایا' اس لیے نہیں کہ اس کے باپ کا نام اللہ وسایا تھا' اس کی اصل وجہ' یہ کسی پہ بھی وساہ یعنی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک اسے خود پہ بھی اعتماد و اعتبار نہیں تھا۔ کوئی بھی معاملہ ہو یہ ضرور کہے گا...... ''یار! میں ذرا بے وسایا سا بندہ ہوں' اعتبار تو میں سگے باپ پہ بھی نہیں کرتا۔'' اس کی وجہ شاید' اس کا پولیس ملازم ہونا بھی تھا۔ یہ اپنے علاقے میں کمن چالان پہنچانے اور تفتیشی کارروائیوں پہ متعین تھا۔ سال میں کہیں دو چار بار' سرکاری وردی پہنتا' ورنہ اکثر یہ عام لباس میں ہی ادھر اُدھر دکھائی دیتا۔ پولیس ملازموں کی ذہنیت' اس میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چونکہ تھانے' کچہری تحصیل اور یہ غیر ممالک میں بندے بھیجنے کا دفتر' اس کے ٹھکانے تھے۔ اس کا ایک خاص کام' یہاں کی غیر قانونی اور مخرب الاخلاق سرگرمیوں کو تحفظ دینا بھی تھا اور ان پارٹیوں سے نپٹنا بھی جو تسلی بخش کام نہ ہونے کی صورت میں تھانے عدالت کی دھمکیاں دیتیں یا وہ لوگ جو غنڈہ گردی دکھاتے۔

اسے علاقے کے اُن تمام مسلم' غیر مسلم' جرائم پیشہ' سزا یافتہ' منشیات فروش' چور ڈکیتوں کا علم تھا۔ بظاہر اُن سے دوستی یارانے تھے مگر حقیقت یہ تھی یہ انہیں بلیک میل کرتا اور اُن سے اپنا حصہ بھی وصول کرتا۔ ایک دو جعلی پیر جو تعویذ گنڈے کا دھندہ بھی کرتے تھے۔ اس کے خاص ذہر تھے۔ مطلب یہ کہ منشیات' جوا' کا سارا انتظام اسی ''کرامتے بے وسائے'' کے دم قدم سے قائم تھا۔

چھٹا رتن' فاضلا'' شورا''...... تعلق اسی گاؤں کے مراثی گھرانے سے' مگر کمال ڈھٹائی سے خود کو قریشی کہتے ہوئے نہ شرماتا' جبکہ باپ' جاما مراثی اور دیگر بھائیوں رشتہ داروں کے ساتھ مراثی کا لاحقہ پکا ٹھکا ہوا تھا۔ بیس بائیس برس کا بانکا چھبیلا سا جوان' جنس مخالف کے لیے بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ خاص طور پہ اس کی

کٹیلی غلافی آنکھوں میں لگاوٹ کی ایسی مقناطیسیت تھی کہ مقابل کے قلب ونظر میں شہوانی اور نفسانی تلذذ کا موجب بنتی تھی۔ انسانی تاریخ اور عشق ومحبت کے حوالوں سے معلوم ہوا کہ یہ طالب ومطلوب کی نفسی بطونی کیفیات وترجیحات پہ منحصر ہے کہ ان پہ نفسیت غالب ہے یا رُوحانیت...... اُن کے تصور میں اجنتا ایلورا کی گھپائیں ہیں یا غار حراء اور غار ثور کی تجلیاں ہیں۔؟

فاضلے شورے کو''شورا''اس لیے کہتے تھے کہ اس میں بے غیرتی کچھ زیادہ ہی ڈرآئی ہوئی تھی۔ جس گلی محلے سے گزرتا...... ایک آدھ لڑکی ضرور شکار کرتا...... یہ شکار نہ بھی کرتا وہ بدنصیب خود ہی کچے دھاگے میں بندھی ہوئی پیچھے پیچھے چلی آتی۔ کچھ لوگوں کے نصیب میں رزق حلال نہیں ہوتا۔ کوشش کرلیں تب بھی سرکہ ان کے پاس پہنچتے پہنچتے شراب بن جاتا ہے وہ کسی کو باجی بہن بھی کہہ دیتا تو جواب ملتا۔ بہن وہی ہوتی ہے جو ایک پیٹ سے پیدا ہوئی ہو؟

آر پار کی کئی لڑکیاں گھر سے بھاگ کر اس کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ وہ ان سے جان بچا کر خود کہیں بھاگ نکلتا۔ آخر مرد بھی تو ایک انسان ہوتا ہے اُس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تیار شی کی ہوا پہ علاقہ کے تمام کتے اُس کے آگے پیچھے منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ بیچاری اپنی جان بچاتی پھرتی ہے مگر اس کی کوئی پیش نہیں چلتی...... دیر بدیر ہمت ہار کر وہ خود کو ان کے رحم وکرم پہ چھوڑ دیتی ہے...... نتیجہ نکلتا ہے تو رنگارنگ ورائٹیوں والے چھ سات پلے اُس کے آٹھ سلنڈروں والے تھنوں سے چمٹے ہوتے ہیں جبکہ ذمہ دار کمینے کتوں کا قریب وجوار میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔''

یہاں معاملہ اُلٹ تھا۔ جانوروں مویشیوں کے موسم ہوتے ہیں لیکن حرص وہوس کے بندوں کے لیے راوی موسم ہی موسم لکھتا ہے۔ صحت ہمت ہے تو موسم...... دولت اور شہرت ہے تو موسم...... راحت خوشی ہے تو موسم...... غمی آزردگی ہے تو موسم...... عید شب برأت ہے تو موسم...... بہار کا نکھار یا خزاں کی خشونت بھی موسم! موجی بے موجی کچی پکی چیلی ہری موسمیاں اس پہ ٹوٹتی رہتیں...... کھانے پینے کو وافر مل جائے تو دوسروں کو بھی دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا جاتا۔ شروع شروع میں تو اس کے ہاں لڑکیاں مختلف زوایوں میں آتی جاتی رہیں۔ رسّی دراز ہوئی تو ادھر کے دیگر دوستوں نے بھی زن غنیمت میں اپنا حصہ طلب کرنا شروع کیا...... اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کچھ وقت لگا اب وہ اپنا نخچیر ساتھیوں دوستوں میں شیئر کرتے ہوئے کوئی حجاب تکلف نہ کرتا۔ ویسے بھی ادھر مل بانٹ جیو اور جینے دو جیو اور پینے دو جیسے اصولوں پہ عمل ہوتا تھا۔ بنا اس کے یہاں کا سسٹم نہیں چل سکتا تھا؟

اردگرد علاقوں کی ضرور تمند بگڑی ہوئی لڑکیاں اپنے والدین کی آنکھوں میں دھول جھونک مختلف

بہانوں حیلوں سے' بھٹکی ہوئی کشتیوں کی طرح اِس واشنا گھاٹ پہ آ لگتی تھیں۔ ایک ہو یا دو تین...... اِدھر آٹھ دس بھجیریوں میں تقسیم ہو جاتیں۔ صبح صبح' یا اپنے پرس نوٹوں سے بھر کر اور اپنے کسی بھائی یا محبوب کے ویزے کا وعدہ لیئے اپنے ٹھکانوں کی جانب نکل جاتیں......!

فاصلے کے ساتھ شورے کا لاحقہ' اِس کی اِنہی خدمات کا اعتراف تھا۔ وہ بھی بُرا نہ مانتا...... کہتا' میں اکیلا ہی نہیں تم سب میری طرح شورے ہو۔ بس' نوعیت مختلف ہے؟

جب کوئی شورا ہو جاتا ہے تو اُس میں سب سے پہلے غیرت' شرم حیا جاتی رہتی ہے۔ حرام حلال' شرع شریعت' اپنے پرائے کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ عورت کا احترام تقدس' زبان قلق وغیرہ بے معنی سے ہو جاتے ہیں۔ ہیرا منڈی' تھانے کچہری' دکان بازار' کسی بھی جگہ...... کنجری رنڈی کی تو کوئی عزت ہو سکتی ہے مگر اُن کے لیے گاہک پھانسنے والے' ڈنے بجڑوے' شورے کی نہیں ہوتی۔ شورا ذلاً تو ضرورت پڑنے پہ' اپنے گھر کے باردانہ کے لیے بھی گاہک تلاش کرنے میں چنداں حیا محسوس نہیں کرتا!

میرا مشاہدہ ہے کہ شورے کی بیوی بیٹی' اوّل تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوں بھی تو وہ کمیٹیوں کے پیسے خود اپنی جسمانی مشقت سے بناتی ہیں۔ بے غیرت خاوند سے یہ کچھ چُھپا نہیں ہوتا۔ کمیٹی نکلنے پہ اگر خاوند نے کچھ مانگ لیا تو یہی سننا پڑتا ہے'' یہ ہم ماں بیٹی کی کمائی کی کمیٹی ہے...... تیری کمائی سے تو کبھی چولہا بھی صبح سے گرم نہیں ہوا...... تجھے جوان بیٹی کی شادی کی فکر نہیں' پر مجھے تو ہے۔''

فاصلے شورے کی اپنے گھر بھی تین بیٹیں تھیں' ایک شادی شدہ' دوسری شہزادی جو میٹرک پاس کرنے کے بعد' رانی کے ساتھ ہی فیملی پلاننگ والوں کی ٹیم میں شامل ہوئی تھی۔ تیسری ابھی کمسن تیسری کلاس میں پڑھتی تھی۔ شہزادی' رانی کی پکی سہیلی تو نہ تھی ایک ساتھ ٹریننگ لینے کی وجہ سے کچھ اُنسیت تھی۔ اکثر ملنا ملانا بھی رہتا جو اتفاقی طور پہ ہوتا۔ آس پاس کے آٹھ دس میل' اندر کے چھوٹے بڑے گاؤں' اِن کی کارروگی کی حدود میں تھے۔ ہفتہ دس دن میں کسی گاؤں گھر' کہیں نہ کہیں آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ مسکراہٹوں کے تبادلے' حال احوال...... وہ اپنی راہ...... یہ اپنی راہ......!

● زہر کہتے ہیں خود اپنی دوا ہوتا ہے......!

ایک دن' جسے روزِ سیاہ کہنا چاہیے۔ رانی کی ملاقات' شہزادی کے بالکل ساتھ والے گاؤں کی ایک گلی میں ہو گئی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا کر' گھروں کو جانے کے لیے نکلی تھیں۔ سہ پہر' سر نکالے شام کو

دیکھ رہی تھی۔ حبس..... اُمس نے اک پژمردگی پھیلائی ہوئی تھی۔ رانی نے چاہا کہ تیز قدموں سے جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ جائے مگر وہ لمحہ' نا آسودہ اس سے پہلے پہنچ چکا تھا جو بعد میں اس لیے بڑا کٹھن وقت لے کر آیا۔ شہزادی اسے اچانک سامنے پا کر "ہائے نی رانی توں؟" کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ پسینے سے دونوں تر بتر تھیں۔

شہزادی نے اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"رانی جی! اتھے کتھے؟"

رانی نے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے بمشکل جواب دیا۔

"نی اے چھیدے نائی دے گھر آئی ساں' دسویں بچے دی تیاری اے..... پتا نہیں انہاں نوں سمجھ کیوں نہیں آوندی؟"

"دفع کر انہاں نوں' چل میرے نال وہ سامنے میرا گھر ہے۔ جھٹ بیٹھ تے ٹھنڈا پانی پی.....!"

"نہیں اڑیے! میں گھر جلدی جانا اے۔ گرمی تے حبس نے اج ساہ ست ای کھچ لیا اے' فیر کدے سہی!"

مگر وہ ضد کر کے اُسے ساتھ لے ہی گئی۔ ایک گلی اور دو کھیت درمیان میں تھے۔ چار پانچ منٹ لگے وہ اُن کے صحن میں تھی۔ چھوٹا سا چینڈو سٹائل گھر اور وہ بھی مراثیوں کا..... اُس کی بے بے نے بڑے چاؤ سے اسے وچھی واری کیا..... گھر کی لسی پلائی' ماں باپ بہن بھائیوں کا پوچھا۔ اسی دوران کہیں فاضلا شورا' نئی نویلی لشکتی موٹرسائیکل سمیت صحن میں داخل ہوا۔ دیہاتی گھروں میں کنڈی کھڑکانے کا رواج تو ہوتا نہیں۔ سیدھے اندر آنے والی بات ہوتی ہے۔ نہ اُسے خبر کہ اُس کی بے بے بہن کے پاس کون بیٹھی ہے اور نہ رانی جانتی تھی کہ ایک خوبرو سا نوجوان پھڑپھڑ کر کے اُس کے سامنے آ جائے گا۔ بالکل ایک فلمی سین کی طرح یہ سب کچھ ہو گیا۔ چند ثانیے اُنہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا' پھر وہ موٹرسائیکل کھڑی کر کے اندر چلا گیا۔ یہ ہڑابڑی میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شہزادی نے ہاتھ بڑھا کر بٹھانا چاہا مگر وہ نہ بیٹھی..... چہرے کا حجاب درست کر باہر نکل آئی۔

اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ نہیں کہ اُس کا واسطہ کبھی اچھے بُرے انسانوں سے نہیں پڑا تھا۔ اُس کا تو کام ہی اپنے گھر گاؤں سے باہر دوسرے لوگوں سے ملنا تھا۔ ایسے گھروں میں بھی جانا پڑتا تھا جدھر مرد بھی ہوتے تھے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گھبرا یوکھلا یا ڈر خوف سے اُدھر جانا ہی چھوڑ دے۔ ٹریننگ کے دوران انہیں خاص طور پہ خود اعتمادی اور بُرے حالات' شرارتی لڑکوں' بدنگاہ مردوں سے نپٹنے اور خود کو اُن کے شر سے بچانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ پر آج نجانے اُسے کیا ہو گیا تھا' خود کو بڑی کمزور اور ڈری ڈری سی

محسوس کر رہی تھی۔ ٹریننگ کے دوران سیکھا سکھایا کچھ بھی تو اُسے یاد نہ رہا...... وہ جلدی جلدی پگ اُٹھاتی ہوئی گاؤں کی پگڈنڈی پہ دُھول رولتی ہوئی جا رہی تھی۔ گھر تک پہنچنے میں ابھی شاہوں کا اُمرودوں کا ذخیرہ...... کھتوں کا باغ...... پرائمری سکول' بابے سردار شاہ کا تکیہ...... عیسائیوں کا چھوٹا پنڈ اور اُس کے اپنے گاؤں کا قبرستان' چھپڑ وغیرہ باقی تھے......!

اِن راستوں پہ وہ بچپن سے گزرتی آ رہی تھی' پر آج لگتا تھا یہ کوئی اجنبی سی راہیں ہیں...... راہ کے نوے' نموز' درخت بُوٹے' کھیت کھلیان بھی اَن دیکھے سے دکھائی پڑتے تھے۔ گرمی تو ویسے بھی انتہا پہ تھی لیکن لگتا تھا اُس کے اندر بھی کئی سورج بیک وقت' نصف النہار پہ اُبھر آئے ہوں۔ سر' منہ گردن اور پُورا جسم' پسینے سے بھیگا ہُوا...... کچے راستے پہ گرم گرم دُھول' کسی بھاڑ کی جلتی بُھوبھل کی مانند تپی ہوئی تھی۔ سینڈل کے اندر جیسے انگارے پڑے ہوئے ہوں۔ اُس کے باوجود اُس کی تیز رفتاری میں کچھ فرق نہ پڑا تھا۔

بعض چہرے' چہرے نہیں کتاب ہوتے ہیں اور جو اتفاق سے کتاب کھلی رہ جائے اور کوئی تیز جھونکا ہوا کا' اُس کا کوئی صفحہ اُلٹ دے اور اتفاق سے کوئی چشم سے وہاں آ جائے...... اتفاقاً اُس کی نظر کسی سطر کے کسی حرف و لفظ پہ پڑ جائے...... اور وہ حرف لفظ' آنکھ کی سیاہ پُتلی کی طرح دل پہ جم کر رہ جائے...... ایسی کیفیت کا پیدا ہونا' نہ تو کسی کے بس میں ہے اور نہ اس سے باہر نکلنا' بس میں ہوتا ہے۔

گھر پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پہ ڈھے گئی۔ ماں نے یہی سمجھا کہ گرمی لُو سے بے حال ہوئی ہے' منہ ماتھا تر بتر...... پانی پلا کر پنکھے سے ہوا دینے لگی...... نیاتاتی بندوں' سندیوں کو پَر مل جائیں تو وہ رنگین تتلیاں بن جاتی ہیں...... دیکھنے کے لیے آنکھیں تو سب کے پاس ہوتی ہیں لیکن اُن کے رنگین دلنشین پروں پہ نقشیں تجریدی تحریروں کو سمجھنے پڑھنے دیکھنے کی توفیق تو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ زندیق و ملحد بھی زندگی میں کبھی کسی زندہ و تابندہ ایمانی جذبے سے سرشار ہو سکتا ہے اور ایسا بھی کہ بڑے عابد و زاہد' کسی لمحۂ لعن میں یُوں پکڑے جاتے ہیں کہ عمر بھر کا زہد و تقویٰ تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اُدھر فاضلے شورے کے ہاں بھی لگ و پیش کچھ ایسا ہی ڈراما تھا...... گو وہ اس میدان کا پُرانا کھلاڑی تھا لیکن پرانے کھلاڑی بھی کبھی کبھی ایسی بونگیاں مارتے ہیں' یقین نہیں آتا کہ یہ بھی یُوں کر سکتے ہیں۔ وہ گھر سے کچھ کاغذات لینے آیا تھا۔ کمرے سے برآمد ہوتے ہی اُدھر دیکھا' دھریک کے نیچے چارپائی خالی تھی...... اُس کی بہن' صحن کے دروازہ پہ کھڑی' رانی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے اُس نے بہن سے کہا۔

"اپنی سہیلی کو کوئی لسی پانی کا بھی پوچھا...... کون تھی؟ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ اُسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔

"میرے محلے میں ہی کام کرتی ہے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنی ٹریننگ مکمل کی تھی۔ پار کے پنڈ کے کھوکھروں کی دھی ہے۔ باپ بیچارہ اپاہج ہے' دو چھوٹے بھائی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیے نوکری کرنے پہ مجبور ہے۔"

لسی پی کر یہ بھی نکل گیا۔ اس کا راستہ دوسرا تھا مگر اُس راستے پہ ہولیا۔ جدھر رانی کا پنڈ تھا۔ وہ جلد ہی سامنے تیزی سے جاتی ہوئی دکھائی دی۔ آہستہ سے قریب پہنچ کر کہنے لگا۔

"میں اُدھر تمہارے پنڈ کی طرف جا رہا ہوں۔ بیٹھ جاؤ' پنڈ کے کچھ ادھر ہی اُتر جانا......"

رانی نے یہ سُن تو لیا مگر نہ قدم روکے' کچھ جواب دیا' نہ اُدھر دیکھا۔

فاضلے شورے نے پینترا بدل کر پھر بڑی لجاجت سے کہا۔

"گرمی بہت زیادہ ہے' بیٹھ جاؤ' میری بہن نے مجھے بھیجا ہے تمہیں پنڈ تک چھوڑ آؤں......"

لیکن اُسے نہ بیٹھنا تھا' نہ بیٹھی اور یہ چند قدم مزید ساتھ چلنے کے بعد' واپس پلٹ گیا۔ رانی کو یہ سب کچھ نہ تو اچھا لگا تھا اور نہ ہی بُرا' مگر اُس کے اندر اِک عجیب سی کیفیت دَر آئی تھی جسے وہ شاید صحیح سے سمجھ نہ پائی اور شاید سمجھنا بھی نہ چاہتی تھی۔

وہ بخار میں پھنک رہی تھی اور ماں اُسے ٹھنڈی پٹیاں کر رہی تھی۔ ایک دو روز کام پہ بھی نہ گئی۔ اُس نے اپنی اضطراری حالت کو کسی حد قابو کر لیا تھا اور اس ناگوار یا خوشگوار واقعہ کو معاشرہ کا روزمرہ سمجھ کر اپنے معمولات میں واپس آ گئی۔

فاضلا شورا' جو پیار محبت عشق وشق کو محض ناکام کمزور' مجبور' شرافت زدہ لوگوں کی ضرورت سمجھتا تھا۔ کسی کی خوبصورت' حُسن و جمال کے بھی اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں تھے۔ عورت کو عورت اور مرد کو مرد سمجھتا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت۔ عورت ایک لذیذ ڈش' گھر یا باہر کہیں بھی مل جائے۔ کھڑے ہو کر کھا لو یا بیٹھ لیٹ کر' مفت مل جائے یا خرید لی جائے۔ دستیاب نہ ہو تو چھین جھپٹ بھی اس کے نزدیک جائز تھی۔ حیرت ہے رانی کی ایک جھلک دیکھ کر اُسے کچھ علیحدہ سا محسوس ہُوا' جسے وہ واضح طور پہ سمجھ نہ سکا تھا"

عاطف جب سے ڈی پورٹ ہو کر واپس آیا تھا۔ دن رات کا زیادہ تر وقت یہیں دفتر والی حویلی میں گزارتا تھا۔ گھر میں اُسے والدین کے سوالات کا جواب دینے میں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ دوسری وجہ' باہر رہ کر اُس کی عادتیں بگڑ چکی تھیں۔ گھر میں وہ خود کو ایک ایسے پرندے کی طرح محسوس کرتا تھا جسے پنجرے میں ڈال دیا

گیا ہو۔ تیسری وجہ ایک یہ تھی کہ وہ پھر پیرس یا لندن نکلنے کی جستجو میں تھا۔ اس سے وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ کچھ عرصہ جیسے تیسے نکال لے اس کے بعد اُسے پکے کاغذوں پہ فرانس یا انگلینڈ بھیج دیا جائے گا۔ ٹکٹ اور ادھر کا خرچہ اسے یہیں اور باقی کے اخراجات وہاں پہنچ اور کما کر دینے ہوں گے۔ والدین کو وہ ایک اچھی رقم بھیج چکا تھا جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اُس نے جُوئے میں پیدا کی تھی۔ اس حقیقت سے والدین بے خبر...... وہ اس رقم کو اُس کی حلال کمائی سمجھ کر سنبھال چکے تھے۔ اسی نسبت سے ادھر پہنچتے ہی نئی موٹر سائیکل مل گئی۔ چند فیشنی قسم کے کپڑے جوگر جوتے ساتھ لے کر آیا تھا۔ بالوں پہ جل اور آنکھوں پہ گاگل لگاتا۔ گھر والوں کو یہی تاثر دیا کہ یہ لوگ بہت اچھے اور شریف ہیں میرے ساتھ اُن کی دوستی ہے۔ میں بہت جلدی' اُن کی وساطت سے یورپ جا رہا ہوں۔

اصل بات بھی یہی کہ وہ کسی نہ کسی طور پھر پاکستان سے باہر انگلینڈ کی طرف نکلنا چاہتا تھا۔ جدھر ہر چیز کی کھلی آزادی...... کوئی روکنے نہ ٹوکنے والا...... شراب شباب جُوا...... عیاشیاں ہی عیاشیاں...... مسجد نہ کوئی مولوی' حرام حلال کی حد اور نہ تنگ دل و نظر' حسد کرنے والے رشتہ دار...... ماں باپ کی طرف سے کھلی آزادی کی آڑ میں وہ اب یہاں ہر اُس اچھی بُری چیز سے آسودہ ہُوا جسے وہ باہر چھوڑ کر آیا تھا۔ منشیات' جوا' عورتیں ادھر کا روز مرہ تھا۔ یہاں ہر ایک کارندے کی اپنی اپنی ڈیوٹی تھی جسے وہ ذمہ داری اور احسن طریق سے سرانجام دیتا تھا۔

اچھی بُری لڑکیوں کو ادھر لانا فاضلے شورے کی ڈیوٹی تھی۔ انہیں ورغلا کر لایا جائے یا اُجرت پہ یہ لڑکی کی ضرورت یا حالات پہ منحصر تھا۔ زیادہ تر دو نمبر لڑکیاں ہی ادھر کا رُخ کرتیں جو شب بھر ساقی گری کے علاوہ ان کی نفسانی خواہشات بھی پوری کرتیں۔ اکثر ایسی لڑکیاں عورتیں بھی جو منشیات کی عادی ہوتیں یا کسی جھوٹے پیار محبت کے چکر میں پھنسی روپے پیسے کے لالچ یا اپنے خاوند بھائی کو باہر بھجوانے کی خاطر اپنی عزت کی بلی چڑھانے پہ مجبور ہوتیں۔

ادھر پہنچی ہوئی لڑکی یا لڑکیاں' چاہے وہ کسی کے بھی وسیلے سے آئی ہوں۔ سب سٹاف کا مشترکہ مالِ غنیمت ہوتیں۔ ہر کارندے کا اپنا اپنا نمبر تھا لیکن پہلی باری اُس کی ہوتی جو اسے ادھر لے کر آتا۔ اس کے بعد دوسرے بھی اپنے اپنے نمبر پہ اپنا اپنا حصہ وصولتے...... نشہ کی بدمستی اور شہوت کی شدت میں پھر ہر شے دُھندلا جاتی...... کچھ بھی تو صاف واضح دکھائی نہ دیتا۔ حتیٰ کہ اگلی صبح کا سورج بھی ان کے چہروں کی خباثت اور رذالت کو دور نہ کر پاتا کہ زیر زمین' ان کی نشاط گاہ تک اُس کی رسائی نہ تھی۔

فاضلے شورے کو یہ علم نہ تھا کہ یہ لڑکی' جس کا چہرہ بھی اُس نے غور سے نہ دیکھا' عاطفے کی پھوپھی زاد اور

مترو کہ منگیتر ہے۔ بہن سے کچھ کرید کرنے کی کوشش کی تو وہ ٹال گئی۔ وہ اس کی طینت سے خوب واقف تھی۔ نہ اُس کا نام کام بتایا اور نہ پنڈ کا اتا پتا بتایا لیکن وہ اس کے راستے سے اندازہ کر چکا تھا۔ پیچھے لپکا اپنی سی کوشش کی مگر اسے تو موٹر سائیکل پہ نہ بیٹھنا تھا نہ بیٹھی ...... یہ نام و نال نیت و نسب کا کچا جٹل سا منہ ڈھو بنائے واپس پلٹ آیا۔ اُدھر رانی بھی اپنے دل و دماغ میں اک عجیب سا خلفشار سمیٹے اپنے گھر پہنچ چکی تھی۔"

وہ نظرو دل کی کچی ایسی کچی لڑکی نہ تھی۔ اپاہج غریب باپ، چھوٹے بہن بھائی ...... گھر کی غربت تنگدستی نے اُسے اک مضبوط لڑکی کے قالب میں ڈھال دیا ہوا تھا۔ وہ خود کو صنفِ لطیف سے زیادہ جنسِ ثقیل محسوس کرتی تھی ...... لیکن فاصلے شورے کے اس واقعہ نے قدرے متزلزل کر دیا تھا۔ مزید بدقسمتی کہ اتنا بھی نہیں جانتی تھی، اس کی نکیل کا یہ خوبرو بھائی کس قماش کا ہے؟ پہلی بار کا آمنا سامنا ...... اک نظر میں انوکھا جانو سا لگا تھا۔

گہرا سا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت بھی کبھی کبھی اک نہ سمجھ میں آنے والا چیستان بن جاتی ہے اس کے من بھانے اور دل وق کرنے کے کوئی اُصول ضابطے واضح نہیں ہوتے۔ سے سجا کی انگلی دل کی یا کسی دل کی گلی کی پخشکل مان مریادہ یا متی مت کی مشکل وغیرہ ...... کبھی اُس کے دل میں آئی ہوئی کامنا کی راہ نہیں روکتے۔ وہ کب پارتی ہے اور کب پرپھٹا کب میرا بائی کب منگلا مکھی ...... سیتا اور کب سنجارکا مہارانی جھانسی ہے یا ماتاہری یا پھر سسی یا صاحباں، نوتن یا انگار سلطانہ ...... عفت مآب اور کب عصمت فروش؟ (استثناء کے ساتھ) اس کے دل کے سودے، منہ کے سواد اور آنکھ کی سدھ نرائیت کا کچھ حال چال نہیں۔ سو روپ ہزاروں سروپ ...... لاکھ چتر چلتر اور کروڑوں چھل بل ...... اس کی پاک دامنی، فہم و فراست، حُسن و خوبی کے ساتھ ساتھ اس کی بے وفائی، حماقتوں، مکر و فریب، سفاکی و بے باکی کے تذکروں سے بھی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ شاید اسی لیے وارث شاہ جیسے لاثانی رمز شناس کو کہنا پڑا ......

وارث زن فقیر تلوار گھوڑا

ایہہ چاروں تھوک کسے دے یار ناہیں

سیانے کہتے ہیں کہ اس کی مت کھری میں ہوتی ہے (استثناء کے ساتھ) ...... خاص طور پہ الھڑ لڑکیاں، جونئی نئی شہرِ شباب میں وارد ہوتی ہیں ...... کچی عقل والی، جذباتیت پسند، فلمیں، ٹیلی ویژن دیکھنے والی، رومانی ناول کہانیوں کی دلدادہ ...... شاپنگ، سیر و تفریح، ہوٹلنگ کی شوقین ...... مخلوط تعلیم و تربیت بھی ان کا دماغ خراب کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔ ماں باپ کی کڑی نگرانی، بے اعتمادی، خاندانی گھریلو گھٹن اور معاشی مسائل بھی ایک وجہ ہیں۔ کچھ نفسیاتی، جنسیاتی رویے اور موروثی رجحان بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

پہلا احساس سابقہ منگیتر عاطف نے دلایا۔ جب اُس نے کلائی تھام کر اپنے ساتھ موٹر سائیکل پہ

بٹھانا چاہا۔ اس واقعہ نے تو جیسے اُس کی عورت والی کوئی رگ کھول دی تھی۔ تاؤ تاؤ کئی روز تک رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت بھی دَر آئی تھی جو اسے اندر ہی اندر اک عجیب سے نشے میں جھگوتی رہتی تھی۔ کوئی چوٹ ایسی بھی ہوتی ہے جو ٹیس کے ساتھ میٹھا میٹھا سا مزہ بھی دیتی ہے کہ بے اختیار منہ سے ''سی'' نکل جاتی ہے...... ایسی ''سی'' نکلنے سے دل میں کہیں گُدگدی بھی ہوتی ہے۔ اَب یہ دوسرا موٹرسائیکل والا، پالا جو فاصلے شورے سے پڑا تھا اس کا اثر تو جیسے دل پہ جم کر رہ گیا تھا کہ وہ ایک اپاہج غریب مگر شریف باپ کی بیٹی تھی لیکن وہ ایک بالغ بھرپور لڑکی بھی تو تھی جو تمام تر نسائی جذباتی تقاضوں سے لبالب تھی...... کہیں کوئی ایسی معدوم سی خواہش، خلش...... کہ کہیں کبھی پھر یوں ہو جائے۔؟

ڈیرے پہ ڈھیری اُداسی، کنویں کی دیواروں پہ کائی کی مانند جمی ہوئی تھی۔ محرم کے ابتدائی دن...... کاروبارِ دین و دنیا، ٹھنڈے چولہے کی بھوبھل کی طرح سرد گرم تھے لیکن جن کے لیے رَاوی نے چین ہی چین اور عیش ہی عیش لکھا ہو اُن کے لیے محرم، صفر، عید شبرأت سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بس اِن دنوں ذرا احتیاط کر لیتے اور ظاہری بھیس مومنوں سا بنا لیتے ہیں۔ پورے گاؤں میں صرف ایک گھر شیعوں کا تھا وہ بھی نہ ہونے کے برابر...... مرد اُدھر کراچی میں مزدوری کرتے، اِدھر گاؤں میں عورتیں اور بچے...... ڈیرہ، گاؤں سے باہر، نہر کے پاس...... بیچ میں کھیت اور پھلوں کے باغات...... اِدھر کون ہو جو ان کی کرتوتیں دیکھے؟

اِدھر سب کے سب بیکار بیٹھے تھے...... کام دھندا نہ ہونے کے برابر...... صبح سے شام اور رات سے پھر فجر کرنا مشکل پڑ رہا تھا کہ محرموں میں پورا نظامِ حیات اُتھل پُتھل سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ بُرے سے بُرا شخص بھی شرما شرمی میں کچھ حیا کر لیتا ہے۔ پورا مہینہ منہ ڈھانپے کسی کونے کھدرے میں پڑ جاتا ہے یا کم از کم پہلا عشرہ ہی اپنے مسلمان ہونے کے ثبوت میں کہیں بیل لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔'' اِدھر بھی انہوں نے پہلے دس دن، کسی نہ کسی طور دانتوں تلے جیب دے کر نکال لیے...... شراب تو سُونگھنے سے بھی رہے۔ دیسی شراب کشید کرنے والے عیسائیوں نے ٹکا سا جواب دے دیا تھا کہ ہم محرموں میں یہ دھندا نہیں کرتے۔ ولائتی کو وہ سرکہ کہتے تھے جو امیروں کا نشہ ہے، دیسی دارو نشے میں جو دم ہے وہ ولائتی کا ورتو نہیں......!

● پچھل موسم دا، تے گل وی لے وی......!

میرا ایک بچہ اک لمبا عرصہ پینے پلانے اور لڑکیوں کے چکر میں پڑ کر اپنی عاقبت اور صحت برباد کرتا

رہا' اچانک ایک طرحدار چنگڑی' جس کا پیشہ صرف جمعرات کے روز بھیک مانگنا تھا' کے حُسن آوارہ پہ لٹو ہو گیا۔ میں اسے راہ پہ لانے کی اپنی سی سعی کرتا رہا مگر اس پہ میری کسی نصیحت فصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ جتنا اسے سمجھاتا اُتنا ہی وہ اور پکا ہوتا...... آخر تنگ پڑ کر اُسے کہنا ہی چھوڑ دیا۔'' دیکھا گیا ہے کہ فیض یابی یا اثر پذیری کا بھی ایک وقت ہوتا ہے...... نہ پہلے نہ بعد' بس منظوری اور حضوری اپنے کسی خاص نے پہ ہی جلوہ افروز ہوتی ہے اور وہ مخصوص کرشماتی لمحہ' کب ظہور پذیر ہوتا ہے یہ ہر کوئی نہیں جانتا' یہ قدرت کے رازوں میں ایک راز ہے۔ جس کے ہاتھوں شفا یا فیض حاصل ہوتا ہے ضروری نہیں کہ وہ ظاہری یا باطنی طور ایک نیک پارسا' اللہ کا ولی ہو...... وہ کوئی ایسا بھی ہو یا ہو سکتی ہے جو دیکھنے جاننے سے سمجھ نہ آئے...... جیسے شہد دودھ میں بھی وہ اکسیری نہیں پائی جاتی جو چند مخصوص امراض کے لیے اُونٹنی' گدھی' کتیا یا کچھ اور جانوروں کے پیشاب میں پائی جاتی ہے۔ ایسے ہی دیگر جانداروں کا بول براز' مینگنیں' کھُر' بال' دانت وغیرہ ایسے ایسے لاعلاج امراض میں کام آتے ہیں کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہاں سمجھ میں بات آتی ہے کہ مالکِ کُل نے کسی' بظاہر اچھی بُری' حلال حرام چیز کو بلا مقصد پیدا نہیں فرمایا۔ ہر مخلوق کا مقصد اللہ کی ثنا اور اللہ کے بندوں کی فلاح ہے۔ ظاہر ہے یہ موٹر مکینک تھا۔ ورکشاپ' شاگرد پیشہ...... وہی گندا مندا ماحول' ونگیں موٹریں' ڈرائیور کنڈکٹر' گالی گلوچ فحش گوئی' ٹھرک بازی اور فحشیات وغیرہ ایسی نچلی سطح کی ورکشاپوں کا یہی حال ہوتا ہے۔''

جمعرات کے روز' بھیک مانگنے والی نوعمر لڑکیاں عورتیں' مناسب سا بن ٹھن کر' مارکیٹوں' دکانوں' کارخانوں اور خاص طور پہ موٹروں ویگنوں کی ورکشاپوں پہ یلغار کرتی ہیں۔ ایسی عورتیں لڑکیاں' خانہ بدوش' چنگڑیاں' لکڑیاں' پکھی واساں یا بکروالیاں ہوتی ہیں۔ یہ ایسے خانہ بدوش قبائل کی عورتیں ہوتی ہیں جو مستقل کسی جگہ ٹک کر نہیں رہتے اور نہ ہی ان کا تعلق کسی مذہب مسلک سے ہوتا ہے۔ حرام حلال کی تمیز سے بھی تہی!...... گھٹیا نشے ان کی گھٹی میں پڑے ہوتے ہیں۔ چھوٹی موٹی چوری چکاری' عیاری مکاری بھی چلتی ہے۔ کبھی کبھی منی' گھاس پھونس کے کھلونے گھگھو گھوڑے' گڑیاں برتن' سانڈے کا تیل بیچتی بھی دکھائی دیتی ہیں لیکن ان عورتوں کا اصل پیشہ اپنی اداؤں اور غمزوں سے ٹھرکی طبیعت' ٹھرکی مزاج مردوں کو جھوٹے پیار دلاسے کے چکر میں ڈال کر مال پانی اینٹھنا ہوتا ہے۔''

ایسے آنکھ نیت کے ٹھرک باز زیادہ تر مکینک' فیکٹری ورکرز' ٹیکسی رکشے والے!...... جو جانتے بھی ہوتے ہیں کہ ان تلوں سے تیل اتنا ہی نکلنا ہے جس سے بس ٹھرک ٹھنڈا ہو سکے' سر چپڑنے یا لک گوڈے کی مالش نہیں...... پھر بھی وہ گلو نڈی کا تیلی بنے اپنی کوشش کا کولہو چلتے رہتے ہیں۔ ان گشتی مہلاؤں میں قریب قریب سب ہی مردوں والی ہوتی ہیں کہ انہیں کم سنی میں ہی قبیلے کے کسی مرد کے پلّے باندھ دیا جاتا ہے۔ وہ مرد آٹھ

برس کا ہو یا ساٹھا پاٹھا؟ بس پچھڑی کو نتھ ڈال کر رکھ سکتا ہو۔ ان کے ہاں مرد وہ ہوتا ہے جو وب کے اُجڈ جھبٹ اور رنج کرے بے غیرت ہو ہر نشہ علت کا عادی...... نحوستی، حرام خوری، بد حرامی، بدکلامی، لڑائی جھگڑائی تھانے کچہری کا جانو پہچانو اور ہر رات، سونے سے پہلے اپنی جورو کے جوڑ ڈھیلے کرنے کا چیمپئن ہو۔" ان کی عورتیں اپنے مردوں کو کما کر کھلاتی ہیں۔ مرد بھی جانتے ہوتے ہیں کہ یہ سارا دن کہاں کہاں جاتی ہیں۔ پیسے بٹورنے کے لیے یہ کیا کیا حربے استعمال کرتی ہیں؟ جو وہ چارآنے یا روپیہ دھیلی دیتا ہے وہ ان سے غلیظ حرکتیں اور باتیں بھی کرتا ہے۔ چھاتی کو بھی چھوتا ہے، موقع ملے تو چٹکی بھی لے لیتا ہے۔ جھوٹی قسمیں، کہیں ملنے کے وعدے، گفٹ فرمائشیں وغیرہ...... ان کے مرد یہ نہیں پوچھتے کہ سارا دن کہاں کہاں گئیں، لوگوں نے کیسی حرکتیں کیں؟ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ لے کر کیا آئی ہے؟

میرے اس ملنگ بچے کے ہاں بھی جمعرات کے روز، پچھلے پہر ایک کٹیلی سی عورت آتی تھی۔ کسی کسائی، بڑی چٹی چربیلی...... جسے نہ تو لڑکی کہا جا سکے اور نہ ہی کوئی ہنڈی ورتی عورت!...... ایسی چیز کی عمر کا صحیح سے اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ بھاری نشہ کے عادی، حرام کاری کرنے والے، حرام غذا کے خوگر، جادو ٹونہ کرنے والے عورت و مرد ان کی آنکھوں میں اک علیحدہ تیکھی سی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ شیطانی یا شہوانی؟ یعنی ان کی آنکھوں میں ایسا کچھ نہ کچھ ضرور در آتا ہے جو ہر طور خیر و خرد کی جانب نہیں، خرابی و خلل کی سمت راغب کرتا ہے...... مقابل فرد بڑے واضح طور پہ سحر زدہ سا ہو کر اپنی پسپائی محسوس کرتا ہے۔ سانپ ہو یا سانپ کھانے والے...... بدقماش عورتیں، جادوگر ساحر، کالا علم کرنے والے۔ ڈاکو دہشت گرد وغیرہ اپنی آنکھوں کی اس ساحرانہ قوت سے بڑے کام لیتے ہیں۔ یہ ابلیسی قوت ہوتی ہے جو ابلیس کی طرف سے اپنے چیلوں چیلیوں کو ودیعت ہوتی ہے۔"

اس چنگڑی عورت کی آنکھوں اور جسم میں بھی کچھ ایسی ہی کشش تھی جس کا اُسے احساس بھی تھا۔ بس اسی سے کام لے کر وہ مردوں کو پرچاتی، بیوقوف بنا کر پیسے بٹورتی۔ وہ ملنگ بچہ بھی اُسے "کھانے پینے" کے چکر میں تھا مگر وہ چنگڑی اسے اپنے ڈھنگ کے تحت، صرف چکھنے کی حد تک رکھے ہوئے تھی۔ اپنا آپ، وہ صرف اپنے مرد کو ہی کھلاتی تھی۔ ویسے بھی زیادہ تر ایسی عورتوں کی ڈوڑ دھوپ محض پیسے بٹورنے کی حد تک ہوتی ہے۔ جسم فروشی ان کا مطمع نظر نہیں ہوتی۔

کوئی ایسی ہی جمعرات تھی۔ بارش، پچھلے روز سے چھما چھم برس رہی تھی۔ پورا علاقہ نیم سیلاب زدہ سا تھا۔ کیچڑ اور راہ راستوں پہ کھڑے پانی نے کاروبار حیات بند کر رکھا تھا۔ میرے اس بچے کی ورکشاپ اور تیل بدلی والے گڑھے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ویگنوں کے پرزے ڈھانچے اور دیگر کاٹھ کباڑ، اوزار سب کچھ بارشی پانی

کے رحم و کرم پہ تھا۔ یہ آہن کا اُلو بنا آدھی ڈوبی ہوئی ویگن کے اندر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے شاگرد لڑکے بالے نشیبی علاقہ کے رہائشی، دوروز سے غیر حاضر تھے کہ خراب موسم نے ان کی راہ ماری ہوئی تھی......

اچانک باہر بجلی کوندی...... دیکھا تو وہی چنگڑی، گوری گوری سڈول پنڈلیوں پہ پائینچے چڑھائے، اس کی ورکشاپ جانب چلی آ رہی ہے۔ اس کو تو یاد بھی نہیں تھا کہ آج جمعرات ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اُس نے دائیں بائیں دوسری ورکشاپوں کو دیکھا ایک تو دوروز سے بند تھی اور دوسری کے باہر راوی بہہ رہا تھا۔ بندہ کوئی دکھائی نہ دیا، کوئی ہو بھی تو اندر کہیں بھیگا چوہا بنا بیٹھا ہوگا۔

وہ بھیگی بلی دھیرے دھیرے پانی پھلانگتے شڑپ شڑپ کرتے ہوئے قضا کی مانند بڑھتی آ رہی تھی۔

بھیگی بلی اور بھیگی ناری، دونوں دودھاری کٹاری سی ہوتی ہیں۔ ایک چوہوں کے لیے کہ بارش برسات میں اس کی اشتہا دوچند ہو جاتی ہے۔ رم جھم، رسیلی تازگی سے اس کے شکم میں تنبورے بجنے لگتے ہیں۔ وہ انگڑائیاں توڑتے توڑتے نڈھال سی ہو جاتی ہے۔ اس سے وہ الہڑ مٹیار کی طرح ہوتی ہے، جس کا من، کسی میٹھے گرم گرم تن کے لیے للچارہا ہوتا ہے۔ اسی طرح شرابی اور عورتوں کی قربت کے رسیا مرد بھی بارش کی شرابوری اور ہلکی ہلکی تمازت کا احساس دلانے والی نم دار سردی میں، بڑے بے کل ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ان کے من اور تن، دونوں کی پیاس بھڑک اٹھتی ہے

؎ پیاس بھڑکی ہے سرِ شام سے جلتا ہے بدن
عشق سے کہہ دو کہ لے آئے کہیں سے ساون

والی کیفیت اُن میں عود آتی ہے......

اُسے شاید ویگن میں بیٹھا اپنا ٹھرکی عاشق نظر نہ آیا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر اپنے دھیانے ورکشاپ کے برآمدے میں پہنچ چکی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا...... سنہری رنگی ہوئی بالوں کی لٹ حسبِ سابق، اس کے ماتھے پہ بھیگی سی چپکی پڑی تھی...... چہرہ گلگوں، رسیلے ہونٹ جو ہمیشہ کی طرح سرخ تھے کہ منہ میں ڈبل چونا کتھا چیلی پتی کا پان دبا پڑا ہوتا تھا۔ آنکھوں کا کالا توا کاجل بھی جوں کا توں...... کچھ بھی تو نہ بدلا تھا، بس! ذرا ساون کی جھڑی نے ناک کی گھوڑی اور کیل کو تیکھا کر دیا تھا۔ وہ دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ ہر جانب جھاڑو پھری دیکھ کر واپس لوٹنے ہی والی تھی کہ یہ ویگن کے ملگجے اندھیرے سے باہر کود آیا۔ یہ تو ویسا ہی تھا کہ بلی کی بو پا کر چوہا، چھلکنے سے چھلنگ آیا ہے۔ عورت نما لڑکی یا لڑکی نما عورت کے چہرے پہ گربہ مسکینی کے کئی رنگ اُبھرا اُبھر کر ڈوبے۔ اس نے حسبِ عادت اپنا دایاں ہاتھ، اُس کے آگے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''جمعرات اے سخیا، دے سچ رب دے ناں دا......''

گریس ڈیزل لوہے کے میل سے آشنا ہاتھ سے پانچ روپے کا نوٹ اُس کی گدری ہتھیلی پہ دبا کر رکھتے ہوئے بولا۔

''تُو بھی تو کبھی سخی بن کر دکھا؟...... آ 'اَج اندر ویگن دے بیٹھ کے گلاں کریئے۔ اَج تے بارش نے وی موقع دے دِتا اے......؟''

وہ اُسے ہلکا سا کھینچ کر ویگن کے اندر لے گیا۔ سیٹ پہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ ایک دس روپے والا نوٹ اُس کے گریبان والے بٹوے میں اُڑستے ہوئے مزید کہا۔

''آج بڑے نوٹ میں تیرے لیے لایا ہوں' مجھے پتا تھا آج تو ضرور آئے گی۔ موسم دیکھا' کتنا رسیلا ہے؟''...... اُس نے ہاتھ بڑھا کر اسے مزید کسنا چاہا۔

وہ کسمساتے ہوئے بولی۔

''چل! دل پشوری کر...... پر زیادہ ہتھ چالاکی نہیں کرنی......!''

وہ مزید ہتھ چالاکی کرتے ہوئے بولا۔

''آج تے دل پشوری نہیں' لہوری کرن دا موسم اے......''

وہ اُسے پرے کرتے ہوئے بولی۔

''زناں اَسی اپنے خصماں دیاں ہوندیاں آں...... کہ دس روپے ہور' اَج میں ڈیرے جلدی جاناں اے۔''

وہ اس کے جواب سے تلملا کر بولا۔

''ہاں ساڈا کچھی جاندی ایں...... جد ساڈی واری آوے...... تے ڈیرے نسی جاندی ایں...... اے بھلا کی گل ہوئی؟''...... وہ اُس کا ہاتھ پرے ہٹاتی ہوئی بولی۔ ''تھرکی بندے ساڈی کا ڈنہیں کہ سکد ے نے تے نِلکی پشکی فاری نیو ہے!...... مرو تے ساڈے ہوندے نیں۔ اَسی اُنہاں نُوں چاواں (چائے) تے شکے نان نچولیاں تے نہیں لایا ہوندا۔ پہلے نُور دی دیسی شراب' دیسی گھیو تے دیسی ککڑ کھلا کھلا' تے دیسی چرس پلا پلا کے دیسی مرد بنایا ہوندا اے' تے فیر جاکے او ساڈے نال دیسی پیار دی تند پاندے نے۔''

کمال پھرتی سے اُس کی جیب سے ایک اور دس روپے کا نوٹ نکالا...... اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے چہکی۔

''کنی سوہنی دیسی جھڑی لگی دی اے۔ اَج میں اُنہاں تیریاں پیسیاں دی دیسی ٹھرے دی ٹیچی لے کے جانی اے...... سا جھاتے میں' زل کے پیاں گے تے کھچ کے دیسی پیار کراں گے......''

اُٹھتے اُٹھتے اُس کے زانوں کے درمیان چٹکی کاٹتے ہوئے بولی۔

"میں چلی آں' توں وی ایتھوں اُٹھ...... ہیٹھ ورد اپیا ایں' نہالے......!"

اُس میں قدرے اخلاقی جرأت ہوتی تو بجائے نہانے کے ڈوب مرتا۔ جن بدچلنی کے کاموں میں دھنسا پڑا تھا' وہ سب سے پہلے بندے کی شرم میں اخلاقی جرأت اور احساس سود و زیاں کا قلع قمع کرتے ہیں اور پھر ایسی بے غیرتی' بزدلی اور بے حسی میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ اُسے دین دُنیا' گھر بار' عزت بے عزتی کا کچھ خیال یا احساس نہیں رہتا۔ لیکن ایسا بھی دیکھا کہ کہیں کوئی ٹھوکر' حادثہ' بات' واقعہ' وقت ایسا بھی ہو گزرتا ہے کہ ایک جھٹکے سے بند آنکھ کھل جاتی ہے۔ اُلٹی رگ' سیدھی ہو جاتی ہے...... فیوز بلب کا ٹوٹا ہوا ایلیمنٹ' کسی طرح پھر جُڑ جاتا ہے اور روشن ہو جاتا ہے۔ بند شریان' کسی انجانے جھٹکے سے پھر رواں ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا' نااُمیدی گناہ ہے۔ تاریک پہلو کی بجائے' روشن پہلو سے اپنی آس و اُمید کو خیزاں رکھنا چاہیے۔ پانسہ کبھی بھی پلٹ سکتا ہے۔ رُکی رگ' فیوز ایلیمنٹ' کبھی بھی کسی لہر بہر' جھونکے جھٹکے سے دوبارہ جُڑ سکتے ہیں۔

انگلینڈ والے میرے پرانے پہاڑی گھر کے تہہ خانے میں بجلی کا ایک بلب فیوز ہو گیا۔ پرانی وضع قطع کا یہ قمقمہ کافی اُونچائی پہ لٹکا ہوا تھا۔ آج کل کرتے کرتے کئی ہفتے گزر گئے۔ کون سیڑھی لے کر نیچے جائے اور اُسے تبدیل کرے۔ دیواروں کے ہوادانوں' روشن دانوں سے ہلکی سی روشنی بہر طور اندر آتی تھی اُسی سے کام چلاتا رہا...... ایک روز' سرِ شام کسی کام سے نیچے اُترا تو تہہ خانہ روشنی سے منوّر تھا۔ یاد نہ آیا کہ بلب' میں نے کب تبدیل کیا؟...... نیچے کھڑے ہو کر دیکھا۔ بلب وہی' اُس کا شیڈ بھی وہی گرد آلود...... الٰہی! یہ فیوز' بلب کیسے روشن ہوا؟ یہی سوچتے سمجھتے میں کسی طور' اُس بلب تک بلند ہُوا۔ وہی کئی سال پرانا بلب تھا جو کچھ روز پہلے ڈیڈ ہو گیا تھا۔ کپڑے سے بلب کی گرد اور جالا صاف کیا...... فلپس' ساٹھ واٹ' اچانک میری نظر ایلیمنٹ پہ پڑی۔ ٹوٹا ہوا سرا اپنے دوسرے سرے سے جُڑا ہوا تھا۔ مزید غور کرنے سے یقین ہوا کہ آندھی یا تیز ہوا کے کسی جھونکے نے اس لٹکتے ہوئے بلب کو جھولا جھلایا اور نازک ایلیمنٹ لرز لرز کر کسی طور اپنے ٹوٹے ہوئے حصے سے پھر ہمکنار ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد پندرہ برس تک وہ بلب روشن رہا...... اک وقت خود ہی اُتارا کہ چھت مرمت طلب تھی۔"

معلوم ہوا کہ ہدایت' فیض' تصرف و توفیق' درجات و برکات حاصل کرنے کا بھی معین وقت ہوتا ہے اور ضروری نہیں کوئی منتخب' ولی و عارف ہی حصول کا ذریعہ بنے۔ اللہ کریم چاہیں تو کسی ملحد کافر' فاسق و فاجر سے بھی ہدایت کے چشمے جاری کروا سکتے ہیں۔ یہ علیم و خبیر کے کرم نے کے سَم' کوئی ناخنِ تدبیر اور کسی شہریار کی نگاہِ ناز کی بار یاوری کی بات ہے۔ دیکھیں تو ہدایت کے لیے اللہ کریم نے کنکروں' پتھروں' جانوروں' سمندروں'

بارشوں طوفانوں' زلزلوں سیلابوں' آسمانی بجلی' آفتوں قحطوں سے بھی کام لیا ہے اور جب ہدایت منظور نہیں تو اپنے منظورِ نظر پیغمبروں نبیوں کی بھی نہیں سُنی۔ اس میرے مکینک بچے نے میری بھی نہیں سُنی مانی تھی۔ اس کو ہدایت' ایک بدقماش چنگڑی سے حاصل ہوئی تھی۔ نادانستگی میں اُس کا ناخن تدبیر' کام کر گیا اور وہ ایک ہدایت یافتہ بندہ بن گیا۔ وہ مکینک بچہ کہتا ہے بابا جی! یہ سب کچھ آپ نے کیا ہے۔ اُس فحشہ چنگڑی کے رُوپ میں بھی آپ ہی تھے وہ بتا رہا تھا......؟

میں چنگڑی کی کاٹ دینے والی باتوں اور دیسی ولائتی کے چکر میں پھنسا ہوا ذہین ویگن میں پڑا ہوا تھا' ایسے میں ورکشاپ کا پٹھان مالک' اپنے ڈرائیور کے ساتھ' میری طرف آیا۔ دُور سے مجھے آوازیں دیں' میں چنگڑی کی باتوں میں پھنسا ہوا شاید سُن نہ پایا۔ پاس آکر اُس نے ویگن کی باڈی پہ دو چار تھپّے مارے۔ میں چونک کر باہر نکل آیا۔ شاید وہ بارش کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کا جائزہ لینے آیا تھا۔ چند منٹ ٹھہرنے کے بعد جانے لگا تو ڈانٹتے ہوئے کہنے لگا!

''اوئے خانہ خراب! اِدھر تو کھڑے ہونے کے لیے جگہ نہیں۔ تم نے بابا صیب کو کدھر بٹھایا تھا۔ کوئی چائے مائے بھی پلایا...... یا نہیں؟''

میں پریشان سا ہو گیا کہ اُس نے شانو چنگڑی کو اِدھر آتے یا جاتے دیکھ لیا ہے۔ لیکن یہ تو کوئی پریشان ہونے والی بات نہ تھی۔ جمعرات کو فقیر بھکاری آتے جاتے رہتے ہیں لیکن میرے اندر تو چور تھا۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں؟ خان پھر کہنے لگا۔

''بابا صیب کو اُدھر میری دکان پہ لے آتا' چائے مائے پلاتا۔ بارش اور ٹھنڈی میں وہ کانپتے کانپتے جا رہے تھے۔ میں نے فردوس کو بھیجا' بابا کو لاؤ' بٹھاؤ اور چائے پلاؤ۔ فردوس کے پہنچنے سے پہلے اُدھر بابا صیب' پھسل کر گر پڑا...... میں خود بھاگ کر پہنچا۔ کپڑے میڑے سب کا ستیاناس ہو گیا۔ اَب میں نے گاڑی پہ بٹھا کر اُن کو گھر بھیجا ہے۔ اوئے کم بخت! اتنا بارش' پانی...... تم اُن کو خود گھر چھوڑنے کیوں نہیں گیا؟''

میں دیدے پھاڑے' خان کی گفتگو سُن رہا تھا جو میرے سر پہ سے گزر رہی تھی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں بول پڑا۔

''خان جی! میرے پاس شانو چنگڑی' جمعرات لینے آئی تھی۔ بابا جی سے تو میں کئی دنوں سے ملا ہی نہیں۔ اس موسم اور بارش میں تو اُن کا اِدھر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنگڑی آئی تھی' صرف میرے پاس ہی نہیں' سب ورکشاپوں میں جاتی ہے۔ بابا جی کسی اور کے پاس آئے ہوں گے۔'' میں نے اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

میری صفائی سن کر خان صاحب تو آپے سے باہر ہو گئے۔ بھنا کر بولے۔

''خو چہ! تم ہم کو جھوٹا بناتا ہے۔ میں نے خود اپنی ان آنکھوں سے بابا صیب کو تمہاری ورکشاپ سے باہر نکلتے دیکھا۔ ادھر کے سب لوگوں نے دیکھا...... سلام دُعا کیا 'خو تم' ہم سب کو اپنی طرح دو نمبر سمجھتا ہے۔''

خان صاحب کی اُونچی آواز میں تکرار سن کر کچھ اور بھی آس پاس کے مکینک' شاگرد لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سب نے تصدیق کی کہ بابا صاحب کو آتے اور جاتے بھی دیکھا جبکہ چنگڑی کو تو پچھلے چھ سات روز سے کسی نے سونگھا تک نہیں...... ان گواہوں میں ایک دو حاجی نمازی بھی تھے۔ لہٰذا اب کوئی شبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔

## ● شاخِ آہو......!

مکینک نے جھنجھٹ سے فارغ ہوتے ہی مجھے ٹیلیفون کیا۔ میری خیر خیریت معلوم کرنے چند ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھا۔

''باباجی سنائیے! بارشوں کا کیا حال ہے؟ کئی دنوں سے دیکھا نہیں' کبھی ادھر بھی نکل آئیے یا حکم دیں تو میں خود قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاؤں؟''

میں نے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے' بارشیں تھمنے کے بعد ملنے کا وعدہ کر لیا۔ اُس نے پھر اچانک بات کا پینترا بدلتے ہوئے پوچھا۔

''باباجی! آپ ادھر ورکشاپ کی طرف آئے تھے؟ میرا ایک شاگرد بتا رہا تھا آپ ادھر کہیں سڑک پہ کیچڑ میں پھسل گئے تھے...... صلابت خان نے اپنی گاڑی میں آپ کو گھر بھجوایا......!''

''تمہارا دماغ درست ہے...... بادل دیکھ رہے ہو مسلسل دو روز سے برس رہے ہیں۔ میں سٹھیا گیا ہوں کیا؟ جو اس حال میں باہر نکلوں گا۔ ویسے بھی ان دنوں میں زکام کی زد میں ہوں۔ اس حالت میں' میں تو سوکھے میں باہر نہیں نکلتا' چہ جائیکہ گیلے میں نکلوں؟''

میرا وہاں ہونا یا نہ ہونا' ایک اچھا خاصا موضوع بن گیا تھا۔ میں دانستہ اس فضول بحث میں باہر رہا۔ جانتا تھا کہ میں جتنا بھی اس بابت صفائی پیش کروں یا سمجھاؤں' اُن پہ کچھ اثر ہونے والا نہیں۔

اَب آتے ہیں اس بات کی طرف کہ اصل معاملہ کیا تھا؟ میں اس مکینک بچے کو اپنے طور سمجھا سمجھا کر تنگ آ گیا تھا مگر میری کسی نصیحت کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا۔ میری زبان کی اثر پذیری ختم ہو چکی تھی یا میری اور اس کی فریکوئنسی میں کچھ گڑ بڑ تھی۔ بہت بعد سمجھ میں آئی' دراصل نشے کے سم میں اُس کی ہدایت کا اَمر

واصل نہیں ہوا تھا۔ چنگڑی کے سروپ اور زبان سے اس کے کا نم کھل گیا جس میں اُس کی ہدایت کی فریکوئنسی سیٹ تھی۔ اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے...... گیئر گراری کے دانتے ایک سے نہ ہوں تو وہ کام نہیں کرتے' پھنس جاتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ گراریوں کے اینگل' سائز مختلف ہوتے ہیں مگر دانتے ایک سے...... میرے دانتے اُس کی گراری سے چھوٹے بڑے تھے' اس لیے بات نہ بنی۔ چنگڑی سے اپنے مزاج اور انداز سے برمحل تذکرہ بات سرزد ہوئی تو اُسے شاد کر گئی۔ بس یہی نے کے نم کا کمال تھا؟

اَن پڑھ غیر مہذب چنگڑی نے اُسے بتایا کہ وہ صرف اپنے مرد کی عورت ہے۔ وہ اُسے بھیک اور دیگر ہتھکنڈوں سے' جو اُس کی پیشہ ورانہ' روایتی مجبوری ہے' کما کر عمدہ دیسی انداز کی خوراک کھلاتی ہے اور اس سے دیسی محبت کرتی ہے اور وہ بھی اس سے دیسی طریقے سے محبت کا جواب محبت سے دیتا ہے۔ یہیں اس کی سمجھ میں یہ بھی آیا کہ وہ لاکھ جتن کرے' کیسا بھی لالچ دے مگر اُسے ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دے گی...... اُس کے چونچلوں' اداؤں' نازنخروں اور سوکھی ہتھ چالاکی سے وہ ہاتھ زینت تو کیلے کر سکتا ہے لیکن اس بپھری تند و تیز ندی میں اتر کر اشنان نہیں کر سکتا۔ اس کی نام نہاد مردانگی کو' اُس کی حقیقت بیانی نے اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں کچھ ایسی تبدیلی واقع ہوئی جس سے وہ بائیں سے دائیں کروٹ ہو گیا۔ اسے یہاں یہ ادراک بھی ہوا کہ مسئلہ وفا کا ہو یا بے وفائی کا' محبت ہو یا نفرت' نزاکت یا شقاوت' پاک دامنی یا فحش سامانی' معاملہ اکرام کا ہو کہ انتقام...... عورت' دونوں صورتوں میں انتہا تک جا گزرنے کی جرأت رکھتی ہے......!

انسانی تاریخ' ایسی صنفِ نازک کے خوب اور ناخوب کارناموں سے خوب آشنا ٹھہری...... کوئی عصر دور' حکومت وحشمت' سرکار دربار' سیاست و ریاست' تاج و تخت ایسا نہ ہوا جو ان نابغہ روزگار اور فتنہ فسوں کار زنان مصر سے تہی رہا ہو۔ جہاں اکثر رسول پیغمبر' ولی قطب' فاتح بادشاہ' عالم' ان کی حیا وفا' تدبر و تدبیر' دانش و بینش' جرأت و جلاوت سے شاد کام و کامران ہوئے' وہیں ان کے فتنہ توز حُسن و جمال' مکر و فریب' چھل کپٹ طراری و طنازی اور منتقمانہ خور و طرز سے عاجز و غارت بھی ہوئے۔ ناریوں کی اسی بھوگن سرشت کی حامل اس چنگڑی نے' اس شہری' نفس پرست ملینک کو اس کی اوقات سمجھا دی تھی۔ اس نسل و نسب کی عورتیں بلا کی رجولت پسند ہوتی ہیں۔ اُن کے اندر شہوت کا اِک جوار بھاٹا ہوتا ہے۔ ایسی عورت' کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ جوں جوں عمر زیادہ ہوتی ہے وہ اور پُر شباب ہوتی جاتی ہے۔ بھلے جسم و اعضاء میں وہ کساؤ تناؤ نہ رہے لیکن کا ٹھی کبھی ماٹھی نہیں پڑتی۔ اُس کے انداز و ادا میں بڑی تیکھی رہتی ہیں۔ وہ اپنے مرد کا انتخاب بھی خود کرتی ہیں۔ ایسا مرد' جو مرد کی تعریف پہ پورا اُترتا ہو۔ ایسی اَوگنی ناری کا پُرش بھی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا...... کیونکہ عورت' ایسی

خوراک اور خدمت سے آشنا رکھتی ہے جو اُسے ایور گرین رکھتی ہے......!
کبھی کبھی دشمن بھی ایسا وار کر جاتا ہے جس سے موت کی بجائے زندگی مل جاتی ہے۔ زہر ہلاہل بھی کبھی کارِ تریاق کر جاتا ہے۔ حادثہ بھی کبھی وہ علاج کر دیتا ہے جو لاعلاج ہوتا ہے۔

سُنی آپ نے اس پیرِ فرتوت کی باتیں! یہ کچے پیروں کا پکا جھونا...... دروغ پرور دروغ باف ایسی ایسی بے پر پاؤں کی چھوڑتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ قاری جانتے ہوئے بھی یقین کرنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اللہ توبہ! اسے آگے پڑھیں؟



## زہر کرتا ہے کبھی کارِ تریاق......!

میرا ایک عقیدت مند میرے ہاں اپنا جواں سال بھانجا لے کر آیا۔ خوبصورت بالا قدامت' یہ گورا چٹا لڑکا' پہلی نظر میں مجھے بڑا بھلا لگا' ماشاءاللہ کہتے ہوئے میں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا' اپنے پہلو میں بٹھایا۔

''باباجی! یہ وہی میرا بھانجا ہے جس کا ذکر ایک دو بار آپ سے کر چکا ہوں۔''

مجھے کچھ یاد نہ تھا کہ وہ اس کی بابت کیا بات کر چکا ہے؟ میرا کمزور حافظہ اور مصروفیات کچھ ایسی کہ صبح کھایا' دوپہر تک یاد نہیں رہتا چہ جائیکہ بیتے دنوں کی کوئی بات یاد رہے۔ یونہی اثبات میں سر ہلا کر ایسا تاثر دیا جیسے میں کچھ بھولا نہیں۔ ''میں نے مسکراتے ہوئے اس جوان لڑکے سے نام پوچھ لیا۔ میری مسکراہٹ' چہرے پہ سکڑ کر رہ گئی جب اس نے توتلی زبان سے اپنا نام' اٹک اٹک کر قیمہ قیمہ بتاتے ہوئے' ہاتھ بڑھا کر میری داڑھی سے کھیلنے لگا۔ ماموں آگے بڑھ کر اُسے میرے پاس سے اُٹھانے لگا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ میری شہ پا کر بہت خوش ہوا۔ اپنی بڑی اُنگلی منہ میں ڈال کر غل غل کرتے ہوئے ماموں کا منہ چڑانے لگا۔ اب وہ داڑھی چھوڑ کر میرے بالوں اور گلے میں پڑے موتی منکوں کی جانب ہولیا۔ جب میرا پورا معائنہ مشاہدہ کر چکا تو کسی دو تین برس کے بچے کی زبان اور لہجے سے پوچھنے لگا۔

''آپ تا نام تا ہے؟...... آپ تے پاث ما نو بلی ہے......؟''

میں اُسے گدگدا کر اُسی کے انداز میں ہاں میں جواب دیا تو وہ کھل کھلا کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا...... یعنی ایک دوست کی طرح مجھے قبول کر لیا تھا۔ آئس کریم کھلائی...... بچوں کے لیے رکھے ہوئے گیند' کھلونے' بہت سی ٹافیاں گولیاں دیں اور پھر ملنے کے وعدے پہ اُنہیں رخصت کیا۔

ایسے اَبنارمل بچوں اور دیگر مرد و زن سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے لیکن ایسا خوبصورت' دراز قد' نوجوان بچہ! اس حالت میں دیکھ کر واقعی دُکھ ہُوا تھا۔ عمر کچھ مہینے کم سولہ برس اور دماغ باتیں' دو اڑھائی برس کے بچے کی۔

اگلے دن اُس کا ماموں' فون پہ گزشتہ روز' اپنے بھانجے کی حرکتوں پہ معذرت کرتے ہوئے مزید بتانے لگا کہ نوجوان بچہ! اپنے بستر پہ ہی بگ مُوت کر دیتا ہے۔ دانت مانجھ سکتا ہے اور نہ خود منہ ہاتھ دھو سکتا ہے۔ کھانے پینے میں بھی زبردستی کرنی پڑتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ پورا مرد ہے' جگہ دیکھتا ہے نہ ماں بہن...... سب کی موجودگی میں اپنے مردانہ اعضاء سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ منع کرو تو بے طرح روتا مچلتا ہے۔ وقت بے وقت' جب جی چاہتا ہے کپڑے اُتار کر ننگا ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں اور کیا کچھ بتاتا؟ میں نے اُسے روک دیا۔

''بھائی! جو کچھ تم بتا رہے ہو وہ میں جانتا ہوں بلکہ وہ کچھ بھی...... ! جو تم اور دوسرے نہیں جانتے۔ بولو! تم چاہتے کیا ہو؟''

''بابا جی! بس' کرم کی اک نظر ڈال دیں۔ میری بہن کا اکلوتا بیٹا ہے اور اس سے نیچے اُوپر کی چار بہنیں اور ہیں جو اسے بے حد چاہتی ہیں۔ اس کی نازیبا حرکتوں سے ازحد شرمندہ ہوتی ہیں۔ کوئی مہمان آ جائے اسے کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ کسی کے گھر' ساتھ لے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

وہ بلا رُکے کہتا جا رہا تھا جیسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کہہ دینا چاہتا ہو۔ مزید بتانے لگا۔

''ذہنی' جسمانی پس ماندگی تو شاید برداشت کی جا سکتی ہے لیکن اس طرح کی سرعام جنسی بیہودگی تو غرق کر کے رکھ دیتی ہے۔ ایک آخری بات کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ مجھ سمیت اُس کے تمام گھر والے بھی یہی یقین رکھتے ہیں کہ اس نوجوان معصوم اور خوبصورت بچے کو اللہ کے بعد آپ ہی......؟''

میری سماعت کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔ اُس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔

''بس! سب بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ میں اسے پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔ بندے کی بھیتر کی ساری کتھا' اُس کی آنکھوں' چہرے ماتھے پہ جلی الفاظ میں تحریر ہوتی ہے۔ سیکڑوں ہزاروں میں ایسے دو چار اَبنارمل مولود نکل ہی آتے ہیں جو دل' دماغ یا جسمانی طور پہ کسی نہ کسی کی خرابی کا شکار ہوتے ہیں۔ زیادہ تر اس طرح کے ذہنی مریض بچے منشیات کے عادی والدین' موروثی وجوہات' دوران حمل کسی پیچیدگی بیماری' لاپرواہی' چاند سورج گرہن کی گھڑ گاتھ...... کالی ایلمی' بانجھ جھگڑی جھوتی' ناری کی بدنگاہی بددعا یا پھر زچگی کے دوران دایہ کے ہاتھوں کسی نرمی سختی کا نتیجہ بھی ہوتے ہیں اور لگا ہے مقسوموں کے لکھے بھی......؟''

چند لمحے اُدھر خاموشی کی برف جمی رہی۔ ذرا پگھلی تو عاجزی سے کہنے لگا۔

''باباجی! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ میرے پلّے کچھ نہیں پڑا۔ ہمیشہ کی طرح یہ گفتگو میرے سر سے گزر گئی ہے۔ مہربانی فرما کر سرِدست آپ صرف اتنا فرما دیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ڈاکٹروں' حکیموں اور سیانوں بیروں کا نہ فرمایئے گا کہ جہاں تک رسائی بھائی تھی کوئی نہیں چھوڑا...... اب ہماری آخری اُمید آپ ہی ہیں۔ کوئی دوا' دُعا یا نگاہ؟''

''بھائی! کوئی مرض ایسا نہیں جس کی شفا اللہ پاک نے نہ اُتاری ہو...... تگ و دو سے جی نہیں چُرانا چاہیے۔ اللہ مُسبّبُ الاسباب ہے۔ میری ناقص عقل میں جہاں تک آیا ہے۔ آپ اِسے میرے پیر خانے' آزاد کشمیر تراڑکھل نیریاں شریف لے جائیں' وہاں غزنوی پیر سے دُعا علاج کروائیں۔ اللہ شفا دینے والا ہے۔''

بیس بائیس روز بعد' میرے اُسی عقیدتمند بچے کا فون آیا۔ پتا چلا کہ وہ نوجوان بچہ وہاں پہنچ کر پیٹ کی کسی بیماری سے عاجز ہُوا' ناقابلِ برداشت سردی' سہولتوں کا فقدان' مجبوراً اسے واپس لانا پڑا۔

آزاد کشمیر کا یہ علاقہ انتہائی دُشوار گزار اور بلند و بالا پہاڑوں' قدرتی چشموں پہ مشتمل ہے۔ تراڑکھل پہنچنے کے لیے راولپنڈی سے ویگنیں ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ جو لوگ اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں اُن کے لیے تو شاید کوئی مشکل نہ ہوتی ہوگی مگر نئے آنے والوں کے لیے ایک کڑا امتحان ہوتا ہے۔ دریائے نیلم کے ساتھ ساتھ کبھی اِدھر کبھی اُدھر...... اور پھر چکردار تنگ اُدھڑی پُدھڑی سڑکیں...... آسمان کو چھُوتی ہوئی بلندیاں' پاتال تک اُترتی ہوئی گہرائیاں...... مسافر کو موت کی صُورت دکھا کر کلمے کا وِرد کرنے پہ مجبور کر دیتی ہیں۔ سفر کے بخیریت اختتام پہ اکثر مسافر' منّت کی مُرغیاں اور نقدی دیتے ہیں۔ آئے دن چھوٹے بڑے حادثات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ بریک فیل ہونے یا ڈرائیور کی کوئی غلطی' گاڑی کو فرلانگوں نیچے گہری کھائیوں میں اُتار دیتی ہے۔ لُڑھکنیاں لیتی' پتھروں چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی گاڑی اور مسافر پہچاننے کے قابل نہیں رہتے۔

یہ لوگ بے نیل مرام واپس لوٹ رہے تھے کہ ایک تنگ سے موڑ پہ ویگن پھسل کر نیچے کھائی میں لُڑھک گئی۔ خوش قسمتی سے پہاڑ کے گھنے درختوں نے ویگن کو تو مزید نیچے گرنے سے بچا لیا' لیکن تین مسافر' ایک عورت اور دو مرد' لُڑھکتی ویگن سے باہر گِر کر پتھروں جھاڑوں درختوں سے ٹکراتے ہوئے نیچے مختلف جگہوں پہ جا پڑے۔ ان تینوں میں زندہ مگر شدید زخمی' یہی ذہنی طور پہ معذور جوان بچہ تھا۔ جب لوگوں نے اِسے تلاش کیا تو یہ جسمانی طور پہ معمولی سا زخمی تھا مگر سر بُری طرح کٹ پھٹ چکا تھا۔ زخمیوں کو تراڑکھل ہسپتال لے جایا گیا جبکہ اِسے جیسے تیسے راولپنڈی ملٹری کے ہسپتال لے آئے' چند روز علاج معالجہ ہُوا مگر اِسے ہوش نہ آیا تو ایمبولینس میں ڈالے لاہور لے آئے۔ یہاں اِسے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا مگر یہ کومے کی حالت سے باہر نہ نکل پایا' تو پھر میرے حوالے ہو گئے۔''

انسانی فطرت میں ہے وہ مایوسی اور ناکامی کی حالت میں وہم و گماں' شک و شبہات اور منفی انداز فکر کا حامل ہو جاتا ہے۔ اُس کا یقین ایمان کمزور پڑ کر جادو ٹونے کی طرف راغب ہو جاتا ہے مگر ایسا اُن لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جو بے علم' جاہل ہوتے ہیں۔ توہمات کا زہر اُن کی رگ رگ میں اُترا ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا۔ میرا عقیدت مند بچّہ' جو اس اَبنارمل بچّے کا ماموں تھا۔ اس کا جینا محال کر دیا گیا۔ ہر اِک نے اُسے نوکِ زباں پہ رکھ لیا کہ اس کے بابے کے غلط مشورے کی وجہ سے ہمارے جوان بچّے کا ایسا حال ہُوا...... نہ ہم اُدھر پہاڑوں پہ جاتے نہ حادثہ پیش آتا۔ غرضیکہ اُنہوں نے سارا ملبہ مجھ پہ ڈال دیا۔ اَب میرے عقیدت مند بچّے پہ جب اِک حد سے زیادہ دباؤ پڑا تو وہ پھر مجھ سے رجوع ہُوا' تمام حالات تفصیل سے بتاتے ہوئے' ہاتھ جوڑنے لگا۔

''بابا جی! بھانجا پچھلے دو ہفتوں سے کُومے میں پڑا ہے۔ سر کے زخم تو کم و بیش ٹھیک ہو چکے ہیں مگر بیہوشی نہیں ٹوٹ رہی۔ بہن کا رونا نہیں دیکھا جاتا۔ پہلے تو اِشارے کنایے سے کہتے تھے مگر اَب تو برملا' مجھے اور آپ کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ مَیں اُنہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں وہ کئی ایک عاملوں اور بابوں سے بھی مِل چکے ہیں۔ دَم والا پانی' جھاڑ پھونکے دھونیاں جاری ہیں۔ بہنیں مُصلّے بچھائے وظیفوں پہ بیٹھی ہیں۔ اُنہیں کسی بابے نے کہا ہے اس کا علاج غلط ہُوا۔ پوری فیملی' آپ اور میرے خلاف ہو چکی ہے۔ بتایئے! اَب مَیں کیا کروں؟...... بہن کا رونا' بھانجے کی مُردوں سے بدتر حالت دیکھی نہیں جاتی اور نہ ہی آپ کی توہین برداشت ہوتی ہے۔''

مَیں زیرِلب' مسکراہٹ دبائے اُس کی کتھا سُن رہا تھا اور سوچ رہا کہ حکمت مصلحت مفاہمت کیسے گھمبیر اور مستور ٹھہرے کہ ہر کوئی جان اور سمجھ نہیں پاتا۔ جو جانتے ہیں' اُنہیں ہی پتا ہے کہ بیرونِ دریا کیا اور اندرونِ دریا کیا ہوتا ہے؟

اُس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

''میرے پہلے مشورے سے تم لوگوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا بلکہ اُلٹا نقصان ہُوا۔ اَب کیا کہتے ہو......؟ میری مانو' مجھے درمیان میں سے نکال دو۔ اگر کوئی فائدہ پہنچ جاتا تو مَیں اُن کی نظر میں کوئی کرنی والا بابا ٹھہرتا۔ اَب چونکہ معاملہ پہلے سے بھی زیادہ بگڑ چکا ہے لہٰذا مجھے کرنی والے بابے کی بجائے بھرنی والا بابا نہ بناؤ' میری طرف سے معذرت......!''

وہ میرے پاؤں پکڑ کر بولا۔

''بابا جی! وہ مُور کھ لوگ ہیں اَکلوتے جوان بیٹے کی پریشانی میں پھنسے ہوئے...... جس کا بازو بیلنے میں

پھنسا ہُوا ہوا اُسے غلط صحیح کچھ نہیں سُوجھتا!...... میرا کامل یقین ہے آپ کا مشورہ غلط نہیں تھا اُن سے ہی نا سمجھی ہوئی یا پھر اُس کے مقدر میں شفا نہیں تھی۔''

''تم نے صحیح سمجھا...... مجبور بھوکا اور بیمار صبر اور سمجھداری کا متحمل کم ہی ہوتا ہے۔ اُن کو وہاں سے واپسی کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بچّہ بیمار ہوا یا جاڑا کھا گیا اُس کا علاج بھی ہو جاتا...... بیماری آزاری محض زحمت ہی نہیں رحمت بھی ہوتی ہے۔ اپنی طرف سے وہ بچّے کو وہاں سے بچا کر لا رہے تھے مگر راستے میں گاڑی کھائی میں جا گری...... بیمار بچّہ پہلے حال سے بھی گیا۔''

سُنار' لوہار کے پاس مرمت یا پالش صفائی کے لیے کوئی اوزار یا زیور لے کر جاتے ہیں وہ اُسے پہلے تیزاب یا آگ میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی یہ سنار یا لوہار ہی جانتا ہے کہ اُس نے آب تاب یا اُنہیں مرمت کرنے کے لیے کون سا طریقہ استعمال کرنا ہے۔ اَب بھی میرا مشورہ یہی ہے۔ بچّے کو اُدھر اُسی پیر غزنوی کے پاس لے جاؤ۔ وہ اُسے' نشیب میں کھڑا کروا کر اُوپر حجرے کی چھت سے ٹھنڈے یخ پانی کی دھار ڈلوائے گا۔ اللہ شفا دے گا اور اب رہا کوّے کا قائم رہنا...... تو یہ بھی اُس کے علاج کا حصّہ ہے۔ کسی کا بوسہ بھی کبھی موت کا پھندا ثابت ہوتا ہے اور کسی کا دانتوں سے کاٹ کر بوٹی نکال لینا بھی جراحت عارضہ ہوتا ہے۔ گاڑی گرتی' نہ وہ لوٹنیاں کھاتا پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے گرتا...... سر سے خون نہ نکلتا' نہ دماغ اُلٹ پلٹ ہوتا تو شاید اُس کی دماغی صحت کی دُرستگی کا امکان بھی پیدا نہ ہوتا۔ ذرا سنبھلے تو اُسے وہیں لے جاؤ...... انشاء اللہ! ہر طرح سے صحت مند ہو کر واپس لوٹے گا۔ سبز کناری والی سفید ٹوپی سر پہ پہنے گا تو بھولی بسری ساری عقل واپس لوٹ آئے گی۔''

معلوم یہ ہُوا کہ کبھی زہر بھی کار تریاقی کر سکتا ہے اگر کوئی نگاہ والا ہو؟ حکمت اور تدبیر' تقدیر کو ٹال تو نہیں سکتے لیکن کوئی ایسی صورت ضرور نکل آتی ہے کہ بیچ کا کوئی راستہ دکھائی دینے لگتا ہے۔''

ایک لمبے مشاہدہ' ڈھیروں غوض و غور کے بعد تقدیر اور تدبیر کا گھمبیر مسئلہ کچھ سمجھ میں آیا کہ اٹل تقدیر اپنی جگہ پہ ایک حکم کا درجہ رکھتی ہے مگر حکم والا حاکم' چاہے تو اپنے حکم میں کوئی خوبصورت سی تبدیلی فرما کر اُسے حکمت کی شکل بھی دے سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ کوئی مجبورِ محض نہیں مختارِ کل ہے...... بس اسی حُسنِ فہم و ظن کے صدقے اللہ کے بندے کچھ گنجائش حاصل کر پاتے ہیں......!

اللہ جانے' کس طرح وہ لوگ دوبارہ وہاں جانے پہ رضامند ہوئے' بہرطور کوّے کی حالت میں مریض کو لیے اُنہی دُشوار گزار پہاڑیوں سے گزر رہے تھے کہ عین اُسی حادثہ والی جگہ پہ پہنچ کر مریض بچّے نے

ہلکی سی کراہ کے ساتھ حرکت کی۔ چند لمحوں کے بعد آنکھیں بھی کھول دیں۔ گھر والوں کی خوشی دیدنی تھی۔ مریض نے اشارے سے پانی طلب کیا...... ایک آدھ گھونٹ لینے کے بعد خود اپنے زور سے اُٹھ بیٹھا۔ اردگرد جھانکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بابا کہاں ہے......؟''

باپ نے پوچھا۔ ''کون بابا......؟''

''جس نے مجھے سوتے ہوئے جگایا۔''

باپ نے بتایا۔ ''یہاں ہم ہی ہیں بابا تو کوئی نہیں!''

وہ دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد میرے اُسی بچے نے ٹیلیفون پہ نوید سنائی کہ اُس کا بھانجا اَب مکمل طور پر صحت یاب ہو کر واپس گھر پہنچ چکا ہے۔ حیران کن بات یہ ہوئی کہ اُس کی پیدائشی ذہنی بیماری دُور ہو چکی تھی۔ وہ اپنی عمر' عقل و ذہانت کے مطابق بات کرتا' نازیبا حرکات ختم ہو گئیں۔ اَب وہ ایک اِنتہائی معقول' صحت مند جوان تھا جسے دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ کبھی فاترالعقل بھی رہا ہوگا۔

اِس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد' یہ بتانا تھا کہ جو ہوتا ہے وہ اصل میں نہیں ہوتا۔ آنکھ تو بشریت کے تقاضوں سے دیکھتی ہے جبکہ اِس کے باطنی اور روحانی مقدرات یکسر کچھ اور ہوتے ہیں۔ آنکھ کو تو منظر کا عکس نظر آتا ہے اُس کا باطن نہیں...... اور عکس' لرزاں لرزاں...... کوئی بھی لرزتی لہراتی چیز اپنی مرکزیت سے جُزی نہیں بلکہ دُھندلی غیر واضح بے ثبات سی ہوتی ہے۔ اُڑتی اُمڈتی کالی سرمئی گھٹائیں' بظاہر دُھنکی ہوئی گدلی رُوئی جیسے دکھائی دیتی ہیں۔ تار تار ریشہ ریشہ تتر بتر...... مگر جب جی کھول کے برستی ہیں تو لگتا ہے قلزم' زمین پہ نہیں آسمان پہ چڑھے بیٹھے ہیں!

## ● منزلیں خود بھی تو گم کرتی ہیں رَستہ اپنا......!

علمُ الاِنسان کے ماہرین' علمائے نفسیات خوب سمجھتے ہیں کہ اِنسانی فطرت' جبلت' سرشت...... طور و رویے' حمق و خباثت' اِس کے معمولات و مشاغل کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں۔ اِنسان کا تلوّن' خودسری و خود پسندی اسے کیوں کرتگنی کے ناچ نچاتے' جبکہ اِک حد سے زیادہ خود اعتمادی و خود پسندی بھی خوب خوار کرتی ہے۔ سو جو چیز اسے سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے بلکہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے وہ بے علمی'

مایوسی اور بے یقینی کی فضا ہوتی ہے۔ اسے اپنے کسی عمل کے سیاق و سباق کی خبر نہ کسی ردِعمل اور انجام کا ادراک؟ وہ ایک ایسے مسافر کی مانند ہوتا ہے جو اندھا بھی ہے اور اندھیرے میں سفر بھی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ پھر اُس کا مقسوم کب کوئی انجانا ہاتھ آگے بڑھ کر اُسے تھام لیتا ہے یا وہ پھر کسی گہرے کھڈے میں جا گرتا ہے۔

اللہ کریم کے لینے دینے کے ڈھنگ' بندے کی کھوپڑی میں نہیں آتے۔ بندہ تو بس! اپنی محدود عقل سمجھ سے تھوڑا بہت دال دلیہ ہی دَل سکتا ہے...... حکمت و مصلحت کی باریک بینائی' اس کی منطقی موٹی چھلنی سے سیدھی سیدھی گزر جاتی ہے۔ آگ سے گلزار کھلانا' پرندوں سے فیلے مروانا' مُردوں کو زندہ کروانا' کنکریوں سے کلمہ پڑھوانا' بن باپ کے اولاد' اندھیرے سے اُجالے اور اُجالوں سے تاریکی پیدا کرنا اُسی کے ہی کام ہیں۔"

انسانی دماغ' دل اور آنکھ' اللہ پاک کے کارخانۂ قدرت کی کمال صناعی صفات کے بینظیر نمونے ہیں۔ انسان کی تمام تر سائنسی ترقی' میڈیکل' پیرامیڈیکل سائنس کے اثاثے' مشاہدے اور تجربات' ابھی تک ان اعضاء کی ظاہری باطنی کارکردگی' حکمت و فعالیت کو کماحقہٗ جاننے سمجھنے سے عاجز ٹھہرے۔ بے شک' انسانی علوم و معقول' فہم و ادراک' بینش و ذہانت' ہمت و طاقت' اپنے محدود دائرہ و دم میں ہی عاجز رہتے ہیں۔ باہر نکل جائیں تو نمرود' شداد' فرعون و نخشب بن کر فاخر ہو جاتے ہیں۔ دیکھیں تو ماورائیت' بعض مخصوص اور علیتِ بشری سے معصومان کے لیے ہوتی ہے یا پھر وہ جسے عطا کر دے......!

اَب یہاں ایک بڑا سا "لیکن" بھی ہے کہ ربُّ الحکمت نے اپنی کمال مشیت و مصلحت سے اپنے اور اپنے بندوں کے آس پاس جو شیطان الرجیم کھلا چھوڑا ہوا ہے وہ ایسی ایسی ذرفطیاں' موشگافیاں' دلچسپیاں' رنگینیاں' دلنشینیاں' خوبصورتیاں بکھیرتا ہے جیسے شکاری' شکار کو پھانسنے کے لیے دام کے آس پاس دانے ڈالتا ہے کہ بشریت کے تقاضوں سے لتھڑا' ابتھڑا' بشر' کسی نہ کسی طور دام میں پھنس ہی جاتا ہے۔"

نسیان' تلوّن' وانتگی' ذرا اندازی' بغاوت و مزاحمت' ناشکری' نافرمانی' تجسس و تذبذب اور رُعب و لالچ اسے زیر و زبر کرتے رہتے ہیں۔ یقین بے یقینی کی کیفیات میں اُبھرنا ڈوبنا تو سدا اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ جانیے کہ یہی روش رَوِیّے' جہاں اسے معتوب و مغضوب ٹھہراتے ہیں وہیں کبھی زمرہ بشریت و انسانیت میں کسی انوکھے سے مقام و انجام کا بہانہ بھی بن جاتے ہیں۔ کبھی کہیں نیکیاں اچھائیاں' شرافت و نجابت بظاہر نجاست انجام نظر آتی ہیں...... کہیں بُرائی نفرت' عداوت' خشونت اور ظلم و تشدد کی فضا میں راستی سلامتی' بہجت و محبت کی فاختاؤں عندلیبوں کے ہیولے پھڑپھڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔"

آنکھ' ظاہری روشنی اور عقل' دم دلیل کی محتاج ٹھہری...... دونوں کے آگے ستر ستر پردے...... اصل

منظر کا باطن بعید اور حقیقت خدا انجام...... واضح نہ واصل و حاصل......!

اس واقعہ اور بیشتر کے واقعات میں مندرجہ بالا باتوں کی تمام تر امثال بدرجۂ اُتم موجود ہیں کہ تلوّن مزاج' بے صبرا انسان جو اپنی خواہشات کے مطابق فوری طور پہ اپنے حق میں بہتری کا فیصلہ چاہتا ہے۔ کتنے بڑے نقصان' فضل و کرم کی محرومی سے دوچار ہوتا ہے۔ اللہ کریم کی مشیت و حکمت' اس کی نبودی عقل میں آتی ہی نہیں۔ وہ تو فوری طور پہ اپنی نام نہاد عبادات' اُلٹی سیدھی التجاؤں دُعاؤں کی اپنی مرضی کے مطابق تکمیل چاہتا ہے۔ جبکہ اللہ کریم بہتر جانتا اور کرتا ہے کہ اُس کے حق میں کیا مناسب ہے۔؟

''مولائے کائنات کے ایک فرمان کا قریب قریب مفہوم کہ میں نے اپنے ارادوں اور خواہشوں کی ناکامی میں خدا کو پایا۔''

## ● تقدیر کے اُوپر بھی ایک تقدیر ہوتی ہے......!

کہیں سے سنا کشمیر کے علاقہ میں ایک صاحبِ حال ننگ دھڑنگ مجذوب ہے جو دُعا اللہ کریم کے حضور پیش کرتا ہے وہ قبولیت کا درجہ پاتی ہے۔ دل میں اُس کی زیارت کی سمائی۔ دُشوار گزار طویل سفر اختیار کر کے وہاں پہنچا ایک گنجان جنگل کے ویرانے میں اُسے اِس حالت میں پایا کہ جڑی کے بوٹ سے جثہ پہ اک تار و تل سا لنگوٹ' چیدوں میں دُھندلاہٹ کی دُھول...... چندیا چاندی میں چُندلائی ہوئی...... منہ دانت داڑھ سے خالی' اوڑھنا نہ بچھونا...... ایک پرانے درخت کے ٹھونٹھ سے ٹیک لگائے پڑا تھا۔ جنگلی چیونٹوں مکھیوں مچھروں کی ایسی یلغار جیسے وہ انسان نہ ہو پرانے گزی بھیلی یا گندگی کی کوئی پوٹ ہو؟...... گرد و پیش اور خود سے بے نیاز...... پہلی نظر دیکھنے سے لگا وہ گوتم یا گوشے کی باقیات ہو یا پھر کوئی ایسا دَم دُنیا بیزار منش' جو اپنی بچی کھچی سانسیں فطرت کو واپس لوٹانے خاطر' اُس کی گود میں آ بیٹھا ہو۔ ''میں قدرے فاصلہ پہ کھڑا اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کھانا' کھنکھورا بھی' پر کیا مجال جو اُس کے کانوں پہ جوں تک نہ رینگی ہو۔ یوں بھی لگا کہ پنچھی اُڑ چکا ہے۔ ٹوٹا پھوٹا پنجر وخالی پڑا ہے۔ چیونٹیاں' مکھیاں' کیڑے مکوڑے' گدھ نیو ہے' چیلیں کوّے' مُردہ لاشوں کا اپنا تختۂ مشق بناتے ہیں۔ زندہ جسموں پہ حملہ آور نہیں ہوتے۔''

بہت بعد سمجھ آیا کہ جن کی رُوحیں' حق واصل ہوتی ہیں' اُن کے ظاہری جسم' فقیروں کے لنگوٹوں کی مانند تار تار ہوتے ہیں۔ ایسے بوسیدہ و دریدہ لنگوٹ' جنہیں حشرات الدُنیا' دَم دَم کترنے پہ لگے رہتے ہیں اور فقیروں کو خبر تک نہیں ہوتی......!

یہ منش بھی شاید کوئی ایسا فقیر تھا۔ آس پاس کچھ ایسی بیکار اشیا، بکھری پڑی تھیں جنہیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ اِدھر عقیدت مند آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے کھانے پینے کا سامان نذر نیاز وغیرہ لاتے ہیں۔ ردّی کاغذ' مٹھائی کے ڈبے' تازہ باسی پھول پتے...... باکا چاکا کاٹھ کباڑ اِدھر اُدھر بکھرا ہُوا دکھائی دے رہا تھا۔

مَیں اِدھر خالی ہاتھ پہنچا تھا کہ بھرے پُرے ہاتھوں تو پیشہ ور پیروں کے ہاں رسائی ہوتی ہے۔ ولیوں قطبوں غوثوں کے دَروں' سروں پہ ڈالی دھرے داخل ہُوا جاتا ہے۔ جلا پھونک فقیروں دَرویشوں کی کھوج میں سینے کے دَر و دَروں کو دُہکا کر پاؤں دَھرا جاتا ہے اور مجذوب اَلست کے رُوبرو نگاہِ نیم اور دمِ وجیم رکھنا پڑتا ہے کہ اِدھر خطا بھول چوک کی تلافی نہیں ہوتی...... خطا وار سیدھا سیدھے فنا فی النار ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد' احساس ہوا کہ کچھ نچلے بندر اور مختلف پرند' آس پاس موجود ہیں جو شاید مجھ سے کسی دانے پانی کی توقع باندھے ہوئے تھے۔ اُن کی ہلکی ہلکی غُوں غُوں اور آوازیں مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ مگر میرے پاس کیا تھا؟ مَیں اَزلی بھوکا اور پیاسا...... کنویں کی منڈھیر پہ کھڑا...... پانی کہیں تہہ تارا بنا ہُوا...... اُس تک رسائی کی سبیل بظاہر کوئی سجھائی نہ دے رہی ہو۔''

ہر عقدہ کا کوئی حل اور ہر محنت کوشش کا کچھ نہ کچھ پھل' کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا ہے۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں' مَیں کچھ قدم آگے سرکا' کہ حرکت میں برکت چھپی ہوتی ہے۔ پاؤں نیچے کے پتے چرچرائے' کچھ پرندوں کی چہچہاہٹ اُبھری' بندروں کی خُوخُو سنائی دی۔ اَب مَیں ہمت کر کے کچھ مزید آگے بڑھ آیا۔ مَیں قریب سے اس ''مردِ عجیب'' کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اِس دیکھا دیکھی میں کہیں سے ایک شریر سا بندر کا بچہ' اُچک کر اُس کے ناتواں کندھے پہ آ بیٹھا اور مجذوب کے سر پہ چھدرے اُلجھے گندلے بالوں کے درمیان سے کھرنڈ اُکھیڑ اُکھیڑ کر خود بھی کھانے لگا اور مجذوب کے مُنہ میں ڈالنے لگا۔ مجھے اُس کی اس حرکت سے بڑی گھن آئی۔ بلا سوچے سمجھے مَیں مزید آگے بڑھا اور اُسے روکنا چاہا۔ اچانک مجذوب میں حرکت پیدا ہوئی۔ اُس نے ہاتھ کے اِشارے سے مجھے روک دیا۔ تعجب ہُوا کہ اُس نے خود اپنا سر' بندر کے بچے کی جانب جھکا دیا تھا۔ شریر بچہ مجھے دکھا دکھا کر کھرنڈ اُکھاڑ کر مزے سے کھا بھی رہا ہے اور کھلا بھی رہا...... مجذوب کے ہونٹوں جنبش ہوئی۔

''ان بچوں کے لیے اگر تم کچھ لا نہیں سکتے' اُنہیں اِدھر سے ہی کچھ کھانے دو...... !''

پیشتر کہ وہ مجذوب پھر پتھر کی سِل بن جاتا...... مَیں ہاتھ جوڑے سر جھکائے گویا ہُوا۔

''بابا! سخت بھول ہوئی...... بڑی دُور سے زیارت کرنے اور ایک دو سوالوں کا جواب پوچھنے آیا ہوں۔ نادانستگی سے کچھ نذر نیاز نہ لا سکا۔ بندہ بشر ہوں معاف کر دیں' ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''

مجذوب نے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے میرے ہی الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔

"بندہ بشر ہوں معاف کر دیں...... ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"......

پوپلے منہ میں ہوا بھر کر مزید کہا۔ "تم میں تو بندر کے بچّے جتنی بھی سوجھ بوجھ نہیں' بندہ بشر تو بڑی آگے کی منزل ہے۔"

اس رجلِ ذکاء کی یہ بات' شاید میرے پلّے ہی نہیں پڑی تھی۔ میں اسی دست بستگی کی حالت میں سرنیوڑے کھڑا تھا۔ میرے کسی ردِ عمل کو نہ دیکھ کر وہ پھر کہنے لگا۔

"ادب' صدق اور خوئے جستجو اگر تم میں نہ ہوتی تو جس طرح خالی ہاتھ آئے ہو' ادھر سے تہی دست ہی لوٹتے۔ راضی بہ رضا رہنا ہی اصل ایمان اور تصوف ہے۔ مشیّت ایزدی کے آگے' یونہی جیسے تم ابھی کھڑے ہو...... سراپا تسلیم رہنا' حقیقی عبودیت ہے۔ میں بھی کسی کے لیے مخصوص دُعا نہیں کرتا۔ ساری بات' اللہ کی رضا پہ ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتا ہوں۔ کنوئیں میں ڈول ڈال دو...... کیا نکلتا ہے کتنا نکلتا ہے' نہیں نکلتا...... یہ کنوئیں' ڈول اور ڈول ڈالنے والے کے مقدرات ہیں۔ تقدیر کے اوپر بھی اِک تقدیر ہوتی ہے۔"

اندر سے ایک سوال کھدبدایا' ہونٹوں پہ آیا اور ادا ہو گیا۔

"اللہ سے مانگنا' اپنی طلب پیش کرنا......؟"

"یہ سائل کی سرگردانی پہ منحصر ہے۔ اگر صدا لگا کر پیٹ پالنے کے لیے مانگتا ہے تو فقیر بے ضمیر ہے۔ دَر دَر بھٹک کر خیرات اکٹھی کرنے والا دریوزہ گر...... اللہ سے مانگنے والا درویش ہے اور جو اللہ سے بھی اس وجہ سے نہ مانگے کہ وہ علیم و خبیر ہے۔ وہ مجذوبِ الست و مست کی نشانی ہے۔"

"رزقِ حلال کی نشانی؟"

"رزقِ حلال' پیٹ میں پہنچ کر غلاظت پیدا نہیں کرتا' بدبو نہیں چھوڑتا۔ رزقِ حلال کے بندے کے پسینے میں عنبر کی مہک ہوتی ہے۔ وہ خزانے نہیں توڑتا۔ سوتے وقت اُس کے چہرے پہ نور رقم کھلا ہوتا ہے۔ گالی گلوچ نہیں بکتا...... صادق امین' وفا شعار ہوتا ہے اور مستجاب الدعوات ہوتا ہے۔"

پچھلے تمام مختلف واقعات میں چند ایک چیزیں مشترک تھیں۔ روحانی' نفسیاتی' جنسی' معاشرتی اور سماجی کشاکش۔ جن بھوت پریت' تعویذ گنڈے' توہم پرستی' بے علمی' بے شعوری' معاشی بدحالی' بے انصافی' سماجی گھٹن' اخلاقی بے راہ روی وغیرہ۔ جب کسی معاشرے میں ایسی برائیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو آہستہ آہستہ کینسر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ آج ہمارے معاشرے کا یہ عالم ہے کہ گھر گھر' جھگڑے فساد بپا ہیں۔ عزتِ نفس' اخلاق' اعتبار' احترام' برداشت کا فقدان ہے۔ اخبار اکٹھی کر لیں' دیکھیں ہر شہر گاؤں قصبہ' عاملوں جادوگروں'

جن بھوت ہمزادوالوں کے بڑے بڑے نمایاں اشتہار؟ بدقسمتی سے پوری قوم توہمات میں جکڑی ہوئی ہے۔ خدا رسول قرآن پہ اعتماد اُٹھ گیا۔ تعویذ دھاگے' پڑھائیاں' چلّے وظیفوں پہ زور زیادہ...... میرا دن رات ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے جو مجھ سے دُعاؤں' وظیفوں پڑھائیوں کے طالب ہوتے ہیں۔ ہر اک کی ایک ہی کہانی...... کالا علم جادو کارا وار کا رونا...... روزی' رشتہ بندھے ہوئے۔ خون کے چھینٹے' کپڑوں کا خود بخود کٹ جانا' گوشت کے ٹکڑے' سانپ چھپکلیاں' بھوتنے...... غرضیکہ اک سے ایک بڑھ کر خرافات...... ! لگتا ہے ہم خدا رسول قرآن کے ماننے والے نہیں بلکہ کسی سامری کے پیروکار ہیں...... یہ نام نہاد عامل کامل' پیر' بنگالی عیسائی جادوگر' ڈنکے کی چوٹ' لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عورتوں کی عصمتیں' عزتیں' زیور روپیہ پیسہ' سکون سب کچھ برباد...... '' ریاست سیاست کے کارپردازوں' قانون نافذ کرنے والے اداروں' کسی فلاحی تنظیم کا اس طرف دھیان نہیں۔ سب نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ دو چار چھوڑ کر باقی سب اخبار' نوٹ چھاپ رہے ہیں۔ اخبار کے ماتھے پر قرآنی آیات اور آخری صفحات پہ اسلام' دین' اخلاق' قانون کی تضحیک۔ ایسی بے باکی' عریانی اور اسلامی عقائد کی نفی کی انسانیت مُنہ چھپا لیتی ہے۔ ان اخباری اشتہاروں نے لاکھوں گھرانے تباہ کر دیئے۔ طلاقوں' خودکشیوں' ہلاکتوں کی اک بڑی وجہ یہ چند ایک اخلاق باختہ اخبار' دو نمبر ٹیلی وژن چینلز' نام نہاد عاملوں' جادوگروں کے ادارے بھی ہیں۔ اب تو کئی مسلمان بھی عیسائی یہودی مسلّی' بنگالی' ہندو سکھ بن کر اس کاروبار میں وارے نیارے کر رہے ہیں۔

غور کریں تو فطرت اپنے ازلی اُصولوں طریقوں کے تحت خود بخود صفائی اور چھنائی بھی کرتی رہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کائنات اور دُنیا کا نظام چند لمحوں میں تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ ایک اگر مرتا ہے تو دو چار پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورج ایک سمت غروب ہوتا تو دوسری جانب طلوع ہو جاتا ہے۔ بُرائی کے ساتھ ہی بھلائی بھی کہیں نمودار ہو جاتی ہے۔ معاشرہ میں ایسی کاٹ چھانٹ' کتر بیونت لگی رہتی ہے مگر جب کوئی چیز' نفی یا اثبات میں غیر متوازن ہو جاتی ہے تو اُس کے اثرات ہمیشہ مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ خاص طور پہ عقائد' معاشرتی طور طریقوں' باہمی رَوّیوں اور انسانی اخلاقی تقاضوں' قدروں کی بُری طرح پائمالی معرض وجود میں آنا شروع ہو جاتی ہے۔''

غبارہ ایک حد تک ہوا کا دباؤ قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھٹ جاتا ہے۔ طاغوتی ابلیسی یلغار کے آگے نورانی رُوحانی استعانتیں سینہ سپر رہتی ہیں...... تلوار کے توڑ کے لیے ڈھال بھی ہوتی ہے۔ ایک ہاتھ تلوار' دوسرے ہاتھ ڈھال...... کہاں کس ہاتھ بازو نے کام کرنا ہے یہ جنگجو کی عسکری فراست پہ منحصر ہوتا ہے۔ جہاں کدھر وہ لمحہ بھر غیر متوازن ہُوا۔ کٹ کر دو پارہ ہُوا۔

سروری جہانگیری ' فیلے کی سواری کاسہ کسریٰ میں خوں نوشی ...... فقیری درویشی 'شیر کا برقع' پارے کے پیالہ میں تر چہ الماس کی تلچھٹ پینا؟

ایک اَلست مست فقیر سے پوچھا تھا۔ فقر کا مزہ پھیکا کڑوا یا میٹھا؟ ...... مسکرایا پھر بسورا' خاموشی اختیار کی ...... پھر استادہ ہُوا۔ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ دیتے' ایک طرف چل دیا۔ کچھ دور پہنچ کر ایک غار میں گھس لیا۔ گھپ اندھیرا' جھاڑ کانٹے ...... کچھ آگے قدرے روشنی دکھائی دی۔ یہیں ایک بہت بڑا مار سیاہ' دائرہ کی صورت زمین پہ پڑا دکھائی دیا۔ میں اس کے سر پہ پہنچ کر دیکھا کہ سانپ نے پلٹ کر اپنی دُم کی جانب سے خود ہی کو نگلنا شروع کیا ہوا تھا۔ ایسا پُر اسرار اور غیر ممکن عمل اس سے پیشتر کبھی دیکھا نہ کہ ایک جاندار' خود کو نگل رہا ہے۔ حیرت وخوف کی ملی جلی کیفیت میں منہ کھولے' آنکھیں پھاڑے' سامنے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ خوفناک سیاہ اژدر مار' تھوڑے تھوڑے وقفے جھٹکے سے اپنی دُم کی جانب کا کچھ حصہ نگل لیتا۔ یقیناً اسی کے لمبے جثے سے بنا ہوا دائرہ' دھیرے دھیرے کم ہوتا رہے گا۔ دیر بدیر آج نہیں تو کل' یہ اپنے منہ تک خود کو غائب کر چکا ہوگا۔ سوچتے سوچتے' محدود عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ آگے اندھیرا تھا' کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ تھا کہ وہ خود کو ہی کھا رہا ہے ...... صرف منہ آنکھیں باقی رہ گئیں تو وہ کھایا ہُوا کہاں گیا؟ ...... فقیر سے مزید پوچھنے کا یارا نہ تھا محض اُچٹتی سی نظر سے دیکھا' جواب ملا۔

''منہ تک ہی اُلٹ پڑتی ہے اک جھٹکے سے تمام جسم دوبارہ نمودار ہو جاتا ہے اور پھر وہی عمل ...... !''

یہ بات بھی کسی طور پلّے نہ پڑی بلکہ مزید اُلجھ گئی۔ اَب کیا کوئی اور سوال کروں پھر کوئی ایسا ہی جواب لوں۔ چلو! مٹی پاؤ! سوچ ہی رہا تھا کہ اِدھر سے جواب آ گیا۔

''تم نے کسی ابدال کو سوتے ہوئے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا تو سُنو ...... ابدال' سالم نہیں سوتا' وہ اپنی رُوحانی کیفیت میں پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور فقیر درویش' اَلست مست ...... قہر درویش بر جان درویش ...... دکھاں دی روٹی سولاں دا سالن آہیں دا بالن ...... فنا فی الذات یا صاحب حال والی کیفیت اسی زمرہ میں آتی ہے۔ ابدال کی پارہ پارہ ہونے والی کیفیت کو ظاہری آنکھ والا دیکھ اور نہ برداشت کر سکتا ہے۔ ایسے ہی جیسے عام آنکھ جواہرات کے خواص نہیں دیکھ سکتی۔''

حرفوں لفظوں سے پرانی یاد اللہ کے بعد بھی کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ یہ بھی محبوب کے موڈ کی مانند متلوّن المزاج ہوتے ہیں۔ ٹھنڈے' کبھی تتے' رائی کہیں پہاڑ' مہرباں اور کبھی نامہربان۔ آنا جانا لگا رہے تو دماغ' ''احسان دانش کدہ'' بنا رہتا ہے۔ کبھی کھچ پڑ جائے تو ''مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے'' گنگناتے رہنے سے بھی الفاظ وصل کے بیچ نہیں ہوتے۔ اٹکھیلیوں شوخی شرارتوں پہ بھی اُتر آتے ہیں اور کبھی اپنی حرفی

ہیئت کذائی اور صوتی مشابہت سے اچھی خاصی خرخشی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ گُل لالہ اور گُل داؤدی کی مانند آمدی بھی اور آوردی بھی۔ بلا کے خود پسند' سراپا' خوشبو' معنی و مطالب' تانیث و تذکیر' وزن کا نخرہ جیسا چاہیں اختیار کر لیں۔ کئی ایک نے آبِ حیات پیا ہوتا ہے۔ کچھ بیمار مرتے جیتے رہتے ہیں اور کئی خودکشی کر کے قصہ پاک کر لیتے ہیں۔ میں ان کی فطرت طینت سے قدرے واقف ہوں۔ مجھ سے یہ بے اعتنائی برتیں تو میں بھی انھیں منہ نہیں لگاتا۔ نے بیتے پہ دونوں اطراف سے بتدریج اوبار چھٹنے لگتا ہے' معاملات پھر بحال ہو جاتے ہیں۔"

میرے مشاہدہ تجربہ میں خوب آیا کہ زندہ انسانوں' جذبوں تعلقوں' قبروں' کتابوں کی طرح حرف و لفظ بھی ہوتے ہیں۔ سدا بہار' جوان و توانا' زندگی کی حرارت و حرکت سے بہرہ مند...... ذہن و دماغ میں ہوں تو چکا چوندی' فراست کی چہکار...... کتابوں' مخطوطوں' صحیفوں لوحوں میں اُبھریں تو علم و حکمت' آگہی و آموزش کی ترویج و تہذیب بن جاتے ہیں۔ نطق و نصائح میں فصاحت نصاحت و بلاغت کے پھول کھلاتے ہیں۔

ہاں' تلخ آمیز بھی ہوتے ہیں' ہلاکت آفریں بھی...... دراڑیں ڈالنے والے' قطع کرنے والے بھی۔

یہ چناؤ کرنے والے پہ منحصر ہوتا ہے کہ گلشنِ سخن سی چہل بھی...... حظ بھی مل جاتا ہے اور کہیں رنج بھی......!

لاہور لبرٹی مارکیٹ میں ایک آئس کریم پارلر کے قریب' گاڑی میں اپنے بچے کا انتظار کر رہا تھا جو قریب عینکوں والی دکان سے میری مرمت شدہ عینک اُٹھانے گیا تھا۔ گرمی تھی' شیشہ نیچے کر کے باہر کا نظارا کرنے لگا۔ معاً میری نظر ایک چھوٹے سے بھک منگے بچے پہ پڑی جو حسرت بھری للچائی نظروں سے' میز پہ بیٹھے کسی امیر گھرانے کے بچوں کو آئس کریم کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ گندا مندا نیم کھلا ہوا ہاتھ' آگے بڑھایا ہوا تھا۔ پھٹی ہوئی قمیص' ننگے پاؤں' ناک سے ریزش بہتی ہوئی...... اک عجب سی کسمپرسی اور زندگی کی پھٹی پرانی تصویر بنا وہ اس اُمید میں تھا کہ شاید کوئی بچہ' تھوڑی سی بچی کھچی آئس کریم اسے دے دے۔ مگر وہ گول مٹول صحت مند امیر گھرانے کے بچے تھے جو اس قسم کی فضولیات پہ دھیان نہیں دیتے۔ وہ مختلف زاویے بدل بدل کر ان کی توجہ دھیان حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک اور گاڑی آ گئی۔ اس میں بھی بچے تھے' وہ کھانے بیٹھے تو یہ بچہ' ان کے دوالے ہو گیا۔ جب یہاں بھی اسے کچھ حاصل کرنے میں کامیابی دکھائی نہ دی تو وہ ساتھ والے پارلر کی جانب بڑھ گیا۔ اِدھر چند داڑھیوں والے' بغیر بچوں کے بیٹھے آئس کریم کھا رہے تھے۔ حاجتمند اپنے اپنے حساب سے ٹھوے اندازے لگاتا رہتا ہے۔ اُس کے معصوم اندازے کے مطابق داڑھیوں' ماتھے محرابوں' نورانی چہروں اور اُجلے پیراہن والے شاید خدا ترس'

محتاج غریبوں کا احساس کرنے والے ہوتے ہوں گے؟ مگر ان نیک لوگوں نے تو آئس کریم کے کون تک نہ چھوڑے جو اکثر بچے بڑے پھینک دیتے ہیں اور یہ بھک منگے اِن اَدھ کھائی کونوں کو اُٹھا کر کھا چاٹ لیتے ہیں۔

اچانک میرا بچہ عینک لیے دکان سے برآمد ہوا۔ عینک دیکھی پہنی اور ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

''میرا رنگ کالا ہے براؤن نہیں فوراً فریم تبدیل کروا کر لاؤ......؟''

گاڑی سے باہر نکل کر میں آئس پارلر کے ایک خالی ٹیبل پہ بیٹھ گیا۔ دھیان میرا اسی بچے کی طرف تھا اور یہ عینک کے فریم والا بہانہ بھی اِدھر مزید رُکنا اور بچے کا مطالعہ کرنا تھا۔ یہاں مجبوراً مجھے ایک اظہار کرنا بھی مقصود ہے کہ میں نے بچے کا جبلّی جانور پہچان لیا تھا۔ ایسا جانور اپنے رُوبرو پا کر میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں اس سے صرفِ نظر کرتا۔ وہ پرلی دوکان کی آخری ٹیبل پہ بیٹھے بچوں اور بڑوں سے اُمیدِ وفا باندھے کھڑا اور میں اُسے دیکھنے میں مگن تھا۔ بیرا آیا اور میں نے اُسے ایک چھوٹی آئس کریم اور ایک بڑی مکس آئس کریم لانے کا آرڈر دیا۔ آئس کریم دھر کر وہ چلا گیا تو میں نے موقع پا کر اُسی بچے کو اشارے سے بلایا۔ وہ پل جھپکنے پہ میرے پاس پہنچ چکا تھا۔ مسکراتے ہوئے اُسے کرسی پہ بیٹھنے کو کہا۔ ڈرا سہا اور حیرت زدہ سا وہ بیٹھنے سے اجتناب برت رہا تھا۔ میں نے پچکارتے ہوئے بڑی زسائی سے کہا۔

''پتّر! یہاں کرسی پہ بیٹھ پیٹ بھر کر آئس کریم کھا' یہ تیرے لیے ہی منگوائی ہے۔''

وہ دکان کی طرف دیکھتے ہوئے متردد سا بیٹھ گیا۔ میں نے پہل کرتے ہوئے کھانا شروع کی تو وہ خاموش بیٹھا رہا' بلکہ سہما سہما سا دکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں بیرا پہنچ آیا۔

''بابا جی! یہ پیشہ ور بھیک مانگنے والے ہیں' ہماری گاہکی خراب کرتے ہیں۔ اتنے ڈھیٹ اور بے شرم ہیں کہ منع کرنے کے باوجود گاہکوں کو تنگ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس نے آپ کو بھی پریشان کیا ہے۔''

اَب وہ بچے سے مخاطب تھا۔

''اُٹھ اوئے آئس کریم پکڑ اور بھاگ جا......!''

میں نے بچے کو پچکارتے ہوئے کرسی پہ بیٹھ کر آئس کریم کھانے کا کہہ کر بیرے سے مخاطب ہوا۔

''جاؤ اس کے لیے ایک اور شاندار آئس کریم لے کر آؤ' سب سے مہنگی اور مزیدار...... اور جُوس کا ڈبا بھی...... مہمان ہے۔''

وہ بڑی شرمندگی سے جی کہہ کر چلا گیا۔

آئس کریم کا بڑا کپ' جُوس' میز پہ دھرتے ہوئے وہ عجیب سی نظروں سے میری اور بچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو گھونٹ گھونٹ جُوس بھی سُڑک رہا تھا اور میں چور نگاہی سے بچے اور دکان کی جانب دیکھ دیکھ کر

اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔

یہ بچہ سرس پرندے کی جبلت پہ تھا۔ سارس اور ہوتا ہے' سرس اس سے چھوٹا' بگلے سے ہلکا سا بڑا...... رنگ نیلگوں' دونوں بازوؤں کے شاہ پر سپید ہوتے ہیں' اسے ابدالی کونج بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی ابدال ہی ہوتے ہیں۔ ملاح' آبی پرندوں کے شکاری نیلی سرس کے نام سے پہچانتے ہیں۔ یہ پرندہ کمیاب ہے' ایسے آبی ذخائر' دور دراز کی جھیلیں' دریاؤں کے ڈیلٹے...... دریاؤں کے سنگم' جو انسانی دستبرد سے محفوظ ہوں' کبھی کبھی دکھائی دے جاتے ہیں۔''

## ● ''مصر'' کا دشتِ لوط......!

قاہرہ کے خان بازار میں' حنوط پرندوں کی ایک دکان پہ مجھے حنوط کیا ہوا ایک سرس دکھائی دیا۔ میں دیوانہ وار اس کی جانب لپکا۔ پسندیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قیمت پوچھی تو گھاگ مصری نے ایسی قیمت بتائی جس سے دو دو کوہانوں والے دو اونٹ خریدے جا سکتے تھے۔ اتنی قیمت کی وجہ پوچھی۔ بتایا گیا کہ تم بھی جانتے ہو قیمت کیوں زیادہ ہے۔ یہ پرندہ تمہیں میرے علاوہ کسی اور دکاندار سے نہیں ملے گا۔ برسوں بعد کوئی دیہاتی یا شکاری اسے ٹکڑوں کی شکل میں لاتا ہے۔ جنہیں حنوط کرنے کے ماہرین مکمل سرس کی شکل دے کر حنوط کرتے ہیں۔ میں نے اسے غور سے ملاحظہ کیا۔ پاؤں' ٹانگیں' گردن' پر بازو' باقی جسم' بڑی مہارت اور صفائی سے باہم پیوست تھا۔ شاہ پر بھی اصلی حالت میں موجود تھے۔ میں نے زیادہ قیمت کی وجہ سے خریدنے پہ معذوری کا اظہار کیا۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''میں تمہیں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تم کون ہو؟ ویسے تمہارا حال حلیہ شکل و صورت ہی تمہارا تعارف ہے۔ میرے ہاں دنیا بھر سے سیاح آتے ہیں' عام بھی اور خاص بھی...... مصری اُلو' سانپ' باز' بلیاں' صحرائی چھپکلیاں' نیل کی کستورا مچھلیاں' گھڑیالوں کے بچے' مینڈک' بچھوے وغیرہ خوب بکتے ہیں۔ اس سرس کی جانب کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ پچھلے تین برس سے یہ سرس' شیشہ کے مخصوص بکس میں رکھا ہوا ہے۔ مہینے دو مہینے بعد اس کی کیمیائی محلول سے صفائی کی جاتی ہے۔ درجہ حرارت قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اگلے برس اس کی قیمت دگنی ہو چکی ہو گی۔''

میں اس نایاب پرندے کی نمی حاصل نہ کر سکنے پہ خاصا دل گرفتہ سا تھا۔ جانے لگا تو اس مرد مہربان نے مجھے روک لیا...... میری طرف سے مصری قہوہ تو پیتے جاؤ...... یہ کہہ کر وہ دکان کے اندر کہیں غائب ہو گیا۔

مصر کے اِن مداری قسم دوکانداروں کا دُنیا بھر میں کوئی جواب نہیں۔ خاص طور پہ نوادرات بیچنے والوں کا تو کسی سطح پہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کہتے ہیں کہ مصری دکاندار آپ کو مفت بھی کوئی چیز دے دے تب بھی وہ آپ سے کچھ نہ کچھ کما چکا ہوتا ہے۔ دو نمبر نوادرات سے مصر کے بازار اَٹے پڑے ہیں۔ یہاں تک کہ مصری نیشنل میوزیم میں بھی آپ کو نظر آنے والی کسی چیز بارے یہ گنجائش رکھنی پڑتی ہے کہ وہ دو نمبر ہو سکتی ہے اور تو اور مشہورِ عالم مونا لیزا کی پینٹنگ کے بارے کوئی دعوے سے نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ اصلی ہے۔ مصری دکاندار تو اَزلی چور اور جعلساز ہیں۔ مصر کے تمام مشہورِ زمانہ میوزیم' نمائش گاہیں' خاص طور پہ خان بازار' تمام نہاد دو نمبر نوادرات سے اَٹے پڑے ہیں۔

مَیں دکاندار کی غیر موجودگی میں اسی قسم کی نقلی مگر بہتر تر اصلی نوادرات ملاحظہ کر رہا تھا کہ وہ قہوہ کا فنجان تھامے' بھاری پردے کے پیچھے سے یوں برآمد ہوا۔ جیسے کوئی جن' اپنے آقا کی فرمائش پوری کر کے حاضر ہُوا ہو۔

''اجنبی بابا! لو قہوہ پیو' تمہاری تمام کسلمندی' جو یہ نایاب نُوادر حاصل نہ کر سکنے سے پیدا ہوئی ہے فوراً دُور ہو جائے گی۔ ایک حقیقت کی سو فیصد گارنٹی کہ یہ اَبدالی نُوخج کی اصلی ممی ہے۔ دریائے نیل کے ڈیلٹا میں یہ کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کسی کے ہاتھ لگ جائے تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ اس برس' ہندوستان اور ازبکستان سے زیادہ ٹورسٹ نہیں آئے ورنہ اِسے منہ مانگی قیمت پہ کوئی خوش قسمت حاصل کر چکا ہوتا۔''

اس قسم کی رسمی باتوں کے بعد جب مَیں دوبارہ اُٹھنے کے لیے پَر تولنے لگا تو الوداعی الفاظ ادا کرنے سے پہلے انتہائی انکساری سے اس سودے کی ناکامی پہ متاسف ہُوا۔ اچانک جیسے اُس کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ عجلت سے ایک بار پھر دکان کے پچھلے حصہ میں گھس گیا۔ مَیں کھڑا اُس کی آنی جانی پہ تاؤ کھا رہا تھا کہ واپس آ گیا۔ اَب اُس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بستہ سا تھا۔ مجھے بٹھاتے ہوئے بستہ کھولا۔ مَیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اَبدالی سرس کے دو خوبصورت مکمل شاہ پَر جگمگا رہے تھے۔

''یونہی مجھے ان کا خیال آ گیا...... یہ تمہاری خوش نصیبی ہوگی اگر تم اِن نایاب شاہ پروں کو مناسب ہدیہ کے بدل حاصل کر سکو......؟''

مَیں نے بڑی احتیاط اور تجسس سے شاہ پَروں کو چُھوا' اُلٹا پلٹا' اصلی پَر تھے۔ ڈرتے ڈرتے قیمت پوچھی۔ کچھ لمحے توقف کے قیمت بتائی اور ساتھ یہ بھی کہا۔

''یہ آپ کی شخصیت اور شرافت کی وجہ سے ہے۔''

ادائیگی کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرا ہاتھ روک دیا۔

''یہ میری جانب سے ایک درویش کے لئے حقیر سا نذرانہ!.....میں بھی اسی راہ کا طالبعلم ہوں' میرے لیے کوئی نصیحت کرتے جائیں۔''

مجھ سے ایک مجلس میں سوال ہُوا۔ انسان تو کسی نہ کسی جانور کی جبلّت کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ کیا جانور بھی انسانی سرشت کے تحت ہوتے ہیں؟

صحیح اور مکمل جواب' کتابی نصابی اکتسابی علوم سے دینا مشکل' ایسے علوم' دلیل و برہان کی بُنیاد پہ انحصار کرتے ہیں۔ سوال کیا جائے' ستاروں' سیاروں کے پَرے کیا ہے؟ اس سوال کا کیا جواب دیا جاسکتا ہے۔ مروّجہ علوم یہی بتاتے ہیں..... ان کے آگے بسیط خلائیں ہیں۔ ان کے آگے اور پھر ان کے آگے؟ تمام علوم ختم..... اس محدود دُنیا یعنی اَرض کی حد تک تو کوئی غلط صحیح جواب دیا جاسکتا ہے۔ اس کے پَرے کُل کائنات کے بارے اِنسانی عقل و بصیرت عاجز رہتی ہے۔ کتابِ اللہ بھی ایک حد تک راہنمائی فراہم کرتی ہے۔ باقی سب غور و غوض اور تجسس کے حوالے ہے۔

مومن کی فراست سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں سوال سِرے سے ہوتا ہی نہیں بلکہ جواب ہی جواب ہوتے ہیں۔

مومن مجذوب' اللہ کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ علمِ لَدُنّی علمِ الٰہیات' علمِ وہبی' اُن کا منبع ہوتے ہیں۔ وَلی' غوث' قطب' اَبدال عصر کے حکمران ہوتے ہیں۔ روحانی نظام اِنہی کے حوالے ہوتا ہے۔ فقیر' دَرویش صوفی ملامتی ہوتے ہیں۔ راضی برضا..... اُن کے ہاں اَندر ہی اَندر ہوتا ہے' باہر ظاہر نہیں ہوتا۔

جس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا جانور بھی انسانی سرشت پہ ہوتے ہیں؟ میں نے اُسے غور سے دیکھا اور کہا۔

''اِنسان محض کسی جانور کی جبلّت پہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کائنات اور بھی بہت سی چیزوں کے کسی نہ کسی طور زیرِ اثر ہوتا ہے جبکہ اُس کا خمیر اِس اَرض و سما کے عُنصرات سے وُجود میں آیا۔ یہ تمام عُنصر ایک دوسرے کی ضد اور کم و بیش ہیں۔ مختلف اَدوار' موسم' سمندر' بھونچال' سیلاب' شہاب ثاقب' چاند سورج گرہن وغیرہ بھی اپنے اثرات دِکھاتے ہیں۔ اِنسان اپنی طبع مزاج کے مطابق ان عنصرات کے اثرات بھی قبول کرتا ہے۔''

جانور' چرند پرند' خزند' حشرات الارض' حشرات المیاہ و ہوا بھی' اِنسان سے وابستہ و پیوست ہوتے ہیں۔ یہ بھی سرشتی طور پہ اِنسان کے خصائل و وظائف' اعمال و افعال سے بالواسطہ اثرات قبول کرتے ہیں۔ جنگلی گدھے' بھینسے' گھوڑے' شیر' ہاتھی' گینڈے اور اِنسانوں کے درمیان رہنے والے اِن جانوروں کے رَویّوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ پہاڑوں اور میدانوں کے باسیوں میں بڑا تضاد ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اِس کائنات کی ہر شئے

اِک ذوجے سے براوراست یا بالواسطہ کسی نہ کسی طور اثر قبول کرتی ہے۔

انسانوں کی مانند جانوروں کے دَرجات' مقامات وتصرفات میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے۔ ان میں بھی صفاتی لحاظ سے وَلی' درویش' فقیر' ملامتی' صوفی' سالک ہوتے ہیں۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے مگر حقیقت یہی ہے بھیڑ' بکریوں' مچھلیوں' مرغیوں' اونٹنیوں' ہرنوں' شتر مرغ...... چیونٹیوں' شہد کی مکھیوں' مکڑیوں' مکڑیاں' مینڈک...... شیر' بھیڑیے' مگرمچھ' اژدھے' تیندوے' کرلے' ہاتھی' گینڈے' کتے' گھوڑے' بھینسے' زیبرے' گدھے...... لومڑ' لکڑ بگھے' جنگلی کتے' اُود بلاؤ' مموے' اُلو' شکرے' چمگادڑ' گدھ' چیلیں' باز' گلہری...... کوئلیں' کوّے' کبوتر' طوطے' مینا...... تتلیاں' چڑیاں' فاختائیں' عندلیبیں' مرغابیاں' بگلے' سارس' بطخیں' ہنس راج' کچھوے' بچھوے ان سے آگے بڑھیں تو کچھ جانور ان سے بھی سوا...... ہُما' مرغِ زریں' ہُد ہُد' ابابیل' سرس (ابدالی کونج) سروگ (کاگا) کستورا مچھلی' شاہین ققنس' آتش ماہی' ریگ ماہی' دیمک' چکور' شتر بچے...... غور فرمائیں مندرجہ بالا سب جانوروں میں کسی نہ کسی طور انسانوں کی اعلیٰ خصوصیات بلکہ کچھ ان سے ماوراقدریں بدرجہ اُتم دکھائی دیں گی۔ پیغمبروں' ولیوں' غوث واقطاب' درویشوں' ابدالوں اور صوفیوں جیسی ارفع صفات...... اللہ کریم نے انہیں بھی خوب نوازا اور خوب کام لیا۔

ان جانوروں سے پیغمبروں نبیوں نے بھی بہت سے کام لیئے۔ تصوّف روحانیت کی منازل میں پھنسے ہوئے درویش عامل بابے' جوگی ہمیشہ سے ان کی استعانت حاصل کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔

سرّی خفی علوم کے حصول' مجاہدات وریاضت' تزکیہ نفس کی چند منازل میں ان کی معاونت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ خود بھی اللہ کے ذکر فکر اور مجاہدات میں مشغول رہتے ہیں۔

آدھی فقیری تو یہ پیدائشی طور پہ لے کر آتے ہیں' مثلاً علائق دُنیا سے بے نیازی' کل کی فکر سے دُور' سادہ اور فطری زندگی' مال وزر کا تصور مفقود...... آزادی اور صبح وشام کی بے فکری' فطرت سے رہنمائی اور اللہ توکلی......!

انسان کے ساتھ تو سو طرح کی ضرورتیں چلتیں لگی ہیں۔ آزمائشوں کے چکر سے نکلتا ہی نہیں...... فطرت کی رہنمائی' حقیقت تک رسائی اس کے لیے بھاری پڑتی ہے۔ مَن وتُو کے سیاپوں میں پڑا رہتا ہے۔ محل ماڑیاں' توشہ خانے' قلعے بناتا ہے۔ زر وجواہر خزانوں کے انبار جمع کرتا ہے' اللہ کی زمین کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ غرضیکہ ان دُنیاوی مادی علتوں سے یہ جانور محفوظ ہوتے ہیں۔

زندگی کا اِک بڑا حصّہ ان مخلوقات کے مطالعہ ومشاہدہ میں گزرا اور اس نتیجہ پہ پہنچا کہ اللہ کریم نے انہیں انسانیت کی دلبستگی' فلاح ومعاونت اور دُعاؤں کی قبولیت کی خاطر تخلیق فرمایا اور ان سے زندگی اور رُوحانیت کے بیشتر معاملات میں راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ بہترین معاون ودوست ثابت ہوتے

ہیں۔ مالکِ ازل و ابد نے جب اپنی بے بہا نعمتوں کی تقسیم فرمائی تو ان کا نمایاں حصہ اپنی اس مخلوق کو عطا فرمایا۔ وفا' محبت' فہامت' فطرت فہمی' شکر مندی' صبر برداشت' توکل اور اپنے مالک و خالق کی شب و روز عبادت کا شعور ادراک اور حظ انہیں بخشا......!

جانوروں' شجرات حجرات سے دوستی پیدا کرنی کچھ یُوں مشکل بھی نہیں ہوتی۔ بس ذرا توجہ' صبر اور سمجھداری کی ضرورت ہوتی ہے یا جسے پھر اللہ کریم عطا کر دے۔ مجھے ان کی زبان' سانگی اور پہچان' ودیعت میں ملی۔ یہ مخلوقات بھی انسانوں کو پہچان لیتی ہیں جن سے' ان کوئی سلسلہ جُڑنا ہوتا ہے وہ خود بھی رجوع کر لیتی ہیں۔ جنات اور دیگر ماورائی مخلوقات کی مانند ان کے بھی تحفظات اور ترجیحات ہوتی ہیں یعنی نہ یہ مخلوقات ہر کسی پہ ملتفت ہوتی ہیں اور نہ ہر اک انسان' انہیں قابلِ التفات و توجہ سمجھتا ہے۔ ہمارے نزدیک کُتا' حقیر اور ناپاک...... درخت' چولہا جلانے...... حجرات محض شوبازی کے لیے...... جنات ڈرنے ڈرانے اور نوجوان خوبصورت دوشیزاؤں کو چمٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔

مَیں نے اِن کے تصرفات سے بہت کچھ حاصل کیا اور شاید انہیں بھی مجھ سے کچھ حاصل ہُوا ہوگا؟ لین دین یکطرفہ نہیں ہوتا۔ قُدرت نے ایک دوسرے کے مفادات' باہم بانٹ رکھے ہیں۔

## ● کوچہ ابدال کا عبداللہ دیوانہ......!

اِک زمانہ میں مَیں کھاریاں میں بطور الیکٹریشن ملازمت کرتا تھا۔ رہائش لالہ موسیٰ رکھی ہوئی تھی کہ وہاں روشن آرا بیگم' عالم لوہار' بالوجٹی رہتی تھیں۔ ہر شب کہیں نہ کہیں موسیقی کی محفل رہتی یعنی پیٹ کی غذا اور رُوح کی غذا دونوں میسّر تھیں۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ میری یار باشی بڑی وسیع تھی۔ میری دیکھا دیکھی اور بھی بہت یار دوست' ساتھ کام کرنے والے لالہ موسیٰ منتقل ہو گئے۔ اومن امریکن الیکٹرک کمپنی تھی۔ میرا اثر و رسوخ کام آیا۔ اُنہوں نے اسٹاف کے لیے مجھے ایک شیورلٹ پک اَپ دے دی۔ لالہ موسیٰ سے کھاریاں چھاؤنی' محض دس میل...... فضول میں فاصلے کا پتا بھی نہ چلتا۔ سارا اسٹاف' ورکشاپ اُتار کے' مَیں اکیلا گاڑی لے کر گلیانہ گاؤں کی جانب بڑھ لیتا جدھر عارضی طور پہ کیٹر پلرز کے بڑے الیکٹرک جنریٹر لگے تھے۔ مَیں وہاں کا انچارج تھا۔ کھیت کھلیان' اُونچا نیچا' آڑھا ٹیڑھا راستہ' درخت' مویشی' آتے جاتے گاؤں کے لوگ' میرا جی بڑا خوش ہوتا۔ دیسی مرغیاں انڈے اور سرسوں کا ساگ......؟

راستہ میں ایک چھوٹی سی پُلی پڑتی تھی۔ جس پہ گزرتے ہوئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی۔ اِس

نُلّی کے پار دائیں جانب، راہ سے ذرا ہٹ کر نخل آم کا ایک چھوٹا سا پیڑ تھا۔ آم کا پیڑ، کالی بھیڑ اور زاویہ قائمہ
بناتی ہوئی نیزہ......... میری کمزوریاں، کہیں کدھر یہ بولتے جادو دکھائی دے جائیں تو لازم ہے میں اُدھر بھرپور
توجہ دوں۔ اجمال بیان کرنا اس کا فی الوقت مقصود نہیں۔ نُلّی آہستہ سے پار کرتے ہوئے خود بخود میری نگاہ اُس
پیڑ کی جانب اُٹھ جاتی۔ آم کے پیڑ کی ہریالی، کھٹی میٹھی خوشبو، بَریل تُوتوں اور ڈالوں پہ پڑے جھولوں کا
جانفزا تصور مجھے نہال کر کے رکھ دیتا۔ میں اکثر اس کے کھالے میں ایک معصوم سا بچہ بیٹھے دیکھتا جو اس کے تنے
سے ٹیک لگائے ٹھیکریوں سے کھیل رہا ہوتا۔ یہاں چونکہ پہلے گیئر کے چکر میں ہوتا اس لیے چند آسودہ سے
لمحے مجھے اُس بچے کو دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ کئی بار محسوس ہُوا کہ وہ جیسے اپنی مہربان ماں کی گود میں بیٹھا کھیل رہا
ہے یہاں تک کہ پیڑ کی شاخساروں کو جھک کر پنکھا جھلاتے دیکھا۔ وہیں سویا ہُوا بھی پایا۔ اَب تو وہ میرے لیے
آم کا پیڑ اور انسان کا بچہ نہ تھے ایک ماں بیٹا تھے.........!

وقت کچھ آگے آ گیا تھا مگر وہاں، وہی ایک سا منظر......... شاید قدرت کو یہ معصوم سا منظر ایسا بھلا لگا تھا کہ
اسے وقت کے کینوس پہ ساکت سا کر دیا تھا۔

یاد نہیں کوئی تہوار تھا یا کوئی ایسا موقع کہ دو تین روز کی فراغت مل گئی۔ ایسی صورت میں غیر مقامی اپنے
اپنے شہروں کو چل دیتے ہیں۔ میں بھی ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اَب یہ بھی یاد نہیں کہ میں سیالکوٹ کیوں نہ گیا۔

آٹھ دس ہانڈی والوں میں ایک بھی اِدھر نہ تھا۔ روٹین میں لگے ہوئے محنت کش، کام ہو نہ ہو اپنے
روزمرہ کے وقت پہ بیدار ہو جاتے ہیں۔ روٹین توڑ دیں تو بیمار یا الکس زدہ ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے وقت
بیدار ہو لیا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر نیچے اُترا۔ گاڑی اسٹارٹ کی تو خیال آیا۔ آج تو میرے ساتھ کوئی بھی جانے
والا نہیں۔ دو اڑھائی روز چھٹیاں ہیں۔ دل اُداس سا ہو گیا۔ بادلِ نخواستہ، گاڑی نکال کر جی ٹی روڈ پر ڈال
دی۔ کچھ خبر نہیں کہ میں اکیلا کہاں جا رہا ہوں۔ ارادہ نہ کوئی پروگرام......... ایک مخبوط الحواس شخص کی طرح
خالی الذہن سا اپنی روٹین کی راہ پہ بھاگا جا رہا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد میں میکانکی انداز میں کھاریاں چھاؤنی
کی طرف مُڑ گیا۔ سڑکیں خالی، کمپنیوں کی گاڑیاں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں ٹھیک وقت کے مطابق
اپنی ورکشاپ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس حالت میں کہ میری گاڑی کے علاوہ وہاں اور کوئی گاڑی نہ تھی۔
ورکشاپ، سٹور اور دفتروں کے بند دروازے میرا منہ چڑا رہے تھے۔

انسان، جب اپنی ہار، غلطی، سزا کو دل و دماغ سے قبول کر لیتا ہے تو بہت حد تک مطمئن اور آسودہ خاطر
ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی تسلیم کر لیا تھا کہ آج میں اکیلا ہوں جبکہ مجھے پیشتر رات ہی سیالکوٹ گھر چلے جانا
چاہیے تھا۔ کیوں نہ جا سکا؟ فی الحال اس کا جواب میرے پاس نہ تھا، پر اتنا ضرور تھا کہ پس پشت کوئی نہ

کوئی مصلحت ضرور ہے۔

پائلٹ' جب ضرورت محسوس کرتا ہے وہ جہاز کا کنٹرول آٹو پائلٹ کے سپرد کر کے خود قدرے ریلیکس ہو جاتا ہے۔ میں تو اکثر ایسا ہی کرتا ہوں کہ میرا روزمرّہ اور معمولات' عام سمجھ میں آنے والے نہیں ہوتے بلکہ دماغ خراب کرنے والے ہوتے ہیں۔ میں نے خود کو بیشتر اوقات' آٹو پائلٹ پہ لگا دیتا ہوں۔ یعنی خود کو خود سے بے دخل کر کے کسی اور کے سپرد کر رکھا ہوتا ہے۔ آسان الفاظ میں تحت الشعوری کی کیفیت میں ہوتا ہوں۔ میرے لیے یہ کیفیت بڑی آسودہ خاطری کی ہوتی ہے۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوتا رہتا ہے میں نچنت سا پڑے بیٹھا نیرو کی طرح چین کی بانسری بجاتا رہتا ہوں۔

اصل میں تو آٹو پائلٹ پہ میں' گزرے روز سے ہی لگا ہوا تھا۔ یہاں احتیاطاً ایک بار پھر ری سیٹ کرتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کی۔ مچھلیوں کو پانیوں میں' صحراؤں میں شتروں کو' کھیت کھلیانوں میں ڈھور ڈنگروں' فضاؤں میں پنچھیوں اور بَن میں جوگیوں کو راہ راست کوئی نہیں سُوجھاتا...... راہ راستے' خود بخود اُن کے سامنے بچھے پڑتے ہیں۔ بے حسّی کی اک عجیب سی کیفیت میں' میں پُلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پہلا گیئر ڈال کر بڑی آہستگی سے پُلی پار کی...... یہاں پہنچ کر میرا پہلا کام' دائیں جانب آم کے پیڑ اور بچے کو دیکھنا ہوتا تھا۔ آج بھی یہی ہُوا مگر منظر' مکمل نہ تھا۔ پیڑ کا کھالا' خالی...... اور لگتا جیسے کسی ظالم نے بڑی بے دردی سے کاٹ چھانٹ کر پیڑ کو اُدھورا' بے ثمر کر دیا ہے۔ آم کے پیڑ کی جو چہل پہل اور کایا کلپ ہوتی ہے وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ عجب اُجاڑ منظر تھا۔ میری اُدھر کی محویت سے گاڑی کی بائیں جانب کے دونوں پہیے' راستے کے کولے سے اُتر کر ڈھلوانی زمین پہ آ گئے جس کے ساتھ کھیت کی باڑھ اور پانی کی آڑ تھی۔ گاڑی کے جھٹکنے سے جو جھٹکا لگا تو میں نے مزید نیچے اُتر کر گاڑی روک لی۔

بے اختیار سا میں پیڑ کے پاس پہنچا۔ اس سے پیشتر اِدھر آنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ درخت کی حدود' چھاؤں میں قدم دھرتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے کسی قریۂ کرب و کراہ میں قدم دھر دیا ہو۔ میرے ظاہری باطنی اعصاب پہ غم و اندوہ کے چھینٹے سے پڑنے لگے۔ کسی مرگ والے گھر میں داخل ہو کر جو کیفیت ہوتی ہے ویسی ہی حالت اس وقت میری تھی۔ ذرا اور قریب پہنچا تو پیڑ سے آہوں کراہوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ شاخوں پتوں میں کپکپاہٹ لرزہ' جو غم کی شدت میں طاری ہو جاتا ہے۔ درخت کی ہریالی' پیلاہٹ میں بدل چکی تھی۔ برگ و بار بوجھل بوجھل سے لگے۔

میرے لیے یہ سب کچھ سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا جبکہ ہمیشہ اِدھر دکھائی دینے والا بچہ موجود نہ تھا۔ مجھے اب اس معصوم بچے کی فکر پڑ گئی۔ اسی دوران' اِدھر اُدھر نظر دوڑائی...... دیکھا تین چار کھیت پرے دو اُدھیڑ عمر دیہاتی

کتائی چھنائی کر رہے ہیں۔ میں لپک کر اُدھر ہولیا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اُس بچے کے بارے میں پوچھا...... جواب میں اُنہوں نے بتایا۔ وہ سامنے گاؤں کے عنایتے مراثی کا بچہ ہے۔ اس بدنصیب کی ماں سلامتے اس کی پیدائش کے دوران زچگی کی کسی پیچیدگی سے مرگئی تھی۔ یہ عنایتے مراثی کا آٹھواں آخری اور اُس کی نظر میں منحوس ترین بچہ تھا۔ وہ اسے اپنی خوبصورت بیوی جسے وہ کسی دُور جگہ سے بھگا کر لایا تھا' قاتل سمجھتا تھا۔'' عنایتا' ایک خوبرو جوان تھا۔ عورتوں کے لیے اس میں بے پناہ کشش تھی۔ سلامتے بھی اسے جان سے چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُوپر تلے آٹھ بچے محض دس سالوں میں اس کے چھوٹے سے گھر کی زینت بن گئے تھے۔ عنایتے نے اس نواز عرف نواجے کو شروع دن سے ہی ماں کا قاتل' منحوس' قسمت کا کھوٹا سمجھ کر دل و دماغ اور اپنی کفالت سے باہر کر دیا تھا۔ بیوی مر چکی تھی۔ بچی کوئی تھی نہیں۔ گوڈے گوڈے مفلسی محتاجی...... اس نے نواجے سے ہاتھ اُٹھالیا اور گاؤں کی ایک اوتر نکھتر بھٹیارن کی جھولی میں ڈال دیا۔ جو بھٹ جھونکتے ہوئے بھی اسے گود میں ڈالے رہتی تھی......

جب بھٹیارن ہیضہ میں کام آئی تو نواجا ساڑھے چار برس کا تھا۔ اب اسے گاؤں کے ایک خداترس شخص نے روٹی کپڑے کے عوض اپنے ڈنگر وچھے چرانے پہ رکھ لیا۔ ایک ہی گاؤں میں رہنے کے باوجود اس کے باپ نے کبھی اسے منہ نہ لگایا۔

عنایتے مراثی نے بمشکل چالیسویں تک انتظار کیا اس کے بعد نہ جانے کہاں سے ایک اور خوبصورت سی جوان عورت لے آیا۔ کہتا تھا کہ اس سے باقاعدہ نکاح کیا ہے۔ اس مشین سے بھی دھڑا دھڑ بچے نکلنے شروع ہو گئے۔ اتفاق یا اس کے جرثومے ہی کچھ ایسے تھے؟

ایسے مردوں کا جبلّی جانور جنگلی سانڈ یا بندر ریچھ ہوتا ہے۔ ان کے پسینہ کی کوئی بوند بھی اگر کسی مؤنث پہ پڑ جائے تو نوے فیصد بچے کے امکان پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے مرد پیدا ہی اسی کام کے لیے ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ایسے یگانہ روزگار سانڈ نما مردوں کی بیویاں بھی مٹی کی نہیں بلکہ کچے گوشت کی ایک ایسی ہانڈی کی طرح ہوتی ہیں جو ہمہ وقت چولہے پہ چڑھی رہتی ہے اور اس میں پورا سال سری پائے' بوٹیں' کلیجی گردے کپورے' دل اور اوجری پکتی رہتی ہے......

نواجا چھ برس کا ہوا تو اُس کے دونوں بڑے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ نواجا اب بیمار رہنے لگا تھا' خون کی کمی' مسلسل ناک کان آنکھوں کا بہنا۔ ننگے رہ رہ کر پاؤں تلے گٹھے پڑ چکے تھے۔ ناخنوں کا کیا مذکور کہ کاٹنے تراشنے کی نوبت کبھی نہ آتی تھی۔ سر کے اَن تراشے بال' دھوپ دھول سے بدرنگے ہو چکے تھے۔ پہناوا سدا سے ایک سا' دھونے بدلنے کی شاید ہی کبھی ضرورت پڑی ہو...... نواجا بھی ایسا مست ملنگ کہ اسے

زندہ رہنے کے لیے شاید کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ نیند نام کی کسی چیز سے وہ واقف نہ تھا۔ کھرلی میں پڑ جاتا ہے' نہر کنارے ٹیکی لے لیتا' بھینس کٹے کے اوپر بیٹھا بیٹھا سو جاتا۔ وقت پکھا اور آگے سرک گیا......

عنائت مراثی کے من میں جانے کیا سائی ایک صبح وہ اس شخص کے گھر پہنچ گیا جس نے بھٹیارن کے مرنے کے بعد نواز کو ترس کھا کر روٹی کپڑے کے عوض پناہ دی تھی۔ بیٹا تو اسی کا تھا۔ تھوڑی سی بحث وتمحیص کے بعد اس کی کانا کلائی تھامے گھر لے آیا۔ اسے اپنی نئی بھینس اور کٹی کے لیے چرواہے کی ضرورت تھی۔ مزدوری کے چکر میں لڑکے' گھر چھوڑ کر باہر دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے تھے۔ چھوٹے ابھی بہت چھوٹے تھے اور جو سکول جاتے' وہ اس بیگار کے لیے مناسب نہ تھے۔ لے دے' یہی ایک گھر کا مفت بچہ نظر آیا جسے اس کام کا تجربہ تھا اور یہ تھا بھی اسی قابل کہ اس نے جنم لیتے ہی اپنی ماں کو آگے بھیج دیا تھا۔

اپنے حقیقی گھر پہنچ کر بھی اس کے لیے کوئی فرق نہ پڑا۔ ہاں' ایک دو باتوں میں کچھ تبدیلی ضرور ملی۔ وہاں اسے روکھی سوکھی ہی سہی' عزت سے مل جاتی تھی' یہاں اپنے گھر سوتیلی ماں' اپنے بچوں کا بچا کھچا ٹنٹے کے ٹھیکرے میں ڈال کر دیتی۔ یہ صبر شکر سے کھا لیتا۔ دوسری تبدیلی یہ وہاں گھر کے فرد کی طرح رہتا تھا۔ گھر کے بچوں اور اس میں کوئی امتیاز نہ برتا جاتا۔ یہاں وہ اپنے چھوٹے بڑے بھائیوں کے ساتھ کھیلنا بات چیت کرنا تو کجا' ساتھ بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ صبح سویرے باسی روٹی' لسی ٹھونسا کر اسے بھینس کٹی کے ساتھ باہر دھکیل دیا جاتا۔ باہر نکلتے ہی اُچک کر بھینس پہ بیٹھ جاتا۔ باقی آگے کا سفر بھینس کٹی خود نکالتیں۔ دو تین فرلانگ طے کرنے کے بعد چھپڑ کے قریب انہیں چرنے نہانے کے لیے چھوڑ دیتا' اور خود اسی درخت کے نیچے سائے میں ٹھیکریوں سے کھیلتا رہتا۔ گاؤں کی طرف آتی جاتی' کمپنی کی گاڑیوں کو دیکھتا رہتا۔ کچی پکی امبیوں سے منہ کھٹا میٹھا کرتا اور جب نیند کا ہلکورا آتا وہیں تنے سے سر ٹکائے لمبا پڑ جاتا۔

آم کا یہ پیڑ مادین تھا۔ نر اور مادہ کا تصور' ہر طرح کی مخلوق' عنصر و مادہ میں موجود ہے۔ ماسوائے قدسیوں' ملائکہ' رجال افلاک...... نر اور مادین کا ہونا' فطری اُصولوں...... بشری قدروں کے عین مطابق ہے۔ پوری سائنس' برقی توانائی' علوم وفنون کا ہر کلیہ قاعدہ' کسی نہ کسی طور نفی و اثبات سے ہو گزرتا ہے۔ انسانی اجسام کا سارا نظام' خون' سانس' سماعت' بینائی۔ دل و دماغ جو بھی دیکھیں...... تصوف و روحانیت' ریاضت و مجاہدت کی ساری بحث' جمع تفریق' نفی اثبات' تذکیر و تانیث زیریں و بالا' آگے پیچھے' جنگ و امن' دوستی و دشمنی یا نفع و نقصان کے سارے فلسفے وغیرہ نر و مادہ کی وضاحتیں شرحیں ہیں۔ آگے سب کلوننگ اور پیوندکاری ہے۔ چٹے میں سے کالا' کالے سے پھر سفید...... مرد سے عورت اور عورت سے پھر مرد...... ری سائیکلنگ کا یہ ازلی سسٹم ہی نمو ہے زندگی اور حرکت ہے۔

کائنات کی ہر شے اپنے نقیض کی وجہ سے قائم ہے۔ نشانہ نہ ہو تو تیر کے کچھ معنی نہیں۔ مرید نہ ہو تو پیر' عاشق نہ ہو تو معشوق' شر نہ ہو تو خیر کا وجود تلاش کرنا عبث ہے......!

نوازے نے ماں دیکھی اور نہ باپ کی باچھا...... نہ وہ ماںتا سے واقف نہ شفقتِ پدری سے۔ اُس کا چھوٹا سا دماغ' اپنے ہونے کی وجہ اور اللہ دی گئی زندگی کے مقصد کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ گھاس پھونس کا ننھا سا تنکا' جو کسی ایسی جگہ نمو پایا ہو' جہاں اُسے نہ کوئی دیکھنے دکھانے' کھانے والا یا محسوس کرنے والا ہو۔ وہ اپنی ہستی کے بارے کیا فلسفہ رکھ سکتا ہے۔ کیا زندگی محض سانس لینے یا صبح سے شام کرنے کا نام ہے؟

وہ پنڈ میں بچوں کی ماؤں کو دیکھتا تو اندر اندر ہی ہوکتا' کس بل کھا کر پھر خود ہی سیدھا ہو جاتا کہ اُسے کوئی مثبت جواب مل نہیں پاتا تھا۔

ممتا اور محبت کا پہلا احساس اُسے اس آم کے پیڑ کے تلے بیٹھ' لیٹ' سو جاگ کر ملا تھا۔ ماں کی گود کی گرمی' نیند کی تُکی تُکی نرمی کے سادے سے سواد سے واقفیت یہیں سائے میں ہوئی تھی۔ اردگرد سے ٹھینیاں' روڑے ٹھیکریاں پتھر اٹھا لاتا۔ پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتا' اوپر تلے جوڑ کر مکان مینارے بناتا رہتا۔ ''بہلول دانا بھی یہی کچھ کرتے رہتے تھے۔ وہ تو جنت میں گھر بناتے اور الاٹ کرتے تھے مگر وہ تو کسی جنت دوزخ سے واقف نہ تھا۔ گوبر ملے کیڑے کی طرح اس کی ساری خوشبوئیں بدبوئیں ایک سار تھیں۔ جب اُوب جاتا تو ڈھ کر بے سُدھ پڑ جاتا' تو اُمباماں تھپک تھپک کر لوریاں سناتی۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا' اُن کی سب خدائی ہوتی ہے۔

گھر میں سوتیلی ماں کچھ پیسے کہیں رکھ کر بھول گئی۔ تلاش کے باوجود جب نہ ملے تو نُواجے پہ چوری کا الزام لگ گیا۔ گھر کے کسی بچے نے بتایا کہ نواجا مرنڈا کھا رہا تھا۔ اُس کا مرنڈا کھانا ہی اُسے چور ثابت کرنے کے کافی تھا۔ سوتیلی نے پہلے تو دھمکا ڈرا کر پوچھا' جب وہ نہ مانا تو کپڑے دھونے والے ڈھبروے سے اُس کی دُھلائی کی۔ ایک آدھ ایسا ہاتھ جو اُس کی پنڈلی پہ پڑا تو اندر سے بڑی چیخ نکلی۔ وہ روتا چلاتا ٹانگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مگر سوتیلی کو ترس نہ آیا۔ ڈھبرو پھینک کر پھر اُس نے ہاتھوں پاؤں سے اُسے خوب دُھنکا۔ تھک گئی تو روتا تڑپتا چھوڑ کر سر پہ دوپٹہ باندھ کر کھاٹ پہ پڑ گئی۔ مذاکتا مراثی' باہر سے آیا تو خوب مرچ مسالا لگا کر چوری کی واردات سنائی۔ باپ نے بھی لاڈلی بیوی کی باتوں میں آ کر گالیوں اور چپیڑ چانٹوں سے تواضع کر کے گھر سے نکال دیا۔ چٹخی ہوئی ہڈی تو ہلنے نہیں دے رہی تھی۔ گھسٹتا ہُوا' آدھی رات' بھینس والے وَرانڈے کے ایک کھدرے میں پڑ گیا۔ سر پڑی رات' اس کے لئے بہت بھاری تھی......

چار چوٹ کی پڑی ہو تو زخم باہر کم اور اندر زیادہ ہوتے ہیں اور اپنا آپ ظاہر بھی بعد میں کرتے ہیں۔ جس طرح چاند ستارے' رات میں اُجاگر ہوتے ہیں اسی طرح جدائی' بیماری اور لڑائی بھڑائی کی چوٹیں بھی

رات کے اندھیرے کی مسافرت میں اپنا صحیح طریقے سے تعارف کراتی ہیں۔ بارش کے چھینٹے پڑنے سے پچھلے پہر خنکی بڑھ گئی تھی۔ جسم پہ جگہ جگہ نیل نوجن ‘ اکڑن ...... اوپر سے ہڈیوں میں سرایت کرتی ہوئی خنکی ...... وہ بخار میں تپنے لگا تھا۔ جسم میں طاقت اور ہڈیوں میں رُوبک نہ ہو تو ہلکا سا عارضہ بھی مضبوطی سے پکڑتا ہے۔ اِدھر تو ہر طرف سے اللہ کا نام ہی تھا۔

صبح تڑکے جب اُس کا باپ دودھ دھونے کی خاطر اِدھر آیا تو اُسے بخار میں پھنکتا ہوا پایا۔ ہلایا جلایا تو اُوں آں کر کے بے ہوش ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ گھٹنے کے نیچے ٹخنے کے اُوپر ہڈی چٹخا کھا چکی ہے۔ اُٹھا کر ہڈیاں جوڑنے والے نائی کے پاس لے گیا۔ اُس نے دوا والے تیل سے مالش کر کے پٹی باندھ دی۔ بخار اور درد کی دوا بھی بتا دی۔ اس کی جگہ اَب گاؤں کا ایک اور لڑکا بھینس کٹی کو چرانے کے لیے لے جانے لگا۔

اُن کسانوں سے یہ المناک رُوداد سُن کر مَیں پتا پوچھتا۔ اُس کے گاؤں پہنچ گیا۔ گاؤں کے شروع کنارے پہ ایک مسجد تھی‘ ابتدا اچھی ملی‘ انتہا کی خیر مانگتا ہوا آگے بڑھا تو سڑک کے کنارے ایک پرائمری ٹاٹ سکول دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ننگی زمین پہ بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ ماسٹر صاحب خفتہ تھا‘ سڑک کے پاس ہی ایک درخت کے سائے میں بیٹھے‘ چند ہم جنسوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مَیں نے گاڑی اِن کے پاس ہی جا کر روکی۔ نیچے اُتر کر عنایتے مراثی کا پوچھا۔ وہ حیران ہوا کہ اُومن امریکن کمپنی کی گاڑی والے کو کسی گاؤں کے مراثی سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ وہ کرسی سے اُٹھ کر بولا۔

’’خیر ہے‘ آپ کو عنایتے مراثی سے کس سلسلے میں ملنا ہے؟‘‘

مَیں نے اس کی گھبراہٹ کو دُور کرنے کی خاطر کہا۔

’’اُس کا بچہ بیمار ہے۔ ٹانگ میں فریکچر آ گیا ہوا ہے۔ مَیں کمپنی کے میڈیکل سنٹر میں اُس کا علاج کروانا چاہتا ہوں۔‘‘

میری بات سے وہ قدرے مطمئن ہوا تو زور سے ایک لڑکے کو آواز دے کر بلایا۔ عنایتے مراثی کے دو لڑکے دوسری اور تیسری میں یہیں پڑھتے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ‘ گھبرایا ہوا آ گیا۔

’’اُوے رفیق! اِن کو اپنے گھر لے جا......!‘‘

وہ لڑکا آگے آگے بھاگا جا رہا تھا اور مَیں رینگتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے ...... مَیں نے اُسے آواز بھی دی کہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ مگر اُس نے میری ایک نہ سُنی۔

کچھ دُور موڑ کاٹ کر مَیں رُک گیا کہ وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑے سے اِنتظار کے

بعد میں آہستہ آہستہ گلی میں بڑھنے لگا۔ دو گھر آگے' عنایت مراثی اپنے گھر سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس کے پیچھے اُس کی چھنال سی بیوی' چھوٹے بڑے پانچ چھ بچے' ایک بوڑھی مائی اور دو عدد ٹنٹے بھی میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

میں اُسے پہلی نظر میں پہچان گیا تھا۔ سیکڑوں بندروں میں لُنڈر الگ ہی ہوتا ہے۔ جیسے ہاتھیوں کے غول میں' بتھم ہاتھی!...... جنگلی بھینسوں کے جُھنڈ میں اَڑنا بھینسا...... ہرنوں میں بارہ سنگھا۔ ان نمایاں جانوروں میں یہ اعزاز انہیں بہادری یا اضافی جرأت وخوبی کی بناء پہ نہیں بلکہ ان بے پناہ رجولت پسند خرابی کی وجہ سے ملا ہوتا ہے۔ مَردوں میں ایسے بے پناہ مَرد کو لیڈی کلر بھی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں جنسِ مخالف کا صرف ایک ہی رُوپ ہوتا ہے۔ ماں بہن بیٹی بھائی کے ناتے رشتے فضول اور بے معنی ہوتے ہیں۔ ایسے انسانیت باختہ' نسائیت آشام افراد کا انجام بڑا اندوہ ناک ہوتا ہے۔ میں نے ایسے عورت خوروں کو اکثر جذام' فالج اور غلیظ جنسی امراض میں مبتلا پایا ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں ایسے بے شمار مشہور لوگ گزرے ہیں اور موجود بھی ہیں جن کا ایک آدھ سے گزارہ ہی نہیں ہوتا۔ ان کے ''کھاتۂ ازدواج'' میں درجنوں زندہ مُردہ' مطلقہ عورتیں ہوتی ہیں...... ایسے خوار و رُسوا افراد کے جنازہ میں مرد کم اور عورتیں بچے زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی پہچان ان کے چہرے اور حرکات سے ہویدا ہوتی ہے۔ آنکھوں میں تیز حرکت' جنسی چمک' سوَر کا بال...... چہرے کے جغرافیہ کا بار بار بدلنا' مصنوعی خباثت آمیز مسکراہٹ...... کوئی بھی سائز' بیاہی اَن بیاہی' اپنی پرائی سب پہ بُری نظر ڈالنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔"

میں اس کے گھر کے سامنے' گاڑی روک کر نیچے اُتر آیا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے اُس کا نام پوچھا اور بتایا کہ میں کمپنی کا ملازم ہوں۔ روزانہ اسی گاڑی پہ گلیانہ سے گزر کر سائٹ پہ جاتا ہوں۔ بچے کو پُلی کے پاس آم کے درخت نیچے دیکھتا تھا' آج دکھائی نہ دیا تو کھیت میں کام کرنے والے ایک آدمی سے پوچھا۔ معلوم ہوا' بچے کی ٹانگ پہ چوٹ آئی ہے۔ آج چھٹی تھی سوچا' چلو اس معصوم بچے کو کمپنی کے ہسپتال سے مفت دوا لے دیتے ہیں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو بچے کو دیکھ لوں؟

میں نے اپنے بابوں سے یہ بھی جانا کہ زندگی کے معاملات' اپنے ہوں یا بیگانے' اگر ان میں مداخلت ضروری ہو جائے تو ہمیشہ سادگی اور سچائی سے کام لو' ہیرا پھیری نہ کرو' باعزت اور سُرخرو ہو گے۔ چالاکی ہشیاری دکھانے' جھوٹ فریب سے کام نکالنے والے کہیں نہ کہیں پھنس جاتے ہیں۔ سوائے رُسوائی اور پشیمانی' ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔

تولہ ماشہ' من وعن بات اس کے سامنے رکھ دی۔ چند لمحے اُس گرگِ باراں دیدہ نے مجھے گھورا' مراثی

تھا یہ ذات! بڑی مردم شناس اور موقع شناس معاملہ فہم ہوتی ہے...... بال کی کھال اُتارنا اور پھر کھال سے بال نکالنا ان کا موروثی فن ہوتا ہے۔ یہ اس کی روٹی کھاتے ہیں...... اُس نے بڑی عزت سے اندر آنے کی دعوت دی۔ صحن کے درمیان دھریک تلے ایک کھاٹ کھٹولی پڑی تھی۔ جس پہ دو انسان کے بچے ایک بکری کا میمنہ دو چار کوّے اپنی اپنی حرکتوں میں مصروف تھے۔ جلدی جلدی اُنہیں وہاں سے ہٹا کے مجھے بڑی عزت احترام سے بٹھایا گیا۔ اُس کی چھنال بیوی کھٹی لسی کا پیالہ مجھے تھماتی ہوئی بولی۔

''بڑا چنگا بچہ اے۔ پر ذرا کمزور تے لاپروا اے۔ لت پہ لگنے کا بس بہانہ ہی بن گیا ہے۔ کیمپنی دے ہسپتال میں علاج ہوگا تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

عنایتا خاموش کھڑا تھا۔ مَیں کھٹی لسی کے تلخ گھونٹ نگلتے ہوئے کانی نظروں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کہیں نواجا بھی دکھائی دے جائے۔ مگر وہ شاید کہیں جینس واڑہ میں پڑا تھا۔ اتنے میں عنایتے کی ماں نے ایک فضول سا بدنما تحفہ میرے سامنے لا دھرا۔ جسے مَیں نے ہٹوا دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے صحن' بچوں اور عورتوں سے جل تھل ہو گیا۔ ایسی دھکم پیل شروع ہو گئی کہ گھبرا گیا۔ عنایتے سے مَیں نے بچے کو بلانے کا کہا۔ وہ سامنے وَاڑے میں گیا اور نواجے کو اُٹھا لایا۔ زرد زرد نواجا' بڑی نقاہت بھری نظروں سے مجھے تک رہا تھا۔ چند لمحے مَیں بھی اُسے تکتا رہا۔ ایسے میں وہ پرائمری سکول کا ماسٹر بھی پہنچ گیا۔ جس نے اِدھر پہنچنے میں میری مدد کی تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ کھاٹ پہ بیٹھ گیا۔ مَیں نے نواجے کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ بچوں کو پرے ہٹا کر' باہر کھڑی اپنی گاڑی دکھائی۔ وہ اس گاڑی کو پہچانتا تھا۔ اُدھر سے گزرتے اگر وہ اِدھر دیکھ رہا ہوتا تو ہارن بجا کر مَیں اُسے متوجہ کرتا۔ اگر کھیل میں مصروف یا اُونگھ رہا ہوتا تو مَیں سیدھا گزر جاتا۔

نواجے سے مویشیوں کے گوبر اور پیشاب کی سڑاند اُٹھ رہی تھی۔ پھٹے اُدھورے کپڑے' لگتا تھا گھر والوں نے اِسے گھر کا فرد ہی نہ سمجھا تھا جبکہ یہاں پہ موجود' گھر اور باہر کے بچے' بہت اچھی حالت میں نہ سہی' مناسب سی صورت و حال میں تو تھے۔

قطع نظر' اِس کی حالت کے' مَیں نے اُسے یوں گود بھرا ہوا تھا جیسے کئی برس گم رہنے کے بعد میرا بچہ واپس مِلا ہو؟ اِس کی بھی یہی صُورت کہ اپنا سر میرے سینے پہ ٹکائے آسودگی سے چمٹا پڑا تھا۔ بچوں اور گاؤں کے دیگر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ مَیں نے عنایتے مراثی سے اِسے کیمپنی کے ہسپتال لے جانے کی اجازت چاہی اور یہ بھی کہا کہ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے۔ اُس نے اپنی بیوی کے کان میں کچھ کُھسر پُھسر کی اور بڑی لجاجت سے کہا۔

''ہم غریب مراثی لوگ ہیں۔ ہماری تو دال روٹی پوری نہیں ہوتی' ہسپتالوں کے دوا دارو' ڈاکٹروں

کے خرچے کہاں سے لائیں گے؟ آپ کو اگر اللہ نے توفیق دی ہے تو اسے ساتھ لے جائیں۔ علاج کرا کے اُدھر ہی کہیں، کسی افسر کے گھر، اوپر کے کام کاج پہ رکھوا دیجیے گا۔" اس دوران اس کی بیوی بھی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔

میں ان ظالموں کے رَوّیے پہ سخت دلبرداشتہ ہُوا...... کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہوں کیا کروں؟ ایسے میں ماسٹر صاحب بول پڑے۔

"آپ دردمند انسان ہیں عنایتے کے دس بارہ بچے ہیں۔ بیشک بچے اور رزق اللہ دینے والا ہے مگر اس کے گھر رزق کی بڑی تھوڑ ہے۔ دودھ اور اُپلے بیچ کر بمشکل ایک ٹیم کی روٹی چلتی ہے۔ بڑے بچے اپنا اپنا مُنہ سر کر کے شہر میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ سات چھوٹے بڑے بچے، یہیں کھڑے ہیں۔ کوئی کسی کی مُنج کُٹی چڑا تا ہے دو بچی گندم کی چھڑائی کرتے ہیں۔ ایک دو میرے پاس پڑھتے ہیں۔ باقی گاؤں، چھپڑوں، روڑیوں پہ آوارہ گردی کرتے ہیں۔" ماسٹر صاحب نے عنایتے سے علیحدگی میں بات کر کے مجھے کہا۔ "آپ اسے ساتھ لے جائیں...... شاید آپ کی توجہ و وسیلے سے یہ کوئی اچھا انسان بن جائے؟ یہاں اسی حالت میں رہا تو کہیں مر ور جائے گا اور اگر بچ گیا تو یہاں کے بے شمار آوارہ بچوں میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔ واپسی پہ بچوں اور کتوں کی ایک وافر تعداد ہمیں الوداع کہنے کی خاطر گاڑی کے پیچھے خاصا دور تک آئی۔

پُلی اور پیڑ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ دور سے دیکھا تو پیڑ جھوم رہا تھا۔ جیسے تیز ہوا یا آندھی میں درخت بُوٹے ڈولنے لگتے ہیں مگر اس سمے پہر قدرے دھوپ تو تھی پر تیز ہوا کا تصور تک نہ تھا اور نہ ہی قریب کسی درخت کی ایسی کیفیت دکھائی دی تھی......؟

راہ سے ہلکا سا ہٹ کر گاڑی کھڑی کر دی...... امریکن کوک کا ڈبا کھولا۔ گھونٹ گھونٹ اُسے پلایا۔ بسم اللہ پڑھ کر اُٹھایا اور اُمباماں (آم کا درخت) کی گود میں لا بٹھایا۔ ڈاریاں دیوانہ وار جھوم رہی تھیں...... بینائی کی طرح سماعت کے بھی کئی پردے اور حجاب...... جو انسان کی بساط مقدور کے مطابق ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے جو خدا کو اُس کی قدرتوں سے پہچان کر ایمان لے آتے ہیں اور یوں بھی جو سب کچھ مانتے جانتے ہوئے بھی نہیں مانتے۔ کچھ کان ایسے جو نوائے سروش کی سرگوشیوں کی گُن مُن بھی پا لیتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی کہ جن کے آگے صُور بھی پھونکا جائے تو کانوں پہ جُوں تک نہیں رینگتی۔ میرے باریک کانوں نے اُمباماں کی خوشی سے نکلتی ہوئی جذبات اور ممتا بھری آوازیں سُنیں۔ نواجا کو وچیرے سے کھالے میں رکھ دیا تھا۔ وہ رینگ کر تنے سے چمٹ گیا۔ جیسے دُنیا جہاں کی نعمتیں اُس نے حاصل کر لی ہوں۔ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا...... نرم نرم نظروں سے ماں بیٹے کا مُدھر مِلن دیکھتا رہا۔ دونوں کو اُدھر چھوڑ کر، گاڑی بھگائے کھاریاں بڑے بازار میں پہنچا کہ اُس کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لاؤں۔ گھنٹہ بھر بعد واپس پہنچا تو وہی پرانا منظر، نواجا، اُمباماں کی گود

میں پڑا' میٹھی نیند کے مزے لُوٹ رہا تھا۔ ایسا وحیرج ایسا سکون ...... جیسے دونوں اَمر ہو گئے ہوں۔ کافی دیر اِدھر پاس بیٹھا رہا۔ پاس سڑک پہ آتے لوگ گاڑیاں' عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے گزرتے۔ کمپنی کی گاڑی' اصل مصیبت تھی۔ درخت کا سایا بھی اَب آگے بڑھ آیا تھا...... مَیں ذراوقت گزارنے کے لیے گلیانہ سے آگے سائٹ کی جانب نکل آیا۔ جدھر کیٹرپلرز کے جنریٹر لگے ہوئے تھے۔ چوکیدار غلام سرور' جو پاس گاؤں کا رہائشی اور پرانا فوجی تھا' وہ بھی پہنچ آیا۔ اُس کے گھر سے کھانا منگوا کر کھایا۔ یہیں ٹینٹ میں ذرا کی ذرا کمر سیدھی کی' اخبار پڑھا اور پھر واپس' پُلی کے پاس پہنچ آیا۔ دُور سے دیکھا تو اجا بیٹھا اپنے معمول کے کھیل میں مگن تھا۔ گاڑی کو دیکھا کر بہت خوش ہُوا۔ ٹھیک سے چل نہیں سکتا ورنہ وہ بھاگ کر میرے پاس پہنچ آتا۔

بچّہ تھا' اپنے ذہن سے کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر...... دیہاتی' ماحول معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کا مارا ہوا' غربت محرومیوں کی دلدل میں دھنسا ہُوا۔ مَیں اُس سے کیا پوچھتا۔ کیسا مشورہ کرتا کہ تم نے اپنے بارے کیا فیصلہ کرنا ہے؟ مَیں اُسے بڑے مگرمچھوں سے تو بچا لایا تھا اَب فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ مَیں اُسے کہاں لے جاؤں کدھر رکھوں؟...... ظاہر ہے اِدھر ویرانے میں کھلے کھیتوں پیڑ کے نیچے اِسے اکیلے نہیں رکھا جا سکتا جبکہ یہ بیمار اور مضروب بھی تھا۔ جذبات اور چیز ہوتے ہیں حقائق کچھ اور؟ جو فیصلہ مشاورت سے ہوتا ہے اِسی میں سلامتی اور برکت ہوتی ہے۔ مَیں نے اَماباماں سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دانائی کیا ہے؟

- وقت کے شعور اور تقاضوں کے فہم و ادراک کو سمجھنے کا نام......!

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اِنسان' اِنسان کے علاوہ بھی کسی غیر اِنسانی مخلوق' اَدنیٰ اَعلیٰ ہستی وعنصر سے مشورہ یا خیر وفلاح کی کسی استعانت سے استفادہ حاصل کر سکتا ہے؟ اِس کا جواب اثبات میں ہے۔ اگر اِنسان بُرائی بدی' کسی کو زک پہنچانے کی خاطر' طاغوتی ابلیسی ذرائع کو درمیان لانے سے دریغ نہیں کرتا تو نیک مقاصد کے فروغ کے لیے صالح وصادق ذرائع (حسبِ ضرورت) استعمال کرنے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔ آسمانی کتابوں' قصص الانبیاء' ملائکہ' قدسیوں دیگر پاک نفوس اللہ کے بندوں کے تذکروں سے بھی واضح ہوتا ہے ایک مخلوق دوسری مخلوق سے فیض یاب ہوئی...... باہم تعلقات ومشاورات بھی رہے۔ استخارہ' قرآنی فال' صلواۃِ حاجات ادا کر کے مصلّی پہ آنکھیں مُوندھ کے لیٹ جانا۔ کسی بزرگ سے دُعا اور رائے طلب کرنا' رینگنے والی مخلوق کے راستے کشادہ کرنا' لنگر کا بندوبست اور مچھلیوں کو چارا ڈالنا...... یہ سب اہتمام اِسی ذیل میں آتے ہیں۔

اقوامِ عالم کے قدیم اور جدید مذہبی عقائد و رویوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دینے سے پیشتر فال نکالنا' جانوروں کی حرکات' اُن کا چہچہانا رونا' موسموں کے تیور' ہواؤں' بادلوں کے رُخ سے کامیابی اور ناکامی کے شگون اخذ کرتے تھے۔ انسانوں' جانوروں کی قربانی' کھیتوں' کنوؤں میں خون ڈالنا وغیرہ...... بھلے آپ ان سب باتوں کو توہمات کے زمرے میں ڈال دیں لیکن ان کی کسی نہ طور حقیقت اور اثرانگیزی سے انکار بھی ممکن نہیں۔

بسم اللہ کا شروع میں پڑھنا' السلام علیکم' ملاقات کے وقت کہنا' کسی کا شکریہ ادا کرنا...... تحسین و آفرین کے کلمات ادا کرنا...... الحمدللہ' جزاک اللہ' ماشاءاللہ...... یہ سب کیا ہے؟ یہ ساری خیر سگالی' سپاس و صالحیت سلامتی و انسانیت کے رویے ہیں۔ جو ہم میں باطنی بالیدگی' مالک کی شکرگزاری' اپنی کم مائیگی' بندگی' اطاعت کی خوشبو پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔''

لاریب کہ ہر معاملہ میں قدرتِ کاملہ ہی مبتدا و منتہا ہے۔ اس کے باوصف' ماڈہ چونکہ مادہ سے اپنی بُنیادی قُربت و نسبت کی بناء پہ احسن اور واضح ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی اک طفل تسلی کے لیے بھی اللہ کی دیگر مخلوق سے بھی شگون اُٹھا لیتا ہے۔'' ایک بار یُوں ہوا کہ مجھے قریبی عزیزوں کے درمیاں اک تنازعہ میں بطور ثالث مجبوراً شامل ہونا پڑا۔ دوسرے شہر میں پہنچنا تھا مجھے رات کو ہی گوجرانوالہ پہنچنے کے لیے کہا گیا تا کہ اگلے روز صبح سویرے جہلم کے لیے روانگی اختیار کی جا سکے اور مسئلہ نمٹا کر اسی روز واپس آیا جا سکے۔ میں رات کو اُدھر پہنچ گیا۔ رات کافی دیر تک معاملہ کے سیاق و سباق پہ تیاری ہوتی رہی۔ صبح سویرے ناشتے کے بعد جہلم روانہ ہونے کے لیے باہر نکلنے لگا تو دیکھا کہ گلی میں دو گھروں کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے۔ مرد عورتیں بُری طرح آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ گالی گلوچ بھی چل رہی ہے۔ اردگرد کے لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ہم مرد لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ گھر کی عورتیں ابھی بیٹھنے کی تیاری کر رہی تھیں کہ گھر کی بڑی عورت نے گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کرتے ہوئے سفر ملتوی کرنے کا عندیہ دے دیا۔ جب میں نے عورتوں کو واپس گھر میں جاتے دیکھا تو میں نے گھر کے سربراہ سے وجہ دریافت کی۔ وہ میرے پاس سے اُٹھ کر گھر گیا۔ جلد ہی واپس لوٹا' بتایا کہ گھر والی نے جہلم جانا ملتوی کر دیا ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ ہم وہاں صلح کے لیے جا رہے ہیں۔ گھر سے باہر قدم نکالتے ہی لڑائی جھگڑا دکھائی دی ہے۔ شگون صحیح نہیں...... وہاں بھی صلح کی بجائے مزید کام بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ مزے کی بات' گھر کے اس سربراہ نے بھی بیوی کی بات پہ صاد کرتے ہوئے مجھے اس پروگرام کو اگلے دن تک ملتوی کرنے کی درخواست کی۔ میرا تو میٹر گھوم گیا۔

''بھائی! لڑائی تو اُدھر ہو رہی ہے۔ اس کا ہمارے پروگرام سے کیا تعلق؟''

گلٹو بند ہو جائے...... کسی بسیار خور کو قبض یا کسی احمق تو ہم پرست کو وہم...... بڑی مشکل پیدا کرتے ہیں۔ میں ان سے بحث کرنا فضول سمجھتے ہوئے واپس لاہور جانے کا کہہ کر گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ ان کو پتنو پڑ گئے' کسی نہ کسی طرح مجھے واپس بیٹھک میں لا بٹھایا گیا۔ مختلف توجیہات بیان کر کے مجھے ایک دن مزید ٹھہرنے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اُن کی جہاندیدہ بیوی نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے مختلف کہاوتیں بیان کیں جیسے گھر سے جاؤ کھا کے' آگے سے ملے پکا کے۔ ہسدے جاؤ تے ہسدے آؤ۔ لڑائی دیکھ کر جاؤ' آگے سے بھی لڑائی دیکھ کر آؤ وغیرہ وغیرہ۔ مزید کہنے لگی۔

''بابا جی! وڈے وڈیروں نے یہ باتیں ایسی ہی نہیں کہیں۔ بڑے تجربوں اور سر ورتیوں کی باتیں ہیں۔ جہلم والے تو ویسے ہی بڑے جھگڑالو اور لڑاکے ہیں۔ مجھے تو آج وہاں جاتے ہوئے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

میں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہوں گی' مجھے مجبوری ہے۔ میرے پاس وقت نہیں' پہلے ہی میں بڑی مشکل سے وقت نکال کر آپ لوگوں کی بہتری کی خاطر آیا ہوں۔ میں تو واپس لاہور جا رہا ہوں۔''

پتا نہیں کہ وہ کیسے رضامند ہوئی۔ بادل نخواستہ ہم دو گاڑیوں میں سوار جہلم کی جانب چل دیئے۔ دو اڑھائی گھنٹوں کے سفر کے بعد' مشین محلہ نمبر دو میں اُن کے گھر کے سامنے ہم پہنچ گئے۔ مجھے دیکھ سن کر یقین نہ آیا کہ وہاں ہم سے پہلے ہی لڑائی کا میدان گرم تھا۔ ہمیں دیکھ کر اُن لوگوں کا ایک رشتہ دار باہر نکلا اور کہنے لگا۔

''خدا کا واسطہ آپ لوگ فوراً اِدھر سے چلے جائیں۔ اندر تو بندوقیں پستولیں نکلی ہوئی ہیں۔ لڑکے کی ماں بے ہوش ہے' ماں باپ تو صلاح کے لیے راضی ہیں پر لڑکا نہیں مان رہا۔ مہربانی فرما کر آپ لوگ واپس ہو جائیں۔ لڑکے کا دماغ بہت خراب ہو چکا ہے......!''

دیکھا آپ نے؟...... لڑائی دیکھ کر چلے تھے آگے بھی لڑائی دیکھنی پڑی۔ نہ ماننے کے باوجود بھی ہمیں ماننا ہی پڑتا ہے کہ یہ چیزیں بھی کوئی حقیقت رکھتی ہیں۔ یہ کوؤں کا بنیرے پہ بیٹھنا' کاں کاں کرنا...... بلیوں کا رونا لڑنا' کتوں کی لڑائی...... گدھے کی آواز' مرے کبوتر فاختہ دیکھنا...... رات اُلو کی آواز سننا...... چاند سورج گرہن دیکھنا' ماموں بھانجے کا بارش آندھی میں اکٹھے باہر نکلنا...... کنواری لڑکی کا صبح صبح مطلقہ یا بیوہ کو دیکھنا...... سوتے ہوئے چیونٹیوں کا جسم پہ آ جانا...... کسی بیمار کے کپڑوں کو چوہے کا کتر جانا...... دودھ میں چھپکلی گرنا...... چھت پہ بلیوں کی لڑائی...... پکتی ہوئی' مٹی کی ہانڈی کا آپے آپ پیندا نکل جانا...... آنکھ کا پھڑکنا' ہتھیلیوں پہ خارش ہونا...... جوتی پہ جوتی کا چڑھ جانا' گھر کے پیڑ پودوں پہ اُمر بیل کا پیدا ہو جانا...... عورت یا جانور کا دودھ سوکھ جانا وغیرہ وغیرہ......

بڑے کہتے ہیں' ہاتھ پاؤں کے ناخن تراش کر گھر کے اندر نہیں رکھنے چاہئیں' باہر کسی ایسی جگہ تلف کریں جدھر سے کوئی انہیں حاصل نہ کر سکے۔ اسی طرح داڑھی' سر یا جسم کے بال بھی چار دیواری سے باہر کسی جگہ دبا دینے چاہئے۔ جانور کے کلیجی' گردے' دل کو چھری سے نمک لگا کر رکھنے چاہئیں۔ اپنا لباس' زیر جامے' دوپٹے' جرابیں' بنیانیں' رومال' پگڑی وغیرہ پرانے ہو جائیں تو اعتماد والے غریب ملازم محتاج کو دے دیں' جلا دیں یا ٹکڑے ٹکڑے کر صفائی کے لیے استعمال کریں۔ غلط لوگ' ان پہ جادو ٹونہ کر دیتے ہیں۔ کھانے والے برتن استعمال کے فوراً بعد دھو ڈالیں' دن یا رات بھر جوٹھے نہ رکھیں۔ یا مارے جوٹھا یا مارے جھوٹ...... درخت کے سائے' حشرات الارض کے بلوں' گرم ریت مٹی' دریا نہر' تالاب جوہڑ کے کھڑے یا بہتے پانی میں پیشاب نہ کریں۔ بانجھ' نموک والی عورت یا جس کے ہونٹوں' شرمگاہ پہ تل پھنسے' دھدر یا برص کے داغ ہوں' کے سائے' جوٹھا کھانے پینے' جنسی تعلقات قائم کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔ جب تک اس کا علاج نہ کروالیا جائے۔ سورج کے ساتھ سفر شروع کرنے سے' منزل آسان اور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

اُماں مائی کا عندیہ لینے کے لیے وضو کر کے' خواجے کے پاس ہی' دو رکعت نفل پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اللہ پاک سے التجا کی۔

''مالک! اس معصوم مظلوم' بیکس بچے کے حق میں جو بہتر ہو اس کا وسیلہ عطا فرما اور اُماں مائی اور مجھے بھی بجھائی عطا فرما......!''

نیند اور غنودگی میں بہت فرق ہے۔ وہی جو سرور اور بدمستی میں ہے۔ مَیں سویا جاگا سا تھا کہ سر پہ ایک چھپکلی سی آ بی گری...... اُماں مائی نے ہوشیار کرنے کے لیے شاید اشارہ دیا۔ مَیں ہلکا سا خنداں لب اُٹھ بیٹھا۔ میری سانسوں میں آموں کی رسیلی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کچے آم' پکے انناس اور ہرے نیبو کی کھٹی میٹھی خوشبوئیں' میرے دل و دماغ میں لطافتوں' نزاکتوں کے گلزار کھلا دیتی ہیں۔ میرے اندر' نرگسیت کے خوش رنگ طیور چہچہانے لگتے ہیں' دل میں کافوری خنکی سی لہرانے لگتی ہے۔ فضاؤں میں اُڑنے' سمندروں میں غوطے لگانے' صحراؤں میں بھٹکنے اور گھنے جنگلوں میں پاگل پروائی کی مانند مگن میں کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔ ان تینوں کی لطافتوں' مہکاروں' شیرینیوں' لذتوں' ترشیوں اور ضوری جمال و کمال کا مجھے گونا گوں گیان حاصل ہوا ہے۔ وصال و فراق کے معاملے' اول و تمام کرنے کے لیے آم چھتنار کی چھایا سے اچھا کوئی گوشۂ عافیت نہیں' پریم جھولے لینے کے لیے اس کے ڈال سے بہتر کوئی ہنڈولہ نہیں۔ ہریل طوطوں کی پریم پالی بھی اسی کے برگ و بار کی باس میں ہوتی ہے...... سبحان اللہ!

تو اس برابر ہوئے تو نواب کو اپنی جگہ پہ موجود نہ پایا۔ نظر ہٹا کر سامنے دیکھا...... وہ کمپنی کی ڈبل کیبن کے پچھلے کھلے حصے میں بیٹھا اپنے دھیان نے ٹھیکریوں سے کھیل رہا ہے۔
کھیل میں مگن بچہ...... ! ماں کا دودھ چُسکتا ہوا نو مولود...... شبنم کے قطرے سے بھیگی ہوئی پنکھڑی' سرِ مژگاں ٹھہرا ہوا آنسو...... فرطِ جذبات سے مغلوب لبوں کی لرزش...... دُنیائے رنگ و بو کے حسین ترین مناظر کہے جا سکتے ہیں۔
مجھے قدرت کی رضا اور اُمہا میا کی جانب سے اجازت مل چکی تھی۔ نواب کا گاڑی میں خود بخود بیٹھ جانا' اس اَمر کی دلیل تھا۔ میں سبک سبک سا گاڑی کے پاس پہنچا...... مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں' بھئی! کیا ہو رہا ہے؟ یہ بتاؤ تم گاڑی تک کیسے پہنچ گئے؟ ٹانگ کی وجہ سے تمہارے لیے کھڑا ہونا مشکل...... گاڑی پہ کیسے چڑھ گئے؟''
وہ اپنے کھیل میں مگن' بڑی بے نیازی سے بولا۔
''اُمہاں والی اماں نے میری لت وی ٹھیک کر دتی اے۔ تے مینوں آ کھیا' جا چاچے نال شہر ٹُر جا!''
میں نے حیرانی سے اُس کی بات سنتے ہوئے مزید پوچھا۔
''اتنی اُونچی گاڑی پہ تم کیسے چڑھ ہو؟''
''اُمہاں والی اماں نے چک کے چڑھایا سی......!''
یقین کرنا بہت مشکل' مگر کیا کہا جائے کہ ایسے ہی ہے اور دن رات ہوتا رہتا ہے۔ مگر ہم اپنے محدود علم اور بصیرتی کی بنا پہ نہ تو سمجھ سکتے ہیں اور نہ مانتے ہیں۔''
کنکریاں کلمہ پڑھ سکتی ہیں۔ کھجور کا تنا فریاد کر سکتا ہے' رو سکتا ہے...... چیونٹیاں بات کر سکتی ہیں' پتھر بول سکتے ہیں۔ شجر' پرندوں نے کلام کیا۔ جنگل' دریا' صحرا' سمندر رب اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ناڑیلی پڑھتے ہیں...... درود شریف کا ورد کرتے ہیں۔ انسان اُن کی زبان ذکر کو سمجھ نہیں پاتا۔ بجز' جس کو وہ عطا کرے۔

- سرخ گلاباں دے موسم وچ پُھلاں دے رنگ کالے......!

اُستاد امانت علی خان' اسد امانت کے والد' نہ صرف ایک بڑے پائے کے گائیک تھے بلکہ مردانہ وجاہت و رعنائی کا ایک نادر پیکر بھی تھے۔ میں نے بے شمار گویے سُنے دیکھے' کوئی گانے میں بھلا مگر دیکھاؤ سجاؤ بھلاؤ میں رہ گیا۔ اُستاد امانت علی خان' سُننے اور دیکھنے کے علاوہ محسوس کرنے کی بھی چیز تھے۔ اس گھرانے کے

تمام کاریگر اِس لحاظ سے بڑے خوش قسمت رہے کہ وہ گائیکی دوران شکل نہیں بگاڑتے تھے بلکہ گاتے وقت اپنے اصل سے کہیں زیادہ پیارے اور من موہنے لگتے۔ اتفاق کہہ لیں کہ مجھے اِس گھرانے 'اُستاد امانت علی' اُستاد فتح علی' اُستاد حامد علی اور اسد امانت سے موسیقی کے واسطے سے کچھ تعلقات رہے۔ اُستاد امانت علی مرحوم سے کچھ زیادہ کہ اُن سے موسیقی کے علاوہ بھی ایک اور نسبت بھی تھی۔

راوی روڈ سے ذرا ہٹ کر ایک بزرگ کا گمنام سا مزار تھا۔ اُن کا نام تو کچھ اور تھا مگر امانت علی اُنہیں سائیں بھیروں کہتے تھے۔ ایسا کہنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ میں ایک خاص مقصد سے ہر جمعرات' بُھنے چاولوں کے لڈوؤں کا لنگر لے کر' اِس مزار پہ حاضری دیتا تھا۔ پرانے وقتوں کا یہ غیر معروف ٹُونا ٹُھوٹا' عام سا مزار' شاید آج موجود نہ ہو۔ یہ پرانے قبرستان کے ایک کونے میں واقع تھا۔ اسے مزار کہنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی کہ یہ قبر زمین سے اُونچے ایک چبوترے پہ تھی۔ ذرکے بغیر طاقچوں والی دیواروں پہ قبّہ نما چھت...... جس پہ کوؤں کبوتروں کے پرے پرے ڈیرے ڈالے رہتے تھے۔

میں عَلی الصباح' سیالکوٹ سے باؤ ٹرین پہ بغیر ٹکٹ سفر کر کے لاہور پہنچا۔ آٹھ دس آنے' کرائے پہ خرچ کر دینے کے بعد لنگر کے لڈوؤں کے لیے پیسے نہ بچتے تھے۔ لہٰذا' ٹکٹ چیکر سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے بادامی باغ پہنچ جاتا۔ یہاں سُست رفتار گاڑی سے آسانی کے ساتھ نیچے ڈھلوان اُتر کر نیچے بازار...... یہاں چنے چاول' مُونگ پھلی بھونے والوں کے بھٹ تھے۔ دیہاتی ماحول' ہندو دکاندار' ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر خوب مُفت خوری ہوتی۔ چنے' مُونگ پھلیاں' گچک' ریوڑیاں' املوک' دال سیویاں...... غرضیکہ جو ہاتھ لگتا' پیٹ میں پہنچ جاتا۔ دکاندار بھی بھلے لوگ ہوا کرتے تھے جانتے بُوجھتے' نظر دھیان دوسری جانب پھیر لیتے کہ بچے کچھ ٹُونگ لے......!

اِدھر سے میں آنے دو آنے کے بُھنے ہوئے موٹے چاولوں کے میٹھے لڈو لیتا۔ یہ بھی عجیب سوغات تھی۔ چاول' بھٹ میں بھون کے گُڑ کی راب ملا کر لڈو بنائے جاتے۔ ساتھ سونف' مُونگ پھلی کی گریاں' کھوپا...... کچھ دانے سرخ اور سبز بھی ہوتے' جو بڑے خوشنما لگتے۔ یہ لڈو دیہاتی' شہری بچوں کا دلپسند کھاجا تھا...... دھیلے دمڑی میں بچے پرچ جاتے اور نذر امٹھائی کی ضرورت بھی پوری ہو جاتی۔

یہ میری اَوائل عمری کا وہ دَور تھا جب مجھے سیکھنے سکھانے کا جنون تھا۔ جو بھی اچھا بُرا کام دیکھتا' جب تک میں اُس کے گھر تک نہ پہنچ جاتا مجھے چین نہ پڑتا۔ اس سے کچھ فائدہ نقصان کی غرض نہ ہوتی۔ بس! یہ کہ کام مجھے آنا چاہیے...... سارا بچپن' اسی قسم کی حماقتوں میں بیتا۔ مجھے کیا خبر ہوگی کہ وقت میری پرورش کر رہا

ہے۔کارزارِ زیست میں سُرخرو ہونے کے لیے مجھے تیار کر رہا ہے۔

ہوا میں اُڑنے کی کوئی تربیت حاصل کرتا ہے' کوئی سمندروں میں اُترنے کی...... کانیں کھودنے کی اور کوئی ریت کھنگالنے کی۔کوئی عالم دین اور مبلغ بنتا ہے۔انجینئر' کوئی سائنس دان' عالم فاضل کوئی ڈاکٹر' قانون دان تو کوئی لیڈر اور کوئی ایدھی ہے اور کوئی صنعت کار' اپنی فیلڈ' دلچسپی صلاحیت اور مقدر......!

ہم کو تمہارے عشق نے کیا کیا بنا دیا
مجنوں بنا دیا کبھی لیلیٰ بنا دیا

ہر پتھر کے نصیب میں گوہر ہونا نہیں ہوتا اسی طرح ہر ہیرے کے مقسوم میں کوہِ نور بننا بھی نہیں ہوتا۔
علم حقیقی کچھ اور ہوتا ہے۔بڑی بڑی درسگاہیں...... عصری علوم سے کسی حد تک استفادہ کیا جا سکتا ہے جس سے محض رواں وقت کی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔علوم عتیق و حقیق' معرفت سے مملو ہوتے ہیں اور معرفت' اللہ کریم کی خاص عطا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طفیل فرقان الحمید سے ملتی ہے۔

قلندروں فقیروں درویشوں کے لیے پوری خدا کی خدائی...... اک درسگاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔دُنیا اُن کے آگے اک پشہ کے پر سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔گل لالہ کی پرورش اور حفاظت کوئی باغبان نہیں کرتا۔ قدرت نے یہ ذمہ داری خود سنبھالی ہوتی ہے۔کچھ" بےفضول" نکمّے مگر دیوانے سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے معلّم وقت اور فطرت ہوتے ہیں' حالات اور معاملات ہوتے ہیں۔وہ تلمیذ الرحمٰن' سفر میں تو دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقت میں سفر انہیں طے کر رہا ہوتا ہے۔وہ کسی منزل کی جانب نہیں بلکہ منزلیں' اُن کی جانب رواں ہوتی ہیں...... وہ سب مخلوق سے محوئے کلام' وہ خود ہی ناظم اور نظام ہوتے ہیں۔

چاولوں کے لڈوؤں کا ذکر ہو رہا تھا۔میں حسبِ جیب' لڈوؤں کا لنگر لے کر' راوی روڈ سائیں بھیروں کے مزار پہ پہنچ جاتا۔صبح کا وقت' اِدھر آنے جانے والے نہ ہونے کے برابر ہوتے۔کبھی کبھی تو کوئی بھی دکھائی نہ دیتا۔یہ موسم پہ بھی منحصر تھا۔بہرحال! اور کوئی ہو نہ ہو' ایک فرد اِدھر ضرور موجود ہوتا۔قبر کے پاؤں کی جانب' منہ سر ڈھانپے بڑے اَدب سے کسی کیفیت میں گم ہوتا۔اندر داخل ہوتے ہی اِک مخصوص سی خوشبو' مجھے اس کی موجودگی اور نفیس الطبع ہونے کا احساس دلاتی۔میں حسبِ معمول فاتحہ شریف پڑھ کر' دُعا مانگتا اور لنگر تقسیم کرنا شروع کرتا۔جو بھی موجود ہوتا اُسے ایک لڈو تھماتا...... خود بھی کھاتا اور باقی باہر پڑی مٹی کی کنالی میں رکھ دیتا جو آنے جانے والوں کے علاوہ اِدھر کے کوؤں' کبوتروں کے کام بھی آتے۔

میں ہمیشہ محویت میں ڈوبے اس شخص کو بھی لنگر دیتا جس کی نہ صورت دیکھی اور نہ کبھی بات ہوئی تھی۔ میرے لیے اس کا خاموش سراپا اور مخصوص خوشبو ہی اس کا تعارف تھا۔ایسے مقامات پہ ویسے بھی کسی کو جانے

پہچاننے کی ضرورت نہیں ہوتی؟ جس کے پاس پہنچا ہوتا ہے اُس کی کوئی گُن مُن مل جائے تو بڑی بات ہوتی ہے...... ایک جمعرات دیکھتا ہوں وہ شخص اپنی جگہ پہ موجود نہ تھا۔ حیرانی اور پریشانی بھی کہ مہاراج 'آج کدھر رہ گئے؟ بجھے بجھے 'لنگر تقسیم کیا۔ اُس کا حصہ قبر کی پائینتی پہ رکھ دیا...... اَب نہ جانے کیا جی میں آئی میں بلا ارادہ اُس کی مخصوص جگہ پہ وہی انداز اختیار کر کے بیٹھ گیا۔ سر پہ چادر' آنکھیں نیم وا تھا ڈھانپے 'اب میں اُس کیفیت کی تلاش میں تھا جو اُس پہ طاری رہتی تھی۔ انسان نقل تو کر سکتا ہے بمطابق اصل...... لیکن کسی کیفیت کی رُوح کی نقل نہیں کر سکتا۔ بہر حال' میں کسی نہ کسی طور وہیں پڑا رہا۔

اچانک میرے نتھنوں میں وہی مخصوص خوشبو لہرائی۔ چادر ہٹا کر دیکھا وہی رَجلِ مستور چہرے کا چراغ روشن کیے بیٹھے ہیں۔ فوری کچھ سمجھ نہ آیا' اُٹھوں یا بیٹھا رہوں۔ مجھے کسمسا تا دیکھ کر بولے۔

''تسلی سے بیٹھے رہو' میرا اِدھر کا کام پچھلی جمعرات ہی پورا ہو گیا تھا۔ آج تو میں صرف تمہارا لنگر کھانے اور یہ دیکھنے آیا کہ تم اپنی جگہ پہ بیٹھ گئے ہو کہ نہیں؟''

کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں ٹکر ٹکر اُن کے چراغ چہرے اور مشعل آنکھوں کو دیکھ رہا تھا' وہ پھر گویا ہوئے۔

''تمہیں بابا بھیروں سرکار سے بہت لگن معلوم ہوتی ہے۔ تمہیں یہاں لنگر بانٹتا دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ اَدب اور علم والے بچے ہو۔ تعلیم لیتے ہو' گھرانے والے ہو یا عطائی......؟''

کچی بات ہے میں گھبرا سا گیا...... کیا جواب دوں؟...... بوکھلایا سا بولا!

''تعلیم سے بھاگا ہوا ہوں...... گھر تو ہے لیکن وہاں کوئی عزت نہیں...... باقی رہی بابا بھیروں سے لگن والی بات...... اِس راہ پہ مجھے منّے نُولے نے ڈالا ہے۔''

''ماما نُولا سیالکوٹ والا......؟'' اُنہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا؟

''جی ہمارے گھر کے قریب ہی اُس کی پانوں کی دکان ہے۔ آئے دن وہاں گانے بجانے کی محفلیں ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرے شہروں سے بھی گانے بجانے والے آتے رہتے ہیں۔ سیالکوٹ کے بہت سے لڑکے اس کے شاگرد ہیں۔''

''تم بھی اُس سے گانا سیکھتے ہو؟''

'جی ہاں' مجھے موسیقی سے بہت دلچسپی ہے۔ جمعہ والے دن' مسجد میں نعتیں بھی پڑھتا ہوں۔ گانا بھی گا لیتا ہوں۔''

''کوئی ساز بھی بجا لیتے ہو؟''

''ڈھولکی اور بنجو بجانا سیکھ رہا ہوں۔ اُستاد ماما نُولے نے بتایا تھا اگر کسی نے اصلی گانا بجانا سیکھنا ہو تو

سائیں بھیروں کے مزار پہ منت مانگے' چالیس جمعراتیں' چاولوں کے لڈوؤں کا لنگر بانٹے۔ اگر چالیسویں جمعرات' سائیں بھیروں خود اپنے ہاتھوں شیرینی کھلا دیں تو سمجھو کہ راگ راگنیاں سیکھ جاؤ گے' اگر ایسا نہ ہو تو مزید چالیس جمعراتیں ادھر لنگر بانٹنا اور حاضری دینی ہو گی۔''

''مگر اس کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی بہت ضروری ہے اور پکا ریاض بھی ...... بتاؤ' تم نے اَروہی اَمروہی پکائی ہے......؟''

اَب مَیں کیا جانوں اَروہی اَمروہی کیا ہوتی ہے؟...... میرے بھانویں تو یہ از قسم کوئی ساگ پتے تھے۔ جنہیں صرف پُرانی دیہاتی عورتیں ہی پکا سکتی ہیں۔ مٹی کی پرانی ہانڈیاں' اُپلوں کی آگ اور دُھواں...... کڑوا سرسوں کا تیل' لکڑی کا گھوٹنا وغیرہ...... مَیں اَروہی اَمروہی کو بھی' سرسوں ہاتھو کیچ میچ میتھی پالک' تارا میرا وغیرہ...... مَیں نے جواب میں احمقوں کی مانند نفی میں سر ہلا دیا۔

اَب میری باری تھی مَیں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔ آپ......؟

آنکھوں کے کنول دکھاتے ہوئے بتایا۔

''مجھے بھی تمہاری طرح موسیقی سے پیار ہے بلکہ عشق' بزرگوں نے بتایا۔ دُنیا میں پہنچ کر مَیں نے منہ بسور کر رونے کی خاطر جو پہلا سُر لگایا تھا وہ بھیرویں تھا۔ اُس سمے سے اَب تک مَیں بھیروں کے بھید بھاؤ سے باہر نہیں نکل پایا۔ تمہیں ایک اور راز کی بات بتاؤں' مجھے ایک بوڑھے ہندو سنگیت بدیاوان نے کہا تھا بچّے! تمہیں جیون میں کبھی بھیروں مائی کا گیان درشن اَوش ہو گا؟ اِک لمبے زمانے تک صبح صبح راوی گھاٹ' ریاض کیا مگر شاید کوئی کمی رہ گئی تھی۔ کبھی مجھے غیب سے سُجھائی دیا کہ مَیں اِدھر باوا بھیروں سرکار سے عرض کروں۔ کئی مہینوں جھولی بھری' کہیں اَب شنوائی ہوئی ہے۔''

مَیں حیرانی سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ یوں ہی پوچھ لیا۔

''مجھ سے ایسی بھید بھری باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ مَیں ان کا اہل نہیں۔''

حسبِ معمول مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایمانداری کی پُوچھو تو میری حسرت پوری ہونے میں مجھ سے زیادہ تمہارا کام ہے۔ تم مجھے لنگر کے لڈو کھلاتے تھے۔ باوا بھیرویں تم سے خوش ہوئے اور یوں میرا کام بھی بن گیا۔''

''مگر مجھے تو ابھی تک گانا وانا نہیں آیا' بلکہ پہلے سے بھی گزر گیا ہوں۔''

مسکراتے ہوئے کہا۔

''ضروری تو نہیں کہ تم میری طرح گانا گاؤ۔ گانے والے سے کہیں زیادہ گنی کن رسیا ہوتا ہے۔ ہمارا

تو گھرانے کا کام ہے' تمہارا نہیں...... یا پھر جسے مالک عطا کرے۔"

خان صاحب بتاتے تھے کہ بھیروں مائی جی نے راوی کنارے' اُنہیں ورشن دیا اور اپنے راگ کے خاص الخاص بھید بھاؤ تعلیم کیے۔ معلوم ہوا کہ جذبہ' یقین' صدق محنت اور راس سمتی کے تعین سے اُن حجابات کو بھی دُور کیا جا سکتا ہے جو عام طور پہ انسان اور دیگر مخلوقات کے درمیان حائل ہوتے ہیں۔ یقیناً اِن کا شمار رازہائے خفتہ یا اَسرارِ سِرّی میں ہوتا ہے؟

کائنات کی اَن گنت بُوالعجبیوں میں' عام انسان کے دائرہ ادراک میں واضح طور آنے والی کوئی شے نہیں...... اللہ کی کتاب' بین المفہوم' اشارتاً اور کہیں صاف صاف بیان تو کرتی ہے مگر قرآن فہمی بھی تو ایسی آسان نہ ٹھہری کہ ہر کوئی بے سُود فیض یاب ہوتا پھرے۔ قرآن تو اُس پہ کُھلتا ہے جو مالکِ قرآن' صاحبِ قرآن اور حُرمت و عظمتِ قرآن پہ قربان ہو......؟

دو اِقسام کی مخلوقات' ناطق اور مُطلق' شعورِ مکانی اور شعورِ زمانی سے مزین ہوتی ہیں۔ اَب رہی بات' شعورِ من اور شعورِ غیر از من تو یہ حسبِ مقدور ہوتے ہیں۔ ایک ماں باپ کی اولاد کی مانند...... کوئی کمزور کوئی صحت مند' ذہین و فطین تو کوئی اجہل مطلق...... دھیما دھیرج والا' کوئی نائی کی طرح ناشکرا ناصبرا......!

یہ دھیما دھیرج والا شخص' عظیم گویا اُستاد امانت علی خان تھے' ایسا سُریلا' اُجلا' سُرتا یا رعنائی و زیبائی...... جو گاتے ہے انسان نہیں دیوتا لگتا تھا۔ اپنے وقت کی بڑی بڑی عظیم گانے والیاں' ملکہ پکھراج' روشن آرا' نور جہاں' مختار بیگم' فریدہ خانم' اِس کے ساتھ نجی اور عوامی موسیقی کے جلسوں میں شامل ہوتیں' لگتا سُر سنگیت کی سب سُرتیاں' ایک سنگم پہ سنگھاری گئی ہیں۔ کہیں دُور ٹمٹماتے دیوں کی طرح' اُس دَور کی سہانی یادیں' اَب بھی دل میں سورنگیوں کے جھالے سے لہرا دیتی ہیں۔ تب کہیں اُس فسوں گر دنیے کے کنول کٹورے ہمیں بھی اُجل کر ہلکی ہلکی روشنی دینے لگتے ہیں......

کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ مخلوق کسی بھی طور و ڈھنگ کی ہو اپنی اک مخصوص بولی ٹھولی اور سائیکی رکھتی ہے۔ صانع لم و یزل نے کسی کو بے مقصد و بے اصل نہیں بنایا۔ اپنی اپنی جگہ حیثیت میں ہر کوئی کامل ہے۔ اُن کی اپنی دُنیا' اپنے طور و طریق' اُصول و قانون اور مرنا جینا ہے۔ بس فرق یُوں کہ انسان اپنے زعمِ اشرف المخلوق میں غلطاں' دُوسری مخلوقات کو درخورِ اعتنا نہیں گردانتا۔ نگاہِ بینا قلبِ سلیم اور ظرفِ عمیم والوں کے ہاں تو پشّہ' تارِ عنکبوت' ذرّہ و ریگ' سَم مار اور گوبریلا کیڑا بھی مخلوقاتِ مطلق و مدلل میں اپنی حیثیت و ہستی رکھتے ہیں اور نظامِ ہست و بُود میں اپنا ایک مُثبت کردار سرانجام دیتے ہیں۔ بلاشبہ ہر کس و ناکس کو اِن کا علم حاصل ہوتا ہے اور نہ شوق و ضرورت......؟ انسانیت کی فلاح و بہبود' بہجت و بصیرت کی آرائش و زیبائش کی خاطر معرضِ وجود

میں لائی گئی یہ مخلوقات بھی انتہائی خاموشی سے کوئی خلل پیدا بغیر انسانیت کی خدمت میں جُتی رہتی ہے۔ انسان کی طرح انہیں ستائش کی بھی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ حتی الوسع نازیبا سلوک بھی برداشت کر لیتی ہیں تاوقت کوئی انہیں نابود کرنے کے دَر پے نہ ہو جائے۔ فقیر درویش' سنیاسیوں جوگیوں' سادھوں سنتوں سے ان کی خوب پہچان ہوتی ہے۔ ایک دُوجے کے دوست اور ساتھ نبھانے والے ہوتے ہیں۔

مَیں اپنی نہ سمجھ میں آنے والی قرنوں پہ محمول زندگی میں ایسے ایسے عجیب و غریب' مافوق الفطرت واقعات دیکھنے اور کسی نہ کسی طور اُن میں دخل دینے پہ مجبور ہُوا...... ماننا پڑا کوئی ماورائی طاقت' بستی دانستہ مجھے اُن راہوں پہ ڈال رہی ہے جو میرے اپنے فہم و ادراک سے لگا نہیں کھاتیں۔ امکان سے باہر' وسائل سے وَرا' حدِ ظلمت و حیثیت سے بہت پرے...... پَر جلنے والی جگہ پہ......!

جدھر مَرنا لکھا ہو' موت اُدھر کھینچ کر لے جاتی ہے۔ جہاں سے کچھ بہتری کی صُورت حاصل ہوتا ہو۔ ہوا اُس طرف زبردستی اُڑا کر لے جاتی ہے۔ درویشوں فقیروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ ہوا کے دوش پہ سوار اُڑتے پھرتے ہیں...... ارادہ کدھر کا' پہنچ کہیں اور جاتے ہیں؟

## ● سندر بن کے پورم پار......!

بھارت کی جانب سے اگر سُندر بن کے جنگلات میں داخل ہوں تو انتہائی مفلوک الحال' جانور نما انسانوں کی ایک بستی راہ میں پڑتی ہے۔ جنہیں دیکھ کر یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ ہندوستانی ہیں یا بنگلہ دیشی مسلمان یا ہندو......؟ انہیں انسان سمجھنے میں بھی تامل ہوتا ہے۔ ہرے بانسوں' پٹ سن کی کھپریل سے بنے ہوئے چند جھونپڑوں پہ مشتمل اس بستی میں زندگی کی رمق تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔ سَڑی جلی بھُنی' ہڈیوں کے ڈھانچے زرد رُو عورتیں...... جو صنفِ لطیف سے کہیں زیادہ کوئی جنسِ کثیف کی بدرُوحیں دکھائی دیتی تھیں اور چند مریل ننگے دھڑنگے بچے کہ شاید ہی کسی نے کپڑا پہنا ہو یا صحتمند دکھائی دیا ہو۔ ناک سے بہتی ریزشیں چاٹتے ہوئے...... مچھروں مکھیوں کے جھرمٹوں میں پھنسے ہوئے...... چند ایک مرد نما' انسانی کیڑے بھی دکھائی دیے جو مجھ سیاہ پوش اور میرے بنگالی گائیڈ نما دوست کو شام ڈھلے اپنی بستی میں دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اُن کا بے طرح خوش ہونا عین اُن کی ضرورت کے مطابق تھا۔

گرز ودگنج' اس گنجی منجی بستی کا نام تھا۔ دریا کے گھاٹ اور سُندر بن کے سنگم کی وجہ سے اس کی اہمیت واضح تھی۔ جھونپڑ نما ایک آشرم شالہ تھا۔ لیٹنے کے لئے پٹ سن کا بچھونا۔ بچھو دریائی مچھر' سُندر بن کی کالی

مکھی مفت اور کھانے کے لیے ماچھی بھات۔ اپنے تجربے کے مطابق' خاص طور پنجابی' اسے سزا کے طور بھی نہیں نگل سکتا۔ ناریل کا کچا تیل' سمندری نمک' امباہلدی' لبی ٹیسا ندی مچھلی' دریا کا پانی اور موٹا پِنّہ بھات' یہ سارے مسالے مل یک ایک ایسی ناقابل طعام' غذا کو مکمل کرتے ہیں جو حلق میں اُترنے کی بجائے' واپس منہ کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اُدھر کے غریب الحال لوگ' مزے اور توانائی کی غرض سے نہیں بلکہ کسی نہ کسی طور زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں۔ کلکتہ کی اطراف سے ادھر پہنچنے والا یہ آج کا آخری بیڑا تھا جو ادھر کے گھاٹ' میرے سمیت دس بارہ' مسافر اُتار کر آگے کسی منزل کی جانب بڑھ گیا تھا۔''

سمندر' دریا کے سفر میں بھوک سوا لگتی ہے کہ پیٹ کو اُچھالا لگتا ہے۔ کوہ و دمن میں بھوک دب جاتی ہے کہ پیٹ دابو ہوتا ہے...... فضاء اور پانی کے نیچے کا سفر بھوک کو مؤثر کر دیتا ہے کہ پیٹ کی آنتیں غذا کی بجائے دم لطیف کی ضرورت زیادہ محسوس کرتی ہیں۔ صحرا اور جنگل کا سفر' بھوک سے زیادہ پیاس کو محسوس کرتا ہے۔ ہم مسلسل ساڑھے پانچ گھنٹے' سمندر نما دریا کے اندر' اس بیہودہ ٹچر قسم کے جہاز میں قید رہے تھے جو ہر گھنٹے آدھ گھنٹے کے بعد کسی نہ کسی فضول قسم کے گھاٹ پہ' سواریاں اُتارنے یا چڑھانے کھڑا ہو جاتا۔ اس کے گرداگرد' واہیات سے بڑے چھوٹے ٹائر بندھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا یہ پرانے سکریپ ٹائروں سے لدا ہوا کوئی جہاز ہے۔ ٹھیک ہی تو تھا' ہمارے سمیت سب ہی گھسے پٹے انسان نما ٹائر ہی تو تھے جو جبری زندگی کے اُدھڑے پدھڑے راستوں پہ چل چل کر خود چل چلاؤ کی راہ آ لگے ہوں۔''

میں اپنے ذوق آوارگی اور قسمت کے چکروں میں پھنسا ہوا۔ سُندر بن کا حُسن تحیّر' برہم پترا' کرنافلی کے گھاٹوں کا فسوں محسوس کرنے کی علت میں گرفتار' کلکتہ کی جانب سے ادھر بنگلا دیش میں داخل ہوا تھا۔ یہ میرا دوست نما گائیڈ یا گائیڈ نما دوست' ادھر چٹا گانگ کا رہنے والا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے غیر ملکیوں کو سُندر بن کی سیاحت کرواتا...... دو نمبر شیر کا شکار' اس کا اصل کام تھا۔ جس سے خاصا روپیہ بٹور لیتا۔

میں اُسے اک زمانہ سے جانتا تھا لیکن اُس نے مجھے کیسے دریافت کیا؟ یہ راز اس نے کبھی نہ کھولا۔ کئی بار پوچھنے پہ بھی اُس نے کچھ نہ بتایا۔ یہی کہہ دیتا آپ میرے بابا' میرے روحانی اُستاد ہیں۔ آپ کی خدمت کر کے بے پناہ خوشی ہوتی ہے۔ میں ازل سے آپ کی تلاش میں تھا۔ میں آپ سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ پر یہ کبھی نہ بتایا کہ وہ مجھ سے کیا سیکھنا چاہتا ہے؟ اپنے تئیں مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے فراڈوں سے کسی طور واقف ہو چکا ہے اور یہی کچھ مزید مجھ سے سیکھنا چاہتا ہے۔

سید معید الحسن! لیکن موودی شاہ' مشہور تھا۔ میں اُسے موودی شاہ کی جگہ موڈی شاہ کہتا کہ موڈ درست ہو تو کچھ بھی کہہ کروالو' موڈ خراب' تو ماتھے پہ آنکھیں دھرے لگا۔ مجھے کوئی کام نکالنا ہوتا تو اس کے موڈ کا خیال

رکھتا کہ مَیں اُسے برتتا جان گیا تھا......

مغرب کی اَذان کہیں سے بلند ہوئی۔

''شاہ جی! اِدھر مسجد بھی ہے؟...... مَیں تو سمجھا اِدھر صرف ہندو جاتی لوگ ہی رہتے ہیں۔''

اُس نے تُرت جواب میں کہا۔

''بابا جی! یہ چھوٹی سی بستی مسلمانوں کی ہے۔ دو چار جھونپڑے ہندوؤں کے بھی ہیں۔ جو اِدھر مچھلی کی آڑھت کرتے ہیں۔ آیئے' پہلے مسجد چلتے ہیں۔ ماجد میاں سے بھی ملاقات وہیں طے ہے۔ وہ بھی مالا پور سے پہنچنے ہی والا ہے۔''

''ماجد میاں کون......؟''

''یہ وہی ماجد میاں ہیں جن کے باوا کا ذکر' آپ سے کر چکا ہوں۔ بیس برس سے اُن کا ٹھکانا' سُندر بن کے بیچ بنگال کے رائل ٹائیگروں کے درمیان ہے۔ دو دن بعد اُن کا عُرس شروع ہونے والا ہے۔ یہی کچھ دکھانے کی خاطر' اِدھر لایا ہوں۔ ایک تیر سے دو شکار...... سُندر بن کی سیاحت بھی' ٹائیگر بھی اور سب سے بڑی بات' قلندر بادشاہ کے عُرس شریف میں شرکت......!''

مَیں اپنے تئیں بہت خوش ہُوا' کسی بنگالی بزرگ کے مزار کی زیارت بڑی سعادت کی بات ہوگی۔ لیکن سُندر بن' شیروں کے علاقہ میں مزار' کچھ بات سمجھ میں نہ آئی۔ پُوچھنے پہ معلوم ہوا قلندر بادشاہ ابھی حیات ہیں' مرحوم نہیں ہوئے...... ماہِ شعبان کی سات تاریخ' اُن کا عُرس' اندرونِ جنگل' شیروں چیتوں اور دیگر خونخوار درندوں کے مسکنوں بیچ' منعقد ہوتا ہے۔ اہلِ جنگل' باقاعدہ شریک ہوتے ہیں...... سلامی اور نذرانے پیش کرتے ہیں۔ مسلسل تین روز باقاعدہ تقریبات اور لنگر' نذر و نیاز بااہتمام ہوتے ہیں۔

خوشگوار موڈ میں اکثر ایسی چھوڑتا رہتا تھا۔ پہلے یہی سمجھ کر' مَیں نے کوئی توجّہ نہ دی پھر جب اُس نے کہا کہ دو روز بعد' مَیں زائرین کی نمائندگی کرتا ہوا جنگل میں جاؤں گا...... تو مَیں ٹھٹکا' جنگل کے درخت کی مچان پہ محفوظ طریقے سے بیٹھ کر' کسی اعلیٰ قسم کے سرکس میں یا چڑیا گھر میں تو شیر چیتوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن بنفسِ نفیس شیروں کی کچھاروں میں پہنچنا' کہاں کی عقیدت ہے؟

مَیں نے اپنی کمزوری پہ قابو رکھتے ہوئے' سرسری انداز میں پوچھا۔

''یہ زائرین' جنگل میں مسلّح جاتے ہیں یا گاڑیوں میں بند ہو کے؟''

میرے سوال پہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

''مَیں کچھ سمجھا نہیں' بابا جی؟''

"بھائی! میرا مطلب ہے کہ خطرناک درندوں میں زائرین کا اس طرح کی بے تکلفی سے جانا' کچھ قرین از دانشمندی نہیں۔ احتیاط' خود حفاظتی کا صاف صاف حکم دیا گیا ہے اور ہاں' کیا عورتیں اور بچے بوڑھے بھی......؟"

وہ ستم ظریف مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بابا جی! سارا سال' اُن کے عقیدتمند' عُرس کے انتظار میں رہتے ہیں۔ بچے' بوڑھے' عورتیں سب خراماں خراماں پیدل جاتے ہیں۔ کوئی گن مین یا گارڈ ساتھ نہیں ہوتی۔"

مَیں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"......اور شیر چیتے وغیرہ کہاں ہوتے ہیں؟"

"وہ اُدھر جنگل میں ہی ہوتے ہیں مگر قلندر بادشاہ کے کسی عقیدتمند کو کچھ ضرر نہیں پہنچاتے' سب جانور قلندر بادشاہ کے مُرید ہیں۔ دن رات اُن کی سیوا میں جُٹے رہتے ہیں۔"

مَیں حیرتوں کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا کہ دُور سے ماجد میاں آتا دکھائی دیا۔

مسجد کچھ زیادہ دُور نہ تھی۔ گنبد نہ کوئی مینار...... منبر نہ محراب' سادہ جھونپڑا' قدرے کشادہ...... کھجوری چٹائیاں...... ایسے ہی کھجوری سے نمازی' امام صاحب اور مکبّر و موذن' لگتے تو انسان تھے...... انسان کا بھی کچھ وزن وجود ہوتا ہے' محض استخوانی ڈھانچوں کو انسان کہنا ذرا عجیب سا لگتا ہے۔ پر کیا کیجیے اُدھر ہر بیڑن ایسے ہی دکھائی دیتا ہے؟ خاص طور پہ کسی بنگالی پیش امام کے پیچھے جہر نماز کی ادائیگی' عجیب سی صورتِ حال سے دوچار کر دیتی ہے۔ لگتا ہے کہ اصل قرآن' بنگلہ زبان میں نازل ہوا تھا۔ کیا مجال کہ کسی سورۃ و آیت پہ عربی کا شائبہ گزرے؟ نذرالاسلام' ٹیگور کی کوتاؤں سا انداز' عربی کی حلاوت و نفاست کو بنگلہ بھاشا کی "ماجھی رے" میں بدل دیتا ہے۔ یہی حال پٹھان آئمہ کرام کا بھی ہے۔ پشتو کا پیچ' اُن کی بھی مجبوری ہے۔ قرأت اور بعد اُزدعا بھی اسی عربی بنگلہ انداز میں ہوئی...... ویسے مَیں نے سندربن سے خیر خیریت سے واپسی کی دُعا' اپنی پنجابی میں مانگ لی تھی۔"

اللہ ہی جانتا تھا اُدھر میرا قیام کتنے عرصہ کے لیے لکھا تھا۔ ویسے میرا اپنا ارادہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کا تھا۔ اس کی چند ایک وجوہات تھیں۔ کلکتہ نزدیک' سندر بن سامنے' مسلمانوں کی اکثریت اور میرا یہ گائیڈ دوست' جس کا اس بستی میں خاصا اثر و رسوخ تھا۔

وہ اپنے کلائنٹ کے لیے اسی بستی سے مزدور' محافظت کے لیے ڈانگ سوٹوں سے مسلح' برائے نام گارڈ حاصل کرتا تھا یہ الگ بات ہے کہ جنگل میں انہیں اپنی حفاظت کی' سیاحوں سے کہیں زیادہ ضرورت

ہوتی۔ جنگل کے آدم خور درندے اُنھیں بڑی آسانی سے اپنا چارا بنا لیتے تھے۔ کسی اوڑ سے نکلے' تنگر یا دالی اور جھاڑیوں میں غائب...... ان خستہ حالوں کے مُنہ سے سی تک نہ نکلتی اور نہ ساتھیوں کو خبر کہ ہمارا ایک بندہ کسی بھوکے باگھڑے کی بھوک کا سامان بن گیا ہے۔ دو چار روز بعد اُس کی لنگوٹی' گلے کا تعویذ اور سرکاری نمبر اُس کے گھر والوں کے سپرد کر دیئے جاتے۔ ساتھ چند سکے بھی جو محکمہ جنگلات' بچی کھچی ہڈیوں کے دفن کے لیے پیش کرتا۔"

بستی سے خاصا اندر' جنگل میں قلندر بادشاہ (جو حیات تھے) کے عرس یا میلہ میں' دور قریب کے گاؤں بستیوں والے بڑے اہتمام و جوش و خروش سے شرکت کرتے۔ ایک خاص بات جو ادھر کے باسیوں میں دیکھی' وہ اپنے اپنے مذہب و مسلک سے منسلک رہتے ہوئے آپس میں بڑی یگانگت سے مل جل کر رہتے ہیں۔ ادھر زیادہ تر ہندوانہ طرزِ حیات ہے۔ رسم و رواج' میلے ٹھیلے' لباس خوراک' نام نمود' کچھ پتا ہی نہیں چلتا کون مسلمان ہے اور کون ہندو......؟

مسجد کے صحن میں کھپریل کے نمدے پہ دھرنا دیئے' سوچ رہا تھا۔ اس بستی میں کسی طرح دو چار دن گزر پائیں گے۔ دن رات بسر کرنے کے لیے جن بنیادی ضروریات کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اُن کا تو دور دور تک کوئی تصور نہیں تھا۔ مسجد کا طہارت خانہ' شاید اس بستی میں واحد جگہ جہاں یہاں کے حساب سے قدرے قرینہ تھا۔ چار چھوٹے بانس ٹھوک کر پٹ سن کے ریشے لپیٹ دیئے گئے تھے۔ کبوتر کی مانند آنکھیں بند کر لینے سے تصور کرنا پڑتا تھا کہ آپ کو کوئی دیکھ نہیں رہا...... یہاں منٹ دو منٹ سے زیادہ بیٹھا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ نیچے بہنے والی بدرو' ناک کے پردے پھاڑ کے رکھ دیتی تھی۔ طہارت کے پانی کے ڈبے میں کالی کالی چھوٹی نوکیلی مچھلیاں اور کیچوے الگ توجہ کھینچے رکھتے۔ پاس پڑوس کے جھونپڑوں کے "واش روم" بھی اسی طرز کے تھے۔ گزرنے والوں کو صاف دکھائی دیتا کہ اُدھر کوئی بیٹھا ہے یا بیٹھی ہے۔ سر بھورے ہو تو بیڑی کے دھوئیں سے بندہ شناخت ہوتا ہے۔ زبان چل رہی ہو تو کسی بندی کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اپنے تئیں غور کر رہا تھا کہ میں کچھ روز کدھر سینگ سماؤں گا؟ نیند تو خیر سولی پہ بھی آ جاتی ہے۔ نیند کا پھندا' ہوا انسان کہیں بھی پڑ جاتا ہے لیکن بیت الخلاء کا مسئلہ میرے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔ دو دو میل اطراف میں کسی ذی نفس کا احتمال ہو تو فراغت ہی نصیب نہیں ہوتی۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے بہت تنگ ہوتا ہوں۔ گاؤں وغیرہ میں جانا ہو تو کئی کئی میل دور نکل جاتا ہوں۔ غیر ممالک میں ہوٹلوں میں پہلے باتھ روم چیک کرتا ہوں اور پھر دوسری چیزیں......؟

ماجد میاں پہنچ آئے تھے۔ بڑا سا چرمی تھیلا لٹکائے وہ مسجد میں داخل ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد وہ

وضو تازہ کر کے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پڑھا لکھا' اُردو' انگلش' ہندی سے واقف' بڑی سلجھی ہوئی گفتگو۔
بس' سو بیاریوں کی ایک بُرائی ...... بیڑی پیتا تھا۔ پان تو سبز چائے' کلّے میں زبان ہو تو بنگالی سو بیتا ہی نہیں۔
چینیوں نے افیون ترک کی تو ایک عظیم اور صنعتکار قوم بن کر دُنیا میں نام اور کام پیدا کیا۔ اگر بنگالی بیڑی چھوڑ
دیں تو وہ بھی چین کی طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ بیڑی کی سڑاند آمیز بدبُو سے' جب مَیں اُوب گیا تو اُٹھ کر باہر
نکل آیا۔ کچھ دیر بعد میرا گائیڈ دوست بھی میرے پیچھے پہنچ آیا۔
''مجھے معلوم ہے تم اِس وقت کیا سوچ رہے ہو؟ ...... مجبوری ہے۔ تمھیں ماجد میاں کے بیڑیوں کے
دھوئیں برداشت کرنے پڑیں گے' جیسے مَیں برداشت کرتا ہوں۔ اس ایک علت کے علاوہ اس شریف انسان
میں ایک سو ایک خوبیاں بھی ہیں۔ جو آہستہ آہستہ' سندر بن کے سفر کے دوران تم پہ عیاں ہوں گی ...... اور ہاں' یہ
تو مَیں تمھیں بتا ہی چکا ہوں کہ سندر بن والے بزرگ قلندر بادشاہ اس کے پیر ہیں۔''
مَیں نے حیرانگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
''یار! اتنی بڑی بزرگ ہستی کا مرید ...... اس قسم کی گھٹیا عادت کا شکار؟''
مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔
''جناب! سرکار قلندر بادشاہ تو جنگلی تمباکو کا پائپ پیتے ہیں بلکہ ہر وقت اُن کے منہ میں دبا رہتا
ہے۔'' مجھے حیران پریشان پا کر مزید بولا' ''میرے خیال میں انسان کو دُوسروں کے ذاتی معاملات میں بڑا
وسیع القلب ہونا چاہیے۔ اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کے پیمانے' دُوسروں کے لیے استعمال کرنا بہتر نہیں ہوتا ......
ورنہ ......!''
بات تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ کہاں تک کوئی کسی کو روکے ٹوکے ...... اچھائی بُرائی' نفع نقصان ہر کوئی
سمجھتا ہے ...... ہار مان کر مَیں چُپ ہو گیا۔
گھاٹ کے پاس ہی محکمہ جنگلات کا چھوٹا سا گیسٹ ہاؤس تھا۔ چار پانچ کمرے' ملحقہ باورچی خانہ
اور خستہ حال سا واش رُوم ...... یہ شاید جنگلات کے چھوٹے موٹے افسروں کی عارضی اقامت گاہ تھی۔ اتفاق یا
میری خوش قسمتی کہ ماجد میاں کی ہلکی سی کوشش سے ایک چھوٹا کمرا مجھے مل گیا۔ مچھروں مکھیوں سے بچاؤ کی خاطر
دروازے' کھڑکی اور روشن دان پہ باریک جالی بھی منڈھی ہوئی تھی۔ جھلنگی سی کھاٹ' تین ٹانگوں والا گول میز
دو جھولنے والی کرسیاں۔ جن کا بیدا اُدھڑا ہوا تھا۔ گویا میری لاٹری نکل آئی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا' اس کام
کی خاطر ماجد میاں کو جھوٹ اور رشوت کا سہارا بھی لینا پڑا تھا۔ اُسے میرے گائیڈ سے میری تمباکو دُشمنی کا بھی
معلوم ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اب قدرے اجتناب برتنے لگا تھا۔

سیانے کہتے ہیں کہ انسان' شوق سے سیکھتا ہے یا پھر خوف سے...... ضرورت اور چاہت بھی بندے سے' خلافِ توقع ایسا کچھ کروا لیتی ہے جو عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔ ادھر مجھ پہ یہی چاروں کیفیات بُری طرح طاری تھیں...... روزمرہ کی ضروریات' کھانا پینا' ہگنا مُوتنا' سونا جاگنا' پڑھنا لکھنا...... کچھ بھی تو معمول کے تحت نہ تھا...... یعنی وقت کو میں نہیں وہ مجھے بسر رہا تھا۔ بیچ کے روز دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے۔ اس دوران' بستی کی گہما گہمی میں کئی چند اضافہ ہو چکا تھا۔ گرد و نواح سے لوگ ادھر جمع ہو رہے تھے' میلے کا سا سماں...... کشتی دکاندار' مٹھائیاں' کچے پکے ناریل' پھول پتی' بتاشے بیچنے والے بھی۔

غریبوں خستہ حالوں کی خوشیوں غمیوں کا بھی کیا؟ پل دو پل کی دھوپ چھاؤں...... کبھی شاد ہوئے تو دُھلے کپڑے' سر پہ ٹوپی' خودرو پھول بالوں کان میں اُڑوس لیے۔ دانت مانجھے تیل چُپڑ لیا' کلّے میں پان بتّا' پوری بیڑی پی لی' تازی تملو سے ٹلّی کر لی...... ناراض اُداس ہوئے تو ندی کنارے بیٹھے سوچا کیے...... ندیا کا پانی ساگر کی جانب کیوں جاتا ہے۔ ساگر جل' ادھر کیوں نہیں آتا؟ یا دھرتی پہ پانی کی کوئی کمی ہے جو اوپر آسمان سے بھی چھاجوں برستا ہے یا مُن' بھات اور گیہوں کیوں نہیں برستے؟ پیڑوں' ٹہنیوں پہ ٹملے ٹماٹوں کی جگہ ٹکے کیوں نہیں پھوٹتے؟...... چاند' چاندی کا اور سورج مین' سونا دھارا کیوں نہیں ہوتا؟...... محرومیوں اور افلاس کا مارا ہُوا مفلوک' ہمیشہ ایسی باتیں سوچتا ہے جو نیوست کے مارے فلاسفر سوچتے ہیں...... بدلتا ہر کتا کچھ بھی نہیں' بس! یہی کچھ ہونا اَن ہونا' بے تکا سا...... جس سے اردگرد کے ماحول میں گھٹن کا احساس بڑھتا ہے۔ کانوں کی سنسناہٹ بھو کے گیدڑوں کی چیخوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور زبان کے نیچے پھولی ہوئی سیاہ گلٹی سے زہر ماری رطوبت خارج ہونے لگتی ہے۔

اذان کے بعد میں مسجد پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا کہ گائیڈ پہنچ آیا۔

''بابا جی! نماز ناشتہ کے بعد تیاری ہے۔ رتوسک گھاٹ سے بجرا نکل پڑا ہے۔ آپ اپنا بیگ تھیلا ہاتھ میں ہی رکھیں۔ وہیں مسجد سے ہی گھاٹ نکل لیں گے۔ ہاں' کوئی نذر پرشاد لے کر جانا ہو تو خرید رکھیں۔''

تھیلا کاندھے پہ لٹکائے باہر نکلا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ مرد و زن بچے...... چند بچھڑے اور میمنے......

زائرین کے لباس اور سفری اہتمام سے قدرے تازگی اور کشادگی کا احساس ہوتا تھا۔ لگتا تھا یہ غریب لوگ' آج بہت خوش ہیں۔ ان کے بُشروں پہ کِھلی دھوپ دیکھ کر مجھے بھی خوشبو بھری تمازت کا احساس ہُوا۔

''بجرا کیا تھا ایک چھوٹا سا جہاز تھا۔ دھڑا دھڑ لوگ اس پہ سوار ہو رہے تھے۔ بچھڑے بکرے بھی...... ماجد میاں' بسنتی رنگ کا چولا اور سیاہ پگڑی پہنے بڑے شاندار دکھائی دے رہے تھے۔ مُمن کا ایک بھونپو اُن کے ہاتھ میں تھا۔ جس کے ذریعے وہ زائرین کو ہدایات دے رہے تھے۔

ڈیزل انجن سے چلنے والا یہ بجرا بڑے سُست رَو تھا...... لگتا تھا جیسے جم کر ایک جگہ کھڑا ہے۔ میرا گائیڈ ہری ہرن بڑی مستعدی کے ساتھ ماجد میاں کے ساتھ زائرین کو کنٹرول کرنے میں مدد کر رہا تھا۔ ہری ہرن بڑا بھلا منش تھا...... مخلص، ذمہ دار اور ہنسوڑا...... بس ہزاروں بُرائیوں کی بُرائی کہ وہ بھی بیڑی پیتا تھا مگر مجھ سے چھپ چھپا کر...... مجھ سے پرے پرے رہ کر، ماجد میاں کی مدد کرتا۔ اس کی ضرورت تھی کہ اُس کی آڑ اوٹ میں ایک آدھ کش لگانے کا موقع مل جاتا تھا۔ مَیں بھی اُس کی مجبوری سمجھ کر اغماض برت لیتا۔

بنگال کے ندی نالے، دریا سمندر، بڑے شُوریدہ سَر واقع ہوئے ہیں۔ کشیدہ سَری بریدہ سَر ہوتے ہیں۔ حسرت و افلاس کے سائے اکثر چہروں پہ لہراتے دکھائی دیتے ہیں۔ پانی ان کی زندگی پانی ہی ان کی موت...... ہر سال لاکھوں انسان جانور یہاں سیلابوں طوفانوں بارشوں اور موسموں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ فرق کچھ نہیں پڑتا کہ دُگنے تگنے پیدا بھی ہو جاتے ہیں۔ بجرے میں میرے آگے پیچھے، دائیں بائیں، انسان ہی انسان تھے۔ جو سُندر بَن کے بیچ ایک اپنے جیسے انسان کے دَرشن کے لیے جا رہے تھے۔ خوشحالی، صحتمندی، قرضوں کی ادائیگی...... شادی بیاہ کی منتیں مانگنے، گھر کے پالے، قرض سے حاصل کیے ہوئے نذر نیاز کے جانور، پیٹ کاٹ کے جمع کیا ہُوا توشہ، لنگر کے لیے دھان دلیہ...... قلندر بادشاہ کے لیے کپڑے پگڑیاں چادریں، شیرینیاں...... اگر بتیاں اور موم بتیاں!...... اور مَیں خالی ہاتھ، یہ دیکھنے جا رہا تھا کہ آدم خور دَرندوں کے درمیان ایک بوڑھا نہتا انسان کس طرح زندہ ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ شیر چیتے باوا کی سلامی کے لیے آتے ہیں اور دیگر جنگلی جانور، باوا کی خدمت حفاظت کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ عُرس پہ پہنچنے والے کسی خُورد و کلاں کو جنگل میں کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ مگر اس کے لیے ایک خاص طریقہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔

اندازاً دو گھنٹے کی دریائی مسافت کے بعد بجرا، سُندر بَن کے اندر ایک آبی رہگذر میں داخل ہُوا...... ایسی چھوٹی بڑی آبی رہگذریں اکثر دکھائی دیتی ہیں جو سُندر بَن کے اندر دُور دُور تک جاتی ہیں۔ کچھ تو اندر، کہیں نہ کہیں آپس میں مل جاتی ہیں اور کچھ پھر کہیں دریا ندی میں اُتر جاتی ہیں۔ جا بجا دلدلیں، تالاب، جھیلیں...... یعنی جنگل ایک ایسے چیستان کا منظر پیش کرتا ہے جدھر انسانی عقل دَم بخود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اِدھر صرف جنگل، جھیلوں دلدلوں اور دریاؤں کا قانون کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ مگرمچھ، تیندوے شیر چیتے، اژدھے سانپ، گیدڑ، لگڑ بگے، چیتل لومڑیاں، مرغابیاں...... یعنی جنگلی حیات کی مکمل حکمرانی......!

سُندر بَن ایک وسیع و عریض جنگلی عجائب خانے کا نام ہے۔ جس کے راز و اسرار، گہرائی و پہنائی تک رسائی مشکل اَمر ہے۔ انسان اپنی جدید ٹیکنالوجی سائنسی بصیرت اور افرادی وسائل کے باوصف، اس کو مکمل طور پہ دریافت نہیں کر سکا۔ دُنیائے جنگلات کا خوبصورت ترین ٹائیگر یہیں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زہریلے

مچھر مکھیاں، حشرات الارض، عظیم الجثہ چمگادڑیں، خون چوسنے والے پیڑ پودے، زہر بھرے جنگلی پھل پھول......
اس کے اندر ایسے مقامات بھی جدھر سورج کی روشنی اور گرمی نہیں پہنچ پائی۔ یہاں اندھیروں کا راج ہے، ظلمتوں کی استعانتوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ زمانہ قدیم کے مندر کھنڈرات اور ایسے نشانات موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کبھی ان جگہوں پہ غیر انسانی مخلوق کے ٹھکانے تھے۔ ایسی غاریں بھی موجود ہیں جو انسانی ہاتھوں سے وجود میں آئی ہوئی نہیں لگتیں۔ اُن کے بنانے والے یا تو کرۂ ارض سے باہر کسی سیارے سے آئے تھے یا پھر جنات میں سے اُن کا تعلق تھا۔ کچھ لوحیں بھی نظر سے گزریں جن کی زبان پڑھنے والا اس دنیا میں کوئی نہیں اور نہ ہی کہیں کتابوں میں ذکر ملتا ہے۔''

کولمبو میں پرُاسرار علوم پہ سہ روزہ ایک کانفرنس ہو رہی تھی۔ اتفاق سے میری ملاقات ایک پرُاسرار علوم کے ایک عالم سے ہوئی جو میرے ساتھ ہوٹل میں مقیم تھا۔ گو اُس کا تعلق برازیل سے تھا مگر ایشیائی زبانوں اور علوم سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ کانفرنس میں اُس کا ایک مکالمہ ''سُندر بن اور افلاکیات'' بڑی دلچسپی سے سنا گیا۔ ایک شام ہوٹل کی طعام گاہ میں اچانک اُس سے ملاقات ہوگئی۔ اکٹھے کھانا کھاتے ہوئے کچھ بات چیت بھی ہوئی۔ میں نے اُس کے مکالمے کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا واقعی سُندر بن کبھی رجالین افلاکی کی دلچسپیوں کا مرکز رہا ہے؟''

میری دلچسپی دیکھ کر اُس نے مجھے ایسی قیمتی معلومات بہم پہنچائیں کہ میں ششدر رہ گیا۔ بقول اُس کے بنگال کے سحر کا سارا مرکز ہی سُندر بن تھا۔ اس جنگل کے گھُپ اندھیروں میں ''ڈوبا ہُوا شیر'' کی شکل کا ایک مندر ہے۔ مندر اندھیرے میں یُوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی دیوہیکل شیر دلدل میں آدھا دھنسا ہوا باہر نکلنے کی کوشش میں جبڑا پھاڑے کراہ رہا ہے۔ براہما کے چنچل دیوتا نے سورگ میں ایک دلدوز چیخ سُنی۔ کھوج کی تو پتا چلا سُندر بن کی ایک خطرناک دلدل میں یہاں کا بُراہما باگھ پھنسا باہر نکلنے کی ناکام کوشش میں دہاڑ رہا ہے۔ براہما کے چنچل دیوتا نے پہلے آکاش سے مدد کے لیے اپنے ایک مہان پُرش کو بھیجا۔ اُس سے کوئی کوتاہی ہوئی کہ اُس کے وہاں پہنچنے تک براہما باگھ مرگیا۔ اس طور کہ آدھے سے زیادہ دھڑ دلدل کے اندر اور آگے کے دونوں پنجے اور کھلا ہوا منہ سر باہر...... چنچل دیوتا اُس کی کوتاہی پہ ناراض ہُوا، اُسے شراپ دیتے ہوئے حکم دیا۔ تم باگھ کے منہ کے اندر گھس جاؤ اور پھر کبھی باہر نہ نکلنا۔ تب سے اَب تک وہ مہان پُرش باگھ کے منہ کے اندر ہی اندر کھدائی کرتا ہُوا کہیں سے کہیں پاتال کے اندر اُتر گیا ہے۔...... کہتے ہیں کہ آج تک اُس باگھ مندر تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ اندھیری سنسان راتوں میں مندر سے کراہتے ہوئے باگھ کی دہاڑیں جنگل کے جانوروں کے کلیجے پھاڑ دیتی ہیں۔ سحرِ بنگال اِسی باگھ مندر کی کوکھ سے دہاڑ کی صُورت نکلتا ہے۔

برازیل کے اس پروفیسر کی ایسی باتیں سن کر میں بڑا متاسف ہُوا کہ اِتنا بڑا اسرار اور میں اس سے بے خبر...... ؟ دل میں ٹھان لی کہ کبھی موقع ملا تو اُدھر ضرور جاؤں گا۔ جہاں جدھر سے مجھے سُندر بن کے بارے معلومات حاصل ہوئیں میں جمع کرتا رہا...... مگر اصل کام کی بات نہ ملی' کلکتہ' چٹاگانگ' سلہٹ اور دیگر مقامات اور جنگلات کی محکموں سے بھی ایسے کسی مندر اور اُس کے محل وقوع کے بارے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ سوائے مُبہم اور نامکمل معلومات کے...... کاکس بازار کے ایک بُوڑھے پنڈت' جو جڑی بوٹیوں کے لیے سُندر بن تک جاتا رہتا تھا۔ کچھ معلومات ملیں مگر اس تنگ نظر نے مجھے مسلمان جان کر کُھل کے کچھ نہ بتایا۔

یہ میرا گائیڈ بھی میری اسی کھوج کی وجہ سے تھا۔ اس سے ملاقات اور واقفیت' گو بہت پرانی تھی مگر تازہ اسی تلاش سے ہوئی۔"

ہدایتکار اَدیب صحافی شوکت ہاشمی مرحوم نے مشرقی پاکستان کے پس منظر میں ایک فلم "ہمسفر" بنائی تھی۔ اس میں میرا دوست اداکار صحافی اسد جعفری بھی تھا۔ لاہور کے ایک اسٹوڈیو میں اس فلم کا پوسٹ ورک ہو رہا تھا۔ اسد جعفری مرحوم کی وجہ سے میں بھی اُدھر چلا جاتا تھا۔ یہیں اس گائیڈ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس پہلی ملاقات کے پندرہ برس بعد میں نے اُسے کلکتہ میں تلاش کیا۔ معلوم ہُوا کہ یہ اپنے اسی پرانے پیشہ سے ابھی تک جڑا ہوا ہے۔ میری خواہش اور محبت کی وجہ سے اس نے سندر بن کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ اصل میں یہ بھی قلندر بادشاہ کا عقیدت مند تھا۔ عُرس کی تقریبات بھی تھیں۔ اس طرح یہ مجھے کلکتہ کے راستے' اپنے طریقہ سے اِدھر لے آیا تھا۔"

خدا خدا کر کے دریا کا سفر تمام ہُوا۔ بجرا گھاٹ سے ذرا ہٹ کر ٹھہرا تھا۔ اُتھلا پانی' اس کا بھاری بوجھ سہارنے سے قاصر تھا۔ رُکتے ہی لوگ باگ پانی میں ہی اُتر پڑے۔ انسان بے صبرا ٹھہرا' ہر کام میں جلدی دکھاتا ہے۔ میں ان معاملات میں بڑا دھیما۔ ایک طرف لگ کر کھڑا تھا کہ یہ آنے والے لوگوں کا اژدحام اُتر لے تو میں بھی اُتر لوں گا۔ آدھے گھنٹے میں بجرا خالی تھا۔ ماجد میاں بھونپو پہ گلا پھاڑ پھاڑ کر زائرین کو گھاٹ کی ایک جانب جمع ہونے کی ناکام تلقین کر رہے تھے۔ میرے بعد بچھڑوں اور بکریوں کو اُتارنے کی تدبیریں ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا یہ جانور منتوں کے ہیں۔ عُرس کی تقریب پہ لنگر پکانے کے کام آئیں گے۔

میری نظریں جنگل کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ دُنیا کا پُراسرار' مشہور زمانہ بنگال ٹائیگر والا جنگل' جس کی اہمیت پُراسرار باگھ مندر کی بنا پہ اب میری نظر میں سہ چند ہو گئی تھی۔

قارئین! سوچ رہے ہوں گے کہ میں کن بیکار شغلوں میں پڑا ہوا تھا۔ اس قسم کی فضول' اسلامی نقطۂ نظر سے غلط مصروفیات سے مجھے کیا حاصل تھا؟ بالکل صحیح! مگر میں کیا کروں میری گُھٹی میں ہی یہ کچھ گندھا ہوا ہے۔

کوئی نعتیں پڑھ کر پیٹ پالتا ہے اور کوئی اسٹیج پہ گندے لطیفے جگتیں سنا کر روزی حاصل کرتا ہے۔ جج صاحب انصاف کر کے رزق لیتے ہیں۔ جلاد صاحب پھانسی گھاٹ کا لیور دبا کر چولہا گرم کرتے ہیں۔ کوئی ہسپتال میں نشتر چلا کر ڈاکٹر اور چاقو سے انتڑیاں نکال کر کوئی ڈاکو ہے۔ کوئی نرس بن کر بیمار انسانیت کی خدمت کرتی ہے اور کوئی فاحشہ بن کر صحت مند انسانیت کی تذلیل کرتی ہے۔ کسی کو خدا حرم سے ملا اور کسی کو بت خانے سے۔ میرے نصیب میں خزانوں میں ہاتھ ڈال کر ہیرے موتی اُٹھانا نہیں' کنکروں کو کارآمد بناتا ہے...... "

میں شاہی مسجد' شاہی محلّے سے گزر کر جاتا ہوں۔ درویشوں کے لیے علم' بڑی بڑی درسگاہوں میں نہیں مسافتوں' کثافتوں' ذلتوں' رسوائیوں اور جگ ہنسائیوں میں ہوتا ہے۔ میں نکیلی سے پازیب نکالتا ہوں' میں کانوں سے سونا نکالنے والا کان کن نہیں۔ سنو ہے بازار سناروں کی دکانوں کے نیچے گندی نالیوں موریوں کے گند کو چھاننے' نتھارنے والا نیاریہ ہوں۔ جو فضول گند مند سے بالآخر سونے کے ذرّے علیحدہ کر ہی لیتا ہے۔ دُنیا کی کوئی اچھائی' کسی نہ کسی طور بُرائی سے مبرا نہیں اور کوئی بُرائی ایسی نہیں جس میں اچھائی چھپی ہوئی نہ ہو۔ سچ مسخ ہو جائے تو جھوٹ کی بدترین صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح وہ جھوٹ ہی آج تک نہ ہوا جو سچ کی بنیاد لیے ہوئے نہ ہو۔ مومن کے گھر منکر ہو نہ ہو مشرک کے گھر مسلمان نکل ہی آتا ہے۔"

میں اپنے آپ میں گم' کسی اور ہی دُنیا میں دھنسا ہوا تھا۔ ماجد میاں' مجھے اشارے سے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ پاس پہنچا تو عجیب منظر دیکھا۔ پٹ سن کا بنا ہوا رسّا' بہت لمبا' دو آدمیوں نے تھام رکھا تھا۔ تمام مردوں کو دائرے میں کھڑا کر کے اندر قلب میں عورتوں بچوں کو داخل کیا۔ اب دو آدمیوں نے رسّے سے مردوں کے گرداگرد حصار قائم کیا۔ اس طرح کہ تمام زائرین اس رسّے کے اندر تھے۔ دائرے کے مردوں نے رسّا اپنے ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ حصار ایسا ڈھیلا تھا کہ چلتے وقت وقت تنگی نہ پیدا کرے۔ تمام کے تمام افراد جب رسّے کے حصار کے اندر جمع ہو گئے تو ماجد میاں نے مجھے اور میرے گائیڈ کو آگے کے رُخ' حصار میں داخل ہونے کا اشارہ دیا۔ ہم دونوں بھی اندر داخل ہو گئے۔ اسی طرح ہمارے دائرے کے پیچھے بھی ایک حصار بنایا گیا۔ جس میں بچھڑے بکریاں' کپڑے اور دیگر سامان' چند کارکن اس کے اندر داخل تھے جنہوں نے جانور اور سامان سنبھال رکھا تھا۔ میں آنکھیں پھیلائے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ سب کیا ہو رہا ہے؟ بالکل ایسے ہی جیسے انگلش فلموں میں دیکھتے ہیں۔ فوجی' گرفتار ہونے والے قیدیوں کو آگے پیچھے باندھ کر جنگل میں لے جا رہے ہوتے ہیں۔ یہاں فرق یہ تھا کہ بندھا ہوا کوئی نہ تھا۔ سب آزاد مگر رسّے کے حصار کے اندر...... میری سمجھ میں یہ آیا کہ چونکہ جنگل کا معاملہ ہے۔ سب کو حصار میں رکھ کر ان کی حفاظت مقصود ہے۔ مگر نہ...... بات کچھ اور تھی جو ماجد میاں نے بیان کی۔ یہ رسّا' قلندر بادشاہ کی جانب سے جنگل کے درندوں سے حفاظت کی ضمانت تھا۔

جو اس حصار میں رہے گا وہ جنگل کی آفات سے محفوظ اور جو رُخ سے باہر اُس کی کوئی ضمانت نہیں۔ سمجھ میں بات نہ آئی...... میں زیرِ لب مسکرا کر رَخ کے اندر خود کو جنگلی آفات' خوفناک درندوں سے محفوظ سمجھنے لگا تھا۔

چلنے سے پہلے ماجد میاں اور مسجد کے مولوی صاحب نے کچھ آیات اور دَم درود پڑھے۔ سب زائرین پہ ہوائی پھونکیں پھینکیں اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے چلنے کا اذن دیا۔ اب آگے آگے ماجد میاں لہک لہک با آوازِ بلند ذکر کرتے جا رہے تھے۔ ''اللہ بادشاہ'' اُن کے پیچھے زائرین ''حق قلندر بادشاہ'' کہتے...... ایک مخنّی سا تنگ دھڑنگ مجذوب' ایک بڑا سا ٹل بھی کھڑکاتا جا رہا تھا...... کچھ قدم چلنے کے بعد میں بھی اُن کا حصّہ بن چکا تھا۔ میرے منہ خود بخود یہ کلمات ادا ہو رہے تھے۔ بھول چکا تھا میں کون ہوں کیا ہوں اور کدھر ہوں......؟

جنگل کسی نامعلوم سمت کی جانب بڑھتے ہوئے ہمیں گھنٹہ بھر تو ہو چکا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے' جنگل گھنا اور تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ جنگل کے اندر کا ایک مخصوص سناٹا اور ماحول ہوتا ہے۔ جس میں انجانا سا خوف' تردّد اور خدشات ہوتے ہیں۔ جنگلی حیات اپنی تمام تر اچھائیوں بُرائیوں کے ساتھ آپ کے آگے پیچھے دائیں بائیں ہوتی ہے۔ آپ کے اپنے تحفظات اُن کے اپنے۔ آگے قدرے کشادہ سی جگہ پہ پہنچتے ہی' ماجد میاں نے رُکنے کا اشارہ دیا۔ جہاں کھڑے تھے وہیں سب بیٹھ گئے۔ پچھلے والے حصار سے دو آدمی آگے بڑھے اور ایک گٹھڑی سے چاولوں کے میٹھے مُٹھے بانٹنا شروع ہوئے۔ پندرہ منٹ کے بعد پھر سفر اور ورد شروع......!

کچھ دیر دَم ذِکر کرنے کے بعد میری کیفیات میں اک آسودہ سی تبدیلی واقع ہوئی۔ محسوس ہوا کہ اپنے اردگرد دیکھنے غور کرنے اور کچھ اخذ کرنے کے قابل ہو گیا ہوں جبکہ سفر کے پہلے حصّہ میں میں بالکل خالی تھا۔ جنگل' ہر بڑھتے ہوئے قدم پہ مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ پہلی منزل والے درخت' جھاڑ جھنکاڑ' بیلیں' زمین کے خدوخال تبدیل ہو رہے تھے۔ لگتا تھا ہم دھیرے دھیرے جنگل کے ظاہر سے ہٹ کر اس کے باطن کی جانب جا رہے ہیں...... ڈیڑھ گھنٹہ سفر کے دوران میں نے کسی جنگلی جانور کو دیکھا اور نہ کوئی آہٹ یا آواز سُنی...... لگتا تھا جیسے کسی نے یہاں کے جانوروں کو کہیں لے جا کر بند کر دیا ہے۔ ہاں پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ اور آوازیں ضرور سنائی دیں وہ بھی یوں جیسے وہ ہماری آمد کی خوشی میں نغمہ ریز ہوں۔ میں سوچ رہا تھا یہ وہ خوفناک جنگل ہے جہاں شیروں چیتوں' بندروں اور دیگر خونخوار درندوں کی تعداد دُنیا بھر کے جنگلوں سے زیادہ ہے۔ جس قدر ہم جنگل کے اندر پہنچ چکے ہیں اس حساب سے تو کم از کم پانچ دس بھاروؤں کو شیروں کے شکموں میں اُتر جانا چاہئے تھا۔ چہ جائیکہ کسی شیر چیتے کا سایا تک نظر نہیں آیا۔ عقلی حساب لگایا تو سمجھ آیا چونکہ سب با آوازِ بلند ورد کر

رہے ہیں اور آپس میں اکٹھے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ٹل بھی کھڑک رہا ہے اس لیے درندے قریب نہیں آرہے' دور دور رہتے ہیں۔ لیکن یہ خوش فہمی کچھ ہی دیر بعد ختم ہو گئی'...... آگے کسی ندی کی آب جو دکھائی دی جس کے کنارے تین عدد شیر پانی نسر ک رہے تھے۔ مجھ سمیت' زائرین میں ہلکی سی ہلچل ضرور پیدا ہوئی۔ ورد اور دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔ لیکن ہم سب بڑی آہستگی سے اُن کے پاس سے گزر گئے۔ اُنہوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا پھر گردنیں ڈال کر پانی پینے میں مصروف ہو گئے۔

ورد...... جیسے ہمارے خوف و خدشات کے زخموں پہ مرہم کا کام دے رہا تھا...... باگھ بگھیاڑ دیکھنا تو کجا' ان کی بُو باس ہی پا کر' مویشی بدک اُٹھتے ہیں' ڈکار دُکار آسمان سر پہ اُٹھا لیتے ہیں۔ تعجب کہ پچھلے حصار میں چلنے والے جانوروں نے محسوس تک نہ ہونے دیا کہ وہ چند فٹ کے فاصلے پہ شیروں کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ اس جنگل نے میرے سارے عقلی تخمینے باطل کر دیے تھے۔ پختہ ارادہ کر لیا کچھ بھی ہو مَیں اپنی عقل دانی بند رکھوں گا۔ رکھنا بھی چاہئے' جس راہ و راست کا مَیں مسافر تھا اُدھر سوجھ بوجھ کا کیا کام؟ وادیِ عشق و جنوں میں' عقابِ عقل کے شاہ پَر جل جاتے ہیں......!

اندھے غاروں' گہرے پانیوں اور گنجان جنگلوں میں اُترنے والے جانتے ہیں کہ جب یہ اپنا باطن کھولتے ہیں تو پھر کیسے کیسے اَسرار بولتے ہیں۔ ہر شخص نہ تو ان تک رسائی حاصل کرنے کا اہل ہوتا ہے اور نہ ان کی پارسائی سمجھنے کے قابل...... ہلکی سی بے صبری' چوک یا بے بھی خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ غلطی کوتاہی شروع یا منزل کے قریب پہنچ کر سرزد ہوتی ہے۔ بچوں بوڑھوں' جوانوں اور عورتوں کے ایسے اژدحام میں کسی بے احتیاطی بے ضابطگی کے سرزد ہونے کا احتمال بعید از قیاس نہیں ہوتا۔ کسی فرد کے بشری تقاضے کے مدِنظر' قافلہ رُک جاتا...... ورد بند اور اس فرد کی کمر گرد رسا ڈال کر دائیں بائیں کسی اوٹ میں کر دیا جاتا اور اس دوران' باقی لوگ رُک کر انتظار کر لیتے۔ مَیں کثرتِ بول کا پرانا مریض ہوں۔ مجھے بھی آگے جا کر پیشاب کرنے کی حاجت محسوس ہوئی۔ چنانچہ مجھے بھی کمر کے گرد رسہ ڈال کر' جھاڑیوں کی اوٹ ہونا پڑا۔

بول و براز کا تعلق' انسان کی اندرونی حسیات سے ہے۔ یکسوئی' مکمل تنہائی' ذہنی جسمانی آمادگی میسر نہ ہو تو اطمینان بخش اجابت نہیں ہوتی۔ افراتفری' آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس' خوف و عجلت میں کام بننے کی بجائے بگڑ جاتا ہے۔ مجھے بھی یہاں اک تجربہ ہوا۔ جونہی مَیں جھاڑیوں کی آڑ میں پائجامہ نیچے سرکا کر اُکڑوں بیٹھا...... سامنے سرکنڈوں میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی...... دیکھا تو ایک چیتا مجھے گھور رہا تھا۔ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میری کیا حالت ہوئی ہو گی؟ جان کی تو کوئی بات نہ تھی آنی جانی شے ہے' اصل خجالت یہ کہ اُس نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا تھا۔ اَب کچھ ہوش نہ رہا' زبان گنگ' اُٹھنے کے قابل نہ پائجامہ اُوپر سرکانے کے

اہل۔ جس کار کام کے لیے بیٹھا تھا اُس پہ چار حرف بھیجے۔ کسی طرح رٹنا بلایا...... اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ کیسے ہمت پڑی کیونکر اُٹھا واپس پلٹنا۔ کس کو کیا پتا تھا؟...... اب میرا یہ عالم کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ دائیں بائیں آگے جھاڑیوں سرکنڈوں کے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔ وہم سا ہو گیا کہ جھاڑی کے پیچھے شیر یا چیتا موجود ہیں' ہمارے ہر فرد پہ اُن کی نظر ہے۔ وہ کچھ فاصلے پہ ہمارے ساتھ ساتھ حرکت کر رہے ہیں۔ بس اس انتظار میں ہیں کہ کوئی بندہ یا جانور رتنے کے حفاظتی حصار سے باہر نکلے تو اُسے پکڑیں۔

دُنیا بھر کے جنگلات میں اور کچھ مشترک ہو نہ ہو ایک اچپل جانور مشترک ہے وہ ہے بندر' جو مختلف نسلوں' قسموں اور حیثیتوں میں موجود ہوتا ہے۔ اگر علم جنگلیات کو کھنگالا جائے تو بندر ہر درخت ٹہن پہ پھلانگتا نظر آتا ہے۔ اس کے بغیر' کوئی ''جنگل سٹوری'' مکمل نہیں ہوتی۔ ان کی جنگل میں وہی حیثیت و عزت ہوتی ہے جو پنڈوں وسیبی علاقوں میں مراثیوں بھانڈوں کی ہوتی ہے۔ یہ جنگل کے نیوز رپورٹر ہیں، لال بجھکڑ' جنگل کی ماسی لومڑی جان' چاچا گیدڑ مصلّی' تایا حاجی ہاتھی نتھا اور ناظم اعلیٰ شیر خان' ہر اک کا شجرہ نسب' اندر کی باتوں' کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں۔ ڈرتے ورتے کسی سے نہیں۔ پنگے ہر کسی سے لیتے رہتے ہیں۔ جنگل کا ہر وسیک ان سے دبتا اور بلیک میل ہوتا ہے۔ جنگل کی یہ مخلوق اور پرندے شاید قلندر بادشاہ کے حصار کی زد میں نہیں تھے۔ اسی لیے آزاد دکھائی دے رہے تھے بلکہ ہمارے ساتھ ساتھ سفر بھی کر رہے تھے۔

سمندروں' صحراؤں' پہاڑوں اور جنگلوں کے اسفار بڑی ترجیحات و ترغیبات سے تشکیل و تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ مسافر و منزل کی درمیانی مسافت' عجب ڈرامائی سی صورت حال اختیار کر لیتی...... کبھی مسافر اُسے طے کرتا ہے اور کبھی وہ مسافر کو طے کرتی ہے۔ اسی کشاکش میں جڑ جاتا ہے سلسلہ چاہ کا'' راہ شوق و عشق کے راہروؤں کی رہبری چونکہ دونوں ''خواجاؤں'' کی عملداری میں ہوتی ہے لہٰذا خیر و برکت رہتی ہے۔

سفر...... 'چور نخنگ کا' عاشق نامہ بر' طالب علم یا تاجر ہو یا...... وطن بدر مہاجر کا آخر کہیں نہ کہیں اختتام پذیر تو ہو ہی جاتا ہے۔ آثار بتا رہے تھے کہ ہم بھی کہیں منزل کے قریب ہی ہیں۔ غلاموں کے دست و پا کی زنجیروں کی طرح' ان غریب غربوں کی سانسیں بھی چھنکنے کھنکنے لگیں تھیں۔ مسلسل ورد اور چلنے کی مشقت نے انہیں بھیڑوں کے اُس ریوڑ کی مانند کر دیا تھا جو کہیں دور دراز کے بے آب و گیاہ علاقے سے کسی ہری بھری چراہ گاہ کی جانب آ گئی ہوں۔''

قدم قدم جنگل کا جغرافیہ بدلتا ہُوا محسوس ہو رہا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ پیڑ پودے' بیلیں بوٹے...... جیسے فطرت کی دسترس کے ساتھ ساتھ انسانوں کے ہاتھوں سے بھی شناسائی پا گئے ہوں۔ ناگاہ دائیں بائیں چند خونخوار سے چیتے گھورتے ہوئے دکھائی دیے۔ درندہ چڑیا گھر' مضبوط پنجرے میں بند ہوتا ہے۔ جانتے ہوئے

بھی کہ یہ کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا اس کے باوجود دیکھنے والوں کے دل کی دھڑکنیں ناہموار ہو جاتی ہیں۔ اِدھر تو وہ ہم سے چند قدموں کے فاصلہ پہ تھے جو اُن کی چوتھائی جست سے بھی کم بنتا ہے۔ میری طرح یقیناً دوسروں نے بھی انہیں دیکھا ہوگا مگر کیا مجال جو کسی نے ذرا گھبراہٹ کا اظہار کیا ہو......؟

کچھ آگے پہنچے تو منظر ہی بدل گیا۔ بڑے بڑے چھتنار برگد نما درخت' جن کی داڑھی نما شاخیں اُتر کر زمین میں بذاتِ خود درختوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ گھیرے دار پھیلے ہوئے تنے...... ٹیڑھے میڑھے ہیبت ناک تھن...... بندروں چمگادڑوں اور دیگر اَن دیکھے پرندوں جانوروں سے اَٹے ہوئے...... لگتا جیسے صدیوں کے بہیانہ طلسم اِدھر تہہ در تہہ جم کر نشانِ عبرت بن چکے ہیں۔ وقت کی کثیف گرد نے یہاں ہر چیز کو گہنا کر رکھ دیا ہوا ہے۔ یہ گوشہ شاید دُنیا کی وہ جگہ تھی جہاں فطرت نے بھی توجہ دینی چھوڑ دی تھی...... سورج تو کیا آسمان کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا...... ہواؤں کا بھی اِدھر سے گزر نہ تھا لیکن اِک ایسی روشنی تھی جو شاید سورج کی کرنوں کی محتاج نہ تھی۔ موسم ماحول بھی ایسا کہ سردی گرمی کا احساس نہ رہے...... اک عجیب کثیف سی سدابہار خوشبو' جیسے لوبان اور عُود اکٹھے کہیں دھیمے دھیمے سُلگ رہے ہوں...... اسی دیکھا دیکھی میں کچھ آگے بڑھے تو ایک چھوٹا سا میدان' درمیان میں گھاس پھوس سے بنی ہوئی کُٹیا...... باہر قلندر بادشاہ' دائیں بائیں خوبصورت جوان شیروں کے درمیان براجمان تھے۔ قافلہ آگے کُٹیا کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ ماجد میاں نے اختتامی دُعا پڑھی۔ آگے بڑھ کر اپنے دادا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ خادموں نے حصار کا رَسّہ کھول کر اِرد گرد کے درختوں سے باندھ کر حصار کو وسیع تر کر دیا اور بچھو نیوں سے ہدایت کی' کوئی فرد اس رَسّے سے باہر نہ نکلے۔

مجھے آگے لا کر' قلندر بادشاہ سے تعارف کرایا گیا۔ مَیں نے سلام کر کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ انتہائی مُختنی سے بزرگ' نیم ننگے' گہرا سانولا رنگ' مُنہ دانتوں سے خالی' سر پہ ابھی کھائیں مُنہ میں خود بنایا ہوا تمبا کو کشید کرنے کا پائپ' جو بُجھا ہوا تھا۔ قلندر بادشاہ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ جواب میں سب حاضرین نے اللہ اکبر کہا' ساتھ ہی دائیں بائیں کے شیروں اور جنگل کے دیگر باسیوں نے اپنے اپنے انداز میں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیروں' دیگر جنگلی جانوروں' درختوں' پیڑ پودوں نے کیا عربی زبان میں اللہ اکبر کہا......؟ ہر انداز کی مخلوق' اپنے اپنے طریق نطق سے کلام کرتی ہے۔ ہر انسان کے لیے اس کا سمجھنا ضروری نہیں۔ علم' الکلام کے عالم اس موضوع پہ بات بڑھا سکتے ہیں۔ زبان سے خاطر خواہ کام' انسان نے لیا اور کچھ پرندوں نے بھی۔ باقی تمام حیوانِ مطلق اس سے عاری ٹھہرے۔ مگر اظہار کے لیے اُن کو خداوندِ کریم نے اور طرح کے وسیلے دیئے۔ مثلاً سیٹیاں' سسکاریاں' مختلف نوع کی آوازیں۔ مچھلیاں اور چیونٹیاں بھی آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔ رینگنے والے کیڑے حشرات الارض اور فضاؤں کے پرندے بھی ایک دوسرے سے تعلق

رابطے میں رہتے ہیں۔ میں نے بھونروں' پتنگوں' بِڑوں' مچھروں کی گفتگو سُنی۔ قرآن مجید' دیگر کتابوں' اساطیر کے قصّے کہانیوں سے بھی ثابت ہے۔''

قلندر بادشاہ پچیس سال سے اس جگہ مقیم تھے۔ وہ ادھر اکیلا رہتے تھے۔ اُن کے مُریدوں معتقدوں میں انسانوں کے علاوہ جنگل کے جانور' پرندے' حشرات الارض بھی شامل تھے۔ دو خادم شیر ہمہ اوقات اُن کی حاضری میں رہتے۔ بابا اُن پہ سواری بھی کرتے ...... نہ صرف جانوروں کی زبان جانتے بلکہ بڑی آسانی سے اُن سے گفتگو بھی کرتے۔ اُن کا کہنا تھا انسان' جانوروں کی بولی' بول سمجھ سکتا ہے مگر کوئی جانور' سوائے ایک آدھ پرندے کے۔ انسان کی طرح بولنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ درختوں پیڑوں پھلوں پھولوں گھاس مٹی پتھروں سے بھی گفتگو کرتے تھے۔ ہوا پانی بارش سے بھی باتیں کرتے۔

عُرس کی تقریب تین روز تک رہی۔ لنگر کا انتظام وہیں کیا گیا۔ گوشت کے لیے بچھڑے بکرے موجود تھے۔ جنگل میں منگل' ہر کوئی شریک ...... درندوں شیروں کا کچا لنگر علیحدہ۔ ایک بات مجھ سے بالاتھی کہ قلندر بادشاہ ہر وقت مُنہ میں جو تمبا کو پینے کا پائپ دبائے رکھتے تھے وہ کیا بلاتھی۔ نہ تمبا کو بھر کر سلگاتے دیکھا۔ نہ کوئی دُھواں چنگاری؟ معلوم ہُوا وہ بھی کبھی عام بنگالیوں کی طرح بے انتہا تمبا کو نوشی کرتے تھے پھر ایک وقت آیا' ترک کر دی ...... پھرتے جانے جی میں کیا آئی کہ جنگلی کچے کٹھل کے خول اور سرکنڈے پائپ سا بنایا اور منہ لگا لیا۔ بس بچوں کی طرح کا ایک کھلونا تھا جسے منہ میں دابے رکھتے۔ مسکراتے ہوئے' راز کی بات کی طرح بتایا۔

''کبھی کبھار اس میں سے دُھواں بھی نکل آتا ہے۔''

شیر کی درندگی' جبلّت کے بارے پوچھا۔ وہ پاس لیٹے ہوئے اپنے بچے شیر کے جسم پہ ہاتھ پھیرتے یہ اللہ کے شیر بھی ان دیگر جانوروں پرندوں کی طرح میرے مُرید ہیں' اللہ کی مخلوق ہیں' میں انہیں تعلیم دیتا ہوں۔ انسان اور ان جانوروں میں جسم جاں' جبلّت' جذبات اور جانکاری میں فاصلہ ہے۔ اپنی جبلّت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جہالت کر بیٹھتے ہیں ورنہ ان سا معصوم' محبت اور اطاعت کرنے والا کوئی اور نہیں۔ میں نے انہیں انسانوں سے کہیں زیادہ وفادار اور اطاعت شعار پایا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا! کارخانۂ کائنات میں ہر اک شے متحرک و مستعمل ہے۔ ہم سب بشمول مخلوقاتِ دِگر' قدرت کی کائناتِ یعنی مشینری کے چھوٹے چھوٹے نٹ بولٹ پُرزے ہیں۔ جاہل و کامل انسان سے لے کر شیر اور چھچھوندر تک کوئی بھی غیر اہم نہیں۔ ادنیٰ و اعلیٰ ہو تو ہو مگر بیکار محض کوئی نہیں۔ شجر بلند و بالا اپنی جگہ' اُس کے پھل پھول اپنے مقام پہ ...... گھاس کی ننھی سی پتی بھی اپنا شجرہ' اپنی ہستی اور مقام و مقصد رکھتی ہے۔ کسی کو بے ہست بست سمجھنا' بے علمی اور بدنصیبی کی دلیل ہے۔ ویرانے بھی آہنگ دینے لگتے ہیں۔ سامنے کھڑی پڑی موجودات بھی مکالمہ

کر سکتی ہے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے اگر آنکھوں میں بینائی' زبان میں گویائی اور کانوں میں شنائی پیدا ہو جائے تو......؟ شیر کے پیچھے تیر و تفنگ' بندوق طمنچہ لے کر پڑو گے تو وہ کیا تمہارے لیے مٹھائی کا ڈونا لیے ہوئے ہوگا؟ چار پائے' دو پاؤں والوں کی نیتیں خوب پڑھ لیتے ہیں۔ آدم کے کلبوت ہیئت میں ہیبت رکھی گئی۔ ذی وقار بنا کر اُسے ارض پہ خلیفہ مقرر کیا گیا۔ اشرف المخلوقات کا درجہ دے کر دیگر مخلوقات سے افضل کیا گیا۔ مگر وہ اپنی پہچان کھو بیٹھا...... اپنے منصب کو بھول گیا وہ شیر تو کیا' رینگنے والے کیڑے سے بھی خوفزدہ ہے۔ خود شناسی' خدا شناسی مفقود ہو جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔؟

سکوتِ لالہ وگل سے کلام پیدا ہو سکتا ہے اگر کوئی خود سے کلام کرنے کا قرینہ سلیقہ سیکھ لے۔

''خود سے کلام کیسے کیا جا سکتا ہے؟''

''جیسے کوئی مجذوب خود سے ہم کلام ہوتا ہے۔ جب تک کوئی جواب نہ ملے وہ خاموشی اختیار کرتا ہے۔ گہرے خاموش سمندر کی مانند......!

''......اور جب کوئی جواب مل جاتا ہے تو؟''

''وہ مزید مخمور والی دائمی خاموشی اختیار کر لیتا ہے کہ اُسے اَب مزید کسی کلام کی ضرورت نہیں رہتی۔ اندر کا کلام معکوس ہو کر مالک بن جاتا ہے...... مالک کا ''ا ل م'' رکھ کر ''ک'' کی کڑک نکال دیتا ہے تا کہ کلام کا کال ہی نہ بچے......!''

عرس کے آخری روز میں قلندر بادشاہ کے قدموں میں بیٹھا اُن کے پاؤں داب رہا تھا۔ ایک دو تین نہیں بلکہ آٹھ دس شیر چیتے بھی پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ بجے دھجے' خوبصورت جوان' لمبی لمبی سرخ زبانیں نکالے' سرنگوں کیے ہوئے مودب...... ہمارے سامنے' دائیں بائیں زائرین' بچے بوڑھے جوان اور عورتیں۔ الٰہی! یہ کیسی دُنیا ہے؟...... حیوان اور انسان ایک دوسرے سے بے نیاز۔ ڈر نہ خوف...... اسی جنگل میں یہی شیر چیتے' انہی لوگوں' ان کے مویشیوں کو پھاڑ کھاتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ دو چار بندے لقمۂ اجل نہ بنتے ہوں۔ میں ان ہی باتوں پہ مَن ہی مَن میں غور کر رہا تھا۔ ظاہر ہے میرا غور کرنا فضول ہی تھا۔ یہ فقر و درویشی' روحانیت اور ماورائے طبیعیات باتیں' حقیقتیں ایسی آسانی سے اگر سمجھ بدھی میں آ جائیں تو ہر شخص فقیری جھولے میں دکھائی دے۔''

اچانک آس پاس درختوں پہ بیٹھے بندروں پرندوں نے غیر معمولی انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ دیکھا کہ شیروں چیتوں نے بھی سر اُٹھا لیے...... قلندر بادشاہ نے اچانک بائیں جانب دیکھتے ہوئے شیر کی آواز میں کچھ شبد منہ سے نکالے۔ شیر چیتے کھڑے ہو گئے۔ جیسے کوئی بائیں جانب سے اِدھر آ رہے ہوں۔ لوگ بھی سر

اٹھا اٹھا اُدھر دیکھنے لگے۔ یا اللہ! آگے ایک عمر رسیدہ مگر پُر جلال شیر اور پیچھے دس بارہ شیر چیتے ...... اس طرح سے مستی میں جھومتے چلے آرہے تھے جیسے عُرس کے دنوں میں عقیدتمند چادریں لے کر دھمالیں ڈالتے آتے ہیں۔ اُن کی آمد پہ راستہ چھوڑ دیا گیا۔ سرکردہ شیر نے قریب پہنچ کر قلندر بادشاہ کے آگے سر نیہوڑا۔ ہاتھوں پہ بوسہ دیا۔ دیگر شیروں نے بھی باری باری تقلید کی اور آگے پیچھے جدھر جگہ دیکھی بیٹھ گئے۔ آپس کی زبان میں بات چیت ہوتی رہی ویسے ہی جیسے مہمانوں کی آمد پہ رسمی طور پہ ہوتی ہے۔ بچھڑوں کے گوشت کے بڑے بڑے پارچوں سے تواضع کی گئی۔

عرس کا آخری دن تھا۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ آنے والے مہمان شیر' جلدی واپس لوٹ گئے تھے۔ اِدھر بھی لوگ واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مجھے قلندر بادشاہ سے مزید بات چیت کا موقع مل گیا۔ مَیں نے پوچھ لیا۔

''بابا! اس جنگل کے شیر آپ کے مُرید ہیں ہر سال سیکڑوں اللہ کے بندے اِن کی درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ کیا یہ ......؟''

مَیں نے دانستہ اپنا فقرہ مکمل نہ کیا تھا۔ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''بیٹا! کیا ہر سال ہزاروں اللہ کے بندے مختلف حادثات بیماریوں سے موت کے مُنہ میں چلے نہیں جاتے۔ شیر تو پھر بھی جانور ہیں' ہزاروں انسان' انسانوں کے ہاتھ قتل نہیں ہو جاتے۔ زندگی موت کا سلسلہ ازل سے اَبد تک یونہی چلتا رہے گا۔ شیر تمہارے قریب بیٹھے ہیں انہوں نے تو کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اچھے بُرے ہر جگہ موجود...... میرے شیر بچوں میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے کبھی انسانی گوشت نہیں کھایا اور ایسے بھی جو اَب تائب ہو چکے ہیں۔'' پائپ منہ سے نکال کر مزید فرمایا۔'' یہ جو اللہ کی مخلوق ابھی رُخصت ہوئی ہے...... دیکھا تم نے' یہ بھی تو شیر ہیں مگر اللہ کے......!''

مَیں کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموش ہو لیا۔ خود ہی پھر فرمانے لگے۔

''اللہ تعالیٰ نے مولا علی کو اسد اللہ کہا ...... یعنی اللہ کا شیر! اسی طرح کچھ دُنیا کا مال ہوتا ہے اور کچھ خدا کا...... جیسے بہت سے انسان دُنیا کا دروغ ہوتے ہیں اور کچھ دین کا فروغ ...... بیٹا! یہ سب کچھ یونہی چلتا رہے گا۔ آخر میں گھاٹا اُس بدنصیب کے لیے ہے جس نے دُنیا بھی گنوائی اور آخرت میں بھی کچھ نہ پایا......''

بات سے بات نکلتی دیکھ کر مجھے مزید بات کا موقع مل گیا۔

''بابا! مجھے کبھی کسی نے بتایا تھا۔ سُندر بن میں کہیں کوئی ایسا استھان ہے جو شیر کے سر سے مشابہ ہے۔ شیر کا منہ آدھا کھلا ہوا۔ وہ دلدل میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے چارگی......

زندگی بچانے کی تگ و دو میں بُری طرح کراہ رہا ہے۔ حسرت و یاس کا اک بھیانک منظر......!''

باوا میری نگاہوں میں نگاہیں ڈالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''تم کوئی ہو یا چتر کار...... پتر کار بھی ہو سکتے ہو؟ ہو بہو یہی منظر ہے اُدھر کا......تم شاید نہیں جانتے یہ بزرگ شیر اور دیگر وہیں سے آئے تھے۔'' باگھ ناتھ کا استھان!''

''یہ کوئی ہندوؤں کا استھان ہے......؟''

''استھان' استھان ہی ہوتا ہے۔ مسجد کہو یا مندر...... دیر و کعبہ سب ایک ہی اللہ' ایشور کے استھان ہیں۔ رحیم کہہ لو یا رام...... دونوں نام کام ایک ہی ہیں۔ اپنی اپنی بولی بھاشا...... لیکن دل تراشا ایک ہی......!''

''باوا جی! وہاں کوئی سادھو منش بھی ہیں یا صرف شیر ہی رہتے ہیں؟''

''بیٹا! اس دھرتی پہ ابھی بہت کچھ ایسا ہے جو ابھی تک کسی منش پہ نہیں کُھلا اور شاید کبھی کُھلے بھی نہیں...... کیونکہ یہ سب قدرت کے اسرار ہیں' سربستہ راز ہیں۔ راز راز ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔''

''راز کو اگر راز ہی رکھنا تھا تو راز کو سامنے لانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا بند چیز کھولنے کے لیے نہیں ہوتی......؟''

باوا نے میری بات کا کچھ بُرا ماننے کی بجائے بڑی کشادہ دلی سے جواب دیا۔

''تم نے درست کہا جس پہ واجب ہو جائے اُس پہ راز افشا کر دیا جاتا ہے۔ ہر کوئی اہل نہیں ہوتا...... جیسے ہر کوئی بادشاہ یا فقیر درویش نہیں بن سکتا۔ دُنیا بھر میں بے شمار جنگل ہیں مگر سندر بَن اور بندرا بَن جیسا کوئی نہیں۔ شیر تو دُنیا میں اور بھی ہیں مگر ٹائیگر آف بنگال جیسا کہیں نہیں۔'' چند لمحوں کی خاموشی اختیار کرتے ہوئے کہنے لگے۔'' مجھے خوب خبر ہے تم اِدھر کیوں آئے ہو؟ باگھ ناتھ کے استھان کی یاترا کی خواہش من میں مچل رہی ہے لیکن شاید تم یہ نہیں جانتے کہ یہ خواہش کسی کی پوری نہیں ہوئی۔ جس کی ہو جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا۔ جیسے شیر کے منہ میں سر دینے والے زندہ نہیں رہتے...... اُدھر بھی ایسا ہی ہوتا ہے' دلدل میں ڈوبے ہوئے شیر کے منہ سے کوئی واپس نہیں نکلتا۔ تمہارے من کی کلپنا دیکھتے ہوئے تمہیں باگھ ناتھ کی کتھا سناتا ہوں۔ آج پُورنماشی ہے' سمے کا بڑا اسبندھ ہے۔ یہ اُس لدے زمانے کی بات ہے جب آزادی کے متوالے سُبھاش چندر کا بچپن تھا۔

## سدا سہاگ فقیر......!

میرا جنم' ندی کنارے' مچھلیاں پکڑنے والے ایک غریب مسلمان کی جھونپڑی میں ہُوا۔ مگر میری

پرورش نواکھلی کے گاؤں مادھوپور کے ایک اناتھ آشرم میں ہوئی۔ دودھ چھٹنے کی عمر میں یتیم بھی ہو گیا اور بے گھر بھی...... سیلاب آیا' میرے اَبّا' اماں اور بہن بھائیوں کو بہا کر لے گیا مگر مجھے ایک پیڑ کی ٹہنیوں میں پھنسا ہوا چھوڑ گیا۔ وہاں سے مجھے ڈیڑھ دن بعد ایک ہندو کسان نے اُتارا اور اناتھ آشرم میں جمع کروا دیا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی' میرے ابھی ختنوں کی نوبت نہ آئی تھی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر انہوں نے مجھے ہندو سمجھ کر پرورش کیا۔ مجھے اپنے مذہب' قوم برادری' ماں باپ' رشتہ داروں' شہر گاؤں کا کچھ علم تک نہ تھا۔ بس یہی کہ میرا نام رام ہے اور میں اِس آشرم کا پالک ہوں...... یہاں کا پنڈت لالہ رام پرشاد' میرا باپو اور اِدھر رہنے والے بے آسرا لوگ' میرا پریوار ہیں۔ وقت بھی کسی اُمنڈے ہوئے سیلاب کی مانند بڑی تیزی سے آگے بڑھ گیا اور میں زندگی کے منجدھار میں پھنسا ہوا ڈولے ہچکولے لیتا رہا۔

لالہ رام پرشاد کا دیہانت ہوا تو میں بھی ایک رات' پھر کبھی اِدھر نہ آنے کے لیے نکل گیا۔ ڈرتا گھبراتا ایک ریلوے سٹیشن پہنچا۔ ایک گاڑی تیار کھڑی تھی' سامنے ڈبے میں گھسا' پہلے سے موجود بچوں کے ساتھ میں بھی بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اپنی آزادی کی نیند سویا تھا۔ کچھ خبر نہ رہی کہاں ہوں' کدھر جانا ہے' کھانا نہ پینا۔ کسی آبشار کے دھارے پہ خشک پتے کی مانند بہتا ہوا کسی انجانی منزل کی طرف......؟

کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا...... سامنے ٹکٹ چیکر تھا' مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ منہ بسور کر رونا شروع کر دیا۔ اُس کے دل میں دیا جاگی...... میری جھوٹی سچی کتھا کہانی سن کر مجھے ساتھ لے گیا۔ چند روز اپنے گھر بچوں کے ساتھ رکھا پھر مجھے ایک مسلمان ریلوے افسر کے ہاں گھر کے چھوٹے موٹے کاموں پہ رکھوا دیا۔ وہ نیے بڑے بھلے تھے' دین دھرم ذات پات پہ کوئی زیادہ توجہ نہ دی جاتی تھی' دلوں میں دیا' آنکھوں میں حیا تھی۔ انسان کو انسان سمجھا جاتا تھا۔ اناتھ آشرم کے آنجہانی پنڈت رام پرشاد نے بھی انسان سمجھ کر پالا پوسا' جب میں اُس کے پاس لایا گیا تو نہ میں مسلمان تھا نہ ہندو نہ عیسائی۔ میرے ماتھے پہ کسی مذہب کی مہر نہ تھی...... نہ اللہ' ایشور لکھا تھا۔ صرف ایک پیدائشی نشان' دائیں ہاتھ کی چھنگلی کے ساتھ ایک چھوٹی سی اُنگلی جڑی ہوئی تھی۔ میرے پانچ بہن بھائیوں کے علاوہ میرے اَبا' نانا کے ہاتھ پہ بھی یہ اضافی اُنگلی موجود تھی۔ گویا یہ ہماری خاندانی پہچان تھی۔ میں اکثر اِس نرم ڈھیلی سی اُنگلی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ دوسرے بچے بھی اِسے چھو کر خوش ہوتے' یہ سب کچھ مجھے اُس وقت معلوم ہوا جب مجھے میرے ماموں نے اِس خاندانی نشانی سے پہچانا......''

میرا ماموں کلکتہ شہر میں ریلوے ورکشاپ میں مکینک تھا۔ یہ افسر' جس کے گھر میں کام کرتا تھا۔ اِس کا افسر تھا اور اِس سے ورکشاپ میں واسطہ رہتا تھا۔ اِس افسر کی کوٹھی' ریلوے کی افسر کالونی میں تھی' جو ورکشاپ کے عقب میں تھی۔ میں ہر روز تو نہیں' کبھی جب ڈرائیور کہیں مصروف ہوتا دوپہر کا کھانا لے کر ورکشاپ جاتا

تھا۔ ایک دن جب میں کھانا لے کر ورکشاپ گیا تو میرا ماموں بھی وہاں موجود تھا۔ کھانے کا ڈبا رکھتے ہوئے اُس کی نظر میری اُنگلی پہ پڑ گئی۔ اُس وقت تو وہ چپ رہا۔ اس سے اگلے روز وہ کسی بہانے سے کوٹھی پہنچ گیا۔ میں بھی اُدھر گاڑی کے لیے چارا بنا رہا تھا۔ ماموں میرے پاس آیا۔ میرا اور باپ کا نام دریافت کیا۔ میں کیا بتاتا؟ میرے پاس تو میری شناخت' سرے سے ہی موجود نہ تھی۔ میری خاموشی پہ اُس نے میرا ہاتھ اور اُنگلی دیکھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ کسی تیسری آنکھ سے میرے ماتھے چہرے کو دیکھا اور مجھے پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔ اُس نے جیب سے ایک پھٹی پرانی تصویر نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے بتایا۔ یہ جس عورت نے یہ ننھا سا بچہ اُٹھا رکھا ہے میری بہن فریدہ ہے اور یہ بچہ تم ہو؟ تمہارا نام قلندر بادشاہ ہے۔ یہ نام ہمارے مرشد باوا سلطان سبحانی ڈھاکہ والوں نے تجویز کیا تھا۔ یہ چارپائی پہ پڑا تمہارا باپ کریم اللہ ہے۔ چارپائی پہ اس لیے پڑا ہے۔ اُن دنوں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ یہ ساتھ کھڑے اور بیٹھے تمہارا بہن بھائی ہیں۔ تصویر میں تو دکھائی نہیں دیں گی۔ تمہارے تمام بہن بھائیوں اور ابا کے ہاتھ یہ اُنگلی ایسی ہی ہے جس طرح تمہاری ہے۔ تمہارے دادا کی بھی ایسی ہی تھی۔ یہ تمہارے دادا کے کسی بزرگ کی دُعا تھی کہ تمہاری نسل میں جو بھی اولاد ہوگی اُس کے دائیں ہاتھ کی چھ اُنگلیاں ہوں گی اور تمہاری سب سے اہم نشانی ایک اور بھی ہے کہ تم پیدائشی قلندر صائم ہو اور مختون بھی۔ تمہارے پیدائشی طور پہ ختنے مکمل تھے اور گدی کے پیچھے ریڑھ کی ہڈی کے آخر پہ چاند گرہن کا ٹیکا ہے۔

یہ سب کچھ دُرست تھا۔ بڑے افسر نے ان تمام نشانیوں کو دیکھ کر تصدیق کی اور معذرت طلب کی کہ اُنہوں نے مجھے اپنے گھر بطور نوکر رکھا۔ میں اَب اپنے ماموں کے گھر پہنچ گیا تھا۔ میرے ساتھ میری شناخت' نام اور کام بھی تھا۔

اسلام کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ ہر لمحہ پل' دُنیا میں کہیں نہ کہیں اذان کا سرمدی آہنگ گونجتا رہتا ہے۔ اللہ کی پوری کائنات میں بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ! اگر دیکھنے والی آنکھ' سننے والی سماعت اور محسوس کرنے والا قلب دے تو پھر دیکھیں سُنیں اور محسوس کریں کہ ہر سمت' نیچے اُوپر' دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف سے اللہ کی حمد و ثناء کی صدائیں آ رہی ہیں۔ ایک آہنگ ختم ہوتا ہے تو کہیں دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر کہیں اور...... اور پھر کہیں اور سے۔ غرضیکہ یہ اللہ کی تعریف و توصیف کا اِک لامتناہی سلسلہ شروع ہی رہتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے محض ذہنی صوت و آہنگ ہے جو کانوں میں گونجتا ہے۔ سماعت سے ٹکرا کر مغنی و کیفیات پیدا کرتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں' ایسا آہنگ و صوت تو ایک ابتدائی سلسلہ ہے...... جو محض کانوں سے سُننے والوں کے لیے ہے۔ سکوتِ لالہ و گل سے جو صوت و کلام پیدا ہوتا ہے اصل چیز تو وہ ہے۔ مُلا کی اذان اور' مجاہد کی اذان اور...... مہاجر کی اذان اور' مسافر کی اذان اور......؟

ہر نماز کی اذان اپنا اپنا رنگ و کیفیات لیے ہوتی ہے۔ کوئی جمالی اور کوئی جلالی...... داؤدی تو کوئی ابوذری...... بلالی تو کوئی غزالی...... اذان مرغ، اذان زاغ...... اذان ابر، اذان صبر...... اذان نومولود، اذان نصرت، مسعود، اذان بیعت، اذان قحط...... اذان ایک ہی...... کیفیات، ضروریات اور مقصد الگ الگ...... اِدھر جنگل میں بھی عصر کی اذان کا آہنگ اُبھرا...... کہاں سے یہ تو معلوم نہ ہو سکا؟ یہاں پہنچ کر صحیح سے سمجھ آیا کہ اصل نماز کی حقیقت کیا ہے۔ وضو کے لیے وافر پانی نہ طہارت کے لیے کوئی انتظام...... درست سے قبلہ کا کوئی تعین اور نہ نیچے مصلے قالین...... وہی دعوت شیراز والی بات؟...... جنگلوں، صحراؤں، سمندروں اور پہاڑوں میں...... حالتِ سیاحت، مہاجرت، مجاہدت، تجارت۔ الگ ہی سواد اور ثواب کہ سرور تو قا ہی نہیں۔ خالص ذوق عبادت اللہ کے لیے...... صرف اللہ!

''جنگلی'' نماز سے فراغت ہوئی تو ہر کوئی اپنے اپنے مقصد کے پیچھے ہولیا۔ میں اپنے مطلب کے دوالے۔ قلندر بادشاہ نے قہوے کی پیالی عنایت کرتے ہوئے ٹھوڑی پکڑ کر پاس بٹھالیا۔ بولے۔

''سورنگی کے سو رنگ ہوتے ہیں ابھی تو ایک رنگ ہی چھڑا ہے۔ جم کر بیٹھو اور باقی رنگ بھی دیکھو۔ یہ جنگل ہے اِدھر سونا، رونا اور خود کو کھونا، منع ہے...... ہاں تو...... ماموں میرا بھی اک اللہ کا ولی تھا۔ رزق حلال کھانے، کھلانے کا خوگر...... گھر میں تین بچے تھے چوتھا مجھے بنالیا اور اُن کے ساتھ میری تعلیم و تربیت بھی شروع کر دی۔ بچے سب ہی عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ دو بیٹے عارف اور عادل...... ایک بیٹی عدیلہ، جو عمر میں کوئی تین برس مجھ سے بڑی تھی۔ ممانی پڑھی لکھی تھیں بظاہر مجھ سے ٹھیک تھیں لیکن اندر پردہ مجھ سے نالاں تھیں۔ میری موجودگی اُن کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ شاید اس کی وجہ کہ میں اپنے باپ کے خاندان میں واحد فرد تھا جو سیلاب سے بچ گیا۔ اناتھ آشرم میں میری پرورش ہوئی۔ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ اسی وجہ سے ابتدائی تعلیم بھی نہ حاصل کر سکا۔ میری کمزوری صحت، معمولی شکل و صورت بھی ایک وجہ ہو سکتی تھی۔ ماموں کی مجھ میں غیر معمولی دلچسپی یا شاید یہ بھی کہ ماموں، میری شادی اپنی اکلوتی بیٹی سے نہ کر دے۔ یہ سارے اپنے قیاس قیافے تھے اصل کیا تھا یہ اللہ ہی جانتا تھا؟

ایک روز شام کے وقت ماموں ممانی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں سردرد کی وجہ سے ساتھ والے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں ممانی نے کہا۔

''اس قلندر بادشاہ کی وجہ سے کالونی کے لوگ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ سکول میں بچوں کا بھی مذاق اُڑاتے ہیں۔ اس کی عادتوں کی وجہ سے ہمارے بچوں پہ بھی بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ آپ اس کا انتظام کسی آشرم یا ہوسٹل میں کر دیں۔ اس گھر میں جب سے آیا ہے بیمار ہی رہتا ہے۔ وہ گھر میں رہنے والا بچہ نہیں ہے۔

ہمارے بچے بگڑ جائیں گے۔"

ممانی نے کرنے کو تو بات کر دی تھی۔ ماموں پہ کیا بیتی میں نہیں جانتا کہ میں اندر کمرے میں تھا۔ صرف اتنا سنا' ماموں کہہ رہے تھے۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ میرا بھانجا ہے' میرے سوا اس کا دُنیا میں کوئی نہیں۔ یہ تو بڑا اللہ والا بچہ ہے' تم اسے آشرم میں پھینکنا چاہتی ہو؟ ذرا سوچو! اگر یہ سب کچھ تمہارے اپنے کسی بچے کے ساتھ بیتے تو تم کیا کرو گی؟"

ممانی بھنا کر بولی۔ "میں کچھ نہیں جانتی' ہماری بیٹی بڑی ہو رہی ہے میں اس نیم پاگل بچے کو گھر میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

ایک زوردار تھپڑ کی آواز نے مجھے کھاٹ سے اُٹھنے پہ مجبور کر دیا۔ میرا جسم بُری طرح کانپنے لگا تھا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ماموں تو اپنا غصہ نکال کر باہر نکل گئے۔ ممانی نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ مجھے کوسنے' بددعائیں دینے لگی کہ اَب میں ان کا گھر اُجاڑنے کے لیے آیا ہوں۔ بچے بھی عجیب نفرت بھری نگاہوں سے میری جانب گھور رہے تھے۔ میرا اندر سے کوئی بول اُٹھا...... تو کسی گھر پریوار کے لیے نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو تیرے اپنے گھر والے ماں باپ' بہن بھائی تجھ سے جُدا نہ ہوتے...... میرے اِدھر آنے سے ہی یہ سب کچھ ہُوا ہے۔ مجھے اپنی وجہ سے ماموں کے گھر کا سکون برباد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے' کہیں نہ کہیں سر چھپانے کو جگہ مل ہی جائے گی۔ میں نے اِدھر سے نکلنے کا اِرادہ کر لیا تھا۔ بس' کسی وقت کا انتظار کرنے لگا۔

اگلے دو روز بڑی ذہنی کشمکش میں کٹے۔ ماموں تو جیسے اندر سے کٹ کر رہ گئے۔ گو مجھ سے کوئی بات نہ ہوئی اور شاید انہیں یہ بھی پتا نہ تھا کہ میں سب کچھ اپنے کانوں سے سُن چکا ہوں بلکہ ممانی کا کہا سنا بھی اپنی جان پہ جھیل چکا ہوں۔ مجھے خوب اندازہ ہو چکا تھا کہ ماموں' خود اپنی زبان سے مجھے کچھ نہ کہیں گے۔ اُدھر اُن کے گھر کی سلامتی کا مسئلہ تھا۔ بیوی بچوں کو چھوڑتے ہیں تو گھر برباد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اُن کے پاس اس مسئلہ کا سرِدست کوئی شافی حل موجود نہ تھا۔

قدرت کا طریقہ ہے کہ جب کسی مسئلہ کا اِنسان کے پاس کوئی حل نہ ہو تو حالات کی پٹاری سے کوئی نہ کوئی حل' مینڈک کی مانند پھدک کر باہر نکل پڑتا ہے اور وہی اس کا صحیح حل ہوتا ہے۔ میں بھی جب کسی اُلجھن میں اُلجھ جاتا ہوں اور کوشش کے باوجود اُس کا کوئی اُپائے میری سمجھ میں نہیں آتا' میں بڑے آرام سے اُسے اللہ پہ چھوڑ دیتا ہوں۔ مالک! تو علیم و خبیر ہے بہتر جاننے اور کرنے والا ہے مجھے اُس راہ پہ ڈال دے جو خیر

سلامتی کی جانب کھلتا ہو۔ یقین کریں اس طرح سے مجھے کبھی کوئی ناکامی نہیں ہوئی۔ دیر بدیر اس اُلجھن کا کوئی بہتر حل نکل ہی آتا ہے۔"

قلندر بادشاہ نے اپنی بات بڑھاتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

"ماموں سے نگاہیں ملاتے ہوئے میں بھی گریز کر رہا تھا۔ ماموں اور ممانی کے تعلقات میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ دراڑیں دیواروں میں پڑیں دلوں یا تعلقات میں' نتیجہ اس کا اچھا نہیں نکلتا۔ میں خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ میں اِدھر نہ آتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نیچے اُوپر تین چار روز گزر گئے اور میں اللہ کی جانب سے کسی اشارے کا منتظر تھا۔ کوئی راہ راست کھلتا نظر آئے تو اُدھر منہ کروں۔ ایسا ہی ہُوا' جمعرات کا روز تھا۔ ماموں' بڑے پریشان' ورکشاپ سے گھر پہنچے' آتے ہی مجھے ساتھ چلنے کا کہا۔ ممانی کے پوچھنے پہ بتایا۔ صاحب کے بوڑھے والد' غسلخانے میں پھسلے' اُن کا کولہا اور ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ گئے ہیں۔ ہو سکے تو تم بھی اُدھر چلو...... قدرت نے مجھے ایک بار پھر اُدھر پہنچا دیا۔ بڑے صاحب ایک لمبے عرصہ کے لیے بستر پہ پڑ گئے اور مجھے اُن کی دیکھ بھال پہ مقرر کر دیا گیا۔

بڑے صاحب! بڑی خوبیوں والے' پڑھے لکھے بزرگ تھے۔ داڑھی مُونچھ صاف' اِس عمر میں بھی پینٹ شرٹ اور سر پہ انگریزی ٹوپی پہنتے تھے۔ پنجگانہ نماز' تہجد بستر پہ ہی اشارے سے ادا کرتے۔ ایک لمبی سی تسبیح ہاتھ میں رہتی جس پہ وہ ہر نماز کے بعد کوئی وظیفہ پڑھتے۔ مجھے وہ اچھے لگنے لگے تھے۔ اُن کی خدمت کر کے مجھے بہت سکون ملتا...... میں پاؤں داب رہا ہوتا تو مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے رہتے۔ وظیفہ ختم کرتے تو منہ ہی منہ کوئی دُعا مانگتے اور میرے چہرے پہ پھونکتے۔

اُن کی عادت تھی باتیں کرتے کرتے اچانک سو جاتے' خراٹے توڑنے لگتے...... اور کبھی نیند کے دوران یوں بدک اُٹھتے جیسے کسی نے بجلی کا تار چھوا دیا ہو...... یا کبھی اچانک بیدار ہو کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگتے جیسے کسی کو تلاش کر رہے ہوں۔ میں بچہ! اُن کی ایسی کیفیات کو سمجھنا میری عقل شعور سے بعید تھا۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے مزہ دیتا تھا' اچھا لگتا...... اپنا لگتا' جیسے یہ کیفیات خود میری اپنی ہوں' مجھ پہ ہی بیت رہی ہوں۔ ریلوے کے بڑے افسر کی کوٹھی تھی۔ میرے علاوہ' رسوئی' جھاڑ پونچھ پہ دو دو ماما ئیں موجود تھیں۔ مالی چوکیدار اور ڈرائیور بھی...... میں عمر قد کاٹھ سب سے چھوٹا' ناتواں بے اہل...... پر بڑے صاحب مجھے بڑی عزت محبت دیتے۔ جیسے میں اُن کی نظر میں بڑی کوئی قابل بزرگ ہستی ہوں مخاطب ہوتے تو "آپ" کہہ کر ہوتے۔ قلندر بادشاہ' پورا نام لے کر پکارتے۔ اپنے ہاتھ سے بسم اللہ کہتے ہوئے لقمہ کھلاتے۔ پھل چھیل کر دیتے' کبھی میرا ہاتھ تھام کر کہتے۔ قلندر بادشاہ! میرے لیے دُعا کرو' اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔ کبھی کبھی تو مجھے اُن سے ڈر لگنے لگتا۔ سوچتا' اُن کا یہ غیر حقیقی رَوَیّہ کب تک میرا لیے قابل برداشت رہے گا۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی میرا نظروں سے

اُوجھل ہونا برداشت نہ کرتے۔ ضرورت کے تحت گھر کے کسی اور کام میں مصروف ہوں تو بُرا مناتے۔ میں تو آسمان سے گر کر کھجور میں اَٹک گیا تھا۔ اُدھر ماموں کے گھر نفرت کی بنا پہ ماموں نہ تھا۔ اِدھر صاحب کے ہاں شفقت' عقوبت بنتی جا رہی تھی۔

ظاہر ہُوا محبت یا نفرت...... انہیں نبھانے کے لیے بھی اِک قرینہ چاہیے' یہ نہیں کہ جب چاہا چوم چوم کر چہرہ چقندر کر دیا اور جب جی میں آیا جوتے مار مار وجود پر کا جولا بنا دیا...... کبھی زہر بھی کارِ تریاقی کرتا ہے اور کہیں جامِ حیات بھی آبِ مرگ......!

میری موجودگی میں پہلی نوچندی جمعرات تھی۔ مجھے کیا خبر ہر مہینے اِدھر ذکرِ حمد و ثنا کی روحانی محفل ہوتی ہے اور بڑے صاحب میرِ مجلس ہوتے ہیں۔ مجھے نئے کیسری کپڑے پہنا کر' سر پہ دستار' گلے میں ہار' ہاتھ میں رنگین عصا' سُرمہ خوشبو سے آراستہ کر کے اپنے پہلو بٹھا لیا۔ الٰہی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ذکرِ قلندریہ' شجرہ شریف' ضروبِ باطنی کے بعد باقاعدہ مجھے گود بٹھا کر اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ میرے پیدائشی نام کی تجدید کرتے ہوئے۔ شیر شاہ کی اضافت فرمائی اور کہا۔ بنگال کے تمام صاحبِ شیر' اس کی اردل میں دیئے۔

میری سمجھ بھی نہ آیا کہ میں نے کونسی بے کل گھڑیوں' بے چین لمحوں اور نا آسودہ ساعتوں میں جنم لیا تھا کہ ہر وقت تغیرات کی زد میں؟...... نامساعد حالات کے آسمان سے گرتی ہوئی بجلیاں' میرے ہی آشیانے کے بکھرے ہوئے تنکے کیوں تلاش کرتی ہیں؟ پچھلے کسی جنم کا کوئی اَپرادھ یا آنے والے کسی سمے کی کوئی دُرگھنا؟ جب کچھ بھی بُدھی میں نہ آتا تو میں خود کو حالات کے دھارے پہ کھلا چھوڑ دیتا کہ ہو جو سو ہو......؟

اَب کیا تھا لوگ دُعاؤں شفاؤں کے لیے مجھے پکڑنے لگے۔ میرے ذمے جو گھر کے کاج کام تھے وہ دوسروں کے سر ڈال دیئے گئے۔ بڑے صاحب نے مجھے سختی سے باہر نکلنے' کسی سے بات چیت کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اُن کی کھاٹ سے جڑ کر مجھے بیٹھنا پڑتا اور اُن کے بتائے ہوئے ورد و وظائف سبق رٹنے پڑتے۔ ساتھ ساتھ قرآن حدیث اور دیگر دینی تعلیم بھی جاری تھی۔

بڑے صاحب اَب صحت یاب ہو چکے تھے۔ اپنے کمرے کی چارپائی چھوڑ کر ملاقات کے کمرے میں بیٹھنے لگے تھے۔ مجھے بھی اُن کے ساتھ ہی بیٹھنا پڑتا...... جو میرے لیے اِک مصیبت سے کم نہ تھا۔ ٹھیک ہے پڑھنے لکھنے کے دن تھے لیکن کھیلنے کودنے کا زمانہ بھی...... جو شاید میری قسمت میں نہ تھا۔

قسمت کے چکر بھی عجیب چکر ہوتے ہیں۔ جو چاہیے وہ تو نصیب نہیں ہوتا اور جس کے بارے بھی سوچا تک نہ ہو وہ گلے پڑ جاتا ہے۔

اَب گلے میں گلابی مقدس منکوں والی مالائیں' انگلیوں میں دُرِ نجف' عقیق' مرجان۔ کانوں کی

جھائیں شانوں سے نیچے اُتر آئی تھیں...... خالص عطر، نجفی نرم، چہرے مہرے کھلا ہوا رُوحانیت کا نُور...... جیسا نقشہ ماحول سوچ، ویسا ہی منش کا رُوپ سروپ ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد میں یکسر بدل چکا تھا۔ ذکر، وظیفے، رُوحانی محفلیں، دُعائیں مناجات، نمازیں، نوافل تہجد......!

بڑے صاحب اَب دن بہ دن لاغر ہوتے جا رہے تھے، کھانا پینا محدود، اکثر غنودگی کی حالت میں خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ بات چیت بھی کم...... اب آنے جانے والے معتقدین اُن سے کم اور مجھ سے زیادہ رُجوع کرتے۔ جیسے وہ میری لَو بڑھا کر خود معدوم ہوتے جا رہے ہوں؟

بڑی گیارویں کا ختم شریف تھا۔ تین روزہ تقریبات میں سہلٹ ڈھاکہ، باقر گنج، شیر پور، گوالا بازار، تامل، بولا گھاٹ اور جیسلانگ سے بڑے بڑے عالم صوفی شیخ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ذکر، سماع، نعت، حمد، خطاب کی بابرکت پُرنور مجالس سے خوب رونق رہی۔ لنگر طعام وقیام کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ مقامی لوگوں، ہندو مسلمانوں عیسائیوں کے بلا تخصیص مذہب و مسلک فراخ دلی سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آخری دن، آخری تقریب میں اجتماعی دُعا سے پہلے میری دستار بندی ہوئی اور بڑے صاحب نے مجھے اپنی چادر، جُبّہ پہنا کر اپنی جگہ پہ تفویض کر دیا۔ حالانکہ اس وقت میں ایک بچہ تھا، جس کے منہ دانت پورے تھے نہ پیٹ کی آنتیں۔ میں کیا جانوں کہ معرفت، حقیقت طریقت اور شریعت کیا ہوتی ہیں؟ ان کے معنی تو چیزے دیگرے...... میں تو ان کے ہجے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہی گوشت و پوست کا شیر خوار بچہ نما ایک لوتھڑا، جو اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت کے تحت، سیلاب کے ریلے میں ایک جھاڑ دار درخت کی پھنک میں پھنس کر رہ گیا جبکہ باقی کا سب پریوار، ماں باپ بہن بھائی سیلاب میں بہہ گئے۔ کسی دردمند ہندو کی نظر پڑی۔ اُس نے وہاں سے اُتارا۔ خدا کی حکمت کہ ایک دو روز درخت پہ لٹکے اور بن کچھ کھائے پیئے میں زندہ تھا۔ اک زمانہ ایک اناتھ آشرم میں پلتا رہا۔ کچھ بڑا ہوا تو ایک اور آشرم میں پہنچا دیا گیا۔ کوئی نام نہ کوئی شناخت...... دین نہ دھرم؟ پاؤں پہ کھڑا ہونا سیکھا۔ بدھی نے کام شروع کیا تو پھر زندگی کے باقاعدہ سفر کی ابتدا ہوئی۔ اللہ کی حکمت کہ اَب سگے ماموں نے مجھے دریافت کر لیا۔ اُن سے ہوتا ہوا، یہاں بڑے صاحب تک پہنچا۔ اُنہیں، خدا جانے کیا چیز مجھ میں نظر آئی کہ اس درویشی کی راہ پہ ڈال دیا۔

- خسرو ندیا پریم کی اُو رالٹی جا کی دھار جو نِکلا سو ڈوب گیا اور جو ڈوبا سو پار......!

میرے پیر و مرشد، جو بڑے صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ ایک گُپت منش تھے۔ وہ قلندر تھے یا وَلی،

کسی کو کچھ پتا نہ تھا؟ کچھ لوگ اُنہیں صوفی سالک سمجھتے تھے اور بہت سے عقیدتمند ابدال بھی کہتے۔ اپنے مسلک کے بارے اُنہوں نے کبھی زبان نہ کھولی۔ وہ ہفت رنگ تھے۔ محرّم میں باقاعدہ مجلسیں برپا ہوتیں' سبیلیں لگتیں' ماتم کا اہتمام' کونڈوں کا ختم' گیارویں شریف' میلاد شریف کی مجالس' قوالیاں' وِرد و سلام کی مجالس...... ذکرِ جہر و خفی تو شب و روز جاری رہتا۔ یہاں تک غیر مسلموں کے تہوار بھی بڑے جوش و خروش سے منائے جاتے تھے۔ اُن کے روزمرہ میں بھی کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ ایک کٹر مسلمان ہیں نہ ہی لباس' گفتگو اور برت برتاؤ میں وہ کسی خاص فکرِ حیات کا اظہار نمایاں رکھتے۔ وہ کہا کرتے' ہم سب انسان ہیں۔ کوئی کیسے جیتا ہے' کس مکتبِ فکر و مذہب سے وابستہ ہے یہ اُس کا ذاتی مسئلہ ہے؟ ہر شخص اپنے طور' اپنے سیاق و سباق سے جینے کا حق رکھتا ہے۔ اُس کا حق مت چھینو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ کسی نا سمجھی یا غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے تو اُس کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے اعمال' کردار اور انسانی رواداری سے کام لیتے ہوئے ایک خاموش نمونہ بن کر دکھاؤ...... نہ کہ خود کو دُرست اور اُسے نادرست سمجھتے ہوئے اُس کا اخلاقی استحصال کرو۔

میرے اپنے اندازے میں وہ ایک مہان بھگت تھے جو مذہب مسلک' رنگ و نسل' لسانی' جغرافیائی' بشری معائب محاسن اور تقاضوں سے قطع نظر محض یہ دیکھتا ہے کہ ہر کوئی مجھ سے بہر طور بہتر انسان ہے اور ان کے بے شمار انسانی حقوق مجھ پہ واجب الاَدا ہیں' بس......!

یہی کچھ اُنہوں نے مجھے سکھایا...... بتایا کہ کائنات کی بیشتر مخلوق' انسان کے تابع ہے۔ اس کی عملداری میں ہے۔ مخلوقات میں ہر اک کوئی نہ کوئی ذمہ داری اُٹھائے ہوئے ہے۔ کوئی ذی حس' ذی نفس اس سے مبرّا نہیں۔ حیوان ناطق' حیوان مطلق' آپس میں کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ اِک دُوجے کے مرہونِ منّت ہیں۔ سب مخلوق' ایک دوسرے کی آزادوٹ سے نمودار پذیر اور فیض یاب ہوئی۔ انہوں نے آپس میں شناختیں' خصلتیں' جبلتیں' سرشتیں بانٹ رکھی ہیں۔

قلندر بادشاہ بولے جا رہے تھے اور میں کہیں اور پہنچا ہوا سُن رہا یا شاید کچھ سمجھ بھی رہا تھا۔ ہر طرح کے احساسات سے تہی...... مجذوبِ حق' عاشقِ صادق اور درویشِ کامل کے رُوبرو بیٹھنا' سننا' سانس لینا اور برداشت کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہوتا' بڑے بڑوں کے پرزے ہوا دینے لگتے ہیں۔ تپش' توجہ' انہماک' اَمر' جذب و جذبات کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ آگ لگنے میں بس دو ایک پھونکوں کی ہی کسر رہتی ہے۔ خوش قسمتی کہ میرے پاس ایک دو درویشی ٹوٹکے ہیں۔ جنہیں میں ایسے مواقع پہ کام میں لا کر اپنا کسی حد تک بچاؤ کر لیتا ہوں......

نامعلوم طور پہ گہری سی سانسیں لے کر میں نے پوچھا۔

''باوا جی! میں بالز! آپ کی روحانی گفتگو سے ناک تک بھر گیا ہوں۔ مجھے یہ بھی تشفی دیں کہ میں انہیں سمجھ اور جذب بھی کر سکوں...... باوا! آپ کو مرشد پاک یعنی بڑے صاحب نے شیروں پہ صاحب کیا' اس کی کوئی وجہ؟...... میں ادھر تین روز سے دیکھ رہا ہوں کہ بڑے بڑے خوفناک شیر چیتے آپ کی حاضری میں رہتے ہیں جیسے وہ جنگل کے بادشاہ نہ ہوں آپ کے پالتو بکرے چھترے ہوں؟''

باوا' جس شیر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے' اُس کی گردن پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''شیر' بہادر' طاقتور' بردبار اور پُروقار و پُرجلال جانور ہے۔ ان کی بہت سی اقسام ہیں۔ ایک قسم اسد اللبلی کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی شیر ہیں جن کی قوت' جرأت اور جلالت کی بناء پہ مولا علی سے نسبت ٹھہرائی گئی۔ میرے بڑے صاحب کے مریدوں میں' انسانوں' جنوں کے علاوہ کچھ اور مخلوق خدا بھی شامل تھی۔ نمایاں طور پہ اسد اللبلی شیر بھی...... جو زیادہ تر سندربن کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔''

جس طرح حیوان ناطق میں ولی' قطب' ابدال' صوفی سالک' درویش اور کچھ ملامتی فقیری صفات ہوتے ہیں۔ اسی طرح حیوانات مطلق میں بھی کچھ مخصوص ہوتے ہیں۔ اب یہ الگ بات کہ عام انسانوں کو انہیں جاننے پہچاننے کا ادراک حاصل نہیں ہوتا۔

شیر' شتر...... گھوڑا' گدھا...... کوا' کبوتر...... ہدہد' ہما...... تیتر' بٹیری...... چیونٹیاں' چڑیاں...... ماہیاں مرغابیاں...... ابابیل' افعی سیاہ...... فاختائیں اور عندلیبیں...... حشرات الارض' بونوں میں...... مخلوقات ساقط اور متحرکہ...... کچھ ایک پہاڑوں' صحراؤں' سمندروں' جنگلوں اور میدانوں وادیوں میں بھی خاص تشرفات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

شیر' سانپ اور کوا...... سریت' اسراریت اور روحانیت کے حوالوں سے انسان کے زیادہ قریب رہے ہیں۔ آدم کے خلد سے نکلنے' ہابیل قابیل کے قتل' دفنانے کا واقعہ' حضرت نوح سے لے کر حضرت موسیٰ' فرعون' اہرام' ابوالہول' داؤد و سلیمان' آگے بڑھتے آئیں تو نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت' غار ثور اور فتح خیبر' کربلا کا میدان...... آگے بڑھیں۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں ولیوں' بادشاہوں' حکمرانوں' نوابوں' امیروں' رئیسوں کی زندگیوں' سرگرمیوں میں شیر' سانپ' گھوڑے' گدھے' کتے' بلیاں' ابابیل' ہدہد اور دیگر پرندے جانور بڑے فعال کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ ملکوں کے قومی نشان بھی ان سے آراستہ ہیں۔ ان کو مقدس جان کر پوجا کی جاتی ہے۔ خوش بختی اور کامیابی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ان کی کھالوں' پروں' سروں' آنکھوں دانتوں کو محفوظ رکھا جاتا ہے' حنوط کیا جاتا ہے۔

کسی بادشاہ حاکم' امیر کبیر کی نشست گاہ' دیوان خانہ' دربار' شیروں کی کھالوں اور حنوط چہروں سے خالی

نہیں ہوتا۔ ان کی شان شوکت' جلالت وحشمت' زندہ یا مردہ شیر کے بنا مکمل ہی نہیں ہوتی۔ بہادری کے خطاب واعزاز بھی شیر سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسد اللہ' شیر شاہ سوری' شیر افگن' شیر خان' شیر دل رچرڈ' مائی شیراں والی' بابا شیر سوار وغیرہ۔ اکثر سنا ہوگا کہ فلاں اللہ کا ولی' شیر کی سواری کرتا ہے۔ آدھی رات شیر آتے ہیں۔ اپنی دُموں سے صفائی کرتے ہیں۔ اسی طرح سکھ حضرات جو اپنے نام کے ساتھ لفظ سنگھ لگاتے ہیں اس کا مطلب بھی 'سورما' شیر ہوتا ہے۔ یہ جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے۔''

''آپ کو بڑے صاحب نے شیر شاہ کا لقب دیا' جبکہ آپ کا نام قلندر بادشاہ تھا۔ اب یہ شیروں کا عمل دخل کب سے......؟''

''جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ بڑے صاحب نے پردہ لینے سے کچھ عرصہ پہلے بڑی گیارہویں شریف کی تقریب میں جب مجھے اپنی جگہ پہ بٹھایا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا آج سے صاحب شیر تمہارے مطیع ہوئے۔ اُن کی اس بات کے بطونی معنی تو جو بوجہ کھولے نہیں جا سکتے محض اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ اُن کے پردہ لینے کے بعد اُن کے ہی حکم پہ میں نے بن باس لے لیا۔ یہ جنگل' وہ جگہ ہے جدھر کسی انسان کا پہنچنا ممکن نہیں' ماسوائے ان چار دنوں کے' جب بڑے صاحب کا عُرس شریف ہوتا ہے۔''

''باوا! یہ اتھاہ جنگل' جنگلی وحشی جانوروں کی دُنیا...... انسانی معاشرتی دُنیا سے بالکل الگ تھلگ' کسی انسان کا ان کے درمیان' زندگی بسر کرنا' کچھ سمجھ نہیں آتا؟ انسانی تقاضے بنیادی ضرورتیں...... یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟''

باوا نے نام نہاد سموکنگ پائپ' منہ میں جماتے ہوئے کہا۔

''جب انسان' دوسری مخلوقات کی طرح خود کو ایک مخلوق سمجھ لے کسی لحاظ دوسروں سے خود کو ترجیح نہ دے تو پھر بہت کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ شاید تم اس باریک نکتے کو سمجھ نہ پاؤ کہ خداوند کریم جب چاہتا ہے کسی اعلیٰ مخلوق کو کسی ادنیٰ مخلوق کی دستگیری' رہنمائی پہ مقرر کر کے اُس کے لیے آسانیاں پیدا فرما دیتا ہے۔ اُسی ہی کوئی مصلحت کہ کسی ادنیٰ کو کسی اعلیٰ پہ مقرر کر دے۔ اُس کے لیے دینے' پرکھنے' آزمانے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ پتھر میں بند کر دے یا قطرے میں...... بیج میں ڈال دے یا سیپ میں...... جھاڑ جھنکاڑ میں اپنا تجلا دکھا دے یا کنکریوں سے کلمہ پڑھوا دے۔ وہ دہکتے تنور سے بیل بنا نکال دیتا ہے۔ دہکتے شعلوں کو گلزار میں بدل دیتا ہے...... اس کے کارخانۂ قدرت میں سب کچھ ممکنات میں سے اور مخلوقات کی بہتری کے لیے...... آپ کے سامنے کہ ایک اُمّی کو دونوں جہانوں کے علوم' حکمتیں' عزتیں اور رفعتیں عطا کر کے کل عالموں کے لیے رحمت اللعالمین بنا دیا۔ اللہ کی یہ معصوم مخلوق' جسے ہم شیر کہتے ہیں اپنی زندگی کی اٹل جبلّت کے باوجود'

درویشانہ طور و طریقت کا خوگر ہوتا ہے۔ شیر اور شاہین میں تصوف کی تائید دیگر تمام جانوروں سے اُتم ہوتی ہے جبکہ صاحب شیروں اور شاہینوں میں جبلی خوں ریزی بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ قدرت اُن کو رزق ایسے ہی مہیا کرتی ہے جیسے فقیروں درویشوں کو بن حیلہ فراہم ہوتا ہے۔

باوا کہتے ہیں کہ اس وسیع و عریض سُندر بَن میں اَب بھی ایسے اَنجانے علاقے موجود ہیں جدھر انسان کو جو دو پہنچ نہیں پایا۔ ایسی ایسی خطرناک جھیلیں ندی نالے اور اندھی دلدلیں راہ پڑتی ہیں کہ اُن کے پار اُترنا کسی کے بس کی بات نہیں اور اگر کسی بدقسمت نے ہمت کی بھی تو اُس بدنصیب کا نام ونشان تک نہ ملا۔ صدیوں قدیمی اَستھان مندر شوالے زیرِ زمین بُھول بُھلیّاں' تیسی اشکال کی عبادت گاہیں' مرتیو گھاٹ زمین اور چھتنار درختوں پہ بنی ہوئی صدیوں پرانی قبریں...... ٹہنیوں پہ لٹکے ہوئے انسانی پنجر...... شیروں اور انسانوں کی ملی جلی ہڈیوں کے انبار جنہیں امتدادِ وقت نے خشک ٹیوب اور بھربھری مٹی کے ڈھیلوں میں تبدیل کر دیا ہوا ہے...... اور یہ بھی کہ عہدِ ماضی میں دوسرے سیاروں کی مخصوص مخلوق اس جنگل کے ایک خاص مقام پہ اُترتی رہی اور اس کے واضح نشانات اِدھر موجود بھی ہیں۔"

باوا نے کمال لاپروائی سے میری باتیں سُنیں' ذرا سا دھیرج لیتے ہوئے بولے۔

"تمہیں یہ سب کچھ کہاں سے معلوم ہوا؟ تمہاری عمر اور کایا تو ایسے جھمیلوں میں پڑنے والی نہیں؟"

"باوا! اگر میری کایا اور عمر آپ تک پہنچ جانے کی ہے تو ان اَسراروں کی جانکاری کی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی بھید بھری باتیں ہڈیائیں تو میرے شریر کے اندر بُجھی راکھ میں دبی چنگاریوں کی مانند سلگتی رہتی ہیں۔ مَیں نہیں جانتا ایسا کیوں؟ لگتا ہے جیسے میری آتما اِدھر کے بھیدوں بھاؤں کی ہر بھاونا سے خوب واقف ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر اُس اَستھان کی سگندھ اور ستار محسوس کرتا ہوں' جدھر کدھر بھی کسی بدھواں یا مُنی مُنچھ نے پریم پُران پڑھے ہوں...... الف اللہ' الکوزائن' اَمَل اَوپ کی اَکار پڑی ہو۔ آکاش سے اُپدیش اُتریں...... دھرتی کے بھیتر کا کوئی مجرم بھید چُھونے...... پُروا کے پُران چُھوئیں تو لگتا ہے جیسے کوئی مجھے پکارتا ہے...... صدائیں دے دے کر اپنے پاس بلاتا ہے۔ سُندر بن پہنچنے کی آرزو پچھلے کئی یُگوں سے میرے اندر کروٹیں لے رہی تھی۔ ادھر آپ کے پاس پہنچا تو من کو شانتی ملی۔ شانتی' جو پیاس بجھنے کے بعد محسوس ہوتی ہے' وصال پانے پہ پہنچتی ہے۔"

مَیں نے باوا کے گھٹنوں کو چُھوتے ہوئے کہا۔

"قلندر بادشاہ' شیر شاہ باوا! مَیں آپ کی طرح نہال ہونا چاہتا ہوں۔ سنسار کی موہ مایا سے دَم دھیرج کر کے اَنت جیون کے وشال ساگر میں بے کارو بے قرار ہونا چاہتا ہوں۔ مَیں اِک لمبی راہ سے ہو کر آپ تک پہنچا۔ اَب مجھے واپس پلٹ کر سنسار کی نمبادھ کی جانب مت جانے دیں...... اُدھر میرا جی نہیں لگتا۔

میں اپنے آپ کو توڑتا رہتا ہوں...... دھواں دھواں' دھانسا...... مانند شعلہ بھڑک کر راکھ کیوں نہیں ہو جاتا......؟"

میں اپنے ترنگ میں جانے کیا کچھ کہتا رہا' جب کوئی کن رسیا من بسیا' روبرو بیٹھا' آپ کی رنگ رس راگ داری سے اپنا راانجھا راضی کیے ہوئے ہو تو بڑی کومل اور کھری سُریں لگتی ہیں۔ سے کی سنگھٹن بھی اگر سمکھ مل جائے تو بڑا ساد ھو سنت بھی مادھو مہنت بن جاتا ہے۔ مسیحا کے پیش' مریض کنول کے پھول جیسا پوتر ہوتا ہے۔ بھلے وہ کسی تالاب یا جوہڑ میں کھلے۔ بھلے کے لیے بھلا اور بُرے کے لیے ہر کوئی بُرا......!"

باوا نے ہاتھ بڑھا کر میرے سر پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تجھے سویکار کیا۔ خوب جانتا ہوں تو اِدھر جنگل دیکھنے نہیں' منگل کی منگلتا دیکھنے آیا ہے۔ سوموار کو سوم ناتھ' منگلا مائی کے لیے ماتگلیں تلکھت لے کر آیا ہے' جو سوئمبر جیتنے پہ منگلا کو پہنایا گیا تھا۔ اَب سُن! کل صبح سویرے تمام لوگ یہاں سے واپس روانہ ہوں گے۔ پرنتو! اِدھر تو پرندھیان کے پرساد ھن تک رُکے گا۔ یہی تیری اَنت اچھیا تھی۔"

کائنات کے بھی عجیب و غریب طور طریق اور موڈ ہوتے ہیں۔ ایک جہاں' دوسرے سے یکسر مختلف' دُنیا میں علیحدہ علیحدہ۔ فطرت' سرشت' جبلت اک دوسرے سے متصادم...... سمندر! قلندر' مچھ مچھندر...... افلاک نقش پائے صاحب لولاک' رفعتِ تجلی ادراک...... صحرا! اندھا گونگا بہرا' اندر سے اُتھلا' باہر سے گہرا...... پہاڑ! غار در غار' اسرار در اسرار' یوم نشور روئی کے گالے' اس سے پہلے بوجھو بجھار!

یہ جنگل تھا...... جس کا اپنا ایک اٹل قانون ہوتا ہے۔ قانون بھی کیا' زندہ بچ رہنے کا اک جنون ہوتا ہے۔ اپنا پیٹ بھرے...... دوجا چاہے جیئے یا مرے یہاں کے وسیکوں کا یہی فلسفۂ حیات ہے۔ جو طاقتور اور موقع شناس ہے دھونس دھوکہ دے سکتا ہے وہی اِدھر کا شاہِ جنگل اور فاتح دنگل ہے اور یہ رتبہ فی الوقت شیر کو حاصل ہے۔ جنگل میں ہو یا سرکس کے بند پنجرے میں شیر' شیر ہی ہوتا ہے۔ اس کی ہیبت و دہشت' انسان سمیت' سبھی جانداروں پہ یکساں طاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پاؤں تلے بچھے شیر قالین پہ بھی پست ہمت پاؤں دھرنے سے گریزاں ہوتے ہیں۔ مگر دُنیا کے اس مہان جنگل سُندر بن کے اس حصّے میں گنگا میڑھی بہہ رہی تھی۔ جنگل کے ازلی قانون کی اُلٹی گنتی جاری تھی۔ بڑے ذی جلال' کمال پُر جمال شیر' جو مخش سوئے ہوئے پُر ہیبت بھی دکھائی دے جائیں تو اک لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اِدھر ان کی بیچ سلطنت' ایک ننگ دھڑنگ مست ملنگ...... نوبہ پوست واستخواں' بے بست سوختہ جاں' بیکل وگھائل' بظاہر بودا و سائل منتش' کے بڑے بڑے اس کی سرکار سرنیہوڑے پڑے ہیں۔ حفظِ مراتب کا ایسا خیال" سانس بھی آہستہ کہ ادب کی جا ہے۔"

شیر شاہ سرکار کے اشارہ پہ دُم کھینچتے ہیں۔ قلندر بادشاہ ان پہ سوار ہو کر جنگل کی سیر کو نکلتے ہیں۔ انہیں تکیہ بنا کر لیٹ جاتے ہیں۔ کیا مجال جو کوئی گند پھیلائے' اُلٹی سیدھی حرکت کرے یا آواز نکالے۔ وہ ایسے مہذّب' منکسر مزاج اور معصوم دکھائی دیتے ہیں کہ اشرف المخلوقات ہونے کا وعدے کرنے والا انسان' اُن کے سامنے بونا دکھائی دیتا ہے۔ بظاہر حیرانی کی بات ہے کہ خونخوار درندے اپنی جبلّت سے قطع نظر' ایسے رویے بھی اختیار کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب ایسا مشکل بھی نہیں کہ یہ سب کسی رجلِ کامل کی نظر کا فیضان جو فطرت' جبلّت' سرشت تو کیا؟...... قسمت اور تقدیر بھی بدلنے کی قدرت رکھتی ہے۔"

مشاہدے اور تجربے سے معلوم ہوا کہ جو کچھ بھی عالم ہست کے بیچ' صیغۂ معلوم میں ہے وہ دُھویں ہیولے اور اُچٹ سپنے کی مانند بے اعتبار و قرار ہے۔ قرار صرف اور صرف تغیّر کے لیے ہے۔ کہنے کو تو فطرت اپنے مسلّم اُصولوں پہ بندھی ٹکی نظر آتی ہے۔ چاند سورج ستارے' موسم' گرمی سردی' زلزلے سیلاب' ساری تبدیلیاں کسی مربوط نظام کے تحت ظہور پذیر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ افزودگی' بالیدگی' پیدائش و افزائش اور نمود و نمائش کے لیے بھی فطرت کی کارفرمائیاں' اپنے منتخب راستوں پہ مستقیم...... حیات و ممات' قضاء و قدر' صبر و جبر' اجر و تعزیر بھی اپنے اپنے منطقی عوامل پہ قائم...... لوح و قلم کے فرمان بھی اٹل و صائب...... لیکن یہاں ایک بہت بڑا "لیکن" کہیں سے سر اُٹھاتا ہوا نظر آ جاتا ہے۔ یہ کہ کبھی فطرت' سرشت' جبلّت' خصلت کے بالکل اُلٹ بھی ہو جاتا ہے۔ کلیے قاعدے' اُصول قانون منہ چھپاتے دکھائی دیتے ہیں......"

شیرنی اپنے بچوں کو دودھ پلاتی نظر آتی ہے۔ اُن سے کھیلتی ہے۔ حفاظت کرتی ہے' مگر یہی شیرنی' ہرنی' نیل گائے کے معصوم دودھ پیتے بچے کو ہلاک کر دیتی ہے۔ مادہ سانپ' مچھلیاں' بلیاں' کُتے اپنے ہی بچوں انڈوں کو کھا جاتے ہیں۔ کہیں اژدھا' انسان کو نگل جاتا ہے اور کہیں انسان سانپوں کو کھا جاتے ہیں۔ انسان فطرتاً احسان فراموش' متلوّن' جلد باز' خود غرض' نسیانی' شرپسند' فسادی اور جانے کیا کچھ واقع ہوا ہے۔ کیا کہیے یہی حضرتِ انسان' دوسروں کی خاطر اپنی جان لڑا دیتا ہے۔ بھوکا رہ کر' دوسرے بھوکے کی جان بچا لیتا ہے۔ کسی کا گناہ اپنے سر لے کر سولی پہ چڑھ جاتا ہے۔ حق و باطل کی شناخت کے لیے مجاہد بنتا ہے۔ شہید ہوتا ہے' ایثار قربانی' صبر برداشت اور رواداری کی اعلیٰ ترین مثالیں پیش کرتا ہے۔ انسانیت کے فروغ کے لیے...... طبقاتی' لسانی' مذہبی اور مسلک کی شدت پسندیوں کے خاتمے کی خاطر بھرپور جدوجہد کرتا ہے۔ شداد' نمرود' فرعون' ہلاکو' چنگیز' شمر' یزید' ضحاک' حسن بن صباح' ہٹلر......"

علیٰ ھذا القیاس! بے شمار اس طرح کے انسانیت سوز' ہلاکت و بربادی کی علامت درندہ صفت لوگ دُنیا میں موجود رہے اور اَب صرف اِن کی بربریت کی کہانیاں موجود ہیں اور یہ رزقِ خاک ہو کر نابود ہو گئے۔

ان کے مقابل میں پیغمبر، صحابہ کرام، اولیاء اللہ اور دیگر اللہ کے نیک بندے جنہوں نے اپنی زندگیاں انسانی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیں۔ یہ بھی تو ویسی ہی فطرتیں، جبلتیں، سرشتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ کتیا شیر کے بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ بلی کی چوہے سے دوستی...... انسان کا بچہ سانپ کے ساتھ سوتا ہے۔ شکرا اور فاختہ ایک پنجرے میں رہتے ہیں۔ تھائی لینڈ اور کوریا میں لامے، چیتوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کسی کی فطرت کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخلاص اور پیار کے روبرو سب کچھ رام ہو جاتا ہے اور یہ دونوں جذبے اللہ کی مخلوق خوب سمجھتی ہے۔ جب آپ کسی کو اپنے اخلاص اور پیار کا یقین دلا دیتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اُس سے ضرر پہنچنے کے امکانات کم سے کم ہو جاتے ہیں۔

انسان کے علاوہ دیگر ارضی و سماوی بادی آتشی مخلوقات کو حکمتوں، مصلحتوں اور محبتوں کے کھیل ذرا کم ہی آتے ہیں۔ یہ شرف محض انسان ہی کو تفویض ہے کہ اُسے پھندے سے جان بچانے اور پسلی سے پیکان نکالنے کے ڈیڑھ سو ڈھنگ آتے ہیں۔ پیار و محبت کے اتنے رنگوں سے آشنائی اور ایسی رنگ رلیاں کہ وہ رنگ ساز سے کہیں زیادہ رنگ باز دکھائی دیتا ہے۔ انسان تو انسان کو شیشے میں اُتار لیتا ہے حیوانات مطلق کو قابو لانا کیا مشکل؟...... بڑے بڑے کراندیل ہاتھی، گینڈے، تیندوے، عظیم الجثہ وہیل، ڈولفن، مگرمچھ دریائی گھوڑے اس کے اشارۂ ابرو پہ عمل پذیر ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ سب انسانی عقل و حکمت، عمل و مشق کے کرشمے ہیں۔ ان میں محض تکرار اصرار، بھوک خوف اور حیوانی نفسیاتی سے کام لیا جاتا ہے۔ ہاتھی گینڈے کے لیے کسی انسانی وجود کو سونڈھ یا پاؤں سے ختم کرنا کیا مشکل؟ شیر کے جبڑے میں قابو انسانی سر کس طرح سلامت رہتا ہے؟ کیا یہ رنگ ماسٹر کے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی کا خوف ہے یا اس کے پیار حکمت سے مملو کسی مشق، برتاؤ کا اعجاز؟ جبکہ اس ساری تگ و دو کا ثمر محض دُنیا اور پیٹ کا سامان مہیا کرنا اور داد و دہش سمیٹنا ہوتا ہے۔

قلندر بادشاہ المعروف شیر شاہ سرکار کے ہاں شیروں والا معاملہ ایسا نہ ہوا۔ یہ سُندر بن تھا نہ کہ جیمنی سرکس! جدھر شیروں کے جبڑوں میں انسانی سر ڈالے جاتے۔ آگ کے حلقوں سے گزارا جاتا۔ ان پہ سواری کی جاتی، پچھلے پاؤں پہ کھڑا کروا کر چلوایا جاتا تھا...... یعنی جنگل کے بادشاہ کے اندر سے بندر نکلوایا جاتا...... اور دکھایا جاتا کہ پچکے پیٹ کی بھوک اور سوکھے چمڑوں تازیانے کا خوف، جنگل کے بادشاہ کو کیسے بھیگی بلی سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔ غلام ہونا یا بن جانا کوئی ایسی اچنبھے کی بات نہیں بلکہ اعزاز ہے۔ صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کوئی کن معنوں میں غلام ٹھہرا اور کس کے آگے......؟ ایک ہوتی ہے تن کی آزادی اور ایک ہوتی ہے مَن کی آزادی! اسی طرح تن اور مَن کی غلامی بھی ہوتی ہے۔ دونوں حالتوں کے مادی اور رُوحانی معنوں اور قدروں کا فرق ہوتا ہے۔ ایک انسانی تذلیل و تحقیر کے معنوں میں اور دوسرا رُوحانی رفعتوں رسائیوں کی

ذیل میں آتی ہے۔"

بات' مالک کے ہاں رسائی کی بھی ہوتی ہے کہ آگے رسائیوں کے بھی درجات و مقامات ہوتے ہیں کوئی بلال تک پہنچتا ہے تو کوئی ایاز تک رہتا ہے۔ کسی کے در پہ ٹکے رہتے ہیں کسی اردل میں شیر...... کہیں حشرات الارض اور کہیں طائران فضا و ہوا...... جنات' رجال افلاک اور قدسیوں تک سلسلہ بڑھتا ہے۔

بات آگے بڑھتے بڑھتے کہاں تک جا پہنچی۔ اصل بتانا تو یہ مقصود تھا کہ شیر شاہ سرکار کی اردل میں شیر تھے اور باوا جنگل میں اُن کے درمیان...... اُنہوں نے مجھے اک غیر معینہ عرصہ کے لیے ادھر رُکنے کا حکم دیا تھا میں چاہتا بھی یہی تھا کہ باوا کی طرح اسی جنگل میں جیون بتا دوں۔ باہر کی دُنیا میں کیا تھا' لوٹ کھسوٹ' نفا نفسی' جھوٹ منافقت اور دین دھرم کے نام پہ اک دوجے کے گلے کاٹنا......؟ ادھر راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ یکسوئی' شانتی...... نہ کمانے کی فکر نہ کھانے پینے کی چنتا۔ رشتہ دار اور نہ کوئی دوست' بیوی بچے گھر' گاڑی' بل' ٹیکسی اور نہ کہیں لڑائی جھگڑا...... یہاں جنگل ہی جنگل' جھاڑیاں درخت' پودے' پرندے جانور' قدِ آدم اُونچی گھاس کہ آدم زاد کھڑا ہو تو دکھائی نہ دے۔ شیر چیتے' بندر' گیدڑ' لومڑ' سانپ اژدھے اور ہزار اقسام کے مچھر مکھیاں' دلدلیں اور جھیلیں جوہڑ...... جنگلی پھل' بیر انگور' کھٹل' جنگلی کیلے اور گولا ناشپاتیاں' نارنگیاں' ناریل' شہتوت اور سیب نما ایک پھل' جسے ادھر کی زبان میں کٹوبا کہتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں اور جا بجا لٹکتے ہوئے چھتے...... بنفشہ' بادیان کے بڑے بڑے۔ خود رو حشیش' خس خس کے ڈوڈے...... جنگلی پھولوں بیلوں کی بہاریں۔ سب کچھ تھا اس خلد میں' سورج چمک رہا ہو یا بادل چھائے ہوئے...... گرمی' سردی' آندھی ہو یا طوفاں...... مگر یہاں سدا بہار سا سماں...... جیسے گھنے جنگل کے سارے سامان' موسموں کو من مانیاں نہیں کرنے دیتے...... اپنے بھیتر کی شیتل رُتوں کو سدا ایک سار رکھتے ہیں۔ یہاں کسی کو ایک دوسرے سے ضرر نہ تھا...... نہ کوئی آپس میں اجنبی...... سرنی کے دانوں کی طرح' آپس میں بندھے ہوئے اور الگ الگ بھی......!

اگلے روز بجر دم زائرین رخصت ہو رہے تھے۔ باوا سرکار نے فرداً فرداً سب کو کچھ نہ کچھ تحفے دانے' جنگلی اناز جن سے اناردانہ تیار ہوتا ہے۔ مازا پودے کی مسواکیں' بیتا پھل کے بیج اور خشک ڈوڈے' جن سے مالائیں اور تسبیحیں' سمرنیاں اور گلے بازو کے جوشن بنتے ہیں۔ جوشاندے کے پھول اور ملٹھی کی ٹہنیاں' نو کے کھٹل بیر' جوں جوں پڑے رہیں' توں توں رسیلے' کھٹے میٹھے سوادی ہوتے ہیں۔ سرخ یاقوت دانوں کی مانند دھلکیں مارتے آنکھیں خیرہ کرتے ہیں۔ جنہیں منہ میں ڈالنے کی بجائے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ منہ پڑ جائیں تو کھٹل باہر نکالنا مشکل پڑے۔ میٹھا تو کبھی کھٹا' تلخ تو کبھی کسیلا' نمکین تو کبھی سیلا۔ اس کے بھی

اُسے نکلے' زباں سکے۔ یُوں یُوں گٹھلی سفید ہو جائے پرندے سے باہر پھینکنے کو دل نہ چاہے۔ لونڈیوں بالیوں کا من بھاتا مشغلہ! جیون کے سارے رنگ ' اُمنگ ' سواد ننھی سی گٹھلی میں سمائے ہوئے...... موم بتیاں بنانے کے لیے شہد کے خام چھتے۔ کپڑے لتّوں کو مایا چڑھانے کے لیے بھگوار کے خشک پتے۔ اگر اور چندن کے خوشبو...... خوشنما پرندوں کے پڑ' انڈوں کے چھلکے۔ مار سیاہ اور افعی سُرخ کی کینچلیاں کہ دُکھی آنکھوں' بڑوال' آشوب ضعفِ بصر' کالا موتیا' نکروں کی گھناول کے لیے اکسیر...... کئی بدبختوں نے شیر کی چربی' مونچھوں کے بال' ناخن کی کھوج نکالنی چاہی' باوا نے نامراد نکال دیا۔ آتے سمے والا حصار' جاتے وقت بھی زائرین کے گرد لگایا گیا۔ دُعا سلامتی کے بعد قافلہ روانہ کر دیا گیا۔

## حیرانی اپنے پنکھ کھول دیتی ہے......!

زائرین سے جنگل ہلکا ہُوا تو اِدھر کا ماحول بھی یکسر بدل گیا۔ برکھا برسنے کے بعد اِک جاں لیوا سا گھٹن طاری ہو جاتی ہے۔ اِدھر بھی یہی کیفیت دَر آئی تھی' لیکن تھوڑی دیر بعد یہ کیفیت اِک حیران کن خوشگواری میں بدل گئی۔ چشم زدن میں چاروں اطراف سے جنگلی جانور' پرندے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جھاڑ جھاڑیوں' گھاس پھونس' درختوں کے ڈال ٹہنیاں جدھر بھی نظر کرو' اُدھر ہی جانور ہی جانور' پرندے ہی پرندے دکھائی دے رہے ہیں۔ اپنے اپنے طور و طریقے سے اِدھر کی صفائی کرنے میں مصروف ہیں۔ کھانے پینے کی بچی کھچی اشیاء' گٹھلیاں چھلکے' دیگر الم غلم جو بھی پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب ٹھکانے لگا دیا' کھا لیا...... ضرورت کا اپنے گھونسلوں کھنڈوں کھاڑوں میں پہنچا دیا۔

قلندر بادشاہ' اِک عجب طمانیت سے اپنے گھاس پرال کے کھوڑے پہ آنکھیں موندے پڑے تھے جیسے تین چار روز کی مسلسل مشقت سے نڈھال ہو گئے ہوں۔

جنگلوں میں صبح دوپہر شام کا کچھ پتا نہیں پڑتا۔ سورج یا مہاراج کی چنچل کرنیں' گھنے گھور پیڑوں میں سے کہیں راہ رستہ پا کر اندر گھس بھی آئیں تو وہ اِدھر کی شاما شانتی سے یوں شردھا ہوتی ہیں کہ واپسی کی راہ کھو بیٹھتی ہیں۔ جنگل کے اندر سماں بھی جیسے رشی پیڑوں کی آشیر واد لے کر نجنت پڑ جاتا ہے۔

باوا سرکار اور میرے علاوہ کوئی تیسرا منش' یہاں موجود نہیں تھا۔ زائرین کے رُخصت ہونے کے بعد مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ باوا اِدھر اکیلے رہتے ہیں۔ مَیں سوچ میں پڑ گیا کہ انسان اِس طرح بھی زندگی بسر کر سکتا ہے؟ مَیں ہلکا سا متردّد ہوا تھا کہ اچانک باوا سرکار اُٹھ بیٹھے۔ بڑی رسان سے بولے۔

''بھیا! قافلے والے ابھی ایسی بھی دُور نہیں پہنچے ہوں گے۔ میں حاجی ضیغم علی سے کہتا ہوں' تمہیں اُن تک پہنچا آئے۔'' ایسا بول کر وہ دوبارہ لیٹ لیے۔

میں سوچنے لگا' ہم دونوں کے علاوہ یہاں کوئی تیسرا فرد موجود نہیں...... پھر یہ حاجی ضیغم علی کہاں سے آیا؟...... ابھی غور میں ہی تھا کہ باوا سرکار پھر اُٹھ بیٹھے۔ آنکھیں موند ھے موند ھے کہنے لگے۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ جو دکھائی دیتا ہے وہ اصل میں بھی موجود ہو اور جو نظر نہیں آتا وہ لا وجود ہو۔ ہماری ظاہری آنکھ تو سیدھے کو اُلٹا اور اُلٹے کو سیدھا دیکھتی ہے۔ اس کی گواہی ہم کیسے سچی مان سکتے ہیں؟...... حاجی صاحب! او حاجی صاحب!''

پیچھے جھنڈ سے ایک پُر ہیبت شیر نکل کر ہمارے سامنے سر نیوے آکھڑا ہوا۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ شیروں کے تذکرے بہت سنے ادھر پہنچ کر بنفسِ نفیس دیکھے۔ تین چار روز ان کے آس پاس گزارے بھی۔ اب تو ان کا خوف بھی جاتا رہا تھا۔ مگر ان کے نام اور کام انسانوں کی طرح بھی ہوتے ہیں یہ آج اور ابھی معلوم ہوا۔ باوا سرکار نے اک لمبی سی انگڑائی توڑی' بلکہ کسی خشک ٹہنی کے ٹوٹنے کی باقاعدہ آواز تک سنائی دی۔ بڑے بے رس لہجہ میں بولے۔

''چھوٹی سی بات سمجھ میں ناہیں آرہی' انسان! شیر' نام رکھ سکتا ہے تو شیروں کو انسانوں والا نام دینے میں کیا قباحت پیش آسکتی ہے؟ اور حج عمرہ بھی محض انسانوں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے دوسری مخلوقات' کیا اللہ کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں؟...... بھیا! وہ ربّ العالمین ہے۔''

جواب پاکر خجل سا ہو گیا۔ یہ بھی کہ سوال ابھی میرے ذہن میں ہے' ہونٹوں پہ نہیں آتا...... مگر جواب کھٹ سے مل جاتا ہے۔ اس کا جواب بھی مل گیا۔ فرمایا!

''خوشبو یا بدبو' انسان سے خارج ہو تو پاس بیٹھے ہوئے محسوس کر لیتے ہیں اور سوالات' خیالات' جذبات' احساسات یوں ہی کہ پر نہیں' پر طاقتِ پرواز سوا ہوتی ہے۔ حاجی صاحب! یہ واپس جانا چاہیں تو مرکب بن انہیں قافلہ تک پہنچا دیں۔ وہ لوگ ابھی چند بن تک ہی بمشکل پہنچے ہوں گے؟''

حاجی ضیغم علی اپنی جگہ سے سرک کر میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ میں نے بوکھلا کر جو باوا سرکار کی جانب دیکھا تو وہ پھر اونگ میں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد کی کتھا یاد نہیں کہ میں نے بھی وہیں پڑ کر اک لمبی اُونگ لے لی تھی...... کہا جا سکتا ہے کہ میں اس ناگہانی صورتِ حال کو برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش پڑ گیا تھا۔

بے ہوشی تب طاری ہوتی ہے جب اُوسان مکمل طور پہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی اعصاب بے حس پڑ جاتے ہیں۔ انسانی کبوتر' ناگہانی پریشانی کی بلیوں کو سامنے پا کر آنکھیں سختی سے میچ لیتا

ہے۔ پھر جب کہیں آنکھ اُچٹتی ہے تو وہ اپنے تمام تر سپیئر پارٹس کے ساتھ بلّی کے پیٹ کے گودام میں ہوتا ہے۔ مجھے بھی منطقی طور پہ بلّی کے بھانجے کے پیٹ میں ہونا چاہئے تھا مگر بوجوہ ایسا نہ ہوسکا۔ ہوش برابر ہوئے تو مَیں گھاس پھوس کے فرش پہ پڑا تھا۔

ایک لنگور نما بندر' جو ڈیل ڈول اور وضع قطع کوئی اُستاد ما لشیا معلوم ہوتا تھا۔ زور زور سے میرا سر سہلا رہا تھا۔ دو جوان سی بندریاں' میرے تلوے چاٹ رہی تھیں۔ آنکھ اُوپر کی توحدِ نظر تک درختوں کی بلندیاں' سرسبز شاخساریں' چہکتے پرندے اور کہیں کہیں جھانکا لگاتی ہوئی سُورج کی سُنہری کرنیں۔ فرطِ بہجت سے میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ مجھے لگا' بنکاک کے کسی اعلیٰ قسم کے مساج پارلر میں پڑا ہُوا مساج سپیشلسٹ سے ٹریٹمنٹ کروا رہا ہوں۔ موقع بہ موقع انسان' آسودگی خوشی' دِل بہلانے کے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے اور اگر ایسے مواقع' اُسے مفت یا اِتفاق سے نصیب ہو جاویں تو مالِ مفت' دِلِ بے رحم کے مصداق' خُوب لُطف اندوز ہوتا ہے' فائدہ اُٹھاتا ہے۔ مَیں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں آنکھیں مُوندھے پڑا سکون لے رہا تھا۔ بندروں کے ہاتھ پاؤں' اِنسان سے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہ ہر وہ کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دے سکتے ہیں جو اِنسان کے لیے ممکن ہوتے ہیں۔ اِس کے جبلّی جنسی اور نفسیاتی اور سماجی رویّے اِنسان سے بڑا لگا کھاتے ہیں......!

آرام سکون اور عیش کا زمانہ بڑا مختصر! اس کی مُدت ختم ہونے سے پہلے اگر اِنسان خود کو اِن کیفیتوں سے باہر نکال لے یعنی بھرا میلہ چھوڑ دے تو یہ اس کی خُوش بختی' ورنہ وہ عیش وعشرت' سکون وآرام کا خوگر ہوکر بربادیوں کی دلدلوں میں ڈوبنے لگتا ہے......!

اِس بات کی تائید میں ایک بہت خوبصورت اور برمحل مثال پیش ہے۔ صبح دم نیند اپنے پورے جوبن اور مستی میں ہوتی ہے۔ دیگر الفاظ میں' صبح کاذب کی نیند' نوم کامل ہوتی ہے۔ نیند کی مستی میں ڈوبا ہُوا اِنسان' دین و دُنیا سے بے نیاز مرگِ صغیرہ کی آغوش میں خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹ رہا ہوتا ہے۔ اِک میکش کی مانند مست حال ہوتا ہے۔ اِسی لیے کہا گیا کہ نیند کی فسوں خیز غفلت کو کُلّی طور خود پہ طاری نہ ہونے دو۔ اِس سے پیشتر کہ تم آہِ سحرگاہی اور برکاتِ صبح خیزی سے محروم رہو فوراً اپنے آرام دہ بستروں کو چھوڑ دو......مطلب کہ کیف ونشاط کے لمحات کو طوالت مت دو...... اُدھورا رکھو تاکہ تم تجاوز کرنے والوں میں شمار نہ کیئے جاؤ۔

مَیں بند آنکھوں کے مزے سے باہر نکل آیا تھا۔ سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سہلانے والے بندر کھی کھی کرتے ہوئے اِدھر اُدھر ہوگئے۔ میدان خالی پاکر' بادلِ نخواستہ اُس جانب ہولیا جدھر حاجتِ ضروریہ کے لیے جنگل کا اِک مخصوص حِصّہ تھا۔ اُدھر جاتے ہوئے راہ میں ایک پتلی سی آب جُو پڑتی تھی۔ جس پہ آسانی سے چھلانگ کر گزرا جا سکتا تھا۔ صاف شفاف میٹھا پانی...... خدا جانے کہاں سے آتا تھا؟ وضو' غسل اور پینے

کے لیے پانی یہیں سے حاصل کیا جاتا۔ ذرا آگے بڑھا تو باوا جی سرکار وضو کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ حاجی شفیع علی اور صوفی صدر دین دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ میرے اُدھر آنے کی کن سُن پاتے ہی صوفی صدر دین نے اپنے مخصوص اشارہ سے باوا جی سرکار کو مطلع کیا۔ اُنھوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے تبسم فرما کر کہا۔

''اچھا ہوا بے خود پڑ گئے' بچ گئے...... اب ہوش میں ہو اور بھی بہتر ہوا۔''

خیالات کا اَبہام' خرابی پیدا کرتا ہے۔ انسان وہی کچھ ہے جو وہ سوچ رہا ہوتا ہے اور جس نے اپنی سوچ اور خیال پہ قابو پا لیا' خود کی ایورسٹ کو سر کر لیا' اُسے دھیان کا گیان مل گیا۔

''جلد فارغ ہو...... وضو کرو' اشراق کا وقت نکل رہا ہے۔''

اِک دَم میرے اَندر سے نئے سوال نے سر اُٹھا لیا کہ انسان اپنی سوچوں اور خیالات پہ قابو کیونکر پا سکتا ہے یہ تو اُس کے بس سے باہر ہے۔ مگر اس وقت' کچھ پوچھنے کا محل نہ پا کر جھکے سر آگے بڑھ گیا۔''

آج میرا اُدھر جنگل میں پہلا روز تھا جس کی شروعات صبح صبح بے ہوش ہونے سے ہوئی تھی۔ باوا سرکار اور میں...... دو انسان' باقی سب اِدھر وہ مخلوق جو صُلبِ آدم میں سے نہ تھی۔ خوبصورتی یہ تھی ہم میں سے کسی کو یہ احساس تک نہ تھا کہ ہم مختلف حوالوں سے الگ الگ مخلوق ہیں۔ طرزِ زندگی رویے ضروریات' اخلاقیات' سزا جزا' شکل وصورت' جینا مرنا' کچھ بھی تو ملتا جلتا نہ تھا۔ ڈر خوف نہ کوئی اجنبیت۔ ایک پریوار کی طرح' جن کے کاکا دادا مُرشد' باوا شیر شاہ' شاہ بادشاہ تھے۔ اُن کا ہم نفس' اک میں...... جسے نہ جانے کس مصلحت کے تحت' اِدھر روک لیا۔ باوا سرکار کے اسی فیصلے پہ لوگوں نے جہاں تعجب کا اظہار کیا' وہاں یہ بھی بتایا کہ باوا نے کبھی کسی کو اِدھر رُکنے کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی کوئی اس خطرناک جنگل میں رہنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ لوگ تو یہاں تک کہتے' اس جنگل میں جنّات کے بسیرے ہیں جنہوں نے شیروں کا روپ لیا ہوا ہے۔ دلیل اِس کی یہ دیتے ہیں کہ سارے سُندر بن کے شیر' آدم خور ہیں ہر سال سیکڑوں لوگ ان کی درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ باوا سرکار والے شیر' سُندر بن کے شیر نہیں' کوہ قاف سے اِدھر مہاجرت کیئے ہوئے جنّات ہیں' جن کا سلسلۂ طریقت کفعف نامی اُس بزرگ جن سے ملتا ہے جو شہنشاہِ جنّات و چرند و پرند و درند' حضرت سلیمانؑ کا مصاحب تھا اور یہ بھی کہ باوا سرکار کے مُرشد' المعروف بڑے صاحب کے ہاں بھی اکثر جنّات آتے جاتے رہتے تھے۔ بلکہ اُن کے ملازم' جو عرصہ دراز سے اُن کی خدمت پہ معمور تھے۔ باوا سرکار کے آنے پہ اُنہیں واپس کوہ قاف جانے کی اجازت مل گئی تھی اور یہ سب شیر' اصل میں بڑے صاحب کے مُرید ہیں۔ اُن ہی کے حکم سے اَب باوا سرکار کی حاضری میں ہیں۔

عُرس کے دوران' ایک بوڑھے نیم مجذوب کی زبان سے کہیں نکل گیا۔ جنگل کا یہ حصّہ' جدھر باوا صاحب براجمان ہیں۔ جنّات کا بہت بڑا جنّ اڈہ ہے۔ چوبیس گھنٹے ادھر جنّات کی پروازیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ باوا سرکار اس جگہ کے بڑے افسر ہیں۔

میں نے اس قسم کی عجیب و غریب باتیں ایک کان سے سُنی اور دوسرے سے باہر نکال دیں۔ کسی معقول بات پہ توجہ دی جا سکتی ہے مگر بھنگڑ پہ دھیان دینا' حماقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ویسے بھی میں ایسی مافوق الفطرت باتیں سننے اور انہیں ہضم کرنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ میرا وجدان ایسی باتوں کا دودھ اور پانی فوراً علیحدہ کر لیتا ہے۔

بادی النظر میں دیکھا جائے تو زندگی' شاید صبح سے شام' کچھ اِدھر اُدھر کے کام اور کچھ آرام کرنے کا نام ہی ہے۔ کچھ دُنیادار دھن دولت کمانے' اچھا پہننے کھانے رہنے کو زندگی کے معنی دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے عزت شہرت کامیابی صحت مندی' شادکامی ہی زندگی کی ذیل میں آتی ہیں مگر کچھ لوگ عجیب سی منطق اور کھوپڑی کے مالک ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا کسی ایک بھی چیز کے مالک یا طالب نہیں ہوتے' وسائل اور قدرت رکھتے ہوئے بھی ان مکروہات سے گریزاں رہتے ہیں بلکہ خود کو ایسے راستے پہ ڈال دیتے ہیں جو اُن سے بالکل متصادم ہوتا ہے۔ یعنی اُلٹے پانی کی مچھلیاں......جسم و جان میں چھوٹی' دیکھنے پرکھنے میں کھوٹی کلوٹی......مگر ذائقے ذکاوت اور ذہانت میں بڑی موٹی......!

ایسے لوگ "کچھ لو اور کچھ دو"...... جیسے عالمگیر مروجہ اُصول کی سراسر نفی ہوتے ہیں۔ للعجب وہ اس صریحاً انحراف کے نتیجہ میں یکطرفہ طور پہ کیونکر سلامت رہ پاتے ہیں جبکہ انسانی پنجے پہ لادی ہوئی زندگی تو آگے پیچھے جڑی ہوئی ضرورتوں' خواہشوں' خودغرضیوں' دھوکہ بازیوں اور محبتوں نفرتوں سے لتھڑے ہوئے ایسے چیتھڑے کی مانند ہوتی ہے جسے صاف کیا جا سکتا ہے اور نہ مزید گندا...... کچھ خوشبوئیں اور بدبوئیں محبتیں نفرتیں' خوشیاں اور غم یوں بھی کہ ہزاروں زندگیوں اور سیکڑوں موتوں کے بعد بھی اپنے ہونے کے نشان قائم رکھتے ہیں۔ بس! اس چیستان حیات میں یہی کچھ تو ہے......

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پریم کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو پیا تیری

زندگی بس کسی ایسے ہی یار طرحدار کی طرح جس میں کوٹ کوٹ کر ہرجائی پن' چالاکی مکاری بھری ہو......وہ اپنے اِشارۂ اَبرو سے جو چاہے انجام لکھ دے۔

یہ مست ملنگ' بوٹی بھی بھنگ' مرلی کبھی چنگ' سنگ ہی سنگ' رنگ ہی رنگ' بھنگ ہی بھنگ......اپنے

رُوبرُو خود بیٹھ کے منگ پتا کھیلنے والے' چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی...... اپنا حساب خود ہی برابر کرنے والے...... ٹھنڈی چلّی کے دَھدڑ دانے' آلو کبھی کھانے' تکتے نمانے...... جیون جو گے' مرجانے...... ان کی دُنیا میں الگ' ان کے جنگل بیلے دَکھرے...... مسجدیں' مندر گرجے' گروددوارے' سب اللہ میاں کے پچھواڑے۔ کوئی انہیں سائیں کہتا ہے کوئی شاہ اور کوئی آرائیں' مُرشد تو کوئی پیر...... صوفی ہے تو کوئی بابا...... ملامتی ہے تو کوئی کرامتی؟...... مگر ہیں یہ سب سلامتی۔ سب کی خیر مانگیں' بھلا چاہیں اور سینے سے لگائیں۔

باوا قلندر بادشاہ تو پیدا ہی قلندر ہوئے تھے۔ دودھ پینے کی عمر میں سیلاب نے گود میں لے لیا۔ وہاں سے ایک پیڑ نے اُچک لیا۔ ایک بھلے مہاشے نے وہاں سے اُتار کر اَناتھ آشرم کے سپرد کر دیا۔ وہاں سے ہوتے ہوتے یہ بڑے صاحب جیسے گُپت قلندر کی نگاہوں کی دھار پہ چڑھ کر صیقل ہوئے۔ اُن کے تجاب لینے پہ انہیں اس سُندربن کی جاگیر عطا کر کے اِدھر آدم خور شیروں کی کچھاروں میں بھیج دیا گیا۔ بھلا اِدھر بھیجنے کی کیا تُک بنتی تھی؟ کسی بزرگ کے پاس' مدرسے' دارالعلوم میں بھیجا جا سکتا تھا۔ جدھر علم ہدایت' نصیحت یا تبلیغ و تعلیم ہوتی۔ انسانی قدروں پہ مشتمل معاشرہ...... نہ کہ جنگل جنگاس' درندے پرندے کہ ان کے درمیان پڑا اچھا بندہ بھی بندر بن جائے۔ معلوم نہیں جوگی بیراگی' بھگت سنیاسی' مفرور لٹیرے' معتوب' عشق میں چوٹ کھائے ہوئے۔ نروان گیان ڈھونڈنے والے رَمتے کملے بالآخر جنگلوں ویرانوں میں کیوں دل لگا لیتے ہیں۔"

حیرانی کی بات کہ کسی اچھے بڑے مقصد کے تحت جنگل میں رہنے والے شاذ ہی کبھی کسی درندے' عارضے یا حادثے کا شکار ہوئے ہوں۔ خوفناک درندے آگے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ خطرناک سانپ بچھو مچھر' بِھڑ' بےچیونٹے زہریلی مکڑیاں مکھیاں آس پاس منڈلا رہی ہیں۔ بندر شرارتیں اور منہ چڑا رہے ہیں۔ ٹارزن بھی تمام عمر جنگلوں میں رہا۔ کیا مجال کبھی وہ بیمار پڑا ہو یا کبھی اُسے لباس' جوتے یا حجامت بنوانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ سردی گرمی ننگا...... کھانا بناتے کھاتے یا نہاتے دھوتے بھی کسی نے نہ دیکھا۔ عجیب آزاد مرد ہوتا تھا۔

لدے سموں کے ٹارزن اور اس دورِ جدید کے ہمارے باوا قلندر شاہ کے مابین بہت سے تفاوت تھے۔ پہلا تفاوت تو زمانہ وقت تھا ٹارزن کسی زمانے میں نہ جانے کن حالات کے تحت جنگل میں پہنچ گیا ہوگا۔ کوئی جنگلی جانور' از قسم بندر گوریلا ریچھ وغیرہ اُسے اُٹھا لائے تھے یا وہ جنگل کی راہ پہ کسی قافلے سے بچھڑ گیا تھا جو بھی ہوا' وہ بچپن ہی سے جنگل میں جانوروں کے درمیان رہا' جانور بھی اُس سے ہل مل گئے تھے اور وہ بھی خود کو ان میں سے ہی سمجھتا تھا۔ فرق صرف دو پاؤں اور چار پاؤں کا تھا۔ باقی سب کچھ ایک سا ہی...... اُن وقتوں میں بجلی بھی نہیں تھی۔ موٹر گاڑیاں جہاز بھی نہ تھے۔ الیکٹرونک سامان کا تصور تک نہ تھا۔ یعنی وہ پتھر کے زمانے سے ذرا بعد کا زمانہ ہوگا۔ اُن وقتوں میں انسان اور حیوان' اک دوسرے کو ایک ہی برادری سمجھتے ہوئے مل جل کر

وقت گزارتے تھے۔ جیو اور جینے دو کے فلسفے پہ عمل کرتے ہوئے حتی الوسع برداشت سے کام لیتے تھے۔ انتہائی بھوک یا جبلّت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑی معذرت کے ساتھ ایک دوسرے کا شکار بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اب وہ وقت ڈور نہ رہا تھا۔"

انسان نے علم و فنون میں بڑے معرکے سر کر لیے' سائنس ٹیکنالوجی کے مختلف شعبوں میں خُوب ترقیاں ہوئیں' سمندروں کو کھنگال ڈالا' چاند ستاروں پہ کمندیں ڈال دی تھیں۔ لکڑی کی خاطر جنگل کے جنگل صاف کر دیے۔ اچھے اچھے جانوروں کو چڑیا گھروں کی زینت بنا دیا۔ نایاب قیمتی ہڈیوں' دانتوں کھالوں بالوں اور دیگر اعضاء کی خاطر جانوروں کا قتل شروع کر دیا۔ اس استحصال کے نتیجہ میں جنگلی حیات آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ بچے کھچے جانور اپنی جانیں چھپاتے پھرے' ایک دوسرے سے بدکنے لگے۔ انسان' جانور مار ہو گیا اور جنگلی جانور مردم خور ہو گئے' جس کے جو ہاتھ لگا وہ نابود ہو گیا۔"

کچھ جانور یوں بھی کہ جن کے لیے عام حالات میں انسان کو ضرر پہنچانا ضروری نہیں ٹھہرتا تھا۔ اکثر ایسا ہُوا کہ پگڈنڈی سے راہرو گنگناتا ہوا گزر گیا ہے اور چار پانچ فٹ پرے خوبصورت گھبرو سا بانکا ہمسٹ بھری نظروں سے اُسے دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ زہریلا سانپ سرسراتا ہوا' پاؤں کے پاس سے گزر گیا۔ بھیڑیۓ گیدڑ دُور کھڑے خوش فعلیوں میں مصروف ہیں' ہاتھی تو باقاعدہ سونڈ اُٹھا کر سلامی دیا کرتا تھا...... ٹکڑ بگھے' بندر' باگڑ بلّے تو بڑے اہتمام سے آگے پیچھے اُچھل کود سے جذبہ خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے۔ خنزیر کے گھر والی اپنے پریوار کے ساتھ بڑی آسانی کے ساتھ بستیوں باڑوں میں مٹر گشت کیا کرتی تھی۔ کوّے کبوتر چڑیاں طوطے چھوٹوں بڑوں کے سروں کاندھوں پہ بلا کھٹکے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ چوہے چھچھوندریں کرلے چھپکلیاں بِلّیاں ہمارے چار پائیوں پہ سویا کرتیں...... مینڈکیں ڈوڈو طوطوں کے بچے' چوچے ہماری جیبوں میں ٹھنسے رہتے تھے۔ شیروں ریچھوں سے البتہ ہم خوفزدہ رہتے کہ پھاڑ کھاتے ہیں۔ ان کی دھاڑ دل دہلا دینے والی ہوتی۔ چڑیا گھر میں بند پنجروں کے اندر بھی شیر چیتے بھالو دیکھتے ہوئے ہم اپنے ابا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا کرتے تھے۔

بہت بعد سمجھ میں آیا' جنگل میں آزاد شیر' پنجرے میں بند اور قالین پہ اُون سے بنے ہوئے شیر میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اسد اللہ اور شیر دل رچرڈ...... لائن آف ڈیزرٹ عمر مختار اور لائن آف پنجاب راجہ رنجیت سنگھ...... شیرِ میسور اور ایم جی ایم فلمز کے دھاڑتے ہوئے شیر میں کچھ فرق محسوس ہوتا ہوگا؟...... شیر کو بھاٹی گیٹ لاہور کے طاقت کی دوا بیچنے والے حکیموں نے بھی کمپنی کی مشہوری اور چندہ اکٹھے کرنے کی خاطر پنجرے میں بند کر رکھا ہے۔ اسی طرح ایک سیاست کا کاروبار کرنے والوں نے بھی اپنی پارٹی کے نشان کے طور اور اپنی دہشت ظاہر کرنے کی خاطر ایک شیر نما جانور' اپنی قیام گاہ کے باہر لوہے کی زنجیر میں جکڑ کر مقامِ عبرت کے طور

باندھ رکھا ہے اور ضرورت پڑنے پہ ٹرک پہ کھڑا کر کے جلسوں' ریلیوں میں بھی لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی موقع پہ تذلیل محسوس کرتے ہوئے شیر نے تمنا کی ہو' کاش! میں ایسا شیر ہونے سے کوئی کتا ہوتا...... معلوم ہوا' پابند شیر سے کتا لاکھ درجہ بہتر جو آزاد ہو۔

## • شیر بنگال......!

میں اِدھر بنگال میں شیر بنگال مولوی فضل حق کو دیکھنے نہیں بلکہ سُندربن کے ٹائیگر آف بنگال کو ان کے موروثی ماحول میں دیکھنے آیا تھا۔ جب انسان کی خواہش مستجاب ہو جاتی ہے تو سامنے کے راستے خود بخود طے ہونے لگتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ قلندر باوا شیر شاہ نے میرے علاوہ دوسرے تمام مریدوں' زائرین کو وہاں سے فارغ کر دیا۔ دوسروں کے لیے میں قابلِ رشک تھا اور شاید قابلِ رحم بھی کہ اس گھنے خطرناک جنگل' جس میں موجودہ جدید دور کی کسی سہولت کا تصور بھی نہ تھا اور خونخوار آدم خور شیر چیتے جن کے درمیان مسلسل رہنا تو کجا' کچھ وقت بھی گزارنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ مگر وہی ایک سیانے والی بات کہ اس پل پل رنگ ڈھنگ بدلتی دُنیا میں کچھ بھی ناممکنات میں نہیں...... پتھر کے جگر سے شبنم کے موتی ٹپک سکتے ہیں...... شہباز ممولے کے بچے کو گود لے سکتا ہے...... کرپشن ختم ہو سکتی ہے...... لوگ' بچوں کے علاوہ بھی کوئی کارآمد چیز ایجاد کر سکتے ہیں...... کسی احمق کو سمجھداری مل سکتی ہے یعنی کچھ بھی ہو سکتا ہے جو بادی النظر میں اَنہونی کی مد میں آتا ہے۔

میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا...... سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی میں سندربن کے دور اندر' جدھر سورج کی کرنوں' بارش کے پانی اور ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا ہے' پہنچوں گا...... ہاتھی نگل جانے والی ہولناک دلدلیں...... گنجان جنگل...... زہریلے کانٹوں والی جھاڑیاں' قدم قدم پہ اسرار اور خطرات...... ساری دُنیا سے الگ سا خطہ' جدھر پہنچ کر انسان خود سے بھی علیحدہ ہو جاتا ہے۔

چند روز اِدھر گزار لینے کے بعد' باوا صاحب کی بے پناہ شفقت اور جنگل کے ماحول نے جہاں کمال حوصلہ اور ولولہ عطا کیا تھا وہاں بے پناہ روحانی بالیدگی بھی حاصل ہوئی۔ ہر گزرتے لمحے' میرے اعتماد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مختلف زاویے اختیار کر کے وہ وژن مل ہی گیا جس کی جانب توجہ مبذول کر کے میں' زندگی آمیز مناظر کے تصور سے اطمینان کشید کر سکتا تھا۔ سلف کنیکشن یعنی آگاہی' خود اعتمادی' باطنی قبولیت' بہت ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بنا سرفرازی حاصل نہیں ہوتی۔ دُشوار مراحل اور حصولِ مقاصد کے کٹھے میٹھے ساحل' اس کے

بغیر عبور نہیں کیے جا سکتے۔

گھر میں کہیں مشک نافہ کی پوٹ' سات پردوں میں لپٹی ڈھکی پڑی ہو مشکبار کیے بغیر نہیں رہتی...... محبت اور مشک دونوں ہی دل دماغ پہ چڑھے نہیں اُترتے۔ پنڈو بیرا اُستاد' نالائق شاگردوں بچوں سے خفا ہوتے تو دبکتے ہوئے کہتے۔" اوے تیرا مشک مارا جائے۔" کون جانتا ہوگا کہ اس کے اصل کیا معنی ہیں؟

شیر کی مونچھ کا بال' الماس کے ریزوں میں پکّی دال اور کسی سوہنی کنیا کے بن کا سولہواں سال' کلیجہ کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

شیر کی مونچھ کے بال کی بات' یونہی برسبیل تذکرہ سامنے آ گئی۔ کہتے ہیں کہ رات' نیند اور سکون کے لیے ہوتی ہے۔ اللہ کے بندے کچھ دیر کمر سیدھی کر لینے کے بعد دھیان گیان کے لیے بیدار ہو جاتے ہیں۔ شب کی خموشی تنہائی اور تیرگی' بندے میں بندگی کی بصیرت و بہجت کا بہاؤ بڑھا دیتی ہیں۔ یکسوئی' ارتکاز باطنی کی بازیافت میں ممد اور فروغ فکر و فہامت ہوتی ہیں۔ خلق اور خالق کے درمیان حجاب (حسن طلب اور مشائے مشیت کے مطابق) بتدریج وا ہونا شروع ہوتے ہیں۔ یہی وہ سرمدی سماں ہوتا ہے جب من و تو کے ادق مسئلے کچھ سمجھ میں آتے ہیں......

موقع' ماحول' مقسوم اور کسی مرد کامل کی مصاحبت منظور ہو جائے تو بظاہر بڑے بڑے لاینحل معاملے چشم زدن میں حل ہو جاتے ہیں۔ یکبارگی میں اُس کی رحمت کی کوئی چوندھ چمکارا مارتی ہے تو پوری وادئ سینا بقعۂ نور ہو جاتی ہے۔ سیاہ و سفید' ہر شے اُجل جاتی ہے......

ڈیڑھ عشرہ بعد مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں سیاہ پوش ہوں یا سفید پوش؟ میری سیاہ پوشاک چند دنوں میں ہی چیتھڑوں میں بدل چکی تھی۔ جنگل کا ماحول ہی ایسا کہ تن پہ لباس سلامت رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ خود رو زہریلے کانٹے دار جھاڑیاں' جن کی دستبرد سے آپ خود کو محفوظ رکھ ہی نہیں سکتے۔ کپڑے تو کپڑے' جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پہ تراش خراش کے نشان اور ٹوٹے ہوئے کانٹوں کی اَنیاں گھسی ہوئی نہ ہوں۔ آخر ایک صبح لٹکتے جھولتے ہوئے ذریدہ چیتھڑوں کو خود ہی کھینچ پھاڑ علیحدہ کر دیا۔ باوا صاحب کا بھی یہی عالم تھا کہ ننگے پنڈے کا کوئی حصہ سالم نہ تھا۔ جا بجا خراشوں اور نئے پرانے زخموں سے نقشے بنے ہوئے تھے۔ کئی چھالوں زخموں میں خاکستری کانٹے گھسے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ موقع پانے پہ مخصوص بندر' انہیں نکالنے کی کوشش کیا کرتے......

میں نے بھی باوا صاحب کی تقلید میں ناف کے نیچے پاجامے کے چیتھڑے کا لنگوٹ بنا کر پہن لیا۔ جُوتا تو اِدھر پہنچ کے اگلے روز ہی پھینکنا پڑا کہ ادھر راہ اور راستوں پہ جُوتوں کا تکلف' اذیت دیتا ہے۔ اِس خلیے میں دو تین روز کے بعد میں کسی بوگی کا بھوت دکھائی دیتا تھا۔ جیسے سونامی کے بعد کسی تباہ حال جزیرے کے جنگل

سے دریافت کیا ہو۔ لبی کا کلیں' بن کنگھی' شیمپو' تیل ملکوں کی جنتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جن میں کانٹے تنکے پرندوں کی چہچہیں اور جنگل کا الم غلم بھرا پڑا تھا۔ دانت مانجھنے کی خاطر' مسواکیں تو دستیاب تھیں مگر ان کی ضرورت نہ ہونے کے برابر کہ اِدھر کھانے کے لیے جنگلی پھل پھولوں کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں۔ چولہا' آگ ہنڈیا' برتن وغیرہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ کیا کھٹ مٹھے بیر' آلو کی طرح کے سیب ناشپاتیاں اور جنگلی ساگ پات...... اس کے علاوہ ایک نعمت اور بھی' جسے شاید ہماری ہی ضرورت کی خاطر قدرت نے اِدھر وافر پیدا فرما دیا تھا۔ موٹی سی سنہری مکڑیاں جو درختوں شاخوں سے چمٹی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ سب سے پہلے بندروں کو انھیں کھاتے دیکھا۔ وہ اسے چُن چُن کر اس طرح کھاتے ہیں جس طرح بچے بالے مونگ پھلی چھیل چھیل کر نگلتے ہیں۔ سمندری چھوٹے سائز کے جھینگوں کی طرح ان پہ پیاز کے چھلکے کی طرح خول ہوتا ہے جسے مونگ پھلی کے چھلکے کی طرح کھانے سے پہلے چھیل کر علیحدہ کیا جاتا ہے' چاہو تو منڈی مڑوڑ کر علیحدہ کر لو۔ سالم بھی کھا لو تو کچھ وقت یا کراہت نہیں ہوتی۔ مزہ بھی سکاٹ سامن مچھلی جیسا' مکڑی ویسے بھی حلال ہوتی ہے۔ اسے پکانے کی ضرورت نہ دھونے صاف کرنے کی۔ پروٹین' وٹامن اور دیگر غذائی عناصر سے بھرپور' انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوقات کے لیے بھی آسمان سے اُتارا ہوا' ہوائی کی مَن وسلویٰ......!

لفظِ رَب پہ تجسس کیا جائے تو کھلتا ہے کہ اللہ کی یہ صفت اپنے ہاں کیسے کیسے معنوی خزانے رکھتی ہے۔ اللہ محض رزق عطا ہی نہیں کرتا' ساتھ حکمت طاقت' صحت اور دولت سے بھی سرفراز فرماتا ہے۔ یوں عقل فکر کا مالک بندہ' اپنے ربِ جلیل کی کونسی کونسی نعمتوں کا شکر ادا کرے گا؟ یہ آدم زادہ ناشکرا اور احسان فراموش ٹھہرا......!

پہلے تو مَیں نے ناک بھوں چڑھائی...... لیکن جلد ہی مَیں بھی اور دھوئی اَن دھوئی زندہ مکڑیاں کھانے پہ مجبور ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ عادی بھی...... ہمیں یہ بھی سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ پتھر کے دور کا انسان جو آگ سے پکا کر کھانے کا تصور نہ رکھتا تھا ایسا صحت مند' فطرت شناس کیونکر تھا۔ پرانے اطباء بھی یہی کہتے تھے کہ آگ پہ کھانا مریضوں کے لیے پکایا جاتا ہے۔ غذا وہی جو قدرتی حالت میں استعمال کی جائے۔ سبزیاں کھیتوں میں اُگتی ہیں۔ پھل درختوں پہ لگتے ہیں۔ پھلوں کو قدرتی حالت میں کھایا جاتا ہے جبکہ سبزیوں کو خوب بھون پکا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ مَیں نے روس' ایران' سکاٹ لینڈ' افریقہ اور عرب کے کئی علاقوں میں آج کے دور میں بھی غذائی اجناس خام حالت میں استعمال کی جاتی دیکھی ہیں۔ بیماریاں نہ ہونے کے برابر' دانت ہڈیاں' بال' بینائی کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ ذیابیطس' فشارِ خون' دل جگر کے عارضوں سے وہ لوگ واقف نہیں۔ کوئی گنجا' عینک لگائے ہوئے دکھائی نہیں دیتا۔ تمباکو نوشی بھی برائے نام...... باشندے طویل قامت اور

درازعمر ہوتے ہیں۔''

تمام حیوان مطلق فطری طریقوں سے اپنی غذائی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ آگ پہ غذائیت کا بیڑہ غرق کر کے کھاتے ہیں اور نہ فریج کی یخ بستہ بے دم خوراک استعمال کرتے ہیں۔ غور کریں کیا کوئی جانور' لباس' عینک' وگ' مصنوعی دانت' سماعت کا آلہ استعمال کرتے ہوئے نظر آتا ہے؟ جنگل صحرا' سمندر پہاڑوں پہ کوئی ہسپتال کلینک یا ڈاکٹر حکیم ہوتا ہے؟ فطری انداز زندگی' فطری انداز زندگی' فطری غذا اور فطرت قدرت پہ بھروسا تقویٰ ہی ان کے ڈاکٹر اور حکیم ہوتے ہیں۔ توکل' تقویٰ' تگ و دو' تقدیر و تدبیر کے فلسفہ کو سمجھنا ہو تو جانوروں سے بڑھ کر کوئی اُستاد نہیں۔!

## ● ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی......!

میری آوارگیوں' آشفتہ سریوں کے سلسلے بڑے دراز رہے۔ فطرت' جن پہ اپنے اسلوب اور اُسرار افشا کرنے کا فیصلہ کرتی ہے' رازدار بنا کر اپنا مقرب مقرر کرنا چاہتی ہے تو پہلے اُن کی فکری تہذیب کی تربیت' ترتیب دیتی ہے۔ اُن کے لیے مواقع' وسائل و سہولیات میں آسانیاں' حوصلوں اور ذوق و شوق میں برکت فراواں کر دی جاتی ہے۔ جب وہ رواں ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا شمار بھی قدرت کے رازدانوں میں ہو جاتا ہے۔ یہ چنیدہ و پسندیدہ لوگ مختلف طبقات الارض' طبقات الافلاک میں منقسم ہو کر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ لامتناہی عالمین میں وسیع و عریض کائناتیں بھی معرض وجود ہیں۔ انسان اپنی علمی' شعوری اور رُوحانی بے بساطی کے تحت' انہیں اپنے دائرہ ادراک میں لانے سے قاصر ٹھہرا۔ سوائے اُن مخصوص و محبوب بندوں کے جنہیں اللہ علیم و خبیر منتخب کر لیتا ہے۔

مَیں سن و سال کے حساب سے لمبی زندگی گزارے ہوئے ایک بوڑھا اور کار کرتوت کی کتاب کے حساب سے پیر فرتوت......! ظاہر ہے اس'' عمرِ بے لذت'' میں ضرورتیں اور روزمرہ کے تقاضے یکسر بدل جاتے ہیں۔ سب سے نمایاں تبدیلی کھانے پینے میں آتی ہے۔ دانت اور آنتیں قصہ پارینہ بن چکے ہوتے ہیں۔ حریص بوڑھے' غذا کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے احتیاطی کے لقمے نگل نگل' بہت جلد لقمہ اجل بن کر چارپائی خالی کر جاتے ہیں۔ کچھ بزرگ جو بوڑھے کوّے کی طرح سیانے ہوتے ہیں وہ بڑھاپے پہنچ کر اپنے جوانی والے مشاغل ترک کر دیتے ہیں۔ زیادہ وقت مسجد میں گزارتے ہیں' بازاروں میں نکلنے کی بجائے' قبرستانوں' کھیتوں نہروں کی جانب' جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے اجتماعات اور تقریبات میں

جانے سے پرہیز کرتے ہیں جدھر خواتین موجود ہوں۔ شرعی داڑھی ٹوپی تسبیح کے اضافے ہو چکے ہوتے ہیں۔ اِن کے ساتھ غذا بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ گوشت مرغی کی بوٹیوں کی جگہ یخنی شوربا...... بھنّوں چرغوں کی بجائے نرم سے شامی کباب' باربی کیو' سیخ کباب' برگر کی بجائے کھچڑی' حلیم ہریسہ' مچھلی پہ رغبت زیادہ رہتی ہے۔ نان' تنوری روٹی' تھبوں اور قیمہ آلو والے پراٹھوں سے ہاتھ کھنچ جاتا ہے۔ اُلٹے توے کے پھلکے' رومالی چپاتی' بیسنی اور میٹھی ریشمی روٹی سے گزارہ ہوتا ہے۔''

کوکی یا کاکی ایک نرم اور زود ہضم چھوٹی سی روٹی کا نام ہے۔ درویش فقیر مسافر لوگ' رغبت اور سہولت سے کھاتے ہیں۔ اس کے اجزاء معمولی اور آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اسے عام دوسری روٹیوں کی نسبت' دیر تک کارآمد رکھا جا سکتا ہے۔ تیاری کے لیے بھی کسی خاص سامان یا توے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بُو ملے سے جَو' جوار یا گندم کا آٹا' نکالا' پانی دودھ پنیر' جو بھی دستیاب ہو شامل کیا...... زیتون کو تیل شہد سونف کھجور کشمش تِل وغیرہ میسّر ہوں تو ڈالے جا سکتے ہیں۔ گوندھ' بلا کر موٹی سی روٹی کی صورت' تپتے ہوئے پتھر یا زمین پہ پھیلا دی جاتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بڑی خستہ نرم لذیذ کوکی بن جاتی ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ بغداد کے ایک بازار سے گزر رہے تھے۔ بڑی پاکیزہ سی اشتہاء پیدا کرنے والی خوشبو محسوس ہوئی۔ تجسّس سے دائیں جانب دیکھا...... بھٹیار خانہ میں ایک جوان رعنا' بشرے پہ سعادت کرامت شرافت اور نجابت کے چہار چراغ روشن کیے' الاؤ میں گرم پتھر پہ کوکیاں تیار کر رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اُسے دیکھا کیے...... آگ کے نیلے پیلے سرخ شعلوں کی تپش تاب سے چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ کوکیوں کی سوندھی خوشبو اور خستگی نے لذّت کام و دہن کو مہمیز جو دی تو ناگاہ اظہار کر بیٹھے......

نوجوان! ایک خستہ سی کوکی' ہمارے لیے بھی ڈال دو! کوکبائی نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔

وَلی' وَلی کو پہچان لیتا ہے۔ بڑے چاؤ لگاؤ سے کوکی تیار کی...... کمال اَدب سے پیش کرتے ہوئے' سر جھکائے روبرو کھڑا ہو گیا۔ آپ نے لقمہ توڑا چکھا...... سبحان اللہ کہتے ہوئے فرمایا' نوجوان! بولو کیا مانگتے ہو؟...... کوکبائی' وہیں ساکت و جامد گھگیاتے ہوئے گویا ہُوا۔ الاؤ کے سامنے کوکیاں سینکتے تن تو تپ چکا...... اگر آپ کے سینے کا تھوڑا سا سوز دروں مل جائے تو من مرادہ بھی پوری ہو جائے...... سوز دروں بھی کیسا اکسیر ہُوا ہے؟ بہت سوں اللہ کے برگزیدہ بندوں نے اس کی خواہش جستجو کی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے محبوب مرید خسروؒ کے بارے فرمایا۔ روز حشر اللہ کریم مجھ سے پوچھے نظام الدین! دُنیا سے ہمارے لیے کیا لائے تو مَیں عرض کروں گا۔ اللہ! مَیں خسرو کے سینے کا سوز لایا ہوں۔

الاؤ کی آگ اپنی تپش' پتھر کے تن من میں منتقل کرتی ہے۔ آٹے ' دودھ ' پانی ' شہد ' زیتون کی نرم کوکی' تپتے دہکتے سنگ کے انگ لگتے ہی سونگنا ہونا شروع ہوتی ہے اور نرمی ' نمی آناً فاناً خستگی اور سوختگی میں تبدیلی...... دہکتا پتھر اپنا سوز بیرون اور دروں' کوکی کا کچا پن' پکے اور بڑے پن میں بدل دیتا ہے......

سوز نہ ہو تو ساز نہیں
درد نہ ہو تو آواز نہیں

اقبال کو سوز کی بھیک' رومی کے سوز دروں سے ملی' پیچ و تاب کی خیرات رازی سے جبکہ شب زندہ داری اور آہ و گریہ' مولوی میر حسن کے تجربے کا صدقہ تھی۔ سوز دروں کے روبرو سوز تپاں بھی ہوتا ہے۔ پت جھڑ کے آگے خزاں کی مانند رہی سہی ہر قیل قال کا کلیجہ کلیان کر کے رکھ دیتا ہے۔

بات جنگل کی لکڑیوں سے چلی تھی کہ جنگل میں آگ' ہنڈیا' چھری' مسالوں کے بغیر' انسان کس طرح اپنی روزمرہ کی زندگی گزار سکتا ہے۔ خاص طور وہ فرد جو ایک متمدن معاشرہ سے اُدھر پہنچا ہو۔ وہی بات کہ اس کھیل تماشا' حسرت و حیرت' ہونی انہونی' کمال و زوال کی اس دُنیا میں قدم قدم' ہر ساعت و لمحہ ایسا کچھ دیکھنے اور سننے کو ملے گا جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ ایک چیستان' معمہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا......!

موسم' ماحول' معمولات کا اپنا ایک سحر اور کیفیات ہوتی ہے۔ یہ کچھ نہ ہو تو بندے کے لیے وقت گزارنا اور خود کو سنبھالنا انتہائی مشکل ہو جائے۔ قدرت نے انسان کے اندر' خود کو موقع محل کے مطابق ڈھالنے اور صورتِ حال سنبھالنے کی ایک خداداد صلاحیت پیدا فرمائی ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ حالات سے نپٹنے کے لیے وہ خود کو آمادہ پاتا ہے جن کا عام حالات میں تصور تک ممکن نہیں ہوتا۔ عام روزمرہ کی زندگی میں انسان' اپنا دماغ اور صلاحیتیں بہت کم یا ضرورت پڑنے پہ استعمال کرتا ہے مگر غیر معمولی صورتِ حال' یا ناگہانی واقعات پیش آنے پہ اس کے دماغ کا ایک مخصوص حصہ اور مخصوص صلاحیتیں' اک خودکار حیاتی نظام کے تحت فعال ہو کے پورے جسمانی نظام کو اپنے کنٹرول میں لے لیتی ہیں......

اللہ کریم نے خود مدافعتی' بھوک اور جنس...... یہ تینوں حسیں پیدائشی طور پہ انسان کو ودیعت فرما کر دُنیا میں داخل کیا۔ جس طرح پانی اپنی وہی حالت بنا لیتا ہے جس میں اُسے ڈالا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی خود کو حالاتِ حاضرہ کے ڈھانچے کے مطابق ڈھال لیتا۔ یہی اُس کی بقا کا راز ہے۔ اس معاملہ میں جہاں وہ خود اپنی مدد کرتا ہے وہاں فطرت بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔

بچپن ہی سے میرے اندر بلندی پہ چڑھنے کی ہچکچاہٹ موجود تھی۔ میلوں ٹھیلوں میں زمین سے لگے جھولوں پہ تو جھول جھال لیتا تھا مگر آسمان سے چھوتے چکر دار جھولوں کو دیکھتے ہی جھرجھری آ جاتی تھی' اسی طرح

نفرت محبت' نسیان' نفسا نفسی اور تلوّن و تکبّر کے چکّر میں ہی رہتا ہے۔ اپنی ذات واوقات کے باہر اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں...... سرشت میں خود غرضی اور خود پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ یہ تو ہوئے بشریت کے تقاضے' جبکہ انسانیت بہت گام آگے کی منزل ہے۔ بشری اور انسانی تقاضوں کی دو پاٹ چکّی کے درمیان پستا ہوا یہ اللہ کا نائب' عجب گومگوئی حالتوں میں اپنے وجود کو سلامت رکھنے کی خواہشوں اور کوششوں میں سرگرداں رہتا ہے۔ پھر ایک مقررہ وقت پہ اپنی بھلی یا بُری متاع سمیٹے' جُز سے کُل کی جانب رجوع کرتا ہے۔

اَزل اور اَبد کے مابین' قلزمِ عصر میں بادل برسے یا بدرو گرے سب اک یک ہو جاتا ہے۔ موسیٰ یا فرعون' نوح ہو یا اُس کا پسر' یُونس ہو یا تختۂ چوب پہ بہتا ہوا معصوم بچہ' سوہنی مہینوال یا مچھیاں جال...... خالد بن زیاد کی کشتیاں یا محمد بن قاسم کے دُخانی جہاز' سب کا آغاز و انجام' عتاب و انعام پہلے سے موجود ہوتا ہے۔؟

زندگی' اللہ تعالیٰ کی ایک عطائے خاص ہے۔ نعمت اعزاز و اکرام بھی' اک مقصد اور منزلت بھی...... مگر ایسا کچھ انجانے ایمان وایقان کے اتقاض ٹھہرے۔ مگر کچھ مخصوص لوگ' اپنے عقیدے' نظریے اور علم و عقل کے مطابق بھی زندگی کے بارے ذاتی رائے اور معنی رکھتے ہیں۔ کچھ زندگی کو پھولوں کی سیج' خوشیوں کا گہوارہ' مسکراہٹوں قہقہوں اور ملے گلے کی آماجگاہ سمجھتے ہیں۔ کچھ کامرانیوں شادمانیوں اور حکمرانیوں کی جگہ جانتے ہیں...... کسی کے لیے اک انجانا سفر' آزمائش گاہ' خاروں کی باڑ' کسی پچھلے جنم کا خمیازہ یا سزا' جرمانہ ہے...... ایسے بھی جو کہتے ہیں......

~ یہ زندگی اُسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا پیار ہی میں کھو گیا

~ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

~ اے میری زندگی' آج رات جھوم لے' آسمان کو چوم لے

~ زندگی جا چھوڑ دے پیچھا میرا میں بھی اک انسان ہوں پتھر تو نہیں

کئی سمجھتے ہیں زندگی' زندہ دلی کا نام ہے۔ بندگی بھی سمجھی جاتی ہے اور شرمندگی بھی...... دوسروں کی سیوا خدمت کو بھی زندگی کہا جاتا ہے۔ خود کو ملک و قوم' تدریس و تبلیغ' جنگ و جہاد کے لیے وقف کر دینا اصل زندگی...... مجذوب کی بڑ' اک معمہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا......

~ زندگی دینے والے سُن تری دُنیا سے دل بھر گیا

~ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

~ زندگی کی نہ ٹوٹے لڑی' پیار کر لے گھڑی دو گھڑی

ے زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں مَیں تو مر کر بھی میری جان تجھے چاہوں گا

ے زندگی اے زندگی دیکھ میری بے بسی

میری اپنی ناقص رائے میں زندگی کو کسی دیوانے کا خواب کہنا عام بشری فہم کے زیادہ قریب لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی سٹھیایا ہوا فاترالدماغ شخص خواب دیکھے گا تو اس کی کوئی بھی کل سیدھی نہ ہوگی۔ خستی اونٹ کے چنڈوں میں پڑا پڑا وہ کوہ قاف پہ پرواز کرنے لگتا ہے۔ وہیں سے غوطہ لگا کر چیچو کی ملیاں سے ہوتا ہوا خان بازار قاہرہ میں ایک حجام کے سیلون سے لنگوٹی سلواتا ہے۔ گدھا گاڑی پہ لفٹ لے کر رابندر ناتھ ٹیگور کے تنور قلعہ گوجر سنگھ پہنچتا ہے۔ وہاں سے دونوں شیکسپیئر کا کھیل ''باتھوڈا ساگ تے ریوڑیاں'' کا پہلا شو دیکھنے سوہو پیکاڈلی کے مشہور رائل تھیٹر پہنچتے ہیں۔ دو دن وہاں سوئے رہنے کے بعد بھوک چمکنے پہ چاندنی چوک دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ دو دو درجن خوشبو والے میٹھے پانوں کا جل بھوجن کر کے واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پہ پہنچ جاتے ہیں۔

مجھ ایسے عامیوں کی زندگیاں بھی ایسی ہی بے تُکی بے سمتی یعنی کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا اور کہیں پہ پھول کہیں پہ پھوڑا ٹاپ کی ہوتی ہیں۔

مَیں کبھی غور کرتا ہوں کہ غریبوں بے سکتوں بے جلموں بے توقیروں کے پاس خوابوں خیالوں کی یہ خداداد سہولتیں نہ ہوتیں تو یہ معصوم و مظلوم لوگ کس طور زندگی کا زہر ہلاہل حلق نیچے اُتارتے؟...... کوہ ہندوکش سا بھاری کھوڑ باہر سے ہی بستہ بھیتر تند و تختہ جیون بِتانے کے بعد معلوم ہوا کہ دنیاوی زندگی میں خوابوں خیالوں سی نعمت کوئی اور نہیں۔ جو ہنر مند اپنے من پسند سپنوں کی بنائی حاشیہ آرائی اور خیال آفرینیوں میں کمال حاصل کر لیتا ہے وہ نہ تو قسمت کو کوستا ہے نہ کسی سے شکوہ شکایت وسائل وسیلوں کا کوئی مسئلہ نہ رشک وحسد...... وِن خیالوں کی جنت میں...... ہر نعمت روبرو جو چاہا وہ خیالوں میں پکالیا...... خیالی پلاؤ تو اب عام سا بچھڑا بن کے رہ گیا ہے۔ خیالی تکے خیالی تفتجن خیالی شاہجہانی بریانی...... خیالی شاہی زعفرانی قورمہ کابلی دنبہ کی چکی کا افغانی پلاؤ...... سانبھر کے لذیذ تم کا روغن جوش...... ترکی مرغ کے تکے کشمیری گوشتابہ...... کمال کرم وکشادِ اِن خیال پرور لوگوں پہ کہ اِن نعمتوں کے حصول کے لیے نہ تو انہیں بیش قیمت اجزائے طعام میدہ و قوام پستہ و بادام حاصل کرنے پڑتے ہیں اور نہ تیاری کا جوکھم جھیلنا پڑتا ہے۔ کسیے کو ہاتھ لگائے بیٹھے بٹھائے بازونگری بلائے بغیر جنت کے پکے پکائے خوانوں سے شادکام ہوتے رہتے ہیں...... خالص مخالص کا چکر نہ وقت بے وقت کا جھنجھٹ مہنگائی کا رونا نہ عدم دستیابی کی فکر...... بس ذرا خیال کو مہمیز لگائی...... وقت اور طلب کو دیکھا اور خوانِ نعمت تیار......!

## ● آنکھوں سے خواب' دل سے تمنا تمام شد......!

کچھ تو ہے اور خواب بھی؟ جب خستہ حال خواہشیں' آزردہ آرزوئیں' تیرہ تکمیل تمنائیں کوئی راہِ قرار نہ پا کر بے موت مرجاتی ہیں تو نا آسودہ' بے چہرہ شریر و سرکش' مرئی ہیولوں میں تبدیل ہو کر نیا روپ دھار لیتی ہیں۔ ایسی ہی جیسے بے آباد جگہوں' ویرانوں کھنڈروں میں چمگادڑیں اَبابیلیں اور دیگر حشرات الفضاء' جنم لے لیتے ہیں......!

نشہ کی حالت' غیر اخلاقی اِنسانی تنازعات' چوری ڈاکے' مقابلے میں مارے جانے والوں کی رُوحیں بھی کرب و اضطراب میں مبتلا رہتی ہیں اور موقع بے موقع مختلف انداز' شکلیں و بے گمان وَبا ئیں بن کر دیگر مخلوقات' بشمول جن و بشر تنگ کرتی رہتی ہیں۔ انہیں ہم بھتنے' شرشرار' نساخ' نسان' ہوائی چیز یا باہر کی چیزیں کہتے ہیں۔ ان کی مثال شراروں کی طرح ہوتی ہے۔ آگ' شعلہ' انگارہ' کسی نہ کسی انداز حد میں اپنا وجود رکھتے ہیں مگر شرارے کا کوئی وجود نہیں ہوتا' اِک ساعت کے ہزارویں حصے میں اُڑا' چمکا اور نابود ہو گیا۔ (اُوپر پہلی سطر میں رُوح کا لفظ محض استعارہ کے طور استعمال کیا گیا ہے۔ آپ اِسے اعمال' احوال' مکافات' رِدِّعمل کی مختلف اشکال بھی کہہ سکتے ہیں) جیسے اموات کی بھی اِقسام ہیں۔ جیسے طبعی فطری اور غیر طبعی غیر فطری...... طبعی فوتیدگی وہ جو فطری انداز سے واقع ہوتی ہے۔ حادثہ' وَبا' جہاد' خود حفاظتی' علالت یا پیرینہ سالی میں مرض الموت کی صُورت بتدریج لمحہ بہ لمحہ اُترتی ہے۔ اِنسان کی اپنی شامتِ اعمال' بدمستی' زعم و غرور' دانستہ غلطی سے جو اَموات ہوتی ہیں اُنہیں فطری اَموات نہیں کہا جا سکتا۔ جسمانی موت کے علاوہ' اخلاقی موت' ایمانی موت' رُوحانی موت' شرم و حیا غیرت احساسات' دید لحاظ کی اموات بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگ چلتے پھرتے تو دکھائی دیتے ہیں مگر مُردوں سے بدتر ہوتے ہیں اور کچھ لوگ بظاہر قبروں میں لیٹے ہوئے...... مگر اپنے اعمال و اقوال' افکار و اذکار میں زندہ و پائندہ......!

بات خواب و خیال کی ہو رہی تھی کہ کچھ لوگ ہمیشہ کے ناکام اور مایوس ہوتے ہیں' اپنی سی ہمت کوشش کے باوجود اُن کے دامن' کو ہر مراد سے تہی رہتے ہیں اَب اُن کا آخری سہارا خواب و خیال کی دلفریب دُنیا ہی ہوتی ہے۔ اُن کی محرومیاں' نا آسودگیاں اور بے بسیاں' خوابوں خیالوں کے خیابانوں میں اپنی عارضی تسکین کا سامان تلاش کر لیتی ہیں۔ الگ بات ہے کہ بہت جلد وہ واپس حقیقت کی دُنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ جدھر اُن کے ہمیشہ کے مسائل اپنی تمام تر تلخیوں تباہ کاریوں سمیت موجود ہوتے ہیں۔ شاید وہی چند لمحے یا کچھ وقت' جو

اُنھوں نے خوابوں خیالوں کے سرابوں میں گزارہ ہوتا ہے وہی اُنھیں مزید جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ بہرحال! جو بھی ہے خواب وخیال کی دُنیا بڑی حسین دلفریب ہوتی ہے۔ شیخ چلی ٹائپ ہی نہیں بڑے بڑے بقراطیے بھی اِن سے مستفیض ہوتے ہیں......!

خرگوش' بڑا معصوم' خوکا نرم اور خون کا گرم جانور ہوتا ہے۔ اِس کے پسندیدہ روزمرہ میں خواب دیکھنا' نسل کوفروغ اور زمین تلے سرنگیں بناتا ہے۔ ماہرین خرگوشیات نے بڑی طویل تحقیق کے بعد پتا لگایا ہے کہ اِس کے یہ تینوں شغل آپس میں یوں مربوط ہیں کہ اگر ایک شغل اِس کی زندگی سے خارج کردیا جائے تو دیگر کے باقی رہنے کا جواز ازخود ختم ہوجاتا ہے۔ خرگوش کو اگر پاؤں جوڑے' کان لمبے دھرے' منہ بسورے حجرے سے سونے نہ دیا جائے تو وہ خواب نہ دیکھ پائے گا۔ اِس طرح وہ خواب میں البیلی نازک اندام خرگوشنیوں کے التفات سے محروم رہے گا۔ کثیرالاعیالی سے بچے گا...... یوں اُسے مزید رہائشی سرنگیں کھودنے کی ضرورت پیش نہ ہوگی۔ دیکھا آپ نے خواب خرگوش کیا گل کھلاتا ہے؟...... یہ اگر خواب دیکھنے اور رفتار پہ کچھ گرفت حاصل کرلے تو خرگوش کی بجائے کچھوگوش کہلائے کہ کچھوا تو کانوں سے محروم ہوتا ہے۔

خرگوش کے بعد سب سے زیادہ رنگین' کمی لذت اور وصل وظائف والے میٹھے میٹھے خواب بِلّی دیکھتی ہے۔ لطف کی بات' یہ کہیں بھی' کبھی بھی' جب چاہے اپنے سپنوں کی سجا سجالیتی ہے۔ اگلے پنجوں پہ تھوڑی ٹکائے' ہلکی سی مسکان دیے...... دُم دُم جھلاتے' بانکی سی چھل بل لیے...... یوں جلوت دیے پڑی ہوتی ہے جیسے جھانسی کی رانی' کانسی کی چیکن پہ نیناں نوائے' بچار کررہی ہو؟ حیوان مطلق میں سب سے زیادہ اور خوشگوار خواب' بلیاں' مچھلیاں' خرگوشنیاں اور چھچھوندریں دیکھتی ہیں۔ اِنتہا کے سُست الوجود' کاہل اور خودپسند یہ جانور بڑے نازک مزاج نکتے' ہمہ وقت نیند کی نمی میں بھیگے بھیگے رہنے والے ہوتے ہیں۔ دن ہو یا رات' یہ تصورِ جاناں میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں یا پھر آرائش جمال میں مگن...... ظاہر ہے ایسے ناز و انداز' جلوہ آفرینیوں سے جنس مخالف کے مزاجوں میں خلل کا پیدا ہونا ایک منطقی عمل ٹھہرتا ہے...... نتیجے میں یہ چاروں مخلوقیں سال بھر میں کئی کئی نِجھالے بچوں کے تیار کرتی ہیں کہ بچے پیدا ہوتے ہوئے حیا کرتے ہیں مگر کیا مجال جو اِن خرافاؤں کے رُجحان رجولت میں کوئی سقم واقع ہو......؟

خواب' رؤیا' القاء' تصورات' چھایا' گمان' وہم' شک وشبہات میں سے زیادہ تر کا تعلق بشری رُجحانات' روزمرہ معمولات' شوق وشغل' پیشہ ورانہ تقاضوں سے جُڑا ہوا بھی ہوتا ہے۔ ذہنی' قلبی' جسمانی' جنسی' اخلاقی اور روحانی زاویے اِن کی پشت پنت میں اِک نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ پیٹ میں پڑی خوراک کا اِنہضام' نیند میں خلل' موسمی اثرات' اردگرد کے ماحول شورشرابہ سے بھی اچھے بُرے خواب' خیالات و توہمات جنم لیتے ہیں۔

اچھے سچے اور بُرے جھوٹے خواب بھی...... نیک' پرہیزگار لوگوں کے خواب سچے ہوتے ہیں اُنہیں قدرت کی جانب سے اِشارے رہنمائی' مستقبل کے بارے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ وہ قدرت کے رازداروں میں سے ہوتے ہیں...... جیسے نبیوں پیغمبروں رسولوں پہ وحی نازل ہوتی تھی جو احکام و پیغامات آسمانی فرستادوں فرشتوں کے توسط سے اُترتے' وحی کی ذیل میں آتے ہیں۔

اللہ کریم جب چاہتا ہے اپنے منتخب بندوں کو باانداز' الہام' خواب یا القاء سے بھی براہِ راست احکام جاری کرتا ہے کہ درمیان کوئی وسیلہ یا پیغامبر نہیں ہوتا۔ کبھی کچھ خواب' تنبیہ' اشارے ایسے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے بھی جنہیں ہدایت' توفیقِ حق دینا مقصود ہو۔ بعض سلیم الطبع' صالح' صادق قائم القلوب افراد کو رویائے صادق کے مشاہدات ہو جاتے ہیں۔ روشن ضمیری' شفاف باطنی' تجلیلِ نفسی' ریاضت و عبادت اُن کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ افلاک و آفاق پہ لہراتے ہوئے فطرت و قدرت کے اِشاروں کو اپنی حد تک سمجھنے پڑھنے کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔

اِسلام سمیت دیگر مذاہب کی آسمانی کتابوں میں خوابوں' الہاموں' آسمانی پیغامات' پیغام رسان آسمانی مخلوق وغیرہ کے بہت سے اذکار محفوظ ہیں۔ مالک و خالق نے اپنی مخلوق سے کیسے کیسے انداز سے رابطے رکھے اور کیسے مختلف وسائل اختیار کیے......؟

اللہ کریم نے بشر کو ارضی فلکی' بہت سے علوم فنون' وصف عطا فرمائے۔ اس کو تخلیق' تخیل' تصور' تلاش' تجلیل' تدبر' تدبیر' توقع' تحمل' تعلم' تجسس جیسی صلاحیتوں سے بہرہ مند کر کے دیگر مخلوقات سے افضلیت دے دی۔ اَب اِنسان پہ منحصر ہے کہ وہ ان صلاحیتوں سے کیسے کام لیتا ہے اور ان میں مزید جِلا پیدا کرنے کے لیے کتنی محنت کوشش کرتا ہے۔ وحی' رُوح پہ نازل ہوتی ہے۔ اِنسانی وجود میں رُوح ہی ہے جو اللہ کریم کے جمالِ نُور کے اَمرِ خاص کی اک لطیف سی تنویر کا' ادنیٰ سا جزو ہے۔ جب قُدسی' مالکِ قدوس کے حُکم سے اُس کا فرمان' کسی پیغمبر' نبی' رسول کی رُوحِ مطہر پہ منعکس کرتے ہیں تو بڑی سخت اضطراب کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ رُوح ہی ہے جو فرشتہ کی آمد اور فرمودات ربانی کے بارکی متحمل ہوتی ہے۔ آب و خاک' آگ اور ہوا کا مجموعہ' بشری وجود' وحی کے نزول کو برداشت نہیں کر سکتا (اِستثنیٰ کے ساتھ)۔

القاء' سینے پہ ہوتا ہے یعنی قلب پہ۔ بالکل کسی ٹیلی گراف' سیلولر برقی صوتی پیغام کی طرح...... ٹک ٹک ٹک! حرکت میں یا ساکت' بیداری یا نوم' کسی حالت میں اُلقاء ہو سکتا ہے۔ اولیاء اللہ' عارف عابد' عاملین کاملین' چنداں خوش خصال رجالِ خاص' جہاں قلب' ہمہ اوقات جاری رہتے ہیں جن کے گنبدِ مینائی میں ٹھوکا آہنگ گونجتا رہتا ہے۔ مطلع صاف' مابین حجاب دھندلا نہیں ہوتا۔

الہام بھی کچھ ایسے ہی کہ القاء کی طرح اس کے لیے بھی کوئی درمیانی پیامبر نہیں ہوتا۔ قدرت اپنے احکام و پیغام کا مقصود اپنے منتخب بندوں کو سمجھا دیتی ہے۔ الہام زیادہ تر ہنگامی اور فوری فیصلہ کی ضرورت کے تحت ہوتے ہیں۔ بشری فہم و ادراک' عقلی منطقی بصیرت و نفسیات ایک حد تک تو پرواز کرتی ہے۔ اس سے آگے اس کے پر جلنے لگتے ہیں۔ کوئی خاص ہو یا عام...... اگر بنیادی طور پہ بشر ہے تو اُسے حد سے ماورائیت کے لیے اُوپر سے رہنمائی ملتی ہے۔ وحی ہو الہام' القاء' رویاء ہو یا خواب صادق...... سب اسی قبیل کی کڑیاں ہیں......

عوام الناس کے لیے سچے جھوٹے خواب سپنے ہی ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی کلیہ یا اُصول نہ ٹھہرا۔ زندگی ایک تماش گاہ کی طرح بھی ہے۔ طرح طرح کی بوالعجبیاں' ہونیاں' اَن ہونیاں' نیرنگیاں' ایسے واقعات کہ دانتوں تلے اُنگلیاں دیے بن چارہ نہ رہے۔ ایسی ایسی کہانیاں قصے اور سیدھی اُلٹی باتیں سننے کو ملیں گی کہ حیرت گم ہو جاتی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ نسیان' تلوّن' خود غرضی' احسان فراموشی' دغا بازی اور بے وفائی کا خوگر انسان بھی کبھی وفاداری' حیاداری' احسان مندی' عہد کی پاسداری کا اس حد تک خیال رکھ سکتا ہے اور اپنے ایک بزرگ کی روزمرہ کی گفتگو میں اُن کے ایک خواب کو سن کر ایسا بڑا فیصلہ کر لیتا ہے جس نے اُسے اور اُس کی آئندہ نسلوں کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ صوفیوں کے ایک ایسے مسلک کی بنیاد ڈالی جس نے تصوّف میں خاصا نام اور کام کیا۔ اس واقعہ سے یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ خواب' جو اللہ کریم کے نیک خاص بندوں کو دکھائی دیتے ہیں اُن میں پیغام کے ساتھ درجات کا انعام بھی ہوتا ہے۔ اللہ کریم جو چاہے جسے چاہے کر سکتا ہے۔ سچے خوابوں میں اُس کی نوازشات چھپی ہوتی ہیں......

## ● کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے......!

ہمارے رشتہ داروں میں ایک عجیب و غریب شخص تھا۔ مجھے اُسے اپنے ابتدائی بچپن اور عنفوان جوانی تک دیکھنے اور اُس زندگی کے روزمرہ' مشاغل' کاروبار' عادات' بال بچے داری کا خوب مشاہدہ ہوا بلکہ اُس کا مشاہدہ میری مجبوری بن چکا تھا۔ وہ دو گلی پرے رہتا تھا مگر کسی نہ کسی کام' وجہ بہانہ اُس کا ہمارے گھر آنا جانا لگا ہی رہتا۔ بلا کا چست' کھوڑا' مطلبی' محنتی' موقع شناس مگر دیانت دار اور مخلص! کوئی کام دھندا یا روٹی روزی کی فکر کرتے اُسے کسی نے نہ دیکھا تھا اور شاید ہی اُس کے گھر کبھی کسی نے چولہا جلتے ہوئے بھی دیکھا ہو؟ خلقت کا تمبا کو' شہر بھر کی تمباکو کی دوکانوں سے وقتی کے طور اکٹھا کرتا...... چلم کے لیے چنگاریاں' تیرے میرے گھر سے......

نچولہے سے آگ کھینچتے ہوئے' چڑھی ہنڈیا کو بھی سونگھ لیتا۔ مطلب کا سالن ہوتو عین کھانے سمے' کسی نہ کسی بہانے نازل ہوجاتا۔ چونکہ سارے محلّے والے اُس کے اپنے تھے اور دَابو بھی ...... کوئی بھی مرنے جینے کا مسئلہ ہوتا آخر کام تو یہی چاچا گا چینا آتا۔"

آپ سوچ رہے ہوں گے یہ چاچا گا چینا کیا ہے؟ دراصل چاچا گا' چراغ کی بگڑی ہوئی شکل اور چینا؟ اس لیے کہتے کہ وہ برص پُھلبہری کا مریض تھا۔ اکہرے جسم کا جتنا رقبہ دکھائی دیتا وہ سُرخ و سپید بالکل گوروں کی طرح لگتا تھا۔ چہرے پہ محض ایک دو جگہ معمولی سے گندمی رنگ کے دھبے باقی تھے جن سے اندازہ ہوسکتا تھا کہ اس مرض سے پہلے اُس کی رنگت گہری گندمی رہی ہوگی؟ اس موذی مرض نے اس کے پتلے پتلے ہونٹوں' مسوڑوں دانتوں کے علاوہ آنکھوں کی پلکوں اور بھوؤں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوا تھا جس سے اس کا چہرہ مصنوعی اور خوفناک لگتا۔ بچے تو بچے' بڑے بھی اندھیرے سویرے اِس کا اچانک سامنا ہونے پہ سہم جاتے۔ اسی سبب وہ زیادہ تر جسم کے حصے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ڈھانپے رکھتا۔ سچّی بات یہی کہ چاچا گا چینا! بڑی غیر قدرتی زندگی بسر کر رہا تھا مگر شاید اَب اِس کا عادی ہو چکا تھا۔ اُس کی ضرورتیں بہت محدود اور خواہشیں تو شاید تھی ہی نہیں۔ باپ کا چھوڑا ہوا چھوٹا سا مکان ...... بیوی کو بیس برس قبل وہ فارغ کر چکا تھا۔ دو لڑکے شادی شدہ کویت میں کام کرتے تھے لیکن باپ سے کوئی سروکار نہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ اُن کی مرنے والی ماں کی موت کا ذمہ دار یہی اِن کا باپ تھا۔ مرنے والی یہ عورت بڑی حسین و جمیل تھی جبکہ چاچا گا چینا' معمولی شکل و صورت کا اَن پڑھ بندہ! ...... انتہا کا شکی مزاج' ہر لحظہ اپنی خوبرو چٹّی سفید بیوی پہ نظر رکھنے والا ...... معمولی کپڑے کنگھی پٹی بھی نہ کرنے دیتا۔ گھر کی چار دیواری میں یُوں ڈال رکھا تھا جیسے کوئی خوبصورت پرندے کو پنجرے میں ڈال دیتا ہے۔ ظلم کی انتہا کہ وہ اُسے' اُس کے میکے بھی نہ جانے دیتا اور نہ کسی رشتہ دار کو گھر گھسنے دیتا۔ کبھی سال میں ایک آدھ بار بوڑھی والدہ اور بیوہ بہن' اس کے پاس چلی آتی تھیں مگر بہت جلد تنگ پڑ کر واپس لوٹ جاتیں۔ اِن کے جانے کی بڑی وجہ' اِس کی ماٹھ تاتک کر گزارہ کرنے کی عادت' کپڑوں اور بدن سے اُٹھنے والے بدبُو کے بھبکے تھے۔

سفید داغ' پُھلبہری' برص وغیرہ کوڑھ کی ایک سُست رفتار قسم ہے جو نہایت نامحسوس انداز سے مریض کو ایک بھیانک بُھوت میں بدل کر رکھ دیتی ہے۔ جسم' منہ اور کپڑوں سے انتہائی غلیظ بدبو خارج ہوتی ہے۔ مریض خود تو عادی ہوجاتا ہے مگر آس پاس والا بڑی ناگواریت محسوس کرتا ہے۔ داغوں پہ ملنے لگانے والی مرہموں میں چونکہ انتہائی تیز سریع الاثر مفردات شامل ہوتے ہیں جو داغوں سے بدبُودار مادے' پسینہ کے ذریعہ خارج کرنے کے مُوجب ہوتے ہیں۔ اِس طرح برص کی بدبُو' مرہم کی بدبُوؤں سے

مِل کر تعفن کا طوفان بپا کر دیتی ہے۔ کسی دوسرے اِنسان کا قریب رہنا یا ایک کمرے میں سونا' بڑا کٹھن ہو جاتا ہے۔ بگڑے ہوئے برص' منہ پاؤں بغل کی گند' سوزاک گند' نسوانی رطوبت اور اِنسانی بدنیتی کی گند...... یہ بدبوئیں' طبع طبیعت کو تباہ کر دیتی ہیں...... رُوح کو ناشاد اور نفرت کو جنم دیتی ہیں۔

اکثر لوگ اپنی نا سمجھی' عدم تربیت اور بے حِسی کی بنا پہ غذا کھانے میں بے احتیاطی برتتے ہیں۔ بڑے بڑے لقمے' نہ بسم اللہ نہ الحمدللہ! صحیح طریقے سے کھانا نہ چبانا۔ پانی پینے کا طریقہ' نہ حلق سے نیچے اُتارنے کی ترتیب...... لقموں کا درمیانی وقفہ اور نہ اندازہ کہ کب کھانے سے ہاتھ کھینچنا ہے۔ میرے بابا' کہا کرتے تھے کہ دُرویش...... اکلِ حلال کمانا' خود لنگر تیار کرنا' مخلوق میں تقسیم کرنا پھر جو تھا' موٹا سا خود کھانا اور ہر لقمہ' گھونٹ پہ الحمدللہ کہنا...... سے شروع ہوتی ہے......!

اللہ کریم کے نوازنے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ کسی پیشی گواہی کی مَد میں جا کا چینا کچہری گیا ہوا تھا۔ واپسی میں دیر ہو گئی' بھوک سے بے دَم...... کھیسہ میں کوئی دھیلہ چھدا ہوتا تو وہیں کہیں دال دلیہ کر لیتا۔ تیز تیز قدم اُٹھائے کرشن نگر کے چھوٹے راستہ پہ ہو لیا کہ گھر محلے پہنچ کر کچھ کھانا پینا کرے۔ کرشن نگر' موٹے موٹے وِشنوان کاروباری ہندو رہتے تھے۔ مندر' دھرم شالے' بھوجن اور معاشی آسودگی اِدھر ہی نظر آتی تھی۔ وہ اِدھر کی ایک کشادہ سی گلی سے گزر رہا تھا۔ بھوک' گرمی کی بنا پہ سر چکراتا ہوا محسوس ہُوا۔ دائیں جانب' بجنگے جھنجے والی ایک وید کی دکان دکھائی دی۔ دَم دُرستی کی خاطر وہیں تھڑے پہ بیٹھ گیا۔ ہندو وید جی کسی پُستک میں مگن تھے۔ اس نے ہلکی سی کھانسی کی تو اُن کا دھیان' اُس کی جانب ہُوا!

نگاہ جو پتھر کے کلیجہ کے اندر بھی اُتر جاتی ہے وہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ اللہ کریم کے خاص بندوں کے پاس ہوتی ہے جنہوں نے اپنی زندگیوں کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کیا ہوتا ہے۔ وہ نفس کے غلام نہیں ہوتے...... تفکر' تدبر' تحمل اُن کا وطیرہ اور راضی' برضا رہنا' اِن کا خاصہ ہوتا ہے...... سرنگوں رہتے ہیں' مذہب مسلک' رنگ و نسل کی آڑ لے کر اِنسانیت کا استحصال نہیں کرتے۔ تنگ نظر' متشدد' انتہا پسند نہیں ہوتے......!

زمانہ دیدہ چشم کشیدہ اس بوڑھے وید کا بظاہر پیشہ طبابت دکھائی دیتا تھا...... مگر اندر بھیتر وہ ایک مہان رِشی تھا۔ دُنیا بھر کے معقول منقول علوم...... پُراسرار ودیا میں' پرتھوا آکاش کی شکتیوں شانتیوں کی جانکاری اور مختلف دین دھرموں شاستروں کتابوں پہ گہری دسترس بھی......!

جب کسی سنار' جوہری پارکھ کے پاس سونا چاندی' ہیرا موتی لایا جاتا ہے تو وہ پہلی نظر میں ہی اصل نقل ملاوٹ کھوٹ کھنکیڑ کا اندازہ کر لیتا ہے۔ اس کے لیے جانچ پڑتال ٹسٹ کسوٹی' تاؤ تلاؤ تو محض اِتمامِ حجت ہوتا ہے۔ اِسی طرح طبیب حاذق بھی مریض کا چہرہ دیکھ کر ہی اُس کے مرض کا اِدراک حاصل کر لیتا ہے۔ اس

صاحب نظر وید جی کو جانے کیا نظر آیا یا اس کی دگرگوں حالت پہ دیا آئی؟ اپنے سیوک کو کہہ کر کچھ جل بھوجن کرایا۔ کچھ سمے بعد گاجر کے مربہ کی پھانک کھلائی۔ جب اس کے کچھ سدھ بدھ قائم ہوئے تو بڑی رسان سے پاس بٹھا کر پوچھا۔

''بیٹا! کیا دھندہ کرتے ہو......؟''

اس نے بتایا۔ ''بس اللہ کی مخلوق کی خدمت کرتا ہوں۔ بیوی بچوں سے فارغ ہوں۔ سفید دھبوں کی اس بیماری نے عاجز کر رکھا ہے۔ پسینے سے پھوٹنے والی بدبو کی وجہ سے کوئی قریب نہیں پھٹکتا۔ آپ حکیم اور دیالو ہیں' میری اس بیماری اور بیکاری سے چھٹکارا دلا دیجیے۔''

وید جی نے بڑی تسلی سے اس کی بات سُنی...... پوچھا۔

''تمہارے آس پاس کوئی ایسا نرش...... جسے تمہاری بدبو' خوشبو محسوس ہوتی ہو' تم سے محبت کرتا ہو؟''

اس غیر معمولی سے سوال پہ اپنی آنکھیں جھپکاتا سا رہ گیا۔ جب کوئی جواب بن نہ پڑا تو بولا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں......؟''

''تم نے بتلایا کہ تمہارے بیوی بچے تو ہیں نہیں...... اَب مَیں جاننا چاہتا ہوں تمہارے ہاں کوئی ایسا' اپنے بیگانوں میں سے' جس کا تم سے من ملتا ہو' تمہیں اپنا سمجھتا ہو؟''

کچھ دیر اپنے اندر باہر جھانکتا ہوا بولا۔

''ایسا تو کوئی نہیں...... بس کچھ محلے دار' پرانے جاننے والے' جن کے مَیں کام آتا ہوں اور وہ میرا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ہاں' ایک ایسا لڑکا ہے جو میری بڑی عزت کرتا ہے۔ بیمار پڑوں تو دوا دارو بھی لا دیتا ہے۔ اُسے شاید مجھ سے بدبو نہیں آتی...... مجھے یاد ہے ایک بار وہ مجھے سہارا دے کر حکیم جی کے پاس لے گیا۔ مَیں نے یونہی کہہ دیا۔ تمہیں مجھ سے بدبو آئے گی مجھے اس طرح مت تھامو...... مجھے یاد ہے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں' منہ سے تو کچھ نہ بولا مگر میری کمر کے گرد گرفت اور مضبوط کر لی۔ ہاں' ایک اور بات بھی یاد ہے۔ میری کمر میں چتے داغوں پہ زور سے کھجلی چھڑی ہوئی تھی۔ وہاں تک ہاتھ پہنچ نہ رہا تھا۔ ایسی بے چینی ہوئی کہ دیوار پہ لگے سوکھے اُپلوں سے کمر رگڑ رہا تھا۔ وہ کہیں سے اِدھر آ نکلا میری حالت دیکھ بھاگا ہوا آیا۔ کھینچ کر پرے کیا۔ کمر سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ اپنی قمیص کھینچ کر اُتاری' میری کمر صاف کی اور پولے پولے سہلانے لگا۔ بس' اُس دن مَیں نے فیصلہ کر لیا۔ خودکشی نہیں مَیں جیوں گا۔

وید مہاراج! بس' پوری دُنیا میں صرف یہی ایک انسان ہے جس کو مجھ سے بدبو نہیں آتی۔ یہی میرا دوست ہے' اُسی سے مجھے محبت ہے۔ اس کا نام یحییٰ ہے۔ پٹھان ہے۔''

"یہ بھلا مانس کون ہے' کیا کار کرتا ہے؟"

"ہمارے محلے کا ایک شرارتی لڑکا ہے۔ اسکول جاتا نہ کوئی کام کرتا ہے۔ آوارہ گردی' چھوٹی موٹی چوریاں' ہر وہ حرکت جو کسی نکمے نچلے اور ندیدے بچے میں ہو سکتی ہے' پر اس میں عقل نقل' ذہانت اور ادب خدمت بہت زیادہ ہے۔ فقیروں درویشوں ملنگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ جو بھی ہے میری نظروں میں ایک مہان پُرش ہے۔ مگر آپ یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

وہ ایک شیشے کی برنی سے پیلے رنگ کی مرہم دکھاتے ہوئے بولے۔

"یہ ایک نایاب قیمتی اور انتہائی پُر اثر مرہم ہے جو پیلے رنگ کے مخملی سانپوں کی کینچلی اور سرسوں کی کونپلوں کے ملاپ سے بسنت رُت میں ہی بنایا جاتا ہے۔ اس کی تیاری میں چاندی کے سکے نہیں سونے کی اشرفیاں لاگت آتی ہے۔ یعنی سپیرے سانپ کے وزن برابر' سونا اُٹھاتے ہیں۔

مزید انکشاف کرتے ہوئے بتانے لگے۔ "اس جادوئی مرہم کا سب سے بڑا چمتکار یہ کہ اس کا استعمال' صرف ایک بار کیا جاتا ہے۔ بسنت رُت میں چندرما کے گھٹاؤ کے آخری دِنوں' پھوٹی سرسوں کے کھیت میں بیٹھ کے کوئی ایسا شخص' اس مرہم کو مریض کے سر پر لگائے' جو بد بُو اور کراہت کو انتہائی حد تک برداشت کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ پھر دَم' پُو پھوٹتے نئے' سرسوں کے پتوں سے سر صاف کر کے نہلا دے۔ اگر مرض دائیں بازو' ہاتھ ہونٹوں سے شروع ہوا تھا تو سورج کے نکلنے تک سر صاف ہو کر اپنے اصل رنگ پہ آ جائے گا اور پھر کبھی اثر انداز نہ ہوگا' اگر بائیں جانب سے شروع ہوا اور نوّے فیصد یا زیادہ اثر پذیر ہو چکا ہے تو پھر شفایابی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ بسنت بہار شروع ہو چکی ہے۔ یہ مرہم لے جاؤ اور اپنے اُسی ہمدرد دوست کو آمادہ کرو کہ وہ تمہارے سر پہ اچھی طرح مل دے پھر اگر تمہارے نصیبوں میں تندرست ہونا لکھا ہے تو اچھی بات! اگر نہیں تو اور بھی اچھی بات......؟"

چانے چھینے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ لیا۔ "بھلا تندرست نہ ہونے میں کونسی اچھی بات ہوگی؟"

"جب کوشش چنتا کے بعد بھی کسی کار میں کامیابی نہیں ملتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مالک کا کوئی اپنا اور فیصلہ ہے' جس میں بندے کے لیے کوئی بہتری ہوتی ہے۔"

چانے چھینے نے مرہم کی ڈبیا کو یوں دیکھا اور پکڑا جیسے اس میں تریاق نہ' کوئی پدم ناگ ہو......ہکلاتے ہوئے بولا۔

"مہاراج......! میں تو دمڑی کی ڈبیا جس خریدنے کے اہل نہیں ایسی قیمتی اور نایاب مرہم حاصل کرنے کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں گا؟ اور پھر اس مرہم کے لگانے کی اتنی احتیاطیں؟......وہ میرا دوست

بچے لاکھ میرا ہمدرد سہی مگر ہے تو اِک انسان! اپنے مطلب کی خاطر اُسے ایسی کڑی آزمائش میں ڈالنا' کچھ اچھا نہیں لگتا۔''''آپ نگاہ دھیان والے ہیں' اندر بھیتر جھانک لیتے ہیں' میرے جثے پہ ایک چپہ جگہ ایسی نہیں جو سفید داغوں سے خالی ہو۔ حتیٰ کہ تمام بال پلکیں ابرو سفید اور آنکھوں کی پتلیاں کرنجی رنگت اختیار کر چکی ہیں۔ اسی لیے سب مجھے چینا کہتے ہیں۔ کبھی آئینہ پہ نظر پڑ جائے تو مجھے اپنا آپ ایک باسی سنگھاڑا مچھلی کی طرح جاپ پڑتا ہے۔ یہ بغیر چانوں والی سنگاڑا مچھلی اور سفید سانپ مجھے زہر لگتی ہیں۔ بیوی میرا ساتھ چھوڑ' اللہ کے پاس چلی گئی...... بڑے بچے علیحدہ ہو گئے۔ چھوٹوں کو ننھیال والے لے گئے' گھر میں جھاڑو پھر گئی...... در و دیوار پہ جالے لٹک گئے۔ کئی بار ریل کی پٹڑی پہ لیٹنے کا خیال آیا...... مگر نہ جانے کیوں عمل نہ ہو سکا' جیسے کوئی نادیدہ طاقت مجھے پکڑ لیتی ہے۔''

مہاراج! اَب میری یہ حالت ہے کہ محلّے داروں کے ٹکڑوں پہ پڑا ہوں۔ اس بیماری کی وجہ سے کہیں ملازمت بھی نہیں کر سکتا۔ آج میں کچہری ایک جھوٹی گواہی دینے کے سلسلہ میں آیا تھا۔ خدا کو حاضر ناظر اور قرآن پہ ہاتھ رکھ کر میں نے جھوٹی گواہی دی۔ صرف اور صرف تین روپوں کی خاطر!'' چاچے چینے نے تین روپے کھیسے سے نکالے وید جی کے آگے رکھے۔ گھگھیاتے ہوئے فریاد کی۔ ''یہی کچھ میرے پلّے ہے...... ان کی جتنی دوا آتی ہے دے دیں۔ میرا من کہتا ہے میرے روگ کا اَنت بھوگ آپ کے کرم کرپا سے ملے گا۔''

وید جی نے کمال تحمل سے اُس کی مختصر طویل رُوداد سُنی...... گہری نظروں سے اُسے تولتے ہوئے گویا ہوئے۔

''لاکھ جتن کر ہارو' لیکھوں کا لکھا نہ ٹلے۔ کیوں جتن اَوش ہے۔ یہ طلسمی مرہم سنبھالو اور جیسے بتایا ویسے ہی اپنے سر پہ لگواؤ...... دیکھتے ہیں کیا چمتکار ہوتا ہے؟...... اور ہاں' مرہم سے داغ دھبے جاتے رہیں تو اگلے روز یہاں پہنچ جانا۔ اگر داغ دھبے اور گہرے ہو کر پھیل جائیں یعنی مرض ختم ہونے کی بجائے' مزید بڑھ جاتا ہے تو اگلے ماہ' چندرما کی بڑھوتی کے ساتویں دن' جو شکروار ہو گا' اسی سمے اِدھر میرے پاس پہنچ جانا۔ بقیہ بات' تب ہو گی۔''

چاچا چینا' مرہم لے کر میرے پاس آیا...... ساری بات بتائی۔ اس کی رام کہانی سُن کر نہ تو مجھے کوئی تعجب ہوا اور نہ میں نے کوئی توجہ دی۔ وہ کہتا رہا اور میں بڑی بے دلی سے سُنی اَن سُنی کرتا رہا کہ ایسی حرکتیں اُس کا روز مرہ تھیں۔ میری سرد مہری محسوس کرتے ہوئے تپ کر کہنے لگا۔

''یار! میں اتنی زبردست بات بتا رہا ہوں اور تم یوں اُکھڑے اُکھڑے سُن رہے ہو جیسے میں تمہیں کسی فضول سی فلم کی سٹوری سُنا رہا ہوں۔''

میں نے اُس کی خفگی کے قطع نظر' اسی لاپروائی سے جواب دیا۔

"گواہی اور کچہری کی حد تک تو مَیں نے بات توجّہ سے سُنی' مگر جب اِس تریدی وید کا ذکر آیا تو میری دلچسپی ختم ہوگئی۔"

بھنک کر پوچھنے لگا۔

"اُس کی ویدی نے تمہاری دلچسپی ختم کردی یا اُس کے تریدی ہونے نے......؟"

میرا موڈ کسی وجہ سے خراب تھا۔ مَیں نے اِسے آڑے ہاتھوں لینے کی ٹھانتے ہوئے پوچھا۔

"تم اِس شہر سیالکوٹ کے کسی مشہور حکیم طبیب کو جانتے ہو؟"

اُس نے احمقوں کی طرح دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"حکیم خادم علی' لالہ بیلی رام اور اپنے سبزی بازار والے حکیم صادق......!"

"بالکل ٹھیک! چاچاجی! ان کے علاوہ بھی اس شہر خوبی و خرابی میں کئی اور وید حکیم ڈاکٹر ہیں۔ ہندو مسلمان عیسائی اور سکھ بھی' لیکن ان کے درمیان ایک ایسا بندہ بھی ہے جو بندہ ہو کر بھی بندہ نہیں فرشتہ لگتا ہے۔ ڈاکٹروں حکیموں ویدوں سنیاسیوں رشیوں سے بڑھ کر کوئی مسیحا...... ہندو' مسلمانوں' سکھ عیسائیوں کی مخصوص محدود سوچ فکر سمجھ سے آگے کی ذہنیت وظرف کی اِک ہستی؟...... تم اُس راستے سے اکثر گزرے ہو گے۔ ہمارے محلّے سے کچہری جانے کا شارٹ کٹ راستہ پورن نگر سے نکلتا ہے۔ کھیت ختم ہوتے ہی دھرم شالہ اور بازار دکھائی دیتے ہیں۔ بازار میں رام دیال جج کی کوٹھی سے پہلے ہرزہ وار بھوت ہے۔ اس کے نیچے کی سات دوکانوں میں سے ساتویں دوکان کے باہر برآمدے میں دھوتی پہنے برہنہ گوتھلا سا انسان نما اِک عجوبہ' لکڑی کے تخت پہ براجمان ہوتا ہے۔ اُدھر سے گزرنے والا' چاہے نہ چاہے اُسے دیکھنے پہ ضرور مجبور ہوتا ہے۔ اُس کی پشت پیچھے اِک دوکان دکھائی دیتی ہے غور سے دیکھنے پہ بھی پتا نہیں چلتا کہ یہاں بکتا کیا ہے یا ہوتا کیا ہے؟ اس کی ہیئت کذائی اور دکھائی دینے والے اجزائے قدیمہ اور جدیدہ سے کچھ پلّے نہیں پڑتا۔ دیکھنے والا اپنے اندر باہر کی معاملت سے اگر کچھ نتیجہ حاصل کرلے تو وہ اس کی باطنی بصیرت ہے۔ کسی دائمی بیمار کو وہ اَوشد حالیہ دکھائی دے گی۔ بے آسرا کو آشرم' بھوکے پیاسے کو پرشاد خانہ...... جیون بِتیا کی کامنا والوں کو شمشان گھاٹ' من مات والوں کے لیے سنگسات...... انا الحق کہنے والوں کے لیے مقتل!...... دُنیا جہاں کی تمام خوشبوؤں کو آپس میں ضم کردیا جائے تو وہ یک رنگ اور بے باس ہو جاتی ہیں پھر کسی ایک خُوشبو کو دیگر خوشبوؤں سے جُدا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ کسی کا رنگ خیالا' کوئی صاف شفاف' کھارا کوئی میٹھا بھاری تو کوئی ہلکا...... زہریلا اور کوئی شفابار' بابرکت اور کوئی بے برکت...... وشال ساگر میں شامل ہوتے ہیں تو سارے باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ من و تُو کے تمام تلخ و ترش تردّد تمام ہوجاتے ہیں۔ یکتائی اِک آزاد سا آزار اور دُوئی اِک پابندی مُسکان......!"

جانا چیتنے نے اس گنجلک گفتگو سے اُوبھ کر پہلو بدلنے شروع کر دیے تھے۔ منہ سے کچھ کہنے بولنے کی جرأت کہاں سے لاتا۔ اُس کی بے چینی محسوس کر کے مَیں نے خود ہی موضوع کو تبدیل کرنا مناسب جانا۔

''اچھا بتاؤ' یہ مرہم کب لگوانی ہے؟''

کچھ آسانی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

''یار! مرہم تو آج رات ہی لگانی چاہیے...... ڈرتا بھی ہوں کہیں کام اور خراب نہ ہو جائے۔ اَب یہ تمہاری باتیں سن کر مَیں اور پریشان ہو گیا ہوں۔ ایک بات تو بتانا بھول گیا' ویدجی نے جو شربت پلایا' ایسا میٹھا خوش ذائقہ شربت پہلی بار پیا...... جسم میں جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اک دم تازگی طاقت کا احساس ہوا بھوک پیاس سب غائب...... ایسی تاثیر توانائی والا شربت ہمارے حکیموں' عطاروں کی دکانوں سے کیوں نہیں ملتا؟''

''تم نے کبھی شربتِ دینار یا شربتِ اشرفی پیا ہے؟''

وہ بھاڑ سا منہ کھولے مجھے تکنے لگا جیسے مَیں نے کہہ دیا ہو کہ تم نے کبھی پارے یا گندھک شورے کا شربتِ نوش جان کیا ہے؟...... بمشکل پوچھنے لگا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ڈالروں اور پونڈوں شلنگوں کا شربت بھی ہوتا ہوگا؟ مَیں نے پہلی بار تم سے ان شربتوں کے نام سنے ہیں۔ صندل بزوری' انار' گلاب' الائچی کے شربت پیئے ہیں مگر ویدجی والے شربت کی بات کچھ اور ہے۔''

''اس لیے کہ ویدجی آیورویدک کے مہان ویدی ہیں۔ ان کے پاس آیورویدک کی گیان شکتیوں کے علاوہ اور بہت سی بدیاؤں کی شکتیاں بھی ہوتی ہیں۔ ایسی شکتیاں' یوگیوں' منیوں کے ہاں ہی ہوتی ہیں اور ایسے مہان مُنش' خال خال ہی کہیں ہوتے ہیں اور اگر کہیں ہوتے ہیں تو اپنی پہچان نہیں کرواتے ہیں۔ بستیوں شہروں میں اُن کا وجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ بن جنگلوں پہاڑوں میں اپنی تپسیا ریاضت میں جٹے رہتے ہیں۔ مَیں حیران ہوں کہ تمہاری اُن سے مٹھ بھیڑ کیسے ہو گئی؟...... کہاں راجہ بھوج' کہاں گنگوا تیلی...... مَیں اسی وجہ سے تمہاری یہ ویدجی والی کہانی' کوئی فلمی سٹوری سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔''

ہلکا سا غصہ دکھانے کے بعد پوچھنے لگا۔

''تم ویدجی کے بارے اتنا کچھ کیونکر جانتے ہو اور یہ اَوکھی اَوکھی باتیں جو مجھے ابھی بتائی ہیں کیا اُن سے سیکھی ہیں؟ مَیں نے تو تمہیں کبھی اُن کے یا کسی وید سنیاسی رِشی کے پاس بیٹھے نہیں دیکھا؟''

مَیں نے جواب دیا۔ ''ہم ظاہری باطنی' آپس میں ایسے قریب نہیں ہیں جو مفصل ایک دوسرے کو جانتے سمجھتے ہوں۔ تمہارے سامنے ہی ہے کہ ایک گھر میں ساتھ رہنے والے' ایک ماں باپ کی اولاد' ایک

دوسرے کے بارے صحیح سے سب کچھ نہیں جانتے ہوتے۔ ہم تو محض محلے دار ہیں جو پرانے بزرگوں کے وقتوں سے ایک دوجوں کا ویہ لحاظ رکھتے ہیں۔ ویسے تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں جب سیالکوٹ میں موجود ہوتا ہوں تو ہر روز اُن کے درشن اور بھوجن کے لیے پورن نگر کا چکر ضرور لگاتا ہوں۔ میں اُنہیں کب سے جانتا ہوں' اُن سے کیا کچھ سیکھا پڑھا اور سمجھا' وہ اصل میں کیا ہیں؟ یہ سب کچھ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔ البتہ ایک بات ضرور تمہیں معلوم ہونی چاہیے کہ وہ دھارمک شاستروں' پرانی پستکوں' پرانوں' ودیاؤں اور ارضی افلاکی پراسرار علوم کے مہا گیانی' ودیالو اور برہمچاری ہیں۔ پریوار تو ہے مگر کوئی پتنی یا سنتان نہیں۔

اُن کے سورگباشی پتا جی' ہردوار کے مہان پنڈت تھے۔ بوڑھے ہو گئے مگر اولاد نرینہ سے محروم۔ علاج معالجہ' جھاڑ جنتر دکھشنا سے جب کوئی آس نہ بندھی تو کسی مسلمان کے کہنے سننے پہ بیس کوس دورے کلیر شریف صابر پیا کے مزار پہ پہنچا۔ آدھا سر' نہر کے پانی میں ڈبوئے پراتھنا کی' منت مانگی' سنتان کے لیے بنتی کی...... ہردوار کے پنڈتوں پجاریوں کا طریقہ ہے کہ وہ اپنا آدھا سر' گنگا کے پانی میں ڈبو کر پراتھنا کرتے ہیں۔ یہی انداز اس نے کلیر شریف کی نہر میں بھی اپنایا۔ رات گئے اپنی پراتھنا ختم کی...... بقیہ رات کا وقت بتانے کی خاطر منہ سر لپیٹے دربار کے صحن میں لیٹ گیا۔ سپنے میں دیکھتا ہے اس کی گود میں ایک پوٹلی گری ہے۔ آدھی ریشم اور آدھی سوت کے دھاگوں کی۔ اندر سے گوشت پوست کا ایک پتلا برآمد ہوتا ہے۔ مردانہ مگر لباس اور آرائش زنانہ...... غیب سے آواز آتی ہے۔ ''نہر کے پانی سے باہر رہ کر بات کرتا تو یہ کچھ نہ ہوتا۔ تو نے جو طریق اپنایا تجھے ویسے ہی ملا۔ اپنے پورب اوڑ پانستر کوس' پورن نگر میں بسر کرو!''...... ہوش برقرار ہوئے تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ واپس ہردوار پہنچے' مسلسل کئی مہینوں یہی سپنا دکھائی دیتا رہا۔ آخر اپنی پتنی کو تیار کیا اور چپکے سے ادھر نکل آئے۔ کھوجتے کھوجتے جب پورن نگر تک پہنچے تو ان کی پتنی امید سے تھی...... پنڈت جی کی اپنی یہ حالت کہ وہ آدھے برہمن اور آدھے مسلمان...... ہندوؤں مسلمانوں کے تمام رسوم و تہوار مناتے۔ دونوں مذاہب والی آپس داری' رواداری برقرار رکھی...... اختلافی بھید بھاؤ کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ صابر پیا کا لنگر سدا جاری رکھا۔''

اللہ کے سچے اور مخصوص بندوں کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں۔ پنڈت جی نے بظاہر اپنا دھرم بدلا اور نہ نام...... سر پہ چٹیا اور گلے میں جینؤ' ماتھے پہ تلک پاؤں میں کھڑاویں...... دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ کٹر ہندو برہمن ہیں مگر ذرا ٹٹولو تو اندر سے جبّے سے ایک مومن نکل آتا۔ مقابل میں ہندو مسلمان تلاش نہ کرتے انسان دیکھتے۔ اُنہوں نے دھرم شالے' مندر اگر بنوائے تو مدرسے اور مسجدیں بھی تعمیر کروائیں۔

جب دیہانت ہوا تو وہی گرو نانک جی والا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا...... جلائیں یا دفنائیں؟...... ہندوؤں کی

اکثریت تھی اُنہوں نے ارتھی اُٹھوائی اور شمشان گھاٹ لے گئے۔ منوں چندن کاٹھ اور دیسی گھی سے چتا کو آگ دکھائی۔ لکڑی اور گھی اتنا کہ دس ارتھیاں پھول بن جاویں ...... پر ادھر ایسی اَن ہونی ہوئی کہ جس نے سُنا مُنہ میں اُنگلیاں داب لیں۔ ناف سے نیچے کا جسم آگ کھا گیا اور اُوپر صحیح سلامت' بال کا سا سینک تک نہ لگا۔ نئے سرے سے تمام رسومات ہوئیں' بڑے بڑے بھاری بچاری اور پنڈت اکٹھے ہوئے۔ ہون ہُوا' اشلوک پڑھے گئے۔ پہلے سے زیادہ لکڑی گھی جلایا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باقی کا حصّہ اَب بھی سلامت رہا۔ تب ان وید جی نے' جن کی عمر اُس سے بمشکل چند برس تھی۔ پنڈتوں براہموں کو اپنا سپنا سنایا کہ پتا جی سورگباشی کا باقی جسم' جلایا نہ جا سکے گا۔ اس کو مسلمانوں کے طریقہ سے دفن کرنا پڑے گا۔ ہندوؤں میں اشتعال پھیل گیا۔ کوئی کچھ کہے اور کوئی کچھ۔ آخر فیصلہ ہوا کہ ہردوار اور سومناتھ سے فیصلہ لیا جائے۔ اُدھر سے فیصلہ آیا کہ زمین میں گڑھا کھود کر چتا جلائی جائے اور جلانے کے لیے لکڑی گھی کی مقدار بڑھا دی جائے۔ اگر ارتھی پھر بھی نہ جلے تو اسی گڑھے کی قبر میں دفنا دیا جائے ...... یہی کیا' لیکن وُہی کہ آگ نے بقیہ مُردہ جسم کا بال تک بیکا نہ کیا۔ تب مسلمان آ گئے اور غسل دے کر کفنایا' نمازِ جنازہ پڑھی اور اسی گڑھے کی قبر میں دفن کر دیا ...... یعنی جسم کا جو حصّہ' کلیر شریف کی نہر میں پانی میں ڈوبا رہا وہ جل گیا جو باہر رہا وہ دفن ہُوا ...... اس واقعہ سے ہندوؤں مسلمانوں میں اک کھلبلی سی مچ گئی۔ کئی ہندو مسلمان ہو گئے ...... ان کی قبر پہ مسلمانوں نے مزار بنا دیا اور چتا کی جگہ ایک مندر ......!''

چاچا چینا' کچھ ایسی محویت سے سُن رہا تھا کہ جیسے وہ جان سے گزر چکا ہو اور میں بھی سنانے میں یُوں مگن کہ وقت گزرنے کا خیال ہی نہ رہا۔

کہنے اور سُننے کا بھی کوئی ماحول بنتا ہے۔ کچھ باتیں' کام اور فیصلے' ہر وقت کرنے کے نہیں ہوتے' کر بھی گزریں تو اثر پذیر نہیں ہوتے۔ تجربہ بتاتا ہے موسم کا پھل' جوانی کی کمائی' شادی اَولاد' صحیح وقت پہ عمل اور فیصلہ' بہتر نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ ہر پل ساعت سماں' اپنے اپنے مخصوص سواد' سو سلوک رکھتا ہے۔ وقت کی راگنی اور بے وقت کا شور ...... وقت کی زبان' تیور تقاضا سمجھنے والا ہی تائیدِ تجنبط کا سزاوار ہو سکتا ہے۔

ایک لاڈلے بیٹے نے باپ سے ہاتھی کی فرمائش کی۔ ہاتھی بان' گلی گلی آوازے لگا رہا تھا۔ ٹکے کا ہاتھی' ٹکے کا ہاتھی لے لو ...... مفت ہی سمجھو' ٹکے کا ہاتھی۔ بچّے نے ضد کی کہ ہاتھی بہت سستا مل رہا ہے۔ تنگدستی کے مارے باپ نے بچّے سے کہا۔'' ٹکے میں بھی ہاتھی مہنگا ہے۔ آج کل سردی زوروں پہ ہے' ہاتھی جاڑا جلدی کھا جاتا ہے۔ موسمِ بہار میں اچھا سا ہاتھی لے دوں گا۔'' بچّہ بیچارا' باپ کی بات' بہانے میں آ کر صبر کے سنتو پی کر کُھلے موسم کا انتظار کرنے بیٹھ گیا۔ وقت ہو گزرا ...... قلاش باپ کے حالات پہ موسمِ بہاراں نہ اُترنا تھا نہ اُترا ......

اچانک وقت نے انگڑائی لی حالات ومعاملات میں خوشگوار تبدیلی آ گئی۔ نبھا نے دن لوٹ آئے' ہاتھ کشادہ ہو گیا۔ روپیہ پیسہ کی ریل پیل ہو گئی۔ ایک دوپہر' باپ بیٹا بیٹھے گلابی سردیوں کا لطف لے رہے تھے۔ گلی میں کوئی آواز لگا رہا تھا۔ "ہاتھی لے لو' ہاتھی! آسام کا سفید سدھایا ہوا ہاتھی۔ پکے پورے دانت' ڈیچی کی ڈا بو تانت' سونڈ کی سیدھی آنت' نہ کانت نہ بھانت؟ ہاتھی جیون بھر کا ساتھی"...... بچے آواز سُن کر کسمسایا تو ضرور مگر منہ سے کچھ نہ بولا کہ جاڑے کا موسم بھنبھنیا ہاتھی سردی کھا جاتے ہیں...... وہ سُنی اَن سُنی کر رہا تھا۔ ادھر باپ کی بھاری جیب میں روپہلی سکوں کی کھنکھناہٹ اُبھری۔ بیٹے سے کہا' ذرا لپک کر پوچھو ہاتھی کن داموں بیچ رہا ہے۔ وہ بھاگا بھاگا گیا لیکن منہ لٹکائے واپس لوٹا۔ باپ نے وجہ دریافت کی تو بولا۔

"وہ ہاتھی ہمارے کام کا نہیں ہے۔"

"کیا بوڑھا ہے کمزور یا بے ڈھبا ہے؟" باپ نے متردد ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاتھی اچھا ہے مگر دو عیب ہیں ایک جاڑے کا موسم کہ ہاتھی سردی کھا جاتا ہے۔ دوسرا عیب' ایک لاکھ روپیہ' جو اس کے دام ہیں۔" وہ مزید بتانے لگا۔ "پچھلے برس بھی یہی آدمی' ہاتھی بیچ رہا تھا۔ وہ ہاتھی' اس ہاتھی سے بھی زیادہ صحتمند اور خوبصورت تھا مگر قیمت ایک ٹکا تھی۔ ابا! پکا لاکھ روپیہ بتا رہا ہے۔"

باپ زانو پہ ہاتھ مار' کھلکھلا کر ہنسا۔ لاکھ روپوں کا توڑا ملازم سے اُٹھوایا' بیٹے سے کہا۔

"فوراً جا کر ہاتھی خرید لو۔ ایسا سستا ہاتھی پھر ہاتھ نہ لگے گا۔"

بیٹا حیران وپریشان باپ کو سوالیہ نظروں سے تکنے لگا' ہمت کر کے پوچھ بیٹھا۔

"ٹکے کا ہاتھی تو مہنگا اور آج لاکھ کا ہوا تو سستا...... سرد موسم بھی آڑے نہ آیا؟"

باپ نے بُرجستہ جواب میں کہا۔

"ساری سمیا' سمے کے سبھاؤ کی ہے۔ جاؤ ہاتھی خرید لو......!"

لوہا گرم ہو' ٹہنی ڈھنل نرم ہو...... آنکھ میں شرم ہو' سر پہ دستِ کرم ہو تو سب موسم' موسم بہار اور سب ہاتھی' ساتھی ہوتے ہیں۔ لوہار خوب جانتا ہوتا ہے کہ سُرخ رو تاپ کھائے لوہے کو کن ساعتوں میں اپنی منشا کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔ یہی سمان' ساعتیں' باغبان اور دہقان دھیان میں رکھتے ہیں۔!

## • عجب پریشاں ہے گفتگو میری......!

ملائیشیا کے دور افتادہ ایک گاؤں میں میرا ایک زراعت پیشہ بچہ رہتا ہے۔ بڑے عریض و وسیع

کھیت کھلیان' سرسبز مرغزار' تالاب' آبجوئیں' ثمر بار باغات' مویشیوں کے باڑے اس کی ملکیت میں ہیں۔ اُس کا اصل شوق' نباتات پہ تجربات اور تحقیقات کرنا ہے۔ وہ ہمہ اوقات' اپنی تجربہ گاہ اور کھیتوں میں جڑی بُوٹیوں سے جُڑا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔ درختوں' پودوں بھا بھڑ' بجنس' قلموں کونپلوں' جڑوں جھاڑوں بیجوں کی اقسام' نسل و اصل سے یوں واقف جیسے ہمارے ہاں' پشتینی میراثی ہوتے ہیں جو پچھلی کئی نسلوں کے شجرے ازبر رکھتے ہیں۔ کھادیں' گل' مختلف توڑوں جوڑوں سے پودوں' پھل پھولوں اور جڑی بوٹیوں کی نت نئی اقسام بھی دریافت کرتا رہتا۔ انہی کوششوں تجربوں کے نتیجہ میں اُس نے زعفران' قہوہ' انجیر' زیتون اور کالے گلاب کی چند ایک قسموں پہ تجربات کیئے۔ بہت حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔

بہت عرصہ پہلے اس کے بے حد اصرار پہ مجھے وہاں ملائیشیا جانا پڑا۔ دراصل وہ مجھے اپنی کامیابیاں اور فارم ہاؤس دکھانا اور اپنے بوڑھے نابینا باپ' جو کینسر کا مریض تھا' کے لیے دُعا اور دوا کرانا چاہتا تھا۔ ہمارے آپس کے تعلقات کا دورانیہ قریب قریب دس سال پہ محیط تھا۔ کسی آسودہ اوقات زمانہ میں' مجھ سے کچھ عربی رسم الخط میں خطاطی سرزد ہوگئی تھی۔ احباب کے اصرار پہ جب یہ سلسلہ دراز ہوا اور ایک اچھا خاصا کام اکٹھا ہوگیا۔ تب احباب نے ہلکی سی پبلک نمائش کا اہتمام بھی کر دیا۔ یہ میری خطاطی کی نمائش مقامی سطح پہ تھی۔ جسے فنی اعتبار سے کوئی پذیرائی نہ ملی...... چلو! دوست خوش ہو گئے اور مجھے بھی کچھ نام اور دام مل گئے۔ انگریزوں اور پاکستانیوں نے میرا کچھ کام خرید لیا تھا۔ ان خریداروں اور قدر شناسوں میں ایک "عقل کا اندھا" یہ ملائیشین ماہر نباتات بھی تھا جس نے میری ایک سورہ الکوثر والی چھوٹی سی پینٹنگ' بڑے داموں خرید لی تھی۔ میرے فن کی خوب تعریف کرتے ہوئے میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"آپ کی خطاطی کے انداز نے مجھے ایک نئی راہ سجھائی ہے۔ ایک ایسا آئیڈیا ملا جس سے میں بہت سا کام کرسکتا ہوں۔"

اپنی اس پذیرائی پہ مجھے تعجب بھی ہُوا کہ فنی حوالے سے میرے کام میں مزید بہتری اور معیار کی گنجائش بہر طور موجود تھی جس کا مجھے احساس بھی تھا۔ اس معاملہ میں' میں پورا پورا "کمیذ الرحمان" تھا...... لہٰذا میں اس ملائیشین کی طرف سے ملنے والی پذیرائی اور پیسوں کو نعمتِ غیبی جان کر ڈکار گیا۔ مجھے کیا علم کہ یہ اُدھیڑ عمر ملائیشین' میری جان کو ہی آ جائے گا۔

وہ انگلینڈ میں اپنے بیٹے کے ہاں آیا ہوا تھا جو بریڈفورڈ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا۔ دونوں میرے ریسٹورنٹ کے قریب ہوسٹل میں رہتے تھے اور اکثر رات کا کھانا میرے ریسٹورنٹ میں کھایا کرتے۔ مسلمان ہونے کے ناطے' رسمی سی علیک سلیک ہوئی۔ دو چار ملاقاتوں میں احساس ہوا کہ عبدالحنان تمیمی' ایک مخلص'

بے پناہ صلاحیتوں کا مالک' دردمند مسلمان ہے۔ پشتینی ثروت مند اور ہمیشہ درویشوں فقیروں کی صحبت اختیار کرنے کا آرزومند رہتا ہے۔ بہت جلد ہم دونوں نے اک دوجے کو کھوج لیا تھا۔ میرے ریسٹورنٹ کے اندر دیواروں اور مختلف نمایاں جگہوں پہ میری مصوّر خطاطی کے طغرے بڑے زیبائی سے آویزاں تھے کہ اندر موجود ہر فرد کو دعوت نظارہ دیتے تھے۔ ایسے غیر مسلم افراد' جو عربی رسم الخط سے آشنا نہ بھی ہوتے" محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتے اور انہیں سمجھنے کی خاطر' مجھ سے رجوع کرتے۔

عبدالحنان تمیمی بھی میرے فن پاروں کی تعریف کرتے نہ تھکتا تھا۔ جانے میرے مَن میں کیا سمائی' میں نے اُسے اپنے گھر' عشائیہ پہ مدعو کرلیا۔ یہاں مجھے اس کی وارفتگی کا اک حیران کر دینے والا مشاہدہ ہُوا۔ کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے تا کہ ریلیکس موڈ میں بیٹھ کے ہلکی پھلکی گفتگو کرسکیں۔ ادھر دائیں دیوار پہ میرا ایک مستطیل طغرا' جس پہ کلمہ طیبہ کچھ اس انداز سے لکھا ہُوا تھا۔ جیسے سبزے کی باڑ پہ قدرتی طور پہ اُگا ہو۔ شاخسار' پتّے' کونپلیں' غنچے سب کچھ ایسا قدرتی کہ کہیں بھی یہ گمان نہ ہوتا کہ توڑ مروڑ یا کاٹ چھانٹ کر بنایا گیا ہے' ایسے غیر معمولی فن پارے جو عام ڈگر سے ہٹ کر وجود میں آتے ہیں۔ یقیناً وہ تائید ایزدی کے بغیر ممکن نہیں ہوتے' کبھی کبھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ جانے کب اور کس طرح سے یہ طُغرا مجھ سے بن پایا تھا۔ بعینہٖ جیسے مجھ سے کچھ ایسی تحریریں قلم زد ہو جاتی ہیں کہ میں قسم اُٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے نہیں لکھیں لیکن میں اپنا نام دھرنے پہ خود کو مجبور پاتا ہوں۔

اس جگہ لانے کا مقصد' چائے کافی اور ہلکی پھلکی گپ شپ تھا مگر معاملہ بالکل اُلٹا ہو گیا۔ وہ منہ وا کیے' بٹ بٹ طغرے کو دیکھنے لگا جیسے کوئی ایسا شہکار دیکھ لیا ہو جس کی نظیر کہیں اور نہ ہو۔ اُس کی میری خطاطی سے وارفتگی کا اندازہ تو مجھے تھا لیکن ایسی بھی شیفتگی کیا؟...... میرے دل میں خیال آیا' یہ شخص یا تو کوئی سنکی ہے یا پھر اسے مجھ سے کوئی مطلب ہے جو بے جا تعریف کر کے مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن فوراً بعد' میری یہ بدگمانی دور ہو گئی اور شرمندگی بھی کہ ناحق' اس معصوم ذی الحس انسان پہ شبہ ہُوا۔

بعض حد سے بڑھی ہوئی عقیدتیں' محبتیں' نفرتیں' احتیاطیں' اعتقاد' اعتماد' بے تکلفیاں وغیرہ بڑی دُکھن دیتی ہیں۔ اسی طرح بے سوچے سمجھے جانے کی بدگمانیاں' خوش فہمیاں بھی پریشانیاں اور پچھتاوے کا باعث بن جاتی ہیں۔ انسان اپنے محدود فہم و گمان پہ بھروسہ دھرتے ہوئے یکطرفہ فیصلے کرنے میں بڑی عُجلت دکھاتا ہے۔ سمجھ آنے پہ پھر اتنی ہی تیزی سے واپس پلٹتا ہے اتنی دیر میں نتائج کی سرسوں پک کر کولہوں میں پِڑ جاتی ہے۔ تجربہ میں آیا کہ جو افراد' مول تول' عہد باندھتے' دوستی دشمنی' کوئی فیصلہ کرنے' رائے قائم کرنے" نتیجہ اخذ کرنے جلدی بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ بہت نقصان اُٹھاتے ہیں۔ تدبر اور تفکر' دونوں الفاظ پہ تشدید واقع ہے جو یہ

اشارہ دیتی ہے کہ کم از کم دو سو مرتبہ سوچو پھر کوئی فیصلہ کرو۔ جلدی کام شیطان کا...... کہتے ہیں کسی کو دوست کہنے سے پیشتر اُس کے ساتھ کم از کم پانچ سیر نمک کھاؤ۔

اَبلیس سے بھی کچھ اسی نوعیت کی خطا ہوگئی تھی۔ سہو نسیان تو بشریت کے تقاضے ٹھہرے' قدسیوں کے نہیں مگر مشیت الٰہی سے کیا بعید......؟

میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ میں تحمل اور بردباری سے وظیفہ ہائے زندگی ادا کروں مگر دو کام ایسے ہیں کہ میں اُن کی ادائیگی میں پرلے درجہ کا جلد باز اور بے صبرا واقع ہوا ہوں۔ حالات اور رزق پانی' اگر میرے سفر کا ہلکا سا اشارہ دے دیں یعنی ایک فیصد بھی اگر شائبہ ہو جائے تو باقی ننانوے فیصد انتظامات میری طرف سے خود بخود ہو جاتے ہیں۔ صبح لنڈے بازار سے سردیوں کے کپڑے خریدنے کا پروگرام ہوتا ہے مگر لنڈا' لندن میں بدل جاتا ہے' لندن کے ٹکٹ کٹ جاتے ہیں اور میں ایئر پورٹ پہ ہوتا ہوں۔ اچھرے کو آسٹریلیا بننے کچھ دیر نہیں لگتی۔ انارکلی بازار اجمیر شریف کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ کہنا یہ کہ میرے اندر باہر کے سفر میں انتہائی سرعت اور عجلت لکھی گئی ہے۔ دوسرا کام یہ کہ اپنے یا بیگانے کی خاطر اگر کوئی فلاح و بہتری کا کام برابر آ جائے تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا' میری حد درجہ کوشش ہوتی ہے فوراً سے پہلے اُس کا کام ہو جائے۔ آپ یقین کریں چند دنوں کی محدود' مدت میں تین تین شادیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ میری عجیب سی کلپنا بنی' جب تک پیش نظر مسئلہ' حل نہ ہو جائے' میں چین نہیں پکڑتا۔ فرمایا گیا' نیکی کے کام' کسی کی بہتری کے لیے کوئی عمل' بالغ بچوں کے نکاح' مُردے کو دفنانے میں' بھوکے کو کھلانے میں جوان بچی کے نکاح میں دیر نہ کرو...... پتا نہیں پھر توفیق ملے نہ ملے' فوراً کمربستہ ہو جاؤ۔''

چانا چینا' میری بے محل اور بے تکی گفتگو سے بے مزہ ہوتے بولا۔

''تم نے دو کام بتائے ہیں جن میں تم جلدی کرتے ہو اگر ایک چھوٹا سا میرا یہ مرہم لگانے والا کام بھی اپنی اسی عجلت سے کر دو تو تیرا بڑا احسان ہوگا۔ اگر میں یہ مرہم خود اپنے تمام جسم پہ لگا سکتا تو ویدجی کبھی نہ کہتے کہ تم اپنے کسی ایسے جاننے والے سے مرہم لگواؤ جو انسان دوستی کے حوالہ سے تمہارے قریب ہو۔ جسے تمہارے جسم سے بدبو نہ آئے۔ تمہیں اللہ کی مخلوق سمجھتا ہو۔ ایسا بندہ' جس کے رُوبرو تم اپنا جسم تو کیا' دل اور رُوح تک کھول سکو۔''

میں اُس کے چہرے کی جانب ہٹ ہٹ تک رہا تھا...... سوچنے لگا' چانے چینے جیسا اَن پڑھ اور اُجڈ آدمی' ایک بار ویدجی جیسے گیانی دھیانی سے مل کر کیا آیا کہ اُس کے رویہ اور گفتگو میں ایک واضح تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ سچ ہے کسی اندر باہر سے اُجلے انسان کے پاس ایک لمحہ بیٹھنا' صدیوں کی بیہانہ ظلمتوں کو چندیا دیتا

ہے۔ گلستان کے قریب سے گزرو تو مشامِ جاں معطر ہو جاتی ہے۔ قلب و قواء میں طراوت دَوڑنے لگتی ہے۔ رُوش رَوَیہ میں رَسان پیدا ہوتی ہے جبکہ کمیلا مذبح یا رُوڑی ڈھیر کا راستہ ...... 'دُھندلاہٹ ڈھوک اور دَم ذابہ پیدا کرتا ہے۔

''کس سوچ میں پڑ گئے ......؟'' وہ مجھے یوں گم صم سا پا کر پوچھنے لگا۔

میں نے اُس کی جانب نرمی سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''سوچ رہا ہوں کہ وَید جی سے محض ملنے سے ہی تم میں ایسی نمایاں تبدیلی آ گئی ہے۔ اُن کے مکمل علاج سے پتا نہیں کیا کچھ ہو جائے؟''

''کچھ ہو گا تو تب جب تم مرہم لگاؤ گے۔ میں کپڑے اُتارتا ہوں تم اللہ کا نام لے کر مرہم ملو۔''

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟ بظاہر یہ مرہم لگانے کا کام نہ تو کوئی مشکل تھا اور نہ کوئی ایسی وجہ کہ انکار کر سکوں ...... اس سے خاصی بے تکلفی یاری دوستی تھی۔ میں اُسے تمام بشری قباحتوں کے باوجود ایک مخلص اور بھولا بھالا' بے ضرر انسان سمجھتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ جس میں اخلاص ہو اُس کی ایک سو ایک کمزوریوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ ایک وفادار 'کتا' کئی منافق' مطلب پرست دوستوں پہ بھاری پڑتا ہے۔ اگر زیورِ تعلیم' کسی کے ظاہری باطنی' انسانی اخلاقی' مادی اور رُوحانی خدوخال' محاسن و معاملہ کو نکھارنے سے عاجز ہو تو ایسے الزام سے بہتر وہ اَن پڑھ غیر متمدن سیدھا سادہ فرد ہے جو کسی کا بُرا نہیں سوچتا ...... ہر ایک کو اپنے سے بہتر انسان گردانتا ہے۔ کسی کے کام آنا اپنی سعادت سمجھتا ہے ...... تکبر و تفاخر' رشک و حسد کے معنی تک نہیں جانتا بس ......! اسی طرح کی کچھ ادائیں تھیں جو جاناچینے کا وصف تھیں اور میں ان کی خوب پہچان رکھتا تھا۔

''یار! تم کہاں پھنس گئے ہو؟ جلدی سے مرہم ملو ...... عشاء کی نماز بھی ہو چکی اور تم ابھی تک باتوں کے گالڑ دوڑا رہے ہو؟''

غرض مند دیوانہ ہوتا ہے ...... اُس کے پیشِ نظر صرف اور صرف اپنی غرض ہوتی ہے وہ محض رُوبرو دیکھتا ہے باقی پانچ اطراف اغماض برتتا ہے اور چارہ ساز' کسی چارا کاٹنے والے کو نہیں کہتے ...... چہار دانگ عالم اِن کے تصرف میں ہوتے ہیں۔

وَید جی بھی ایک چارہ ساز کے منصب پہ فائز تھے۔ ایسے منتخب لوگوں کو وَلی قطب بھگت گیانی' فقیر درویش' رشی مُنی' دھرماتما' اَبدال' صوفی' سالک مجذوب وغیرہ یا جو بھی کوئی اپنی زبان بیان یا سمجھ سے کہہ لے لیکن بنیادی مسلک و مناصب سب کے ایک ہی ہیں' بس آگے دین دھرم کی تاویلیں اور اکائیاں مختلف ہیں۔

تعصب تمرّد اور تنفّر کی عینک اُتار کر دیکھا جائے تو سب ایک ہی رب کے بندے دکھائی دیتے ہیں۔ کائنات اور فطرت کے رازوں کے طالب علم خوب جانتے ہیں کہ قادرِ مطلق کی حقانیت وحدانیت، جوہرِ انسانیت، تقبیرت اور تسلیم و رضا ہی اصل عناصر ہیں جن سے بشریت کے معنی و مقاصد وضع اور واضح ہوتے ہیں۔

اُتاؤلا تو باؤلا ہوتا ہے۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا!

"ہر کام کا اِک وقت اور ہر وقت کا بھی اِک کام ہوتا ہے۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے اور تم بھی تھکے تھکے دکھائی دے رہے ہو۔ جاؤ، تم بھی سو جاؤ، یہ وقت مرہم لگانے کا نہیں......"

اصل میں، میں مرہم لگانے سے گریز کر رہا تھا۔ اگر میرے مرہم لگانے سے افاقہ ہو گیا تو وید جی کی جے جے کار...... اور اگر فائدہ نہ ہوا تو مجھے لعن پھٹکار کہ میں ہی منحوس لعنتی تھا۔ ظرف و حرف، فہم و فکر کے کوتاہ سے نیکی بھلائی بھی سوچ سمجھ سے کرنی چاہیے کہ اِدھر بدگمانی اور شک و شبہات کچھ فراواں ہوتے ہیں۔

وہ جھنجھلا کر کہنے لگا۔

"یار! دو گھنٹے سے مرہم لگانے کے چکر میں اِدھر بٹھا رکھا ہے۔ اَب کہتے ہو کہ مرہم نہیں لگاتی، نیند آ رہی ہے۔"

"مرہم لگوانی ہے مگر کون سے دن، یہ تو بتایا ہوگا؟"

یاد کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے کچھ یاد تو نہیں، مرہم دی تو لگانے کے لیے ہی ہے اور جب لگانی ہی ہے تو آج سے ہی شروع کیوں نہ کی جائے۔"

"...... اور اگر آج کی بجائے کل لگائی جائے تو کیا حرج ہے، بلکہ کچھ بہتر ہی ہوگا۔ کل بدھ وار ہے، سنا نہیں "بدھ، کام سدھ"...... اچھی طرح نہا دھو بھی لینا، کچھ سفید سوتی کپڑا، چادر اور صفائی کے لیے...... مچھلیوں، مکھیوں، مچھروں کے لنگر پانی کا بندوبست بھی......!"

"یہ مچھلیوں، مکھیوں، مچھروں کی بات سمجھ میں نہیں آئی؟"

"ضروری نہیں ہر اِک بات سمجھ میں آئے...... یہ مچھلیاں، مچھر مکھیاں وغیرہ اِس نامراد مرض برص کے لاحقے ہیں۔ ایک حد تک یہ تینوں چیزیں اِس مرض کی وجہ بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم اِن کی مضرت سے بچ پائیں اور اِن کے لنگر پانی کا کچھ خیال کر لیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اِس میں کوئی بُرائی ہے۔"

وہ ہکا بکا سا میری انوکھی سی باتیں سُن رہا تھا...... بگلے سی لمبی گردن اُٹھائے، تھوک سے حلق تر کرتے ہوئے ممیایا۔

"یار! یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟ اس سے پہلے ایسی نپی تُلی باتیں تمہارے مُنہ سے کبھی نہ سُنی تھیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم وہ نہیں جو پہلے تھے؟"

مَیں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"مَیں تو جا رہا ہوں گھر...... تمہیں تو کوئی پوچھنے پاچھنے والا نہیں' پر میری پٹائی ہو جائے گی اور ہاں' تم نے صحیح کہا کہ مَیں آج کچھ مختلف دکھائی دے رہا ہوں۔ ایسا ہی ہے' عمرِ رواں کا ہر گزرا ہوا لمحہ' اگلی ساعت میں مُعطل ہو جاتا ہے...... عہدِ ماضی' دُھندلکے میں کہیں ڈوب جاتا ہے۔ سنجیدہ بڑھاپا' مست جوانی کے بے ہنگم قہقہوں کا مفلوج مکافات ہوتا ہے۔ تبدّل کا یہ موسم' سدا بہار' سدا رنگ...... یہی زندگی کا محور' مقصد و مصدر ہے۔ آخر ہر کسی کو یہ سزا ملنی ہوتی ہے۔ کیونکہ فطرت اور مقدرت' بہر طور مقدم ہے۔"

مَیں نے جاتے جاتے' آج شب کی کشمکش تکلّف کا آخری تیر بھی پھینک ہی دیا۔

"جانے چینے! اُٹھو گھوڑے گدھے بیچ کر سکون سے سو جاؤ۔"

اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا۔ مَیں یہ جا وہ جا......!

نورا تارزن چوکیدار' ہماری گلی کا چکر لگا کر قصائیوں کے محلے کی جانب بڑھ چکا تھا۔ "جاگدے رہنا" مانوس آواز کی بازگشت سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کس گلی کوچے یا سڑک پہ ہے۔ مَیں چونکہ مُنتے بلّی چمگادڑ کی مانند راتوں کو ٹوٹ ہونے والا جانور تھا اس لیے گھر والوں سے الگ ہی کھٹولا ڈالتا...... وہ نیچے صحن میں ہوتے اور مَیں اُوپر کوٹھے پہ تارے گنتا رہتا۔ نیچے سونا اُن کی مجبوری تھی' عشاء پڑھ کر تسبیحات کے بعد وہ سرِشب ہی بستروں پہ پڑ جاتے کہ فجر کی اذان سے پیشتر بیدار ہونا اُن کا معمول تھا جبکہ میرے معمولات میں' دن بھر کے مُنتے کُھنسی کے علاوہ آدھی رات تک' دوستوں یاروں کے ساتھ آوارہ گردی' فلم کے آخری شو کا نے بجانے اور دیگر ناقابلِ بیان شغل و شرابا میں وقت اور نیند کا زیاں کرنے کے بعد' گھر میں سیدھے راستے سے داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا مَیں دیوار پھلانگ کر یا ہمسایوں کی چھتوں سے ہوتا ہُوا اپنے کوٹھے پہ پہنچ جاتا...... اِک نظر نیچے صحن میں خرّاٹے توڑتے ہوئے والدین اور ہمشیرہ پہ ڈال کر اپنے ٹیڑھے میڑھے کھٹولے پہ لیٹ جاتا......

کھاٹ بڑی ہوتی ہے چھوٹے بڑے سب لیٹ بیٹھ سکتے ہیں' کھٹولہ چھوٹی کھاٹ ہوتی ہے۔ تنگ مختصر سی...... چھوٹے بچے' لڑکے بالے' اس پہ خوب آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ ہم دونوں بہن بھائی کے الگ الگ کھٹولے تھے۔ بہن والا قدرے ہلکا باریک بُنائی والا اور چاروں کونے پائے قائم' جبکہ میرے والا میری طرح بے ڈھبا' اُدھڑا' اُدھڑا اور چاروں پاؤں کا کھینچو تین پائے اگر فرش پہ ٹکے ہیں تو چوتھا اُٹھا ہُوا' گویا

چاروں پائے ٹکانا اُس کی خُو میں ہی نہ تھا۔ پایوں کی چولوں میں کچھ خلائیں واقع ہوئی تھیں اور کچھ کجیاں بھی کہ بیٹھتے، کروٹ بدلتے یا اُدبتے پھیلتے نسکرتے، ان سے کچھ غیر مانوس، یبوست میں ڈوبی ہوئی کراہیں اُبھرتی تھیں......"

سیانے عمر چشیدہ بوڑھے خُوب سمجھتے ہیں کہ ٹوٹتی رات، کھوچل چارپائی کی چرچراہٹ، بھوتری بلیوں کی غُرغُراہٹ، بے دانت مائیوں کی بڑبڑاہٹ، کچی سڑک پہ کسی چھکڑے کی گڑگڑاہٹ، دمِ ساوہ کے مریض کے کھانسنے کی کھڑکھڑاہٹ کیسی بدمزگی اور کوفت پیدا کرتی ہے......

ہمشیرہ اپنا کھٹولہ مجھ سے بچا کر رکھتی تھی...... سہیلیوں کی آمد پہ اُن کی خاطر تواضع اور کبھی کبھار لکھنا پڑھنا کاڑھنا پرونا بھی ہو جاتا۔ ضرورت نہ ہوتی تو اِسے باورچی خانہ کے پہلو میں دیوار کے ساتھ آسودہ کر دیتی۔ یہی وجہ کہ کھٹولہ موسموں اور میرے دستبرد سے بچا ہوا تھا۔ میرے کھٹولے کے نصیب، میری طرح تھے۔ کوٹھے پہ تین فٹ اُونچے پردے والی اجابت گاہ کے ساتھ پہلو پہ پڑا یا بچھا رہتا۔ دونوں صُورتوں میں اِس کی حالت ویدنی ہوتی...... اس کے بازو رانیں تانگیں گوڑے گٹے تمام کسی اَبدال کے وظیفہ ہائے شب و روز کی مانند چیدہ و دریدہ دکھائی دیتے۔ اس کے چہار پائے چوب میں سے ایک تو ازل سے ہی لنگ تاز تھا کہ کسی طور فرش پہ کوہ جمانہ پاتا۔ باقی تینوں بھی ضعف ہائے پیرانہ سالی اور گھریلو خستہ حالی سے شکوہ سنج تھے۔

ناک کو اُلٹا پڑھو تو کان ہوتا ہے۔ کان تین طرح کے ہوتے ہیں یا ہوتی ہیں۔ سود مند کان وہ ہوتی ہیں جن سے معدنیات برآمد ہوتی ہیں، از قسم ہیرے جواہرات، تیل گیس، کوئلہ سونا چاندی، تانبا، نکل جست، پارہ ابرق، پلاٹینم، لوہا، نمک وغیرہ اس کے علاوہ ایک اور کان ہوتا ہے جو اِنسانی جسم کے اُوپر والے خطہ میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ٹیڑھی میڑھی تنگ و تاریک غاریں، خاردار جھاڑ جھنکاڑ اور ٹوٹے بٹے ہوتے ہیں۔ دیگر کانوں کی طرح اِس کان سے معدنیات کی بجائے "کاندنیات" نکلتی ہیں بلکہ اِنہیں مختلف ننھے منے اُوزاروں سے زبردستی کھرچ کھرچ نکالا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ان برآمدات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پیپ، خشک بھوسی، جمے ہوئے سکڑے ہنگ ہلدی جیسی پیلی پیلی مروڑیاں، کبھی کبھی خنوط شدہ مچھر، مکھی، بھڑ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سڑے بجھنے بال اور کن کھجورے بھی پائے جاتے ہیں۔ کچھ کان کن ٹائپ کے لوگ عادتاً بھی کسی تنکے، ماچس کی تیلی، کیل کانٹے...... کچھ نہ ملے تو کاغذ پنی کی پھریری سے ہی کان کنی شروع کر دیتے ہیں اِس اُمید پہ کہ کوشش جستجو کرنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ مگر کان کے "پردہ بکارت" کو مخدوش کرنے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔ ویسے کُہنہ مشق پیشہ ور کن میلیے، کا کمال ہنر کہ وہ آپ کے کان کے غار سے صدیوں پرانے وہ جانور بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے نکال سکتے ہیں کہ جن کا ذکر اَساطیری قصے کہانیوں اور جن کے اُدھورے ڈھانچے

عجائب خانوں میں پڑے ملتے ہیں......

آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ انسانی کان اور بھی کئی کام آتا ہے۔ مثلاً بزرگ اور سکول مکتب کے اُستاذ انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی کے بڑھے ہوئے ناخنوں کی چٹکی سے چھیدنے تو یہ استغفار کرنے مسوسنے اینٹھنے اور مرغا بن کر پکڑنے کے لیے بھی موزوں ثابت ہُوا ہے۔

لوکی آکھدے بالناتھ جوگی ول جاندا اے پار لنگاوندا

اپنے بِلاّ چوگیاں والے باوا بالناتھ کے جوگ کا سارا زور ہی کانوں پہ تھا۔ وہ اپنے چیلوں کی پہلی تربیت ہی کانوں کی لَوویں چھید کر مَوٹے مَوٹے بالے پہنوا کے کرتا تھا۔ رانجھا بیچارے کے ساتھ بھی یہی ناروا سلوک کیا گیا۔ ہیر کے شوق اور عشق میں اچھے خاصے کان پھڑوا بیٹھا اور شاید بالناتھ کی نسبت سے ہی کانوں کی مندروں کو "بالے" کہا گیا ہوگا؟

بات میرے عجیب الجثت کھٹولے سے شروع ہوئی تھی کہ میں رات کے کسی بھی پہر کوٹھے ناپتا دیواریں پھلانگتا ہوا دبے پاؤں کوٹھے پہ پہنچ کر اپنے جیسے اس کھٹولے پہ دراز ہو جاتا...... پہلے تو یہ میرے وجود کو سہارتے ہی دو چار دردناک قسم کی چیخیں نکالتا۔ میں دم سادھ کر اسے احساس دلانے کی ناکام جستجو کرتا کہ میں کیا میرا وجود کیا؟ میں ایک بار پھر دم سادھ لیتا۔ سُنا ہے دم دبا لینے سے بے وزنی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ملنگ کھٹولے کے ساتھ شروع سے ہی ایسے ہوتا رہا۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی اس کی مرمت یا بان کی نئی بُنائی ہوئی ہو نیا سیرو پایہ ڈالا ہو۔ سردی گرمی برسات...... کوٹھے پہ ہی بیت الخلاء کی دیوار سے لگا رہتا۔ کوٹھے ٹیپاں بلیاں چھپکلیاں کرلیاں بڈیاں کھٹمل پسو اور دیگر حشرات الارض وغیرہ اور چوہوں کے لیے یہ ایک آشرم کا مقام رکھتا تھا۔ یہ میرے لیے محض استراحت و راحت کا سامان ہی نہیں بلکہ جھولنے کے لیے جھولا بھی تھا۔ پاؤں کے اُنگلیوں کی خارش مٹانے کے لیے اس کے اُلجھے کھردرے بان کی رسیاں بڑی مہربان ثابت ہوتیں۔ اصل چیز اس کی ازلی کان تھی...... کان اُس ٹیڑھ کو کہتے ہیں جو گرم سرد موسموں دھوپ بارش میں پڑے رہنے کی وجہ سے کھاٹ کھٹولے میں پڑ جاتی ہے۔ کان پڑی چارپائی کھٹولے کھاٹ کے چاروں پاؤں بازوؤں رانوں میں ایسا نفاق ہوتا ہے کہ کسی کا مُنہ مزاج ایک سا نہیں رہتا۔ جغرافیہ الجبرا ایسا عجیب و غریب کہ چارپائی کسی پہلے دَور کے خلائی جہاز کی بیڑی کا اُدھڑا ہوا کوئی ڈھانچہ دکھائی دیتی ہے۔

کمر میں پڑی چک گردن کا بل...... مرکز سے ٹلی ناف جبڑے کے تکلے کی ٹیڑھ اور چارپائی میں پڑی کان ہر کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا ٹھیک نہیں کرسکتا۔ اُلٹی پیدائش والا یا جس نے کنجی عورت کے صرف بائیں پستان سے دودھ چکھا ہو۔ چاند گرہن کی پہلی منزل کا پیدائشی...... میرا نہیں خیال کہ میرے اس نادر روزگار کھٹولے کی

کان منقذ کر دیا۔ اصحاب خاص بھی نکال سکتے کہ کچھ روگ لا دوا اور کچھ لوگ ایسے بے حیا' بے مہاتے ہوتے ہیں کہ کوئی مسیحا' حکمت دُعا اور دم درود ان پہ اثر انداز نہیں ہوتے' اگر ایسا ہوتا تو ہمیں اپنے قرب و جوار میں کوئی شیطان ابوجہل یزید رُشدی اور ملعون دکھائی نہ دیتے۔ بس اللہ کی مشیت ہی ہوتی ہے وہی علیم و خبیر ہے۔ انسان تو بس اپنی بُودی عقل اور ناقص علم کے اندازے ٹھوکتا رہتا ہے۔ اس کی کان نکالنا میرے بس میں نہ تھا۔ کوشش بسیار کے باوصف میں ناکام رہتا تھا۔ یہی کر سکتا تھا کہ اس کی اُٹھے ہوئے پائے کے نیچے اینٹ پھنسا دیتا۔ جب چند ایک بار اس نسخہ کو آزمایا تو شدت سے احساس ہُوا کہ کھٹولے کی خُودی اور حالتِ جذب کی کیفیات میں تعطّل سا پیدا ہو جاتا ہے۔ کروٹ بدلتے' ملتے جُھلتے "آ و بھرنے پہ جکل کان والی حالت سے جو "جواب آں غزل" آتا تھا۔ اینٹ رکھنے سے وہ مفقود ہو گیا ہے۔ نہ آ و نہ فریاد ...... بچکی نہ کوئی سسکی ...... میں نے اینٹ دینی چھوڑ دی۔ کئی روز نخرے اُٹھانے بھی نہ کیا کہ تناؤ پیدا ہو جاتا ...... جھلنگا ختم ہو جائے تو پیٹھ فرش سے مس نہیں ہوتی ...... انگریزی کا "V" بن کر سونے کا مزہ وہی جان سکتا ہے۔ جسے زندگی میں کبھی وی وی آئی پی پروٹوکول حاصل ہُوا ہو؟ وی آئی پی پروٹوکول تو اکثر لوگوں کو کبھی نہ کبھی مل ہی جاتا ہے۔

ملنگ لوگوں میں نارزن بابا بھی تھے۔ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے تہی گزران کرتے تھے۔ وہ بھی جھلنگے پہ راحت محسوس کرتے تھے۔ جھلنگی کھاٹ یا جھلنگے میں لیٹنے سے پیٹ نہیں نکلتا۔ بھوک میں کم غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ گردے' مثانے' معدے کا فعل بہتر ہو جاتا ہے۔ عاجزی انکساری اور عبادت میں دل لگتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میرا یہ ملنگ کھٹولہ میرا ندیم' اُستاد اور رازدار بھی تھا۔ مجھے تو کبھی اُس کا کوئی حق ادا کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی مگر اُس نے اُس وقت تک میرا دم بھرا' جب تک میں اُسے دریدہ دریدہ' خمیدہ خمیدہ' لرزیدہ لرزیدہ چھوڑ کر مناکحت کے بندھن میں جکڑا نہ گیا۔ ویسے بھی اُس کی حالت اب میرا ساتھ دینے کی نہ رہی تھی۔ میں آوارہ گردی کے کسی لمبے ٹور پہ تھا۔ گھر میں گاؤں سے مہمان اُترے' اُن کے ہمراہ کچھ شیطان بچے بھی تھے۔ وہ دنوں کے بعد جب نکلے تو میرا کھٹولہ اُڑن کھٹولہ بن کر کہیں غائب ہو چکا تھا۔ باقیات میں کچھ بوسیدہ سے ٹیڑھے ڈنڈے رہ گئے جو اِدھر اُدھر کہیں کام آ گئے۔

جانے چینے سے جان چھڑا کر میں اپنے کوٹھے پہ پہنچ آیا تھا۔ اک اُچٹتی سی نظر نیچے صحن میں گھر والوں پہ ڈالی اور کھٹولہ سیدھا کر کے اس میں اُتر گیا۔

میری عادت تھی کہ میں سونے سے پہلے آیت الکرسی' تیسرا کلمہ ضرور پڑھتا تھا اور اگر کبھی اُوپر سے کوئی اشارہ لینا ہوتا تو وظیفہ چہل کاف کی اوّل منزل بھی پڑھ لیتا۔ اس سے یہ ہوتا کہ کوئی نہ کوئی اشارہ مل جاتا۔ آپ اسے استخارہ کی ایک صورت بھی کہہ سکتے ہیں۔ کچھ دیر تک میں خالی الذہن ہونے کی ناکام کوشش کرتا رہا کہ

کچھ دیر کے لیے ہی سہی' اُونگھ کی جھپکی لے لوں...... پر تو بہ کیجئے' مجھے نیند اور نیند کو مجھے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اتفاق سے اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو کھوج بھی لیں تو باہمی افہام و تفہیم میں کوئی نہ کوئی پھڈا پڑ جاتا ہے۔ اسے نمٹاتے نمٹاتے ہم دونوں کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو کبھی اس شعر کے خالق کی ہوئی ہوگی......

اِک سمت ہے شب کی تاریکی اِک طرف غم کا سناٹا
مَیں شکر کے سجدے کرتا ہوں جب رات بسر ہو جاتی ہے

شبِ فراق اور شبِ وصال...... ایک دُوری' دُوسری حضوری...... پہلی میں ایک اور دوسری میں دو...... دونوں میں مشترک بیداری...... شبِ فراق میں جو غافل ہُوا تو وظیفۂ عشق میں مسِ خام ہُوا' اور شبِ عروس میں جو سویا وہ ناکام اور بدنام ہُوا...... ایک اور شبِ بیراگ بھی ہے جو مجھ ایسے ''شب دیدہ'' کا مقدر ہوتی ہے۔ ایسی شب' جس میں جاگنا' جان سوزی اور سونا' سکرات...... شب خیزیاں اپنی تمام تر عشوہ گری سے جلوہ فگن...... خموشیوں کو ایک سرمدی زبان مل جائے...... کائنات' اِک چکر لینے والے پنگوڑے کی طرح گھومنا شروع ہو جائے۔ چھپی ہُوئی مخلوقات' حجاب سے باہر نکل آتی ہیں۔ عام حالات جو نظر نہیں آتا وہ دکھائی دے۔

پنگوڑے کے کنویں کی قبر میں' مَیں دھیرے دھیرے یوں اُترتا چلا جاتا جیسے خشک دلدل میں کوئی جانور غرق ہوتا ہے۔ ڈھیلے' اُدھڑے لٹکے اور چھدرے بان کا جھلنگا' میرے وجود کو اپنے اندر تحلیل کرتا ہُوا میری پیٹھ' تحت الثریٰ سے لگا دیتا۔ ریڑھ کی ہڈی کے سلسلہ کا ایک انت کھوپڑی کے پیچھے گدی تک اور دُوسرا پیٹھ کی ہڈی تک' جدھر سے پُٹھوں کا دو شاخہ شروع ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے اُوپر والے سرے کی نوکدار گلی دماغ کے صدر دفتر میں گھسی ہوتی ہے جبکہ نیچے والی گلی مثانہ تک جدھر سے مردانہ عضوِ تناسل شروع ہوتا ہے یہ علاقہ پیٹھ کا ہوتا ہے۔ ایک جانب کھوپڑی دماغ' دُوسری جانب پیٹھ...... مقابلہ میں اگر پیٹھ پُشت زمین سے چھو جائے تو شکست ہو جاتی ہے۔ پیٹھ پہ وار سہنا' بزدلی کی دلیل ہوتا ہے۔ پیٹھ دکھانا' بے وفائی اور کسی کی طرف پیٹھ کرنا بے ادبی...... پاگل کتّا کاٹ لے یا آتشک سوزاک جیسے خبیث و غلیظ امراض میں اسی پیٹھ پہ جب لمبے لمبے ٹیکے ٹھکتے ہیں تو نانی یاد آجاتی ہے۔'' ماں کے بطن میں نامکمل بچّے کا سر اور پیٹھ ہی نمایاں ہوتے ہیں۔ سکول میں مرغا بننے کی سزا ملے تو پیٹھ اُونچی اور سر نیچا رکھنے کا حکم ہوتا ہے۔ چُست تن کی بوتل میں تا بت انڈا...... عورت کا سینہ دبا ہُوا ہو تو اُدھوری ہوتی ہے۔ مرد کے چوتڑ' سُرین' واضح نہ ہوں تو اس کی چال میں مردانہ پن پیدا نہیں ہوتا' وہ از قسم مخنث لگتا ہے۔ قطرۂ نیساں سیپ کی کوکھ میں پیٹھ کے بل گرے تو وہ لُولوئے لوامع بنتا ہے اور ایسی وضع قطع کا حامل ہوتا ہے جو اُسے یکتائی عطا کرتی ہے۔ اَب یہی قطرۂ مار سیاہ کے منہ' دو شاخہ کے درمیان اُلٹے پہلو پڑتا ہے تو زہر ہلاہل کا موجب بنتا ہے۔

## ● فقط دُرویشی، نیستی و ناداری......!

مقسوم میں جو لکھا ہوتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ خدا اگر چاہے تو سب کچھ بدل بھی جاتا ہے...... جو اللہ کریم کی مان کر چلتے ہیں، اللہ کریم و رحیم اُن کی بھی مان لیتا ہے...... اُن کی دُعاؤں، التجاؤں کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ میرے مشاہدہ میں بار ہا ایسا ہُوا کہ نصیب میں اولاد نہیں...... کسی کی اطاعت خدمت نہیں۔ صالحیت و قبولیت نہیں...... آسودگی و سکون نہیں...... دین و دُنیا کی دانش و دلچسپی نہیں یا علم سمجھ نہیں...... صحت و تندرستی نہیں تو کسی اللہ والے سے دُعا کروائی تو مالکِ کُل نے وہ کچھ عطا کر دیا جو نصیبوں میں نہ تھا یا سائل کسی بھی طور اس کے اہل نہ تھا اور یہ بھی کہ محض محنت کوشش شوق یا وسائل بھی کبھی کبھی اپنے منطقی نتائج کے برعکس انجام دکھا دیتے ہیں...... ''جتنی محنت اُتنی دولت''، ''جیسی کوشش ویسی بخشش''، ''ڈھیر چاہت انبار محبت''، ''جیسی کرنی ویسی بھرنی''...... ''جیسا راجہ ویسی پرجا''، ''خندی دیوی بھُز وا پجاری''، ''جیسے گانے والے ویسے ہی سُننے والے''، ''جیسا بُوت ویسا بھُوت'' اور ان جیسی سیکڑوں ضرب الامثال، کہاوتیں اکثر بُری طرح غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اکثر بڑے بوڑھوں نے جو دانش بھری باتیں نصیحتیں کی ہیں وہ شاید اساطیری مزاج، ماحول اور انسانی سائیکی کے مطابق تھیں...... فی زمانہ تو ان کی ساری کیمسٹری ہی بدل کے رہ گئی ہے۔ پُرانے فرج، ٹیپ ریکارڈز، کیمرے، ٹیلی وژن، گھڑیوں کی طرح سب کچھ آؤٹ آف ڈیٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ ماسوائے قدرت و فطرت کے لگے بندھے نظام، جن میں تبدیلی لانا انسانی بس کی بات نہیں۔''

مَیں پرانے وقتوں کا ایک بہت ہی بوسیدہ عُمر رسیدہ بُوڑھا ہوں...... دُنیاوی پڑھائی تو ہوئی نہیں ماسوائے اُس عوامی تعلیم، لڑائی جھگڑے گالی گلوچ، چغلیاں، چوریاں شرارتیں یا پھر تھوڑی بہت عربی فارسی جو بغیر کسی مکتب سکول کے گلی کوچوں تھڑوں سے ہی خُود بخود مل جاتی تھی۔ مجھے جو بھی علم عقل، فن و ہنر، فقیری درویشی نصیب ہوئی وہ تمام کی تمام وہبی تھی یا یہ سب کچھ میرے اندر ہی فیڈ تھا۔ بس، کُھرچ کُھچار کر یہ مفرید کر نکالنا پڑا۔ یہ فقیری دُرویشی کیا ہے؟ مَیں خود بھی نہیں جانتا۔ بس سُنا دیکھا تھا کہ یہ فقیر اور فلاں درویش ہے ان کی اصل نسل کیا ہوتی ہے یہ معلوم نہ تھا؟ وہ جو کہتے ہیں کسی پہاڑی علاقہ میں ایک غریب کمہار کو مٹی کی تلاش میں کھدائی کرتے ہوئے ایک ہیرا مل گیا وہ کیا جانے یہ کیا ہے؟ بس ایک خوبصورت ملائم پتھر روز وجان کر رسّی میں باندھا اور اپنے گدھے کے گلے ڈال دیا۔ اس قیمتی جواہر کی چمک دمک ایسی تھی کہ اندھیری رات میں گدھے کے تھان پہ روشنی کا ایک لہراسا رہتا۔ رات کو اکثر اُس کا اُدھر جانا ہوتا، ہلکی ہلکی روشنی بھی دیکھتا، چونکہ اُس کے

اپنے اندر اندھیرا تھا اس لیے کبھی جان نہ پایا کہ یہ ہلکی ہلکی روشنی کہاں سے پھوٹ رہی ہے؟...... ''مرے پہ سو دُرّے'' کے مصداق یہ بھی کہ جہالت اور غربت اس کا مقدر بن چکی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا ایک نایاب بیش قیمت ہیرے کا مالک ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی اگلی نسل تک تنگدستی' بے نصیبی اور بے علمی کی دلدل میں دھنسا رہا۔

مقدر کا سکندر ہر کوئی نہیں ہوتا...... اور نہ ہی ہر کوئی گھوڑا سکندر کا گھوڑا ہوتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کوششیں' محنتیں' عقلیں' علم' عبادتیں' صداقتیں' ریاضتیں اور ان کے ساتھ مقدر' مقسوم' نصیب' قسمت' تقدیر وغیرہ سب کچھ حقیقت ہونے کے باوجود انہیں امرِ حقیقت کہنے میں تامل محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان کے منطقی انجام بدلتے دیکھے۔ بُرے' اچھے ہو گئے' بڑے بڑے کھرے' انتہا کے کھوٹے ثابت ہوئے اور نکمے' نامور نکلے...... اَن پڑھ پھوہڑ پرلے درجہ کے غیر کاروباری ذہن رویوں والوں کو کمال کا میاب تاجر دیکھا اور یوں بھی کہ نچلے طبقے کے بجھلے اور مسخرہ مزاج لوگ' وقت کی مشہور حسین امیر اور اعلیٰ سوسائٹی کی صفِ اول خواتین کے التفات کا مرکز بھی بنے۔''

چشمِ فلک نے غیر معروف' معمولی تعلیم کے حامل' غلام ابن غلام' دہقانوں' صحرانشینوں' بدوؤں' شتربانوں' چرواہوں' سپہ گروں کو وقت کا حاکم' میرِ سلطنت' ناظم سپاہ' بزرگ قبلہ گاہ' فقیہہ مملکت' مفتی اعظم کے مناصب پہ متمکن بھی دیکھا۔ ایسے بھی جنہیں مانگے کوئی بھیک نہ دے' قریب سے گزریں تو اشراف کی جبینوں پہ شکنیں اُبھر آئیں...... بات کریں تو تھوک پھینکیں' وہ ملک وقوم کے لیڈر بن گئے اور چور' قطب بنا دیئے گئے۔ یہ سب نیرنگیٔ قدرت ہے' اس کارخانہ رنگ و بو' صنعتِ ہست و بود میں اس طرح کی ہونیاں اَنہونیاں ہمہ وقت جاری وساری رہتی ہیں' مالکِ کل بے ہمتا ہے کسی کے روبرو جوابدہ نہیں' جو چاہے سو کرے۔ اُلٹی کو سیدھی اور سیدھی کو اُلٹا بنا دے۔''

قضاوقدر' مقدر' مقسوم' ثواب وگناہ' ازل وابد' حشر ونشر' نور و بشر' زیر و زبر' حیات و ممات' قبر و برزخ' جنت ودوزخ' جزا وسزا' فقیری درویشی وغیرہ' بے شمار معاملے' سلسلے' نکتے' فلسفے اسرار بھید ایسے ہیں جن کے بارے میں خدا اور اُس کی برگزیدہ ہستیوں کے علاوہ کوئی جن و بشر کما حقہٗ طور پہ سمجھ نہیں سکتا...... عام انسان' بتقاضہ بشریت' ایسی فہمیت و ادراکیت کا اہل ہی نہیں کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں گِل تراب کی اضافیت' اُس کی باطنی شفافیت کو سمجھ اور جان سکے' لیکن کوزہ گر خالق و مالک اپنی کمال مشیت سے کبھی کوئی ایسی نفیس ولطیف مشک بیز گِل بھی وجود میں لے آتا ہے جس سے جو اعلیٰ ظروف منصۂ شہود پہ آتا ہے وہ اُس کے رازدانوں میں ہوتا ہے۔

میں جس ابتدائی دور کی بات کرنے جا رہا ہوں وہ میری ''تُوں فقیری تے دو پہریں دُھواں'' کا

زمانہ تھا کہ میں خود کو فقیر درویش کہلوانا دکھانا پسند کرتا۔ حال خلیہ' طعام وقلیہ...... قال وقیل' منطق دلیل...... مرام ونیل' قصد وکلیل یعنی ہر طور وا تمام یہی خواہش رہتی کہ میں دوسروں سے علیحدہ دکھائی دوں...... لوگ میری عزت کریں' اہمیت دیں' مجھے دُنیا سے علیحدہ' پہنچا ہوا کرنی بھرنی والا فقیر درویش سمجھیں۔

ابہام سے لتھڑی' اَدَق بَدق بے سروپا باتیں کرنا میرا وطیرہ تھا لیکن کسی کو دھوکہ دینا' کوئی مفاد مقصد یامال پانی بٹورنا مقصود نہ تھا...... چونکہ آوارہ گری میری سرشت میں شامل تھی۔ گھر اور اپنے شہر سے زیادہ تر باہر ہی بھاگا رہتا لیکن میری منزل ہمیشہ کسی پیر فقیر کا ڈیرہ' مزار' حجرہ' مکتب و مدرسہ' عرس قوالی میلہ وغیرہ ہی ہوتی کہ ایسی تقریبات اور مقامات' محافل ومجالس میں میرا جی خوب ٹکتا تھا۔ پاک وہند کا کوئی قابل ذکر' دید کے قابل مزار مقبرہ و میلہ عرس شہر قلعہ باؤلی تلہ ہٹہ ایسا نہ ہوگا جدھر میں نہ پہنچا اور وہاں سے کچھ فیض و فکر لے کر نہ آیا۔ کچھ ایسے مزار و دربار' اَرضی و فلکی' بحری وصحرائی کوہستانی مقامات وطبقات اور کفن گودڑی گلیم ولنگوٹ بردار ہستیاں یوں بھی کہ میرے لیے ظاہری باطنی اسباب ایسے پیدا ہو جاتے کہ میں اندھیراتے کے مریض کی مانند اُٹھتا اور کوئی بھی رُخ پکڑ لیتا۔ کسی زادِ راہ کی فکر' نہ وقت پہر' دن رات کا تعین...... کہیں سے اجازت نہ کسی کا ڈر خوف......؟

پاک وہند میں قدیمی قلعوں کی کمی نہیں' ان میں اکثر قلعے عالمگیر شہرت واہمیت کے حامل ہیں۔ زیادہ تر اُن علاقوں' جو عسکری اہمیت رکھتے یا کسی سلطنت کے دارالخلافہ تھے' قلعے موجود تھے۔ تاراگڑھ' اجمیر' لاہور' آگرہ' جے پور' گولکنڈہ' بہاولپور' ملتان' رہتاس' دراوڑ' منگلا' جودھ پور' جیسلمیر' سیالکوٹ' ملتان وغیرہ...... ہر قلعہ اپنی تاریخی حیثیت واہمیت کے ساتھ اپنی کچھ ماورائی اقلیدسی' اَرضی وافلاکی تنجیم وتقویم' جغرافیائی تشرفات و ترجیحات کے علاوہ کچھ روحانی تصرفات کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی قلعہ ایسا ہو جس میں کسی اللہ کے بندے' ولی قطب شہید کا مزار نہ ہو۔ مسلمانوں پہ ہی کیا موقوف' اچھے' نیک' رَب رَب کرنے والے تو ہر دین وَ دھرم میں ہوتے ہیں۔ ایسے قلعے جو ہر لحاظ سے غیر مسلموں کے تصرف وتسلط میں رہے وہاں بھی اللہ کے ولیوں کے ٹھکانے' استھان' مزار' سمادھیاں موجود ہیں اور بلا امتیاز وتخصیص مرجع خلائق ہیں۔

زیادہ تر لوگ پاک قلعوں میں سیر تفریح کی غرض سے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ جنہیں تاریخ سے دلچسپی ہوتی ہے وہ تاریخی حوالوں سے انہیں دیکھتے ہیں۔ اَب زمانہ بدل گیا' قلعے تفریح گاہوں' پارکوں' لائٹ اینڈ ساؤنڈ شوز مشاعروں اور غیر ملکی وفود کی دعوتوں کے لیے مخصوص ہو کے رہ گئے ہیں۔ کئی قلعوں محلوں اور حرم سراؤں کو پانچ پانچ ستارہ ہوٹلوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جہاں دَاد و دہش' عیش وعشرت کے سبھی لوازمات مہیا ہوتے ہیں۔ پَر ہمارے وقتوں میں یوں نہ تھا...... قلعوں میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ سامان حرب'

فیل خانے' بارود خانے' عقوبت خانے' مچانیں' فصیلیں برج' منجنیق' توپیں' تیز آبے' زرہیں' آتش گولے وغیرہ نمایاں ہوتے تھے۔ گزشتہ جنگوں کے آثار بھی جنہیں ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ تکتے تھے۔

قلعہ کے رقبہ کے حساب' اندر مسجدیں' مندر' گوردوارے' گرجے بھی کہ افواج میں ہر مذہب و ملت کے افراد ہوتے جو ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر برسرِ پیکار رہتے...... اسی مناسبت سے قبرستان' شمشان بھی' کچھ نمایاں نشانیاں اور قبریں بھی کہ زندہ اور روشن قومیں اپنے محسنوں شہیدوں کے احسانوں قربانیوں کو فراموش نہیں کرتیں۔

میرا کسی قلعہ میں جانے کا بڑا مقصد' توپیں' تلواریں' گولہ بارود دیکھنا نہ ہوتا' یہ ہتھیار ہی تو ہیں جو صرف خوف و ہراس اور جاں کو جسم سے علیحدہ کرنے کے کام آتے ہیں۔ بصارت و عقل' احساس اور سپاس سے عاری' محض شہر اور بستی بستی برباد کرنے کے سامان...... دُنیا میں کوئی ہتھیار ایسا ایجاد نہیں ہُوا جو ہلاکت آفرین نہ ہو' جو جاندار کا دُشمن نہ ہو...... بے بصیر اور بے وفا نہ ہو۔

میں تو قلعوں کی بلندیوں' اُونچی فصیلوں' برجوں' کنگروں پر پہنچ کر بہت نیچے ٹھٹھرے ٹھہرے پانی کی بھری خندق کو دیکھتا...... پاس سے گزرتے ہوئے سہمے سہمے دریا کو دیکھتا یا پھر پہاڑی دروں' گہری کھائیوں گھاٹیوں اور نیچی اُونچی بل کھاتی تنگ گزرگاہ پگڈنڈیوں کو دیکھتا اور میری چشمِ حیرت و تصور اُن ہزاروں انسانوں کو دیکھتی جن کا پیشہ' محض سپاہ گری ہوتا اور اپنے جیسے انسانوں کے ہاتھوں پتھروں' کھولتے تیل و پانی' تیروں کی بوچھاروں' بارود کے گولوں کی زد میں آ کر مارے جاتے ہیں۔

میں کسی قلعہ میں پہنچ کر سب سے پہلے باؤلی تلاش کرتا جو کسی قلعہ کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے...... پہاڑی قلعوں میں باؤلی کم ہی ہوتی ہے کہ پانی نہیں ہوتا' ہوتا بھی ہے تو بہت ہی نیچے پھر سخت پتھر' راہ مارتے ہیں۔ ایسے قلعوں میں پانی ذخیرہ کر لیا جاتا ہے۔ اگر باؤلی ہوتی ہے تو کمال کی ہوتی ہے...... دُنیا میں کوئی ایسی جگہ دیکھنی ہو جو آپ کو اپنی ذات کی سیرت اور باطن کی بصیرت کھوجنے میں مدد دیتی ہے تو وہ باؤلی ہوتی ہے اور جو جوگ جگانا چاہتا ہو وہ کہیں پہاڑی قلعہ کی کسی بھاگ بھری جاگ بھری' باؤلی کی تلاش کرے اور اس سے بھی آگے جو کسی اندھی اور ٹھنڈی آگ یعنی فقیری بھگتی جاننے سمجھنے کا متلاشی ہو وہ کہیں دُور دراز کسی ویران سے پہاڑی قلعہ کی ایسی باؤلی ڈھونڈھے جو جنم جنم کی بانجھ ہو...... بانجھ باؤلی وہ ہوتی ہے جسے کھودتے کھودتے پاتال تک اُتر جاؤ مگر وہ بے حساب محنت' کئی جانوں کی بلی لینے کے بعد بھی گیلے پانی کا ایک قطرہ تک نہ سونگھا ئے...... ایسی "میرا بائی" سی باؤلیاں پاک و ہند میں صرف تین ہیں جن کے نامۂ اعمال میں اُن وقتوں کے حساب' لاکھوں کے صرفے' بے حساب محنت مزدوری اور کئی محنت کشوں کی جانی قربانیاں اور سیکڑوں اُونٹوں

کی قدامتوں کی کھدائیاں لکھی ہیں مگر اک قطرۂ آبِ لبِ آرزو و جستجو کو نصیب نہ ہو سکا۔

کہا تو یہی جاتا ہے کہ محنت کوشش صبر و صداقت رائیگاں نہیں جاتے مگر ایسا کبھی کبھی کہیں ہو بھی جاتا ہے۔ باغ ذخیرے کے سارے شجر ثمر بار نہیں ہوتے کوئی ٹنڈ منڈ بھی رہ جاتا ہے...... بانجھ بھی ایسے ہی سنت منت ہوتے ہیں اور کئی کنویں ایسے بھی کہ لمبی کھدائی کے بعد بھی نچلو بھر پانی تک رسائی نہ ہو۔ مل بھی جائے تو آبِ حنظل کی طرح کا بشر چکھے اور نہ شتر منہ رکھے کڑوا بدمزہ پیٹ میں پیچ ڈالنے والا......!

قدرتی بانجھ عورت اور مخنث نامرد چاند سورج گرہن کے سمے اور اُلٹا پیدا ہونے والا ماں کے پیٹ سے پورے دانت لے کر جنم لینے والا مسکراتے ہوئے پیدا ہونے والا مردہ جسم سے زندہ پیدا ہونے والا قبرستان مرگھٹ میں اور پیدائشی کالی زبان والے بچے حرام مکروہ جانور کے کجاوے اُلٹے پانی میں رواں کشتی ابرق اور سنگِ حدید کی کانوں کے قریب کے پیدائشی عقوبت خانے میں پیدا ہونے والے بچے...... ایسے تمام افراد ابنارمل ہوتے ہیں ان کی حسیں غیر معمولی ہوتی ہیں۔ اکثر کسی عامل کے آگے معمول کے طور ہوتے ہیں میڈیم کی حیثیت سے کام کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے زیادہ تر منفی رجحانات اور طاغوتی استعانتوں کے زیرِ نگیں رہتے ہیں۔ انہیں ایسی غیر مرئی ہستیاں بھی دکھائی دیتی ہیں جو عام نارمل انسان کے لیے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان چیدہ علیحدہ سے لوگوں کو بھوت پریت سے نہ تو خوف آتا ہے اور نہ انہیں کوئی پُراسرار مخلوق سمجھتے ہیں۔ طرفین ایک دوسرے کی سائیکی کیمسٹری سے خوب واقف ہوتے ہیں۔

عجیب سی بات کہ ان جداگانہ سے افراد میں دس بارہ فیصد ایسی بھلی نیک خو ہستیاں بھی مشاہدہ اور تجربہ میں آئی ہیں جو ان سے یکسر مختلف ہوتی ہیں اُن کا رجحان و صیان منفی رویوں کے برعکس مثبت ہوتی ہے وہ بائیں جانب کی بجائے دائیں طرف جھکاؤ میں آسانی محسوس کرتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے چوروں ٹھگوں کے گھرانے میں کوئی دانہ مولوی یا حافظ بھی نکل آتا ہے یا پیشہ ور رہزن گیروں کے ہاں کا کوئی فرد تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ اللہ کریم جسے چاہے ہدایت دے دے اور جسے چاہے قعرِ مذلت میں دھکیل دے۔ بیشک وہی مالکِ مطلق ہے کسی کا ثمر بار یا بانجھ ہونا بھی اُسی کے اختیار میں ہے۔

ثمر مندی اور بانجھ پن کو میں نے اپنے اردگرد کی ہر اُس چیز میں محسوس کیا ہے جو مخلوقات میں شامل ہے۔ کسی بھی شے کو جاننے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ درمیانی فاصلہ کم کر کے نطقی افہامی تفہیمی فکری ذہنی تعلق پیدا کیا جائے۔ تعلق دو علیحدہ علیحدہ جزیروں کو آپس میں ملانے والا پُل ہوتا ہے۔ جب ہم کسی حد تک تعلق اُستوار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اگلا مرحلہ تعلق میں استحکام پیدا کرنے کا ہوتا ہے۔ جس طرح ہر شادی شدہ جوڑے کے ہاں اولاد کا پیدا ہونا ضروری نہیں ہوتا کہ ایک سوایک وجوہات میں کوئی ایک وجہ بھی ہو

سکتی ہے۔ اسی طرح ہر تعلق کے لیے بھی ضروری نہیں کہ وہ ثمر بار ہو...... تعلق بانجھ بھی ہوتے ہیں' سو برس تک دوستی تعلقات رہتے ہیں مگر کیا مجال جو ایک ذوجے کے لیے بھی نمو مند رہے ہوں۔ ستر برس تک ازدواجی زندگی بسر ہو جاتی ہے' نصف درجن بچے بھی نکل آتے ہیں مگر اصل مسئلہ تو میاں بیوی کے درمیان ذہنی فکری مزاجی بانجھ پن دور کرنے کا ہوتا ہے۔ محض بچے بنانے کا نام تو شادی نہیں...... ذہنی فکری مزاجی میلان کی شادکامی کا نام شادی ہوتا ہے۔

آپ کے آگے پیچھے دائیں بائیں اوپر نیچے ہر شے ہر عمل' فیصلہ' نتیجہ' یا بار آور ہے یا پھر بانجھ......! یہ الگ بات کہ انسان اپنے فہم و ادراک' اندر باہر کے حساب سے بار آوری اور بانجھ پن کو کتنا محسوس کرتا ہے یا سمجھ پاتا ہے......؟

جب بار آوری اور بانجھ پنے کے مابین فرق کی سمجھ سوجھ تھی تو اپنی ہر حرکت عمل فیصلہ' نتیجہ راست اور صائب لگتا تھا...... کامیابی کو اپنی عقل محنت اور صحیح فیصلہ کی مرہون منت سمجھتا اور ناکامی کو "نصیب میں نہ تھا" یا پھر دوسروں کے سر پہ ڈال دیتا۔

دیگر انگنت عوامل کی طرح اکثر اسفار بھی بانجھ ہوتے ہیں...... میں اپنی نام نہاد فقیری ذرویشی کے زعم میں اک خاصا لمبا عرصہ بانجھ قسم کے سفر کرتا رہا اور یہی سمجھتا رہا کہ یہ میری ذرویشی کا ایک ضروری حصہ ہیں...... یہ سلسلہ شاید کبھی نہ تھمتا یا نہ جانے کون سا غلط یا صحیح رخ اختیار کرتا اگر مجھے ایک مرد ذرویش سے واسطہ نہ پڑتا......!

## ● مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے......!

میں ایک ایسے ہی لاحاصل سفر کی حالت میں تھا...... ملک شہر' سرحدیں' پاسپورٹ امیگریشن ویزے وغیرہ تو سو پچاس برس پہلے بھی تھے مگر ایسے نہ تھے جیسے اب ہیں...... پاسپورٹ ویزے کے بغیر کسی دوسرے ملک کا سفر قدرے مشکل ضرور تھا مگر ناممکن ہرگز نہ تھا...... کسی بھی ملک کی سرحد کو ذرا سی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ آسانی سے پار کیا جا سکتا تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ سرزنش ہوتی یا پھر دو چار روز حوالات میں رکھ کر چھوڑ دیا جاتا' بس!...... انسانوں کی اسمگلنگ' منشیات یا ادھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا اِدھر والا سلسلہ عام نہ تھا' کہیں خال خال ایسے واقعہ سننے آتا تھا۔

میں جب پہلی بار یورپ گیا تو پاسپورٹ نام کی جو چیز مجھے ملی اُس پہ چہرہ تو میرا تھا مگر دھڑ کسی اور کا کرفٹ پاتھ پہ ڈبا کیمرے والے کوٹ ٹائی والا نگیٹیو پہلے ہی تیار کر کے سٹاک رکھتے تھے۔ تصویر دیکھ کر اندھے

کو بھی پتا چل جاتا'' چہرہ میرا باقی اُن کا...... ''امیگریشن آفیسر سب کچھ جاننے کے باوجود مسکرا کر ویلکم کہتے تھے۔

ایران کا بارڈر تو مَیں نے اپنے جیسے دیگر پندرہ ساتھیوں کے ہمراہ دن کے اُجالے میں یوں پار کرلیا تھا جیسے شیمپو سے دھوئے ہوئے بالوں میں سے کنگھی گزر جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ تین عدد بلوچی گدھے اور دو خچر' جن پہ ہمارا سامان لدا تھا۔ ساتھ وہ مال بھی جو ہم پاکستان سے اس غرض سے ساتھ لے جارہے تھے کہ کچھ زادِ راہ نکل آئے گا۔ ایران پہنچتے ہی ہم پہلے پڑاؤ پہ ہی تتر بتر ہو گئے۔ کچھ ساتھیوں کو اُن کے دوست رشتہ دار ساتھ لے گئے اور باقیوں کو ان کے ایجنٹ' جن سے ترکی کا بارڈر پار کرانے کا ٹھیکہ ہو چکا تھا...... ایک مَیں اور ایک میرے جیسا فقرا...... ہم دونوں ایک کھلی سی ویران جگہ پہ یوں رہ گئے تھے جیسے کوئی کچھ کھا پی کے' خالی لفافے چھلکے ڈبے پھینک دیئے جاتے ہیں۔ سفر اور پھر اس قسم کے غیر قانونی سفر میں پریشانی مصیبت میں تو سب ایک دوسرے کے غمخوار ہوتے ہیں' جونہی کسی ایک کو اپنی بہتری ہوتی دکھائی دو نوں بے تعلق ہو جاتا ہے جیسے کبھی کوئی راہ و رسم ہی نہ رہی ہو...... ٹھیک ہے بشری تقاضہ ہے کہ وہ موقع شناس' مطلب پرست اور خود غرض ہوتا ہے۔''

ہم دونوں ایک ایک کپڑوں کا تھیلا اُٹھائے' بھوکے پیاسے کوئی شناسا چہرہ' کوئی کھدرا' آسرا ڈھونڈ رہے تھے...... اُوپر سے پکڑے جانے کا خوف...... جب یہ سارے عذاب نازل ہوں تو حاجات ضرور یہ کے یاد رہتیں ہیں؟...... لیکن مَیں بچپن ہی سے پیٹ' مثانے اور کردار کا کمزور ہوں...... حالت وصورت کوئی بھی ہو' یہ میری تینوں کمزوریاں کبھی دب کے نہیں رہتیں۔ کوئی اخلاقی قانونی' دینی دُنیاوی تقاضہ' ضرورت مجھے ان کے آگے قدغن لگانے پہ مجبور نہیں کرسکتی۔ جب کسی چیز پہ بس ہی نہ چلتا ہو تو بندہ بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

''یار نوید! مجھے زوروں کا پیشاب لگا ہے۔ آس پاس کوئی اُوٹ جگہ دکھائی نہیں دے رہی...... اَب کیا کروں......؟''

پیشاب کی شدت روکنے کے میرے پاس دو ہی طریقے ہیں۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا لیتا ہوں یا پھر اُلٹا ہو کے لیٹ جاتا ہوں...... اس سے یہ ہوتا ہے اندر مثانہ میں پیشاب اِدھر اُدھر پھیل کر اپنی سطح برابر کر لیتا اور شدت کم ہو جاتی ہے اور یہ کچھ نہ ہو تو قطرہ قطرہ خارج ہو جاتا ہے۔ ٹانگیں' شلوار پوری طرح بھیگتے نہیں...... کچھ عزت رہ جاتی ہے۔

مَیں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے' ناف پہ دونوں ہاتھ رکھے پیٹ مسوس رہا تھا کہ سامنے ایک وردی والا سپاہی آتا دکھائی دیا۔ مجھے تو پیشاب کے علاوہ کچھ اور سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ نوید ہشیار نکلا' وہ طرح دے کر بغلی گلی کی جانب نکل گیا۔ وہ سپاہی نما شخص اپنی رفتار چلتا ہوا میرے قریب سے گزرنے لگا تو مَیں نے نتائج سے

بے نیاز ہو کر اُسے السلام علیکم کہا...... اُس کے وعلیکم السلام سے پہلے ہی مَیں نے اُسے اِشارہ سے سمجھایا کہ مجھے بیت الخلاء کی تلاش ہے...... وہ شریف آدمی تھا یا کوئی سرکاری کارندہ؟ جو بھی تھا مگر ہمارے ہاں کی طرز کا نہیں تھا۔ اُس نے مجھے ہاتھ سے اپنے پیچھے کا اِشارہ دیا۔ تھیلا اُٹھائے مَیں اُس کے پیچھے لگ گیا۔ بالکل یُوں ہی جیسے وہ بڑا بھولا بھالا سا سکھ کسی ریس میں حصّہ لے رہا تھا۔ ریفری نے کہا' وہ جو سامنے سرخ روشنی دکھائی دے رہی ہے اُس کو ہاتھ لگا کر آنا ہے۔ ریس شروع ہوگئی' کچھ دیر بعد سب واپس آ گئے مگر اُن میں سے وہ سکھ دوسرے روز ریفری کی تلاش میں ہانپتے ہوئے اُس کے گھر پہنچ گیا۔ ریفری نے حیران پریشان ہوتے پوچھا' تم کہاں تھے؟ جواب میں بتایا۔ تم نے لال بتی کو ہاتھ لگا کر آنے کو کہا تھا۔ مَیں لال بتی والے ٹرک کو ہاتھ لگا کر پشاور سے واپس آ رہا ہوں۔

مَیں بھی اُس سکھ کی طرح' اِس ''ایرانی ٹرک'' کے پیچھے لگ گیا تھا۔ جو مجھے کسی ''جائے ضرورت'' کی جانب کشاں کشاں لیے جا رہا تھا مگر وہ ''مقامِ مُوترم'' ہنوز کہیں نظر نہیں آ رہا تھا...... سچ ہے کہ......

موت نہ ویکھے عمر نوں' عشق نہ ویکھے ذات
نیند نہ ویکھے بستر نوں' بھُک نہ ویکھے ماس

یہ پیٹ اور مثانے کے ''اندراج و اخراج'' نہ تو کوئی مقام دیکھتے ہیں اور نہ کوئی موقع محل؟ شاہ کا حکم چلتا ہے نہ فقیر کی اِلتجا کچھ اثر کرتی ہے۔ ناف پہ لعاب لگانے سے سکون ملتا ہے نہ ہاتھوں کے دونوں انگوٹھے دبانے سے نکلی ہوئی بات دبائی جا سکتی ہے۔ جس طرح ہونی ہو کر رہتی ہے ایسے ہی یہ دونوں ''نظام'' بھی اختتام ہو کر رہتے ہیں۔ وہ ''ایرانی ٹرک'' جس کی لال بتی کے پیچھے مَیں لگا ہوا تھا اپنی رَو رفتار میں رَواں دَواں تھا۔ اِس نے کسی لمحہ بھی پیچھے نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ایک سڑک کراس کی پھر ایک چوک آیا جس کے درمیان ایک فوارہ پانی اُچھال رہا تھا۔ بس' پانی دیکھتے ہی میری شلوار بھی پانی پانی ہوگئی۔ پہلے تو کچھ کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش ہوئی پھر جب قطرے' پتلی سی نل پر پیشر دھار میں تبدیل ہو گئے تو مَیں نے بھی پران ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اَب مَیں سڑک کنارے ایک کونے میں لگا' ناف سے نیچے ٹخنوں تک شرابور کھڑا تھا۔

کھانا پینا پیٹ میں اُتار کر جو آنند حاصل ہوتا ہے اور بعداً ذیر بدیر انہیں پیٹ اور مثانہ بدر کر کے جو بھرپور طمانیت حاصل ہوتی ہے اُس کا جواب نہیں ہوتا۔ ثابت ہُوا کہ لذت' لُطف' طمانیت' سکون' فرحت' مزہ وغیرہ کے کوئی نپے تلے پیمانے نہیں ہیں۔ قدرت نے اِس کائنات کی ہر حرکت میں برکت رکھی ہے اور وہ ہر عمل' جس کا رشتہ زندگی سے جڑا ہوا ہے اُس میں انبساط و التفات کی لہریں دوڑا دی ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اِنسان اپنی شعوری اِدراک' بے بساطی کی بنا پہ انہیں کماحقہ طور پہ سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ مگر اللہ کریم جسے

چاہیں عطا بھی کر دیتے ہیں......
میرے گروپ کا آخری ساتھی نوید بٹ تو اس سرکاری کارندے کو دیکھتے ہی بھاگ نکلا تھا...... اَب میں نے اس سرکاری کارندے کی جانب دیکھا جو مجھے کسی بیت الخلاء کی جانب لے جا رہا تھا۔ وہ اپنی ہی رفتار اور بے نیازی سے کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا۔ وہ شاید بھول چکا تھا کہ اُس نے کسی ''سکھ'' کو اپنی لال حق کے پیچھے لگایا ہُوا ہے؟ خس کم جہاں پاک پڑھا کر ٹانگیں پھیلا کر ٹہلنے لگا کہ کسی طور گیلی شلوار خشک ہو جائے...... پیشاب کی بدبو بھی ایک الگ مسئلہ تھا جو شلوار بدلنے اور ٹانگیں دھونے سے ہی حل ہو سکتا تھا۔
سڑک کے درمیان مجھے ایک پتلی سی آبجو دکھائی دی' دو رویہ میوے کے درختوں کے بیچوں بیچ' صاف شفاف' آئینہ صفت آبجو...... جیسے جنت کی کسی کنج میں ننھی سی نہر...... جو بہشت کے طیور شیریں مقال و خوش جمال کی حمام و آئینہ بندی کے لیے قدرت نے بنائی ہو۔ پانی وہ بھی بہتا ہُوا صاف شفاف' قدم خود بخود اُدھر اُٹھ لیے...... تھسیلا' پاس گھاس پہ دھرا اور آبجو میں اُتر گیا۔ اندر بیٹھنے پہ معلوم ہوا کہ پانی ایسا گہرا نہیں البتہ یخ ضرور ہے۔ خوب مل کر شلوار ٹانگیں صاف کیں اس دوران محسوس ہُوا کہ فٹ پاتھ' سڑک پہ لوگ مجھے عجب خشمگیں نظروں سے تو متے ہوئے گزر رہے ہیں۔ پہلے تو کچھ سمجھ نہ آیا لیکن سمجھ اُس وقت آیا جب وہی سرکاری کارندے' جس سے میں نے بیت الخلاء کی بابت پوچھا تھا' میرے سر پہ آکھڑا ہُوا......''
فارس والوں اور فرانس کے باشندوں میں ایک بڑی کھری خرابی ہے کہ کسی غیر ملکی سے اپنی قومی زبان کے علاوہ بات چیت کرنا پسند نہیں کرتے۔ اچھی بات ہے مگر کیا ضروری ہے کہ کوئی سیاح اُن کی مادری زبان سیکھ کر آئے؟...... کم از کم گزارے لائق تو کسی اجنبی سے انگریزی میں بات کر لینی چاہیے...... فرانسیسیوں کی تو بہت سی عادات' روزمرّہ اور روایات ایسی ہیں جو غیر ملکیوں کے لیے پریشانی پیدا کرتی ہیں' مگر اُن کی شائستگی لہجہ حلاوت' دھیماپن اور سبھاؤ ایسا لبھاؤ والا ہوتا ہے کہ مخاطب اپنی پریشانی بھول کر اُن کے اخلاص و اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ یہی حال ایرانیوں کا ہے وہ بھی غیر ملکیوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ اپنے شاندار ماضی اور سنہری تاریخ پہ فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنی قدامت پرستی' علم وفنون اور روایات کو اعلیٰ تر سمجھتے ہیں...... اس میں شک وشبہ کی گنجائش بھی نہیں کہ یہ دونوں ملک' بلاشبہ اپنی تہذیب وتمدن' علم وادب' صنعت وحرفت' خاص طور پہ فنون لطیفہ کے حوالے سے بھی درخشاں روایات کے امین رہے ہیں۔
ان دونوں قابل فخر ملکوں کی کئی ایک قدریں مشترک ہیں...... مثلاً علم وفنون کے ٹھنڈے میٹھے چشمے اِدھر سے پھوٹے...... ثقافت وتہذیب' اَدب وشعر' مصوری' صنم تراشی' زبان وبیان کی چاشنی اور سحر انگیزی' دُنیا کے بہترین لذیذ ترین کام ودہن کے لوازمات ومشروبات ملبوسات و پیراہن کی جدّت طرازی......

حُسن و جمال کی فتنہ سامانی' چشم و ابرو کا کل میں شب تار کی سیاہی......گل و اشمار' تمثیل و ڈراما' ایجاد و اختراع وغیرہ...... ان دو ممالک کی آرٹ گیلریاں' عجائب گھر' اسلحہ خانے' لائبریریاں' گلستان و مرغزار' قصر و کاخ' عندلیب و زاغ' نکہت و نُور' سیب و انگور' شاہ و شاہراہیں' اُمراء و اشراف' جوہری و صراف...... اور بھی بہت کچھ؟

وہ سرکاری کارندہ' بظاہر تو یہی کچھ لگتا تھا میرے سر پہ کھڑا ہاتھ ہلا ہلا کر بڑی ٹھیٹ فارسی میں مجھے کوئی بھاشن دے رہا تھا...... مَیں کیا سمجھوں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اندازے اور اُس کی جسمانی حرکات' خاص طور ہاتھوں کی شاعری سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے اِس طرح ''بیچ کھیت'' نہانے سے خفا ہے اور مجھے آبجو سے باہر نکلنے پہ مُصر ہے۔ میرا کام تو ہو چکا تھا بھلا مجھے پانی سے باہر نکلنے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ مَیں چُپکے سے باہر نکل آیا' حالت یُوں کہ نیچے پوری شلوار پانی سے شرابور اور ٹانگوں سے لپٹی ہوئی۔ آتے جاتے لوگ دیکھ دیکھ حیران ہو رہے تھے لیکن اصل حقیقت سے تو کوئی بھی واقف نہ تھا کہ میری مجبوری کیا تھی۔ وہ سرکاری کارندہ' ابھی تک خاموش نہ ہُوا تھا' مسلسل وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ نُطق سے زیادہ' اُس کے ہاتھ اور چہرے کے اُتار اوچڑھاؤ کام کر رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ میری ''پاکستانیت'' تو سب پہ واضح ہو چکی تھی اِس نسبت سے مَیں اُن کی نظر میں رعایت کا بھی مستحق تھا۔ فرد ہو یا ملّت و قوم' ان کا عروج و زوال' مذہب مسلک' جغرافیائی یا نسلی بنیادوں پہ قائم نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی جائے تو مستحکم نہیں ہوتا...... قوموں کی کامیابی' ان کی اخلاقی' فکری' علمی سوچ اور رواں وقت کے تقاضوں کے مطابق خُود کو ڈھالنے' معیشت کا قد بالا رکھنے میں مضمر ہوتی ہے۔ ''جیو اور جینے دو'' جیسے زندگی آمیز فلسفہ پہ عمل پیرا ہونے' دوستی رواداری' تجارت و سفارت کو فروغ دینے سے ملتی ہے۔

کہنے کو تو ہم آزاد ہیں مگر آزادی محض قفس سے آزاد ہونے سے تعبیر نہیں ہوتی۔ آزادی اور خُودی کے معنٰی ہم شاید جانتے ہی نہیں اور نہ ہی کوئی لُغت ان الفاظ کے باطنی مطالب کا صحیح سے سُراغ دیتی ہے کہ اسے بلا کے ذہین فطین اور علمی لسانی لوگ ترتیب دیتے ہیں...... ان کے ہاں علم و فضل کی فراوانی ہوتی ہے۔ مگر کچھ حرف و لفظ اور لوگ' ان پیشہ ور دانشوروں اور ماہر تدریس و تعلّم سے کئی صحیفے اور صفیں آگے ہوتے ہیں...... قلندر' درویش' صوفی' بھگت...... جو مکتب عشق اور کوچۂ ملامت کے طالب' عشق اور دریوزہ گر ہوتے ہیں...... آزادی اور خُودی کی ''دلآرام'' فقط اِن کے رُوبرو ہی اپنا گھونگھٹ اُلٹتی ہے۔

عشق نہ ہو تو نہ علم ہے اور نہ عمل اور عقل بے چاری بغل بغل دُور بیٹھی آنکھیں ٹپٹپا رہی ہوتی ہے کہ اُس کی کوئی دلیل منطق فلسفہ سنتا ہی نہیں۔

علم، عمل اور عقل کے سات سات سمندر ایک ہی گھونٹ میں اُتارے جائیں تو عشق والی "عین" بلکی سی "شق" ہوتی ہے..... آزادی (اگر اس کے باطنی معنی کسی پہ القا ہو جائیں) تن کی، من کی..... ذہن کی یا فکر کی سوچ اور سمجھ کی..... اظہار کی، گفتار کی..... شخصی آزادی یا بشری آزادی..... اسی آزادی کے جوہر سے خودی کے سوتے ہرے ہوتے ہیں اس میں رَس پیدا ہوتا ہے..... طاقتِ پرواز پیدا ہوتی ہے، سرِ نہاں کا راز کھلتا ہے۔

بات آزادی کی تھی کہ ہم الحمدللہ آزاد ہیں، جس فرد یا قوم سے اُس کی عزتِ نفس چھین لی جائے..... اُس کے بُنیادی اور انسانی حقوق سلب کر لیے جائیں، انصاف کا حصول، شجرِ ممنوعہ بنا دیا جائے..... بد دیانتی، رشوت، اقربا پروری، ڈاکے قتل اغواء، پولیس مقابلے روزمرہ بن جائیں۔ گھر، قلعوں میں تبدیل ہو جائیں..... خاردار رکاوٹیں، سیکورٹی کیمرے، مسلح چوکیدار، ناکے، پولیس کی تلاشیاں..... قدم قدم پہ سکریننگ مشینیں..... اللہ کے ولیوں کے مزاروں پہ دھماکے..... ٹارگٹ کلنگ، بندیاں فرداً فرداً تلاشیاں..... کیا یہی ہماری آزادی ہے؟.....

برٹش راج میں تو ایسا نہ تھا، کہیں ایک قتل ہو جاتا یا کسی بے بس پہ ظلم ہوتا تو لال آندھی اُمنڈ آتی تھی..... تیز تند جھکڑ، ہوا ورلے چلنا شروع ہو جاتے، ہر کوئی اپنی جگہ سہم دُبک جاتا..... ہم بچے بالے ڈر کے مارے ماؤں کی بغلوں میں سمٹ جاتے..... استغفار پڑھی جاتی، قیامت کے قرب کی نشانی سمجھی جاتی..... آج ہماری اخلاقی انسانی آزادی کا یہ عالم کہ روزانہ درجنوں بے گناہ معصوم انسان دہشتگردی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں..... لال آندھی تو کجا، ہلکی سی آہ نہیں نکلتی..... اُدھر خوفناک دھماکہ ہوتا ہے اِدھر ہم خبرناک قہقہے لگا رہے ہوتے ہیں..... قتل و غارت دہشتگردی کی آزادی نے ہم سے لفظ آزادی کے مَعنی چھین لیے.....

اُس مردِ آزاد نے بے طرح کی سنانے کے بعد ایک بار پھر مجھے اپنی "لال حق" کے پیچھے لگا لیا.....

مَیں اُس سے پیچھا چھڑا کر نوید بٹ کی طرح اِدھر اُدھر کہیں کھسک لیتا مگر چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ ایک مقناطیسی کشش تھی جو مجھے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے پہ مجبور کر رہی تھی..... وہ پھر اُسی اپنی پہلی روش پہ ہی چلا جا رہا تھا..... بے خیالی میں اپنے ہاتھ لہرا لہرا کر جانے کس سے مخاطب تھا۔ مَیں اندر سے ڈرا ہوا بھی..... ! ایران کا بارڈر کراس کرنا کوئی اتنا بڑا جرم بھی نہ تھا۔ ہر روز صبح و شام ہزاروں لوگ اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے تھے..... کچھ پھیرے باز اسمگلر، کچھ سیر سپاٹے کے شوقین اور کچھ ایران سے آگے ترکی یونان یورپ کے چکر میں۔

مَیں بھی آگے ترکی، یونان اور پھر یورپ سلپ ہونے کے چکر میں اس بھگوڑوں کے گروپ میں شامل ہوا تھا..... یہ بھی کیا زمانہ تھا کہ انسان، انسان کا دم ساز ہمدرد اور ساتھ دینے والا تھا۔ اغواء برائے تاوان، قتل و غارت، دہشت گردی کا تصور تک نہ تھا..... وہ دو سال گھر نہ پلٹو تو ماؤں کو تسلی رہتی۔ اندھیرے سویرے

سب محفوظ تھے۔ دیس پردیس سب اَمن شانتی...... مسافر بے کھٹکے سفر کرتے...... مسافر نواز بہتیرے تھے۔ آؤ بھگت ہوتی...... کھیتوں باغوں ذخیروں والے کھلانے پلانے ٹہل سیوا میں اپنی عزت سمجھتے تھے۔ کنوؤں کا پانی ٹھنڈا میٹھا اور ہر چیز میں خیر و برکت...... تھوڑے میں بسر اوقات ہو جاتی تھی۔

یہ ایرانی گھن چکر پھر میرے آگے اور میں پیچھے کہ میں تیز رفتار و گفتار نہ تھا وہ تو جیسے زمین پہ چل نہ رہا ہو پھسل رہا ہو اور خود کلامی؟ کہ جیسے اُس کے ساتھ کوئی نادیدہ مخلوق بھی چل رہی ہے جس سے وہ بحث رہا ہے...... اشارے کنایئے' صوت کا زیر و بم' اعضائی حرکت...... اس دوران اُس نے حسب سابق اک نظر بھی مُڑ کر نہ دیکھا کہ یہ مزیل لیلا پیچھے پیچھے آ بھی رہا ہے یا پھر کہیں غائب ہو کر مُوتنے بیٹھ گیا ہے؟

بیٹھنے' کھڑے ہونے' لیٹنے سونے کی مانند چلنے دوڑنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کے آگے وہ سرحد ہوتی ہے جس کے پار جانے کے لیے انسانی قوے عاجز ہوتے ہیں۔ چلتے چلتے بلکہ نیم بھاگتے ہوئے میرے پاؤں جواب دے رہے تھے۔ مگر میں اُس کا ساتھ دینے پہ خود کو مجبور پاتا تھا کہ ناتواں جان کر میرا تھیلا' اُس نے اپنے بے ہنگم کاندھے پہ لٹکا رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے منزل پہ پہنچ ہی آئے...... میری حیرت دوچند ہوگئی جب میں نے خود کو ازمنہ قدیم کی طرز کے ایک ایسے گھر کے سامنے پایا جو کسی طور بھی ایرانی طرز تعمیر کا حامل نہ تھا...... لگتا تھا بلوچی سندھی اور پنجابی اندازِ تعمیر کی یکجائی سے اِسے بنایا گیا ہوگا۔ پرانی رتیلی خشت سے بنی ہوئی بوسیدہ دیواریں' جن کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ انتہائی دراز دروازے جو امتدادِ زمانہ سے اپنی اصل حالت پہ قائم نہ رہ سکے تھے...... ٹیڑھے اور اُونچے نیچے کواڑ اور پرانی طرز کے تانبے کے میخ مورے اور قفل سنگھنے' باہر دروازے پہ دو تین مریل سی بکریاں' جن کے تھنوں پہ غلاف چڑھے تھے' اپنے پکھ میمنوں کے ہمراہ بیٹھی تھیں۔ جو بھی تھا اور میں جدھر بھی تھا ایک گونا اطمینان یہ ہُوا کہ چلو چلنے سے تو جان چھوٹی! امکان کہہ لیں یا کوئی حجرہ' صدر دروازہ کے عین اُوپر وسط میں سنگ سیاہ کا ایک خطرہ آویزاں تھا جس کی خستہ حالت اور قدیم فارسی میں ایک رُباعی کندہ تھی...... میں چونکہ فارسی پڑھنے سمجھنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا اس لیے محض تکنے کی حد تک ہی رہا۔ ویسے بھی وہ پتھر ایسا خستہ اور دگرگوں حالت میں تھا کہ اچھے سے اچھا فارسی خواں بھی شاید پڑھنے سے عاجز رہتا۔ جب قدرے ہوش ٹھکانے لگے تو دو احساس بیک وقت پیدا ہوئے۔ ایک شدت کی بھوک' دوسرا' یہ مجھے یہاں کیوں لایا ہے؟...... اگر یہ سرکاری کارندہ ہے اور اس کا کام غیر قانونی لوگوں کو پکڑنا ہے تو اسے مجھے کسی پولیس تھانے لے جانا چاہیے تھا۔ مگر یہ جگہ پولیس تھانہ ہے نہ کوئی اور سرکاری دفتر؟...... یہ جگہ یا تو اس کا گھر ہے کیونکہ اس میں اور اس گھر میں بس گوشت پوست اور پرانی اینٹوں پتھروں کا ہی فرق تھا۔

وہ مجھے پچھلے سے ہاتھ کے اِشارے سے پیچھے آنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ نہ بھی دیتا تو میں نے کونسا

کہیں اور جاتا تھا؟ دروازہ اُس نے خاصا زور لگا کر وا کیا تھا۔

پرانی کھاٹ اور بنڈا ہوا در...... انہیں چھیڑیں تو اچھا بھلا واویلا کرتے ہیں۔ اسی طرح پرانے بُجھے حُقّے کی گڑگڑ اور عمر کھائے بوڑھے کی بُڑبُڑ دونوں کی ایک سی ہی چِڑچِڑ ہوتی ہیں...... دونوں ٹھنڈے پڑنے پہ بھی گرم رہتے ہیں۔ کانسی کے چھنّے کی مانند دونوں کی گڑگڑاہٹ اور بڑبڑاہٹ کا صوتی آہنگ کچھ لمحوں تک گونجتا رہتا ہے...... "بُڈھی رَن تے پرانی گَنڈ' مُڑ مُڑ کھاون خصماں دے بَنڈ۔"

زمانوں سے ایک ٹھکے محور پہ گڑے بیوں کی چرچراہٹ ہمارے گزرنے کے بعد بھی گونجتی رہی...... گُونج اور گُونج میں فرق کاف اور گاف کے علاوہ دکھائی دینے اور دکھائی نہ دینے والے پَروں کا بھی ہوتا ہے...... ایکو' بھانپا کا نپا لگا دینے والی کرلاہٹ' ایسا دکھائی نہ دینے والا وجود جو صرف سایہ ہو۔ جیسے دَبی ہوئی سنسناہٹ' جو رُوح میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور کپکپاہٹ' جو ظاہری باطنی اعصاب میں کھنک سی طاری کر دیتی ہے......

اندر داخل ہوتے ہی تیز کی کچھ کُرلاتی کُونجیں میرے سر پہ سے پھڑ پھڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

باطن ہمیشہ اپنے ظاہر سے مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ظاہر اور باطن ایک ہونا چاہیے وہ فطرت کے اُصولوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ سیدھا اور اُلٹا کبھی ایک سا نہیں ہو سکتا؟ "اندر اور باہر" یہ دونوں لفظ اپنے صوت سے ہی اپنا تضاد واضح کر دیتے ہیں...... یہ الگ اَمر ہے کہ کوئی ظاہر میں اصل ہے اور کوئی باطن میں کھرا؟...... کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ سونا اندر باہر سے سونا ہی ہوتا ہے یعنی اُس کا ظاہر باطن ایک...... یہ سونے کی مالیاتی حیثیت ہے جسے باطن کہتے ہیں تو اُس میں ماورائی کیفیات اور خفی اثرات وتشرفات یا مضرات بھی ہوتے ہیں جو بادی النظر میں بشری بصیرت وادراک سے کہیں بالا ہوتے ہیں۔

ظاہر میں تو یہ زمانہ قدیم کی معمولی چھوٹی سی سرائے یا کسی دہقان کی حویلی دکھائی دیتی تھی اور جس کی خستہ حالت' اِس اَمر کی غماز بھی کہ اس سے متعلقہ لوگوں نے اسے خدا کے آسرے پہ چھوڑ رکھا ہے۔

ڈیوڑھی پار کر کے جب سامنے نظر دوڑائی تو ایک اچھا خاصا صحن تھا...... دو چار پرانے درخت اور ایک ساتھ بنے ہوئے حجرے۔ ویسے ہی جو بغداد شریف پیراں پیر عبدالقادر جیلانی سرکار کے مکتب میں بنے ہوئے ہیں۔ قدرے پھیلے ہوئے ایک درخت کے نیچے چٹائیوں پہ کچھ دَرویش نما پیر وجواں مؤدب بیٹھے تھے۔ رُوبرو موٹے سے نمدے پہ ایک بزرگ گفتگو فرما رہے تھے...... اردگرد کچھ مور بھی دکھائی دیئے۔ ایسے خوبصورت مور' مَیں نے پہلی بار یوں آزادی بے فکری سے ٹہلتے دیکھے...... اِدھر اندر کی فضا اپنے ظاہر سے اس قدر مختلف ہوگی مَیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا؟ اسی ظاہر و باطن کی اُدھیڑ بُن میں پھنسا ہوا مَیں بھی سرکاری کارندے کے ساتھ پچھلی صف میں بیٹھ گیا۔ میرِ محفل نے اِک نظر ہمیں دیکھا۔ مثنوی رُومی کا درس' وہی قدیم فارسی کا سِکّہ بند لہجہ!......

لگتا تھا مولینا جلال الدین رُومی کا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ جیسے کہنے والے ویسے ہی سننے والے وہی ماحول' حفظِ مراتب' اَدب واحترام بھی وہی...... علم حاصل کرنے کی وہی جستجو' وہی ذوق وشوق' محنت خدمت......!
عہدِ عتیق کے اَساتذہ' فقہاء' عُلماء' آئمہ کرام میں خُوئے دلنوازی فروزاں ہوتی تھی...... فُروغ علم کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہوتے تھے۔ منفعت کے لیے نہیں اپنی مغفرت اور اللہ کی رضا کی خاطر علم کی روشنی پھیلاتے۔ خاکبازی کا نہیں' خداشناسی کا سبق پڑھاتے...... عطار' حافظ' سعدی' رُومی و رازی' جامی' غزالی کی راہ ورسم پہ ڈالتے تھے......''
مَیں اِک گونا استعجاب واضطراب سے اُنہیں سُننے لگا...... مَیں سُننے کی استعداد میں تو تھا مگر سمجھنے کے ادراک سے تہی تھا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ قرآن پڑھنا نہ آتا ہو تو حروف والفاظ پہ اُنگلی پھیرتے ہوئے سطر سطر آگے بڑھتے جاؤ...... اللہ کریم حُسن نیت اور جوہرِ اخلاص کو دیکھتا ہے۔ مَیں بھی اسی فلسفے کے تحت' تہہِ دل سے سُن رہا تھا' کیا عجب اللہ کریم اس کے حُسنِ معنٰی سے دل منور کردے۔!
ایسا ہی ہُوا' یوں لگا جیسے ایک ایک لفظ' شعر' سراپا تصویر وتسلیم بن کر میرے اندر اُبھر رہا ہے...... وہ صاحب ارشاد تھے۔ اللہ کریم جسے یہ مرتبہ ومنزل عطا کرتا ہے اُسے اثر پذیری اور جذب وجمال سے بھی معمور فرماتا ہے۔ وہ قلب وسماعت کو اپنے حُسنِ بیاں سے مسخر کرتا چلا جاتا ہے۔ ضروری نہیں ٹھہرتا کہ سامع' ذی علم اور بالغ شعور بھی ہو؟...... ظاہر تو محض سنتا ہے جبکہ باطن خُوب سمجھتا ہے......
بعدِ مجلس برخاست ہوئی تو چند احباب کے علاوہ سب اَدب واحترام واجب کرتے ہوئے رُخصت ہوئے...... ساتھ ہی قہوہ کچھ دیگر ماکولات بھی پیش ہوئے۔ ان سے فراغت پائی تو بزرگ نے توجہ فرمائی۔
''ہاں بھئی' کتھوں آیا ایں' تے کتھے جانا ایں......؟''
اُن کی زبان سے ٹھیٹ دیہاتیوں' پنجابیوں والی زبان سُنی تو اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا۔ مَیں تو اُنہیں کوئی اجل عالم' فقیہی' مفتی' مدرسی قسم کی کوئی ہستی سمجھ رہا تھا اور یہ بھی کہ یہ اہلِ فارس میں سے ہیں۔ پنجابی کے جس لہجہ میں اُنہوں نے مجھ سے بات کی وہ خالص پنجابی کے علاوہ کسی اور سے ذرا کم ہی ممکن ہے۔ ابھی مَیں ورطۂ حیرت سے باہر نہ نکل پایا تھا کہ اُس سرکاری کارندے نے ایک اور دھماکہ کر دیا۔ میرے کوئی جواب دینے سے پہلے وہ اُنہیں بتانے لگا۔
''بابا! اے پرو ہنا وی نواں آیا اے۔ دُو جے تے ایدھر اُودھر ہو گئے نے' پَر اے چڑی وانگوں میرے ڈاہے چڑھ گیا اے...... ایدا موتر نکل گیا سی...... تُہجے سنے نُوے ج وڑ کے نہان دھون کر ریا سی کہ مَیں ادھر لے آیاں واں......!''

اُس کے بھی پنجابی ہونے کے انکشاف پہ میرا ایک بار پھر مُوتر نے کو جی چاہا...... الٰہی! ظاہر اور فی الوقتی رویّے بھی کتنا بڑا تضاد ہوتے ہیں۔ ابہام کی کیسی بڑی فضا قائم کر دیتے ہیں۔

مَیں ایسا ہی کچھ سوچ وبچار کر رہا تھا کہ بزرگ بڑی رسان سے پھر لب کشا ہوئے۔

''اوئے علی شیرا! نصیباں والے ای پھڑے جاندے نے...... تے جنہاں دے پلّے کُجھ نہیں ہوندا' اَوکھکھاں وانگوں اُڈ جاندے نے۔''

اَب وہ پھر مجھ سے مخاطب تھے۔

''ہاں پُتّر! توں کون ایں تے کِتھوں آیا ایں تے کِتھے جانا ایں؟''

اَب مَیں کیا بتاتا' مَیں کون ہوں' کہاں سے آیا اور کدھر جا رہا ہوں؟ میری تو بِتّی ہی گم ہو گئی ہوئی تھی...... ہڑبڑاہٹ میں مُنہ سے نِکلا۔

''مَیں اِک دَرویش ہوں...... سیالکوٹ سے آیا ہوں' مگر پتا نہیں کہ جانا کہاں ہے؟''

میرا جواب سُن کر ہلکا سا تبسم فرمایا پھر چہرے پہ دُھندلا سا غبار آیا...... بڑی متانت سے فرمایا۔

''فقط دَرویشی نیستی و ناداری......!''

اُن کا یہ فارسی پرندہ بھی میرے سر پہ سے زنانے سے اُڑ گیا۔

یہ فارسی اور عربی بڑی ثقہ زبانیں ہیں۔ انہیں پڑھے سمجھے بغیر عُلومِ قدیمہ اور جدیدہ میں دَرک حاصل کرنے کا تصور بھی عَبث ہے کہ آسمانی عرشی علمی فضیلت وجلال عربی عبرانی میں ہے جبکہ اَرضی فرشی عُلوم و اَدب اور لطافت و جمالت' فارسی میں ہے...... پُرانے لوگوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت فارسی عربی سے ہی شروع ہوتی تھی۔ اِس کے بعد دیگر مروجہ اور علاقائی زبانیں اور عُلوم کی تعلیم شروع ہوتی۔ عربی' فارسی' ریاضی' منطق' عروض' صرف و نحو' خطاطی' خُوش نویسی' حکمت و موسیقی' شعر وشاعری' تن سازی' پہلوانی وغیرہ یہ سب عُلوم' ہنر وفن' نصاب میں شامل ہوتے تھے۔''

''فقط دَرویشی نیستی و ناداری'' والی بات چونکہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ فارسی میں تھی اور میرے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ حقیقی دَرویش میں دیگر خُوبیوں کے علاوہ ایک کرامت یہ بھی ہوتی ہے کہ آپ جو بھی سوچ رہے ہوتے ہیں یا دل میں لیے ہوئے بیٹھے ہیں' سوال کوئی اعتراض' بُغض' بُرائی یا بہتری' اُسے اِس کا پورا پورا اِدراک ہوتا ہے یہ الگ بات کہ وہ ظاہر کرے یا نہ کرے۔

میری اِس ''فقط دَرویشی نیستی و ناداری'' والی نہ سمجھ سکنے والی بات کو بھی اُنہوں نے پا لیا تھا۔ بڑی سلیس اور شستہ اُردو میں سمجھانے لگے۔

''سنو بچے! درویشی اپنا حلیہ بگاڑنے' بال ریش بڑھانے یا دَر دَر بھٹکنے کا نام نہیں اور نہ درویش اپنے منہ سے خود کو درویش کہنا پسند کرتا ہے...... جو درویشی' ظاہریت کا احساس پیدا کرے اور خواہش پروان چڑھائے کہ لوگ' اسے درویش سمجھیں اور اہمیت دیں اُس کا رزق آسمان سے اُترے گا اور وہ کھائے گا!...... بس یہی نیستی ونا داری ہے۔''

نماز کا وقت آ لگا تھا...... اپنے اسی مرید سے' جسے میں اپنے حساب سے سرکاری کارندہ سمجھ بیٹھا تھا' تاکید کرتے ہوئے فرمایا۔

''علی شیر! ایس بلونگڑے دَرویش دا' ربن کھان پین تے سون دا اچھا جیا بندوبست کر...... ایہنوں بھک وی لگی ہوئی اے...... تے تھکیا ہویا وی اے......'' اتنا کہہ کر وہ پائیں دَرانڈے سے ہوتے ہوئے اپنے حُجرے میں چلے گئے۔''

علی شیر سرکاری کارندہ تو نہ نکلا البتہ اللہ کا کارندہ اور پنجاب کا پُوت ضرور نکلا...... یہاں پھر واضح ہُوا کہ ظاہر اور باطن ایک سے نہیں ہوتے۔ پہلے میں کہا کرتا تھا' تصویر' تحریر' تقدیر بڑا دھوکا دیتی ہیں...... ایسا مکمل اور پُریقین دھوکا کہ اگر بندے کے سامنے اِن کا دھوکہ' کسی بھی طرح کھل جائے تو انسان کوئی انتہائی قدم بھی اُٹھا سکتا ہے۔ تب میں نے تصویر' تحریر اور تقدیر کے ساتھ ظاہر کو بھی شامل کر کے اِن کی تعداد چار کر دی۔

''چل کا کا اُٹھ' کُجھ کھا پی تے فیر آرام کر لئیں...... رات کُفتاں دی نماز بعد' بابا جی دی مجلس چ فیر بیٹھاں گے۔''

اس ''ظاہر'' نے مجھے کتنے بڑے دھوکے میں رکھا...... جبکہ میں اسے خفیہ کا کوئی سرکاری آدمی سمجھ رہا تھا۔ ایران' پاکستان' ہندوستان یا کوئی بھی ملک ہو۔ سرحدی شہروں علاقوں میں خفیہ کے کارندے موجود ہوتے ہیں جو غیر قانونی سرحد پار کرنے والوں پہ کڑی نظر رکھتے ہیں۔ جب یہ مجھے ملا' میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا یہ پاکستانی اور پنجابی بھی ہو سکتا ہے۔ ایرانیوں کی اپنی ایک الگ پہچان ہے...... اُن کی گفتگو کا لہجہ' عادات وخیالات' جسمانی حرکات' ملی اور مسلکی رویئے' فرانسیسیوں' جرمنوں کی طرح ''من حیث القوم اپنی برتری کا احساس' اپنی تہذیب' روایات' ثقافت' اپنے اکابرین شاہوں اور دیگر اہلِ فن وہنر پہ حد درجہ ناز اور افتخار' ایرانیوں کو ایک الگ اور خاص سی شناخت کے حامل بنا دیتے ہیں۔

منجملہ مجھے ایرانی باشندے' اُن کے طور طریق...... رہن سہن' شہر' کوچے گلیاں' اِن کے نام اچھے لگتے ہیں۔ صاف ستھرے' گورے چٹے' سیاہ اَبرو وکاکل' دراز قد...... مجھے تو بغداد' دمشق' یوروشلم' قرطبہ' دہلی' لاہور کی گلیاں بھی اچھی لگتی ہیں' انگوروں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی گلیاں کوچے...... اسی طرح تاشقند' سمرقند' بخارا کے

کوچہ و بازار ...... مکئی، گوندھ، میانی، منگو، جیسلمیر کے قبرستان بھی ...... کوہ قاف، جھیل سیف الملوک، اسکاٹ لینڈ کا ایک ڈسٹرکٹ، بیکانیر، صحرائے گوبی ...... نیلم سندھ جمنا ...... مجھے مہوے کے پیڑ، چندن کے جھاڑ بھی اچھے لگتے ہیں جن سے سانپ لپٹے مدہوش پڑے ہوتے ہیں کھٹے میٹھے جنگلی بیر، کالا شہتوت، گڑ کی گزک بھی اچھی لگتی ہے۔ گندم اور کالی چمکیلی پھرتیلی ٹیڑی بھی بھلی لگتی، جس کی حرکات رفتار پہ نظر نہیں ٹھہرتی ...... بھیڑوں کے نوزائیدہ میمنے تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ کالی کٹیلی آنکھیں ...... گدرائے ہونٹ، گڑھے پڑے گال، جڑے ہوئے ابرو، گھنگھریالے بال ...... تنگ پائجامہ اور سلوکہ بھی اچھا لگتا ہے۔ گریٹا گاربو، سر لارنس اولیور، صوفیہ لورین، جینا لولو، انتھونی کوئین، بلراج ساہنی، کنہیا لعل، مینا کماری، نوتن بھی اچھی لگتی ہیں ...... نارمن وزڈم، چیپلن، منور ظریف، لہری، نور محمد چارلی اور گوپ کا میں دیوانہ تھا ...... مجھے تو الفرڈ ہچکاک اور کے آصف اور کمال امروہوی بھی اچھے لگتے ...... چکوال کی ریوڑیاں مونگ پھلی بھی اور حافظ آباد کا کھدر مجھے بہت بھاتا ہے۔

مجھے باہر سے کم اور اندر سے زیادہ سادہ، بے وقوف ان پڑھ جاہل لوگ تو بہت ہی بھلے لگتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ قدرے فربہی مائل ہوتے ہیں۔ ان کی توند شریف باہر نکلی ہوئی اور ہونٹ موٹے ہوتے ہیں۔ ان کی کھلی کھلی سچ بولتی آنکھوں میں بلا کی معصومیت ہوتی ہے لیکن اگر یہ گائیڈ یا داستان گو نہ ہوں۔

میرے اندر سے اس "سرکاری کارندے" خضر صورت، الیاس صفت، ایرانی سیرت اور پاکستانی طینت انسان کے لیے خود بخود ایک نام اور مقام نکل آیا کہ میرے منہ سے بن سوچے چاچا علی شیر نکل گیا ...... جب میں نے اُسے اس نام سے پکارا، وہ آگے آگے اپنے فربہ تن و توش کے ساتھ لڑھکتا جا رہا تھا اور میں کسی کٹے کے بھوکے پلے کی مانند اس کے پیچھے پیچھے کہ دالان پار کرتے ہی میرے منہ سے ایسا نکل گیا تھا ...... اُس نے یوں پلٹ کر میری جانب دیکھا جیسے میں نے پیچھے کمین گاہ سے اس پہ وار کر دیا ہو۔ ظاہر ہے اُس کی اچانک پلٹ سے میں گھبرا سا گیا ...... سمجھ میں نہ آیا مجھ سے ایسی کون سی بھول ہوئی جس کی پاداش میں چاچا علی شیر نے کسی بھوکے شیر کی مانند کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا ...... لیکن اگلے چند لمحوں میں اُس کا چڑھا ہوا پارہ یکدم نیچے گر گیا۔ وہ خود پہ قابو رکھتے ہوئے بولا۔

"یار! توں نے تے میری جان ہی کڈھ لئی اے ......!"

میرا ایک بار پھر حیرت سے منہ کھل گیا کہ مجھ سے اس کی جان نکالنے والی کون سی حرکت سرزد ہو گئی ہے؟ ...... وہ میری پریشانی میرے چہرے سے پڑھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"اوئے میرا مطلب اے ایڈے پیار تے لاڈ نال مینوں چاچا علی شیر آکھ کے سدیا ای کہ میری جان ای کڈھ لئی آ ......!"

گل و بلبل، شعر و نغمہ، لب و عارض، چشم و مژگاں، چتون و اَبرو، کاکل و قامت، جلال و جمال کی سنہری سرزمین ایران میں گو میرا پہلا دن تھا لیکن رات، کنج درویش میں مجمدی بستر پہ لیٹے ہوئے یہی محسوس ہوا میں صدیوں سے ادھر مقیم ہوں...... میرے علم و بصیرت میں ایک نئی چوند پیدا ہوئی، ظاہر و باطن کی نئی جہتیں سمجھ میں آئیں۔ میں جیسے کڑی دھوپ سے نکل کر گھنے سائے میں پہنچ گیا تھا۔

سیالکوٹ سے لاہور، سکھر، حیدرآباد، بنی سے ہوتے ہوئے کوئٹہ ادھر کئی دن کا قیام بے طعام و آرام، پھر اک طویل بلوچستان کا سفر جو بالآخر ایران کی سرحد تفتان پہ اختتام پذیر ہوا...... یہاں وہی روایتی سرحد پار کروانے والے ایجنٹوں کی سردردیاں، جھوٹ سچ، وعدے، دونمبریاں، ٹریلر فلمیں کہانیاں...... سونا نہ جاگنا، ہر وقت بے یقینی کی کیفیت، ایمرجنسی...... روزمرہ کی بنیادی ضرورتیں منہ لٹکا کے کہیں غائب ہوگئی ہوتی ہیں۔ ہر اجنبی اپنا اور کبھی پرایا لگتا ہے!

مسافرت، جو نقل مکانی جو کسی معاشی اخلاقی اور انسانی معاملت کی وجوہ پہ اختیار کی جاتی ہے، وہ سعادت ہوتی ہے اور جو غیرقانونی، چور اسمگلر کی حیثیت سے چھپ چھپا کر ہوتی ہے وہ خوف ابتذال اور انسانی اخلاقی جرأتوں قدروں کی قاتل ہوتی ہے۔ ذرا غور کریں، جنگل میں شیر، فضا میں شہباز اور سمندر میں شارک اپنی روزی رزق کے لئے حصول کے لیے کیسے آزادانہ رویے راستے اختیار کرتے ہیں جبکہ ان رویوں کے پیچھے محض طاقت ہی نہیں بلکہ اخلاقی قوت بھی موجود ہوتی ہے اور ایسے آزادانہ رویوں اور اخلاقی جرأت و جذبے کا گدھ، گدھے اور گیدڑ میں فقدان ہوتا ہے۔ یہی حال چوہے، چوہے، چام چڑک اور چھپکلی کا ہوتا ہے۔ گم راستوں، رات کے اندھیروں، اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے، غیرقانونی طور پہ جو لوگ تجارت کرتے ہیں وہ اسمگلنگ کے زمرہ میں آتی ہے اور جو لوگ اس طرح ادھر اُدھر آتے جاتے ہیں، وہ انسانی اسمگلنگ ہوتی ہے۔ دنیا میں اب ایسی غیرقانونی آمد و رفت برداشت نہیں کی جاتی۔ سیدھے سیدھے گولی ماردی جاتی ہے یا پھر غیرمعینہ مدت کے لیے جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔

نیند ایک ایسی نعمت ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ نیندیں بھی مختلف ہوتی ہیں، سچی اور جھوٹی بھی، پوری اور اُدھوری بھی...... سینڈریلا سلیپنگ بیوٹی والی اور جوج ماجوج والی بھی...... سستی والی بھی اور مرزا جٹ والی بھی...... سانپ والی اور خرگوش والی بھی...... شب زندہ والی بھی اور پہلوئے یار والی بھی...... مجاہدوں اور چوکیداروں والی بھی، ٹرک ڈرائیوروں والی بھی اور ہوائی جہاز کے پائلٹوں والی بھی...... مولوی ملاؤں جیسی بھی اور گورکنوں والی بھی...... طالبعلم والی بھی اور معلم والی بھی...... ہجر کی آگ میں سلگنے والی بھی اور شب وصل والی بھی...... بیمار بیرانہ والی بھی اور اولاد نرینہ والی کی بھی...... بچے جوان بوڑھے، شادی شدہ اور غیرشادی

والے کی نیند...... سائیکل' کشتی' گدھا گاڑی' بیل گاڑی' ریل گاڑی' بس کار' جہاز' سمندری جہاز' گھوڑے گدھے اور اُونٹ ہاتھی پہ سواری والی نیند اسی طرح مسافر کی نیند بھی...... ایک وہ جس کی کوئی منزل ہے ایک وہ جس کی منزل کا کوئی نشان نہیں......!

نیند جسے موت صغیرہ بھی کہتے ہیں۔ نیند جو سولی پہ بھی آ جاتی ہے...... جو بستر تکیہ' مٹی کنکر پتھر کیچڑ کچھ بھی نہیں دیکھتی' جب آتی ہے تو بس آ ہی جاتی ہے۔ میں نے بچوں کو چلتی بھینس کے اُوپر بے سدھ سوتے دیکھا ہے۔ صحراؤں تھلوں میں قطار در قطار اُونٹوں کا قافلہ رواں دواں ہے' بھیگی ہوئی صحرائی رات کا جادو اُترا ہُوا ہے...... شتربان مزے سے اُونٹوں پہ محملوں میں بیٹھے بیٹھے خراٹے توڑ رہے ہیں۔ جنہوں نے کبھی اُونٹ پہ لمبا سفر کیا ہو وہ خُوب جانتے ہیں کہ اُونٹ پہ محض کچھ دُور تک بیٹھنا ہی کس قدر مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ طویل سفر کرنا؟...... اُونٹ پہ سفر کرنے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کے مہرے سٹین لس سٹیل کے ہونے چاہئیں' عام بھربھری ہڈی کے مہرے تو ایک کوٹھے سے دوسری کوٹھے تک کے سفر میں کام آ جاتے ہیں۔ اُونٹ پیچھے ہچکولے کر جو آگے کی طرف دھکولا لیتا ہے تو عام مہرہ دوسرے مہرے سے اپنا تعلق کمزور ہوتا محسوس کرتا ہے۔ برسبیل تذکرہ اَب تو شطرنج کے مہرے بھی پہلے والے نہیں رہے......!

میں نے پہلی بار جو شطرنج کے اسباق لیے اور پھر جس بساط پہ اپنے شاطر اُستاد کو بہا تمک ذلیل بیچ کھیت شہ مات دی' وہ اتنی قدیمی اور اتنی تھی کہ نہ تو پتا چلتا کہ یہ کس میٹریل کی بنی ہوئی ہے اور نہ اس کے مہروں کی شناخت ہوتی؟ بس اندازے سے ہی اندازہ کرنا پڑتا تھا کہ یہ پیادہ' فیلہ' گھوڑا یا فرضی اور شاہ ہے۔ شاہ اور فرضی کی کچھ شناخت اُن کے قد و کاٹھ اور تاج تمغے سے ہو جاتی اور باقی اُن کے قدرے بچے کھچے رنگ رُوپ سے کہ یہی وہ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی "نشست برخاست" دوسروں کی نسبت کم ہوتی ہے؟ بساط کا یہ عالم کہ خانے' خانہ براندازی کا نقشہ ہیں۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں نے لڑ لڑ' بھڑ بھڑ پورا بساطی میدان ہی چوپٹ کر دیا ہُوا تھا...... بس' اندازے سے ہی مہرہ آگے پیچھے یا دائیں بائیں چلانا پڑتا تھا۔ یہ لکڑی کی بڑی سی بساط' ایک چوبی تپو کے پہ ہمارے ایک رشتہ کے تایا جی کی بیٹھک میں موجود رہتی...... ہم نے شاذ ہی اسے کبھی آرام کرتے یا بیکار پڑے دیکھا ہو؟ صبح دوپہر شام اور رات گئے تک پانچ دس نکمے وَیلے مصروف بزرگ! اس پہ نبرد آزما رہتے تھے۔ حقہ اور سبز چائے چلتے رہتے' گھٹنوں بغلوں اور گوڈوں میں سر دیئے' چالوں پہ غور ہو رہا ہے...... اَگلی بغلی بھی اپنے اپنے تئیں اندازے قیافے لگا رہے ہیں...... کانا پھوسیاں...... مشورے' ٹھنڈی آہیں اور گرم سانسیں......!

آپس کی چالیں بُری طرح پھنسی ہوئی ہیں' گھوڑے کام آ رہے ہیں نہ ہاتھی کے ہاتھ کی بات رہی۔

پیادوں کے پَر جلتے ہیں...... رُخ بھی بے رُخی دکھا رہے ہیں۔ شاہ بے چارہ مجبور خانۂ فرنگ رنگوں میں محبوس ہے۔ وزراء سر جھکائے بے بسی کی تصویر بنے اِستادہ ہیں۔"

ہم بچے لوگ دُور کھڑے بیٹھے اِن 'بدھوں' جن کے لیے راوی چین ہی چین اور گنجفہ' تاش' چوسر اور شطرنج لکھتا ہے' کو حیرت اور استہزاء بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے...... کیا خبر تھی کہ اِک وقت ہم بھی اِن جلتوں کا شکار ہو جائیں گے بلکہ بڑے بڑوں کے ناک کاٹیں گے۔؟

بات' نیند کی چلی تھی اور میں بھٹکتے بھٹکتے کدھر سے کدھر نکل آیا؟ چاچا علی شیر' شروع شروع میں مجھے اُلول جلول سا لگا تھا۔ مجھے قطعی اندازہ نہ تھا اک وقت ایسا بھی دیکھوں گا کہ اس سے بھی کئی ہاتھ آگے نکل جاؤں گا۔ سیانے کہتے ہیں کہ خود کو دوسروں سے بہتر نہ کہو' کہتر کہو کہ کیا عجب جس کو تم کمتر سمجھتے ہو...... وہ تم سے بھی بہتر ہو جائے...... کسی پہ مت تھوکو' ایسا نہ ہو تھوک پلٹ کر خود اپنے منہ پہ آ پڑے۔"

پہلی رات' میں مسافت کی نہیں' نصیحتِ صالح کی گود میں سویا۔ ایسی میٹھی گہری پُرسکون نیند' ماں کی گود میں' گزری گود میں یا پھر گور کی گود میں ہی میسر آ سکتی ہے۔؟

میں عشاء کی نماز باجماعت اور باباجی کی مجلس کے بعد سونے کی غرض سے اُٹھ آیا۔ چاچا علی شیر نے میرے لیٹنے کا انتظام اپنے ہی حُجرے میں کیا تھا۔ چٹائی پہ لیٹ کر چاہیے تو یہ تھا کہ خرّاٹے لینے لگتا مگر تھکاوٹ کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ رہ رہ کر اُن کی گفتگو یاد آ رہی تھی کہ وہ کتنی آسان گفتگو کرتے ہیں' کہیں بھی اپنی علمیت کا احساس ہونے نہیں دیتے۔ سمجھانے کا انداز ایسا سہل اور من موہنا کہ سُننے والے فرحت آسانی اور دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنی بات' کسی پہ ٹھونسنے کی ہرگز کوشش نہیں کرتے بلکہ اختلاف رائے کا احترام کرتے ہیں...... خطاب کا انتہائی مختصر دورانیہ بڑے خوشگوار اثرات چھوڑتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے سے چھوٹوں یا کم علم لوگوں میں کم علمی یا احساسِ کمتری پیدا ہونے نہیں دیتے بلکہ نہایت رسائی سے انہیں مطمئن کرتے ہیں' اُن کی عزتِ نفس کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔"

نیند تب ٹلتی ہے جب نیند کے سکون سے بڑھ کر کوئی اور سرور آپ کو مسخر کیے ہوئے ہو۔ میں ابھی تک مجلس کی گفتگو اور اُن کی سادہ مگر مسحور کن شخصیت کے زیرِ اثر تھا۔ نیند کی کوشش میں جب چند بار کروٹیں بدلیں تو چاچا علی شیر کسمسایا۔

"سوجا' سویرے جلدی اُٹھنا پیندا اے......!"

"چاچا! نیند نہیں آوندی...... باباجی دی مجلس وچوں اُٹھ کے بڑی آیاں' لگدا اے نیندراں ای گوا

آیاں آں......!''

چاچا دوسری جانب سے میری جانب کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔

''سبحان اللہ! میریاں نیندراں تے سَت وَریاں بعد گواچیاں سَن' تے توں سَتاں کھنیاں چ ای گوا بیٹھا ایں..... بڑی شتابی چینڈ امار یا ای......؟''

چاچا کی گنجی بات کا مَیں کیا جواب دیتا..... بس خجل ہو کے پوچھ بیٹھا۔

''چاچا! اے سَتاں وَریاں دی کی گل اے......؟''

جانے کیا سوجھی کہ چاچا اُردو میں شروع ہو گیا۔

''پتر! سات برس پہلے کی بات ہے مَیں اُس وقت فُل جوان تھا۔ سات جماعتیں پاس کر کے مَیں نوکری کی تلاش میں لگ گیا کہ گھر کے حالات بہتر نہ تھے' اپنے آبائی شہر وزیر آباد میں چاقو چھریوں کے کارخانہ میں ملازمت کی مگر یہاں میرا دل نہ لگا۔ مَیں کراچی چلا آیا' رہنے کو جگہ نہ کوئی واقف کار' بڑی تنگدستی سے وقت گزر رہا تھا۔ اتفاق سے سید عبداللہ شاہ غازی کے مزار پہ ایک نیک خو ایرانی سے مُلاقات ہوئی۔ یہ ان کا عقیدتمند تھا ہر نوچندی جمعرات یہاں حاضری دیتا لنگر تقسیم کرتا۔ رہتا یہ ایران میں تھا مگر اس کا ایک چائے کا کیفے پاکستان چوک میں بھی تھا۔ اللہ نے اس کے دل میں میرے لیے ہمدردی ڈالی اور اس نے اپنے ایرانی کیفے پہ مجھے کیشئر کی نوکری دے دی۔ اس طرح کراچی میں میرے قیام طعام اور معاش کا مسئلہ حل ہو گیا۔ مَیں نے خوب جانفشانی سے کام کیا..... کیفے کا کاروبار خوب چلنے لگا۔ میرا ایرانی سیٹھ مجھ سے بہت خوش تھا۔ ایک وقت آیا کہ سیٹھ نے ایک اور ہوٹل خریدا اور سارا کاروبار میرے حوالے کر دیا۔ اَب مَیں بھی مطمئن اور خوشحال تھا۔ میری سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ میرے دونوں' حقیقی اور مجازی مالک مجھ سے خوش ہیں..... محنت' ایمانداری اور وفاداری نے مجھے رنگ لگا دیا۔''

ایک شروع کی بات بتانا بھول گیا۔ جب مَیں پاکستان چوک والے کیفے میں کام کرتا تھا وہاں آدھی رات کے وقت ایک مجذوب سے بزرگ چائے پینے آیا کرتے تھے۔ چائے وہ ہمیشہ اپنی مٹی کی کٹوری میں ڈال کر پیتے تھے۔ کٹوری وہ اپنے ساتھ لاتے..... اس کٹوری کو چھوٹا سا کلہڑ بھی کہا جا سکتا ہے۔ دیر بدیر جب تک اُن کا جی چاہتا کیفے میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے' ایک دو مرتبہ چائے پیتے پھر بل چکانے کے لیے' میرے پاس کونٹر پہ آتے اور بل چکا کر خاموشی سے چلے جاتے۔ اَب اُن کا بل ادا کرنے کا انداز بھی ملاحظہ فرماؤ۔ وہ چائے کا بل' جو بمشکل دو چار آنے ہوتا..... سکہ رائج الوقت کی بجائے مٹی کی کٹوری کی صورت میں ادا کرتے' جس میں وہ کیفے کے شیشے کے گلاس سے اُنڈیل کر نوش فرماتے تھے۔ پہلی مرتبہ جب اُنہوں نے پیسوں کی

بجائے مٹّی کی کٹوری دی تو حیران ہونے کی بجائے مَیں پریشان بھی ہُوا کہ ان سے پیسوں کا تقاضہ کروں یا پھر کٹوری قبول کر لوں...... میرے اندر کے کسی چھوٹے بڑے نے چشم زدن میں کٹوری کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ کٹوری کو ایک نظر دیکھنے کے بعد نیچے دراز میں رکھ دیا اور اپنی جیب سے دو نی نکال کر خود ادائیگی کر دی۔ میرے ایرانی سیٹھ کی جانب سے مجھے اجازت تھی کہ مَیں اپنے مہمانوں کی خاطر داری کیفے کے حساب میں کر سکتا ہوں مگر مَیں نے ایسا کبھی نہ کیا۔ میرا ادھر کراچی میں اوّل تو کوئی ایسا دوست یا عزیز نہ تھا جس کی خاطر داری مَیں کیفے کے حساب میں کرتا دوم اگر کبھی کسی سے مجھے ایسا سلوک کرنا بھی پڑتا تو مَیں اپنے پلّے سے پیسے ڈال دیتا تھا۔''

اَب یہ کٹوریوں والا اک روز مرہ بن چکا تھا۔ جب دراز کٹوریوں سے بھر جاتا تو مَیں انھیں احتیاط سے اٹھا کر اُوپر چھت پر اپنے کمرے میں لے آتا اور ایک بوری میں جمع کرتا رہتا۔

میرے ساتھی بیرے باورچی غلیل مین چوکیدار سب جانتے تھے کہ مَیں اُس مجذوب بابے سے کیا سلوک کر رہا ہوں اور نہ ہی کبھی کسی نے اس موضوع پہ مجھ سے کوئی بات کی اور نہ مَیں نے کسی سے اس بابے کے بارے پوچھا کہ کون ہے کیا کرتا ہے...... ؟ یہ کٹوریاں کہاں سے لاتا ہے یا رات کے اس مخصوص پہر میں ہی کیوں آتا ہے؟

اِس قسم کے اصلی نقلی بابے تو ہر دَور میں اور ہر جگہ ہوتے ہیں...... معاشرے کا حصہ ہیں۔ یہ جو بھی ہیں جیسے بھی ہیں ہم ان کا احترام کرنے پہ خود کو مجبور پاتے ہیں۔

ایک اور بات جس پہ حیران ہُوا جا سکتا ہے کہ اِک خاصا عرصہ اِسی شُغل میں بسر کرنے کے بعد بھی کبھی ہمارے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہ ہُوا...... وہ تو کبھی بات کرتے ہی نہ تھے مگر مَیں بھی اُن کے سامنے ایک بہت بڑا گونگا تھا۔ معلوم ہوا کہ تعلقات اندر کے ہوں یا باہر کے ان کے استحکام کے لیے زبان کلام افہام و تفہیم شرط نہیں ٹھہرتا......!

ہر اَمر کے کُھلنے کا ایک وقت ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے اَمر کیا ہوتا ہے؟...... اَمر وہ رضا یا مشیّتِ الٰہی ہے جو مالکِ کُل کی جانب سے ''کُن'' کی صورت اُترتا ہے۔ ہوا چلتی ہے تو پیڑ پودے لہلہاتے جُھومتے ہیں...... بہار آتی ہے تو قُمریاں عندلیب نغمہ سنج ہوتے ہیں چاند میں چودہ چاک پڑتے ہیں تو جوالا مکھی چٹون چڑھاتی ہے۔ اَبرِ نیساں نسبت کرتا ہے تو صدف میں صدق اُترتا ہے۔

یہ ازل اَبد حشر نشر جزا سزا جنت دوزخ زندگی موت عزت ذلت یہ سب کیا ہے...... اَمرِ ربی!''

کچھ دیر اُس نے چُپ سادھ لی پھر چٹائی سے اُٹھ کر پیچھے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا...... عجیب

سی پُراسرار نگاہی سے تکنے لگا۔ کچھ دُور کونے میں استادہ صندل کی لکڑی کا کھڑا مشعل دان جو ایک بڑے سے کشکول سے مشابہ تھا نیم روشن تھا...... پچھلے اَدھ کھلے دریچے سے ہوائے اوّل شب کے ہلکے ہلکے ہلکورے مشعل کی سوختہ جاں لَو سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے زیتون کے عنبریں روغن کی مقدس مہک سے شب خانہ درویش دَہکا ہُوا تھا...... لگتا تھا چاچا علی شیر اپنی جون بدل رہا ہو...... اُس کا چہرہ اب وہ پہلے سا نہ تھا۔ آنکھیں مشعلوں کی مانند روشن...... بشرے کے خدوخال خالی خالی سے جیسے وہ معلوم و معدوم کی کسی منزل کا مسافر ہو؟ رات اور اس کی رُوداد تارتو خود اک بحرِ سیاہ ہوتی ہے اور جو اس کے ڈسے ہوئے ہوتے ہیں وہ روتے ہیں نہ سوتے ہیں...... کہتے ہیں "سانپ کا ڈسا سوئے اور بچھو کا کاٹا روئے......!"

خاموشی بڑی قاتل چیز ہوتی ہے...... اُس وقت تو وہ مزید مہلک ہو جاتی ہے جب کوئی اہم اور رَواں بات اُدھوری چھوڑ کر بندہ اِک ڈرا دینے والی چُپ سادھ لے......سانسوں کی دُھنکنی رُوئی دُھنکنے والے کے دُھنک تُونے کی طرح تُومڑ تُومڑ چل رہی ہوتی ہے کہ سُننے والا اپنی سارنگی سارنگی کے تار ٹوٹنے پہ تلملا اُٹھتا ہے۔

مذہبی اخلاقی روحانی درس خطاب تکلیم وغیرہ معاملے ہیں۔ سامعین اپنے آپ کو خشوع و خضوع سے سُننے پہ مجبور پاتے ہیں...... خموشی محویت سنجیدگی کا پاکیزہ سا ماحول ہوتا ہے اور جنہیں دُنیاوی منفعت شہرت عزیز ہوتی ہے وہ اپنے لحن خطابت ترنّم زود گوئی سحر بیانی کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں اور موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے شوق پیشہ کی خوب مشق و ریاض کرتے ہیں۔ یہ معرفتِ اَرض و غرض کے علم و عمل کے بندے ہوتے ہیں......"

مگر وہ درویش فقیر کی مَحفل مکتبِ عالم صِدق بارگہ وَلی اور کسی صدق صُوفی کی صَف پہ نہ تو شوکتِ لفظی ہوتی ہے نہ لچھے دار گفتگو جھاڑ نہ پھیلاؤ...... ابہام و اتہام کی بھی کوئی تہہ نہیں ہوتی...... کم نہ بیش جزوقتی نہ ہمیش...... پکّا ناپ تول ڈنڈی نہ جھول!...... صُوفی درویش ٹپک ٹپک بوند ابرِ رحمت ہوتا ہے...... سیلاب بلا ناگہانی قضایا کسی بیسوا کی عشوہ ادا کی مانند نہیں...... جو سفلی اور نفسانی جذبات انگیخت کر کے بندے کو حیوانِ محض بنا دیتے ہیں۔ وہ تو سیلی سیلی فضائے نیم شبی جھونپڑے کے سوراخ سے جھل مل کرتے روشن قطبی تارے کی طرح ہوتا ہے جو رُوح کو منوّر کرتا ہے۔ جس کی تنویر سے قلب و جان جلا اور بھٹکے ہوئے راہ پاتے ہیں...... ناقوس شور مچاتا ہے کانوں کے پردے پھاڑتا ہے۔ فانوس آنکھوں میں خیرگی اور چُوندھ پیدا کرتا ہے۔ نے کی لَے اور تنبورے کی تُن تُن میں تمیز بڑی واضح ہوتی ہے۔

چاچا کو تو جیسے چُپ لگ گئی تھی...... جب سے میری اُس سے ملاقات ہوئی تب سے مَیں نے اس کے تین چار رُوپ تو دیکھ لیے...... اب اور کتنے رُوپ دیکھنے تھے اِس کے لیے مَیں پوری تیاری میں تھا۔ ایران کے

سرحدی شہر میں پہلی رات' پچھلی کئی راتوں کے ساتھیوں میں کوئی بھی تو ساتھ نہ تھا۔ سب اپنی اپنی کینچلی کے بے ضرر سانپ تھے۔ عام سانپ سال بھر میں ایک بار اپنا لباس' کینچلی ضرور تبدیل کرتا ہے...... یہ اُس کی جسمانی ضرورت ہوتی ہے۔ تنگ کٹے پھٹے' ٹیڑھے میڑھے راہ راستوں' درختوں اور کھوہوں' چھوٹے موٹے جانوروں پرندوں کے بچوں انڈوں کی تلاش میں اُسے بڑی تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔ اس کٹھن میں اُس کی کھال خشک پڑ کر تڑخنا شروع ہو جاتی ہے۔ سانپ کو اُلجھن ہوتی ہے' وہ اس سے جان چھڑانے کے چکر میں تنگ سوراخوں جھاڑیوں سے گزر کر اُتار دیتا ہے۔ دُنیا بھر میں سانپوں کی سیکڑوں اقسام ہیں جن کا تفصیلی بیان اس وقت مقصود نہیں...... اس ضمن میں عام اور چند خاص سانپوں کی بات کرتے ہیں...... یعنی بے ضرر اور ضرر پہنچانے والے۔ کھیتوں باڑوں گھروں' کھپریلوں چھتوں ذخیروں اور سمندروں دریاؤں جھیلوں جنگلوں والے ننانوے فیصد سانپ بے ضرر اور انتہائی ڈرپوک ہوتے ہیں۔ رنگ و شباہت طوالت مختلف ہوتی ہے۔ یہ انسان سے اتنا ہی ڈرتے اور بھاگتے ہیں جتنا انسان ان سے ڈرتا بھاگتا ہے۔ ان کی غذا چوہے' پرندے' ان کے انڈے بچے' ڈڈے' چھپکلیاں' گائے بھینسوں کا دودھ ہوتا ہے...... کچھ بھی نہ ملے تو مہینوں زندہ رہ سکتے ہیں۔ سانپ کوئی بھی ہو نسل کا یا بے نسل اچھا بُرا...... کچھ عادات خصلتیں سب میں ایک سی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی اچھی چیز اس میں صبر ہے۔ یہ درویشوں فقیروں جوگیوں کی طرح ایک جگہ پڑا نہیں رہتا۔ ہر طرح کے حالات موسم میں جینا جانتا ہے۔ کسی کو بلاوجہ ضرر نہیں پہنچاتا۔ انتہائی بھوک اور مجبوری کے تحت ہی کوئی انتہائی قدم اُٹھاتا ہے۔ پہاڑ صحرا میدان جنگل پانی' گھاس پھونس' درخت ٹہنیاں جو بھی ہو وہاں گزارہ کر لیتا ہے۔ سُست الوجود' بینائی اور سماعت کا کمزور لیکن بلا کا زُود حس اور سریع الحرکت......!

سانپوں کی ایک آدھ قسم اُڑ بھی سکتی ہے۔ جیسے مرغی بطخ شترمرغ وغیرہ کہ ضرورت کے تحت کچھ دال دلیا کر لیتے ہیں۔ سانپ کے اُڑنے سے مراد وہ حرکت ہے جو وہ انتہائی مجبوری میں جمپ کی صورت کرتا ہے۔ کچھ سانپ' پچکاری کی صورت اپنے منہ سے زہریلا اور لیس دار لعاب اپنے شکار یا دشمن پہ پھینکتے ہیں جس سے مقابل کی بینائی اور مدافعت کی قوت متاثر ہوتی ہے۔ سانپ اپنے لچکیلے نرم اور سکڑنے پھیلنے والے جسم کو موقع محل کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سانپ اور چور کو ہر شے راستہ دے دیتی ہے۔ سانپ پہلا خزندہ' جانور ہے جس کے ذریعہ ابلیس نے جنت تک رسائی حاصل کی' حوّا اور آدم کو بہکایا اور وہ ممنوعہ دانہ گندم کھانے پہ راغب ہوئے تھے۔ دُنیا کے قریب قریب تمام مذاہب میں سانپ کو اہمیت حاصل رہی...... کچھ ایسے بھی جو اسے دیوتا کا درجہ دیتے ہیں' اس کی پُوجا کرتے ہیں۔ پاؤں' کانوں ہاتھوں گردن کے بغیر واحد رینگنے والا کیڑا جس کی زبان دوشاخہ ہوتی ہے اور کھائے پیئے بغیر مہینوں زندہ رہ سکتا ہے...... اس میں سریت اور مقابل کو مسخر

کرنے کی خداداد صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اس کی بے پلک آنکھوں میں بے پناہ تنویمی قوت اور سحر ہے۔۔۔''

کائنات کا واحد جانور جو جنم سے لے کر آخری وقت اور بعد نابود ہونے تک آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ ایسا جانور' جسے جنم دینے والی ماں' پیار سے چاٹنے کی بجائے چٹ کر جاتی ہے..... یعنی سیکڑوں بچوں میں سے جو سانپ' ماتا کی وحشت ناکی سے کسی طور بچ نکل کر ادھر اُدھر ہو جاتا ہے وہی مستقبل کا سانپ ہوتا ہے۔ سانپ اور کانپ..... سانپ کے لس لس جسم کا تصور کھینچتے ہی دل مُسوسنے اور کانپنے لگتا ہے۔ بے ضرر ہو یا زہر بھرا' سانپ سانپ ہی ہوتا ہے۔ چور اور سانپ کی دہشت تو مشہور ہے۔ یہ لہریے لیتا ہوا چلتا ہے' ہیجڑا اور سانپ اپنی چال' عاشق اور فقیر' اپنے حال..... عالم اور جاہل اپنی قال سے پہچانے جاتے ہیں۔ سانپ' ماچس کی تیلی کی موٹائی لمبائی سے لے کر شہتوت کی گیلی کی اُٹھائی تک کا ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹا' زہر اور ہلاکت میں بڑا ہوتا ہے..... سرسری نظر' دیکھنے سے دکھائی نہیں دیتا کہ جدھر ہوتا ہے اُدھر کے مطابق خود کو رنگ رُوپ دے لیتا ہے۔ اس چھوٹے مگر اسرار و ہلاکت آفرینی میں بڑے اس سانپ کے قصوں کہانیوں' پُراسرار واقعات سے اساطیر بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پہ ہندو متھالوجی تو ناگ ناگنوں کے گُنوں پُنوں سے جل تھل ہے۔ اس کے مقابل جو بڑے بڑے اُفعی اَجگر اَژدھے وغیرہ تو بیچارے محض دھرتی کا بوجھ ہوتے ہیں۔ جھیلوں دلدلوں' جنگل بیلوں میں تھل کے تھل پڑے رہتے ہیں۔ انتہائی بھوک میں کہیں ہلتے جلتے ہیں' وافر گوشت پوست کی صُورت میں جو بھی گرفت میں آ جائے' سالم ہی نگل جاتے ہیں۔ چاہے جسامت قدامت میں وہ' ان سے دوگنا چوگنا بڑا اور روزنی ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں ہلاک کر دینے والا زہر نہیں ہوتا۔

کچھ مخصوص مشہور' مقبور و مسموم سانپ بھی ہوتے ہیں۔ ایسے بھی جن کا ڈسا ہوا بہت جلد موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے لیکن بروقت علاج کرنے سے بچ بھی سکتا ہے۔ یُوں بھی کچھ سانپ ہوتے ہیں کہ اُن کے شکار کا رنگ نیلا یا سیاہ پڑ جاتا ہے' وہ بڑی اذیت کی موت سے دوچار ہوتے ہیں لیکن دو چار دن نکال جاتے ہیں۔ ایسے بھی جو ڈوجا سانس نہیں لینے دیتے۔ ایک ظالم مگر انتہائی خوبصورت سانپ ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ مارگزیدہ' آہستہ آہستہ گلنا سڑنا شروع ہو جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں نیلے پانی کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مختلف سانپوں اور مختلف زہروں کے مختلف اثرات ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک دَم گہری نیند کا طاری ہو جانا' مسلسل ہنسنے کا دورہ پڑ جانا..... روتا چلا نا' ناک منہ آنکھوں کانوں اور پیشاب پاخانہ کے راستوں سے خون کا جاری ہو جانا..... بخار اور ٹھنڈے پسینے کا اخراج' ہذیان بکنا' گہری غنودگی وغیرہ۔

دُنیا بھر کی عجیب و غریب' سمجھ میں آنے والی اور سمجھ میں نہ آنے والی کہانیاں قصے واقعات' سانپوں

سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے منکے' کینچلی' دانت' ریڑھ کی ہڈی' اس کا گوبر' موت' انڈے' گوشت' ہر چیز جو ان سے منسوب ہے پُراسرار حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ سپیرے اور عطائی حکیم' دو نمبر پیر فقیر طرح طرح کے قصے اور من گھڑت کراماتیں ان سے جوڑ کر خوب دولت بٹورتے ہیں؟

## عاشق بُھور فقیر تے ناگ کالے......!

سو برس بعد سانپ اپنی ہیئت بدلنے پہ قادر ہو جاتا ہے۔ اَن دیکھے زمین میں چھپے خزانوں پہ سانپوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ یتیموں' بیواؤں اور مظلوم لوگوں کے مال و زر کی حفاظت پہ معمور ہوتے ہیں۔ قبر میں خائن' ظالم' سود خور اور یتیموں مظلوموں کا حق کھانے والے مردوں کی چھاتی پہ سوار ہو کر ڈنگ مارتا رہتا ہے۔ حاملہ عورت اور معصوم بچوں کو سانپ نہیں کاٹتا بلکہ اُن کی حفاظت کرتا ہے۔ اپنی جُون بدل کر مرد' عورت یا کسی جانور کا رُوپ لے لیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی بے شمار جھوٹی سچی کہانیاں حکائتیں مشہور ہیں۔ ''وقت کے ساتھ ساتھ انسان نے علم و ہنر کے ہر شعبہ میں اتنی ترقی اور جانکاری حاصل کر لی کہ چشم حیرت پھیل کر کشادہ ہو گئی ہے۔ لگتا ہے کہ سانپ کا خوف' پُراسراریت اور اس کے متعلق مافوق الیقین حکائتوں باتوں کا اَب وقت اور تحقیق نے قلعی کھول دی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سانپ پہ ہی کیا موقوف' اس سے کہیں زیادہ اور مہلک زہر تو انسان اور دیگر مخلوق میں موجود ہے۔ سانپ تو ایک لذیذ مہنگی ترین غذا کے طور مقبول ہے۔ اس کا گوشت مقوی اور لذت میں یکتا ہے۔ بڑے بڑے جدید فارموں میں اس کی سائنسی بنیادوں پہ پرورش ہوتی ہے۔ شوربا اور گوشت قیمہ' بند ڈبوں میں بکتا ہے۔ ہزاروں ہوٹل ریسٹورنٹ' تیک اَوے مختلف ڈشیں بناتے ہیں۔ لوگ مزے لے لے کر تکے' یخنی قورمہ کباب نوش جان کرتے ہیں۔ اس کے زہر سے قوت بخش دوائیں اور ویکسین تیار ہوتی ہیں۔ مختلف بیماریوں میں اس کا زہر کار تریاقی کرتا ہے۔ اس کے نرم گرم قیمتی پوست سے جوتے' پرس' بیلٹ اور لباس دستانے ڈیزائین ہوتے ہیں۔ غرضیکہ سانپ کی سریت اَب جاذبیت اور طمانیت میں بدل گئی ہے۔ پہلے سانپ مارے جاتے' اَب پالے اور کھائے جاتے ہیں۔

خوف ڈر کیا ہوتا ہے؟ تحیّر بے علمی اور گریز جب منجمد ہو جاتے ہیں تو انسانی دماغ کے بائیں انتہائی جانب کی ایک ارتجاتی نس سکڑ جاتی ہے۔ یہ سکیڑ اور سکتہ' خوف ڈر اور لرزہ پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں...... ماہرین نفسیات خوب جانتے ہیں کہ انسانی حسیات کے شکیڑ انگیز اور اتھل پتھل سے کیسی کیسی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک معصوم بچہ جو سانپ کی دہشت' سریت' پُراسراریت اور اس کی ماورائی حیثیت سے واقف ہی

نہیں۔ وہ سانپ سے بالکل نہیں ڈرتا' بلکہ کئی بچے خطرناک سانپوں سے کھیلتے پائے جاتے ہیں۔ جو بھی ہو جائے مگر سانپ' سانپ ہی ہے۔ وارث شاہ نے یونہی نہیں کہہ دیا...... ؎

عاشق بھور فقیر تے ناگ کالے
بناں منتروں نمول نہ کیلئے نی

جس طرح بشر اور انسان میں بنیادی بُعد تو کوئی نہیں صرف جفاتی خوبی ہی ان کے مابین اِک حدِ فاصل قائم رکھتی ہے۔ اسی طرح سانپ اور ناگ میں بھی تفاوت ہے۔ ناگ بھی سانپ ہوتا ہے مگر ہر سانپ' ناگ نہیں ہوتا...... بے ضرر' یعنی چوہے چوزے کھانے والے سانپ' سر نیوکر رکھتے ہیں اور زمین پہ یوں بچھ کر چلتے ہیں جیسے کوک بھر کر چلنے والی بچوں کی کھلونا ٹرین چلتی ہے...... جبکہ ناگ زمین سے خاصا اُونچا ہو کر چلتا ہے اور سر اوپر اُٹھا کر رکھا ہے۔ ناگ کا پھن ہوتا ہے ویسے ہی جیسے بھینس کا تھن ہوتا ہے...... تھن سے یاد آیا کہ کچھ چینڈ وقسم کے سانپوں کو گائے بھینس کا دُودھ چسکنے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح بھینسوں گایوں کو بھی سانپوں سے دُودھ چسکوانے کا لپکا لگ جاتا ہے۔ اس علت عادی سانپ اور گائے بھینس وغیرہ پھر کسی اور کام کے نہیں رہتے۔ سانپ اپنی خوراک کی تلاش میں تالاب جوہڑ نہر پہ پڑا رہتا ہے کہ کوئی دُودھیل جانور اِدھر آ اُترے۔ ایسی گائے بھینس بھی پھر کسی انسان کے ہاتھوں دودھ نہیں اُتارتی۔ یہ بالکل کسی منشیات کے عادی کی طرح ہی ہے' جب تک اُسے اُس کی خوراک نہ ملے وہ تُونا' روٹھا سا رہتا ہے۔ اس کیفیت کو ٹھیٹ بول چال میں ''تروڑک'' کہتے ہیں۔

- کون کہتا ہے محبت کی زباں ہوتی ہے......!

آنجہانی جگجیت سنگھ' اندر باہر سے بہت خوبصورت' سُریلا' رسیلا فنکار اور انسان تھا۔ غزل گائیکی میں مہدی حسن' غلام علی کے علاوہ بھی دو ایک بڑے نام ہیں مگر سُر' شعر' تلفظ اور ادائیگی کا جو انوکھا انداز اور سجاؤ اُس کے ہاں تھا اُس کا جواب نہ تھا۔ کلام محسوس کر کے پڑھتا اور گاتا تھا...... کنور راجندر سنگھ بیدی بھی خالص سکھ ہونے کے باوجود لیلائے اُردو کا عاشق تھا...... گلزار بھی سکھ ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں نہ ہوئے یہ سوہنے سکھ میر درد غالب کے دَور میں؟...... سکھوں کے منہ سے پنجابی ہی پھبدی اے...... اُردو بولتے ہوئے تو مجھے دہلی والے بھی گوپالے لگتے ہیں۔ گلزار کہیں غزل گائیکی کی گلی میں دو چار گلی ڈنڈے کے مار لیتا تو جگجیت بن جاتا اور اگر جگجیت' سوئے شعر وسخن کی جانب آنکلتا تو مکمل گلزار ہوتا......!

میری جگجیت سنگھ سے خُوب بنی تھی اور اگر ایک آدھ معاملہ میں نہیں بنی تھی تو بننا بھی نہیں چاہیے تھی کہ میرے ہاں اعلیٰ ذوق وظرف کی بے حد کمی واقع ہوئی ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ پینے والی رقیق شے کو دقیق نہیں ہونا چاہیے۔ تلخابوں کے لیے خانہ خرابوں کی کمی کسی دور میں بھی نہیں رہی۔ مے ارغوانی کو آبِ سلطانی کی مانند تلخ اور جاں سوز نہ ہونا چاہیے...... اُسے تو باغِ بہشت کی کسی نہر کے آبِ روحانی کی طرح رُوح افزا اور شربتِ خُوبانی جیسا خُوبیوں، خوبصورتیوں، خُوشبوؤں کی طرح خوش انجام ہونا چاہیے۔"

اِنسان چاہنے کو تو بہت کچھ چاہتا ہے۔ اپنی پسند، ناپسند دوسروں پہ بھی تھوپنا چاہتا ہے۔ ٹھوکر ٹھیس تو برداشت ہو جاتی ہے مگر وقتاً وقتاً اُٹھتی ہوئی ٹیسیں ہلکان کر کے رکھ دیتی ہیں۔ جگجیت سنگھ میں سہہ لینے، برداشت کرنے اور دم نکالتی ہوئی ٹیسوں کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہہ لینے کی لا متناہی قوت تھی۔ وہ ایک پربت کی طرح اُوالعزم اور مضبوط فنکار تھا۔ اشعار کے بین الباطن معنی ومحاسن کو سمجھا سمجھا اور بتا بتا کر سجانے میں اُسے اِک خاص کمال حاصل تھا۔

چترا سنگھ، جنھیں مَیں احترام اور دُلار سے بے بے وَتی کہتا تھا، بڑی دلآویز شخصیت اور ٹچل سُروں کے بہاؤ کا نام ہے۔ اس کی کسی بھگت کے کاسہ سی آنکھوں میں راگ بدیا کی دان بڑی دکھائی دیتی ہے۔ جب یہ دونوں مہان فنکار اِک دُوجے کی سنگت میں بہلاوے لے لے کر گاتے، لگتا سمے کا دھارا تھم سا گیا ہے۔

ان دونوں کے فن، شخصیت کی بابت بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ سرِ دست مَیں ان کا حوالہ لے کر کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ جگجیت کے علم میں تھا کہ مَیں پاکستان میں موجود ہوں۔ اکثر ٹیلیفون پہ ہیلو ہیلو ہو جایا کرتی تھی۔ ایک روز اچانک اُس کا فون آیا کہ فلاں تاریخ کو چندی گڑھ میں ایک خاص تقریب میں گانے کا پروگرام ہے۔ بڑے بڑے لوگ محفل میں موجود ہوں گے، تم بھی آ جاؤ تو مجھے بھی کچھ ڈھنگ رنگ سے سنانے کا موقع مل جائے گا۔"

کال بڑی مختصر تھی جیسے وہ عجلت میں ہو اور مجھے محض مطلع کرنا مقصود ہو...... مَیں سوچ میں پڑ گیا کہ اُس نے کچھ تفصیل سے بتایا ہی نہیں۔ جو تاریخ اور دن اُس نے بتایا تھا اُس میں چھ سات دن ابھی باقی تھے۔ سوچا، چلو! ایک دو روز میں اُس سے تفصیل سے بات ہو گی تو اُدھر جانے کا پروگرام بنا لیں گے۔ دو چار روز آگے کھسکے تو مَیں مصروفیت میں بھول ہی گیا کہ جگجیت سے کوئی بات ہوئی تھی۔ اچانک ایک روز دوپہر کو پھر ٹیلیفون کھڑکا، جگجیت بول رہا تھا۔

"بابا جی! اَسی اجے اَپڑے ہی نہیں...... تہاڈی بے بے وَتی پُچھ رہی تھی...... دسو کدوں پہنچ رہے او؟"

مَیں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"یار! میں تو بھول ہی گیا تھا کہ انڈیا پہنچنا ہے۔ تم نے بھی تو اُس دن سرسری سی بات کی تھی' کچھ تفصیل سے تو بتایا ہی نہیں تھا...... اب بتاؤ' کہاں پہنچنا ہے اور کب؟...... ادھر سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو لیتا آؤں۔ اور ہاں! جے جے وقتی سے بھی پوچھ لینا کہ لاہور سے کچھ منگوانا تو نہیں......؟

وہ جل ترنگ کی طرح چھڑا......!

"وعدہ کرو کہ جو کہوں گا وہ لیتے آئیں گے؟"

مجھے کیا علم کہ وہ کیا کہے گا؟ پاکستان سے اُس زمانے میں پاکستانی کولڈ ڈرنکس' گھوڑا بوسکی' پشاوری ہزارچپّہ' لاہوری مٹھائیاں' لاہوری نمک' نمک سکڑا وغیرہ ہی سوغات کے طور پہ اُدھر لے جایا کرتے تھے...... یا کوئی پاگل' پاکستانی زمینی مٹی...... پانی' توت' شہتوت' سوہانے کی پھلیاں' کچنار وغیرہ کی بھی فرمائش کر دیا کرتے تھے۔

ماں' وہی نہیں ہوتی جو اپنی کوکھ سے جنم دیتی ہے...... وہ بھی ماں ہوتی ہے جو اپنی مٹی کی مہک سے آشنا کر کے بچے کو زندگی کی حقیقی خوشبو سے آشنا کرتی ہے' اپنے سینے پہ لٹا کے' اپنی گود میں بٹھا کے پروان چڑھاتی ہے پھر اُنت سے اپنی آغوش کشادہ کر کے اَبدی لوری سناتی ہے۔ پھر ماں اپنا رُوپ بدل کے مادرِ علمی بھی ہوتی ہے...... زیورِ تعلیم و تربیت سے سجا بنا کر اُسے دُنیا میں کامران و کامیاب بناتی ہے...... جو چیز آپ کے نیچے اُوپر' دائیں بائیں' آگے پیچھے موجود ہے وہ آپ کے لیے ہے۔ یہ سب کچھ ماں کے رُوپ ہیں...... اس کا محض نام ماں ہی نہیں اِس کے تو اتنے نام ہیں کہ تصور میں اُتارنا مشکل ہیں......!

یہ تعلق' ربط' راہ و رسم' اُنسیت' پیار' محبت' عقیدت' یگانگت' اُلفت اور عشق' یہ آذرِ فطرت کی صنم سازیاں ہیں...... نفس کے بندر کی اُلٹ بازیاں ہیں...... زبہ جالیاں اور کبھی چِک قاشیاں ہیں...... عطّاریاں ہیں' بایزیدیاں' سعدیاں ہیں رُومیاں ہیں اور رازیاں ہیں......!

"بھائی! بولو کیا چیز چاہیے؟...... جلدی کرو' ایسا نہ ہو کہ لائن کٹ ہو جائے......؟"

"پہلے وعدہ' پھر بتاؤں گا کیا لانا ہے......؟"

دُنیا کے مال اسباب کی تو اُس کے ہاں کمی نہ تھی...... گاڑی' فلیٹ' روپیہ پیسہ' اولاد' خوبصورت بیوی' عزت شہرت اور شراب!

وہ یوں بول رہا تھا جیسے کوئی جرم کر رہا ہو۔

"میرے لیے بی بی پاک دامناں کے احاطہ کی مٹی اور قبروں کے اُوپر درخت کے چند پتے لیتے آیئے گا۔"

ٹیلیفون بند ہو گیا' جبکہ میں کھل گیا'...... سر یا نس کھل جائے تو لہو نکلتا ہے' قسمت کھل جائے تو وہ

کچھ ملتا ہے جس کی اُمید نہیں ہوتی......؟

لندن کی ایک شبینہ محفل میں' جس میں سلطے آغا' اس کے والدہ' والد' محمود سپرا' ضیاء سرحدی' سحاب قزلباش' ساقی فاروقی' ابن انشا اور دیگر چیدہ چیدہ فلمی اور غیر لوگ موجود تھے۔ نور جہان بھی وہاں رونقِ محفل تھی...... بات ہندوستان کے دورے کی ہو رہی تھی کہ نور جہان بطورِ خاص وہاں گئیں۔ نوشاد صاحب' دلیپ کمار' شبانہ اعظمی اور بہت سی قابلِ ذکر فلمی ہستیوں کی موجودگی میں نور جہاں کو سراہا گیا۔ ان سے پرانے گیت سنے گئے۔ غیر ارادی طور پہ کسی نے میڈم سے پوچھ لیا۔

''میڈم!'' مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' اور'' آواز دے کہاں ہے دُنیا میری جواں ہے'' کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ یہ پنجابی گیت'' ساڈوں نہر والے پُل تے بُلا کے'' ہندوستان اور ایسے بڑے کلچرل لوگوں کی محفل میں سنانا مناسب تھا؟''

نور جہان نے چند ثانیے ناگواری سے گھورتے ہوئے جواب دیا......

''پہلا گیت'' آواز دے کہاں ہے'' برسوں پہلے میں نے گایا...... نوشاد صاحب نے بڑی محنت کی۔ اللہ نے عزت دی اور یہ گیت آج بھی پہلے کی طرح ہی پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔ یہ یہاں کے لوگوں کا حق تھا کہ میں گاؤں۔ باقی رہی فیض صاحب کی غزل اور دیگر پنجابی گیت تو یہ میرے ملک کے ہیں' ان کی کمپوزیشن اتنی آسان نہیں اور نہ ہی انہیں گانا ایسا سوکھا ہے...... میں نے ان گیتوں کو پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ موسیقی میں ہم آج بھی آپ سے کئی منزلیں آگے ہیں......!''

نور جہان نے اپنی دھرتی ماں کو ایسا خراجِ تحسین پیش کر کے ایک خوبصورت مثال قائم کی۔

اُوپر کہیں سانپ کے لیے سو برس کی قدغن ٹھہری لیکن کچھ بندے ایسے بھی کہ جب چاہیں اپنا سروپ بدل لیں اور وہ جو بھی رُوپ دھار لیں تو ایسا لگے کہ یہی ان کا اصل چہرہ ہے۔

دُنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو پیدا ہو گئے پھر کوئی اور ان جیسا پیدا نہ ہوا اور نہ ہوگا...... بڑے بزرگ اور روحانی ہستیوں سے قطع نظر جو ہم لوگ پیدا ہوئے اُن میں نور جہان نمایاں ہے۔ اس کے نمایاں' درخشاں ہونے میں اس کے نام کام اور چام کا بڑا عمل دخل رہا۔ اگر اس کا جنم پتری والا نام اللہ وسائی ہوتا اور گانے کے کام کی بجائے وہ کوئی اور عورتوں والا کام کر لیتی اور اس کا سراپا' عام عورتوں کی مانند کھڑ پنچو ٹائپ کا ہوتا تو کون جانتا کہ ملکہ ترنم نور جہاں بھی کوئی ہستی ہے؟...... میرے ایک چینڈو بچے نے اپنے ایک سکول کے ساتھی کا قصہ سنایا۔ جس کو سوال دیا گیا کہ ملکہ نور جہاں اور جہانگیر کی بابت سیر حاصل مضمون لکھو۔ اس

نے قصور سے کلکتہ ممبئی اور پھر لاہور تک کے تمام حالات لکھے۔ ''پنڈ دی کڑی' مرزا صاحباں' مرزا غالب' انارکلی' جگن وے' گلنار' پانے خان اور دیگر تمام فلموں کے بارے بہت کچھ تحریر کیا اس کی مصدقہ' غیر مصدقہ شادیوں کا ذکر بھی تفصیل سے تحریر کیا..... گالم گلوچ مار کٹائی' ہاتھا پائی کی تمام فتوحات لکھیں..... جہانگیر کے بارے لکھا کہ اس سیالکوٹی' جس کے مکھڑے پہ کالا کالا تل تھا..... جگن وے میں اس کا ہیرو تھا..... بلکہ اتنا کچھ اور ایسا کچھ لکھا کہ نورجہاں اگر پڑھ لیتی تو یہ ضرور کہتی ..... ''ہا میں نی میں اے جی وی آں.....؟''

نورجہاں ایک فاتح عورت تھی لیکن وہ عورت کہاں اور کب تھی؟ محض نسوانی اعضا، خدوخال اور اُن کی فعالیت تو کسی عورت کے مکمل ہونے کا سرٹیفکیٹ نہیں۔ ارباب نشاط کے ہاں عورت' نوٹ چھاپنے والی مشین کا نام ہے۔ گڑیاں کھیلنے کے دنوں میں اسٹیج پہ پہنچ گئی تھی' پہلے دن اسٹیج پہ پاؤں دھرتے ہی اُس کے اندر کی عورت' منہ چھپائے باہر نکل گئی' پھر آخری سانسوں تک وہ اپنے اندر کی کھوئی ہوئی عورت کو تلاش کرتی رہی..... مگر مردوں کے گدلے بجوسے میں کسی بچی کے ناک کی تیلی اور حرص و ہوس کے گھنے جنگل میں پھنسی ہوئی ننھی تتلی بھی کبھی باہر نکل سکتی ہے؟..... وہ بہادر مرد کی طرح تھی..... عورت' جب کنبے کی کفالت کرتی ہے تو وہ بہادر مرد ہوتی ہے اور عورت کی کمائی کھانے والے مرد' عورت ہوتے ہیں نہ مرد' بلکہ وہ تو ہیجڑے بھی نہیں ہوتے.....!

نورجہاں' بچپن سے اپنی گواچی ہوئی عورت' اور عہد شباب میں اپنے شوہروں کو تلاش کرتی رہی مگر یہ سارے نام نہاد شوہر' اُس کی بچی کھچی عورت کو بھی خراب کرتے رہے.....

غیر فطری موت لینے والوں کی آتماؤں کو سکون نہ کہیں ٹھکانا ملتا ہے' وہ بھوت پریت بدروح میں تبدیل ہو کر اپنا انتقام لیتی ہیں۔ گواچی ہوئی عورتوں میں اکیلی نورجہاں ہی نہیں تھی..... مینا کماری' مدھو بالا' مینا شوری' نادرہ' نگار سلطانہ' سلمیٰ آغا' بیگم پارہ وغیرہ بھی تھیں ان اداکاروں کی جیون کتھا قریب قریب ایک سی ہے..... آغاز بھی اور انجام بھی..... ان دکھی آتماؤں نے جس مرد کا ہاتھ پکڑا اُسے مس خام سے کندن بنا دیا..... مگر یہ تمام خود بکھری ہوئی مٹی کی مانند بے خانماں ہی رہیں اور بڑا عبرت ناک اور حسرت ناک انجام لے کر اس جہاں سے رخصت ہوئیں یا ہونے والی ہیں۔

متذکرہ بالا تمام عورتیں بچپن ہی سے ٹوٹ چکی تھیں۔ جب کوئی عورت اپنے بچپن میں ٹوٹ جاتی ہے تو وہ پھر کبھی نہیں جڑتی..... دوسروں کے لیے وہ سونے کی چڑیا ثابت تو ہوتی ہے مگر اپنی ذات کی دشمن..... دوسروں کو روشنی دے کے خود بجھ جاتی ہے۔ اتفاق کہہ لیں یا جو بھی سمجھیں' میرا ان خواتین سے کسی نہ کسی طور واسطہ رہا' سوائے سلمیٰ آغا کے.....!

بات نور جہاں سے آگے بڑھی تھی۔ بے شمار بشری کمزوریوں، علمی فکری کوتاہیوں کے باوجود وہ ایک گریٹ گانے والی اور ایک دل پذیر عورت اور گلیمرس شخصیت تھی۔ میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ اگر اس میں یہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو وہ کبھی نور جہان نہ ہوتی؟

نام کے اثرات، خاندانی فنی وراثت، بابا بلھے شاہ کی عنایت، ذاتی کوشش وریاضت، قصور کی مٹی کی خاصیت، مختار بیگم کی دُعا، اُستاد غلام محمد کی محنت اور سید شوکت حسین رضوی کی صحبت و تربیت اور سب سے اہم محرکات، جنہوں نے قصور کی اللہ وسائی کو نور جہان بنایا وہ اس کی ہتھ چھٹ، مُنہ پھٹ طبیعت...... کھری کھری سنانے کی عادت، اُوبڑ اور اُجڈ پن، بے علمی اور گھرانوں والی روایتی بولی ٹھولی اور ہر طرح کی بے راہ روی۔ یہ سب اچھائیاں بُرائیاں ساری زندگی اُس کے ساتھ ساتھ رہیں۔ ان کے بغیر نور جہان کا تعارف ہی مکمل نہیں ہوتا...... اور نہ ہی بشریت کا؟ اَب اس کو کیا کہیے کہ کچھ تلخ مزاجوں کو تلخی ہی راس آتی ہے۔ عدم، قتیل، فیض، منیر نیازی، جوش و جگر، مجاز، فراز...... ان تمام کو تلخی ہی راس تھی۔ ان کی تلخی پسندی کے قطع نظر ان کے سخن کی شیریں مقالی پہ کسے کلام ہو سکتا ہے......؟

اَب وہی بات ظاہر و باطن کی...... یہ کبھی ایک سے نہیں ہو سکتے۔ میرے پاس سیکڑوں ایسی مثالیں موجود ہیں، کچھ شنیدن اور کئی ایک کا میں خود شاہد ہوں۔ نور جہان جیسی دردمند اور مخیّر خاتون بھی میری نظر سے نہیں گزری...... پیروں فقیروں سے بے پناہ عقیدت، اَدب و خدمت میں لامثال...... حفظِ مراتب کی پوری...... وہ اپنے ہر ملنے والے کی طبیعت، اوقات کے مطابق برتاؤ کرتی...... کیسی عجیب بات کہ ایک طرف تو وہ وقت کے حاکم کو جوتی کی نوک پہ رکھتی اور دوسری طرف ایک عام سے لڑکے کے جوتے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی تھی۔ یہ اُس کی عظمت اور محبت کا اعجاز تھا......؟

عظیم فنکار کبھی نارمل نہیں ہوتے۔ تلوّنِ مزاجی اُن کا وطیرہ ہوتی ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، اُن کے بول بھاشا کا بھی کوئی پاسا سیدھا نہیں ہوتا۔ جو مُنہ میں آیا نکال دیا، جو دل میں ہوا اُچھال دیا۔ کوئی بُرا لگا تو اُس کی بھد اُڑا کر رکھ دی، کوئی اچھا لگا تو اُس کی سیج سجا کر رکھ دی!

میں موسیقی کے فن کی فیلڈ میں اُم کلثوم سے بڑا متاثر تھا۔ عرب دُنیا جس کی دیوانی تھی وہ اپنی زندگی میں ہی لیجنڈ کا درجہ حاصل کر چکی تھی...... اُس کی محفلوں میں شاہ فاروق جیسے لوگ کئی کئی گھنٹے کھڑے ہو کر سنا کرتے تھے۔ اُس کی شخصیت حیثیت کسی ملکہ سے کم نہ تھی...... اُس کے رسیلے زمزموں کے آگے وقت کی دھڑکنیں بھی رُک جاتی تھیں اور آج بھی وہ اپنے لازوال فن میں زندہ ہے۔ دوسری عورت الزبتھ ٹیلر تھی، وہ واقعی کلو پیٹرا تھی...... اُس کی اداکاری، اُس کا حُسنِ بے مثال، اُس کے پورے سراپے میں ایسے طلسم تھے کہ وقت کے

بڑے بڑے قیصر اور انتھونی اُس کے آگے پانی بھرتے تھے۔ اُس کے شوق' اُس کا ذوق' اُس کی پسند' تلوّن مزاجی' اُس کے عشق' اُس کی شادیاں' ہیرے' جہاز' تحفے' شوہر' ملبوسات...... دُنیائے فن و حُسن میں ایسی مکمل فنکارہ اور عورت پھر کبھی پیدا نہ ہوگی۔ تیسری ہستی نور جہاں! اللہ نے اسے نور کا گالا دیا...... بابا بلھے شاہ نے اس میں جاگ لگائی...... وہ اک دیوی تھی۔ ہم کم سوادوں نے اس کی قدر نہ کی...... اُس کی ظاہری خامیوں پہ نظر رکھی۔ اُس کی باطنی بالیدگیوں سے چشم پوشی کی...... ملامتی یہی تو ہوتے ہیں؟

مکہ مکرمہ میں ملکہ ترنم کا پیغام ملا...... بھاگا بھاگا پہنچا۔ نور جہاں' اداکار یوسف خان کے ساتھ حج کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اُن دونوں کا یہ پروگرام انتہائی خفیہ تھا...... ظاہر ہے کوئی خاتون فریضۂ حج کی غرض سے کسی نامحرم کے ساتھ تو نہیں آسکتی۔ اداکار اقبال حسن مرحوم بھی اپنی پھوپھی کے ساتھ حج کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ میں نے اقبال سے پوچھا۔

''یہ کیا چکر ہے' کیا نو سو چوہے پورے ہو گئے ہیں......؟''

ظاہر ہے میں مذاق کے مُوڈ میں تھا۔ وُہ حسبِ عادت قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''خان صاحب' تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں...... اب میڈم کا پالا کسی نو بے سے نہیں چیتے سے پڑا ہے...... دیکھتے جایئے' اللہ خیر کرے گا!''

قصوری بلّی اور لاہوری چیتے کا قیام ایک بڑے ہوٹل میں تھا۔ وہ حرم میں بھی آتے تو بڑا اُچھپ چُھپا' میڈم تو کسی طور خود کو حجاب میں چُھپا لیتی پر خان صاحب تو چُھپ نہیں سکتے تھے۔ وہ آنکھوں میں عینک' سر پہ رومال دھر کر بچنے کی کوشش کرتے۔ اس کے باوجود وہ دونوں پہچان لیے گئے۔ اَب علاج یہ نکالا کہ وہ رات کو نکلنے لگے...... مگر خوشبو یا بدبو کا اندھیرے اُجالے سے کیا واسطہ' وہ تو اپنا آپ دکھا کر رہتے ہیں۔ اَب میں نے اُنہیں ایک طریقہ بتایا۔ حرم شریف میں ایک ایسا مقام بھی ہے جدھر عام لوگ نہیں پہنچ پاتے۔ میں بھی اکثر اُن کے ساتھ اِدھر آ جاتا۔ ایک دو نمازیں ادا کر کے اُسی راستے نکل آتے۔ ایک روز خان صاحب کسی وجہ سے نہ پہنچے۔ میں اقبال حسن اور میڈم اپنے اپنے شغل میلے میں لگے ہوئے تھے۔

انسان بھی کیا چیز ہے؟ نہ یہ میٹھا ثم کر کھا سکتا ہے نہ چیکا۔ اس کو ہر وقت اوّل بدل چاہیے ہوتی ہے۔ خاص طور پہ جب یہ عبادت میں بیٹھا ہو تو اس کے اندر عجیب سی کیفیت ہوتی ہے۔ شیطان اس کو انگیخت کرتا رہتا ہے۔ کبھی زبردستی محسوس کرتا ہے کہ مجھے پیشاب لگ رہا ہے۔ ٹانگ سُن ہو رہی ہے۔ بھوک پیاس کا احساس ہوتا ہے...... غرضیکہ کوئی نہ کوئی بہانہ بکھیڑا گھڑ ہی لیتا ہے۔ خود کو خوب لُکائے چھپائے بڑی نیک پروین بنی میڈم تسبیح

کر رہی تھی۔ میں پرانا پاپی بھی پڑھنے پڑھانے کا سوانگ رچائے بیٹھا تھا۔ میڈم نے اقبال حسن کو آبِ زم زم لانے کا کہا۔ وہ لے کر پہنچا تو دو گھونٹ پی کر بولیں۔

''بابا! جی چاہتا ہے کہ باقی حیاتی یہیں پہ بسر ہو جائے......!''

میں نہ جانے کس موڈ میں تھا' جواب میں کہا۔

''کام کی حیاتی تو وہ تھی جو اسٹوڈیو اور گاتے ناچتے گزر گئی۔ اب باقی کیا بچا رہ گیا ہے جسے یہاں گزارہ جائے...... ویسے ایک بات جاننا چاہتا ہوں' آپ یہاں اللہ کے گھر بیٹھی ہیں۔ سچ سچ بتائیے' یہ یوسف خان اور حج والی حرکت کیا ہے......؟''

میڈم کو تو جیسے چپ لگ گئی' کوئی جواب دینے کی بجائے وہ بھری آنکھوں سے خانہ کعبہ کی طرف دیکھتی رہیں۔ چادر سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں۔

''حرام خوروں سے جان چھڑانا چاہتی ہوں...... ماں جائے' پیٹ جائے...... رشتہ دار' کنبے والے' دُنیا والے کوئی بھی تو نہیں جو مجھے میری کھوئی ہوئی عورت کو واپس دلا سکے...... یہی فریاد لے کر یہاں حاضر ہوئی ہوں...... دیکھئے' مراد ملتی ہے یا بے مراد واپس لوٹتی ہوں۔''

وہ اندر سے ایک معصوم بچی تھی...... بلکہ گونگے' اندھے بہرے' پولیو زدہ بچوں کا ایک ہُجم غفیر اس کے اندر پناہ گزیں تھا۔ اُس کی گائیکی ادائیگی غور سے دیکھیں سُنیں تو یہ بات آپ کی سمجھ میں بھی آ جائے گی۔

ہوا کے آوارہ جھونکے کی طرح کدھر سے کدھر نکل آئے...... نہ زمن وزماں کی حد' نہ جنس و جاں کی کوئی قید...... قلم کا گھوڑا' جدھر منہ ہوا چل دوڑا...... وادی مہران ہے تو کہیں ارضِ ایران ہے...... سانپ سپولے ہیں تو کہیں شہباز و مولے ہیں۔ گھر کی گاڑی ہو تو سرپٹ دوڑنے پہ کیونکر بھاری ہو۔

جگجیت سنگھ نے پھر اپنی بات دُہرائی۔

''بابا جی! جو کہوں' وہ لے آئیں گے نا......؟''

اُس کی فرمائش سُن کر جھٹکا تو ضرور لگا مگر یہ کوئی ایسی بات بھی نہ تھی جو ایسی ہو کہ سن کر آدمی سُن ہو جائے...... میرے ہاں کرنے پہ مطمئن ہو کر اُس نے کال کاٹ دی۔

بات کٹ جائے یا ٹیلیفون...... لگتا ہے کسی نے شہ رگ کاٹ دی ہو۔ میری سوچ ہی کچھ ایسی ہے۔ میں کہتا ہوں قتل کرنا اگر لازم ہو بھی جائے تو کم از کم آدابِ اقلی تو ملحوظ خاطر رہیں۔ جوڑنا ہو یا توڑنا' بنانا ہو یا بگاڑنا' سلیقہ قرینہ تو بہر طور پیش نظر ہونا چاہیے...... آخر اخلاق مندی اور معاشرتی طور طریقے بھی تو کوئی چیز ہیں؟

مثلاً ہم نے اپنی پیاری بیوی کو شاپنگ یا کسی کے ہاں دعوت میں ساتھ لے کر جانا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم غاروں پتھروں کے دور کے آدمی کی طرح اُسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بیچ بازار لے کر جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اندازِ دلبری اُس دور کے معاشرتی اخلاقیات کے مطابق ہو۔ ہر دور کے اپنے اخلاقی روایتی تقاضے ہوتے ہیں......!

اس حوالے سے آپ چنگیز خان، ہلاکو خان کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں کہ وہ تو کوئی ایسے پرانے زمانوں کے نہیں تھے اُن کے ہاں قتل گری کا قرینہ سلیقہ کیونکر نہ آیا؟ دونوں حضرات ذات واوقات کے بڑے قصاب تھے۔ اُن کے آباء واجداد ڈانگا سوروں پہ ہاتھ صاف کیا کرتے تھے...... یہ پیشہ ور قاتل تھے۔ مغلوں کو صبح دم ''نوم شبی'' سے بیدار کرنے کے لیے مطربائیں، مغنی، راگ وارثے کا راگ، ساز بنا کر، میوز چھل نجلا کر، عنبر وعود سونگھا کر عالمِ ہوش میں لانے کی جرأت کیا کرتے تھے۔ چنگیز و ہلاکو کی صبح بیداری، میں پچیس تنومند باکرہ و فاسقہ مرد وزن اور بچگان معصومہ کے قتل مقاجات سے ممکن ہوتی۔ جب تک اُن کے نتھنے چہروں پہ خون ناحق کے چند چھینٹے نہ پڑتے اُن کے ہوش کا مل بوپے وا نہ کرتے...... تم قتل کرے ہو کہ کرامات کرے ہو؟...... والی بات ہونی چاہیے!

قتل کرتا ہو یا قتل ہوتا ہو...... دوستی کی ابتداء اور انتہا دیکھنی ہو تو...... امام العاشقین صالحین، صوفی حسین بن منصور حلاج کے قتل، اُن کے قاتلوں اور اُن کے ہمدمِ دیرینہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پور پور کٹ رہی ہے اور وہ مزے لے رہے ہیں...... دیکھنے والے چیخ رہے ہیں۔ آہ و بکا ہو رہی ہے...... اور وہ ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں اب مزہ آرہا ہے......!

گلوٹین اور گلا کٹنے والے کو خبر تک نہیں ہوتی اور قصہ تمام ہو جاتا ہے؟

ٹیلیفون بھی اچانک آ جائے تو میرے جیسے مجہول کو گلوٹین سے گلا کٹنے کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح کی بہت سی اذیتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہوں...... اور جب تک نُوں، ہوتا رہوں گا۔ جگجیت سنگھ اور ایک ایسی ہی ایک ''عارفانہ سی حرکت'' جناب قبلہ گاہی محسن نثار صاحب سے بھی سرزد ہوئی۔ ایک کالم کے نفسِ مضمون کے سلسلہ میں ٹیلیفون پہ بات ہو رہی تھی، مجھے کچھ اختلاف تھا...... محترم محسن نثار......! مَیں نے ان سے بہت کچھ سیکھا...... ان کی تحریر، انداز اور جرأتِ اظہار کا مداح ہوں...... مگر اس کے ساتھ ساتھ مَیں انہیں ایک بشر بھی مانتا ہوں اور بشر اپنی کجیوں کمزوریوں کے ساتھ ہوتا ہے...... ایسی چند چیزیں ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں...... مَیں کہتا ہوں اگر خامیوں میں بھی خوبصورتی اور کچھ انفرادیت پیدا کر لی جائے تو وہ خوبیوں کے قریب ہو جاتی ہیں۔ اُن کے مزاج میں نخوت اور انا پرستی کچھ زیادہ ہے...... زعمِ علمیت کا توازن بگڑا ہوا ہے......

گفتار و اظہار میں قطعیت آ جاتی ہے۔ وہ متفق کم ہوتے ہیں...... اُن کے دور تک بال' عینک' آنکھیں ہونٹ' بات کرنے اور بیٹھنے کا انداز بالکل جاگیردارانہ ہے جبکہ اندر سے وہ ایسے نہیں ہیں...... اپنے انسانی' پیشہ ورانہ' فکری اور تمہارا کونوشی کے زاویوں میں وہ بالکل سرور تنکھیرا اور کچھ کچھ عطاء الحق قاسمی ہیں۔ اُن کے ہاں اُٹھنے بیٹھنے والے بھی' اُن جیسے بہت اُوپر تک پڑھے لکھے اور حیثیت والے لوگ ہوتے ہیں۔ مجھ ایسا تھرڈ کلاس 'بڈھا' جاہل اُن کی رینج میں نہیں آتا۔

بات کر رہا تھا کہ میری اُن سے ٹیلیفون پہ بات ہو رہی تھی۔ مجھے اُن کے کالم کے ایک فقرے پہ اختلاف تھا۔ میرے عرض کرنے پہ وہ مجھ سے متفق نہ ہوئے۔ یہاں تک ٹھیک رہا' بات بگڑی تب جب اُنہوں نے انتہائی بے دردی سے میرے اعتماد' خلوص اور عقیدت کا گلا کاٹ دیا...... یعنی بغیر کچھ کہے گفتگو کو کوئی بہتر موڑ دیے بنا ٹیلیفون کاٹ دیا۔ سب جانتے کہ اس طرح کے برتاؤ کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی بکواس بند کرو' میرے پاس اَنٹ شنٹ سننے کے لیے وقت نہیں۔ دوسرا یہ کہ آئندہ ٹیلیفون کر کے میرا وقت برباد مت کرنا۔ چلئے! میں ہی غلط اور جاہل تھا...... مگر آپ تو نہ تھے۔ علم' تحمل' تدبر اور تفکر سکھاتا ہے...... چھوٹوں اور کم علموں اور کم اَوقاتوں سے بُردباری سے نبٹنے کہ حسن بصری کو اِن کا تحمل اور عجز کا تحمل لے چڑھا اور حسن بن صباح کو اس کا علمی سیاسی اور مجلسی تفاخر لے بیٹھا......!

پچھلے دِنوں قدرت کو کیا منظور تھا...... 'مخدومی عطاء الحق قاسمی کے پروگرام'' بہ زبانِ قاسمی'' کا الحمراء میں اہتمام تھا۔ پہلی صف میں صرف دو نشستیں خالی تھیں۔ ایک پہ مجھ ایسے' پچھلی صفوں پہ بیٹھنے والے کو بحکم قاسمی صاحب بٹھا دیا گیا' ساتھ والی ہنوز خالی تھی...... سوچ رہا تھا' اللہ کریم کسی متوازن سے بندے کی ہمسائیگی نصیب فرمانا...... دُعا کا پنچھی ابھی سینے کے قفس سے اُڑنے بھی نہ پایا تھا کہ قیمتی گرم شال' شانے پہ ڈالے ایک ''ادب اور میڈیا کا وڈیرا'' میرے ساتھ والی نشست پہ فروکش ہُوا...... یہ میرے بزرگ' حسن نثار صاحب تھے...... دِل بلّیوں اُچھل رہا تھا...... یہ کیا ہُوا؟...... میں تو اِن سے ناراض ہوں...... ان کو علم ہے کہ اُنہوں نے ٹیلیفون کیسے پٹکا تھا!

کمی کمین اور اَن پڑھ جاہل لوگ تو چھتّی چھوٹی جھکی چھت کی مانند ہوتے ہیں۔ اشراف' پڑھے لکھے تہذیب دار' وائٹ گولڈ کی چھری کی طرح ہوتے ہیں...... یہ چھری نیچے ہو یا اُوپر اور نہ بھی ہو تو کچھ فرق نہیں پڑتا...... گدھوں گھوڑوں کے آگے ڈالنے والی پھٹ' اپنی اوقات میں ہی پھٹ جاتی ہے۔

میں نے سر نیو کر سلام کیا' جواب میں مسکراہٹ جلیبی کر لی۔ حال احوال پوچھے گئے...... یوں لگتا تھا کہ بزرگوار' بصرے کا چکر لگا آئے ہیں۔ میں اُن کی بغل میں' بغلی بچہ بنا بیٹھا تھا۔ نکوٹین کی مہلک بدبو کی

بجائے کسی بغیر الکوحل کی خوشبو کے لیرے مجھ سے شناسائی پیدا کرنے کی کوشش میں تھے۔ میرا تجربہ ہے کہ جو شخص زیادہ اور تیز خوشبو میں استعمال کرتا ہے وہ انتہا کا سونے باز ہوتا ہے۔ مگر ان کے ہونٹوں اور چہرے کی سُرخی سے اندازہ ہوتا تھا کہ بابا جی نے سونے بازی کم کردی یا چھوڑ دی ہے۔

عہدِ حاضر کے میرے کچھ بزرگ ایسے ہیں جن کے بارے مجھے یقین ہے کہ وہ جیتے جی اس کارِخرابی سے خلاصی حاصل نہیں کر پائیں گے۔ ان میں عطاء الحق قاسمی سرِفہرست ہیں وہ مجھ سے ملنے سے اس لیے کتراتے ہیں کہ مَیں اُن کی تمباکونوشی سے مضطرب ہوتا ہوں۔ کبھی انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہوں تو خجالت چھپاتے ہوئے دُعا کا کہہ کے آخری سُوٹا کھینچ کے باقی کا پھینک دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنے مرحوم بھائی کا تمباکونوشی کے ہاتھوں انجام دیکھ لیا ہُوا ہے۔ دوسرے نمبر پہ مرحوم خالد احمد تھے' حسن نثار' سرور سکھیرا' مستنصر حسین تارڑ' قاضی احمد وغیرہ...... کبھی کبھی سوچتا ہوں ان سب بزرگوں کو اکٹھا کروں اور کہوں تم بڑے قیمتی اور نادر لوگ ہو...... موجودہ اور آنے والی نسلوں کو تمہاری بڑی ضرورت ہے...... خود پہ اپنے بیوی بچوں پہ رحم کرو...... پھر جب اپنی اوقات پہ نظر پڑتی ہے تو چُپ سادھ لیتا ہوں۔ واللہ! ہم تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے......!

قاسمی صاحب کا پروگرام' ہر لحاظ سے بہت کامیاب تھا۔ اُنہوں نے اپنی چیدہ چیدہ تحریریں بڑے اَحسن انداز سے پڑھیں اور حاضرین سے خُوب داد سمیٹی۔ پروگرام ختم ہوا تو مَیں مبارکباد پیش کرنے اسٹیج کے پیچھے پہنچا تو وہ اپنے پروانوں کے نرغے میں بُری طرح پھنسے ہوئے تھے اور ایک سگریٹ اُن کے ہونٹوں کی گرفت میں سُلگ رہا تھا۔

مَیں اس پروگرام کو ایک اور حوالے سے بھی کامیاب سمجھتا ہوں کہ نثار صاحب اور میری صلح ہوگئی۔ ہم خُوب دل کھول کر اک دوجے سے باتیں کرتے رہے اور بطورِ خاص' مَیں نے اس خوشی کا اظہار کیا کہ آج مَیں آپ کے قدموں میں بیٹھا ہُوا ہوں' میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے...... لکھنے لکھانے اور میری عزت و شہرت میں آپ کا قابلِ قدر حصّہ ہے......؟

موسیقار' گائیک اور ایک خوبصورت دل و دماغ کے مالک سردار جگجیت سنگھ کی بات بیچ میں لٹکی رہ گئی۔ بُھول ہی جاتا اگر اس میں بی بی پاک دامناں کے ذرکی مٹی اور قبروں کے اُوپر چھتر چھاؤں والے سیکڑوں برس پرانے درختوں کے پتّوں کی بات نہ ہوتی...... ہم لاہور میں رہتے ہیں' دن میں کئی بار وہاں حاضری زیارت کے لیے جاسکتے ہیں...... جاتے بھی ہیں مگر ہم نے تو کبھی اِدھر کی خاک مٹی یا درختوں کے پتّوں کے بارے میں

نہیں سوچا اور نہ کبھی ان کی ضرورت محسوس کی یا یہ کہ کس مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں؟ سچ ہے کہ دوری میں حضوری کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ آنکھوں کے ساتھ ہی ناک ہے مگر دکھائی نہیں دیتا۔ اتنی قربت اور ایسی دوری؟...... مکّہ اور مدینہ شریف میں کئی ایسے لوگ موجود ہیں جو پیدا بھی اُدھر ہی ہوئے' بوڑھے بھی ہو لیے مگر کبھی زیارت' سلام کے لیے اندر جانے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ایسے بھی سیکڑوں ہزاروں کوسوں سے کشاں کشاں دوڑے چلے آتے ہیں۔ اپنے اپنے نصیب اور توفیق کی بات ہے......؟

ہنوز میں اسی گھمن گھیری میں پھنسا ہوا تھا کہ ایک سکھ کو بی بی پاک دامناں کے دَر سے ان چیزوں کی ضرورت کیونکر پیش آئی؟...... میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں اُس کی مطلوبہ اشیاء حاصل کروں اور واہگہ کراس کر کے اُس تک پہنچاؤں اور پھر جاننے کی کوشش کروں کہ یہ اشیاء حاصل کرنے کا' اس کا کیا مقصد تھا؟

درویش کے لیے مشرق مغرب' شمال وجنوب اور تحت الثریٰ سے فلک الافلاک تک کی مسافتیں' اڑھائی قدم سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ میرے اللہ کریم کے کرم وفضل اور میری پہلی مرشد چاچی کی دُعا برکت سے مجھ عاجز گنہگار کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ اس بارے میں ''پیا رنگ کالا'' میں تفصیل بیان کر چکا ہوں۔ اس سائنسی دور میں اس بات کو بیان کرنا دیوانے کی بڑ سے زیادہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا' لیکن یہ بھی حقیقت ہی ہے۔ اللہ کریم جو چاہیں ہو جاتا ہے اور دُعا تو اَنہونی کو ہونی میں بدل دیتی ہے...... کھوٹے کھرے اور چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں...... چور قطب بن جاتے ہیں...... گو وہ ڈونی چاڑ نیچے غار اُوپر پہاڑ...... 'کنجری دا تُکّے وانہ یار...... 'یوہ ماڑو ساکھ تے ہاڑ...... 'کدی جت تے کدی ہار' دھوبی درزی مستری لوہار...... 'مراثی مصلی چنگڑ چمیار...... 'تیلی میلی کمی کمہار...... 'نانک دُکھی سب سنسار' جگ میں جیون تھوڑا کون کرے جنجال...... 'چل سو چل ایہو چنگی گل...... ے

کی لبھناں ایں زیراں زبراں نوں
کیوں ڈرنا ایں ڈونگیاں قبراں نوں
اِک دن اوتھے جاناں اے
جتھے خاص ٹھکانا لانا اے
پڑھو لا الٰہ اِلّا اللہ محمد ''پاک'' رسول اللہ

''پیا رنگ کالا'' میں اُس دیہاتی بزرگ کے بارے تو پڑھا ہوگا...... جو کلمہ طیبہ ''پاک'' کی اضافت سے پڑھا کرتا تھا۔ باباجی نے سمجھایا کہ کلمہ پاک صحیح طریقے سے پڑھنا چاہیے...... کسی صورت اس میں کمی بیشی

جائز نہیں۔ چینڈو بزرگ نے لاکھ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ پریشان ہو کر کہنے لگا۔ "بابا جی! میرے منہ توں سو ہنے نبی دا ناں' پاک لا یاں بناں نکلدا ای نئیں...... میں کی کراں؟"...... یہاں علم' منہ دیکھتا رہ جاتا ہے اور اخلاص و عشق بازی مار جاتے ہیں!

عجب منطق ہے لاعلمی سے غلط میں بھی اخلاص شامل ہو جائے تو صحیح سے زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے اور اگر صائب میں تکنیک کی صعوبت ثبت ہو جائے تو نہ صحیح نہ غلط' کچھ بھی تو نہیں رہتا۔

نہ ہو عشق تو مسلماں......؟

علی الصباح بی بی دامناں حاضری دی اور مطلوبہ اشیاء لے کر سیدھا واہگہ پہنچا...... جتنی دیر میں پرانی انارکلی سے نئی انارکلی "دہلی مسلم ہوٹل" "مہاراج کھتک کے" "دربار" تک پیدل پہنچا جا سکتا ہے' میں اس سے بھی کم وقت میں اناری سے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر چندی گڑھ روانہ ہو چکا......؟

یہ وہ بھلا وقت تھا جب دونوں ملکوں کے درمیان ایسا تناؤ کھچاؤ نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ دونوں اطراف کے لوگ آسانی سے ویزہ حاصل کر کے آتے جاتے رہتے تھے۔ مشکلیں کم' آسانیاں زیادہ تھیں جبکہ میرے لیے راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ پاکستانی پاسپورٹ کے علاوہ برٹش پاسپورٹ بھی تھا' جس پہ ویزے کی ضرورت نہ تھی۔ دونوں اطراف کا عملہ بڑی محبت مروت سے پیش آتا اور فقیر سے دعائیں لیتا۔

امرتسر' میری محبت ہے' لاہور میرا عشق' سیالکوٹ میرا جنوں اور باقی خدا کی خدائی میرا مکتب......!

کئی تگیں بتانے کے بعد بھی میں "ہونے نہ ہونے" کے مرحلے پہ ہوں۔ قویٰ اعضا' بشری تقاضے اندر باہر کے کھرے کھوٹے' دنیا داری' صحت بیماری' کاری بے کاری دیکھ اور محسوس کر کے گمان ہوتا ہے کہ بشر ہوں' پر میرے طور طریقے' سوچ بچار' خواب و خیال' انداز و افکار' نظر و نگاہ' حرکات و ادا' آمد و رفت' خصائل و وسائل' شدومد' ضرب و زد' تعلق و تملق' بشرانہ سے نہیں لگتے بلکہ لگتا ہے کہ میں دو چار بلکہ کئی ایک مختلف مخلوقات کا کاک ٹیل ہوں' مجھے خوب بلا جلا کھڑکا کر ایسا گاڑھا مغلوبہ بنا دیا گیا کہ ہر اک کی الگ پہچان ختم ہو گئی ہے۔

کبھی کوئی جن اندر سے جھانکنے لگتا ہے' کبھی کوئی پری' پر پھیلائے میرے شانوں پہ سے باہر نکل آتی ہے۔ کبھی درویش فقیر' علی علی کی جلی لگاتا ہوا' سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی کوئی بھگت چپس کاری الکھ نرنجن کا نرسنگھا بجاتا ہوا پاس سے گزر جاتا ہے۔ کبھی کوئی صوفی سائیں اور کبھی کوئی سید آرائیں؟...... جدھر میں کبھی جسمانی طور پہ گیا ہی نہیں' اکثر ادھر ادھر ہوتا ہوں۔ جسے کبھی دیکھا بھالا ہی نہیں' وہ میرا شناسا نکل آتا ہے۔ ایسے ایسے شعر' قول' مقولے' نسخے فارمولے ترکیبیں' نکتے اور منظر' دماغ کی سکرین پہ ابھر آتے ہیں' جن تک میری علمی بصیرتی یا کسی طور بھی رسائی ہی نہیں ہوئی۔ اکثر جاگے ان جاگے' کھلی یا بند آنکھوں' چلتے یا اڑتے' تصور میں یا

تخیل میں ایسے موجود نا موجود مقامات تک پہنچ جاتا ہوں پتا نہیں وہ صفحۂ ہستی پہ موجود بھی ہیں یا نہیں۔
بالشتیے' بونے' بڑے بڑے حد نگاہ تک بلند نسا چہ' جنات' پہاڑوں سے پھیلاؤ والے زحل ارض و افلاک ......
یہ ''اواتار'' فلم آج بنی ہے' مَیں ایسے اُڑنے والے گھوڑوں' لمبی دُموں' کبھی آنکھوں' پھیلے ناکوں اور ہوا میں
تیرنے والی مخلوق اور ایسے پھیلے ہوئے درختوں' بجھتے جلتے والے پھولوں' قوسِ قزح کے جھولتے جھولوں' باتیں
کرنے والے خوش رنگ طیور کو اپنی کھلی آنکھوں سے کئی بار دیکھ چکا ہوں' اُدھر جا چکا ہوں ...... جب مجھے پہلی بار
بضد اصرار اس فلم کو دکھایا گیا تو کچھ بھی میرے لیے اَن دیکھا نہ تھا بلکہ کئی چیزوں کی نشاندہی میں نے
خود کی ......!

لگ بھگ پچاس پچپن برس پرے کی بات یاد آ گئی ...... اس یاد سے بھی ایک اور بات یاد آ گئی کہ
میری یہ یادداشت بھی اک طرفہ عجوبہ ہے ...... شعر کا ایک مصرعہ حاضر' مصرعہ ثانی غائب ...... آدھا نام یاد ہے باقی
بھول گیا۔ اسی طرح سسرالی رشتہ داروں کی پہچان' نام ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ ایک شخص بڑے خلوص اور
اپنائیت سے بغلگیر ہو رہا ہے' مصافحہ کر رہا ہے اور مَیں بھونڈوں کی طرح اُسے دیکھ رہا ہوں کھسیانی سی مسکراہٹ
سے اُس کا حال احوال پوچھ رہا ہوں۔ کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہوں کہ خود اپنا تعارف کرا دے یا مجھے کچھ
اس کی بابت کچھ یاد آ جائے؟ پر توبہ کیجیے کہ کچھ یاد آ جائے۔ خُوب باتیں ہو رہی ہیں' بیوی بچوں' صحت طبیعت'
سیاست ریاست' دہشت گردی' مہنگائی' بجلی گیس پانی سب موضوعات چل رہے ہیں اور اِدھر اپنا دماغ بھی چل
رہا کہ آخر یہ حضرت ہیں کون؟ ...... اَب مَیں اپنی اصلیت پہ اُتر آتا ہوں۔ باتوں باتوں میں اُسے گھیر گھار کر کسی
ایسے مقام پہ لانے کی کوشش کرتا ہوں جہاں سے مجھے اُس کا کچھ اتا پتا یا کم از کم نام' مجھ سے تعلق' رابطے کا کوئی
سراغ مل سکے۔ اسی کشمکش میں اگر دماغ کی رگ کھل گئی تو پتا چل جاتا ہے کہ یہ کون ہیں ...... نہیں تو گھنٹہ بھر
مغز ماری' اداکاری کے بعد وہ اپنی راہ اور مَیں اپنے راستے ...... بخدا! لینا دینا بھی یاد نہیں رہتا ...... اکثر سامان
بندھوا کر باہر نکلنے کی کرتا ہوں تو دوکاندار مجھے ادائیگی کا کہہ کر شرمندہ کر دیتا ہے۔

ایک شریف انسان' جو مرغیاں کاٹتا تھا کہ اصلی دیسی چینذ و مرغی اُسی کے ہاں سے دستیاب ہوتی تھی۔
مَیں اُس کا مستقل گاہک ...... وہ بھی میری قدر کرتا اور اچھی سے اچھی نرم ''چوزہ'' میرے لیے ذبح کرتا ......
غریب شریف آدمی' رزقِ حلال پہ یقین رکھنے والا۔ ایک روز صبح صبح وہ میرے ہاں آیا ...... سلام دُعا کے بعد
انتہائی عاجزی انکساری سے گویا ہوا ......

''آپ سے اجازت اور دُعا لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

مَیں نے خوش ہو کر پوچھا۔

فرمایئے......!

''بہت عرصہ سے عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کی تمنا تھی۔ اللہ نے قبول فرمائی ہے۔ سب انتظامات بھی ہو گئے۔ بس کچھ ٹکٹ کے پیسوں میں کمی واقع ہے۔ سوچا اللہ رسول کے بلاوے پہ جا رہا ہوں۔ جاتے ہوئے آپ سے اجازت اور دُعا لے لوں اور کچھ......؟''

''کچھ'' کے آگے وہ خاموش ہو گیا۔ میں سمجھ گیا...... اُس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹکٹ کے پیسوں میں کمی ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے بتایئے؟...... اللہ مسبب الاسباب ہے۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔

''بابا! سب کچھ ٹھیک ہے میں کبھی زبان پہ نہ لاتا...... مگر اب مجبوری سے کہنا پڑا کہ آپ کی جانب میرے کچھ پیسے نکلتے ہیں۔ اگر اُس کی ادائیگی فرما دیں تو میری یہ ٹکٹ کی رقم والی پریشانی دُور ہو جائے گی۔''

میں نے بڑی حیرانی سے اُس کی یہ بات سُنی۔

''میری طرف کچھ پیسے نکلتے ہیں؟...... بھئی میں کچھ سمجھا نہیں...... ذرا وضاحت کر دیں تو میرے لیے آسانی ہوگی؟''

''بابا! آپ اکثر ادائیگی کرنا بھول جاتے تھے...... اور میں آپ کی حیا کرتا تھا۔ پلٹ کر کہتے ہوئے زبان پہ گرہ پڑ جاتی تھی۔ یہی سوچ کر خاموش ہو جاتا...... کوئی بات نہیں میرا حق ہوگا تو مل جائے گا۔ اللہ کے خزانے میں جمع ہو رہے ہیں...... انشاءاللہ! منافع کے ساتھ مل جاویں گے۔''

مجھ پہ گھڑوں اوس پڑ گئی...... میں نے اپنی کوتاہی اور بھول جانے کی عادت پہ لعن طعن کرتے ہوئے انتہائی شرمندگی سے سر جھکائے ہوئے پوچھا!

''بھائی! میں نے کبھی ادائیگی بھی کی یا ہر بار یوں ہی مرغی لے کر چلا آتا تھا......؟''

جواب دینے کی بجائے اُس نے جیب سے ایک چھوٹی سی کاپی نکال کر میرے سامنے لاتے ہوئے اٹک اٹک کر بتانے لگا......؟

''دو برسوں کے اوپر کا حساب اللہ کی گواہی سے لکھا ہے۔ آپ خُود دیکھ لیں؟'' ساتھ ہی ہاتھ جوڑ کر روہانسا سا بولا۔ ''بابا جی! خدا گواہ ہے میں آپ سے اپنا حساب چُکتا کرنے نہیں آیا...... دُعا لینے آیا ہوں اور یہ بھی کہ حج عمرہ کی توفیق ہو تو واجب ہے اگر توفیق نہ ہو تو قرض اُٹھا کر جائز نہیں۔ کئی روز سے اسی مخمصے میں رہا کہ آپ سے کہوں یا نہ کہوں؟ پھر یہی مناسب لگا کہ آپ کو یاد دلاؤں کہ آپ کی طرف کچھ ادائیگی کرنا باقی ہے۔ اس میں یہ بات بھی تھی کہ آپ بھول جاتے ہیں آپ کو یاد دلانے سے آپ پہ بھی کسی کا بوجھ نہیں رہتا۔''

اُس ایسی حقیقت افروز باتیں سُن کر میں اندر ہی اندر بہت شرمندہ ہوا اور خوش بھی کہ اس دورِ نا آسودہ میں بھی ایسے متوکل انسان موجود ہیں...... سچ ہے جس نے اپنے رب پہ توکل کیا' وہ کبھی گھاٹے میں نہیں رہا۔

اُس کی چھتنار اسی کاپی جس پہ اصلی دیسی چینڈو مرغیوں کے خون اور بیٹوں کے دھبے' ناگواری بو رچی بسی تھی...... اِس وقت میرے رُوبرو ایک ایسی مقدس دستاویز کی صورت دھری تھی جس میں توکل تقویٰ' تفہیم تقدیری اور تسلیم تمامی کے تمامتر تصفیے تفصیل تھے۔ باقی کی رُوداد لکھنے کی ضرورت نہیں...... صرف اتنا کہ وہ دیسی مرغیوں والا اپنی منزل پہ پہنچ گیا۔ کہنا یہ کہ اللہ کریم کی جانب سے ہر حرکت میں برکت ہوتی ہے' کسی کی سمجھ میں فوراً آ جاتی ہے اور کوئی اک خاص وقت پہ اُسے سمجھ پاتا ہے۔

اللہ کریم نے اپنے خلیفہ نائب آدم کو "احسنِ تقویم" تخلیق فرمایا۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں بڑی خاص حکمتیں مصلحتیں صلاحیتیں رکھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ متضاد عناصر مثلاً خود غرضی' تلوّن' ضد' حسد' غرور' خود پسندی' عُجلت' طمع' لالچ' حرص' نمایاں ہونے کی خواہش...... انہی عناصر کو عناصرِ حاضر اور غائب ہونے کی صلاحیت بھی عطا کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی مرئی اور غیر مرئی قوتوں کو بھی اس کے دائرہ دسترس میں کر دیا لیکن کچھ استثنائی صورتوں کے ساتھ...... مالک و خالق نے نظامِ ہست کو رواں دواں اور خیر و شر میں توازن رکھنے کی خاطر' انسانوں میں کچھ الگ سے بندے بھی خلق فرمائے۔ اسی حساب سے اُنھیں عام بندوں کی فہامت استقامت سے ماورا تفہیم و تجلیل تفویض فرمائی...... اُنھیں بصارت نطق' سماعت اور بشارت سے تہذیب کیا...... یہ لوگ اللہ کے ولی' غوث' قطب' اَبدال ہوتے ہیں۔ جس طرح بڑے لوگوں کے ہاں چوکیدار پہرہ دار نوکر چاکر ہوتے ہیں اسی طرح اِن کے آگے بھی سالک' عالم فاضل' عابد عارف حافظ محتسب قاضی مفتی پیر وغیرہ۔ یہ اللہ ھو کی لڑی میں پروئے دانے موتی ہوتے ہیں۔ دُنیا کا روحانی نظام' درجہ بدرجہ اِن کے رُوبرو ہوتا ہے......؟

قطع نظر' ان سب کے کچھ نظر ہو بھی...... فقیر دَرویش' مجذوب' صوفی' سَنت' ملنگ...... سب اس راہ کے مسافر!...... مگر ذرا ہٹ کے کچے پہ چلتے ہیں۔ کہ کچ اور پک بھی چلنے اور چکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ گاڑی کے ایک دو پہیے اگر پکے سے کچے پہ اُتر جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گاڑی سے الگ ہو گئے' اسلام آباد تو وہ بھی پہنچ جائیں گے۔ راستہ کچا ہو یا پکا قافلہ گزر ہی جاتا ہے...... اور قافلہ ایسے کاروان کا نام ہے جس میں کمزور' توانا' مرد و زن' بوڑھے بچے...... گدھے گھوڑے اُونٹ سب ہی شامل ہوتے ہیں لیکن منزل سب کی ایک......! ان سے بھی آگے کچھ اور کُھلے کھانے بھی ہوتے ہیں۔ گلی گلی' نگر نگر رُلنے والے رَمتے جوگی' چُپ سائیں' ملامتی فقیر دَرویش' ٹھور نہ ٹھکانا' اپنا نہ بیگانہ' جورو نہ بچے' جھوٹے نہ سچے' چُپ نہ کچے...... جدھر کی ہوا

چلی چل دیئے نشاں نہ کوئی منزل ...... یہ بڑے قیمتی اور گنی ہوتے ہیں۔

اُمرتسر' جلیانوالے باغ کے باہر تجیت سنگھ کی بھجوائی ہوئی گاڑی کھڑی تھی۔ ایک موٹا سردار میری راہ دیکھ رہا تھا۔ اُسے شاید مجھے لے کر چنڈی گڑھ جانے کی جلدی تھی۔ مگر میں نے اُس سے آدھ گھنٹے کی مہلت لے لی۔ دربار صاحب حاضری دی۔ پھر اُسے ساتھ لے ہال بازار پہنچا' قاضی صاحب کے والد صاحب والی مسجد اور قبرستان گیا' فاتحہ پڑھی اور چنڈی گڑھ نکل پڑے۔

چنڈی گڑھ کے نواح میں ایک وسیع و عریض خوبصورت فارم ہاؤس کے دروازہ پہ بڑے بڑے جفادری قسم کے سونڈ بونڈ سرداروں کا مجمع لگا تھا۔ فارم ہاؤس کا بڑا سا گیٹ پھولوں سے آرائش تھا۔ بڑے تپاک سے میرا استقبال ہوا...... تجیت سنگھ پتا نہیں کیا کچھ میرے بارے بتا رکھا تھا۔ یہ سب لوگ مجھے کوئی روحانی شخصیت سمجھ کر میرے آگے پیچھے بچھے جا رہے تھے۔

ذرا تنہائی نصیب ہوئی تو تجیت نے پہلا سوال جو مجھ سے پوچھا وہ بی بی پاک دامناں کی مٹی اور پتوں کا تھا۔ میں نے زبانی کوئی جواب دینے کی بجائے پیکٹ نکال کر اُس کے ہاتھ تھماتے ہوئے کہا۔

''مہاراج! معلوم ہوتا ہے آپ نے مجھے اِس مٹی اور پتوں کی خاطر یہاں بلایا ہے؟''

وہ قدرے سنجیدہ سا ہو کر بولا۔

''خدالگتی تو یہی ہے کہ میں نے آپ کو اِسی لیے یہاں پہنچنے کا کشٹ دیا ہے۔ ویسے یہ پوتر مٹی اور پتر تو کوئی اور بھی مجھے یہاں پہنچا سکتا تھا...... مجھے دراصل آپ کی بھی یہاں ضرورت تھی۔''

''تم نے تو مجھے موسیقی کے پروگرام کا بتایا تھا...... کیا اس کے علاوہ بھی کوئی خاص کام تھا؟''

''ہاں' تفصیل سے باتیں پروگرام کے بعد علیحدگی میں ہوں گی۔ فی الحال آپ ذرا آرام کریں' غسل اشنان کر کے تازہ دم ہو لیں اور میں بھی ذرا ریہرسل میں بیٹھ رہا ہوں۔ باہر حویلی میں سازندے میرا انتظار کر رہے ہیں۔''

''جے جے وتی کدھر ہے......؟''

''وہ لدھیانے گئی ہے' دوپہر تک آ جائے گی۔''

''ایک اور سوال' یہ موٹے موٹے سونڈ بونڈ سردار کون ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے یہ لوگ کہیں کینیڈا و ینیڈا میں سیٹل ہیں؟''

''ہاں' یہ میرے رشتہ دار بھی ہیں اور عاشق بھی' جب اِدھر آتے ہیں دو چار روز مجھے زبردستی باندھ کر

اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔'' وہ اُٹھتے ہوئے کہنے لگا۔'' باقی باتیں بعد......!''

گرمی اور لو...... وہ بھی چندی گڑھ کی' گو ادھر گرمی سے بچاؤ کے بڑے پکے انتظام تھے مگر گرمی تو اپنا آپ دکھا کر رہتی ہے۔ اشنان کا موڈ نہ بنا' ہاتھ منہ دھویا' ہلکا جل پان کیا اور لمبا پڑ گیا۔

سردار حضرات کے ہاں جو سو خرابیوں کی ایک خرابی پائی جاتی ہے وہ ہے خوشی کے موقعوں پہ پینا پلانا...... خیر اس کو بھی کسی حد تک برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن پینے کے بعد جو ہڑبونگ مچاتے ہیں وہ کم از کم میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ سکھ بوتل اندر کرنے کے بعد اپنا آپ باہر نکال دیتا ہے...... یہ بھی ایک لحاظ سے ان کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے۔ ویسے بھی سیدھا سادا' من کا کھرا آدمی اپنے اندر کوئی ایسی چیز نہیں رکھتا جو بدبو یا گھٹن پیدا کرے...... جو شراب پی کر سنجیدہ یا چپ سادھ لیتے ہیں' مدہوش پڑ جاتے ہیں انھیں شراب کی بجائے دس بارہ نیند کی گولیاں نگل کر لیٹ جانا چاہیے......!

یہ فارم ہاؤس والے سردار صاحبان' یہاں کے کھاتے پیتے زمیندار تھے' کینیڈا میں بھی کاروبار...... پڑھے لکھے' وقت زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے والے لوگ...... سرکار دربار میں بھی تعلقات اور سب سے بڑی بات کہ جگجیت سنگھ کے یار اور گائیکی کے عاشق......!

بڑے وسیع تر انتظامات کے ساتھ شاندار طریقے سے پروگرام ترتیب دیا گیا۔ سرداروں کی شان بان' گاڑیوں اور ان کے تیوروں سے پتا چلتا تھا کہ یہ تمام یہاں رئیس متمول اور اثر رسوخ والے لوگ ہیں۔ قیمتی قالین' سپید براق چاندنیاں' گاؤ دان' گدے تکیے اور گیندے کے پھولوں کے پَرے کے پَرے' لگتا تھا یہ پروگرام بسنت بہار میں پھولی سرسوں کے کھیت میں ہو رہا ہے۔ سٹیج کے پیچھے گھنے سرو کے درخت عجب بہار دکھا رہے تھے۔ کچھ پرے نیلے پانی سے بھرا سوئمنگ پول تھا جس میں ہزاروں کی تعداد میں پیلے پیلے گنگترے مالٹے سفید کمیوں کے پھول...... نیچے سبزے پہ روشنی پھینکتے ہوئے برقی قمقمے...... لمبی لمبی گردنوں والے راج ہنس اور سفید مور...... عجب نظر نواز منظر تھے کہ نظریں بار بار اُدھر اُٹھتی تھیں...... پیلے پیرہن اُوپر سرخ کمر بند اور پگڑیاں...... ایک سی عمر و کاٹھ والے ساقی...... شراب ساری ولائتی تھی۔ وڈکا' شیواز' واٹ 69' جانی واکر' وائٹ ہارس...... برف کی ڈلیوں سے جل تھل قابیں......!

مجھے سٹیج کے عین سامنے ایک آسودہ سے گدے پہ بٹھایا گیا...... میرے اردگرد سب داڑھیوں والے سردار جن کے درمیان میں بھی ایک سردار ہی لگ رہا تھا...... جگجیت سنگھ اور جے جے وتی چترا سنگھ اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھ گئے۔ سازندوں نے سُر ملائے اور پروگرام شروع ہو گیا۔

رات کی اپسرا نے اپنی عنبریں زلفیں کھول دیں اور دخترِ انگور نے اپنی تھلی اُتار دی تھی...... ـــــ

کون کہتا ہے محبت کی زباں ہوتی ہے
یہ حقیقت تو نگاہوں سے بیاں ہوتی ہے

اس فسوں کی جوڑی نے چنچل نسروں کی ایسی پُونچھیں لڑائیں کہ نشہ چڑھ گیا...... کیا سرور' مدہ نشہ کیف کیفیت خمار صرف بوتل والی شراب سے ہی حاصل ہوتے ہیں؟ کیا ہونٹوں سے پینا ضروری ہے؟ کیا منہ سے محبت کا اقرار کرنا ضروری ٹھہرتا ہے؟...... کیا اس کا تلخ اور بدمزہ ہونا بھی ضروری ہے...... کیا سرور نشہ سماعت اور بصارت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا؟...... پینے کے علاوہ کیا کچھ کھانے سے بھی کیف حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں...... کیا پینے کھانے' سننے یا دیکھنے کے بعد بہکنا بھی لازم ٹھہرتا ہے یا سب ڈرامے ہوتے ہیں؟ اس سے زیادہ حماقت اور بدذوقی کیا ہو سکتی ہے کہ پینے سے پہلے آدمی ہوش میں ہو اور پینے کے بعد بے ہوش و خرد ہو جائے......؟

خوش ذائقہ' قوت بخش' تر و تازہ اللہ کریم کی نعمتوں کو گلا سڑا' اس کا ستیا ناس مار کر خوب غلیظ بدذائقہ کر کے پی جانا اور کہنا مجھے نشہ چڑھ گیا' سرور آ گیا...... اس سے بڑا دھوکہ جھوٹ' خود فریبی اور گمراہی بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟ سکھ بادشاہوں اور مسلمان شہنشاہوں پہ کیا موقوف دُنیا میں زندہ انسانوں کا ایک بڑا حصہ اسی خبیث علت کا عادی ہے۔ کوئی کس کس کو سمجھاتا پھرے......!

سرسوں کا گھوٹواں ساگ' مکھن کا پیڑا' مکئی کی روٹی اور لسی کا چھنا...... ایسا سرمدی سرور اللہ اللہ...... نشہ تو کنویں کا ٹھنڈا تازہ پانی پی کر بھی ہو جاتا ہے۔ باسی روٹی لسوڑوں کے اچار سے بھی ہو جاتا ہے۔ میں اپنی بات کرتا ہوں' کوئی حسب حال شعر' اچھا فقرہ' جملہ...... خطاطی کا کوئی شہ پارہ...... کوئی انوکھا بامعنی نام بھی مجھے بےخود کر دیتے ہیں۔ اذان سن کر میں سن سا ہونے لگتا ہوں...... آنکھیں' کاٹ دار ہونٹ' کھڑی گھوڑی والا ناک' آپس میں پیوست ابرو' جبڑے کی بناوٹ' عید میلاد النبیؐ پہ کسی پہاڑی کی سجاوٹ...... ہریسے حلیم کی گھلاوٹ' شامی کبابوں کی بناوٹ...... یہاں تک کہ کسی سفر کی تھکاوٹ بھی مجھے نڈھال کر کے نشے کی کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے۔"

میں تو کسی کو روتے ہوئے دیکھ لوں تو اپنے آپ میں اُتر جاتا ہوں۔ نشہ بڑا بودا اور بازاری لفظ ہے۔ مستعمل ہے اس لیے بھی زدِ زبان آ جاتا ہے' ویسے اُم الخبائث کے لیے یہی مناسب رہتا ہے...... یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں...... ایسے گھٹیا شرابی کو دو جوتے لگا کر جواب میں کہنا چاہیے...... یار "مجھے بھی معاف کرو میں غصے میں ہوں"...... اللہ سمجھے اس چاچو غالبؔ اور تاؤ جوشؔ کو' ناس مار کے رکھ دیا شراب اور شاعری کا...... ان خدائی مارے بڈھوں کے شعری دیوانوں کو کبھی نچوڑ کر دیکھیں ایک آدھ گلبڑ کچی پکی اب

بھی نچڑ نکلے گی......!

بستی نظام الدینؒ میرا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ چاچو کا نیو بارہ چونک راؤ مارتا ہے مُڑ تا اِدھر بھی جھانکا لگا لیتا ہوں۔ پچھلی بار جب میں اور رحیم خان' چاچو کے مزار سے ملحقہ بازار سے گزر رہے تھے تو رحیم خان کہنے لگا۔

''باباجی! اِدھر قصائیوں اور کبابیوں کی دوکانیں بہت ہیں؟''

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''پیارے بھیّا! جیسا باپ ویسا پیٹ' جیسی بھابی ویسا جیٹھ...... کچھ سمجھے؟ یہ جو سامنے نوشہ میاں لیٹے ہیں' ناں! قیمے اور کباب کی دکانیں بھتیجے ان کی خاطری ہیں۔ پُھول پتی کی دکانیں آگے ہیں۔ جدھر جس چیز کی کھپت ہوتی ہے اس کی دکانیں بھی اُدھر ہی ہوتی ہیں۔''

اِدھر چندی گڑھ میں چاچو کے بھانجے بھتیجے اپنے چاچوتاؤ والے شغل میں مشغول تھے۔ محفل سا آتش تھی' شراب کباب اور رباب......؟

بھیگی رات کی رُت میں چترا سنگھ کوئی پنجابی لوک گیت گا رہی تھی' کچھ چنچل سے سِکھ حضرات بدمستی میں بھنگڑا ڈال رہے تھے اور میں اپنے اندر کی چکّی چلائے پسائی کرتے سوچ رہا تھا ہر اک کا اپنا اپنا رانجھا اور اپنی اپنی ہیر ہوتی ہے۔ کسی کے ٹھوٹھے میں دال اور کسی کے کھیر ہوتی ہے...... کوئی سُکھ پال ہوتا ہے اور کوئی بلبیر ہوتی ہے۔ پھر دل میں آئی...... گجیت تو پیشہ ور گوّیا ہے وہ تو دن رات اسی طرح کی محفلیں سجاتا رہتا ہے...... مجھے اچھی طرح سمجھتا بھی ہے پھر کیا ضروری تھا کہ پاکستان سے فوری آرڈر پہ بُلا کر اِدھر مادھو بنا کر بٹھا دیا...... اور محفل موسیقی بھی وہی سِکھوں کے مزاج والی...... پھر دھیان بی بی پاک دامناں والی مٹی اور پتوں کی طرف گیا۔ جب کچھ پلّے نہ پڑا تو آنکھیں نیم وا کر کے اُونگھنے لگا۔

یہ نیم آنکھوں والی اُونگ بھی بڑی منافقاناں اور مشرکاناں ہوتی ہے۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں...... والی بات ہوتی ہے۔ اس منافقت میں پڑا ہوا بندہ ناکام اداکاری کرنے کی کوشش میں بڑا بھونڈا دکھائی دیتا ہے...... خوامخواہ مسکرائے گا' پہلو بدلے گا' ہونٹ ہلائے گا...... آنکھیں یوں رکھے گا جیسے عالمِ کیف میں ہو...... اس فضول اداکاری میں پڑنے سے تو لاکھ بہتر ہے ہر مصلحت کو جُوتی کی نوک پہ رکھے پاؤں پسارے اور بیچ کھیت لمبا پڑ جائے...... شاید میں ایسا نہ کر سکتا تھا کہ دُولہا' مہمان خصوصی' میر محفل' پیر صاحب' باباجی اور کوئی حسین صورت...... یہ کسی طور بیچ محفل خراٹے نہیں لے سکتے ان کو بہر طور کوئی نہ کوئی منافقانہ رویہ اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔ متذکرہ بالا لوگوں کی ان منافقانہ حرکات اور عیارانہ طور طریقوں کو میں نے بڑے غور اور اہتمام سے دیکھا ہے۔ ویسے آپ ناظرین ٹیلیوژن کی سکرین پہ پارلیمنٹ اسمبلیوں کے اجلاس

میں بڑے بڑے سیاستدانوں کو خرانٹے توڑتے دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ بیچارے بڑے مظلوم مقہور قدرت کی طرف سے سزا یافتہ' معتوب لوگ ہوتے ہیں۔ جب سونے کا وقت ہوتا ہے جاگتے ہیں اور جاگنے کے وقت سونے پہ مجبور ہوتے ہیں۔ شوگر' بلڈ پریشر' دل کی دھڑکن' کثرت بول' بواسیر' اندھراتا' خلجان کے علاوہ بھی کچھ پرائیویٹ عارضوں میں مبتلا' یہ فارغ لوگ' بدقسمتی سے ہمارے رہبر ہوتے ہیں۔

سکھوں کے بلے گلے میں" دی اینڈ" اس وقت تک نہیں ہوتا جب دو چار گرنہ پڑیں' ہسپتال نہ پہنچیں' سالیا' تیری ماں بہن نہ ہو...... پولیس تو ویسے ہی ست سری اکال کہنے پہنچ جاتی ہے اور ایک آدھ بوتل کے ساتھ واپس چلی جاتی ہے۔ گرمئ محفل جو سکھوں کی پارٹیوں میں پیدا ہوتی ہے وہ کہیں اور نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ زندہ لوگ ہوتے ہیں۔"

گورو داس پور' لدھیانہ' امبرسر' چندی گڑھ کی ٹھیٹ پنجابی کا لکا' چینڈ' خالص گالم گلوچ کا چسکا...... دیسی دارو کا منکا' کسی کا خوف نہ کھٹکا...... زندگی کی رگ رگ سے خوشیاں مستیاں نچوڑنے والے یاروں کے یار' موج بہار' پیاری پیار...... خدا خدا کر کے یہ کفر اس وقت ٹوٹا جب اچانک تیز ہوا نے جھکڑ کی صورت اختیار کر لی...... تنبو قناتیں اڑنے سے پہلے ادھر سے مخمور پرندے بھی اڈاریاں بھرنے لگے...... پنڈال خالی ہونے سے پہلے مجھے قریب ہی ایک شاندار مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا...... کچھ دیر بعد جگجیت کا پیغام بھی "میں کپڑے تبدیل کر کے پہنچ رہا ہوں......" اس دوران میں بھی واش روم سے فارغ ہو کے بیٹھا ہی تھا کہ کھانے کے ساتھ جگجیت بھی پہنچ آیا...... وہی دیہاتی سا کھانا' دال مکھن توے کی روٹیاں' اچار اور کچھ میٹھا...... جو بھی تھا ضرورت کے مطابق پیٹ میں اتارا...... اللہ کا شکر ادا کیا۔ اتنے میں چائے بھی پہنچ گئی۔

جگجیت' شرارت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو بابا جی! آپ نے اپنا کام دکھا دیا......؟"

"کیسا کام......؟"

"یہی جھکڑ آندھی والا......!"

"سبحان اللہ! جگجیت سنگھ جی! اگر میں ایسے چمتکار دکھانے کے اہل ہوتا تو ادھر صرف آپ کی محفل ہوتی' یہ ہنگام ناؤ نوش نہ ہوتا...... آپ تو خوب جانتے ہیں کہ اچھائی اور برائی یا گناہ و ثواب اور ظلم و احسان کے بھی کچھ مخصوص اوقات ہوتے ہیں۔ وقت ختم ہو جائے تو گرجے مندر مسجد گوردوارے بھی کچھ دیر کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں تاکہ صفائی ستھرائی بھی ہو جائے اور بھگوان کرتار خدا اور یسوع مسیح کو کچھ ریلیکس مل جائے۔ شراب خانے' جوئے خانے' قحبہ خانوں پہ کلوز کا بورڈ لگ جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کتنے بڑے بڑے پڑھے

لکھے' صاحب حیثیت لوگ آپ کی محفل میں شامل تھے اور جب توازن آؤٹ ہو گیا...... بے ہودگیاں' مسخریاں اور لڑائی جھگڑے ہونے لگے تو وقت ختم ہو گیا۔ اَب بتائیے؟ اس سارے افسانے میں مَیں کہاں ہوں؟...... مذاق چھوڑیں' مَیں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ وہاں بی بی پاک دامناں' آپ کا سلام بھی عرض کر دیا تھا۔ اَب مزید حکم......؟''

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک کھلے ماتھے' موٹی موٹی بولتی آنکھوں والا خوبرو سکھ بچہ اجازت طلب کر کے اندر داخل ہوا...... ست سری اکال کہہ کر میرے گھٹنے چھوئے اور اُلٹے پاؤں کمرے سے باہر چلا گیا۔

''بابا! یہ میرا عزیز بلونت سنگھ ہے مَیں اِسے بلونگڑا کہہ کر مخاطب کرتا ہوں۔ اس نے آسٹریلیا سے ماسٹر کیا ہوا ہے' اکلوتا لاڈلا اور بے حد خود سر' اپنی کرنے والا' دماغ میں جو بیٹھ جائے وہ کر گزرتا ہے۔ خاموش زیادہ رہتا ہے...... کوئی یار بیلی بھی نہیں......''

تجیت اِتنا بتا کر خاموش ہو گیا اور عجیب عقیدت بھری نظروں سے میری جانب تکنے لگا۔ ایسی ٹکٹکی باندھی جیسے پتھر سل ہو گیا ہو۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر اس نے آنکھ نہ جھپکی۔

عقیدت صاف نگاہ نہیں رکھتی...... اِسے ایک کی بجائے دو بلکہ اس سے آگے کئی سو دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں میرے باباجی نے مجھے نصیحت کی تھی' بیٹا! فقیر درویش کو دو چیزیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ایک عقیدت' دوسرا زُعم...... جو ان سے خود کو بچا گیا' وہ گیانی...... اور جو ان میں پھنس گیا وہ محض دھیانی!...... یہ گیانی اور دھیانی والی رمز اُس سمے تو سمجھ نہ سمائی...... بعد جب سمجھ آئی تو خوب آئی......!

بادشاہ ہو یا درویش...... دونوں کو یہی دونوں جلا بخشتی ہیں یا پھر جلا کر راکھ کر دیتی ہیں...... بادشاہ کو اُس کے خوشامدی' مصاحب' مشیر مار کر رکھ دیتے ہیں اور درویش کو اس کے ناعاقبت اندیش چیلے چانٹے' اُس کی تعریفیں کر کے' ہاتھ پاؤں چوم چاٹ' غیر ضروری اَدب و آداب سے اُس میں زُعم اور گھمنڈ پیدا کرنے کے موجب بنتے ہیں۔

جیسے تجیت نے مجھے مسکراتے ہوئے کہا' یہ میری آندھی آپ نے لائی ہے' میرا جواب تھا کہ ہر اچھی بُری چیز' گناہ و ثواب' حرکت برکت کے سمے کی ایک حد ہوتی ہے اُس کے بعد کوئی صورتِ حال ایسی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ کام بند ہو جاتا ہے۔

تجیت کی بات سے مَیں اس زُعم میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ واقعی اس آندھی کا آنا اور محفل کا تتر بتر ہو جانا میری کرامت ہے...... مگر میرے باباجی کی دُعا نصیحت مجھے بچا گئی۔

جگجیت سنگھ ابھی تک میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ مجھے کوئی پیغام پہنچانا چاہتا ہو جو وہ اپنی زبانی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا یا پھر وہ کوئی ایسا ڈھنگ تلاش کر رہا تھا کہ وہ اپنا مافی الضمیر احسن طریقے سے بیان کر سکے۔ میں نے اُوب کر کہہ دیا۔

''ہاں جی! آپ کچھ اس بلونگڑے کے بارے میں بتا رہے تھے؟''

وہ ایک ٹھنڈی لمبی سانس لیتے ہوئے واپس آیا۔

''بابا جی! اس ٹھودسر بلونگڑے نے دو سال قبل ایک لڑکی سے شادی کر لی جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا کہ وہ کون ہے' کس خاندان اور دھرم سے ہے۔'' قدرے خاموشی کے بعد پھر بتانے لگا۔'' یہ فارم ہاؤس اور اس کے ارد گرد لمبی چوڑی جائیداد کا وہ اکیلا وارث ہے۔ یہ پروگرام دو وجوہات کی بناء پہ تشکیل دیا گیا۔ بڑی وجہ آپ کو ادھر بلانا اور اس بلونگڑے کے بارے ڈالینا اور دوسری وجہ کچھ موج میلہ کر کے اس کا دل بہلانا اور آپ سے اس کی ملاقات کرانا تھی۔ آپ نے دیکھا وہ آیا اور آپ کے چرن چھو کر باہر چلا گیا۔ وہ کسی سے بھی نہیں ملتا' ماتا پتا کا بُرا حال ہے۔ بہنیں بھائی کے حال پہ رو رو کر پاگل ہو گئی ہیں۔''

میں نے ہاتھ کے اشارے سے جگجیت کو مزید کچھ بتانے سے روکتے ہوئے پوچھا۔

''آپ نے مجھے ادھر اسی کارن بلایا ہے......؟''

''جی اپنے بڑوں بزرگوں کو بچے اسی وقت یاد کرتے ہیں جب اُن سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا یا کوئی راستہ نہیں ملتا۔''

''جگجیت جی! آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس سلسلہ میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟''

''سمجھ کر ہی تو بلایا ہے......!''

''میرے اپنے دو بچے سخت بگڑے ہوئے ہیں' اجازت دیں تو میں اُن کو آپ کے پاس سیدھا ہونے کے لیے بھیج دوں؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ضرور بھجوا دیں...... میں گُرو کی کرپا سے دو چار مہینوں میں ہی اُنہیں گانا سکھا دوں گا' ویسے

منجیاں بیڑھیاں ٹھوکن والے

لمّے گئے گوڈے نہیں چڑھا سکدے

جو میں کر سکتا ہوں حاضر ہوں اور جو آپ کے ذمہ ہے وہ آپ کریں گے۔''

میں نے اُس کے اس مرلیے استدلال پہ قربان ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''بلونت' ڈرنک سموکنگ کرتا ہے......؟''

''زبردست نفرت...... اس معاملوں میں وہ پکا مومن ہے۔ باباجی! آپ حیران ہوں گے کہ وہ پانچ چھ ورے آسٹریلیا میں رہا' کبھی کوئی شکایت نہ آئی۔ لڑکیاں کڑیاں ٹوں بھی کبھی بُری اکھ نال نہیں ویکھیا...... ہاں' ایک بات تو بتانا ہی بھول گیا' آسٹریلیا جانے سے پہلے اس کی منگنی اپنے رشتہ داروں کی ایک خوبصورت پڑھی لکھی کڑی سے ہوگئی تھی' اس میں اُس کی پسند بھی شامل تھی۔ آسٹریلیا سے واپسی پہ شادی کا پروگرام بھی تھا۔ اس کی شادی کا سُن کر اس کی منگیتر نے دو دفعہ خودکشی کی کوشش کی' وہ اس سے بڑا پیار کرتی ہے۔ بیچاری رُو رُو کے جھلی ہوگئی ہے۔''

''اچھا ایک بات کا جواب دو' بلونت مجھ سے اکیلے بیٹھ کر بات کرنا پسند کرے گا؟''

''وہ تو آج محفل میں بھی نہیں بیٹھا' بس! دو چار منٹ بیٹھا پھر اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ بڑی مشکل سے مَیں نے آپ کو ست سری اکال کہنے کی حد تک تیار کیا تھا۔ کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں ہوسکتا ہے مان جائے۔ دراصل وہ اس غلط فہمی میں ہے کہ ہم سب اُس کی بیوی کو اُس سے چھیننا چاہتے ہیں۔ اُس کی ایک سالہ بیٹی بہت پیاری ہے' اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتا ہے۔ ہر وقت اُس کو اُٹھائے رہتا ہے۔''

مَیں نے ایک اور سوال پوچھا۔

''وہ علیحدہ رہتا ہے یا ماتا پتا کے ہمراہ......؟''

''باباجی! وہ اسی فارم کے دوسرے کنارے پہ علیحدہ رہتا ہے۔ وہ نہ اِدھر آتا ہے اور بیوی بچی کو آنے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی بیوی اور بیٹی آج تک اپنے سسرال والوں کے سامنے نہیں آئی اور نہ ہی وہ کسی کو اپنے ہاں آنے دیتا ہے۔ ایک دفعہ اس کے ماتا پتا نے زبردستی جانے کی کوشش کی تو اُس نے فائرنگ کر دی' اپنے پاؤں پہ گولی ماری' خودکشی کی دھمکی دی۔ اس واقعہ کے بعد کوئی بھی اُس سے ملنے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اپنے پریوار کے کسی فرد سے ملتا ہے۔ ایک ہی بچہ ہے' پریشانی میں ہے۔ اس کے پتا نے درخواست کی تھی کہ مَیں آپ کو یہاں آنے کی دعوت دوں اور بلونت کے سلسلہ میں آپ سے بات کروں۔''

''مٹی اور پتے منگوانے کا مقصد......؟''

''مَیں نے بھی پوچھا تھا کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ بتایا کہ سُننے میں کسی مسلمان پیر فقیر نے بتایا کہ وہاں سے یہ چیزیں منگواؤ' ان سے یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ پر اُس پیر فقیر نے ان کے استعمال کا طریقہ نہیں بتایا۔ اَب ان کا استعمال آپ بتائیں گے؟''

میرے منہ سے خود بخود سبحان اللہ نکل گیا اور ہنسی بھی کہ اس دُنیا میں کیسے کیسے خوش فہم لوگ موجود

ہیں۔ خود بخود ہی فیصلے کر لیتے ہیں۔ میں نے انہیں پکارتے ہوئے کہا۔

''مہاراج! میں آپ کو کیا کہوں' آپ بھولے بادشاہ ہیں۔ بلند پایہ مُغنّی بھی موسیقار بھی اور ایک اچھے دردمند انسان بھی۔ بھلا یہ تو سوچیں' جس کام کو آپ میرے شانوں پہ ڈال رہے ہیں کیا میں اس اہل ہوں؟ میں تو دُعا کر سکتا ہوں' اے سب انسانوں' دھرموں کرموں کے مالک! نیتوں دلوں کا حال جاننے والے کرم کر' رحم اور فضل کا معاملہ کر' دُکھیوں کے دُکھ دور فرما' بیماروں لاچاروں کو شفا عطا کر...... جگجیت جی! میں بس یہی کر سکتا ہوں' مجھے اجازت دیں میں ذرا اجمیر شریف اور کلیر شریف سلام کر کے واپس لاہور پہنچوں۔''

وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

''بابا جی! ابھی تو آپ نے میرے ساتھ ممبئی جانا ہے۔ ماہم شریف اور حاجی بابا سرکار...... لیکن جب تک بلونت کا کے کا مسئلہ حل نہیں ہوتا...... نہ میں کہیں جا سکتا ہوں نہ آپ!...... یہ ایک سِکھ کی ایک مُسلے سے جُھجوڑی......!''

کالج یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے لڑکے' جس طرح پڑھائی کے ساتھ ساتھ کسی کلاس فیلو لڑکی سے دوستی کرنا ضروری سمجھتے ہیں' میں سمجھتا ہوں اسی طرح کسی اچھے انسان کا' جو زندگی کی یونیورسٹی میں ہے اُس کے لیے کسی خالص سِکھ سے دوستی بڑی ضروری ہے۔ میں نے یہ نکتہ بڑے مشاہدے اور گہرے تجربے سے پایا ہے۔

میرا ایک بچہ جو کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا مجھ سے کاروبار میں شرطیہ کامیابی کے لیے کسی نصیحت مشورے کا طلبگار ہوا' میں نے فوراً اُسے مشورہ دیا۔ کاروبار شروع کرنے سے پیشتر کسی شیخ کے ہاں سال دو سال ملازمت کرلو پھر کسی کام میں اُنگلیاں ڈالنا۔ انشاءاللہ پانچوں گھی میں ہوں گی...... ایسا ہی ہوا وہ مون مارکیٹ میں ایک شیخ صاحب کے ہاں ملازم ہو گیا۔ وقت ہو گزرا' میں کسی چیز کی تلاش میں مون مارکیٹ گھوم رہا تھا۔ اچانک وہی بچہ' جو روزانہ حاضری دیا کرتا تھا' بچوں کے ملبوسات بیچتا ہوا دکھائی دیا...... وہ اڑھائی برس میں وہ کافی بدل چکا تھا۔ جسم پہ گوشت' آنکھوں میں چربی' ہونٹوں پہ مونچھوں کے اضافے کے باوجود میں نے اُسے پہچان لیا۔ اسی اثناء وہ بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔ بڑی ڈھٹائی اور کھلے ڈُھلے انداز میں وہیں دوکان سے ہی آوازہ لگایا۔

''آؤ آؤ' بابا جی! اے تہاڈے بچے دی دوکان اے...... بڑی رحمتاں نے' تساں دی دُعا اے۔''

ماشاءاللہ' ماشاءاللہ کہتے ہوئے میں اُس کی دکان پہ جا کھڑا ہوا۔ وہ کچھ گاہکوں سے نپٹ رہا تھا۔ فارغ ہوا تو چائے بوتل کا پوچھنے لگا۔ میں نے شکایت کے انداز میں کہا۔

''یار! پہلے تو روزانہ ملاقات کے لیے آ جاتے تھے۔ دو سال ہو گئے تمہاری شکل دیکھے ہوئے؟''
معافیاں سرکار معافیاں...... کاروبار وچ پے گئے آں' تساں ای تے مشورہ دتا سی' کاروبار کرنا ہے تو کسی اصلی شیخ دا شاگرد بن جا...... سرکار ہنڈرڈ پرسینٹ عمل کیتا اے...... سال پورا کام سکھیا اے تے اگلے سال دوکان اپنی کرلئی اے' رحمتاں ہی رحمتاں نے...... ہور سناؤ' کوئی ٹھنڈا گرم......؟''

میں مزید ترقی کی دُعائیں دیتا ہوا آگے بڑھنے لگا تو پیچھے سے ہانکا لگا کر کہنے لگا۔

''بابا جی! ٹائم ملیا تے میں لاواں گا چکر...... !'' میں مزید آگے بڑھ گیا تھا پھر آواز آئی۔''بابا جی! کوئی ہور اچھی جئی نصیحت مشورہ؟''

میرے پھٹے منہ اچانک نکل گیا۔

''بیٹا! اب پٹھانوں سے کاروبار کرنا سیکھو...... ایک پٹھان کرائے پہ دکان لیتا ہے سال بعد پوری مارکیٹ میں نسوار ہی نسوار ہوتی ہے۔''

سکھوں کے اُصول' گولڈن ٹمپل کی طرح بڑے سنہری ہوتے ہیں۔ لدھیانے سے لندن یا فیروز پور سے فرینکفرٹ' امریکہ' افریقہ جہاں بھی چلا جائے وہ سکھ ہی رہتا ہے' نہ اپنا کھانا پینا بدلتا ہے نہ کچھا کنگھا کڑا کیس تے کرپان بدلتا ہے...... دارو شراب' مجبوراً بدلتا ہے کہ وہاں دیسی' ٹھرّا نہیں ملتی...... اپنی گفتگو گالیاں بھی نہیں بدلتا...... ذات برادری بھی چینج نہیں کرتا۔ حماقتیں اُولیاں جلونیاں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں کہ زندگی میں بے ساختہ خوشیاں انہی سے ہوتی ہیں۔ سکھوں کی آنکھیں روشن اور دانت سفید کہ پان بیڑا سگریٹ بیڑی نسوار گٹکا استعمال نہیں کرتے' باقاعدہ داتن پھیرتے ہیں۔ ان کے ڈولے بڑے سڈول' ایڑی گٹے گول ہوتے ہیں۔ سر داڑھی کے بالوں تک بات بنی رہتی ہے باقیوں کی تعداد مخفی رہتی ہے۔''

فوج پولیس میں بھرتی کے لیے جائیں تو ان کے فزیکل ایگزامینیشن نہیں ہو سکتے' فارمیلیٹی پوری کرنے کے لیے ہوں بھی تو اوپر اوپر سے' کچھا کبھی نہیں اُتارا جاتا...... خاص طور پہ ان کے میڈیکل کے لیے کوئی پرانا سکھ ڈاکٹر ہی ہوتا ہے۔ سکھ مردوں کو اپنڈکس کی شکایت بھی نہیں ہوتی کہ آپریشن سے پہلے بالوں کی صفائی رگڑائی ضروری ہوتی ہے جو کسی اوزار آلے پوڈر کیمیکل سے ممکن نہیں ہوتی...... دو چار کیسوں یں وہی طریقہ آزمایا گیا جو جَوی کے کھیتوں میں فالتوں جڑی بوٹیاں جلا کر تلف کرنے کے لیے کیا جاتا ہے مگر نتائج بے حد خوفناک نکلے۔ اپنڈکس نکالنے کی بجائے جوڑوں پہ سے کھال نکال کر پیوند کرنی پڑی۔

سُنی سنائی بات ہے کہ کسی اُجڈ دیہاتی نے غلطی سے بوبکرا خرید لیا...... پہلی رات' دیگر جانوروں کے ساتھ اُسے بھی باڑے میں باندھ دیا...... صبح جو دیکھا' بکرے کے سوا' تمام جانور فوت ہو چکے تھے' بڑے

بوڑھوں سے تفتیش کروائی تو پتا چلا کہ یہ بُو بکرا ہے۔ اس کی بُو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے مر گئے ہیں۔ دیہاتی نے اُسے اونے پونے بیچنے کی کوشش کی مگر ایک سردار صاحب کے علاوہ کوئی اور خریدار نہ ملا۔ سردار صاحب نے بھی جو قیمت لگائی وہ اصل خرید سے بھی آدھی تھی۔ مجبوراً بکرا بیچنا پڑا' سو بیچ دیا۔ سردار صاحب پیچھے پیچھے باندھ کھینچ کر اُسے اپنے گھر لے گئے۔ غریب آدمی تھا۔ باڑہ واڑہ تو کوئی تھا نہیں' اپنے ہی جھونپڑے میں اپنی کھاٹ کے ساتھ باندھ دیا۔ جاڑوں کے دن تھے' جھونپڑے کا دروازہ ایئر ٹائٹ کر کے سردار جی سو گئے۔ صبح جو اُٹھے' دیکھا بکرا زبان نکالے چل بسا ہے...... اسی دوران بوڑھا ہمسایا کسی ضرورت سے اِدھر آ نکلا...... صورت حال دیکھی پوچھا۔

''یہ کیسے ہُوا......؟''

سردار صاحب بولے۔

''چاچا! میرا خیال ہے سردی چڑھ گئی اے......!''

بوڑھے نے اپنے تجربے سے بتایا۔

''پتر! سردی نہیں چڑھی' تیری بُو چڑھی اے...... اسے اپنی کھاٹ سے دُور باندھنا تھا' تازہ ہَوا کا بھی خیال رکھنا تھا۔''

سکھ بولا۔

''چاچا! اے خود بو بکرا تھا...... اسے دوسرے کی بُو خوشبو سے کیا لینا دینا؟''

بوڑھے نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔

''پتر! غیرت بندیاں وچ ای نہیں جانوراں وچ وی ہوندی اے؟''

سرداروں' پٹھانوں اور ان کے بعد دیہاتیوں پینڈوؤں کے لطیفے بڑے مشہور ہیں۔ میَں سمجھتا ہوں کہ ان سکھوں پٹھانوں دہقانوں کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے ہے۔ انسان ایسے ہی تو نہیں کسی کو یاد کرتا' ذکر کرتا یا اُس سے منسوب کوئی واقعہ قصّہ سناتا...... لطیفے کے پیچھے اک زندگی' اک سبق' چھپا ہُوا کوئی مشورہ نصیحت ہوتی ہے۔ جیسے کسی بچے کو کونین کھلانی ہو تو بڑی مشکل پڑتی ہے۔ کونین کڑوی ہوتی ہے' معصوم بچے کڑواہٹ برداشت نہیں کر پاتے...... اس حساب سے شوگر کوٹڈ کونین دیتے ہیں۔ وہ خوشی خوشی نگل لیتے ہیں۔ ہمیں سکھ اور پٹھانوں کے ساتھ ساتھ پینڈوؤں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ دانش' بہجت اور مسکراہٹیں فراہم کرنے کی مُوجب بنتے ہیں۔

اچھے بُرے کہاں نہیں ہوتے' سفید بھیڑوں میں دو چار دانے' بھائی کالی بھیڑوں کے بھی نکل آتے

ہیں۔ یہ عین فطرت کے اُصولوں کے تحت ہے۔ ملائکہ میں بھی تو ایک نالائقہ نکل آیا۔ سکھ من حیث الانسان' قوم' دوست' کاروباری ساتھی بہت خوب ہیں۔ میرے بہترین دوستوں اور بچوں میں بہت سے سکھ شامل ہیں۔ جن سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں پہنچی۔ میں باباجی گورونانک کو بہت مانتا ہوں۔ میرے بچپن کا کچھ حصّہ اُن کی گود میں سوکر گزرا' مجھے اُن کی زیارت ہوئی...... فیض حاصل ہُوا' اُن کے ہمراہ سفر کی سعادت نصیب ہوئی۔

جگجیت سنگھ سے یاری' بھائی بندی' ارادت کی دیگر وجوہات موسیقی' انسان دوستی' اُردو سے عشق' اپنی روایات سے پیار اور اُس کا سکھ ہونا بھی شامل تھا۔ وہ جب بھی یورپ پہنچتا' مجھے ضرور ملتا۔ اکثر میرے ہاں ٹھہرتا...... اور جب میں انڈیا آتا' ہم مل کر خوب خوش ہوتے' گوردوارے اور مزاروں پہ جاتے' محفلیں جماتے اور خوب باتیں بھی ہوتیں۔ میں پیری مریدی نہیں کرتا لیکن وہ مجھے اپنا گرو' بابا مانتا تھا اور ہمیشہ مجھ سے آشیرباد لیتا رہتا۔ اللہ کریم اُسے اگلے جہان میں آسودگی دے بڑا اچھا انسان اور کمال کا فنکار تھا۔ غزل گائیکی میں اُس کا ایک منفرد انداز تھا۔ اُردو زبان پہ اُس کے بڑے احسان ہیں اور اُردو کا بھی اس پہ بہت سا قرضہ؟

جگجیت سنگھ مجھے دھمکی دے کر چلا گیا ہے۔ میں تنہائی میں بستر پہ نیم اکڑوں بیٹھا اُس کی دھمکی کی جزویات پہ غور کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میں اِس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے تو اپنی اصلی اوقات کا علم ہے۔ میں کیا ہوں' کس جوگا ہوں؟ لوگوں کا کیا ہے وہ تو عقیدت میں اندھے ہوتے ہیں...... اُن کو کسی چیز سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اُن کا بس مسئلہ حل ہونا چاہیے۔ اِدھر بھی یہی معاملہ تھا کہ نہ میں بلونت سنگھ کو جانتا ہوں نہ اُس کے پریوار کو' منگیتر اور پُراسراری موجودہ بیوی اور بچی کو' جس کے بارے مجھے بتایا گیا کہ وہ کسی نہ سمجھ میں آنے والی بیماری کا شکار ہے...... اور یہ بھی کہ بلونت سنگھ اِدھر ہی کہیں آس پاس بیوی بچی کے ساتھ رہتا ہے لیکن کسی کو اُس کی رہائش کی جانب جانا تو ایک طرف نگاہ اُٹھانے کی بھی ہمت اور اجازت نہیں...... اُس کی پہلی معصوم اور خوبصورت سی منگیتر' جو اُس کی اپنی پسند بھی تھی' دوبارہ آتما ہتیا کی کوشش کر چکی ہے اور اُس کے پیار اور بے وفائی میں نفسیاتی مریضہ کی مانند جیون بسر کر رہی ہے۔

بلونت سنگھ بڑا پیارا اور خاموش طبع نوجوان...... ! کسی قسم کی کسی علت' نشہ کا عادی نہیں۔ ملنا ملانا بھی نہیں' نہ وہ عام نوجوانوں کی طرح لڑکیوں' میوزک' میر سپاٹے' لڑائی بھڑائی' آوارہ گردی سے دلچسپی رکھتا ہے...... سکھ بچہ' بالشت بھر کا سنپولیا' چنکارا ہرن کا بچہ' خرگوش' گدھے' ہاتھی اور بکری بلی کے بچے' بڑے پیارے اور من موہنے ہوتے ہیں۔ آنکھوں اور دل میں کھب جاتے ہیں۔ اُنہیں دیکھ اور قریب محسوس کر کے اک انوکھی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ بلونت سیہاں کوئی ایسا بھی ننھا منا گلوتھنا سا بچہ نہ تھا جسے گود میں بٹھا لیا جائے یا اُس کا گھوڑا بن

کرسواری کرائی جائے۔ وہ تو سرو کے بوٹے کی طرح لمبا تڑنگا' نوبلی عمر کا ایک پڑھا لکھا جوان رعنا تھا۔ سیاہ غزالی آنکھیں' تجزے ہوئے یونانی انداز کے ابرو' یاقوتی اُبھرے اُبھرے ہونٹ' مردانہ دہانہ اور جکوال کا مدھے جو اس کی سکندر بختی' ارادے کی پختگی' فیصلے میں قطعیت اور جمال جلال کے مظہر تھے۔ تبے دار ڈھلوانی ماتھا' چوڑی کنپٹیوں کے اُبھار' سر کی ضلاحق بناوٹ اور بالوں کا قدرتی انداز...... اُس کا مونا سکھ ہونا اس بات کی علامت تھا کہ وہ نئے زمانے کے ساتھ نئے انداز سے چلنا چاہتا ہے؟

کیس اور داڑھی اُسے رکھنے چاہئیں جنہیں اچھے لگیں' اُن کی شخصیت کا حصہ لگیں...... اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جنہیں داڑھی رکھنی چاہیے وہ پرہیز کرتے ہیں اور جن کی داڑھی ہوتی ہے وہ یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے انارکلی سے بیس روپے کی نقلی داڑھی خرید کر لگالی ہے۔ لباس' ٹوپی جوتے' داڑھی مونچھیں' بالوں کی تراش اگر آپ کی شخصیت حیثیت سے مطابقت نہیں رکھتی تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ آپ شعار زندگی سے واقف نہیں اور نہ ہی تعلیم و تمدن سے آپ نے کچھ سیکھا ہے۔

رات کی ہنیری آندھی اور بعد کی ہلکی سی پھوہار نے رُت گدرا دی تھی۔ ویسے بھی چندی گڑھ کی شامیں شاندار اور راتیں بھیگی بھیگی ہوتی ہیں جو قدرے اُمس پیدا کرتی ہیں۔

## ● سمے کی سمیا......!

مجھے چاہیے تھا کہ کرسیدھی کر لیتا مگر بلونت سنگھ کے قصے نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہوا تھا۔ نیند کی دیوی سے تو تب "آئی لو یو" ہوتی ہے جب مکمل خالی الذہن ہو کر بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیں اور بستر کے ساتھ بستر بن جائیں اور اگر آپ کے دماغ کی گراریاں کہیں اور پھنسی ہوئی ہیں یا خیالات کے بلبلے بن رہے ہیں پھٹ رہے ہیں تو نیند کسی اور کے ہاں چلی جائے گی جس نے صبح سویرے بچوں کی روٹی پیدا کرنے کے لیے کسی مزدوری پہ کھڑا ہونا ہے۔ بھلا ایسے نکھٹے نحوستے کے ہاں نیند پہلے کون سے لمبے ڈیرے ڈالے پڑی رہتی ہے' بس دو چار گھڑی لیک جھپک ہوئی پھر پھُر ہو گئی۔

واش روم جانے کی حاجت ہوئی...... جو باہر برآمدے کے انتہائی کونے پہ واقع تھا۔ باہر نکلا' آسمان پہ چھدرے چھدرے بادلوں کے ٹکڑے' ہلکی ہلکی ہوا کا مجھے چھو کے گزرنے والا جھونکا یقیناً کسی چنبیلی کے پودے سے چھیڑ خانی کر کے آیا ہو گا' بھینی بھینی مہک نے مجھے سرشار کر دیا تھا...... باتھ روم والی ضرورت بھول گئی اور مَیں وسیع میدان کی طرف نکل آیا۔ یہ وہی جگہ تھی جدھر گئی رات کی محفل جمی تھی...... بیشتر بھاری سامان ابھی

اِدھر ہی پڑا تھا۔ مَیں یہاں سے گزر کر اُس طرف ہو لیا' جدھر کچھ گھنے درخت اور ایک بڑا سا تالاب دکھائی دیا۔ یہ تالاب شاید مچھلیوں کے پالنے کے لیے تھا۔ دائیں طرف بڑے بڑے لکڑی کے ڈربے دکھائی دیے' ان میں مُرغیاں مُرغابیاں یا تیتر بٹیر ہوں گے۔ اِن کے کنکنانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اِن آوازوں میں ایک آواز ''سبحان تیری قدرت'' کے مشابہ تھی یقیناً یہ کوئی کالا تیتر تھا جو اِس صبح گاہی میں اپنے مالک و خالق کی حمد میں رَطب اللسان تھا۔ مَیں مزہ لینے کی خاطر قریب آ گیا۔

چرند ہوں یا پرند کوئی بھی جانور اپنے مالک و خالق کی حمد و ثناء سے غافل نہیں رہتا۔ وہ علی الصبح بیدار ہو جاتے ہیں' ہم سمجھتے ہیں چڑیوں کوؤں نے صبح صبح کیا شور مچا رکھا ہے؟ چوں چوں...... کائیں کائیں' چہچہانا سخت ناگوار گزرتا ہے۔ ہمیں جاننا چاہیے کہ یہ تمام اپنے مالک کی حمد و ثنا کر رہے ہوتے ہیں......

پرندوں میں کالا کوا موذنِ اوّل ہے...... سب سے پہلے وہ بیدار ہو کر حمد و توصیف میں مشغول ہو جاتا پھر کالا تیتر!...... آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مَیں ان کے ساتھ لفظ کالا کیوں لکھ رہا ہوں۔ کوے تیتر کالے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک غور طلب نکتہ ہے صاحبانِ فہم و ذکاء کے لیے۔

کچھ دیر مَیں ان ڈربوں کے پاس کھڑا رہا پھر آگے بڑھنے لگا تو ایک کالا سا کتا' جانے کدھر سے اِدھر پہنچ گیا...... اُس کی سیاہ چشمِ نیم ملگجے میں بھی سیاہ آہوں کی مانند جھلکیں مار رہی تھی۔ وہ بے کھٹکے میرے پاس پہنچ کر میرے پاؤں چاٹنے لگا...... ہلکے ہلکے چکے بھی مارے۔ چکے' مُتّے کالا ڈ پیار ہوتا ہے' وہ پنڈلی پہ جبڑا رکھ ہلکا سا دباتا ہے پھر چھوڑتا ہے پھر دباتا ہے۔ اپنے پیار کے اظہار کے لیے اُس کے پاس یہی طریقہ ہے۔

اپنے بچے رحیم اللہ خان کے گاؤں جب بھی جانا ہوتا ہے تو اُن کا کالا کتا کالو بھی مجھے دیکھتے ہی دوڑ لگاتا میرے پاس پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہ ہوتا ہے اور میرے پاؤں پنڈلیاں اور چکے۔ گھر والے کہتے رہتے ہیں ہٹاؤ کالو کو' بابا جی کے کپڑے پلید کر رہا ہے۔ مَیں اُنہیں منع کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ پیار پلید نہیں کرتا' بلکہ پلیدی صاف کرتا ہے۔

مَیں کہیں بھی پہنچوں کچھ ''کالو'' میرے پاس ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ جیسا کوئی ہوگا ویسے ہی اُس کو یار' واقف کار بھی ملیں گے......

کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

یہ خوبصورت کتا کہاں سے آیا؟...... جواب بھی خود ہی نکل آیا۔ انہی فارم والوں کا ہوگا۔ کتوں کے معمول میں ہوتا ہے کہ صبح صبح ہلکی پھلکی ورزش' حاجت و فراغت کے لیے باہر نکل آتے ہیں...... اِدھر سونگھ' اُدھر

پنجے مار...... ٹانگ اُٹھا کر موتنا' کسی پرندے کے پیچھے پڑنا' غرانا' بھونکی لگانا وغیرہ۔ تھوڑی دیر تک وہ میرے آگے پیچھے لاڈیاں مستیاں کرتا رہا پھر اچانک ایک طرف بھاگ نکلا' یوں جیسے اُسے کوئی کام یاد آ گیا یا کسی نے بُلایا ہو۔ ایسی بھاگم بھاگی کُتے عموماً کسی خرگوش موش کے لیے ہی کرتے ہیں۔

جس جانب اس کالو کا رُخ تھا اُدھر کچھ پیڑ درخت دکھائی دیے شاید کوئی چھوٹا موٹا باغ باغیچہ تھا یا پھلدار درختوں کا ذخیرہ؟...... غیر ارادی طور پہ میں اُدھر ہولیا۔ فطری اَمر ہے کہ جب اِنسان اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوتا ہے اِس دوران اُسے کہیں روشنی کی کرن دِکھائی دیتی ہے تو بلا ارادہ اُدھر کا رُخ اختیار کر لیتا ہے یا وہ کسی ایسے لاینحل مسئلے میں پھنسا ہوتا ہے جس سے نکلنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ ایسے میں فطرت اِسے ایسی کسی راہ پہ ڈال دیتی ہے جو اِس کے لیے انجان ہوتی ہے پھر اسی عجائب وغرائب میں سے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نِکل آتا ہے۔ بُرے موسم' بارش' برف باری میں پائیلٹ اپنی کارکردگی کو فی الوقت موقوف کر کے جہاز کو آٹو پائیلٹ کے سپرد کر دیتا ہے۔ آٹو پائیلٹ' زمینی رہبری کی مدد سے جہاز کے لینڈنگ سسٹم کو اپنے کنٹرول میں لے کر جہاز بحفاظت لینڈنگ کروا دیتا ہے۔ اِس دوران پائیلٹ کا اپنا کوئی رول نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنے آگے دائیں بائیں کچھ دیکھ سکتا ہے۔ نامساعد حالات اور بے یقینی مایوسی کی کیفیت میں' فطرت قدرت ہی ہوتی ہے جو آٹو پائیلٹ کا کردار ادا کر کے صحیح لینڈنگ یا ٹیک آف کرا دیتی ہے۔

کالو تو اپنی رَو میں بھاگتا ہوا کہیں غائب ہو چکا تھا اور میں اپنی دُھن میں خُود کو ڈھکتا ہوا' اِس جگہ تک آ پہنچا جدھر کانٹے دار تار اور لکڑی کی ایک مضبوط سے باڑنے آگے بڑھنے کے لیے رُکاوٹ پیدا کر رکھی تھی۔

صُبح کاہی کے دُودھیائی جھٹپٹے میں برکت پڑ چکی تھی اور میں ایک سیکورٹی گیٹ کے باہر آویزاں ایک بورڈ کو پڑھ رہا تھا جس پہ گورمکھی ہندی اور انگریزی میں خبردار کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "یہ جگہ' جس کے گرد پیلے رنگ کی دیوار بنا کر حد بندی کر دی گئی ہے...... کوئی بھی فرد' متعلقہ' غیر متعلقہ اِس حد بندی کو پار کرنے کی کوشش میں بجلی کے شاک' خونخوار کتوں کے حملے یا کسی گولی کا نشانہ بن جائے تو وہ اپنے انجام کا خُود ذمہ دار ہوگا۔ خبردار کر دیا گیا ہے......"

میری تو ہنسی کھسک گئی۔ میں سوچ رہا تھا' آدم اِتنا بوڑھا ہو جانے کے باوجود ابھی تک نابالغ ہی ہے' وہ کسی کا انجام کیسے لکھ سکتا ہے؟ آدم' آدم کے پاس آئے تو وہ اِس پہ کتے چھوڑ دے' بجلی کا شاک لگوا دے یا سیسے کا سلگتا ہوا ٹکڑا' اُس کے جسم میں داخل کر دینے کا اختیار حاصل کر لے؟

بِلّی کے پیارے سے بلونگڑے جیسے بلونت سیہاں کا یہ اِنتہائی سخت رَدِّعمل' سمجھ میں آ جانے کے باوجود

میں ہضم نہ کر سکا...... گُرووں اور گرنتھ کو ماننے والے' اپنے اک رَب سچے پہ ایمان رکھنے والے...... اِک معصوم سی بیمار بچّی کے باپ کو تو بڑا شفیق اور رقیق القلب ہونا چاہیے نہ کہ وہ ایسا شقیق القلبی ' انتہا پسندی اور انسان دشمنی کا مظاہرہ کرے کہ کوئی اُس کے قریب تک نہ پھٹکے...... ایسے انتہا پسندانہ سوچ ' رَوّیوں کے حامل افراد' نیم پاگل یا نفسیاتی مریض ہوتے ہیں...... وہ کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان سے محتاط رہنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ زندگی کی ٹوٹی ہوئی مالا تو دوبارہ پہلی سی حالت میں لانا ممکن نہیں ہوتا......؟

ایسے مریضوں کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم ایسے افراد جو اَبنارمل پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے مراد وہ بچّے جو شروعِ حمل ٹھہرنے سے لے کر پیدائش تک نہ خود قرار پکڑتے ہیں اور نہ نو مہینے بدنصیب ماں کو چین لینے دیتے ہیں۔ اس کروٹ' کبھی اُس کروٹ' نیچے کبھی اوپر...... دل پکڑا کبھی کلیجے پہ چڑھے۔ نو ماہ تک زچّہ عذابِ مسلسل کی سولی پہ ٹنگی رہتی ہے۔ مرنا چاہے تو مر نہیں سکتی اور جینے یہ بچّہ نہیں دیتا۔ آخری دنوں تک نیم مُردہ سی مختلف عوارض کا شکار رہتی ہے۔ اکثر جنم دیتے سمے جیون کی بازی ہار جاتی ہے۔ یہ اس خبیث بچّے کا آخری تحفہ ہوتا ہے جو وہ ماں کو پیش کرتا ہے۔

دُنیا کے ظالموں' قاہروں' قاتلوں' انسانیت دشمنوں' آمروں' ڈاکوں ٹھگوں کی تاریخ اُٹھا کر پڑھیں' معلوم ہوگا اُنہوں نے نہ خود چین لیا نہ کسی کو لینے دیا...... اپنی ماؤں کو زندہ کھا گئے' اپنے خاندان کے لیے ننگِ خاندان کہلائے۔ اُن کے مرنے' قتل ہونے پہ کوئی افسردہ نہ ہُوا...... خس کم جہاں پاک کہہ کر آگ یا گڑھے میں ڈال دیا گیا...... یا ایسے مردودوں نے خود ہی خود کو واصلِ جہنم کر دیا۔ یہ بدروح جب تک زندہ رہتے ہیں ان سے کبھی کسی کو فیض فائدہ حاصل نہیں ہوتا...... تخریب کاری' فسادِ فسق و فجور' قتل و غارت' سازش و شرارت ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہوتی ہے۔ جھوٹی نبوت اور خدائی کے دعویٰ دار بھی ایسے ہی فتنہ عالم لوگ تھے۔ اُن کے انجام سے کون واقف نہ ہُوا؟...... یزید' شمر' ہلاکو خان' چنگیز خان' مسلمہ کذاب' رَجل جبل' حسن بن صباح' راسپوتین' ہٹلر' امیر علی ٹھگ......!

سوال پیدا ہوتا ہے ایسے لوگ' ایسا نصیب لے کر دُنیا میں آتے ہیں یا خود بخود ہی پید ہو جاتے ہیں یا پھر پیدا تو صالح سالم ہوتے ہیں بعد میں ماحول تربیت اُنہیں غلط راہ اور منفی سوچ کی طرف دھکیل دیتی ہے؟ یا پھر وہ نُطفے اور خمیر میں منفی ارجحانات کے ایسے سالمے لے کر آتے ہیں جو اُنہیں صالحیت راستی بھلائی کی جانب آنے ہی نہیں دیتے۔ یہ بھی کہ ابلیسی قوتوں یا فلکی استغاثوں کے زیر اثر ہوتے ہیں......؟

میرا تجربہ مشاہدہ میری رہبری کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر زیادہ تر ہماری بے علمی' اخلاقی و رُوحانی پس ماندگی محرک رہتی ہے۔ ہر علم اور عمل کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں اسی طرح ضابطہ

بائے حیات و ممات بھی ہیں۔ قلم تراشتے ہوئے بھی تو کچھ چاقو چھری کی تیاری کرتے ہیں۔ نہاتے دھوتے' کھاتے پیتے' یہاں تک کہ لڑتے جھگڑتے بھی کچھ اہتمام ہوتا ہے۔ اگر ہم احتیاط نہیں کرتے تو وہ عمل ہے اپنی بیوی کے قریب جانے کا؟ شراب سگریٹ چرس بھنگ' پیٹ بھر کر کھانا' بغیر سوچے سمجھے' وقت بے وقت' آمادگی' رغبت بے رغبت ہم جُت جاتے ہیں...... یہ تو وہی بات ہوئی کہ کھانا دیکھتے ہی پل پڑتے ہیں' بے طرح ٹھونستے ہیں' نہ اچھی طرح چباتے ہیں نہ دو لقموں کے درمیان وقفے کا خیال...... بے طرح پیٹ بھر لیا جائے تو کیا ہوتا ہے۔ معدہ خراب' تے' درد' بواسیر' کھٹے ڈکار' نیند میں بے مزگی...... "وقت دی نماز تے کویلے دیاں ٹکراں" سیانے ایسے ہی تو نہیں کہہ گئے یہ بات......!

کوئی وقت رحمانی ہوتا ہے اور کوئی سماں شیطانی ہوتا ہے۔ کوئی بسم اللہ کی ساعت ہوتی ہے تو کوئی استغفر اللہ کا وقفہ!...... اکثر نطفے ایسے کڑے' بے آسودہ اور بے برکتے لمحوں میں قرار پکڑتے ہیں جب ارض و فلک پہ شیطان اور اُس کے چیلوں پہ شہابیوں کی سنگ باری ہو رہی ہوتی ہے...... وہ بھاگ بھاگ کر شہابیوں سے بچتے ہیں...... کوئی شہابیہ اُن سے ٹکرا جائے تو اُس کا اثر زائل کرنے کی خاطر اِدھر اُدھر اُچھال دیتے ہیں۔ جدھر کوئی اپکا لگ اُدھر ویسا ہی شیطان پیدا ہو جائے گا جس نے یہ اُچھالا تھا۔

پرانے بزرگ کسی صالح مند نیک کو اک نظر دیکھتے اور کہتے۔ "بسم اللہ دا نطفہ لگدا اے" کیا مطلب؟......

مطلب یہ کہ جب انسان اپنی نسل کو آگے بڑھانا چاہے تو اللہ سے خیر مانگے...... اُس کا نام لے' بسم اللہ پڑھے' ساعت کی تلاش کرے' رضامندی لے' سنتِ آدم' طریقہ رسول صلعم ذہن میں رکھے تو خیر ہوتی ہے۔ شرابیوں چرسیوں سونے بازوں اور محض نفسانی خواہش کی خاطر' بیوی کے قریب جانے والوں کے ہاں اکثر ناآسودہ خاطر بچے جنم لیتے ہیں۔ زندگی بھر بیماری' عسرت' ناہمواری' بے برکتی اور نحوست اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

اللہ کی سلطنت میں' سُنا ہوگا کہ مادرزاد ولیوں نے جنم لیا...... ماں کے پیٹ میں کسی نومولود نے پورا قرآن حفظ کیا۔ کسی نے آدھا اور کسی نے کچھ پارے...... کچھ مادرزاد تحصیل علم کر کے پیدا ہوتے تھے اور مائیں' چکّی بھی چل رہی ہے' تلاوت بھی جاری ہے...... ایسی بھی مائیں' شیرخوار کو بن وضو دودھ نہیں پلایا...... باپ کا رزق' برتاؤ' رویے طور طریق' اخلاق و اخلاص اگر صالح ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ آگے آنے والی نسل کی بہبود بہتری کے لیے اُس نے کیا کردار ادا کرنا ہے تو وہ پھر اوّل دن سے لے کر پیدائش تک ہر عمل و حرکت میں احتیاط سے کام لے گا۔

پہلے غازی اور مجاہد پیدا ہوتے تھے' عالم و فاضل' حافظ و محدث جنم لیتے تھے۔ کامیاب تاجر'

زبدۃ الحکماء' معلّم و مدرس' فقیہہ و قاضی القضاء پیدا ہوتے ہیں کہ اُن کے بڑے اور ماں باپ بھی متوکل' رزق حلال کے خوگر اور وظیفہ ہائے حیات کو جاننے والے ہوتے تھے۔ اس دور میں اکثریت دین و مذہب سے بے بہرہ' اخلاق و انسانیت سے عاری' ملک و ملت خاندان پہ بھاری' نکھٹو' نشیئے' جنسی اخلاقی انسانی بے راہروی کا شکار' سدا کے بیمار' بھتہ خور' دہشت گرد' موبائل جھپٹنے والے' اغواء برائے تاوان والے پیدا ہوتے ہیں کہ زیادہ قصور والدین کا...... ماحول اور سوسائٹی اور اپنے میڈیا کا...... جنہوں نے اچھائی بُرائی میں توازن برقرار نہ رکھا۔ سنسنی خیزی' خوف و ہراس اور اپنی فوقیت' اہمیت بڑھانے کی خاطر' بے احتیاطی سے کام لیا۔ جس نے نئی نسل پہ مثبت کی بجائے منفی اثرات ڈالے۔

دوسری قسم کے غیر متوازن بچے' اُن لوگوں کے ہاں اکثر پیدا ہوتے ہیں جو نام نہاد پیروں فقیروں' عاملوں کے ہاں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں۔ تعویذ گنڈے' دم پھونکے جادو تعویذوں سے اُنہوں نے اپنا بیڑہ غرق کر لیا ہوتا ہے۔ کچھ توہمات میں جکڑے ہوئے لوگ بھی جو ہر کام حرکت میں کوئی نہ کوئی شگون اُٹھاتے ہیں۔ بلاوجہ کی احتیاطیں کرتے ہیں' غیر اللہ' غیر مذاہب کی ما فوق الفطرت باتوں کاموں پہ غیر ضروری توجہ دیتے ہیں۔ ایسے گھروں میں ایسے بچے ہوتے ہیں جو روحانی' نفسانی اور اذہانی طور پہ متوازن نہیں ہوتے۔ وہ زندگی بھر منفی رُجحانات کی جانب ہی کھنچے رہتے ہیں!

تیسری قسم میں ایسے لوگ آ گئے ہیں جن کے جینز میں ہی یعنی خُونی وراثت میں اُدھورا پن' پاگل پن' عدم برداشت' انتہا پسندی' خود پسندی اور منتقم مزاجی ہوتی ہے۔ ایسے بچوں کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ جیسا بیج ہوگا' سارے کھیت کا کماد بھی ویسا ہی ہوگا...... کانٹے میں پودا کیسے اُگ سکتا ہے؟...... بھیڑیے کے ہاں بھیڑ کا بچہ پیدا نہیں ہو سکتا!

چوتھی قسم ایسے کسی انسان کی ہوتی ہے جس کی پیدائش میں انسانی عمل کم اور غیر انسانی دخل زیادہ ہوتا ہے۔ اس دُنیا کی تماشا گاہ میں ایسے ایسے تماشے واقع ہوتے ہیں کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کے دائرہ وہم و گمان' عقل و خرد کے کسی خانے میں وہ بات تیقّن ہی نہیں کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی ایسا فرد جس کا باپ یا ماں' بشر نہیں ہیں۔ اُس کا نطفہ غیر انسانی ہے یا کوکھ کسی عورت کی نہیں' عقل قبول ہی نہیں کرتی...... لیکن ذرا سوچئے کہ آج کل جو کچھ ٹیکنالوجی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے کیا پچاس ساٹھ سال پیچھے ان پہ یقین کیا جا سکتا تھا؟...... یہ سب کچھ محض دیوانے کی بڑ اور مشرکانہ باتیں سمجھی جاتی تھیں۔ مولوی حضرات آج بھی نہیں مانتے کہ انسان چاند پہ اپنے قدم رکھ چکا ہے اور جلد آنے والے وقتوں میں وہاں انسانی کالونیاں آباد ہوں گی۔ بچے سر ہالیڈے اور نئے بیاہتا جوڑے ہنی مون کے لیے جایا کریں گے۔''

میرے ایک کاروباری بچے نے جو امریکہ میں ایک سرجن ہے ایسے بچے کا قانونی باپ ہے جو اسی کے نطفہ سے ہے لیکن اُس کی منکوحہ بیوی کی کوکھ سے نہیں۔ کوکھ ایسی نامعلوم پیشہ ور عورتوں کی حاصل کی جاتی ہے جو معاوضہ پہ کسی مرد کا نطفہ اپنے رحم میں رکھوا لیتی ہیں...... بچہ پیدا کر کے "پارٹی" کے حوالے کر دیتی ہیں' نہ مرد کو علم کہ وہ عورت کون اور نہ عورت کو پتا وہ مرد کون؟...... دونوں ایک دوسرے کے لیے محض پارٹی یا کلائنٹس ہوتے ہیں' درمیان میں وہ قانونی یا غیر قانونی ادارہ' جو ایسے اولاد کے متمنی جوڑوں کی مدد کرتا ہے جو کسی بھی وجوہ کی بنا پہ خود اولاد پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

"کاجل کوٹھا" میں ممبئی کی ایک لڑکی سنبل سہانی کا خاصی تفصیل سے ذکر ہوا ہے جو" تن کوری" تھی' ایسی لڑکی ہزاروں میں کوئی ایک آدھی نکل آتی ہے۔ جو ساری زندگی خود چین سے رہتی ہے نہ اپنے متعلقین کو سکون سے رہنے دیتی ہے۔ تن کوری عورتیں ہی نہیں بلکہ تن کورے مرد بھی ہوتے ہیں۔ شاید آپ میں سے کسی نے ایسی عورت یا مرد دیکھا ہو یا کہیں سنا ہو۔ میرے مشاہدہ میں تو ایسے کئی مرد وعورتیں بچے ہیں جن کے ساتھ اسی نوع کے مسئلے موجود ہیں۔ اس میں ان مریض' بدنصیب افراد کا کوئی دوش نہیں ہوتا...... بس' کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ اگر کسی کے ہاں اپاہج' اندھا' لولا یا ہیجڑا پیدا ہوتا ہے تو اس میں پیدا ہونے والے کا کیا اختیار؟...... یہ تو مقدر' ماحول' تربیت یا پھر ماں باپ کی بے علمی اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اکثر ابنارمل بچوں کی پیدائش میں یہی عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور اس تلخ حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

جس طرح جسم واعضاء کی افزائش ہوتی ہے اسی طرح ذہنی' باطنی روحانی قوتوں صلاحیتوں کی نشونما بھی ممکن ہے۔

دُنیا میں ہر جگہ ابنارمل بچے موجود ہوتے ہیں۔ وہاں کے سرکاری' رفاہی ادارے ہر ممکن اُن کی مدد کرتے ہیں' علاج معالجہ اور سیر و تفریح کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ ستر فیصد ایسے ابنارمل افراد صحت یاب ہو کر معاشرے کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں اکثر ابنارمل افراد کو زبردستی "اللہ والا" پہنچا ہوا ولی سمجھا جاتا ہے۔ اُنہیں جلیاں مارنے' دھمالوں ڈھولوں اور منشیات پہ لگا کر کمائی کا وسیلہ بنا دیا جاتا ہے۔ اُن سے مرادیں' دُعائیں پھونکیں دَم کرائے جاتے ہیں...... استغفراللہ......!

میرا واسطہ چند ایسے بچوں اور افراد سے بھی پڑا ہے جن کا باپ یا ماں انسان نہیں تھے۔ غیر انسانی مخلوق' درندے چوپائے' دیگر جانور بھی...... ایسا ہونا ناممکنات میں نہیں' بات نطفہ رحم اور باہمی قبولیت کی ہے۔ درختوں پودوں پھل پھولوں' سبزیوں کی جو قلمکاری ہوتی ہے یہ کیا ہے؟...... آج دُنیا میں نوے فیصد زیادہ پھل پھول' سبزیاں ترکاریاں' درخت پودے' اجناس وغلہ اپنی اصلی قدرتی شکل وحالت' خوبی وخوشبو' افادیت و

اثرات میں نہیں۔ پہلے موسموں کی اپنی اپنی سبزیاں اور پھل ہوتے تھے' اب بارہ مہینے سب کچھ دستیاب ہے۔ مصنوعی دودھ' گھی' مکھن' چینی' نمک' ذائقے اور مہک...... بغلیں مرغیاں لگاتار انڈے دیتی ہیں۔ انڈے مشین میں رکھو' دس منٹ میں چوزے چوں چوں کرتے باہر......!

آسٹریلیا سے تخم کے ٹیکے آتے ہیں' بچھڑے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی پسند کا بچہ حاصل کرنے کے اشتہارات تو اخبارات میں آپ پڑھتے ہی ہیں؟...... گنجے سروں پہ گنے کماد کی طرح بال اُگ رہے ہیں...... چہرے اور خدوخال بدلے جاتے ہیں۔ اصلی دانتوں سے زیادہ مضبوط اور خوبصورت' کبھی نہ خراب ہونے والے دانت داڑھیں' جبڑوں کے ساتھ جڑوں میں کسے جا رہے ہیں۔ گردے' پھیپھڑے' جگر پتہ آنتیں...... گٹے گوڈوں کے چپنیاں' زانو پنڈلیوں کے راڈ...... پسلیاں' ناک اور جبڑوں کی ہڈیاں' معدے اور دل لبلبے کے پائپ نالیاں' دماغ کی وائرنگ...... آنکھوں کے کیمروں کے لینز غدے...... سب کچھ یوں تبدیل ہوتا ہے جیسے پرانی گاڑی کے پرزے نٹ بولٹ تبدیل ہوتے ہیں۔ اب انسان میں اور کسی گاڑی' ٹیلی وژن' کمپیوٹر' ویڈیو گیم' روبوٹ کے میکنزم میں کچھ فرق باقی نہ ہے۔ درست بھی ہے کہ اُستاد کی پیڑھی شاگرد بھی کبھی نہ کبھی بیٹھتا ہی ہے۔

اَب انسانی باڈی کے مکینک' پورا چہرہ یا خدوخال' پرانے اعضاء' جسمانی ساخت کو جزوی طور پہ یا مکمل بدل دینے پہ قادر ہیں۔

## ● نہ عروج اچھا نہ زوال اچھا......!

مائیکل جیکسن اور الزبتھ ٹیلر کو کون نہیں جانتا' ان کی آپس میں گہری دوستی تھی جس کی بنیاد میں چند نمایاں مشترکہ قدریں شامل تھیں۔ پہلی قدر ان دونوں کا شہرۂ آفاق اداکار اور گلوکار ہونا تھی...... دوسری حد سے بڑھی ہوئی خود پسندی' خود آرائی' خود نمائی اور پیشہ ورانہ لحاظ سے خود کو منفرد رکھنا...... تیسری قدر' انتہائی دولت مند ہونا' ہیرے جواہرات' بڑی بڑی جائیدادیں' قیمتی گاڑیاں' مہنگے ترین لباس پرس جوتے اور کتے......!

کتے سے یاد آیا...... ایک بار الزبتھ ٹیلر کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے امریکہ سے انگلینڈ پہنچی تو دیگر سٹاف میں اُس کا انتہائی قیمتی پیارا کتا بھی شامل' جو اُس کا ندیم خاص تھا۔ اتفاق کہ لیس ان دنوں کسی بیماری کی وجہ سے انگلینڈ میں کتوں کے داخلہ پہ سخت پابندی تھی۔ یہ لاڈلی ممتاز ترین اور دُنیا بھر کی منہ چڑھی اداکارہ بھی اس کی زد میں آ گئی۔ بات اَنا اور وقار کی تھی...... اُدھر اُس کے کام کے خاتمہ تک انگلینڈ میں موجود رہنا ضروری

تھا...... اُدھر محکمہ ہیلتھ کتّے کی کلیرنس نہیں دے رہا تھا۔ جب پائن ووڈ کی کوئی سفارش بھی کام نہ آ سکی تو "لِز" نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ جس کو بھی پتا چلا اُس نے حیرت سے منہ کھول لیا۔ اُس نے انگلینڈ کی سمندری حدود سے باہر ایک کروزر پہ خدمت گاروں اور ڈاکٹروں کے ساتھ اپنے پیارے کتّے کو ٹھہرایا۔ کام سے فراغت کے بعد وہ اُس کے پاس پہنچ جاتی...... اس سارے انتظام پہ زرِ کثیر خرچ ہُوا...... مگر لِز نے اپنے محبوب کتّے کی جدائی برداشت نہ کی...... جبکہ انگلینڈ کی ملکہ اور سلور سکرین کی سدابہار ملکہ' آپس میں گہری دوست بھی تھیں اور برٹش ہونے کے ناتے' انگلینڈ اس کا اپنا ملک تھا...... عوام اس سے محبت کرتے تھے' ریاست سیاست میں اس کا رسوخ واثر بھی کچھ کام نہ آیا کہ محکمہ ہیلتھ اور امیگریشن ایکٹ درمیان میں تھا۔ اس واقعہ سے لِز کو بین الاقوامی شہرت ملی......"

بالکل ایسی ہی حرکتیں مائیکل جیکسن بھی کیا کرتا تھا یعنی ہر وقت تحیّر پھیلاتے رہنا' خبروں میں رہنا۔ ایک اور باہمی قدر' جواہرات' مہنگی اور کسی نہ کسی اہمیت کی حامل جائیداد' پینٹنگز اور دُنیا بھر کے خیراتی رفاہی اداروں کی مالی اعانت کرنا بھی تھی۔ جنس برابر اور مخالف سے جذباتی سلسلے بڑھانے میں بھی ان دونوں نے بڑے بڑے معرکے مارے اور اچھی بُری شہرت سمیٹی...... ایک اور بات جو بازار کی نہیں' راز کی ہے کہ ان دونوں کو "ڈیول جینئس" کی قوتوں صلاحیتوں پہ بڑا یقین تھا...... دُنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں ایسے شیطانی اور روحانی ادارے' سنٹر موجود ہیں۔ جدھر ان قوتوں سے استفادہ حاصل کرنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ باقاعدہ اجلاس' پوجا پاٹ ہوتی ہے' ابلیسی استعانتوں کو رام کرنے کے لیے' عجیب وغریب قربانیاں نذرانے پیش کیے جاتے ہیں کہ جنہیں کوئی دوسرا دیکھ لے تو خوف ودہشت سے نیم پاگل ہو جائے...... زندہ چمگادڑوں کے نرخرے سے خون چوسنا...... اُلو کی نوکیلی چونچ سے اپنے ماتھے پہ شش گوشہ ستارے کا نشان بنانا' یہاں تک کہ خون نکل آئے...... ایسی فضول توہمات پہ یقین رکھنے والے مرد حضرات' پیشانی' بائیں زانو یا شانہ اور عورتیں' ناف سے آدھی بالشت نیچے یا بائیں پستان پہ بنواتی ہیں۔ ان کے راہب جو ڈیول ڈیڈ یا ڈیول ماسٹر کہلواتے ہیں وہ اس ستارے والے نقش کو پشت پہ ریڑھ کے پہلے مہرے پہ بنواتے ہیں...... کچھ اپنی زبان پہ بھی ٹیٹو بنواتے ہیں۔ خنزیر' اُلو' چمگادڑ' خارپشت اور گال گدھ کے تازہ خون کی "کاک ٹیل" جسے وہ بڑے اہتمام سے انسانی کھوپڑیوں کے کاسوں میں تیار کر کے' اپنی ابلیسی ضیافتوں' ریاضتوں میں نوش جان کرتے ہیں۔

ان کا یقین ہے اور ان کے ابلیسی نصاب میں واضح ہے کہ ہر نجس ناپاک چیز میں ان کے لیے مکتی ہے۔ آنجہانی مائیکل جیکسن اور الزبتھ ٹیلر بھی ان توہمات پہ یقین رکھتے تھے۔ وہ اپنی شہرت دولت اور صحت کی روز بروز افروزی کا کارن' انہی خرافات اور توہمات کو گردانتے۔ مائیکل جیکسن نے تو اپنے جسم کے پوشیدہ

جسموں اور پورے چہرے کی ساخت' کھال' خدوخال' رنگت کی تبدیلی کے دوران اپنے ماتھے کی بڑی ہڈی پہ ایسے ایسے نشان اور متروک زبانوں میں فسوں بھی بنوائے تھے۔ جنہیں شاید وہ خود بھی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ مگر اُسے یقین تھا یہ پُراسرار شبد اُس کی کامیابی میں دخیل ہوں گے۔ اسی طرح الزبتھ ٹیلر بھی اسی طرح کے توہمات کا بُری طرح شکار تھی۔ خاص طور پہ "قلوپطرہ" کی فلمبندی کے دوران اُس کے ساتھ کئی ایک ایسے پُراسرار اور پُرخطر حادثات ہوئے کہ وہ بُری طرح بدحواس ہو گئی۔ اُس کے بس میں ہوتا تو فلم کو ادھورہ چھوڑ کر کہیں بھاگ نکلتی مگر یہ اُس کے جیتے جی ممکن نہ تھا۔ اُس وقت کے لحاظ سے قلوپطرہ کا پروجیکٹ' دُنیائے فلم کا عظیم اور مہنگا ترین منصوبہ تھا۔ جس میں بلامبالغہ ہزاروں اداکاروں اور سیکڑوں بحری جنگی بیڑوں کے علاوہ ہزاروں لاکھوں ہتھیار' ملبوسات اور دیگر لوازمات شامل کیئے تھے۔ مشکل' مہنگی اور دُشوار ترین لوکیشن' جن میں صحرا' سمندر' پہاڑ' دریا' شہر' بستیاں باغات' گلی کوچے...... کچھ اصلی اور کچھ بنائے گئے سیٹ...... ان پہ کثیر صرف اُٹھا تھا۔ صرف قلوپطرہ کے کاسٹیوم پہ ایسا بجٹ تھا کہ ایک علیحدہ فلم بن جائے۔ حق تو یہ کہ الزبتھ ٹیلر نے قلوپطرہ کو اپنے فن سے اَمر کر دیا۔ آج بھی اس مصری ساحرہ کا تصور کھینچتے ہی الزبتھ ٹیلر سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ لگتا تھا کہ یہ اسی کردار کے لیے پیدا ہوئی تھی...... لیکن دو چار جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ اس لافانی اور شیطانی کردار کو نبھانے کے لیے اِسے کن کن استعانتوں اور وسیلوں کا سہارا لینا پڑا۔ اگر ہندوستانی' مصری یونانی اور اسرائیلی مافوق الفطرت قوتیں اور کچھ رجال طاغوت کی فسوں سازی اس کے ہمراہ نہ ہوتی تو وہ شاید دُنیا کی نمبر ایک اداکارہ' حد درجہ امیر اور حسین ترین عورت نہ ہوتی۔"

اگر آپ نے دیکھا ہو تو یاد کریں مائیکل جیکسن کی ایک کمرشل ریلیز ہوئی تھی۔ جس میں وہ ایک قدیم فرعون کے دربار میں اُس کی ایک حسین وجمیل بیوی کے سامنے ناچتا گاتا ہے۔ وہ اس کے بے مثال گانے اور رقص پہ ہزار جان سے ایسی فریفتہ ہوتی ہے کہ اُسے اپنا ہوش رہتا ہے اور نہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے فرمانروا شوہر کا خیال و خوف...... وہ اس کے نادرِ روزگار فن و ہنر سے متاثر ہو کر دیوانہ وار اس کی جانب رجوع کرتی ہے۔ پاس بیٹھا بادشاہ سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے وہ معاملہ کی سنگینی کے پیش نظر اس رقاص جادوگر کو گرفتار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس رقاص کے پاس ایسی شکتی ہوتی ہے کہ وہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ رقص کرتے کرتے پھرکی کی مانند گھومتا ہے اور نیچے ریت میں غائب ہو جاتا ہے۔"

ایسے اور بھی کئی کھیل' پرفارمنس ایسے پیش کیئے جن کے بارے کبھی کسی پرفارمر نے سوچا بھی نہ ہوگا؟

اُس نے جو پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک تبدیلی کروائی وہ کوئی خالی از علت نہ تھی...... اس کے پیچھے بھی اُس کی حد درجہ توہم پرستی اور سفلی شکتیوں پہ زبردست یقین تھا...... وہ سامریت' مصریت' قدیم

فسوں کاریوں ارضی وافلا کی اولیائے طاغوت اور دیوی دیوتاؤں کے چمتکاروں کو ماننے والا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دُنیا کے دائرہ میں رہنے والے اِسی دُنیا کی ارضی روحانیت اور ماورائیت سے ہی بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ جس طرح تیل اور پانی آپس میں ضم نہیں ہو پاتے اسی طرح مادیت میں پرویا ہوا بشر بھی لاہوتی معارف سے سیر حاصل فیض یاب نہیں ہو سکتا۔ اُسے وہی کچھ بھاتا اور موافق آتا ہے جو اُس کے خمیر اور اجزائے ترکیبی کے قریب قریب ہو۔

مَیں نے اُسے امارات کے ایک ننھے منے سے ملک میں دیکھا۔ جسے ملک تو کیا ایک قصبہ بھی نہیں کہا جا سکتا ...... چند ہی بستیاں سے کچھ ہی زیادہ رقبہ کے اِس ملک میں وہ اپنے خاندان کے چند چیدہ چیدہ افراد کے ساتھ کچھ دن رات بسر کر رہا تھا لگتا کہ رہبانیت کی جانب رجوع کر چکا ہے۔ لمبا بدوں والا قدیمی طرز کا چوغہ' ریگستانی طرز کے چپل اور سر کی چادر ...... داڑھی مونچھ اور بالوں کی تراش خراش سے تو وہ فارغ تھا کہ یہ سب غیر قدرتی اور بے جان تھے۔ پلاسٹک سرجری کا شہکار نمونہ ...... لیکن اب ان غیر قدرتی اور مصنوعی اعضاء و بال و پر ...... اس کے لیے ایک عذاب جہنم بن چکے تھے۔ بے حسی بے جانی کی کیفیتوں نے اُسے نڈھال کر دیا ہوا تھا۔ اُسے اب شدت سے احساس ہونے لگا کہ بہت جلد وہ ایک شکستہ اور بھیانک سراپے میں تبدیل ہو جائے گا اس کی شہرت اور عزت گہنا جائے گی۔

اُس کی جلد جگہ جگہ سے تڑخنے چٹخنے لگی تھی ...... کہیں سے رطوبت رستی اور کہیں سے ناگوار بُو آنے لگتی۔ ذرہ کھجلی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھونے سے محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ اپنے جسم کو ہاتھ لگا رہا ہے۔ اَب وہ اکثر ایسا ڈیزائن کیا ہوا لباس پہننے لگا تھا جو اُس کے جسمانی' خصوصی طور پہ چہرے کے خد و خال کو نمایاں نہ کرے ...... محفلوں اور ایسے اجتماعات میں شرکت بھی نہ کرتا' جو دن کے اُجالے یا تیز روشنیوں میں ہوتیں۔

روز بروز اس کی پریشانیوں' غیر ضروری ادویات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گولی' پتھر لوہے یا لکڑی پہ تو اثر کرتی ہے ...... ریت' مٹی' خس و خاشاک کی باڑ یا کپڑے کے پردے پہ کچھ اثر نہیں دکھاتی کہ آہ کا اثر دکھانے کے لیے قلب و جگر کی ضرورت ہوتی ہے ...... اصل استخوان پہ مصنوعی گوشت کا اُستر چڑھوا لینے سے تو کھردری کھال کی کھدری نہیں نکلتی ......!

اب تو وہ آئینہ کا سامنا کرنے سے بھی کترانے لگا تھا۔ تب اُس کے ایک قریبی دوست نے جو ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھا' مشورہ دیا کہ اگر تم اپنی عاقبت اور دُنیا بچانا اور کسی بھوت کی بجائے ایک بھلے انسان سا انجام پانا پسند کرتے ہو تو اپنے سفلی عقائد و خیالات سے چھٹکارا حاصل کرو ...... خدا نے جس طرح بنایا تھا اگر تم اس پہ قانع رہتے' محض شہرت' دولت اور مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر خدائی کاموں میں دخل نہ دیتے تو آج

تمہاری ایسی حالت نہ ہوتی' دُنیا کی ہر نعمت اور آسائش پالینے کے باوجود تم خود اپنا سامنا کرنے سے کتراتے ہو...... تمہارا جسم' تمہارا ہوتے ہوئے بھی تمہارا نہیں ...... تمہارے اپنے تمہیں عدالتوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ تمہارے خلاف بدمعاملگی اور بچوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی کے مقدمات چل رہے ہیں۔ پیشہ ورانہ طور پہ بھی تم مسلسل تعطل اور تھکاوٹ کا شکار ہو۔ تمہارے دوست اور پرانا سٹاف بھی آہستہ آہستہ تمہارا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ مائیکل نے جھنجھلا کر کھٹ سے جواب دیا۔

''یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟...... لز میری بہترین دوست ہے' مونس غمخوار اور ہر مشکل میں ساتھ نبھانے والی...... اس کے ہوتے مجھے بھلا کسی اور کی کیا ضرورت ہوگی؟''

مسلمان دوست نے ہلکے سے استہزاء کے ساتھ جواب دیا۔

''تم نے کبھی دو ایسے افراد دیکھے ہیں جو ایک ساتھ ڈوب رہے ہوں؟''

مائیکل نے اُس کے عجیب سے سوال پہ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''دو ڈوبتے ہوئے افراد کو کوئی تیسرا کیسے دیکھ سکتا ہے؟'' ساتھ ہی فوراً ایک اور سوال داغ دیا۔'' کیا تم نے دو ایک ساتھ ڈوبنے والوں کو کہیں دیکھا ہے؟''

''ہاں' دیکھ ہی تو رہا ہوں...... پرنس! شاید تم نہیں جانتے کہ دو ایک ساتھ غرقاب ہونے والے پانی سے باہر کیسے بھی گہرے دوست رہے ہوں۔ ڈوبتے وقت بدترین دُشمن ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ دونوں جانتے ہیں کہ آج اِن کا اَنت ایک ساتھ ہے لیکن پھر بھی ہر دو کی کوشش ہوتی ہے دوسرے کے کندھے پہ پاؤں رکھ کے' اُچھالا لے اور کسی طور بچ نکلے...... مگر دونوں ایسا نہیں کر پاتے۔ کھلی آنکھوں غڑپ غڑپ پانی نگلتے وہ بالآخر تہہ آب بیٹھ جاتے ہیں۔ پانی میں کھولنے کی بجائے اگر پانی سے باہر آنکھیں کھول لیتے تو ایسے بھیانک انجام سے دوچار نہ ہوتے۔''

مائیکل جیکسن نے اپنی آنکھوں کو بھی نہیں بخشا ہوا تھا۔ وہ موقع محل کے مطابق مصنوعی رنگدار عدسے استعمال کرتا تھا۔ اَبرو' مژگان' آنکھوں کی بناوٹ سب کچھ پلاسٹک سرجری کی دین تھا۔ ہاں' آنکھوں کے ڈیلوں کے پیچھے ہلکی سی روشنی اصلی تھی۔ جو حالات و حرکات اور ماہ و سال کے ساتھ ساتھ' ساتھ چھوڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکنے پہ بھی قادر نہ تھا' کوشش کے باوجود پوری طرح آنکھیں بند کر لینا اُس کے بس میں نہ تھا۔ سانپ کی مانند آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔

دُنیا کا شہرت یافتہ' انتہائی دولت مند اور بے حد متاثر کن گائیکی کا شہزادہ' انوکھی اداؤں اور رقص کے سینکڑوں دلفریب سانچوں میں ڈھل جانے والا امن موہنا' جس سے چند لمحوں کی ملاقات کے لیے سربراہان

مملکت اور بڑے بڑے انسان منتظر رہیں۔ اگر ایلوس پر سلے وہ آتشہ تھا تو یہ سہ آتشہ رہا۔ اس کی گائیکی' رقص' انداز' لباس' حال حلیہ' جوتے' رومال' کس کس کی نقل نہ ہوئی؟...... اُس نے اک زمانے کو اپنے پیچھے ڈال رکھا تھا۔ لیکن فطرت سے روگردانی' طاغوتی استعانتوں کی فرسودگیوں' نحوستوں اور غیر اللہ سے معاملت نے اسے زندگی اور برکتوں سے بہت دور دھکیل دیا۔ یہاں تک کہ خاک بوس ہونے کے بعد بھی ازدواجی اور خاندانی بدمعاملگیوں کی بدبو' جائیداد اور لین دین کی پیچیدگیوں اور قانونی اُلجھنوں نے اسے نہیں بخشا۔ اس کی شہرت دولت محبوبیت' فن اور انفرادیت نے اسے کچھ فیض نہ پہنچایا۔ یہی کچھ الز بتھ ٹیلر کے ساتھ بھی ہوا کہ دونوں کی کہانیاں' شوق وشان...... شادیاں' خانہ بربادیاں' بے رہرویاں وغیرہ غیر فطرتی اور غیر متوازن تھیں۔

کنواں کا پانی' لاکھ ٹھنڈا میٹھا' صاف صحت بخش ہو اگر اسے نکالنے والا بوکا' مُردار اور حرام جانور کی کچی کھال سے بنایا ہوا ہو تو پانی کی ساری خوبیاں' شفایابیاں بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

مسلمان' عیسائی' یہودی یا کوئی ہندو سکھ ہو عقیدہ کا صحیح ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ جب ہم جانتے اور مانتے ہیں کہ نظام ہستی چلانے والا کوئی موجود ہے۔ کائنات کے پیچھے کوئی مالک وخالق بھی ہے...... ہم اُس کی تخلیق ہیں۔ وہ ہماری ڈوریاں ہلاتا ہے تو ہم حرکت میں آتے ہیں' وہ جب چاہے ہمیں ساکت وجامد کر سکتا ہے تو پھر کسی ایرے غیرے کو اپنا ملجا و ماوا ماننے سے کیا حاصل؟...... خدا کی قدرت کہ اُس مسلمان دوست کی سیدھی سیدھی' زیادہ رعائت سے پاک باتیں' مائیکل پہ کچھ اثر دکھا گئیں۔ خوش قسمتی ہوتی ہے کہ کسی بھی سٹیج پہ انسان راستی کے راستے گمرہی سے بچ نکلے......!

سر پہ پڑے صبح وشام یوں کٹ رہے تھے جیسے دو دھاری کٹار' حلقوم سے اندر باہر آئے جائے۔ اُسے اندھیرے میں کسی مہین سی کرن کی مانند ایک بات سوجھی۔ وہ اپنے خاندان کے چند افراد اور بچوں کے ساتھ امارات نکل آیا۔ میڈیا اور دیگر تشہیری ذرائع سے بچنے کی خاطر اُس نے خاطر خواہ بندوبست کر لیا تھا۔ اپنا معمول کا زرق برق' جدید تراش خراش کا لبادہ اتار کر قدیمی بدوؤں کی وضع قطع اختیار کی...... عام لوگوں کے درمیان منہ سر ڈھانپے بڑے سکون سے گھومتا رہتا۔ اُسے ایک گونا تسکین وطمانیت کے احساس نے اپنے حصار میں لے لیا تھا...... وہ ہلکا سا سمجھ پایا کہ گلیمر اور نمائشی دُنیا کے باہر دم سادھے' سادگی اور گمنام رہنے میں جو لطف وانبساط ہے وہی فطری زندگی کے اصل مفہوم کی گرہیں کھولتے ہیں۔

نکلتے قد' قبول صورت' عام فہم وفہامت' محدود وسائل ووضع وقطع' جھجکی سوچ وسکت' قانع وقدامت' نیم خواندہ نحیف ونزار' کم گفتار ورفتار' گمنام گھن زدہ بے بساط وبے سوادلوگ...... کالے شاہ لوکوں کی مانند ہوتے ہیں۔ مٹھاس اور کسالی یوں آپس میں ضم ہوتی ہے کہ علیحدہ نہ کیا جا سکے۔ شکل عقل بھی ایسی کہ بس دانتوں تلے

دباتے ہی بنے...... بوری بھرلو یا کھیسے میں ڈال لو' پونے میں ڈبالو یا ٹلی پہ نکال لو...... دانتوں میں پھنسے مسوڑھوں پہ چپکے...... ننھے منے سورجے تیج' کانچ کے کیل...... امیروں کی امرتیوں سے تو بھلے کہ منگل بازار نہیں کسی جنگل نکل لو' جھڑ بھڑ سے جھولے بھرلاؤ......!

کچے اور پکے کانچ میں بس ایک آنچ کا فرق ہوتا ہے' وہی جو گڑ کی راب اور دانہ دار شکر اب میں ہوتا ہے...... بچھڑے اور سانڈ' مطلقہ اور رانڈ یا پھر مائی بھیروں اور ڈ کھڑ ماند میں ہوتا ہے۔؟

عقل مت کے مختلف نام اور ستر ہزار کام ہیں۔ اسے ابدال بنتے ہوئے دیر لگتی ہے نہ چنڈال میں تبدیل ہوتے ہوئے پتا چلتا ہے۔ کہیں یہ پی کی پکار تو کبھی عمرو عیار ہوتی ہے...... کہیں یہ ستیزہ کار ہے تو کدھر یہ مال' نیلام سربازار ہے۔ دیپک راگ بھی ہے اور میگھ ملہار بھی...... اس کے کھلیانوں میں تمے اور گنے ایک ساتھ اُگتے ہیں۔ یہاں بُدبُدو شسوار اک ساتھ چکتے ہیں۔ کہیں یہ مصلحت کی سان پہ چڑھ کے آبدار ہوتی ہے۔ کہیں یہ منطق کے بان برساتی ہے۔ کمان کے جھکاؤ' دریا کے بہاؤ میں بھی کارفرما ہوجاتی ہے۔

عقل اور عشق میں ہمیشہ ڈو بدو...... ایک دوسرے کو چت کرنے کی ٹھنی رہتی ہے۔ کاٹھ بھاری تو کبھی سنگ پہ لرزاں طاری...... اُصول' طور طریقے' قانون قاعدے' فلسفے کلیے قرینے' مقابل کے آئینے...... انگشتریوں کے نگینے...... تناؤ' بہاؤ' سجاؤ...... کسی میں کبھی بھی یکسانی' ایک سی روانی نہیں رہتی۔ ناگہانی کو سہ لینا' برداشت کرلینا...... اس میں سے کوئی سلامتی کی راہ تلاش کرلینا ہی دانش ہے...... دانش فراست' عقل بینش' حکمت کے آپس میں عجیب سے رشتے ہوتے ہیں جیسے جذب جنوں' عشق و عجز کے مابین تعلق و تفاوت...... گراریوں کے کھانچے آپس میں پیوست وپیہم ہوتے ہیں تو حرکت میں برکت پڑتی ہے۔

مائیکل جیکسن کی عقل کی گراریاں باہم پیوست ہوچکی تھیں۔ وہ جان چکا تھا کہ ڈودھ ڈودھ ہی ہوتا ہے اُس جیسی سفید رقیق کوئی دوسری چیز ڈودھ کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ ''آواز دوست'' نے اُسے بتادیا تھا کہ دل' فطرت کی طرف رجوع کرنے سے قرار پکڑتا ہے...... در و دیوار برج مینارے گارے مٹی پتھر پلاسٹک' لکڑی لوہے سے تو بنائے جاسکتے ہیں مگر انسان نہیں...... وہ تو اللہ خالق و مالک کے ہاتھوں سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ جو ماں نے جنم دیتے نے تمھیں جسم و جاں' اعضاء و ادا دی تھی وہی فطرت اور اصل تھی۔ دُنیا کی اشیاء' قبر اور سمندر قبول نہیں کرتے...... مُردے کو کپڑے کا کفن دینا...... ہمارا شرعی شعار ہے جو ضروری ہے مگر یہ شہید اور عاشق اس سے چنداں مستثنیٰ کیوں ہوتے ہیں کہ یہ راہ ہی اولڑی ہوتی ہے۔

''آواز دوست'' نے اُسے سمجھا یا تھا' دروازہ مکمل بند ہونے سے قبل داخل ہوجاؤ...... ورنہ......؟

مائیکل جیکسن بھی تن گورے مردوں کی ایک ایسی قسم سے تھا جو سراپا اسرار تھے۔ ان کا اوّل بہتر نہ

آخر...... لیکن یوں بھی مشاہدہ میں آیا کہ بعض تن کورے مردوزن انتہا کے فطین ذہین اور مخترع ہوتے ہیں۔ ایسے ایسے کارنامے ایجادات اور فن پارے تخلیق کرتے ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ اپنی انفرادیت' نوانجیوں' محیر العقول عادات' خیالات و افکار میں زندہ رہتے ہیں۔ دُنیا میں علم و ہنر' فن و فکر' سیاست و ریاست' عسکریت و فتوحات کے جو کارنامۂ ہائے' پڑھنے دیکھنے سننے کو میسر ہیں...... غور کریں تو اُن کے عقب میں ہمیں ایسی ہی نابغۂ روزگار ہستیوں کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جو اپنی شاخ زعفران سی شخصیت و شرف کے سیاق و سباق میں کسی نہ کسی مقام کے تن کورے تھے۔

ان عجوبہ صفات لوگوں کو بنظر غائر دیکھا جائے تو ماضی قریب و بعید میں لیڈروں آمروں میں ہمیں ہٹلر' مسولینی' مارگریٹ' شاہ فاروق' ظاہر شاہ' قدافی فنکاروں میں الزبتھ ٹیلر' مائیکل جیکسن' جیکولین' مارلین منرو' چارلی چپلن' الفرڈ ہچکاک' آرڈے ہیبرن' مائیکل کین' نگار سلطانہ' بیگم پارہ' ستارہ' گرودت' ثریا' لتا منگیشکر' سلمٰی آغا...... ادیبوں شاعروں میں برناڈ شا' آسکر وائیلڈ' آئن سٹائین' قرۃ العین حیدر' میراجی' ن م راشد' عصمت چغتائی' وحید مراد' ساغر صدیقی' شاہینہ جمیلہ رزاق' اُستاد امانت علی خان' تنویر نقوی' عارفہ صدیقی' ذوالفقار علی بھٹو' ساحر لودھی' فریحہ پرویز' اسلم پرویز' مینا کماری' ساحر لدھیانوی' سہگل' مدن موہن' فریدہ خانم' جون ایلیا' بڑے غلام علی خان' صادقین' 'کچھو رام' کے آصف اور نور جہان...... چند ایک اور بھی...... یہ سب بڑی عجوبہ ہستیاں' کم و بیش حیثیت میں تن کورے تھے۔ یہ بات تو سمجھ میں آ چکی ہوگی کہ تن کوری جنس' ایک بالکل علیحدہ ''پروڈکٹ'' ہوتی ہے جیسے کسی مصنوعات کے سپیشل یا لمیٹڈ ایڈیشن ہوتے ہیں۔

تن کوری شخصیت کی پیشانی کے عین وسط میں ایک گہیرے دار اُبھار ہوتا ہے جو ہرگز ہرگز کسی عام شخص کی نگاہ میں نہیں آ سکتا...... حتیٰ کہ دوسرا تن کورا بھی جان نہیں سکتا۔ اس نشان اور دیگر تن کوری علامات کو کوئی ''خاص'' ہی پہچان سکتا ہے۔ یہ خاص لوگ' دوسرے لوگوں کی طرح گھل مل کر وقت گزارنا اور کسی سے بھی بے تکلفی پسند نہیں کرتے۔ مطلب کی اور حتمی بات کرتے ہیں' جس میں رد و بدل کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ دوستی اور تعلقات کے معاملہ میں بڑے محتاط ہوتے ہیں۔ شادی سے پرہیز یا پھر ایسا فیصلہ کرتے ہیں کہ سننے والے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرنے لگتے ہیں۔

ایک تن کوری دیکھی' ایسی حسین و جمیل کہ پورے علاقہ میں کوئی عورت اس کی ہمسر نہ تھی...... چھوٹی ذات سے تھی مگر کئی بڑے بڑے اُونچی ذات برادری والے' اس کے چکر میں تھے۔ روپیہ پیسہ' سونا چاندی' مویشی باڑے' ہر طرح کی پیشکش اس کے قدموں میں ڈھیر تھیں...... بتھ خبیث بے دھڑک ایسی کہ کئی ایک سورے اس نے سیدھے کر دیئے تھے۔ آئے دن کے تماشے سے تنگ آ کر پنچوں نے فیصلہ سنایا کہ وہ ایک ماہ

کے اندر اندر کسی مرد سے بیاہ کرلے ورنہ گاؤں چھوڑ کر کہیں چلی جائے۔ اُس نے مجبور ہو کر شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی جات کے ایک انتہائی غریب بچے سے جس کی عمر بمشکل چھ سات ماہ تھی' گود میں اٹھا کر پھیرے لے لیئے۔ پنچائت نے بچے سے شادی پہ اعتراض لگایا۔ اس نے جواب میں بچے کو ننگا کر کے مرد ثابت کیا۔ اپنی مرضی پسند سنائی...... اس شوہر بچے نے جو اس کی گود میں پڑا' بکری کا دودھ چسک رہا تھا...... پیشاب کی دھار بہا کر اپنی مردانگی کا ثبوت دیا۔

پندرہ بیس برس بعد جب اس کا شوہر بمشکل جواں مرد ہُوا' یہ بڑھیا کھوسٹ بنی اپنے اس ''شوہر بچے'' کے لیے پوری بیلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ چند ماہ بعد بچا کُن میں اپنے شوہر کو طلاق دے کے پڑوس کی اُوشا سے اس کے لگن کی بات چلائے گی کہ دونوں اب آپس میں آنکھوں آنکھوں باتیں کرنے لگے تھے۔

ارضی و افلاکی حساب کے اک خاص سے' اگر دو تن کوروں کا ملن ہو جائے تو کمال کے حادثات ہوتے ہیں۔ اک ڈوبے کی تن کوری جانے بغیر وہ بے پناہ اپنائیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک ڈوبے سے تعاون میں پیش پیش اور ہر لمحہ جانثاری میں آگے...... لگتا ہے وہ دونوں اک ڈوبے کے لیے ہی پیدا ہوئے' دو مر جاتے ہیں مگر الگ نہیں ہوتے۔ اگر دونوں فنکار ہیں تو ایسے کارنامہ ہائے انجام دیتے ہیں کہ اک زمانہ کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ اگر رومان پسند ہیں تو عشق میں کوئی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ ادیب شاعر ہیں تو اشفاق احمد اور بانو قدسیہ' حجاب اور سید امتیاز علی تاج' عصمت چغتائی اور شاہد لطیف' چترا اور جگجیت سنگھ بن کر نام کماتے ہیں...... اَبنارملٹی' ماورائیت' تحیر اچھی بُری شہرت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی...... اور ایسا بھی ہُوا کہ ایک تن کورا' کسی بھی حالات یا وجہ سے کسی غیر تن کورے سے وابستہ ہونے پہ مجبور ہوا تو دونوں ڈوب گئے۔ ایسے کہتا ہے کہ کن کی طرح کھائے گئے' پر علیحدہ نہیں ہوئے۔ ایک دوسرے کو لے ڈوبے مگر اک ڈوبے کا ساتھ نہ چھوڑا...... یہ خالصتاً ایک نفسیاتی اور ماورائی بشری فطرت و سرشت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ جسے شاید کوئی عالم و فاضل' ماہر بشریت و انسانیت ابھی تک کما حقہٗ سمجھ نہیں پائے۔

لارنس آف عریبیہ کا بدنام زمانہ کردار ادا کرنے کے لیے اسٹیج کا اداکار پیٹر او ٹول ہرگز منتخب نہ ہوتا اگر وہ تن کورا نہ ہوتا۔ اس کردار کے لیے سر لارنس اولیور اور ریل برائز موزوں اور زیرِ غور تھے مگر باوجود خواہش اور کوشش کے یہ کردار حاصل نہ کر سکے تھے۔ حقیقی لارنس آف عریبیہ' ماضی بعید کی دو اہم شخصیت میں سے ایک تھا جو تن کورے تھے دوسری رُسوائے زمانہ شخصیت جاسوسہ ماتا ہری کی تھی۔ اسی شہکار اور بڑی فلم میں ایک اور تن کورا' آئی ایس جوہر بھی شامل تھا جو اُس وقت فلم انڈسٹری کا واحد' تین ایم اے اداکار' ہدایت کار تھا۔ اس کے علاوہ فلم میں تین اور بھی تن کورے تھے۔ سرایلس گنس' عمر شریف اور ضیا محی الدین...... گویا اس مشہور زمانہ فلم میں

تن کوروں کی ریکارڈ اکثریت شامل تھی جو مثبت نتائج کی متقاضی ہوئی۔

چندی گڑھ کی شبینہ موسیقی کے بعد جگجیت سنگھ نے مجھے اپنے عزیز بلونت سنگھ سے بطور خاص تنہائی میں ملوایا کہ اسی کی خاطر مجھے ادھر بلوایا گیا تھا۔

اس خوبصورت سے نوجوان نے چند لمحوں کی ملاقات میں جو پہلی چیز مجھ سے شیئر کی وہ یہ تھی کہ "میں زحلی تن کوراہوں" زحلی اور قطبی تن کوری شخصیات اپنے کچھ علیحدہ سے تشرفات کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسے ہی جیسے اندھیرے میں جگنو یا شرارہ چمکے۔ زحلی کو شرارہ اور قطبی کو جگنو کی صفات سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

اسی طرح شمسی' قمری' عطاردی' اسی طرح حمل' قوسی' اسدی' سنبل' ثوری' جدی' جوزی' یزانی' دلوی' سرطانی' حوتی' مقربی وغیرہ۔

تن کوروں کا موضوع اتنا طویل' عمیق' دلچسپ اور توجہ طلب ہے کہ علوم سری و خفی کے طالبعلم ایک بار تو سمجھنے سے اکھڑ جاتے ہیں۔ یہ نصابی اور منقولی علم نہیں' اکتسابی اور سینہ بہ سینہ چلنے والا علم ہے۔ سیکھا بھی نہیں جا سکتا...... مگر اللہ کریم جسے عطا فرما دیں۔ علمُ الانسان بھی اس موضوع پہ بڑا محتاط و محدود زبان کھولتا ہے۔ یہ علم تو کھولتے ہوئے سیسے کی مانند کہ قریب لگتے ہی جھلسا کر رکھ دے۔ فی الوقت اس تن کورے کی بات کرتے ہیں جو زحلی کیفیات واثرات کا حامل تھا۔ ایسے زحلی تن کورے کہیں خال خال ہی نظر آتے ہیں جبکہ عام نوعیت کے کہیں نہ کہیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے عام چوہے کھانے اور دودھ پینے والے سانپ تو گھروں کھروں کھیتوں میں رینگتے مل جاتے ہیں مگر شیش ناگ یا مارسیاہ تو کسی قسمت والے کو ہی دکھائی دیتا ہے ایسے ہی گیدڑ لومڑ لکڑ بگھے تو کھیتوں باڑوں میں ذلیل ہوتے پھرتے ہیں پر افریقن ببر شیر اور بنگال کے باگھ...... افریقہ اور سندربن کے جنگلات یا پھر کسی چڑیا گھر میں دکھائی دیتے ہیں۔

بلونت سنگھ بھی چندی گڑھ میں اپنے باپ کے چڑیا گھر میں محبوس و مجبور ایک باگھ ہی تھا ویسے بھی سنگھ' ضیغم یعنی شیر ببر کو ہی کہتے ہیں۔ یہ تو کئی طرح سے شیر تھا۔

شیر سا طاقتور اور طمطراق والا طرار جنگلی جانور بھلا اور کون ہوگا؟...... لیکن مشاہدہ یہ بھی دکھاتا ہے کہ شکم کی مجبوری' سن کی معذوری میں اس سے بڑھ کر بزدل' کمینہ اور مکار بھی اور کوئی نہیں ہوتا۔ شیر چیتے پہ ہی کیا موقوف' مصیبت معذوری و مجبوری میں تو حرام اور چوری ڈاکہ بھی کسی حد تک روا ہو جاتا ہے...... بہر طور و طریق' جان ایمان اور ایقان بچانا اولیٰ ٹھہرتا ہے۔

بلونت سنگھ جیسا پڑھا لکھا' جوان رعنا' کھلے ہاتھ پاؤں اور قلب و نظر کا مالک' اکلوتا' بے انتہا دولتمند

باپ کی بوڑھی آنکھوں کا تارا...... کیا جو تم کیسی چپا تھی کہ وہ ایک پوشیدہ پُراسرار اور قیدیوں سی زندگی بسر کرنے پہ مجبور تھا؟...... اپنے پرائے سب اسی کھوج و کوشش میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح اسے اس خوفناک انجانی سی دلدل میں غرق ہونے سے بچایا جا سکے۔ جو اسے ناف تک تو نگل چکی...... لیکن وہ ابھی اس حالت میں تھا کہ کسی طرح بچانے کی کوشش کی جا سکے۔ ظاہر ہے میرا ادھر بلانا بھی اسی سلسلہ کی کڑی تھا۔

ہر شخص دوسرے کے بارے جو رائے، توقعات، سوچ، خوش فہمی یا غلط فہمی رکھتا ہے وہ سراسر اس کی تجزیاتی فہامت کی صوابدید پہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی جو اپنے قیاس اندازے، تجربات مشاہدات کی درست سمت تعیّن کرنے پہ قادر ہوتے ہیں۔ شاذ ہی وہ کبھی اپنی بوجھ سوجھ یا صحیح اندازے کے اخذ کرنے میں ناکامی سے دوچار ہوئے ہوں اور ایسے بھی جو اپنی شیخی، بے علمی یا گمان و گھمنڈ میں کچھ ضرورت سے زیادہ خود اعتماری اور کسر فہمی میں مبتلا ہو کے اُتاؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میرا اندازہ کچھ درست ہی نکلا کہ میرے بارے یہ بھولے بھالے کچھ زیادہ ہی خوش فہمی اور عقیدت میں ''چکروتی'' بنے ہوئے ہیں۔ میں سکھوں کی سیدھی سادی سائیکی، موڈ مزاج، موسیقی، مذاق اور مذہب مسلک کی کیمسٹری سے خوب واقف ہوں۔ یہ میرے بابا گورو نانک جی کے ''نا کیچے'' کسی بھی میرے جیسے چکر بازیے کے چکر میں بغیر گھمائے ہی گھوم جاتے ہیں جبکہ ان کو دوست یا دشمن بنانے میں کچھ زیادہ محنت درکار نہیں ہوتی۔

اچھوں بُروں کی بھی کبھی کوئی کمی نہیں ہوتی، کمی ہوتی ہے تو اُن حقیقت پسندوں اور حق آگاہوں کی جو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اچھائی اور بُرائی، نیکی اور بدی، گناہ اور ثواب یہ سب زندگی کے لازمے ہیں۔ یہ سارے زندگی کے معنی سمجھنے کے مختلف استعارے، اُلٹی سیدھی، دائیں بائیں کی کروٹیں ہیں...... یہ طلوع و غروب ہیں، یہ اندھیرے اُجالے ہی تو ہمیں بتاتے ہیں کہ یہی حیات کہیں ثبات ہے تو کہیں نفی...... حرکت، تبدل سے تعبیر ہے...... جمود و نمود ہے۔ یہی اکائیاں، صیغے، ریاضیات، الجبرے، آڑی سیدھی ڈرائنگیں، فارمولے، فلسفے، اصول قانون، ضابطے لائحے لاحقے، اشکال، وضع وضاحتیں وغیرہ...... اس کے ساتھ ساتھ یہ کالے چٹے علوم و فنون، یہ خرد و جنون، یہ عشق و مشک، یہ تر و خشک، یہ رند و زاہب، عاجز و فاخر، محرم و مجرم، یہ زندیق و زاہد، دارا و سکندر، یہ مسجد و مندر، زیر و حرم، یہ جور و کرم، زہر و تریاق، یہ ستم و ضحاک، یہ سب مشاطۂ گیتی کی بوالعجبیاں ہی تو ہیں......

ہر ذی الحس کی ایک اپنی کیمسٹری اور انرٹیکنالوجی ہوتی ہے۔ احساسات رویے، زندگی برتنے کے رنگ ڈھنگ، اچھائی بُرائی، نیکی بدی کے معیارات، رشتوں ناطوں کی پہچان اور اہمیت، کرب و بہجت کی بو خوشبو کا احساس، روزمرہ کے وظائف حیات اور معمولات، ظاہر و باطن وغیرہ اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ ہر زندہ انسان کو بنیادی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ڈھب ڈھرائے من چاہی زندگی بسر کرے۔ اگر کوئی پاؤں کی بجائے سر

کے بل چلنے اور کانوں سے سننے کی بجائے دیکھنے کی کوشش میں ہے تو کوئی دوسرا محض اس کی توجہ ہو چھنے یا اپنے تئیں جاننے کی کوشش کرے گا یا زیادہ سے زیادہ کوئی مشورہ دینے کی کوشش کرے گا مگر اُسے زبردستی کوئی روک نہیں سکتا...... یعنی گھوڑے کو کھینچ کھانچ کر دریا تک تو لے جایا جا سکتا ہے مگر کوئی اُسے پانی پینے پہ مجبور نہیں کر سکتا۔ یہ کام وہ اپنی مرضی سے ہی کرے گا...... الکہ نرش کی مایا کہیں دُھوپ کہیں چھایا......!

شری بلونت سنگھ ڈھلون اگر ایک ایسی پُراسرار خواہ مخواہ کی غلط فہمیاں اور خوف پیدا کر دینے والی زندگی بسر کرنے پہ مجبور یا مُصر ہیں یا صورتِ حال ایسی ہے کہ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تو پھر کوئی دوسرا کیا کر سکتا ہے۔ فلسفۂ سود و زیاں سے سب کو اَزبر ہوتا ہے' پڑھا لکھا ہو یا جاہلِ مطلق...... یہ تو آسٹریلیا سے بزنس مینجمنٹ میں ماسٹر کی ڈگری لے کر آیا تھا......

آئی ایسی موج کہ ساحل ڈوب گیا
ورنہ اپنی کشتی کون ڈبوتا ہے

سپیدۂ صبح' وقفۂ سحر کی سحر انگیزی سے سنگ کر آتش بداماں ہو چکا تھا...... طلوع اور غروب کے وقفے' اَرض و فلک اور مابین...... قوسِ وقزح' لرزیدہ و دَمیدہ ساعتیں' اَبر و باراں کے لہرے جھالے' آفتاب و مہتاب کی کرنوں کے کانپتے' مہ کامل اور شبِ تاب کی سحر انگیز تابانیاں...... اجرامِ فلک کی انجمن آرائیاں...... یہ سب حسین منظر' فطرت کی خوبصورتیوں' دلفریبوں' سحر انگیزیوں کے چند تحفے ہیں جو اُن خوش نصیب معین لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ لمحے اپنی محدودیت میں کیسی بڑی وسعتیں سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کمسن اور معصوم ساعتوں کو دسترس میں لے لینا' کتنا انوکھا اور خوشتر ہوتا ہے۔

میرے کچھ بچے جو بال کی کھال کھینچنے میں دلچسپی لیتے ہیں اور ثقہ قسم کے قاری' اَدب کے طالبعلم جو میری کتابوں کی ایک ایک جزویات کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پیشہ ور تنقید نگار جو میری کتابوں کی زبان و بیان' تحریر و تکلم' واقعات حالات کا اَزمنہ قدیم و جدید کے تناظر میں تنقیدی' تقابلی یا مطالعاتی جائزہ لیتے ہیں تو معترض رہتے ہیں کہ میرے مضامین و مقالات میں کوئی مسلمہ اسلوب و معیار اور سیدھ پتھ دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی آغاز اپنے منطقی انجام کو واضح نہیں کرتا۔ اک بلا کی تشنہ لبی قاری کے اعصاب پہ سوار رہتی ہے۔ عجیب شتر گاؤ قسم کا اَدب' با تخلیق کرتا ہے کہ جسے نہ تو کوئی نام دیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی الزام......!

یہ اپنے لوگ' جو بھی کہتے ہیں صحیح ہی کہتے ہیں۔ صرف میری ایک بات کا جواب دے دیں۔ دُنیا اور زندگی کیا یہی کچھ نہیں؟...... کیا اس کا کوئی اُصول اُسلوب یا سیدھ پتھ ہے؟...... اس شتر بے مہار و بے محمل کی کوئی کل سیدھی بھی ہے؟...... دُنیا تو شہد کی مکھی کی مانند کہ منہ میں شہد اور ڈنک میں زہر...... اور زندگی......

زرنج و راحت گیتی مرنجا دل مش و خرم
کہ آئیں جہاں گاہ چنیں گاہ چناں باشد

کہنے والے کہتے ہیں کہ بابا کو سکھوں میں تصوف دکھائی دیتا ہے۔ طوائفیں ہیجڑے بدمعاش چور ٹھگ جیب کترے بے علم جاہل نکمے گنہگار اور آنکھوں تک برائیوں اور بدکاریوں میں ڈوبے ہوؤں میں یہ گیانی دھیانی درویش ولی اور پہنچی ہوئی ہستیاں تلاش کرتا ہے۔

سچ ہے مجھے تالاب جوہڑ میں مسکراتے ہوئے کنول اچھے گمراہ اور منزل سے بے خبر دور مسافر بھلے لگتے ہیں...... لٹے بکھرے ٹوٹے ہوئے اداس پریشان پرندے بیمار اور تباہ حال غربت و افلاس زدہ لوگ عظیم دکھائی دیتے ہیں۔ نئی قیمتی امپورٹڈ لش پش کرتی گاڑیوں کی بجائے حادثوں کا شکار ٹوٹی پھوٹی کھنکار وکاروں کے ڈھانچے مجھے آرٹ کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔

میں نہ تو یاسیت پسند ہوں اور نہ قدامت پرست...... تنگ نظر نہ تنگ دست...... ماضی کے پچھواڑے والی کھڑکی احتیاجی ضرورت کے تحت تھوڑی سی کھولتا ہوں...... میں تو حال مست اور جہاں گشت ہوں۔ مستقبل اک بیکار کی کل کل' مفروضے ڈھکوسلے' جاہلوں احمقوں کی جنت جانب بند روزن کی جھری...... اندیشہ ہائے دور دراز خوش فہمیوں اور بدگمانیوں کی شکستہ منجنیقوں کا ملبہ...... شاید میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے بے قاعدہ "بے فضول" کچے مجہول قسم اطوار و اعمال کے لوگ محبت بھرے لگتے ہیں۔ کچھ اور ہو نہ ہو ان میں اخلاص فراواں ہوتا ہے اور اخلاص ہی شرط اول ہے بندہ ہونے کی......

راز دانے عجیبے صاحب راز عجیبے

بلونت سنگھ بھی ایسا ہی کیس تھا۔ ایسے مریض کو نفسیاتی ہرگز نہ سمجھنا چاہئے۔ نفسیاتی عارضے گھر اور باہر کے ماحول' اپنوں بیگانوں کے ناروا سلوک' سماجی رد‌یوں اور جذباتی ناہمواریوں کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ ان پہ خاطر خواہ علاج و معالجہ سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر جس نحوست کی خشک دلدل میں یہ نامحسوس سے انداز سے دھنس رہا تھا اس کا تعلق نفسیات سے اور نہ ہی کسی کالے چٹے اعلم یا بھوت پریت سے تھا۔ یہ تو نفس حیوانی کی گربھ بدیا کی کارستانی تھی۔ جو بہت کم کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔

ایک ہوتا ہے عمل الٰہی اس کے مقلد طالبعلم عامل بارگاہ صمدیت سے براہ راست فیض یاب و سرخرو ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کے تصور سے تہی...... راضی برضا ہوتے ہیں۔ آزمائش میں ثابت' توکل میں کامل' استعانت باللہ (اسماء صفات الٰہی) مخلوق خدا کی خدمت میں مگن...... اک الوہی تنویر ان کے چہروں پہ ضوفگن رہتی ہے۔ یہ ہستیاں ولی قطب غوث ابدال ہوتے ہیں۔"

## آذر اعمال کی فسوں گری......!

عمل علوی...... اس کے عالم و عامل' اللہ کریم کو تو اپنا پروردگار اور ربِ جلیل مانتے ہیں مگر اجرام و بروج فلکی' تجمیات عرشی' عالمان و عاملان ارضی کے سری علوم اور سحری بابلی و مصری سے استفادہ کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے...... طاغوتی استعانتوں اور سفلی سحر و فسوں سے اجتناب برتتے ہیں...... نقش' نوچین' تعویذ' چلے وظائف اور دیگر مجاہدات' تزکیہ نفس اور رزق ذات کی مختلف مشقیں اور اوراد ان کا وظیرہ ہوتے ہیں۔ یہ علم القرآن' علم جفر' علم قیافہ' علم رمل' دست شناسی' کلام' حساب سنی' توقیت' مرایا' طب و حکمت' کیمیا و سیمیا' اکرو اسماء' جدل و بدیع جیسے علوم سے بھی استفادہ کر لیتے ہیں...... یہ علم مباح ہے اگر اس کا مقصد سلامتی اور اثبات ہے۔

عملِ سفلی! یہ سراسر شیطانی علم ہے...... اول تا آخر روحانیت ارضی و خاکی' ذوات تحتین' اسفل السافلین کا عمل...... اسے ہی کالا علم کہتے ہیں۔ اس کے موجد و مدید شیطان الرجیم اور اس کے مقلدین ہیں۔ کالے علم کو کالی مائی کلکتہ والی سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ جو تباہی بربادی' قتل و غارت کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔ بدروحیں' بھوت پریت' نساچ' بڈاوے' چڑیلیں' مچھل پیریاں' باؤ بتاس' آسیب' سایہ بے دین جن و پری وغیرہ یہ سب اولیائے طاغوت کی استعانتیں ہیں۔

کالا علم یا علم سفلی سیکھنے یا کرنے والا سب سے پہلے اللہ برحق کی ذات کی نفی کر کے ابلیس کو اپنا استاد مددگار مانتا ہے۔ اس کے بعد وہ تمام شیطانی قوتوں پہ ایمان لا کر حرام خورد و نوش' گندگی غلاظت نا پاکی اختیار کرتا ہے۔ جتنا وہ پلید ہوگا اتنا ہی وہ سفلی عمل میں کامیاب ہوگا۔ ان کے سراپے سے انتہائی سڑی ہوئی' جلے مُردوں کی بدبو چہرے پہ خباثت' کراہت اور شیطنت دھری رہتی ہے۔ ان سے آنکھیں دو چار کرنے سے خوف طاری ہو جاتا ہے۔ ان کا آخری وقت بڑا بھیانک اور دہلا دینے والا ہوتا ہے۔ اکثر خود کو ہلاک کر لیتے ہیں یا کسی بدروح بھوت کے ہاتھوں جہنم رسید ہوتے ہیں۔ ہر طرح کے منشیات کے عادی' عادات خبیثہ کے حامل' دوسروں کی عورتوں کی عزت خراب کرنے' انہیں گمراہی کی جانب لے جانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔"

حرام جانوروں کا لہو اور گوشت' ان کی من پسند خوراک ہوتی ہے' بچھو' سانپ' کرلے' چھچھوندر' الو' کوے' گیدڑ' گوہ وغیرہ سے نہ تو انہیں گھن محسوس ہوتی ہے اور نہ خوف۔ ان کا خون' غلاظت' پر' چونچیں' دانت' آنتیں' ہڈیاں' جنتر منتر تنتر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ گندگی حیض کی غلاظت' جسم کے بال' ناخن' میل کچیل' کپڑوں

کی اُترن ناک کان کا میل ٹوٹے نکلے ہوئے دانت جوٹھا پانی خوراک عکس تصویر وغیرہ سے جادوٹونے کرتے ہیں اور اللہ کی مخلوق کے لیے رکاوٹیں پریشانیاں کھڑی کرتے ہیں۔

کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ سفلی عمل سحر کالا ایلم جادو بدنظری وغیرہ نیک پاک نمازی حاجی پہ اثر نہیں کرتے یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ آگ کسی نیک یا ایمان کامل والے کو زک نہیں پہنچاتی گنہگار بدکار کو جلاتی ہے تو یہ اس کی بے علمی ہوگی؟ آگ کی زد میں جو آئے گا وہ اُس کی مضرت سے بچ نہیں پائے گا۔ رحمانی رحمتوں کے ساتھ ساتھ شیطانی قوتیں بھی موجود ہیں ان سے انکار ممکن نہیں۔ جن بھوت بدروحیں سائے ٹونے ٹوٹکے سب اثرات رکھتے ہیں۔ نیک ہو یا بد سب ان کی زد میں آسکتے ہیں مگر جسے اللہ بچالے یا جو کوئی احتیاطی تدابیر اختیار کرلیتا ہو۔ پیر مرشد بھی ان بلّیات سے بچنے کے کچھ طریقے بتاتے ہیں۔ جیسے کوئی ہیضے زکام یا کسی وبائی اثرات سے بچنے کے لیے احتیاطی ٹیکے لگوا لیتا ہے یا دوا لے لیتا ہے۔

بلونت سیہاں ان مذکورہ بلاؤں میں سے کسی کا بھی شکار نہ تھا۔ وہ ناری کے رُوپ میں ایک ایسی چڑیل کا دیوانہ تھا جو دکھائی تو اک عام سی مہیلا دیتی تھی مگر اس کا چتّی والا سبھاؤ عام استریوں والا نہ تھا...... وہ جوبن رس چوسنے والی ایسی بلا کی مانند تھی جس کی اَمٹ پیاس کبھی نہ بجھے اور نہ اپنے پریمی کو آزاد کرے۔ آزاد کر بھی دے تو وہ اس کی چاہ میں ایسا بے بس ہو جائے کہ مقناطیس سی کشش سا کھنچا ہوا اس کے پہلو میں آپڑے......

انسان ایک ایسا معاشرتی جاندار ہے جو اکیلا رہنا پسند نہیں کرتا ہے...... خاندان کی صورت قبیلوں گروہوں میں مل جل کر رہنا اس کی فطری اور معاشرتی ضرورت ہوتی ہے۔ اَب اِس کی گروہی مجبوریاں سماجی تمدّنی ضرورتیں اور دیگر زندگی کے تقاضے اس میں مختلف تبدیلیاں اور اُتار اُو چڑھاؤ نسود وزیاں اچھائی بُرائی کے قطع نظر وہ ہر وہ قدم اُٹھانے سے گریز نہیں کرتا جو اُسے اِرتقائی منزل کی جانب اُٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح زمانے تہذیبیں قومیں اپنے اپنے تقاضوں کے تناظر میں صدیوں کے فاصلے طے کرتی ہوئیں اپنے اپنے سفر میں رواں دواں رہتی ہیں۔''

قوموں مذاہب تہذیب و تمدن جنگ و جدال عقائد و اطوار علوم فنون اَسرار و توہمات اور واقعات و عجائبات پہ نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ انسان نے اگرچہ بے شمار علمی فکری فنی سائنسی اور دیگر مختلف شعبۂ ہائے حیات میں اِرتقائی منزلیں طے کیں وہیں یہ بھی اَمرِ حقیقت کہ بہت سارے معاملات مثلاً قضا و قدر سعد و نحس اللہ و اہرمن حیات و ممات زندگی بعد از موت طلسمات و توہمات جن بھوت پریت اور بہت سے

دیگر عقائد و جبلت کی معاملت میں ہنوز از منہ سنگ و سار میں ہی ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ گو وقت کے ساتھ ساتھ اب بہت کچھ بدل کر رہ گیا ہے لیکن اب بھی کہیں کہیں کوئی ایسا چٹکارہ دیکھنے اور سننے کو مل جاتا ہے کہ ہندو متھالوجی سے وابستہ کچھ پر اسرار حقائق' حیوان ناطق اور حیوان محض کی جبلت' جنس' جنوں خیزی وجذبات پہ لرزاں و اُفتاں ہوئے بن رہا نہیں جاتا...... اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے علم تجسس' عقل وجستجو کی جس بھی معراج پہ پہنچ جائے اُس کی بُنیادی بشری بُوالعجیاں' کسی نہ کسی طور اپنا آپ ظاہر کیئے بغیر نہیں رہتیں۔''

- ہنو ناری اور وشدھر ناتھ......!

صدیوں قدیمی پُران شاستر' ہندو متھالوجی یعنی طور وطریق' دانش واُصول قانون قاعدہ' کار و کتھا سے بھرے پڑے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے پرم پریا' سنگار و سنگت" بدھ یدھ" کار کرم' بلوان و نروان' نرکھ و سورگ' مہلا منش' بھگوان بھگوت' گورو چیلا' پچھم و پورب' نرت کرت' گیت سنگیت' بن بندر' گنگا جمنا اور رام رادھا کیے بن بات نہیں بنتی۔ دیگر مذاہب کی ارضی و آسمانی کتابوں میں بھی ازل و ابد اور کائنات کی بند اور کھلی حکائتیں اور تفاصیل لکھی ہیں مگر ہندو مت کے پرانوں شاستروں میں وہ کچھ بھی' جو دوسری حاضر کتابوں میں نہیں ملتا۔ ہندو مت بہت پُرانا مت ہے۔ اس میں قدیمی بدیاؤں کے پرچار کر بہت ہوئے۔ پُرش ناری کی باہمی رفاقت اور اس فلسفہ پہ سیر حاصل مواد حاصل ہوتا ہے۔ اس موضوع پہ کئی ایک شاستر ملتے ہیں اور ان کے علاوہ اجنتا الیورا کی غاریں اور کئی ایک مندر' عجائب گھر بھی......!

جنسیات' ایک مکمل اور اہم علم ہے اور زندہ موضوع...... بے علم لوگ اسے چھیڑتے ہوئے گھبراتے شرماتے ہیں جبکہ یہ ایک 'بنیادی آگاہی ہے۔ اسے سمجھے جانے بغیر انسانی وجود' احیائے حیات' موجودات' مخلوقات' تخلیقات' نفی اثبات کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس موضوع پہ ہم اپنے ہم جنسوں سے بات کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ کتابوں رسالوں فلموں تصویروں کے علاوہ ہم پالتو اور آوارہ جانوروں پرندوں چرندوں سے بھی سیکھتے ہیں یا پھر کچھ قریبی بے تکلف دوست یاروں کی سیدھی اُلٹی باتیں حرکتیں بھی ہماری معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ غرضیکہ کہ ہم ضروری سیکھے جانے والی تعلیم' سیدھے طریقے کی بجائے اُلٹے طریقے سے حاصل کرتے ہیں' جس کا نتیجہ زیادہ تر بے راہروی کی صُورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دینی اور دُنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ مناسب اور سہل طریقہ سے اسلامی شعار اور طہارت کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بچوں کو جنس کی تعلیم بھی باہم پہنچانی چاہیے۔ تاکہ وہ غلط ہاتھوں میں پڑ کر بے راہروی نہ

اختیار کر سکیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جو بے سمجھ ماں باپ 'نام نہاد شرم' حضوری میں اپنی اولاد کی جنس کے معاملہ میں خود تربیت نہیں کرتے۔ اُن کے بچے غلط سوسائٹی میں پڑ کر جنسی بے راہروی' منشیات' آوارگی اور مختلف خرابیوں میں پڑ کر اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں۔

شرع شریعت' پاکی پلیدی' طہارت' شادی نکاح اور دیگر مسئلے مسائل' ماں باپ کو خود بتانے چاہئیں۔ یہ اللہ رسول کا حکم بھی ہے اور فرض بھی......!

بات ہو رہی تھی کہ ہندو متھالوجی میں جنس کو بڑی اہمیت حاصل رہی اور اس موضوع کو اصنام گری' شاعری' تمثیل نگاری' رقص' قصوں' کہانیوں اور دھارمک کتھاؤں میں بڑا نمایاں کیا گیا۔ بت تراشی' ہندو مت میں ایک مقدس فن کی حیثیت رکھتی ہے...... دُنیا کے بہترین بت تراشی کے شہکار جنس پہ بنے' ان شہکاروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو مت میں جنس کی کتنی اہمیت ہے۔

شری بلونت سنگھ کا قصہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ قصہ سنایا جائے میں مخصوص قسم کی چند عورتوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جو اپنے ماں باپ کے ہاں ایک ناری کا روپ لے کر پیدا تو ہوئیں مگر کہیں نہ کہیں کوئی ایسی گڑبڑ ہو جاتی ہے کہ ان کی شخصیت میں کھنڈت پڑ جاتی ہے یا جنم سے کوئی نحوست آڑے آ جاتی ہے یا کہیں ماں باپ کی طرف سے کچھ ایسی جنم گھتائیں ملیں کہ اُن کی شخصیت ہی بدل گئی یا ارض و فلک کے کچھ منفی اثرات پڑ گئے...... کسی بھوت پریت یا جانور کے قبضہ میں چلی گئیں۔ کچھ معاملے کچھ ایسے تھے کہ ان پہ مبتلا میں ویسے ہی عجیب و غریب خصلت والی ہوتی ہیں۔ کچھ اپنے تیکھے مزاج و مرضی سے اپنے لیے کوئی علیحدہ سی راہ متعین کر لیتی ہیں کہ وہ خود اپنے اور اپنے پریوار کے لیے اک عذاب مسلسل بن کر رہ جاتی ہیں۔

''کاجل کوٹھا'' میں ایسی ہی ایک لڑکی سنبل سہانی کا تفصیل سے ذکر ہے جو ''تن کوری'' تھی۔ لکھ چکا ہوں کہ تن کوری ایک ایسی خود پسند شخصیت! جس کی اپنی بنائی ہوئی ایک دُنیا ہوتی ہے اور وہ اُس میں اپنی مرضی پسند کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ کسی دوسرے کی شراکت پسند نہیں کرتی وہ حاکم بھی خود اور محکوم بھی خود ہوتی ہے۔ بے انتہا صفائی اور تنہائی پسند' خوش طبع' خود دار اور تحکمانہ طبیعت کی مالک...... جو چاہ لے یا کہہ دے وہ کر کے رہتی ہے' انکار سننا پسند نہیں کرتی۔ شادی کو اک کار فضول اور شوہر نام کی شے کو مجمع جہول سمجھتی ہے۔ ماں باپ اور دیگر لوگوں کے لیے اک عذاب پیہم...... جب تک جیتی ہے دوسروں کو جینے نہیں دیتی۔ اکثر کی موت المناک اور عبرتناک ہوتی ہے۔

اس تن کوری سے ایک جوتا آگے...... وش کنیا ہوتی ہے' یعنی زہریلی لڑکی!...... اس طور کی لڑکی کا مذکور بھی کہیں ہو چکا ہے۔ لدے وقتوں میں چھوٹی ذاتوں' ملیچھ' شودر' اچھوت' دلت' آدھیک' سپیروں اور سانسیوں

میں ایسی وش کنیا تیار کرنے کا رُجحان عام تھا۔ ان نیچ چھوٹی ذات کی عورتوں پہ جوانی ٹوٹ کر آتی ہے' ملیح رنگت' تیکھے نین نقش' انگ انگ میں کڑی کمان کی طرح ٹوٹتی ہوئی انگڑائیاں ...... اُبھرے اُبھرے پکے پھالوں کی مانند ہونٹ اور چھن چھن چھپا کے مارتی ہوئی ہنسی ...... یہ فتنہ طراز چلتے پھرتے جادو' بڑے بڑے ذی شانوں کو اپنے سر شانوں سے اُتارنے پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ جانتے ہوئے بھی کہ یہ زہر کی پڑیاں ہیں' پھر بھی انہیں حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔''

جب راجوں مہاراجوں کے دور تھے ...... راجواڑے آباد اور راوی' عیش ہی عیش لکھتا تھا ...... ان وش کنیاؤں کا دور تھا۔ یہ خانہ بدوش' بدمعاش لوگ' چھوٹی شیر خوار بچیوں کی پرورش' سانپوں کے زہر سے کرتے تھے۔ ان کے دودھ' بچھونوں کپڑوں' کھلونوں میں ایک مخصوص مقدار زہر کی آمیزش کرتے ...... حتیٰ کہ وہ کنیا بڑی ہو جاتی۔ پھر زہر کی مقدار' اس کی خوراک میں شامل کر دی جاتی۔ دھیرے دھیرے وہ لڑکی اک زہریلی ناگن کی طرح ہو جاتی۔ بھری نظر سے دیکھ لیتی تو سامنے والا مدہوش ہو جاتا ...... اُس کے انگ انگ میں بسا رچا زہر' اُسے مزید حسین بنا دیتا۔ عین عہد شباب میں' اُسے بڑی ترکیب تیاری سے کسی راجے مہاراجے کے رُوبرو کر دیا جاتا۔ اس طرح یہ وش کنیا کچھ ہی عرصہ میں اُس کی صحت زندگی چاٹ جاتی اور اس کے دھن دولت پہ اس کے لواحقین قبضہ کر لیتے۔ یہ لوگ بھی پرانے ٹھگوں کے قبیل کی طرح بڑی احتیاط' سمجھداری اور صبر سے وارداتیں کرتے تھے۔ راجپوتانہ میں' میں نے خود کئی ایک وش کنیا ئیں دیکھیں۔ ان کی سانسیں' آنکھیں' لمس ہر چیز زہر سے بھری ہوتی ہے۔''

آگے بڑھیں تو ناریوں میں ایک اور قسم'' پشو باندی'' ہوتی ہے۔ پشو باندی' ایسی کنیا ہوتی ہے جو کسی ایسی عورت کے بطن سے جنم لیتی ہے جو کسی بھی طرح کسی انسان کی بجائے کسی پشو سے حاملہ ہوگئی ہو۔ یہ لڑکی بجائے لڑکا بھی ہوسکتا ہے۔ قارئین کے لیے یہ بات ایک انکشاف ہی ہوگی۔ اس تماشا گہ دُنیا میں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے۔''

روس میں سرکس کے ایک نٹ سے اتفاقاً میرا آمنا سامنا ہوگیا۔ دُبلا پتلا' چھیل چھبیلا سا نوعمر لڑکا ...... بلا کا پُھرتیلا اور تیز طرار ...... میں اس کے جھولوں پہ جھولنے کے کرتب سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ انسان نہیں کوئی بندر ہے۔ چھلانگنے پھلانگنے میں بے خطریوں جیسے وہ جھولوں' رسیوں پہ نہ ہو ...... جنگل میں ٹہنیوں شاخوں پہ ہے۔ اُس کے جسم کی بناوٹ بھی کچھ علیحدہ سی ...... مجھے کرید ہوئی' میں جتن کر کے اُسے ملا۔ وہ انگریزی سے نابلد تھا۔ مجھے اپنی بات اُس تک پہنچانے میں بڑی دقت ہوئی۔ بالآخر ایک ذرائع سے میں اُس سے پوچھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہ سرکس کے ایک خاص قسم کے لنگور کا بچہ تھا جسے ایک ایسی عورت نے جنم دیا

تھا' جو اس لنگور کی ٹریز تھی۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کسی کے جنم کے لیے' پیٹ میں نطفہ کا ٹھہرنا کچھ ایسا ضروری نہیں ہوتا...... بہت سے واقعات اسے بھی کہ بن اختلاط بچہ ہو گیا۔ محض جسم چھونے یا قربت کی کئی ایسے قرینے بھی کہ بامراد ہوا جا سکتا ہے۔ جیسے کہیں پیغام پہنچانے کے لیے منہ کھول کر زبان چلانی پڑتی ہے اور کچھ ایسے بھی جو آنکھ کے ہلکے اشارے سے بہت کچھ کہہ لیتے ہیں۔''

میرا ایک بنگالی ہندو دوست' جو کسی زمانے میں میرے ساتھ برٹش ریلوے میں کام کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا مجھے بچے کے لیے اپنی جورو سے کسی سلوک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ محض چھو لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ درخت پودے وغیرہ تو ایک دوجے کے قریب نہیں جاتے...... دور دور سے ہی مادہ درختوں کو ثمر بار کر دیتے ہیں۔ کنجی ڈال کر تالا کھولا جاتا تھا۔ اب انگوٹھے کے لمس' نشان سے پٹ وا ہو جاتا ہے۔ یہ پہلے بھی ہو سکتا تھا اور ہوتا تھا...... مگر تب ایسی آگاہی نہ تھی۔ بات ساری آگاہی' اندر کی گواہی کی ہوتی ہے۔ ستر برس بیوی کو ٹوہتے رہتے ہیں۔ چوہیا کا ایک اندھا بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ اک اُچٹتی سی نظر' قیس نے محمل پہ ڈالی 'صحرا'' آہوانِ لیلیٰ'' سے بھر گیا۔!

ے ورد لیلیٰ بھی وُہی قیس کا پہلو بھی وُہی' نجد کے وَشت و جَبل میں رَمِ آہو بھی وُہی.....

کتوں' گھوڑوں' گائے بھینسوں میں زیادہ دلچسپی اور وقت گزارنے والوں میں اُنہی جیسی خُو خصلت اور خوشبو بدبُو پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اس پہ کنٹرول نہ کریں تو اُن کے اندر باہر بہت سی تبدیلیاں' اِن پشوؤں سے مماثل ہو جاتی ہیں۔ انسان کا بچہ کچھ عرصہ جانوروں میں رہے تو وہ جانور ہی بن جاتا ہے۔

انگریز جانوروں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ خصوصاً کتوں' بلیوں پہ تو وہ دل و جاں سے فدا ہوتے ہیں۔ کئی لوگوں نے اپنی کروڑوں لاکھوں کی جائیداد اپنے کتوں' بلیوں کے نام کر دی۔ کئی انگریز مرد و عورت اپنے پیارے کُتے کے مرنے کے بعد خودکشی کر گئے یا اُس کے غم میں فنا ہو گئے۔ میں نے کتوں' بلیوں کے قبرستان دیکھے ہیں۔ اُن کی قبروں پہ قیمتی پتھر' سرہانے کتبے...... اُن پہ لکھے قصیدے شجرے اور وفا کے کارنامے...... اکثر انگریز بیوہ' مطلقہ عورتیں اپنی تنہائی دُور کرنے کی خاطر کُتے پال لیتی ہیں۔ کُتا یقیناً ایک وفادار جانور ہے' تنہائی کا ساتھی' مونس اور غمخوار...... لیکن کُتا تو بہر حال کُتا ہی رہتا ہے' مگر میں نے کئی کُتے' شوہر سے بھی زیادہ قریب اور عزیز دیکھے ہیں۔ کئی عورتیں' خاوند کی بے وفائی کے مقابلہ میں وفادار کُتے میں وفا کے موتی تلاش کر لیتی ہیں۔ پھر وہ ایسی ''سگ پرست'' ہو جاتی ہیں کہ پھر مرد اُن کے لیے کسی لینڈی کُتے سے بھی کم درجہ کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

پشو باندیوں یا پشو باندوں کی بھی کچھ اقسام ہیں۔ ان میں اکثر حادثات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ آپ نے بھی پڑھے سنے ہوں گے کہ ایک عورت کسی بھی طرح جنگل میں بھٹک جاتی ہے۔ دُور دُور تک اُسے

کوئی اپنا ہم جنس دکھائی نہیں دیتا۔ وہ تھک ہار کہیں پڑ جاتی ہے۔ اچانک کہیں سے ریچھ اِدھر آ نکلتا ہے۔ وہ اُس کے قابو میں آ جاتی ہے۔ ریچھ اُسے کوئی ضرر پہنچائے بغیر اُٹھا کر اپنے غار میں لے آتا ہے۔ اُسے کھانے پینے کے لیے پھل پھول لا کر دیتا ہے۔ احتیاطاً اپنی کھردری زبان سے اُس کے تلوے چاٹ جاتا ہے تاکہ وہ اِدھر سے بھاگ کر کہیں جا نہ سکے۔ وقت زمانہ آگے بڑھ جاتا ہے' وہ عورت اُدھر ہی رہتی ہے۔ لباس کپڑوں سے آزاد' چاروں ہاتھ پاؤں پہ ریچھ ہی کی طرح چلتی ہے۔ غوں غوں غُرغُر کی آوازیں نکالتی ہے۔

کسی باب میں کہیں ایسی ہی ایک ڈاکٹر عورت کا ذکر ہے جو ایک ریچھ کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنا سب کچھ اُس کے سپرد کر چکی ہوتی ہے۔ ایسی عورتوں کے ہاں اگر کوئی اولاد پیدا ہوتی ہے تو وہ پشوپاندی ہوگی۔ خصلت انسان کی اور جبلت حیوان کی۔ ضروری نہیں کہ ایسی مخلوق کا باپ کوئی جانور ہی ہو' وہ انسان بھی ہو سکتا ہے مگر انہیں انسانی مخلوق کہنے میں تامل ہوتا ہے۔

اس قسم کی مخلوق کا تصور کوئی نیا نہیں ہے۔ کئی صدیوں سے ہم ایسے انسان کا ذکر سنتے آ رہے ہیں جس کا دھڑ گھوڑے اور سر انسان کا ہوتا ہے۔ اسی طرح بھیڑیا بھی جو آدھا انسان ہوتا ہے...... جل پریاں' جو اوپر عورت اور نیچے سے مچھلی کا دھڑ رکھتی ہیں...... شیر' لگڑ بگھے' گیدڑ بھی ایسے پائے گئے۔ بندر ریچھ لنگور تو ہوتے ہی آدھے آدمی ہیں...... برفانی انسان تو اکثر دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ریکارڈ پہ موجود ہے۔ ان کی حقیقی تصاویر' ہاتھ پاؤں کے پرنٹ اور بے شمار مواد مع ثبوت محفوظ ہیں۔ بہت سے شکاری' سیاح اور جہاں گشت ان کی موجودگی ثابت کر چکے ہیں۔ میں خود بھی ایسی مخلوط نسل کو دیکھ چکا ہوں۔ ازل سے ابد تک اس قسم کے واقعات ملاحظہ میں آتے رہیں گے جن پہ تعجب و حیرانگی کا اظہار ہوتا رہے گا۔ شاید اسی لیے اسے شیشۂ حیات' کارزارِ دُنیا' جہانِ رنگ و بو' جہانِ آب و گل...... حیرت کدۂ دُنیا' جائے عبرت' فسوں خانہ' طلسم کدہ' سرائے دہر' کوچۂ آذری' مجمع سامری' بازارِ مصر وغیرہ کہتے ہیں۔

اس دُنیا میں حضرتِ انسان کے علاوہ جو دیگر مخلوقات موجود ہیں اُن میں غیر مرئی مخلوق بھی شامل ہے۔ ان میں بنی جان (جنّات) سرِفہرست ہیں۔ بنی آدم اور بنی جان کا ذکر ہمیشہ ساتھ ساتھ آیا کہ ان کی بیشتر قدریں آپس میں مشترک ہیں۔ مختلف العناصر ہونے کے باوجود یہ ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی ربط و راہ رکھنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ ان کی بیشتر باہمی دلچسپیاں' مشاغل سرگرمیاں' قول قبیلے' راہ و رسمیں' عائلی علامتی طور طریقے ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ مختلف معاملات میں آپس میں مٹھ بھیڑ بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یہی باہمی اور علامتی واسطے رابطے کبھی کبھی کوئی انوکھی واردات کو بھی جنم دینے کا باعث بنتے ہیں۔

جن اور اِنس' پانی اور تیل کی طرح دو مختلف عنصر ہیں' جو آپس میں ضم نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود کچھ

تراکیب وتراجیم یوں بھی کہ ان کے قارورے باہم ایک ہوجاتے ہیں۔ آپس کے بنیادی عنصری تضادات کے باوجود ایک صف میں کھڑے بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسروں سے سیکھنے سکھانے کا عمل' دوستیاں' ملنا ملانا...... وقت پڑنے پہ ایک دوسرے کی مدد یہاں تک باہمی جذباتی' پیار و محبت' شادی بیاہ کے رشتے بھی قائم ہو جاتے ہیں۔ جن اور بشر کے درمیان ایسے تعلق' بظاہر تو ناممکن' ناقابلِ یقین دکھائی دیتے ہیں مگر ایسے ہوا اور ہوتا رہتا ہے۔ اس حیرت کدہ جہاں میں وہ کچھ بھی ممکن ہے جو بظاہر ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ انسان تو محض اپنی ناقص عقل کے بل بوتے پہ بات کرتا ہے۔ دلیل اور منطق کے تناظر میں دیکھتا' سوچتا اور فیصلہ کرتا ہے مگر یہاں بہت کچھ ماورائے عقل بھی ہوتا ہے اور یہی اسرار' علوم سِرّی و خفی کہلاتے ہیں۔

جنات کے علاوہ اس عالم صوری کی دیگر سِرّی مخلوقات' ناسوتی ابلیسی عجائب و غرائب...... علوی علوم' سیمیا' ریمیا' کیمیا اور کچھ موہوماتی' مدرکاتی' متخیلاتی استعانتیں بھی...... جو مختلف اشکال' ہیئتوں' صورتوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ عام تصرف و نظر سے ہٹ کر یہ منصۂ شہود پہ موجود ہوتی ہیں۔ چشمِ بینا والا کوئی فردِ وحید ہی انہیں شناخت کر سکتا ہے۔

سانپ' کتا' بلی' چمگادڑ' اُلو' کوا وغیرہ ایسے سروپ ہیں جو ان سِرّی مخلوقات کے اور کچھ ایسے علیحدہ سے مرد و زن اور طفل بھی جو طاغوتی وسیلوں کے لیے آسان موصل ہوتے ہیں۔

''ہنونارِی'' یا ''ہنومنچھ'' ایسے افراد ہوتے ہیں جنہیں سِرّی مخلوق اپنا وسیلہ اظہار بناتی ہیں۔ ان کی نشانی' یہ زمین پہ رینگنے اور بچھ کر چلنے والے جانور کھاتے اُن کا خون پیتے ہیں۔ شیطان اکثر اپنی سواری کے لیے اسی قسم کے جانور منتخب کرتا ہے۔ اس کی مثال' جنت میں شیطان کا سانپ کو وسیلہ بنا کر داخل ہونا ہے۔ ارضی معرکوں میں وہ زمین کے ساتھ بچھ کر رہتا ہے۔ جیسے دشمن کے ریڈار سے بچنے کی خاطر' جنگی جہاز نیچی پرواز کرتے ہیں۔ گوہ کرلے کی دُم پکڑ کر سانپ کے سر پہ سوار ہو کر یا پانی میں گھڑیال کی پیٹھ پہ سفر کرتا ہے۔'' کاہن' فسوں گر اور کالے ایلم کے عامل بھی گھڑیال کی کھال اوڑھے' مارِ سیاہ کی چابک پکڑے گوہ کرلے کی زرچی کی کلغی لگائے...... کچھوے کے کاسے میں ان جانوروں کا خون پیتے ہیں پھر مشرق سے مغرب' شمال سے جنوب تک اپنے بازو لہراتے ہوئے کسی نئے معرکے کا اعلان کرتے ہیں اور ان جانوروں سے معاونت طلب کرتے ہوئے وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ان کی سرپرستی کرتے رہیں گے۔

یہ جانور سِرّی خفی طاغوتی قوتوں کے پروردہ مخلوق ہیں۔ اَسراریت' طلسمیت' ساحریت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ خوف دہشت وحشت' ان کا نام لینے سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ ارضی استعانتیں ان

کی بھرپور اعانت کرتی ہیں۔ چھپنے، کھٹنے اور پردہ لینے کے لیے مُمدّ ثابت ہوتی ہیں جبکہ شیطانی جانور بھی ان کی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کوئی ہنوناری یا ہنومنچھ انہیں بھٹکتا ہوا ملے اور اس پہ قبضہ کریں۔ یہ رینگنے والے جانور نہ صرف اپنا رنگ روپ تبدیل کر لینے پہ قادر ہوتے ہیں بلکہ یہ ماحول اردگرد کو بھی ضرورت کے مطابق نیچے اوپر کر لیتے ہیں۔ بچھو، رونہنگ، سانپ، گوہ، کرلا آپ کے سامنے بیٹھے مگر دکھائی نہیں دیتے۔ مٹی کیچڑ ریل میں یہ بھی ویسے ہی نظر آتے ہیں کہ نظر دھوکا کھا جائے۔ یہی ان کی سرّیت اور اسرار ہوتا ہے کہ ہوا کے ساتھ ہوا، پتھر کے ساتھ پتھر...... کوئی کتنا بھی بچے، یہ دھوکا دے کر اپنا وار کر جاتے ہیں۔

جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں کو باہر کہیں سے سایہ ہو گیا ہے تو وہ بھی خنّاس ہوتے ہیں۔ عام لوگوں میں یہ ذرا کم ہی دلچسپی لیتے ہیں مگر ہنوقسم کے فرد ان کا فوری شکار بن جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ ہنوقسم کے افراد کی اپنی ایک علیحدہ ونُو ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا سایہ اور آواز کی لہریں بھی ان کی شناخت ہوتی ہیں۔ یہ سوئے ہوں یا جاگے، جو ان کی رینج میں آ جائے یہ چوکنے ہو کر اپنا وار کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ پہلے شکار کو اپنی آنکھوں کی سرّیت یعنی مقناطیسی قوت سے نیم بیہوش کرتے ہیں۔ جب شکار بے بس ہو جاتا ہے تو پھر اپنے حساب سے اس کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کسی کو نقصان پہنچا کہ انھیں کیا ملتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بچھو کسی کو ڈنک مار کر کیا حاصل کرتا ہے؟ آسمانی بجلی، زمین پہ کسی درخت یا انسان پہ گر کر کتنے ثواب کی مستحق ہو جاتی ہے؟ زہر کسی کو ہلاک کر کے کون سا کار تریاقی کرتا ہے؟ اچھائی برائی، گناہ نیکی، سعد ونحس...... ہماری اپنی بشری بصیرت، عقل اور مادی سود وزیاں کی تکڑی تول کے باٹ اور اکائیاں ہیں۔ کائنات اور فطرت کے اصولوں طریقوں اور پانسوں کے باٹ اور رتی ماشوں سرسائیوں کی سائنس کچھ اور ہے۔

زندگی ایک راستے سے آنے کا نام ہی نہیں، دوسری راہ سے جانے کا نام بھی ہے۔ سرخ خون کے ساتھ نیلے خون کی رگ...... ناریل کے بھورے سخت کھوپڑے میں نرم ملائم میٹھا سفید سفید گودا...... آم آرزو آلوچے آلو بخارے کی باہری نرمیاں مٹھاس، ذائقے اور اندر کی گٹھلیاں گٹھلیاں...... گلاب کے ساتھ کانٹا...... چندن سے لپٹا ہوا سانپ...... زندگی کے سنگ یہ سب رنگ بھی ہوتے ہیں......

تین بہنوں میں آخری نمبر پہ صاحب کور کی جیون جوت، تو چندی کے پہلے منگروار، جب سیارہ مریخ، برج حوت میں گھسا بیٹھا تھا، جگی تھی۔ اس میں اُس کا تو کوئی دوش نہ تھا۔ اس سے سنسار میں اور بھی کئی بچے پیدا ہوئے تھے۔ مگر یہ اکیلی ہی تھی جو سے کی ریکھا کے مطابق ہنوناری ہوئی اور اس کے ماتھے پہ دونوں ابروؤں

کے بیچ ''سنگل میڈھ'' کا گچھا تھا۔ جو بالوں کی میڈھی کی طرح آپس میں گندھا ہوا صاف دکھائی دیتا ہے۔ ہزاروں میں کوئی ایک ایسی جبلّت کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایسی پیدائشیں ہوتی رہتی ہیں' کیوں؟...... یہ بھی قدرت کے رازوں میں کوئی راز ہے۔

صاحب کور کے باپوٗ اُس زمانہ میں اُوٹی میں فارسٹ آفیسر تھے۔ ایماندار' محنتی' فرض شناس اور اپنے سِکھ دھرم پہ جان قربان کرنے والے' اُوٹی کے بڑے گورو دوارے کے سرپنچ بھی تھے۔ ان کی پتنی نریندر کور ایک ایسی مذہبی' سُگھڑ سادہ سی عورت تھی جو اپنا سب کچھ' اپنے دھرم پتی اور پریوار کو ہی سمجھتی ہیں اور اپنا جیون ان کی سیوا میں اَنت کر دیتی ہیں۔ دو پتریوں کے جنم کے بعد ان پتی پتنی کو پتر کی خواہش ہوئی۔ منّت مانگی بڑے گورو صاحب بیٹا دیں تو اس کا نام صاحب سنگھ رکھیں گے۔ ''بڑے صاحب جی'' کی کوئی حکمت' بیٹے کے ساتھ بیٹی بھی پیدا ہوئی۔ اس چمتکار پہ دونوں بہت راضی ہوئے۔ خوب خوشیاں منائی گئیں...... دونوں جڑواں بہن بھائی کے نام کے ساتھ ''صاحب'' لگا دیا گیا۔

''بڑے صاحب'' کی یہ بھی کوئی مصلحت ہوگی کہ یہ دونوں بہن بھائی جو بمشکل ایک برس کے ہوئے ہوں گے کہ ایک رات جنگل والے سرکاری بنگلے میں مچھر دانی کے اندر سوئے ہوئے تھے۔ صبح دیکھا تو لڑکا مرا ہوا تھا اور لڑکی ایک کالے ناگ کو پکڑے کھیل رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر ماتا پتا کی تو جان نکل گئی۔ لوگ باگ اکٹھے ہو گئے۔ گورو دوارے کے گیانی جی بھی پہنچ گئے۔ ہزار جتن کیئے مگر نہ صاحب کور سانپ کو چھوڑ رہی تھی اور نہ سانپ وہاں سے ٹل رہا تھا۔ لگتا تھا دونوں آپس میں ہنسی خوشی کھیل رہے ہیں۔ کسی نہ کسی طور مردہ صاحب سنگھ کو وہاں سے نکالا گیا۔ سارا سر نیلا پڑ چکا تھا۔ لگتا تھا کہ اس موذی ناگ کے زہر سے اس کا کام تمام ہوا ہے۔

اسی جنگل میں ایک بوڑھا سپیرا بھی رہتا تھا۔ اُسے بلایا گیا کہ کسی طرح اس ناگ سے صاحب کور کی خلاصی کرائی جائے۔ بوڑھے سپیرے نے جب ناگ کے درشن کیئے تو وہ سجدے میں گر گیا اور پتا نہیں کیا کیا بذیان بکنے لگا؟ بمشکل اُس نے زبان کھولی' یہ شیش ناگ تو ناگ دیوتا کا رُوپ ہے۔ اس کی ہتھیلی کا ترشول دیکھیں! اس کے تو درشن کسی بھاگوان کو ہی ہوتے ہیں۔ اس کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا' یہ لڑکی بھی دیوی ہے۔ اسے ناگ دیوتا نے سویکار کر لیا ہے۔ اب یہ ان کی رکھشا میں ہی رہے گی۔ جو کوئی انہیں علیحدہ کرنے کی چِتا کرے گا گھاٹے میں رہے گا۔ ناگ دیوتا نے اس کے بھائی کو بھی اس لیے ڈس لیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ اس برداشت نہیں کر سکا۔ اسی طرح کی بذیان بکتا ہوا' معذرت کرتے ہوئے وہ جان چھڑا کر بھاگ گیا۔ اِک تماشا لگا ہوا تھا جس نے سنا وہ بھاگا چلا آیا۔ ناگ اور بچی' آپس میں مگن...... کبھی وہ اُسے بے تکلفی سے پکڑ لیتی اور کبھی وہ اس کے گرد لپٹ جاتا اور منہ ماتھے پہ زبان پھیرنے لگتا۔ لوگوں میں کسی میں جرأت نہ تھی کوئی

قریب جائے یا ناگ کو پکڑنے کی کوشش کرے۔ ایسا سیاہ پنکھے جیسا پھن...... خوفناک دوشاخہ سیاہ زبان اور لمبائی موٹائی...... ایسا کسی نے دیکھا نہ سنا......!

بچّی کے ماتا پتا کی عقل سمجھ مفلوج ہو چکی تھی۔ غراؤوں سے مانگا ہوا صاحب سنگھ مرا ہوا ساتھ پلنگ پہ پڑا تھا۔ نیلی رنگت جیسے کسی نے اُسے گہرے نیل کے ماٹ سے ڈبکی دے کر باہر نکالا ہو؟ ادھر صاحب کور جیسے اپنے کسی من پسند کھیل میں مگن ہو...... وہ کیا جانتی کہ کیسا خطرناک سیاہ ناگ اُس کے ڈر پہ ہے اور شاید ناگ جی کو بھی یہ ادراک نہ تھا کہ وہ کیسی خوفناک چنگاری سے کھیل رہا ہے کہ جسے ہلکی سی ہوا دے دی جائے تو جلا کر ایسا بھسم کردے کہ راکھ تک نہ اُڑے......!

بے خبری بھی کیسی نعمت ہے، مالکِ حکمت و مصلحت اگر بے خبری اور نسیان سی نعمتیں تخلیق نہ فرماتا تو اس ناصبور و ناقص شعور بندے کا جو حشر ہوتا وہ ارضی وسماوی سب دیکھتے۔

## ● اَنت مایا کی کایا، جس کا کسی نے بھید نہ پایا......!

بنوناری یا بنومنچھ میں آکاش و پاتال کے رَدّ و کرِ اکھشش سادھی جمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ زمین سے پیٹ لگا کر اور فضا میں تیر کی طرح ہدف تک پہنچنے والے جناور اور پکھیروں کے پَر پھڑ پھڑے اس کے بھیتر بولتے ہیں۔ پاؤں پڑے پڑے رہنے سے ان کی مکتی ٹھہرتی ہے۔ شیش، پدم اور گردھر ناگ تو ایسی بنومہلا کے نرش کے آگے خود بین بجاتے ہیں۔ اس کالے بینڈے ناگ کے لیے مقامِ شکر تھا کہ یہ ابھی ٹھنڈی سی چنگاری تھی، بھڑک کر شعلہ نہ ہوئی...... ورنہ صاحب سنگھ کی جگہ یہ نیل کنٹھ دھرا ہوتا......!

یہ شیش ناگ، شمبھوناتھی پنتھ کے اُس ناگ، مچھن دھوت کا چہیتا چیلا تھا جسے ناگوں کے مہاراج شمبھوناتھ نے اپنے ایک حکم کے انکار پہ اپنے پنتھ سے دھتکار ہوئے شراپ دی...... کہ ''تیری نسل سری رام چندر جی کی اُس آشیرباد کو پھل نہ کر پائے گی جو انہوں نے شمبھوناتھ پنتھیوں کو دی تھی۔'' مزید کہا کہ تیری پنتھ لمبا جیون لے گی اور یہ بھی کہ اِن کا اَنت بھلے پہ نہ ہوگا...... چکوری کی پیچ پیچ چلتی رہے گی۔

سری رام چندر، لچھمن اور سیتا جی کے بن باس سمے، اُدھر کے بن باسیوں نے اس پریوار کو کسی پل بھی اکیلا نہ چھوڑا نہ اُداس ہونے دیا تھا۔

چودہ برس کا بن باس کوئی ایسا سوکھا کارم نہ تھا۔ بن باسیوں نے اپنے تن من سے ان نردوش معصوموں کی سیوا سنبھل اور منورنجن کی خاطر بڑے جتن کیے۔ جنگل کا کوئی خزندہ، پرندہ چرندہ درندہ، یہاں تک

کہ کوئی پتا بوٹا' درخت پودا' پھل پھول' کونپل ڈھونگل' کلی پھلی' یوں نہ تھی جو اس پریوار کی جی جان میں کھبی ہوئی نہ ہو۔ خاص طور پہ بندر (ہنومان) ہاتھی (گنیش) سانپ (ناگ) گائے (گاؤ) شیر (باگھ) ناریل (بلوہ پھل) شریفہ (سیتا پھل) صندل (چندن) گنا (گیندا) کی (کنول) کیلا' کیلا اس کے پتے' گھاس (کپو) چاول (دھان) دودھ چھاچھ' تل تلسی' مہوا مکھن' لوگی پھول وغیرہ' کیا نہ تھا جو ان کے لیے نہ تھا۔

ان سب جناور پنچھ میں' شیش ناگ اور اس کے بعد بندر (مرکٹ) مجازاً ہنومان جی تھے۔ جو ہر سمے ان کے بازوؤں اور چرنوں میں رہتے اور سیس نوائے' پران چھوڑ دیتے مگر ان کی بھگتی ساودھی میں ساتھ نہ چھوڑتے تھے۔ پشے ہو یا پرش' پرندخرند' سبھی اپنی جبلت و فطرت کے منڈل میں پرکٹ ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھیں یہ اپنی جبلت و فطرت کے برعکس بھی...... ! لیکن ایسا کہیں خاص حالات و معاملات میں ہی ہوتا ہے۔ ورنہ یہ سب دیگر مخلوقات کی مانند اپنی گی بندھی فطرت و جبلی اَت کی راہ پہ ہوتے ہیں۔

سانپ ایک سیریت سے بھرا پیشہ نفشتر اور اَنتر جال "وِش ناتھ" ہے۔ فطری طور پہ منچھ سے خوف کھاتا ہے...... قریب نہیں آتا۔ اس کا شروع اور آخیر' کاٹنا اور بھاگنا ہوتا ہے...... ناراض ہو تب بھی اور خوب راضی ہو جب بھی...... اظہار ممنونیت بھی ڈس کر کرتا ہے۔

کالے اعلم کا عامل' تب تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ تمام عالم نورانی کی نفی نہیں کرتا۔ خدا رسول قرآن اور انسانیت سے منحرف نہیں ہوتا اور ابلیس رجیم اور اس کی تمام طفیلی طاغوتی فیملی کے روبرو سرنہیں جھکاتا۔ جادوگر' سفلی علوم والے عامل بابے' جن آسیب نکالنے والے کریہہ صورت وسیرت والے عامل...... مستقبل کا حال بتانے والے' فال نکالنے' ہاتھ کی لکیریں' ستاروں کی چالیں دیکھنے والے دونمبر نجومی پامسٹ' زائچے کھینچنے اور استخارے کرنے والے نام نہاد صوفی' پیرزادے اور شاہ جی...... عیسائی بنگالی اور خاندانی عامل و کامل اکثر جعلی ہوتے ہیں۔ عقل کے اندھوں سے مال بٹورنے اور اُن کا ایمان یقین خراب کرنے والے...... ! ایسے جعلی سپیرے بھی' جو چند لاغر بے ضرر سے سانپ' پٹاریوں اور بوتلوں میں دکھا کر' جھوٹی سچی اَسرار بھری کہانیاں قصے بنا کر آخر میں طاقت کی گولیاں فروخت کرتے ہیں۔ یہ پرلے درجہ کے مجرمانہ ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ سانپوں کی اَلف بائے سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ سانپ محض تماشا بین ٹائپ کے "وسیلے" ٹھر کیے لوگ جمع کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ پٹاریوں میں بند' فاقہ مست' بے سکت و سم...... زندگی سے بیزار سانپ نما کیڑے بڑے مظلوم ہوتے ہیں۔ جو کوئی لڑھک جاتا ہے وہ سرکہ بوتل میں بند ہو جاتا ہے۔ کمبخت کے نین لوچن' جیون تیاگنے کے بعد بھی کھلے ہی رہتے ہیں۔ پتا نہیں وہ بعد مرنے کے کس کی راہ دیکھ رہا ہوتا ہے......؟

صاحب کو، مزید سے بتانے کے بعد اچھی خاصی سیانی ہو چکی تھی۔ بچیوں بالیوں والے سب کھیل کھلاڑے اس میں موجود تھے۔ گڑیوں پٹولوں سے نہ صرف کھیلتی بلکہ اُنھیں خود بناتی بھی تھی۔ ننھے ننھے ہاتھوں سے کپڑے کی پھٹی پرانی لیروں اور پرانی رُوئی سے ایسی خوبصورت گڑیاں بناتی کہ دیکھنے والے عش عش کر اُٹھتے......بس ایک ہی عجیب بات ہوتی کہ گڈے گڈی کا چہرہ گردن سر آنکھیں زبان' کسی بھی طور انسانی نہ ہوتیں......یعنی دھڑ انسان سے مشابہ اور منہ ماتھا سانپ کا...... اگر اس کی وجہ پوچھ بیٹھو تو گول گول آنکھیں گاڑے مقابل کو زچ کر دیتی مگر کوئی جواب نہ دیتی...... ہاں' کبھی کبھی انکار میں سر ہلا دیتی کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔

ماتا پتا تو گوروکی اِس "مہر" پہ صبر شکر کا پرشاد چھک کر نچنت ہو چکے تھے۔ کیسا بھی دُکھ دلدر ہو نرش اُسے کسی نہ کسی ڈھنگ' بھوگ ہی لیتا ہے کہ مالک نے اُسے بسارنے اور برداشت کرنے کی شکتی بھی اُتم دی ہوتی ہے۔ نے کا رَواں دھارا بڑے بڑے نوکیلے پتھروں کو ملائم اور ہموار کر دیتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی نامساعد حالات اور زندگی کے اجنبی رَدیوں سے راہ ورسم پیدا کر ہی لیتا ہے۔ زندگی کا کڑا بوجھ' کمزور کاندھوں پہ اُٹھائے چلتے رہنے پہ مجبور انسان' کہیں پل دو پل دَم سادھنے کی خاطر بیٹھ رُک بھی تو نہیں سکتا کہ بڑھتے چلتے رہنے کا نام ہی تو زندگی ہے۔

تکشت نامی' یہ شیش ناگ اُس گوت سے تھا جس نے رِشی مہاراج شورنگی کی شرپ سے کام دھاری راجہ پریکشت کو ڈسا تھا۔ یہ موذی و شدھر' باسک بادشاہ شانپ بھی کہلاتا تھا۔ اس سانپ کی ایک خاص پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے منہ میں زبان والے سوراخ کے دائیں بائیں اک انوکھے چمکار والے دو دانت باہر نکلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاتھی کے دانتوں کی طرح' ان تیز تیز اور نوکیلے دانتوں سے باسک ناگ' مقابل کو ڈسنے اور خوفزدہ کرنے کے علاوہ ایک اور کام بھی لیتا ہے جو کسی اور چمکاری سانپ کے بس کی بات نہیں...... عام زہریلے سانپوں کے نوکیلے دانت منہ کے اندر' جبڑے کی گدیوں میں دبے پڑے ہوتے ہیں اور محض ڈسنے کے وقت باہر نکلتے ہیں۔ اپنا کام کرنے کے بعد واپس اپنی جگہ گھس جاتے ہیں۔ جیسے بلی اپنے پنجوں سے ناخنوں کو حملہ کرتے وقت باہر نکالتی ہے۔

تکشت' سانپ عام چوہے انڈے یا دودھ پینے والا سانپ نہیں' یہ اُوتاروں' مجکشوں' رشیوں اور جگتوں فقیروں کی گردنوں باہنوں اور چرنوں میں پڑا رہنے والا ناگ ہے جسے ہمیشہ دیویوں دیوتاؤں' مہان پرشوں کی آشیرواد حاصل رہی ہے۔ کہا گیا یہ وہی پسلیوں کے بل رینگنے' نرم چمکیلے اور بے پناہ سکڑنے پھیلنے اور اپنی ہیئت وضع بدلنے پہ قدرت رکھنے والا سریع الحرکت اور تیزی الفطرت کیڑا ہے جسے شیطان نے اپنا آلہ کار بنا کر جنت میں اماں حوا تک رسائی حاصل کر کے بہکایا تھا۔ یہ بھی کہ تب یہ پاؤں رکھتا تھا بعد اِس کے پاؤں اور

کان' سزا کے طور کاٹ دیے گئے کہ اس نے پاؤں اور کانوں کا غلط استعمال کیا تھا۔ اس کی زبان درمیان سے چیر کر دولخت کر دی گئی......"

اس کے منہ کی غدودوں سے سنہری روشنی پھیلانے والا مادہ نکال کر نیلی اور پیلی رنگت والا زہر ملا ہل بھر دیا گیا۔ آسمانوں کی وسعتوں سے گرا کر' اسے بھربھری' کھردری' بدبودار تاریک و تنگ بلوں' سوراخوں' سنگلاخ گھاٹیوں' جنگلاتی کچھلکوں' برساتی دلدلوں اور بے آب و گیاہ صحراؤں میں لڑھکا دیا گیا...... کہ جاؤ ویرانوں' قبرستانوں' جنگلوں بیابانوں' کھیتوں کھلیانوں' کھنڈروں کھدروں' مندروں میں اپنے لیے بقا اور حیا تلاش کرو...... کہیں تمہیں نوچا جائے اور کہیں تمہیں گھسیٹا جائے...... گھسٹ گھسٹ' لڑھک لڑھک بھاگنا' تمہارا مقدر ٹھہرا...... خوف دہشت' سرسراہٹ کلبلاہٹ تمہارا وطیرہ...... بھوک پیاس' انجا کی سستی بے حسی' کاہلی کمزوری...... خموشی تمہاری اوقات اور سریت تمہاری ذات......!

سریت' طاغوتی طاقتوں کی پروردہ اور پرلے درجے کی ابلیسیت کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ ابہام' اس کے پیٹ سے جنم لیتا ہے اور ابہام' ابر نہیں ہوتا ہے جو حقیقت میں برستا ہے وہ تو ابر کا سایہ ہوتا ہے اک سراب اور رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ٹھوں ٹھپ کرتا ہوا ایک ایسا ہیولا' جو کسی انگ اپنی شناخت بنانے سے قاصر ہوتا ہے......

دیومالائی واقعات' قصوں کہانیوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ مَن گھڑت' پُراسرار' سُنی سُنائی سچی جھوٹی کتھاؤں نے جہاں سانپ کے وجود سے اَن گنت اَسرار پیدا کر لیے وہیں ایک مافوق الحیات و فطرت جنس کا درجہ دینے میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی۔

سامنے کے روشن' نیم روشن مذاہب کے علاوہ بجھے ہوئے' حنوط زدہ' پیرینہ متروک جتنے بھی ادیان مذاہب' کہیں ہیں یا کہیں تھے' سب کے ہاں "حضرتِ سانپ" کسی نہ کسی طور موجود دکھائی دیتے ہیں...... کہیں گردن بازوؤں سے لپٹا...... کہیں سر کے تاج پہ براجمان...... کہیں تختِ سنگھاسن' سر پہ رکھے' کہیں جنت میں ہے تو کہیں اپنے سر پہ دھرتی اُٹھائے ہوئے ہے۔ فرعون کے دربار میں اور غارِ ثور میں بھی موجود...... دیکھو تو محوِ خواب گوپالے کی حفاظت کر رہا ہے اور کہیں مقامِ سجدہ پہ اَلف کھڑا' سید عبدالقادر جیلانیؒ کی نماز میں کھنڈت بھی ڈال رہا ہے...... کب قارون کے خزانے کی پہرہ داری اور تب گوگے پیر کے ڈیرے کے چوکیداری اور غلامی......!

گوگا کو ملے والا' انسانوں کا تو نہیں البتہ سانپوں کا پیر ضرور تھا۔ قدرت نے اسے کچھ ایسی صلاحیت اور سری علم بخشا ہوا تھا کہ پوری سانپوں کی قوم اس کی مطیع تھی...... عقیدت اور جانثاری کا یہ حال کہ اس کے

راستے اور اُٹھنے بیٹھنے کی جگہوں پہ پھن پھیلے پڑے رہتے۔ گوگا پیر ان کی گردنوں پہ سے جوتوں سمیت گزر جاتا۔ جن اور سانپ چونکہ سرِیت میں اک دوجے کے اُلٹے سیدھے ہیں اس لیے شوریدگی شر پسندی شرارت ان کے خمیر میں پڑی ہوتی ہے۔ معتوب سانپوں سے وہ اپنی کھری چارپائی بان کی مانند بُنتا...... صبح اُٹھتے ہی تیز سی چھری سے سانپوں کا بنا ہوا بان کاٹ دیتا۔ اس طرح سیکڑوں شریر سانپ ہر روز تلف کر کے وہ انسانوں کو ان کے ضرر سے محفوظ بھی رکھتا اور سانپوں کو سزا بھی دیتا۔ اس بُری طرح اپنی نسل کشی دیکھ کر بھی کوئی سانپ گوگے پیر کے رُوبرو کسی سرتابی کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ زہریلے سے زہریلے سانپ کا زہر گوگے پیر کے لیے اکسیر تریاق کا اثر رکھتا تھا۔ اُس کے کھانے پینے یہاں تک کہ حقّہ تمبا کو نسوار میں بھی زہر ہلاہل موجود ہوتا مگر بھی اُس کے لیے حیات آمیز اُمرت کا درجہ رکھتا تھا۔''

اس کائنات دُنیا زندگی کے کھیل میں کچھ بھی تو حرفِ آخر نہیں...... حتمی اُصول و اسلوب واضح طور و طریق یا کوئی ضابطہ کلیہ فلسفہ و منطق ایسا موجود نہیں جو اپنی جگہ پہ اٹل جامع و جامد ہو قدرت فطرت وقت...... اپنے انداز فیصلے فلسفے حتمی اُصول و اسلوب طور طریقے تلخ کھیلے قاعدے قرینے نتیجے خود ہی اتھل پتھل کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ زہر ہلاہل کبھی تریاق اور نار کبھی گلزار نہ بنتی...... ولیوں کے گھر بھوت اور پیغمبروں کے ہاں نافرمان جنم نہ لیتے...... خدائی کا دعویٰ کرنے والوں کے ہاں کفر کا قلع قمع کرنے والے پرورش نہ پاتے اور نہ ہی کسی بُت تراش کے زیرِ عاطفت بُت شکن پروان چڑھتے......؟

میڈیکل سائنس نے ثابت کر دیا کہ مار سیاہ کا زہر قاتل کم اور حیات بخش زیادہ ہے۔ ہم نے اُس کے زہر کے منفی کردار پہ نظر رکھی اس کے مثبت پہلو پہ کبھی غور ہی نہیں کیا...... اسی طرح سیلابوں زلزلوں لگاتار بارشوں آندھیوں طوفانوں آتش فشانیوں قحطوں وباؤں اور دیگر ناگہانیوں حادثوں میں پنہاں حکمت وسیع افادیت و سلامتی پہ ہمیں تدبر کرنے کے بہت کم مواقع نصیب ہوتے ہیں۔

ہلکے سے فکر و تدبر سے ہم پہ منکشف ہوتا ہے کہ اس کارزارِ ہستی میں جو کچھ ہے مالکِ کُل کا اُمرِ مشیت ہے اور جو باقی ہے وہ تسلیم و تعمیل ہے...... زندگی بندگی کے جو وضع اُصول قانون اور ضابطے قاعدے ہیں وہ انسان اور معاشرہ کے درمیان آسانیوں سلامتیوں اور فراوانیوں کے رابطہ پل ہیں اور پل کی تعریف یُوں ہے کہ وہ پانیوں کی رَوانیوں میں کوئی خلل پیدا کیے بغیر راہ رَواں اور آر پار کے رابطے بحال رکھتا ہے۔ پر کبھی کہیں یہ کام پل کو خارج البحث کر کے بھی انجام دیے جا سکتے ہیں یا خود بخود ہو جاتے ہیں۔

سو اس جہانِ ہست و بُود نحس و نمود زیاں و سُود ہوش و غنود رند و زہد خفیف و شہود آسود و نا آسود نصرانی و یہود مسلم و ہنود مظہر و مفقود میں کچھ بھی تو اوّل و آخر نہیں سوائے مالک و معبود کے......! ہر لحظہ ہر

پل ہر لمحہ' عرش و فرش' دُنیا میں کائناتیں اپنے رُخ زاویئے' انداز اُصول بدلتی رہتی ہیں۔ جو اندر ہوتا ہے اگلی ساعت باہر نکل پڑا ہوتا ہے۔ نرم' سخت...... کافر' مسلمان...... چور' قطب اور شاہ' گدا میں بدل جاتا ہے۔ میرے جیسا بے علم و عمل' دانشور' صوفی اور اُدیب کہلاتا ہے اور رُشدی جیسا پڑھا لکھا نامور مصنف و مدبر معتوب و زندیق ہو کر اپنی جان بچاتا پھرتا ہے۔ کہیں مونا لیزا جیسی بے نام و نمود دیہاتی تصوراتی لڑکی' کی مبہم مُسکان' نسوانی حُسن و جمال' آرٹ کا فقید المثال نمونہ بن کر شہرت کی بلندیوں کو چھوتی ہے اور کدھر زندہ تابندہ رعنائی و جمال کا پُروقار پیکر' پیرس کی ایک غار نما سڑک کے ایک تنگ ستون سے ٹکرا کر' سنگدلانہ سفا کی اور اِنسانی ہمیت کی ایک ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ نظر اُٹھا کر دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔''

کسی بھی اَنہونی کو دیکھ چونکیں نہیں اور نہ کبھی یہ بولیں کہ ''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا'' اِس رنگ بدلتی دُنیا اور تغیر سے تعبیر اِس کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے' دکھائی دیتا ہے وہ عین اِس کا حصّہ' پروگرام میں شامل' اپنے ہونے میں کامل ہوتا ہے۔'' مولا کریم کے اِس خاص بخشے ہوئے اِدراک کے صدقے حالات اور واقعات کیسے بھی گھمبیر' سمجھ میں نہ آنے والے' حیرتناک خوفناک' جیسے بھی ہوں اللہ کے کرم سے میرے اُوسان خطا نہیں ہوتے مَیں بڑے سکون تحمل اور موقع کے مطابق سُوجھ سے کام لے کر کوئی نہ کوئی سلامتی کا حل نکال لیتا ہوں۔

میرے بابا جی نے اِن مواقع پہ اپنے آپ کو سلامت رکھنے کا طریقہ سمجھایا تھا۔ نیت دُرست کر کے بسم اللہ شریف' لاحول ولاقوۃ' تیسرا کلمہ اور وزود ابراہیمی کا پانچ بار وِرد کر کے کھڑے کھڑے گھوم کر اپنے گرد حصار کھینچ لو...... ہمیشہ ناک کی سیدھ دیکھو پیچھے نہ مڑو...... شیاطین اور شر شرار بلیات سے بچاؤ رہتا ہے۔''

چندی گڑھ واپس چلتے ہیں...... کالا کتا جس کی چمکیلی چشم' صبح صادق کے نیم ملگجے میں ابریشم سیاہ کی مانند جھلکے مار رہی تھی...... پھر کہیں سے نکل کر میرے آگے آ گیا تھا۔ کتے کی جبلت میں شامل ہے کہ جب وہ کسی خاص مشن پہ ہوتا ہے تو اِس میں اضطراری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نوکِ دُم سے لے کر ناک کی پھنگ تک وہ مثلِ سیماب بنا ہوتا ہے۔ اِس کی تمام بیرونی اندرونی عام اور خاص حسیں متحرک ہو جاتی ہیں۔ اِس وقت بھی اُس کی یہی حالت تھی کہ وہ پھوں پھوں کرتا ہوا کبھی آگے کبھی میرے پیچھے چکر کاٹ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہُوا وہ مجھے دھکیل کر کسی خاص راہ پہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مَیں نے ایک خاصا عرصہ کچھ مخصوص جانوروں کو سمجھنے' اُن کی سائیکی کے مطالعہ مشاہدہ میں صرف کیا۔ حیوانِ مُطلق چونکہ ''کمیذ الرحمان'' ہوتے ہیں اِس لیے ایک کھلی کتاب کی طرح اُن کو پڑھا جا سکتا ہے۔ کتا' گھوڑا' بلی اور دیگر چوپایوں کے علاوہ کچھ پرندوں اور آبی مخلوق جو اِنسان دوست کہلاتے ہیں' کوئی اگر

چاہے تو ان کی حیوانی جبلت اور مخصوص تشرفات و تصرفات کے ماورائی پہلوؤں سے علمی استفادہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ علم الحیوانات' اپنی حیثیت میں ایک دلچسپ اور گمبھیر علم ہے۔ علم الانسان کے بین بین اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے...... دور دراز' پہاڑوں جنگلوں صحراؤں سمندروں' جزیروں غاروں کے باسیوں کی حیات و بقا' اسی علم کی مرہون منت ہوتی ہے۔ انسانیت اور حیوانیت' ایک دوسرے سے یوں باہم پیوست ہوتی ہے کہ علیحدگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

انسانی اور حیوانی تاریخ بتاتی ہے کہ ان دونوں مخلوقات نے ایک دوسرے کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں...... وفاداری' احسان کیشی اور ذمہ داری نبھانے کی خاطر' ایسے ایسے کارنامہ ہائے انجام دیے کہ دیکھنے پڑھنے والے عش عش کر اٹھے۔ میدان جنگ میں ہاتھیوں گھوڑوں' کتوں کبوتروں' ابابیلوں' یہاں تک کہ مکھیوں مچھروں مکڑیوں نے بھی ایسے ایسے کام کیے جو علم و دانش اور طاقت و جرأت کے دعویدار انسان بھی نہ کر سکے۔ جنگلوں بیابانوں' برف زاروں میں بھٹکنے والوں' جھیلوں دریاؤں سمندروں میں ڈوبنے...... تہ زمین' کانوں تودوں میں دفن ہونے والوں اور آگ' بادوباراں طوفانوں میں پھنسنے والوں کو کتوں نے اپنی جانوں پہ کھیل کر بچایا...... گھوڑوں نے میدان کارزار سے اپنے زخمی نیم مردہ سواروں کو بڑی جرأت و ذمہ داری سے نکال کر ان کی جان بچائی...... بلیوں بازوں کبوتروں' شہد کی مکھیوں نے جنگوں کے نقشے بدل ڈالے۔ مکڑیوں کوؤں اور مرغابیوں نے بھٹکے ہوؤں کو راستے پہ ڈالا۔ ان کے گوشت' خون' پروں' چونچ ہڈیوں اور فضلے پیشاب وغیرہ بہت سے انسانی جسمانی عارضوں میں بطور دوا استعمال ہوتے ہیں۔ دودھ تو شفا ہی شفا ہے۔''

یہ بھی درست کہ یہ سب چیزیں سفلی علوم و وظائف میں بھی استعمال ہوتی ہیں...... استعمال تو استعمال ٹھہرا' جو جس ارادے سے کرے ویسے ہی نتائج حاصل کر لیتا ہے۔ باورچی خانے کی چھری سے پیاز کاٹ لو یا کسی کا پیٹ پھاڑ دو...... چولہے کی آگ سے کھانا پکا لو یا گھر کی بہو جلا ڈالو...... دیے بتی کی معصوم لو' کٹیا کے اندھیرے کو دور بھی کر سکتی ہے اور اسے راکھ کے ڈھیر میں بھی بدل سکتی ہے۔ بات نیت ارادے کی ہے...... مرغ بادنما کی چونچ ادھر ہی ہوتی ہے جدھر ہوا کی کھونٹ ہوتی ہے۔''

کیسا بھی ماڈرن جدید ٹیکنالوجی کا حامل...... صدیوں کے تجربے والا کپتان...... ہزاروں قیمتی جانوں سے لبالب' سمندری جہاز جب کسی ساحل پہ لنگر انداز ہونا چاہتا ہے تو اسے ایک مقامی رہبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ چھوٹے سے رہبر ٹگ (کشتی) میں زیادہ سے زیادہ دو تین تجربہ کار ملاح ہوتے ہیں جو دیوہیکل جہازوں کے کھلے سمندر سے' ان کی محفوظ مخصوص جیٹی تک پہنچنے میں رہبری کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اتنے بڑے جہاز کا ذی شان کپتان! اب ایک معمولی سے بیمار انجن کے حامل ٹگ کے پیچھے پیچھے کسی فرمانبردار چیلے کی مانند سر

نیبوڑے' انتہائی عجز و رجز سے چلا آ رہا ہوتا ہے...... وقفہ وقفہ سے اُس کے کلیجے سے نکلتی ہوئی بے بسی کی چیخیں' ساحل کے مقامی پرندوں اور کارندوں کو اپنی آمد کی شناختی سیٹیوں کی صورت سنائی دیتی ہیں۔ ساحل پہ اُس کا مستقر دکھاتے ہی وہ ننگ' اُغل بُغل کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ قدرت کا نظام ہے کہ وقت اور ضرورت کی بساط پہ استعمال شدہ مہرہ' میدان سے ہٹ جاتا ہے اور دوسروں کو اپنی چال چلنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

میرے نگ' یعنی رہبر کُتے نے مجھے میرے ''مقامِ مقصود'' پہ لا کھڑا کر دیا تھا۔ مالک و خالق جب کسی کے لیے ہدایت سلامتی کا فیصلہ فرماتا ہے تو اپنی مخلوق میں جسے چاہے رہبری کی صلاحیتیں عطا کر کے آگے کر دیتا ہے۔ نبی پیغمبروں رسولوں پہ ہی کیا موقوف' وہ جب چاہے غلاموں' بے علموں' بے توقیروں' مہروماہ' اجرام' چرندوں پرندوں' حیوانوں' حجرات' شجرات' ہوا پانی آگ' حتیٰ کہ ریت کے ذرّوں' سمندر کی مچھلیوں' مچھروں' مکڑیوں' چیونٹیوں' دیمک کو بھی رہبری کی توفیق تفویض کر دیتا ہے۔''

## ● اُف تیرے حُسنِ جہاں سُوز کی پُرسوز کشش......!

میرے رُوبرو گھنے جھاڑوں پیڑوں کے حصار میں ایک خوبصورت سا ہٹ' نیم ملگجے سے ماحول میں موجود تھا۔ کونے کے ایک کمرے میں دریچے سے ہلکی سی روشنی باہر چھنتی ہوئی دکھائی دے رہی...... ایسی دُودھیا سی ٹھنڈی روشنی جو خواب گاہوں میں رات کے سمے خوابیدہ سی رہتی ہے۔ صُبحدم مست خرامی کرنے والی پُروائی پودوں جھاڑوں شاخساروں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ عجب سی بھجت' تیز تازگی اور بھجت' ماحول کو اپنی باہنوں میں لیے ہوئے تھی...... طلوع سے کچھ پہلے کا یہ سماں' بڑا پُرفسوں اور پُراسرار بھی ہوتا ہے۔ یہ وہی سرمدی سا سماں ہوتا ہے جب کونپلوں میں کلیوں کی کلپنا جاگتی ہے اور کلیاں' مسکرا کر گُل اندام ہوتی ہیں۔ گھونسلوں میں پرندے کسمساتے ہیں...... ندیوں دریاؤں کے کنارے' انگڑائیاں توڑ کر نیند کے ہچکولوں سے باہر نکلتے ہیں۔ نہائے دھوئے سورج کی لجاتی شرماتی کرنیں' لیٹے دیئے اپنے رُخ پر سے آنچل سرکاتی ہیں اور دھرتی پہ دھری روئیدگی بڑے شبنمی انداز سے مسکراتی ہے......

کُتے کی بے صوت ہَف ہَف نے مجھے ایک پیغام دیا جس کے خاموش جواب میں' مَیں اُدھر ہلکے روشن دریچے کی جانب بڑھ لیا...... اچانک میری نظر باڑھ اور ہٹ کی دیوار پہ آویزاں وارننگ کی تختیوں پہ پڑی...... نیم اندھیرے کے باوجود' گورمکھی' ہندی اور انگریزی میں جلی لکھا ہوا پڑھا جا سکتا تھا۔

''اس رہائش گاہ اور گردونواح کی حفاظت' الیکٹرک ہائی وولٹیج کی ننگی تاروں' تربیت یافتہ خونخوار کتوں'

مستعد نگہ داروں کی ذمہ داری میں ہے۔ کسی بھی غیر متعلقہ فرد کی ادھر نقل و حرکت سختی سے منع ہے۔ اس وارننگ کو نظر انداز کرنے والا اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہوگا۔ خبردار کر دیا گیا ہے۔"

اس وارننگ کی تختی پہ دو ہڈیوں اور کھوپڑی والا مخصوص خطرے کا نشان بھی تھا۔

ظاہر ہے میں کسی اضافی احتیاط کو خاطر میں لائے بغیر بلا خوف و خطر' بازجیس اور بیرونی روکاوٹیں پھلانگتا ہُوا' اندر کھڑکیوں' دروازے تک چلا آیا تھا۔ کوئی الارم بجا نہ کوئی خطرے کی نشاندہی کرنے والی فلڈ لائٹ روشن ہوئی۔ نہ کسی خفیہ ہائی وولٹیج تار یا کانٹے دار باڑھ نے مجھے اپنا تعارف کرایا؟...... خونخوار حفاظت کرنے والا کتا تو تھا ہی میرے ساتھ ساتھ...... بلکہ وہی میرا گائیڈ تھا' ادھر تک پہنچانے میں میرے آگے آگے...... اب دو ہی باتیں تھیں یا تو تمام کا تمام سسٹم بوگس تھا یا پھر کوئی طاقت تھی جو مجھے بہر طور ادھر پہنچانا چاہتی تھی۔"

مَیں اُن کاموں میں کچھ زیادہ سوچ بچار کرنے کا عادی نہیں جو میری عقل سمجھ کے کھانچے میں فٹ نہ بیٹھتے ہوں...... مغز ماری کرنی فضول ہوتی ہے۔ دیر بدیر وہ خود ہی ہر چیز سمجھ میں آ جاتی ہے۔

کُتا میری ٹانگوں سے جُڑا کھڑا تھا' یوں دُم اور دُم دبائے جیسے ہم دونوں زندگی اور موت کے دہانے پہ کھڑے ہوں یا شرلک ہومز طرح کے کسی معرکے میں وہ معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ ہو۔

کہتے ہیں چور' فقیر' سانپ اور عاشق کو زمین آگ پانی اور ہوا بھی وقت راستہ موقع اور پردہ فراہم کر دیتے ہیں۔ پر میرا تو ان چاروں تھوک سے کسی ایک سے بھی کوئی واسطہ تعلق نہ تھا...... لیکن کچھ نہ کچھ تو ایسا تھا جو مجھ پہ عیاں نہ تھا۔؟

اندر کھڑکی کے آگے دبیز پردہ...... جس کے آر پار کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اِدھر اُدھر جھانکنے کے باوجود جب کوئی جھری روزن دکھائی نہ دیا تو کتے نے ہلکا سا ہونکا بھر کر متوجہ کرتے ہوئے بغلی کھڑکی کی جانب بڑھنے کا اذن دیا۔ ادھر ایک کونے سے جھانکا تو نگاہوں کو ایسا جھانکا لگا کہ پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ گو میں ہر اَنہونی اور ہُونی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ادھر پہنچا تھا مگر میں ایک بشر بھی تو تھا اور بشر چاہے کیسی بھی علمی عقلی دُنیاوی یا روحانی ارتقائی منزلیں طے کر لے' اُس کے بشری فطری تقاضے قدریں اور حدود حجاب اُس کے ساتھ ساتھ ہی رہتے ہیں۔ انہی کی بدولت وہ زندگی کی تنی تار پہ' جس کے نیچے بربادی کی گہری کھائیاں ہوتی ہیں کچھ تو ازن قائم رکھ کر قدرے بچ بچاؤ کر پاتا ہے۔

اگلے لمحوں میں' مَیں اپنے تحیر کو رومال کی طرح تہہ کر کے تحمّل کی جیب میں رکھ چکا تھا۔ عجیب سا زاویہ تھا...... دکھائی بھی دے رہا ہے اور نہیں بھی...... قیمتی بستر پہ ریشمی چادریں گاؤ تکیے کے بیچ ایک قیامت کی

قامت دوشیزہ زُلفوں کی گھٹائیں بکھیرے ہاتھ کے پیالے میں مکھن سے مُکھڑے کا پیڑا رکھے خواب مست ہے...... گدرے رسیلے ہونٹوں کی اَدھ کھُلی قاشیں یُوں وا ہیں جیسے کسی اناڑی نے کُند بوسے کی چھُری سے پکے ہوئے آڑو پہ گھاؤ لگا دیا ہو مگر بیچ کی سخت کُھردری گٹھلی نے دونیم ہونے سے بچا لیا ہو۔

اللہ کریم کی توفیق سے مَیں اپنی نظریں واپس کھینچنے میں کامیاب ہُوا ورنہ بشر نے تو اپنا کام ڈال دیا تھا۔ نظریں ہٹا کر مَیں اپنی حس جمال کی مرمت میں مصروف تھا کہ بیچے گُٹے نے پھر کسمسانا اور ہُفی ہُفی شروع کر دیا جس کا ترجمہ تھا کہ مخصوص سمے بیتا جا رہا ہے۔ ہاں ویسے تو ہر کام کے لیے اِک وقت مخصوص ہوتا ہے...... اگر وقت بیت جائے اور وہ کام رہ جائے تو پھر بے وقت اُس کا کرنا یا نہ کرنا برابر ہو کے رہ جاتا ہے۔

ایسے کام جن کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ عملِ نورانیہ یا عملِ اَراضیہ، افلاکیہ یا علویہ سے ہُوا اپنے سمعد سمے پہ سرانجام پانے سے ہی مکمل ہوتے ہیں۔ خاص طور پہ ایسے کام، جن کا تعلق کسی اَندرجال یا مایا کرشمہ سے ہو اُس کے پرکٹ کے لیے سمے کا پراپت اَوش ہونا ٹھہرتا ہے۔ اِس سمے کو پٹے نکشتر کہتے ہیں...... عمل کے دوران اگر اِس کی گرہ ہاتھ سے چھُوٹ جائے تو ساری محنت اکارت ہو جاتی ہے۔"

چند اُچکتے سے لمحوں کے بعد جب اُدھر دیکھا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا...... یاقوتی حُسن و جمال والی دوشیزہ نے میرے رُخ کروٹ لے لی تھی۔ یہیں اچانک میری نظر ایک بڑے سے کالے سانپ پہ پڑی جو اُس کی بغل کے ساتھ جُڑا لیٹا...... اپنا بڑا سا پھن پھیلائے، پستان پہ مُنہ دیے پڑا تھا۔ سانپ کی گردن کے سکڑنے پھیلنے سے خُوب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اِس کا دودھ چُسک رہا ہے۔ سوئی ہوئی یا غنودگی کے عالم میں اُس کے چہرے پہ اِک سکون آمیز طمانیت کی چاندنی چِٹکی ہوئی تھی۔ جیسے وہ دُنیا مافیہا سے بے نیاز، کیف و انبساط کے کسی چمنستان میں معصوم سی مسکراہٹوں کی تتلیوں کے پیچھے لپک رہی ہو۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ سرکتا ہوا، پلنگ سے اُترنے کی خاطر پائنتی کی جانب لپکا...... یہی وہی سمے تھا جسے مَیں کھونا نہیں چاہتا تھا...... شاید گُٹے نے بھی میرے ارادے کو بھانپ لیا تھا...... زبان نکالے کان کھڑے کیئے چند لمحے کچھ کَن سُن لیتا رہا پھر اچانک دُم میری ٹانگوں سے مَس کرتا ہوا تیزی سے پچھواڑے کی طرف چل پڑا۔ اُدھر پیچھے ایک کمرا نظر آیا جو شاید کچن یا غسل خانہ تھا۔ وہ اُس کی بغلی دیوار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جیسے کسی کے اِنتظار میں ہو۔ مجھے اندازہ ہو گیا اِدھر ہی سانپ کے آنے جانے کا راستہ ہے...... سامنے کھڑکی کی بغل میں ایک خاصا بڑا گول سوراخ دکھائی دیا جس میں پانی کے پائپ کا گزر تھا۔ گُٹا بڑی مستعدی سے یُوں کھڑا تھا جیسے وہ کسی بھی صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہو۔ مَیں نے خود کو ذہنی اور جسمانی طور پہ کسی ناگہانیت سے نبرد آزمائی کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔"

قارئین کو یاد ہو گا یہ وہی تن کوری لڑکی تھی جو محکمہ جنگلات کے ایک افسر کے گھر پیدا ہوئی تھی اور یہ سوگندھ شیش ناگ بھی ڈہی' جو اُس کے جنم نے سے ہی اُس کے ساتھ منگرانت اور اپنی بس کا یا کا کڑا اس پہ ڈال چکا تھا۔ جس بالک کی ریڑھ کی ہڈی کے آخری مُہرے پہ جنومان کی دُم پیدائشی طور پہ ہوتی ہے وہ بالک' سانپوں کا سپوران ہوتا ہے۔ سانپ اس کی مخصوص مہک سے اسے ڈھونڈھ لیتے ہیں اور پھر بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس گھنتا کا اُپائے کسی عام سپیرے یا سادھو سنت کے پاس نہیں بلکہ کسی خاص گنی منی کے ہاں ہوتا ہے۔ اس دور میں نہ تو ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں اور نہ ہی ایسے گنی منی منش!...... خدا کی خاص عنایت ہوئی کہ اس سے میں اپنے منڈل' پنج تنی حصار میں تھا یعنی نیت کا درست کرنا' بسم اللہ شریف' تعوذ' تیسرا کلمہ اور درود ابراہیمی پانچ بار پڑھ کر' کھڑے کھڑے گھومتے ہوئے اپنے جسم پہ پھونکتے جاؤ...... مڑ کر نہ دیکھو' کسی اجنبی آواز پہ دھیان نہ دو...... جادو' شر شرار بلّیات شیاطین کا وار کارگر نہیں ہوتا۔ (قارئین یاد رہے کہ اپنے مرشد' بابا کی اجازت حاصل کیئے بغیر کوئی عمل نہ کرنا چاہیے...... نقصان ہوتا ہے)

میں نے اپنے سیاہ چندن کاٹھ کے عصا' جس کی نچلی کھونٹھ میں گوروچند کی زود رکھی ہوئی تھی۔ (کپولا گائے کے پتے میں گہرے نیلے رنگ کا خون کا جما ہوا لوتھڑا۔ جو جادوئی' شیطانی عمل کے سدِّباب اور توڑ میں کام آتا ہے۔ کپولا گائے یعنی آٹھ دانتوں والی گیا' ہر کپولا گائے میں گوروچند نہیں ہوتا۔ گوروچند والی کالی شیا اور نیلے لوچن والی' لیکن چاروں کُھر اور ماتھا سفید ہوتا ہے اور نہ ہی وہ باسی سڑا اُبھسا یا میلا کھاتی ہے۔''

سوراخ کے سامنے کھڑے ہمیں کچھ دیر ہو چکی تھی۔ میرے اور گنتے کے حساب سے سانپ کو اب تک باہر نکل آنا چاہیے تھا کہ صبح کا اُجالا پوری طرح پھوٹنے سے پہلے اُسے بہر طور اپنی بابنی میں واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ سانپ عام ہو یا کوئی خاص' اُس کی فطرت میں شامل ہے کہ جب وہ کسی کو ڈس لے یا پیٹ پوری طرح بھر لے تو اُس کی حالت ایک شرابی کی سی ہو جاتی ہے جو نشے کی ترنگ میں پُور' کہیں پڑ کر بے خودی کی کیفیت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ سانپ کی یہ حالت خاصی دلچسپ ہوتی ہے۔ نڈھال سا وہ جان بچاتا پھرتا ہے...... اس کی پہلی کوشش ہوتی ہے وہ کسی طور اپنی بابنی میں پہنچ پائے۔ دور ہو تو کسی محفوظ بل سوراخ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔

اللہ کریم خالق و مالک نے اپنی کتاب قرآن مجید میں دس عدد حشرات الارض کا ذکر بھی فرمایا ہے جن میں سانپ' کتا' مکھی' جوں' چیونٹی بھی شامل ہیں' یہ حشرات الارض بے پناہ ماورائی قوتِ شامہ کے حامل ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی بقا کا دارومدار ہی سونگھنے اور محسوس کرنے یعنی حسِ لامسہ پہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ان کی قوتِ لامسہ کے غیر معمولی مظاہر دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات

ہے اس معاملہ میں ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔

ننھی سی جان' چیونٹی مکھیوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی بھی کونے کھدرے میں کچھ بھی کھانے پینے والی چیز' کسی بھی مقدار میں ہو وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ یہی حال چوہوں' کوّوں کا بھی ہے مگر اس سونگھنے' جانچنے جاننے' تلاش' کھوج نکالنے اور غیر مرئی موجودات کو محسوس کرنے کے معاملہ میں کتے سے آگے اور کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے دُنیا میں انسان کے نزدیک اس سے زیادہ قابلِ اعتماد' کارآمد وفادار' انسان دوست اور کوئی جانور نہیں دیتا۔ بلیاں' طوطے' چڑیاں' خرگوش' کبوتر' بٹیر' تیتر سب آرائشی اور بے ضرر جانور ہیں جن کا نہ کوئی فائدہ نہ نقصان...... گھوڑا گدھا البتہ کام کے جانور ہیں۔

سانپ' تحت الارض کا وسیک' زمین کی اُوپر والی سطح' اس کے لیے ایسے ہی ہے جیسے زمین کے اُوپر رہنے والوں کے لیے زمین کے نیچے کی غاریں' دلدلیں یا جھیلیں سمندر دریا ہیں۔ یہ عموماً زمین کے نیچے بلوں غاروں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اُوپر وہ انتہائی ضرورت' بھوک' گرمی یا پھر سیلاب میں دکھائی دیتا ہے کہ سیلابی پانی اُس کے بلوں میں گھس کر اُسے باہر نکلنے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ زمین کے اُوپر' اس کے لیے محفوظ اور پسندیدہ جگہیں ویرانے' کھنڈر' قبریں' پرانی عمارتیں' گھنے جنگل' چھتنار درخت اور ایسی جگہیں جہاں انسان اور دیگر جانوروں کی آمد و رفت نہ ہو۔ زمین کے اُوپر کا ہر جانور' بشمول انسان اور فضاء میں اُڑنے والا ہر پرندہ' اس کا اَزلی دُشمن ہے۔ دیکھتے ہی اسے مارنے پہ تل جاتے ہیں۔ بس' خدا واسطے کا بیر...... انسان تو اس سے فطری طور پہ گھن اور خوف کھاتا ہے مگر سانپ' خود انسان سے حد درجہ گھبراتا ہے۔ وہ انسان کو دیکھتے ہی طرح دے کر اِدھر اُدھر چھپنے بھاگنے کی کرتا ہے جبکہ انسان' اسے دیکھ کر مارنے کی کوشش میں ہوتا ہے اور جب یہ محسوس کر لیتا ہے کہ مجھے اب چھوڑا نہ جائے گا تو تنگ آمد بجنگ آمد کے تحت مقابلہ پہ اُتر آتا ہے اور پھر جو جیت جائے! یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کبھی مقابلہ میں دونوں فریق کھیت رہتے ہیں۔

انسان کے علاوہ مور' کتا' نیولا' بندر' چیل' باز' شکرا' پہاڑی بکرا (مارخور)' اُلّو' لومڑی' گیدڑ' لگڑ بگھا اور خار پشت اس کے تھوڑے فرق کے ساتھ سخت دُشمن ہیں۔ آمنا سامنا ہونے پہ کاٹنے دار مقابلہ ہوتا ہے عموماً سانپ مارا جاتا ہے۔ شیر' چیتا' بلّی' بارہ سنگھا بھی موڈ میں ہوں تو اس سے پنگا لے لیتے ہیں۔ دراصل سانپ کی حرکتیں' چال چلیہ اور حسب و حساب ہی ایسا ہے کہ خواہ مخواہ اس سے دو دو ہاتھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس سے قریب ترین جانور بندر ہے' سانپ میں تجسس ہے' بندر میں تفنن' دونوں ہی انسانوں میں تماشا بنتے ہیں۔ قبر میں پاؤں ڈالے بڈھا' قبرستان جا رہا ہوگا مگر کہیں راستے میں پٹاری کھولے کوئی مداری قلندر' بندر کو

سسرال بھیجتا دکھائی دے جائے تو تماشا دیکھنے کی خاطر وہ بھی کھڑا ہو جائے گا۔

میں اور کتا بھی ادھر دو دو ہاتھ کرنے کی خاطر تیار کھڑے تھے مگر تماشا نہیں ہو رہا تھا۔ اغلب یہی تھا کہ شیش ناگ نے آدم بو اور سگ بو سونگھ لی تھی' اُسے سمجھ لگ گئی تھی کہ سوراخ کے باہر' آدم اپنی جنت سے بے دخلی کا بدلہ لینے اور سگِ سیاہ' اپنے مالک کی وفاداری جتانے کی خاطر نبرد آزمائی کے لیے سراپا انتظار کھڑے ہیں۔''

شیش ناگ کے لیے اب وقت بے حد تنگ تھا کہ سورج دیوتا کسی سے بھی روشن دریچے سے جھانکنے والے تھے جبکہ اس سانپ کا پیشہ' نقشہ' رات کا اندھیرا یا ملگجا سا ہے! ...... اندھیرا نہ اُجالا ...... کہ تمام سفلی' طاغوتی ابلیسی استعانتیں' ظلمت میں ہی متحمل ہوتی ہیں ...... اُجالے' روشنیاں اُن کے لیے زہر قاتل ثابت ہوتے ہیں۔ مدھم تاروں کی ٹمٹماتیں ضیا باریاں' چاندنی چھنی چھنی چاندنی' قدرے برداشت ہو تو مگر سورج کی' سینے میں سوراخ کرتی ہوئی سیدھی کرنیں تو سفلی سانپوں' خون آشاموں' بھیڑیوں کالی' مایا کرشمہ' عجائب وغرائب چھلاوں کے لیے تو زہر نگند ھا ہوتی ہیں۔

میں شیش ناگ کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا ...... مگر وہ تھا کہ درشن ہی نہیں دے رہا تھا ......

یہ بھی خدشہ' کہیں اندر ہی نہ چھپ گیا ہو یا کوئی اور راستہ تلاش نہ کر لیا ہو؟ ...... مگر نہیں' اگر ایسا کچھ ہوتا تو یہ کتا اِدھر تاک اور ناکا لگائے ہوئے نہ ہوتا۔ اس کا مسلسل سوراخ کی جانب نظریں جمائے رہنا اس اَمر کی غمازی تھا کہ وہ خبیث' بُو بک' یہیں سوراخ کے پیچھے گو مگوں کی حالت میں دُبکا پڑا سوچ رہا ہے کہ آج ان دو ٹانگوں اور چار ٹانگوں والے کتوں سے کیسے جان بچائے ......؟

دُودھ' اللہ کریم وجمیل کی ایک کمال نفیس ولطیف نعمت ہے۔ اس کا ذائقہ شیرینی' رنگ اور تاثیر لاجواب' ہر جاندار کی ابتداء سے لے کر آخر تک اُس کی ضرورت! غرضیکہ دیکھا اور سوچا جائے تو اللہ مہربان کی واحدیت' مالک وخالق اور رازق ورحیم ہونے پہ محض دُودھ کی دلیل ہی کافی ہے۔ جاندار کے پیٹ میں اس کی پیداوار بھی کسی معجزے سے کم نہیں ...... مالکِ حکمت ومصلحت نے اسے پیٹ کے دیگر عفونت زدہ فضلات کے درمیان مُصفا ومفرح جاری فرمایا۔ تمام مَمالیہ جاندار بشمول انسان' اپنے شیر خوار بچوں کو دُودھ پلا کر اک گونا تسکین وتشفی محسوس کرتے ہیں۔ تمام مَمالیے' امین ہوتے ہیں۔ حقدار' وارث کو اُس کی امانت لوٹانا ...... باعثِ مسرت ہی نہیں اللہ کریم کی خوشنودی خیر وبرکت کے حصول کا ذریعہ بھی ہے۔ میرے نزدیک دُنیا کی صرف ایک تصویر حقیقی اور فطری ہوتی ہے اُس کی خوبصورتی پاکیزگی' کسی فنکار کی فنی مہارت' چابکدستی یا رنگ آمیزی کا شہکار نہیں بلکہ قدرت کی جمالیت اور صناعیت کی مظہر بھی ہوتی ہے' وہ ہے ماں کی چھاتی سے دُودھ

چسکتا' مسکراتا ہمکتا ہوا نوزائیدہ بچہ!...... اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ دُنیا کی بوالعجبیاں' بوالقلمونیاں' تقاضے یا فروعات ہیں۔"

بات دُودھ کے دُودھ اور پانی کے پانی کی ہو رہی تھی۔ جانوروں کا دُودھ تو اُن کے بچّوں کی پرورش کے لیے ہوتا ہے مگر زیادہ تر ان کے بچّوں کی بجائے اِنسان پی جاتے ہیں شاید یہ دُرست بھی ہے کہ دُودھ بچّے کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

دُودھ کسی بھی مویشی کا ہو ذائقے' پتلے گاڑھے اور رنگ کے ہلکے سے فرق کے باوجود خوش مزہ' قوت بخش اور زُود ہضم ہوتا ہے۔ یہ ایک مکمل رقیق غذا اور جسمانی کمزوری کی دَوا بھی ہے۔ چھوٹے بچّوں اور بڑے بوڑھوں کے لیے نعمت اور خدائے بلند و برتر کے خاص انعامات میں سے شامل ہے۔ جس طرح اَدویۂ مفرد و مرکبات کے اجزائے بنیادی اور ترکیبی کی تصریح و تشخیص ضروری نہیں ہوتی کہ اس میں طب و حکمت کے اَسرار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح دُودھ' کسی بھی ممالیے کا ہو صرف اپنے خواص و اثرات کی بنا پہ اَفضل ہوتا ہے چاہے وہ کسی نجس یا ایسے جانور کا ہی کیوں نہ ہو جو ہمارے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ حلال اور انسان دوست جانوروں کا دُودھ تو اکثر استعمال میں رہتا ہے اور آسانی سے دستیاب بھی ہوتا ہے مگر اکثر غیر دوست جانوروں کا گوشت گوبر رال پیشاب' یہاں تک کہ سینگ دانت خون بال پوست و استخوان اور دیگر اعضا' خاص طور پہ دل' پتہ' جگر' تِلّی' کلیجہ وغیرہ مختلف ظاہری پوشیدہ عوارض میں اَکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔ حکیم حاذق' سیانے لوگ بڑی احتیاط اور گہری رازداری سے ان چیزوں سے علاج کرتے ہیں کہ مریض کو اپنی دَوا کے بارے کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اگر کسی طرح اُسے خبر لگ جائے کہ وہ کیا کھا رہا ہے تو مرنا تو پسند کر لے گا مگر وہ دَوا نہ لے گا۔ اسی کا نام حکمت ہے کہ مسیحا کے ہاتھ' زہر ہلاہل بھی کار تریاقی کر جائے...... مکروہ' حرام و حلال کا تصور اپنی جگہ مگر حکمت و مطلب' جراحت و جو نجل' کُشت و کُشتۂ بھسم و بھنگ میں کوئی زیر و زبر' پیش و مد شد کام نہیں آتے۔ حکیم اجمل خان کا ایک واقعہ پہلے بھی کہیں نقل کر چکا ہوں۔ قندِ مکرر کے طور پھر دہرا رہا ہوں۔

ہمارے قریب زمانہ کے طبیب کامل' حکیم حاذق ...... حکیم اجمل خان مرحوم و مغفور اپنے دَور کے نہ صرف یگانہ روزگار طبیب' بلکہ ایک درویش صفت' صاحب نظر انسان بھی تھے۔ دُکھی انسانیت کی خدمت میں ہمہ اوقات مصروف رہتے۔ اُن کے ہاتھوں میں ہی نہیں نگاہوں میں بھی شفا تھی۔ مطلب میں داخل ہونے والے مریض کا مرض' تشخیص کیے بغیر' محض اک دیکھنے سے ہی جان جاتے تھے' لیکن اتمام حجت کے طور باقاعدہ تشخیص بھی فرماتے ...... وہ مریض کی ستر فیصد بیماری' اُس سے بات چیت کے دَوران ہی رفع کر دیا کرتے تھے۔ جو آتا فیض یاب اور شفایاب ہو کر لوٹتا ...... اُن کے ہاتھوں اور باتوں میں خدائی شفا تھی ...... کہیں

بات کام کرتی تو کدھر حکمت کا گھاٹ ...... خواص و عام میں بے حد مقبول!...... وقت بے وقت مریضوں کے علاوہ اُن کے چاہنے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور حکمت و خدمت' سخاوت و ضیافت کا لنگر بھی چلتا رہتا۔

راجوں مہاراجوں کا دور دورہ تھا...... عیش و عشرت' دولتمندی و اقبال مندی' تن آسانی و بہجت رسانی والے مشاغل و طور طریق' اُمراء اور عوام کے روز مرہ تھے...... راوی عیش ہی عیش لکھتا تھا۔

ایک آسودہ سے راجواڑے کا ولیعہد' اک نامعلوم بیماری میں مبتلا ہو کر' حد درجہ لاغر و بے حال ہوا تو باپ راجہ' جو اپنی دولت و صولت کی وجہ سے پورے ہندوستان میں ایک خاص مقام رکھتا تھا...... اپنے معتمد خاص کے ہمراہ' اُسے علاج کے لیے حکیم صاحب کے پاس بھیجا کہ اس دور میں حکیم صاحب سے بہتر' تجربہ کار اور نام والا اور کوئی حکیم موجود نہ تھا۔ راجے مہاراجے اور بڑے لوگ' نہ صرف ان پہ کھلا اعتماد کرتے بلکہ انھیں اپنے ملک کا ایک قیمتی اثاثہ بھی سمجھتے ہوئے بڑی عزت و توقیر کرتے...... کہنے کا مقصد یہ کہ حکیم اجمل خان' محض ایک مستند طبیب ہی نہیں انسانیت' شرافت' نجابت اور مسلم تہذیب و تمدن کا ایک نمونہ بھی تھے۔''

مریض ولیعہد' جو پندرہ سولہ' بن کا ایک خوبرو نوجوان تھا بڑے ریاستی تام جھام کے ساتھ' حکیم صاحب کے مطب میں حاضر ہوا...... شاہی چوبدار' کارندے آگے پیچھے' ہٹو بچو! ادھر پہلے سے موجود خستہ حال مریض اپنی پریشانیاں بھول کر ریاست کے ولیعہد کی شان شوکت دیکھنے میں کھو گئے۔ قطار' انتظار میں بیٹھے ہوؤں کو تتر بتر کر دیا کہ حاکم اور محکوموں میں کچھ تو امتیاز روا ہوتا ہے...... مگر حکیم صاحب کو ریاست کے کارندوں کی یہ حرکت ناگوار گزری...... قدرے درشتی سے حکم دیا کہ مریض کے علاوہ کوئی بھی متعلقہ فرد' ادھر موجود نہ رہے۔ پورے دو عشروں بعد' مریض کو یہاں سے لے جاویں۔ مجاز عہدیدار نے بہتیرا واویلہ مچایا کہ ریاست کا ولیعہد ہے کوئی عام فرد نہیں...... علاج کے دوران' ان کے عملہ کا حاضری میں رہنا اشد ضروری ہے اور شاہی حکم بھی یہی ہے۔ ادھر حکیم اجمل خان' اپنی ذات میں اسم با مسمّیٰ!...... ''الف لام میم'' کا اپنے نام میں تشرف لیے ہوئے۔ اپنے زمانہ کے طبیب حاذق' مسیحا' عصر' دستِ شفائی' انگشت مینائی...... اُن پہ کون اپنا حکم اور بات رکھ سکتا تھا۔ فوراً راجہ صاحب کو اطلاع کی گئی...... اُدھر سے جواب ملا۔ جو حکیم صاحب کا حکم ہے' من و عن بجا لایا جائے......!

خلقِ خدا اور چشم فلک نے دیکھا...... نازوں پلا' شہزادہ' اُسی قطار میں بمشکل بیٹھا تھا جدھر کئی بیمار لاچار مریض' اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب' شہزادہ کا عارضہ تو پہلی نظر میں ہی جان چکے تھے اور طریقہ علاج کا تعین بھی ہو چکا تھا۔ بس' حسبِ معمول کا اہتمام نجت رہتا تھا۔ باری آنے پہ معمول کے چند ایک

سوالات ہوئے' بالکل یُونہی جیسے طبیب اور مریض کے مابین ہوتے ہیں۔ طبیب کامل ہو تو اُس کے لیے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ کسی شاہ کی نبض پہ اُنگلیاں لگائے بیٹھا ہے یا کسی گدا کی...... انتہائی عُجلت سے مریض کی تشخیص ہوئی' علاج تجویز کر کے شفاخانے کے مخصوص مریض خانہ میں داخل کر دیا گیا۔

کھردے فرش پہ سرکنڈوں کی چھال کی کھُردری چٹائی...... بانس کی گرہ کا گلاس' جو دھ پور کی جھتی رتیلی مٹی کی نائد...... کھٹل کاٹھ کی کھڑاویں' کچا چُونا بھرا تکیہ اور ویسا ہی بچھونا کہ جس پہ جلو پا بچھو تک نہ پڑے۔ صبح کالے جوار' کالی سرسوں کی جڑ کا جوشاندہ' دوپہر پاؤ بھر بھنا ماس' سوتے سے سوکھے ڈوڈھوں کی خشخش کا خاگینہ...... ایک بجنگ کا لاکلوار سونا گبھرو دار' مقرر ٹھہرا' جو ہمہ وقت اس کی نگرانی کرتا اور خاص طور پہ ٹھہرانے پہ بھنا ہوا نرم خستہ گوشت 'مٹی' کی نائد میں پیش کرتا۔'' اُس کی ذمہ داری تھی' یہ خاص طعام' بہر صورت شہزادے کو کھلائے اور کھانے کے دوران اس کی کیفیت پہ بھی نظر رکھے۔

جب ریاست کے دیوان صاحب کو ان تمام ناروا باتوں کا علم ہوا جو ہرگز ہرگز ایک شہزادے کی شان شان نہ تھیں تو وہ خاصا تلملایا اور راجہ صاحب سے حکیم صاحب کے متعلق شکایت کرتے ہوئے' شہزادے کے لئے حیثیت کے مطابق مراعات کی درخواست کی...... اُدھر راجہ صاحب' جو اکلوتے ولیعہد بیٹے سے بے حد اُنس رکھتے تھے' اپنے طور بھی اُس کی حالتِ زار سے باخبر ہو چکے تھے...... انتہائی اَدب سے کچھ نرمی اور ذاتی ملازم' خدمت اور مصاحبت میں رکھنے کی درخواست گزاری...... جواب میں حکیم صاحب نے کہلا بھیجا...... یہ ایک عوامی شفاخانہ ہے شاہی مہمان خانہ نہیں۔ اِدھر مریضوں کے لیے لازم ہوتا ہے کہ یہاں کے طور طریقوں پہ عمل کریں اور یہاں مریض صرف مریض ہوتا ہے۔ عام اور خاص کی تخصیص نہیں ہوتی......!

راجا اپنے بیٹے کی پُراسرار بیماری سے بے خبر تھا۔ اپنے طور شاہی طبیبوں سے وہ ہر طرح کا علاج ہو چکا تھا۔ شفایابی تو دُور کی بات' کوئی حکیم سیانا' ہزار کوشش کے باوجود یہ بھی سمجھ نہ پایا کہ اُسے مرض کیا ہے؟...... مریض سُوکھ کر چھرخ ہو چکا تھا' جسم نحیف کی ایک ایک ہڈی نمایاں تھی۔ دھنسی ہوئی آنکھیں' رنگت میں سرسوں کھلی ہوئی۔ کمزوری اور نقاہت تھی کہ کسی پرانے دق زدہ بوڑھے کا گماں ہوتا تھا۔ کھانا پینا خوراک اور کوئی دوا دارو' سب بے اثر......! اب آخری واثق اُمید' حکیم اجمل خان تھے...... جنہوں نے اس بھول سے شہزادے نازوں پلے ولیعہد کو ایک سیاہ رو چمار کے سپرد کیا ہوا تھا...... جس سے کسی مریض کو شفا کیا ہوتی؟ اُسے دیکھ کر ہی جان سے جانے کی تمنا پیدا ہوتی تھی......! اس بدہیئت چمار کی ذمہ داری ہی کچھ ایسی تھی کہ جسے اس طور ٹھور کا بندہ ہی نبھا سکتا تھا۔

بیتے دن بھی ڈھلتے سائے کی مانند ہوتے ہیں...... دیکھتے ہی دیکھتے دن کا اُجالا' شام اور پھر شب کی

تاریکی میں اُتر جاتا ہے۔ ایک دو تین گنتی شروع ہونے کی دیر ہوتی ہے۔ ''ایک'' کا عدد یا حروف تہجی کا ''الف'' ہی اکیلا ہوتا ہے...... پھر عدد اور حروف آگے سرکتے پھیلتے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ سیکڑوں ہزاروں لاکھوں کروڑوں اربوں کھربوں اور پل پہروں عشروں مہینوں برسوں صدیوں اور قرنوں تک پھر کہیں رُکنے ٹھہرنے کا مقام نہیں آتا......!

یہ تو محض دو عشرے تھے...... چل سو چل ہوئے تو دوج کے چاند تک جا پہنچے...... مریض کے باپ اور خود بیمار پہ جو گزری سو گزری' مگر جو کالو چمار پہ ہو بیتیں اُس کا مذکور ہی بہت مکروہ اور طبیعت مکدر کر دینے والا تھا؟...... یہ تو کالو بھگدڑ رے کے بھاویں تھا کہ اپنی فطری فطانت اور پیشہ ورانہ وراثت و واردات سے ہر روز کہیں نہ کہیں سے چار چشمے کنتے کا پانچ چھ دنوں کا نوزائیدہ پلا تلاش کر لیتا...... کاٹ بنا' اصلی گھی میں چسکہ دار بھون پکا کے مریض راجکمار کو کھلا دیتا...... مسالوں میں حکیم صاحب کی ادویات بھی شامل ہوتیں۔ راجکمار کی طبیعت اوتی' تب زبردستی یا پیار دُلار سے اُسے کھانے پہ رضامند کر ہی لیتا۔ ویسے بھی اصلی گھی' حکیم صاحب کے اصلی ادویاتی مسالوں سے بھنا ہوا نرم نرم رسیلا گوشت اپنی جگہ۔ پہ بھی ایک خوب ذائقہ دار بھوجن تھا...... ظاہر ہے کہ راجکمار کو یہ بتانے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی کہ وہ کتوں کے پلوں کا پکوان کھا رہا ہے۔

ہر شخص کا کوئی نہ کوئی من پسند شغل ہوتا ہے۔ کوئی سپورٹس میں دلچسپی لیتا ہے' کوئی تن سازی' تیراکی' گھڑ سواری یا گاڑیوں میں...... شطرنج کا کھلاڑی ہے تو کوئی تاش پتہ یا چوسر گنجفہ سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی رکھتا ہے۔ بہت سے لوگ پالتو جانوروں کے شوقین ہوتے ہیں۔ کتے بلیاں خرگوش مختلف اقسام کے طوطے تیتر بٹیر وغیرہ۔ کچھ شیر' چیتے' ہرن' گھوڑے بھی پال لیتے ہیں یعنی انسانی شوق خبط و جنون کی کوئی حد نہیں ہوتی...... سانپوں کے علاوہ نہنگ مگرمچھ بھی اپنے گھروں فارموں کی زینت بنا لیتے ہیں۔ اب رہے صاحب حیثیت اور اُونچے درجہ کے لوگ' جن کے ہاں وسائل اور زر و دولت کی کوئی کمی نہیں ہوتی' وہ زندہ ہی شغل میلے کے لیے ہوتے ہیں...... راجگان ہند' ان معاملات میں بڑے نمایاں ہُوا کرتے تھے۔ خاص طور پہ فنون لطیفہ کی بڑی سرپرستی کرتے تھے۔ نامور ادیبوں' شاعروں' موسیقاروں' پہلوانوں رقاصاؤں حکیموں اور مصوروں کی ہر طور حوصلہ افزائی کرتے' گرانقدر مشاہروں پہ ان کی خدمات حاصل کرتے اور موقع بے موقع انہیں نوازنے کے بہانے ڈھونڈتے نکالتے رہتے تھے۔''

بادشاہوں' حاکموں راجوں مہاراجوں کے اپنے شوق شغل بھی ان کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق ہوتے تھے' کوئی چوگان اور گولف کا رسیا تو کوئی کرکٹ اور بلیرڈ کا چیمپئن...... کچھ کبڈی اور ریسلنگ کا شائق...... شکار تو خاص طور پہ ان کا دلپسند مشغلہ تھا...... سال بھر اس کے لیے بھرپور تیاریاں ہوتی رہتیں۔ ملکی' غیر ملکی مہمانوں کو

بطور خاص مدعو کیا جاتا' سیکڑوں ہزاروں کا عملہ...... تجربہ کار شکاری' ہانکے' ڈھول تاشے' مچانیے' باورچی' خاصہ بردار' طوائفیں اور دل بہلانے کے لیے مسخرے بھانڈ' چھولداریاں' تمبو کناتیں' غالیچے قالین' گیس ہنڈولے' مشعلیں تیل تماکو' ڈھور ڈنگر' گھوڑے ہاتھی' اسلحہ بارود کے آگے شراب کباب اور شباب کا بھی کھلا اہتمام ہوتا۔''

شکار کے اس ہنگام سے علاقے کے مقامی لوگوں کے لیے بھی عید کا سا سماں بندھ جاتا کہ فالتو شکار کام آتا' پڑاؤ اُٹھنے کے بعد بیکار سامان' کاٹھ کباڑ سے ان کے وارے نیارے ہو جاتے' مزدوروں غریبوں کو روزگار اور بخششیں مل جاتیں...... ان کا بھی موج میلہ ہو جاتا۔

اِدھر راجوں مہاراجوں کے راجکماروں اور دیگر خاندان کے افراد کا بھی یہی حال! ہر کوئی اپنی من پسند عیش و عشرت اور شغل شغلے میں مگن...... اجدھر دولت وقت اور وسائل کی فراوانی ہو وہاں راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔ اُس دور کے نوعمر انگریزی اسکولوں کالجوں میں پڑھنے والے راجکماروں ولیعہدوں اور کنوروں میں بھی کچھ ایسے ہی شوق تھے۔ خوبصورت غیر ملکی قیمتی سپورٹس کاریں دوڑانا...... اعلیٰ نسل اور بیش قیمت ریس کے گھوڑوں اور نایاب قسم کے کتوں کی نسل بڑھانا' ریس چوگان کھیلنا' شکار کے خونخوار کتے پالنا...... فنونِ لطیفہ' ''زنانِ عفیفہ'' اور ''مشروبِ شریفہ'' سے حسبِ سن و حال ذوق و جمال مستفید ہوتے۔

مذکورہ بالا راجکمار بھی اسی قبیل کے راجکماروں سے تعلق رکھتا ہے...... سبزۂ عارض میں برکت اور نہ ہی ابھی بازوؤں کی مچھلیوں میں حرکت پڑی تھی لیکن عنفوانِ شباب کے چند جھٹکے ضرور لگ چکے تھے۔ دُخترِ انگور سے چُہلیں' چسکیاں تو روز مرہ تھا جبکہ در بار بازار کی کچھ معتبر مہیلاؤں کی دو چار چلبلی سی نوچیوں سے نوخیز بلے کی طرح نوچا نوچی بھی کر چکا تھا۔ خیر' ایسا کچھ تو اس عمر اور ایسے بڑے لوگوں کے ماحول میں چلتا رہتا ہے۔

اس خوبصورت جواں سال راجکمار کے ساتھ پچھلے برس سے ایک عجیب سا معاملہ چل رہا تھا۔ ہر طرح کی خوراک بھی کھاتا' کوئی کمی یا پریشانی بھی نہ تھی...... مگر صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔ ناخن خشک کھُردرے' آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ گالوں پہ سرسوں کھلی ہوئی' جسم ہڈیوں کا مینارہ' بال اُجڑے ہوئے۔ لگتا تھا کوئی گردشِ لیل و نہار کا مارا ہوا کوئی زرکوب ہے۔ دَف کو بجتے کو بجتے جو خود بھی دَف کا چمڑا بن کر رہ گیا ہو......!

راجکمار کی دسویں سالگرہ پہ اس کے پاپا نے اسے سائبیریا کی ایک خاص نسل کے نوجوان کتوں کا ایک جوڑا گفٹ کیا تھا۔ چہار چشمی' بدوری رنگت' لمبوتری تھوتھنی اور مضبوط کاٹھی والے یہ بھیڑیوں کی اُس مقدس نسل سے تعلق رکھتے تھے جن کے اجداد کو دیوتاؤں نے برف زاروں میں پھنسے ہوئے مسافروں کی دستگیری کے لیے منتخب کیا تھا۔ چنانچہ یہ خاص بھیڑیے جو وقت کی کٹھالی سے نکل کر اب کتوں کی صورت میں

دکھائی دیتے ہیں...... روس کے لوگ اور حکام' خاص طور پہ سائبیرین' ان کتوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر ان کی نگہداشت اور توقیر کرتے ہیں۔

ان قابل قدر اور انسانیت کی خدمت پہ مامور یہ کتے' سائبیریا کے برف زاروں کے علاوہ کہیں اور کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے بھی ان کی نسل اپنے علاقوں سے باہر خوش رہتی ہے اور نہ ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ چند ایک مخصوص اور مکمل چڑیا گھروں کے علاوہ یہ کہیں نہیں ملتے۔ سفید چیتا' شیر' پانڈا' شکرا' ٹونا' ہاتھی' ریچھ' سانپ' گلہری وغیرہ چونکہ برف زاروں یا سرد ملکوں علاقوں کے جانور ہیں۔ اسی لیے یہ اسی سرد ماحول میں ہی پنپتے اور زندہ رہتے ہیں۔''

ماہرین حیوانات' ماحولیات نے مسلسل تحقیق اور تجربات کے بعد ان مخصوص حیوانات کے جینز میں کچھ تبدیلیاں لاکر ان کی نئی نسل پیدا کی ہے۔ اس وقت دنیا کے اچھے اچھے چڑیا گھروں میں نایاب نسلوں کے جو چند ایک جانور دکھائی دیتے ہیں وہ اسی نئی ٹیکنالوجی کے شاہکار ہیں جن میں وہ مولوی مدن والی بات نظر نہیں آتی......!

یہ کتوں کا جوڑا' جو نہ بچے تھے نہ جوان البتہ بے حد خوبصورت اور من موہنے تھے۔ یہ تو پتا نہ چلا کہ راجہ صاحب نے انہیں کہاں سے اور کیسے حاصل کیا؟ لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ ایسی انوکھی چھل بل اور عالیشان اُٹھان والے کتے' پورے ہندوستان کے کسی راجہ یا کسی سطح کے انگریز کے پاس بھی نہ تھے۔ دُور قریب سے دیکھنا در کنار' عام اور خاص لوگ' ان کا ذکر کرنا بھی اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔ یہ ایک نایاب اور قیمتی تحفہ تھا...... راجکمار انہیں پا کر جیسے اپنے اردگرد کی ہر چیز کو بھول گیا تھا۔ اپنے ہاتھ سے کھلاتا پلاتا' نہلانے کے لیے بھی وہ خادموں کی مدد نہ لیتا۔ ہر لمحہ وہ ان کی محبت میں ڈوبا رہتا...... ایک لقمہ خود کھا رہا ہے دُوسرا انہیں کھلا رہا ہے۔ بٹھاتا اور سلاتا بھی اپنے ساتھ!...... راجہ صاحب بھی بڑے خوش کہ بیٹے نے باپ کی بھینٹ کو سویکار کر لیا ہے۔ وقت آگے سرکا' تب یہ تینوں ''کتے'' یا تینوں ''منتش'' اپنے قد و قامت میں کچھ اوپر اُٹھ چکے تھے۔ تب دیکھنے والوں کو احساس ہوا کہ راجکمار کی صحت دن بدن گرتی چلی جا رہی ہے۔ حکیموں معالجوں نے اپنے اپنے طریقے آزمائے' جب کچھ افاقہ نہ ہوا تب راجہ صاحب کو مزید چنتا گئی تو حکیم اجمل خان کا خیال آیا۔

حکیم صاحب نے پہلی نظر میں اس کا مرض جان لیا تھا کہ حد سے زیادہ قربت سے کتوں کے مخصوص حیاتیاتی جرثومے اور جیچڑ' اس کے معدے میں پہنچ کر خوب افزائش نسل کر چکے ہیں۔ پیٹ معدے آنتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' راجکمار جو بھی خوراک لیتا ہے یہ موذی اُسے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اُس سے بھی یہ سیر نہیں ہوتے تو آنتوں وریدوں کی تہہ دار چربی نوچ نوچ کر کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح راجکمار اندر سے

کھوکھلا ہو چکا تھا۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی کہ کسی وقت بھی یہ "انہونی" ہو سکتا تھا۔

دیوان نے راجہ صاحب سے جب حکیم صاحب کے طریقہ علاج' معیار رہائش اور دیگر مہیا کی جانے والی سہولتوں کو راجکمار کی شان شایاں اور مزاج کے مطابق نہ ہونے کی رپورٹ کی تو راجہ صاحب نے اُز خود حکیم صاحب سے ملاقات کر کے قدرے رعایت و سہولیات کی درخواست کی۔ حکیم صاحب نے بیماری کی سنگینی اور علاج و پرہیز کے تقاضوں سے آگاہ کرتے ہوئے جب یہ بتایا جو طریقہ کار ہم نے اختیار کیا ہُوا ہے اس سے رُوگردانی کا مطلب' اس کی موت ہے۔ صرف اسی علاج و پرہیز سے صحت مندی کی آخری اُمید وابستہ ہے۔ راجہ صاحب نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بنتی کی۔

"حکیم جی! راجکمار کو ماس کھانے کے گھنٹہ بھر بعد جو تُتے ہوتی ہیں وہ اُس کی جان کھینچ لیتی ہیں...... تین چار زبردست اُلٹیاں' اُس کی آنتیں اُلٹ دیتی ہیں۔ لگتا ہے اُس کا دیہانت ہو جائے گا۔ بس' یہی خدشہ ہے کہیں وہ......؟"

حکیم صاحب نے اُنھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"راجہ صاحب! زندگی اور موت مالک کے ہاتھ میں ہے...... آپ کے ہاتھ نہ میرے ہاتھ میں۔ آپ نے راجکمار کو اُس وقت' میرے ہاں علاج کے لیے بھیجا جب کتوں کے حیاتیاتی جرثومے' جو اُن کی نسلی بیت میں مصنوعی طور پہ کچھ تبدیلیاں لانے کی وجہ سے انتہائی خطرناک ہو چکے تھے' اس کے معدے میں پہنچ گئے...... مخلوط نسل کتوں کی دن رات کی صحبتوں اور انسانی اور حیوانی درمیانی قربتوں احتیاطوں کا خیال نہ رکھنے سے اسی نوع کے عوارض عود آتے ہیں۔

انسانی اور حیوانی جبلّت الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے جسمانی اور حسیات نفسانی' تقاضہ ہائے زندگانی و روحانی میں عجیب و غریب تضادات و تفاوات واقع ہیں۔ جب ہم ان کے درمیانی فاصلے کم سے کم کرتے ہوئے ان کا وجود ختم کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں تو اکثر جبلّتِ حیوانی کا غلو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ حیوانی جبلّت' انسانی جبلّت و سرشت پہ غالب ہونے کے بہتر انداز رکھتی ہے۔ یوں سمجھیں کہ جانور مُطلق سو سال' جانور ناطق یعنی انسان کی صحبت میں رہے تو وہ کبھی بشری جبلّت و سرشت کو اپنا نہیں سکتا اور نہ وہ انسانی قدروں کا خوگر ہو سکتا ہے لیکن آدمی اگر حیوانوں میں رہے تو وہ بہت جلد جبلّتِ حیوانی کو قبول کر لیتا ہے۔ کیونکہ جبلّتِ حیوانیہ...... تہذیب و تمدن' اخلاق و آداب' قواعد و قرینہ' آگاہی و آشنائی اور علم و عقل کے گورکھ دھندوں میں اپنے لیے آسانی رسائی محسوس نہیں کرتی...... اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کسی حجاب و خدر' حرام و حلال' حیثیت و حمیت کے چکر میں بھی نہیں پڑتے۔ اُن کی دانست و سرشت میں منافقت کی مکمل نفی

ہوتی ہے۔ شدت اور حدت' بیساختگی و بے باکی اُن کے خمیر میں بڑی گھمک سے گندھی ہوتی ہیں۔ مصلحت کی مصیبت' دُور اندیشی کی دھوک' عقل کی عیاری' وسیع تر مفاد کا وسیع تر وبال اور نظریۂ ضرورت کی ناصوابی سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے لیے جنت ہے نہ دوزخ...... حساب ہے نہ کتاب...... کرام اًکاتبین نہ حشر نہ نشر...... جو کچھ ہے اُن کی نقد جان! جو گئی سو گئی اور پھر نہ جُنوں رہا نہ پری رہی......؟"

روایت تو سنتے آئے ہیں...... حضرت عمر فاروق رضی تعالیٰ عنہٗ جنگل میں حسبِ معمول کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے' نیم دراز استراحت فرما رہے تھے۔ ناگاہ' اوپر کسی شاخ پہ ایک پرندے پہ نظر پڑی جو بڑے مزے سکون سے ڈال پہ بیٹھا چہچہاتے ہوئے اللہ عزّوجل کی حمد بیان کر رہا تھا۔ خیال آیا کاش! مَیں ایک ایسا ہی پرندہ ہوتا' جس سے قیامت کے دن کوئی پُوچھ گچھ نہ ہوتی...... مَیں خلیفہ ہوں میرے کندھے ذمہ داریوں سے بوجھل ہیں...... دجلہ کنارے کسی بھوکے کُتّے کو خوراک بہم پہنچانا بھی میری ذمہ داری میں شامل ہے۔ کاش! مَیں......؟

مَیں کیا کروں...... پتا نہیں میرے ہاں کُتّا کہاں سے آ جاتا ہے وہ بھی کالا...... کالے کوّے میرے سر پہ اور کالا کُتّا میرے دائیں بائیں...... آگے پیچھے کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ کوئی کوّا' کُتّا مجھ سا تو نہ ہوا مگر مَیں اُن جیسا ضرور ہوگیا کہ کوئی جانور' بشر نہیں بن سکتا...... مگر کوئی بشر بندہ و جبلّت کے حوالے سے اُن سا ضرور بن جاتا ہے۔ آج تک کسی جانور نے کسی دوسرے جانور کو "اوئے انسانا' بندیا' بشرا" کہہ کے "گالی" نہیں کی۔ مگر اِنسان اِک دُوجے کو کسی نہ کسی وجہ سے کُتّا' بِلّا' بندر' کھوتا' حتیٰ کہ سُور سانپ کہہ کر بھی گالی بک دیتا ہے۔

جنگل بیلوں' صحراؤں' بَرفزاروں' پانیوں اور بے کنار فضاؤں میں کسی راستے' پگڈنڈی کے بارے کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ کسی منزل تک رسائی ملے گی یا نہیں؟...... مزاجِ یار کی مانند اِن کے تیور تڑتے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی چلن میرے "سرِ قلم" قلم کا بھی ہے جو قرطاس پہ نِک کے رہے تو جان جاتی ہے...... پیچھے کچھ اور آگے کچھ اور لکھ رہا ہوتا ہے۔ بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ مَیں اُس سے لکھ نہیں رہا ہوتا بلکہ وہ مجھ سے لکھ رہا ہوتا ہے تب ہی تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کُوئے یار سے نکل کر' سُوئے دار کیونکر نکل آتا ہوں؟...... مسجد کے سیدھے صاف راستے کے بائیں پہلو کوئی پتلی بغلی گلی' کسی جم خانہ یا مے خانے کی جانب کس حساب میں کُھلتی چلی جاتی ہے......؟

حکیم صاحب نے مزید بتایا کہ شب و روز کی کُتّوں کی صحبت' ایک ساتھ کھانا پینا' پیار دُلار سے حیوان اور اِنسان کے درمیانی تعلقات میں عدمِ توازن سے یہ آنتوں کی سوزش اور ضعفِ معدہ کا عارضہ لاحق ہے۔ کُتّوں کے جرثوموں اور جِچّڑوں نے اِس کے انہضام کے نظام کو تباہ کر کے رکھ دیا ہُوا ہے۔ لہٰذا وہ بیماری کے مطابق طریقۂ علاج اپنا کر اِس کی صحت یابی کے لیے کوشاں ہیں۔

حکیم صاحب کے لیے سب سے بڑا مشکل مسئلہ راجکمار کے پیٹ معدے کی صفائی کا تھا...... کچھ تشخیص وتوجّہ کے بعد انہوں نے علاج بالمثل کے اُصولوں کے تحت کُتوں کے کیڑوں چیچڑوں کو آسانی سے خارج کرنے کے لیے کُتوں کا ہی سہارا لیا۔ اپنے ایک معتمد ملازم کی ذمہ داری لگائی کہ وہ ظہرانے میں ایک چہارچشمی کُتے کا پلا کاٹ کر دیسی گھی میں بھونے اور مخصوص سفوف چھڑک کر راجکمار کو ہر صورت کھلائے۔ وقفہ وقفہ سے ایک دوا ملا ہرا پانی بھی پلاتا رہے۔ نرم پلے کا بھنا ہوا لذیذ گوشت ظاہر ہے بڑا سوادی اور اشتہا آور تھا۔ مگر کھا چکنے کے گھنٹہ بھر بعد راجکمار کی طبیعت خراب ہو جاتی اور بے تحاشہ اُلٹیاں شروع ہو جاتیں۔ بے انتہا بدبُودار گدلا مواد جس میں پگلی ہوئی بوٹیاں بھی ہوتیں' کالے کالے چیچڑ کیڑے بھی جو بوٹیوں سے کلبل کلبل کرتے لپٹے ہوتے۔ قے کرنے کے لیے سیاہ مٹی کا ڈھکن والا ایک مخصوص برتن تھا جو فوراً بعد ملاحظے کی خاطر' حکیم صاحب کو پیش کر دیا جاتا تھا۔

کُتے کے پلے کا دیسی گھی میں بُھنا ہوا گوشت' جس پہ کوئی دوا چھڑکی ہوتی' جب معدے میں پہنچتا تو اپنی مخصوص وحاسّہ سے کیڑوں چیچڑوں کو متوجہ کر لیتا۔ چیچڑ کیڑے' آنتیں اور بافتیں چھوڑ کر اِدھر پل پڑتے اور بے تحاشہ کھانا شروع ہو جاتے۔ کچھ ہی دیر بعد اُوپر چھڑکی ہوئی دوا بھی اپنا رنگ دکھاتی...... پہلے طبیعت مالش کرتی پھر جی متلاتا' بڑی آنت' حلقوم سے باہر لوٹنے کو کرتی اور پھر وہیں پلاسی سوا تین ماترے...... قے کا ایسا آبشار اُنڈتا کہ مریض کی طبیعت چاؤں چاؤں ہو جاتی۔ اندازے کے تحت دو عشروں کی محنت' نگہداری کے بعد' پیٹ سے جو مواد نکلا وہ چیچڑوں کیڑوں سے تہی تھا اور کچھ عرصہ بعد راجکمار صحت یاب ہو گیا اور کُتوں بلّوں کی بے طرح کی صحبت ومحبت سے بیزار ہوا......

جنوں اور انسانوں کا آپس میں جوڑ توڑ یا گزارہ ہو جاتا ہے کہ آگے پیچھے اور آپس تعلق داری کی مخلوق ہیں۔ حساب کتاب' حشر نشر' جنت دوزخ کا معاملہ بھی سانجھا ہے۔ مگر حیوان مُطلق سے محض دیکھے مُنہ کی سانجھ ہے۔ کفن نہ دفن' عرس نہ میلہ' دمڑی نہ دھیلہ؟...... ایک دو کوّے' تین چار کُتے' پانچ دس گھوڑے' چند ابابیلیں' ایک آدھ پکھیرو' ہد ہد' کچھ کبوتر اور بلّیاں' چند چیونٹیاں' مکھیاں' مچھر اور مچھلیاں' بکریاں وچھیاں' کچھ دانے دیمک...... بھیڑیں اور شتر شر...... بس خس......!

## سانپ رے سانپ ذرا باہر تو جھانک......!

خاموش سی غوں غوں' جسے صرف باطنی کان ہی سُن سکتے ہیں...... مجھ تک پہنچ چکی تھی۔ میری بائیں

ناٹک سے لگے نُکتے نے مجھے نگل دیا تھا۔ شیش ناگ نے بڑا سا پھولا ہُوا منہ سوراخ سے باہر نکال لیا تھا......
سانپ، خصوصی طور پہ ناگ کا منہ گردن، صرف دو حالتوں میں پھولتے ہیں...... انتہائی غضب میں یا جب پیٹ خوب بھرا ہُوا ہو...... ظاہر ہے کہ یہ دونوں خطرناک حالتیں اس پہ وارد تھیں اور ساتھ ایک روشنی والی مجبوری بھی...... سانپ، سماعت سے یکسر محروم ہوتا ہے جبکہ بصارت بھی اس کی واجبی سی ہوتی ہے جو سورج کی روشنی میں مزید معدوم پڑ جاتی ہے۔" اوپر کہیں لکھ چکا ہوں کہ خوں آشاموں، بھوت پریت، چھلاوے، بڑا وے، نساچروں، سپید سانپوں کے لیے سورج کی کھڑی سیدھی کرنوں والی روشنی زہر کی طرح ہوتی ہے۔ وہ حتی الوسع اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ سیدھی روشنی کے سامنے سے اُن کی سِفلی شکتیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔

مَیں گھر سے باہر کسی بھی وجہ سے نکلوں میرا عصا میرے ہاتھ اور تقریباً تین گز کی چادر میرے سر یا کاندھوں پہ ہوتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں میرے لباس کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ سفر و حضر، سوتے جاگتے، تنہائی یا کسی مجلس مذاکرت میں میری مدد و معاون اور عصا، تو جیسے میرا تیسرا کارآمد بازو اور اضافی ٹانگ ہے۔ مَیں تھکن غنودگی کی حالت میں اس کے خمیدہ دستے پہ ٹھوڑی جما کر تھوڑی دیر کے لیے پُرسکون ہو جاتا ہوں...... کسی سوچ وبچار میں ہوتا ہوں تو اس کو گھماتا رہتا ہوں...... اُٹھنے بیٹھنے میں مدد لیتا ہوں...... شرارتی کُتے، بِلّے قریب نہیں پھٹکتے...... آم، امرود، بیر، بَہی، توت، شہتوت، کُھنے کیلے، سیب، سنگترے وغیرہ آسانی سے چوری کیے جا سکتے ہیں۔ پتنگ کی ڈور لوٹنے گھسیٹنے میں مزہ آتا ہے۔"

میرے کچھ نالائق نکمے بگڑے ہوئے بچے اس سے بچنے کی بیکار کوشش میں مزید حماقتیں کرتے ہیں۔ اس کے آنکڑے میں میرے صرف ایک بچّے زین شاہ کی گردن فٹ آتی ہے۔ راستے میں پڑی نقصان دہ چیز روڑا پتھر بھی ہٹا لیتا ہوں۔ کسی کے دروازہ کی گھنٹی بغیر کرنٹ جھٹکے کے بجا لیتا ہوں۔ اس پہ کپڑا لپیٹ کر کونوں کھدروں کے جالے بھی اُتارے جا سکتے ہیں۔ کسی نشاندہی اشارے کے لیے بھی کام آتا ہے۔ جھاڑ کھینچے، ریگ ماہی تلاش کرنے، "نقش برآب بنانے"، ہوا میں ہوائی حشرات سے نبٹنے کے لیے بھی یہ "عصائے ملامت" کام آتا ہے۔"

تاریخ انسانی ہمیں بتاتی ہے ایسے مختلف اشکال کے عصا، چھڑیاں، سونٹے، ڈنڈے، کھونڈیاں، مطریں، ترشول، لاٹھیاں وغیرہ ہر دور میں کسی نہ کسی طرح انسان کے ہاتھ اور ساتھ رہے...... گڈریا ہو یا گاڑی بان، بادشاہ یا پیغمبر، درویش ہو یا دریوزہ گر، قاضی یا قصہ گو...... خطیب، شہر ہو یا فقیر شہر، داروغہ، دربان، فرامین ہوں یا فسوں گر، معلم یا محتسب...... چونکہ کیدار ہر کسی کو اس کی ضرورت رہی، چاہے یہ زینت و زیبائش کے لیے رہا ہو یا گوشمالی یا فہمائش کے لیے؟ دیکھا جائے تو یہ ہر دور ہر فرد کی ذاتی، سماجی، رواجی اور پیشہ و قماش کی خود ساختہ

ضرورت رہی۔ بادشاہ، حاکم نے اسے شان و شوکت و دبدبے کے لیے استعمال کیا۔ گاڑی بان اور دربان نے اسے ہنکانے اور ڈرانے کے لیے برتا...... شعبدہ باز اور فسوں گر نے اسے نظر بندی کے لیے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ مدرّس و محتسب نے اسے علم و قانون کی اہمیت بتانے سکھانے کی غرض سے گھمایا...... کمزور بوڑھے نے ٹیک کے لیے اور گلی گلی بھیک مانگنے والے نے آوارہ کتّوں اور شریر بچّوں سے بچنے کے لیے اسے اپنی سپر بنایا۔"

کہتے ہیں کہ آسمان سے چار کتابوں کے ساتھ پانچواں ڈنڈا بھی نازل ہوا تھا۔ کسی پہ بے جا ظلم کے لیے نہیں، ہدایت کی غرض سے کہ باتوں کے بھوتوں کے ساتھ کہیں لاتوں کے بھوت بھی ہوتے ہیں۔

پیغمبروں نبیوں رسولوں اور دیگر چنیدہ یا لیدہ ہستیوں نے بھی اس کا بھرپور استعمال کیا...... آسمانی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ سے لے کر جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک، کسی نہ کسی صورت عصا، چابک چھڑی ضرور ہاتھ میں رہی...... غرضیکہ اچھا ہو یا کوئی بُرا، ادنیٰ یا اعلیٰ، یہ ہر اک کی ضرورت رہا۔"

مَیں جب سے بابا کہلایا...... عصا خود بخود میرے ہاتھ آیا...... کیا خوب کہ مَیں نے آج تک بھی کوئی عصا، ڈنڈا یا چھڑی از خود نہیں خریدی۔ اللہ کریم کے برگزیدہ بندوں نے کمال محبت و شفقت سے مرحمت فرمائیں۔ بغداد شریف، اجمیر شریف، سہون شریف، داتا سرکار اور بھی بہت سی جگہوں کے علاوہ میرے پاس میری روحانی اُستاذ، چاچی جموں والی کے بعد کے روحانی بابا "باؤ ترین" جلالپور والے کا "جناتی عصا" بھی مجھے حاصل ہوا۔ بابا جی کی ظاہری حیاتی میں مَیں نے اس جلالت مآب عصا کے بہت سے چمتکار دیکھے، گو اُس عہدِ طفلیت میں اُنہیں سمجھنے جاننے کا کما حقہٗ ادراک نہ تھا اس کے باوجود اُن کی ماورائیت کچھ نہ کچھ سمجھ آتی تھی۔"

قارئین! اگر چاہوں تب بھی مَیں، اس جلال پوری، جلالی ڈنڈے (جسے عصا کہنا کچھ زیادہ معقول لگتا ہے) کو فراموش نہیں کر سکتا کہ اس سے جنات اور دیگر نادیدہ مخلوق کی درگت بنتے دیکھی...... بہت آگے پہنچ کر ایسی ہی صفات و تشرفات والا ایسا ڈنڈا، اپنے جمالی و جلالی بابا ڈنڈے والا سید عطا اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں دیکھا...... ان کے جذبہ ایمانی، جرأت لاثانی...... قرآن، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عقیدت...... اُن کی فقید المثال خطابت اور نسبی شرافت کے اپنے تو اپنے، بیگانے بھی معترف تھے۔ مَیں نے ان کے ڈنڈے کو کئی بار بوسے دیے۔ ان کے ڈنڈے سے جڑی ہوئیں چند ایک "ڈنڈیاں" یعنی چھڑیاں بھی دیکھیں۔ ان چھوٹی جتھ چھڑیوں کا اپنا ایک الگ مقام اور شان تھی۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، مولانا آزاد، مظہر علی اظہر،

غلام رسول مہر' غلام مرتضٰی میکش' حکیم احمد شجاع' صوفی تبسم' مولوی عبدالحق' مولانا مودودی' حکیم سعید دہلوی' بڑے غلام علی خان' غلام حسین مہاراج' گاندھی جی' نواب نصراللہ خان وغیرہ...... ماضی قریب و بعید میں اُمراء شرفاء کی چھڑی' اُن کے لباس اور ذات کا حصّہ ہوتی تھی۔''

میرے والد مرحوم کے پاس ایک چھڑی ہوتی تھی' جس کی مٹھ سینگ کی اور باقی گینڈے کے چمڑے کی تھی۔ نیچے پیتل کا پیندا تھا۔ وہ اسے افریقہ سے لائے تھے۔ ایک قیمتی اور پُراسراری چھڑی' مجھے ایس ایم ظفر کے والد صاحب جو رنگون والے کشفی نظامی پیر کہلاتے تھے' کے گھر سے ملی تھی۔ آپ حضرت حسن نظامی رحمتہ اللہ علیہ کے خلفاء میں ایک اعلٰی پائے کے بزرگ تھے۔ ان کا مزار' نارووال کے نواح' چک قاضیاں میں مرجع خلائق ہے۔''

زندگی کے مختلف اَدوار میں' میرے ہاتھ کے عصاء بدلتے رہے...... اس میں شاید میرے ارادے کا دخل نہ ہوتا ہو' ضرورت' سفر کا تقاضہ' موڈ یا پھر یہ کہ جو سامنے ہاتھ لگ گیا...... اس سے چندی گزشتہ میں جو عصاء میرے ہاتھ تھا...... سیاہ چندن کا ٹھ' جس کے ٹیڑھ' اسی کے پتوں کی آگ کے سینک سے سیدھے کیے جاتے ہیں' مجھے ہرڑوار کے ایک پنڈت دوست نے یہ بتا کر تحفہ میں دیا تھا۔ باباجی مہاراج! یہ کلیر شریف کے نہر کنارے' پرانے جنگل کے خاص چندن کا ہے...... جس کا صندل سندور' کسی دور میں سونے کے پتروں کے بھاؤ ملتا تھا کہ ہری دوار پہنچنے والے یاتری' اسے اپنی پوجا پاٹ میں استعمال کرتے تھے۔ مزید انکشاف کرتے ہوئے بتایا۔ سانپ کوئی بھی کسی نسل بھید بھاؤ کا ہو' اس کاٹھ کا رن' کا نیور کا کنہیا لعل کچلو بن کے رہ جاتا ہے۔ کیڑے مکوڑے' بچھو بچو گڑے' قریب لگتے ہی بے دم ہو جاتے ہیں۔ مدھے مدھے مہوے کی مہک کی مدھرتا' من کو منورنجن دیتی رہتی ہے۔ اس کاٹھ کو ہاتھ میں رکھنے والے کا بلڈ پریشر صحیح رہتا ہے...... اور تو اور دل دماغ پھیپھڑے گردے جگر یعنی اعضاء رئیسہ مضبوط رہتے ہیں۔ اپنے مالک پالک کی طرف دھیان رہتا ہے۔ اَنت اچھا رہتا ہے۔''

اللہ کریم! سورہ رحمٰن میں فرماتے ہیں۔ ''تم میری کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' پھر مالک و خالق' اجمال سے اپنی عطا کردہ نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں...... عود کے پیڑ جھاڑ کی مانند چندن یعنی صندل کا پیڑ جھاڑ بھی' اللہ کریم و جمیل و جلیل کی صناعی' حکمت' جمالت...... عنایت و مراحمت کا عظیم تحفہ ہے۔ عود کی مانند اس کی باس بھی باغ بہشت کی مہک کے مثل ہے۔ سنبل و نسترن' گلاب و گیندا' چمپا و چنبیلی کی نکہتوں سے وَرے کچھ اچھوتی سی مشامی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی لکڑی' پتوں' پھولوں' کلیوں' چھال حتیٰ کہ جڑوں اور نیچے کی مٹی سے بچا س روحانی' ذہنی جسمانی جنسی بیماریوں کا علاج ممکن ہے۔ اس کے خشک پتے' لکڑی کا برادہ بطور بخورات

دہکانے کے کام آتے ہیں۔"

حاضرات' موکلات کی مجالس اور اَرواح کی حاضری کے لیے اِس کا دُھواں دُھانس بہت ضروری ہوتی ہے۔ دماغی اور ذہنی امراض میں اس کی گولوں کا لعوق چٹانے سے خاطر خواہ افاقہ' جبکہ اس کے پھولوں کلیوں کی معجون سے خفقان' خلل کا علاج ہے۔ اس کے تیل سے بیشتر بیش قیمت خوشبویات اور جمال افروز کریمیں تیار ہوتی ہیں۔ اس کی چھال سے ایسے رنگ اور مہک آور مواد تیار ہوتے ہیں جن سے امراء اور نازک مزاج خواتین کے ملبوسات' ریشمی اور کاغذی رومال' شب خوابی کا لباس اور دریچوں کھڑکیوں کے باریک پردوں میں بسایا جاتا ہے اور بھینی بھینی' بھلی سی کی مہک کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس کی بیکار ٹھونٹھوں' گانٹھوں' بُرادے سے عرقیات اور مشروبات تیار ہوتے ہیں۔ جو مفرح' تسکین آور اور گرمی حدت سے نجات دلاتے ہیں۔ لُو اور شدید گرمی کے ایام میں صندل کا شربت اِک نعمت سے کم نہیں ہوتا۔

چندن کاٹھ کی کئی اِقسام ہیں۔ ان میں سے چند ہی قسمیں ایسی ہیں جو تاثیر و تحلیل کے سبب' خُوشبویات' اَدویات میں کام آتی ہیں۔ کچھ ایسی جو اپنی کم تر خوشبو کی بنا پہ بخورات یا سُلگانے کے لیے ہیں۔ انہیں مندروں' معبدوں اور دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں میں مسلسل سُلگایا جاتا ہے۔ فارس' یونان' روم' مصر' بابل' نینوا' ہندوستان کے قدیم معبدوں میں قیمتی پتھروں کے علاوہ اسی کی لکڑی کے بُت اور دیگر سامان زینت و آرائش ہوتا تھا۔ محرابیں اور دروازے' کھڑکیاں' بیٹھنے کے لیے چوکے...... مشعلوں کے قلابے...... پستکوں کتابوں کے لیے الماریاں...... چھت روشندان' عبادت گاہوں میں اِک جو روحانی اور عرفانی ماحول قائم ہوتا تھا۔ اُس کی ایک بڑی وجہ بھی اِسی صندل کی سدابہار بھینی بھینی مہک اور اس کے روحانی وجدانی اسرار ہیں۔

اس لکڑی کی ایک اور قسم ہندوؤں کی اَرتھیاں جلانے کے کام آتی ہے لیکن وہ بھی سونے کے مول دستیاب ہوتی ہے...... میں نے دہلی اور آگرہ' جمنا کنارے غریبوں کو کاٹھ کباڑ' سائیکل اور موٹر کے پرانے ٹائروں سے بھی ارتھیوں کو آگ دیتے دیکھا ہے۔

صندل کے ذخیرے جنگل بھی زعفران کے کھیتوں کی طرح' سرکاری تحویل میں ہوتے ہیں...... عام آدمی ان کے ذخیروں کھیتوں میں داخل نہیں ہوسکتا کہ اِدھر کی خُوشبو اور اڑتی ہوئی جیناتی رَوئیں سے غشی' سر درد یا نزلہ زکام میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ دوسرا کارن' ان کا قیمتی اور کمیاب ہونا بھی ہے۔ تیسری ایک اور وجہ' صندل کے پیڑ سے اکثر سانپ لپٹے دکھائی دیتے ہیں۔ بے ضرر سے بے ضرر سے...... اصل میں وہ اس کی مہک کی مستی میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُنہیں پکڑ لو یا مار دو اُنہیں کچھ خبر نہیں ہوتی...... بالکل ایسے جیسے ہمارے ہاں منشیات کے عادی' کونوں کھدروں ویرانوں میں نشہ پورا کر کے سر دیئے پڑے ہوتے ہیں۔ صندل کی محبت

میں قدرت نے ایک خاص تاثیر رکھی ہے' جو انسانوں جنوں کے علاوہ ہر اُس جانور کے لیے متاثر کن ہے جس میں سریت' تحلیل اثری اور مافوقیتِ بدنی' بدرجہ اُتم موجود ہے۔ اس لحاظ سے سانپ' صفِ اول کا نمبر دو ہے...... بعدازاں ابابیل' کبوتر' کوا' کتا' ہدہد' چیونٹیاں' ماہیاں' مکڑیاں' مچھر' دیمک وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔

سانپ کو دائیں بائیں اور درمیان تینوں اطراف کے درجات...... جنت میں داخل ہونے اور آدم علیہ السلام کو بہکانے کا بوجھ بھی اس کے سر ہے۔ بہت آگے آئیں تو فرعون کے دربار میں' موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے درمیان' حق و باطل کے مقابلے میں بھی سانپ اپنا مثبت کردار ادا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ غارِ ثور میں بھی' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی غرض سے کئی زمانہ' پڑا منتظر رہتا ہے۔ غرضیکہ سانپ کے مختلف' منفی و مثبت کردار و رُوپ ہمارے سامنے آتے ہیں...... ہم کما حقہٗ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ سانپ اصل میں ہے کیا؟...... دوست ہے یا دُشمن؟...... ہم اس کا شمار حشرات الارض کی مضرت پہنچانے والی مخلوق میں کرتے ہیں جبکہ' ہمیں انسانی اور حیوانی تاریخ بتاتی ہے کہ' ہمیں نقصان سے کہیں زیادہ' اس سے فائدہ ہی ہُوا۔

آج تحقیق کہتی ہے کہ یہ دُشمن نہیں دوست ہے محسن ہے۔ اگر یہ ہمیں کاٹتا ہے تو یہ اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے نہ ہاتھ ہیں نہ پاؤں' بینائی نہ ہونے کے برابر...... سُن اور آنکھیں بھی بند نہیں کر سکتا کہ اُس کی پلکیں پپوٹے نہیں ہوتے۔ وہ صرف اپنے دفاع میں مجبوراً حملہ آور ہوتا ہے۔ عام حالات میں وہ طرح دے کر اپنی جان بچاتا ہے۔

ہمارے علاوہ دوسروں نے' جنہیں ہم کافر' ملحد' زندیق کہتے ہوئے نہیں شرماتے۔ اس کارآمد' قیمتی اور پُراسرار جانور پہ بہت کام کیا۔ اس کے بارے جو جھوٹی' من گھڑت کہانیاں قصے مشہور ہیں جن کی وجہ سے ہم اسے کوئی مافوق الفطرت جانور سمجھتے ہیں۔ انہیں رَد کر کے اُس کا خوف اسراریت ختم کی۔ آج اسے فارموں میں پالا جاتا ہے۔ اس کی مختلف نسلیں قسمیں تیار کی جا رہی ہیں۔ اس کے زہر سے مختلف عارضوں کے لیے ویکسین تیار کی جا رہی ہیں۔ اس کی کھال سے قیمتی جوتے' پرس' لباس' بیلٹ' دستانے' سر کی ٹوپیاں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کی ہڈیاں بھی کام آتی ہیں۔ اس کا لذیذ گوشت' دُنیا بھر میں بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ ڈبوں میں بند کر کے دساور بھیجا جاتا ہے۔ اس کی دُم اور سری کی یخنی' ایک کمال کا مشروب ہے' جو دُنیا کے صرف اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں دستیاب ہے۔ یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ آج کے دَور میں سانپ' ایک خطرناک جانور نہیں۔ ہمارے دل دماغ میں بیٹھا ہوا خوف اگر دُور نہیں ہوتا تو اس میں سانپ بیچارے کا کیا دوش؟...... ہماری ہڈیوں میں سیسے کی طرح بیٹھی ہوئی بے علمی اور جہالت' اگر ہم خود دُور نہیں کرتے تو اس کا علاج کرنے کوئی لقمان تو نہیں آئے گا......؟

سانپوں کا ذکر...... ! میں جن سانپوں کا ذکر لیے بیٹھا ہوں وہ کوئی اور سانپ ہیں۔ جس طرح عام انسانوں کے بیچ کچھ اور طرح کے انسان بھی ہوتے ہیں۔ جو ہوتے تو انسان ہیں مگر اُن میں قدسیوں کی سی قدریں بھی ہوتی ہیں۔ اور ایسے بھی جو دکھائی تو بڑے نیک پارسا دیتے ہیں مگر اندر سے پکے پورے راکشس شیطان ہوتے ہیں۔"

یہ شیش ناگ بھی' عام سانپ نہ تھا؟...... اور میرے ہاتھ جو عصا تھا وہ بھی کوئی دو کوڑی کی کوتل دھریک' کسی کیکر کا کڑ کا جھن یا بانس بنسیل کا لٹھ نہ تھا۔ مہان تیرتھ ہردوار کے پرمان پنڈت دین دیال جی مہاراج نے کمال کر یا سے بھینٹ کیا تھا...... صدیوں پرانا چندن چوب جو کبھی کسی قدیمی ناگ دیوتا کے مندر کا کوئی حصہ رہا ہوگا۔ کسی نہ کسی طرح پنڈت جی کے ہاتھ لگ گیا۔ بے ڈھنگا' بے ڈول' بے طرح کا صندل کی لکڑی کا ٹکڑا ممکن ہے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کسی ارتھی میں جل چکا ہوتا...... پنڈت جی نے اُسے اپنے آشرم میں دیپ رکھنے کے لیے دیپک دون بنالیا۔ ہوم کرتے ہوئے اصلی گھی کا شاندہ دیپ' اِسی ساڑھے تین فٹ اُونچے دیپک دون پہ رکھ کر روشن کرتے۔

دیپک دون' موٹے سے ڈنڈے کا سٹینڈ ہوتا ہے۔ نیچے بھاری سا پیندا اور دیپک رکھنے کے لیے اُوپر گول گہری سی تختی ہوتی ہے۔ یہ دیپک دون' چندن کا شبھ کا مانا جاتا ہے...... نچلی جات شودروں' بھنگیوں کے ہاں برگد' پیپل یا پھر شیشم کیکر کا بھی ہوتا ہے۔ مسلسل گھی تیل سے تتھڑے رہنے کی بناء پہ اس کی اصلی اوقات جات تو کہیں اندر دب کر رہ جاتی ہے۔ تب کہیں کوئی چندن گندن کا فرق باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں ایسے دیپک دونے ہر مندر' دھرم شالے اور سادھیوں میں استھانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

بہت پرانی بات! میں احمد آباد کُمبھ کے بڑے میلے میں' جدھر ہندوستان سمیت' دُنیا بھر کے ہندو مت' جین مت یاتریوں کے علاوہ دیگر مذاہب اور سیاحوں کا فقید المثال اجتماع ہوتا ہے۔ وہاں کچھ مختلف ہندو اور بین المذاہب تنظیموں کے زیرِ اہتمام مختلف نجم و نجت کے سیمینارز' کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ دُنیا بھر سے ہندو بین شرکت کرتے ہیں۔ میں بھی دو تین مرتبہ ان سیمیناروں میں شریک ہُوا...... ایسی بین المذاہب کانفرنسوں میں شرکت کے بہت فائدے سامنے آتے ہیں...... ایک دوسرے کو قریب سے جاننے سمجھنے کے مواقع ملتے ہیں...... تہوار تو ویسے بھی سانجھے ہوتے ہیں' مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ مل جل کر آپس میں پیار محبت بڑھایا جائے اور ہنس کھیل کر زندگی کو خوشگوار بنایا جائے وغیرہ وغیرہ...... میرا مقصد بھی یہی ہوتا ہے اس لیے میں کبھی بھی ایسا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا...... مذہب مسلک' ملک و ملت' رنگ و نسل سے بے نیاز ہو کے میں ہر اُس جگہ چلا جاتا ہوں جدھر لوگ...... بحث مباحث لڑتے جھگڑتے' گلے شکوے' چغلیاں' بخلیاں' نظارے

ورتارے کرنے نہیں' بلکہ دلوں کی کدورتیں' طبقاتی لسانی تضادات' دین و دھرم کی چپقلشیں' رنگ و نسل کی تفریقیں دور کرنے کی غرض سے شامل ہوتے ہیں۔''

ایسی ہی ایک کانفرنس کے دوسرے دور میں میرے ساتھ والی سیٹ پہ ایک عجیب وغریب حلیے کا بندہ آکر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اُس نے السلام علیکم کہہ کر مجھے چونکا دیا۔ جبکہ اُسے ہاتھ جوڑتے ہوئے نمسکار کہنا چاہیے تھا۔ گیروے رنگ کی دھوتی شالی' گلے میں جینؤ' ماتھے پہ قشقہ' چاروں اَبرو چٹ' پاؤں کھڑاویں ...... حتیٰ کہ اُس سے وہ مخصوص باس بھی آرہی تھی جو یہاں تیرتھوں کے پیشہ ور پنڈتوں سوامیوں اور سیوا کار یا پراتھنا سیوکار کرانے والوں پجاریوں کے جسم جثے کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے۔ مَیں ابھی اُسے صحیح سے سمجھنے کی کوشش میں تھا کہ اُس نے نہایت عجز و انکسار سے اپنا پر یچے کرایا۔ اس سے پہلے کہ مَیں بھی اپنا حدود اربعہ بتاتا' وہ خود ہی مجھے' میری بابت بتانے لگا۔ آپ کا شبھ نام بابا محمد یحییٰ خان ہے' بڑا شبھ' شانت نام ہے۔ آپ انگلینڈ سے پدھارے ہیں۔ آپ یہ ہیں' آپ وہ ہیں ...... جتنی بھی اچّی بچّی' وہ میرے بارے جانتا تھا اُگل کر سامنے رکھ دی۔ ظاہر یہ تمام معلومات' اُسے کانفرنس کے پروگرام بروشر سے ملی تھیں۔

پروگرام شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ ساتھ ساتھ بیٹھنے والے اس فارغ وقت میں ایک دوسرے کا سر کھاتے ہیں۔ وہی رٹی اور موٹی باتیں ...... جو محض باتیں ہی ہوتی ہیں۔ مگر اُس کی باتوں میں کچھ گھاتیں بھی ہوتی ہیں۔!

یہ جتنے بھی علیحدہ سے' نابغہ روزگار لوگ ہوتے ہیں' یہ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ مبہم یا مَعنی خیز' پُرمغز پُراسرار گفتگو ...... سیدھی بات کی بجائے گھما پھرا کے گفتگو کرنا اپنی قابلیت سمجھتے ہیں۔ یہ برہمن بھی کچھ یوں ہی تھا ...... نچلے سپتک میں بات کرتا تھا مگر بڑی پکّی! ...... اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران' اُس کی ایک بات نے مجھے دوبارہ اُسی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ جو کیفیت اُس کے پوری قرأت کے ساتھ ''السلام علیکم'' کہنے سے پیدا ہوئی تھی۔ کہنے لگا۔

''باباجی! میری نشست کہیں اور تھی مگر مَیں آپ کے ظاہری اور باطنی سیٹ اَپ سے متاثر ہوتے ہوئے' اِدھر آپ کے چرنوں میں بیٹھنے پہ مجبور ہوا ہوں۔''

ظاہری سیٹ اَپ تو سمجھ میں آیا۔ باطنی سیٹ اَپ پہ ٹھٹکا سا گیا۔

''مہاراج! مَیں بڑا مسرور کہ واقع ہوا ہوں' باطنی سیٹ اَپ کی ذرا وضاحت فرمادیں ......؟''

مجھے دزدیدہ نگاہوں سے تولتے ہوئے بولا۔

''بوتلیں تو آپ نے دیکھ رکھی ہوں گی ......؟''

میرے اثبات میں سر ہلانے پہ مزید گویا ہوا۔
''کچھ بوتلیں شیشے کی' کچھ چمڑے یا کسی دھات وغیرہ کی ہوتی ہیں۔''
مَیں نے مزید سر ہلا کر تائید کی۔
''شیشے کی بوتلوں میں جو سیال ہوتا ہے وہ تو دکھائی دیتا ہے مگر جو چمڑے یا دھات کی باٹلی میں ہوتا ہے وہ اوجھل ہوتا ہے۔''
''درست......!''مَیں نے ہونکتے ہوئے پھر جواب میں سر جھکایا......
''کچھ بوتلیں سفید شیشے کی ہوتی ہیں مگر اُن میں سیال مادہ کسی اور رنگ کا ہوتا ہے۔ اب بوتل خود کو زرد کر کے اندر کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ اسی طرح کچھ بوتلیں رنگدار ہوتی ہیں' وہ اندر کے رنگ کو اپنے رنگ میں رنگ ڈالتی ہیں۔ بس' یہی ظاہر باطن ہے......جس کا رنگ پکا ہوگا وہی رہے گا اور جو کچا ہوگا اُتر جائے گا۔ آپ کے اندر کا رنگ' ظاہر کی بوتل سے جھانک رہا ہے۔''
ظاہر ہے اس مُبہم سی دلیل' منطق یا گفتگو کا میرے پاس کوئی ظاہری جواب نہ تھا۔ زچ پڑ کر مَیں سوچنے لگا اس براہمن بقراطیے سے کس طرح جان چھڑاؤں؟......میری مسلسل خموشی کا پتا نہیں اُس نے کیا مطلب لیا۔ اَب اُس نے مجھے بور کرنے کا ایک نیا محاذ تلاش کر لیا۔ میرے دائیں ہاتھ کی تیسری اُنگلی میں سنگِ موسیٰ کا ایک جبری دانہ اِک زمانہ سے مقیم تھا۔ اُس کے اس قیام میں میری پسند مرضی کا کچھ زیادہ دخل نہ تھا۔ بس کبھی اُس سے قاہرہ میں یاد اللہ ہوئی جو اَب تک قائم تھی۔
''کیسا ذی وقار متکلم رتن ہے......؟''وہ اسے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
''ہاں اِس کے علاوہ مجھے سنگِ سلیمان' سنگِ یشب' سنگِ مریم بھی بہت گراں قدر لگتے ہیں......اور میرے خیال میں آپ کو سنگِ موسیٰ سے کچھ زیادہ ہی عقیدت ہے؟''مَیں نے اُس کے ہاتھ میں چھوٹے سے ترمنڈل کے منکے پہ سنگِ موسیٰ کی ایک چھوٹی گیٹی لگی دیکھ کر کہا۔
''ہاں' آپ کا خیال درست ہے۔ مَیں ناگ دیوتا کے بڑے مندر کا بھگت ہوں......ناگ دیوتا کی کرپا برکت سے ہر سمے ناگوں' سپیوں کے بیچ' اُن کی سیوا میں رہتا ہوں......''
وہ اپنے ہاتھ' سیاہ رنگت ترمنڈل کو دکھاتے ہوئے مزید کہنے لگا۔
''یہ میرے ہاتھ بھی ہر سمے یہ سیاہ شجرہ کا ترمنڈل رہتا ہے......ناگوں کو شانت شتحل رکھنے میں یہ ترمنڈل اور موسیٰ رتن بڑے کام آتے ہیں۔''
میری انگشت میں حجرِ موسیٰ اور ہتھ چھڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بابا! میں نے آپ اپنے ترمنڈل اور رتن کے بارے بتا دیا۔ اب آپ مجھے بتائیں' کیا آپ نے بھی یہ چیزیں' اسی کارن رکھی ہوئی ہیں' جس کارن میرے پاس ہیں؟''

میرے کسی جواب سے پہلے اس نے ایک بات اور کر ڈالی۔

''آپ تو مسلم ہیں اور مسلمان اُن چیزوں کو اہمیت نہیں دیتے جو ہمارے دھرم کا حصہ ہیں لیکن آپ تو مجھے کوئی گیانی دھیانی جاپ پڑتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے بھی وچار وہی ہوں جو میرے ہیں؟''

اُس نے مختصر سے وقت میں بہت سے سوال کر ڈالے تھے۔ مَیں نے کوئی صحیح غلط جواب دینے کی بجائے محض مسکرا دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ اسی دوران پروگرام بھی شروع ہو چکا تھا۔ وہ مجھے خاموش پا کر اُٹھ کر دھیرے سے اپنی نشست کی جانب بڑھ گیا جو دو قطار پیچھے تھی۔

سر پڑی رات' جب مَیں تھکن دُکھن سے بے حال' نڈھال سا اپنے ہوٹل پہنچا تو یہ مہاشے' باہر سڑک کنارے' برگد کے پیڑ کے پیڑے پہ سر دھرے سائیں بابا کے سامنے کھڑے اپنے دھیان سے سر جھوڑے' سراپا عجز و انکسار بنے ہوئے تھے۔ مجھے لگا وہ ایک پیشہ ور پجاری' پنڈت سے کچھ آگے ایک اچھے گیانی دھیانی منیجھ بھی ہیں!

دوپہر پہلے کی اُدھوری ملاقات میں اُس کی بھید بھری باتوں' خاص طور پہ سنگِ موسیٰ اور چندن کاٹھ کے ترمنڈل کی بابت گفتگو سے مَیں خاصا فیض یاب ہُوا تھا پھر اُس کے وہاں سے اچانک اُٹھ جانے سے مَیں اندر ہی اندر کچھ مایوس بھی ہُوا' پروگرام' اس کے اوقات کی مجبوری پیشِ نظر تھی لیکن اس کے باوجود اس سے سیر حاصل گفتگو اور نشست کی خواہش' دل ہی دل میں کہیں جڑ پکڑ چکی تھی......

مجھے نت نئے اور قدیمی پُراسرار علوم و فنون جاننے سمجھنے اور سیکھنے کا لپکا ہمیشہ سے ہی رہا...... اسی جنوں کی خاطر' دُنیا جہاں کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ جہاں جدھر کوئی نئی بات' گھات مات دکھائی دیتی ہے اُدھر ہی نکل لیتا ہوں۔ اسی بدھوان میں بھی مجھے کسی وچارک کا پرکاش دکھائی دیا' پہلی مختصر سی ملاقات میں ہی دو چار نئی باتیں پلے پڑ گئی تھیں جبکہ مَیں ان کے بھیتر کی بدیا کی پوری کی پوری گٹھڑی پہ نظریں جمائے بیٹھا تھا۔''

اسے اپنے ہوٹل کے دروازے کے قریب یوں پا کر مَیں حیران تو ضرور ہوا مگر پریشان نہیں کہ میری زندگی میں ایسا کچھ تو صبح و شام سرزد ہوتا رہتا ہے۔ مَیں اُس کے دھیان میں کھنڈت نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ایک ہی صورت تھی کہ انتظار کروں...... اس کی نوبت نہ آئی' اچانک پلٹا اور میری جانب بڑھ آیا۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی نستعلیق سی السلام علیکم کہتے ہوئے میرے قدموں میں جھک کر چرن چھونے لگا تو مَیں نے اُسے کندھوں سے دبوچ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''مہاراج! مَیں ایک بَجس پشو ہوں..... مجھے میری جگہ ہی رہنے دیں..... بڑی کرپا ہوگی؟
نرم نگاہوں سے نکالتے ہوئے بولا۔

''پرنتو آپ مہان بھی ہیں' وِدوان بھی اور ہمارے مہمان بھی..... مَیں آپ ہی کی طرف آیا تھا.....
میرے کارن کوئی سیوا.....؟''

میرا کوئی جواب لیے بغیر ہی مزید کہنے لگا۔

''مَیں آپ کو بظاہر معمولی مگر ایک بھیدوں بھرا تحفہ بھینٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

مَیں نے بڑی حیرت سے اُس کی یہ بات سُنی' ظاہر ہے سرِ راہ کھڑے ایسی باتوں کی بحث کچھ مناسب نہ تھی لہٰذا مَیں نے اُسے اپنے ساتھ ہوٹل آنے کی دعوت دی۔ سرِ نیوڑھائے بڑی ''سعادت'' سے وہ میرے ساتھ ہولیا..... دن بھر سننے سنانے کی مشقت سے گو طبیعت سخت بیزار تھی لیکن اس کی پُراسرار شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ اس کے ساتھ بڑی دلچسپی اور خوب مزے سے اچھا وقت بیتایا جا سکتا تھا۔ میرے اندر ایک تصویر خانہ ہے۔ میرے مطلوبہ معنوں کی وہاں خود بخود شبیہ اُبھر آتی ہے۔ میرے ذہن کی آرٹ گیلری میں وہ ایک نرم آنچ والوں شعلوں کی تصویر کی طرح سج چکا تھا۔

## ● علموں بس کریں او یار.....!

سچا سودا جس کے پاس ہو وہی بدھوان اور دھن وان ہوتا ہے۔ عشق' مجبوری اور طلب..... مذہب مسلک' خطۂ طبق' رنگ و نسل' سن و سمبند وغیرہ کے مرہونِ منت نہیں ہوتے۔

بنیادی طور پہ علم کی دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں' علم نافع اور علم ناقص..... علم نافع' طالب علم میں سلامتی' رواداری' تحمل برداشت اور یگانگت کے رَوِیے پیدا کرتا ہے اور سب سے بڑی بات کہ خودشناسی کے بعد خداشناسی کی نشاندہی بھی کرتا ہے جبکہ علم ناقص' راہِ مستقیم سے بھٹکا کر دین و دنیا کی بربادی کی راہ پہ ڈال دیتا ہے۔ نفرت' کدورت' طمع لالچ' خودغرضی' حسد و فساد اور فسق و فجور کی ترغیب کا موجب بنتا ہے۔ ایسے علوم و ہنر' شوق و شغل' محافل و مجالس' جو وقت کا ضیاع' اخلاق و اعمال تباہ اور اللہ رسول قرآن کی راہ سے گمراہ کر دیں' علوم ناقصہ ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہی علوم' شیطانی ترغیبات ہیں لیکن ان علوم فاسقہ ناقصہ کی بابت' معقول سی جانکاری رکھنا' کہ اِن کے بد اثرات اور نقصانات سے خود اور اللہ کی مخلوق کو بچایا جا سکے' چنداں عیب نہیں..... یا یوں کہہ لیں کہ علم کی نہ تو کوئی جنس یا جذبات ہوتے ہیں اور نہ کوئی مذہب و مسلک..... نہ عربی اور عجمی ہوتا ہے

اور نہ اس کی کوئی جمع و تفریق؟...... علم تو عمل کرنے سے قبل یہ جاننے کا نام ہے کہ اس کا نتیجہ خیر' سلامتی اور منشائے قدرت و فطرت ہے یا پھر اس کا ماحصل' خصومت و خرابات؟...... شیطان لعین کی پیروی یا کسی کو خدع دینا ہے؟ کسی کو نیچا دکھانا یا عزتِ نفس مجروح کرنا ہے؟...... نتیجہ یہ نکالا کہ علوم' آگاہی' گیرائی' باطنی بصیرت چشم کشائی اور وجدان و اَذہان کی ذاوری کے لیے ہوتے ہیں۔ اُسے جاننے پہچاننے اور ماننے کے لیے ہیں جو ہمارا سب کا رَبّ ہے......!

کیا خوب بات کی؟...... آئینہ اپنے دونوں رُخوں کے سیاق و سباق سے آئینہ کہلاتا ہے۔ ہلیم کا ہو خلب یا سکندر یہ کا...... اس کا کام' ظاہر کے خدوخال کا عکس دکھانا ہی ہوتا ہے...... بباطن جلوے دکھانے والے آئینوں کے پشت پہلو آب نقروے نہیں...... تہلیل و ذکرہ سے صیقل ہوتے ہیں۔

بات کا کیا ہے؟ بڑھتے بڑھتے قامتِ یار تک جا پہنچے...... میرے ہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اختیار کچھ نہیں...... قلم کا کابلی ٹٹو جدھر چاہے نکل جائے؟ خرطوم کے اَبلق گھوڑے' جون پور کے گدھے' خراسان کے خچر اور کابل کے ٹٹو...... لدھیانے اور لاہور کے لٹو...... کانپور کے کنکوے' پشاور کی لنگیاں اور تانگے...... دہلی والوں کے ڈبے...... ممبئی کی بھیل' تملہ گنگ کا تیل...... نیلی بار کی بھینس' سیلون کی چائے...... رام پور کے چاقو' جموں کے جامن اور ہری دوار کے پانڈے' پنڈت اور برہمن......؟

بات برہمن کی ہو رہی تھی جو ساتھ بیٹھا چائے سرک رہا تھا دیے کی لَو گی بندھی سی ہو تو دھونک دھانس نہیں دیتی۔ تعلق وہ جو طرحدار ہو...... طرفہ نہیں' طرفین کے دلی طمانیت کا باعث ہو۔ جس کی خشتِ اوّل' اخلاص سے تعمیر ہو تو تعلق' گردشِ زمانہ اور حوادثِ شب و روز کے جھٹکوں سے بچا رہتا ہے اور اگر تعلق' تملق اور دُنیا کے اغراض اور مقصد براری کے لیے ہو تو وہ موسمی ہوتا ہے۔ بے خوشبو کے پھول کی طرح...... رنگ بھی' جمال بھی مگر نکہت وَنُور کا کمال نہیں ہوا......

کہیں نہ کہیں' کبھی نہ کبھی دو اجنبی ایسے بھی آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ جو کسی معاملہ میں بھی اک دوجے کے لیے نامحرم نہیں ہوتے۔ شاید ہم دونوں کے بیچ میں یہی معاملہ تھا۔ یک جنس تو پھر آپس میں اک ڈگر گر والے ہوتے لیکن دیگر جنسوں والے بھی کہیں ایسے رَل مل جاتے ہیں کہ یقین نہ آتا بلکہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مَیں نے اپنے مشاہدات تجربات سے نتیجہ نکالا کہ ''مَن ملے کا میلہ اور چت ملے کا چیلہ'' والی بات بالکل دُرست ہے۔ اصل بات تو ہر دو کا قارورہ ملنے کی ہوتی ہے۔ جدھر یہ جُڑ گئے' بے لوث دوستی کی کاک ٹیل تیار ہوگئی۔

دن بھر کی مصروفیات پہ ہلکی پھلکی بات چیت کے بعد اچانک اُس نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا!

''مہاراج! میں نے آج کانفرنس میں ہندو مت کے استھانوں' تہواروں' اس کا فلسفہ' آواگون' شاستروں پُرانے پُرانوں' ویدوں کے بارے آپ کے وچار سُنے...... یقین کریں میں نے آج تک کسی مسلم تو کیا' کسی ہندو سکالرز' بدوان سے بھی ایسی حقیقت افروز اور معلومات بھری باتیں نہیں سنیں۔''

وہ میرے گھٹنے چھوتے ہوئے مزید بولا۔

''شبھ نام' لباس اور وضع قطع سے اگر آپ مسلم جاپ نہ پڑتے تو میں آپ کو کوئی مہادیو پرم گروہی گرداننا......!''

وہ نہایت لجاجت سے میری تعریفیں کر رہا تھا اور میں شرمندگی کے ساتھ سُن رہا تھا اور اس کی کوئی وجہ بھی تلاش کر رہا تھا جو سرِ دست سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جب پُرش' کسی انجانی پریشانی یا کسی مخمصے میں مبتلا ہوتا ہے تو اُس کا نتیجہ مختلف بدگمانیوں یا خوش فہمیوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ایسے ایسے وہم اور خیالات اپنے حصار میں کھینچ لیتے ہیں کہ اُسے خود پہ ہنسی آتی ہے۔ مجھے بھی کچھ لمحوں کے لیے یہ احساس ہوا کہ یہ پنڈت' خفیہ کا کارندہ ہے جو مجھے ٹٹولنے کے لیے میرے ذوالے ہے...... یہ بھی کہ کوئی فراڈیہ ہے مجھے لُوٹنے کے چکر میں ہے۔ انسانی ذہن جب ایک بار ڈھلوان پہ پھسل جائے تو بڑی دور تک پھسلتا ہی چلا جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال' جبکہ وہ بہت اچھا انسان تھا...... مجھے انوکھا سا مسلمان پا کر اصلیت کُریدنا چاہ رہا تھا۔

اچانک اُس نے حسبِ توقع ایک اور سوال داغ دیا۔

''آپ مسلمان پاکستانی ہیں اُدھر اجمیر شریف یا نظام الدین بھی حاضر ہوئے یا اِدھر ہی......؟''

مجھے شاید یہی جواب کہنا چاہئے تھا۔

''مہاراج! اس دھرتی پہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی پوتر استھان یا کسی مہان منش کی سمادھی مدفن نہ ہو۔ اس کے لیے کسی دین دھرم کی شرط نہیں ہوتی۔ ساگر صحرا پربت پرتھوی' گھٹائیں ہوائیں' فضائیں وغیرہ' انسانوں کے لیے ہیں' دھرموں کا کوئی تعلق...... پیشتر اس کے وہ کوئی جواب دیتا...... میں نے مزید بات کو ایڑ لگا دی۔ ''آپ دہلی اجمیر شریف اور کلیر شریف جاتے ہیں۔ میں بھی ہردوار' متھرا بنارس گھنٹہ آتا ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ سب اُسی ایک مالک کے چمتکار اور رنگ ہیں' جس پہ جو رنگ چڑھ گیا؟ رنگ رَجوا کے ہاں' کالا' گیروا ہی نہیں...... نیلا پیلا' ساوا' ہرا' اودھا جامنی رنگوں کے علاوہ رنگ پُختہ اور رنگ کاٹ بھی ہوتے ہیں۔ وہ کچے کو پکا' پکے کو کچا' چڑھے کو اُتارتا اور اُترے کو چڑھاتا ہے۔''

قارئین! آپ حیران ہوں گے اُس نے جواب میں ''سبحان اللہ'' کہا لیکن میرے لیے یہ بھی کوئی حیرت کی بات نہ ہوئی کہ میں نے بڑے بڑے کافروں کو بہتیرے مومن اور اچھے اچھے خضر صورت بزرگوں

کے باطن کو شیطان کی آماجگاہ دیکھا ہے۔ اسی لیے کہا گیا "جب تک کسی کے ساتھ پانچ سیر نمک نہ کھا چکو' دوست مت کہو...... جب تک کسی کے تلووں تلے' تین تلاؤ' کالے تل مدھوانہ لو کبھی سفر میں اپنا ساتھی نہ بناؤ۔

بھارت سمیت دُنیا بھر میں' مسلمانوں کے علاوہ ہندو' سکھ' عیسائی' یہودی اور دیگر مذاہب و مسلک والے میرے عقیدتمند اور تعلقات والے ہیں...... ہمارے تعلق رشتے زیادہ تر انسانی بنیادوں پر اُستوار ہیں اور اگر کہیں بے ضرری رُوحانیت یا تصوف کے حوالے سے کوئی تعلق جڑ پکڑ لیتا ہے تو وہ بھی بہت متوازن ہوتا ہے۔ میرے اکثر غیر مسلم بچے' آتے جاتے السلام علیکم اور کھاتے پیتے الحمدللہ کہتے ہیں...... ماشاءاللہ' سبحان اللہ اور جزاک اللہ وغیرہ تو اُن کا معمول بنا ہوتا ہے۔ انسانیت' اخلاقیات' حفظِ مراتب اور دیگر ہلکے پھلکے موضوعات پہ بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ میرا انداز گفتگو ناصحانہ اور ناقدانہ نہیں بلکہ دوستانہ مشفقانہ اور روزمرّہ والا ہوتا ہے۔ میری صحبت و قربت میں وہ اجنبیت اور تکلف نہیں اپنائیت اور آسانی محسوس کرتے ہیں۔ میری حیثیت یا اہمیت (جو کچھ بھی نہیں) کے تلے وہ خود کو دابو نہیں سمجھتے...... میں انہیں باور کراتا رہتا ہوں کہ ہم سب ایک دوسرے کے لیے اہم ہیں...... اک دوجے سے سیکھتے سکھاتے ہیں۔ خلوص اور انسان دوستی کے رشتے روابط تعلقات اگر برابری اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پہ اُستوار ہوں تو اُن میں برکت رہتی ہے۔

لگتا تھا جیسے وہ مجھے مجھ سے کہیں زیادہ جانتا ہے۔ حافظ نابینا لوگ' بینائی والوں سے کہیں زیادہ صحت کے ساتھ دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ یہ اندر باہر کے اندھیروں اُجالوں کی زیارت و ریاضت کی بات ہوتی ہے۔ ہندوؤں وِدھ حوالوں میں تو سریر چھایا اور اُنگ مایا کی شکتیاں بدرجہ اُتم ہوتی ہے۔ پرکھ پھیرو' پنتھ پروکش' کچھ بھی تو ان سے اوجھل نہیں ہوتا۔

ان بھید بھری باتوں کی گھاتوں میں سے کی سمیا کا کچھ دھیان نہ رہا...... میری آنکھوں میں تھکن کی مدھرا اور بیتتے سمے کی بدھرا کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے جانے کی آگیا کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! میرا سو بھگ کہ آپ کے چرنوں میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ من میں تھا میں آپ کو اپنا مہمان بناتا' جتنے بھی روز آپ اِدھر ہوتے' آپ کی سیوا میں رہتا۔ میری مستقل سکونت' ہری دوار میں ہے۔ کلیر شریف سے صرف چودہ پندرہ کوس کا فاصلہ...... مجھے خوب علم ہے آپ وہاں صابر پیا کے ہاں چوگھٹ چومنے جاتے ہیں۔"

میں جھٹ بول پڑا۔

"ہری دوار بھی بابا سبز برگ' سوامی نوشاد صابری کی درگاہ کی بھی زیارت کرنے ضرور جاتا ہوں۔"

حسبِ عادت' مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں' پانچ برس پہلے میں نے آپ کو وہیں دیکھا تھا۔ مگر مالک کی اچھیا نہیں تھی' اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔'' اپنے ہاتھ کا عصا' مجھے دیتے ہوئے مزید بولا۔'' یہ ایک معمولی سی بھینٹ ہے' دس برس پہلے سوامی نوشاد صابری کے ایک کشمیری چیلے نہال چند صابری جو ہر برس حضرت بل شریف سے' ادھر پہنچ کر بڑی فاتحہ کرواتا تھا۔ مجھے یہ عصا' یہ کہتے ہوئے دیا تھا...... اپنے ہاتھ رکھو' تمہیں بڑی شکتی ملے گی اور سب سے بڑی بات کہ تمہیں کبھی ادھر اُدھر ہونے نہیں دے گا۔ یہ شکتیوں والا کرمنڈل' ویسا ہی ہے جیسے گڈریے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ منچھ کے بھیتر کی بکریاں کبھی باندھی نہیں جاسکتیں مگر باڑے کی جانب ہانکی جاسکتی ہیں۔ جس کے لیے کسی کرمنڈل ڈنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف بیوقوف بکریوں کو دکھاؤ ملتا ہے بلکہ خود گڈریے کو بھی بدطینت بھیڑیوں گیدڑوں سے بچاؤ رہتا ہے۔''

میں نے حیرت بھری نظروں سے اس سیاہ عصا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مہاراج! آپ اپنے ہاتھ کی سوبھا' جو اتنے بڑے بزرگ نے آپ کو تحفہ میں دی' مجھے کیوں دے رہے ہیں؟...... ایسے سوبھاگیہ اور انمول خزانے آگے دینے کے لیے نہیں...... پیڑھیوں سنبھال کر رکھنے کے لیے ہوتے ہیں؟''

عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا......!

''خزانہ کے لیے حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ کمزور منش خزانے کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ دس برس تک اس کرمنڈل نے میری اور میں نے اس کی حفاظت کی...... اب آپ کو دیکھ کر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ یہ آپ کے کام کی چیز ہے۔''

اک عجیب سا ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ کبھی میں اُسے' کبھی عصا' اور اس کی گنجلک باتوں اور انکشافات پہ غور کر رہا تھا۔ میں اپنے تئیں کسی حتمی نتیجے پہ پہنچے بغیر پوچھ بیٹھا۔

''پرنتو! کوئی ایسا کارن تو ہوگا جس کی بنا پہ ایسا حکمت بھرا کرمنڈل مجھے بخشا جا رہا ہے؟''

وہ پھر فلسفہ جھاڑنے لگا۔

''آپ تو بہتر جانتے ہیں کہ اس سنسار میں جیون سمیت' ہر چیز عارضی اور وقتی طور پہ آپ کے پاس ہے...... اپنے اپنے سے' اپنی ڈیوٹی ختم کر کے ہر کوئی اپنے انت کی جانب لوٹ جاتا ہے۔'' اناللہ وانا الیہ راجعون'' کا مطلب بھی آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں...... آپ ادھر پدھارے' کل ول اپنے وطن' اپنے گھر واپس لوٹ جائیں گے اور پھر...... کبھی جب سے لگے گا آپ اُس گھر سے بھی آگے' اپنے اصلی گھر منتقل ہو جائیں گے اور پھر...... پھر......؟''

میں کرمنڈل یعنی عصا، کو دیکھ کر اندر ہی اندر کانپنے لگا تھا۔ جیسے یہ کوئی عصا نہ ہو فرعون کے درباری جادوگروں کا کوئی سانپ ہو...... میں اپنے آپ سے خود کلامی کر رہا تھا۔ مسلمان کو کم از کم توہم پرست نہ ہونا چاہیے......!

اس پُراسرار پجاری' پورو پروہت' چنچلر سے پُرش نے' میرے چہرے سے نگاہیں ہٹائے بغیر یہ صندل کاٹھ کا عصا' جس کا مڑا ہوا متھا' ہاتھی دانت اور کانسی کا جبکہ اس کا بھیتر گورو چندر کا مصمت تھا' میرے ہاتھ تھما دیا......

ہتھ چھڑی اور عصا، میں فرق...... لمبائی اور موٹائی کا ہوتا ہے۔ ہتھ چھڑی کا متھا' لٹو یا گیند کی مانند گول یا نصف دائرہ کی طرح ہوتا ہے۔ عصا' قریب قریب قد آدم کے برابر اور اس کا متھا نہیں ہوتا۔ ایک قسم کی لٹھ' جس کے دونوں سیرے' ہلکے سے فرق کے ساتھ' ایک سے برابر ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا۔ جس نے اژدھا کی صورت اختیار کر لی تھی یا جس کے پڑنے سے دریائے نیل شق ہو گیا تھا۔ حضرت سلیمان کا تاریخی عصا...... اسی طرح قریب قریب ہر نبی پیغمبر نے ہتھ چھڑی کو کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہاتھوں میں رکھا ہے۔ قدرت نے اس عمل میں بڑی مصلحت اور برکت رکھی ہے۔ ڈنڈا' چھڑی' لٹھ' عصا' کرمنڈل' سوٹی' لاٹھی' ڈانگ وغیرہ...... مختلف نام کام...... افسر ہو' استاذ' چوکیدار' نمبردار' چرواہا' گڈریا' سرکاری درباری اہلکار' قریہ قریہ گھومنے والے' درویش فقیر' بھیک مانگنے والے' دریوزہ گر' بیمار لاغر بوڑھے' مسافر شکاری اور جادوگر فسوں کار...... یہ کسی نہ کسی شکل وصورت' سب کے ہاتھ ساتھ رہی...... بگڑوں تگڑوں کو راہ پہ لانے کے لیے' پھل پتے جالے اُتارنے کے لیے...... آگ الاؤ دہکارنے کے لیے...... دشمن' وحشی جانوروں سے بچاؤ کے لیے۔ گہرائی اُونچائی جانچنے کے لیے...... سرکھولنے اور نیل گھولنے کے لیے...... لٹھ ماراں بلی ماراں علاقوں محلوں کے نام بھی ہیں...... چور اور سپاہی بھی اسے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ گتکا' لٹھ بازی تو باقاعدہ فنِ حرب میں شمار ہوتے ہیں......

سرکس میں خونخوار شیر رنگ ماسٹر سے نہیں اُس کے ہاتھ کی پتلی سی چھڑی سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ مدرسے کے شریر لڑکے لونڈے' ماسٹر کے ڈنڈے سے سوتر میں رہتے ہیں۔ شعبدہ باز پتلی چھوٹی سی کالی چھڑی سے ہی ہیٹ سے خرگوش نکالتا ہے۔ اس طرح سانپ' کیسا بھی پھرتیلا' زہریلا کیوں نہ ہو...... شکاری کے ہاتھ کی چھڑی یا سوٹے ڈنڈے کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں تو میں نے ایسے مخصوص اوزار نہیں دیکھے جو ہر قسم کے سانپ کو پکڑنے یا بے بس کرنے کے کام آتے ہوں مگر باہر کے ممالک میں یہ ایک عام ہتھیار یا اوزار ہے جس سے سانپ آسانی سے پکڑا جا سکتا

ہے۔ یہ ایک پتلا ہلکا سا ساڑھے چار پانچ فٹ لمبا اندر سے کھوکھلا آہنی پائپ ہوتا ہے۔ پکڑنے کے لیے ایک طرف دستہ جیسے جھ چھڑی کا ہتھا اور اگلے سرے پہ سانپ کو پکڑنے کے لیے ای زنبور کی سی شکل کا آنکڑا جو پائپ کے اندر ایک تار سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ تار دستے کے ساتھ لگی ایک نب سے کھینچی جا سکتی ہے...... سانپ کو پکڑنے کے لیے ذرا دور سے اُسے راڈ کے آنکڑے میں لایا جاتا ہے۔ جونہی وہ آنکڑے کی زد میں آتا ہے' دستے کی نب کو دبا دیا جاتا ہے جس سے آنکڑے کا منہ بند ہو جاتا ہے اور سانپ آنکڑے میں پھنس کر بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

مَیں نے خاندانی تجربہ کار سپیروں کو خالی ہاتھوں سے خطرناک سانپوں کو پکڑتے دیکھا ہے۔ عام آدمی تو خوف و دہشت کی وجہ سے سانپ کے قریب نہیں جاتا جبکہ سبھی سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔ جو لوگ' سانپ کی سائیکی اور فطرت و جبلّت کو سمجھتے ہیں اُن کے نزدیک یہ محض رینگنے والا' انتہائی بزدل سا کیڑا ہے۔ سوائے دو چار خاص نسل کے سانپ یا پھر وہ سانپ' جو مخصوص ماورائی پُراسرار استعانتوں کے حامل' ارضی طاغوتی اندر جال اور ابلیسی قوتوں کے پروردہ ہوتے ہیں۔

عصاء جو اُس پنڈت نے' بن مانگے میرے ہاتھ تھما دیا تھا خاصا قدیمی دکھائی دیتا تھا۔ بظاہر ایسا بھاری دکھائی نہ دیتا تھا مگر جب مَیں نے اُسے اُٹھا کر جانچا تو لگا جیسے اِس میں پارہ بھرا ہوا ہے۔ کالا کاہو' شمشاد' صنوبر' عود اور پکے صندل کی لکڑی' دیکھنے میں ایسی بھاری نہیں دِکھتی مگر اُٹھاتے وقت لگتا ہے جیسے فولاد اُٹھایا ہوا ہے۔ پکّی' گھر اور دم والی مضبوط......!

عموماً ہتھ چھڑیاں' عصاء اور لٹھ انہی درختوں کی لکڑی سے تیار ہوتے ہیں۔ کچھ خاص عصاء' چھڑیاں...... بید مجنوں' صنوبر' زیتون' اخروٹ' چیڑ اور آبنوس کی قیمتی چوب سے بھی تیار ہوتی ہیں۔ بادشاہوں حاکموں روحانی ہستیوں کے لیے نقش و نگار' کندہ کاری والی چھڑیاں عصاؤں پہ چاندی سونے' پیتل تانبے کے چھلّے' شامیں' گھومبڑے' نکیل کوکے' قیمتی حجرات' سیپ موتکے' دانشوروں کے اقوال' مقدس آیات' شبد' لوحیں' نقشے تصویریں بھی بنائے جاتے ہیں۔ بارہ سنگھے کے قیمتی سینگ' ہاتھی' گھڑیال' گینڈے کی کھال ہڈی' دانت...... اُونٹ کے کوہے اور پسلی کی استخوان بھی مُٹھے' دستے کے طور استعمال ہوتے ہیں۔ دریائی بیری اور صحرائی اُوک کی کچھ شاخساریں ایسی قدرتی وضع قطع کی حامل ہوتی ہیں کہ وہ سانپ کے جسم کی طرح دکھائی دیتی ہیں...... لگتا ہے پورا سانپ ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے۔ کئی پرانی تصویروں اور فلموں میں کاہنوں' جادوگروں اور بادشاہوں کے ہاتھوں میں ایسے عصاء دیکھنے کو ملتے ہیں کہ وہ ہو بہو سانپ لگتے ہیں۔ ہیر رانجھا کے موضوع پہ بننے والی کسی بھی دَور کی فلم کو دیکھیں' ہیر کے چاچا کیدو کے ہاتھ میں ایسا ہی سانپ کی وضع قطع والا عصاء دکھائی

دے گا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہی عصا، اُس کے کردار افعال و اعمال کی پوری پوری عکاسی کا مظہر دکھائی دیتا ہے......''

کچھ خاص الخاص عصا، یا ہتھ چھڑیاں بھی ہوتی ہیں...... کسی میں زہر میں بجھی ہوئی انی' جو دستے پہ اک خاص جگہ دبا کر دباؤ ڈالنے سے باہر آتی ہے' کسی میں پتلی سی شمشیرِ براں' جو وقت ضرورت ایک مکمل ہتھیار کا کام دیتی ہے۔ ایسی ہتھ چھڑیاں بھی جو بندوق کی طرح فائر کرتی ہیں۔ کچھ عصا اور ہتھ چھڑیاں جن کے دستوں کے خفیہ خانے میں زہر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اک خاص انداز سے گھمانے پہ کسی مشروب یا طعام کو زہر آلودہ کیا جا سکتا ہے......''

آسمانی کتابوں' ارضی پرانے پرنوں' تاریخی صحیفوں اور اساطیری داستانوں میں پُراسرار غیبی قوتوں والے عصاؤں' جادوئی چھڑیوں اور محیرالعقول اثرات والے ڈنڈوں' بلّیوں لاٹھیوں کے اذکار ملتے ہیں۔ پیار اور شرافت کی زبان جب بے اثر ہو جائے تو پھر ڈنڈے کی زبان سے فائدہ ہوتا ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہوا کہ کچھ افراد' قومیں' ممالک' معاشرے' ماحول' بچے' بیویاں' عوام' حاکم' رشتہ دار' وقف کار' ملازم' ادارے وغیرہ ڈنڈے کی زبان ہی سمجھتے ہیں...... بچپن سے سنتے آئے ہیں۔

''چار کتاباں آسمانوں آئیاں پنجواں آیا ڈنڈا......!''

ڈنڈا' چھڑی' ہاتھ میں رکھنے کے لیے کسی عمر کی شرط نہیں' یہ عمر سے نہیں ضرورت اور اہمیت سے ہے۔ البتہ عصا اور چیز ہے۔ اس کا تعلق یا ضرورت' عمر حیثیت بزرگی' مرتبت و منزلت سے ہوتی ہے۔ علماء' فصحاء' مفتیوں' قاضیوں' فقیہوں کا روزمرہ ہے۔''

سمندری جہاز دُھند میں اور ہوائی جہاز جب بادلوں میں اُترے ہوئے ہوں تو وہ کسی معصوم بچے کی طرح' کمپیوٹر کی اُنگلی پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بابے بوڑھے' حافظ نابینے' فقیروں بھکاریوں' دردر ماروں کے لیے یہ بھی ایک حفاظتی کمپیوٹر کی طرح ہوتا ہے۔ مَیں بھی جب سے بھرپور زندگی کی زد میں آیا تو خاص طور پہ ہاتھ کا عصا' اور سر کی چادر' کبھی علیحدہ نہ ہوئی۔ یہ دونوں میرے حفاظتی کمپیوٹر ہیں...... مَیں کم از کم ان دونوں کے بغیر' گھر سے باہر نکلنے کا تصور نہیں کر سکتا۔''

سر کی لمبی سیاہ چادر کی بکل تو ایسے محسوس ہوتی ہے کہ مَیں اپنی ماں کی گود میں بحفاظت بیٹھا ہوں...... دُور نزدیک کوئی اَلم پریشانی دُکھ درد میرے قریب نہیں...... گرمی سردی' آندھی بارش دُھوپ آنچ' خوش نظری بدنظری' کسی بھی چیز کا کوئی اثر نہیں ہوتا' مَیں مامون و محفوظ رہتا ہوں۔ اسی طرح ہاتھ کا عصا' تو جیسے میرا ہمزاد ہے...... مجھے کہیں بھٹکنے نہیں دیتا' ہردم سنبھالا دیتا ہے...... راہ راستے کا ہر دلدر دُور کرتا ہے' ضعیف البصری کے

سب کہیں میری تیسری آنکھ کا کام دیتا ہے اور کہیں ناتوانی میں توانائی بڑھاوا' اُٹھنے بیٹھنے میں مدد...... کسی محفل کانفرنس میں طویل نشست کے دوران بیٹھے بیٹھے اس سے ٹیک لے لیتا ہوں۔ طبیعت اُوب جائے تو بدمزگی دُور کرنے کی خاطر اس کے دستے کو گھما گھما کر خود کو بہلاتا رہتا ہوں۔ راہ میں پڑا کیلے کا چھلکا' روڑا پتھر ہٹا لیتا ہوں۔ سڑک کراس کرنی ہو تو اس کو سیدھا کر گزر لیتا ہوں...... ویسے بھی تجربہ ہوا ہے کہ عصا یا ڈنڈا بردار بوڑھے یا بزرگ بابے کی عزت قدر بہت ہوتی ہے۔ ہجوم میں خود بخود راستہ بن جاتا ہے۔ کُتّے بِلّے نشئی جیب کترے بھک منگے قریب نہیں پھٹکتے۔ آس پاس بچے بالے شور شرارتوں سے باز رہتے ہیں۔ گھر میں بہو بیٹیوں کے سروں پہ دوپٹہ ٹکا رہتا ہے۔ غرضیکہ ایک ڈنڈا' سو تحفے......!

قارئین! آپ نے میری کتاب "پیارنگ کالا" کے سرورق پہ اس ڈنڈے کی زیارت کی ہوگی۔ یقین فرمائیں کہ کئی میرے بگڑے ہوئے نمونے باز' نجومند' ویلے نکمے' کمپیوٹر زدیے بچے' محض یہ ڈنڈے والا ٹائٹل دیکھ کر ہی تائب ہو گئے...... یہ ساری ڈنڈے کی برکات وصدقات ہیں لیکن ڈنڈا ایجنگ گھومنے والے کے ہاتھ کا نہیں...... بابا ڈنڈے والے' امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ہاتھ والا' یا پھر اُن کے کسی غلام کے ہاتھ والا......!

چندی گڑھ کے اسی فارم میں واپس چلتے ہیں جس کے ایک کونے میں دو کمروں کے ماڈرن کاٹیج کے بیک یارڈ میں کچن کے دروازے کے ساتھ پانی کے پائپ والے سوراخ کے سامنے کھڑا ہوں اور ہاتھ میں وہی ہردوار والے پنڈت جی کا تحفے میں دیا ہوا چٹکاری صندل کا ٹھ کا عصا' جسے میں نے اُلٹا پکڑا ہوا ہے...... دستے والا مڑا ہوا حصہ سوراخ کی جانب اور نیچے والا حصہ میرے ہاتھ میں۔ پاس کالا کتا اپنے تئیں ہوشیار' دُم اُٹھائے دَم بخود و تیار کھڑا' سوراخ سے اُسی خوفناک پُراسرار شیش ناگ کو باہر سرکتے دیکھ رہا ہے۔ سانپ کا پیٹ پھولا ہوا کہ اُس نے تھوڑی دیر پہلے ایک خوبصورت عورت' جو ایک بچی کی ماں بھی تھی' کا دودھ پیٹ بھر کر پیا ہے......

سانپ کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ پیٹ بھرنے اور کسی کو کاٹ لینے کے بعد انتہائی سُست ہو جاتا ہے۔ وہ کہیں پڑ کر آرام کرنا پسند کرتا ہے۔ ایک بات اور بھی کہ اگر وہ ایک بار کسی سوراخ یا بل میں اپنا سر داخل کر لے تو پھر اپنا پورا جسم بھی اُدھر سے گزارتا ہے۔ اس کے سوراخ سے آہستہ آہستہ باہر نکلنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی کہ سوراخ' خالی پیٹ کے لیے کشادہ مگر بھرے پیٹ کے لیے قدرے تنگ تھا...... میں اور ساتھ کھڑا کالا کتا...... اس پہ مُستزاد میرے ہاتھ میں عصا' صندل سیاہ کا...... اور اُس کا دستہ اُس کے لیے آنکڑا' جس کے اندر گورو چند کی بوٹ پڑی تھی...... اور سورج مہاراج پہلی پنتھ پہ پدھار رہے تھے۔ جس کی نرل کرنیں اُس کے لیے تیز برچھیاں تھیں۔ شیش ناگ کو ہر حال میں سوراخ سے باہر نکلنا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔

بساطِ زندگی کی ہو..... شطرنج کی ..... یا کسی مقصد، منزل اور یا پھر عشق و محبت کی ..... ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ بڑے سے بڑے شاطر کا ''شہ'' حالات اور عمل مکافات کے ایسے گھر میں پھنس جاتا ہے کہ اُسے کوئی راہِ مفر سجھائی نہیں دیتی۔ آگے بڑھتا ہے تو ایک معمولی سا پیادہ اُسے ختم کر دیتا ہے۔ دائیں جانب ڈھائی گھر پہ گھوڑا اجہنار ہا ہوتا ہے۔ بغلی راستہ دیکھتا ہے تو فیل راہ مارتا ہے۔ اُسے اب صرف بائیں جانب ایک چھوٹا سا گھر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راہ سلامتی نہیں۔ یہ گھر بھی اُسے اِدھر زیادہ دیر تک پناہ نہیں دے سکتا.....!

لگتا تھا آج اِس سانپ کے سارے راہ مارے گئے تھے۔ ویسے بھی ہر اچھائی بُرائی، نیکی بدی کا کوئی نہ کوئی اَنت ہوتا ہے۔ اگر یہ کچھ نہ ہو تو نظامِ ہستی چل ہی نہیں سکتا۔ مرنا جینا، حشر نشر، جزا سزا، جنت دوزخ وغیرہ یہ سب کیا ہے؟..... یہی کہ جو کرو گے، وہی بھرو گے..... خلافِ فطرت جو ہوگا وہ خرقِ فطرت ہوگا اور جو خلافِ قُدرت ہوگا وہ مصیبت و معصیت ہوگا۔ پانی بہنا اور راہ پانا چاہتا ہے..... روانی اور آسانی، تا کہ وہ اپنے اَنت وشانت ساگر تک پہنچ پائے اور اُس میں ضم ہو کر خود بھی اُسی کا حصّہ بن جائے۔

میرے مشاہدہ میں آیا کہ انسان سے بڑھ کر دیگر جانور خاص طور پہ جن کے نام ''ک'' اور ''گ'' سے شروع ہوتے ہیں، زیادہ متحمل، صابر شاکر ہوتے ہیں..... سخت کوشی، برداشت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ کتا، کوا، کبوتر، کچھوا، کنجل، کاز اور اُدھر گدھا، گدھ، گھڑیال، گیدڑ، گھوڑا، گینڈا، گاؤ، کھنل!

کان زبان آنکھیں اور دُم اِن چار اعضاء سے کُتّا اپنے محسوسات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ مَیں بیک وقت، سانپ اور کُتّے کی حرکات پہ نظر رکھے ہوئے تھا۔ سانپ کے پاؤں تو ہوتے نہیں کہ اُس کی پیش قدمی کو جانچا جا سکے، اُس کی ریڑھ کی ہڈی اور جسم کے پھیلنے سکڑنے سے ہی اُس کے اِرادوں کا اِدراک ہوتا ہے۔ نامحسوس انداز سے وہ کوئی ڈیڑھ بالشت برآمد ہو چکا تھا۔ مَیں جانتا تھا جتنا وہ باہر ہے اس سے آٹھ دس گنا اندر ہے..... سانپ کی گردن، چھاتی اور زیرِ ناف، دُم تک کا حصّہ اس کے پیٹ کے مقابلہ میں نسبتاً پتلا ہوتا ہے۔ اِنسانی جسمانی تقسیم بھی لگ بھگ ایسی ہی ہوتی ہے۔ اب چونکہ انسان غاروں اور سانپوں کی طرح بلوں میں نہیں رہتا اِس لیے اُسے اپنی اس بدنی بناوٹ کی کوئی زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ مگر سانپ بیچارے کے لیے مصیبت؟..... اسی کارن وہ مہینوں برسوں بغیر کچھ کھائے پیئے اپنی بانبی میں آدھ مُوا سا پڑا رہتا ہے۔ قُدرت نے اِس پُراسرار کیڑے کو کھانے پینے، ہوا آکسیجن، سُننے دیکھنے، نسل بڑھانے کی رغبت اور فساد فی سبیل اللہ دوسروں ہم نفسوں سے پنگا لینے کی عادتِ بد سے بچا کر رکھا ہے..... آپ اسے بھلے سے اِستثنیٰ کے ساتھ درویش صفت بھی کہہ سکتے ہیں۔؟

مشاہدہ ہُوا کہ جب کسی لَونڈر نٹے کے سانس گنے جا چکے ہیں تو وہ کسی سرکاری کارندے یا سیاسی سماجی ٹھیکیدار کی پنڈلی پہ دانت دَھر دیتا ہے۔ کسی گدھے گیدڑ کے بُرے دن آئیں تو وہ کسی مدرسے مسجد میں گھس جاتے ہیں۔ جب کسی نَو دَولتیے کے لیے پیغامِ رسوائی آتا ہے تو وہ الیکشن میں کھڑا ہو جاتا ہے یا نئی شادی کر کے گھر بیٹھ جاتا ہے۔ تازہ تازہ ماسٹر کرنے والے کسی بیوقوف کی جب علمی شامت آتی ہے تو وہ کسی نئے ٹی وی چینل پہ اینکر پرسن بن جاتا ہے۔ اسی طرح کسی مولوی یا خطیب کی جب کم بختی شروع ہوتی ہے تو وہ سیاست کے اکھاڑے میں کود پڑتا ہے' جدھر وہ مسجد و محراب جوگا رہتا ہے اور نہ انتخاب و انقلاب جوگا......!

جوگی کا جب جوکھوں آتا ہے تو وہ جانگل جاوتری کے جنگل میں جا براجتا ہے اور اسی طرح جب سالے سانپ کی سُدھ بُدھ سار سلب ہوتی ہے تو سپاری' صندل کے پیڑوں جھاڑوں میں اپنا کرودھ کلیان کرنے رینگ آتا ہے۔''

یہ مہاشے' اب قریب تین چوتھائی باہر پدھار لیے تھے۔ آہستہ آہستہ دیوار سے لگ کر نیچے کی جانب سرک رہے تھے۔ شاید اُن کی خوش گمانی ہوگی کہ وہ زمین کو چھوتے ہی دَوڑ لگا دیں گے...... مگر ایسا نہ ہونا لکھا جا چکا تھا۔ میرے عصاء کا دستے والا آنکڑا' اُس کے صدیوں پرانے لجلجے سر کو اپنے لپیٹے میں لے چکا تھا۔ کیسا بھی سانپ ہو وہ ''سٹیکر کچر'' آنکڑے والی چھڑی میں پھنس کر کانپ ہو کر ہانپ ہو جاتا ہے۔ اب وہ پُورا کا پُورا باہر نکل میرے عصاء کے آنکڑے میں لٹکا ہُوا اپنی بے بسی پہ بَس کھول رہا تھا۔ مَیں اُسے ایک سوتک کی گنتی تک اسی طرح لٹکائے رکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ چندن کاٹھ کے عصاء کی مدہم مہک محسوس کرے اور گورو چند کی پوٹ سے لپٹ جائے۔'' ہندوؤں کے ایک پران میں گورو چند کے مثل ایک سنگوٹ کی بابت لکھا ہے کہ یہ پراڈش ناگوں کو اُن کی بُرن ھرشتی سے نہتا کر دیتا ہے۔ نیچے گُٹے کا یہ عالم کہ وہ پلٹ پلٹ اُچھل اُچھل کر اُسے پکڑنا چاہ رہا تھا۔ اگر مَیں ناگ کو اُس سے مناسب فاصلے پہ نہ رکھتا تو وہ یقیناً اس کا تیا پانچا کر دیتا۔ لگ بھگ چھ فٹ لمبا ناگ' خاصا صحت مند اور وزنی تھا۔ لگتا تھا انسان دُودھ' اُسے راس آ گیا تھا۔

آدھا اِدھر اور آدھا اُدھر لٹکا ہوا وہ خاصا غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے تئیں وہ اُچھلنے اور اپنی جان چھڑانے کی کوشش میں تھا مگر بعض مقامات اور حالات میں کی گئی تمام کوششیں اِک سعیٔ لاحاصل کے سوا اور کچھ نہیں ہوتیں۔!

سانپ کا سب سے بڑا دوست اور دُشمن اُس کا اپنا جسم ہی ہوتا ہے۔ وہ خُود کو اسی جسم کی وجہ سے بچا پاتا ہے اور جب قابو میں آتا ہے تو یہی جسم اِس کا دُشمن بن جاتا ہے۔ اس کا دل' دماغ' ہاتھ پاؤں' کان' آنکھیں...... یعنی سب کچھ' اس کا سر ہوتا ہے۔ اسی سر میں نوکیلے دانت' بس سے بھری غدودیں' دوشاخہ لچکتی

زبان' بے پلک بے جھپک گول مقناطیسی سریع اثرات والی آنکھیں اور دونوں آنکھوں کے درمیان' ماتھے کے بیچ قدرت کا ودیعت کیا ہوا کیمونیکیشن کا ایک اعلٰی بے عیب نظام...... زبان کی دوشاخہ کے پیچھے ایک ایسا ریڈار' جو لمحہ لمحہ کی آہٹ' حرکت' انسان' جانوروں کے عزائم ارادہ کی ریکارڈنگ نوٹ کرتا ہے۔

سانپ کے اندر سریت' اسراریت اس قدر ہوتی ہے کہ اور کسی جانور میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ کتا' بلی' کوا' چمگادڑ' اُلّو' ابابیل بھی اس لحاظ سے بہت پیچھے ہیں...... دُنیا کے تمام نئے پرانے مذاہب اور ارضی و آسمانی صحائف میں' جتنا ذکر اور واقعات اس کے بارے میں ہیں کسی اور جانور کی بابت نہیں ہے۔ سانپ کی کچھ اور حرکتیں بھی اسے ماورائیت عطا کرتی ہیں۔ مثلاً بلی کی طرح جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اب مرنے یا مارنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تو یہ اپنی تمام ظاہری' مخفی' جبلی' سفلی قوتوں اور طریقوں کو کام میں لا کر جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے' آگے بڑھ کر فیصلہ کن حملہ کرنے سے گریز نہیں کرتا...... اپنی آنکھوں کی مقناطیسیت کو بروئے کار لاتا ہے۔ زہریلا تھوک پیدا کر کے مقابل کی آنکھوں چہروں پہ پھینک کر اُسے اندھا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ خوفناک شُشکاریاں بھر کر دہشت زدہ کرتا ہے۔ اپنے جسم سے ایسی لہریں خارج کرتا ہے جو اگلے کو ماؤف کر دیتی ہیں۔ یہ سب کام وہ اس وقت بھی کر رہا تھا جب وہ میرے عصاء کے آنکڑے میں پھنسا ہُوا تھا۔

اس کے علاوہ وہ دیگر حربے بھی استعمال کر رہا تھا مگر مَیں نے اُس کے ہر وار سے بچنے کی تیاری کر لی ہوئی تھی...... اُسے آنکڑے میں پھنسا کر خود سے کافی فاصلہ پہ فضاء میں لٹکایا ہُوا تھا۔ وہ سر والے حصّے کی طرف سے لہریے لے لے کر مجھ پہ حملہ کرنے کی کوشش میں تھا۔ تھوک بھی پھینک چکا' جو مجھ تک پہنچ نہ پایا...... غیض کے عالم میں شوکریں بھی مار رہا تھا۔

مَیں دراصل اُسے تھکا دینا چاہتا تھا اور ساتھ اس کوشش میں بھی کہ وہ اپنی سفلی شکتیوں کا جتنا استعمال کرنا چاہتا ہے کر لے...... کیونکہ مجھے کلیر شریف کے جنگلات کے کالے صندل کے عصاء اور اس کے اندر پڑے' گوروچند کی پوٹ کے اثرات بھی دیکھنے تھے جبکہ اس دوران کتا بھی لپک جھپک اُس پہ دو چار وار آزما چکا تھا......

اُصولِ فطرت ہے کہ طاغوتی طاقتیں کیسی بھی اندوہناک اور سفاک ہوں بالآخر انہیں اپنے منطقی انجام تک پہنچنا ہی ہوتا ہے کہ خیر اور سلامتی صرف حق سچ کو ہے۔ اسی طرح طلسم وفسوں کی ہیمنت اگر صدیوں پہ بھی دراز ہو جائے انجام کار اُسے باطل ہونا ہی ہوتا ہے۔

ڈیڑھ صدی سے یہ پرانا پاپی اب اپنے نشے تشتر سے باہر نکل رہا تھا۔ اس سنکرانت سے وہ اپنے

اُنت کے رُوبرو تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی جدوجہد جیسے ماند پڑنے لگی ہو...... لیکن اس کی غصہ بھری پھنکار اب بھی جاری تھی۔ اِدھر میرا بھی یہ حال کہ ایک بازو پہ اس پاپی کا وزن اُٹھائے مَیں بے حال ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مَیں نے اُسے نیچے زمین پہ ڈال دیا مگر آنکڑے کی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ نیچے پڑتے ہی اس نے خود کو لپیٹ لیا۔ پھر پتا نہیں کیا ہُوا کہ اچانک کُتّے نے اس کے بڑے سے پھن کو اپنے دانتوں میں لے کر بُری طرح جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ آنکڑے کی پکّی پکڑ میں وہ پہلے ہی بے بس تھا کچھ صندل کا ٹھ کی مہک کا اثر اور کچھ گورو چند کا چمتکار...... اُوپر سے کُتّے کے فولادی جبڑے اور تیز نوکیلے دانتوں کی مضبوط گرفت نے اس پاپی کو بالکل ہی بے کل کر دیا...... وہ منحوس مُنڈی ڈالے بے حِس و حرکت ڈھیر کا ڈھیر پڑا تھا اس حالت میں کہ اس کا سر گردن کُتّے کے جبڑے میں کسے ہوئے تھے اور اس کے پاؤں پنجوں کے نیچے سانپ کے ”انگنت صدیوں کے طلسم“ کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔“

کچھ جانور بہت جاندار ہوتے ہیں۔ خاص طور پہ رینگنے والے حشرات الارض ان میں چھچھوندر چھپکلی، پشمکڑی، مینڈک، کیچوے، کنکھجورے اور سانپ بچھو وغیرہ...... اِدھر انہیں مارو، مطمئن ہو چکو...... لیکن وہ صحیح سے مرتے نہیں ہیں، کسمسا کر پھر اُٹھ کر بھاگ نکلتے ہیں یا دوبارہ جنم لے لیتے ہیں۔ ان کی جسمانی ساخت ہی کچھ ایسی ہے۔ مَیں چاہتا تو اس کے مرنے کا یقین کر کے آنکڑا ڈھیلا کر اسے فرو جان کر چھوڑ دیتا مگر مَیں نے اس کے مرنے کے ڈھونگ کا اعتبار نہ کیا۔ اگر وہ واقعی جہنم رسید ہو چکا ہوتا تو کُتّا اُسے ضرور چھوڑ دیتا۔

آدم اور سانپ، روزِ ازل سے ایک دوسرے کے حساب کتاب میں رہتے ہیں کہ ان دونوں کو واسطہ جنّت میں ہی پڑ گیا تھا۔ اس میں ایک اہم کردار اماں حوّا کا بھی تھا۔ جسے اس سانپ نے سبز باغ دکھا کر بہکایا تھا۔ ابھی اِسی مرنے جینے کی اُتھل پتھل میں تھے، جن کا بغلی دروازہ وا ہُوا اور وہی دوشیزہ، جس کے دودھ کا یہ سانپ متوالا تھا۔ شب خوابی کے لباس میں باہر آئی اور سارا منظر ملاحظہ کرتے ہوئے اُلٹے پاؤں واپس ہو گئی۔ نہ اُس کے آنے کا صحیح سے پتا چلا اور نہ اُس کے جانے کی واضح طور پہ خبر ہوئی۔ بس اِک کوندا سا لپکا اور غائب ہو گیا...... اِسی حیص بیص میں تھے کہ وہی ”بجز کنا سا شعلہ“ پھر نمودار ہُوا۔ چونکہ ہم دونوں یعنی کُتّا اور مَیں اِدھر سانپ پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے اُس پہ دھیان نہ جما سکے تھے۔

فنِ حرب و ضرب کے عالم کہتے ہیں...... میدانِ جنگ میں ستیزہ کار کو اپنے مقابل دشمن کے بارے زیادہ خوش فہمی کا شکار بھی نہ ہونا چاہیے۔ دشمن کی بوٹی بوٹی بھی ہو جائے تب بھی اُس کی جانب سے غافل مت رہو...... اس کے جسم کی کوئی بوٹی ہڈی بھی پلٹ کر حملہ کر سکتی ہے۔ رَن پڑنے پہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رکھو۔ ایک لمحہ کے لیے بھی جھپکنے کی غلطی نہ کرنی چاہیے۔ اگر ایسی غلطی کر دی تو یہی لمحہ آپ کی

موت کا پہلا لمحہ بن جائے گا۔ اس نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مَیں اور کُتے نے سانپ پہ سے نگاہ نہ ہٹائی تھی۔

ز ز ز ز...... اچانک دو فائر ہوئے اور کُتا دیکھتے ہی دیکھتے خُون میں لت پت ہو گیا...... یہ سب اتنا اچانک ہُوا کہ کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ سب کیا ہے؟ ہلکی سی چُوں کی آواز نکلی اور کُتا سانپ کے اُوپر ہی ڈھیر ہو گیا مگر وشدھری گردن اور پھن ہنوز اُس کے جبڑے کی گرفت میں تھے۔

میری گَل بھی کچھ عجیب سی ہے۔ سیاہ و سفید، اچھا بُرا، نیکی بدی، ہونی اَنہونی کچھ بھی ہو جائے۔ ''میرے لیے سب ٹھیک ہی ہے'' ہوتا ہے۔ اوسان خطا ہوئے نہ کبھی بلڈ پریشر ہائی ہوا، غشی پڑی اور نہ کبھی ''ارے یہ کیا ہو گیا؟'' کہا...... اگر کچھ کہا، الحمدللہ! ہی کہا ہو گا۔ بڑے سکون سے اُدھر دیکھا...... وہ ایک سڈول جسم، دلکش تیکھے بولتے خدوخال والی عورت تھی۔ عورت اس لیے کہا کہ وہ ایک بچّی کی ماں تھی۔ چتون چڑھائے میری جانب گھور رہی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ، اُس کے ہاتھ کا اٹالین میڈ لیڈی پسٹل، اپنی واحد گول آنکھ، مجھ پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ اُس پہ ہذیانی کیفیت طاری تھی، لڑکھڑاتی زبان سے بولی۔

''آپ اور جمی نے میرے ناتھ کو مار ڈالا...... آپ دونوں کا اُس نے کیا بگاڑا تھا؟ اگر کوئی بات تھی تو آپ دونوں مجھے مار دیتے۔ اب مَیں اپنے ناتھ کے بغیر کیسے جیوں گی......؟''

وہ بولے جا رہی تھی...... اور مَیں ابھی تک آنکڑا پھنسائے اپنی جگہ کھڑا بلکہ گڑا ہُوا تھا۔ جمی کُتے کا خون، سانپ کے مُردہ جسم کو بھی رنگین کر گیا تھا۔ جمی کی نیم کُھلی آنکھیں جیسے وہ میری جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہا ہو۔ ''باباجی! میرے مرنے کے بعد بھی اس موذی کا مُنہ گردن میرے جبڑے سے نہ نکالیے گا...... مَیں نے اس پہ بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہُوا ہے۔ اس نے میرے مالک کا جیون اَجیرن کر دیا ہوا تھا۔ مَیں اک زمانہ سے اس کے پیچھے تھا...... اکیلا تھا کوئی بس نہ چلتا تھا۔ آپ آئے تو آپ کی وجہ سے مجھے بھی موقع مل گیا۔''

ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ نائٹ گاؤن پہنے سردار بلونت سنگھ بھی آ پہنچا...... ظاہر ہے وہ فائر کی آواز سن کر گھبرایا سا اِدھر نکل آیا...... مرا ہُوا سانپ اور اُس کا پیارا کُتا جمی...... خُون میں لت پت۔ اُس کی خوبصورت بیوی جس نے ارادتاً یا محض شوق سے مجھ پہ پستول تان رکھا تھا۔ یہ سارے منظر، شاید اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ عجیب سی نظروں سے مرے ہوئے سانپ اور کُتے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھا اور اپنی بیوی کے ہاتھ سے پستول لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''یہ فائر تم نے کیئے ہیں، تم نے میرے جمی اور اپنے ناتھ کو مار ڈالا......؟''

وہ کوئی جواب دینے کی بجائے ہونقوں کی طرح اُسے دیکھنے لگی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔

''باباجی! آپ اِس سے اِدھر، یہ ممنوعہ جگہ ہے...... اِدھر آنا کسی کے لیے مناسب نہیں ہو سکتا۔ مَیں

حیران ہوں میرے کتوں کی موجودگی میں آپ اِدھر کس طرح پہنچ گئے؟...... یہ جگہ جہاں آپ اس وقت کھڑے ہیں سو فیصد پرائیویٹ ایریا ہے' کوئی شارع عام نہیں......؟"

اب شاید مجھے کچھ کہنا چاہیے تھا۔

"سردار جی! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کے رات والے فنکشن میں بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ سے ملنا نہیں چاہیے تھا۔ آپ کے بارے کوئی کتھا بھی سُنی نہیں چاہیے تھی۔ آپ کے پتاجی کی چنتا تو بالکل ہی سُنی نہیں چاہیے تھی۔ آپ کو جاننا چاہیے کہ ان تمام عوامل میں میرے کسی ارادے کا قطعی کوئی دخل نہیں۔ مجھے اِدھر شری جگجیت سنگھ جی نے بڑے اصرار سے بلایا تھا کہ انھیں آپ کے باپو جی نے مجبور کیا تھا جبکہ آپ کے باپو کو اُس کے اکلوتے بیٹے بلونت سنگھ یعنی آپ کی پریشانی نے پریشان کیا ہوا تھا اور آپ کو؟ آپ خوب جانتے ہیں کہ کس کی محبت نے باندھا ہوا ہے؟...... اور آپ کی محبت کے ساتھ کیا مجبوری تھی آپ شاید اس سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہیں۔ اگر کچھ تھوڑا بہت جانتے بھی ہیں تو آپ اس کا اُپائے کرنے سے خود کو بے بس سمجھتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ میں اِدھر علاقہ غیر میں کیونکر اور کیوں داخل ہوا؟ آپ کو معلوم ہے کہ میں مسلمان اور پاکستانی ہوں' کوئی کمانڈو یا کسی ایجنسی کا جاسوس نہیں۔ جوان اور کوئی صحتمند بھی نہیں...... سیدھا سادا ایک بوڑھا کمزور اور ایک فقیر درویش بابا ہوں۔ یہاں مجھے یہ آپ کا وفادار کتا لے کر آیا...... جس نے آپ پر اپنی جان قربان کر دی۔ باقی رہی یہ بات کہ آپ کی الیکٹرونک اور دیگر انسانی حیوانی سیکورٹی کے باوجود میں یہاں تک کیسے پہنچا؟ تو اس کا جواب میرے پاس بھی نہیں...... مجھے یہاں تک یہ آپ کا پیارا وفادار کتا لے کر آیا ہے۔ اِدھر پہنچ کر دیکھا۔ اس سوراخ سے یہ خوفناک سانپ باہر نکل رہا ہے' کتے نے اسے پکڑ کر مار ڈالا...... اتنے میں آپ کی بیوی باہر نکل آئی' کتے کے منہ میں سانپ کی گردن دیکھ کر اس نے دو فائر کیے اور کتا ڈھیر ہو گیا۔ دیکھیں' مرنے کے بعد بھی اس نے اپنے مالک کے دشمن کی گردن نہیں چھوڑی...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ وفاداری کی اُستواری میں زندگی موت کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔"

وہ ششدر سا کھڑا میرا طویل بیان سن رہا تھا...... اگر میں مختصر اور کنائیہ میں بات کرتا تو شاید بلونت سنگھ کی بدھی میں نہ آتی۔ زیادہ تر سکھوں کی "سمجھ دانی" ذرا چھوٹی ہوتی ہے وہ سیدھی سیدھی با تکب دہل بات کرنے اور سننے کے عادی ہوتے ہیں۔ اشارے کنائے' ذومعنی گفتگو ان کے نزدیک چالاکی اور بے ایمانی کی ذیل میں آتی ہے۔ محبت ہو یا عداوت وہ کسی تعلق میں ملاوٹ کے عادی نہیں ہوتے۔

سورج چڑھ آیا تھا...... سورج کے طلوع کے چار مدارج اور غروب کے بھی چار مرحلے ہوتے ہیں۔ ان مراحل کے مختلف تشرف و تحرک بھی...... ان کے تصرفات کو صرف پرانے حکمت دان اور بدھی مان ہی سمجھتے

ہیں۔ مسلموں میں کہیں خال خال مگر دیگر مذاہب' ہندو مت' جین مت اور بدھ مت کے پیروکاروں میں سوریہ سنچاری ہر کوئی ہوتا ہے۔ ایسے اَویا یک تپسیاوں کا کام کرم انہی چار سپتکوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔ جو اکثر ندی کنارے' پَنگھٹ کے اندر' کسی پربت پُوٹی پہ سماپت ہوتی ہیں۔

مجھے شاید لاشعوری طور پہ سورجیہ مہاراج کے تیسرے سپتک کی سنکرانت کا سنسکار مل چکا تھا۔ جو اس سمے میں وہ کام ہو گیا جو زمانے گزرنے کے باوجود' کسی اُپائے سے نہ ہو سکا تھا۔ یہ خاص اللہ کا کرم تھا جو اس دُرویش کا بھرم رہ گیا اور پیارے سے وفادار کُتّے نے اپنی جان کی قربانی دے کر اپنے مالک کو بچا لیا۔

اتنے میں دو تین سیکورٹی والے اور چوکیدار بھی اِدھر پہنچ چکے۔ ذرا دُور کھڑے کانی آنکھوں سے سانپ اور کُتّے کے مُردہ جسم' خوف اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے دیکھ رہے تھے۔ بلونت کی پُراسرار دھرم پتنی تو ایسی بے حس اور بے نیاز سے کھڑی تھی جیسے اِدھر کوئی واقعہ ہوا ہی نہ ہو۔ دُکھ غم یا حیرانی پریشانی کی فراوانی میں ایسی صُورت حال دیکھنے میں آتی ہے۔ انسانی ذہن اور حواس' یکبارگی میں پیش آنے والے واقعات کے اثرات کو فی الفور قبول کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور انسانی رویے میں وقتی طور پہ ایک سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں جب ذہن کچھ سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو انسان یا تو پھٹ پڑتا ہے یا پھر واویلا شروع کر دیتا ہے' بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔ اس سکھ ناری کی بھی یہی کچھ کیفیت تھی...... مگر اب شاید وہ صُورتِ حال کو کچھ سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ ایکدم چیخ مار کر بلونتا! کہہ کر بلونت سنگھ سے چمٹ گئی......"

مَیں اس واقعہ کو یہیں ختم کر دینا اپنے اور قارئین دونوں کے لیے مناسب سمجھتا ہوں جبکہ یہ حیرت ناک اور آج کے زمانے میں اک انہونا سا واقعہ ابھی ختم نہیں ہوا...... یہ سب کچھ تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اس بُوالعجوب' نیرنگیوں سے بھری دُنیا میں بہت کچھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانی عقل و بساط اور موجودہ علم و سائنس بھی دیکھتی کرشمشدر رہ جاتی ہے۔ خیر و شر کی طرح روحانیت اور شیطنت دونوں آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ یہ بعض' ناسوتی کبھی کبھی اس عالمِ ناسوت کے شیطانی چکروں اور دُنیاوی بکھیڑوں میں پڑ کر اپنے گرداگرد ایسی کُھلکلیں گوندھ لیتا ہے کہ آخر کار خود کو عاجز پا کر آہستہ آہستہ قعرِ مذلّت میں اُتر جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مالک اپنی مہر سے اُسے بچا بھی لیتا ہے۔ کسی بزرگ کی نگاہ یا کسی اپنے کی التجا' دُعا کام آ جاتی ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا بہر طور قوی ہے......!

میرے ہاتھ کا یہ عصا' جو مجھے اس پنڈت نے کمال رغبت و چاہت سے بھینٹ کیا تھا۔ کوئی پندرہ سولہ برس میرے ہاتھ رہا۔ مَیں نے اس کا نام "صندلو راج" رکھا ہُوا تھا۔ ویسے ہی جیسے چھوٹے سکولوں میں ماسٹر جی کے ہاتھ میں مولا بخش نام کی سوٹی ہوتی ہے۔ مَیں نے جانا کہ ڈنڈوت ڈنڈی مل نہیں کرتا بلکہ ڈنڈا جی

مہاراج کرواتے ہیں۔ چرواہے کے ہاتھ ڈنڈا نا تھ نہ ہو تو نہ بھیڑیں قابو رہتی ہیں اور نہ بھیڑیے بھاگو اُس سے ڈرتے ہیں...... اسی طرح سرکش شرارتی قوموں کے سروں پہ جو نبی پیغمبر رسول اُترے اُنھیں کتاب نصاب اور خطاب کے ساتھ ایک عدد ڈنڈا بھی تفویض کیا گیا کہ یہ بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ہر بڑے انسان کے ہاتھ ساتھ کا تھ ضرور رہا کہ اس کی نظامت' جسامت و قدامت میں بڑی کرامت ہوتی ہے۔

انسانی تاریخ کا پہلا قتل پتھر کی ضرب سے ہُوا' پھر لکڑی کی سُٹیں اور ڈنڈے استعمال ہوئے...... بہت بعد جا کر کہیں آہن اور دیگر دھاتیں سامنے آئیں...... بارود اور دوسرے دھماکہ خیز مواد ات کی تباہ کاریوں کا اندازہ ہُوا...... اور اب جرثوموں کی ہولناکیاں اور شعاعوں کی تباہ کاریوں کی دُھوم ہے لیکن ڈنڈے کی اہمیت' اس ترقی یافتہ دور میں بھی اپنی جگہ پہ مستحکم ہے۔ دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں عام حالات میں قانون نافذ کرنے والوں اداروں کے افراد کے پاس اب بھی ایک چھوٹا سا ڈنڈا ہوتا ہے جسے وہ وقتِ ضرورت استعمال میں لاتے ہیں۔ ڈنڈا گھوڑا اور کتّا ہر دور میں انسان کے ساتھ رہا...... جنگل سے منگل تک...... ان تینوں کا نعم البدل کبھی پیدا نہ ہو سکا......؟

میں نے دُنیا کے بڑے لوگوں' پیغمبروں' ولیوں بادشاہوں' حاکموں' دانشوروں' کیمیا دانوں' ذلیوں' جوگیوں' صوفیوں' مفتیوں' فقیہوں' جادوگروں' شعبدہ بازوں اور اساتذہ کے ڈنڈے' عصا' لٹھ' چھڑیاں' چمکاں' بید وغیرہ ان سب کی کارگزاریاں پڑھ سُن اور دیکھ رکھی ہیں اور اس نتیجہ پہ پہنچا کہ اگر یہ سب نہ ہوتے تو آج دُنیا کا نقشہ وہ نہ ہوتا جو دکھائی دے رہا ہے۔ یہ سب اسی کا نورِ ظہور ہے۔

اندھوں کی سفید چھڑی' بوڑھے بزرگوں کی لاٹھی' لنگڑے لُولوں کی بیساکھی' چرواہوں کی ڈانگی' رسہ گیروں کی گنڈاسی' مسافروں کی کھُونڈی' ہرکاروں کی سوٹی' ہرکاروں کی چھنوٹی (پہاڑی اور دُشوار گزار راستوں پہ گزرنے والے ریاستی پیادہ ہرکارے ایک سے دوسری منزل' سفر کے دوران' ہاتھ کی لاٹھی' جس کے اُوپر سرے پہ گھنگھرو بندھے ہوتے' چھنکاتے جاتے یہ ان کی سرکاری پہچان ہوتی تھی) سپاہیوں کی پیتل کی شام جڑی ڈانگ' ڈنڈا بردار جتھے...... لٹھ بازی' گتکا بازی' کمان و پیکاں' ٹُلی ماری' بلم بازی' بازی گری' علم برداری' نیزے بازی وغیرہ......

میرے اس ''صندلوراج'' نامی عصا سے میں نے آپ پہ تو کوئی نقش بنائے نہ ہوا فضا میں کوئی چتر کاری کی...... بندوں کو سیدھا کیا اور نہ جنّوں کی ٹھکائی کی لیکن اس نے میرے اندر باہر کی صفائی اور رکھوالی ضرور کی۔ میرے ساتھ گھاٹ گھاٹ گھوما...... جدھر پہنچا' آدھا قدم' مجھ سے آگے ہی رہا۔ شرور و بلّیات' حشرات الارض و فضا سے مامون کیا...... اس سے کھینچا گیا حصار بہت محفوظ رہا...... اس کا لمس' قربت' صحبت

بڑی صائب رہی یعنی میرا ہمدم' ندیم خاص اور میرے حریم شوق وشیوہ اور شبرو و شیخو خت کا شاہد و شامل......!

قارئین! یاد دلا دوں کہ میں اس گھوڑے پایے کا ہم زاد مخاطب ہوں۔ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کی بے سر و پا باتیں سن سن کر میں تو آدھا پاگل ہو چکا ہوں' پتا نہیں آپ کا کیا حال ہے؟ اب ذرا صبر سے آگے سنیے! اور سر دھنیے......!

## ● مجھے گردشِ ایام صحرا صحرا لیے پھری......!

ہم سمجھتے ہیں کہ دوستی محض ہم جنس سے ہی ہو سکتی ہے اور فیض و فائدہ بھی کسی ایسے بندے سے پہنچ سکتا ہے جو ہم مذہب و مسلک اور جس کا نسب و حسب بھی ملتا جلتا ہو مگر جہاں نوردی نے مجھ پہ یہ راز کھولا کہ دُنیا تو دُنیا' کائنات کی ہر مخلوق' چاہے وہ مخلوق ناطقہ ہو یا مطلق...... ساکت ہو یا متحرک...... کثیف یا لطیف' شریر ہو یا شریف' اَرضی ہو یا فلکی...... ان سب کے آپس میں گہرے سمبندھ' رشتہ داری ہے۔ یہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی کہ ان سے محبت اور شناسائی کے تعلقات اک عجیب سا سرمدی لُطف دیتے ہیں۔ جن خوش قسمت لوگوں کو اللہ کی مخلوقات سے باہمی افہام و تفہیم کی نعمت حاصل ہوتی ہے وہی جانتے ہیں کہ اصل دوستی اور تعلقات کیا ہوتے ہیں اور کیسا مزہ دیتے ہیں۔

مَیں جب تک اس حقیقت سے بے خبر تھا اک کھوکھلی بے رنگ سی زندگی گھسیٹتا رہا مگر جب آشنائے راز ہوا تو یکسر زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔

طالب' جب تک اپنے گھر کی دہلیز پار نہ کرے...... زادِ راہ کے بغیر کسی بے منزل' سفر کا رُخ نہ پکڑے۔ خارِ مغیلاں' اُبھرتے پھوٹتے چھالوں کی لذت سے آشنائی حاصل نہ کرے...... فاقے رت جگے' رُسوائیاں' اپنا روزمرہ نہ بنائے...... اندھیروں' اُجالوں' موسموں' رُتوں' سود و زیاں کی جمع تفریق سے باہر نہ نکلے' وہ فطرت اور کائنات کے رازوں اور اسراروں سے دوستی کر ہی نہیں سکتا۔

مَیں ایک صحرا نوردی کے دوران ایک عجیب سے شخص سے ملا جو بظاہر فاتر العقل اور دین وُ دنیا سے بیگانہ دکھائی دیتا تھا وہ جس طویل و عریض کٹھن سفر راہ پہ تھا اُس کے لیے تو مسافر کے وزن سے دُگنا زادِ راہ' پیٹھ پہ لدا ہونا چاہیے کہ عشروں مہینوں بے آب و گیاہ' سراب آشنا' تند و تلخ ریگ زاروں میں بھٹکنا کچھ آسان کار نہیں ہوتا۔ پتہ پگھل کر پانی بن کے بہہ جاتا ہے۔

صحرا' جنگل پہاڑ اور سمندر...... ان میں اُترا ہوا انسان خود کو بڑا اکیلا محسوس کرتا ہے۔ ان کی ہیبت

وسعت اور پُراسرار سنّاٹے' مسافر کو اندر باہر سے مبہوت کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ خود کو ان کے رُخ پہ ڈالنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اندھی آندھی' طاقی طوفان' سموم یا سیلاب' آفاتِ آتش اور وبال و بابھی بے دست و پا کر دیتے ہیں۔ انسان کی تمام عقل و دانش اور احتیاطی تدبیریں' بپھری ہوئی موجوں کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ قدرت و فطرت کی قطعیت و ناگہانیت کے آگے انسانی عقل و دانش' کوشش و کاوش' سکت و سنبھل کے تمام تر وسائل و طیرے واہی ہو جاتے ہیں۔ خدائے عظیم و برتر اگر کسی کو فطرت اور کائنات شناسی عطا فرما دے تو کائنات اور مافیہا جو کچھ بھی ہے اُس سے محض آشنائی ہی نہیں دوستی بھی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے کا بنیادی فلسفہ میں نے پہلی بار اسی نیم مجذوب آوارہ گرد سے سیکھا جو نجانے کس زمانے سے محوِ سفر تھا۔"

دیکھا جائے تو گرہ محض رسّی دھاگے پہ ہی نہیں لگائی جاتی...... لگانے والے تو کرن ہوا اور پانی میں بھی گرہ لگا دیتے ہیں۔ مصرع طرح پہ لگائی جاتی ہے' کسی کی بات اوقات پہ بھی...... فسوں پھونکتے ہوئے کالے بٹے ہوئے سُوت پہ بھی...... بشمول غالب' اکثر شاعر رات کے وقت شعر کے نزول پہ' آزار بند یا کسی رومال پہ گرہ لگا لیا کرتے تھے اور صبح گرہ کھول کر شعر لکھ لیتے۔

صحراؤں کے دن بڑے کٹھور' بے رحم اور تند و تلخ ہوتے ہیں...... شامیں بوجھل اُداس اور تھکی تھکی سی اور راتوں کے تو کئی روپ ہوتے ہیں۔ ماں کی مانند مشفق مہربان...... کہیں چلبلی چنچل ہرجائی محبوبہ کی مانند جو پہلو میں پڑی تو ہوتی ہے مگر نخنے پہ ہاتھ دھرنے نہ دے۔ کبھی بیقرار بیمار بوڑھے کی طرح' جسے کسی کروٹ قرار نہیں پڑتا...... کسی برہن کی طرح بھی کہ راہیں دیکھتے دیکھتے جس کی اکھڑیوں کے آنگن میں تھور اُگ آتے ہیں......!

اُوپر چھوٹی چھولداری ہو یا بڑا کاروانی خیمہ' نیچے ریگ پہ بچھا قیمتی قالیچہ ہو یا کھجور کے پتّوں کی چٹائی اور اردگرد کیسی بھی کنات یا حفاظتی پردے...... ان حشرات الصحرا سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ جو سورج کے غروب ہوتے ہی اندھیرا پھیلنے پہ' نیچے ریت سے کُلبل کُلبل کرتے اُوپر آ جاتے ہیں۔ مختلف نوع' ہیئت و شکل کے سانپ' بِنڈے' کنکھجورے' چیونٹے...... کن کھجورے' کالے بھورے بچھو' چیچڑے' پسّو' بے' رتیلے اُولا' پتنوما کھے اور پتا نہیں کیا کچھ باہر ریت پہ رینگ رہا ہوتا ہے...... عجیب بات کہ شاذ ہی یہ مسافر کے لیے منضرت پیدا کرتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ کچھ کھجلی جلن یا جسم ہلکا سا سرخ ہو جائے گا......

قطع نظر ان حشرات کے...... لیبیا کے صحرا رات کو خاص طور پہ بڑے دلفریب اور پُرسکون ہو جاتے ہیں مگر شب کا پہلا پہر قدرے کسلمندی اور گھبراہٹ میں گزرتا ہے شاید صحرا اپنی دن بھر کی تھکن اُتار رہا ہوتا

ہے۔ اِس کروٹ کبھی اُس پہلو؟ مگر دوسرا پہر شروع ہونے سے بہت پہلے یہ آسودہ بھی ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ صحرائی خوشبو کے فرحت بیز جھونکے...... جھینگروں اور صحرائی پرندوں جانوروں کی سرگوشیاں اور چاروں اوڑ پھیلی گھٹی ہوئی پُراسرار خموشیاں' اک طلسماتی سا سماں پیدا کر دیتی ہیں۔ فطرت اپنی تمامتر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہو جاتی ہے......

صحرائی قافلے' سفر کے دوران شب بسری کے لیے کسی ایسی جگہ پڑاؤ ڈالتے ہیں جدھر انسانوں اور حیوانوں کے لیے کچھ آسانیاں ہوں اور صحراؤں میں ایسے سرسبز نخلستان بہت کم ہوتے ہیں...... سبزہ چارا سایہ اور پانی...... یہ تمام چیزیں' ایک ساتھ کسی پڑاؤ' نخلستان میں کم ہی ہوتی ہیں...... ایک دو' ان ضروری چیزوں کی اکثر کمی ہوتی ہے۔ کاروان سرائے بھی ہوتے ہیں۔ زیادہ تر ان سراؤں میں جملہ ضروریات کی ہر اشیاء موجود ہوتی ہیں...... پانی چارا' خوراک' آرام و استراحت کے لیے مناسب انتظام...... بھٹیار خانہ' چھوٹی موٹی تجارت کے لیے آڑھت' مطب' حمام' دوکانیں' جانوروں کی خرید و فروخت کا انتظام' قصہ گری' کھیل تماشا' داستان گوئی کی محفل وغیرہ وغیرہ......!

مَیں جدھر شب بسری کے لیے ٹھہرا۔ اسے نہ تو کوئی کاروان سرائے' داستان سرائے یا کوئی نخلستان کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی یہ جگہ کوئی پڑاؤ ڈالنے والی تھی...... یہ تو ایک بے حدہ سا تھا جس کے تین اطراف تین پرانی بستیاں...... عین صحرا کے بیچ و بیچ' الگ تھلگ...... ان میں جو قریب ترین وہ پچیس صحرائی کوس' دوسری چھتالیس اور تیسری چدرہ کچے کوس دور صلا بیا!...... چند جھونپڑے' کچی مسجد اور ایک قبرستان پہ مشتمل...... قبرستان میں جو چند قبریں' وہ اصل میں پتھر تھے جو زمین پہ پڑے تھے۔ مگر ایک قبر زمین سے قدرے اُبھری ہوئی تھی۔ سبز چادر' جس کے کونوں پہ پتھر رکھے تھے اور سرہانے کی جانب آڑھا جھکا ہوا کتبہ جس پہ جو بھی لکھا تھا...... پڑھنے میں نہ آتا تھا کہ امتدادِ زمانہ نے اس پتھر کو بھی چاٹ لیا تھا۔''

میری منزل'' صلابیا'' نامی یہی بستی تھی...... مَیں اسی جانب محوِ سفر تھا اور مجھے اس رُخ پہ ڈالنے والا وہی' تہران میں پہلے روز ملنے والا چاچا شیر محمد تھا۔ جسے مَیں پہلی نظر میں سرکاری کارندہ اور ایران کا باشندہ سمجھ بیٹھا تھا۔ وہ اپنے پیچھے پیچھے مجھے ایک نواحی بستی میں لے گیا۔ جدھر ایک قدیمی خانقاہ میں ایک عمر رسیدہ بزرگ سے شرف باریابی حاصل ہوا۔ ان نورانی چہرہ' روحانی بابا کو بھی مَیں ایرانی اور کوئی اجل عالم سمجھ بیٹھا تھا۔ اِن کے اِدھر ہزاروں مرید اور شاگرد...... جو ان سے فیض علم حاصل کرتے تھے۔ صبح و شام اور رات گئے تک خانقاہ میں سعدی و رُومی' رازی جامی کے فلسفہ تصوّف اور اُن کی مثنویات' حکایات پہ درس و تدریس اور مباحث کا سلسلہ رہتا۔ اِدھر پہنچنے کے ایک گھنٹے کے بعد مجھ پہ حیرت انگیز عقدہ کھلا کہ یہ دونوں حضرات گوجرانوالہ اور

سرگودھا سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت زمانہ پہلے اِدھر ایران میں محنت مزدوری کے چکّر میں پہنچے تھے۔ پھر نجانے قدرت کو کیا منظور تھا کہ وہ محنت مزدوری کے دوران کسی دُرویش کے ہتھے چڑھ گئے۔ جس کے روحانی اور علمی تصرف نے اُنہیں کہیں کا کہیں پہنچا دیا...... وہ آئے تو اِدھر روزی کمانے مگر وہ کسی اور کمائی میں لگ گئے تھے۔ اَن پڑھ دیہاتی اُجڈ جو کبھی گوجرانوالہ اور سرگودھا لکھنے پڑھنے کے اہل نہ تھے۔ اب رومیؒ، سعدیؒ کی تفسیریں بیان کر رہے ہیں......!

معلوم ہوا کہ علم و ادراک محض مدرسوں مکتبوں کتابوں سے ہی جُڑا ہوا نہیں...... ہجرتوں، صحبتوں، خدمتوں، محبتوں اور محنتوں سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اور وافر و واثق ملتا ہے۔

مَیں بھی علم و حکمت، شعر و نغمہ، آہو و عندلیب، طاؤسِ رنگیں و طوطیٔ زرّیں، حجر و شجر، زیتون و زعفران، حُسن و جمال، ہنر و کمال، طالع آزماؤں شہنشاہوں اور پہلوانوں بہادروں کی سرزمین کو دیکھنے اور اپنا رزق کشید کرنے کی غرض سے اِدھر پہنچا تھا...... تعلیم و تہذیب کی تمیز بھی پلّے نہ تھی...... اگر کچھ تھا تو جنون تھا، جو اُفتاں و خیزاں مجھے لیے لیے گھوم رہا تھا۔ تہران، اصفہان، زاہدان، ہمدان، تبریز، شیراز، مشہد، قم وغیرہ نام سُنے ہوئے تو تھے نقشے پہ بھی دیکھ رکھے تھے لیکن وا حسرتا! وائی بات تھی...... محض شوق اور خواہش ہی سے تو کام نہیں بنتا۔ جیب میں مال نہ ہو تو کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ متھرا بنارس یاترا کی خواہش ہو تو سادھو کو اپنے کشکول میں محض مُونچھ کے منکے نہیں پارس کے پیڑے بھی رکھنے چاہئیں۔

میری قسمت اِدھر پہنچتے ہی مجھے ایرانیوں کے رُوپ میں پاکستانی مل گئے۔ وہ بھی ایسے جو ٹھیٹ پنجابی اور اَن پڑھ بنا اَن پڑھ ہونے کے باوجود اہلِ فارس کو فارسی پڑھا رہے تھے۔ میری نظر میں چند اور بھی پاکستانی اور ہندوستانی ہیں جو عربوں سے بڑھ کر عربی، انگریزوں سے کہیں زیادہ انگریزی، اہلِ زبان سے کہیں اچھی اُردو اور ایرانیوں سے بہتر فارسی کے عالم تھے۔ قائداعظم، علامہ اقبال، پطرس بخاری، علامہ احسان الٰہی ظہیر، صوفی تبسم، فیض، حفیظ جالندھری، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ۔

چاچا شیر علی کے بارے مَیں نے جانا کہ اُس نے شادی ہی نہیں کی اور نہ ہی وہ کبھی واپس پاکستان لوٹا...... نوجوانی کے عالم میں اِدھر آیا اور اب اُدھیڑ عمری کہ جسم فربہی کی جانب جھک چکا اور سر کے بال پک چکے تھے۔ داڑھی مونچھ سے بے نیاز چہرہ، جس پہ طمانیت اور آسودگی نے اُجالا پھیلا رکھا تھا...... مَیں دو اڑھائی عشرے اس کے ہاں رہا...... اس دوران مَیں نے شدّت سے محسوس کیا کہ وہ ایک مطمئن شخص ہے۔ استغنیٰ کی نعمت سے مالا مال...... ہمہ وقت اللہ کی مخلوق کی بلا تخصیص و تمیز خدمت میں جُتا رہتا ہے۔

دیکھا جائے تو بندے کو اِک گونہ اطمینان ہی چاہیے ہوتا ہے۔ تمام بدنی قویٰ فکری شعوری، لاشعوری

عبادات، طالب کے اندر عجز، عمل صالح، صبر، ایثار پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ اطمینان، تسلی، تشفی اور نورِ صالحیت کی حنا بندی کرتی ہیں۔

ایک سہانی سی فجر سے، غیر ارادی طور پہ میرے منہ نکل گیا۔

''چاچا شیر علی! میرا دل چاہتا ہے میں اِدھر ہی پڑا رہوں...... ساری زندگی یہیں گزار دوں؟''

میری بچوں سی بات سن کر وہ حسبِ معمول سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہا......

وہ ایرانی شکھ چین کی شاخساروں سے مسواکوں کے لیے نرم نرم سی ٹہنیاں کاٹ رہا تھا...... وضو خانے کے باہر، طاق پہ ایک ٹوکری تازہ مسواکوں سے بھری رہتی...... ساتھ روغنِ زیتون، کحل امامی (سرمہ) اور زیتون کی لکڑی کا بے ڈھنگا سا کنگا بھی پڑا ہوتا۔

میری جانب نرم نرم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرے پیر و مرشد نے، جن کے قدموں میں ہم دونوں پڑے ہوئے ہیں...... مجھے جو پہلا تحفہ عطا کیا تھا...... جانتے ہو وہ کیا تھا؟''

ظاہر ہے کہ میں اُس گزرے ہوئے اَمر یا واقعہ سے کیونکر واقف ہو سکتا ہوں جو برسوں پہلے دو انسانوں کے درمیان سرزد ہو چکا ہو۔ میرے ہاں تو عام ظاہری علم تک نہ تھا، غیب کے علم کا کیا محل؟...... کیا جواب دوں میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ وہ پھر بولا۔

''میرے اِس سوال کا جواب تمہارے پاس ہے مگر تمہاری حالت اِس وقت اُس کیمیا گر کی سی ہے جسے معلوم ہوتا ہے کہ کچا شنگرف اُس کے ہاں ہے مگر کہاں رکھا ہے وقتی طور پہ اُس کے ذہن سے نکل گیا ہوتا ہے۔ بالکل ساز و روپے یا تلاش کرنے سے مل بھی سکتا ہے۔ اب میں پھر تم سے پوچھتا ہوں کہ میرے مرشد نے مجھے سب سے پہلا تحفہ کیا دیا تھا؟''

اچانک میرے منہ سے نکل گیا۔

''مسواک، سرمہ، روغنِ زیتون اور کنگھی......!''

''بالکل درست!...... یہ خدائی اور رسولی تحفے ہیں...... فقیر کے فقر کی حفاظت کرتے ہیں۔ جس گھر کا دروازہ، کھڑکیاں، روشندان، فرش، چھت صاف ستھرے رکھے جائیں رنگ و روغن کا خیال رکھا جائے وہاں برکتیں اُترتی ہیں۔ ہر سوال کے اندر ہی اُس کا جواب مستور ہوتا ہے۔''

چاچا شیر علی بڑی مستعدی سے اُٹھا اور میرا کپڑوں والا تھیلا مجھے پکڑاتے ہوئے بولا۔

''اب تم یہاں سے کوچ کرو...... تم نے کدھر جانا ہے...... یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے...... اِدھر رہنے کا حکم

نہیں۔ جو تمہیں اِدھر سے ملا ہے اُتنا ہی تمہارا حصّہ ہے۔ باقی جو ہے وہ "صلابیا" سے ملے گا...... !"

قارئین! اس ایران کے سفر کے بعد میں تین برس تک صلابیا بستی میں پہنچنے کے جتن کرتا رہا مگر وہاں پہنچنا تب نصیب ہوا جب اللہ کریم کو منظور ہوا اور جس کے پاس میرے حصّے کا فیض تھا اُس کا بلاوا آیا۔

اب چلتے ہیں واپس وہیں اُسی سہ حدے پہ...... جدھر تین اطراف 'صحرائی راستے کھلتے تھے جن میں ایک کنا پھنا معدوم' بنتا بگڑتا سا راستہ صلابیا کی جانب 'مشرق سمت کھلتا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اِدھر ایک بھرپور قسم کی سرائے ہوتی کہ تین اطراف جانے والے مسافر یا قافلے...... اِدھر کچھ دیر کمر سیدھی کرنا چاہیں تو پڑاؤ کر سکیں مگر اِدھر ایسا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اِدھر پانی' کمیاب اور جو دستیاب تھا وہ جانوروں کے منہ بھی پھیر دیتا تھا...... کھجوروں کے درخت وافر تعداد میں موجود تھے مگر ان کے پھل کا معاملہ بھی پانی جیسا تھا...... نہ کچّی کا مزہ نہ پکّے میں کچھ لذت برکت...... ہاں' البتہ جانور منہ مار لیتے تھے۔ ایک اور تیسری وجہ بھی سمجھ میں آتی تھی وہ قبرستان تھا۔ جو قبرستان کم اور ٹوٹے پھوٹے بے ہنگم پتھروں کا کوئی گودام دکھائی دیتا تھا۔ اک عجیب سی ہولناکی تھی جو رونگٹے کھڑے کر دیتی تھی۔ دُور تک پھیلے ہوئے پتھر...... کچھ استادہ کچھ لیٹے پڑے ہوئے...... ان پہ نام' آیات دُعائیں کچھ نقش و نگار...... لفظ حروف اور آڑی ترچھی لکیریں نقش' جو سمجھ میں نہ آتے...... سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِدھر لق و دق صحرا بیچ' اتنا وسیع شہرِ خموشاں...... جیسے کبھی اِدھر کوئی بلا کا معرکہ پڑا ہو؟...... جس میں سیکڑوں انسان کھیت رہے ہوں...... یا کوئی بڑا قافلہ کسی ناگہانی صورتِ حال سے دوچار ہو کر تمام کا تمام' تمام ہو گیا ہو۔؟

اِدھر صحراؤں میں قبرستان مختصر یا بہت کم ہوتے ہیں...... صحرا اور سمندر' صرف زندہ چیزوں سے دوستی رکھتے ہیں' گزر گئی گزران سے گریزاں رہتے ہیں۔ ریگ زاروں میں چونکہ مٹی نہیں ہوتی ریگ ہوتی ہے اس لیے وہ مٹی کو با دلِ نخواستہ ہی قبول کرتی ہے جبکہ غیر مرئی مخلوقات و عنصرات کے معاملہ میں اُس کا سلوک ایسا نہیں ہوتا۔ ریگ اور مٹی' آپس میں بہت سے بنیادی بُعد رکھتے ہیں...... دُنیا بھر کے صحراؤں کی ریت دیکھ لیں ذرہ ذرہ علیحدہ...... جو صدیوں باہم بغلگیر رہنے کے باوصف' شملہ کے چاولوں کی طرح الگ الگ ہی رہے...... ریگ گھڑی ملاحظہ کر لیں' دانہ دانہ جُدا ہوگا۔ اگر ان میں اکٹا ہوتی تو ریگ گھڑی کبھی وجود میں نہ آتی۔ مٹی تو مِٹ اور مل کے رہتی ہے۔ اگر اس میں یہ دونوں صفتیں نہ ہوتیں تو یہ گِل بھی نہ بن سکتی تھی...... گِل تیار نہ ہوتی تو "آ...... دم" کیسے وجود میں آتا......؟

تجز' ریگ میں پانی کا انجذاب نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے' پانی انہیں باہر سے گیلا تو کر دیتا مگر اندر سے

بھگوتا نہیں۔ جب تک کوئی اندر سے نہ بھیگے وہ ''بھگوان'' کیسے بن سکتا ہے؟...... خرطوم سے میں لیبیا پہنچا' پھر طرابلس سے چھ روز کا میدانی اور ریگستانی فاصلہ' جو بسوں' ٹیکسی' صحرائی سیاروں اور اُونٹوں پہ مشتمل تھا' بمشکل طے ہُوا۔ اس دَوران نہ تو کوئی خورد و نوش کا خاطر خواہ انتظام تھا اور نہ ہی استراحت و قیام کا...... شب و روز کا سفر' پیٹ خراب' اعصاب مضمحل...... نہانا دھونا درکنار' ہاتھ منہ بھگونے کے لیے پانی نام کی چیز کا حصول مُشکل تھا۔ اُوپر سے آگ برساتا سُورج...... بَول براز کی سہولت کا فقدان...... اور جسم میں پانی کی ازحد کمی واقع ہو گئی تھی۔ مجھے بیک وقت آرام' خوراک' اَدویات کی ضرورت تھی مگر اِدھر صحراؤں میں ان بُنیادی ضرورتوں کا محض تصوّر تو کیا جا سکتا ہے ان کا حاصل کرنا' جُوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔

میرے تجربے مشاہدے میں ہے کہ سیلاب میں بہتے' سفر میں پڑے اور ڈھلوان سے سرکتے ہوئے انسان کا خود پہ اعتماد اور اختیار ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ وہ جتنا سنبھلنے اور خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے اُتنا ہی وہ مزید خراب ہوتا ہے۔

ابھی مجھے اپنی منزل ''غلایا'' تک پہنچنے میں مزید چودہ صحرائی کوس طے کرنے تھے۔ پاپیادہ یا اُونٹ پہ کہ اُدھر کا راستہ...... صبح دوپہر شام اور شب اپنا جغرافیہ بدلتا رہتا ہے۔ صحیح سمت کا تعین صرف وہاں کے مقامی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ خراب موسم میں تو سفر بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

مَیں مغرب سے کچھ پہلے اِدھر سہ حدہ پہ پہنچا تھا۔ صحرائی کیکڑا یعنی سیارہ نے سہ حدہ سے کچھ پیچھے ایک پرانی سی صحرائی بستی میں اُتار دیا تھا۔ بستی کیا تھی چند اُجاڑ قسم کے جھونپڑے' سخت کھنچے ہوئے چہروں والے چند بوڑھے...... لگتا تھا اُنہیں کسی اجنبی کا اُدھر آنا خوشگوار نہ لگتا۔ نہ ہی وہ کسی کا میزبان بننا پسند کرتے ہیں...... سخت قسم کے تمبا کو نوش اور بے مہرے...... ایسے ناپسندیدہ غیر اخلاقی رَویوں کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ کسی اجنبی یا مسافر کو اپنی بستی میں شب بسری پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسی صُورت میں کون ہو گا جو اِدھر ٹھہرتا ہو گا؟

مَیں اور میرے ساتھ دو اور مسافر جو عراقی تھے ہم نے باہم فیصلہ کر لیا کہ جو بھی ہو...... آگے سہ حدہ پہ ہی رُکیں گے...... یہ بھی جانتے ہوئے کہ اُدھر جاگتے ہوئے چوکس رہ کر سخت پریشانی کے عالم میں رات کا وقت گزرے گا۔ سایہ نہ سائبان' صدیوں قدیمی خستہ حال کنواں...... پانی' پاتال سے لگا ہُوا اور وہ بھی دو چار چلّو سے زیادہ نہیں' نہ انسان کے کام کا' نہ جانور کے منہ دھرنے۔ کھار اور کڑواہٹ' دونوں اکٹھی ہو جائیں تو تیزاب بن جاتی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ صبر کر لیا جائے...... یہ بھی سنا وہاں رات کے اندھیرے میں قبرستان کے اندر آسیب اکٹھے ہو کر کوئی قدیمی شیطانی جلسہ کرتے ہیں اور کسی بھٹکنے والے مسافر کی قربانی پیش کر

کے اس کا خون پیتے...... اور پھر اُدھر گاڑھ کر اُوپر ایک آدھ پتھر رکھ دیتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا بھوت باہر نہ نکل سکے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اِدھر قبرستان میں یہ قبریں اور اُوپر پڑے ہوئے چھوٹے بڑے پتھر سب مقتول مسافروں کے مآل تھے۔ اس حساب سے تو کسی مسافر کو سہ حدے کے قریب تک سے نہیں گزرنا چاہیے تھا...... مگر راستے راہیں کب بند ہوتے ہیں چاہے اُدھر ڈاکو لومیں یا کوئی سانپ راہ مارتا ہو؟...... بس اتنی احتیاط ضروری ہوتی کہ رات کا اندھیرا اُترتے ہی سہ حدہ مسافروں سے خالی ہو جاتا۔

سہ حدے پہ پہنچتے پہنچتے شام کے سائے دراز ہو چکے تھے۔ ہم تینوں اب اس ششِ و پنج میں تھے کیا کریں' کیا نہ کریں...... اِدھر تو ویرانی تھی یا ملگجا سا اندھیرا کہ کچھ بھی صاف دکھائی سجھائی نہ دے رہا تھا...... ٹنڈ منڈ سے چند بانجھ سے کھجوروں کے درخت' ذرا کچھ دُور زنگ آلودہ ٹن اور کار بورڈ کے بنے دو چار ہٹ سے تھے...... جن میں ایک کے باہر تیل سے جلنے والی دُھندلی سی لالٹین لٹکی ہوئی...... جس کی روشنی ہونے نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہم تینوں تھکے ماندے بے دم سے ایک طرف ہو کے بیٹھ گئے۔ سب سے فوری حل طلب معاملہ بول و براز کا تھا کہ مسلسل آٹھ گھنٹے کی کیکڑا سواری نے ہمارے پیٹ بولا کر رکھ دیے ہوئے تھے...... انگ انگ سے ٹیسیں اور منہ سے "سیں سیں" خارج ہو رہی تھیں...... مجبوراً ہم باری باری اُٹھ کر اِدھر اُدھر بکھر کر' کسی نہ کسی طور فارغ ہو لیے...... اب فوری بعد کچھ ٹھونسنے کھانے پینے کے مسئلے نے سر اُٹھالیا...... اس کا بھی ایک ڈوبے کے توشہ دانوں سے حل نکل آیا۔"

## چاند' چاندنی اور چہار چکوے......!

اب چاند بھی نکل آیا تھا' چاندنی کا سحر بھی سر پہ چڑھ کر بولتا ہے۔ کسی نے اگر زندہ طلسم ملاحظہ کرنا ہو تو پورن چندر کی رات' صحرا میں نکل آئے...... جن و بشر' چرند پرند' نباتات و جمادات دریا' سمندر' جھیلیں جھرنے آبشاریں...... غرضیکہ ہر وہ چیز جس کا چاندنی پہ سایہ پڑے...... عالمِ وارفتگی میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کے نوری اور تابکاری اثرات سے دیوانے' فرزانے اور فرزانے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ سمندر کے اندر مونگے مرجان کی جڑیں رنگ پکڑتی ہیں...... کستورہ ہرن اور کستورہ ماہی کے ماتھے اور ناف میں برکت پڑتی ہے...... چکوے اور پپیہے کی جان پہ بن آتی ہے۔ فلکِ اوّل پہ نقرئی بانات تن جاتی ہے' رسوب بالا کی پہلی منزل تک کی راہ نیم روشن دکھائی دیتی ہے اور مہ کامل کی ضوفشانی سے اک عالم منور ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ چاند' چاندنی کا جمالی مثالی اور روحانی رُخ ہے۔ اس کارزارِ ہست و بود میں ہر موجودات کے

دوسرے رُخ کی طرح' چاند اور چاندنی کے منفی رُخ بھی ہیں جو انتہائی منفی اثرات کے حامل' سریع الاثر اور مکروہ ہوتے ہیں۔ طلسماتی اور طاغوتی عناصرات' بھوت پریت' نساجی' خون آشاموں...... آسیبی چمگادڑوں' میمنوں چھلاووں اور ٹونوں کے لیے چاندنی' اک بہار کے موسم کی طرح ہوتی ہے...... یہ سب ابلیسی استعانتیں...... خاص طور پہ پورے مثلث کی چاندرات میں اپنے اپنے ٹھکانوں' قبرستانوں مرگھٹوں اور غاروں درختوں کنوؤں سے نکل اُتر کر چاندنی کی کرنوں میں موج میلہ کرتی ہیں لیکن انسان کو دکھائی نہیں دیتیں اور نہ ہی ضرر پہنچاتی ہیں۔ تاوقتیکہ کوئی اُن کی مصروفیات میں بلاوجہ مخل نہ ہوتا ہو...... اس لیے بزرگ کہا کرتے تھے...... چھوٹے بچوں' خاص طور پہ خوبصورت لڑکوں لڑکیوں' کنواریوں کو چاندنی رات میں اکیلے باہر نہ نکلنا چاہیے کہ ڈر جاتے ہیں۔"

کسی حکمت کے تحت' اللہ کریم نے عام انسانوں (استثناء کے ساتھ) کو وہ صلاحیت اور آنکھ نہیں دی کہ وہ غیر مرئی اور شیطانی شرشرار اور بھوت پریت کو دیکھ سکے۔ اگر ایسی احتیاط نہ ہوتی تو بنی نوع آدم کا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا اور اندھیرے سویرے سفر کرنا مشکل ہو جاتا کہ ابلیسی قوتیں اور عناصر' جو مختلف شکلوں' جسموں میں ہمارے اردگرد ہوتے ہیں اگر ہم انہیں دیکھ لیں تو چیختے ہوئے بیہوش ہو جائیں۔

اپنی ابتدائی عمر میں جب نفع نقصان' اچھائی بُرائی' غلطی درستی کی کچھ پروا نہ تھی مجھے جن بھوت' بڈاوے' موت کا فرشتہ' جنت دوزخ' قبر کے اندر کے حالات' دودھ شہد کی نہریں' بہشت کے قصرات' باغ' حور و قصور' پل صراط وغیرہ دیکھنے' ان کے متعلق تفصیلات جاننے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مَیں نے درویشی فقیری یا تصوف بھی اسی لیے اپنایا کہ ایسے مافوق الفطرت اور مابعد الفوق الفطرت علوم و اسرار سیکھ سکوں۔ تعلیم تو حاصل نہ کر سکا شاید لاشعوری طور پہ اسی طرح مَیں اپنی کمزوریوں محرومیوں کا مداوا کر کے اپنے احساسِ کمتری کو سنبھالا دینا مناسب سمجھتا تھا۔ جو بھی تھا' ٹھیک ہی تھا...... مجھے فطرت اور کائنات کے اندر کی کائناتوں کے اندر' تہہ در تہہ دُنیاؤں کی کھوج کا جنون تھا...... یہی جنون مجھے گلی کوچہ بازار' جنگل صحرا' نگر نگر ڈگر ڈگر لیے لیے گھومتا رہتا تھا۔

ایران والے چاچا شیر علی نے مجھے اس جگہ کا اشارہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ کبھی موقع ملے تو ''صلا بیا'' جو لیبیا کے دُور دراز صحرا کے اندر ایک غیر معروف متروک سی بستی' جدھر ایک قدیمی قبرستان ہے۔ پر وہاں ایک کھلی قبر ہے جو صدیوں پرانی ہے مگر اس میں ایک بزرگ لیٹے کبھی بیٹھے...... اللہ کی تسبیح کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ السلام وعلیکم کہو تو اُدھر سے وعلیکم کا جواب ملتا ہے۔ اگر وہ چاہتے ہیں تو وہ ہاتھ اُٹھا کر مصافحہ بھی کر لیتے ہیں۔ ضرور جانا...... اس سے مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں...... وہاں پہنچو گے تو تم سب کچھ خود بخود جان جاؤ گے

کہ اِدھر کیوں آئے اور اِدھر پہنچنا کیوں ضروری تھا...... تمہارا کام صرف وہاں تک پہنچنا ہے۔ میں اُس کی بات کبھی نہ بھول پایا...... کوشش اور چاہنے کے باوجود اِدھر لیبیا کی جانب آنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ میں ''صلابیا'' پہنچنے کی آرزو پرانی ہونے کے باوجود ہنوز کسی بچھڑنے والے کی یاد کی مانند تازہ تھی۔ میرے پاس وافر وقت' زائد زادِ راہ' شوقِ فراواں اور وہ چیز حاصل کرنے کی جستجو بھی...... جس کا اشارہ اور مشورہ بھی ایران میں چاچا شیر علی نے دیا تھا۔ وہ کیا تھا جو ایران کے چمن زاروں میں نہ تھا...... اِدھر اُدھر دراز لیبیا کے آگ برساتے' بے آب و گیاہ' پُرہول ریگزاروں میں جس کا سراغ تھا......؟

اللہ کریم وجمیل کی ونڈ بھی کیسی پُرحکمت اور مصلحت آمیز ہوتی ہے کہ اس کی اتھاہ تک انسانی عقل وبصیرت کی رسائی آسان نہیں ہوتی...... انسانی دانش وبینش' دلیل منطق اور سیدھے صاف دو دونی چار والے اُصول طریقے کے تحت ہی کسی غلط صحیح' بھلے بُرے' چھوٹے بڑے یا سعد نحس کی بابت اپنی رائے پیش کرتی ہے جبکہ اللہ کریم کی قدرت وقدر' مشیت ومشیئت کے نہ تو ارضی یا کائناتی طرز وطرح کے کوئی قاعدے کلیئے ہوتے ہیں اور نہ کسی ملائکہ وجن یا بشر کے علمی و ادراکی قیاس وگمان میں' ان کا کوئی گزر ہو سکتا ہے؟

اتنا لمبا عرصہ' اِدھر پہنچنے کے انتظار میں کیا مصلحت تھی...... کیا راز تھا۔ یہ تو وہی قادرِ مطلق ہی بہتر جانتا تھا...... بس' مجھے تو اتنی خبر تھی کہ میں اپنی اس منزل کے قریب پہنچ چکا تھا جس کی جانب فکری سفر میں اک خاصا لمبا عرصہ بیت چکا تھا۔

رات کے چار پہروں کے بھی چار چار باطنی رُوپ ہوتے ہیں۔ جن کا اِدراک ہر ایک لیے نہیں ہوتا...... دن بھر محنت مزدوری کرنے والا اپنی تھکن دُور کرنے کے لیے کھاٹ پہ پڑ جاتا ہے۔ اُس کی بلا سے چار پہر کب آئے' کب گئے؟ رات بھر جاگتے تاروں اور چاند پہ کیا گزری؟ پپیہے اور چکور کس کرب سے دوچار ہوئے؟ شبنم بیچاری کتنے آنسو روئی؟ کوئی شب زندہ دار' کوئی پہلوئے یار میں مست؟ کوئی کسی آزار میں مبتلا؟...... رات کے رنگ رُوپ کوئی سرحد پہ چوکے پاؤں مستعد کھڑا نگہبان شب آخر کا کوئی مسافر عدم' کوئی برہا کا مارا...... کوئی منتظر ہی جان سکتا ہے' جس کی جاگتی آنکھوں کے سامنے' خامشی' تاریکی' سناٹے اور شب کی سیاہ زُلفِ گرہ گیر کے مشکبار سائے عجب دُھنکی رچاتے ہیں...... یہ بھی جانا کہ شب سے شناسائی نہیں ہوتی تو شناور دریاؤں کی شناوری بھی نصیب نہیں ہوتی...... شیخوپورہ پہنچنے کے لیے شاہدرہ بھی تو شب کے پہر کے اندر کا ایک پہر ہے...... کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی......؟

## آخرِ شب کے ہمسفر......!

میرے دونوں لبنانی ہمسفر اِدھر سہ حدّے تک ہی میرے ساتھی تھے...... یہاں بائیں جانب جو راہ نکلتی تھی...... اُدھر کے لیے تین چار نفر اُونٹوں کا کارواں پہلے سے ہی موجود تھا...... دو ایک مسافر پہلے سے اِدھر تھے...... ان لبنانیوں کے پہنچتے ہی یہ کارواں اپنی منزل کی جانب رَوانہ ہو گیا' باقی جو ٹوٹکو بچے اُن میں بدو قسم کے دو اور مسافر...... جو پیدل ہی اپنی کسی منزل کی طرف ہو لیے تھے۔ ان کا سامان بھی بدوانہ قسم کا تھا...... خیموں کی مرمت کا سامان' پلاسٹک کے پانی جمع کرنے والے برتن اور کچھ کھیتی باڑی کے اُوزار؟...... مَیں حیران تھا جب وہ یہ بے ڈھنگا سا کاٹھ کباڑ' اپنے سروں کاندھوں پہ لاد کر...... ڈوبتے سورج کے رُخ رَواں دکھائی دیے۔ صحرا نشینوں میں ایک خاص خوبی یہ ہوتی ہے کہ باہر اُن کے شتر ہوں نہ ہوں۔ اُن کے اندر شتر ضرور ہوتے ہیں...... اور شتر کینہ بھی...... دونوں کی قدرِ مشترک' بُنیادی ضرورت پانی ہوتا ہے۔ ان کے مابین ستیزہ کاری کی اکثر وجہ بھی پانی کے کنویں اور شترِ اصیل ہوتے ہیں۔

صحراؤں کے بیچ میٹھے پانی کا گہرا کنواں' چھوٹا بڑا نخل اور شتر ہی اصل متاعِ حیات ہیں۔ صحراؤں کی سرداری' اُسی کے پاس ہوتی ہے جس کے ہاں یہ تینوں نعمتیں موجود ہوں۔ مَیں اُن سابقہ دونوں ساتھیوں کو سیاہی اور گہری خون رنگ سرخی میں اُترتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ مزید کچھ دیر بعد یہ سرخی بھی غائب ہو جائے گی پھر بڑی سرعت کے ساتھ تاریکیاں اپنے تمبو تان لیں گئیں...... اندھیروں کے منتظر جانور اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئیں گے...... صحراؤں کے راستے تو ہوتے ہیں' بس! سمت کا غلط یا صحیح تعین ہی ہوتا ہے یا پھر وقتِ حاضر کا کوئی ستارہ' راہ' سمت سمجھاتا ہے......

بے ڈھنگے سے سامان کا بیہودہ سا بوجھ...... مَیں اس پرائی چیز کو پیٹ میں رکھے مروڑ کھا رہا تھا کہ سہ حدّے کے تیسرے راستے سے' جو ان دو لبنانی بدّوں والے راستے سے کچھ پرے نکلتا تھا۔ اک سایہ سا' جو کبھی ہے کبھی نہیں...... اِدھر اپنی جانب بڑھتا ہوا جاپ پڑا...... مَیں اِک ٹک سے اُسے دیکھنے لگا۔

پُشت دکھانے والے ہیولے ہیولے معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اِک نُقطہ بن کر پیشِ منظر میں کہیں ختم ہو جاتے ہیں...... اسی طرح چہرہ دکھانے والے' صبح سویرے سورج کی کِل سار رنگ کی نسار اُبھرتے ہیں اور پھر سوچتے ہی سوچتے' آنکھوں کے سامنے اِک روشن حقیقت کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ اِدھر میری جانب بڑھتا ہوا ہیولا اب کچھ خدوخال پکڑتا جا رہا تھا۔ صحراؤں کے چمکتے دن' آنکھوں میں

چکاچوند پیدا کرتے ہیں...... سُلگتے تیز وتند جھکڑ اور نظر دھوکہ دیتے ہوئے سَراب' صحرائی خاشاک کے لہراتے اور بھاگتے ہوئے گولے' ایک دفعہ تو مسافر کو گھما کر رکھ دیتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے جنوں بھوتوں کے بچے' ہوا و ردولوں کے پھندوؤں سے کھیل رہے ہیں مگر شام اُترتے ہی منظر بدلنے شروع ہو جاتے ہیں...... اُونگھتی ہوئی خموشیوں کو جیسے اِذنِ تکلم مل جاتا ہے...... سُورج کے پردہ پوش ہوتے ہوتے رات کی رانی بھی اپنی مشکبار زلفیں کھول دیتی ہے...... فضاء میں کستوری کی لہک سی لہرانے لگتی ہے۔ چیتل' تلور' موروں' تیتریوں جینڈے جھینگروں کی سرگوشیوں کے زمزمے سماعت میں رس ٹپکانے لگتے ہیں۔ مست خرام نیروا کے انگ بدلتے نرت بھاؤ...... مہاراج غلام حسین کتھک' مہاراج بِھورام اور ستارہ دیوی نیپالن کی یادیں تازہ کرا دیتے ہیں۔

آسمان اور فلک پہ حاملانِ افلاک اور مہ و انجم کی انجمن آرائیاں جھلملاہٹیں' ضوفشانیاں' تنویریں' کھیل تماشے' چالیں چہلیں اور آپس کی چپقلشیں' چارچُوئیں ملاحظہ میں لاتی ہوں تو اوّل صحرا' دوم سمندر اور سوم پہاڑ...... ان تینوں میں صحرا ہی ہیں جن کی نیلے فلک سے اکثر قدریں مشترک ہیں...... ایک دوسرے کے مقابل' نیچے اُوپر...... اجرام اور ذرّے برابر برابر نیچے سامنے ذرّے تو واضح اس لیے دکھائی دیتے ہیں وہ قریب تر ہوتے ہیں مگر اجرامِ فلکی لاکھوں کروڑوں نُوری سال و میل دُور اُوپر...... اُوپر کے لیے وقت اور پیمائش کا پیمانہ اور...... جبکہ نیچے کے لیے مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے نیچے تو بہت کچھ دکھائی دیتا ہے مگر اُوپر وہی کچھ جو ہمارے دائرہ بصارت میں آتا ہے۔"

کہتے ہیں صحرا' پہلے قلزم ہوا کرتے تھے...... امتدادِ وقت سے سمندروں کا پانی گرم ہو کر خشک ہو گیا اس کی موجیں' ریلے' لہریں اپنی ہیئت بدل کر ٹیلے بے ٹیکرے بن گئیں...... پانی' بُلبلوں قطروں میں تبدیل ہوتا ہوتا بالآخر صاف شفاف ذرّوں میں تبدیل ہو گیا۔ دیکھا جائے تو صحرا' اک خشک سمندر ہی تو ہوتا ہے...... جیسے ہر صحرا کے نیچے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر...... اسی طرح ہر سمندر کی اتھاہ میں ایک خشک صحرا بھی ہوتا ہے...... بس' یہ نیچے سے اُوپر اور اُوپر سے نیچے والا فرق یا فلسفہ جس کی بھی سمجھ میں آ جائے......؟

لحظہ لحظہ تاریکی بڑھتی چلی جا رہی تھی...... اسی تاریکی میں بجلی اِتنی تیزی' اک عجیب سی مخلوق' میرے قریب کے اک بے ثمر و سایہ کوتاہ و قامت کھجور کے تنے کے ساتھ پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی...... بدوؤں والا' بن آستین کا لمبا چوغہ...... جو تاریکی سے بھی کہیں زیادہ و تاریک اور تار تار ہو گا۔ سر پہ دریدہ سا سُرخ رومال...... بس یہی کچھ تھا جو دکھائی بھی دے رہا تھا اور نہیں بھی۔ بادیٔ النظر میں وہ کوئی اُچکا' اُٹھائی گیرا دکھائی دیا جو مسافروں کو غافل پا کر' انہیں زادِ راہ سے ہلکا کر دیتے ہیں...... یا پھر کوئی بھک منگا...... ذہنی طور پہ کھسکا ہوا بھی ہو سکتا ہے...... کسی اُونٹوں

والے کا کارندہ بھی ...... جو مسافروں میں مَیں اب آخری مسافر تھا جسے شاید خود بھی کوئی اپنی خبر یا فکر نہ تھی کہ وہ قیس ہے لیلیٰ' محمل یا صحرا ہے......؟

سر پہ پڑی رات' پردیس' بُنیادی ضرورتیں...... اِدھر کوئی سرائے' آشرم' نہ مدرسہ' مسجد کہ جدھر مسافروں کے لیے بادا نُچاکا' شب بسری کا آسرا ہوتا ہے۔ بیمار پڑ جائے تو کوئی چارہ ساز' عطار اور نہ دوا دارو؟...... موسم رُوٹھ لے تو کوئی چھپر نہ چھاؤں' کجا وہ نہ کانس' اوٹ نہ آڑ' بجیرا نہ باڑ...... سب کچھ خدا کے آسرے پہ تھا۔ یہ سب کچھ ٹھیک مگر اس کے باوجود...... انسان' ولی اللہ ہو یا درویش بھگت' مجذوب یا کسی طور کا مسافر......! ہوتا تو بندہ بشر ہے۔ اس کے فطری جبلّی' جسمانی نفسانی تقاضے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ ایک حد تک تو خود کو دبایا جا سکتا ہے مگر اُس کے بعد معاملہ خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اعصابی ٹوٹ پھوٹ بھی...... پھر اس کے بعد ایکدم سب کچھ تباہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ انسانی فطری طریقہ یہی ہے کہ انسان اپنے قول و فعل' طور طریقوں اور رَوّیوں میں معاملہ فہمی اور یوں توازن و اعتدال رکھے کہ ہر دو صورت' آسانی اور سلامتی رہے۔ بشر اگر اپنے بشری اندازِ فکر اقدار اور وقتِ حاضر کے معاشرتی' سماجی تقاضوں میں افہام و تفہیم کو اپنا شعار بنا لے تو ستر فیصد مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

جو اپنی ذات سے ذرا پرے ہٹ کر دوسروں کے متعلق سوچتا ہے...... اپنے سے بہتر سمجھ کر فوقیت عزت و توقیر دیتا ہے...... عزتِ نفس کا احساس کرتا ہے۔ اُس کے دُکھ درد کو محسوس کر کے اپنا سمجھتا ہے۔ وقت پڑنے پہ آگے بڑھ کر مدد کرتا ہے...... سہارا دیتا ہے دلجوئی کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے جینا سیکھ لیا ہے۔ زندگی کا مفہوم جان لیا ہے...... وہ صحیح معنوں میں خلیفۃ الارض کے منصب پہ متمکن ہونے کا سزاوار ہے۔

مجھا ایسے اکثر لوگ محض ظاہریت کے خُوگر ہوتے ہیں...... اُن کی نُودی نظر میں عزت' محبت' قربت قدر اور دوستی کے اہل وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس کوٹھی' کاروبار' فارم ہاؤس یا وہ کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پہ فائز ہوں...... کسی امیر وزیر' بیوروکریٹ' جج' پولیس' سیاستدان کے رشتہ دار ہوں...... دن میں کئی کئی لباس گاڑیاں بیویاں اور وفاداریاں بدلتے ہوں...... انہیں تنگ گلیوں' محلوں' بھینس کالونیوں' گندے نالوں کے قریب رہائش پذیر...... چہروں مُہروں سے غریب دکھائی دینے والوں' ویگنوں میٹرو اور موٹر سائیکل' رکشوں پہ سفر کرنے والوں' چکڑ چھولوں بڑی کھد' بونگ سری پائے' پٹھانوں کے تندوروں سے نان کلچہ کا ناشتہ کرنے والوں...... پاکستانی کرتہ شلوار اور لنڈا برانڈ استعمال کرنے والوں' بار بار کثرت سے السلام علیکم' الحمدللہ' ماشاءاللہ' سبحان اللہ' جزاک اللہ کہنے والوں سے سخت کد ہوتی ہے...... وہ بوتل کے اندر کا امرت دھارا نہیں دیکھتے' باہر کا لیبل بناوٹ اور خوبصورتی دیکھتے ہیں۔''

سُنا دیکھا ہوگا کچھ لوگوں کو پرانی ٹکٹیں سکّے تصویریں اخباریں رسالے گانوں کے توے جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اِسی طرح کچھ مجھ جیسے پاگل لوگوں کو خوبصورت بوتلیں خوشبو عطر کی شیشیاں بھی جمع کرنے کا جنون ہوتا ہے۔ مجھے بھی امپورٹڈ زیتون اور شراب کی نادر بوتلیں جمع کرنے کا چسکا ہے...... مَیں اُن پہ خطاطی اور ڈیزائننگ کرتا ہوں...... قیمتی خام اور تراشیدہ پتھر جواہرات سیپ گھونگے سمندری کدو جن کے کشکول بنتے ہیں اور خشک دریائی گھوڑا مچھلی بھی جمع کرنا میرا مشغلہ ہے...... مَیں کتابوں قلموں اوراق اور ان مذکورہ بالا مخلوقات کے درمیان رہنا سونا جاگنا اور دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ یہ مجھے چاہتے ہیں اور مَیں اِن پہ نثار رہتا ہوں۔ مَیں اِن کی تلاش میں اور یہ میری جستجو میں رہتے ہیں......

چت ملے کا چیلہ تے مَن لگے کا میلہ

یہ تمام بات مجھے اس لیے کرنی پڑی کہ یہ اچانک تیسرے راستے کے اندھیرے سے کسی سیاہ کرن کی طرح برآمد ہونے والا نیم مجذوب انسان ایسا ہی تھا...... نہ کوئی ظاہری شخصیت چال ڈھال سے ڈھلو ملو...... شکل و صورت لباس...... افلاس ہی افلاس...... کوئی بھی تو ایسا نہ ہوتا کہ جو اس کی جانب توجہ دینے کی خواہش کرتا۔ اپنے اور اس شخص کے علاوہ اگر اِدھر کوئی تھا تو فی الوقت وہ منظر سے اوجھل تھا...... صحرا کے پردۂ غیب سے کب کوئی اُبھرتا ہے اور کب کوئی اوجھل ہوتا ہے یہ تو شاید خود صحرا بھی نہیں جانتا......؟

رات ریگ گھڑی کی طرح نامعلوم سے انداز سے آہستہ آہستہ جمع ہوتی جا رہی تھی اور ہلکی سی خنکی بھی دَر آئی تھی جس کی وجہ سے ہلکا سا تھکن کا احساس ہُوا۔ کپڑوں کا تھیلا جس میں سلیپنگ بیگ کپڑے تھے چرمی تھیلی جس میں پیسے کاغذات پاسپورٹ دوائیں اور دورانِ سفر کام آنے والا اَلم غلم ہوتا ہے اور پانی کی چھاگل! یہی کچھ ہلکا پھلکا زادِ راہ تھا جسے کسی بیکار بوجھ کی طرح اُتار کر مَیں ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر بیٹھ چکا تھا کہ شاید رات یہیں بسر ہو...... شاید اس سرحد پہ اس وقت ہم دونوں کے علاوہ نہ تو کوئی مسافر دکھائی دے رہا تھا نہ کوئی قافلہ اونٹ نہ ایسے کوئی آثار...... لیکن صحراؤں سمندروں جنگلوں اور دیوانے درویشوں کا کیا بھروسہ...... کب ان کے مزاج و تیور بدلتے ہیں؟ ان کے ہاں کسی اُصول منطق قانون کا کیا کام؟...... ان دیوانوں درویشوں کے اپنے ہی فلسفے ہوتے ہیں یا پھر سرے سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔

اُس بندۂ صحرائی نے شاید مجھے اِک اُچٹتی سی نظر سے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ جو اس سے سوا دیکھ رہا ہو اُسے کسی اور طرف نظر کرنے کیا کیا ضرورت؟ نظارۂ طور میں محو بلّے جوگیاں کی جانب کیونکر دیکھے...... فنا فی اللہ فنا فی الشیخ تو بڑے بخت کی منزلیں ٹھہریں فنا فی الذات کا راستہ ہی دُنیا مافیہا سے بہت الگ ہو کر گزرتا ہے......؟

## کوچۂ اَبدال کا دریوزہ گر......!

جانے وہ کون تھا مگر جو بھی تھا کوئی ماورا سی چیز تھا۔ ظاہر ہے وہ یہیں کہیں' قریب و جوار میں ہی رہتا ہوگا۔ اسی علاقہ کا کوئی باشندہ ہوگا۔ اجنبی یا کوئی بھولا بھٹکا مسافر تو یوں اطمینان اور بے نیازی سے اِدھر براجمان نہ ہوگا؟...... اُس کی تن تنہائی' بے سروسامانی' اَلست مستی یہی ظاہر کرتی تھی کہ وہ کوئی فقیر درویش ہے۔ نہ یہ نجد کا صحرا' نہ یہ قیس اور نہ ادھر کوئی کُتا...... ورنہ مَیں مان لیتا کہ آج میاں مجنوں سے ملاقات ہوگئی ہے۔ اُدھر کچھ دُور' جو سوکھے ٹنڈ منڈ کھجوروں کے درختوں کے پاس جو اُجڑا ہوا جھونپڑا تھا۔ شاید اُدھر کوئی رہتا ہو لیکن جب سے مَیں آیا ہوں مَیں نے اُدھر سے کسی کو نکلتے یا آتے جاتے نہیں دیکھا تھا......

مجھے قریب قریب سو فیصد یقین ہو چلا تھا کہ آج رات ادھر ہی گزرے گی۔ اس سے پہلے کی چار جاگتی راتیں بھی صحرا میں گزری تھیں...... لیکن ایسی ہول اُلاگتی ہوئی' بوجھل قدمی' اُداسی رات' کچھ علیحدہ ہی محسوس ہو رہی تھی جبکہ میری منزل مراد ابھی ایک آدھ منزل کی دُوری پہ تھی۔

بندہ بشر' بیماری بیزاری' مسافرت مہاجرت' کار کرم' تعلیم' کسی وظیفے مجاہدے یا کسی عشق معشوقی کی منزل میں پڑا ہوا ہو تو وہ ظاہری باطنی' ذہنی اور روحانی طور پہ ایک قسم کی تنویمی کیفیت میں ہوتا ہے' وہ خالصتاً بالیدگی اور شعور و سمجھ کی حالت میں رہ کر کوئی انوکھا کام سرانجام دے ہی نہیں سکتا۔ کچھ مسئلے عقل و دانش اور ہوشمندی سے طے پاتے ہیں اور کچھ دیوانگی اور جنوں کے متقاضی ہوتے ہیں اور چند ایسے بھی جو حماقت نادانی' دانستہ غیر ذمہ داری اور بے نیازی برتنے سے پایہ تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ ہر کھیل کے لیے علیحدہ کھلواڑ' ہر شکار کے لیے علیحدہ شکارگاہ' ہر اُڑان کے واسطے خاص فضا و ہوا...... تیرنے ڈوبنے کے لیے کوئی انوکھا سا سمندر' ہر ستیز و کاری کے لیے مخصوص پانی پت کا میدان......"

جنگل کا قانون' آبادیوں بستیوں پہ لاگو نہیں ہوتا...... رواں پانیوں کی گزرگاہوں کو دریا آبجو یں نہریں کہتے ہیں اور راہ انسانوں کی راہوں کو شاہراہ' شارع...... بادل' ہوا' روشنی سب کے لیے...... کسی انسان حیوان' اچھے بُرے اعلیٰ و ادنیٰ' عربی و عجمی کے تخصیص نہیں ہوتی...... اسی طرح کچھ زندگیاں یوں بھی کہ بظاہر اُن کا کوئی مقصد محور دکھائی نہیں دیتا...... محبتیں بھی جن کا نصیب ہجر یا وصال نہیں ہوتا...... تعلق' جو اکثر بانجھ رہتے ہیں...... رشتہ داریاں جو اصل میں دُشمن داریاں ہوتی ہیں...... اسی طرح عبادتیں' ریاضتیں' حضر و سفر' عندیے اور مُفاد و مقاصد' فیصلے فرمودے' ایثار قربانیاں' صبر و شکر وغیرہ یہ سب اعمال و افعال' رائے رویے ضروری نہیں کہ

اخلاص یا راستی پہ مبنی ہوں۔"

معیارات اپنے روائیں بدلتے رہتے ہیں...... بظاہر خشک اور سنجیدہ صاف دکھائی دینے والا برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ فیصلہ کرنے میں عُجلت 'خجالت' کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ مادی دُنیا اور بشری معاملات میں کچھ بھی سو فیصد نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اپنی رائے کو حتمی کہنے سے گریز کرو۔ اس اتفاق و اسباب 'نفی اثبات' ہزار رُخی 'پل پل پہلو بدلنے' رجا و رنج سے تعبیر 'دکھلاوے بہلاوے' عشوہ و انداز 'آس نراس کے نت نئے رنگ ترنگ دکھلانے والی طوائف صفت دُنیا میں رہتے ہوئے ایک آنکھ میں یقین اور دُوجی میں شک رکھو کہ حق اور سچی ذات باری ہے 'جس پہ ایمان سب پہ بھاری ہے...... باقی جو کچھ ہے وہ تلذیزی اور تاتاری ہے......!

یہیں بیٹھے ہوئے مجھے ایران والا چاچا شیر علی یاد آیا...... عجب دین و دُنیا سے بے نیاز مرد تھا...... لیکن وہ بظاہر ایسا تھا باطن کچھ اور تھا۔ اس سے پیشتر بھی کسی باب میں بحث ہو چکی ہے کہ اس جہان رنگ و بو میں کوئی بھی دکھائی دینے اور محسوس ہونے والی موجودات اپنا ظاہر و باطن الگ الگ رکھتی ہے۔ یہ تقاضۂ فطرت کے تحت ہے کہ ہر لحظہ لمحہ 'ازلی نظام تغیّر سے موجودات کی ہیئت کذائی میں نمایاں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے' جو ساتھ ساتھ ماضی کا حصہ بھی بنتی جاتی ہے۔"

لگتا ہے جیسے اس کائنات کو خالق و مالک نے کسی خاص مصلحت کے تحت اُدھورا رکھا ہے...... (استثنٰی کے ساتھ) ایک کی خوبی دوسری مخلوق کی ضرورت بنا دی...... کسی کو بوجھا کر دیا اور کسی کو کمی کر دی' تا کہ وہ ایک دوسرے سے منسلک ہوں آپس کی ضرورت رہیں۔ کپڑے بننے والا جوتا نہیں گانٹھ سکتا...... گھوڑے کا معالج' گھوڑے کے سوار کا علاج نہیں کر سکتا...... مرد ماں نہیں بن سکتا اور لوہار زیور نہیں بنا سکتا...... کوئی سیکھنے والا اور کوئی سکھانے والا...... کسی کا مقدر ہار ہے اور کوئی فاتح...... کدھر خامیاں ہیں اور کہیں خوبیاں...... کوئی عاشق ہے تو کوئی معشوق...... یعنی ہر چیز اک دُوجے کی محتاج...... جیسے پانی کے سالمے دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں...... روشنی کی کرنیں آپس میں جُز کر شعاعیں بنتی ہیں۔

رُوحانیت تصوّف میں بھی یہی کچھ ہے۔ کوئی دینے والا اور کوئی لینے والا...... کسی کے پاس پچیس فیصد ہے' باقی کا پچھتر فیصد کسی اور کے پاس ہے یا اس سے زیادہ ہیں' جن کے پاس اُس کا حصہ رکھا ہُوا ہے۔ ایسے بہت سے واقعات پڑھنے سننے کو ملتے ہیں...... کسی بزرگ کے قدموں میں کوئی طالب پہنچتا ہے' وہ اُسے فیضیاب کرتے ہیں...... پھر حکم ہوتا ہے۔ بس' تمہارے لیے اتنا ہی تھا...... باقی کا تمہیں فلاں جگہ سے حاصل ہوگا۔ یہ ویسے بھی سائل کے سوال...... طالب کے حُسنِ طلب پہ منحصر ہے کہ اُس کا دامن' کس در پہ بھرے گا...... کس کی نگاہ سے فیض ملے گا۔

پھٹکری نوشادر زینگ معصفر تو گلی بازار کے پنساریوں دکانوں سے بھی دستیاب ہو جاتے ہیں مگر جب کبھی ضرورت اصلی چترالی سلاجیت' کشمیری زعفران یا کچے میوے کی شراب' اصلی نافہ کستوری کی پڑ جائے تو کالے کوسوں کا سفر اور کھنکتی چمکتی اشرفیوں کی تھیلی درکار ہوتی ہے۔

چاچے شیر علی ایران والے نے' جانے کس ترنگ میں آ کر مجھے ادھر صلالہ بیا (لیبیا) جیسے دور دراز صحرا میں ایک غیر معروف سی جگہ' ادھر شاید گنتی کے چند جھونپڑے اور بہت سی بے نام و سنگ قبریں...... جن پہ اگر بھاری پتھر نہ دھرے ہوں تو وہ قبریں دکھائی ہی نہ دیں۔ پہنچنے کا مشورہ یا حکم دیا تھا۔ ظاہر ہے اگر اس نے مجھے ادھر پہنچنے کا کہا تھا تو وہ خود بھی ادھر کبھی پہنچا ہوگا...... لیکن مجھے یہ نہ بتایا گیا کہ میرا ادھر پہنچنا کیوں ضروری ٹھہرا ہے اور نہ ہی یہ نشان دیا گیا کہ کس سے ملنا ہے اور کیا لینا دینا ہے؟...... ایسے کسی سوال کا جواب' میرے پاس نہ تھا۔ یہ سلسلۂ وفا بھی عجیب ہوتا ہے کہ لبوں کو اذنِ جنبش نہیں ہوتا...... سوال کرنا یا کچھ کہنا پوچھنا در کنار' کچھ سوچا جانا بھی کفر کی ذیل میں آتا ہے۔ دل جما کے سر جھکا کے تسلیم کا اشارہ دینا پڑتا ہے...... سو میں بھی یہ کر گزرا تھا۔ کئی ماہ و سال سے میں...... اسی انتظار میں تھا کہ کب ادھر کی راہیں کھلتی ہیں اور میں ''صحرائے شوق'' میں ایک ذرۂ ریگ کی مانند شامل ہو جاؤں گا۔

آسمان پہ چمکتے ستارے' آگے پیچھے دائیں بائیں ہر سو انسان ہی انسان...... درخت پہاڑ وغیرہ بظاہر دیکھنے کو ایک سے ہی لگتے ہیں...... جیسے ٹوکرے میں پڑے سیب...... خوشے میں جڑے انگور...... تاجور انار میں خوش رنگ خوبصورت یاقوت دانے...... ایک دانۂ ریت کا...... انسان اور اس کا کمپیوٹر ان ریگ ذروں کو صحیح سے گنتی کرنے سے عاجز آ جائے گا...... سیکڑوں ہزاروں لاکھوں اربوں کھربوں اور پدموں کے بنیادی اعداد و شمار کے انبار کپڑے کے تھانوں کی مانند تہہ ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ بشر کی عملی عقلی علمی' فکری بصیرتی اور استعدادی صلاحیتیں محدود و مسدود ہیں ایسے ہی کچھ راز' جو مالکِ کُل نے اپنے اس شہکار سے اخفا میں رکھے...... ایسا نہ ہوتا ہر کوئی اپنی جگہ پہ خدا بنا بیٹھا ہوتا......؟

اللہ' خالق و مالک و رازق کے بارے جو متامل و منکر ہو' اُسے اُٹھا کر بیچ گہرے سمندر اندر کسی ٹاپو پہ اُتار دیا جائے یا مونٹ ایورسٹ' گلیشیر پہ بٹھا دیا جائے یا کسی گھنے جنگل کے درمیان ڈال دیا جائے یا کسی لق و دق صحرا میں پہنچا دیا جائے...... تو کچھ ہی دیر میں ماننے پہ مجبور ہو جائے گا کہ اُس کا اور اس صحرا کا بھی کوئی خالق ہے...... وہ مٹھی بھر ریگ اُٹھائے اُس کے ذرے گننا شروع کرے...... بہت جلد وہ ریت پھینک دے گا اور پکار اُٹھے گا...... بے حساب و بے شمار صرف اللہ کریم کی ذات ہے۔ سمندر پہاڑ جنگل صحرا اور بھی سب کچھ محض اُس کے مظہر ہیں۔

خلیل جبران نے کہا تھا..... صحرا کے اَن گنت ذرّوں میں سے کسی ایک کا سینہ چیر کر جھانکو، غور سے دیکھو تمہیں ایک مکمل کائنات، جس میں چاند سورج، سیارے ستارے، کہکشائیں، منگھٹ، سیاہ غاریں، بروج، ساکنانِ افلاک اور جو کچھ اِس کائنات میں ہے..... نہریں دریا، جھیلیں، موسم، پیڑ، زمین، میدان، سمندر پہاڑ جنگل صحرا نخلستان گلستان وغیرہ، اک پورا نظامِ ہستی قدرت و فطرت کی مکمل کارفرمائیاں بلکہ اِس سے بھی سوا دکھائی دے گا۔؟

جب کہیں عالمین کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو مطلب یہ نکلتا ہے..... اَن گنت جہان، عالم..... جن تک ہماری علمی عقلی اِدراکی رسائی نہیں ہے اور نہ ہی وہ بینائی گہرائی اور گیرائی کہ ہم اُنہیں دیکھ سکیں مگر جنہیں اللہ مالک وخالق نے عطا کیا ہو.....!

اِنسان اگر اشرف المخلوقات ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیگر مخلوقات اسفل مخلوق ہیں..... اللہ تعالیٰ جب مخلوق میں کسی کو کوئی اعزاز تفویض کرتا ہے تو یونہی نہیں بخشا جاتا بلکہ اُسے اس اہل بھی بنایا جاتا ہے جبکہ وہ خود کو بھی اس قابل بناتا ہے۔ اگر وہ خُود کو اس شرف کے اہل ثابت نہیں کر پاتا یا کوئی کوتاہی برتتا ہے تو پھر اک مخلوق محض ہی رہ جاتا ہے..... مخلوقِ محض ہو یا مخلوقِ خاص! بہر حال مخلوق تو ہیں ہی..... فرق صرف شرف، احساسِ ذمہ داری اور عمل کا ہے.....!

حجلۂ صحرائی میں رات کسی عنبریں سی طرحدار عروسہ کی طرح سے اُترتی ہے کہ ذرہ ذرہ شوقِ وصل میں سرشار ہو کر دَمکنے اور جھکنے لگتا ہے..... آہوان آوارہ، دیگر ساکنانِ صحرا، خوش نوا طیور و میور اور کانڈل کیوڑے کی مہکاریں بکھیرتی ہوئی پُروائی.....!

صحرا تھلوں میں سفر کرنے والوں کی سماعت بصارت اور حسِ لطیف میں اگر برکت ہو تو وہ یہ سب کچھ دیکھ، سُن اور محسوس کر سکتے ہیں۔ ریگزاروں میں سَراب خُنک ولدلیں..... ٹیلے ٹیکرے جھاڑ جھنکاڑ، جھکڑ جھولے کھال جھلساتی گرم ہوائیں..... آنکھیں پھوڑتی ہوئی ریت کی چمک..... مسافر کے لیے بہت بڑی آزمائش ہوتے ہیں۔ دن بھر سفر کرنے والوں، سوا نیزے پہ سورج کی جان لیوا تمازت جھیلنے، تجھلتی ریت سے سُوجے، فگار پاؤں کی ٹیسیں، دورانِ حرکت تو کم مگر جونہی استراحت کے لیے کمر کھولی تو آنکھیں دکھانے لگتی ہیں.....

اگر کہیں کسی جھیڑو کانٹے نے ''دندی'' رکھ دی ہو تو اُس کا سواد الگ آتا ہے۔ ویسے بھی کھیس (چوہا) نیز گلہری، اُلٹا جنم لینے والے پانچ چھ دانت بچے، لال گانی والے طوطے، جنگلی بیری کا کانٹا، پیلی بھڑ، کالی شہد کی مکھی، ڈیمو، سنپولیا، بچھو، خارِ مُغیلاں اور تھلوں صحراؤں میں جا بجا پائے جانے والی جھاڑی ببولی کے خُمدار کانٹے جو خشک ہو کر ببولی کی جھاڑی سے جھڑ کر اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔ تیز ہوائیں جھکڑ آندھیاں اُنہیں دُور نزدیک اُڑتی ہوئی

ریت میں شامل کر دیتی ہیں اور یہ ریت میں دَبے ہوئے دکھائی نہیں دیتے...... گو شتر کے پاؤں چپٹے اور سخت ہوتے ہیں اس کے باوجود یہ خمدار تیز اور سخت زہریلا کانٹا اُسے بھی بے بس کر دیتا ہے۔ عام بندہ تو دو قدم چلنے سے بھی معذور ہو جاتا ہے۔ اسے ایڑی تلوے سے نکالنے کے لیے بھی اک خاص ڈھنگ ڈھب کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی اور عُجلت سے کام لیا جائے تو یہ پاؤں کے اندر ٹوٹ جاتا ہے۔ دراصل اس کی اَنّی ہی اصل زہر ہوتا ہے جب یہ اندر گوشت میں رہ جاتی ہے تو بے حد تکلیف ٹیس پیدا کرتی ہے۔ پاؤں اور گھٹنے ٹخنے کی رگوں نسوں میں جکڑن پیدا کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ ایسا کوئی کم ہی پیادہ مسافر ہوگا جس کے پاؤں میں چھالے نہ پڑیں یا خار مغیلاں نہ چبھیں......!

دُنیا کے چند بڑے وسیع و عریض' پُراسرار' عجیب و غرائب خطرناک صحرا اور تھل جو اپنی جغرافیائی' تاریخی' موسمیاتی' حیاتیاتی اور رُوحانی حیثیت سے بھی اپنا ایک مقام و شہرت رکھتے ہیں...... مجھے مختلف حالات و وجود کی بنا پہ صحرا گردی کے مواقع حاصل ہوئے۔ اسی تلاش و جستجو' آوارہ گردی سیاحت کی اک اوکھی سی منزل یہ لیبیا کے صحارا بھی تھے۔ اسی طرح کالاہاری' تھر کے صحرا' صحرائے گوبی' تکلامکان' اوچھی' راجستھان' بیکانیر' سعودیہ کے صحرا...... بلوچستان' رحیم یار خان' سندھ کے تھل روہیاں وغیرہ بھی......!

کہتے ہیں پہلوان' بزرگی میں سستی اور جوڑوں کے درد کے ہاتھوں بہت اوکھا ہوتا ہے۔ ہیجڑا ڈاڑھی چھوڑ کر ہاتھ میں تسبیح پکڑ لیتا ہے کہ ضعیفی میں چہرے کی ڈھیلی کھال پہ موٹے سخت بال مونڈنا اب اُس کے بس سے باہر ہو کر رہ جاتا ہے۔ سپیرا اور شکاری' اکثر اپنے اپنے پیشے یا شوق کے ہاتھوں ہی اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔ جیسے بدمعاش اسمگلر اور دیگر غیر قانونی اخلاقی حرکتیں کرنے والے گنتی کی موت مارے جاتے ہیں۔ ملاح کے نخٹے میں پانی نہیں ہوتا اور اس کا انت بھی اکثر پانی ہی ہوتا ہے۔ بہتے اور گہرے پانیوں' جنگلوں پہاڑوں' برفزاروں...... ریگزاروں میں بود و باش رکھنے والوں اور اِدھر سے رزق تلاش کرنے والوں کی زندگیاں...... بچپن جوانیاں' بڑھاپے اور انجام بھی عام انسانوں سے مختلف اور دہلا دینے والے ہوتے ہیں...... اسی طرح پیشہ وری کی حد تک آوارہ گردی' سیاحت کرنے والے بھی کچھ نارمل سے جاندار نہیں ہوتے...... اُن کا تخم اور خمیر کہیں اور سے پھوٹتا اور اُٹھتا ہے...... پروان کہیں اور چڑھتے ہیں' ثمر بار کہیں کدھر اور خاتمہ بالخیر کہاں......؟ عام انسان کو یہ خاص لوگ' دیکھنے سننے ملنے برتنے اور روزمرہ کے راہ و رویوں میں بھی مختلف سے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ فطرت کے پروردہ ہوتے ہیں۔

میں اسے کوئی مستورالحال درویش کہہ سکتا تھا کہ عالم کے سب تیور دیوانوں والے تھے۔ دیوانوں کی صحراؤں سے نسبت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اس موقعہ پہ کسی "دیوانے" کا ایک "دیوانہ" سا شعر" دیوانہ وار" یاد آیا ہے...... ؎

میں تو دیوانہ ہوں صحرا کو نکل جاؤں گا
تم کہاں جاؤ گے معصوم جوانی لے کر؟

ہلکے سے غنودنے مجھے اپنے حصار میں لے لیا تھا...... غنودگی اور پُرسکون نیند میں وہی فرق جو مستی اور سُکر میں ہوتا ہے۔ غنودگی نیند کا برزخ...... جبکہ مستی کا بہکا ہوا اگلا قدم سُکر میں پڑتا ہے۔

انسان جب مرنے لگتا ہے تو اس کی جان پاؤں کے انگوٹھوں سے نکلنا شروع ہوتی ہے جبکہ غنودگی آنکھوں کے پپوٹوں کو پھیلاتے اور پلکوں کو سکیڑتے ہوئے دماغ کے روزن و روشندان بند کر کے کافوری چھینٹوں سے حواسِ خمسہ کی کابکوں سے ہوش کے کبوتر اُڑا دیتی ہے۔ عقاب اور کبک کبوتر دونوں آسمانوں کو لکیری بناتے ہیں...... آنکھ کے تل سے اُڑ کر بامِ ثریا کی خبر لاتے ہیں۔

اس سے پیشتر کہ غنودگی کی دوشیزگی بانہوں میں جکڑتی بیٹھے بیٹھے گردن ایک جانب لڑھکنے سے جھٹکی تو حواس کی بڑی گرہ سُلجھ گئی۔ آس پاس وقت مقصد حاجات مقدرات ایک اک کر کے صاف ہوئے تو پہلا مطالبہ پیٹ کا سامنے آیا کہ مرو یا جیو...... اس پاپی کا پالن یعنی اس تنور کا بالن دھونکنا فی الوقت اشد ضروری ہے...... رفتار گفتار کوئی کچھ بھی ہو...... انجن میں ایندھن کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اونٹنی کے دودھ خشک کھجور زیتون تل شہد اور جو کے ملیدے سے پکے ہوئے سنہری رنگت کے خشک تفتان (کاکی) میرے توشہ دان میں موجود تھے۔ صحرا نوردوں دُور دراز کے راہیوں کے لیے یہ روٹی ایک نعمتِ مترقبہ سے کم نہیں ہوتی...... دو تین عشرے آرام سے مکمل غذا کا کام دیتی ہے...... جوں جوں باسی ہوتی ہے توں توں خستہ میٹھی خوشبودار اور لذیذ...... دودھ یا پانی میں ڈبو بھگو کر بھی کھائی جائے تو ایک الگ ہی سواد ملتا ہے۔ اس برکت والی روٹی میں ایک اور خوبی کھانے کے دوران یا بعد پیاس کا احساس نہیں ہوتا نہ لقمہ چباتے ہوئے منہ یا حلق خشک ہوتا ہے۔ دو چار بھرپور لقموں سے پیٹ سیر ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید روغنِ زیتون کھجور تل اور شہد ہیں یہ چاروں نعمتیں اللہ کریم کی خاص عطائیں ہیں جو بیک وقت ٹھوس و زم بھی غذا بھی دوا بھی...... گرم کش سردی گرمی میں کارآمد معتدل مزاج آسانی سے ہر جگہ دستیاب......!

توشہ تھیلی کا تسمہ ڈھیلا کر کے ایک بڑا سا روٹی کا ٹکڑا نکالے لقمہ توڑنے ہی والا تھا...... معاً خیال آیا کہ اس مستورالحال رجل صحرا کو بھی پوچھ لینا چاہیے؟ چنانچہ میں اُٹھا اور اس کے سامنے روٹی لے کر کھڑا ہو گیا...... دوسرے پہلو اپنے اندر کے کسی مقدمے کی پیشی بھگت رہا تھا۔ کچھ دیر میں یہی سوچ کر خاموش رہا کہ وہ مجھے دیکھ کر کوئی موقعہ دے اور میں اُسے اپنے ساتھ کھانے میں شامل کروں۔ خیال گزرا کہ وہ کوئی خرقہ پوش مکروہ سالوس ہوتا تو یہاں اس حال بے حالی میں نہ ہوتا...... صحرا پہاڑ سمندر جنگل اُفق و آفاق کبھی کسی بے چہرہ کو قبول

نہیں کرتے۔ خاص طور پہ صحرا میں تو وہ صبح سے شام اور رات سے سحر کرے جس نے پچھلا جنم کسی ریگ ماہی کا جیون بیتایا ہو...... اشتر خیال مختلف شترغمزوں میں مست تھا...... دُنیا بھر کے تمام صحراؤں کے ذرّوں سے کہیں زیادہ اس ایک اشرف المخلوقات کے دماغ میں صحرا ہوتے ہیں...... جب صحرا ہوں گے تو دیوانے بھی ہوں گے؟ جب کوئی دیوانہ اپنے اندر کا کوئی ایک صحرا تلاش کر لیتا ہے...... تو پھر وہ اپنے اندر اُترنے میں دیر نہیں لگاتا۔ دیوانوں کے اندر ایک عدد علامتی' ملامتی لیلیٰ بھی ہوتی ہے' جس سے وقتاً فوقتاً "نجونڈی" کرتے رہتے ہیں۔ اس شغل میں یا تو آبادی ہو جاتی ہے یا پھر بربادی!...... اس وقت' صحرا بھی تھا مجنوں بھی لیلیٰ اور محمل بھی...... وہ اپنے گرد اِک گہری تاریکی کی بُکل مارے ہوئے ایک معدوم سا ہیولی دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ ہو بھی اور نہ بھی ہو......؟

خدوخال' واضح ہونے کے لیے چنداں روشنی کی ضرورت پڑتی ہے مگر کچھ منظر اور صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بے خدوخال اور مستورالحال ہوتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہیں' سنتی اور بولتی ہیں مگر اُن کے کان' ہونٹ' آنکھیں' ناک وغیرہ کچھ نہیں ہوتے' جب مَیں ایسے بہت سے مشاہدات اور تجربات سے ہو گزرا تو معلوم ہوا کہ یہ سارے لازمے اور تقاضے عام انسانوں کے لیے ہیں لیکن اپنے اندر اُترے ہوئے خود شناس علیحدہ سے لوگ' شاید ایسی ظاہری شناختوں ضرورتوں سے بہت پرے ہوتے ہیں......؟

پانی کے اندر پیرتا ہُوا اور سوچوں خیالوں میں گم صُم انسان' بے حد سبک اور ہلکا ہوتا ہے۔ اسی طرح بے خُودی' بے نیازی اور بے ہوشی بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ مَیں شاید اُس کے حضور کھڑا کھڑا کسی ایسی ہی کیفیت میں اُتر گیا تھا۔

ایک بے آہنگ سی صوتی لہر میری حس سماعت کی کسی فری کوئینسی پہ اُبھری۔

"بیٹھ جاؤ کھانا کھاتے ہیں......!"

یہ ایک واضح آواز تھی جو مجھ تک پہنچی...... مَیں جدھر کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا...... شانوں سے چادر کھینچ کر نیچے بچھائی...... نیم خشک روٹی کے بھُر بھُرے بھُورے زیتون کا اچار' پانی کی کُپی...... یہ رزق صحرائی' نیچے ریگ پہ بچھی چادر کے پلّو پہ پڑا دکھائی دے بھی رہا تھا اور نہیں بھی...... تاریکی میں جب مزید تاریکیاں رَل مل جاتی ہیں تو اِک نہ نظر آنے والا اُجالا پیدا ہو جاتا ہے۔ جو آنکھوں کو دکھائی دے نہ دے پر محسوس ضرور ہوتا ہے۔ مجھے بارہا تجربہ ہُوا کہ دُنیا میں کوئی بھی سیاہ رنگ ایک سا سیاہ نہیں ہوتا...... یکساں اَوزان' لگا بندھا فارمولا' ایک سا طریقہ ترکیب وترتیب' ایک ہی خام مال...... مستری کاریگر اور نگران بھی ایک...... وقت بھی یکساں...... مگر ایک ہی مشین' پلانٹ پہ تیار ہونے والی مصنوعات...... وہ پارچات' چرم ظروف' کاغذ پلاسٹک' چوب' دھات حجرات'

جسے رنگا جا سکتا ہو' کبھی دو اشیاء کا رنگ' خاص طور پہ سیاہ رنگ ایک سا نہیں ہوتا لیکن اس فرق کو ایک عام آنکھ سے جانچا نہیں کیا جا سکتا......

اِدھر تو کالکیں ہی کالکیں' اندھیرے ہی اندھیرے دھرے تھے...... کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جو ظاہری آنکھ دیکھ سکتی ہو؟ ایسے گھپ اندھیروں میں اگر کسی کی کوئی رہنمائی کر سکتی ہے تو وہ صرف باطنی تنویر ہے۔ روشنی اور تنویر میں بہت تفاوت ہے۔ اُجالا روشنی وغیرہ مادی وسائل' انکل کوشش سے حاصل کیئے جا سکتے ہیں جبکہ تنویر' انسانی قدرت سے باہر ہے...... روشنی دکھائی دیتی ہے اور اس کا منبع بھی موجود ہوتا ہے۔ تنویر' روشنی کی رُوح ہوتی ہے جو دکھائی نہیں دیتی' اسے صرف باطنی بصیرت محسوس کرتی ہے......!

ظاہری روشنی اور اُجالے' سورج کی حدت کے محتاج ہیں...... تنویر' تجلائے طور سے مستعار ہوتی ہے...... ''اللہ نور السمٰوٰت والارض'' کے نور کی ایک ادنیٰ سی تنویر طور پہ پڑی تو جلا کر سرمہ کر دیا۔ اُسی ادنیٰ سی تنویر کے آگے کروڑوں بار قلزموں کے ٹھنڈے پانیوں سے سرد کی ہوئی تنویر......!

؎ دل کو جو شاد کرے رُوح کو پُرنور کرے
ہر نظارے میں وہ تنویر کہاں ہوتی ہے

ایسی باطنی تنویر' کسی صاحبِ اَمر کے ہاں ہی ہوتی ہے...... وہ ظاہری آنکھ سے نہیں باطنی بصیرت سے دیکھتا ہے...... اندھیروں اُجالوں کے قضیئے معاملے تو چہروں پہ ٹکنے دِیلوں والوں کے لیے ہوتے ہیں...... صاحبِ اَمر کے اندر کی کوٹھڑی میں دل کے طاق پہ دھرے دیے کی تنویر چھن چھن...... اِک عالم کو منور کیے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ اس کے نور کے جھالے میں کائنات کے اِک اِک ذرّے کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ صاحبِ اَمر' اپنے شرف میں صاحبِ رائے' صاحبِ نظر' صاحبِ ارشاد' صاحبِ قیل وقال اور صاحبِ قلم وقرطاس بھی ہوتا ہے......

فقر و تصوف کے یہ دیگر تمام منصب و مدارج' مقام و منازل' اللہ کریم جسے بھی چاہے ودیعت فرما دے؟ یہ سب کسی رہبر مرشد' پیر مردِ کامل کی تعلیم وتوجہ یا ذاتی کوشش' ریاضت ومجاہدت سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں...... نصیبوں اور استقامت کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اس کے حال ونسب نسبت بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ جنم نے کی ساعتیں وقت بلکہ پل پہر دن دیہاڑ بھی شامل ہوتے ہیں...... اَرضی افلاکی ساعتیں گردشیں' نجوم و بروج کی نشستوں برخاستوں کی مقناطیسی استعانتیں بھی پیش پیش ہوتی ہیں...... غرضیکہ ایسے دُکھرے اور سلکھوے لوگوں کے ظاہری باطنی اجزائے ترکیبی ہی مختلف ہوتے ہیں۔ سالک اور مجذوبوں کے مقامات کے آگے کے یہ فرد وحید' عام طور پہ گوشہ نشین رہتے ہیں...... ترکِ دُنیا نہیں کرتے۔ عوام الناس کے درمیان ایک عام انسان کی طرح پہچان رکھتے ہیں...... شاذ کوئی پہچان میں بھی آ جائے تو متر دّد نہیں ہوتے...... عالمِ موجودات

میں ہوتے ہوئے بھی عالم حیرت وحجاب میں غوطہ زن' قائم اللیل اور صائم نہار...... ہر لحہ ہر پل' رجوع الی اللہ رہتے ہیں۔ بیکاری بیزاری نہیں سوچتے......!

ماضی قریب و بعید اور حال رواں میں بھی بہت سی ایسی پاکیزہ نفس ہستیاں موجود تھیں اور ہیں بھی۔ وقت زمانہ کا کوئی پل ساعت ان کے وجود سے خالی نہیں رہتا کہ اک عالم ان سے فیض یاب ہوتا ہے۔ جیسے ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور پھر جا کر کہیں کوئی چمن میں دیدہ وَر پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ چرخ کہن بھی' مدتوں اپنی کوتاہ نظری پہ گریہ کرتا ہے تب کہیں اُسے کوئی صاحبقراں دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

مردانِ افلاک' محرمانِ آفاق' صدیوں ایسی سعد ساعتوں کے منتظر رہتے ہیں کہ جب مشتری اور زحل ایک برج میں قریب یا قیام پذیر ہوں...... مہر گیتی افروز کی توانائیوں میں مہربانیاں شامل ہوں اور بہاؤ' کرۂ تراب کی جانب ہو...... ماہِ نیم ماہ کی تابانیوں تبسم ریزیوں سے وادیٔ ایمن...... چاہِ شعیب' عین ناف اُوپر' سمت الراس کھنچا ہُوا ہو...... اللہ کریم مہربان تو پھر کہیں کوئی صاحبقران' منصۂ شہود پہ آتا ہے......۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نور پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایسے ہی صاحبقراں کی طرف اشارہ ہے۔

صاحبقراں! حاکم وقت بھی ہو سکتا ہے' مفتی قاضی' حکیم طبیب' محتسب بھی...... لیڈر' سائنسدان بھی' موچی جولاہا اور لوہار بڑھئی بھی ہو سکتا ہے...... وہ دین کے ساتھ دُنیا کی اہمیت سے اِنکار نہیں کرتا...... توکل تقویٰ کے ساتھ عمل' کوشش اور ہمت جرأت کو بھی ضروری گردانتا ہے۔ شکر گزاری' احسا نمندی اور عفو درگزر' اس کا نمایاں شعار۔ خودداری اور ''اپنی مدد آپ'' کی ترغیب دیتا ہے۔ غلامی اور آزادی کے معنوں کو خوب جانتا ہے۔ عجز و انکساری کی طاقت اور مقناطیسیت سے واقف ہوتا ہے۔ نظم و ضبط' اتحاد یقین محکم اُس کے بنیادی زرّیں اُصول ہوتے ہیں۔ اُس میں قیادت' نظامت' سیاست' امانت و دیانت' افہام و تفہیم اور دلنوازی ہوتی ہے۔''

ہر عصر و زمانہ میں کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ دو تین صاحبقراں بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی شناخت میں اوّلاً ان کی شخصیت' قول و فعل ہیں۔ اس کا بعد ان کی دین و دُنیا کے معاملات میں فعالیت اور مقبولیت...... پیشانی پر مہرِ اُمراور پاؤں کے تلوؤں میں خم قوسین' ان کی پہچان ہوتی ہیں مگر یہ شناختیں صرف کوئی چشم بینا والا ہی جان سکتا ہے۔

## صاحب' باباصاحب اور صاحبقراں......!

ماضی بعید و قریب' حال و عصرِ رواں میں بہت سی قابلِ ذکر " صاحب' باباصاحب اور صاحبقراں" ہستیاں ظاہر ہوئیں۔ جنہوں نے اپنے منصب و تشرف کے تحت' دین و دُنیا کی معاملت کے بہت سے اہم فرائض سرانجام دیے۔ جن میں قیادت نقابت' سیاست و سیادت' تصوف و تدین پیش پیش تھے...... امیر تیمور' شاہجہان اور قائدِاعظم محمد علی جناح جیسی ہستیوں کی مثال دی جاسکتی ہے۔ کچھ اولیاء کرام صوفیاء اور دیگر مذہبی ہستیوں اور مشہور لوگوں کی بابت بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ صاحب' بابا اور صاحبقراں تھے۔

مجھے بھی دو چار ایسی ہستیوں کو ملنے اور دیکھنے کی سعادت حاصل ہے۔ ان ہستیوں کو محض دیکھ لینا ہی بڑی خوش نصیبی کی بات ہوتی ہے۔ جدھر یہ موجود ہوں اُدھر آس پاس کی فضاء اک مخصوص سی مہک سے رچی بسی ہوتی ہے۔ میٹھی میٹھی دُھوپ اُتری ہوتی ہے...... ۔

پھیلی ہوئی ہے آس پاس آنکھوں کے دھوپ سی
یہ آپ ہیں تو آپ کے قربان جایئے

یہ وہ نادر نفوس ہوتے ہیں جن کی بعثت قدرت کی مشیت کے تحت ہوتی ہے جو افلاکی اُرضی سعد استعانتوں' مخصوص باد و تر آب' آتش و آب' خیر و خوبی میں خاص اور تشرف و تصرف میں بھی تمام ہوتے ہیں...... جس طرح دُنیا میں بلائیں اور شریر شیطان' ظالم و رند و صفت اناس ہوتے ہیں یا کسی نہ کسی حوالے سے متعین ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کریم کے کریمانہ نظام کے تحت' فرشتہ سیرت' خضر صورت' مسیح نفس' دستگیری کرنے والے' بھولوں بھٹکوں کو راہ دکھانے والے' انسانیت کے پرچار گر' محبت' اخلاص اور شفقت سے پیش آنے والی ہستیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ کائنات کے کاروبارِ دُنیا کی دوکانداری اور حیات و حساب کے سارے سلسلے' ان کے رُوبرو' " با اَدب باملاحظہ ہوشیار" مؤدب کھڑے ہوتے ہیں۔"

سات آسمانوں کی مانند' کوئی پہلا اور کوئی دوسرا تیسرا...... اور آگے ساتویں تک...... کوئی پیدائشی مختون ہوتا ہے۔ کوئی مکمل دانتوں' پورے سیاہ یا سفید بالوں سمیت جنم لیتا ہے' کوئی پیدائشی ناطق' کوئی حاذق...... قطبی تارے کے سائے میں تو کوئی ماہِ کامل کی گود میں!...... کچھ ایسے بھی جو ماں کے پیٹ سے نبوت لے کر آئے...... ولی کامل' حافظ قرآن' جنت کی بشارت' شہادت کی سعادت' معجزات و کرامت کے ساتھ......

صاحب اِقبال' صاحب اختیار' صاحب تدبیر' صاحب جوڑا' صاحب دل' صاحب جذب' صاحب رائے'

صاحبِ ذکا وفکر، صاحبِ ولایت، صاحبِ فضل و دانش ...... بس، یہ سب اور دیگر جو اللہ مالک و خالق سے مراعت یافتہ منتخب، صاحبِ جود وسخا اور صاحبِ جمال وجلال ہوتے ہیں۔ جن کی کھلی آستینوں میں خورشید اور بند مٹھیوں میں مہ وانجم ہوتے ہیں۔ ایسی ہستیوں کو پہچاننا چنداں آسان نہیں ہوتا اور شاید ایسا مشکل بھی نہیں ...... اگر سر پہ کسی کا دستِ فیض اور دیدوں میں کسی کبیرے نے کحل طور کا سرمہ پھیرا ہو ...... !

حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام، ذواتِ قدسیہ نوریہ، خاص طور پہ منتخب جن و بشر اور دیگر ارضی، ہوائی، آبی اور آتشی مخلوقات اشجار وحجرات وغیرہ ...... یعنی کائنات کا سارا کاروبار، انسانیت کے فلاح وبہبود اور رہبری کے لیے متعین ہوتا ہے ...... صرف ہم اپنی بے بصری کی بنا پہ جان پہچان نہیں پاتے۔

پہلے دن سے لے کر تادمِ تحریر، میری تمام حیاتی "گنبدِ آبگینہ رنگ کے گرد" آوارہ گردی میں ہی گزری ...... خدا کی خدائی بہت بڑی ہے، انسان نہایت کمزور اور محدود! ...... لگتا ہے ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں، میں کہیں گیا ہی نہیں ...... اپنی ذات کے انڈے سے باہر نہیں نکلا۔ نہ ابھی اپنی پہچان ہوئی اور نہ کسی کھوٹی کھری دوکان کے سچے جھوٹے سودے کا سود وزیاں دیکھا ...... انسان ساری زندگی محوِ گردش اور مبتلائے سرزنش رہتا ہے، خوش رہتا ہے، ناراض رہتا ہے ...... سچ کہتا ہے کوڑ کہتا ہے ...... اسی اوکھ سوکھ میں آخر ایک دن مٹی کی چادر اوڑھ کر، حشر تک لمبا لیٹ جاتا ہے، پھر ...... نہ جنوں رہا نہ پری رہی ...... خودی نہ خودسری رہی ...... بے خبری کی گہری دھند ایسی ذور کی کوڑی لاتی ہے کہ لیت ولعل، لے لہجہ سب لوٹن ہو جاتے ہیں۔"

میرے بابا جی اشفاق احمد کہا کرتے تھے۔ آپس میں سلامتیاں، خیر اور محبتیں بانٹنے والے بنو ...... جیسا کہ سطورِ بالا میں لکھ چکا ہوں کہ کارخانۂ کائنات میں جو بھی کچھ دکھائی دیتا ہے اور وہ جو نظر نہیں آتا، جو سمجھ میں بھی نہیں آتا اور وہم وگمان، قیاس وقیافہ، ابداع ادراک بھی سے خارج ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کریم کے اس عظیم شہکار خلیفۃ الارض حضرت انسان کی آسانیوں آسائشوں اور خوشیوں برکتوں کے لیے ہے جبکہ محور انسان ہے، جبکہ دیگر تمام مخلوقات کی وجۂ تخلیق، اس پہ کشاد، کشاکش، مزید کے باب کھولنا ہے۔ جیسے ننھے پیارے بچوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت اور ذہنی، جسمانی نشونما کے لیے ایسے کھلونے فراہم کیئے جاتے ہیں جو دیکھنے میں خوبصورت، دلچسپ، بے ضرر اور توجہ کھینچنے والے ہوں ...... جو اس کی دماغی صلاحیتوں اور جسمانی یافتوں کو مستحکم کرنے میں ممد ثابت ہوتے ہوں۔ ان میں تمیز توجہ تمنا اور تلذذ پیدا کرنے کا موجب بنتے ہوں۔ انسان کے گرداگرد کا تمام سیز یو یہی ثابت کرتا ہے کہ اس "بزرگ بچے" کے بہلا دے، سکھلا دے اور دکھلا دے کی خاطر یہ کائنات کا "گھروندہ" اور دیگر مخلوقات جیسے "کھلونے" تخلیق فرمائے گئے۔

تمام عمر کی بادیہ پیمائی کے کھجلی نے میری ظاہری باطنی بے پناہ تربیت کی۔ ایسے ایسے خفتہ نہفتہ علوم،

فن و ہنر، حکمتیں، مصلحتیں، قدرتیں سیکھنے، دیکھنے اور سمجھنے کے لیے سامنے ہوئیں کہ جو شاید کہیں اور سے نصیب نہ ہوتیں...... سچ ہے کہ قبر میں اُترے بغیر تنہائی، تاریکی، تنگی، تشنگی، تشویش اور تقصیر کا سچا احساس اور کہیں نہیں ہو سکتا...... تکلّہ کے ریگزاروں میں اندھی خشک دلدلوں میں، ریگ گھڑی کے دانہ دانہ ریگ کی مانند نیچے دھنستے ہوئے کسی جاندار سے کوئی جا پوچھے کہ ریت بھری کھُلی آنکھوں سے بے چارگی، بے بسی کی موت سے ہم آغوش ہونا، کیسا روح فرسا اور کس قدر اندوہناک تجربہ ہوتا ہے؟...... تیر دل میں پیوست ہو یا تلوار نے پہلو دو نیم کر دیا ہو...... گولی گردن سے گزر گئی ہو یا پھانسی کے رسّے کی گرفت اور لٹکے ہوئے جسم کے بوجھ سے گردن کی ہڈی کی گرہ کھُل جائے تو دفعتاً بندے کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی کسی کو بلندی سے نیچے دھکا دیتا ہے تو بلندی سے نیچے کی جانب گرنے والا، درمیان میں ہی مر جاتا ہے لیکن اگر ناگہانی کا شکار ہو کر کسی ایسی پھائی میں پھنس جاتا ہے جس کا انجام ہلاکت ہو تو یہ ایک اذیت ناک اور انتہائی بھیانک موت ہوتی ہے۔

- **جو دوا کے نام پہ زہر دے اُس چارہ گر کی تلاش ہے......!**

زہر پینے کے تین طریقے ہوتے ہیں...... زہر پیالہ اُٹھاؤ، ذائقہ اور انجام جانے بغیر غٹ غٹ چڑھا جاؤ اور اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاؤ...... جرعہ جرعہ، ذائقہ اور انجام محسوس کرکے پیو گے تو موت سے پہلے کئی موتوں مرو گے یعنی سو جوتے بھی اور سو پیاز بھی!...... اب تیسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی جبڑے میں ڈنڈی ڈال کر زبردستی تیز آب، حلق میں انڈیلے...... یہ انداز بہت تذلیل آمیز اور بھیانک ہوتا ہے۔ ہلاک ہونے والا تو کسی نہ کسی طور اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے مگر جبر کرکے موت کے گھاٹ اُتارنے والے بھی چلتے پھرتے مُردوں کے بھوت ہی ہوتے ہیں۔

زہر پیالہ، اُمرت جام بن جاتا ہے اور اگر میرابائی اور سقراط پئیں...... اور سم ہلاہل بن جاتا ہے جب طاغوتی استعانتوں کے حامل، زودی طبیب اور ساحر راسپوتین کو مکر اور جبر سے پلایا جائے۔ بے خطر آتش میں کودنے سے ہی آگ گلزار بنتی ہے...... سسک سسک گھٹ گھٹ جیون بتانے والا کھیئے رام تو ہو سکتا ہے، گھن شیام نہیں......!

غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ اس اشرف المخلوقات کے علاوہ دیگر مخلوق، بشمول قُرۃ الماء، ہوا، تراب اور نار! سبھی اللہ کریم کی حمد و ثنا، اور اس اشرف المخلوق کی اطاعت و خدمت میں مگن ہیں...... میں نے دیکھا کہ راہ کے پتھر، درخت، گُل بوٹے، جھاڑ جھاڑیاں، مٹی کے تنے تودے، حتیٰ کہ منظر، آسمان، برق و باراں، ہوا، آندھی، جھکڑ

طوفاں...... پانی کے ریلے سیلاب' ستارے' چاند' خوشبوئیں' بدبوئیں' آوازیں سنسناہٹیں' پرندوں کی چہچہاہٹ' پرواز کا رُخ...... غرضیکہ ہر کوئی رہرو کی رہبری پہ آمادہ خاطر ہوتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے سفر میں بھی انسان کے مسائل و معاملات' طلب و جستجو' شوق و ذوق میں جب کوئی اُلجھن پیدا ہوتی ہے تو اُس کے حل کے لیے بھی کوئی نہ کوئی دستگیر سامنے آ جاتا ہے۔ انسان اِسے محض اتفاق سمجھتا ہے جبکہ یہ عین اَمر ہوتا ہے۔

انسان کی بود و باش کے لیے سنگ و خشت' لکڑی مٹی یا قدرتی غاریں' درختوں کے نیچے اُوپر پناہ گاہیں ہوتی ہیں۔ چونکہ انسان ایک متمدن جانور ہے۔ آسائش سہولتیں' آسانیاں خوبصورتیاں' قرینہ سلیقہ' ادب آداب وغیرہ' اِس کی ترجیحات میں شامل ہوتے ہیں۔ تمام زندگی وہ انہی کے حصول کے لیے جُتا رہتا ہے باوجود بے پناہ کوشش و ہمت کے وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتا...... دو چار آنچوں کی کسر ہمیشہ سامنے رہتی ہے۔ بے طرح کی حرص طلب کا پیالہ کبھی لبریز نہیں ہوتا۔

مطمئن لاغرض اور بے خوف و خطر تو فقیر درویش آوارہ گرد اور رَمتے جوگی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاں کوئی لائی پائی نہیں رکھتے...... نہ کچھ پانے کی خواہش اور نہ کچھ کھونے کا کھٹکا کہ اُنہوں نے تو اپنا جھٹکا کیا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لیے اُن کے ہاں بھٹکا نہیں ہوتا۔

یہ تو طے تھا کہ نہ وہ کوئی بھٹکا ہوا رَہرو تھا اور نہ مَیں کسی ڈار سے بچھڑا ہوا پکھیرو...... یا شاید ہم دونوں لیرو کنوں کی طرح' گنجان بیلے میں اپنی اپنی لیری مجنوں کی کھوج میں تھے۔ ہجنس سے بچھڑا ہوا کتا...... کُتی کا ٹھکرایا ہوا کتورا اور برسات کی بہار میں جگہ جگہ کلبلاتے ہوئے کیڑے کیچوے' بڑا کرب و کساد پیدا کرتے ہیں......

آپ کے مشاہدہ میں آیا ہوگا کہ پیشہ ور کوئی بھی ہو...... کہیں بھی ہو اور کسی بھی حالت میں ہو؟ وہ اپنی پیشہ ورانہ شناخت' عادت خصلت اور اپنے مخصوص رَویے کبھی چھپا نہیں سکتا اور نہ کبھی اُن سے اپنی جان چھڑا سکتا ہے۔ کبھی کسی مجبوری یا حالات کے تحت جوں جوں چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ توں توں مزید ننگا اور بدنما ہوتا جاتا ہے۔ سرخ رنگ کا شربت' کسی لال رنگ کے لباس پہ گر کر اپنی رنگت تبدیل نہیں کر سکتا بلکہ اپنے نشان دھبے کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔

پیشہ ور چوروں ڈاکوؤں' جیب تراشوں' فوجیوں' پولیس خفیہ والوں اور بھکاریوں وکیلوں سیاستدانوں کی طرح یہ فقیر فُقرے' درویش صُوفی' جوگی سنیاسی اور نگر نگر ڈگر ڈگر' جنگل بیلے' پہاڑ صحراؤں میں بادیہ پیمائی کرنے والے آوارہ گرد بھی ایک لحاظ سے پیشہ ور ہی تو ہوتے ہیں۔ بے ننگ و نام' برباد بیمار' ذلیل و خوار' بھوکے ننگے' بے آسرا اور بے خانماں بے نشاں' خستہ حال و تشنہ کام رہنا یا ہونا بھی تو ایک پیشہ' کاروبار ہی تو ہے

یہ الگ بات کہ یہ پیشہ کن مصروفیات اور سُود وزیاں کے کس انداز اور فلسفہ کو پیش کرتا ہے؟

دیگر پیشہ وروں کی طرح اس خانہ خراب پیشہ کے کاریگر بھی اِک دُوجے کو یک نگاہی میں ہی اپنی چُبھتی نظروں سے نکال لیتے ہیں۔ رُوبرو ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی...... کئی کئی کوس دُور دُور سے نامحسوس سی مخصوص مہک لپک اِن کی موجودگی کا احساس دِلا دیتی ہے۔ مگر صرف انہیں جو اسی قبیل کے پیشہ ور ہوتے ہیں۔

مَیں شادی بیاہ اور غمی سوگ کی تقریبات میں شمولیت سے حتی الوسع گریز کرتا ہوں۔ اس کے باوجود کچھ جگہیں یا حالات ایسے ہوتے ہیں کہ مجھے بادلِ نخواستہ اُدھر جانا پڑ جاتا ہے۔ شامل نہ ہونے کی یہ وجہ نہیں کہ مَیں مردم بیزار ہو چکا ہوں۔ اپنوں بیگانوں کی غمی خوشی میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا یا مَیں نے بیراگ لے لیا ہے' گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے...... یا پھر یُوں کہ مَیں انتہا کا خود پرست واقع ہوں' دوسروں سے ملنا جلنا کسرِ شان سمجھتا ہوں...... اِن میں سے کوئی بات بھی دُرست نہیں...... اصل پریشانی یہ ہوتی ہے کہ ایسے کسی بھی ماحول میں جاتا ہوں تو لباس پہنے ہوئے بھی خود کو بُری طرح برہنہ محسوس کرتا ہوں۔ اگر پوری برہنگی میں کچھ کسر کی رہ گئی ہو تو اُدھر لوگ تُوم تُوم کر الف لِلا ننگا کر دیتے ہیں اور آگے پیچھے ہاتھ رکھے' مجھے وہاں سے بھاگنا پڑتا ہے۔

اسی وجہ سے مجھے دو چار بار انتہائی نامساعد صُورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا...... تلخی ایسی خطرناک صُورت اختیار کر گئی کہ علیحدگی اور طلاق تک نوبت آ گئی۔ دُولہا بیچارہ' اپنے ماں باپ اور بہنوں کے ساتھ اسٹیج پہ رونق افروز ہے مگر باراتی اور دیگر مہمان مجھے گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں...... کیمرے چل رہے' آٹو گراف دیے جا رہے ہیں...... لگتا ہے جیسے اصل دُولہا تو مَیں ہوں...... شا کالے کپڑوں والا مجھول...... جنگلی ببُول کا میڑھا نُول...... بھسیلی نہ بید...... اُلٹ نہ سیدھ...... بھونڈوں کا کھکھرا...... بھیں بھیں باجے کا ٹکڑا...... کچی نالی کا گیلا ٹکڑا' ذات کی کوڑھ کرلی اوقات کی کالی بِلّی' پٹھان کا ٹُوٹ گھڑی میں وَلی' گھڑی میں بھوت؟...... سارے میرے دوالے ہوتے ہیں...... دُولہا دو ٹکے کی اوقات' بجز بُھونجوں کی ذات! گنجے سر پہ سُنہرا سہرا مکٹ سجائے' آنکھوں میں سُرمہ لگائے...... نئی سجائی مسند پہ مُتحیر اُس پیشہ ور پانڈے کی اکڑ دُھکڑ میں ہوتا ہے جو تازہ تازہ دُسہرے کا سیزن بھگتا کر صحت اور مال بنا کر واپس اپنے گھر آیا ہو اور گاؤں والے اُسے اپنے مندر میں منڈل پہ بٹھائے آشیرواد لے رہے ہوں۔''

کئی دُولہوں کے سرپرستوں نے دُولہے کی بے قدری پہ ناراضی کا اظہار بھی کیا...... بغیر ڈولی کے جانے کی دھمکی بھی دی۔ ایسے بہت سے ناخوشگوار واقعات ہیں...... غمی کی موقعوں پہ بھی تعزیت کرنے والے' میت اور اُن کے غم زدہ پس ماندگان سے اغماض برتتے ہوئے میرے چٹکلوں اور چٹخے دار گفتگو سے محظوظ ہوتے ہیں...... ایسا بھی ہُوا کہ دفن میں تاخیر ہونے پہ مرحوم نے کفن کے بند تسمے ڈھیلے کرتے ہوئے' وہیں سے ہانک

لگائی...... ''میرے پیارے عزیزو! اس بابے کی باتیں بعد میں سننا پہلے مجھے تو قبر میں اُتار لو۔ اس کی باتوں اور کتابوں میں پھنسنے والا کبھی رہائی نہیں پاتا۔ میں آج اس حال میں اسی کی بدولت پہنچا ہوں۔ میرے دوستو، رشتہ دار اور محلے دارو! یاد رکھو مرنے کے بعد دفن...... شادی کی عمر کو پہنچنے پہ نکاح اور بھوک لگنے پہ کھانے میں تاخیر سے کچھ خاطر خواہ قسم کے نتائج برآمد نہیں ہوتے۔''

کچھ مرنے والے تو میری طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے...... ''اس بابے سے بچو، یہ کوّے کھاتا ہے نہ مرتا ہے اور نہ دوسرے مرنے والوں کو عزت سے مرنے دیتا ہے...... سچ کہ ملامتی بابے تو موت کے فرشتے کو بھی درخورِ اعتنا نہیں گرداتنے۔''

بات کر رہا تھا کہ پیشہ ور لوگ ایک دوسرے کی پہچان کر لیتے ہیں یا خود بخود ان کی آپس میں پہچان ہو جاتی ہے...... ادھر بھی ایسی ہی بات تھی۔ فرق صرف چھوٹے بڑے چور ڈاکو کا تھا۔ اُس نے محسوس کروایا کہ وہ میری چٹنی کی ہوئی روٹی کھا رہا ہے...... اسی طرح میں نے بھی ایک چھوٹا سا ٹکڑا روٹی کا مُنہ میں رکھ لیا تھا۔ درمیان میں بظاہر خاموشی، مگر آپس کی باطنی گفتگو جاری تھی...... جب کچھ کھا اور کہہ سن چکے تو اذن ملا کہ اُٹھو اور پیچھے پیچھے بندے چلے آؤ۔

مقناطیس کا محور جب کشش دیتا ہے تو حلقۂ قرابت کا ہر نفس وندیم، بلا اگر و مگر و ارادہ، اُدھر رجوع کرتا ہے۔ مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ کا خفی معنی یہی ٹھہرا کہ ''جو نگاہِ یار کہے مان جائیے''

اندھیرے، تاریکی یا ظلمت میں ظاہر ہے کہ نمایاں فرق ہوتا ہے۔ جیسے نور، اُجالا، روشنی...... والد، باپ، ابا...... خاوند، شوہر، خصم، یار، دوست یا پہچان والا...... بظاہر سب کے معنی قریب قریب ایک سے ہی لگتے ہیں...... مگر یہ سب علیحدہ علیحدہ رشتے ہیں جنہیں ہم اپنی کم علمی کی وجہ سے گڈمڈ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

آخر شام کے کاذب اندھیرے اب شروعاتِ شب کی ''شترغمزی'' سی تاریکی میں کہیں منہ چھپائے غائب ہو گئے تھے۔ جی ہاں، صبح کاذب کی طرح ''شام کذب'' بھی ہوتی ہے...... یوں لگتا ہے جیسے صدق، کوئے کذب سے گزر کر اپنے مقام کے ''میدان عرفات'' میں اُترتا ہے۔ اندھیرے میں ابہام اور تاریکی میں اسرار ہوتے ہیں جو اپنے رُخ، زاویے، اثرات اور مطلب معانی تبدیل کرتے ہیں اور یہ سب ایسی سُرعت اور سبھاؤ سے ہوتا ہے کہ انسان، ان کے تبدیل پذیر تیوروں کو اپنے ترازوئے ادراک پہ تولنے کا فہم ہی نہیں رکھتا...... مگر جنہیں اللہ کریم اپنے فضل و کرم سے عطا کر دے۔

دُنیا کی راہوں کے سفر...... خدشات، توہمات، خوف و ہراس، حسرت و یاس، آس و نراس اور مادی مقاصد کی بُو باس لیے ہوتے ہیں جبکہ ترکِ لذات و خواہشاتِ دُنیا، تلاشِ حقیقت، حصولِ علم و معرفت، جستجوئے

رہبر و مرشد اور معرکہ حق و باطل کے سفر تازگی بالیدگی زندگی اور بندگی کی خوشبو اور نوید لیے ہوئے ہوتے ہیں؟ دو چار قدم اُٹھانے سے ہی منزل سامنے دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان راہوں کے مسافروں کے پاؤں تلے قدسی نرم پر بچھا دیتے ہیں اور سر پہ سلامتی اور رحمت کا سایہ ہوتا ہے۔ وقت اور فاصلے اپنی طنابیں کھینچ لیتے ہیں...... انسانی بنیادی ضرورتوں اور اس کے ساتھ جڑے ہوئے فطری تقاضوں کی اہمیت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اُن کی سانسیں تھمی اور نگاہیں اپنی منزل پہ جمی ہوتی ہیں۔

یہ مستور الحال درویش بھی کچھ ایسے ہی راستوں کا کوئی مسافر تھا۔ ایسے صاحب اسرار یگانہ روزگار لوگ اپنی کیفیات کو چھپانے' طاری یا ساقط کرنے پہ قادر ہوتے ہیں۔ چاہیں تو آئینہ بن کر سامنے آ جائیں۔ نہ چاہیں تو کسی کو دکھائی بھی نہ دیں۔

## ● زہرِ ہندی' تریاقِ ترکی......!

اپنے ساتھ ایک ہو گزرنے والا واقعہ یاد آیا...... میں جب بھی یورپ جاتا یا اُدھر سے وطن پہنچتا تو حتی الوسع' ترکش ایئر یا پھر مصری ایئرلائن سے سفر کرنا پسند کرتا...... مصر اور ترکی دونوں درمیان میں پڑتے ہیں...... دونوں ہوائی کمپنیاں' مسافروں کو سفر کے دوران اپنے ملک میں سیاحت کی ترغیب دیتی تھیں۔ مفت ہوٹل' سٹی ٹور' قابلِ دید جگہوں کی سیر اور بھی بہت دلچسپیاں شامل ہوتیں۔ سیاحت اور عیش و عشرت کے دلدادہ ایسی پُرکشش ترغیبات سے خوب فائدہ اٹھاتے۔ میں بھی ان شوقین لوگوں میں سے تھا۔ یہ الگ بات کہ میری ترجیحات کچھ اور تھیں۔ میں نے سیکڑوں سفر پاکستان اور یورپ کے درمیان کیے ہوں گے...... ان میں چند سفر ایسے بھی' جن کے دوران میں مصر' تھائی لینڈ' ترکی یا قطر دوحہ نہ رُکا ہوں گا۔ مجھے ویسے بھی لمبے سفر قسطوں قسطوں' ٹکڑوں' ٹھہر ٹھہر' رُک رُک کر محسوس کر کے طے کرنا اچھا لگتا ہے۔ ہوائی کمپنیوں کو اپنے صدر مقام پہ مسافروں کو سیاحت کی پیشکش سے دہرا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اُن کو بزنس ملتا ہے اور ملک کو زرمبادلہ...... یہ کمپنیاں بہت سی سہولتوں کی پیشکش بھی کرتی رہتی ہیں...... یعنی ایک ہی ٹکٹ میں آپ دہرا مزہ لے لیتے ہیں۔

ایسے ہی ایک سفر کے دوران مجھے استنبول میں دو تین روز کے رُکنا تھا۔ استنبول میرے گم شدہ خوابوں اور میری سوچوں کے اُجالوں کا شہر خوب و خوباں...... ارض کے کینوس پہ ایک ایسی پینٹنگ جس کے رنگ و روغن قوس قزح سے' منظر و محل وقوع' باغ عدن سے' حور و غلمان انہار و قصور بہشتِ بریں سے' کوہ و دمن وادئ سینا سے مستفاد ہوئے...... اِدھر کے سب منظر و موسم منظوم!...... علم و ادب' فن و ہنر' ثقافت و قدامت'

تہذیب و تمدن، ریاست و سیاست، مذہب و ملت کے سارے انداز دلنشیں و دلفریب...... دماغ دل کو مسخر کرنے اور دل و دماغ پہ اپنا نقش چھوڑنے والے......!

ترکی کے دامن میں جو سب سے بڑی دولت ہے وہ میزبان رسول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالی عنہ کا مزار! دوسری دولت مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ کا مرقد فیض بار اور دیگر غیر مترقبہ نعمتوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' اصحابِ کرام' آلِ رسول کعبہ' مدینہ شریف اور لاتعداد مقدس تبرکات' جن میں قرآن کریم' سامانِ حرب وضرب' ملبوسات' کفش مبارک' رومال اور دیگر بہت کچھ؟ یہ ترکی کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کے نصیب میں ان مقدس تبرکات کی حفاظت اور زیارت کی سعادت آئی۔

میں ترکی پہنچ کر سب سے پہلے ان دو مقامات کی زیارت کرتا ہوں اس کے بعد جو بھی مجھے کرنا ہو کرتا ہوں۔ مولینا رومی کی درگاہ کے علاوہ اور یہ سب زیارتیں استنبول میں ہی واقع ہیں۔ مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ کے قدموں میں حاضر ہونے کے لیے استنبول سے بہت دور قونیہ شریف جانا پڑتا ہے۔ ریل گاڑی موٹر کار یا بس کے ذرائع بھی ہیں جو خاصا وقت برباد کرتے ہیں...... ہوائی جہاز سے سہولت رہتی ہے مگر روزانہ ایک دو فلائٹس ہی ہوتی ہیں...... پیشگی بکنگ کروالینا بہتر رہتا ہے۔

اس سفر کے دوران' ترکی میں رکنے کی سہولت صرف دو روز کے لیے تھی یعنی دو دن اور تین راتیں! میں دوپہر سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا تھا...... دواڑھائی گھنٹے بعد قونیہ شریف پہنچنے کے لیے ہوائی جہاز میں میری نشست محفوظ تھی۔ ٹکٹ میری جیب۔ بڑے سکون سے امیگریشن سے فارغ ہوا...... اب مجھے انٹرنیشنل ٹرمینل سے نکل کر لوکل ٹرمینل' جو ساتھ ہی تھا پہنچنا تھا۔ اندر ہی اندر وہاں تک جانے میں پانچ منٹ صرف ہوتے ہیں۔ خدا جانے کیا ہوا' ذہن پلٹا کھا گیا یا قدرت کو ہی کچھ اور منظور تھا کہ میں دوسرے مسافروں کی بھیڑ میں پھنسا ہوا باہر نکل آیا۔ اپنی باری پہ ٹیکسی پکڑی اور گھنٹے' پونے گھنٹے میں حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی مسجد اور مزار شریف کے سامنے حاضر تھا۔ ایک ثانیے کے لیے بھی میرے ذہن میں یہ نہ آیا کہ مجھے تو اس وقت قونیہ شریف پہنچنے کے لیے ٹرمینل دو پہ ٹرکش ایئر کے کاؤنٹر پہ ہونا چاہیے تھا۔ تاکہ میں اپنے وقت اور پروگرام کے مطابق اُدھر پہنچ سکوں۔ جدھر مجھے ایک رات اور آدھا دن رہنا تھا۔ حسب معمول' مزار شریف کے قریب میرے قیام اور طعام کی ایڈوانس بکنگ بھی میرے پاس موجود تھی۔

انسان کے اپنی عقل و سمجھ کے مطابق پروگرام بنتے ہیں مگر قدرت کے پروگرام' اُس کی اپنی مشیت و مصلحت کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جو انسان کی محدود فہامت و ذہانت میں آتے بھی ہیں اور نہیں بھی...... انسان اپنے فیصلوں کی ناکامی اور اتھل پتھل پہ تپ پا ہو جاتا ہے اور بظاہر نقصان ہوتا ہوا بھی دیکھتا

ہے۔ چونکہ درونِ پردۂ قدرت کی مصلحت کو سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتا اس لیے وہ اپنی بے بسی پہ کڑوے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ دیر سویر جب اُس پہ اپنی اسی ناکامی کے پردے میں چھپی ہوئی خیر' سلامتی کا ادراک ہوتا ہے تو پھر اُسے سمجھ آتی ہے کہ بندے کے ارادے اور پروگرام...... اور اللہ کی مشیت اور رضا و رضابت کیا ہوتے ہیں؟ ...... فلسفۂ رضا و تسلیم جس خوش قسمت کی سمجھ میں آ گیا اور یقینِ کامل کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ اُس کے لیے فکرِ فردا نہ غمِ روزگار...... کچھ سود و زیاں ہے نہ زندگی موت کا دھڑکا؟...... وہ جنت دوزخ کے چکر میں اور نہ قبر و برزخ کی فکر میں؟ وہ اپنی تمام حیثیت و شخصیت' آغاز و انجام' جزا و سزا' گناہ و ثواب وغیرہ...... شجرِ رضا و تسلیم کے ایک برگ کی صورت خود کو ایک ایسی آبِ جُو کے دھارے پہ ڈال چکا ہوتا ہے جو کسی آبشار میں خود کو ضم کر کے اُسی کا حصہ بن چکی ہوتی ہے۔

مَیں نے بھی چٹکی بھر اپنی مدھم سی بساط و بصیرت کے حساب سے اس فلسفۂ رضا و تسلیم کو سمجھنے اور اس پہ خود کو ڈالنے کی سعی کی...... مگر بتقاضائے بشریت اور ناقص علمیت و فہمیت' مَیں کماحقہ' طور پہ اس نعمت سے بہرہ ور نہ ہو سکا لیکن جتنا بھی مَیں عمل کر سکا وہ تو اک دانۂ عشیر کے برابر بھی نہ تھا۔ کیا کیجیے کہ اتنے نے ہی میری زندگی کا رُخ بدل ڈالا اور مَیں توکل' تشکر' تحمل اور تحفظ کے حقیقی معنوں سے رُوشناس ہُوا۔ خود کو خدا کے سپرد کر دینے...... توکل اور تشکر کا دامن تھامنے سے جس تحمل' تحفظ اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے وہ اک نعمتِ خداوندی ہی تو ہوتی ہے......!

راہِ حق' فلاح کے راستے...... شہرِ علم کی جانب' جہاد کی جہد اور کوئے یار کی سمت' قدم بڑھانے کے رُخ پہ' رجالِ قدسی نفس' حاملانِ افلاک و آفاق' ملائکہ' جن و پری سب معاونت و محافظت پہ متعین ہوتے ہیں...... یہ الگ اَمر ہے یہ سب کچھ خفی بھی اور جلی بھی...... ان راہوں کے راہیوں کو سب کا پتا ہوتا ہے۔

ٹیکسی سے اُتر کر مَیں نے پہلا کام' مسجد میں گھسنے کا کیا...... نمازِ مغرب کا وقت بھی آ گیا۔ طہارت' وضو اور نماز کے بعد قدرے سکون کا احساس ہوتے ہی مَیں فاتحہ اور حاضری کے لیے پاس مزار شریف پہنچ گیا۔ گھنٹہ بھر کی مصروفیات کے بعد' باہر نکلا...... اپنے ایک پسندیدہ ہوٹل سے کھانا کھایا...... اور اب سوچ رہا تھا کہ سلطان احمد اسکوائر پہنچ کر پہلے مَیں اپنے پسندیدہ ہوٹل میں شب بسری کا انتظام کروں گا اور کچھ وقت اپنے سامنے کے وسیع و عریض پارک میں اُس کنج کے مخصوص چوبی بنچ پہ کافی دیر بیٹھوں گا۔ جس کے رُوبرو نیلی مسجد' طلائی روشنیوں میں نہائی ہوئی جلوے بکھیر رہی ہوتی ہے۔ یوں تو عثمانیوں نے اپنے سنہرے دور میں بے شمار قابلِ ذکر و فخر کارنامے سرانجام دیے ہیں لیکن قصرات' محلات' عجائب گھر' مساجد' تبرکات و نوادرات اور اپنی تہذیب و ثقافت کو جو وقار و اعتبار دیا ہے وہ قابلِ صد ستائش و آفریں ہے۔

مصروف شاہراہ پہ نیلی مسجد کے قریب یہ تین ستارہ ہوٹل ایک اُدھیڑ عمر' دراز قد ترکی نژاد یہودی کی ملکیت ہے۔ اُس کے ہوٹل میں کل اٹھارہ کمرے ہیں۔ دس ڈبل اور آٹھ سنگل...... اگر کبھی میں بغیر اطلاع اور پیشگی بکنگ کے اُدھر پہنچ جاؤں اور کوئی کمرا خالی نہ بھی ہو تو وہ میرے لیے رہنے کی کسی نہ کسی طور' کوئی گنجائش نکال ہی لیتا ہے۔ روایتی سکاٹش اور خوجوں کی طرح' یہودیوں میں بھی کفایت شعاری' کوٹ کوٹ بھری ہوتی ہے جو بالآخر بڑھتے بڑھتے کنجوسی اور خساست کی حدوں سے بھی پرے نکل جاتی ہے۔ میرا یہ "یہودی دوست" اگر کبھی مجھے اپنا ذاتی ڈربہ نما کمرا' جو اس کا سٹور اور کباڑ خانہ بھی ہے وقتی طور پہ کمرسیدھی کرنے کے لیے دیتا ہے تو اس کا کرایہ بھی پورے ہوٹل کے کمرے کے برابر وصول کرتا ہے۔ مجھے اس کی کسی بھی اَدا' رویے یا یہودانہ خصلت وحرکت سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی کہ آپ کسی کے نخنے گھٹنے پھیپھڑے آنکھ' گردوں گپوروں کی تبدیلی کا تو سوچ سکتے ہیں مگر یہودیوں کی خصلت اور جبلّت کو بدلنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

کچھ اچھی بُری تحریریں' کاغذوں' پتھروں چمڑے چوب پہ لکھی ہوتی ہیں...... کچھ کوشش وترکیب سے انہیں مٹایا بھی جا سکتا ہے۔ مگر جو تحریریں' گوشت کے گودے کے اندر ہڈیوں کی رگوں پہ کندہ ہوں۔ اُنھیں تو "بڑے ملک صاحب" یعنی موت کے محکمے کے سربراہ بھی بدل نہیں سکتے۔ جن کی فطرت' عادت جبلّت میں تبدیلی نہ آ سکتی ہو انہیں صرف برداشت ہی کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے بھی......!

پرلے درجہ کا کنجوس' مکھی چوس' تو ندیل' ہوٹلنگ کے کاروبار کا کیڑا' اُصولی آدمی' وطن پرست' فنون لطیفہ کی پرکھ میں سخت قنوطیت پسند...... لیکن جنس لطیف کے معاملہ میں بلا کا معاملہ فہم اور مستعد!...... اس کی یہ موجودہ چوتھی بیوی شیلا ہبرک' بلا کی خوبصورت اور چنڈال تھی...... اسے نہ صرف اپنی نسوانی اور جمالیاتی خوبیوں' خیرگیوں اور خوش اقبالیوں کا مکمل ادراک تھا بلکہ وہ ان خزائن کو باانداز خسروانہ خرچ کرنا بھی جانتی تھی۔ یوں تو وہ سراپا آتش تپاں تھی کہ اِک اُچٹتی سی نظر ڈالنے والا اندر باہر سے جھلس کر رہ جائے لیکن اس کے مخصوص ہتھیار تو پھوٹ پڑنے پہ تیار آلو چے جیسے گدرے ہونٹ تھے بلا تر دُد کلیجہ چھیدتی ہوئی کالی' کٹیلی آنکھیں اور ریشمیں پوٹلوں میں بند اور کھلا کچھ سامان خاص!...... جو مقابل کی نگاہوں میں آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

ناز نخرا اور نُور نظارت میں ڈھلی' اِس فتنہ ساز کا مادی وجود اِسی شہر حیرت میں ایک قدامت پسند' دولتمند یہودی کے ہاں اماوس کی ایک آخر شب کی اُن مہمل ساعتوں میں ظاہر ہوا تھا جنھیں افلاکی یا نجومتی زبان وتفہیم میں "زہرہ گھنڈی" کہتے ہیں۔ زہرہ اور زمین کا آپس میں ایک خاص زاویہ قائم ہو جاتا...... اس ساعت میں جو صدف ثمر' نطفہ نمو پذیر ہوگا وہ کسی نہ کسی آفاقی مخصوص خوبی وجودت کا سزاوار ہوگا۔

مشہور ملکۂ مصر قلوپطرہ، اُمّ کلثوم، الزبتھ ٹیلر، اداکارہ عشرت جہاں بو، نور جہاں، مختار بیگم، ملکہ پکھراج، اداکارہ نسرین، نگار سلطانہ اور بھی بہت سی نسوانی شخصیات ہیں مگر اس زمرے میں مرد حضرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اس قبیلۂ زنان کی نسوانی نزاکتوں کے خدوخال اور حُسن و جمال کے سحر آگیں تیور طرارے جنس مخالف کے لیے اک خاص کشش کے حامل ہوتے ہیں۔ جو خوش قسمت، ان کی ناؤ کی ناؤ میں بیٹھ جائے یہ اُسے اپنا ناخدا بنا کر نہال بھی کر دیتی ہیں۔

شیلا ہبرک بھی اک ایسی ہی ہوشربا خاتون تھی، جن کے ظاہر و باطن میں ہر لحظہ حسن جہاں سوز کی نمائش لگی رہتی ہے۔ نمود چھلک چھلک پڑتا ہے۔ یہ اپنے دیوانے کو کبھی ہوش میں آنے نہیں دیتیں۔ کیا قیامت ہے کہ ان کے دام میں پھنسا ہوا "صید زبوں" خود بھی کبھی رہائی کا طلبگار نہیں ہوتا۔ جیسے کہ مصری ناگن قلوپطرہ کے حسن و جمال کے سحر میں پھنسے ہوئے عاشق، خوب جانتے تھے کہ اس کی دعوت عیش کا مطلب "فقط ایک شب کی زندگی ہے۔ اگلی صبح وہ اس کے شبستان کے عین نیچے، نیل کے پانیوں کے خونی گھڑیالوں کے شکم میں پہنچ چکے ہوں گے۔"

مشہور زمانہ جاسوسی دُنیا کی شاطر اور بدنام جاسوسہ ماتاہری بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ اس کے مسخر اور سُن کر دینے والے جمال اور دل و دماغ میں کُھب جانے والی نگاہوں اداؤں سے لُطف اندوز ہونے والے خوب جانتے تھے کہ یہ زہریلی ناگن اُن کے لیے موت کا پیغام ہے۔ اس کے باوجود وہ خفیہ معلومات کے عوض اس کی قربت حاصل کرتے اور دانستہ اپنے آپ کو ہلاکت کی گود میں ڈال دیتے۔

شیلا کے زیرک اور بیمار باپ نے اپنے آخری انجام سے بہت پہلے ہی کمال دانائی اور یہودیانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے نہ صرف، اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی اس گائیڈ سے کر دی بلکہ اس کے پیشے اور دلچسپی کے پیش نظر، یہ ہوٹل والی بلڈنگ بھی بطور جہیز اسے دے دی...... گویا اس ہوٹل کی اصل مالک شیلا ہی تھی۔ شیلا چونکہ پڑھی لکھی، نسوانی بنیادی توانائیوں سے بھرپور اور انتہائی باتونی تیز طرار لڑکی تھی...... اپنی ان اضافی خوبیوں کی بنا پہ بہت عرصہ بطور گائیڈ کام کرتی رہی۔ ہوٹلنگ اور گائیڈنگ، استنبول کے آپس میں جڑے ہوئے، منافع بخش کاروبار ہیں، متعلقہ افراد دونوں ہاتھوں سے دولت اکٹھی کرتے ہیں۔

حصول دولت اور اس کا برمحل استعمال، یہودیوں سے بڑھ کر اور کون جانتا ہوگا؟ انہوں نے شادی کے کچھ عرصہ بعد گائیڈنگ کے پیشے کو ترک کر کے، یہ ہوٹل کھول لیا۔ گائیڈنگ اور ہوٹلنگ ایسے سدا بہار اور گل و گلزار کاروبار ہیں کہ ایک وقت میں کئی کئی مزے لوٹے جا سکتے ہیں۔ ان پیشہ والوں میں پژمردگی اور بڑھاپے کی نحوست پیدا نہیں ہوتی...... بندہ خوش باش، خوش نظر، خوشحال و خوشحال رہتا ہے۔ حالات حاضرہ اور

رجحانات فاجرہ سے باخبر رہتا ہے۔ مردان و زنان سے دوستیاں' رابطے اور واسطے...... بھانت بھانت کی زبانیں بولیاں...... کرنسیاں' وزیٹنگ کارڈ' تصاویر اور دیگر انسانی اور بشری دلچسپیاں سرگرمیاں بھی رہتی ہیں۔ اِن گھاگ میاں بیوی کے پیش نظر بھی یہی شریفانہ عیاشیاں رہی ہوں گی جو انہوں نے یہ سدابہار کاروبار شروع کیا۔ جس میں خاصے کامیاب بھی تھے۔ نیچے ریسپشن کاؤنٹر پہ شیلا ہی اپنی "استقبالیہ حشر سامانیوں" سمیت موجود رہتی۔ نئے نکور مہمانوں سے پیشہ ورانہ انداز سے بنٹنا وہ خوب جانتی تھی۔ ابتدائی بات چیت کے دوران مہمان سے ایسے ملائم اور دلنشیں لہجہ میں ہم کلام ہوتی کہ کھردرے سے کھردرے مزاج و مقام اور ملکوں ملکوں گھومنے پھرنے والے سیاح جو بات بات پہ بارگننگ کرتے ہیں۔ اس کے روبرو نکھٹو گھوڑے بنے کھڑے متفق دکھائی دیتے۔ وہ بڑی دلنشین تفہیم و طریق سے اپنے ہوٹل کی خوبیوں' انفرادیت اور پیش کی جانے والی سہولتوں کا ذکر کرتی...... سامنے نیلی مسجد' تاریخی لان والا وسیع و عریض گلستان' کھلا سمندر' دور دکھائی دیتا ہوا دو بار پہ خوبصورت پل' جو ایشیا کو یورپ سے ملاتا ہے...... شاپنگ مال' شراب خانے اور قمار خانے...... نوادرات اور آرٹ کے مراکز' پولیس پوسٹ...... عین نیچے ٹرام کا سٹاپ اور ٹیکسی اسٹینڈ...... خاص طور پہ اپنے ہوٹل کے عقب میں' اُن مساج پارلرز اور گرم سرد حماموں کا بھی ذکر کرتی جدھر انتہائی واجبی نعم البدل پہ تسلی بخش خدمات پیش کی جاتی ہیں۔ وہ اپنے ہاں' ترکی سے لے کر مصر' یونان و ایران اور دیگر نزدیکی تفریحی مقامات اور سمندری جزائر کی سیاحت کی سہولت' جملہ انتظامات کی پیشکش بھی کرتی...... غرضیکہ وہ اپنے تمام تیز بڑی فنکارت سے ہدف پہ آزماتی...... تیر انداز' تجربہ کار' پھرتیلا اور ہدف شناس ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنے مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔

یہ نہیں کہ شیلا اکیلی ہی ہوٹل کو سنبھالتی تھی...... دونوں میاں بیوی نے اپنے اپنے کام بانٹ رکھے تھے۔ کونٹر کے سب کام' چیک ان چیک آؤٹ...... حتیٰ کہ ٹیلیفون آپریٹر اور مہمانوں ملازموں کے لیے صبح ناشتے کی تیاری بھی اسی کے ذمہ تھی۔ اُبلے ہوئے بطخ کے انڈے' بسکٹ توس' آدھا تولہ مکھن' سنگتروں کے چھلکوں کا ہوم میڈ مالمیٹ' چائے کا پیالہ تو ہوتا ہی تھا۔

میں نے زندگی میں جتنی بھی حسین فطین دلنشین عورتیں دیکھیں اُن کے شوہروں کو شوہر مخنث ہی پایا۔ یہ لے پالک قسم کے شوہر بڑے معصوم اور مغموم ہوتے ہیں۔ اِن میں ہیر مٹر منسٹر بیورو کریٹس ڈاکٹرز سفارت کار' اداکار اور دیگر بڑے بڑے پڑھائی لکھائی والے لوگ بھی ہوتے ہیں......!

احساسِ جمال' انسان میں تفاخر' تساہل' تجاہل' تغافل اور تکلف پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے لیکن وہ خوبصورتی اور حُسن ہی کیا جو خودسری' خودنمائی' خودپسندی' خودستائی کا خوگر نہ ہو......؟

اپنی خوش جمالی کا ادراک اور اہمیت کا احساس رکھنے والے خوش فہم افراد ہمیشہ اپنے اور دوسروں کے لیے ناقابلِ فہم مسائل کھڑے کرتے رہتے ہیں' وہ ایسے کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اس کی تین وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دو نمبری خوبصورت ہیں...... اُن کا حسن و جمال حقیقی نہیں...... میک اپ اور بناؤ سنگھار کا مرہونِ منت ہے۔ دوسری وجہ' وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہوئے کہ یہ حسن و شباب ڈھلتی دھوپ کی مانند...... نظر کا فریب اور خود کو دھوکے میں مبتلا رکھنے کے مترادف ہے۔ اس کے زعم میں دوسروں کو کسی بھی لحاظ سے کمتر سمجھنا' غیر انسانی اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔

اچھے لوگوں کے نزدیک حسن و جمال' وصف و کمال کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کے رَویوں' اعمال و اقوال اور اخلاق و کردار سے پھوٹے' نہ کہ شکل و شباہت' لب و رُخسار' چشم و اَبرو' چاہِ زنخداں یا دَ کتے دنداں کی محتاج ہو...... لیکن اس عفیفہ میں یہ تمام کچھ' اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ موجود تھا۔

مَیں نے بہت سی عورتیں مرد حتیٰ کہ گھوڑے کتے بلّیاں اور خرگوش ایسے دیکھے جن کی دونوں آنکھیں مختلف رنگوں کی تھیں' ایک سُرخ اور دوسری نیلی سبز یا بھوری۔ مسقط میں ایک متمول شیخ کے ہاں شاہی نسل کا شاہین دیکھا جس کی ایک آنکھ شہتوتی رنگ اور دوسری نیلی تھی...... کئی ایک شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن میں خیر اور شر' بحر و بر' خشک و تر' آب و خزو غیرہ ایسی خوبی و خصوص کے ساتھ مجتمع ہوتے ہیں کہ اُنھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایک آنکھ کافر دوسری مومن...... کون جو بچ پائے؟

بتانا تو یہ تھا کئی بیتے برس پہلے جب مَیں تیسری بار استنبول آیا اور نیلی مسجد کے قریب کسی سستی اور مناسب سی رہائش کی تلاش میں تھا۔ فٹ پاتھ پہ مَیں اس ہوٹل کے قریب سے گزر رہا تھا تو یکبارگی میری نظر اس قتالہ پہ پڑی جو اپنے کونٹر پہ کھڑی کسی ٹورسٹ سے نپٹ رہی تھی۔ استنبول کے اس مرکزی حصّہ میں جدھر سیاحوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں اور حُسن و جمال کا ''بازار استنبول'' سجا رہتا ہے۔ میرا اس کو کسی خاص نظر سے دیکھنا بنتا نہیں تھا۔ مگر کیا کیجیے کہ بازار سے گزرتے ہوئے اچانک کسی شوروم کے باہر ونڈو میں تجی ہوئی کوئی ایسی چیز دکھائی دے جاتی ہے کہ جس کو خریدنا ضروری نہیں ہوتا مگر پھر بھی کبھی محض تفریحِ تجسس کی خاطر چند ثانیے اُدھر رُک لینے میں کچھ بُرائی کی بات بھی نہیں ہوتی...... اس شوق یا عادت کو ونڈو شاپنگ کہتے ہیں اور اس سے بہت سے سفید پوشوں اور غریبوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔ یورپ میں بہت زمانہ رہنے کی وجہ سے مجھے بھی ونڈو شاپنگ کی عادت پڑ چکی تھی۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ آپ کی ضرورت یا مطلب کی کوئی چیز اُدھر ہے۔ محض کھڑے ہو کر کچھ وقت اُدھر رہنا ضروری ہوتا ہے۔

مَیں طبعاً نظر باز نہیں یعنی ''بھونڈی'' کرنے کے لیے میرے ہاں جراثیم ہی نہیں اور نہ ہی میری عمر

حلیہ لباس اور حال مجھے اس کی کوئی گنجائش دیتا ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ میرے بڑھتے ہوئے قدم آپ ہی رُک گئے اور مَیں چار پانچ قدم پیچھے اس ہوٹل کے صدر دروازہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اندر وہی منظر ابھی تک قائم تھا۔ غیر ملکی سیاح رجسٹر پہ دستخط کر رہا تھا۔ مَیں ایک قدم اندر داخل ہوا تو وہ فارغ ہو چکی تھی۔

دوپہر کا آداب کہنے میں اُس نے پہل کی تھی۔ میرے سامنے تین فٹ کے فاصلے پہ کھڑی اُس کی قیامت نے میرے خلیے لباس اور چہرے پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہوئے انتہائی معصومیت اور بیساختگی سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ سردست ہمارے ہاں کوئی کمرا خالی نہیں۔ آپ کچھ آگے مزید ہوٹل دیکھیں گے یقیناً اُدھر آپ کو بہتر جگہ مل جائے گی۔''

مَیں اُس کے رسیلے اور گیلے ہونٹوں سے پھسلتے ہوئے الفاظ کی ریشمی پُھوار سے ریشہ خطمی سا ہو کر رہ گیا تھا۔ مقابل میں اگر جنسِ مخالف کے لب!...... لعلیں، خمیدہ لرزیدہ اور نمیدہ ہوں، پیچھے نیم کھلے درج میں دندان کی ذرافشانی خیزاں ہو تو بشر کا تو حشر نشر ہونے میں کیا کسر باقی رہتی ہوگی؟...... مجھے لگا کہ وہ اپنے ان جملہ ساز و سامان کی بدولت اک دُنیا کو لرزاں و افتاں کر سکتی ہے......!

اَب حقیقت یہ ہے کہ مَیں یہاں سے ٹلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھے ٹکا سا جواب دے کر دوبارہ اپنے لگے بندھے کاموں میں جٹ گئی تھی۔ بلّی کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور چوہے خوبیاں اُس کے سامنے اگر کرکٹ بھی کھیل رہے ہوں تو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی بلکہ کسی چوکے چھکے پہ شاباشی بھی دے دیتی ہے۔

مَیں اپنے تئیں فیصلہ کر چکا تھا مجھے ایک آدھ روز جو اِدھر رہنا ہے وہ ڈریہیں ہوگا۔ میری فقیری دُرویشی سب کہیں پَس پردہ چلی گئیں اور میری حیوانی جبلّت باقی رہ گئی۔ مَیں اپنے پاؤں پہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ ایک بار پھر اس سے کہہ کر دیکھوں...... اکثر ایسے سیاحتی مقامات کے ہوٹلوں میں اُوپر نیچے کہیں نہ کہیں ایک آدھ کمرے یا بستر کی جگہ نکل ہی آتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو چار گھنٹے کے بعد کوئی کمرا خالی ہونے کو ہوتا ہے تو انتظار کے بعد آپ اُسے حاصل کر سکتے ہیں۔ مَیں نے مزید بات کی گنجائش پا کر پھر اُسے متوجہ کیا۔

''مادام! اگر کچھ دیر انتظار کر لینے سے کوئی گنجائش نکل سکتی ہو تو مَیں سامنے پارک میں بیٹھ کر انتظار کر سکتا ہوں۔''

وہ حسبِ پیشہ مجھے ریشہ ریشہ کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

''آئی ایم ساری، کل تک تو کوئی کمرا خالی نہیں...... ایک آخری کمرا تھا جو آپ سے پہلے مَیں ایک مہمان کو پیش کر چکی ہوں...... کل آفٹر نون تک......!''

اِسی دوران بغلی کمرے سے ایک خوبرُو وجیہہ سا شخص باہر نکل کر اُس کے پاس یوں آ کھڑا ہوا جیسے کئی زمانوں سے اِس اِنتظار میں رہا ہو کہ کب وہ اِس کے قدموں میں آ کھڑا ہو۔ اِس ستم ظریف نے یہ تک نہ دیکھا کہ ایک سیاہ پوش دُرویش سامنے کھڑا ہے۔ بندہ کچھ حیا ہی کر لیتا ہے' مگر نہ صاحب ناں!...... اُس نے کھٹاک چٹاخ ایک بھرپور بُوسہ اُس کے انگارہ سے ہونٹوں پہ داغ دیا۔ میرے لیے یہ کچھ نیا تو ہرگز نہ تھا کہ مَیں نے جس معاشرہ میں چالیس برس بسر کیے وہاں تو یہ روزمرہ تھا...... بس ذرا اخلاقیات پہ توجّہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِنسانی رَویوں' جذبات و احساسات کے اظہار میں چنداں احتیاط اور سلیقہ و قرینہ برتنے سے بڑا مجرم رہ جاتا ہے۔

تیز گفتار' تیز رفتار لوگ' کسی نہ کسی عِلت میں گرفتار بھی ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایسا ہی تھا' اپنی زبان میں ابہام و تفہیم کرتے ہوئے اُس نے مجھ سے آنکھ ملائے بغیر جان لیا کہ میری ضرورت کیا ہے۔ پھر ایکا ایکی پھرکی کی طرح گھومتے ہوئے وہ بغلی کمرے میں گھُس گیا۔ اُس کے جانے سے مجھے ایسے ہی طمانیت کا احساس ہُوا جیسے تلوے سے کانٹے کی ٹوٹی نوک نِکل جاتی ہے۔ وہ ایک بار پھر مجھ سے رجوع ہوئی...... اور مجھے صوفے پہ بیٹھنے کا کہہ کر وہ بھی اُسی کمرے میں گھُس گئی جدھر وہ پُرکشش زندگی کی توانائیوں سے بھرپور اِنسان داخل ہُوا تھا۔ اس خوشگوار تبدیلی پہ مَیں دل ہی دل میں خوش ہُوا۔

مَیں ایک صوفے پہ پُراُمید سا بیٹھ گیا کہ شاید کمرہ مل جائے؟ اِدھر اُدھر جھانکا تانکی میں' میری نظر ایک چھوٹی سی بلیک اینڈ وائٹ تصویر پہ پڑی جو کاؤنٹر کے پیچھے دیوار پہ' ہوٹل سے متعلق مختلف سرٹیفکیٹس اور لائسنسوں کے اُوپر نمایاں سی جگہ پہ آویزاں تھی۔ پُرانے بُوڑھوں کو پُرانی چیزوں سے خاصی رغبت ہوتی ہے مگر یہ دونوں تو خاصے آزاد خیال اور نئے دَور کی نئی قدروں کے دلدادہ دِکھائی دے رہے تھے۔ مَیں اپنے دل میں مختلف ٹیوے لگانے لگا۔ شاید یہ پرانی وضع قطع کا بوڑھا' کبھی اِس ہوٹل کا مالک رہا ہوگا یا اِس لڑکی' لڑکے کا کوئی بزرگ ہوگا؟ خیر و برکت یا اظہارِ سپاس و عقیدت کی خاطر یہاں اِس کی تصویر ٹانک رکھی ہے۔

خاص طور پہ پارسیوں' ہندوؤں' سکھوں اور سکاٹش یہودیوں نے اپنے سورگباشی بزرگوں کی تصاویر اپنی دوکانوں' گھروں میں نمایاں جگہوں پہ لگا رکھی ہوتی ہیں۔ تصویر کے گرد تُلسی کے پتّے' گیندے کے زرد پُھول کلیاں اور نیچے لوبان چندن اگر وغیرہ سُلگ رہا ہوتا ہے۔ پرانی وضع کی اِس تصویر میں پتا نہیں کیا دلچسپی محسوس ہوئی کہ اُٹھ کر کاؤنٹر کے سامنے اُسی جگہ پہ جا کھڑا ہُوا...... جہاں مَیں پہلے کھڑا تھا۔ غور سے دیکھا تو یہ حقیقت کھلی کہ یہ بزرگ تو کوئی یہودی ہیں۔ سر پہ چھوٹی سی سیاہ ٹوپی' جو قدامت پسند یہودیوں کی خاص نشانی ہے۔ تصویر کے نیچے عبرانی زبان میں کچھ لکھا تھا شاید اِس بزرگ کا نام ہوگا؟

دُنیا کے سیکڑوں ممالک کے باشندوں کی اپنی الگ الگ پہچان' خدوخال' انداز و اطوار ہوتے ہیں۔ آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ عربی ہے' پاکستانی' ہندوستانی' افریقن یا انگریز' امریکن ہے۔ اسی طرح لباس' رویے لہجے برتاؤ بھی ہر کسی کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ تو ہوئیں وہ چیزیں جو ظاہری آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہیں جبکہ بہت کچھ ایسا بھی ہوتا ہے' جس کو دیکھنے کے لیے کسی تیسری آنکھ کی ضرورت پڑتی ہے۔ بس' وہ آنکھ ہر کس و ناکس کے ہاں نہیں ہوتی۔

میں ایسا محو تھا کہ پتا بھی نہ چلا اور وہ واپس اپنی جگہ پہ کھڑی' مجھے حیرت بھری نظروں سے گُم صُم دیکھ رہی تھی۔ میں ہلکا سا جھٹکا لے کر واپس اپنے آپ میں آیا۔ وہ مجھے بتانے لگی۔

''ہم نے آپ کے لیے وقتی طور پہ ایک روز کے لیے قیام کا بندوبست کر دیا ہے لیکن آپ کو ٹاپ پہ ایک واجبی سے کمرے میں رہنا ہو گا۔ کل آپ کے لیے نیچے کسی فلور پہ بندوبست ہو جائے گا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ کو اُوپر چھت والا یہ چھوٹا سا کمرا بہت پسند آئے گا۔ اس کے ساتھ ہی ڈائننگ رُوم ہے...... ناشتہ وغیرہ کے لیے آسانی رہے گی۔ بس ذرا واش رُوم کے لیے نیچے کے فلور پہ آنا پڑے گا۔ ہاں' اُوپر کبوتر اور سیگلز سے آپ بہت محظوظ ہوں گے' پورا شہر اور سمندر آپ کے سامنے......'' وہ مزید بتانے لگی۔ ''میرے شوہر نے خاص طور پہ آپ کی سفارش کی ہے۔ ورنہ یہ خاص کمرا' جو ہماری عبادت کے لیے مخصوص ہے' کسی مہمان کو نہیں دیا جاتا۔'' میری آنکھوں میں ہلکا سا جھانکتے ہوئے مزید گویا ہوئے۔ ''آپ چونکہ مُسلم ہیں آپ کی اور ہماری عبادت میں کوئی زیادہ تضاد نہیں لیکن کرایہ آپ کو نیچے کے فلور والے' ڈبل بیڈ کے کمرے کا ہی دینا پڑے گا۔''

میرے اندر کسی نے ایک خاموش سا قہقہہ لگایا کہ اس پُرکشش خاتون نے اپنا تعارف کرانے میں قطعی کسی تکلّف سے کام نہیں لیا' مجھے ویسے بھی کھلے کھرے لوگ اچھے لگتے ہیں...... غیر واضح' مُبہم' ڈھیلی مٹھی گفتگو' میک اپ کی تہوں میں چھپی ہوئی جُھریاں' برص کے نشان' کلر و سمہ چڑھے سفید بال' مصنوعی دانت' آئی کنٹیکٹ مجھے زہر لگتے ہیں۔ اسی طرح کاروباری اور پیشہ ورانہ مسکراہٹیں' ڈھیلے مصافحے' جُھپّیاں' منافقانہ مصلحتیں' رویے انسان کو ادھ مرا کر رکھ دیتے ہیں۔

مجھے اکثر وسیع پیمانے پہ لنگر کا اہتمام کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ میرا پرانا آزمودہ طباخ' جوڑوں کے درد اور وقت سے پہلے ہی بڑھاپے کا شکار ہو کر صاحبِ فراش ہو چکا تھا۔ پکائی کا کام فزیکلی فٹنس کا متقاضی ہوتا ہے' وہ بیچارہ تو ہاتھ پاؤں ہلانے سے بھی عاجز ہو گیا تھا۔ اب مجھے ایک تجربہ کار باورچی کی اشد ضرورت تھی۔ جو میرے ہدایات کے مطابق خود مختاری سے لنگر پکا لے۔

قارئین کی خدمت میں عرض کرتا چلوں کہ عام یا خاص دعوت اور چھوٹے یا بڑے لنگر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ شادی بیاہ، خوشی کی دعوتیں، جن کا مقصد صرف کھانا پینا ہلا گلا ہوتا ہے۔ محض برادری میں ناک اونچا رکھنے کی خاطر منعقد کی جاتی ہیں۔ کچھ دنیاداری رسم و رواج کی پاسداری۔ دراصل یہ اپنی حیثیت، دولت کا اظہار اور طعام و انسان کے درمیان رزق کی توہین اور بربادی کے دنگل ہوتے ہیں۔ چھوٹے بڑے، پڑھے لکھے اَن پڑھ جانوروں کی طرح ٹھونستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ رزق کی پامالی کرتے ہیں۔ کفرانِ نعمت اور جہالت و رذالت کی انتہا، پیٹ آخری حدوں تک بھر جاتا ہے مگر نیت نہیں بھرتی۔ کھاتے کم اور ضائع زیادہ کرتے ہیں اور دیدہ دانستہ ایسا کرتے ہیں۔ اللہ رازق و رحمٰن کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ بے قدری اور ضیاع سے روزی رزق میں کمی، بے برکتی اور تنگدستی پیدا ہوتی ہے۔ ایسی دعوتوں اور محفلوں میں شیاطین اور شریر جنات بھی کثرت سے شامل ہوتے ہیں۔ ایسی جگہیں اور مخلوط محفلیں جہاں رزق کی بے حرمتی، بے قدری اور مرد و زن کے مابین، انسانی اخلاق اور صنفی امتیاز کا خیال نہ رکھا جاتا ہو، شیطان کی پسندیدہ اور بہکانے کے لیے آسان ہدف ہوتی ہیں۔ مُردہ ارواح خبیثہ، شیاطین اور بے راہ جنات کا پسندیدہ طعام ہڈیاں اور ایسا بسا بچا کھانا، جس پہ بسم اللہ شریف نہ پڑھی گئی ہو، الحمد للہ نہ کہا ہو اور غیر انسانی، شرعی طریق سے کھایا پیا ہو...... مشروب نجس کا استعمال ہو...... یہ دراصل انسانوں کی نہیں شیطانوں کی محفلیں ہوتی ہیں۔

دوسرے اجتماعات وہ ہوتے ہیں جو خالصتاً اللہ کریم اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اُس کے دینِ مبین، تبلیغ جہاد، ہجرت اور ایسے اجتماعات جو باہمی اخوت، نکاح ولیمہ، فتوحات پہ بطور تشکر و تہنیت منعقد کیے جاتے ہیں۔ سعد بابرکت اور اللہ کریم کے کرم و فضل اور رحمت کے حصول کا وسیلہ ہوتے ہیں۔

سوم...... ایسے دسترخوان جو کسی مہمان کی مدارت کے لیے آراستہ کیے جائیں اور اپنی مقدرت سے بڑھ کر اُس کی تواضع کی جائے۔ مہمان سیر ہو جائے، ذائقہ ولذت کی عمدگی سے سیراب ہو کر اُٹھے...... چاہے اس کے لیے پڑوسی یا کسی اور سے معاونت حاصل کرنی پڑے۔

چہارم...... وہ طعام جس کا اہتمام بلاتخصیص و تمیز اللہ کریم کی مخلوق کے لیے بانیت و نسبت کیا جائے۔ عمدہ طعام پکایا جائے، خاص طور پہ ایسے احباب و اقربا، غربا و مساکین، سفید پوش، فقیروں درویشوں مسافروں اور پریشاں اوقات لوگوں کو کھلایا جائے جو عمدہ خوراک حاصل کرنے کے اہل نہ ہوں۔ انسان ہی نہیں بلکہ دیگر مخلوق بھی کھائے۔ خالصتاً اللہ کریم کی رضا کے لیے اس اہتمامِ طعام کو لنگر کہتے ہیں۔

مَیں نے یہ جانا کہ جس نے لنگر کی اہمیت کو پہچانا، اُس کا کبھی خالی نہ ہوا خزانہ!...... کچھ اور سمجھ میں آیا کہ لنگر اپنے ہاتھ یا نگرانی میں تیار کر کے بانٹنا، شوق اور محبت سے کھلانا...... اک ایسا چسکا، نشہ اور لت ہے جسے

لگ جائے وہ اس سے مرتے دَم تک نہ چھوٹے...... بلکہ مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ ہائے شوق' کسی نہ کسی طور جاری وساری رہتا ہے۔

بات شروع ہوئی کہ مجھے ایک ایسے باورچی کی ضرورت تھی جو میرے حساب وضرورت کے مطابق لنگر کی تیاری میں میرا مددگار ثابت ہو بلکہ میری عدم موجودگی میں بھی' میری ضرورت اور معیار کے مطابق پکائی کر سکے۔ اپنے بچوں اور احباب سے ذکر ہُوا تو باورچیوں کا تانتا بندھ گیا۔ مجھے جاننے سمجھنے والے خوب جانتے تھے کہ مجھے کس قسم کا کاریگر چاہیے؟ کوئی خاندانی کوئی عطائی...... کوئی چنیوٹ والا تو کوئی سیالکوٹیا...... کوئی دُنبہ پکانے کا ماہر تو کوئی سفید قورے کا کاریگر...... ہریسے' حلیم بریانی' زردہ' دال چاول' کھچڑا' نہاری' شب دیگ وغیرہ غرضیکہ ایک سے اک ماہر آیا...... کچھ میں نے پوچھا کچھ انہوں نے سنایا' کسی کے پلّے میں نہ پڑا' کسی کو میری سمجھ نہ آئی' کوئی مجھے نہ بھایا اور کوئی مجھے نہ پایا۔ چونکہ یہ کام مستقل نوعیت کا تھا اسی لیے طرفین خوب سمجھ جان کر ایک دوسرے کو کھنگال رہے تھے......

انسان جیسا بھی اچھا بُرا' چھوٹا بڑا مگر جس بھی ادنٰی و اعلیٰ پیشہ سے وابستہ ہو' اُسے اُس میں پرفیکٹ اور مخلص ہونا چاہیے...... ڈنڈی مارنے والا نہ ہو...... کسی اِنسان کا اچھا ہونا' حاجی نمازی' نیک شریف' ایماندار امانتدار' ہندو مسلمان' سکھ عیسائی ہونا' یہ سب اُس کے ذاتی معاملے ہیں۔ جن کا کسی سیکنڈ یا تھرڈ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ جس پیشے کے وسیلے سے اپنے بچوں کی روزی حاصل کرتا ہے' اگر وہ اس میں مخلص اور مکمل نہیں تو اس کے منفی اثرات اُس سارے نظام پہ پڑتے ہیں۔ رزق حلال اور رزق حرام کے بنیادی معنی اسی پیشہ ورانہ اخلاص اور پروفیکشن سے نکلتے ہیں۔

مجھے میرے مطلب کا کوئی باورچی نہ ملا تو میرے ایک بچے نے مجھے کچھ باورچیوں کا بتایا۔ مَیں نے زبانی کلامی انٹرویو کی بجائے ڈائریکٹ عملی ٹیسٹ کے لیے جمعرات کی صبح ان کا بلوالیا۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ ایک ایک دیگ' بریانی اور قورمہ' الگ الگ ہر باورچی تیار کرے گا۔ ان سے مطلوبہ سامان کی علیحدہ علیحدہ پرچیاں بھی منگوالیں۔ اسی شام' چار باورچیوں کی پرچیاں پہنچ گئیں۔ ایک فیصل آباد اور دو چنیوٹ اور سانگلہ سے تھے' ایک لاہور من آباد سے......!

ان باورچیوں کا پہلا امتحان' اِن کے مطلوبہ سامان کی فہرستیں تھیں۔ دو نے سیدھا سیدھا سامان طلب کیا...... دس دس سیر باسمتی پرانے چاول' گھی اور مٹن...... باقی وہی لگے بندھے مسالے وغیرہ اور باقی دو نے دو ایک ایسے مسالے لکھے جو کمیاب ہیں اور کبھی مغلیہ دَور میں شاہی باورچی استعمال کرتے تھے۔ اب روٹین کی بریانی یا مزاعفر میں اس کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ آخری دو میں سے ایک نے تو ''خشی بوٹی'' طلب کر کے

مجھے چونکا دیا۔ یہ خس خس کے ڈوڈے کی گانٹھ ہوتی ہے۔ خس خس جھاڑ کر جو ڈنٹھل گانٹھ یا خُنخنڈ بچتا ہے اس کو خشک کر کے پیستے ہیں' دودھ میں اس کا آمیزہ حل کر کے پکاتے ہیں...... پھر پتھر کی ناند میں پھیلا کر سکھانے کے بعد اس کے بڑیاں بنتے ہیں...... یہ بالکل ماش کی دال کی طرح کی بڑیاں یا وڑیاں ہوتی ہیں۔ اس میں سفید تل بھی پیس کر شامل کیے جاتے ہیں۔ سفیدہ بریانی کا یہ ایک جزو لاینفک ہیں۔ سفیدہ بریانی کا ایک لازمہ بھیڑ کے گوشت کے بلے بھی ہیں...... بوٹی تو اس کے قریب بھی نہیں لائی جاتی۔ بلے' دو پارچے جو سینے کی پسلیوں کے اردگرد ران اور دستی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

سفیدہ بریانی مغلیہ شہنشاہوں کا خاص خاصہ ہوتی تھی۔ اس پکوان کے ماہر باورچی' بڑے بڑے اعزاز پاتے...... کشمیر کا زعفران' کا جو جاوتری جائفل' روغن زرد' چاروں مرچوں کا دانا' خستی بڑی مُگل خطائی' بادیہ بُوزڈیرہ دُون کے چشموں کے چاول' بھیڑ کے بغلی پلّوں کا گم اور کاہو کے کاٹھ کی آنچ...... سفیدہ بریانی کے پکانے اور دَم والانے کے لیے رانگا رنگی برنی...... چھپن' جس کے بھیتر' تسبیح دانے کا سوراخ...... گھی سے لبالب' قطرہ قطرہ ٹپکاؤ وغیرہ ایسا کیمیائی نسخہ تھا جو لذت کام و دہن کو جلا بخشتا تھا...... مفلس کی سوئی ہوئی رگوں میں زعفران سی کوند بھر دیتا تھا...... شباب کی چونچ میں لہریے لینے لگتیں ہیں۔ موتی پلاؤ' کشمیری مزعفر...... کھچا کھچڑا' جوگاؤ کے گھی' سہارنپوری سیلے میں پکتا ہے۔ خصّی بکرے کے کپوروں اور ارد کی دال' کالے چنے کی نبولیوں سے دَم دیا جاتا ہے...... کبھی کھایا ہوا بوڑھا...... ناڑیاں بند' جوڑ کھل گئے ہوں...... سینے میں سانس کے پسٹن چھنتے ہوں...... جوت جھلملا رہی ہو...... دماغ کے ذر کھلنے میں کھنچ مارتے ہوں...... ملک الموت' مذاکرات کرنے میں حیا کر رہا ہو۔ کھچا کھچڑا' ڈیڑھ عشرہ کھلا دو' بڈھا شادی مانگنے لگے گا۔ بہتر ہوگا کہ اس بات کو بیچ میں ہی رہنے دوں' ورنہ جھگڑا بن جائے گی۔''

جمعرات کی صبح سب ماہرین آ پہنچے...... علیحدہ علیحدہ سب کو ان کا مطلوبہ سامان دے دیا گیا۔ الگ الگ جگہوں پہ لنگر کی تیاری کا بندوبست تھا۔ تاکہ ایک دوسرے کو پکاتے ہوئے نہ تو دیکھیں اور نہ ہی کوئی آپس میں بات چیت کر سکیں۔ صحن وسیع' کناتیں کرا اس کر کے چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ میں اوپر پہلی منزل پہ شیڈ میں بیٹھا ان کی کارکردگی دیکھ رہا تھا جبکہ وہ اوپر میری موجودگی سے بے خبر تھے۔

دیگیں پکانے والوں کو بازاری زبان میں نائی کہا جاتا ہے۔ اس تخاطب میں شائستگی اور اخلاقیت کا فقدان ہوتا ہے لیکن کیا کہا جائے کہ یہ لوگ بھی اسی معیار اور صحبت کے ہوتے ہیں...... حال حلیہ' نشست و برخاست' گفتگو اور وعدہ وعید اور کام نام...... چند فیصد اس پیشہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس پیشہ میں عزت شہرت' نام اور دام بھی بنائے اور واقعی ایسا کام کر دکھایا کہ انعام و اعزاز کے مستحق ٹھہرے۔

مجھے دعویٰ یا فخر تو نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ اللہ کریم نے میرے ہاتھوں میں بھی برکت' لذت اور ذمن رکھا ہے۔ کچھ بھی اُلٹا سیدھا جیسے بھی پکا پروس لوں کھانے والے تعریف کیے بغیر نہیں رہتے اور مدتوں سے میرے ہاں کھائے ہوئے لنگر کو یاد رکھتے ہیں۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ میں درویشی طریقے طعام تیار کرتا ہوں اور یقیناً اس لیے بھی کہ میری نیت میں یہ بھی شامل ہوتا ہے کہ بچے مہمان کھائیں گے۔ انہیں مزہ ملنا چاہیے' کھا کے خوش ہونا چاہیے...... اور یہ بھی کہ میں کھانے پکاتے وقت ہر مرحلہ پہ الحمدللہ پڑھتا رہتا ہوں...... اور کھانا جوٹھا نہیں کرتا۔

مجھے اس اعتراف میں کچھ باک نہیں کہ میں خوش خوراک واقع ہوا ہوں اور اس ضمن میں خاصا خوش ذوق اور اعلیٰ علم وشعور بھی رکھتا ہوں۔ بے شمار نت نئے کھانوں کا موجد بھی ہوں یعنی یہ علم بھی مجھے ودیعت ہوا۔ خوراک و غذا کے اجزا' اوزان' اوصاف' فائدے نقصان' تیاری و تراکیب' خواص و مقدار' حسب نسب میرے اندر سے ہویدا ہوتے ہیں۔ جب کوئی چیز آپ کے اندر سے خود بخود نکلتی ہے وہ کسی نہ کسی طور صحیح ہوتی ہے۔"

میں نے زندگی میں اَن گنت جگہوں' دعوتوں' تقریبات میں کھایا پیا لیکن ان میں سے چند ہی بار ایسا ہوا کہ مجھے اُن ہاتھوں پہ رشک آیا جنہوں نے وہ طعام تیار کیا...... جس نے میرے جیسے کھیڑے کوے کو بھی کیل لیا۔ مجھے چاولوں اور مختلف گوشت کے طعام پکانے میں بڑی رغبت ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں اللہ کریم بھی اچھے اچھے لذیذ' مہک آور اشتہا آور طعام و مشروب میں دلچسپی رکھتا ہے تبھی تو انواع و اقسام کے مسالہ جات' حلال جانور پرندے' مچھلیاں' سبزیاں اثمار اور مشروب تخلیق فرمائے۔ ذرا غور فرمائیں اگر الائچیاں' سونف' زیرہ' اجوائین' ادرک' لہسن' پیاز' دار چینی' بادیہ خطائی' تیزپات' گھی مکھن تیل' پودینہ' دھنیہ' زعفران' جاوتری جائفل' ہینگ' ہلدی' لونگ' کری پتہ' کیوڑہ' گل...... یہ تمام مسالہ جات نہ ہوتے...... قسم قسم کے چاول' دالیں اور اناج ناپید ہوتے تو کیا ہوتا؟...... مالکِ کل نے یہ تمام کچھ بطور نعمت' مَن وسلویٰ اُتارا...... باقی تمام کچھ سورہ الرحمٰن میں مندرج ہے۔

میں اُن کے علم میں آئے بغیر چاروں کی کارکردگی دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی تندہی اور انہماک سے اپنے کاموں میں جُتے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے ہی ان سب کے کانوں سے نکال دیا تھا کہ یہ پکوان کوئی دعوتی یا شادی ولیمہ سالگرہ کے لیے نہیں ہیں۔ یہ لنگر ہے جو اُن کے لیے ہے جو اس کے انتظار میں رہتے ہیں' جو اس کے مستحق ہیں' جو اس لنگر کی حکمت و اہمیت سے واقف ہیں...... اس لیے کوئی کسر نہ رہ جائے اور یہ بھی بتا دیا...... لنگر کی اپنی ایک مخصوص مہک ہوتی ہے اور اس مہک کے چار حصے ہوتے ہیں۔ پہلا حصہ جو اہتمام کرتا ہے' دوسرا

جو تیار کرتا ہے' تیسرا حصہ جو کھاتا ہے' چوتھا حصہ جو قبول کرتا ہے۔ تم تیار کرنے والے ہو۔ دیکھتے ہیں کہ کس کے تیار کیے ہوئے کھانے سے وہ مخصوص خوشبو آتی ہے۔ جس کے پکوان سے وہ مہک آئے گی وہ لنگر تیار کرنے کی خدمت کے اہل ہوگا۔

اڑھائی تین گھنٹے میں چاروں کی آٹھ دیگیں دم پہ تھیں...... پکائی کے دوران میری آنکھوں دیکھی ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات بھی میرے سامنے تھیں۔ کس نے سگریٹ اور نسوار کا استعمال کیا۔ صفائی ستھرائی کا کتنا خیال رکھا؟ کس نے کتنے مسالے چوری کیے اور کہاں چھپائے...... چکھنے کے بہانے کس نے بوٹیاں کھائیں اور دیگر چھوٹی چھوٹی باتیں......!

ظہر کی نماز کے بعد بسم اللہ شروع ہوئی اور دو دو ڈونگوں میں بریانی اور قورمہ میرے روبرو دھرا تھا۔ پہلے تین باورچیوں کو لنگر اور معاوضہ دے کر معذرت کر لی گئی۔ چوتھا' جس کا تعلق چنیوٹ سے تھا اور لاہور میں ایک ''چنیوٹ پکوان'' نام کے ایک ادارے میں پارٹ ٹائم ملازم تھا۔ صرف خاص تقریبات کی پکوائی کرتا تھا۔ عام قسم کے کاموں میں نہیں جاتا تھا۔ اس کا معاوضہ' دوسروں کے مقابلے تین گنا زیادہ اور نخرے نوابوں جیسے۔ پکائی کے لیے سامان' مالکان سے نہیں لیتا تھا۔ خود خریدتا مثلاً اُسے دو من بکرے کا گوشت یا دو بوریاں چاول' گھی مسالہ جات جو بھی چاہیے' آپ یا آپ کا ملازم ساتھ ہوگا۔ لے گا وہ اپنی مرضی کی چیز' پکائی وہ پردے میں کرے گا۔ اس کے شاگرد ساتھ ہوں گے' اس دوران وہ مالک کو بھی اُدھر پھٹکنے نہیں دے گا۔ معاوضہ' وہ نودولتیوں سے طے کرتا...... کچھ ایسے لوگ' جنہیں وہ کھانے پینے کے شوقین اور جانکار سمجھتا ہے' اُن سے معاوضہ طے نہیں کرتا...... اُن کی مرضی پہ چھوڑ دیتا ہے۔ آپ خوش ہوں جائیں تو جو جی چاہے دے دیجئے گا۔ میں بند مٹھی جیب میں ڈال کر چلا جاؤں گا۔ کوئی کسر رہ جائے یا آپ کو مزہ نہ آئے تو میرے لیے ایک پیسہ بھی حرام......!

یہ تھا بشیر احمد چنیوٹیا! جس کے دادا پردادا بھی یہی کام کرتے تھے اور فقیر درویش میں بھی نام رکھتے تھے۔ سفید بریانی' جس کے چاولوں کا ایک ایک دانہ الگ ثابت اور نیچے سیپ کی سی ڈھلک مارتا ہے...... اُوپر سے سادہ چاولوں کا خشک تراو دکھائی دیتا ہے' مگر جب اُنہیں منہ میں دھرو تو لذت و لطافت سے لب اِک دُونے کا بوسہ لینے لگتے ہیں۔ ایسی لطف چھوڑتی ہوئی مہک کہ مشامِ جاں لپک لپک اُٹھے۔ کہیں جھانکتی ہوئی رسیلی پلے پردے کی نرم نرم بوٹیاں...... منہ دھرو تو آپ ہی آپ رس گھولتی ہوئی حلق میں اُتر جاویں...... ایک آدھ لونگ' کالی مرچ' بادیہ خطائی کا قطبی ستارہ...... سیاہ زیرے کی نرم سی جھلک...... زعفران کا ترازو' کا جو کی ترشی بھری!...... تناول کرتے ہوئے لگتا ہے داستانِ امیر حمزہ کے حرف و لفظ اور کردار' سفید و بریانی میں بدل

گئے ہیں۔

یہی حال میرا کہ دو لقمے اُٹھائے ہوں گے کہ اندر باہر سیراب ہو گئے۔ میں نے اسے شاباش دیتے ہوئے پوچھا۔

"بشیر احمد! چاندنی چاول پکانے کے لیے اور ریشمی رساول بنانے کے لیے کیا کچھ ضروری ہوتا ہے؟"

بشیر احمد مجھے یوں تکنے لگا۔ جیسے میرے سر پہ سینگ نکل آئے ہوں۔ بن آنکھ جھپکے مجھے تک رہا تھا...... یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ارے......؟

عالم تحیر اور عالم سکرات میں کچھ ایسے بھی مقامات آتے ہیں کہ دماغ کی سلیٹ صاف ہو جاتی ہے۔ انسان بے بس ہو جاتا ہے' اُس کے ظاہری باطنی سب سسٹم ساکت و جامد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میرے اچانک اِس سوال پہ جو اِسی وقت ہی ذہن میں اُبھرا تھا...... میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا ری ایکشن ایسا زبردست ہوگا کہ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑنے لگیں گی...... سکتہ میں اُتر جائے گا اور موٹی موٹی آنکھیں سرخ پڑ کر ٹھٹھری رہ جائیں گی۔ کسی کی سکتہ والی کیفیت کو توڑنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہوتا؟...... سکتہ اکثر اپنا علاج خود ہی کر لیتا ہے یا پھر لوگ' جھنجھوڑ یا تھپیڑ لگا کر اُس کے حواس درست کر دیتے ہیں۔

یہ کچھ میں اِدھر تو نہ کر سکتا تھا۔ ہاں' البتہ! اپنے سوال پہ غور کیا' میری ایسی کون سی بات تھی جو اسے لڑ گئی ہے؟ جب کچھ پلّے نہ پڑا تو آنکھوں میں یہی سوال بھر کر اُسے استفہامیہ نظروں سے تکنے لگا۔ مقابلتاً اُس نے بھی بوندا بوندا آنکھوں میں جواب دھر کر مجھے یوں پیش کیا جیسے کوئی مَن چنچلی الہڑ' کسی سوال کے جواب میں اپنے بالم کو جل بھرے چاندی کے کٹورے میں تیرتا ہُوا' کالی مٹی کا بھرُ کتا دِیا بھینٹ کرتی ہے۔

باباجی! میرا والد' اپنے پیر کو چاندنی چاول اور گنوں کے موسم میں جب بیلنوں پہ رس نکالا جاتا ہے...... ریشمی رساول پکا کر اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتے تھے۔ جب میرے والد' یہ پکوان تیار کر رہے ہوتے تو اپنے قریب کسی کو پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ مجھے بھی کام سکھاتے ہوئے یہ تاکیدکی تھی کہ اپنے ہنر میں حجاب رکھنا۔"

میرے سامنے سے پردہ سرکا...... مجھ پہ کھلا کہ مقدس اور قیمتی نوادرات حجاب ہوتے ہیں...... پاکیزہ نفوس' محترم چہرے' حُسنِ حقیقی' حق حقیقت' حجاب کے پیچھے ہی اپنی معنویت رکھتے ہیں...... رازہائے کائنات و کونین' حجاب میں ہیں۔ انفاسِ قدسیہ' جنات دیگر عنصرات' نہفتہ و خفتہ صیغۂ راز میں ہیں...... اسی طرح کیمیا گری' حکمت و حذاقت' فن و فطانت' وجاہت و امانت وغیرہ کھلی ہوا میں نہیں رہنے چاہییں...... کم سوادی' بے قدری' حسد و حسرت کی سیلن زنگ پھیر دیتی ہے۔ اپنے غم اَلم' فرسودگیاں محرومیاں' پریشانیاں' پژمردگیاں' کہیں پس منظر کی اَلگنی پہ ٹانگ کر بھول جاؤ کہ پیٹ پیچھے سے پلاؤ اُٹھانے سے حاصل تو کچھ ہوتا نہیں' پردہ'

پھونک میں نخو بن جاتا ہے۔

مَیں نے اسے مزید پریشان کرنا اور کُریدنا مناسب نہ سمجھا...... معاملہ کو سمیٹنے کی غرض سے کہا۔

''بشیر احمد! دائی سے پیٹ پڑا پھوڑہ اور گیدڑ سے کھیت میں دھرا خربوزہ چھپائے نہیں چھپتے۔ مَیں نہ کچھ کھوتا ہوں اور نہ بولتا ہوں۔ بس' وہ مسالوں کے چُرانے والی حرکت کو خود ہی کھول کر دھیلا کر دو کہ مَیں بھی کچھ سیکھ سکوں۔ عقلِ کُل کا مالک' کوئی نہیں ہوتا...... جو پیدا ہوتا ہے پہلے روتا ہے' پاتا وہی ہے جو کھوتا ہے۔''

مجذوب سا کہنے لگا۔ ''مجھے میرے بابا جی نے بتایا...... فرشتے اور آدمی میں نمایاں فرق نفس کا ہے۔ فرشتہ' خواہشاتِ نفسی و عقلی سے ماورا اور بشر' ان سے بھرا ہوتا ہے۔ جب انسان کسی بھی وجہ سے بشریت کے دائرہ سے پاؤں نکال کر فرشتوں کی حدود میں منہ مارنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے مقامِ بشریت اور اعزازِ انسانیت سے مطمئن نہیں۔ جبکہ بشریت' اپنی جگہ خود بشارت ہے اور اس میں ماورائیت کی جستجو' صریحاً بدعت ہے۔ فقیرِ شہر اور امیرِ شہر کے مابین یہی فرق ہوتا ہے کہ ایک کا سفر' نیچے کی طرف ہوتا ہے اور دوسرے کا اُوپر کی جانب......!''

ہم ملامتی ہیں...... ہماری کوئی تعریف کر دے یا ہم سے کوئی اچھائی سرزد ہو جاتی ہے تو ہمیں فکر پڑ جاتی ہے...... اس خاطر ہم خود کو حساب میں رکھنے کی خاطر' دانستہ ایسی حرکتیں بھی کر گزرتے ہیں۔ جن میں ضم کا پہلو نکلتا ہو...... ارے! یہ تو ہمارا پیر بھائی' ملامتی نکلا......؟

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے اپنے اندریں سلوکے میں ہاتھ ڈال کر دو چار پوٹلیاں جن میں الائچی' لونگ' زیرہ' جلوتریاں تھیں نکال باہر میرے رُوبرو رکھ دیں...... بولا۔

''دیکھیں مَیں نے صرف آپ کی خاطر فنتی فنتی نہیں' تمیں' ستر کا حساب رکھا۔ ورنہ مَیں آدھے سے زیادہ تو نکال ہی لاتا ہوں۔ گھی' چاول' چینی اس کے علاوہ ہوتے ہیں۔ اس سامان سے کئی مفلسوں کے گھروں میں چولہے روشن ہوتے ہیں۔ دولتمندوں کا کیا' وہ تھوڑا کھاتے' زیادہ پھینکتے ہیں۔ بس! میرے کام میں یہی برکت ہے۔''

مَیں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''کیا یہ تمہاری چوری' گناہ کے زمرے میں نہیں آتی......؟''

عجب سا جواب داغا......!

''اچھائی' بُرائی' گناہ و ثواب کے سارے فلسفے' اخلاقیات' سماجیات کی مختلف توجیہیں ہی تو ہیں جو پڑھنے' سننے میں بڑی بھلی اور دلنشین لگتی ہیں مگر ضرورت' حقیقت اور مجبوری کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں۔

گونگلوں کی کرانڈ ختم کرنے کی خاطر دو چار چٹکیاں گڑ شکر کی شامل کرنی پڑتی ہیں۔ اسی طرح نیشکر کی راب صاف کرنے کے لیے ایک آدھ مٹھی میل کاٹ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بندۂ بندگی کے بند حسن میں قابو رہتا ہے اور نہ بشریت کے کینڈے میں پوری طرح فٹ بیٹھتا ہے...... یعنی اس کی فطرت کے گنے کوڈوں میں پارے کی طرح بیٹھے ہوئے تلون اور نسیان' اس کو تملائے اور تگنی کا ناچ نچائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح مستقل مزاجی' بردباری اور تحمل و تدبر کا فقدان بھی اس کا ناس مار کے رکھ دیتے ہیں......؟

کیڑا' موری میں خوش رہتا ہے اور اپنی حیثیت' سرشت کے مطابق طبعی زندگی بسر کرتا ہے۔ کرم کو رطوبت سے' کھٹمل کو کھٹیک کھاٹ کھاڑک سے' چیچڑ' مچھر' جونک کو کھدری کھال اور مجزمل بالوں سے' پسوؤں کو چام شام جون سے' نسری کو جھنڈ اور مجورے سے' دیمک کو داسا اور در و دالان سے...... چھچھوندر' چھپکلی' چھلپ اور چھلاوے کو اگر بلوں' بالوں' نیلوں' کڑیوں' مرچیوں سے نکال باہر کیا جائے تو مخلوق کا نظامِ حیات و ممات مفلوج ہو کر رہ جائے؟ ارے! یہ تو فلاسفر بھی ہے؟

## ● کوچۂ پٹ رنگاں میں اک سیاہ پوش......!

میرا ایک بچہ رنگریز ہے...... میری خواہش ہوتی ہے میری یا داللہ کچھ ایسے پیشہ ور ہنرمندوں سے بھی رہے جو اپنے پیشہ میں مخلص اور یکتا ہوں' عطائی نہ ہوں۔ اپنے جدی پشتی پیشے کے امین' اور علمبردار ہوں' ان پیشہ وروں میں نائی' قسائی' نانبائی' جراح' حکیم' سقے' موچی' منجیاں پیڑھیاں ٹھونکنے والے ترکھان...... تلواریں' تیر' تبر' زریں' منجنیق اور سامان زراعت بنانے والے آہن گر...... عمارتیں تعمیر کرنے والے معمار' کھوجی' کمہار' کپڑے بننے اور دھونے والے درزی' دھوبی' تیلی وغیرہ...... اسی طرح خاندانی مراثی' بھانڈ' کلونت' قلندر' مداری' ڈھولیے' پہلوان' ملاح اور نلوانے!...... میں ان لوگوں کی بہت عزت اور ڈھیر ساری قدر کرتا ہوں۔ میں ایمانداری سے اس امر پہ یقین رکھتا ہوں کہ زندگی کی اصلیت کا اصل علم اور ادراک ایسے ہی بے ضرر مگر عظیم انسانوں کے پاس ہوتا ہے۔ یہ رزق حلال کمانے والے لوگ ہوتے ہیں۔

یہ میرا رنگریز بچہ بھی لا لاریوں کے ایک قدیمی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ ان پڑھ اور ان پاڑ......! مگر اپنے فن میں سولہ آنے تیار...... رنگ' اس کے روبرو اپنے پورے انگ کھول دیتے تھے۔ ایسے پکے اور نیچے رنگ چڑھاتا کہ خسرو کی چنریا اور چودڑ آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتیں۔ تصوف میں رنگ رجوا کا استعارہ سب سے زیادہ خسرو نے استعمال کیا اور خوب کیا......؟

اقبال ٹاؤن لاہور کی مُون مارکیٹ میں سے گزر رہا تھا۔ رنگریزوں کا اِک جمِ غفیر اِدھر موجود ہوتا ہے۔ بیچ بازار ہی دوپٹے لہرائے سکھائے جاتے ہیں۔ رنگوں بھری ناندیں' بھٹوں پہ اُبالے کھا رہی ہیں۔ کاریگر لونڈے بالے' پتلی پتلی سی چھڑیوں سے پارچات کو اُتھل پتھل کر رہے ہیں۔ نیلے پیلے' اُودے کاسنی' بسنتی' سرخ فالسئی' خاکستری' فاختئی' جامنی رنگوں کی بہاریں اُتری ہوتی ہیں۔ اِدھر سے گزرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نگار خانے کی راہ سے ہو لیا ہوں' طبیعت میں عجیب سی ترنگ اور سرنگی سی در آتی ہے...... نگاہوں کے ورے' کھٹ مٹھے سے لہرے جھولتی ہوئی قوسِ قزحیں جلمک کرنے نکلتی ہیں...... بسنت رنگ کے سارے منظر' رنگوں کی پچکاریاں' گلال اور آراروٹ کے تازہ آٹے کی مہک سے مَیں مہکارا جاتا ہوں۔

ایک سہانے سے دن' شام اُترنے سے کچھ پہلے...... میرا اِس کوچہ "پٹ رنگاں" سے گزر ہوا...... کہیں سے "بابا جی" کی تھمی سی آواز سنائی دی۔ جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو...... خود بخود مجھے بریک لگ گیا اور مَیں مُڑ کے دیکھنے لگا......

پکار' ندا' صدا وغیرہ صوت کی مختلف کیفیتیں ہیں۔ آواز حلق سے نکلتا ہے جبکہ یہ تینوں کہیں اندر کی کوٹھڑی سے نکلتی ہیں۔ جیسے چیخ' آہ' کراہ اور واہ ہوتی ہیں...... یہ بھی لاشعوری ہیجانی کیفیات ہوتی ہیں۔ ایک نوجوان جو اپنے داغدار لباس اور رنگوں سے سیاہ ہوئے ہاتھوں سے رنگریز دکھائی دیتا تھا' میرے سامنے سربسجود آ کھڑا ہوا۔

ہاں' مختلف رنگ جب ایک جگہ رَل مل جمع ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی انفرادی شناخت کھو کر ایک مشترکہ رنگت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ رنگت سیاہ ہوتی ہے۔

نورِ حقیقی' لوح و قلم' تختِ وکرسی' کونین کا نئات' کس رنگ کے ہیں......؟ نظامِ ہست و بُود' ازل و اَبد' مہد و لحد' دانش و بینش' علم و عقل' فہم و ادراک سب کیا ہیں؟ اِک پردہ حجاب ہی تو ہیں' جب انسان حجاب کر لیتا ہے تو اس کا واسطہ اِک سیاہ پرت سے پڑتا ہے۔ جو کالی گھٹا' کالی چادر کی طرح ڈھانپ لیتی ہے۔

سیاہ رنگ' نہیں ایک ازلی اَبدی حقیقت ہے جو کسی عمل یا ردِ عمل کا محتاج نہیں۔ اس رنگ کے حصول کے لیے کسی مادی میٹریل کی محتاجی نہیں ہوتی......! اب ذرا غور کریں کہ تنہائی کیا چیز ہے......؟ تنہائی بھی سیاہ ہوتی ہے اگر تنہائی سیاہ نہیں تو وہ محض کنارہ کشی ہے۔ سیاہ رنگ جب مکمل گہرا ہوتا ہے تو یکدم اپنی ہیئت بدل کر اُجل جاتا ہے اور از قسمِ نور بن کر دل و نگاہ کو روشن کر دیتا ہے۔ یہی وہ روشنی ہے جسے تنویر کہتے ہیں جو مہتاب و آفتاب کے مستعار اُجالوں سے کئی نوری سال بڑھ کر ہوتی ہے......؟

سرمہ اثمد اصفہانی ہو یا سرمۂ طُورِ دل کے لیے سرور اور آنکھوں کے لیے نورِ ظہور ہوتا ہے۔ دونوں ہی

شیاہ سیاہ ہوتے ہیں۔ روشنی میں سیاہی نہ ہوتو وہ آشنائی و آگاہی دینے میں متامل ہوتی ہے۔ تل، کالا نہ ہو تو دل میں میخ کی مانند کھٹکتا ہی نہیں...... رات 'شب تار' نہ ہو تو اُس میں اَسرار ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زلف گرہ گیر سیاہ نہ ہوتو مار سیاہ میں بس نہیں رہتا...... اسی طرح تنہائی میں سیاہی کی گلیم سر پہ نہ ہو تو سر سیاہی بھر سرور نہیں آتا ہے۔ 'کوا' کالا نہ ہوتا تو کوئی کبوتر ہوتا اور جو کبوتر شیاہ سیاہ ہوتا وہ قطب کبوتر ہوتا ہے۔

بات رنگریز بچے سے آگے بڑھی تھی...... کہ مجھے رنگریزوں کی مارکیٹوں سے گزرنا اچھا لگتا ہے۔ میری طبیعت کھل اُٹھتی ہے۔ میں اپنے روبرو کھڑے اس بچے کا عندیہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے مجھے بے ساختہ پکارا...... ایسا اُس نے ارادتاً کیا یا اُس سے خود بخود سرزد ہو گیا۔ اُس کے سر نیہو کر کھڑے ہونے کے انداز سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ "پکار" والی ہوک...... اُس کے اندر اندھیری کوٹھڑی کی کسی کنج سے اَو بدائی اَبابیل کی مانند پھڑ پھڑاتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ کونجوں کی کُرلاہٹیں، کوّوں کی کاں کاں، کتوں کی کُوں کُوں اور اَبابیلوں کی آزردہ سی آوازوں اور اُدھوری اُدھوری اُڑانوں سے تو میری پرانی شناسائی اور قرابت داری ہے۔

عاشق اپنی آنکھوں، عالم اپنی باتوں...... شاطر اپنی چالوں، نہایا اور کھایا ہُوا اپنے بالوں اور گالوں سے...... مسافر اور مریض اپنے حال و ملال سے، سائل اور ہیجڑا اپنے سوال اور چال سے...... مشاط اور جیب تراش اپنی اُنگلیوں سے، خراف اور مراثی اپنی ذرفطنیوں چٹکلیوں سے...... گنوار کمہار، لوہار، ٹھٹھیار، معمار اپنے ہاتھ پیر...... چوہدری، چور اور چمیار اپنی پگ چک سنگ...... پٹواری، تیواڑی کباڑی اور لالاری (رنگریز) اپنے لباس کے داغوں اور رنگی ہوئی ہتھیلیوں، نیلی پیلی سیاہ پوروں اور ناخنوں سے شناخت ہو سکتے ہیں......؟

اصل حقیقی رنگ تو صرف ایک ہی ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی رنگ ہیں وہ اسی سیاہ رنگ کے ضمنی روپ بہروپ ہیں جو مادیت کی مختلف ہیئات اشکال، کیفیات و کرامات کو آفتاب کی تابانیوں کی مہربانیوں سے گوناگوں رنگین عکسوں سے، انسانی عدسوں کو دکھائی دیتے ہیں۔ اگر گھاس 'سبز' دکھائی دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سبز ہے۔ بنیادی چیز 'دکھائی دینا' نہیں 'ہونا' ہے۔ گھاس کا ہرا دکھائی دینا' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس کے گرد و گرد و جو اُس کے کیمیائی عنصرات پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اُن کے اثرات ہوں۔

بہت سے اِنسان اور دیگر مختلف جانور ایسے بھی ہوتے ہیں جو کلر بلائنڈ ہوتے ہیں۔ وہ رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتے...... اُن کے سامنے پوری کائنات 'بس دو ایک معدوم سے رنگوں پہ ہی مزین ہے...... کچھ جانور اور اِنسان' ذائقوں اور خوشبو بدبو...... درد تکلیف' خوشی غم...... خوف' ڈر...... جذبات' رحم ترس اور ہمدردی جیسی حسیات سے بُری طرح محروم ہوتے ہیں۔ ہر قبیل کی مخلوق' اپنا اپنا مخصوص ظاہری اور باطنی نظام پا کر معرض وجود میں آتی ہے۔ مگر اِن میں سے کچھ دانے علیحدہ سے بھی ہوتے ہیں...... جن میں ماورائیت ہوتی ہے۔ یہ تو خالق

ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہوتی ہے۔؟

مجھے مٹی سے مس کرتے ہوئے اور کسی نامعلوم بے نشان منزل کی جانب بڑھتے رہنے والے پاؤں...... کارمشقت' رزق اور سلامتیاں آسانیاں تقسیم کرتے ہوئے ہاتھ اور ناخن تدبر و تفہیم' تدبر و تحمل سے حالات' مشکل معاملات کی گرہیں ڈھیلی کرتی ہوئی انگلیاں اچھی لگتی ہیں...... سبحان اللہ!

جن کے ہاتھوں پہ مشقت سے گھٹے نمایاں ہوں' تلاش کے سفر میں پاؤں پہ چھالے پڑے ہوں...... ممنونیت کی مد میں ماتھے پہ مہر تکرمت مقیم ہو...... اخلاص و اخلاق' سچ اور دھیرج سے جھکے ہوئے لہجے' عجز و احترام سے جھکے ہوئے سر اور وفا و حیا کے سرمے سے بنی ہوئی آنکھیں...... ایسے قطب نما' کہیں پاؤ تو آنکھیں سیر کرلو...... دل گداز کرلو...... سوچوں کی سمت راس کرلو کہ یہی وہ ہیں جن کی آستینوں میں خورشید ہوتے ہیں......!

اس رنگ رجوے کا نام شاہجہان تھا۔ فل بنا فل' میری طرح اَن پڑھ...... جن کے ہاں سے آگے فیض کے چشمے جاری ہوتے ہیں...... بے رنگوں' بدرنگوں' کج رنگوں کو پکے رنگ چڑھتے ہیں...... ایسے لوگ اکثر اَن پڑھ ہی ہوتے ہیں۔ گل لالہ ہوتے...... قدرت اُن کی پرورش کرتی ہے...... تلمیذ الرحمٰن ہوتے ہیں...... چشمہ کی طرح' رواں دواں پانی' صاف ستھرا' معطر و مُقطر' شفا بخش' آب جاوداں کی طرح حیات پرور......!

فطری علم میں قدامت رہے تو اس میں کرامت بچی رہتی ہے...... جدیدیت آ جانے پہ حرکت تو رہتی ہے مگر برکت اُڑ جاتی ہے۔ حرکت میں برکت نہ ہو تو نحوست و یبوست جنم لے لیتی ہیں۔ شاہجہان اور رنگریزی؟...... نام اور کام نے میرے اندر اک ہنگام برپا کر دیا تھا۔

سرِراہ' مجھے ایک ایسے معصوم افغانی بچے سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا بورا کندھے سے لٹکائے' سڑک کے کنارے پڑے آہنی کوڑادان سے ایسی اشیا چُن رہا تھا جنہیں بیچ کر وہ کچھ رقم حاصل کر سکے۔ مَیں شاید اُس کی جانب متوجہ نہ ہوتا اگر مَیں اُس کے پیر سے رِستا ہوا خون نہ دیکھتا۔

مَیں قریب فٹ پاتھ سے گزر رہا تھا اور وہ غلاظت کے کوڑادان کے اندر اترا ہوا متعفن گندگی کے انبار میں سے اپنا رزق تلاش کر رہا تھا...... کوڑادان گہرا جبکہ وہ کانحا اور عمر و عقل میں کمتر!...... پاس سے گزرنے والوں کو دکھائی نہ دیتا کہ اندر دھنسا ہوا تھا۔

خوشبو اور بدبو دونوں اپنی اپنی حیثیت میں اہم ہیں...... خوش جمالوں اور روشن دماغوں کے لیے خوشبو اک نعمت غیر مترقبہ ہوتی ہے...... بدبو یا ناگوار مہک سے ان نازک مزاجوں کی طبیعت مالش کرنے لگتی ہے' موڈ بگڑنے لگتا ہے...... یہاں تک کہ وہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ جیسے مغلوں کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اک

''شاندار جبری موت'' سے ہمکنار کرنے کے لیے بدنیتوں بداندیشوں نے انسانی غلاظت کے تعفن کو بطور زہر ہلاہل استعمال کا منصوبہ بنایا...... یعنی جو باسی گلگلے کھانے سے مر جائے اُسے گلوٹین کے نیچے دینے کی کیا ضرورت؟...... لیکن خوشبو اور بدبو تو ایسے ہی ہیں جیسے میٹھی اور کھٹی لسی...... یا پھر گھیا توری اور کریلے نیمولیاں یا کچنار...... جنگلی بیر یا دھرکونے...... کوزہ مصری یا منقہ بریاں...... نیشکر نبخت یا نوشادر کھار وغیرہ...... یہ سب خوشبوئیں بدبوئیں' میٹھے کڑوے کھٹے کسیلے' پھیکے چسکے تیکھے' چرپرے نمکین ذائقے' موسم اور کام و دہن سب سامریٔ عصر کے کرتب و کرشمے ہیں۔'' تجربہ کرلیں! کڑوی شے کو میٹھا سمجھ کر ہپ ہپ کرتے کھاتے جائیں تو کچھ ہی دنوں بعد وہی تلخ چیز' اچھی اور میٹھی لگنے لگے گی۔ جیسے لعاب منہ میں خود بخود بنتا ہے اسی طرح انسانی لذات و خطأت' خیالات جذبات کیفیات' منہ کے مزے' مزاج' موڈ بھی لعاب دہن کی مانند ہوتے ہیں...... جیسے معدے کا موسم ویسے ہی منہ کے لعاب کی رُت......!

مَیں اُس بچے اور اُس کے پاؤں سے رستے خُون کو دیکھ نہ پاتا اگر ناگاہ میری نظر اُس کے سفید ننھے منے ہاتھ پہ نہ پڑتی جس کی مدد سے وہ کوڑادان کے اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔مَیں اس کا چاندی کی مانند چمکتا ہاتھ' ننھی منی اُنگلیاں دیکھ کر غیر ارادی طور پہ رُک گیا...... میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کسی نہ کسی طور باہر نکل آیا...... کاٹھ کباڑ کا بورا اُس کی گرفت میں تھا۔ سر پہ افغانی ٹوپی' ویسے ہی کپڑے اور جوتے' جو اُس کے پاؤں کے حساب سے بڑے دکھائی دے رہے تھے...... یہ سفید رنگ کے جوگر تھے...... دائیں والا جوگر' خون سے سرخ ہو رہا تھا...... بچہ کسی نہ کسی طور' خود آپ اپنی مدد کے تحت زخمی پاؤں کو جوتے سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگا...... جوگر کا گز بھر لمبا تسمہ کھولنے میں اُسے خاصی دُشواری ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے خُون سے لت پت جوتا دیکھ کر اُس کا حواس باختہ ہونا سمجھ میں آتا تھا۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔قریب گیا پاس بیٹھ کر اُس کی مدد کی غرض سے' تسمہ کھولنے لگا...... وہ اچانک مجھے اور میرا حلیہ' سیاہ لباس' لمبی ریش' دراز گیسو' مالائیں' انگوٹھیاں' ہاتھ میں عصا، دیکھ کر بلند آہنگ سے رونے چیخنے لگا' شاید ڈر گیا تھا' ''شیروانی پٹھان ہونے کے باوصف مَیں پشتو زبان سے نابلند ہوں۔ دو چار نسلیں پہلے کہیں آباء و اَجداد اِس مَردانہ زبان سے باہمی افہام و تفہیم کرتے ہوں گے۔ ہم نالائقوں تک پہنچتے پہنچتے یہ ''عظیم'' مجاہد اور مردانہ'' زبان ہمارے ہاں اجنبی بن کر رہ گئی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا زبانیں بھی مَردانہ' بزرگ اور مجاہد ہوتی ہیں؟ میرے نزدیک اس کا جواب بھی ہاں میں ہے۔ فارسی' عربی' فرانسیسی' قلعہ معلی والی اُردو اِس کی موٹی موٹی امثال ہیں...... جو زبان اپنی اظہاری افہام و تفہیم کے لیے آنکھوں ہاتھوں اور اشاروں کنائیوں کی محتاج اور ایک حد سے بڑھ کر لجاجت' عجز و خاکساری

اور بات بات پہ سر اور کاندھے جھکانے کا وطیرہ رکھتی ہو..... قطعیت سے عاری اور ہاں ناں کا درمیانی موقف اختیار کرتی ہو میرے نزدیک وہ مردانہ زبان نہیں ہوتی..... ابلاغیت اور اخلاقیت کا غیر ضروری استعمال اکثر منفی نتائج پیدا کرتا ہے۔ ہندکو سرائیکی ہندی' سندھی بلوچی بھی کسی حد تک اسی قبیل میں آتی ہیں۔

وہ پشتو میں مجھے شاید بُرا بھلا کہہ رہا تھا یا مجھے تسمہ کھولنے سے روک رہا تھا' یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ میری مدد قبول کرنا نہیں چاہتا ہے اور یہ بھی اغلب ہے کہ وہ مجھے کوئی پہنچا ہوا بزرگ سمجھ کر اپنے پاؤں کو ہاتھ لگانے سے منع کر رہا تھا۔ جو بھی تھا وہ میری گرفت سے اپنا پاؤں کھینچ رہا تھا اور میں اُس کے خون سے سُرخ جوتے کو اُتارنا چاہتا تھا۔ سڑک پہ ٹریفک رواں دواں تھی۔ بسیں' کاریں' موٹر سائیکل' رکشے اور دیگر ریڑھے' ریڑھیاں تانگے' ہر کوئی اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں..... کسی کو اتنی فرصت فراغت کہاں کہ سڑک سے ہٹ کر پڑے بلدیہ کے غلاظت بھرے آہنی چھکے ہوئے کوڑے دان سے اپنا رزق تلاش کرتے ہوئے کسی افغانی بچے کے لہولہان پاؤں کو دیکھ سکے۔ یہ تو معمولی زخمی ''غیر ملکی'' بچہ تھا جو اُردو پنجابی کا ایک لفظ تک نہیں جانتا..... یہاں تو روزانہ ٹریفک کے حادثوں' ٹارگٹ قتل کی وارداتوں' دہشت گردی کے واقعات میں سینکڑوں لوگ کام آجاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک کسی کی جانب دھیان دے' روئے پیٹے' واویلا یا اُن کی مدد کرے.....؟

جب کوئی آپ کی زبان نہ سمجھتا ہو تو کوئی معاملہ درمیان ہو تو میرے پاس یہی حل ہوتا ہے کہ میں دائیں ہاتھ دل پہ رکھ کر سر خم کر لیتا ہوں..... اور ساتھ الحمدللہ' الحمدللہ! کہتا جاتا ہوں..... مقابل میں مسلمان ہو یا کسی اور مذہب کے ماننے والا' کوئی بھی چینی جاپانی' افریقن یا امریکن..... جنگلی یا صحرائی' کوئی بھی ہو میرا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ بچہ مجھ سے حد درجہ خائف ہے اور نہیں چاہتا کہ میں اُسے ہاتھ لگاؤں' ہمدردی یا مدد کروں تو میں نے یہی الحمدللہ والا نسخہ استعمال کیا۔ اُس سے نظریں ملائے بغیر' آہستہ آہستہ الحمدللہ پڑھتا رہا اور ساتھ ساتھ تسمہ بھی کھولتا جا رہا تھا۔

شیشے کی کوئی کرچی' اُس کے جوگر کے تلے میں گھس کر تلوے کو چاٹ گئی تھی۔ اُس کے نکالنے کی کوئی ترکیب یا انکل اُس کی سمجھ میں تو نہ آئی' البتہ کوڑا دان سے باہر نکلنے کی تگ ودو میں ٹوٹ ضرور گئی۔ سینے میں اُترا ہوا تیر شاید اتنی تکلیف نہیں دیتا جتنی اُس کی ٹوٹی ہوئی انی اذیت پہنچاتی ہے۔ اسی طرح سینے میں دم پھنسا رہ جائے' یا کوئی خلش' کشمکش' حسرت' آرزو' یا ارمان اور یاد! سانپ کے منہ میں چھپکلی کی طرح کا حال ہوتا ہے۔ سینہ ایک ایسے قفس کی مانند بن کے رہ جاتا ہے' جس میں پرندہ بھی موجود ہوتا ہے' کھڑکی بھی کھلی..... آب ودانہ بھی وافر..... مگر اذن پرواز نہیں ہوتا۔

میں اُس کے کسی بھی ردِعمل کی پروا کیے بغیر' بائیں پاؤں سے بہتا خون' اپنی سیاہ چادر سے صاف کر

رہا تھا۔ تلوے پہ اک گہرا گھاؤ دکھائی دیا۔ ہلکا سے دبایا تو خون کی ایک دھار باہر اُبل پڑی' مجھے محسوس ہُوا کہ ٹوٹے ہوئے شیشے کا کچھ حصہ ابھی بھی پاؤں کے اندر گھسا ہُوا ہے جسے ہسپتال والے ہی نکال سکتے تھے۔

بچہ نیم بے ہوش ہو چکا تھا' خون کافی بہہ چکا...... اب اُسے فوری کسی ہسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ مَیں بوڑھا پیدل ماسٹر! اِدھر اُدھر دیکھا...... سڑک پہ ایک خالی رکشہ دکھائی دیا۔ آواز و لگایا اُسے بلایا...... ہسپتال پہنچایا...... ایمرجنسی میں ڈاکٹر نے ہلکا سا کٹ لگا کر ٹوٹے ہوئے شیشے کو نکال باہر کیا...... ایک دو ٹانکے لگے' پٹی باندھی' فارغ کر دیا۔ انجکشن' ٹانکوں کی تکلیف' ہسپتال...... وہ خاصا حواس باختہ تھا۔ زبان کا مسئلہ الگ' معصوم مسلمان بچہ! اِسی حالت میں اُدھر چھوڑ کر تو نہیں آ سکتا تھا۔ چار و ناچار دوبارہ رکشے پہ دھرا اور گھر لا اُتارا......!

گھر میں کون سے نوکر چاکر یا بیوی بچے تھے جو اسے سنبھالنے میں مدد دیتے۔ مَیں تو خود دوسروں کے آسرے ڈھونڈتا رہتا ہوں یعنی کوئی تو ہو جو میری ناتوانیوں' پیرینہ سالیوں کا ساتھی ہو؟ میری کہنگی کا یہ عالم کہ دائیں ہاتھ پاؤں کو ہلانے کے لیے بائیں ہاتھ پاؤں کا احسان لینا پڑتا ہے۔ پہروں ایک پہلو پہ پڑے پڑے پچھے نچھے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ رگوں کی ٹوٹی پھوٹی نالیوں میں خون کی بجائے ریشہ و بلغم کی غلیظ گار پھنسی رہتی ہے۔ مانجھی' مچھلی منڈی کے فحش' مواو مالی' ماجھے کے مبیتوال اور مست ملنگوں کے حقوں میں آگ پانی کی سدا تھوڑی رہتی ہے مگر گڑگڑ بجتے کی گڑگڑیوں کے حق ہو کے اور جھٹکے بھی ماند نہیں پڑتے۔

رہائش گاہ' مکان' کوٹھی' بنگلہ' فلیٹ' جھونپڑا' کُٹیا' ڈھیری' آستانہ' تکیہ...... جو بھی ہو بندوں انسانوں کے قیام و آرام کے تقاضوں کو سامنے لاتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ کام کے بعد آرام' سفر کے بعد قیام' بڑوں کو سلام چھوٹوں کو انعام' رذیل کو دشنام دینا' کیوں اہم ہوتا ہے۔ ہنسنے کے بعد رونا' جاگنے کے بعد سونا' پانے کے بعد کھونا...... غم کو چبونا' اپنے اندر کو بھگونا...... کسی کو بلونا' ہاتھوں کو دھونا بھی کیوں ضروری ہوتا ہے؟

اِس چار سو بارہ نرگس بلاک علامہ اقبالؒ ٹاؤن لاہور کے برزخ کی کھونٹی پہ پھٹی پرانی کالی گلیم کی مانند مجھے علامہ اقبالؒ نے لٹکایا تھا جبکہ میرے نامۂ اعمال کے ابھی دو تہائی صفحے خالی تھے۔ ابھی تو کچی عمرا فروزی کی توانائی آمیز تابانیوں کی تلاش ہی شروع ہوئی تھی اور اُدھر نہ تو عقل داڑھ کی میڑھ بنی نہ ہی حلقوم کی ہیزھ میں کسی کالے کوّے نے ٹھونگا لگایا تھا......

کچھ ہی عشروں بعد جب ذرا ہوش ٹھکانے لگے اور اس "محل وقوع" کے دیگر کوائف و عواقب پہ نگاہ دوڑانے سے پتا چلا کہ پوری دُنیا اور لاہور کو ایک طرف رکھ کر مجھے اس گھر میں لا پھینکنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ اسکیم کا نام' علامہ اقبال ٹاؤن...... بلاک کا نام' نرگس بلاک...... گھر کا نمبر چار سو بارہ...... پلاٹ کے نیچے پہلی اور دوسری پرت میں ریتو لوشٹھہ' تیسری پرت میں جلاانجل...... چوتھی میں نرنگ اور مشرک...... پانچویں میں

تمکا اور ریتی...... چھٹی پرت میں پرت پکھان اور واشب...... ساتویں پرت میں یاماری اور دیگر پارتھو وغیرہ...... ویسے یہ کچھ اور بھی بہت کچھ طبقات ارض نیچے ہوتا ہے مگر کچھ خاص معدنیات' حجرات' نباتات و کیمیائی عنصرات کا واقع ہونا بہت سے معاملات میں کسی قطعہ ارض کو منفرد بنا دیتا ہے۔

گجرات شہر سے جلال پور جٹاں کی جانب بڑھیں تو کچھ آگے ایک خشک نالہ راہ میں پڑتا ہے......

مَیں زمانہ بچپن میں بدھ وار کی صبح سیالکوٹ سے گجرات' سائیں کانواں والے سرکار اور جلال پور جٹاں' پیدل پہنچا کرتا تھا تو دوران سفر میرے پانچ پڑاؤ ہوتے تھے۔ بارہ پتھر سیالکوٹ سے آگوکی...... اگلا پڑاؤ سمبڑیال...... یہاں نہر کی دوسری جانب وسیع و عریض ریلوے یارڈ میں واقع ایک قدیمی مزار ہے۔ اِدھر حاضر ہونے کا ایک الگ ہی مزہ...... فاتحہ سلام کے بعد ہلکا سا آرام وطعام...... اِدھر مستقل بیٹھنے والوں کی محبت اور صحبت کے علاوہ آگے کی منزل کے لیے ہمت اور سہولت بھی۔ یہاں سے آگے اپنی وادی جی کے جگووال کی ہواؤں کو سونگھتا اور مٹی کو چومتا ہوا' نظام آباد اور وزیر آباد کی اَدب بیز اور مردم خیز زمین میں پہنچ کر یوں محسوس کرتا جیسے مَیں بابا ظفر علی خان کے "زمیندار" بابا مجید لاہوری کے "نمکدان" راجہ مہدی علی خان کے دُھر گیت منڈل میں آ براجا ہوں۔ یہاں کے مین بازار میں پکوڑے مچھلی کی بہت سی دوکانیں ہوا کرتی تھیں...... چھری چاقو قینچیوں کے علاوہ یہی پکوڑوں' تلدی' تگے اور مچھلی کہ مچھلی گھر یعنی دریا ساتھ تھا۔ اسٹیشن اور ریلوے یارڈ' ورکشاپ ایسی وسیع و عریض...... لگتا تھا وزیر آباد اس ریلوے کی حدود کے اندر آباد ہے۔ اس کے بعد کا سفر گویا سفر نہ رہتا...... چناب کے پُل تک پتا ہی نہ چلتا کہ گجرات پہنچ آیا ہوں۔

خطہ گجرات' جذب و مستی کی کیفیتوں' عشق و محبت کی ترنگوں...... حُسن و جمال کے رنگوں' کسب و ہنر کے شہکاروں' علم و اَدب کے گہواروں' حرب و ضرب کے شہسواروں اور فن کاروں گلوکاروں کی سریلی سرزمین!

بچپن میں میری پہلی اُستاد چاچی جنوں والی نے انکشاف کیا تھا کہ میرا جبلی جانور کا گا ہے۔ مَیں اُس وقت علم و عقل اور عمر کے حساب سے یہ عجیب سی بات سمجھ نہ سکا اور قدرے منہ بنا کر شکایت کے انداز میں کہا۔ کوا تو بڑا مکار اور چکا ہوتا ہے...... کیا مَیں ایسا ہی ہوں؟...... چاچی نے پیار سے میرے گال پہ چپت لگاتے ہوئے جواب دیا۔ کوا پی کے پہنچنے کا سندیس بھی تو لاتا ہے اور بھی کوے کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتائیں جو دوسرے جانوروں پرندوں میں نہیں ہوتیں۔ مگر میرے لیے یہی ایک پیا کے پہنچنے کے سندیس والی اچھی بات ہی کافی تھی۔

مَیں اپنے تئیں مطمئن ہو گیا بلکہ خود دوسروں کو فخر سے بتاتا کہ مَیں کوا ہوں...... جہاں کہیں کوا دیکھتا اُسے پیار بھری نظروں سے تکتا...... دوست بنانے اور کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کرتا مگر یہ تو بڑا چوکنا محتاط

اُچپل پرندہ ہے۔ انسان کے قریب پھٹکنا تو درکنار یہ تو اُس کی نیت اور سوچ کو سُونگھ کر ہی راہِ فرار کر لیتا ہے۔
میری مثبت سوچ اور رَوّیے بالآخر کام آئے اور ساتھ ہی مَیں نے اپنے اس جبلّی رُخ کو واضح کرنا جان لیا تھا
جس کی بدولت' کوؤں سے میری قربت بڑھنی شروع ہوگئی' وہ اب دھیرے دھیرے میرے قریب آنے شروع
ہوگئے۔ یہاں تک کہ میرے ہاتھ سے کھانا پینا بھی کرنے لگے۔ کاندھوں اور سر پہ بیٹھ جاتے...... پیدل سفر
کے دَوران میرے ساتھ ساتھ اُڑتے رہتے۔

اب ایک وقت ایسا بھی آ لگا کہ ہمارے درمیان نُطقی افہام وتفہیم بھی ہونے لگی۔ شروع شروع کچھ
دُشواری پیش آئی بعداً وہ بھی ختم!...... اب واضح طور پہ ہمارے مابین باہمی بات چیت ہونے لگی۔ وقت
کچھ آگے کھسکا تو رہی سہی اجنبیت بھی جاتی رہی۔ اب بلا تکلف ہم ساتھ کھاتے پیتے رہتے اور دُکھ سُکھ
کہتے تھے......

علم وحکمت' دانش وبینش' تحقیق وتنقیح اور تفتیش وتنقید کے جہانِ دَبستان کُھلے پڑے ہیں...... آدم نے
غاروں پہاڑوں' صحراؤں سمندروں سے بہت آگے کا سفر طے کر لیا...... لیکن شاید اس کی منزل ابھی بہت دُور
ہے۔

کہتے ہیں عزت اور خیرات' پہلے اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح سفر بھی پہلے اندر
سے شروع ہوتا ہے اور اس سفر کی کوئی منزل اور نہ کوئی سنگِ میل...... ہمسفر نہ کوئی رہبر! اندر اور اپنے باہر وظاہر
کے سفر کرنے والوں کے فرق کو' سنگ تڑے'' کے چھلکے اور گرو گودے کی مثال سے خُوب سمجھا جا سکتا ہے۔

ظاہری سفر' سورج کی روشنی...... یعنی دن کے اُجالے میں شروع کیے جاتے ہیں جبکہ باطنی سفر رات
کے پچھلے پہر...... تاریکی اور تنہائی میں تمہید کیے جاتے ہیں۔

مؤذنِ اوّل' کوا ہی ہوتا ہے جو طلوع کی پہلی خبر دیتا ہے۔ ورنہ صبح کاذب سے صادق اور سحر وفجر تک
پہنچتے پہنچتے تو آدھی حیاتی بیت جائے۔ مولوی ثناءاللہ ابھی غسل کا سوچ رہے ہوتے ہیں جبکہ کالے کاگے اپنے
عارضی ٹھکانوں سے باہر اپنے حقیقی تصور پہ ہوتے ہیں۔

سانپ اور کوا' دو زخندہ اور پرندہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے ہی کسی نہ کسی طور آدم سے جُڑے رہے
اور آج بھی ہیں...... سانپ نے اپنی جبلّت کے مطابق طاغوتی اندازِ عمل اپنایا اور کوّے نے اپنا طریقہ کار
دکھایا۔ ایک دُشمن اور گھس پیٹھیا بنا' دوسرا دوست اور اَتالیق!...... کوا نوید لاتا ہے...... راہ دکھاتا ہے...... صبح دَم
سب سے پہلے مالک وخالق کی حمد وثنا' یہی بیان کرتا ہے۔

''کالا شیاہ کالا' میرا کالا اے دلدار تے گوریاں نوں دفع کرو''

ظاہری باطنی کوئی بھی سفر ہو...... یہ کالے کرماں والے میرے ساتھ ساتھ ہی رہتے ہیں اور آپس میں گفتگو' عرض و بیاں بھی کرتے ہیں۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں' گڈریئے' گلہ بان' سرکس میں جانوروں کو سدھارنے والے...... شتربان' فیل بان' مگس پالنے والے' ریچھوں بندروں' گھوڑوں' سانپوں سپوں کتوں کی تربیت کرنے والے آپس میں گہری افہام و تفہیم رکھتے ہیں۔ مزاج شناسی کے علاوہ ایک دوسرے کے اداشناس بھی ہوتے ہیں۔

"کاجل کوٹھے" میں ایک بزرگ کا ذکر ہوا ہے' جن سے انسانوں سے زیادہ کتے عقیدت و ارادت رکھتے تھے۔ اُن کی حضور میں کسی کتے کو بھونکتے اور غلاظت پھیلاتے نہیں دیکھا۔ سر اُٹھائے اور زبان لٹکائے یا ہانپتے نہیں دیکھا...... یہاں تک کسی کتے کی دُم ٹیڑھی بھی نہیں دیکھی...... سیدھی اور لٹکی ہوئی۔ ایک ایک آگے بڑھتا آتا۔ دَرِ حلیم کا لنگر لے کر سر جھکائے نکل جاتا۔"

اسی طرح کا بارش اور کتوں ایک اور واقعہ ہے کہ بارش نہیں ہو رہی تھی' اللہ کی مخلوق سخت پریشان تھی۔ انسان اور جانور مرنے لگے قحط پڑ گیا۔ انسان کو خدا بھی اس وقت یاد آتا ہے جب اور کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ تنگ پڑ کر اہل علاقہ' ایک اللہ والے بزرگ کے ہاں' بارش کی دُعا کے لئے پہنچے۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے بہت وسیع پیمانے پہ حلوا تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ جس میں دیسی گھی' اعلیٰ قسم کے مغزیات اور دیگر میٹھی چیزیں بھی شامل کرنے کی تاکید کی۔ حلوا تیار ہوا تو شہر کے ایک وسیع میدان میں کتوں کے دَلوں میں اُنہیں حلوا پیش کیا گیا'...... بھوکے کتوں نے پیٹ بھر کر حلوا کھایا۔ آسمان کی جانب تھوتھنیاں اُٹھا کے انہوں نے ہُوہُو بُوبُو کی آوازوں سے اک محشر برپا کر دیا۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ یہ فریادیں' اُسی وقت تک جاری رہیں جب تک آسمان سے چھاچھوں بارش شروع نہ ہوئی اور ہر طرف پانی ہی پانی تھا......!

بابا کُتیاں والا! اسی طرح شیراں والا بابا...... بابا سنگھاں والا' بابا بودی والا' بابا ڈھیراں والا' بابا نوری بوری والا...... چھتری والا بابا...... بابا سوا لکھ' بابا تماں والا' جیاں والا بابا' بابا بیراں والا...... ڈاہڈ بیز دیر سپاہی' پھوڑی شاہ' ننگا سائیں' سبز پیر ہرے بھرے' مستی شاہ' بابا قردا' فرشتہ سائیں' توتھیا سائیں' توکل شاہ سرکار!

میرے اندر اور باہر کے کوّے مجھے گجرات' اپنے سائیں کاواں والے سرکار کے پاس لے گئے۔

کچہری عدالت میں منصف وکیل' سرکاری کارندے' گماشتے یا پھر ملزم مجرم ہوتے ہیں...... سائیں کاواں والے سرکار کے سرکاری کارندے مجھے گھیر گھار کر پابہ جولے جاتے تھے...... وہاں کاں ہی کاں ہوتے تھے۔ بھری ہوئی کنالیاں' بھیگی ہوئی روٹیاں' پراٹھے' مکئی یا جرے کے روغنی توڑے' دیسی گھی اور شکر میں گندھی ہوئی چوریاں...... کیا کیا نعمتیں ہوتیں جو کوّے نما انسان اور انسان نما کوّے مل کر کھاتے تھے...... شاذ ہی کوئی کاں'

کے......سقراط کی طرح کسی کا پیالہ برزخ بنا تو کوئی زندہ درگور ہو کر......کوئی پور پور کٹوا کر......کوئی اُلٹی کھال اُترواکر......!

اس افغانی بچے کے رزق کا برزخ 'کوڑادان تھا جبکہ میرا برزخ مسافتیں ٹھہریں تھیں۔ آپ نے کسی دریا نہر پہ ریلوے کے آہنی پل دیکھے ہوں گے۔ بڑے بڑے فولادی پشتوں پہ تیل پیئے ہوئے بھاری مضبوط لکڑی کے شہتیر اور اُن کے اُوپر ریلوے کی پٹڑیاں جکڑی ہوتی ہیں۔ جن پہ ریل گاڑی دوڑتی ہے۔ ان پٹڑیوں کے دونوں اطراف' ریلوے کے مستریوں اور چوکیداروں کے گزرنے کا راستہ بنا ہوتا ہے۔ یہ راستہ اتنا کشادہ نہیں ہوتا کہ دو گزرنے والے ایک دوسرے کو سہولت سے کراس کر سکیں۔ ہر بیس پچیس گز کے بعد ایک قدرے کشادہ سا پلیٹ فارم بنا ہوتا ہے کہ اگر مرمت یا نگہداری کے دوران گاڑی آ جائے تو اس پلیٹ فارم پہ پہنچ کر خود کو محفوظ رکھا جا سکے۔

برزخ بھی اسی طور کا پلیٹ فارم ہوتا ہے طویل مسافت کے دوران کا پڑاؤ...... جدھر عارضی طور پہ قیام کیا جاتا ہے......

کچھ میرے جیسے الگ سے لوگ بھی ہوتے ہیں جو محض شارٹ کٹ مارنے یا تفریحاً ایسے پلوں پہ چڑھ جاتے ہیں...... اس دوران اگر کبھی گاڑی پہنچ بھی جائے تو وہ اس پلیٹ فارم پہ پناہ لے لیتے ہیں۔

میں خود زندگی کے اسی طرح کے پُل سے گزرتے ہوئے بارہا ایسے برزخی پلیٹ فارموں پہ ضرور تایا ویسے ہی تفریحاً رُکتا رہتا ہوں...... اسی طرح مجھے اندازہ ہوا کہ برزخ بہت ضروری ہوتا ہے۔ دو قدموں کے درمیان' جو غیر محسوس سا دمدمہ سا وقفہ ہوتا ہے وہ بھی تو برزخی لمحات ہی ہوتے ہیں؟

شاہجہان' بادشاہ ہو یا شاہجہان رنگریز' خلعتِ فاخرہ و تاج ہیرے پہنے ہو یا پھٹے پرانے داغدار کپڑے اور ہاتھ اُنگلیاں' جو کارِ مشقت سے فگار ہوں' سب اپنا اپنا برزخ بھوگ رہے ہوتے ہیں۔ ایران کے چاچے ہاپے یا لیبیا کے صحرانشیں درویش......کوڑا دانوں سے اپنے حصے کا رزق تلاش کرتے ہوئے افغانی بچے جوان یا بوڑھے۔ یہ سب کوئی' اپنے اپنے برزخ ہی تو ہیں؟

کتابِ لاریب' فرقان الحمید میں مالکِ لم یزل نے بڑا حکمت بھرا لہجہ استعمال کیا ہے۔ بشری افہامی استطاعت کے مدِ نظر سادہ انداز تکلم' چھوٹے چھوٹے پیرائے' آسان آسان امثال تاکہ مخلوق خاص طور پہ جن و بشر کما حقہ' مستفیض ہو سکیں۔ مالک و مخلوق کے درمیان...... حق و صداقت' معبود و عبد اور توحید و تسلیم کا کوئی دقیقہ باقی نہ رہے لیکن اسی عظیم و مقدس کتاب میں کچھ مضامین و مسائل یوں بھی ہیں کہ جن و بشر ان کا فہمی احاطہ کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ یا تو اللہ کریم اپنے کرم و فضل سے ان پہ آسان کر دیتا ہے یا پھر کوئی اللہ کا منتخب

بندہ اُن پہ روشن کر دیتا ہے۔

بڑی عرق ریزی کے بعد یہ نکتہ سمجھ آیا کہ عام اور خاص' آسان اور اَدق' اعلیٰ و اَدنیٰ' خوب و ناخوب' دُرست نادرست بھی اپنی اپنی جگہ سب دُرست ہیں۔ عرش کے بعد عرشِ معلیٰ نہ ہوتا۔ پہروں دنوں ہفتوں عشروں مہینوں سالوں برسوں صدیوں کو ایک دوسرے پہ فضیلت نہ ہوتی...... طبقات الارض' طبقات العرش' طبقات الجنت و جہنم' سزا و جزا' گناہ و ثواب اور درجات مقامات' گوڈری' گلیم...... تحت تختہ' قعر مذلت اوجِ ثریا...... یہ عزلت' بخت آوری...... سیاہ بختی' سکندری سرداری...... گم نامی و ناموری بھی کچھ باطنی معنی رکھتی ہیں۔''

مقسوم مقدر سے ماورا بھی کچھ حقائق موجود ہوتے ہیں۔ موت کا وقت اور نصیبوں کا لکھا ہُوا بھی ٹل جاتا ہے...... ہونی کو بھی چٹکیوں میں ٹہلا دیا جاتا ہے۔ اللہ کے مخصوص بندے دکھائی تو کچھ دیتے ہیں مگر بباطن کچھ اور ہوتے ہیں۔ دونوں بھی ہوتے ہیں......۔

جس سمت وہ نظریں اٹھتی ہیں<br>
کونین اُدھر ہو جاتی ہے

شروع میں ایران والے چاچا شیر علی جسے مَیں کوئی معمولی سرکاری کارندہ سمجھ کر کچھ پوچھ بیٹھا تھا' کا ذکر ہُوا ہے...... بظاہر وہ بے ضرر' بے وقوف اور بے سُدھ دکھائی دیا تھا...... مگر وہ تو اک صاحبِ حال نکلا اور آگے جس بظاہر 'مسیتی مُلاں'' سے ملوایا وہ صاحب اَمر کے منصب پہ فائز نظر آیا۔ چند روز مجھے صحبت ملی' نامعلوم طریقے سے تربیت ہوئی' خاطر مدارت...... نامعلوم منزل کے بیچ اک پڑاؤ...... چھوٹا سا برزخ' پھر کچھ نشانیاں دے کر آگے کر دیا...... بتایا اور سمجھایا بھی کچھ نہیں......؟

مقناطیس حقیقی اور طاقت والا ہو تو خود بخود کھینچ لیتا ہے لیکن اُس کی رینج میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لوہا چاہے کیسا ہی ناقص نکما اور نکھٹو ہو' مقابل مقناطیس! اُسے خود سے چمٹا ہی لیتا ہے یعنی کوئی ناقص کسی واصف سے جڑ کر آصف بن ہی جاتا ہے۔''

وقت ہوگزرا...... مجھے لیبیا کے ریگ زار کے برزخ میں پھر ایک مجذوب نے اُچک لیا تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ کوئی مجنون جاپ پڑا' بعد میں مجذوب نکل آیا...... برزخ در برزخ......!

جنون' چچک کی مانند چپ چپ کرتا چام سے چمٹ جاتا ہے جبکہ جذب تو اک جوک در جوک' جوگ ہوتا ہے' ایک سدا بہار جوت!...... جو جہانِ ذات کی تمام جہتیں جگمگا کر رکھ دیتی ہے۔ جُوئبار کی طرح رگ رگ میں روحانیت کی رطوبت اُتار دیتی ہے۔ مجنون' الف ننگا ہوتا ہے...... ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ اُس پہ کوئی حد

لا کونہیں ہوتی...... وہ کسی قاضی القضاء کا کیس نہیں ہوتا...... سید ھا سید ھا رد و متقل کی جانب ڈال دیا جاتا ہے۔
مجنوں کے پیشِ نظر حیات و ممات' محض دو مختلف لفظ ہوتے ہیں۔اُن کے معنی اور نتائج پہ غور کرنا ضروری نہیں
ہوتا۔ مجذوب میں یہ تمام کچھ معروضی اور جزوی طور پہ ہوتا ہے یعنی وہ جنوں اور جوشش کے عالمِ برزخ 'یعنی
ورغ جذب میں ہوتا ہے؟
برزخ! حقیقتِ نفس الامری کے تحت کا تعطل' دارالعمل اور یوم الحساب کا درمیانی عارضی عرصہ ہے۔
وہ وقفہ و قیام جو دو مخالف کے مابین ہو...... جیسے جنت اور دوزخ کے درمیان اعراف ہے۔''نسنان اور بندر''
انسان اور حیوان کے درمیان کی مخلوق...... ''صبح کاذب'' رات اور صبح کے بیچ کا وقفہ...... دیکھیں تو ''حیرت''
بھی چند ثانیوں کے تذبذب' تامل و تاثر کا برزخ ہی تو ہے......!

- ''کلیسا'' میرے پیچھے ہے ''کعبہ'' میرے آگے

استنبول میں نیلی مسجد کے سامنے' ہوٹل والے یہودی میاں بیوی' جنہیں مَیں اُن کی کاروبارانہ اور
یہودانہ ''خصلتوں'' کے باوجود بہت پسند کرتا تھا اور وہ دونوں میری ''اِنسانہ اور مسلمانہ'' کمزوریوں کے
باوصف مجھے سخت ناپسند کرتے تھے مگر وہ اپنی کاروباری مصلحتوں کے تحت' مجھ سے بنا کر رکھنے پہ مجبور تھے کہ ایک
تو مَیں کرائے کی مد میں بھاؤ تاؤ نہ کرتا...... دوسرے مَیں روزانہ کمرے کی صفائی' بیڈ شیٹ' تولیہ صابن طلب نہ
کرتا...... تیسرے' مَیں اپنے کمرے میں کوئی ''مہمان'' نہ ٹھہراتا تھا...... چوتھے مَیں سگریٹ اور شراب نوشی
جیسی اِبلیسی علتوں سے نفریں تھا...... پانچویں اور آخری وجہ! مَیں اس خوبصورت سحر آگیں عورت سے کسی
نوعیت کی بات چیت کے دوران اپنی بڑھاپا زدہ مگر مردانہ آنکھوں کو جھکائے رکھتا تھا کہ اُس کی جانب محض
اِک نظر دیکھ لینے سے ہی بندے کے مسلمان سے کافر اور کافر سے یہودی ہو جانے کے نوّے فیصد امکان
جگمگانے لگتے تھے۔''
اُس کے عاشق خاوند کو وہ مہمان زہر لگتے جو استقبالیے کے ڈیسک پہ کھڑے ابتدائی یا انتہائی معمول
کی گفتگو کے دوران بھونڈی کرنے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پہ وہ خود آگے بڑھ کے
معاملہ عجلت سے انجام تک پہنچا دیتا...... وہ نہ چاہتا تھا کہ کوئی اَیرا غیرا' اُس کی اکلوتی' امیر' ازرق چشم' کھری
اشرفی کی مانند کھنکتی چمکتی دمکتی بیوی کو مردانہ ندیدگی سے دیکھے...... مگر اس میں دیکھنے والوں کا کیا دوش؟ اس کا
تو پیکر ہی پارے کا پرتاپ تھا...... تھلتھلاتا' ڈھلکیں مارتا ہوا...... فینوں کے نیل سے نکل پاؤ تو گلگلوں گالوں کے

لیے آتے ہیں؟ آپ آتے نہیں بلکہ آپ کو اِدھر لایا جاتا ہے۔ استنبول میں کون آپ کو لاتا ہے اور قونیہ میں کون؟ آپ بھی جانتے ہیں اور مَیں بھی...... آپ ہمارے ہوٹل میں کچھ روز ٹھہرتے ہیں' ہم معاوضہ لیتے ہیں۔ بس! یہی والی ایک خدمت ہے جو مَیں اپنی طرف سے بلا معاوضہ کرتی ہوں۔''

کچھ لمحے خاموشی سے احترام بھری نظروں سے دیکھتی رہی...... بولی۔

''مجھے ایسا کرنے کا حکم ہے...... آپ واحد اِنسان ہیں جنہوں نے مجھے ہمیشہ ایک انسان کی حیثیت سے دیکھا...... جنس یا مذہب کی عینک سے نہیں...... دُوسرا حصہ! مَیں اپنے بابا کی اکلوتی اولاد تھی...... ماں کو شاید مَیں نے انتہائی کم سنی میں دیکھا ہوگا' کچھ یاد نہیں...... بابا نے مجھے ماں کی ممتا کی مہک بھی دی اور ایک شاندار باپ کی شفقت کی شان بھی...... مَیں نے اپنے بابا کی موجودگی میں کبھی اپنی ماں کی کمی محسوس نہیں کی تھی لیکن میرے بابا جب اللہ کے پاس چلے گئے تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میری ماں نہیں ہے...... آپ کو دیکھتی ہوں تو ماں اور باپ' دونوں کے بارے میں محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔''

معلوم ہُوا کہ کوئی ادنیٰ یا اعلیٰ' مرد یا عورت' اجنبی یا واقف کار...... کوئی بھی جب آپ سے ملتا ہے تو آپ کے پاس' اُس کی کوئی امانت اور اُس کے ہاں' آپ کے لیے کوئی پیغام یا جنھے کی کوئی چیز' جو آپ دونوں نے ایک دوسرے تک پہنچانا ہوتی ہے۔ وہ امانت' پیغام یا چیز...... کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا جاننا ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے ڈاکیے کا کام خط' لفافہ ڈلیور کرنا ہے...... لکھا کیا ہے؟ اُس کا تعلق اس سے نہیں ہوتا۔

بات کھلتی ہے کہ رُوحانیت کا تعلق مذہب و مسلک سے کہیں زیادہ باطنی صالحیت اور نیت کی شفافیت سے ہوتا ہے۔ تلوار کے آہن کا مذہب و مسکن بعد کی بات ہے' دیکھا یہ جائے کہ غزوہ میں کتنے شانوں کا بوجھ ہلکا کرتی ہے...... اگر درختوں کی شاخوں' ٹہنیوں نے شمشیر بڑاں کا کام کیا تھا تو اِس کے پیچھے رحمت العالمین صلعم کا حکم اور یہی رُوحانیت تھی جو باطن اور نیت کے نُور سے ہویدا ہوتی ہے؟

کسی غیر مسلم سے بھلائی' نیکی' بہتری بھی ظاہر ہوتی ہے یا وہ ایسے کارنامہ ہائے انجام دیتا ہے جو عین عبادت اور اللہ کی مخلوق کے لیے رحمت' برکت اور سہولت بنتے ہیں تو یہی اس کی رُوحانیت ہے۔ مالک کو ملجا و ماوا' امان کے بھی ایسے عمل کرنا جو مالک و مخلوق کے لیے پسندیدہ نہ ہوں تو یہ روحانیت نہیں......!

یہ خاتون یہودی تھی کہ مذہب مسلک تو نومولود کو پیدائشی انعام یا الزام کے طور' مفت' بلا طلب و پسند زبردستی دیا جاتا ہے۔ ہر انسان کے فطری' فکری' مزاجی' ظرفی' باطنی اور رُوحانی تقاضے رویے مختلف ہوتے ہیں۔ مذہب مسلک' نظریات' رجحانات' خیالات وغیرہ' انسان اپنے گھر' ماحول' اردگرد' سوسائٹی' دوستوں سے حاصل کرتا ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی سے پوچھا جائے تم نے سگریٹ' شراب' نشہ وغیرہ کیسے شروع کیا تو جواب

ہیں میرے پیارے پاپا نے فلسطین کی اسی قسم کے متبرک بلوط سے بنوائی تھی جس طرح کی لکڑی سے ہیکل سلیمانی کی چھتوں کے شہتیر اور دروازوں کے پرچھال بنے تھے۔ یہی بلوطی چوب مسیح ناصری کے عہد میں تختہ دار شکنجوں صلیبوں میں بھی استعمال ہوئی۔ اس مقدس نشست پہ پاپا کے بعد بیٹھنے کا اعزاز صرف آپ ہی کو حاصل ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ عالم برزخ میں بہشت مقدس کی جانب کھلنے والے دریچے میں کھڑے آپ کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔؟

میری روح خلاؤں میں گھوم رہی تھی۔ جیسے وہ واقعی اپنے گریٹ پاپا کو عالم برزخ کے بہشت کی جانب کھلنے والے دریچے سے ادھر استنبول میں اس شاندار ہوٹل کی چوتھی منزل کی چھت کی جانب 'ایک نیم مسلمان درویش' کو مسکراتی دیکھ رہی ہے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتے ہی ایک گونا گوں مسرت کا احساس ہوا کہ ایک کٹر یہودی' اک بے نوا مسلمان کو اپنی مقدس کرسی پہ متمکن دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔ گو روز ازل سے آج موجود تک کی یہودی تاریخ' اس امر حقیقت کی نفی کرتی رہی ہے کہ کوئی یہودی یا مسلمان' ایک دوسرے کی کسی حرکت میں خیر و برکت تلاش کر سکے ہوں؟۔ ان کے آپس میں اختلافات کی بنا ہمارے بزرگ پیغمبروں' رسولوں نبیوں کے مختلف ادوار سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ جبکہ یہ بھی ایک مکمل دین' کتاب' رسول اور توحید پہ ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ کریم نے انہیں بے پناہ انعامات و اعزازات' علوم و فنون' مال و دولت اور کامیابیوں سے ہمکنار کیا مگر شاید انہیں یہ سب کچھ ہضم نہ ہو سکا۔ ان میں تفاخر و تملق اور زعم پیدا ہو گیا۔ سیاست' ریاست' نیابت اور قیادت کے شغل و شوق میں شرانگیزیاں شروع ہو گئیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔''

فطرت و قدرت کے انعام اور تعزیریں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ آگ میں گلزار اور گلستان' گورستانوں میں کب تبدیل ہوں گے؟ بت تراش کے گھر' اللہ کی توحید بیان کرنے والا اور نبی کے ہاں گمراہوں کا ساتھ دینے والا کب جنم لے گا؟ نومولود بچہ کب اپنے پیدا کرنے والے کی بدحالی' اپنی ماں کی بے گناہی کی شہادت اور اپنے رسول ہونے کی بشارت دے گا اور کب کون اپنے پیغمبر باپ کا دست ہدایت جھٹک کر سیل ذلت میں ڈوب مرتا ہے؟ کچھ اللہ کے ہاتھ سے کھا کر بھی بدبختی کا شکار ہو جاتے ہیں اور کوئی جھوٹے خدا کے گھر میں پرورش پا کر سچے خدا کی عبادت اور اس کے دین متین کی بات کرتے ہیں؟

میرے ساتھ شروع سے ہی یہ سب کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مجھے ایسی ایسی جگہوں اور لوگوں سے خیر و سلامتی ملی اور وہ ملی کہ تعجب ہوتا ہے ان کے تو خمیر ضمیر میں ہی یہ کچھ نہیں ہوتا۔

## دم تو ذرا لینے دے.....!

میں ہمیشہ کی طرح ایک سفر میں تھا ... انسانی آبادیوں کی تہذیب و تمدن سے بہت پرے بھی کچھ زندگی ہوتی ہے۔ ایسی زندگی کہ تعجب گزرتا ہے کہ یہ انسان کس طور طریقے سے ہیں ... جو وہ حرکات و انداز اپنا کر تہذیب یافتہ باعلم و باشعور معاشرہ میں جس کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا؟ ... ہم کئی لطیف سائنسی اصولوں سے تیار اور پیک کیا ہوا معیاری و اعلیٰ غذا کھا کر بیمار ہو جاتے ہیں اور یہ لوگ گندے ڈھابے کے کھانے، کیڑے اور دیگر غلاظت سے سڑے ہوئے جراثیم زدہ پانی ساری عمر پیتے رہتے ہیں اور کبھی بیمار نہیں ہوتے۔ صاف ستھرے جراثیم سے پاک صفائی آلودگی سے محفوظ مضر اثرات نہ تو ہمیں صحت بخش غذائیت و افادیت فراہم کرتے ہیں اور نہ ہماری جسمانی مطلوبہ توانائی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں مگر کیا کہیے کہ موجودہ تہذیب یافتہ دنیا کی ایک چوتھائی آبادی آج بھی کیڑے مکوڑے، چھپکلی سانپ، کتے بلیاں، مینڈک، چوہے اور دیگر حشرات الارض بنا پکائے اور صاف کیے بغیر، بے چبائے کھا جاتے ہیں اور کبھی پیٹ پکڑ کر ڈاکٹر کے ہاں نہیں جاتے بلکہ صحت مندانہ اور طویل زندگی جیتے ہیں۔ [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] تندرستی [illegible] وغیرہ ان کی تحقیق کے مطابق انسانی قوت بخش شباب آور اور حقیقی غذائیں ہیں جن کا نعم البدل اور کوئی طعام نہیں ہو سکتا۔ حیوانیات و نباتات غذائیات کے ماہرین بھی ان کے نظریے کے حامی نظر آتے ہیں۔

ہندوؤں کے بعض فرقے ایسے ہیں جن کے چوہوں، سانپوں، بندروں اور دیگر جانوروں کے مندر اور آشرم ہیں ... ادھر انسان اور حیوان پاکی پلیدی، حرام حلال، کراہت و رغبت وغیرہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ان کی بو بھی ہوتی ہے اور میل بھی ... ؟ ادھر مندروں آشرموں میں کہیں کسی سانپ نے چوہے بندر کو انسان کو کاٹتے یا ضرر پہنچاتے نہیں دیکھا۔ ننھے ننھے بچے، مرد، عورتیں انہیں گلے گود میں اٹھا کر دودھ مٹھائیاں کھلاتے پلاتے ہیں

ثابت ہوا کہ ایمان، یقین اور اعتقاد میں بڑی طاقت ہوتی ہے ... خیال اور سوچ بڑے [illegible] کی کے حامل ہوتے ہیں جو بعد رویے اچھے ہوں یا برے ... ہر طرح کی مخلوق خصوصاً حیوان ناطق اور حیوان غیر ناطق پہ یکساں طور پہ اثرانداز ہوتے ہیں۔"

انسان پہلے خیال لاتا ہے پھر سوچتا ہے اس کے بعد ارادہ ... پھر اس نظریہ قائم کرتا ہے۔ اس کے بعد یقین اور ایمان جوڑتا ہے اور پھر عمل پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی اکثر سوچیں، خیالات، اعتقادات، نظریات اور

کھاتا ہے مگر وہ مطمئن نہیں ہوتا' محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ مزید کھانا چاہیے یا اس سے بہتر کھانا ہونا چاہیے۔ رات بھر لمبی تان کر سونے کے بعد بھی طبیعت ہشاش نہیں ہوتی' جمائیاں اور اکسی سے جسم ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ پوری نمازیں' نوافل تلاوت کے بعد بھی احساس رہتا ہے کہ حضوری نصیب نہیں ہوئی۔ رزق حلال کمانے کھانے کے بعد بھی اک عجیب سی بے کلی طاری رہتی ہے۔ جب سے پاؤں نے چلنا سیکھا انہیں رُکنا نصیب نہ ہُوا...... لیکن یوں لگتا ہے یہ سب کچھ رائیگاں ٹھہرا' باطنی تسلی و رُوحانی تشفی کا ثمر ابھی کہیں اوجھل ہے؟

اپنے تئیں سمجھتا ہوں کہ میں بہت اچھا باورچی ہوں...... کسی حد تک یہ دُرست بھی ہے۔ دیگر بہت سے ہنر وفنون کی مانند یہ کھانے پکانے کا فن بھی مجھے ودیعت ہُوا...... دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ' اس فن میں مزید تجربات بھی چلتے رہتے ہیں۔ بڑے رازق کا کرم ہے وہ مجھے اچھا لنگر تیار کرنے' تقسیم کرنے اور کھانے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ ہمیشہ میری کوشش رہتی ہے کہ خود اپنے ہاتھوں سے لنگر کا اہتمام کروں۔''

لنگر والی بات پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ یہ ایک نشے اور چسکے کی مانند ہے جسے یہ چینک لگ جائے وہ زندگی کے آخری دموں تک اس کے حصار سے نکل نہیں سکتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اس کے لنگر جاری رہتے ہیں......''

## ● لنگر کرے تو نگر......!

ہانگ کانگ میں اپنے بچوں کے ہاں مقیم تھا...... یہ میرے بچے اور دوست خاصے آسودہ حال کاروباری لوگ ہیں۔ یہاں کے سماجی کاروباری اور معاشرتی حلقوں میں بھی اُن کا ایک نمایاں مقام ہے۔ ایک خوش آئند بات یہ کہ تمام احباب' دیندار اور رفاہی سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے۔ یہاں کہ ایک صاحب جن کا قالینوں اور ہینڈی کرافٹ کا کاروبار' ہانگ کانگ کے علاوہ' پیرس' لندن اور نیویارک تک پھیلا ہُوا ہے' میرے پاس پہنچے اور علیحدگی میں کچھ بات کرنے کا وقت مانگا۔ میں ایسے لوگوں کو خوب جانتا ہوں کہ وہ علیحدگی میں کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ ظاہر ہے اُن کی کچھ ذاتی' کاروباری پریشانیاں' جادو تعویذوں کے سیاپے' اولاد کے رشتوں کی رکاوٹیں' نافرمانیاں وغیرہ وغیرہ...... شاذ ہی کوئی علیحدگی میں بات کرنے کا خواہشمند ایسا بھی ہو' اس مادیت سے ہٹ کر کچھ عاقبت' دین' تصوف یا انسانیت حقانیت پہ کچھ مجھے بتانا سمجھانا چاہتا ہو یا مجھ سے کچھ اِن موضوعات پہ بات چیت کا متمنی ہو......؟

مَیں ایسے لوگوں کا چہرہ مہرہ دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کرتا ہوں اور اُن سے معذرت کر لیتا ہوں کہ مجھے کسی سے تنہائی میں بات چیت کی مناہی ہے۔ ویسے بھی مَیں سمجھتا ہوں کہ اس دُنیا اور کارزارِ حیات کے گرم حمام میں ہم سب ننگے ہیں...... ہمارے آپس کے مسائل ایک سے ہی ہیں۔ ایک آدھ نمبر کی بیشی سے ہم تمام المیہ گیت گنگناتے رہتے ہیں' ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ کوئی باہر سے رو لیتا ہے اور کوئی اندر ہی اندر کینسر کا کیس بن جاتا ہے...... زیادہ تر ہم عملِ مکافات کا شکار ہو کر مرگِ مفاجات تک پہنچتے ہیں۔ اس معاملہ میں ہم تقدیر و تدبیر اور قضاء و قدر کو بھی ذرا کم ہی خاطر میں لاتے ہیں...... ہر لمحہ شکوہ بلب رہنا ہمارا وطیرہ بن چکا ہے۔ اپنی قسمت کا رونا روتے رہتے ہیں۔"

ہم پستہ باداموں والا اُودیسی گھی سے بھیگا ہوا زعفرانی حلوہ کھانا پسند کرتے ہیں۔ ہم رس ملائی برفی قلاقند' امرتیاں' چاکلیٹ آئس کریم جی بھر کے کھاتے ہیں لیکن قدرت نے ایسے ماکولات کے مضرات کو زائل کرنے کی خاطر ایسی غذائیں بھی پیدا فرمائیں جو یقیناً تلخ کسیلی کڑوی بدذائقہ ہوتی ہیں۔ ایسی کہ ہم ناک بھوں چڑھا لیتے ہیں لیکن یہی جو نام و نمود سے بھی عجیب و غریب' علیحدہ ہی مگر صحت بخش اور حیات آور ہوتی ہیں اور میٹھے زہر کا تریاق ہیں۔ لذت سے بھری شیریں اشیاء کے نام شکلیں ذائقے بڑے دلفریب' بھلے اور من بھاونے ہوتے ہیں مگر اثرات اتنے ہی بھیانک۔" جاپان کی کہاوت ہے کہ اگر انسان ایک حد سے زیادہ میٹھا کھانا اور ٹھنڈا پانی پینا ترک کر دے تو صحت مندی کے علاوہ طویل عمر بھی جی سکتا ہے۔ لگتی تو یہ بات عجیب سی ہے مگر ہے حقیقت......!

ذرا شیریں اشیاء کے "اسمِ گرامی" ملاحظہ ہوں...... لب شیریں' رس گلہ' گلاب جامن' رس ملائی' امرتی' برفی' قلاقند' میسو پتیسہ' جلیبی' سوہن حلوہ' موتی چور' قلفہ' آئس کریم وغیرہ اب ذرا وہ نعمتیں سنیں جنہیں اللہ کریم نے ان کے رَدّ کے لیے تخلیق فرمایا۔

نیم' کریلے' چاکسو' صبر' چینگ' ہلدی' چرائتہ' کالی پیلی سرسوں' تارامیرا' کچنار' بھنگ' کوار گندل' دھتورا' جھکڑا' سوہانا' باتھو' میتھی' مونگرے' سہجنا' کرم کلہ' چھتر' تھوڑ' دیسی آک' ہندوانہ وغیرہ وغیرہ......

میٹھی اور کڑوی اشیاء کے میٹھے اور کڑوے نام اور کام آپ کے لیے نئے نہیں...... اُن کے معائب اور محاسن سے آپ بھی کچھ نہ کچھ واقف ہوں گے اب صرف اب یاد دہانی کرائی ہے کہ میٹھا اور ٹھنڈا نقصان دہ ہو سکتا ہے جبکہ کڑوا اور گرم بہتر رہتا ہے..."

بات آگے لنگر کے فیوض و برکات اور ہانگ کا تمغہ والے اس بھلے شخص سے بڑھی تھی جو مجھ سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ ایسی ملاقات کے لیے مَیں انکار کر دیا کرتا ہوں کہ تخلیہ' ماسوا دو چار نصورتوں کے میرے

نزدیک مباح نہیں۔ میں اسے بادشاہوں اور مصلحت کوش امراء کا طریق سمجھتا ہوں۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ میرے منہ سے "ہاں" نکل گئی۔ میں نے اسے شام کو پندرہ تیس منٹ کی مختصر ملاقات کا اذن دے دیا بعد میں سوچنے لگا کہ یہ انہونی کیسی ہو گئی۔ جبکہ میں نے یہ تک نہ پوچھا کہ مختصر ملاقات کس ضمن میں چاہیے۔ آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والی "ہاں" ہو چکی تھی۔ بس اپنے کمرے کے ہشت گوشہ دریچہ میں کھڑا تھا۔ سامنے سمندر اور بہت زرد لہو رنگ ڈوبتا ہوا سورج۔۔۔!

یہ پانسو پانچ نمبر کمرہ اس ہوٹل کے چہرے پر محراب کی مانند تھا۔ اس ہوٹل کے صرف اسی مخصوص کمرے میں ہی ایک ہشت گوشہ دریچہ تھا جس کے پانچوں دروں میں رنگین لہوری سے مزین تھے جو سامنے ڈوبتے سورج کی اداس کرنوں سے منعکس ہو کر انہیں مزید پریشان کر دیتے تھے۔ آج بھی میں اسی وقتِ ماتم میں اچھوتے دریچے کے روبرو اک عجیب سی کیفیت میں خالی الذہن سا کبھی سامنے سمندر اور کبھی نیچے دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں یہ تو موجود تھا کہ آج میں نے قربان صاحب قاتلوں والوں سے ملنا ہے مگر ملاقات کا وقت میرے ذہن سے نکل چکا تھا۔

سو میری نظر سامنے نیچے کار پارک میں ایک انوکھی سی مرسیڈیز کار پر پڑی جو پارکنگ ایریا میں پارک ہو رہی تھی۔ شام کے جھٹپٹے اور ہوٹل کی جلتی بجھتی روشنیوں میں وہ کار آکاش سے اترا ہوا کوئی اڑن کھٹولا دکھائی دیتی تھی۔ مرسیڈیز کاریں بہت دیکھیں۔۔۔ ایک سے ایک بڑھ کر مگر اس عنابی رنگ کی جھل جھلی سپورٹس کار میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی۔ اس کی چھت اور آگے پیچھے کے حصوں پر عجیب و غریب کسی نامعلوم سی زبان کے حروف و نقوش کھنچے تھے جیسے کوئی افلاکی تجسیم کا نقشہ ہو۔ کسی قندیل مشین کی طرح نقرئی سی شعاعیں ابھارتی تھیں اور جو رنگ اس میں سے پھوٹ رہے تھے وہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ لگتا تھا یہ آج سے پچاس برس بعد کی کوئی گاڑی ہے۔۔۔!

اسی تحیر کی دیکھا دیکھی میں دیکھا کہ گاڑی کے دروازے یوں کھلے جیسے کسی تتلی جس نے اپنے پروں کو ہلکا سا پھیلا کر پھر سمیٹ لیا ہو۔ ایک طرف سے قربان صاحب اترے اور دوسری جانب سے اترنے والا یقیناً ان کا بیٹا تھا کہ قد و کاٹھ چال ڈھال، خدوخال سب باپ بیٹے والے تھے۔ دونوں ہوٹل کے صدر دروازے کی جانب بڑھ آئے۔ ہوٹل کی کرشل جیسی تیز رفتار لفٹ جس میں نیچے اوپر پہنچنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مگر ان کے میرے کمرے تک پہنچنے سے پہلے قربان صاحب کا مجھ سے تنہائی میں ملنے کا مقصد اور اس نوجوان کی پوری ذہنی کیفیت میرے پاس پہنچ چکی تھی کیونکہ اب محض ان کا پیکر میرے کمرے میں پہنچنے والا تھا۔"

زرنگ نا تمنی کی تنگ تنگ کا مطلب تھا کہ تیرے دوار کوئی جوگی روگی یا بھوگی کھڑا ہے۔" کیسی انوکھی

بات ہے پکھوانو کے لوگ ایسے بھی جو پاؤں کی چاپ' سانسوں کی سَمار...... دروازے پہ دستک...... نظروں کی نیت' سائے کی سیدھ' موسم کا مشاہدہ' حشرات الارض کی حرکتیں' پرندوں چرندوں درندوں کی دراندازیوں...... ہوائی بیولوں کی ہیت کذائیاں...... جنات کے جل جلوس...... جمادات نباتات اور معدنیات کے مُغلّی خیز مزاج و معمولات سمجھنے جاننے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں...... یہ صلاحیت و دیعتی بھی ہوتی ہیں اور آمدی اور آوردی بھی......!

بعض لوگوں کی ظاہری باطنی حسیات' مشاہدہ' قیاس و قیافہ ایسے مربوط و محاذی ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے...... چشم زدن میں وہ معاملہ و معائنہ کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔"

میں ایک بہت کامیاب شخصیت سے واقف ہوں' اُس کے ہاں ایک عجیب و غریب سا شخص مشیر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ دن بھر کاروباری لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ وہ بظاہر ایک چوکیدار کی طرح' کمرے کے باہر بیٹھا رہتا۔ معمولی لباس' سادہ سی شکل و صورت والا یہ دیہاتی بندہ' اندر سے بڑے گُنوں والا تھا۔ ایسے نابغہ روزگار لاکھوں میں کہیں ایک آدھ ہی ہوتا ہے۔ وہ انسان کو اُس کی چال اور سائے سے جانچ لیا کرتا۔ اُس کے سامنے آتا جاتا گزرتا ہوا بندہ ننگا ہو جاتا تھا' وہ اُس کی خصلت اصلیت' کاروباری حیثیت و ذہنیت کی پوری رپورٹ' مالک کو پہنچا دیتا۔ مالک اُس کے تجزیے کی روشنی میں اپنے کاروباری فیصلے کرتا اور ہمیشہ فائدہ میں رہتا۔ کیونکہ اِس شخص کا تجزیہ سو فیصد درست ثابت ہوتا تھا۔ ایسی یگانہ صفات ہستیاں قسمت سے ہی کہیں ملتی ہیں کیونکہ صدیوں ان کی پرورش ہوتی ہے۔ یہ وقت کے بیٹے ہوتے ہیں' یہی ہوتے ہیں جن سے جن اور مردان ارض و افلاک مستفیض ہوتے ہیں۔"

بیٹا آگے اور باپ پیچھے' بیٹے کے ہاتھ میں سُلگتا ہوا برازیلین سبز سگار تھا۔ جس کی مہک' دروازہ کھولنے سے پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکی تھی...... تمباکو کی تیز بُو سے میری جان مالش کرنے لگتی ہے مگر ان سبز خوش رنگ و مہک سگاروں سے میری خوب بنتی ہے مگر صرف دیکھنے' محسوس کرنے اور سونگھنے کی حد تک۔ برازیل کے گھنے جنگلات کا پُراسراری خوشبو والا' شاہ بلوط کا ہینڈ میڈ ڈبا' جس میں یہ سگار' کسی شان اور وقار سے آسودہ ہوتے ہیں' دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز ہے۔"

کئی برس پہلے مجھے میرے ایک بچے نے ایسا ڈبا گفٹ کیا۔ جھجکتے جھجکتے کہنے لگا۔

"بابا جی! مجھے علم ہے کہ تمباکو کی بُو سے آپ الرجک ہیں...... مگر مجھے یہ بھی یقین ہے اس ڈبے' اس کے اندر سگاروں اور ان کی اک علیحدہ سی انوکھی مہک' آپ کو بھلی لگے گی۔ آپ نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ پہاڑوں کی ڈھلوانوں' جن کے پاؤں سمندر کے کناروں سے جڑے ہوئے ہوں' ادھر پیدا ہونے والے

بول لو یا شتر مرغ کو مولے کا نام دے دو' کچھ نہیں ہوتا...... یعنی نام محض ایک شناختی کوڈ ہے' بس!

شیکسپیئر نے کہا تھا' گلاب کو کوئی بھی نام دے لو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔ مَیں سا ٹھ فیصد اس سے متفق ہوں...... گلاب کو جب ہم گلاب کہتے ہیں تو ایک تر و تازہ خوش رنگ' حیات آور خوشبو سے مہکتا ہوا گلابی پھول ہمارے سامنے مسکرانے لگتا ہے۔ گلاب کو اگر ہم گلاب کی بجائے گیندا یا گوگل کہتے ہیں تو یقیناً گلاب کی جملہ خوبیاں خوبصورتیاں خوشبوئیں' ہمارے تصور میں نہیں اُبھریں گی۔ اسی طرح ہم بھیڑ کو بھیڑیا' آب کو آتش' مہ کو مہر' زبر کو زیر' محبت کو منافقت' زبرجد کو زجاج' سفید کو سیاہ' درویش کو دریوزہ گر' گھوڑے کو گدھا اور امریکہ کو افریقہ کہنا اگر چاہیں تو کہہ سکتے ہیں مگر وہ بات پیدا نہ ہو گی جو بات' جملہ صفات' کوائف وقدر اور صوتی اجمال وجلالت کی ہم آہنگی سے پیدا ہو کر ہماری سماعت اور سمجھ کے پردوں پہ مجسّم ہوتی ہے۔ پانی کو اگر ہم پانی کہتے ہیں تو اس کے چار حروف ہمیں پانی کا حرکت میں رہنا' اس کی نزاکت ولطافت' شفافیت افادیت اور ٹھنڈک وتازگی کا تصور عطا کرتے ہیں۔ جبکہ آتش ان سب صفات واحساسات سے ہٹ کر اپنا ایک گرما گرم تصور سامنے لاتی ہے۔''

بات جمشید کی تھی کہ اس کی آفتِ روزگار اور ''تا ختہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے'' قسم کی شخصیت میں اس کے نام کا بھی بے حد دخل وعمل تھا۔ سکندر' اکبر' قیصر' فخر' پرویز' مظہر' مشرف' آصف' سلطان' معظم' شکیل' ارجمند' اعظم' حاکم' ناظم' جہانگیر' ذوالفقار' تاجدار' شعیب' شاہد' شاہجہان' شوکت' ذیشان' شہریار' شہباز' جمشید...... یہ نام عام ناموں کے برعکس کچھ علیحدہ سے اثرات وخیالات والے' سر اُٹھا کر دیکھنے کے عادی تحکمانہ مزاج و انداز کے مالک' اپنی بات منوانے والے اور متحکمانہ' شاہانہ سوچ وفکر کے خوگر ہوتے ہیں۔ ان کی بھی آگے دو قسمیں ہیں' ایک مثبت رویوں کے روادار اور دوسری غیر متوازن مساعد ومستقر والی۔''

حرف ''ش'' کی شروع میں شمولیت والے اِسم اکثر شہامت والے' شوخ' شوریدہ' شاہانہ' آتش مزاج...... درمیان میں ''ش'' شامل ہو تو شیخی' سخ' شماتت پسند' تشکیل وتمیل' شگی وشاکی اور اگر آخر میں ہو تو اکثر شارب' شاہد باز' شرمیلے مگر شاطر!...... اوّل وآخر ''ش'' ہو تو بلا کے رجعت پسند' فطین خطیب' نڈر' بے باک' مسخر کر دینے والے ہوتے ہیں۔''

علم الاعداد' علم جفر...... اعمال تقطیع وتنجیم' تناسب وتناسخ میں ''الف لام میم'' بڑی اہمیت اکرام و برکات کے حامل ہیں۔ قرآن الحمید کی ابتداء میں یہی حروف ہیں۔ جن کے معنی اللہ کریم' اُس کے رسول اور مولا علی کے علاوہ شاید کوئی اور نہیں جانتا...... مَیں ''الف لام میم'' کو ''تیری رضا میری تسلیم'' کی اضافت سے پڑھتا رہتا ہوں اور بے پناہ برکت اور خیر خوبی پاتا ہوں......''

پیشِ نظر کتاب ہمارے وائس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

**میر ظہیر عباس روستمانی**

03072128068

حرف ''ش'' بھی ایک خاص اہمیت کا حرف ہے۔ اسی طرح حرف ''پ'' بھی جو عربی زبان میں مستعمل نہیں لیکن عربی نکتہ وراور ماہرینِ لسان وابجد اور عالمانِ تقطیع وتنجیم اِس سے خوب واقف ہیں۔

جمشید ملک کو ایسے ہی ہونا چاہیے تھا جیسے وہ ہے۔ عطر کی شیشی ہو یا مٹی کے تیل کی کپی' باہر وہی نکلے گا جو اُس کے اندر ہوگا۔ اچانک اُس نے اپنے لانگ کوٹ کی جیب سے سموکنگ کٹ نکالی' کھولی اور اس کے اندر سے ٹریولنگ ایش ٹرے نکال کر اپنے سامنے ٹیبل پہ رکھ دی۔ مَیں نے اِس موقع پہ اس کے والد صاحب کی جانب انکھیوں سے دیکھا۔ وہ بیچارہ بُری طرح کٹ رہا تھا۔ ظاہر ہے اُسے اپنے اکلوتے لختِ جگر کی یہ ناپسندیدہ حرکتیں بُری طرح زچ کر رہی تھیں۔!

شادی کے بعد اولاد نہ ہو یا بیٹیاں ہی پیدا ہو رہی ہوں تو والدین کیا نہیں کرتے۔ حکیم' ڈاکٹر' وید' پیر فقیر' تعویذ گنڈے' ٹونے ٹوٹکے کیا کچھ نہیں ہوتا کہ کسی طرح اللہ اولادِ نرینہ عطا کر دے...... اُمید بھر آئے تو پھر کیا کچھ نہیں ہوتا۔ مٹھائیاں' خوشیاں' جشن' دعوتیں' مبارک سلامت' بندہ خود کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔ ناز و نعم میں پرورش ہوتی ہے۔ بچّے کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں نغمۂ یں پُوری کی جاتی ہیں...... اِک لمبا عرصہ بچّے کو جوان' تعلیم یافتہ اور ایک اچھا انسان بنانے میں گزر جاتا ہے۔ اِتنے میں ماں باپ بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں وقت زمانہ بہت سی منزلیں مار کر آگے بڑھ چکا ہوتا ہے۔ اب وقت کی طنابیں' تعلیم' تہذیب یافتہ نوجوان کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ہر حرکت' بات کو وقت کے مطابق دُرست سمجھتا ہے اور اپنی ہی کرتا ہے۔ وہی والدین جنہوں نے ماتھے رگڑ رگڑ کر خدا سے مانگا ہوتا' اب وہی اُس کی نظر میں پرانے وقتوں کے کھوٹے سِکّے پُرانی سوچوں' قدروں کے لوگ' اَن پڑھ جاہل ہو جاتے ہیں۔ پھر مجبور بوڑھے والدین' اولاد اور وقت کے تقاضے کے آگے اپنا سر جھکا کر' مسجد کے موذن کے اعلان کا انتظار کرتے ہیں...... ''حضرات! ایک ضروری اعلان سنیئے' حاجی ملک قربان صاحب' ہانگ کانگ والے آج صبح قضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے ہیں۔ اُن کی نماز جنازہ نمازِ ظہر کے فوری بعد حنفیہ مسجد نکاس والی میں ادا کی جائے گی۔ حضرات! ایک ضروری اعلان......!''

عمر اور حالات کے حساب سے ملک قربان صاحب ابھی ایسے اعلان کے اہل نہیں ہوئے تھے مگر ان کے فرزندِ ارجمند کے وطیروں سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔ یہ کاروباری لوگ' جو حاجی نمازی اور اپنے کاروباری حلقوں کے سرکردہ...... محلّے علاقے کی مسجدوں رفاہی تنظیموں کے صدر سیکریٹری بھی ہوں...... دولت شہرت عزت کی فراوانی سے اُنہیں حیاتِ جاودانی ملتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی اولاد اکثر اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتی ہے۔ والدین کی چشم پوشی انہیں عیّاش' بدمعاش اور بدکار و بیکار کر کے رکھ دیتی ہے اور پھر بالآخر وہی مسجد والا اعلان' حضرات......؟

اب باباوابا تو جیسے کہیں غائب ہو گیا تھا...... ملک صاحب بھونچکے سے ہم دونوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھ رہے تھے۔ انہیں امید نہیں بلکہ یقین تھا کہ میں تھان سے اکھڑے اس ابلق گھوڑے کو راس ڈال کر اس کے حوالے کر دوں گا۔ مگر اس کی یہ ساری خوش فہمی سخت مایوسی اور حیرانی میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہ نصیحت فضیحت بلکہ الٹا میں اس کا ہم نوا وہم ادا بن کر اس کا ساتھ دے رہا ہوں......؟

ملک صاحب کی اندرونی بیرونی ساری کیفیات میرے روبرو تھیں...... ہلکے سے چائے پانی کے بعد میں نے ملک صاحب سے درخواست کی۔

''آپ کی نماز کا وقت ہے۔ آپ جمشید صاحب کو میرے پاس چھوڑ جائیں۔ مجھے ان کی گاڑی بہت بھلی لگی ہے، میں چاہوں گا کہ کچھ دیر ان کے ساتھ ہانگ کانگ کی سیر کروں...... میں بھی دیکھوں کہ اس گاڑی میں کون سی خوبیاں ہیں جو اس کی قیمت میں پاکستان میں سات عدد گاڑیاں خریدی جا سکتی ہیں؟''

ملک صاحب کو منہ کھولے حیرانی سے میری جانب دیکھنا چاہئے تھا، سو وہ دیکھ رہے تھے۔ بمشکل بولے۔

''مگر باباجی! اس کی گاڑی میں اس کے ٹمی ملک کے علاوہ کوئی اور بیٹھ ہی نہیں سکتا۔''

''ٹمی ملک کون...... اس کی گرل فرینڈ یا بیوی......؟'' میں نے پوچھ لیا۔

جواب جمشید نے دیا۔

''میرا ڈاگی ہے...... واقعی اس گاڑی میں اس کے علاوہ کبھی کوئی میرے ساتھ نہیں بیٹھا۔''

''ٹھیک ہے یہ تو بڑی اچھی بات ہے مجھے بہت پسند آئی...... میں اس کے ڈاگی کو اپنی گود میں بٹھالوں گا۔ مجھے ڈاگی بہت پسند ہیں۔''

ملک صاحب کے منہ سے بدقت نکلا۔

''باباجی! اس کی گاڑی ٹوسیٹر سپورٹس ہے...... یہ اپنے ساتھ والی سیٹ پہ ٹمی کو بٹھاتا ہے۔''

''کیا آپ اس کے ساتھ گاڑی میں نہیں آئے......؟''

''میں تو اپنی گاڑی پہ اس کے ساتھ آیا ہوں۔ اس کے ساتھ اس کا کتا ہی بیٹھ سکتا ہے، بندہ نہیں۔''

''ڈیڈی! پلیز...... کتا نہ کہیں، ٹمی ملک کہیں۔''

میں نے شرارتاً باپ بیٹے کے درمیان کی گفتگو کو کوئی نیا رخ دینے کی غرض سے چھیڑ چلاتے ہوئے کہا۔

''بات تو وہی شیکسپیئر والی ہوئی کہ کتے کو کچھ بھی کہہ لو...... کتا، کتا ہے ٹمی ملک نہیں۔ یہ تو محض آپ کے ڈلار اور پیار کی اضافت اور شرافت کا استعارہ ہے۔''

ملک قربان صاحب قدرے جھنجھلا کر بولے۔

"بابا جی! آپ اس کے ساتھ جانا ہی چاہتے ہیں تو میری گاڑی لے جائیں..... ڈرائیور آپ کے ساتھ ہوگا۔"

"ملک جی! آپ کی گاڑی' اک عام گاڑی ہے جو لاکھوں کی تعداد میں ہانگ کانگ میں دکھائی دیتی ہیں۔ جمشید ملک کی گاڑی جیسی شاید کوئی اور بھی ہو' مگر ایسی کرامات اور تصرفات والی گاڑی' شرطیہ کوئی دوسری اور نہیں ہوگی..... ہوگی بھی تو وہ گاڑی' جمشید ملک اور نمی ملک کہاں سے پیدا کرے گی۔"

یقیناً ملک قربان صاحب دل میں سوچ رہے ہوں گے' مَیں تو اِدھر نماز بخشوانے پہنچا تھا مگر یہاں تو روزے بھی گلے پڑ گئے۔ اچھا ہُوا کہ ہم دونوں پاگلوں سے جان چھڑا کر نکل گئے۔

باپ کے رُخصت ہوتے ہی اُس نے سامنے کی کرسی گھسیٹی' اپنی لمبی لمبی ٹانگیں دراز کرتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے وِسکی فلاسک نکالا..... دو لمبے لمبے گھونٹ لے کر بولا۔

"بابا جی! آپ نے تو وِسکی بہت پی ہوگی؟"

"یس.....!"

مَیں نے اُس کا سوال ختم ہونے سے چند ثانیے پیشتر ہی جواب کا گیند اُس کے کورٹ میں پھینک دیا تھا۔ انگریزی زبان میں "یس" اور "نو" دونوں دو حرفی لفظ (اردو میں) سب سے زیادہ آسان اور بیساختہ سے ہیں۔ انہیں استعمال کرنے کے لیے نہ تو ٹائمنگ کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور نہ انگریزی کی سی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس! ذرا عقل کا استعمال ضروری ہے ورنہ لینے کے دینے اور دینے کے لینے پڑ سکتے ہیں۔

"بابا جی! مجھے پتا ہے آپ نے زیادہ عمر یورپ میں گزاری ہے اور دُنیا بھر میں گھومتے رہتے ہیں۔ آپ کے پاس بہت علم اور زندگی کا تجربہ ہے..... آپ کتابیں لکھتے ہیں..... مَیں چونکہ اُردو نہیں پڑھ سکتا اس لیے آپ کی کتابیں نہیں پڑھ سکا..... لیکن ٹیلیویژن پہ آپ کو بہت دیکھا سُنا۔ مَیں آپ کو اس لیے بھی پسند کرتا ہوں کہ آپ رَوایتی مولوی کی طرح رَوایت اور شدّت پسند نہیں۔" سگار کا منہ سرخ کرتے ہوئے مزید پوچھنے لگا۔ "آپ کو یہ سگار بہت پسند ہیں' اس کی مہک' دُھواں' اس کا باکس' اس کی لکڑی کی خوشبو!..... کیا آپ کا بھی پسندیدہ سگار یہی ہے؟"

"یس! میرا فیورٹ سگار اور اَروما بھی یہی ہے۔ حیران ہوں کہ آپ کے مزاج' پسند' خیالات اور سوچ وفکر سے مَیں کس قدر قریب ہوں۔ جمشید صاحب! یقین کریں کہ مَیں آپ سے مل کر بے حد خوش ہُوا ہوں۔ کبھی کوئی انسان ایسا بھی مل جاتا ہے جو نہ جانے کیوں پیارا اور اپنا سا لگتا ہے۔ کہیں اندر سے آواز ہ لگتا ہے' یہی ہے وہ جس کی تلاش تھی۔"

انسان بھی کیا انوکھا متوالا سا جانور ہے' اس کی پسند' ناپسند کے معیارات بھی نہ سمجھ میں آنے والے ہوتے ہیں...... جھنگی گنجی بیگمن سڑی بھٹیارن کو دل کے سنگھاسن پہ بٹھالے اور کہیں راجہ وشے کی ذریت کی پتری زرشا کو ذرد روزر کی ٹھوکروں کے لیے چھوڑ دے...... انمول ہیرے سے دل میلا کرلے اور کدھر خنحل بننے میں بھگوان کھوج کے پوجا شروع کردے۔ جرص غرض ہوس' طمع لالچ' تلون اور نسیان بھرے اس بندے کی کوئی بڑی سیدھی ہے اور نہ کوئی بوٹی...... اس سے کچھ بھی بعید نہیں...... اصول نہ کوئی طریق' اس کائنات میں جتنے بھی مشابہات مترادفات' اختلافات ومتضادات ہیں ان تمام کا عکس جمیل وجلیل' اس آدم میں موجود ہیں۔ اس کی کسی بھی حرکت پہ چاہے وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اچنبھے کا اظہار نہیں کیا جاسکتا اور نہ کرنا چاہیے....؟

گوشت پوست استخواں سے تعمیر وتعبیر انسان کی فطری غذا گوشت' پانی' دودھ' شہد' سبزیاں' اناج اور پھل پھول ہی ہوتے ہیں مگر کیا کہیے کہ کچھ انسان آہنی پتھر کنکر کانچ شیشہ' آہنی کیل بلیڈ' ریت اور تیل تیزاب' شراب' انسانوں جانوروں کے گوشت خون کے علاوہ اپنا اور دوسروں کا پیشاب بھی کھاپی جاتے ہیں اور نارمل زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن میں کچھ بھی دیگر انسانوں سے ماورا یا الگ نظر نہیں آتا۔ نشہ اور سرور حاصل کرنے کی خاطر خطرناک سانپوں بچھوؤں سے کٹوانے اور ڈسوانے والے تو اب عام ہوگئے ہیں۔''

اس ترقی یافتہ دور میں بھی بہت سے لوگ پہاڑوں کی غاروں' زمین کے نیچے اور درختوں کے اوپر زندگی بسر کرتے ہیں۔ لاکھوں لوگ اب بھی کچی غذا میں' اناج ترکاریاں کھاتے ہیں...... کوئی صرف پانی پی کر زندگی بسر کرتا ہے اور کوئی گھاس پتے کھاتا ہے۔ دُنیا میں ہزاروں لاکھوں ایسے بھی ہیں جنہوں نے کبھی کوئی لباس' جوتا نہیں پہنا' دانت صاف نہیں کیے' بال نہیں کٹوائے' کنگھا نہیں کیا...... یہاں تک کہ وہ کبھی نہائے نہ ہاتھ منہ دھویا۔''

مَیں ایک شخص کو بھی جانتا ہوں جس نے بچپن سے لے کر ابھی ستر برس کی عمر تک کسی قسم کی ٹھوس غذا نہیں کھائی۔ صرف دودھ اور پانی شہد ناریل جل یا پھلوں سبزیوں کے جوس پہ زندگی بسر کی۔ ایک شخص ایسا بھی جو پیدائش سے اب تک ایک لمحہ کے لیے سویا نہیں۔ میسور میں ایک سوامی جی کو دیکھا جو سارا جیون اُلٹے ہی لٹکے رہے۔ دھرتی پا اپنے پگ پہ کھڑا ہونا ایسا ہی تھا جیسے کسی عام منش کے لیے سر کے بل کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ کسی کے ہاں زہر ہلاہل تریاق کا کام کرتا ہے اور کوئی آبِ حیات پینے سے سورگباش ہوجاتا ہے...''

کچھ بدنصیب نکوٹین اور الکوحل کے بنے ہوتے ہیں...... یہ خاموش زہر اُن کے لیے ایک نامک کی حیثیت اختیار کرچکے ہوتے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے کا ذکر ہے کہ میرے ہاں ایک نفیس' حلیم الطبع' دردمند سے ڈاکٹر صاحب نے آنا جانا شروع کیا۔ اچھے خاصے ڈیل ڈول والے پراثر شخصیت کے مالک تھے' جن کے

وسیلے سے میرے پاس پہنچے' وہ بھی دانتوں کے ڈاکٹر اور میرے دیرینہ یاد اللہ والے تھے۔ مَیں ان نئے آنے والے ڈاکٹر صاحب کی پُر لطف شخصیت اور تصوف سے دلچسپی' بے پناہ علمی اور مشاہداتی تجربات اور قرینے سلیقے سے بے حد متاثر ہوا اور دل میں سوچا کیے۔ اچھا ہُوا کہ اس پرآشوب اور ناسواد دور میں کسی ضراحت وضحبت والے سے ملاقات ہوئی؟

دانتوں والے ڈاکٹر صاحب کی زبانی بعد میں معلوم ہوا کہ ان ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں اللہ کریم نے بے پناہ شفا رکھی ہے۔ جیسا بھی پیچیدہ مرض ہو' مریض کیسا ہی گیا گزرا ہو' اس مسیحا کے پاس پہنچتے ہی شفایاب ہو جاتا ہے۔ ان کا کلینک مریضوں سے بھرا رہتا ہے۔ فیس نہ ہونے کے برابر' مریض پہ خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ علاقہ بھر میں ان کی دُھوم ہے۔ اسی قسم کی اور بھی بہت سی باتیں' جن سے میری خوب تسلی ہوئی اور اندر ہی اندر ان کا دَم بھرنے لگا اور تہیہ کر لیا کہ جب بھی کبھی بیمار شمار ہُوا تو ان سے ہی رجوع کروں گا؟

مجھ سے عقیدت رکھنے والے مہربان' اپنی محبتوں اور عقیدت کے اظہار کے لیے دن دیکھتے ہیں نہ رات' جب بھی ان کی عقیدت جوش مارتی مجھ سے رابطہ کر لیتے ہیں...... کہتے ہیں کہ اللہ کریم نے دن' کام کے لیے اور رات آرام کے لیے بنائے ہیں...... بنائے ہوں گے؟...... مَیں جانوں میرے لیے تو دن اور رات دونوں لوگوں سے ملنے ملانے' ٹیلیفون پہ سر کھپانے اور کھانسنے کھنسانے کی خاطر بنائے گئے ہیں۔ شاذ ہی چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت ایسا ہو جب ٹیلیفون کی ٹرررن ٹرررن بج نہ رہی ہو...... اور کوئی نہ کوئی مجھے اپنی کوئی کتھا کہانت نہ سُنا رہا ہو؟

کسی امریکی مغزمارے نے کہیں کہا تھا کہ دُنیا کے مشکل ترین' اذیت ناک کاموں میں ایک کام' کسی کی دُکھ بھری داستان' مصائب پریشانیاں' محرومیاں سننا بھی ہے......؟

ایک امریکن دولتمند بوڑھیا نے اپنے محبوب آنجہانی شوہر کی شان' شاندار بنگلے کی تزئین نو کے لیے ایک کمپنی سے معاملہ کیا' کمپنی نے اپنے عملے کو کام پہ لگا دیا۔ ایک نیگرو کاریگر اپنے کام کے دوران اس نرم خُو' خلوص اور ہمدردی کی متلاشی بوڑھی کا بھی بہت خیال رکھتا۔ نرم اور دھیمی سی مسکراہٹ سے سر جھکا کر سلام کرتا' صحت اور مزاج کا پوچھتا...... حالاتِ حاضرہ' موسم اور اِدھر اُدھر کی دل بہلانے' خوش کر دینے والی باتیں کرتا۔ پھر تن دہی سے اپنے کام میں جُت جاتا۔ یوں سمجھ لیں کہ ان دونوں علیحدہ جنسوں' مختلف رنگ و نسل' متضاد مزاج و میلان اور جُدا جُدا سن و سال کے نفوس کو باہمی انسانی ضرورتوں تقاضوں نے وقتی طور پہ ہی سہی' ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ محنت کش نیگرو اور دولتمند خوش ذوق و نظر بوڑھی امریکن عورت......؟

کہا بھی جاتا ہے اور مشاہدہ میں بھی آیا ہے کہ امریکن بچپن میں نادان' جوانی میں بُوڑھے اور

جوں جوں عمر ڈھلتی جاتی ہے وہ پُرشباب ہوتے جاتے ہیں۔ وہ اپنی جوانی کی تشنہ خواہشوں ادھورے سپنوں اور گم گشتہ آرزوؤں کی کھوج میں نکل پڑتے ہیں۔ میں نے وہیل چیئر اور بیساکھیوں پہ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے امریکن بوڑھوں بوڑھیوں کو دیوارِ چین کی چڑھائیاں چڑھتے' تاج محل کے تاریک تعویذ تلے' اجنتا ایلورا کے الف ننگے' اَنگ اَنگ انگیختہ اصنام کے سامنے آنکھیں پھاڑے...... اہرام اور ایفل ٹاور کی بلندیوں پہ چڑھتے اُترتے...... متھرا مدراس' بنارس' کشمیر' کیلاش' کاشی' ہڑپہ' موہنجوداڑو' ہری دوار کی یاترا کرتے' گھومتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی امریکن بڑھاپے میں جوان ہوتے ہیں۔ زندگی اگر کوئی انجوائے یا بسر کرتے ہیں تو امریکن!...... بچے جوان یا بوڑھے' خاص ہو یا عام...... وہ لمحۂ موجود کو چاہے وہ کیسی بھی کیفیت کا حامل ہو' سنوارنے گزارنے اور ٹالنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔''

مرمت اور تزئین و زینت کا کام بالآخر ایک روز اپنے اختتام تک پہنچا اور بادل نخواستہ اس بوڑھی خاتون کو جس نے اس نیک خو ہمدرد اور دلنوازی کی قوت سے آشنا نیگرو اور اس کے ساتھیوں کو شکریہ کے ساتھ رخصت کرنا پڑا۔ ان کاریگروں نے اپنا کام پوری محنت اور پیشہ ورانہ دلچسپی سے سرانجام دیا تھا...... بڑھیا بہت دنوں تک انہیں یاد کرکے خوش ہوتی رہی۔ خاص طور پہ وہ اس نیگرو کو تو بالکل ہی بھول نہیں پائی تھی۔ وہ بھولنے والا بھی نہیں تھا...... ایسے مخلص اور ہمدرد انسان' اس دورِ قحط الرجالی میں کہاں ملتے ہیں۔؟

ایک روز جب بڑھیا سے نہ رہا گیا تو اس نے نیگرو کو ٹیلیفون کرکے بلایا۔ نیگرو نے سمجھا کہ شاید کام کے متعلق کوئی شکایت ہوگی؟ معلوم ہوا کہ اس نے شکریہ ادا کرنے اور کچھ باتیں کرنے کی غرض سے بلوایا ہے۔ وہ اس سے اپنی ازدواجی زندگی' اپنے خاوند جو ملٹری میں ایک بہادر' فرض شناس آفیسر تھا اور اس سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا کی باتیں سناتی...... اس کے ساتھ کھینچی ہوئی تصویریں' تحفے اور بھی بہت سی یادیں شیئر کرتی اور وہ نیگرو پوری توجہ سے کان دھرے ہوئے سنتا رہتا اور موقع کے مطابق لقمہ بھی دیتا رہتا۔ بس یہی کچھ تھا کہ بڑھیا کو یہ نیگرو بہت مخلص اور ہمدرد لگتا تھا۔ اس نے نیگرو سے درخواست کی' وہ اگر ہر روز کچھ وقت نکال کر اس کے پاس پہنچ آیا کرے تو اسے بے انتہا مسرت ہوگی۔

نیگرو اب ہر روز' شام ایک مقرر وقت پہ اس کے ہاں پہنچ جاتا۔ اپنے ساتھ بڑھیا کے پسندیدہ پھول لانا نہ بھولتا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بڑھیا خوب باتیں کرتی۔ بچپن' جوانی' ماں باپ بہن بھائی...... اپنا بوائے فرینڈ' سکول اور ملازمت کے زمانہ کے معاشقے...... زندگی میں ملنے والی خوشیاں...... محرومیاں' دُکھ بیماریاں...... کیا کچھ نہ ہوتا جو وہ نہ کہتی' سناتی اور وہ بیچارہ!...... جی جی' اوہ' اوہ کرتا رہتا۔ نیگرو اپنا پیٹ بھرنے اور بڑھیا اپنا پیٹ خالی کرنے کے بعد جیسے دونوں کو چین مل جاتا......!

اسی سُنی سنائی' پیٹ خالی' پیٹ بھرائی' منہ دکھائی چھپائی میں چار پانچ ہفتے گزر گئے۔ اتوار کا دن تعطیل کا ہوتا...... ہفتے کے روز وہ اپنی نشست ڈبل کر دیتا مگر اتوار وہ مکمل چھٹی کرتا۔ یہ ویک اینڈ کا دن' چرچ کی حاضری' ریس کھیلنا اور شراب پی کر بلے گلے کے لیے مخصوص تھا۔"

باہر گیٹ پہ گھنٹی نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ باہر سائیکل پہ ایک نوعمر لڑکا تھا۔ اُس نے صبح کا سلام کرتے ہوئے ایک لفافہ بڑھا دیا۔ بڑھیا کے استفسار پہ نیگرو لڑکے نے بتایا کہ اس کے پاپا نے بل بھیجا ہے اور تاکید کی ہے کہ اس کی ادائیگی کیش کر دی جائے۔ بڑھیا حیران ہوئی کہ یہ کیسا اور کون سا بل ہے جو اتوار کی صبح دستی بھیجا گیا ہے اور اس تاکید کے ساتھ کہ ادائیگی بھی کر دی جائے۔ بڑھیا نے گلے میں لٹکی ہوئی عینک مندھی مندھی آنکھوں پہ جمائی اور بڑی حیرت سے لفافہ چاک کر کے بل نکالا۔ دو ہزار ڈالر کا بل تھا...... اس کی تو سٹی گم ہوگئی' سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ بل کس ضمن میں ہے۔ لڑکے سے پوچھا' اُس نے بھی کاندھے اُچکا دیے۔ آخر اُس نے نیگرو کو فون کر کے اس نہ سمجھ میں آنے والے بل کے متعلق پوچھا۔ اُس نے سیدھا بغیر کسی لگی لپٹی کے بڑھیا کی ناقص معلومات میں اِک مکمل اضافہ کیا...... یہ بل اُس کی خدمات کے ضمن میں ہے' جو اُس نے اس کی مصاحبت میں اپنا قیمتی وقت اور اعصابی نظام پیش کیا ہے۔ پرانی بڑھیا جب یہ مصاحبت اور اعصابی نظام کی خدمات والی نئی بات سمجھ نہ پائی تو اُس نے نیگرو کو بلا بھیجا کہ خود پہنچے اور جو معاملہ ہے خود سمجھائے۔"

طوعاً کرہاً نیگرو خود پہنچا تو اُس کا چہرہ کھنچا ہوا تھا' وہ پہلے والا مخلص ہمدرد انسان اُس کے ہمراہ نہ تھا جو اُس کے دُکھ درد کان لگا کر سنا کرتا تھا۔ جب وہ مونس' غمخوار اُسے کہیں دکھائی نہ دیا تو اُس نے پوچھ ہی لیا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟ لگتا ہے تمھیں کوئی پریشانی ہے؟"

تب وہ کبیدہ ہو بولا۔

"مام! جب کوئی حاجت پوری نہ ہو' زندگی کی ضرورت' بھوک بن کر پیٹ میں مروڑ پیدا کر دے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

بڑھیا کے وقت خوردہ دماغ میں جب کچھ نہ پڑا تو وہ منہ کے مصنوعی دانت' نمائش کے لیے پیش کرتی ہوئی استفہامیہ سی صورت میں اس کی جانب تکنے لگی۔

"مام! یہ بل میں نے بڑی احتیاط اور آپ کے ساتھ مخلصانہ مراسم کی قدر کرتے ہوئے بہت کم بنایا۔ کوئی اور ہوتا تو اس میں کم از کم ایک ہزار ڈالر کا مزید اضافہ ہوتا۔"

بڑھیا ہکلاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"مگر میں تو تمہارا بل ایک ماہ قبل ادا کر چکی ہوں۔"

''ہاں ہاں!...... میں وہ کام والا بل وصول کر چکا ہوں۔ یہ حقیر سا بل میرے اُس گرانقدر کام کا محنتانہ ہے جو میں پانچ ہفتوں سے اِدھر پہنچ کر سرانجام دے رہا ہوں۔''

بڑھیا سر پٹا کر بولی۔

''کون سا کام......؟''

''یہی آپ کے دُکھ درد کی کہانی سننے والا...... آپ کے ماضی کے واقعات' حسین یادیں...... وہ لمحات جنھیں اب کبھی واپس نہیں لایا جا سکتا...... وہ زہریلی ٹیسیں جو یادوں کے اندھے کنویں سے آہیں بن کر نکلتی رہتی ہیں۔ آپ سمجھتی ہیں کہ کسی نوجوان' جسے ابھی ڈھنگ کی گرل فرینڈ بھی نہ ملی ہو' محض اسی لیے ہے کہ وہ کسی بیوہ بوڑھی عورت' جس کا شوہر اُس کے بڑھاپے کے لیے ایک بڑی دولت' جائیداد چھوڑ گیا ہو' اُس کے جان لیوا دُکھ سُنے...... کیا اُس عورت کو اس ''خطرناک'' کام کے لیے اس مزدور کو معاوضہ نہیں دینا چاہیے۔ کیا اِس محنت کش کو اتنا حق نہیں کہ وہ ویک اینڈ پہ صاف ستھرے کپڑے پہنے چرچ جائے...... ڈھنگ کی بیئر پیئے' لنچ ڈنر کھائے...... ریس کھیلے' لاٹری کا ٹکٹ خریدے کہ دولت کی دیوی اس پہ بھی مہربان ہو جائے؟''

وہ اُٹھ کر اس کے کپکپاتے جھریوں بھرے ہاتھ چومتے ہوئے کہنے لگا۔

''یقین کرو' مام! اس دُنیا میں کسی کے دُکھ سننا...... اُس کے خوابناک اور پُرلطف وخوبصورت ماضی کی یادیں شیئر کرنا...... اُس کی آہیں کراہیں خشک و تر آنسو دیکھنا...... اُس کی یخ بستہ' مرگ گرفتہ مصاحبت اختیار کرنا' دُنیا کا سب سے مشکل اور خطرناک کام ہے۔'' آپ کو معلوم ہونا چاہیے ایسے لوگ' جو کسی کے دُکھ پریشانیاں سنتے ہیں' اُن سے ہمدردی اور دوستی رکھتے ہیں۔ بہت پہلے خود موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں جبکہ دُکھ سنانے والے خوش وخرم رہتے ہوئے کسی فضول سے آدمی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں جو اُن کے دُکھ سُنے...... مام! یقین کرو' یہ ایک بے اعتبار سی جاب ہے۔ اس کا معاوضہ جتنا بھی طلب کیا جائے' میرے نزدیک بہت کم ہے۔''

اچھے اور کڑے وقت کھائے ہوئے اور حقیقت آشنا بڑھیا کو اُس کی باتیں بالکل بُری نہ لگیں' اس نے اُس کے معاوضے کی نقدی اُس کے حوالے کرتے ہوئے درخواست کی۔

''تم تواتر سے اپنے اس جاب پہ آتے رہو...... تم جیسے ہمدرد اور حقیقت آشنا دوست کے لیے میرا سب کچھ قربان ہے۔ ہاں' تم نے مجھے رفاقت اور انسانیت کے کچھ نئے معنوں سے بھی آشنا کیا ہے۔ شادی کا مطلب محض گلے بندھے سماجی معاشرتی اور جنسی جذبوں کی تکمیل ہی نہیں...... بلکہ کچھ انسانی اعلیٰ قدروں کی پاسداری بھی ہوتا ہے...... یہ حقیری رقم تمھاری فوری ضرورت کے لیے ہے...... باقی بات' بعد میں ہوگی۔''

بعد میں کیا ہونا تھا...... بڑھیا نے اپنی تمام جائیداد اور نقدی' اس نیگرو کے نام کر دی...... اور کچھ ہی

عرصہ بعد وہ اس جہاں سے رُخصت بھی ہو گئی...... مگر قانوناً اس نیگرو کی بیوی بن چکی تھی۔ کورٹ میں شادی کے وقت پہلا ''کس'' ہُوا' اس کے بعد اُن دونوں نے ایک دوسرے کو کبھی چھوا تک نہ تھا۔ وہ سامنے بٹھا کر اُسے اپنے ماضی کے سنہری وقتوں کے قصّے سناتی رہتی اور وہ بڑی دلچسپی اور پوری نیت سے اُسے سنا کرتا...... پھر وہی ''ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے''...... اس سارے قصّے سے یہ برآمد ہوا کہ کسی کا دُکھ سُننا اور رُو برو بیٹھ کر کمال تحمل صبر برداشت کا مظاہرہ کرنا' دُنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک کام ہے۔''

## ● لذتِ رُسوائی......!

جمشید ملک کا قصّہ بھی یہی تھا مگر اُس کا انداز مختلف تھا۔ کچھ مریض' طبیب کے ہاں شفا کی غرض سے جاتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کسی بابے' وکیل' پولیس اور ڈاکٹر کے سامنے بھی غلط بیانی سے کام نہ لو۔ اُلٹے پھنس جاؤ گے۔ یہ چاروں تھوک پہلی نظر میں ہی اصلیت تک پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ ان سے چور سپاہی کا کھیل کھیلنا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔''

''دائی کو پیٹ والی سے مہینے اور دن پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گلی محلے کی مائی منداں' سب جانتی ہوتی ہے کہ سایہ بچا کر گزرنے والی بلّو' کہاں آتی جاتی رہی ہے؟...... قصائی کو بھی کھٹکا ہوتا ہے کہ بکرے کا خصیہ چھنکا ہُوا ہے یا اُس کا گردہ گلا ہُوا ہے...... اور مجرائی کو بھی سمجھ ہوتی ہے کہ اُس کی سیڑھی چڑھنے والے کے کھیسے میں رُوکڑا کا غذائی ہے یا محض اُنگلی زرو پلّی کی بھنائی ہے یعنی دائی' مائی' قصائی اور مجرائی بھی اتنی سُوجھ رکھتے ہیں جبکہ بابا تو سترّ بہتروں بدری پرشادوں کو بیچ بیچ کر بندرا بن کا بنجارا بنا ہوتا ہے۔''

اس کی دانائی یہ تھی کہ بالکل ننگا ہو کر میرے سامنے آیا تھا...... جب وہ خود ہی الف ننگا ہو جائے تو مَیں اس کو اور کیا کھولتا......؟

''مَیں آپ کو بابا مان کر نہیں آیا' نہ ہی کوئی مشورہ یا نصیحت پکڑنے...... مَیں تو یہ سمجھنے پہنچا ہوں یہ لذتِ رُسوائی کی للک میں اتنی چینک کیوں ہوتی ہے؟ یہ پتنگے' کیا عقل کے ایسے پتلے ہوتے ہیں کہ انجام سامنے دیکھتے ہوئے بھی دیوانہ وار موت سے لپٹ جاتے ہیں اور کوئی خطا کار نہ ہونے کے باوجود خوشی خوشی جھومتا ہُوا تختۂ دار پہ چڑھ جاتا ہے۔ موت کا جام پینے والے رَسّے کی گانٹھ چوم اور جھوم کر خود ہی جھونا لے لیتے ہیں...... پور پور کٹواتے ہوئے فرطِ مسرت سے نعرۂ مستانہ لگانے میں کیسی حکمت ہوتی ہے......؟

مَیں نے آگے بات اُچک کر کہا۔

''اور اپنے ہاتھوں زہر پیالہ چڑھانے میں کیسی چس ہے؟ سیاہ مارکی پٹاری میں ہاتھ ڈال کر ڈسوانے میں کیسا رس ہے؟؟ اپنی اچھائی سے پٹی سنگ ہی ہوتا بھی کیسی تمنا ہے؟...... اگر تمہیں بوجھل دھوئیں کی باڑ اور پگھلی سنہری نار میں ڈوب کر ہی تشفی اور تلذذ ملتی ہے تو تمہیں کون ٹوک روک سکتا ہے؟ ہر شخص اپنی جنت اور جہنم کی صلیب اپنے کاندھوں پہ اُٹھائے پھرتا ہے۔ ایک وقت یوں بھی کہ اُسے دونوں میں سے ایک کاندھے کا بوجھ اُتار پھینکنا ہوتا ہے...... اب وہ دایاں خالی کرتا ہے یا بائیں کی بات کرتا ہے یہ اُس کی تدبیر یا تقدیر پہ منحصر ہوتا ہے؟

میری یاوہ گوئی کا یہ اثر ہوا کہ وہ کچھ دیر تک خاموش سا گہری نظروں سے مجھے تو تکتا رہا پھر عجیب سے انداز میں خود بخود بولتا رہا۔ جیسے وہ میری کہی ہوئی باتوں کو منہ ہی منہ دُہرا رہا ہو۔ دو چار پختہ پختہ سے کش لے کر ایک چوتھائی سگار کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ وسکی گلاس کو یکبار ختم کرکے، نشست آگے سرکا کے میرے مزید قریب ہوکر رازدارانہ انداز میں بولا؟

''باباجی! یہ دونوں میرے مرغوب ترین چسکے ہیں جن کے بغیر میں زندگی بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کیا آپ میرے لیے کوئی ایسا طریقہ تجویز کر سکتے ہیں جو مجھے ان سے بیگانہ کردے؟؟''

اب میں نے اُسے گھورنے میں کچھ وقت لیا۔ مجھے اُس کے چہرے پہ چمکتا ہوا ایک عزم دکھائی دے رہا تھا جو مالک کُل کے خاص کرم و فضل سے ہی کسی گنہگار کے دل میں پیدا ہوتا ہے...... ایسا وقت، جس میں اُس کے لیے خیر و سلامتی کے فیصلے ہوتے ہیں؟...... میری اپنی سمجھ کے مطابق وہ وقت آن پہنچا تھا جب اُس کے دل و دماغ کے رُخ تبدیل ہونے شروع ہو چکے تھے۔ اذن حاصل ہوتے ہی میں نے آہستگی سے کہا۔

''تم نے ایک لفظ چسکا استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ انتہائی بازاری طبیعت کا حامل ہے۔ مگر اس مقام پہ اس لفظ نے مجھے بے حد محظوظ کیا ہے۔ اسی لفظ کو اب میں بھی استعمال کرنے لگا ہوں۔ میں تمہیں ایک ایسے پُرلطف اور پُروقار چسکے سے متعارف کراتا ہوں جس کے رُوبرو دُنیا بھر کے چسکے عاجزی کی چسکیاں بھرنے لگتے ہیں۔ میں ہر اختیار تمہارے ہاتھوں میں رکھتا ہوں، یہ نہ تو کوئی پند و نصیحت ہے اور نہ کوئی تبلیغ و تعلیم! تمہیں اختیار ہے کہ اگر میرا بتایا ہوا چسکا تمہیں ڈسکہ نہ دکھا دے، تمہاری آنکھوں سے سگار کے دھوئیں کی دُھندلاہٹ اور سکاچ کا سفید موتیا نہ نکال دے تو تم چاہو تو یہ پہلا والا چسکا پھر اختیار کرلو۔ مگر ایک التجا! جو کہ شرط ہرگز نہیں کہ تم میرا یہ بے ضرر سا نسخہ پورے تین ماہ استعمال کرو گے۔ نوے دنوں کے بعد فیصلہ تمہارے ہاتھوں میں ہوگا؟...... میں یہاں سے تین چار دنوں کے بعد رُخصت ہو جاؤں گا، اس دوران تم اس معاملہ میں اپنے وعدے اور اللہ کریم کے درمیان رہو گے...... مناسب سمجھو تو اللہ کریم کو درمیان میں رکھ کر ایک زبانی کلامی معاہدہ کرلیتے ہیں۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔'' صرف بیس منٹ کے لیے میں تنہائی چاہوں گا۔

تم چاہو تو باہر جا سکتے ہو...... اپنے والد صاحب کا پتا کرو وہ چلے گئے ہیں یا نیچے کہیں بیٹھے ہیں اور ہاں میری اس بات پہ بھی غور کرنا۔"

میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے سنجیدہ' اہم معاملات اور فیصلوں میں دوسری پارٹی کو سوچنے' ہاں اور ناں کی آزادی دینا بڑے خوشگوار نتائج پیدا کرتی ہے۔ دوسرے کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا کہ دباؤ تناؤ میں آ کر غلط فیصلہ ہو گیا۔ خاص طور پہ ایسے مواقع پہ جب آپ کسی عادت' علت دور کرنے کے درپے ہوں...... ہاتھ پہ ہاتھ' بچے پہ پنجہ مار کر جو فیصلے یا معاہدے ہوتے ہیں اکثر خام رہتے ہیں!

مقررہ وقت پہ جب باہر کی گھنٹی بجی تو دروازہ کھلنے پہ دونوں باپ بیٹا شانہ بشانہ اندر داخل ہوئے۔ دونوں کے بشروں سے پتا چلتا تھا کہ ان کے اندر کے کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کر رہے ہیں...... چہروں پہ کسانوں کی سی شگفتگی کھلی ہوئی تھی جو ریڈیو سے مینہ برسنے کی خبر سن کر خوشی خوشی گھر داخل ہوتے ہیں۔

میں نے کریدنے کی خاطر بڑے ملک صاحب سے پوچھا۔

"ماشاءاللہ! بہت خوش خوش دکھائی دے رہے ہیں......؟"

"باباجی! جمشید وضو کر کے آیا ہے۔ خدا جانے اس نے اس وقت کون سی نماز پڑھنی ہے؟"

"ملک صاحب! نیکوکاروں کی نمازوں کے اوقات ہوتے ہیں۔ ہم ایسے گنہگاروں کی ٹکروں کے کوئی ٹائم نہیں ہوتے...... جب اُدھر سے توفیق ملی پڑھ لی۔ کچھ ایسے بھی جو وقت پہ اہتمام سے کھانا کھاتے ہیں کچھ وہ بھی کہ جب ملتا ہے تو کھاتے ہیں' اُن کے ہاں وقت کی پابندی نہیں ہوتی...... جیسے مرنا جینا' بس میں نہیں ہوتا اسی طرح اچھائی' برائی' عزت ذلت' دولت' شہرت اور ہدایت و توفیق بھی اُدھر سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ بندہ لاکھ سر پٹکے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

میں یہ کچھ فی البدیہہ کہہ کر پیچھے کچن میں چلا آیا۔ کھجوریں اور کچھ ادھر اُدھر کا کھانا پینا لا کر سامنے دھرا......!

"لیجیے' الله کر چکھیں......!"

جمشید ملک گویا ہوئے۔

"آپ کسی زبانی معاہدے کی بات کر رہے تھے...... کیسے......؟"

"بھائی! معاہدہ کیا' بس! دو انسانوں کے درمیان ایک افہام و تفہیم ہوتی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ معاہدے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کاروباری' رشتہ داری' سیاسی اخلاقی اور پیار محبت دوستی وغیرہ...... یہ تمام کچھ دُنیاداری کے ایک ڈھب پہ لانے کی کوششیں اور طریقے ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ معاہدے باقاعدہ

قانونی طور پہ ضابطہ میں لائے جاتے ہیں اور کچھ زبانی کلامی اور گواہیوں اور شہادتوں کے ساتھ ..... مگر میرا اور آپ کا معاہدہ بڑا سادہ سا ہوگا۔ آپ کے والد صاحب چونکہ حاضر موجود ہیں اس لیے صرف یہی جانتے ہوں گے کہ ہم دونوں نے کیا معاہدہ کیا ہے۔"

میں نے ایک عجوہ کھجور بسم اللہ کہتے ہوئے اُس کے منہ میں رکھتے ہوئے مزید کہا۔

"یہ بابرکت کھجور نبی کریم صلعم کی پسندیدہ غذا ذوا اور شیرینی! ..... ساتھ یہ شہد جس میں کلونجی کے سیاہ دانے شامل ہیں اور زیتون کا روغن اور پھل! ..... یہ چاروں نعمتیں اللہ کریم کی جانب سے خاص تحفے ہیں ..... انہیں استعمال میں لانا نہ صرف شفا برکت اور صحت ہے بلکہ گھر میں رکھنا بھی ایسا ہی ہے جیسے کسی نے خزانہ لا رکھا ہو۔ اب آپ تین ماہ کا عرصہ بطور غذا یہی چار چیزیں استعمال کریں گے۔ دودھ پانی اور ہر طرح کا پھل مستثنیٰ ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی بھی غذا روٹی چاول گوشت گھی شکر دالیں منع ہیں۔ تمبا کو شراب کے قریب تک نہیں پھٹکیں گے۔ پورے مہینے آپ ہر روز لنگر تقسیم کریں گے ..... لنگر میں وہ غذائیں پکی ہوں گی جن کی آپ کے لیے مناہی ہے۔"

لنگر کی وضاحت کرتے ہوئے مزید بتایا۔

"لنگر وہ طعام ہے جو اللہ کی ہر طرح کی مخلوق کی ضیافت کی نیت سے تیار کیا جائے اور ساتھ یہ خیال ہو کہ وہ اللہ کے بندے بھی ضیافت میں شامل ہوں جو تنگدستی' غربت یا کسی بھی وجہ سے پیٹ بھر کے اچھا کھانا' کھانے کے قابل نہیں۔ لنگر' خیرات' صدقہ یا کوئی منت نیر سے کا کھانا نہیں ہوتا۔ یہ سب کے مالک و رازق کے نام کی دعوت ہوتی ہے۔ چرند پرند کیڑے مکوڑے' انسان حیوان' جس جس کا نصیب ہو کھائے۔ یہ عمل محض اللہ کریم کی خوشنودی کی خاطر ہونا چاہیے۔ لنگر کے پکوان کے لیے مقدار' اجزا' اور وقت کی کوئی قید نہیں ..... گھر کے افراد' ہمسائے' احباب' مسافر' اپنے پرائے سب کھا سکتے ہیں۔ مذہب و مسلک کا بھی کوئی مسئلہ نہیں' جو رب کا بندہ ہے ..... پیٹ رکھتا ہے' کھا سکتا ہے۔"

میں نے مزید سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم خود اپنے ہاتھ سے لنگر تیار کرو' اپنے ساتھ ملازم شامل کر سکتے ہو۔ صبح اُٹھ کر پہلے یہی کام کرو پھر سارا دن اپنا کاروبار کرو۔ آہستہ آہستہ لنگر کو وسعت دو' پھر دیکھو کہ خدا تمہیں کیا کچھ دیتا ہے؟"

میں نے مزید تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"جس طرح رزق کے معنی محض اکل و شرب نہیں ..... رزق کی ذیل میں آل اولاد' مال اموال'

صحت وتندرستی' عزیز واقارب' عزت وشہرت' علم وعبادت' حتیٰ کہ تحمل وتدبر اور صبر وشکر کی توفیق بھی رزق کی ذیل میں آتے ہیں......''

ہم اپنے لیے آخرت و عاقبت بخیر کی دُعا اکثر مانگتے ہیں' اگلے جہان کی بہتری' درجات میں بلندی اور جنت حور وقصور کے حصول کے بھی خواہشمند رہتے ہیں۔ اپنی ظاہری باطنی عبادات اور اعمال وافعال میں خشوع وخضوع کی کوشش بھی اسی لیے ہوتی ہے کہ اللہ کریم' ہم سے خوش ہو جائے اور اُس انعام واکرام کے حقدار ٹھہریں جس کا کہ اُس نے وعدہ فرمایا ہے۔ بہت دُرست ہے ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن کیا کہوں کہ میں نے کچھ یوں بھی اللہ کے بندے دیکھے ہیں جو نہ جنت مانگتے ہیں اور نہ حور وقصور...... وہ شکرگزاری کی مد میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ہمہ وقت اپنے رب کی مخلوقات کو راضی کرنے' اُن میں سلامتیاں تقسیم کرنے میں جُتے رہتے ہیں۔ اسی عبادت میں اُنھیں کچھ بھی تو ہوش نہیں ہوتا...... ہوتا ہے تو اِک جوش! اُن کے پیشِ نظر' اَن دیکھی مستقبل کی بہشت کے شیریں مثالِ طیور' خوشنما خوب لذت ثمور' خوش ذائقہ دُودھ شراب طہورہ سے لبالب نہروں' اُن کے سرسبز کناروں اور سدابہار موسموں کے نظاروں کا کوئی تصور نہیں ہوتا بلکہ اس کے دھیان گیان کا محور مقامِ انسانیت سے اُترے گرے پڑے لوگ ان کے مسائل' کھلے رستے زخم' گہرے گھاؤ' مصائب کی خشک وتر دلدلوں میں دھنسے ہوئے ڈھانچے' بے گوروکفن لاشے...... زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے تہی مخلوق...... بے رُخ بے منزل' مقہور ومجبور مہاجروں کے انبوہ' جو کسی رہبر' مسیحا کی تلاش میں' دشتِ دہر میں درماندگی کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔

میرے بابا اشفاق احمد' اپنی گفتگو میں آخری فقرہ فرمایا کرتے تھے۔

''اللہ ہمیں سلامتیاں آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔''

غور کیا جائے تو ان مختصر اور بظاہر سادہ دُعائیہ التجائیہ سے لفظوں میں رُوحانیت صالحیت اور مالک ومخلوق سے اخلاص بھرا کیسا خوبصورت رشتہ اُستوار دکھائی دیتا ہے اور یہ الفاظ ادا کرتے وقت بندہ تسلیم ونیاز سے بھیگ سا جاتا ہے۔''

ناراضی کی ٹنگی...... مٹی کی پھنگی...... آٹے کی گوندھ...... خوشبو کی سوندھ...... مانگ میں تانگ۔ دھار میں تار۔ دوستی میں راستی اور کستوری میں اگر مستوری کی بھیگت پیدا نہ ہو تو کچھ مزہ نہیں آتا۔'' یہ گئے وقتوں اور گھاتیں نہیں...... کسی چودھری چھاؤں اور نیچے گاؤں کی گاؤ گیتا کی گوت پھر اُونچے دوچاروں اور کرم کاروں کی باتیں ہیں...... جنھیں سُنیں تو سُنیں' اور نہ سُنیں تو نہ سُنیں......!

بھیگت' بہت ضروری ہوتی ہے۔ گل اگر بھیگت پوری طرح جذب نہیں کر پائی تو ظروف اور ظرف

دونوں ضعیف اور خفیف ہیں۔ صوفی کے اندر اک بھیگیت ہی تو ہوتی ہے جو اُسے صافی اور شافی بناتی ہے۔ جذبہ بھیگ کر ہی جذب بنتا ہے۔ اسی طرح عشق' بھی خوب بھیگ کر ہی عشق کے برگ و گل کھلاتی ہے...... فرط غم و اندوہ یا مسرت و انبساط میں آنکھ کی پتلی بھیگیت بھوگتی ہے تو آنسوؤں میں رَسا پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھیگیت نہ ہوتو مجھ کا موت ہوتے ہیں...... کاونت میں نرگی رساونت' بھیگاوت بن نہیں آتی؟

مجھے نیل کنٹھ' نیل گگن' نیل تھوتھو' نیل گن' نیلم کو ہر' نیلے کنٹھے نین' نیلے رنگ میں ملتانی کاشی کاری' نیلا زخم...... ''نیل کرائیاں نیلکاں' میرا تن مَن نیلو نیل''! میوز پکھ میں نیلا بال' نیلا گنبد' نیلی روشنائی' مجھے تو نیلو اور نیلی بھی اسی نیل کی وجہ سے اچھی لگتی تھیں...... آگ کے سرکش اور بیباک شعلوں میں نیلاہٹ! سمندر کا نیلگوں پانی' آسٹریلیا کے چشموں' چترال اور جھیل سیف الملوک کے یخ بستہ پانیوں کی نیلی تراوٹ' سکاٹ لینڈ' آئس لینڈ کے جزیروں کی سُنہری سامن مچھلیوں کی جلد میں ڈبکیں مارتے پھسلتے نیلے نیلے ذرات' رنجیت سنگھ کی نیلی گھوڑی اور نیلی بار کی نیلی نیلی چھب دکھلاتی ہوئی بھینسیں!...... راجپوتانے کی سیاہ ہونٹوں پہ گہرے نیلے تل چھدوائے ہوئے مہلائیں!...... مار سیاہ کے کاٹے کی نیلی زہریلی رنگت!...... اُوپل میں دیگر رنگوں کے درمیاں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نیلے نیلے ذرّے......!

نیلے اور کالے رنگ اسرار و طلسموں کے دو تیور اور گول نر ہیں۔ دو ٹھاٹ ہیں...... میزان کے دو باٹ' آمنے سامنے کے دو گھاٹ ہیں۔''

## ● نیل کرائیاں نیلکاں میرا تن مَن نیلو نیل....!

جمشید ملک کا جبلّی رنگ سیاہی مائل نیلا تھا جبکہ میرا رنگ نیلگوں رُجحان کا سیاہ ہے...... بات تو قریب قریب ایک ہی تھی۔ وہ برازیلین سگار کا دُھواں' سکاچ مشروب' منہ منہال سے کشید کرتا تھا اور مَیں ان دونوں خباثتوں کو ناک کی نَلی سے چشید کرتا...... مطلب کی مہک لپک یعنی آکسیجن کو مچھلی کی طرح کام میں لاؤ' باقی فضولیات کو گُھمرو وں کی کھڑکیوں سے باہر گلی میں پھینک دو...... کام وہ بھی یہی کرتا تھا یعنی ہم دونوں کسبی تھے بس گھرانے ذرا مختلف تھے؟ مَیں سیالکوٹی گھرانے کے نائک اُستاد بڑے شیخ محمد اقبال کا' کالا لنگوٹ بند شاگرد نا خلف تھا اور وہ سرگودھا گھرانے کے اقبالمند اُستاد جبکہ چھوٹے ملک قربان علی گنجیالوی کے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔

مَیں سیالکوٹی گھرانے سے تھا اس لیے میری محنت زیادہ تھی۔ جبکہ اقبال مندی اُن کے گھر کی ''سیپ''

تھی اس لیے جمشید ملک کی محنت کی ترجیحات بدل گئیں..... "وہی اسد اللہ خان غالب والی بات کہ اگر شراب تھا کو کھانا پینا' ہاتھ پاؤں ہلائے اور مصلے بچھائے بغیر ہی حاصل ہو جائیں تو پھر کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو روزی رزق کے لیے ہڈیاں نچوڑے!" اکلوتا اور خود سر ہونا بھی' والدین کے لیے اِک عجیب سی آزمائش ہوتی ہے..... ماں باپ قدم قدم پہ قتل ہوتے ہیں مگر خود سر اُولاد کے آگے بولنے کی ہمت نہیں کر سکتے کہ چھوٹا ہو یا بڑا..... اُولاد ہو یا ماں باپ' ہر کسی کی عزت اُس کے اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔"

مگر اِدھر معاملہ قدرے بہتر تھا..... جمشید ملک کی دلچسپیاں اور بُرائیاں کبھی بھی والدین کے لیے عذاب نہ تھیں' نہ وہ بے اَدب یا بدحرام تھا۔ کام کا پکا' محنتی' اپنی ذمہ داریوں کا خیال رکھنے والا اور گاڑیوں کے کاروبار کا کیڑا..... ! بڑے ملک صاحب کے پاس جو کچھ بھی تھا' زیادہ تر اسی کی محنت اور کاروباری سوجھ بوجھ کا ثمر تھا۔ باپ کو اگر بیٹے سے شکایت تھی تو یہی کہ وہ ہمہ وقت سگار اور شراب کے دوالے رہتا ہے۔ اچھی گاڑی جو اور کسی کے ہاں نہ ہو' لمبی ڈرائیو..... گھومنا مگر اکیلے!..... وہ گاڑی میں کسی کو ساتھ بٹھانا پسند نہ کرتا..... گاڑی بھی کسی اور کم سواد کو اپنی گود میں نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ کوئی عورت' لڑکی؟ نہ ناں! وہ اس قبیل کا بھی بندہ نہ تھا..... ! چاہتا تو ایک سے ایک پٹاخہ لڑکی اس کے جوتے چاٹتی..... اس قسم کی چھچھوری حرکتیں سخت ناپسند تھیں..... عمر' دولت' تعلیم' شہرت' جوانی..... کیا اُس کے پاس نہ تھا۔ ماں باپ اس کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر اُن کی تمام کوششیں بیکار ہو چکی تھیں۔ وہ اس معاملہ میں پنچھے پہ ہاتھ نہ دھرنے دیتا تھا۔ رشتہ داروں میں کئی لڑکیاں اس کی چشمِ التفات کی منتظر..... جبکہ زیادہ فکر اس کے اُترتی عمر کے والدین کو تھی جو اکلوتے بیٹے کی اگلی نسل کو کھیلتا اُدھم مچاتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔"

وہ اپنے ذاتی معاملات میں کسی کو دخل دینے بھی تو نہ دیتا..... لطف کی بات کہ وہ جو کچھ بھی اچھا بُرا سوچا کرتا' اس کے لیے نہ تو شرمندہ ہوتا اور نہ اُسے کوئی بُرائی یا گناہ گردانتا..... اُس کا فلسفہ تھا' میں صحیح طریقہ سے کاروبار کرتا ہوں' جھوٹ بولتا ہوں نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہوں۔ محنت اور ذہانت سے کام لیتا ہوں۔ میرا حق ہے کہ جو مناسب سمجھوں کروں' کسی کو بھی میری ذاتی زندگی یا معاملات میں دخیل ہونے کا حق نہیں۔ ایسے لوگ مضبوط دل گردے کے مالک اور اپنی سی کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ زندگی میں بے شمار کامیابیاں' دولت و شہرت سمیٹتے ہیں۔"

ویسے بھی حرام حلال' اچھائی بُرائی' گناہ وثواب' خوبصورت بدصورتی یا نفع ونقصان کا فلسفہ ہر اِک کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ اپنی اپنی عینک اور منظر! جس طرح عینکوں کے نمبر مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ہر کسی کے دائیں بائیں آگے پیچھے کے منظر' معاملات وحالات بھی ان کے اپنے مکافات اعمال وخیالات کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔"

اسے تو

مَیں خوب سمجھتا تھا۔ یہ فرغ زَرّیں میرے منڈوے منڈیر پہ اپنی مرضی سے نہیں اُترا...... اسے تو مشیتِ حقانی' ماں باپ کی بھیگی ہوئی دُعائیں التجائیں' فلکی و اَرضی استعانتوں کی مثبت لہریں' خیر و سلامتی کی رَو ائیں دھکیل دھکیل اِس رُخ لائی ہیں۔ جب پرندہ کسی دیوار باز ہیر یا جہاز درخت کی ٹہنی ٹہن نور پہ ٹِک لیتا ہے تو کچھ لے کر بھی جاتا ہے اور کچھ دے کر بھی...... کہ کارزار ہست و بُود میں کچھ وقوع پذیر ہو جانا خالی از علّت و مصلحت نہیں ہوتا۔ وہ بیٹھ کر اپنے پَر پنکھ پُھلاتا ہے' مُنہ منقار صاف کرتا ہے' ہیئت شیئت کے بعد دَم بخت ہو کے نزدیک و دُور' نیچے اُوپر' دائیں بائیں جائزہ لیتا ہے کہ اس کا رزق و رَوا کہاں رکھا چُھپا ہے......؟ اسی طرح کوئی سند مند پاتے ہی وہ اُدھر کا رُخ کرتا ہے۔"

اِس شاندار پرندے کو بھی کوئی باطنی گُن مُن اِس درویش کے دَر پہ لے آئی تھی۔ ظاہر ہے وہ کچھ لینے اور دینے آیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کسی ایسی لذت اور ایسے لُطف کا پتا مانگا تھا جو سگار اور شراب کے چسکے سے بھی بڑھ کر اور جس کا سُرور سرمدی اور اَبدی ہو۔"

مَیں نے اُس سے نوّے دن طلب کیے...... پکے تین مہینے...... جن کے دَورانیے میں وہ وُہی کچھ کرے گا جو اُس کے لیے طے ہوگا۔ مَیں جانتا تھا ایسے افراد جو اپنی بُرائیوں خامیوں کو چھپاتے نہیں...... جو کچھ بھی اچھا بُرا سوچتے یا کرتے ہیں' اس پہ پردہ ڈالنے یا غلط توجیہات پیش کرنے کی کوشش میں نہیں ہوتے...... کوئی معقول یا غیر معقول جواز نہیں گھڑتے...... خجالت محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی احساسِ تفاخر کی کوئی تحریک۔ تخی ان کے مزاج و موج میں شُخی یا خوش شاں پیدا کرنے کی مُوجب بنتی ہے؟

جمشید ملک سے یہ ایک انوکھا سا زبانی معاہدہ بڑی خوش اُسلوبی سے طے پا گیا تھا...... ان کے والد صاحب بڑے خوش اور مطمئن سے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید انہیں اُن کے مَن کی مُراد پوری ہوتے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ ماں باپ اپنے جگر گوشوں کے لیے اپنے دلوں میں بڑے نرم گوشے رکھتے ہیں۔ اگر اِس قصّے کو سمیٹنا چاہوں تو شاید اِس طرح ہوگا کہ جمشید ملک صاحب اِس وقت پابندِ شرع شریعت' ایک نہایت ہی ہر دلعزیز' سماجی' دینی اور کاروباری شخصیت ہیں۔ ماشاءاللہ! پہلے روز سے آج دس برس ہونے کو آئے۔ وہ باقاعدگی سے ہر روز عمومی اور ہر جمعرات کے دن خصوصی طور پہ لنگر کا اہتمام فرماتے ہیں۔ بڑے ملک صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ مَیں اُن کی آخری رسومات میں بوجوہ شامل نہ ہو سکا مگر اُن کا ایک خصوصی پیغام جو اُنھوں نے اپنی وصیت کے وقت لکھوایا تھا' مجھ تک پہنچا تھا۔ لکھا تھا' بابا جی! مَیں نے اگر اِس زندگی میں کوئی کام ایسا کیا ہو جس کا اجر مجھے بخشش کی صورت مل سکتا ہو' وہ سب سب کچھ مَیں آپ کو ہدیہ کرتا ہوں...... مَیں بڑے اطمینان اور سکون سے اپنے رَبّ کے پاس پہنچ رہا ہوں...... والسلام!

قارئین! ملک جمشید صاحب کا کہنا ہے..... بابا جی! قسم ہے اُس رازق و مالک کی دُنیا کی سب سے بڑی لذت اور چسکا لنگر تقسیم کرنا ہے۔ میں بھی اسی چسکے اور لذت کا اسیر ہوں..... اللہ کریم اس وظیفہ میں اپنی شراکت بھی ڈال دیتے ہیں۔ پھر آپ محض تقسیم کرنے والے رہ جاتے ہیں جبکہ اصل لنگر کھلانے والا اللہ کریم ہی ہوتا ہے۔"

اگر کسی نے جنت کی نعمتوں کے مزے نشے دُنیا میں حاصل کرنے ہیں تو وہ حسب استطاعت لنگر شریف کا اہتمام کیا کرے۔ مالک ورازق رزق روزی میں ایسی برکت ڈال دے گا کہ کبھی کسی کی محتاجی باقی نہ رہے گی۔ آزمائش شرط ہے؟

لنگر شریف بھی اک چشمۂ فیض کی مانند ہوتا ہے۔ میں نے کئی ایک ایسے مریضوں کو جنہیں حکیموں ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے کر میانی صاحب کے قریب رہائش پذیر ہونے کے عندیے دیے تھے مگر محض لنگر شریف کی تقسیم..... ہر لقمہ وگھونٹ پہ الحمدللہ اور موقع کے مطابق السلام علیکم کے وظیفے میں استقامت اختیار کرنے سے مولا کریم نے انہیں صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائی۔

بشری بیماریاں عارضے کجیاں کمزوریاں اور دیگر نفسانی رُوحانی پیچیدگیاں بھی اس کے لیے ضروری ہوتی ہیں کہ یہی اس کی اصل قوت ہوتی ہیں۔ انہی کے حیلے وسیلے سے یہ مجموعہ اضداد خانہ برانداز..... تلوّن وتلذذ خفقان ونسیان حرص وہوس کا بندہ ڈال ڈال کا پرندہ اپنے کینڈے میں رہتا ہے۔ ٹھوکر کھا کر سنبھلنا اور سنبھل کر ٹھوکر لینے اور گندوں کے بعد انڈے اور پھر ڈنڈے کھانے میں اسے بے پناہ آنند ملتا ہے۔ پرانے پھٹوں اور پرائے پھڈوں میں ٹانگ پھنسانے میں مزہ اور بار بار ایک ہی سوراخ میں اُنگلی ڈالتے ہوئے اسے اک گونا گوں سکون کا احساس ہوتا ہے۔"

یہ خیالوں خوابوں کے سرابوں خرابوں کے عذابوں اور خوش فہمیوں خوش گمانیوں کی گھمن گھیریوں میں گھرے رہنے میں زندگی محسوس کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک حد تک تو قدرے خوشگوار لگتا ہے مگر جب کبھی پھالا ذرا اُونچا لگ جاتا ہے تو گٹے گوڈے توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ایسے میں جب بات بس سے باہر ہو جاتی ہے تو بندے کی حالت صحرا میں بھٹکے ہوئے کسی شتر بے مہار کی طرح ہو کر رہ جاتی ہے۔

## ● اُونٹ رے اُونٹ تیری کون سی کل سیدھی.....؟

اُونٹ لاکھ طاقت والا اور خوبصورت جوان ہو..... مہار اور کسی مہارت والے شتربان کے بغیر اک

بے ڈھنگا جو پایۂ تخلیق ہے — صحرائی گھونس گھوڑی اسے اپنے آگے لگا لیتے ہیں اور پھرتی چوہیا چنڈول اپنے پیچھے!

قد و کاٹھ، چال ڈھال، اپنی فطری مدھم ماتھا اور قد و قامت کی بنا پر یہ ایک عجیب الخلقت جانور ہے۔ اونٹ سفید، سیاہ، سرخ اور بھوری یعنی سرخی مائل پیلا بھوری اور مٹیالے رنگ میں ڈھلنے لگتا ہے۔ بڑی عمر کی ہوتی ہے۔ ایک اور دو کوہانے بھی پائے جاتے ہیں۔"

اونٹ اور گدھا — یہ [illegible] کی سواری بھی رہے ہیں — کہتے ہیں کہ اونٹ پہ سے اونٹنے والا محفوظ رہ سکتا ہے مگر گدھے سے گرنے والا کبھی گر ضرور کھلواتا ہے۔ شتر اور خر دونوں ازلے سے ملائی ہیں موسیقی کو بہ ترتیب حدی اور [illegible] کی حد تک سمجھتے اور جانتے ہیں۔ شعرا نے اور نری طرح بہتانے کے علاوہ بے چارے کوئی اور سر سنگ جانتے ہی نہیں۔ ان دونوں کی ہزاروں خوبیوں پہ بھاری ایک خامی بھی ہے یعنی صنفِ مخالف کے معاملے میں ندیدگی انہیں دور نزدیک ان کی موجودگی کو سونگھتے ہی انہیں بے طرح سے دورہ پڑتا ہے کہ قابو رکھنا صاحب کا مشکل ہو جاتا ہے۔ مرگی کے دورے کا علاج جوتا سنگھانا ہوتا ہے مگر ان کی بے حیائی بے غیرتی کا دورہ ڈنڈوں سوٹوں سے ٹھکائی اور ان کی ماں بہن کے بارے میں زبانی کلامی تازیانے ٹھہرتا ہے۔"

اونٹ ریگستان کا جہاز کہلاتا ہے جبکہ یہ نہ تو ہوائی جہاز کی مانند لینڈ یا ٹیک آف کرتا ہے اور نہ سمندری جہاز کی طرح کسی مخصوص بندرگاہ پہ لنگر انداز ہوتا ہے یعنی اس کے پہیے ہوتے ہیں نہ چپو...!

پرانے شتربان اور گدھابان مشورہ دیتے ہیں کہ اونٹ کے آگے اور گدھے کے پیچھے کھڑا ہونے سے اجتناب برتنا چاہیے بلکہ گدھے کے عقب کے علاوہ دائیں بائیں حتیٰ کہ آس پاس بھی نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں تک تنبیہ کی گئی کہ اسے "حالتِ خلوت" میں بھی دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے کہ بہت سے ضروری اور غیر ضروری سوالات جو از خود دوران لطیفہ وطیفہ میں پیدا ہوتے ہیں ان سے بچا جا سکے۔

اسی طرح اونٹ کی بابت بھی الول جلول سی باتیں جن کے کبھی جواب کہیں سے نہیں ملتے۔ اگر ملتے بھی ہیں تو خاطر خواہ تسلی نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ وجہ ہے کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ پورے جہازی ڈھانچے میں ایک پرزہ ایسا ہی جو ڈھب سے ڈھلا ہوا لگتا ہے جیسے پورے کا پورا ادھار ٹھیکے پہ ڈھلوایا ہو — رگڑائی چھلائی صفائی نہ پالش — [illegible] قسم کی مصنوعات یہ واحد بے ڈھبا سا جانور ہے جسے اس کے ہم عصر بے ڈھنگے سگوں نے جنگل میں رہنے نہیں دیا۔ نکال صحراؤں کی جانب دھکیل دیا۔ ان کی سمجھ سے بالا تھا کہ یہ کھڑا تو آگے کی جانب ہوتا ہے منہ تا پیچھے کی طرف ہے اور یہ بھی کہ ایسا قد و کاٹھ ڈیل ڈول والا ناوتیوں کی مانند کب

بھی قدیمی نوادرات کی خرید و فروخت کے لیے مشہور ہے۔ جس ملک میں بادشاہت قائم ہو یا رہی ہو وہاں اس قسم کے بازار اور نوادرات کے کاروبار ضرور ہوتے ہیں۔ قدیمی نوادرات میں ایک نمبر اور دو نمبروں کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ اکثر بے وقوف قسم کے دولتمند دو پیسے کی چیز کو لاکھوں میں خرید لیتے ہیں۔ نوادرات کا کاروبار کرنے والے بلا کے چرب زبان' لپاٹیے اور ماہر نفسیات ہوتے ہیں۔ وہ پہلی نظر میں گاہک کی عقل' طلب' دولت کا پیمانہ سو فیصد درست اندازہ کر لیتے ہیں۔ گاہک اپنی جگہ بڑا ہوشیار' چالاک بننے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ ہزار طریقوں میں کوئی ایک طریقہ استعمال کر کے اسے پھانسنے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ گاہک اپنے تئیں سمجھتا ہے میں نے اسے لوٹ لیا جبکہ دکاندار بھی اپنے لٹنے کی اداکاری کر کے اس احمق کو لوٹ چکا ہوتا ہے..."

میں ادھر کسی کو لوٹنے یا خود کو لٹوانے نہیں آیا تھا... مجھے ایک سمت کا تعین کرنے والا کمپاس چاہیے تھا۔ مصر میں اور بہت سی چیزوں کے علاوہ وہ کمپاس بھی بہت اچھے اور منفرد بنتے ہیں۔ فرعونوں کے وقتوں کی قدیمی تکنیک! ... عجیب مخروطی سی قسم کی دھات کے بغیر ہی وجوب کی ایک چھوٹی ڈبی سی ڈبیا' اوپر مچھلی کے چھلکے کا شیشہ' اندر مچھلی کے کانٹے کا سمت نما...!

میں نے کچھ عرصہ پہلے مکہ مکرمہ میں ایک مصری کے پاس دیکھا... وہ میری دائیں جانب بیٹھا تسبیح رول رہا تھا۔ نماز میں کچھ دیر تھی' اس نے اپنی لمبی عبا میں سے ہاتھ ڈال کر کچھ نکالنا چاہا تو یہ سمت نما ڈبیا بھی باہر نکل آئی۔ مجھے کیا غرض کہ یہ کیا ہے' شاید وہ کچھ نکالنا چاہتا تھا۔ ڈبیا اور کچھ چیزیں سامنے ڈال کر وہ دوسری جیب میں تلاش کرنے لگا۔ اچانک میری نظر ڈبیا پر پڑی' یہ ویسی کالی تھی اور بے ڈھبی سی... بالکل جیسے نسواری ڈبیا ہوتی ہے۔ غور سے دیکھا تو مجھے اس دھندلے سے شیشے کے اندر ایک عجیب وضع کا چمکتا ہوا کانٹا دکھائی دیا' جو تھرک رہا تھا۔ میں تجسس بھری نظروں سے قدرے آگے جھک کر دیکھنے لگا۔ وہ مجھے پا گیا کہ میں اسے شوق سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے ڈبیا اٹھائی اور میرے سامنے رکھ دی۔ چمکتا ہوا کانٹا آگے پیچھے سرک رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا یہ پرانی مصری تکنیک سے بنا ہوا کمپاس ہے... جو کبھی غلط سمت نہیں بتاتا۔

بات کابل کے شہر بازار کی شروع ہوئی تھی... کابل بھی قاہرہ کی طرح ایک تاریخی قدیمی شہر ہے۔ قاہرہ فرعونوں' اہراموں' مقبروں' پیغمبروں' مطلق العنان شاہوں' خود ساختہ خداؤں' ساحروں' ملکاؤں اور خدائی نعمتوں' جشنوں' ... جو نیل کی سرزمین...! کابل سے بھی اس کی بہت سی قدریں مشترک ہیں' یہاں بھی بادشاہ' عظیم الشان روایات' تہذیب و تمدن' مجاہد' ولی' قطب' پہاڑ' ذرے دریا... معدنیات' اقتدار' مہمان نواز لوگ' ثقافت' تجارت' قصرات' دانشوران' علم و دانش کا ہیں... کیا نہیں جو کابل میں نہیں ہے...؟

میرا طریق رہا کہ میں جدھر بھی پہنچا ـــــ ضروری مصروفیات سے فراغت ملتے ہی ادھر کی مساجد، مزارات، علمی اداروں، قدیمی عمارات اور بالا بالا گھروں تک ضرور پہنچتا ـــــ اس کے علاوہ ادھر کے قدیمی بازاروں میں بھی بطورِ خاص جاتا ـــــ لہٰذا دیکھا تو ایک طرف ان قدیمی بازار، پرانی دکانیں، بیچ کھچے کھنڈرات ـــــ کسی بھی شہر کی قدامت، ثقافت، تہذیب و تمدن، علم و دانش کا آئینہ ہوتے ہیں ـــــ!

کابل کے اس قدیمی بازار کا کل وقوع دیکھ کر ازمنہ قدیم کی کوئی بستی نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔

صدیوں پرانی طرزِ تعمیر، چوب پتھروں کے در و دیوار، کھڑکی روزن و در بیچے، محرابی چھجے، طاق و طرح تختے تختوں والی دکانیں جن کے زور بروکشادہ و والان ـــــ قالینوں اور غالیچوں پہ نشست، قہوان، پرانی طرز کی چوبی الماریاں ـــــ بوڑھے، مضبوط کاٹھیوں گھنی داڑھیوں والے بارعب افغان دکاندار ـــــ سرخ رنگ چمکتی ہوئی مٹھائی، آنکھیں اور سروں پہ بھاری پگڑ ـــــ چہروں مہروں پہ کاروباری امانت کی دمک ـــــ میٹھی دھیمی زبان ـــــ کا کچھ خریدے نہ خریدے ـــــ آؤ بھگت پوری، خشک میوہ جات، میکاریں، چھوڑتا ہوا گرم گرم قہوہ ـــــ!

ان دوکانوں پہ بجا بجا صدیوں پرانی مختلف نوع کی اشیاء، مصوری کے شہکار، پرانے ہتھیار، آرائشی سامان، قالین، غالیچے، سونے چاندی، چینی مٹی کے ظروف، آلات حرب و ضرب، موسیقی سے متعلقہ سامان، قرآنِ مجید و ذکر اذکار کے لیے آلات ـــــ زیورات، عصا، چھڑیاں وغیرہ ـــــ!

مجھے یہاں سے کسی پرانے عصا کی تلاش تھی۔ افغانستان کے بادشاہوں اور زر و ساہو خواتین میں رواج تھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں قیمتی نایاب قسم کا عصا رکھتے تھے یعنی اشرافیہ میں ہاتھ کا عصا، کچھ کا حصہ اور روز مرہ میں شامل تھا۔ وقت کے ساتھ جب میری کمر میں قدرے جھکاؤ اور طبیعت میں سنجیدگی آئی تو عصا تھامنے کا شوق بڑھا ـــــ مجھے پہلا عصا دین ماتھے اجمیر شریف سے ملا تھا۔ دوسرا عصا، میرے میرے ایک بیٹے نے تحفہ میں دیا ـــــ تیسرا عصا، نقاوی چشتی سلسلے کے بزرگوں سے عطا ہوا ـــــ پھر یہ ”سلسلہ عصاں“ چل نکلا اور میری ذات کا ایک نمایاں حصہ بن گیا۔“

انواع و اقسام کے بہت سے عصا، جب جمع ہو گئے تو میں نے بھی آگے ”عصا دلائق“ احباب میں تحفے دینے شروع کر دیئے۔ عصا، نقدی، چھڑی، ٹوپی، بیٹ، پگڑی، چادر، رومال، عینک، قلم، جوتا، جراب وغیرہ بھی لباس کا حصہ ہوتے ہیں اور لباس کسی بھی فرد کی پہچان اس کی شخصیت، ذات، اوقات اور روایات، وہم تہذیب، قوم و نسل کا تکمیل ہوتا ہے۔ کچھ مقبل تو کم و بیش سب میں ہوتی ہے مگر اصل اور اک گیان کی گدھک تو ہر سر اٹھائے ہوئے پہاڑ کے پیٹ میں نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر آنکھ سے بہنے والے آنسوؤں میں اس کی دیکھ و ملاش ہوتی ہے۔

لباس پہننے والا ہر کوئی اس ادراک کا اہل نہیں ہوتا کہ اس کے تن پیکر پہ کون سا پہناوا اسے پرشکوہ بناتا ہے یا کون سا پیرہن اسے پراچین کا ہاتھ سے یا پیالے کا چغت دکھاتا ہے۔ مجھے جلد ہی ادراک ہو گیا کہ میرے ہاتھ میں کیسا عصا ہونا چاہیے؟ میرے جیسی سطحی عقل بوجھ رکھنے والے تو یہ تک نہیں جانتے کہ ان کی طبیعت بلغمی ہے یا بادی؟..... عقل داڑھ کب نمودار ہوتی ہے۔ نزلہ زکام کوئی بیماری نہیں کیفیت ہے۔ آنکھ جو بھی دیکھتی وہ اتنا دیکھتی ہے۔ سیدھا پیچھے دماغ کے پردے پہ ہوتا ہے۔ بندر کے دو دماغ ہوتے ہیں۔ ماموں اور بھانجے کو رات کے وقت اکٹھے سفر کے لیے نہیں نکلنا چاہیے۔ سالے بہنوئی کو کسی کاروبار میں شراکت نہیں کرنی چاہیے۔ بیوی کا جھوٹا کھانا کھالینا محبت اور صحت ہے مگر اس کا چھوڑا ہوا پانی نہیں پینا چاہیے۔ جوتا ٹوپی اور آزاربند کے ہوئے نہیں ہونے چاہئیں۔ سونا سرخ رنگ شلوار مسوڑ فیروزی گیا اور ریشمی لباس..... تمہاکو کش تیز تیز حرکت کرنے والی آنکھوں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی عورت کیا ہوتی ہے؟..... اور ہاتھ کی چھڑی عصا انگوٹھی انگشتری کو کون جانے گا؟..... یہ چابک اریاں واقعتیں اور کیوں دھیان تو دھر ماتھاؤں اور عصا تاؤں کا پرکانں ہوتا ہے۔''

اب مجھے کسی ایسے عصا کی تلاش تھی جسے دیکھتے چھوتے ہی مجھے احساس ہو جائے کہ اسے بھی میری کھوج تھی اور میں اسے تھاموں تو یہ مجھے کسی انجانے سفر کی جانب لے جائے کہ عصا ہمیشہ ایک کام آگے کی خبر لاتا ہے۔''

قونیہ شریف بغداد شریف دمشق شریف نجف اشرف تاشقند سمرقند بخارا اجمیر شریف ملتان و بصرہ مصر و سوڈان قم و مشہد بیت المقدس جدہ..... علی خط الاقتباس..... انھیں نے ہر اس جگہ پہ ایسے عصا کو تلاش کیا جدھر سے مجھے امید ہو سکتی تھی مگر یہ نظر نہ آیا..... بے شمار قیمتی نادر و نایاب قدیمی..... ایسے ایسے کہ یہ فلاں بادشاہ کا ہے فلاں مفکر و فلاسفر کا..... سائنسدان کا ہے۔ سونے چاندی ہاتھی دانت گینڈے کے چمڑے سے بنے ہوئے آبنوس چندن بید مجنوں شاہ بلوط ہیرے جواہرات سے مزین..... تیکھی سناں اور گولی والے..... شمشیر بارہ خنجے جنگلی ساگوان کے پھولوں کے دستے والے..... ساحروں جرنیلوں امیروں وزیروں سے متعلقہ..... امیر تیمور راجہ رانا سانگا راسپوٹین راجہ رنجیت سنگھ نپولین بونا پارٹ مہاتما گاندھی میر عثمان سر آغا خان سر ونسٹن چرچل سر واٹسن چارلی چیپلن الفرڈ ہچکاک شیخ عبداللہ نواب آف رام پور رنجیت سنگھ بیر بل اور لوڈرل امان اللہ خان ظاہر شاہ محمد علی پاشا سنگھ فاروق امیرس وغیرہ کی چھڑیاں چھتریاں ہیٹ دستانے سگریٹ ہولڈر اور پائپ..... عینکیں اور گھڑیاں کف لنکس ٹیبل رومال فونٹین پن ہیرے بیٹ اور سونگھنے والی نسوار کی ڈبیاں..... شطرنجیں مہرے اور چائے کافی کے کپ شراب پینے کے ظروف اور واسکٹ..... جس میں بال

ناخن کاٹنے رگڑنے، کھوے نتھنے صاف کرنے، کان کا میل نکالنے، ناک اور چہرے کے فاضل بال کھینچنے والے موچنے اور دانتوں کی درزوں سے چھلکے، ریشے نکالنے والی سلائیاں ہوتی ہیں۔ ایک چھوٹا سا زیور بھی ہوتا ہے ــــ یہ آلات حسب حیثیت تانبے جیسے چاندی اور سونے کے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ مصنوعی دانت، بال، ہاتھ پاؤں نقلی کرتے اور بول و براز کی چیزیں بھی ... غرضیکہ نوادرات کے مراکز میں اسی نوع کی اصلی نقلی اشیاء کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ گاہک دکاندار خریدار کے ذوق و شوق، جیب و حیثیت کے مطابق لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں۔

ان مراکز میں "داؤ لگے" کے کاروبار ہوتے ہیں۔ کسی نو دولتیے بیوقوف کی نظر پہ چڑھ جائے تو وہ ٹکے کی پیالہ اور منحوس چیز، لاکھوں میں اٹھ جاتی ہے اور کھوٹی بھی نادر و نایاب اشیاء جو دکاندار کی بے حسی، ناواقفیت کی بنا پہ برسوں پڑی سڑتی ہیں۔ جگہ خالی کرنے کی غرض سے دکاندار کوڑیوں میں اٹھوا دیتا ہے۔

کمان اور عصا کی جستجو میں خوار ہوتے ہوئے میں ایک دن شاہ بازار کابل میں جا نکلا ــــ مجھے ادھر پہلے ہی پہنچنا چاہیے کہ افغانوں اور دیگر متقدر خوانین و اشراف ہاتھ میں نمایاں طور پہ چھڑی یا عصا کا رواج پایا جاتا ہے۔ جیسے انگریزوں کے دور اور آج بھی اونچی نیچ کے سرکاری افسروں کے ہاتھ میں چمڑا چڑھی چھڑی یا بید کی لکڑی ہوتی ہے جو ان سرکاری حیثیت اور دبدبے کی دلیل ہوتی تھی۔

"جب ملک یا شہر میں نت بھانت کے سیاحوں، غیر ملکیوں کی آمد و رفت زیادہ ہوتی ہے وہاں خاص طور پہ کرائے کی گاڑیوں، ہوٹلوں، طوائفوں اور ہینڈی کرافٹ نوادرات کا کاروبار عروج پہ ہوتا ہے۔ کابل بھی اپنے تاریخی، سیاسی، جغرافیائی اور ثقافتی پس منظر میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل رہا ہے۔"

جب میرا کابل اترنا ہوا تو روسی وہاں سے مراجعت کر چکے تھے اور امریکی وارد ہو رہے تھے۔ روسیوں کی ہر نوع کی "باقیات" سے کابل اٹا پڑا تھا۔ بچے بوڑھے جوان ــ نے دیکھو کھود کھود روسی مال غنیمت سمیٹے ہوئے ہے۔ باہر سے جب کوئی استعماری قوت کسی ملک پہ یلغار کرتی ہے تو وہ اپنے مقصد کی بر آوری کے لیے ہر وطیرہ و طریقہ کر کے وہاں پہ اپنے نشان چھوڑ کر واپس چلی جاتی ہے۔ تباہی بربادی کی شکل میں بہت کچھ دے جاتی ہے مگر جو کچھ دے جاتی ہے اور یہ وہ کچھ ہوتا ہے جو پہلے ادھر نہیں ہوتا۔ اصول فطرت ہے کہ تخریب کا دوسرا رخ تعمیر ہوتا ہے۔ اسی طرح تعمیر کے اندر بھی کہیں بگاڑ پیدا اور پا ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ افغانستان ہمیشہ جنگ و گری کا شکار رہا ــ مگر زندہ رہا ــ ہر آفات کے بعد اس کے اندر نئی توانائی پیدا ہوئی۔ اس کے حوصلے فراخ ہوئے، اس میں آبرو مندانہ انداز میں جینے کی نئی امنگیں پیدا ہوئیں۔"

شاہ بازار جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ قاہرہ کے خان بازار کے انداز کا ایک عجوبہ سا بازار ہے۔

بولا۔ ''اناڑی! تم سب ہی مرے قصائی ہو، کام کے نہیں'' ۔۔۔ یہ کہہ کر بکرے کو بچھاڑنے، ذبح کرنے کا دعویٰ کرتے ہوئے جوش میں آ کے، اور انگلیاں بچا بچا کر بڑی قوت سے بکرے کو دھکا دیا۔ پھر کھڑے کھڑے ایک دولتی بازو پر ... میں پھر آہستہ آہستہ پیچھے سے چل چل کر قریب پہنچا، یکدم پہلو بدل کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ بکرے کی سمجھ سے بالا تھا کہ یہ الّو کا پٹھا کر کیا رہا ہے؟ پہاڑی بکرا تھا سیدھی سادی بکرانہ سوچ کا مالک۔ بکرا اسی شدومد میں چونکا ہوا تھا کہ اس شخص نے جھپٹ کر اس کے اوپر سواری کر لی۔ بکرا جز بز ہو کر بھاگا تو وہ اس کے پیچھے اس طرح سے گرا کہ اس کے مضبوط ہاتھ بکرے کی کمر کے لمبے لمبے بالوں پر پڑے اور وہ پیچھے پیچھے گھسٹتے ہوئے گھسٹ رہا تھا۔ ادھر بکرے نے جان چھڑانے کی غرض سے پچھلی دونوں ٹانگیں کھڑی کر کے اسے دھر دیں۔ گدھا گھوڑا پچھلی ٹانگیں مارتا ہے مگر بکرے کا یہ کام نہیں، وہ سینگوں یا ماتھے کی ٹکر سے مقابلہ یا حملہ کرتا ہے۔ مگر جب جان پہ بنی ہو اور کچھ سمجھ میں بھی نہ آئے تو کچھ بھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔

کبھی کبھی تو غیر متوقع بھی سرزد ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ ادھر بھی ہو گیا۔ بکرے کا ایک تو پیا مضبوط کھر اس کی ٹانگ پر ہتھوڑے کی مانند پڑا، وہ لڑکھڑا کر گرا چت ہو کر پلٹ گیا۔ دوسرا کھر وہ اس قصائی بچے کے زیر ناف ''ایدوں'' پہ پڑا۔ جس کی پاداش میں یہ عمر بھر کے لیے مخنث ہو کر تو بکرا بن گیا۔ نتیجے میں اس ظلم کے سبب پہاڑی بکرے کو ذبح کرنے کی بجائے فروخت کر کے رخصت کر دیا گیا۔''

یہ معاملہ بھی ایسے ہی ''زورِ بیتی بکرے'' کی طرح کا تھا جسے ذبح کرنا کم ازکم ان ''بازاری قصائیوں'' کے بس کی بات نہ تھا۔ مرے ہوئے کو کوئی کیا مارے گا، جو پہلے ہی لٹ پٹ چکا ہو اسے کوئی کیا لوٹے گا؟

بہت سے آئے بہت سے چلے گئے۔ بازار سے گزرتے ہوئے دکانوں اور نمائش کے لیے رکھی ہوئی اشیاء پہ نظر ضرور ڈالو۔ کچھ مطلوب چیز تک پہنچ پاؤ ۔۔۔ مگر کبھی بھول کر بھی دکاندار کی آنکھوں میں آنکھیں مت ڈالو ۔۔۔ یہ دکاندار نظروں ہی نظروں میں نظر بندی کر کے بھولے بھالے گاہک کو نقلی چیز بھاری دام کے عوض خریدنے پہ آمادہ کر لیتے ہیں۔ زیادہ تر دکاندار چرب زبانی، خوش بیانی اور موقع شناسی سے کام لیتے ہیں۔

ایک ہوشیاری ہوتی ہے اور ایک ہوتی ہے چالاکی! اس سے آگے بڑھیں تو عیاری اور مکاری! یہ تو ہم برائیاں یا اچھائیاں ۔۔۔ خوبیاں یا خامیاں کسی نہ کسی شکل انداز اور مقدار میں ہر ذی نفس یا یوں کہیں کہ ہر جاندار میں ہوتی ہیں۔ یہ جبلت و سرشت کا خاصہ ہیں۔ زیادہ تر دکاندار ضرورت سے بہت زیادہ ہوشیار، چالاک اور عیار و مکار ہوتے ہیں اور بہت بڑے اداکار بھی! سادہ و بھولے بھالے گاہک ان کو سچا شخص، اچھا دکاندار اور جائز منافع حاصل کرنے والے سمجھ لیتے ہیں۔ یہی دکاندار کی اداکاری اور مکاری چالاکی ہوتی

ہے۔ شاید آخر وہ فیصلہ اپنے کاروباری لوگ بھی ہوں گے جو حق جائز منافع اور رزق حلال کے حصول پر ایمان رکھتے ہوں گے؟

میں کوئی آدھ گھنٹے سے دائیں بائیں اپنے مطلب کی کوئی دکان تلاش کر رہا تھا۔ دکانوں کے باہر والانوں برآمدوں میں بھانت بھانت کے ملکی غیر ملکی نوادرات، تانبے پیتل کے برتن، کمانیں، اسلحہ، حنوط پرندے درندے اور دھاتی ظروف بھرے پڑے تھے۔ غیر ملکی سیاح جابجا گھومتے اور دکانوں کے اندر باہر دکھائی دے رہے تھے۔ کابلی افغانی بوڑھے بڑے دبنگ اور مضبوط ہوتے ہیں۔ سرخ و سپید رنگت، فربہ جسم، چاک و چوبند، بے حد مہربان، خوش خلق اور وضعدار... زیادہ تر ایسے ہی بوڑھے دکھائی دے رہے تھے جو ان دکانوں پہ نمایاں جگہ بیٹھے تھے۔

یہ ہفت زبان ہوتے ہیں... انگریزی، جرمن، فرانسیسی سمجھ بول لیتے ہیں۔ پشتو فارسی اردو ہندکو وغیرہ تو گھر کی لونڈیاں ہیں... ترکی اور عربی میں بھی خاصا منہ مار لیتے ہیں۔ نسوار، سوکھی خشک اور قہوہ یہ تین علتیں! بوڑھا ہو یا جوان، مہمان ہو یا میزبان، رزق کی بات ہو یا حکمرانی، ہر جگہ موجود ہوتی ہیں۔ مہمانداری، دکانداری، دشمنداری، نشست یا سواری... یہ چاروں ہر جا پائی جاتی ہیں۔

اچانک میری نظر ایک شاندار سے بزرگ شکل پہ پڑی جو اپنے روایتی لباس اور سکھ شاہی والی کج و دھج کے ساتھ تخت نما دیوان پہ براجمان تھے۔ پگڑی پہ پنج کلغی، سپید دراز داڑھی، بڑی بڑی گھنی مونچھیں، کالا سیاہ لباس، موٹی چمکتی ہوئی آنکھیں، سرخ ہونٹ، مضبوط جبڑا، کمر کس میں اڑسی ہوئی کرپان... وہ ایک بے پناہ جاذب نظر شخصیت تھے۔ سیاہ رنگ کے کمرے نما تنگ موری پاجامہ، کمر سے دار پگڑی... وہ کسی سکھ پنتھی کا گرو دکھائی دیتا تھا۔ میں بن سوچے سمجھے اس کی جانب بڑھ لیا۔

"پلیتھی وی و دھائی" شاید یہی شبد تھے جو گورمکھی، انگریزی، جرمن، پرشین اور گورمکھی میں ایک بڑے سے پیتل کے بورڈ پہ کھدے لکھے تھے۔ گوردوی کی بے کا نشان بھی نمایاں تھا۔ مجھے اپنی دکان کی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ بزرگ اپنے استھان سے اٹھے اور بازو وا کیے، سینہ بھرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

اگر کوئی شخص اپنا ہاتھ کھول کر آگے بڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے وہ آپ سے مصافحہ کرنا چاہتا ہے اور جو دونوں بازو کھول کر خود آپ کی جانب لپکتا ہے، سینے سے لگا کر دلوں کی دھڑکنوں کی بازگشت سننا اور سنانا چاہتا ہے۔ مزید اگر یہ سب حرکتیں کوئی دکاندار کسی گاہک کی آمد پہ کرے تو اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ یہ کہ اس کی مرغی سونے کا انڈہ اور لذیذ گوشت دونوں دے گی۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کو اپنا اصلی نقلی مال بیچنے والا آج خود بے مول تول کسی کے پاؤں میں بچھ جانے پہ آمادہ ہے۔"

نفس نے چند ایک ایسے انسان بھی دیکھے جو بازار میں خریدنے گئے۔ آگے دکاندار اپنا مال کہ اُن کے ہاں خود کو نذرانہ پیش کر آئے۔ کچھ یوں بھی کوئی ایسا گاہک آیا کہ دکان دار نے سامان تیاگا، سر جھکائے اُس کے پیچھے ہو لیے.... طلب اور طلبگار، دکاندار، خریداری، کوچہ و بازار.... گل و گلشن، دشت و صحرا، تشنہ و دار، راوی ستار، جمنا کے پار، کالوں کے بالے، بس کے پیالے وغیرہ وغیرہ سبھی تو موجود ہے اس دنیا میں.... جس کی جو جستجو ہو، سچی طلب اور خلوص.... اور پھر اس کے لیے مقدور بھر عملی کوشش.... اور دعا بھی۔ اللہ کریم! جو نفس کہ ملتا تھا گزر را اب آگے جو تیری مشیت....!

اس بزرگ کو دیکھتے ہی مجھے کھٹک گئی تھی کہ ادھر آج ذات پڑنے ہی پڑے.... وہی ہوا وہ آگے بڑھ گئے اب میری کیا مجال کہ میں ان کی جانب نہ بڑھتا۔ اُدھر بڑھتے ہوئے یہ بھی گمان گزرا شاید انہیں پہچاننے میں کوئی غلطی ہوئی ہو۔ مجھے اپنا کوئی پرانا محرم سمجھا ہو جو اک زمانہ کے بعد اچانک انہیں دکھائی دیا ہے.... پھر اک تجربہ کار دکاندار کی طرح انہیں اندازہ ہو گیا ہو کہ میں ان کے کام کا گاہک اور وہ میرے مطلب کے دکاندار ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب وکھنے جو کوئی اور وجہ ہو جس کا جاننا سر دست میرے لیے ضروری نہ تھا۔"

میرے ساتھ تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا رہتا ہے کہ منزل پہلے مل جاتی ہے اور سفر بعد میں شروع ہوتا ہے۔ معاوضہ، انعام پہلے، کام اور انجام بعد.... میرا تو بڑھاپا پیدا ہوتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ پھر بتدریج ختری، لڑکی، ادھیڑ عمری، جوانی، لڑکپن، چھٹپن، بچپن سے واسطہ پڑتا گیا۔ اب تو شیرخواری کے وقتوں کے عرصے چھک رہا ہوں۔ اس طرح سے میری نسبت کا ایک سلسلہ "سلسلہ معکوسیہ" کی جانب بھی نکلتا ہے؟

"تمہیں صدقے تمہیں واری اپنے باپ دے....!" یہ شعر یا شبد انہوں نے میرے لیے ہی کہے۔
جب رخ میری جانب تھا تو مخاطب بھی میں ہی تھا۔ ان شبدوں میں "باپ دے بیری" کے بچنے کا شبد تھا۔

سیالکوٹ کے ایک قدیمی قبرستان میں بیری کا ایک درخت ہے۔ مستند روایت کے مطابق بابا جی گورونانک نے اپنے ایک روحانی سفر کے دوران اس بیری کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر ایک پہر آرام فرمایا تھا۔ آپ کی برکت سے اس بیری کا پھل نہ صرف میٹھا لذیذ ہوا بلکہ بہت سے عوارض کے لیے تریاق بھی ثابت ہوا؟ اس مقدس بیری کا تذکرہ پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔"

میرے بچپن اور لڑکپن کا بہت سا وقت اس قبرستان، خاص طور پر اس مقدس بیری کے درخت کے گزرا.... یہ زمانہ وہ تھا جب میں عمر میں بہت چھوٹا تھا.... یہ تو مجھے یاد نہیں کہ بابے کی بیری سے میری پہلی رسائی یا باریابی کب اور کیسے ہوئی مگر یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب پہلی بار اُدھر گیا ہوں گا تو صرف

اور صرف بیروں کے چکر میں ...! یہ وہی زمانہ تھا جب ہم سب ہم عمر دوست مل کر امرود، جامن، آم اور طوطوں کے بچے انڈے چرانے اڑاتے، ہاتھوں، ڈھیلوں اور سرکاری درختوں پر اجتماعی یلغار کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی انفرادی طور پر بھی کسی چوری کے پھلوں سے پیٹ بھرنے اکثر جایا کرتے۔

یہ بابے کی بیری والا قبرستان بالمیک جو جموں توی سے اٹھتا ہے، سیالکوٹ کے مشرقی کنارے کو چھوتا ہوا آگے نکل جاتا ہے کے کنارے واقع ہے۔ لمبا چوڑا گورستان بہت پرانا اور پُراسرار ہے۔ بہت سی سچی جھوٹی کہانیاں اس سے وابستہ ہیں ... مگر یہ بابا گورونانک والی بات سو فیصد سچی ہے۔ اس قبرستان میں اور بھی بہت سے برگزیدہ بزرگوں کے مرقد ہیں جو مرجع خلائق ہیں۔"

اس مخصوص بیری کے درخت کے متعلق ایک عجیب سی روایت زبان زدِ خاص ہے کہ اس کی بنیادی گٹھلی جس سے اس درخت کی پیدائش و پرداخت ہوئی وہ عرش کی مقدس بیری سے جھڑ کر اس جگہ گری۔

بابا جی گورونانک اس کے سائے تلے فروکش ہوئے تو شاید اس کی یہی وجہ تھی۔ ان کے گیان دھیان میں جو توحید کی خوشبو پیدا ہوئی اس کی اصل وجہ اس بیری کا پرکاش بھی ہو سکتا ہے ... واللہ علم بالصواب!

جس زمانہ کا میں نے ذکر کر رہا ہوں تب اس درخت کی وضع قطع بڑی پُراسرار اور انوکھی سی تھی۔ ایسا عجیب و غریب درخت کبھی دیکھا نہ تھا۔ لگتا تھا جیسے یہ اس زمین کی پیداوار نہیں ... کہیں اور سے اکھاڑ کر یہاں گاڑ دیا ہے۔ اس وضع قطع کے مقدس درخت اجمیر شریف، کلیر شریف، بابا بلھے شاہ، بی بی پاکدامناں، گنج شریف، پاک پتن شریف اور دیگر مزارات مقدسہ پر آج بھی موجود ہیں ... ایسے شجر بھی بزرگ ہوتے ہیں، وہ صدیوں سے صاحبِ مزار کے تصرف سے پائندہ ہیں۔ ان کی زیارت کرنا، سائے میں بیٹھنا ... عقیدت سے چومنا بھی باعثِ فرحت و برکت ہوتا ہے۔"

مجھے جب اپنی بے ہودہ حرکتوں، شرارتوں اور چوریوں چکاریوں پہ گھر سے "پھٹ" پڑتی تھی تو میں منہ بسورتا، روتا اور اپنے دکھتے ہوئے "پاسے" سہلاتا ہوا بابے والی بیری تک جاتا اور اسی بیری کے ماں کی سی گود کی طرح کے بیٹھے ہوئے تنے کے تنوں سے لگ کر نیم دراز ہو جاتا ... ٹھنڈی ہوا اور تنہائی کے زور سے آنکھیں جڑ جاتیں تو کچھ دیر کے لیے ادھوری جھپکی لے لیتا۔ کئی بار محسوس ہوا، بابا جی نورانی ہاتھوں سے میرا جسم سہلا رہے ہیں۔ ان کی لمبی گھنی داڑھی میرے چہرے پہ گدگدی اور میٹھی میٹھی سانسوں کی مہکار مجھے شاد کام کر رہی ہے۔"

"اب میں اکثر ادھر جانے لگا۔ تقسیم سے قبل کا یہ زمانہ بڑا امن دار اور بھلا بھلا سا تھا۔ سب لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ اپنی من بھاوتی زندگی گزارتے۔ ذات پات، مذہب، مسلک، چھوٹے بڑے، امیر غریب سب

''ارے بھولیا یونہی! پریم اور پریت میں دھرم ذات نہیں کرم اور کرت دیکھے پرکھے جاتے ہیں۔''

کیا سمجھتا کہ اس سکھ نے مجھے کیا کہہ دیا ہے! البتہ یوں لگا جیسے میں اُن کے کہے کا مافی الضمیر پا گیا ہوں۔ مزید انکشاف کیا۔

''تم سے پریم ساری سنگت آتی ہے اور یہ سنگت گرو پیاروں میں پیدا ہوتی ہے۔''

کابل کے شاہی بازار کے اس بزرگ سکھ نے جس تپاک سے اُٹھ کر آرتے میرے لیے اپنے بازو وا اور سینہ کشادہ کیا وہ میرے لیے خاصے اچنبھے کی بات تھی۔ جو اُس وقت میری سمجھ میں تو نہ آئی مگر بعد میں جب سمجھ میں آئی تو اُس بابے دی پھیری والے سکھ کے پریم ساری سنگت والی بات سے زیادہ تعجب خیز تھی۔ اس پھیری والے سے تو گاہے میری ملاقات رہتی تھی مگر یہ کابلی بزرگ تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔''

محبت ہو یا عقیدت اس کی گرمی میں جب کسی گرم مشروب کی حدت شامل ہو جاتی ہے تو بات ہو یا ملاقات دو آتشہ ہو جاتے ہیں۔ مجھے انہوں نے باہر ڈیوڑھی کی تھڑی کی بجائے دکان کے اندر ایک سیاہ سبز رنگ والے دبیز قالیچے پر اس طرح بٹھایا تھا جیسے بارات کے دن سسرال والے دولہے کو اہتمام سے سنگھاسن پر نشست کراتے ہیں۔'' اس وقت دولہے میں اک عجیب نخوت در آتی ہے' وہ خود کو کوئی مہاراجہ رنجیت سنگھ یا مقدر کا سکندر تصور کرتا ہے۔ مگر میری حالت یوں نہ تھی...... میں تو گہری شرمندگی کی دلدل میں دھنسا جا رہا تھا۔ اُن کے اشارے سے ایک بالکے نے جو انسان سے زیادہ کوئی کستورا ہرن لگ رہا تھا میرے سر پہ کھڑا میزبانی کرنے لگا۔ ویسے اس بالکے کا جبلی جوڑ کستورا ہرن ہی تھا۔

سوہنگی طاؤس اور میوہ رکھیل کا پیالہ...... پاتھن بیچے بندہ کو اندر سے اندر سا کر دیتے ہیں۔ میں بھی جلوہ میں جھلا سا ہو رہا تھا کہ ایک افغان ملازم نے خشک میووں بھرا طشت آگے رکھ دیا۔ خشک میووں کا حقیقی مزہ وہیں ملتا ہے جہاں کی یہ پیداوار ہوں...... چلغوزے، کباب، چلغوزہ، اخروٹ، آڑو، ناشپاتی، انگور، سیب، سنگترہ، پستہ، میوہ، انگور، آلو بخارا، کشمش، کھجور، شریفہ، شہتوت، ناریل، نمو...... آم، آلوچہ، امرود، انار، انجیر، املی...... ان نعمتوں کا اصل لطف ان کے گھر کے آنگن میں بیٹھ کر ہی کھانے میں آتا ہے۔ جیسے مچھلی جھینگے وغیرہ اگر سمندر یا دریا نہر کے کنارے کھاتے ہیں تو اور مزہ ہے۔ مگر یا کسی ریسٹورنٹ میں کھاتے ہیں تو کچھ اور...!

مسجد میں نماز کی کچھ اور حضوری ہے' گھر میں نماز ادا کرتے کچھ مختلف کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح مہمان بھی بہت طرح کے ہوتے ہیں' کسی کے آنے کا اشتیاق رہتا ہے اور کوئی ایسے بھی کہ ان کے جانے کا انتظار ہوتا ہے۔ کوئی دل کا مہمان' کوئی آنکھوں کا...... کوئی مطلب کا اور کوئی رشتے کا...... اسی طرح میزبان بھی

کوئی کوئی ہی ہوتا ہے۔"

اس دکان میں پہنچ کر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں کوئی عام مہمان یا گاہک نہیں اور نہ ہی میرا میزبان کوئی عام تاجر ہے اور اگر وہ دکاندار بھی ہے تو اس طرز کا جو بن مول، خود کو خریدار کے قدموں میں ڈال کر اپنے آپ کو نذر کر دے۔!

یہ بزرگ میرے سامنے بیٹھے مجھے یوں دیکھا کیے جیسے میں اُن کا محبوب ہوں اور ایک زمانے کے بعد پردیس سے واپس پلٹا ہوں۔ جو نگاوٹ اور خلوص و محبت ان کی آنکھوں میں دکھائی دے رہی تھی وہ صرف اور صرف اُن نینوں میں ہوتی ہیں جنہیں کسی پی کا انتظار ہوتا ہے۔ میں خاموش سا اپنے ارد گرد پڑی ہوئی نادر اشیاء کو دیکھنے لگا کہ جس مقصد کے لیے ادھر کاشی اور اس بازار میں آیا ہوں وہ شے ادھر ہے یا نہیں۔ مقصد تو ادھر پہنچنے کا یہی تھا کہ میرے مطلب کی کوئی پرانی نادر سی چھڑی، عصا یا کوئی کمپاس مل جائے جس کے زیادہ تر ملنے کے امکانات کاشی کاشی اور خاص طور پہ اسی بازار سے تھے۔"

وہ بزرگ اپنی نشست سے اُٹھے اور ہاتھ جوڑتے ہوئے مجھ سے دکان کے پچھلے حصے میں جانے کی آگیا چاہی۔ مجھے بھی موقع ملا۔ میں اُٹھ کر مختلف نوادرات دیکھنے لگا جو میرے مطلب کے نہیں تھے... دیکھتے دیکھتے مجھے ایک صاف شفاف دانی جیسی چاندی کی ڈبیا دکھائی دی جس پہ کندہ نقوش استعمال زمانہ سے مدھم پڑ چکے تھے مگر ایک مغلیہ مہر ہنوز نمایاں تھی۔ میں شیشے کی الماری کے قریب ہو گیا تاکہ غور سے دیکھ سکوں۔ ایک شیر اور ہرن جس کے دو سینگ خم دار اور دُم کھچے دار تھی۔ اشرفی برابر گولائی کی یہ مہر جہانگیر کی قدیمی حکمرانی کی تھی جس کے عہد میں سونے چاندی کے ظروف اور آرائشی اشیاء پہ کندہ کاری کا فن اپنے عروج پہ ہو گا؟"

نادر اشیاء سے بھری ہوئی آدھی الماری جس پہ موٹا شیشہ لگا ہوا تھا... ایک ایسے عجیب و غریب قفل سے پابند کی گئی تھی جس کا شمار بھی نادر اشیاء میں کیا جا سکتا تھا... کیونکہ میں نے ایسا قفل اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔" کہتے ہیں جو چیز عجیب و غریب اور پُر اسرار ہوتی ہے وہ پُرکشش اور قابل توجہ ہوتی ہے یعنی بھید و عقل کے کھاتے میں فٹ نہ بیٹھنے والی چیز! دائرہ اختیار اور قدرت و گرفت سے جو بھی باہر ہو گا وہی توجہ و تجسس اُبھارے گا......؟

ایسے چھوٹے چھوٹے لکڑی، چمڑے، سونے چاندی اور دیگر دھاتوں کے بنے ہوئے ڈبے ڈبیاں بادشاہ و اُمراء اور شرفاء عام طور پہ پان، نسوار، تمباکو رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کی خاص الخاص اشیاء جو بڑے بڑے نوابوں یا بادشاہوں کے ہاتھ یا جیب میں ہوتیں۔ ان پہ ان کے ذاتی شاہی نشان بھی ہوتے۔" بادشاہوں، نوابوں کے زمانے لد جانے کے بعد ان کی باقیات، ان کے وارثوں، متعلقین، مصاحبوں

اور چوروں سے ہوتے ہوئے بالآخر ان سے بڑے "ڈاکوؤں" یعنی نوادرات کے ڈیلروں کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ یہ ڈیلر اب نوادرات فروخت کرنے کے لیے کوئی ایسے گاہک تلاش کرتے جو ان چیزوں کے شوقین یا متلاشی ہوتے یا کوئی بڑا خود ہی ان کی نظر میں آ جاتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ دھندا قطعی ایک بلائنڈ گیم کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں کچھ بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا!

نوادرات کے ڈیلر بڑے ہوشیار، چالاک اور موقع شناس ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں پائی جانے والی نوادرات زیادہ تر نقلی، جعلی، غیر مصدقہ، پس منظر کی حامل یا مسروقہ شدہ ہوتی ہیں اور اگر ہر صورت سے صحیح اور اصلی بھی ہوں تو ان کی قیمت اتنی ہوشربا ہوتی ہے کہ خریدار سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچتا ہے۔ مسٹر بگی ٹھٹھے کے پاس کا عجیب و غریب سامان بھی دوسری اشیاء کے ساتھ اس چوبی ڈبیا جو مس صاحب کے سامنے رکھی تھی دیکھا.... خاص طور پر میری دلچسپی کا مرکز وہ پراسرار مہر یا مونوگرام تھا جو ڈبیا کی سیدھی جانب درمیان سے کچھ اوپر بنا ہوا تھا، بالکل ایسی ہی جیسی کوئنز لیف پیپر یا پاسنگ شو سگریٹ کے پیکٹ پر ہوتا تھا۔

اسی لمحے میں یہ بھی پتا چلا کہ میرے پیچھے وہ کلوز رنگ ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے ہیں ان کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی میں واپس پلٹ کر اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں وہی جوان جو مور چھل کر رہا تھا اندر داخل ہوا ایک لمبی سی ریشمی سیاہ غلاف میں لپٹی ہوئی کوئی چیز بزرگ صاحب کو پیش کی، انھوں نے بڑی احتیاط سے اوپر کا غلاف ہٹایا تو وہ ایک عصا تھا۔ ساڑھے تین چار فٹ اونچائی میں ہوگا کالا شیشم۔ لکڑی کا تو اندازہ نہ ہو سکا۔ آبنوس یا شاہ بلوط یا صندل کا تھا یا بید یا بانس بھی ہو سکتا تھا؟

کیا قیامت ہے کہ جب اصل میں مزید اصلیت، نفاست اور اس کو مثبت پیدا کرنے کے لیے جب غیر معمولی صفائی، حفاظت اور پالش کی جاتی ہے تو اصل چیز کو جو محسوس ہونے والا نقصان پہنچتا ہے جو دکھائی تو بہت کم دیتا ہے مگر اس کی عمر اور افادیت کو کم ضرور کر دیتا ہے۔ خاص طور پر چوب اور پارچات یہ دونوں چیزیں چاہے کیسی بھی اصل اور قیمتی ہوں وقت کا دیمک، سیلن اور سردی ان کا ستیاناس مار کر رکھ دیتی ہیں۔ پالش، وارنش، فینائل، تارپین اور دیگر ادویہ وقتی طور پر تو اوپری اوپر تو ٹھیک رہتے ہیں مگر ان کی طبعی عمر برباد کر کے رکھ دیتے ہیں؟

اس قیمتی اور نادر عصا کی ایک جھلک نے ہی مجھے ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ اکثر خوبصورت اور دلنشین دکھائی دینے والی چیزیں جو نادر و نایاب بھی ہوں زہریلی، خطرناک اور بدانجام ہوتی ہیں۔ زہریلا پن اور سرنوشت علاوہ ان کا سبب ہیں اور منفرد ہونا ان کے منحوس ہونے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ مجھے اس عصا کو دیکھتے ہی کھٹک گئی تھی کہ یہ میرا انتخاب اور محبوب بننے والا ہے اور یہی دونوں رقیب بھی کمال

ایک سو ایک بدبوؤں اور خوشبوؤں کے ''شیڈز'' ہیں۔ کئی لوگوں کو کوئی جانتا پہچانتا نہیں۔ یہ دس بارہ مہکاروں میں سگندھ کے رنگ پہ کون سی ہے اور سگندھ کے روپ میں کون سی ؟

اچھائی، برائی، نیکی، بدی، اچھی نیت، بری نیت، محبت، نفرت، شرک و توحید کی بھی اپنی اپنی واسنا اور واسنا ہوتی ہے۔ خواہش، آرزو، تمنا، طلب، ضرورت بھی اپنی اپنی مہکیں اور لپٹیں رکھتے ہیں۔ نفرت اور الفت، بدی واشنی کی خوشبو اور بدبو کی لہریں چھوڑتے ہیں۔''

بابا ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولے۔

''اس عصا کی مخصوص مہک نے آپ کو ادھر بلایا ہے۔ پچاس برس گزر گئے اس نے آپ کا بڑا لمبا انتظار کیا۔''

میں نے بھی سا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''سردار جی! آپ سے بہتر اور کون جانے گا۔ اُن اور بچھڑن کا ایک سے مقرر ہوتا ہے۔ میں نے بھی تو انتظار کیا ہے۔''

سردار جی عصا کو ایک طرف دھرتے ہوئے مزید گویا ہوئے۔

''آج کئی برس بعد مجھے اس پوتر سگندھی کا احساس ہوا جو کبھی ننکانہ صاحب گرو جی کی جنم بھومی سے سونگھنے کو ملی تھی۔''

''یہ سگندھ ایسی تو نہیں جیسے ولی اللہ ہستیوں کے نور کی ہوتی ہے؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''جی جی! بالکل ایسی ہی ہے — کیا آپ کو بھی کبھی ایسی سگندھ سے واسطہ پڑا ہے؟''

''آپ کو معلوم ہے کہ گلاب کے پودے کے نیچے کی مٹی میں بھی گلاب کی سگندھ محسوس کی جا سکتی ہے — اور میں نے تو ایک بار نہیں، بے شمار دوپہریں شامیں بابا جی کی گود میں گزاری ہیں۔ بابا جی، باپ دادا کی بیری کے قبرستان میں — جس بیری کے تنے سے سر ٹکا کر آرام فرمایا تھا۔ اسی تنے سے لگ کر میں اکثر سویا اور رویا ہوں — تب میں نہیں جانتا تھا کہ اس بیری کے تنے کا شرف کیا ہے؟ — سردار جی! یہ حق اللہ ہستیوں کی خوشبوؤں کی سگندھ وہی سگندھ ہے جو میرے سر پر اور آتما کے بھیتر اک جیوتی ہوئی ہے۔ میں جہاں بھی کہیں ایسے استھان پہ جاؤں جہاں سنتوں کی پنت پہ یہ وہ میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے جیسے چوپڑی روٹی کے پیچھے اور شیر سے بھری تازہ گڑ کی روڑی کے ساتھ ہوتا ہے —؟

میں نے مزید بتایا کہ سیالکوٹ جو جو میرا آنا جانا اب نہ جانے کے برابر رہ گیا لیکن امرتسر، گولڈن ٹمپل آنا جانا لگا رہتا ہے شاید یہ اب آگے کی منزل ہے۔ یہ آنے جانے والی بات بھی بہت بعد بڑی

گیا۔ بہت عرصہ اس کی بات پہ غور کرتا رہا ــــ آخر ایک دن اُس کی بات سمجھ میں آ گئی۔ واقعی! سفر کے بعد
حق صداقت کی کائنات پہ غور کرنے اور اس کی مخلوق کے لیے آسانیاں فراہم کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس
کے بعد میں نے سفر کے موضوع پہ سروے کرنے کی ٹھانی۔ میری رینج میں بڑے بڑے جغادری جہاں گشت
تھے۔ جب بھی کوئی ملتا تو میں سفر کے بارے میں ضرور یہ پوچھتا کہ بہترین سفر کیا ہوتا ہے؟ کسی کا جواب ہوتا کہ
بہترین سفر حج عمرہ کا ہے' کسی کے نزدیک نجف اشرف' بغداد' مشہد ــــ بہت اولیائے کرام کے مرقدوں کی
زیارتوں کے حق میں۔ داتا صاحب' اجمیر شریف' پاکپتن' قونیہ شریف' سیہون شریف' کٹک' یا صوبہ سرکار' بری
امام ــــ جس کی جس سے نسبت ٹھہری' اس کی نظر میں وہیں کا سفر افضل ہوا۔ بہت سے ایسے بھی جنھوں نے
سیاحت کو عبادت اور حصول علم کا درجہ دیا۔ کسی نے قرآن حدیث اور اولیائے کرام کا حوالہ دے کر سفر کو ضروری
قرار دیا۔ "حصول رزق کے لیے بھی سفر بہتر ہوا۔" غرضیکہ ہر ایک نے اپنی اپنی راگنی سنائی مگر اس لمحاتی جہاں
گرد نے جو "شدھ بہاگ" کا بھاؤ بتایا تھا وہ کسی نے نہ دیا۔ یہ جانکاری بھی تھی کہ سفر وہ نہیں جس کا ماحصل منزل
ہو اور جس محبت میں وصال کی خواہش ہو وہ محبت نہیں ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت جب پوری ہو جاتی ہے تو
پیچھے قلاکت ہی رہ جاتی ہے اور قلاکت' ہلاکت ہوتی ہے ــــ؟

سردار صاحب بتانے لگے یہ نایاب عصا' عجیب و غریب حالات میں مجھے ایک صد سالہ افغانی بزرگ
سے حاصل ہوا تھا۔ جو اسی کے سہارے یہاں پہ بڑی دقت سے پہنچے تھے۔ اس وقت اُن کے ہمراہ ایک
نوخیز سا لڑکا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس کے چہرے پہ ابھی مسیں نہیں بھیگی تھیں۔ اتنی عمر کے بزرگ جب کسی
پرانے نوادرات کی دکان پہ آتے ہیں تو اکثر دکاندار پریشان سے ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن کا آنا کچھ پریشان
کن سوالات کو جنم دیتا ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ قبرستان کی بجائے ادھر کیا لینے آئے ہیں؟

ان دکانوں پہ اکثر اشیاء فروخت ہوتی ہیں ــــ حنوط کیے ہوئے طوطوں' شکروں' شیروں' چیتوں'
اژدھوں' بارہ سنگھوں کی لاشیں ــــ مسالے لگا کر محفوظ کی ہوئی کھالیں' ہڈیاں' نیولے کے نیولے سر اور
سینگ ــــ ہاتھی اور گینڈوں کے فٹ ڈیڑھ فٹ پاؤں مع ناخنوں کے بھی دیکھے ــــ جن پہ جوتے رکھ کر
صاحب لوگ پالش کرواتے تھے۔ خدا کی ذات کے سوا ہر چیز اپنی میعاد پوری کرنے کے بعد فنا کے راستے پہ
پہنچ جاتی ہیں۔ انھیں دفن یا پانی میں بہا دینا چاہیے۔ جلایا بھی جا سکتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو تعفن پیدا ہو جاتا
ہے' بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں' ماحول پراگندہ ہوتا ہے۔ مصریوں کو کیا کہیے! جنھوں نے لاشیں حنوط کرنے کی
بنیاد ڈالی۔ مگر ان کا بھی قصور نہ تھا شاید وہ نہیں کہ اللہ کریم نے فرعون کی لاش کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا ارادہ فرمایا
تھا۔ اس طرح مصریوں کو فن حنوط بھی سیکھنا پڑا......!

حنوط شدہ جسم خواہ کیسا ہی محفوظ کیا ہو بو مارنے سے باز نہیں آتا...... مُردہ اجسام کی بدبو انسانی مشامِ جاں کے لیے انتہائی ناقابلِ برداشت جبکہ درندوں پرندوں اور دیگر نوع کے حیوانوں کے لیے انتہا کی خوشگوار اور اشتہا انگیز ہوتی ہے ماسوائے شیر کے وہ مُردار نہیں کھاتا......"

سردار بابا بتا رہے تھے کہ لگ بھگ دس برس پہلے ایک قریب سو سالہ افغان بزرگ مجھے اپنی دوکان کی جانب بڑھتے دکھائی دیے تو میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ یہ عصا اُن کے رعشہ زدہ ہاتھ میں دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ اچانک میرے من میں کئی ایک منحوس قسم کے اندیشے سر اُٹھانے لگے۔ مجھے لگا جیسے یہ بوڑھا اپنی زندگی کے آخری سفر کے اختتام کے لیے ادھر پہنچا ہے۔ مشاہدے میں آیا کہ ایسے بوڑھے آخری وقت میں اپنی قیمتی نشانیاں فروخت کر دیتے ہیں۔ ان کی کوئی مالی ضرورت یا مرنے کے بعد اس کے وارثوں میں کوئی یہ نوادرات سنبھالنے کے اہل نہ ہو۔ کچھ ایسے بھی جو انہیں فروخت کر کے رقم کسی فلاحی کام میں لگانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ایسے نوادرات میں خاص طور پر اعلیٰ سونے چاندی کے میڈل تمغے سکے تختیاں چھڑیاں تلواریں ہوتی ہیں......"

اس بوڑھے کے ساتھ ایسا کوئی سامان تو نہ تھا جس کا اس بازار میں کچھ دام لگ سکے۔ اس کے تو جھریوں بھرے دائیں رعشہ زدہ ہاتھ میں سیاہ عصا تھا جس پر اس نے اپنے بوڑھے نازک جسم کا آدھا بوجھ ڈال رکھا ہے اور بائیں جانب سے جھکاؤ کے سہارے کے لیے قریب ہی چاق جوان نے سہارا دے رکھا تھا جو اس کا بیٹا تو ہرگز نہ لگتا تھا نہ ہی کوئی پوتا دوہتا دکھتا تھا۔ ہاں البتہ کوئی ملازم یا شاگرد ہو سکتا تھا۔"

قارئین سوچتے ہوں گے کہ میں اتنی قطعیت کے ساتھ ان رشتوں ناطوں کے تعلق کی بات کیونکر کر سکتا ہوں؟ دراصل ہر قوم و نسل اور انفرادی پشت و صلب کے اپنے اپنے ظاہری و مخفی سانچے اور پیمانے ہوتے ہیں۔ جس کے مطابق جبڑے، ماتھے، آنکھیں، کندھے اور خاص طور پر سر کھوپڑی کی پیچھے کی ہڈی جو گردن کی ہڈی سے جڑی ہوتی ہے۔ بات چیت کا انداز، چلنے اور قدم اٹھانے دھرنے کا طریقہ، آنکھوں پلکوں کی لپک جھپک اور بہت کچھ موروثی عادتیں اور طور طریقے جو ودیعت ہوتے ہیں......!

ایک باپ کے صلب سے پیدا ہوئی اولاد شکل و صورت، قد و کاٹھ، رنگ و ڈھنگ میں مختلف ہو سکتی ہے مگر وہ تمام اپنی بنیادی بناوٹوں اور جسمانی ڈھانچے کی کچھ مخصوص ساختوں کی بنا پر ایک سی ہی ہوتی ہیں۔ عالمانِ آدمیت و انسانیت...... اجسام و وجود اور قوموں نسلوں کی تاریخ و ارتقاء پر نظر رکھنے والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں......!

جب وہ بوڑھا اور جوان میری دکان میں داخل ہوئے تو میں نے اس کے لیے پہلے سے ہی تیار

کر وہ نشست پا سے اٹھایا۔ دم درست ہونے پہ مشروب سے دونوں کی تواضع کی۔ تشریف آوری کا مقصد جاننے کی غرض سے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ اچھا دکاندار کاروباری اوقات میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ مقصد یہ ذکر گاہک کو جلد از جلد نمٹا کر فارغ کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر انداز ایسا اختیار کرتا ہے کہ گاہک سمجھتا ہے وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا رہا بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کی صحبت سے فیض یاب ہونا چاہتا ہے۔"

بوڑھا جلدی مطلب کی بات پہ آ گیا بولا۔

"سردار جی! میں بغیر سوچے سمجھے آپ کے پاس پہنچ گیا۔ دراصل میں کسی افغانی کی دکان پہ جانا چاہتا تھا۔"

جب میں نے اُسے بتایا کہ میں بھی تو افغانی ہوں تو وہ ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔

"یارا! اگر تم خالص افغانی ہوتا تو ہمارا ٹھنڈے شربت پانی کے ساتھ گرم گرم سوتی چلم سے بھی تواضع کرتا۔"

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ہم شہروں میں تمباکو نوشی کی ممانعت ہے۔ ہمارے ہاں حقہ لسوار کا رواج نہیں۔ صرف فادر کو بیچنے کی خاطر پرانے نسخے اور نسوار کی ڈبیاں رکھی ہوئی ہیں۔ آپ بولیں تو میں حقہ حاضر کر دیتا ہوں۔"

بوڑھے نے جواب دے کر مجھے تعجب میں ڈال دیا کہ وہ تو ساری زندگی حقہ لسوار کے قریب تک نہیں گیا۔ ان عادتوں کو وہ بہت ہی فضول سمجھتا ہے۔ میں اس دلچسپ بوڑھے کی شخصیت اور باتوں سے لطف کشید کرنے لگا تھا۔ دوپہر کا وقت ویسے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ کاؤنٹر کوئی سر پھرا آ بھی جائے تو دماغ ٹھکا کر کے چلا جاتا ہے۔ اس پرانے بزرگ اور نئے نوجوان سے بھی مجھے کوئی کاروباری فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا مگر چلو! کچھ تو ٹائم پاس کرنے کی خاطر میں ذرا دل لگی کے موڈ میں آ گیا تھا۔

"خان صاحب! فرمایئے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟"

ویسے میرا اندازہ تھا یہ کوئی میڈل، روپی اسحہ یا فیروزہ تراشا نگینہ بیچنے کی غرض سے آیا ہو گا مگر جب اُس نے ہاتھ کا عصا دکھا کے کالی چادر سے جھاڑ پونچھ کر میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"سردار صیب! میں یہ انتہائی نادر عصا فروخت کرنے کی خاطر ادھر آپ کے پاس پہنچا ہوں۔ مجھے میرے ایک پہچان والے نوادرات کا کاروبار کرنے والے نے ادھر بھیجا ہے کہ آپ سکھ لوگ پرانی قیمتی چیزوں کی اچھی قیمت لگاتے ہیں۔"

بوڑھا اشتیاق اور عقیدت بھری نظروں سے عصا کی جانب دیکھتے اور پوپلے ہاتھ پھیرتے ہوئے مزید بتانے لگا۔ میری خواہش تھی کہ یہ عصا مرنے کے بعد میرے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے۔ میں اس کی جدائی برداشت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مگر شاید اب میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔ مجھے اس مقدس اور جان سے پیارے عصا کے بغیر ہی دفن ہونا پڑے گا۔ مگر کیا ہو؟ یہ میری مجبوری ہے۔"

بوڑھے افغانی کی اس بات نے میرے تجسس کو مزید ہوا دی۔ عصا کی جانب اشتیاق اور حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس عصا میں ایسی کون سی خیر و خوبی ہے کہ اسے آپ اپنی قبر کا ساتھی بنانا چاہتے تھے لیکن اب فروخت کر کے اچھی قیمت بھی وصول کرنا چاہتے ہیں؟"

اُسے جیسے چپ سی لگ گئی ..... مندی مندی آنکھوں سے عصا کو گھورے جا رہا تھا۔ پھر بتانے لگا۔

"یہ عصا میرے باپ نے مجھے دیا تھا ..... جو چالیس کے سن میں ایک جان لیوا بیماری کا شکار ہو کر اس دارفانی سے کوچ فرما گیا ..... انتقال سے قبل مجھے طلب فرمایا۔

"حشمت خان! یہ عصا میری امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھو اور جب تمہیں کوئی ایسا شخص ملے جس کی سفید ریش کا سب سے لمبا بال اس کی ناف کے عین نقطہ تک اترا ہوا ہو ..... آنکھیں روشن اور کشادہ ماتھے پہ قطب ہو اسے یہ چیز دے دینا۔ اگر ایسا انسان کوشش بسیار کے بعد بھی نہ ملے تو ایسا نوجوان جو سیدزادہ ہو متقی اور صاحب ایمان و کردار ہو اسے پیش کر دینا ....."

اب میں نے اشتیاق کر کے پوچھ لیا۔

"اگر ایسا کوئی خوش نصیب نہ مل سکے تو کیا حکم ہے؟"

فرمایا۔ "پھر انتظار کرنا اس ساعت سعید کا جب تمہیں اپنے مالک و خالق کے ساتھ کیے ہوئے عہد کے مطابق قبر میں اترنا پڑے تو اس عصا کو اپنا ساتھی بنانا ....."

یہ سن کر میری تو سٹی گم ہو گئی کہ قبر میں اسے ہمراہ لے جاؤں ..... بھلا وہاں اس کا کیا کام؟.....

اس جواب کے بعد مجھے کوئی سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرے ایک سوال کا جواب انہوں نے میرے پوچھے بغیر خود ہی دے دیا۔

"ہاں اگر یہ سب کچھ تم سے نہ ہو سکے تو پھر اس عصا کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو اس وقت کے حالات کا تقاضا ہو۔"

نوادرات کی دکان والے سردار صاحب اپنے اس پُراسرار عصا کی قیمت اور تین چار فٹی دستکاری والے

شہکار عصا کے متعلق ایک داستان گو کی طرح بڑے پیشہ ورانہ انداز سے خوش گفتاری فرما رہے تھے جبکہ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ یہ اپنے اس یادگار عصا کو ایک شاندار قیمت پہ میرے ہاتھ فروخت کرنے کے لیے یہ محنت کر رہے ہیں یا واقعی اس عصا سے وابستہ حقائق بیان کر رہے ہیں؟

## ● خوف زدہ لوگ خواب نہیں دیکھتے ——!

سردار صاحب کی مہربانی نے کم سے کم میں چرب زبانی نہیں مان سکتا تھا۔ چرب زبانی میں بھلے وافر الفاظ کی فراوانی تو ہوتی ہی ہے لیکن اس کے ساتھ تصنع، خود ہشیاری اور غرض بھی ہوتی ہے جو اخلاص اور سادگی سے عاری کر دیتی ہے۔ دکاندار حضرات اسی چرب زبانی، ہشیاری، چالاکی اور جھوٹ سچ سے گاہک پھانستے ہیں۔ یہ سردار جی بھی ایک دکاندار تھے۔ اینٹیک نادر، پرانی قیمتی اشیاء کی خرید و فروخت کرنے والے۔ یہ جو عصا کے بارے کہانی سنا رہے تھے میرے لیے بڑی دلچسپ انوکھی اور پُراسراری بھی تھی۔ جس میں کچھ تصوف و تفکر کا رنگ بھی شامل تھا؟

میری دلچسپی اور غیر معمولی توجہ دیکھتے ہوئے سردار جی مزید بتانے لگے بوڑھے افغانی نے اپنے ساتھی نوجوان کے متعلق یہ انکشاف کرتے ہوئے بتایا "یہ نوجوان اس عالم پیری میں میرا اصل عصا ہے۔ میں ایک زمانے سے اس کے سہارے اپنے وجود کی گرتی دیواروں کو سہارا دیے ہوئے ہوں لیکن اب پوری ایمانداری سے محسوس کر رہا ہوں کہ میں تو اپنی آخری منزل پہ پہنچ گیا لیکن میری وجہ سے اس کی منزل کھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اب اس کے والدین جو مالاکنڈ میں رہتے ہیں اس کی شادی کا سوچ رہے ہیں۔ رشتہ داروں میں ایک بھلی سی لڑکی بھی مل گئی ہے جو خوبصورت، دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ اور اچھائی و برائی کی سمجھ بھی ہے۔ یہ دونوں آپس میں پسندیدگی کے جذبات بھی رکھتے ہیں۔ رسم و رواج جو کسی طور پہ بھی مناسب نہیں لیکن صدیوں پرانی روایات اور طور طریق کو بھی یکسر درست بدلنا ممکنات میں نہیں۔ لڑکی کے والدین نے شادی کے لیے ایک خاصی بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا ہے۔ جو کسی بھی طرح لڑکے والوں کے بس کی بات نہیں —— لڑکی والوں کی بات اس لیے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ لڑکی لاکھوں میں ایک ہے۔ ادھر علاقہ کے بڑے بڑے عزت شہرت والے ادھر رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ لاکھوں روپے گھوڑے کھرے بھی دینے کو تیار ہیں۔ ماں باپ شاید مان جائیں مگر لڑکی میرے اسی شہباز سے شادی کرنا چاہتی ہے......"

اب صورت حال یہ ہے کہ ممکنہ طریقے سے کوشش کی کہ کسی طرح یہ روپے پیسے کا مسئلہ حل ہو جائے......

میں کہ شاید جو واقف آداب آوارگی تھا ابھی کہ "اپنی" تن بدن تیرہ" بھول کر اس کی "چار چوک
چوبالیس" کے حوالے ہو گیا۔ سب سے پہلی مناقشت یہ سرزد ہوئی کہ میں نے اپنا تھیلا بوک (سلیپنگ بیگ)
کھول کر بیٹھے بیٹھے گرد پھیلایا اور اسے سمیت سمٹ کر اندر داخل کیا — اونی ٹوپی پہنائی اس کے لمبے سنہری بال
سمیٹ کر اندر کھینچے، کانوں کی یخ بستہ لوویں ڈھانپیں — سردی کا اثر دور کرنے کے لیے ہاتھ پہ بام سے
مالش کی — ناک کی ریزش صاف کی پھر تھپک کر سلانے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب اسے قدرے سکون ہوا تو آنکھیں پٹ پٹا کر مجھے حیرانی سے تکنے لگا۔

تیز روشنی اور گھپ اندھیرا دونوں ابہام پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ ان سے آگے بڑھیں تو
سورج، چاند، ستاروں کی روشنیاں اپنی جگہ پہ الگ الگ تشرفات و تصرفات کی حامل ہوتی ہیں۔ آسمانی صاعقہ کی
کڑک چمک، روغن و گھی، تیل و چربی، گوند، چوب و بخور، چراغ، دیا، مشعل، جہاز فانوس "الاؤ" منقل، موم بتی، شمع
وغیرہ یہ سب قدرتی اور مصنوعی روشنی و اجالے کے منبع ہیں۔ کسی سے نور پھوٹتا ہے تو کسی سے کرنیں نکلتی ہیں۔
کہیں نور جھانکا لیتی ہے کہ حرارت کوندتی ہے بجلی کی صورت میں تو کہیں دل کی دھڑکن و تابندگی میں — چقماق
کی چمک چنگاری میں بھی اور آتش انگار میں بھی — !

اللہ کریم کے نورِ حقیقی کے ماتحت مظہر ہیں۔ جس چیز کا بصارت، عقل، دانش اور اعضائے ظاہری و خفیہ
احاطہ کر لیں وہ نورِ حقیقی سے براہِ راست یا بالواسطہ مستعار ہوتی ہے — عالم ہست و بود میں جو کچھ بھی ہے،
اکائی سے ہزار، رنگ، ذائقہ، مہک، شکل و صورت، حالت و انداز، سمجھ میں آنے والا یا نہ آنے والا، دکھائی دینے والا یا نظر نہ
آنے والا — ذرہ ذرہ، خشک و تر — ان سب کے پیچھے سے اگر نورِ حقیقی کا منبع بند کر دیا جائے تو وہی
صورت ہو گی جو بجلی کا مین سوئچ آف کر دینے سے گھر کے پورے بجلی کے نظام کی ہوتی ہے۔

ہر ذی نفس، ذی جان کے چہرے سے لے کر سراپے سارے اور تمام حسیات بدنیہ بشمول اعضائے
رئیسہ وغیرہ میں بدرجۂ مقدور و مقدر، نورِ حقیقی کا عنصر کسی نہ کسی سطح پہ موجود ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی مخلوق
مکمل ہی نہیں ہوتی۔"

نورِ حقیقی کے کئی مظہر ہیں جن کا ایک اہم نمونہ یا شاہکار حضرتِ انسان بھی ہے۔ جن و ملائکہ بھی، شجر و حجر
بھی — گل و اشجار، دشت و دمن، قلزم و کوہسار بھی، تھل بھی، صحرا بھی — چرند پرند، چوپائے اور درندے تک
بھی — نیم باز آنکھوں، مست نیناں، دوشیزہ مژگاں میں بھی، زلفِ مشکبار میں بھی، کاکل سیاہ میں بھی — قد یار
میں بھی، حُسنِ جہاں سوز میں بھی — چاہِ زنخداں میں بھی، گال گلوں میں بھی، تیرے تل، ڈھلک، ڈھال اور
مال میں بھی — موئے مصور میں بھی، خیال و تصور میں بھی، ہر جا ہر راہ و منزل اسی کا نور ظہور ہے۔"

اس بچے کے چہرے پہ سعادت مندی اور اقبال مندی کا ایک سرمدی سا نور کھلا ہوا تھا۔ آنکھ ہو اور اس کے پیچھے ناظر ہو تو مقاتل کا ہر منظر مصحف ہوتا ہے......؟

نیم غنودگی کی حالت میں ہی میں نے اُسے کچھ کھلایا پلایا اور سردی نمونیے سے بچنے کے لیے ایک دو قرص بھی اس کے حلق سے نیچے اتار دیں۔ کچھ دیر بعد میں نے اس کے ماتھے پہ ہتھیلی رکھی...... بخار اور کپکپی ہنوز موجود تھے۔ اب میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ رہ گیا تھا کہ میں اپنے تن کے کپڑے بھی اتار کر اُسے اوڑھا دوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اپنا سوئیٹر جو بھیڑ کے بالوں سے بنا ہوا تھا اُتارا اور اس کے اوپر لحاف کی مانند ڈال کر اسے ساتھ لپٹا لیا۔

نیند تو کانٹوں سے آگے سولی پہ بھی آ جاتی ہے۔ شب ہجراں یا کسی بیماری عارضہ کی درماندگی وقفہ انتظار یا عقوبت و آزار نشست شتر یا اسپ و فرزو رفتار کی ٹھنک ہو یا نوکیلے کنکروں کی چبھن...... چوکیدار سپاہی...... ریلوے بس ٹرک ہوائی جہاز وغیرہ کے ڈرائیور پائلٹ...... عدالت میں جج صاحبان اسمبلی میں ممبران کلاس روم میں استاد سنیما ہال میں فلم بین سازندے یہاں تک کہ کئی بھٹکے لوگ پیدل سفر کرتے ہوئے نیند کا جھونکا لے لیتے ہیں۔ میں ایک ایسے نکاح میں بھی شریک تھا کہ نکاح خواں کو "قبول ہے" کہلوانے کی خاطر دولہا میاں کو باقاعدہ جھنجھوڑ کر جگانا پڑا۔"

مجھے بھی بندہ بشر باوجود دانت کٹکٹانے والی سردی...... جو ناکافی کپڑوں کی بنا پہ میرے جسم کو مفلوج کر رہی تھی۔ نیند کی کوئی بوجھل سی ساعت ہوگی کہ میں بھی اس جھپکی کی زد میں آ گیا تھا۔ نجانے کب پھر ایک تیز سی تھرتھری سے ہڑبڑا کر آدھا ہو کے بیٹھ گیا...... ناک کی پھنگ بے حس ہونٹوں پہ کافوری تہہ...... کان کی لویں ٹھنڈی ٹھار تھیں اور پاؤں جیسے برف کی سل میں لگے ہوں۔"

رات اپنے سفر کے آخری پڑاؤ پہ تھی...... یہ وقت نیند کی شدت کا ہوتا ہے۔ سچی نیند تو ماں کی راحت بھری آغوش میں حصول رزق کے لیے محنت کے بعد محبوب کے زانو پہ سر رکھ کے...... اپنے مرشد پاک کے ساتھ لگ کر یا پھر لحد میں لیٹ کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ تمام نیندیں بے مزہ ادھوری اور اذہان و اعصاب کی تھکن کا ازالہ ہوتی ہیں۔ ایسی نیندیں خواب بھی ادھورے اور اندھے دکھاتی ہیں۔

مست ملنگوں مجذوبوں محبوبوں معشوقوں اور معصوموں کی آنکھ نیندیں مکمل اور اصل ہوتی ہیں۔

یہ معصوم بھی ایسی ہی آنکھ نیندی میں گم تھا۔ کچھ غذا، کچھ دوا اور گرم کپڑوں کی حرارت کے علاوہ میری شفقت بھری توجہ نے سنبھالا دے رکھا تھا۔ ادھر میری یہ حالت کہ بری طرح جاڑے سے جکڑا گیا...... پسلیوں کے نیچے جیسے اندھیری تھیں لگتا تھا کہ نمونیہ ہو گیا ہے۔ دل کسی ذبح کیے ہوئے کبوتر کی مانند تڑپ رہا تھا۔ ادھر صبح

کا ذب کے آ جانا ۔۔۔ تیز بخار چڑھ جانے سے مریض ہذیان بکنے لگتا ہے۔ ایسا کچھ تو نہ ہوا لیکن یہ احساس ضرور ہوا کہ اگر فوری طور پہ میں نے اس سردی کا سدِّباب نہ کیا تو یہ نمونیہ مجھے چاٹ جائے گا!

مجھے فوری طور پہ گرم کپڑوں اور کسی دوا دارو کی ضرورت تھی جن کا حصول سردست اس وقت اور اس ماحول و جگہ میں ممکن نہ تھا۔ اللہ کریم کے توکل پہ خود کو دلاسے صبر شکر کر کے رہ گیا۔ بس سے بات باہر ہو جائے تو توکل تھوڑی بڑی تقویت دیتے ہیں۔ اندر کی سچی چاہائی طبیعت میں تھی، سے برداشت پیدا ہوئی تو کسی کم عمری گھڑی میں گھٹنوں میں سر دیے اداوں سے بھری گٹھڑی بنا رہ گیا۔"

درد حد سے بڑھ جائے تو دوا بن جاتا ہے میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہوگا۔ جاڑے سردی میں سورج کی روشنی تمازت بھی بے دام ہی لگتی ہے۔ سورج نکل آیا تھا مگر کپکپاہٹ ہڈیوں سے نہ نکلی۔ لگتا تھا نوشادر اور پھٹکری ہم وزن پیس کر چھڑکی ہوئی ہے۔ میں اپنی جگہ پہ تنہا پڑا تھا وہ بچہ تھے بچانے کی خاطر خود کو آزمائش میں ڈالا، نہ وہ تھا اور نہ دوسرے آوارہ شب مسافر ۔۔۔ اجنبی رات ادھر آ سو رہے تھے۔ اکیلا میں ہی کسی سرائے کے ساتھ رہ رہے کی مانند جو رات بھری بے خوابی سے تو نا بیزار سا سویا جاگا پڑا ہوتا ہے۔"

کچھ پہاڑی کوے چہرے سامنے ڈھلان میں نیچے کے پاس رزق پانی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہم جاگتے ہوئے اعصاب کی چند مزید گرہیں کھلیں تو احساس ہوا کہ جو کپڑے میں نے اس بچے کے جسم پہ سردی دور کرنے کے لیے ڈالے تھے وہ اب میرے اوپر پڑے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ بچہ بچ گیا اور اپنی راہ لگ گیا۔ اسے کوئی مطمئن سا ہونے پہ میں خوش تو ہوا مگر جسمانی طور پہ اس قابل نہ تھا کہ اپنا سفر جاری رکھنے کی خاطر اٹھ کھڑا ہوتا۔ چارو ناچار پڑا اس کا انتظار کرنے لگا کوئی اللہ کا بندہ دکھائی دے تو کچھ مداوا کروں؟

افغانستان کے پہاڑ درے، سنگلاخ راہ راستے، علاقے، شہر قصبے اور دیہات وغیرہ سے غیر معمولی اور ایک منفرد سی تقسیم و تنظیم والے ہوتے ہیں۔ اس ملک و خطے میں جنم لینے والے پہاڑوں کے بیٹے اور حریت کے فرزند کہلاتے ہیں۔ اپنی آن اور اپنے مہمان کے لیے جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دغا کرنے والے ہوتے ہیں نہ دغا نہیں کرتے۔ مصیبت، پریشانی میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ افغان ہونے کے ناطے مجھ میں بھی یہ خصلتیں موجود ہیں شاید اس بچے کی دستگیری کرنے میں یہی کام آ گئیں۔ یہ معصوم بچہ جس کے چہرے بشرے پہ اقبال مندی اور سعادت مندی کی چمک جھلک رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا؟ بھول بھٹک گیا، گھر سے نکل آیا تھا یا کسی کے ساتھ سفر میں تھا اور بچھڑ گیا۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو اس کے جسم پہ موسم کے مطابق کپڑے لتے تو ہوتے، کوئی آدم زاد زادِ راہ ہمراہ ہوتا؟ ۔۔۔ وہ تو دو تن کے کپڑوں کے ساتھ ٹھٹھر پڑا سردی سے کانپ رہا تھا ۔۔۔؟

میں اُس کے بارے ایسی ہی اِدھر اُدھر کی باتیں سوچ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں سامنے والی پگڈنڈی پہ وہ ایک بوڑھے کے ساتھ خراماں خراماں چلا آ رہا ہے۔ اُس کے ساتھ آنے والا بوڑھا کوئی نیم حکیم تھا۔ اُس نے آتے ہی کپڑے کا تھیلا کھولا۔ اُس میں سے بوٹیاں اور جڑیاں نکال کر نیچے ڈھیر کر دیں۔ مجھے زبان دکھانے کا کہہ کر میری نبض ٹٹولنی شروع کر دی۔ یہ کچھ ہو رہا تھا کہ اتنے میں کہیں سے حجرے کا گھبرو بھی چلا آیا۔ حکیم نے اُسے کسی جڑی بوٹی کے خشک پتے دیتے ہوئے جوشاندہ تیار کرنے کے لیے کہا۔ پانی کے ساتھ کسی کڑوی سی دوا کا سفوف پھانک کر مجھے لٹا دیا۔ وہ جڑیاں مزید تھماتے ہوئے گرم چادر اوڑھا دی ـــ پورا دن آرام کی تاکید کرتے ہوئے شام کو دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا۔“

وہ اور جوشاندہ کیا پیا، پورا دن بے سدھی سی پڑی رہی ـــ کدھر ہوں، کون ہوں، عجب بے ڈھنگے بے پر کے خواب دیکھتا رہا؟ ـــ پہاڑ پر اُگے کنوئیں، مری ہوئی بھیڑیں، تین ٹانگوں والے تیتر ـــ!

جب شام سے ذرا پہلے کروٹ سنبھلی تو جسم بھیگا سا محسوس ہوا۔ تمام کپڑے پسینے سے نچڑ رہے تھے۔ بڑی منحوس سی گیلی گیلی کیفیت تھی، بدبو جھٹکے مار رہی تھی جیسے کئی راتوں کی بڑی مچھلیاں جھینگے گل سڑ گئے ہوں؟

محسوس ہوا طبیعت بحال ہے ـــ لازم تھا کہ کچھ کھایا پیا جائے لیکن ـــ اچانک سامنے برآمدے سے بچی، چچی اور حجرے کا گھبرو اندر داخل ہوئے۔ وہ کھانا لائے تھے۔ میرے بیدار ہونے کے انتظار میں باہر بیٹھے تھے۔ میرے جاگنے کی کن سن پاتے ہی اندر چلے آئے۔

مسافر کے لیے آرام و قیام اور کچھ طعام، تینوں بہت اہم ہوتے ہیں۔ موقع پہ دستیاب ہو جائیں تو اس کی طمانیت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ کھانے کی تاب، دیکھتے ہی بھوک چمک اٹھی۔

بھوک، جنس اور جان بچانا، بشری جبلت کے بنیادی تقاضے ہوتے ہیں جو پیدا ہونے والا شکمِ مادر سے ساتھ لے کر آتا ہے۔ انسان، شعوری اور لاشعوری طور پہ ہمیشہ ان تینوں جبلی تقاضوں کے حصار میں ہی رہتا ہے۔ انسان کیسا بھی ہو، دنیاوی یا علمی، اخلاقی، سماجی، سیاسی، روحانی یا دینی طور پہ جو بھی اُس کا مرتبہ یا درجہ ہو ـــ کسی نہ کسی سطح پہ وہ انہی اپنے جبلی تقاضوں کے زیرِ اثر ہوتا ہے کہ حیوان ناطق ہو یا حیوان مطلق اپنی جبلت کی تحریک پہ ہی چلتے ہیں۔“ اس سے آگے بڑھیں تو واضح ہوتا ہے کہ مخلوقات میں جو کچھ بھی ہے ہر ایک اپنی اپنی فطرت اور جبلت کے زیرِ اثر اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے ”عشق“ اصل بات تو اندر کے ”مصطفیٰ“ والی ہی ہوتی ہے۔“

امر، روح، وجدان، فطرت، قدرت، مقدر، نصیب، مقسوم، قسمت، باطن، سب کے سب، تھوڑے سے افتراق و اطلاق کے باوجود ایک ہی فریکوئنسی پہ سیٹ ہوتے ہیں۔

میسر ہوتا اور اللہ برتر کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

فیروز بخت کو میں نے اپنا پانچواں بیٹا بنا لیا۔ میرے چار بیٹے بس روایتی بیٹے تھے۔ وہ تو تینوں تانگیوں کا کاروبار کرتے — تیسرا فیروز قانونی دھندا کرتا جبکہ چوتھا چالیس میں اپنے ماموں کے پاس قرآن حفظ کر رہا تھا اور میں بھی ان کے لیے ایک روایتی باپ ہی تو تھا۔ میرے اپنے شغل مشغلے تھے جن سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ دنیا کا مال اسباب اکٹھا کرنے کے جنون میں بہت آگے نکل گئے تھے کہ اب ان کا حقیقت فطرت اور قدرت کی طرف لوٹنا انتہائی مشکل ہو گیا تھا۔ کاروبار تو میں بھی کرتا تھا کہ اس کے بنا اپنے وجود کو بچانا مشکل پڑ جاتا ہے۔ مگر میں کاروبار بندوں کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے ساتھ کرتا تھا جس کی بندگی سب بندے کرتے ہیں جس کا رزق کھاتے ہیں... جو سب کا ملجا و ماویٰ ہے۔"

مجھے علم و فن سیکھنے اور اللہ کے ایسے منتخب بندوں کی صحبت اختیار کرنے اور زیارت کرنے کا شوق تھا جو دنیا کی چند روزہ زندگی کو سمجھنے اور ایسا علم سکھاتے اور ایسے نکتے سمجھاتے ہیں جو روز ازل آدم کو سکھایا اور بتایا گیا۔ اپنے اسی مقصد کو جنون بنا چکا تو میں اپنے وطن اور ذات کے محدود کنوئیں سے باہر نکل آیا۔ میں ہوا اور روشنی کی مانند پھیلنا اور بکھر جانا چاہتا تھا۔ میں اس سفر پہ چل پڑا! جس کی کوئی منزل میرے سامنے نہ تھی اور نہ راہ اور راستوں سے آشنائی! — ایسی راہوں پہ تو سنگ میل بھی نہیں ہوتے اگر ہوں بھی تو وہ سنگ میل گم ہو رہی گم سوادی کی بند قبر کے کور دیدہ کور پشت کتبے کی طرح ہوتے ہیں۔ جن سے کسی منزل کی نشاندہی تو کیا ہو گی بس! دیکھے اور سر پھوڑے جا سکتے ہیں۔"

چھ سات برس کا یتیم و لسیر کوہستانی بچہ خود اپنی زبانی اپنی کتھا کیا سناتا؟ — اس کی روداد الم و ستم اس کے حال سے ظاہر ہوتی تھی۔ باقی کی تیرے کے تجربہ کار بوڑھے سے معلوم ہوئی جو اس کا سگا باپ بھی تھا۔ زلزلے کے ایک سانحہ میں اس ریٹائرڈ فوجی کا تمام خاندان اور ایک بازو کام آ گیا — امداد کے طور پہ اسے ایک خاصی رقم اور خیمہ مل گیا۔ کچھ عرصہ بعد گاؤں کی ایک عورت جو عمر میں اس سے خاصی چھوٹی اور اسی زلزلے والے سانحہ میں بیوہ ہو چکی تھی نکاح کر لیا۔ کچھ عرصہ تو جیسے تیسے بیت گیا بعد میں اس عورت نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ اس کے پہلے خاوند سے تین بچے تھے، وہ سادہ سا لڑکا ہو گئے ایک چھوٹا بچہ جو حادثے سے بچ گیا تھا ساتھ لے آئی۔ فوجی کو اور کیا چاہیے تھا کہ نئی بیوی کے ساتھ پلا پلایا بچہ بھی مل گیا۔ ظاہر ہے عورت کو اپنا پہلا بچہ زیادہ عزیز تھا اور فوجی کو اپنا بچہ پیارا جو اس کی مرحومہ بیوی کی نشانی تھا۔"

آہستہ آہستہ گھر میں ایک نامحسوس سی کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ وقت کچھ آگے بڑھا تو اس بے وقوف عورت نے کھلم کھلا اس لڑکے کے خلاف ایک محاذ کھول دیا۔ مطالبہ شروع کر دیا کہ وہ رہے گی یا پھر یہ لڑکا! —

معذور پریشان حال فوجی اب ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؛ بچے کو نکالے یا اس بدبخت عورت کو چھوڑ دے۔۔۔!

کوئی فیصلے قدرت کرتی ہے اور کچھ فیصلے وقت اور حالات کا تقاضہ ہوتے ہیں' جبکہ اکثر اپنے فیصلے انسان خود کرتا ہے۔ اگر انسان بالغ نظر اور حاضر وقت کی نبض پہ اس کی انگلیاں ہوں تو اس کے فیصلے اکثر صائب و صحیح ہوتے ہیں۔ وقت کا تقاضہ تو کچھ اور تھا مگر اس بچے نے اپنا فیصلہ خود کر لیا کہ اس کا انتظام قدرت نے پہلے سے ہی کر کے اس کے نزدیک ور رکھ دیا ہوا تھا۔"

جس شب کے دوسرے پہر میں اپنی سیاحت کے دوران اس کو بستانی حجرے میں شب بسری کے لیے اترا تھا۔ اسی شب کے اول پہر یہ ممتا کی مہک سے معذور عورت سوتے میں کسی ضرورت کے تحت بیدار ہوئی تو دیکھا اس کا پہلا بیٹا اور خاوند کا پہلی بیوی سے بیٹا دونوں اکٹھے سو رہے ہیں۔ کڑاکے کی سردی دونوں آپس میں گتھم گتھا سو رہے ہیں۔ کیا نے اس کے جی میں کیا آئی اس نے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کو اس سے علیحدہ کیا اور بھاری توشک کھینچ کر اس پہ ڈال دی۔ اسی اثنا میں فوجی کے بیٹے کی آنکھ اچٹ گئی مگر ڈر کے مارے اس نے یہی باور کرایا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ بے رحم عورت نے انسان ہونے کے ناطے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ فوجی والا بچہ گرم لحاف توشک نہ ہونے کی وجہ سے بیمار پڑ جائے گا۔ سوتیلی ماں کا سلوک وہ دیکھ چکا تھا' اب اُسے سال بھر میں ہونے والے سب سلوک یاد آنے لگے۔" وہ اچھا کھانا جو اپنے بچے کو دیتی' اس کے بہتر کپڑے جوتے ہوتے اور سلوک بھی اس سے مختلف۔۔۔؟

پے در پے ایسی حرکتوں اور امتیازی سلوک سے اُس نے اس بچے کے ذہن میں بے پناہ نفرت اور بغاوت بھر دی تھی۔ باپ سے شکایت کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اُس کی بیوی علاقے کے ایک ناپسندیدہ شخص کی بہن تھی۔ یہ معذور اور سادہ و بیمار فوجی اپنی بیوی اور اس کے میکے والوں سے ٹکا لینے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ یہی کافی تھا کہ بیوی نے اس کے بچے کو گھر رہنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ ایک اور بھی وجہ تھی۔ زلزلے میں جو نقدی کی صورت امداد ملی تھی وہ اسی چھنال نے اپنے قبضے کی ہوئی تھی۔ ان تمام حالات کے پیشِ نظر وہ قدرت کے کسی فیصلے کا منتظر تھا کہ میرا وہاں حجرے میں آمد والا واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔

یہ بچہ اسی وقت رات کے دوسرے پہر سوتیلی ماں کے اس نارواسلوک سے دلبرداشتہ سا جسم پہ کافی گرم کپڑوں کے ساتھ گھر چھوڑ کر کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں باہر نکل آیا۔ معصوم سا پہاڑی بچہ' شاید عزتِ نفس کے مفہوم سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گا مگر وہ اپنے بڑے اور معذور باپ کی مجبوریوں اور ذاتی سوتیلی ماں کے سوتیلے پنے سے شاید کما حقہ طور پہ آگاہی نہ رکھتا تھا۔"

باپ کی بات کے آہنگ کی گونج ابھی لرز رہی تھی کہ بچہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بابا! میں عزت سے جینا مرنا سیکھنے کی بجائے ذلت سے مرنا اور جینا سیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے یہ مجھے آپ ہی سکھا سکتے ہیں۔"

بچہ دیر تک باپ پر نظریں جمائے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر زہر آلود لہجے میں بولا۔

"میری ماں نے تین دن پہلے آدھی رات جب میں اور اس کا بیٹا یعنی میرا سوتیلا بھائی ایک ہی لحاف پہ پڑے تھے۔ سردی انتہا کی جبکہ میری نیند بے چاری مجھ سے کوسوں دور۔۔۔ میں آنکھیں میچے کسی شمع کے گاؤں کے تصور میں اترا ہوا تھا کہ اچانک میری ماں نے اپنے بیٹے کو ہاتھ چھوا۔ اس کی توشک درست کی۔۔۔ جب واپس جانے لگی تو نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی اتفاقی بے دردی سے میری توشک بھی کھینچ کے اس کے اوپر ڈال دی۔۔۔ اس کے دل میں ذرا بھی خیال نہ آیا کہ میں بھی اس کا سوتیلا ہی سہی بیٹا تو ہوں۔ چلو! اگر یہ بھی اسے گوارہ نہ تھا تو کم از کم ایک بن ماں کا بچہ یا انسان ہی سمجھ لیتی۔ میں اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ کبھی خود کبھی قسمت سمجھ نہ آ رہا تھا میں کیا کروں؟ غصہ اور گھٹن کی جلن بھی سردی کی شدت کو کم نہ کر سکی۔ میں تھر تھر کانپ رہا تھا اور میرا سوتیلا بھائی دو دو توشکوں کی حدت کے مزے لے رہا تھا۔ اگلے لمحے میں کمرے سے تو کیا گھر سے باہر تھا! اور پھر جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔"

کچھ توقف کے بعد وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"میں نے اسی لمحہ گھر چھوڑ دیا تھا۔۔۔ جس گھر کا سربراہ معذور اور بیوی کے سامنے مجبور ہو اس گھر میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ بندہ قبرستان میں چلا جائے۔۔۔ مگر شاید میں قبرستان کے لائق بھی نہ تھا۔ اللہ نے میرے اس بابا کو میرے پاس بھیج دیا تا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ لے جائے۔"

وہ بوڑھا معذور فوری آنکھیں میچے بڑا مطمئن سا بیٹھا تھا۔ جیسے وہ اپنے کم سن بچے کو سکول کی چھٹیوں میں اس کے ماموں کے ساتھ کوئٹہ جدھر اس کا چاچے کا ہوٹل ہے روانہ کر رہا ہے۔ اس قسم کی طمانیت بندے میں تب تشکیل پاتی ہے جب وہ "راضی برضا"، "مرضی مولا از ہمہ اولیٰ" ۔۔ "تسلیم و رضا" کے معنوں تلاش ہی توکل کی توانائی سے تابندہ ہو یا پھر وہ سرے سے ہی کسی سٹھیایا ہوا ہو۔ مگر وہ تو مجبور محض تھا کہ دوسری بیوی نے کمال ہوشیاری کے ساتھ اس سادے سے مرد سے سب کچھ اپنے نام لکھوا لیا تھا۔ اب تو بے چارے میں سانس بھی اس کی اجازت کے بغیر لینے کی سکت نہیں تھی۔ اس فرزند نے اس اچھے بچے کو نیوز خان آوارہ اور منحوس کہہ کہہ کر خود کو بد دل کر دیا ہوا تھا۔ وہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا کہ کوئی یا چین کسی جاننے والے کے چائے خانہ میں "چھوٹے" کے طور پر کروا دے۔ ایک آدھ درمیان کے آدمی سے بات بھی چلائی تھی۔ درمیان کا

آدمی ایک ایجنٹ ہوتا ہے جو دور دراز کے علاقوں سے غریب تنگ دست لوگوں سے ان کے بچے پیشگی رقم دے کر بڑے بڑے شہروں میں دکانوں، گھروں، چائے خانوں، ہوٹلوں میں نوکر کرواتا ہے۔ غریب لوگ نقد رقم پکڑ کر اپنے پھول سے بچوں کو اس کمائی ایجنٹ کے حوالے کر دیتے ہیں۔"

خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا..... مجبور باپ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ قدرت نے اس کے لیے ایک اور ہی بندوبست کر دیا کہ مجھے ادھر بھیج دیا اور حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ بچہ میرے سپرد کر دیا گیا۔ اس سپردگی میں باپ سے کہیں زیادہ بچے کی مرضی شامل تھی۔ اس کے باپ نے کسی طرح کے تردد یا جھجک کا اظہار نہ کیا تھا اور نہ ہی بچے کے چہرے پر کوئی تذبذب تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ باپ نے اگر اسے میرے ساتھ بھیجنا ہی تھا تو کم از کم وہ میرا نام پتا اور میرے متعلق شہر گاؤں کا کچھ پوچھتا!..... مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔"

بچہ شاداں و فرحاں اور میں قدرے متعجب و متامل کہ میں ٹھہرا سیلانی کیلانی..... کیا ان کو بھی اصفہان، تہران اور کبھی ملتان..... یہی سوچ کر میں اس ننھی سی جان کے بلا کٹرے کو کس کس بن بیابان، جنگل، صحرا، بیلے پہاڑوں میں گھسیٹتا پھروں گا؟..... اس کا من کتب کے مطابق تھا۔ سیاحت و مسافت کی مساعدت کے لیے نہیں اور پھر میرا اور اس کا کیا جوڑ؟..... ایک جگنو اک نجوم..... قطرہ اور دریا.....!

میں اپنا تھیلا تھامے حجرے سے باہر نکلا..... تو بچے نے میرا دایاں ہاتھ تھام لیا..... باپ پیچھے پیچھے سکول تک آیا۔ ادھر دو راستے نکلتے تھے۔ میرے والے راستے کا پہلا پڑاؤ معلوم تھا..... ادھر منہ کرنے سے پیشتر اس کے باپ نے میرے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہوئے کپڑے میں لپٹا ہوا یہ عصا میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"بابا! میرے گھر میں صرف یہی ایک چیز تھی جس پر میرا اختیار تھا..... جس کے بارے کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لیے مجھے اپنی بیوی کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا۔ یہ عصا میرے مرحوم باپ کی نشانی ہے۔ یہ میرے بہادر غیرتمند باپ کو اس کے سپہ سالار امیر فراست علی خان مہمند نے انعام میں دیا تھا کہ ایک مشکل معرکہ میں اپنی جان پہ کھیل کر اس کی جان بچائی تھی۔ امیر فراست علی خان مرتے دم تک میرے باپ کے احسان کو نہ بھولا اور ہمارے گھرانے کا بہت خیال رکھا۔ سنا تھا کہ یہ نادر اور مقدس عصا، امیر کے پیر و مرشد نے انہیں عطا کیا تھا۔ جو بخارا کے ایک عظیم المرتبت روحانی استاد تھے۔ میرے والد اکثر امیر کے ساتھ ان کی زیارت کے لیے بخارا شریف جایا کرتے تھے۔ مرشد پاک کی تاکید تھی، عصا کو ہمیشہ حفاظت میں رکھنا۔ اس کی فضیلت اور اسرار کا ادراک تمہیں بہت بعد ہوگا۔ یاد رکھنا، شراب، جوا، نسوار یا کسی اور نشے کی علت والا اس سے فیض یاب نہ ہوگا اور نہ کسی کو دینا، چاہے اگر اولاد میں کوئی اس کے اہل اور طالب ہو، اس کو دے سکتے ہو۔"

پہلی بار اسے قدرے زودرنج اور جذباتی ہوتے دیکھ رہا تھا۔ عصاء میری جانب بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"آج میں وہ دو قیمتی چیزیں آپ کے سپرد کر رہا ہوں جن کے بعد میرے پاس صرف ایک ادھوری سی جان ہی باقی رہ جاتی ہے، جس کا مالک خدا ہے۔"

شاید آنسو چھپانے کی خاطر اس نے اپنا منہ اس آڑی ترچھی پگڈنڈی کی جانب پھیر لیا تھا جس کے آخری سرے پہ اس کا بے ڈھبے پتھروں سے بنا ہوا گھر اور اس کے اندر ایک سنگدل گھر والی موجود تھی۔

بیوی اور گھر والی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بیویاں کئی ہو سکتی ہیں جبکہ گھر والی صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ شریک حیات، زوجہ، منکوحہ، عورت، نار، زن، حرم، لونڈی، داشتہ! عورت کے کتنے روپ ..... شطرنج کی بساط کی طرح مختلف خانوں کے مدارج میں بٹی ہوئی۔ طرفین کے اپنے اپنے رنگ، ڈھنگ، چالیں۔ بادی النظر میں دیکھا جائے تو مرد کے مقابل یعنی اس کا نقیض صرف عورت ہے۔ جو اپنی مخصوص جسمانی ہیئت، خدوخال، نفاست، صبر وحیا اور جنسی، جذباتی، ہیجانی، جبلی رویوں سے پہچانی جاتی ہے۔ رشتے، روپ، دین، دھرم، سن سال، ہم نشان، عربی، عجمی، رابعہ یا رادھیکا، رانی یا مہترانی، سب کی سب اول تا آخر عورت ہی عورت ہوتی ہیں۔"

عصاء مجھے تھماتے ہوئے آہستگی سے کہنے لگا۔

"چاہیے تو یہ تھا کہ میں اپنا واحد اثاثہ اپنے بیٹے کے حوالے کرتا مگر وہ ابھی اس مقدس اور بہادر امانت کو سنبھال سکنے کے اہل نہیں، نہ اس کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اب میری اور اس کے دادا کی جگہ پہ آپ ہی ہیں ..... لہٰذا آپ دونوں کے امانتدار ہیں۔"

میرے ہاتھ پہ بوسہ دیتے ہوئے مزید بولا۔

"میں پوری ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ اس سارے عمل میں اللہ کی رضا، میرے بیٹے کی مرضی اور آپ کی آمد کا دخل ہے ..... میں یہاں بھی خود کو بے بس پاتا ہوں۔ فی امان اللہ! ..... میں اسے اللہ، اس کے نصیب اور آپ کے حوالے کرتا ہوں۔"

مزید کوئی بات کیے وہ اپنے گھر کی جانب لوٹ گیا اور ہم دونوں کسی نامعلوم، ان دیکھی منزل کی طرف!

ایسی سفری طویل تھکن و تجسس میں تحلیل داستانیں پرانے وقتوں کی سراؤں، پڑاؤں، سرراہ اقامتوں، منڈی میلوں ٹھیلوں یا قہوہ خانوں میں پیشہ ور داستان گو بیان کیا کرتے تھے۔ ان کی ساری جادوگری ان کے بیانیے میں ہوتی تھی، وہ واقعات کی منظرکشی اور جزئیات، سیاق و سباق ایسی خوش لحنی اور اداکاری سے بیان کرتے کہ سامعین عہد حاضر سے نکل کر عہد عتیق میں آ جاتے بلکہ سنتے سنتے خود بھی داستان کا کوئی کردار بن

جاتے۔ حاضرین و سامعین کے علم، معلومات میں اضافہ تو ہوتا ہی تھا مگر ساتھ ہی جو جمعیت اور توجہ بندگی حاصل ہوتی وہ خاصے کی چیز ہوتی تھی۔"

کابل کے شاہی بازار میں نوادرات کا کاروبار کرنے والا یہ افغانی کمال شوق اور بے پناہ دلچسپی سے بوڑھے کی داستان سن رہا تھا۔ جو اس عصا کی بابت تھی جسے اس جوان رعنا کے معذور فوتی باپ نے بطور خاص اسے دیا تھا۔ یہ میری شہزادہ جس کی دائیں آنکھ کالی بھوری اور بائیں شنگرفی شربتی تھی، وہی معصوم یتیم اور بے حال بچہ تھا جو سوتیلی ماں کے ناروا سلوک سے ہڑکا ہوا آدھی رات گھر سے نکل کر اس حجرے میں آ پڑا تھا۔"

جہاندیدہ افغانی سیلانی بزرگ عادات اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ایک زمانہ ساتھ رہتے رہتے اللہ کی زمین گھومتے گھومتے ظاہر و باطن کے بھید بھاؤ سیکھتے سیکھتے اب بازے ایک ایسا شہباز بن چکا تھا جس کے شہ پر میں کا تخم تخمل پڑ جاتی ہے جو پر سمیٹے ہے بغل میں جڑا نہ پیدا کرتی ہے مگر اونچی طویل پرواز میں چوندی و رواتی ہے۔"

باز کے شہ پر میں جب تخمل کا تخم پیدا ہوتی ہے تب ہی اس میں خود سے بلند بھی و پروازی پیدا ہوتی ہے اور "شہباز کرے پرواز" والی بات کی بنت بھی بنتی ہے۔ باز اور شکرے، عقاب و شاہین کے مابین یہی تخمل کا تخم کا فرق ہوتا ہے۔ یہی کا تخم تخمل ہی ہوتی ہے جو کسی نر میں "مردانگی" کسی مادہ میں "دوشیزگی" کی نشاندہی اور شخصرانے میٹھے ماسے سیاہ شعور کے مردے کی مہک پیدا کرتی ہے۔ اس کے جنے کا جتنا فیض بابا کے پاس تھا وہ حاصل کر چکا تھا۔ وہ اب زندگی کی آخری منزل پہ تھے جبکہ اس کے سامنے ابھی مزید راہ راستے تھے......؟

سردار جی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑے ادب سے پوچھا۔

"خان بابا! مجھے اس بندے کی بے خبری اس جوان کی کہانی سن کر بہت آنند ملا ہے۔ میرے دھن بھاگ کہ آپ سب کے درشن بھی ہو گئے اب میرے لیے کیا حکم ہے ... میں آپ تینوں کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟"

خان بابا کچھ دیر خلاؤں میں گھورتا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

"سردار جی! امر کھلا ہے کہ میں اب اپنے آخری سفر پہ مدینہ شریف روانہ ہو جاؤں..... اٹھارہ برس میں نے اس اللہ کے بندے کی ذمہ داری اٹھائی جو کچھ میرے پاس تھا اس کے حوالے کیا...... ایک چیز ایسی جو صرف آپ کو سونپنا چاہتا ہوں۔ اس بچے کے باپ دادا کی نشانی یہ عصا آپ کو جب بھی کہیں کوئی ایسا اہل مل جائے جو اس لائق ہو تو دے سکتے ہیں تاکہ یہ عصا بھی کسی مسافر کی طرح اپنا بقیہ سفر جاری رکھ سکے۔"

سیدھے سادے معنوں میں مسافر، سفر کرنے والے کو کہتے ہیں۔ کسی متعینہ منزل و مقصد کی جانب

زوال۔ قافلہ و کارواں میں شامل بھی مسافر ہوتا ہے۔ بھر یہ کہیں بھی میں یہ جا کہ محض انسان ہی اکیلا مسافر نہیں ہوتا دیگر مخلوقات میں جو کچھ بھی ہے سب کے سب محو سفر ہیں۔ اپنے منبع کی طرف اپنے مالک و خالق اپنے انجام اور آمر کار کی طرف.....!

حیات: حرکت و مزاحمت سے تعبیر ہے.... اور پن چکی! ہوا ہلکی ہو یا بھاری' اس کے پر پنکھوں میں حرکت ہی رہتی ہے۔ اس کا ہوا کے رخ کے مطابق رہنا ہی اس کی بقا اور ادا ہوتی ہے۔ مرکب کی آنکھیں سر ماتھے پہ ہوتی ہیں.... پشت پیچھے پہ نہیں کہ حرکت و برکت کے لیے سورج کو پیچھے ہی رکھنا چاہیے اور سامنے کو آگے' جو منزل پہ تم سے پہلے' تمہارے مقصد کا ایلچی بنے اور تمہاری پہچان دے سکے؟

سردار جی بتا رہے تھے کہ میں خان بابا کی یہ عجیب و غریب خواہش جان کر بے حد متعجب ہوا.... میں ایک پیشہ ور نوادرات فروش تھا۔ میرا پیشہ کاروباری اصولوں تقاضوں کا پابند ٹھہرا' اس میں کسی جذباتیت یا بے اصولی کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن میں بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ میں نے خان بابا کی انوکھی خواہش اور بچے جذبے کے سامنے خود کو بے بس پا کر کہا۔

"خان بابا! میں ایک دوکاندار ہوں اور دوکاندار اول تا آخر دوکاندار ہوتا ہے۔ دوکاندار کبھی نیو کر سودا نہیں کرتا' کہتے ہیں کہ دوکاندار ملت بھی دے دے تو اس میں بھی اس نے کھوٹ کچھ کمایا ہی ہوتا ہے۔ اسی قسم کا ایک سچا سودا ہمارے سچے سرکار بابا گورو نانک نے بھی کیا تھا۔ میں ان کی نقل کرنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا لیکن ان کے بتائے ہوئے وچاران سے میں بھی آپ سے یہ سچا سودا کرتا ہوں۔"

میں مبہوت سا یہ "داستان خان بابا" سن رہا تھا۔ داستان ہو یا سیستان' دونوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کے ختم ہونے تک اپنے ہونے کا احساس نہیں رہتا۔ مجھے بھی کچھ یاد نہ رہا کہ میں تو پرانے نادر شاہی یا امان اللہ دور کے کسی نادر قسم کے عصا، یا ہتھ چھڑی کی جستجو میں ادھر پہنچا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے مطلب کا ایسا عصا ادھر یا پھر ہندوستان کی قدیمی ریاستوں میں کہیں دستیاب ہو گا....؟

رام پور' حیدر آباد دکن' گوالیار' لکھنؤ' بھوپال' دہلی' ممبئی' ڈیرہ دون' آگرہ' بے پور' جودھ پور' سری نگر وغیرہ.... ان قدیمی تہذیبی علاقوں میں امراء و شرفاء' راجے مہاراجوں میں ان عصاؤں اور ہتھ چھڑیوں کا رواج ہے۔ کسی کی موت کے بعد چوری ہو جانے پر یا کسی کی طرح طریقے سے یہ یادگار اشیاء چور بازاروں اور نوادرات کے تاجروں کے ہاں پہنچ جاتیں اور پھر زیر زمین محفوظ خانوں میں زمانوں پڑی رہتیں اور کسی ایسے قدردان' پاگل دولتمند کی توقع کی منتظر رہتی ہیں۔"

میدانوں کے آگے برف بار پہاڑوں کا سفر ..... بیابانوں جنگلوں صحراؤں کے زوپروز دریاؤں سمندروں کی مسافتیں ..... سیاروں ستاروں بروج و مجر متوں کہکشاؤں گھپاؤں خلائی غاروں اور خمحوں کے سفر ..... کہنا مقصود تھا کہ صرف جن انسان دیو پری اور دیگر جان دار جسم رکھنے والے جاندار ہی اپنی راہوں کے مسافر نہیں ہوتے بلکہ وہ مخلوقات بھی محو سفر ہیں جو خلق کی کسی بھی ذیل میں ظہور پذیر ہے۔ چاہے شجر ہو یا حجر ذرہ ریگ ہو یا مشتِ خاک زندگی اجیری ہو کوئی نیم بجھی چنگاری ..... اضطراب اضمحلال خیال خواب خوب خراب عقل قیاس سوچ قیاس الٰہی عقیدت آرزو تمنا حسرت حرمان فلو کرم گمان وہم زعم ظن زیغ ظن کچھ بھی کوئی بھی مبرا نہیں۔ ہر کوئی محو سفر اپنی اپنی منزل کی جانب رواں .....!

- خدنگ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں.....!

مجھے میرے ابا اور بابا نے وصیت اور نصیحت کی تھی کہ حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام دونوں میں سے جو بھی نصیب ہو۔ ان کے مزار پر چالیس روز ایک مخصوص دعائیہ چلہ کا اہتمام کرنا ..... یہ چلہ ان اوراد پر مشتمل تھا جو حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی مناجات اور دعاؤں میں اور حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اپنی مخصوص ولادت نام اور پیغمبری تفویض ہونے پر بطور تشکر بارگاہِ الٰہی میں پیش کیے تھے۔ ایک زمانہ کارہائے حیات نے اس چلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی مہلت نہ دی۔ ایک جواز یہ بھی تھا کہ مجھے ان دونوں جلیل القدر پیغمبروں میں سے کسی ایک کے مزار اقدس پہنچنا اور چالیس روز تک ادھر مخصوص قعود و قیام ضروری تھا۔ یہ کام تو اپنے وطن میں دشوار۔ یہاں پیدا ہو کر رہ جانے پر جانیے۔ دوسرے ممالک میں جدھر آپ ہندی یا عجمی شناخت ہوتے ہیں اور اس قسم کے معمولات کو شادگی کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا؟

حکیم و کریم نے ایک آسودہ سا موقع خود ہی فراہم فرما دیا اور میں نجومنت ابراہیم دمشق پہنچ گیا۔ دمشق بلاد اشتبول قاہرہ جمیرا اور لاہور ..... میرے لیے خوابوں خواہشوں خیالوں خواسوں اور جستجو اور خضری بلد ہیں۔ میرا ظاہری جسم ادھر کہیں بھی نہ ہو مگر میرا داخلی وجود ادھر ہی کسی نہ کسی شہر کے مزار مسجد گلی کوچے ویرانے آستانے بازار باڑے باغ دریچے قہوہ خانے مطبخ یا کسی داستان سرائے میں موجود ہوگا؟

ایک محفل میں موجود تھا کوئی نشست ہے۔ بکار فلسفہ تاریخ پر مولانا فرما رہے تھے۔ میں بھی ان کے منبر کے سامنے بیٹھا ان کی لن ترانیاں بظاہر سن رہا تھا کہ علم کی باتیں کوئی "علم دین" کی کہے جاتے؟ میں علمی مذہبی گورکھ دھندوں سے دور ہی رہ کر اپنی اندر کی دنیا میں مگن رہتا ہوں۔ ایسا کہ پاس بیٹھا ہوا بھی بے خبر

● واہگرو کا خالصہ اور بابے دا بالکا.....!

دوپہر ڈھل چکی تھی...... ہر زمانہ، وقت، عصر بلکہ صبح دوپہر شام شب اور سحر کے علاوہ وہ لمحوں، پلوں، ساعتوں اور گھڑیوں کے بھی اپنے اپنے موڈ مزاج، سعد و نحس اثرات اور عواقب و نتائج ہوتے ہیں۔ بادی النظر میں تو یہ محسوس نہیں ہو پاتا مگر سب کچھ ان کے اثرات کے حصار میں ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے میں بھی پچھلے دور کے فقیر بابا جی داستان ارادت و رفاقت، ملاقات و مشاورت کے سحر میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ وقت کا خیال نہ یہ کہ میں ادھر کس مقصد کے تحت پہنچا تھا۔ اچھی داستان اور تجربہ کار داستان گو اچھی چیز، چہرہ اور موقع شناس دکاندار...... وقت بھلے ضائع کرا دیں مگر مقصد اور معاملہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

سردار جی نہ صرف ایک بھلے منش تھے بلکہ ایک مردم شناس تجربہ کار دکاندار بھی...... جو دکان کے اندر داخل ہونے والے کی حیثیت، جیب اور ضرورت کا اندازہ ان کی پرچھائیں دیکھ کر ہی لگا لیتا ہے۔ مجھ خوش سا مجسس اور اشتیاق بھری نگاہوں سے اس عصا کو تکنے لگا جو ایک قیمتی ریشم کے غلاف میں لپٹا ہوا تھا۔ سبز و سیاہ رنگ کا گف کپڑا، جو پرانے وقتوں میں افغان بادشاہوں اور امراء و رؤساء کے لیے خاص طور پہ ملائم پشم سے ہاتھوں سے بنایا جاتا تھا۔ ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ سردار صاحب کے اشارہ پہ اس نوجوان نے جس نے یہ عصا بڑے احترام و احتیاط سے دونوں ہاتھوں پہ اٹھا رکھا تھا، آگے بڑھا اور غلاف علیحدہ کر کے نرم ہاتھوں سے پونچھنے لگا۔ یہ ایک ایسا ہی منظر تھا جیسے کسی نے تاریک جگہ پہ اچانک مشعل روشن کر دی ہو...... جو کوئی مہتاب صفت بے حجابانہ کسی قصر کی بے ترتیب گلی میں نکل آیا ہو یا پھر کوئی شمشیر براں کسی صاعقہ کی مانند لہرا گئی ہو۔ میں اس عصا کو اک نگاہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔"

حیرت بے ساختہ اور بے دریغ ہوتی ہے۔ جب ہو آتی ہے تو دماغ سن کر دیتی ہے...... انسان اپنا منہ اور آنکھیں ضرورت سے کچھ زیادہ وا کر لے تو احمق سا مٹی کا مادھو دکھائی دیتا ہے۔ میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی...... مگر میں حیرت زدہ ہونے سے کہیں زیادہ متعجب تھا کہ یہ عصا اتنے جوکھم اور مراحل طے کروا کر جیسے میرے لیے ہی سردار جی کے پاس پہنچایا گیا ہو۔ ہو بہو وہی قامت و قدامت، قال و قیل، قاعدہ و قیام، قالب و قبضہ وہی نوک نقشہ، ویسی ہی طلب و جنبش...... وہی بانکپن وہی تیور و چھب...... وہی نقش و نگار ویسے ہی وا اور ابھار...... گھڑی شاخ بلوطیوں جیسے الف ہو حنوط...... !

سردار جی اٹھے آگے بڑھے...... عصا ہاتھ لیا مجھے پیش کرتے ہوئے کہنے لگے۔

رہتا ہے کہ میں کہاں ہوں؟

معلوم ہوا کہ محض جسم اور ظاہری قویٰ و اعضاء ہی سے انسان مکمل نہیں —— ظاہری پہچان جسم سے اور باطنی واقفیت وجود سے ہوتی ہے۔ درویش شش جہتوں میں ہوتا ہے۔ جب چاہے باہر سے اندر ... کی کرے تو باہر نکل آئے اور جو چاہے تو سب بتیاں روشن کر کے گھر خالی چھوڑ کر کسی سمت نکل جائے۔؟

سیانوں کے ہاں تحرک کی نوبت نہیں ہوتی —— جیسے تجارتوں کے قافلوں میں اونٹ ہی اونٹ، مال و اسباب بھاری مضبوط لادے جا رہے —— انواع و اقسام کا سامان تجارت چلتی پھرتی تجارت ——! اجناس کپڑے جوتے تیل مسالے گز و مناب اطلس و کمخواب مروارید و مرجان !

فبأی آلاء ربکما تکذبان؟ بڑی ماتوں کے ہاں بھی عقل علم عمل دلیل منطق فلسفہ فکر تدبیر کی کمی نہیں ہوتی —— بیچ گری بات کو بنانا آتا، اپنی پسند کے مطابق نقل دیتا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے —— مگر دیوانوں مستانوں کے ہاں یہ کچھ نہیں ہوتا —— ان کے ہاں بات تولنے کے لیے باٹ نہیں ہوتے اور نہ ہی جیب اور ہمیان کی نقدی گننے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کہیں جانے آنے کے پروگرام مہینوں عشروں پیشتر ترتیب نہیں پاتے۔ ان کے ہاں تو نقد ہوتے ہیں، جمع و ادھار کا بیوپار نہیں ہوتا۔ امروز کے متعلق سوچتے ہیں، فردا کے قریب تک نہیں آتے۔ وہ دم رواں کو ہی متاع کارواں سمجھتے ہیں۔”

حضرت یحییٰ ابن زکریا علیہ السلام کا مزار اقدس اقلیم شام کے شاندار شہر دمشق کے عین قلب میں مسجد بنو امیہ کے درمیان واقع ہے۔ یہ مسجد عہد قدیم میں ایک عالیشان عبادت گاہ کلیسا ایوان اور دربار کی صورت میں بھی اپنی ایک واضح حیثیت رکھتی تھی۔ آج بھی اس کے در و دیوار گنبد و مینار احاطہ و حصار فصیل و برج نقش و نگار وسعت و وضع اور شوکت و شکوہ —— ”اللہ اکبر“ کے سرمدی نغموں سے سرشار ہو کر جب خدائے برتر کی عظمتوں عہد رفتہ کی شوکتوں کی گواہی دیتے ہیں تو اس معتبر و موقر گواہی میں شہادت حسین اور تربت یحییٰ علیہ السلام کی برکات کی فضیلتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔”

مسجد کے درمیان بیچ درمیانہ سا مزار ایک منبر سے خوبصورت سے حجرے میں ہے۔ زائرین بڑی سہولت اور آزادی سے اس کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ جالیوں دریچوں دروازہ و چوکھٹ چوم چھو سکتے ہیں۔ بغل میں بیٹھ کر عبادت کر سکتے ہیں چونکہ مسجد کا ماحول ہے اس طرح عقیدت مند زائرین حاجی نمازی بالکل قریب ساتھ جڑ کر نماز بھی ادا کر لیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ محبت و عقیدت ضرورت اور عادت کسی ضابطہ طور اصول قانون کی زد میں رہنے سے گریزاں رہتے ہیں —— والہانہ پن پیدا کرتے ہیں، عجلت و فرصت کو جنم دیتے ہیں۔ وقائع و وسائل سے

چشم پوشی ہوتی ہے ـــ پانی پہ بند لگانے اور ہواؤں پرندوں کو پنجروں میں پابند کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔

میں بھی ان چاروں میں سے دو یعنی عقیدت اور ضرورت کا بندھا ہوا اک لمبا انتظار کھینچنے کے بعد ادھر پہنچا تھا۔ مجھے ادھر مزار سے جڑ کے ایک چلہ مکمل کرنا تھا ـــ میرے بڑوں کی جانب سے پر زور تاکید کے علاوہ ایک روحانی معاملہ کی تکمیل کے لیے منت مانی ہوئی تھی کہ حضرت زکریا علیہ السلام یا حضرت یحییٰ علیہ السلام میں ایک کے مزار پہ چلہ کشی کروں گا۔"

صوفیوں، سنتوں، درویشوں کی عبادت و ریاضت اور حصول علم و معرفت اور تقسیم و تفہیم کے ترازو باٹ کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ عام سیدھے سادے پانیوں میں بہنے والے بیوپاریوں کی سوجھ بوجھ سے یہ کچھ بالا ہوتا ہے۔ یہ مراقبے، چلے، مجاہدے، یہ گیان، سادھنا، وظیفے وسب درمیان گیان عبادت و ریاضت میں ارتکاز اور ارتعاش پیدا کرنے کی مشقیں ہوتی ہیں تاکہ یکسوئی سے علم و عرفان کی منازل طے کرنے میں آسودگی حاصل ہو سکے۔ کچھ معرفت و طریقت کے نکتے اور کچھ اپنے بزرگوں کے سلسلوں کی بیعت پہ ہونے پشت در پشت روایات اور مخصوص منت کیے ہوئے اوراد و وظائف ـــ لیکن میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ بس یہ کہ مجھے ایک بزرگ نے سمجھایا تھا کہ چونکہ میری پیدائش ایک قلندر کی نگاہ، اک درویش کی التجا اور ایک عالی پیغمبر کی دعا کی نسبت کے ارتباط سے ہوئی تھی۔ لہٰذا واجب ٹھہرتا ہے کہ میں شکرانے اور نذرانے کے طور ان کی قربت میں بیٹھ کر اپنے مالک و خالق کی عبادت کروں جو التجاؤں کو سنتا ہے ـــ محروموں کو نوازتا ہے۔ غم کھائے ہوؤں کو تھامتا ہے اور خطاؤں سے درگزر کرنے والا مہربان ہے۔"

ایک دو روز تو میں ادھر کے ماحول، اوقات اور انتظامیہ کے معمولات کا جائزہ لیتا رہا۔ واضح ہوا کہ ادھر میرا یہ عمل ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ نمازوں کے اوقات اور جمعہ کے روز کے علاوہ مزار کے پاس کوئی خاص بھیڑ بھاڑ نہ ہوتی ـــ اس عمل کے باوجود قدرے متذبذب بھی تھا کہ اتنے روز دن رات لگاتار ایک ہی جگہ ایک ہی ڈھنگ میں بیٹھنا کیا ممکن ہوگا؟ اس نوع کے چلوں مجاہدوں سے میں پہلے بھی گزر چکا تھا مگر ادھر کچھ مختلف تھا۔ عرب ممالک میں ایسے لوگوں اور اس قسم کی سرگرمیوں کو تحسین و خوش نگاہی سے نہیں دیکھا جاتا۔ شاید اسی کشمکش و پیچ میں میرے کچھ اور دن گزر جاتے۔ لیکن قدرت نے میری اس خواہش کی تکمیل کا ایک وسیلہ خود بخود ہی پیدا کر دیا۔"

میں عشاء کی نماز کے بعد مزار کی جالی سے جڑ کر بیٹھے سے مراقبے میں اترا ہوا تھا کہ قالینوں کی صفائی کرنے والی مشین کی آواز نے مجھے ہشیار سا کر دیا۔ میری محنت کا سرکٹ بریک ہو گیا تھا۔ گردن اٹھا کر

عصا ہدیہ میں قبول کر لیا تھا۔ چلّے کی تکمیل کے لیے مجھے عصا کی ترسیل کرنی پڑی تھی۔"
معلوم ہوا کہ اس کائنات میں سب مخلوق اپنے اپنے راستے پہ محوِ سفر ہے۔ کوئی اکیلا کوئی دوکیلا' کوئی قافلہ کے ساتھ' کوئی قافلہ سے باہر...... کوئی ایک قدم کوئی چند قدم...... کوئی کچے پہ کوئی پکے پہ...... جتنا جتنا ساتھ کوئی دے سکتا ہے ساتھ چلتا ہے پھر حالات معاملات ایسا رُخ بدلتے ہیں وہ علیحدہ ہو جاتا ہے۔ پیار و محبت' اقرار و وفا رشتے ناطے' تعلق و عقیدت' چاہت یگانگت سب آذرِ عصر کے تراشے ہوئے نامکمل چھوٹے بڑے صنم ہیں جو اپنے خدوخال' رنگ و رعنائی مدھم پڑنے پہ اپنی اہمیت و معنی کھونے لگتے ہیں۔
ساتھ مرنے جینے زندگی بھر ساتھ نبھانے کے دعوے' لہو سے نام بھرنا' کلائیوں پہ نام کھدوانا...... کتابوں میں گلاب رکھنا' پانیوں پہ پیام لکھنا' خود سے کلام کرنا...... یہ سب کچھ اندر باہر کے موسموں' مزاجوں اور منظروں منزلوں کے غیر منطقی مظاہر ہوتے ہیں۔
صحرا میں سراب اور خشک دلدلیں نہ ہوں تو صحرا نوردی محض آوارہ گردی بن کر رہ جائے۔ بگولے بدولے' خارِ مغیلاں اُڑتے ہوئے جھکاڑے...... جھلساتی ہوئی لوئیں' بے آب ندے...... خشک پھٹے ہوئے ہونٹ' اُبلی ہوئی شعلہ بار آنکھیں' بکھرے ہوئے بال اور تڑخے گال...... پھر جا کر کہیں کوئی محمل نشین ملتا ہے!
جو چیز ہاتھ میں آ سکتی ہے وہ ہاتھ سے جا بھی سکتی ہے...... الف کو لکھتے وقت' نیچے سے شروع نہیں کرتے۔ اُوپر سے اُتار کر نیچے لاتے ہیں۔ درخت جھکنے کے لیے اُوپر اُٹھتا ہے...... روشنی کا مینارہ بلندی پہ ہوتا ہے' رہبری وہ نیچے والوں کی کرتا ہے۔ جوتا سب سے نیچے ہوتا ہے مگر حفاظت' سب سے اُوپر والے کی کرتا ہے۔ بلندی پہ چڑھتے وقت طاقت مگر اُترتے ہوئے فراست چاہیے ہوتی ہے۔ کسی سے لینے اور کچھ چھیننے سے بڑھ کر یہ سوچو کہ تم خود کو اور دوسروں کو کیا دے سکتے ہو؟ جاننے سے ماننا' لاکھ درجہ بہتر ہوتا ہے۔ مارنے سے مر جانا اچھا اور لوٹنے سے لُٹ جانا اَولیٰ......!
پچھلے کسی باب میں لکھ چکا ہوں کہ لنگر کے لیے اہتمام کرنا...... تقسیم کرنا اک بہت بڑا چسکا ہے اور جسے ایک بار یہ چسکا لگ جائے وہ ساری زندگی اس سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر پاتا۔ چسکا کی طرح ایک اور بھی چیز ہوتی ہے وہ ہے لنکا! یہ لنک سے ہے جیسے نیک کے آم' جن کا اپنا ایک الگ ہی سواد و ذائقہ ہوتا ہے۔ نیکی کر کے بُرائی لینے کا بھی اپنا لنکا ہے۔ کوئی درد پسند ایسے بھی جو جوتے میں کنکر رکھ کر میٹھے میٹھے درد کا مزہ لیتے ہیں اور کوئی ہونٹ چبا چبا کر اپنے ہی لہو کا نمک چکھنے میں لُطف کشید کرتے ہیں۔ کوئی اپنے اعضاء کو مسل رگڑ کھجا کر کھکھی نکالنے میں عجیب سا تلذذ محسوس کرتا ہے۔ ناخنوں کی جڑیں اُکھاڑنا' پِت کے دانے پچکانا...... کھری چار پائی پہ لیٹے ہوئے اُدوائن میں پیر کی اُنگلیاں پھنسا کر رگڑنا وغیرہ......"

یہ ایذا پسندی بھی ایک نفسیاتی عارضہ ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ عادت اور ضرورت بن جاتی ہے۔ میں جب ”ایذا پسندی“ کی بات کرتا ہوں تو وہ نفسیاتی نہیں وجدانی ہے جس کا خوگر زندگی کا بد رنگی پاکر خوش نہیں ہوتا بلکہ تنگی اور اچھائی کے ملے جلے ذائقے یعنی رسوائی اور بے عزتی حاصل کر کے بہجت محسوس کرتا ہے۔ یہ کوئی نفسیاتی عارضہ نہیں ایک انوکھا تصوف زدہ فلسفہ ہے کہ گالیاں کھا کر طبیعت مسرت ہو بلکہ مکرر مکرر کی آواز نکلے۔ پھولوں کی سیج شاہانہ مسند پر فروکش ہونے کے بجائے سولی پہ کھنچ کر ہی روحانی طبیعت مطمئن ہے۔ سر پہ سرداری و سلطنت کا سہرا سجوا کر زرد بیلے مکرمے تیز کانٹوں سے گندھا ہوا تاج پہنوا کر شانے پہ دوشالا کی بجائے چوبی صلیب رکھوا کر سوئے مقتل جو سفر طے ہوتا ہے اس کا مزا ہی کچھ ایسا انوکھا اور نرالا ہوتا ہے کہ انگ انگ سے شہنائیاں اور نفیریاں سی بجنے لگتی ہیں......“

چھوٹے بچے کے منہ میں انگلیاں دے کر دبی وضاحت نے گھر بیٹھے مجھے کی بات لیتے ہوئے گجرے میں پتی ڈال کے میاں مٹھو کی چونچ میں دینے سے جو بھلی سی ٹیس اور منہ سے سی نکلتی ہے اس کا سرور بھی پھوا سے نکلنے والے ہی جانتے ہیں جنہیں بار بار ٹھنکنے کھانے کی عادت پڑی ہوتی ہے۔ ”آ بیل مجھے مار“ والی بات بھی یہی ہے کہ بل فائٹ اور اس طرح کے ایسا خونیں کھیل سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس کے مضرات، خدشات اور خون خرابے کے باوجود خود کو اس کھیل سے باز نہیں رکھ سکتے۔ ہر سال پورے اسپین میں سینکڑوں جانیں اس شغل میں ضائع ہو جاتی ہیں مگر کیا مجال جو ان کے شوق و رغبت جانوں کے گنوانے میں کبھی شمہ بھر بھی فرق واقع ہوا ہو۔

اسی طرح دنیا بھر کے مذاہب میں کچھ فرقے ایسے بھی ہیں جن کے مسلکی امور میں خود کو تکلیف و وظائف خود اذیتی یعنی اسی زمرے یعنی ”تنگ“ کے زمرے میں آتے ہیں۔“

انسان تو انسان، حیوانات، نباتات و جمادات میں بھی یہ ”خود اذیتی“ کی لگن پائی جاتی ہے۔ انسانی پہنچ سے پرے پرانے گھنے جنگلوں میں خوبصورت رنگوں، سنہری کلغی والی سرخ چونچ والا ایک پرندہ ایسا بھی پایا جاتا ہے جو اپنی عمر مکمل کرنے کے بعد اپنے گرد اگرد خشک پتے ٹہنیاں اکٹھی کر کے دیپک راگ کے الاپ سے آگ بھڑکا کر خود کو بھسم کر لیتا ہے۔ کہتے ہیں اس کی راکھ سے پھر اسی طرح کا نیا پرندہ پیدا ہو کر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔“

تھیا سانپ اکثر خود کو کاٹنا اور کھانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ دم سے شروع ہوتا ہے آدھا جسم ہڑپ کر کے بے سُدھ پڑ جاتا ہے۔ مہینوں بعد اس کا نیا جسم پیدا ہو جاتا ہے۔ کتا بھی خشک اور سخت ہڈیوں کو بھنبھوڑتا اور جھنجھوڑتا ہے اپنے منہ، مسوڑوں کے لہو کا مزہ لیتا رہتا ہے۔ بلی کو اپنے تلوے چٹوانے اور کھجلی کو اپنی دم کو نوچنے کا بہت اشتیاق ہوتا ہے۔ افریقی ہاتھی اپنے دانت تڑوانے اور گینڈا اپنا سینگ تڑوانے میں بڑی دلچسپی

لیتے ہیں۔ مگر یہ جانتے ہوئے کہ بارہ سنگھے پہ منہ رکھنے کا مطلب پیٹ پھڑوانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا پھر بھی وہ اُسے کھینچ کر سالم کھینچ لیتا ہے۔ جلتے انگاروں پہ چلنا' کئی کئی روز برت رکھنا' پانیوں میں کھڑے رہ کر...... قبروں میں دفن ہو کر' کنوؤں میں اُلٹے لٹک کر'' لنک'' حاصل کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہوتا۔؟

بھکشوں لاموں' سوامیوں' منیوں' صوفیوں' جوگیوں فقیروں میں لنک کی چنگ بہت ہوتی ہے۔ دراصل کھوج کا بوجھ اُٹھانے سے جو کاندھے کمرُ دُکھتے اور چھلتے ہیں اس کا سواد ہی بہت چلبلا اور تیکھا ہوتا ہے۔ تزکیہ نفس کے لیے جو جو بھی مجاہدے' مشقتیں' چلّے ریاضتیں پیش آتی ہیں وہ روحانی طور پہ مدافعت کی لذت سے سرشار کرتی چلی جاتی ہیں۔ ظاہر معدوم اور باطن مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ مشقت و محنت کا آزار کاہلی سستی اور فروتنی سے بیزار کر دیتا ہے۔ جب رُوم رُوم سے پسینہ پھوٹتا ہے تو اک تازہ رُوح' خوش دم پھریروں کی مانند' ظاہر و باطن کی بوسیدگی رگیدگی کو زائل کر کے اک نئی جان پیدا کر دیتی ہے۔''

کہہ رہا تھا پرائی چیز کو پہلو میں پالنا لنک ہوتا ہے۔ میں بھی اسی جاں سوز راستے کا پرانا پاپی ہوں۔ اس مرض کے حامل اکثر دائمی قائمی ہوتے ہیں۔ جنم سے ہی جن کی طرح اپنی سلامی نشانی پیش کر دیتے ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اور باتوں کے بتنگڑے کی ہر نرالی بات!

اجمال اس کی یہ کہ ہماری خاندانی دائی بہت کرماں والی بی بی تھی' میرے اور میرے اُوپر کی بہن کی بسم اللہ تک حیات تھی۔ دَم ساہ کے باعث مر رہی تھی تو میں اس وقت مولا بخش کے تالاب میں ڈوبتے ہوئے آدھے پھیپھڑوں میں پانی بھروا چکا تھا۔ وہ تو بھلا ہوا' محلہ دار عاشقے قصائی کے بڑے بھائی وارث کا جس کا دائیں پاؤں اتفاقاً میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے مجھے کھینچ گھسیٹ باہر اُوپر سیڑھی پہ اُلٹا لٹا دیا۔ پیٹ میں بھرا ہوا پانی غٹ غٹ باہر نکلا تو کچھ نرت سنبھلی......!

ابھی میں پوری طرح ہوش و حواس میں نہ آیا تھا کہ ڈوبتے سمے کی تمام تر کیفیات' پوری جزویات سے آنکھوں کے سامنے پھر گئیں کہ کس طرح میں اُوپر سیڑھی سے جو قریب دو فٹ گہری ہوگی' آگے نیچے کی جانب پھسلا اور پاؤں بے پایہ ہو گیا۔ دو چار بار ہاتھ پاؤں چلائے مگر میں مزید آگے نیچے جھکتا گیا۔ کھلی آنکھوں کے رُوبرو اُوپر تیرتے ہوئے لوگوں کے پاؤں' جسم لہرے لیتا ہوا گدلا سبز پانی' ٹوٹتے پھوٹتے بلبلے...... عجب سا ماحول جو چند فٹ اُوپر کی زندگی سے الگ تھا...... زندگی اور موت کا درمیانی پردہ کتنا مہین ہوتا ہے...... آنکھیں چُراتی ہوئی زندگی اور آنکھیں ملاتی اور منکاتی ہوئی موت...... بے طرح سے ہاتھ بازوؤں' پاؤں کا رقص محسوس ہو رہا تھا زندگی کے ڈرامہ کا یہ آخری سین ہے۔ زندگی کے مراحل ہی نہیں موت کی منزلیں بھی'' لنک'' کا تلذذ اور معنی سامنے لاتی اور سمجھاتی ہیں......

دُنیا بھر میں گھومتا رہتا ہوں۔ چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں رہنے کا اتفاق بھی ہوتا رہتا ہے۔ چالیس پچاس منزلوں والے ہوٹل بھی جدھر جدید ترین لفٹیں لگی ہوتی ہیں۔ مگر مَیں حتیٰ الوسع سیڑھیاں استعمال کرتا ہوں..... سانس پھول جاتا ہے' دل کا پسٹن جیسے رنگ توڑ کر باہر آ رہا ہوتا ہے مگر مجھے مزہ آتا ہے۔ اگر کبھی لفٹ استعمال کرنی بھی پڑے تو رہ رہ یہی خیال کہ بجلی بند ہو جائے۔ دروازہ جام ہو جائے' اس کا کوئی تار' گیئر' آٹومیٹک سسٹم یا کوئی اور گڑبڑ..... یہ کہیں درمیان میں لٹکی رہ جائے تو کتنا مزہ آئے؟

میری دوستیاں' محبتیں' تعلقات' اعتبار و پیار کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اگلا بے وفائی کرے' میرا دل اور اعتبار توڑے..... مجھے مزہ آئے؟

اکثر دوسروں کو ایسے مشورے دیتا رہتا ہوں جو اُن کی عقل و دانش سے بعید ہوتے ہیں۔ شادیاں' لڑکا' پچاس برس اور دُلہن اٹھارہ برس..... کہیں دُلہن بتیس برس اور دولہا بیس سال کا..... ڈبل ایم اے کے ساتھ مڈل فیل لڑکی..... لڑکا رانگلرز اینڈ' فیکٹری ورکر' سوٹے باز' شادی اس کی کروا دیتا ہوں' حافظ دیندار لڑکی سے..... تاکہ لنک کے مزے لوٹیں..... اُن کی اَنا مرے..... انسانیت سیکھیں' قربانی اور ایثار کا جذبہ پیدا ہو.....؟

ترقی یافتہ اور مہذب ممالک جن کی تقلید کرنا ہم اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ جن کی یونیورسٹیوں اور علمی فنی تربیت گاہوں سے فارغ التحصیل ہونا ہمارے لیے اعزاز اور خوش نصیبی کی بات ہوتی ہے۔ اگر ہم عمیق نظری اور سنجیدگی سے ان کے معاشرے اور طرز و طورِ حیات کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ علم محض صنعتی' سائنسی ترقی' چاند ستاروں تک رسائی' ایٹم بم' کا شگوفہ' سیلولر ٹیلی فون اور ڈرون طیارے بنانے تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ تو بہت پہلے اور آگے' خود سے آگاہی' بلند نگاہی..... فطری' انسانی اعلیٰ قدروں کی پاسداری' اپنے مالک و خالق کی شکر گزاری' رواداری' میانہ روی' محنت اور اللہ کی مخلوق کی خدمت و عزت سے بھی تعبیر ہے۔ علم ظاہر و باطن کی طہارت' نظر و نیت کی شرافت' قول و عہد کی صداقت سے بھی عبارت ہوتا ہے۔ علم کی بالغ نظری کا یہ عالم کہ اپنے علاوہ اوروں کی بھی عزتِ نفس' اہمیت' حیثیت اور فوقیت کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔"

ہر کسی کی سوچ سمجھ سجاوٹ کی الگ الگ ساکھ ساز ھنا اور نبھا ہوتی ہے۔ در و بام' دلہیز' دریچے' دالان' ذرے ذرے علیحدہ علیحدہ! ہر اک کی اپنی اپنی منطق..... فرداً فرداً فلسفہ..... طرح طرح کے طور طریقے' اُصول و اسلوب الگ الگ..... یعنی ظاہر اور شکل و صورت قریباً ایک سی..... مگر اندر مسجد مندر' بندر قلندر' شلجم چقندر اور پورس سکندر جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ جیسے جواہر اصلاً کوئلہ پتھر ہیں مگر رنگ و رُوپ' سارنگ و سروپ' چھاؤں دُھوپ اور گنوں پنوں کے دھنک رنگوں سے بچتی بچتی ڈھکے ہوئے.....؟

تو اس تو اس ایک سادھو سنت جوگی بھائی کے اس قلعے سے ابھی نا واقف تھا' کو بھلا لالچ کی مایا' پاپی سنسار کی اس کایا کو تیاگ کر دور جنگل میں سادھی لگائی ـــــ دھیان گیان اختیار کر کے پرماتما کا پرچار کر رہا تھا چاہتا تھا لیکن وہ نہیں سمجھتا تھا کہ عاشق اور فقیر بنے نہیں پیدا ہوتے ہیں۔ جس وہ ہوس طلب و حرص کا قلع قمع کر کے نروان حاصل کرنے کی خاطر اس نے سب رشتے ناطے توڑ کر تپسیا کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ اپنی اسی ڈگر پہ چلتے چلتے ایک روز اسے کڑی آزمائش سے اس کا واسطہ پڑا۔ ایک کتا جس کے جسم پر کیڑے پڑ چکے تھے۔ جگہ جگہ کھال زخموں اور بدبو سے رستا ہوا خون ـــــ جنگلی مکھیوں مچھروں نے اسے ادھ موا کر دیا ہوا تھا۔ کتے نے سادھو کی جانب بڑی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ اس کا دل پسیج گیا۔ تپسیا کرتے ہوئے اپنے علاقے میں لے آیا۔ جڑی بوٹیوں سے علاج کیا' نہلایا دھلایا' زخم صاف کیے۔ چند دنوں کے آرام، خوراک، نگہداشت سے کچھ بہتر ہوا تو خود بخود ہی جیسے من کر گیا۔ سادھو بڑا خوش ہوا کہ اس کی کوشش اور توجہ سے ایک بے زبان کے لیے جینا آسان ہوا اور وہ خوش خوش اپنی زندگی کی جانب لوٹ گیا۔ اپنی "نیکی" یاد کر کے وہ ایک آدھ روز خوب سرشار رہا۔

تیسرے روز اپنی صبح کی ضروریات سے فارغ ہو کر اپنی کٹیا کی جانب لوٹ رہا تھا' سامنے وہی کتا ایک اور خارش زدہ بیمار بھائی کو اپنے ہمراہ لیے چلا آ رہا تھا۔ اس کتے کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ کھال جگہ جگہ سے سڑی گلی ہوئی ہے اور تعفن کے علاوہ مکھیوں مچھروں نے اس پر بری طرح یلغار کی ہوئی تھی۔ اصل وجہ تھا وہ اپنی تو تھی اور زخم سے ان مکھیوں مچھروں سے نجات حاصل کرنے میں ناکام دکھائی دیتا تھا۔ اس کی چندھی ہوئی آنکھوں میں بڑی کرب ناک سی بے بسی لاچاری نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور باچھیں مزید چیر کر کانوں تک آ پہنچی تھیں۔ آنکھوں سے بڑھ کر قلبی و ذہنی اعصابی جذباتی و جسمانی کیفیتوں کا مظہر بھلا اور کون ہو سکتا ہے؟

سادھو سارا معاملہ سمجھ گیا ـــــ اپنی کٹیا پہنچا تو یہ دونوں بھی پیچھے پیچھے تھے۔ نئے مریض کے ساتھ بھی وہی پرانا طریقہ علاج دہرایا گیا۔ تین چار روز کے بعد اسے بھی افاقہ نصیب ہوا تو یہ بھی ایک صبح بغیر اطلاع کیے غائب ہو گیا۔ سادھو بھی اپنے سادھن کے نتیجے پہ نہال ہوا اور چند دن اور آگے کو کھسک آئے۔ اک دن ایک اور تماشا دیکھنے کو ملا۔ دونوں پہلے والے شفا یاب کتوں کے سنگ دو اور اسی نوع کے بیمار کتے اس کی راہ پہ کھڑے ہیں۔ سادھو نے خوشی خوشی ان کا علاج معالجہ خدمت سیوا کی ـــــ یہ کتے بھی شفا یاب ہو کر چلے گئے۔ اسی طرح یہ "سلسلہ نیکی و بھلائی" آہستہ آہستہ رنگ پکڑ گیا ـــــ؟

اب ایک ایسی صبح بھی طلوع ہوتی ہے کہ سادھو کٹیا کے اندر پریشان بیٹھا یہ سوچ رہا ہے کہ وہ باہر کھڑے سینکڑوں خارش زدہ بیمار کتوں کو پیٹھ دے کر کس جانب بھاگ نکلے جو صبح سویرے سے خارش زدہ کتے

اس کو پہچانا کریں ..... کیونکہ شئے اب اس کی زد پہ پہنچنے لگے تھے۔ سادھو کا سر بھی گنجا ہونے لگا تھا۔ اب وہ بال کم سر پر تھا مگر بڑھے ہوئے ناخنوں اور میلی کچیلی انگلیوں سے کھجلانا زیادہ تھا۔''

شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ گیان دھیان، عبادت، ریاضت، پوجا پاٹ وغیرہ کھوا لینے جان کو جوکھم میں ڈالنے والے کام نہیں ہیں۔ ایک ہاتھ سے تالی بجانے اور کندھے سر پہ بٹھا کر نوٹ کروانے، شادی گواہی ضمانت میں پھنس کر جیل جانے سے کھوپڑی میں اترتا ہے۔''

پہاڑی زبان کا ایک مقولہ ہے ''کر بھلی ہوئی تجنی بھلی'' یعنی بھلی کر اور اپنا منہ تڑوا ..... لیکن کیا کیجئے یہ نیکی بھلائی اچھائی احسان شرافت والے کام ہی تو انسانیت کا طریق ہیں۔ اصل لوگوں پیغمبروں ولیوں قطبوں، عاشقوں صادقوں کے وطیرے ہیں جبکہ باقی گورکھ دھندا ہے! ..... وہی کسیرے اور ٹھٹھیرے والا فرق؟ ..... عقل ضروری نہیں کہ کھوپڑی بڑی ہونے میں یا سر کے اندر بھیجے میں ہی ہو۔ یہ تو قدرتی کشش سے چھوٹے دماغ میں بھی بڑی ہوتی ہے۔ ہاتھی چیونٹی اور مکڑی کی مثال میں بھی ..... حقیقی چیز تو اس کا ادراک اور وقت ماحول ضرورت کے مطابق طریق احسن استعمال ہے۔؟

کہیں بھی ایک سر پھرے سے ''دانشور'' نے کہا تھا نیکی کرتے سمے ہزار سوچو مگر کسی سے اچھائی نیکی کا سوچنے سے سو بار سوچو دیکھو ..... درشتہ وعالی مقام اجس پہ احسان رکھو اس کے شر سے بچو۔ کیا نمک لینا اور بات پچانا، ہضم کرنا اور ..... ؟

میں ہر وقت، آندھیوں، بگولوں، زلزلوں، آتش فشانوں، طوفانوں، زلزلوں کی زد میں رہا ..... صحرائی آگ سے آسموں کی دشت و بل کی گھم اور خس وخاشاک کی شوریدہ خرامیوں سے وجود میں آنے والے آوارہ حسین بگولوں کی طرح کا وجود جس کا مقصود ہی دربدری، آشفتہ سری اور خاک بسری ہو کیونکر سرخروئی اور سلجھاؤ کی سمت بڑھ سکتی ہے۔''

بگولوں اور کھجر پانوں کے بازوؤں تلے سے بادِ صبا کا گزر نہیں ہوتا اور تھپیڑوں ضوفشاں گجروں میں موگرے کی کلیوں، صندل کے شگوفوں کی مہکاروں کی مہکیں پرونے لگتی ہیں۔ خوشبو کروٹ بدل لے تو بدبو کا بھوت بن جاتی ہے۔ گند کو مہک کی ساہوکاری میں بحال کرنا ان ساہوکاروں سیاسیوں کی سوجھا ہے۔؟

● زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے، دموں کی الٹ پھیر کا نام ہے!

صوبہ بہار میں ''گیا'' نامی ایک قدیمی شہر جو ہندوؤں کا ایک پوتر تیرتھ بھی ہے یہاں پچھم میں ایک

پُراسرار جاپ ہی ہے۔ یہ جنگل کوئی ایسا بڑا بھی نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی شیر ہاتھی ہوتے ہیں۔ بس صدیوں پرانے درخت اور وہ کچھ جو روایتی جنگلوں میں ہوتا ہے۔" اس کی کوشش کچھ یوں ہے کہ جگہ جگہ غار ہیں' کھوہیں' ٹوٹے پھوٹے اور کچھ ایسی پُراسرار جگہیں' جنہیں دیکھ کر اندر سے گواہی نکلتی ہے کہ ادھر کچھ مافوق الفطرت عنصری سرگرمیاں موجود رہی ہیں۔ واضح نشانیاں اور ثبوت بھی کہ عام انسانوں سے ہٹ کر کچھ خاص ہستیوں نے یہاں پہ تپسیا و ریاضت کی ... گیان دھیان حاصل کیا ... یہاں تک مشہور ہے کہ یہ مخصوص جنگل دیویوں دیوتاؤں اپسراؤں اور آکاش گندھروں کا نروان منڈپ بھی رہا ہے۔ پرانے شاستروں پرانوں میں بھی اس شجر جنگل اور ادھر کے استھانوں کا ذکر ملتا ہے۔"

میں پہلے بھی کہیں بڑی تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں کہ اس ارتھ' پرتھوی' ارض' زمین' دھرتی وغیرہ جس زبان میں بھی آپ کہہ لیں۔ اس کی مختلف جگہوں' ملکوں علاقوں کے اپنے اپنے شرف ہیں۔ جیسے کسی علاقہ کا پانی کھارا ہے اور کہیں کا میٹھا ... کوئی زمین فصل اچھی اور زیادہ دیتی ہے کوئی کم اور کمزور ... کسی مٹی پانی میں وفا اور حیا ہے اور کدھر طوطا چشمی اور بے مروتی ... کہیں نیچے ہیرے جواہر سونا چاندی ہے اور کہیں گندھک' گندھ وغیرہ اور کیا کیا ... کہیں گلاب و لالہ و گل کھلتے ہیں اور کہیں تھوہر اور ببول ....!

ایسے ہی کسی سرزمین میں امن شانتی حقانیت اور صدق و صداقت کا بول بالا ہوتا ہے اور کسی قطعہ ارض کے نصیب کفر الحاد بدامنی بے انصافی اور عدم استحکام آتا ہے۔ ایسی جگہیں بھی' جہاں عبادت گاہیں' مکتب مدارس اور اپنے عصر کے جید عالم و دانشور ہوتے ہیں۔ ایسے علاقے بھی جن کی وجہ شہرت وہاں کے عشرت کدوں' قمار خانوں' شراب خانوں' انسانیت سوز سرگرمیوں اور جرائم کی دنیا کے بے تاج بادشاہوں کی مرہون منت ہوتے ہیں۔"

ہندوستان کی وجہ شہرت وہاں کی پرکشش سرزمین' پُراسرار دیومالائی ہندو میتھالوجی' اساطیری قصے کہانیوں' گہرائے نینوں' سلونی رنگت دراز قامت اپسراؤں' مہاراجوں ... دریاؤں' جنگلوں' بھگتی' ریشم اور لونگ الائچی مصالحوں' شیروں' ہاتھیوں' ہندوؤں کے علاوہ صدیوں پرانے مندروں' آشرموں' مزاروں' مقبروں اور قدیم استھان ہیں۔" ہمالیہ کے وسیع و دراز سلسلے اُن کے دامن سے سرکتے ہوئے سدابہار دریا ... سرسبز وادیاں' مرغزار' جھیلیں اور اپنے دامن میں صدیوں کے اسرار اور تہذیب و ثقافت سمیٹے ہوئے خوبصورت شہر جو ہندوستان اور ہندومت کی اصل علامت اور تہذیب کے پرچارک ہیں ... اپنا مشاہدہ کرنے والوں کو یوں محسوس طور پہ یوں جکڑ لیتے ہیں کہ وہ خود کو بھول کر ان کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ ہندوؤں کے روایتی میلے ٹھیلے' ناٹک' دھارمک کھیل' دسہرہ' راس' رام لیلا کے بہروپ تماشے بڑے دلچسپ اور متاثر کر دینے والے ہوتے ہیں۔"

ہندوؤں کے دھارمک تہوار بارہ مہینے ہی چلتے رہتے ہیں۔ پوتر استھان زیادہ تر دریاؤں کے کنارے آباد شہروں میں ہیں ... پہاڑوں، جنگلوں اور ایسے مقامات پہ بھی کہ جدھر انسان تو کیا بندر بھی نہ پہنچ پائے۔ یاتریوں کی اکثریت ... متھرا، ہری دوار، کاشی (الہ آباد)، دوارکا، بنارس، اجودھیا، بدری ناتھ، رامیشورم، امرناتھ کے تیرتھوں میں زیادہ دلچسپی سے جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہاں اچھے موسم، آسان راستوں کی سہولت بھی ہے۔ دیگر تیرتھ ودیپن، اندرا ولی، بھدراوان، تریہانی، چترکوٹ، پہاڑ، دوار تھے، کیلاش، رشی کیش، کماکھیا، گنگوتری اور کالا پانی، کیدارناتھ کے علاوہ بے شمار چھوٹے بڑے تیرتھ ہیں جدھر پورا سال یاتریوں کے ہجوم رہتے ہیں۔ دور دراز علاقوں میں ایسے بھی تیرتھ موجود ہیں جن تک رسائی بہت مشکل ... کچھ ایسے مقام بھی کہ جن کے چمتکار کی بابت تو بہت کچھ پڑھا سنا مگر کوئی ایسا نہ ملا جو ادھر تک پہنچا بھی ہو۔ دریاؤں، جھیلوں، جنگلوں کے تالاؤں، پربتوں کی دشوار گزار وادیوں، چوٹیوں، دروں اور گپھاؤں میں ایسی ایسی خطرناک، ویران اور گمنام جگہیں ... عقل حیران ہوتی ہے کہ ادھر کون جاتا ہوگا؟ مگر ادھر میلا ضرور رہتا ہے ...

"ایسے استھان بنانے کی کیا ضرورت؟ کون تھے جنہوں نے انہیں کھوجا، تراشا، کھودا، شکل دی ... لوازمات، اخراجات، محنت مشقت، موسموں کی تند مزاجیاں جھیل پائے ہوں گے۔" جب عقل جواب نہیں دے پاتی تو پھر ایک ہی بات سوجھتی ہے کہ اتنا دشوار اور انسانی عقل و مقدور سے بالا یہ کام دیوتاؤں کا ہی ہو سکتا ہے اور شاید ایسا ہی ہو ... ہندوستان میں ایسے تیرتھ، مندر، بھون، دیو دھام، ورکھشے، پاٹھ شالے، گندھ آشرم اسٹوپوں کی کمی نہیں۔ حکومت بھی اپنے ان قیمتی اور متبرک علاقوں کی نگہداشت میں کوئی فروگذاشت نہیں چھوڑتی۔ دنیا بھر سے لاکھوں لوگ ان تیرتھوں کے درشن کے لیے آتے ہیں۔"

اک لمبے زمانہ میں بھی ان دیکھی، ان دیکھی راہوں منزلوں کا مسافر رہا ... عقل، عمل، عقیدہ، دین دھرم اپنا اپنا، لیکن دھرتی، دھیان، دھرم، بہت دھمال اور دھوپ تو ہر کسی کے لیے سانجھے ہیں۔ مشاہدہ، مطالعہ، غور کرو، موازنہ اور مراقبت کرنا تو سب کا حق ہے۔ حکم ہوا کہ زمین پہ چلو پھرو ... دیکھو، غور کرو اپنے مالک کی نشانیاں تلاش کرو اور اس کی حمد بیان کرو ... !

ہر کسی کا اپنا ذوق شوق اور نصیب ہوتا ہے ... کوئی اس دنیا میں صرف پیدا ہونے کے لیے پہنچا ... جنم لیا، کھایا پیا، شادی کی، بچے پیدا کیے، بوڑھے ہوئے، بیمار پڑے اور آخر قبر میں جا لیٹے ... کچھ لوگ لڑائی جھگڑے، دنگا فساد، انتشار و افتراق کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسے بھی جو جوڑنے، ملانے، کھلانے، آنسو پونچھنے اور دکھ سکھ بانٹنے کی خاطر زندہ ہوتے ہیں۔ کوئی مسیحا، کوئی فقیہ، کوئی جراح، کوئی جلاد ... کوئی ساحر، کوئی صاحب نظر، پیدا تو

میرے من میں ادھر پہنچنے اور خوب خوار ہونے کی خواہش موجود تھی۔ جیسے میں دبی ہوئی خواہش اور سوتا سا کوئی بھولا ہوا اپنا ـــ کبھی زندگی اپنے انجام کے ساتھ سامنے آ ہی جاتے ہیں۔ میں اس لیے ادھر پہنچنا چاہتا تھا کہ میرے پاس بہت سے اہم سوالات تھے جن کے جوابات مجھے اسی گیا کے ذہن سے مل سکتے تھے۔ جیسے گیج ہو گوشت پوست اور زعفران صرف اور صرف کشمیر کے ہی ہو سکتے ہیں۔؟

بحیثیت مسلمان میرا عقیدہ ہے کہ کسی انسان کے لیے مرنے کے بعد دوسرا جنم لے کر دنیا میں آنا ممکن نہیں مگر خدا کے حکم سے اعمال کے حساب کتاب کی خاطر اسے قبر سے اٹھایا جائے گا اور جزا و سزا کے لیے جنت یا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ میں ایک جسم سے روح کا نکل کر دوسرے جنم میں جانے کا قائل نہیں ـــ آواگون کے فلسفے پہ ہندوؤں کے علاوہ بھی دنیا کے کئی مذاہب یقین رکھتے ہیں۔ بلکہ اس فلسفے کی تائید و توصیف میں کئی ملکی و غیر ملکی مصنفین کی بہت سی کتابیں بھی موجود ہیں۔ ان میں جنم در جنم کے واقعات ذاتی مشاہدے، تجربے ـــ حیرت انگیز یا کہیں زبردستی کے نتیجے اور ماورائے عقل و فطرت معاملات کے بغلوں بیونہ آ جاتے۔ یا لاشعور کی بندوقت مانتے ہوئے بھی انہیں درست ماننے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔"

انسان آنکھوں کے سامنے ایک سن رسیدہ خشک درخت ہوگی جس کی سوختہ ٹہنیوں پہ چمڑا سوکھ کر سیاہ پڑ چکا ہے ـــ آنکھوں کے ڈھیلے بیچ ـــ دراز جٹیں خمیدہ کمر لرزیدہ لرزیدہ گھسٹ گھسٹ بڑے جنگلوں سے پرانے برگد کے پیچھے جاتا ہے۔ ایسا آتی ہے ـــ کوئی اکیلا نڈھال بوڑھا اپنی مدد آپ کے تحت لباس کر لیتا ہے۔ اب چشم حیرت دیکھتی ہے ـــ وہ منظر جس پہ یقین کرنا بہت ہی مشکل امر ہے۔ برگد کی دوسری جانب سے ایک نوخیز لڑکا نکلتا ہے ـــ خراماں خراماں اس جانب او جھلتا ہے جدھر سے وہ بوڑھا جوگی آیا تھا۔ اب برگد کے پیچھے کا منظر سامنے آتا ہے۔ وہاں اسی جوگی کے بوڑھے جسم کی سڑی بسی کینچلی پڑی ہوئی ہے جو آہستہ آہستہ بھوبھل میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے؟

گیان سے ایک منظر میں جوگی کو دیکھا اس کا دایاں بازو اوپر اٹھا ہوا ہے اور سیدھی انگلی آکاش رخ کھڑی ہے۔ سوکھی ٹہنیاں جٹا میں کرمٹ جھول رہی ہیں۔ دنیا مافیہا سے بے نیاز ـــ معلوم ہوا یہ جوگی تیس برس سے اسی حالت میں اسی جگہ کھڑا ہے۔ وہ اپنا اٹھا ہوا بازو نیچے بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا کہ گوشت پوست کا بازو اب خشک چوب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ شاید یہ ریاضت کا راز اور مالک کی یکتائی کا اظہار کر رہا ہو لیکن تیس برس سے ایک ہی اکمل انداز میں کھڑا رہنا۔ مسلسل ہاتھ بازو اوپر اٹھائے رکھنا ـــ کہ ایک ہی حالت میں رہتے رہتے یہ تن ہوتے ہوتے خشک لکڑی کی مانند ہو گئے ـــ کیا کسی جیتے جاگتے جسمانی و روحانی بنیادی تقاضوں کے حامل کسی ذی جاں انسان کے لیے یہ عمل مسلسل قائم رکھنا ممکن ہے؟ یقیناً نہیں لیکن گیا کے ذہن میں

سے تصوف، تقشف، درویشی، سادھو سنت جنہوں نے مروجہ طریقوں سے ہٹ کر اپنی علیحدہ راہیں اپنائیں..... لیکن اپنے انسانی، روحانی ارتقاء سے بال برابر پیچھے نہ ہٹے۔ نفس کشی، ریاضت و عبادت سے تسکین پائی۔ اپنے پالن ہار کی مخلوق سے پیار کیا، دکھی انسانیت کی خدمت، ان کے دکھ درد بانٹنے کو اپنا شعار بنایا۔ تزکیہ، یعنی اپنے نفس، عہد کے پاس اور عفو و کرم پہ اختیار رکھا۔ قدرتی فطری انداز اپنائے، علوم متعارف و غیر متعارف، الہیات، معرفت و سلوک، صبر سے صدق پایا۔ لذائذ و خواہشات سے اجتناب برتا۔ جیون جنجال سے کنارہ کشی کی، خود کو اپنے مالک کے سپرد کر دیا..... ؟

اس حقیقت کے راستے پہ گامزن لوگ، رواجی دین دھرم کے طور طریقوں پہ کاربند دکھائی نہیں دیتے لیکن باطن ان کا تقدس، اتقا و دین ہوتا ہے۔ میں نے اپنے وسیع مشاہدہ سے یہ حقیقت بھی کہ اخلاص انہی لوگوں کے ہاں ہوتا ہے۔ کر و فر نہ کوئی تصنع، غرور، نمائش نہ منافقت..... بس ان کے ہاں عجز و انکساری ہی ہوتی ہے۔ بحث نہ تمحیص..... ذات کی نفی کے نفع کو ان سے زیادہ اور کون بہتر سمجھ سکتا ہے۔ ایک اور بڑی خوبی یہ کہ کسی سے اس کا مذہب، قوم، نسل، نسبت نہیں پوچھتے..... نہ کسی سے کوئی ذاتی سوال و جواب کرتے ہیں۔ چھوت چھات نہ کوئی ذات کی بات..... کتے سے بھی قربت، کمین کی بھی عزت..... نہ کوئی سود اور نہ زیاں سے ڈر..... یہ گودڑی پوش، خاک نشین، آبلہ پا، شکستہ خاطر، کاسہ لیس، زخم کشیدہ قسمت، تہی دست..... اندر سے بھرے پرے ہوتے ہیں۔ بے فکرانہ بسر اوقات..... بس ایک اس کی ذات جو سب کے لیے مالک ہے اور ایشور اور بھگوان ہے اور کسی کے ہاں اللہ، خدا ہے یا جو بھی اسے کوئی نام، پہچان دے دے..... !

جسے کسی چیز کی تلاش ہوتی ہے وہ اسے حاصل کرنے کی خاطر ہر وقت سرگرداں رہتا ہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں پتا ہوتا ہے کہ وہ کس کی تلاش میں ہیں اور ایسے بھی جو نہیں جانتے کہ ان کی تلاش کیا ہے؟..... اور کچھ ایسے بھی جو ان دونوں حالتوں سے ماورا ہوتے ہیں..... یعنی ایسے ذہین ماہی مسافر کی مانند جسے منزل خود تلاش کرتی ہے۔ انہیں دو قدم بھی چلنا نہیں پڑتا اور سامنے منزل آ جاتی ہے۔ ایسے بھی دیکھے جو خود منزل ہوتے ہیں مسافتیں اور مسافر انہیں ڈھونڈتے رہتے ہیں..... اور یوں بھی کہ کوئی اس چند سے دھندے کا بندہ ہی نہیں ہوتا..... اس کی کوئی مسافت اور نہ کوئی منزل..... وہ حالت تنزل و ترفع، ہر سانس نفس اپنے جنس کے قفس میں مقید کیے رہتا ہے۔"

عشق قلندر جوگی، شہبازوں کے بن باسیوں کی پرکھ ہر کسی کی آنکھ کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی یہ عام انسانوں کے فہم و ادراک میں آتے ہیں۔ شیر جنگل اور اپنی جبلت کا ماحول رہے تو شیر ہے ورنہ محض گوشت کا ڈھیر ہے۔ چڑیا گھر کے پنجرے میں ہے وہ شیر نہیں۔ شیر نما ایک چوپایہ ہوتا ہے جو اپنی فطرت کے مطابق شکار کر

کڑوے کی دھوپ؟ ... سراپا محبت اور کہیں نفرت ہی نفرت ... ولی کامل بھی اور مُطلق جاہل بھی ... طالب
اور مطلوب بھی، عاشق بھی معشوق بھی ... رقیب بھی محبوب بھی، شاہد بھی مشہود بھی، مخفی بھی مشہود بھی —
بظاہر بے ننگ و نام، بے رغبت و نخوت کا مرکز امروز تمام اُدھر سے پھرتے فقیر درویش، سادھو سنت لوگ بہت
بےضرر معصوم ہوتے ہیں۔ استاد قمر جلال آبادی نے کہا تھا —

حال دل کیوں نہ کہوں سامنے دیوانوں کے
یہ تو وہ لوگ ہیں اپنوں کے نہ بیگانوں کے

یہ جیرے میرے کپڑے لتے، روپے پیسے، من و سال نہیں دیکھتے ... سیدھے سیدھے منش کے
منہ پر منہ رکھتے ہیں۔ لو بھلا دیکھو لہجہ کا کوئی لگ دکھائی دے جاوے تو لوچن بند رکھتے ہیں۔ ایسی ہی
کوئی وجہ ہوگی جو وہ بے لوث لڑکے نظرانداز کر کے مجھ سے کچھ زیادہ ہی التفات برتتے تھے۔ میرے بھیگے
بدن سے پانی بھی خشک ہونے نہ پایا کہ دیکھا بابی ناشتہ کا خوان اٹھائے دوارے میں داخل ہوئے۔ مجھے ایسی
صبح سویرے سادھوؤں کے پاس بیٹھا دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ میری جانب گھوری ڈالتے ہوئے سادھوں کو تعظیم
دی اور خیرت پوچھنے لگے ...؟

"مہاراج! اس موڑے نے سویرے سویرے آپ کو ضرور تنگ کیا ہوگا؟ اس کی ماں بتا رہی تھی
یہ کئی دنوں سے اسی انتظار میں تھا کہ بابے آئیں گے اور مجھے خوبانیاں اخروٹ ملیں گے۔ الٹی کھوپڑی بچھڑے کی
کی طرح، ہر وقت جھنڈ ملنگی کے چکر میں رہتا ہے۔"

میں نے دیکھا وہ تینوں بھی ہنسنے لگے تھے۔ ایک نے جوان کا گردن تھامل کی طرح جھپٹا مار کر مجھے
اپنی جانب کھینچ لیا۔ اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا!

"کمان جی! یہ بالک آپ کا اکلوتا سنتان نہ ہوتا تو میں بھی کا اسے اپنا بالک مان پربتوں کی اوڑ لے
گیا ہوتا ..." ٹھوڑی اوپر اٹھا کر میرا ماتھا دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ "اس کے مستک پہ گوپی چندن کے ابھار کا
چمکار دیکھیں؟ ... کیوں آپ تو جانتے، اس پر بھاگ ہے جب کہ وشن مہاراج برہما سنکھ میں براجمان ہیں،
لکشمی دیوی، اگنی چندو کا بلیدان سوئیکار کر رہی ... یہ گم کنڈل، یہ شاد بے سے شانت ہو کے پھیر واپی ہتھیلی
پرتی میں یہ باس و کمن چنوں نیوں کی چمک ... جھنکی! ... پر تو! اس دم تنے میں کوئی من موہن بھجنے سر پر تلکیے
تیوروں امرتی سیا شکت میں آ بیٹھے تو اسے سمان ممسا کے سنگھاسن پہ براجنے کا ادھکار دینا اوش ہو جاتا ہے۔
ایسی بیما کوئے آکاش سے بدھوا جیولی برتی ہے۔ وشال ساگر کے سیپ انمول موتیوں کے لیے منہ کھول
دیتے ہیں، سیپے میں کافور، چندن میں کدھرا، بھسوے سے صلد ہیں، گورانی سے گادلوچن ... گھنشیامی سے رتن

درد دل کی دوا دینے والا وہ کون ہے جا کر کہیں اور نکل چکا ہوتا ہے......؟

کسی جنگل میں بھٹکتے ہوئے بے زادِ راہ مسافر کی طرح "میں" گھٹتے گھٹتے کہاں سے کہاں نکل آیا؟ جنگل باہر کا ہو یا اندر کا ...... جو ان میں اُترا، خوش نصیب ہی ہوگا جو پھر کبھی باہر نکل پایا ہو۔ جنگل کا جذب ذہنوں، فصیل کے جھاگ بھرے لب کی طرح ہوتا ہے جو خود کے حاشیوں، گیان دھیان نروان کے کھوجیوں کی روحانی بے چینی کو سنگ سایہ دوست دیتا ہے۔ گم ہوئے بِن خود کو پانا ممکن نہیں ...... جس نے بھی خود یا خدا کو تلاش کرنے کی جستجو کی، وہ جنگلوں صحراؤں، سمندروں دریاؤں میں گھس گیا۔ پہاڑوں، غاروں کی جانب رُخ ہوا تو اُدھر ہو لیا۔ زمین مٹی نے راہ دی تو کنوؤں باولیوں، کھوؤں، تہہ خانوں، قبروں میں اُتر گیا۔ یہ سب ایسے بے ڈر دروازے ہیں جنہیں عبور کیے بغیر عبدیت، معبودیت، خودیت، ابدیت، ماورائیت، فطریت، عصریت، الٰہیت، روحانیت، صائبیت علی القیاس انسانیت کو سمجھا جانا مشکل پڑتا ہے۔ یہ فطرت کے کھلے کتب، جو یقیناً انسانوں کے محدود المامول مدارس سے اولیٰ ہیں۔"

اقبال جیسے واقفِ حال، دانائے راز اور حکیم الفطرت نے کیا خوب جانا اور کہا ......

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی ..... یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

صرف اتنی سی بات کہنے کے لیے اتنی لمبی چوڑی تمہید قلم زد ہوئی کہ میں نے پہلے پہل جنگل کی اہمیت اور اس کی باطنی کیفیت و رمزیت کو کشمیر کے پُراسرار سدا بہار برف زار برہتوں سے اُترے ہوئے برہمچاری مہاراج سے بھی جو ہمارے قصبے میں میرے والد صاحب کے مہمان خاص تھے۔ والد صاحب کی بے پناہ عقیدت میرے اکلوتے ہونے اور اولاد سے بچپن ہونے کی بنا پر وہ مجھے عزیز رکھتے تھے۔ صبح صبح کا سماں، جلدی جلدی نہائے، جسم پونچھے بغیر، فرطِ عقیدت سے بھیگا ہوا ان کے قدموں میں آن گرا تھا۔ چہرے کا کنول کھلا تھا، گیلے عنبری بالوں سے مروارید ٹپک رہے تھے۔ آنکھوں میں نجانے طراوت تیر رہی تھی۔ اوپر سے والد صاحب بھی پہنچ گئے۔ مجھے اس حالت میں مہاراج کے قریب دیکھ کر ہلکا سا معترض ہوتے ہوئے پوچھا کہ کہیں میں کوئی بدتمیزی تو نہیں کر رہا؟ مہاراج نے مجھے اپنی گود میں کھینچ کر جواب دیا۔

"کھان جی! اس بچے نے تو ہمیں صبح صبح نہال کر دیا۔ اسے دیکھ کر کرشن مہاراج کے بچپن کا گوپال دھیان میں آ جاتا ہے۔ بھگوان! اس کی رکھشا کرے۔ کیول اس کے ماتھے پہ چندن تلک کا بھرن ہے ...... یہ ذات کا سولکھن نقش ہوگا ...... آپ کو بدھائی ہو۔"

انھوں نے مجھے چھاتی سے چپکا کر اپنی "چھتنار" داڑھی میرے سر چہرے پہ ڈال رکھی تھی ...... جیسے

سونپ دی جاتے ہیں جبکہ وہ ہم جنس نہیں ہوتے اور نہ ہی آپ کے اجزائے ترکیبی سے اُن کا کوئی تعلق ہوتا ہے۔
یہ کچھ تو ہوتا ہے کہ وہ آپ کے دل میں کوئی نرم گوشہ اور طلب و جذبِ طبیعت میں رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

میں خام بجز اشتیاق و فکر کسی نہ کسی طور کسی نگاہ والے کی نگاہ میں اٹک پیدا کر جاتا تھا۔ اٹک مٹک جھٹک یا حرکت پیدا ہو جائے تو کچھ نہ کچھ کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے۔

میں اُونچی آن بان و آوارہ بازار میں بکنے کھڑا تھا۔ کبھی بزنس کی طرح کسی کی مجبوری کے بڑا ... میری گلی کو گوندھائی گستاخی، شاید نیکی ہوئی کہ کبھی کا سبکی بات۔ گلہ ان تو کبھی کندہ دان ... قدر وکی صورت کہیں تلپٹ تو لاشے کی حالت کہیں سُولی پہ لٹک! ... صید بنا کبھی صیاد تو وہ بھی فریاد نالہ تو کبھی نغمہ انبساط تو کہیں صدمہ ... محبوب تو کہیں معشوق ... تاب کبھی حجاب ... کیا نہ تھا جو میں نہ تھا! صد پہلو ورزو گرد تو کبھی بزم ... کھلا دیا کبھی نہ آیا ... کیا پایا کیا کھایا ... کون جانے کس کا چاند ... کیا بھایا کیا سہایا۔ کبھی کچھ بن کبھی میں نہ ہوا۔ سیلاب کے تند و تیز ریلے میں ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح بے طرح بہتا ہوا۔ انت نہ کوئی منزل ... ؟

## ● ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دیجیے ...!

بچپن عمر کے نت نئے کھیل کود کا حصہ اور درختوں پہ چڑھ کر کچے پکے پھل توڑ کر کھانا انتہائی دلچسپ اور سنسنی پیدا کرنے والا مشغلہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر اُن موقعوں پر جب بچے بندروں کی مانند جتھے بند ہو کر کسی باغ کو گھیرے پہ دھاوا بول دیتے ہیں۔ طوطوں، چڑیوں، بلبلوں، گلہریوں کی یلغار ہو تو کسی نہ کسی طور کم نقصان ہونے کا امکان ہو سکتا ہے مگر ان لونڈوں بالوں کی زد میں آئے ہوئے باغ بغیچے برباد ہو جاتے ہیں۔ پکے نا پکے پھل کے ساتھ ساتھ درخت ٹہنیوں شاخوں، پتوں پھال، چھلکے اور بھرت کا حلیہ بھی بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ بسیرا کرنے والے پنچھیوں پرندوں کے آلنے گھونسلے محفوظ نہیں رہتے۔ الغرض ان منہ زور بچوں کی شامت آئی رہتی ہے۔ شاید اسی نوع کی تعمیر، تخریب، کھیل تماشے، فنا و بقا کے سلسلے ہیں جو ہر لحظہ اس کائنات میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور شاید یہی حیات و ممات، حرکت و برکت، تغیر و تبدل ہے۔"

میں بھی اس نوع کے بچہ پارٹی کا ایک حصہ تھا۔ ہمارے اس ٹولے میں محلہ بھر کے نکھٹو، آوارہ، سکول و مکتب سے بھگوڑے، دانا لے ہوئے، جیب پیسے سے خالی، گھر والوں سے بیزار ... جن کی کہیں قدر، ضرورت، عزت یا گنتی نہ ہوتی وہ ہم نفس تھنگوں میں آ شامل ہوتے۔ ہمارے کوئی ضوابط و قواعد نہ تھے۔ جو بھی دن کے اجالے میں مخبری شاہ کی ریوڑیوں اور رات کی تاریکی میں دھاریوال کے چنے بھوننے والے بھٹیوں کے

لال کالی والے اس خوبصورت پرندے میں قدرت نے دیگر اوصاف کے علاوہ جو سب سے بڑی صفت رکھی ہے وہ انسانی اور پورے سیاق و سباق کے ساتھ انسانی آواز اور لہجے کی نقل ہے۔ جب یہ سکھایا جاتا ہے تو اس کی سرخ چمکتی پتلیاں اور وہ بھی چمکتی زبان سر اور گردن کے کھڑے ہوتے ہوئے بال مستی و وارفتگی میں جھومتا جھومتا ایک عجیب سماں سا باندھ دیتا ہے۔ اس کی مستانہ اور والہانہ ادا میں بڑی دلربائی اور خوش ادائی کی مظہر ہوتی ہیں۔ پرندوں سے محبت کرنے والے خوش ذوق امیر کبیر لوگ چونچیاں لال لال، سبز کالی کالے پنکھ، شیر زری، بجری، سیمانی، ہدہد، آسٹریلین طوطے، کاکاتوا، خراسانی، زرین مرغ، طاؤس، سرخاب وغیرہ بڑے اہتمام سے پالتے ہیں۔ قیمتی خوشنما آرام دہ پنجروں کو ہوادار کمروں میں انہیں آسودہ رکھتے ہیں علاج معالجہ، خوراک اور انہیں قدرتی ماحول مہیا کرنے پر بڑی توجہ دیتے ہیں۔

گھریلو ماحول میں خوش رہنے والے انسان دوست پرندوں میں طوطے سرفہرست ہیں۔ خاص طور پر باتیں کرنے والے سرخ کالی والے طوطے اپنی گوناگوں خوبیوں کی بناء پر بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کے نایاب اور قیمتی ہونے کی وجہ ان کی خوبصورتی، ذہانت، تیز اور حسین یادداشت، خوش لفظیاں اور باتیں کرنے کی استعداد و صلاحیت ہے۔ جس گھر میں یہ پرندہ طوطا ہوتا ہے وہاں رونقیں اور شادمانیاں، شادابیوں کے ڈیرے ہوتے ہیں۔ یہ گھر بھر کو مصروف اور چوکنا رکھتا ہے۔ خود نہ چپ رہتا ہے اور نہ دوسروں کو گم سم ہونے دیتا ہے ایک طرح تماشہ لگائے رکھتا ہے۔ یہ پرندہ ہرا بھرا تھیٹر دکھاتا ہے۔ اپنی خوش بختی اور برکت سے اپنے مالک کو بھی فیض یاب کرتا ہے۔ انسانوں کی طرح سہانے خواب خوب دیکھتا ہے۔ اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب سویا اور کب بیدار ہوتا ہے؟

ان کی چمکدار گول آنکھیں بڑے کرتب دکھاتی ہیں۔ بلا کا ڈرامہ باز اور نقال ایسے ایسے کرتب اور کمال دکھاتا ہے کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ اذان دینے والے طوطے، موسیقار طوطے، مختلف آوازیں، سیٹیاں اور صوتی اثرات پیدا کرنے والے طوطے غرضیکہ اساطیر کے قصے کہانیاں ہوں یا دور جدید کے واقعات، یہ سبز پوش پرندہ منفرد ہی رہا۔ کوئل اور مینا بھی اسی قبیل کے خوبصورت خوش گلو پرندے ہیں۔ سیاہ پنکھ اور کالی، مگر مختلف سیاق و سباق میں یہ طوطا چیزے دیگری ہے!

طوطے پالنے کے حوالے سے بات طوالت پکڑ گئی۔ ہوتا یہ تھا کہ ہم بچے لوگ طوطوں اور ان کے بچوں کی کھوج میں رہتے کہ شہرت کے ساتھ کچھ پیسے ٹکے بھی ہاتھ لگتے......

"ٹنٹے گھسی" بیکار اور بیگاری زندگی کو کہتے ہیں۔ دین و دنیا گھر بار یا حسن ظاہر سے فارغ وہ بچے یا حضرات، جن کے پاس کوئی کام کا کام نہیں ہوتا وہ بھی ٹنٹے گھسی کا کام کرتے ہیں۔ اس وقت کی ضرورت اور

بھی جانے کا مقصد خیر و برکت کے علاوہ کھانا پینا اور نذر نیاز کے پیچھے آزادانہ۔۔۔"
بچوں اور منگوار ہمارے لیے کرکٹ گیندیاں لٹو کھیلنے کے دن ہوتے۔ خاص طور پر منگل وار کا دن گڈیاں اڑانے اور مرغیاں چوری کرنے کے لیے بڑا سعد مانا جاتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس دن مرغیاں دعائیں کرتی ہیں کہ ہمیں کوئی چرائے اور بھون کر کھائے۔ اس دن ہمارے ٹولے کا کوئی فرد گھر سے کھانا نہیں کھاتا تھا۔ دو چار مرغیاں اور ان کی ضیافت میں بشیریوں میں یک رنگی ہوتی تھی۔

آگے اب ایک ہی دن بچتا ہے وہ ہے بدھ وار! ہم بدھ کو "کام سدھ" کہا کرتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا بدھ کے دن چیلیوں کے مابین بچوں بدھ کا حکم ہوا تھا۔ یہی وہ مبارک گھڑی ہے جس نے تمام پرندوں کو اپنے آرام و بسرام کے لیے گھونسلہ بنانا سکھایا۔ خاص طور ان پرندوں کو جو جھاڑ درخت کی بڑی شاخوں ٹہنیوں پر اپنے گھونسلے نہیں بناتے۔ انہیں انڈے بچے دینے کے لیے چھتنار درختوں کی قدرتی کھوکھی کھوؤں اور کھندوں میں اپنے آشیانے بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان چند پکھیروؤں میں خاص طور پر طوطے اپنے نسلی تقاضوں کی بجا آوری کے لیے ایسے پرانے کھلے درخت تلاش کرتے ہیں۔ جو ہم انسانوں کی راہ گزر سے دور حشرات الارض اور حشرات الفضاء کی دسترس سے محفوظ ایسے کھوکھلے تنے کھوئیں، قدرتی سوراخ اور تنگ گوشے جہاں ہوا اور روشنی تک کا گزر مشکل ہو۔ اس سیانے طوطا اور خود پسند پرندے کی احتیاط اور توجہ کا اندازہ اس کے گھونسلے کا محل وقوع اور بناوٹ دیکھے بغیر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا تعلق ان چند ایک پرندوں کے قبیلے سے ہے جو محض پنکھوں والے پکھیرو ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کا بعض منطق سے ہے جو حیواتی تقاضیات اور ان کے جبلی تقاضوں سے مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔

پرندوں کی تمام قسموں کے بعد یہ طوطا واحد پرندہ ہے جو نقل اداکاری اور صداکاری بھی کر سکتا ہے۔ اس کی انہی خوبیوں کی بنا پر اس کی مانگ بہت زیادہ ہے جبکہ بازیافت انتہائی قلیل اور محدود ۔۔۔ پہلے وقتوں میں لوگ گھروں میں پالتو جانور پرندے بڑے شوق سے رکھتے تھے۔ گائے بھینسیں بھیڑ بکریاں بطخیں مرغیاں تیتر بٹیر اور طوطے! سمجھا یہ جاتا تھا کہ جانور گھروں میں رکھنے پالنے سے رزق میں برکت اترتی ہے اللہ پاک خوش ہوتے ۔۔۔ جانور اپنے پالنے والوں کی جان مال کے لیے خیر مانگتے ہیں ۔۔۔ رونق لگی رہتی ہے اور بچے بڑے خوش اور مصروف رہتے ہیں۔"

درندوں میں شیر چیتا پرندوں میں شکرا اور طوطا ایسے ہیں جن کے دانتوں جبڑے اور چونچ کی کاٹ گرفت اتنی پکی مضبوط ہوتی ہے کہ پکڑ میں آئی ہوئی چیز چھڑانا ممکن نہیں ہو سکتی۔ طوطا اور شکرے شہباز کے دانت نہیں ہوتے محض تیز دھار والی مڑی ہوئی خنجر نما چونچ ہوتی ہے۔ یہی تیز چونچ دانتوں کا کام کرتی ہے۔

کہتے ہیں جو گہرائی میں بہنے والے ندی نالے سے پانی کھینچ کر انھیں سیراب کرتا ہے۔ ہم بچے لڑکے ندی میں خوب نہاتے اودھم مچاتے۔ امرودوں کے باغات میں کچے پکے امرود توڑتے اور جیبیں بھر کر واپس لوٹتے..... جدھر ہمارے گھوڑے ہمارے منتظر ہوتے۔"

بابا بخشا ان باغات کا رکھوالا تھا، جس کی شاید ساری حیاتی انھیں باغات کی رکھوالی کرتے گزر گئی تھی۔ شادی وادی کے جھنجھٹ سے آزاد میں گھاس پھونس کی کٹیا میں رہتا تھا۔ ہم بچوں سے بے حد پیار کرتا۔ خاص طور پر مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں اس سے ایسے ایسے سوال پوچھا کرتا تھا جن کی توقع کم از کم میری عمر کے بچوں سے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ دوسرے بچے امرود توڑتے یا پرندوں کے گھونسلے تلاش کرتے لیکن مجھے وہ اپنے پاس زمین پہ بچھے پھوس پہ بٹھا لیتا، سامنے کٹے پھٹے امرودوں کی ڈھیری لگا دیتا کہتا "خوب کھاؤ اور باقی ساتھ گھر لے جاؤ۔" یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ دوسرے بچوں کو اپنی پسند کے درختوں پہ چڑھ کے امرود توڑنے کی اجازت تو دے دیتا اور مجھے پرندوں کے کٹے پھٹے باسی بڑی مشکل امرود وہ اصرار کر کے کھلاتا، باقی ماندہ میری جیب میں ڈال دیتا۔ ایک عرصے تک جب یہ عقدہ مجھ پہ نہ کھلا تو ایک دوپہر میں اکیلا ہی باغ میں پہنچا۔ بابا بخشا جیسے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سرخ گودے والے امرود چھوٹی سی چھری سے کاٹ رکھے تھے۔ لونی مرچ اور کھٹا' کٹا ہوا پاس پڑا تھا۔ حسب معمول میں نے سلام میں پہل کی..... بابا نے مسکراتے ہوئے "وعلیکم السلام" جواب میں کہا اور مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ گھر والوں کی خیر خیریت پوچھی، میرے ساتھیوں کا پوچھا کہ آج وہ کدھر ہیں؟

"آج میں اکیلا آیا ہوں۔"

وہ اپنی میلی چادر سے میرے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"اتنی سخت دوپہر ہے تمہیں گھر سے اکیلا نہیں نکلنا چاہیے تھا..... مگر میری بوجھ میں تھا کہ تم آج اس وقت ضرور ادھر پہنچو گے۔ اسی لیے تو میں نے سرخ سرخ میٹھے میٹھے امرود پہلے ہی کاٹ چھانٹ کر تمہارے لیے تیار رکھے ہیں۔"

آپ ہی آپ میرے منہ سے نکل گیا..... !

"بابا! کبھی مجھے بھی تازہ امرود بھی کھلا دیا کرو، میرے نصیبوں میں کیوں یہ آدھے کھائے کیڑوں والے امرود ہی رہ گئے ہیں؟ دوسرے بچے تو ادھر چڑھ جاتے ہیں پہ کچے پکے تازہ امرود توڑ کر کھاتے ہیں اور مجھے تم ادھر جانے ہی نہیں دیتے۔ آج یہی بات میں پوچھنے کے لیے اکیلا ادھر آیا ہوں۔"

لیکن یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ آج کچھ موڈ دگر ہے۔ میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے کے بعد بولے۔ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا ---؟

"کہو۔۔۔ مزہ آیا ---؟"

"نہ صرف مزہ ہی آیا بلکہ کھایا عجیب سا بھی لگا جیسے ---!"

"بولو۔۔۔ جیسے کیا ---؟"

"جیسے ایسا کبھی پہلے نہ کھایا ہو۔"

وہ جیسے کسی اسرار کی گرہ کھولتے ہوئے بتانے لگا۔

"بہشتی زیور کیا ہے ---؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ مشہور کتاب ہے! جس میں شرع شریعت کی روشنی میں روزمرہ کے مسائل اور ان کے جوابات آسان پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ خاص طور پہ شادی کے موقع پہ لڑکیوں کو جہیز میں بطور خاص دی جاتی ہے۔"

"اچھا! یہ تو تم نے صحیح بتایا۔۔۔ اب یہ بتاؤ کہ بہشتی اثمار کن پھلوں کو کہتے ہیں؟ --- جواب ذرا مشکل ہے کچھ اشارے دے دیتا ہوں۔ ان میں چند ایک کا ذکر قرآن میں اور باقیوں کا حدیث، حکمت، طب کی کتابوں میں ہے؟"

میں نے جھٹ سے کھجور، تین اور زیتون کا نام لے دیا۔

"بالکل صحیح لیکن کچھ اور پھل بھی ہیں جنھیں جنتی میوے کہا جاتا ہے۔ ان کی لذت اور مہک علیحدہ سی ہوتی ہے کھانے کے بعد دیر تک خوشبو بھرے ڈکار آتے رہتے ہیں --- اتفاق یا کہ اللہ کی کوئی حکمت! ان کے نام بھی اللہ کے اسم کی طرح الف سے ابتدا ہوتے ہیں۔"

میں آم اور انگور تک کر چپ ہو لیا۔ دماغ پہ زور دے کر سوچنے لگا --- الف سے اور کون سے پھل شروع ہوتے ہیں جنھیں جنتی میوے کہا جاتا ہے۔ مجھے تذبذب میں پڑے دیکھا تو خود ہی بتانے لگا۔

"امرود جو اندر سے مکمل گلابی ہوں۔ انار اور انگور رنگت میں پختہ عنابی ہوں۔ آم اور اناناس جو بہشتی --- آرزو انجیر جو ظاہر و باطن آتشی ہوں۔ ان چھ سات جنتی میووں کے بھی کچھ کمالات و درجات ہیں۔ ایک آدھ فقیرانہ اور درویشانہ مسلک کچھ مست ملنگ --- ایک شاہانہ مزاج --- شگفتہ اور کوئی آشفتہ --- انسان تو انسان حیوان بھی انھیں کھا کر سونگھ کر شاد کام ہوتے ہیں۔ خاص طور پہ وہ طوطی مقال و جمال پرندے جو چشم بینا نہیں بلکہ چشم گیرندہ رکھتے ہیں ان سے سیر شکم ہوئے بغیر نہیں گزرتے۔"

وہ ذات عناب و انگور' بیر' یا طن و کھجور گردانا جاتا ہے۔ جس پہ کسی تیتری کی 'بد بد' عندلیب' چڑیا چنڈول کی
چونچ ٹھونگے نہ لگے ہوں اور وہ آرزو آم' انجیر' کیا جو بلبلوں' چڑیوں' تیتروں' طوطوں کی منہ ماریوں
سے بچ رہے ہوں۔ ان سب میں ایک امرود ہی وہ واحد کیف اور مہک آور ثمر ہے جو مثال ہے جو اول آخر اپنی
لطیف مہک سے مشام جاں کو مشکبار بنائے رکھتا ہے گو انناس اور انجیر بھی یہی وصف رکھتے ہیں مگر گلابی امرود
میں کچھ سوا پراسرار اور حکمت آموز تصرفات واقع ہیں۔"

تین انجیر اور انار کے بیجوں دانوں میں بھی اللہ پاک نے ایسی ایسی تحریریں' شکلیں' رموز و معانی اسرار'
مکارم' منکشف کر رکھے ہیں کہ اگر وہ انسانی دانست و دسترس میں آ جائیں تو اس کے ذریعہ کائنات کے بیشتر
اسرار افشا ہو جائیں؟ زیتون' زنجبیل' انگور' شریفہ' شلغم' تمباکو کے پتے ہوئے سوہے؟؟ انسانی اعضا اور اشجار
و حجرات' سمندر کی لہریں' صحراؤں کے رقص' دلدلات کے جغرافیے... ستاروں کی تجسیم' شمس و قمر' بروج' کہکشاؤں
کے جھرمٹ' شفق' بادلوں کے جھنڈ بھی اپنی ادوال و شباہت میں کئی ایسی تحریریں رکھتے ہیں اور خوب رکھتے
ہیں..."

انسان جو کچھ سوچتا ہے یا جو اس کے دل و دماغ کے نہاں خانہ میں ہوتا ہے وہ کھٹ سے اس کے
چہرے' آنکھوں میں اتر آتا ہے۔ درختوں' پتھروں پہ ان دیکھے زمانوں کی داستانیں تحریر ہوتی ہیں۔ ہوا میں
فضا میں گنبدوں میں بھی اپنے منہ لیے اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں۔ آج نہیں تو بیتے ہوئے کسی زمانہ میں کسی کو چاند پہ
بڑھیا چرخہ کاتتی دکھائی دی ہوگی۔ آج بھی کسی کو آسمان پہ بادلوں میں اللہ' محمد' علی یا لفظ پاک لکھا ہوا دکھائی
دے دیتا ہے۔ پہاڑیوں کی باڑ پہ لفظ پاک یا کوئی آیت کریمہ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔"

پچھلے دنوں ہمارے ایک گاؤں میں کوئی دیہاتی خاتون سیدھے توے پہ روٹیاں پکا رہی تھی۔
سامنے بیٹا اپنا ناشتہ کا انتظار کر رہا تھا کہ سکول سے دیر ہو رہی تھی۔ ستم ہشتم عورت نے الٹی سیدھی روٹی سینک کر
بیٹے کے آگے دھر دی۔ لڑکا دوسروں کے طالب علم کی مانند روٹی پہ نظر پڑی تو اس کے منہ سے سبحان اللہ نکل گیا۔
روٹی پہ پکائی کے دوران جو دست پناہ سے روٹی پکڑ کر آگ پہ سینکی جاتی ہے۔ اللہ کا نام واضح طور پہ لکھا ہوا
دکھائی دیا۔ آناً فاناً گاؤں بھر میں چرچا ہو گیا۔ اگلے گھنٹہ دو گھنٹہ بھر میں ارد گرد کے سب دیہاتوں' شہروں'
عیسائیوں کے گاؤں ادھر اکٹھے ہو چکے تھے۔ مقدس روٹی کو سبز مخملی کے سرپوش کے اوپر دھر کے نماز والے
چوکے پہ زیارت کے لیے رکھ دیا گیا۔ اپنے اپنے طریقے علم اور توفیق کے مطابق عقیدتمند' بوسے لیتی ہوئی عورتوں کی
قطاریں لگ گئیں۔ مرد حضرات' سر پہ ٹوپیاں سجائے' دوسری طرف سے زیارت کے لیے اپنی اپنی باری پہ آنے
لگے۔ پولیس میڈیا سے پہلے گاؤں کے بڑے' خطیب' موذن' معززین' عاشق' چوہدری اور سیاسی' سماجی رفاہی

مخلوقات بھی پہنچ چکی تھیں۔ پولیس نے آتے ہی ادھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ شام تک پھول، چڑھاوے، نذر و نیاز کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ ایک عیسائی خاندان نے یہ زندہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔"

ایسی کرامتیں، فوق الفطرت واقعات اکثر سننے، دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ قطع نظر اس کے، کیا حق ہے کیا جھوٹ یا شعبدہ؟ ایسا کچھ ہوتا ہے، دیکھنے سننے کو ملتا ہے۔ ایسے پھل اور سبزیاں، کونپلیں، شگوفے، پھول کلیاں، جڑیں، ٹہنیاں، شاخیں، جنہیں انسان کسی نہ کسی طور اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ ان میں بہت سی قدرتی چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے ملاحظہ میں آتی ہیں۔ ادرک، آلو، کچنار کی ٹہنیاں، گاجریں، مولیاں، شکرقند وغیرہ۔ جستجو کریں تو ان میں کئی مقدس نام بنتے دکھائی دیتے ہیں یا ستر اسّی فیصد تک ہوتے ہیں۔ بقیہ ہم خود اپنے تصور میں مکمل کر لیتے ہیں..."

مجھے اپنے ایک عقیدت مند کے ہاں ایک ضروری مسئلہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مسئلہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا تو واپسی کی اجازت چاہی۔ ان کے بزرگ اور معتقد والد نے دس منٹ مزید رکنے کا کہا۔ مروّت کا مارا میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ انہوں نے اشارے سے کچھ طلب کیا۔ ایک بوڑھا ملازم اندر داخل ہوا۔ اس کے سر پہ صندلی چوب کا ایک صندوقچہ دھرا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے کسی تبرک کی زیارت کروانا چاہتے ہیں۔ اکثر مالدار حاجی حضرات یا سعودیہ میں ملازم لوگ اپنے تعلقات اور دولت کی بناء پر اصلی نقلی تبرکات حاصل کر لیتے ہیں۔ خود کو خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ مقدس نوادرات صرف ان ہی کے تصرف میں ہیں۔"

سعودی عرب میں بھی ایسے مقامی اور بیرونی دو نمبر لوگوں کی کمی نہیں جو عقیدت کے مارے ہوئے معصوم لوگوں سے دھوکہ دہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ خانہ کعبہ کی دیواروں کے پتھروں کے ٹکڑے۔ غلاف کعبہ کا کپڑا، فانوسوں کے بلب اور شیشے ... فرش کی ٹائلیں۔ اترا اور کھرچا ہوا رنگ --- آبِ زم زم کے کنویں کے ٹکڑے، پرنالے کے پرانے ٹکڑے --- قبرستانوں کی مقدس قبروں کی مٹی وغیرہ۔

صندوقچہ سامنے رکھ دیا گیا۔ بڑے احترام و عقیدت سے درود پاک کا ورد شروع ہو گیا۔ یہ نورانی ساعتیں اختتام پذیر ہوئیں تو ایک فرشتہ صورت نوجوان نے بڑے ادب و جذب سے نعت شریف کی شروعات کیں۔ کون کافر ہوگا جو دم مارنے کی جرأت رکھتا ہو؟ ... بڑے خشوع خضوع سے یہ مرحلات مقدسہ بھی طے ہوئے تو بزرگ نے بسم اللہ کر کے صندوقچہ کھولا۔ اندر ریشمی کپڑے سے لپٹا ہوا ایک چاندی کا ڈبا نکالا، کھولا!
اب میرے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ ادرک کا ایک مڑا تڑا سا ٹکڑا تھا، جسے آپ نمونہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک اور ڈبا کھولا تو اس میں سے ایک آلو دکھائی دیا جو سوکھ سکڑ کر عجیب سی صورت اختیار کر چکا تھا۔ میں بغور دیکھ رہا تھا۔

کوشش میں تھا کہ جان پاؤں کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور مجھے دکھانے کا مقصد کیا ہے؟ صندوقچے کی آمد اور نعت شریف کے اہتمام سے یہ تو سمجھ میں آ رہا تھا کہ بزرگوار مجھے کسی تبرک کی زیارت سے مشرف فرما رہے ہیں۔ مگر ادرک اور آلو دیکھ کر مجھے حیرت کے ساتھ ان کی سادگی پہ بھی پیار آیا کہ ہم اپنی عقیدت اور محبت کو کیسے کیسے دعائی رنگوں میں سجا لیتے ہیں۔

بزرگ مجھے بڑے رقت آمیز لہجہ میں بتا رہے تھے۔

"یہ تبرکات ہماری خاندانی میراث ہیں۔ ہماری زمینداری میں وہ قطعہ زمین ابھی بھی ہے، جدھر خاص طور پہ متبرک سبزیاں اگتی ہیں۔ ایسی نادر اور پاکیزہ اشیاء کو چھوا تو نہیں جا سکتا البتہ جی بھر کے زیارت ضرور کی جا سکتی ہے۔"

اپنے تجسس کو مزید مہمیز لگانے کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

"چوہدری صاحب! آپ کے ان متبرک کھیتوں میں ساری فصل اسی صورت ہی پیدا ہوتی ہے یا؟"

"الحمد للہ      واہ جی، اس کی حکمت ہے کہ سارے کھیت میں ایسے نادر دانے، بس دو چار ہی پیدا ہوتے ہیں وہ بھی کسی ایک فصل میں      مگر ہم ان کھیتوں کی فصل فروخت کے لیے منڈیوں میں نہیں بھجواتے تبرک کے طور، عقیدت مندوں میں بانٹ دیتے ہیں۔"

میں نے مزید آگے بڑھ کر مقدس ادرک کو غور سے جانچا      عام ادرک کی مانند بڑی ہی گانٹھ جڑ سے جڑی ہوئی      کچھ یوں کہ اسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھا جا سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ واضح طور پہ دوسرے حرف "م" اور آخر پہ "د" کے گرد اگرد نامعلوم سی تراش خراش بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قدرتی طور سے بنا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر ایسا بھی نہ تھا کہ ہر کوئی آسانی سے پڑھ لیتا ہو۔ ایسے ادرک کے ٹکڑے جس کے بھی ہاتھ لگتے وہ اپنے حساب کی کاٹ چھانٹ سے مقدس بنا کر اپنا کوئی مفاد حاصل کر لیتا۔ اس طرح یہ معمولی ادرک کے ٹکڑے ایک مقدس تبرک میں تبدیل ہو جاتے۔ اسی کی طرح بیشمار مثالیں موجود ہیں آئے دن یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ وجہ شاید ہماری دینی علوم سے دوری      اللہ رسول سے عشق اور خوش گمانیاں بھی ہیں.....؟

دیکھا جائے تو کائنات کی کون سی چیز ایسی ہے جس سے اس کے خالق و مالک کی نشاندہی نہ ہوتی ہو؟ اللہ کو اپنی شانِ ربوبیت کے اظہار اور خالق و مالک ہونے کی تصدیق کے لیے نعوذ باللہ! کسی آلو، ادرک، بینگن، بادل، پتھر، پودوں یا زعفران، ادرک کی ضرورت نہیں۔ زعفران اور ادرک سے یاد آیا      میں کئی خوش نصیبوں سے واقف ہوں جنہوں نے آسمان پہ چمکتی کڑکتی بجلی سے اللہ محمد علی لکھا ہوا اور کلمہ طیبہ کی زیارت کی ہے۔ سبحان اللہ!

آدھی رات کو ایک ٹیلی فون کال آئی۔ جو کسی ہسپتال کے میٹرنٹی وارڈ سے تھی صحت مند خوبصورت بچے کی نوید تھی۔ عورت کی خوشی اور فرطِ حیرت کا یہ عالم کہ اس کے منہ سے بات تک نہ نکل رہی تھی۔

"بابا جی! سبحان اللہ! ۔۔۔ بابا جی! سبحان اللہ! ۔۔۔ آپ کی دعا سے اللہ نے مجھے ولی دے دیا ہے۔ میں قربان میں صدقے ۔۔۔!"

اولادِ نرینہ کی ترسی ہوئی یہ عورت اک زمانے سے میرے در پہ آئی تھی کہ میں اسے بیٹے کی بشارت دوں۔ ہر جمعرات کے روز اس سے سر کھپائی کرنی پڑتی تھی۔ اس کے نسائی دماغ میں میری یہ بات کسی طور بھی سما نہ پاتی تھی کہ اللہ قادرِ مطلق ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ میں جب اس لایعنی گفتگو سے زچ ہو جاتا تو یہ کہہ کر ٹیلیفون بند کر دیتا کہ "راضی برضا رہو" "اے اللہ میں تیری رضا پہ میری تسلیم" کا ورد کیا کرو ۔۔۔ خدا حافظ!"

اللہ نے اس کی سن لی تھی اس کی محرومی پہ مالک و خالق کو رحم آ گیا۔ اس کی ویران پھلواری میں ایک پھول کھل اٹھا تھا جس کی اطلاع مجھے دی گئی اور اس کو میری دعا کا نتیجہ سمجھا گیا۔ میں نے اسے مبارک سلامت کہتے ہوئے۔ بچے کا صدقہ دینے کی تاکید کی۔ اس نے بچے کا نام پوچھا۔ میں نے ترنت جواب دیا۔

"گھر میں دادا، نانا یا کوئی بزرگ ہو تو ان سے نام رکھواؤ۔ برکت رہتی ہے۔"

"بابا جی! بارہ برس میں نے ان سے دعائیں کرائیں۔ کون سا دربار یا پیر فقیر ہوگا جدھر میں نے دامنِ طلب نہ پھیلایا ہو۔ مجھے تو بھیک آپ کے در سے ہی ملی ہے۔"

مجھے اندازہ تھا اس خوش فہم اور عقیدت کی ماری ہوئی خاتون سے بحث فضول ہے پھر بھی بات سمیٹنے اور اس کا دل رکھنے کی خاطر کہا:

"بی بی! اللہ ہی قادر و مالک ہے۔ اس کائنات میں سب کچھ اس کے حکم سے ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ بس ہمیں مطمئن کرنے کی خاطر کوئی نہ کوئی وسیلہ پیدا کر دیتا ہے۔ تمہاری فریادیں مستجاب ہوئیں۔ اب تم ہر پل اس کا شکر بجا لایا کرو اور ہاں کوئی اچھا سا اسلامی نام جو تمہیں یا تمہارے شوہر کو پسند ہو رکھ لو۔ مناسب جانو تو محمد یا علی نام میں شامل کر لینا۔"

اپنے تئیں میں خوش ہو رہا تھا کہ خاتون بڑی آسانی سے مطمئن ہو گئی ہے مگر میں تو اور مشکل میں پڑ گیا۔ تو چیخ چیخ کر بتانے لگی۔

"بابا سرکار! مجھے تو اسے دیکھتے ہی پتا چل گیا تھا آپ نے اپنے لاڈلے کا نام پہلے ہی تجویز کر دیا ہوا ہے۔ "مجھے اشارہ ہو گیا تھا۔"

لیجیے آئندہ روزے گلے پڑ گئے ۔۔۔ میں نے جزبز ہو کر پوچھا۔

”ممی نے اُس کا نام پہلے ہی رکھ دیا ہوا ہے ــــ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ایسی بات تمہیں نہیں کہنی چاہیے۔ میں تو بلی کی قسمیں جانتا تک نہیں۔“ ممی نے جھٹکے سے تاؤ میں آ کر ٹیلیفون بند کر دیا۔“

استغفراللہ کہتے ہوئے اپنے لکھنے پڑھنے میں لگ گیا۔ قریباً آدھ گھنٹہ بعد پھر وہی بی بی رابطہ میں تھی۔

”بابا جی سرکار! پورا ہسپتال ممی کی زیارت کے وارڈ کے باہر جمع ہیں، اخبار والے بھی کیمرے لیے باہر کھڑے ہیں۔ بچے کے ماتھے صاف ”علی“ لکھا ہوا پڑھا جاتا ہے۔ جو مجھے مبارک دیتا ہے میں بتاتی ہوں کہ یہ سب میرے بابا سرکار کی دعا ہے۔ آپ چاہیں تو خود یا کسی کو بھیج کر تصدیق کر سکتے ہیں ــــ؟“

”بی بی! اللہ آپ پہ رحم کرے اور عقل دے ــــ اسے نہلا دھلا دو۔ تین دنوں کے بعد اگر پھر بھی وہاں ”علی“ لکھا ہوا دکھائی دے تو مجھے ٹیلیفون کر دینا اور اگر پیشانی کی صرف رگیں اُبھری ہوئی دکھائی دیں اور اپنی جگہ پہ ہموار ہو جائیں تو پھر ٹیلیفون نہ کرنا۔ بیٹا! اللہ رسول، صحابہ کرام اور دیگر مقدس اور پاکیزہ اسماء مبارک کے بارے یہ تصور اسلامی دینی اور شرعی اقدار کے منافی ہے کہ نومولود بچوں کی پیشانیوں، جڑی بوٹیوں ترکاریوں، پودوں، پھلوں، پاؤں، ریت کے ٹیلوں، بحری لہروں، موجوں پہ ظہور پذیر ہو یا چاند ستاروں، خلاؤں میں دکھائی دے۔ دینِ فطرت، اللہ کی وحدت حقانیت ربوبیت کو ثابت کرنے کے لیے یہ دلیلیں بڑی مضحکہ خیز دکھائی دیتی ہیں۔ یہود و ہنود، عیسائیوں کے ہاں ایسا کچھ شاید ہو مگر اسلام میں قطعی کوئی گنجائش نہیں ــــ؟“

نہیں جانتا میری ان باتوں کا اس پہ کیا اثر ہوا مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس کا جب بھی ٹیلیفون آیا۔ ماتھے پہ ”علی“ لکھے کا ذکر نہ ہوا۔“

قطع نظر اس بحث کے، اسلام میں ایسی مافوق العقول، ماورائے فطرت و حقیقت عوامل و واقعات، سینہ بہ سینہ چلی آ رہی باتوں، قصوں کہانیوں میں ایسا کچھ موجود چلا آ رہا ہے کہ ان کا اقرار بھی مشکل اور انکار بھی نہ ہو سکے۔ ثقہ لوگ کہ جن کے کہے سنے پہ شک نہیں کیا جا سکتا جب کوئی اسی طرح کا واقعہ سناتے ہیں تو ماننے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں رہتا۔“

گو روحانیت کی حقانیت سے انکار ممکن نہیں لیکن اپنے گرد پھیلی ہوئی مادیت کی زد کی طرح پھیلا ہوا تمدنی اور عقلی منطقی توجیہات کی اسراریت سے صرف نظر بھی مشکل پڑ جاتا ہے۔ پُراسرار وہی چیز ہوتی ہے جو عقل و علم کے کھانچوں میں پوری طرح فٹ نہ بیٹھتی ہو۔ آب و آتش، خاک و ہوا کے پنپنے کے لیے نہ تو مادیت کی معدومیت مددگار ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی روحانیت کی زود پاری اور درماندگی کہ یہ دونوں اس کی تکمیل کو حیات میں بڑی طرح زندگی بسی ہوئی ہوتی ہیں۔ دل میں پایہ کی دونوں ٹانگوں کی کمزوری کا اعتراف کیے بنا انسان ہموار چلن کا اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا۔ حلوے کی غذائی اہمیت کے ساتھ اگر جڑ کے مربے اور بلم کی ثمولیوں کی

شفافی خاصیت پہ نظر نہ رکھی جائے تو صحت کی سائنٹس میں نقص پڑنے کا خدشہ رہتا ہے۔"

مادوں کے بھی مدار ہوتے ہیں۔ مرکز قائم ہوئے بغیر کسی مادہ و محوریت' منزل' مقصد' مقام' مثال' مذہب' مسلک' مشرق' مغرب' مکہ' مدینہ' مشہد و ملتان کی ماورائیت ثابت نہیں ہوتی؟ مادے سے روحانیت اچھی ہے تو روحانیت بھی کسی نہ کسی صورت مادیت سے مذاکرات کرتی دکھائی دیتی ہے۔ مادہ جسم ہے تو روحانیت وجود۔۔۔ ایمان وجدان' کبھی ایک بھاری اور کبھی دوسرا سیر پہ سوا سیر۔۔۔؟

بات' گلابی رنگت والے کھائے ادھ کھائے امرودوں سے آگے بڑھ گئی۔ وہ امرود کے باغ کا رکھوالا بظاہر دیہاتی ان پڑھ اجڈ' جس کا حال حلیہ ایسا کہ کوئی معقول آدمی اس کے قریب نہ بیٹھے۔ میری خاطر وہ بیٹھ کے چھٹے بادی گلابی امرود جمع کر رکھتا۔۔۔ میرے پہنچنے پہ میری جیبوں میں ٹھونس دیتا' اصرار کر کے اپنے ہاتھ سے کھلاتا۔۔۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالا تھا مگر پھر بھی کچھ ایسا تھا جسے میں ظاہرانہ سہی باطنی طور پہ محسوس کر رہا تھا کہ صرف مجھے ہی ایسے گلابی امرود کھلانا کچھ خالی از مصلحت نہیں۔ جاننے کے لیے بھی دماغ پہ زور بھی نہ دیا کہ مجھ غریب چٹخورے کو امرود کھانے سے غرض تھی پیڑ پہ چڑھنے سے نہ تھی۔

مجھ پہ ترس آ گیا یا اس روز زور زوروں پہ تھا۔ خود ہی بتانے لگا۔

"راطوطوں کے چکھے ہوئے گلابی امرود کھانے سے سبز سرخ گلابی سفید اور کتھئی رنگوں کے اسرار کھلتے ہیں۔ سرخ کالی والے طوطے سفید امرود بھی چکھتے ہیں مگر انہیں کھانے سے فائدہ نہیں ہوتا۔"

"تم بھی تو امرود کھاتے ہو۔۔۔ کیا تمہیں کچھ حاصل ہوا۔۔۔؟"

"معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔۔۔"

"ہاں' کچھ حاصل ہوا ہے بھی تو تمہیں بھی بتا رہا ہوں۔۔۔"

"صرف مجھے ہی کیوں اور دوسرے لڑکے بھی تو ہیں۔۔۔؟"

"ہاں' دوسرے بچے بھی ہیں مگر تم ان سے مختلف ہو۔ جیسے راطوطے' کالے طوطوں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ تمہیں تو شاید یہ بھی پتا نہیں کہ کالی والے راطوطوں میں ایک گرو طوطا بھی ہوتا ہے۔ جس طرح رانی مکھی ہوتی ہے۔ سانجھروں میں بڑا سانجھر' بارہ سنگھا' گج ہاتھی' شیش ناگ' چوہا ناگ' دیوتیوں میں بھی دیوتی' ساتھیا ساتھی' بندروں میں پھندر وغیرہ۔۔۔ کالی والے طوطوں کا گرو طوطا۔۔۔ سائز اور چھب ڈھب میں خاصا بڑا اور انوکھا ہوتا۔ اسے پہچاننا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ اس کے منہ پر بڑے مضبوط لگے ہوئے نوکیلی خاصی مضبوط چونچ اور گردن کی کالی' سبز رنگت' آنکھیں مجرتیلی تیز اور گول ایسی ابھرتی دکھتی جیسے جنور نگر بھٹ رہے ہیں۔ پرانی کہانیوں میں خوفناک دساولوں اور بھوت پریتوں کی جان ایسے ہی طوطوں کے قلبیے میں ہوتی

ہوتی تھی۔ جب تک اس طوطے کو ہلاک نہ کیا جاتا وہ بلا مرتی نہ تھی۔ اسی طرح پرانے تجربہ کار کشتی راں اور دشت نورد اپنے طوطے ساتھ رکھتے تھے۔ بھٹکنے اور گمراہ ہونے پر یہی ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ کوؤں میں کوئی کوا بھی ایسی ہی صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔۔۔؟

میں پچھمی طرف طوطوں کا ٹولہ پلک جھپکنے میں کہیں غائب ہو گیا ـــــ وہ جو سن رہا ہوں اور وہ بھی جو ابھی کہہ نہیں پایا ہے میرے روم روم میں اتر رہی ہیں۔ سرخ گلابوں والے ہرے ہرے طوطے اور کالے سیاہ کوے میرے بھیتر کی فضاؤں میں پھڑ پھڑا رہے ہیں ٹولیاں لے رہے ہیں ان کو بھتوں سے گزرتے ہوئے سنہری غبار کو سورج کی ارغوانی کرنوں سے ہم رقص دیکھ رہا ہوں۔ رنگوں کی جھلملاہٹ نور ظہور کا رنگ کا فطرت انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہی ہے اور میں شاید شبنم کا کوئی لرزتا ہوا قطرہ ـــــ نوک خار پہ اٹکا ہوا ہونے نہ ہونے کی کیفیت میں پھنسا پڑا۔ مادیت اور روحانیت کے باطنی معنوں کی آشنائی سے محروم ـــــ جو دائیں کا مطلب راستی اور بائیں کی حرکت کو بے راہ روی سے تعبیر کرتا ہے ـــــ؟

"امرودوں کے بیجوں بیچ بھی بیج ہوتے ہیں۔ بظاہر نرم اور ملائم کہ گودے کے ساتھ سالم پیٹ میں اتر جائیں ـــــ مگر ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوتی ـــــ؟"

وہ حکیمانہ انداز میں کہنے لگا۔ "تم جانتے ہو بیج نرم ہوں یا سخت انسانی انتڑیوں کے لیے بہتر ہوتے ہیں۔ اندر پہنچتے ہوئے شیاطین کا قلع قمع کرتے ہیں۔"

"اور کچے پکے امرودوں کے کھیلا تے کیڑے؟" میں نے منہ بناتے ہوئے پوچھ لیا۔

"یہی تو امرود کی اصل جان ہوتے ہیں۔ مگر یہ ہوتی ہے کہ دکھائی دے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے دیکھ کر زہر پھانکا نہیں جاتا۔ انسان بھی تو خوب دکھائی دینے والا ایک کیڑا ہی تو ہے۔ اس کے دماغ میں کیڑے پیٹ میں کیڑے ناک کان منہ ـــــ اندر باہر کیڑے ہی کیڑے ـــــ اس کی پیدائش میں کیڑوں کا دخل مرنے کے بعد کیڑے ہی کیڑے۔ انسان سے کیڑے لے لیے جائیں تو یا ایک بے حس و حل ولل گوشت پوست کا لوتھڑا بن کر رہ جائے۔ آپ جو بھی نوش جاں کر رہے ہوتے ہیں وہ تمام کیڑوں کا مغوبہ ہی تو ہوتا ہے۔ فرق صرف ایسا کہ یہ کیڑے مختلف شکلوں، رنگوں، ذائقوں اور خوشبوؤں سے رچے بسے ہوتے ہیں ـــــ تجزیہ کر کے چاہیں تو کسی بھی غذا پھل سبزی یا مشروب کو استعمال کی بجائے پڑا رہنے دیں پھر دیکھیں وہ سب کلبلاتے کیڑوں میں بدل چکا ہو گا یا کسی انسانی مردہ جسم کا پوست مارٹم ہوتا دیکھیں۔ بدسے کو اپنے جسم سے گھن آنے لگے گی۔ اس کا کھانا پینا چھوٹ جائے گا۔۔۔"

یہ کلبلاتے سرسراتے کیڑوں کی باتیں سنتے سنتے ایسا لگا کہ میں خود بھی ایک گندہ کیڑا ہوں ـــــ صرف

کے تناور درخت بنے اور ثمر بار ہو کر جھکنے سے بھی سیکھ سکتا ہے مگر جانور مطلق، جانور ناطق میں ہر طور پہ تو نہ ہو کچھ جبلی آشنائی تو ہوتی ہے جبکہ دیگر مخلوقات کے تقاضے انسانی تقاضوں سے یکسر مختلف ٹھہرے۔۔۔"

پھر نجانے یوں کہ میرا ادھر آنا موقوف کر دیا گیا۔ شاید میرے سوالات و جوابات آڑے آنے لگے تھے یا میرے لیے مناسب یہی ٹھہرا کہ میں ادھر کا رخ نہ کیا کروں۔ کسی جھاڑی کے کونپلیں پتے جب بکری چٹ کر جاتی ہے تو پیٹ کی پوجا سے خود، خود کو کسی اور جانب ہنکا کر لے جاتی ہے۔"

آخری بار بس یہی کہا ۔۔۔ ابر میں طوطے کے کسی ایسے بچے کو حاصل کرو جس کا تناسب سر اس کے باقی جسم سے بڑا ہو اور اس کی چونچ اس کے سر سے موٹی !

یہ بات بھی میرے سر پہ سے کسی لا پرواہ پروائی کی مانند گزر گئی۔ میں نے آج تک طوطے کا ایسا کوئی بچہ دیکھا نہ تھا جس کی خطرناک چونچ اس کے سر سے بڑی اور سر اس کے دھڑ سے دگنا ہو۔ طوطوں کے بچے ابتدائی بچپن کا زمانہ اپنے مخصوص غار نما بلوں میں ہی گزارنے پہ مجبور ہوتے ہیں۔ موٹی چونچ، بے ڈول سا سر باقی جسم سے دگنے بھاری بال و پر سے خالی جسم گٹھے سے پوٹ کی پوٹ۔۔۔"

ماں باپ اس وقت تک ان کے دانے دنکے کا اہتمام کرتے ہیں جب تک وہ بال و پر اور متوازن جسم حاصل نہیں کر پاتے۔ یہ بچپن کی بیچارگی کا زمانہ ان بچوں پہ بڑا بھاری پڑتا ہے۔ ان بے ڈھب و بے ڈھب ننھی منھی جانوں کے دشمن ہزار ہوتے ہیں۔ پرندوں کے انڈے بچے کھانے والے سانپ، کھیتے، نیولے، کوّے گلہریاں بھی ان پہ منہ مار لیتے ہیں۔ کوّے شکرے، چیلیں، الّو بھی طبع آزمائی کر لیتے ہیں لیکن ان کے سب سے بڑے دشمن پرندے فروخت کرنے والے شکاری یا وہ بچے ہوتے ہیں جو طوطے پالنے یا بیچنے کے لالچ میں ان کے بچوں کو پکڑتے ہیں۔ بالغ طوطوں کی نسبت ان کے نوزائیدہ بچوں کو حاصل کرنا قدرے آسان ہوتا ہے۔ اس لیے شکاری اور بچے ان کی پیدائش افزائش کے موسم میں باغوں، ذخیروں، جنگلوں میں ان کے بلوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

سمجھا جاتا ہے کہ نشہ، لطف و لذت، کیف و انبساط، بے خودی و سرمستی وغیرہ منشیات کے استعمال سے حاصل ہوتے ہیں یہ وقتی تسکین اور عارضی تلذذ ہوتا ہے جو دیر پا بہت برے اثرات چھوڑ کر جسمانی، نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن باطنی سرخوشی، روحانی کیفیات یا سرمدی سرور تو اللہ کے ذکر، اچھے اعمال، اس کی مخلوق کی خدمت، ان کے لیے بہتریاں فراہم کرنے سے حاصل ہوتا ہے یا پھر ایسی مصروفیات و اشغال سے جو موسم، فطرت، حقیقت اور ضرورت کے عین مطابق ہوں۔۔۔!

کاروباری سرگرمیاں اس ذیل میں آتی ہیں اور تفریحی مصروفیات، فرصتی وقت یا مصروفیات خالصتاً

نشے کی تعریف یہ ہے کہ آپ کو بے حس کر دے اور فرائض دین و دنیا سے دور لے جائے۔ قریب قریب یہی کیفیت میری تھی۔ میں ہاتھ دھو کر راطوطوں کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ محلے کے جن ہندو مسلم گھرانوں میں رامیاں مٹھو تھے، بہانے بہانے اُدھر نکل کر ان کو دیکھتا۔ امیر کبیر گھرانوں میں بڑی اعلیٰ نسل کے صحت مند تربیت یافتہ طوطے جیتی دیدہ زیب پنجروں میں "سوہو" ہوتے ہیں جبکہ غریب گھروں میں کاٹھے لنڈ منڈے شکل و صورت سے ہی دکھائی دینے والے ""میاں مٹھو چوری کھانی ہے"" کی بازاری گردان رٹ لگائے ہوئے۔ اپنے غریب طوطوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تو ہوتا ہے۔ آئے دن بلیاں ان کی گردن دبوچی رہتی ہیں۔ گھر کے دیگر بوڑھوں کی طرح یہ بھی بے قدری کی زندگی کاٹ رہے ہوتے ہیں۔"

انسان کے علاوہ دیگر اکثر جانداروں کے ہاں افزائش نسل کے موسم ہوتے ہیں۔ فطرت نے ان کی طبع، گرمی سردی، خزاں بہار برسات کی موافقت اور ان کی ضرورت و آسانی کے مطابق، کچھ مخصوص عرصے مہینے واضح کیے ہیں جن میں ان کے لیے افزائش نسل کی رغبت رکھی ہے۔ پرندے چرندے، خزندے، درندے، مچھلیاں، مکھیاں وغیرہ کی جنسی ضرورتوں میں رہبری فطرت کرتی ہے مگر انسان اشرف المخلوقات ہونے کے زعم اپنے محدود ناقص علم اور زعم بے جا خود مختاری کی آڑ میں فطرت کی متعین راہوں سے خود کو بے نیاز کر لیتا ہے اور بے شمار اخلاقی، نفسیاتی، جنسی، جسمانی اور سماجی خاندانی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے....."

فضا و ہوا میں رزق تلاش کرنے اور طبعی زندگی گزارنے والے پرندوں میں طوطے بھی شامل ہیں جو انسان کی طرح مجرد، عائلی گھریلو زندگی گزارتے ہیں۔ بال بچے داری ان کی نگہداشت پرورش خوراک کا خاص طور پر خیال۔ ان کے گھونسلوں کے اندر کا نظام ایسا مکمل اور تربیت شائستہ ہوتا ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان کے نومولود بچوں کا عہد طفولیت بہت صبر آزما اور کڑا ہوتا ہے۔ دیگر پرندوں کی نسبت یہ بچے بڑے سست، بے ڈھنگے اور گوتھے ہوتے ہیں۔ بے پناہ ننگے اور بھوکے بھی۔ کبھی گھونسلوں سے وجود باہر نکل پڑتے ہیں۔ دکھائی کچھ دیتا نہیں اور عقل سمجھ سے بھی عاری!۔۔۔ اکثر باہر گر پڑتے ہیں یا پھر گھونسلے کے دہانے پہ کسی دوسرے جانور کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ سانپ کے بچوں کی طرح ان پرندوں کے بچوں کی افزائش کو فطرت اپنے حساب سے قابو میں رکھتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو ہر طرف پرندے ہی پرندے ہوں۔"

جنگلی راطوطے اور ان کے بچے حاصل کرنے کے جنون نے مجھے تو جیسے پاگل کر دیا ہوا تھا۔ شہر اور مضافات کے اکیلے دکیلے باغ، جھنڈ، ویرانے، درختوں کے ذخیرے میری جولان گاہ تھے۔ کپڑے جوتے کھانے پینے سے بے نیاز، سارا سارا دن خوار ہوتا رہتا۔ اکیلا اور کبھی اپنے جیسے کسی یار دوست کی سنگت

رہتی ۔۔۔ درختوں کی کھڈوں کھوؤں گھونسلوں میں ہاتھ کلائی پہ کپڑا لپیٹے ۔۔۔ اندر سے بچے طوطے کو جتا رہتا۔

کھوج کیسی بھی ہو بندے کو ایک دفعہ تو تھوتا ہار کر رکھ دیتی ہے ۔ کھوجی پاس کے وزن سے دگنا وزن ڈال دو ماں بہن ایک کردو یا مار مار کر ادھ موا کردو اس کے پائے استقلال میں خم نہیں آتا۔ میرا بھی یہی حال ۔۔ کھانے پینے کا ہوش نہ سونے جاگنے کے کوئی اوقات؟ گھر والوں کی لعن طعن الگ، چہرا پھیکا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں ۔۔۔ شکر دوپہریں، میلوں کی مسافت، دربدری الگ ۔۔ ان سب سے الگ ناقابل برداشت ہاتھ انگلیوں کے زخموں کی اذیت تھی۔ طوطوں، ان کے بچوں اور جھڑوں کے کاٹنے سے ہاتھ انگلیاں فگار ہوچکی تھیں۔ طوطا تو بالکل تیز کتر کی مانند کاٹتا ہے۔ ایسا زخم مندمل ہونے میں خاصا وقت لیتا ہے۔ خون اور پیپ برا حال کردیتی ہیں۔ اس زخم کی وجہ سے بغل میں گلٹی ابھر آتی ہے جو ایک الگ آزار ہوتی ہے۔"

پیشہ ور شکاری باغ طوطوں کو پھندوں پھانسیوں، دام، کُٹے گیسدار مادوں کے ذریعے پکڑ لیتے ہیں جن میں ہاتھوں انگلیوں کے زخمی ہونے کا احتمال نہیں ہوتا مگر چھوٹے بچوں کو تو ہاتھ کھونسلے کے اندر داخل کرکے قابو کرنا پڑتا ہے اور اسی پکڑ دھکڑ میں بچے اپنا کاٹنے کا کام کر جاتے ہیں۔ ہاتھوں پہ کپڑا لپیٹنا بھی کام نہیں آتا کہ کسی ہولی نچونچی کپڑے کو بھی قینچی کی مانند کاٹ دیتی ہے۔"

گرم گرم چوٹ ناگہانی صدمہ، بری خبر یا کسی کے پیار اعتبار کا گھاؤ ۔۔۔ فی الفور اثر انداز نہیں ہوتے۔ بلکہ سا ٹھنڈا پڑنے پہ سمجھ میں آتے ہیں۔ گھر والوں کی آنکھ سے ہاتھوں کو چھپا کر صبح سویرے باہر کھسک لیتا اور اندھیرا اترنے پہ گھر لوٹتا پھر ساری رات پڑے پڑے کراہتا سہلاتا رہتا ۔۔ ہاتھوں سے کھانا پینا تو دور کی بات، دھونا یا کسی چیز کو پکڑنا بھی مشکل تھا۔ انگلیوں کی کھالیں نیلی پڑ کر سوجھ چکی تھیں، زخموں کے تیور اب بھی ٹھنڈی گرم ہوا بھی لگتی تو ٹیسیں نکل جاتیں مگر واہ رے "شوق المعروف جنون" کہ ہر صبح وہی راہ راستے جو شہر سے باہر دور دور درختوں کے جھنڈوں کی جانب نکلتے تھے۔"

## ● شاہ شرف ۔۔۔!

زمانے کھایا ہوا برگد کا ایک چھتنار درخت ۔۔۔ جس کی چھاؤں تلے ٹھنڈک رکھتا تھا جیسے ازل ہی سے طلوع ہوئی اور ابد بھی ادھر ہی کہیں غروب ہوگی۔ "سدا بہار گہری چھاؤں، وجدان سے ملحق ہوئی ہولی ہولی سی ٹھنڈک ۔۔۔ اک ایسی مہک جو صبح ازل سبز کائی سے اٹے ہوئے پانیوں سے اٹھتی تھی۔ صدیوں کی تھیر کا پاس

کسی تپسوی کی مانند گہرے استغراق میں غرق ہوا بزرگ برگد! کہنے کو تو ایک تھا مگر اس ایک میں سیکڑوں اور بھی
برگد جٹا سے بچے تھے جن کی نیم کی سیڑھی جڑیں 'لٹکی ہوئی داڑھیاں' شاخسارے جا بجا زمین کے اندر باہر پھیلے
ہوئے دکھائی دیتے تھے۔''

یہاں قدیم زمین کا واحد پُراسرار اثرات لیے برگد و شجرات 'صوفی صفت' 'مست ملنگ' بم بم نگھ وہ گھیر
گھیرے جو ایک چھوٹی سی کائنات کی طرح ہوتا ہے۔ ایک مکمل 'شجر ہستی' کا وہی کٹوری کی مانند ... جس میں بلا
تخصیص 'چمگادڑ' 'چھپکلیاں' 'طوطے' 'سانپ' سب ہی کے دریں اسیر سے ہیں ... 'نفسی زشتی' ساحر سنت جوگی بیراگی
بھی اس کی گھنیر چھاؤں میں اپنی تپسیا مکمل کرتے ہیں۔ منشیات کے عادی جھگڑے ڈکیت' بردہ فروش چور
اور 'عاشق معشوق' الٹے سیدھے عمل کرنے والے بھی ادھر ہی پناہ حاصل کرتے ہیں۔ پنچایتیں' غمی خوشی کی
تقریبات' سیاسی و دینی جلسے' مویشیوں کی نسل کشی' کشتیاں' دنگل بھی یہیں منعقد ہوتے ہیں۔''

بزرگوں کے سامنے سے برگد ہٹا لیا جائے تو کورے دیے ہو جائیں۔ برگد امن آشتی شانتی کا ایک
رول ماڈل ہے۔ اس جیسا الخلوق پرور درخت کون سا ہوگا کہ ہر کسی کو برداشت کرتا ہے۔ قیام طعام حفاظت اور
خاطر خواہ آسائیاں بھی فراہم کرتا ہے۔ ''جیو اور جینے دو'' کا فلسفہ سمجھنا ہو تو کسی برگد کو دیکھا جا سکتا ہے۔ برگد
کے خاندان کا ایک اور درخت پیپل بھی ہے ... برگد کی کچھ صفات اس میں بھی موجود ہوتی ہیں مگر دونوں میں
وہی فرق ہے جو مولوی مدن اور مولوی مالی میں ہے ...؟

بات 'مردوں' سے بڑھی تو طوطوں تک پہنچی — مزید ان کے انڈوں بچوں تک پہنچی — ذرا اور
آگے بڑھی تو برگد بزرگ کے ذہن و ...!

میں نے اپنے بچپن میں جنگل کے بیچ تو بہت دیکھے تھے مگر برگد کا پہلا درخت' اپنے خاندانی دیوان
خانے کے آنگن میں دیکھا اور خوب دیکھا تھا ... اسی برگد کے موٹے تنے پہ سال کے سال' عرس' پہ ''اللہ ہو'' کا
انسانی جھولا جھولتا تھا۔ مگر یہ بزرگ برگد ہرگز نہ تھا۔ اس پہ کچھ پھیروں سے آگے نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس
کی وجہ شاید یہی ہوگی کہ یہاں ہر وقت مطلوب تھا۔ بے وقت لوگوں کا آنا جانا اور بیٹھنا لیٹنا رہتا تھا۔ گنجفہ
تاش' چوسر' شطرنج اور دیگر وقت ماری کے کھیل جاری تھے۔ چوری چھپے منشیات بھی استعمال ہوتی تھیں۔ دوا سے
یعنی دیوان خانے کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوشش کے باوجود ان خرافات پہ قابو رکھنا مشکل پڑتا ہے۔ کہنے کا
مقصد یہ تھا کہ یہ بزرگ والا درخت بھی ادھر کے ماحول میں رہتا۔ رہتے رہتے آسودہ تنوں کا بڑا حصہ بن چکا تھا
ہندو یا برگد جب اپنی اوقات' مقصد ذات و حیات سے آگے نکل جائیں یا بہت پیچھے رہ جائیں تو سانپ کی اتری
ہوئی کینچلی بن کر رہ جاتے ہیں جس سے سانپ کے وجود کو ثابت تو کیا جا سکتا ہے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

فقیروں درویشوں اور سائیوں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں —— پانی اور ہوا بھی کبھی کہیں ٹکت نہیں ٹھہرتے اور محبوب کا مزاج بھی ایک سا نہیں رہتا —— سنگ و خشت یا خوب پختہ گھاٹ میں خشکی فوراً دوڑ' دیر بعد زنگ آلود ہو کر کئی کبولت پیدا کر دیتی ہے۔ لہراتے پانیوں میں جھولتے موتی کے ڈھنڈے کو ہم مہوات کی پابندی حاصل کر لیتے ہیں ؟

امرودوں کے باغ کی راہ بدل کر میں اس پگڈنڈی پر آ نکلا تھا۔ یہ راستہ میرے لیے کوئی اجنبی نہ تھا... مگر آج اس طور کہ میرے ساتھ میرا معدوم سا سایہ ہی تھا کوئی اور لگا بندھا ساتھ ساتھی نہ تھا ''

زندگی پابندی' پیار محبت' عداوت نفرت' تعلق تقرب' تصوف تصدیق' اظہار و اقرار کے دیکھے بھالے جانے پہچانے انداز ہیں۔ عمل اور ردِ عمل —— منطقی آغاز و انجام —— مگر کچھ آغاز و انجام چونکا دینے اور دہلا دینے والے بھی ہوتے ہیں۔ سیدھا راستہ تو سب پگڈنڈیاں پکڑتی ہیں۔ ایک آدھ اُلٹی سمت کی تار و بھی ہوتی ہے۔ مجھ ذہب کی اونچی ڈگری تاپ کی کی زراوت اور سالمن —— سرمد' حلاج' منصور کے راستے الگ ہی تھے۔ کوئی ساتھی' ساتھ نہ تھے اگر کوئی تھا تو تنہائیوں میں شامل تھا ؟

کوئی انجانی سی قوت مجھے کہاں کہاں دھکیلے ہوئے تھی۔ یعنی اس راستے پہ جو صریح بوڑھا بوڑھ کا درخت تھا لے جا رہی تھی۔ میں دن کی روشنی میں کسی اندھراتے کے مریض کی طرح' کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا بھالتا بے خود سا چلا جا رہا تھا۔''

ڈائنوں والا کھوہ —— شہر سے باہر نالہ ایک کے پار ہندو شودروں کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے کنارے الگ تھلگ ایک ویران سے مندر کے آنگن میں تھا۔ تھوڑے فاصلے پہ ایک بیچ و سا مرگھٹ —— ادھر چھوٹی جات کے ہندو شودر اپنے مُردوں کو آگ دیا کرتے تھے۔ برہمن تو دیہانت کے بعد سورگ باشی ہو کر امر شکتی دیوتا سمان ہو جاتا ہے جبکہ شودر کم جات دیہانت کے بعد بھوت بن جاتا ہے یا نرک میں آگ میں پکتا رہتا ہے... اسے بھگوان!

مشہور تھا کہ ''ڈائنوں والے کھوہ'' میں شودروں کی مری ہوئی مہلائیں بھوتنیاں بن کر رہتی ہیں اور نیچ لوگ بھوت پریت بن کر برگد کی لٹکی ہوئی داڑھیوں اور شاخوں جڑوں کی جٹاؤں میں بسیرا کر لیتے ہیں اور ادھر آنے والوں کو چمٹ جاتے ہیں۔'' یہ جگہ شہر سے خاصی دور اور بیچ میں نالہ ایک بھی حائل ہوا اکثر پانی سے پُر رہتا تھا۔ حال یہ کہ اس گاؤں کے قریب و دور کے دیہاتی بھی اُدھر کا رُخ کرنے سے گریزاں رہتے..... شہر سے اُدھر کوئی خاص ضرورت اور مجبوری والا ہی جاتا ہو گا۔ ہاں' ہم عمر کے لونڈے آوارہ گردی کرتے ہوئے مچھلیوں' مچھلوں' گھونگوں کے لالچ میں بھی اُدھر نکل لیتے تھے یا پرندوں کے انڈے بچوں کی تلاش اُدھر لے جاتی

تھی لیکن اکیلا دُکیلا جانے کی جرأت کسی میں نہ تھی؟

امرودوں والے پُراسرار چوکیدار نے واضح طور پہ تو مجھے کچھ نہ کہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے اب اپنے پاس بٹھانے، امرود کھلانے سے گریزاں ہے۔ میں بھی ادھر پکے ہوئے گلابی امرود کھا کھا کر اوب چکا تھا۔ میری سمجھ سے یہ بھی بالا تھا کہ امرود جو سبز طوطوں کے کُٹے ہوئے ہوں یا زمین پر گر کر بگڑے پڑے ہوں انھیں کراہت کی بجائے رغبت سے کھانے میں کون سی حکمت اور تصوف تھا؟ ... اور مزید یہ بھی سمجھ نہ آیا کہ میرے اندر سبز طوطوں کے بچے پکڑنے کی شدید خواہش کیوں جنم لے چکی ہے۔ لگتا تھا میری زندگی کا مقصد ہی یہی ٹھہرا کہ میں انھیں خود اپنے ہاتھ سے پکڑ لوں۔؟

ڈاکیوں والے کھوہ کے پاس سے ایک دو دفعہ گزر ضرور ہوا مگر قریب جانے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ کچھ پرے سرکنڈے کے بڑے سے خیمہ نما تھوڑی طرح کے گھیراؤ پھیلاؤ والے صدیوں پرانے بوڑھ کی جانب جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا گھیراؤ پھیلاؤ، زمین سے لگی ہوئی اژدھوں کی مانند شاخیں، بھانت بھانت کے پرندوں کا شور، آس پاس کا خوفناک ماحول دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔"

ایک نالہ پار کر کے گھنٹہ بھر کی مسافت کے بعد میں بوڑھ کے قریب پہنچ گیا۔ اس عرصہ میں سورج کافی اوپر آ گیا۔ دھوپ میں تیزی ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک مٹی کے ٹیلے سے نیچے سستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا مگر ادھر پانی کہاں ... تھکن و پیاس سے دھیان ہٹانے کی خاطر برگد کی جانب دیکھنے لگا۔ اکا دکا پرندے آ جا رہے تھے۔ سوچنے لگا میں ادھر کیوں آیا ہوں اگر اسی طرح کے پرندے ہی دیکھنے تھے تو شہر کے درختوں پہ کیا کمی تھی ... ادھر بائیں سامنے بغیر کاشت کے کھیت تو ہے ہی، مختلف نوع کے پیڑ درخت جھاڑیاں بکھری ... وہی جو ہو کی ویران سنسان شمشان قسم کے علاقہ میں ہو سکتا ہے۔

یک دم میرے سامنے ایک خارپشت رینگتا ہوا آ گیا۔ خاصا بڑا اور تنومند تھا بس میں گھبرا سا گیا۔ اپنے پاؤں زمین سے اٹھا کر جما سا ہو گیا۔ خارپشت مجھے نظر انداز کرتا ہوا سامنے ٹیلے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ میں اسے غائب ہوتے دیکھتا رہا تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے ایک بجو بھی تو قریب میں دکھائی دیا۔ میں سانپ، بچھو، شیر، چیتے ... کسی خونخوار خوفناک بدہیئت جانور سے بھی نہیں ڈرتا مگر بجو اور خارپشت سے میری جان جاتی ہے حالانکہ یہ دونوں انتہائی بزدل اور مٹی تاپ کے جانور ہیں۔ زندہ انسان کے قریب آنے سے کتراتے ہیں اور کوئی زندہ انسان بھی ان کے نزدیک جانے سے بدکتا ہے ...!

جس مہم یا تلاش کی شروعات ہی بجو اور سیہہ یعنی خارپشت سے ہوا اس کے انجام پہ کون سے گرگ شب تاب اور ہُدہُد کی توقع باندھی جا سکتی ہے؟ ... بہر کیف الطبیعت ابھی خاصی مکدر ہوئی ... پچھتاوا ہوا کہ

اکیلا کیوں آیا ایسی راہوں پہ تو کارواں بے راہ ہو جاتے ہیں۔ ایک آدھ کوئی ساتھی ساتھ ہو تو مرنے جینے کی اطلاع کا کوئی وسیلہ تو ہوتا ہے۔۔۔؟

حلق میں پیاس سے ریگزار سا بھرنے لگا۔ بھوک تو کسی حد تک قابلِ برداشت ہوتی ہے مگر پیاس ایسا ادھم بے حال کرتی ہے کہ بندے کی سوجھ بوجھ طاقت سارا سب کچھ سلب ہو کر رہ جاتا ہے۔ کم و بیش ایسا ہی کچھ حال میرا بھی ہو رہا تھا۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں ادھری نڈھال ہو کر رہ جاتا' اٹھا اور بوڑھ کی جانب چل دیا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ بمشکل میں نے خود کو بوڑھ کی ایک ٹیڑھی میڑھی شاخ پہ جو زمین پہ پھیلی ہوئی تھی' ڈال دیا۔۔۔"

بے ہوش تھا یا ہوش میں کچھ خبر نہ تھی۔۔۔ اپنے ذہن میں بائیں دیکھ بھال رہا ہوں۔۔۔ برگد کے گھمبیر سائے کی خنکی بھی محسوس کر رہا ہوں۔ یہیں کچھ بدبو تعفن کا احساس ہوا۔ غور کیا' دیکھا' ہاتھ منہ کپڑے پرندوں کی غلاظت بیٹوں سے اٹے پڑے ہیں۔ سفید' سرخ' پیلی' سیاہ بیٹھیں۔۔۔ خدا جانے کن کن پرندوں کی تھیں۔ بمشکل اٹھا' صورتِ حال پہ غور کیا۔۔۔ دھوپ عروج پہ تھی مگر ادھر فضا قدرے خنک لیکن بدبو تعفن تھی کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔"

حالات کیسے بھی ناگفتہ بہ طبیعت کے خلاف یا خطرناک ہوں۔۔۔ پھنسا ہوا انسان کسی نہ کسی طور ان سے مفاہمت کر کے اپنے لیے سلامتی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتا ہے۔۔۔ ایسے ناموافق ناپسندیدہ حالات میں ہی اس کے صبر برداشت جسمانی روحانی استعداد اور علم و عقل کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے مگر کسی بے جوڑ کے سے ایسی توقعات رکھنا عبث ہے۔ میں شاید اس ذیل میں آتا تھا۔۔۔ جو نہ کرنا چاہیے مجھ سے ہی سرزد ہوتا۔۔۔ میری ہانپ جس تجس کے حصے میں تھی اس کے آگے میرا کوئی زور نہ تھا۔۔۔؟

خشک حلق' تلخ زبان اور آنکھوں کی جلن نے ایک بار پھر پانی کی شدید طلب کا احساس دلایا۔ جستجو کرنا فرض ہے۔ ادھر ادھر' قریب و دور نظر دوڑائی۔ جب کہیں کوئی پانی کے آثار دکھائی نہ دیے تو ناگاہ یاد آیا یہاں پاس ہی شمشان گھاٹ اور کنواں بھی ہے جو ڈاکیوں والے کھوہ کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ ڈھارس بندھی کہ شاید ادھر سے چنے اور بیٹوں کی غلاظت صاف کرنے کے لیے پانی مل جائے۔ یہی کچھ سوچ کر میں برگد کے گھمبیر پراسرار سائے سے باہر دھوپ میں نکل آیا۔"

سائے کے لیے کسی کایا کا ہونا ضروری ہے۔ درخت کا سایہ سر کی عیاری کو محفوظ رکھتا ہے۔ گرمی اور لو سے پگھلنے نہیں دیتا۔ بزرگوں کا سایہ بھٹکنے نہیں دیتا۔۔۔ سر کے سائیں کا سایہ بکنے نہیں دیتا اور رحمن و رحیم کی رحمت کا سایہ بندے کو کسی غیر کے آگے جھکنے نہیں دیتا۔۔۔"

بدھو، بے وقوف، احمق کو نہیں کہتے۔ بدھو تو وہ ہوتا ہے جس کے ہاں شُدھ بُدھ پیدا ہو ــــ یعنی وہ شُدھ بُدھ پیدا
تھی جس کا گیان گوتم کو حاصل ہوا تو وہ مہاتما بدھ کہلایا۔"

اچانک سائے سے باہر نکلنے سے وہی ہوتا ہے جو یک دم اندھیرے سے روشنی میں آنے یا اجالے
سے تاریکی کی جانب جانے سے ہوتا ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے سکڑنے سے وقتی طور پر کچھ دکھائی نہیں دیتا
بدھو بولا سا جاتا ہے۔ اس وقت میرا بھی یہی حال تھا۔ آنکھوں کے آگے ترمرے سے تیرنے لگے تھے۔

لق و دق صحرا ہو یا چٹیل میدان نصف النہار پر سورج چمک رہا ہو ــــ پیاس کا تڑکا، حبس گھٹا ہو تو
قریب دور دکھائی والی ہر چیز سراب میں بدل جاتی ہے۔ فریب نظر بڑھ جاتا ہے۔ ہوتا کچھ ہے دکھائی کچھ اور
دیتا ہے ــــ!

میرے ساتھ کچھ ایسے ہی ہوا۔ ہلکا سا سر گھوما، دیکھا کچھ دور سامنے ایک کنواں نظر آیا۔ ادھر کا رخ
پکڑا، قریب پہنچ کر معلوم ہوا یہ تو کوئی جھاڑ جھنکاڑ سے اٹا ہوا مٹی کا تودہ ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی منظر دکھائی
دیے جو سب کے سب فریب نظر کے سوا کچھ نہ تھے ......؟

برسات لوٹ کر برستی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ــــ اللہ کی مخلوق کے لیے پریشانیاں ہی پریشانیاں
پیدا ہو جاتی ہیں۔ سیلاب کا خطرہ الگ ــــ اس کے باوجود برسات اچھی لگتی ہے۔"

حبس، لو، گرمی، سردی، برسات، بہار، خزاں سب موسموں کے اپنے اپنے جادو اور رنگ ہوتے ہیں جبکہ
اصل موسموں کے رنگ تو انسان کے اندر ہوتے ہیں۔ اس طور سے باہر کے موسم بھی بھلے لگتے ہیں۔ حبس میں لُو
خشک سال میں بانجھ بدلی ــــ صحراؤں میں سراب بڑا دھوکہ دیتے ہیں۔ میں بھی ایسی ہی صورت حال سے
دوچار تھا ــــ"

انسانی دماغ میں سیدھی جانب شعور اور الٹی جانب لاشعور ہوتا ہے۔ ان پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔
یہ ایک خودکار نظام ہے جو حالات، واقعات اور داخلی خارجی ضرورت کے تحت کام کرتا ہے۔ اپنی ضرورت یا
سہولت کے تحت جس طرح پائلٹ اپنے جہاز کو آٹو پائلٹ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اسی طرح انسان
بھی حالات کے مطابق اپنی کارکردگی اور فیصلوں کو اپنے خودکار شعوری نظام کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب سب
فیصلے اور فعل اپنے آپ ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان میں اس کے کسی ارادہ یا خواہش کا عمل دخل نہیں ہوتا۔"

جب میں اپنی ہر کوشش میں ناکام ہو گیا ــــ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر خاصا بھٹک چکا تو ہمت
جواب دے گئی۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جب انسان کا اپنی کسی حرکت و عمل پر کنٹرول نہیں رہتا۔ وہ خود کو اپنے
شعوری لاشعوری نظام کے سپرد ہو جاتا ہے۔ اب اس کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو اس کے لیے لکھا ہوتا ہے ......

ہوتی ...... صرف جان ہوتی ہے' جس سے کوئی پرسش نہیں ہوگی ...... ؟

اساطیر کے قصوں داستانوں میں بڑے بڑے راکھشوں کی جانیں' طوطوں کے قالب میں ڈھلی بتائی جاتی تھی۔ دُور دیسوں سے پہنچنے والے کاروان' سوداگر لوگ' دیگر مال اسباب کے ساتھ بڑے بڑے نایاب خوبصورت خوش رنگ' ہفت زبان باتیں کرنے والے طوطے بھی لایا کرتے تھے ...... اور ایسے بھی جو موسیقی' شاعری' لطیفہ گوئی' داستان گوئی اور حکمت کی باتیں کرنے میں طاق ہوتے ہیں۔ ان کے قدردان بھی ایسے جو منہ مانگی قیمت پہ انہیں حاصل کر لیتے ...... ایسے طوطے بھی جنہوں نے اپنے مالکوں کی جانیں بچائیں' چوروں ڈاکوؤں سے حفاظت کی' ان کی تنہائیوں کے مونس بنے' یا مخبری کی' راز اگل کے جنگلوں میں گم کر دینے والے یہ سبز پرندے بھی پائے گئے۔"

اس پرندے کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ باغِ بہشت کے چند اِن خوشنما' ہمہ اوصاف پرندوں میں سے ایک سرسبز پرندہ ہے جو جنتیوں کی خاطر داری کے لیے ہوں گے ...... اپنی پیاری پیاری حرکتوں اور باتوں سے جنت کے باسیوں کا دل بہلائیں گے ...... واللہ اعلم بالصواب ...... !

طوطے عالمِ وارفتگی میں بسم اللہ بسم اللہ ہو کا ورد بھی کرتے ہیں۔ ٹھما ٹھما' سر گردن کے بال پھلا کر اپنی خفگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں انہیں "میاں مٹھو چوری کھانی اے" سکھاتی ہیں۔ کہتے ہیں طوطا بےوفا پرندہ ہوتا ہے۔ پنجرے کی کھڑکی کھلی رہ جائے تو یہ باہر نکل کر اُڑ جاتا ہے اور پھر ہاتھ نہیں آتا۔ طوطے پہ ہی کیا موقوف؟ وہ تو پرندہ ہے' انسان میں کیا کم ہے۔ وہ تلی بے قید سے چھٹکارا' رہائی کیا کسی اسیر کا حق نہیں ...؟

## • میں ہی آگہی میں ہی آئینۂ حسن ——!

سرخ گانی والے ہرے طوطے ...... سایہ' آسیب' جن پری اور رجال الغیب وغیرہ آسانی سے دیکھ لیتے ہیں۔ وہ کسی روپ بہروپ میں ہوں انہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کرتے۔ اس وقت' ان کی عجیب سی حالت ہو جاتی ہے۔ چونچ سے کٹکٹانا شروع کر دیتے ہیں۔ پورے جسم کے بال کھڑے اور پتلیاں پھیل کر دگنی ہو جاتی ہیں۔ بے چینی' پھڑپھڑاہٹ ایسی کہ بس میں ہو تو پنجرے سمیت اڑ جائیں۔ عجیب و غریب سی آوازیں نکالتے ہیں۔

مجھے چند ایسے عاملین کی مجالس و مراقبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا جو موکلات اور ارواح کی حاضری کا اہتمام کرتے تھے۔ میں نے بغور مشاہدہ کیا کہ عاملین مختلف مراحل پہ بلی' الو' کوے اور اس مخصوص طوطے کی

جبلّی استعداد وں سے بھی مدد حاصل کرتے ہیں۔ کچھ غیر مرئی ہستیاں ایسی بھی ہیں کہ انسان کی ظاہری و باطنی آنکھ انہیں دیکھنے کا یارا نہیں رکھتی لیکن مخصوص لوگوں کے لیے انہیں محسوس کرنا ناممکن بھی نہیں۔ مگر زود رو الفاظ و امور مکاشفہ امر محال کہ ہر دو کی کسوٹی مختلف ٹھہری۔"

ارض اور سموات کے مابین جو بھی موجود ہے وہ ہر قسم مخلوقات ہے۔ مخلوقات میں محض مختلف نوع کے جاندار ہی نہیں جو طرح طرح کے اجسام و اشکال، حرکات و سکنات اور افعال و کمال رکھتے ہیں بلکہ ایسی بھی مخلوق موجود ہیں جو نہ تو کوئی ٹھوس وجود و وجہہ رکھتی ہیں، دکھائی دیتی ہیں، نہ ہم انہیں چھو سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے رویے، قدریں اور تقاضے ہماری طرح کے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہ ہیں جنہیں حق تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت، صنعت، قدرت و مصلحت کے تحت تخلیق فرمایا۔ یقیناً ان کی تخلیق و تکمیل کا مقصد ارض و سماء کے ایسے معاملات، انتظام و انصرام کے لیے ہوگا جن سے بنی نوع آدم اور دیگر ارضی و سماوی مخلوق براہ راست یا بالواسطہ فیض یاب ہو سکیں.......“

ایسی ذواتِ مقدسہ ارواحِ طیبّین کہلاتی ہیں ...... تمام الہامی معارف، رازہائے کائنات اور رازہائے ماورائے کائنات ان پر روشن ہوتے ہیں۔ ”علم غیب، سروش، سیر انفس، مخصوص جنات، اولیائے ظلمت اور ایسی نہ دکھائی دینے والی ماورائی مخلوق، اللہ کریم نے دانشِ نورانی سے نوازہ ہوتا ہے۔ ایسے سیر آفاق، انفس صور، اَرواح فلکی وغیرہ اشراف الانبیاء کہلاتے ہیں۔ ان کے ذمہ مجرم سے بچنے، امن، راستی اور سلامتی کا شرف قائم رہتا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام کی مثل ان کے بھی کچھ افعال و فرائض ہیں۔ بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانا، شیطانی چکروں سے بچانے کی کوشش کرنا ...... غیر اللہ کے وساوس اور غلبے سے بچنے میں ساتھ دینا ...... بے بسی و معذوری کی منزلوں میں مدد کرنا ...... یعنی یہ نادیدہ مخلوق نہ دکھائی دیتے ہوئے اللہ کے امر سے ہر اس بندے کی مدد کرتی ہیں جو اللہ پہ بھروسہ کرتے ہوئے خود کو اور اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیتا ہے!

آج کل تو نہیں لیکن ہمارے وقتوں میں دادیاں، نانیاں مائیں، گھر سے رخصت کرتے وقت بچوں، بڑوں کو ”اللہ دے سپرد“ کہا کرتی تھیں ...... یہ بہ دعا تسلی اور قلبی ڈھارس کا موجب ہوتا تھا۔ مزے کی بات کہ اللہ پاک بھی ”اپنے سپرد“ ہونے والی اس کی جان مال کی حفاظت پہ یہی ارضی و سماوی مستقیمین مقرر فرما دیتے ہیں۔“

قدرت و فطرت کے ازلی اصول کے تحت ”ارواحِ طیبّین“ کا نقیض بھی ٹھہرا ...... یہ ہیں ارواحِ طاغوت یا ارواحِ خبیثین ...... ارواحِ طیبّین (شدھ) پاک اور ارواحِ خبیثین (اشدھ) ناپاک ...... یہ سحر سامری،

میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جدھر گزرے وقت کی کسی کٹیا کی کچھ باقیات تھیں۔ ٹوٹے پھوٹے مٹی کے برتن گھاس پھونس کا بنا گدیلا جو شاید کسی جوگی کا بستر رہا ہوگا۔ ناریل کی بنی کڑکڑی۔ سادھو لوگ اس میں جنگلی حشیش بناکر کش کرتے ہیں جو انھیں دھیان گیان جمانے میں مدد دیتی ہے۔ ٹوٹا ہوا اک تارا اور بھی ادھر ادھر کی بےکار سی چیزیں جن کی موجودگی اور خستہ حالت سے پتا چلتا تھا کہ ماضی قریب میں ادھر کسی سادھو سنت نے سمادھی لگائی ہوگی؟ ـــ جانے کیا جی میں سمائی میں ادھر خس و خاشاک کے ہموار سے بستر پہ بیٹھ گیا ـــ سوچنے لگا کوئی دھیانی گیانی ادھر اپنی تپسیا کے لیے بیٹھتا ہوگا؟ ـــ ناقابلِ برداشت ماحول ویرانی ہی ویرانی ـــ پانی ہے اور نہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کوئی ڈھنگ ڈھب کی چیز ـــ ہر سُو جانوروں پرندوں کا شور ـــ مچھر جھینگر کیڑے مکوڑے گرمی سردی برسات اس کی لمبی لمبی راتیں اور انسانی جسمانی نفسانی جبلی تقاضے ـــ؟

کیا فقیری درویشی ویدانت اور تصوف! ریاضت مجاہدت نفس کشی ترکِ دنیا زہاد لطف و لذات کا کام اور نام ہے؟ رسوائیاں جگ ہنسائیاں محرومیاں اور اپنی ذات کی نفی طرح طرح کی نفی ہی کیا ان کا انعام ہے؟

پورو اکو مغرور گھوڑے نے عاشق مائل ہوگی چونکا رمن مارے بہت بارے جنگلوں بیلوں دشت صحراؤں میں گم کیوں ہو جاتے ہیں؟ ان کے من ادھر کیوں بھٹکتے ہیں ـــ متمدن معاشرے سے ہٹ کر جنگل کے قانون قاعدوں میں تحفظ کا احساس کیونکر حاصل کر پاتے ہیں ـــ میں کچھ سوچ رہا تھا کہ بیٹھے بیٹھے اونگھ سا گیا۔ جیسے کوئی تھکا ہارا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے ہم دراز ہو جانے کا آسرا تلاش کرتا ہے...
مجھے جب تک پاؤں پہ قائم رہتا ہے اس کے بیچ نکلنے کی بھوت بھرا بیدار رہتی ہے مگر جب وہ آگے جائے تو کیسا بھی ہمت والا ہو پران چھوڑ دیتا ہے۔ پنڈت پڑ بھی کہ جب اس کی آنکھوں کے اوپر والے پپوٹے بھاری ہو جاتے ہیں تو پھر اس کے ہمراہ اس کے ہاتھ پاؤں بھی بھاری ہونے لگتے ہیں...''

عجب سی بات ہے پرہی کہ دن کے اوقات میں کچھ بار سا ہاں ایسا بھی ہوتا ہے جب پوری طرح آنکھ بند ہو جاتی ہے یعنی ایسا وقت کہ چند لمحے ہی کیوں نہ ہو سدھ بدھ کھو دی جاتی ہے۔ شاید اسی لیے دوپہر کھانے کے بعد قیلولہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اس کے مقابل رات کے آخری پہروں میں بھی کچھ وقت کی بیداری ایسی ہوتی ہیں جنھیں بیداری کی حالت میں پالینا بڑی سعادت اور خوش بختی ہوتی ہے۔ اس کو شب زندہ داری کا نام بھی دیا جاتا ہے ـــ؟

نیند بھی کئی طرح کی ہوتی ہے کچی اونگھ بس جھپٹ پٹ سی کہ نیند کی بھی ذرا سے تو آنکھ کھل جائے بچلی پکی

والی کسی کھانے پینے کی کوئی چیز اگر زہریلی ہے، انسانی صحت کے لیے مضر ہے تو یہ ٹوٹ جاتا ہے...... دوسری خوبی یہ اگر اس میں کھانے پینے کے لائق چیز رکھا ہے تو خراب نہیں ہوگا۔ جسے کاٹتی نہیں کوئی زہریلا کیڑا، مچھر، مکھی سانپ، بچھو یا چھپکلی قریب نہیں پھٹکے گا.....!

کشکول اور بھی کئی چیزوں سے بنتے ہیں۔ مالدیپ اور یمن، بحرین کے ساحلوں پر ذرا آب جانوروں کی کھوپڑیوں میں ایک سمندری کدو پیدا ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ قدرت نے اسے خاص طور پر جوگیوں، بھگتوں، فقیروں، ملنگوں کے کاسوں کے لیے ہی پیدا فرمایا۔ واقعی یہ ایک عجیب چیز ہے۔ سیاہ، مضبوط، چمکدار اور خوبصورت۔ دنیا بھر کے ملنگ سادھو اسے بڑے چاؤ سے استعمال کرتے ہیں۔ اس میں ڈالا گیا جل بھوجن چاہے اور دوش و نشاط سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا کارن یہ بتایا جاتا ہے جب دھات اور پتھر لکڑی کا بطور برتن استعمال نہیں جانا گیا تھا تو دیوتاؤں نے اپنے بھگتوں کو اس کاسے کا استعمال سکھایا تھا.....''

پرانے پرانوں شاستروں اور اساطیری داستانوں میں کچھ کھوپڑیوں کے کاسوں کے استعمال کا پتا چلتا ہے بلکہ میرے مشاہدے میں بھی چند ایک ایسے واقعات آئے ہیں جن سے میری معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ چند ایک عجیب اور مخصوص جانوروں کی کھوپڑی کے کاسے ایسے ہیں جو پُراسرار سفلی سرگرمیوں اور کالے علم کے عملیات میں کام آتے ہیں۔ افسوں گر، سحر ساحری کے عامل اور عاملین طاغوت ان کھوپڑیوں کے پیالوں میں مختلف اقسام کا خون، شراب اور ادنیٰ مچھلیوں، دیویوں دیوتاؤں ساگروں کے جل پیتے ہیں جو ان کے سفلی حساب کے مطابق ہوتے ہیں۔ انسان کا خون، اُلو، چمگادڑ، بندر، بچھو، تیتر، کبوتر، بلی، کتے، خنزیر، چھپکلی کا خون!''

اسی طرح کھوپڑیوں کے پیالے بھی ہوتے ہیں۔ اکثر انسانوں کے سروں کے کاسے کام آتے ہیں۔ بندروں کی کھوپڑیوں کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں ایک ایسا الجھن آمیز مشروب پیا جاتا ہے جو چمگادڑ کے خون، کالے ماش کے کشیدہ شراب، سات ایسی ندیوں کا پانی جو سورج کے نکلنے کی طرف بہتی ہوں۔ اکثر بنگال، نیپال کے جادوگر ایسی کنواری کنیا، جسے قتل کیا گیا ہو یا جس نے آتما ہتیا کی ہو، کی کھوپڑی کے کاسے میں اپنے خون کے چند قطرے اور میوے کی شراب شامل کرکے پیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ایسا کرنے پر جنتر منتر جادو ٹونے مکمل ہو جاتے ہیں.....''

میں نے برازیل میں انسانی باقیات، خصوصاً کھوپڑیاں، بازو، پنڈلیوں اور ریڑھ کے مہروں ہڈیوں کا ایک ''عجائب گھر'' دیکھا۔ دراصل یہ عاملان محرفسوں کا ایک قدیمی کلب تھا۔ جیسے یہودیوں کے فری میسن کلب ہوتے ہیں۔ ایسا ایک کلب لاہور میں چڑیا گھر کی بغل میں جادوگر یا جوگی گھر کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی سرگرمیاں، اغراض و مقاصد اور ممبران ہمیشہ پُراسرار رہے اور اس کی حقیقت بھی کوئی کماحقہٗ طور پر نہ جان سکا

اور گزرتے وقت نے اسے مزید پُراسرار کر دیا ہے۔"

یہ ادارہ "ہاؤس آف ازم" یا جس کا جو بھی نام رکھ لیں۔ ایسے امیر من کے چیلوں چانٹوں کے لیے مخصوص تھی جو پُراسرار علوم "علمِ نجوم، علوی علم الافلاک، مافوق الفطرت اور مافوق و ماورا" وغیرہ کے حصول کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ یہاں کے جلسوں میں بھانت بھانت قسم قسم کے جادوگر لوگوں کا شرکت کرتے ہیں۔ بڑے دعوں جنات بھوت پریت اور ارواح کی حاضری والے بھی سیکھنے سکھانے کے لیے آتے ہیں۔ الگ الگ رنگ و نسل، مختلف زبانیں اور مذہب و مسلک مگر ایک قدر جو مشترک ہوتی ہے وہ ہے ان کا مخفی علوم سیکھنے کا جنون! پیشہ ور بھی اور محض جاننے سمجھنے کی حد تک شوقین بھی ...... ایک اور خاص بات یہ کہ ان خاص افراد میں اتفاق، نظم و ضبط، باہمی روابط اور رازداری بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے خاندان کے افراد کی طرح ہوتے ہیں جو ایک دوسرے پہ جان چھڑکتے ہیں۔ اعتماد، اعتبار اور عزت کرتے ہیں۔ اجنبیوں سے محتاط روابط بڑھانے میں حد درجہ احتیاط سے کام لیتے ہیں لیکن ایسے قابلِ بھروسہ افراد جو کسی معتبر خاص سفارش یا سنجیدگی سے جادو، طلسم، خفیہ علوم سیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں یا اپنے شوق کی کوئی سند ...... کوئی اعتبار، ضمانت و امانت پیش کرتے ہیں، وہ ان سے خاص توجہ اور طمانیت پاتے ہیں ......"

میں بھی اسی طرح اپنے ایک دوست کی وساطت سے یہاں تک ایک شوقیہ مہمان کی حیثیت سے پہنچا تھا۔ انہوں نے میری خاطر تواضع اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں خاص دلچسپی دکھائی ...... میری خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ چھوڑی ...... یہاں تک کہ مجھے اپنے خاص جلسے میں دوسری صف میں بٹھایا اور اپنی پوری کارروائی میں شامل رکھا ...... خدا جانے! میرے اس مصری دوست جو ان کا بااعتماد ممبر تھا میرے بارے میں انہیں کیا کیا اُلٹی سیدھی باتیں بتائی ہوئی تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے عشائیے کے وقت ہوا کہ انہوں نے صرف میرے لیے ایک انڈین ریسٹورنٹ سے خاص طور پہ کھانے پینے کا کچھ سامان منگوایا تھا۔

یہاں جتنے بھی افراد تھے تمام بڑے پُروقار، آدابِ زندگی سے بہرہ ور، معقول ذی شان تھے لیکن اُن کی شخصیت میں ایک پُراسراریت تھی۔ ظاہر ہے پُراسرار علوم کے طالبعلم یا عالم پُراسرار ہی ہوں گے ...... ؟
جو اندر ہوتا ہے اس کا کچھ نہ کچھ اثر باہر بھی ہوتا ہے۔"

● سامری عصری اصنام گری ......!

میں سوچنے لگا ...... یہ کیا "پچھلے پاسے" لگے ہوئے ہیں؟ شیطانی علم، کالا علم، ابلیسی حاضرات ......

سب کہتے ہیں کہ علم کے معنی جاننے کے ہیں۔ چھری کی بابت سب جانتے ہیں اس کا کام کاٹنا ہے۔ اب چھری والے پہ منحصر ہے کہ اپنی ضرورت سمجھ کے تحت سبزی، پھل کاٹے یا پھر طبیعت، غصے سے مجبور ہو کر کسی کا گلا کاٹے؟ علم کا صحیح یا غلط استعمال ہی اسے علم نافع یا علم ناقص بناتا ہے ۔۔۔۔؟

علم و دانش، کتابوں، نصابوں، مدارس و مکاتب، نسلی و عملی اور شرفاء و فقہاء کے وسیلے سے حاصل ہوتے ہیں مگر کماحقہ طور پہ حاصل کرنے کے لیے ان علوم سے تعلق کے علم کا ادراک کسی علم کے بنیادی اور حقیقی معنی اور افادات اجاگر کرتا ہے۔ ضرورت ہو یا نہ ہو تصویر، آئینہ، چلمن، تعلق، منظر، فیصلہ، سفر اور منزل کے دوسرے رخ پہ تدبر کر لینا بہتری لاتا ہے۔"

جو علم اور عمل نتائج کے دونوں رخوں پہ نظر، بچار اور تدبیر نہیں رکھتے ان کے خام ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ چور بھاگنے کا راستہ نظر میں رکھتا ہے۔ سپیرے بھی سانپ کے زہر کا تریاق پاس رکھتے ہیں۔

قرآن الحمید کو حفظ کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ اساتذہ حضرات طالبعلموں کو حفظ کرانے کے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ پہلے تو بچے کا ذوق طبیعت اور شوق دیکھتے ہیں۔ پھر اس کے مطابق بسم اللہ شروع کرواتے ہیں۔ چاہیے تو یہ کہ "الف لام میم" سے شروعات کروائیں ۔۔۔ مگر وہ آخری سورتوں سے آغاز کرواتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی یعنی ہمارے یہ بچے نیچے سے اوپر نہیں چڑھتے، اوپر سے نیچے کی طرف آتے ہیں۔ اصول طور طریقے قانون وغیرہ انسانیت کی آسانی اور معاشرہ میں وضعداری قرینہ وغیرہ فرد کے بنیادی حقوق کی پاسداری اور حفاظت کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ مگر دیکھا گیا کہ قدرت فطرت کے آگے بندھے اصول قانون بھی شاید "نظریہ ضرورت" کے تحت آگے پیچھے ہو جاتے ہیں۔ قادر مطلق جو چاہے کرے اس کی حکمتیں وہی بہتر جانتا ہے۔ انسان تو بس اپنی ناقص و نحیف عقل و سوچ کے مطابق ہی کچھ جان سکتا ہے اور ہوتا بھی ایسے ہی ہے کہ بزعم خود اپنے اندازوں سے غلط فیصلے کر لیتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے۔"

ہمیں جو کچھ اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں اوپر نیچے دکھائی دیتا ہے اور جو ہماری فرسودہ محدود بصارت بصیرت کی بنا پہ پردۂ اخفا میں ہے ۔۔۔ اور وہ بھی جو بتقاضۂ بشریت ہمارے فہم و ادراک سے ماورا ہے وہ بھی جہانِ حیرت و حسرت، عالمِ تغیر و تبدل ہے ۔۔۔!

ارفع و ادنیٰ، مطلق و ماحق، نوری و ناری، خاکی و آبی، ارضی و فلکی، جنتی و جہنمی غرضیکہ جتنی بھی معلوم نامعلوم مخلوقات ہیں سب ششدر، شرمندہ، آنکھیں پھاڑے منہ پھاڑے دیکھے محوِ استعجاب و اجتناب ۔۔۔ قدرت کی گوناگوں بوقلمونیوں میں مستغرق ۔۔۔ کہ انسانی عقل و بینش، فہم و ادراک کے جتنی بھی کھڑکیاں دروازے

لمبوترا — جوگی بھگت توری لوکی کو خشک کر کے پانی کے برتن کے طور استعمال کرتے ہیں۔ جب اس نے پانی میری جانب بڑھایا تو اچانک میری نظر اس کے ہاتھوں کے ناخنوں پہ پڑی۔ چھوٹے بڑے کے سینگوں کی مانند بڑھے ہوئے تیز نوکیلے ناخن — جیسے کئی برسوں سے انہیں تراشنے کی تکلیف نہ کی گئی ہو۔ میں نے بمشکل پانی حلق سے نیچے اتارا۔ سبحان اللہ! ایسا میٹھا ٹھنڈا اور رسیلا پانی' کہیں کم ہی پیا ہوگا؟ — میں نے تشکر آمیز لہجہ میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''بابا! آپ کہاں رہتے ہیں۔ میں پہلے بھی ادھر دوستوں کے ساتھ آیا ہوں مگر آپ کو کبھی یہاں نہیں دیکھا؟''

میرے سوال کا کوئی جواب دینے کی بجائے وہ بندر کی مانند اچھل کر پیچھے ایک چھدری سی جنگلی شاخ پہ الٹا ہو کر لٹک گیا۔ میں آنکھیں پھاڑے ہوا دیکھتا رہ گیا — الٰہی! یہ بندہ ہے یا بندر؟ اک عجب شعبدہ یہ بھی دیکھا کہ وہ زمین سے اٹھا ہوا صاف ہی لگتا ہیں — برگد کی جابجا لگی ہوئی داڑھی کی گھنی چھدری شاخیں' ٹہنیاں' پتے — ان کے درمیان وہ ایک پرانے ٹوٹے مڑے تنے کی مانند ہی تھا۔ برگد اپنے سائے میں پنپنے والی ہر چیز کو برگدی چولا پہنا کر اپنے رنگ میں رنگ ڈالتا ہے۔''

''گویا قدرت کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اس کا سراپا دھیرے دھیرے برگد بن گیا تھا۔ جگہ جگہ شاخیں پھوٹ پڑی تھیں۔ دل اور آنکھوں کے علاوہ باقی تمام جسم اس کے کاٹھ میں تبدیل ہو گیا۔ ناگ' بیر' میرا بائی کے علاوہ لاتعداد معروف غیر معروف سنتوں' جوگیوں' صوفیوں' درویشوں نے اس بزرگ' مرشد درخت کے سائے میں سودھیاں جمائیں — گیان و نروان حاصل کیے۔

پتھروں پہاڑوں میں رہنے اور پیدا ہونے والوں میں پتھروں کی سی سختی اور طور طریق پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ پتھروں کے درمیان خود بھی کسی چٹان کا حصہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح صحراؤں' پانیوں' برف زاروں اور میدانوں' جنگلوں میں رہنے والوں کے طور طریق' ان کی عادتیں' سوچیں اور رویے بھی اسی ماحول میں ڈھل جاتے ہیں۔''

''واقعی ہوا تو ایسا ہی تھا مگر یا تمہیں اس نے بڑی سیدھی بات —!

''تمہیں اس دوپہر کو ادھر جنگل کی طرف آنے کی کیا پڑی تھی؟ — جانتے ہو دوپہرے جب سورج' کھوپڑی کے اوپر ہوتا ہے۔ بچوں کو بلا ضرورت گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے خاص طور پہ اس طرح کی خطرناک جگہ پہ بالکل نہیں آنا چاہیے بچے ڈر جاتے ہیں — اب تم ادھر کیوں آئے ہو؟''

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں۔ پہلے جی میں آیا کہ جھوٹ بولوں — نہیں بابا قسمیں دوں

سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے ۔۔۔۔ بابا نے پانی پلایا' اتنا اچھا کھانا کھلایا ۔۔۔ جھوٹ بولنے کا فائدہ ۔۔۔؟

"بابا! میں ادھر جنگل میں باتیں کرنے والے طوطوں کے بچوں کو پکڑنے آیا تھا۔"

"کیوں ان معصوموں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ۔۔۔؟"

بندہ ایک بار ہمت کر کے سچ بول دے تو اس کے لیے بڑی آسانی اور برکت پیدا ہو جاتی ہے۔ سچ کہنے کا راستہ کھل گیا تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے ایک اور سچ بولا۔

"بابا جی! امرودوں کے ایک باغ کا رکھوالا میرا دوست بن گیا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے لیے کانی والے، طوطوں کے کٹے ہوئے امرود بچا کر رکھتا تھا۔ جب میں اس کے پاس جاتا تو وہ زبردستی مجھے کھلاتا تھا جبکہ میرے دوسرے ساتھیوں کو اچھے اچھے سالم امرود دیتا ۔۔۔ کئی بار میں نے اس سے احتجاج کیا 'کٹے ہوئے باسی امرود کیوں کھلاتے ہو؟' ایک بار میرے ضد کرنے پر اس نے بتایا 'تمہارے ایک بند علم کی گرہ ایک خاص طوطے کے ادھ کھائے امرود کے بیجوں کے کھانے سے کھلے گی۔ اس طوطے کی پہچان یہ بتائی کہ اس کی آنکھیں سفید اور دم کا ایک پر کالا سا ہوگا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایسا طوطا' جو طوطوں میں ایک خاص رتبے پر فائز ہوتا ہے۔ یہاں اکثر آتا ہے مگر یہ پتا نہیں وہ کون سے بوٹے پر بیٹھتا اور امرود کھاتا ہے ۔۔۔"

ٹھوں ٹھوں کی عجیب سی آواز ابھری۔ شاید بابا میری اس بکواس پر ہنس دیا تھا۔ ایک تکلیف دہ خاموشی کے آزار سے بیزار ہو کر میں نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید بتایا۔

"اب میں گھر چلتا ہوں ۔۔۔ کھانے پینے کا شکریہ ۔۔۔"

چلنے لگا تو بابا بولا۔

"اچھا تو تم ادھر طوطوں کے بچے تلاش کرنے آئے تھے؟ ... تم بھی تو ایک بچے ہو' اگر تمہیں کوئی پکڑ کر پنجرے میں ڈال دے تو تمہارے ماں باپ پر کیا گزرے گی۔ اپنے کسی گھٹیا بڑے مقصد کے لیے بچے پکڑنا تو بڑی بات ہے۔ بچے تو بچے ہی ہوتے' انسان کے ہوں یا جانور کے ۔۔۔؟"

بابا کی بات سن کر میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوا ۔۔۔ کیا جواب دیتا' خاموشی کے علاوہ اور کیا جواب ہو سکتا تھا ۔۔۔ بابا پھر بولا۔

"بیٹھ جاؤ' ابھی دھوپ گرمی بڑی تیز ہے۔ سورج ذرا ادھر ہو لے تو چلے جانا۔"

میں پھر بیٹھ گیا اور کاسے کو دیکھنے لگا۔ میری خاموشی توڑنے کی خاطر بابا نے پھر سلسلہ کلام شروع کر دیا۔

"اچھا' اب تم بھی مجھ سے کچھ پوچھو ۔۔۔؟"

میرے پاس تو سوال ہی سوال تھے... میں کہاں سے شروع کرتا۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"بابا! آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں ادھر آیا ہوں اور پیاس کے ہاتھوں بے حال ہوں؟"

"پتر! بوڑھ کی طرح میں بھی انسانوں کا ایک بوڑھ ہوں... یہ بوڑھ اتنا بڑا درخت ہے کہ سائے تلے سات باراتوں کے باراتی کھلے ڈلے بیٹھ سکتے ہیں اور اس کے تن شاخیں جھاڑ تنے اتنے زیادہ کشادہ وسیع و عریض ہیں کہ پرندوں جانوروں کے جنگل کے جنگل ادھر بسیرا کر لیتے ہیں۔ مجھ میں بھی یہ بوڑھ والے تکڑ قوت پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک چیونٹی یا مکھی بھی ادھر ادھر حرکت کرے تو پتا چل جاتا ہے۔ مل جل کر رہنے والوں میں یہی تو ایک خوبی ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی بیماری کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔ تمہاری آمد اور ضرورت کی خبر سب کو ہو گئی تھی۔ یہاں تک طوطوں کے بچے بھی تمہارے ڈر سے بچنے کی خاطر اپنے گھونسلوں میں زیادہ نیچے اتر گئے تھے اور میری طرح درمیان گیان کے جگنوؤں نے اپنے گرد حصار کھینچ لیے تھے۔"

میں سہما ہوا اس پر اسرار کی گفتگو سن رہا تھا اور سوچ رہا کہ میں تو آسمان سے گر کر کھجور پہ آ اٹکا ہوں۔ امرودوں والے رکھوالے کی جگہ اب بوڑھ والا بابا مل گیا۔ میرے نصیبوں میں تو یہی کچھ لکھا ہے۔ اب میں ادھر سے بھاگنے کا رستہ دیکھ رہا تھا کہ یکدم بابا قلابازی لگا کر نیچے اتر آیا۔ میں اس عمر اور حالت میں اس کی پھرتی و چستی دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا جیسے اس نے میرے بھاگنے کے ارادے کو پڑھ لیا تھا۔

"بچے! ادھر لوگوں کا آنا جانا تو لگا رہتا ہے لیکن کچھ مہمان ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جاتی۔ تمہیں حیرت ہوگی یہاں کا ہر باسی تمہاری دعوت خاطر کے لیے بے چین ہے اور تم جانے کے لیے اتاولے ہو رہے ہو؟... اس سنسار میں مرنے والے سب ایک سے اور مارنے والے بھی سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صرف وجہیں اور شناختیں مختلف ہوتی ہیں۔ جیسے سارے ماس ایک سے... گائے بکری بھینس مچھلی مرغی بکرے... جس پانی بھی ایک جیسے... دریا سمندر جھیل جوہڑ کنواں... بنیادی جوہر ایک ہی مگر رنگ ذائقہ تاثیر مختلف... بوڑھ والا بابا امرودوں کے باغ کا رکھوالا سنگلاں والے بزرگ حافظ باؤ [illegible] یا تمہاری چاچی... یہ سارے تانے جوڑے ایک ہی کھڈی کے بانے ہیں...؟"

بابا نے بھینس بکری کے ساتھ بکرے کا نام لیا تو عجیب سا لگا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کچھ دیر پہلے کھایا ہوا کھانا عجیب سا لگا تھا۔ خود بخود منہ سے سوال نکل گیا۔

"بابا! کھانا بہت مزیدار تھا لیکن تو بہ ایسا لذیذ سادہ کھانا میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں چکھا۔ چھوٹی چھوٹی بوٹیاں جیسے گوشت نہ ہو [illegible]... بابا! یہ کھانا کون پکاتا ہے؟ گوشت کس پرندے یا جانور کا تھا؟"

بابا مجھے اپنے پیچھے لگائے برگد کی حدود سے باہر نکل آیا... اونچے اونچے پتوں کے [illegible]... جھاڑ جھنکاڑ سے

اور سخت ہوتی ہے۔ بناوٹ ایسی کہ لمحہ بھر چھری تلوار کا وار اس پہ اوچھا پڑے۔ کوئی ضرر پہنچائے بغیر ادھر ادھر پھسل جائے۔ کوئی جانور بھی اسے اپنے پنجے، دانتوں یا جبڑے سے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کھوپڑے کو صانع لم یزل نے اپنی کمال مہارت و حکمت سے محرابی بیضوی سی ایسی شکل اور سختی عطا کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ پتلا اور وزن میں ہلکا سا کاغذی سا پردہ جو اس ننھی سی جان پہ کسی حفاظتی خول کی طرح تنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال تارِ عنکبوت اور محرابی بیضوی سے دی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں دنیا کا سب سے مضبوط تار تارِ عنکبوت ہے اور انڈے کی بیضوی مضبوطی ایسی کہ کھڑے انڈوں پہ ہاتھی کھڑا کر لو۔۔۔!

تارِ عنکبوت اور کھڑے انڈوں کی مضبوطی یکجا کر لی جائے تو کچھوے کے کاسے کی مضبوطی تخلیق پھر بھی زیادہ ٹھہرتی ہے۔ مگر سچ ہے کہ مضبوطی بھی کہیں نہ کہیں اپنی کمزوری رکھتی ہے جو اس کے بھرم اور دعوے کو توڑ دیتی ہے۔ ہر کمال میں کہیں اس کے زوال کا سامان بھی چھپا ہوتا ہے۔ استحکام کے ساتھ انہدام کا ہونا عین فطرتی امر ہے۔ شیر خاصا خونخوار اور طاقتور درندہ ہے۔ اپنے سے دس گنا زیادہ جسامت اور وزن والے جانور کو آسانی سے شکار کر لیتا ہے۔ اس میں طاقت اور خونخواری سے کہیں زیادہ اس کی شکار کرنے کی تکنیک کا تعلق ہے۔ قدرت نے اسے آگاہی دے رکھی ہے کہ شکار کی شہ رگ کو دبوچنا اور اس پہ سوار ہو کر گردن سے لٹک جانا ہے۔ شکار پہ سوار سارا وزن جھلاتا ہے، گردن پہ دباؤ ڈال کر اسے سر کے بل گرا دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ بے وقوف اپنی گردن کا منکا تڑوا کر چاروں شانے چت میت ہو رہتا ہے۔ شکار ہونے والے جانوروں میں اگر ذرہ سی بھی سمجھ ہو تو وہ جانتے کہ طاقت اور بربریت کے اس پیکر کے نیچے اور پیٹ والی کھال معمولی کاغذ سے بھی پتلی اور نرم ہے۔ اس کھال کے اندر اس کے دل اور پھیپھڑے بھی ہیں جنہیں سینگ کی معمولی سی چوٹ اور کھر کے جھٹکے سے کھڑے کھڑے تہس نہس کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا ادراک اور آگہی صید اور صیاد کے مابین شاید بنا ہوا ہوتا ہے کہ ہر کوئی ایک جیسے ضابطہ اخلاق اور طریقِ حیات کا پابند نہیں ہوتا۔ کسی کے لیے مرنا مقصدِ زیست ٹھہرا اور کسی کو مار کر کوئی یہ فرض اور ضرورت پوری کرتا ہے۔۔۔!

اصل جنگل کا قانون جنگل میں کم اور انسانی معاشرہ میں زیادہ مستعمل ہوتا ہے۔ جانورِ مطلق تو اپنی جبلت کے تحت گزر کرتا ہے اور ایسا کرنا بھی چاہیے کہ اس کی دنیا محدود ہوتی ہے۔ اس کی بندگی دنیا میں انہوں نے جینے مرنے کے لیے جس سے خوراک حاصل کرتا ہے اور جس کی خوراک بنتا ہے۔" اب آئیے! جانورِ ناطق کی طرف۔۔۔ یہ بھی سو فیصد سے زیادہ اسی جنگل کے قانون کے فلسفے پہ مکمل طور پہ یقین رکھتا ہے فرق صرف منافقت کا ہے۔ جنگلی جانور اس سے آشنا نہیں ہوتے اور متمدن اخلاق یافتہ انسان اس سے

کھانا پینا اُدھر ڈیرے پہ ہی ہوگا۔"

جو کھانا نصیب میں ہے وہ پیٹ میں آ کر ہی رہے گا اور جو رات قبر میں ہے وہ بھی قبر میں لیٹ کر ہی آئے گی۔ ہم دونوں کھابہ زادوں کا یہی نعرہ تھا۔ ہم کھابہ کھاتے وقت یہی قول دہرا کر اپنی شکم پروری کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔"

میں پوچھتا ہی رہا مگر اس نے نہ بتایا کہ یہ نایاب کڑاہی گوشت والا ڈیرہ کہاں ہے۔ ہم ایک لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد راوی پار مقبرہ نور جہاں کے مقبرے کے عقب میں ریلوے لائن پار ایک جھگی نما ڈیرے کے پاس جا رکے — دریا کا پاٹ اور شاہدرہ والا مجھوڑے کے درختوں والا ذخیرہ وغیرہ دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ اس قسم کے ڈیرے عموماً دریاؤں کے کناروں پہ ہوتے ہیں۔ بظاہر تو ادھر دریا کی تازہ پکڑی ہوئی مچھلی بکتی ہے مگر اصل کاروبار منشیات کا ہوتا ہے۔ مچھلی بھی تازہ کیا ہوتی ہو گی؟ کڑاہی کے کھولتے ہوئے تیل میں آ کر اس کا سارا باسی پن اور بو ختم ہو جاتی ہے۔ دیسی شراب کے نشے کی چسک میں کیا باسی کیا تازی؟ کیا بو، کیا تعفن؟ سب برابر ہوتے ہیں۔ مجھے اب پتا لگا کہ حضرت! کیوں نہیں بتا رہے تھے کہ وہ مجھے کدھر لے کر جا رہے ہیں۔ میرا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر وہ کھسیانا سا کہنے لگا۔"

"بابا یار! آپ اپنا موڈ خراب نہ کریں۔ میں نے جان بوجھ کر اس جگہ کے بارے میں نہیں بتایا کہ آپ ادھر آنے سے انکار نہ کر دیں۔ بظاہر یہ جگہ وحشت ناک معقول سی دکھائی نہیں دیتی مگر یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ بُری دکھائی دینے والی چیز ضروری نہیں اصلاً بھی بُری ہو؟ — اس جگہ کے بارے میں میرا پہلا تاثر بھی ویسا ہی تھا۔ مگر بہت جلد مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔"

مجھے ایک "مجھوں" سی چارپائی پہ بٹھا کے وہ ایک جھونپڑے کی جانب بڑھ گیا جدھر ایک باریش لمبے گیسوؤں والا ملنگ بیٹھا تھا۔ پا بیٹھا آگ کی بڑی ہانڈی میں گوشت بھون رہا تھا۔ گوشت کی ٹیپ سی نیاندار کچھ نے میری حس شامہ کو خبردار کر دیا کہ یہی وہ گوشت ہانڈی تیار ہو رہا ہے جسے کھانے کی خاطر مجھے ادھر لایا گیا ہے۔ میرے ارد گرد چارپائیوں پہ کچھ معقول سے لوگ بیٹھے تھے۔ دو چار موٹر کاریں بھی کھڑی تھیں۔ گیس سے چلنے والے بلب کی زرد روشنی میں ادھر کے ماحول کو کچھ پُراسرار سا بنا رکھا تھا۔ ویسے بھی دریاؤں سمندروں جھیلوں تالابوں کے آس پاس کی دنیا پُراسراری ہوتی ہے۔"

بہتے اور ساکت پانیوں کے اپنے تشرفات تصرفات اور تصرکات ہوتے ہیں۔ ارضی و افلاکی مخلوقات نوری و ناری ارواح وقتاً فوقتاً ادھر جمع ہوتے ہیں۔ نوری حضرات بہتے پانیوں میں اجتماع کرتے ہیں اور ناری حضرات ساکت پانیوں پہ جمع ہوتے ہیں"

نوری و ناری علوم کے مقتدرین اپنی اپنی ضرورت کے مطابق بہتے اور ساکت پانیوں کے بیچ یا کناروں پہ اپنی اپنی ریاضت اور چلّہ کشی کا اہتمام کرتے ہیں۔ نوری علم کے طالب علم اپنی ریاضت عبادت بہتے پانی کے اس رخ پہ کرتے ہیں جدھر سورج کے طلوع کا منظر پانی میں اترتا ہو اور ناری' کالے علم' والے اپنی تپسیا ساکت یا نیم رواں پانی میں گھٹنوں تک اتر کر کرتے ہیں۔ طلوع اور غروب کے دونوں سمے ان کے لیے مکمل شدھ ہوتے ہیں۔

رات کے سمے پانیوں کی ہوائیں باہر نکلتی ہیں ۔۔۔ نوری علم والوں کے قریب نہیں پھٹکتیں لیکن ناری اور مافوق العلم والوں کو دکھائی بھی دیتی ہیں اور ابلیسی شکتی بھی ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ دریاؤں کے دور دراز اور ویران کناروں، بیلوں میں سادھوں، سنتوں، درویشوں، فقیروں کے ٹھکانے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ جوگی، چلے اور تپسیا والوں کے لیے بھی محفوظ ترین جگہیں ہوتی ہیں۔ بھوت، پریت، شرشرار، چھلاوے، بھڑاوے بھی ادھر ہوتے ہیں۔ ان مذکورہ جنّات کا تعلق چونکہ ناری قبیلہ سے ہوتا ہے اس لیے یہ کمزور اور کچے علم والوں سے چھیڑ خانی بھی کرتے ہیں۔ جب بڑے بزرگ اپنے بچوں اور نوجوانوں کو وقت بے وقت اکیلے، بن سنور، خوشبو سے مہکا کر، کچے گوشت کے ساتھ ویرانوں، دریا کے پاس، قبرستانوں، شمشان گھاٹ، جنگل بیلوں میں جانے سے منع کرتے ہیں تو یہی خدشہ ہوتا ہے۔

ان جنّات اور شرشرار کا کچے گوشت، خوشبو، سرخ لباس، ساز و سنگیت، خوبصورتی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ایک بار یہ سمجھنے پہ غور کرنا بڑا ضروری ہوتا ہے کہ جن ایک ایسی مخلوق ہے جو شریر بھی ہوتے ہیں اور شریف بھی۔ یہ مومن بھی ہیں اور فاسق و فاجر بھی ۔۔۔ جبکہ ان کے علاوہ جو بھی آسیبی، ہوائی، مافوق حضرات از قسم بھوت، پریت، سنت، چھلاوے، بھڑاوے، ڈائن، پری، شرار، بدروح، اگیا بیتال، نیم مخترے، پرچھاویں، بھٹکے ۔۔۔ یہ اللہ کی مخلوق میں شامل نہیں۔ یہ تمام شیطان رجیم کی برادری ہے۔ انسان کے بُرے اعمال کے بگڑے ہوئے چہرے، سائے اور ہیولے ہیں ۔۔۔ جو قیامت تک بھٹکتے رہیں گے۔ یہ انسانی غلطیوں، کوتاہیوں، بے ڈھنگیوں، اپنے حقیقی مالک و خالق سے بیگانہ رہنے کے شاخسانے ہیں۔ ان سے خوفزدہ ہونا، ان پہ یقین رکھنا، ان کی استعانت طلب کرنا انتہائی بدنصیبی ہے۔ کم عقلی، بے عقلی کی باتیں ہیں۔ مگر کیا کیجیے کہ یہ سب ہمارے ہی اعمال رہا ہے جس طرح ہمارا سایہ ہمارے ساتھ چلتا ہے؟ اس سائے کو ساتھ چلنے سے روکنے کے لیے تاریکی میں سفر اختیار کرنا پڑتا ہے کہ تاریکی میں سایہ ساتھ نہیں ہوتا ۔۔۔ تاریکی اسے نگل لیتی ہے۔ اندھیرا نہ ہو تو اُجالے کا تصور نہیں ابھرتا ۔۔۔ نیگیٹو سے پازیٹو بنتا، پازیٹو سے اصل نیگیٹو نہیں! ۔۔۔ لا کے بعد الا اللہ ہو گے تو بات بنے گی اور سمجھ میں بھی آئے گی۔

بات جاری تھی کہ ان بلیات کا انکار ممکن نہیں ۔ یہ ایسے بدنصیب انسانوں کی بدروحیں ہوتی ہیں جنہیں نہ تو دنیا میں جسم کے اندر پناہ ملتی ہے اور نہ ہی جسم سے آزاد ہو کر آزادی نصیب ہوتی ہے۔ عالم برزخ میں انہیں داخلہ نہیں ملتا ــــ افلاک کی طرف بڑھنے سے انہیں جوتے پڑتے ہیں ــــ قبر میں ان کا پرانا مسکن اب گل سڑ چکا ہوتا ہے ــــ یعنی زمین و آسمان میں کہیں پناہ نہیں ملتی تو تنگ پڑ کر یہ انتقام پر آ جاتی ہیں۔ شمشان گھاٹ، قبرستان، ویرانے، غلاظت و تعفن بھری جگہیں، مذبح خانے، جہاں خون اور غلاظت کے ڈھیر ہوں، ایسے مقام جہاں اخلاق سوز حرکتیں ہوتی ہوں ــــ فسق و فجور کی محافل، قتل و غارت کے میدان، جھوٹ و کذب کے بازار، ایسے دماغ جو ہر وقت انسانیت کی تحقیر ہی سوچتے پہنچتے رہتے ہوں۔؟

ان ناآسودہ روحوں کو جو بھٹکتی، بلاؤں، ڈائنوں، پری، بھوت، جن بنے ہوتے ہیں یہ بھی قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ کوئی بھی انسانی حیوانی صورت و پیکر اختیار کر لیں۔ بکری کا میمنا، سانپ، کوا، کتا ــــ کوئی معصوم خوبصورت سا بچہ، حسین وجمیل دوشیزہ، شیر، الو ــــ یہاں تک کہ کسی مچھر میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وال، بھڑ، آدمی، بادل، کھٹا، کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔ انسانی تاریخ ان شیطانی چکروں، کرتوتوں اور ایسے واقعات کی تائید کرتی نظر آتی ہے کہ کس طرح ان مافوق الفطرت طاقتوں نے خدا کے برگزیدہ بندوں، نبیوں، فقیروں، اولیاء کرام کو بہکانے کی ناکام کوششیں کیں ــــ یعنی ابلیس لعین اور اس کے چیلے چانٹے برابر اپنا کام کرتے رہے۔ اللہ کے بندے اللہ کے کرم و فضل سے ان کے ہتھکنڈوں سے بچتے رہے۔ یہ رحمانی اور شیطانی سلسلے قیامت تک جاری رہیں گے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ابلیس کو روز آخرت تک اجازت دے رکھی ہے۔''

ان بھوت پریت اور بلا ہوائی چیزوں کی پسند ناپسند کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تیز لال آگ، خوبصورتی، خوشبو، ساز و موسیقی، کچے گوشت کو بہت پسند کرتے ہیں۔''

## ● میرے پیر سے شادی جنّی ــــ!

اس حوالے سے مجھے ایک بہت پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ عارف لوہار کے مرحوم والد عالم لوہار سے میری بہت پرانی یاد اللہ تھی۔ اس زمانے سے جب دونوں آتش جوان تھے، میں اور عالم لوہار مرحوم بھی ــــ یاد ہیں نا؟ کوئی کچھ پہن سا نہ ادھر یا ادھر کی بات! عالم لوہار لالہ موسیٰ میں تھے اور میں بھی۔ ملازمت میری کھاریاں کینٹ امریکن آئل کمپنی میں تھی، رہائش لالہ موسیٰ میں۔ وجہ یہ تھی عالم لوہار اور روشن آرا بیگم ادھر رہتے تھے۔ ان

کے علاوہ بالی جٹی بھی تھی۔۔۔ بالی جٹی سے تو میرا کوئی سروکار نہ تھا لیکن روشن آرا بیگم اور عالم لوہار سے قریب قریب ہر روز کا ملنا جلنا تھا۔ روشن آرا کے شوہر کا پہلی بیوی سے ایک بیٹا تھا۔ جس کی مین بازار لالہ موسیٰ میں بجلی کی دکان تھی۔ اس سے دوستی تھی کہ اس کی بدولت ہی روشن آرا تک رسائی حاصل ہوئی تھی۔ عالم مرحوم کا اگر لالہ موسیٰ سے باہر کوئی پروگرام ہوتا تو میں بھی چھٹی کر لیتا یعنی ان کی دکان پہ نہ جاتا۔ ورنہ اکثر عالم سے ہر شام وہیں ملاقات رہتی اور ظاہر ہے جتنی دیر بھی ساتھ رہتے موضوع گیت سنگیت ہی رہتا۔۔۔ یعنی ہماری دوستی سراسر مطلب کی تھی۔ میں ان کی منفرد گائیکی کا دیوانہ وہ میری دو نمبر فقیری درویشی کے دلدادہ۔ اگر کوئی خاص محفل یا کسی یادگار قسم کا پروگرام ہوتا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔۔۔ میں ان کی گائیکی سے لطف اندوز ہوتا اور وہ میری صحبت سے۔ یہ زمانہ عالم لوہار کا ہر لحاظ سے ایک سنہری زمانہ تھا۔ مقبولیت کا یہ عالم کہ جدھر بھی پروگرام کرتا لوگوں کے دل اور دولت لوٹ کر لے آتا۔''

وہ زمانہ تھیٹر کا تھا۔ بڑی بڑی تھیٹر پارٹیاں! پورا پاکستان ان کی زد میں تھا۔۔۔ مگر زیادہ تر مقبولیت پنجاب اور خاص طور پہ آزاد کشمیر میں تھی۔ بالی جٹی اور خود یا تو اس دور کے تھیٹر کی مقبول فنکارائیں تھیں۔ عالم کے اکثر پروگرام ان کے ساتھ ہوتے اور خوب ہوتے تھے۔ مگر اس کے باوجود پروگرام اپنی حیثیت میں بڑے خاص ہوتے کہ مقبولیت داد و تحسین کے علاوہ دولت بھی بوریوں میں آتی تھی۔ میرے اپنے مشاہدے تجربے کے تحت فنکار میں چار خوبیاں ہونی چاہئیں۔ پہلی خوبی یہ کہ فن اسے ودیعت ہوا ہو۔ دوسری خوبی فن کے مظاہرے میں خوبصورتی ہو وہ فن پیش کرتا ہو تو قدرتی اور اچھوتا لگے۔۔۔ تیسری خوبی! وہ اپنے ناظرین سامعین کے موڈ مزاج کے مطابق اپنا فن ڈھالنے اور پیش کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو۔۔۔ چوتھی سب سے اہم خوبی! وہ خوش بخت بھی ہو۔ یہ آخری خوبی اگر کسی فنکار میں نہیں ہے تو وہ اپنے فن کا اظہار دکانوں کی تھڑوں، یار دوستوں کی خوشیوں، چوہدریوں کے ڈیروں، چھوٹے موٹے تھیٹروں، موت کے کنوؤں پہ ہی کرتا رہ جاتا ہے۔ رفیع، مہدی حسن، جگجیت سنگھ، نصرت فتح علی خان، نور جہاں اور لتا کی مانند شہرت، عزت، فن اور دھن کی بلندیوں پہ پہنچ نہیں پاتا۔ میں نے بڑے بڑے سریلے سوز گداز میں بھیگے ہوئے گویئے دیکھے جو قسمت کے ہاتھوں گمنامی اور کسمپرسی کے عالم میں ہی اس جہانِ فانی سے گزر گئے۔۔۔ کہ نہ کوئی خبر چھپی، تعزیتی جلسہ ہوا اور نہ کوئی افسوس صدمہ۔۔۔؟

عالم لوہار میں نہ صرف یہ چاروں خوبیاں موجود تھیں بلکہ کچھ مزید خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ وہ حد درجہ مخلص، اپنی اوقات میں رہنے والا باادب بندہ تھا۔ اللہ والوں، پیروں فقیروں سے بے پناہ عقیدت تھی، بزرگوں بڑوں کے آگے بچھ بچھ جاتا، ہمیشہ سر جھکا کر مدھم سُر میں بات کرتا مگر گاتے سمے اس کی سُر اس طرح

میں جب ان جلسوں میں ہوتے تو بڑی بڑی حسن و فن کی ملکاؤں اور شہزادیوں کے دل زخم ہو جاتے ..... فن اپنی جگہ' گائیکی کا انداز ستھے کی ادائیں سے نکلتا سراپا جب سُروں سے ہم آہنگ ہوتا تو ہزار مصور سا منظر سامنے آ جاتا .... بڑی بڑی نور جہانیں' فریدائیں .... اس ترنم اور رعنائی و زیبائی کے کرشمے کے آگے مجبور ہو کر رہ گئیں۔ استاد امانت علی' استاد اسد امانت علی جیسے شہزادے موسیقار' گویئے پھر کہیں پیدا نہ ہوئے۔ یہ خاندانی گائیک تھے' موسیقی نہ صرف ان کا پیشہ تھا بلکہ شناخت بھی تھی۔ عالم لوہار اور ان میں چند قدریں مشترک تھیں .... عوام و خواص میں دونوں مقبول' وجاہت و رعنائی میں یکتا۔ جنس لطیف کے لیے دونوں میں کشش تھی۔ شہرت اور دولت دونوں پہ عاشق .... مذکورہ بالا تینوں گویوں میں سب سے اہم مشترک قدر ان کی بھرپور جوانی اور شہرت و مقبولیت کے عین سنہری عہد میں اس دار فانی سے کوچ کر جانا تھا۔"

شاید اچھے اور سنہری شخصیت کے حامل لوگ زیادہ زمانہ اپنے چاہنے والوں کے درمیان نہیں رہتے .... یا پھر اللہ تعالیٰ کو بھی یہ اچھے لگتے ہوں یا اس میں کوئی بہتری ہوتی ہے۔ فنکار تو ایک ایسے خود رو' خودسر' خوشبودار' خوبصورت' خوب سیرت' گل تیوری طرح ہوتا ہے جو جنگلی بھی ہے' بے قدری' بے توجہی' بے اعتنائی' بے وفائی برداشت نہیں کر پاتا۔ خوشی سے کوئی خواہش پیدا کیے بغیر مرجھا جاتا ہے کہ فلسفہ تسلیم و رضا' تحمل و برداشت' آداب ادب و حیا اور ظرف والوں سے ان سے بہتر اور کون واقف ہو سکتا ہے .... ؟

عالم لوہار جیسے شریف سیدھے سادے اور معمولی سے پڑھے دیہاتی بندے کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کا سراپا' حسب' گائیکی کے دوران اس کی والہانہ کیفیت' آواز کے زیر و بم کا جادو ایسے جاگتے جادو تھے جو بلا تمیز و تخصیص مرد و زن پیر و جوان خورد و کلاں پرند و بیاں کے سر چڑھ کر بولتے تھے اور تو اور ہر کی ہوائی مخلوق بھوت' پریت بھی ان کی گائیکی دلچسپی سے سنتے تھے۔ ان کا ذکر آگے آئے گا' فی الحال عالم لوہار کی ان پریشانیوں یا کمزوریوں کا ذکر مقصود ہے جن کا میں شاہد ہوں .... ؟

وہ دور .... جس میں گاؤں دیہاتوں میں "پڑ" باندھ کر ساری ساری رات گایا جاتا تھا .... رات بھر ڈھولک رجائے جاتے تھے۔ تب الیکٹرونک کی جدید سہولتیں نہ تھیں۔ موسم کے مطابق مرد و زن سب اکٹھے ہو جاتے تھے .... چارپائیاں' تختے' کھانے پینے کے لوازمات کا انتظام کر کے پروگرام شروع ہو جاتے تھے۔ ساری رات ڈھولک' چمٹے' طوطیاں' باجے' گھنگھرو بجتے اور سامعین و ناظرین محظوظ ہوتے رہتے۔ لڑکیاں بالیاں اور گرد چھتوں پہ براجمان ہوتیں۔ بچے بالے آگے کی صف میں اور ان کے پیچھے ادھیڑ عمر بوڑھے جوان بیٹھ جاتے۔ یہ زمانے نفسا نفسی کے نہیں تھے' مل جل کر رہنے والے لوگ' پیار و محبت اور اعتبار کرنے والے انسان .... موقع بہ موقع' کہیں نہ کہیں مل بیٹھنے کے بہانے تلاش کر لیتے۔ میلے' عرس' کبڈیاں' دنگل' جانوروں کے مقابلے' کتوں

بیلوں گھوڑوں کے مقابلے — زندہ و خوشحال معاشرے کی ہی نشانیاں ہوتی ہیں کہ وہ اپنی ثقافت تفریحات کو زندہ رکھتا ہے!

تھیٹر اور کھیل تماشے چلتے پھرتے مداری، نقالوں کے وائس، بھانڈوں، مسخروں، بہروپیوں کے کھیل ہماری ثقافت کے اہم جزو ہوتے تھے۔ ان ثقافتی تفریحی سرگرمیوں کی اصل جان ہمارے یہ عوامی فنکار ہوا کرتے تھے۔ جو بارہ مہینے ادھر سے ادھر پورے ملک میں مصروف رہتے۔

عالم لوہار کی بات ہو رہی تھی کہ بہت اچھا انسان اور فنکار تھا۔ ہر انسان پہلے انسان ہوتا ہے پھر وہ فنکار یا جو بھی اس کا پیشہ ہو۔ انسان کی بشری کمزوریاں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہیں یا وقت حالات کے تحت کچھ پیدا بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کے فن اور شخصیت کی ایک بشری خاصیت یہ تھی کہ جنس مخالف بڑی متاثر ہوتی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ عالم لوہار کہیں اپنا پروگرام کر کے آیا ہو اور کوئی عورت یا عورتیں اس پہ ریجھ نہ گئی ہوں۔ اس کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کئی عورتیں اس کی دیوانی ہو چکی ہیں۔ کئی عورتوں کے تھوڑے وقت کے ساتھ نکل جاتے اور کوئی ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ جاتی۔ اس کو خبر تب ہوتی جب وہ اس کے پیچھے پیچھے گھر تک جاتی یا پیغام بھیج دیتی۔ یہ شریف آدمی جو اس قماش کا نہ تھا ایسی صورتحال سے بوکھلا جاتا۔ نپٹنے کی کوشش کرتا کہ کام تو وہ چھوڑ نہیں سکتا تھا کہ اس کا ذریعہ معاش تھا — جتنی احتیاط برتتا اتنا ہی "گرو" مشہور ہو جاتا۔ جب دو چار عورتوں نے انتہائی قدم اٹھائے تو اس کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ مزید احتیاط کا مطلب یہ تھا کہ گانا اور چلنا پھرنا چھوڑ دے جو ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے اوپر کئی نکاح کرنے پڑے — یہی حال امانت علی خان اسد امانت کا بھی رہا — لال محمد اقبال نیازی کا بھی یہی حال ہوا — یہ تو بہت بہتر ہوا کہ ان فنکاروں کے لالچ انسان برادری میں ہوئے اگر انسانوں سے باہر جن بھوتوں کی برادری میں ہوتے تو پھر کیا ہوتا —؟

آزاد کشمیر کے شمال مشرق کے ایک خوشحال سے گاؤں میں کسی صاحب حیثیت چوہدری صاحب کی دعوت پہ عالم صاحب وہاں چلے گئے۔ یہ تمام پہاڑی علاقے اپنی جغرافیائی اور ارضی ماہیت و معروفت کے حساب سے کچھ خاص اثرات کے حامل ہیں۔ ادھر انسانوں سے زیادہ ایسی مخلوقات اور ہوائی عنصرات کی موجودگی ہے جو انسانوں کے لیے پراسرار اور پر خطر سمجھے جاتے ہیں۔ جنات شرشرار تخیل چھلاوے پچھل پیریں وغیرہ ادھر کے باشندوں کا ان سے واسطہ بھی پڑتا رہتا ہے۔ شمال مشرق کے پہاڑی علاقوں میں ان کی موجودگی قدرتی امر ہے جبکہ ادھر کے زیادہ تر لوگ توہم پرست اور ان پڑھ واقع ہوئے ہیں۔

عالم لوہار کا پنڈ ایک وسیع میدان میں سجا ہوا تھا۔ ارد گرد کے علاقوں کے لوگ بھی جمع تھے۔ عالم اس کی اشرفیوں کی محتاج آواز فن اور اس کی شہرت نے یہ چاروں اپنے اپنے جوبن پہ تھے۔ عالم جگنی گا رہا تھا۔ نے

ٹکیوں اور جھٹکتے چمٹے اور کڑے کی کڑ کڑ اور سامعین و حاضرین کی داد و تحسین نے ایک فسوں خیز سماں باندھا ہوا
تھا۔ دور اوپر آسمان پہ جھلملاتے ستارے، چیڑوں سے چھیڑ خانی کرتی ہوئی پُروائی اور شب دیدہ پرندوں
ٹٹیریوں کی قلقاریوں سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ سب مست و مگن ہیں۔ اچانک ایک چھناکا ہوا اور چمٹا خاموش
ہو گیا، جیسے زبردستی کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔ "کیا ہوا کسی کو خبر نہ تھی؟ ٹکیوں والا ٹکیوں پہ منہ رکھ
مست ... عالم گاتے گاتے ایک دم رُک گیا تھا جیسے ابرِ جھڑی رک گیا ہو۔ چند ثانیے تو کسی کی سمجھ میں کچھ
نہ آیا۔ سب لوگ اس نوجوان کا منہ دیکھ رہے تھے۔ پنڈال میں بھی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ مٹی کے تیل
والے ہنڈولوں کی روشنی ایک دم تیز ہوگئی۔ عالم عالم حیرت میں اپنے چمٹے کو دیکھنے لگا جو درمیان سے ٹیڑھا ہو
چکا تھا۔ ایسے جیسے کسی نے چمٹے کو گھٹنے پہ رکھ کر دونوں اطراف سے دبا کر ٹیڑھا کر دیا ہو۔ یہ کیسے ہوا؟ ... مگر ہو
چکا تھا۔ پکے لوہے کا مضبوط چمٹا جو ایک خاص طریقے صرف بجانے کی خاطر بنایا گیا ہو وہ بھی اپنی دھن کی دوکان
پہ ... بجاتے بجاتے اچانک ٹیڑھا ہو کر انگریزی کا "ایل" بن گیا، کیونکر ممکن ہے؟ جب چمٹا کسی سے بھی
نہ بڑا تو دوسرا چمٹا لایا گیا۔ پروگرام دوبارہ شروع ہوا۔ ابھی سنگت کا تال میل بھی نہ ہوا کہ یہ نیا چمٹا بھی پہلے
کی طرح ٹیڑھا ہو گیا اور ساتھ ہی ہنڈولوں کی روشنی بھی ڈوب گئی۔ بزم جم گئی اور لوگ پنڈال سے اٹھنا
شروع ہو گئے۔ ستاروں کی روشنی میں عالم ٹیڑھے چمٹے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ بھلا اس بھولے بھالے فنکار
کو چمٹے میں کیا دکھائی دیتا۔ یہ کام تو نہ دکھائی دینے والی ذوات خفیہ کا تھا۔ قصہ مختصر پروگرام ختم ہو گیا۔ سامعین
کو ایک نیا شوشہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ آپس میں کانا پھوسی کرتے ہوئے سب تتر بتر ہو گئے ..."

عالم لوہار اور ساتھیوں کے قیام و طعام کا انتظام پاس ہی ایک ڈیرے پہ تھا۔ ایک دو پاڑیاں چھوڑ کر
نوکیلے پتھروں سے بنا ہوا ایک مناسب سا کمرہ۔ ادھر پہاڑی علاقوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ باورچی خانہ اور
بیت الخلا کا تکلف نہیں ہوتا۔ رفع حاجت کے لیے آس پاس کے جھاڑی جھنڈ کہیں بھی کوئی آڑ اوٹ ... کھلا
ماحول ہر جانب فطرت کی فراوانی، کشادگی، ہمہ نوع اشجار اور پتھر پہاڑ، کہسار ... لگتا ہے انسان اللہ میاں کی
گود میں بیٹھا ہے ...؟

عالم صاحب چپ چاپ ایک کھاٹ پہ بیٹھے چمٹوں کو سامنے رکھے غور کر رہے تھے کہ آج یہ چمٹوں کو
کیا ہوا ہے۔ کچھ حسرت سے اپنے میزبان سے کہنے لگے ...!

"چوہدری صاحب! یہ چمٹوں کے ٹیڑھے ہونے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آج تک ایسا کبھی نہیں
ہوا کہ بجاتے بجاتے چمٹا ٹیڑھا ہو کے مڑ گیا ہو۔ یہ سیاہی لوہے کا بنا ہوا ہے کوئی ربڑ یا پلاسٹک نہیں ...؟"

چوہدری تو چوہدری ہوتے ہیں کوئی سائنسدان فلاسفر نہیں۔ ویسے بھی سادے ان پڑھ اکثر پہاڑی

"ماننے والا" تھے مرشد کا بولا۔ "گرم سرد چشیدہ..." اسے وہم ہو گیا کہ چیخنے تو نیچے تھے ہوئے سو وہ ہوئے کہیں اس کی آواز بھی نیچی نہ ہو جائے۔ وہ بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ بس ایک ڈر سا اس کے اندر بیٹھ گیا تھا..."

کسی مولوی نے مشورہ دیا کہ تم بیرے شاہ غازی کی جگی ادھر جا کر کا؟ جب عرا اس سمجھنے کی زیارت ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ ہوائی چیزیں مسلمان اور جنّی ہیں۔ اگر یہ بات ہوتا تو وہ بیرے شاہ غازی کی جگی بننے پر اصرار نہ کرتے۔ جتنے منہ اتنی باتیں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پکی تھی کہ مسلسل تین روز سے عالم نے نہ تو "ہوں ہاں" کے علاوہ کوئی بات کی۔ ہر وقت نیچے سے چیخوں کو دیکھتا رہتا۔ بس اب اسے فکر اپنی آواز کی تھی جو اس کا سرمایہ شوق اور حاصل حیات تھی۔"

وہ زمانہ ٹیلیفون کا نہ تھا۔ ٹیلیفون دفتروں، پولیس، ریلوے اسٹیشن پہ ہوا کرتے تھے یا پھر افسر یا امیر کبیر شخص کے پاس... آزاد کشمیر خصوصاً دور دراز پہاڑی علاقوں میں ان کا تصور تک نہ تھا اور جن وقتوں کا یہ واقعہ ہے اس وقت عالم کے پاس ریڈیو کی سہولت بھی نہ ہوا کرتی تھی۔ موبائل بہت بعد آئی جس کے ہیجیر پارٹ میں اسے سیالکوٹ اپنے چچا حسن خان سے لے کر دیا کرتا تھا۔"

پانچویں روز بخار کا کچھ زور ٹوٹا... سنگت کے ساتھی یہاں بڑے تنگ پڑ چکے تھے۔ پیچھے بال بچے یاد آ رہے تھے... وہ بے الفاظ میں واپس جانے کے اشارے دے رہے تھے۔ ادھر میزبان بھی یہی چاہتے تھے یہ لوگ ادھر سے نکلیں، شاید ادھر سے جانے سے بھوتوں کے اثرات سے چھٹکارا مل جائے؟

آخر ایک چمکتی ہوئی صبح یہ لوگ کچھ مقامی کی مدد سے نیچے بڑی سڑک تک پہنچے جدھر سے کسی بس گاڑی کے ذریعے میرپور تک پہنچا جا سکتا تھا۔ چھٹے ساتویں روز واپس گھر پہنچے تو عالم کی حالت دیکھ کر گھر والے بڑے پریشان ہوئے اور جب پورا واقعہ سنا اور نیچے سے چیخنے دیکھے تو گھبرا کر ادھر ادھر کے عامل وہ بلا اکٹھے کر لیے۔ جنہوں نے عالم کی رہی سہی حالت بھی بگاڑ کر رکھ دی۔"

عالم کے واپس پہنچنے کی خبر مجھے ادھر کھاریاں ورکشاپ میں ہی مل چکی تھی۔ مجھے کیا پتہ کہ اس پہ ادھر کیا بیت چکی تھی اور نہ ہی اتنے دن کوئی رابطے کی شکل بنی تھی۔ شام لالہ موسیٰ پہنچتے ہی میں اپنے ڈیرے پہ پہنچنے کی بجائے چوہدری صاحب (روشن آرا کے سوتیلے بیٹے) کی دکان پہ پہنچا اور انہیں ساتھ لے کر عالم کے پاس پہنچے۔ وہ بے حد خستہ حال اور چپ چپ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چہک مہک جو ہماری ملاقاتوں کی پہچان تھی غائب دکھائی دی۔ میں نے اسے آہستہ آہستہ ٹٹولا۔ اس نے گریبان ہٹا کر مجھے گلے میں پڑے ہوئے وہ تین تعویذ دکھائے اور پاس میز پہ پڑا ہوا تانبے کا پیالہ دکھایا جس میں آیت الکرسی کندہ تھی اور پانی بھرا ہوا تھا۔ میں کچھ کچھ تو سمجھ گیا لیکن اصل واقعہ ابھی تک اوجھل تھا۔ ایسے میں ایک عامل قسم کے بزرگ بھی پہنچ گئے۔ آتے ہی

انہوں نے بڑی زوردار پھونک پھونکی اور مزید ایک بڑا سا تعویذ اس کے گلے میں ڈال دیا۔ پرہیز کے طور پر تاکید کی کہ دو وہ بات چیت سے اجتناب کیا جائے۔ گانا وغیرہ تو بالکل ہی نہیں گانا اور میری جانب عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے مکرر تاکید کی کہ کسی ایسے شخص سے تو ہرگز نہ ملا جائے جو کانوں پاس پہنتا ہو۔ بال لمبے اور انگوٹھیاں مختلف استعمال کرتا ہو۔'' یہ عامل صاحب نقشبندی سلسلے کے کوئی بزرگ تھے۔ ان کا کہنا سر آنکھوں پر رکھا۔ میں نے چوہدری صاحب کو اشارہ کیا ........ اٹھو بھائی ہم چلتے ہیں ........ جانے لگے تو عالم بولے۔

''بابا جی! آپ تشریف رکھیں ........ اتنے دن آپ کو بڑی یاد کرتا رہا۔ آپ کو دیکھ لیا آپ آ گئے مجھے بھی حوصلہ مل گیا۔''

وہ بزرگ اٹھے اور آگے بڑھ کر عالم کے گلے سے تعویذ اتارا اور لاحول ولا قوۃ پڑھتے ہوئے تشریف لے گئے ........ اور واقعی دو تین روز میں عالم تندرست ہو گئے۔ میں نے کام سے چھٹیاں لے لی تھیں ........ شام کو دوکان بڑھا کر چوہدری صاحب بھی ادھر آ جاتے ........ خوب کھانا پینا اور گپ بازی ہوتی ........ لیکن عالم کو گانا اور چمٹے کو ہاتھ لگانا موقوف تھا۔ باہر کے پروگرام بھی بند ........ گھر آرام اور ایک اہتمام یہ کیا کہ عامل مولوی حضرات جو جن سایہ بھوت کے علاوہ کوئی اور بات ہی نہیں کرتے سختی سے ان کا داخلہ ممنوع کر دیا۔ ہر دوسرے روز روشن آرا بیگم کی بیٹھک میں ان کا ریاض شروع ہو جاتے ........ بس!

تیز سے چمٹے کی رنجھیں لگن ہی عالم سے چھٹے ہوئے تھے۔ ہماری کوشش ہوتی کہ کسی طرح اس کا دھیان ادھر نہ جائے۔ پر کیا کیجئے کہ چمٹے کے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہی اس کا آہنی ساز تھا جس کے بغیر اس کی اور اس کی گائیکی کی پہچان مشکل ہوتی ہے۔ کیا خوبصورت بات ہے کہ لوہار کا ساز بھی لوہا ہے۔ جو دو حوالوں سے حضرت داؤد علیہ السلام سے جڑتا ہے۔ لحن داؤدی اور آہن داؤدی ........ ایسی مثال کا حامل دنیا میں کوئی فنکار ہو ہی نہیں سکتا۔

عالم خدا داد گانے والا ہرگز نہیں وہ عطائی ہے اور لوہار ہے؟

اے لو میں ہاری پیا ہوئی تیری جیت رے

کاہے کا جھگڑا بالم نئی نئی پریت رے

دیکھئے اپنی ذات کی نفی کا کیا انداز ہے ........ ''ہار'' جو مزہ ہار میں ہے وہ جیت میں کہاں ........؟

آدھا عشرہ والا سموئی میں ہم تینوں درویشوں کا انہی دنوں پہ بیٹھے گزر گیا ........ اگلے روز نوچندی جمعرات تھی۔ میں نے تیاریاں اپنی ورکشاپ سے ڈبل کیبن شیورلیٹ کا انتظام کیا ........ شام تک ہم سات نفر عالم، روشن آرا کا بیٹا، میں اور دو ٹلیوں والے، ایک ملازم، دونوں تیز سے چمٹے آزاد کشمیر کے اس پہاڑی گاؤں

(بوجوہ گاؤں کا نام نہیں لکھا) پہنچ گئے۔ جلیبیوں، لڈو، اندرسوں کی ٹوکریاں اور آٹھ دس بکروں کا پکا گوشت، جو ہم نے دریائے چناب کے ملاحوں کے ذریعہ حاصل کیا تھا، ہمارے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر پہلے تمام وضو کیا۔ جب وضو سے فارغ ہو کر نماز پڑھی اور چند لڑکوں کو لے کر اس میدان کو صاف کروایا۔ چٹائیاں بچھوائیں، اگربتیاں سلگائیں، کچھ پھولوں پتوں کا انتظام کر کے رات پڑنے کا انتظار کرنے لگے۔"

گاؤں کے سادہ معصوم لوگ ہماری اچانک آمد سے گھبرا سے گئے کہ پھر کوئی جنّوں والی بات ہونے والی ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ہمارے اس علاقے میں صدیوں سے کچھ ہوائی ہستیاں رہتی ہیں، وہ ہمیں تو دیکھتی ہیں مگر ہم انہیں اصلی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ہمیں کبھی کسی پرندے، چرندے اور کبھی کسی جانور کے روپ میں دکھائی دے جاتے ہیں۔ ان کا مقصد ہمیں خوف زدہ کرنا یا نقصان پہنچانا نہیں ہوتا صرف اپنی موجودگی کا احساس دلانا ہوتا ہے تاکہ ہم ان کے معمولات میں دخیل نہ ہوں۔ میں نے انہیں مزید بتایا کہ ان ہوائی چیزوں میں اچھی بھی ہوتی ہیں اور شرارتی بھی۔ ہمارے اس علاقے میں شرارتی شرشرار بھی ہیں مگر لیکن وہ بھی اس وقت تک ہمیں نقصان نہیں پہنچاتے جب تک ہم انہیں نہ چھیڑیں۔ پھر میں نے مثال دیتے ہوئے بتایا۔ اسی میدان میں عالم صاحب جنّی سنا رہے تھے۔ آپ سب مزے سے بیٹھے سن رہے تھے۔ آپ حیران ہوں گے کہ آپ انسانوں سے کہیں زیادہ تعداد میں ہستیاں اس جگہ اور آس پاس موجود تھیں۔ وہ تو آپ سب کے ساتھ شامل تھیں جبکہ ان کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ عالم صاحب نے جنّی شروع کی اس میں کچھ بزرگوں کا نام بھی شامل کیے مگر ان سے چوک ہو گئی کہ انہوں نے سرکار پیر شاہ غازی کا نام شامل نہ کیا۔ یہاں مقیم تمام وہ ہستیاں ان سے عقیدت رکھتی ہیں، انہیں یہ بات اچھی نہ لگی جائے کہ وہ عالم صاحب کو کوئی سزا دیتے۔ انہوں نے مہربانی کی، اپنا غصہ جنّوں پر نکالا۔ آپ لوگوں کو ایک اور عجیب بات بھی بتاؤں۔ یہ بیج سے پتنگے کی انسان سے سیدھے ہو کر واپس اپنی اصل حالت پر نہیں آ سکتے۔"

"ایک دفعہ عالم صاحب نے کہا تھا۔ "لو بازتے فوریجان اپنی غر جھے تک دیوان ہاتھوں انہاں دے بغیر کوئی ہور نہیں اتار سکدا"۔۔۔ اسی طرح ان جنّوں کو جن ہستیوں نے بیج بنا دیا اب سیدھا کرنے کی طاقت بھی انہی کے پاس ہے۔ آج ہم اپنی غلطی کی معافی لینے ادھر دوبارہ آئے ہیں۔۔۔ ان ہستیوں کو وہی کھلائیں گے جو وہ پسند کریں گی۔ ہم ان کے لیے کچھ تحفے بھی لے کر آئے ہیں۔ یہ تحفے اور چیزے ہمیں پڑے ہیں، ہمیں یقین ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔ ہمارے لائے ہوئے تحفوں کو شرفِ قبولیت بخش کر جنّوں کی خطا بھی معاف کر دی جائے تاکہ ہم سیدھے جنّوں کے ساتھ جنّی سنا سکیں۔۔۔؟

اگربتیاں سلگا کر مٹھائیاں، بکروں کا گوشت، خوشبو اور بیج سے چپٹے دری پر رکھ کر ہم سب مسجد کی

رکھتے۔ ان کی دعوتیں کرتے، خدمت عزت کرنے میں پیش پیش رہتے۔ اصلی عرس کی تقریبات تو تین دن ہوتیں باقی میلہ آٹھ دس روز تک چلتا رہتا۔ موت کے کنویں، گھوڑوں والے، جادو کے تماشے، سرکس والے دوکاندار خوب نمایاں کرتے۔ پھر آہستہ آہستہ جاڑا، دھڑکی شروع ہوتی۔"

گلابی موسم، سردی نہ گرمی ...... آدھی رات، چاندنی چھٹی ہوئی ...... عالم لوبان تہبند اور بنیان پہنے اپنی پھولداری میں محو استراحت تھا۔ اس کی چھوٹی سی پھولداری دوسرے خیموں سے کافی ہٹ کے نصب تھی۔ کھری کھاٹ پہ لیٹا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ قریب قریب سب ہی گانے والوں میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے کہ وہ گہری نیند میں جب بھی خراٹے لیتے ہیں ...... ایسے خوفناک زیر و بم لیے ہوئے خراٹے ...... لگتا ہے میاں تان سین عالم تصور میں راگ میگھ ملہار کے الاپ رہا ہے۔ تھوڑا موسیقی کی شدھ بدھ رکھنے والا اگر رات کو ان کے آس پاس رات کرنے پہ مجبور ہے تو وہ بالکل سو نہیں سکتا۔ بیچارہ کانوں میں روئی کپڑا ٹھونس کر رات گزارے گا یا سر پہ کہیں جنگل کی جانب نکل لے گا۔"

کسی کی قسمتوں سے جان چھڑانی ہو تو مسلسل کئی راتوں تک کسی قسم کی شوگر دکھائی جائے تو آئے ہلکا ہو جائے گی۔ یعنی یوں سمجھیں، حکیم، چیچک، پھوڑوں بیماری وغیرہ سے پرہیز کروائی ہو تو اس کو ان خرابیوں کی تیاری کے حسین دکھا دیے جائیں۔ اداکاروں کے قیمہ کا ذکر تو تھا ہو تو میک اپ اور سرخی پاؤڈر کے بغیر ان کی زیارت کروا دی جائے۔ کسی گلوکار کی گلوکاری کا عشق جو ختم ہو تو اس کے دیوانے کو گانے والے کی خواب گاہ کے قریب چارپائی پہ ہمدم کر الٹا دیا جائے۔ پھر دیکھیں گلوکار کے خراٹے کیا کمال دکھاتے ہیں ......؟

نور جہاں، فریدہ خانم، نصرت فتح علی خان، رفیع، امانت علی، مہدی حسن، پرویز مہدی، فتح علی خان، جگجیت سنگھ، غلام علی اور اقبال بانو یہ وہ گلوکار ہیں جن کا میں ذاتی طور پہ شاہد ہوں۔ باقی بھی گلوکار اور کلاسیکل فنکار یقیناً ایسے ہی ہوں گے کہ مجھے ان کی خواب گاہوں کے نزدیک بھی شب خیزی یا شب بسری نصیب نہیں ہوئی ......"

ہوتا یوں ہے کہ ان گلوکاروں نے ریاضت کر کر کے اپنے گلے کے پٹھوں، رگوں اور وریدوں کو اتنا لچکدار، نرم اور لچیلا کر لیا ہوتا ہے کہ سوتے سمے سانس لیتے کھینچتے ہوئے یہ ابھر کر بجنے لگتی ہیں۔ اس دوران جب یہ حلقوم کے کوے کے ساتھ رگڑ کھاتی ہیں تو بے سری، بے ہنگم، دل دہلا دینے والی گڑگڑاہٹ، چھڑچھڑاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ کبھی توپ داغنے کی گھن گرج، کبھی چارپائی گھسیٹنے کی کسمساہٹ، روئی دھننے کی تھنتھناہٹ، سوئے کی بوتل کھولنے کی آواز ...... کوے کے گلے میں اٹک جانے کی کرکراہٹ ...... پرانے کھنڈر کے چرچرانے کی چرچر ...... دیہاتی کولہو چلنے کی گھرر ......!

***

اس دوران میں دیکھ رہا تھا کہ کھوکھا روں والے لوگ بھی ادھر چارپائیوں پہ بیٹھے ہیں۔ ظاہر ہے وہ بھی ہماری طرح ادھر کڑاہی گوشت ہی کھانے آئے ہوں گے۔ چارپائیوں کے بڑے گدے سے ٹیک اور بیٹھنے کے لیے سرہانوں کے موڑے بھی پڑے تھے۔ الموتم کے ڈھکے ہوئے بلب اور گلاس بلبلی مدھم سی روشنی     یوں لگتا تھا پورا اصرف اپنے منفرد کڑاہی گوشت کی بدولت ہی مشہور ہے ورنہ اور کوئی بات اس لائق نہیں کہ شہر کے اچھے اچھے صاف ستھرے اور نزدیک ریسٹورنٹ چھوڑ کر ادھر گھپ اندھیرے ویرانے میں کھایا جائے۔ جدھر گوبر، کیچڑ اور چھوا اور بھی بو باس ناک سونگھ رہی ہوں؟

میرا دوست ادھر ملک کے پاس ہی کھڑا سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا اور ملک کو بھی پلا رہا تھا۔ لپکتے شعلوں، اڑتی چنگاریوں، دھوئیں کے دھندلے رنگوں اور بھنتے گوشت کی مہک نے ایک الگ سا ماحول پیدا کیا ہوا تھا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ایک دو مجہول سے ملنگ نما ادھر ادھر سے نکل آئے اور میزوں موڑوں کو ادھر ادھر کھسکا کر گندی سی پلیٹیں اور بڑے ملک کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بڑا ملک المونیم کی کڑاہیوں میں گوشت بھر رہا تھا۔ تنوری گرم گرم روٹیاں ایک گندی سی چنگیر میں ہمارے سامنے تھیں۔

پاکی پلیدی، اچھائی برائی، نیکی بدی کا تصور اسلام نے ہمیں دیا۔ انسان اگر اپنے ارد گرد نظر ڈالے اور وسیع النظری سے فطرت، کائنات اور زندگی کے بنیادی اصولوں طریقوں کو دیکھے تو پتا چلتا ہے کہ ہر چیز مخلوقات کی خاطر اور اس کی آسانی کے لیے پیدا کی گئی۔ ایک چیز ایک جاندار کے لیے پسندیدہ، پاک اور عزیز ہے۔ وہی دوسرے کے لیے ناپسندیدہ، پلید اور بدذائقہ ہے۔ انسان ہر چیز میں نفاست، خوبصورتی، ذائقہ اور قرینہ سلیقہ تلاش کرتا ہے نہ ہو تو پیدا کر لیتا ہے۔ فطرت بھی یہی تو کرتی ہے مگر اس کے انداز جداگانہ ہیں۔ ایک طرف سے پاک و صاف داخل ہوتا ہے دوسری طرف سے پلید اور گندہ خارج ہوتا ہے پھر وہی ایک دوسرے چکر میں پاک ہو جاتا ہے۔ "کالا چٹا اور چٹا پھر کالا"     یہی تغیر و تبدل، رد و بدل کائنات کا بنیادی اصول ہے۔" زمانہ اور وقت نہیں بدلتا، مخلوق کے زاویے، انداز اور سوچ تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلی حالات، ضروریات اور کا تناقض گروہوں کا فطری ردعمل ہوتا ہے۔ زندگی میں جو کچھ بھی ہے ایک دوسرے کی ضرورت کے تحت ہے۔ زندگی اپنے اور دوسروں کے لیے آسانیاں فراہم کرنے اور ایک جہدِ مسلسل کا نام ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے محنت کوئی کرتا ہے اور پھل کسی اور کو مل جاتا ہے۔ گنہگار بخشا جاتا ہے نیکوکار پکڑا جاتا ہے۔ مالک کے رنگ نرالے ہیں۔ زندگی کسی دیوانے کا خواب ہے۔ کسی کے لیے جنت کسی کے لیے عذاب ہے!

بسم اللہ کر کے کھانا شروع کیا۔ ایک ادھ لقمہ لینے کے بعد میں نے محض بات برائے بات پوچھا۔

"یار! بھلا یہ دراوی دریا کی سوغات کیا ہے؟"

وہ ایک اچھی سی بوٹی میری جانب سرکاتے ہوئے بولا۔

”راوی کی سوغات تھیلے ہیں۔“

”اچھا تو یہ تھیلے کیوں نہیں پکاتا ...؟“

”شاید تھیلوں کا موسم نہیں، ویسے یہاں کی خاص ڈش بھی کڑاہی گوشت ہے ... یہاں بڑی بڑی دور سے خاص لوگ کھانے آتے ہیں۔“

”تمہارے علم میں شاید ہو کہ راوی کی سوغات میں تھیلوں کے علاوہ کچھوے بھی ہیں جنہیں ہم پنجابی میں کچھوے کہتے ہیں۔ ویسے تو یہ ہر دریا میں ہوتے ہیں لیکن راوی کے کچھوئے اور ان کے انڈے خاص طور پر مشہور ہیں کہ ان کی بدولت لاہور والوں کو گوشت انڈوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کڑاہی، پالتی، لوتا گوشت اور ورثی یہ سب اکثر کاروبار اسی کی بدولت رواں دواں ہیں ورنہ یہ چھوٹے موٹے لیلے بکرے وغیرہ تو شادی ملے بھاٹی دروازے کے لاہوریوں کے لیے بھی کافی نہیں۔“

وہ کھاتے کھاتے رک گیا۔ میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

”اطمینان اور پیٹ بھر کر کھاؤ ... جیسے میں کھا رہا ہوں۔ یہ اردگرد دوسرے لوگ بھی کھا رہے ہیں۔ کچھوئے کا گوشت خواہ زہر مار یا گدھے کھوتے کے گوشت سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے کہ حرام نہیں بس ذرا سا مکروہ ہے۔ جیسے یہ جو تم نسوار، بازی اور دو دو چسکتے ہو جو صرف مکروہ ہے اور حرام ہے۔“

اب کہاں کا کڑاہی گوشت؟ وہ کھانے سے ہاتھ کھینچ چکا تھا اور میں نے حسب عادت لچھے پا کر کڑاہی صاف کی ...

زمانہ ہو گیا ... اس آخری ”دعوت کچھوا“ کے بعد وہ پھر کبھی مجھ سے نہیں ملا۔ اس کے چند ایک دوستوں سے پتا چلا وہ سوائے وزنی شراب نوشی یہاں تک کہ ہر قسم کی گوشت خوری سے بھی تائب ہو چکا ہے۔ کچھوے کا یہی مجھ پر ایک بڑا احسان ہے۔“

## ● پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے ...؟

جب کسی راز اسرار یا علم کے منکشف ہونے کے اسباب پیدا ہوتے ہیں تو اس کے پس پردہ قدرت کی مصلحتیں ہوتی ہیں جنہیں انسان فی الفور سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ میرے ساتھ روز و شب یہی تماشے لگے رہتے ہیں خود بخود کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تو سوچنا ہی چھوڑ دیا ہوا ہے کہ یہ سیاپے مجھ سے نہیں

ملنگ بابا نے بتایا۔ "یہ گھر ہزاروں پرندوں جانوروں کے آشیانے ہیں۔ اژدھے، سانپ، چمگادڑیں، طوطے، شکرے، گلہریاں، نیولے اور بھی کئی کیڑے مکوڑے ۔۔۔ اسی طرح بوڑھ کے نیچے بھی کئی جانور ۔۔۔ جن میں ہم ملنگ بھی شامل ہیں۔ حکومتوں ملکوں کی طرح یہاں بھی ایک سلطنت قائم ہے۔ وہ ہے بوڑھ بابا کی سلطنت! ہم سب اُن کی رعایا کے طور پہ رہتے ہیں مگر مکمل آزادی کے ساتھ ۔۔۔ جو چاہے ادھر آئے رہے، جو چاہے یہاں سے چلا جائے۔ آنے جانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ۔۔۔ یہاں کسی کا قانون نہیں چلتا! کوئی سزا اور جزا نہیں ۔۔۔ تم ادھر اپنی مرضی اور ضرورت کے تحت آئے ہو۔ جب تمہارا دل چاہے جاسکتے ہو۔ جب تک ادھر ہو بوڑھ بابا کے مہمان ہو ۔۔۔ یہاں مہمان جانور پرندے اور ملنگ سب گولے (پھلوا) کا گوشت کھاتے ہیں۔ جو ادھر والی مٹی اور والی ایک بوٹیاں اگواتی ہیں۔"

میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"یہ گولے کا ماس ہی کھانا کیا ضروری ہے اور جانوروں کے گوشت بھی ہیں جو ساری دنیا کھاتی ہے ۔۔۔؟"

"ہاں وہ دنیا والے لوگ ہیں، ہم فقیروں ملنگوں کے لیے یہی ماس ہے، جو ہماری خوراک کی ساری ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ جب تک کسی کی تپیا نہ ہو، نہیں چکھا اور کھانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ ماس ہمارے اندر لوبھ وانا سنحوال نہیں بلکہ شوق، گن اور عشق پیدا کرتا ہے ۔۔۔؟"

وہ میرے پاس سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"جس کام سے لیے آؤ، کرو، پانی کرو، مجھے کوئی پوچھنے ٹوکنے والا نہیں۔ کھانے پینے کا بھی تمہیں پتا چل گیا ہے۔ جس طرح ادھر آنے کے لیے تمہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں تھی، اسی طرح ادھر سے جانے کے لیے بھی کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں ۔۔۔!" وہ بوڑھ کے بڑے تنے تک تو جاتا دکھائی دیا، پھر وہ جیسے اس کا کوئی حصہ بن کر کہیں غائب ہوگیا۔"

کہتے ہیں کہ کوئلے کی کان میں کام کرنے والے بھی ایک وقت کوئلے کی طرح ہو جاتے ہیں۔ دریا میں رہتے رہتے ملاح بھی پانی کی کسی لہر موج کی مانند دکھائی دینے لگتے ہیں۔ رانجھا رانجھا کہتے کہتے ہیر بھی رانجھا بن جاتی ہے۔ گوتم بدھ جو دو برس جنگل میں سمادھی جمائے بیٹھا رہا اور خود بھی جنگل کے ایک پیڑ کی طرح ہو گیا ۔۔۔ جسم سوکھ کر کاٹھ بن گیا تھا اور سر داڑھی کے بالوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔ آنکھوں اور دل کے علاوہ باقی سب خشک ہو کر پاتھر ہو گیا۔ کیا عجب کہ یہ بوڑھ بابا بھی بوڑھ کا حصہ بن چکا ہو ۔۔۔ یا خود ہی بوڑھ تھا ۔۔۔!

فینش ناگ کی بابت کہتے ہیں کہ سو برس بعد اپنی جون بدلنے پہ قادر ہو جاتا ہے۔ "کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک" مگر یہ سو سال بارہ سو مہینے اور تقریباً چھتیس ہزار دن تو جانوروں، سانپوں اور انسانوں کے ہیں۔ فقیر، درویشوں کے لیے تو وقت اور زمانے کی اکائیاں مختلف ہوتی ہیں کہ وہ خود، وہ نہیں ہوتے جنہیں کوئی نام یا کام دیا جائے۔ ناں کا کوئی نام نہیں ہوتا' ترقی کرنے والا اپنے ظاہر سے بہت پرے باطن کے سفر میں ہوتا ہے۔"

ملنگ بابا تو دیکھتے دیکھتے یوں غائب ہوئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ ادھر جو دو چار ملنگ ادھر کھڑ پڑوں کا دھڑن تختہ کر رہے تھے وہ یوں بے نیاز اور لاتعلق سے دکھائی دے رہے تھے جیسے میرا وجود ان کے لیے نہ ہونے کے برابر ہو۔ پوری توجہ اور دل جمعی سے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے جیسے اسی کام کے لیے وہ دنیا میں زندہ ہیں اسی میں ان کی مکتی ہے۔"

کچھوا چھوٹا ہو یا بڑا اس کا پتا پانا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ اٹھا کے الٹا کر دو۔ اس کا پیٹ، چاروں ٹانگیں سامنے آ جائیں گی۔ وہ اب صرف ٹانگیں چلاتا اور سر ادھر ادھر مارتا رہے گا۔ الٹا پڑ جائے تو خود بھی سیدھا نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ اپنے آخری انجام تک پہنچ جائے۔ مرنے کے بعد زیادہ تر یہ حشرات الارض، کیڑے مکوڑوں، مکھیوں مچھروں کے کام آتا ہے کہ یہ موذی تب اس کا خالی کھوکھا رہ جاتا ہے جو انسان اور ہاتھی دانت، گینڈے، بارہ سنگھے کے سینگ سے بھی بیش قیمت اور پرکشش کا حامل ہوتا ہے۔

قدرت نے جو کچھ بھی تخلیق فرمایا اس میں کچھ نہ کچھ، کوئی نہ کوئی خوبی، حکمت اور بنی نوع انسان، دیگر مخلوقات کے لیے بہتری پنہاں ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اسے سمجھ یا جان سکیں۔ ہمارے ارد گرد اوپر نیچے لاتعداد مرئی اور غیر مرئی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ چند ایک کے علاوہ ہم نہ تو کسی کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کے مطالب و معانی سمجھنے کا ادراک رکھتے ہیں۔ ہم انہیں "بے فضول" سمجھتے ہوئے ادھر دھیان ہی نہیں دیتے۔ ہم تو یہ تک جاننے ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ اگر ان کا وجود نہ ہوتا تو اس زمین پہ ہماری سلامتی کو طرح طرح کے خطرے لاحق ہو جاتے۔"

کتے، بلیاں، کوے، چوہے، مکوڑے، گدھ، چیلیں، سانپ، چھپکلیاں، ٹڈیاں، کیڑے، مینڈک، حشرات یہ چند نمایاں سے ہمارے سامنے کے جاندار ہیں جن کا ہمیں دن رات سامنا رہتا ہے۔ انسان اور زندگی جدھر ہوگی یہ بھی ادھر ہوں گے۔ ان میں سے ایک دو کے علاوہ ہم کسی کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان سے نفرت کے علاوہ خوفزدہ بھی رہتے ہیں۔ کوئی مکروہ ہے تو کوئی حرام، خطرناک تو کوئی خوفناک، پلید تو کوئی نجس۔ اس طرح سے کئی جانوروں کے نام ہم ایک دوسرے کو گالیاں دینے اور نفرت کے طور بھی استعمال کرتے ہیں۔"

اُبھار سے آئے گا....."

کچھوے کے کھلے منہ سے پتا ہی نہیں چلتا یہ منہ ہے یا کسی درخت کے بیج کا اکھوا؟ میری ہنسی تو نہ تھی لیکن چہرے پہ استہزا کا ہلکا سا رنگ ضرور ابھر آیا۔ نہ جانے میرے جی کیا آئی، اسے اُلٹا کر دیا۔ اس کا پیٹ چیرا کسی پرانے ماڈل کی فوکسی کی چھت کی طرح لگا..... چاروں پاؤں چلاتا ہوا جیسے سیدھا ہونے کی سعی کر رہا ہو۔

تدبیر الٹی ہو جانے کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تقدیر میں کچھ سیدھا لکھا ہوا ہے؟ تقدیر اور تدبیر کے فلسفے کو کچھوا خوب سمجھتا ہے کہ سیدھا زندگی ہے اور الٹا موت.....!

میرے قریب سے ایک ملنگ نے شاید میری یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ وہ بڑی خوش دلی سے کھسکتا ہوا میرے قریب ہوا..... مجھے ایک پرانی کند سی چھری پکڑاتے ہوئے کہا۔

"شاباش بچے! تو نے تو کمال کام کیا..... پہلے دن ہی اتنا کچھ سیکھ لیا۔ لگتا ہے بابا تجھ پہ مہربان ہو گئے ہیں۔ جب یہ کچھوا حرکت کرنی چھوڑ دے تو پہلے گردن کاٹ دینا، پھر ٹکڑے کر کے چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنا کر ادھر کڑاہی میں ڈال دے۔" ملنگ اتنا کہہ کر پھر اپنے کام میں جت گیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ میرا کچھوے کو الٹا کر دینا اس کی بے بسی اور بے تعلقی کو ختم کر دینے کا سبب بنا ہے۔ میری اس بے ارادہ حرکت میں ایسا کون سا خوشگوار خوبصورت پہلو ہے جس نے اس مجہول ملنگ کو اپنا موڈ بدلنے پہ مجبور کیا؟ دماغ پہ بہت زور دیا، جب کچھ سمجھ نہ آیا تو کسی بے وقوف بھوڑے کی طرح اسے تکنے لگا۔ جو کمال مہارت، مستعدی اور مشاقی سے کچھووں کا پوسٹ مارٹم کر رہا تھا..... ایسی چابک دستی اور مہارت خاندانی قصابوں یا منجھے ہوئے جراحوں میں ہوتی ہے۔ چھری کی نوک اور دھار سے وہ ایک ایک بافت اور ریشہ الگ کر رہا تھا۔ ایسا منہمک جیسے وہ اپنی کسی عبادت میں مگن ہو.....!

پرندوں اور زمین پہ رینگنے جانوروں میں گدھ اور کچھوے کی اوسط عمر اپنی قبیل کے دیگر جانداروں سے عموماً زیادہ ہوتی ہے۔ گدھ اور کچھوے میں بظاہر ایک آدھ کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ ان دونوں میں سب سے بڑی مشترکہ صفت صبر و استقامت ہے..... بدنظری، حسن، بدقریب اور خوش منظری کی خوگر ہوں اُن کے لیے ان دونوں کو دیکھنے کا تجربہ کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا..... جبکہ یہ دونوں انسانیت کی بہت زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ گدھ، چیلیں، کوے، کتے، بلیاں، چیونٹیاں، مکھیاں، مچھر نہ ہوں تو انسان بالآخر غلاظت خوری کے چنگل میں پھنس کر اپنے وجود سے فراغت حاصل کر لے۔"

گدھ اور اسی طرح کی صفائی پہ مامور دیگر جانور، جو موٹی موٹی دکھائی دینے والی غلاظت کا قلع قمع

کرتے ہیں' کچھوا ان سے کئی گنا زیادہ زمین کی صفائی کا کام سرانجام دیتا ہے۔ پانی، ریت، مٹی اور زمین کی تہہ پر اگے سبزے پر موجود پائے جانے والے کیڑوں' ہلاکت خیز جراثیم کا صفایا اس صفائی سے کرتا ہے جس طرح قالین پر سے صوفوں کا گرد و غبار کی صفائی کرنے والی مشین "Hoover" کرتی ہے۔

کچھوے کے پورے جسم اور خصوصی طور پر پیٹ کی نچلی تہہ پر قدرت نے ایک ایسی زبردست جراثیم کش مقناطیسی کشش پیدا فرما دی ہے کہ مضر ماحول' گرم کیڑے جلد یا ساتھ چھوتے ہی تباہ ہو جاتے ہیں۔ جدھر کدھر یہ پہنچتا ہے ماحول کو صاف پاک کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بو مہک بھی جراثیم کے خاتمے کا موجب بنتی ہے۔ جبکہ دوسرے جانور حصول غذا' گندگی کا صفایا تو کرتے ہیں مگر جراثیم کی آلودگی کا خاتمہ ان کے ہاں بھی نہیں ہوتا۔۔۔

جب اس کے جسم کی نچلی تہہ کی مہک بو میں ایسی مقناطیسی کشش اور حفاظتی صلاحیت موجود ہے تو اس کے باقی اعضاء' عضلات' گوشت پوست اور ہڈیوں میں کیا کیا شفائی اثرات موجود نہ ہوں گے۔۔۔ اور کچھ ہماری انجزاء اس پہ مستزاد۔۔۔؟

سمندر اور اس کے کناروں' ساحلی و دلدلی علاقوں' دریائے تالابوں جھیلوں کے آس پاس رہنے اور کاروبار کرنے والوں میں کچھ ایسے دیکھنے میں آنے والے ذہنی اور اعصابی عارضے پیدا ہو جاتے ہیں جو میدانی کوہساروں صحراؤں میں رہنے والوں میں نہیں پائے جاتے۔ خاص طور پر وہ غوطہ خور اور ملاح' پیشہ ور مچھلیوں کے شکاری' جن کا زیادہ تر وقت رواں پانی میں بسر ہوتا ہے۔۔۔ خفقان جیسی ایک دماغی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔۔۔ ایک دم دماغی تناؤ اور اعصابی کھچاؤ پیدا ہو جاتا ہے قوت برداشت ختم ہو جاتی ہے "معمولی سی بات پر طیش میں آ کر مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں' منشیات کا بے تحاشا استعمال اور آخر پانی میں اتر کے رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے مریضوں کی زیادہ تر اموات ڈوبنے سے ہوتی ہیں۔۔۔!

ناک' کان' پیشاب کی نالی اور مقعد کے راستے' پانی کا ایک نہ دکھائی دینے والا "ایوا" جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔۔۔ ویسے تو اس کیڑے کو پسندیدہ شکار کچھوے جیسی اور تنگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ویسے جن پانیوں میں انسانی عمل دخل کم ہوتا ہے ادھر یہ "ایوا" بھی کچھوؤں جھیلوں میں منتقل ہونا پسند کرتا۔ ان کے ذریعہ پھر کسی نہ کسی طرح' سمندری و دریائی جانوروں یا ان انسانوں' جن کا روزگار پانی سے وابستہ ہے پہنچ جاتا ہے۔ سب سے پہلے یہ معدہ پر حملہ آور ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ خون میں شامل ہو کر دماغ اور مزاج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مریض پانی دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس کا ہر وقت پانی میں ڈبکیاں لگانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے کچھوے جو اس ایوا سے متاثر ہوتے ہیں وہ پانی سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے۔ عموماً تہہ میں گم صم بیٹھے

کی وجہ سے اس کے گوشت اور انڈوں میں یکسانی اور اختلاف موجود واقع ہے۔"

اللہ کریم کی عظمتوں اور رازوں کو سمجھنا کم از کم بشر کے بس کی بات نہیں۔۔۔ مگر جسے وہ اپنے کمالِ کرم سے عطا کر دے۔۔۔ اُجالے سے اندھیرے اور اندھیروں سے اُجالوں کا ظاہر ہونا اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ اس کائنات میں فطرت کا ہر عمل، وقت کی ہر کروٹ متقاضی ہے کہ ہم ایک دوسرے میں ہو کر رہیں۔۔۔ ایک جائے، دوسرا آئے۔۔۔ مد و جزر، سیارہ و بروج، ارض و سما کی گردشیں، طلوع و غروب، رتیں، موسم، سیلاب، زلزلے، آندھیاں، طوفان۔ یہ سب کیا ہے؟ زندگی کی کروٹیں، حرکت میں رہنے کی برکتیں۔۔۔ اور جو دو ہیں اور جیسے وہ اس کائنات کی کوئی شے مکمل نہیں، یہ سب اس لیے ادھوری رکھی گئیں کہ ہم انہیں تلاش کریں۔۔۔ ایک دوسرے کی امانتیں، ایمانداری اور خوشی خوشی لوٹا دینی چاہئیں تاکہ ہم مکمل ہونے کی کوشش میں ہوں۔۔۔ بس یہی کوشش زندگی ہے۔۔۔!

مجھے جوہڑ میں کنول اچھا لگتا ہے۔ جس کی جڑ گندے کیچڑ میں اور اجالا نکھرا ہوا سپید نکھرا پانی کے باہر جلوے دکھاتا ہے۔ اسی تالاب یا جوہڑ میں کانٹوں بھرے بے ڈھنگ سنگھاڑے۔۔۔ رنگ و روپ چھاؤں نہ دھوپ۔ لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ بجا؟۔۔۔ کسی کنول چہرہ کو دیکھو حسن و رعنائی کے آنگن میں کیسی میٹھی میٹھی دھوپ کھلی ہوتی ہے۔۔۔

کھلی ہوتی ہے آس پاس چہرے کے دھوپ سی
آپ ہیں تو آپ کے قربان جائیے

لب و رخسار، آنکھیں، مژگاں، کاکل و ابرو و دنداں، کمر، سراپا و قامت، ناز و ادا۔ ہر جا لی ہیں اور ادھر لالہ و لاجونتی، چمپا اور چنبیلی، سنبل و سوسن، گل شبو، گل داؤدی۔۔۔ سبحان اللہ! دیکھی ویسی کلی کی معصوم مہک، موہن موتیا، نرگس و نسترن، رت جگا، بہوٹ اور دا‌تل۔۔۔ ہائے! ادھر تو ریحان اور ادھر مروا۔۔۔ گلِ سری کے ساتھ گلِ نورا۔۔۔ گل رانے تو گل عباسی اور گل اشرفی کی بہار بھی دیکھنی چاہیے۔ پھر وہ جب دم نہ سدھ جائے تو گل مہندی اور گل شب بو کی عطری نکہت سے طبع میں تراوت، تسکین اور تہذیب و تطہیر پیدا ہوتی ہے؟

تہذیب مگر تو زمرد و زرقون، ملک و سمور، حریر و دیبا، یاقوت و مروارید، اطلس و کمخواب کا گاہک ہوتی اور سنگ سے تراشے بھی ہوتی ہے۔"

اللہ کہو، ایشور، رب، بھگوان، من لوڈ یا پرماتما، لگ بھی اسی کے نام ہیں۔ گاڈ، یزدان یا خدا کہنے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے؟۔۔۔ اس کا نام کچھ بھی نہ ہو تب بھی وہ ہے۔۔۔ اسے کچھ بھی پکارو ہماری آواز اس تک پہنچتی ہے۔ زبان پہ صوت تو بہت بعد میں گزرتا ہے جبکہ ہاں کے پیچھے ایقان کی اذان بہت پہلے کہیں اندر ایوانوں

جانوروں کے شکار پہ ہوتا ہے۔ دریاؤں نہروں جھیلوں اور سمندر کے آس پاس رہنے والے مچھلی اور دیگر آبی
جانوروں کو اپنے روایتی طریقوں سے پکڑتے ہیں۔ میدانی، صحرائی اور پہاڑی علاقوں کے اپنی طرح کے انداز
ہوتے ہیں۔ بنیادی چیز شکار ہوتا ہے جبکہ طریقے جدا جدا ۔۔۔ اس سارے عمل کے پیچھے انسان کا شوق اور
معاشی ضرورت کا عمل دخل ہوتا ہے۔"

شاید قدرت نے شکار اور شکاری کو ایک دوسرے کا لازم ملزوم قرار دیا ہے۔ شکاری کا اپنی ضرورت
اور زندہ رہنے کے لیے شکار کرنا ضروری ہوتا ہے اور شکار کے لیے اپنی فطری بقا اور مقصد تخلیق کے تحت شکار ہونا
حقیقت ازلی ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ دونوں فریق ایک دوسرے کی تاک میں ہوتے ہیں۔ اب غور کیجیے کہ دونوں
کے مقصد مخالف رخ اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں مگر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پہ درست ۔۔۔ یعنی کسی کی بقا کسی
کی فنا اور کسی کی فنا کسی کی بقا ۔۔۔ زندگی سے موت جنم لیتی ہے اور موت سے زندگی کا ظہور ہوتا ہے ۔۔۔؟
یوں بھی ہوا کہ شکاری کو شکار کرنے کی مہم ہی نہیں پڑی ۔۔۔ شکار خود ہی قدموں میں آ پڑا کہ
مجھے قبول کر ۔۔۔ اور ایسا اتفاق بھی بیتے ہوئے دیکھی کہ شکاری خود شکار کے روبرو شکار ہو گیا ۔۔۔ لینے گئے
تھے مگر خود دے کر آ گئے"

جمعرات کا روز دن کا پہلا پہر ۔۔۔ میں گھر اور شہر سے دور کہیں نالہ ڈیک کے پار دو صدیوں پرانے
برگد کے پاس اس کوٹھی والے طوطوں اور ان کے بچوں کو پکڑنے کی خاطر پہنچا تھا۔ وجہ بھی بتا دیتا ہوں کہ
امرودوں والے باغ کے رکھوالے نے طوطوں کے ٹھونگے ہوئے کچھ امرود کھلا کھلا کر مجھے پاگل کر دیا ہوا تھا۔
میں اس سے متعدد بار دریافت کر چکا تھا کہ مجھے یہ ٹھونگی چونچوں والے امرود کیوں کھلاتا ہے؟ ۔۔۔ ایک زمانہ وہ
مجھے کوئی معقول سا جواب دینے سے قاصر رہا۔ آخر میرے اصرار پہ صرف اتنا بتایا کہ تم جس منزل پہ ہو اس کے
آگے کا راستہ ان باتیں کرنے والے طوطوں کے وسیلے سے نکلے گا ۔۔۔ میری ادھوری ناقص عقل میں یہ بات نہ
آئی ۔۔۔ میں ناراض ہو گیا اور اس کے پاس آنا جانا ختم کر دیا مگر یہ طوطوں والی بات دماغ کے کسی کونے میں اٹک
کر رہ گئی تھی۔ دوسری وجہ ان طوطوں کا نایاب ہونا تھا۔ باغ میں طوطے تو خیر بہت تھے مگر ان کے بچے بھی
بڑے مہنگے بکتے تھے۔ تیسری وجہ ان کے پکڑنے یا حاصل کر لینے سے معصروں میں اہمیت بڑھ جاتی تھی"

ادھر برگد تک پہنچ کر معلوم ہوا تو پتہ چلا کہ بھوسے کا طعام کھانے اور پھر اس کا گوشت کاٹنے کے بعد
محسوس ہوا کہ میں ادھر آیا تو طوطوں کا شکار کرنے تھا مگر خود شکار ہو کر رہ گیا ۔۔۔ اب طوطے تھے نہ بچے اندر سے
مجھ میں نہ جنون رہا نہ پری رہی ۔۔۔ حتی کہ یہ بھی یاد نہ رہا میں کون ۔۔۔ "کہاں سے آیا ہوں نام کیا ہے؟" ۔۔۔ برگد
بابا ملنگ اور بھوسے ۔۔۔؟

انسان' شجر' پرندے' چرند' حیوان' بے تحاشا ڈھنڈلو ۔۔ سوا نیزے پہ سورج کی آگ برساتی تیز دھوپ میں اپنی شناخت سے قریب قریب محروم ہو جاتا ہے کیونکہ ان سب کا بالواسطہ تعلق آگ کی تمازت سے ہے۔ ہزاروں کی یخ بستگیوں' صحراؤں کی وسعتوں' پہاڑوں' جنگلوں کی سیر' دریاں بھرتی ہوئی خاموشیوں اور اتھاہ سمندروں کی گہرائیوں کی پُراسرار پنہائیوں میں بھی یکسانیت اور ماورائی' بعید العقول کیفیات پنہاں ہوتی ہیں کہ انسانی عقل و دانش ان کا احاطہ کرنے سے عاجز نظر آتی ہے ؟

حضرت ! یہ تمام مقامات و کیفیات' اسلوب و سلوک اگر یکجا کہیں ملاحظہ کرنے ہوں تو کسی آدم مفر شجر حکمت یعنی بابا برگد کے حضور پیش ہو جایئے کہ اس کی گھنیری چھاؤں میں مل جائے گا ؟

یہ و مخصوص عالمان ارضیات' فلکیات خوب جانتے ہیں ارض و فلک کے کون سے طبقات' کن کن ماورائی نسبتوں اور اثرات کے حامل ہیں اور ان کے روحانی تصرفات کیا کیا ہیں ؟ ۔۔۔ وقت' موسم' قدرتی گھٹ بڑھ' افلاک کی گردشیں' مہر و ماہ و نجوم کی گردشیں' کہکشاؤں کی گزرگاہیں' مخصوص ساعتوں' گنبدوں کی گھماؤ ' زمین کے نزول و عروج ۔۔۔ سے کنارہ وسعتوں' قوس و کمان سے بھی ماورا' اوج ثریا کی مسافتوں کو جانچنے ان کی معدنی نباتوں اور نیابتوں سے مستفیض و مستفید ہوتے بھی جاتے ہیں "

ارضی طبقات اپنے بطونی افعال' اعمال و اثرات سے ممتاز' مبارک اور مقدس ہیں و پھر اپنے مخصوص تحریکات کی بنا پر مردود منحوس اور معتوب ہوتے ہیں۔ کسی خطۂ ارض کو نبی' پیغمبر' رسول' اماموں' ولیوں کی گود میں پروان چڑھانے کا شرف حاصل ہوا اور کسی قطعۂ زمین پر انہیں اذیتیں دی گئیں' شہید کیا گیا' دار و رسن پہ کھینچا گیا ۔۔۔ کسی سرزمین پہ فتح و نصرت نے جھنڈے گاڑے اور کہیں جان و مال کا بے پناہ زیاں ہوا ۔۔۔ کوئی کھیت بازی جیت پر دولت بھر دیتی ہے اور کسی کھلواڑے کھلیان میں پڑے ہوں چراغوں کو چوکر کا متھا تک نصیب نہیں ہوتا۔ پانی کہیں ٹھنڈا میٹھا اور کہیں بد بودار' سڑا ایسا کہ چوپائے تک منہ نہ دھریں۔ ہوا عرب کہیں بد خو اور کہیں تو بڑی تیز' سمندر تک نہ پہنچے ۔۔۔ تیل کہیں تیزاب ۔۔۔ کہیں کہیں گندہ وبگڑا' کوئی سوت چھپائے ہوئے تو کوئی تانا لگائے ہوئے ۔۔۔ کلاوے کا بات تو کہیں تکلی کا پاٹ ۔۔۔ جلانے کا کاٹھ اور ادھر سنگھاسن کا راٹھ ۔۔۔ عجب رام لیلا ۔۔۔ کوئی سوتا کوئی کیلا لالہ تو کوئی پیلا ۔۔۔ ؟

کہتا یہ تھا کہ برگد ہر جگہ اپنی جڑیں نہیں جماتا کہ پاس پڑوس میں آگ اور تاڑ اگے ہوں اور نہ ہی چند سے اور یہ موذ عادتی کی ایسے استھان پہ براجمان ہوتا ہے جہاں شوذر اور شلوک پہ ہوں ؟

بوڑھا یا بوڑھے کا درخت' ہزاروں سال زندہ رہتا ہے ۔۔۔ پھوا سیکڑوں سال ۔۔۔ برگد سر پر رکھتا ہے آنکھ نہیں ۔۔۔ پھوا زبان رکھتا ہے دانت نہیں ۔۔۔ !

برگد کے سائے میں سمادھی لگانے والے کے اندر باہر جب تک برگد نہ اگ آئے اس کی تپسیا سوئیکار نہیں ہوتی۔ برگد گیان کا شعور و درشن ہے ۔۔۔!

اس تک دھڑ تک ملنگ کو جس کے بان کی مانند بٹے ہوئے بال پیٹ کی ناف تک اترے ہوئے تھے قصائی بھی کہہ لوں تو کچھ غیر مناسب نہ ہوگا کیونکہ جس مہارت، چابکدستی سے بکھوؤں کا تیا پانچا کر رہا تھا وہ کوئی پیشہ ور قصاب ہی کر سکتا ہے۔ میں بھی کن آنکھ سے دیکھتے ہوئے اس کی نقل کرنے کی کوشش میں تھا۔ چربی کی بنی ہوئی نام نہاد چھری کی نوک سے میں اب بکھوے کے گوشت سے چھوٹی چھوٹی بوٹیاں نکال رہا تھا۔ اچانک ٹن کی آواز ابھری ۔۔۔ ایک سریلی سی ٹن جیسے پیتل کی کوئی چھوٹی سی گولی کسی تانبے کے تسلے میں گر پڑی ہو۔ نیچے بھرا گوشت والا تسلہ دیکھا تو ایک ننھی سی سرخ رنگ کی گولی دکھائی پڑی ۔۔۔ چند ثانیے دیکھتا رہا کہ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو انگلی سے دبا کر دیکھا۔ نہ جمے ہوئے خون کا قطرہ تھا اور نہ کوئی ہڈی کا گول ٹکڑا ۔۔۔ یا اور یہ ہو سکتا ہے؟ میں نے اٹھا کر ہتھیلی پر رکھ لیا ۔۔۔ یہ تو کوئی سخت سا موتی تھا۔

سنگ پشت ویسے تو بکھوے کا اصطلاحی نام ہے ایسے ہی جیسے ہم سیہہ کو خار پشت کہتے ہیں اہل فارس انھیں یونہی بولتے ہیں۔ اسی طرح کچھ اور سنگ بھی ہیں ۔۔۔ سنگ ماہی، سنگ قجز، سنگ مثانہ، سنگ مار (سانپ کا منکا) سنگ چلد (کوا اپنے نوزائیدہ بچوں کی بحفاظت دیکھ بھال کے لیے گھونسلے میں رکھتا ہے۔ یہ کسی قدیم جنگلی جڑی کی گول ہوتی ہے۔ زمین میں ایک عرصہ دبی رہے تو پتھر کی مانند سخت اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ رات کو چراغ کی مانند روشن رہتی ہے۔ اندھیری راتوں کو کوا اپنی مقناطیسی روشنی کی کشش سے اسے تلاش کر کے اپنے گھونسلے میں لے آتے ہیں۔ گمان کرتے ہیں کہ گھونسلے میں سنگ چلد کی موجودگی سے وہ آفات ارضی و فلکی سے محفوظ رہتے ہیں ۔۔۔ بچوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کے بال و پر اور آنکھیں جلد کام کرنے لگتی ہیں جبکہ یہ ان کی لمبی عمری کا سامان بھی ہوتا ہے۔"

خیالی اور صحت وران اکثر انھیں تلاش کرتے ہوئے ان کے گھونسلوں تک پہنچ جاتے ہیں ۔۔۔ نصیب میں ہو تو مل بھی جاتا ہے ورنہ تھے تو اری تو ہوتی ہی ہے۔ یہ ورائے حصول اشیاء بھی ہر کس و ناکس کے ہاتھ نہیں لگتیں۔ کچھ میرے ایسے پاگل دیوانے یوں بھی کہ پوری زندگیاں ایسے ہی فضول کاموں میں صرف کر دیتے ہیں۔"

میں تو آج بھی جبکہ میرے پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں مگر میری تلاش کا سفر ہنوز جاری ہے۔ میں ملکوں ملکوں، شہروں بستیوں، ویرانوں قبرستانوں، پہاڑوں صحراؤں، جنگلوں اور سمندروں میں در در بھٹکتا رہتا ہوں۔ میں چاہوں بھی تو کہیں قیام کر رک نہیں سکتا ۔۔۔ مجھے کسی نہ کسی کی تلاش رہتی ہے۔ میں آج تک اپنی تلاش

دھرا ہوا ہے وہ اسے جلد سے جلد حاصل کر لے۔"

ملنگ خاصی دیر تک اس موتی کو بغور دیکھتا رہا پھر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے میری ہتھیلی پہ دھرتے ہوئے بولا۔

"بابا! بڑے نصیبوں والے ہو ۔۔۔ سنبھال کر رکھنا باقی تمہیں بڑے گورو جی بتائیں گے۔"

مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال کر وہ پھر کھوؤں کے ڈھیر، ہر چیز میں جت گیا۔ چند ثانیے میں ہتھیلی پہ دھرے موتی اور ملنگ کو باری باری استفہامیہ انداز سے دیکھتا رہا۔

انسان نے تو اپنی ناقص محدود عقلیت کے باوجود بے شمار ماورائے فطرت، توہمات، خود ساختہ مفروضات و توہمات ایجاد کر لیے ہوئے ہیں۔ جن کا نہ تو منطقی آغاز ہوتا ہے اور نہ کوئی حتمی انجام؟ ۔۔۔ اب دوسری جانب دیکھیں تو اللہ کریم نے بھی کیا کیا نوادریاں پیدا فرمائی ہیں۔ احساس ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کا مقصد شاید انسانیت کا تمسخر تو نہ ہوگا کہ بشر ایک موڑ سے نکلے تو دوسری میں داخل ہو جائے۔ اس کا ذہن یہ چاہے وہ غور و فکر میں پڑ جائے ۔۔۔ دل لگا رہے کہ زندگی بہر طور تھکا اور گھبرا دینے والا دورانیہ ہے۔ راہوں راستوں کے دائیں بائیں پیڑ درخت، اونچ نیچ، پیچ و خم حتیٰ کہ شادی موڑ موجود ہیں سیدھے نپے تلے پورا راہوں کا مقصد ضرورت بھی اسی لیے کہ مسافر کا دل بہلا رہے اس کی آنکھ طرح طرح کے مناظر دیکھتی رہے ۔۔۔"

اللہ کریم نے اپنی تمام ذی جان مخلوق کی تخلیق میں تنوع، باریکی، حکمت، جلال و جمال کی ندرتیں، جدتیں، برکتیں پیدا فرما کر واضح کر دیا کہ وہ نہ صرف قادر و مالک اور جمال و کمال کو پسند کرنے والا ہے بلکہ وہ تجسس، تحیر، غور و فکر اور اسرار کو درمیان میں رکھ کر اپنے نائب یعنی آدم میں ذہنی، فکری اور علمی حرکت بھی برقرار رکھنا پسند فرماتا ہے۔ اللہ کریم کا اپنے کلام و فرمان میں غور و فکر، تجسس و تدبر کی تلقین فرمانا اسی امر کی دلیل ہے۔"

ہم اپنے روبرو کی مخلوقات پہ نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ انہیں تخلیق کرنے والا مالک و خالق کتنا عظیم صناع اور حکمت والا ہے کہ وہ نہ صرف ان کی تخلیق و تکمیل کرتا ہے بلکہ ان میں ایک ایک غور و فکر کی حامل خوبیاں خوبصورتیاں خوب سے خوب تر نکھارتا ہے کہ وہ بے ساختہ سبحان اللہ منہ سے ادا ہو جاتا ہے۔ بتائیے! کہ اللہ کریم کے کارخانے میں بھی کسی غلط فہمی کا امکان ممکن ہو سکتا ہے؟ انہیں پھر کسی ایک دھڑ کے ساتھ دو علیحدہ علیحدہ سر اور چار ہاتھ بازو کیسے لگ جاتے ہیں۔ کسی بچھڑے کی پانچ ٹانگیں کسی ہاتھ کی چھ انگلیاں ۔۔۔ نومولود کے پورے دانت، بالوں سے بھرا سر اور چہرہ ۔۔۔ مختلف پیدا ہوتا دو سروں والے سانپ حتیٰ کہ کسی جانور کے پاؤں نہیں کان نہیں لیکن وہ جانور چل بھی سکتا ہے۔ ہاتھی اور خنزیر کے لیے دانت باہر نکال دیے جو ان کی پہچان بن گئے۔ کسی کا ناک اور کان حد سے زیادہ لمبے چوڑے کر دیے ۔۔۔ مگر مچھ کو زبان ہی نہیں دی اور کسی

کرنے کو اتنی لمبی دے دی کہ وہ دور ہی سے شکار کو لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ گینڈے نے سونڈ مینڈک کو گردن ہی نہیں دی ــــ زیبرے کی گردن اور ٹانگیں ہی اس کی نشانی بن گئیں۔ کچھوے کے دانت ہی نہیں ہوتے دریائی گھوڑا اسے ملا ہوتا ہے اس کی مادہ نہیں۔ چمگادڑ منہ سے ہی کھاتا اور ہگتا ہے۔ کسی کی بصارت دن میں نہیں، رات میں کام کرتی ہے ــــ بچھو کی آنکھیں اس کے ڈنک میں ہوتی ہیں، چاند سورج گرہن، قوسِ قزح، سیلاب، زلزلے، آتش فشانی، طوفان، آندھیاں اور ایسے انسان بھی جو کون و مکان کی خبر رکھتے ہیں۔ خدائی اور نبوت کے دعوے دار بھی، سقراط و بقراط بھی ــــ ہلاکو خان، چنگیز خان، بہلول دانا اور رابعہ کی ذات، غور کرنے کی چیزیں ہیں.....؟

غور و خوض کرنے کی دعوت تو ہر وہ عنصر دیتا ہے جو مشتِ ہستی حاضر و غائب ہے آپ کو دیتا ہے۔ پیچھے منظر تو موجود ہوتا ہے اگر نظر نہیں تو منظر کس کام کا؟..... اسی طرح ہر آغاز و انجام انسان کے اندر فیڈ ہوتا ہے، دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرف کا رخ بدلتا ہے؟ آپ نے سمندر میں تیرنے والی مچھلیاں تو اکثر دیکھی ہوں گی مگر اڑنے والی مچھلیاں بہت ہی کم کسی نے دیکھی ہوں گی کہ ہمارے ادھر کے سمندروں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ چیلہ برسات کی مانند اڑتی ہیں، سمندر میں اگر کوئی ان کی زد میں آ جائے تو یہ اس طوفانی انداز سے ٹکراتی ہیں کہ بچنا محال ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مچھلی تیرنے کے علاوہ اڑ بھی سکتی ہے اور شکاری کے پاس خود چل کر بھی جاتی ہے۔ ہاں! ایسا بھی ہوتا ہے کہ صید خود صیاد کے پاس آ کر پاؤں پڑ جاتا ہے کہ للہ واسطے خدارا! مجھے شکار کرو ــــ میری مشکل آسان کرو....!

ایسی ہی مضمون جھڑیوں میں تب پھنسا پڑا تھا کہ یکبارگی دو سرخ گالوں والے راطوطے کہیں سے آئے۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا، میں میں اودھم مچاتے ہوئے میری گود میں آ پڑے۔ کچھ جانور پرندے ہوتے تو بہت ہوشیار اور پھرتیلے ہیں مگر آپس میں لڑائی جھگڑے کے دوران بری طرح خونخواری اور بربریت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس تیز رفتاری میں وہ ایسے اندھے ہوتے ہیں کہ اکثر گھروں کی چھتوں صحنوں یا کسی انسان کے سر پہ گر پڑتے ہیں۔

کتے، بلیاں، گدھے مرغے اور پرندوں میں کوے، کبوتر، چیلیں، چمگادڑ چڑے وغیرہ.....طوطے بھی لڑنے جھگڑنے میں کسی سے کم نہیں ہوتے۔ ان کی اکثر لڑائی کسی مادہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ چڑے، طوطے، مرغے، کبوتر بے انتہا رنگوں پسند ہوتے ہیں اور یہی وجہ ان کی آپس میں لڑائی کی ہوتی ہے۔ یہ میری گود میں گرنے والے دونوں طوطے خاصے خوبصورت اور جوان تھے۔ جوان راطوطے کی جوانی کی پہچان دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ چونچ سے دم کے آخری پروں تک وہ سراپا ”خوبصورتی“ ہوتا ہے۔ ہلکا چمکتا ہوا سبز رنگ، گہری سرخ

اثرات اور نتائج میں داخل ہو جاتا ہے اور جب اپنے قیام و کلام میں قرار پا لے تو یہاں ایک ایسا عالم واضح ہوتا ہے جو کسی وجود یا پیکر میں نہیں اپنے اثرات 'کیفیات اور نتائج میں محسوس اور دکھائی دیتا ہے ---؟

عہد تخلیق سے علم الاوائل 'متقدمہ و غیر متعلقہ' قدیمہ جدیدہ' لدنی 'مروجہ غیر مروجہ' الہیات 'کسبی و وہبی 'مخلوقی علوی' عقلی معقول 'منقول' احیائے موت 'تسخیر' ارضی و افلاکی 'نوری ناری' بہشت و دوزخ 'معرفت و شریعت' ان کے علاوہ دیگر گنت علوم جن کا ذکر اور تفصیل لکھنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں موجود اور مستعمل ہیں۔

علم اپنی افادیت یا مضرت کبھی ضائع نہیں کرتا ---- سونا 'سیماب 'سہاگہ اور سنگ سلیمانی کی صفات ہمیشہ کارآمد اور کرۂ قرض میں رہتی ہیں۔"

اللہ کریم نے جس طرح شیطان کو اس کے مانگنے پر مہلت دی کہ وہ قیامت تک اپنی کارروائیاں کر سکتا ہے مگر جو ایمان والے ہیں وہ اس کے بہکاوے میں نہ آئیں گے۔ اسی طرح اللہ کریم نے اپنی مشیت و مصلحت کے تحت ابلیس کے چیلوں چانٹوں' ارضی فلکی ہوائی آبی آتشی رجال موکلین و معتقدین کو بھی اپنی مخلوق استعانتیں آزمانے کی مہلت دے دی۔ جبکہ ان ارکل سالکین کو یہ بھی یقین ہے کہ جو اپنے مالک و خالق اللہ کریم پر ایمان کامل رکھتے ہیں وہ ان کے ہتھکنڈوں میں نہ آئیں گے ----!

ایک دانش نورانی اور ایک خصلت شیطانی ہے۔ ادھر اولیائے اللہ ہیں اور اُدھر اولیائے طاغوت ----!

ایک طرف علوم روحانی' موضوعات عرفانی ہیں تو دوسری جانب دیومالائی اساطیر اور عملیات جنود و جانی ہیں ---- دائیں ارواح سعیدہ ہیں تو بائیں بازو پر اژدہے ہیں ---- مشاہدات و مکشوفات ہیں تو ساتھ ہی تسخیر چنڈال قرابات ہیں ---- سیر و سلوک سیر ملکوت ہے تو پیچھے جھل جنی بلا اور بھوت ہے ---- "لوح محفوظ پیش است اولیاء" اور کہیں نفس بغل و تکبر ادھر یا ---- تزکیہ باطن تصفیہ نفس' ادھر جنتر منتر کا رعب و دبدبہ!

یہاں اکل حلال صدق مقال وہاں نفس حرام اور رزق کا جنجال ----!

یعنی خیر و شر اصل و اراذل پاک پلید نیک و بد اور سعد و نحس ---- انسان کے دو پاؤں دو بازو دونوں دو آنکھوں کانوں کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں ---- دائیں کے ساتھ بایاں ضروری ہے ---- ایسے ہی جیسے ہر مقدس جگہ کے ساتھ بیت الخلا کا ہونا بڑی اہم ضرورت ٹھہرتا ہے!

دانش نورانی کے مقابل اگر خصلت شیطانی کا تصور نہ ہو تو قیامت نورانی اور موضوعات عرفانی کی سمجھ نہیں آتی۔ اسی طرح اگر عقل و دانش کے دور و جہل و حمق نہ ہو تو ذہانت و دانش نام کی چڑیا کا کوئی کام نہیں!

زندگی ایک سوراخ سے پیدا ہوتی ہے اللہ کریم کے "کن" کہتے ہی کائنات معرض وجود میں آئی یہ بقول کائناتی علوم کے ماہرین ---- معلوم میں دھماکہ شہابیوں کے ٹکراؤ ---- وقت کی گردش گردشیں صدیوں

میں امتیاز کیوں برتا جاتا ہے۔ بزرگ تو سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ فیض کو عام ہونا چاہیے نہ کہ بزرگوں کو کسی نام
جا کر مخصوص کر دیا جائے۔"

جب بندہ کسی مسئلے کو اپنی ذات کا مسئلہ بنا لیتا ہے تو شعور کا پیدا ہونا ضروری امر ہوتا ہے۔ اتنا تو علم تھا کہ یہ مکرانی ہیں، کراچی کے گرد و نواح یا گوادر، پسنی وغیرہ میں رہتے ہوں گے مگر شاید کسی کو تلاش کرنے کے لیے اتنا ہی جاننا کافی نہیں ہوتا۔ میں کراچی، حیدرآباد، سندھ، بلوچستان کے اکثر احباب سے حاجی فرید علی مکرانی اور اماں جی بابا کا پوچھتا رہتا۔ حاجی فرید علی مکرانی کو کچھ لوگ جانتے تھے کہ اکثر سیہون شریف، منگھوپیر، خواجہ فرید، عبداللہ شاہ غازی، شاہ عبداللطیف بھٹائی وغیرہ کے میلوں عرسوں میں درویشوں کے ٹھکانوں پہ دکھائی دے جاتا تھا۔ مگر کوئی بھی اماں جی بابا کی بابت کچھ نہ بتا سکا۔ اب میرے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں بزرگوں کے عرسوں میں اسے تلاش کروں اور یا پھر کوئی ایسا راستہ اختیار کروں کہ جس پہ چل کر میں اماں جی بابا (بعد میں ان کی اصل حقیقت معلوم ہوئی) کے دربار تک پہنچ پاؤں ---؟

قلندر پاک کے عرس پہ میں دو روز پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اس عرس پہ تمباکو، بھنگ، چرس نہ پینے والوں کے لیے خاصی دشواری ہوتی ہے۔ منشیات کا عادی کسی ڈیرے ڈگے پہ پڑ کر اپنا گزارہ کر لیتا ہے۔ کھانا پینا بھنگ چرس لنگر میں مفت مل جاتے ہیں۔ ٹھنڈا پیو، نشہ کرو، دھمال ڈالو، جھولیاں مارو --- کہیں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جہاں تھکو وہیں لیٹ پڑ جاؤ، کسی ہوٹل سرائے کی ضرورت نہیں۔ اب جو یہ سب کچھ نہیں کرتا، محض قلندر پاک کو سلام کرنے جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہوٹل میں جگہ نہیں، ڈیروں والے --- شریف آدمی کو جو نشہ نہیں کرتا، پیشاب کر کے استنجا کرتا ہے، اپنے ہاں بیٹھنے بھی نہیں دیتے بلکہ وہ خود بھی ادھر ایک پل ٹک نہیں سکتا کہ دھواں، بدبو اور غلاظت بندے کی مت مار دیتی ہے۔ اب دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، ایک یہ مزار پاک کے صحن یا حجروں میں کہیں ٹک جائے۔ جو اکیلے دکیلے کے لیے ناممکن ہے کہ وہاں بندے پہلے ہی ٹھنسے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ شہر کے اندر کسی گراؤنڈ، پارک یا مدرسہ مسجد میں جگہ لی جائے --- یہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ خاص کر کسی اکیلے نوعمر لڑکے کے لیے کہ اوباش لوگ اسے تنگ کرتے ہیں یا اس کی جیب صاف کر لی جاتی ہے۔ کپڑوں کا تھیلا، جوتا غائب ہو جاتا ہے۔ تیسری صورت کہ شہر سے باہر دریا یا پہاڑوں کی جانب کہیں پناہ لی جائے۔ بہر حال متذکرہ بالا خدشات و خطرات ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ میری آج تک یہ حیرانی دور نہیں ہو سکی کہ منشیات کے بے تحاشہ استعمال کے لیے اللہ کے برگزیدہ بندوں کے عرسوں کو کیوں استعمال کیا جاتا ہے۔ کیا کبھی کسی نے یہ سوچا ہے کہ صاحبِ مزار نے بھی اپنی زندگی میں ایسا کچھ کیا ہے۔ ہم وہاں خیر و برکت

''السلام علیکم! حاجی صاحب! کہئے کہاں ملاقات ہوئی ۔۔۔؟''

وہ مجھے حیران سا تکنے لگا جیسے یقین نہ ہو کہ میں اُسے اس مقام پر مل سکتا ہوں۔ وہ یادل نخواستہ سا مسکراتے ہوئے اٹھا اور گرم جوشی سے بغلگیر ہو گیا۔

''بچے! تم ادھر کدھر ۔۔۔؟''

''جدھر آپ حاجی صاحب ۔۔۔؟''

اُس نے میرے کندھے پر بازو ڈالتے ہوئے مجھے جھاگ کی مانند بٹھا دیا۔

''اکیلے آئے ہو یا کوئی اور درویش بھی ساتھ ہیں ۔۔۔؟''

''فی الحال تو اکیلا ہی ہوں ۔۔۔ آپ خوش قسمتی سے مل گئے تو ہم دو ہو گئے ۔۔۔ اسی طرح اور بھی مل جائیں تو ایک جماعت بن جائے گی۔''

''بچے! بڑی گہری باتیں کرنے لگے ہو ۔۔۔ کن درویشوں سے صحبت ہے آج کل تمہاری ۔۔۔؟''

''اللہ کی اللہ جانے ۔۔۔ آپ جیسے بزرگ مل جاتے ہیں تو کچھ پر پلے ڈال دیتے ہیں۔''

''تمہارا ڈیرہ کہیں ہے یا شہر میں ۔۔۔؟''

میرے منہ سے حیرت انگیز طور پر نکل گیا۔ ''میرے تو سارے ڈیرے آپ ہی ہیں۔''

ماتھے پہ تیوری چڑھائے وہ چند ثانیے غور کرتا رہا پھر پوچھنے لگا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں ۔۔۔؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے لیکن خفیف سا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''وہی ایلچی بابا والا ڈیرہ ۔۔۔ بھی تو آپ ہی ہیں؟''

اُس کا منہ حیرت سے اتنا زیادہ کھل گیا کہ میں اُس کے دانت گن سکتا تھا جو گٹکا کھا کھا کر سیاہ ہو چکے تھے۔''

''ایک بات پوچھتا ہوں مجھے یقین ہے تم سچ بولو گے تم ادھر میری تلاش میں آئے ہو ۔۔۔؟''

''بالکل! میں نے آتے ہی ادھر سب سے پہلے یہی دعا کی تھی اے قلندر پاک! میں جس مقصد کے لیے آیا ہوں وہ اللہ سے کہہ کر پورا کروا دیں ۔۔۔''

میں ادھر حاجی صاحب کے ڈیرے سات روز رہا ۔۔۔ آٹھویں روز ہم اُسی سامان والے ٹرک پہ سوار ہو کر کراچی سپر ہائی وے آ گئے۔ حاجی صاحب کا رویہ یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ بہت مشفق، معتدل اور خلیق

سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ فیض کو عام ہونا چاہیے نہ کہ بزرگوں کو کم عام
میں اقرض کیوں پڑتا ہے۔ بزرگ تو سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ فیض کو عام ہونا چاہیے نہ کہ بزرگوں کو کسی خاص
بجا کر مخصوص کر دیا جائے۔"

جب بندہ کسی مسئلے کو اپنی ذات کا مسئلہ بنا لیتا ہے تو ضد کا پیدا ہونا ضروری امر ہوتا ہے۔ اتنا تو علم تھا کہ یہ مکرانی ہیں، کراچی کے گرد و نواح یا گوادر، پسنی وغیرہ میں رہتے ہوں گے مگر شاید کسی کو تلاش کرنے کے لیے اتنا ہی جاننا کافی نہیں ہوتا۔ میں کراچی، حیدرآباد، سندھ، بلوچستان کے اکثر احباب سے حاجی فرید علی مکرانی اور اپانچی بابا کا پوچھتا رہتا۔ حاجی فرید علی مکرانی کو چند لوگ جانتے تھے کہ اکثر سیہون شریف، منگو پیر، خواجہ فرید، عبداللہ غازی، شاہ عبداللطیف بھٹائی وغیرہ کے میلوں عرسوں میں درویشوں کے ٹھکانوں پہ دکھائی دے جاتا تھا، مگر کوئی بھی اپانچی بابا کی بابت کچھ نہ بتا سکا۔ اب میرے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں بزرگوں کے عرسوں میں اسے تلاش کروں اور یا پھر کوئی ایسا راستہ اختیار کروں کہ جس پہ چل کر میں اپانچی و شادو (بعد میں اُن کی اصل حقیقت معلوم ہوئی) کے دربار تک پہنچ پاؤں ---؟

قلندر پاک کے عرس پہ میں دو روز پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اس عرس پہ تمباکو، بھنگ، چرس نہ پینے والوں کے لیے خاصی دشواری ہوتی ہے۔ منشیات کا عادی کسی ڈیرے، تکیے پہ پڑ کر اپنا گزارہ کر لیتا ہے۔ کھانا پینا بھنگ چرس لنگر میں مفت مل جاتے ہیں۔ کھاؤ پیو، نشہ کرو، دھمال ڈالو، جلیاں مارو --- کسی کو حرج نہیں ہوتا۔ جہاں جھونپڑیں لمبے پڑ جاؤ، کسی ہوٹل سرائے کی ضرورت نہیں۔ اب جو یہ سب کچھ نہیں کرتا، محض قلندر پاک کو سلام کرنے جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہوٹل میں جگہ نہیں، ڈیروں والے --- شریف آدمی کو جو نشہ نہیں کرتا، پیشاب کر کے استنجا کرتا ہے، اپنے ہاں بیٹھنے بھی نہیں دیتے بلکہ وہ خود بھی ادھر ایک پل ٹک نہیں سکتا کہ دھواں، بدبو اور غلاظت بندے کی مت مار دیتی ہے۔ اب دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، ایک یہ مزار پاک کے صحن یا حجروں میں کہیں ٹک جائے۔ جو اکیلے دو اکیلے کے لیے ناممکن ہے کہ وہاں ہفتہ پہلے ہی قبضے ہو چکے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ شہر کے اندر کسی گراؤنڈ، پارک یا مدرسہ، مسجد میں گنجائش لی جائے --- یہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ خاص کر کسی اکیلے نوعمر لڑکے کے لیے کہ اوباش لوگ اسے تنگ کرتے ہیں یا اس کی جیب صاف کر لی جاتی ہے۔ کپڑوں کا تھیلا، جوتا غائب ہو جاتا ہے۔ تیسری صورت کہ شہر سے باہر دریا یا پہاڑوں کی جانب کہیں بنا لی جائے۔ بہر حال متذکرہ بالا خدشات و خطرات ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ میری آج تک یہ حیرانی دور نہیں ہو سکی کہ منشیات کے بے تحاشہ استعمال کے لیے اللہ کے برگزیدہ بندوں کے عرسوں کو کیوں استعمال کیا جاتا ہے۔ کیا کبھی کسی نے یہ سوچا ہے کہ صاحب مزار نے بھی اپنی زندگی میں ایسا کچھ کیا ہے۔ ہم وہاں خیر و برکت

ایسی لاہوتی خوشبو جو صرف ایسے خاص الخاص اللہ والوں کی قربت میں ہی محسوس ہوتی ہے جو فنا فی اللہ کے مقام پہ فائز ہوں۔۔۔؟

وہ بزرگ، جنہیں وہ مرشد پاک کہتے تھے۔ ایک نوجوان تھا، جس کی مسیں ابھی ٹھیک سے بھیگی بھی نہیں تھیں۔ میرا حیران و پریشان ہونا واضح تھا مگر اُن کی بابت کچھ مزید دریافت کرنے کا یہ موقع نہ تھا۔ میں خاموشی اور خوشبو سے مدہوش، حاجی صاحب کا لایا ہوا، اُن کے پیچھے پیچھے وہاں بیٹھے ہوئے دیگر مریدین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مریدین میں ہر عمر و نوع کے لوگ تھے لیکن پٹھان، بلوچی اور عراقی بھی نمایاں تھے۔ باری باری سب آگے بڑھ کر مرشد صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے دُعا و برکت حاصل کر کے واپس اپنی جگہ پہ آ جاتے۔ ایسی خاموشی، وقار اور نظم کہ نگاہ و نگاہ، سانسوں کا زیر و بم بھی کہیں سنائی نہ دیتا تھا۔۔۔"

میں اپنی باری پہ اپنی جگہ سے اُٹھا، سہما سا، ایک انجانے خوشبو دار خوف میں بھیگا ہوا۔۔۔ ایسا خوف، جو یا تو کوئے یار کی جانب بڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے اور یا پھر سوئے دار کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے رُوم رُوم میں سرایت کر جاتا ہے۔ رگ و پے میں ایک ایسی سرسراہٹ اور سنسناہٹ سی جو چوم ڈالنے کو چھوتے ہوئے محسوس کرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جونہی میں نے اُن کے ہاتھوں میں ہاتھ دیا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ایسے نرم اور ملائم ہاتھ جیسے وہ ہاتھ نہ ہوں، مخمل کی دو چھوٹی گڑیاں ہوں۔!

مرشد کی اُداس سی نمی میں بھیگی ہوئی ابابیلیں، جو مٹھی میں گرفت کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح انگوٹھے کی بغل میں اپنی گردن سا سر باہر نکال ہی لیتی ہے یا جیسے مرغ زریں کی بغلوں میں ہاتھ دے دیا ہو۔۔۔ مجھے احساس ہوا کہ میں کسی ایسے جنت کے قریب پہنچ گیا ہوں جدھر بے شمار ابابیلوں کے گھونسلے ہیں۔ سبحان اللہ! جو بے مثالی، ملاحت و ملائمت، نسبی شرافت و لطافت، روحانیت و عبادت اس مٹھی کی جان کے حصے میں آئی۔ اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے ہوائی پرندے کے ہاں پایا نہیں جاتا۔ کیا جا سکتا ہے کہ بند بند اور پور پور تک بھی اس کے بعد ایسے تصرفات کے حامل کروائے جا سکتے ہیں۔۔۔"

خانقاہ والے بزرگ نما نوجوان جن کے چہرے مہرے پہ چھائی روحانی اور وجدانی طمانیت کا نور جلوہ افروز تھا جو خود کو خدا کے سپرد کرنے ۔۔۔ خودی کی عطا پانے کے بعد ہی کسی کا نصیب بن سکتا ہے۔۔۔ ملیح رنگت، گھنگریالی سی ریش، خاکستری چولے اور اوپر سیاہ و مخملی سی پگڑی پہنے وہ مراکش کا کوئی خاص نگینہ دکھائی پڑا۔۔۔ جب اس نے ہاتھ کے نرم سے دباؤ سے مجھے اپنی دائیں جانب بیٹھنے کا اذن دیا تو بیٹھتے ہی یوں لگا جیسے ابابیلوں کا ایک جھرمٹ اس کی ذات کے آلنوں سے چھلک اُٹھتا ہوا میرے وجود کی تریزوں میں آ گھسا ہے۔ میں ابابیلوں کی سرمئی سرمدی مست مہک سے بے خود سا ہو گیا تھا۔ میری خوش نصیبی، مجھے مختلف انواع

عرس کی تیاریاں زوروں پہ تھیں۔ ایک تو دو روز باقی تھا تو قافلوں پہ قافلے چلے آ رہے تھے — میں فراغت پاتے ہی باہر نکلا۔ ایک آدھ چکر دربار والوں سے نکال دیا مگر وہ ملنگ کہیں دکھائی نہ دیا — سوچا ایک ادھ روز باقی ہے' وہ بھی درویشوں ملنگوں کے کسی قافلے کے ہمراہ ادھر آ نکلتا ہو گا — خود کو سمجھایا کہ بے صبری اچھی چیز نہیں' قلندر پاک کی خدمت میں احوال رکھوا دیا ہے۔ آخر تمہارا پیام پہنچتے پہنچتے بھی وقت تو لگتا ہے۔ اتاولا تو شیطان کا بھائی ہوتا ہے — ؟"

اگلے روز اک دم ہجوم بڑھ گیا۔ عرس شروع ہو چکا — آج پورا لگ تھے درویشوں ملنگوں کی ٹولیاں' رنگ برنگے لباس' پاؤں میں بھاری گھنگرو' دراز زلفیں' تراشا چہرے اور دہکتے جذبے ... جہاں میں سوتا تھا اب وہاں کوئی اور گروپ قابض ہو چکا تھا۔ انسان کا بس چلے تو زمین کے ہر اک ذرے پہ اپنے قبضے کی مہر ٹھونک دے جبکہ ہر مادی اور عنصر شے پہ اللہ کا قبضہ ہے۔ وہ تو عارضی طور پہ آزمائش کے لیے کسی کو قدرت و ہمت دیتا ہے مگر ہم ہیں کہ اس نازک نکتہ کو سمجھتے ہی نہیں۔ بس اینٹھی کہ یہ بھی میرا وہ بھی میرا — اور موت نہ تیرا چھوڑتی ہے اور نہ میرا۔ وہ یکدم ہوا پھیر کر سب تم اور میں برابر کر کے رکھ دیتی ہے۔ جیسے جیسے شب بھر کی آنکھیں' بے خوابی کے سبب بھیجنے کو آ رہی تھیں۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی' پوری لاش کے لیے قبر کی زمین کہاں سے ملتی؟ اک قیامت کا سماں' سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی — ؟"

چارو ناچار تھکتا ہوا کسی طور پیدل ہوا سرکاری پہاڑیوں کی جانب چل دیا کہ ادھر ایسا رش نہیں ہوتا اور مرنے جینے کو بھی جگہ کی کمی نہیں ہوتی — مزار شریف پہ فاتحہ پڑھی اور تھکا ہارا قریب کی پہاڑی تلے ایک کٹیا کا ادھورا سایہ پا کر لیٹ گیا۔"

کیا کرتا نیند کے ہاتھوں تنگ تھا — ایسے سویا کہ شام کو کہیں جا کر آنکھ کھلی۔ دیے روشن ہو رہے تھے۔ اسی پل کو ملنگی میں قریب ہی کہیں آوازیں سنائی دیں۔ اٹھ کر دیکھا تو درویشوں کا ایک ڈیرہ جم چکا تھا۔ پیچھے سڑک پہ ایک ٹرک کھڑا تھا اس پہ سے سامان اتار کر لایا جا رہا تھا۔ اسی ہجوم میں اچانک میری نظر صادق فرید علی کرمانی پہ پڑی جو ایک بڑی سی بچھانے والی ترپال کا دستہ کاندھے پہ دھرے اوپر پہاڑی پہ چڑھ رہا تھا — سبحان اللہ! میں سوچ رہا تھا اگر میری سونے والی جگہ پہ قبضہ نہ ہوتا اور نیند سے تنگ ہوا ادھر نہ آتا تو اس مقصود کو کیسے حاصل کر پاتا۔ قلندر پاک نے ایک ٹاٹ کی دعا اوپر پہنچا دی تھی۔ "یقیناً صادق فرید علی نے مجھے نہیں دیکھا تھا اگر ایسا ہوتا تو اس کا ردعمل ضرور ظاہر ہوتا۔ اس کا شاید تیسرا پھیرا تھا' کبھی لوہے کا چولہا' کبھی دیگچے ... اور اس کی پوری دلجمعی سے کام سرانجام دے رہا تھا۔ اب وہ تھک کر ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ میرے اندر سے آواز آئی یہ ملاقات کا صحیح وقت ہے۔ میں اچانک نکل کر اس کے سامنے تھا۔"

اُنہوں نے مجھے کار پہ لمبی سیر کی دعوت دی...... مَیں مسکرانے لگا کہ لانگ ڈرائیو کا ایک سیزن ہوتا ہے' عمر اور حالات وجذبات ہوتے ہیں...... یہ تو وہی بات ہوئی کہ کوئی پرانی عمر رسیدہ بیوی کو دعوت دے کہ منوّر بی بی' چلو مری چلتے ہیں اُدھر لمبی سیر کریں گے' لٹکتی جھولا کرسیوں پہ بیٹھیں گے...... سمجھدار ہوئی تو جواب دے گی' دانش کے ابا! کبھی تو دانشمندی کی بات بھی کرلیا کرو۔ جب میرے سیر کرنے' گھومنے پھرنے کے دن تھے تو کبھی بھائی پھیرو تک نہ لے گئے کہ کہیں مَیں اپنے بھائیوں سے نہ مل لوں' اَب مرنے کے دن آئے تو مری سیر کرنے کی دعوت دے رہے ہیں...... لو دَسو...... اے میری تیجڑا پلی مار کر ہوائی جھولے پہ بیٹھنے کی عمر ہے۔ جان ہی چھڑانی ہے تو وہاں لے جانے کا خرچہ بھی بچاؤ...... یہاں کوٹھا بھی ہے سیڑھیاں اور سرہانے بھی...... لو دَسو! اسے کہتے ہیں بات کا بتنگڑ اور رَسّی کا سانپ بنانا......"

ملک اَسد صاحب کی لمبی سیر کی دعوت سے کچھ اسی طرح کے خیالات میرے دماغ میں آئے......

کوئٹہ میں کار پہ لمبی سیر کے لیے کہاں کوئی جائے؟ شہر سے باہر نکلو تو پہاڑ شروع ہو جاتے ہیں' کالے کالے اور سرمئی پہاڑ' کوئلے اور معدنیات سے بھرے ہوئے...... پیٹوں کے خالی برتن لیے' خون پسینہ ایک کیے مزدور' فضاؤں ہواؤں میں گھلی ہوئی نفرتیں...... اپنی پشت پہ سیاسی' طبقاتی' معاشی' لسانی محرومیوں اور ناآسودگیوں کے بھاری بھرکم پتھر اُٹھائے ہوئے مجبور ومقہور عوام...... ان عذابوں کو محسوس کرتا ہوا کوئی حساس قسم کا انسان' اِدھر کسی لمبی سیر پہ کیونکر نکل سکتا ہے......؟

بادلِ نخواستہ مَیں ساتھ چلنے پہ راضی ہو ہی گیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ کوئی تو ملا جس نے لمبا ساتھ دینے کا عندیہ دیا ہے ورنہ اس بے ذوق دور میں تو کوئی آدھا قدم ساتھ نہیں چلتا۔ اس نادر موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مَیں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا......"

میرا طریقہ کہہ لیں کہ مَیں اگر کسی کو اپنا رہبر یا بڑا مان لوں تو پھر ہر اچھائی بُرائی' اُس پہ چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ کچھ بھی کرے یا جدھر بھی جائے مَیں کبھی معترض نہیں ہوتا...... پیری مریدی' دوستی یاری' عقیدت وطریقت کے معاملے تو بڑے معاملات ہوتے ہیں۔ مَیں تو کبھی رکشہ ٹیکسی یا بس میں بھی سفر کروں تو خود کو اللہ کے بعد ڈرائیور کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ غلط چلائے ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرے یا اپنے ساتھ' دوسروں کی جان بھی خطرہ میں ڈال دے' مَیں خاموش اور خوش رہتا ہوں بلکہ خوب انجوائے کرتا ہوں کیونکہ اس مرحلہ پہ آپ' سواری سے اُترنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے یا پھر آپ سوار ہونے سے پہلے اپنے ڈرائیور' رہبر وغیرہ کے بارے میں خُوب جان پرکھ کرلیں......!

## چہ خُوب اَست......!

مَیں ایران کے مشہور شہر مشہد میں اپنے ہوٹل پہنچنے کی خاطر ایک ٹیکسی میں بیٹھا۔ کئی اور مسلم ممالک کی طرح ایران کی ٹیکسیاں، سالم بھی لی جا سکتی ہیں اور آواز لگا کر بھی سواریاں بٹھاتے ہیں۔ جیسے ہمارے تانگے والے بھائی بھائی سٹیشن وغیرہ کے آوازے لگا کر سواریاں اکٹھی کرتے ہیں۔ یہ میری ٹیکسی والا سواریوں کی تلاش میں تھا۔ مَیں تو بیٹھ گیا مگر کوئی اور سواری دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔ آخر ایک سواری مل ہی گئی۔ اَب ہم دو ہو گئے۔ ٹیکسی والا کسی مزید سواری کی تلاش میں بار بار چوک کے چکر لگا رہا تھا لیکن سواری نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ مَیں ''چوک چکروں'' سے تنگ پڑ چکا تھا، ڈرائیور سے کہا۔

''مجھے اُتار دو، میرا اگلے بیس منٹ میں ہوٹل پہنچنا ضروری ہے۔''

ڈرائیور نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اِنشاءاللہ اگلے پندرہ منٹ ہوٹل پہنچ جائیں گے۔''

ایک آخری چکر لگانے کے بعد وہ ہم دو سواریوں پہ ہی قناعت کرتے ہوئے میرے ہوٹل کی جانب ہولیا...... میرے ساتھ والے اُدھیڑ عمر والے سنکی اور وہمی قسم کے ایرانی نے، میرے ہوٹل سے کچھ آگے آزادی چوک تک جانا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی فل سپیڈ پہ چھوڑی ہوئی تھی۔ مَیں اُس چابکدست اور اپنے ہُنر میں خوب ہوشمند کی ڈرائیونگ سے خوب محظوظ ہو رہا تھا...... وہ بھرپور ٹریفک میں بغیر سپیڈ توڑے، یوں زِگ زیگ بناتا ہُوا، ہوا کے گھوڑے پہ اُڑا جا رہا تھا جیسے اُس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہو......؟ دو چار بار مجھے بھی محسوس ہُوا کہ ٹیکسی اَب کہیں ٹکرائے ہی ٹکرائے اور یہ بھی کہ شاید نشے وشے کی حالت میں ایسا کر رہا ہے۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا مسافر بڑا بوکھلایا ہُوا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو خُوب کَسا ہوا تھا...... مُنہ کھلا ہُوا اور آنکھیں باہر نکلی ہوئی۔ حیرانی کی بات کہ اِسی شہر کا ہی باشندہ تھا اور یہاں کے ٹیکسی ڈرائیوروں کی حرکتوں سے بھی خُوب واقف، پھر بھی ایسا سراسیمہ کہ اِس کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی...... ایک ٹریفک لائٹ پہ چند لمحوں کے لیے ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی اُڑان روکی تو وہ ہکلایا......''

''آغا! مجھے یہاں اُتار دو، آج میری سالگرہ ہے گھر پہ بیوی بچے اور دیگر عزیز و اقارب میرے منتظر ہیں...... تم بڑی خطرناک ڈرائیونگ کر رہے ہو تم یقیناً کہیں ایکسیڈنٹ کرو گے۔ یہ اپنا کرایہ لو......!''

اِسی لمحہ سبز لائٹ روشن ہوئی ٹیکسی فراٹا بھرتے ہوئے آگے بڑھی۔ وہ مسافر پھر بولا۔

''آغا! مجھے یہیں فوراً اتارو......''

ڈرائیور نے بریک لگائی تو وہ کھٹ سے دروازہ کھول کر باہر کی جانب لپکا......مگر اس کے ساتھ ہی ''بڑے ملک صاحب'' بھی جھکائی لے چکے تھے۔ اُسی باتھ پیچھے سے ایک اور ٹیکسی غلط لین میں آ کر ہماری ٹیکسی کو اوورٹیک کرنے کے قریب تھی...... اس سالگرہ والے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اُترتے ہی جو فٹ پاتھ کی جانب تیزی سے بڑھا تو اُس ٹیکسی کی زد میں آ گیا......ٹکر سے وہ کئی فٹ اُچھل کر ایک اور ٹیکسی سے ٹکرایا، جس سے اس کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں۔ پھر وہی کچھ ہوا جو اس قسم کے حادثات کی کارروائیوں میں ہوتا ہے۔ مرنے والے کی برتھ ڈے پارٹی میں کئی پولیس، ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں، سرخ نیلی جلتی بجھتی بتیاں اور دیگر سیکڑوں گاڑیوں والے شامل تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کج فہم نے اپنے رہبر پہ بھروسہ نہیں کیا تھا، اُس کی کارکردگی پہ شک تھا...... وہ سمجھ رہا تھا کہ سالگرہ کے روز اُس کا خیر خیریت سے گھر پہنچنا ضروری ہے......لیکن تجربے نے اُسے سمجھایا کہ رہبر پہ بھروسہ کرنا اور یقینِ کامل سے اُسے مرشد سمجھنا کتنا ضروری ہے۔ تیز چلے یا آہستہ اس کی کارکردگی سمجھ میں آئے نہ آئے، اُس کا ہاتھ تھامے رہو......؟

اُسد صاحب اپنی طرح بڑی نرم ڈرائیونگ کر رہے تھے......ہم بہت جلدی شہر سے باہر پہنچ گئے، شام کے ملگجے سائے ابھی پوری طرح گہرے نہیں ہوئے تھے۔ اس قسم کی ڈرائیونگ، جس میں وقت، مصروفیت ذہنی ادبار اور کسی مخصوص منزل کا تعین نہ ہو میں اکثر اپنے ظاہر و باطن کے کچھ سوئچ، لیور بند کر دیتا ہوں تب میری کیفیت اُس ساٹھ سالہ ذہنی مریض کی سی ہوتی ہے جس کا ذہن چھ سالہ بچے کا ہوتا ہے...... وہ اپنے گردوپیش کا جائزہ اپنے اُسی دماغی لیول سے لیتا ہے۔ اس وقت میں اسی ٹرانس میں تھا کہ سارے سسٹم بند......نیم وا جیسی آنکھیں، پتہ نہیں کتنی چیز جا رہی ہے؟

یقیناً اسد صاحب بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوں گے کہ وہ بھی گم صم ہپناٹائز سے تھے۔ جیسے وہ اپنے بھیتر کی کسی چتا میں اُلجھے ہوئے ہوں......؟ موسموں، سموں، پہروں اور ساعتوں کے اپنے اپنے تشرف، تیور اور فسوں ہوتے ہیں۔ موٹی کھال کے پشتو یہ باریکیاں جان نہیں سکتے لیکن اربابِ رمز و جذب، انہیں خوب سمجھتے ہیں کہ نطق، ظاہری زبان ہوتی ہے اور خموشی، باطن کی......!

کوئلے کی کانوں سے ہم گزر رہے تھے......کچے اور تازہ کوئلے کی، کفوز، کستور اور کھجوری بکھاوٹ، ہمارے ساتھ ساتھ تھی۔ کوئلے کی کانوں اور انسانی قبرستانوں کی فضا اور ''باڈی لینگوایج'' ایک سی ہوتی ہے۔ فرق صرف دابنے اور نکالنے کا ہوتا ہے۔ جو کوئلہ ہیرا بننے سے گریزاں ہوتا ہے اُسے زمین کی گہرائیوں سے نکال کر جلا دیا

جاتا ہے اور اسی طرح اکثر ہیروں کو کفن ڈال کر کوئلہ بنانے کے لیے دوبارہ زمین کے اندر گاڑ دیا جاتا ہے۔ انسان اپنے اردگرد دیکھے تو اسی طرح کا ری سائیکلنگ سسٹم جگہ بہ جگہ دکھائی دے گا اور یہی امرِ زندگی ہے۔

پہاڑوں کی اُترائیاں تیز ڈھلائیاں اور کاٹ موڑ شروع ہو چکے تھے...... سُورج دُور پہاڑیوں کی اوٹ میں اُتر رہا تھا۔ اندھیرے اُجالے کے اس تماشے میں شفق کے شوخ رنگ بھی خوب دُھوم مچاتے ہیں گو یہ کھیل تماشہ بہت کم وقت کے لیے ہوتا ہے لیکن مجھ ایسے سر پھرے یہ سبق آموز کھیل دیکھنے کے گھنٹوں انتظار کرتے ہیں۔ کچھ خوش گمان لوگ طلوعِ آفتاب کے سمے کو بڑا شبھ سمجھتے ہیں...... ہندوؤں کی تو ایک پراتھنا اس سمے کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ بہر حال ہر کسی کے اپنے اپنے طور طریقے اور یقین کہ کوئی ابتدا اچھی دیکھنا پسند کرتا ہے کوئی انتہا...... کچھ جو دونوں ہی بہتر جانتے ہیں...... ایسے بھی مستِ الست کہ جن کے ہاں ماضی مستقبل کچھ نہیں ہوتا وہ صرف اپنے ''حال'' پہ ہی قانع رہتے ہیں۔''

سرخی میں سُرمئی اور سیاہی گھلتی جا رہی تھی...... سُورج کی پیشانی کا محراب اب بمشکل دکھائی دے رہا تھا کہ یکدم سامنے والی پہاڑی سے اَبابیلوں کا ایک غول ہماری جانب آیا اور جھکائی دیتا ہوا ہمارے اُوپر سے گزر گیا...... اَبابیلوں کی ایسی طوفانی آمد سے یہ ہُوا کہ ہم دونوں اپنی اپنی اُونگھ سے باہر نکل آئے...... ملک اسد صاحب گویا' گویا ہوئے......!

''باباجی! میں اکثر اِدھر اِسی وقت آتا رہتا ہوں...... یہ اَبابیلیں میرا اسی طرح استقبال کرتی ہیں۔ سارے سفر میں میرے آگے' کبھی پیچھے...... یہاں تک کہ مجھے گھر تک چھوڑ کر آتی ہیں۔''

مَیں نے یُونہی سوال داغ دیا۔

''وہ خاص طور پہ آپ کے ساتھ ہی ایسا کرتی ہیں یا اِدھر سے گزرنے والی ہر کار گاڑی کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے؟''

اُنہوں نے جواب دیا۔ ''دُوسروں کے متعلق تو پتا نہیں البتہ میرے ساتھ ایسا ضرور ہوتا ہے......!''

واقعی ایسا ہی تھا کہ جانے کا آدھا راستہ اور واپسی کا پورا سفر اَبابیلوں کے ساتھ ہی بیتا۔

اصل بات' مَیں اُنہیں بتا نہیں سکتا تھا کہ قبل اَز وقت کسی مخفی اسرار کا منکشف کر دینا خطرناک بھی ہو سکتا ہے...... اسی کتاب کے کسی باب میں لکھ چکا ہوں کہ انسانی بنیادی اَربعہ عناصر کی طرح' ماہیوں کی بھی بنیادی اقسام چار ہے۔ آب ماہی' آتش ماہی ریگ یا تراب ماہی اور باد ماہی...... باد ماہی یعنی اَبابیل ایک ایسی ہوائی مچھلی ہے جس کا شمار اللہ کے آسمانی کمانڈوز میں ہوتا ہے۔ یہ اعزاز صرف اسی ننھے سے پرندے کو وَدیعت ہُوا......''

دُنیا کی ہر ایجاد کا بنیادی تصور قرآن' نظامِ شمسی وقمری...... موسموں' سمندروں' پہاڑوں' صحراؤں'

جنگلوں' میدانوں اور انسان سے مستعار لیا گیا...... سانپ چوہے موٹے' کیچوے پچھوے گٹے' بلّے' سُوڑ چیونٹیاں' مکڑیاں' جوکیں' ٹڈے' چھپکلیاں' نیولے ہزار پایہ' بھڑیں' بچھو' مگرمچھ' خارپشت' کن کھجورے' کرلے مچھر' لال بیگ' سُنڈیاں' دیمک' پسّو' کھٹمل' جوویں' فنگس' اُلو' چمگادڑیں' چیلیں' کوّے' لکڑبگے' گدھیں' بجو وغیرہ جنہیں ہم حشرات الارض کہتے ہیں...... کتنا خوف' دہشت' نفرت اور احتیاط...... ؟ مگر قدرت نے انہیں بامقصد تخلیق نہیں فرمایا۔ ان کا وجود اگر سطحِ ہستی سے نابود کر دیا جائے تو انسان اپنی شناخت اور ہستی کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اُس کی تمام وہ سہولتیں' آزادیاں' تحفظات' لطف اور خوشیاں انہیں حشرات الارض کے وجود سے قائم و دائم ہیں۔

اس سطحِ زمین پہ جنم لینے والا بچہ' ستر آفاقی اور ایک سو ستر ارضی' آفات و بلیات کی زد میں ہوتا ہے۔ ہر آفت اُسے زک پہنچانے کی تگ و دو میں رہتی ہے۔ آفاقی بلائیں' اللہ کے کرم و رحم' قرآن پاک کی تلاوت' مُرشد پاک کی دُعا سے ٹلتی رہتی ہیں جبکہ ارضی آفات...... نماز کی برکت' ماں کی دُعا' احتیاط اور حشرات الارض' حشرات الفضا کے فیوض سے غارت ہوتی ہیں۔ انسانی بقا کی دُشمن بلاؤں' جن میں دیدہ نادیدہ جرثوم' کرم' زہریلے بخارات' خطرناک مقناطیسی لہریں...... فرسودگی' عفونت اور بوسیدگی سے پیدا ہونے والے حیات دُشمن مادے...... موسمی تبدیلیوں سے جنم لینے والے طفیلیے...... ہوا' پانی' دودھ' دہی اور دیگر مشروبات میں مضرِ صحت بیکٹیریے...... در و دیوار' کپڑوں اور دیگر اشیاء پہ پیدا ہونے والے کیڑے مکوڑے...... ان کے خاتمے کی خاطر اللہ پاک نے ان حشرات الارض و ہوا کو تخلیق فرمایا۔ انسان دُشمن چیزوں کو' حشرات الارض کی پسندیدہ غذا بنا کر انسانیت کو محفوظ کر دیا۔''

مَیں نے ایسی ایسی متبرک ہستیوں کے مزاروں' مقبروں' عظیم الشان مساجد' مکتبوں اور میناروں میں ابابیلوں کے گھونسلے ٹھکانے دیکھے' جدھر کسی پرندے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کبوتر بیچارہ تو بہت پیچھے رہ جاتا ہے...... اس کی اَنگنت اقسام اور چند جبلّی اور فطری کمزوریاں' اسے بہت پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔ خاص طور پہ اس کی نسل پروری کی عادت' حد سے تجاوز کرتی ہوئی نرگسیت اور گندگی پھیلانے کی بُرائی' اس کی بہت بڑی دُشمن ہیں۔ ان بُرائیوں میں کوئی بُرائی بھی ابابیل کے کھاتے میں نہیں...... فضا' ہوا' زمین' پانی میں اس کا کوئی دُشمن نہیں۔ اس کے ٹھکانے اکثر ایسی جگہوں پہ ہوتے ہیں جہاں انسان' حیوان کا بہت کم آنا جانا ہو۔ قلعوں کے کلسے' محرابوں کی اندرونی کُنجیں' میناروں کی نیم روشن سیڑھیوں کے دیدبان...... گنبدوں کے اندر لٹکتے ہوئے فانوس جھاڑ' غلام گردشوں کے روشندان' ہوادان...... اُونچی دیواروں کے طاقچے' پلوں کے نیچے کی دراڑیں سوراخ...... کنوؤں باولیوں کے اندر کے چھجے وغیرہ......''

کہتے ہیں کہ ابابیلوں کے اصل نشیمن آسمانوں کے اوپر کہیں ہوتے ہیں۔ قدرت نے جن ارضی جانوروں کو انتہائی خاص حسوں سے نوازا ہے ان میں کتا' بلی' چوہے' سانپ' چیونٹیاں' مکھیاں' چمگادڑ' مچھلیاں' شکرا اور ابابیل وغیرہ ہیں...... قوتِ شامہ' لامسہ' بصارت اور سماعت تو اکثر جانوروں کو انسان سے کہیں زیادہ ملیں لیکن ہوائی' مقناطیسی' تابکاری لہروں اور امواج سے استفادہ حاصل کرنے کی صلاحیت محض چند ایک مخصوص پرندوں کو دی گئی...... رات کی تاریکی میں مصروف عمل رہنے والے جانور عام طور پہ بلیاں' کتے' چوہے' سانپ اور خاص طور پہ چمگادڑ' الّو' ابابیل وغیرہ۔

سائنسدانوں نے ہوائی جہازوں کا تصور پرندوں سے لیا...... ریڈار' وائرلیس' سیلولر سسٹم انہی کی خداداد صلاحیتوں سے مستعار لیے' لڑاکا جہازوں کے ڈیزائن' ساختیں انہی کی مرہون منت ہیں...... راکٹ' بم اور دیگر ہتھیار اٹھا کر دشمن کے ٹھکانوں پہ پھینکنا' ابابیل نے سکھایا۔ ابابیل کی ساخت' شکل' رنگ' برق رفتاری' سبک اندامی سے کیسے کیسے جدید جنگی جہاز معرض وجود میں آئے۔ ابابیل نے یہ بھی سکھایا کہ اگر بلندی سے اک خاص زاویہ کے مطابق اگر چھوٹے سے چھوٹا کنکر بھی نیچے گرایا جائے تو وہ کیسے تباہ کن اثرات کا موجب ہوتا ہے۔ نشانہ لگانا اور ٹکڑیوں میں بٹ کر حملہ آور ہونا اور دوبارہ ہتھیار بند ہونا...... یعنی پورا پورا کمانڈو ایکشن کی موجد یہی ابابیل تھی۔ زیرک اور زبردست غیر مرئی خصوصیات کا حامل یہ پرندہ' یہ سب کارنامے' قدرت کے ودیعت کیے ہوئے اس ریڈار کے ذریعہ سرانجام دیتا ہے۔"

آپ کے مشاہدے میں آیا ہوگا کہ دوردراز جنگلوں پہاڑوں صحراؤں میں کوئی مردار پڑا ہے اور بہت سے گدھ' چیلیں' کوے' اسے اپنی خوراک بنا رہے ہوتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ کون سی چیز' اس سڑے مرے جانور کی نشاندہی کرتی ہے۔ جواب اس کا یہی ہے کہ ان کی حسیات میں فٹ ریڈار...... ان کی غیر معمولی حسِ شامہ...... بے انتہا دوری تک دیکھنے والی بصارت۔ چیل' شکرا' شہباز' عقاب وغیرہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین پہ رینگنے والے معمولی کیڑے کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ سمندری شکرے' گوشت خور پرندے بہت اونچائی سے پانی کی تہہ میں تیرتی ہوئی ننھی سی مچھلی کو دیکھ کر غوطہ لگاتے ہیں اور سیدھے تیر کی طرح اس پہ جھپٹتے ہیں...... سانپ میلوں دور' انسان یا کسی جانور کے قدموں کی چاپ سن لیتا ہے جبکہ اس کے پاس قوتِ سماعت نہیں ہوتی اور اس کی بصارت بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ چوہے اپنی خوراک کی خوشبو کو سونگھ لیتے ہیں چاہے وہ سات پردوں میں چھپی ہوئی ہو...... چیونٹیاں اسی قوت سے کام لے کر ایسی جگہوں پہ پہنچ جاتی ہیں جدھر ان کے پہنچنے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ کتا' روڑی اور انباروں ڈھیروں سے اپنے مطلب کی

ہڈی ڈھونڈ نکالتا ہے چاہے وہ منوں مٹی یا غلاظت کے اندر کہیں پڑی ہو......؟

اَبابیل کی غذا' غلاظت نہیں ہوتی وہ فضا میں پائے جانے والے پتنگے' بھنورے' چھوٹی مکڑیاں' جگنو' تتلیاں' ٹڈے وغیرہ کو اپنی خوراک کا حصہ بناتی ہے...... شدید بھوک کی حالت میں بھی پودوں' جھاڑوں پہ رینگنے والے کیڑے اُن کی نرم کونپلیں یا کھیتوں میں پڑے فاضل دانے دُنکے بھی چگ لیتی ہے' ورنہ وہ سطح زمین پہ اُترنا پسند نہیں کرتی...... اسے ایسے ماحول میں رہنا اُڑنا ناپسند ہے' جس میں کسی اللہ والے کی مہک رچی بسی ہو۔ وہ رُوحانیت شناس ہے...... کسی صاحب تصرف کی خوشبو اسے دیوانہ کر دیتی ہے۔ وہ اُس کے اِردگرد چکر کاٹتی رہتی ہے' لپک وچہک باریک باریک آوازیں نکال کر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتی ہے۔ اَبابیل اور کوّے اور ٹیٹریاں' نیک بندوں اور راہ بھٹکے ہوؤں کی رہبری بھی کرتے ہیں...... اور سب سے بڑی بات کہ اَبابیل پہ براہِ راست احکام اُوپر سے اُترتے ہیں...... یہ اپنے دوستوں سے باتیں کرتی اور مشورے بھی دیتی ہے۔ مجاہدین یا قافلے رُخصت ہو رہے ہوں تو سلامتی کے نغمے الاپتی ہوئی بہت دُور تک ساتھ جاتی ہے کامرانی کی دُعائیں دیتی ہے۔ کوئلہ' سنگِ خارا اور سُرمہ کے پہاڑوں کی کھوؤں میں بھی اس کے ٹھکانے پائے جاتے ہیں۔

## ● سوز و سازِ رُومی......!

سیراب گوٹھ کی اس خانقاہ میں آج پہلی جمعرات تھی۔ حاجی فریاد علی مکرانی نے مجھے کالا لباس دیتے ہوئے حکم دیا۔

''نہا کر اسے پہن لو آج جمعرات ہے۔ لنگر' محفلِ سماع اور دیگر ذِکر اذکار بھی ہوں گے۔''

سارا دن خوب رونق رہی' ہر دو نماز کے درمیان محفل ہوتی...... نعتیں' ذِکر اور سماع...... لنگر کا خاصا انتظام تھا۔ مَیں نے دیکھا پٹھان' میمن' پنجابی یہاں کے مقامی لوگ' غرضیکہ ہر نوع کا بندہ یہاں موجود ہے...... وہ نوجوان جو یہاں پہنچنے والوں کے مُرشد پاک تھے۔ وہیں اپنی جگہ پہ تشریف فرما...... ہر آنے والا اُنہیں عقیدت سے سلام کرتا' دست بوسی کرتا اور جدھر جگہ ملتی بیٹھ جاتا۔ عجیب مُرشد تھا' وہی روزمرہ کا عام سا لباس' وہی رنگ وہی ڈھنگ...... کوئی روایتی پیروں والی بات نہ تھی کوئی کرّوفر طنطنہ یا تکبر؟...... اس کی وجہ یا تو اُس کی اس لائن میں ناتجربہ کاری اور یا پھر یہ قرونِ اولیٰ کے اُن نوجوان مجاہدوں' محدثوں اور طالبعلموں جیسا تھا' جن کی جوانی بے داغ' دِلوں میں اللہ کی خشیت...... چہرے پہ پاکیزگی کے پَرتو اور آنکھوں میں حیا ہوتی تھی۔ ایسے نوجوان ہی اصل میں دین اور انسانیت کا بُنیادی جوہر تھے...... جن کے ہاں تن آسانی' عیش کوشی اور

خانقاہی آمریت وسامریت کا تصور تک نہ تھا...... بہر حال' یہ نوجوان بزرگ بھی کچھ ایسا ہی کہ جن سامیں نے پہلے بھی نہ دیکھا تھا......!

عشاء کی نماز کے بعد' حاجی فریاد علی کرانی مجھے ساتھ لیے' اُن پیر و مرشد کے ہاں' حجرے میں پہنچا......
نیم اندھیرے' عام سے حجرے میں اک عجیب نا آشنا قسم کی دھانس پھیلی ہوئی تھی۔ سرسوں' زیتون اور تلوں کے تیل ملا کر اگر کوئی دیا روشن کیا جائے تو شاید اسی قسم کی تیکھی دھانس پیدا ہوگی...... میں اسے کوئی خوشبو اس لیے نہیں کہہ سکتا تھا کہ خوشبو ہلکی اور سہل ہوتی ہے جبکہ دھانس تیکھی' قدرے کڑوی اور آنکھوں میں کھجلی کا احساس پیدا کرتی ہے...... ایسی غنودگی' جس میں ہونے اور نہ ہونے کا احساس بھی رہتا ہے۔ دکھائی بھی دے رہا ہے اور نہیں بھی...... دماغ ایک حد تک کام کرتا ہے اس کے آگے دھند کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں ہلکی سی جلن' ناک میں بھاوٹ اور حلق' جیسے کوار گندل چبا رکھی ہو۔ خوکی خامشی' اک عالم نیم تیرگی' شب کے پہر اوّل کا آخری حصہ......!"

باہر خانقاہ کے صحن سے ڈھول کا آہنگ اُبھرنا شروع ہوا...... ہولے ہولے جیسے کوئی سرگوشیاں ہو رہی ہوں' ڈھول کی زبان میں کوئی رازکی بات کہہ رہا ہو...... ہر ساز کی اپنی زبان اور آہنگ ساز ہوتا ہے۔' کوئی ساز' ملن کے گیت سناتا ہے' کوئی ہجر و فراق کا خزینہ چھیڑے ہوئے ہوتا ہے...... کوئی انتظار کی ہوک لیے' کسی میں درو دروں' کسی میں سوز دروں' کسی میں پیچ و تاب رازی...... کسی میں جمال خسروی' کسی میں کمال ایازی...... کسی میں ماہی بے آب کی تڑپ' کوئی سمندر کی مانند شانت...... مگر ڈھول اک الگ سا ساز ہے کہ اس کی گت تال پہ خود بخود جھومنے کو جی چاہتا ہے۔ بس! بندہ کا ہلکا سا صاحب حال ہونا ضروری ہے......؟

میرا بھی یہی حال ہے کہ کہیں ڈھول کی آواز آئی اور میرے باہر اندر کا کوئی نہ کوئی کل پرزہ اپنا فعل چھوڑ کر اس کی تال پہ لگ جاتا ہے۔ اس وقت جب میں مرشد صاحب کے پہلو میں حالت بے خودی میں بیٹھا تھا' اس ڈھول کی آواز نے مجھے ہلا اور جگا کر رکھ دیا۔ نظر اٹھا کر دوسرے درویشوں کی جانب دیکھا۔ وہ ویسے ہی کاٹھ کے ٹھونٹھ لٹکے بیٹھے تھے...... دھیان بٹ جائے تو بندہ ادھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا...... میں باہر سے اندر تھا اور اندر سے باہر ڈھول کی تھاپ پہ...... اُترتی چڑھتی اور تال بدلتی گتوں پہ' اپنے حال میں غرق کسی صاحب حال کی مرغ بسمل سی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے کلبوت سے باہر ہوتا ہے اور یا پھر کہیں اندر...... وقت اور جسم و جان کے تقاضے کہیں دور پیچھے رہ جاتے ہیں اور اردگرد تمام کا تمام دھیرے دھیرے معدوم ہو جاتا ہے۔

میں بھی کھویا سویا سا ایسی ہی کسی کیفیت میں اُترا ہوا تھا کہ اچانک دھند میں پھڑ پھڑانے کی آوازیں اُبھریں اور ننھی ننھی اَبابیلوں کا ایک غول اندھیرے کی مانند حجرے میں اُتر گیا۔ لگتا تھا کوئی بڑا سا دَر دریچہ کھل

گیا ہے جس کے دُوسری جانب اَبابیلوں کا اُندھا جنگل ہے۔ اگر کسی جگہ جنگل میں چمگادڑوں کے لٹکن بسیرے اور بدبو تعفن ہو تو اُدھر طاغوتی اور اَبلیسی اِستھانوں کے ٹھکانے ہوتے ہیں اور اگر اُدھر اَبابیلوں کے گھونسلے اور اگر پانی ہریالی کی مہک رچی بسی ہو تو کسی بزرگ کا مسکن یا مزار ہے' جنات یا کہیں رِجال غیب ہیں......؟

## ● شبِ تار کا کاجل......!

اَندھیرے' تاریکیاں' ظلمتیں' سیاہیاں' کالکیں بھی مختلف انواع خصائل و معائب کی حامل ہوتی ہیں مگر کسی ایک کی بھی" سیاہی سفیدی" اور خوبی وخرابی' دُوسرے سے لگا نہیں کھاتی۔ سنگِ خارا میں بھی رنگت کے اعتبار سے بیس سے زیادہ ورنگ ہیں۔ کالے موتی اور سیاہ گلاب میں بھی کئی شیڈ موجود...... یعنی کالا رنگ بھی اپنے شیڈ کے حساب سے فیض یا غیض کا حامل ہوتا ہے۔ کالے رنگ کی پرتوں میں جتنی گہرائی اور پنہائی ہوگی اُس کے اَسرار و اَفسوں بھی ویسے ہی پُراثر ہوں گے۔ جبکہ ہر نظر' کالے رنگ کی تہہ در تہہ پرتوں کو' اُن کی جلالیت یا جمالیت کے تناظر میں دیکھنے کی اہل بھی نہیں ہوتی...... آپ نے دیکھا سنا ہوگا کہ پرانے بزرگ کالا رنگ پہننے کی مناہی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کالا رنگ خطرناک یا منحوس ہوتا ہے بلکہ یہ کہ ہر شخص کا باطنی مزاج اس کا متحمل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کی بُنیادی سیاہ پرتیں اپنے فطری' عنصری' کیمیائی اور رُوحانی تشرفات' ہر کس و ناکس پہ اپنا باطن وَا کرتی ہیں۔" بادیُ النظر میں ہمیں ہر سیاہ چیز' کالی دکھائی دیتی ہے ایسا ہرگز نہیں۔ وہ اُس کا ظاہر و بصری تاثر ہوتا ہے جبکہ وہ سیاہ نظر آنے والا رنگ' مختلف رنگوں کا مجموعہ' گہرا سرمئی' نیلا فاختئی یا خاکستری بھی ہوسکتا ہے۔ ایسے بے طور وتمیز رنگ کو کالا جان کر اِستعمال کرنے سے اصل کالے رنگ کے تصرفات سے فیضیاب نہیں ہوا جاسکتا بلکہ اکثر اُلٹا ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کالا رنگ پسند کرنے والے بندے ہی الگ ہوتے ہیں...... اُن کی کیمیا اُتھری اور ہیئت مجموعی دُکھری ہوتی ہے۔ اُنہیں کالکیں ودیعت ہوئی ہوتی ہیں۔"

شیخوپورہ میں میرا ایک نیا نیا عقیدتمند بچہ جو اِنتہائی خوبرو' صحت مند' واپڈا میں افسر تھا۔ دیکھا دیکھی اُسے کالا لباس پہننے کا شوق چرایا...... شوق اپنی تکمیل چاہتا ہے چاہے اُس کے لیے کیسی بھی قربان دینی پڑے۔ غلطی اُس سے یہ ہوئی کہ مجھ سے کالا لباس پہننے کی رسمی اجازت طلب کی اور نہ کپڑے کے متعلق کوئی معلومات حاصل کیں۔ سیدھا بازار پہنچا' کالے رنگ کا کپڑا خریدا' ایک اچھے سے خیاط سے سلوایا' زیب تن کیا...... اِک ماہتاب تھا جو کالی گھٹاؤں کی اوٹ سے اُبھر آیا' جس نے دیکھا' دیکھتا ہی رہ گیا۔ رُوپ نگر کا کوئی شہزادہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ رنگ ایسا بھایا کہ اُس نے کئی ایک کالے سوٹ سلوا لیے' بدل بدل دِکھا دِکھا پہنتا رہا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ

بھی کالا رنگ' اُس کا راس رنگ ہے...... اسی دوران اُس نے ٹیلیفون پہ مجھے بھی کالا رنگ پہننے کی خوش خبری سنائی اور اگلے ہفتے' لاہور پہنچ کر ملاقات کا عندیہ ظاہر کیا۔ مگر اگلے ہی روز وہ اچانک بیمار پڑ گیا...... گھر والوں اور ڈاکٹروں کی کچھ سمجھ نہ آیا کہ اسے تکلیف کیا ہے۔ ہائے نہ وائے' بس مبہوت ہے جس سا پڑا سب کا منہ تک رہا ہے۔'' اسی دوران گھر والوں نے اس کے کپڑے تبدیل کرنے چاہے تو یک دم اس کی حالت بدل گئی' دہاڑتے ہوئے کپڑے بدلنے سے انکار کر دیا۔ کھانا پینا بند' نیند بھی جیسے اس کے لیے غیر ضروری سی ہو گئی تھی۔ جب پانچواں روز اسی حالت میں آ لگا اور اس کی حالت غیر ہونے لگی تو بھائیوں میں سے کسی کو عقل آئی اور مجھے فون پہ اطلاع کر دی۔ مَیں نے تمام حالات سننے کے بعد فوراً وہاں پہنچنے کا فیصلہ کیا...... گھر سے ایک کالا جوڑا کپڑوں کا بھی لیتا گیا...... وہاں پہنچتے ہی مَیں نے پہلا کام جو کیا وہ اُس کے کپڑوں کی تبدیلی کا تھا......

شام تک مَیں وہیں رہا...... واپس لاہور لوٹنے کے لیے جب مَیں گاڑی کے قریب پہنچا تو آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولنے والا وہی تھا جو بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے زندگی اور موت کے بیچ لٹکا ہوا تھا مگر اب وہ ایک صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ مَیں نے اُسے کالے کپڑے پہننے کی اجازت بھی دی اور اصلی نقلی رنگ کی پہچان بھی بتائی کہ جیسے سفید دکھائی دینے والا ضروری نہیں کہ اصل سفید بھی ہو' اسی طرح ہر کالا رنگ بھی اصل کالا نہیں ہوتا۔ نقلی چیز سے فائدے کی بجائے نقصان کا اکثر احتمال رہتا ہے۔ خاص طور پہ نقلی سیاہ رنگ تو نقلی سونے چاندی اور نقلی جواہرات کی طرح برباد اور بے توقیر کر دیتا ہے۔''

اصلی اور نقلی کی پہچان کچھ یوں آسان بھی نہیں ہوتی کہ ہر آنکھ کی کسوٹی' پیتل اور کندن کی پہچان کر سکے مگر ہر انسان کے اندر ضمیر' چھٹی حس اور تیسری آنکھ کے علاوہ اصل نقل اور اچھے بُرے میں تمیز کرنے والی ایک بے نام معدوم سی روشنی بھی ہوتی ہے جو عین وقت پہ اُسے کھرے کھوٹے کا اشارہ دے دیتی ہے۔ اب یہ اس پہ منحصر ہے کہ وہ اس سے کام لینے کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں......!

آدمیت کے اس لبادے میں انسان اپنی ذات کی دو پرتیں رکھتا ہے۔ ایک خاکی' جسے ہم دیکھ محسوس کر سکتے ہیں...... دوسری مثالی' جسے ہم دیکھ اور محسوس نہیں کر سکتے۔ ہم ان ہر دو کو مادی اور نوری اجسام بھی کہہ سکتے ہیں یا ہمزاد اور دو بل بھی کہا جا سکتا ہے یعنی خاکی تجسیم کے ساتھ ہی ایک غیر مرئی ہیولہ بھی ہمارے ساتھ پیدا کر دیا گیا جو ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے اور کسی معینہ یا غیر معینہ وقت و عرصہ کے لیے اپنے محور سے علیحدہ ہو کر قریب یا دُور بھی ہو جاتا ہے۔ خاکی اجسامات و مہمات کی حرکیت' مادی وسیلوں اور ظاہری انتظامات و اہتمامات کی محتاج ہوتی ہے جبکہ نوری وجود یعنی ہمزاد' ان آلائشوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ انسان کا یہ نُورانی وجود' کتنا فعال' طاقتور اور تابع ہے...... وسعتِ پرواز اور توفیق کار کی حدود کیا ہیں؟

نُور کی بھی اقسام ٗ دَرجات اور حجاب ہیں جیسے پگھلانے والے کارخانہ کی بھٹی اور عام لوہار کی بھٹی مختلف ہوتی ہے۔ فلڈ لائٹ اور نائٹ لائٹ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ان دونوں میں بنیادی توانائی کا تصور آگ اور بجلی ہی ہوتا ہے جو کہ نُورِ اَرفع واَولی کی تجلیّات کی اَدنیٰ سی اقسام ہیں...... روغنِ زیتون کی ایکسٹرا وَرجن کو النی کے بعد تیل کی کئی اقسام ہیں جو دَرجات ٗ اثرات و تاثیر قدر و قیمت میں کہیں پیچھے ہوتی ہیں مگر کہلاتی روغنِ زیتون ہی ہیں۔''

مثالی یا نُوری وُجود کے لیے زمان ومکاں کی کوئی قید نہیں وہ لامکاں سے پرے تک کی بھی خبر رکھتا ہے...... فرش و عرش تک رسائی رکھتا ہے۔ اس کی ایک اعلیٰ ترین مثال واقعہ معراج ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٗ جو بشر ہونے کے ساتھ نُورِ اَرفع واَولی کے ''ایکسٹرا ورجن'' دَرجات کے بھی حامل تھے اپنے جسم مطہرہ اور وُجودِ نُورانی سمیت اُس مقامِ مصدقہ تک تشریف لے گئے ٗ جہاں اُس سے پہلے کسی جنّ و بشر کی رسائی نہ تھی...... بلکہ آپؐ کے وَسیلہ جمیلہ سے وہ اشیائے فرشی بھی ساتھ رہیں جو صرف دُنیا کی ہی ضرورت تھیں۔''

اللہ کے منتخب بندے ٗ ولی ٗ قطب ابدال ٗ اکثر ایسے تجربات سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال علامہ اقبالؒ کے مثالی رُوحانی مُرشد مولانا رُومؒ تھے۔ جنہیں آپؒ نے اپنی مادی آنکھوں اور خاکی جسم کے ساتھ نہ دیکھا نہ محسوس کیا تھا ٗ مگر آپؒ اپنے مثالی وجود کے ساتھ اُنؒ کے درس میں بلاناغہ شریک رہتے تھے۔ تکمیلِ رُوحانی نصاب کے آواخر میں اُنؒ کی معیت میں دفترِ افلاک پہنچ کر سندِ قلندری ٗ اُنؒ کے دستِ مبارک سے پائی...... اسی طرح مادھولعل حسینؒ اپنے محبوب مرشد شاہ حسینؒ کے ساتھ اپنے والدین کو دیکھنے کی غرض سے گنگا تیرتھ گئے تھے جدھر وہ یاترا کی غرض پہنچے ہوئے تھے۔ اس نوع کی بہت ہی مثالیں ہیں کہ کچھ مخصوص بندے اپنے مثالی نُوری وُجود کے ساتھ ایسے ایسے مقامات پہ پہنچے جدھر اُن کا خاکی پیکر کے ساتھ پہنچنا ممکن نہ تھا۔

مثالی وُجود ہر اُس بنی نوع انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعینہٖ جنّات کا بھی ایک خاکی وجود ہوتا ہے جنہیں وہ بقدرِ ضرورت یا مجبوری اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا جانوروں ٗ انسانوں ٗ پرندوں میں حلول کر لینا اسی مادی وجود کی بدولت ہوتا ہے یعنی جنّ و انس کو ایک دوسرے کے خاکی (مادی) ٗ آتشی (نُوری) اُلٹ وسیدھ کے تناظر میں تخلیق کیا گیا کہ ایک قاعدہ کے تحت علیحدہ علیحدہ بھی رہیں اور ملے جلے بھی......!

اندھیرے اور تاریکی کے مابین فرق کو مندرجہ بالا سطور میں واضح کر چکا ہوں...... اندھیروں کی بابت جان لینا چاہئے کہ وہ اندھیرے اُدھورے ہوتے ہیں جبکہ تاریکی بینا و دَانا ہوتی ہے۔ جیسے اُونٹ سے اُلٹا ہُوا بچ جاتا ہے مگر گدھے سے گرا ہُوا ٗ گٹا گوڈا تڑوا بیٹھتا ہے۔ اسی طرح اندھیرے میں پھنسا ہُوا اُس پھانس کی

طرح ہوتا ہے جو نکل بھی جائے مگر اپنی آئی کی گئی' اِک مسلسل نمیں کی صُورت باقی چھوڑ جاتی ہے جبکہ تاریکی' پشمینے کی اِک گداز سیاہ شال کی مانند ہوتی ہے جس کا بُخ' ممتا جیسا ملائم اور مدھم مدھم ہوتا ہے۔ یوں جان لیں کہ اَندھیرا' رات کا مادی یا خاکی جسم ہوتا ہے اور تاریکی' شب کا مثالی یا نوری وُجود...... کسی رَجلِ رَشید کا اپنے نوری وُجود سے براہِ راست رَابطہ شب کی تاریکی میں ہی بہتر جُڑتا ہے کہ عُروسِ شب اپنی سیاہ اَبریشمی کاکلیں بکھرائے' آنکھوں میں شبِ تار کا کاجل...... مانگ میں ستاروں کی ضوفشانی بھرے جب خُوب بھرے بھرے سیاہ اَبروں سے اِشارۂ معرفت دیتی ہے تو سیاہ فام پوش و توش دَرویشوں کے کام بن جاتے ہیں۔"

- رقصِ اَبابیل......!

میں دُوسرے تین دَرویشوں سے الگ ''نوجوان بزرگ'' کے پہلو میں دُبکا پڑا ہُوا تھا...... حجرے کے اَندھیرے اَب مکمل تاریکی میں تبدیل ہو چکے تھے...... ننھی ننھی لاتعداد اَبابیلوں کی یلغار اور بھرمار سے پہلے تو طاقچوں میں دَھرے دِیوں کی لَویں لرز لرز رہیں پھر پروں کی پھڑپھڑاہٹوں سے بجھ کے دُھواں دُھواں ہو گئیں پھر یُوں لگا جیسے اَبابیلوں کی مخصوص آوازوں میں ایک ترتیب سی آ گئی ہے دِھیرے دِھیرے یہ آہنگ' ہمارے تنفس میں بھی ایک ردھم لے آیا...... پہلے تو کچھ پلّے نہ پڑا پھر دیکھتے ہی دیکھتے سماعت و سُوجھ کا مطلع صاف ہوتا گیا...... ''لے بابا اَبابیل''...... ''دے بابا اَبابیل''...... کہ خُود بخود میری زبان پہ بھی یہی وِرد جاری ہو گیا...... تاریکی نے تسکین کی تانت پکڑ لی تھی۔ ظاہری آنکھ پپوٹوں کی چادر اوڑھ چکی تو وہی اَجلی اُجالے جو تاریکیوں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں کسی ماہِ نیم شب کی مانند اُجل آئے...... باطنی بصیرت کے آگے کوئی اَوٹ نہیں ہوتی اور نہ ہی کالے شار رنگ کے رُوبرو کوئی رنگ ہوتا ہے...... کیا کمال کہ تاریکی میں کالی چیزیں بھی یُوں دِکھائی دیتی ہیں جیسے چاندنی میں سنگِ اَبیض......!

میں بند آنکھوں سے رقصِ اَبابیل دیکھ ہی نہیں رہا تھا بلکہ دُوسرے دَرویشوں کے ساتھ اِس میں شامل بھی تھا۔ کیا مزہ کہ ہم سب محوِ رقص بھی تھے اور اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھے ہوئے بھی۔ محوِ رقص اَبابیلیں خُود بخُود دَرویشوں کی دسترس میں آتیں اور وہ بڑے آرام و احترام سے نوجوان بزرگ کی جانب بڑھا دیتے...... وہ وصول کر اپنی دَلق کے اَندر کہیں ڈال لیتے۔ لگتا تھا کہ اُن کے پہلو میں کوئی بڑا سا رَوزن ہے جدھر سے وہ واپس اپنے مسکنوں کی جانب رجوع کر رہی ہیں اور حُجرہ بتدریج خالی ہوتا جا رہا ہے...... یکبارگی مجھے محسوس ہُوا کہ جتنا بوجھ حُجرے سے کم ہُوا ہے اُتنا ہی کہیں میرے اَندر بڑھ گیا ہے۔ جب بھی ''نوجوان بزرگ'' اَبابیل

لے کر اپنی چادر کے اندر ڈالتے مجھے لگتا کہ وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی سیدھی میرے وجود میں اُتر جاتی ہے۔ مزید غور کرنے سے پتہ چلا کہ وہ سب' چادر کے اندر ڈالی ہوئی ابابیلیں' میرے ہاں پہنچ چکی ہیں......''

میں جب سے اِدھر آیا تھا اُنہوں نے ہمیشہ مجھے اپنے دائیں پہلو ہی بٹھایا...... اس کی اصل وجہ تو وہی جانتے ہوں گے۔ میری بُدھی میں صرف اتنا ہی سمایا' چونکہ میں کم عمر اور شاید چند ظاہری باطنی منازل پہلے ہی طے کر چکا تھا اس لیے وہ کچھ اہمیت دیتے تھے...... اب یہ ابابیلوں کی اُدھر سے اِدھر میری جانب مراجعت سمجھ میں آئی اور نہ یہ کہ ابابیلوں کا اتنا بڑا جمگھٹا کس طرح میری ننھی سی جان میں اُتر آیا؟...... جس طرح ہر سوال کا ضروری نہیں کہ کوئی جواب بھی ہو...... میری اس گُھد بُھد کا بھی میرے ہاں کوئی جواب نہ تھا......؟

جب آخری ابابیل اور ورد کا آخری بول'' لے بابا ابابیل'' بھی تمام ہوئے' جوش ٹھنڈا ہوا' طبیعت کی گردبیٹھی تو محسوس ہوا کہ سیکڑوں ابابیلیں میرے مساموں کے آلنوں میں گھس چکی ہیں پھر یوں کہ میں خود بھی ایک ابابیل میں تبدیل ہو کر اپنے ہی اندر کسی تاریک سے آلنے میں جا بیٹھا ہوں...... مزید بصارت کی کوئی رگ کُھلی تو سارے درویش ہی ابابیلوں کی صورت دکھائی دینے لگے...... سرنیوڑھائے بازوؤں کے پَر پھیلائے جیسے ہانپ رہے ہوں...... شیاما سی دھانس والی تھکاوٹ سے ماحول دھواں دھواں تھا۔ ابابیل ابابیل کی ذکی لرزتی بازگشت کا ارتعاش ابھی نہیں ٹوٹا تھا کہ نوجوان بزرگ نے'' اللہ اکبر کبیرا'' کی اِک جلی بلند کی...... اس کے ساتھ ہی تاریکی کی ساری تار پود بکھر گئی۔ وہی روشن دیے' وہی نشست' وہی درویش اور در و دیوار...... کچھ سکوت ہُوا...... وہی کیفیت جو اِک پُرسکون نیند لینے کے بعد طاری رہتی ہے...... ہلکی سی غنودگی' ہونے نہ ہونے کی درمیانی سی حالت کہ انسان ماضی میں ہوتا ہے حال اور نہ مستقبل میں......!

فجر کی اذان سے کچھ پہلے ہم سب وہاں کے روایتی ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ دسترخوان پہ ہی تھے کہ معلوم ہوا کہ ہم چند درویشوں کا ایک قافلہ کسی نامعلوم سفر پہ روانہ ہونے والا ہے...... حاجی فریاد علی کرانی بھی اس سفر میں شامل تھا۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اِک'' شامل باجا'' کی حیثیت میں اس کے ساتھ تھا۔''

یہ ایک ٹرک تھا...... ویسا نہیں جیسے پٹھانوں کے بنے سنورے ویو میکل ٹرک ہوتے ہیں۔ میرے اپنے قیاس کے مطابق یہ ملٹری آکشن سے لیا ہوا کوئی آؤٹ آف ڈیٹ فوجی گاڑی ہوگی۔ جس میں متعدد تبدیلی کر کے اسے اپنے مطلب کے مطابق بنالیا گیا ہوگا۔ فوجی گاڑیاں چونکہ مضبوط ترین اور مسافت کی ہر آزمائش پہ پوری اُترنے والی ہوتی ہیں اس لیے پہاڑوں صحراؤں اور کٹے پھٹے راستوں پہ استعمال کرنے کے لیے انہیں خاص طور پہ حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اپنی ضرورت کے مطابق اُنہیں ڈھال لیا جاتا ہے۔

یہ بھی عجیب و غریب ہیئت کی ایک روڈ مشین تھی۔ پچھلے حصے میں مضبوط لکڑی کی پڑچھتی...... یعنی ٹرک

کے اَندر درمیان میں چھت ڈال کر اُسے دو منزلوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا۔ نیچے سامان' بھیڑ بکریاں مرغیاں' پانی پٹرول اَجناس تمبو خیمے اور دیگر اَلم غلم...... اُوپر منزل پہ مسافر حضرات...... مناسب سی رفتار' اُترائی چڑھائی' پتھر روڑے' پانی دلدل سب برابر......''

ساتھی سب ہی دَرویش تھے۔ سیاہ پوش' دراز زُلفیں' خضاب چہرہ ریش' سب ہی اک دُوجے پہ واری قربان ہونے والے۔ اگر ساتھ نہیں تھے تو وہ پیر مُرشد تھے یعنی ''نوجوان بزرگ'' جو مجھے اپنے دائیں پہلو بٹھاتے تھے۔ جی میں آئی کہ موقع دیکھ کر حاجی فریاد علی مکرانی سے پوچھوں...... بھائی! پچھلی رات کا رقص اَبابیل کیا تھا؟ وہ لاتعداد اَبابیلیں کہاں سے آئیں اور پھر مُرشد پاک سے ہوتی ہوئیں میرے اَندر کیسے پہنچ گئیں؟...... مُرشد پاک ہمارے ساتھ تشریف کیوں نہیں لائے اور ہماری منزل کہاں ہے؟ اس نوع کے سوالات پیدا تو ہوئے' نوکِ زبان تک بھی آئے مگر اَدا نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ بھی سمجھ میں نہ آئی۔ شاید ایسی باتیں سمجھ میں نہ آنے کے لیے ہی ہوتی ہیں......؟ مذہب عشق کی طرح مسلکِ فقر و دَرویشی میں بھی سوال نہیں ہوتے اور کسی جواب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......؟

کراچی سے کب روانہ ہوئے...... راستے میں کون کون سے مقام آئے...... سردی یا گرمی' اور اَب کہاں ہیں؟ نہ سوال نہ جواب' رات خاصی مشقت ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنی مستی میں مست پڑ چھتی پہ بچھے بڑے سے توشک پہ بیٹھا یا لیٹا تھا...... ایک دُوسرے کے ساتھ بھی اور الگ الگ بھی...... نماز' ایندھن یا کسی ضرورت کے تحت ٹرک کہیں رُکتا تو ہم سب نیچے اُتر کر پاؤں سیدھے کر لیتے...... پہاڑی راستے میں سرِراہ قسم کے ایک چھپر ہوٹل سے چائے کھانا بھی کیا...... چل سو چل' ایمبولینس میں مریض کو راستے' وقت' موسم وغیرہ کا کچھ احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ترنگ میں ہوتا اور سفر کا اپنا رنگ......؟

سرِشام ہم پہاڑی سڑک کے کنارے چند کچے پکے گھروں جھونپڑوں پہ مشتمل ایک گاؤں میں رُکے یہاں رُکنا شاید ہماری مجبوری بھی تھی۔ موسم کے تیور کچھ اچھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سڑک کی حالت بھی بڑی مخدوش تھی' دونوں اطراف دیووں جیسے سیاہ سر بفلک پہاڑ ویسے بھی مغرب کی نماز سر پہ آ گئی تھی گو ابھی اَذان میں کچھ وقت باقی تھا کہ مغرب کی اوڑھ شفق ہنوز کھلی پڑی تھی۔'' ہمارے میر کارواں جو ایک اَدھیڑ عمر بلوچی تھے نے رات اِدھر پڑاؤ کرنے کا حکم دے دیا......''

دُور دراز پہاڑی سلسلوں کے راستوں پہ ہوٹل' مساجد وغیرہ بس گزارہ ہی ہوتے ہیں۔ جب چاہو رُک لو کھاؤ پیو یا ستالو اور مسجد میں جو چاہے اور جب چاہے اَذان دے کر نماز پڑھ لو یا جماعت کرا لو یا وہیں لمبا پڑ کر آرام کر لو...... ایسی مساجد میں تکلفات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ دَر و دیوار' مینار و گنبد' وضو اور طہارت

گاہوں سے بھی بے نیاز ہوتی ہیں۔ میں نے جانا کہ جو خط و خضوری ایسی سر راہ مسجدوں میں نصیب ہوتی ہے وہ بڑی بڑی عالیشان مسجدوں میں دبیز قالینوں پہ اور بیش قیمت فانوسوں تلے حاصل نہیں ہوتی...... میں ابھی ٹرک کی اُوپر والی منزل سے نیچے نہیں اُترا تھا کہ میرے وجود میں اک ہلچل سی مچ گئی...... یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم کے اندر کی جانب سے مسام کھل گئے ہوں اور اُن میں سے کچھ خارج ہو رہا ہو۔ یکدم میرا دھیان گزری شب حجرے میں رقصِ اَبابیل کی جانب چلا گیا......"

رقص کے اختتام پہ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے ایک ایک کر کے تمام اَبابیلیں براستہ مرشد آباد میرے وجود ہی داخل ہو کر مساموں کے اندر سرایت کر گئی ہوں...... اک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ ایسی کیفیت بچہ جنتے وقت زچہ پہ طاری ہوتی ہے یا لاوہ اُگلتے سمے آتش فشاں کی ہوتی ہوگی...... دل کے پھپھولے یا دیدوں کے چھالے پھوٹتے سمے بھی شاید ایسی ہی حالت ہوتی ہو۔؟ میں اندر ہی اندر کراہ رہا تھا' لگتا تھا میرا سارا وجود پھوٹنے کو آ رہا ہے...... شاید اندر پھڑ پھڑاتی ہوئی اَبابیلیں باہر نکلنے کے لیے آپس میں دھکم پیل کر رہی تھیں...... میری حالت یوں ہوگئی کہ میں کسی لمحہ بھی کھٹی اُبکائی کے ساتھ ایک بڑی سی قے کردوں گا اس میں سے سینکڑوں اَبابیلیں نکلیں گی اور اِدھر اُدھر پہاڑوں میں پھیل جائیں گی۔"

حاجی فریاد علی نیچے اُتر چکا تھا اور مجھے بھی اُترنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ میں نے پیٹ پکڑ کر معذوری کا اظہار کیا تو وہ اُوپر چڑھ آیا۔

"کیا بات ہے پیٹ میں گڑبڑ ہے تو نیچے اُترو اور دائیں بائیں کہیں بھی فراغت کے لیے چلے جاؤ اور اگر درد وغیرہ ہے تو بھی نیچے اُتر لو...... تھوڑا سا ٹہلو گے تو طبیعت بہتر ہو جائے گی۔"

میں نے اپنی جانب غوطہ لگاتی ہوئی اَبابیلوں کی جانب اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے میرے اندر بہت سی اَبابیلیں پھڑ پھڑا رہی ہیں اور کہیں باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی ہیں۔ ڈر ہے کہیں باہر نکلنے کا کوئی غلط راستہ اختیار نہ کرلیں۔"

وہ بات کا مزہ لیتے ہوئے بولا۔

"فکر نہ کرو' ہمارے بابا کی پالتو اَبابیلوں کو داخل ہونے اور باہر نکلنے کے لیے کسی راہ راستے کی حاجت نہیں ہوتی...... تم اِدھر دھیان دینا چھوڑ دو' نیچے اُترو...... آج رات قیام اِدھر ڈھروت میں ہوگا......"

اَب کہاں کا پیٹ اور اَبابیلوں کی ریڈ؟...... میں تو فریاد علی کی اس بات پہ ہی پڑ کر رہ گیا...... "ہمارے بابا کی پالتو اَبابیلوں کو داخل ہونے اور باہر نکلنے کے لیے کسی راہ راستے کی حاجت نہیں ہوتی......"

سُبحان اللہ! بابا جی کی پالتو اَبابیلیں؟...... اَندر جانے اور باہر نکلنے کی بات بھی سمجھ نہ سکی۔ اُلجھی ڈور سلجھانے' اِس کا سِرا ڈھونڈنے میں اگر شتابی دِکھائی جائے اور ہاتھ کی اُنگلیاں اور پوریں بھی اگر ہُنر حنا، بندی اور دُوقوف سُجاؤ و سُلجھن سے تہی ہوں تو پشیمانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا...... مَیں کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ وہ مجھے نیچے اُتار کر دُوسرے کاموں میں جُت گیا اور مَیں ذرا پرے ہٹ کر' دُور خُوں رنگ منظر میں ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگا۔ ایسے ہی کہیں کبھی سُنا ہوا ایک شعر اُچھل کر سامنے آ گیا......

حُسن والے حُسن کا انجام دیکھ
ڈوبتے سُورج کو وقتِ شام دیکھ

کسی کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر چہرے پہ اک عجیب سا حُزن کِھل اُٹھتا ہے اور ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ اُسے زبردستی پکڑ دھکڑ کر آگ اور خون کے سمندر میں پھینکا جا رہا ہے...... یہ نظارہ کرنے والوں کے چہروں پہ بھی آگ و خون کے چھینٹوں کے عکس دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُدھر پانی اور دلدل میں ڈوبتے ہوؤں کو دیکھنے والے بڑی اُچٹتی سی نظر سے دیکھتے ہیں...... اُنھیں دیکھنا بھی کیا دیکھنا کہ دیکھتے ہی دیکھتے منظر کی بساط سے لڑھکا دیے جاتے ہیں۔ کچھ غیرت کے نام پہ ڈوب مرنے والے بھی ہوتے ہیں...... شرم و حیا میں ڈبکیاں لینے والے...... اور کچھ اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا جانے والے بھی پائے جاتے ہیں اور کہیں اہلِ ایماں صُورتِ خورشید بھی جیتے ہیں جو اِدھر ڈوبتے ہیں اور اُدھر پھر نکل آتے ہیں!...... کبھی کسی قلندر کی اَنچتی سی بات بھی بندے کو پانی پانی کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے...... کچھ یوں تنک تن غوآشی کے شائق بھی جو محض کسی گہری آنکھوں میں ڈوبنا پسند کرتے ہیں۔ جیسے اسی قبیل کے کسی شاعر نے کہا......!

تم سمندر کی بات کرتے ہو
لوگ آنکھوں میں ڈوب جاتے ہیں

لیکن میری دانست کے مطابق غروبِ آفتاب اور اپنے اندر ڈوبنے کی وارداتیں خاصی ڈونگی ہوتی ہیں۔ ظاہراً یہ زوالِ خورشید اور باطناً تحلیلِ نفسی کے "عام و خاص" واقعے ہیں لیکن یہ مادی و رُوحانی اور اَرضی و افلاکی قوتِ طاہرہ و قاہرہ کے مظاہر بھی ہیں جن کے مشاہدہ و مطالعہ کے بغیر تصوّف میں دستگاہِ کاملہ کا اِدراک مشکل ہے......!

میرے دیکھتے ہی دیکھتے سورج اپنے انجام کو پہنچ گیا...... سُرخی گہری سیاہی میں تبدیل ہوگئی۔ دِیا بُجھ بھی جائے تو کچھ تازہ تازہ سی ساعتیں نیم روشن رہتی ہیں۔ اسی طرح شمع' فروزاں ہو جانے کے بعد بھی چند چندی چندی سیاہیاں آس پاس لہراتی سی دکھائی دیتی ہیں۔" یک دم میرے جسم سے جیسے سیکڑوں بلبلے

چھوٹنے کو آئے ہوں' ہمیں ایک دو جھٹکے سے محسوس ہوئے اور مَیں خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اپنے پیروں پہ ہی ڈھے گیا۔ کوئی عمارت زلزلے سے زمین بوس ہو جائے...... کوئی درخت بجلی یا طوفان کی زد میں آ کر ٹوٹ پڑے...... کسی کی دستارِ فضیلت پاؤں پڑ جائے یا کوئی بے بس و بے نوا' کسی صاحبِ اختیار کے قدموں میں گر پڑے تو ایسی گری پڑی یا ڈھی چیزیں' بس ڈھائے کے پہاڑ سے یا ڈھائے کے علم کی طرح' بُرفسوں' بُرجنوں ہوتی ہیں۔ سر دھڑ سے علیحدہ ہو کر نیچے گر جائے تو بے جسم و جان ہو جاتا ہے!...... بیہوش' متحیّر' سرشار اور کسی نفسانی' ہیجانی' جسمانی اور روحانی کیفیت میں بھی یہی حالت ہوتی ہے کہ انسان' وقتی طور پہ اپنے مرکز سے کچھ دیر کے لیے ہی سہی علیحدہ ضرور ہو جاتا ہے۔''

یہی حالت میری تھی...... میں اردگرد سے بے نیاز وہیں ڈھیر تھا۔ شاید مَیں بھی اپنے مرکز سے وقتی طور پہ علیحدہ ہو چکا تھا۔ اِس کا اندازہ یوں ہُوا کہ مَیں ایک ننھی سی اَبابیل کی صُورت' دوسرے اَبابیلوں کے ساتھ جو میرے وجود کے آلنوں سے نکلی تھیں محوِ پرواز تھا...... جونہی ہماری ڈار دُور نزدیک پہاڑوں اور آس پاس کے ڈیروں کا چکر کاٹ کر اِدھر مسجد کے قریب سے گزری تو مَیں نے اپنے ظاہری جسم کو مسجد کی چٹائی پہ پڑے دیکھا۔ حاجی فریاد علی میرے ہاتھ پاؤں سہلا رہا تھا......!

فجر کی نماز کے بعد ناشتہ پانی ہُوا' تمام تَجام سنبھالا اور کارواں رواں ہو گیا۔ پچھلی رات کا کوئی قصّہ کہانی یاد نہ رہی...... کسی دُھندلی سی یاد کی طرح یا یاد نہ رہنے والے خواب کی مانند سب کچھ دُھندلکے میں اوجھل ہو چکا تھا' لیکن نہ جانے کیسے...... وہ پہاڑوں' ڈیروں' گھروں اور سرِراہ مسجد کے اُوپر والی پروازیں یاد تھیں جو مَیں نے دیگر اَبابیلوں کی سنگت میں اک ننھی سی اَبابیل کے پیکر میں کی تھیں...... ٹرک کے اُوپر والی منزل پہ چت لیٹا مَیں محسوس کر رہا تھا کہ میرا وجود پہلے کی طرح جل تھل ہے...... وہی بھاری پن' جو کراچی نوجوان بزرگ کے حجرے میں جلی ذکر اور رقصِ اَبابیل کے اختتام پہ محسوس ہوا تھا کہ تمام اَبابیلیں' بالواسطہ مرشد پاک' میرے وجود کے اندر' کہیں مساموں کے آلنوں میں گھس گئی ہیں۔ اَب اِس وقت بھی مجھے اپنے اندرون وجود کا ایک ایک مسام' اَبابیلوں کا آلنا بنا محسوس ہوتا تھا بلکہ یوں بھی لگتا تھا جیسے مَیں خود بھی اَز قسم ایک اَبابیل ہوں جو بوجہ اس کے اُڑان بھرنے سے معذور ہو اور دوسری انسان نما اَبابیلیں' مجھے کسی اَبابیل طبیب کے پاس لے جا رہے ہوں...... چت لیٹا انسان اُوپر آسمان اُوپر آسمان کو ہی صحیح سے دیکھ سکتا ہے۔ یہیں مجھے یکدم خیال آیا کہ میرا جبلی جانور تو کوّا ہے۔ یہ اَبابیل کہاں سے آ ٹپکے ہیں۔ کوّا دُور دُور دکھائی نہیں دیتا ہر جانب اَبابیل ہی اَبابیل ہیں سرِدست! اَبابیل ہی اَبابیل ہیں سرِدست! اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔

پہاڑوں کے بیچ کے سفر انسان کو پتھر کی مانند سخت کر دیتے ہیں...... اُس کے جسم کی طراوت ختم اور

رگوں میں خُون بھاری ہو جاتا ہے جبکہ بہاؤ معمول سے کچھ تیز...... مزاج میں قطعیت اور برداشت مضبوط ہو جاتی ہے۔ حقائق کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں رہتا۔ "صحرا بُردباری تحمل تدبر پیدا کرتے ہیں وسعت نظری اور وسوخ میں وقوف اُجالتے ہیں۔" سمندروں کے سفر یہ احساس دلاتے ہیں کہ انسان محض پانی ہی کی پیداوار ہے۔ مٹی آگ اور ہوا تو اسے محض چھو کر ہی گزرے ہیں۔ ہر شے پانی...... بلکہ اوپر آسمانوں پہ بھی پانی ہی پانی ہے کہ جب کہیں چھلک جائے تو بارش کی صورت ٹپکنے لگتا ہے۔

میرے طرح کے بڑے بڑے بدمغزے ہوتے ہیں جو دانستہ لمبے لمبے راستے اختیار کرتے ہیں کہ اُنھیں خوار و خراب ہونے میں بڑا حظ محسوس ہوتا ہے۔ خاص طور پہ سمندری سفر جو ہفتوں عشروں پہ محیط ہو ایک خبطی آوارہ گرد کے لیے جو اپنے اندر باہر سے پانی پانی ہو بڑی اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہوتا ہے۔ سمندری سفر ہی اس لیے کہ یہی ایک ایسا سفر ہوتا ہے جو مسافر کو اپنے اندر ڈبو کر پانی پانی کر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام سفر جو صحرا' جنگل' فضا' پہاڑ یا میدان میں طے کیے جاتے ہیں وہ اپنے گردونواح کے مظاہرات کی وجہ سے خاص نہیں ہوتے۔ "جنگل کے سفر منگل ہوتے ہیں جو سفر کی رُوح کو مجروح کرتے ہیں...... پہاڑوں کے اپنے پہاڑے ہوتے ہیں جو سفر کے مقصد و لُطف میں دراڑ پیدا کرتے ہیں جبکہ فضا کے سفر ہوا ہوائی ہوتے ہیں۔ خاک سے پاؤں اُٹھاتے ہی یہ پُتلا خاکی سا ہو جاتا ہے۔ بندۂ بشر کا بھرم ہی مٹی خاک سے بندھتا ہے ہوا فضا میں پہنچتے ہی اس ہوا سرک جاتی ہے۔ جسم و وجود دونوں ہی سبک ہو جاتے ہیں...... زمینی حقائق و علائق مفقود اور افلاک و آفاق سے خود بخود ہی ناتا جڑ جاتا ہے۔ مرگ و زیست اپنے معنوں میں ایک سے لگتے ہیں۔"

سمندر میں سفر سے یہ بھی آشکار ہوتا ہے کہ جب اس ارض پہ پانی ہی پانی اور جِن ہی جِن تھے تو کسی انسانی آنکھ کے دیکھنے کے لیے کیسے کیسے عجب مناظر ہوں گے؟ مجھ پہ کُھلا کہ انسانی کلبوت میں آگ و ہوا کی نسبت' پانی اور مٹی کا استعمال کہیں زیادہ ہوا ہے کسی بھی طور کی گل تیار کرنے کے لیے مٹی اور پانی ہی اس کی بنیادی ضرورت ہوتے ہیں پھر اس گل سے تخلیق کردہ کسی ظروف و ظرف کو پختہ کرنے کے لیے پہلے ہوا میں رکھ کر خشک کیا جاتا ہے پھر آگ دکھا کر اک مضبوط شکل دی جاتی ہے...... ہوا خشک کرنے کی خاطر اور آگ اُس کی پختگی کے لیے...... اصل بنیادی نسخہ مٹی اور پانی ہے جو وجہ ارض اور بشر ہے......؟

جن لوگوں کو کسی بھی طرح تہہ آب جانے کا اتفاق ہوا ہو وہ جانتے ہیں کہ وہاں کی دُنیا ہی کچھ عجیب ہوتی ہے۔ قُدرت و فطرت کی ایسی ایسی بوالقلمونیاں' رنگارنگیاں' نادر نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ بیساختہ مُنہ سے سُبحان اللہ! نکل جاتا ہے۔ اشرف المخلوقات' بلاشک حضرت انسان ہی قرار دیا گیا مگر اس کے ساتھ کچھ

اَرضی وسماوی جاندار بھی کم وبیش کچھ اِسی طرح کے اعزاز وخصائل کے سزاوار ٹھہرے! ایسے جانداروں کی نشاندہی کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کچھ اِشارے بھی دیے جیسا کہ مچھلیاں ہیں...... جنہیں قدرت نے ذبح کر کے پانی میں اُتارا ہے۔ واحد حلال وپاک جانور جسے حلال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اِسے ایسا خوبصورت اور نظر نواز بنایا کہ پہروں دیکھنے سے بھی جی نہیں بھرتا...... اِتنی اِقسام ایسے رنگ اور وضع قطع...... اُن کے حسین سراپے پیرنا لہرانا...... معصومیت شفافیت ایسی کہ اِنسان ہر دُنیاوی مشغلے سے اُکتا سکتا ہے مگر ماہی بینی سے نہیں...... انہیں سمندروں دیگر ساقط وروَاں پانیوں کی زینت...... اِنسانی حیوانی اعلیٰ درجہ کی غذا اور منفعت بخش ذریعہ معاش بنا کر اشرف کر دیا...... اُونٹ گھوڑا...... کبوتر اَبابیل بھیڑ بکریاں گائے بھینس اور مُرغابیاں بھی اِسی قبیل میں آتی ہیں یعنی جو جانور اِنسانیت کی بھلائی اور آسانی کے لیے اپنا بہترین کردار ادا کرتے ہیں اُن کے درجات بھی بہترین ہیں......!

اِک زمانہ تھا جب ہوائی جہاز کا سفر ہر کسی کے لیے اَرزاں اور اُس کی دسترس میں نہیں تھا۔ ہوائی جہاز صرف اُوپر آسمان پہ دیکھنے کی حد تک بھلا لگتا تھا۔ دُور دراز کے سفر ریل گاڑیوں اور دُوسرے دیسوں تک رسائی سمندری جہازوں کے ذرائع سے ہوتی تھی۔ نزدیک کے سفر چند دِنوں کی مار ہوتے تھے جبکہ دُور یعنی سمندر پار کے سفر ہفتوں عشروں پہ جا پڑتے......"

اُس زمانے کے جہاز بھی ایسے اللہ مارے کہ سمندر کی ذرا سی گڑبڑ سے ڈولنے بڈولنے لگتے اور مسافروں کی جان پہ بن آتی۔ تب مسافر بردار جہازوں کے علاوہ مال بردار جہاز بھی راستے کے مسافر لاد لیا کرتے تھے۔ اِن دیوہیکل تجارتی جہازوں کے علاوہ چھوٹی بڑی لانچوں دُخانی کشتیوں پہ بھی جائز ناجائز مال اور اِنسان اِدھر اُدھر ہوتے تھے۔ پاسپورٹ کا جھنجھٹ دُور سات سمندر پار کے ممالک کے لیے ہوتا تھا قریب وجوار کی مسلم ریاستوں اور ساحلی علاقوں کے لیے محض واقفیت تھوڑے سے پیسوں اور سخت جانی کی ضرورت ہوتی کہ اِن لانچوں اور مال بردار کشتیوں پہ جان مال آرام روزمرہ کی مناسب ضروریات اور عزتِ نفس کا کوئی تصور نہ ہوتا تھا۔ اِس قسم کے مسافروں میں زیادہ تر فوج اور سرکاری محکموں کے بھگوڑے چھوٹے موٹے جرائم پیشہ لوگ وافر روزی رزق کے متلاشی یا پھر میرے جیسے فقرے آوارہ مَنش کہ جنہیں جدھر کشادگی ملی اُدھر ہو لیے...... یعنی اِک جنون تھا۔ کو وہ سامنے ہوتے تو کوہ کنی کو جی کرتا...... بَن رُوبرو ہوتا تو بَن باس لینے پہ آمادگی ہوتی...... کوئی صحرا راہ پڑتا تو پاؤں کے نہفتہ چھالے بیدار ہو جاتے...... فضاؤں کی پہنایاں اَبابیل کی مانند اُچپت اور بیکراں سمندروں کے پانی مجھے ماہیٔ بے آب کی مانند نیم بسمل سا کر دیتے۔"

میری دیوانگی اور بے تابی اُس کے دیکھنے والی ہوتی جب میرے سامنے کوئی راہ کھلے یا پھر بند پڑی

ملے...... ہوا' روشنی اور بُو کی طرح 'مَیں ہر لحظہ کوئی ایسا روزن' راہ تلاش کرتا رہتا جدھر سے مَیں کہیں دُوسری جانب نکل پاؤں۔ کئی بار یُوں بھی ہُوا...... گھر سے خط پوسٹ کرنے بڑے ڈاک خانے کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ راہ میں ریل کا پھاٹک بند ہے کہ گاڑی' وزیر آباد کی جانب سرک رہی ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا کہ گاڑی دیکھتے ہی دماغ اُلٹ جاتا ہے۔ سُست رفتار گاڑی جونہی سامنے سے رینگتی ہوئی دکھائی...... کوئی طاقت مجھے دھکا دے کر گاڑی کی جانب اُچھال دیتی ہے اور مَیں گاڑی کے پائیدان پہ لٹک رہا ہوں...... ہوش تب آتا ہے جب مَیں وزیر آباد کے شنٹنگ یارڈ میں اُترا پڑا ہوں...... ہاتھ میں مُڑا تُڑا سا خط میرا منہ چڑا رہا ہے......؟ یہیں کھڑے کھڑے فیصلہ ہوتا ہے کہ لاہور کچھ دُور نہیں' چلو یہیں سے لاہور والی گاڑی پہ سوار ہو کر لفافے والے پتہ پہ خط دستی ہی پہنچا آتے ہیں۔ اَب یہ الگ بات ہے کہ وہاں پہنچ کر کس جانب منہ ہوتا ہے اور واپسی کب لکھی ہے؟...... اس قسم کی احمقانہ اور غیر ذمہ دارانہ حرکتوں سے زندگی بھری پڑی ہے اور شاید یہی کچھ متاعِ حیات بھی ہے۔ کسی کی متاع' مال و زر کے انبار اور کسی کے لیے کاٹھ کباڑ کا ڈھیر...... اپنی اپنی جستجو اور اپنا اپنا اندازِ طلب......؟

- بندہ نہ بندر' سُوئے سمندر......!

مجھے کسی طرح کراچی کے ایک فلمی پرچے میں' سب ایڈیٹر کے دُوسرے نمبر پہ مددگار کے طور پہ ملازمت مل گئی تھی۔ لاہور میں بھی اسی نوع کا کچھ کام کیا تھا۔ چائے پیسٹری لانا' سگریٹ پان مہیا کرنا ادھر اُدھر کے مختلف دفتری کام وغیرہ...... محتاط الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مَیں ذرا اُوپر درجہ کا دفتری چپڑاسی تھا۔ جسے سب پیار یا طنز سے شہزادہ کہتے تھے۔ اس ''عزتِ سادات'' کی بڑی وجہ مجید لاہوری تھے جو مجھے اسی نام سے پکارتے تھے اور اُنہی کی سفارش پہ مجھے یہاں یہ ''شہزادگی'' کی ملازمت ملی تھی۔ یہ ادارہ' شاید کراچی کا واحد آسودہ حال اشاعتی ادارہ تھا جو اپنے اہم بلکہ غیر اہم سٹاف کو بھی عین وقت پہ تنخواہ عطا کر دیا کرتا تھا جبکہ مجید لاہوری مرحوم کے ہاں کھانا' رہائش یا پنجاب آنے جانے کا کرایہ ملتا تھا۔''

اس فلمی پرچے کے مالک ایک بہت بڑے سیٹھ تھے۔ اصل کاروبار بصرے کی کھجوروں کا تھا۔ یہ رسالہ اُنہوں نے محض ''وقت پشوری'' کرنے کے لیے نکالا ہُوا تھا۔ بڑی دبنگ شخصیت اور تخیر کہ جو بھی منہ لٹکائے نوکری کی طلب میں پہنچ گیا جھٹ کہیں نہ کہیں کھپا دیا۔ جس کا ثبوت مَیں خود تھا کہ تعلیم تجربہ ال نہ کو کو! اور ایڈیٹر کے نیچے چوتھے نمبر کا اسسٹنٹ بنا دیا...... پچاس روپے تنخواہ' سیڑھیوں کے نیچے لکڑی کے ڈربے میں

رہائش...... کھانا پینا' دفتر کے سٹاف کے ساتھ...... واپسی کے پرچوں کی ردّی کا بونس...... اور کیا چاہیے تھا؟ کہ ہم واقعی شہزادے تھے......!"

ہماری جو بن آئی کہ ایک دن سیٹھ صاحب نے مجھے دوسری چند دفتری ملازمین کے ہمراہ کیماڑی جیٹی پہ بھیجا...... اِدھر اُن کی دو ملکیتی 'بصرے کی کھجوروں سے لدی ہوئی لانچیں پہنچی ہوئی تھیں۔ ان دو لانچوں کے علاوہ اُن کی دُخانی کشتیاں بھی تھیں جو کراچی' بلوچستان کے مختلف ساحلی علاقوں تک باربرداری کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ اس سے قبل میں نے لانچیں' دُخانی کشتیاں' سمندری جہاز وغیرہ دُور سمندر میں تو دیکھ رکھے تھے مگر قریب سے دیکھنے' اُن کے اندر جانے یا سفر کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی تھی۔ اَب جب مجھے یہاں کیماڑی بھیجا گیا اور بچشم خود میں نے لانچوں اور دیگر اردگرد کھڑی کشتیوں کو دیکھا تو اندر اک عجیب سی کھلبلی مچ گئی۔ یہیں کہیں اندر ہی اندر فیصلہ ہوگیا کہ اَب زمین کو خیرباد...... دوستی ہوگی تو سمندر سے۔"

کسی وجہ سے مزدوروں کی ہڑتال تھی۔ ملے جُلے ہم پندرہ بیس لوگوں نے کھجوروں کی گانٹھیں' لانچ سے نکالنی تھیں۔ کھجوری چھال سے بنے ہوئے بڑے بڑے گٹھے' وزنی' چپ چپے شیرے سے لتھڑے ہوئے۔ ہم اخباری لوگ' رنگین خوبصورت فلمی تصویروں والے رسالے چھاپنے والے بھلا یہ قلیوں مزدوروں والا کام کیسے سرانجام دیتے؟ بمشکل ڈیڑھ دو گھنٹے سر کے ہوں گے کہ سب کی چیں بول گئی...... لکھنے پڑھنے' قلم و قرطاس والے کتابی چہرہ لوگ' ہاتھ منہ کپڑے لباڑے ایک طرف بیٹھے ہانپ رہے تھے کہ ناگاہ سیٹھ صاحب اِدھر پہنچ آئے۔ ہم سب کی ایسی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو فوراً واپسی کا حکم سناتے ہوئے کہا۔

"میری غلطی کہ میں نے آپ کو اِدھر بھیجا...... یہ کام اُنہی لوگوں کا ہے جو ہڑتال پہ ہیں۔"

خدا جانے مجھ میں قوتِ رندانہ کہاں سے پیدا ہوئی؟ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"سیٹھ صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو کچھ دیر اِدھر ٹھہر لیتا ہوں مجھے جہاز اور کشتیاں دیکھنے کا بڑا شوق ہے یا مناسب سمجھیں تو اِدھر ہی مجھے کوئی منشی گیری کا کام سونپ دیں۔ انشاءاللہ! میں آپ کو کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ دفتر میں بھی تو میں بس یونہی ٹائم پاس کرتا رہتا ہوں۔ اِدھر کام کے ساتھ میرا شوق بھی پورا ہوتا رہے گا۔"

وقت کا اَمر تھا کوئی یا میری دُعا قبول ہوئی تھی۔ سیٹھ صاحب نے چند لمحے مجھے سرتاپا بغور دیکھا پھر قدرے ہچکچاہٹ سے مجھے اِدھر کام کرنے کی اجازت دے دی۔ ذرا دُور کھڑے کیپٹن' ہیڈ خلاصی اور دیگر عملے کو قریب بلا کر کچھی زبان میں کچھ ہدایات دیں اور مجھے اُن کے حوالے کر کے چلے گئے...... مالک کے حکم پہ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولے لیکن اُن کے جانے کے بعد مجھے یُوں تکنے لگے جیسے وہ میرے اَجزائے ترکیبی دریافت کر

رہے ہوں کہ اس کے انسانی اعضا ئر ز ے مکمل بھی ہیں کہ نہیں؟ پورا کون سا اور اُدھورا کون سا ہے۔ ایک نے تو میرے چھڑی نما بازو کو اُوپر کر کے ہلایا جھلایا' شانے کا جوڑ چیک کیا...... گھٹنوں کو ٹٹولنے کے بعد ہاتھ پاؤں کی اُنگلیاں گنی...... اپنی دو اُنگلیاں دکھاتے ہوئے پوچھنے لگا...... ''بولو بچہ! یہ کتنی اُنگلیاں ہیں؟''

ایک نانے سے خلاصی نے ایک ہی ہاتھ سے مجھے اُٹھاتے ہوئے میرا وزن چیک کیا...... غرضیکہ میری جنرل جسمانی جانچ پڑتال کے بعد اُنہوں نے مجھے سوالات کی زد پہ رکھ لیا...... نام' عمر' تعلیم...... جسمانی لاغری کی کوئی خاص وجہ...... ؟ ناچ گانے سے دلچسپی' تمبا کو نسوار سے رغبت...... تاش کے کتنے کھیل آتے ہیں؟ پیرنا آتا ہے...... غوطے میں کتنا دَم ہے؟ وغیرہ وغیرہ اور وغیرہ......؟

رات' اُنہوں نے میرے سونے کی خاطر انجن روم میں ڈیزل کے ٹینک کے نیچے جگہ بنائی تو میری ہنسی گم ہو گئی۔ چاچے خدا بخش ہیڈ مستری نے بڑا احسان دھرتے ہوئے بتایا۔

''بچہ! یہ وہی آئی پی بیڈ ہے ادھر نیا آنے والا پہلے پہلے یہیں سوتا ہے۔ سردی' سمندری ہوا اور زہریلے مچھر ادھر نہیں آتے' ڈیزل کی بُو انہیں دُور بھگائے رکھتی ہے۔''

ڈیزل ٹینک آہنی ستونوں پہ ٹکا تھا' اُس کے نیچے چوبی پھٹوں پہ ڈیزل سے بھیگا ہوا نمدا جس پہ گاہے گاہے تیل ٹپکتا رہتا...... انجن کا مسلسل شور اور اک عجیب سی تیل ملی دُھویں کی دھانس کہ سانس لینا بھی یوں کہ ڈیزل کی ہلکی سی چسکی لے لی ہو۔''

رات کا کھانا' ہم سب سٹاف نے لانچ کے عرشہ یعنی پہلی منزل کے چوبی فرش پہ بیٹھ کر کھایا...... چھوٹے جھینگوں کا سالن' شاید ڈیزل سے بگھارا ہوا تھا...... پیاز اور جھینگوں کے چھلکے اُوپر تیر رہے تھے' ساتھ کچے لہسن کی چٹنی...... البتہ روٹیاں تنور کی تھیں۔ چند لقموں کے بعد جو قے کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی برسوں کا کھایا ٹھونگا' سب سمندر بُرد ہو گیا۔ بعد کے تجربہ نے بتایا کہ پیٹ صفائی کے لیے سمندری سفر اور کھانوں سے بہتر اور کوئی علاج نہیں......!

خلاصیوں کی ہڑتال بدستور جاری تھی' مجھ سمیت سوا پندرہ خلاصی مسلسل تین روز تک بھرے کی کھجوروں کے بورے اُتار اُتار کر ہلکان ہوتے رہے۔ چوتھے روز ہڑتال کھلی تو ہم سب نے بھی سکھ کا سانس لیا...... اَب کھجوروں کے اُتارنے کا کام جیٹی کے خلاصیوں کے پاس چلا گیا...... لانچوں کے سٹاف کے پاس اَب فرصت ہی فرصت تھی۔ اَب مجھے یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ کسی وقت بھی دفتر واپس بھیج دیا جائے گا۔''

منگم نام کی یہ لانچ ایک چھوٹا سا جہاز ہی تو تھی...... تین منزلوں پہ مشتمل اس لانچ کی نچلی منزل میں انجن' تیل پانی کے ٹینک' سٹاف کے سونے آرام کی جگہ اور ورکشاپ تھی۔ اُوپر دو منزلوں پہ باربرداری کا سامان لادا جاتا جبکہ اُوپر عرشہ پہ ایک چھوٹا سا کرین' جس کے ذریعے کھجوروں کی گانٹھیں اِدھر اُدھر کی جاتیں۔ باہر سے یہ

لانچ چھوٹی سی دکھائی دیتی مگر اس کی وسعت کا اندازہ، اندر پہنچ کر ہی ہوتا تھا۔ ایک تین منزل عمارت کی مانند اس میں بڑی گنجائش تھی ...... ہماری لانچ سے ذرا چھوٹی دو اور بھی لانچیں تھیں۔ جب سب خالی ہو گئیں تو صفائی کا مرحلہ شروع ہوا تو انہیں یہاں سے ہٹا کر صفائی والی گودی پہ لا کھڑا کیا گیا۔ ادھر مرمت اور صفائی ستھرائی ہوتی تھی، کھجوروں کے گاڑھے شیرے کی صفائی بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ پھسلن سے پاؤں رپٹ رپٹ جاتے ...... شیرے کی ڈھلائی کا پانی لوگ، چمڑے کے مشکیزوں میں جمع کر کے لے جاتے۔ بتایا گیا کہ اسے تمباکو میں ڈال کر خمیرہ بنایا جاتا ہے۔''

ان چھ سات روز میں سمجھ میں آیا کہ سمندر میں رہنا یا اس کے قریب زندگی بسر کرنا کیسا ہوتا ہے۔ نمدار بوجھل ہوا، آبی پرندوں کی سیٹیاں چیخیں کرلاہٹیں ...... مچھلیاں، گھونگھے سیپیاں، جال سمندری کائی، مدّوجزر اور ہر وقت کی اک مخصوص باس ...... میں روز بروز خود کو نامحسوس طریقے سے اک کچھوے میں تبدیل ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا ...... دفتر کی دُنیا، اک خواب سالگتی تھی اور اس سے پچھلی زندگی، کہیں پچھلے جنم کی واردات ......!

مجھے ناخدوں نے شاید قبول کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے اپنائیت کا سلوک کرنے لگے تھے۔ اس عمل میں کچھ میری ناتوانی اور تحمل و تحمل کی چنداں فراوانی کا بھی عمل دخل تھا۔ میں ان کے روبرو مٹی کا مادھو نہیں تھا جو گھٹنے بھر پانی میں بھی ڈوب جاتا ہے، میں نے چند دنوں میں خود کو چوب کا وہ چپو ثابت کر دیا جو بھرے سمندر میں بھی ڈوبتا نہیں اور اپنے سے کئی ہزار گنا بڑی نیا کو کھیتا بھی رہتا ہے۔''

ایک صبح میں نے کچھ تبدیلیاں سی محسوس کیں ...... کریدنے سے معلوم ہوا کہ اگلے دو چار روز میں ہماری بڑی لانچ منگلم، مسقط، بحرین کی جانب روانہ ہونے والی ہے۔ کچھ تعمیراتی سامان اور مسالہ جات لوڈ ہونے کے لیے پہنچنے ہی والے ہیں۔ باقی دونوں کشتیوں میں ایک مرمت کے لیے رُکے گی، دوسری گوادر پہنچنی کے لیے مویشی بھرے گی۔ طبیعت میں بڑی کھد بھد مچی کہ اب تو دوبارہ دفتر جانا پڑے گا۔ دبی دبی زبان میں ہیڈ خلاصی چاچے نور محمد چانڈیو سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''چاچا! اب منگلم چلی جائے گی اور آپ لوگ بھی ......؟''

''ہاں، بچے! ہم سمندر کی مچھلیاں ہیں جو پانی کے اندر ہی اچھی لگتی ہیں۔ سمندر سے باہر ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے، ہم اداس ہو جاتے ہیں۔''

''چاچا! مجھے بھی سمندر بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی پانیوں سے دوستی کرنا چاہتا ہوں ...... کیا تم مجھے اپنے ساتھ سمندر کے دور دیسوں میں لے جا سکتے ہو؟ مجھے سمندروں کے کنارے، ان کے ناؤ، ان کے اندر ابھری چٹانیں، مدّوجزر موجیں، طلاطم خشکی! انہیں اندر قریب سے دیکھنے کی بڑی تمنا ہے۔''

وہ مجھے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''بچے! ابھی تم چھوٹے اور جسمانی طور پہ کمزور ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ سمندری ٹھنڈی نمدار ہوا سے تمہیں زکام ہو گیا ہوا ہے...... تمہارے پھیپھڑے ابھی ہلکے ہیں اور پھر تمہارے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ تو سیٹھ صاحب کے ہاتھ ہے میرے ہاتھ نہیں۔ ویسے میرا مشورہ یہی ہے کہ اُدھر سیٹھ کے دفتر میں کام کرنا تمہارے حق میں بہتر ہوگا......''

میں مایوس سا چپ ہو رہا...... قریب پندرہ کا سن ہونے کے باوجود خرابیٔ صحت کی بنا پہ بمشکل بارہ تیرہ برس کا لگتا تھا لیکن اس میں میرا کیا قصور؟ میرا تو رگ ریشہ ہی ایسا تھا...... میرا یہ دن اور اگلا روز بڑی کسلمندی اور مایوسی میں گزرا...... دانستہ میں کام سے منہ موڑ کر انجن روم اپنے ڈیزل کے ٹینک کے نیچے والے تختے پہ ماندہ پڑ کر لیٹ گیا۔ یہی سوچا' کل نہیں پرسوں بنجارے اپنا تام جھام سمیٹے کسی منزل کی جانب روانہ ہو جائیں گے...... میں انہیں دور تک دھند میں اُترتا دیکھتا ہوا اسی جگہ رہ جاؤں گا' پھر بدیر واپس دفتر بھیج دیا جاؤں گا۔ چلو جتنا بھی ہو سکے اس خوبصورت لانچ' منگم اور ان لوگوں کی رفاقت کی یادیں جمع کر لی جائیں۔ دونوں ہاتھوں کے تکیہ پہ سر ٹکائے' میں اُوپر ڈیزل کے بڑے سے ٹینک کو دیکھ رہا تھا۔'' یہ بتاتا چلوں کہ اس ٹینک کے بڑے سے پیندے میں اللہ جانے کہاں کوئی تریڑ یا سوراخ تھا کہ اک آدھ وقفہ سے ایک ننھا سا قطرہ ٹپکتا...... بندہ سیدھا لیٹا ہو تو عین دل کے مقام پہ' اور اگر کروٹ پہ یا اوندھا ہو تو جگہ بجگہ کے مطابق گرتا۔''

ہیڈ مستری خدا بخش' جو اسی جگہ لگ بھگ پندرہ برس سے لیٹ رہا تھا' نے بتایا۔ کئی بار ہم نے سوراخ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ نہ ہم نے اُدھر لیٹنا چھوڑا اور نہ وہاں سے ٹپکا ؤ بند ہوا...... اب ایسی عادت پڑ گئی ہے سوتے سمے اُوپر سے قطرے نہ ٹپکیں تو کھل کے نیند ہی نہیں آتی۔''

بدھی مان کہیں کہتے ہیں' کسی سوئے ہوئے انسان کی ظاہری حالت یعنی جسم' سر چہرے' ہاتھوں' ٹانگوں پاؤں کے انداز دیکھ کر اس کے ظاہر باطن' اخلاق و اعمال کے مختلف پہلوؤں پہ خاصی روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ بالکل سیدھے لیٹنے والے حقیقت اور عجلت پسند ہوتے ہیں اور اگر ہاتھ بازو بھی سیدھے کھلے چھوڑ رکھے ہوں تو یہ مندرجہ بالا صفات کے ساتھ غیر معمولی استعانتوں کے مالک بھی ہو سکتے ہیں...... پہلو جانب اور گال تلے ہاتھ دبا کر سونے اور وقفہ وقفہ مسکراہٹ بکھیرنے والے' رجعت پسند خیالوں خوابوں میں بسنے والے تخلیقی لوگ ہوتے ہیں۔ ٹانگیں گھٹنے اُٹھا کے نیند کا مزہ لینے والے محنتی' ہنرمند' اعتماد کرنے والے جبکہ منہ پھاڑ کھولے' اُلٹا پڑ کے سونے والے' اکثر بیمار' بیکار' مخمش اور سست الوجود لاشیں ہوتی ہیں۔''

میں اس وقت سیدھا لیٹا ہوا ڈیزل ٹینک کے نیچے پیندے پہ نظریں ٹکائے' لاشعوری کیفیت میں پڑا

تھا۔ ایسے ہی جیسے کوئی ہجر کا مارا کھلے آسمان تلے پڑا تارے گن رہا ہو۔ اچانک میری نظریں ساڑھے چار فٹ اُوپر چینڈے پہ مٹے اَنمٹے حروف سے آشنا ہوئیں تیل' گریس یا کالے مارکر سے کچھ نام' ناموں کے پہلے حرف' رَوائتی دِل اور تیر' نامکمل مصرعے' آنکھیں اور غیر واضح سے چہرے بھی...... جُوں جُوں توجہ سے دیکھتا گیا میری دلچسپی دوچند ہوتی گئی۔ نیم اندھیرے کی بنا پہ سب کچھ صاف دکھائی تو نہ دے رہا تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ سُوجھ میں آ رہا تھا کہ اِدھر لیٹنے والے' لمبے سمندری سفر کے دَوران مَن پر چانے کے خاطر اس چینڈے کو اپنا تختۂ مشق بناتے ہوں گے۔ جیسے بندی خانے کی دیواروں پہ' کچھ حرماں نصیب اَسیر' اپنے نہ کٹنے والے وقتوں سے آشنائی کی رُوداد...... اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کا حساب کتاب یا کسی کی وفاؤں اور جفاؤں کی کہی اَن کہی کہانیوں کے اشاریے لکھنے کے طریقے ڈھونڈتے ہیں......"

بندے نے کمیٹی ڈالی ہو تو اس کے نکلنے کے انتظار میں بڑی عجیب وغریب حرکتیں کرتا رہتا ہے' وقت گزاری اس کے لیے اصل مسئلہ ہوتا ہے۔ اسی طرح شادی کے بعد اولاد کا انتظار' سفر کے دوران منزل کی تانگ یا امتحان کے بعد نتیجہ کی فکر...... میرا اندازہ تھا اس جگہ لیٹنے والے یقیناً ایک سے زائد لوگ ہوں گے کہ اِدھر مختلف ہاتھوں کی نامکمل تحریریں اور تصویریں تھیں...... تنہائیوں' خاموشیوں کے اَسیر' ظاہری عقوبتوں سے ایسے خائف نہیں ہوتے جتنا کہ وہ اپنے باطنی اکاپے سے عاجز ہوتے ہیں۔ ایسے مقہور ومجبور جینے اور نہ مرنے کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن جو اَندر کے اندھیروں سے جگر جگر ہوتے ہیں اُنھیں باہر یا ظاہر کے اگر ومگر سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا کسی سمندر کی مانند شانت و مانت' وہ وقت کے چنگل میں نہیں بلکہ وقت اُن کی مٹھی میں ایک اَبابیل کے بچے کی صورت دُبکا پڑا ہوتا ہے۔"

انجن رُوم کی دُھندلی روشنی ہر شے ڈیزل سے چپڑی اور دُھویں سے دَھانسی ہوئی۔ انجن کا بے ہنگم شور' لہروں موجوں کی تڑپ تڑپ...... یہاں ڈیوٹی دینے والے یا لیٹنے سونے والے اِدھر کے تیل پانی' میکانکی نظام' ماحول کا ایک حصّہ بن کر ہی تو رہ جاتے ہیں۔ ان کے احساسات' جذبات اور بشری تقاضے رَویے بھی آہنی اور آبی صفات ہو جاتے ہیں۔ بچے لوہے کی پختگی' لچک بھی اور پانی جیسی خود سپردگی اور تحمّل بھی۔ لوہا لچک لے لے گا مگر ٹوٹنے میں حیا کرے گا جبکہ پانی کو کسی بھی پیمانے میں ڈالو تو وہ وہی صُورت وحالت اختیار کر لیتا ہے۔ سمجھ میں آیا کہ جہاز ران' مانجھی' ملاح بھی خاک آب و آہن کا اِک 'ملا جلا رُوپ ہوتے ہیں......؟

مَیں ایک طرح کے احتجاج یا خاموش سی بغاوت کے مُوڈ میں اِدھر آ پڑا تھا۔ مَیں اپنے پاؤں تلے کی پکّی مٹی چھوڑ' بہتے گہرے پانیوں کی پنہائیوں میں اُتر جانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جیسے بندہ ثقیل غذا لینے کے بعد پانی پینا چاہتا ہو...... لوہے لکڑی کی چھوٹی بڑی کشتیوں کو پانیوں پہ تیرتے ہلکورے لیتے دیکھتے طبیعت بڑی شاد

ہوتی' اندر سیلی سیلی تازگی سے بھیگ جاتا۔ مچھلیاں' سیپیاں' گھونگے اور دیگر آبی دُنیا تو میرے سُہانے خواب تھے۔ جن کی سہانی تعبیر دیکھنے کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔''

بارش سے شرابور ایک دن اور آگے سرک گیا کہ کالی اُودی گھٹاؤں نے آسمان پہ خوب ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اس طرح سامان کی لدائی چڑھائی میں وقتی طور پہ رکاوٹ تو پیدا ہو گئی تھی لیکن میرے لیے خوشی کا باعث بھی بنی کہ اس طرح دو چار روز مزید اِدھر عیاشی مارنے کی گنجائش نکلتی دکھائی دے رہی تھی...... بارش' زمین پہ برسے یا سمندر پہ' خوب دھماچوکڑی مچاتی ہے۔ ہر جاندار جی جان سے خوش ہو لیتا ہے۔ کاروبارِ حیات بارے محسوس ہونے لگتے ہیں' اک سُہانی سرمستی' کسی کنج میں پڑے ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے۔'' گانے گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ بارش' بام مینا سے قطرہ قطرہ ٹپکتی ہوئی شراب ہی تو ہوتی ہے...... شراب اُلنا دیں تو بارش برسنے لگتی ہے جو بارش اُلنا دو تو شراب ٹپک پڑتی ہے۔ ویسے تو یہ سب کچھ کسی قدح کش کے شغلِ شُرب' تہذیب' تخیل یا اندر باہر سے شرابور کسی مستِ اَلست دیوانے کی باطنی فرزانگی پہ منحصر ہوتا ہے۔ لفظ شرابور میں بھی تو پہلے شراب ہی چھلکتی ہے۔؟

بات بندرگاہ کی بارش سے شروع ہوئی تھی۔ بھیگتے بھیگتے ایسی آگے بڑھی کہ بات سے بتنگڑ بن گئی...... گیلی لکڑی خوب دُھواں پھیلاتی ہے اور بھیگے کپڑے تو بندے کا کچومر نکال کر رکھ دیتے ہیں...... سیلی دیا سلائی سیاپا ڈال دیتی ہے۔ گیلا اناج آٹا' چوکر بن جاتا ہے۔ بھیگی رُت یا رات' کسی نوجوان کے چہرے پہ بھیگی مسوں کی پہلی فصل کا فسوں' طبیعتوں میں فشار پیدا کر دیتا ہے۔ بھیگی بلّی' نیوبا اور سَنی بناحد بے ضرر ہو کر رہ جاتے ہیں...... بھیگی آنکھیں' بھیگی سانسیں اور بھیگا بھیتر' بھیگا تیتر' بھیگے اوڑھنے رنگ گھولتے ہیں بھید والاں دے کھولتے ہیں...... اہلِ علم و ہُنر خوب ادراک رکھتے ہیں کہ سُر کی گرہیں جب تک نہ بھیگیں' سُروں میں رچاؤ پیدا نہیں ہوتا...... اسی طرح آواز اور ساز میں بھی سوچ اور لوچ' اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب اپنے اپنے باج میں بھیگ جاتے ہیں۔ رجز اور بحر' وتر کھائی گل کی مانند' جس پہ گیلی بوری پڑی ہوتی ہے...... جو اپنے کوزہ گر کے ہاتھوں مشرّف بہ مشیت ہونے کی منتظر ہوتی ہے۔ بہر حال' کہیں بھیگنا' مصیبت اور کہیں بہجت۔ اِدھر بارش کی شرابوری دوسروں کے لیے پریشانی اور میرے لیے شادمانی تھی...... خلاصی فرصت پا کر' شہر کی طرف یا دوسرے ہم پیشہ لوگوں کے ڈیروں یعنی لانچوں' جہازوں پہ چلے گئے تھے۔ ایک آدھ چوکیدار اور میرے علاوہ کوئی بھی اِدھر نہ تھا۔ مجھے اِدھر لانچ میں چھوڑنے کی وجہ شاید میری کمزوری' کم عمری اور دفتری ملازم ہونا بھی تھی جبکہ مَیں چاہتا بھی یہی تھا......''

## ● شاخِ خشخاش اور برگِ حشیش......!

بوڑھا کچھی جلمدار چاچا' ہمارا چوکیدار' باورچی' حکیم اور بینک بھی تھا۔ سمندروں' ساحلوں' طوفانوں' اچھے بُرے انسانوں' صبر' شکر اور جاں گسل محنت مزدوری سے اس کی پرانی آشنائی تھی جبکہ عملاً اس لانچ کا حقیقی ناخدا بھی وہی تھا۔ دو چار بار جب میں نے اُس کے منہ سے منگھم کی بجائے منگی اور نسوار کے لیے ملنگی کے الفاظ سُنے تو مجھے تعجب نہ ہوا کہ کچھی لوگ اکثر الفاظ اپنے انداز میں بگاڑ کر بولتے ہیں۔ آج جب وہ انجن روم میں نیچے فرش پہ بیٹھ کر نسوار کوٹنے کی تیاری کرنے لگا تو میں اپنی نشست سے اُٹھ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دیکھیں کہ سمندری نسوار کس طرح تیار کی جاتی ہے اور اس میں کتنی قسم کے زہر استعمال کیئے جاتے ہیں؟......
حقّہ تازہ کرنا' چلم تمباکو آگ کی تیاری...... چرس چانڈو کی چُسکی کے لیے کلیان کی صافی بھگو کر اس کی تہہ داری کرنا۔ مے نوشی کے لیے' لوازمات کا اہتمام! برگِ حشیش کی ٹھنڈیائی میں چار مغز' بادام' خشخاش دانے' سبز الائچی' سونف وغیرہ کی اضافت...... افیون چنیدنی کے لیے نازک سی پیالی' آبِ مصفا یا آبِ بادیان' شاخِ خشخاش سے گھولائی اور زعفران کی چٹکی...... زہروں کے زہر کچے خشخاش ڈوڈے کی "زہر دائی"...... مارِ سیاہ اور عقربِ سیاہ سے زبان پہ ڈسوانا...... پاؤں کے انگوٹھوں کی جڑوں میں' دھتورا کے زہریلے پانی میں بھیگے ہوئے خارپشت کے کانٹوں سے کچوکے لگانا وغیرہ...... معلوم ہوا کہ نشیات کے تلذذ میں ڈوبا ہوا مورکھ منش' اپنے مصنوعی اور وقتی کیف کو دو اور سہ چند کرنے کی خاطر کیا کیا طریقے اختیار کرتا ہے...... لیکن پھر بھی وہ کسی مقام پہ مطمئن نہیں ہوتا اور بالآخر اپنے آخری مقامِ مدفن پہ پہنچ کر ہی اس کی نشوں سے جان چھوٹتی ہے......!

نشہ' علت چھوٹی سطح کی ہو یا بڑی کی دونوں ہی نقصان دہ ہوتی ہیں...... کچھ احمقوں کی جنت میں کرائے پہ رہنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ کھانے کے بعد ایک آدھ سگریٹ...... واڑھ کے درد کے لیے نسوار رکھ لینا یا ساغرِ صدیقی کے عرس کے موقع پہ دو چار کچے سگریٹ پی لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا...... جبکہ ہماری اکثر شادیوں پہ اگر دولہا کے دوستوں کو علیحدگی میں شراب اور چرس فراہم نہ کی جائے تو دولہے کو بُرے ذوق کا بدذوق' مکھی چوس' بلکہ ایک طرح کا نامرد سمجھا جاتا ہے۔ کیا قیامت ہے عام آدمی تو ہے ہی عامی' اکثر جید علماء کرام' مدرس اور مولوی حضرات' حقّہ' نسوار بے دردی سے استعمال کرتے ہیں۔ "ستر پچھتر فیصد فوج' پولیس اور دیگر سرکاری محکمے' اسی علت میں مبتلا ہیں۔ مزدور ڈرائیور حضرات کی تو یہ نشے' نسوار مجبوری ہیں۔ تبلیغی اجتماعوں میں تنبیہ کی جاتی ہے کہ نسوار تمباکو اپنے ہمراہ نہ لائیں۔ اس کے باوجود تلاشی کے دوران' نسوار کی پڑیوں' سگریٹوں

کے پیکٹوں ماچسوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ جنہیں تلف کرنا بھی اِک الگ مسئلہ بن جاتا ہے...... ستر فیصد
سے زائد وہ طبقہ جو فنونِ لطیفہ سے وابستہ ہے اِسی خانہ خرابی میں مبتلا ہوتا ہے۔ کیا شاعر کیا اَدیب...... مصوّر'
مغنّی' رقاص' پینٹر' اداکار...... اِنہی نشوں میں پھنسے رہتے ہیں اور آخر ایک دن ہسپتال میں پڑ کر' حکومت سے
مفت علاج کی اپیلیں کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو اکثر باقیماندہ کی شکلیں' آنکھیں' چہرہ اور دانت زبان دیکھ
لیں۔ شراب' چرس' تمباکو' نسوار اور بداعمالیوں' بے راہرویوں کی پوری سٹوریاں پڑھنے کو مل جاویں گی...... آہ!
اِن علتوں نے ہمارے کیسے کیسے نابغۂ روزگار ہیرے' موتی' قیمتی اثاثے ہم سے چھین لیے...... اکثر بھری جوانی
میں ہی درمیان سے اُٹھ لیے۔ کچھ خودکشی' قتل کی حرام موت مر گئے...... اور کئی ہسپتالوں میں کام آ گئے۔ چند
ایک کو چھوڑ کر' باقی کوئی ایسا نہیں تھا جو فطری موت سے ہمکنار ہُوا ہو۔؟

تُرکوں کی بابت مشہور ہے کہ وہ تُرک ہی نہیں جو تمباکو کش نہ ہو۔ میری مشاہدہ میں بھی یہ بات آئی۔
اِن کے بعد بنگالی' عربی' مصری اور امریکن...... لیکن نسوار کے معاملے میں اپنے پٹھان بھائی ریکارڈ پہ ہیں۔
سندھی' بلوچ' مکرانی اور اَب پنجابی بھی نسواری بنتے جا رہے ہیں۔ جدھر تمباکو سے متعلق کوئی کارکام ہو رہا ہو
وہاں کام کی نوعیت کے مطابق' تمباکو کی بُو بُری طرح پھیلی ہوتی ہے۔ وہاں کے کارندوں کو تو محسوس نہیں ہوتی
لیکن اُدھر پہنچنے والے کسی نئے آدمی کے تو نتھنے اُدھیڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خاص طور پہ اُن کا تو ناس مارا جاتا ہے جو
تمباکو سے کسی طور نفریں ہوتے ہیں۔ اَب کیا کہیے کہ میرا اشمار بھی اینٹی سموکنگ والوں میں ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ
میرا اَپاپا پاک رہا اور کبھی اِس کے قریب نہیں پھٹکا۔ زندگی کے ایک ناآسودہ سے دَور میں مَیں بھی اِس کے چنگل
میں بُری طرح جکڑا گیا تھا۔''

دیکھا ہے کہ کوئی اچھائی بُرائی' عادت' خُوخصلت خود بخود پیدا نہیں ہو جاتی۔ کوئی نہ کوئی دوست' ماحول'
صحبت یا حالات ایسے ہوتے ہیں جو اِنسان کو بھلی بُری راہ پہ ڈال دیتے ہیں۔ شروعات ہمیشہ ہلکے پھلکے انداز
میں ہوتی ہے۔ تجربہ کے طور پر نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے کہ اِنسان میں تجسّس کا مادہ اُسے اُکساتا
رہتا ہی یا پھر کوئی واردات ایسی ہو جاتی ہے جو اُسے اِک دلچسپ سی حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اِک ایسی ہی
''واردات'' میرے ساتھ بھی ہو گئی تھی۔ رگوں میں سُرخ ذرّات والا خُون ٹھاٹھیں مار رہا ہو تو بندے کو دکھائی
دینے والی ہر چیز سُرخ ہی دکھائی دیتی ہے۔''

لگ بھگ ساڑھے چار دہائیاں پہلے' مَیں اور جمیل الدین عالی' ماسکو ایئرپورٹ کے ٹرانزٹ لاؤنج
میں بیٹھے' ملکی حالات پہ تبصرے کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ دو بنگالی اخبار نویس بھی تھے۔ ہم سب کی منزل
لندن تھی۔ اُس زمانہ میں کراچی سے لندن جانے کے لیے ماسکو' استنبول میں ری فیولنگ اور سروس کے لیے رُکنا

پڑ جاتا تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مسافر لاؤنج میں ناشتیں کھول لیا کرتے تھے اور کچھ ٹیکس فری شاپس میں ''ونڈو شاپنگ'' کرتے۔ اخبار نویسوں میں یہ سدا کی خرابی ہوتی ہے کہ وہ کہیں بھی ہوں' اندر یا باہر' اوپر یا نیچے' دائیں یا بائیں' باتیں بے حساب کرتے ہیں۔ بحث اور حجت تو ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے جبکہ موضوع اکثر سیاست ہی ہوتا ہے اور اگر سوئے اتفاق ان میں ایک بنگالی ہو اور دوسرا اہل زبان ہو تو وہ کتر کتر کی قینچیاں اور چھریاں چلتی ہیں کہ تو بہ ہی بھلی......!

دیکھا گیا ہے جد ھر اخبار نویس' شاعر' ادیب' کسی طرح کے بھی اہل ہنر وفن اکٹھے ہوں گے وہ خاموش یا بے ضرر نہیں بیٹھ سکتے۔ کوئی نہ کوئی گرما گرم موضوع' لایعنی سی بحث و تکرار ان کے زو برو رہے گی۔ ''حرف ولفظ' موضوع ومخاطب کی ان کے ہاں کمی نہیں ہوتی...... دماغ مزاج بھی گرم انگارہ! افہام وتفہیم' تحمل برداشت تھر کتا پارا! نتیجہ یہ کہ اک معرکہ بپا رہتا ہے۔ لگتا ہے دیر بدیر ایک آدھ کھیت ہو رہے گا۔ مگر! یہ پڑھے لکھے زیرک لوگ' انتہائی شریف اور اندر سے ازحد ڈرپوک اور بے ضرر ہوتے ہیں اس لئے مرنے مارنے کی نوبت نہیں آتی۔ چائے کی پیالیاں اور گلاس خالی اوندھے اور کئی ایش ٹرے مسلے ہوئے سگریٹوں کے ٹوٹوں سے بھر جاتے ہیں۔'' میرے دور میں' ریڈیو ڈرامہ والے اور اخبار نویس' صحافی ہوتے تھے۔ اب ٹیلیویژن کے اینکر' ہوسٹ اور دیگر کار پرداز ہوتے ہیں...... الیکٹرونک میڈیا کی بلا کی سمارٹ مخلوق؟ جو کئی کئی ''ایم اے'' پاس ہوتے ہیں۔ یہ چائے کافی خانوں کی فضول سی میزوں پہ بیٹھنے والے اپنا دماغ اور وقت ضائع کرنے والے نہیں ہوتے۔ یہ پرانے صحافیوں والا کام اپنے صبح اور گئے رات کے پروگراموں میں بحث مباحثوں' لطیفوں چٹکلوں' کھانوں سجاوٹوں کی ترکیبیں بتاتے سنانے میں کرتے ہیں۔'' چائے خانوں اور ہوٹلوں کا کلچر اب ناپید ہو چکا ہے اور نہ ہی اب پہلے سی ادبی سرگرمیوں' بیٹھکوں اور مباحثوں مشاعروں کا چلن رہا ہے۔ اب تو سب کچھ الیکٹرونک میڈیا' اکیلا ہی کر لیتا ہے۔''

مباحث' ادبی جھگڑے' مشاعرے' کتابوں کی رونمائیاں...... کانفرنسیں' سیمینار اب کہیں خال خال دکھائی دیتے ہیں...... مگر بے جان سے.. جیسے اصل روح رحمت سے خالی ہوں۔ لائبریریاں اب صرف سرکاری سطح پہ ہی کہیں دکھائی دیتی ہیں۔ عوامی سطح پہ ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔'' ہمارے وقتوں میں' تجربہ کار منجھے ہوئے صحافی ہوتے تھے...... جنہوں نے پڑھا لکھا بھی اور سینہ بہ سینہ بھی حاصل کیا...... پھر کسی ادارے سے منسلک ہو کر تجربہ بھی حاصل کیا۔ اخلاص محنت سے کام کیا اور نام پیدا کیا۔'' اب شاید ایسا نہیں ہے...... پہلے ادارے' تربیاں اور علم گاہیں ہوا کرتی تھیں...... اب ادارے' ظاہریت' نام نمود اور بے عملی بے راہ روئیوں کے گہوارے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے نرسری ہوگی اُدھر کی مصنوعات بھی ویسی ہی ہوں گی......'' بات ہو رہی تھی ماسکو ایئرپورٹ کے لاؤنج

کی' جدھر جمیل الدین عالی' مشرقی پاکستان کے دو اخبار نویس اور مَیں' دوسرے مسافروں سے علیحدہ ایک طرف بیٹھے بحث رہے تھے۔

دُوسرے دو بنگالی صحافی جو ڈھاکہ اور سلہٹ کے اخبارات سے منسلک تھے عالی صاحب سے بحث میں شامل تھے۔ تجربہ نے بتایا کہ بنگالی' پہلے بنگالی ہوتا ہے۔ مسلمان' پاکستانی' آدمی' اِنسان اچھا بُرا' صحافی یا لیڈر' ایکٹر یا موسیقار...... خواجہ ناظم الدین یا مجیب الرحمٰن' رابندر ناتھ ٹیگور یا نذر الاسلام جو بھی ہو وہ بعد میں ہوتا ہے۔ بنگالی کہیں بھی ہوگا' کھائے گا بھات ماچھی ہی' جبکہ پان پتہ اور بیڑی بھی بنگلہ کے ہوں گے...... ڈھاکہ کی ململ اور سری ٹوپی بھی وہیں کی۔"

مَیں چونکہ کسی بھی طور اِن کی سطح کا بندہ نہ تھا لہٰذا اِن کے سامنے ایک آرام دہ سے کاؤچ پہ دھنس گیا۔ بحث اور کج بحثی' کسی پیار محبت کے موضوع پہ بھی ہو تب بھی کھلتی ہے۔ یہاں تو اوّل تا آخر سیاست ہی سیاست تھی اور پھر جس موضوع سیاست میں بنگلہ دیشی ٹچ بھی شامل ہو اس سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے کہ بندہ' اُستاد بندو اُمراؤ خان کے الاپے ہوئے کسی خیال کو اپنے خیال میں لا کر الاپ لے...... سو مَیں اُن سے ذہنی طور پہ کٹا ہوا اِدھر اُدھر نظر بازی میں مشغول ہو گیا۔"

رُوس' سیاہی چُوس...... رُوس' بڑا منحوس...... رُوس' پکا دیوث...... رُوس کو اُلٹا پڑھو تو زبان سے ادا کرنے میں تامّل ہوتا ہے۔ بچپن میں ہم رُوس کے بارے میں یہی کچھ دُہرایا کرتے تھے۔ کئی بار اِدھر آنے کے باوجود' اس رُوس سے اپنی بن نہ پائی۔ مجھے متعدد بار اس کے جہازوں میں سفر کرنے کا اِتفاق ہوا لیکن کبھی بھی مَیں نے سفر کو انجوائے نہیں کیا۔ امریکن' یورپین جہازوں کی نسبت رُوسی جہاز اِنتہائی دَرجہ بھونڈے' بے آرامے اور بے سہولتے ہیں۔ لگژری نام کی کوئی شے اِن میں نہیں ہوتی۔ یہی حال اس کی ٹرینوں' موٹر کاروں اور دیگر کمرشل گاڑیوں کا ہے۔ عوام' اُن کی بُود و باش' رَوِیّے اور سوچ و فکر پہ وہی رُوسی چھاپ لگی ہوئی۔ بلڈنگز' میوزیم' ریلوے اسٹیشن' ہوائی اڈّے' آرٹ گیلریز' یونیورسٹیاں...... ایک ایک ذرہ کمیونزم کے سانچوں میں ڈھلا ہُوا!

ایئرپورٹ اور اِس کا ٹرانزٹ لاؤنج' ڈیوٹی فری شاپس اور وہاں پڑا ہوا سامان' وہاں کا سٹاف' عجیب سا رُوکھا سُوکھا' بے حِس اور مجسم بے اعتنائی...... سردی اور برف باری اپنی اِنتہا پہ تھی۔ ماسکو ایئرپورٹ' دیودار صنوبر کے جنگلات سے شروع ہوتا ہے۔ لینڈنگ کے وقت یوں لگ رہا تھا جیسے جہاز ایمرجنسی میں کسی برف زار میں اُتر رہا ہے۔ لاؤنج میں سٹاف نے بھی ایسی گرم پوشاکیں' یونیفارم لانگ شوز اور سمور کی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں جیسے وہ ایک انٹرنیشنل ایئرپورٹ پہ نہ ہوں' حالتِ جنگ کی حالت میں سٹالن گراڈ کے محاذ پہ ہوں...... لمبی تڑنگی' سیب کی مانند سرخ دَہکتے رُخساروں والی رُوسی مہلائیں' قلب و نظر میں تازگی کا سبب تو بن رہی تھیں مگر

اُن کی آنکھوں اور رویّوں میں ہم پاکستانیوں کے لیے جذبۂ خیر سگالی یا مروّت و محبت کے دیے روشن نہ تھے اور نہ ہی ہم غریب الوطن مسافروں سے کسی نے جھوٹے منہ سے مہمان نوازی کی مد میں کسی چائے پانی کا پوچھا۔؟

اچانک اعلان ہوا کہ پی آئی اے کی لندن ہیتھرو روانہ ہونے والی پرواز ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پہ مزید دو گھنٹے لیٹ ہو جائے گی...... مرے کو مارے شاہ مدار! ایسے بیہودہ بانجھ ایئرپورٹ پہ پہلے ہی بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا اب مزید دو گھنٹے یا اس سے زیادہ انتظار!...... سامنے تینوں چاروں کالے چٹے تکوڑا اپنی کج بحثی جنگ میں جٹے ہوئے تھے۔ تاش شطرنج اور بحث میں 'جتنا' ہو ہر کھلاڑی اپنے اپنے انداز میں شاطر ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اُنہوں نے تاخیر کا اعلان سُنا ضرور مگر اس پہ کسی اچھے بُرے ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر پھر آپس میں بھڑ گئے...... میں نے تو اتنی بھی دلچسپی نہ لی تھی کہ یہ تک جان سکوں وہ آخر کس مسئلے میں پھنسے ہوئے ہیں؟...... سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں' تمتماتے ہوئے چہرے' کھنچی ہوئی رگیں اور جوش و خروش کا یہ عالم' لگتا تھا کہ یہیں ایک آدھ ہسپتال میں پہنچ جائے گا۔"

مزید گھنٹہ بھر یہی عالم رہا' اب پیٹ بھی کچھ سوال کرنے لگا۔ ذرا پرے بائیں جانب ایک ریسٹورنٹ دکھائی تو دے رہا تھا مگر وہی کہ اگر جیب اجازت دے بھی دیتی تو حرام و حلال کا خدشہ بہر صورت سامنے تھا۔ پانی کی جگہ وڈکا اور شاید ہی کوئی رشین ڈش ایسی بھی ہو کہ جس میں لحم خنزیر یا غیر ذبیحہ استعمال نہ ہوتا ہو...... شاید مسافروں میں سے کسی بھوکے کی خدا نے سُن لی تھی۔ اعلان ہوا کہ پی آئی اے کے مسافر' دوسرے فلور پہ ایئرپورٹ ریسٹورنٹ میں تشریف لے جائیں' اُن کے لیے ریفریشمنٹ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ لشتم پشتم' ہم سب مسافر پوچھتے پاچھتے اُوپر ریسٹورنٹ میں پہنچے......"

ریسٹورنٹ میں ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ چار چار سیٹوں والی میز پہ وڈکا کی ایک چھوٹی سی بوتل' پلیٹ میں دو دو سینڈوچ' ایک میں سرخ ٹماٹر' سبز سلاد کے پتے' موٹا کٹا ہوا پیاز اور ایک پتلی سی قاش پنیر کی دکھائی دے رہی تھی۔ دوسرے سینڈوچ میں گلابی گلابی حرام گوشت کے قتلے جھانک رہے تھے۔ ساتھ کاغذی کپ میں کوئی میٹھی چیز تھی اور ایک چھوٹے سے تھرموس میں شاید قہوہ یا کافی ہوگی اور چار چھوٹے چھوٹے ٹیشو پیپر...... میرے سمیت اکثر مسافر یہ حال دیکھ کر واپس نیچے اُتر آئے...... جو چند ایک بچے تھے اُن میں یہ تینوں بھی تھے۔ یقیناً بحث وہاں بھی جاری رہی ہوگی کہ صحافی جو ٹھہرے۔ ایک اہلِ زبان اور دو بے دو بنگالی بھائی...... سروتے سے چھچھ کی اور قینچی سے کنگھی کی ڈیوٹی تو نہیں لی جا سکتی۔ ان میں گونگے اور بہرے نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں کہ یہ مخاطب کو اپنے روبرو گونگا اور بہرہ بنا دیتے ہیں۔ دوسرے کو کچھ بولنے تو دیتے نہیں' اس صورت میں وہ بے چارہ بہرہ مادھو سامنے بیٹھا ہاں ہاں کرتا رہتا ہے۔"

میں بھی پی آئی اے کے باکمال عملہ اور لاجواب پرواز پہ چہار حرفی کلمۂ تحسین اُچھالتا ہوا' بن بکھو کھائے پیئے نیچے' واپس لاؤنج میں اُتر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں امریکن ایکٹریس گریٹا گاربو جیسی سروقد قتالۂ اک عجب سی شانِ دلبری سے میرے والے کاؤچ پہ براجمان ہے۔ سمور کا فل کوٹ' ایک دوسری پہ چڑھی ہوئی' سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی سڈول ٹانگیں جو سکن کلر ٹائٹس کے باوجود برہنہ دکھائی دے رہی تھیں۔ اے موٹی موٹی مسکارے سے لتھڑی ہوئی کنول آنکھیں...... سنہری زلفیں' زوپا رنگ ناگنوں کی مانند پھنکارتی لہرا رہی تھیں۔ ہونٹوں پہ جیسے لعلِ یمانی چپکا رکھے ہوں۔ میں اس رُوسی حسینہ پہ سے نظریں ہٹائے بغیر' بلا ارادہ سامنے خالی کاؤچ پہ بیٹھ گیا۔ وہی کاؤچ جس پہ کچھ دیر پہلے باتوں کے گالڑ آپس میں بھڑ رہے تھے۔ اَب بیٹھنے کو تو میں ادھر بیٹھ گیا لیکن لگا یوں جیسے میں کسی جوالا مکھی کے روبرو آ بیٹھا ہوں۔ ''شاہد باز ابن بازاری! میرے ایسے لوفروں کو ہی کہتے ہیں۔''

آتشِ حُسن و شباب! بڑی سوختہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ ہوش و خِرد جلا کر بھسم کر دیتی ہے...... آتشِ تپاں کی طرح' چھوٹے بڑے' کھرے کھوٹے' نیک و بد میں تمیز نہیں کرتی۔ اس کے بھڑکتے لپکتے بے رحم شعلے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بس اگر آنکھوں میں کچھ دم ہو یا اور طبیعت ذرا نم ہوئی تو چرم' چڑ اند چھوڑ دیتا ہے اور استخواں بھی دُھواں دیتے ہیں۔ قلب و جگر کباب ہو جاتے ہیں۔ گو میں اس میدان کا گھوڑا تھا نہ نو...... برائے نام ہی سہی' سینہ پہ بال اور منہ پہ مسیں تو تھیں۔ مرد بچہ ہو جوان یا بوڑھا' ہوتا تو بنیادی طور پہ مرد بچہ ہے۔ لاکھ اپنے اُوپر زہد و تقویٰ' شرافت و نجابت کے پردے ڈالتا پھرے پر کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی طرح اُس کے اَندر کا مرد اپنی کارروائی ڈال ہی لیتا ہے۔ کوشش کے باوجود بھی میں اپنی نظریں اُس کے سراپے سے ہٹا نہ سکا...... ایسا نسوانی وَقار و تمکنت اور آتشیں جمالت و جلوت' جو اِس ''زنِ رُوسی'' میں دیکھی وہ اپنے دور کی باکمال ایکٹریسوں' گریٹا گاربو یا ایوا گارڈنر میں بھی نظر آئی تھی۔؟

اچانک مجھے ایک زبردست دھچکا لگا...... میں جیسے کہیں آسمان کی بلندیوں سے دھڑام نیچے آ گرا...... اس فتنہ طراز نے اپنے سنیک سکن خوبصورت قیمتی پرس سے گولڈن سگریٹ کیس نکالا...... سنہری پَنّی والا براؤن کلر کا سگریٹ نکالا' اِک کافرانہ اَدا سے ہونٹوں میں دبا کر سلگایا پھر جس خوش اَدائی سے کش پہ کش کھینچا' میری تو مَت ماری گئی۔ منہ پھاڑ کھولے اُسے پاگلوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ یہ نہیں کہ میں نے کبھی کسی عورت کو تمباکو نوشی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا...... یہ کچھ تو میں بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ میرے اپنے خاندان میں قریب قریب سبھی مرد و زن تمباکو نوش تھے...... میرے مُرشد کا حقہ ابھی تک تازہ ہے۔ کچھ بھی کہہ لیں کہ مجھے خاص طور پہ عورت تمباکو کش کرتی ہوئی کسی طور نہیں بھاتی...... وہ تو عورت رہتی ہی نہیں' کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ میں اس

یونانی مجسمے کی مانند تراشی ہوئی دل رُبا اور خوش اُدا عورت سے کسی طور یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وہ ایسی مردانہ اور شتیلانہ حرکت کی مرتکب ہوگی...... مگر اگلے ہی لمحہ محاضرئیوں لگا جیسے وہ یہ کمال نہ کرتی تو اُس کی فسوں خیز شخصیت بے ذوصال سی رہ جاتی۔

ہر چند کہ مومن سے بھی ایسی مکروہات گاہے سرزد ہو جاتی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچی چلی جاتی ہیں اور کہیں کسی کافر کی کسی بے ساختہ معصومانہ اُدا پہ اپنا سارا ایمانی ایقانی اثاثہ قربان کر دینے کو جی چاہتا۔ کڑے وقت کی زد میں آئی ہوئی کوئی نیکی اچھائی بھی چھاج میں پھٹوا کر رکھ دیتی ہے اور آسودہ وقتی کی چکی میں بے دھیانی سے پڑنے والے بجر دانے بھی گیہوں کا گبھدیلا گرم آٹا بن باہر نکلتے ہیں......"

اُس کی موٹی اُنگلیوں میں سنہری اور گہری گندمی رنگت والا پتلا سا سگریٹ جس کے سرخ منہ سے سرمئی دُھوئیں کی صورت نرم نرم گرم آہیں خارج ہو رہی تھیں' مجھے بہت اپنا سا لگا۔ اَب نہایت ہی نفیس سے تمبا کو کی خفیف سی مہک میرے نتھنوں سے آشنا ہوتی ہے...... ہلکی تلخ مگر ملاحت بھری۔ میں نے دَم داب' اُسے پھیپھڑوں کے پچھواڑوں میں جذب کر لیا۔ یہ میری فضول زندگی میں پہلی معقول سی عورت تھی جس کی تمبا کو نوشی میں مجھے فنونِ لطیفہ کی کوئی ذیلی شاخ پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں نے جانا کہ اِس واہیات کام میں بھی کہیں کام کی بات کا احتمال ہو سکتا ہے۔ سو سگریٹ نوشی کی ضمن میں میرے ہاں خاصی لچک اور پچک پیدا ہو چکی تھی۔ میں اِسے گوارہ کر لینے پہ نیم راضی ہو گیا تھا۔"

صاحبو! یہ تھی میری سگریٹ نوشی کی اِبتدا۔ میری پہلی رُوحانی اُستانی' یعنی چاچی جموں والی کے بعد یہ بت طناز زرون' میری سیکنڈ کمو ٹیوٹی لیڈی ٹیچر تھی۔ چاچی کی تعلیم کے مطابق میں نے اِسے بائیں آنکھ دیکھا تو یہ سائبیریا کی برفانی لومڑی نکلی۔ بعد اِک لمبے عرصے تک میں یہ سمجھ نہ پایا اِس عادتِ بد کی محرک' اُس کی جمالی فتنہ گری تھی یا تمبا کو کشی کی کوئی جُداگانہ سی کسب و ہُنری......؟

ریلوے سٹیشنوں' لاری اڈوں' بس اسٹاپوں اور ہوائی اڈوں پہ مسافر' انسان کم اور پارسل یعنی کارگو زیادہ ہوتے ہیں کہ اِنہیں اُٹھایا لادا کر' اندر ڈالا نہیں جاتا۔ یہ اِنسانی پارسل خود اپنے پاؤں پہ چل کر سوار ہو جاتے ہیں۔ اِن پارسلوں میں ہلکے بھاری' بھدے خوبصورت سب ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پارسل آپس میں بات چیت نہیں کرتے۔ اپنی فلائٹ کے تیار ہونے پہ یہ خوبصورت پارسل بھی' اُونچی ایڑی اور سڈول پنڈلیوں پہ اپنا دِلکش سراپا اُٹھائے ایک طرف روانہ ہو گیا اور میں اِس فتنہ رفتار کو اوجھل ہونے تک تکتا رہا......!

اسی تمباکو نوشی کے محاسن و معائب کے حوالہ سے چند ایک دوستوں' بزرگوں اور معاصرین کا "برسبیلِ تذکرہ" بھی شامل ہُوا چاہتا ہے۔

## ● کمالِ حُقّہ نوازی......!

تمباکو پھونکنے والے "بڑے لوگوں" سے کہیں زیادہ مجھے شراب چُسکنے والے "چھوٹے لوگ" اچھے لگتے ہیں۔ فرطِ نشاط یا اللہ کی حیا کہ ان کے چہرے فروغ مے سے گلگوں رہتے ہیں۔ آنکھوں میں قدرے پانی...... اس میں کچھ مُرغابیاں بھی جو کہ پانی میں رہتے ہوئے بھی پروں پر پانی پڑنے نہیں دیتیں۔ تمباکو مارے تو کش کھینچ کھینچ کر اپنے چہروں کے تمبوروں کے تار ڈھیلے کر لیتے ہیں۔ ہونٹ' کوئلوں پہ گری کلیجی کی طرح بُھنے سڑے...... دندان' مسان میں پڑی اُدھ جلی ہڈیاں...... آنکھوں میں بجز مُردار کا گدلا کیچڑ کہ کسی لعن طعن سے خُود ڈوبنا بھی چاہیں تو ادھر سے جواب آئے...... ؎ جا چھوڑ دیا تجھے لعنت بیکار سمجھ کر......!

ہر چند کہ اس شغلِ بیکار محض میں قریب قریب میرے سبھی بڑوں کے نام آتے ہیں...... قطبوں ولیوں کو چھوڑ کر جہاں تک نظر اور تاریخ کی آشنائی پہنچتی ہے اکثریت اسی میں غرق دکھائی دیتی ہے...... معلوم ہوتا ہے چند ایک معدے کے بیماروں کے علاوہ بقیہ سب بیکاروں کی وقت گزاری کا مشغلہ تھا۔ میرے بھی چند ایک رُوحانی بابوں سے قطع نظر باقی ماندہ سب اسی "سلسلۂ حُقّہ کشاں" سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ میرے والدِ گرامی مرحوم اور علامہ اقبالؒ نے ایک ہی وقت' ایک ہی حُقّہ پہ' بابے چراغ کبابیئے کی دوکان' پسرویوں والے اڈے سے اپنی تاریخی "حُقّہ نوازی کا" آغاز کیا تھا...... علامہ کا کمال نے نوازی' جوان کے کسی کام نہ آیا اس کے پس منظر میں شاید ان کی انتہائے حُقّہ نوازی کا کمال بھی تھا۔ عمر کے آخری حصّہ میں آشوبِ چشم کی ایک وجہ بھی یہی دیسی کثیف تمباکو کا کڑوا دُھواں اور دُھواں دھار عقیدت و صُحبت والے دوست بھی تھے جو نہ تو علامہ کو سونے دیتے اور نہ ہی حُقّہ کو بُجھنے دیتے تھے۔"

میرا کچھ کہا بولا میرے آگے آیا کہ میری ان "تمباکو گزیدہ" آنکھوں کو بڑے بڑے جلیل القدر' جمیل العصر اور "کبیر الکلوز" حُقّہ شریف کی زیارت بالجبر اور بالکراہت بُھگتنی پڑی۔ اپنے ہاں کے عام چینڈو دیسی حُقّوں کے بعد' پہلا باتمکین' خُودی سے مزین اور قیمتی حُقّہ' علامہؒ کے ہاں دیکھا۔ اس کی نے' نیچہ' چلم' چمٹا' زنجیر زربرنج' مُنہال' مُور پنکھی سلائی اور سرپنچ وغیرہ بڑے خاص الخاص تھے۔ یہ جُثّی ستّی حُقّہ تھا مجلسی ذرشی ہرگز نہ تھا اس کے باوجود کچھ قربت دار' بطور تبرک و نیاز' چند کش چکھ بھی لیا کرتے تھے......"

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا حقّہ بڑا 'جیّد' حقّہ تھا۔ بڑے بڑے سیاستدان' علمدان' ادیب
شاعر مفسر' اسے تازہ کرتے رہتے تھے۔ اسے محض دیکھ لینے سے ہی علم تازہ ہو جاتا تھا اور جسے خوش بختی سے
ذرا چکھ لینے کا موقع نصیب ہو جاتا وہ شورش کاشمیری اور بابائے اردو بن جاتا تھا۔ مجھے اس نادر و فاضل حقّہ کی
زیارت نصیب ہوئی ہے۔ حقّہ بیچ محفل یوں پڑا ہوتا جیسے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر! اس کانٹوں پہ گھومنے والا نیچہ' ایسا
رواں کہ ہلکے سے اشارۂ ابرو سے بھی اپنے محور پہ مزے سے گھومتا رہے' اس کی اٹھان بھی بلا کی تھی۔ دو گز ے
باز و لمبی نے' کہ کہیں دور بیٹھے بھی اس تک رسائی لے لو...... اعظم گڑھ کی رسیلی سوندھی مٹی کی چکار اچکّی سی چلم'
جس کے گرد سرخ تانبے کی مُوگرا جالی اور اوپر خالص کانسی کا زیرچ' تمکن گھومبرو' پاؤ بھر عنبری مراد آبادی خمیرہ'
جب امروہہ کی راب میں سُلگتا تو دو دو کوس مہک تھمنے نہ دیتی...... حقّہ نوشی' چائے نوشی' انشا پردازی' علم و فضل اور
زبان و بیان کو جو وقار و اعتبار' مولانا نے بخشا وہ انہی کا خاصا تھا......؟

بابائے اردو مولوی عبدالحق کا حقّہ حق حقّہ تھا مگر تھا زبان' افسوس وہ اپنے حقّہ کو وہ مقام نہ دلا سکے
جس کا وہ حقدار تھا اس کی شاید وجہ یہ تھی کہ مولانا انتہائی مرنجاں مرنج اور طبعاً شریف النفس بوڑھے تھے۔ ایسے
شریف اور بے ضرر کہ انہوں نے کسی ممکنہ فسادِ خلق کی وجہ سے مناکحت سے بھی پرہیز فرمایا۔ سوچنے کی بات' کہ
ایسا کریم النفس بوڑھا جس نے عورت کی بجائے اردو سے بیاہ کر لیا ہو وہ خاک ٹھسّے دار حقّہ پیئے گا۔ وہ محض
دکھانے کی خاطر حقّہ چھیڑتے تھے کہ لوگ احباب سمجھیں کہ مولوی! اردو کے علاوہ بھی کچھ کام کر سکتا ہے۔ غور
سے دیکھنے سے بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ واقعی حقّہ پی رہے ہیں...... گڑگڑ نہ دھوئیں کی کوئی لہر' خوشبو نہ بدبو۔
ان کا چہرہ اور جسم بُشرہ بھی پیشہ ور حقّیوں سا نہیں تھا۔ حقّہ پینے والوں کے تو لب بھی ہوتے ہیں۔ ان کے تو وہ
بھی محض الزام سے ہی لگتے تھے۔ اصل میں لفظِ بابا نے انہیں ڈبویا۔"

ہمارے ایک بابائے صحافت بھی تھے۔ مولانا ظفر علی خان "زمیندار" اخبار والے۔ اصل میں ان کے
اخبار کا نام "زمیندار" کی بجائے "تھانیدار" ہونا چاہئے تھا۔ وہ تھے بھی اک تھانیدار...... جو اپنے کام کو عبادت
سمجھ کر کرتا ہے۔ رشوت نہیں لیتا اور نہ کسی سے اصولوں پہ مفاہمت کرتا ہے۔ ڈر' خوف' لالچ ان کی گھٹی میں ہی
نہیں تھا......" ان کا حقّہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ یہ بھی تھانیدار ہی تھا' انہی کی طرح دبنگ اور بے باک' آگ
دھڑ دھڑ ہر وقت شعلے چھوڑتا رہتا اور نیچے میں پانی کلبل کلبل کرتا رہتا......" خزیوں میں کانپا چھڑا ہوتا......
مولانا' کش لیتے تھے مگر دھواں نہ ہوتا...... شعلے اور شرارے لپکتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ ایک زمیندار کا حقّہ تھا'
کسی سرمایہ دار کا نہ تھا...... زمینداروں کے حقّے' پانیوں' تمباکوؤں یا آگ شعلوں کے محتاج نہیں ہوتے وہ تو ہر
وقت گرم رہتے ہیں۔ مولانا بھی نے منہ میں لگائے بیٹھے لینے لکھ رہے ہیں۔ حقّہ صدیوں سے بجھا ہوا ہے مگر

مولانا تو گرم ہیں۔ حقہ یا حقہ نوش' دونوں میں سے کسی ایک کا گرم رہنا ضروری ہے...... کہتے ہیں طوطا خود بولتا ہے' حقہ نہیں' وہ تو' بلانے سے بولتا ہے۔!

صوفی تبسم' اُستادوں کے اُستاد' پتا نہیں اُنہیں صوفی' کیوں کہا جاتا ہے؟ وہ تو رند مشرب تھے...... مَیں نے خدانخواستہ ان میں کبھی کوئی صوفیوں والی حرکت نہیں' البتہ انسانوں والی باتیں حرکتیں ضرور دیکھیں! یہ بھی حقہ کے بڑے رسیا تھے مگر ان کا حقہ بڑا عالمانہ حقہ تھا کبھی فارسی میں گڑگڑ کرتا تھا اور کبھی پنجابی اُردو میں۔ اُسی کے موڈ پہ منحصر تھا۔ نُور جہان اور فریدہ خانم سامنے ہوتیں تو بڑے رُومانٹک انداز میں بھی گڑ گڑاتا۔ دیکھا نہیں مگر سنا ہے کہ اُنہوں نے اپنی اُردو فارسی اور پنجابی کی بہت سی نظمیں غزلیں گیت ترانے اپنے حقہ سے لکھوائے مگر پیش اپنے نام سے کیے...... غالب کے کلام کو کرتہ تہبند پہناتے ہوئے تحرّے کی بوتل بھی سامنے رکھ لیتے تھے...... واللہ اعلم بالثواب......؟

نوابزادہ نصر اللہ خان کا حقہ' بلکہ ان کے بے شمار اور مختلف نُوع ونسب کے حقے بھی بڑے مشہور تھے بلکہ وہ خود بھی کوئی حقہ حقا' تھے...... اُنہی کے ایک خادم سے سنا ہے اُن کے تسلیم بحق ہونے کے باوجود بھی اُن کے لاتعداد قیمتی حقے...... نوابوں کی پشتینی بندوقوں' تلواروں کی طرح' نکوٹین کی ناگوار بو سے پاک اور تیل پالش پانی سے صاف کر کے اُن کی حویلیوں کوٹھیوں میں سجا دیے گئے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں' اس فضول الوجود آلے کو دیکھ کر عبرت پکڑیں اور یہ فیصلہ کرے کہ بابائے سیاست کو کیوں نہ بابائے حقیات کہا جائے کہ اُن کا ایک وفادار ملازم' محض حقہ کے جہنم میں انگارے دہکاتے ہوئے "جان بحق" ہو گیا تھا......

خدا مغفرت کرے کیا خوب گرفتہ ملازم تھا۔

مشہور ہے کہ آنجہانی سرونسٹن چرچل کی بیگم' رات سوتے وقت' سگار کے رسیا اپنے شوہر کے منہ سے کھینچ کر سگار علیحدہ کیا کرتی تھی۔ سنا ہے نوابزادہ مرحوم کے ہاں معاملہ اُلٹا تھا۔ حقوں کی بجائے' نوابزادہ صاحب کو ہی بہانہ بہانے وہاں سے ٹہلا دیا جاتا تھا۔ اندازہ کریں اُن کی کار کے لیے خاص بیٹھا وہ حقہ تھا جس کے پانی' چلم چنگاریوں کو کسی سائنسی طریقے سے قابو کیا گیا تھا۔ ایسا کوتاہ قامت کہ اُنہی کی سیٹ نیچے بھیگی بلی کی طرح دُبکا رہتا۔ بس پتلی سی نڑی' ایک کونے سے باہر نکلی رہتی' مرحوم کشید کرتے رہتے۔ ہوائی سفر کے لیے مظفر گڑھ کے سائنسدانوں نے الیکٹریکل ہبل ببل ایجاد کیا تھا۔ جو زندہ آگ شعلوں سے پاک تھا۔ اس کی چلم میں الیکٹرک ہیٹر کی طرح بیٹری سے گرم ہونے والا چھوٹا سا ایلیمنٹ لگا دیا گیا تھا۔ تمباکو کی ٹکیہ رکھ کر بٹن دبا دینے سے چلم زندہ ہو جاتی۔ چھوٹے سے پاندان کی مانند یہ آٹومیٹک خوبصورت ساحقہ مَیں نے خود دیکھا ہے۔ بلکہ کراچی' کلفٹن میں سید عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے باہر کھڑی گاڑی میں' نوابزادہ صاحب نے بات چیت

اور حقہ نوشی کے دوران مجھے تبرکاً ایک دو کش لگانے کی دعوت بھی دی گئی۔ جو میں بوجوہ قبول نہ کر سکا۔ اسی دوران نوابزادہ مرحوم نے مظفر گڑھی سائنسدانوں کی ایجاد کی تعریف بھی فرمائی اور اسے پاکستان کی تکنیکی ترقی پہ محمول کیا اور میرا سر فخر سے بلند ہو گیا......"

اپنے پیر پگاڑو صاحب بھی تمبا کو نوشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اشوک کمار کی طرح میں نے اُن کی ایسی کوئی تصویر کم ہی دیکھی ہوگی جس میں وہ ہوانائی سگار کے بغیر ہوں۔ اس شوق تمبا کو نوشی سے اُن کی صحت' بڑھاپے' چہرے کے خدوخال اور داڑھی مونچھوں پہ بہت ناگوار اثرات مرتب ہوئے۔ کسی مذہبی یا سیاسی رہنما کو کسی بھی ایسی علت و عادت سے دُور رہنا چاہئے جو اُس کا حسبِ مراتب نہ ہو۔ سنا ہے اُن کے بہت سے گھوڑے بھی ہیں' جو دوڑتے ہیں۔ میں بھی کیسا فضول انسان ہوں' گھوڑے دوڑنے کے لیے ہی تو ہوتے ہیں۔ جیسے جوان لڑکیاں' شادی کے لیے ہوتی ہیں۔"

سنا ہے کوئی بوڑھا' کسی جوان باکرہ دوشیزہ سے شادی جوڑ لے تو وہ پھر سے جوان ہو جاتا ہے جبکہ وہ عورت' وقت سے پہلے ہی بوڑھی یا کم سے کم بیوہ ہو جاتی ہے۔ مگر کھر صاحب کے حساب کتاب دیکھ کر اس بات پہ آدھا یقین تو آ جاتا ہے اور آدھا نہیں کہ مہاتما بدھ کے دور کے اس برگد کی جڑوں کو اپنے خونِ جوانی سے سینچتے سینچتے' متعدد خوبرو تعلیم یافتہ' زمانہ چشیدہ دوشیزائیں خود بوڑھی اور بدنام ہو کر جنگل خالی کر گئیں مگر اس کے "شوقِ شادیات" کا حتمی مداوا تلاش نہ کر سکیں۔ ان سب کے لیے ڈوب مرنے کا مقام کہ کوئی بھی ماں کی لعل' خود کو بیوہ ہونے کا اعزاز نہ دلوا سکی۔ اُن شادیوں کا یہ کونہ اِدھر کا ہے اُدھر سمندر پار کا نہیں۔ جب آتش جوان تھا اور ایک ہوٹل میں میزبان تھا......؟

بات تمبا کو نوشی سے ہوتی ہوئی کوٹ اُدو تک پہنچ گئی...... لال حویلی' پنڈی کا فاصلہ بھی کچھ زیادہ دُور نہیں۔ یہ سونی حویلی کب سے شہنائیوں کی تانوں کو ترس رہی ہے...... کسی لال جوڑے والی کی چھب دیکھنے کے لیے اس کے در و دیوار اک حسرت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ اُن کی بے تحاشہ سگار نوشی' بھٹو مرحوم کی سگار نوشی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ کافی اور سگار' دونوں انتہائی تلخ اور خشک ہوتے ہیں۔ دونوں ہی امپورٹ ہوتے ہیں کہ یہ غریب ملک ان کی تیاری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ "حیف کہ یہ دونوں اَب تک یہاں دو نمبر کیوں نہیں بن پائے جبکہ سگاروں کے لیے پیپل اور کوار گندل کے پتے اور دیسی تمبا کو وافر ہوتا ہے اور کافی بنانے کے لیے لنڈے بازار کے پرانے چیتھڑوں سے ایسنس کشید کیا جا سکتا ہے جسے سائنسی طریقہ سے کسی چاکلیٹی خوردنی بُرادے میں شامل کر کے کافی کی مقامی شکل دی جا سکتی ہے؟

ماشاء اللہ! اپنے شیخ جی' اس تازہ بتازہ بڑھاپے میں بھی' کنواروں کی مانند شاداں و فرحاں دکھائی

دیتے ہیں۔ اُن کی نوکیلی باتوں' جگتوں اور جولانیوں میں بجی کی کی بجائے روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے...... مگر ہنوز شادی کا کوئی پروگرام دکھائی نہیں دیتا۔ جب بھی وہ ثقافتی اُمور کے سربراہ تھے اور ریما بی بی سے باہمی ثقافتی تعلقات خوشگوار تھے تو اُن کے بہی خواہوں میں شرطیں لگ گئی تھیں کہ اَب "لاہور سے پنڈی" دُور نہیں...... یہاں تک کہ لوگوں نے ریما کو ریما بھابی بھی کہنا شروع کر دیا تھا...... ریما' شریف ایکٹرسوں کی طرح شرما کر بابر علی کو ٹیلیفون کرنے لگ جاتی تھی۔"

بڈھے باپ کسمسا اور خُوب دَم بھر کر حقّہ یا سگریٹ کا کش لگاتے ہیں...... ماہر نفسیات اِس کی دو وَجہیں بتاتے ہیں ایک یہ ہے کہ اس باپ کی بُڈھی اسے چھوڑ کر آسمانوں پہ اپنے میکے سدھار چکی اور وہاں سے اُسے مسلسل بلاوے بھیج رہی ہے۔ دوسری وجہ' باپ میں ابھی کچھ دَم خَم ہے وہ کہیں اپنے بڑھاپا خراب کرنا چاہتا ہے مگر اِس کی جوان اولاد اور پوتے پوتیاں اسے عاق کرنے کی دھمکیاں دے کر "حاقاں ملتانن" سے واسطے ثواب والے نکاح ششم سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باپ کی اولاد کے آگے پیش نہیں چلتی' اَب وہ اپنا سارا زور حقّے کے کشوں پہ نکالتا ہے۔ حتیٰ کہ حقّے اور حاقاں میں بُوڑھی عورت اور نزیوں' چلم اور نیچے کا فرق ہے...... ؟ مگر جب نشہ' غصہ یا شادی' دماغ میں چڑھے ہوئے ہوں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا......"

پُرانے تجربہ کار بوڑھوں کا کہنا ہے۔ ناکتخدا جوان لڑکی میں ایک آدھ شیطان ہی ہوتا ہے جبکہ کئی بار کی بیوہ بوڑھی پہ کم از کم سات آٹھ مستند قسم کے شیطان قابض ہوتے ہیں۔ جوانی کا عشق تو کسی نہ کسی طور قابو کر لیا جاتا ہے مگر بڑھاپے میں شادی کا بُھوت' بڑے پوتوں والے قبر رسیدہ کو بھی مولوی کے سامنے لڑکا بنا کر بٹھا دیتا ہے۔" لہٰذا شیخ صاحب کو مشورہ دیا کہ اپنا زور سگار نوشی پہ نہ لگائیں...... کسی نوشی' زوشی یا گوشی سے دو بول پڑھوالیں اور یار لوگوں کو اُلٹی سیدھی باتیں کرنے کا موقع نہ دیں......!

یادش بخیر! استاذی رئیس امروہی کا حقّہ بھی اِک نادرِ روزگار جناتی حقّہ تھا۔ حقّہ کشید کرنا بھی ایک فن ہے۔ یہ ایک سینہ بہ سینہ علم کی مانند' بڑا حکمت آمیز اور پُراسرار بھی ہے۔ آپ نے اکثر تمباکو فروشوں کے ہاں بڑے بڑے منجنیق نما حقّے دَھرے دیکھے ہوں گے اور دو چار پرانے حقّہ باز دو والے کھڑے بڑے خشوع و خضوع سے کش لگا رہے ہوتے ہیں۔ اِس حقّے میں دَنگی تمباکو یعنی اُس دکان کا خاص تمباکو' نمونہ سُلگ رہا ہوتا ہے۔ شوقین حقّہ باز خریدنے سے پہلے نمونہ چکھتا ہے پھر تمباکو خریدتا ہے۔ گھاک دکاندار' حقّہ اور گاہک پہ کڑی نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے اکثر مفتوڑے حقّہ پینے کی چس میں وہاں مصنوعی گاہک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں یا پھر چینڈو پردیسی' اپنے نشے کی تڑوڑک میں پروانہ وار اِدھر لپکتے ہیں اور دکاندار کی نظر بچا کر جلدی جلدی ایک آدھ

سونا لگا ہی لیتے ہیں۔ تمبا کو فروش کو یہ پروا نہیں ہوتی کہ اُس نے کش کیوں لگایا ہے اصل تکلیف یہ ہوتی ہے کہ ایسے چینڈو مفتوز یا شادی کے رسیا بوڑھوں کا سونا بڑا ظالم ہوتا ہے۔ یہ حضرات ایک ہی بار منہال پہ منہ دھرنے سے چلم کا سارا تمبا کو غارت کر کے رکھ دیتے ہیں......''

چائے کافی اور شراب' بنانے اور پیش کرنے کے لیے جہاں اک ہنر' سلیقے اور دلنوازی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں انہیں پینے برتنے کے لیے کمال قرینے اور ظرف کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ اسی طرح سگریٹ' پائپ حقے کے استعمال میں بھی کمال سجاؤ اور حسن برتاؤ چاہئے ہوتا ہے۔ جس سے ہر کوئی واقف نہیں ہوتا۔''

سید رئیس امروہی مرحوم' کمال کے ہمہ جہت انسان تھے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں گو ان کا پورا خاندان ہی علم و عرفان اور انسانی اعلیٰ قدروں کا حامل تھا مگر وہ جو بات مولوی مدن والی تھی وہ کمال امروہی' رئیس امروہی اور جون ایلیا میں ہی تھی لیکن رئیس امروہی کو جو خوبیاں' دوسروں سے علیحدہ اور ممتاز کرتی تھیں وہ اُن کا بے مثل زود گو شاعر' نثر نگار' کالم نگار اپنے عصر کا ماہر روحانیات و علوم خفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا ہمدرد انسان' اُستاد ہونا بھی تھا۔'' حقے' پانوں اور خوش جمالوں کے شوقین تھے' جتنا قرینہ اور شان و شوکت اُن کے پان چبانے اور حقہ کشی میں تھی اس کا عشر عشیر بھی میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ اُن کا حقہ' غریب کی جورو کی طرح نہیں تھا کہ جس کا جی چاہا آگے بڑھ کر تھما لے لیا...... اُن کی اور حقے کی شخصیت ہی کچھ ایسی ڈھنگ تھی کہ اُدھر نگاہ دھرنے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا تھا۔ اُن کے نین کٹورے ہمہ وقت مستی اور اَلستی سے جل تھل رہتے تھے اور چہرے پہ جیسے جنات کی پرچھائیں لہرا رہی ہوتی......''

ایک روز نہ جانے کس لہر میں تھے بتانے لگے۔'' میرا یہ حقہ' جنات بھی پیتے ہیں۔''...... میں ڈرتے ڈرتے حقے کو تکنے لگا۔ چلم سے لہرا کر نکلنے والے دھوئیں میں مجھے عجیب و غریب سی شبیہیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ حقہ کش کرتے ہوئے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے اپنے محبوب کو بولی بولی چپیاں دے رہے ہوں کہ منہ دانتوں سے خالی تھا......''

ڈبلیو زیڈ احمد اور شباب کیرانوی کے ہاں بھی حقہ نوشی ایک شریفانہ آرٹ کا درجہ حاصل کر چکا تھا...... جگر مراد آبادی' جوش ملیح آبادی' حقے کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے جو شاعر حضرات' اپنی محبوبہ سے روا رکھتے ہیں......''

برصغیر پاک و ہند کے شاہ ہوں یا شاعر' سیاستدانوں ہوں یا ریاستدان...... غافل ہوں یا عالم و فاضل' عامیوں نامیوں کی اکثریت اس علت خانہ خراب میں غرق دکھائی دیتی ہے۔ مغلوں نے اس بڑا فروغ دیا...... دربار میں بادشاہ سے پہلے پیچوان پہنچ جاتا تھا اور تو اور ان کی ملکائیں' شہزادیاں' کنیزیں باندیاں دائیاں وغیرہ

بھی تمباکو خوردنی اور تمباکو نوشی کا ذوق فراواں رکھتی تھیں۔ اُن کی نشست و برخاست' روزمرہ' قیلولہ' شعر وسخن' تفریح و تفنن' مشاورت و مذاکرت کے مواقع پہ تخلیہ' صحبت ولداراں' اس کے بن بات نہ بنتی ...... وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا؟ ...... عیش و عشرت' تلذذ و تسکین کے نت نئے سامان پیدا ہوتے تھے ...... راوی چین ہی چین لکھتا تھا' ملوکیت' رنگ و رامش' رقص و موسیقی' حُسن و جمال کے بازار منڈیاں' مشاعرے وغیرہ۔ اس ماحول میں تمباکو کشی بھی اک وجہِ تلذذ بن گئی۔'' پھر وقت کے ساتھ یہ ایک صنعت کا درجہ اختیار کر گئی۔ استعمال کے عجیب وغریب طریقے دریافت ہونے لگے ...... تمباکوؤں کی مختلف اقسام' خمیرے' مرکبات' شیرے' زعفرات' مالیدے' عنبری' کستوری' مرادآبادی' پنجابی' پشاوری' نوابی' ملتانی' حیدرآبادی اور سلطانی وغیرہ وجود میں آئیں ...... تمباکو کشیدن کے آلات حقہ' پیچوان' چلم' گڑگڑی ...... کھڑا' جھجواں' ناری' نوابی' مجلسی' پشواری' الفی' بہاولپوری' کلیان' سلفی' سفری' سگریٹ' چُرٹ' سگار' سگریٹ' بیڑی' پائپ' نگی وغیرہ کیا کیا نہ ایجاد ہوئے۔ گویا پھیپھڑوں' آنتوں' دانتوں اور خون کی خرابی کے کیا کیا سامان پیدا نہ ہوئے؟ اب کیا کہیے کہ ہمارے موسیقاروں' سخنوروں' شاعروں' ادیبوں' مصوروں اور دیگر فنونِ لطیفہ سے متعلقہ قیمتی افراد کی اکثریت نے پتا نہیں' تمباکو نوشی کے ساتھ ساتھ اور کتنی نوشیاں اپنا نوشتۂ تقدیر سمجھ کر نوشِ جاں کی تھیں ......؟

قطع نظر ان فضولیات اور واہیاتیوں کے چند ایک فائدے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً باعزت' باوقار اور بغیر کسی کو یا خود کو چھیڑے ہوئے خودکشی کرنے کا' تمباکو نوشی سے بہتر اور کوئی طریقہ ہی نہیں ...... سوٹے باز' بڑی تسلی' خاموشی' آہستہ آہستہ دھرتی کا بوجھ ہلکا کر جاتا ہے۔ گھر والے سمجھتے ہیں کہ اس کی جوانمرگی میں ''بڑے ملک صاحب'' کا ہاتھ ہے جبکہ اصل کام تو ''نوشیوں'' نے ڈالا ہوتا ...... تمباکو نوشی' چرس نوشی' شراب نوشی یا کوئی دو ٹانگوں والی کوئی نوشی ...... زندگی کھائے ہنڈائے ہوئے بُوڑھے' جن کے بال اور دانت جھڑنے کے بعد دوبارہ برآمد ہونے کی تیاری میں ہوتے ہیں ...... انہیں مشغول' متوازن اور اُن کا منہ بند کرنے کے لیے حقہ سے بہتر کوئی آلہ ایجاد نہیں ہُوا ...... سیانے بوڑھے انگریز کہتے ہیں۔ سرونسٹن چرچل اگر چیئن سموکر نہ ہوتا تو وہ نہ برطانیہ کی افواج کا کبھی سربراہ ہوتا اور نہ وزیراعظم اور نہ ہی اتنا بڑا عسکری مفکر' مقرر' مصنف اور نجات دہندہ ہوتا ......؟

عجیب اتفاق ہے کہ ملکہ وکٹوریہ اور چرچل میں بہت سی قدریں مشترک تھیں' چہرہ مہرہ ڈیل ڈول' ہردلعزیزی' فربہی' فراخ دلی' اک قیامت کی حسِ مزاح لیے ہوئے سنجیدگی اور اپنے اپنے منصب جلیلہ پہ فائز رہنے کا طویل دورانیہ ...... یہ بھی اک خوبصورت اتفاق کہہ لیں کہ میں نے ملکہ مادر سے لے کر موجودہ تمام شاہی خاندان کو دیکھا ہے۔ میں حد سے زیادہ متاثر ملکہ مادر کو دیکھ اور مل کر ہُوا ...... گو اُن کی جھلک' موجودہ ملکہ

الز بتھ میں بھی موجود ہے‘ مگر اُن سا تدبر رکھ رکھاؤ‘ قدامت پسندی‘ دھیما پن‘ ممتا بھری مسکراہٹ اور وضعداری کہاں سے کوئی لائے......؟

سرونسٹن چرچل (جنھیں میں اپنے طور چاچا چراغ تمبا کو والا کہا کرتا ہوں۔) آدھے تمبا کو کے بنے ہوئے تھے۔ لیڈی چرچل کا تعلق اشرافیہ سے تھا شاید اسی وجہ سے اُن میں کمال تحمل و برداشت تھی...... تمبا کو نوشی سے بے دریغ مغائرت کے باوجود ساری عمر اپنے محبوب و عظیم شوہر کے شوق کو ہاتھوں ہاتھ رکھا...... اُن کے روزمرہ کے سگاروں کا حساب‘ سگار سلگانے سے لے کر رات سوتے وقت اُن کے منہ سے علیحدہ کرنے تک‘ وہ ہمہ تن مستعد رہتیں۔ ”کمال کی عورت تھی۔ چرچل نے تسلیم کیا کہ میری طالع مندی‘ کامیابیوں کامرانیوں اور بے پناہ نجی خوشیوں کے پیچھے‘ میری بیوی کا سچا پیار اور اخلاص بھی شامل تھا۔“

برنارڈ شا‘ چرچل کا بے تکلف دوست تھا...... وہ بھی اس کی بے تحاشا تمبا کو نوشی کو تشویش کی نظر سے دیکھتا تھا اور اکثر اس کا اظہار بھی کر دیتا تھا...... ایک دن وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

”ونسٹن! میرا اندازہ ہے کہ جتنا تمبا کو تم اکیلے پھونک ڈالتے ہو‘ وہ دُنیا کے آدھے تمبا کو نوشوں کے لیے کافی ہوتا ہوگا؟“

چرچل نے انتہائی سنجیدگی سے سگار کا ایک بھرپور کش لے کر جواب میں کہا۔

”شا! میری کوشش ہوگی کہ میں اکیلا ہی تمام دُنیا کا تمبا کو پھونک ڈالوں تاکہ دُنیا والے‘ اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔“ ایسا خوبصورت‘ پُرمغز اور پُرمزاح جواب صرف سرونسٹن ہی دے سکتا تھا۔!

چرچل نے اپنی عمر عزیز کے آخری ماہ وسال‘ طویل علالت میں بسر کیے مگر کیا مجال کہ انتہائی نقاہت اور بیماری کی حالت میں بھی کہیں تمبا کو نوشی سے پرہیز کی ہو...... سگاروں کا ڈبا اور جہازی سائز ایش ٹرے پاس سائیڈ ٹیبل پہ دھرے رہتے...... سگار‘ اپنی روٹین کے مطابق جلتا بجھتا رہتا...... چرچل کے لیے‘ ایک دو سگار تو کیا‘ ہزاروں لاکھوں سگاروں کا خون معاف تھا کہ وہ ایک سربلند قوم و ملک کا ہیرو تھا؟

کچھ نا آسودہ‘ مجبور‘ مغموم اور زیست کی توانائیوں‘ شادمانیوں سے محروم لوگوں کے ہاں تمبا کو نوشی‘ خصوصاً حقہ‘ خود بخود کہیں سے پہنچ جاتا ہے...... تعلیم و تربیت سے محروم‘ غریب لوگ‘ جن کے ہاں تفریح نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی...... غمِ دوراں اور غمِ روزگار نے اُنھیں بتلا بتلا کر دیا ہوتا ہے...... وقت اُن سے آنکھ ملاتے ہوئے گھبراتا ہے...... موسم اُن سے شرماتے ہیں۔ ایسے میں حقہ ہی اُن کا غمخوار و دمساز ہوتا ہے۔ حقہ خقی سے اپنا کچھ حق بھی طلب کرتا ہے...... اُس سے اپنی کچھ ٹہل سیوا بھی کرواتا ہے...... چلمیں بھرواتا تو کہیں خود کو تازہ اور ٹھنڈا بھی کرواتا ہے۔ صاف ستھرائی اور نگہداشت کے علاوہ اپنے پیٹ‘ مثانے‘ نا ڑیوں کی صفائی

ڈھلائی پہ بھی مائل رکھتا ہے۔ حقہ نوشی' غریب مہاتڑوں کی عیاشی' کل وقتی مشغلہ اور تسلی تسکین و تشفی کا باعث بھی ہوتی ہے۔''

یہ واحد علت یا نشہ ہے کہ جس کے لیے کسی کا منت کش اور زیر بار نہیں ہونا پڑتا۔ اُدھیلے کا کڑوا تمبا کو' چولہے بھٹ سے گرم بھوبھل...... جو ہڑ' تلاؤ' ندی کا چلو بھر پانی...... بس! حقہ' چلم' گڑگڑی تیار...... اب چاہو تو جیون' یہیں بسر کردو...... چلم میں چنگاری یا تمبا کو کا سُرا جاگل رہے نہ رہے...... حقہ ہر کش پہ حق بولتا ہے...... سوسال کش پہ کش لگاتے رہو' دھواں نکلے یا نہ نکلے...... تمبا کو کی دھانس نکلتی رہے گی...... جب تک نیچے میں چند بوندیں پانی' نڑیوں کی انتڑیوں میں جما پھنسا ہوا میل کچیل باقی ہے حقہ' حق ہے۔'' پینڈو اور شہری بابے بھی ایک طرح کا بُجھا ہُوا حقہ ہی ہوتے ہیں نہ گڑ' تمبا کو نہ آگ پانی...... سچ ہے جوانی بچی ہوئی چلم اور بڑھاپا بُجھا ہُوا حقہ......!

''کاجل کوٹھا'' کی سفیداں بائی بھی اپنی آخری عمر میں صدیوں سے بُجھے ہوئے حقہ کی چپائی ہوئی نَے' اپنے منہ میں دابے' بے سکت بے ہوش سی پڑی رہتی تھی۔ بچپن جوانی میں تو کوئی علت نہ پالی...... جبکہ ساری علتیں اور ذلتیں' انہی گلی کوچوں' کوٹھوں چوباروں پہ پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں مگر کیا ضروری ہے کہ ان کے درمیان جنم لینے والا یار ہنے والا' ان کا خوگر بھی ہو؟ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بُرائی اور گناہوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی کچھ اللہ کے بندے بندیاں' بلند مقامات و درجات پہ متمکن ہیں۔'' سفیداں بائی المعروف مائی چنی کوئی ولیہ تھی اور نہ کچھ الگ سی حاجن نمازن تھی...... طوائف زادی تھی' گانا بجانا' دل پرچانا اور مال بٹورنا' اس کا خاندانی پیشہ تھا...... مگر اس کے باوجود وہ ایک الگ سی طوائف تھی...... اچھوتی سی مُغنیہ' الگ سے سجاؤ لبھاؤ والی... مَن بھاونی سی صورت سیرت اور ان سب سے بڑھ کر ایک نہایت اچھی انسان.... جو اپنے پیشے کے تقاضوں سے کچھ آگے بڑھ کر بھی سوچتی تھی...... ہر انسان کی طرح اُس کی زندگی میں بھی بڑی خوشیاں' کامیابیاں' شہرتیں اور دولتیں آئیں اور ساتھ ہی کچھ جذباتی مدّوجزر بھی آئے...... وہ حالات کے ہاتھوں مجبور بھی ہوئی۔''

سنتوک سنگھ کی بے غبار چاہت اور بے وقت موت کو بھی سینے پہ اک داغ لے کر سہہ گئی۔ پھر وہ رام پور کے کھرے پٹھان کالے خان المعروف جموں راکا لے کی معصوم عقیدت اور اُس کے سچے سُروں سے پیار سے متاثر ہوئی..... یہ شروع سے یک طرفہ تعلق تھا جس میں محض اخلاص اور عقیدت کا دخل تھا..... پھر اس کی زندگی میں ایک آشفتہ سَر' کشمیرے سنگھ بیر' وکسی مسحور کر دینے والی تروتازہ پُروائی کی مانند آیا..... جس نے آناًفاناً اِسے فتح کرلیا۔ ذہنی طور پہ سُلجھا ہُوا مگر قلبی طور پہ اُلجھا ہوا' شدھ موسیقی کا رَسیا...... مجلسی نشست وبرخاست سے

بہرہ ور...... حُسن و جمال' عشق و محبت کی دُنیا کا بندہ اِس طوائف زادی کو پہلی نظر میں ہی بھا گیا تھا۔ پھر ایک جذباتی حادثہ میں وہ بھی پیا نجھڑا گیا...... یہیں اسے احساس ہوا کہ میرے نصیبوں میں سچا پیار اور پکا جیون ساتھی ہے ہی نہیں..... ساتھ ہی یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے جو وارد ہوتے ہی سب سچے' بھلے بُرے' سنتو کے' کشمیرے' کالے بچے' طبلے توے برابر کر دیتی ہے؟

کشمیرے سنگھ کو قتل کرنے کے بعد کالے کان' آلۂ قتل سمیت' تھانے حاضر ہو گیا تھا۔ اپنے بیان میں اُس نے تمام حالات من وعن بیان کر دیئے۔ کشمیرے کا نموییہ میں مبتلا ہو کر حواس کھو دینا۔ پستول نکال کر قتل کی دھمکی' اُنگلیوں کے نشانات' فرش پہ ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے...... سفیداں بائی اور دُوسری لڑکی کے پاؤں کا زخمی ہونا۔ حالات' واقعات اور شواہد کے مطابق یہ سیدھا سیدھا خود حفاظتی اور سانحاتی کیس تھا۔ کالے خان تین برسوں کے لیے جیل بند ہو گیا۔''

زمین و آسمان' موسم و حالات' کیفیات' وقت زمانہ کے رویّوں...... فکرِ جاناں فکرِ فردا اور فکرِ روزگار تو بڑے بڑوں کے کس بل نکال دیتے ہیں...... زندگی کا جغرافیہ تبدیل کر کے رکھ دیتے ہیں...... کافروں کو مومن اور مسلمان کو زندیق بنا دیتے ہیں...... دریاؤں کی گزرگاہیں' میدانی شاہراہوں میں اور جنگل' منگلوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ وقت چلتا تو کچھوے کی چال ہے مگر فاصلے وہ خرگوشوں اور سانبھروں کی رفتار سے طے کرتا ہے...... کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا؟...... جوانی کے دن تو بچّے کی اُنگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں...... فنکار کیسا بھی چُلبلا ہو' وقت کے آگے چیتل ہو ہی جاتا ہے...... ایسے میں کوئی اور آگے بڑھ کر اُس کی جگہ کوئی اور لے لیتا ہے۔ دیکھیں تو اُس بازار میں بیٹھنے والوں کا نمک نموش اور اساس و توقیر ہی کیا ہوتی ہے؟ اِدھر جونہی انگ رنگ' بن جوانی میں ماند پڑا' اُدھر اُن کی شہرت قدر میں کھنڈت پڑی...... وہ عورت جسے حُسن و شباب یا کسی فنی' بنیاد پہ بے پناہ شہرت اور عزت حاصل ہوئی ہو وہ اپنی بےقدری' عزت و منزلت میں کمی' کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ چاہے اس کی وجہ' وقت کی بدلتی قدریں' اُس کا بن سے اُتر جانا یا کوئی عارضہ ہی کیوں نہ ہو......؟

فن کی دُنیا' خاص طور اداکاروں میں تو بوڑھا ہونا بڑا ناپسندیدہ ٹھہرتا ہے...... موت سے اتنا خوف نہیں ہوتا جتنا سر کے ایک سفید بال یا چہرے پہ ہلکی سی جھری سے ہوتا ہے۔ کسی طوائف یا ہیروئن کو سدا جوان رہنے کا نسخہ بتا کر آپ اُس سے جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ بوڑھی طوائف تو بڑھاپے کے دن پورے کرنے کے لیے نائکہ' ڈیرہ دارنی بن جاتی ہے۔ اس دھندے میں اُس کا اپنا من بھی پر چار رہتا ہے یعنی چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا......!

سفیداں بائی نے سنتوک سنگھ کی ڈرامائی موت کو بڑی مشکل سے برداشت کیا تھا کہ کچھ عرصہ بعد'

اُسے اپنے دُوسرے من پسند قدر دان اور شوہر کشمیرے سنگھ کا ناگہانی قتل' جو سنتوک سنگھ کی موت سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ اُس کے اِن دونوں عاشقوں نے اُس کی آنکھوں کے سامنے پران چھوڑے تھے...... اَب ستم بالائے ستم کہ اُس کے سروں سے والہانہ پیار اور دیویوں کی طرح پرستش کرنے والا کالے خان بھی' اُس کی توہین برداشت نہ کرتے ہوئے قتل کے جرم میں جیل چلا گیا...... ماں باپ' نہ اور کوئی آس آسرہ...... لے دے وہی پشتینی سازندے اُستاد دو چار خانہ زاد نوچیاں جنہیں وہ رُوتا تڑپتا' ایک بائی کی ملازمت میں چھوڑ آئی تھی۔

جموں اطلاع کروا کر کچھ لوگوں کو بلوایا...... دو چار ماہ' پولیس کچہری' وکیلوں منشیوں میں گزر گئے...... بادشاہوں کے اُصطبلوں' فیل خانوں اور طوائفوں' بائیوں کے ڈیرے کوٹھوں کے خرچے کے آگے تو قارون کے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔'' یہاں تو قتل کا معاملہ تھا...... پولیس' وکیلوں کو تو اللہ دے کہ کوئی ایسا ویسا قتل اور طوائف کا کیس اِن کے ہاتھ لگے۔ انہوں نے اِسے خُوب نچوڑا...... جمع پونجی' کشمیرے سنگھ کے دیئے ہوئے زیورات' جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء ہفتوں عشروں میں یوں نکل گئیں جیسے چوری لُوٹ کا مال نکلتا ہے۔

کالے خانے کو سزا ہوئی تو اسے بھی برأت نصیب ہوئی...... ہاتھ پاؤں کا رہا سہا تُوم چھلا بھی سُنار کے مُنہ پہ دے مارا اور پرُ مُردہ سی' بدحواس واپس جموں لوٹ آئی۔ آتے ہی کھاٹ سے لگ گئی' جیسے چپوٹوٹی' بے پتوار کشتی کسی طوفان سے بچ کر گھاٹ پہ آ پڑتی ہے...... آدھی پانی میں بیٹھی ہوئی اور باقی اُوپر کہ کوّے بیٹھ کر کائیں کائیں کرتے رہیں؟

گھر میں کھانے کُترنے کو کچھ نہ ہو تو چوہے تک ہجرت کر جاتے ہیں...... تن پہ کپڑا ہو نہ ہو' پیٹ میں پڑی گانٹھیں بھی بن بھوجن آسودہ نہیں ہوتیں۔ پیٹ میں کوران یوپ نہ ہوں تو پریمی کا پریم بھی پیلا ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ عقیدت' محبت اُنس کے سارے فلسفے' بھرے پیٹ سے ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ جب جموں پہنچ کر بھی طبلے سارنگیوں کے غلاف نہ اُترے اور ہنڈیا تو ا بھی پھیکار ہا تو خانہ زاد ٹھنکے اور بول پڑے۔

''بائی جی! ہم سب کو بھی سنکھیا دے دو...... اَب تو جینا مرنا برابر ہو گیا ہے...... تب سفیداں بائی نے ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی مانگی اور سب کو اپنا اپنا معاش تلاش کرنے کی اجازت دے دی...... چند دنوں بعد رکھا رکھوایا' اونے پونے بیچ باچ کر کالے خان کے نام دیا...... منہ سر ڈھانپ کر اپنے ننھیالی شہر انبالہ چلی آئی...... جدھر اَب بھی اُس کی کچھ رشتہ دار نیاں' بازار بیٹھتی تھیں۔

اَرباب نشاط کے ہاں' پیشہ ورانہ مروت مثالی ہوتی ہے۔ اچھے بُرے وقت میں خُوب ساتھ نبھاتی ہیں...... وہاں سب نے اِسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کا غم بانٹا' تسلیاں دیں اور مشورہ دیا کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اَب سب کچھ بُھول بھال کر نئے سرے سے اپنا دھندا شروع کرو۔ بات تو اُن کی دُرست تھی۔ بازار میں کوئی گانے

والی بیٹھے یا پیشہ کمانے والے' کہلاتی دونوں طوائف ہی ہیں یہ لاکھ حاجن نمازی یا ولیہ ہوں...... طوائف یا رنڈی کا لاحقہ، ان کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ کنجر' بھڑوے' حجام' مراثی بھانڈ اور کباڑیے وغیرہ ایسے لاحقے ہیں جو عمر بھر ساتھ نہیں چھوڑتے...... طوائف کا لفظ بھی کچھ اسی قبیل میں آتا ہے۔ اس کا آغاز انجام کوٹھا اور بازاری ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے کوئی اور جگہ راس نہیں آتی...... میں نے بڑی بڑی طوائفیں دیکھیں جنہوں نے اپنے حالات بدلنے کی کوشش کی...... اچھے اچھے خاندانی لوگوں نے بھی ان سے شادیاں رچائیں اور بازار سے نکال کر گھر کی چاردیواری میں ہر طرح کی آسائشیں بہم پہنچائیں' مگر دیکھا یہ گیا کہ دیر بدیر' کوئی نہ کوئی صورت ایسی پیدا ہوئی کہ وہ عورت واپس اپنے کوٹھے پہ چلی گئی...... شاید ہی کوئی دو چار مثالیں ایسی ہوں کہ ایسا نہ ہُوا ہو......!

طوائف بھی پہلے انسان اور پھر عورت ہوتی ہے اور عورت' چاہے وہ پیشہ' ضرورت مجبوری کی کسی بھی سطح پہ ہو' بہر طور اُس میں عورت پنا موجود رہتا ہے۔ اُسے محبت' حفاظت اور عزت کی شدید ضرورت ہوتی ہے بس وہ اسی تکون کی تلاش میں ساری حیات سرگرداں رہتی ہے۔

سفیداں بائی کی زندگی بھی اسی طرح کی ایک تکون کے زیرِ اثر رہی...... "تین شہروں کے کونے' تین مردوں کی مترتا...... زندگی کے تین اَدوار"...... انبالہ' اپنوں میں پہنچ کر' اُس کا خیال تھا کہ اعصاب و اَذہان پہ پڑا اِدبار چھٹ جائے گا...... اپنوں میں رہے گی اپنی محرومیوں کے احساس کو جھٹک کر اک نئی زندگی کی شروعات کر سکے گی۔ مگر کوشش کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔ اَب وہ دھیرے دھیرے خُود فراموشی کا شکار ہوتی جا رہی تھی...... کپڑا لتّا' نہانا دھونا' بناؤ سنگار تو جیسے وہ بھول ہی چکی تھی جبکہ وہ ایسی گئی گزری بھی نہ تھی بلکہ ڈھلتی عمر تو بڑے غمزوں اور عشوؤں کی ہوتی ہے۔ اداؤں میں بڑی لگاوٹ سی گھل مل جاتی ہے' جسم و جان میں اِک فسوں خیز سا گُداز پیدا ہو جاتا ہے یعنی اَب بھی وہ جواں اور حسین تھی...... آواز میں وہی لوچ بلکہ اِک لچکتی ہوئی لہک بھی پیدا ہو گئی تھی...... مگر اِدھر تو جیسے جینے کی تمام کشتیاں جلا ڈالی تھیں...... یہ حال دیکھا تو اپنوں نے مشورہ دیا۔

"بہت دن بیت لیے...... سوگ' سدا کا نہیں ہوتا۔ ہوش پکڑو...... کام دَھندا ہوگا تو دیا جلے گا۔"

اُسے احساس ہُوا کہ دُوجوں پہ بوجھ بننا بھی ٹھیک نہیں...... کہنے لگی۔

"من بجھ گیا ہے' اَب اِس دَھندے پہ طبیعت نہیں ٹھہرتی...... گھر کے اُوپر والے کام کاج کر لیا کروں گی۔ بدلے میں ٹکڑا روٹی کا دے دیا کرنا۔"

یہ سُنا تو وہ لوگ خوب روئے کہ کیا کہہ دیا اس نے؟...... اس کے بعد کبھی کسی نے کوئی شکایت نہ کی۔ اس کا جی چاہا تو اِن کے درمیان بیٹھ لی' وَرنہ گھر کا کوئی نہ کوئی کام' اس کے سامنے دَھرا ہی رہتا...... وقت کے

پرندے نے اپنے اندازِ پرواز سے پتا نہیں کہاں سے کدھر کے فاصلے برابر کر دیے تھے......؟
وقت یا تو اُٹھا وغم و یاس میں گزرے تو پتہ نہیں چلتا یا پھر انتہا کی فرطِ شادمانی میں بیتے تو کانوں کان خبر نہیں ہوتی؟ ایسا ہی ہُوا' اِک دھماکہ ہُوا اور بٹوارہ ہو گیا۔ مہاجرین کے قافلے اِدھر سے اُدھر ہونے لگے۔ ہندو مسلمان اِک دوجے کا گلا کاٹنے لگے۔ جدھر جس کے سینگ سمائے وہ اُدھر ہو لیا' انبالے میں محلّے کے محلّے جلا کر خاکستر کر دیے گئے۔ ہزاروں مسلمانوں کا خون بہا دیا گیا...... کچھ لوگوں نے سیانت کی اور عین موقع پہ جو ہاتھ لگا' اُٹھا کر پاکستان کی جانب نکل آئے۔ ان میں یہ انبالے کی طوائفیں بھی تھیں...... ظاہر ہے' ان کے ساتھ سفیداں بائی بھی اِدھر آ گئی۔ مہاجر کیمپ میں خوار ہونے کے بعد اِک افسر نے خاص نظرِ کرم کرتے ہوئے ان کی مدد کی اور یہ لوگ' لاہور شاہی محلّے کی اس چار منزلہ بلڈنگ میں آ قابض ہوئے۔ یہاں کی ایک مشہور و معروف نائکہ' جس کا سلسلہ سکھوں کے عہد کے اُس نامی گرامی طوائف گھرانے سے ملتا تھا' جس کی ایک حسین و جمیل طوائف' مہاراجہ رنجیت سنگھ کی دلپسند درباری مُغنیّہ تھی۔ خضوری بائی' کشمیری النسل ڈومنی تھی۔ بتانے والے نے' اُس کی گِل میں ستاروں کی کرنیں اور سیاہ مروارید وں کی اَدھ بسی کَجیاں گوندھ کر ایک بُتِ طنّاز سیاہ فام تخلیق کیا تھا۔ ''رات کی تاریکی میں حریری بستر پہ پڑی یوں دکھتی جیسے اپنے ہی حسن و شباب کی بس میں مدہوش' اِک سیاہ ناگن بے سدھ پڑی ہے۔ اُس کی پہاڑی انگ گائیکی میں اُونچے پربتوں کے پہلوؤں میں سرکنے والی نرم پُروائیوں کی سرسراہٹ اور کپکپاہٹ سی تھی۔ شاید اسی وجہ سے' جاننے والے اُس ''کالی بُکلی بائی'' بھی کہتے تھے۔ اس کے گلے میں بھگوان تو نہیں البتہ کشمیر کی جنت نظیر وادیوں کی گھمبیر خاموشیوں کی ٹھمرتا کا بے آہنگ فسوں ضرور لہراتا تھا۔ مہاراجہ نے اپنی اس پالتو کوئل کے گلے میں سونے کی جڑاؤ زنجیر پہنا رکھی تھی۔ یہ حویلی نِیو بارہ بھی چاندی' چندن چوب کی ایک ایسی خوبصورت قیمتی کابک کی مانند تھا جسے پرندوں کے شوقین حضرات' اپنی کسی مَن پسند مینا یا شیاما کے لیے بطورِ خاص تیار کرواتے ہیں......''

● ہیرامنڈی میں اللہ بندی......!

سکھوں کے سنہرے دورِ حکومت میں ہیرامنڈی یا شاہی محلّہ' شاہی قلعہ کے سامنے بائیں پہلو' ایک ہموار اور خوبصورت قطعہ اَرضی پہ بڑی مہارت اور ہنرمندی سے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پہلے دریا کا کنارا اور مختلف پھلوں پھولوں کے باغات ہُوا کرتے تھے۔ اِدھر سے بھی ایک کشادہ شاہراہ' شاہدرہ کی جانب نکلتی تھی۔ جس پہ اکثر اُمراء' درباری سرکاری عہدہ دار ہی سفر کرتے تھے۔ اس شاہی محلّے کی تعمیرِ نو کے سارے اخراجات'

شاہی خزانے سے ادا کیئے گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بڑی فراخدلی اور شوق سے اس کی تزئین و ترتیب پہ توجہ دی تھی۔ اس قریب ترین علاقہ کو ایک طرب گاہ میں تبدیل کرنا' اس کی حکومتی پالیسی اور مجبوری تھی۔ اس زیرک بہادر حکمران میں کچھ بنیادی بشری اور شخصی کمزوریوں کے قطع نظر' بہت سی انسانی حکمرانی خوبیاں بھی بدرجۂ اُتم موجود تھیں۔ وہ آداب حکمرانی سے بہرور ہی نہیں اُن کا موجد بھی تھا...... ''سیاسی اور سماجی اُمور نبھانے پہ حیرت انگیز قدرت رکھتا تھا۔ بہت بڑا انسان شناس تھا' کسی کے چھپے ہوئے جوہر' اہلیت اور اُس کی خصلت پہنچاننے کے لیے اُس کی ایک آنکھ ہی کافی تھی۔'' وہ قابل اور عالموں فاضلوں بہادروں' مختلف فنون لطیفہ کے یکتائے روزگار لوگوں کی قدر اور عزت کرنا جانتا تھا۔ اُن کی صلاحیتوں اور وفاداری سے اِستفادہ حاصل کرنے کا ہنر بھی اُس کے پاس تھا۔ موسیقی' رقص' مصوری' شمشیرزنی' تفنن و مزاح' ضلع جگت' لطیفہ گوئی' حاضر جوابی کا دلدادہ تھا اور سب سے بڑی خوبیوں کی خوبی کہ کمال درجہ کا حُسن پرست اور رنگ رنگولت پسند تھا! خوبصورت رنگیلیوں' گانے والیوں اور نوخیز حسین و جمیل کنیزوں لونڈیوں کے پرے کے پرے' اُس کے ہاں لگے رہتے تھے۔ بیویوں کی صورت میں بھی حسین و ذہین ترین عورتیں اس کے حرم میں رونق افروز تھیں۔ غرضیکہ وہ اپنے دور کا راجہ اندر تھا......!

شاہی محلّہ' اُس کی اپنی ضرورت اور اپنے عہدہ داروں کی دلبستگی کا سامان مہیا کرنے کی غائت سے معرض وجود میں آیا تھا...... شاہی قلعہ کی دائیں جانب' دروازہ کے عین سامنے والے علاقہ شاہی محلّہ اور شاہی مسجد کی بائیں جانب اور عقب میں جو علاقہ تھا وہ ہیرامنڈی کہلاتا تھا...... یہ ہیرامنڈی' ادھر راوی دریا تک اور پیچھے بھاٹی دروازے اور بائیں جانب شاہ عالمی دروازے اور دہلی دروازے تک پھیلی ہوئی تھی۔ تین اطراف باغات اور خندق تھی۔''

شاہی محلّہ' اُمراء و رؤساء' فوج اور سرکاری اہلکاروں اور دربار سے وابستگاں کے لیے مخصوص تھا لیکن یہاں چند ایک حویلیاں ایسی بھی تھیں جدھر' مہاراجہ کی منظور نظر نوچیاں' طوائفیں خاص مراعات کے تحت فروکش تھیں۔ انہیں سرکار دربار سے باقاعدہ ماہانہ تنخواہیں ملتی تھیں اور صرف مہاراجہ کی پابند تھیں۔'' اُس جانب کھلنے والے راستے بھی شارع عام نہ تھے۔ ہیرامنڈی میں عام و خاص' دونوں طبقات کی طوائفیں خانگیاں بیٹھی تھیں۔ گانے ناچنے والی بھی اور بیسوا بھی...... ایسی بھی جو صرف چھوٹے موٹے درباری سرکاری کارندے کی رکھیل ہوتیں...... یہاں ہر کوئی' جس کے کھیسے میں دام ہوتے' تماش بینی کا ذوق ہو' ادھر آ جا سکتا تھا۔'' اُن وقتوں میں بھی یہ ہیرامنڈی' ممبئی' دہلی' کلکتہ' امرتسر' کراچی اور حیدرآباد کے حُسن بازاروں سے درجات میں بلند ہی تھی کہ اِدھر جموں' کشمیر' ڈھاکہ' بنگالہ' ہند سندھ' گجرات و پشاور اور پنجاب کے مضافات سے تازہ مال آتا

جاتا رہتا تھا۔ چھوٹی بڑی ریاستوں کی ڈیرہ دارنیاں اور طفیلی طوائفیں' ادھر بھی رونق بڑھانے اور مال کمانے چلی آتی تھیں......''

غرضیکہ وہ سکھوں کی حکومت اور بعداً انگریزوں کا زمانہ!...... اِس حُسن بازار جو ہیروں کی منڈی اور بعد میں ہیرامنڈی کے نام سے مشہور ہوا کا بڑا سنہری دَور تھا۔ یہاں کے ارباب نشاط نے برِصغیر میں بڑی شہرت کمائی...... بڑی بڑی گانے والیاں' رقاصائیں اور مشاطائیں اور سازکار' موسیقار اِس ہیرامنڈی کی دین تھے اور ہیں کہ اُنہوں نے اپنے فن کے اظہار سے اک دُنیا میں نام کمایا۔''

اک لمبا زمانہ گزر گیا...... ہیرامنڈی یا شاہی محلہ' آج بھی اپنی پرانی رَوایات کے ساتھ موجود ہے۔ اِس کے کوٹھوں' چوباروں' حویلیوں کی نئی پرانی دیواریں اپنی اینٹوں پہ کھڑی ہیں۔ مکین آتے جاتے رہتے ہیں' مکاں کھڑے رہتے ہیں۔ رَوائتیں یادیں' باتیں باقی رہتی ہیں؟ اِنسان ایک ہی ہے' اُس کی شکلوں' عقلوں' طور طریقوں رَویوں میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ پیشے بدل جاتے ہیں' عشق وہی رہتا ہے' پہاڑ اور تیشے بدل جاتے ہیں...... اِن کوچوں کوٹھوں چوباروں میں طوائفیں' ڈیرہ دارنیاں' کنجریاں' مُجریاں' کسبیاں ہی رہ سکتی ہیں؟ یہ الگ بات ہے کہ اِسی ماحول محلوں میں بڑے بڑے اللہ کے بندے' وَلی' اپنے وقت کے ابدال بھی رہے اور ہیں...... مگر دُنیا نے اُنہیں بھی کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا......!

اربابِ نشاط جب کسی اِبتلا مصیبت میں پھنستے ہیں تو وہ ہجرت کر کے اپنے ہم پیشہ لوگوں کے پاس ہی پناہ لیتے ہیں...... کیونکہ اُن کے پیشہ کے گھر سیٹنگ ہی ایسے میز ھے ہوتے ہیں جو کسی اور بغل میں سما ہی نہیں سکتے۔ اِن کے علاوہ ہیجڑے' نشئی بھی اگر کسی دوسرے شہر علاقہ میں جائیں گے تو اپنے ہم جنسوں کے اڈے ٹھکانے تلاش کریں گے یعنی ''کبوتر با کبوتر' باز با باز'' والی بات ہوتی ہے......؟

اِمتدادِ زمانہ اور بٹوارے کے ہنگاموں سے شاہی محلے کی حویلیوں چوباروں کی محض بُنیادوں پہ کھڑی دیواریں ہی باقی رہ گئی تھیں یا پُرانی کھڑی کھڑی کی چوکھائیں' دَر اور کھڑکیوں کے پٹ...... نیا نو دِن' پرانا سو دن والی بات کہ اَب تک کچھ عمارتیں قابلِ استعمال تھیں۔'' اِن انبالہ والی طوائفوں کو اِدھر سر بازار ایک لگا لگایا کوٹھا' جو پتا نہیں کیونکہ بلوائیوں کے ہاتھوں بچا رہا الاٹ ہوگیا۔ مُجرے کے لیے ایک بڑا ایک چھوٹا ہال' رہائش کے طور بہت سے کمرے' دالان اور گُنبد چھجوں والی بالکونیاں' جن کے آگے چک پڑی رہتی۔'' پہلی ہجرت کرنے والی نائکہ جو کچھ باقی چھوڑ کے گئی تھی وہ ویسے کا ویسا ہی دَھرا تھا یعنی اُس میں کاروبار رنگ و رامش شروع کیا جا سکتا تھا۔ گو ملک کی تقسیم کے بعد اِس کاروبار میں خاصا تعطل اور مندا واقع ہوا تھا۔'' چلو! یہی کہ پاؤں پسارنے کے لیے فرش اور سایہ کے لیے چھت مل گیا تھا...... اَوکھے سوکھے دن بیتنے لگے...... سُفیداں بائی' پہلے ہی نوکھی کھیتی

تھی' جب اَب اِدھر ہر سُو سوکھا ہی سوکھا تھا...... مگر کنبہ کے دُوسرے لوگوں کے ساتھ تو پیٹ لگے ہوئے تھے' جو دو وقت روٹی پانی مانگتے تھے۔؟

اللہ سب کو رزق بہم پہنچاتا ہے وسیلہ کچھ بھی ہو؟ وہ تو یہ نہیں دیکھتا کہ کون کنجر بجڑوا ہے اور کون مولوی وَلی ہے؟ ہر کسی کے حصّہ کا دیتا ہے' رازق جو ٹھہرا...... الاٹمنٹ والوں میں ایک بھلا سا افسر' جس نے خاص سفارش کوشش سے ان کو یہ متروکہ حویلی دلوائی تھی' سفیداں بائی پہ آنکھ رکھے ہوئے تھا...... جبکہ اس کُنبہ میں دو چار نوچیاں' تو سفیداں بائی سے بھی کم عمر اور حسین و جمیل تھیں' ایک آدھ کی تو ابھی نتھ بھی نہیں اُتری تھی مگر کیا کہیے کہ جو مَن کو بھائے وہی بھاگ وَتی کہلائے......!

ملک شوکت اَب اکثر اِدھر آنے لگا تھا...... محکمہ بحالیات میں افسر' اچھی خاصی تنخواہ' اُوپر سے فضلِ ربّی بھی ہو جاتا تھا...... شادی شدہ' دو بچوں کا باپ!...... جب حلال کی کمائی میں حرام شامل ہو جائے تو وہ اپنے ساتھ حلال کو بھی گندگی بنا کر اِک فتور بنا دیتا ہے جو رنگ لائے بِن نہیں رہتا...... بیماری' دُشمنی مقدمہ' پولیس' چوری ڈاکہ' رشوت' جُوا...... بڑی بڑی بھیانک صُورتیں اختیار کرتا ہے۔'' بازارِ حُسن میں آنے جانے اور داشتائیں رکھیلیں رکھنے والوں کی کمائی حرام ہی تو ہوتی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کروانے کے لیے اِدھر کھینچ لاتی ہے...... ملک شوکت' بوڑھا نہ جوان' بڑی اچھی صحت و شخصیت کا مالک...... سفیداں بائی کے دل میں جگہ بنانے کی غرض سے اُس نے انہیں یہ حویلی الاٹ کروائی تھی...... پتہ نہیں اُسے' اِس میں کون سی ایسی چیز نظر آئی کہ وہ اس کا دیوانہ ہو گیا تھا...... نہ پہناوہ نہ دِکھلاوا' بارنہ سنگھار...... اِک وِدھوا کی طرح دُھلا سفید کپڑا سی بنی' زندگی کی اُنگلی پہ سوکھنے کو پڑی تھی...... سفیداں بائی تو طوائف تھی جو نظریں پہچانتی تھی' جانتے ہوئے بھی چُپ چاپ تھی کہ کیا کہے اُسے مرد تو جیسے راس ہی نہ تھے۔ اَب وہ کسی تیسرے مرد کو موت سے ہمکنار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے تئیں فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی کے بقیہ دو چار دن' اِن اپنوں کے دَر پہ پڑے ہی گزار دے گی...... گانا بجانا تو مدّت سے موقوف اَب کھانا پینا' ہنسنا مسکرانا بھی ختم ہو کر رہ گیا تھا...... کچھ عرصہ اسی طرح کی بے ڈھبی زندگی کی دُوب کھڑپیوں میں بیت گیا۔''

ملک شوکت کی شیفتگی میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا...... وہ اَب اس سے نکاح کرنے پہ مُصر تھا۔ سفیداں بائی نے اپنی مجبوری سامنے رکھتے ہوئے معذرت کر لی۔'' ملک صاحب نے بھی جیسے اِسے جیتنے کی قسم اُٹھا رکھی تھی۔ ڈھیروں زیور روپے پیسے اور جائیداد کی پیشکش کی۔ اُس کی دَارفتگی' اخلاص اور دولت دیکھ کر' اس کے اپنوں نے اِسے سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا ہے...... اَب پیچھے کی بجائے آگے کی طرف دیکھو کہ باقی رہ کیا گیا ہے بڑھاپا؟ جو کچھ تھا وہ تو اُبالہ رہ گیا۔ یہاں ملک صاحب مہربانی نہ کرتے تو پتہ نہیں ہم سب کہاں کہاں

ٹھوکریں کھا رہے ہوتے ...... اللہ کا شکر گزار ہو کہ عمر کے اِس وقت مغرب میں کوئی نماز جا بجا پڑھنے والا ملا ......
جواب کیا دیتی ...... مُنہ میں حیرت‘ بے چارگی کی بڑبڑیں ڈالے گم صُم دیکھتی رہی ...... اپنی والی نے مزید عقل دلاتے اور اپنے پیشہ کے اُصول طَور بتاتے ہوئے سمجھایا۔ بوڑھی بھینس کو جگالی کے لیے چارا اور ڈھلتی عمر طوائف کو گزارہ چاہیے ہوتا ہے۔ کب تک کوئی کسی کے ہاں‘ ہاتھ پاؤں توڑے پڑا رہ سکتا ہے ...... صدا کا داتا‘ خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔ موقع ہے‘ مَن مار کے اِس سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو کاٹ لو‘ ہمارا تمہارا سب کا فائدہ اِسی میں ہے۔“

سب نے گھیر گھار‘ اِس کا نکاح‘ ملک صاحب سے پڑھوا دیا اور پھر ہر طرح سے اُنہیں نچوڑ نچوڑ کر‘ اِسے اُن کے ساتھ رُخصت کر دیا۔ ملک صاحب نے اس کے لیے علیحدہ انتظام کیا ہوا تھا۔ گڑھی شاہو میں ایک خوبصورت سا مکان‘ جس میں ہر طرح کی آسائش موجود تھی‘ اسے تحفہ میں دیا۔ اَب وہ دو کشتیوں کے سوار تھے‘ ایک ٹانگ اِدھر تو دُوسری اُدھر۔“

پہلی شادی‘ خاندان سے‘ رزقِ حلال اور دو تین چھوٹے بڑے بچوں والی تھی۔ اَب یہ دُوسری‘ عشق معشوقی‘ رزقِ فرسودہ اور طوائف سے تھی۔ ظاہر ہے دونوں کے نسلی فصلی‘ سماجی روایتی اجزائے ترکیبی اور نسل و نسبت میں بلا کا تضاد تھا اور جو کوئی تضاد میں تفریق روا نہیں رکھتا وہاں‘ خدا واسطے کا فساد پیدا ہوتا ہے‘ مزید براں اُس فساد میں بربادی کا مواد‘ پھر بہت کچھ تہہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے۔“

اکثر دیکھا گیا ہے کہ تماش بینی اور زناشوئی کے رَسیا لوگ‘ اپنی رکھیل یا گھر ڈالی ہوئی طوائف سے اَولاد نہیں نکالتے کہ اِس سے بے شمار خاندانی‘ قانونی اور شرعی مسائل جنم لے لیتے ہیں ...... اولاد وہ بھی اپنی خاندانی بیوی سے ہی لیتے ہیں۔ اِس کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن چند ایک مثالیں یوں بھی ہیں کہ دُوسری طوائف یا ایکٹریس بیوی سے اولاد ہوئی جو بالآخر بڑھاپے میں بدمزگی‘ قانونی جنگ اور بدنامی‘ رُسوائی کا باعث بنی ...... کچھ ایسے نادان لوگوں کی مثالیں بھی پیشِ نظر ہیں جنہوں نے پے دَر پے شادیاں طوائفوں‘ اداکاروں سے کیں‘ اُن سے بچے پیدا کیئے ...... زندگی میں اور بعد اَز مرگ بھی اپنی خوب بھد اُڑوائی ...... مختلف بیویوں کی اَولاد کے درمیان‘ ساری عمر اختلافات اور مقدمہ بازیاں ہی ختم نہ ہوئیں ......!

زبردستی کے شوہر اور نئے گھر میں ابتدائی چند دن تو بڑے مناسب سے گزر گئے ...... ملک صاحب سارا دن دفتر میں رہتے ...... شام‘ واپسی پہ اپنے پرانے گھر پہلی بیوی بچوں کے ساتھ اور پھر اِدھر نئے گھر پہنچتے جدھر پتھری سفیداں‘ کچھ ایسی کیفیت میں ملتی جسے نہ انتظار کہا جا سکتا ہے اور نہ بیزاری ...... بس اِک روبوٹ کی طرح بے حِس و بے تعلق ...... شکوہ نہ شکائت‘ وہ ہنستے تو یہ ہنس پڑتی‘ جیسے اُس نے اپنی ذات کو بے ذات بنا دیا ہو‘

کوئی خواہش نہ کوئی خواب؟ ملک صاحب پہلے تو اسے شروع شروع کا حجاب اور رکھ رکھاؤ سمجھتے رہے پھر احساس ہوا کہ وہ حسین بھی ہے اور پُرکشش بھی مگر نہ تن ہے نہ تناؤ' رَجھاؤ اور نہ بہلاؤ؟ بازاری عورت کے ہاں تو یہی مال مسالے ہوتے ہیں' جو تماشبین کو گھریلو بیوی میں نہیں ملتے۔''

سمجھ میں نہ آیا کہ ٹھنڈا گوشت گرم کیسے کیا جائے۔ اتنے خرچے خراچگ کے بعد بھی ٹھنڈی کھچڑی؟ اُس نے جاننے کی کوشش بھی کی...... سفیداں نے کہی ہوئی بات پھر دُہرا دی تھی۔

''ملک صاحب! میں نے اپنے ماضی کی اچھی بری کوئی بات' آپ سے نہیں چھپائی...... میں نے جنہیں چاہا اور جنہوں نے مجھ سے پیار کیا۔ وہ میرے سامنے ہی مَوت کے مُنہ میں چلے گئے...... اَب تو کسی کی جانب دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں آپ کو بڑی عزت دیتی ہوں۔ آپ ہمارے مُحسن ہیں' کڑے وقت بہت کام آئے...... میں آپ کو زندہ اور خوش باش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں ہر وقت آپ کی زندگی کی دُعائیں مانگتی رہتی ہوں۔ آپ نے مجھے حاصل کرنے کی خاطر بڑی قربانی دی' میں آپ سے التماس کرتی ہوں کہ آپ اپنی بیوی بچوں کے پاس رہا کریں۔ میں آپ کے قابل نہیں' میرے اَندر کی عورت مر چکی ہے۔ میری نسائیت ختم ہو چکی ہے۔ آپ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں......!''

ملک شوکت کی سمجھ کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے لیکن چند دنوں بعد قدرت نے اس کی مشکل خود ہی حل کر دی...... چھٹی کا دِن تھا' ملک صاحب' سفیداں بائی کی دِلبستگی کی خاطر' اُسے فلم دکھانے نکلے ہوئے تھے...... فلم کے بعد ایک بڑھیا سے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ ہیرامنڈی نکل آئے کہ پان کھائیں گے۔ اس کے بعد وہ چند منٹوں کے لیے' اس کے رشتہ داروں کے کوٹھے پہ پہنچ گئے کہ سفیداں کئی روز سے اِدھر نہیں آئی تھی۔ ملاقات کے بعد وہ دونوں اپنے گڑھی شاہو والے گھر کی طرف آ گئے۔ یہاں ''بڑے ملک صاحب'' چھوٹے ملک صاحب کی گھات میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ اُن کی پہلی بیوی سے بیٹا جو ملٹری میں ملازم تھا' کسی طرح چوری چھپے اپنی ڈیوٹی سے غائب ہُوا سوتیلی ماں' سفیداں کو قتل کرنے کے ارادہ سے اِن کے گھر چھپا بیٹھا تھا۔ اُسے اپنے باپ کی دُوسری شادی کا اتنا دُکھ نہیں تھا' جتنا دُکھ اس بات کا تھا کہ اُس نے اپنے بیوی بچوں کا حق چھین کر زیورات' نقدی اور جائیداد اِک طوائف کی بھینٹ چڑھا دی۔ ابھی جائیداد کی قانونی منتقلی سفیداں کے نام نہیں ہوئی تھی۔ وہ سفیداں کو قتل کر کے اپنی ماں اور جائیداد کو بچانا چاہتا تھا۔ اُس کا ارادہ صرف سفیداں کو ختم کرنے کا تھا۔ رات ہی رات وہ اپنے ذرائع سے واپس ڈیوٹی پہ پہنچ جاتا اور اس طرح سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔ قدرت کو کوئی اپنا تماشہ دکھانا منظور تھا...... قاتل ایک خطرناک چاقو تھامے اندھیرے میں چھپا تھا...... وار کرنے میں اندازے کی غلطی ہو گئی۔ آگے بڑھ کر جو سفیداں پہ وار کیا......

اچانک اُس کا باپ آگے آ گیا۔ عین دل کے اُوپر چاقو پیوست ہو گیا...... باپ کی چیخ اور اُسے گرتے دیکھ کر بیٹے کے اوسان جاتے رہے۔ اسی لمحہ وہ چھلانگ لگاتے ہوئے باہر اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ یہ ایک ایسی اچانک اور نہ سمجھ میں آنے والی واردات تھی کہ وہ ڈیوڑھی میں کھڑی اِدھر اُدھر مجش دیکھتی رہ گئی...... جب کچھ سمجھ میں آیا تو شوہر کے اُوپر دھب سے گری اور بیہوش ہو گئی۔''

پولیس' کچہری' وکیلوں' عدالتوں کے پھر وہی پرانے چکر...... یہاں بھی وہ اِک بے حس مُردہ بظاہر زندہ کی حیثیت سے شامل تفتیش رہی' قاتل نامعلوم تھا' کچھ عرصہ بعد یہ بھی آزاد ہو گئی' بجائے ہیرامنڈی اپنوں میں جاتی' سیدھی بی بی پاک دامناں جا بیٹھی...... کالا چولا' کالی چادر چوری اِک بے حال مخدوش سی صدیوں پرانی عورت' بزرگ درخت کے نیچے' قبروں کے درمیان اِک زندہ قبر...... اپنے والوں نے لاکھ جتن کیئے کہ واپس ہیرامنڈی چلی چلے مگر وہ نہ مانی...... زیور نقدی' گھر' سب کچھ شوہر کی بیوی بچوں کو لوٹا دیا تھا۔

وقت کی چکی اپنے قُطب پہ چلتی رہتی ہے۔ اُس میں گیہوں ہو یا گھن' اُس کا کام پیسنا ہے۔ اس کا ریں ریں رَونا اور گُڑ گُڑ کرنا بھی ساتھ ہی رہتا ہے۔ رونا اور ہنسا دونوں ہی زندگی کو رَواں رکھنے کے لیے ضروری ٹھہرے یعنی آنکھوں میں آنسو بھی اور ہونٹوں پہ مُسکان بھی...... دادا کی دکان' پھیکا پکوان بھی......! ماں مُوچن' بیٹا پہلوان بھی...... جو جینے کا جتن کرے وہ جی نہ پائے اور جو مرنا چاہے وہ مر نہ سکے۔''

وقت کی بُھول بُھلیوں میں پھنسی ہوئی وہ سب کچھ بھول گئی کہ وہ مَرد یا عورت' زندہ ہے یا مُردہ......

رات دن' تک' موت' کھانا پینا' سر ڈھانپنا تن پہننا' محرم و نامحرم کا احساس' جب ختم ہو جاتا ہے تو انجذاب کی کیفیت شروع ہو جاتی ہے اور ایسی کیفیت لیے ہوئے انسان' اَب کسی اور منزل کی جانب رُخ لے لیتا ہے۔ اس دُنیا کی حقیقت' اُس پہ آشکار ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ اپنے نصیبوں سے لڑ لڑ کر ہمت ہار چکا ہوتا ہے۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے خشک پتّے کی مانند' خود کو ایسے سیلِ رَواں کے سپرد کر چکا ہوتا ہے جو بالآخر' اُس دریا سے جا ملتا ہے جس کے آخر پہ آبشار ہوتا ہے' جو قلزم میں گرتا ہے تو اُس کا حصّہ بن جاتا ہے۔ اَب اپنوں یا بیگانوں کے بس کی بات بھی نہ رہی تھی...... نہ ہی وہ کسی کو پہچانتی تھی۔ بٹ بٹ دیکھتی رہتی' کسی کی پسند نہ پسند بات پہ بھی اُس کے چہرے پہ کوئی اچھا بُرا تاثر نہ اُبھرتا......!

اِدھر بی بی پاک دامناں میں عورتوں کا ہجوم ہوتا ہے اِس لیے کہ شاید یہاں مردوں کی بجائے عورتوں کے مزارات اور عمل دخل زیادہ ہیں۔ ہر جانب عورتیں ہی عورتیں' اِن میں عقیدتمند' منت مرادوں والیاں' صفائی والیاں' نذر نیاز تقسیم کرنے اور انتظامی اُمور والیاں...... اِن کے علاوہ یہاں مستقل اور عارضی طور پہ رہنے اور آنے جانے والی اللہ لوک' مجذوب' بیبیوں کی ملنگنیاں اور شاہانیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہاں اکثر آنے جانے

والیاں' اس قسم کی عورتوں' مائیوں سے بے پناہ عقیدت رکھتی ہیں' وہ انہیں پاک بیبیوں کی خاص منظورِ نظر سمجھتی ہیں۔ ان کی خدمت کرتی ہیں' انہیں نذر نیاز پیش کرتی ہیں۔ ان سے دُعائیں کراتی اور برکتیں حاصل کرتی ہیں۔

بہت جلد سفیداں بائی بھی چپنی مائی کے طور جانی پہچانی جانے لگی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا کہ اس کی چھب ہی نرالی تھی...... نہ کسی سے کوئی بات' نذر نہ نیاز اور نہ کوئی دو نمبر حرکت...... اپنے آپ میں بہت اندر تک اُتری ہوئی۔ صاف شفاف رنگت' موٹے موٹے مدھرا میں ڈوبے ہوئے نین' چہرے پہ نورانی ہالہ...... عورتیں اُسے صاحبِ حال مجذوب سمجھنے لگی تھیں...... پرانی بیٹھنے والی' اصلی نقلی مائیوں نے جب اس کی شہرت پھیلتے دیکھی تو اُن کے ماتھے ٹھنکے...... حسد اور رشک سے اُن کا بُرا حال ہو گیا۔ اُنہوں نے اس کے خلاف جھوٹی تچی افواہیں اُڑانا شروع کر دیں۔ کوئی اِسے انڈیا کی جاسوس کہتا اور کوئی اے سی آئی ڈی کی لیڈی افسر کہتا...... یہاں تک کہا گیا کہ یہ کسی مخالف فرقے کی جانب سے بے حرمتی کرنے یہاں بھیجی گئی ہے۔ غرضیکہ اس کے خلاف' اک محاذ کھڑا ہو گیا...... کمال ہے کہ اسے نہ تو کچھ احساس تھا اور نہ ہی کوئی مدافعانہ حرکت و کوشش......!

جمعرات کے دن' شاہی محلہ کی چند طوائفیں' سلام و زیارت کی غرض سے اِدھر آئی ہوئی تھیں...... کسی کو کیا غرض اور پتہ کہ یہ طوائفیں یا شریف زادیاں؟...... اچانک ایک بائی کی نظر سفیداں پہ پڑی۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گئی...... پاس آئی اور کچھ بات چیت کی کوشش کی مگر وہاں تو ایک ہی چُپ تھی۔ اُس نے اس کی جانب دیکھنا تک گوارہ نہ کیا۔ وہ بائی' اس کی شادی اور بیوہ ہونے تک کی ہر خبر رکھتی تھی۔ اچانک اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔

''سفیداں بائی! میری کسی بات کا جواب تو دو...... میں راحت جان ہوں' ہیرا منڈی میں تمہارے سامنے مائی مٹّو بلڈنگ والی!''

یہ شبدِ ذرا دُور بیٹھی ہوئی ایک پرانی بیٹھنے والی مائی نے بھی سُن لیے...... بس کیا' سفیداں بائی کی حقیقت کھل چکی تھی...... جو اسے ولیہ سمجھتے تھے' اس پہ تھوتھو کرنے لگے۔ اس کی ہوا بگڑی تو انتظامیہ نے چند روز بعد اسے وہاں سے نکال باہر کیا۔''

ایک صبح یہ وہیں بازار میں گندی موری کے پاس پھسکڑا مارے پڑی تھی۔ اس کے جوڑے کا پلو پیچھے موری کی گندگی میں بھیگ رہا تھا...... اور ایک کالا کتّا' پاس بیٹھا اس کے پاس پڑے ٹکڑے کھا رہا تھا...... کچھ دیہاتی عورتیں سامنے بیٹھی اسے گڑ والی میٹھی روٹی کھلانے کے جتن کر رہی تھیں کہ ایک کالا بھجنگ' سر منڈا' صورت سے مسنڈا دکھائی دینے والا شخص' پاس آ کھڑا ہوا...... اُس کے ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ عورتوں کو ہٹا کر آگے بڑھا اور ہاتھ اُس کے سامنے لا کر مٹھی کھول دی...... اِک کلیجہ کاٹتی ہوئی نسوانی چیخ بلند ہوئی اور...... اور؟

جموں رہ کالے خاں جیل کاٹ کر کچھ عرصہ بیمار رہا۔ جیل میں اُسے معدہ کی ایک پُرانی بیماری نے بے حال کر دیا ہوا تھا...... چلنے پھرنے کے اہل ہوا تو سفیداں بائی کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ بہت جلد اُسے پتہ چل گیا کہ وہ پاکستان پہنچ چکی ہے۔ پاکستان بن چکا تھا لیکن بٹوارے کے اثرات ہنوز باقی تھے۔ خاندانوں کی تقسیم نے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں میں بے چینیاں پریشانیاں گھول کر رکھ دی تھیں...... گمشدہ افراد کی تلاش میں لوگ مارے مارے پھر رہے تھے۔ کالے خاں بٹوارے کے دو سال بعد کسی نہ کسی طور جموں سے سیالکوٹ پہنچ آیا تھا۔ وہاں سے لاہور چلا آیا......"

ہیرا منڈی پہنچتے ہی اُسے سفیداں بائی کا پتہ مل گیا تھا۔ باقی حالات کا علم اُس کے اپنے والوں سے معلوم ہو گیا۔ وہ تیر کی طرح بی بی پاک دامناں پہنچا...... جہاں وہ باہر بازار میں ہی بیٹھی مل گئی کہ اُس کے کپڑے غلاظت میں بھیگے ہوئے کتا بیٹا اُس کے آگے دھرے روٹی کے ٹکڑے کھا رہا تھا۔ وہ سُرمہ دانی جو کشمیرے سنگھ کے قتل کا ارتکاب کرنے کے بعد پولیس سٹیشن جاتے ہوئے اس نے سفیداں سے مانگی تھی۔"

بچے سُروں کی سرکار! اپنی سُرمہ دانی مجھے دے دو بس! میں یوں گیا اور یوں واپس آیا۔" یہ وہی سُرمہ دانی تھی جو کبھی اُس نے کالے خانے سے خود مانگی تھی۔ اَب جب اُسے دکھائی دی تو اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی کہ روضے کے صدر دروازے کے اُوپر محوِ استراحت کبوتر اُڑ گئے...... کوئی آہ کراہ چیخ حلق سے نکلتی ہے...... کوئی دل سے اور کوئی کلیجے سے...... حلق سے نکلے تو سماعت سے ٹکراتی ہوئی ہیجان برپا کرتی ہے...... دل سے اُٹھی ہو تو درماں دریافت کرتی ہے جبکہ کلیجے سے برآمد ہونے والی دوسروں کے کلیجے بھی کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔"

کالے خان نے اس کے اپنے والوں سے رابطہ کیا اور اسے واپس شاہی محلے لے آیا۔ کوشش محنت کر کے اس کا حال حلیہ درست کیا۔ ایک مناسب سے کمرے میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیا...... کالے خان نے وہی اپنا پرانا دھندا پھل فروشی شروع کر دیا۔ وہی جموں والا طریقہ اچھا اچھا دانہ سفیداں کے لیے علیحدہ کر لیتا۔ کبھی پیار اور کبھی منت سماجت اس کو کھلانے کی کوشش کرتا۔ وہ بھی کبھی چبایا کبھی یوں ہی ٹھونس لیا۔ سارا سارا دن بے حس بے طلب و غرض کھٹیا پہ پڑی رہتی۔ اَب تو بے ہضم کھایا پیا بھی شلوار میں نکال دیتی...... غلاظت گنگ موت کی سڑاند پوری بلڈنگ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی کہ کہیں ناک دھرنا بھی مشکل پڑ جاتا......"

انسان بلندی کی جانب سیڑھیوں پہ پاؤں دھرتا ہے تو اپنے جسمانی بوجھ کو سامنے رکھتے ہوئے قدرے آگے جھک کر چڑھتا ہے اور اس عمل کے لیے اُسے بے محابا توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ نیچے اُترتا ہے تو اسے حکمت بھری قوت توازن اور اپنے جسم کا بوجھ پیچھے رکھنا بہت اہم ہوتا ہے...... انسان

اُوپر چڑھتے ہوئے نہیں گرتا...... نیچے اُترتے ہوئے گرتا ہے۔"

کسی کو زوال پہاڑ پہ چڑھ کر ملتا ہے...... کسی کو غاروں کنوؤں دریاؤں سمندروں...... اور کسی کو جنگل بیلوں میں...... کسی کو ماں کے پیٹ اور کسی کو مچھلی کے پیٹ دار پہ چڑھ کر بھی زہر پیالہ پی کر بھی...... سر اُٹھا کر بھی اور کٹوا کر بھی...... کسی کو بزرگی بڑھاپے میں جا کر ملتی ہے اور کوئی بچپن سے ہی بابا ہوتا ہے۔ کسی کی جڑیں زمین میں دراز ہوتی ہیں اور اُوپر سے ٹُنڈ مُنڈ...... کوئی پھلواری میں کھلتا ہے تو پھول کہلاتا ہے...... خوشبو رکھتا ہے تو گلاب گیندا موتیا چنبیلی بن جاتا ہے...... ڈھیر دلدل اور کیچڑ میں کھلنے والے بھی کچھ پھول ہوتے ہیں۔ جڑوں کے بغیر کیا کوئی پودا بیل بھی ہوتی ہوگی؟...... اَمر بیل ہوتی ہے۔ جس کی زمین اندر کوئی تانت جڑ نہیں ہوتی۔ ایک بیل جسے چندر جوت منی پلانٹ کہتے ہیں...... یہ زمین میں جڑ پکڑ لیتی ہے اور پانی میں بھی...... مٹی کے پیالے اور شیشے کے گلاس میں بھی اپنا وجود قائم کر لیتی ہے۔

اسی طرح یہ بابے مجذوب درویش فقیر صوفی بھی ہوتے ہیں...... جو اللہ ھو والی نرسریوں میں اُگائے جاتے ہیں...... ان کی جڑیں کونپلیں نکال سنبھال کر ضرورت کی جگہوں پہ بھیجا جاتا ہے۔ وہاں اُنہیں کھیتیوں کیاریوں گملوں میں لگایا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا چھتوں پہ اُونچی اُونچی منزلوں کنوؤں کی دیواروں میناروں اینٹوں کی تعمیرات میں یعنی ایسی جگہوں جو مٹی زمین سے اُونچی ہوتی ہیں وہاں بھی سرسبز خوبصورت پودے شاخسارے پھول پتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ دیکھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے الٰہی! یہ پودوں کے پیدا ہونے کی کونسی جگہیں ہیں۔ زمین نہ مٹی پانی گوڈی نہ کاٹ چھانٹ؟...... شاید کوئی بیج ریشہ یا تخم تاثیر...... ہوا پانی مٹی کے ساتھ مل کر اُدھر پہنچ جاتے ہوں یا جو بھی وجہ ہو...... مگر ایسا ہوتا ہے!

سفیداں بائی والا پودا بھی ایک ایسا ہی پودا تھا۔ جسے پتہ نہیں کس نرسری سے نکالا گیا تھا...... کہاں کہاں اسے دبایا لگایا اُکھاڑا پھر کہیں لگایا اور اب یہاں بی بی پاک دامناں میں اس میں پھول لگا...... ساتھ اِک کانٹا بھی اُگ آیا اس کی حفاظت کے لیے...... سچ ہے کہ وفا کے پھول کہیں کھلتے تو ہیں مگر بہت کم......!

روز بروز سفیداں کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی...... جسمانی بھی اور ذہنی بھی۔ کالے خان اس کی حالت اور بلڈنگ کے دوسرے مکینوں کی سہولت کے پیش نظر چوتھی منزل کی چھت پہ اس کے رہنے کے لیے ایک جھونپڑا نما کمرا تیار کر رہا تھا۔ یہاں کبوتروں کے لیے ایک خاصا بڑا لکڑی کا بنا ہوا ڈھانچہ پڑا تھا جس کے چاروں طرف کبھی تار کی جالیاں لگی ہوں گی...... نہ جانے کب سے یہ ٹوٹا پھوٹا سا پڑا اکھڑا تھا۔ سب بلڈنگ والے اس پر اپنے کپڑے سکھاتے تھے...... ریڈیو کے ایریل پانی والی سیمنٹ کی ٹینکی۔ اسی نوع کا آلتو فالتو سامان اس چھت کا نصیب تھا...... نصیب بدلتے کب دیر لگتی ہے؟ کالے خان جو آ گیا تھا۔ جتنے منہ اُتنی ہی

باتیں' کوئی اِسے سفیداں بائی کا عاشقِ صادق سمجھتا تھا۔ کوئی قریبی رشتہ دار اور کچھ اِسے پُرانا ملازم کہتے جو آنکھوں دیکھوں سے' اِس کڑے وقت تک اپنی وفاداری نبھا رہا تھا۔ ویسے اِس نے خود کو اِس کا پُرانا سازندہ ظاہر کیا ہوا تھا۔ سفیداں بائی نے بھی اپنے عمل اور زبانی طور پہ اِسی کو اپنا کفیل قرار دیا تھا۔ کون جانتا کہ اِن کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ یہاں تک کہ یہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ پہ یہی سمجھتے تھے کہ دُوسرا اصل رشتہ سے واقف نہیں ہے۔ درمیان میں وہ شرم یا غیرت تھی یا خدا کی جانب سے کوئی حکمت؟ تھے تو وہ دونوں سوتیلے بہن بھائی......!

کالے خان نے دن رات کی محنت اور کوشش سے بالآخر ایک عجیب و غریب کمرا تیار کر ہی لیا...... پرانی لکڑی' بورڈ' تختے' ٹین کی چادریں...... اور ایک برآمدہ بھی جس کا مقصد دُھوپ بارش سے بچاتا تھا۔ جب کمرا اور ساتھ ہی کونے میں بیتُ الخلاء تیار ہو چکا تو وہ سفیداں کو اپنی بانہوں میں تھام کر اُوپر لے آیا۔ اُوپر چھت کے فرش پہ پہلا قدم دھرتے ہی سفیداں بائی کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

''بالا خانہ!...... طوائف کے کوٹھے کو بالا خانہ بھی کہتے ہیں۔'' اُوپر نگاہیں اُٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے پھر کہنے لگی...... ''بالا خانہ! اَب مجھے عالمِ بالا میں پہنچنے کے بعد ہی نیچے اُتارنا......''

نیچے کوٹھے والیوں کی جان چھوٹ گئی تھی...... بغیر ضرورت' اَب کوئی اُوپر چھت پہ بھی نہ آتا تھا۔ کالے خان نیچے پھل کی ریڑھی چھوڑ کر دو چار بار اُوپر ضرور آتا...... جدھر یہ مُندی ہی آنکھوں سے آسمان پہ نظریں جمائے بے سُدھ پڑی ہوتی۔ البتہ اِس کی آہٹ پہچان کر اِس کی جانب اِک نظر دیکھ لیتی...... یہ ہاتھوں سے سہارا دے کر اُسے بیتُ الخلاء تک لے جاتا...... صفائی کرتا اور واپس لا کر آرام سے کھٹیا پہ لٹا دیتا۔ نرم میٹھے پھل کے علاوہ وہ اکثر شام کو اِس کے لیے پتیجے سے شوربا اور نرم سا کلچہ بھی لاتا...... شاید ہی وہ کبھی ایک آدھ لقمہ لے لیتی......!

جمعرات کا روز تھا' اِس دن وہ جلد فارغ ہو کر داتا صاحبؒ چلا جاتا۔ سلام دُعا کے بعد کچھ دیر قوالی سے محظوظ ہوتا۔ واپسی پہ سفیداں کے لیے لنگر بھول کھانے لانا نہ بھولتا' اِسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتا پلاتا...... داتا صاحبؒ کے دربار کی باتیں سناتا رہتا۔ ایک دن اِس نے سفیداں کے لیے تسبیح خریدی' اِسے تھماتے ہوئے کہنے لگا۔

''خالی چپ پڑی رہتی ہو' اللہ اللہ کیا کرو......''

اَب اللہ اللہ تو وہ کرے جو اُس سے دُور ہو...... اللہ تو شاید اِس سے اِتنا قریب تھا کہ درمیان میں کچھ تھا ہی نہیں...... ایک دن ریڑھی بڑھا کر اُوپر پہنچا' دیکھا ایک اُس کی رشتہ دار' پاس بیٹھی حقہ تیار کر رہی ہے۔ دیکھتے ہی جھلا اُٹھا' آگے بڑھ کر حقہ ہٹا دیا...... وہ بوڑھی ملازمہ تھی کہنے لگی۔

"کالے خان! سفیداں بائی کو حقّہ کی اشد ضرورت ہے۔ اس سے نہ صرف اس کا دل بہلے گا بلکہ دھیان بھی لگی رہے گی۔ یہ بیماروں بوڑھوں کا علاج اور مشغلہ بھی ہوتا ہے۔"

جواب دیا...... "میں ساری زندگی حقّہ بیڑی پیتا رہا ہوں بلکہ سب ہی پیتے تھے لیکن میں نے کبھی بائی جی کو تمبا کو شراب سے شغل کرتے نہیں دیکھا بلکہ وہ تو اس سے نفرت کرتی تھی۔ توبہ توبہ اب آخری وقت اسے حقّہ کی علت میں ڈال دوں۔"

وہ چھنال بولی۔ "یہ علت یا کچھ اور؟...... لیکن یہ ہے بڑے کام کی چیز! تم نچے اپنے دھندے میں رہتے ہو۔ حقّہ ہوگا تو یہ ادھر اس سے بہلے گی...... اچھا تم یوں کرو اسے بغیر تمبا کو پانی آگ...... محض خالی حقّہ آگے دھر دو پھر دیکھو......؟"

پتہ نہیں کیا سوچ کر اگلے روز ایک چھوٹا سا خوبصورت حقّہ خرید لایا۔ سفیداں کو دکھا کر سامنے رکھ دیا...... دوپہر کو جب وہ اوپر پہنچا تو حیران ہوا کہ وہ حقہ کی نے منہ میں دابے بڑی شانت سی پڑی ہے۔ چلم میں نرمہ دانی اور بہت سی چیزیں دھری تھیں۔ بس یہیں سے حقّہ اس کی رہی سہی زندگی میں داخل ہوا...... اس کی طرح بجھا ہوا...... تمبا کو آگ نہ پانی......!

"کاجل کوٹھا" لکھنے کے سلسلے میں دربدر گھوما...... اس کی تفصیل لکھ بھی چکا ہوں کہ جموں بابا بالی شاہ کے مزار پہ ایک ننگ دھڑنگ فقیر سے پالا پڑا تھا جس نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں تین کاجل کوٹھے ملیں گے۔ شری نگر کی ڈل میں لاہور شاہی محلہ میں اور تیسرا تیرے اپنے اندر...... شری نگر والا تو مل چکا تھا لاہور شاہی محلہ والا باقی تھا۔ اس تک پہنچنے کا سردست کوئی راستہ نہ مل رہا تھا۔ اسی تگ و دو میں پڑے ہوئے دس برس اور نکل گئے مگر لاہور والا کاجل کوٹھے کا کوئی سراغ نہ ملا اور جب سراغ ملنے پہ آیا تو جھٹ مل گیا...... یہ تو مجھے خبر تھی کہ یہ دوسرا کاجل کوٹھا لاہور شاہی محلہ میں کہیں موجود ہے۔ اس غرض سے میں قریب قریب روزانہ داتا سرکارؒ حاضر ہوتا وہیں سے براستہ شاہی محلہ اپنے مرشد حضرت علامہ اقبالؒ کے مزار پہ حاضر ہوتا فاتحہ سلام کے بعد کاجل کوٹھے کے سراغ میں اسی بازار سے ہی گزر کر واپس آتا۔

## ● سیالکوٹ کا "سکھاوٹی"

پتہ نہیں کہ وہ کیسا سمے کا امر تھا...... حضوری باغ کے ایک کونے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک بوڑھا داستان گو کھڑا سلطان صلاح الدین ایوبی کے کسی جنگی کارنامے کو اپنے خاص ڈرامائی انداز میں سنا رہا تھا۔ میں

قریباً روزانہ ہی اِدھر سے گزرتا تھا۔ لاہور میں بارہ دری بھی اک خاص جگہ ہے' اس کی تاریخی حیثیت جو ہے سو ہے اس کے علاوہ اس کی ثقافتی' سماجی' تاریخی اور تعمیراتی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ مغرب کی جانب' مزارِ اقبالؒ، شاہی مسجد' مشرق میں شاہی قلعہ' شمال کی طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مڑھی جبکہ جنوب میں شاہی محلہ اور شہر...... سکھوں اور انگریزوں کے دورِ حکومت میں اس بارہ دری کی متعدد بار "بیت دری" بلکہ "عصمت دری" کی گئی...... مگر صد شکر کہ یہ کسی نہ کسی صورت ابھی تک قائم ہے۔ اس کے گردا گرد بہت قدیمی قیمتی اشجار ہیں۔ سرسبز گھاس کے قطعے' پھولوں کی روشیں' کیاریاں...... جھاڑ' پودے...... شہر کے بیچوں بیچ' ایسے تاریخی اور خوبصورت مقامات کے درمیان یہ سنگِ مرمر کی خوبصورت بارہ دری...... جو مغلوں کے مخصوص فنِ تعمیر کا ایک اچھوتا نمونہ بھی ہے بڑی سجاوٹی سی جگہ ہے۔ اس کے اطراف اشجار و اثمار بڑی بہاریں دکھاتے ہیں ان کے گھمبیر سایوں اور گھنی شاخوں پہ خوش نما اور شیریں مقال طیور تانیں اڑاتے ہیں۔ یہاں کسی بھی غرض سے بیٹھنے والے' اِدھر کے ماحول و مناظر سے بڑے شادکام ہوتے ہیں۔ میں نے اکثر وہاں بیٹھ کے محسوس کیا کہ یہ جگہ اپنے محلِ وقوع کی مطابقت سے بڑے اسرار و رموز کی حامل ہے...... بارہ دری کے اندر سنگی فرش پہ فروکش بندہ' بیک وقت بہت سی اِستعانتوں کے زیرِ اثر ہوتا ہے (شرط یہ ہے کہ بارہ دری کے اندر چکی کے پاٹ کی گولائی کے برابر مخصوص جگہ کے حصار اندر موجود ہو) جن طبقاتی' ارضی و سماوی جدولت کے ماہرین اور حکمت افلاکی و آفاقی کے خوشہ چینوں نے اس جگہ کے نقش اور بانٹ کی تھی وہ اپنے وقت کے اَبدال و جدال تھے۔ اس مخصوص جگہ کو تصرفات و اَسرار سے یا وہ خود واقف تھے یا تاجدارِ وقت...... علاوہ اگر کوئی اور ہوتا ہوگا تو وہ کوئی صاحبِ نظر و بصر' بندۂ عصر و خضر ہوگا اور ایسے لوگ گونگے بہرے ہوتے ہیں۔ لاکھ ڈھونڈو بھی تو پیشِ نظر' دکھائی نہیں دیتے۔ اُن کے سروں پہ سلیمانی ٹوپیاں اور ہاتھوں میں عصائے موسوی ہوتے ہیں......"

بات ہو رہی تھی حضوری باغ اور بارہ دری کی...... بارہ دری یوں کہ یہ نشستِ گاہ' سات بالشت اونچی کھڑی چوکور چوکی پہ بارہ در کھولے کھڑی ہے۔ گو سکھوں اور انگریزوں کے دورِ بے سواد میں اس کے قیمتی پتھروں کی ٹوٹ پھوٹ اور لوٹ مار سے' اس کی ہیئت اور دلکشی میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی تاہم کسی نہ کسی طور اس کی مجموعی حیثیت باقی بچی رہی......!

مشہور و معروف آسٹرو پامسٹ' بین الاقوامی شہرت کے حامل' میر بشیر سیالکوٹی' بڑے اعلیٰ پائے کے منجم اور ارضی' افلاکی علوم کے ماہرین میں سے تھے۔ ہمارے اُن سے خاندانی مراسم تھے۔ میں اُن کا بہت بڑا معتقد تھا۔ اپنی علمی پس ماندگی اور فکری عسرت کی بناء پہ میں اُن سے اتنا کچھ حاصل نہ کر سکا جو میں چاہتا تھا۔ گو خاندانی تعلقات کی وجہ سے مجھے' اُن کے کافی قریب رہنے کا موقع بھی ملا...... وہ میرے ذوق شوق اور

طلب سے واقف بھی تھے اور مجھے کچھ عطا کرنے پہ آمادہ بھی...... !میرے شوق کو دیکھتے ہوئے وہ اکثر مجھے اپنی کتابیں اور ہاتھ پاؤں کے فالتو پرنٹ بھی عطا کر دیا کرتے...... جب کبھی پامسٹری اور اس سے متعلقہ علوم و فنون پر کہیں مباحث یا سیمینار ہوتے تو مجھے بھی شامل ہونے کی ترغیب دیتے...... وہ اکثر غیر ملکی دوروں پہ رہتے اور مختلف فیلڈ کے نمایاں لوگوں کے زائچے تیار کرتے' انھیں مشورے دیتے اور بھاری فیس وصول کرتے...... اُنھیں کیروثانی اگر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا...... ؟

انگلستان میں برف باری اور بارشیں شروع ہوئیں تو مَیں دو چار ہفتوں کے لیے لاہور پہنچ آیا......

ادھر موسم بڑا رنگیلا تھا۔ یہاں اپنی وہی آوارہ گردی' روزمرہ کے وہی معمولات داتا صاحب'' علامہ صاحب'، حضوری باغ، شاہی محلہ وغیرہ...... مَیں ہر طرف سے فارغ ہو تھک تھکا کر حضوری باغ میں سستانے کی غرض سے' کہیں بیٹھ جاتا۔ ویسے میری پسندیدہ جگہ' بارہ دری کا مغربی کونا...... عین سامنے شاہی مسجد کی سیڑھیاں' تبرکات والی ڈیوڑھی اور مینار...... آنکھوں کا زاویہ ذرا بائیں جانب موڑیں تو مُرشد پاک کا مزار...... دائیں طرف رنجیت سنگھ کی مڑھی جبکہ قلعہ کا ماضی' حال' مستقبل اور سطوت و جلال' میری پشت پہ پڑا رہتا۔''

تانبہ کی طرح تپتی ہوئی ایک دوپہر مَیں خجل خوار ہوتا ہوا' اُدھر سستانے کی غرض سے پہنچا۔ حضوری باغ' لوگوں سے اَٹا پڑا تھا...... قمیضوں' بنیانوں سے بے نیاز' سایہ دار درختوں کے نیچے دَم بخت ہوئے پڑے ہیں۔ بارہ دری کی طرف نظر دوڑائی تو اُدھر بھی یہی عالم لیکن مجھے کہیں نہ کہیں تو بیٹھنا تھا۔ مَیں بادلِ نخواستہ بارہ دری کی جانب نکل آیا۔ ادھر ہمیشہ کی طرح وہ بوڑھے جنھیں گھر میں مائیاں تائب بیویاں یا کھتی بہوویں ٹکنے نہیں دیتیں۔ گھر سے بھاگے لڑکے' جگراتے تھکن کے مارے ہوئے پردیسی' مزدور...... شاہی محلے کے وہ افراد' جو بائیوں' مجرائیوں کے ہاں سنگت میں بیٹھتے ہیں یا اُن کے بھڑوے ملازم' ماشئیے' ہوٹلوں چائے خانوں پہ کام کرنے والے لڑکے' چوکیدار اور آوارہ منش' بھنگی چرسی بھی یہیں وقتی طور پہ بسر اوقات کرتے ہیں۔

یہاں کبھی کبھی نوسر باز اور جیب تراش بھی پائے جاتے ہیں...... ادھر سیر و تفریح کی غرض سے آنے والے بھی گھڑی دو گھڑی نیکی لے لیتے ہیں یا تصویریں اُتارتے نظر آتے ہیں۔ دو ایک مخلوقات اور بھی ادھر اکثر دکھائی دیتی ہیں۔ اخبار کا مطالعہ کرنے والے' جن کا اخبار' وہاں پہ موجود ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ تبصرے اور آرا بھی ہوتے ہیں...... ایک اور سُریلی مخلوق...... !موسیقی کے دلدادہ لوگوں کی جنھیں کوئی اور برداشت نہیں کر سکتا وہ اِدھر تانیں پلٹے لگاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی داد کے ساتھ اُنھیں کشتی چائے یا سگریٹ بھی پلا دیتا ہے۔ کشتی چائے' وہ ہوتی ہے جو بنی بنائی تھرماسوں اور گلاسوں میں فروخت ہوتی ہے......''

اس وقت' یہاں خاصا رَش تھا کہ مندرجہ بالا سارے قبیلے اِدھر کا کُک نیل بنے ہوئے دکھائی دے

رہے ہیں۔ کوئی بیٹھا تو کوئی لیٹا ہے کوئی باقاعدہ خراٹوں سے سو رہا ہے۔ سگریٹ' چائے' اخبار' موسیقی سب چل رہے ہیں۔ میں چونکہ پرانا عادی آوارہ گرد تھا اس لیے یہ سب کچھ میرے لیے ہرگز نیا یا حیران کن نہ تھا۔ ''اب میں اِدھر تلاش کر رہا تھا بس اتنی سی جگہ' جدھر میں مختصر بیٹھ ہی سکوں......؟

میں بارہ دری کے چاروں اطراف' طواف کی صورت گھوم کر کہیں بیٹھنے کی گنجائش دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے نام کا آوازہ پڑا...... آواز بڑی دبنگ مگر نستعلیق تھی...... پنجابی زبان میں پکارنے والا یقیناً کوئی اپنا ہوگا؟ اَب میں آواز کے منبع کو کھوج رہا تھا...... دوسرے یا تیسرے آوازے پہ میں نے اُس کا کھوج لگا ہی لیا۔ کوئی کالا بھجنگ سا شخص' میلے سے کپڑوں میں ملبوس' لوگوں کے درمیاں پھسکڑا مارے' سموٹ آسن میں بیٹھا تھا۔ مجھے رُکتے اور اپنی جانب دیکھتے ہوئے' وہیں سے آواز دیا۔

''اوئے! اُوپر آ جا...... باہر سخت دھوپ ہے......''

میں ابھی تک پہچان نہ پایا یہ کون شخص ہے جو میرا نام بھی جانتا ہے اور گرمی سے بچنے کا بھی کہہ رہا ہے؟ ہمت کر کے' بھلا لگتا چلا گیا' میں اُس کے قریب پہنچا تو مارے حیرت میری چیخ نکل گئی۔

''میر صاحب! آپ......؟''

سر پہ نمازیوں والی ٹوپی' کالی عینک لگائے وہ بالکل پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ ہونٹوں پہ اُنگلی دھرتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا عندیہ دیا...... ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اپنے عصر کا اتنا بڑا دست شناس' ماہر علم نجوم و تجوید اور ہیئت دان' جس کی زندگی کا بڑا حصہ انگریزوں' امریکنوں اور فرانسیسیوں کے درمیان گزرا۔ جس کی شہرت و علمیت کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا ہے...... اِس حال حلیے' سلگتے جلتے موسم' اِس جگہ اور ایسے لوگوں کی کھچڑی میں پکا کالا موتھ بنا پڑا ہے۔ پاس بیٹھا تو ہولے سے انگریزی میں گنگناتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات یا سوال نہ کرنا خاموش میرے پاس بیٹھو رہو......''

اُمس اور شعلے برساتی ہوئی گرمی نے کمال رنگ دکھایا ہوا تھا۔!

سنگِ مرمر کی بہت سی اقسام ہیں۔ قدرت نے خاص طور پہ اعلیٰ تعمیراتی اور آرائشی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے تین چار پتھروں کو بڑا شرف عطا فرمایا ہے...... سنگِ مرمر' سنگِ احمر' سنگِ خارا وغیرہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرقان الحمید میں فرمایا ہے کہ پہاڑوں میں بھی سفید' سرخ اور گہری سیاہ دھاریوں والے پتھر پائے جاتے ہیں' جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔'' مغلوں میں تعمیراتی ذوق و شوق بڑا اہم تھا' اس سلسلہ میں اُنہوں نے بڑے کارنامہ ہائے انجام دیئے' جن کے وہی موجد و موخر تھے...... اُنہوں میں بڑی خوبی تھی کہ

وہ تعمیراتی اُمور میں پختگی کے ساتھ خوبصورتی کا بھی خیال رکھتے کہ تعمیر ایسی ہو جو صدیوں کی چیرہ دستیوں' زلزلوں' موسموں اور آفات کا مقابلہ کر سکے۔ اُنہیں سنگِ مرمر سے اِک تعلق خاص تھا۔ یہی وجہ اُن کی چیدہ چیدہ تعمیرات میں اِس کا برمحل استعمال دکھائی دیتا ہے۔ اس کی نمایاں مثالیں تاج محل' شاہی قلعہ لاہور' دہلی آگرہ' اکبرآباد' اودھ' کشمیر کی مساجد...... اجمیر شریف' حضرت سلیم چشتیؒ' داتا سرکارؒ اور دیگر مغل بادشاہوں کے مقبرے' ہرن مینار' جمنا گنگا' راوی کی سیر گاہیں' بارہ دریاں' چبوترے' نَو برجیاں' مینارے اس کے علاوہ اولیائے اللہ کے مزارات...... ان تعمیرات میں سنگِ مرمر کا بصد اہتمام استعمال ہُوا جبکہ راجپوتانہ کے سرخ پتھر' سیاہ پتھر کے علاوہ اور مختلف پتھر بھی ضرورت اور جگہ کی مناسبت سے کام میں لائے گئے......

مَیں بتا رہا تھا کہ حجرِ ابیض یعنی سنگِ مرمر کی مختلف اقسام اور خوبیاں ہوتی ہیں۔ دُودھ کی مانند' دمکتا ہُوا' زیادہ تر اٹلی سے نکلتا ہے اور وہیں یہ نئی ٹیکنیک کے ساتھ کاٹا تراشا اور پالش کیا جاتا ہے۔ جس کی مثال' حرمین شریف میں استعمال کیا جانے والا سنگِ مرمر ہے...... بے لبِ دَب یہ قیمتی پتھر' سخت سے سخت حدت کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم...... بے پناہ وزن برداشت کرنے' جھڑنے' ٹوٹنے سے محفوظ' موسموں کے مضر اثرات کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور انجذاب کی خامی سے پاک...... پاکستان' بھارت' افغانستان' رُوس کے علاوہ بھی اور ممالک میں یہ پتھر پایا جاتا ہے۔ اِس میں دُوسرے ہلکے رنگوں والے بھی ہوتے مگر اعلیٰ اور اصلی وہی جو لٹھے کی مانند کھلا ہُوا سپید اور آب والا ہو......''

یہاں بارہ دری' شیش محل' موتی مسجد' شاہی مسجد میں اسی طرح کا جو سکھوں اور انگریزوں کے دَور میں بڑی بے دردی سے اُکھاڑا گیا قیمتی سنگِ مرمر اُن کی ذاتی رہائش گاہوں میں بھی لگایا گیا...... اس کے علاوہ اِس کی بیچ کاری نقش و نگار میں آویزاں' قیمتی پنے' فیروزے' زمرّد' لاجورد اور سیپ بھی نکال لیے گئے...... جن کی تلافی پھر کبھی بھی ممکن نہ ہو سکی۔ بارہ دری کے دَر و دیوار' فرش و چھت' سیڑھیوں اور ستونوں کے پتھروں کو دیکھ کر اِس لوٹ کھسوٹ کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ جگہ جگہ سے اُدھڑا ہُوا سرخ پتھر کا خوبصورت فرش! جسے کبھی مرمت کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ اب جابجا' پانوں کی پیک' جلے بُجھے سگریٹوں کے ٹکڑے......!

میر بشیر صاحب اسی بارہ دری میں بڑے تخت سے براجمان تھے جیسے نوتر استھان پہ کوئی ودھوان' گیانی رِشی بیٹھا ہو۔ اردگرد اِن کے شاگرد چیلے بیٹھے ان کا بھاشن سُن رہے ہوں؟ مَیں سب سے پہلے ان کی لاہور آمد کے سلسلہ میں ہی حیران تھا کہ اِس سخت گرمی کے دِنوں میں اِدھر آنے کی کیا تُک بنتی ہے...... دُوجے اس خلیہ میں' اِن بازاری لوگوں کے بیچ' اِس طرح گھس کر بیٹھنے کی وجہ بھی سمجھ سے بالا تھی...... بہرکیف! مَیں ان کے چُپ رہنے کے اشارے کے مطابق خاموش رہا۔ ایک تو بے ڈھب سا بیٹھنے کی بناء پہ مَیں خاصا بدمزہ

تھا دُوسرے ٗ عجیب وغریب حلقوں میں مجسم ٹھساز کر ٗ خاموشی اختیار کرنا بھی اِک مشکل امتحان تھا جس ٗ اور پیاس پسینے نے میرا بُرا حال...... ! طبیعت مالش کر رہی تھی اور بہت سے سوالات میرے دماغ میں بچھوؤں کی مانند کلبلا رہے تھے...... ایک ہی پہلو بیٹھے بیٹھے میری ایک ٹانگ سُن ہو چکی تھی جیسے وہ میرے جسم کا حصّہ ہی نہ ہو۔ مَیں بے چین سا ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے انگریزی میں پوچھنے لگے۔

''تمھیں کچھ تکلیف ہے......؟''

مَیں نے بڑبڑاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

''اس اژدحام میں دَم گھٹ رہا ہے۔ مَیں حیران ہوں آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟''

میری بات کا کچھ جواب دینے کی بجائے اُنھوں نے ہونٹوں پہ اُنگلی دھر کے مجھے پھر خاموش رہنے کا اِشارہ کیا۔''

اِنسان جب کوئی بات یا اَسرار سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو وہ اُس جیپ کی طرح ہوتا ہے جو چڑھائی کے پتھریلے راستے پہ پہلے یا دُوسرے گیئر میں بھی چڑھنے سے عاجز ہوتی ہے ٗ اُسے پھر سپیشل گیئر کی ضرورت پڑتی ہے۔ مَیں بھی جب یہ معاملات نہ سمجھ پایا تو اپنے اَندر کسی سپیشل گیئر کو تلاش کرنے لگا جو یہ نہ سمجھ میں آنے والی بات کی چڑھائی کو سر کر سکے۔ ایسے مواقع پہ مَیں اپنے حواسِ ظاہریہ کو حواسِ باطنیہ کے سپرد کر دیتا ہوں...... حالت میری وہی ٗ جو ایک نشئی کی ہوتی ہے جو اپنی خوراک لینے کے بعد خُود کو خُود کے حوالے کر کے خُود نچنت ہو جاتا ہے...... وہ ماحول میں بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی ٗ بات کرتا بھی ہے سنتا بھی ہے ٗ دیکھتا بھی ہے...... مگر وہ وہاں موجود نہیں ہوتا......!

مَیں اپنے آپ سے واپس اُس وقت ہُوا جب اُنھوں نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا...... اُٹھتے ہوئے اپنے ساتھ لیے مسجد کی جانب نکل آئے...... نمازِ عصر کی اَدائیگی کے بعد مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کبھی کسی مینار پہ چڑھے ہو......؟''

مَیں خوفزدہ سا اُن کا مُنہ تکنے لگا...... یہ تو ویسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی سیانا کسی بچّے سے پوچھے ٗ کبھی مونگ پھلی یا ریوڑیاں کھائی ہیں؟

''تم نے جواب نہیں دیا......'' وہ پوچھنے لگے!

مَیں سہما سا فرفرایا...... ''جی مَیں نے دُنیا کے چیدہ چیدہ مینار دیکھ رکھے ہیں بلکہ اُوپر تک پہنچا بھی ہوں بلکہ ایسے بُرج بھی ٗ جو دشمنی ٗ عقوبت گاہ ٗ رسدگاہ ٗ نگہبانی کے طور استعمال ہوئے......''

چند لمحہ اُوپری سی نظروں سے تولتے ہوئے بولے۔

''پھر تو میرے ساتھ' آج مینار پہ ضرور چڑھو...... ہم مینار کے اُوپر سے قریب و دُور کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں گے...... اُوپر سے شاہی قلعہ' شاہدرہ' راوی گھاٹ' داتا صاحب' چوبرجی' نور جہاں' نادرہ بیگم' جہانگیر کا مقبرہ' رنجیت سنگھ کی سمادھی' پرانا شہر بہت واضح دکھائی دیتے تھے اور شاید اب بھی دکھائی دیتے ہوں..؟

میرے لیے اَب مزید حیرانی کی بات تھی۔ ایسی دھوپ گرمی کہ چیل نے انڈہ چھوڑا ہُوا ہے اور ہم مینار کی چڑھت اُترت میں لگ جائیں...... میں نے معذرت سے عرض کی۔

''میر صاحب! پسینے سے بُرا حال ہے...... اگر مینار پہ ہی چڑھنا تو شام کا وقت مناسب رہے گا...... آیئے' ہم بازار سے فالودے والا ٹھنڈا میٹھا دُودھ پیتے ہیں......''

فرمایا...... ''بات تو تمہاری دُرست ہے۔ پرنتو! مجھے کی ستوگن تھوڑی دیر بعد کھلنے والی ہے۔ جب مینار کا سایہ بارہ دری پہ دراز ہوگا۔''

میں بھلا کیا سمجھتا؟...... سرڈال کے پیچھے ہولیا۔

مینار کے باہر کھڑا نگہبان' عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مینار' لوہے کی لاٹ کی مانند تپ رہا ہے...... آپ شام کو اُوپر جائیں' یہ وقت مناسب نہیں......''

میر صاحب بولے۔ ''بھائی! ہم باہر سے آئے ہیں' ہمارے پاس وقت کی کمی ہے۔ گرمی تو اِدھر بھی ہے بلکہ لُو چل رہی ہے...... مینار کے اَندر کم از کم لُو کی کاٹ سے تو بچیں گے۔''

اَب ہم اُوپر چڑھ رہے تھے......!

مینار اور کنویں بھی اک دُوجے کے عجیب وغریب نقیض ہوتے ہیں' مینار اُوپر اُٹھتا ہُوا یُوں دکھائی دیتا ہے کہ عالم بالا کو تکنگی لگا کر رہے گا اور کنواں' نیچے یُوں گھستا ہوا' لگتا ہے کہ تحت الثریٰ تک' اُتر کر ہی دم لے گا۔ یہ دونوں بازیگر دیکھنے' اُترنے' چڑھنے والوں کو عجیب دھوکہ دیتے ہیں...... یہ بلندی اور پستی کے استعارے' اپنے باطن میں سفر کرنے والوں کے لیے نت نئے نظارے اور جہان رکھتے ہیں۔ یہ بھی دکھاتے ہیں کہ پستی سے بلندی...... گگن سے پاتال' کیسے دکھائی دیتے ہیں؟ کششِ ثقل اور کششِ آفاق کیا ہوتی ہیں؟...... انتہائی نیچے اور انتہائی اُوپر' وقت زمانہ' اندھیرا اُجالا' زندگی موت' احساس وجذبات' رُوحانیت مادیت...... نفسیت اور جنسیت کے تقاضے' رُونیے' کیا ہوتے ہیں اور وہ اپنی باطنی سیرت کیسے اُجاگر کرتے ہیں۔

جُوں جُوں میں اِس صاحبِ فہم وذکا' اَسرار ونگاہ کے پیچھے' اُوپر چڑھتا گیا تُوں تُوں میرے سر سے سراب نیچے کی طرف سرکتے گئے--- اُٹھنے والے ہر قدم پہ محسوس ہوتا جیسے میں اُنگشت بھر چھوٹا ہوگیا ہوں۔ وزن بھی اُترتا جارہا ہے۔ آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے یُوں لگا ڈیڑھ بالشت کا بونا رہ گیا ہوں جس میں گوشت

پوست کی بجائے ہوا بھری ہے ۔۔۔۔ ویسے بھی کسی مرد بلند مقام کی معیت و مصاحبت میں زیادہ مدت بھی ہونے ہی لگتے ہیں......"

اوپر پہنچنے میں چند سیڑھیوں کا فاصلہ ہی تھا کہ دم درستگی کی خاطر سیڑھی پہ بیٹھ گئے اور مجھے بھی بٹھا لیا جبکہ مینار کی آخری منزل کا دروازہ وہاں ہی تھا۔ اُن کا ادھر یوں بار بار بیٹھنا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مجھے قدرے متردد پا کر خود ہی کہنے لگے!

"یار ایک تو ادھر ابھی کچھ دھوپ ہے ۔۔۔۔ اتنی چڑھائی کر کے آئے ہیں، دم پھول گیا ہے۔ سوچا چلو! کچھ دیر یہاں سائے میں سستا لیتے ہیں ۔۔۔۔ تم ذرا دم لے لو ۔۔۔۔ اور میں تمہیں خضری باغ اور بارہ دری کے بارے کچھ بتاتا ہوں ۔۔۔۔ تمہیں تعجب ہوا تھا کہ میں اس شدت کی گرمی میں پاکستان خاص طور چلا ہوں اور اس وقت یہاں کیوں آیا ہوں؟ ۔۔۔۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے ۔۔۔۔ کہ میاں سرد ہوائیں، خزاں، بہار یہ سارے زندگی کے حوالے اور ہمارے اپنے موسم ہیں۔ انگلینڈ کی شدت کی سردی برفباری وغیرہ تو ہم خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ گرمی بھی برداشت کرنی چاہیے ۔۔۔۔ جسم و جان کے فرائض ادا ہوتے ہیں۔ بدن کے فاسد مادے پسینے کے راستے خارج ہوتے ہیں۔ میرا ادھر آنے کا مقصد گرمی اٹھوانے کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ شاید تمہاری سمجھ میں یہ بات نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کے دن کے دوسرے پہر میں یہ ساعت "طولِ مختصر" ساعتیں بھی ہو گزرتی ہیں کہ اگر کوئی عامل نجم کی چاندنی بارہ دری برج مینار یا باؤلی کہ جس کی تعمیر ارضی و افلاکی تنجیم و ترتیب کے تحت ہوئی ہوئے مرکزی نقطۂ اتصال میں انہیں پالینے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اپنے ہاتھ کے قلم سے ایسی لوح نقش زائچہ چیز وہاں لکھ سکتا ہے جو گردشِ حالات، نظر بد، سحر بندی، ناموافق ستاروں کی نحوست اور شر انگیزیات و سمیات سے نجات کا موجب بن سکتے ہیں......"

حیرانی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے میں انہیں تکنے لگا۔

انہی لمحوں میں کسی قفس کی طرح میرے اذہان پہ القا ہونے لگا۔ مجھے جاننا چاہیے کہ کارخانۂ قدرت میں قیام صرف تغیر کو ہے۔ ہر شے تخلیق کے حساب میں ایک ورد گردش کرتی ہے۔ کشش ثقل اس کا نظام میں گردش پذیر اجرام فلکی کی طرح ارض بھی اپنے مدار میں محوِ گردش ہے ۔۔۔ وہ ذات میں گردشیں کی بندی ہیں لیکن افلاکی نظام کے تحت ایک معینہ مدت کے بعد ان کی حرکت و برکت میں چھوٹی تبدیلیاں بھی واقع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی اصل وجہ تو قادر مطلق ہی جانتا ہے مگر جو بھی سمجھ میں آتا ہے اس سے سامنے آیا کہ ان تبدیلیوں میں مخلوق اللہ کے لیے خیر و برکت کے فیصلے ہوتے ہیں ۔۔۔۔ ان تبدیلیوں کو اللہ کے مخصوص بندے ہی

بہتر سمجھتے ہیں کہ اُن کے ہاں علومِ وہبی کے علاوہ عصری ظاہری دانش جو ہوتی ہے...... سُرخ جھکڑوں بگولوں کی یلغار' آتش فشانی' آندھیاں طوفان' سیلاب' مدّوجزر وغیرہ...... گرمی کا حد سے بڑھ جانا۔ کبھی سردی برف باری' اَولوں کا پڑنا...... رات بڑی اور کبھی دن...... بارشوں کی شدّت اور کہیں حد کا سُوکھا...... چاند سورج کے گرہن' گھٹاؤ بڑھاؤ بھی اِنسان کو خوف اور ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ستاروں کا ٹوٹنا اور گرنا...... چیدہ چیدہ ستاروں' منحوس' کہکشاؤں سیاروں کی تلوّن مزاجیاں...... آسمانی غبار کی آلودگی' بجلیوں کی بے جا گڑگڑاہٹ اور صاعقہ کا پے دَر پے زمین پہ گرنا...... دریاؤں سمندروں کا رُخ بدلنا' پہاڑوں کا کھسکنا...... سرسبز گھنے جنگلوں کا اچانک آگ کی لپیٹ میں آ جانا۔ سمندری حیات کی تباہی' اُن کا مُردہ حالت میں کنارے پہ آ پڑنا۔ نہ سمجھ میں آنے والی مہلک بیماریوں اور وَباؤں کا ناگاہ پھوٹ پڑنا' اور بھی بہت کچھ......؟

یہ بے شمار تبدیلیاں تغیرات' کائناتی نظام کا حصّہ ہیں۔ ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے کہ فطرت' کسی بھی تبدیلی سے قبل' کچھ اِشارے ضرور دیتی ہے۔ اگر کوئی صاحبِ بصیرت اُن اشاروں کو سمجھ لے تو پھر کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکلتی ہوئی نظر آ جاتی ہے۔ دریں صورت پھر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ بارش ژالہ باری' زلزلے' لاوا فشانی' قحطِ آب' وَبا سے پہلے بھی بہت سے اِشارے' پیغامات ہم تک پہنچتے ہیں۔ مگر ہم اُنہیں درخورِ اعتنا نہیں گردانتے......''

ملکوں قوموں اور اَرضی طبقات میں جو اچانک بڑی بڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ اُن کی دیگر وجوہات کے علاوہ' اَرضی' سماوی اور ساکنانِ افلاکی' سیاروں' ستاروں' بُرجوں' گمنُوں' منحوس' کھوکسوں اور گُنبدوں کی اُتھل پُتھل کا بھی خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ انجم شناس' ہیئت دان' افلاک بین' اپنی مخصوص تجربہ گاہوں اور سیارگاہوں میں اِک مخصوص سمے کے حصار میں اُن کی چالوں' ٹھکانوں اور اُن کی آئندہ متوقع رُجحانات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اِس عمل میں وہ بڑی وسیع النظر طاقتور دُوربینیں' قدیمی مُقدمے' نقشے' تقویم و تنجیم کی کُتب' لکھے' عمر خیام' ملک شاہ' ابنِ یونس' شرف الدولہ' الطوسی کی بخششیں' نظریے اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ دیگر سیرین' رُوحانیتِ فلکی اور استعانتِ اجرام کے ماہرین ایسی قرانُ السعدین کی ساعتوں میں اپنی رَصدگاہوں میں مشغول ہوتے ہیں۔''

قدرے توقف کے بعد میر صاحب مزید بتانے لگے۔

''آج کا دن اور یہ گزرتے ہوئے لمحات' ایسی ہی ایک افلاکی تبدیلیوں کو قدرے آسانی سے سمجھنے کے لیے ممد جانے جاتے ہیں۔ ان کا کما حقہ' ادراک حاصل کرنے کے لیے' اَرضی اِستعانتوں کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ جیسے کسی بھاری بوجھ کو سہارنے کے لیے پاؤں نیچے کی زمین بھی سخت ہونی چاہیے ورنہ بوجھ

اُٹھانے والا' بوجھ سمیت زمین میں دھنس کے رہ جائے گا۔ اسی طرح' اس کے' اِن پُراسرار لمحوں کی برکات حاصل کرنے کے لیے ایسے ارضی طبق کی ضرورت ہوتی ہے...... جس پہ سلامتی سے موجود رہ کے' اُس کی منفعت سے بچ کر اپنا مقصد حاصل کیا جا سکے! برصغیر پاکستان ہندوستان میں ایسی بہت سی جگہیں ہیں۔ ایک تو دہلی میں مہرولی کے قطب مینار کے پاس قطب لاٹ ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں یہ صدیوں کے سینوں پہ گڑی ہوئی تعمیرات یونہی بنادی گئی تھیں۔ نہیں...... ! اُن وقتوں کے بادشاہ' محض تاج پہننے اور تخت پہ بیٹھنے والے بادشاہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ وہ بڑے وقت شناس' گہرا ادراک اور اُلوہی حکمت و دانش رکھنے والے بادشاہ بھی ہوتے تھے۔ اُن کے ہاں بڑے بڑے عالم' نکتہ دان ماہرِ تعمیرات' مستقبل بین اور عالمانِ بحر و بَر ' ارض و آفاق موجود ہوتے تھے...... جو ہمہ اَوقات' علم و دانش اور فن و ہنر کی روشنی میں' موجودہ اور آنے والے وقتوں کے لیے ایسی تعمیرات کے عملی تصور پیش کرتے جو بنی نوعِ انسان کے لیے حکمت و علمیت اور فکر و تجسس کا دَر کھلے رکھتے......''

غور کرنے کی بات ہے کہ صدیوں پہلے کی یہ تعمیرات آج بھی ہمارے لیے پُراسرار اور انوکھی ہیں۔ اُن کی فنی باریکیوں' پختت و پیچ' طریقِ تعمیر' استعمال ہونے والے آلات' مسالے' ہنر و تکنیک کو ہم آج بھی صحیح سے جان نہ پائے لیکن اس کے باوجود کچھ ایسے نفوس بھی موجود ہیں جو ان تعمیراتی اَسرار اور حکمتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ ایسی ہی ایک اور جگہ' بہاول پور کے قریب قلعہ دراوڑ کے کنویں کے پاس سطح سے نیچے ایک چار حدہ ہے...... جدھر سے زیرِ زمین چار مختلف راستے' کبھی کھلتے تھے۔ جو جودھپور' دہلی' آگرہ اور ملتان۔ ان کے علاوہ قلعہ آگرہ' قلعہ منگلا' تارا گڈھ' قلعہ سکردو' ٹلہ جوگیاں' جھیل سیف الملوک' سیالکوٹ کا قلعہ' ٹیکسلا' سکردو بھی ہیں...... لاہور میں ایسا ایک استھان یہ بارہ دری بھی ہے......؟

اِک زمانہ ہو گزرا' قلعہ' شاہی محلّہ' یادگار' دریائے راوی کا گھاٹ' کچھ پَرے داتا ہجویریؒ والا ٹیلہ اس کے ساتھ ہی دریا کا بیلہ' اُس پار شاہدرہ کھجوروں کے باغات' ذخیرے' کھلے میدان' سرائیں بھٹیار خانے اور تجارتی منڈیاں...... ہند سندھ' موہنجو داڑو' کلاچی' دیبل' بصرہ' عدن' ملتان' مشہد' کاٹھیاواڑ' سومناتھ' بنارس' سیالکوٹ' پشاور و افغانستان' بلخ بخارے' چین سے قافلے ادھر پڑاؤ ڈالا کرتے تھے۔ قدرت' انسانوں' جانوروں' پرندوں کو خود بخود سُجھا دیتی ہے کہ کون سی جگہ' علاقہ اُن کی سلامتی اور خیر و برکت کے لیے ہے۔ جس زمین پہ سبزہ لہرائے' فصلیں بار آور ہوں۔ مویشیوں کے لیے چارا' پرندوں کے لیے دانہ اور انسانوں کے لیے روزی رزق کھلے...... وہی قطعہ زمین مثلِ فردوس ہوتا ہے......''

یہ بارہ دری اور قُرب جوار ایسا ہی ایک پُراسرار استھان ہیں...... جس طرح ہر چکی کے پاٹ کا ایک قطب ہوتا ہے جو بھاری پتھر کو ایک مرکز پہ قائم رکھ کر گھومنے میں اس کی مدد کرتا ہے اسی طرح کسی بستی شہر بلد

میں بھی قطب ہوتا ہے جو اُس کے رُوحانی مرکز کو قائم رکھتا ہے۔ ایسے ہی کسی طبق اَرضی کا بھی ایک قطب ہوتا ہے جو اُسے اَرضی سماوی آفتوں سے محفوظ رکھنے میں ممد ثابت ہو سکتا ہے...... لیکن یہ پتہ لگانا قدرے مشکل ہوتا ہے کہ اِس بار سعد سے اَرض کے کس طبق یعنی حصہ زمین پہ نزول کرے گا...... اس جائے نزول کا تعین کرنے کے لیے مختلف قیاس آرائیوں اور اندازوں کا سہارا لینا پڑتا ہے جو غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال مجھے اِک عرصہ سے اس سَمے کا اِنتظار رہا......''

ہفتہ پہلے میں لاہور پہنچ چکا تھا اور مختلف طریقوں سے اِس سَمے کے نزول کا اندازہ لگاتا رہا۔ اپنے اندازے کے مطابق میں پوری تیاری سے آج صبح ہی یہاں بارہ دَری پہنچ چکا تھا۔ خلیہ کپڑے بھی عام لوگوں جیسے کہ مجھے اِدھر جم کر بیٹھنے میں دُشواری نہ ہو۔ جوں جوں سورج اُوپر اُٹھتا گیا، گرمی اور تپش نے بُرا حال کر دیا...... میں چونکہ درمیان میں پڑا ہوا تھا اس لیے قدرے بچا رہا لیکن اِدھر بیٹھے لیٹنے والے آوارہ گرد اور فارغ اوقات لوگوں سے محفوظ نہ رہ سکا، کوئی سونے لگا رہا تو کوئی گا بجا رہا ہے...... کوئی خزانوں سے سو رہا ہے تو کوئی کسی سے ملکی حالات پہ بحث مباحثے میں جُتا ہوا ہے...... مگر میں اپنے مخصوص آسن میں بیٹھا اُس سعد سَمے کے اِنتظار میں تھا جو کسی طرح بھی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اِسی اثنا تم پہ نظر پڑی، تم اِدھر اُدھر شاید اِدھر بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کر رہے تھے۔ میرے آواز دینے پہ تم مُجسّم گُھسنار کر کے میرے پاس آ بیٹھے۔ تم مجھے اِدھر دیکھ کر متعجب ہوئے اور مجھ سے بات کرنا چاہی...... میں نے اشارے سے تمہیں رُوک دیا۔ اَب تم یہ سُن کر حیران رہ جاؤ گے کہ میرا اندازہ غلط نکلا۔ اُس ساعت کا مرکز کوئی اور طبق اَرضی رہا ہوگا لیکن اُن مخصوص لہروں کا کچھ نہ کچھ اثر اِس طبق پہ بھی ہوا...... مجھے محسوس ہوا کہ میں اِن کے راستہ میں ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اِدھر سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا اور تمہیں بھی بٹھا لیا۔ مجھے چُھو کر دیکھو لگتا ہے میں برف کی سِل میں تبدیل ہو چکا ہوں۔''

میں نے چُھوا تو یہی محسوس ہوا کہ اُنہیں ابھی ابھی کسی گلیشیر سے نکالا گیا ہے۔ ایسی گرمی میں ایسی سردی کہ اُنہیں محض چُھو لینے سے ہی میں کپکپا کر رہ گیا...... میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھ لیا۔

''میر صاحب! اِس سعد سَمے کی تسخیر کے بعد کیا حاصل ہوتا ہے......؟''

اُن کا جواب تھا...... ''کوئی خزانہ تو حاصل نہیں ہوتا...... نیک خواہشات کی تکمیل ہو جاتی ہے، کسی وجہ سے بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں، دماغ کا تیسرا طبق جو اندھیرے میں ڈوبا اور ابہام میں تیرتا ہوا محسوس ہوتا ہے رُوشن اور کُھل جاتا ہے...... یہ بند رہے تو عقل بینش کے بڑے بازار بند رہتے ہیں۔ کھڑکے کھوکھے کُھلے رہتے ہیں اس سَمے تیسرے آسمان پہ بزرگ ستاروں سیاروں کے گھر، راستے اور منزلیں سمجھ میں آتی ہیں......''

میں اِب اَن کہی اور انوکھی باتوں کو کیا سمجھتا؟ بس! اپنی علمی کجی اور کم مائیگی چھپانے کی خاطر یوں ہی

سوال کر بیٹھا۔

''میر صاحب! جموں' بابا بالی شاہ کے مزار پہ ایک ننگے فقیر نے مجھے کاجل کوٹھے کی راہ سجھائی تھی...... تین کاجل کوٹھے بتائے تھے۔ شری نگری کی جھیل کے اُس پار ایک درویش کے ہاں' جو کاجل بناتے تھے۔ دُوسرا لاہور شاہی محلّہ کے ایک کوٹھے پہ' تیسرا میرے اپنے اندر...... شاہی محلّہ والا کاجل کوٹھا نہیں ملتا۔ اِک زمانہ سے اِدھر پھیرا لگا رہا ہوں کہ کوئی وسیلہ ملے جو کاجل کوٹھے تک لے جائے...... آپ سے درخواست ہے اِس سعد کے' میری کچھ دستگیری فرمائیں......''

میر صاحب نے نرم سی نگاہوں سے میری جانب دیکھا...... کچھ دیر بعد فرمایا۔

''اُوپر چلے جاؤ پلٹ کر میری جانب نہ دیکھنا اور نہ ہی میری تلاش کرنا......''

میر صاحب' جیسے نرم خو بزرگ کی زبانی یہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا...... یقیناً میں نے کہنے سننے میں کہیں غلطی کی ہے یا اِس جگہ' ساعت کی مناسبت سے مجھے ایسی بات نہ کرنا چاہیے تھی۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور میں بیٹھا بیٹھا کسمسانے لگا تو قدرے تیکھے سے فرمانے لگے۔

''بزرگوں کے کہے پہ کُنّی نہیں مارنی چاہئے...... بن سوچے سمجھے فی الفور عمل کرنا چاہئے...... سمے کسی کا اِنتظار نہیں کرتا...... لوگ صدیوں اُس کا اِنتظار کرتے ہیں...... ایک پل کی دیر بھی ہو جائے تو چھتری پہ بیٹھا ہُوا شیرازی کبوتر اُڑ جاتا ہے......!''

میں چھپڑاپی مار کر اُٹھا' اُن کا ہاتھ چوما اور پانچ سیڑھیاں اُوپر پہنچ گیا...... ایک دَم جو دروازہ سے نکلا تو سامنے مینار کی منڈیر پہ بیٹھا کالا شا شیرازی' جھونکا لے کر شاہی محلّہ کی جانب اُڑ گیا۔ میں نے اِک نظر اُسے بیٹھے ہوئے بھی دیکھا' گھبرا کر اُڑتے ہوئے بھی اور پھر شاہی محلّہ کی اُونچی چھتوں پہ اَن گنت چھتریوں کی طرف محوِ پرواز بھی دیکھا۔ کیا بانکا چھیلا کبوتر تھا۔ کالے رنگ نے اُسے شہ کا فورسا بنا دیا ہوا تھا...... اُس کی سرخ متوحش آنکھیں اور بانکی گردن کا مزہ لے ہی رہا تھا کہ اسی لمحہ! بُری طرح ہانپتا ہوا' ایک کالا بھجنگ اُدھیڑ عمر شخص اُوپر آیا...... اِدھر اُدھر اور آسمان کی جانب دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''کچھ دیر پہلے یہاں ایک کالا کبوتر بیٹھا تھا وہ اُڑ کر کس طرف گیا ہے؟''

میں نے شاہی محلّہ کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''اِس طرف......!''

وہ اُدھر دیکھ کر واپس نیچے اُترنے لگا تو میں نے اُسے تھوڑی دیر یہاں دَم دُرست کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے پوچھ لیا۔

"یہ خوبصورت کالا کبوتر تمہارا ہے یا پھر ویسے ہی تم اسے پکڑنا چاہتے تھے......؟"

وہ آخری سیڑھی کے ٹکڑے پہ بیٹھتے ہوئے بتانے لگا۔

"یہ کبوتر' میری بچے نسروں کی سرکار' سفیداں بائی کا خاص پسندیدہ کبوتر ہے...... کل صبح اپنی معمول کی اُڑان پہ نکلا تھا۔ شام پھر رات واپس نہ آیا تو بائی جی ساری رات چھتری کے نیچے بے چین پڑی رہی...... اب بھی وہ تڑپ رہی ہے' بس ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔ ہائے میرا اُجرا' میرا کاجل...... ہائے رے کالے خان! میرے کاجل کو ڈھونڈ...... قلعہ جا' میناروں پہ دیکھ' بازار والوں سے پوچھ' کسی بلی سے پتہ کر' منّے کے پاس...... کاجل نہ ملا تو میں اس کوٹھے سے کود جاؤں گی......"

میں تو کاجل کا لفظ سن کر ہی غفلت ہو گیا تھا اب جو کوٹھے کو سنا تو میر صاحب کی بات' پوری سمجھ میں آ گئی......"

قارئین! پچھلی کتاب "کاجل کوٹھا" میں سفیداں بائی کی داستان اُدھوری رہ گئی تھی۔ ویسے بھی داستانیں اُدھوری ہی رہیں تو داستانیں لگتی ہیں...... مکمل ہو جائیں تو کہانیاں بن کر اساطیر میں ڈھل جاتی ہیں۔ ان کی طرح' اُدھوری محبتیں' اُدھورے تعلق' اُدھورے وعدے' اُدھوری تحریریں' تصویریں' تقدیریں بھی بڑا سواد دیتی ہیں۔ اُدھورے سفر تو کئی منزلیں مارنے کے بعد کسی قسمت والے کو نصیب ہوتے ہیں۔ جس طرح اُدھوری بیماریاں' بڑی شفایاز ہوتی ہیں اسی طرح اُدھوری شادمانیاں بھی خوب شاد باد کرتی ہیں۔ مجھے کالے خان المعروف جموں را کالے کے توسیلے اور میر بشیر صاحب کے حیلے سے دوسرے کاجل کوٹھے تک پہنچنے کی توفیق ہوئی۔ یہ وہ زمانہ وہ تھا جب سفیداں بھائی پہ "جذب" پولی پولی پھوہا نما برف کی مانند آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا جبکہ استغنا ابھی ابھی کچھ منزل دور تھا......؟

سفیداں بائی کی زندگی کے آخری برسوں میں' میں مسلسل ہر جمعرات وہاں' ناشتہ کے ساتھ حاضری دیتا رہا۔ اپنے ہاتھوں چھوٹے چھوٹے لقمے کھلایا کرتا...... کبھی طبیعت میں ہوتیں تو کچھ کہہ بتا دیتیں ورنہ کالے خان تو تھا ہی...... انتقال کے متعلق سب کچھ کہہ سن گئیں...... اور کچھ ملفوظے' مخطوطے بھی دے گئیں......

ایک اور بات کہی...... "ضروری نہیں آپ بُرے لوگوں میں پیدا ہوئے ہوں اور بُرے ہو جائیں اور نہ یہ کہ اچھے لوگوں میں جنم لے کر اچھے ہوں...... کڑی دھوپ میں آپ کسی چھتر کے نیچے پناہ لے کر دھوپ سے بچ سکتے ہیں۔ گودڑیوں سے بھی لعل نکل آتے ہیں" ......

سفیداں بائی جنہوں نے مجھے کاجل کوٹھا وصیت میں عطا کر دیا تھا۔ میرے ہاتھوں' ایک جمعرات کی کالی شام' میانی کے ایک تاریک گوشے میں آسودہ ہوئیں۔ کالے خان چند برس بعد تک اُن کی قبر پہ بیٹھا پھر

وہیں خاموشی سے اُن کے پاؤں میں لمبی تان کے پڑ گیا۔"

بات خفگی کی تھی...... اس سے دشمنی کے باوجود میں نے مائی جی سے خفگی علیحدہ نہیں رکھا کہ ضروری نہیں اسے آگ، تمہا کو سے آلودہ کیا جائے۔ اس سے بچ کر بھی خفگی پیا جا سکتا ہے شاید یہی حق خفگی ہوتا ہے......

سفیداں بائی بھی تو نکھن کے پیڑے کی مانند سفید، پولی پولی تھی مگر نصیبوں کے رنگ کیسے بکھرے اور بے آب تھے کہ اصل میں وہ "پیار رنگ کالا" لیے "کاجل کوٹھے" میں پیدا ہوئی تھی۔ کاجل اور کوٹھا، دونوں آخر اسے مل ہی گئے تھے...... دیکھئے کہ انسان کو اس کی منزل کن کن عجیب وغریب راہوں پہ چل کے ملتی ہے؟

## ● نسوار کے چمتکار......!

واپس چلتے ہیں...... لانچ منگم میں جدھر انجن روم کے فرش پہ بیٹھا چاچا علمدار پنجی اپنی "مشہور زمانہ ملاحاں" ہاتھوں ہاتھ بکنے والی نسوار "ملنگنی" بنانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ عجیب ملنگ سا بوڑھا تھا، جو دماغ میں آتا کہہ دیتا...... لانچ منگم کو وہ منگی کہہ بولتا تھا۔ اسی طرح اُس نے اپنی مرضی سے اپنی ہوم میڈ فضول سی نسوار کا بکنیم بھی ملنگنی رکھا ہوا تھا۔ اس نسوار کی نسبت مشہور تھا کہ کراچی، گڈاونی، پسنی، گوادر یا ادھر کی کسی بھی جیٹی، بندرگاہ سے روانہ ہونے والی لانچ، کشتی یا جہاز میں ملاحوں کے لئے اور کچھ ہو نہ ہو چاچے علمدار پنجی کی ملنگنی وافر ہونی چاہیے کہ یہی اصل مسالہ ہے جس سے خلاصی لوگ چلتے ہیں اور اُن سے آگے کشتیاں لانچیں چلتی ہیں......

چاچا علمدار پنجی کے پاس نسوار بنانے کا وہ کون سا صدری نسخہ تھا کہ جس نے اس جادوئی نسوار کو پاکستان سے لے کر خلیج کے ملکوں تک مشہور کر دیا تھا۔"

مجھے ایک پُرانے نسواری خلاصی نے بڑی رازداری سے بتایا۔ بلوچستان اور سندھ کے بڑے بڑے وڈیرے اور جاگیردار چاچے کی نسوار خاص طور پہ منگواتے ہیں۔ کچھ نسوار فروشوں نے اس نسخے کو حاصل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کیں۔ چاچے کو روپے پیسے کا لالچ بھی دیا مگر اس نے اپنی پُرانی ڈگر نہ چھوڑی...... وہی ایک آنہ کی پُڑیا...... کسی کے پاس پیسے نہ ہوں تو ویسے ہی دے دیا کرتا تھا۔ پیسے دھیلے کی پروا بھی نہ تھی۔ بس اپنی اور نسوار کی عزت، شہرت کا خیال تھا......!

چاچا، نسوار ہمیشہ علیحدگی میں بناتا...... ایک دو روز اس کی تیاری کے لیے ضرورت کی اشیاء وغیرہ اکٹھے کرتا رہتا...... پھر وہ موقع دیکھتے ہی، نیچے انجن روم کی ڈیوٹی پکڑ لیتا۔ اُوپر کا دروازہ اندر سے بند کر کے اپنے کام میں جُت جاتا...... یہ بھی نہ تھا کہ نسوار کے مسالے کچھ سیکرٹ تھے بلکہ وہ تو قریب قریب اس کا سارا

سامان دُوسرے خلاصیوں کے ہاتھوں بازار سے منگواتا۔ ہر نسوار یا جانتا تھا کہ یہ کیسے تیار ہوتی ہے مگر اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ضرور تھا جو صرف چاچا کے سینے میں تھا...... بس کوئی ایک آدھ چٹکی مسالہ ہی ہوگا جسے کوئی نہ جان سکا تھا......؟

جب سب سٹاف کو جو بارش کی وجہ سے فارغ تھا، نکال کر وہ دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے انجن رُوم میں اُترا تو میں بے دل سا اپنی نشست پہ لیٹا، اُوپر ٹینک کے پیندے کی مٹی اَن مٹی تحریریں پڑھنے میں وقت گزاری کر رہا تھا۔ اُسے علم تھا کہ میں یہاں موجود ہوں...... اس کے باوجود اُس نے مجھے اُوپر جانے کا نہ کہا۔ میں بھی جانتا تھا کہ وہ اِدھر نسوار بنانے کی خاطر آیا ہے لہٰذا اُٹھتے ہوئے خُود ہی کہا۔

''چاچا! تم اِدھر کام کرو میں اُوپر کیبن میں چلا جاتا ہوں۔''

میری جانب متوجہ ہوئے بغیر ہی بولا...... ''تم میرے پاس یہیں رہو، میری مدد کرو۔''

میں حیران ہوا چاچا تو کسی کو بھی تیاری کے دوران اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتا...... میرے لیے رعائت کیوں؟ ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے ہاتھ پکڑ کر لکڑی کی منگلی تھماتے ہوئے کہا۔

''لو یہ تمباکو کافور اور چونا کوٹو...... نسوار تم دھرتے نہیں، تم سے کیا پردہ؟...... اور پھر تم آج نہیں تو کل واپس دفتر چلے جاؤ گے اور ہم منگی کے ساتھ پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتے پھریں گے۔ لو کوٹو یہ نسوار......!''

کسی سیاہ سخت سی لکڑی کے یہ چٹو اور منگلی، بڑے ہی منحوس اور فضول سے دکھائی دے رہے تھے۔ عجیب بیہودہ سی بدبو میں رچے بسے یہ آلاتِ نسوار سازی ہلکا سا سبز رنگ لیے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے بوٹی رگڑنے والا کونڈی ڈنڈا یاد آ گیا...... لیکن ایک تو وہ سائز میں چھوٹا اور خوبصورت ہوتا ہے جس میں طبیعت مکدر کر دینے والی تیز بُو بھی نہیں ہوتی اور ڈنڈے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گھنگھرو بھی ہوتے ہیں جو بھنگ کی سردائی رگڑتے ہوئے چھن چھن بجتے بڑے بھلے لگتے ہیں...... منگلی پکڑتے ہی ناک منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''چاچا! میں نے نسوار بنانی سیکھ کر کیا کرنا ہے۔ مجھے تو اس کی بدبو سے چکر آنے لگتے ہیں اور ویسے بھی میری داڑھ میں شدید درد ہے۔ ابھی میں صرف تمہیں نسوار بناتے ہوئے دیکھوں گا......''

وہ مجھے اپنی موٹی موٹی خوفناک آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔

''بچے! یہی نسوار جو تم کوٹو گے۔ تمہاری داڑھ درد کا بہترین علاج ہے۔ بس ایک چٹکی اُوپر رکھو...... درد ورد سب غائب......!'' وہ مزید بتانے لگا۔ ''آج تک کسی نسوار یے کے دانتوں میں درد نہیں ہوا اور نہ ہی

کیڑا اور کھکھیڑا لگتا ہے۔ سمندری بیماریوں' تے اُلٹی سے جان چھوٹی رہتی ہے۔ ڈیوٹی کے دوران' نیند کا غلبہ نہیں ہوتا' معدہ اور دماغ ٹھیک کام کرتے ہیں اور سب سے بڑی خوبی کہ '' نسواریا'' اپنے آپ میں مصروف اور مخمور رہتا ہے۔''

اتنی ساری خوبیاں سُن کر مَیں حیران رہ گیا...... اس لانچ میڈ' چاچا کی خاص الخاص نسوار میں اتنے سارے چمتکار...... ایک سوال خود بخود میرے لبوں پہ آ گیا۔

'' چاچا! یہ تمہاری معجزاتی نسوار' کسی خبطی کو جسے سمندروں میں اُترنے اور ڈوبنے کا خبط ہو اس کی کیا مدد کر سکتی ہے؟''

چاچا کی بوڑھی سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہ آیا...... چند ثانیے اپنے نیوے لگانے کے باوجود بھی جب اُس کے پلّے کچھ نہ پڑا تو گڑبڑا کر پوچھنے لگا۔

'' بچّہ! سیدھی بات بولو...... تم کتابوں اخباروں والے لوگوں کو بات گھما پھرا کر کرنے کی بُری عادت ہوتی ہے۔ دو ٹوک بم پٹاس بات کرو......''

## ● دُکھ سُکھ ساگر......!

'' چاچا! مَیں سمندر سے ملنا چاہتا ہوں اُس کی دوستی اور دُشمنی دیکھنا چاہتا ہوں...... زمینی کیڑوں اور کاکروچوں سے مَیں تنگ پڑ گیا ہوں...... زندگی تو وہ ہے جو ڈولتے بڈولتے ہچکولے لیتے' موجوں لہروں سے بھڑتے بجھڑاتے اور ڈوبتے اُبھرتے بسر ہو؟...... چاچا! مَیں ساری عمر تمہاری نسوار کوٹوں گا...... ان کی پڑیاں تیار کروں گا۔ ڈاڑھ میں درد ہونہ ہو تب بھی' اس کی گولی بنا کر منہ میں بھی ضرور رکھوں گا...... بس! ایک بار تم میرے سر پہ ہاتھ دھرو اور اس منگی کے ساتھ میری پکّی منگنی کر دو......''

وہ ہاتھ اور زبان روک کے مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے مَیں نے کوئی ایسی اُنج سی بات کر دی ہو جس کی اُسے مجھ سے توقع نہ تھی۔ جب کچھ دیر اُسے مجھے گھورتے گزر گئی تو مَیں نے ڈرتے ڈرتے پھر زبان کھولی۔

'' چاچا! تم مجھے اس طرح گھور کیوں رہے ہو۔ کیا مَیں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟''

چاچا مجھے گہری نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا۔

'' نہیں بچّہ! ایسا تو کچھ نہیں۔ بس تمہاری ایک بات نے مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دیا...... بالکل ایسی ہی بات' کبھی مَیں نے اپنے بابا سے کی تھی کہ مَیں سمندر سے دوستی کرنا چاہتا ہوں مجھے بھی اپنے ساتھ مچھلی پکڑنے

لے جایا کرو...... میرا بابا' میری یہ خواہش سُن کر خفا ہو گیا' مجھ سے بات چیت کرنا چھوڑ دی۔ میری ماں کے ذریعے مجھے پیغام دیا کہ میں صرف پڑھائی سے دوستی کا سوچوں...... چھوٹے اور کھوٹے' بڑوں اور کھڑوں سے دوستی کرتے اچھے نہیں لگتے...... دوستی' برابر والوں سے ہی بھلی لگتی اور نبھتی ہے۔ اُس وقت تو یہ گمبھیر بات میری سمجھ میں نہ آئی اور کچھ مَن کو بھی نہ بھائی......''

سمندر سے اپنے لیے رزق اور زندگی حاصل کرنا ہمارا پرکھوں سے پیشہ رہا ہے۔ ہمارا اندر بھی سمندر' ہمارا باہر بھی سمندر...... ہمارا جینا بھی سمندر اور مرنا تو ہے ہی سمندر!...... ہماری گوٹھ تین اطراف سمندر کے اندر اور ایک طرف معمولی سی زمین سے جُڑی ہوئی کہ رات' جب جوار بھاٹا جاگے تو وہ راستہ بھی پانی پانی ہی ہو جائے...... پیدا ہونے کے بعد خدا سے بھی پہلے' جس حقیقت پہ سب سے پہلے ایمان لایا' وہ سمندر تھا!...... پیدائش کے وقت میرا باپ سمندر کے بیچ کہیں مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ میرا پہلا نہلا وہ سمندر کے پانی سے تھا۔ سیپ کی کٹوری میں شہد اور مچھلی کا تیل بطور گھٹی چٹایا گیا۔ گھونگوں کی مالا' گردن میں ڈالی گئی...... ریت کے گھروندے' سیپوں کے کھلونے' سمندر جھاگ سے کھیلنا' یہی میرا بچپن!...... بھلا اس سے زیادہ سمبندھ اور سمندر سے دوستی کیا ہوتی ہو گی؟......

میرا بابا جیسے میرا ہی بابا تھا اسی طرح میں بھی اُس کا اکیلا ہی بیٹا تھا۔ میرے بابا کا بابا بھی سمندر کے بڑے پن کے آگے اپنا چھوٹا پن ہار گیا تھا اور اِسی طرح اُس کا بابا بھی اور پھر آگے پیچھے کے سارے بابے بھی...... پھر میرا بابا مجھے کیوں بچانا چاہتا تھا؟...... میرے منہ پہ ابھی مسیں نہیں بھیگی تھیں کہ سمندر نے میرے بابا کو اپنی آغوش میں لے کر بھگو دیا۔ اُس کی مچھلیوں سے بھری ہوئی کشتی کہیں تیسرے روز' دور گہرے پانیوں میں ڈولتی ہوئی ملی کہ میرے بابا کا کچھ سامان ہاتھ آیا۔ ہماری گوٹھ کا قبرستان بھی' کشتیوں کی مرمت کے کارخانے کی بغل میں تھا۔ کبھی کبھی پانی وہاں بھی چڑھ آتا ہے۔ خدا کی حکمت کہ جس دن میرے بابا کو دفنایا گیا اُسی رات سمندر میں ایسی کاٹ آئی کہ قبرستان کی آدھی سے زیادہ قبریں کھل گئیں۔ برسوں پرانی قبروں کے ساتھ میرے بابا کی تازہ قبر بھی دیگر مُردوں اور ہڈیوں سمیت' سمندر کے پیٹ میں چلی گئیں۔

میں اُسی روز ہی سمندر کی حقیقت' اُس کی دوستی' دشمنی کو اچھی طرح جان گیا تھا...... اَب جیسے محرومیوں' تنگدستیوں اور مایوسیوں نے ہمیں نشانے پہ رکھ لیا تھا۔ کچھ دنوں میں ہمارا بچا کھچا اثاثہ بھی ختم ہو گیا تو میں نے بابا کی شکستہ حال کشتی گھسیٹ کر سمندر میں اُتار دی اور پانی سر پہ ڈال کر سمندر سے معافی مانگی۔ ہاتھ میں ناشتہ کا تھیلا لیے میری بیمار ماں اور بہنیں پہنچ گئیں......''

علمدار! آج گھر میں دوسرا فاقہ ہے...... سوائے پانی کے اور کچھ بھی نہیں' سورج غروب سے پہلے گھر

ضرور پلٹ آنا۔ ہاں' کچھ کھانے پکانے کے لیے لاؤ گے تو چولہا چلے گا۔"
اتنا کہہ کر چاچا خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر جھکا ہوا' خالی خالی نظروں سے نسوار والی کونڈی مُنگی کو دیکھتا رہا' ایک لمبی آہ بھر کر بولا۔
"بچے! مجھے سمندر سے دوستی دشمنی کیئے ہوئے چالیس برس ہو چکے ہیں۔ اسی دوستی کی خاطر میں نے شادی نہیں کی...... بہنیں بیاہی گئیں۔ ماں' سمندر کنارے گھونگے سمیٹ رہی تھی کہ بے دھیانی میں کانگڑے کا کانٹا ایڑی میں بیٹھ گیا۔ بس سے پاؤں نیلا پڑ گیا' علاج معالجہ ہوا مگر وہی کہ جو ہونا لکھا تھا۔ لوٹ پوٹ کر بڑہ کر گئی۔ بچے! میں تو خشکی پہ پاؤں دھرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں اور تم پانیوں میں اُترنا چاہتے ہو؟ پانیوں سے دوستی اور دشمنی بڑی مہنگی پڑتی ہے...... میری سمجھ میں یہ بھی آیا پانی سے دوستی وہ کر سکتا ہے جس میں پانی جیسی صفات اور صبور ہو۔ جانتے ہو کہ پانی کی سب سے بڑی صفت کیا ہے؟ لیکن تم نہیں بتا سکو گے کہ تجربات اور مشاہدات کے پانی نے ابھی تمہاری آنکھیں ڈبوئی نہیں بلکہ ابھی تو تمہارے پاؤں کی اُنگلیاں بھی تر نہیں ہوئیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں اس کی بڑی خوبی کہ وہ ہمیشہ زمین کے نیچے اور اُوپر بچھ کر رواں رہتا ہے اور خود کو اُسی راہ راستے یا پیمانے میں ڈھال لیتا ہے جو اُس کے لیے مقرر ہوا ہو...... کہیں رُک جائے تو دیوانہ' رواں رہے تو درویش......!
کہتے ہیں! چلتا ہوا پانی پاک ہوتا ہے چاہے اُس میں کوئی مُردار ہی بہہ رہا ہو۔ پانی بے رنگ و بے ذائقہ ہوتا ہے۔ پانی' نورِ مراہ ہوتا ہے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ آب وہ قطرۂ رحمت ہے جو زمین کے باطن میں سب سے پہلے اُتارا گیا...... برکت عطا کر کے رحمت بنا دیا گیا۔ یہ اکٹھا ہو جاتا ہے اور پھیل بھی جاتا ہے۔ اُڑ جاتا ہے اور جم بھی جاتا ہے' سوئی کا ناکا ہو یا آبشار کا دھارا گزر جاتا ہے۔ کہیں جھیل' کہیں جھرنا...... نالہ اور کہیں دریا' سمندر' بادل برسات' کیسی کیسی شکلیں' صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ بادلوں کے بعد اس پانی کی سب سے عظیم و ضخیم صورت و حالت' سمندر ہے جو پوری زمین سے تین گنا وسیع و عریض ہے...... دیکھا ہے کسی بے بہا سے راہ و رسم یا دوستی کے لیے مقابل کا بھی کسی نہ کسی طور بے اندازہ ہونا ضروری ٹھہرتا ہے اور تم ابھی کم سنے بھی ہو اور کم گنے بھی......"
یہ بھید بھری باتیں میں کیا سمجھ پاتا۔ پرندوں کی مانند میرے سر پہ سے گزر گئیں۔ میری یہ عمر دیکھنے کی زیادہ تھی' سمجھنے اور سننے کی کم...... مجھے اُلّو سا پا کر چاچا' مجھے مزید بتانے لگا۔
"سمندر میں اُترنے کے لیے جن بڑ گوڈوں' جسمانی طاقت' آگے پیچھے کی فراغت اور ازلی بیوقوفی کی ضرورت ہوتی ہے وہ تم میں سرے سے ہی موجود نہیں...... تمہارے ان نازک ہاتھوں میں کاغذ' کتابیں'

قلم دواتیں ہی اچھی لگتی ہیں۔ یہ پائجامہ اور شرٹ' پاؤں میں کینوس کے شوز کا پہناوا تمہیں بھلا لگتا ہے۔ جہاز ہو یا لانچ کشتی جب سمندر کی دشمنی کی زد میں آ جاتے ہیں تو پھر اللہ کے علاوہ اور کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ ٹھلاتی' خوفناک لہریں' بپھری ہوئی غضبناک موجیں' طوفانی ہوائیں' ہمیں موت کے اتنا قریب تر کر دیتی ہیں کہ بس! لمحوں کا فاصلہ ہی درمیان رہ جاتا ہے لیکن ہم اُمید کا دامن' ہاتھ سے نہیں چھوڑتے نہ ہی ہمت ہارتے ہیں بلکہ انتہائی بے چارگی اور مایوسی پیدا کر دینے والے حالات میں بھی سلامتی کا یقین اور اوسان برقرار رکھتے ہوئے کشتی اور جانیں بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلاتے ہی رہتے ہیں...... اور پھر سمندر' ہمارا عزم' ہمت اور بچانے والے کی برتری کو دیکھتے ہوئے ہماری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور ہمیں سلامتی کے ساتھ ساحل پہ پہنچا دیتا ہے۔''

میں مبہوت سا چاچا علمدار ملاح کی علم و دانش اور تجربات سے رچی بسی باتیں' محض کانوں سے ہی نہیں' لگتا تھا اپنے اندر باہر کے جسم و وجود کے اربوں کھربوں مساموں سے بھی سُن رہا ہوں۔ حیران تھا' سمندر کنارے مچھیروں ملاحوں کی ایک پسماندہ گوٹھ میں ایک عام سے مچھیرے کے گھر جنم لینے والا' یہ اَن پڑھ سا چاچا علمدار بھی' ایسی بھید اور کھید بھری باتیں بھی کر سکتا ہے؟ جو علم تجربہ اور روزمرہ کی دانش' اس کے ہاتھ تھی اُسے زندگی کی گود میں بیٹھ کر حاصل نہیں کیا جا سکتا وہ تو زندگی اور موت کے سینے میں اُتر کر میسر ہوتی ہے۔

کچھ دیر بعد جب میری حیرت کی محویت کچھ نرم پڑی اور میں سوجھ بوجھ میں کچھ دم دھرنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے یہی سمجھ میں آیا کہ پانی تو پانی' میں تو خشکی پہ بھی پاؤں دھرنے کے قابل نہیں..... میں کاغذ کتابوں' قلم دواتوں کا کوئی اَدنیٰ سا کیڑا تو ہو سکتا ہوں لیکن کارزارِ حیات میں کسی ایسے کام کاج کے اہل نہیں' جس میں محنت مشقت' برداشت و ہمت کا دخل ہو..... مانا کہ میں دُبلا پتلا اور کمزور تھا مگر ایسا بھی نہیں کہ مجھے ٹی بی کا مریض سمجھ کر کسی ہسپتال میں داخل کرا دیا جاتا۔ ایسا ہوتا تو مجھے اس میگزین کے دفتر میں خطوط کے جوابات لکھنے کی نوکری پہ نہ رکھا جاتا اور نہ اِدھر جیٹی پہ کھجوروں کے بورے ہٹانے کے لیے لایا جاتا۔''

آخر میں نے بم پھٹا سا ہوا......

''چاچا! جب تم نے سمندر سے دوستی دشمنی کے لیے پہلی بار جب اپنے مرحوم باپ کی شکستہ کشتی اکیلے ہی پانی میں دھکیلی تھی تو یقیناً مجھ سے بڑے نہیں تھے اور نہ ہی اس وقت کوئی علم عقل یا ہمت ہو گی۔ کیونکہ مچھیروں کے بچے بھی اکثر مچھلیوں مچھروں جیسے ہی ہوتے ہیں' کوئی مچھندروں کی طرح نہیں..... کہ عمر' اچھی صحت' قد اور تعلیم وغیرہ بھی کسی حد تک ہی اثر انداز ہوتی ہیں جبکہ اصل چیز تو خداداد قابلیت' جذبہ' لگن اور صحیح سمت میں سچی محنت ہے اور اِنہی چار خوبیوں کے تم اُس وقت امین تھے۔ شاید اِن میں سے کوئی ایک آدھ

مجھ میں بھی موجود ہو؟ بہر حال میں اَب سمندر سے دوستی دُشمنی نہیں کروں گا۔ اَب صرف یہی کہ جب تک اِدھر منگی موجود رہے مجھے یہیں ٹھہرنے کا موقع دِلوا دو۔ میں زیادہ سے زیادہ منگی کا قُرب محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میں اِس کے ساتھ اور لنگر کو چُومتے ہوئے تصویریں بھی بنوانا چاہتا ہوں۔''

چاچا مجھے کچھ ایسی نظروں سے گُھوم رہا تھا جیسے کسی احمق بکواسی کے ہذیان پہ اُس سے سلوک کیا جاتا ہے...... میں اُس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے پھر بولا۔

''چاچا! ہوسکتا ہے کہ میری اِس بات میں بے باکی یا گستاخی کا ہلکا سا عنصر شامل ہو اور تمہیں بُرا بھی لگا ہو لیکن کیا میں نے کچھ غلط کہا؟...... تمہیں شاید پتا ہوگا اِس دُنیا میں بڑے بڑے کام 'ایجادیں' کتابیں وغیرہ کِن لوگوں کی وجہ سے معرضِ وُجود میں آئیں' نمایاں کارنامہ ہائے کِن سے ظہور پذیر ہوئے...... اُن علیحدہ لوگوں سے جو بظاہر کمزور' مجہول تھے اور کوئی غیر معمولی پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔ مگر اُن کے ہاں وَلولۂ ہائے تازہ کی کمی نہ تھی۔''

چاچا نے ماتھے پہ گہری گھوری ڈالتے ہوئے زبان کھولی۔

''بچے! سمندروں میں اُترنے اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والوں کے تیور ہی ایسے ہوتے ہیں۔ اُن کے مزاج دُودھ کی ملائی کی طرح نہیں' سمندری جھاگ کی مانند ہوتے ہیں...... جو لہروں پہ سواری کرتے ہوئے کناروں پہ اُتر کر کھنگروں کی طرح سخت جاں ہو جاتی ہے۔ میں بھی جماندرو ملاح ہوں ہماری بناوٹ میں کہیں نرماہٹ چھپی ہوتی ہے جیسے بپھرے ہوئے سمندر کی تہہ میں کہیں سمندری گھاس ہوتی ہے جس کی نرم گرم لہروں اور لہراتے ریشوں میں ننھی مُنھی پونگلیاں مزے سے کھیلتی رہتی ہیں...... بچوں کے لیے اَمن ہی اَمن ہوتا ہے' وہ سمندر میں ہوں صحرا' میدان یا جنگل میں...... سارے سیاپے تو اُن کا نصیب ہوتے ہیں جن کی گنڈی (حلقوم) نِکل آتی ہے مگر تم ابھی بچے ہو نہ جوان...... اِس لیے تمہارا میدان ابھی سمندر سے باہر ہے۔'' ہلکے سے مسکراتے ہوئے مزید کہنے لگا...... ''تم نے سچ کہا کبھی میں بھی سمندر کے بارے میں اِسی طرح سوچتا تھا اور میرا باپ بھی یہی کچھ کہتا تھا جو میں نے تم سے کہا ہے...... میں کوشش کروں گا کہ تم زیادہ سے زیادہ وقت منگی پہ گزار سکو...... مگر اِس کے لنگر اُٹھاتے ہی تم بھی واپس دفتر چلے جاؤ گے۔''

''دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟ اَب تم نسوار بناؤ...... میں تمہارا ہاتھ بٹاتا ہوں۔''

میں اُکڑوں سا فرش پہ بیٹھ گیا۔ چاچا نے مجھے تمباکو' چونا اور کافور کو منے پہ لگا دیا...... اِن تینوں زہروں کی تیز مہک نے میرا ناک مار کر رکھ دیا...... مگر کچھ ہی دیر بعد احساسِ سُود و زیاں نابود ہو گیا۔ دو تین مختلف نوع کے تمباکو' پتری پشاوری' دیسی کھجّو اور کچا سندھی تمباکو اور نہ جانے کیا کیا اَلم غلم تھا۔ کچا پکا چونا' نوشادر' کافور'

سونف کا پانی 'ملٹھی' کپا قدرتی موم' پرامنٹ کا ست 'خشخاس کے ڈوڈے' بھنگ کے تازہ پتے...... ذہن میں بٹھانے کے باوجود بھی کچھ اشیاء یاد نہ رکھ سکا۔ کمال ہے چاچا نے مجھ سے کچھ چھپایا بھی نہیں۔ نسوار کی تیاری میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے کچھ مزید فوائد وتشرفات بھی بتائے کہ کس طرح یہ میری نسوار 'امرت دھارا' کا کام کرتی ہے...... دانت درد' زکام و بخار' سمندری معتدی بیماریاں' خلجان 'اداسی کے علاوہ کثرت البول' احتلام واختلاج اور ڈیوٹی کے دوران 'شب بیداری کا تیر بہدف نسخہ...... مزید معلوم ہوا کہ ہر روز دانت مانجھنے کے جھنجھٹ سے بھی جان چھوٹتی ہے۔ نسوار خود بخود دانت 'منہ اور اس کی بدبو کو دور کرتی ہے کہ یہ خود اپنی بدبو پیدا کر کے پہلی بدبو کو ختم کر دیتی ہے۔"

ساحلی علاقوں میں موسم' محبوب کے مزاج کی مانند ہوتے ہیں۔ ابھی دھوپ ہے تو کچھ دیر بعد ابر باراں ہے...... اُمس اور حبس تو کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ہے۔ اسی طرح 'مختلف بولیاں' پہناوے' رنگ اور انداز اور رزق ہے...... ؟

سارا دن نسوار سازی میں بیت گیا۔ کھانا بھی یہیں بیٹھ کر کھایا...... باہر بارش کبھی ہو رہی اور کبھی بند...... شام کے بعد چند خلاصی' سونے کی غرض سے واپس پہنچے اور میں اپنی نشست پہ نیم دراز ہو گیا۔ نسوار کی بُو نے انجن رُوم کی اَزلی ڈیزلی بُو کو بوجھل کر دیا ہوا تھا...... چاچا نے سامان سمیٹنے کے بعد کمال محبت ومہربانی سے ایک پلاسٹک کی پڑیا میں نسوار تھماتے ہوئے کہا۔

"نسوار نشہ نہیں' توشہ ہے۔ نشے اور توشے کے فرق کو تم ابھی نہیں سمجھو گے۔ ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ یہ ایک ٹونکہ ہے سُستی نیند اُداسی بھگانے کا...... یہ نسوار کی پڑیا اپنی جیب میں رکھو' کہیں استعمال میں لاؤ' نہ لاؤ تمہاری مرضی؟ لیکن سمندر میں دن رات ایک کرنے اور اس سے دوستی کرنے والوں کے لیے یہ بڑے کام کی چیز ہے۔"

میں نے بادلِ نخواستہ پڑیا لے کر بغلی جیب میں ڈال لی۔ چاچا کے اُوپر جاتے ہی میں لیٹنے کے لیے دراز ہو گیا۔ مگر نیند...... ؟

دیکھا گیا ہے موٹی عقل والے' کم پڑھے لکھے' لاپرواہ' صحت مند لوگ' کھاٹ پہ پڑتے ہی جانوں کی طرح خراٹے توڑنے لگتے ہیں مگر دیوانے' صحرا نورد' آوارہ' پراگندہ' اظہار' عاشق طبع حضرات' لیٹ تو جاتے ہیں مگر نیند کسی محبوب کی مانند ان کے قریب نہیں پھٹکتی۔ یہ شب دیدے' نیند کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ گو میرا شمار ان خوش قسمت ہستیوں میں نہیں ہوتا لیکن ان جیسی کوئی نہ کوئی علت بلت' مجھ میں بھی یقیناً موجود تھی کہ نیند کا میں بھی بھگوڑا تھا۔ میں اکثر ان لوگوں کو تعجب خیز نظروں سے دیکھتا ہوں جو لیٹے

ہی نیند کا جھولا جھولنے لگتے ہیں یا جو بے خبر گہری نیند سوتے ہیں اور وہ لوگ تو میری دانست میں انتہائی گئے گزرے واقع ہوئے ہیں جو پڑتے ہی خراٹوں کے رہٹ چلانے شروع کر دیتے ہیں یا سفر کے دوران سو کر یا پوستیوں کی طرح اُونگتے ٹونگتے ہوئے وقت گزارتے ہیں۔''

سفر کا دورانیہ' کالج' مدرسہ کے تدریسی دورانیے کے مترادف ہوتا ہے۔ کلاس رُوم' سونے لیٹنے کے لیے نہیں پڑھنے لکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ سفر کے دوران سونا کسی بھی طرح درست نہیں ہوتا۔ سفر کا بڑا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ آپ بہت اہم مشاہدہ و مطالعہ سے محروم رہتے ہیں کہ جس کا خلّم رَبّ کائنات نے دیا ہے۔''

مَیں سمندر سے دوستی دُشمنی اِس لیے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کسی کشتی' لانچ میں مَیں پڑ کر خواب خرگوش کے مزے لُوٹوں کہ کھلے گہرے پانیوں میں موجیں لہریں خوب ہچکولے دیتی ہیں اور بندہ کسی معصوم شیر خوار بچے کی طرح' خوب آسودگی کی نیند لیتا ہے۔ مَیں تو اندھیری گہری طویل شبوں میں ننگے کھلے عرشہ پہ استادہ ہو کر' وشال ساگر کے باطنی بلیک ہول کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس کی بیکرانیوں میں پنہاں' اُن بیقراریوں کا اندازہ کرنا چاہتا تھا جو اُسے ساحل کے سکوت کو چُومنے پہ مجبور کر دیتی ہیں...... مگر مَیں شاید اپنی بے دیدگی کی وجہ سے بھول گیا تھا کہ ساحل یا کشتی' جہاز کے عرشہ پہ کھڑے ہو کر محض نظارہ لینے سے ہی اس کی گہرائی کی گھمبیری اور گرداب کے گھمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ جبکہ مَیں سمندر کے وسیع آنگن بیچ' کھلی ہوئی چاندنی میں' اس کے کرب' اندوہ' تڑپنے کسمسانے کا کارن بھی کھوجنا چاہتا تھا کہ چندا کی چاندنی میں یہ دیوانہ' بے خود سا کیوں ہو جاتا ہے اور پھر عالم مستی میں اس کی بلاخیزی میں تندی و تلخی کی وجہ بھی سمجھنا چاہتا تھا کہ اِس کی وجہ کوئی عارضی شکوہ بھی ہے یا طبیعت کی زُود رنجی......؟

## ● ہرے کانچ کی چُوڑیاں......!

بارش اور سمندر کا کنارا ہونے کی وجہ سے سردی کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ مگر کسی بھی جہاز' لانچ کا انجن رُوم ہر موسم میں گرم ہی رہتا ہے کہ بجلی تیل پانی کی کوئی نہ کوئی مشین موٹر چلتی رہتی ہے...... ویسے بھی اُوپر کے موسم کا اثر' اِدھر کچھ کم ہوتا ہے۔ مَیں ٹانگیں سکیڑے' پتلی سی چادر اوڑھے' اپنی سوچوں' خیالوں' قیاسوں کی دُنیا میں اُترا ہوا تھا۔ ساحل سے ٹکرانے والی لہروں کے ہچکولے' میرے لیے بڑی طمانیت کا باعث تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اپنے کام میں مشغول ماں' پاس پڑے بچے کے پالنے کو' ہاتھ پاؤں کی حرکت سے جھلاتی بھی جا رہی ہو۔

انجن رُوم سے ملحقہ کیبن سے دیگر خلاصیوں کی باتوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ یقیناً اُدھر تاش کی بازی جمی ہوگی۔ فراغت کے موقعوں پہ خلاصیوں ملاحوں کے ہاں یہی کچھ تو ہوتا ہے۔ تُو تکرار' تاش تماشہ' تمباکو' تازی' تان تنبورے۔ اپنی اپنی دُنیا' اپنا اپنا شوق اور اندازِ وقت بسری...... یونہی ہاتھ جیب سے ٹکرایا تو نسوار کی موٹی سی پڑیا نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ طبیعت مکدّر ہونے کو تھی کہ چاچا علمدار کی نسواری رنگ باتوں نے کچھ تکدّر کم کرنے میں مدد دی۔ غیر ارادی طور پہ ہاتھ جیب کی جانب بڑھا اور ہرے کانچ کی پسی ہوئی چوڑیوں سی نسوار' پلاسٹک کی تھیلی میں میرے سامنے تھی۔''

رنگوں اور روشنیوں کی اپنی ایک الگ ہی دُنیا اور حکمت ہوتی ہے۔ یہ دونوں خوب دھوکہ دیتے ہیں۔ ان کا آپس میں ایسا تال میل کہ اِک دُوجے بغیر' نہ تو مکمل اور نہ ہی کوئی بُرا بھلا ناٹک رچا سکتے ہیں۔ رنگوں اور روشنیوں کے دلچسپ کھیل تماشوں اور طلسماتی اثرات کا مَیں خوب جانو پہچانو ہوں۔ فنونِ لطیفہ کی تمام معتبر اصناف کی آب و آبرو میں یہی کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ کاروبارِ حیات میں ان کے دَم قدم سے چکا چوندی ہے۔ حُسن و جمال ہو یا قُرب و وصال...... زیبائش یا آرائش و نمائش...... کامرانی و شادمانی جلوت و خلوت' ان کے خدوخال' روشنیوں اور رنگوں کی ترنگوں سے ہی روشن و نمایاں ہوتے ہیں۔''

کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ انجن رُوم کی پھیکی زرد روشنی میں یہ نسوار مجھے ہرے رنگ کی کُٹی ہوئی چوڑیوں کا بُرادہ ہی لگی...... جو بطور زہرِ ہلاہل بھی استعمال ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں میں اکثر عِفّت مآب دوشیزائیں' جو مخدوش حالات میں زندہ رہنے پہ مجبور ہوتی تھیں۔ اپنی کلائیوں میں ہرے رنگ کی چوڑیاں پہنتی یا انہیں پیس کر محفوظ کر لیتیں کہ کسی کڑے وقت' اپنی عزت و عفت کی حفاظت کر سکیں۔'' اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہرے رنگ کی چوڑیاں ہی کیوں؟ سرخ یا پیلے رنگ کی کیوں نہیں؟ بس ایسی ہی کوئی بات کہ زہر ہرا یا نیلا ہی بھلا لگتا ہو' ورنہ سینکڑوں اقسام کے سمیات ایسے جو بے رنگ بھورے سفید' سیاہ اور سرخ بھی ہیں۔؟

دیکھا گیا ہے زہروں کی ہلاکت آفرینی میں بھی رنگ و روشنیاں کسی نہ کسی انداز میں شامل ہوتی ہیں۔ ویسے نیند کی طرح ایک چھوٹی موت' رنگوں اور روشنیوں کے غیر مؤثر و متوازن ہونے سے ہی ہو جاتی ہے جبکہ اموات میں بھی فرق ہوتا ہے کہ وہ جبری ہے کوئی حادثہ' قتل خودکشی یا طبعی ہے۔ اَزمنۂ قریب و بعید کی غیر معمولی ہستیوں کے اموات پہ اگر بہ عمیق غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ روشنیوں اور رنگوں نے وہاں بھی اپنا کردار ادا کیا۔؟

روشنی' مالکِ کُل کے نُورِ امر کی ایک ادنیٰ سی تجلّی کے ظہور کے عکس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی جھلکیاں' ہمیں صاعقہ' آگ شمس و قمر اور نجوم میں دکھائی دیتی ہیں۔ روشنی جب حِدّت خارج کرتی ہے تو اُس

کے ماخذ سے برقیاتی مقناطیسی لہریں اور بخارات پیدا ہوتے ہیں جن سے حیاتیاتی توانائی وُجود میں آتی ہے۔ یہی توانائی' کرۂ الارض' کرۂ الماء' کرۂ الفضاء وہوا میں نمو کی بُنیاد فراہم کرتی ہے۔ ان ہی لہروں گیسوں کے پھیلنے' سکڑنے اور دیگر عمل وردِّ عمل اور مختلف اشکال اختیار کرنے کے نتیجہ میں جلا پانے والے حیات پیز رنگ' جب روشنی کی توانائی کے ساتھ شامل ہوتے ہیں تو حیاتِ نو کی بنا پڑتی ہے۔"

انسان اپنی رواں زندگی میں' دیگر ضروری توانائیوں کے ساتھ ان دونوں خاص الخاص توانائیوں سے بھی مستفید ہوتا رہتا ہے۔ خاص طور پہ مشتری ماتھے والے سکندر بخت اور الٰہی مُہر والے قطب قلندر روی کے گرد تو اِن رنگوں روشنیوں کے قافلے اُترے ہوتے ہیں۔ یہ خاص بندے اپنی پیدائش سے آخری لمحہ تک' ان روشنیوں کی چکا چوندیوں' اُجلے رنگوں کی خوشرنگیوں اور اُن کے رُوحانی دائروں میں آسودہ رہتے ہیں جبکہ عام انسان بھی ایک حد تک فیضیاب ہوتا رہتا ہے۔ زندگی کے اِس آخری مرحلہ میں جب مخصوص لوگ' اپنی نقدِ جاں کی امانت سپردِ آفریں کرتے ہیں تو یہ روشنیاں اور رنگ بھی اپنے انداز میں ماتم کناں ہوتے ہیں تو اُس وقت ان کے رنگ وَ حنگ بھی الگ اور عجیب ہوتے ہیں۔ اِس طرح کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں...... اللہ کی راہ میں شہادت پانے والے شُہدا کے چہروں کے رنگ' اردگرد کا ماحول' نُورانی ہالے' محسوس ہوتا کہ آس پاس قدسی اُترے ہوئے ہوں۔ فضا میں لہو گھلا ہوا ہے' وقت نے سیاہ لباس اوڑھ لیا ہے۔ رنگ اور روشنیاں مل جُل کر ایسا نُورانی ماحول پیدا کر دیتی ہیں جیسے اِک فانی پیکر سے لاکھوں لافانی پیکر جنم لے رہے ہوں۔"

- اے موجِ دریا ہلکے سے دو چار تھپیڑے......!

تنہائی' زرد پھیکی سی روشنی' لہروں کے ہلکوروں پہ' کسی بچے کے پالنے کی مانند جُنبشیں لیتی ہوئی لانچ! ہلکی ہلکی بارش کی رِم جِھم...... ہاتھ میں سبز چوڑیوں کا پیا ہوا بُرادہ یعنی چاچا علمدار کی تیار کردہ نسوار......! مجھے یوں لگا جیسے منگی کا لنگر کسی نے کھول دیا ہے...... سمندری ہوا کے ایک زوردار جھکڑ نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک پہلو سے جھکائی لے کر منگی کھلے سمندر کی جانب بہہ نکلی۔ منگی کا انجن رُوم چونکہ سطح سے نیچے کی منزل پہ تھا اور یہاں باہر جھانکنے کے لیے کوئی دریچہ نہیں تھا۔ اب کسی شوخ و تند موج نے لانچ کو اچھا خاصا اُچھالا اور پھر نیچے لا پٹخا تھا...... مَیں اپنی نشست سے نیچے گرتے گرتے بچا...... موسم کے تیور خاصے بگڑ چکے تھے۔ باد و باراں گھن گرج کے ساتھ' سمندر میں بھی اُتھلے پتھلے شروع ہو چکے تھے۔ گرنے سے خود کو بچاتا ہوا' سیڑھی کی جانب لپکا......"

لوہے کا مضبوط دروازہ جیسے کسی نے باہر سے بند کر دیا ہو۔ میں کئی دنوں سے اس دروازے کو استعمال کر رہا تھا اس سے پیشتر تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ خاص ڈھکم پیل کے بعد بھی جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو میں نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا کہ شاید ہوا کے شدید دباؤ کی وجہ سے کھل نہ پا رہا ہو۔ اب میں ساتھ والے خلاصیوں کے کیبن کی جانب بڑھ آیا...... اِدھر تو جیسے ازلی ہونجا پھرا ہوا تھا۔ برتن، تاش کے پتے، دیگر کاٹھ کباڑ کے ساتھ سفری خفّہ اِدھر اُدھر لڑھک رہے تھے۔ الٰہی! یہ لوگ کدھر گئے؟ کچھ دیر پہلے تک ان کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں...... بُرے بُرے خیالات آنے لگے۔ اگر کسی ہنگامی صورت کے پیشِ نظر انہیں یہاں سے نکلنا ہی تھا تو مجھے بھی ساتھ لیتے۔ وہ جانتے بھی تھے کہ میں اِدھر سوتا ہوں اور تو اور چاچا علمدار بھی نسوار سمیت پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا؟ جبکہ وہ چوبیں گھنٹے اِدھر ہی دھرا رہتا تھا۔ جب بیچے اپنے علاوہ کوئی اور نظر نہ آیا تو میں اک عجیب سا احساس تنہائی لیے ہوئے واپس اپنی نشست پہ یوں محتاط سا آ ٹکا جیسے اس پہ میخیں ٹھکی ہوں۔ بیٹھتے ہی پہلا احساس جو اُبھرا وہ سمندر کے غیض اور دُشمنی کا تھا اور یہ بھی کہ ابھی تو میں کنارے پہ ہوں، اس کے اندر کا عالم کیا ہوتا ہوگا؟ اور یہ تجربہ بھی ہُوا کہ جب انسان کسی اِبتلا میں مبتلا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اُس کے پیشِ نظر اپنی حفاظت ہوتی ہے۔"

ہر بشر بچہ، پیدائش سے پہلے ہی تین صفات میں تعلیم یافتہ ہوتا ہے یعنی مالکِ حکمت و نعمت نے اسے تین بنیادی بشری جبلتوں کی شکمِ مادر میں ہی آگاہی عطا کر دی ہوتی ہے۔ زندگی کی بقا کے لیے بھوک کی خواہش واظہار، جسم و جان بچانے کے لیے خود حفاظتی کا احساس اور تگ و دو افزائشِ نسل کے لیے جنسی رویوں لذتوں سے آشنائی۔! ان تینوں کے معاملہ میں بندہ کسی دُوسرے سے ذرا کم ہی اِتفاق کرتا ہے کیونکہ یہ اُس کے بنیادی بشری تقاضے ہیں۔ بشر سے بندہ بننے اور بندہ سے تابندہ انسان یعنی مومن بننے کے لیے لگتی ہے ذرا محنت زیادہ......!

سمندر سے دوستی دُشمنی کے سارے فلسفے کہیں اُڑنچھو ہو گئے۔ بشری بنیادی جبلّی تقاضہ کے تحت اَب یہی پیشِ نظر تھا کہ اس ناگہانی صورتِ حال سے کس طور نمٹا جائے......؟

ٹانگیں لٹکائے میں اپنی نشست پہ بیٹھا انجن رُوم کی دیواروں اور اُوپر چھت کے حصوں کو دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی باہر نکلنے کا محفوظ راستہ دکھائی دے جائے۔ اِدھر لانچ کی ہلچل بتا رہی تھی کہ وہ ڈولتی بڈولتی ہوئی آہستہ آہستہ کسی طرف کھسک رہی ہے۔ لانچ یا کشتی کے نیچے پہیے یا اس کے کوئی بریک تو ہوتے نہیں کہ اُس پہ ہنگامی حالت میں قابو رکھا جا سکے۔ کھڑا کرنے کے لیے گائے بھینس کی مانند کھونٹے سے باندھا یا پھر لنگر لٹکا دیا جاتا ہے۔ تیز آندھی طوفان کی صُورت میں اکثر باندھے ہوئے مویشی اور کشتیاں اپنے رَسّے لنگر تڑوا کر گم ہو جاتے ہیں۔ ہَوا و رولے اور بپھری ہوئی لہریں موجیں پھر انہیں ناقابلِ یقین فاصلوں پہ پہنچا دیتی ہیں۔ اکثر

ایسا بھی ہوتا کہ اُن کا نشاں تک نہیں ملتا......

سمندری طوفانوں میں پھنسے ہوئے دیوہیکل جہاز' لانچیں' کشتیاں وغیرہ خش وخاشاک سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ پہاڑوں کی مانند سر اُٹھاتی ہوئی موجیں اور جھپٹتی لپکتی خوفناک لہریں' ان سے چوہے بلی کا کھیل کھیلتی ہیں۔ جہاز ران لمحہ لمحہ جینے مرنے کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ کوئی حکمت و ہنر کام نہیں آتا۔ سوائے اُن دُعاؤں اور اِلتجاؤں کے' جو بے جنبش و صوت' خود بخود کہیں سے نکلتی ہیں اور اَبابیلوں کی صُورت کہیں نکل جاتی ہیں۔''

چرچراہٹ کی آوازیں کہیں سے اُبھریں اور لانچ بُری طرح ڈگمگانے لگی پھر اگلے ہی لمحہ کسی سخت سی چیز سے ٹکرائی۔ ڈک یارڈ' جیٹی' گھاٹ کنارے یہی کچھ ہوتا ہے۔ آہنی چوبی ستون' پانی میں اِستادہ اور تیرتے ہوئے لنگر' پل وغیرہ جو کشتیاں لانچیں باندھنے اور نقل و حرکت کے کام آتے ہیں۔ سمندری طوفانی موسموں میں جہازوں' لانچوں کی حیثیت کسی طور کاغذ کی کشتیوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بپھری ہوئی غضبناک موجیں' انہیں خُوب اُلٹ پلٹ کرتی ہیں اور یہی کچھ بے چاری منگی کے ساتھ ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا۔ مَیں بھی موتمک کی پھلی میں کسی بیج کی مانند اِدھر اُدھر ہوتا تھا جو کسی کھاتے کھانے میں نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اندر کہیں کوئی وجہ رچ' اِستقامت یا توکل کا تصور موجود تھا جس نے مجھے مایوس ہو کر ٹوٹنے بکھرنے سے بچایا ہُوا تھا۔ اَب مَیں باری باری سارے باپ آنکھوں کے سامنے آنا شروع ہو گئے' کہیں چاچی جموں والی اور میاں جی سنگلاں والے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ حافظ باؤ زرین' سائیں ٹنو سرکار بھی دِکھائی دے رہے ہیں۔ صوفی صاحب اُمرتیوں والے دیگر اور بزرگ بھی۔؟ جیسے دَم مسافر ہونے سے پیشتر' اپنے پرائے' سارے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی تھا۔ جب بندے کو یہ اِدراک ہو جاتا ہے کہ وہ اَب ''بڑے ملک صاحب'' کے ساتھ اَجل کے گھوڑے پہ سواری کرنے والا ہے تو وہ کسی حد تک پُرسکون ہو جاتا ہے یعنی وہ اپنے ایمان و ایقان کی حد تک موت کی حقیقت کو تسلیم کرنے پہ مجبور ہوتا ہے اور کسی معصوم اچھے صلح جو بچے کی طرح جو اپنی جان کا کھلونا '' جانِ جاناں'' کے سپرد کر دینے میں ہی اپنی عافیت دیکھتا ہے......؟

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پانی کا ہلکا سا چھینٹا میرے اُوپر پڑا ہے۔ سر پہ ہاتھ پھیرا تو گیلا تھا۔ اُوپر جھانک دیکھا لیکن کہیں کوئی پانی وانی دِکھائی نہ دیا۔ اُوپر تو وہی ڈیزل کا ٹینک تھا جس کے پیندے پہ عجیب و غریب تحریریں اور تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جانے وہ کون لوگ تھے جو اس کے نیچے اپنی آسودہ' نا آسودہ خواہشوں کو لکھ کر محفوظ کر دیا کرتے تھے اور جو لکھ پڑھ نہ سکتے ہوں گے وہ تصویریں بنا دیا کرتے ہوں گے؟ اِک چھپاکا سا ہوا اور پُورا ماحول تاریکی میں ڈُوب گیا۔ بلب فیوز' یا کہیں سے بجلی کی سپلائی بند ہو گئی ہو گی۔

گھٹا ٹوپ اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔''

روشنی سے اندھیرے میں اُترنا' کچھ وقت کے لیے بڑی پریشانی پیدا کرتا ہے جیسے تاریکی سے روشنی کی جانب رجوع...... کچھ دیر تک میں گھپ چپ سہما سا اندھیرے میں حافظ صابر حسین شاکر بنا بیٹھا' ناپیتے نجوتوں کو تاڑتا رہا۔ آنکھیں قدرے اندھیرے سے شناسا ہوئیں تو بجلی بند ہونے کی وجوہ جاننے کی کوشش کی...... ہلکی سی کوشش سے پتہ چلا جنریٹر تو چل رہا ہے کہ اُس کے چلنے کی مدھم سی آواز اس گڑبڑی کے عالم میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ بلب فیوز ہو گیا یا کہیں وائرنگ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہو گی؟ فی الوقت یہ دونوں کام میری بساط سے باہر تھے لیکن اندھیرے میں یُوں کالی داس بن کر پڑے رہنا بھی کچھ یوں آساں نہ تھا۔''

مَیں اپنی نشست پہ نیم دراز سا ہو گیا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا؟...... یہ بتانا تو مَیں بھول ہی گیا کہ چاچا علمدار کی جادو اثر نسوار کی پڑیا ابھی تک میری مُٹھی میں کسی دُم کٹی مُردہ چھپکلی کی طرح دَبی پڑی ہوئی تھی۔ میری اچھی بُری عادت کہ مَیں لیمو کو نچوڑے بغیر' اس کے بیج چھلکے نہیں پھینکتا۔ چاچا علمدار نے اپنی نسوار کو ''نسخۂ کیمیا'' قرار دیتے ہوئے بتایا تھا...... سمندر کی ہر ابتلا اور انسانی ہر آزار کا علاج اس میں موجود ہے۔ چاہے وہ ہیجانی ہو' جذباتی' جسمانی یا رُوحانی...... میرے لیے یہ کوئی نیا انکشاف بھی نہیں تھا۔ اسی دور میں لاہور کی ایک لقمان ٹائپ حکیم صاحب نے ایک اَمرت دھارا صفات دوا ایجاد کی تھی۔ یہ چھوٹی شیشی میں ٹنکچر کی طرح مائع سی دوا تھی۔ سونگھنے سے بڑی تیزی خوشبو محسوس ہوتی جو سیدھی دماغ کو پکڑتی۔ ماتھے یا کنپٹی پہ لگانے سے ہلکی ہلکی سُوئیاں چبھتی تھیں۔ زکام' نزلہ' بخار' دادھ' درد' دردِ شقیقہ' کان درد' جوڑوں کی پیڑ' بدہضمی' پھوڑے' زخم' دھدر' چنبل' بالچر' ملیریا' ہیضہ...... بچھو بھڑ' سانپ کا ڈنک' ...... پائیوریا' ماخورہ' قے قولنج غرضیکہ جو بھی معلوم' نامعلوم عوارض انسان کے لیے موجود ہیں۔ یہ ''دل روز'' دوا سب کے لیے اَمرت دھارا تھی۔ قیمت بھی اس زمانہ کے حساب سے زیادہ نہ تھی چنانچہ یہ امیر غریب سب کے لیے ایک نعمت تھی۔''

## ● میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال کھیسہ ماری......!

اب اس فراڈی بابے کے کچھ نئے کام بھی ملاحظہ فرمائیں۔ کیسے کیسے مزے لے لے کر اپنے ''کارنامے'' بیان کرتا ہے۔ کچھ آپ بھی مزہ کشید کریں......!

باتوں سے باتیں اور گھاتوں سے گھاتیں نکلتی ہیں۔ اَمرت دھارا کی بات سے کچھ یاد آ گیا' میری زندگی بھی کچھ اسی طرح ''دل روز'' دوا کی طرح کی تھی۔ ٹھور نہ کوئی ٹھکانہ' انگڑائی تیرا ہے بہانہ...... یہ واقعات

اس فلمی پرچے کی ملازمت سے پہلے کے ہیں۔ میری اپنی آوارگیوں لاپروائیوں سے ریلوے کی ملازمت بھی جاتی رہی تھی۔ مجید لاہوری مرحوم نے مجھے اس فلمی رسالے میں ملازمت دلوادی تھی جدھر سے مَیں سمندر سے دوستی کے چکر پڑ گیا تھا۔"

میرے بارے میں قارئین خوب جانتے ہیں کہ مَیں کیسا اُلٹی شلٹی تھا۔ دماغ 'شیطان کی فیکٹری' ہاتھ کھلے بُد بُدی صفات آنکھیں! پیروں نیچے چوکور پہیے...... کان' گھوڑے کی کنوتیاں کی طرح ہر بات حرکت کی سُن سُن لیتے ہوئے......؟ کسی اچھے بُرے کی زبان سے کوئی انہونی انوکھی اچھی بات نکلی مَیں نے چیل کی مانند جھپٹا مارا اُچکی! یعنی مَیں خاص طور پہ علمی فکری ذہنی اور رُوحانی چھینا جھپٹی' چوری چکاری کا اُستاد تھا۔ یہ قُدرت بھی مجھے قُدرت کی جانب سے ہی وَدیعت ہوئی تھی۔ کیا کہیے کہ مَیں خبطیوں کی طرح ایسے پیروں فقیروں' سادھوؤں' سپیروں' شعبدہ گروں' جادوگروں اور رنگ بازوں کی ٹوہ میں رہتا جن سے مَیں کچھ نہ کچھ بھلا بُرا سیکھ سکوں؟...... آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ بھلے کے ساتھ بُرا بھی سیکھنا کیا ضروری ہے؟...... ہاں! اپنی اپنی اُفتاد ہے لیکن میری اپنی سوچ کے مطابق اچھائی کے ساتھ ساتھ بُرائی پہ بھی نظر رکھنی چاہیے...... اُس کی منطق' عمل ردِعمل اُصول نظور بھی اُس حد تک سمجھنے جاننے چاہئیں۔ جس حد سے آپ کی سلامتی شروع ہوتی ہے۔ بعض بُرائیوں کو جاننا اپنی اور دُوسروں کی سلامتی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اُجالوں سے اندھیرے اور اندھیروں سے اُجالے پُھوٹنے کی حکمت اور مصلحت سے تو آپ واقف ہی ہوں گے؟...... شر سے بچنے' اُس کے سدِّباب کی خاطر اُس کی کیمسٹری پڑھنا جاننا ضروری ٹھہرتا ہے۔" لیکن اس کو ماننا اور اس پہ عمل پیرا ہونا ضروری نہیں...... بھیڑ اور بھیڑیا' گائے اور گدھا' مچھلی اور مگرمچھ' بَطخ اور بگلا بھگت' چڑیا اور چمگادڑ' ہم جانتے سب کو ہیں مگر کھاتے اُنہی کو ہیں جو ہمارے کے لیے بہتر ہیں اور کھانے کا حُکم ہے اور جن کی مناہی ہے اُن سے پرہیز رکھتے ہیں...... آپ نہیں چاہتے کہ دورانِ سفر کوئی جیب کترا' آپ کے مال پہ ہاتھ صاف کر جائے۔ اس غرض سے اپنا پیسہ دھیلہ بڑا سنبھال کر رکھتے ہیں اور اگر آپ اُن کے طریقۂ واردات کا علم اور ہتھکنڈوں سے بھی کما حقہٗ واقفیت رکھتے ہوں تو اُن کے ہاتھوں نقصانات کے امکانات ستر اَسّی فیصد کم ہو جاتے ہیں۔ علم' علم ہوتا ہے اچھا بُرا نہیں ہوتا۔ یہ اس کے استعمال پہ منحصر ہے کہ اُس سے کس نوع کا کام لیا جاتا ہے۔؟

آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ مَیں اِک زمانہ میں کسی ایسے پُرکار اُستاد کی کھوج میں رہا جس سے مَیں فنِ جیب تراشی سیکھ سکوں اور اُس کے پیشہ ورانہ رموز و نکات جان سکوں۔" بازاری اور مقامی انداز ہنر کے غریب غُربے اور تھوڑ بھتّے گنڈ کپیئے تو بےشمار مل جاتے ہیں مگر کوئی ایسا یگانہ روزگار اور "صاحب واقف اسرار

جیب و گریباں' دکھائی نہ دیتا تھا جس کے آگے زانوئے تلمذ طے کر سکوں۔ چند ایک چالو قسم کے پاکٹماروں سے واجبی سی یاد اللہ تھی جو مجھے حُسنِ اتفاق سے کراچی کے اُس ہوٹل سے دستیاب ہوئے تھے جس کی شہرت' پاکٹ ماروں کے دَم سے تھی۔''

ایک زمانہ تھا کراچی میں ایرانی ہوٹلوں' چائے وندان سازوں کی بھرمار تھی۔ ہر چوتھی پانچویں دکان ایرانی چائے خانہ تھا۔ چائے سامنے دھرے آپ سارا دن' ساری رات اِدھر بیٹھ سکتے تھے۔ شرط صرف اتنی کہ کپ میں گھونٹ ڈیڑھ گھونٹ چائے کی تلچھٹ باقی پڑی رہے۔ دریں صورت آپ کے وہاں دھرنا دینے کی معقول وجہ مفقود ہو جاتی تھی۔ ان چائے خانوں کی شہرت' اس میں دن رات بیٹھنے والوں کے پیشے کی وجہ سے ہوتی تھی۔ جہاں ٹیکسی رکشہ والے زیادہ بیٹھتے ہیں۔ وہ ڈرائیور ہوٹل' جدھر سٹہ باز اور بروکر زیادہ وقت گزارتے وہ سٹہ کیفے...... کہیں فلموں میں ایکٹر بننے والے اور ایکسٹرا سپلائر بیٹھتے ہیں تو وہ ایکٹر ہوٹل کہلاتا ہے...... اسی طرح پہلوان کیفے' گونگوں کا ہوٹل' کھڑا ہوٹل (ہیجڑا ہوٹل) مکھی مار ہوٹل...... ایک ہوٹل گدھا گاڑی والوں اور ایک چاپئی' ہوٹل بھی تھا جدھر زیادہ تر مالش کرنے والے خوبصورت لڑکے بیٹھے ہوتے۔ صاف ستھرے لباس' ہلکا پھلکا میک اَپ' ہاتھ میں برائے نام ہی تیل کی شیشی...... یہ بدکردار لڑکے' مالش کی آڑ میں غلط دھندا کرتے تھے۔ یہاں سب سے زیادہ رش ہوتا۔'' کھانے' چائے کا معیار انتہائی گھٹیا' کسی ایرانی نے اسے ٹھیکے پہ چڑھا رکھا تھا۔ اس کے ملازم' باورچی اور دیگر اہلکار بھی اسی قبیل کے تھے۔ اسی طرح گھریلو ملازموں' محنت کشوں کے علاوہ ایک کیفے'' دی پھوکٹ'' بھی تھا۔ اس کی اصل شہرت پاکٹ ماراں کے نام سے تھی۔ دیسی پردیسی' اُستاد شاگرد' پولیس کے مخبر' مسافر' لٹنے والے اور لوٹنے والے سب اس میں دھرے ہوتے تھے۔''

مجھے اس کا پتا ایک رکشہ والے نے بتایا تھا...... اس کے رکشہ میں بیٹھا تو سامنے لکھا تھا'' سواری اپنے سامان اور پاکٹ کی ذمہ دار خود ہو گی'' ٹھیک ہی لکھا تھا۔ سوار یا سواری' دونوں کو اپنے سامان کی حفاظت خود ہی کرنی چاہئے...... لیکن دوسری بات کھٹکی یعنی پاکٹ والی! میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

'' بھائی! یہ پاکٹ والی بات ذرا سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا رکشہ کے اندر بھی پاکٹ ماری کا خدشہ ہے؟''

وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔'' بھائی جان! بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آنے والی ہے لیکن بتائے دیتا ہوں...... آپ نے جس طرف جانا ہے راستہ میں مرغی مارکیٹ کی بغل میں ایک پھوکٹ ہوٹل ہے' وہاں ایک سے ایک بڑھ کر اُستاد اور شاگرد بیٹھتے ہیں...... جو قریب تو قریب' بہت دُور گزرتے ہوئے موٹے مرغے کو بھی کاٹنے کا ہنر جانتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک دو بار ایسی واردات ہو چکی ہے کہ محض اس ہوٹل کے سامنے سے گزرنے سے ہی کھیسے سے بٹوا غائب ہو گیا۔ تب سے میں روپیہ پیسہ اپنی سیٹ کے نیچے چھپا کر رکھتا ہوں۔

احتیاطاً سواریوں کے لیے بھی لکھوا دیا ہے تاکہ کسی کا نقصان نہ ہو جائے۔''

اُس کی ایسی احمقانہ بات پہ میری ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اُس سے درخواست کی۔

''بھائی! اِدھر سے گزرتے ہوئے جب کیفے ڈی پھوکٹ کے پاس پہنچو تو مجھے اس کی زیارت کروا دینا۔ میں اِس نادر الوجود ہوٹل' اس کے میزبانوں اور مہمانوں کو تحسین بھرا اسلام پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے تولتے ہوئے کہنے لگا۔

''بھائی جان! آپ نے شاید غلط سنا ہے۔ وہ ہوٹل' پاکٹ ماروں کا اَڈا ہے تبلیغی جماعت والوں کا مرکز نہیں۔''

مُرغی مارکیٹ کے قریب پہنچتے ہی جب اندر باہر مُرغیوں کبوتروں کے پنجرے پڑے ہوئے دکھائی دیے تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''بھائی! جب کیفے ڈی پھوکٹ کے سامنے پہنچو تو دَم کی دَم رُک لینا۔''

وہ شیشے میں مجھے تعجب خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''خیریت......؟''

میں نے بات بناتے ہوئے جواب دیا۔'' قریب ہی پان سگریٹ والی دُکان سے پان اور سگریٹ لینے ہیں' سنا ہے بڑے کڑک سانچی کے پتے لگاتا ہے......''

وہ بھونڈا سا بولا۔'' بھائی جان! اگر آپ اس پانوں والی دکان کو جانتے ہیں تو کیفے ڈی پھوکٹ سے کیونکر ناواقف تھے...... یہ بات سمجھ میں نہیں آئی؟''

میں نے جواب میں کہا......'' ناواقف تو میں ابھی بھی ہوں۔ یہ تو میرا اپنا اندازہ تھا کہ پاکٹ ماروں کے چائے خانہ کے پاس' پان سگریٹ کی ایک مشہوری دکان ہوگی۔ سینما اور دو نمبر گھڑیوں' ریڈیو' کپڑے کی بولی والی نیلامی کی دُکانیں اور گھریلو اشیاء کی کوئی مارکیٹ...... کیونکہ یہ سب کچھ یہاں موجود نہیں؟''

اِسی دَوران وہ پانی سگریٹ والی دکان کے سامنے رکشہ کھڑا کر چکا تھا۔ میں نے اُترتے ہوئے پوچھا۔

''ڈبل پتہ' ڈبل چونا کتھا...... بناری پتی...... کتنے پان بندھوا لاؤں تمہارے لیے......؟''

وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں بھی اِسی علاقہ کا کوئی اُستاد جیب تراش ہوں۔ مجھے اُتار کر وہ مُمیاتے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے صرف ایک اٹھنی کرایہ کی مد میں دے دیں میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے میں گھر جا رہا ہوں۔''

اٹھنی وصول کر کے وہ سر پہ پاؤں کی بجائے رکشہ رکھ کر بھاگا۔

اُس کے ''خس کم پاک'' ہوتے ہی میں نے دکان کے سامنے پہنچ کر جیب سے چند روپے نکالے ایک روپے والا نوٹ علیحدہ کر کے باقی نوٹ واپس جیب میں ڈال دیئے۔ دکاندار کو میں نے دو والا بجی سپاری میٹھے پانوں کا آرڈر دیا۔ میں کانی آنکھ سے سامنے دکان کے شیشے پہ نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک سڑیل ڈبلا سا آدمی میرے دائیں جانب آ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی بائیں جانب ایک موٹا سانڈ سا ٹکرانی' اپنی جگہ بناتے ہوئے آ گھسا' مجھے پتا تھا یہ موٹا' مجھے اپنی جانب متوجہ کر کے' دائیں جانب والے سڑیل کو میری جیب خالی کرنے کا موقع فراہم کرے گا۔ میں نے دانستہ' اُن دونوں کو اپنے اپنے جوہر دکھانے کا موقع فراہم کر دیا۔''

دس پندرہ روپے' اُس دور میں خاصی اچھی رقم ہوتی تھی لیکن مجھا ایسا سر پھرا' گھر جلا کر آگ تاپنے والا' نیند بھگانے کے لیے آنکھوں میں مرچوں والی اُنگلی پھیرنے والا...... پلا خالی کر کے عناد مول لینے والا! اتنے پیسوں کو بھلا کیا اہمیت دیتا......؟

وہ دونوں جب کام ڈال چکے تھے تو سڑیل نے گُم بولی میں' موٹے کو O.K کا میسج دیا۔ پان سگریٹ لے کر وہ آگے پیچھے وہاں سے نکل کر کیفے دی پھوکٹ میں داخل ہو گئے۔ ان میں سڑیل سینئر تھا اور موٹو ٹکرانی جونیئر...... ان کی یہ کارروائی روٹین کی بچگانہ حرکت تھی۔ چائے سگریٹ پانی کے خرچے کی خاطر' نوآموز ایسی کارروائیوں سے اپنا ہاتھ سیدھا کرتے ہیں۔ میں اپنی پنگا لینے والی عادت سے مجبور' چودہ پندرہ روپوں کا بلیدان چڑھا کر' کسی نہ کسی طور اپنے ٹھکانے' کراچی کینٹ ریلوے کوارٹروں میں واپس پہنچ گیا۔''

مجھے مجبوراً چند ماہ کے لیے لوکو موٹو شاپ کراچی میں بطور الیکٹریشن کام کرنا پڑا۔ کرنا بھی کیا تھا' بس ریلوے کے اکثر بڑے بڑے حرام خور ملازمین کی مانند' میں بھی ایک چھوٹا سا حرام خور تھا۔ رشتہ کے ایک بہنوئی صاحب کا ادھر اثر رسوخ تھا۔ اُنہوں نے ہمیں یہاں الیکٹریشن بھرتی کروا کر کنبہ پروری کا ثبوت دیا تھا جبکہ ہم ذات اور دولت کے فرق سے بھی ناآشنا تھے۔'' دیکھا گیا ہے ریلوے میں کسی اچھی پوسٹ پہ ہونا شرط ہے پھر اُس کے خاندان کا ہر نکھٹو بیکار' تھرڈ کلاس' ریلوے میں بھرتی ہو جائے گا' گھر بیٹھ کر حرام کھائے گا اور بچوں کو کھلائے گا۔ ظاہر ہے میں بھی اِسی سسٹم کا حصہ بنا ہوا تھا مگر بہت جلد اللہ تعالیٰ نے مجھے اِدھر سے نکال کر ایک ایسی جگہ پہنچا دیا کہ جدھر میں چاہتا بھی تو ایسا نہ کر سکتا تھا۔ بتاؤں وہ جگہ کون سی تھی؟ وہ پیاری سی جگہ جیل تھی۔ اَب آپ سوچیں گے کہ میں اور جیل؟...... یہ جیلیں' دار و رسن' عقوبت خانے' قلعے اور تہہ خانے' کوڑے' پتھر روڑے' مینار اور باولیاں...... تختے' ہاتھی' زہر' توپ دم' فصیلوں سے دھکے وغیرہ انسانوں کے لیے ہی تو ہیں۔ یہ بھی تو کسی طور کی علاج گاہیں اور تربیت گاہیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ اِدھر سب ہی گنہگار' مجرم' سزاوار ہوتے ہوں۔ نہیں' یہاں اکثر بے گناہ اور اپنے ضمیر کے مجرم بھی ہوتے ہیں...... بیگاری اور رضا کاری ہوتے ہیں اور

یہاں وہ بھی ہوتے ہیں جو تاریخ رقم کرتے ہیں' قوموں کی تقدیریں لکھتے ہیں......''

میں جن دنوں کیفے دی پھوکٹ کے باہر پان شاپ پہ دانستہ جیب صاف کروا کر آیا تھا وُہ مہینے کے آخری دن تھے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ جب کوئی پاکٹ مار' پاکٹ مارتا ہے تو اَز راہِ ہمدردی' کچھ پیسے دھیلے کرائے کی مَد میں جیب میں رہنے نہیں دیتا بلکہ مکمل جھاڑو پھیرتا ہے۔ میں اُس دن واپس پیدل پہنچا تھا۔ چند روز بعد جب تنخواہ ملی تو اِدھر اُدھر کے سارے اُدھار چُکا کر باقی وہی پندرہ بیس روپے بچے تو جیب میں کھجلی سی چھڑ گئی۔ خیال آیا کیوں نہ کیفے دی پھوکٹ والے پان کھائے جائیں اور ننھے پاکٹ مار دوستوں کی زیارت بھی کی جائے۔ اَب اتفاق کہ اُس دن چُھٹی بھی تھی' نہایا دھویا' کُرتہ پاجامہ پہنے' بال چُپڑ سنوار' اِک چھیلا بنا' پاکٹ ماروں کے اَڈّے پہ پہنچ گیا۔ پہلے روز دانستہ باہر ہی دکان پہ کھڑے جیب کٹوائی تھی...... مگر اَب میں اِرادتاً اندر بھی پہنچنا چاہتا تھا...... اَڈّے کے بھی اور اِس فنِ جیب تراشی کے بھی......!

باہر دَروازے سے ہی مجھے وہ دونوں جیب تراش دَوست دِکھائی دیے جو دائیں جانب کے آخری ٹیبل پہ کسی کے ساتھ بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی سنجیدہ موضوع پہ بات چیت کر رہے ہیں۔ مجھے بھی اُنہوں نے اپنے پیشے کے تقاضے کے تحت اَندر داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا۔ سانپ اور جیب کترا ایک بار کسی کو کاٹ لیں تو پھر اُسے نہ تو کبھی بھولتے ہیں اور نہ ہی حتی الوسع اُس کے سامنے آتے ہیں۔'' ایسے جرائم پیشہ اَفراد کے اَڈّے ٹھکانے وغیرہ عموماً خفیہ اور ایسی جگہوں پہ ہوتے ہیں جو عام لوگوں کی پہنچ میں نہیں ہوتے لیکن کیفے دی پھوکٹ محض اِس شہر کے پاکٹ ماروں کا میٹنگ پوائنٹ تھا' کوئی اَڈّا نہیں تھا۔ وہ بھی اِدھر ظاہر کھانے پینے آتے تھے۔ اَب میں اُنہیں محسوس کرائے بغیر اُدھر ہی متوجہ تھا کہ میں اِدھر پہنچا ہی اُن کے لیے تھا۔''

اَندر داخل ہوا تو کوئی خالی میز دِکھائی نہ دیا...... اگر دو چار خالی سیٹیں دِکھائی دیں بھی تو دُوسرے لوگوں کے ساتھ' کہیں تین بیٹھے ہیں تو کہیں دو...... عام صورت' ہوٹل میں کوئی شخص اَجنبی لوگوں کے بیچ گھُس کے بیٹھنا پسند نہیں کرتا اور میرے ہاں کوئی فیصلہ کرنے میں دیر نہیں ہوتی...... میں اِدھر اُدھر جگہ دیکھنے کی ایکٹنگ کرتا ہُوا' اُن کے ٹیبل پہ چوتھی خالی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے رَسمی سی مسکراہٹ کا دَانہ ڈالتے ہوئے اپنی خوش خلقی کا مظاہرہ کیا۔ قدرے بوکھلاتے ہوئے اُنہوں نے بھی پھیکی سی خوش دِلی کا اظہار کیا۔ اپنی جاری گفتگو اُنہوں نے بند کر دی اور چائے چُسکنے لگے۔ بیرا آیا تو میں نے بن مسکہ اور چائے کا آرڈر دیا۔'' اَب وہ بظاہر روزمرہ کی عام باتیں کرنے لگے تھے مگر اپنی کوئی خاص بات' کُھم بولی میں بیان کرتے۔ میں اُن کی موجودگی سے بے نیاز' اخبار پڑھنے میں لگا رہا۔ ناشتہ آنے پہ کھانے پینے میں لگ گیا۔ بظاہر میرے سامنے

اخبار دھرا تھا مگر اُن بے وقوفوں کو کیا خبر کہ مَیں اُن تینوں کو اُن کی باتوں سمیت فوکس کیئے ہوئے تھا۔

احمقوں نے مجھے ہی موضوع بنایا ہُوا تھا۔ ایک نے مجھے مرغی کا چوزہ قرار دیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹی بوٹی اور کمزور ہڈی ہے۔ پہلے کی طرح کھیسے میں چائے پانی کا خرچہ ہی ہوگا۔'' ...... وہ تیسرا شخص' جسے آج پہلی بار ان کے ساتھ دیکھا تھا میری اُنگلیوں کے بارے انکشاف کرنے لگا...... ''اس کی گرہیں پتلی اور ناخن لمبے ہیں'' ...... یعنی میری اُنگلیاں پاکٹ ماری کے لیے موزوں ہیں۔ یہ ساری گفتگو وہ یوں کر رہے تھے جیسے مَیں وہاں موجود ہی نہیں۔ میری جانب دھیان دیئے بغیر وہ مجھے تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اُنہیں یقین تھا کہ مَیں نے اُنہیں پہچانا نہیں۔ کھا ڈکار کر مَیں بل دینے کے لیے کونٹر کی جانب بڑھ گیا...... کیا دیکھا ہوں کہ وہ تینوں بھی میرے پاس دائیں طرف آ کھڑے ہوئے ہیں۔ مَیں نے بل ادا کر دیا اور وہ ادا کرنے والے تھے۔ باہر نکل کے مَیں اُسی پانوں والی دُکان پہ پہنچا اور دو پان باندھنے کو کہا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے...... اور پھر وہی کچھ ہُوا' جو چند روز پہلے ہو چکا تھا...... ایک اہم بات جو مَیں بتانا بھول گیا۔ مَیں نے بیس روپوں کے درمیان ایک خط بھی تہہ کر کے رکھا تھا' جس پہ مَیں نے اپنی رُوداد لکھ رکھی تھی۔''

''میرا نام محمد یحیٰی خان ہے' سیالکوٹ کا رہائشی' حال مقیم کراچی کینٹ ریلوے کالونی...... اِدھر انجن شاپ میں الیکٹریشن ہوں...... تنخواہ تقریباً سو روپے' جو بیس کھانے پینے اور سگریٹ سینما میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ اَب مَیں اپنے اصل مقصد کی جانب آتا ہوں۔ مجھے بچپن سے ہی ہلکی پھلکی چوری چکاری کی لت ہے۔ بلکہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ میرا شوق مشغلہ بھی ہے' جس کی باقاعدہ پریکٹس اِنتہائی چھوٹی عمر میں شروع کر دی تھی۔ سیانے لوگ کہتے ہیں کہ بچّے کی تربیت گھر سے ہی شروع ہوتی ہے...... گُڑ' گھی' گری کھوپا' کھانڈ' مٹھیری' مربہ جات وغیرہ تو بڑی معصوم اور بے ضرر چوریاں تھیں۔ میری اصل پہلی چوری کی بسم اللہ! اَباجی کی واسکٹ سے پوری اکنی چُرانے سے ہوئی تھی۔ اُس دن مَیں نے گھر سے روٹی کھانے کی بجائے' پیٹ بھر کے بھنی ہوئی مونگ پھلیاں' ریوڑیاں' گول گپّے اور گُڑ' گری کھوپے والی گزک کھائی تھی۔'' یہ الگ بات ہے کہ اُس رات' مجھے اَباجی کے ہاتھوں اور مُنہ سے کیا کچھ کھانا پڑا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ سچّے فنکاروں کے لیے ایسی مار' گالیاں کھوسڑے' مزید تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ چوری کی چاٹ اور یاری کے ٹھاٹ' کا کچھ الگ ہی سواد ہوتا ہے؟ اَب جو گھر میں تنگی ہوئی تو باہر کشادگی پیدا کر لی۔ ہمسایوں' محلّے' شہر کے دُکانداروں' رشتہ داروں کے ہاں طبع آزمائی شروع ہوگئی۔ اس پہ سونا اُوپر کہ کبھی گرفت میں نہ آئے۔ چھوٹے موٹے جرائم میں پے در پے کامیابیوں کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اُستاد ابلیس' آپ کو کسی چھوٹے موٹے کھڈے میں نہیں کہیں بڑی کھائی میں پھینکنے والا ہے۔ مَیں مُولیوں' مونگ پھلیوں' مُرغیوں' مسجد کی ٹونٹیوں' تیل' مزاروں کی چادروں

اور نیاز نذر کے دھیلے پیسوں پہ ہاتھ صاف کرتا ہُوا برتنوں' کتابوں' سرکاری نلکوں کی پیتل کی ٹونٹیوں' جانور باندھنے والی زنجیروں اور رات' باہر پڑے ہوئے تختوں کے دھاتی حصّوں تک کی سرقہ زنی تک آ پہنچا تھا...... دو چار بار اپنی ہی غلطی یعنی کسی یاردوست کے آگے پھُوٹ بھگارنے سے پکڑا بھی گیا...... خاصی دھلائی بھی ہوئی۔ اب یہ تھا کہ واردات' کسی دوسرے محلّے میں ہوتی اور پکڑا میں جاتا...... میرے بدخواہوں نے اس طرح مجھے بدنام بھی کیا اور خود مزے بھی اُڑائے......"

نتیجہ یہ نکلا کہ میں اس شغل سے تائب ہونے کی سوچنے لگا کہ جس شوق وفن سے فنکار کو عزت کی روٹی میسّر نہ ہو اُسے ترک کر دینا چاہئے۔ چوری تو چھوڑ دی مگر اس سے ملتی جلتی علّت' یعنی ہیرا پھیری پال لی' ساتھ ہی نوسربازی اور رنگ بازی بھی آ گئیں۔ جیسے ایک خریدو تو ایک ساتھ میں فری ملتی ہے۔ کچھ عرصہ اس طرح بھی ٹائم پاس ہوتا رہا...... ان کاموں کے لیے عمر' قد' زیرکی سختی برداشت کرنے والا ڈھیٹ جسم اور اس پیشہ میں مناسب سی تعلیم وتربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جبکہ ان میں سے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا مگر ایک فائدہ ضرور تھا کہ نابالغی' کم عمری کی بنا پہ پکڑے جانے پہ کچھ رعایت مل جاتی تھی۔"

## ● علی پور کا پارکر پَن......!

کچھ عرصہ یہ ہیرا پھیری کا سلسلہ چلتا رہا مگر تابکے! مکمل برکت ختم ہونے پہ میں کسی اور فیلڈ میں نکلنے کی سوچ رہا تھا کہ بڑے پیر جماعت علی رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ مجھے اُن سے بے پناہ عقیدت تھی۔ شاہ صاحب بھی مجھ سے شفقت فرماتے تھے۔ میں میں اکثر وہاں حاضری دیا کرتا تھا۔ غم سے نڈھال' بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تو جنازہ تیار تھا...... عقیدتمندوں کا اک جمِ غفیر!...... لوگ دھاڑیں مار مار کر اظہارِ غم کر رہے تھے۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس جوڑے گئے تاکہ زیادہ سے زیادہ مُریدین' کاندھا دینے کی سعادت حاصل کر سکیں۔ میں بھی اپنے چند ہم عمر اور ہم شغل دوستوں کے ہمراہ جنازہ کے ساتھ اُس جگہ میں موجود تھا جدھر' کاندھا دینے والے ایک دوجے پہ سبقت لے جانے میں مصروف تھے۔ نالہ وشیون' آہ وبکا سے اک قیامت بپا تھی...... کلمۂ شہادت کا بلند آہنگ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اب کیا کہیے غم واندوہ کے ان دردناک لمحات میں جب سینے پھٹے جار ہے ہوں اُستاذِ لعین ورجیم نے مجھے ورغلایا...... ساتھ والے ایک ہٹے کٹے شخص کے کوٹ کی سامنے والی جیب میں لش لش کرتا ہوا پارکر کا نیا پن مجھے آنکھیں مار رہا تھا۔ اُس زمانہ میں' میں نے کہیں سے اِس پارکر پن کا نام اور دام سن رکھے تھے اس کے علاوہ میرا اس پن سے کوئی تعارف نہ تھا۔ مدرسہ

میں اگر چند عشرے پہلے تختی لکھی بھی تو وہ کانے سرکنڈے کا قلم اور مٹی کی دوات...... اُس دور میں پارکر یا شیفر کا قلم بڑے پڑھے لکھے افسر کی جیب میں ہوتا تھا یا پھر کسی امیر کبیر کے پاس...... یہ پن سونے کے بھی ہوتے تھے اور گولڈن نب والے بھی......!

اس پن پہ نظر پڑتے ہی میری نیت خراب ہوگئی' پارکر کو پار کرنے کی خواہش کلبلانے لگی لیکن یہ موقع محل ایسا تھا کہ جرأت نہیں پڑ رہی تھی اور نہ ہی پیشہ ورانہ کچھ تربیت تھی۔ میں اپنے فاسد خیالات پہ لعنت بھیجتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھ کر دوسری جانب کنی کھا کر نکل گیا۔'' کہتے ہیں اچھائی بُرائی جو بھی ہے کا امر ہو کر رہتی ہے...... اب میں کیا کرتا کہ وہی صاحب' نہ جانے کس آزمائش میں پھنسے پھر میرے دائیں پہلو میں سرکتے ہوئے نظر آئے...... پھر کسی بپھری لہر کی طرح' ہجوم کا ریلہ آیا اور وہ صاحب' بُری طرح مجھ سے ٹکرائے...... اُن کا سینہ میرے ماتھے سے آ لگا تھا...... یہیں میں نے اپنے ہونٹوں کو پن کی پتی لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اب خدا ہی جانتا ہے یا پھر وہ مردود شیطان' جس کے ہاں وسوسات' گمراہیوں کے کیڑوں بھرے امرودوں کے وسیع باغات ہیں۔ دس منٹ بعد میں پن' نیفہ میں اُڑسے ہجوم سے باہر نکل چکا تھا...... یہ میری پہلی جیب تراشی کی شروعات تھی۔ میری بدبختی کہ علی پور شریف میں ایسے موقع پہ مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوئی لیکن یہ بھی واضح تھا کہ یہ ایک ناگہانی حرکت تھی جس کی نہ تو میری نیت تھی اور نہ ہی کوئی تیاری۔؟

لاہور' انارکلی میں جب میں نے یہ پن بیچنے کی کوشش کی تو دکاندار نے ایسا قیمتی پن' میری ظاہری حالت اور عمر دیکھتے ہوئے مجھے سوالات کی زد پہ رکھ لیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ مجھے پولیس کے حوالے کرتا میں پن اٹھا کر سر پہ پاؤں رکھے بھاگ لیا۔ گھر والوں اور یاروں سے بھی چھپا کر رکھا مبادا کوئی چھین لے۔ بہت دنوں تک جب اُسے بیچ نہ پایا تو دل میں آیا کیوں نہ اس سے کچھ لکھنا شروع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے اس پن سے لکھنا چاہا تو یہ سمجھ نہ آیا کیا لکھا جائے؟ کبھی کچھ اور کبھی کچھ اسی طرح کئی صفحے سیاہ کر ڈالے مگر کچھ رنگ ڈھنگ پیدا نہ ہو سکا۔ جب تک روح پیدا نہ ہو جسم بیکار محض ہوتا ہے یا شاید اس لیے بھی کہ اس قلم کے حصول کا طریقہ غلط تھا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ چوری چکاری' جیب تراشی وغیرہ محض مالی مادی منفعت کی خاطر سیکھنا یا اختیار کرنا شاید زیادتی ہے۔ یہ تو ویسے ہی ہے جیسے انسان' محض پیٹ پُر کرنے کے لیے اسے اَلم غلم سے بھرتا ہے۔ پیٹ میں بہتر خوراک اُتارنا' تو بہترین توانائی حاصل کرنے کی خاطر ہونا چاہئے۔''

میں نے قلم کو سنبھال کر ایک جگہ رکھ دیا کہ کسی ایسے نیک انسان کو' جو کام آنے والی اور مثالی انسان تخلیق کرنے والی باتیں اور نسخے لکھتا ہو' تحفہ دے دوں گا مگر اب کسی کی جیب سے کچھ نکالوں گا نہیں' چوری نہیں کروں گا...... یہیں کسی کی کہی ہوئی یہ بات بھی یاد آ گئی کہ کسی سے کچھ مانگنے کی بجائے' حالات ایسے پیدا کرو

کہ وُہ خود بخود مطلوبہ چیز تمہیں دے دے۔ حد سے گزرنا چاہو تو گزرو مگر بھکاریوں کی مانند ماٹگومت کہ تم انسانیت تو کیا' آدمیت سے بھی گزر جاؤ گے...... اب میں کسی ایسے وَلی انسان کو تلاش کرنے لگا جو قلم کی تلوار اور خُودی کی ڈھال سے جہاد کرتا ہو۔''

یونہی ریل کے ایک سفر کے دَوران' ایک بوڑھا معزز سا شخص دیکھا جو پیش و گرد سے بے نیاز' لگاتار کچھ لکھنے میں مصروف تھا...... آس پاس کون ہے کیا ہو رہا ہے' کون سا سٹیشن گزر رہا اور کون سا آنے والا ہے اُسے کچھ خبر نہ تھی؟ کتنا مطمئن' کیسا پُرسکون اور پُروقار تھا وہ شخص...... میں پچھلے دو اڑھائی گھنٹوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ پارکر پن' میرے پاس موجود نہیں تھا وَرنہ میں اُس کی خدمت میں پیش کرتا' التجا کرتا......

''اے مطمئن اور مدبر انسان! اِک وَلی کے جنازہ کے دَوران اُڑائے گئے اِس قیمتی پن سے معرفت' متابعت' محبت اور مسافرت لکھ......!''

ریل گاڑی بڑے خوش منظر علاقہ سے گزر رہی تھی...... سرسبز کھیت کھلیان' ندی نالے پُل' دَرختوں کے جُھنڈ...... ہلکی ہلکی ہوا' جس میں سبزے اور ثمردار کشادگی کی مہک رچی بسی تھی...... مسافر کھڑکیوں سے باہر فطرت کے نظاروں میں مگن تھے مگر یہ انوکھا سا شخص' شاید اپنے اَندر کے موسموں میں کہیں گم تھا۔ انسان کی باطنی کیفیات کے کھلے موسموں میں اُڑنے والے خُوش رنگ پرندے' اُس کی محویت کو کہیں اور بھٹکنے نہیں دیتے۔ میں جُرأت کر کے اُس کے قریب پہنچا اور سہما سا سامنے کھڑا ہو گیا۔ جیسے دفترِ جنوں پیش کرنے اپنے کسی پیشوا کے رُوبرو ہوں...... مستغنی جو ہوتے ہیں وہ یو نکتے نہیں' دم و حیرج ہوتے ہیں۔ ٹیلیفون کی گھنٹی یا بم دھماکہ' مرنے جینے کی کَن سُن سے سٹپٹائے نہیں جاتے...... فشارِ خون میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ آنکھوں میں خیرگی نہیں تیرتی......!

سدھارتھ کی سُدھ والا وہ منش' آنکھ اُٹھائے بغیر مجھ سے مخاطب ہُوا۔

''تم بھی دُوسروں کی طرح باہر کے نظارے دیکھو' ابھی تمہارے دیکھنے' جاننے کے دِن ہیں...... اندر رہنے اور زیادہ سمجھنے محسوس کرنے کی عمر نہیں......''

بِن سوچے سمجھے میرے مُنہ سے نکلا۔

''مجھے چوری اور دُوسروں کی جیب کاٹنے کا شوق ہے......''

وہ اُسی حالت میں مسلسل لکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے بھی یہی شوق تھا اور اب بھی یہی کام کرتا ہوں......''

میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''مگر آپ تو بڑے ہیں پڑھے لکھے' آپ یہ کام......؟''

اَب اُس عجیب شخص نے قلم بند کر کے عینک اُتاری اور غور سے مجھے گھورتے ہوئے بتایا۔

''علم اور عقل' اِس کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا...... دُوسروں کے افکار' احساسات' خیالات' اصول واسلوب وغیرہ چُرائے بن بات نہیں بنتی...... اپنے سے بہتر لوگوں کی اَچھوتی ترکیبیں' سوچیں' ندرتیں' اُن کے دماغ کی جیبوں سے نکالنی پڑتی ہیں۔ یہی سیکھنے سکھانے کا عمل کہلاتا ہے...... علم وعرفان چوری کرو' کام ایک سا ہی ہے صرف میٹریل بدل جاتا ہے۔'' وہ اپنے کاغذوں کا پلندہ دکھاتے ہوئے مزید بتانے لگا......

''یہ دیکھو! ایسے ہزاروں لاکھوں صفحے مَیں نے لکھے ہیں۔ میری کتابیں اِک دُنیا پڑھتی ہے۔ تم بھی اگر علم عقل حاصل کرنا چاہتے ہو تو علم وادب کی چوری کرنا سیکھو......!''

''کیا یہ ضروری ہے......؟''

''اگر چاہو تو بھیک مانگ لو مگر میرے خیال میں بھیک مانگنے سے چوری کر لینا کچھ بہتر ہی ہوتا ہے۔''

مَیں نے قدرے بڑبڑاتے ہوئے مزید یہ بھی بتا دیا کہ مَیں نے انتہائی گھٹیا پن کا ثبوت دیتے ہوئے ایک وَلی اللہ کے جنازے کو کندھا دینے والے ایک بھلے آدمی کی جیب سے پارکر پن اُڑایا اور اِس سے کچھ لکھنے کی کوشش کی......!

اَب حیرانی کی بات' اُس نے بھی کچھ ایسی ہی سٹوری سنائی کہ بچپن میں اُس نے اپنے ایک بزرگ کا قیمتی فونٹین پن کسی طرح چُرایا تھا...... اور یہ بھی کہ جو کوئی لکھنے کے لیے قلم چُراتا ہے وہ پھر ساری عمر لکھتا ہی رہتا ہے۔ شاید یہ قلم چُرانے کی سزا ہوتی ہے۔ دیکھ لو مَیں بوڑھا ہونے کو آیا مگر لکھنے پڑھنے سے جان نہیں چھوٹی...... اُس پُروقار شخص نے تھیلے سے کتاب نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ لو کتاب! اسے ضرور پڑھنا......''

''لیلےٰ کے خطوط'' یا ''صحرانورد کے خطوط'' ایسی ہی کوئی کتاب تھی۔ اِک علیحدہ سے ناک چہرے والے اِس عجیب شخص نے اُنگلی کے اشارے سے کتاب پہ لکھا ہوا اپنا نام بھی دکھایا۔ ''مرزا اَدیب''۔

مَیں نے وہ کتاب' اپنی پہلی فرصت میں ہی تمام کر ڈالی تھی...... اپنی عمر فہامت کے مطابق کچھ سمجھا' کچھ نہ سمجھا...... لیکن ایک بات کہ مجھے لکھنے پڑھنے کا چسکا پڑ گیا۔

مَیں اپنی لوکو انجن شیڈ میں بھی کبھی کبھی شوقیہ طور' چھوٹی موٹی چوری کی واردات ڈال دیا کرتا تھا۔ اَوزار' نٹ بولٹ' پیتل تانبے کا کوئی پرزہ...... کچھ بھی جس سے کچھ دھیلہ پیسہ مل جائے اور عادت شوق کی آبیاری بھی ہوتی رہے...... لیکن اِس کے ساتھ میری یہ بھی کوشش رہتی کہ دُوسروں کی اچھی باتیں' عادتیں اور خوبیاں بھی چُراتا رہوں...... ایک بات جو سامنے روشن ہی دکھائی کہ چوری اور نوسر بازی میں وہ مزہ اور ایڈونچر

نہیں جو جیب تراشنے میں ہے۔ چوری تو بڑا بودا اور بدمزہ سا کام...... جس میں بزدلی' دھوکہ دہی اور گھٹیا پنے کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دوسرے کے اعتماد و بھروسہ کو زک پہنچایا جاتا ہے' آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی ہے۔ چور مجھے نچو ہا لگتا ہے جس کی شکل و صورت اور کارکرتوت کی کتر کتر' بتر بتر سے جی مالش کرنے لگتا ہے جبکہ جیب کاٹنے کے لیے شکرے کی آنکھ' چیتے کی سی پھرت' لمحہ' واردات کا انتظار و اہتمام' صبر و تحمل...... شکار کی سائیکی سمجھنا' جائے مال اور تخمینہ' اس کی حرکات سکنات' موقع واردات کا تعین' خود پہ قابو' ساتھی سے پورا پورا رابطہ اور نکلنے کے راستہ پہ نظر رکھنی پڑتی ہے۔''

ملاحظہ فرمائیں ! اس کام میں کتنی دلچسپی اور ذہنی گہما گہمی ہے۔ کتنی حسیں' قوتیں اور ذہنی جسمانی صلاحیتیں بروئے کار لانی پڑتی ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ عام فوجی' چینڈو دیہاتی' حافظ مولوی' طالبعلم اور بچے بوڑھے کی جیب پہ جھاڑو پھیرنا بے حد آسان ہوتا ہے اور یہ بے استادوں' نومشقوں' بڑے گھٹیا جیب تراشوں کا کام ہے۔ عموماً جسمانی' ذہنی اور نفسیاتی عوارض میں مبتلا 'مشینیں (جیب کتروں کا اعزازی نام) ایسی جھک مارتی ہیں۔ ان کی عزت اور حیثیت ایسی ہی ہے جیسے پکے راگ دھاریوں کے روبرو پاپ گانے والوں کی ہوتی ہے۔ تفصیل لمبی ہوگئی لہٰذا میں مقصد کی جانب آتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی ابھی انتہائی کچا سا جیب تراش...... بلکہ اس فن پہ گھٹیا سی تہمت ہوں۔ یعنی دھر (شکار) خود ہی اگر اپنا بٹوہ نکال کر مجھے تھمادے تو میں لے لیتا ہوں۔ بلیڈ چلانا' ناخن کی نوک سے کپڑا کاٹنا' ادُنچا دے کر بٹوہ پار کرنا بھی مجھے نہیں آتا...... نیفا' شلوکہ' شلوار کی جیب' بغل' بوجھا' آزاربند کی گرہ' جراب کی جیب' پیٹ پٹی' جوتا تلہ' تِک پلّا وغیرہ تو بہت آگے کے مرحلے ہیں؟

یہاں کراچی میں' چند ایک لائٹ سی وارداتیں ضرور کی ہیں وہ بھی کلفٹن میں جمعرات کے روز مزار شریف کے نیچے چرس کے سوٹے بازوں کے ہاں مگر ان کے پاس سے روپیہ پیسہ کم اور سگریٹ چرس' نسوار زیادہ نکلی...... پچھلے دنوں اتفاقاً ایک بھلے رکشہ والے سے' اس کیفے دی پھوکٹ کا پتہ چلا کہ ادھر اس کام کے بڑے مہان گرو' استاد آتے جاتے ہیں۔ میں نے ایک آزمائش کی ٹھانی کہ اگر ادھر میری جس نے جیب کاٹی تو میں اس کی شاگردی میں آجاؤں گا...... سو میں ادھر چند روپے جیب میں ڈال کر چلا آیا۔ باہر پان کی دکان پہ کھڑا تھا کہ آپ دونوں صاحبان میرے دائیں بائیں'' کاؤ ے'' بن کر کھڑے ہوگئے۔ مجھے اسی لمحہ کھٹک گئی کہ آج شاگردی استادی کی ابتدا ہو ہی جائے گی۔ چنانچہ میں نے بھی بھرپور تعاون کیا...... آپ حضرات نے بڑی پھرتی تسلی سے اپنا'' کاڈا'' کیا اور ہوٹل میں کہیں غائب ہوگئے اور میں فنی خوشی اپنے کو اٹر لوٹ آیا۔

دو دن پہلے مجھے پکار ملی تھی۔ ہوٹل' دکاندار اور بالے ٹلی کا ادھار چکا کر باقی بیس روپے بار و آنے

بچے تھے اِن میں دس بارہ روپے اپنا خرچہ پانی علیحدہ رکھا' باقی آپ بزرگ اُستادوں کا نذرانہ' کا ڈے والی جیب میں ڈالا اور یہاں آپ کے درشن کے لیے چلا آیا۔ ایک اور بات' جس سے میں اس پیشہ کی خوبصورتی اور اُصولوں پہ قربان ہو گیا کہ آپ نے ایک نو عمر بچے کو بھی نہ بخشا اور نہ یہ سوچا کہ اسے تو کچھ پلّے سے دینا چاہیے نہ کہ اس کی جیب سے مونگ پھلیوں کے چھلکے تک نکال لیے جاویں...... خیر! میں قائل ہو گیا کہ جیب تراش کسی بھاروی شکل عمر' جنس یا ذات پات نہیں دیکھتا...... وہ تو اس فن کے اُصولوں کے مطابق صرف جیب کے اندر کا ہلکا بھاری مال دیکھتا سونگھتا ہے۔''

قصّہ مختصر! میں آپ اُستادوں سے بے حد متاثر ہوں۔ آج بھی میں آپ کے لیے معمولی سا نذرانہ' جیب میں رکھ لایا تھا اس یقین کے ساتھ کہ آپ یہ حقیری رقم ضرور قبول فرمائیں گے اور مجھے اپنی شاگردی میں لے کر بہت بڑا احسان کریں گے۔ اب اگر آپ میری باتوں پہ یقین کر چکے ہوں تو میرے شوق اور عقیدت کے پیشِ نظر میرے سر پہ دستِ شفقت رکھ کر مجھے اپنے زیرِ سایہ' اس فن سے آشنائی بخشیں...... میں آج شام مٹھائی کے ساتھ دوبارہ یہاں حاضر ہوں گا...... انشاء اللہ!

میں حسبِ پروگرام' کراچی سوہن حلوہ کا سیل بند ڈبہ لیے' کیفے دی چھوکٹ میں داخل ہُوا...... اس نے گہما گہمی کچھ سوا ہی تھی۔ ساری نشستیں لدی ہوئی اور شور شرابا بھی تھا۔ یاد آیا کہ مہینے کے وہ دن ہیں جب چمار کے کھیسے میں بھی چاندی کا کھنکتا' ہوا چاند ہوتا ہے۔ رونق علی کے ساتھ میاں زلدو بھی پنواڑی کے لمبے بڑے سانچی کے پانوں کا پانچہ بندھوا رہے ہوتے ہیں۔ پانچ پستول مارکہ بیڑیوں کا پورا بنڈل' بنڈی کی سیدھی پاکٹ میں دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ خس لگا روئی کا پھوا' مڑے کان کی کانس میں اُڑسا اور کالے تیتر مارکہ خضاب سے چندیا کے چند چھیدرے سے بال چمک رہے ہوتے ہیں...... تازہ تنخواہ کے ان دو چار دنوں میں غریب غربوں کی عید ہوتی ہے۔ ایک آدھ فلم' منڈوا تھیٹر' کھیل تماشہ...... سیر سپاٹا اور باہر کا کھانا کھابا' چائے لسّی بھی چلتی ہے۔ ان چار دنوں کی چاندنی کے بعد پھر وہی سوا تین ہفتوں کی اندھیری رات۔! یہ بھی ایسے ہی دن تھے اس لیے بازار' ہوٹلوں' دکانوں پہ خوب گہما گہمی تھی۔ اندر پہنچ کر اِدھر اُدھر دیکھا' کوئی کرسی سیٹ خالی دکھائی نہ دی۔ دیکھتے دیکھتے اُدھر دیکھا' جدھر انہیں ہونا چاہیے تھا...... وہاں بھی مطلع صاف تھا۔ تین کرسیوں پہ شاید کوئی سٹہ باز بیٹھے آپس میں اُلجھ رہے تھے۔ بس پورے ہوٹل میں دو سیٹیں ہی اُجڑی دکھائی دیں۔ ایک اِدھر سٹہ بازوں والی اور دوسری' ہاتھ دھونے والے سینک کے پاس کہ کوئی کتنی بھی احتیاط سے ہاتھ دھوئے' اس کرسی والے پہ چھینٹے پڑیں ہی پڑیں...... اس لیے اِدھر روز مرّہ کے آنے جانے والے اِدھر بیٹھنے

سے گریزاں ہی رہتے۔ میں مجبوراً آگے بڑھ کر ان سٹہ بازوں کے درمیان چوتھی خالی کرسی پہ گھس کر بیٹھ گیا کہ اس کے علاوہ اور کوئی جگہ نہ تھی۔ اس قسم کے بازاری ملباری چائے خانوں میں یہ خاص بات بھی دیکھنے میں آئی کہ اگر ایک ٹیبل گرد چار مختلف لوگ بیٹھے کھا پی رہے ہیں تو وہ چاروں اپنی اپنی جگہ پہ مکمل خود مختاری اور آزادی سے بیٹھے ہیں۔ کسی دوسرے تیسرے چوتھے کا وجود انہیں پریشان نہیں کرتا...... ساحلی علاقوں کے ہوٹلوں شراب خانوں قحبہ خانوں کا ماحول ہی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہاں بڑی کشادہ دلی اور فراخ ذہنی سے دوسروں کو قبول کیا جاتا ہے۔''

بیٹھنے کو تو میں بیٹھ گیا اور چائے پیسٹری کا آرڈر بھی دے دیا مگر اندر کچھ اور ہی کھد بد تھی۔ نگاہیں اُن اُستادوں کی کھوج میں تھیں جو فی الحال اِدھر کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سوہن حلوہ کا ڈبہ سامنے میز پہ دھرا تھا جس کے گرد بیٹھے یہ سٹہ باز اپنی مخصوص زبان میں انداز سے محو گفتگو تھے۔

چائے پیسٹری سے نپٹ ہی رہا تھا کہ یہ سٹہ باز جانے کی غرض سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک جو قدرے بوڑھا بیمار دکھائی دیتا تھا اُٹھتے ہی لڑکھڑایا اور نیچے گر گیا...... یہ گرنے والا میری بائیں جانب بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں بھی گھبرا کر اس کی جانب جھکا۔ دوسرے ساتھیوں نے فوری لپک کر اُسے سہارا دے کر اُٹھایا کھڑا کیا...... شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ بولا۔

''بس! ذرا چکر آ گیا تھا......''

کونٹر پہ بل ادا کر کے وہ وہاں سے نکل گئے۔

ان کے جانے کے چند لمحوں بعد ہی وہ میرے اُستاد لوگ سیدھے میرے پاس پہنچ کر خالی کرسیوں پہ بیٹھ چکے تھے۔ ظاہر ہے میں اچانک انہیں اپنے سر پہ پا کر بوکھلا سا گیا تھا۔ بیٹھتے ہی وہ دُبلا سا اُستاد بولا۔

''کیسے ہو بچے......!''

جبکہ موٹے نے بھی مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ کھٹ سے مجھے کھٹک گئی کہ میرا تحریری احوال اُن کے ملاحظہ میں آ چکا ہے۔ اَب دَر طۂ حیرت سے میری آنکھیں اُبلنے کو آ گئیں جب میں نے موٹے کے پھیلے ہوئے ہاتھ پہ اپنا ریلوے والا شناختی کارڈ اور چند کرنسی نوٹ پڑے ہوئے دیکھے۔ فوری طور پہ کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ جب شناختی کارڈ پہ اپنی سوکھی سڑی صورت پہ نظر پڑی تو لامحالہ میرا ہاتھ اپنی دائیں جیب کی جانب بڑھا جو کسی کم سوادے کی آنکھوں میں حیا کی مانند خالی تھی۔ اک دم آنکھوں کے سامنے کچھ دیر پہلے کا وہ سین تازہ ہو گیا۔ جب اِک بیمار دکھائی دینے والا سٹہ باز اپنی نقاہت کے سبب چکرا کر نیچے گر گیا تھا اُس کے ساتھیوں اور میں نے ہاتھ دے کر اُسے سنبھالا دیا تھا۔

جب ساری بات سمجھ میں آ گئی تو میں نے احسانمندی سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''یہ میری چیزیں آپ کو کہاں سے......؟''

موٹے نے مسکراتے ہوئے تُرت جواب دیا۔

''بچّہ! وہ کھٹارا مشینیں اپنے ہی کرخانے (کارخانے) کی ہیں۔ یہ وڈ کسن جرا کم دیتی ہیں بس! اپنا کھرچہ مرچہ نکال لیتی ہیں۔ ہم ہیرا باجو میں ایک دوسرا پرچہ (پرزہ) ڈھیلا کر رہے تھے...... بڑا ٹائٹ تھا' تھوڑا الٹر یکیٹ کرنا پڑا۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ لیا۔

''کیا کسی بائیسکل یا موٹر بائیک کا پُرزہ تھا؟...... میں بھی تھوڑی بہت مکینکی جانتا ہوں...... میں دیکھ لیتا ہوں۔''

وہ دونوں کھی کھی کرتے ہوئے ہنسنے لگے۔ ذرا میرے قریب لگ کر وہ موٹو کہنے لگا۔

''بچّہ! ابھی تم کچا ہو اس لیے نہیں جانتے کہ پرچہ ڈھیلا کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔'' پھر وہ میرا شناختی کارڈ اور روپے میری جانب سرکاتے ہوئے مزید گویا ہوا۔ ''یہ اپنا مال مسالہ اپنے کھیسے میں ڈالو......!''

مزید وہ چپلا دُبلا اُستاد بتانے لگا......''بچّہ! تمہارا لیٹر پڑھ کر اس عباس بھائی کو سُنایا ہے۔ یہ کوئی زبان تو کیا' اپنا نام لکھا ہوا بھی نہیں پڑھ سکتا...... عباس بھائی! تمہارے لیٹر سے بہت خوش ہوا...... ایک بات کھلے کا بولا کہ تم پنجابی ہے' جو تھوڑا بہت پنجابی مشینیں اِدھر چالو ہیں' وہ بڑا گندہ کام کرتی ہیں۔ جیسے ایک گندی مچھی پورے جال کو گندہ کرتی ہے۔ اِن کا بھی اِدھر ایسا ہی حال ہے۔''

اَب عباس بھائی درمیان میں بولا۔ ''بچّہ! تم ہم کو اچھا لگا ہے...... تین بار تم اِدھر اس مَبل پہ ملا...... دو بار' ہم نے تم کو پلٹی ماری اور داؤد گروپ نے تم کو پلٹا مارا۔ ان کی پلٹی تو واپس مل گئی ہے اَب مُرشد سائیں ملنے پہ شاید پہلی دو پلٹیاں بھی واپس ہو جاویں گی......''

اَب میرا پُوچھنا بنتا تھا کہ یہ مُرشد سائیں صاحب کون ہیں' کون سی مسجد مزار یا آستانہ پہ بیٹھتے ہیں؟ اَب مجھے جو مُرشد سائیں صاحب کا تعارف حاصل ہوا تو وہ مجھے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا...... جس طرح پہلوانوں' گویوں' ہیجڑوں کے گرو' خلیفہ اور اُستاد ہوتے ہیں اس طرح ان جیب کتروں کے اپنے اپنے گھرانے اور گروہ ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر گرو بڑی حیثیت' دولت اور پہنچ' رسوخ والے ہوتے ہیں...... حاجی نمازی اور متخیر بھی۔ ان کے اپنے اپنے علاقے ہوتے ہیں...... دُوسروں کے علاقے میں واردات نہیں ڈالتے اور اگر ایسا ضروری یا مجبوری ہو تو پھر واردات کے لیے بولی لگتی ہے۔ شکار کی حیثیت مالیت کے مطابق اُسے

خریدا یا بیچا جاتا ہے۔''

گرو میں سینئر اور جونیئر بھی ہوتے ہیں مگر سب اپنے گرو کی ہدایات اور طریقوں کے تحت کام کرتے ہیں...... کامیاب واردات کے بعد لازم ہے کہ جیب کترا حاصل شدہ مال سمیت اپنے اڈّے پہ حاضر ہو اور حاصل کردہ اشیاء اپنے گرو کے رُوبرو پیش کرے۔ گرو اپنی حسب منشا جو چاہے جتنا چاہے اُسے دے یا نہ دے...... گرو وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کو وقت حالات کے مطابق نت نئے طریقوں سائنٹیفک انداز نئی ٹیکنیکل جدتوں سے بھی روشناس کراتا رہتا ہے اور باقاعدہ پریکٹیکل ٹریننگ بھی دیتا ہے۔ وہ اپنے گروہ کے ہر ممبر کے ہر طرح کے مفادات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ قانون پولیس تھانہ جیل کچہری یا پبلک ضمانت ہر جگہ ہر مرحلہ پہ اُس کی نگہداشت اور حفاظت کرنا اُس کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ اُس کے ہاں اپنے وکیل پولیس اہلکار بھی ہوتے ہیں۔ ضمانت کے کاغذات تیار ہوتے ہیں۔ صرف دستخطوں کی ضرورت ہوتی ہے......''

اکثر بڑی وارداتیں جو کاروباری جگہوں بنکوں کے اندر باہر...... ایئرپورٹس ریلوے سٹیشن لاری اڈّوں مزاروں میلے عرسوں یا جلسوں جلوسوں میں باقاعدہ تیاری سے ڈالی جاتی ہیں...... ان میں اکثر پولیس تھانوں کی ملی بھگت بھی شامل ہوتی ہے...... اصل جیب کتروں سے کہیں زیادہ وہ ساتھی ہوتے ہیں جو واردات کے موقع پہ ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں جس کی آڑ میں جیبوں کا صفایا ہو سکے...... مثلاً دو آدمی آپس میں بُری طرح لڑ پڑتے ہیں خونوں خون ہو جاتے ہیں یا اچانک کوئی آدمی گر کر ایڑیاں رگڑنے لگتا ہے۔ چھوٹا موٹا ایکسیڈنٹ یا ٹکر یعنی کوئی ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی توجہ اُدھر مبذول رہے...... گنجان بازار میں ایک قیمتی گاڑی اچانک بند ہو جاتی ہے۔ اس میں سوار اکیلی خوبصورت اتراتی ماڈرن لڑکی اُسے بار بار سٹارٹ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر باہر نکل کر بونٹ کھولتی ہے۔ اس دوران سینکڑوں مسلمان بھائی اپنی بہن کی اخلاقی اور تکنیکی مدد کے لیے جمع ہو جاتے ہیں...... نقص چونکہ مصنوعی اور معمولی ہوتا ہے دس پندرہ منٹ میں درست کر دیا جاتا ہے۔ لڑکی اِک کافرانہ سی مسکراہٹ سے سب کا شکریہ ادا کرتی ہوئی یہ جا وہ جا...... اس خوبصورت مسلم سمارٹ لڑکی کی پریشانی میں دل و جان سے اپنی خدمات پیش کرنے والے جذبۂ ایمانی اور انسانی سے سرشار مسلمان نوجوان دُور تک نظر آنے والی کار کی پشت پہ آویزاں نمبر پلیٹ دیکھتے رہتے ہیں...... یہیں پھر ہوش و حواس واپس آنے پہ پتہ چلتا ہے کہ دو چار مسلمان بھائیوں کی جیبوں کا مال نکل چکا ہے...... کون جانے کہ یہ لڑکی بھی کسی ایسے ہی گروپ کی کارندہ تھی جو عجیب و غریب طریقوں سے نت نئی ترکیبوں سے اپنے شوق پورے کرتے ہیں۔

میرے اِن اُستادوں نے اپنے گرو یا مرشد کی تعریف تعارف کچھ اس انداز سے بیان کیا کہ لامحالہ

دل میں زیارت کی سعادت حاصل کرنے کی تمنا مچل اُٹھی...... الٰہی! یہ کیسی کیسی نابغۂ روزگار اور سراپا ہنر و کمال ہستیاں اپنے ہاں موجود ہیں جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ ہونے کے ساتھ حاجی' نمازی' مُرشدی اور پتا نہیں کن کن مراتب پہ بھی رَونق افروز ہیں......؟

میرے کاؤ کی رقم سے ہی نذر کی شیرینی خریدی گئی اور ہم تینوں کچھ ندر زیبدل ہی گرُو مندر کے اندر' تنگ سی گلی کی ایک خستہ حال کوٹھڑی کے سامنے جا پہنچے۔ مُرشد سائیں کو شاید اپنے خفیہ ذرائع سے ہماری آمد کی خبر مل چکی تھی...... دُبلا پتلا' ہڈیوں کا پنجر...... سُڑا سُوکھا' گوشت سے خالی چہرہ...... موٹی موٹی اُبلی ہوئی آنکھیں۔ آدمی تھا یا کیکڑا' او دبلا؟ اس لیے نہیں کہا کہ اس کے پتلے پتلے ہونٹ' نہ صرف مونچھوں کے بوجھ سے آزاد' بلکہ چہرہ بھی بے ریش تھا۔ ایسا چہرہ' جو قدرتی طور پہ بالوں کے جھنجھٹ سے آزاد ہوتا ہے۔ ماتھے پہ سجدوں کا نشان' معمول کے لباس میں وہ زندگی کا ناگوار بُوجھ اُٹھائے ہوئے ایک عام سا محنت کش دکھائی دیتا تھا۔ جو اپنی آدھی پگار' سیٹھ کے قرض کی مَد میں جھونک دیتا ہو...... سپاٹ چہرہ' جس پہ کوئی اچھا بُرا تاثر لائے بغیر اُس نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا...... اپنی کسی خفیہ بولی میں ایک آدھ جملے کا تبادلہ ہوا اور ہم شکاری کُتیا کے حواری پلّوں کی طرح پیچھے پیچھے چل دیے......''

گلی کی آخری نُکڑ پہ قدرے آسودہ سی ایک بیٹھک' جس میں پہلے ہی سے چار پانچ نوجوان بیٹھے کیرم کھیل رہے تھے...... ہمارے داخل ہوتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھے' سلام کرتے ہوئے باہر غائب ہو گئے...... میں تذبذب میں تھا کہ یہ بیمار اُونٹ سا شخص' کہیں مُرشد سائیں تو نہیں؟...... یقین اس لیے نہیں آتا تھا کہ میں نے مُرشد' بابے' سائیں' صُوفی وغیرہ کسی اور ڈھب ڈھنگ کے دیکھ رکھے تھے اور یہ گھروں میں قلعی سفیدی کرنے والوں جیسا بیمار سا شخص' کسی زاویے سے مُرشد نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے اس کے مُرشد سائیں ہونے پہ یقین اس وقت آیا جب موٹو نے اُسے مُرشد سائیں مخاطب کر کے میرا رقعہ اُس کے رُوبرو کر دیا۔

مُرشد سائیں نے موٹو کی بجائے دُبلے شخص کو پڑھنے کا حکم دیا۔ میں کسی اقبالی مُجرم کی طرح ٹھوڑی سینے سے لگائے سُن بھی رہا تھا اور چور نظروں سے مُرشد سائیں کی جانب دیکھ بھی لیتا...... کہ چہرے کے کسی تاثر سے مجھے اپنی تحریر کی تقدیر کی سُن گُن مل جائے۔ مگر وہاں تو کوئی اَزلی بُونجا پھرا ہوا تھا' جیسے چہرے کے اعصاب کی رگیں ہی کسی حادثہ میں ماری گئی ہوں' ہاں! البتہ دریائی گھوڑے کی سی باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں بڑی جاندار تھیں' کاربن سٹیل کے برموں کی مانند...... پیشِ نظر ہر چیز کو چھیدتی' کاٹتی اور گہرائی تک اُترتی ہوئی۔ مجھے بظاہر اس بے سَواد' بے صَوت و بے صُورت شخص کی جن خُوبیوں' فنّی صلاحیتوں اور زُہد و تقویٰ کی ارفع منزلوں کا بتایا گیا تھا...... اُن کا حامل' کم از کم یہ شخص نہیں ہو سکتا! میں اپنے وَساوس اور سُوچوں کی اسی کتر بیونت میں تھا

کہ رُقعہ کا مضمون تمام ہو گیا۔ مُرشد سائیں چند لمحے گُم صُم رہا' پھر قائد اعظم جیسی اُنگلیوں والا ہاتھ بڑھا کر میری اُنگلیاں اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ کبھی میرے ناخنوں کو دیکھتا اور کبھی پوروں کو...... ہتھیلی پڑھتا' کلائی اور ہاتھ کے مابین لچک دیکھتا!......

اسی اثنا چائے کی چینک لائی گئی۔ چائے کے دوران بھی مُرشد سائیں نے کچھ بات چیت نہ کی...... گفتگو کا ایسا خسیس...... ! میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے اُس کی چبھتی ہوئی خاموشی سے خوف آنے لگا...... جبکہ موٹے اور پتلے سے میں قطعی مرعوب نہ ہوا تھا۔ وہ دونوں بھی اِدھر یُوں مؤدب و مہذب' جیسے کوتوال شہر کے رُوبرو کسی تعزیر و تعمیل میں کھڑے ہوں۔''

حد سے تجاوز کرتی ہوئی خاموشی' خدمت' عزت و عقیدت بھی کبھی کبھی بڑی دُشمن پیدا کرتی ہے جس طرح حد سے گزرا ہوا انتظار اعتبار اور پیار پیدا کرتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے اندر کی کس کل کل سے بوکھلا کر کوئی بونگی مار بیٹھتا...... مُرشد سائیں نے پُراسرار خموشی کی مُہر توڑی۔ میرا نام پوچھا' جبکہ میرا نام رُقعہ میں لکھا ہوا تھا...... میں نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔ تعلیم کا پوچھا تو بتایا کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی...... رُقعہ میرے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سب کچھ تم نے کسی سے لکھوایا ہے یا خود لکھا ہے......؟'' اس کا جواب میں نے ہاں میں دیا۔

بڑی رسان سے گویا ہوئے!

''بیٹا! تم اس کام کے اہل نہیں ہو...... جیب تراشی کے لیے اُنگلیاں اور ہاتھ علیحدہ سے ہوتے ہیں۔ پولیس والوں کے ہاں جب کوئی رنگے ہاتھوں پکڑا ہوا' پاکٹ مار لایا جاتا ہے تو وہ اُس سے یہ نہیں پوچھتے کہ تم نے پاکٹ ماری ہے یا نہیں' وہ اُس کی اُنگلیاں دیکھتے ہیں۔ پاکٹ مار کی اُنگلیاں ہی اُس کے خلاف ناقابلِ تردید گواہی ہوتی ہیں۔ تمہارا شوق اور دلچسپی اپنی جگہ' مگر تمہاری اُنگلیاں اور ہاتھ' اس کام کے لیے موزوں نہیں ہیں اور نہ ہی تم ایک ماہر جیب تراش بن سکتے ہو۔؟

اچانک میرے مُنہ سے نکل گیا۔

''تو پھر یہ ہاتھ اُنگلیاں لوہا کوٹنے کے لیے ہیں جو میں ریلوے انجن شاپ میں کر رہا ہوں؟''

''نہیں' یہ اس کام کے لیے بھی نہیں...... یہ تمہارے قیمتی ہاتھ اور اُنگلیاں قلم پکڑ کر لکھنے کے لیے ہیں' کسی کی جیب سے کچھ نکالنے کے لیے نہیں...... اپنی جیب سے نکال کر کسی کو کچھ دینے کے لیے ہیں......؟ سو تم اِدھر توجہ دینے کی بجائے لکھنے کی جانب بڑھو...... تمہیں قلم تو اللہ کے ایک برگزیدہ ولی نے خود عطا کیا ہے اس سے بڑا معتبر لکھنے کا اذن اور کہاں سے ملے گا؟''

''وہ تو مَیں نے ایک پڑھے لکھے' غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے بابو کی جیب سے پار کیا تھا......''

''تمہاری نیت' قلم چوری کرنے کی تھی؟...... کیا تم نے اُسے تلاش کیا...... اُس کا پیچھا کیا تھا؟ اگر نہیں' تو وہ قلم تمہیں لکھنے کے لیے دیا گیا...... آدمی آگ لینے جاتا ہے اُسے پیغمبری مل جاتی ہے...... لوٹنے جاتا ہے مگر واپس لٹ کر آتا ہے...... وہ مالکِ عظیم جب دینے پہ آتا ہے تو پیغمبریاں سروریاں' نبوتیں' رسالتیں' عزتیں عطا کر دیتا ہے...... گنہگار' شرابیوں بدکاروں کو ولائتیں بخش دیتا ہے اور کہیں صدیوں کی عبادت اطاعت گزاری کو نظر انداز کر کے راندۂ درگاہ کر دیتا ہے۔ فرشتوں' پیر پیغمبروں' تاجداروں' سکندر بختوں کو دو کوڑی مول کا کر دیتا ہے۔ کسی کو کنویں میں لٹکایا تو کسی کو دار' صلیب پہ چڑھا دیا...... کسی کا سر کٹوا دیا' کسی کو سرِ بازار رُسوا کر دیا...... جس کو چاہا زمین و آسمان کی حکومتیں عطا کر دیں اور جب چاہا سلطنتیں دے کر سب کچھ سلب کر لیا...... شہریاروں کو جلاوطنی اور مہاجروں کو سروری بخش دی۔'' بھتیا...... ! یہ سب اُس کی عطائیں' ادائیں اور بے نیازیاں ہیں' جو چاہے کرے' اُس کی حکمتوں مصلحتوں کے آگے' کوئی عقل' دلیل اور منطق کام نہیں کرتی۔؟ جاگنے والے کو محروم دو عالم رکھا سونے والے سے کہا جا ساری۔

مَیں مبہوت سا' اُس کی دانش و حکمت بھری باتیں سُن رہا تھا بلکہ اپنے تئیں اُن کے مخفی مطالب پہ بھی غور کر رہا تھا اور ساتھ ہی اُس تضاد پہ بھی حیرت تھی جو اس کے پیشہ اور گفتگو کے مابین اِک شجرِ ممنوع کی مانند اِستادہ تھا......!

کچھ صحیح سے نہ سمجھ پایا کہ اِدھر جیبیں کاٹنے' سیکھنے کے لیے آیا تھا یا مولانا احتشام الحق تھانوی سے پندو نصائح سننے؟...... ''شکل و شباہت مجرماں اور باتاں چیتاں' مومناں'' ...... ''کام دھندا جیب تراشی' اُوپر سے دیکھیں حاجی نمازی'' ...... نہ پتا کہ دھوبی' نائیں اور اِدھر کہلوائے مُرشد سائیں...... ! کیا کہوں' کیا پوچھوں؟ کچھ سمجھ نہ آیا...... چُپ کی گھنگھنیاں مُنہ میں ڈالے بٹ بٹ دیکھتا رہا......''

کسی کو آواز دی' تو کسی خفیہ زبان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر میں ایک لڑکا' ایک لفافہ سامنے دھر کر چلا گیا۔

''یہ لو تمہارے پیسے...... گن لو! پورے کے پورے ہیں۔ کچھ لوگ حلال جانور ذبح کرتے ہیں اور کچھ حرام حلال مردہ جانوروں کی کھالیں اُتارتے ہیں' اُن کی ہڈیاں بیچتے ہیں۔ اِسی طرح کوئی میت کو غسل دیتا ہے' کوئی مُردے کے لیے کفن اور قبر تیار کرتا ہے اور کوئی زندہ اِنسان کے گلے میں پھانسی کا پھندا کسنے پہ معمور ہوتا ہے۔ سناروں کے بازار کی گندی موریوں نالیوں سے گندگی چھان کر کچھ لوگ اپنا رزق تلاش کرتے ہیں' کسی کی خوراک کیڑے مکوڑے اور کسی کا رزق چوہا چھپکلی اور کسی کے لیے سانپ بچھو!...... اور ایسے بھی کہ جن

کے لیے موتی انگور سیب امرود اور انار...... کیسی رزق کی تقسیم ہوتی ہے؟

کارخانۂ قدرت میں سارے رنگ ڈھکتے ہیں سب خوشبوئیں مہکتی ہیں...... تم نے دیکھا ہوگا کسی کی چونچ بڑی تو کسی کی ناک کوئی پیٹ ہی پیٹ ہے تو کوئی ٹانگیں ہی ٹانگیں!...... کسی کی ٹانگیں سرے سے ہی نہیں۔ کہیں کان غائب تو کہیں آنکھیں۔ جس کا بس چلتا ہے وہ دوسرے کو ہڑپ کر جاتا ہے...... یہی بقا اور فنا کا قانون ہے۔ اچھائی برائی حرام حلال جائز ناجائز نیکی بدی زندگی موت وغیرہ سب اخلاقیات کے استعارے ہیں جو تقدیر کے آگے اور تدبیر کے پیچھے اپنا کوئی بھی مفہوم برقرار نہیں رکھ سکتے۔ تمہاری انگلیاں اور ہاتھ اگر موزوں ہوتے تو میں تمہیں ضرور یہ فن سکھاتا۔ جیسے دل گداز ہو تو اس میں سوز پیدا ہوتا ہے ورنہ بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہوتی ہے۔''

مُرشد سائیں اُٹھتے ہوئے مزید بولے۔ ''بچّہ! تم لکھنا پڑھنا سیکھو...... اس میں بھی یہی فن ہوتا ہے دوسروں کے قلم چراؤ...... نادر اچھوتے خیالات کا نو...... تمہیں پتا ہے کہ قلم اور جیب دونوں تراشے جاتے ہیں......''

میں نے فوراً بات بنائی۔

''مُرشد سائیں! میں وہی سیکھنا چاہتا ہوں جو آپ کے پاس ہے...... میں آپ کے باطن تک پہنچنا چاہتا ہوں......''

صاحبو! اس کے بعد جو اک سلسلہ شروع ہوا اس کا بیان بڑا طولانی اور طوفانی ہے...... مختصر صرف یہ کہ میں نے ہر لگن اور محنت سے جیب تراشی قیافہ اور چہرہ شناسی عوامّ الناس کی نفسیات صبر تحمّل بچنا بھاگنا خفیہ اشارے گفتگو...... پکڑے جانے کی صورت میں پولیس سے تعاون ان کی چھتر ول سے خود بچانا سیکھا!

یہیں مجھے معلوم ہوا کہ اس نازک فن میں پختگی اور کمال حاصل کرنے کے لیے کن کٹھن مراحل اور صبر و برداشت سے گزرنا پڑتا ہے...... ایسی کٹھن اور عجیب و غریب ریاضت و محنت شاید ہی کسی اور فن کے سیکھنے میں کرنی پڑتی ہو۔ حربی فنون اور اس فن کے علاوہ کوئی اور فن بھی ایسا کوئی دکھائی نہیں دیتا جس کی تکمیل بیچ کھیت سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر کی جاتی ہو...... لیکن اب جیب تراشی کا فن سیکھنے سے کہیں زیادہ میری دلچسپی مُرشد سائیں سے ہو گئی تھی۔ میں شاید اس کے ظاہر و باطن کی باریکیوں کو کماحقہٗ طور پہ جان نہ سکا تھا...... وہ ایسے کیوں تھا؟ مخلوقِ خدا کی جیبیں کاٹنا سکھاتا بھی ہے اور کٹواتا بھی ہے...... وعظ و نصیحت بھی ہوتی ہے۔ نکالا ہوا مال واپس بھی لوٹا دیتا ہے اور اس بُرے دھندے سے دُور رہنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔''

ہفتہ وار چھٹی پہ اور کبھی کبھی شام کے بعد بھی میں مُرشد سائیں کے ڈیرے حاضری دیتا تھا......

مُرشد سائیں نیچے بیٹھک اور شاگرد پیشہ اُوپر چوبارے میں اپنے سینئرز سے رموزِ جیب تراشی کی زبانی کلامی اور ہفتے میں تین دن عملی تربیت حاصل کرتے...... بیرونِ کراچی سے پکھولز کے اِس مُرشد سائیں گروپ سے تربیت حاصل کررہے تھے۔ مہینے میں ایک دو بار مُرشد سائیں بھی کچھ خاص نکات پہ زبانی اور عملی لیکچر دیا کرتا تھا...... مجھ پہ اِک خاص عنائت یہ تھی کہ میں اُوپر' نیچے جہاں جی چاہتا بیٹھ جاتا...... میرے لیے ہر طرح کی آزادی تھی۔ میں حیران بھی تھا کہ مُرشد سائیں' مجھ پہ یہ خاص لطف و کرم کیوں روا رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ چند ماہ چلتا رہا' اِس دَوران اُن کی طبیعت خرب رہنے لگی...... ایک صبح مجھے پیغام بھیجا۔

''بچے! آج کے بعد تمہارا اِدھر ڈیرے پہ آنا مُوقوف ہُوا......''

پیغام لانے والے سے پوچھا تو معلوم ہوا...... علاقہ کے تھانے کا عملہ تبدیل ہو گیا ہے۔ ڈیرے اور کینٹ دی چوکٹ سے بہت سی مشینیں پکڑی گئی ہیں۔ مُرشد سائیں نہیں چاہتے کہ تم کسی پریشانی میں پھنس جاؤ...... اِس کے باوجود' میں خود کو روک نہ سکا...... چلا ہی گیا' مُرشد سائیں وہاں پہ نہ تھے۔ پتہ چلا ہسپتال میں ہیں...... اُدھر پہنچا تو مرشد سائیں بڑی نازک حالت میں بستر پہ پڑے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں...... دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

''مجھے یقین تھا کہ مرنے سے پہلے تم مجھے ضرور ملنے آؤ گے...... غور سے سنو! گلزاروں میں گُل تو کھلتے ہی ہیں مگر کچھ پھول دَلدلوں اور پہاڑوں میں بھی مسکراتے ہیں...... اُجلے اُجلے' خُوش رنگ خوشبودار...... اِدھر نہ تو کوئی اِن کا باغباں ہوتا ہے نہ ہی فطرت کے علاوہ کوئی اور نگہداشت کرنے والا!...... پہاڑوں چٹانوں کے سخت پتھروں کے دَرمیان گُلِ لالہ اور جوہڑوں' دَلدلوں کے گدلے پانیوں میں کنول! یعنی اپنے اپنے مقسوموں کی بات...... محراب و منبر پہ' جُبہ و دستار پہنے وعظ و پند کرنا بڑا آسان اور ثواب و اَجر کا کام ہے مگر کسی مے خانے' قمار خانے' قحبہ خانے اور چوروں' جیب کتروں کے بیچ پیدا ہو کر' اُن کے درمیان رہ کر' دُوسروں اور اپنے لیے کوئی بہتر سوچنا اور بھلائی کرنا ایسا آسان نہیں بلکہ بڑے عذاب وعتاب کا معاملہ ہے۔ مُرغابی کی مانند' جو تمام زندگی پانی میں ہی رہتی ہے مگر کبھی بھی اپنے بال و پَر کو بھیگنے نہیں دیتی۔''

امام الہند مولانا اَبوالکلام آزاد نے' ایک سوال کے جواب میں کہا...... ''آپ لوگ تو پاکستان بنا کر اُدھر چلے جائیں گے پر جو اِدھر ہندوستان میں رہ جائیں گے اُن کے لیے تو کسی نہ کسی کو تو اِدھر رہنا پڑے گا؟...... جنت کے انتظام تو ہوں گے ہی...... آخر دوزخ بھی تو کسی کے سپرد ہوگا؟...... بُرے بھی تو اَچھوں کی طرح اِک اِکائی ہیں...... یاد رکھو! بُرے سے اَچھا بننا...... اَچھے کا بُرا بننے سے لاکھ درجہ افضل ہوتا ہے۔''

کچھ دیر مجھے لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھتے رہے پھر اپنے بیٹے کو قریب بلا کر کہا۔

''میرے مرنے کے بعد میری ساری کتابیں اور ذاتی نوشتہ ڈائریاں محمد یحییٰ خان کو دے دینا......
میں نے تحریری طور پہ بھی یہ وصیت کر دی ہے......''

## ● یاقوتِ یمنی لعلِ بدخشانی......!

تاشقند و سمرقند کو اگر ثمر قند ہی لکھا جائے تو بے جا نہ ہوگا...... قدرت نے وہاں کی آب و ہوا' پھلوں پھولوں' اناج سبزیوں کو جیسے بہشت سے اُتارا ہو...... وہاں کے پیرو جوان' دوشیزائیں عورتیں بچے لگتا ہے کسی اور سیارے سے اُترے ہیں۔ اُن کی نیلگوں آنکھیں' سرخ و سپید گال' سونے کے پتروں سے منڈھے دانت' سنہری بال' فراخ ماتھے' تاباں چہرے...... رنگین خوبصورت ڈھیلے ڈھالے لباس اور خوش خلقی وغیرہ اجنبیوں کو مبہوت کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے جو بڑے فراخ اور سیکولر ذہن و فکر کے مالک ہیں۔ جدید تقاضوں کے ساتھ ساتھ وہی قدیمی مساجد مدرسے' حجرے' دیوان خانے...... معلوم ہوتا ہے کہ ہماری پرانی اسلامی اقدار اپنی پوری قدامت پسندی اور روایتی انداز سے وہاں پہ زندہ ہیں۔''

مجھے کئی بار سمرقند' بخارا' قندھار' تاشقند' آذر بائیجان کی سیاحت کا موقع ملا۔ میں وہاں اک گونا گوں سکون محسوس کرتا ہوں۔ ان جگہوں پہ جہاں تاریخی' قومی' ثقافتی معاشرتی نوادرات اور نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں قدیمی دینی' مذہبی اور تہذیبی اثاثے بھی اپنی اہمیت دو چند رکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میرا موضوع چونکہ تصوف' مذاہب وادیان ٹھہرا اس لیے سیاحت کے دوران میں بزرگانِ دین کے مزارات' مساجد و مدارس اور صوفیائے عصر کی جستجو میں رہتا ہوں۔ میرے ہاں جو کچھ بھی علمی' قلمی اور روحانی طور پہ محفوظ و موجود ہے وہ ربّ العزت کا کرم و فضل اور بزرگانِ دین و دُنیا' مزارات و کتب کی طفیل ہے۔''

کہتے ہیں جیسی نیت ویسی مراد' جیسا بھوت ویسا ہمزاد اور جیسا زوبی ویسا بہزاد...... روزِ ازل سے ترتیب ہوئے میرے ہر سفر حضر کا اصل ماخذ' یہی بزرگانِ دین کی آماجگاہیں' زماں و مکاں کی مسافتیں' حصولِ علم اور اکتسابِ فہم و دانش ہی رہا۔ میں کسی طور کے سفر سے تہی دامن نہیں لوٹا...... میرا شوق وارفتگی' حُسنِ طلب' ادب و نیاز اور عجز و انکسار ہی کچھ یوں کہ دینے والا' نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ میری دریدہ جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ سنبھالنے برتنے کا یہ قرینہ بھی عطا ہوا کہ اک ذرہ بھی جھولی سے نیچے نہ گرنے پائے...... کسی عطا کو سنبھالنا بھی جس ظرف و تحمل کا متقاضی ہوتا ہے وُہ ہر کسی کے پاس تو نہیں ہوتا۔''

بدخشاں' شیراز' لاہور' نیشاپور و نینوا' کاشغر و کابل' بابل و بصرہ' بغداد و بخارا' تبریز و تاشقند'
استنبول و اصفہان' قونیہ' قرن' قندھار' دمشق و دہلی' مشہد و ملتان وغیرہ ایسے نمایاں عظیم بلاد ہیں جو اپنی تہذیبی'
جمالی' رُوحانی اور ثقافتی کشش سے مجھ ایسے زبوں حال مستوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ مالک ارض وسما نے
اپنے کمال فضل وکرم سے میرے لیے فاصلوں کو طے کرنے میں آسانیاں فرما دیں...... بس کہیں پہنچنے کے لیے
صرف نیت ہوتی ہے باقی تو وسیلے وسائل غنچوں کی مانند خود بخود مسکرانے لگتے ہیں۔ یہ منزلیں یہ راستے' یہ
آستانے اُدھر کے فرزانے مستانے مجھے نمانے دیوانے کو اپنی جانب کھینچتے رہتے ہیں۔ میں سر کے بل' قدم قدم
نثار وہاں حاضر ہوتا ہوں لیکن ایک بات طے ہوتی ہے کہ میرا کہیں پہنچنا' خالی از مصلحت نہیں ہوتا...... کچھ نہ کچھ
بیچ اس مسئلہ کے ضرور ہوتا ہے...... کچھ تو سفر کے پہلے ہی سوجھ جاتا ہے اور کچھ وہاں پہنچ کر سمجھ میں آتا ہے؟

میرے باوا اویس قرنیؒ (جن نے ہمارا سلسلہ اُویسیہ ملامتیہ جڑا ہوا ہے) کے دیس یمن کے دُرِ نایاب'
مانندِ یاقوتِ یمانی اپنی چمک دمک' خوبصورتی' گہری سرخ رنگت کی بنا پہ دُنیا بھر میں بیش قیمت اور معیاری
سمجھے جاتے ہیں۔ اساطیر کی کہانیوں اور دیگر مذہبی حکایتوں رِوایتوں میں بھی بطورِ خاص' ان کا تذکرہ موجود ہے۔
لعلِ یمانی سے مجھے اپنی زندگی کی ایک عجیب وغریب ملاقات یاد آ گئی' جو حرم شریف میں زم زم کے کنویں پہ ایک باپ
بیٹا سے ہوئی تھی......"

بوڑھا وہاب صحابی تاشقندی' اپنے پولیو زدہ بیٹے کے ہمراہ' خانہ کعبہ میں مجھے اتفاقاً ملا تھا۔ میں سعی
سے فارغ ہو کر چاہِ زم زم کی ٹونٹیوں سے زم زم پی رہا تھا کہ ایک بوڑھا' ساتھ والی ٹونٹی سے چلّو میں پانی
لے لے کر نیچے فرش پہ پڑے اپاہج بچے کو پلا رہا تھا...... دونوں نے احرام باندھے ہوئے تھے۔ بوڑھے کے
چہرے بُشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تاشقندی' تاجک' بخاری یا ازبکی ہے۔ ان علاقوں کے باشندوں کے
چہروں کے خدوخال' چال ڈھال' اک علیحدہ ہی طرز کے ہوتے ہیں۔ شمشاد کی مانند اٹھی اور بھری ہوئی
قامت وجسامت' گول مضبوط دہانے' فراخ ماتھے' گہری نیلگوں آنکھیں اور اکثر کے ہاں' دانتوں پہ سونے کا
پترا منڈھا ہوا کہ کوئی بھائے تو کوئی دُکھائے...! اس بوڑھے نے مجھے ادھر اپنا ہمسایہ جانتے ہوئے مسکرا کر
شاید جذبہ خیر سگالی کا اظہار کیا تھا...... جس کا جواب میں نے بھی مسکرا اور سر جھکا کر دیا...... اسی دوران مجھے
اس کے سونا منڈھے اگلے دانت بھی دکھائی دے لیے' جن پہ ہلکی سبز کائی سی جمی ہوئی تھی۔ کیا کرتا کہ دیکھتے ہی
طبیعت اوبنے سی لگی...... سونا مَردوں اور مُردوں کے استعمال کی وجاہت نہیں جبکہ ہمہ وقت' دہن میں دانتوں
سے چمٹی پڑی ہوئی تو انتہائی' عجیب اور غیر فطری سی لگتی ہے۔ پر کیا کیجیے! ان علاقوں میں' خاص طور عورتوں میں یہ
اک رَواج رِوایت یا فیشن ہے...... ہو سکتا ہے کہ امارت کا اک اظہار بھی ہو۔ بہرحال' ادھر یہی حال ہے کہ

اردگرد عموماً منہ میں سونا چمکائے ہوئے لوگ ہاگ دکھائی دیں گے۔" "سونا دافع عفونت' سڑاند و سم بھی ہوتا ہے۔ اس میں پھیلنے اور اپنی ذہنک و دَم قائم رکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ شاید یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پہ اس کی اس طرح بھی پذیرائی ہوتی ہے لیکن اس کی اِک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں کے لوگ اپنے ٹوٹے ہوئے' کمزور یا خراب دانت کا عیب چھپانے کی خاطر اس پہ سونے کا پترا منڈھوا لیتے ہوں! کیونکہ یہاں کی آب و ہوا' خاص طور پہ دانتوں کے لیے کچھ زیادہ مناسب نہیں ہوتی۔ پنجاب کے وسطی شمالی علاقوں میں مرد و زن کے دانتوں پہ عجیب سی سفید اور کتھئی سی تہہ چڑھی ہوتی ہے جو دیکھنے میں بھلی نہیں لگتی...... یہ دانت نہ مانجھنے کا شاخسانہ نہیں بلکہ ادھر کی آب و ہوا کا اثر ہے۔"

خیر یہ دانت اور سونے کا معاملہ' جو تھا سو تھا۔ اصل میں میری توجہ کا مرکز وہ لڑکا تھا جو میرے اور اس کے درمیان نیچے زم زم سے بھیگے ہوئے فرش پہ اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے کوئی بھاری بھر کم ٹرک اُسے روند کر نکل گیا ہو۔ عجیب وغریب حلیہ کا وہ لڑکا تھا......؟

احرام بھی عجیب سا پہناوا ٹھہرا کہ بندہ' بندے اور بندگی کے' ہر شناخت ختم کر دیتا ہے۔ شاہ و گدا کو شانہ بہ شانہ لا کھڑا کرتا ہے۔ عربی و عجمی کے تضاد کو مٹا دیتا ہے...... ہر فرد خود کو کفنایا اور دفنایا ہوا محسوس کرتا ہے...... اب احرام' احرام میں فرق ہوتا ہے...... ہمارا احرام' کھڑ کھڑ کرتے ہوئے سفید کورے بے شکن لٹھے کا ہوتا ہے' نیچے اِک مخصوص چپل اور ہم نئے نئے مُعتمر یا حاجی' اِک عجز اور تفاخر کے عجیب سے ملے جلے انداز سے اِسے زیب تن کرتے ہیں جبکہ احرام پہننا خود کو اپنے ہاتھوں کفنانے کا عمل ہوتا ہے۔

اَب ہم عجمیوں کو چھوڑ کر عربیوں' مصریوں' سوڈانیوں' ایرانیوں' یمنیوں یا دیگر عرب ممالک کے زائرین کو جب دیکھتے ہیں تو اُن کے ہاں احرام کے معاملہ میں وہ خاطر خواہ اہتمام نظر نہیں آتا جو ہمارے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ وہ اصل اہمیت مناسک حج عمرہ کو دیتے ہیں۔ احرام کے لیے چاہیے ہوتی ہیں دو چادریں' بڑے سے تولیئے یا ایسے بن سلے صاف پاک کپڑے جو جسم کا کچھ حصہ ڈھانپ سکیں...... ہمارے ہاں حاجیوں یا عمرہ ادا کر کے آنے والوں کا بارات کی طرح پھولوں پہنا کر استقبال کیا جاتا ہے جبکہ اُدھر ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میرے ایسے سیدھے سادے غریب الحال حاجی بھی دیکھنے میں آتے ہیں' جن کے احرام کچھ قیمتی اور زیادہ بااہتمام نہیں' بس گزارہ والائق ہی ہوتے ہیں۔

اس بوڑھے اور فرش پہ بچھے اس کے لڑکے کے احرام بھی کچھ ایسے ہی تھے...... جگہ جگہ مسکے ہوئے کچھ داغ دھبے بھی نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ اَب میں نے ذرا غور سے لڑکے کی جانب دیکھا۔ کِھلتی ہوئی عُمر کا لڑکا' مسیں ابھی ابھی بھیگی تھیں۔ چوڑی چھاتی' ڈھلوان شانے' مضبوط درخت کے تنے سی گردن۔ وہ لانبی لانبی

پلکن والی نیلگوں آنکھیں اُٹھائے میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک تو وُہ رعنائی و زیبائی کا ایک نمونہ تھا۔ نیچے ناف سے پاؤں تک ایک ٹنڈ منڈ' ہڈیوں کا دوشاخہ۔ جیسے ببول کے دو نیز ھے میڑھے چھلکے سے ٹہنی گو لیے میں نکلے ہوں۔ مجھے جھر جھری سی آ گئی میں اپنے تئیں یوں خجل سا جیسے اس کی اِس ہیئت کذائی کا صرف میں ذمہ دار ہوں...... میں نظریں بچائے چور سا کھڑا تھا کہ کسی نے میرے پاؤں پہ ہاتھ دھر دیئے...... اُدھر دیکھا تو وہی پولیو زدہ لڑکا تھا...... فوراً جھکتے ہوئے میں نے اُس کا ہاتھ ہٹانا چاہا مگر معلوم ہُوا کہ وہ مجھ سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس دوران وُہ بوڑھے باپ سے اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا...... زبان نہ سمجھتے ہوئے بھی میں اتنا ضرور جان گیا کہ وہ کچھ میری بابت ہی بات کر رہا ہے۔ اس کا باپ بھی نیچے اُکڑوں بیٹھ گیا' ہاتھ کی اُنگلیوں کی پوروں کو اکٹھا جوڑ کر منہ کے قریب لا کر اپنی زبان میں کچھ پوچھنے لگا۔

میرے نفی میں سر ہلانے کے بعد وہ خاصی اچھی انگریزی میں گویا ہُوا کہ کیا آپ انگلش سمجھ سکتے ہیں؟ اثبات میں میرا سر ہلتے ہی وُہ سر کو ہاکا سا خم دیتے ہوئے بتانے لگا۔

''میرا نام وہاب صحابی تاشقندی ہے' آپ شاید ہندوستانی' پاکستانی یا بنگلہ دیشی......؟''

میں اُسے فر فر انگریزی میں اپنا مافی الضمیر بیان شروع کرتے دیکھ کر ٹھٹکا اور محتاط بھی ہو گیا کہ شاید میں پھر ایک بار کسی انٹرنیشنل بھک منگے کی زد پہ ہوں۔''

حج عمرہ کے دنوں میں' یہاں دو نمبر دھندہ زوروں پہ ہوتا ہے۔ ایسے ایسے دو نمبر چکر دھار یے ادھر ملتے ہیں کہ آپ کی طبیعت کے ساتھ ساتھ جیب بھی صاف کر کے چلتے بنتے ہیں۔ فراڈ' جیب تراشی' رنگ بازی' دھوکہ دہی اور بھک منگی کے میدان ادھر مقدس مقامات پہ خوب لگتے ہیں...... حج عمرہ والے' خاص طور پر پاکستانی خواتین' ان دھوکا بازوں کے لیے تر نوالہ کی طرح ہوتی ہیں...... مزے کی بات یہ پیشہ ور مرد و زن بھی مظفر گڑھ' ملتان' بہاولپور' بہاولنگر' رحیم یار خان' بلوچستان' سندھ وغیرہ کے گرد و نواح کے دریوزہ گر قبیلے ہیں جو نسل در نسل اسی دھوکہ دہی' بھک منگی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔'' یہ خانہ بدوش لوگ سدا محوِ سفر رہتے ہیں شاید ہی ان میں سے کوئی فرد کہیں سکونت کی حالت میں مرا جیا ہو...... ورنہ ان میں اکثر دورانِ سفر ہی پیدا ہوتے اور مرتے ہیں یہ شاطر' مکار اور منظم قبیلے کے قبیلے' بین الاقوامی سرحدوں پہ مکھن سے بال کی سی آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ ان کے پاس باقاعدہ دستاویز ہوتی ہیں۔ بوڑھے گرگ باراں دیدہ بوڑھیاں آفت کی پرکالہ اَبلیس کی خالہ...... مرد' عمرو عیار کے چیلے' امیر علی ٹھگ کے چاہنے...... عورتیں' نک سک کی نوکیلی اور زبان چشم سے چھکنے پہ تیکھی ہوتی ہیں بڑی خرافہ اور فنِ قیافہ و نفسیات کی اُستادِ زماں...... شاید ہی کوئی بھارو بندہ ان کی کنائی سے بچ نکلتا ہو۔؟

ان کی کمائی کے سیزن حج عمرہ ماہ شعبان' رمضان وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ پہنچتے یہاں حج عمرہ کے ویزے پہ ہیں مگر ان کے رنگ ڈھنگ اور اٹھک ایسے سحرانگیز ہوتے ہیں کہ یہ کنبے کے کنبے وہاں طویل قیام کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سعودیہ پہنچنے کے لیے اکثر زمینی راستے اختیار کرتے ہیں...... مختلف ممالک سے گزرتے ہوئے یہ ہر وہ طریقہ ہنر اختیار کرتے ہیں جس سے ان کے قیام وطعام کا بندوبست ہوتا رہے اور کارروان آگے بڑھتا رہے۔ اشد مجبوری وضرورت کی حالت میں گھروں کھیتوں بازوں' تعمیراتی کاموں میں محنت مزدوری بھی کر لیتے ہیں...... اکثر عورتیں اپنے عشوہ و انداز سے بھی کام نکلوانے میں چنداں حرج تصور نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کے مرد مزاحم ہوتے ہیں۔"

حرمین شریف کے گرد و نواح میں یہ اداکارائیں اپنے اپنے رُوٹ پہ پھیل جاتی ہیں۔ یہ وقت وہ ہوتا ہے جب نمازی واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پہ پہنچ رہے ہوتے ہیں۔ ان پیشہ ور عورتوں نے' جو اپنے علاقائی لباس میں ہوتی ہیں۔ گودوں میں ننھے ننھے سوئے ہوئے شیر خوار بچے...... عورتوں کے ہاتھ میں فیڈر بھی ہوتے ہیں۔ اَب وہ دُور سے اپنے اپنے ''بھارو'' منتخب کر لیتی ہیں جو اکثر پاکستانی عورتیں ہوتی ہیں۔ جو اک مخصوص رقم پاکستان سے ہی امداد کے مستحقین کے لیے ساتھ لے کر آتی ہیں مگر افسوس کہ وہ ان مکار پیشہ ور اور بدکردار عورتوں اور گود لیے ہوئے کرائے کے شیر خوار بچوں کے فریب میں آجاتی ہیں۔ ان بہت سی سن سَن کی جوان خوبصورت اور ایک سے عمر کے شیر خوار بچوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ بین الاقوامی مافیا ہے' جس کے اپنے ٹریننگ سنٹر ہیں' اپنے میٹرنٹی ہوم ہیں' اپنی ملازم خوبصورت عورتیں ہیں جو وقت کی رعایت سے حج عمرہ موسم کے لیے بچے پیدا کرتی ہیں۔ چار چار ماہ کے بچے...... جو بدقسمتی سے جنم سمے سے ہی بھیک مانگنے پہ متعین کر دیئے جاتے ہیں اور ٹھیکے پہ چڑھ جاتے ہیں۔ اُن کی اصل مائیں' روزانہ ان کی دیہاڑی وصول کرتی ہیں...... اور ان کے گرگے مرد آس پاس کھڑے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔"

مَیں حرم شریف سے واپس اپنے ہوٹل کی جانب جا رہا تھا۔ راستہ میں کچھ سیاہ فام اپاہج عورتیں بچے زمین پہ بچھے پڑے تھے۔ یمنی نہیں تو سوڈانی یا پھر الجزائر کے یا مراکش کے ہوں گے...... کبوتروں کے لیے دانہ' تسبیحاں' چھوٹے موٹے کپڑے ٹوپیاں وغیرہ بیچ لیتے ہیں۔ صدقہ خیرات دو تو انکار بھی نہیں کرتے...... پولیس' انتظامیہ کے لیے یہ لوگ' مسائل تو پیدا کرتے ہیں' مگر وہ بھی ایسے نادار محتاج لوگوں سے سختی نہیں برتتے...... ان کے پاس سے گزرتے ہوئے میری نظر ایک ایسی ہی عورت کے سامنے دھرے سیاہ پائجاموں پہ پڑی...... مَیں ٹھہر گیا۔ بلکا نچلا کا سیاہ پائجامہ' جس میں آزار بند کی جگہ الاسٹک...... اور دونوں اطراف' زپ والی جیبیں تھیں۔ مجھے کچھ معقول سا لگا۔ مول تول ہو ہی رہا تھا کہ ایک پاکستانی بھک منگی عورت بمعہ گود میں شیر خوار بچہ' میرے

ذوالے ہوگئی۔''

''حاجی صیب! اللہ عمرہ قبول کرے۔ ہم غریب لوگ بھی خشکی کے راستے عمرے پہ آئے تھے راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا...... میرا بوڑھا بابا اور اس بچی کا باپ ہسپتال میں مر گئے۔ صدقہ خیرات' میری مدد کرو۔''

مَیں نیچے پاؤں بھار بیٹھا مڑ کر اُس کی سٹوری سُن رہا تھا۔ یہیں وہ سیاہ فام اَپاہج دکاندارنی اُس کے لئے لینے گی۔ عربی میں گالم گلوچ' میرے تو کچھ پلّے نہ پڑی' البتہ حرام اور زنا جیسے الفاظ میری کچھ سمجھ میں آئے۔ اِدھر یہ پاکستانی بھیک منگنی فراڈن' میرے حال حُلیے اور عُمر کو دیکھتے ہوئے کسی لمبی رقم کی اُمید لگائے میرے سر پہ کھڑی تھی اور اُدھر یہ دکاندارن اِسے کوسنے دے دے کر بھگانے کے چکر میں تھی...... یعنی دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔ مَیں چونکہ دونوں کا بَردا تھا دونوں ہی مجھے نچوڑنے کی فکر میں تھیں...... مَیں اس پھڈّے سے جان چھڑا کر کھسکنے کے چکر میں تھا کہ پاس بنگلہ دیشی گھڑیاں بیچنے والا دکاندار ہمسایہ' وہیں اپنے ٹھیئے سے بیٹھا اس بھیک منگنی کو اُردو میں بُرا بھلا کہتے ہوئے بھگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کالی فام نے پانجامہ مجھے تھماتے ہوئے بڑی فصیح و بلیغ عربی میں واشگاف طور پہ اس بھکارن کی کرتوتیں میرے گوش گزار کرنی شروع کر دیں اور مَیں بھی سر ہلا ہلا کر اُس کی تائید کر رہا تھا جیسے ایک ایک لفظ سمجھ رہا ہوں...... جاننے کو تو مَیں اُس سے زیادہ جانتا تھا' پر بعض اوقات ہم جانتے ہوئے بھی بے جانے سے ہوتے ہیں...... یُونہی مزہ لینے کی خاطر مَیں نے بنگلہ بابو سے پوچھ لیا۔

''یہ جھگڑا کاہے کو ہُوا......؟''

اُس نے انکشاف کیا۔'' حاجی صاحب! اِن بدکار عورتوں نے ہم لوگوں کو اِدھر دو کوڑی کا کر دیا ہُوا ہے۔ سینکڑوں ایسی عورتیں یہاں پھیلی ہوئی ہیں۔ سب کی ایک ہی سٹوری ہوتی ہے' سب کی گود میں بچے ہیں۔ ان کے مُردار مَرد اِدھر ہی آس پاس منڈھلاتے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ کالی عربی عورتیں بہت غریب ہوتی ہیں۔ اپنے ملکوں سے حج عُمرے اور چار پیسوں کی اُمید پہ اِدھر بڑی مشکلوں سے پہنچ پاتی ہیں۔ چھوٹی موٹی تجارت بھی کر لیتی ہیں جبکہ یہ بھیک منگیاں یہاں بدکاری پھیلاتی ہیں۔ انہوں نے تو ہمیں بدنام کر دیا ہُوا ہے...... بعض اِنتظامیہ والے بھی ان کے چُنگل میں پھنسے ہوتے ہیں' اُنہیں کُھلی آزادی دے دیتے ہیں......''

مَیں یہاں سے لاحول پڑھتا ہُوا اُٹھا اور پانجامہ پکڑے ہوٹل کی راہ پہ لگا۔ نہ جانے وہ کمبخت کہاں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی...... آگے آہنی پُل کے نیچے پھر میرے پیچھے آ گئی اور لگی اپنی کتھا بیان کرنے...... پر اِس بار اُس کا باپ اور خاوند ہسپتال میں مرے نہیں تھے' بس کسی غلط فہمی کی وجہ سے جیل میں تھے...... مَیں کھڑا ہو گیا۔ نہایت تحمّل شفقت سے اُسے سمجھایا۔

''بی بی! ہم دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلے پیشے سے ہے لیکن میرا طریقہ واردات ذرا بزرگانہ اور فلسفیانہ سا ہے۔ میں اتنی جلدی اپنی سٹوری نہیں بدلتا...... یاد رکھتا ہوں کہ کس بھاروکو کتنے نمبر سٹوری سُنائی تھی۔ آؤ اُدھر گلی والے پاکستانی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں......!''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک چٹی داڑھی والا' بغل میں پلاسٹک کا مُصلّی دبائے' سر پہ ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح لیے' جھجتی نظروں سے تکتا ہوا ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ السلام علیکم! کہہ کر وُہ عورت سے مخاطب ہوا۔

''کیا بات ہے' متو! یہ حاجی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟''

اَب جو میں نے غور سے اُسے دیکھا تو وُہ وہی منہ بسورتا ہوا بدنصیب شخص تھا جو دو روز پہلے مجھے ایک دوسرے بازار میں ملا تھا جس کی بیوی بچے ٹریفک کے حادثہ میں جان بحق ہو چکے تھے اور وُہ اَب واپسی کا کرایہ اکٹھا کر رہا تھا۔''

میں چاہِ زم زم کی ٹونٹیوں کے پاس کھڑا اس تاشقندی بوڑھے شخص کی بات سُن بھی رہا اور اندر ہی اندر ڈر بھی رہا تھا کہ خدا جانے اَب مجھے کس قسم کی سٹوری سے واسطہ پڑے اور میرا کیا حال ہو؟...... ویسے تو بحیثیت نام نہاد مسلمان' ہمیں اللہ کے گھر پہنچ کر' مطمئن ہو جانا چاہئے کہ یہاں اَمن ہی اَمن ہے۔ اِدھر کوئی کسی کو دِق نہیں کر سکتا زک نہیں پہنچا سکتا۔ یہاں ہر کوئی اللہ کی حفاظت میں ہے' یہ دارالسلام ہے۔ مگر کیا کیجئے طواف کے دوران' پاسپورٹ سمیت سارا زادِ راہ' کوئی اللہ کا بندہ' کاٹ کر لے جاتا ہے حجرِ اَسود کی زیارت کے دوران' گھڑی' ہُوہو غائب ہو جاتے ہیں۔ حرم کے برآمدوں میں کمر سیدھی کرنے والوں کو دُو مال سونگھا کر خالی کر دیا جاتا ہے...... تو کیا اِدھر زم زم کے کنویں کے احاطہ میں میرا ساتھ کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہی کہ جب تک کچھ ہو نہ جائے آپ کچھ کہہ یا کر بھی نہیں سکتے۔ ویسے ہی جیسے آپ تھانے چوکی جاتے ہیں۔ رپورٹ کرتے ہیں کہ فلاں شخص سے مجھے جان کا خطرہ ہے۔ اُس نے واضح طور پہ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔ میری جان بڑی قیمتی ہے لہٰذا' میرے ممکنہ دُشمن سے میری حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ اُس شخص پہ نظر رکھی جائے' اُس کو تھانہ پابند کیا جائے۔ تھانے کا ذمہ دار افسر آپ کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو اور قانون سے ناواقفیت کی بنا پہ محض استہزائیہ سا مسکرا کر آپ کو مشورہ دیتا ہے کہ کس طرح آپ اپنا بی پی بڑھا رہے ہیں اور ایسی فضولیات میں پڑ کر اپنا اور سرکاری محکمہ کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' آپ تاؤ میں آ کر پھر اپنی قیمتی جان' آل اولاد اور کاروباری ذمہ داریوں کا بتاتے ہیں اور مخالف کی دھمکی کا یاد دلاتے ہیں۔ افسر کمال لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھر قانونی شق کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔ محض دھمکی تو قتل نہیں' آپ کے مخالف نے دھمکی' محض مُنہ سے دی ہے جبکہ قتل' مُنہ سے نہیں ہاتھ سے ہوتا ہے...... افسر مزید سمجھاتے ہوئے مثال دیتا ہے

کہ چلیے میں آپ کو قتل کی دھمکی دیتا ہوں بتائیے آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے؟''
اس کا مطلب یہ کہ جب تک کوئی واقعی کسی کو قتل نہیں کر دیتا۔ اس کے خلاف قتل کا مقدمہ درج نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جب تک اُن کا کوئی فراڈ میرے سامنے نہیں آ جاتا میں اُن پہ کوئی بات نہیں دھر سکتا تھا۔''
بجلی کی ایک مشین' گھومنے والے برش کے ذریعے فرش صاف کر رہی تھی۔ کارندے پلاسٹک کی ڈوری کھینچ کر صفائی والا حصہ علیحدہ کر رہے تھے۔ اُن کو اپنی جانب آتے دیکھ کر وہاں سے نکلنے کی سوجھی...... گفتگو محض اُس کے نام تک ہی محدود رہی۔ میں وہاں سے ہٹ لیا...... بوڑھے نے جھک کر جوان مگر اپاہج لڑکے کو بمشکل اُٹھایا۔ میں آگے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی بغلوں میں بازو ڈال کر اُسے اُٹھایا مگر بے جان بے ڈھنگی ٹانگیں' کیکڑے کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کی مانند کسی طور قابو نہ آ رہی تھیں...... لڑکے نے کمال پھرتی سے اپنے بازو' بوڑھے مگر حوصلہ مند باپ کی گردن کے گرد حائل کر دیے مگر ٹانگوں پہ یقیناً اُس کا کوئی قابو نہ تھا اس لیے وہ پھیلی کی پھیلی رہیں لیکن بوڑھے نے انہیں بھی پکڑ دھکڑ کر کینڈے میں کر لیا تھا۔''
مجھے اپنی بُوڑھی ساس یاد آ گئی...... جو بوڑھی کمزور ہونے کے باوجود بغیر کسی سہارے اپنے پاؤں پہ چل لیتی تھیں...... میں نے کمال مکاری سے مصروفیت کا بہانہ کر کے حج پہ ساتھ جانے سے معذرت کر لی...... بیگم اور اس کے بھتیجے بھانجے ساتھ کر دیا لیکن اصل بات یہ تھی کہ میں کسی کمزور یا بوڑھے کے ساتھ گھسٹ نہیں سکتا تھا شاید میرے اندر کسی اپنے کے لیے کوئی پریشانی اُٹھانے کا جذبہ ہی نہ تھا...... اس بوڑھے کو اپنی اولاد کی خاطر یہ مشقت اُٹھاتے دیکھ کر مجھے شرم سی محسوس ہونے لگی اِک عجیب سی تبدیلی تھی جو یہ منظر دیکھ کر میرے اندر پیدا ہوئی۔ وہ بدقت مرمر کی سفید دُودھیا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور میں محض ایک سیڑھی پیچھے...... محسوس ہوا کہ میں اُس گدھے کی مانند ہوں جو ریڑھے کے ساتھ ٹریننگ کے بندھا ہوا گھسٹ رہا ہوتا ہے...... اُوپر پہنچتے پہنچتے جیسے کئی صدیاں بیت گئیں۔ اُوپر کی جانب اُٹھتی ہوئی سیڑھی کی ہر سِل' جیسے میرے دل و دماغ پہ پڑے ہوئے ہر پتھر کو بھک سے اُڑا رہی تھی...... باہر نکلتے ہی پہلی نظر کعبہ پہ پڑی...... تو الحمدللہ منہ سے نکلا۔!
نیچے سے اُوپر کا کوئی بھی سفر ہلکا اور ہلکان ہوئے بن طے نہیں ہوتا...... وُہ سوچ ہو کہ خیال' آہ ہو یا کراہ' صدا ہو یا دُعا' کبوتر ہو یا کنکوا...... پانی بھاپ بن کر ہی اُوپر کو اُٹھتا ہے۔ رُوح' جسم کا بوجھ اُتار کر ہی بلند ہوتی ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی لگا جیسے مجھے اس بوڑھے نے بڑے جتنوں سے کسی گہری کھائی کے باہر نکالا ہے۔ میں پَرکاہ کی مانند خود کو سبک و سار محسوس کر رہا تھا۔ شکرانے کے دو نفل ادا کرنے کے بعد میں نے اُس بوڑھے اور بچے کی کھوج میں دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھا مگر مجھے وُہ دونوں کہیں دکھائی نہ دیے...... اس کے بعد کچھ کیفیت ایسی دَر آئی کہ کچھ ہوش ہی نہ رہے کہاں ہوں کدھر ہوں......؟

عصر کی اذان سے کچھ پہلے حرم کے رضا کاروں نے مجھ ایسے بے خبر سونے والوں کو بیدار کرنا شروع کیا تو میں بھی اُن کی زد میں آ چکا تھا۔ ہوش پکڑے تو وضو طہارت کے خاطر باہر نکل آیا...... نماز کے قریب غسل خانوں میں بے پناہ رش ہوتا ہے۔ قطاروں میں لوگ کھڑے ہوتے ہیں' میں بھی قدم بڑھاتے ہوئے اپنے دروازے کے سامنے والے بیتُ الخلا کی جانب چل دیا۔ بیتُ الخلا کی سیڑھیوں سے پہلے آہنی دروازہ اور جنگلہ ہے' اس جنگلے پہ لوگ اپنا فالتو سامان وغیرہ لٹکا جاتے ہیں۔''

اچانک میری نظر بوڑھے اور اُس کے بیٹے پہ پڑی...... بوڑھا' اس کا احرام پھیلائے سُکھا رہا تھا۔ میں فوراً اُدھر بڑھا' علیک سلیک کے بعد اُس سے معلوم ہوا کہ اپاہج بچے کے کپڑے خراب ہو گئے تھے' ہوٹل بہت دُور...... لہٰذا اسے کپڑوں سمیت ہی غسل کروا دیا۔ اس دوران اس کے کپڑے بھی دُھل گئے' اب اُنھیں سُکھا رہا ہوں...... لڑکے نے ایک ناکافی سا کپڑا اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔''

ابھی تک نہ تو میری لڑکے سے براہِ راست بات ہوئی تھی اور نہ میں اُس کا نام جانتا تھا۔ اُس کے چہرے مُہرے سے بلا کی متانت' طمانت چھلکتی تھی جبکہ لمبی لمبی جھالروں والی آنکھوں میں ذہانت و فطانت نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے...... میں نہ جانے کیوں اُسے اندر سے تفصیلی جاننا چاہا؟ جبلّی لحاظ سے وہ نیل کنٹھ کی نسل کے ایک پرندے ڈوب کے باج پہ تھا...... ''لاکھوں میں ایک' سونے کی ڈیگ'' ''الماس کے بُرادے کی رنگ''...... رِستے سانپوں کی مانند' صندل جھاڑوں میں ہی جیون جوگ کرے۔ یوگی کہیں کہ یم راج بھی چندن کے جھاڑ تلے تیکی لے لیتے ہیں۔'' چندن کی سوگندی چِتا اور چل ٹل کو دُور کرتی ہے۔ بہت ہی عرصہ بعد ایسا زریاں نقش دیکھا؟...... اُس کے یوں بُری طرح اُدھورہ ہونے پہ بھی کچھ رنجیدہ ہُوا...... مگر قدرت کے بھیدوں کو کون جان سکا ہے کہ کس اُدھورے پنے میں کہاں اکملیت چھپی ہوئی ہے اور کون سی بظاہر مکمل چیز' اپنے کس انگ رنگ میں نچنکل پھیکی نامکمل ہے۔''

نہا دھو کر واپس اُوپر پہنچا تو اذان ہو چکی تھی...... وہ باپ بیٹا بھی تیار' میرا انتظار کر رہے تھے۔ لڑکے کو بمشکل کمر پہ لادے وہ میرے ساتھ حرم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نہ آگے نہ پیچھے' ساتھ ساتھ چل رہا...... اس دوران لڑکے کی سُوکھی ٹانگوں کے ٹانڈے میری بغل سے مَس بھی ہوئے' میں بُوڑھے اور لڑکے کو چلنے میں سہولت دینے کی خاطر' اُن کے لیے رستہ بھی بنا رہا تھا......''

اذان کے فوراً بعد نمازیوں کا بے حد ہجوم ہو جاتا ہے۔ عام آدمیوں کے لیے تو کچھ مشکل نہیں ہوتی لیکن بوڑھوں اور معذوروں کے لیے پریشان ہوتی ہے...... جس زمانے کی یہ بات ہے تب معذور لوگوں کے لیے پہیوں والی کُرسیوں کا عام رواج نہ تھا' ہاں البتہ سر پہ اُٹھانے والی ڈولیاں تھیں جنھیں دو آدمی سر پہ اُٹھاتے

تھے یہ طواف اور سعی کے دوران جا بجا دکھائی دیتی تھیں۔ ان کا فائدہ یہ تھا کہ پیدل زائرین کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی تھی جبکہ یہ پہیوں والی کرسیاں نیچے سے جگہ بھی کافی گھیرتی ہیں اور لوگوں کی ٹانگوں ٹخنوں سے بھی ٹکراتی ہیں اور جن لوگوں کو ڈولیاں دستیاب نہ ہوتیں یا جو اُن کا کرایہ نہ دے سکتے وہ اپنے معذوروں یا بیماروں کو خود ہی کندھوں پہ اُٹھا لیا کرتے۔ میں ابھی تک یہ نہ جان پایا تھا کہ ان باپ بیٹے کا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے؟ اور نہ ہی ہنوز یہ بات صاف ہوئی تھی' یہ اصلی حاجی ہیں یا ان کے روپ میں بھک منگے فراڈ یئے......؟

نماز کے بعد ہم تینوں فوراً ہی باہر نکل آئے...... باب علی کے سامنے ایک کشادہ سی جگہ پہ پہنچے تو میں نے کہا۔

''آپ یہاں بیٹھیے......! میں کچھ کھانے پینے کے لیے لاتا ہوں......'' یہیں میں پہلی بار لڑکے سے مخاطب ہُوا......''

''بیٹا! تم کھانے پینے میں کیا پسند کرو گے؟''

میری حیرت دو چند ہوگئی جب لڑکے نے نہایت اعلیٰ درجہ کی انگلش میں جواب دیا۔

''مجھے کھانے میں چکن برگر یا پیزا اور پینے کے لیے کوک......'' یُوں جواب پا کر میں کچھ لمحے اُس کی انگلش اور چوائس پہ متحیرانہ انداز سے غور کرتا رہا۔ وُہ بظاہر کسی طور ایسے بدیسی کلام و طعام کا متحمل دکھائی نہ دیتا تھا تاہم ایسا اَمر واقع تھا۔'' اِس دَوران مجھے اُس کے بھی سونے کا بتر امنڈے ذانت اچھی طرح دیکھنے کا موقع بھی ملا کہ اُترتے ہوئے سورج کی ترچھی کرنوں نے اُنہیں مزید نمایاں کر دیا تھا۔ وہاں سے سامنے بازار اور واپسی' سارے راستے میں ان کے دانتوں' اَپاہج اور انگریزی کے بارے میں ہی غور کرتا رہا مگر اُن کے بارے کوئی واضح رائے قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا......؟

کچھ کارکرم یُوں بھی دَرپیش ہوتے ہیں کہ فوری سمجھ میں نہیں آتے تا آنکہ وُہ اپنے منطقی انداز اور مشیّت ایزدی کے مطابق انجام پذیر نہ ہو جاویں...... انسان چونکہ متلوّن المزاج اور بے صبرا واقع ہُوا ہے اسی سبب وہ اپنے عمل کا بدل نتیجہ اور تعلق و تعبیر کے ثمرات فوری حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

میں دُنیاوی معاملات جن میں محض مادیت ہی کارفرما ہو جلد نپٹانے کی کوشش کرتا ہوں کہ تاخیر محض وقت اور ضبط کا ضیاع ہے اور ایسے معاملات جو اَز خود ظہور پذیر ہوئے ہوں اور اُن کے ڈانڈے دُنیاوی اُمور سے جُڑے ہوئے نہ ہوں تو وہاں میں خود کو اور نتائج کو ذاور عصر کے سپرد رکھتا ہوں...... ان باپ بیٹا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی دکھائی دیتا تھا۔؟

چکن برگر کے ساتھ پوٹیٹو چپس اور کوک کا ڈبا پا کر وُہ بے حد خوش ہُوا...... دہی اور خمیری روٹی' شلجم

زیتون کھیرے کا اچار کیلے سیب اور چین کے سنگترے...... کھانے پینے کے دوران ہلکی پھلکی دوستانہ گفتگو شروع ہوئی تو مَیں نے بچّے کی بیماری کا پُوچھ لیا؟...... اُس نے بتایا کہ سات برس کی عُمر میں اس پہ پولیو کا حملہ ہُوا تھا' اکلوتا بچّہ' علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر کچھ افاقہ نہ ہُوا...... اپنے سکول میں ہمیشہ اچھی پوزیشن حاصل کرتا رہا...... ذہنی شعوری حساب سے یہ اپنی عمر سے بہت آگے تھا۔ اس وقت یہ سولہ برس کا ہے مگر آج تک وہیل چیئر پہ نہیں بیٹھا۔ گو اِس کی مفلوج کمزور ٹانگیں اس کا بوجھ اُٹھانے سے قاصر ہیں اس کے باوجود یہ خُود حرکت کر کے اپنے روزمرّہ کے وظائف پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چل تو سکتا ہی نہیں لیکن گھسٹ اور لوٹ پوٹ ہوکر یہ اپنے گھر' کھیتوں اور فارم ہاؤس میں اِدھر اُدھر ہولیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں بُری طرح زخمی ہوجاتی ہیں جن کی پھر مرہم پٹّی پہ بُری طرح پریشانی ہوتی ہے۔''

مَیں نے اُچٹتی سی نظر سے اُسے دیکھا جس کا ابھی تک نام بھی نہیں جانتا تھا...... عجب سی بے نیازی سے برگر کھانے میں جُتا ہُوا...... لگتا تھا وہ حرم پاک کے احاطہ میں نہیں' اپنے سکول کی گراؤنڈ میں ہمجولیوں کے سنگ بیٹھا لنچ کر رہا ہو...... فراخ ماتھے پہ ہلکی سی پسینے کی تریلی۔ معصوم سی آنکھوں میں طمانیت اُتری ہوئی' لُقمہ چباتے جبڑے جیسے رقص کر رہے ہوں...... ناک کا کھڑا بانسا' وہ ایک بیتابن کے مینار کی مانند تھا جسے ٹُنڈ مُنڈ ٹانگوں کے اُوپر ہی اُوپر دیکھنا چاہیے؟

''وَیری نائس...... ''برگر کا ایک لُقمہ نگلتے ہوئے بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نکل گیا...... ''مجھے پتا نہیں تھا اِدھر اتنے اچھے برگر بھی ملتے ہیں...... اِدھر تو بار بار آنا چاہیے۔؟

''صرف برگر کے لیے یا عُمرہ' حج کے لیے......؟

''اصل ضرورت روٹی ہے سالن تو محض اضافت ہے!...... عمرہ' حج کے لیے اِدھر پہنچیں گے تو برگر بھی ملیں گے۔''

یہیں اس کے گولڈ دانت پھر دیکھنے کو ملے۔ بات بناتے ہوئے کہہ دیا۔

''تمہارے گولڈ دانت بہت بھلے لگتے ہیں...... سوچتا ہوں اگر ان پہ سونے کا خول نہ چڑھا ہوتا تو کیسے لگتے؟''

اس کی بجائے' باپ نے جواب دیا۔

''انتہائی بھدے کہ اِس کے دانت' اپنے باپ کے دانتوں کی مانند' اپنے باغوں کے اَنار کھانے سے ٹوٹ گئے تھے۔'' وہ اپنے دانت دِکھاتے ہوئے مزید بولا۔ ''جیسے کہ میرے دانت!''

اُس کا جواب کچھ میرے پلّے نہیں پڑا تھا جبکہ اُس کے زنگ آلود وہ دانت دیکھ کر مجھے جرمنی کے ایک

میوزیم میں پڑی ایک فرعون کی ممی کے جبڑے میں ٹھکے سڑے بوسیدہ دانت یاد آ گئے۔ جن پہ شاید کسی انجانی سی دھات کا خول چڑھا ہوا تھا...... ''مقابل کے کم از کم اگر دانت و دہن صاف اور آنکھوں میں حیا ہو تو میں کسی نہ کسی طور اُسے گوارہ کر لیتا ہوں مگر یہاں محض آنکھوں میں حیا اور وفا دکھائی دیتی تھی۔ دانتوں اور دہن والا معاملہ کھٹائی میں تھا۔ بلکہ میرا اندازہ تو یہ بھی تھا کہ یہ حضرت تمباکونوش بھی ہیں۔''

تمباکونوش حضرات کے چہرے، ہونٹوں، دانتوں، آنکھوں میں اک عجیب طرح کی بے رونقی اور نحوست سی در آتی ہے...... زندگی کی تازگی، طمانیت، جانے کہاں مفقود ہو جاتی ہے؟ ایسے بدنصیب بدذوا اپنے علاوہ اپنے جیون ساتھی کو بھی سچی خوشی، رفاقت و محبت نہیں دے سکتے۔'' اُن کے پاس دینے کے لیے صرف اور صرف نکوٹین کی بدبو کے بھبکے اور غلیظ دھویں کے دُکھی بخوت ہوتے ہیں۔ ان کی شریک حیات ' جنتی' اک صبر کرتی ہے جبکہ یہ خود دُنیا میں ہی جہنم کی آگ دہکائے رکھنے پہ معمور ہوتے ہیں۔ اب آپ اندازہ کر لیں کہ دیگر منشیات کے عادی اہلِ جفا اور کور نگاہ لوگ ' کس نوع کے عذابِ مسلسل میں مبتلا ہوتے ہوں گے...... پکی بات کہ ایسے مکروہات کے عادی لوگوں کی ''داستانِ حسرت'' ان کے چہرے کی مسال اُڑی سلیٹ پہ کسی قبرستان کی مٹی کے ڈھیلے سے لکھی ہوتی ہے۔

میں کدھر نکل گیا؟...... ذکر اُس کے دانتوں اور چہرے کا تھا اور میں تمباکو نوشی اور منشیات کے خلاف اپنا ساز نکالنے بیٹھ گیا...... اگرچہ تمباکو نوشی اور اس سے پیدا ہونے والی منفرت سے میں آگاہ ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود کچھ ایسا ضرور تھا جو ابھی مجھ پہ عیاں ہونا باقی تھا...... ورنہ یہ لوگ زم زم کے کنویں پہ ہی میری نظر نہ چڑھتے اور پھر دوبارہ ادھر مٹھ بھیڑ بھی نہ ہوتی۔؟

کھاپی کر فارغ ہوئے لیکن میں اپنے دماغ میں پڑی گانٹھ کو بُری طرح محسوس کر رہا تھا جو دَہاب صحابی کی بات سے پڑی تھی کہ ہمارے دانت ' ڈاڑھیں اپنے اُنار کھانے سے ٹوٹ گئے وغیرہ وغیرہ...... چونکہ میں اس عجیب بات کے سیاق و سباق کو پوری طرح سمجھ نہ پایا تھا اس لیے اب فرصت پاتے ہی میں اس بات کو دوبارہ چھیڑ کر پوری طرح سمجھنا چاہتا تھا...... اس سے پیشتر کہ میں زبان کو اذن جنبش دیتا۔ باپ بیٹا نے اپنی زبان میں کوئی اُدت پچھدی سی بات کی اور اُدھر جانے کا قصد کیا ' جدھر ایک ستون کے اُوپر گھڑیال اور نیچے لاتعداد کبوتر دانے چگ رہے تھے۔ میں اُن کے اس طرح اُٹھنے اور اُدھر رجوع کرنے کو فوری طور پہ نہ سمجھ سکا اور وُہیں بیٹھا بیٹھا ' بچے ہوئے کھانے ' خالی لفافوں ' ڈبوں کو سمیٹنے لگا...... باپ تو اپنے پاؤں پہ تھا جبکہ لڑکا ' فرش پہ آڑھا ترچھا گھسٹتے ہوئے جا رہا تھا۔ اب میرے دیکھتے ہی دیکھتے وُہ کبوتروں والے میدان میں ایک تنگی تھڑے کے نیچے بیٹھ گئے...... شتابی شتابی اُس مرد نا شقندی نے سگریٹ نکالے، سُلگائے ایک اپنے ہونٹوں میں دابا اور

دُوسرا بیٹے کے مُنہ میں دیا...... میری تو ہنسی گم ہوگئی کہ ناخلف باپ اپاہج بیٹے کو بھی اپنی لائن پہ لگا رہا ہے؟

وُہ دونوں ہمجولیوں کی مانند آمنے سامنے دُنے سُوٹے لگا رہے تھے بلکہ بیٹا باپ سے بھی دو جوتے آگے دُھواں پھینکنے میں سٹائل مار رہا تھا...... کہتے ہیں کہ نماز کی صف میں کھڑے محمود و ایاز میں آقا و غلام کا فرق نہیں رہتا...... میں نے دیکھا ہے کہ منشیات کے استعمال کے دوران پتا پُوت گدھا گھوڑا اور اعلیٰ وادنیٰ کے فضول تضاد دَھرے کے دَھرے رَہ جاتے ہیں۔ یہاں رشتے عمریں مذہب اخلاقی قدریں نہیں دیکھی جاتیں اس دُھویں دَم دَارو کی دُنیا میں صرف اور صرف وَاری کش گھٹ دَم سُوٹا دیکھا جاتا ہے......؟

نشّہ کا ویری ہوتا ہے مگر نشئی سب کے دوست ہوتے ہیں۔ شرط صرف اتنی کہ دونوں نشئی ہوں۔ غیر نشئی اک اصیل نشئی کی نظر میں بندہ ہی نہیں ہوتا ہے...... تمباکو نوش غفلت خوف یا خوشی میں جب سُوٹے لگاتا ہے تو جسم کے قریب قریب تمام سوراخوں سے دُھواں خارج کرتا ہے...... یقین کریں کہ میں سُوٹے باز کی ٹُنی (ناف) سے بھی دُھویں کی لہریں اُٹھتی دیکھی ہیں...... ناک کان آنکھوں سے تو نئے نئے سُوٹوں پہ لگے اسکولیے بچے بھی شوقیہ دُھواں نکال لیتے ہیں......؟

یہ تاشقندی لڑکا بھی کچھ اسی طرح کے سٹائل دکھا رہا تھا...... ایک بار جو اُس نے ہونٹ سکیڑ کر دُھویں سے ایک دائرہ بنا کر دُور سے میری جانب اُچھالا تو میرا کلیجہ اُچھل کر حلق تک آگیا کہ اس لڑکے کی معذوری نوعمری...... چہرے آنکھوں کی معصومیت نے مل کر میرے دل میں جو اک گداز سا پیدا کیا تھا اب اُس میں اک تناؤ سا آگیا۔ میں تڑخنے لگا تھا۔ علت پوری کر کے وُہ واپس ادھر میرے پاس آ گئے...... مگر اُن کے پہنچنے سے پہلے رُوسی گھٹیا تمباکو کی اعلیٰ ترین خودکشی پہ آمادہ کر دینے والی بدبُو میری طبیعت مکدّر کر چکی تھی......!

وُہ دونوں یُوں پاؤں پھیلائے ہوئے آسودہ خاطر جیسے کوئی نہایت اہم فریضہ سرانجام دے کر مطمئن سے ہو بیٹھے ہیں۔ "تمباکو کشی کے بعد بندہ سمجھتا ہے کہ اُس کے مُنہ بدن کپڑوں سے خوشبوئیں اُٹھ رہی ہیں جبکہ دوسرے اِسے قتل کرنے یا کم از کم خودکشی کے ممکنہ امکانات پہ غور کر رہے ہوتے ہیں۔ میری اک آنکھ میں جیسے زاہد کہ شہرِ سلامتی میں موجود...... اور دُوجی میں زندیق رُود کہ مکروہاتِ مذکورہ کا مخبوط! مجھے قدرے سنجیدہ سا پا کر مخاطب ہُوا......"

"تم کچھ مضمحل سے دکھائی دیتے ہو شاید تھک گئے......؟"

"ہاں پہلے میں اس اچھے سے بچّے کی معذوری سے رنجیدہ ہوا کہ جس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ابھی باقی پڑا ہے...... وُہ کس طرح زندگی کی ہمہ ہمیوں سے محظوظ ہو سکے گا۔ اسی طرح آپ دونوں کے سونے کے میل خوردہ دانت بھی میرے لیے باعثِ کراہت تھے کہ ناگاہ مجھے آپ دونوں کی بلاتکلف آمنے سامنے

تمبا کو نوشی دیکھ کر مزید جھٹکا لگا۔ اَب دیکھئے کہ آگے آگے کیا پردۂ ظہور میں آتا ہے......؟''

میری اس تلخ نوائی سے نہ تو اُن دونوں کے چہروں پہ کوئی خجالت کے نشان اُبھرے اور نہ ہی کچھ معذرت کا اظہار ہُوا بلکہ اُلٹا دونوں مجھے یوں تکنے لگے جیسے میں کوئی احمق سا انسان ہوں اور کسی ایسے علاقے قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جس کا اس موجودہ دورِ زمانہ سے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں...... اس دوران اُنہوں نے آپس میں اپنی زبان میں کچھ گفتگو بھی کی...... اَب وہ بے ریش لڑکا گویا ہُوا۔

''انکل! سوری' آپ کو ہمارے دانتوں اور سموکنگ سے تکلیف ہوئی...... مگر شاید آپ نے اُن محرکات پہ توجہ نہیں دی جن کے تباہ کن اثرات سے بچ نکلنے کی خاطر ہمیں ان علتوں کا وقتی سہارا لینا پڑا۔ جیسے دانتوں کا معاملہ' کہ ان پہ سونے کا خول چڑھوانا ہمارا شوق اور روایت ہے۔''

تبھی باپ نے بیٹے کی بات پکڑی' وہ بتانے لگا۔'' اس کے علاوہ ہماری ایک مجبوری قات بھی ہے۔''

میں نے زیرِ لب ''قات'' کا لفظ دُہرایا۔

قات' یمن کا ایک پودا ہے' اس کی نرم ٹہنیوں اور کونپلوں کو مُنہ میں رکھ کر چبایا جاتا ہے۔ جس سے وہ ایک گاڑھے لعاب کی صُورت اختیار کر لیتی ہے...... یہ لعاب' مُنہ میں ایک جانب اکٹھا کر کے ٹھنڈے یخ پانی کے ساتھ' جُرعہ جُرعہ پیٹ میں اُتارا جاتا ہے...... قات ازقسم تمبا کو یا کوئی اور منشیات نہیں بس ایک مشغلہ' جیسے اہلِ عرب' کھیرے کدو اور ککڑی کے بھُنے ہوئے بیجوں کو فارغ یا خوش وقتی میں ٹونگتے رہتے ہیں۔ یہ بیج خوری بہت مفید قوت بخش مشغلہ ہے۔ دانتوں اور جبڑے کی خُوب ورزش ہوتی ہے مگر اس قات سے مُنہ جبڑوں کی ورزش تو شاید نہیں ہوتی البتہ اک بُری عادت اور قدیمی روائت ضرور پوری ہوتی ہے...... جبکہ دانتوں کا ناس الگ مارا جاتا ہے......''

میں نے باپ بیٹے کے بودے دلائل سے اُوبتے ہوئے کہہ دیا۔

''اور یہ تمبا کو نوشی' آپ کی کس روایت کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے......؟''

دُور سامنے حرم کے مینار پہ نظریں ٹکاتے ہوئے بتانے لگا۔

''بڑی دُعاؤں التجاؤں کے بعد کہیں ہماری سُنی گئی اور اس عبید صحابی کا ہمارے ہاں جنم ہُوا...... تین بیویوں' پانچ بیٹیوں کے اُوپر اس کی پیدائش' ہمارے خاندان کے لیے بے شمار خوشیاں لے کر آئی...... اس کی ماں' یمن کے ایک متموّل خاندان' جن کا کیلوں اور اناروں کا کاروبار تھا' تعلق رکھتی ہے۔ اپنے والدین کے ہاں اکلوتی اولاد ہونے کی بنا پہ بے حد لاڈلی اور خودسر تھی۔ میرے ساتھ اُس کی شادی بھی اک عجب اتفاق تھی۔ میں اپنے پھلوں کے کاروبار کے سلسلہ میں اکثر یمن' شام' فلسطین' بیروت وغیرہ جایا کرتا تھا۔ یمن میں

جس پارٹی سے میرے کاروباری روابط تھے بڑے امیر کبیر تجارت پیشہ لوگ تھے۔ صنعاء' تعز' زبید اور اس کے گردونواح میں پھلوں' موخا کافی کے باغات اور پھلوں کو محفوظ رکھنے کے گودام تھے۔ اک عرصہ جب میرے ان کے ساتھ کاروباری مراسم خوش اسلوبی سے سرانجام پاتے رہے تو پھر ایک وقت اُن سے گھریلو سطح پہ بھی تعلقات اُستوار ہو گئے' ایک دوسرے کے ملکوں میں آنا جانا بھی لگ گیا۔''

میری خوش قسمتی کہہ لیں یا کچھ اور کہ مجھے اُن کی اکلوتی حسین وجمیل لڑکی سے ایک گونا سی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ گومیں دو عدد باحیات بیویوں' پانچ چھوٹی بڑی بچیوں کا باپ تھا۔ میں اس دلچسپی کو کوئی نام دینے کی حالت میں بھی نہیں تھا' یعنی اِسے محبت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میں طبعاً ایسا نہیں ہوں۔ کوئی کاروباری مصلحت بھی نہیں کہ میں کسی مالی منفعت کی خاطر اُس کو زینہ بنانا چاہتا...... اور شاید یہ بھی نہیں کہ میرے دل میں اُولادِ نرینہ کی خواہش نے مجھے اُس کے قریب کر دیا ہو...... ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود حالات' خود بخود ایسا رُخ اختیار کرتے رہے کہ میں خود کو جذباتی طور پہ اُس کے قریب سے قریب تر محسوس کرتا رہا۔ مزے کی بات کہ بظاہر ایسا بہت مشکل تھا کہ اِدھر کا قانون کسی یمنی عورت کو کسی غیر ملکی سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔'' دیکھنے میں ہم دونوں کے درمیان تین چیزیں مشترک تھیں۔ اِنسان اور مسلمان ہونا اور تیسری چیز گہرے سرخ صاف جواہر یعنی یاقوت سے از حد دلچسپی' یمن ویسے بھی لعلِ یمن کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں کے یاقوت دُنیا بھر میں اپنی صاف سرخ رنگت' آب و تاب' حجم اور بے عیبی کی وجہ سے اک گوہرِ بے بہا مانے جاتے ہیں۔ میں بھی اِدھر کے گوہر دانوں کا دیوانہ تھا۔ جب بھی اِدھر آتا کوئی نہ کوئی دانہ ضرور حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا...... ایک موقع پہ اس خاتون کو یاقوتوں سے میری والہانہ دلچسپی کا علم ہُوا...... اَب ہمارے باہمی تعلقات کی نوعیت یُوں تھی کہ غیریت قطعی ختم ہو چکی تھی۔ ہم جیسے ایک ہی خاندان ہوں۔؟

اُن کے ہاں شادی کی ایک تقریب تھی۔ میری دونوں بیویاں' بیٹیاں اور میرے والد...... تاشقند سے خاص طور پہ اس تقریب میں شمولیت کے لیے صنعاء پہنچے تھے۔ میرے خاندان کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ تاشقند سے باہر کسی دوسرے ملک' خاص طور پر کسی عرب ملک میں کسی شادی کی تقریب میں شامل ہوئے۔ لہٰذا ہم سب بڑی تیاری اور جذبۂ خیر سگالی کی اعلیٰ قدروں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہاں یمن پہنچے۔'' اِس صُورت کہ ہمارے ساتھ بے شمار تحائف تھے...... کئی روزہ تقریب میں ہم سب نے بڑی گرم جوشی اور دلچسپی سے حصّہ لیا...... اِسی دَوران' مجھے اپنے میزبان اور کاروباری ساجھے دار کے پورے خاندان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُس کی اکلوتی پڑھی لکھی خوبرو بیٹی غمیدہ...... جس سے میں متعدد بار پہلے بھی مل چکا تھا' اِس تقریب میں اِک اَنوکھے رُوپ میں دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔''

یہ واضح کرتا چلوں کہ نہ تو میری سوچ میں بطلیت تھی اور نہ ہی عبیدہ صحابی سطحی شخصیت کی حامل کوئی عام سی خاتون تھی۔ پڑھی لکھی' سلیقہ شعار' خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ...... اپنے باپ کے کاروبار میں عملی طور شامل تھی۔ وہاں موجود لوگوں میں وہ ایک درخشاں ستارے کی مانند روشن۔ گلے میں انتہائی قیمتی یمنی چولا و رن یاقوتوں کا ہار' ایسے ہی سرخ انگارہ آویزے۔ اسی طرح سے انگوٹھیاں' کلائیوں میں کنگن ...... وہ خود بھی تو اِک تازہ سُرخ گلاب سی تھی' پھر اتنے سارے دَہکتے یاقوتوں کی بھرمار' لبوں پہ تریری سُرخی اور ایسی نسبت ملے بانات کے آتشیں لباس نے اسے اک شعلۂ بداماں بنا دیا ہُوا تھا۔ دیگر طرحداروں میں یہ ایک ایسی ہی تابدار تھی کہ نگاہِ نظارہ میں 'خونِ کبوتر' اُتر آئے۔ میں ایسا حواس باختہ ہُوا کہ خود پہ قابو نہ رہا...... مُنہ پہ کہہ دیا کہ آپ نے ان یاقوتوں کو عزت بخش کر ان کے مزید درجات بلند کر دیے...... اُسے یہیں پہلی بار یاقوتوں سے میری انتہائی دلچسپی کا احساس ہُوا۔ پہلے تو میں یہاں کاروباری انداز سے جڑا ہُوا تھا اب ایک نئی جُڑت لعلِ یمنی کے حوالہ جوالہ سے ہوگئی۔ سیانے بیانے کہتے ہیں کہ ''شوق دا کوئی مل نہیں ہوندا تے معشوق دا کوئی مُل نہیں ہوندا''...... بٹیر تیتر یا کبوتر باز جب اپنا ہم نفس کہیں کھوج لیتے ہیں تو محمود و ایاز' مول و شہباز کے مابین سارے فرق و فاصلے محض فروعی حیثیت کے رہ جاتے ہیں......''

عبیدہ صحابی اگر لعلِ یمنی تھی تو میں بھی کسی طور لعلِ بدخشانی سے کم نہ تھا۔ سچی بات یُوں کہ یمن کے لعل کے رُوبرو بدخشاں کا لعل ذرا' کچھ ایسا دانا بھی نہیں کہ اُس کی چمک دمک' خونِ کبوتر کی سی سُرخی اور شفافیت پہ بڑھ کر کوئی بات رکھ سکے۔ میرے اپنے یمنی بدخشانی' رمانی سیامی یاقوت دانے جو تاشقند میں پڑے تھے' کچھ بے توقیرے سے لگنے لگے۔ ''جس طرح کوہِ نُور ہیرے کے ملاحظہ کے بعد دریائے نُور ہیرا دیکھنے سے آنکھوں میں الماس ریزے سے چبھنے لگتے ہیں یا جیسے اصفہان و استنبول میں جھاتک لو تو لندن و پیرس' پلاسٹر آف پیرس کے پیٹرن سے دکھائی دیتے ہیں۔''

میں محسوس کر سکتا تھا کہ یاقوتوں میں دلچسپی' ہماری آپس کی دلچسپی بن چکی تھی۔ اس ملاقات کے بعد میں جب بھی صنعاء پہنچتا' ضروری کاروباری معاملات کے بعد' ہم یاقوتوں پہ ہی گفتگو کرتے رہتے۔ اپنی اپنی معلومات اِک دُوجے تک پہنچاتے۔ اُس کے ہاں یقیناً نایاب یاقوتوں اور اعلیٰ اخلاق قدروں' سلیقگی' علمی آگہی کے نایاب خزانے تھے۔

ایک اچھے موسم اور مُوڈ میں میں نے عبیدہ صحابی اور اُس کے والد' والدہ کو تاشقند میں آنے کی دعوت دے ڈالی۔ اس سے پیشتر بھی اُس کے والد اور ایک چچا میرے ہاں آ چکے تھے۔ اَب اِس دعوت میں جو مہمان حاصل دعوت تھا وہ یقیناً عبیدہ صحابی تھی مگر دعوت دیتے وقت میرے کسی گوشۂ گمان میں یہ بات موجود نہ

تھی کہ یہ دعوت، میری دعوتِ ولیمہ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوگی۔ تاشقند میں اُن کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا تھا۔ سیر و تفریح اور شرب و طعام کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہوا جو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ وہ میرے لیے نیم تراشیدہ یاقوت کا ایک قیمتی ٹکڑا لائی تھی جو قدرتی طور پہ انسانی دل سے مشابہ تھا۔ دل کے علاوہ وہ خون کا جما ہوا ایک چھوٹا سا لوتھڑا بھی دکھائی دیتا تھا۔ ایسا دلآویز پتھر تھا کہ جسے پا کر میں بے حد خوش ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ فکر دامن گیر ہوگئی کہ میں اسے تحفہ میں کیا پیش کروں کہ وہ بھی میری طرح اک حیرت آمیز خوشی سے سرشار ہو جائے۔"

اسی شش و پنج میں پڑا ہوا میں نے ایک سہانی دوپہر جب اتفاق سے ہم دونوں اپنے پائیں باغیچے میں بیٹھے تھے اپنا یاقوتوں والا صندوقچہ اُس کے سامنے لا دھرا..... لعلوں کے علاوہ اور بھی بہت سے تراشے اَن تراشے نگینے رُوبرو پیش تھے۔ اُس کی آنکھوں میں اک حیرت اور مسرت انگیز خیرگی جھلملانے لگی۔ کئی محبت خیز ساعتیں، ہمارے درمیان خوشی سادے گزر گئیں۔ میں اُس کے چہرے پہ اُلٹتے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ آخر اُس نے ایک ایسا جواہر دانہ اُٹھایا جو بہت عرصہ پہلے کاشغر میں حضرت سلطان مہدی کاشغری کے مزار پہ ایک جانشین بزرگ نے مجھے بطور خاص عطا فرمایا تھا..... یہ یاقوت کاشغری تھا..... کاشغر میں کرنڈ، زبرجد لہسنیا، نیلم اور سنگِ یشب وغیرہ تو مل جاتے ہیں مگر کام کا یاقوت دانہ شاذ ہی کبھی دریافت ہوا ہو.....؟

میں اس گہری سُرخ رنگت والے نایاب جواہر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ بادی النظر میں یہ کسی خوب پکّے قندھاری حبشی اناردانہ سے مشابہ تھا۔ لگتا تھا سُورج کی تابش کی تاب نہ لاتے ہوئے رسیلے رنگیلے انار کا جوبن جو پھوٹا تو ایک دانہ یاقوت بن کر اُن بزرگ کی گدڑی پہ آ ٹپکا۔ اب میں نے نظر کے سامنے لا کر غور سے دیکھا تو گردن جانب ایک باریک سا سوراخ نظر آیا..... یقیناً یہ سوراخ بھی اس کی بناوٹ کی طرح قدرتی تھا، انسانی ہاتھوں کے فن و ہنر نے اسے چھوا تک نہ تھا، انار کے پختہ دانے کی مانند پہلودار، شفاف اور بے عیب.....؟

وہ بزرگ، مزار کی بائیں ایک حجرے میں کئی برسوں سے بیٹھے تھے۔ اُن کے رُوبرو کالے بڑے تھیلے میں ایک بڑی سی تسبیح، اناج کے دانوں کی مانند بھری پڑی رہتی..... اُن کا دایاں ہاتھ، تھیلے کے اندر تسبیح رولتا رہتا۔ اللہ جانے وہ تسبیح لاکھ دانے کی تھی یا پانچ لاکھ کی..... جب بھی کسی نے دیکھا وہ اپنی اسی عبادت میں مگن دکھائی دیے۔ زائرین اور عقیدت مند سید سلطان مہدی کے مزار پہ فاتحہ، دعا کے ساتھ، ان کی زیارت کرنا بھی نہ بھولتے تھے۔"

میں یہاں پہلی بار آیا تھا اور خوب آیا..... مزار شریف پہ حاضری کے بعد باہر نکلا تو مجھے یہ بزرگ، دُنیا و مافیہا سے بے نیاز، قبلہ رُخ بیٹھے عبادت میں مشغول دکھائی دیے۔ آس پاس کچھ عقیدت مند بھی باادب

بیٹھے تھے۔ میرے جی میں آئی کہ میں بھی ان کی زیارت کراوں۔ میرے پاس تھیلے میں تاشقند سے لائی کچھ سوغات مٹھائی موجود تھی' نکالی وہیں موجود لنگر کے ساتھ رکھ دی اور وہاں لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُرادتمند آتے جاتے رہے مگر وُہ سب سے بے نیاز اپنے آپ میں گم...... میں حیران کہ میں اتنی دیر سے یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہوں؟ جبکہ میرا ارادہ محض اُنھیں سلام کرنے اور دُعا لینے کا تھا...... اِنہی ساعتوں میں کہیں اُن کی محویت ٹوٹی اور اُن کے جسم میں حرکت سی پڑی۔ اُن کی دائیں جانب ایک غالیچے پہ نذر نیاز پڑی تھی جو عقیدتمند لاتے تھے۔ یہیں میری لائی ہوئی شیرینی جو کاجو' بھنے چاولوں' سفید تلوں' کھجوروں اور شہد کے آمیزے سے تیار ہوتی ہے بھی موجود تھی...... اُنہوں نے کمال محبت و متانت' میری والی شیرینی اُٹھائی اور اُس میں سے ایک ڈلی نکال کر مجھے عطا کرتے ہوئے کھانے کا حکم دیا پھر ایک ڈلی خود بھی تناول کرتے ہوئے فرمایا۔

''بہت دنوں بعد کوئی بلند مرتبت میری پسندیدہ مٹھائی لایا ہے اور میرے حلق سے ٹھوس غذا کی صورت کوئی خوراک اُتری ہے۔''

اِتنے میں کچھ لوگ قہوہ کی طرح کا کوئی تلخ سا مشروب لیے پہنچ گئے...... بڑی شفقت سے ایک فنجان مجھے عطا کرتے ہوئے فرمایا۔

''بعد از نماز عشاء' آپ یہاں آئیے گا اور ماحضر میرے ساتھ تناول فرمائیے...... آج چہار شنبہ میری طویل ریاضت بھی اختتام پذیر ہوئی اور میری معمول کی زندگی کا آغاز ہوگا۔''

میں کاشغر میں بظاہر کاروباری سلسلہ میں پہنچا تھا مگر اندر پردہ کہیں میری یہ آرزو بھی تھی کہ مالک کُل' اپنی رحمتوں کے صدقے مجھے اولادِ نرینہ سے نواز دے۔

یہاں کاشغر پہنچنے کا مشورہ مجھے ایک صاحب تصرف ایرانی بزرگ نے دیا تھا یونہی اُن سے اُولادِ نرینہ کی خواہش بیان کر دی۔ چند لمحے وہ میرے چہرے کی جانب متوجہ رہے پھر میرے خانگی حالات معلوم کرنے کے بعد فرمانے لگے۔ کل اِسی وقت' مجھے یہیں ملیے گا۔ دوسرے روز ملاقات پہ بتایا۔

''میری سمجھ کے مطابق آپ کے ہاں اُولادِ نرینہ کا نشان ملتا ہے مگر معدوم اور مغموم سا کہ جیسے اُولادِ نرینہ کی محرومی ہی بہتر ہو۔''

میں کچھ واضح طور پہ نہ سمجھتے ہوئے پُوچھ بیٹھا۔

''اُولادِ نرینہ کا نشان بھی ملتا ہے اور پھر محرومی و مغمومی' بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی......؟''

فرمایا۔'' کچھ ناکامیاں بباطن شادمانیوں سے معمور ہوتی ہیں جبکہ بیشتر کامیابیاں' خوشیاں اپنے جلو میں بربادیوں اور حسرتوں کے سامان لاتی ہیں...... اِنسان اپنی کج فہمی کی بنا پہ قُدرت کی اِن مصلحتوں کو سمجھ نہیں

پاتا اور بے صبری ناشکری کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔"

"خدائی ونڈ" یعنی اللہ حکیم ورزاق کی بے نیازانہ تقسیم کے فلسفہ کو سمجھنے کے باوجود مَیں شاید اُن کی دلیل سے کماحقہ مطمئن نہ ہُوا تھا۔ جرأت کرتے ہوئے پُوچھ لیا۔

"بزرگوارم! اللہ کا حقیر سا بندہ ہوں شادیاں کیں بیٹیاں ہوئیں لیکن کوئی وارث پیدا نہ ہُوا۔ حسبِ توفیق رزق حلال کے لیے محنت، مخلوق کی خدمت، اللہ کی عبادت جو بھی بن پڑتا ہے کرتا ہوں...... کیا مَیں اللہ سے ایک بیٹے کی خواہش بھی نہیں کر سکتا......؟"

"اللہ سے مانگنا یا کسی بہتری کی خواہش تو غلطی نہیں۔ بندہ اپنے خالق و مالک سے التجا کر سکتا ہے بس! اَب آگے اُس کی مرضی ہے وہ سرفراز کر دے یا محروم رکھے...... ویسے اچھی بات تو یہی ہے کہ سائل اپنا سوال پیش تو کر دے مگر جواب اپنی مرضی کا نہ چاہے۔"

پتہ نہیں کہ میرے مُنہ سے کیونکر نکل گیا۔

"اور بعض سائل جو لے کر ہی ٹلتے ہیں...... اُن کے بارے آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ میرے چہرے پہ نظریں ٹکائے کچھ دیر مختلف زاویوں سے دیکھتے رہے پھر بصد تکلف بولے۔

"ایسے خود سروں کو پھر ہر طرح کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ قسمت کی کیمیا گری اپنے جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔" رُخصت سے پہلے پُوچھا۔ "کبھی کاشغر جانے کا اِتفاق ہُوا؟"

میرے نفی میں جواب دینے پہ مشورہ دیا۔

"کاشغر میں بابا سلطان مہدی کاشغری کے روضہ پہ حاضری دو۔ میرا ساتھ یہیں تک تھا آگے کا معاملہ پیچیدہ ہے...... مجھے یقین ہے کہ باقی کا معاملہ وہیں جا کر طے ہوگا......"

اِس طرح مَیں پہلی فرصت میں کاشغر پہنچا تھا۔ میرے اندر نفس خانہ میں کوئی اُبال سی آ رہی تھی کہ اللہ نے چاہا تو میرا دامنِ مُراد یہیں سے بھرے گا...... یہاں پہنچتے ہی مَیں نے پہلے کاروباری معاملات نمٹائے بعدِ یکسوئی ہُوئی اور جب دل و دماغ، سوچ خیال آمادۂ چوکھٹ بوسی ہُوئے تو نذر نیاز کی پھول پتی، لنگر کی شیرینی شکر اور آنکھوں میں تشکر کی نمی سنبھالے مَیں بابا کے مزار پہ حاضر ہُوا۔ فاتحہ دُعا کے بعد کچھ دیر ایک کونے میں آنکھیں مُوندے دُبکا پڑا رہا...... دل ہی دل میں اولادِ نرینہ کے لیے ملتجی ہُوا۔ اِس نیم مراقبہ سے بڑی تشفی ہوئی اور کچھ ڈھارس سی بندھتی محسوس ہوئی۔ چڑیوں کے پَروں کی طرح ہلکا پھلکا اُٹھا اور اُلٹے قدموں چوکھٹ چُومتا ہُوا باہر نکل آیا۔ کفش اُڑس کر جوالف ہُوا تو روبرو ایک حُجرے کے برآمدے میں وُہی بزرگ دوزانو بیٹھے دکھائی دیے۔ جن کا چلّہ آج دوشنبہ نمازِ عصر کے بعد اختتام پذیر ہوا تھا۔ جنہوں نے میری شیرینی

پسند فرمائی خود کھائی اور مجھے بھی دی...... پھر کمال شفقت سے اُنہوں نے مجھے عشاء کے بعد کھانے کی دعوت پہ بلایا تھا۔ میرے اندر اک عجیب سی کیفیت تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ کبھی خوف و تردد کی لہر اُٹھتی تھی اور کبھی خوشی و مسرت کا احساس ہوتا۔

اِدھر پہنچا تو چراغ پہ چراغ روشن تھا...... دل میں مسرتوں کے پھول کھل رہے تھے۔ صاحب مزار کا تصرف کہ اِن بزرگِ معرفت و عرفان کا فیض کہ طبیعت پہ اک عجب سی سرمدی کیفیت طاری تھی۔ فرشی نشست تھی جیسے کہ صوفیوں درویشوں کے ہاں ہوتی ہے لیکن اکل و شرب کا اہتمام پُرتکلف تھا۔ جیسے کسی حاکم کا دسترخوان ہو؟

شاہی النسل بھیڑوں کے روغن دار گوشت کے بھنے ہوئے پارچے' موٹے اور چھوٹے مصری چاول جن کی مخصوص مہک کسی خوش خوراک کو دیر تک مسحور رکھتی ہے۔ ساتھ کھٹا دہی اور پنیر...... خستہ تفتان جن کی سنہری رنگت اور سوندھی سوندھی خوشبو خوامخواہ کی اشتہا پیدا کرتی ہے۔ یقیناً یہ دعوت ''دعوتِ شیراز'' کے زمرے میں نہیں آتی تھی۔'' میرے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ بزرگ نے شاید ہی ایک آدھ نوالہ لیا ہو' زیادہ تر وہ دوسروں کو کھلانے پہ جُتے رہے۔ بعد از طعام' قہوہ کا دور چلا پھر ذکر اذکار کی محفل جمی...... دوپہر رات بیت چلی تو مشاغل شبانہ اختتام پہ پہنچے شرکائے مجلس رخصت ہوئے۔ مجھے رُوبرو بٹھاتے ہوئے فرمایا۔

''اللہ کی رضا پہ راضی رہنا ہی عین سعادت و راحت ہے!...... مال' حال اور آل' وہ جسے چاہے زیادہ دے کم یا بالکل ہی نہ دے یہ اُس کی رضا ہے۔ رضا کے آگے سرِتسلیم خم کرنا ہی بندگی ہے۔ آرزوئیں' سنہری چڑیوں کی طرح...... تمنائیں' رنگین طوطوں اور خواہشیں' یاد نہ رہنے والے خوابوں کی مانند...... انہیں دل و دماغ کے پنجروں میں مقید نہیں رکھنا چاہئے انہیں اپنی خواہش مرضی کے قفس سے نکال باہر کر کے مشیت کی کھلی بیکراں فضاؤں کے رُخ پہ چھوڑ دینا چاہئے کہ پرندوں کی اُڑانیں' ہواؤں کے رُخ...... روشنیوں کے زاویے اور خوشبوؤں کی لہروں کو نہ روکا جاسکتا ہے' تبدیل نہ باندھا اور نہ ہی پکڑ کر جکڑا جا سکتا ہے۔؟

کچھ توقف کے بعد مزید ارشاد ہوا۔

''میں جانتا ہوں تمہارا یہاں تک کا سفر' صرف اُولادِ نرینہ کی خواہش کے پنچھی کو قابو کرنے کی خاطر طے ہوا...... میری سمجھ میں آیا تمہاری قسمت میں اُولادِ نرینہ نہیں جبکہ تم پانچ پیاری سی بچیوں کے والد ہو۔ بیٹے کی خواہش نے تمہیں دیوانہ کر دیا ہوا ہے۔ اپنی دانست میں جسے تم مستجاب دُعا سمجھتے ہو اُسی سے اظہارِ تمنا بھی کر دیتے ہو۔ بے شمار منتیں بھی تم نے مان رکھی ہیں۔ اب تم کہو کہ راضی برضا رہتے ہو یا پھر بیٹا چاہتے ہو' چاہے وہ کسی بھی قربانی پہ حاصل ہو......؟''

میری زبان تو جیسے بندھ چکی تھی۔ میں صرف اُنھیں سُن رہا تھا اور وہ وہی کچھ کہہ رہے تھے جو میرے من میں تھا...... اَب اچانک جب اُنہوں نے مجھ سے جواب چاہا تو میں ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اسی حالت میں بغیر کچھ سوچے سمجھے میرے منہ سے نکل گیا۔

''ایک بیٹے کی خواہش' محض میری کوئی عام سی رِوایتی اِنسانی خواہش نہیں کہ میرے بعد میرے نام و نسل اور مال و اموال کا کوئی وارث ہو' ایسی قطعی کوئی بات نہیں...... میری یہ آرزو ایک رُوحانی ہے۔''

میں نوعمر تھا' بخارا کے مضافات میں میرے والد کے ایک قریبی دوست رہتے تھے جو ایک برگزیدہ گیلانی بزرگ سے بیعت تھے' وہاں اُن کے اناروں کے بہت سے باغات تھے۔ اناروں کے موسم میں والد وہاں ضرور جایا کرتے تھے کہ اُنہیں اناروں کے جھاڑ پودے' شگوفے' انار کلیاں' سبز پتے' بھینی بھینی مہک اور انار کا سُنہرا تاج وغیرہ بہت پسند تھے اور خاص طور پہ انار کے گہرے سُرخ آبدار دانوں کو قدرت کی جانب سے بخشا ہوا یاقوتوں کا خزانہ سمجھتے تھے۔''

والدِ محترم کے اِس بزرگ دوست کو ایک سیلانی بزرگ سے بشارت ملی تھی کہ اُن کے باغات میں ایک پیڑ ایسا بھی ہوتا ہے جس پہ ایک انار مُرشدِ پاک کی دُعا برکت سے باغاتِ عدن سے اُتارا جاتا ہے اور اس کے سینکڑوں دانوں میں ایک مخصوص دانہ' انمول رتن کی صُورت ہوتا ہے۔ گہرا سُرخ تراشا ہوا نگینہ کہ اس جیسا نادر یاقوت دُنیا میں کہیں اور دستیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک اور خاص بات بھی کہ وہ مخصوص انار' ہر فصل پہ مختلف پیڑ پہ ہوتا جبکہ اُس کی کھوج کچھ ایسی آسان بھی نہ تھی...... لاکھ جستجو' نگہ داری' تلاش بسیار کے باوجود ہاتھ نہ لگتا تھا۔ اِتنے لمبے برسوں میں محض ایک دو دانے ہی دستیاب ہوسکے تھے......''

والدِ محترم' اپنے اِس دوست' اس کے اناروں کے باغات اور کسی کرشماتی انار سے حاصل ہونے والے یاقوتی دانہ کا ذکر کرتے تو ہم سب گھر والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں خاص طور پہ مجھے بڑا اچنبھا ہوتا...... میرا جی چاہتا اُڑ کر وہاں پہنچوں' پیڑ پیڑ خوب' اُس انار کو تلاش کروں جس میں اصلی قیمتی یاقوت دانہ ہوتا تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ خوش فہمی سی ہوگئی تھی کہ میں اُس مخصوص انار کو آسانی سے تلاش کرسکتا ہوں...... دل ہی دل میں میں وہاں پہنچنے کی دُعا میں مانگا کرتا تھا مگر والد سے کُھل کر بات کرنے کی جُرأت نہ ہوتی......؟

اِک لمبا عرصہ' میں اپنے دل میں وہاں جانے اور یاقوت کے دانوں والے اناروں کے باغات دیکھنے کی خواہش پالتا رہا۔ اِس دوران میری شادی ہوگئی اور اس سے اگلے سال والد' داغِ مفارقت دے گئے۔ جب میرے ہاں پہلی بیٹی نے جنم لیا تو میں اپنے والد کے پھلوں کے کاروبار کو مکمل طور پہ سنبھال چکا تھا۔

اکلوتا ہونے کے ناطے سے اب میں خودمختار تھا۔ جب دوسرے برس بھی دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو میرے سر پہ پہلا چاندی کا بال نمودار ہُوا۔ اسی رواں برس' والدہ بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ والدہ نے انتقال سے پہلے' مجھے علیحدگی میں طلب کیا اور ایک چھوٹا سا چرمی صندوقچہ میرے سپرد کرتے ہوئے کہا۔"

''اس میں تمہارے مرحوم والد کی کچھ باقیات ہیں مجھے اُنہوں نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد کسی مناسب موقع پہ تمہارے سپرد کر دوں۔ میں نے اس صندوقچے کو کھول کر نہیں دیکھا کہ اس کے اندر کیا کچھ ہے۔ جو کچھ بھی ہے تمہاری امانت ہے۔''

اک مناسب وقت پہ اس صندوقچے کو کھولا تو اس کے اندر سے وہی کچھ نکلا جو کسی روایت پسند بوڑھے باپ کے سنبھالے ہوئے سامانِ دُنیا سے برآمد ہوتا ہے۔ دو تین مختلف نمبروں کی عینکیں...... کچھ تسبیحاں' ذاتی ڈائریاں' شجرہ نسب' جوانی کی تصویریں' تعلیمی اسناد' پرانا پاسپورٹ' نکاح نامہ اور جیبی گھڑیاں' جو نہ جانے کب سے حبسِ دم کا شکار ہو چکی تھیں۔ اسی سامان سے چمڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی بھی کہیں سے نکل کر سامنے آ گئی...... ڈوری کھولی' اُلٹا تو دو عدد سُرخ یاقوت' بشکل اَناردانے' سامنے تھے۔ اک نظر دیکھنے سے یہی لگتا تھا کہ کسی اَنار سے دو دانے نکل کر باہر ٹپک پڑے ہیں...... میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ مَس کرنے کی ابھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی...... تھیلی کو مزید جھٹکنے پہ کاغذ کا ایک پُرزہ بھی باہر نکل آیا...... لکھا تھا!

''فرزند! بُخارا میں اَناروں کے باغات والے میرے دوست' جو دراصل میرے پیر بھائی بھی تھے اُنہوں نے ایک بار مجھے تمہارے بارے میں ایک حیرت انگیز بات بتائی کہ تمہارے ہاں بیٹیاں ہوں گی جبکہ اولادِ نرینہ صرف ایک نجت سے ہو گی۔ اولادِ نرینہ سراپا آزار اور آزمائش ہو گی۔ نر بچہ ایک ایسی عورت کے بطن سے پیدا ہو گا جو علم وحلم میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت اور مانند یاقوت یعنی خوب رنگ وخوبصورت بھی ہو گی۔ جواہرات' خاص طور پہ یاقوت اُس کی کمزوری ہوں گے۔ خُوش بختی' خُوش حالی' خُوش وقتی سے وہ مالا مال ہو گی۔''

آگے تحریر پانی کے دھبوں سے پھیل چکی تھی...... کوشش کے باوجود کسی طور پڑھنے سمجھنے کے قابل نہ تھی۔ اللہ جانے کہ آگے کی چند سطروں میں کیا لکھا تھا؟

میں نے اِن نادر جواہر دانوں کو جو یقیناً بُخارا والے اَناروں سے اُترے ہوئے کرشاتی یاقوت تھے سنبھال کر رکھ لیئے۔ اس کے بعد اک عجیب سی تبدیلی پیدا ہوئی کہ مجھے جواہرات' خاص طور پہ گہرے سُرخ یاقوت سے اللہ واسطے کی دلچسپی پیدا ہو گئی۔

وقت کچھ ہو گزرا کہ مجھے ایران والے بزرگ کی ترغیب پہ کاشغر پہنچنے کا موقع ملا۔ حُسنِ اتفاق کہ وہاں

حضرت سلطان مہدی کا شفری کے مزار کے حجرے میں ایک بزرگ نے میری پیش کی ہوئی مٹھائی کھا کر مجھے قدرتی سوراخ والا ایک یاقوت کا شفری کا نگینہ عطا فرمایا۔ اس طرح میرے پاس چند دیگر جواہر دانوں کے ساتھ یہ تین عدد یاقوت جمع ہو چکے تھے۔

تاشقند میں' جبکہ حمیدہ صحافی میری مہمان تھی' ایک روز یونہی اُسے دکھانے کی خاطر اپنی جواہرات والی پوٹلی کھولی تو وہ دیکھتی ہی گئی' ان تین یاقوتوں کو خاص طور پہ اپنی ہتھیلی پہ رکھا جیسے وہی ان کی اصل مالک ہو اور اک عرصہ گمشدگی کے بعد برآمد ہوئے ہوں۔ کچھ دیر وہ انہیں اُلٹ پلٹ دیکھتی سوچتی رہی۔ میں اُس کی محویت کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بس' یہیں ایک کوندا سا لپکا اور مجھے نپینو پسین کر گیا۔ مجھے اپنے مرحوم والد کا مخطوطہ یاد آ گیا......!

مجھے اُس کے سراپے میں اپنا زائچہ جھلکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا...... یہیں مجھے اپنے مرحوم والد کا وہ نوشتہ نظروں کے سامنے آ گیا...... جو کچھ لکھا تھا' ایک ایک بات درست تھی...... وہی سراپا' وہی خوب صورتی و سیرت' ویسی ہی جواہرات' یاقوتوں سے دلچسپی...... گو یہ سب کچھ بہت پہلے سے ہی میرے سامنے تھا مگر تب میں اس سوچ کا تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ دو بیویوں کا شوہر اور پانچ بیٹیوں کا باپ' عمر و حیثیت کا تضاد...... قومیت' وطنیت کا فرق؟ اس وقت بھی میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ میرے اندر اک رہٹ سا چل پڑا تھا۔ تھنڈا انجار پسینہ' نفی و اثبات' اُمید و نومیدی' آس و یاس؟...... جیسے کوئی فاسٹ فلم چل رہی ہو کہ کسی منظر فریم پہ نگاہ نہ ٹکے اور دیکھے بھی سب کچھ...... وہ مجھے یوں کا بجو ما بجو سا دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''خیریت' آپ کچھ......؟''

میں نے بات بناتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کو یہ نگینے پسند آئے......؟''

وہ اک ادا سے اُنہیں دیکھتے ہوئے چہکی۔

''یہ تو مجھے دل و جان سے پسند آئے ہیں اس کا ثبوت یہ کہ میں اُنہیں حاصل کرنے کی تراکیب پہ غور کرنے لگی ہوں مگر آپ کہاں گم ہیں؟''

''میں بھی اُنہیں اک غیر معمولی ہستی کو ہدیہ کرنا چاہتا ہوں اور کسی ایسے بے خطا طریقے کی تلاش میں ہوں کہ جس کے استعمال سے ان کی قبولیت بھی ہو جائے اگر آپ کی سمجھ میں کوئی ایسا طریقہ ہو تو مجھے بتا دیں؟''

وہ دُزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ایک خوبصورت طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اُنہیں تحفہ دے دیں اور دوسرا طریقہ؟...... ہاں' دوسری

انتہائی دل نشین صورت یہ کہ آپ انھیں منہ دکھائی میں پیش کریں۔''

''ہاں یہی ایک وہ صورت ہے جو میرے مرحوم والد کی وصیت اور پیش گوئی کے عین مطابق ہے اور اس طرح میرے اولادِ نرینہ کی خواہش بھی پوری ہوتی ہے۔''

میں نے اپنی تمام کہانی بلا کم و کاست' اُس کے رُوبرو رکھ دی تھی اور یہ بھی بلا جھجک کہہ دیا۔

''میں نہیں جانتا مجھے ایسا کہنا چاہیے کہ نہیں لیکن یہ بالکل دُرست ہے کہ آپ ہی کی ذات میں وہ نشانیاں اور اُوصاف واضح ہیں جن کی نشاندہی میرے والدِ مرحوم کی وصیت اور کاشغر والے بزرگ کی نصیحت سے ہوتی ہے۔''

دونوں اطراف چند لمحوں کی خاموشی نے اِک گھمبیر سنجیدگی طاری کر دی تھی...... لگتا تھا جیسے ہم دونوں اپنی اپنی حدود سے کچھ دُور نکل آئے ہوں......؟

باہر باہر کے اُوپرے فیصلے' موٹر کار' سائیکل' گاڑی کے یا کسی بھی گھومنے والے پہیوں کی مانند ہوتے ہیں اور اندر (بشمول دل و دماغ) کے فیصلے کسی بھی عام دستی گھڑی کی ننھی ننھی گراریوں کی طرح......! باہر دکھائی دینے والے پہیوں کا کچھ تعلق اِنسانی قوت اور میکانکی نظام سے ہوتا ہے جبکہ اندر کے پہیوں کی حرکت' اِنسان کی باطنی' اخلاقی' علمی اور رُوحانی استعداد کے مطابق ہوتی ہے...... باہر پہیے گھومیں تو اِرتعاش' آواز اور رگڑ پیدا کرتے ہیں۔ اندر کی گراریاں' چپ شانت' مُسکراہٹ سے اپنے کام میں جُتی رہتی ہیں۔ آواز نہ دُھانس......!

اِدھر بھی دونوں اطراف' اپنی اپنی گنج اور اپنے اپنے دندانوں کی گراریاں چل رہی تھیں۔ میں بن کچھ سوچے سمجھے کہنے لگا۔

''آپ جانتی ہیں میری دو بیویاں اور پانچ بچیاں موجود ہیں...... اس کے علاوہ چند ایک' وطنیت' حیثیت' قابلیت اور عمر کے نمایاں تضادات بھی اپنی جگہ پہ نمایاں حقیقت ہیں۔ اس کے باوجود بھی پورے یقین اور شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ میں آپ کو خوش رکھ سکوں گا...... آپ کی عزت و توقیر میں خاطر خواہ اضافہ کا باعث بنوں گا اور آپ کی اَدنیٰ سے اَدنیٰ خواہش بھی پورا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے......!''

یہ ساری بھیگی بھیگی بھولی باتیں میں گردن ڈالے ہوئے' آنکھیں جھکائے' دامن و گریباں بچائے ہوئے' خود میں سمائے...... عقل و خرد سے پرے' ہتھیلی پہ سر دھرے یوں گوش گزار تھا جیسے روزِ نشور' مالک کے حضور کوئی صاحبِ سرور اپنا معاملہ ''من و تُو'' پیش کر رہا ہو۔؟

وہ سنگِ ابیضِ لہر کا ایک پُر وقار حسین مجسمہ بنی سامنے بیٹھی تھی جیسے کوئی نادان دوشیزہ بھول چوک میں

کسی بے نام و ننگ کا بچہ جن کر نجنت سی ہو جاتی ہے...... اک تفاخر آمیز خجالت اُس کے بشرے پہ تیز بھی قوس قزح کی مانند گھنڈی ہوتی ہے...... قوس قزح کا اپنا تو کوئی ٹھوس وجود ہوتا نہیں وہ تو آفتاب کی آڑی ترچھی کرنوں کے زاویوں اور ابر باراں کی آبی نیرنگیوں کا کھیل رچا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ قلب و نظر چاہتوں قربتوں اور آرزوؤں خواہشوں کے سلسلے بھی قوس قزح کی طرح بڑے دلنواز خوش رنگ و خوش ترنگ ہوتے ہیں۔ اچھا خاصا سیانا بندہ بالکوں کی طرح بتوڑیاں مارنے لگتا ہے۔ میری بتوڑیاں اُسے شاید اچھی اور خاص لگی تھیں۔

کسی کی عقلمندی سچائی ایمانداری اور دین داری بھی کبھی کھل جاتی ہے اور کبھی کہیں جھوٹ بے ایمانی کمینگی بے وفائی اور کافری بھی پیاری لگنے لگتی ہے۔ یہ تو وقت موڈ ماحول اور کیفیت نفس کی بھاونا ہے؟ بس! ایسی ہی کچھ کیفیت ادھر بھی تھی...... بدیرؤہ اپنی ذات کی باؤلی سے باہر نکلی۔"

"بات مقسوموں کی ہے...... وُہ تو ہو کر ہی رہتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے...... آپ کا کاروباری طور پہ ہم سے جڑنا آپس کے روابط میں استحکام پیدا ہونا...... جواہرات خاص طور پہ یاقوتوں والی قدر مشترک...... میرا ادھر پہنچنا وغیرہ شاید یہ سارے محرکات اسی جواز کے لیے پیدا ہو رہے تھے۔ اگر یہ سب کچھ اسی لیے ہے تو مجھے بھی حاکم تقدیر کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دینا چاہئے۔ اَب آگے آپ کا مقدر کہ اس طرح آپ کا مقصد حاصل ہوتا ہے یا نہیں......؟

قصہ مختصر کہ کچھ عرصہ بعد ہمارا نکاح ہو گیا...... منہ دکھائی میں میں نے وہی یاقوت پیش کر دیے تھے اور ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے اور ہاں یہ بتانا تو میں بھول گیا میری نئی بیوی نے چند ایک مطالبات بھی رکھے تھے ایک یہ کہ میں خود اور اس کے بطن سے ہونے والی اولاد کے نام کے ساتھ صحابی کی اضافت لگاؤں گا۔ دوم بخارا کے گیلا نیوں کے اناروں کے باغات میں ہر فصل میں ایک یاقوتی اناروانہ معرض وجود میں آتا ہے۔ جس کی تلاش اور حصولی اپنی جگہ ایک کارزار ہے میں ہر فصل پہ اس یاقوتی اناروانہ کی تلاش یا بازیافت کا حصول ممکن بناؤں گا۔"

یہ انتہائی بابرکت اور روحانی تصرفات کا حامل اک گوہر کامل ہے جو کسی خوش نصیب انسان کے علاوہ قمریوں عندلیبوں کے گھونسلوں میں بھی پایا گیا ہے۔ یقیناً یہ قدرت کی اعانت سے ہاتھ لگتا ہے۔"

کہتے ہیں کہ کبھی کوئی بزرگ کسی دوسرے ملک سے تبلیغی سلسلہ میں ادھر آ نکلے تھے...... دوران سفر انہیں ادھر اناروں کے پیڑوں کا ایک ذخیرہ دکھائی دیا۔ خوش رنگ و لطف شاخساروں کونپلوں کلیوں شگوفوں کی بہار سے وہ از حد محظوظ ہوئے کچھ دیر اس ماحول میں سکون حاصل کیا اس بابرکت قطعہ ارض کو دعا دی...... رخصت ہونے لگے تو باغات کے بوڑھے مالک نے ازراہ عقیدت ایک خوش رنگ انار گل پیش کرتے

ہوئے عرض کی۔"

''ابھی فصلِ گل کی شروعات ہیں' دو ڈھائی عشروں تک فصلِ ثمر تیار ہوگی فی الحال یہی نوخیز و نورنگ گل پیشِ خدمت ہے۔ اس خواہش و درخواست کے ساتھ کہ موسمِ ثمرات ہو اور آپ ان شیریں اناروں کا تازہ بہ تازہ مشروبِ فردوس نظیر نوش فرمائیں۔''

جلیل القدر بزرگ' اس کی اخلاص و اخلاق آمیز گفتگو اور اس خوبصورت تحفہ سے بھی خوش ہوئے۔ فرمایا۔

''دُنیا میں ہر ثمر' جنت کے کسی نہ کسی پھل کے مشابہ ہوتا ہے مگر معدودے چند پھل صرف جنت الفردوس کے تحفے ہیں...... ان میں نمایاں طور پہ انار بھی ہے۔ انار کا دانہ ذو یک دانہ ہے جو مثلِ یاقوت ہے۔ اگر اسے پختگی اور آب و تاب دے دی جائے تو گوہرِ یگانہ کہلائے...... ان باغات کے انار بھی کسی نعمت سے کم نہیں' میں دُعا کرتا ہوں کہ یہاں کے ثمرات میں مزید برکت ہو۔'' مزید ارشاد فرمایا۔ ''ہر فصل پہ کسی نہ کسی ایک پیڑ پہ' کسی ایک انار خاص میں ایک دانہ ایسا موجود ہوگا جو حقیقی دانۂ یاقوت ہوگا...... مگر اس کی پہچان محض دیکھنے سے نہ ہوگی بلکہ پرکھنے سے ہوگی۔''

سو اک زمانہ سے بُخارا کے اس باغ کی ہر فصل پہ اس خاص دانہ کی تلاش رہتی ہے۔ ظاہر ہے سینکڑوں پیڑوں کے ہزاروں اناروں کے لاکھوں دانوں میں کسی ایک خاص دانہ کی تلاش و پرکھ کوئی آسان کام نہیں اور نہ ہی یہ کسی فردِ واحد کا کام ہے۔ سُنا ہے کہ کئی کئی برس فصلِ اناری مگر تلاش کی ناکامی پہ مایوس ہو کر' ضائع کر دی یا پھر اونے پونے بیچ دی...... یہ دانۂ یاقوت والا راز بھی راز نہ رہا' سینے کی کوٹھڑی سے کسی نہ کسی طریقہ باہر نکل گیا۔ لوگ دھڑا دھڑ انار خریدنے لگے' قیمتیں بھی آسمان کو چھونے لگیں۔ بوڑھے مالک اور اس کی اولاد کی سمجھ میں یہی آیا کہ بزرگ کی دُعا' بشارت کا مخفی معنٰی یہی تھا کہ اناروں کے دانے یاقوتوں کے بھاؤ بکیں اور خوب دُھن دولت کی ریل پیل ہوگی!...... دیر بدیر اب اُن کا دھیان دانۂ یاقوت کی جانب کم رہتا۔ فصل کی بڑھوتری کی طرف زیادہ......!

کچھ زمانہ ہو گزرا کہ اُسی بزرگ کا اتفاقاً پھر وہیں سے گزر ہوا تو اُنہیں اس اناروں کے باغ کے رسیلے اور میٹھے انار یاد آ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ پہلے والا بوڑھا مالک فوت ہو چکا ہے اب اس کی اولاد یہ باغات سنبھالے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے ان سے واقفیت نہ تھی اگر ہوتی بھی تو وہ اسے کچھ اہمیت نہ دیتے کہ یاقوت دانہ والی کہانی پہ ان کا یقین اُٹھ چکا تھا...... اس بزرگ نے کچھ انار خریدے اور اُن میں ایک چھوٹا سا انار' واپس لوٹاتے ہوئے کہا۔

''دو روز بعد جمعرات کے روز' اسے کھولیں۔ اللہ کا نام لے کر اس کے تاج کی جانب کے چند دانے

کسی غریب مسکین کو خیرات کر دیں۔ اللہ برکت دے گا۔''

اُنہوں نے اِسے بوڑھے کی بڑ سمجھتے ہوئے کوئی توجّہ نہ دی۔ انار کے بدلے ایک بڑا انار دے کر اس کا چھوٹا انار لاپروائی سے کٹے پھٹے اناروں کے ڈھیر جانب لڑھکا دیا۔

اَب اللہ کی قدرت دیکھیں' اس گلے سڑے اناروں کے ڈھیر کو ایک غریب عیال دار آدمی' اپنے بچوں اور بھیڑ بکری کے لیے لے جاتا ہے جبکہ وہ بزرگ کا بخشا ہُوا چھوٹا انار ایک بچّے کے ہاتھ لگتا ہے۔ کھانے کے دَوران کڑک کی آواز نکلتی ہے اور بچّے کے منہ سے ایک دانت' کڑک کی مانند ٹوٹ کر باقی ملغوبے کے ساتھ باہر نکل آتا ہے۔ بچّے کے رونے پہ جب باپ توجّہ دیتا ہے اور ٹوٹا ہُوا دانت دیکھتا ہے تو حیران ہوتا ہے کہ ایسا مضبوط دانت کیونکر ٹوٹ گیا۔ چبائے ہوئے ملغوبے میں اُسے قدرے ایک بڑا صاف چمکتا ہُوا انار دانہ علیحدہ ہی پڑا دکھائی دیتا ہے۔ علیحدہ کر کے صاف کرتا ہے وہ ایک سخت پتھر سا ہوتا ہے۔ صاف کر کے غور سے دیکھتا ہے تو وہ ایک نایاب یاقوت ہوتا ہے۔ بازار پہنچ کر جوہری کو دکھاتا ہے تو اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب جوہری اُسے ایک خاصی رقم کے بدلے خرید لیتا ہے۔ گھر واپس آتا ہے تو باقیماندہ اناروں کے چھلکے کو خوب دھیان سے دیکھتا ہے مگر اَب اِدھر سوائے گند اور کچھ نہیں ہوتا...... اَب اِس غریب آدمی کے دن بدلتے ہیں مگر کسی پہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ سب کیسے ہُوا؟...... اس کے بعد لاکھ جتن کیے مگر پھر ویسا انار دانہ اُس کے ہاتھ نہ لگا۔

باغات کے موجودہ مالکوں کے ہاں یہ یاقوت دانے والی کہانی بزرگوں سے چلی آ رہی تھی لیکن اس پہ یقین ذرا ڈھلمل سا تھا کیونکہ اک زمانہ سے تلاشِ بسیار کے باوجود کوئی ایسا انار دانہ حاصل نہ کر سکے جسے یاقوت کی تہمت بھی دی جا سکے۔ اَب کسی طرح سے اُن کے کان میں' اس نئے دریافت ہونے والے انار دانہ یاقوت کی بھنک پڑ گئی۔ وہ اس ماضی کے غریب اور حال کے خوشحال کے پیچھے پڑ گئے کہ اس گوہر نایاب پہ ہمارا حق تھا۔ اُس کا جواب کہ اس بیکار کوڑے کرکٹ کو تو آپ پہلے بھی میرے لاغر جانوروں کے لیے دے دیا کرتے ہیں۔ اَب بھی یہی کچھ تھا' میرے بچّے کے ہاتھ ایک چھوٹا سا سوکھا سڑا انار لگا۔ اُس ندیدے نے اُس پہ منہ مار لیا۔ مجھے خبر تب ہوئی جب اُس کا سامنے کا دانت دو پارہ ہو کر باہر پڑا تھا۔ اسی دیکھا دیکھی میں کہیں یہ یاقوت بھی دکھائی دیا۔ اک نظر دیکھنے سے یہی دکھا کہ یہ انار دانہ ہے مگر ٹٹول کر دیکھا تو یہ یاقوت تھا۔ اَب یہ اُسی چھوٹے سے انار سے نکلا یا کہیں اور سے اِدھر آ ٹپکا' اس کی خبر خدا کو ہے۔ ویسے آپ خود ہی بتائیں کہ بھلا کسی انار سے یاقوت بھی برآمد ہوتے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو اس انار کے سب ہی دانے یاقوت ہوتے؟

بہر حال' قصّہ مختصر کہ باغ کے موجود مالکان کو اپنے بڑوں کا یہ کہنا' صادق لگا کہ اس باغات کی ہر فصل میں کسی ایک جھاڑ پہ ایک انار ایسا بھی ہوتا ہے جس کے سیکڑوں دانوں میں ایک دانہ یاقوت بخاری یا

یاقوت گیلانی ہوتا ہے۔''

پہلے برس اللہ نے ہمیں ایک خوبصورت بچہ عطا فرمایا...... بچہ کیا تھا اک یاقوت ہی تھا سُرخ وسنہری' گوشت وپوست' اُستخوان وخُون سے تعمیر نہ ہو بلکہ شفق اور دھنک رنگوں سے سیمابی آنگوں کی تعمیر ہو۔؟

اللہ کی قُدرت وعنایت کہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی 'معجزاتی طور پہ بخارا میں اناروں کا یہ باغ ہماری تحویل میں آ گیا...... مَیں خُوب سمجھتا تھا یہ آہستہ آہستہ آنے والی ساری تبدیلیاں میری اس نئی بیوی کے نصیبوں کا چمتکار ہیں۔ شادی کی شرائط میں یہ اناروں کے حصول کی بات بھی تھی اور اناروانوں کی بھی یعنی یاقوتوں کی بھی...... حالات کی بساط پہ اک نئی بازی تھی۔ ہوائیوں کہ باغات کے مالکان بھائیوں میں اختلاف پڑ گیا...... ہر کسی کی کوشش تھی کہ کسی طرح ہر فصل پہ یاقوت دانہ اُسی کے ہاتھ لگے۔ لالچ اور حرص نے ان کے درمیان بے اعتمادی سی پیدا کر دی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آپس میں بدظن سے رہنے لگے...... دُودھ پُوت' سونا چاندی' ہیرے مُوتی...... اولاد کا سُکھ اور میوے ثمراز کہ'تو نصیبوں والوں کو نصیب ہوتے ہیں...... حسد ہو لڑائی جھگڑائی' حسد رشک' بے یقینی بے اعتمادی اور لوبھ وحرص کا سلسلہ شروع ہو جائے تو گھڑوں میں پانی سُوکھ جاتا ہے۔ بے برکتی اور نحوست اپنے پاؤں پسار دیتی ہے۔''

میرے والد کے اُن کے بزرگوں سے تعلقات تھے جو اگلی نسل یعنی مجھ تک بڑے استحکام سے استوار تھے اسی ناطے مَیں نے بہتیری کوشش کی' مگر اُن بھائیوں کے درمیان مفاہمت کی فضا قائم نہ ہو سکی۔ خدا جانے یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہُوا' جیسے کہیں نادیدہ طاقت کوئی پُراَسرار ہستی' دَرپردہ ایسے اسباب پیدا کر رہی ہے کہ یہ اناروں کے باغات ہماری ملکیت میں آ جائیں۔ چنانچہ ایسے ہی ہُوا...... ہمارے اس اکلوتے بیٹے کی پیدائش انہی باغات کے کنج میں ایک دَرویش سی جھونپڑی میں ہوئی کہ انار جھاڑوں کی لچکتی لہراتی شاخساریں' اپنے سرخ وسپید غنچوں کلیوں شگوفوں کی بہاریں اِدھر اُتارا کرتی تھیں۔ اس جھونپڑی میں اپنے پہلے بچے کی پیدائش میں بھی میری بیوی کی خواہش کا ہی عمل دخل تھا۔ یہ گلوتھنا سا بچہ' عام بچوں سے بے حد مختلف تھا۔ زچگی کے دوران شاید ہی یہ رویا چلایا ہو' ہم نے اسے روتے مُنہ بسورتے ہوئے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ مسکراتا ہُوا ہر وقت ہاتھ پاؤں چلاتا رہتا۔ اس کی بڑھوتری بھی غیر معمولی طور پہ بڑی عُجلت میں ہوئی۔ ایک اور عجیب بات اس نے اپنی ماں کا دُودھ شاید ہی چکھا ہو۔ اس کی آیا اور ماں نے شروع سے ہی اسے انار کے رَس پہ رکھا۔

یہ میری زندگی کا سنہری دَور تھا' کاروباری کامیابیاں اپنے عروج پہ تھیں۔ مَیں خوشیوں کامرانیوں کی برسات میں بھیگا ہُوا' زندگی کا لُطف لے رہا تھا کہ اچانک ایک دن میری بیوی بیٹھی بیٹھی ٹوٹ پُھوٹ ہونے لگی...... کسی کی کچھ سمجھ نہ آیا کہ اُسے کیا تکلیف ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے اور ماتھے پہ پسینہ آ گیا۔ بڑی وقت

سے صرف اِتنا کہا کہ میرے بچّے کی کبھی آزردگی نہ کرنا...... جو چاہے کرے اِسے منع نہ کرنا...... میں اِسے اللہ اور تمہارے سپرد کرتی ہوں...... اِتنا کہہ کر اُس نے آنکھیں مُوند لیں۔ یہ میرا بیٹا اُس وقت بھی اَنار کھاتا ہُوا مسکرا رہا تھا؟

اَنار اِس کی کمزوری تھے...... ہر وقت' وہ ان کے درمیان رہتا...... کھانا پینا' کھیلنا' اُٹھنا بیٹھنا غرضیکہ اوڑھنا بچھونا بھی اَنار ہی تھے...... اَنار کے پیڑوں پہ وہ گلہری کی طرح اُچھلتا پھرتا...... جس اَنار پہ چت آیا' تھپنا توڑا اور مُنہ مارنا شروع کر دیا۔ سخت چھلکا' تاج کنگرے اور دانتوں کا پھوک بھی نگل لیا۔"

ایک دن اَنار کھاتے ہوئے اُس کا دانت ٹوٹ کر باہر آ پڑا' تب اُس کی عمر بمشکل پانچ برس ہوگی۔ ہنستا مسکراتا اچھلتا ہُوا۔ وہ خون آلودہ ٹوٹا ہُوا دانت کا ٹکڑا اور ایک یاقوت مثل اَنار دانہ ہتھیلی پہ دھرے میرے پاس چلا آیا' یوں جیسے وہ کوئی معرکہ سرانجام دے کر آیا ہو۔ یہیں مجھے اِس کی پُراسرار شخصیت یہاں کے اَناروں کی اہمیت اور اِس کی مرحومہ ماں کی وصیت کا صحیح معنوں میں ادراک ہُوا...... اس کے ہاتھ مُنہ صاف کرنے کے بعد میں اُسے کشاں کشاں واپس باغ میں لے گیا اور اُس پیڑ کا پوچھا جدھر سے اُس نے وہ اَنار حاصل کیا تھا...... فصل ابھی کچّی پکّی تھی' کچّا اَنار سخت اور بدمزہ ہوتا ہے مگر کیا کہیے کہ طائروں اور طفلوں کو یہی من بھاتے ہیں جو کچر کچر کھاتے ہیں...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ کسی ایک پیڑ پہ ایسا اَنار ایک ہی ہوتا ہے جس کے سینکڑوں دانوں میں صرف ایک دانہ ہی یاقوت دانہ ہوتا ہے۔ مزید دو چار اَنار کھولے مگر وہاں محض کچّا پکّا گودا ہی تھا۔ اَب اِس اُصول کے تحت کہ ہر فصل میں صرف ایک ہی یاقوت دانہ ہوگا تو یہ دانہ حاصل ہو چکا تھا۔ اَب اگلی فصل پہ کون سا پیڑ ہوگا...... کونسا اَنار ہوگا اور کونسا دانہ ہوگا...... اور کس دیدہ ور کا دانت ہوگا...... جو دولخت ہوگا اور یاقوت اُس کا بخت ہوگا......؟

خدا کی حکمت ہر فصل پہ کسی نہ کسی طور یہ یاقوت دانہ میرے یا اِس کے دانت تلے ہی آتا...... شاید یہ اَمر کہیں طے ہو چکا تھا اور اِن کی دستیابی ہمارے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔

یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ میرا یہ فرزند' اَناروں کے علاوہ اور کوئی غذا نہیں کھا سکتا تھا۔ اِس کی بڑی وجہ شاید اِس کے ٹوٹے ہوئے دانت تھے جو غذا چبانے کے اہل نہیں تھے...... دوسری وجہ اِس کی نحیفی نزاری اور پتلا پیٹ جو عام قسم کی غذا کا متحمل نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح مرچ مصالحوں سے بُری طرح بدکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ کہیں اُبلے ہوئے چاول یا آلو چکھ لیتا جبکہ اِس کی ماں سلاد سینڈوچ' سوپ وغیرہ سے بھی رغبت کر لیتی تھی...... شاید اُس کی نزاکت و نفاست' خوبصورتی و جمالیت کا راز بھی یہی کسرِ غذا تھا۔

اب روز بروز عبید صحابی بھی اپنی ماں کے سانچے میں ڈھلتا ہُوا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کی عادات و حرکات

ہو بہو ویسی ہی تھیں۔ شائستگی' طمانیت' پُروقار انداز' گفتگو اور ہلکی سی نرگسیت ...... بچپن اور چھٹپن کے اپنے بھی کچھ تقاضے' دوست' ہمجولی' کھیل کود' شرارتیں ضدیں ہوتی ہیں۔ خاندان میں اُس کی عمر کے بعد بھی بچے تھے اُس کی اپنی بہنیں بھی تھیں مگر اس کے باوجود الگ تھلگ رہنا ہی اچھا لگتا ...... پڑھائی لکھائی کے علاوہ وُہ اپنے فارم اور کالج میں عجیب وغریب نوع کے مشاغل میں مصروف دکھائی دیتا۔ ایسے مشاغل جو اس کی عمر اور صحت سے لگا کھاتے دکھائی نہ دیتے تھے ...... ذرا اُور قامت اور عمر دکھائی تو ایک دن اچانک بیٹھے بیٹھے جسم اینٹھنے لگا۔ ٹانگیں کپکپانے لگیں مجھے اُس کی ماں کا وقتِ آخرت یاد آ گیا۔ اُس پہ بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ ہاتھ اُٹھائے دُعا مانگی ...... اے زندگی اور موت کے دینے والے اس معصوم پہ رحم فرما ......!

شفاء خانے والوں کے مطابق اس پہ پولیو کا حملہ ہُوا ...... کئی عشرے بخار میں جھلستا رہا بالآخر جب قدرے افاقہ کی صورت دکھائی تو نچلا دھڑ بے جان ہو چکا تھا ...... جو دھیرے دھیرے بالکل ہڈیوں کا پنجر بن گیا اور اس کا کوئی بھی علاج نہ تھا ...... وقت اور زندگی' دونوں گھومتے پہیے اور سورج کے سفر کی مانند ہوتے ہیں۔ وقت اپنے ڈگر اور سورج اپنے سفر پہ رواں رہتے ہیں۔ بیوی کی مفارقت کے بعد گو زندگی بے رنگ ہو چکی تھی لیکن بیٹے کی صورت میں اُس کی نشانی' میرے لیے بڑی راحت اور تقویت کا باعث تھی۔ اُب بیٹے کے مستقل اپاہج ہو جانے سے تو میری کمر ہی ٹوٹ گئی ...... یہیں مجھے کاشغر والے وُہ بزرگ اور اُن کے الفاظ یاد آ گئے۔

''ویسے اچھی بات تو یہی ہے کہ سائل اپنا سوال پیش تو کر دے مگر مالک سے جواب اپنی مرضی کا نہ چاہے۔'' میرے منہ سے نکل گیا۔ بعض سائل جو لے کر ٹلتے ہیں اُن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' وہ بولے۔ ''ایسے خودسروں کو پھر ہر طرح کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہئے کہ قسمت کی کیمیاگری اپنے جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔''

یہ گرہ کھلی کہ واقعی جو قدرت کرتی ہے اُسی میں انسان کی کہیں نہ کہیں بھلائی مقصود ہوتی ہے انسان کے پاس ایسا اِدراک شعور نہیں کہ وہ قدرت کی ان حکمتوں کو کماحقہٗ سمجھ سکے۔ اس سانحہ کے بعد مَیں یہ بھی جان گیا تھا اَب آگے میرے لیے آزمائشیں ہی آزمائشیں ہیں اور مجھے خندہ پیشانی سے انہیں برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا کہ مَیں مقسوموں سے تجاوز کر کے اپنے من ٹھانی کر بیٹھا تھا!

میری زندگی کی ہر خوشی خواہش اَب اس معذور بیٹے کے لیے سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ڈال ڈال' پنچھیوں کی مانند پُھدکنے سے تو وُہ رہا۔ اَب گھسٹ گھسٹ کر کبھی اِدھر کبھی اُدھر وہ اپنی عادت پوری کرتا رہتا اور مَیں دیکھ دیکھ خون کے آنسو روتا رہتا۔ اَب وہ قدرے چڑچڑا بھی ہوتا جا رہا تھا۔ بات بات پہ ضد' کبھی یہ کبھی وُہ ...... تھوڑے بہت جو دانت ٹوٹنے سے بچ گئے تھے وہ ناصفائی سے بوسیدہ ہو گئے ...... یہیں اُسے بال بڑھانے کا شوق

آ لگا...... اناروں سے دلچسپی قدرے کم ہو گئی تھی۔ خوراک کے طور اب اُس کی دلچسپی غیر ملک فاسٹ فوڈ کی جانب مبذول ہو گئی۔ برگر سینڈوچ' چپس وغیرہ اچھے لگتے۔''

پہلا غیر ملکی سفر چین کا تھا...... جدھر اسے اپنے ننھیال' اپنی مرحومہ ماں کی وراثت کے سلسلہ میں جانا پڑا...... دُوسرا سفر' تاشقند سے باہر کاشغر اور بخارا کا تھا...... اِدھر میں اُسے بابا کاشغری کے روضہ کی زیارت اور اُن بزرگ سے ملاقات کرانا چاہتا تھا جن کے وسیلہ دُعا سے یہ میرے ہاں پیدا ہُوا تھا۔''

تمبا کو نوشی ہمارے ہاں روز مرہ کی خوراک کی مانند ہے اسے کوئی عِلّت یا عیب نہیں سمجھا جاتا...... عورتیں مرد حتیٰ کہ بچے بالے بھی بے کھٹکے تمباکو نوشی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور سونے کے دو چار یا پورے دانت لگوانا بھی ہماری روایت کا حصہ ہے' یہ فیشن کے طور بھی حسب استطاعت لگوائے جاتے ہیں۔ جس کے جتنے دانت سونے کے ہوں گے اُسے اتنا ہی صاحب ثروت اور معزز سمجھا جاتا ہے۔

میں پہلے بھی اس کے معاملہ میں بڑا فراخ دل تھا۔ اس کی ہاں میں ہاں اور ناں میں ناں ہی میرا وطیرہ تھا مگر اس بیماری کے بعد تو میں بالکل ہی کچھ سے کچھ ہو گیا...... چوبیس گھنٹے اس کی دلداری دلنوازی میں گزر جاتے۔ یوں لگتا کہ جیسے اپنا وجود اس کے وجود میں تحلیل ہو گیا ہو اور میری زندگی کا مقصد' محض اور محض اس کی تیمارداری' نگہداشت اور خوشنودی ہی ہو۔''

میری پہلی دو بیویاں' بیٹیاں میری توجہ التفات کے لیے ترستی رہتیں مگر منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ شاید انہیں میرے اندر کے دُکھ کا خوب احساس تھا۔ عجب یاس اور اُکتاہٹ بھرے دن تھے۔ اچانک جی میں آیا کہ تاشقند سے باہر نکلا جائے کہ اس طرح عبید کا من بھی پرچ جائے گا مگر ساتھ یہ بھی کھٹکا کہ کہیں انکار نہ کر دے پھر بھی میں نے دبے دبے الفاظ میں اُسے کہہ ہی دیا...... خدا کا کرنا کہ وہ خلاف توقع بہت خوش ہُوا اور خراماں خراماں سفر کی تیاری کرنے لگا۔

کاشغر میں عظیم صوفی حضرت سلطان مہدی کاشغریؒ کے مزار پہ حاضری کے بعد میں وہی تاشقندی شیرینی' جو اُن چلہ نشین بزرگ نے بڑی رغبت سے کھائی تھی' لے کر وہیں حجرے میں پہنچا۔ یہ وہی بزرگ تھے جنہوں نے راضی برضا کا فلسفہ سمجھایا تھا کہ مشیت ایزدی کے آگے سرنگوں رہنا چاہیے نہ کہ پیروں' فقیروں اور دیگر مستجاب الدعوات سے اپنی خواہشوں کی برآوری کے لئے دُعائیں کروائی جائیں...... اللہ کے ایسے بندے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ نکلا ہُوا ہر کلمہ' کلمۂ حق وامر ہوتا ہے...... مالک اُن کے کہنے کی لاج رکھ لیتا ہے۔ مقسوموں کا لکھا ہُوا ملتا نہیں...... اور اگر کوئی بندۂ مومن منہ سے نکالے تو پھرے ہوئے جُوتے ڈھل جاتے ہیں منحصر ہے کہ وہ جُوتا کہیں پہلے کسی دھبے دھکے پہ تو نہیں پھرا ہُوا تھا۔ قضا و قدر' سُرخروئی و زبوں حالی

کا فلسفہ بھی اِک عجیب گورکھ دھندا ہے برف زاروں کے سینوں میں دہکتے ہوئے آتش بار دکھائی تو نہیں دیتے پر اپنا وجود تو رکھتے ہیں...... اُوپر سے کون بھیتر کے بھید جان سکتا ہے؟ ذوا پنی کہے جا رہا تھا...... بس یہ سوچ کہ میں واقعی سن رہا ہوں یا اُس کی داستانِ امیر حمزہ سے بیزار ہو کر کہیں اِدھر اُدھر نکلنے کی راہ دیکھ رہا ہوں۔''

● تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات......!

مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں...... جو ایک ایسے میاں بیوی کا ہے جن کے ہاں اولادِ نرینہ نہیں اور وہ محض ایک بیٹے کے لیے ترس رہے ہیں۔ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ مناسب' غیر مناسب' گناہ ثواب' اچھا برائی کے سارے فلسفے اُس کے سامنے محض ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنے مقصد یا خواہش پوری کرنے کے لیے ہر جائز ناجائز حربہ اختیار کرنے میں دریغ نہیں کرتا...... اولاد کے متمنی اس شخص نے کوئی حکیم وید نہ چھوڑا...... علاج معالجہ ہُوا صحت و جسم میں کوئی خرابی نہ تھی جو مانع اولاد ہوتی۔

کسی نے ایک درویش خانے کی راہ سُجھائی کہ جو کام مشکل ہو یا ممکن نہ ہو وہ کسی مردِ مومن کی ایک نگاہ سے ہو جاتا ہے۔ بزرگ کے قدم پکڑ لیے اور دل و جان سے خدمت کرنے لگا...... دن رات ایک کر دیئے کہ کسی طرح میرے مرشد خوش ہوں اور بولیں۔ بول بیٹا! کیا مانگتا ہے؟...... اِک زمانہ جب خدمت و اطاعت میں لدگیا قویٰ ڈھیلے اور بال پکنے لگے تو ایک دن بیوی بولی۔

''میاں! اِک زمانہ سے آنگن خالی ہے' اپنے مرشد پاک سے بیٹے کے لیے دُعا تو کراؤ......''

جن شوہروں کے ہاں اُولاد نہیں ہوتی وہ بڑے ڈاہو قسم کے خاوند ہوتے ہیں۔ بیوی کے آگے جی حضوری سے کام نہ لیں تو جینا اجیرن ہو جاتا ہے وہ اِک بھیانک قسم کے ''احساسِ ناخاوندی'' کا شکار ہو جاتے ہیں۔ محلّہ وغیرہ میں سر آنکھیں جھکا کر چلتے ہیں کہ عاجزی اللہ کو پسند ہے...... سسرالیوں اور علاقہ کی ڈائیوں کھسروں سے بد کتے کہ ناخلف انہیں ہمیشہ کھور کر دیکھتے ہیں!

''بسم اللہ کراں'' قسم کے خاوند نے بیوی کا حکم' سر آنکھوں پہ رکھا اور اپنے مرشد کے حضور بڑے اُدب سے اُولاد کے لیے درخواست پیش کر دی۔ مرشد پاک نے منہ سے تو کچھ نہ کہا' محض ہلکا سا تبسم فرمایا اور بس!

وقت کی بیل گاڑی جب ایک آدھ سنگِ میل اور آگے بڑھ جاتی ہے اور اِدھر بیوی کے پہلو میں کوئی حرکت برکت پیدا نہیں ہوتی تو وہ پھر اپنے اس اُدھورے کَن کھجورے خاوند کو پکڑتی ہے کہ آپ کے ساون بھی بھگوئے بن گزر گیا ہے...... جاؤ اور اپنے پیر صاحب سے فریاد کر کے آؤ...... کہ آپ کا پلّا پکڑا ہے تو نظرِ کرم

کریں ادھر بھی ایک آدھ چھینٹا ڈال دیں...... موقع پا کر دوبارہ درخواست پیش کی جاتی ہے۔ پیر صاحب اس مرتبہ آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے اس کا شانہ تھپکتے ہیں اور حسبِ حال خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

خاوندوں اور بیویوں کی اس بستی میں سال ڈیڑھ سال میں کئی گھروں میں ننھے پھول کھل چکے تھے مگر ان کی جیون پھلواری میں بھولے سے بھی کسی کونپل نے سر نہیں اُٹھایا تھا' وہی چودہ پندرہ برس خزاں سی کیفیت ٹھنڈی ہوئی تھی جبکہ مرشد کے ڈیرے حاضری پکی نذر نیاز بھی قائم تھی...... عقیدت کی حنا کا رنگ بھی پکا چڑھا ہوا تھا......شب و روز کی خدمت نوکری اپنے عروج پہ تھی۔ یہی اُمید کہ کب مرشد کرم فرمائیں؟...... بیوی نے جب اگلے ماگھ پوہ پھاگن بھی جب خالی نکلتے دیکھے تو پھر تنگی بولی۔

''اَب یہ دن رات کی نوکری چھوڑ دو ایسے پیر فقیر مرشد کا کیا فائدہ جو اپنے مرید کے کسی کام نہ آ سکے۔ سچا پیر فقیر تو وہ ہوتا ہے جو اپنے مریدوں کی مَن مرادیں پوری کرے۔'' اس قسم کی چند ایک اور کھری کھری باتیں سُنا کر اُس نے خاوند کو آخری بار پیر صاحب کے پاس بھیجا کہ اگر اگلے دو تین چاند پیٹ میں بچہ نہ پڑا تو پیر صاحب سے اجازت ہی لے لیں۔ ایسے حکیم وید کا کیا فائدہ جس کے ہاں درد کی دوا نہ ہو...... خال خال خاوند بیچارہ بھلا کیا بولتا وہ تو غریب محض پیادہ تھا...... بادشاہ سلامت کے رُوبرو بچھا رہے یا ملکہ عالیہ کے پیچھے پرچھاواں بنا رہے...... اُسے اپنی حیثیت کا اِدراک ہوتا ہے۔''

مرشد کے پاؤں پڑ گڑگڑایا' سرکار! مَیں تو جیسے تیسے صبر کر لیتا مگر میری جورو بڑی اُندھر عقل ہے پھر ساری بات چیت جو میاں بیوی کے مابین ہوئی' مِن و عَن رُوبرو رکھ دی اور ساتھ ہی عرض گزاری۔

''حضرت! میری بھی خواہش ہے کہ اللہ پاک ہمیں اَولادِ نرینہ سے نوازے۔ اپنے پرایوں کے طعنے اور بول سہہ سہہ کر باولا ہو چکا ہوں...... گھر کے بھڑولے رزق اَناج سے اَٹے پڑے ہیں' سنسان آنگن میں چڑیاں تک نہیں اُترتیں' ہوائیں آہیں بھرتی رہتی ہیں...... چھتنار آم کے پیڑ پہ بُور لگتا ہے' کوئل بینختی ہے اور نہ کبھی کسی نے جھولا ڈالا ہے۔ ایسی اُجاڑ بستی میں اگر ایک پھول کھل جائے تو بہار آ جائے۔'' اَب مرشد کے پاؤں مضبوطی سے پکڑ کر بڑی آزردگی سے بولا۔ ''میری گھر والی نے بڑی بے عقلی سے مجھے کہا ہے اگر پیر صاحب اپنے مریدوں کی کوئی مراد پوری نہیں کر سکتے تو کیا فائدہ؟ اگر تھان کے بچھوں بچھیوں پہ ہی ہاتھ لنڈانی ہے تو کسی کے آستانے جانے کی کیا حاجت... پیر' بچہ نہ گواوے تے کیہہ فائدہ؟

پیر صاحب! خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے خوب سُنتے رہے۔''

بندہ عقل والا ہو یا عقل کا دُشمن' جب کچھ بھلی بُری سُنانے پہ آئے تو خوب سُنو...... اُسے اپنے اندر کی بھڑاس نکالنے دو' اس طرح کہہ کہت کر کے وہ اپنی آتما ٹھنڈی کر لیتا ہے اور جب بھڑکتی آگ شانت اور

چنگاریوں کا چنچل پنا ختم ہو جاتا ہے تو پھر تیاؤ میں شرت پیدا ہوتی ہے ...... پیر صاحب بھی اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے کہ محرومیوں کا شکار تقسیم میں ناانصافی کا شاکی تشنہ لب اور خالی پیٹ انسان کے پاس بچے کھچے آنسو آہیں فریادیں اور یا پھر بڑی خطرناک قسم کی خاموشی جسے آپ مجبوری کی حد کا صبر بھی کہہ سکتے ہیں ہی ہوتے ہیں ...... اور جب کہیں اپنی یہ پونجیاں بھی گنوا یا لٹا چکتا ہے تو پھر اس کا باغی یا پاگل ہو جانا کچھ بعید از قیاس نہیں ہوتا؟ کچھ فقیری ملنگی بھی اختیار کر لیتے ہیں ایسے افراد پھر کسی حد بند کے نہیں ہوتے ...!

پیر صاحب چونکہ اس کی علمی اور فکری سطح سے واقف تھے لہٰذا انہوں نے اسی کے مطابق اُسے سمجھانا شروع کیا کہ ہر انسان اپنے مقدر اور اعمال کے راستے پہ چلتا ہوا اپنے اچھے یا برے انجام تک پہنچتا ہے۔ اُس کا رزق پانی عزت ذلت زندگی موت اہل و عیال کا نوشتہ اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اب بندہ اسی نوشتۂ تقدیر کے مطابق ہی زندگی بسر کرتا ہے ...... رزق کی بانٹ کی طرح اولاد کی بانٹ بھی مقرر ہوتی ہے۔ رزق کے معنی محض اُن اناج پھل ترکاریاں ہی نہیں آپ کے اہل و عیال مال مویشی کھیت کھلیانے نوکر چاکر حتیٰ کہ آپ کا علم و ہنر اور زندگی بھی رزق کی ذیل میں آتے ہیں ...... اہل و عیال یعنی بیوی بچے بھی چونکہ رزق ہیں اس لیے تقسیم میں ہیں اس خدائی تقسیم میں جتنا جسے مل گیا وہی اُس کا نصیب ہے۔ پیر صاحب نے کہا!

میں نے جہاں تک دیکھا یہی نظر آیا کہ تمہاری تقسیم میں اولاد نہیں ہے۔ "اللہ کی تقسیم میں یقیناً کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔ مصلحت کے مطلب وہ سلامتی جو بظاہر سمجھ نہیں آتی مگر دیر بدیر کہیں نہ کہیں اُس میں خیر چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ہم محض اُن عطاؤں کو ہی نعمتیں گردانتے ہیں جو ہمارے لیے تقویت مسرت اور افادیت کا سامان مہیا کرتی دکھائی دیتی ہیں جبکہ محرومیاں بیماریاں ناآسودگیاں اور رسوائیاں بھی بہت بڑی نعمتیں ہوتی ہیں ...... اُس بڑے حکیم نے کہیں سخت میں نرم کہیں ٹھنڈے میں گرم ...... شیرینی میں تلخی سیاہ میں سپید اور موت میں حیات وغیرہ یوں شیر و شکر کر رکھے ہیں کہ حضرت انسان اپنی بودی اور محدود عقل و دانش سے اُنہیں سمجھ نہیں پاتا اور بے صبری کا مظاہرہ شروع کر دیتا ہے ......!

پیر صاحب نے بڑی رسائی سے اُسے قضا و قدر کا فلسفہ سمجھایا راضی برضا رہنے کی برکتیں بتائیں ...... مگر سب کچھ بے سود گیا۔ وہ مورکھ بس ایک رٹ لگائے رہا کہ آپ اللہ والے ہیں سب کچھ کر سکتے ہیں صرف ایک بیٹا لے دیں۔ اس برس اگر ایسا نہ ہوا تو بیوی نہ صرف گھر سے نکال دے گی بلکہ مجھے نامرد مشہور کر دے گی۔ آپ تو جانتے ہیں شیرنی کی گود ہری نہ ہو تو گیدڑ لکڑ بگھے شیر کا جنگل میں منہ کالا کرتے پھرتے ہیں ...... شیرنی کے کانوں میں اُلٹی سیدھی ڈال کر اُس کو ورغلاتے ہیں ...... وہ پاؤں پہ سر رکھتے ہوئے فریادی ہوا۔

"موتیوں والیو! بس اِک چھوٹا سا بچہ ......!"

پیر صاحب نے زچ ہو کر بمشکل اُس کا سر پرے ہٹاتے ہوئے' اگلے روز بیوی سمیت حاضر ہونے کا حکم دیا۔ مُرید' خوشی خوشی گھر چلا گیا۔''

پیروں فقیروں درویشوں کے پاس تین طرح کی مخلوق آتی ہے۔ زیادہ تر دُنیاوی مادی معاملات میں پھنسے ہوئے لوگ' مثلاً کاروبار' من پسند شادی بیاہ' بیرونِ ملک جانے کے خواہشمند' بیماری' تنگدستی' عشق معشوقی' مقدموں کے چکر میں پھنسے ہوئے ...... کسی کی اچھائی بُرائی کے لیے تعویذوں' گنڈوں کے طلبگار وغیرہ۔ دوسری قسم' معدودے چند وُہ انفاس جو علمِ دین' رُوحانیت' تصوّف' سلوک و معرفت یا دیگر ارضی افلاکی عُلوم جاننے سیکھنے کے مقصد سے آتے ہیں...... باقی رہی تیسری قسم تو وہ اُن ستم ظریفوں کی ہے جنہیں میں اپنی زبان میں ''رُوحانی بھونڈ'' کہتا ہوں اُنہیں صرف پیر فقیر درویش چکھنے' دیکھنے اور اُنہیں ٹیسٹ کرنے کا چسکا ہوتا ہے...... جہاں اُنہیں کوئی ابنارمل سی حالت میں کوئی مردِ مجہول دکھائی دیتا ہے یہ اُس کے دوالے ہو جاتے ہیں۔ مختلف زاویوں سے اِسے دیکھتے ہیں۔ اس میں کچھ ہو یا نہ ہو لیکن یہ کوئی نہ کوئی کرامت' فیض' اُونچ سی حرکت برکت دریافت کر کے ہی دَم لیتے ہیں۔ جیسے شاہد باز ہوتے ہیں کہ اپنا یا بیگانہ کوئی اِن کی بدنظری سے بچ کر نہیں نکل سکتا......؟

اِس مُرید کا تعلق قسمِ اوّل سے تھا وہ پیر صاحب سے اولاد حاصل کرنے کی خاطر ہی جُڑا تھا۔

اگلے روز وہی مُرید اپنی بیوی اور اچھے خاصے نذرانے کے ساتھ حاضر ہو گیا...... پیر صاحب نے کچھ دیر بعد خلوت میں اُنہیں طلب کر لیا۔ بیوی جوان خوبصورت تھی ایسی عورتیں اکثر بیوقوف اور پھوہڑ ہوتی ہیں۔ پیر صاحب نے اپنی باطنی آنکھ سے اُسے دیکھا اور بڑے قرینے سے اُسے بتایا کہ آپ کے شوہر کے مقسوموں میں اولاد کا خانہ خالی ہے یقیناً اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت ہے لہٰذا آپ میاں بیوی اللہ کی رضا پہ راضی رہیں یا اگر زیادہ ہی اولاد کا شوق ہے تو کوئی بچہ بچّی گود لے لیں......!

اِس مشورہ پہ خاوند کی بجائے بیوی چہکی۔

''پیر جی! آپ اللہ کے پیارے ہیں۔ آج کل اپنے نہیں بنتے' دوسروں کے بچے کہاں کوئی پالتا رہے' بچہ وہی جو ماں کے دُودھ کی چھتیس دھاروں کی لاج رکھے...... دُعا' عمل کر کے رب پیارے سے ایک بچہ لے دیں۔''

پیر صاحب سمجھ گئے تھے اِن بے وقوفوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے پھر بھی اُنہوں نے آخری کوشش کے طور پر اُنہیں کھول کر سب کچھ سمجھایا مگر جہاں عقل پہ پتھر پڑے ہوئے ہوں وہاں وُہی ڈھاک کے تین پات ہوتے ہیں۔ آخر پیر صاحب نے ہاتھ اُٹھائے دُعا کی اور اُنہیں گھر بھیج دیا۔

خدا کا کرنا کہ اگلے برس ان کے ہاں ایک تندرست و توانا بچے نے جنم لیا۔ چاروں اور دھوم مچ گئی' جس نے بھی سنا' خوش ہوا کہ چلو ان اولاد کے لیے ترسے ہوؤں کو بھی آل آسرا ملا۔ ساتھ ساتھ پیر صاحب کی کرامت بھی آسمان پہ چڑھ گئی تھی' اُن کی آن بان شان میں شیرینی پڑ گئی...... مبارک سلامت' مٹھائیاں ڈھول تاشے' بھانڈ مراثی صدقہ خیرات...... یہ سب کیوں نہ ہوتا کہ نومولود کے والدین آسودہ حال اور شاداں و فرحاں تھے۔''

موسم خوشگوار ہو تو پیاروں' بیقراروں کو تسکین تسلی ملتی ہے۔ آرزوؤں کی شاخساروں پہ کھلے غنچوں کی مہک بڑی رُوح پرور ہوتی ہے...... اِن کے آنگن میں بہار اتری ہوئی تھی...... مہینے وصل کے بڑی عجلت میں ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہونہار بروا نے ہاتھ پاؤں نکال لیئے تھے۔ پالنے میں تو وہ بمشکل دو چار ماہ رہا ہوگا۔ اُس کا اَب پالنا' وسیع و عریض صحن' برآمدہ دالان وغیرہ تھے جدھر وہ مرغیوں' چوزوں اور بطخ کے بچوں سے کھیلتا رہتا۔''

ایک روز کھیلتے کھیلتے اس کے ننھے منے مگر مضبوط گرفت والے ہاتھوں کی زد میں آ کر دو چوزے اپنے انجام کو پہنچ گئے' جسے محض اتفاق سمجھ لیا گیا...... کچھ اُچھل سے دن اور آگے سرکے تو اس خونخوار بچے نے ایک دہشت ناک قسم کا منظر دکھایا...... صحن کے ایک حصہ میں کچی دیوار کے ساتھ مویشیوں کی کھرلیاں بنی ہوئی تھیں' ساتھ والے برآمدے کی کوٹھڑی میں توڑی' خشک چارا اور دیگر زرعی آلات پڑے ہوئے تھے۔ یہ حضرت کہیں لڑھکتے گھسٹتے اِدھر پہنچ گئے' یہیں کہیں سے ایک قسمت کا مارا ہوا کالا بھجنگ سانپ شوکارتا ہوا نکل آیا...... خدا جانے وہ بدنصیب اِس کے ہاتھ کیسے لگ گیا......؟

اُس کی ماں' اسے کسی موٹی سی کالی شے سے گتھم گتھا دیکھ کر بھاگی بھاگی ادھر پہنچی' دیکھا کہ ایک لمبے سے مارسیاہ کی گردن' اِس کے پنجے میں پھنسی ہوئی ہے۔ سانپ نے اس کے جسم کے گرد بل کسا ہوا ہے۔ یہ حال دیکھ کر اس کی ماں دوہتھڑ چیخی...... واویلے سے آس پاس اکٹھا کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈانگ سوٹے لیے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اَب کسی کی جراٴت نہیں کہ آگے بڑھ کر بچے کو خوفناک سانپ کے لپیٹے سے آزاد کرائے۔ اُدھر بچے کی یہ حالت کہ جیسے اُس نے سانپ نہ پکڑ رکھا ہو کسی کھلونے سے دل بہلا رہا ہو...... سانپ کا حلق اُس کے پنجے میں کسا ہوا انتہائی بے بسی کی حالت میں بچے کے گرد لپیٹا ڈال کر آزاد ہونا چاہتا تھا۔ سامنے کھڑے مرد و زن تماشا تو دیکھ رہے ہیں مگر آگے بڑھ کر کوئی کارروائی کرنے سے اجتناب بھی برت رہے ہیں کہ بچے کو سانپ سے کوئی آزار نہ پہنچے...... بچے کا باپ گھر پہ موجود نہ تھا' اپنے کھیتوں پہ تھا۔ کوئی بھاگم بھاگ اُس کو خبر کر آیا مگر اُس کے گھر پہنچتے پہنچتے سانپ' اِک گُتے کی موت مر چکا تھا۔ اردگرد کے علاقہ میں یہ عجیب و غریب

اَنہونا سا واقعہ آگ کی مانند پھیل گیا۔ لوگ باگ مرے ہوئے سانپ اور ٹارزن ٹائپ بچے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھ رہے تھے۔ باپ نے آگے بڑھ کر بڑے فخر سے بچے کو اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ صدقہ کا بکرا کٹا' خیر خیرات ہوئی۔

اَب تو جیسے یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ مرغیاں' بکری کا بچہ' بلخ...... یہاں تک کہ ایک اچھی خاصی صحت مند بلّی بھی جب اس کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی تو ماں باپ کے علاوہ اردگرد کے لوگوں میں تشویش کی اِک لہر دوڑ گئی۔ لوگ دَبی دَبی زبان میں اِسے خونی بچہ کہنے لگے' کچھ اسے بالا کو خان کہہ کر بھی چھیڑنے لگے۔

اَب ماں باپ نے اس پہ خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔ پر کیا کیجئے کہ جیسے گا بھن گائے ''سو'' کر رہتی ہے ایسے ہی ہونی بھی ہو کر رہتی ہے۔ ماں کی کڑی نگہداشت نے اِسے خاصا محدود کر دیا تھا۔ مرغیاں' بلّیاں' کبوترے حتیٰ کہ کوّے چیلیں تو ہے بھی اس کی بُو پا کر اس کی دسترس سے دُور رہ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے اس طرح' اس پہ جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی...... کسی اور چیز پہ بس نہ چلتا تو چھوٹی موٹی توڑ پھوڑ شروع کر دیتا...... پانی کا گھڑا لڑھکا دیا' کپڑے پھاڑ دیئے' ہنڈیا اُلٹ دی' ایک بار تو ماں کو ایسا کاٹا کہ وہ بلبلا اُٹھی......

غرضیکہ دن بدن اس کی وحشت' بربریت' جھنجلاہٹ میں اضافہ ہوتا گیا...... ایک وقت آیا کہ اس کے گھر بچوں وچوں نے ڈر کے مارے آنا چھوڑ دیا۔ اس کے گھر کا نام ہی خونی بچے کا گھر پڑ گیا۔''

وقت کا سورج کچھ آگے سرک آیا تھا...... وہ بمشکل سات برس کا ہوگا کہ اُس نے پہلی واردات اپنے ایک ہم عمر پہ نہر میں نہاتے ہوئے ڈالی' کسی بات پہ تُو تکار ہوگئی نتیجہ میں خونی بچے نے اُسے دو چار ڈبکیاں دے دیں...... وہ بیچارہ پھر دوبارہ اُبھر کر اوپر نہ آیا...... اچھا ہُوا یا بُرا کہ اس وقت کسی نے اِسے ڈبکیاں دیتے نہیں دیکھا...... چل سو چل' پہلے چھوٹی موٹی چوریاں شروع کیں...... لڑائی بھڑائی تو روز مرہ تھی۔ اَب باقاعدہ وارداتیں بھی ڈالنی شروع کیں...... ماں باپ اس کے لچھن دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر ہلکا ہو رہے تھے کہ الٰہی! کس عفریت سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ اِسے آنکھوں کی ٹھنڈک کے طور اللہ سے مانگا تھا مگر یہ تو آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھنے لگا ہے۔ پیار' ڈانٹ' پھٹکار' ترلے واسطے کچھ بھی تو اس پہ اثر انداز نہ ہوتے......''

اِنسان کے لیے جب سارے نظر آنے والے راستے' دروازے کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں تو پھر وہ آسمان جانب ہاتھ اُٹھائے' اُس کی جانب دیکھتا ہے...... جو نیتوں کو جانتا ہے' قلب و اذہان میں موجزن کیفیتوں کو پہچانتا ہے...... اُس سے سر پڑی اُفتاد سے نجات کی فریاد کرتا ہے۔

فرمایا گیا کہ اِنسان' نسیان' تلوّن' جلد بازی اور خود غرضی کے امراض میں مبتلا رہتا ہے اور یہ امراض اُسے کہیں کا نہیں چھوڑتے جبکہ نصیب' تقدیر اور مقسوموں کے معاملہ میں راضی برضا رہنا ہی عافیت ہے......!

اُنیس برس کے بن تک وہ تین چار قتل اور بے شمار چوری ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث ہو چکا تھا۔ قانون کی انتہائی مطلوبہ افراد کی لسٹ پہ اُس کا نام تھا...... اشتہاری ہونے کے ٹھیک آٹھ ماہ بعد جب اُس کی گرفتاری عمل میں آئی تو متعدد مقدمات میں وُہ مطلوب تھا...... قصّہ مختصر مقدمہ چلا تو اُسے پھانسی کی سزا ہو گئی...... اپیلیں ہُوئیں لیکن سزا بحال ہی رہی۔

پھانسی کے کچھ روز پہلے اُس کی غم زدہ ماں' جو وقت سے پہلے ہی بوڑھی' لاغر اور جواں سال بیٹے کے غم میں نڈھال ہو چکی تھی۔ شرمندہ شرمندہ سی خاوند سے کہنے لگی۔

"اللہ کے بندے' تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے دل پہ کیا بیت رہی ہے۔ مَیں زندہ درگور ہو گئی ہوں...... میرا لختِ جگر' تمہارا نورِ العین کچھ دنوں بعد پھانسی پہ لٹکا دیا جائے گا۔ ہماری دُنیا اندھیر ہو جائے گی۔ ہو سکے تو کچھ چارہ کرو...... اپیل کرو' سب کچھ بیچ باچ کر اُس پہ لگا دو جیسے بھی ہو اُسے پھانسی سے بچا لو!"

خاوند نے انتہائی آزردگی اور مایوسی سے جواب دیا۔

"بھلی لوگ ہر طرح کا چارہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ کہیں کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی...... پھانسی کے آرڈر نکل چکے ہیں۔ بس ایک آدھ روز میں آخری ملاقات کی اطلاع ملنے والی ہے۔"

بیوی کو جیسے دُور کہیں معدوم سی جھلملاتی روشنی کی کرن دکھائی دی...... چمک کر بولی۔

"سنو! اپنے مُرشد کے قدم پکڑ لو...... جب تک بچے کی جان نہ بچے وہاں سے مت ہٹو...... اُن کی دُعا سے یہ عطا ہُوا تھا' مجھے یقین ہے کہ اَب بھی اُن کی دُعا سے ہی یہ رہا بھی ہو گا۔"

خاوند نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر اپنی کی ہی منوانے والی بیوی نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے حکم دیا۔

"کچھ مت کہنا...... اُٹھو فوراً پہنچو۔ پتر کی زندگی کی خوشخبری لے کر ہی واپس منہ دکھانا۔"

خاوند سمجھتا تھا کہ یہاں بحث کرنا فضول ہے...... اُٹھا اور اُسی حال مُرشد خانے پہنچا۔ قدم پکڑ کر سارا احوال کہہ سُنایا۔

اُدھر ایک شانت سمندر تھا کہ کہیں ہلکا سا ارتعاش تک پیدا نہ ہُوا...... جیسے کچھ سُن بُن ہی نہیں رہے تھے...... دُوبارہ عرض گزاری تو ہونٹوں پہ ہلکی سی جنبش ہوئی' بڑی بردباری سے فرمایا۔

"بیٹا! ہر حرکت اپنی حد میں ہوتی ہے' حد سے باہر ہو جائے تو مکافاتِ حرکت بن جاتی ہے...... مقسوموں کا لکھا تو جیسے تیسے' کچھ سے کچھ ہو ہی جاتا ہو گا مگر مکافاتِ عمل نہیں ٹلتے...... لمبا عرصہ قبل جب تم اَولاد کے لیے آئے تھے تو مَیں نے تمہیں ہر بات صاف صاف کھول کر بتا دی تھی کہ راضی برضا رہنا ہی اصل عبدیت

وغیرہ ہیت ہے۔ جب عبداللہ نیا' تسلیم ورضا کی نفی کر کے اپنی من مانی پہ بضد رہتا ہے یا کسی اللہ کے پیارے بندے کو درمیان میں لا اپنی بات منواتا ہے تو وہ پھر مشیتِ ایزدی کے حصار سے تجاوز لے لیتا ہے۔ اس طرح وُہ اپنی ذمہ داری پہ مکافاتِ کار کے رَویّوں کے حوالے ہو جاتا ہے۔ اس مقام پہ پھر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔۔۔!''

آخری ملاقات پہ ماں نے بُری طرح دو ہتھڑ چیخیں دھاڑیں لگائیں کہ اس بڑھاپے میں بیٹے پہ کیا کاری زخم لگا ہے اس سے تو کہیں بہتر تھا یہ پیدا ہی نہ ہوتا' اس سے تو ہم لاولد ہی بھلے تھے۔ باپ سمجھدار تھا' رویا نہ واویلا کیا نہ بیہوش ہُوا۔ پاس کھڑا ٹک ٹک بیٹے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا یہی وُہ راز ہے جو قدرت نے پردے میں رکھا ہُوا ہے۔۔۔۔ ہاں' کسی کے نصیب میں ہو تو کسی مُرشدِ کامل کے توسط سے کچھ عشرِ عشیر سمجھا جا سکتا ہے۔ وُہ راز ہے تسلیم ورضا یعنی راضی برضا رہنا۔!

## ● دیوانہ تو کیا چیز ہے صحرا نہ رہے گا۔۔۔۔۔!

میرا ایک عقیدتمند بچہ' جس کے پُرانے لائل پور میں کپڑے کے کارخانے تھے۔ اپنے صنعتکار باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چونکہ مُنہ میں سونے کا چمچہ لے کر' چار بہنوں کے اُوپر پیدا ہُوا اس لیے بڑا گھمنڈی' شاہ مزاج اور کسی حد تک نرگسیت لیے ہوئے بھی تھا۔ میرے ساتھ اُس کے تعلقات بھی کچھ عجیب سی نوعیت کے تھے جنھیں آپ نہ تو کوئی رُوحانی جُڑت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی دُنیاوی' کہ اس کے ہاں دُنیا ہی دُنیا تھی۔۔۔۔۔ جو چاہتا اُسے حاصل کرنے میں کوئی دُشواری نہ تھی۔۔۔۔ لیکن کچھ اشیاء ایسی بھی ہوتی ہیں جو معمولی ہونے کے باوجود بھی حاصل نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی کسی بھی قیمت پہ اُسے خریدا جا سکتا ہے۔؟

ایسا شہزادہ کہ جسے یہ زُعم اور احساس بھی ہو کہ وہ اپنے زرِ زور رائج' ذہانت اور اپنی مردانہ جمالی خُوبیوں سے ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔ اب اگر وہ کسی عام سی چیز کے حصول کو اپنی اَنا اور وقار کا سوال بنا لے تو تعجب کے ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے کہ بندہ محض اپنی اَتھلی سی تسکین کی خاطر اپنی شخصی توانائیوں کو کس جہالت سے ضائع کر رہا ہے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوبرو جوان آصف صفی کی منگنی' اُس کی اپنی اور گھر والوں کی خواہش اور پسند کے مطابق طے ہو چکی تھی۔ منگیتر انگلینڈ میں اپنی تعلیم کے آخری سال میں تھی جس کے بعد ان کی شادی متوقع تھی۔۔۔۔۔ اس کی خالہ کی یہ بیٹی بڑی حسین' طرحدار اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی شائق تھی۔۔۔۔ آپس میں کزن

تھے' ساتھ کھیلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ شادی بھی دونوں کی پسند سے طے ہوئی...... درمیان میں غیریت یا تکلف نہ تھا' ٹیلیفون پہ پہروں باتیں ہوتیں...... جن میں مستقبل کے بڑے بڑے خوبصورت منصوبے' مختلف ملکوں میں تفریحی دورے' بچوں کے نام...... کیا کچھ نہ ہوتا ان دیوانوں کی باتوں میں......؟

سیانے کہتے ہیں کسی بھی کام پروگرام' تعلق یا منصوبے میں خوش فہمی کا زیادہ عنصر نہیں ہونا چاہئے۔ اکثر ایسا ہی ہوا ہے کہ جہاں اپنے خوش آئند اندازوں' توقعات' خوش گمانیوں اور اُمیدوں کی وابستگی زیادہ ہوتی ہے وہیں کام بگڑنے کا خدشہ بھی دوچند ہو جاتا ہے۔ شاید چشم فلک اپنے سائے تلے کسی کو اِک حد سے زیادہ شاداں فرحاں نہیں دیکھ سکتی...... یعنی اتنا زیادہ وہ نہ ہنسو کہ آنسو نکل پڑیں۔

اِس لائل پوری شہزادے سے میری ملاقات بڑی طلسماتی سی تھی...... (میرے ساتھ ہر کسی کی پہلی ملاقات طلسماتی ہی ہوتی ہے) بندے کے مُنہ میں جتنے دانت ہوتے ہیں اُتنے ہزار فٹ کی بلندی پہ کسی خرم سرا کی مانند سجے' پُرآسائش اپارٹمنٹ میں' آدھی رات سے اگر آپ کی اچانک ملاقات کسی کوہ قاف کے شہزادے سے ہو جائے تو آپ کیا اِسے طلسماتی ملاقات نہیں کہیں گے۔؟

پی آئی اے کا نیوی بلیو اور سکائی بلیو رنگ کا شاندار جیٹ دیوہیکل طیارہ' ملے جُلے' مسافروں کو گود میں بھرے کراچی کی جانب محوِ پرواز تھا...... اڑھائی سو سے بھی کم مسافروں کو جہاز میں سہولت دی گئی تھی کہ وہ اپنی پسند کی خالی سیٹوں پہ بیٹھ یا لیٹ سکتے ہیں...... رات بھر کا سفر' مسافر کھاپی کر اضافی نشستوں پہ مزے سے دراز ہو گئے تھے۔ ہلکی نیلی روشنی میں ماحول نہایا ہوا تھا۔

اپنی اپنی طبیعت عادت' کچھ لوگ لیٹتے ہی خراٹے توڑنے لگتے ہیں۔ سر پہ کھڑے ڈھول بجاؤ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی اور کوئی مجھ سا ایسے رات کے جانور کہ جن کی پوری آنکھیں ہی رات کو کھلتی ہیں...... پلک سے پلک جڑنے کا نام اگر نیند ہے تو شاید مَیں بھی کچھ دیر سو جاتا ہوں گا لیکن اِس طرح کہ دل و دماغ کے دریچے پوری طرح وا رہتے ہیں۔ سر کا اک ایک رُوم بلند آہنگ میں "جاگتے رہو" کے آوازے لگا تا رہتا ہے۔ "سیاہ رات' ہوائی جہاز کا طویل سفر' ہوائی اڈے' اکیلے لمبی ڈرائیونگ' انتظار گاہیں' اللہ میاں کے قریب بلند و بالا ہوٹلوں کے چپ چپ کرتے کھلے سمندروں میں بھیگے بھیگے سفر۔ یہ سب عذاب! میرے جگراتوں کی تہذیب کرتے ہیں۔"

یہ ہوائی سفر بھی میرا اِسی نوع کا تھا...... لندن ہیتھرو سے کراچی' براستہ اِستنبول گیارہ بارہ گھنٹوں پہ مبنی سفر بظاہر اک اُکتا دینے والا دکھائی دیتا ہے مگر مَیں شاید واحد مسافر تھا جس کی خواہش تھی کہ یہ سفر مزید طویل تر ہو کیونکہ جہاز کے اندر ایک سحر انگیز ماحول تھا۔ مسافر سوئے ہوئے' انجنوں کی مسحور کن ہلکی ہلکی آواز...... مدھم

سی خواب آگیں روشنی' فضائی میزبان بھی اپنی مخصوص نشستوں پہ نیم خوابیدہ تھے...... مَیں جہاز کی دُم میں آخری دوسیٹوں پہ آ ٹھ دس تکیے' جمائے بیٹھا لکھ رہا تھا۔ میری پُشت پہ واش رُوم اور اُس کے پیچھے شاید کچن تھا۔ یہ "پس ماندہ" اور بے کشش سی نشست' میرا اوّلین اِنتخاب اس لیے ہوتی ہے کہ واش رُوم پاس ہی ہوتا ہے اور کچن رُوم بھی...... یہ بُنیادی ضرورتیں اگر آپ کے دائرہ اختیار میں ہوں تو بہت سی آسانیاں آپ کے قریب ہو جاتی ہیں اس کے علاوہ جو بہت اہم سہولت جو مجھے میسر ہوتی ہے وُہ یہ کہ سب میری نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور میں کسی کو دکھائی نہیں دیتا...... ایک اور وجہ بھی کہ مَیں رات کو سو نہیں سکتا کہ مجھے لکھنا پڑھنا ہوتا ہے اور پڑھنے کے لیے باہر روشنی اور اندر تاریکی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سب کچھ سب سے پیچھے رہ کر ہی حاصل سکتا ہے......!

بی او اے سی کی پاکستان کے لیے ہر فلائٹ میں کم سے کم دو تین پاکستانی ائیر ہوسٹس ضروری ہوتیں کہ مسافروں کی اکثریت پاکستانیوں کی ہوتی تھی۔ پاکستانی میزبان خواتین اُن کی زبان میں اُن کی ضروریات دریافت کرتیں۔ اس طرح مسافروں' خاص کی خواتین' بچوں کے لیے بڑے سہولت تھی...... یہاں بھی ایک بھلی سی پاکستانی میزبان خاتون نے مجھے کوئی پیر فقیر یا عامل کامل جان کر بڑا خیال رکھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد وُہ مسکراتے ہوئے چائے کافی کا پوچھتی۔ پانی کی بوتل' فاضل کاغذی رومال' کچھ پھل بھی خصوصی طور پہ لاکر میرے پاس رکھ دیے تھے اور یہ بھی کہا کہ مَیں اُس کے لیے خصوصی دُعا کروں کہ اُس کے بہن بھائی اپنی تعلیم مکمل کر کے کوئی مقام حاصل کر سکیں؟

یہ وہ زمانہ تھا جب مَیں "پیا رنگ کالا" کے اِبتدائی باب تحریر کر رہا تھا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ کتاب لگ بھگ نو دس برس میں لکھی گئی تھی۔ کئی ممالک' لاتعداد فضائی' سمندری' زمینی اور کوہستانی صحرائی سفر درمیان میں تھے...... اور کیا کچھ ہُوا' شاید یہ لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں......؟

مَیں اپنی نشست پہ دھنسا' کہیں حرفوں لفظوں کے پھیر میں پڑا ہُوا تھا کہ سُبک قدمی سے کہیں وُہی ائیر ہوسٹس بچی میرے پاس آئی' مداخلت کی معذرت چاہی' مسکراتے ہوئے ایک خوبصورت سا وزیٹنگ کارڈ اور تہہ کیا ہُوا ایک دبیز ورق میرے سامنے کھانے کی کھلی میز پہ دھرتے ہوئے کہنے لگی......!

"بابا جی! فرسٹ کلاس میں بڑی پُروجاہت اور دلآویز شخصیت کے مالک ایک مسافر نے مجھ سے انتہائی دردمندی سے دَرخواست کی ہے کہ آپ جناب تک یہ کارڈ اور رُقعہ پہنچا دوں...... گو یہ میرے فرائض میں شامل نہیں لیکن نہ جانے کیا ہُوا کہ مَیں اِنکار نہ کر سکی۔" وہ مزید کسی ضرورت کا پُوچھ کر رُخصت ہو چکی تھی۔

مَیں چونکہ اپنے لکھنے کی بِپتا میں پھنسا ہُوا تھا...... اس لیے اُس کی بات' کان دھر کر نہیں سُن سکا۔ نگاہ اُٹھا کر سامنے دَھرے کارڈ اور رُقعہ کو دیکھا...... اُدھو میچڈے سے الفاظ بھی کانوں میں بھٹکتے سے سُنائی دیے......

''دلآویز شخصیت' دردمندی' فرسٹ کلاس'' وغیرہ وغیرہ...... بندہ تو بہت گندہ ہوتا ہے' اس میں بہت کمزوریاں خامیاں' برائیاں موجود ہوتی ہیں۔ وہ چاہے بزعم خود نیک پاک حاجی نمازی ہو یا شیخ عیب شرابی بدکار گنہگار...... سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں...... فرق صرف ظاہری حال حلیئے' طریقۂ واردات اور موقعہ و حالات کا ہوتا ہے۔ ایک گانے کے بول!

اس دُنیا میں سب چور چور' کوئی گٹھڑی چور کوئی پیسہ چور اور کوئی دل کا چور

کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ میں اپنے ظاہری حال حلیئے سے کوئی پہنچا ہُوا درویش بزرگ لگتا ہوں۔ میری ریش' زلفیں' انگوٹھیاں' مالائیں' سیاہ کپڑے اور سب سے بڑھ کر میری لچھے دار گفتگو' اُلجھی ہوئی تصوف کا رنگ لیے ہوئے باتیں...... یہ سب کچھ مل ملا کر دُوسروں کو بڑا متاثر کرتے ہیں...... آج کے ناآسودہ دَور میں پریشان حال لوگوں کو بس میرے جیسے دو نمبر کے درویش اور بہروپیئے ہی چاہئیں جو مذہب تصوف اور درویشی کے نام پہ انہیں کوئی تعویذ گنڈا' دُعا پھونک جھاڑ لگا کر پریشانیوں' بدحالیوں اور غربت کے عذابوں سے نجات دلا سکیں...... میں اکثر ایسے لوگوں پہ توجہ نہیں دیتا اور نہ ہی ایسے رقعوں' مخطوطوں کو پڑھتا ہوں کہ جب میں سوائے دُعا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تو کسی کو فریب دینے کا کیا جواز......؟

وہ رقعہ اور کارڈ وہیں سامنے کھانے کی ٹیبل پہ پڑے تھے...... میں انہیں پڑھنا تو در کنار' اُٹھا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں تو لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لینے والوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں جانتا تھا کوئی پریشان خاطر ''انگلینڈیا'' ہوگا...... کسی فیکٹری یا ریسٹورنٹ کا مالک' شراب پینے کی خاطر فرسٹ کلاس میں عیاشی کر رہا ہوگا؟ کم از کم پی او اے سی میں پینے پلانے کی خاصی سہولت رہتی ہے۔ پی آئی اے مذہب کی آڑ لے کر قدرے اجتناب برتتی ہے اور دیتی بھی ہے تو کنجوسی سے کہ نہ حلق تر ہوتا ہے اور نہ ہی سر پہ چڑھ کر بولتی ہے؟ یا پھر یہ رقعہ بھیجنے والا مغزخوروں کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوگا جو محض سفر کی بوریت دُور کرنے کی خاطر کسی ایسے اُلو کے پٹھے کی جستجو میں ہوتے ہیں جو مسلسل اُن کی بکواس سنتا اور برداشت کرتا رہے۔؟

بدقسمتی سے اگر میں سفر کے دوران کسی ایسے پاگل کے ہتھے چڑھ بھی جاؤں تو دو منٹ بعد میں آنکھیں جھوٹ موٹ چڑھا کر خراٹے توڑنا شروع کر دیتا ہوں اور اگر اس نسخے سے بھی دَو نہ ملے تو پھر اگلی تراکیب پہ عمل کرتا ہوں۔ جیسے میں کسی وِرد وظیفہ میں مصروف ہوں۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بھی بنا لیتا ہوں۔ ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کر خاموش رہنے کا بھی عندیہ دیتا ہوں۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے ٹوٹکے ہیں۔ جو سفر کے دوران' آپ کو غیر متعلق ساتھیوں کی جہالت اور اُن کی غیر پارلیمانی حرکات سے محفوظ رکھتے ہیں۔''

سفر کیسا بھی ہو' کتابیں رسالے' لکھنے پڑھنے کا دیگر مسالہ میرے سنگ ہوتا ہے۔ سفر دَوران پڑھنے

لکھنے کا اپنا ایک دُکھڑا ہی سواد ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کھڑکی سے مناظر سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ بیشتر تو سفر صرف سونے اُونگھنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ دفتری حساب کتاب دیکھتے ہیں۔ اور کچھ دوسروں کو پڑھتا دیکھ کر اُن سے اخبار کے بیچ کا صفحہ مار یا مانگنے کے لیے ہی سفر اختیار کرتے ہیں...... اُن کا لہجہ رویہ ایسا ہوتا جیسے وہ اپنا اُدھار مانگ رہے ہوں۔ پہلے پہل تو میں اُن کی جانب سے خود ہی خجل سا ہو کر پورا اخبار ہی اُن کی خدمت پیش کر دیتا تھا...... کیا مجال جو وہ سفر کے اختتام سے پہلے واپس کر دیں...... کیونکہ وہ اس قابل ہی نہ ہوتا' پوری بس یا کوچ میں تقسیم ہو چکا ہوتا۔ اس دُکھ سے تنگ آ کر میں نے بسوں میں سفر کرنا ہی چھوڑ دیا۔ تا بکہ! آخر ایک ترکیب سمجھ میں آئی...... میں دو تین اخبار ہاتھ میں پکڑ کر بڑے ٹھسے سے بس میں بیٹھتا' دوسری مُٹھی میں پانچ دس کے کچھ نوٹ ہوتے۔ بیٹھنے کے ٹھیک دس منٹ کے اندر اندر پیچھے آگے یا دائیں بائیں سے حسبِ دستور سالم اخبار یا بیچ کے صفحہ کی ڈیمانڈ آتی ہے' میں بڑی خوش خُلقی سے دریافت کرتا...... ''اخبار سالم چاہیے یا کچھ حصے بخرے؟...... پورے اخبار پہ میں پانچ روپے کا نوٹ اور بیچ کے صفحہ کے دو روپے پیش کر دیتا کہ باہر سے خرید لیں...... اس ترکیب سے میں اُس اذیت سے بچ لیتا جو اکثر میرا نصیب بنی رہتی۔''

میرے جیسے حال حلیہ کے لوگوں کا جو بُرا حال لوگ کرتے ہیں اُس کا شاید آپ کو اندازہ نہیں...... کوئی مخلص بزرگ پیر سمجھ کر ہاتھ ملائے گا بلکہ چُومے گا بھی...... دُعا برکت کے لیے کہے گا۔ کوئی ملنگ سادھو سنت سمجھ کر کسی چمتکار کے لیے بنتی کرے گا۔ کوئی نجومی قسمت کا حال بتانے والا' جان کر ہاتھ کھول کر آگے کر دے گا اور شادی' بچوں کا پوچھے گا۔''

اسی طرح سٹہ کا نمبر' لاٹری' پرچی والی کمیٹی' پرائز بونڈ کے نمبر وغیرہ بھی پُوچھنے والے بھی ملتے ہیں۔''

میں اکثر عقیدتمندوں کے خواب خیالوں میں بھی آتا ہوں جبکہ یہ سارا اُس ناقص غذا اور پانی کا خمیازہ ہوتا ہے جو وہ کھانے پینے پہ مجبور ہیں۔ میرے بارے ایک خوش فہمی یُوں بھی ہے کہ میری دُعائیں پوری ہوتی ہیں اور میرے مشورے صائب ہوتے ہیں۔ میرے رکھے ہوئے ناموں والے بچے ذہین' فرمانبردار' کامیاب اور دیندار ہوتے ہیں...... یعنی یہ کہ خُوش فہمیاں' خُوش تعلقیاں اور خُوش عقیدتی کیسے کیسے خُوش رنگ گُل کھلاتی ہیں......؟

جہاز اپنی رفتار سے ٹرکی کے سر بفلک پہاڑوں پہ سے گزر رہا تھا بہت ہی کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ اگر نیچے سمندر ہو تو جہاز کا مُوڈ کیسا ہوتا ہے۔ اسی طرح پہاڑ' جنگل' صحرا اور آبادی ہو تو اس آہنی پرندے کے رویّوں میں کیا کیا تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں' اس کا کیف یا کساد کیا ہوتا ہے؟ جیسے اگر نیچے سمندر یا جنگلات ہوں تو جہاز بڑے پُرسکون مُوڈ میں ہوتا ہے۔ انجنوں کے علاوہ اس کے اندرونی بیرونی تمام نظام نرم میں ہو جاتے ہیں۔ پٹرول کا کھاپا برائے نام سا رہ جاتا ہے۔ کیپٹن' جہاز کو اپنے ساتھی کے حوالے کر کے ٹانگیں

پھیلائے' آنکھوں پہ ٹوپی سرکائے' گھڑی دو گھڑی آرام کر لیتا ہے۔ ایئر ہوسٹس' میک اَپ فریش کر لیتی ہیں اور جہاز فضا کی بیکرانیوں میں ایک راج ہنس کی مانند سبک سبک سا تیرتا جاتا ہے۔''

میری آنکھیں یا جہاز کی کھڑکیاں کھلی ہوں یا کہ بند' میں اپنے نیچے کی لوکیشن سے خوب واقف ہوتا ہوں۔ ایک ایک شہر' جھیل' دریا' پہاڑ' صحرا' سمندر' جیسے میرے ساتھ ساتھ سرک رہے ہوتے ہیں۔ طلوع کا طمطراق' شفق کا شرف' اَبر کا ابریشم' قوسِ قزح' گھٹاؤں کی گھاتیں...... رعد کڑک چمک' بادلوں کی دھنکی ہوئی رُوئی...... دُوئی بھی یکسوئی' فطرت کے عجیب و غریب مظاہر' جو میرے ظاہر و باطن میں فنا و بقا کے فلسفے کو مزید فسوں خیز بنا دیتے ہیں۔

ایک ہلکا سا جھٹکا لے کر اس فسوں خیزی سے باہر نکلا تو دیکھا وہی میرے بارے میں خوش فہم ایئر ہوسٹس بچی' میری بائیں کھڑی میٹھی میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

مَیں نے خفیف سا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی بیٹا! کہو......؟''

''بابا جی! کسی چیز کی ضرورت......؟''

میرے پیار بھرے انکار پہ گویا ہوئی۔

''بابا جی! میرے خیال میں آپ نے ابھی تک اس کارڈ اور رقعہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا؟''

''ہاں بچی! تم دُرست کہتی ہو...... دراصل مجھے ایسی چیزیں دیکھنے سے کوئی رغبت نہیں...... یہ اندھی عقیدت اور فہمیدہ جہالت کے سندیسے ہیں' جن کا میرے پاس کوئی علاج نہیں...... سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا قول کچھ اس طرح سے ہے کہ مَیں اللہ کے امر سے مُردہ اجسام کو زندگی' اندھوں کو بینائی' کوڑھیوں کو توانائی تو دے سکتا ہوں مگر کسی جاہل احمق کو عقل و بینش دینا میرے بس سے باہر ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے قدرے جھجک کر بولی۔

''بابا جی! کوئی کیسا بھی ہو اگر آپ کی ہلکی سی توجہ سے اس کا کچھ سنور جاتا ہے تو کیا یہ آپ کی عطا اور فیض نہ ہوگا......؟''

مَیں چند لمحے اُس کی اس بات پہ غور اور مزہ لیتے ہوئے بولا۔

''بتاؤ' تم اصل میں کہنا کیا چاہتی ہو......؟''

''آپ اجازت دیں تو مَیں آپ کے پاس بیٹھ کر بات کروں؟''

مَیں نے اپنا کاٹھ کباڑ سمیٹتے ہوئے اُس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

''جب تم لوگ مجھے وق کرنے پہ تُل ہی گئے ہو تو بسم اللہ! تم میرے لیے ایک گرما گرم نیٹ بلیک کافی بنا کر لاؤ' ایسے میں مَیں واش رُوم کا پھیرا لگا آتا ہوں۔''

'بُڈھے' مسجد اور واش رُوم سے کچھ ایسے شتابی بھی نہیں نکلتے...... وہی جانیں کہ وہاں کیا کرتے ہیں؟ جو بھی ہو وہ یقیناً انسانی اور پیرانہ سالی کی بساط کے اندر ہی ہوتا ہوگا۔ مسجد سے تو وہ اُس وقت نکالے جاتے ہیں جب مولوی صاحب نے تالا لگا کر محلے میں ایک دو گھریلو ٹیوشن پڑھانے یا ختم فاتحہ پہ جانا ہوتا ہے۔ گھریلو بیت الخلا تو اُن کی اپنی جو ہوتی ہے' وہاں تو وہ دو چار ٹھونکے بھی لگا آتے ہیں۔ جہاز کی بیت الخلا سے انھیں میل اسٹاف ہی بمشکل برآمد کرواتا ہے اور بعد اَزاں گھنٹہ بھر صفائی اور ناگواریت دُور کرنے پہ صَرف ہوتا ہے لیکن مَیں ایسے خدائی خوار قسم کے 'بُڈھوں' میں سے نہیں ہوں۔ میرے بڑھاپے پہ تو ہزاروں جوانیاں قربان! مَیں یُوں گیا تھا اور یوں واپس آیا جیسے بیت الخلا والا کام کرنے نہیں' لیٹر بکس میں اپنی میل چیک کرنے گیا تھا۔''

وُہ بچی' میری سیٹ سے نیچے گرے پڑے چھوٹے چھوٹے تکیے اُٹھا رہی تھی۔ مجھے ایسی شتابی واپس آتے دیکھ کر حیران ہوئی...... مگر اُس کی ساری حیرانی آنکھوں میں تھی' چہرے پہ تو محض ہلکا ہلکا میک اَپ تھا...... میک اَپ میں لاکھ خُوبیاں اور خوبصورتیاں ہوں مگر چند بُرائیوں میں جو نمایاں بُرائی ہے وُہ یہ کہ نسوانی چہرے پہ لطیف جذبات و احساسات اور شرم و حیا کی باریک سی لہریں اور آتے جاتے رنگ کہیں دب کر رہ جاتے ہیں۔ نسائیت کہیں دُم دبا کر غائب ہو جاتی ہے۔ اندازہ ہُوا کہ نسائیت محض زنانہ اعضا اور خدوخال کا ہی نام نہیں' وہ تو آنکھ کی حیا اور چہرے پہ آتی جاتی گنگا جمنی رُتوں کی بسنت بہار کا نام بھی ہے۔

مَیں ونڈو کے پاس اپنی سیٹ پہ براجمان ہو گیا اور میری ساتھ والی سیٹ پہ ٹک سی گئی کہ اُنھیں کسی مسافر کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

''ہاں' کہیے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں......؟''

وہ قدرے مُتذبذب سی بتانے لگی۔

''وہ جہاز کے امتیازی حصّہ میں فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں...... فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے وی آئی پی ٹریٹمنٹ ہوتا ہے' ہمیں اُن کی چھوٹی سے چھوٹی بات پہ دھیان دینا پڑتا ہے...... اس ایئرویز کی پالیسی کے مطابق خاص طور پہ پاکستانی مسافروں کو پاکستانی ایئر ہوسٹس ہی ڈیل کرتی ہے۔ فرسٹ کلاس میں وُہ واحد پاکستانی مسافر ہیں...... ساٹھ سیٹوں میں سترہ سیٹیں ایک برٹش ڈیلیگیشن کے تصرف میں ہیں جو آگے نوز میں ذحت پڑے سو رہے ہیں۔ اٹھارویں سیٹ' جو شروع سے دوسری قطار میں ہے اس پہ یہ صاحب پچھلے ہوئے بے تحاشا شراب نوشی میں مصروف ہیں...... دو چار منٹ کے بعد وہ مجھے بُلانا اور کوئی نہ کوئی چیز طلب کرنا

ضروری سمجھتے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ ہمارا کام ہی یہی ہے مسافروں کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جائے مگر کچھ مسافر اس سے آگے بڑھ کر کچھ چاہتے ہیں۔ ہم اُن کے پاس بیٹھیں' بے تکلفی سے باتیں کریں اور کچھ تو اس سے بھی بہت آگے کا گمان کر لیتے ہیں۔ دوستی' پیار محبت یہاں تک کہ شادی کا پرپوزل بھی پیش کر دیتے ہیں۔''

انہوں نے کم از کم ایسی کوئی حرکت تو نہیں کی البتہ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں اور ساقی گری کے فرائض بھی انجام دوں...... شراب کی بوتل لانے پہ انہوں نے مجھے سو پونڈ دینے چاہے جو میں نے شکریہ کے ساتھ لوٹا دیئے...... میں نے انہیں بے تحاشہ شراب نوشی سے روکتے ہوئے سو جانے کا مشورہ دیا۔ اس پہ اُلٹا مجھے کہا' تم کیوں نہیں سو جاتی؟...... ظاہر ہے میرا جواب تھا کہ میں ڈیوٹی پہ ہوں اور ڈیوٹی کے درمیان ہوشیار رہ کر مسافروں کی دیکھ بھال میرے فرائض میں شامل ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا۔ میں بھی ڈیوٹی پہ ہوں' کسی کی یاد کی ڈیوٹی اور اس ڈیوٹی کے درمیان بھی سونا یا غافل ہونا کفر ہے۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر پوچھا! کیا اس وقت عملے اور میرے علاوہ کوئی اور بھی بیدار ہے؟ جس کے اندر اندھیرا اور سر پہ روشنی ہو......؟ زمین نہ آسمان' رات کا یہ بھیگا ہوا پہر' جس سمے اجرامِ فلکی بھی اُونگ لے لیتے ہیں' ہے کوئی جو میری طرح جل رہا ہو نہ سُلگ اور نہ دُھواں دے رہا ہو......؟

تب میں نے اُسے بتایا کہ نیچے اکانومی میں جہاز کی ٹیل کی آخری سیٹوں پہ ایک سیاہ پوش بابا جی' بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں اُن کے سر پہ روشنی جل رہی ہے۔ اُن کے علاوہ پورے جہاز میں کوئی بیدار نہیں ہے۔ عجیب سی نظروں سے مجھے تکتے ہوئے۔ آپ کی عمر' لباس حلیہ دریافت کیا۔ کچھ گہری خاموشی کے بعد' آگے سے شراب' گلاب سب کچھ ہٹانے کا کہا...... اچانک اس تبدیلی سے میں بڑی حیران ہوئی کہ آپ کے متعلق یہ کچھ جان کر اسے کیا ہو گیا؟...... وُہ اُٹھا اور واش روم چلا گیا' میں اس کی سیٹ اور دیگر بکھرا ہوا شراب کا کاٹھ کباڑ سمیٹنے لگی...... اس جگہ خوشبو کا اسپرے کیا' استعمال شدہ تکیے' گرم چادریں بدلیں اور سائیڈ ٹیبل پہ فریش فروٹ اور پھول سجا کر رکھے...... واپس آیا تو وُہ' وُہ نہیں تھا جو گیا تھا...... اک دم تر و تازہ' جیسے نیا جنم لے کر آیا ہو......

آتے ہی اُس نے ہونٹ سکیڑ کر واہ......! کا نعرہ بلند کیا...... تھینکس کہہ کر اپنی سیٹ پہ بیٹھ چکا تھا...... اب وُہ کسی بھی طور پہلے جیسا نہیں لگتا تھا۔ ایا' مشرب سا انسان کہ جس نے بیتھرو سے لے کر ترکی کے ساحلوں تک سوائے وسکی' سوڈا کے اور کچھ بھی نہیں لیا تھا...... کھانا' اسنیک' جوس فروٹ آئس کریم...... ہر چیز پہ تھینکس ہی کہا...... وائٹ ہارس اسکاچ کے دو کوارٹر بٹر فیلڈ سوڈے سمیت اس کے معدے میں اُتر چکے تھے جو ایک اچھے خاصے تندومند گھوڑے کو لنڈورا گدھا بنانے کے لیے بہت ہوتے ہیں...... مگر اِدھر تو جیسے کچھ اثر نہ تھا۔؟

اُس نے اَب وِسکی کی بجائے بنا فریش کریم کے بِنا چینی والی بلیک کافی طلب کی تھی...... مَیں دیکھ رہی تھی اُس نے اپنا بلیک لیدر کا بریف کیس کھولا...... اِک جاذبِ نظر سا پیڈ نکالا' قیمتی پین سے اِک ورق پہ کچھ لکھا' اپنے وزیٹنگ کارڈ کے ساتھ مجھے دیتے ہوئے درخواست کرنے لگا کہ مَیں یہ آپ تک پہنچاؤں گو اِس قسم کی پیامبری میرے فرائض میں شامل نہیں لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں مَیں معذرت نہ کر سکی۔ شاید لاشعوری طور پہ یہ وجہ ہو کہ مَیں نے اچانک اِس میں ایک مثبت تبدیلی محسوس کی تھی اور یہ بھی کہ آپ کی وجہ سے ہو سکتا ہے اُس کی کسی بے چینی کو قرار آ جائے۔''

قدرے توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔

''مَیں تو یہ پوچھنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتی کہ آپ نے اُس کے پیغام کو پڑھا بھی یا یہ رُقعہ اور کارڈ ویسے ہی دَھرے ہیں جیسے مَیں یہاں رکھ کر گئی تھی۔''

مَیں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تم نے ٹھیک سمجھا...... مَیں نے اِنہیں نہ تو چُھوا اور نہ ہی پڑھا ہے۔ وہ شخص' میرے آگے اوّل درجہ میں اعلیٰ نشست پہ متمکن ہے۔ اُس کا قیمتی اعلیٰ بریف کیس اصلی کالے چمڑے' قلم پارکر گولڈ' وزیٹنگ کارڈ مائیکرو پلاسٹک اور پیغام' انگلش فائن آرٹ پیپر پہ تحریر ہے۔ کہنا یہ تھا کہ وہ امیر کبیر' پڑھا لکھا وجیہہ' مہذب جوان ہے۔ زندگی کی شادمانیاں' کامیابیاں اور ہمہ ہمیاں اس کی ہمراہی ہیں...... آرزوؤں کے خُوش نوا پرندے اِس کے دل کی سنہری کابک میں چہکتے رہتے ہیں...... وہ ہر وقت خوشبوؤں میں بسا رہتا ہے۔ ایسی خوشبوئیں جو لہک لہک' مہک مہک' جوان اُمنگوں' تشنہ لب آرزوؤں اور تتلیوں کے پَروں پہ خوش رنگ غبار کی مانند تمناؤں کو انگیخت کرتی رہتی ہیں۔ ایسے مُنہ زور اَبلق بگٹٹ بھاگتے گھوڑے کو لپک' لگام دینا کچھ ایسا آسان بھی نہیں۔ مَیں مُنہ زور گھوڑوں کا سائیس نہیں' عجز و حزن کے خاکساروں کا سائیں ہوں۔ اَب تم کہو کہ اُجلے اور گدلے کا آپس میں کیا میل......؟

میل اور کھیل تو مَن ٹکنے کا ہے......؟ جب تک بندہ اپنی عقل' علم اور پندار کے مینارے سے نیچے نہیں اُترتا۔ خاک اور راکھ کو ماتھے کا تِلک اور تن کا بھبھوت نہیں بناتا وہ اُجلتا اور شیاما کو بُجھ ہی نہیں سکتا......؟ سب روشنیوں اور اندھیروں کا چکر ہے۔ دن کا رات میں ضم ہونا اور پھر تاریکیوں کے سمندر سے روشنی کا پُھوٹنا......

یہ سب کچھ فطرت کا حصہ ہی تو ہیں...... اُوپر والا نیچے ضرور آتا ہے۔ نیچے والا بھی اُوپر ضرور اُٹھتا ہے آدم کو اُوپر سے نیچے اور پھر اُوپر لے جایا گیا......'' نیچے آئے بنا اُوپر نہیں جایا جا سکتا......؟''

اِتنا کہہ کے مَیں گردن ڈالے خاموش ہو گیا...... اللہ جانے وہ کب تک اِدھر بیٹھی......؟

جہاز ایئر پاکٹ میں ڈولے بڑولے لے رہا تھا...... ایسی کیفیت میں بچوں کی طرح میں بھی خوب مزے لیتا ہوں۔ بچپن کی وہ گھسیاں' پتنگیں' آسمانی جھولے' لکڑی کے گھوڑوں والے پنگوڑے...... جن پہ بیٹھ چٹ کے ہم پنگوڑے والے سے "اور تیز اور تیز" کہتے تھے۔ آسمانی جھولا جب ڈولتا ہوا اُوپر سے تیزی کے ساتھ نیچے آتا تھا تو دل اُچھل کر بغلوں میں کہیں چھپ جاتا تھا۔ ایئر پاکٹ میں پھنسا ہوا جہاز بھی لگ بھگ ایسا ہی مزہ دیتا ہے...... بڈھوں کھوسٹوں کی آنکھیں خودبخود بند اور کھل جاتی ہیں۔ انھیں کچھ ہوش نہیں ہوتا...... بھول بھلکڑ ے بھی وہ کمال کے ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ یاد نہیں تھا کہ دیر پہلے میرے پاس کون تھا اور میں نے کیا کچھ باتیں کیں...... سامنے ٹیبل پہ کافی کا کپ ویسے ہی پڑا تھا' ساتھ کارڈ اور رُقعہ بھی جیسے صدیوں سے کسی کی توجہ کے طالب ہوں......؟ یکدم میری اُونگھ اُچٹ گئی......

میری اگلی سیٹوں سے اُٹھ کر کوئی میرے سر پہ سورج کی طرح کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم بابا جی......!"

میں بھونچرا سا اُسے تکنے لگا...... "وعلیکم السلام!" خودبخود میرے منہ سے اَدا ہو گیا۔ ارے یہ تو وہ کارڈ اور رُقعہ والا ہے۔

"میں آپ کے قدموں میں بیٹھ سکتا ہوں؟

میں نے خود کو سمیٹتے ہوئے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"بابا جی! آج' اِس وقت' زمین اور آسمان کے بیچ خلاء میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کر کے ایک عجیب سا اطمینان حاصل ہوا ہے۔ یوں محسوس ہُوا کہ میں اپنے اندر اُتر آیا ہوں بالکل یوں جیسے کوئی جُھلستے ہوئے موسم سے عاجز ہو کر اپنے گھر کی پچھلی اندھیری کوٹھری میں گھس آتا ہے۔ بابا! اندھیرے اِتنے سیاہ اور ٹھنڈے کیوں ہوتے ہیں؟ خاموش' بجھے بجھے سے......؟"

میں اَندھی مندھی آنکھوں سے بٹ بٹا کر اس کی ایسی اَوق سی باتیں اپنے پلّے ڈالنے کی سعی کر رہا تھا جن کا بظاہر کوئی مفہوم' کم از کم میری سمجھ نہیں آ رہا تھا...... اگر بچّہ! کسی عالم اور کوئی دہقان کسی فلاسفر کی زبان بولے' تعجب تو ہوتا ہی ہے۔ مگر جس طرح مُشک اپنے سے کی ہر خوشبو کی مُشک مار دیتا ہے اسی طرح عشق بھی اپنے اُوپر کی ہر عقل کا عقد فسق کر کے رکھ دیتا ہے......!

وہ لندن میں اپنی منگیتر سے مل کر واپس آ رہا تھا جو وہاں ایک یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے آخری سال میں تھی۔ خدا جانے اُسے کیونکر شک ہُوا کہ وہ کچھ بدل گئی ہے...... وہ نیلوفر نہیں رہی جو انگلینڈ آنے سے پہلے پاکستان میں تھی......؟ پہلے برس تو سلسلہ نارمل رہا پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ سرد مہری سی دَر آئی تھی'

کبھی ایک دن میں تین تین ٹیلی فون' اَب یہ عالم کہ تین تین ہفتوں بعد کہیں ایک آدھ سرد اُنسا سا ٹیلیفون' یُوں کہ اگر کوئی تیسرا فرد اِن کی گفتگو سن لے تو یقین سے کہہ سکتا ہے یہ دونوں آپس میں منگیتر نہیں ہو سکتے اور یہ مان ہی نہیں سکتا اِن دونوں کی نسبت' مرضی پسند سے بھی بھی ہوئی تھی اور یہ دونوں آپس میں فرسٹ کزن بھی ہیں۔؟

نیلوفر' خوبصورت ہی نہیں خُوب سیرت اور بڑی گُنوں والی لڑکی تھی۔ یہ اکلوتا بیٹا اور وہ بھی اکلوتی لاڈلی تھی...... بچپن بھی ایک ساتھ ہی گزرا ایک دُوسرے کی طبیعت مزاج سے واقف بھی تھے۔ کچھ برس پہلے نیلوفر نے تعلیمی میدان میں بڑی اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ دونوں کے گھر والوں نے اِن کی شادی کی ٹھانی' تیاریاں بھی کیں...... مگر اچانک اِس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نیوکاسل میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ جائے گی۔ تین چار برس کا یہ ڈگری کورس تھا...... اس کا مطلب تھا کہ شادی مزید چند برس آگے سرک گئی تھی۔

آصف صفی قدرے مایوس ہُوا' یہ نہیں کہ اُسے شادی کا شوق یا جلدی تھی صرف گھر والوں کی جانب سے اصرار تھا۔ وہ تو ایک دن کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا چہ جائیکہ اکٹھے تین چار برس...... وہ سوچ سوچ ہلکان ہُوا کہ کس طرح سے اُسے انگلینڈ جانے سے باز رکھے۔ لاکھ سمجھایا کہ جتنی تعلیم تم نے حاصل کی ہے وہ بھی ایک لڑکی کے لیے بہت زیادہ ہے مگر وہ ایک ہی نکتہ پہ اَڑی رہی کہ میں بھی اتنی ہی تعلیم حاصل کروں گی جتنی تم نے حاصل کی ہے۔ لاڈلی' ضدی' خُودسر اُس نے لندن داخلہ حاصل کر کے ہی دَم لیا۔ اَب آصف کے لیے لازم ہو گیا تھا کہ ہر دو ماہ بعد لندن پہنچتا...... اس سے خُوب شکوے شکایتیں اور سیر و تفریح ہوتی' ڈھیروں شاپنگ کرواتا۔ اس کے اخراجات' واجبات کی ادائیگی کرتا اور سرد آہیں بھرتا ہُوا واپس اپنے کاروبار پہ پہنچ جاتا جدھر تین عدد کپڑے کے کارخانے' دن رات اُس کی دولت و ثروت میں اضافہ کر رہے ہوتے۔"

کچھ مہینوں سے اسے کھٹک رہی تھی کہ نیلوفر میں کچھ تبدیلی واقع ہوتی جا رہی ہے...... پہلے تو ٹیلیفونی رابطوں میں بے ضابطگی پیدا ہوئی جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ پورا پورا ہفتہ اُس سے رابطہ نہ ہو پاتا اور اگر کارِ قضا ہو بھی جاتا تو یُوں محسوس ہوتا کہ وہ کسی اجنبی یا ناپسندیدہ فرد سے اَز رہِ مجبوری' گفتگو کر رہی ہے۔ اِس تبدیلی کا کسی سے ذکر تو نہ ہوا لیکن وہ اندر ہی اندر جیسے کہیں بُری طرح پھنس کر رہ گیا تھا۔

اُس نے اپنے ایک دوست سے جو اُسی یونیورسٹی میں تھا اپنے طریقے سے بات کر کے نیلوفر کی بابت معلومات حاصل کیں' معلوم ہوا کہ اِن دنوں بے تحاشہ جوگنگ اور ایکسر سائز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ بال بھی ترشوا دیئے ہیں۔ ممبئی کا ایک کلین شیو سکھ لڑکا جو یہاں پرفارمنگ آرٹ میں ڈگری کر چکا ہے اُس کا کلوز فرینڈ ہے۔ لڑکا ایک امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں اُن کے کئی ایک ریسٹورنٹ ہیں۔ رولس رائس' مرسیڈیز میں اُس کے ساتھ گھومتی ہے...... کلبوں اور شراب خانوں میں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ وہ سکھ کوئی

زبردست قسم کی فلم بنا رہا ہے اور یہ اُس فلم کی ہیروئن سلیکٹ ہوگئی ہے' آدھی فلم یورپ اور باقی ممبئی بنے گی۔ یہ بھی معلوم ہُوا کہ وہ اب نیلوفر کی بجائے کسی اور نام سے خود کو اُجاگر کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ اَب وہ یونیورسٹی میں بھی ایک سٹوڈنٹ کی طرح نہیں بلکہ کسی راجکماری کی طرح آتی ہے۔"

آصف صفی کے لیے یہ سب کچھ روح فرسا ہی نہیں بلکہ ناقابلِ برداشت بھی تھا لیکن وہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ کزن ضرور تھی اُس کی بچپن کی ساتھی' پہلا پیار بھی لیکن منکوحہ بیوی تو نہ تھی اگر ہوتی بھی تو سوائے برداشت' سمجھانے یا آخری حربہ کے طور علیحدگی کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہ سکتا تھا۔ انگلینڈ میں تو عورت کچھ بھی رَدِ عمل اختیار کرے اُسے ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔"

لندن پہنچنے سے پیشتر اُس نے نیلوفر کو پیشگی اطلاع کر دی تھی مگر ہیتھرو پہ اک لمبے انتظار کے بعد بھی وہ نہ پہنچی تھی جبکہ ٹیلیفون بھی خاموش تھا۔ ایسا کچھ پہلے تو کبھی نہ ہُوا تھا...... پناہ حاصل کرنے والوں کی مانند ایئرپورٹ' میٹنگ پوائنٹ پر مایوس اور دل گرفتہ سا مسلسل تین گھنٹے تک سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا ہُوا اُس کا انتظار کرتا رہا مگر اُسے نہ آنا تھا نہ آئی۔ خاصا دل برداشتہ سا ہو کر' اپنے ایک دوست' جو اُس کا یونیورسٹی فیلو بھی تھا' فون کر کے بلایا...... اُس کی زبانی بہت سی ناقابلِ یقین وسماعت باتیں مزید معلوم ہوئیں تو وہ دونوں اُس کی تلاش میں نکل پڑے۔

وہ اپنے ہوسٹل میں نہ تھی' اِدھر کا کوئی کلب' پب' ریسٹوران ایسا نہ تھا جدھر اُسے تلاش نہ کیا ہو...... اِدھر اُدھر کہیں ہوتی تو مل جاتی مگر وہ تو اپنے سکھ بوائے فرینڈ گولڈی سنگھ کے ہمراہ لندن کے پائن وڈ سٹوڈیو کے اوپن فلور میں' چندی گڑھ کے تناظر میں بنائے گئے ایک سیٹ پہ پنجابی فوک گیت پہ لڈی پکچرائز کروا رہی تھی...... انڈیا سے خاص طور پہ بلوائی گئی فوک کوریوگرافر رشن کور بھنڈاری' اُسے کھیتوں کے درمیان بنائی گئی اُونچی مچان پہ بٹھائے' بال جھٹکنے کا بھاؤ بتا رہی تھی۔ ایک شعر سامنے آ گیا......

یہ کہہ کر ستمگر نے زُلفوں کو جھٹکا
بہت دن سے دُنیا پریشان نہیں ہے

جھٹکا کوئی بھی ہو کیسا بھی ہو زُلفوں کو ہی نہیں' بڑے بڑے انسانوں کے اَرمانوں کو بھی پریشان کر کے رکھ دیتا ہے۔ آصف صفی' تو ایک ایسا اُبھرتا ہوا صنعتکار نوجوان تھا جو اگر تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں تو محض اپنی صنعت و پیشہ کے متعلق...... جن کی زندگی کی ہر خواہش' کوشش' حرکت وغیرہ اپنی پیشہ ورانہ برکت کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اُن کے تعلقات و مراسم' دوستیاں' دُشمنیاں' شادیاں رشتہ داریاں بھی کاروباری حساب و کتاب سے مملو ہوتی ہیں اور یہی اندازِ فکر' طور اور رَویے' اُن کا کاروباری استحکام ہوتے ہیں۔ ایسے صنعتکاروں کی برادریاں'

ملک کے بیشتر صنعتی شہروں میں پائی جاتی ہیں۔ سرِفہرست فیصل آباد' گوجرانوالہ' سیالکوٹ' چنیوٹ' گجرات اور لاہور ہیں۔ اصل میں یہی برادریاں اور ان کے ادارے ملکی معیشت کے خون کے لیے سرخ ذرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کا تعلق بھی ایسے ہی آسودہ حال خاندانوں سے تھا جو فیصل آباد میں صنعتی کاروباری لحاظ سے اپنی ایک نمایاں ساکھ کے حامل تھے...... دو چار برسوں کے فرق سے وہ ایک ساتھ ہی بڑھے پڑھے اور پیار کے بندھن میں بندھے تھے۔ ایک ہی دادا کی اگلی نسل ہونے کی بنا پر آپس کے میل جول میں بھی کوئی تکلف نہ تھا۔ دونوں کے والدین نے ان کی باہمی دلچسپی اور قریبی قرابت داری کی خاطر ان دونوں کو رشتۂ ازدواج میں پابند کرنے کا فیصلہ کرلیا ہوا تھا۔ بس اگر دیر تھی تو لڑکی کی ڈگری کی تھی جسے مکمل کرنے کی خاطر وہ لندن میں مقیم تھی...... اپنے منگیتر سے اس کا ہر طرح سے رابطہ تھا۔ وہ جب بھی جی چاہتا' اُس کے پاس ادھر آ نکلتا جبکہ وہ ڈیڑھ برس میں صرف ایک بار تین ہفتوں کے لیے فیصل آباد آئی تھی۔

''حالات تو چلتی ہوئی ہوا کی طرح ہوتے ہیں خبر تک نہیں ہوتی اور وہ اپنا رُخ تبدیل کرلیتے ہیں...... سب ٹھیک چل رہا تھا اچانک نیلوفر ہوائے بادِ صبا سے بادِ سموم بن گئی۔ یکسر اپنا رُخ کچھ اس سُرعت سے تبدیل کیا کہ کسی کو یقین نہ آیا۔ حاجی نمازیوں' کروڑ پتیوں کی ایسی نرول سی لڑکی' اپنے قومی' اخلاقی' خاندانی اور دینی تقاضوں کو بالائے طاق ڈال کر اک ایسی ڈگر پہ چل نکلے گی جو اُسے اپنے اوراپنوں سے بہت پرے دھکیل دے گی۔ اُس میں یہ ہولناک تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی اس کا شافی جواب تو اُسی کے پاس ہوگا؟ مگر امرِ واقع یہ تھا کہ اُس کے گھر والوں نے اُس پہ اندھا اعتبار کیا تھا۔ کچھ والدین کسی بھی وجہ سے اپنے بچوں کو اُن کی اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے حق میں ہوتے ہیں یا ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ماحول سوسائٹی کے اثرات بچ کے نکلنا بڑا مشکل ہوتا ہے کسی نہ کسی حد تک اس کا رنگ چڑھ ہی جاتا ہے۔''

بھیڑوں اور بچوں کی نگہداشت سے صرفِ نظر کرنے سے نقصان اور بگاڑ کا احتمال بہر طور موجود رہتا ہے۔ دولت اکثر لوگوں کے پاس وافر ہوتی ہے مگر ہر دولت مند کے ہاں اس کا استعمال مختلف ہوتا ہے۔ گولڈی سنگھ کے ساتھ بھی قریب قریب یہی مسئلہ تھا...... یعنی ماں باپ کا از حد لاڈ پیار' اندھا اعتماد' مست شباب' دولت کے انبار...... حسینوں پہ دولت لٹانے کا جنوں اور اُنہیں رجھانے کا ڈھنگ......!

نیلوفر سے وہ اپنی ایک پارٹی میں متعارف ہوا تھا۔ یہ پارٹی اس کے اپنے ایک ٹاپ کلاس انڈین کلب میں ترتیب دی گئی تھی۔ شرکاء میں انگریز' پاکستانی' ہندوستانی' بنگلہ دیشی' اُس کے کاروباری احباب' ماڈلز' سنگرز' اداکار' دوست اور آگے اُن کے دوست سب ہی موجود تھے۔ حُسن و شباب' شراب و کباب' طاؤس و رباب

کسی سامان کی کمی نہیں تھی...... تھی تو یہ ایک عام سی پارٹی مگر اس کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ گولڈی سنگھ ایک انٹرنیشنل سطح کی فلم بنانا چاہتا تھا...... پاکستانی اور ہندوستانی لوگوں کے باہمی مسائل کے بارے میں جو انگلستان میں ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اپنے اپنے مذہبی' ثقافتی اور قومی تشخص کے خول میں بند سمٹے ہوئے......؟ مگر کہیں کوئی ایسا حادثہ بھی رونما ہو جاتا ہے کہ وہ کہیں ایک دوجے کے انتہائی قریب آ جانے پہ بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہیں اُنہیں احساس ہوتا ہے وہ محض پاکستانی یا ہندوستانی نہیں انسان بھی ہیں' جن کے انسانی' نفسانی' جذباتی اور جبلّی رویے یکساں ہوتے ہیں۔''

انگلستان میں بسنے والوں دو خاندانوں کے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ملاپ کی کہانی بڑی پُراثر تھی۔ سکھ لڑکا اور لڑکی پاکستانی! دو مختلف مذہب و ملک' تہذیبیں قدریں علیحدہ...... وہی بات ''عشق نہ پُچھے ذات!'' دونوں ایک ساتھ پڑھتے ایک ہی ساتھ اُٹھتے بیٹھتے' کھاتے پیتے...... بڑی معصومیت اور بن کچھ سوچے سمجھے اک دوجے کو دل دے بیٹھے...... وعدے ارادے پکے کر لیے۔ ڈگری کے بعد شادی کا بھی طے کر لیا...... نہ جو سوچا وہ یہ کہ دونوں کی اپنے اپنے دیس' رشتہ داروں میں منگنی ہو چکی ہوئی ہے اور وہ ان کی ہاں کا انتظار کر رہے ہیں۔ نہ یہ خیال کہ ان کے درمیان مختلف مذاہب اور ملکوں کی دیواریں بھی کھڑی ہیں۔ جن کو پاٹنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں...... لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ اگر ارادے اور اعصاب مضبوط ہوں...... اخلاص اور بنی نوع انسان کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کا جذبہ فراواں ہو تو راستہ کی ہر دیوار ہٹائی جا سکتی ہے۔ مشکلوں کے درمیان سے ہی راہیں نکل آتی ہیں...... یہ اک بڑا جاندار موضوع تھا...... نیلوفر یقیناً ایک بیدار مغز' کھلی آنکھوں کانوں والی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔''

انٹرنیشنل آفیئر میں ماسٹر کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک خواتین کی بہبود کے لیے سرگرم رہی...... کچھ غیر ملکی فلاحی تنظیموں سے روابط ہوئے وہ انٹرنیشنل سطح پہ انسانوں کے درمیان کھنچنے والے فاصلوں' نفرت تعصب کو دُور کرنے کے لیے کچھ عملی کام کرنا چاہتی تھی۔ ہلکی سی ڈھیل دیتی تو اس وقت کم از کم دو بچوں کی ماں ہوتی۔ آصف کی طرف سے شادی کے لیے دباؤ تو تھا' اصل اصرار تو آصف کے والد' تایا' ابو کی جانب سے تھا کہ وہ دل اور شوگر کے مریض ہیں۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے آصف کے سر پہ سہرا دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اس نے اچانک اعلان کر دیا کہ شادی' انگلینڈ سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہو گی۔ خود سر لڑکی' سب کی آنکھوں کا تارا...... اس کے فیصلے کے آگے کسی کو بات دھرنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ لندن چلی آئی۔ اِدھر تو ایک سے ایک پاگل' بہت جلد اُسے اپنے جیسے ہم خیالوں کا ایک حلقہ مل گیا۔ ہر قبیل اور صنف و جنس کے بندے جو رنگ و نسل' مذہب و قوم سے بالاتر ہو کر صرف ایک نکتے پہ زور دیتے تھے۔ زمین اور آسمان کے درمیان جو

مخلوق اِنسان کہلاتی ہے وہ سب ایک ہیں...... بلاتفریق واِمتیاز ایک جیسے رنگ' نسل' زبانیں' مذہب وغیرہ یہ سب جغرافیائی' علاقائی اور طبقاتی تقاضے ہیں' اُن کی ذاتیات ہیں...... ہم سب زمین پر رہنے والوں کو بلا جھجک وحجاب ایک دُوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اِنسانی جُڑت کی ایک ایسی مضبوط زنجیر بنانی چاہیے جو کرۂ اَرض کے گرداگرد اِس طرح سے محیط ہو کہ وہی دِکھائی دے ہاتھوں والوں کے چہرے نظر نہ آئیں......''

گولڈی سنگھ' جس کا اصل نام رگھبیر سنگھ تھا۔ گولڈی' اِس لیے مشہور ہوا کہ اُسے سونا پہننے کا بہت شوق تھا...... انگوٹھیاں' گلے میں بھاری بھاری خالص کندن کی مالائیں...... ہاتھ پاؤں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے' کلائی کی زنجیر' چابیوں کا چھلا' فونٹین پن' بیلٹ کا بکسوا' سگریٹ کیس اور لائٹر بھی اَٹھارہ قیراط...... بس! محض شوق تھا کوئی امیری دِکھانے کا مسئلہ نہیں تھا...... اکیلا پُتر' سکھوں میں ہو یا سنگھیروں میں' ہوتا نین سُکھا ہی ہے! پڑھائی ختم کر کے اپنے ہوٹلوں کے کاروبار کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن تھا وہ انہی پاگلوں کا سرخیل! ساؤتھ آل والے بڑے ریسٹورنٹ کا زمین دوز بڑا ہال' برتھ ڈے پارٹیوں' شادی بیاہ کے فنکشنوں کے کام آتا یا پھر اِس کے دوستوں اور لندن کی یونیورسٹیوں' کالجوں کے سٹوڈنٹوں کے جو اِنسانی بھائی چارے کے داعی تھے۔ اِس کے دوستوں میں پاپ اور کلاسیکل گانے والے' ماڈلز' ایکٹرز' اسٹیج آرٹسٹ' پینٹرز' ڈانسر' میوزیشن' بیوٹیشن' شاعر' اَدیب' براڈ کاسٹر...... غرضیکہ فنونِ لطیفہ سے متعلقہ ہر دانہ' اِس کی دوستی' بلکہ اِنسان دوستی کی مالا کا رتن تھا۔ وہ تو اِن سب کو اکٹھا کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا...... ہر طرح سے اِن کی مدارت کرتا...... کھلاتا پلاتا' جیسا تا اور جس طرح بھی بن پڑتا اُن کے کام آتا...... ہر تے' اُس کے ہاں منورنجن کی سبھائیں بجی رہتیں۔''

بس! ایک ہی چھوٹی یا بڑی خامی تھی کہ اُس کے ہاں کوئی بھی خوشی یا میٹنگ...... کھانا ناشتہ یا کوئی مسئلہ جول بیٹھنے کا ہو' شراب کے بغیر نہ ہوتا۔ عام سکھوں کی طرح' پینا پلانا اُس کا پسندیدہ شغل تھا لیکن اُس کے ہاں پینے سے کہیں زیادہ دُوسروں کو پلانے پر زیادہ زور ہوتا۔ دُنیا بھر کی قیمتی نایاب شرابیں' اُس کے ذاتی بار میں وافر موجود رہتیں...... جنہیں چکھنے پینے کے قطع نظر' محض نظر بھر کے دیکھ لینا بھی کسی اعزاز سے کم نہ ہوتا۔ حیف! شراب' پانی کی طرح پینے والا' تمبا کو نوشی سے بے حد متنفر تھا اور یہی حال' اُس کے ننانوے فیصد دوستوں کا بھی تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے ملنے والوں میں سے اگر کسی نے ایک دو روز پہلے بھی تمبا کو نوشی کی ہوتی تو اُسے محسوس ہو جاتا......''

اِسی طرح کچھ اور زندگی کے معاملات میں بھی وہ ''چیزے دیگرے'' واقع ہوا تھا...... ''مثلاً جنسِ لطیف' چاہے وہ کسی بھی رنگ وروپ' بھلی بُری بے حد تکریم وتعظیم دیتا۔ عورت کے بارے اُس کا فلسفہ بھی عجیب تھا اُسے کائنات کی سب سے لطیف خوبصورت اور اہم تخلیق کہتا...... وہ تو عورت کی کسی ناپسندیدہ حرکت' نماط روپ

یا پیشہ کو بھی مجبوری معذوری جان کر بے قصور ٹھہراتا......"

انگلستان کے مخلوط مادر پدر آزاد معاشرہ میں جنم تعلیم اور پروان لینے کے باوجود کبھی کسی مخالف جنس سے آلودہ نہ ہوا...... وہ تو آنکھیں جھکا کر بات کرتا۔ کہتا مجھے ہر عورت میں انسان کی چھپی ہوئی ماں نظر آتی ہے۔ شاید یہی اُس کے خیالات تھے کہ ابھی تک وہ نہ تو کسی لڑکی سے جڑ سکا اور نہ ہی شادی کے بندھن میں بندھ سکا۔ گو اُس کی منگنی اپنے دُور پار کے رشتہ داروں میں ایک حسین پڑھی لکھی سے طے پا چکی تھی۔ اُس کے والدین بھی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔"

سیانے بھی کہتے ہیں اور مجھے خود بھی تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ عام ڈگر سے علیحدہ سا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جن کی سوچ وفکر اور زندگی کے متعلق رویے عمومیت سے ہٹ کر خصوصیت کی جانب رجوع ہوتے ہیں اُن کے دفتر جنوں میں انہونیاں اچنبھوں اور حیرتوں کے اندراج ہوتے ہی رہتے ہیں۔ انہیں مناظر حالات میں ایسی غیر معمولی تبدیلیوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے کہ وہ خود اور دیکھنے سننے والے ششدر رہ جاتے ہیں۔" عملی انسانی زندگی ہو یا کوئی ارضی افلاکی یا کائناتی حادثہ! یقیناً کسی نہ کسی رویے سوچ یا عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے جبکہ یہی ردِ عمل اعتدال لانے میں باعث بخت ہوتا ہے۔"

اتفاق ملاحظہ ہو گولڈی سنگھ اگر زندگی کے اِن مخصوص رویوں میں بائیس قیراط سونا تھا ادھر نیلوفر ابھی اس سے دو تولہ آگے کی تھا یا چاندی تھی۔ اُس نے گولڈی سنگھ کو اس کی سلور شیڈ رولس رائس میں دیکھا بھی تھا اُس کے بارے بہت کچھ جھوٹ سچ سنا بھی تھا مگر اس کے دل میں کبھی اُسے ملنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایسے نو دولتیوں کی ذہنیت سے خوب واقف تھی جو اپنی جائز ناجائز دولت کی نمائش کے لیے بڑے عجیب اوچھے رنگ ڈھنگ اختیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود کون سی ایسی غریب غربا تھی جو اُس سے متاثر ہوتی...... وہ طبع اور ظرف کے لحاظ سے بڑی مضبوط متوازن لڑکی تھی۔ یونہی نہیں والدین نے پڑھنے کے لیے اکیلا ادھر بھیج دیا تھا۔؟

دیکھا گیا ہے ہر کام کے لیے اک خاص وقت مقرر ہوتا ہے۔ لاکھ کوشش کرو کام اپنے وقت پہ ہی ہوگا۔ اِدھر بھی یہی کچھ ہوا پڑھائی اور زندگی اپنے انداز میں قدم بہ قدم لمحہ بہ لمحہ اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ چلتے چلتے جیسے راہ میں ندی دریا کھڈے پہاڑ اترائیاں چڑھائیاں آتی ہیں اور راہرو اُن سے نمٹے بنا آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی طرح نیلوفر کے راستہ میں بھی ایک ایسا مقام آیا جس نے اِسے زندگی کے ایک نئے مفہوم اور اک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ وہ حیران تھی کہ اَب تک وہ کن سرابوں کو حقیقت سمجھ کر اپنا وقت اور توانائی ضائع کرتی رہی...... کسی کے متعلق اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے بل بوتے پہ اچھا برا تاثر قائم کر

لینا کس قدر احمقانہ فعل ہوتا ہے۔ سنی سنائی باتوں یا کسی کی گفتگو' ظاہریت اور حال حلیہ کی بنیاد پہ قائم کی ہوئی رائے بھی اکثر غلط ہوتی ہے۔''

سیانے کہتے ہیں کسی کو دوست کہنے سے پہلے' اُس کے ساتھ پانچ سیر نمک کھاؤ' تب کوئی فیصلہ کرو اور کسی کے بارے کوئی پکی رائے تب ہی دی جاسکتی ہے جب آپ کم از کم پانچ خوبیوں پہ ذاتی طور پہ گواہ ہوں۔ حسب ونسب' تحمل وتدبر' صالحیت وصبور' قول بول اور میانہ روی......!

نیلوفر کی ایک انڈین کیبلی' جو پرو فارمنگ اور اسکرپٹ رائٹنگ میں ڈگری کے لیے کوشاں تھی' بتایا کہ آج رات' اُس کے ایک دوست کے ہاں' اُس کی ایک فلم کے بارے کچھ ڈسکشن ہوگی...... یہاں کے اسٹیج ٹیلیوژن' فلم سے متعلقہ دوستوں کے علاوہ' ممبئی سے کچھ اداکار' ہدایتکار اور کوریوگرافر بھی شامل ہوں گے......؟ کچھ نئے لڑکیوں لڑکوں کے باقاعدہ آڈیشن اور فوٹو سیشن ہوں گے...... میرے دوست کو کسی ایسی لڑکی کی تلاش ہے جو اُس کی فلم میں ہیروئن کا کردار کر سکے۔ اگر آج شام تمہارے پاس فرصت ہو تو میرے ساتھ چلو...... مجھے یقین ہے تم وہاں خوب انجوائے کرنے کے علاوہ' ایسے لوگوں سے بھی ملو گی جو تمہارے ہی خیالات اور نظریات کے پرچار کرتے ہیں......!

نیلوفر' ایسی محفلوں میں جا کر انجوائے کرنے کی حامی نہیں تھی جدھر مرد و زن' آپس میں شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔ شراب' ڈانس اور بے طرح سے تمباکو نوشی ہو اور پھر فلم ولم سے تو اُسے کچھ دلچسپی نہ تھی...... اپنی کیبلی' جو اُس کی کلاس فیلو بھی تھی کہ باتیں سُن کر کہنے لگی۔

''تم جانتی ہو کہ مجھے دعوتوں اور مخلوط تقریبات میں جانے کا کچھ شوق نہیں...... شراب اور سموکنگ سے تمہیں تو پرہیز نہیں' پر میری جان جاتی ہے۔ تم ہر موضوع پہ باتیں بھی کر لیتی ہو...... گا' ناچ بھی لیتی ہو' جبکہ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی' لہٰذا تمہارا تو اُدھر جانا بنتا ہے' میرا نہیں۔''

بندو نے جب اپنا نشانہ خطا ہوتے دیکھا تو چیک کر بولی۔

''سوچ لو! تم ایک بہت اہم اِنویٹیشن کا ستیاناس کر رہی ہو...... خیر تم اچھے بچے کی طرح اِدھر بیٹھ کر ہوم ورک کرو...... میں جاتی ہوں۔ ویسے بھی گولڈی سنگھ کی دعوت میں شرکت ہر کسی کا مقدر بھی نہیں ہوتی......''

گولڈی سنگھ کا نام سن کر وہ قدرے چونک سا گئی۔ پوچھنے لگی۔

''گولڈ سنگھ رولس رائس والا......؟''

''ہاں وہی...... انڈیا سے بڑے بڑے اداکار پہنچ رہے۔ ہیلن' دھرمیندر' آشا پاریکھ اور پتہ نہیں کون کون' آج کی دعوت بڑی خاص ہے کہ گولڈی سنگھ اپنی فلم کی کاسٹ' سلیکٹ کر رہا ہے...... مجھے بھی کام دینے کا

وعدہ کیا ہُوا ہے......"

اَب وہ پوچھنے لگی۔ "یہ گولڈی صاحب فلمیں بھی بناتے ہیں؟ مَیں نے سنا تھا کہ اُن کا ہوٹلوں کا کاروبار ہے۔"

"تمہاری دونوں باتوں میں دَم ہے۔ ہوٹلوں کا بزنس بھی ہے اور ممبئی میں فلموں کو فنانس بھی کرتے ہیں...... اکثر بڑی بڑی فلموں کے اوورسیز حقوق اُنہی کی کمپنی گولڈی فلمز کے پاس ہوتے ہیں۔ مگر اَب وہ ایک بڑی فلم یہاں بنا رہے ہیں۔ ممبئی کی بڑی کاسٹ کے ساتھ وہ کچھ آرٹسٹ اِدھر سے بھی لے رہے ہیں۔ خاص طور پہ فلم کی ہیروئن وہ یہیں سے تلاش کر رہے ہیں۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں اسی اُمید پہ آج آ رہے ہیں کہ شاید اُنہیں چانس مل جائے۔؟"

"مگر مجھے تو کسی فلم میں کام کی تلاش نہیں......"

وہ اُسے گھورتی ہوئے بولی۔ "مَیں نے کب کہا کہ تم اُدھر فوٹو سیشن کروانے جا رہی ہو...... تم تو میرے ساتھ ایک مہمان کی حیثیت سے چلو گی...... وہاں بڑے بڑے انٹلیکچوئل پرنٹ میڈیا فلم میڈیا اور بین الاقوامی شہرت یافتہ لوگ...... مہذب اور ایک علیحدہ سوچ وفکر سے وابستہ دانشور...... ایسے مہمان لوگوں کے درمیان تم خود کو بھی اُس پرندے کی مانند پاؤ گی جو پنجرے سے نکل کر کسی چھتنار درخت پہ دوسرے پرندوں کے درمیان آزاد فضا میں چہچہانے لگتا ہے......"

وہ چند لمحے سوچتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے مگر یہ کیا گارنٹی ہے کہ مَیں وہاں بور نہیں ہوں گی۔"

"یہ میری گارنٹی ہے...... مگر کیا تم بھی مجھے گارنٹی دو گی کہ ایسے نفیس لوگوں سے ملنے کے بعد تہہ دل سے میرا شکریہ ادا کرو گی......؟"

میٹھا میٹھا موسم ہلکی سی خنکی جو فصلِ جان میں انبساط اور گرم جوشی کی لہر دوڑا دے...... گولڈن ٹیمپل ریسٹورنٹ کے عقب میں زیرِ زمین کیا شاندار وسیع وعریض ہال تھا...... پورے ہال میں چھوٹے بڑے مووی کیمرے لائٹیں اور متعلقہ سامان بکھرا پڑا تھا ایک اسٹیج بھی تیار تھا۔ کیمرہ مین اور عملہ لائٹیں سیٹ کر رہے تھے۔ باوردی سٹاف مستعد کھڑا تھا۔ ایک خاص بات کہ انتظامیہ کے تمام عملہ میں ایک بھی کوئی دیسی بندہ نہ تھا اور نہ ہی کوئی انگریز دکھائی دیا...... ہال کے گرداگرد بڑی پُرآسائش آرام دہ نشستیں تھیں۔ جدید طرز کا بار جدھر دُنیا بھر کی بیش قیمت شرابیں دعوتِ شرب دے رہی تھیں۔ بہت سے دفاتر بھی شیشوں کے پَرے مختلف لوگ مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ ایک انتہائی مستعد خوبصورت تمکین نے انہیں نشستوں تک پہنچایا...... اگلے لمحہ ایک ویٹر آ گیا سر جھکا تعظیم دیتے ہوئے دو پھول پیش کیے...... تروتازہ مسکراتے ہوئے گلاب کے پھول بندو کے

نصیب ہوئے اور نیلوفر کے لیے نیلگوں غنچے...... ایک اور ویٹر آیا' تعظیم دے کر ڈرنکس سائیڈ ٹیبل پہ سجا گیا۔ بندو نے سافٹ ڈرنک کا بلوریں گلاس' اسے دیتے ہوئے کہا۔

''میڈم! تمہاری پسند کے غنچے اور پسندیدہ اناس ڈرنک! آپ بتاؤ' یہاں کے ملازم کتنے بڑے مردم شناس ہیں؟ وہ کچھ کہے بغیر سامنے ہال میں فلم بندی کے آلات دیکھنے گی۔

یہ ہال اور دیگر دفاتر' کمرے وغیرہ گولڈن سنگھ نے اپنی ضرورت کے تحت بنوائے تھے...... لیبارٹری' ورکشاپ۔ نیلوفر یہ عجائبات دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ ایک اور حیرانی' خود اس کے پاس چل کر آ گئی...... یہ دو ٹانگوں والی حیرانی' گولڈی سنگھ تھا جو اپنے دفتر سے نکل سیدھا اسی طرف آ گیا جدھر یہ دونوں بیٹھی تھیں...... وہ ان کے سروں پہ کسی ابر کی مانند جو برسنے پہ آمادہ ہو' کھڑا تھا......؟

''بندو! میں تمہارا شکر گزار ہوں تم میری درخواست پہ یہاں تشریف لائی ہو...... اور ان کا بھی جنہوں نے میرا مان بڑھایا ہے۔ مجھے آپ دونوں کی شُبھ کامناؤں کی ضرورت ہے۔ آج میں ایک ایسا قدم اُٹھا رہا ہوں جو اس ملک میں ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھے گا۔ تم تو جانتی ہو کہ میرا اور میرے دوستوں کا مشن کیا ہے؟ ہم سب کو انسانیت کا پرچار کرنا چاہئے۔ کالے گورے' انڈین پاکستانی اور دین دھرم کے گورکھ دھندوں سے قطع نظر' ہمیں دیکھنا ہوگا کہ بحیثیت اک انسان ہم پہ کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ پیار محبت' امن' رواداری' وسعت نظری سے کام لے کر ہم اس دھرتی کو سورگ کا نمونہ بنا سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں' میں ایک ایسی مووی بنانے جا رہا ہوں جس کا تھیم انسانیت کا فروغ ہے۔ اس مووی کی ورکنگ باڈی میں سب انسان ہوں گے' کوئی انڈین یا پاکستانی انگریز جیکسن نہیں ہوگا...... جو شراب پیتا ہے ضرور پیئے' نماز پڑھنے والا نماز پڑھے۔ کسی کی مسجد' کسی کا گوردوارہ یا مندر گرجا...... ہر شخص کو اپنی اپنی ڈفلی بجانے کا حق ہے مگر یہ سب کچھ اسی کی حد تک ہو...... فرد کی آزادی' افکار کے اظہار کی آزادی' اپنی مرضی سے جینے مرنے کی آزادی...... اپنی پسند اور ناپسند کی آزادی...... دُنیا میں کہیں بھی آنے جانے کی آزادی...... یہ سب آزادیاں ہی انسانیت کے حقیقی معنی ہیں۔''

وہ اُنہیں اپنے دفتر لے گیا۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد نیلوفر سے مخاطب ہُوا۔

''آپ پاکستان کی رہنے والی ہیں مگر بہتر تعلیم کے لیے آپ نے انگلینڈ کو پسند کیا...... اس سے مزید آگے بڑھ کر آکسفورڈ یونیورسٹی کو تجویز کیا...... اس کا مطلب ہوا کہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کہیں بھی جا سکتا ہے' کسی سے بھی حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے بھی اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے فلم میڈیا کو چنا ہے۔ اس سے پیشتر میں نے کئی ایک کمرشل موویز کو پروموٹ کیا ہے...... میرا لگایا ہوا سرمایہ' اکثر

مجھے ذہنی تنگی صورت میں واپس ملا...... اَب مَیں اپنا سرمایہ ایک عالمی بلکہ انسانی مقصد کے لیے لگا رہا ہوں۔ اس راہ پہ میرے بہت دوست شامل ہیں جن میں فی میل بھی ہیں اور میل بھی' بوڑھے' جوان اور بچے بھی۔ میری خوش قسمتی کہ میرے ان ساتھیوں میں ہر میڈیا کے ہنرمند موجود ہیں جن کا تعاون بلا معاوضہ حاصل ہے۔ اس پروجیکٹ میں ہمارا ہر ساتھی باقاعدہ طور پہ ہمارا پارٹنر ہے...... نقصان کی صورت' میں اکیلا ذمہ دار لیکن پرافٹ میں سب شریک ہوں گے۔ یہ فلم انگلینڈ' انڈیا' پاکستان کے علاوہ افریقہ اور امریکہ بھی شوٹ ہوگی۔ آج اس فلم کا مہورت بھی ہے اور کاسٹ کی سلیکشن بھی۔ اس شبھ دن آپ تشریف لائیں' میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔''

شاید ابھی کچھ دیر تھی...... ٹیکنیشن اپنے اپنے کاموں میں نپٹے ہوئے تھے۔ مہمانوں کی آمد بھی جاری تھی مگر ہر چیز سے بے نیاز گولڈی سنگھ' دفتر میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ ہال کی جانب شیشے کی دیوار تھی...... باہر کی ہر کارکردگی اُس کے سامنے تھی۔ اس دوران نہ تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور نہ کوئی اس تک چل کر آیا...... لگتا تھا کہ اُس کا ہر کام شیڈول کے مطابق ہوتا ہے۔ خود کے علاوہ اُسے دوسروں پہ بھی بھروسہ کرنا آتا ہے...... پیار' اعتماد' محنت وشوق کی قوت وبرکت سے مالا مال......!

کھانے پینے کا انتظام اُوپر ہوٹل میں تھا وہ بھی تیسری منزل پہ...... چار سیٹوں والے میز پہ یہ تینوں بیٹھے کھانا پینا کر رہے تھے...... اختتام پہ لفٹ کے ذریعے' نیچے سٹوڈیو پہنچے تو سب کام تیار تھا۔ کیمرے' لائٹس' ساؤنڈ' سٹل کیمرے...... ڈائریکٹر ایکٹر' جیسے سب گولڈی سنگھ کا انتظار کر رہے تھے۔ سیٹ پہ آتے ہی اُس نے گھڑی پہ نظر ڈالی اور سیٹ ڈائریکٹر سے کچھ بات چیت کی۔ فلم لائٹس کے بعد کیمرا آن ہوا اور گولڈی سنگھ بڑے اَدب ووقار سے کیمرے کے سامنے آیا۔ ہاتھ جوڑ کر سب کو تعظیم دی...... تلے الفاظ میں کہنا شروع۔

''آپ سب کا سواگت ہے۔ آج ہم سب اپنی فلم ''نیلا صاحب'' شروع کر رہے ہیں جس کی تفصیلات' بروشر میں موجود ہیں...... آپ جانتے ہوں گے کہ گورو گوبند سنگھ جی کے گھوڑے کا نام نیلا تھا۔ ہم یہ نام' اُمن' بھائی چارہ' جرأت اور سچائی کے لیے بطور استعارہ استعمال کر رہے ہیں اس اُمید کے ساتھ بھی کہ ہم میں بھی یہ چار صفات پیدا ہوں تاکہ ہم اُمن کی خاطر' بھائی بھائی بن کر جرأت اور سچائی کے لیے عملی طور پہ کوئی کام کر سکیں۔ انسانیت کے فروغ کی خاطر ہمارا اقدم' یہ فلم ہے۔ اس کا مہورت ایک ایسی لڑکی کے ہاتھوں ہوگا جو بہت وجوہات کی بنا پہ اس کی حقدار ہے...... اَب مَیں مزید وقت ضائع کیے بغیر' اُس معزز ہستی کو کیمرے کے سامنے آنے کی دعوت دیتا ہوں...... مس نیلوفر! پلیز آپ یہاں تشریف لائیں۔''

نیلوفر اور بندو تو جیسے اپنی نشستوں سے گرتے گرتے بچیں...... اُن کے تو وہم وگمان میں بھی کہیں موجود نہیں تھا...... ایک سپاٹ لائٹ نے اُنہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ تالیوں کا شور' سیکڑوں نگاہیں ان پہ جمی

ہوئی تھیں۔ گھبراہٹ کے عالم میں بندو نے اسے کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ نیلوفر اپنی جگہ پہ حیران کہ اگر ایسا ہی ہونا تھا تو اُسے پہلے بتا دیا جاتا تاکہ وہ ذہنی طور پہ تیار ہو جاتی۔ اچنبھے اچانک ظہور پذیر ہونے والی حیرتوں کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔ اچنبھا' خوشگواریت لیے ہوئے ہو تو چلوؤں خون بڑھ جاتا ہے' چہرہ گلنار ہو جاتا ہے۔ رگ و پے میں بجلیاں سی کوندنے لگتی ہیں اور اگر ناگواریت لیے ہوئے ہو تو دل بے طرح دھڑکنے لگتا ہے...... چہرہ بے رنگ اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں...... بادلِ نخواستہ اُٹھی' مَن مَن بھاری قدموں سے چلتی ہوئی کیمرے کے سامنے پہنچ گئی...... گولڈی سنگھ نے آگے بڑھ کر سواگت کیا' پھولوں کا گلدستہ پیش کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔

''گھبرائیں نہیں' ہم سب آپ کے ساتھ ہیں اور آپ ہمارے ساتھ......''

لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آپ ہیں شریمتی نیلوفر جی! آپ کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یہاں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں...... سب کے لیے خوشخبری کہ آپ ہماری مووی نیلا صاحب میں ہیروئن کا رول کریں گی۔ مجھے بہت عرصہ سے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو میری فلم کی ضرورت کے عین مطابق ہو۔ میری گڈ لک کہ میری تلاش مکمل ہوئی اور مس نیلوفر کی صورت میں مجھے نیلا صاحب کی نیلماں مل گئی۔ ابھی نیلا صاحب کا مہورت بھی مس نیلوفر ہی کریں گی۔''

تالیوں کی گونج اور مبارک سلامت کے شور میں' نیلوفر جیسے کہیں گم ہو گئی' کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں وہ بندو کے اصرار پہ محض ایک پارٹی میں شریک ہونے آئی تھی یا پھر گولڈی سنگھ کو قریب سے دیکھنے...... نہ کہ کسی مووی کا مہورت کرنے یا ہیروئن بننے۔ اُسے یہ سب کچھ عجیب سا لگا...... جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو مگر یہ سب کچھ حقیقت تھا۔ انہی تالیوں اور میوزک کے شور میں اُسے اپنی دوست بندو اور شری گولڈی سنگھ کی تمام باتیں یاد آ گئیں...... وقت کا پھیر یا پھر قسمت کا گھیر' اُس کے اندر سے کہیں آواز آئی...... تمہیں ان پیارے لوگوں کے مشن میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے یہ انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں...... وہی قومیں' لوگ زندہ اور خوش رہتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں گے اور نفرت تعصب منافقت چھوڑ کر جیو اور جینے دو کے فلسفہ پہ عمل پیرا ہوں گے۔؟

انسانی سوچ بڑی تیز رفتار ہوتی ہے۔ یہ حالات اور وقت کی پکڑ میں نہیں آتی۔ اک ساعت کے کروڑویں حصہ میں صدیوں پہ محیط فیصلے کر لیتی ہے۔ ظاہری جسم کی مانند ظاہری ذہانت بھی ہوتی ہے۔ یہ سود و زیاں' درست و غلط کا حساب کتاب کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح اک باطنی ذہانت بھی' جو ہوتی ہے۔ ''حسابِ دوستاں در دل'' تو دیکھتی ہے مگر اندیشہ ہائے کم و بیش میں مبتلا نہیں ہوتی۔ ایسے جراثیم پاگلوں'

عاشقوں مجاہدوں یا پھر مجذوبوں بابوں میں پائے جاتے ہیں۔''
انسان ایک مکمل کمپیوٹر کی طرح ہوتا ہے۔ اُس میں ہر وہ حرکت برکت سوجھ بوجھ' فہم وفہامت' دانش اور جنبش سکت وطاقت موجود ہوتی ہے جس سے دیر بدیر کبھی پالا پڑ سکتا ہے۔ اَب جس نے اپنی اندر باہر کی ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کو جان لیا اس کے لیے چشم زدن میں فیصلہ کرنا ممکن ہو جاتا ہے اور جس نے کوشش ہی نہیں کی یا چاہا ہی نہیں' اُس کے لیے یہ کمپیوٹر ایک چوپا دان کی طرح ہے۔''
نیلوفر کے باطنی کمپیوٹر نے فوراً جواب دے دیا تھا...... آب صرف ہاں کرنا اور مہورت کی رسم ادا کرنا باقی تھا......
''میں مسٹر گولڈی سنگھ کی مشکور ہوں کہ اُنہوں نے اِتنے اہم مشن میں مجھے شامل ہونے کا موقع فراہم کیا اور مس بندو کی بھی' جس نے اِس جانب میری توجہ دلائی...... میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کسی فلم میں اداکاری کروں گی۔ گولڈی صاحب نے مجھے بہت بڑا سرپرائز دیا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ میں اُن کی توقعات پہ پوری اُتروں۔ مجھے یہاں جو عزت قدر ملی وہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔''
تالیوں کی گونج میں وہ واپس اپنی سیٹ پہ آ بیٹھی۔ بندو نے سب سے پہلے اُسے بدھائی دی۔ گولڈی سنگھ نے اُسے سکرپٹ کا ایک ورق دیتے ہوئے کہا۔
''یہ آپ کا ڈائیلاگ ہے پہلا شاٹ آپ پہ ہوگا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد آپ پہ ٹیک ہوگا...... آپ ڈریسنگ روم میں کپڑے تبدیل کر لیں۔ میک اَپ بھی......''
''ڈائیلاگ تھا۔'' دین دھرم اپنا اپنا پر انسانیت سب دی سانجھی ہوندی اے' انج ای پریم دی وگدی دھارا وی اِکو ای...... جیڑا ایہناں گاں والا آگئے دودھ کے اِک گھٹ اُمرت دا پی لے......'' اُس کے اندر کا ناپا سا چھِڑ گیا۔ یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہوگیا۔ جیسے اُس کے حواس شل سے ہو گئے تھے...... اُسے ہپناٹائز کر دیا گیا تھا۔ نہیں ایسا نہیں تھا دراصل جب مشین کی گراری کا کھانچا' دوسری کھانچے میں فِٹ بیٹھ جاتا ہے تو وہ دونوں آپس میں مل کر حرکت پذیر ہو جاتے ہیں یا کسی کی کوئی بات' جب کسی کے اُصول' فکر و سوچ سے لگا کھا جاتی ہے تو وہ پھر دونوں کی سانجھی ہو جاتی ہے...... ایک طاقت اور ہمت بن جاتی ہے۔ آپس کی سوچوں خیالوں کے دھارے ہی تو مل کر اِک وشال ساگر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اِن کی سائیکی آپس میں مل گئی تھی......''
لاکھوں لوگ' ہزاروں برس اِک دوجے کی بغل میں رہتے ہیں مگر کیا مجال جو کبھی ایک لمحہ بھی ذہنی فکری طور پہ اِک دوسرے کے قریب آئے ہوں...... دیکھا ہوگا کہ کبھی کوئی انجانا سامنے یا قریب سے گزر گیا تو یوں لگا جگر کا ٹکڑا پہلو سے نکل گیا۔ شوہر کے پاس بیوی ضروری نہیں ذہنی اور فکری طور پہ بھی موجود ہو۔

روزمرہ میں ہے کہ کچھ بچے' اپنے والدین کی بجائے' کسی اور فرد سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اندر کے کھانچے آپس میں ملتے ہیں۔ خاوند کو اپنی حسین بیوی سے کہیں زیادہ' موٹے ناک والی سڑی سالی اچھی لگتی ہے کہ اُن دونوں کی سائیکی آپس میں ملتی جلتی ہوتی ہے......؟

یہی حال اِدھر بھی ہُوا۔ اسے لگا جیسے گولڈی سنگھ' اُس کے چاروں آدرشوں خیالوں اور اس کی باطنی پکاروں کو سُن اور خوب سمجھ سکتا ہے۔ اِس مقام پہ جنس مذہب دھرم اور دیگر طبقاتی 'لسانی تضادات چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ ''اِنسان' ظاہری باطنی آسودگی اور سلامتی کا خواہاں ہوتا ہے۔ جدھر سے مل جائے وہی اُس کی جنت ہے اور جس سے مل جائے وہی اُس کا خواجہ!......اُس کے دل نے صاد کیا تھا......اُسے بھلا اور کسی گواہی کی کیا ضرورت تھی؟

تعلیم کے ساتھ ساتھ' فلم کی شوٹنگ بھی ہونے لگی۔ اُسے یُوں لگا جیسے وہ کوئی پیشہ ور اداکار ہے۔ کبھی بھی تو اُسے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ بڑے اعتماد اور ماہرانہ انداز سے مشکل سے مشکل سین' پہلے ہی شاٹ میں اوکے کروا دیتی......سچ تو یہ کہ گولڈی سنگھ کی پُرخلوص رفاقت اور چشم وقلب کی کشادگی وطہارت نے اُسے بے پناہ تقویت اور اعتبار بخشا تھا۔ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک ہی دل و دماغ سے کام لیتے ہیں......قالب الگ الگ مگر بنیادی میٹریل ایک ہی ہو......!

فلم کے اِبتدائی تین چار شیڈیل' چنڈی گڑھ' ممبئی اور امرتسر میں مکمل ہو چکے تھے۔ کینیڈا' نیروبی کا اہم کام بھی ہو چکا تھا۔ اَب اِنگلینڈ میں کچھ کام ہونا باقی تھا۔ جس کے لیے کرسمس کا اِنتظار تھا......اِن دِنوں فلم کا کچھ پوسٹ ورک پائن وُڈ سٹوڈیو میں ہو رہا تھا اور ڈانس کا پیچ ورک بھی جسے اِنڈیا سے خصوصی طور پہ آئی ہوئی کوریوگرافر' ورشن کور بھنڈاری کروا رہی تھی۔'' نیلوفر کی یہ ساری سٹوری کُھلی تو ذرا دیر سے' مگر کُھل گئی......!

آصف صفی کو اپنے دوست اور کچھ دیگر ذرائع سے سب باتوں کا علم ہو گیا تھا......جلا بُھنا لندن پہنچا، مختلف جگہوں پر تلاش کر رہا تھا۔ تلاش میں سمت اگر درست، محنت اور اخلاص شامل ہو تو کھوجنے والا بالآخر کامیاب ہو ہی جاتا ہے......

نہ ہو طلب تو کسی دَر سے کچھ نہیں ملتا

جو ہو طلب تو دونوں جہاں سے ملتا ہے

پائن وڈ، اِنگلینڈ کا سب سے بڑا قدیمی اور تاریخ ساز فلم اسٹوڈیو ہے۔ یہاں یہ بڑی بڑی معرکۃ الآرا فلمیں وجود میں آئیں جن کی تعداد اور تفصیل اپنی جگہ پر اِک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس کے اوپن فلور پہ

نیلا صاحب کا ایک سیٹ لگا ہوا تھا۔ جس پہ سیکڑوں چھوٹے بڑے اداکاروں اور رقاصاؤں کے ساتھ نیلوفر پہ ایک لوک ڈانس فلمایا جا رہا تھا۔ کسی ایشین کمرشل مووی کی یہاں فلمبندی، بذاتِ خود، اس کے لئے ایک اعزاز کی بات تھی ...... یہ گولڈی سنگھ کا پروجیکٹ تھا جو اس اسٹوڈیو کے لئے بھی باعثِ افتخار تھا۔ ریسپشن سے گولڈی کے سیکنڈ اسسٹنٹ کو آصف صفی کا کارڈ، سیٹ پہ بھجوایا گیا۔ اطلاع پاتے ہی نیلوفر بھاگی بھاگی آئی ...... بڑی خندہ پیشانی اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اپنے ہمراہ سیٹ پر لے آئی۔ گولڈی سنگھ سے تعارف کروایا۔ فلم اور اپنے کردار کے بارے مزے لے لے کر باتیں کر رہی تھیں یوں جیسے یہ سب کچھ اس کے لئے بڑے فخر اور اطمینان کا باعث ہو۔ پنجابی کُرتہ لاچے میں پنجاب کے کسی گاؤں کی کوئی الہڑ مٹیار لگ رہی تھی ...... لمبی سی گُت، سیدھی مانگ، کجرائے نین، شفتالوں سے گال، کانوں کی لووں میں بڑے بڑے بالے، ناک سے ناک میں موٹا سا لونگ ...... وہ کچھ لمحوں کے لئے بھول ہی گیا کہ وہ کون ہے ...... یہ سامنے کھڑی آنکھیں مٹکا مٹکا کر چیڑ چیڑ باتیں کرنے والی مٹیار کون ہے اور اِدھر کس مقصد کے لئے پہنچا ہے ......؟

کچھ لمحوں بعد ہوش ٹھکانے لگے تو اُس کے اندر باہر کی کیفیت ہی بدل چکی تھی۔ اُسے یہ سب کچھ بہت بھلا لگا۔ نیلوفر کے چہرے بُشرے، باتوں اور حرکات سے پھوٹتی ہوئی بشاشت ...... گولڈی سنگھ کی مسحور کُن شخصیت، انگ انگ سے پُھوٹتی ہوئی شرافت ...... یہاں کا ماحول، لوگ ...... لگا کہ یہ سب کچھ بڑے سلیقے اور پروفیشنل انداز سے ترتیب دیا ہوا ہے۔ یہاں دوسروں کی عزتِ نفس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ذات پات، دین دھرم، سب کے اپنے اپنے ...... کسی پہ کچھ ٹھونسا نہیں جاتا اور وقت ضائع نہیں کیا جاتا ...... یہیں غور کرتے کرتے وہ اچانک دُوسرے رُخ کی جانب رُجوع ہُوا۔

کیا یہ وہی نیلوفر ہے؟ شرم و حیا کی پُتلی، اپنی مشرقی روایات، خاندانی قدروں کی پاسداری کرنے والی ...... جو اعلیٰ تعلیم اس غرض سے حاصل کرنا چاہتی تھی کہ اپنے خاندانی کاروبار کو مزید جدید انداز میں وسعت دے سکے ...... وقت کے بدلتے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ سسرال والوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے ...... محض ایک روائتی بیوی بن کر بہت سے بچوں کی ماں نہیں بننا چاہتی تھی۔ آصف صفی اُس کا پیار تھا منگیتر تھا‘ اُس کی جیون ساتھی بن کر دونوں خاندانوں کو ترقی، خوشحالی و شہرت کی نئی راہوں پہ ڈالنا اُس کا خواب تھا، مگر ...... یہ ...... جن راہوں پہ چل نکلی یہ تو اس کی پہلے سے متعین کردہ راہوں سے بالکل مختلف ہیں۔؟

خاندان والوں اور بزرگوں کو جب یہ پتہ چلے گا کہ اُن کی بہو بیٹی، ایک انڈین سکھ کے مقابل فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کر رہی ہے اُن پہ کیا بیتے گی۔ اخباروں، رسالوں میں جب اس کے اشتہار شائع ہوں گے۔ کیا اُن کی عزت اور کاروباری ساکھ، خاک میں نہ مل جائے گی ......؟

رات شوٹنگ ہوتی رہی۔ صبح سے پہلے، وہ نیلوفر کے ہمراہ فلیٹ میں چلا آیا۔ پچھلی بار وہ اپنے یونیورسٹی والے ہوسٹل میں تھی۔ اس بار گولڈی سنگھ والے پُرآسائش لگژری فلیٹ میں مقیم...... وجہ سمجھ میں آتی تھی پہلے اس کی ترجیح محض تعلیم کا حصول تھا اب اُس کے پیشِ نظر فلم مکمل کرنا...... ساؤتھ آل کے خوبصورت، ریذیڈنس پلیس میں دو خواب گاہوں والی یہ اقامت گاہ، جس کا نام "بلیو سکائی" یعنی نیلا امبر...... اک پُرتعیش قیمتی فلیٹ تھا...... جس کے ملکیتی حقوق، فلم کے معاوضہ طور اسے کانٹریکٹ سائن سے ہی دے دیئے گئے تھے جبکہ اُس وقت اس کا سکرین ٹیسٹ بھی نہیں ہوا تھا۔"

یقین، بھروسہ، اک خدائی نعمت کہ جن طالع مندوں کو عطا میں مل جائیں تو وہ عصر کے سکندر ٹھہرتے ہیں۔ لکھ دیا گیا ہے کہ پیار، اعتبار اور ویہار میں ڈنڈی نہ مارنا۔ بہت قیمتی ہو جاؤ گے اور حدِ متعینہ سے تجاوز بھی نہ کرنا کہ راکھ بچے گی نہ خاک...... ؟ یقین! جس نے یقین کو عین الیقین بنالیا اور یہ جان لیا کہ کس پہ، کس وقت، کس حد تک اعتبار و بھروسہ کرنا ہے...... وقت و وقوع کی عنان اُس کے ہاتھ ہوتی ہے۔"

گولڈی سنگھ اس نعمتِ غیر مترقبہ سے خوب بہرہ ور تھا۔ مقابل کو اُس کے خد و خال صُوت کے زیر و بم سے ہی نہیں بلکہ اُس کے اندر والے چہرے مہرے کے مدّ و جزر سے بھی پہچان کرتا تھا یعنی وہ سکۂ رائج الوقت کا شاہی مہر شناس ہی نہیں اصل ٹکسال بھرت کو بھی پرکھنے جانچنے کی سُرت سمجھ رکھتا تھا۔ پرکھنا، جانچنا بعد میں ہوتا ہے مگر جواہر کی جبلّی جولانی وجودت...... جوہری کو جواہر زری کا جُھولا نجھائے بن نہیں رہتی۔ اصل فیصلہ تو وہ پہلی نظر میں ہی کر لیتا ہے...... بعد کی سب باتیں فروعی اور پیشہ ورانہ ہوتی ہیں۔

گولڈی سنگھ کے سارے فیصلے اور فوری عملی اقدام بادی النظر میں کسی نو دولتیے، شہرت پسند اوچھے شخص کے احمقانہ اقدام دکھائی دیے مگر دیکھنے والوں اور تجزیہ کرنے والوں نے مانا کہ اُس کے پاس ایسی نظر، غیر معمولی حس اور کوئی باطنی قوت یقیناً موجود ہے جو اسے انجام کی سلامتی بھری مہک سے آشنا کرا دیتی ہے۔

ہر ذی نفس کے اندر باہر، دیدہ نادیدہ، خفتہ نہفتہ کچھ قوتیں صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ کچھ پہ تو اختیار اور بہت سی میں بُعد اور ایسی بھی کہ اگر چاہو تو آسانی سے انھیں برت لو...... مگر تساہل پسندی اور کچھ خوف و خطر آڑے آ جاتا ہے۔ معدودے چند ایسے بھی جو اپنی ان صلاحیتوں کے اچھی طرح جانو ہوتے ہیں۔ ان سے کام لینے کے ڈھب اور سمے کی سعد سُمیا کا بھی ادراک رکھتے ہیں...... یوں کہ جیسے خاندانی تجزیہ کار دیکھ داؤ ذی سے فیض یاب آہن گر...... لوہے کی کچاؤ پکاؤ، رنگ و نسل، برت و کرت کے خوب خُوگر ہوتے ہیں۔ وہ تیغ و سناں، تیر و تبر، تیز و نیزہ، کٹار و خنجر، سپر و خود کے ساتھ ساتھ ناخنہ و نشتر، انگشتہ، تکلہ، مہمیز، سُوئی قینچی، چھری، چاقو، پیچ و پنجہ، تمنچہ و ترازو، میخ و مُہر، تیشہ و کدال، سلاخ و سلاسل پہ خوب ہاتھ رواں رکھتے ہیں جبکہ

کج ذاتیے' مستری لوہارئیے' کھرپے بسولے، کواڑ کنڈے، منھ ڈنڈے، تیشے رندے، رہٹ ڈولے، ہلوں کے پھل، پانی کے نل، گھوڑوں خچروں کے کھر کوکے، ورانتیاں ٹوکے، پیار چھیتوں کی کلیاں، ڈانگ سوٹوں کی شامیں، دست پناہ، مویشیوں کے کلّے، ہتھوڑے چھینیاں اور تعمیراتی اوزاروں کے لئے ہی اپنی سندان صاف اور بھٹی دہکائے رکھتے ہیں۔

"ذرفش کاویانی" ہر کسی آہن گر کے ہاں نہیں نکلتا۔ ریوڑ جنگلی بھینسوں کے ہوتے ہیں' شیروں کے نہیں۔ دھرتی پہ بڑی رنگا رنگیاں ہوتی ہیں مگر دھنک رنگیاں، صرف نیلے امبر پہ ہوتی ہیں، چرخ نیلی فام...... نیل نم کوئی زہریلی ہوتی ہے...... سم ہلاہل، جب ہلاک کر دیتا ہے تو چہرہ نیلا پڑ جاتا ہے۔ پانی میں ہلاکت سے جثہ پھول کر نیلگوں ہو جاتا ہے۔ شعلہ بھی جوالا مکھ ہونے پہ نیلے شیڈ چھوڑتا ہے۔ نیل کنٹھ کا پھوڑا ہو یا نیلا تھوتھا...... نیلی بار کی بھینس ہو یا کوئی مہکتی ہوئی نیلماں، نیلم کی کنی یا سرسراتا ہوا نیلگوں سنپولیا...... میرا تجربہ ہے سب ہی کٹیلے زہریلے اور بھڑکیلے ہوتے ہیں۔ نخاوے سے ٹکر مارنے اور فوری ردِ عمل ظاہر کرنے والے...... نیوی بلیو...... سکائی بلیو کے آگے ہی شانت پڑتا ہے۔

نیلوفر کا فوری مثبت ردِ عمل، اُس کے نام کے مزاج کے عین مطابق تھا......

؎ ایک پل میں بدل گئی دُنیا حادثے بھی عجیب ہوتے ہیں

ایسا حادثہ کہ پل بھر میں سب کچھ زیروزبر ہو گیا تھا...... فلیٹ پہنچ کر شتم پشتم، کام نبٹاتے ہوئے وہ اپنے اور اس کے گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کرنے لگی۔ کہیں کہیں، اپنی مصروفیات، پڑھائی، فلم کی بات بھی کر دیتی۔ فلم کا ذکر کرتے ہوئے وہ خاصی گرم جوش سی ہو جاتی جیسے یہ موضوع اُس کی زندگی، مستقبل کا اہم موضوع ہے۔ وہ ان ساری غیر معمولی سی تبدیلیوں کو اپنے لئے بڑی سعد تصور کر رہی تھی جیسے اگر یہ تبدیلیاں نہ آتیں اور گولڈی سنگھ اُس کی زندگی میں داخل نہ ہوتا تو وہ زندگی کے مقصد سے کوسوں دور رہتی...... اُدھر آصف صفی، چہرے پہ خشک برف کا سفوف ملے' کانوں میں پارہ ٹپکائے اور زبان کے آرپار تکلہ لیے، موتیا بند آنکھوں سے اِسے دیکھ سُن رہا تھا۔ ایسا محبت کی اِنتہا میں ہوتا ہے یا پھر جسے اللہ اپنی رحمت سے موقع محل کے مطابق کام لینے کی سوجھ عطا فرما دے کہ وہ صبرِ جمیل اور عقلِ سلیم سے استفادہ حاصل کرکے راضی برضا رہے اور اپنی تدبیر کی تمام تر توانائیوں کے تلف ہونے کو عین اُس عظیم بالاتر کی حیثیت تسلیم کر کے آسودۂ خاطر ہو جائے۔

وہ شاید سوچ رہا تھا یہ محبت ذ جنت، سب بکواس چیزیں ہیں...... کچے اور نا سمجھ ذہنوں کی پیداوار! بیکار وقتی کے نچو نچلے مشغلے...... خود تلذذی کی بچکانہ سی مشق...... یا پھر اوائل عمری میں محبت کے بارے کچھ جاننے کی خاطر ایسا کچھ کیا جاتا ہے۔ دیکھا دیکھی میں محض چکھنے کی خاطر بھی محبت کر لی جاتی ہے جبکہ دیکھا گیا ہے کہ

ایسی محبت، منگنیاں، وعدے وعید تعلقات اکثر تو نہیں چڑھتے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ، جو اس قسم کے جذباتی حادثات خود کو ٹوٹنے بکھرنے سے بچا لیتے ہیں۔؟

کافی بسکٹ سامنے دھر کر وہ شاور لینے گھس گئی...... بلیک کافی کے اُوپر تیرتی ہوئی کریم کی جھاگ چمچ سے چھیڑتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ سیاہ تلخ کافی کے اُوپر سفید نرم کریم، جو پہلے سپ ہی میں کہیں گم ہو جاتی ہے پھر تلخ کافی، جو آخری گھونٹ تک تلخ ہی رہتی ہے...... مطلب یہ کہ اصل حقیقت تو کالی تلخ کافی ہے۔ سفید نرم میٹھی ملائی تو اِک دکھاوا بہلاوا ہے جو اِبتدائی طور پر کچھ خوبصورتی لاتا ہے اور بس! کریم کی جھاگ بیٹھ گئی اور کافی رہ گئی۔ نیلوفر کے باہر آنے تک وہ جھاگ کو بھول کر کالی کافی کی حقیقت تک پہنچ چکا تھا۔ اُس نے بالوں کو تولیے سے پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں گولڈی سنگھ کیسا لگا......؟''

اس کا فوری جواب تھا۔

''ونڈرفل بہت ہی اچھا! بے لوث اور خوش اخلاق...... کم از کم مَیں نے اِس سے پہلے سکھوں میں ایسا پیارا بندہ نہیں دیکھا۔''

''آصف! یقین کرو یہ انسان! اس دور کا کوئی بہت بڑا ولی اللہ ہے...... مَیں نے یُونہی سکھ مذہب کے متعلق کچھ مزید جاننے کی خاطر، لائبریری سے بابا گورونانک کے بارے ایک کتاب لی، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ وہ تو ہم نام نہاد مسلمانوں سے کہیں بڑے مسلمان تھے۔ اِنسانیت کے فروغ کے لئے اُنہوں نے اپنی تمام زندگی وقف کر رکھی تھی...... اب یہی کچھ گولڈی سنگھ بھی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فرق صرف زمانے اور نئے طور و انداز کا ہے۔ ہم سب لوگ، اِسی اِنسانیت کے مشن کو آگے لے جانے میں جُتے ہوئے ہیں۔''

اس کی بات سن کر آصف صفی ہلکا سا مسکرا دیا...... یونہی پوچھنے لگا۔

''یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر یہ فلم میں کام کرنا...... ناچنا گانا اداکاری وغیرہ؟...... تم خُوب جانتی ہو، تمہارا یہاں آنے کا مقصد ایڈوانس ایجوکیشن حاصل کرنا تھا نہ کہ فلم! ذرا سوچو! جب ہمارے بزرگوں رشتہ داروں کو پتا چلے گا تو کیا ردِعمل ہوگا......؟ تعلیم کے بعد ہمارا شادی کا پروگرام ہے، ساری تیاریاں مکمل ہیں۔ مَیں تمہارے فارغ ہونے کا اِنتظار کر رہا ہوں اور تم نے یہ سب کچھ اپنے طور ڈن کر لیا...... اور تو اور مجھ سے بھی مشورہ تک نہ کیا۔ مَیں تمہارا منگیتر ہی نہیں دوست اور پھر کزن بھی ہوں۔''

وہ کمال بے اعتنائی سے آئینہ کے رُوبرو بال سنوارتے ہوئے بولی۔

''آصف! تم نے بالکل ٹھیک کہا...... بلکہ اگر مَیں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید اِس سے بھی زیادہ کچھ کہہ

گزرتی۔ پر پتا نہیں یہ سب کچھ کیسے سرزد ہو گیا۔ مَیں جو کچھ واضح کرنا چاہتی ہوں اُسے، اگر تم میرے منگیتر، کزن، پاکستانی اور مسلمان بن کر سنو گے تو بات کی حقیقت تک پہنچ نہیں پاؤ گے اور اگر دوست اور انسان بن کر سنو گے تو پھر یقیناً اُسے سرا ہو گے!...... میری یہ بات، ظاہری کانوں کی سماعت کے لئے نہیں بلکہ باطنی بصیرت کے لئے ہے۔ جس طرح کچھ دیکھنے والی چیزیں، سُننے کے لئے اور سُننے والی دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ کچھ یوں بھی یگانہ اُوصاف ہوتے ہیں جو خوشبوؤں کو سونگھتے نہیں، محسوس کرتے اور دیکھتے ہیں......؟ کچھ پیغام ایسے بھی جو کہ صوت، صورت اور بصارت کے محتاج نہیں ہوتے' وہ لوحِ باطن پہ اُلقا ہوتے ہیں...... وہی راست و راسخ ٹھہرتے ہیں۔ طور پہ چڑھنے سے پیشتر کچھ اور ہوتا ہے اُوپر پہنچ کر کچھ اور...... اور پھر نیچے اُتر کر کچھ سے کچھ اور...... پاؤں سے سفر محض زمین کا ناپنا ہے...... سوچ و خیال کی مسافتیں' کائنات کا ناپنا ہے جبکہ باطنی فکری اسفار خود کو جانچنا ہوتے ہیں۔"

کچھ دیر، آصف صفی کی پیشانی کو غور سے دیکھنے کے بعد پھر کہنے لگی۔

"مَیں بھی جانتی ہوں اور ابھی ابھی تم نے بھی یاد دلایا کہ میں اِدھر ایڈوانس ایجوکیشن میں ڈگری لینے کی خاطر آئی تھی۔ ٹھیک ہی تو ہے یونیورسٹی میں پڑھتی بھی ہوں اور پریکٹیکل بھی کر رہی ہوں۔ یونیورسٹی والی ڈگری مجھے چند مزید کپڑے کی ملوں، فارن بینکوں کی موٹی موٹی بینک بکوں تک تو رسائی دے سکتی ہے مگر شاید باطنی فکری اور انسانی بالیدگی تک اس کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔"

آصف! مَیں یہاں تک خود نہیں پہنچی' کوئی نادیدہ اور برتر ہاتھ، مجھے پکڑ کر یہاں تک لے آیا۔ مَیں پورے وثوق سے سمجھتی ہوں کہ مجھے یہی کچھ کرنا چاہیے جو مَیں کر رہی ہوں۔ شادی کر کے بچے پیدا کر لینا...... بزنس بڑھا کر ڈالر جمع کر لینا وغیرہ اگر یہی کسی کی زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے تو یہ اُدھورا اور اندھا مقصد ہے۔ اِدھر آئے ہو تو چند روز ہمارے ساتھ گزارو، اگر تم یہیں کے ہو کر نہ رہ گئے تو جو کہو گے وہی کروں گی......؟ یہاں تک کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہارے ساتھ واپس چلی جاؤں گی' وعدہ......!"

آصف صفی اُسے باتیں کرتے ہوئے یوں تک رہا تھا جیسے وہ اُس کی منگیتر، کزن نہ ہو، عبرانی زبان میں کسی آسمانی صحیفے کا کٹا پھٹا کوئی ورق ہو...... جو، نہ تو پڑھا جا رہا ہو اور نہ سمجھ میں آتا ہو لیکن اُس کا سمجھ میں آنا بھی ضروری ٹھہرا ہو۔!

"کہاں گم سم ہو، جو کہہ رہی ہوں سُن بھی رہے ہو یا مَیں اپنے الفاظ ضائع کر رہی ہوں؟"

"ہوں......! وہ جیسے چونکا۔" ہاں ہاں! خوب سُن رہا ہوں بلکہ یہ سب کچھ پہلی بار ہی تو سُن رہا ہوں کہ شاید پھر کبھی ایسا کچھ سُننے کو نہ ملے۔"

وہ برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔ پلیز! اب تم سو جاؤ۔ مَیں بھی کچھ آرام لینا چاہتی ہوں؟

''مَیں تم سے ملنے اور بہت کچھ کہنے سُننے آیا ہوں۔ سونے نہیں...... تم مجھے اصل سونے یعنی گولڈی سنگھ کے بارے میں مزید بتاؤ......! اور یہ بھی کہ یہ تمہاری فلم کس حد تک تیار ہو چکی ہے...... تمہارا کام کتنا باقی ہے اور کیا تمہارا فی الفور اس پراجیکٹ سے علیحدہ ہونا ممکن ہے؟؟''

وہ اُسے گھورتے ہوئے جواب دینے لگی۔

''مَیں فرداً فرداً جواب دیتی ہوں' گولڈی سنگھ میرے لئے ایک انسان دوست ہے اُسے لڑکیوں کی کمی نہیں اور نہ ہی وہ کسی کمپلیکس میں مبتلا ہے۔ اُس کا مشن اور مشغلہ، انسانیت کے فروغ کے لئے اپنا کردار ادا کرنا ہے اور اس کے گرد بشمول میرے، سب ہی اس مشن میں اس کے ساتھی ہیں...... جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ فلم میڈیا، کسی مشن کو آگے بڑھانے میں کتنا زبردست کردار ادا کر سکتا ہے...... ہماری مُووی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور چونکہ ہمارے زیادہ تر ساتھیوں کا تعلق فلم، ٹیلی ویژن، سٹیج اور پرفارمنس آرٹ سے ہے اس رعایت سے ہمارے لئے مووی بنانا قدرے آسان ہے اور تم حیران ہو گے کہ تمام ساتھی بلامعاوضہ اپنا اپنا کام کر رہے ہیں اور ہاں' یہ بھی تمہیں معلوم ہو کہ بطور ہیروئن، میری سلیکشن کسی منصوبے یا ارادے سے عمل میں نہیں آئی۔ اوپننگ شاٹ سے آدھا گھنٹہ پہلے تک مجھے یا کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ مَیں اس فلم کی ہیروئن ہوں اور نہ ہی میرا اسکرین ٹیسٹ ہُوا اور نہ کوئی کاسٹیوم یا میک اپ...... بس' میرے گلے میں ہار ڈالا گیا اور کیمرے کے سامنے لا کر دو لائنیں بولنے کو دی گئیں اور مَیں اس فلم کی ہیروئن تھی۔''

لو! ایک اور بات اچنبھے کی سنو' پہلا شاٹ اوکے ہُوا تو گولڈی سنگھ نے ایک لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ اس مُووی میں آپ کی شمولیت کے شکریے کے طور، یہ معمولی سا نذرانہ...... پتا ہے' آصف! اس میں کیا تھا؟ اس فلیٹ کے مالکانہ حقوق...... بمع جنرل ریٹس ٹیکس اور دیکھ بھال کے اخراجات وغیرہ۔ دُوسروں کے ساتھ اُس نے کیا سلوک کیا، مَیں اس سے واقف نہیں لیکن مجھے اپنی فرینڈ بندو سے معلوم ہُوا وہ تمام ساتھیوں کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ سب اعلیٰ اَدنیٰ کے آگے ایسے جُھکا رہتا ہے جیسے وہ اِن کا معمولی سا ملازم ہے۔ باقی تمہارے سوالوں کا جواب دینے کی اب شاید ضرورت نہیں۔'' ہاں' ایک دو باتیں ضرور کہوں گی کہ مجھے فلموں میں ہیروئن بننے کا کوئی شوق نہیں...... کوئی مشن ہو یا کوئی مشینری' یہ دونوں اُس وقت فعال ہوتے ہیں جب تک اِن کے کُل پُرزے اپنی اپنی جگہ اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہوں...... مَیں بھی گولڈی سنگھ کے مشن اور مشینری کا ایک پُرزہ ہوں...... مَیں اپنی ذمہ داری سے سرِمُو انحراف کا تصور نہیں کر سکتی۔ یہ نہیں کہ مَیں اُس کی شخصیت، دولت، دریا دلی سے متاثر ہوں۔ نہیں' تم جانتے ہو کہ یہ سب کچھ ہمارے پاس بھی

موجود ہے۔ بات صرف اتنی کہ اُس نے مجھ پہ اعتماد کیا...... بِن کسی شرط، معاہدہ اور پابندی...... ہر بار جیت میری جھولی میں ڈال دی۔"

اگر تم اُس کی صرف ایک بات، حیران ہوئے بغیر سن سکو تو سنو۔ یہ سب کچھ عمل میں آ جانے کے بعد، اُس نے مجھے کہا تھا...... مس نیلوفر! تم کبھی بھی میرے معاملہ میں میرے کسی ضابطے کی پابند نہیں ہو...... جب بھی چاہو تم اپنا حق خودمختاری استعمال کر سکتی ہو؟...... جو تمہارے پاس ہے وہ ہر صورت تمہارا ہے...... صرف اور صرف مجھے تمہاری خوشی، آزادی اور سلامتی چاہیے۔"

"کیا وہ ایسی مخیرانہ طرزِ عطا، خوبصورت پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ ہی رَوا رکھتا ہے یا......؟"

آصف صفی نے پوچھا۔

وہ اُس کی بات قطع کرتی ہوئی بولی۔

"آگے کچھ مت کہو تو بہتر ہے...... میں سمجھ گئی تم پسِ الفاظ کیا جاننا چاہتے ہو...... مائی ڈیئر آصف! اُس کے اردگرد اِندر سبھا سجی رہتی ہے۔ اتفاق سے اُسے خوبصورت لڑکیوں سے مُنہ پر جانے کا کوئی شوق نہیں۔ وہ ٹھپ دھاریہ سنگھ ہے جو دوسروں کی بہو بیٹیوں کو بُری نظر سے دیکھنا بھی مہا پاپ سمجھتے ہیں اور پھر مسلمانوں پہ کیا موقوف، وہ ہر مذہب و دین کو عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔"

آصف صفی کے ترکش میں آخری تیر تھا جو اُس نے بالآخر چھوڑ دیا۔

"اب تمہارے کیا ارادے ہیں مثلاً پڑھائی، شادی اور پاکستان......؟"

"پڑھائی جاری ہے اور شادی، فی الحال وَتی دُور اُست والی بات نظر آتی ہے' باقی رہا پاکستان تو وہ میرا گھر ہے...... گھر سے باہر نکل کر، میں یہاں آئی تھی، واپس بھی جاؤں گی...... مگر کب' اِس کا سرِدست میرے پاس کوئی جواب نہیں۔؟

آصف صفی، کسی گہرے کنویں سے پوچھنے لگ۔

"اگر گولڈی سنگھ بھی تمہارے سامنے شادی کی تجویز رکھ دے تو تمہارا ردِ عمل یا جواب کیا ہوگا؟"

وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ، پُر اعتماد لہجہ میں کہنے لگی۔

"یہ تو آنے والے وقت کی کتھا ہے' کل کیا ہوتا ہے کون جانتا ہے؟...... ویسے بائی دے وے...... میرے اور اُس کے ذہن و دل میں ایسا کوئی پروگرام نہیں، شادی مرد و زن کی ایک جسمانی اور سماجی ضرورت ہے مگر کچھ کام اِس سے بھی زیادہ ضروری ہوتے ہیں۔؟

"تم نے میرے شادی والے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیا؟"

وہ اُسے گھورتے ہوئے تلخ لہجہ میں بولی۔

''شاید تم میں اور اُس میں یہی فرق ہے...... ؟ شک! بے یقینی، خود اعتمادی کا فقدان، آدمی کو کتنا تنہا کر دیتا ہے...... اُس کی یہی اک بڑی صفت، وہ خود اور دوجوں پہ اعتماد کرنا جانتا ہے۔ کسی کی شخصی آزادی، ارادوں، خیالوں پہ پہرے نہیں بٹھاتا...... ہواؤں، خوشبوؤں، تتلیوں کو آزاد فضاؤں میں پھیلے ہوئے دیکھنے کا متمنی رہتا ہے۔ اب تمہارے اندر شادی والی کُھد بُد کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ کبھی مجھے اِس قابل سمجھتے ہوئے اپنا چاہے تو اِس میں یقیناً میری خوش بختی کا پہلو ہوگا جبکہ ہمارے معاشرے میں شادیاں گن پوائنٹ پہ کرائی جاتی ہیں۔ اِس میں دونوں اطراف کی مشترکہ قدروں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ بس بچھیا کو کھونٹے سے باندھنا مقصود ہوتا ہے۔ شادی محض جسموں کا ملاپ تو ہے نہیں، مزاج، ذہن اور رُوحوں کا سنگم بھی تو ہوتی ہے۔؟ مَیں تمہیں مشورہ دوں گی اعتماد، یقین اور اعتبار پیدا کرو...... خدا کا تصور بھی اِنہی اوصاف میں ہے......'' مسلمان، سکھ، ہندو، عیسائی، محض ظاہری تشخص کی اکائیاں ہیں اصل تشخص تو باطنی بالیدگی ہے جسے اِنسانیت کہا جاتا ہے۔ جب ہم دوسرے کے آنگن اور گریبان میں جھانکنا چھوڑ کر اپنے اندر ڈبکی لگانا سیکھ جائیں گے تو اِس دھرتی کے بہت سے اِنسانی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔؟

''کالے بابا جی! مَیں مزید کچھ کہنے سُنے، گُنگ مُنگ سا اُس کے فلیٹ سے نیچے اُتر آیا۔ نہ اُس نے مجھے رُکنے کو کہا اور نہ مَیں نے وہاں مزید ٹھہرنا چاہا...... لمبی سیڑھیاں اُترتے وقت محسوس کر رہا تھا جیسے مَیں اپنے کے پاتال میں اُتر رہا ہوں...... جوں جوں نیچے اُترتا رہا، توں توں یخ بستگی میرے رگ و پے میں دھنستی گئی۔ نیچے پہنچا تو میرا وُجود دو حصّوں میں تقسیم ہو چکا تھا، ٹھنڈا اور گرم...... ٹھنڈا حصّہ سفید اور گرم حصّہ کالا...... گردن موڑ کر مَیں نے آخری بار، اُس کے فلیٹ کی کھڑکیوں کو دیکھا، جو اندر کے اندھیرے کی مانند تھیں...... شائد نیلوفر روشنیاں بُجھا کر اپنی خواب گاہ میں جا چکی تھی۔ خواب ٹوٹ جائیں تو اُن کی تعبیریں بھی اُدھوری رہ جاتی ہیں۔

مَیں اپنے بکھرے وُجود کو بمشکل سنبھالتا ہُوا پتا نہیں کہاں ٹھوکریں کھاتا رہا...... رات بھر کا جگراتا، اعصاب شل، دماغ ڈل لیے ایک پارک میں خالی بنچ پہ پڑ گیا۔ نہ جانے کب تک پڑا رہتا اگر کسی پرندے کی ایک بڑی سی بیٹ نے مجھے بیدار کر دیا نہ ہوتا۔ قریب ہی ایک تالاب تھا۔ پانی لے کر کپڑے صاف کیے۔ اُسی دوست کو فون کیا جو بیتی رات، پائن وڈ سٹوڈیو تک میرے ہمراہ تھا...... ایک ہی رات میں میرا بدلا ہوا حال حلیہ دیکھ کر پریشان ہُوا۔ اُسے کیونکر بتاتا کہ میرے ساتھ کیا بیت چکی ہے۔ کچھ دُکھ درد ایسے ہی، جو محض سہنے کے لئے ہوتے ہیں کسی سے شیئر کرنے کے لئے نہیں۔ مَیں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر درد بڑھتا

گیا جوں جوں دوا کی۔ دماغ کو پگھلنے سے بچانے کا جتن کرتا تو ڈوبتا ہوا دل ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ میری ایسی ہیجانی سی کیفیت دیکھ کر وہ مجھے زبردستی اپنے فلیٹ لے گیا...... اُس کی کوشش تھی میں کسی طرح سو جاؤں' شاید اسی خاطر مجھے کچھ شراب پلا دی۔ پھر کیا تھا میں دو روز تک شراب میں ڈوبا رہا۔ اس دوران مجھے نیلوفر کے کئی ایک ٹیلیفون بھی آئے کچھ تو نشے کی وجہ سے نہ سُن سکا جو ایک آدھ سُنا بھی تو کوئی کام کی بات نہ ہو سکی۔ وہ مجھے ملنا چاہتی تھی مگر مصروفیت کی وجہ سے میرے پاس پہنچنے کے لئے وقت نہیں تھا جبکہ میں شراب کے شغل کے علاوہ کچھ دیگر وجوہات کی بنا پر اُس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ تنہا یا فرصت میں کہاں ہوتی تھیں۔ گولڈی سنگھ کے ہاں ریہرسل یا پھر سٹوڈیو میں مصروف...... اُس کی نظر میں کام اور کومٹ منٹ کو دیگر تمام کاموں پہ فوقیت حاصل تھی اور شاید یہ کچھ صحیح بھی تھا۔''

تین راتوں اور چار دنوں سے مَیں اسی فلیٹ میں بے سُدھ، بے حس سا پڑا بادہ نوشی میں مصروف رہا...... بہتر بھی ہُوا کہ مسلسل مدہوشی نے مجھے یہ رُوح فرسا سانحہ برداشت کرنے میں مدد دی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں ظلمت کے اندھیروں سے نُور کی کرنیں ہویدا ہوتی ہیں...... ولیوں کے ہاں بھوت بھی جنم لے لیتے ہیں، ہیں زہر ہلاہل بھی کار تریاقی دکھاتا ہے اور کبھی ساج کی سیج پہ چڑھی ہنڈیا ایسی جل جھلتی ہے کہ رُسوائی کا مُنہ کالا کر دیتی ہے۔ گزرتے وقت نے جب دل پہ لگے چرکوں کو کچھ مندمل کر دیا تو میرے دوست نے مشورہ دیا اب تم پاکستان چلے جاؤ' ان حالات میں تمہارا اِدھر رہنا مناسب نہیں۔ وقتی طور پہ گیم تمہارے ہاتھ سے نکل چکی ہے...... بات اُس کی ٹھیک تھی۔ آخری دو دنوں میں نے کوشش کی کہ شراب نوشی سے جان چھوٹ جائے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ پیگ نہ لینے سے وہی پہلی سی حالت، اعصاب کی شکستگی اور مایوسی کے دورے...... نیلوفر کے فون آتے رہے۔ اُس کی وہی دن رات کی مصروفیت اور دیگر اِدھر اُدھر کی باتیں۔ اصل بات تو یہی تھی کہ اب اُس کے رُوبرو کی منزل کوئی اور تھی جس کی جانب بڑھتے ہوئے کم از کم مَیں اُس کا ہمرکاب نہیں تھا۔''

ایئرپورٹ پہ مَیں بہت پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ کسی مجبوری کی وجہ سے میرا دوست ساتھ نہ آ سکا۔ دل پرچانے اور دماغ مصروف رکھنے کے چکر میں، مَیں اِدھر بار میں گھس آیا۔ ابھی پیگ لئے بیٹھا ہی تھا کہ دیکھا سامنے مسکراتے ہوئے گولڈی سنگھ اور نیلوفر چلے آ رہے ہیں۔ اُنہیں اِدھر دیکھ کر عجیب سا لگا...... اِک کھنچتی ہوئی حیرت تھی یا مُنہ چھپاتی ہوئی کوئی مسرت کہ مَیں والہانہ انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا جیسے اُن کا استقبال کرنا مقصود ہو...... پاس پہنچتے ہی نیلوفر شکایت کے انداز میں بولی۔

''آصف! تمہیں کیا ہوا؟...... ٹیلیفون، ملاقات اور نہ اب پاکستان روانہ ہونے کی اطلاع۔ یہ تو بھلا ہو چنگیزی کا جس سے پتا چلا تم پاکستان روانہ ہونے کے لئے ایئرپورٹ جا چکے ہو اور ہاں' یہ ڈرنک کب سے

شروع کردی تم نے؟"

مَیں محجوب سا...... اس بُتِ طناز کو تکتے ہوئے سوچنے لگا کیا واقعی عورت فطرتاً احمق، نادان ہوتی ہے یا چلتر، چالاک!...... خود چرکہ لگاتی ہے اور پھر خود ہی مرہم لگانے کا جتن بھی کرتی ہے۔ کیسے بھول پنے سے مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہی ہے۔ وہ دونوں میرے سامنے بیٹھ چکے تھے۔ مَیں نے اپنا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مس نیلوفر! سارے معاملے مسئلے تو اندر باہر کی فرصت سے طے پاتے ہیں۔ آپ کو اپنے انتہائی اہم کاموں سے فرصت نہیں تھی اور مجھے اِن غیر ضروری جاموں سے رُخصت نہیں تھی یعنی ہم دونوں ضروری اور غیر ضروری کاموں میں مصروف تھے۔"

مَیں نے اپنا جام خالی کرتے ہوئے مزید کہا۔" اب چونکہ ہم دونوں اپنے کام و جام سے فارغ ہو گئے ہیں، کچھ وقت کی گنجائش بھی موجود ہے اس لئے چلو، یہاں بیٹھ کر چند باتیں کر لیتے ہیں۔"

گولنڈی سنگھ جو بڑے مزے اور دلچسپی سے آصف صفی کی بھید بھری باتیں سن رہا تھا، کمال دوستانہ لہجہ میں گویا ہوا۔

"صاحب! آپ کو بھی پتہ ہے کہ ہم مووی میں بِزی ہوئے تھے مگر آپ کو نہیں بھولے تھے۔ ہماری مجبوری تھی کہ ممبئی کے آرٹسٹوں کا کام، طے شدہ وقت کے اندر مکمل کرنا تھا۔ شیڈول بڑا ٹائٹ تھا۔ دن رات لگا کر بڑی مشکلوں سے کام نمٹایا ہے۔ وہ لوگ بھی آج دوپہر کی فلائٹ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ مس نیلوفر اکثر آپ کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ آپ کے بارے اُس نے بہت کچھ بتایا...... آپ اُس کے کزن، منگیتر ہی نہیں، دوست اور بچپن کے ساتھی بھی ہیں۔ آپ دونوں کی بچپن سے لے کر اس وقت تک لڑائیاں بھی بہت ہوتی رہی ہیں۔ پلیز! آپ ہمیں معاف کر دیں۔ اس کوتاہی میں مس نیلوفر سے زیادہ میرا قصور ہے کہ مَیں نے انہیں شیڈول ٹائمنگ کا پابند رکھا۔ یوں بھی ہم خبطی لوگ ہیں اپنے مشن کی خاطر اپنی ذاتی ضرورتوں اور مسئلوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہماری یہ مووی انٹرنیشنل نوعیت کی ہے جس میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ خدا کی اس زمین پہ بسنے والے تمام انسان آپس میں ساجھے دار ہیں۔ برابری کی سطح پر ہر اک کو عزت کے ساتھ جینے کا حق ہے۔ دین دھرم، بولی بھاشا اپنی اپنی، مگر کرم بھرم سب کے ساجھے۔ ہمیں آ بنسا کے پرچار کے لئے ہاتھ میں ہاتھ دے کر پریم وشواس کی ایک ایسی زنجیر بنانی پڑے گی جو اس دھرتی کے گرد، انسانیت کے بھرم بھاؤ کا ایک ایسا ہالہ قائم کر دے جس کے اندر ہر کوئی خود کو محفوظ اور خود مختار سمجھ سکے۔"

گولنڈی سنگھ کے چہرے کے گرد مجھے ایسا ہی ایک نورانی ہالہ اُبھرتا ہوا محسوس ہوا جو وعظ و اُپدیش دیتے

ہوئے مہان گرووؤں کے نورانی چہروں کو اپنی جلو میں لے لیتا تھا...... یا شاید سچائی بھلائی کا کوئی کارکرم کرتے ہوئے منش کے اندر کی ازلی روشنی پھوٹ پھوٹ ڈلکیں مارنا شروع کر دیتی ہے کہ سچ حق کا اظہار اور انسانیت کے فروغ کے لئے کچھ کر گزرنے کی جستجو، بندے کو دیوتا سمان بنا دیتی ہے...... وہ بڑی سوبھاونی سی مسکراہٹ سے مزید گویا ہوا۔؟

"آپ کو پتا ہے ہمارے پیر پیغمبروں، مہاتماؤں، گرووؤں اور نیتاؤں نے اپنے آدرشوں کے پالن کے لئے کیسے کیسے جوکھم جھیلے۔ ہم ان جیسے تو نہیں بن سکتے مگر جو کچھ اپنی حیثیت میں کر سکتے ہیں اُسے کرنے کی کوشش تو کر رہے ہیں...... آپ یہ بھی جانتے ہیں فلم میڈیا اور پرنٹ میڈیا اس دور کے سب سے پاورفل میڈیا ہیں۔ ہم سب دوست ساتھی چونکہ فلم اور پرفارمنس میڈیا سے متعلق ہیں اس لئے مووی بنانا ہمارے نزدیک زیادہ آسان تھا۔ ہمارے دیگر دو چار ساتھیوں کے علاوہ مس نیلوفر بھی بنیادی طور پر اس میڈیا کی اسٹوڈنٹ نہیں تھی مگر رب نے اسے ہمارا ساتھی بنا دیا اور ان کا انتخاب کیسے ہُوا' یہ ایک الگ سا سرپرائز ہے جو ابھی تک مس نیلوفر کو بھی نہیں بتایا۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو مَیں آپ کو بتا سکتا ہوں۔"

"چلئے' لگے ہاتھوں آپ یہ بھی بتا دیجئے' تاکہ مزید جاننے کے لئے کچھ باقی نہ رہے۔"

وہ پوری آنکھیں کھولتے ہوئے مزید بتانے لگا۔

"مَیں نے سکرپٹ کے مکمل ہوتے ہی پوری کاسٹ فائنل کر لی تھی سوائے ہیروئن کے...... کہ پوری ممبئی کی پروفیشنل اداکاروں میں کوئی بھی ہیروئن میری مووی کے مطابق نہ تھی۔ اک خاصا عرصہ، تلاش میں رہا۔ ساؤتھ افریقہ میں پیدا ہونے والی ایک ہندو لڑکی، کسی حد تک مطلب کی نکلی مگر کوشش کے باوجود وہ پنجابی لب ولہجہ اختیار کرنے میں ناکام رہی اور نہ ہی وہ اسلامی شعار اور روزمرہ کی گفتگو' طور طریقوں سے آشنا تھی۔ السلام علیکم، اللہ، بے بے، ماسی، میری تو بہ ایسے الفاظ اُس کے منہ سے اجنبی اور اُدھورے لگتے تھے جبکہ یہ کردار ایک مسلمان پنجابی پاکستانی لڑکی کا تھا جو انگلینڈ تعلیم کی غرض سے پہنچتی ہے۔ چُپ چُپ' گُم سُم، معصوم سی...... جو خود آشنا نہیں تھی۔ اُس کے دل ودماغ میں یہی بھرا ہوا تھا کہ مسلمانوں کے علاوہ باقی سب فاجر وکافر ہیں...... تنوّے کی روٹی اور ہانڈی کا سالن ہی مسلمانی حلال کھانے ہیں۔ باقی سب فش، چپس، پیزا، مکھن، پنیر، پیسٹریاں وغیرہ جنہیں انگریز یا ہندوؤں، سکھوں نے تیار کیا ہو وہ مکروہ اور نجس ہیں۔ جینز پتلون، ٹائی، ہاف شرٹ، مادر پدر آزاد لوگوں کے پہناوے ہیں اور تو اور کسی غیر مرد سے ملنا، بات چیت بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اگر ہم اپنے بچوں کو ترقی یافتہ ملکوں میں ایڈوانس ایجوکیشن کے لئے بھیجتے ہیں تو یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ امریکہ' انگلینڈ یا جرمنی جا رہے ہیں، جدھر کے معاشرتی تہذیبی تقاضے ہم سے

مختلف ہیں...... اِدھر وقت اور زمانے کی بدلتی قدروں کے ساتھ ساتھ زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ لکیر کی فقیری نہیں پکڑی جاتی۔ تعلیم انسان کو بہتر انسان بننے میں مدد دیتی ہے۔ دوسرے مذاہب، رنگ و نسل سے مفاہمت، مل جل کر جینا اور اِک دوسرے کا احترام کرنا سکھاتی ہے اور یہ اس دور کی اہم ضرورت ہے...... دُنیا اِک گلوبل گاؤں میں سمٹ آئی ہے، سب کرنسیاں اِک عالمگیر کرنسی میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ انٹرنیشنل زبان وضع ہو چکی ہے۔ مگر ہم اپنی سوچ، ذہنیت اور اوقات کے جوہڑ سے ہی باہر نہیں نکلتے۔ ہم ایشیاؤں کے دماغ سے معدے مٹانے کی بھوک ہی نہیں نکلتی۔ ہم نے ترقی، ماں کا سر کرنی ہے۔''

وہ اپنی ہی کہے جا رہا تھا اور مَیں اُس پہ نظریں لگائے سُن رہا تھا۔ ابھی تک اُس نے کوئی ایسی بات منہ سے نہیں نکالی تھی جو حقیقت سے بعید ہو مگر وہ چونکہ سکھ تھا اور مَیں نام نہاد مسلمان اور وہ مسلمان ہی کیا جو مسلمان کے علاوہ کسی اور غیر مذہب کی حقیقت کو حقیقت کہہ دے؟ لیکن ہر انسان کے اندر کہیں ایک ایسا گوشہ بھی ہوتا ہے جو انسانی فہم و ادراک اور اس کے علمی سیاق و سباق سے مختلف ہوتا ہے اس میں صرف اَزلی صداقتوں، حقیقتوں اور فطرت کے مسلمہ اُصولوں کے لئے ہی گنجائش ہوتی ہے۔ اب یہ اپنے اپنے نصیب و استعداد کی بات ہے کہ کوئی اس پہ کتنا دھیان دیتا ہے۔ مَیں ابھی تک اُس کے مضبوط کشادہ جبڑے والے چہرے کا جغرافیہ پڑھ رہا تھا وہ بھی بے سکت و شانت میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے ہوئے تھا۔ تاب نہ لا کر مَیں نے اپنی گھڑی پہ نگاہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یقیناً آپ کی بات منزل پہ پہنچ چکی ہوگی جبکہ میرے سفر شروع ہونے کا وقت آ گیا۔'' مَیں نے اپنا سفری بیگ کاندھے پہ لٹکا کر اُٹھتے ہوئے مزید کہا۔ ''مسٹر گولڈی! میرے نزدیک زندگی، کسی سفری بیگ کی طرح ہے جو سفر کی نوعیت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ کسی دیہاتی کے لئے گٹھڑی، کسی فقیر درویش کے لئے گودڑی، کسی کا پلو نما تھیلا اور کسی کا اعلیٰ چرمی قیمتی بریف کیس...... اپنی اپنی ضرورت، قسمت اور اوقات۔''

مَیں پتا نہیں کیا کچھ کہہ چکا، جس کا شاید مجھے خود بھی اِدراک نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ زبان بھی کسی اور سے بھی ڈکٹیشن لے لیتی ہے۔ مَیں اُنہیں حیرت زدہ سا چھوڑ کر لاؤنج کی طرف چل دیا۔ شیک ہینڈ نہ بائے بائے اور نہ ہی مڑ کر دیکھنا گوارہ ہوا۔ عجیب سا ملن اور کیسا غریب سا بچھڑن تھا...... اندر پہنچتے ہوئے مَیں نے سیدھا بار کا رُخ کیا۔ شراب میں لاکھ کیڑے ہیں مگر کہیں کوئی ٹمٹماتا ہوا جگنو بھی ہوتا ہے جو اُسے خود فراموشی کے کسی غار میں لے جا کر بے خودی کے غنودے ڈھانپ دیتا ہے۔؟

پی او اے سی کا نیوی اور سکائی بلیو، رائل جیٹ، میرے لئے ایک مہیب غار کی مانند ہی تھا۔ قریب قریب ساتھ شاہانہ نشستیں فرسٹ کلاس مسافروں کے لئے ہوتی ہیں۔ فضا میں ہر وہ آسائش و مدارت پیش کی

جاتی ہے جس کا اکانومی کلاس والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ شراب، شباب اور کباب کی ساری لذتیں چھن چھن کر وہاں سجائی جاتی ہیں۔ جہاز کا کیپٹن بنفس نفیس فرداً فرداً سب معزز مسافروں سے ہیلو ہیلو کرتا ہے۔ کسی مزید خدمت کا پوچھتا ہے۔ پھلوں، پھولوں اور گل رخوں کی نکہت بیزیوں سے مخمور، یہ کیبن کسی راجہ اندر کے اکھاڑے سے کم نہیں ہوتا۔ فرنگی مہلاؤں کے پیشہ ورانہ، کافرانہ انداز...... بچھ بچھ جانا...... میوزک، موسم کی مناسبت سے میٹھی میٹھی حرارت یا ٹھنڈی ٹھنڈی برودت، مسافر چاہے مولوی مصلی کا منتظر ہو یا قادرے قصائی کا قوما، اگر وہ کبھی کسی طرح اس کیبن میں سفر کر بیٹھے تو شراب اور شباب، اُس کے دماغ اور نیت کی چولیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں......"

فرسٹ کلاس میں خلاف توقع چند غیر ملکی مسافر ہی سفر کر رہے تھے جو اگلی دو تین قطاروں میں آسودہ تھے۔ مَیں تو آج پی پی کر تہیہ طوفاں کیے ہوئے تھا۔ اپنے کیبن میں داخل ہوتے میرے پاؤں بُری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ زبان سے کہتا کچھ ادا کچھ اور ہوتا۔ بجلی سی ایئر ہوسٹس نے مجھے سہارا دے کر اُوپر بالکل آخری سیٹوں پہ ڈال دیا۔ شاید وہ میری مخدوش حالت بھانپ گئی تھی کہ مَیں نشے کی حالت میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ آخری دو سیٹیں بڑی آسودہ فراخ تھیں جنہوں نے مجھے کسی مہربان کی گود کی طرح بھر لیا۔ میری پہلی فرمائش شراب تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اُردو میں کہنے لگی۔

"ٹیک آف تک انتظار فرمائیے۔ ابھی میں آپ کو کوئی سافٹ ڈرنک لا دیتی ہوں۔"

"تم پاکستانی ہو......؟"

"ہاں! الحمدللہ، مَیں پاکستانی ہوں۔ دو ماہ پہلے مَیں نے بی او اے سی جائن کیا ہے اس سے پہلے تین برس تک پی آئی اے میں انٹرنیشنل فلائٹ پہ سینئر ہوسٹس تھی۔"

"پاکستان کے کس شہر سے آپ کا تعلق ہے؟"

"سر! مَیں پیدا تو فیصل آباد میں ہوئی لیکن والد صاحب چونکہ سرکاری ملازم تھے۔ آئے دن کی محکمانہ تبادلوں کی وجہ سے دربدری ہوتی رہتی تھی۔ میری تعلیم کی خاطر، انہوں نے مجھے میری خالہ کے ہاں مستقل لاہور میں ہی رکھ چھوڑا تھا۔ گورنمنٹ کالج سے گریجوایشن کی...... دُنیا دیکھنے کے شوق میں پی آئی اے جائن کر لی۔ اب کمبل کی طرح یہ مجھے چھوڑتی نہیں جبکہ میرا دُنیا دیکھنے کا جنون کب کا ختم ہو چکا ہے۔"

"شادی تو ابھی نہیں ہوئی ہو گی؟"

اُس نے کمال خود اعتمادی سے جواب دیا۔

"عورت بُری ہو یا اچھی، پڑھی لکھی یا گنوار ان پڑھ، پرائم منسٹر یا کوئی ملکہ، اُس کی تان شادی پہ ہی

ٹوٹتی ہے۔ اسی لئے میں بھی اب سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں جبکہ گھر والوں نے تو مجھے اس سال میں شادی کا الٹی میٹم دے رکھا ہے۔"

"پھر کیا سوچا ہے...... ہے کوئی نگاہ میں......؟"

"رومین کی کوئی بیپ بجی تو وہ معذرت کر کے انٹرکام پہ مصروف ہوگئی...... رائل جیٹ، بڑی شان بان سے رُود بار انگلستان عبور کر رہا تھا۔ میرے اُوپر ایک ملائم سا کمبل ڈال کر، میرے پیچھے اپنی مخصوص سیٹ پہ ایسے بیٹھی تھی جیسے گیارویں کلاس کی کوئی طالب، کلاس روم میں بڑی توجہ سے لیکچر سُن رہی ہو۔ نشہ ٹوٹ رہا تھا، اعصاب میں جکڑن ہو رہی تھی، مَیں نے اُچک کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے مسکرا کر مجھے کچھ انتظار کا اشارہ دیا......"

اب جہاز، فرانس کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔ مقررہ بلندی پہ پہنچتے ہی "کاروبار جہاز" شروع ہو گئے۔ سگریٹ نوشی کی اجازت مل گئی، سیفٹی بیلٹ بھی اُتر گئے سب سے پہلے اُس نے آگے کی قطاروں والے مسافروں کو منہ ہاتھ صاف کرنے والے اسٹیم ناول پیش کئے۔ ایک مجھے بھی دیا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"ابھی کچھ دیر میں، آپ کے لئے ڈرنک بھی لاتی ہوں۔"

واقعی تھوڑی دیر میں ڈرنک لے آئی۔ مَیں نے تلملا کر کہا۔

"مجھے اسکاچ چاہیے، آپ جُوس لے آئی ہیں؟"

"سر! آپ یہ ابھی لیجئے، وہ بھی اپنے وقت پہ پیش کر دی جائے گی۔ ہمیں اپنے پروٹوکول پروگرام کے مطابق ہی سَرو کرنا پڑتا ہے...... پلیز! ابھی یہ پئیں، آپ کی طبیعت میں شگفتگی آ جائے گی۔"

مَیں نے جانا کہ یہ پروفیشنل خواتین، از قسم ایئر ہوسٹس، پروفیسرز، ٹیچرز، ڈاکٹرز، نرسیں، پولیس، فوج، نیوی، ایئر فورس کا "فی میل سٹاف"، بڑے بڑے اداروں میں اُونچی پوسٹوں پہ فائز خواتین!...... اعلیٰ افسروں، سیاست دانوں کی پرسنل سیکرٹریز وغیرہ شاذ ہی کوئی اچھی بیوی، بہو یا بہن بیٹی ثابت ہوتی ہوں۔ یہ اپنے گھر والوں سے بھی وہی سلوک روا رکھتی ہیں جن کی وہ اپنے پروفیشن میں عادی ہوتی ہیں یعنی جو عورت امپورٹڈ میک اپ یا مغربی لباس کی عادی ہو جائے وہ اپنا بناؤ سنگھار، مِسّی، لسّی، کاجل سرمہ، چنبیلی کے تیل، سرخ پراندے یا بالوں کی مینڈھیاں بنا کر نہیں کرے گی۔ کرتہ شلوار، گرگابی، دوپٹہ اور بھاری چادر اُس کا پہناوہ نہیں رہے گا۔"

پروفیشنل خواتین اپنی بات منوانے کی عادی ہوتی ہیں۔ شوہر، غریب غرباء اُن کی نگاہ میں ایک بٹلر یا ڈرائیور کی اوقات سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ اُس بدنصیب کا نام (یا جو بھی نِک نیم رکھا ہو) لے کر یوں مخاطب ہوتی، پکارتی ہیں جیسے وہ بیچارہ اس گھر کا مالک، اس بدلگام عورت کا شوہر نہ ہو۔ کوئی لے پالک بچہ یا اُدھارا

مانگا ہُوا کوئی غلام پیشہ ہو۔ کسی آئے گئے کے آگے تو جان بوجھ کر دو کوڑی کا کر دیتی ہیں کہ دوسروں پہ ان کا رُعب پڑے کہ خاوند کو کیسا پنّہ ڈالا ہوا ہے۔؟

یار! لفظ دو چار مناسب وغیر مناسب معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے اکثر بے تکلفی یا چار یاری میں اس لفظ کا بے محابا استعمال کرتے ہیں..... بُرا بھی نہیں لگتا بلکہ اس میں بے پناہ بے تکلفی، دوستی اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی لفظ انتہائی بے ہُودہ معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ مرد کے لئے تو یہ کسی طور ایسا ویسا نہیں..... بلکہ فخر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں میرا یار ہے لیکن عورتوں کے استعمال کا یہ لفظ نہیں۔ کوئی عورت، کسی کو یار کہہ ہی نہیں سکتی۔ محض الزام ہی لگ جائے کہ فلاں، فلانی کا یار ہے تو کم از کم طلاق اور زیادہ سے زیادہ قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔" پاکیزہ معنوں میں اس کا استعمال بڑا بابرکت اور حرمت والا سمجھا جاتا ہے۔ جیسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا محبوب، یار بھی کہا جاتا ہے۔ چار یار بھی اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ احمد یار خان..... رحیم یار خان..... یاراں نال بہاراں..... لنگ آ چَن چناں دا یار..... لے او یار حوالے رَبّ دے، میلے چار دناں دے، اُوس دن عید مبارک ہوسی جس دن فیر ملاں گے اور یہ بھی ملاحظہ فرمائیں! تھاڈے رہیو اَو بانکے یار..... میرا یار بنا ہے دُولہا اور یہ بھی رنڈی تیرا یار مر گیا وہ پوچھنے لگی کون سی گلی کا.....؟

بعض اللہ والوں کا تو تکیۂ کلام ہی یار رہا ہے۔ یار کی یاری سے مطلب، عیبوں سے نہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ دوست اور یار میں بھی فرق ہوتا ہے۔ یار، دوست سے کچھ قریب ہوتا ہے..... جیسے حسین بن حلاج کے قریب شبلی تھا' محمود کا ایاز' حضرت نظام الدین اولیاء کے لئے امیر خسروؒ، شاہ حسینؒ کے لئے مادھو لعل حسین، سرکار بالا پیرؒ کے لئے شہزادہ شکوہ..... شہباز قلندرؒ کے بودلہ پیر اور میرا یہ بھی ایمان ہے کہ مولا علیؓ، نبی پاک کے یار خاص بھی تھے۔ جتنے رشتے اُن سے تھے اُتنے تو خدا سے بھی نہیں تھے۔"

منصور کا بھی ایک قصائی یار تھا۔ یار مَن ترکی، قربان جایئے اس کے بھی کہ یا رَبّ کہیں، یا رحیم کہیں، یا رحمت اللعالمین پکاریں پہلے یار ہی پڑھا جائے گا۔ اب کیا قیامت ہے؟ کہ اچھے خاصے قانونی شرعی سرتاج کو اس کی منکوحہ بیچ کھیت یار کہہ کر مخاطب کرتی ہے اور کچھ باک محسوس نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ وہ بھی اسے یار کہہ کر جواباً تجدید" بازاریت" کرتا ہے۔ مَیں نے تو قبر آمادہ بوڑھے بوڑھوں کو تو پلیٹ سے ایک دوسرے کو یار کہتے ہوئے سُن کر اپنا سر پیٹ لیا ہے۔ کوئی کسی کا یار نہ بیلی، اسی حال میں کنجڑا تیلی!..... بھڑے بھڑے پھتو دے یار، کوئی اے مصلّی کوئی کمہار۔ میاں صاحب عارف کھڑی شریف فرماتے ہیں.....

پھس گئی جان شکنجے اندر جیں مصیبت بھاری
یاراں باجھ محمد بخشا کون کرے غمخواری

یار کی کوئی خبر لاتا نہیں دم مُسافر ہے نکل جاتا نہیں۔ یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں......
دیکھا! یار لفظ کن کن معنوں استعاروں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسی نیت ذہنیت ویسے ہی یار یاری......!

## دیوانے تیرے فرزانے تیرے.....!

بسیط فضاؤں میں تیرتے ہوئے شبستاں میں فضائی میز بانوں کے رُوپ میں نازک خوبصورت سلیقہ شعار بے پَروں کی پَریاں، لہک چہک مسکراتے ہوئے مہمانوں کو اُن کی ضرورت، حیثیت کے مطابق مشروب پیش کر رہی تھیں۔ کھانے سے پہلے مشروب پیش کرنا مغربی روایات کا حصہ ہے۔ مگر اصل گہما گہمی اور رونق تو لگ بھگ تین سوا کانومی کلاسوں میں تھی۔ مرد و زن، بچے بوڑھے۔ کسی خوشی کی تقریب کا گمان ہوتا تھا، جدھر انسان چاہے بھی تو خود کو اکیلا یا اُداس نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان کے آگے فرسٹ کلاس میں گنتی کے بمشکل چند مسافر جو گننے سے بھی زیادہ کرایہ بھرنے کے باوجود اکیلے پڑے تھے۔ جیسے بھری پُری بستی کے باہر پہاڑ کی کسی کھوہ میں چند گیدڑ گندر یچھ پڑے ہوئے ہوں۔؟

اس فرسٹ کلاس میں سفر اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنے نام نہاد سٹیٹس کے نمود کا احساس رہتا ہے۔ دونمبر کا دھندا کرنے والے، جن کے ہاں کالا دھن افراط میں ہوتا ہے۔ سرکاری درباری افسران، جن کے سفری اخراجات، خزانے سے ادا ہوتے ہیں۔ کاروباری لوگ جنہیں ایسے خرچے، ٹیکس کی کٹوتی میں ڈالنے ہوتے ہیں۔ انٹرنیشنل سطح کے کھلاڑی، ایکٹر یا نواب، جاگیردار وغیرہ۔ کبھی کبھی کوئی بیمار یا فربہ مُسافر، جو عام تنگ سی سیٹ پہ سفر نہیں کر سکتا اور بہت ہی کم ایسے مسافر جو اعلیٰ قسم کی شراب رَج کے پینا چاہتے ہیں اور شاذ کوئی ایسا بھی جو اپنی دولت وشہرت یا اپنی شخصی وجاہت و وسائل کی بناء پہ کسی خوبصورت ایئر ہوسٹس کو پھانسنے کے پروگرام پہ ہوتا ہے۔ کیا کہیے اس کلاس کی، یہ پریاں بھی خوبصورتی نوخیزی میں فرسٹ کلاس ہوتی ہیں کہ یہ جو انٹرنیشنل بھونڈوں کی جولان گاہ ہوتی ہے......!

فرسٹ کلاس کی نوز میں براجمانے یورپین جوانوں کی ساقی گری کے بعد وہ مشروبات کا سامان لیئے سیدھی میرے سر پہ آ کھڑی ہوئی...... دلفریب مسکراہٹ سے پوچھنے لگی۔

''سر! آپ کیا لیں گے......؟''

میرا کوئی جواب لیے بغیر خود ہی کہنے لگی۔

''میرے خیال میں آپ سپارکلنگ سوڈا واٹر لیں۔ طبیعت اور پیٹ دونوں ٹھیک رہیں گے۔''

مَیں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

''فی الحال مجھے جانی واکر سکاچ کا ڈبل پیگ چاہیے۔ اس کے بعد وائٹ ہارس کی بوتل لا دیجئے گا۔''

شاید میری ترش گوئی کو محسوس کرتے ہوئے آرڈر کی تعمیل کرتے ہی وہ ''جی سر'' کہہ کر کھسک گئی۔ دوبارہ کھانے کا پوچھنے آئی کہ میری کوئی خاص پسند ہو تو مَیں اُسے بتاؤں۔ خوشی یا اُداسی، کسی بھی حالت میں جب شراب پی جاتی ہے تو کھانا پھر ثانوی سی ضرورت بن کر رہ جاتا ہے۔ ساری توجہ پینے پہ ہی ہوتی ہے۔ کھانے کے لئے کچھ طلب کرنے کی بجائے مَیں نے وائٹ ہارس کی بوتل لانے کو کہا۔

''سر! اس وقت کھانے کے ساتھ وائن یا وسکی کی کچھ مقدار لے سکتے ہیں، پوری سکاچ کی بوتل ساتھ لے جانے کے لئے خریدی جا سکتی ہے۔ دورانِ سفر پینے کے لئے ایک حد مقرر ہے۔ پلیز، سر! آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔''

مَیں نے اُس کے کہنے کے انداز اور مجبوری کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جو چاہے کرو۔ میرے لئے تو تم بھی نیلوفر ہی ہو...... اس نے بھی میری ایک نہیں سُنی، اپنی ہی کی۔ ہیتھرو ایئرپورٹ تک تو اس کی چلتی رہی اب تم کراچی تک اپنی چلاؤ۔''

کچھ توقف کے بعد وہ متعجب سی پوچھنے لگی۔

''سر! آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

مَیں نے آنکھیں پٹپٹا کر اُسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم بھی کوئی نیلوفر ہی ہو......؟''

وہ منہ سے کچھ پھوٹے بغیر اپنا چھوٹا سا سر اثبات میں ہلا کر مسکرانے لگی۔ مَیں نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کرتے ہوئے، خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''کمال ہے وہاں بھی تُو، یہاں بھی تُو...... ہر جانب تُو ہی تُو......؟'' شرابیں تیری پیمانے تیرے، آنکھیں تیری مے خانے تیرے'' اور ''دیوانے تیرے فرزانے تیرے......''

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھنے۔

''سر! آپ شاید کوئی شعر......؟''

''ہاں شراب کے ساتھ کہیں شاعری در آئے تو سرور دوآتشہ ہو جاتا ہے اور خوش بختی سے اگر شباب بھی شامل ہو جائے تو سرور، نشہ بن کر سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔''

وہ سرشاری سے بولی۔

"سر! آپ کی عمر، شخصیت اور گفتگو ایسی تو نہیں لگتی لیکن اس کے باوجود آپ کوئی پُراسرار دلچسپ سی ہستی ضرور ہیں۔ آپ نے میرا نام تک جان لیا؟ پلیز! آپ کچھ اور میرے بارے میں بتائیں...... میں آپ سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔"

میں دل ہی دل میں اس خوبصورت نوعمر بیوقوف سی لڑکی کی عقل اور سادگی پہ ہنسنے لگا یا پھر یہ کچھ ان کے پروفیشن کا حصّہ ہوتا ہے۔ شاید انہیں ایسی باتیں یعنی خود کو بیوقوف ظاہر کرنے اور دوسروں کو اُلّو بنانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے تا کہ لمبی مسافتوں میں اپنا اور دُوسروں کا وقت پاس کر سکیں!...... جھوٹ موٹ کے قصّے کہانیاں، خانگی سٹوریاں، شادی دوستی کی فسانہ طرازیاں، کارڈوں کے تبادلے، ٹیلیفون کرنے اور ملنے کے وعدے وغیرہ جو سفر ختم ہوتے ہی اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں۔ "رات گئی بات گئی" سفر کے اختتام پہ میک اَپ فریش کر کے، ہیکنگی انداز میں خدا حافظ کہہ کر یہ اندر سبھا کی مہلائیں، کریو کی شکل میں جہاز چھوڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہو جاتی ہیں۔ تب چوبیس چھتیس گھنٹے کے آرام کے بعد اُن کے دل و دماغ کی سلیٹ صاف ہو چکی ہوتی ہے۔ مسافر جن کی دانست میں یہ چڑیا پھنس چکی ہوتی ہے اُن کے کارڈ، یہ جہاز سے اُترنے سے پہلے ہی کچن کے ڈسٹ بن کی نذر کر دیتی ہیں۔"

آپ حیران ہوں گے کہ آج تک شاید ہی کسی ایئر ہوسٹس نے کسی کو اپنا ذاتی نمبر اور گھر کا ایڈریس بتایا ہو۔ عمل مکافات کے نتیجہ میں جہاں کہیں یہ از خود پھنستی ہیں تو خوب پھنستی ہیں۔ اگلی پچھلی تمام کسریں نکل جاتی ہیں۔ وہ بھی کوئی پیشہ ور کھڑ پنچو ہوتا ہے جو دیرآید درست آید کے فلسفہ پہ عمل کرتے ہوئے بڑا خوبصورت اور پکا جال پھینک کے نچنت ہو کر انتظار کرتا ہے۔ ہواؤں کے دوش پہ بے طرح اُڑنے والی رنگین چڑیاں، وافروانہ دُنکا دیکھ کر اپنی دانست میں بڑا پکا پاؤں ڈالتی ہیں۔ بس وہیں ان کا کلیان ہو جاتا ہے وہ شاطر نچوڑ نچوڑ کر ان کی جوانی اور بنک میں پڑی پونجی اُلٹی پہ خوب ہاتھ صاف کرتا ہے جبکہ لڑکی نے اس امیر مرغے کو کاٹنے کے چکر میں، ایئر لائن اور خاندان سے چھپ چھپا کر خفیہ نکاح کیا ہوتا ہے۔ بس! یہیں مات ہو جاتی ہے۔ بچنے سے بچتی ہیں مگر وہ بچے ہی کیا جو لاکھ احتیاط کے باوجود بچا ہوا رہ جائے! ہر طرح سے برباد ہو کر روزن بڑھا کر دال دلیہ کی خاطر کہیں بوتیک کھول لیتی ہیں یا پھر کہیں ایسی جگہوں پہ ملازمت کر لیتی ہیں جدھر منہ پوتنے اور بندے دُھوتنے کا دُھندا ہوتا ہے۔"

چلئے ہم اس پیشہ میں چند پرسنٹ اچھی خواتین کو علیحدہ کر لیتے ہیں جو محض دُنیا دیکھنے اور گلیمر کی خاطر یا روپے پیسے کے چکر میں اس فیلڈ میں آجاتی ہیں۔ یہ کردار، اخلاق اور انسانی رویّوں کے حساب کتاب میں بھی بہتر ہوتی ہیں۔ کرپٹ اور مادر پدر آزاد بھی نہیں ہوتیں نہ ہی مخلوط ماحول پسند کرتی ہیں۔ اپنی ڈیوٹی کے

علاوہ کسی اور فضول مشغلے میں شامل بھی نہیں ہوتیں۔ کیپٹن کو والد یا بڑے بھائی کی جگہ سمجھتی ہیں۔ فرو ساتھیوں سے فاصلہ پہ رہتی ہیں۔ ایسی ٹھنڈی ہے جس وجہ سے یہ لڑکیوں کی ترقی کے چانس نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ وہ موہنجوداڑو، ڈی جی آئی خان، ملتان، کوئٹہ یا زیادہ سے زیادہ جدہ تک محدود رہتی ہیں۔'' انٹرنیشنل روٹس پہ، یہ بین کی ہوئی ہوتی ہیں۔ آپ کو پتا ہوگا قومی ایئرلائن کے بیشتر جہازوں کا یورپ میں داخلہ ممنوع ہے کہ ان کی صفائی ستھرائی، تکنیکی دیکھ بھال کا معیار، بین الاقوامی معیار کے مطابق نہیں ہوتا یا جس طرح لاہور کی مخصوص شاہراؤں پہ تانگہ، گدھا گاڑی، رکشہ، ہتھ ریڑھے کا داخلہ ممنوع ہے۔ بس یہی حال ہمارے ہوائی تانگوں، ریڑھوں، رکشوں کا ہے جو یورپ کے مال روڈ پہ نہیں جا سکتے۔ اسی طرح یہ ٹھنڈی ایئر ہوسٹس بھی ہوتی ہیں جو ایئرلائین کے افسروں کے لئے ماؤں بہنوں کی جگہ ہوتی ہیں۔''

وہ مجھے بیوقوف بنا کر وقت گزار رہی تھی یا پھر واقعی متاثر تھی کہ میں نے نیلوفر کا نام لے دیا جو اتفاق سے اُس کا بھی نام تھا۔ اب یا تو میں مذاق یا شرارت کے مُوڈ میں تھا یا پھر نشے کی پینک میں۔ یُونہی میرے منہ سے نکل گیا......!

''تمہارا نام تو میں نے بتا دیا......اب اگر میں اُس بے وفا کا نام بھی بتا دوں جو تمہیں چھوڑ کر کسی اور لڑکی کی زُلفوں کا اسیر ہو گیا ہے تو انعام میں وائٹ ہارس کی پوری بوتل لا دو گی؟''

وہ مجھے یُوں دیکھنے لگی جیسے میں کوئی مافوق الفطرت انسان ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پہ لرزہ طاری ہو گیا تھا جبکہ میں تو محض شراب کی خاطر اُس سے ڈراما کر رہا تھا۔ بات سنجیدہ ہوتے دیکھ کر میں نے پینترا بدلا۔

''چلو چھوڑو اس بات کو......ایک ڈبل پیگ اور لا دو......پلیز!''

مگر وہ شاید عقل کی پٹڑی سے اُتر کر دل کی کچی زمین پہ آ رہی تھی۔ وہ ٹرالی، کچن میں چھوڑ کر واپس آئی اور میری ساتھ والی سیٹ پہ ڈھے سی گئی۔

''سر! اُس نے میرے ساتھ بڑا دھوکہ کیا ہے۔ میں نے اُس سے تین سال کا عرصہ مانگا تھا کہ اس دوران میرا شوق بھی پورا ہو جاتا اور میں اپنی بیمار بوڑھی ماں کے علاج اور چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کے لئے کچھ اُن کا ہاتھ بٹا سکتی۔ جب تک تو میں پاکستان کے اندر ڈیوٹی دیتی رہی تب تک سب ٹھیک رہا جونہی اچھی کارکردگی پہ پروموشن ملا اور مجھے انٹرنیشنل روٹس پہ منتخب کر لیا گیا تو وہ مجھ سے بدظن سا ہو گیا۔ جبکہ میری تنخواہ، بونس، اُووَر ٹائم ملا کر تقریباً دوگنی ہو چکی تھی۔ وہ بجائے خوش ہونے کے اُلٹا ناراض ناراض سا رہنے لگا۔ حیرت ہوئی کہ اُسے کیا ہو گیا ہے؟ آخر اُس نے بتایا کہ اُسے میرا پاکستان سے باہر جانا پسند نہیں۔ وہاں بڑے بڑے

ہوٹلوں میں رہنا پڑتا ہے۔ شراب اور گندہ گوشت ہوتا ہے۔ باہر جانے والی ایئر ہوسٹس ان برائیوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اچھے بُروں سے بھی واسطہ رہتا ہے۔ آخر ایک دن اُس نے مجھ پہ الزام لگایا کہ کیپٹن اشرف تجھ پہ بڑا مہربان ہے وہ ہر جگہ تمہاری سفارش کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے تم باہر جا کر شراب اور سگریٹ بھی پینے لگی ہو۔ یہ جھوٹی تہمتیں سُن کر میرا تو دماغ خراب ہو گیا۔ پہلے تو مَیں نے آرام سے سمجھانے کی کوشش کی، بغیر ثبوت مجھے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ تمہیں میرے کہے پہ اعتبار ہونا چاہیے۔ یقیناً کسی نے میرے خلاف تمہارے کان بھرے ہیں۔ مَیں اُسے بھی جانتی ہوں وہ کیپٹن غزالہ شیخ ہے جو شروع دن سے ہی مجھ سے جیلس ہے۔ ہم دونوں ٹریننگ کے دوران ایک ہی کلاس میں تھے۔ مَیں کامیاب ہوگئی اور وہ فیل...... میری تمہاری منگنی پہ بھی وہ خوش نہ تھی۔ تم جب مجھے لینے ایئر پورٹ پر آتے تھے تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر اُس کے سینے پہ سانپ لوٹ جاتے تھے۔ ایک دفعہ اُس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ مَیں آصف کو تم سے چھین کر رہوں گی۔"

جہاز نے ایک زبردست جھٹکا لیا تھا۔ اس روٹ پہ دو چار جگہوں پہ ایئر پاکٹ ضرور آتے ہیں مگر معمولی سے۔ اس جھٹکے میں شاید "آصف" شامل ہو گیا تھا۔ اس لئے مجھے شدت کا زیادہ احساس ہُوا۔ وہ اپنی ہی کہے جا رہی تھی اور مَیں ناموں کی مطابقت پہ حیران وششدر...... الٰہی! ایسا بھی ہوتا ہے، معمولی سی تبدیلی کے ساتھ وہی کہانی...... جس کے انجام کا ڈسا ہوا، شراب میں ڈوبا اپنا غم غلط کر رہا تھا۔ ٹوٹا ہوا دل لیئے مایوس سا پاکستان واپس جا رہا تھا...... اللہ! وہی سکرپٹ، اُنہی کرداروں...... آغاز انجام کے ساتھ میرے سامنے دُہرا گیا ہے۔ مَیں اپنی بھول کر، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی سُن رہا تھا...... اُس کا چہرہ جھوٹ بولنے والے چہرہ نہیں تھا۔ بتا رہی تھی......!

"اُس نے بھی سگریٹ نہیں پیا۔ شراب سرو ضرور کی ہے مگر چکھی تک نہیں۔ میرے سب ساتھی بہت اچھے ہیں۔ انسان، خود اچھا ہو تو دوسروں کو بھی جرأت نہیں ہوتی۔ مَیں نے اپنی ماں کے سر پہ ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا ہوا ہے جس دن محسوس ہوا کہ مَیں اس فیلڈ میں محفوظ نہیں، وہ دن میری نوکری کا آخری دن ہوگا۔ یہی وعدہ میرا آصف سے بھی تھا...... مگر نہ جانے کیوں وہ مجھ سے بدظن ہو گیا۔ آپ دُعا کریں، سر! مجھے میرا آصف مل جائے۔"

مَیں جواب کے لئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے ایک دم "نہیں، سر! نہیں...... پلیز مَیں غلطی سے کہہ بیٹھی...... ایسی دُعا ہرگز نہ مانگئے گا......"

مَیں تو خود پاگل تھا اور وہ مجھ سے بھی بڑی باؤلی ثابت ہوئی۔!

"کیوں کیا ہُوا......؟"

''کچھ نہیں سر! مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ غزالہ شیخ نے جو مجھے پیغام بھیجا وہ اُس نے پورا کر دکھایا تھا۔ ساڑھے چار ماہ پیشتر آصف نے مجھ سے منگنی توڑ کر غزالہ شیخ سے شادی کر لی ہے۔''

''تو کیا غزالہ نے ایئرلائن چھوڑ دی؟''

''نہیں! وہ گراؤنڈ سٹاف میں آ گئی ہے۔ بلکہ آصف کو بھی جاب دلوا دی ہے۔''

''چلو! اچھا ہی ہوا کوئی تو کنارے پہ لگا۔ ورنہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جیتے ہیں نہ مرتے ہیں...... ڈوبتے ہیں اور نہ اُبھرتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے ہی نامراد لوگ بھوت پریت بن جاتے ہیں۔ جلتی حسرتوں والی ناآسودہ رُوحیں......!

''سر! آپ کیا ڈراؤنی باتیں کر رہے ہیں؟''

''نہیں، ڈراؤنی باتیں نہیں کر رہا...... بلکہ ایسی باتیں کر رہا ہوں جن سے بہت سے ضروری اور غیر ضروری ڈر دُور ہوتے ہیں۔ آج ہی تو یہ بات سمجھا ہوں کہ انسان کو خواہشوں کے پرندے، دل کے پنجرے میں قید نہیں رکھنے چاہئیں۔ بددُعا دیتے ہیں...... پیار کے نغمے الاپنے والے کسی پکھیرو کے پَر نہیں کاٹنے چاہئیں' بلکہ اُنہیں کھلی فضائیں مہیا کرو کہ گھٹن میں مر جاتے ہیں...... تم جانتی ہو کہ مَیں چند دِنوں سے مسلسل شراب نوشی کیوں کر رہا ہوں؟...... نہیں' تم نہیں جانتی؟...... میری ایک منگیتر تھی جو یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئی۔ ڈگری لینے کے بعد ہماری شادی طے تھی۔ ہم دونوں کی آپس میں بہت محبت تھی۔ ہر دوسرے مہینے، مَیں اس سے ملنے اور تعلیمی کارکردگی کا ملاحظہ کرنے یہاں آتا تھا۔ وہ بڑی پیاری، ذہین، ذمہ دار اور مہذب لڑکی تھی۔'' مگر وہ یہاں پہنچ کر اپنی اصل ذمہ داری نبھا نہ سکی۔ اُس کی نظر اور سمجھ میں اُس کے پہلے مقصد سے بھی ایک اور بڑا مقصد سامنے آ گیا تھا۔ مثال اس کی یُوں سمجھو کہ ایک لڑکے کی منگنی ایک قبول صورت میٹرک پاس غریب خاندان کی لڑکی سے ہوتی ہے۔ دو سال بعد شادی طے پاتی ہے۔ اسی دوران لڑکے کی نظر میں ایک اور لڑکی آتی ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ مالدار خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ پڑھی لکھی بھی زیادہ اور اس کے بھائی بھی دوبئی میں کاروبار کرتے ہیں۔ لڑکا پہلی منگنی سے باغی ہو جاتا ہے اور وقت کی ضرورت کے تحت مالدار لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ اب تم بتاؤ اُس نے غلط کیا یا صحیح؟......

تم نہیں بتا پاؤ گی۔ مَیں بتاتا ہوں لڑکے نے صحیح موقع کے مطابق فیصلہ کیا۔ اب اُسے کوئی بے وفائی کہے یا بدعہدی؟ لڑکا سمجھدار تھا' جانتا تھا ہر وہ کام، جس کی بُنیاد محض مادیت ہو وہ محض نفع نقصان کے اُصولوں پہ ہوگا اور جس کام میں اخلاص اور انسانی جذبہ کارفرما ہوگا وہاں سُود و زیاں نہیں دیکھا جاتا۔ دراصل مَیں ایک کاروباری خاندان کا فرد ہوں...... باپ دادا کی طرح مَیں نے بھی دو اور دو چار کرنا سیکھا، جب زندگی کے ہر

کام میں نفع کا تناسب ہی پیشِ نظر رہتا ہو وہاں گھاٹے کی جانب نظر سرکتی ہی نہیں اور مَیں یہیں غلطی کر بیٹھا......
نیلوفر چونکہ اعلیٰ تعلیم کی غایت سے اِدھر آئی تھی یقیناً اُس نے اعلیٰ تعلیم کے مَعنی و مقاصد پا لیے تھے۔ وہ مجھ سے کئے ہوئے وعدے اور فیصلے کو اس نئے بڑے مقصد کے لئے قربان کر بیٹھی۔ میرے ساتھ باندھا وعدہ بندحسن، اُسے ایک بیوی، بچوں کی ماں تو بنا سکتا تھا مگر شاید اِک عظیم انسان نہیں۔ اب جو وہ کر رہی ہے اگر اُس میں مادیت نہیں مگر اِک مقصدیت اور انسانیت کا پہلو ضرور کارفرما ہے۔ مجھے اُس سے کوئی گلہ نہیں...... بلکہ مَیں اُسے سلیوٹ کرتا ہوں اور یہ بتادوں کہ مَیں شراب، اُس کا غم غلط کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی خجالت دُور کرنے کے لئے پی رہا ہوں کہ مَیں بھی کتنا کمینہ تھا۔ بھرے پَروں بازوؤں والے پنچھی کو قید کرنا چاہتا تھا اور اُسی کے لئے دو سال پہلے ہی شادی نام کا قفس بھی تیار کروائے بیٹھا تھا۔"

جہاز اپنی ترنگ میں تھا اور مَیں اپنی ہانکے جا رہا تھا...... اُس کی جانب دیکھا، پیچھے سر ٹکائے خواب خواب آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی......"

مَیں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔" ایک ڈبل پیگ تو تیار کرلاؤ، مَیں واش رُوم ہو آتا ہوں۔"

ویسے تو ہر جہاز کے انجنوں کی اپنی اِک موسیقی ہوتی ہے مگر رولس رائس انجنوں کا اپنا اِک دُکھرا ہی راگ ہوتا ہے۔ اس مخصوص راگ کو عام قسم کے مسافر ہرگز نہیں سمجھ پاتے، ہاں! البتہ کوئی پرانا کھوچل کَن رَسیا' سدا بہار مسافر جو" رولس رائس گھرانے" کے ایک ایک انگ انگ، تان پلٹے سے واقف ہو، وہی بھیگی رات کے نَے اِن کے مضبوط تھرو سٹ کے زیرو بم، دَم خم سمجھ سکتا ہے......کج رنگے، معدہ مارے، اخروٹ توڑ، لمبی تانے سوئے مرے، غریب کیا سمجھیں گے؟ کوئی جاگے نینوں والا، کھُلے زخموں والا، کچھ اور ہی مزے لوٹ رہا ہوتا ہے۔" شب کا اِک پل ایسا بھی آتا ہے جب خدا کی خدائی میں ٹھہرائی سی آجاتی ہے اور جاگنے والوں کے تار کہیں اور مل جاتے ہیں...... عروسِ شب، کا نا گھونگھٹ کاڑے چھم سے رُوبرو آجاتی ہے۔"

واش روم سے واپس لوٹا تو میری ہر بکھری ہوئی متاعِ ظہور ترتیب میں آچکی تھی۔ فریش ایئر! پہلی سی تازگی کا احساس ہوا اور شاید اُس" گلفام ہوائی" نے بھی اپنے چہرے کی نوک پلک دُرست کر لی تھی۔ سامنے ارغوانی رنگ کھولے سکاچ وِسکی کا ڈبل جام مسکرا رہا تھا۔ برف کے دو کیوب، جیسے خون کی تلچھٹ کے دریا میں وَردے کے گلیشیر سے دو ٹکڑے ٹوٹ کر آ پڑے ہوں۔ ٹھہرے ہوئے درد میں اگر یخ بستہ ٹیس کی کوئی لہر، اچانک اُچک پڑے تو سواد آ جاتا ہے۔ کون لوگ ہوں گے جنہوں نے ایسے نام تجویز کیے؟...... ٹلّے جوگیاں، ڈھوک نمانیاں، کوٹ نیناں، دلدار پورہ، مَردان، ڈھولن وال، عاشق آباد، پریم نگر، راہی دی رَکھ، مچھلی شہر، ملکہ ہانس، حجرہ شاہ مقیم، موہلن وال، بلند شہر، حسن ابدال، نور پور شاہاں، سُہاگ پور، آب گم، کلیان نگر، مُندر بن،

بے بے ونش، بیلو، مہرو کی، مرجان، نینوا، چشمان، لاجورد، یاقوت، عنبر، نور بخت، سیف الملوک، وصولا انباں
وای، ثمر بہشت، دل آرام، زہرہ شام، سدا بہار، بارہ ماسی، شاہ بلوط، نیلوفر...... نیلوفر...... نیلوفر...... میرے
ہونٹ خود بخود ہلنے لگے تھے۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا......؟''

مَیں خالی خالی نظروں سے اُسے تکنے لگا۔

چور، چوکیدار...... شب زندہ دار یا بستر مرگ پہ پڑا کوئی رَجل...... کسی رخشندہ جبین کی زُلف گرہ گیر
سُلجھاتا ہُوا کوئی شب گیر یا نجوم سحر پہ نگاہ رکھے ہوئے کوئی رہگیر...... کوئی بھی ہو؟ وہ رات کے فسوں کے ان
لمحاتِ غنود میں کہیں پل دو پل، آنکھ میچ ہی لیتا ہے۔ یہ نیند کامل تو نہیں ہوتی بس سکون و انبساط کا جھکولہ سا ہوتا
ہے جو لحظہ کی لحظہ اِک ایسے طرب سے آمیز کر جاتا ہے کہ اِنسان پچھلے اگلے سب حساب فراموش کیے ہوئے
ہوتا ہے۔''

اس اُڑن کھٹولے میں بھی کچھ ایسے ہی لمحات اُترے ہوئے تھے۔ مُسافرت سے لدے پھدے لوگ
اپنے اپنے ڈھب ڈھنگے میں بھلی بُری نیند سے اُلجھے ہوئے تھے۔ شاید ہی کوئی دائمی مریض بوڑھا کہ بچے بر باکا
مارا یا پردیس کاٹ کر واپس دیس لوٹنے والا مِلن کی جوت جگائے جاگ رہا ہو؟ کچھ انجنوں کے ہلکے ہلکے
خراٹوں نے بھی کام دِکھایا ہُوا تھا...... جہاز تھا یا نیند کے کچے نشے میں اُڑتا ہُوا اِک بے خانہ تھا۔؟

مَیں نے یونہی اس سے پوچھ لیا۔

''کیا جہاز کے عملے کے علاوہ بھی کوئی اور تیرہ تا سف موجود ہے جو پوری کھلی آنکھوں جاگ رہا
ہو؟''

''ہاں نیچے اکانومی کی آخری سیٹوں پہ اِک ملنگ سا بوڑھا اپنے دھیانے مسلسل کچھ لکھنے میں مصروف
ہے۔ عجیب پُر اسرار سا بزرگ، سیاہ لباس، بڑی بڑی انگوٹھیاں، گلے میں منکوں کی مالائیں، لمبی سیاہ زُلفیں......
یوں بے نیاز سا کچھ لکھ رہا ہے جیسے وہ اپنے حُجرے میں اکیلا ہی کہیں بیٹھا ہو؟...... اپنی کٹی ہوئی ذات میں مکمل
اِک کائنات سا کوئی شخص اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی کوئی حتمی رائے قائم نہ کر پائی تھی کہ میری کولیگ
کلی نے ایک اور انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ مَیں انہیں نجومی جوتش سمجھتے ہوئے اپنے فیوچر کے بارے میں
کچھ جاننے اور اپنے بہن بھائیوں کے لئے دُعا کے لئے درخواست کی۔ بڑی رسان سے بولے۔

''مَیں ابھی صرف دُعا کے مَعْنی سے ہی کچھ واقف ہُوا ہوں۔ مستجابی ہنوز مستور اور دُور ہے۔''

کچھ پلے نہ پڑا تو مزید پوچھ لیا۔

"سائیں جی! ہیتھرو سے ٹیک آف کرتے ہی آپ نے لکھنا شروع کیا تھا...... درمیان میں کھانے پینے کا برائے نام وقفہ ضرور ہوا ہوگا...... مسلسل لکھنے سے آپ اُکتا یا تھک نہیں جاتے؟"

میری استعجابی سی حالت دیکھ کر کہنے لگا۔

"بیٹی! جن ہاتھوں میں قلم تھمایا جاتا ہے اُنہیں لکھنے کی تپتی لگن اور مَن کی ٹھَن بھی عطا کی جاتی ہے۔ لکھتے سَمے مَیں اپنی "مَیں" اور نادیت سے ماورا ہو جاتا ہوں...... وقت، وقوع میں ایک اُلوہیت دَر آتی ہے۔ بارش کی بوندوں کی مانند مضامین افلاک سے اُترتے ہیں۔ قرطاس جائے نماز بن جاتا ہے اور قلم امام...... جبکہ پیچھے اُنگلیاں مقتدی......"

مَیں اِس فضائی میزبان کی گفتگو میں ڈبکیاں لینے لگا تھا۔ جب کچھ اور نہ سُوجھا تو ایک ورق پہ چند حروف لکھے، وزیٹنگ کارڈ ہمراہ کیا، درخواست کی اُس بزرگ تک میرا یہ رُقعہ پہنچا دو اور واپسی جواب بھی......! چندا چھنکتے سے تالیے، رُقعہ پکڑے سُوچتی رہی پھر خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔

"آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ کم از کم میرے حدِ یقین سے باہر ہے اب کیسے فکرِ توقیر اور اندیشۂ رُسوائی۔ جو ہو سو ہو؟" کہتے ہوئے پیچھے سرک گئی۔

اُس کے جانے کے بعد محسوس ہوا جیسے میرے اندر سے کہیں نیلی روشنی کی کرنیں باہر جھانکنے لگی ہوں۔ نیلوفر کے شگوفوں نے مجھے ڈھانپ لیا ہو۔ نیند کا خمار اور شراب کا سُرور، جب آپس میں گھل مل جائیں تب بھی ایسی ہی کافوری سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے مگر اِس کیفیت میں سرمدی کیف کا فقدان ہوتا ہے۔ اِک خوشبو، سوئے ہوئے کو جگا دیتی ہے اور کچھ ایسی مہکاریں بھی ہوتی ہیں جو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیتی ہیں......"

نازک مزاجاں، عیش کوشاں، شاہوں شہزادوں کو علی الصباح بیدار کرنے کے لئے مخصوص مُطربائیں، مَشاطائیں، سنگیت کار، حضوری میں پیش رہتے۔ جو موسم، سَمے، مزاج اور ارضی و سماوی اثرات و حرکات کے مطابق، راگ راگنیوں، آلاتِ صوت و غنا، روشنیوں، خوشبویات و بخورات کا حکیمانہ استعمال کرتے۔ جو صاحبِ قِراں کے لئے خوش بیداری، بہجت افروزی کا موجب ٹھہرتے۔ ایسے یگانہ روزگار...... روشنی، صوت اور خوشبو وغیرہ کا ماہرانہ امتزاج و انصرام، ضرورت و وقت کے مطابق ماحول کی تشکیل کرنے والے ماہر و عالم اب ناپید ہیں۔"

بادشاہ رہے نہ وہ محل و شبستان...... حریری پردے، فانوس، قندیلیاں، چھپر کھٹ، نہ وہ دیوار گیریاں...... غلام گردشیں، جھروکے، قیلولہ خانے، تہہ خانے، سرد خانے اور نہ ہی دیوان خانے۔ کہاں گئے وہ نادرِ روزگار لوگ......؟ جن کی جُنبشِ اَبرو سے سَروں کی فصلیں کٹ جاتی تھیں۔ جو غلاموں، وفاداروں

کے ہاتھوں عنانِ حکومت تھما دیا کرتے تھے...... ؟ کدھر سے لائیں وہ اہلِ قلب ونظر، جو خالِ رُخِ یار کے صدقے میں کابل و بخارا وارنے کا جگرا رکھتے تھے۔ ایسے بھی جو درویشوں کے قدموں میں تاج اور کنیزوں کے پاؤں میں دل کا تخت بچھا دیا کرتے ہیں...... ؟ وہ حبشی غلام، چاک و چوبند چوبدار پہرے دار، نقارچی، نقیب، درباری، اُردو بیگنیاں، خواجہ سرا اور داروغے؟ ان ہی میں شاہی حکیم، شاہی نجومی، شاہی امام و قاضی، فوج کے افسران عہدے دار، گھوڑوں، ہاتھیوں کے سائیس مہاوت، گولوں، توپوں، بارود خانوں کے اسلحہ ساز...... یہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن گئے۔ زبان بگڑی، ودہن بگڑا، تہذیب وتمدن غارت ہُوا۔ اَدب آداب، خورد وکلاں کی تمیز، حفظ مراتب کا خیال...... سُود وزیاں کا احساس و ملال غرضیکہ نام نہاد ترقی کے نام پہ ہم اپنی تہذیبی، تخلیقی، تمدنی شناخت بھی کھو بیٹھے۔ روشنی لینے گئے تھے دامن انگاروں سے بھر لائے......''

سونا لینے پی گئے میرا سُونا کر گئے دیس

سونا ملا نہ پی ملا میرے روکھے ہو گئے کیس

کہتے ہیں اندھا، بچّہ اور بوڑھا بھٹک لیں تو بڑی دُور کی کوڑی لاتے ہیں۔ کیا کہیے کہ میرے ہاں یہ تینوں موجود ہیں بلکہ مَیں ہمہ وقت ان کی زد میں رہتا ہوں۔ یہ تینوں مجھے تگنی کا ناچ نچواتے رہتے ہیں۔ بوڑھا، بوجھ...... تو بھی بچّہ بھاری اور اکثر اندھا حاوی۔ اَندھوں میں ایسے ایسے دیدہ ور بھی دیکھے کہ ہفت اَرض وسماء نگاہ میں رکھتے ہی ہیں جبکہ کنات کائنات کا ایک ایک ٹانکہ بھی اُن کے پھولے پھٹک ڈیلوں کی باڑ پہ ہوتا ہے۔ مگر مَیں ایسا اندھا، جسے دُور تو دُور، قریب تر کی بھی نہیں سُوجھتی...... ؟

کوئی اپنی رُوداد حسرت سُنا رہا تھا یا کہہ چکا تھا۔ کہاں شروع اور کب ختم ہوئی یا ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی ختم کہاں ہوتی؟ مجھے احساس تک نہ ہُوا کہ دوارے ہری دوار کا نہیں فیصل آباد کا جوگی میری آرتی اُتارے ہوئے پڑا ہے۔

''بابا! میرے اندر باہر اندھیرے ہی اندھیرے دکھائی دیتے ہیں۔ لگتا ہے مَیں اکیلا ہو گیا ہوں۔ اس بھرے جہاز میں بھی قبرستان جیسی خاموشی اور اُداسی بھری ہوئی ہے۔ ادھر آپ کے ہاں نیلی سی روشنی دیکھ کر پروانہ وار چلا آیا۔''

اک اُچٹتی سی نظر اُس پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''عزیز! روشنی ننگا کر دیتی ہے جبکہ نیلی روشنی تو ٹھنڈا بھی کر دیتی ہے۔ اندھیرے پردہ پوش ہوتے ہیں۔ کچھ فیصلے زمین پہ ہوتے ہیں، کچھ آسمانوں پہ اور کوئی ایک اَرض وسماء کے مابین، فضا میں...... نیلا رنگ نیل کنٹھ میں ہی نہیں میور کے پنکھوں، رُوئیں میں بھی ہوتا ہے۔ نیل میں بھی سیف الملوک جھیل میں بھی......

جگنوکی جگمگ میں بھی اور نیل گگن میں بھی...... تمہیں یہ پھولوں میں بھی دکھائی دے گا...... آنکھوں اور آتش کے لپکتے شعلوں میں بھی...... یہ زہر اور مہر کا رنگ بھی ہے۔ اس جہاز کی ظاہری شناخت بھی یہی رنگ ہے اور اس کے اندر کی ایک پری جمال کا نام بھی نیلوفر ہے۔ کبھی کبھی اتفاق سے ناموں کی مماثلت اور قسمت کی نیرنگیاں بھی عجب کھیل کھیلنے لگتی ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہُوا اور اس جہاز کی پاکستانی ایئر ہوسٹس نیلوفر کے ساتھ بھی کہ قسمت اور ناموں کی مماثلت، اُلٹ پھیر نے تم لوگوں سے خوب مذاق کیے...... ہنسایا بھی رولایا بھی...؟ تم زندگی کے کئی ایک رنگوں سے آشنا ہوئے اور یہ بھی جانا کہ زندگی محض لینے کا نام ہی نہیں، دینے کا کام بھی ہے۔ ہم کیوں یہ گمان کر لیتے ہیں کہ جو چاہ لیں وہی مَن و عَن ہو جائے۔ اپنی حدود میں انسان محض بے مختارِکل نہیں...... لہٰذا! تم دونوں، مزید وقت برباد کیے بغیر اپنی اپنی اسکیل سیٹ کرلو کہ یہ فیصلہ ارض و سماء کے مابین کا فیصلہ ہے...... مَیں تم دونوں بچوں کا گواہ ہوں۔"

باہر خوب بارش گرنے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔

"رات ہنیری، بدل کنیاں باجھ وکیاں مشکل بنیاں نین نیناں نال گنڈو ے اَڑ ھیا

لیکن آ کھاں چھڈ و ے اَڑیا، بجن دے بجھ بانہاں اساڈی......"

معلوم ہوا کہ انسان اپنے محدود علم و بصیرت سے جو ارادے، فیصلے کرتا ہے اُنھیں وہ سو فیصد کامیابی سے ہمکنار دیکھنا پسند کرتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اُس کے اُوپر بھی ایک سپر پاور موجود ہے جو حکیم بھی ہے اور کریم و علیم بھی! اُس نے اپنی مخلوقات کے بارے اپنے فیصلے لکھ دیے ہوئے ہیں لیکن چونکہ وہ مالکِ کُل ہے، جب چاہے اپنے فیصلے بدل بھی دیتا ہے...... اکثر پڑھا اور سنا ہوگا...... "فقیر دی موج" فقیر کی موج مرضی ہو سکتی ہے تو کیا مالکِ کُل کی موج مرضی نہیں ہو سکتی......؟ یہی سمجھ میں آیا کہ مشیّتِ خداوندی پہ صابر و شاکر اور خشیّتِ ایزدی پہ لرزاں و ترساں رہنا ہی اصل بندگی و زندگی ہے۔ خواہشوں، خوابوں کی تکمیل و تعبیر، اپنی مرضی کے مطابق مت چاہو کہ تمہاری حکمت، بصارت محدود ہے...... عقل و شعور سطحی ہے...... اندازے غلط اور تخمینوں میں کج در آتا ہے......

دیکھا آپ نے! فیصل آباد والے آصف صفی اور نیلوفر...... اُدھر کراچی والے آصف اور ایئر ہوسٹس نیلوفر، دونوں جوڑوں کے واقعات، معاملات اور حالات میں کیسی مماثلت پائی جاتی تھی...... دونوں اطراف کی پارٹیوں نے اپنی خواہشوں، مفادات اور ترجیحات کو پیشِ نظر رکھا۔ دُنیاوی مادی تقاضے ایسے اُبھرے کہ انسانی اخلاق روحانی قدریں کہیں اوجھل ہو کر رہ گئیں...... ہر کسی انسان کو نفع و نقصان، پیار و محبت، تعلقات و توقعات کے بارے اپنی علیحدہ سی فلاسفی ہوتی ہے، وہ اپنی سوچ و سمجھ، حساب و کتاب کی طے شدہ لائنوں

سے ہٹ کر کچھ اور سوچنا یا عمل کرنا نہیں چاہتا۔ اپنا فیصلہ، قول فیصل اور مذہب مسلک، سب سے تیاپانچا، اتم سمجھتا ہے۔ انسانی خمیر میں خود غرضی، خود پسندی، تلوّن اور طرآری مختلف اشکال میں گندھی ہوئی موجود ہوتی ہے۔ سوا اُن مخصوص لوگوں کے جن پہ مالکِ کُل کا خاص کرم ہو۔ جنہوں نے اپنے نفس پہ قابو پالیا ہوتا ہے کہ وہی انسانیت کا جوہر ہوتے ہیں......!

انجام کار یہی ہُوا، جہاز والے آصف اور نیلوفر، اُدھر لندن والی نیلوفر اور کراچی والے آصف نے زمین اور فضاؤں کے مابین اپنے اپنے مقسوموں کا اَنت پالیا تھا۔ چنانچہ باہمی افہام و تفہیم کے بعد، وہ آپس میں گھُلے ملے نیز بیٹھے......لندن والی نیلوفر اور کراچی والے آصف صاحب بھی اپنی اپنی جگہ دُرست تھے۔ مطلب یہ کہ ہر شخص کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ کسی کی عبادت محض نماز، روزہ، حج زکوٰۃ ہے......کوئی تعلیم و تدریس کو عبادت گردانتا ہے۔ کسی کے ہاں رفاہی کام اور دوسروں کے لئے آسانیاں فراہم کرنا ہی سب سے بڑا فریضہ سمجھا جاتا ہے...... چند ایسے بھی، جن کے ہاں دُنیا اور علائق دُنیا سے ناتا توڑ کر جنگلوں پہاڑوں میں ریاضت اور عبادت افضل ہوتے ہیں۔ ”میں نے ایسے بھی اللہ کے بندے دیکھے جنہوں نے چوپاؤں، پرندوں سے محبت اور اُن کے بہبود کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ تمام عمر بیمار زخمی جانوروں کے علاج اور اُن کی نگہداشت میں مصروف رہے۔ کوئی کتابیں تصنیف کر کے مطمئن ہے اور کوئی چھاپ کر...... ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، سپاہی حتیٰ کہ گورکن، جلاد بھی اپنے اپنے فرائض کو عبادت سمجھتے ہیں اور سچ بھی یہی ہے!

- پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے......؟

بوڑھا چاچا علمدار بھی بھی جادوئی اثر نسوار بنا کر، کشتی رانوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اُس کے مطابق یہ کثیر الفوائد نسوار، سمندری موسموں اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے فوری نجات کا ایک آزمودہ نسخہ تھا۔ اس کی ایک چٹکی کلّے میں دبانے سے ہر طرح کی جسمانی، اعصابی سستی، ذہنی خلفشار، جذباتی ادبار، نیند کا خمار، سب کچھ اُڑنچھو ہو جاتا ہے۔ چاچا علمدار کا دعویٰ تھا کہ اُس کی نسوار کے بغیر کوئی کشتی ران، سمندر میں اُتر ہی نہیں سکتا۔ اُس کی نظر میں نسوار سازی بھی اِک عبادت تھی۔ ہے نا ' اپنی اپنی حکمت اور سمجھ کی بات؟...... چاچا نے اس طلسماتی ملغوبہ یعنی ہرے کانچ کے برادے جیسی نسوار کی ایک پڑیا مجھے تھمائی کہ کبھی آڑے وقت کام آئے گی۔ اس کی اور دوسروں کی زبانی اِس نسوار کے خواص جان کر میرے اندر کچھ عجیب قسم کا تاثر اُبھرتا تھا بلکہ اگر اِس میں کچھ سمندر بھی شامل کر لیا جائے تو یہ ”ول روز امرت دھارا“ سے بھی کوئی آگے کی چیز

بن جاتی ہے۔ مَیں اب بھول ہی چکا تھا کہ یہاں کس بِپتا میں پھنسا ہوا ہوں؟..... ایسے میں جو ایک اور زور کا جھٹکا لگا اور مَیں بے دھیانا سا لڑھک کر نیچے آ رہا۔ خیریت ہوئی کہ کسی چیز سے نہ ٹکرایا ورنہ سر تختۂ مشق بن گیا ہوتا۔؟

لانچ اب خاصی نیچے اُوپر ہو رہی تھی لگتا تھا جیٹی کی آڑ سے نکل کھلے پانیوں میں پہنچ گئی ہے۔ اتفاقاً نشست کے نیچے سے گزرنے والے ایک پائپ پہ ہاتھ پڑ گیا تھا ورنہ مَیں اِدھر سے اُدھر لڑھکتا رہتا۔ کشتی کا ناخدا ہو یا نہ ہو، طوفان میں پھنسی ہوئی کشتی، شوریدہ سر موجوں کی زد میں اک تنکے کی حیثیت بھی نہیں رکھتی؛ زندگی اور موت کا مالک تو اللہ ہے وہی ہے جو طوفانوں، آندھیوں، گردابوں میں پھنسے ہوئے جہازوں، کشتیوں کو نکالتا ہے۔ انسان محض مقدور بھر ہمت کوشش اور سلامتی کی خواہش کر سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا......!

نیچے موٹے سے آہنی پائپ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے خاصا وقت گزر چکا تھا۔ اچانک کوندا سا لپکا اور بلب روشن ہو گیا۔ مَیں اپنی چوندھی مُوندھی آنکھیں مَل ہی رہا تھا کہ دوبارہ گھپ اندھیرا اُتر آیا۔ ابھی تو مَیں پوری طرح حیرت زدہ بھی نہیں ہُوا تھا کہ پھر وہی سیاہی اور عالمِ تنہائی...... !اس طرح بجلی کے آنے جانے سے یہ ثابت ہوا کہ طوفانی گڑبڑ کی وجہ سے بجلی کا کنکشن کہیں سے ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اندھیرے میں وقتی طور پہ کچھ گھبراہٹ تو ہوتی ہے لیکن بَدیر جب آنکھیں اور سانسیں تاریکی سے آشنا ہو جاتی ہیں تو پھر بھرپور روشنی سے بھی بہتر اور صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ مشاہدہ میں آیا کہ روشنی تو محض جسم اور ظاہری خدوخال ہی اُجاگر کرتی ہے جبکہ اندھیرے میں ظاہریت سے پرے باطن تک دکھائی دیتا ہے۔ بس! آنکھ میں کالا موتیا ہونا شرط ہے۔؟ پورا انجن رُوم ڈولے بڈولے ہو رہا تھا۔ کہیں سے تیل اور پانی بھی ٹپکنے لگا جس کی غڑپ شڑپ آوازیں بھی نمایاں سُنائی دینے لگیں، اُدھر باہر طوفانِ باد و باراں نے ایک الگ دھما چوکڑی بپا کر رکھی تھی۔'' کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ کسی اُوڑ کچھ بچاؤ کی صُورت پیدا ہو؟

جب معاملات بَس و بساط سے باہر ہوتے جا رہے ہوں تو پھر بندہ خُود بخُود ہی سر پڑے حالات کے رُخ و رحم پہ پڑ جاتا ہے اور شاید یہی اس کی بہتری کی کوئی صورت ہوتی ہے۔ ایسا کر کے اک گونہ اطمینان تو ہوتا ہی ہے کہ بالواسطہ راضی برضا رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اک دَم جھٹکا سا لگا خیال آیا کہ مَیں تو سمندر سے دوستی کرنے کا سوچ رہا تھا۔ دوستی کے لئے پہلا تاثر تو یہی ہوتا ہے کہ دوست، مہربان، نیک خُو اور باوقار باوفا ہو۔ یہاں تو چھوٹتے ہی غیض و غضب اور شوریدگی؟...... ایسے باولے بھوترے سے توبہ بھلی۔ پر اب دوستی دُشمنی کا کوئی وقت نہ تھا...... آہنی قید خانہ تھا اور مَیں کچا پکا بچہ! جس کے بچنے کی سرِدست کوئی صُورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

معاً ایک اور زور کا جھٹکا لگا اور لانچ ایک کروٹ جھکولا لے کر ڈولنے لگی...... اسی دوران میرے ہاتھ سے آہنی پائپ چھوٹ گیا جو اب تک میرا سہارا بنا ہوا تھا۔ اس پہ گرفت بھی تو بائیں ہاتھ کی تھی۔ دائیں میں تو دوہرے کاغذ کے بُرادے جیسی نسوار کی پڑیا تھی جو بقول چاچا کنجی علمدار، ہر دُکھ کا دارو اور ہر اُلجھن کی اُنگل تھی! میں تیل پانی کی تلچھٹ میں پھسلتا ہوا انجن کے باڈی فریم کے ساتھ جا لگا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ پاؤں اُدھر تھے اگر سر ہوتا تو پچک گیا ہوتا۔"

خیال، سوچ، احساس، محبت، وہم، ڈر، خوف و جنوں وغیرہ جب چاہیں وارد ہو جائیں۔ چکنے چوبی فرش پہ پھسلتے ہوئے میرے ہاتھ کھل گئے۔ لڑھکتا پھسلتا، گرتا ڈوبتا ہوا انسان غیر ارادی طور پہ کسی تنکے کے سہارے کی جستجو میں ہوتا ہے۔ اس کا دماغ، ہاتھ، آنکھیں، اعصاب، قوتِ مدافعت، دیگر باطنی توانائیاں پوری پوری بیدار ہو جاتی ہیں۔ انجن کے ڈھانچے سے ٹکراتے ہی اپنے اردگرد ہاتھ پاؤں چلانے لگا کہ سہارے کے قابل کوئی چیز ہاتھ لگ جائے۔ یہیں یہ بھی احساس ہوا کہ نسوار کی پڑیا، لڑھکتے سمے کہیں ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ اندھیرے میں دکھائی کیا دیتی یہاں تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ آس پاس ٹٹولتے ہوئے اچانک پڑیا مل گئی تو ایسی خوشی ہوئی جیسے کوئی نعمت غیر مترقبہ ہاتھ لگ گئی ہو۔ اب ایسے کہ میں سر پڑی بپتا بھول کر نسوار دوالے ہو گیا۔ کسی طرح ٹٹول ٹٹول کر نسوار کی پڑیا ڈھیلی کی۔ دیسی پشاوری تمباکو، کپے کافور، جلے بجھے چونے اور پودینے کی ملی جلی مہک نے مجھے اک عجیب سی تازگی اور ہوشیاری سے معمور کر دیا۔ پھر کیا ایک بھرپور چٹکی اس "ہری ہجرت" کی کلّے میں رکھ لی۔"

کمبخت نسوار، منہ میں رکھی جائے یا نتھنوں میں چڑھائی جائے، چشمِ زدن میں نس نس میں چڑھائی کر دیتی ہے۔ یعنی زہر پھانک لیں یا گھول کر پی جائیں، نتیجہ ایک سا ہی رہتا ہے۔ تریاق بھی ہر حال میں کار تریاقی کرتا ہے' سونگھ لو یا سینہ پہ کھینچ لو...... مرے کو مارے شاہ مدار!...... پہلے کون سی حالت اچھی تھی جو نسوار خوردنی سے مزید بگڑتی...... بس ہلکا سا چکر آیا اور میں بے سار سدھ وہیں تر اندیپ تھا۔" نیند اور بے سُدھی میں یوں فرق کہ حالت نوم میں جسم کے پنجرے میں پنچھی نہیں ہوتا ہے جبکہ بے سُدھی کی کیفیت میں میاں مٹھو، اندر ہی منڈھی ڈالے پڑا ہوتا ہے۔ نیند کی نیابت میں خواب آتے ہیں اور بے سُدھی، بے خودی، بے بُدھی میں خوف و خیال خراب کرتے ہیں۔ یہ وہی خوف و خیال ہوتے ہیں جو بے ہوش ہوتے وقت اذہان کی غلام گردشوں میں بازگشت بن کر گونج رہے ہوتے ہیں۔"

کہتے ہیں روزِ محشر مُردے اپنی اپنی قبور سے اُٹھیں گے یہ تو علم نہیں کہ وہ اپنے جسموں یا قائمی حواس کے ساتھ ہوں گے یا محض نوری وجود ہوگا؟...... انسان دس منٹ سو لے یا دس صدیاں! اس کے لئے وقت کی

اکائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ نیند بے ہوشی، مرگ سکر کی حالت میں احساسِ سُود و زیاں جاتا رہتا ہے۔ جسمانی طبعی موت میں اندر بڑے بڑے قطر کے نل پھٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ فشار، متاعِ جان کو لے ڈوبتا ہے۔ حادثاتی سانحات میں اچانک گوشت پوست کے پہاڑوں سے خونی لاوا چھوٹنے لگتا ہے۔ دماغ میں بم سے بلاسٹ ہوتے ہیں۔ پھر گہری سُرخی لیے ہوئے اتھاہ تاریکی طاری ہو جاتی ہے اور متوفی پکّی نیند کی طرح پکّی غنودگی کے چنگل میں پھنسا موت کے تاریک غار میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ اسی دوران جسم کسی بوسیدہ لباس کی طرح بساند چھوڑتے ہی علیحدہ ہو جاتا ہے اور اندر کی مینا اک لمبی کا فوری محویت میں آسودہ ہو جاتی ہے۔ تب سے یومِ نشور تک کا عرصہ، کھربوں نگیوں کا بھی ہو، پلک جھپکتے ہی طے ہو جاتا ہے۔ قبر سے اُٹھنے والا یوں انگڑائی توڑتے ہوئے اُٹھ بیٹھتا ہے جیسے پچھلے پہر ہی قیلولہ کے لئے لیٹا تھا۔ صدیوں کے زمانے فردے کی ایک کروٹ تلے دب کر رہ جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہوش اُڑتے ہی وقت کہیں منجمد ہو جاتا ہے۔ زمانوں پہلے کے دبے ہوئے فردے چوپائے، پرندے کھدائی کے درمیان یوں ظاہر ہوتے ہیں جیسے پچھلے دنوں اماناً دفنایا گیا ہو۔ سائبیریا کے گلیشیر انہیں جوں کے توں سینت سنبھال کر رکھتے ہیں۔"

طوفانی بچھولوں، اندھیرے میں فرش پہ لڑھکنے اور نسوار کے ہرے کی رنگ کی چوڑیوں کے بُرادے نے مجھے بے ہوشی کے دبیز برف زاروں میں دبا دیا۔ گہری برف، خالص شہد، قدرتی سرکہ اور بجھے ہوئے کوئلوں کے بُرادے میں پڑا دبا ہوا گوشت پوست، انسانی حیوانی اعضاء و اجسام گلنے سڑنے اور عفونت سے کافی حد تک محفوظ رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں موم، چونا، تمباکو، پودینہ، پیاز لہسن، نیم کافور، زیتون کے روغن میں بھی ایسے کیمیائی اجزاء موجود ہوتے ہیں جو حیات بیز ہوتے ہیں۔"

بتا رہا تھا کہ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جانے کب تک وہاں پڑا رہا' کس نے مجھے نکالا۔ بے ہوشی کی حالت میں میرے ساتھ کیا سلوک ہوا؟...... بس اتنا یاد کہ جب ہوش آیا تو میں منوڑہ کے نیول ہسپتال کے بستر پہ پڑا تھا۔ ایک نوجوان سا ڈاکٹر چیک کر رہا تھا۔ ہمارے سیٹھ کا مُنشی، چاچا علمدار کھچی اور خلاصی، ذرا پرے بیٹھے تشویش بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔" اسی روز شام کے قریب مجھے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا کہ مجھے ہلکے سے ضعف، قدرے اندیشہ وخوف کے علاوہ کوئی عارضہ نہ تھا۔" طاقت کا ایک سیرپ اور چند مسکن گولیاں تجویز کر کے مجھے واپس میگزین والی بلڈنگ کے اُوپر چھت پہ ٹین سے بنے ہوئے کمرے میں بھیج دیا گیا جدھر مجھ ایسے چار پانچ چھوٹے ملازموں کی رہائش کا بندوبست تھا۔ چند ابتدائی دن تو، لانچ والے واقعے کو محسوس کرتے گزر گئے۔ چاچا علمدار کھچی روزانہ ہی کوئی نہ کوئی پھل، بسکٹ، پیسٹری، ڈبل روٹی لے کر آتا اپنے ہاتھ سے کھلاتا۔ اِدھر اُدھر کی ہنسی مذاق کی باتوں سے میرا دل بہلانے کی اپنی سی کوشش کرتا۔ دفتری کام

سے چھٹی تھی کہ میں چند روز بیڈ ریسٹ لے لوں۔ میں حیران تھا کہ چار پانچ روز گزرنے کے باوجود چاچا نے ایک بار بھی سمندری طوفان یا لانچ والے واقعہ کا ذکر تک نہ کیا اور میں نے دانستہ اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا کہ چاچا کو میں خود ضد کر کے لانچ پہ رکنے اور سمندر سے دوستی کرنے کا کہہ چکا تھا لیکن میں اندر سے چاہتا ضرور تھا کہ وہ مجھے اس طوفان والے دن کے بارے میں کچھ بتائے۔ وہ اس رات نسوار تیار کر کے سامان سمیٹ کر کہاں غائب ہو گیا تھے؟ ایسے کئی ایک سوالات تھے جن کے جوابات میں جاننا چاہتا تھا' مگر لگتا تھا چاچا، جان بوجھ کر اس موضوع کو گول کر رہا یا پھر شاید میری دگرگوں حالت کی وجہ سے کچھ کہہ سن نہیں رہا تھا۔ مبادا میری دل آزاری ہو۔ اچانک بن سوچے میرے منہ سے نکل گیا......"

"چاچا! تمہاری طلسماتی نسوار کی کیا خبر ہے؟"

"اوئے بچے! نسوار زندہ باد ہے' یہ اپنی نسوار ہی تھی جس نے اللہ، پیران پیر دستگیر اور خواجہ الیاس وخضر کے بعد تمہاری مدد کی اور تم ابھی میرے روبرو زندہ سلامت بیٹھے ہوئے دکھائی دے رہے ہو۔"

وہ اپنے کانوں کی لوؤں پہ ہاتھ دھرتے ہوئے مزید بولا۔

"بچے! بڑا بول نہیں بولتا، جہاز، لانچ، کشتی، بیڑی...... سمندر، دریا، جھیل جو بھی ہوں وہ سب اس مسکین چاچا کی نسوار کی حیا کرتے ہیں...... جس کے منہ میں ہو گی اُس میں طوفانوں، مصیبتوں کا جبڑا چیر کر باہر نکلنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

میں گزرے واقعات پہ غور کرنے لگا۔ وہ طوفانی رات، گھن گرج، موسلا دھار بارش، لانچ کا لنگر سے آزاد ہو جانا، جیٹی کی حفاظتی روکاوٹوں سے نکل کر کھلے سمندر میں بپھری ہوئی موجوں کے رحم وکرم پہ پڑ جانا۔ اچانک بجلی کا منقطع ہونا، گھپ اندھیرے میں انجن کے ڈھانچے سے ٹکرانا اور پھر ناگاہ، مٹھی سے نسوار کی پڑیا کا گم ہونا...... پھر اس کا مل جانا...... یاد آنے پہ چٹکی بھر کر کلے میں رکھتے ہی دماغ کا فیوز آف...... گہرا گھپ اندھیرا۔ چاچا اسی طرح مجھے گم صم پا کر پوچھ بیٹھا۔

"بچے! کہاں گم ہو گئے ہو......؟"

"چاچا! تمہاری نسوار، مصیبت پریشانی میں مبتلا کسی کو نجات دلانے کی بجائے بے ہوش کیوں کر دیتی ہے۔ میں اسے منہ میں رکھتے ہی دُنیا جہاں سے بے خبر ہو گیا تھا۔ مجھ پہ کیا بیتی' وہاں سے کون مجھے لایا، ہسپتال کیسے پہنچا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ ذرا تفصیل تو بتاؤ......؟"

چاچا چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر قدرے تُرش روئی اختیار کرتے ہوئے کہنا لگا۔

"یہی کچھ تو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ کیا حماقتیں کیں۔ اُس رات میرے جانے کے

بعد تم نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ انجن رُوم سے عجیب و غریب آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جب خلاصیوں نے نیچے پہنچ کر تمہیں آوازیں دیں، دروازہ کھٹکھٹایا تم نے بجائے کوئی جواب دینے کے اُلٹا بھلا بُرا کہنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے بہتیرا دروازہ کھولنے اور توڑنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے لیکن کچھ دیر بعد تمہاری آوازیں بھی بند ہو گئیں تب وہ مجھے ڈھونڈنے نکلے۔ مگر مَیں نسوار دینے کے لئے کسی اور جانب نکل چکا تھا۔ اب جو بارش شروع ہوئی تو رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی مجبوراً مَیں رات اِدھر نہ آ سکا۔ دوسرے خلاصی اور چوکیدار بھی اپنا اپنا ٹھکانا کر گئے۔ اگلی صبح جو ہم واپس لانچ پہ پہنچے تو نیچے انجن کا دروازہ ابھی تک بند تھا۔ بڑے جتنوں سے لوہے کا بھاری دروازہ کھولا گیا دیکھا تم نیچے فرش پہ بے ہوش پڑے تھے۔ تمہارے ہاتھ میں نسوار کی کھلی پُڑیا تھی۔ نبض بڑی آہستہ اور آنکھوں کے ڈیلے پلٹے ہوئے تھے۔ فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ اس کے بعد کا تمام حال تمہارے سامنے ہے۔''

''چاچا! یہ بتاؤ، جب تم لوگ جیٹی پہ پہنچے تو لانچ کہاں تھی؟''

''وہیں جدھر اُسے ہونا چاہئے یعنی ڈک نمبر ۱۵ پہ۔''

''......اور اُس کی حالت وغیرہ کیسی تھی...... انجن روم کی بجلی، پانی کا ٹینک، سب ٹھیک تھا؟''

''تم یہ سب کیوں پُوچھ رہے ہو......؟''

''اس لئے کہ اُس رات غضب کا طوفان آیا تھا بارش اور جھکڑوں نے اِک قیامت بپا کی ہوئی تھی۔ لانچ بُری طرح ڈول رہی تھی۔ لگتا تھا طوفان اِسے اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ پھر اچانک بجلی بند ہو گئی۔ ساتھ انجن روم کا دروازہ بھی...... گھُپ اندھیرا، مَیں بوکھلا گیا۔ اندھیرا ابھی پوری طرح کھُلا بھی نہ تھا کہ بجلی آ گئی۔ اب مَیں دروازہ کھولنے کے جتن کرنے لگا۔ زور زور سے خلاصیوں کو آوازیں دیں مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ دل شکستہ سا اپنی جگہ پہ بیٹھا ہی تھا کہ یک دم لانچ بائیں پہلو جھکولا لے کر بُری طرح ڈولنے لگی جیسے لنگر سے آزاد ہو گئی ہو۔ میرا توازن بگڑ گیا اور مَیں ڈگمگا کر انجن سے آ ٹکرایا۔ کہیں تیل پانی کی پائپ بھی ٹوٹ گیا تھا فرش پہ کیچڑ، چیچٹ کہ کھڑا ہونا دُشوار تھا۔ یہیں خیال آیا کہ میرے دائیں ہاتھ سے نسوار کی پُڑیا کہیں گر گئی ہے۔ اِدھر اُدھر ہاتھ چلانے سے مل تو گئی مگر تیل پانی میں بھیگی ہوئی۔ کسی طرح کھولی اِک بھاری سی چٹکی مُنہ میں رکھ لی۔ بس یہاں تک تو یاد ہے اس کے بعد اللہ ہی اللہ اور باقی سب کچھ غائب۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر مَیں نسوار مُنہ میں نہ دھرتا تو بے ہوش ہونے کی نوبت پیش نہ آتی۔ پہلی پہلی بار سگریٹ، نسوار، بھنگ، چرس، شراب پینے والوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔؟''

چاچا نے کمال ضبط و تحمل سے جواباً کہا۔

''بچہ! یہی نسوار تھی جس نے تیری ہیجانی حالت میں مدد کی اور تمہیں وقتی طور پر مدہوش کر کے کسی بڑی مصیبت سے بچا لیا۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ لیا۔

''میں کچھ ٹھیک سے سمجھا نہیں چاچا! کہ اِس ناگہانی واقعے میں نسوار کا کردار کہاں سے آ ٹپکا؟''

''بچہ! ٹونکے موٹکے جانتے ہو کیا ہوتے ہیں؟ یہ سیانے گیانے بزرگوں کے آزمودہ نسخے ٹوٹے ہوتے ہیں جنہیں اُنہوں نے اپنی بیتی زندگی میں مختلف عُلوم اور تجربات و مشاہدات سے اَخذ کیا ہوتا ہے۔ علاج دوائیں جہاں کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں وہاں یہ ٹونکے موٹکے خُوب کام دکھاتے ہیں۔ اب چونکہ تمہارے دماغ میں سمندر کی دوستی اور دُشمنی کا جنون بھرا ہوا تھا اور خود کو لاشعوری طور پر سمندر کے حوالے کر دیا ہوا تھا جونہی تُم اُدھر سے نکلا اور تمہیں تنہائی نصیب ہوئی تو پہلے تمبا کو اور کافور کی تیز مہک نے اپنے تیور دکھائے پھر کچھ بارش اور تیز ہوا نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا...... بجلی جانے کے بعد اندھیرے کا جادو بھی سر چڑھ کر بولا۔ نتیجہ یہ کہ تم ڈگمگا کر گرتے ہی بَولا گئے اور پھر وہیں تمہیں نسوار کا خیال آیا۔ کسی طرح اُسے منہ میں رکھ لیا اور چت ہو گئے۔ ہسپتال پہنچ کر ڈاکٹر نے تمہارے منہ میں پڑی نسوار نکالی تھی۔ یہی نسوار تھی جو تمہیں بچا گئی۔ ڈاکٹر کسی خوفناک سمندری بیماری کا نام لے رہا تھا کہ اگر یہ کسی طرح بے ہوش نہ ہوتا تو یہ سر ٹکرا ٹکرا کر مر سکتا تھا......
بچہ! تم خوش قسمت ہو جو سمندر کی دوستی دُشمنی سے بچ نکلے ہو ورنہ...... اور تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہلکی پھلکی بارش اور تیز ہوا کے علاوہ اور کچھ بھی وہاں نہیں۔ لنگر ٹوٹا اور نہ لانچ سمندر میں بھٹکتی پھری......''

''تو پھر یہ سب کچھ کیا تھا......؟''

''جس جگہ تم لیٹتے رہے ہو اور جو کچھ وہاں لکھا ہوا تھا وہیں کچھ تصوراتی طور پہ تمہارے دماغ میں پیدا ہوا اور باقی اتفاق سے پیدا ہونے والی کیفیات اور واقعات وغیرہ...... اکثر انسان کو وہی کچھ دکھائی دیتا ہے یا پیش آتا ہے جو اُس کے خیالات میں ہوتا ہے۔''

یہ تو میری اوائل عمری کا واقعہ تھا جس نے اُس وقت کے میرے مشاہدہ و تجربہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا لیکن زندگی کے حیرت زار میں آگے بڑھ کر اَن گنت اور ایسے بھی واقعات پیش آئے جن سے گزر کر معلوم ہوا کہ دل اور دماغ کی دُنیا کے دستور و منشور بڑے نرالے، سمجھ میں نہ آنے والے پُراسرار اور دلچسپ ہوتے ہیں...... بعض معاملات میں ان کی آپس میں بڑی مسابقت و مطابقت دکھائی دیتی ہے اور بیشتر میں گہرا بُغض و بغاوت......! کمال ہے رہتے بھی اِک دُوجے کی بغل میں ہیں، بس نیچے اُوپر کا فرق ہوتا ہو گا۔ کسی نے اپنی سمجھ سے دل کو دماغ پہ فوقیت دی اور کسی نے اپنے حساب سے دماغ پہ دل کو مقدم جانا۔ پر علامہ نے

اس عقل اور عشق کے مقام کو خوب بیان فرمایا ہے ۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

- دل ہے کہ پنڈت بجرنگ ناتھ......؟

مَیں بھی اس معاملہ میں اپنے مرشد سے متفق ہوں کہ دل، اپنے فیصلوں میں دماغ سے راہنمائی حاصل کرے لیکن پھر کبھی کبھی اپنی مَن مانی بھی کرگزرے کہ اس طرح دونوں ہی کینڈے میں رہتے ہیں۔

دل کو خدا کا ڈیرا بھی کہا گیا...... یا روئی کلی اور سمندر سے ڈونگا بھی۔ کسی نے میڈیکل سائنس کی روشنی میں اسے محض خون سپلائی کرنے والا گوشت کا بنا ہوا پمپ کہا...... پیار پیشہ لوگ، آپس میں دلوں کا تبادلہ بھی کر لیتے ہیں۔ ہلکی سی بے وفائی سے دل ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ ستار، بینا، طاؤس، سارنگی، اکتارہ اور سُرمنڈل کی مانند، دلوں کے بھی تار ہوتے ہیں، جن پہ پریم راگ اور راگنیاں چھیڑی جاتی ہیں۔ کسی نے یہ بھی کہا مسجد مندر منہدم ہوتے ہیں تو ہو جائیں مگر کسی کا دل نہ توڑنا کہ یہ رَب کا معبد ہے۔ غرضیکہ اسے ہر وہ رنگ و رُوپ دیا گیا جو بجھ، عقل نطق، عقیدت و محبت کی بساط میں ہے۔ اسے آبگینہ، آئینہ سنگ و شیشہ سے بھی تشبیہ دی گئی۔ اس میں رحم، رعونت، وَسوسہ و خیال، وہم شکوک، خوف و شبہات بھی پیدا ہوتے ہیں...... بنک کے لاکر کی طرح اس میں بہت سے خانے ہوتے ہیں جس میں ہزاروں اَدنیٰ و اعلیٰ، قابلِ حصول اور ناقابلِ حصول، جائز و ناجائز اشیاء، خواہشات و خیالات موجود ہوتے ہیں۔''

چاہیے تو یہی تھا کہ دماغ کی طرح اس کی شکل بھی ایک سی ہی ہوتی مگر کیا کیجئے کہ محبت میں مبتلا مرد و زن کے لئے اس کی صورت پان کے پتے سی ہوتی ہے۔ مگر اس کا رنگ سبز نہیں سُرخ ہوتا ہے۔ ایک تیر اس کے آر پار ہوتا ہے اور ٹپکتے ہوئے خون کے قطرے بھی!...... درختوں کے تنوں، پریم پتروں، رُومالوں، بازوؤں اور عید کارڈ پہ اکثر بنایا جاتا ہے جبکہ اصل دل مزابری جیسا ہوتا ہے جو خون کی طرح سُرخ ہوتی ہے۔ دُنیا میں کہیں بھی جو شاعری لکھی گئی...... دل کے خصوصی ذکر کے بغیر دِلآویز نہ ٹھہری۔ دُنیائے محبت و چاہت کے سارے پاگل پن اسی سے پھوٹتے ہیں۔ انسانی جسم کا، ہاتھ انگلیوں کے بعد یہ واحد مرکزی اعضاء ہے جو بیک وقت بہت سے فرائض انجام دیتا ہے جبکہ دماغ ایک کنٹرول روم کی طرح ہوتا ہے جو موقع مناسبت سے احکام جاری کرتا اس کا طرزِ عمل کبھی منطقی بھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی......'' یہ بیک وقت بہت سی جہات پہ

نظر رکھتا ہے اور احساسِ سُود و زیاں بھی خُوب...... فتور و فتور اور تکبر و غرور بھی خوب۔ یہ بڑے بڑے لاینحل عقدے حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کبھی چھوٹی چھوٹی اُلجھنیں اسے فتر بُود بھی کر دیتی ہیں۔"

دماغ! دل کو نادان سمجھتا ہے اُس کے راست اقدام کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اپنے غلط فیصلے کو صحیح ثابت کرنے پہ مُصر رہتا ہے۔ بہت کم ایسا ہُوا کہ دونوں نے ایک دوسرے کے عقلی اور جذباتی تقاضے سمجھتے اور برداشت کرتے ہوئے کوئی معاملہ یا معرکہ سَر کیا ہو.. اور جہاں ایسا ہُوا تو وہ پھر کمال ہی ہُوا؟...... یعنی مادیت سے ماورایت کی راہ نکل آئی۔ دل دیوانگی کی ردا اوڑھ کر اس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ نگاہ رُوبرو اور سرنگوں کیے چُپ سادھ لیتا ہے۔ دماغ اس کی اس ادا پہ قربان ہو کے ایسے معرکے دکھاتا ہے جو عام حالات میں اس کے لیے ممکن نہیں ہوتے۔ دل، جسم کی عمارت میں ایسی جگہ پہ مقیم و مقید کہ اس گرداگرد پسلیوں کا مضبوط پنجرہ ہمسائیگی میں نکا نک کلیجہ پھیپھڑے، گردے، لبلبہ، پتہ وغیرہ شاید اسی کی نگہداشت یا بہلاوے کی خاطر، بڑی آنت کی شاہراہ بھی قریب سے گزرتی ہے جبکہ دماغ ...... تو وہ پہاڑ کی چوٹی پہ کسی تیار گاہ کی مانند...... کہ اُوپر افلاک کی خبر رکھے، آسمانی کڑکتی بجلیوں کی زد میں اپنی بینش و خرد صیقل ہوتی رہے...... سوا نیزے کا سُورج اس کی گدی گرم اور میگھا کی رم جھم شانت رکھے......"

کبھی دماغ کے خود پہ ہما بھی بیٹھ جاتا ہے اور کوا اس وقت، جب گنجی چمک اور مکھن کی بساند اُٹھ رہی ہو۔ کلاہ و تاج سے اسے زیب بھی دی جاتی ہے اور تادیبی کارروائی میں "پاپوشی" بھی ہو جاتی ہے۔ چار اَبرو کی صفاچٹی میں اس کی باری پہلے آتی ہے بعد میں ریش، مُونچھیں اور اَبرو۔ آبرو بچانے کی خاطر کبھی اس جیجہ والے چیمبر کو دوکوڑی کے بندے کے آگے نگوں بھی کرنا پڑتا ہے۔ اُولے آنولے بھی سہنے پڑتے ہیں۔ دیکھا' سربلند ہونے میں کیسے عذاب ہیں؟ اُٹھا ہُوا سر دماغی فتور، جبکہ جُھکا ہُوا سر، دل کا سُرور ہوتا ہے۔ ایک دمدمہ ہے تو دُوسرا زمزمہ۔!

میری حیاتِ مُستعار بھی دمدموں اور زمزموں کے مابین رائیگاں رہی۔ کبھی دماغ شعور اور عقل و بینش کی اُلتر بنتر میں پھنسا...... اور کہیں دل کے دَرو دُرود اور دَم دیتی دھانس میں دَھنسا رہا۔ اک سے بچی تو دُوجے سے ٹوٹی...... بہت کم ایسا ہُوا کہ دونوں ہم آہنگ و سنگ رہے لیکن جب رہے تو عجب رنگ رہے کہ دیکھنے سننے والے بھی دنگ رہے۔ غضب کے ترازو پلڑے کہ جنہیں ہم سار رہنا شاید ہی کہیں نصیب ہُوا ہو؟ خدا کی خدائی ایک طرف اور ان کی اَدائی ایک طرف......!

مَیں بھی ایک عجیب مُنش تھا؟ اندیشۂ رُسوائی نہ فکر، تو قیر بادی النظر میں یا خاص بندہ تو وُہی ہوتا ہے مجھے بھوک، نیند، آرام، حالاتِ وقت، عمر کے تقاضوں، اپنی عزتِ نفس، ناپسند، سُود و زیاں، دوستی دُشمنی

محبت ونفرت کا خیال واحساس رہتا ہو...... اس کی کوئی صبح وشام کوئی راہ، رہبر سنگِ میل، منزل، آئیڈیا، پلاننگ یا کوئی جنت ودوزخ ہو......؟

کبیرا کہتا ہے کہ آدمی جب دُنیا اور اس سے وابستہ مکروہات، لوازمات اور عذابوں میں جکڑا جاتا ہے تو وہ ایک عمر قید، بے بس وبیکس، اسیر کی مانند ہوتا ہے جس کے پاؤں، بیڑیوں کے آزار اور باقی ماندہ زندگی بندی خانہ کی عقوبت میں تمام ہوتی ہے۔ وہ ضرب جمع تفریق تقسیم کی اکائیوں میں اِک کائیاں بن کر رہ جاتا ہے۔ مکروہات وموجوداتِ دنیا اُسے تل چٹا بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ہاں چنداں ایسے بھی انسان ہوتے ہیں جو موجود تو اسی کارزارِ دُنیا میں ہوتے ہیں مگر علائقِ زندگی سے اُن کا سروکار کچھ کم ہی رہتا ہے۔ بس نام نہاد سا...... پتا نہیں وہ بسراوقات اور تائیدِ ذات کیونکر کر پاتے ہیں؟...... خوش قسمتی یا بدبختی کہ میرا شمار بھی ایسے ہی فاترالذہنیا افراد میں ہوتا ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے اپنے اپنے مقسوم؟...... عام انسان میں پانچ حسیں اور خاص کے ہاں چھ، جبکہ دُرویش کے ہاں چھ چھکا چھتیس چھتیار قسم کی حسیں پائی جاتی ہیں۔ شش جہاتِ عالم اس کے رُوبرو جامِ جم ہوتے ہیں۔!

میں تب ایک کچا دُرویش تھا...... ویسے تو راہِ فقر ایک ایسی راہ ہے جس کی منزل کا تعین نہیں ہوتا......!
شاید اس راہ پہ قدم دھرنے، پگ پگ آگے بڑھنے کا نام ہی فقیری درویشی ہے۔ فقیروں درویشوں کا شاید کوئی پیر اُستاد بھی نہیں ہوتا، ازل وعصر ہی اُن کی پرورش و پذیرائی کرتے ہیں۔ حشرات الارض، سانپ بچھو اور دیگر مضرت خیز مخلوق بشمول جنات وغیرہ انسان سے کوئی ازلی بیر نہیں رکھتے بلکہ ان سے اپنی جان لکاتے چھپاتے رہتے ہیں تاکہ بشر ان کے فطری رویّوں سے محفوظ رہے تا آنکہ مرنا، مارنا اُن کی مجبوری نہ بن جائے؟ حشرات الارض وماء، بادوگاہ اور مسکین منش اپنے مسکنوں، منفذوں، زمین پہاڑوں، صحراؤں، غاروں، پانیوں کی خلوتوں میں اپنے نقطۂ ارتکاز کی جانب متوجہ رہتے ہیں۔ فقیری، شیر کا بُرقع...... مکمل پردہ، حجاب، ترکِ علائق، گوشہ نشینی...... اپنے سوز دروں کا زہر اندر وارے، کرب وضرب کی کیف کیفیت...... چھپنا چھپانا، جھنجھنانا لرزنا، تڑپنا، کسمسانا، آہیں فریادیں کراہٹیں...... خواہشوں، ضرورتوں کی ریشم گلی سے بہت پرے...... تمناؤں، آرزوؤں کے رانی باغ سے باہر اندیشہ ہائے دُور دراز سے دُور، دُرامکانِ شب پہ پڑے رہنا ہی ان کا نصیب ٹھہرا۔ انسان نے فقر وصبر، ریاضت ومجاہدت، اسباب ووسائل، توکّل وتقویٰ، فطرت وجبلّت، خودی وخود انحصاری کے اوّلین اسباق انہی فقیروں سے سیکھے پڑھے...... انسان کے ہاں اس فہامت وفکر کا فقدان ہے جس سے دیگر مخلوقاتِ عالم کی بابت گرہیں کھلنے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہوں مگر جسے اللہ عطا کرے۔
علمُ الدنی...... الہامی، رویائی، مکشوفی، نومی اور باطنی ذرائع سے حاصل ہوا۔ یہ کتابی اور اکتسابی

وسیلوں سے حاصل ہونے والا علم نہیں۔ یہ گویائی نہیں چپ گپ ہے۔ یہ فطری ہے جو اُترتا ہے لکھا نہیں ہوتا۔ کسی مذہب ومسلک سے بھی فقیری ودرویشی کو جوڑا نہیں جا سکتا۔ حیوانِ ناطق یعنی انسان کے علاوہ کسی بھی دیگر حیوانِ مُطلق کا صرف ایک خالق ومالک ہوتا ہے۔ کسی مذہب مسلک میں پھنسے بغیر وہ ایک ہی رَبّ کی تسبیح کرتے ہیں جس نے انہیں توکل وتقویٰ کی بے بہا قوت ودولت سے بہرہ ور کیا ہوا ہوتا ہے۔''

## ● اُلٹی وا کی دَھار......!

مصر، ترکی، عراق اور ہندوستان، میرے لئے ایسے دیس ہیں جن کی سیاحت سے میرا کبھی نہیں بھرتا۔ راجستھان کا بھی دیوانہ ہوں میرے خوابوں خیالوں کی سرزمین جدھر میں سوئے جاگے بھٹکتا رہتا ہوں، سو جنم بھی اُدھر بسر کرلوں تو مزید کی طلب رہے۔ ایک سفر میں جودھ پور سے پرے، چھوٹے سے صحرائی گوٹھ بھارو بھونا میں بیمار پڑ گیا جو بھی کھاتا پیتا وہ بغیر تکلف وتردد پیچش کی صُورت خارج ہو جاتا۔ ایک بات جو کئی بار کے تجربہ کے بعد سمجھ میں آئی کہ راجستھان اور بنگلہ دیش میں میرا پیٹ خراب ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اِدھر جب پیچش نے مجھے نڈھال کر دیا تو کسی چارہ گر کی تلاش ہوئی۔ جس آشرم میں پڑا تھا اُدھر ایک سنیاسی بابا بھی تھا۔ اُس سے بلا کافی کچھ پوچھ کاچھ کے بعد اِس نے کسی جڑی کے سُوکھے ہوئے ڈنٹھلوں پتّوں کا ایک پوٹلہ تھماتے ہوئے مشورہ دیا کہ افاقہ ہونے تک مسلسل اِس کا جوشاندہ پیتا رہوں۔ پرہیز اور خوراک کے بارے میں تاکید کی کہ جوشاندے اور اِس کے اُبلے ہوئے ڈنٹھل پتّوں کے علاوہ ہر چیز کی مناہی ہے...... پیاس لگے تو جوشاندہ بھوک ستائے تو اِن ہی پتّوں کا بُرادہ......!

پیچش خُشک ہو یا خونی...... بواسیر کی طرح، مریض کو نیم مُردہ کر دیتی ہے۔ زور لگا، پیٹ دبا دبا کر مریض کی جان ضیق میں آ جاتی ہے۔ سیویوں کی مشین کا بل دار دُھرا سا پیٹ میں گھومنے لگتا ہے ایسے مروڑ اُٹھتے ہیں کہ پورا وجود بل کر رہ جاتا ہے...... اِس پاؤں پہ کبھی اُس پاؤں...... آنتیں کٹ کر باہر نکلنے پر آمادہ...... رام جانے وہ نوکدار، بدوضع کسیلے سیاہ ڈنٹھلے برگے، زکھیوں کے کس طعام کا حصّہ ہوں گے کہ جنہیں دیکھتے ہی اُبکائی آتی تھی......؟

ایک چینڈ ومولبی کی بیان کی ہوئی دوزخیوں کی خدمت میں پیش کیے جانے والے ماکولات کی تفصیل یاد آ گئی کہ جہنم میں قیام کے دوران اُنہیں تھوہڑ، خاردار جھاڑیاں، تُمے کی جڑیں، ناگ پھنیاں، زہریلی تھے،

اُدھر یک کے دُھر کوتے ، نیم کی نمولیاں ، منبر کی تلچھٹ ، حقّے کا پانی ، چھچھوندر کی جھینیں ، چگادڑ کے منہ اُگلے ، گلے سڑے زخموں کی پیپ ، گندے خون ، گندھک کے اُبلتے پانی اور تھوہڑ سے تیار شدہ "زقوم" نامی کاک ٹیل پیش کی جائے گی ۔ علاوہ ازیں کچھ کھانے پینے کو نہ ملے گا ۔ اس دوزخی مشروب کے اجزائے ترکیبی جان سُن کر ایسی وحشت و خوف محسوس نہ ہوا تھا جو اس بدہیئت جڑی بوٹی کو پہلی نظر دیکھ کر ہوا ۔ فلائنگ بلیڈ کی مانند تیز کانٹے ۔ تیروں کی انیوں جیسے نوکیلے سخت ڈنٹھل ، ڈوڈوں پتوں پہ گاؤ زبان کی طرح سیاہ رُوئیں ، چیچک دانے جیسی نسری پھرتی ہوئی بھی صاف دکھائی دے رہی تھی ۔ میرا بنا ہوا منہ دیکھ کر وہ مجہول ضیا سی گویا ہوا ۔

"بچہ ! اجڑی بوٹی کھری ہے ۔ تُو پکا کر کے چند دن اسے پیٹ بھر بھوگ لو ، پھر اس کا چمتکار دیکھنا ۔"

مَیں نے ایک ڈوڈا زبان پہ دھرتے ہوئے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا ۔

"یہ تو بہت کڑوا ہے ، کانٹے اور کیڑے بھی ہیں ! اسے حلق سے اُتارنا بڑا مشکل ہوگا ۔"

میری بات اُدھوری رکھتے ہوئے وہ جھکی بولا ۔

"پیٹ بھی تو کیڑوں کے کارن بگڑتا ہے ۔ منجھ بھی تو کیڑا کھٹل سمان ہوتا ہے ۔ کیڑا ہی کیڑے کا دَم دارو ۔ چتاونت کروں نخرے لو لے کرو گے تو جان جوکھم میں پڑ جاوے گی ۔ یہ روگ اِدھر باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو لگ جاتا ہے اور یہی موکھنا بوٹی اس کا انت اُپائے ہے ۔ آگے تمہاری اچھیا ......!"

بات اُس کی دُرست تھی ، پیٹ کی اکثر موٹی موٹی بیماریوں کا تیر بہدف علاج کڑوی کسیلی دوائیں ، بدذائقہ جوشاندے اور تیکھے کھاونے لعوق و عروق ، بے سُواد آشیں ، کھچڑیاں ہی ہیں جنھیں ٹھونس ٹھونس بیچارہ مریض اَدھ موا ہو جاتا ہے جبکہ دیگر سامانِ خورد و نوش بھی زہر لگنے لگتا ہے ۔ اب ستم در ستم یہ کہ اس منحوس عارضے کا شافی علاج بھی انہی دواؤں ، غذاؤں اور پرہیزوں میں پوشیدہ رہتا ہے ۔ وافر اُبلا ہوا جراثیم سے پاک پانی بھی اسی علاج کا بڑا حصہ ہوتا ہے ۔ اِدھر پاک صاف پانی تو کجا دُور و نزدیک گدلا جوہڑ کا پانی بھی مشکل سے دستیاب ہوتا ۔ کلبڑوں منکوں پہ موٹے کپڑے سے نتھار کر پانی پیا جاتا تھا ۔ کیڑے ریت مٹی شامل ہوتی جو اسہال کے عارضہ کا باعث بنتی ۔ وہاں کے مقامی لوگ تو کسی حد تک برداشت کر لیتے یا عادی ہو جاتے ہیں اصل مصیبت تو اجنبی مسافروں یا مہمان لوگوں کے لئے ہوتی ۔ میرا چونکہ راجپوتانے میں آنا جانا لگا رہتا تھا ۔ صحرا نوردی ، تھلوں ، گوٹھوں ، قبیلوں ، باڑوں ، راجواڑوں کی آوارہ گردی میرا جنون تھا ۔ مجھ ایسے دَرویش منش ، مجنوں کا ایسی بیماریاں تکلیفیں کیا بگاڑ سکتی تھیں پھر بھی ، کبھی نہ کبھی کوئی ایسی اُڑچن ضرور آڑے آ جاتی جو سارے کس بل نکال باہر کرتی ہے ۔"

چار و ناچار اس راجھستانی فرتوت کا یہ ٹوٹکہ استعمال کرنے پہ مجبور ٹھہرا ۔ کسی نہ کسی طور پہلی خوراک

پہ منہ دھرا تو حبلِ الورید سے حلق، معدہ تک ایک شدید حرکت کی لہر نے دُھرا کر دیا۔ یوں لگا جیسے غلطی سے آبِ شورہ تھوڑا پی لیا ہو؟ — جدھر جہاں اُس آتشِ سیال کا گزر ہوا، نارِ نمرود دہکتی گئی۔ شدید اذیت میں دونوں ہاتھ پیٹ پکڑے پڑ گیا۔ ناک، پیشانی ٹھنڈی، پنڈا پسینے سے تچ تچ پاؤں اینٹھنے لگے۔ پردیس میں کون منیا تھی جو صدقے واری ہوتی۔ ہائے وائے، لوٹ پوٹ، ڈیرا آشرم پاڑے میں بے سُدھ پڑا رہا۔ تاپ، پیٹ دانت کے عارضے بڑے اذیت ناک ہوتے ہیں۔ اگلی پچھلی سب بھلا دیتے ہیں۔؟

شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جنہاں تیں بھارے ہو
تاڑی مار اُڈا نہ باہو اسیں آپے اُڈن ہارے ہو

اس سخن کی عملی تفسیر بنا میں کئی روز سے اِدھر پڑا سڑ رہا تھا۔ راجستھان کے ان پسماندہ علاقوں کے مسافر خانے، دھرم شالے، اناتھ آشرم، صحرائی سرائیں وغیرہ بس برائے نام ہی ہوتی ہیں۔ روزمرہ کی بنیادی ضروریات اور سہولتوں کا کوئی تصور نہیں — کچی پکی، ریتلی مٹی کی دیواریں، گھاس پھونس کھپریل، جوت جھاڑ کے چھت اور نیچے ریتلے فرش پہ چٹائیاں یا ڈھیلے کھٹیا، پینے کے پانی کے لئے ماٹ اور باہر پچھواڑے اوٹ میں کانے پردے والا سنڈاس! — کسی اچھے آشرم میں کچھ دال بھوجن کا بندوبست ہوتا ہوگا' کوئی کھٹیا کھٹولا بھی اور کدھر اُونٹ، گھوڑے، ٹٹو، خچر کے تھان استھان بھی...... امیر غریب، چور، ڈاکو، اُوچے بد سے مسافر یاتری، تجارت پیشہ، نٹ نوڑے ٹھگ اور مجھ ایسے نٹ پونجیے، جنم جنم کے آوارہ گرد قریب سب ہی، ان پسماندہ صحرائی علاقوں، شہروں، گوٹھوں کے آشرموں میں بسر اوقات کر لیتے کہ ان کے علاوہ اور کوئی متبادل جگہیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے تین چار یا پانچ ستاروں والے ہوٹل، تب کہاں تھے۔؟

اب وقت بدلا تو وہاں کے راجاؤں اور ٹھاکروں نے اپنے پُرکھوں کے عالیشان محل، بھون، بنگلے پرتعیش ہوٹلوں، کلبوں، گیسٹ ہاؤسز میں تبدیل کر دیے ہیں جدھر ایک شب بسر کرنے کا کرایہ پچاس ہزار تک بھی ہو سکتا ہے۔ میرے زمانہ میں ان آشرموں، سراؤں میں وقتی طور پہ ٹھہرنے یا آسرا لینے کا معاوضہ نہ ہوتا تھا۔ اپنی مرضی سے اگر کوئی دان والی ڈلیا ڈبے میں کچھ دھیلا پیسہ دھر جاتا تو اُس کا پُن ہوتا۔ کبھی کبھی بھوجن بھاجی یا پڑ پوڑی بھی پاس کے مندر، مسجد سے اِدھر مسافروں کے لئے بھیج دی جاتی۔ ایک آدھ پُرانا بوڑھا سیوک بھی دکھائی دیتا جو صفائی ستھرائی اور آنے جانے والوں کی سیوا پہ جُتا رہتا...... مقصد بتانے کا یہ تھا کہ یہ بھی ایک وقت تھا اُس زمانے اُس دور کے تقاضے تھے۔ انسان، انسان سے انسانیت سے پیش آتا تھا...... مذہب و مسلک، رنگ و نسل سے بہت پرے ایک دوجے کی عزتِ نفس کا خیال رکھا جاتا۔ مل جُل کے جیا جاتا' اک دوجے کے دُکھ سُکھ سمجھے جاتے...... اپنا رام، اپنا رحمٰن اور اپنا اللہ، اپنا بھگوان تھا......!

ہاں مَیں بتا رہا تھا کہ اسی دھرم شالہ میں وہ سنیاسی بھی کہیں پڑا ہوا تھا جس نے میرے پیٹ کی خرابی کے لئے صحرائی جڑی بوٹی کے جوشاندے سے علاج تجویز کرتے ہوئے تاکید کی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مَیں یہ علاج جاری رکھوں ورنہ مَیں مناسب خوراک اور صاف پانی کی کمی کی وجہ سے کسی جان لیوا صورتِ حال سے دوچار ہو سکتا ہوں۔ اب اسی خوف کی بنا پہ مَیں پچھلے تین چار روز سے یہ منحوس بدذائقہ تلخ و تند جوشاندے زہر مار کرتے کرتے ایسا ہاکا ہو چکا تھا۔ کہ اب چلنا پھرنا تو در کنار مَیں اُٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہو گیا تھا۔ چہرے پہ ہلدی پِت گئی، آنکھیں کہیں کھڈوں میں اُتری ہوئیں۔ چہرہ جبڑے ایسے کھنچ گئے جیسے بکری کی سری کے بال جلا کر تنور سے باہر نکالا ہو۔ زبان، جیسے نیم کی گلی حلقوم میں پھنسی ہوئی ہو......؟

ایک صبح جب مَیں سنڈاس میں بیٹھا پیٹ دبائے کراہ رہا تھا۔ اتفاقاً اُسی سنیاسی کا پاس سے گزر ہوا۔ میرے کراہنے کی آواز سن کر قریب آیا اُوپر سے جھانک کر مجھے دیکھا۔ اِدھر میری یہ حالت کہ مَیں درد کی شدت سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح مجھے وہاں سے نکال کر آشرم کے برآمدے میں فرش پہ ڈال دیا...... خدا جانے اُس نے کون سا لخلخہ سونگھایا، یا کوئی جنتر منتر پھونکا کہ کچھ ہی دیر میں نُصرت پکڑ کے اُٹھ بیٹھا۔ درد و رد، نقاہت کمزوری سب غائب اور مَیں سمجھنے نہ سمجھنے کی کیفیت میں حیرانی سے اُسے تکنے لگا۔ وہ بھی اک عجب بوبک تھا...... کھی کھی کرتے ہوئے بولا۔

''بالک! مَیں نے تیرا انت علاج کر دیا ہے۔ اب نہ تجھے ایسا کوئی روگ لگے گا اور نا ہی کبھی سرِ شتی میں کوئی کمی پڑے گی۔ یہ بیروں کی ٹکڑی تجھے کھلائی ہے۔ علی دم مہاراج کے جھاڑوں کی ہے۔''

ٹکڑی عجیب، لیسدار لیکن مزیدار قدرے تلخی لیے ہوئے۔ تھلوں میں جنگلی بیروں کے خودرَو جھاڑ ملتے ہیں۔ ننھے ننھے کھٹے میٹھے کسیلے بیر بڑے مزے کے ہوتے ہیں۔ گودا کم، گٹھلیاں زیادہ، پھر بھی کھاتے جی نہیں بھرتا۔ اک انوکھی لذت اور طاقت سے بھرپور۔ صحرا نوردوں کے لئے یہ اک قدرتی مٹھائی ہی تو ہوتی ہے۔ میری دانست میں یہ چُورن انہی صحرائی بیروں کو خشک کر کے گٹھلیوں سمیت پیس کر بنا ہو گا۔ کھٹا میٹھا سواد کسیلی سی لیس کہ زبان تالو اور ہونٹوں سے چپک چپک جائے۔ میرا استعجاب ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ مَیں اس سنیاسی سے بہت کچھ پوچھنا جاننا چاہتا تھا جس کے لئے کوئی مناسب ساعت ہاتھ نہیں لگ رہی تھی۔ اب جو علی دم مہاراج کا نام سنا اور اُن کی بھیجی ہوئی شفا بخش ٹکڑی سے حیاتِ نو پائی تو سب کچھ پسِ پشت ڈال کر مَیں نے پوچھ لیا۔

''مہاراج! یہ علی دم مہاراج کون ہیں، کہاں رہتے ہیں......؟''

کھی کھی بے تکا ہنسنا، شاید اس کی عادت بن چکا تھا کہ اس کے بنا کسی بات کا اسٹارٹ ہی نہیں لیتا

تھا۔ جب وہ اپنی خوراک لے چکا تو بے دانتوں کا منہ سکیڑتے ہوئے رازدارانہ لہجہ میں بولا۔

''اپنے مہاراج میاں علی دَم سائیں کو آپ نہیں جانتے ہیں کیا؟......وہی دَم گدّے والے......وہی کھواجہ مہاراجہ غریب نواج کے بالکے۔ اِدھر ہم غریبن لوگ اُنہی پہ بھروسہ دھرتے ہیں۔ جب کاج بگڑ جاوت ہیں تو اُنہی کے دَم سے سنورتے ہیں۔ آج گجر دَم، اُن کا ایک سنت اِدھر براجا تھا۔ دَم کی دَم رُکا، دم دھیرج بکڑا، یہ نگدی تھمائی اور یہ کہہ کر چل دیا کہ بالک نمدے سنبھل لے تو سائیں علی دم کی اور بھیج دینا۔ اب تم آج نہیں تو کل تڑکے تڑکے اِدھر سے نِل لو۔ دیکھ لو سائیں جی نے تمہیں بلایا ہے۔'' ساتھ ہی اُونٹ کے چمڑے کی ایک چھوٹی سی چھاگل بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔'' اِس میں شہد ہے، راستہ میں اور کچھ مت کھائیو پیئو۔ بس اِسی کو ضرورت کے مطابق چاٹ لینا۔؟

## • دشتِ محال میں مگس باغ......!

شہد جو قدرتی عمل سے گزر کر تیار ہُوا ہو وہی خالص شہد کی اصل شکل ہوتی ہے جو طبی اور روحانی اعتبار سے مختلف اثرات وخواص کا حامل ہوتا ہے۔ گلزاروں، مرغزاروں میں قدرتی پھول کلیوں سے پُھوما چاٹی کرنے والی چھوٹی مگس خوش ذائقہ، خوش رنگ، خوشبودار شہد معرضِ وُجود میں لانے کی سزاوار ہوتی ہیں......جنگلوں، مختلف اشجار، ذخیروں سے رس چُوسنے والی بڑی مکھیوں کا شہد پرانے گڑ کی راب جیسا کسیلا اور بھاری جبکہ تاثیر میں تبخیری ہوتا ہے۔ کیکر، نیم کی نمولیوں، گُل ریحان، سُنبل سونف، سورج مکھی، پیلی کالی سرسوں، بیری...... اِسی طرح کھجور، انجیر، زیتون اور دیگر پھل پھولوں سے حاصل کردہ شہد بڑے کیمیائی شفائی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ اِس تاثیر وخواص کو کوئی حکمت والا جانتا ہے یا پھر کوئی سنیاسی جوگی جو مگس کی مانند منگل جنگل، بیلے بیلے، بگیا بگیا، جھاڑی جھاڑی، دَم سوتے رہتے ہیں۔''

شہد کی مگس بھی کیا مہان مکھی ہے، اپنے مطلب کے ننھے سے قطرۂ رس کو لینے کا رن کیسا کشٹ اُٹھاتی ہے۔ ظلم، وقت، اُصول قاعدہ کی پابند......سوچا جائے تو اِس کڑی مشقت سے مکھی کو کیا اُجر ملتا ہے۔ کون سی خلعت، جاگیر یا حُسنِ کارکردگی کا ایوارڈ مل جاتا ہے؟ ننھی سی معصوم معصوم مکھی، کتنے بڑے غذائی، شفائی اور قدرتی نظام کو رَواں دَواں رکھنے میں اپنا بے مثال کردار ادا کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دودھ اور شہد کا ذکر بطور خاص قرآن کریم میں شامل ہُوا۔ جنت کی نعمتوں کے حوالے سے اِن کو نمایاں فرمایا' خصوصی طور پہ توصیف کی گئی'

ارشاد کا قریب ترین مفہوم جو سمجھ میں آیا...... ''غور کرو کہ تمہارے رَبّ نے دودھ کو کس حکمت سے، پیشاب اور گوبر کے مابین پیدا کر کے علیحدہ کیا''......لطیف ولذیذ، پاک ومنزّہ، قوت وشفا بخش کہ صغیر وکبیر، نحیف وتوانا سب کے لئے اکسیر......اور شہد جو مکّس کا پیٹ اُگلا ہوتا ہے اپنے ہاں کیسی شفائی، حیاتیاتی اکسیری اور کیمیائی خصوصیات رکھتا ہے۔''اگر انسان محض اِن دو نعمتوں پہ ہی غور کرے اِن کے معرضِ وجود میں آنے کے ناقابلِ فہم طریقہ اور اِن کے ثمرات کو باریک بینی سے دیکھے تو اس کی عقل و بینش، ایقان وایمان کے بہت سے معاملے، سلسلے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں ایسی قدرتی نعمتیں ہیں جو غذا بھی ہیں اور دوا بھی۔ ثقیل بھی ہیں رقیق بھی۔ شہد اور دودھ کے ہوتے ہوئے مزید کسی ٹھوس یا مائع خوراک کی ضرورت باقی نہیں رہتی، انسان ان پہ تکیہ کر کے صحت مندانہ زندگی بسر کر سکتا ہے وہ بھی ایسی کہ کبھی کوئی قابلِ ذکر عارضہ اِس کے قریب نہ پھٹکے۔''

دودھ، شہد اور پیاز لہسن کی کرشماتی افادیت سے، اہلِ فارس، بابلی، یونانی اور خاص طور پہ مصری خوب واقف تھے۔ اُن کے دیوتاؤں نے صدیوں پہلے اِن غذاؤں کی کیمیائی اور شفائی طاقتیں آشکار کر دی تھیں۔ اِن کے حکمت شناسیوں، اطبا اور تحقیق دانوں نے اپنے عصری تقاضوں کے تحت اِن جادوئی اثر غذاؤں دواؤں پہ مزید تحقیقات جاری رکھیں۔ اِن پہ حیرت کے نئے نئے جہان روشن ہو گئے۔ یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اِن کے صحیح بروقت استعمال سے حیرت انگیز نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ جسمانی، نفسیاتی، روحانی اور زندگی کے دیگر فعال وظائف میں اِن کا استعمال ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ارتقا پذیر معاشرہ، مملکت ومقننہ، صحت مند امراؤ وافراد سے ہی تشکیل وتکمیل پا سکتا ہے۔ اِس پہ مستزاد، وہ اِس راز سے بھی واقف ہو گئے کہ قوموں اور سلطنتوں کی تقدیریں محض افراد ونفوس یا سپاہ وجاہ سے ہی رقم نہیں ہوتیں۔ وُسعت وسائل، تہذیب وثقافت، تمدن وتعمیر کی سربلندیاں، ہنر وفن کی جدتیں نئے رُخ وزاویے بھی اُنہیں حال ومستقبل میں استحکام فراہم کرنے میں مُمد ثابت ہوتے ہیں چنانچہ اُنہوں نے اِن چار چیزوں سے بھی خوب استفادہ حاصل کیا۔

دودھ کا مختلف حالتوں میں استعمال، غذا، دوا، افزائشِ حُسن، افزودگیٔ بصارت، تابندگیٔ دنداں، ناخون، بال، ہونٹوں کے مختلف امراض کے لئے بھی یہ خوب ٹھہرا۔ گائیوں، بھینسوں، بکریوں، اونٹنیوں، گدھیوں، گھوڑیوں حتیٰ کہ عورتوں اور کُتیوں کا دودھ بھی اپنی اپنی تاثیر وتصرف میں تریاق بھی۔ عذرا، شیبا، بوبیا، قلوپطرہ، فریدہ، صوفیہ، فرح، نور جہان کی کمیس بدنی، شعلہ بدامی اور حُسن جہاں سُوز کا ایک نمایاں راز دُودھ، شہد لہسن، پیاز سے استفادہ بھی رہا۔''

کرۂ ارض کی بعض چیدہ چیدہ تعمیرات کے بارے کہا جاتا ہے یہ انسانوں کا نہیں جنّات کا کام تھا جبکہ

حقیقت یہ ہے کہ ماسوا چند ایک، بقیہ تمام انسانی وسائل اور ہنر مند ہاتھوں سے ہی معرضِ وجود میں آئیں۔ چاہِ بابل، نینوا کے معلق باغات، ایتھنز کے محلات اور اکھاڑے، اجنتا، الورا کے غار، اہرامِ مصر، برازیل کے مجسّمے اور ہیکل...... ہردوار، متھرا، بنارس، کاشی کے بڑے بڑے قدیمی مندر، دُنیا کے سمندروں کے بیچ اور کناروں، اُونچے پہاڑوں پہ صدیوں سے ایستادہ، روشنی کے مینار، سیارگاہیں، بُدھوں کے استوپے، مجسّمے...... استنبول کی چند مساجد، تاج محل، برِصغیر کے اکثر قلعے، مقابر اور مسجدوں باؤلیوں کے تعمیراتی مسالے میں چونا، پسا ہوا پتھر، ہینگ، گوند، دال ماش، آگ پکی سرخ اینٹوں کی کیری، ملتانی مٹی، نوشادر، لوبان کافور، جانوروں کی پسی ہوئی ہڈیاں، پٹ سن، سوت، مغز لسوڑا، کچا کوئلہ، دھان کی بُھوسی، ابرق سیاہ و سفید، رَسوت سبز، اسپغول کا بُرادہ وغیرہ جگہ مقام کی طبقاتی، جغرافیائی اور موسمیاتی ضرورت کے تحت استعمال میں لائے جاتے تھے۔''

ریگستانوں، پہاڑوں، سمندروں اور میدانوں جنگلوں میں ہمیں اَزمنہ قدیم کی جو بھی تعمیرات خاص طور قلعے، مینار بُرج فصیلیں، عبادت گاہیں اور محلات وغیرہ، جو چیز سب سے پہلے ہماری توجہ کھینچتی ہے وہ اُن کا پُراسرار محلِ وقوع اور طرزِ تعمیر ہوتی ہے۔ اب اِن کے سنگ و خشت پہ جو نظر پڑتی ہے تو وہ بھی ہمیں حیران کر دیتے ہیں کہ صدیوں کی اَرضی تبدیلیوں، امتدادِ زمانہ اور موسموں کی چیرہ دستیوں سے کافی حد تک محفوظ ہیں۔ پتھر سے پتھر، اینٹ سے اینٹ اور تروڑے سے تروڑا یوں باہم پیوست و پابند ہیں کہ یک جان دکھائی دیتے ہیں۔ یک جائی میں، مابین خلا نہیں ہوتا۔ انسانوں میں اخلاق اور اخلاص ہی ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو جوڑے رکھتا ہے اور اگر ذرا دم اور نم پیدا ہو جائے تو زندگی کی چھوٹی موٹی آزمائشیں کچھ بگاڑ پیدا نہیں کرتیں۔ اینٹ، پتھر، چوب دھات کی تعمیرات بھی اگر اپنے صحیح مسالے سے باہم جوڑی جائیں تو وہ ایسی پائیدار ہوتی ہیں کہ اِک طویل عرصہ تک اپنی ساخت، حیثیت برقرار رکھتی ہیں۔ اب کچھ ایسی نادر بے مثل تعمیرات بھی زمین کے سینے پہ اُبھاری جاتی ہیں جنہیں صدیوں تک محفوظ رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ ایسی تعمیرات میں قلعے، پُل، مینار، باولیاں، عبادت گاہیں اور قصر و ایوان ہوتے ہیں۔ کچھ مقابر، مزارات اور یادگار قسم کی عمارتیں اور مجسّمے بھی جو قومی یا مذہبی افتخار و اظہار کے حامل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِن کا تعمیراتی سامان بھی ان خصوصیات کے پیشِ نظر ہی منتخب کیا جاتا ہے۔''

مَیں نہ تو تاریخ داں ہوں اور نہ ماہرِ آثارِ قدیمہ۔ کھنڈرات اور پرانی عمارتوں کے رگ و ریشہ اور بلدی مسالہ کا تجزیہ کرنا میرا مشغلہ ہے۔ ''کوئی ہم کو مل گیا تھا سرِ راہ چلتے چلتے والی بات کہ خواہ مخواہ ہی کوئی نئی اُلجھن میرے گلے پڑ جاتی ہے جس کی تہہ تک پہنچے بِن مجھے چین نہیں پڑتا۔ بس مَیں ہلکا سا تردد کرتا ہوں، اُس کو چھیڑتا ہوں' گدگداتا ہوں تب اِس کی مستور حقیقت میرے سامنے آ جاتی ہے۔ شہد، دودھ، لہسن پیاز کی بابت

پہلے تو میں یہی جانتا تھا کہ یہ باورچی خانہ اور دوا خانہ کے متعلق مفردات ہیں جو کھانے پینے کے کام آتے ہیں مگر پچھلی دو صدیوں کے درمیان ماہرین مصریات کی تحقیقاتی انکشافات نے چونکا دیا کہ فراعین مصر کے مقبروں سے شہد بھی محفوظ اور قابل استعمال حالت میں دستیاب ہوا ہے۔ مزید انکشاف ہوا کہ شہد مصری خاص و عام کے روزمرہ کے استعمال کی چیز تھی۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پہ شہد کی موجودگی اُن کی پہلی ضرورت تھی۔ روزمرہ کی خوراک کے علاوہ شہد آمیز مشروب پیاس کی شدت اور سورج کی تمازت سے محفوظ رہنے کے لئے پیا جاتا۔ سفید پیاز کے عرق کی مالش سے کمزور جسم کو توانائی بحال کی جاتی، بالوں کو نکھار دیا جاتا...... دودھ شہد لہسن کا استعمال، افزائشِ حسن کے لئے ہوتا۔ قلوپطرہ سیکڑوں گدھیوں کے تازہ دودھ سے روزانہ غسل کرتی تھی۔ غروب آفتاب سے پہلے شہد بھرے مٹکے میں گردن تک اُتر جاتی...... بالوں، بھنووں، مژگاں کو شہد سے تر رکھتی۔ یہ بھی ثابت ہوا اہرام اور دیگر مقابر کی تعمیر میں حصہ لینے والے مزدوروں ہنرمندوں کی توانائی، برداشت قوتِ متخیلہ میں افزودگی پیدا کرنے کے لئے پیاز اور لہسن، بطورِ خاص ان کی غذا کا حصہ بنا دیا جاتا۔ مصری شہنشاہوں اور اُمراء کی ممیوں کو محفوظ تر بنانے کے عمل میں بھی شہد، لہسن اور پیاز استعمال کیا جاتا تھا کہ ظاہری و مخفی جراثیم، کیڑوں مکوڑوں، سُنڈیوں، حشرات الارض، وقت زمانہ سے پیدا ہونے والی بوسید گی پھپھوندی عفونت سے محفوظ رکھنے میں ممد تھے۔''

کہیں دیر بعد ایک اور انکشاف سامنے آیا کہ یہ تینوں کیمیائی سریع الاثر اشیاء ماضی کے مختلف اُدوار میں پُراسرار تخصیات اور مخصوص تعمیرات میں بھی استعمال ہوئیں جو سمندروں، پہاڑوں، غاروں اور ایسے مقامات پہ جو تند تیز موسموں کی زد میں رہتے، بنائی مقصود تھیں۔ تبت لہاسہ، ہندوستان، مصر، پاکستان، ترکی، افغانستان، ایران، ترکمانستان میں صدیوں پرانی عمارات، مسجدوں، مندروں اور یادگار میناروں بُرجوں میں استقامت، تحمل و برداشت پیدا کرنے کے لئے انہیں کام میں لایا گیا۔

سندھ میں راجہ داہر کے دور کے مندر، شوالوں کے علاوہ ملتان، بہاولپور، موہنجو داڑو، بلوچستان، سیہون شریف کی پہاڑیوں اور چشموں کے آس پاس...... ٹیکسلا، ہڑپہ، منگلا، ہرن مینار، لاہور میں شاہی قلعہ، راوی کی بارہ دری، چوبرجی، مغل دور کے مزارات اور حویلیاں دروازے، رہتاس کا قلعہ، مکلی کوٹ کے قبرستانوں میں چند قبور و مزارات اور دیگر مقامات پہ ایسی تعمیرات دکھائی دیتی ہیں جن کے تعمیراتی مسالے میں ان تین اجزاء کو بالا اہتمام شامل کیا گیا۔ بخارا، سمرنا، بابل، بغداد، دمشق، ماسکو اور چین میں چند ایک ایسے نادر الوجود مجسمے، مساجد، سیارگاہیں اور مختلف غیر معمولی تعمیرات دیکھیں جو صدیوں پرانی ہونے کے باوجود آج بھی قائم و دائم...... انسانوں اور زمانوں کی دستبرد سے محفوظ...... لگتا ہے انہیں بھی جنوں نے کسی جناتی

مسالے، سنگ وخشت سے تعمیر کیا ہوگا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ انہیں انسانوں نے ہی بنایا۔"
لدے وقتوں میں انسان نے ارضی افلاکی علوم، طبیعات، مابعدالطبیعات مادہ، عنصر، تجسیم، جدول معدن و نباتات، پختت وپز، تعمیر و تجسیم میں کمال درک حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے اپنے کمال ہنر و فن کو اپنے سے آگے منتقل کرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی اتنی مختصر ہے کہ اس میں دُنیائے علم و دانش اور جہانِ کسب و کمال کی حدا میں کھینچی نہیں جا سکتیں۔ آنے والے وقتوں میں بھی ایسے نابغۂ روزگار پیدا ہوں گے جو اپنی اپنی بساط کے مطابق مزید تحقیقات کریں گے۔ سینہ بہ سینہ علوم آگے منتقل کیے تو جا سکتے ہیں مگر ان کی اصل صُورت و ہیئت میں فرق آ جاتا ہے۔ کتب و قرطاس کے ذرائع بھی کچھ ایسے دیرپا ثابت نہیں ہوتے البتہ تعمیرات سے کچھ مقصد حل ہو سکتا تھا۔
اس کرۂ ارض پہ ایسی بہت جگہیں محفوظ ہیں جن میں علمیت و حکمت کے بہت سے خزانے پنہاں ہیں۔ انہیں سنگ وخشت سے تشکیل دیا گیا۔ دُنیا کی زبانوں میں قدیم مصری زبان اور رسم الخط، پراسرار اور پُرمعنی تو تھا ہی مگر دیکھنے پڑھنے میں بھی یہ دلچسپ نوعیت کا حامل تھا۔ قدیم زبانیں عجیب صوری، صوتی قسم کی تشبیہیں لیے ہوئے تھیں۔ جس میں جا بجا انسانوں، جانوروں، پرندوں، روزمرہ کے استعمال کی اشیا، کی گرنے ٹوٹنے کی آوازیں، انسانی حرکات و سکنات اور رویوں کے اظہار کے کنایے، اشارے شامل ہوتے۔ جنہیں عام طور پہ سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ وقت نہ ہوتی۔ آج تک دریافت ہونے والے آثارِ قدیمہ بشمول الواح، معبد، مساجد و مقابر جو دیکھنے کو ملتے ہیں تحقیقاتی عمل سے ظاہر ہوا کہ ان کی تہذیب و تزئین میں شہد اور کئی ایک میں دیگر اجزاء کے علاوہ لہسن پیاز کا آمیزہ اور کہیں کہیں بید مجنوں کے ریشے، کوئلہ، تانبہ کا بُرادہ، چُونا، چکنا پتھر بھی بُنیاد بٹھانے اور جوڑ جمانے کے لئے استعمال کیے گئے۔"
عربوں سے پہلے ایرانی اور یونانی بھی چُونا چاک چاندی چکنے پتھر، چقندر کی جڑوں اور چام کے آب تُوک سے تعمیراتی مسالہ اور پلستر و استر کے لئے گلِ سدّ بالا بنانے کے فن سے واقف تھے۔ حکیم نخشب نے، چاہِ نخشب اور طلسماتی چاند کو بنانے اور اُن میں جھلکتی غیر معمول تاثر و تمکنت پیدا کرنے کے لئے ان اجزاء کے علاوہ اَبرق سیاہ و سفید، سنگِ چقماق اور سمندری سیپوں کے بُرادے اور محلول سے استفادہ حاصل کیا تھا۔"
قدیم فارس کے عبادت خانے، آتش کدہ اور روشنی کے طاقوں کے کندے، پارسیوں کے مُردہ رکھنے کے مینار، بابل کے معلق باغات، جن کو منزل بہ منزل بلندیوں پہ بنایا گیا اور جنہیں شجر بار اور ثمر بار کرنے کے لئے پانی کے فوارے اور جھرنے کچھ اس انداز سے تعمیر کئے گئے کہ عقل کو پسینہ آ جائے؟ انہیں اس طرح معرضِ وُجود میں لانے کے لئے اس وقت کی اعلیٰ ترین حکمت سے استفادہ حاصل کیا گیا وہیں انہیں مستقبل میں

استحکام دینے کے لئے مندرجہ بالا مسالے بھی استعمال ہوئے۔ تاریخی شواہد کچھ زیادہ تو نہیں بتاتے مگر دیگر انسانی اور غیر انسانی وسائل، اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ دیوارِ چین، دیوارِ گریہ، خومِ داؤد، تابوت سکینہ، تختِ فیروز، کاخِ جمشید، تابوت یوسف، اہرامِ مصر، ہندوستان، ترکی، برازیل کا مجسمۂ مسیح کی تنصیبات وتعمیرات میں اس طرح کے غیر معمولی مسالے بھی استعمال میں لائے گئے۔"

اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ نے کچھ انسانوں میں غیر معمولی حِس لامسہ اور شامہ پیدا فرمائیں۔ اس کی ایک مثال اپنے ہاں دیہاتوں، قصبوں کے پیشہ ور کھوجیوں اور سونگھوں کی ہے۔ یہ سادے مرادے، اَن پڑھ دیہاتی لوگ، سُونگھنے محسوس کرنے اور مشاہدے کی بڑی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ کچھ اور ایسے ہی علیحدہ سے نابغۂ روزگار لوگ جن کے ہاں اس قسم کی اہلیت کے علاوہ کچھ اور وسائل وذرائع بھی...... مثلاً روحانی، وجدانی، القائی، رویائی کیفیات...... غیر انسانی، غیر مرئی مخلوقات، جنات، موکلات، نوری نفوس، دُنیا سے پردہ لیئے ہوئے اولیاء، مجذوبین وسالکین بھی ایسی استعانتیں مشیتِ الٰہی سے عطا کردیتے ہیں۔

دُنیا بھر میں اَنگنت ایسی عمارتیں، مقابر ومساجد، مدرسے، مکتب، کنویں، باؤلیاں، مینارے، لاہور دہلی، ملتان، فلسطین، بصرہ، دمشق میں بھی چند ایک ایسے مقامات ہنوز موجود ہیں جو انسانوں نے نہیں بنائے۔ جنہوں نے بنائے اُنہوں نے اپنے پسندیدہ ومنتخب انسانوں کو بھی یہ علم اور فن وہنر سکھایا اور پھر اُن سے بھی کام لیا۔ انسان کی اپنی تحلیل نفسی کی قوت بھی بڑے معجزے دکھا سکتی ہے مگر ہر کسی کے بس میں کہاں؟

مَیں ایسے چند ایک پاکیزہ نفس انسانوں سے واقف ہوں جو تلمیذ الجنات ہیں۔ اُن کا بیشتر کام جنات اور رجال غیب کے ذرائع سے سرانجام پاتا ہے۔ مَیں سب سے پہلے اپنے بچپن میں اپنے والد صاحب کے بزرگ اور دوست حافظ باؤ ترین (یہ میرا دیا ہوا نام تھا) جو میرے بھی دوست اور بزرگ تھے جبکہ مَیں اُن کی روحانیت سے کہیں زیادہ اُنہیں کھانے پینے کے لالچ کے لئے استعمال کرتا تھا۔ جنات رجل غیب اور اُن کی مافوق الانسان قوتوں اور استعانتوں سے واقف ہوا تھا۔ جنات کے تیار کیے ہوئے کھانے، شربت، دودھ وغیرہ کھائے چکھے تھے۔ نوری ہیولوں، غیبی رجال کی آمدورفت اور گفت کو محسوس کیا اور بھی غیر معمولی باتیں جو مجھے اُن کی مصاحبت میں نصیب ہوئیں۔ پیدائشی نابینا ہونے کے باوجود، وہ آنکھوں والوں سے کہیں بہتر دیکھتے تھے۔

سلطان باہوؒ نے جو فرمایا تھا...... کہ "میرے تن وچ سو سو اکھیاں، اک کھولاں اک کجاں ہُو" والی بات تھی۔ دہلی مہرولی والے صوفی صاحب مادر پدر نابینا تھے مگر وقت کے ولی کامل...... اُن کا رُوں رُوں چشماں تھا۔ اُن دونوں بزرگوں میں چند قدریں مشترک بھی تھیں۔ ایک قدر، شہد اور دوسری مقشر لہسن......

معلوم ہوا کہ اللہ پاک کی یہ نعمتیں تعمیرات سنگ وخشت میں ہی نہیں تکمیل ذات واوقات اور شخصیت وروحیت

میں بھی استعمال کی گئیں اور خاص طور پہ اُن مخصوص ہستیوں پہ ان کے خواص و درجات کھولے گئے جن سے کوئی اہم کام لینا اور درجات ارفع کرنے مقصود تھے۔ اوّل ازیں ذوات قدسیہ، دوئم بریں رجال مخصوص، سوئم تریں جنّات معتوبہ......"

اَرض پہ پہلا خدا کا گھر تعمیر کرنا مقصود ٹھہرا۔ اس کے لئے ایک خاص خواص و خصائل کا قطعہ اَرض تجویز تھا۔ وادیٔ مکہ کی بھربھری ریگ اور پتھریلی سرزمین پہ ایسے عظیم ذرو دیوار اٹھانا کچھ آسان نہ تھا کہ جن پہ قرنوں کا بوجھ دھرنا مقصود ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ بیت اللہ اور بیت القدس، اَرض کے سینے پہ اُن چند عظیم النظیر سنگ وخشت کی تعمیرات میں سے تھیں جو ملائک، بشر اور جنات کی باہمی خدمات سے معرضِ وجود میں آئیں۔ جب تعمیرات میں دھاتیں شامل نہ ہوتی تھیں۔ پتھر جمانے جوڑنے کاٹنے کے لئے لوہے کے آلات کا استعمال بھی نہیں ہونے کے برابر تھا...... انسان نے لوہے سے تعمیراتی کام لینا بہت بعد میں سیکھا۔ سنگی سلوں اور چوبی تختوں کو باہم مربوط کرنے کے لئے پرانے وقتوں میں مختلف نوع کے مسالے ایجاد ہوئے جو ضرورت، موسمی اور جغرافیائی لحاظ سے مختلف ہوتے۔ تاہم اُن میں مشترک اشیاء جیسے نرم پتھر کا برادہ، سفید پتھر از قسم چونا، چکنی مٹی اور شہد، شیر گوندیں شامل ہوتیں۔ گوندیں، شیر اختلف نباتات، پودوں، درختوں کے چپک رس سے بنائے جاتے۔ شہد کے کچے موم کے چھتے اور اناجوں کی بھوسی۔ قدرت کی ان نعمتوں کو اگر گہری نظروں سے دیکھا جانچا جائے تو ان کے اندر چھپی ہوئی افادیت کو محسوس کر کے انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ اللہ نے بظاہر معمولی دکھائی دینے والی چیزوں میں بنی نوع آدم کے لئے کیسی کیسی مختلف سودمند حکمتیں چھپا رکھی ہیں۔"

مَیں نے دُنیا کی مختلف جگہوں پہ ایسی تعمیرات دیکھیں جو ہزاروں برس پہلے تعمیر ہوئیں اور آج تک اس حالت میں ہیں کہ اُن کے خدوخال پہچانے جا سکیں۔ کئی ایک اپنے درو دیواروں پہ کھڑی ہیں...... اُن کے چھت فرش قائم ہیں...... اینٹ سے اینٹ اور پتھر سے پتھر جڑا ہوا کہیں درمیان میں ہلکی سی دراڑ تک نمودار نہ ہوئی...... لکڑی کا کام اپنی جگہ قائم...... نہ لوہے کی کوئی میخ ملی...... لکڑی لکڑی سے ایسی جڑی بنی دیکھی کہ شاید کبھی علیحدہ نہ ہو...... یہی حال پتھروں اینٹوں کا پتھر کو چونک لگ گئی...... بھربھرا ہو گیا مگر جوڑ بھرت روزِ اوّل کی مانند قائم۔ کھرچنے سے پتھر تو کھر جائے لیکن جڑت کا مسالہ ٹس سے مس نہ ہو۔ یونان، فلسطین، برازیل، مصر، ہندوستان، کراچی اور سندھ میں کئی ایک مسجدیں، مندر، یادگاریں، قبریں، محلات، مزار اکھاڑے، سیارگاہیں، موہنجوڈارو، ٹیکسلا، ہڑپہ، افغانستان، ایران اور پنجاب میں بہت سے ایسے مقامات موجود ہیں جن کے پتھر تو بھربھرے ہوتے ہوئے ملیں گے مگر جوڑ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔

## ایشور کی مایا......!

ہری دوار میں، میری ملاقات ایک ایسے مورتی ساز سے ہوئی جو نین نقش، انگ سنگ سے بالکل کرشن گوپالہ لگتا تھا۔ ہری دوار سے کچھ دور ایک پسماندہ سے گاؤں میں اُس کی سکونت تھی۔ چھوٹا سا گھر اور گھر ہی کے ایک حصے میں اُس نے شولنگ کی بڑی سی مورتی بنا رکھی تھی۔ پاس ہی بیٹھا، کرشن، گنیش، ہنومان، ناگ دیوتا، گاؤ ماتا، سیتا، رام چندر اور دیگر دیویوں دیوتاؤں کی مُورتیاں بناتا رہتا۔ اس سے ملاقات یوں ہوئی کہ مَیں ہری دوار میں اپنی آوارگی کے دوران، نوادرات کی ایک پرانی دکان میں گھس گیا۔ وہاں مَیں نے شیشے کے بکس میں ایک عجیب وغریب مُورتی دھری دیکھی جو بقول دکاندار، سیکڑوں سال پرانی ہے۔ شولنگ دیوتا نے اپنی پوجا کرنے والے ایک چپکاری کو خوش ہو کر اپنی ایک انوکھی سی مورتی بنانے کی آ گیا دی...... یہ چپکاری چونکہ بہت غریب تھا۔ بس اس مورتی کو بنانے کی دیر تھی کہ اس کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔ شولنگ کے دیوانے پجاری اس کے دوالے ہو گئے۔ اس مورتی کی سب سے بڑی خوبی، اس کا ڈیزائن وآئیڈیا تھا۔ اس صُورت وسائز کی مُورتی دُنیا کے کسی اور مندر میں موجود نہ تھی۔ اس کی ایک اور نئی خوبی، اس کا میٹریل تھا جو نہ کوئی دھات تھا نہ لکڑی، مٹی یا پتھر...... وہ کوئی مختلف اشیاء ملا کر ایک ایسا مسالہ تیار کرتا جس میں مضبوط دھات، پائیدار لکڑی اور انتہائی سخت پتھر کی سی ساری خوبیاں جمع ہو جاتیں۔ کمال یہ کہ اس مسالے سے تیار کردہ مورتی، انتہائی وزنی، ٹوٹنے تڑخنے سے محفوظ، سنگِ خارا کی مانند چمکدار، مضبوط اور سیاہ رنگ ہوتی۔ معمولی صفائی پونچھائی سے ہیرے کی مانند ڈلکیں مارنے لگتی۔ بظاہر یمن اور ایران کے بیش قیمت سیاہ پتھر سے تراشی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ رگ نہ ریشہ، گانٹھ نہ جڑ۔ سو طرح سے پرکھو کالا پتھر ہی جاپ پڑتی۔؟

ہندوؤں کا سب سے بڑا تیرتھ ہری دوار جدھر لاکھوں کی تعداد میں ہر سال یاتری اپنے پاپ دھونے آتے ہیں اور لوٹتے سمے مُورتیاں، سنکھیاں گھنٹیاں، مالائیں، سیندور، کھڑاویں، دھوتیاں، چوٗلے، اگربتیاں اور دیگر پُوجا پاٹ کا سامان خرید کر لے جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر خریداری مُورتیوں، گھنٹیوں، آرتی اُتارنے کی تھالیاں، چندن، سیندور، کانسی کے دیوتاؤں اور دیویوں کی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے ان میں زیادہ تر نقلی اشیاء ہوتی ہیں جنہیں یہاں کے گھاگ دکاندار بڑی چرب زبانی اور ہوشیاری سے بیچتے ہیں۔ چونکہ مَیں ان کا بھی اُستاد ہوں اس لئے اِن کے ہتھکنڈوں سے بچا رہتا ہوں۔ خریدوں یا نہ خریدوں لیکن ہر اک پھیپہ دکان پہ پھیرا ضرور ڈالتا ہوں کہ مجھے "ونڈو شاپنگ" کا شوق ہے۔ اس طرح کی شاپنگ کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ

خریداری کا شوق جنون بھی پورا ہو جاتا ہے اور کیسہ بٹوہ بھی ڈھیلا نہیں ہوتا۔؟''

بوڑھا ہندو لالہ، مورتی میں میری دلچسپی دیکھ کر جب اپنی کتھا پوری کر چکا تو کمال کاروباری انداز سے جل پان کا پوچھنے لگا۔ ظاہر ہے میں اس کی مورتی کے متعلق نجوتی پچی سٹوری سن کر کچھ نہ کچھ متاثر بھی ہوا تھا گو میں انڈین، مصری، افغانی، ایرانی، ترکی، پاکستانی، ہسپانوی اور اطالوی دکانداروں کے کاروباری فراڈوں سے اچھی طرح واقف تھا اس کے باوجود میں اس نادر مورتی، پچی نجوتی خوبیوں سے اک گونا گوں سی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اُس بوڑھے لالہ نے مجھے لیمو جل کا گلاس پیش کرتے ہوئے بتایا۔

''یہ نایاب نادر مورتی فروخت کرنے کے لئے نہیں، یہاں صرف دکان کی شوبھا بڑھانے کی خاطر رکھی ہے۔ اسے دیکھنے بڑے مہان لوگ یہاں آتے ہیں ...... پورے ہری دوار میں صرف ہمارے پاس ہی ہے ...... ہزاروں روپے دینے کو تیار ہیں مگر ہم اس کو دینے کو تیار نہیں۔''

میں جانتا تھا دکاندار ایسی باتیں، گاہک کے دل میں اپنے مال کی لگن پیدا کرنے، اُس کے شوقِ طلب کو ہوا دے کر اچھے سے اچھے دام کھرے کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ میں نے ایسے ہی وقت پاس کرنے اور اس کی باتوں کی سچائی دیکھنے کی خاطر، مورتی دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُس نے کمال احتیاط سے مورتی نکال کر میرے سامنے دھر دی۔ مورتی کی انوکھی چھب اور خوبصورتی نے مجھے ایسے پکڑ لیا جیسے میں خام لوہا اور وہ خالص مقناطیس ہو۔ کالے شفاف پتھر سے تراشا ہوا ایک ایسا شہکار، جس پہ سے نظر نہ ہٹے۔ میں نے دیکھا کہ اس نے دانستہ ہاتھ کی حرکت سے مورتی کونٹر پر سے نیچے پھینک دی، نیچے گرینائٹ کا پکا فرش۔ ٹن سی آواز سے میں دہل کر رہ گیا ...... چاہیے تو یہ تھا مورتی تین ٹکڑے ہو جاتی پر ایسا نہ ہوا۔ دکاندار نے ہاتھ بڑھا کر مورتی اُٹھائی دوبارہ کونٹر پہ رکھ دی۔ مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کے وچار کے مطابق، اسے ٹوٹ جانا چاہیے تھا پر یہ نہ ٹوٹی، اس لئے کہ یہ مٹی، کانچ یا پتھر نہیں۔ کانسی، پیتل اور رانگ بھی نہیں ...... بنانے والے کاریگر کا یہی کمال ہے جو اُسے شیو جی مہاراج نے سکھایا۔ اس قسم کی مختلف اٹھارہ یا بیس مورتیاں بنائی ہوں گی کہ اس نے اچانک یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اُس کی بنائی ہوئی مورتیوں میں بمشکل دو مورتیاں منہ مانگے داموں حاصل کر پایا۔ ایک مورتی، امریکہ کا ایک سائنس دان لے گیا۔ دوسری یہ پڑی ہے جسے فروخت کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں جبکہ اس کے لئے مجھے ہزاروں روپوں کی آفر مل چکی ہے۔''

میں نے اچانک مورتی کو ہاتھوں میں لے لیا۔ کچھ دیر اُلٹ پلٹ دیکھتا رہا ...... دل ہی دل میں اس کے فنکار کو داد دی۔ ساتھ ساتھ اس کے میٹریل پہ غور کرتا رہا کہ یہ کن کن مسالوں کا مرکب ہو سکتا ہے۔ میرے

ایک سوال کے جواب میں بتانے لگا۔

''اس مورتی کو بنانے والا شودھر جنم سے ہی شومہاراج کا سروپ تھا۔ سانولا رنگ 'صورت سریہ پہ سُندرتا کی مُدھرا...... ماتا اسے جنم دے کر پرلوک سدھار گئی۔ جیسے اسے سنسار میں اُتارنے کے لئے آئی تھی۔ باپو بے چارہ غریب سا اَن پڑھ کسان تھا، اُس نے اِسے منحوس جان کر ایک بالک آشرم میں پھینک دیا۔ اس کا دیوتاؤں سامنہ ماتھا دیکھ کر آشرم مندر کے مہنت نے گود لے لیا۔ پرورش کے ساتھ ساتھ، اسے دھیان گیان اور مورتیاں بنانے کی تربیت بھی شروع کر دی۔ سال آگے بڑھا' وہ بے ہوئے انگ ڈھنگ نمایاں ہوئے۔'' دیوتاؤں سی سُندرتا نے جادو جگنے شروع کیے۔ کنول کُورا سی آنکھوں نے مدھرا چھالنی شروع کر دی تھی...... سریر سے ایسی انگھست خوشبو پھوٹی تھی کہ جو اس کے قریب سے گزرتا اِسے مڑ کر دیکھنے پہ مجبور ہو جاتا۔ گاؤں کی اکثر نادان الہڑ جوان چھوکریاں، اِس کے دوالے چکر لگاتی رہتیں۔ شیرا ایک رہا ہو تو کھیاں بھڑیں تو آتی ہی ہیں۔ شیونگ کا پجاری بھی تھا۔ شیونگ کی مورتی کی پوجا کرنے اکثر ناریاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ بس کیا تھا کہ اس کے پریم رس کے دیپک پر اُوڑ جلنے بجھنے شروع ہو گئے اس کے گرو نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اس کو شونگ کی پوجا پاٹ سے ہٹا کر مورتیاں بنانے کے کام پر لگا دیا۔ اس کام میں ایسا دھیان لگا کہ وہ سب کچھ تیاگ کر شومہاراج کی مورتیاں بنانے جٹ گیا۔

ایک بار اُس کے ہاتھ سے ایک مورتی گر کر چکنا چور ہو گئی۔ کئی دن راتوں کی محنت پل بھر میں بیکار ہو گئی۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ بہت دنوں تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیکار بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ کوئی طریقہ پتھر یا مسالہ ہو جس سے مورتی میں ایسی مضبوطی آ جائے کہ وہ نہ تو ٹوٹے اور نہ آتی جاتی رُتوں کا اس پہ کوئی اثر ہو۔ پہلے تو وہ کوئی ایسا پتھر تلاش کرتا رہا جو نمی، گرمی، سردی، ہوا کے اثرات قبول نہ کرے۔ اب یوں ہوا کہ اُس نے پتھروں سے مورتی گھڑنے کے اچھے اچھے کاریگروں سے مزید سیکھنا شروع کر دیا کہ شاید کوئی گُر ایسا ہاتھ آ جائے جو اُسے منزل تک لے جائے۔ مگر کہیں سے بھی گوہر مراد ہاتھ نہ لگا۔ بد دل سا ہو کر گاؤں چھوڑ دیا۔ مختلف تیرتھوں کی یاترا کے دوران، اُس نے پرانے زمانے کی مورتیوں، بُتوں، کلسوں، مندروں کو اپنے انداز سے دیکھا پرکھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مٹی کاٹھ، پتھر، لوہے سے بنائی ہوئی ہر چیز کی ایک عمر ہے اُس کے بعد اُنت شروع ہو جاتا ہے۔

دورانِ سفر اتفاقاً اس کی ملاقات ایک ایسے کاریگر سے ہوئی جو دھاتیں پگھلانے والی مختلف کٹھالیاں بنانے کے فن سے وابستہ تھا۔ عبدالکریم صرف چھوٹی کٹھالیاں بناتا تھا جو سونا چاندی، تانبا پیتل گلانے کے کام آتیں۔ اس سے ملاقات بھی اتفاقاً ہوئی۔ وہ دریا کنارے ایک ویران سے میدان سے گزر رہا تھا۔ یہیں اُسے

ٹوٹی پھوٹی کٹھالیوں کا ملبہ پڑا دکھائی دیا۔ مختلف طرح کی ٹوٹی پھوٹی کٹھالیاں جو کسی فونڈری والوں نے ادھر پھینک دی تھیں۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُٹھا کر اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہیں اُس کے دماغ میں اِک کوندا سا لپکا کہ مختلف اجزاء کے مرکب سے کوئی ایسا مسالہ بنایا جا سکتا ہے جو پتھر، لوہا، بلور کی ملی جلی طاقت اور خاصیت رکھتا ہو۔ اُس نے اپنی جستجو جاری رکھی، بالآخر اسے ایک ایسا شخص مل گیا جو ہتھیاروں، تلوار، خنجروں اور بوڑھے لوگوں کی واکنگ سٹک کے دستے بناتا تھا۔ وہ اس کی تیاری میں مختلف اجزاء سے ایک گاڑھا محلول تیار کرتا جسے گرم کر کے سانچے میں بھر کر اپنا مطلوبہ ڈیزائن بناتا۔ پھر مختلف مراحل سے گزار کر اسے بھٹی میں آگ دکھاتا۔ پالش کر کے اُس میں نگینے، قیمتی پتھر جڑتا۔ کمال یہ کہ دستہ یوں دکھائی پڑتا جیسے بارہ سنگھے، ہاتھی دانت، گینڈے کے سینگ سے تیار ہُوا ہے۔ ٹوٹنے تڑخنے، سکڑنے سے محفوظ۔ رنگ بھی جو چاہو دے لو۔ اُس نے کوشش کر کے اس نادر فنکار کی قربت حاصل کر لی۔ مگر یہ انتہائی خسیس کمینہ ثابت ہُوا۔ کام تیاری کے ہر مرحلے پہ اسے ساتھ رکھتا لیکن اصل کام یعنی مختلف اجزاء سے محلول کی تیاری کا سماں آتا تو کسی بہانہ اُدھر سے ٹہلا دیتا۔ اس نے جی چھوٹا نہ کیا، دل و جان سے اُس کی خدمت اطاعت اور کام سیکھنے میں جُتا رہا۔ اک لمبے عرصے میں وہ اب تک اس مسالے کے محض چند اجزاء ہی جان سکا۔ شیشہ ریگ اس کا جزو اعظم تھا۔ شہد کی راب، سنگاڑے کا آٹا، چکنی مٹی، مردہ جانوروں کی ہڈیوں اور سیپوں کا سفوف، سمندری جھاگ...... خشک لہسن کا آٹا۔ اب تک اُس کی نظر میں یہی سامان آیا...... باقی کا کیمیائی عمل ابھی تک پوشیدہ تھا جبکہ شیشہ ریگ کو سفوف اور طائع بنانا بھی ہنوز سمجھ سے بالا تھا۔''

کئی ماہ و سال مزید اسی تگ و دو میں بیت گئے۔ انسانی صبر و برداشت اور محنت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اس کے آگے بغاوت...... اُسے اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ اُستاد اُسے پورا کام کبھی نہیں سکھائے گا۔ اُدھورا رہنے سے بہتر ہے کوئی اور کام کیا جائے جو مکمل تو ہو۔ ایک روز موقع پا کر نکل گیا۔ کوئی منزل ٹھکانا تو تھا نہیں...... کہاں جاتا؟ بددل سا جنگل کی جانب نکل گیا۔ دُور اندر جا کر پرانے سے کھنڈرات دکھائی دیئے۔ شاید کبھی کوئی مندر یا آشرم رہا ہوگا۔ در و دیوار ٹوٹے پھوٹے...... ہر سو جھاڑ جھنکاڑ، جنگلی گھاس کے طومار، جنگلی جانوروں کے بسیرے۔ لگتا تھا ادھر ہولناک ویرانے سے ویرانے میں شاید کسی کا گزر ہوا ہو یا پھر خوف کے مارے کسی نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے ادھر کچھ دیر ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کوڑا کرکٹ، مٹی پتھر روڑا صاف کیے۔ بیٹھنے لیٹنے کی خاطر کچھ جگہ بنائی۔ پرانے پتھر، سلیں اکٹھی کر کے ایک طرف رکھ رہا تھا کہ اچانک مہاراج شیوراج کی ایک چھوٹی سی مورتی پہ نظر پڑی۔ مورتی کیا تھی ایک چھوٹے سے کھلونے کی مانند، جیسے کسی بچے نے اپنے کھیلنے کے لیے بنایا ہو۔ وہ اُسے اُلٹ پلٹ بڑی دلچسپی اور

فنی گہرائی سے دیکھنے لگا۔ اپنی بناوٹ سے شیوراج کی مُورتی تھی لیکن یہ سمجھ نہ آئی کہ یہ بنی ہوئی کس چیز کی ہے؟ لکڑی مٹی پتھر تو ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ یہ چیزیں تو اپنے منہ اپنی شناخت کرا دیتی ہیں یہ کوئی ایسا مسالہ تھا جس کا اس کے پاس کوئی حوالہ نہ تھا۔ اسی کرید مزید میں کچھ دن اور آ سرک گئے۔ اکیلی جان' گھنا سنسان جنگل...... جنگلی جانور بھی حیران کہ یہ نیا جانور کون سا ادھر آ براجمان ہوا ہے۔ اِدھر اُدھر جو بھی گوند گوگلے' بیر بھینڑے میسر ہوئے پیٹ بھر لیا۔ کچھ دنوں تک اُس نے آس پاس کی خاصی زمین صاف کر لی تھی۔ کچھ ضرورت کے تحت کھدائی بھی کی' اسی طرح چند اور شیو جی کی مُورتیاں بھی دستیاب ہوئیں جو اسی نامعلوم عجیب و غریب مسالے سے بنی ہوئی تھیں۔ جوں جوں منش کی کھوج بڑھتی ہے اُس کا جوش بھی فراواں ہوتا ہے۔ سُدھ بُدھ سے عاری اور اپنی جان پہ بھاری ہو جاتا ہے۔"

وہ دن رات کی چنتا سے بیمار پڑ گیا تھا۔ اُدھر اس کے اُستاد کو فکر لگی ہوئی تھی کہ شاگرد کہاں غائب ہو گیا اور یہ احساس بھی کہ میں نے اُسے صحیح سے کام نہیں سکھایا اور وہ بددل ہو کر کہیں منہ کر بیٹھا ہے۔ وہ اس کی کھوج میں کہیں اِدھر ویرانے کی جانب آ نکلا...... ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس تک پہنچ ہی گیا۔ اس کی یہ حالت کہ لگتا تھا جیسے صدیوں کا بیمار ہو...... چند ہی دنوں میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ خوراک کی کمی کے علاوہ اندر کی چنتا نے اسے مایوس کر دیا اور یہ لگن کہ یہ پرانی مُورتیاں کس مسالہ کی بنی ہوئی ہیں۔ پتھر بُھربُھرے ہو گئے انہیں وقت' موسموں نے کھا چاٹ لیا مگر یہ مُورتیاں ایسے ہی جیسے ابھی ابھی کسی نے بنایا تراشا ہو...... ذرا سی صفائی چکائی کے بعد لش لش کرنے لگیں۔ ابھی وہ مُورتیاں' اُستاد کے سامنے نہیں آئی تھیں۔ اُستاد نے اُسے تسلی دی کہ چلو واپس میں تمہیں خوب کام سکھاؤں گا...... مگر اُس کا شاید مَن ٹوٹ چکا تھا وہ واپس جانے کے لیے کسی طور راضی نہ ہوا اور اِدھر ہی رہنے کا عندیہ دیا۔ اُستاد نے گہری نظروں سے آس پاس دیکھا۔ کھنڈرات' اُلٹے سیدھے چھوٹے بڑے پتھر اور سلیں...... جنہیں کبھی کسی نے گھڑا تراشا ہو گا۔ وہ حیران تھا کہ ابھی تک یہ کھنڈرات اس کی نظر سے کیونکر اوجھل رہے۔ وہ اُسے کھلا پلا کر وہاں سے چلا آیا کہ وعدہ کیا کل پھر آؤں گا اور تمہارے لیے اچھا کھانا اور کچھ کپڑے بھی لیتا آؤں گا۔

سے میں گرہ بھی پڑتی ہے اور سب کچھ تلپھٹ ہو جاتا ہے اور جب مالک کا کرم ہو جائے تو بند نصیبے بھی کُھل جاتے ہیں۔

اس شیوراج کے بھگت کا نصیبہ بھی کُھل چکا تھا۔ اُسی رات' اُس کی حالت بہت پتلی ہو گئی' لگتا تھا کچھ اُس کے پران چھوٹ جائیں گے۔ ایسے میں شیو جی مہاراج پدھارے' اُس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا' تلک لگایا...... چند قطرے گنگا جل اُس کے حلق میں ٹپکائے...... آشیرواد دیتے ہوئے کہا۔

''بالک! تو میرا سچا بھگت ٹھہرا' تیری بھگتی سپھل ہوئی۔ تو ادھر میرا استھان بنا...... میری مُورتیاں تیار کر اور ہاں' تو جو اِن مُورتیوں کے مسالے کے بارے جاننا چاہتا ہے۔ یہ بدّیا' دیوتاؤں کی آشیر باد سے حاصل ہوتی ہے۔ مَیں نے یہ بُدھی اور بدّیا تجھے اَرپن کی اور ہاں' یہ تیرا اُستاد جو ہے اس کے مَن میں کپٹ ہے یہ تجھ کو کچھ نہیں سکھائے گا اور نہ ہی اس کے پاس ودھیان ہے۔ اِس سے دُور ہی رہ......!''

اگلی صبح بندر کے ایک بچے نے اُس کے ساتھ چھیڑ خانی شروع کر دی تھی۔ وہ اُسے گُدگُدا کر پرے ہٹ جاتا...... شاید وہ اُسے جگا رہا تھا' یہ بڑی سہانی صبح تھی' گھنے جنگل کے درختوں سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی کرنیں اسے بڑی بھلی لگیں...... بندر کا بچہ اُسے جگا کر کہیں جا چکا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ دن کی شروعات تو بڑی شبھ ہوئیں' آہستہ آہستہ ذہن کے دریچے کھلنے شروع ہوئے تو یکدم چونکا سا ہو گیا۔ رات والا سپنا...... شیوراج! ایک ایک بات بجلی کے قمقمے کی مانند روشن ہو گئی۔ طبیعت ایسی ہلکی جیسے کبھی بیمار نہ ہوا ہو...... کچھ اور جو سنبھلا تو مورتی بنانے والا مسالہ یاد آ گیا۔ جو اُسے سپنے میں بتایا گیا تھا۔ پڑھا لکھا تو تھا نہیں کہ وہ تمام مسالے لکھ لیتا۔ بس اتنا کیا کہ اُنھیں ذہن میں بٹھا لیا۔ کچھ اشیا ایسی جن سے شناسائی نہ تھی اور مسالے بھی ایسے جو آسانی سے حاصل ہونے والے نہ تھے۔ اِک انجانا سا خوف اعصاب پہ سوار کہ کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے۔ شیوراج کے درشن ہونے سے جیسے اِس کے بھیتر کے سارے جگ روشن ہو گئے تھے۔ وہ خود کو پہلے سے کہیں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے جی میں ٹھان لی کہ خود کو شیوراج کا سچا پکا بھگت ثابت کر کے رہے گا۔

اَب اُس کا معمول ہو گیا کہ ہر صبح شیوراج کی مُورتیوں کو سامنے رکھ کر آرتی اُتارتا' پُوجا پاٹ کرتا' پھر بیس تو اس کر اُن مسالوں کے نام یاد کرتا رہتا۔ جو اُسے شیو جی مہاراج نے سپنے میں بجھائے تھے۔ ''گیانی، دھیانی، بدّیا دانی میں سمجھ سُوجھ اور قرینہ سلیقہ ہوتا ہے...... ناپ تول، بُول بچن کچا پکّا......! ارادہ عزم زیادہ مضبوط جبکہ اُبہام گمان کم ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے سنتوں مَنتوں، پانڈوں جانڈوں اور بے بُدھیوں دھاڑیوں میں اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ ''ہوژمت'' ہوتی ہے کہ جیسے مَن چاہتا ہے کرتے ہیں اور نُسخے سُناتے ہیں۔ مَن مُکھے کا سودا زیادہ اور سِنے لگے کا بھاؤ کم لگاتے ہیں۔''

دن رات لگ کے اس نے سپنے والے داؤ بھید کسی نہ کسی ڈھنگ سمجھ لیے کہ رات شیو جی مہاراج درشن دیتے اور جو کمی بیشی ہوتی اُسی کا اُپائے کرتے دیتے اب ایک وقت یُوں بھی آیا کہ یہ ایسی ایسی مُورتیاں تیار کرنے لگا کہ دوکان تھیے پہ دھرنے کی دیر ہوتی کہ ہاتھوں ہاتھ مُنہ مانگے داموں اُٹھ جاتیں۔ دھیرے دھیرے ایسی مانگ بڑھی کہ دُور دُور سے لوگ پہنچنے لگے۔ دوسرے مُورتیاں تراشنے اور فروخت کرنے والے اپنے مال کی بے قدری دیکھ کر حسد کرنے لگے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس کی مُورتیاں بنیادی طور پہ تجی کس میٹریل

سے ہیں؟ پتھر نہ چونا مٹی...... لکڑی نہ لوہا کانسی، لکڑی نہ سیمنٹ پلاسٹر؟ بڑے بڑے پرانے تجربہ کار کاریگر، جن کی زندگیاں بُت تراشی کے پیشے میں خرچ ہو چکی تھیں...... اس گنوار کی بنائی ہوئی مُورتیاں دیکھ دیکھ اور اُن کے بُنیادی اجزائے ترکیبی سمجھنے کی کوشش میں نیم دیوانے ہو رہے تھے جو نہ گِر کر ٹوٹتیں نہ اُن کی چمک دمک ماند پڑتی...... تراشی خراشی، ایسی سُندر اور اَچھوتی، جیسے انہیں، مُنجھ کے مندے ہاتھوں نے نہیں کسی مہادیو کی مہان شکتیوں نے ایک دھرشک سروپ دیا ہو۔''

آس پاس کے مُورتی گھڑنے والوں نے، اس کی مقبولیت سے عاجز پڑ کر، اس ویران علاقہ میں اپنے کھوجی گرگے پھیلا دیے...... جو اس کی چھوٹی بڑی ہر حرکت اور مُورتی کے بُنیادی پتھر چونے، مسالے سے لے کر مکمل تیاری تک تمام کاروائی پہ نظر رکھتے...... ایسی احتیاط سے کہ اسے کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ اس کی ایک ایک لمحہ کی حرکت و سرگت پہ نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔'' اس ظاہری عقل شکن کے بودے مگر نیت اور کارکرم کے سُدھے کی کوئی ادھر فیکٹری یا ورکشاپ تو تھی نہیں اور نہ ہی کوئی خاص اوزار اور سامان وغیرہ جن کی مدد سے ایسے نادر شہکار معرضِ وجود میں لاتا...... جو دیکھتا! کہنے پر مجبور ہو جاتا کہ ایسی سُندر تجلی مُورتیاں، جو شیو مہاراج کا اصل سروپ دکھائی دیتی ہیں کا تراشنا، کسی لوہو واسنا والے مُنجھ کا کارکرم نہیں یہ تو آکاش سے اُترا مہا مہان دیوتاؤں کا کوئی چمتکار ہے......؟

اس اُدھر پڑے تھے، بھولے ناتھ، جانگلوس مُورتی گھڑ تو کی اپنی شکل، ہاتھ پیر، سر پر کچھ ایسے ننگے؟ کہ جو دیکھ لیتا وہ دوبارہ درشن کرنے کی جرأت نہ پاتا...... لگتا کہ بنانے والے نے اسے، ایسے ہی کاٹھ کباڑ سے جوڑا جمایا ہے جو دوسروں کی تیاری کے بعد کانٹ چھانٹ کے طور فالتو بچ رہا تھا۔''

اُوپر والے کی عجب لیلا ہے کہ وہ ایسے ایسے ''ما بعد الضدین'' نمونے تخلیق فرماتا ہے کہ انسان، بس! دیکھتا، غور کرتا اور حیران ہوتا رہ جاتا ہے۔'' لیکن اگر ان بوالعجبیوں پہ ذرا باریک بینی سے غور کیا جائے تو آخر معاملہ کا مَطلع صاف ہوتا بھی نظر آ جاتا ہے۔ پھر عقدہ کھلتا ہے کہ مالک و خالق، حکیم و علیم جمیل و جلیل کا کوئی اَمر، مصلحت و حکمت سے خالی نہیں۔'' تجسس و تفکر، تدبر و تفاہمت تسہیل و تجلیل جیسی نعمتیں، قوتیں، یونہی تو نہیں انسان کو ودیعت کی گئیں......؟ زمین پہ شجر حجر، بحر و بر...... کوہ و دمن...... موسم گرم و نم...... گل و چمن...... برگ و ثمر، اَسود و سنگِ مرمر...... چرند پرند، درند اور خزند! اوپر آسمانوں پہ چاند سورج اور نجوم...... کہکشاؤں اور ننھوں جُھرمٹوں کے ہجوم...... رحمتیں برکتیں...... عرشِ قدسی...... نظامِ احکام...... فضائیں گھٹائیں ابر باراں...... سب کچھ غور و فکر، تدبر و تفکر کے لیے ہی تو ہے۔؟

یہ مذاہب و مسالک، عقیدے نظریے، طور اور طریقے وغیرہ سب اپنی کامنائیں اور چت ملے کی

چنتا ئیں ہیں۔ اپنے اپنے ذہن کی رسائیاں اور اپنی اپنی سوچ و سمجھ کی اکائیاں ہیں۔ اپنی ذاتی خوش نمائیاں اور اوقاتی خوش ادائیاں ہیں۔ کسی دوسرے کی نکتہ چینی دخل در معقول کی زمرے میں آتی ہیں۔؟

یہ سب اُس مہان رنگ رجوا کے چڑھائے ہوئے رنگ ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ فنا اور احیاء، اجماد و ارتقا...... تغیر و تحیر کے تحت ہے اور یہ رنگوں کا طمطرق، تنوع اور طرار پیدا کرتا ہے۔ رنگوں کا کیا ہے؟ چڑھتے ہیں اُتر جاتے ہیں۔ اُتر جائیں تو چڑھ بھی جاتے ہیں۔" ان کا بھی موسم، موڈ اور ماحول ہوتا ہے...... اصل چیز تو کپڑا، اُس کی نسل اصل اور ہجر و وصل کی وصائیت ہوتی ہے۔"

یہ مہاشے بھی دیکھنے بوجھنے میں کوئی نکورام بھلورام سے...... مگر اپنے اندر کی اندر سبھا کے راجہ اندر پال تھے۔ بھگوت میں آنکھوں تلک اُترے ہوئے، ایک ایسی تھاہ میں...... جو کسی تپسوی کو کئی جنموں کی تپسیا کے بعد کہیں جا کر سپھل ہوتی ہے۔"

ضروری نہیں ہوتا کہ ہر کوئی اپنے استھان، مقام سے آشنا ہو۔ سانپ، اپنے زہر کی ہلاکت آفرینی سے کماحقہ، واقفیت نہیں رکھتا اور نہ ہی ہر ممالیہ جانور اپنے دودھ کی حیات بخشی سے آگاہ ہوتا ہے۔" اسی طرح اکثر دلکش، رعنائی و زیبائی سے مالا مال خواتین، اپنے حسنِ جہاں سوز کی سحر انگیز قوت سے بے خبر ہوتی ہیں۔" کوئی اپنی طاقت، اپنے علم، اپنی ذہانت، تحمل برداشت اور باطنی روحانی ذہنی قوتوں سے لاعلم ہوتے ہیں۔؟ کوئی حادثہ، اتفاق یا جب اللہ چاہے وہ اپنے اندر کے دفینے سے آگاہی پالیتے ہیں...... ورنہ سمندری پہاڑوں غاروں صحراؤں کے سینے دفینوں سے بھرے پڑے ہیں اور بے خبری کا یہ عالم کہ نہ تو وہ خود شناس ہیں اور نہ اُوپر نیچے چلنے پھرنے والا انسان؟ شاید یہ سب کچھ کائنات اور اس کے اندر، زندگی برقرار رکھنے کے لیے ایک اہتمام ہے؟

"ذرا من کی کیوڑیا کھول، سیاں تورے دوارے کھڑے......!"

ان شبدوں کے بھیتر بھی ایک ایسا ہی بھید اَن کا چھپا پڑا ہے...... لگتا ہے جیسے من، ایک کُٹیا کوٹھڑی ہے اور اس کی کیوڑیا یعنی در بھڑا ہوا ہے...... کہیں سے بدا آتی ہے...... مورکھ! تم ناراش اور ناراض ہو کر اندر پڑے مرے ہو؟ ذرا چھید سے جھانک دیکھ! باہر تیرے نارائن کھڑے ہیں......!

ایسا ہی ہے...... ماتھے کے نیچے والی آنکھ اور ہوتی ہے جو آس پاس اور دُور و نزدیک کی ظاہریت کو ہی دیکھ کر اندازے لگاتی ہے......؟ چاند سورج ستاروں کی ضیا مونموں، سموں کے سم کی مرہونِ منت اور دھندلی میلی بھی ہوتی ہے......؟ مگر من کی آنکھ میں یہ کجی کمی نہیں ہوتی...... کالے چٹے موتیئے اور نہ سرخ پیلے گلاب کھُنے ہوتے ہیں۔ کاجل کجل بھی نہیں لگتا...... بیٹھ جانے والی پتلی بھی نہیں...... اس میں تو قطبی تارا کی

تنویر ہوتی ہے اور تنویر وہ جو نُورِ الٰہی کا نُور امر ہوتا ہے۔"

میں نے فارس، لہاسہ، تبت، چین و جاپان، روما، روس اور دیگر ایشیائی ممالک کے مقابر، معابد، صدیوں پرانی عبادت گاہوں، یادگار جگہوں، زیر زمین گپھاؤں غاروں میں ایسے ایسے مختلف نوع کے چراغ، دیئے، مشعلیں، الاؤ روشن دیکھے..... جو صدیوں سے مسلسل روشن ہیں..... انہیں تابندہ رکھنے والا کوئی بندہ دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی اُدھر کوئی ایسا سامان مہیا ہے جس سے یہ جلا پاتے ہیں؟ دُھواں نہیں ہوتا اور نہ کوئی بھک بھک..... بھڑکتی لَو پہ دھیان دو تو محسوس ہوتا ہے کہ نہ تو اس میں شعلہ ہے نہ شرارہ! بس اک نیلاہٹ کا غبارہ..... لگتا ہے کوئی پارے کا بُلبلہ سا پُھوٹتا ہے..... بس!

انسان نے روشنی، اُجالے کو سمجھنے میں کچھ دیر تو لگائی مگر بالآخر سمجھ گیا کہ اُس کی اصل ضرورت، روشنی نہیں اُجالا ہے۔ ہم بڑی بڑی ہائی پاور کی ٹیوب لائٹیں اور بلب لگاتے ہیں۔ مگر اب دیکھیں تو ہمیں یہ روشنی کا سیلاب پیدا کرتی ہوئی لائٹیں بلب دکھائی نہیں دیتے..... مگر جگہیں روشن ہوتی ہیں۔" یہ سب روشنی پیدا کرنے والے ذرائع اَوٹ میں چلے گئے اور اُن کی روشنیوں کے اُجالے، ماحول کو منور کیے ہوئے ہوتے ہیں۔" اب ہماری آنکھیں، روشنی کے سیلاب سے خیرہ نہیں ہوتیں۔ مانوس ہوتی ہیں۔ بصارت و دماغ، کنپٹیوں اور اعصاب پہ بُوجھ نہیں پڑتا۔" روشنی اور اُجالے..... نُور اور ہالے میں یہی ایک فرق ہوتا ہے۔؟

یہاں ویرانے میں دن کے اُجالے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رات کیا نظر آتا؟ حسد کے مارے یہ جاسوس دن رات، اسی کھوج میں تھے کہ کس طرح یہ جان جائیں کہ وہ ایسی نہ ٹوٹنے اور بے حد صاف ستھری، جاذبِ نظر مُورتیاں کس رنگ ڈھنگ سے بناتا ہے۔؟

یہ دیکھ رہے تھے کہ دن کے اُجالے میں وہ اِدھر اُدھر سے بے حساب کنکر پتھر ٹھکورتا رہتا۔ جن کا نہ کوئی سر ہوتا ہے اور نہ پیر! ان پتھروں کو آپس میں رگڑ رگڑ برادہ سا بناتا۔ پھر بھگوان جانے وہ کیا اعلم غلم شامل کر کے اسے گاڑھی سی گِل گوندھتا..... پتے اکٹھے کر کے ڈھانپ دیتا۔ شام ڈھلنے پہ ہاتھوں سے اس گِل کے مُکھڑے بنا بنا کر رکھتا جاتا۔ کبھی لیٹ جاتا اور کبھی بیٹھ جاتا..... رات پڑنے پہ ایک گڑھے میں ٹہنیاں پتے اکٹھے کر کے نرم سی آگ روشن کر کے وہ مُکھڑے اس میں رکھ دیتا۔ صبح نکال کر گھاس چھال سے صفائی شروع کر دیتا۔ چشمِ فلک دیکھتی رہ جاتی کہ یہ بے ڈھبے اَن تراشے مُکھڑے، چمکدار، خوبصورت مضبوط مُورتیوں میں تبدیل ہوئے ہوتے۔ بے کار سے کند منداوزاروں سے ہلکی سی رگڑائی چھنائی کے بعد، وہ انہیں اپنی دوکان پہ لے آتا۔" یہ تھی اُس کی ساری سائنس اور کاریگری..... جو نہ دیکھنے کی تھی اور سمجھنے سمجھانے کی۔ معلوم ہُوا کہ انسانی معمولی اور نہ سمجھ میں آنے والی بُودی عقل و محنت کچھ رنگ نہیں لاتی؟ جب تک اُس میں جذب کشف عشق اور اُوپر

والے کی مہربانی شامل نہ ہو۔ انسان کے ظاہری علم و دانش دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور بظاہر جاہل پھوہڑ بے علمے بے عقلے' بازی مار جاتے ہیں۔ کبھی تو ساری عمر کی محنت مشقت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا وہ دینے پہ آتا ہے پل بھر میں حالات بدل جاتے ہیں؟

اس بھولے ناتھ کی بنائی ہوئی مورتیاں' آج بھی پرانے مندروں' عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ میرے ہاں بھی ایک مورتی ہے اسے مَیں نے کیسے حاصل کیا یہ ایک الگ کہانی ہے؟ آج اس سائنسی دور میں بھی کوئی نہیں جان سکا کہ اس مورتی کے بنیادی اجزاء کیا ہیں۔ اس میں ایسی مضبوطی' چمک اور ہنرمندی کیونکر پیدا ہوئی۔ مورتی کے خدوخال میں ایسا تاثر اور رنگ! جو ملکوتی ہے۔ انسان اسے پیدا نہیں کر سکتا۔''

وقت ہوگزرا...... مَیں صابر پیا کی چوکھٹ چومنے پہنچتا تو ہری دوار بھی جانا لازم ٹھہرتا کہ درمیانی فاصلہ پندرہ بیس کوس کا ہے۔ صابر پیا کے قدموں کو چوم کر گزرنے والی گنگ نہر بھی اُدھر سے نکلتی ہے۔ میرا اس مقدس نہر سے بھی ایک خاص تعلق رہا۔ اس میں ڈبکی لگانا بھی میرے لیے ضروری ہو جاتا تھا۔''

## ● تیرے دوار کھڑا اِک جوگی......!

ہری دوار میں میری کئی ایک پنڈتوں' پانڈوں اور پروہتوں سے رام رام تھی۔ ایک دو سے تو گہری چھنتی بھی تھی۔ مل بیٹھتے تو درمیان میں سے مسلمان برہمن' ہندوستان پاکستان' کا لاکیسری' بھدرا اور ریش خود بخود کہیں کنارے ہو جاتے۔ ہم کھل ڈھل کر باتیں کرتے' کھاتے پیتے' قہقہے لطیفے...... آپس کی تنگ نظری اور ''مخالفت برائے مخالف'' جیسی فضولیات کی بھی خاصی بھد اُڑاتے۔'' پنڈت شمبھوناتھ سے میری دوستی سیالکوٹ کے حوالے سے ہوئی۔ وہ ایک یاتری کو گنگا میں ڈبکیاں دلوا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اشلوک بھی دہرا رہا تھا۔ بوڑھے یاتری نے کہیں غلطی سے اُلٹا سیدھا دہرایا تو اس نے گلابی سیالکوٹی لہجہ کی پنجابی میں اسے فہمائش کی...... مَیں قریب کنارے پہ پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا...... اس کی سیالکوٹی پنجابی سُن کر مَیں ٹھٹھکا! ہو نہ ہو اس کا تعلق کچھ سیالکوٹ سے ضرور ہے؟

کچھ بندھن یُوں بھی ہوتے ہیں کہ انہیں جوڑنے میں کوئی اور غیبی ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے کیا مصلحت ہوتی ہے۔ اُس سے سرِدست آپ باخبر نہیں ہوتے اور میرے ساتھ تو ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا ہے...... تنگ پڑ کر مَیں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہوا ہے کہ کون روز روز کی اس جاننے کے جھنجھٹ میں پڑے؟ میرے مقسوموں میں اگر یہی کچھ لکھا ہے...... مَیں ہی نشانے پہ ہوں؟ تو بسم اللہ چل سو چل!

میں اپنے اندر کی کھد بھد مٹانے کی خاطر اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔" وہ اپنے بھارو کو ڈبکیاں دلوا کر کسی اور سورگ میں پہنچنے کے شوقین کو گھیرے کی تیاری میں تھا کہ میں ہاتھ جوڑے نمسکار کرتے ہوئے بولا مہاراج! مجھے بھی سویکار کریں۔ بہت دُور سیالکوٹ سے پہنچا ہوں...... ؟ اُس بوڑھے پروہت نے مجھے یوں نگاہوں سے نکالا جیسے میں ببول کا تیز حا کانٹا ہوں۔ سر سے پاؤں تک اُس نے مجھے پا لیا تھا۔" میرا سراپا لباس شکل صورت چہرے کے تیور ہاتھ گلے کے زیور عصا! سب کچھ کسی اندھے کے جاننے کے لیے بھی کافی تھے...... یہ تو اک گرگ باردیدہ تھا جو ہر روز سیکڑوں مجھ ایسے گنگا اشنانی بز بچے سورگ بھیجتے ہیں۔" چند گراں سے لمحے وہ بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں تو لتا رہا۔ میں بھی خاموشی لبی میں کچھ بو لتا رہا۔" کاسنی اور پھر جامنی رنگ کے بعد جب اس کی مندھی آنکھوں میں شرتی رنگ کے پھریرے لہرائے اور چندیا پہ پسینے کے تریڑے تلملائے تو میں جان گیا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔ سٹرابری کی سی سُرخی لیئے چتکے سے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی۔"

"ٹسی پاکستانو آئے او"

میرے اثبات میں سر جھکانے پہ اُس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اذن دیا۔"

کچھ پرے ہم دونوں دریا کے راستے ایک چھتے ہوئے تنل میں داخل ہوئے جو ایک پرانے مگر خوبصورت سے مندر کی بغل میں واقع تھا۔"

اس مندر کے سامنے والا حصہ دریا میں اُترتی سیڑھیوں پہ مبنی تھا۔ سیڑھیاں بہت اُوپر سے شروع ہو کر دریا کے پانی میں اُتری ہوئی تھیں۔ مرد عورت اور بچے بوڑھے اِدھر مختلف جگہوں پہ براجمان نہانے اور پراتھنا میں مشغول تھے۔

راستہ تنگ سیلن زدہ اور دریائی گدلے پانی کی خوشبو بدبو سے بسا ہوا تھا۔ ہم ایک آشرم نما بڑے سے ہال میں پہنچ آئے۔ اِدھر موٹے موٹے سنگی ستون صاف پانی کے بڑے بڑے حوض اور پتھر کے تھڑے...... جگہ جگہ تلسی کی کیاریاں اور موٹی موٹی بلیاں۔"

ایک پرانی وضع کے کمرے کے آگے ہم کھڑے ہو گئے۔ بن کھٹکھٹائے پرانی طرز کا پٹ اندر سے کسی نے ہمارے لیئے وا کر دیا تھا۔" پہلے پروہت جی اور ان کے پیچھے میں بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ ننگے سنگی فرش پہ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ موٹے موٹے ستون کسی نہ کسی دیومالائی شکل وصورت پہ تھے۔ دیواروں پہ جگہ جگہ طاقچے...... کوئی نہ کوئی دیوتا براجمان آرتی کے پھول پتے...... اگر لوبان روشن دیئے اور لہریئے لیتا ہوا مختلف مہک دھانس والا دھواں! جو کسی نئے آنے والے کی آنکھوں اور حلق میں اُلجھن پیدا کرتا ہے...... یعنی

اک وہی ماحول! جو مندروں آشرموں میں ہوتا ہے۔؟

پروہت جی کی چوبی کھڑاؤں نے ایک کونے میں پہنچ کر اپنی کرخت آواز بند کر دی تھی...... آشرم ہوں معبد یا مسجد مندر...... یہاں پہنچ کر اکثر کرخت سے کرخت آواز یا سوچ بھی سنبھل جاتی ہے۔ میرا یہ مشاہدہ و تجزیہ ہے کہ کسی دین دھرم کی عبادت گاہ ہو یہاں پہنچ کر سبھی سکون سکوت تو محسوس ہوتا ہی ہے...... دل و دماغ کے علاوہ اندر روح تک طمانیت محسوس کرتی ہے کہ ہر کسی کی آخری منزل' بالآخر حق کی طلب کھوج ہی تو ہے۔؟ ہزاروں مسافر' قافلے' محوِ سفر ہوتے ہیں۔ راستے طور طریقے' وسائل و مسائل الگ الگ...... خاہر اک دوجے کی ضد بھی...... مگر منزل سبھی کی ایک ہی! کوئی اللہ' خدا' مولا کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے' کوئی پرماتما ایشور پربھو پکار لیتا ہے...... کہیں گاڈ' مالک' رب یزداں ہوتا ہے...... معنی مطلب سارے ایک ہی ہیں۔ سیدھے سامنے سے' یا ہاتھ گھما کر ناک پکڑ لو...... اصل معاملہ تو خشنودی ہے۔'' ہندو' مسلم' سکھ عیسائی...... ''کنجڑا' دھوبی' نائی قصائی...... سب ہی روح' رزق اور رازق تک رسائی چاہتے ہیں......؟

پنڈت جی مہاراج اپنے استھان چوکے پہ براجمان ہو گئے اور مجھے بھی فرش پہ بیٹھنے کا کہہ کر ذرا دور کھڑے اپنے بھگت بالک سے کچھ جل پان لانے کا کہہ کر میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے بولے!

مولانا! آپ مسلمان ہیں؟

مَیں نے ترت جواب دیتے ہوئے کہا...... ''اور پاکستانی بھی! لیکن مَیں مولانا نہیں...... بھگت درویش ہوں! نام' میر محمد یحییٰ خان ہے' پکا سیالکوٹی ہوں۔ کلیر شریف اور ادھر ہری دوار حاضر ہوتا رہتا ہوں۔ ان تیرتھوں پہ آ کر مجھے بہت آنند ملتا ہے۔ آج آپ کو ادھر دیکھا...... مجھے لگا کہ آپ کا تعلق بھی کسی نہ کسی حوالہ سے سیالکوٹ سے ہے؟

اس کی اُبلی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پہ گڑی ہوئی تھیں اور بھد رائے چہرے پہ کئی رنگ آ جا رہے تھے۔'' بمشکل وہ بولا! آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

لگتا ہے کہ میری کوئی امانت آپ کے پاس ہے؟ اگر آپ کو بھی ایسا محسوس ہوتا ہے تو کیا اچھا نہ ہوگا کہ آپ آج مکت ہو جائیں اور ہم دونوں اپنی اپنی راہ لگیں۔؟

اسی اثنا اُن کا بالکا' کچا ناریل لے کر آ گیا...... کچے ناریل جل میں پیاس بجھانے کی بڑی پکی شکتی ہوتی ہے۔ یہ دیوتاؤں کا' جل ہے۔ گنگا جل کی تین چوتھائی میں ایک چوتھائی ملا کر کسی نرگی کل کو پلا دو تو وہ سورگ سار ہو جاتا ہے۔'' دو گھونٹ' حلق سے نیچے کیا اُترے مَیں چار چوک اُوپر چوبارے چڑھ گیا؟

چھپکلی شہتیر سے جا چمٹے یا بیل منڈھیر پہ چڑھ لپٹے...... بات بدحالی کی نہیں رسوائی کی بنتی ہے۔''

پاؤں بڈولنے لگے تو میں مسیایا...... آ گیا ہوں تو میں آپ کے چرنوں میں بیٹھ جاؤں؟ کوئی جواب دینے کی بجائے وہ خود اُٹھ کھڑا ہُوا۔ بڑے شانت وماتت سے مجھے اپنے سنگ چوکے پہ بٹھایا اور مسکراتے ہُوئے پُوچھا! سیالکوٹ' کہاں رہتے ہیں آپ؟

رام تلائی کے کچھ دُور موری دروازہ میں! اور آپ؟

موری دروازہ کے عقب محلّہ بھابھڑاں میں! گئوشالہ کے سیوک' لالہ رام دیال' میرے پتا جی تھے......!

موری دروازہ کے "دیوان خانہ اغرخان" والے جھنڈے خان میرے دادا تھے۔!

گنگا جل اور ناریل جل آپس میں ملاپ لے لیں تو بھگوت جل بن جاتے ہیں؟ میری طرح پنڈت رام دھیان بھی پنڈت رام دیال کا اکلوتا بیٹا تھا۔ گئوشالہ میں جنم سے' اسے گئو جل پلایا گیا تھا۔ پرنتو اسے گئوسیوا کا میوہ بھوجن نصیب نہ ہُوا...... بٹوارہ ہُوا تو پتا اور ماتا جی کے تالو پہ بیٹھا تو اپنے ننھیال کھوڈر جا اُترا۔ وہاں پہ ناناٗ ماما بھی گئوشالہ سیوا کار! میں بچپن اور لڑکپن کچھوتا' سرنکالا تو ہری دوار کا گوپالہ بن گیا اور اب بڑھاپا کا سیاپا بھوگ رہا تھا۔"

تیزاب میں مختلف دھاتوں کی ڈلیاں' ایک سا طمع کر کے ڈال دی جائیں تو کچھ ہی دیر میں ایک ایک' اپنا آپ ننگا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ سونا چاندی' لوہا پیتل' سیسہ تانبہ وغیرہ اپنے اپنے تشرف وظرف' خوبی و خواص' ظاہر و باطن' متحرک و سکت' سے مترشح ہو جاتی ہیں۔"

کُتے بلیاں اور دیگر حیوانِ مُطلق' جب پہلی بار اِک دُوجے سے متعارف ہوتے ہیں تو اپنی تمام تر جبلیات ظاہریہ و باطنیہ سے متوجہ ہوتے ہیں۔" مختلف زاویوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں...... سونگھتے چاٹتے ہیں...... تنگند گمند کا حساب لگاتے ہیں آپس کی جبلی جنسی فطری خصلتوں کا جائزہ...... نسل اصل' سکت طاقت وہمت' جسمانی صوری اور صوتی معائب ومحاسن وغیرہ...... غرضیکہ ایک ایک اچھائی برائی دیکھ بھال کر اُس سے سلوک کرتے ہیں اور یہ فیصلہ دیکھتے ہی دیکھتے ہو جاتا ہے...... دوستی یا دشمنی؟

ہر اِک ذی حس' ذی جان' ذی شعور اپنی اِک کلاس' ذاتیاتی معیار اور پسند ناپسند کے کچھ خاص اُسلوب رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت' حیثیت کے کچھ خاص نمبر' کھانچے' گراریاں اور سائز ہوتے ہیں؟ جدھر کہیں' جب جہاں' مقابل میں بھی یہی کچھ دکھائی دے دیتا ہے تو کھٹ سے' دونوں اجناب میں حرکت و برکت پیدا ہوتی ہے اور اِک تعلق خاطر پیدا ہو جاتا ہے۔"

یہاں اب ایک چھوٹا سا مگر اہم سوال سر اُٹھاتا ہے کہ انسان اور حیوان کیا محض ایک دوسرے کی خوبیوں خوبصورتیوں' خوش خُلقیوں سے ہی خوش تعلق ہوتے ہیں یا کج اَدایاں' کج صُورتیاں' کج معاملگیاں یا

کج اطواریوں سے بھی کچھ اچھائی برائی نکالتے ہیں؟
انسانی تاریخ اور نفسیات معقول و منقول اس امر حقیقت کو قبول کرتی ہے کہ مخلوقات نفسیہ، جنسیہ، مخدومیہ اور معدومیہ ہر کوئی اس کی تائید میں دکھائی دیتے ہیں۔''
علماء انسانیت اور حیوانیت...... علم نفسیت، جبلیت، جنسیت اور بشریت کے طالبعلم خوب سمجھتے ہیں کہ ہر امر ظاہر و باطن اور تمام علوم سماویہ وارضیہ، نافعیہ اور ناقصیہ کو اُن کے نقیض کے ساتھ جوڑا گیا۔ شیریں کے ساتھ تلخی، اچھائی کے مقابل برائی۔ محبت کے ساتھ نفرت...... اُجالے کے سامنے اندھیرا...... اسی طرح خدا اور ابلیس...... جنت کے رُوبرو دوزخ، رُوحانیت کے برابر مادیت وغیرہ وغیرہ...... یہ سب کچھ تنوعاتِ حیات کے لازمے ہیں تاکہ یہ فخرِ موجودات، قبلہ و خلیفہ ارض اپنی بشری بالیدگی اور انسانی فہمیدگی اور اللہ کا بندہ بننے کے لئے بندگی کی فراست حاصل کر سکے۔ وہ دائیں بائیں، نفع نقصان، اُلٹے سیدھے کے فرق کو جان سکے......''
ایک شعر ہے

پی جا ایّام کی تلخی کو بھی ہنس کر ناصر
غم کو سہنے میں بھی قدرت نے مزہ رکھا ہے

یعنی ہر نقیض اپنے اندر ایک جداگانہ سا سواد رکھتا ہے...... ایک تحیّر، اسرار، حجاب، تلذذ پوشیدہ ہوتا ہے جو انسان کو بہکاتا، بہلاتا اور اُکساتا رہتا ہے۔ اس میں کرید، تجسس، تفکر اُبھارتا ہے۔ اپنی جستجو کرنے طالب کو کسی دوراہا پہ لا کر کھڑا کر دیتا ہے...... اور کبھی کبھی کسی سدھدے یا چوراہے پہ پھانسی کا ڈر کا بھی دیتا ہے۔''
جتنی دیر میں وہ مجھ میں اور میں اُس میں اُتر گیا تھا اتنے قلیل عرصہ میں تو چاشت سے اُڑائی ہوئی شیرازیوں کی پالی بھی منڈیر چھتری پہ واپس نہیں اُترتی؟
ہم دونوں کے اندر کی پرانی مشینوں کے اکثر پرزے گراریاں، نٹ بولٹ واشل دھرے، کیل وغیرہ قریب قریب ایک ہی ماڈل اور سن و سال کی تھیں...... اس لیے وقت ضائع کیے بغیر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کھوج لیا تھا۔ کہتے ہیں

ٹھک نہ دیکھے سالنا، تے عشق نہ پچھے ذات

کون پنڈت برہمن اور کون صوفی درویش......؟
ہماری سنگت بھی انوکھی تھی...... ایک کی داڑھی اور تسبیح، سیاہ لباس انگشتریاں، گلے میں مالائیں...... اللہ اللہ!! دوجا، گیروی دھوتی۔ گلے میں جینؤ، ماتھے پہ تلک ترشول'' بھدرا کیا، ہوا صفاچٹ چہرہ۔ پاؤں میں کھڑاویں؟ ظاہری کوئی پرت پوت مشترک نہ تھی......''

پنڈت رام دھیان نے مجھے روک لیا تھا جبکہ میرا ارادہ شام کی گاڑی سے واپس دہلی پلٹنے کا تھا اور دو روز بعد لاہور پہنچنا بھی طے تھا۔ مگر وہی کہ سوچ کچھ اور ہوتی ہے اور پہنچ کچھ اور؟

رات کا بھوجن پرشاد ہم دونوں نے ایک ساتھ 'گئوشالہ میں کھایا تھا۔'' رام دھیان نے بتایا تھا کہ ہمارا دھرم کام یہی گئوشالہ کی سیوا ہے۔ اسی گئوشالہ میں' جو شہر سے قریب ہی ایک بستی میں تھی اپنی اندھی بوڑھی ماتا اور پتنی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ گایوں کی دیکھ بھال کے علاوہ وہ ادھر مندر میں گنگا اشنان کروانے کی سیوا بھی کرتا۔ صبح سویرے پہنچ جاتا' شام ڈھلے واپس گھر لوٹ لیتا۔'' رات وہ مجھے اپنے گھر لے آیا تھا۔ اپنے پریوار سے ملوایا۔ بڑے بھلے جیسے لوگ! ایسے نفانفسی' بے دید ے' مصنوعی دور میں اس طور طرح کے منشوں کا دم غنیمت ہے۔'' شاید دنیا زندگی اور معاشرہ انہی تضادات' تفریق و تقسیم سے ترتیب پاتے ہیں؟

ایک خاص اور علیحدہ سی چیز جو میں نے محسوس کی...... وہ اس گھر کا ماحول اور طور طریق تھے۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا تیرتھ' ہندو مت کا گڑھ! ایک کٹر قسم کا قدیمی روایتی برہمن گھرانہ' جو گئو ماتا کی رکھشا اور سیوا میں اپنا ایک نام رکھتا ہے...... اُن کا گھرانہ؟ میری عقل کے تو طوطے اُڑ گئے جب مجھے اُس کمرے میں لے جایا گیا جدھر پنڈت جی نے میرے قیام کا حکم دیا تھا۔''

سب سے پہلے عود کی مہک نے میری مشامِ جاں کو معطر کیا۔ اندر قدم دھرتے ہی جو منظر سامنے دکھائی دیا وہ ایک بڑے سائز میں خانہ کعبہ والا دیواری غالیچہ تھا۔ جو اپنی پوری جمالت و جلالت کے ساتھ نمایاں جگہ پر آویزاں تھا۔ عین اس کے نیچے کھجوری چٹائی' جس پہ دو تکیے اور تہہ شدہ چادر دھری تھی...... ظاہر ہے یہ میری استراحت کی جگہ تھی۔ ساتھ چوبی تپائی' جس پہ سبز جزدان میں لپٹا ہوا مصحف پاک' تسبیح' سرمہ دانی' عطر اور نماز کے لئے ٹوپی! دائیں بائیں کی دیواروں پہ بھی قرآنی آیات کے طغرے کتبے ٹنگے تھے...... طاق میں مٹی کا دیا اور تین چوتھائی تہہ ہوا نماز کے لئے مُصلّے......

مَیں کسی بجوڑے کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ' ان عجائبات کو تک رہا تھا۔ سوچنے لگا! مَیں کسی 'مُلّاں مولوی کے گھر پہ ہوں یا پنڈت برہمن کے ہاں؟ حیرت و استعجاب نے میری عجیب سی حالت کر دی ہوئی تھی؟

اس حیرت زدگی کے عالم میں' مَیں نے پوچھ لیا! مہاراج! یہ آپ کا ہی گھر ہے یا کسی مُسلمان دوست سے میری خاطر مستعار لیا ہے؟

قدرے خفگی سے میری جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔ کیا مَیں آپ کو لے کر کسی دوسرے گھر جاؤں گا۔ کیا میرا پریوار' آپ کو ادھر دکھائی نہیں دے رہا؟

کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے مَیں نے پھر پوچھ لیا! تو کیا ادھر کوئی مُسلمان رہتا ہے؟

قدرے اَدب کر جواب دیا۔ بھائی! یہ میرا کمرا ہے اور اِدھر میں ہی رہتا ہوں...... مگر آپ کو کیا پریشانی ہے؟

میں نے واقعی پریشان ہوتے ہوئے پھر پوچھ لیا۔ مہاراج! آپ ہندو براہمن ہیں...... گئو ماتا کی رکھشا' گئو شالہ کی سیوا اور ہندو یاتریوں کی خدمت آپ کا دھرم ہے...... مگر آپ......؟

میری بات درمیان میں رکھ کر اُسی نے جواب دیا...... میں پکا ہندو پنڈت اور مندر کا پجاری ہوں...... یہی ہمارا خاندانی کارکرم ہے...... مگر آپ کی پریشانی کیا ہے؟

یہ آپ کا کمرا' یہاں کا یہ ماحول' خانہ کعبہ' مصلے' تسبیح' قرآن شریف...... یہ سب کیا ہے؟ ہندوؤں کے ہاں تو بت' مورتیاں...... ترشول' گیتا......؟ وہ بات پوری ہونے سے پہلے ہی میرا بازو تھامے باہر صحن میں ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے اندر لے گیا۔"

اِدھر تو دُنیا کے ساتھ دھرم بھی بدلا ہوا تھا۔ لوبان کی ڈبک...... کرشن جی گوپالے کی مورتی...... استھان پیلے پھولوں سے بھرا ہوا...... آگے لٹکتے ہوئے گل...... یعنی چھوٹا سا مندر' جو اکثر ہندوؤں برہمنوں کے گھروں میں صبح وشام آرتی اُتارنے کے لئے بنا ہوتا ہے۔"

کچھ دیر بعد ہم باہر نکل آئے' اَب مجھے ساتھ لیئے اُس سے آگے والے کمرے میں تھا یہاں ایک اور جہانِ حیرت میرا منتظر تھا؟ گوردوارہ اور اُس سے اگلے کمرے میں گرجا!

میں گنگ منگ...... اِک گونگے بہرے اندھے مٹی کے مادھو کی طرح اِس اِدھر سے اُدھر...... اُدھر سے کہیں اور اُدھر؟ حیرتوں میں ڈوبا اور وسوسوں میں گھرا ہوا میں اُس ٹین کے خالی ڈبے کی طرح تھا...... جو رات کو سفر کرنے والے بیل چھکڑوں کے پیچھے بندھا اُونچے نیچے پتھریلے راستوں پہ گھسیٹ رہا ہوتا ہے...... پہیوں کی چوں چر میں اُس کی کراہیں بھی گاڑی بان کو سنائی نہیں دیتیں۔"

اس دھرم یاترا کے بعد ہم واپس "مسلمان کمرے" میں آ گئے...... نیچے چٹائی پہ بچھے دسترخوان پہ سادہ سا کھانا چنا ہوا تھا۔ ارہر دال کی کھچڑی' گوشت قورمہ' اُلٹے توے کی چپاتیاں اور کھیرے کی قاشیں......! ہاتھ دھونے بھگونے کے لئے پانی کی سلفچی بھی دکھائی دی۔"

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا جب پنڈت جی نے "بسم اللہ" کہہ کر بیٹھنے اور کھانے کی دعوت دی۔ سلفچی آگے بڑھا کر میرے ہاتھ دُھلوائے۔ "میں بے سکت ہو کے رہ گیا جب اُنہوں نے بسم اللہ کہتے ہوئے لقمہ اُٹھایا...... الحمدللہ! الحمدللہ! خدایا یہ کون ہے کیا ہے؟ ہندو مسلمان...... جن یا انسان؟ میں مکہ مدینے میں ہوں بغداد' دمشق یا بخارا میں...... "یہ تو ہندوؤں کا سب سے بڑا استھان ہے۔ اِدھر تو رام ہے بھگوان ہے......؟ یہ

سب کچھ کیا ہے......؟

جب دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تو میں نے بھی ہتھیار ڈال دیے کہ خواہ مخواہ دماغ خراب کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا؟ جو بھی کتھا کہانی ہوگا خود بخود باہر آ ئے گا؟

عشاء کی نماز اُن کی اقتدا میں پڑھی...... میرے ساتھی نمازیوں تین اور صاحب تھے جو بظاہر ان ہی کی طرح ہندو دکھائی دیتے تھے۔ ماتھے پہ تلک بھدرا کیئے ہوئے چہرے گلے میں جنیئو...... بسنتی اُڑسی ہوئی دھوتی...... یہ مخصوص گٹ اَپ پانڈوں پنڈتوں پجاریوں کا ہوتا ہے۔ جو بنارس متھرا ہری دوار اجودھیا کاشی اور ایسے دیگر تیرتھوں پہ یاتریوں کو پوجا پاٹ گنگا جمنا میں اشنان اور دیگر رسومات کرواتے ہیں اور خوب مایا سمیٹتے ہیں۔''

ہمارے ہاں اکثر ملاں مولوی نام نہاد نعت خواں حافظ پیر فقیر اور قلوں دسووں چالیسووں پہ فاتحہ ختم پڑھنے والوں نلوانوں کا بھی تو یہی پیشہ ہے۔'' دین دھرم کوئی بھی ہو یہ ٹھیکیدار ٹائپ لوگ تو ہر کہیں موجود ہوتے ہیں اور انہیں ہونا بھی چاہیے! جیسے سفید چٹے کے مقابل برابر کالا شیا کالا ہوتا ہے......؟

سرچڑھی رات میری اسی ''مسلمان کمرے'' میں گزری...... گزری بھی کیا؟ گزاری! شاید یہ کمرا بے سدھ بدھ سونے کے لئے نہیں تھا...... اگر یہ خود جاگ رہا ہوتو اس کے ہاں پڑا ہوا اونگا ٹھونگا تو لے سکتا ہے مگر گہری نیند میں خراٹے نہیں تو ڑسکتا...... یہی حال کہ میں تمام شب نیم نومی کیفیت میں کروٹیں بدلتا رہا...... ویسے بھی فقیر درویش اہتمام واکرام میں سونہیں سکتا! نرم بستر گداز تکیہ میں خاک اور خار کی سی خاکساری اور خلش کہاں نصیب ہوتی ہے؟

علی الصباح! نیم غنودگی کی کیفیت میں میرے کانوں میں ایک نرم سی ندا نمدانے لگی تو میں قدرے ہشیار سا ہوکر اس کی جانب متوجہ ہوا...... یہ اذان کا سرمدی سا آہنگ تھا...... مدھم سی مزمار میں سنائی تو دے رہا...... مگر دکھائی نہ دے رہا تھا کہ اس کا منبع مرکز کہاں واقع ہے......؟ جب بات حی علی الفلاح تک پہنچی تو میں اُٹھ بیٹھا۔''

طاق میں اک بڑا سا دیا کمال صدق وصفا سے روشن تھا...... کمرے میں دیئے کے دھوئیں کی ہلکی ہلکی چکنی سی بکھاوٹ اور کانپتی سی مدھم روشنی نے اک عجب سا ماحول پیدا کیا ہوا تھا۔ صبح کا یہ سماں ویسے بھی بڑے اسرار لیئے ہوئے ہوتا ہے...... لگتا ہے کوئی ایسا ہی سعد سنبھلا سا سماں ہوگا جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ''کُن'' کہہ کر کائنات کو قیام دیا ہوگا؟

ریگستان میں رتو کرلا ریگ ماہی...... سمندر میں کشتی کستورا مچھلی...... فضا میں آسمانی بجلی شاہین

اُڑن کھٹولے (جہاز)...... زمین کے اُوپر' آذان کا آہنگ' ابدال کے ڈھنگ' ستیزہ گری اور جنگ اپنے پیچھے ایسے نقوش لہریں' پرتو' مٹے اَن مٹے رنگ چھوڑتے ہیں کہ ان کی بازگشت اچھے بُرے اثرات' دیر تک محسوس ہوتے اور یاد رہتے ہیں۔"

آسمان پہ اُڑتے اور سمندر میں گزرتے ہوئے جہاز' ذیل شارکیں' بڑے بڑے گھڑیال' زیرِ زمین معدنیات کیمیاوی مادّے' بخارات...... ارض و سما میں جنات و قدسی - خفّی بشری اور لطیف و ثقیل نفوس...... ولی قطب اور مجذوب و مجاہد' یہاں تک کہ علومِ دینیہ اور انسانیہ کے طالب بھی جب کہیں سے گزرتے یا مراجعت کرتے ہیں تو وہ بھی اپنے گرداگرد ایسی ہلچل و اضطراب بپا کرتے ہیں کہ اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ جا سکتا۔"

فرقان' الحمید کی تلاوت' درود شریف اور آذان کے آہنگ کی گونج تو کائنات کے کونے کونے میں ربّ الکائنات' مالکُ العالمین' خدائے بزرگ و برتر' اللہ ذوالجلال والاکرام کی یکتائی کبریائی کی گواہی پیش کرتی رہتی ہے۔"

ناشتہ ذِی جو گھروں میں ہوتا ہے۔ کسی چیز پہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی کی مہر ثبت نہیں ہوتی۔ زمین سے اُگنے والی اور آسمان سے اُترنے والی یا سمندر سے نکلنے والی بھی کوئی نعمت' مذہب مسلک سے آلودہ نہیں ہوتی...... کسی پہ کچھ لکھا نہیں ہوتا کہ اسے مومن کھا سکتا ہے ہندو سکھ عیسائی یہودی یا کافر مشرک صرف دیکھ اور ان کی خواہش کر سکتے ہیں۔ کوئی سمندر' کنواں' کھیت' درخت' پہاڑ' صحرا وغیرہ کہیں بھی تو مسلمان ہندو' سکھ عیسائی نہیں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اللہ کریم کی سب نعمتیں' اُس کی مخلوق کے لئے ہیں۔ جنہیں کھا پی کر' اُس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

گئے رات تک نشست جمی رہی۔ مالک اور اُس کی برتری کی باتیں ہوتی رہیں۔ نشست تمام ہوئی تو انکشاف ہوا کہ اسی جگہ' اِک زمانہ میں مولانا عبدالسلام نیازی دہلی والے بھی قیام پذیر رہے ہیں۔"

- وَصلِ حق ہے وصالِ دَرویشاں۔"

کراچی! کلانچی یا کرنچی تو نہ بن سکا اور نہ گوادر' گردھر ہو سکا۔ البتہ ہمارے ہمسایہ ملک نے اپنے پرانے خوبصورت ساحلی شہر بمبئی کا نام تبدیل کر کے اسے ایک مہان دیوی کا نام دے کر ممبئی بنا دیا۔ شیر تو شیر ہی ہوتا ہے وہ بچے دے یا انڈے؟ ہم کیا کر لیتے اگر دُنیائے فلم کے اس بڑے شہر کا نام' اِدھر کی کسی فلمی ہیروئن...... بسری دیوی' اُوما دیوی' سیتا دیوی یا کے آصف والی ستارہ دیوی کے نام پہ رکھ لیا جاتا۔ بیس کے اُوپر

دو یعنی گیارہ دُونی بائیس خواجہ کی چوکھٹ بھی اب دہلی نہیں رہی دِلّی ہوگئی ہوئی ہے۔'' وہ تو بہتر ہُوا کہ انتظار حسین اچھے سمے اُدھر نہیں نکلے ورنہ وہ بھی کبھی کے انتصار حسین دِلوی ہو چکے ہوتے؟ مَیں دِلّی کو دہلی ہی کہنے میں بہجت محسوس کرتا ہوں۔'' شاہد احمد دہلوی' حکیم سعید احمد دہلوی' یوسف دہلوی' میر شکیل دہلوی کو'' دِلوی'' کہنے کا تصوّر تک نہیں کر سکتا۔

عہدِ رفتہ کی شان و شوکت'' کی حسرت و عبرت' حکومت و سلطنت کا اندازہ لگانا ہو تو لال قلعہ نکل جاؤ۔ اس کی غریب و عسرت' زبوں حالی و پامالی ملاحظہ کرنا چاہیں تو جامع مسجد اور اس کے گرد و نواح کا چکر لگا لیں۔ شاہراہِ شاہاں پہ قدم رکھنا چاہیں تو شاہدرہ کی جانب نکل لیں۔ دلوں' ذہنوں اور رُوحوں میں بسنے والوں کی زیارت کا شوق ہو تو بستی نظام الدین' مہرولی کا رُخ پکڑ لیں۔ پرانی ثقافت شرافت' تہذیب' تواضع تکلّم کی خوشبو لینی ہو تو مٹیا محل' حبش خانہ' لال کنواں' ترکمان دروازہ' اندرون پرانی دہلی گھوم آئیں۔'' دل اُداس مغموم کرتا ہو تو مولانا آزاد اور غالب کے مزار پہ فاتحہ پڑھ آئیں......

رات کو نہیں' دن کے اُجالے میں چاندنی چوک کا چکر لگا آئیں...... گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی سمادھیوں پہ بھی جایا جا سکتا ہے۔ نئی دہلی' جمنا گھاٹ' انڈیا گیٹ بھی اِدھر ہی ہیں۔'' خواجہ نظام الدین اولیاء اور اُن کے محبوب امیر خسرو...... خواجہ بختیار کاکی کی چوکھٹ چُوم آئیں تو شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی' سلطان شمس الدین غازی' خواجہ باقی باللہ' شاہ حسن رسول نما' شاہ بایزید اللہ ہُو' ہرے بھرے میاں' سرمد سرکار...... بائیس خواجہ کی چوکھٹیں' سب کے لیے کُھلی پڑی ہیں۔''

انہیں نسبتوں سے نمایاں' نصیبوں والی اس دہلی میں تصوّف فقہ' کشف و جذب' علم القرآن' علم الحدیث' تفسیر' صرف و نحو...... بدیع و مناظرہ' کلام و کیمیا' موسیقی ارثماطیقی' ہیئت و لوگا ثمات' حکمت و طب' حساب تکنی توقیت' تجوید' قرأت زیجات و ریاضی' منطق و فلسفہ' ہندسہ و جدل کے علاوہ' بے شمار منقول و غیر منقول عُلوم سے مرصّع و مرجع...... ایک یگانہ روزگار ہستی موجود تھی اور موجود ہے' جنہیں اہلِ علم و فضل مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی کے نام سے پہنچانتے تھے اور جانتے ہیں۔

حکیم علی الاطلاق نے انہیں جو کمال فقاہت و فطانت اور جودتِ طبع عطا فرمائی تھی۔ اُس کی نظیر' ان کے قریب و دُور کے کسی ہم عصر میں دکھائی نہ دیتی تھی۔'' زبان و بیان' سیر و تفسیر' منطق و مثلث کروی' مثلث مسطح پہ عالمِ اَجل تھے۔ فلسفہ وحدت الوجود کی اہمیت و صداقت' دُنیا کے ہر حاضرہ باطنہ' مروجہ و غیر مروجہ عُلوم سے ثابت کر دیتے تھے۔'' جنّات' ہمزاد' رجالِ وحید' مؤکلات' مردانِ غیب و افلاک سے رابطے تھے اُن کے ساتھ انجمن آرائیاں رہتیں۔''

عصر کے بڑے بڑے اہلِ علم و ہنر ذی شان و مرتبت' سیاستدان اور سربراہان مملکت' اہلِ ثروت' تصوف و تقدیس' فن کار' گوئیے' قوال' شاعر ادیب اخبار نویس' آپ کی صحبت میں بیٹھنے کے لیئے بے چین رہتے۔ نیچے بازار میں کھڑے رہتے کہ کہیں ایک جھلک ہی دکھائی دے جائے۔''

مزاج طبع میں بلا کا اکھڑ پن تھا۔ اکثر و بیشتر جذب کی کیفیت طاری رہتی...... بے نیازی تو ایک وطیرہ بن چکی تھی۔ کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے ہیں۔ کھڑے کھڑے لاکھوں کے بندے کو دو کوڑی کا کر دیتے...... لیکن جس سے بات بنتی تو پھر اس سے بنا کر رکھتے۔''

دوستیاں تو چند ایک سے ہی ہوں گی جبکہ دشمنیاں بہت سوں سے تھیں...... دوستیوں کی بجائے وہ دشمنیوں کی پرورش پسند کرتے تھے...... اک شمشیر براں کی مانند کاٹتے چلے جانا اور شعلہ جوالہ کی طرح خاکستر کر دینا یہی اِن کا مزاج تھا۔'' جلال و جمال کا توازن' فقر کے درجات سے طے ہوتا ہے۔''

بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ دہلی میں کبھی تیئس 23 سیڑھیوں کا بالا خانہ' سامنے سید ھا سا صحن' ساتھ ہی ڈیڑھ کمرے کی مکانیت اور آگے خمیدہ بریدہ سا برآمدہ' جس میں مختلف جڑی بوٹیوں سے بھری ہوئی بوریاں' شیشے کی ننھی ننھی بوتلوں سے اَٹے ہوئے ڈبے' تیل کے کُپے' عرق' عطر کشید کرنے کے آلات...... گائے کی گوبریوں اُپلوں کی ڈھیریاں ہوتی تھیں۔''

جب تک خون میں گرمی' مزاج میں نرمی اور رسوئی میں گھر والی...... طاق میں کجل تمک' انگنی پہ انگرکھا' کابک میں کالا کستورا' سُبحان تیری قدرت الا پتا رہا تو یہ بازار سیتارام' ترکمان دروازہ والا چوبارہ' بصورت گھر رہا...... جب یہ تمام کچھ لڑھک لُڑھک گیا تو یہ آسودہ سا گھر' محض بالا خانہ بن کر رہ گیا۔''

کوٹھے' چوبارے' بالا خانے میں وہی فرق! جو رہائش مکان اور گھر میں ہوتا ہے۔ محل' کُٹیا' حجرہ بھی...... سرائے' آشرم اور مسافر خانہ...... پناہ گاہ' کمین گاہ' انتظار گاہ......؟ سات بتیا ایکس جمع دو یعنی تیئس تنگ و تاریک ناہموار سیڑھیاں...... کہ علم عرفان' ادب' حکمت و کیمیا' سلوک و معرفت' طریقت و تصوف' مُباہات و ملامت' منطق و فلسفہ' کشف و کرامت' کلام و بیان' عروض و مُغنی اور جمال و جلال کی تحت الثریٰ تا تختِ الثریا کی منزلیں! تختِ ہندوستان کی چشم حشمت کُشا نے ایسی نابغۂ روزگار ہستی بھلا کہاں دیکھی سُنی ہو گی؟ ان سیڑھیوں پہ قدم رکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔''

مَیں نے نیچے اُترنے کے حوالے سے چند جگہیں' کنویں باؤلیاں' غاریں گھپائیں دیکھیں جو گہرائی پُراسراریت کے لحاظ سے پاتال سے بھی نیچے کی خبر لاتی تھیں۔ ان میں مہرولی دہلی کی قدیمی باؤلی جس کے نیچے زیارتی سُرمہ بنانے والے پیدائشی نابینا میاں جی کی معیت میں پہنچا تھا۔ اس کا ذکر'' کاجل کوٹھا'' میں کر چکا

ہوں۔اس طرح روہیلہ کھنڈ' تاراگڑھ کے پہاڑی قلعہ' بھوپال' ڈراوڑ' سیہون' سلیمان تخت (کوئٹہ) روہتاس'
جیسلمیر' ملتان' لاہور' منگلا' تورابورا کی پہاڑیاں......"

میرولی میں قطب مینار کے کھنڈروں کے نیچے اور قدیمی تاریخی علاقوں عمارتوں کے اندر تاریک اندھی
گہرائیوں اور امتدادِ وقت کی پیلی پیلی سریت سے لتھڑی ہوئی خاموشی سے مملو کیسی کیسی داستانیں ہوں گی......
جن تک کبھی کسی کی رسائی نہ ہوئی ہوگی......؟

کائنات کا ایک اُصول یہ بھی کہ اسرار کبھی اسرار نہیں رہتا' آشکار ہو ہی جاتا ہے۔ پردہ محض پڑے
رہنے کا نام نہیں' ہٹنے کا کام بھی ہے۔ خفا اگر خفیہ ہی رہے تو اُس کی کوئی حیثیت ہی نہیں...... علم منطق کا سارا
وجود ہی شاہد شہود اور مشہود پہ قائم ہے۔"

انسانی عقل و بصیرت' فہم و ادراک' قیاس و قیافہ' گرگمان وغیرہ دو دونی چار کے کلیہ پہ کام کرتے ہیں۔
جدھر ہلکی سی ٹیڑھ آئی' وہیں تشکک و تذبذب' اندیشہ و اجتناب پیدا ہوئے۔"

انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ کامل شانت ذرا کم ہی ہوتا ہے...... بکھرا بکھرا سا' شک شبہات میں
پڑے رہنا اس کے وطیرے میں شامل ہے۔ ہزاروں دلیلیں' منطق سامنے روشن ہیں۔ آغاز و انجام کا بھی ادراک
ہے' اندر سے مانتا جانتا بھی ہے مگر وہ پھر بھی خدا کے بارے ڈولا بڈولا سا رہتا ہے۔ اس لئے کہ اُس کی محدود
موٹی عقل پوچھتی ہے کہ وہ موجود ہے تو کسی لبادہ و صورت میں دکھائی کیوں نہیں دیتا' سامنے کیوں نہیں آتا۔
آنکھیں جیسے کسی موجود چیز کو سامنے پاتی ہیں...... وہ ایسے کیوں نہیں ہے؟

انسان تو خدا کو بھی پردے میں نہیں دیکھنا چاہتا...... مگر خدا نے چند دیگر حقیقتوں کے علاوہ' خود کو بھی
پردۂ اخفا میں رکھ کے' تجسس' تدبر' تجز کا ایک جداگانہ سا انداز پیدا فرما کر اس متلون طبع بشر کو مزید آزمائشوں
سے بچا لیا۔"

اسلامی طور طریقوں اور معاشرتی' عائلی روزمرہ کے وظائف میں خاص طور پر خواتین کے حجاب' پردے
کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ اس سے معاشرے میں بے شمار اخلاقی نفسیاتی اور جنسی برائیوں سے بہت حد
تک بچا جا سکتا ہے۔" اب دیکھنا یہ ہے کہ حجاب' پردہ محض جسم اعضاء چہرہ آنکھیں یا سر ڈھانپنے کا نام ہے یا ان
کے ساتھ' عبادات' تعلقات خیالات' رویے' سوچ سمجھ' سماعت نطق و بصر اور دیگر وظیفہ ہائے حیات کے
معمولات میں بھی حجاب کا کوئی تعلق ہے؟ دید شرم پندار بھرم' جو دوام' درشت و نرم' ادراک ذات' عزت نفس'
اخلاق و اخلاص' مروت' مودت' پیار و محبت سب ہی اصل میں حجاب و حذر کا حرز ہی تو ہیں۔؟

ایک وقت بھی ہو گزرا میں عشق کو وہ عشق سمجھتا تھا جو پیار محبت کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ بہت سی

بے خواری' گدھے سواری و بیزاری کے بعد سمجھ آئی کہ پیار و محبت مخض بھرے پیٹ بھرے کھیت کا مشغلہ ہے جبکہ عشق مختلف روگ ہے۔ اس کی بھی دو اقسام سننے پڑھنے کو ملتی ہیں' حقیقی اور مجازی! یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے کبوتروں میں لکا اور شیرازی ہوتے ہیں۔ ایک نٹ کھٹ البیلا غوں غوں غرغوں' سینہ پھیلائے سر اُٹھائے پیچھے پھیلی دُم میں دبے رقصاں و مستاں' انداز جداگانہ' انڈوں بچوں کا کارخانہ۔ دُوجا' حافظ کا شیرازی' نجابت و کردار کا غازی' حیا و نگاہ کی تیغ بازی...... باانداز رُومی باطریقِ رازی...... عرش کا تارا' فرش کا پارا! پیار محبت' چاہت اُلفت کا گہوارہ!

یہ عشق حقیقی اور مجازی... لکا اور شیرازی...... شہید اور غازی ابلق و تازی...... سیاہ نگاہ کی تیغ بازی...... گلابی اور پیازی' خودی و بے نیازی...... خار اشگافی و آئینہ سازی...... کرگسی اور شہبازی' عجمی و حجازی' عباسی و نیازی اور مفتی و قاضی! زندگی کا سفر ایسی ہی غلام گردشوں' محل سراؤں شاہراؤں' پگڈنڈیوں...... خانقاہوں' حجروں' معبدوں کی خاک پھانکتے' نیچے اُونچے اُلانگتے...... اندر باہر تاکتے جھانکتے گزرا...... کوٹھوں چوباروں' بالا خانوں تک پہنچ بھی رہی...... مجرے بھی دیکھے' دھمالیں بھی ڈالیں...... رقصِ درویش بھی...... پابجولاں اور پا مُغیلاں بھی...... کوڑے پڑے' پور پور کٹے...... حق اللہ' علی مولا کے نعرے اور چلّے بھی...... حرم کے پھیرے بھی دیر کے گھیرے بھی...... کوئے یار کی رُسوائیاں' فرقت کے عذاب' قربت کے ثواب...... آرزوئیں' تمنائیں خواب! مگر اصل حقیقت حجاب میں رہی...... کبھی سمجھ نہ آئی کہ اصل اور وصل کہاں سے شروع اور کدھر سے آخر ہوتا ہے؟ سیدھے صاف رستے کے ہر سرے پہ ٹیڑھی میڑھی دکھائی دیتی اور کہیں اُلجھی راہیں کسی سُلجھی ہوئی زُلف کی مانند بال بال ہوتی ہیں؟ یہ سب ورطہ حجاب ہی تو ہے؟ کوششِ بسیار کے باوجود نہ سمجھ میں آنے والا؟

مجھے اعتراف ہے کہ مَیں نہ شاعر ہوں اور نہ گویا موسیقار؟ البتہ! اچھا شعر سُننے سمجھنے کا شعور خُدا نے ضرور عطا کر رکھا ہے۔ اسی طرح سُر گُر کی گُر بیدا اور آواز و انداز کے انگ رنگ میں نغمگی اور شائستگی سے سرشاری کشید کرنے کی نعمت بھی ودیعت پائی...... عروض و معروض' ساز و سنگت کے رُموز و رکھت بھی بُدھی میں آتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ مَیں درمیانہ درجہ کا سُخن فہم اور اعلیٰ قسم کا کن رسیا ہوں۔ ''مَیں شاید یہ کچھ بھی نہ ہوتا اگر اوائل عُمری میں مجھے اپنے وقت کے بڑے بڑے نامور شعراء اور موسیقار' گائکوں کی محافل اور قربتیں نصیب نہ ہوتیں۔ میرا ایسا ہی معاملہ دیگر فنکاروں' اداکاروں مصوروں' رقاصاؤں' صداکاروں اور ادیبوں مدیروں سے بھی رہا۔ اس پہ مُستزاد فقیروں دُرویشوں صُوفیوں کی صُحبتیں بھی کہ جن کی صُحبت و برکت سے مَیں بے خصما اور بے ہتما ہونے سے بچا رہا۔''

بات گاڑھی ہوگئی، دراصل مَیں بتانا چاہ رہا تھا...... مَیں حجاب والے معاملہ سے لاشعوری طور پہ اُس وقت بھی چونکتا تھا جب تصوف کی راہ پہ عملی طور پہ گامزن نہ ہُوا تھا...... یونہی وقت گزاری کی خاطر تک بندیاں کرتا رہتا...... کہانی بھی افسانہ، گیت کہیں ترانہ...... کبھی اکا دُکا شعر؟ کوئی استاد تو تھا نہیں جس سے اصلاح لیتا یا ڈھنگ کا کوئی شعر کہنا سیکھ لیتا۔ ویسے بھی مَیں کوئی شاعر بننا نہیں چاہتا تھا۔ انہی وقتوں میں کچھ نثرِ نظم میں لکھا۔ اندازہ کرلیں کہ یہ کس معیار کا ہوگا؟ شاید آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ معیار کبھی خود بخود اَنجانے میں واقع ہوجاتا ہے...... محنت، کوشش، ہنر و تکنیک اپنی جگہ؟ لیکن کہیں یہ سب کچھ دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے اور کسی اناڑی کی بے تکی بے ہنری سے کوئی ایسا داؤ پلٹا لگ جاتا ہے کہ اناڑی معیاری بن جاتا ہے۔ اِسے تُکّا لگنا کہتے ہیں اور دُنیا کے اکثر بڑے بڑے معیاری کام، چھوٹے چھوٹے تُکّے لگنے سے ہی معرضِ وجود میں آئے۔"

آج تک مَیں یہ جان نہ پایا کہ اُس زمانہ میں لکھے گئے یہ چند الفاظ، کسی شعر کی ذیل میں آتے ہیں یا تک بندی تک ہی محدود ہیں۔

؎ حُسن زیرِ نقاب ہوتا ہے   جلوہ جلوہ حجاب ہوتا ہے

اگر یہ شعر میرے "مطلعِ ادراک" پہ خود بخود موزوں ہُوا تو پھر وہی باتیں تھیں...... اتفاقیہ تک بندی یا اذہان وا جتہد پہ حجب وخفِ کی کوئی نئی پرت؟

جانا اور دیکھا تو یہی تھا کہ حقیقت، علم عشق اور اسرار بھی اوٹ میں نہیں رہتے۔ لیکن کبھی کہیں کوئی مجازی شق شکل یوں بھی سامنے آجاتی ہے کہ یہ آڑ میں آجاتے ہیں۔" اقبال کی "حقیقتِ منتظر" اور "لباسِ مجاز" کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔" مگر میرا ذاتی تجزیہ، مشاہدہ کچھ اور ہی دِکھاتا ہے کہ حقیقت، علم عشق اور اسرار، "لباسِ مجاز" میں اکثر کم ہی رہتے ہیں بلکہ تجلہ، حجاب میں کچھ زیادہ ہی روشن ہوتے ہیں۔"

گھونگھٹا گھوم اور چک چلمن کی اوٹ چھپنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے چاند چہرے، بس بھری کٹیلی آنکھیں، تھرتھراتے ہوئے نیم وا عناب لب، گلاب گال، لو لگاتی ہوئی کانوں کی لویں، کیا کیا لگائی بجھائی کرتے ہیں، یہ تو کچھ مخصوص مسلک مجاز وحقیقت کی مَس جس رکھنے والے ہی جانتے ہیں۔"

جو خشک وتر اثمار حجاب میں رہتے ہیں وہ اپنی خیر "خوشبو" لذت و برکت، افادیت وغذائیت بچا کر رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں، غور کریں کہ اگر انسان بھی ٹرانسپیرنٹ مچھلیوں کی مانند، یوں شفاف ہوتا کہ انسانی آنکھ آر پار، جسم کے اعضاء کی تمام کارکردگی...... آنتیں، بافتیں، وریدیں اور اندر پڑا سڑا بھسا مال مسالہ، کالے چٹے کیڑے، بدبو چھوڑتی ہوئی رطوبتیں...... حرام حلال مغز، خون، پیپ، بول و براز...... صاف صاف سامنے دیکھ سکتی تو کیا حال ہوتا؟ پوست پنجر استخواں اور لباس کا حجاب دے کر ظاہری نظر سے اوجھل کردیا۔"

تارِ نفس کی تانت جو قلب کے قلب میں تھلبلی تو نہا چھیڑتی ہے...... جذبات واحساسات...... اخلاص واخلاق کے رَوّیے...... نیتوں' سوچوں کے منبئے...... پیار ومحبت کے لُطف وکرم' ذرا زیرِ ظرف وظن رکھ کر زبوں حالی سے بچایا۔"

یار کو جلوہ دکھایا تو درمیان میں فلٹر بھی رکھ دیا' یہ سمجھانے کے لیے کہ "حقیقت" پردہ نشیں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کسی شکل وصورت' قد وقامت' جسم وجان' تانیث وتذکیر' نور ونار' ارضی سماوی' عربی وعجمی' آقا یا غلام کی تمیز یا تخصیص نہیں ہوتی۔"

جنسِ ثقیل کے لئے پردہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں لیکن صنفِ لطیف کے لئے چہرے جسم کا حجاب' شاید اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسی کی نسوانی رعنائی' نزاکت ولطافت اچھی بُری نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہیں جس سے بگاڑ پیدا ہونے کے خدشات اُبھرتے ہیں۔" ایسے ہی جیسے میٹھی رسیلی مہک آور خورد ونوش کی اشیاء پہ مکھیاں مچھر جمع ہو جاتے ہیں...... لوہے لکڑی کے کارخانوں میں چُوہے چلپاسے نہیں ہوتے کہ غذائی رطوبت اور راتب نہیں ہوتا۔" کریانے اجناس' حلوائیوں کی دکانوں اور ہوٹلوں میں اسی لئے چُوہے' بلیاں چھپکلیاں کیڑے مکوڑے زیادہ ہوتے ہیں کہ وہاں حِجاب پردہ نہیں ہوتا۔ کھانے پینے کترنے کی غذائی اجناس' مٹھاس اور اشتہا پیدا کرنے والی اشیاء کی فراوانی ہوتی ہے۔"

موسیقی اور اس سے متعلق ہر صنف بھی خوشبودار شیرے کی طرح ہوتی ہے کہ جدھر کچھ میٹھا میٹھا ہوتا ہے...... مکھیاں اُدھر پہنچ لیتی ہیں۔ "مَیں بھی ایک فضول سا کن رَسیا! کان میں ہلکی سی بھنک پڑنے کی دیر ہوتی ہے اور مَیں' نیند کی حالت میں آوارہ گردی کرنے والے مریض کی طرح' بے خود سا اُدھر ہو لیتا ہوں۔" کومل سی کوئی سُر!...... اُچٹتا سا کوئی الاپ...... مہین سی مُرکی' تڑپتے ہوئے تان پلٹے...... پھندے بہلاوے مور چھنے سُرتیاں...... دھرپد' دادرا' کجری ٹھمری' چوتی بربا' بارہ ماسی بناری رنگ' خیال کافی غزل قول قلبانہ...... کیا کیا لکھوں؟ کس کس پہ سر دُھنوں! کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے..اے کاش! مَیں بھی کہیں نامی گرامی ...... "اُستاد بڑے یحییٰ خان صاحب سیالکوٹ گھرانے والا" ہوتا؟ مَن چاہے راگ راگنیاں گاتا بجاتا' ایجاد کرتا۔ گود میں سُرمنڈل! بائیں جانب طبلہ پہ اُستاد اللہ رکھا...... ستار پہ اُستاد روی شنکر۔ سورنگی پہ اُستاد شریف خان پُونچھ والے اور شہنائی پہ اُستاد بسم اللہ خان صاحب اور پیچھے دو مہ وشیں! تانپوروں کو چھیڑتی ہوئیں......"

مولوی صاحب' موسیقی کے علم ورموز پہ گہری دسترس رکھتے تھے اور بلا کے کن رَسیلے بھی! اچھے اچھے گویوں قوالوں سے دوستی تھی۔ سماع کا شغف' گھٹی میں اُترا ہوا تھا...... شعر وسخن' لے کاری اور آلاتِ موسیقی کی ایسی سوجھ بوجھ تھی کہ اچھے اچھے کلاونت قوال' رُو برو کان پکڑے بیٹھتے تھے۔"

کہتے ہیں کہ ۔ بچھو سانپ اور آنکھ کی طرح 'شعر' بول اور سُر بھی کبھی کبھی کاٹ لیتے ہیں اور ایسا گہرا گھاؤ لگاتے ہیں کہ مضروب 'مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔'' مولانا! سماع کے دوران اکثر پھنس جاتے اور ایسا پھنستے کہ واپس نکلنا مشکل پڑ جاتا۔ آپے سے باہر ہو جاتے ...... جیب کھیسہ اُلٹا کر دیتے ...... انگوٹھیاں قیمتی تسبیحاں' تن کے کپڑے جُوتے' ٹوپی سب کچھ نذر کر دیئے۔''

اکثر غرض' سماع کی محفلوں سے واپس لوٹتے تو یہ حالت ہوتی کہ خالی تہبند' پائجامہ میں پہنچے ہوئے ہوتے۔ باقی تمام اُتار کر قوالوں کی نذر کر آتے ہیں؟ اُن کی اکلوتی شادی بھی اسی عادت کی نذر ہو گئی تھی کہ پھر کبھی شادی کی غلطی نہ کی۔'' کسی سماع کی محفل سے فجر کی اذان سے کچھ پہلے گھر لوٹے۔ حالت یہ تہبند کے علاوہ تن پہ کچھ نہ تھا کہ نقدی اور تمام کپڑے بھی اُتار کر قوالوں کی نذر کر آئے تھے ...... سیڑھیاں چڑھے؟ سامنے بیگم' وضو کر رہی تھی۔ اِن کے نگیز پہ نظر پڑی تو بیساختہ منہ سے نکل گیا۔'' یہ تہبند بھی اُتار کر دے آتے۔'' بات تو سچ تھی مگر اس کے ضمیر میں چھپی ہوئی رُسوائی' اُنہیں چاٹ گئی۔''

بس! یہیں اور اک ہُوا کہ کسی ''مجنّس'' عورت کے لئے کسی علامہ دہر' فقیر کامل یا رَجل رشید کا ''شریکِ حیات'' ہونے کا شرف حاصل کرنا کتنا مشکل ہے! ازدواجی رشتہ قطع کر لیا ...... پھر دوبارہ کہیں نکاح نہ کیا۔'' دَرویش گردن تو کٹوا سکتا ہے مگر طنز اور اوچھی بات یا چوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔''

مولانا کی بات! موسیقی' سماع کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ اس فنونِ لطیفہ اور سعیدہ کے بارے' ان کا ذوق نہایت ہی بلیغ تھا ...... کسی کم سوادے نہ بخی اور نہ ہی کسی بیٹلے کو ان کی سیڑھیوں تک رسائی حاصل تھی۔'' آنے جانے والوں کی خوشبو بد بُو اچھائی برائی' قد کاٹھ' ظرف زمن کی نمونہ' نومنہ' وہ اُوپر اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے محسوس کر لیا کرتے تھے کسی کا قدم غلط پڑتے ہی وہ اُوپر سے ہانکا لگا دیا کرتے ...... اللہ خوش رکھے! مزید ایک سیڑھی بھی اُوپر مت چڑھیے گا ...... اتنے قدم ہی آپ کے نصیب میں تھے۔''

یہ بھی سُنا ہے کہ اُن اَردل میں غیر مرئی ہستیاں رہتی تھیں۔ جو اُن کے اشارۂ اَبرو پہ حُکم بجالاتیں۔'' ہمزاد موکلات حاضرات اور جنّات سے اُن کے یارانے اور کئی ایک تلمیذ میں بھی تھے۔'' دیکھنے کہنے سُننے میں وہ تیل بیچتے تھے ...... عطریات اور خوشبوؤں والے تیل' کچھ خاص تیل بھی ...... جو وہ اپنے کسی خاص الخاص صدری نسخوں سے تیار کرتے ...... عرق النساء' شقیقہ' بالچڑ' دماغ کی کمزوری' ریشہ' بالوں میں گنج' قبل از وقت سفیدی کا نمودار ہونا ...... اِن امراض کا علاج بھی کرتے۔'' داڑھی' مونچھ' صفاچٹ' اَبرو قائم ...... اور صحتمندی دائم! بیچتے بیچاتے بھی کہیں ہوں گے ...... اکثر فراخ مندی اور چونچالی سے دھرنا دیئے آرام فرما دکھائی دیتے۔ بشرے سے پوشاک سے کسی طور'' تیلی'' جاپ نہ پڑتے تھے ...... بدیاؤں کی مدھرتا بھرے نقافی لوچن بہے

مخمور سے رہتے ...... جیسے سدا کی پی رکھی ہو ......؟

اِک زمانہ اُدھر کا قصّہ؟ جب میری ریش میں تھوبا چاندی کی بے داغ نقراہٹ نہیں اُتری تھی اور داڑھوں کی دریدہ دراڑوں میں اجنتا ایلورہ کی مانند لمبی لمبی کھوویں غاریں دریافت نہیں ہوئی تھیں ...... چہرے بازوؤں اور جسم کے عجیب و غریب حصّوں پہ "بے فضول" "مُوکے تل، چٹے، جھُگنیاں" سُرخ نیلے نشان اُبھر یئے بھی مجھے ڈرانے اور موت یاد دلانے کے لئے نمودار نہیں ہوئے تھے؟ ایک سٹرلنگ پونڈ میں چھ گیلن پٹرول اور ہاف کراؤن سِکّے میں بنسن ہیجز' بیس سگریٹ والا پیکٹ اور "لوپاک مکھّن" آدھے پاؤنڈ وزن کا پیکٹ مل جایا کرتا تھا۔"

اپنے جیسے ایک منگ تلنگ ساتھی سے سُو بلی کہ مانچسٹر میں ایک عجب حُلیہ حال والے قوّال کا ایک پروگرام ہو رہا ہے ...... مگر؟

مگر کیا؟ ...... مَیں نے پوچھا!

پروگرام پرائیویٹ نوعیت کا ہے۔ سویٹز بُنیاں بنانے والی ایک فیکٹری کے مالک نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کے موقع پر اسے بُلایا ہے۔ جس میں صرف خصوصی مہمان ہی شریک ہوں گے۔"

قوّال کا نام پوچھا تو معلوم ہُوا ...... عزیز میاں قوّال ہیں جن کی وجہِ شہرت' قوالی کم اور اللہ میاں سے لڑائی زیادہ ہے۔ قوّال' تو وہ سرے سے ہی دکھائی نہیں دیتا ...... عجیب و غریب گول مٹول گھگنا سا' ایک عام گلی محلّے والا' روزمرّہ کا آدمی؟ بیٹھا ہُوا کتابوں کا انبار اور آستادہ ہو قلموں کا منشا دکھائی دیتا ہے۔ "منہ کلہّ لب' باگھ کی طرح سُرخ ...... کہ ڈبل چونا کتھا' شاہجہانی قوام اور زردہ پتّی جب سانچی کے پتّے پہ اپنے رنگ ڈھنگ گھولتے کھولتے ہیں تو لگتا ہے کہ مُوصوف نے خونِ خرگوش سے گُم غرارے کیے ہوئے ہیں۔ اکثر ایسے کہ مقابل مُخاطب کھڑا اپنی سفید پوشی کا بھرم بچانے کی خاطر ایک ڈیڑھ قدم پیچھے ہولیا۔"

سِکّہ بند مخصوص قوالوں کی طرح' اِن میں وقتی بے وقتی جی حضوری' منافقانہ خوشامدانہ گفتگو ...... "مولا خوش رکھے" آہا' واہ واہ اور آنکھوں میں حریصانہ چمک اور پُھرتی تیزی بھی نہ تھی جو جیبوں اور ہاتھوں میں جکڑے کرنسی کے نوٹوں کو دیکھ کر عود آتی ہے۔" وہ پہلی نظر میں کوئی عالم فاضل' فلاسفر یا کوئی سکالر بھی محسوس نہ ہوتے ...... زیادہ سے زیادہ ٹوٹی ہڈیاں' جوڑ بٹھانے والا یا کوئی زود گو اُجرتی شاعر! جو شادی بیاہ کے موقع پہ سہرے' تعریفی اشعار' ہجو کہنے پہ کھُلی داد اور زربفت کی بند تھیلی پاتے ہیں جس میں سِکّہ رائج الوقت کے چند مُہرے سمٹے پڑے ہوتے ہیں۔"

آپ انہیں دیکھ کر کوئی حکیم حاذق بھی سمجھ سکتے تھے جن کا کل اثاثہ اور علم ...... ایک آدھ کوئی صدری

نسخہ ہی ہوتا ہے۔" سرمہ سے لتھڑی ہوئی آنکھیں۔ فراخ ماتھا' چپڑی سنوری ہوئی دراز زلفیں' متبسم مکھڑا...... بلا کے زود حس اور جاذب! وہ عملاً تمام عمر' ایک طالب علم ہی رہے۔" اُن کی شناخت اور نمایاں خوبی' بلا کی یادداشت' روانی اور تندی تیزی تھی۔ کلام اور دوران سماع' وہ اِک عالمِ بیخودی میں ہوتے...... انہیں کچھ ہوش نہ رہتا...... اُکڑوں بیٹھ جاتے...... کھڑے بھی ہو جاتے۔ باجا' بیچارہ خود ہی بج رہا ہے۔ سنگت میں بیٹھے ہوؤں کا بُرا حال' تالیاں تپا تپا کر' ہاتھ چہرے تپتے ہوئے حواس باختہ۔" سامعین میں کئی ایک کو اختلاج کے دورے پڑ جاتے۔ کچھ کمزور دل و اعصاب کے مالک! احتیاطاً' سامنے سے اُٹھ کر دور ہو جاتے یا چلے جاتے کہ ان پہ ہذیان اور جنون طاری ہو جاتا۔" اکثر پروگرام کے بعد باجا بیچارہ بدلنا پڑتا کہ اس کا آ متا پتا تباہ ہو کر رہ جاتا...... اُس کی سُر میں سُرتیاں' سُن ہو کر رہ جاتیں۔!

گردن غائب' ہاتھ بازو پاؤں چھوٹے چھوٹے...... مگر علم اور حلم کے معاملہ میں وہ بے حد بڑے تھے۔" حافظ' جامی' خسروؔ' رازی سعدی' رومی رازی اور دیگر بڑے بڑے...... اُن کے اندر' روح میں اُترے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے اُستادوں' ولیوں کاملوں عالموں کی صحبتوں میں بیٹھے...... زانوئے تلمذ طے کیا...... کسب فیض حاصل کیا...... جبکہ کثیر المطالعہ بھی اور کثیر الازواج و اولاد بھی۔؟

اُن میں پیشہ ور قوالوں والی جیسی تیز طراریاں' ناز نخرے اور رنگ ڈھنگ نہ تھے۔ اِک دُنیا اُن کی دیوانی تھی...... اُن کے پڑھنے' پیشکاری کا انداز جداگانہ تھا' کلام کا انتخاب اور پھر سمجھا سمجھا' دکھا دکھا کر ایک ایک لفظ کی تفسیر و تقطیع کر کے ماخذ و مَعنی کو سامعین کی روح میں اُتار دیتے' یہی اُن کا فن' مشن اور کارنامہ تھا۔" صاف لگتا تھا وہ باجے طبلے سارنگی والے قوال نہیں...... بخارا سمرقند بغداد و دمشق...... قونیہ شریف یا ملتان شریف کی کسی درس گاہ یا حجرے میں تصوف' وحدت' فلسفہ' وحدت الوجود و شہود پہ لیکچر دیتے ہوئے کوئی جنونی اُستاد ہیں۔ جس کے پاس وقت کی تنگی مگر مقصد' اخلاص اور کچھ کر جانے کا جذبہ وافر ہو۔"

ایک قسم سے وہ سولو پروفارمر تھے۔ قوالوں والا تام جھام' سرے سے ہی ناپید! ایک رنڈوا سا ہارمونیم اور بیوہ سی ڈھولک' بس! تین چار ساتھی...... لگتا تھا' کہیں منڈی بہاء الدین سے مُلاقات کی غرض سے آئے تھے' انہیں ساتھ دھر لائے ہیں۔ ڈرے ڈرے سہمے ہوئے...... نہ تو یہ آواز اُٹھاتے ہیں اور نہ ردھم میں تالیاں تپاتے ہیں! صحت مند چہرے' صاف ستھرے دانت' آنکھوں میں جان...... بیٹھے ہوئے لگتے ہیں' ختم شریف میں شرکت کے لئے پہنچے ہیں۔"

قوالی کے درمیان' سامعین کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ بیٹھے رہیں یا کسی بہانہ سے اِدھر سے کھسک لیں! سامعین میں کسی کو اپنی جگہ سے سربلند کرتے دیکھ لیں تو خود باجا چھوڑ کھڑے ہو جاتے

ہیں اُسے بٹھا کر صبر برداشت کی رعایت سے ایک آدھ شعر پڑھ دیتے ہیں۔"

مَیں نے اُن کے چند ایک پروگرام ٹیلیویژن پہ دیکھ سن رکھے تھے...... خدا لگتی کہ مجھے وہ سٹھیائے ہوئے پروفیسر فلاسفر ٹائپ کی کوئی چیز نظر آئے...... قوال ہونے کی تہمت مَیں نے کبھی نہ لگائی تھی۔" مانچسٹر میں اُن کی آمد کا سُن کر مجھ پہ کوئی خاص اثر نہ ہُوا۔ اگر آسانی سے اُن کا پروگرام دیکھنے سُننے کو مل جاتا تو اچھا تھا اگر کسی بھی وجہ ایسا نہ ہو سکتا تھا تو اس سے بھی اچھا کہ ہم تو تسلیم و رضا کے طالبعلم ہیں۔ ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر.....!"

انہی رواں دنوں خوش قسمتی سے مجھے فقیروں' درویشوں کی ایک مجلس میں بیٹھنے کا موقعہ نصیب ہُوا۔ دہلی کی ایک درگاہ کے سجادہ نشین تشریف لائے ہوئے تھے اُن کے اعزاز میں دعوت اور باہمی گفتگو کا اہتمام تھا۔ گفتگو کے درمیان کہیں' ایک صاحب نے کسی ضمن میں عزیز میاں کا نام لے دیا۔ میرے کانوں میں' مَیں شرابی مَیں شرابی کا آہنگ گونجنے لگا کہ دو تین دنوں سے مانچسٹر میں ہونے والے پروگرام میں کسی نہ کسی طرح شرکت کرنے کی کوئی ترکیب سمجھ نہ آ رہی تھی کہ پروگرام پرائیویٹ نوعیت کا تھا۔"

مَیں نے مزید سُن لینے کی خاطر' عزیز میاں والی بات کو بڑھاوا دیا۔ دہلی والے حضرت صاحب نے انکشاف کیا کہ عزیز میاں' ایک لمبا زمانہ دہلی میں مقیم رہے اس قیام کے دوران وہ مولانا عبدالسلام دہلوی قبلہ سے فتوحاتِ مکیہ کی تحصیل کر رہے تھے۔ اس کے بعد اُنہوں نے مشاہیر اور علمائے ایرانیاں اور مزید موسیقی کے اسرار و رموز مُباحات و سماعات کا علم حاصل کیا۔" عزیز میاں' مولانا کو بے حد مانتے تھے۔ قلندری مشرب کے علماء و فقراء کا سرخیل گردانتے۔ زندگی بھر قلبی روحانی ارادت کا سلسلہ قائم رکھا۔" میرا جہاں تک بھی عزیز میاں سے تعلق رہا اور اُنہیں ظاہری باطنی طور سمجھا' مجھے ان کے مزاج' قول و فعل' رویّوں اور علمی روحانی قدروں اور فکری معاملات کے سلسلے مولانا تک دراز ہوتے نظر آئے۔"

مَیں تو پہلے سے ہی مولانا کا دیوانہ تھا دہلی میں زیادہ سے زیادہ قیام کی ایک نمایاں وجہ مولانا کی ذات' اُن کے بارے معلومات کرنا۔ اُن بزرگوں' جگہوں کو تلاش کرنا' جن کا کسی نہ کسی طور اُن سے تعلق رہا۔ اُن پرانی اور بدلی ہوئی دوکانوں' مزاروں اور گوداموں تک بھی پہنچا' جدھر کبھی جایا کرتے تھے۔ مجھے ایک خیاط ملا۔ جس کے بزرگ' اُن کے کپڑے سیا کرتے تھے۔ اُن کے حجام کے بارے بھی کُرید کی...... یہاں تک اُن دوکانوں' ہوٹلوں تک بھی رسائی حاصل کی' جدھر آپ کبھی خاصہ تناول فرماتے یا نشست کرتے تھے۔ قوالوں کے اُس کُنبے کے بزرگوں سے بھی ملا جو آپ کے منظورِ نظر تھے۔ کچھ ذاتی تحریریں' مسودات' مخطوطے اور تیل وعطریات کارکوں شیشیوں کی خرید کی رسیدیں' آپ کے طالبعلموں کے ہاں' آپ کے ہاتھ کے اصلاح شدہ اوراق و اسباق وغیرہ۔ غرضیکہ مَیں نے حتی الوسع' اُن کی شخصیت' اہلیت' تفکر تدبر' منزل مقام' مشرب' مقصد' جاننے سمجھنے

کی سعی کی۔"

افسوس کہ مَیں اُن کے بڑھاپے میں ابھی اپنے لڑکپن سے ہی فارغ نہیں ہُوا تھا۔ ذہنی فکری اعتبار سے بھی بے شناخت تھا...... اور جب مَیں ابھی بمشکل اپنے بچپن کے کچے پَن سے باہر نکلا تو وہ اپنے مقصد اور حیات کے پکّے اور سچے راستے پہ نکل لیئے۔"

خوش بختی! کچھ تگ و دو سے اُن کے ہاتھ کے تحریر کردہ چند اَوراق میرے ہاتھ لگ گئے۔ ان اوراق اور تحریر کی صحت کی تصدیق' مولانا ماہر القادری اور شاہد دہلوی سے بھی ہوگئی کہ اُن کے ہاں بھی مولانا موصوف کے چند ایک مکمل اور اَدھورے مسودے اور مخطوطے محفوظ تھے۔"

مضمون کا کوئی سر پیر نہ تھا...... تحقیقی مقالہ تھا فلسفۂ وحدت الوجود پہ...... "لکھے موسیٰ پڑھے خُدا" مجھ ایسے کوڑھ مغز کے کچھ پلّے نہ پڑا...... اندازِ تحریر بھی ایسا جناتی کہ میرے بس سے باہر......!

میرے سر پہ اک سودا' سوار تھا...... بازار میں چوبارے کے سامنے' بے تکا سا کھڑا دیکھتا رہتا۔ سیڑھیوں والا دروازہ' جس کا ایک پٹ لٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کے آگے اندھیرا کہ کچھ دکھائی نہ دیتا۔ یہ وہی بختوں والا دروازہ اور سیڑھیاں تھیں...... جنہوں نے اپنے عصر کے بہت بڑے بڑے نوابوں راجاؤں' سیاستدانوں' عالموں' ذی شانوں کو سہمے ہوئے باادب اِدھر آتے جاتے دیکھا۔ اپنے وقت کا وہ کون سا دانشور' فقیہہ' فنکار اور طُرم خان تھا جو اِدھر جھک کر نہ پہنچتا تھا۔" ابوالکلام جیسا عالم' مدبر' سیاستدان مصنف ہو یا ذاکر حسین' جواہر لعل نہرو' چیدہ چیدہ ریاستوں کے راجے مہاراجے' حیدرآباد کے سرکاری اہلکار' شاعر گوئیے موسیقار فلموں والے' بڑے بڑے سیٹھ' اربابِ نشاط اور چھوٹے چھوٹے بازاری لوگ! وہ ہفت رُخا' روشن چراغ تھے جس کی علمی روحانی اور انسانی ضوفشانی سے اک عالم منّور تھا۔" بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ دہلی نے نیازی' قادری' ملامتی اور قلندری سلسلہ میں رنگا' ہوا ایسا عالم بے بدل' قلندر برحق' ولی کامل' فقیر بے گلیم' فقیر بے ریا' بندۂ خدا جیسا چشمِ فلک نے پھر کبھی نہ دیکھا؟

درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین.. میرے لئے روحانیت کا ایک ایسا دریا تھا جدھر پہنچ کر میرا تیرنے کو جی چاہتا جبکہ مہرولی شریف خواجہ قطب الاقطاب حاضر ہو کر ڈبکیاں لینے کے لئے مَن مچلتا...... دریا میں بہاؤ ہوتا ہے' اور جھیل میں ٹھہراؤ! یہ تو بیچ اُترنے والے پہ موقوف کہ وہ بہنا چاہتا ہے یا کہ ٹھہرنا؟ بیرو یا ٹھہرو' بھیگنا تو ہر دو صورت میں ضروری ٹھہرتا ہے بھیگت ہی تو اصل چیز ہے اور بھیکت! کسی بھگوت سے بھیک میں ملتی ہے...... بھیک دُنیا والے سے مانگنا' ذلت ہے۔ دین والے سے مانگو گے تو عزت ہے۔"

میرے "مولانا" والے جنون نے اب ایک روگ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مولانا! کیمیا گری میں بھی

درک رکھتے تھے۔ جو تیل' وہ کشید کرتے' اُس کی ایک مخصوص مہک تھی' چنبیلی' حنا، اور موتیا کی خوشبوؤں کو اگر ایک خاص تناسب سے یکجا کیا جائے تو جملہ حاصل' یہ مہک ہوگی جو مولانا کے ایک خاص نسخہ کے تیل کی پہچان تھی۔'' ایک پُرانے بوڑھے نے بتایا...... میری سُرمہ' کنگھی' وسمہ مہندی' اُبٹن اور عطریات کی دکان' حضرت مولانا کی دکان کے پیچھے ایک تنگ سی گلی میں تھی' زیادہ تر جوان شوخ لڑکیاں اور عورتیں میری گاہک تھیں۔ میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ مَیں کوئی ایسا دل پھینک عاشق مزاج بھی نہ تھا...... شرافت' گھٹی میں تھی۔ ہر گاہک' عورت یا مرد اخلاق اور نرمی سے پیش آتا تھا۔'' میری مشکل یہ بنی کہ اسی علاقہ کی ایک شوخ شنگ جوان خوبصورت لڑکی' یک طرفہ مجھ سے دلچسپی کا اظہار کرنے لگی۔''

دکاندار' دکانداری کرتے کرتے خود بھی ایک تجربہ کار انسان بن جاتا ہے۔ گاہک کو اِک نظر میں پہچان لیتا ہے۔ مجھے محسوس ہُوا کہ یہ لڑکی' خوامخواہ میرے لئے کوئی مصیبت کھڑی کرے گی۔ یہی ہُوا کہ وہ وقت بے وقت' ضرورت' بغیر ضرورت دکان پہ آنے لگی اور مجھ سے لگاوٹ جتانے لگی۔'' بڑی کوشش کی کہ اس سے جان بچی رہے مگر وہ تو جیسے تہیہ طوفان کیئے ہوئے تھی۔ میں جتنا پیچھے ہٹتا وہ اُتنا ہی آگے بڑھتی...... آخر ایک دن اُس نے مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔ میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ پچھتانے لگا ایسی دکانداری' کی ہی کیوں؟ جس کا دارومدار لڑکیوں عورتوں پہ ہو؟

ابھی ایک دو دنوں کے درمیان' مَیں خوشبودار تیل کی چند شیشیوں کی خرید کے لیے حضرت مولانا کی دوکان پہ پہنچا۔'' اسی بازار علاقہ میں کاروبار' محلّہ مسجد داری کی بناء پہ اُن سے مناسب سی یاداللہ تھی...... دوپہر ڈھلی ہوئی موہڑے پہ دھرے' پنکھا جھل رہے ہیں لُو کا زور ابھی ہلکا نہ ہُوا تھا۔ گرمی کے دنوں یہ وقت بڑا کٹھن ہوتا ہے' طبیعت اَوبی سی' جی مالش کرتا ہے۔ قیلولہ کا قیام بھی نہیں کہ عصر کا وضو سدلگا ہوتا ہے۔'' احساس ہُوا کہ کُھنچے وقت پہنچا ہوں...... ابھی نہیں آنا چاہیے۔ لوٹنے کا ارادہ کرلیا کہ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا۔

وہیں سے دہاڑے ! اَبے مستقیم! کہاں جارہا ہے؟ اِدھر آ!

مَیں نے سلام کرکے تیل کا بتایا کہ آدھا درجن شیشیاں لینے آیا تھا۔''

تو لیتے جاؤ! بیچو گے تو خریدو گے بھی! چپڑی روٹی ٹکڑا ہوگا تو چیونٹیاں بھی پہنچے گی...... لوہے لاٹ کے گودام میں کوئی لالی' لاجونتی تو آنے سے رہی اور جدھر سُرمہ مِسّی عطر پھلیل بِکے گا' اُدھر کوئی بھڑ بھونجا' قصاب اور رنگریز تو آنے سے رہے...... وہاں تو دل ہاریاں اور پُھلیاریاں ہی پہنچیں گی۔ شریف بچے ہو...... تمہارا باپ سراج الدین پنج وقتہ نمازی اور حاجی ہے...... مجھے مِلے گا تو تمہارے نکاح کا کہہ دوں گا؟......

معلوم ہُوا کہ پیشہ! انسان کی زندگی' روزمرّہ' طبیعت مزاج اور سوچ وخیالات پہ اچھا خاصا اثرانداز

ہوتا ہے۔ ہر چیز' جستجو' فکر خیال احساس' یہاں تک خواہش' آرزو اور عشق مشک کی بھی اپنی اپنی مہک خوشبو' بدبو ہوتی ہے۔ لیکن ہر کسی کے ہاں ایسا ناک یا حسِ شامہ نہیں ہوتے کہ ان لطافتوں' نزاکتوں اور شرافتوں کا ادراک کر سکے۔" مولانا کے ہاں' حسنِ جمال' کمال کی تھی وہ ہر ساعت' خوشبوؤں میں بسے رہتے تھے۔" کہتے ہیں کہ جدھر کوئی انتہا ہو جاتی ہے وہیں تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے مزاج کی تلخی' طبیعت کی کڑواہٹ' روزمرہ کی گفتگو میں اُکتاہٹ اور مردم بیزاری بھی شاید اسی حد سے بڑھی ہوئی نفاست و لطافت کا ردِّ عمل تھا۔"

کہا جاتا ہے کہ انسان جو ظاہر کرتا ہے وہ اُس کا اصل نہیں ہوتا۔ دکھاوؤں' بناوٹوں اور ہر لحظہ ہر پل' اداکاری کرتا ہوا انسان' خود اپنے روبرو بھی اپنی اصلی حالت میں نہیں ہوتا۔ وہ نام نہاد رواداریوں' مصلحتوں اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رویوں کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں شاید یہ دُنیاداری' رواداری یا طرحداری ہوتی ہو مگر یہ سب کچھ اس کے دل و دماغ کے اندھیرے اُجالے ہیں۔" میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جس جگہ کسی کی موت واقع ہو جائے یا کوئی جنم لے لے۔ اُس جگہ ایک نامحسوس سی خوشبو یا بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اللہ کریم نے اپنے مخصوص بندوں اور کچھ جانور پرندوں کو یہ حس بخشی ہے کہ وہ اسے محسوس کر سکیں۔" بہت سے جانور ایسے کہ وہ زمین میں گہری دبی ہوئی خوراک کو' اُوپر ہی سے سونگھ لیتے ہیں اور پھر کھدائی کر کے اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔ انسانوں میں سونگھے ہوتے ہیں جو زمین کے اُوپر کھڑے لمبی گہرائیوں میں نیچے کھارے یا میٹھے پانی' معدنیات گیس' تیل یا کسی مدفون خزانے کی نشاندہی کر لیتے ہیں۔ مٹی ریت' پتھر چٹانیں' پانی کیا کچھ درمیان نہیں ہوتا لیکن اللہ کریم کی عطا کی ہوئی اس قوت سے زمین کی گہرائیوں میں دبی نعمتوں کی خوشبو' بدبو سونگھ لیتے ہیں۔ اُن کے اندازے ننانوے فیصد درست ہوتے ہیں۔"

دہلی میں' بستی نظام الدین' مہرولی اور جامع مسجد' یہ تینوں مقامات میرے محور ہوا کرتے تھے۔ بعداً ایک وقت ایسا بھی آیا مجھے شدت سے احساس ہوا کہ نہائت نامعقول احمق ہوں۔ مجھے اِدھر ترکمان دروازے کے اندرون محلہ قبرستان' گلی کالی مسجد کے پاس ہوا تیلی کی دکان کے اوپر والے چوبارے والے" اللہ بیلی" سے پہلے تالو پہ تصوف کا تیل چسوانا چاہیے تھا...... تاکہ دماغ سے تفلگ' تشتت اور ترفع تو جاتا رہتا..؟ بھنا سے ایسی منکی بھرلانے سے کیا حاصل! جس کے بھیتر چھپکلیوں کے گندے سڑے انڈے سڑانڈ چھوڑ رہے ہوں۔ کوئی بھی شہر ہو' عصر کے شہریار کو توال شہر' قاضی القضاۃ فقیہہ شہر اور فقیرِ شہر بھی تو ہوتے ہیں۔ ان پانچوں مناصب کے سزاوار صرف اور صرف مولانا ہی تھے۔ ورنہ راجد ھانی میں کیا نہ تھا اور کون نہ تھا......؟

علامہ کے عصر آفریں' مولانا محمد ایوب' محمد علی جوہر' شوکت علی' مولانا احمد سعید ناظم' مسلم نظامی' مولانا حسین احمد مدنی' جوش ملیح آبادی' پطرس بخاری' اخلاق احمد دہلوی' شاہد احمد دہلوی' ڈاکٹر راجندر پرشاد'

مفتی کفایت اللہ' ابوکلام آزاد' سید ابوالخیر مودودی' سید ابوالاعلیٰ مودودی' حسن نظامی' پنڈت نہرو اور بھی بہت یکتائے روزگار! عالم محقق' ادیب شاعر' قوال موسیقار' مصور' فلاسفر' ولی' قطب' ابدال...... سب کچھ تھا؟ مگر وہ خود اک یکتائے دانائے راز تھے۔"

مَیں اُن کی حیات ظاہری مَیں نیاز حاصل نہ کر سکا! یہ بھی تو اچھا ہی ہُوا کہ اُن کی زادِ نگاہ کی راہ میں نہ آیا۔ ورنہ میری جہالت' کج فہمی اور بے اوقاتی پہ وہ بے بھاؤ کی پڑتیں کہ اُن کے کہنے کو سننے اور میرے سمجھنے سننے کا ریکارڈ ٹوٹ جاتا۔" اِنسان کی فطرت میں شامل ہے اگر ایک جانب سے ناکام رہتا ہے تو کسی اور طرف سے پھر کوشش کرتا ہے۔" چوہا' چور' چیچک اور" چغل" بندہ! یہ چاروں تھوک تھاک اپنا کام دکھا کر ہی رہتے ہیں...حالات' موسم موقع' کوئی نہ کوئی ترکیب طریقہ' ٹونہ ٹوٹکا ان کی معاونت میں رہتا ہی ہے۔"

واپس چلتا ہوں تین چار دہائیوں پہلے انگلستان میں' جدھر مانچسٹر میں' وہاں ایک پاکستانی صنعتکار کے بیٹے کی شادی پہ عزیز میاں قوال کا پروگرام تھا.... معلوم ہوا کہ صنعتکار صاحب' عزیز میاں کے بہت بڑے مداح اور مرید ہیں۔ سماع کا پروگرام اور ذکر وفکر کی محفل' ذاتی طور کی ہیں۔ خاندان کے علاوہ' باہر سے کسی کی شمولیت ممکن نہیں۔" مَیں عزیز میاں کے بارے کچھ زیادہ معلومات نہ رکھتا تھا۔ اُن کی کچھ چیزیں سُن' دیکھ رکھی تھیں... مگر متاثر ہرگز نہ تھا... بلکہ اُنہیں صحیح سے قوال بھی نہ سمجھتا تھا...... اُن کی بابت ایک بار کہا بھی ...... انہیں یہ برائے نام سا باجا اور ڈھولک تیاگ کر کسی مدرسہ کالج میں' تصوف یا فلسفہ کا اُستاد ہونا چاہیے کہ اِنہوں نے اُردو فارسی عربی وغیرہ میں ایک دو ایم اے کر رکھے ہیں۔"

ان صنعتکار صاحب کو مَیں بھی جانتا تھا۔ انتہائی معقول اور پڑھا لکھا آدمی! چینڈو ہونے کے باوجود حفظِ مراتب اور مجلسی! دردمندی' وطن کی مٹی سے پیار...... اس کی نمایاں پہچان بھی' مگر ان کی عزیز میاں سے پیری مریدی اور شادی کی خوشی کے موقع پہ سماع کی محفل کو محض اپنے خاندان تک محدود کر دینا' سمجھ سے بالا تھا۔" اس شادی میں بھی دو چار دن باقی تھے کہ درویشوں کی ایک محفل میں کسی شخص نے موسیقی اور تصوف کے حوالے سے برسبیلِ تذکرہ عزیز میاں کا نام لے دیا۔ میرے تو کان کھڑے ہو گئے اور جیسے اُس کے نام کی کوئی رگ کھل گئی۔ بات بڑھتے بڑھتے مانچسٹر کے پروگرام اور پیری مریدی تک کھل گئی۔ یہیں ایک اور درویش نے انکشاف کیا...... عزیز میاں تو دہلی والے مولوی عبدالسلام نیازی دہلوی کے تلامذہ میں سے ہیں۔ مولوی صاحب سے انہوں نے فتوحاتِ مکیہ' ایرانیاں' منقول و معقول' موسیقی' عروض و مغنی کی تعلیم لی اور اِک زمانہ آپ کے قدموں میں رہے۔ میرے لئے یہ انکشاف حیران کن تھا......"

مَیں تو پہلے ہی مولوی صاحب کا والا و شیدا تھا...... میری ملامتی درویشی والی ساری رگیں ہی' ان

کے کوچہ ملامت کی جانب کھلتی تھیں۔ وہ تختِ دہلی پہ موجود تھے لیکن مجھے ہی اذنِ نیاز حاصل نہ تھا...... شاید اُن کے تبحر علم، عظمت و منزلت رُعب جلال و جمال کا سامنا کرنے کے میں اہل نہ تھا...... دہلی جاتا بھی تو قبرستان محلے 'ترکمان دروازے کے اندر باہر کا چکر لگا کر واپس آ جاتا...... حالت یہ کہ میری پسلیوں تلے پسینہ آیا ہوتا۔''
یہ وہ زمانہ تھا جب آپ بالاخانہ کے کمرے میں گوشہ نشین تھے۔ اکیس بائیس برس نیچے ہی نہیں اُترے اور نہ ہی دو چار خادموں کچھ عقیدت مندوں اور احباب کے علاوہ کسی سے ملتے تھے۔''

میرے شاطر دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ کسی ذریعہ سے اُن صنعتکار کا ذاتی ٹیلیفون حاصل کر کے اُنہیں اکلوتے بیٹے کی شادی کی مبارک باد اور دُعائیں دیں اور پھر ایک مخلصانہ مشورہ کے طور انتہائی مکاری سے بات بناتے ہوئے بتایا کہ میں بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میرے باپ کو کسی درویش نے سمجھایا تھا کہ اکلوتے بیٹے والوں کو خوشی کے موقع پہ خوب صدقہ خیرات کرنا چاہیے تاکہ اس کے سر کی بلائیں ٹلیں اس کے والدین اور اُسے خوشیاں خوب راس آئیں۔'' سیدھا سادا دیہاتی بندہ تھا۔ میری بات کے جال میں پھنس گیا۔ کہنے لگا خیر خیرات کرتا ہی رہتا ہوں۔ کئی سکول مدرسے شفاخانے' علاقے کے غریبوں کے ماہانے بھی...... اب اس خوشی کے موقع پہ بھی اُس نے دو یتیم بچیوں کو جہیز بنا کر دیا ہے......''
بالکل ٹھیک...... جزاک اللہ! لیکن اصل خیر خیرات وہ ہوتی ہے جو حاضر مال سے فوری طور پہ دی جائے۔ جیسے اگر آپ نے بکرے کے گوشت اور دیسی گھی سے پلاؤ' قورمہ تیار کروایا ہے تو حق یہ ہے کہ پہلی ایک آدھ پلیٹ' اچھی اچھی بوٹیاں سجا کر کسی غریب فقیر کو کھلائی جائے۔ یہ ہے حاضر مال کا حاضر صدقہ خیرات؟ لیکن کھانے والا مستحق ہونا چاہیے!
شریف اور موٹی عقل کھال کا آدمی! فوراً میری چالاکی کے پھندے میں پھنس گیا۔
ہکلا کر پوچھنے لگا؟ میں کچھ واضح طور پر سمجھا نہیں۔ حاضر مال کی خیر خیرات؟
میں نے اگلا تیر نشانے پہ پھینکتے ہوئے کھل کر وضاحت کی...... وہ تو سب کچھ آپ نے پاکستان میں کر دیا...... جبکہ شادی اور خوشی آپ اِدھر مانچسٹر میں کر رہے ہیں۔ اُدھر کا ثواب تو اُدھر رہ گیا...... اب آپ کے لئے حاضر مال کا صدقہ خیرات یہاں مانچسٹر میں نکالنا مستحب ہے کہ اِدھر صدقہ نکالیں اور اُدھر فوراً اس کا ثواب' دولہا دلہن کو مل جائے...... آپ تو جانتے ہیں کہ اِدھر ہمارے ملک کی طرح کے نائی نائنیں تو ہوتی نہیں جو دولہے دلہن کے سروں پہ کھڑی صدقے کے نوٹ پھینکتی ہیں۔ یاد رکھیں یہ حاضر صدقہ بہت ضروری ہوتا۔ شادی والے جوڑے کے مابین محبت' برداشت اور صبر وشکر کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ بہو نسر ساس پہ جان

واری کرتی ہے اور......؟

وہ شاید حاضر مال کے صدقہ کی اہمیت کو کما حقہٗ سمجھ چکے تھے۔ بیچ میں میری بات قطع کرتے ہوئے کہنے لگے۔

میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ آپ اپنے مدرسہ کا پتہ اور اپنا نام نمبر میرے منیجر کو لکھوا دیں۔ میں چیک بھجوا دیتا ہوں۔"

میں نے انہیں ٹیلیفون بند کرنے سے پہلے ہی پھر پکڑ لیا۔ چوہدری صاحب! حاضر مال کا صدقہ حاضر مال سے ہی ہوتا ہے۔ مجھے پیسوں یا چیک کی ضرورت نہیں۔ آپ اُدھر عزیز میاں کا پروگرام کروا رہے ہیں۔ بس! آپ ایک کالے شا کالے لباس والے کو سامعین میں شامل کر لیں۔ صدقہ نکل جائے گا!

کیا میں کسی بندے کو سیاہ لباس پہنوا کر اُدھر بٹھاؤں؟

نہیں! خوشی کے اس موقع پر کسی کو سیاہ کپڑے پہنوانا تو بدشگونی ہوگی! میں جنم جنم سے سیاہ لباس پہننے والے ایک بابے اور اسی حلیہ کے ایک چیلے کو آپ کے ہاں بھجوا دوں گا۔ ان دونوں نظر بٹوؤں کو پروگرام میں بٹھا دیجئے گا۔ انشاءاللہ آپ کے پورے خاندان کا حاضر صدقہ نکل جائے گا...... بس!

چند ثانیے تو وہ خاموش رہا پھر ایک حیرت اور گھمبیرتا میں لتھڑی ہوئی آواز اُبھری! آپ بابا......؟

عزیز میاں کو رات بھر سنا...... مگر یہ سننا وہ پہلے کی طرح کا سننا نہ تھا کہ سماعت اور بصارت دونوں آپس میں یوں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں کہ ان کا علیحدہ علیحدہ مفہوم و ماخذ سمعی و بصری فہمیدگی میں ابہام برپا کر دیتا ہے۔" عام سامع فلسفیانہ انداز فکر کا حامل نہیں ہوتا وہ ایک حد تک کلام یا پھر انداز و ادائیگی کو تو سمجھ پاتا ہے۔ پر کیا کیجئے کہ وہ بیچارہ مضامین کی اُدقیت اور ہائی اسپیڈ موشن و ایکشن میں گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔ بس! یہیں ہلکی سی کامیڈی کا تاثر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔"

پرفارمنس آرٹ میں ایکٹ' ساؤنڈ' لائٹ اور ٹائمنگ اک تیں کی حیثیت رکھتے ہیں مگر عزیز میاں ان بُنیادی ضرورتوں پہ کچھ خاص توجہ نہیں دیتے تھے۔ اُن کا پچاسی فیصد زور' کلام پہ ہوتا ہے۔ اس کلام میں زیادہ تر' اُن کا اپنا ہوتا ہے۔ فارسی عربی' ہندی اُردو' ان کے اپنے گھر کی زبانیں ہیں...... وہ ان کا خوب استعمال کرتے ہیں...... سعدی رُومی جامی' خسرو' اقبال اُن کے من پسند شاعر ہیں...... کبیر داس' میرا' نانک' خواجہ فرید' بلھے شاہ' شاہ حسین' سلطان باھو کے افکار و کلام کی خوب گرہیں کھولتے ہیں۔"

میں نے ان سے خوب راہ و رسم بڑھائی کہ میں زیادہ سے زیادہ مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی کے

بارے جاننا چاہتا تھا۔''بہت سی باتیں نئی معلوم ہوئیں مگر زیادہ تر وہی کچھ تھا جو میں پہلے ہی جانتا تھا۔ لیکن ایک نئی چیز جو انہوں نے مجھے مولانا صاحب سے بے پناہ عقیدت کی بناء پہ بتائی وُہ ایک عمل تھا۔ جو انہوں نے ایک بزرگ سے سیکھا تھا۔ اس عمل یا وظیفہ سے انسان کی حسیات لامسہ اور شامہ کے باطن کھل جاتے ہیں۔ اس موضوع پر پیشتر بھی کسی باب میں لکھ چکا ہوں مگر اس بابت جو کچھ اِن سے جاننا اور سیکھنا نصیب ہُوا وہ یقیناً میرے علم میں اضافہ ہُوا بلکہ میری مولانا سے بالمشافہ مُلاقات نہ ہو سکنے کی جو حسرت تھی اُس کا ازالہ بھی ہُوا تھا۔ بلکہ ایک حد تک ازالہ بھی......!

## ● اللہ جانے کون بشر ہے......؟

عزیز میاں سے میرا ایک ارادت مندی کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان فنِ عقیدت انسان دوستی اور دیگر علمی فکری دلچسپیوں سے قطع نظر...... اِک بڑا حوالہ مولانا سے بے پناہ عقیدت تھا۔ میں عزیز میاں کے ہاتھ آنکھیں چومتا کہ اِن ہاتھوں نے بھی انہیں چھوا ہوگا آنکھوں نے زیارت کی ہوگی! تصویریں کتابیں عطریات اور خوشبویات سے بسے ہوئے رومال اُن کی بخشی ہوئی کتابیں رسالے اور نقدی...... ایک چاندی کی ڈبیا میں اُن کے ناخن اور بال بھی دیکھے۔ گو بری بھی...... اسی نوع کی استعمال کی چیزیں...... جن میں اُن کی خوشبو رچی بسی تھی اور اُن کے تصرفات بھی۔''

حقیقت ہے کہ جس چیز کو کوئی انسان جن جانور چھو لے یا اپنے استعمال میں لے آئے...... جس راہ سے گزر جائے بیٹھ یا لیٹ جائے وہاں اپنی خُو خوشبو بُو شناخت پوری ہسٹری مع اپنی کمزوریوں خوبیوں بیماریوں جنس کی پہچان اور نیت تک چھوڑ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے روحانی وجدانی سائنسی اُصول اُسلوب اور عُلوم وفنون موجود ہیں جن کی مدد سے ہم صدیوں قدیمی محرکات واقعات یا واردات کو کھوج سکتے ہیں کہ اس کائنات میں پتّے کی چشم کی حرکت اور پلکن کے علیحدہ ہونے اور جُڑنے کی آواز بھی ریکارڈ ہو جاتی ہے......'' یہاں تک کہ نیتوں کا سرور اور فتور بھی دُنیا میں جمع ہو جاتا ہے۔'' سمندر میں گزرتا ہُوا جہاز اپنے پیچھے دُور تک اپنی گزرگاہ کی نشاندہی کرتا چلا جاتا ہے کہ وہ پانی چیرتا راستہ بناتا ہُوا اُدھر کے نظام وسکون میں خدشہ وخلل بپا ہُوا اپنی راہ لگتا ہے...... وہی بات کہ کسی کو تھپڑ مارو گے تو روئے چلّائے گا...... تھپڑ کی بازگشت دیر تک گونجتی رہے گی۔ درد سرخی ورم بھی چوٹ کی یاد دلاتا رہے گا۔'' زخم بھلے مندمل ہو جائے محبّت چاہے تو ڑ نہ چڑھے...... لیکن اپنے پیچھے کبھی نہ پیچھا چھوڑنے والے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔''

خوشبوئیں اور بدبوئیں...... ایسے ہی نہیں پیدا ہو جاتیں۔ خوشبوئیں برگزیدہ ہستیوں کی سانسوں' پسینوں' اُن کے پاک پیکروں اور خارج ہونے والی رطوبتوں' آنسوؤں اور چھو کر گزرنے والی ہواؤں' کرنوں اور نگاہوں کی خوش بختی کا جزو ہوتی ہیں۔" پاک نفوس اپنی مخصوص لاہوتی خوشبو سے پہچانے جاتے ہیں۔ آگے درجات ہیں...... اسی طرح ان کی اپنی لہریں بھی ہوتی ہیں جو اُن کے اجسام و وجود کا احاطہ کیے اور پھوٹتی رہتی ہیں...... خوشبوؤں میں عود اور عنبر...... صادق صندل' موتیا موگرا' اگر اور لوبان' مشک اور کستوری...... یہ برگزیدہ نفوس کے مراتب و درجات کے مطابق ہوتی ہیں۔ جیسے ایک ستارہ دو اور تین ستاروں والے۔ اسی طرح ولی' قطب غوث ابدال قلندر' صوفی سالک مجذوب اور فقیر' درویش وغیرہ...... ان میں بلند ترین جو ہوتا ہے' وہ ملامتی فقیر اور درویش ہوتا ہے۔ تصوف کے سرکس میں یہ واحد فنکار ہوتا ہے...... جو آنکھیں پھوڑ' پاؤں توڑ' حق اللہ کہہ کر ڈھیلی ڈوری پہ چڑھ اور چل کر پار اُترتا ہے...... کبھی وہ سربازار بھی تماشا لگا کر لوگ اکٹھے کر لیتا ہے۔ پور پور کٹواتا ہے اور مسکراتا ہے۔" کیا کوئی شام' مصر' کربلا' حلب' بغداد' یروشلم' مکہ' کنعاں کے کوچہ بازاروں' مقتلوں شہادت گہوں میں لگے "عشق تماشے" بھول سکتا یا انہیں بھلایا جا سکتا ہے......؟

صدیوں سے پھیلی ہوئی یہ مشک بیز خوشبوئیں' کائنات کے لئے مشام جاں بنی ہوئی ہیں......" ان کی وجہ سے ہی اس گنبد آبگینہ رنگ میں ثبات و حیات ہے...... ورنہ طاغوتی بدبوئیں تو ہماری شکلیں عقلیں اور علم و اعمال کی فصلیں بگاڑ کر رکھ دیتیں۔" اپنے جسم کی نمود و نمائش کے دلدادہ مختلف ورزشوں اور مراحل سے گزر کر اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں۔ علم و فضل کے خوگر' مدرسوں' معلموں کے متلاشی رہتے ہیں۔ اپنی نظر' سینہ' دماغ اور سوچ' فکر کے بند سوتے کھولنے کے لئے کچھ عملی تگ و دو تو ہوتی ہی ہے۔" کچھ بعد' مجھے ایک صاحب نگاہ سے معلوم ہوا' عزیز میاں صاحب' نہ صرف معروف قوال' مفکر' فلاسفر' ہفت زبان شاعر و نثار ہیں بلکہ وہ ایک جذبہ وفقر کی راہوں کے مسافر بھی ہیں...... بہت سے وجدانی روحانی وظیفے' چلے مجاہدے کرتے رہتے ہیں۔ جنات سے بھی روابط ہیں' حاضرات موکلات بھی حاضری میں رہتے ہیں۔"

اک عجیب سا انکشاف ایک بزرگ نے کیا (یہ بزرگ' ان کے پیر بھائی تھے جن کی کسی بات پہ شک نہیں کیا جا سکتا) کہ عزیز میاں' اکثر جنات کی مجلسوں میں بھی قوالی کی غرض سے جاتے ہیں۔ اس حیران کن انکشاف کی تصدیق میں نے ان سے کرنا چاہی تو انہوں نے حسب طریق مسکراتے ہوئے فرمایا۔"

میاں! مجرائی کو ناویں سے لگت ہوتی ہے...... وہ انسانوں سے ملے یا جنوں سے! مذاق میں کہا یا حقیقت تھی......؟

مزید بتایا' مجھے تو کئی بار شیطان نے بھی مختلف روپ بدل کر بلایا۔ میں اُدھر بھی چلا جاتا ہوں۔"

## • چلو! خاک نشینوں سے مل کر آتے ہیں......!

ایک روز مَیں بضد ہوا کہ مَیں عالمِ رؤیا میں مولانا صاحب کی زیارت کرنا چاہتا ہوں' للہ! میری دستگیری فرمائیں۔

خشمگیں نظروں سے مجھے نکالتے ہوئے قدرے متذبذب ہوتے ہوئے جواب میں کہا' میاں! آپ کے سامنے' مولانا موجود تھے تب آپ نے ایسا نہ چاہا؟

تب مَیں نادان اور اُن کے مرتبہ سے واقف نہ تھا۔ میری رسائی اور آشنائی میں نہ تھے اور یچی بات تو یہ میرے ہاں جراَتِ رندانہ' نہ تھی۔ ''مَیں کراچی رہتے ہوئے بھی دو برس بعد کہیں بمشکل سمندر دیکھنے گیا تھا......وُہ بھی دُور سے! اتنے مہان وشال ساگر کا نظارہ کرنے کے لئے جس وسیع حسِ نظارت اور ظرف کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے ہاں کہاں تھی؟ مَیں تو اب بھی اُن کے تصور سے کانپ جاتا ہوں۔''

اب وہ شاید مزہ لینے کی خاطر پوچھ رہے تھے! ''اب اُن کا سامنا کرنے کی جراَت آ گئی ہے؟''

مَیں نے بھی اُنہی کے رنگ میں جواب دیا۔ کچھ سن وسال میں آگے نکل آیا ہوں...آپ کا وسیلہ میسّر ہوا اور کچھ یہ بچاؤ بھی کہ وہ پردہ فرما گئے ہیں......مزاج کی تیزی کی مرچیں ہلکی پڑ چکی ہوں گئیں اور گالی گلوچ' جوتم پیزاری' مار دھاڑ کا تو عالمِ برزخ میں پرمٹ ہی نہیں ملتا......!

وہ مسکرائے......اُن کا مسکرانا بھی زیرِ لب ہوتا......منہ میں گلوریاں ٹھنسی ہوئیں......منہ کھول کر ہنسنے سے احتیاط کرتے......البتہ باچھوں سے جھانکتی ہوئی پیک سے خبر مل جاتی تھی کہ آپ ہنس رہے ہیں۔'' پیچھے سے اپنی ''زنبیل'' سرکا' آگے کی......موم جامے کے اس تھیلے میں' اُن کا پڑھنے والا کلام' خاص الخاص زعفرانی زردہ' مراد آبادی تمباکو پتّی۔ پان مسالہ' قلم' سروتہ' سرمہ' خوشبویات اور دیگر اُلم غلم ہوتا کہ جس کو آپ غلم اُلم بھی کہہ دیں تو کچھ فرق نہ پڑتا تھا۔'' ایسی زنبیلوں اور کپڑے یا چمڑے کے تھیلوں کے اندر کی دُنیا' بڑی پُراسرار' بھید بھری اور نہ سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے۔ پاتال کی مانند گہری' وسیع اندھیری زنبیلوں کے اسرار' اس کے اندر ہی ہوتے ہیں۔ سُورج کی روشنی' ان کے اندر جانے سے گریزاں رہتی ہے۔ تازہ ہوا قریب نہیں پھٹکتی کہ اندر کے مال و ماحول کو زکام لگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔''

عمرو عیار کی زنبیل' اپنے بعد دُنیا بھر کے حکیموں' شعبدہ گروپ' مداریوں مسخروں' عیاروں' اُچکّوں' رنگ بازوں کی ''جدّ و امجد'' مانی جاتی ہے۔'' بتایا جاتا ہے کہ یہ حضرت! خوامخواہ بدنام ہیں جبکہ یہ نہایت معقول

نستعلیق ہمہ اوصاف خوش طبع شخص تھا...... جو دوسروں کو خوش رکھنے کی خاطر مختلف انداز اختیار کرتا تھا۔ چھوٹے موٹے کرتب' تماشے' بہروپ شعبدے دکھاتا تھا۔ مزاحیہ حرکتیں' جو ملول دلوں کو بشاشت دیتیں۔ لطیفے سُناتا مُنہ سے مختلف ساز بجاتا...... اسی طرح' اس کے پاس' گدھے کے چام کا ایک بوسیدہ سا تھیلا جسے زنبیل بھی کہا جاتا ہے ہوتا تھا۔ اس زنبیل کا چمتکار یہ تھا کہ جو چاہتا' وہ اس کے اندر سے نکل آتا۔ زنبیل کے سائز سے بڑی اشیاء بھی...... اور وہ بھی جو آپس میں ضد ہیں۔ جو ایک ساتھ نہیں رہ سکتی ہر نوع و اعتبار کی قبیل چیزیں۔ اگر ان نکالی ہوئی اشیاء کو جمع کیا جائے تو کسی طرح مانا نہیں جاسکتا تھا کہ یہ تمام کچھ اسی زنبیل سے برآمد ہُوا ہے یا اسے واپس بھی ڈالا جاسکتا ہے۔'' وہ دعوٰے کرتا تھا'میں اپنی زنبیل سے' چاہوں تو ہاتھی بھی نکال سکتا ہوں۔ افسوس کہ میرے مُلک میں ہاتھی نہیں ہوتا۔''

بہت بعد میری بُدھی میں زنبیل اور تھیلے کا فرق سمجھ آیا...... تھیلے میں وہی کچھ سما سکتا ہے جس کے لیے بنایا گیا ہے اور اس کی ایک حد ہے جبکہ زنبیل' ایک ایسی طلسماتی اُوٹ ہے جس میں بلا تمیز و تخصیص ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی شے کو پَردہ دیا جاسکتا ہے۔ مادہ کی ہیئت اور فطرت و جبلّت کو بدل کر اپنی منشا کے مطابق شکل دی جاسکتی ہے۔ ''میں تو بنا ہی اس قسم کے عجائبات اور شعبدے دیکھنے لئے ہوں یا یوں کہہ لیں کہ اتفاقاً میرے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ کارگہہِ حیات اِک تماشا ہی تو ہے۔ ہمارے رُوبرُو اُوٹ اُوٹ نظاہر باطن...... اُوپر نیچے جو کچھ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں بلکہ دیکھتے رہنے پہ مجبور ہیں۔''

بات کرامات کی کہ واقعہ وقوعہ' حادثہ تماشا! سب فِطرت' قدرت کے مظاہر ہیں۔ تعلق علم وفنون یا سائنس حکمت کیمیا کرامت' معجزہ' محبت' آنکھ عقل کا پَردہ! صوت و آواز' روشنی اندھیرا اُجالا یا عکس' سائے کی کوئی کایا مایا...... طلسمون یا فسوں سحر کی کوئی جبر یا خِفت! سب کچھ نیرنگیٔ حیات ہے۔''

مجھے یقین ہے یہ سب تفاوات و تفرقات' ہمیں غور و فکر کرنا سکھاتے ہیں۔ حقیقی اور غیر حقیقی کا تفرق واضح کرتے ہیں...... ہمارے یقین ایمان کی جہتیں مضبوط کرتے ہیں۔ زندگی کی گاڑی آگے' جُتے ہوئے گھوڑے خچر گدھے کی پہچان کرواتے ہیں۔ جو بظاہر چار چار پاؤں' جسم و جسامت' رفتار مکار کارکردگی سے ایک سے ہی دکھائی دیتے ہیں۔''

عزیز میاں کے ہاں فنِ قوالی سے قطع نظر' جراُتِ رندانہ' انداز مستانہ اور خودی میں رنگا ہُوا اِک جُداگانہ رنگ تھا۔ وہ منصور کی مانند دار پہ کھنچ کر اپنے سودا کا مقدمہ پیش کرتے تھے۔'' اکثر لوگ کہتے ہیں وہ قوالی نہیں اپنے خُدا سے لڑائی کرتے ہیں' جو گِلے شکوے کرتے ہیں تو پھر جواب بھی خود ہی دیتے ہیں۔ اُن میں پندار بشریت اور زعم آدمیت کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ اپنی بےبسی اور لاچاری کا رونا' رونے والوں میں سے نہیں

بلکہ ایک قلندرانہ طبع وطبیعت کے مالک تھے۔'' ایسے شہرت یافتہ' ہر دلعزیز فنکاروں کے لاکھوں پرستار ہوتے ہیں۔ انھیں دولت' شہرت' عزت کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ اُن کے پرستار' مداح سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس مقام پہ پہنچ کر انسان میں کچھ غرور' تکبر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ خود کی نظر میں' اپنی اہمیت اور مقبولیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ انا' خود پسندی' خود نمائی در آتی ہے...... ملنے جلنے والوں اور پرستاروں کے معاملہ میں ذرا سخت ہو جاتے ہیں۔ اُن اخلاق واخلاص میں کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے ساری حیاتی' ان چھوٹے بڑے فنکاروں میں یہی کچھ دیکھا کہ شہرت اور دولت ملتے ہی انھیں مایا لگ جاتی ہے۔ گردن میں سریا اور ''میں'' آ جاتی ہے۔ بس یہیں سے اُن کا گراف گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن عزیز میاں میں یہ کمزوریاں کبھی واقع نہ ہوئیں۔ وہ ہمیشہ سریس ہو کر بات کرتے تھے...... دوسرا کسی بھی حیثیت کا ہو وہ اُسے اپنے سے بڑا اور اہم سمجھ کر افہام وتفہیم کا معاملہ کرتے۔'' شاید اس کی وجہ اُن کی یہی درویشی اور بزرگوں کی تعلیم وصحبت تھی۔''

جانتے ہوئے بھی کہ میں جاہلِ مطلق ابجد خواں ہوں...... موسیقی سے میرا تعلق محض سننے کی حد تک ہے۔ تصوف کی ابھی کچی پکی پٹی بھی نہیں پڑھی...... پھر بھی وہ مجھے بڑھاوا دیتے...... میری لن ترانیاں' توجہ سے سنتے...... اُلٹی سیدھی تاویلوں کو اہمیت دیتے...... کہیں اصلاح کی گنجائش دیکھتے یا میری کسی غلطی' بے علمی کی جانب توجہ دلانی مقصود ہوتی تو انتہائی نرم دوستانہ رویہ اختیار کرتے...... جس سے اُن کی بڑھائی اور میری کوتاہی واضح نہ ہوتی۔'' میرے بابا اشفاق احمد کا بھی یہی انداز تھا۔ وہ اپنے چھوٹوں سے دوستی کر لیتے تھے...... مذاق مذاق میں ہی وہ دوسروں کی اصلاح کر دیا کرتے...... نصیحت اور فہمائش سے گریزاں رہتے۔ ہمیشہ دلیل اور افہام وتفہیم کو اہمیت دیتے۔''

ایک بار میرا ایک سکرپٹ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ میں ان کے پاؤں گود میں رکھے لرزاں سا اس انتظار میں کہ آج بے بھاؤ کی سننے کو ملیں گی۔ اپنی نظریں بچا کے کنکھیوں سے ان کی جانب دیکھ بھی لیتا کہ اُن کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگا سکوں؟ صفحوں پہ صفحے الٹ رہے ہیں مگر مجال جو طمانت اور فراست بھرے چہرے پہ ہلکی سی شکن یا بے مزگی کی کوئی لہر نمودار ہوئی ہو۔ بڑی فرخندگی اور آسودہ سی محویت سے مسودہ پڑھتے ہیں...کہتے ہیں' یار! کمال لکھیا اے! اینا ستھرا سواد تے کدی میتوں وی لکھنا نصیب نہیں ہو یا......!

اب کوئی کیا کہے؟ جبکہ مجھے علم ہے کہ زبان وبیان کے علاوہ اور بے شمار خامیاں کجیاں موجود ہیں۔ جن کی نشاندہی' ایک دو سطریں پڑھ کر ہی ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ سب جانتے بوجھتے ہوئے بھی تحسین شاباشی سے نوازتے ہیں۔''

ڈرتے ڈرتے کہہ دیا...... باباجی! بچوں کی خامیاں کیسے دُور ہوں گی؟ طالبعلموں کی اصلاح کی

خاطر اُستاد اُن پہ نظر رکھتے ہیں بلکہ سرزنش بھی کرتے ہیں۔"

ہلکا سا مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے فرمایا' یار! کہنا توں ٹھیک ایں...... پر یار! غلطیاں تے سارے ای کردے نے' وڈا ہووے یا چھوٹا......؟ غلطی دَسو گے تے اگلا ہور غلطی کرے گا۔ بس حکمت نال اُہنوں غلطی دا احساس کرا دیو...... ویسے وی لکھدیاں لکھدیاں بندہ آپے وی کدی لکھاری بن ہی جاندا اے۔"

ایسا ہی رنگ ڈھنگ عزیز میاں کا بھی تھا۔ وہ بھی دوسروں کو اہمیت' عزت بندگی دیتے تھے۔ دوسرے کے سامنے بچھ بچھ جاتے...... میں نے اُنہیں اکثر مٹی کے برتنوں میں کھاتے پیتے دیکھا۔ اُن کی صحبت میں بیٹھنا ایسا ہی تھا جیسے کسی گھنے' ثمر بار پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ لیا جائے۔" وہ ازمنہ قدیم کے بزرگ تھے۔ جن کے علم و فضل' فن و فکر اور کردار و کرم کی خوشبو زمانوں تک ہمیں مشکبار کرتی رہے گی۔"

میری خوش بختی کہ مجھے کچھ اُن سے نسبت رہی...... گو یہ زمانہ انتہائی مختصر تھا اور اس تنگ وقتی کا انہیں بھی احساس تھا۔ میں بیرونِ ملک مقیم تھا۔ وہ پاکستان میں 'ملتان کراچی پنڈی اسلام آباد لاہور' میں وطن لوٹتا تو اُن کے پیچھے پیچھے رہتا۔ وہ بیرونِ ملک ہوتے تو وہاں پہنچ جاتا۔ میری عقیدت طلب اور جنون دیکھ کر اُنہوں نے بھی مجھے اپنے دل میں تھوڑی سی جگہ عنایت فرمادی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میری اُن سے دلچسپی' اُن کا فنِ قوالی نہیں' اُن کا 'سوز دروں' علم و فکر اور مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی سے تلمذ ہے۔ یعنی میں ان کے وسیلہ یا حیلہ سے مولانا کا تصرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

بات سچ تھی وہ بھی میری طلب سے آگاہ تھے۔" لیکن اس کے ساتھ وہ اک انسان بھی تھے۔ زیادہ نہیں لیکن کچھ تو اُنہیں بھی بتقاضۂ بشریت خیال آتا ہوگا کہ یہ لالچی انسان' میری محنت' میری جستجو کا ثمر! بن کسی تردد و تگ و دَو مجھ سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ میری اپنی بچکانا سوچ تھی جسے اُن کے بعد کے سلوک اور رویے نے باطل کر دیا تھا۔" جب اُنہیں یقین ہوگیا کہ میں اپنی طلب میں صادق ہوں اور مولانا سے جنون کی حد تک عقیدت رکھتا اور ملامتی ہوں تو اُنہوں نے مجھے سیہون شریف میں 'سات دن یعنی ایک جمعرات سے دوجی جمعرات تک کا ایک وظیفہ بتایا۔ ان دنوں کے بیچ عرس شریف بھی آتا تھا۔"

مقررہ جمعرات سے دو دن پہلے اُنہوں نے مجھے 'ملتان طلب فرمایا...... کچھ ضروری ہدایات...... کچھ ضرورت کا سامان ساتھ لانے اور دو روز عرس سے پہلے بودلا بہیر کی پہاڑی کے پیچھے ایک ڈیرے کا پتا سمجھاتے ہوئے تاکید کی کہ وہاں روزے کی حالت میں پہنچوں۔ افطاری قلندر پاک کے لنگر سے دربار پہ ہو۔ اسی طرح سات روزے پورے کروں...... اور آخری روز وہیں افطاری کر کے قیام اُٹھالوں...... واپسی پہ کوٹ مٹھن خواجہ فریدؒ کے روضے پہ جمعرات کے روز اُن سے ملاقات ہوگی۔ اس کے بعد بڑی رازداری اور عقیدت سے

ایک چرمی تھیلی کے تسمے ڈھیلے کرتے ہوئے اندر سے ایک عطر کی شیشی' اونٹ کی کھال کی بنی ہوئی چھوٹی سی کپّی' ایک پرانی وضع کی سُرمہ دانی اور سُرمچو نکالے مجھے دکھاتے ہوئے پوچھنے لگے...... جانتے ہو؟ یہ کیا ہیں؟ بن سوچے میرے منہ سے نکلا...... یہ تو وہی بات ہوئی کوئی بھوکے کو روٹی دکھا کر پوچھے...... "جانتے ہو یہ کیا ہے؟" خوشبو ہی بتا رہی ہے کہ اُس کا ماخذ کون سی ہستی ہے؟

کچھ لمحے' میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر آنکھیں میچیں اور مائی بھیروں کی سُرملائی اور سُبحان اللہ کہا......!

قارئین! مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی' عزیز میاں قوال اور سُرمہ دانی' سُرمچو' اونٹ کی کھال سے بنی ہوئی تیل کی کپّی' جس کا مُنہ بند کرنے کے لئے ساگوان کے ڈھکن کا ذات استعمال ہوتا ہے اور کپّی میں کوئی ایسا طلسماتی تیل جو کمیاب' بے حد اَنچھوتا اور قیمتی ہوتا ہے رکھا جاتا ہے کہ اجمالاً ذکر موخر کرتے ہیں اور اسی سے جُڑا ہوا ایک اور واقعہ سُناتے ہیں جو ایک ہونی کی طرح' میرے ساتھ پیش آیا۔

"حیدر آباد دکن کے کہیں پُرانا نادر سامان خرید فروخت کرنے والے کباڑیے سے بظاہر ایک عام سی انگوٹھی جھونگے میں ملی۔ مُفت میں ملی چیز کسی قدر قیمت کی حامل نہیں ہوتی۔ دراصل اُدھر سے گزرتے ہوئے مجھے نوادرات کی ایک دکان پہ پُرانے قلمدان' قرطاس قطع برید کرنے والے آلات اور پرندوں کے پَروں کے قلم' روشنائی کی دواتیں' اوراق پہ رکھنے والے خوبصورت پتھر پڑے دکھائی دیئے۔ ایسے ہی انہیں دیکھنے کی خاطر اندر چلا آیا۔ مجھے یہ لکھنے لکھانے کی پرانی چیزیں اچھی لگیں۔ لگتا تھا یہ کسی حکیم' مُفتی عالم فاضل یا کسی مصنف کا اثاثہ تھا جو اس کے مرنے کے بعد' ناخلفوں نے دھیلوں کوڑیوں میں اُٹھوا دیا ہوگا...... یہ بھی کہ ہر چیز کا اِک وقت اور رنگ ہوتا ہے...... وقت گزر جائے' رنگ بدرنگ ہو جائیں تو پرانے نوادارات کے کباڑیوں کی اچھی خاصی "بجرنگ بلی" ہو جاتی ہے۔ دکان کے سامنے سے گزرتے سمے اِدھر نظر پڑ گئی اور مَیں اندر چلا گیا۔ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا۔ بوڑھے گھاگ کباڑیے نے میری دلچسپی دیکھتے ہوئے مجھے آگاہی دی۔"

حضرت! کانوں کو چھو کر کہتا ہوں سیّد شبیہ الحسن گیلانی جیسا اجل عالم و فاضل' چشمِ فلک کو پھر کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوگا؟ ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں کہیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں...... ساری زندگی' علم و ادب' طب و حکمت' تدریس و تہذیب' تصنیف و تالیف سے تعلق رہا...... مُفتی بھی محتسب بھی۔ کئی ایک مجلّوں' رسالوں کے مُدیرِ کبیر بھی تھے...... وقت وقت کی بات اور الف' استادہ کی اوقات ہوتی ہے.. "ب" بیٹھ جائے تو پستی کی ذات ہوتی ہے۔ "شہرت و عزت کا سورج نصف النہار پہ رہا تو ہر سو چہار دانگ طغارہا۔ شام ڈھلتے ہی ڈلیا اُلٹ گئی! وقت کا بچھوا چوپٹ پڑ گیا...... یہی کچھ! کہ پُشت سے تو کوئی پُشتہ نہ تھا جو آگے رینگتا...... لے پالک جو

تھے وہ پالک بنیرے کے ساگ پات کی طرح جھڑس گئے..... دو چار عشروں میں سب کُتب کتابچے' رسالے مخطوطے ردّی میں تُلوا دیئے.. جُوتے کپڑے دستاریں بٹ بنا گئیں..... باقی یہ قلم دواتیں لکھنے لکھانے کی چیزیں' خوش قسمتی سے میری رسائی میں پہنچ گئیں۔ آٹھ دس برس سے سنبھالے ہوئے ہوں..... بہت سے کم سوادے حاصل کرنے پہنچے.. بہتیرے لالچ دیئے... پر مَیں ٹس سے مس نہ ہُوا.. سیکڑوں ہزاروں کا صَرفہ خرچہ برداشت کر لیا مگر کسی بے نظرے کج قدرے کی پہنچ میں' ان نادر اشیاء کو جانے نہ دیا۔"

خدا جانتا ہے کہ اگر مَیں زبردستی مداخلت کر کے اس باتوں کے گالڑ اور گرگِ باراں دیدہ کی لگام نہ کھینچتا تو وہ شاید ابھی بس نہ کرتا۔" مَیں نے قدرے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے ایک شہپر کا قلم اٹھاتے ہوئے اس کا ہدیہ دریافت کیا۔" وہ موقع پاتے ہی پھر شروع ہو گیا۔ اب وہ اس قلم کے معجزات بیان کرنے میں جُت گیا کہ مرحوم سید صاحب نے اس سے کیسے کیسے شہکار تخلیق کیئے۔؟ اس کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے مَیں نے قلم اُچک لیا۔ اسی قلم کے ساتھ' روشنائی والی دوات بھی پڑی تھی وہ بھی اُٹھائی۔ ایک ساتھ کر کے دونوں کا ہدیہ دریافت کیا۔ قدرے متذبذب ہُوا۔ پھر ساری سٹوری ہی بدل دی... انتہائی رُکھائی سے کہنے لگا۔ یہ قلم اور دوات تو کب کے بِک گئے ہوتے؟ دراصل میں یہ تمام مکمل سیٹ فروخت کرنا چاہتا ہوں..... مَیں نے اسے خریدا بھی اسی طرح سے تھا۔"

اُس کی یہ دکانداروں والی عام سی دلیل سمجھ میں آنے والی تھی کہ پورا سامان' ایک بار ہی نکل جانا چاہیئے' یہ ایسے ہی ہے کہ جنت مکینی بوڑھے کا ذاتی بقایا سامان بھی ساتھ ہی دفنا دیا جائے تو متوفی اور پس ماندگاں آسودگی میں رہتے ہیں۔"

مَیں نے ایک اُچٹتی سی نظر طفیلی سامان پہ ڈالتے ہوئے کہا۔ مجھے صرف یہ شہپر قلم ہی چاہیے۔ پاس ہی سیاہی چوس' نقلی روشنائی کی پڑیاں' گولیاں' چھید کرنے والا سُوا' کانے کے قلم' قلم تراش' دھاتی نبیں پڑی تھیں۔ ایک خوبصورت سا سیاہ رنگ کا چوبی ڈبا دکھائی دیا جس پہ شفاف سیپ کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے' کھولا تو اس میں بھی اسی نوع کا کاٹھ کباڑ تھا۔ اندر کونے میں کُھبی ہوئی ایک دھاتی انگشتری دکھائی دی..... نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے نکال لیا۔ ہنچ دھات تھی۔ سونا چاندی' تانبا' رانگ اور لوہا.....!

## ● نی مَیں جانا جوگی دے نال.....!

کیمیا گروں' حکمت دانوں' سنیاسیوں اور درویشوں کو خوب علم ہے کہ دھات کیا ہوتا ہے اور کس کام آتا

ہے اور جن دھاتوں کا مرکب ہے اُن کے خواص اور اوزان و تناسب کیا ہوتا ہے..؟ ان دھاتوں کی زندگی توانائی اور پژمردگی' بے اثری کا اندازہ کیسے کیا جاتا ہے اور اندازے کے بعد انہیں فعال یا دوبارہ زندہ کیسے کیا جاتا ہے..؟ حجرات اور شجرات اور فوا کہات کے ساتھ بھی یہی کچھ ہے۔''

ریاضت و مجاہدت اور دیگر رُوحانی جسمانی' جدانی اور اذہانی مشقوں میں چونکہ کئی طرح کی توانائیوں.. غیر معمولی حسیات کی بیداری اور قوت برداشت و بردباری کی اشد ضرورت پڑتی ہے اس خاطر بدھوانوں اور رشیوں سنیاسیوں نے' دیگر شکتیوں اور سدھیاؤں کے حصول کے لئے مختلف دھاتوں جواہرات' نگینوں اور جڑی بوٹیوں کو استعمال میں لایا۔'' اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ سردی سے بچنے کے لیے آگ کی حدت' گرم لباس کی گرماہٹ' قوت اور برداشت بڑھانے والی غذائیں مشروب وغیرہ.. کمزور نظر کی خاطر ہم بصارت کو طاقت دینے والے عدسے استعمال کرتے ہیں۔ پست قامت خواتین اُونچی ایڑی والے جوتے پہنتی ہیں۔''

یہ ''پنج دھاتو'' بھی اپنے کیمیائی اور مقناطیسی اثرات کی بناء پر انسانی اعصاب و عضلات پہ مثبت اثرات ڈالتا ہے' منحصر ہے کہ کونسی صلاحیت' قوت میں تقویت بڑھانی ہے۔ رُوحانی' نفسانی' جسمانی' ذہنی یا تخلیقی انتشار خون' اختلاج قلب' مردی قوت' گنٹھیا' خفقان حتیٰ کہ دماغی کام کرنے والے طالبعلموں' اداکاروں' موجدوں' شاعروں' مصنفوں کی غیر صلاحیتوں کو نکھارنے میں ممد ثابت ہوتا ہے۔'' ذہن میں رہے کہ یہ تین حالتوں میں ہو سکتا ہے۔ پہلی حالت مکمل زندہ...... دوسری حالت' جسے زندہ نہ مردہ کہتے ہیں...... تیسری حالت مکمل مردہ مالک و خالق کے سوا' کوئی دوسرا زندہ نہیں کر سکتا۔'' خاص طور پر پانچ' بنیادی دھاتیں اپنے اپنے اندر بڑی مخصوص خاصیتیں رکھتی ہیں اور ان خوبیوں خاصیتوں کا تعلق' خاص طور پہ انسان کی بقا و احیاء اور خفتہ استعانتوں سے بالواسطہ یا براہِ راست ہوتا ہے۔''

حکمت دان' وید سنیاسی' سائل کے مسائل کے مطابق.. دھات کی کمی و بیشی کے تحت' اُس کے لئے انگشتری' کلائی پاؤں کا کڑا... گلے کا ہیکل بازو کا جوشن وغیرہ تیار کرواتے ہیں۔'' کوئی بھی چھوٹا بڑا دھاتو' ایک سا اور ایک سے تصرفات کا حامل نہیں ہوتا۔ ہر انداز کے دھاتو کی اپنی اپنی مہک اور شفائی لہریں ہوتی ہیں جس سے اُس کی دھاتوں کے تناسب اور تصرف کا اندازہ ہوتا ہے۔'' آج کل بازاروں میں مختلف دھاتو بریسلٹ دستیاب ہیں.. جو یہی کام کرتے ہیں مگر ان میں فیشن اور ڈیزائن زیادہ ہوتا ہے... شفا یابی کم ہوتی ہے۔ وہی فرق جو خالص عطر' جو قدیمی طریقے سے کشید کیا ہوتا ہے اور کیمیکل والا مصنوعی خوشبوؤں والا اسپرے' سینٹوں پہ تیار ہوتا ہے۔'' منقش ڈھکنے والا چوبی ڈبا کھولتے ہی میرے نتھنوں نے مجھے انگشتری کے دھاتو کی اوقات کی دھانس پہنچا دی تھی۔''

قصائی ناس! سُنار زیور! حاذق طبیب مریض! دائی' کایا اور دُرویش چھایا دیکھتے ہی عارضہ مرض' سُنت فرض.. اصل نقل' نسل فصل' طبیعت نیت' گرفت برئیت' ذات اوقات' جو اور بھات' جان جاتے ہیں۔"
میں دھاتو انگشتری دیکھتے' مہک سونگھتے ہی جان گیا کہ یہ مرحوم سید صاحب کی ذاتی انگشتری ہے.. جس پہ چند ٹیڑھے میڑھے شبد بھی کندہ تھے جنہیں باوجود کوشش پڑھ نہ سکا۔" انگشتری کو نظر انداز کر کے میں دیگر اشیاء کو دیکھنے لگا۔ پُرانی خستہ حال اُدھڑ بدھڑی عینک! جس کے عدسے دُھندلے ہو چکے تھے۔ چند ایک فونٹن پن! جن میں سے ایک چاندی کا تھا جس پہ عربی کے کلمات کُھدے ہوئے تھے۔ چند ایک سیپ کے بٹن.. کچھ عقیقِ یمنی کے نگینے اور تسبیح! ایک چار انچ لمبی۔ چاندی کی مُنہبال' جو اکثر تمباکوکش اُمراء شرفاء اپنی ہتھیلی میں رکھتے تھے۔ کہیں محفل مجلس میں حقہ نوشی کے موقع پہ اسے حقہ کی نے پہ چڑھا لیتے۔"
مجھے اس ڈبے میں منہمک دیکھ کر دوکاندار نے جُملہ اشیاء بھی میرے رُو برو کرتے ہوئے انتہائی عاجزی سے گویا ہُوا...... یہ تمام اشیاء حضرت سید صاحب کے تصرف کی ہیں۔ جیسے یہ ہمیں دستیاب ہوئیں ویسے ہی یہ تمام' کسی خوش قسمت قدردان کے ہاں مناسب نعم البدل پہ منتقل ہوں گئیں۔" انتہائی چاپلوسی سے مزید کہا! مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ خوش قسمت آپ ہی ہیں؟
میں متعجب سا اُسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا...... یہ آپ سو فیصد یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں ہی اِن کا خریدار ہوں؟
وُہ روشنائی دان کو مخمل صافی سے پونچھتے ہوئے بتانے لگا...... مجھے اس کاروبار میں ستر برس ہو چکے ہیں مجھ سے پیشتر میرے والد اور اُن سے پہلے دادا بھی اسی کاروبار میں تھے...... دو سو برس سے اُوپر کی اِس کاروباری' صحرا نوردی کے بعد بھی اگر یہ سوجھ نہ آئے کہ پانی کہاں سے نکلے گا اور کدھر مرے گا تو پھر اِس دھندے سے کہیں بہتر ہے کہ تیل بیچ لے۔"
یہ نُوالفضول کچھ مرد وزن اور چوپائے جانور چہار چشم بھی ہوتے ہیں آنکھوں کے اُوپر بھووں کے بیچ الگ سی آنکھیں بنی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے انسان اور جانور اپنی ایک الگ قسم رکھتے ہیں۔ انہیں چہار چشمے کہتے ہیں.... اکثر' موقعہ پرست' مطلبی' بدلحاظ اور بھندے کو کہتے ہیں... کایاں' کمینے کج کرتُوتے بھی اسی زُمرے میں آتے ہیں۔"
وہ مجھے پوری لاٹ خریدنے پہ آمادہ کرنے کی کوشش میں تھا جبکہ میں بصرف قلمدان میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اُس کے دعوے پہ کہ "میں ہی وہ خوش قسمت ہوں جو یہ سب کچھ حاصل کرے گا۔ کچھ جز بز ہُوا تھا کہ کس بھرتے پہ ایسا دعوٰے کر رہا ہے... میں نے اِسے مات دینے کی ٹھان لی کہ میں بصرف اور بصرف قلمدان ہی

خریدوں گا وُہ بھی اگر سُودا لگ گیا ورنہ اِدھر سے نِکل لوں گا۔"

مَیں نے ترکیب سوچ لی تھی کہ سیدھے سیدھے انکار کرنے سے کہیں بہتر کہ بھاؤ تاؤ میں لا کر اِس کے دعوے بُطلان کیا جائے۔"

بظاہر عدمِ دلچسپی کی اداکاری کرتے ہوئے مَیں نے کہا چاہیے تو مجھے صرف قلمدان ہی مگر آپ اِسے علیحدہ دینے سے گریزاں ہیں اور یہ بھی سو فیصد یقین! کہ مَیں ہی وہ خوش قسمت ہوں جس کے نصیبوں میں یہ سیّد صاحب والا نادر اثاثہ حاصل کرنا لکھا ہے.... چلیے! فرمائیے! اس سامانِ خوش بختی کے عوض' آپ کس قدر ہدیہ قبول فرمائیں گے۔"

وُہ گھاگ یوں اِک دکاندارانہ انداز سے آنکھوں اور چہرے پہ حساب کتاب لگاتے ہوئے بولا...... حضرت! آپ سے خصوصی دُعا برکت کی خاطر صرف دس سالہ حفاظت کا حقیر سا ہدیہ' دس ہزار روپے...... یقین فرمائیں کہ اس سے کہیں زیادہ تو اس کی صفائی' ستھرائی اور پالش پہ لگ چکے ہوں گے...."

مَیں اُس کے منہ سے کچھ بھی سُننے کے لئے تیار تھا...... ایسے پھوکے دھماکے سُنتا رہتا ہوں.... حسبِ طریقہ مَیں مُسمسا سامنہ بنائے خاموش رہا' جیسے مَیں خُود کو آمادہ نہیں پا رہا۔"

مجھے مُتذبذب پا کر' مزید بتانے لگا... قبلہ! یہ حقیر سا نذرانہ' اِس تمام لاٹ کا ہے جو آپ کے رُوبرُو اِس الماری پہ ہے.... میں آپ کا پسندیدہ قلمدان' یہ قیمتی پتھر کے پیپر ویٹ... قلم تراش..... یہ پتھر' آبنوس اور مُلتانی مٹی سے بنی ہوئی نادر دواتیں... سَن کی گُف سے بنے ہوئے سیاہی چوس... خالص تانبے' فولاد اور بیدِ مجنوں کے قدیمی قلم اور یہ.....؟؟؟

مَیں نہ روکتا تو وہ پتا نہیں کہاں پہنچ کر رُکتا... رُکتے رُکتے بھی وہ بتا ہی گیا...... اور یہ آبنوسی مُنقش نادر ڈبا بھی مع تمام نایاب نوادرات' جو اس میں موجود ہیں۔

اب میری باری تھی... مجھے بھی کچھ نہ کچھ کہنا چاہیے تھا.... سو مَیں نے بھی جواب میں کہا! حضرت! اب دیکھنا' یہ ہے کہ آپ کی پیشین گوئی سو فیصد ثابت ہوتی ہے یا میرا اندازہ اور تجربہ؟ آپ تجربہ کار فروخت کرنے والے اور مَیں ایک نام نہاد بے زر و ذکاوہ خریدار! دیکھئے کیا ظہور میں آتا ہے؟ مَیں حتمی طور پہ اِس سامنے کے حاضر مال کے ہدیہ کے طور ایک ہزار روپے سکہ رائج الوقت پیش کر سکتا ہوں۔" بلا شُبہ' سامان سو برس کا اور لاکھوں کے لاد کا ہے۔ پر کیا کیجئے میرے دامنِ استطاعت میں یہی ایک بے توقیری رقم ہے۔ فرمائیں تو مَیں حاضر کر دوں؟

وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے مَیں نے مال کی قیمت نہ لگائی ہو اس کے قرابت داروں کی شان میں

کچھ بے طرح کی سُنائی ہوں۔'' جب چند طویل سے لمحے مزید لمبے ہوگئے اور مجھے شک گزرنے لگا کہ کہیں یہ سکتہ میں نہ پہنچ جائے تو مَیں نے خود ہی پہل کی.... حضرت! اگر آپ کا سو فیصد یقین کہ یہ مال مجھ خوش نصیب کے لئے ہی مختص ہے تو مَیں دام درہم نکال کر پیش کروں...... ورنہ مغرب کی اذان کا بزن بجنے والا ہے بندہ آداب پیش کرتا ہے۔'' دروازہ کی جانب قدم اُٹھایا ہی تھا کہ اُس ''مردِ صادق زبان'' نے سامان باندھنا شروع کردیا۔''

دکان کے دروازہ پہ مجھے رُخصت کرتے ہوئے کہنے لگا۔ اب فرمایئے! میری پیشین گوئی سو فیصد درست نکلی یا نہیں۔''

مَیں نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ حضرت! آپ اور مَیں...خیر سے انسان ہیں۔ اِدھر تو اس ڈبے میں دھاتو انگشتری کی پیشین گوئی بھی ہزارفی ہزار صحیح ثابت ہوئی.....نی مَیں جانا جوگی دے نال......!

## ● دیارِ شب کا کوُچی......!

کہتے ہیں کہ کمائی عبادت محنت اور اولاد...جوانی کی ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں تو نہ ہمت طاقت رہتی ہے...اُمنگیں' نہ ترنگیں اور نہ اولاد کی بھرپور خوشیاں دیکھنے کا ارمان پورا ہوتا ہے۔'' اسی طرح کچھ باتیں گھاتیں' جیتیں' ماتیں بھی ہوتی ہیں جن کی کچھ ظاہری باطنی گرہیں گانٹھیں' جو ہاتھوں اُنگلیوں' دانتوں لبوں' پپوٹوں اور نوکِ مژگاں سے کُشادہ نہیں ہوتیں۔ اُنھیں کھولنے کے لئے ناخنِ تدبیر کے علاوہ لوحِ تقدیر تک کی رسائی کہیں سے حاصل کرنی پڑتی ہے اور پھر یہ مقسوموں کی بات! کہ بات' کس زُلف کے سر ہونے تک پہنچتی ہے۔

باقی تمام کچھ مصرے کسی خاص کام نہیں تھا...اصل چیز تو پنج دھاتو انگوٹھی تھی' جو میری آٹھوں اُنگلیوں پہ ڈھیلی! مگر مَیں نے اُسے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پہ پھِس پھنسا کر کے ڈال لیا تھا۔'' دراصل مَیں اُس کی پنج دھاتوں کی زندگی' مُردنی کی جانچ کے پیچھے پڑا ہوا تھا...جیسے زبان کی نوک لگا کر بیٹری کے سیلوں کو چیک کیا جاتا ہے کہ ان میں کرنٹ ہے یا نہیں!

مَیں حسبِ معمول کھاپی کے کاغذ قلم لے کر نیم دراز ہوگیا۔'' کچھ لوگ سونے سے پہلے کوئی نہ کوئی کتاب کھول لیتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے اُونگھ میں چلے جاتے ہیں۔ کوئی اپنی پسند کا میوزک سُنتے سُنتے سو جاتا ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے کچھ پاگل' پسند کے چینل کھول کر لیٹ جاتے ہیں وہ خود' پانچ دس منٹ میں خراٹے توڑتے لگتے ہیں جبکہ ٹیلی وژن تمام رات جاگتا رہتا ہے۔'' یادوں کی پٹاری کھول کر بھی لیٹنے والے بہت

ہوتے ہیں۔" "میں نے بھی ایک صاحب کا معمولی سا علاج بھی کیا تھا۔ یہ حضرت! اُس وقت تک سو ہی نہیں سکتے تھے جب تک وہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ' کسی ملازم' بیٹا بیٹی' بیوی کے ساتھ مغز ماری یعنی لڑائی جھگڑائی کر کے اپنی بھڑاس نہ نکال لیں۔"

کچھ لوگ قومی ترانہ سنتے سنتے نیند کی وادی میں پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ سکھوں اور پٹھانوں کے لطیفے.... کوئی عشقیہ شعر و شاعری اور ایسے بھی جو اخلاق باختہ فلمیں دیکھتے دیکھتے سونا پسند کرتے ہیں۔" "گنتی گننا' سنتے بلی سے پیار کرتے.... آسمان پہ ستارے گنتے... بھیڑوں میمنوں کو تصور میں لا کر' کچھ ایسے بھی جو مالشیوں سے مٹھی چاپی کرواتے سو جاتے ہیں.... کچھ تسبیح' دُرود و ذکر کرتے کرتے سوتے ہیں۔"

میں سو جاؤں یا مصطفٰے کہتے کہتے اُٹھوں تو میں صلے علیہ کہتے کہتے۔ میں اُن معدودے چند افراد میں سے ہوں جو محض کچھ دیر اس لئے آنکھیں موندھے پڑ جاتے ہیں کہ جیتے جی' موت صغیرہ سے کچھ راہ و رسم پیدا ہو جائے۔"

ایک تحریر کئی دِنوں سے زیرِ قلم تھی...... یوں ہی سی ایک اُدھوری' بھولی بسری بات جو بگڑ کر جھگڑا بن گئی...... میری دماغی غیر حاضری' بے علمی اور بھول بھلکڑی کے سبب ناتمام سی پڑی تھی کہ کہیں لا کے لگ کر کسی انجام کو پہنچے۔" "بعض قصّے کہانیاں باتیں جتیاں یوں ہوتی ہیں کہ اُن کا نہ تو کوئی اچھا بڑا انجام دکھائی دیتا ہے نہ کسی تفہیم و افہام میں آتی ہیں۔ جن چھنا ڈالے دماغ کو جکڑے رکھتی ہیں۔"

تخلیق کاروں' شاعروں ادیبوں کی زبان میں اس کیفیت کو جمود کہتے ہیں۔" "ماہرینِ اجسام و اذہان اور دیگر حکیم طبیب اور علمُ الابدان کے عالم' خوب جانتے ہیں کہ اِنسانی کلبوت میں بھی' اس دکھائی دینے والی کائنات اور نظامِ شمسی و قمری کی طرح' نہ نظر آنے والا اِک مربوط نظام قائم ہے۔" "ادھر بھی' چاند ستاروں' کہکشاؤں' بُرو جوں' نحسوں کی گردشوں' اُتار چڑھاؤ' قطع و برید' ٹوٹ پھوٹ' اُکھاڑ پچھاڑ جاری و ساری رہتی ہے جو دیکھنے سے دکھائی بھی دیتی ہے اور اِن کے اثرات محسوس کر کے سمجھا بھی جا سکتا ہے۔" "یہ یاد رہے اسی سارے نظام کی اَوّل آخر اِک تغیر ہے۔"

انسانی فِطرت ہے کہ وہ تبدیلی یا تغیر تو قبول کر لیتا ہے مگر ایسی' جو اُسی کی سمجھ میں آئے اور اُس کے لئے پسندیدہ ہو! ہمارے اندر کی ناپسندیدہ تبدیلیوں میں دل اور دماغ کے چھوٹے بڑے عارضے ہوتے ہیں جو ہمیں عارضی اور مستقل پریشانیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اِن عارضوں کی وجوہات بہت سی ہو سکتی ہیں...... مگر زیادہ تر ہماری خود کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔" "ان سے بچنے کی خاطر' ہمیں اپنی روزمرہ کی مصروفیات' غذا' نقصان پہنچانے والی عِلتوں' طرزِ حیات اور معاشی معاملات پہ غور و خوض کرنا چاہیے۔" "اگر سب کچھ صحیح بھی ہو پھر بھی

معاملہ بہتر نہ ہو تو پھر ہمیں روحانی کیمیائی طرزِ تدارک اختیار کرنے میں ہچکچانا نہیں چاہیے۔" تجرباتی' معدنیاتی' نباتاتی شفائی لہریں ہماری بدنی کیفیات' مزاج پہ بڑے لطیف اور نفیس اثرات ڈالتی ہیں.. جیسے موسیقی' سمندری لہروں موجوں کا صوت' ننھے منّے پرندوں کی چہچہاہٹ' جلترنگ' چوڑیوں کی کھنک' علی الصباح بادِنسیم کی سرسراہٹ' شیر خوار بچے کی ہمہماہٹ' میں نے خفقان کے ایک مریض کا علاج' مخصوص شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے کیا تھا۔"

کینیڈا میں پیدا ہونے والا ایک خوبرو صحتمند بچہ' پیدائشی طور پہ جسمانی الرجی کا مریض! تمام جسم' کھجلی کی آماجگاہ تھا۔ اُنیس برس کھجلتے کھجلتے' اس کا پورا جسم' ایک کھیت کی طرح بن چکا تھا جسے ہل نہا کے پھیر کر بجائی کے لئے تیار کیا ہو! کون سا ڈاکٹر' سپیشلسٹ' وید حکیم' سنیاسی تھا جس کا علاج نہ کیا ہوگا؟ جوان بچہ' نہ کسی کالج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے قابل' نہ کسی ملازمت کے اہل... شادی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کون اپنی بیٹی کو کھاج کے چھاج میں چھٹنے کے لئے اس بھولے کے حوالے کرتا۔؟

اُس کا کمرا' کپڑے فرنیچر' کٹلری کراکری الگ تھی.... گو ماں باپ بہن بھائی' جو تمام نارمل تھے اس سے بہت پیار کرتے' کسی بھی طور اسے احساس نہ دلاتے کہ اس کی بیماری' لا علاج اور چھوت چھات والی ہے۔ مگر اُسے خود احساس تھا کہ وہ اپنی فیملی کے لئے ایک ایسا کڑوا نوالہ ہے جسے وہ بہر طور نگلنے پہ مجبور ہیں۔" جانے انجانے میں ایک آدھ بار خود کو نقصان پہنچانے کی ناکام کوشش بھی کی.....ماں باپ کے لئے ایک اندوہناک لمحۂ فکریہ تھا۔ اب اُنہوں نے ہر قیمت پہ کوئی حل تلاش کرنے کی ٹھانی۔ کینیڈا امریکہ' انگلینڈ وغیرہ میں ہر ممکن علاج معالجہ کرا کے دیکھ لیا.....وقتی آرام مل جاتا مگر حتمی شفا کہیں سے بھی حاصل نہ ہوئی....."

اب یہ حالت کہ ناگوار مہک کی بناء پہ قریب بیٹھنا مشکل تھا اور اب وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ دو وقت اس کے پورے جسم پہ دوائیں لگائی جاتیں.... گھنٹہ دو گھنٹے سکون رہتا.... پھر وہی کھُر کا کھُرکی....! کسی نے اُنہیں تھائی لینڈ کے شفائی آشرموں کی راہ سُجھائی...کینیڈا سے وہاں پہنچے.....دو ماہ کے علاج کے بعد پتا چلا کہ خارش تو ختم ہو گئی' مگر اک نئی بیماری' جسم سُرخ اور سُوجنے کی دَر آئی ہے...دو چار ماہ جب اور علاج کرانے کا مشورہ دیا گیا...تو مریض نے خودکشی کی دھمکی دے دی۔" اُدھورے علاج کے بعد وہ بے نیلِ مرام واپس کینیڈا آ گئے....."

اب خدا جانے کون تھا؟ جس نے اُنہیں میرے بارے اُلٹا سیدھا کچھ بتا دیا..اب یہ ہُوا کہ اُن کی توپوں کا مُنہ میری جانب پھر گیا...کہاں کینیڈا اور کدھر پاکستان؟ ٹیلیفون رابطوں سے اُنہوں نے میرے ناک میں دَم کر دیا۔" بہتیرا سمجھایا کہ مَیں کوئی حکیم ڈاکٹر نہیں... یہ جسمانی الرجی کیس ہے اس کا علاج مُوجود ہے

آپ کسی اچھے سے سپیشلسٹ سے رجوع کریں۔ مَیں تو خود کئی ایک کولت اور جہالت کے آزاروں میں مبتلا ہوں..." غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ.... جھٹ میرے پاس پاکستان پہنچ گئے۔ "آپ بھی بچوں والے ہیں اپنا بچہ سمجھ کر اس کی زندگی بچالیں۔" ان غرض مند ماں باپ کو سمجھانا بڑا مشکل پڑ گیا تھا۔ مَیں انہیں صحیح ڈاکٹروں اسپتال والا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ بضد! کہ یہ سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے۔ اب ہماری آخری آس اُمید آپ ہیں ہمیں یقین ہے اس معصوم بچے کی شفا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ تہیہ طوفاں کیئے ہوئے تھے۔ مَیں 'اپنی جان بچا رہا تھا۔ جو اُن کے ارادے جذبے اور یقین کے سامنے بچتی دکھائی نہ دے رہی تھی......"

اسی اثناء اللہ کا کرنا یوں ہُوا کہ مجھے ایک ذاتی مسئلہ میں کھڑی شریف (آزاد کشمیر) کے ایک نواحی گاؤں میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ جو ایک نہر کے کنارے واقع تھا۔ چند بڑے بڑے آسودہ سے گھرانے' جن کے کمانے والے انگلینڈ تھے۔ اُدھر سے وطن پہنچنے والے ایک بھلے مانس کے پاس میری کچھ دوائیں تھیں۔ جو اُس نے مجھے لاہور پہنچانی تھیں۔ کسی ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر' اُسے فوری طور پہ واپس انگلینڈ جانا پڑا۔ ٹیلیفون پہ اُس نے ساری صُورت حال بتائی۔ دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ مَیں فوری طور پہ اُس کے پاس پہنچوں اور دوسری کسی اور کو بھیجوں۔ میری دوائیوں اور انجکشنوں کی نوعیت ایسی تھی کہ مَیں نے کوئی رسک لینا پسند نہ کیا۔ ایک ڈرائیور بچے کو ساتھ لیا اور آدھی رات کو ہی روانہ ہو گیا۔ "رات گہری ہو تو سفر بہت تھوڑا ہو جاتا ہے۔ فاصلے خود بخود سمٹنے لگتے ہیں۔" "گاڑی زمین پہ نہیں آسمان پہ اُڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔"

وقت اور فاصلہ کٹتے ہوئے پتا بھی نہ چلا اور ہم براستہ کھاریاں' سرائے عالمگیر' جاتلاں پہنچے وہاں آگے' کچھ بھٹکے.... ایک چوکیدار سے پُوچھا۔ آگے کچھ شب زندہ دار کتوں سے واسطہ پڑا۔ ہم گاڑی کی لائٹیں جلاتے بجھاتے جا رہے تھے کہ یہی شناخت طے ہوئی تھی۔ بہت آگے پہنچ کر ہمیں دُور سے ٹارچ کے جلنے بجھنے کے اشارے دکھائی دیئے۔ "ہم اُدھر پہنچے' چائے پی' شکریہ ادا کیا اور واپسی کی راہ پکڑی۔" "یہیں پہ اُنہوں نے ایک شارٹ کٹ اور محفوظ راستہ سُجھایا... پندرہ بیس کوس کی بچت اور سیدھے جی ٹی روڈ پہ پہنچ جائیں۔" محض تین چار میل پہلے کا راستہ جو کھیتوں کے درمیان سے گزرتا ہے کچا پکا تھا... رات کا پچھلا پہر! شب بھر کے جگے ہارے ستارے' جن کی جگمگاہٹ میں کچھ غنودگی کا عنصر غالب آنے لگا تھا مدھم پڑتے جا رہے تھے۔ مَیں بھی جلتی ہوئی سُرخ انگارہ آنکھوں سے بار بار پانی پُونچھ رہا تھا جبکہ سر یُوں بھاری جیسے چکی کا پاٹ دھرا ہو؟ میرا ساتھی بچہ بھی چونکہ انسان تھا۔ اُس کی تھکن اور نیند والی کیفیت بھی کچھ مجھ سے دگرنہ تھی۔"

کچھ ہی آگے بڑھے ہوں گے تو محسوس ہُوا کہ مجھے گاڑی روک کر مُنہ پہ پانی کا چھینٹا مار لینا چاہیے... ہاتھ مُنہ گیلے کرنے سے نیند کا غلبہ بہت حد تک کم ہو جاتا ہے۔" پانی کی چھوٹی بڑی بوتلیں پیچھے ڈگی میں موجود

تھیں۔" گاڑی روکی ہم دونوں نیچے اُترے۔ خیال آیا نیچے اُترے ہیں تو کچھ پیشاب وغیرہ سے بھی فراغت حاصل کرلی جائے۔ چھوٹی ٹارچ اور پانی کی بوتل پکڑے میں کچی پکی سڑک کے بائیں جانب قدرے ڈھلوان پہ اُتر گیا۔" میری عادت اور تربیت ہے کہ خصوصا رات کے وقت سفر کے دوران بول وبراز کی حاجت سے نپٹنے کے لئے مجھے تردد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" زمین' اوٹ' اردگرد کا ماحول.... خاص طور پہ اندھیرے میں یہ بھی کہ نیچے یا قریب کسی حشرات الارض کا بل یا ہوائی مخلوق کا ٹھکانا تو نہیں۔ قبرستان یا کوئی نم تر جگہ نہ ہو.... آگے قدرے ڈھلوان' مٹی جاذب ہو تو بہتر رہتا ہے۔ شور' تھور یا آوے کی جلی سڑی مٹی گیری نہ ہو.... قبلہ رُخ' پھلدار' سایہ دار درختوں پودوں کی جڑوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔"

اسی دیکھا دیکھی میں مَیں سڑک سے کچھ دور اتر آیا۔ ایک جگہ پہنچ کر خودبخود میرے پاؤں رُک گئے اور مَیں شلوار ڈھیلی کر کے اُکڑوں بیٹھ گیا.... پانی کی کھلی بوتل میرے ہاتھ میں تھی...." مَیں کثرتِ براز کا پرانا مریض ہوں..... پیشاب زیادہ اور بار بار رُک رُک آتا ہے۔"

میرے سامنے کچھ دور چھدرے درخت تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اُدھر سے کسی انسان کے کراہنے کی نحیف سی آواز سنائی دے رہی ہے۔ بعض اوقات رات کے وقت کتوں بلوں کے رونے' کراہنے کی آوازیں بھی ایسے ہی سنائی دیتی ہیں جیسے کوئی بچہ بلک رہا ہو.... مَیں نے درختوں کے رُخ پہ کان دھر دیے اور اپنے اندر باہر کے کچھ مخصوص سوئچ آن کر دیے۔ اگلے چند لمحوں میں مَیں نے پالیا کہ یہ کسی انسان کے ہونکنے کی آواز ہے۔ ایسی آوازیں اندرونِ حلق سے بیچارگی اور انتہائی تکلیف کے عالم میں بلا ارادہ نکلتی ہیں..... بیہوشی اور نزع کے وقت بھی قریب قریب ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔" چند لمحے مَیں نے مزید توقف کیا۔"

فراغت کے بعد مَیں اس نتیجہ پہ پہنچ چکا تھا کہ آوازیں' انسانی ہیں اور سامنے دکھائی دینے والے درختوں کی جانب آ رہی ہیں۔" مَیں کھڑا اُدھر دیکھ رہا تھا کہ میرا بچہ بھی پہنچ گیا.... میرے ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے واپسی کے رستے کی نشاندہی کرنے لگا۔ مَیں نے اُسے رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

سنو! تمہیں کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں؟

مجھے درختوں کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بھی اُدھر تکنے لگا۔ چند ثانیے دھیان دینے کے بعد کہنے لگا! لگتا تو ہے کوئی ہائے ہائے کر رہا ہے۔ کوئی کتا بلا نہ ہو؟

نہیں! یہ انسان کی آواز ہے۔ چلو! ذرا آگے جا کر دیکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی بیمار ہو یا کسی مصیبت میں مبتلا ہو؟

اُس نے کچھ غور کرتے ہوئے پلٹ کر ذرا دور سڑک کنارے کھڑی گاڑی کی جانب دیکھا۔"

گاڑی کھلی ہے.... بند کر آؤں؟

اللہ وارث ہے۔ تم میرے ساتھ ذرا اُدھر تک چلو!

دو تین منٹ میں ہم درختوں کے پاس پہنچ گئے۔ یہیں ایک کالے رنگ کا کتا بھی عجیب سی چوں چوں کی آوازیں نکالتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔' بچّہ بولا!

باباجی! میرا خیال ہے کہ اسی کتے کی آوازیں تھیں۔!

نہیں یار! اس کا بازو تھامتے ہوئے مَیں کچھ آگے بڑھ آیا۔

اِدھر ایک بڑی سی کھاٹ اور خفتہ دھرا ہوا دکھائی دیا۔'' اگر یہ ڈیرہ ہے تو کسی ایک آدھ بندے' پشو کو تو اِدھر ہونا چاہیے؟

کراہنے کی آواز پھر سنائی دی مگر قدرے واضح! آواز کے رُخ پہ چند قدم ہی بڑھائے ہوں گے تو' ٹارچ کی روشنی میں دیکھا... آم کا ایک اُدھیڑ عمر درخت' اُس کے تنے کے ساتھ ایک تومند نوجوان' برہنہ حالت میں بندھا ہوا ہے۔ بظاہر کچھ سمجھ نہ آیا...... یا کسی نے اسے لوٹ کر اِدھر بے بس کر کے باندھ دیا ہے....؟ اگر ایسا بھی ہوا تو بھی اس طرح برہنہ کر کے باندھنے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔ مَیں نے کسی حتمی نتیجہ پہ پہنچنے کے لئے اُس کے قریب ہو کے' چہرے پہ ٹارچ کی روشنی ڈالی.... دکھائی دیا کہ اُس کا مُنہ بھی قدرے بندھا ہوا تھا مگر کسی طرح اُس نے خود کو قدرے ڈھیلا کر دیا ہوا تھا... جس کی وجہ سے اُس کے مُنہ سے کچھ کراہیں نکل رہی تھیں۔''

وہ ہوش میں اور مستعد تھا مگر بندھا ہوا کچھ یوں کہ خود کو آزاد نہ کر سکتا تھا۔ بن کچھ سمجھے مَیں نے اپنے بچّے کی مدد سے اُس کے مُنہ پہ سے کپڑا ڈھیلا کیا... تاکہ وہ معتوب سانس تو کھل کر لے سکے۔'' ڈھاٹا کھلتے ہی اُس نے قدرے تیز تیز سانس لیتے ہوئے ہمیں دیکھنے پہچاننے کی کوشش کی مگر اندھیرے کی وجہ سے وہ ہمیں واضح طور پہ دیکھ نہ پا رہا تھا۔''

السلام علیکم پتر! تیرے نال کی بنیاں؟ ٹارچ کی روشنی اپنی طرف کرتے ہوئے مَیں نے پوچھا! وہ اس جنگل منگل اور رات کے پچھلے ویلے... اک کالے شا کالے' لمبی داڑھی والے' جنوں جیسے بابے کو دیکھ کر ڈر سا گیا۔'' بات تو ڈرنے والی ہی تھی۔ وقت سماں' ماحول' اُس کی ہذیانی سی کیفیت! کوئی بھی ہوتا تو یہی کچھ ہوتا۔؟ مَیں سمجھ گیا تھا... اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کی کوشش میں مَیں نے کہا۔ یار! ہم لوگ کھڑی شریف سے آ رہے ہیں اور لاہور جا رہے تھے۔ راستے میں اِدھر' پیشاب کی حاجت ہوئی۔ گاڑی روکی... فارغ ہوئے ہی تھے کہ تمہارے کراہنے کی آواز سُنی.... اِدھر پہنچ گئے! باقی سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔'' بتاؤ! تم کس مصیبت میں ہو؟

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ ایک خونخوار سا بُوڑھا اور ایک گھبرو سا جوان' ہمارے سروں پہنچ گئے۔'' یہ کون

ہیں' کہاں سے آئے ہیں؟ میرے سوالوں کا جواب' اُنہوں نے خود ہی دے دیا۔'' وہ میرے پُراسرار سے حلیے کو دیکھ کر قدرے گھبرا سا گیا تھا.... نہر کا کنارا' سنسان ویران سی جگہ' رات کا پچھلا پہر.... شر' شرارز' ڈائنوں چڑیلوں' پیریوں اور بڈاؤں کا ویلہ وقت' علاقہ' ماحول تعلیمی کی نِپس ماندگی؟ اُس کی گھبراہٹ' سمجھ میں آتی تھی۔''

میں اپنا پُرانا آزمودہ اور سلامتی پیدا کرنے اور بے یقینی رفع کرنے والا نسخہ استعمال کرتے ہوئے بھرپور انداز میں السلام علیکم کہا اور وہ بات کی کہ ہم اِدھر سے گزر رہے تھے۔ رفع حاجت کی غرض سے رُکے۔ اس لڑکے کی کراہنے کی آواز سُنی اور اِدھر آ گئے۔'' صرف اتنا بتا دیں کہ اس جوان کو اِدھر کس نے اور کیوں باندھا ہے.... کوئی چوری یاری یا لڑائی دُشمنی؟

زمانہ کھایا ہُوا بزرگ تھا.... مطمئن سا ہو کر مسکراتے ہوئے بولا۔ آؤ اِدھر کھٹ تے بجو! کتھوں آئے او.... تے کتھے جاسو؟

کھڑی شریف توں آئے آں.... لاہور' داتا صاحب جاساں!

کھڑی شریف اور داتا صاحب کا نام سُن کر وہ کچھ پتلا پڑا.... مجھے بھی کوئی پیر ویر سمجھتے ہوئے کھاٹ پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔'' صبح کاذب کا وقت لگنے والا تھا.... نیند اور سفر کی تھکاوٹ الگ.... اجنبی سا ماحول؟ شَشدو بَد میں پڑ گیا' بیٹھ لوں یا نکل لوں..؟ اندر اپنی بولی میں بولا.... محترم! تم تو پیدا ہی ایسے ویسے سیاپوں کے لئے ہوئے ہو؟ پرائے پھڈوں اور پھندوں میں خود کو پھنسانا تمہارا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ بیٹھ جاؤ بیٹا! کھاٹ پہ رام بھلی کرے گا۔''

وہ بوڑھا بزرگ' میرے گھٹنے پکڑتے ہوئے گھگھیایا.... سائیں جی! اے ساڈا اجانک صابر علی اے۔ بڑی مصیبت دے وچ پھسیا ہویا اے۔ تے ساڈا دوجا' جاتک قربان علی اے۔ اے جاتک کالج وچ پڑھنا اے۔ اگلی گل تساں نوں' اے دس سی۔''

قربان علی مجھ سے مخاطب تھا۔ سائیں جی! یہ میرا بڑا بھائی ہے۔ بچپن سے اسے خارش کی بیماری ہے۔ بائیس برس کا جوان ہے۔ مگر دُنیا کا بدنصیب انسان ہے۔ جتنی زندگی اس نے گزاری ہے۔ دن رات اپنے جسم کو کھجلتے زخمی کرتے ہی بسر کی ہے۔ چار بندوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں۔ اس کا جسم کسی انسان کا جسم ہی نہیں لگتا.... کسی خارش زدہ جانور کا جسم دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ناخن ہم بڑھنے نہیں دیتے اور نہ اسے دن رات کے کسی حصے میں تنہا چھوڑتے ہیں۔ اکثر ہم اسے' اس کی قمیص کے بازوؤں میں باندھ کے رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو یہ رگڑ رگڑ کر اپنا جسم زخمی کر لیتا ہے۔ روکو تو گالیاں دیتے ہوئے باہر بھاگ جاتا ہے۔''

قربان علی' مجھے نیم کے درخت سے بندھے' اپنے بڑے بھائی صابر علی کے پاس لے کر آ گیا۔ نارنج

جلا کر اُس کا الف ننگا پنڈا دکھانے لگا۔ جا بجا گھر 'نڈ' نئے پُرانے زخم! لگتا تھا... کسی خونی بھیڑیے نے اسے بھنبھوڑ کر رکھ دیا ہوا ہے۔" گو میں نے اس سے پیشتر بھی کھاج کھجلی اور دیگر جلدی بیماریوں کے اَن گنت مریض دیکھے مگر اس نوجوان کی حالت دیکھ کر میں اندر سے دہل سا گیا۔ جلدی عوارض کئی طرح سے انتہائی گِھن ہوتے ہیں۔ دیگر انسانی بیماریاں تیمار داروں کے لئے شفقت طلب تو ہوتے ہیں مگر نفرت نہیں پیدا کرتے.... محبت اور نفرت ردّ ِعمل جذبوں کا شاخسانہ بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی حالات' بشری کمزوریوں مجبوریوں کی سٹوری یا بگڑی ہوئی شکل میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہ دونوں صورتیں بھی ایک حد تک سمجھ میں آتی ہیں اس سے آگے انسانی فطری جبلی سرشتی مجبوریاں کمزوریاں اپنا کام دکھاتی ہیں۔"

علم الابدان کے مطابق مادۂ حیات کا انزال اور خارش مٹانے کے لیے کھجلنا..... انسان ہو یا کوئی حیوان دونوں کے لئے انتہائی تلذّذ کا موجب ہوتے ہیں۔ انسان اور دیگر جاندار جب ان دونوں میں کسی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہ بے خود ہو جاتے ہیں۔ انہیں مٹانے کے لئے ہر وہ حربہ اختیار کرتے ہیں جس کا عام حالات میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

لندن پکاڈلی سرکس میں تھیٹروں کا اِک جہاں آباد ہے۔ ایسے ایسے شہرۂ آفاق کھیل گھر' جن کے کھیل تماشے شہرت و ساکھ' تاریخ کا حصّہ بن گئی۔ جن کی مخصوص بالکونیوں نشستوں اور دَر و دیواروں نے بڑے بڑے بادشاہ' ملکائیں اور دیگر دُنیائے شہرت و عزت' ثقافت و سیاست کے تاجور دیکھے۔ جدھر کھیل' کئی کئی برس تک دکھائے جاتے ہیں۔ کئی کئی ماہ پہلے بکنگ کروائی جاتی ہے۔ جدھر کھیل دیکھنا اور کسی کھیل کا حصّہ بننا' بذاتِ خود ایک اعزاز سمجھا جاتا ہے۔

شیکسپیئر کا ایک مشہور کھیل' ایک لمبے عرصے سے اپنی دھاک بٹھائے ہوئے تھا۔ روزِ اوّل کی طرح اُس کا ہر شو فل جا رہا تھا۔ کئی کئی ہفتوں تک کی بکنگ ہو رہی تھی۔ سر لارنس اولیور' اسٹیج اور فلم کا جادوگر' مرکزی کردار میں تھا۔ کھیل کے دوران اسٹیج پہ اُسے اپنی کمر کے درمیان کھجلنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی جدھر ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ اُس سے رہا نہ گیا وہ بے خود سا ہو کر اسٹیج پہ ایک ایسی دیوار کے پاس چلا گیا جدھر' پتھر کی سیڑھیوں کا ایک کونا سا اُبھرا ہوا تھا۔ اس کی جانب پشت کر کے ایسے انداز سے کھجلی مٹائی کہ پروڈکشن اور تماشائیوں میں چند افراد کے علاوہ کسی اور نے' اُس کی کھجلی مٹانے والی حرکت محسوس نہ کی۔"

ایک رپورٹر نے اُس سے' اِس حرکت کی بابت ایک سوال پوچھا' اُس نے جواب دیا کہ...... "میں نے طے کر لیا تھا اپنی کھاج مٹانے کی خاطر اگر مجھے اپنا پورا کیریئر بھی داؤ پہ لگانا پڑا تو لگا دوں گا۔" کتا ہڈی سے رَس نکالنے کی جستجو میں اپنے دانتوں سے خون اور خارشیے کھجلاتے کھجلاتے اپنا جسم زخمی کر کے ہڈیاں ننگی کر لیتا

ہے مگر ایسا کرنے سے باز نہیں رہ سکتا اِس نوجوان خارشیئے کا بھی یہی حال تھا سارا جسم' نئے پرانے چھوٹے بڑے زخموں سے اَٹا پڑا تھا اور اِک عجیب سی بدبو! جب پاس کھڑا رہنا دوبھر دکھائی دیا تو مَیں پیچھے کھٹ کی جانب سرک لیا جدھر اس کا بوڑھا دُکھیا' باپ! دکھائی نہ دینے والے آنسوؤں سے رو رہا تھا۔"

ہاں! رونا اور آنسو بہانا بھی کئی طرح کا ہوتا ہے؟ چیخنا' چلّانا... آہوں کراہوں' پٹ سیاپا کرتے ہوئے رونا' ٹسوے' چھم چھم آنسو بہاتے ہوئے رونا پیٹنا اور گم سُم.... اپنے اندر کے گہرے کنویں' باؤلی میں اُترے دَم سادھے' بے آواز' گہری گہری سانسیں بھرنا! ایک وقت ایسا بھی کہ آہیں کراہیں.... رونا پیٹنا اور واویلا بھی ختم ہو کے رہ جاتا ہے.... یہ غم واندوہ کی انتہا ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ غم زدہ' حرماں نصیب کے ہاں آنسو یا آہیں فریادیں ختم ہو جاتی ہیں؟ وہ صبر اور تسلیم و رضا والے سفر پہ چل نکلتا ہے اور اس راہ کا مسافر' شکوہ بلب نہیں ہوتا!

اُس کے راضی برضا باپ نے' اُٹھ کر' میرے رُوبرو ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا! سائیں جی! آپ یہاں ایسے ہی اتفاق سے نہیں آئے.... آپ کو بتاؤں؟ آج رات' جب ہم اِسے زبردستی پکڑ کر اِدھر باندھ رہے تھے تو اِس نے اللہ پاک کی قسم کھا کر کہا تھا۔ لالہ! آج کی رات' میرا جو کرنا ہے کر لے۔ کل مَیں خود توں گولی مار کے ختم کر دیاں گا۔ مَیں تنگ آ گیا واں تُسی وی میرے نال عذاب بُھگتدے پے او۔"

سائیں جی! مَیں آپ کو ویکھدے ای سمجھ گیا ساں! رب نے تہانوں اِس کی شفا کے لئے بھیجا ہے۔" کھٹ پہ بیٹھا کے سامنے نیچے بیٹھ کر میرے پاؤں دبانے لگا۔" مَیں عجب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ "پائے ماندن نہ جائے رفتن" والی بات تھی۔ بچے کی تکلیف دیکھی جائے نہ بھائی باپ کی پریشانی؟ ایسی حالت میں بس! اللہ ہی ہوتا ہے جو کوئی مشکل کشائی کرے... چند ثانیئے مَیں نے آنکھیں میچیں شاید اندر کی کوٹھڑی سے کوئی حل دکھائی دے جائے...؟

بڑے بوڑھوں نے بھی ایک ٹونکہ سُجھایا تھا.... سفر کی حالت میں اگر صحیح سمت سُجھائی نہ دے تو مرکب کو توکلت' الی اللہ کہہ کر باگیں' اِس کے گلے میں ڈھیلی ڈال کر ہنکا دو۔ وہ صحیح رُخ خود بخود تلاش کر لے گا... اگر آپ پیادہ ہوں تو یہی کچھ پڑھ کے آنکھیں میچے' دائیں جانب جھولتے ہوئے گھومیں... آنکھیں کھولیں تو جس جانب' جی چاہے' اُدھر ہو لیں' ایسا ہی کچھ مجھ سے سرزد ہوا ہو گا..؟ آنکھیں وا کیں تو دائیں جانب ایک گھنا سا نیم کا درخت دکھائی دیا.... دیکھتے ہی میری آنکھوں میں چوندی پیدا ہو گئی.... دل یوں مطمئن سا ہو گیا.. جیسے پیاسے کو کنواں دکھائی دینے پہ اطمینان سا ہوتا ہے۔ چند ثانیئے غور کرنے کے بعد مَیں نے بچے کو درخت سے کھولنے کا مشورہ دیا۔"

بزرگو! یہ ڈیرہ آپ کا ہے... یا؟

جی! اپنا ہے...

اور یہ نیم کا درخت کتنا پرانا ہے؟

اپنے بچے صابرے کی عمر کا ہے....''

بیمار بچے کو کھول کر ایک دوسری چارپائی پہ لٹا دیا.... جدھر وہ اُلٹے پلٹے مار کر چارپائی کے بان سے اپنے جسم کو رگڑ رہا تھا۔''

## ● میرا ان ''نیم'' باز آنکھوں میں......!

صبح کاذب' صباحِ صادق میں تبدیل ہو چکی تھی.... ''موذنِ اوّل'' مُرغ کی پہلی اذان کا لہریے لیتا ہُوا آہنگ اور دور ریچہ' مشرق سے زردپیلی سا غبار بھی پھیلتا ہُوا بجھا آ رہا تھا۔ اس سمے کو'' نورِ پیر'' کا ویلا کہتے ہیں۔ اہلِ ایمان' اہلِ تصوف اور اہلِ نظر کے دھیان میں اس کے بے شمار تشرفات ہیں۔'' اس سمے کی عبادت... جسمانی وجدانی' رُوحانی ریاضت.... فنی ہُنری علمی مجاہدت.... منکوحہ سے محبت مجامعت.... مطالعاتی مشاہداتی اور تخلیقی اعمال میں برکت بڑھتی ہے۔ اس سمے' قبرستان' مزارات اور مسجد میں پہنچنا... صفائی ستھرائی' نمازیوں کے لئے پانی' گرمی سردی بارش کے متعلقہ اُمور میں ممد ہونا... بہت بڑے اَجر اور رُوحانیت طمانیت صالحیت کی فراوانی کا مُوجب ہوتا ہے۔'' پَو پھوٹنے سے پہلے پرندوں' خزندوں اور آبی مخلوق کو لنگر ڈالنا.... بندے کو حقیقت فطرت معرفت' ہدایت' برکت' رزق اور مالک کی رضا و خوشنودی کے قریب کر دیتا ہے۔'' خیال رہے کہ یہ ''نورِ پیر و یلے'' کی بات کر رہا ہوں.... یہ سماں ایک ایسا وقت کہ ستارے بھی ٹمٹما رہے ہوتے ہیں... آسمان کے مشرق میں سپیدی سی اُجل رہی اور شب تاری نے بھی گھونگھٹ ابھی اُٹھایا نہیں ہوتا.... قطبی نے بھی ابھی اپنا رختِ سفر اُٹھا رہا ہوتا ہے... الٹھی منزیاں' جن کے ٹھور ٹھوڑے' زمین پہ نہیں' کہیں ستاروں پہ ہوتے ہیں... نی منیری کے نغمے بکھیرتی ہوئی سُنائی دیتی ہیں۔ اس کے کچھ وقفے بعد سحر کی سحر آفرینیوں کا سماں' سُرأت پکڑتا ہے۔'' اسی سحر کی بابت احمد ندیم قاسمی نے سمجھا تھا۔''

رات جل اُٹھتی ہے جب شدّتِ ظلمت سے ندیمؔ
لوگ اس وقفۂ ماتم کو سحر کہتے ہیں

نیم جھٹپٹے میں' میں نے نیم کے درخت کی اُٹھان کو دیکھا... اس کے اُوپر کے تھن' ٹہنیاں' پتے

جھاڑے میری منشا کے مطابق دکھائی دیے۔'' اس از حد مغموم بوڑھے بزرگ سے کہا.... مَیں اللہ کے حکم سے ایک ادنیٰ سی کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ نتیجہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔'' وہ میری جانب پُر اُمید سے دیکھتے ہوئے بولا! حکم سائیں! نیم کے درخت کے قریب لا کر کہا۔ بابا! مضبوط سے سولہا سے بیس فٹے سبز مگر پکے بانس جنہیں نہ تو سینک دکھا کر سیدھا کیا ہو اور نہ ہی اس کے ٹھونٹھ ڈنٹھل صاف کیے ہوں۔ اس نیم کے گرد اگرد گاڑھ دو۔ ان کے اُوپر اسی طرح کے چھوٹے بانسوں سے مچان سی بنا دو۔ بالکل ہی ایسی ہی جیسے شکاری جنگل میں شیر کا شکار کرنے کی خاطر بناتے ہیں۔ مچان ایسی بنی چاہیے جس پہ گھاس پھپریل کا فرش بیٹھنے چلنے اور لیٹنے کی سہولت ہو.... گرداگرد بانسوں کا حفاظتی جنگلہ بھی باڑ بھی! تاکہ اوپر رہنے والے بے دھیانی سے نیچے نہ گر پڑیں۔ بالکل جنگل کے ٹارزن کی طرح کا درخت کے اُوپر گھر! اوپر نیچے آنے جانے کے لئے.... اسی طرح کے بانس کی سیڑھی۔ مگر اس سیڑھی سے مریض دوران علاج نیچے نہیں اُترے گا۔ اس کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہنے والا اُتر چڑھ سکے گا۔''

بُوڑھا! میری جانب یوں متوجہ تھا جیسے مَیں اُسے کوئی جنگل سٹوری سنا رہا ہوں۔ ہکلا کر پُوچھنے لگا۔ کیا ہم سب گھر والے بھی اُوپر جا سکتے ہیں؟

نہیں! اُوپر صرف وہی آ جا سکتا ہے جو چند ہفتے یا مہینے اُس کی تیمارداری پر مقرر ہوگا؟ کوئی بھی ملازم یا بھائی! جو چوبیس گھنٹے اُس کی نگہداشت پرہیز پہ پوری ذمہ داری سے توجہ دے سکے...؟

مَیں ابھی جا رہا ہوں۔ اپنا ٹیلیفون اور پتا دیتے ہوئے کہا۔ مَیں انشاءاللہ! ٹھیک چار دنوں بعد اِدھر آؤں گا.... اس لئے دوائیں تیار کرنے میں اتنا وقت لگ جائے گا۔''

اُٹھنے لگا تو بُوڑھا پوچھنے لگا سائیں! ان چار پانچ دنوں میں اس بچے کا کیا کریں؟ یہ تو وہ پل بھی چین سے نہیں رہتا۔ مجبوراً اسے ہمیں باندھنا پڑتا ہے۔ رگڑ رگڑ کر اپنے آپ کو زخمی کر لیتا ہے۔'' اب مَیں مریض کے پاس آیا.... السلام علیکم کہتے ہوئے مُسکراتے ہوئے کہا۔ بیٹا! انشاءاللہ! تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔ مَیں تمہارے لئے دوائیں تیار کرنے لاہور جا رہا ہوں.... تین چار دن لگیں گے ...بس! تھوڑا سا مزید صبر اور خود پہ جبر کر لو۔ اللہ! تمہارے لئے اپنی رحمت اور فضل و کرم کے دروازے کھول دیں گے۔ تم صحتمند ہو جاؤ گے۔ سکول کالج پڑھائی شروع کرو گے۔ پھر ..اور پھر تمہاری شادی کریں گے اور میرا وعدہ کہ میں تمہاری شادی میں شریک ہوں گا۔''

مَیں نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھ کر اُس کا ماتھا چوما! مَیں دیکھ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بوڑھا اور اُس کا دوسرا بیٹا بھی سُبک رہے تھے..... مریض بچہ! آہستہ سے کہنے لگا۔ سائیں جی!

اپنا ہاتھ اور مُنہ دھو لیں۔ میرے تو قریب کوئی نہیں آتا اور آپ نے مجھے چُوما ہے۔
سو ہنے پُتّر! تم نے دیکھا ہوگا۔ کُتّے بلّیاں اپنے بیمار بچّوں کو چاٹتے ہیں...وہ سارے کام...صفائی ستھرائی مرہم پٹّی زبان سے ہی کرتے ہیں...وہاں تو کوئی چھوت چھات نہیں ہوتی...اخلاص ہی اخلاص ہوتا۔ کیا ہم! کُتّے بلّیوں سے بھی گئے گزرے ہیں؟ مجھے لاہور سے واپس آنے دو....میں تمہیں چُوموں گا بھی چاٹوں گا بھی....اپنے ہاتھ سے تمہیں کھلاؤں گا پلاؤں گا...اور جب تک تم ٹھیک نہیں ہوتے اِدھر ہی اُوپر مچان میں رہوں گا۔''
صابرؔ بلک بلک رونے لگا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ کان میں کہا' سائیں جی! تہاڈی قسمے مَیں تندرست ہوگیا ہوں۔''
اسم بامسمّی' صابر نے سچ کہا کہ وہ اُسی لمحہ تندرست ہوگیا تھا۔''اصل خوبی وخرابی' تو پہلے اندر سے شروع ہوتی ہے...باہر تو اُس کا پَرتو ہوتا ہے...دل اور دماغ پہلے مانتے ہیں پھر جسم وجان اُسے جانتے ہیں۔''
قارئین! مَیں اللہ کے بھروسے پہ اُنہیں کہہ سُن تو آیا۔ اَب مَیں سب سے بڑے حکیم حکمت والے سے توفیق طلب کر رہا تھا کہ وہ مجھے کچھ ایسا سُجھا دے جو اس کے لئے شفا بن جائے۔''
مَیں اُنہیں اپنا ٹیلیفون نمبر دے آیا تھا۔ اگلے روز اُس کے والد کا فون آیا کہ صابرؔ اِک زمانہ کے بعد قدرے سکون سے سویا اور بانسوں کی فراہمی بھی ہوگئی...کچھ مستری لوگ' نیم کے درخت پہ شکاریوں جیسی مچان بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ علاقہ کے لوگ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے اور چہ میگوئیاں بھی کہ یہ کیسا علاج ہے جو نیم کے درخت کے اُوپر چڑھ کر کیا جاتا ہے...؟ کچھ کام مستریوں کی سمجھ میں نہیں آرہا۔ اگر ایک روز پہلے آجائیں تو بہتر ہوگا۔''
میری اپنی مصروفیات تھیں۔ اس کے جسم پہ لگانے کے لئے ایک خاص قسم کا اُبٹن تیار کرنا تھا۔ جس کے لئے خاص قسم کی 'ملتانی مٹی' منگوانے کے لئے' آدمی بھیجا ہُوا تھا۔ خوشاب کی کالی مہندی...کالُھی بیری کا شہد...تارے میرے کا تیل وغیرہ....! کوشش کے باوجود میں مقررہ دن نہ پہنچ سکا۔ فون پہ فون....اُدھر مچان تیار مریض تو جیسے اُس کی شادی ہورہی ہو۔ علاقے کے چھوٹے بڑے سب جمع تھے۔ جب مَیں جاتلاں پہنچا تو بہت سے لوگ' مجھے دیکھنے کی غرض سے موجود تھے۔ عورتیں' مرد' بچے اور مریض بھی! یعنی صابر کا علاج ابھی شروع بھی نہ ہُوا تھا...دیگر مریض پہلے ہی پہنچنا شروع ہوگئے۔ بڑی دقت سے جان چُھڑا کر آگے مچان والے ڈیرے پہنچا۔ وہاں جیسے میلہ لگا ہُوا تھا۔ مَیں نے بہت پہلے ہی راستے میں گاڑی روک لی۔ پیغام بھیجا کہ مَیں اِدھر ایک مریض کا فی سبیل اللہ علاج کی کوشش میں آیا ہوں۔ کوئی تماشا کرنے نہیں۔ جب تک تمام

غیر متعلقہ لوگ 'اُدھر سے ہٹیں گے نہیں' میں اُدھر نہیں جاؤں گا۔'' اُدھر پہنچا تو ڈیرے پہ چند گھر کے افراد تھے لیکن ڈورنز دیک ابھی تک لوگ موجود تھے۔''

مچان ٹھیک بنی تھی۔ مضبوط اور کھلی ڈھلی کہ دو آدمی بیٹھ لیٹ بھی سکیں۔ ڈال ٹہنیاں بُور پتے... نیم کی مخصوص مہک' اردگرد شفائی ماحول! غرضیکہ مَیں نے خود اوپر پہنچ کر ہر چیز کی تسلی کر لی۔ ایک طرف' ہلکا پردہ کر کے بیت الخلاء' غسل خانہ' اوپر کے چھتے پہ پلاسٹک کا ڈرم' جس میں پانی کا ذخیرہ.... لمبی رسّی کے ساتھ ڈول باندھ کر لٹکا دیا کہ چھوٹی موٹی چیز کے لئے بار بار اُوپر نیچے نہ جایا جائے۔'' دراصل یہ عجوبہ چیزیں تھیں جو اُدھر کے لوگوں کے لئے تماشا تھیں...لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دائمی خارش کھاج کا یہ کس طرح کا علاج ہے جو کبھی سُنا نہ دیکھا؟ بات دُرست تھی کہ مَیں خود بھی یہ کچھ نہ جانتا تھا' کبھی ایسا کیا....میرا طب حکمت سے کیا تعلق بنتا ہے۔ اس کے باوجود مَیں ایسا کر رہا تھا' مجھے یہ سب کچھ کس نے سُجھایا؟ یہ مچان دُخان.. نیم کا درخت' یہ کیمیائی اُبٹن مرہم جو مَیں لبطور' اسی کے لئے بنا کر لایا تھا...اس کا نسخہ میرے ہاں' کہاں سے آیا..؟ ان تمام باتوں کا جواب اور اس طرح کی مزید لاتعداد حرکتوں کا جواز' میں کبھی نہ تلاش کر سکا...اور شاید مجھے ایسی کوشش بھی نہ کرنی چاہیے....!

یہ شکاریوں کی مچان تو ہرگز نہ تھی البتہ! جنگل نانس' یعنی نارزن کی رہائش گاہ جیسی ضرور تھی... اِدھر کے سادے فرادے دیہاتی لوگوں کے لیے ایک عجوبہ! اور یہ کہ صابر' اس کے اُوپر رہے گا اور علاج بھی ادھر ہی ہو گا.....''

مَیں نے بوڑھے باپ اور اس کے چھوٹے بھائی کو طریقہ علاج' جسم کی مالش' اُبٹن کا لیپ' خوراک' پرہیز' ہر اک بات' طریقہ تفصیل سے سمجھا دی اور ہر روز' ٹیلیفون پہ رابطہ کی تاکید بھی کر دی۔''

قارئین! تقریباً ساڑھے چار عشروں کے بعد اس کی بیماری میں نمایاں بہتری آ گئی۔ جسم کی کھال' جیسے تبدیل ہو رہی تھی۔ سانپ کی طرح' پرانی کینچلی اُتر چکی تو وہ کسی تانبے کے ایسے برتن کی طرح نکل آیا جسے قلعی کرایا ہو....خارش اب برائے نام رہ گئی۔ جسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔'' نیم کی شفا بخش' کیمیا اثر ٹہنیوں پتوں جھاڑوں سے چھچھل کر پہنچتی' ہوئی ہوا... سورج چاند ستاروں کی ضیاء باریاں...صبح گاہی' دوپہر' شام اور شب بھر کی مہکاریں پھوار یں.... فرحت بیز پُروائیاں' اَنگ رنگ! پہروں سَموں کی سَمیا سے اس میں مردانہ اور دلبرانہ وجاہت و جمالت کی کئی پرتیں اُبھر آئیں۔ وہ دھیمی دھیمی مسکراہٹ کی مانند' واپس زندگی کی تابندگی کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیتا' ہوا دکھائی دیا۔''

اِدھر کے سادہ لوح' خوش فہم اور خوب خُلق لوگوں نے میری جی جان سے پذیرائی کی تھی' پھولوں کے

باڑ ڈھول تاشے...صابر کے گھر والوں اور دیگر علاقے کے لوگوں کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ آدھ گھنٹے کے بعد انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ "میں اُدھر چونکہ اِس وعدہ پہ گیا تھا کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ تک ہی رُکوں گا۔ تخت مصروفیت کے دن تھے۔ وقت دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ میں نے کچھ مزید مشورے اور دوائیں دیں اور صدقہ ادا کرنے کا کہہ کر واپسی کے لئے اجازت چاہی....مگر اُن کی آدھ نظروں سے لگتا تھا کہ وہ مجھے مزید روکنا چاہتے ہیں مگر میں نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے اجازت چاہتے ہوئے درخت کی جانب بڑھ آیا۔" صابر ابھی تک درخت کے تنے سے جُڑ کر یوں کھڑا تھا جیسے اس سے دُوری اِسے منظور نہ ہو!

نیم! نون سے شروع ہونے والا لفظ ہے اور مجھے ایسے نام بڑے اچھے اور سوہانے لگتے ہیں جو نون سے ابتدا پکڑیں اور نون پہ ہی اختتام پذیر ہوں۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی.....نور جہان' نوتن' نگین' نازنین' نوشین' نعمان' نشاتین' نسترن' نین اور بھی بے شمار نام...! جو شروع تو نون سے ہوتے ہیں مگر نون پہ ختم نہیں ہوتے....مثلاً نیلم' نگار' نگاہ' نادرہ' ناقوس' نیند' نور' نیاز' نیساں' نیل' نیلوفر' نکہت' نگارش' نماز' نقیب' نرگس' نخشب' نائمہ' ناہید اور بھی لاتعداد الفاظ سُن دیکھ اور پڑھ لکھ کر بندہ تابندہ سا ہو جاتا ہے۔"

اِسی خاندان کے ایک نون سے' ساتویں نمبر" ی" سے آگے قبلِ زوال اگر" میم" کی اضافت کر دی جائے تو لفظ" نیم" وجود میں آتا ہے۔" لفظ نیم کش اور دو نیم' نیم بسمل سے کچھ پیچھے آگے ایک" نیم" کا درخت بھی ہوتا ہے...اس سے بڑا ماحول اور انسان دوست شجرِ خاص دُنیا میں کوئی اور تلاش نہیں کیا جا سکتا۔" یہ مسیحا صفت درخت...ماحولیاتی' حیاتیاتی نظام کی تطہیر و تہذیب میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔" واحد شجرِ بے مثل' جس کی بنیادی کھاد مٹی سے لے کر جڑیں' تنے' چوب' ٹہنیاں' پتے' کونپلیں' نبولیاں' چھلکے' چھال' موم' تیل' خشک جھڑے پتے۔ اس سے چھن کر گزرتی ہوا...سایہ' بارش میں اس پہ سے ٹپکتا پانی...اس پہ آنکھیں جما کر دیکھنا... ہاتھوں یا جسم لگا کر مَس کرنا...چھال' پتوں کا جوشاندہ' نرم ٹہنی کی مسواک' اس کی جلائی ہوئی لکڑی کی راکھ کا منجن' اس کے لعاب کا مرہم' پتوں سمیت نرم ٹہنیوں کا پنکھا.... نبولیوں' نمولیوں کے ساگ کا سالن اور اس کے چھلکوں' برادے' پتوں کی دھانس کا کاجل...اس کی نبولیوں کی چلم' دم کشید کرنا اور پانی میں جوش دے غسل کرنا....اس کے قریب رہنا' دیکھنا' چھونا...غرضیکہ نیم' سیکڑوں' بیرونی اندرونی' چھوت چھات' وبائی موسمی اور جینیاتی جنیاتی' ذہنی قلبی عارضوں میں تریاق کا کام دیتا ہے۔

" نیم حکیم خطرۂ جاں" تو سُنا ہوگا؟ اب یہ بھی سُن لیں کہ ایک نیم! ایک سو ایک حاذق حکیموں پہ بھاری ہوتا ہے۔ جس کی اس کے ساتھ یاری ہوگئی اُس کی ڈاکٹروں حکیموں سے کُٹی ہوئی...جس آنگن میں نیم ہوگا۔ اُس کے گرداگرد دُور دُور کوئی حکیم نہ ہوگا۔ لیٹنے والے گدے اور تکیے میں نیم کے پتے رکھنے پہ' حشرات کیڑے

کوڑے‘ سانپ‘ بچھو‘ مکھی‘ مچھر‘ کھٹمل‘ چیچڑ‘ چوہے‘ خارش‘ کھجلی سے بچاؤ رہتا ہے۔ بُرے خواب‘ حتیٰ کہ شلوار پائجامہ بھی خراب نہیں ہوتے۔ جگر‘ معدہ معتدل اور دورانِ خون متوازن رہتا ہے۔“

سانس کی دشواری‘ دمہ‘ سادہ دق‘ سِل اور جلد کی بیماریوں والوں کے لئے مشورہ ہے کہ صحت مندی تک دن رات دو چار مہینے نیم کے درختوں یا کم از کم ایک درخت کی قُربت میں بسر کریں۔“ ”مَیں نے تھائی لینڈ‘ لہاسہ اور تبت کے کئی شفائی آشرموں میں مریضوں کے کھانے پینے کے برتن‘ نیم کی لکڑی کے بنے ہوئے دیکھے اور ان کے مقفوں جھونپڑوں میں اسی نیم کی پتوں سے بھرپور ٹہنیاں لٹکتی ہوئی دیکھیں! نیم کے روغن سے ہاتھ پاؤں اور گردن کے پٹھوں کی مالش.... ایک گڑھا جو قدِ آدم کے مطابق گہرا... نیم کے بُرادے سے بھرا ہُوا... مریض کو اُس کی ضرورت کے مطابق‘ گردن تک اُتار دیا جاتا۔“ نیم کی شفا بخش کڑواہٹ‘ شکر کی زہر اثر مٹھاس سے ہزار گنا زیادہ گُن رکھتی ہے۔“

یہ تمام کتھا لکھنے کا مقصد محض یہ تھا کہ جب خیر و سلامتی‘ ہدایت و مغفرت کے فیصلے ہوتے ہیں تو مالکِ مطلق‘ سزاوارِ عزت و عظمت‘ منبعِ حکم و حکمت کے گھر سے مطلق دیر نہیں ہوتی۔ فی الفور ہر حیلہ وسیلہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ آگے بڑھنے‘ بڑھانے والے کارندے مُہرے بھی تیار ملتے ہیں... ناکارے‘ آشتی‘ سلامتی‘ صلح و امن کے ہرکارے بن جاتے ہیں۔“ مجھے تو اللہ کریم نے اِس مشکل عمل میں اِک عامل بنا دیا۔ مَیں کیا جانوں کہ حکمتِ طب کس چڑیا کا نام ہے۔ نیم کی نمولیاں اور کریلے کا کڑوا کس جوگا ہوتا ہے؟ وہ حکیمِ لایزل!! جسے چاہے اکسیر کر دے‘ جسے چاہے اثیر کر دے۔“

اب واپس‘ اُسی کینیڈا والے بچے کی طرف چلتے ہیں... جسے پیدائشی طور پر کھجلی خارش کی الرجی تھی۔ وہ زندگی سے بیزار ہو چکا تھا۔ ہر طرح کے علاج معالجے‘ ٹیسٹ ٹیکے‘ پرہیز‘ پیر فقیر‘ مگر وہ جب کسی طرح سے شفایاب نہ ہُوا تو میرے حوالے ہُوا... اُس کے والدین کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ لکھائی پڑھائی کے قابل نہ شادی کے اہل! بدبُو‘ نحوست‘ پژمردگی کی آماجگاہ..! اُس کی سوشل لائف نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ بغیر کسی اطلاع‘ اجازت میرے دروازے پہ کھڑے تھے۔“

مَیں نے بتیرا نالا‘ سمجھایا کہ مَیں حکیم ڈاکٹر نہیں ہوں... وہ جو کہتے ہیں‘ بھوکا‘ بیمار‘ بیکار... دیوانے ہوتے ہیں۔ ان پڑھے لکھے آسودہ حال لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ ایک ہی رٹ کہ ہماری آخری اُمید آپ ہی ہیں۔“ یہ تو خدا کا کرنا ایسا ہُوا تھا کہ اس دوران یہ نیم کے علاج والا واقعہ پیش آ گیا مَیں نے مالک کا نام لے کر اس بچے پہ بھی یہی طریقہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔“

چونگی کے ایک نواحی گاؤں میں میرے بچے کی پودوں کی نرسری تھی... کچھ عرصہ پہلے مَیں نے اس کے

ہاں نُموی نیم کے کچھ جوان پودے دیکھے تھے۔ نیم کی کئی ایک اقسام ہوتی ہیں۔ جن میں سب سے کڑوی اور شفائی رَسوبت و رَطوبت کی حامل یہی نُموی نیم ہوتی ہے۔'' جب میں اُس کے ہاں پہنچا۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ مجھے اپنے مطلب کے مطابق ایک جوان نیم کا درخت دِکھائی دیا جو نرسری کے آخری کونے میں استادہ تھا۔'' میں نے اُس سے اِس بیمار بچے کے علاج کے لئے مدد چاہی تو اللہ کریم نے اُسے بھی چارہ گروں میں شامل فرما دیا۔ درخت کے پاس ایک رہائشی کوارٹر تھا... جسے تھوڑی بہت تبدیلی سے عارضی رہائش کے قابل بنا دیا گیا۔''

دو تین دن میں ہر چیز کی تیاری کر کے' بچے اور اس کے والدین کو لے کر اُدھر پہنچ گیا۔'' مختلف پھلوں پھولوں اور دیگر آرائشی اور زیبائشی پودوں کے بڑے بڑے گملے پڑے تھے۔ ساتھ ہی رواں تازہ پانی کا سوتا' جو جنت کی کسی نہر سے وابستہ دکھائی دیتا تھا... دائیں جانب قریب ہی پھلائی اور چھوٹی بیریوں کا ایک چھوٹا ساذخیرہ..... ننھی ننھی شہد کی مکھیاں بھی دکھائی دیتیں.... اُمرودوں' آموں اور فالسے' جامن کے بونے پیڑ! چھوٹی چھوٹی کیاریاں.... اُچھل کُود کرتی ہوئی گلہریاں... چہچہاتی چڑیاں... پُھدکتے ہوئے ممولے! سبزے کی میٹھی میٹھی مہک۔ وہ گیسوئے یار کی مانند گہرے ٹھنڈے سائے' ایسا گوشۂ عافیت کہ یہیں عمر تمام کرنے کو جی چاہے۔''

قصہ سمیٹنا چاہوں تو یوں ہوگا کہ لگ بھگ اتنا ہی عرصہ لگا جتنا پہلے مریض صابر حسین کو لگا تھا... کینیڈا میں پیدا ہونے والا یہ جوان بھی اللہ کریم کے کرم سے ہمیشہ کے لئے اس خبیث بیماری سے نجات پا گیا۔'' بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی ٹھیک ہی تھی مگر یہ تو بہت آگے تک نکل گئی! نوجوان نے صحت کیا پائی' اُس کی تو'' جیسے سمجھ دانی کھل گئی۔ وہ خوب جان پایا زندگی کیا ہوتی ہے۔ فطری انداز سے جینا مرنا' اپنے اندر کیا معنٰی رکھتا ہے.... قناعت کفایت اور راضی برضا رہنا کیا ہوتے ہیں؟ اپنے وطن اپنی مٹی میں کیسی تاثیر اور توقیر ہوتی ہے؟ اس طریقۂ علاج اور اِدھر کے ماحول سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ سیدھے سادے' اخلاص و اخلاق سے سنورے ہوئے لوگ.... کھیت' ہریالی' ٹھنڈی ہوائیں... سبزیاں پھل پھول... اُس نے والدین کو بتا دیا کہ واپس کینیڈا نہیں جائے گا۔ تعلیم بھی یہیں حاصل کرے گا اور باقی زندگی بھی اِدھر اسی جگہ ہی بسر کرے گا۔'' والدین کا تعلق بہاولپور سے تھا۔ اُنہوں نے اپنے بیٹے کی خوشی خواہش کی خاطر' اِدھر ہی رہنا قبول کر لیا۔ وہ اپنے بیٹے کی کسی خواہش کو رَد نہیں کرنا چاہتے تھے۔''

میری وساطت سے ہی اُنہوں نے اس نرسری فارم کو منہ مانگی قیمت پہ حاصل کر لیا۔ پہلے والے ملازم بھی برقرار رکھے۔ آنجو کے سامنے والے قطعہ پہ ایک منزل کاٹج بھی تعمیر کروالی.... نرسری کے نقشے بخرے کر کے جدید انداز میں تبدیل کر دیا۔ امپورٹیڈ قیمتی نایاب پودے منگوائے اور پہلی مرتبہ پاکستان میں غیر ملکی کمیاب اور بیش قیمت انوکھے زیبائشی پودوں' درختوں کے کاروبار کو متعارف کرایا۔''

صحت یاب ہونے والے اور کینیڈا میں جنم لینے والے نوجوان کو تو جیسے اپنے خوابوں کا جہان مِل گیا تھا...اُس نے اپنی اُدھوری تعلیم کو مکمل کرنے کی ٹھانی لیکن اپنا سبجیکٹ تبدیل کر دیا۔ اب اُس نے نباتات میں تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ''خاص طور پہ نیم کے شفائی اثرات سے وہ خاصا متاثر تھا۔ اسی نیم نے بڑی آسانی اور خوشی سے اس کی کایا پلٹ کی تھی! بڑی آسانی اور بے دھڑکی سے وہ یہاں تک کہہ جاتا ہے۔ نیم کے راست استعمال سے موت کو بھی مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ طویل عمری کا آسان اور سمجھ میں آنے والا نسخہ نیم کے پاس موجود ہے۔''

سچ ہی تو تھا' نیم کی مسیحائی نے اُسے ایک نیا روشن مستقبل دیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہہ سُن جاتا' اُس کے لئے جائز تھا۔ اُس نے علاج کے دَوران استعمال ہونے والی نیم کے اُوپر مچان کو محفوظ کرلیا...اپنی رہائش' اسی پہ رکھی' بلکہ دفتر تک اُوپر بنالیا۔ نئی ضرورتوں کے تحت مناسب سی تبدیلیاں بھی کیں۔ یہ بالکل ایک ماڈرن نارزن کی سی کاٹج تھی۔ درخت کے گِرداگِرد دائرے میں مضبوط بانسوں کی دیوار....اس کے اندر گھومتی ہوئی چوبی سیڑھیاں جو اُوپر کاٹج تک پہنچتی تھیں۔ غرضیکہ یہ ایک آئیڈیل قسم کی جدید قدیم انداز کی رہائش گاہ تھی۔ جس کا شہرہ جلد ہی گردونواح میں پھیل گیا۔ مگر اِدھر کا راستہ کوئی شارعِ عام نہ تھا۔ ایک معتمد چوکیدار چوبیس گھنٹے اِدھر متعین رہتا۔''

بوڑھے والدین بھی اُوپر نہ جا سکتے تھے...البتہ! مَیں جب بھی پاکپتن جاتا تو اُسے ملنے کی خاطر نرسری پہنچتا۔ وُہ مجھے اصرار کر کے گھونسلے میں ٹھہراتا۔ ہم اکثر کھڑکی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے' شطرنج کھیلتے۔'' اس نے تو میرے منع کرنے کے باوجود اپنے اس دَرختی گھر کا نام ''کاگا کا گھونسلا'' رکھ دیا تھا۔'' یہ گھونسلا پنج گوشہ اور پنج دَرّہ تھا...اتنا آسودہ خوبصورت اور عجیب و غریب کہ اِک نظر دیکھنے والا' اِدھر رہنے حاصل کرنے کی خواہش پال لے۔ لیکن مَیں اُسے کیسے سمجھاتا کہ کوّا گھونسلا نہیں بناتا......''

ایسے ہی مَیں نے کہہ دیا' یار! اس ہٹ کو پانچ ستارہ پنڈال' مجھوُرہ یا پنج تنی پنجہ کہنا چاہیے؟

وہ عجیب سی اِستفہامیہ نگاہوں سے مجھے تکنے لگا...شاید میری پنج پہلوی پہیلی اُس کی پہنچ سے'' پسِ پردہ سی تھی۔''

مَیں نے اسے عاجز پاکر پوچھا! پنجتن' پنجشورہ' پنج پیر' پنجا' نگا' پنجاب' پنجیری' پنجابی' پانچواں وَز' پانچواں سوار' پانچواں چراغ' پانچواں جارج' پانچواں ڈنڈا' پانچواں سُر' پنج تالہ وغیرہ کیا ہوتے ہیں...؟

وہ ہونٹ سکیڑے چُپ تھا...ظاہر ہے کینیڈا کی پروَرش اور پیدائشی بیماری کی وَرزش والا'' فاری' کچا بچہ! بھلا ایسے پکّے پکوڑ' نمو نچوڑ کی اس مغز نچوڑ بات کا جواب کہاں سے لاتا؟

میں نے اُس کی کم چپ سے مزہ لیتے ہوئے مزید سوال کر دیا۔ اچھا یہ بتاؤ! تم نے کیا سوچ کر اس کالج کو پنج کونہ شکل دی.... پانچ دیواریں پانچ روزن بنائے.... چار یا چھ کیوں نہ بنائے۔؟

اُس نے قلم اُٹھایا اور کاغذ پر پانچ گوشہ ستارا بنا کر مجھے دکھاتے ہوئے بتایا کہ اُسے بچپن میں سکول کی بجائے اپنے گھر کے ایک خاص کمرے میں رہ کر پڑھنا پڑتا تھا۔ اُس کی مِس نے اُسے کاغذ پہ پِن کی نوک ہٹائے بغیر پانچ کونوں والا ستارا بنانا سکھایا۔ مجھے پنج کونہ ستارا بنانا بھلا لگتا تھا۔"

خارش کھاج سے کچھ لمحوں کے لئے میرا دھیان بٹ جاتا تھا۔ اسی طرح ستارے بناتے بناتے میں جیسے خود بھی پنج گوشہ ستارا بن گیا۔ جاگتے سوتے نے میں ستاروں کے پنج گوشوں میں بنا رہتا۔ میں کوشش کرتا' کبھی کوئی ایسا ستارا بھی بناؤں جو پانچ کی بجائے چھ سات کونوں والا ہو اور قلم کی نوک بھی کاغذ سے نہ اُٹھے... مگر میری ایسی کوشش کبھی کامیاب نہ ہو سکی اور اگر کبھی کچھ بن بھی پاتا تو وہ کوئی ستارا' آنکھ کا تارا' ہرگز نہ ہوتا... کوئی لکیروں کا بنا ہوا کوئی پزل بن جاتا جس کا مخفی مقصد دریافت ہونا ہنوز باقی رہتا......"

آپ کے حکم کے مطابق جب میں نے اس کالج کا ڈیزائن دریافت کرنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے میرے ذہن میں یہی پنج گوشہ والا آئیڈیا آیا تھا۔ بتیرا چاہا کہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچوں مگر گھوم گھام یہی نقش اُبھرتا... اس لئے کہ شاید یہی پنج گوشہ ستارا میرے لاشعور میں بیٹھا ہوا تھا۔"

مگر یہ "کوّے کا گھونسلا" کہاں سے آ گیا... اس کا نام تو کسی پانچ گوشہ شکل کے مطابق ہی ہونا چاہیے تھا؟

وہ حسبِ معمول پھر کسی ایسے غبی بچّے کی بے سمجھی معصومیت لیے پڑ گیا... مجھے ہٹ ہٹ خالی نظروں سے دیکھنے لگا...! میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کوئی جواب دینے کی حالت میں نہیں ہے۔

بولو! چُپ کیوں سادھ لی؟ یہ کالے کوّے کا گھونسلا! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کوّا' گھونسلا نہیں بناتا۔ یہ ملامتی درویش پرندہ ہے۔ کھوؤں' دراڑوں' ٹیلے ٹبوں کے بِلوں سوراخوں میں' اُدھوری سی شب بسری کی تہمت دھرتا ہے.... ٹہنوں ٹہنوں پہ بھی کبھی کبھی کچّی نیند کے جھکولے لے لیتا ہے۔ دیکھو گے کہ یہ ہمیشہ پانچویں سُر "پا" میں رہتا ہے' کبھی اپنا "کال" نہیں بدلتا۔ چوری چکاری' چھینا جھپٹی' لوٹ مار' موقعہ شناسی' عیاری مکاری' تیزی ہُشیاری.... اس کی جبلّتِ اولیٰ میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھیں' دل زبان' کالی اور خون بھی سیاہی مائل ہوتا ہے۔"

ڈرتے ڈرتے' اُس نے زبان کھولی! میں یہ سب کچھ تو نہیں جانتا سوائے اس کے' کہ آپ اپنے آپ کو کاگا کا سروپ کہتے ہیں۔ اس نسبت سے کاگا کا گھونسلا نام رکھ دیا۔"

لیکن دوست! یہ نام اس لحاظ سے بھی مناسب نہیں کہ کاگا والی کچھ خوبیاں اور برائیاں مجھ میں پائی نہیں جاتیں۔'' مثلاً یہ انسان کا اُستادِ اوّل ہے۔ کہتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کو طوفان تھمنے کے بعد خشکی کی خبر بھی اس نے دی تھی۔ آبِ حیات کے چشمہ کا علم بھی رکھتا ہے۔ موذنِ اوّل بھی یہی ہُوا مسلکاً ملامتی قلندری بھی ٹھہرا کہ اپنی ذات واوقات کی نفی میں تہہ تک اُترا ہُوا۔''

اب اس کی خامیوں کی جانب پلٹو! چوری چکمہ چالاکی کا چاؤش! پراگندگی پلیدی فضلات پہ بھی گرے۔ فضول سی کائیں کائیں کرختی اور شور و غوغا کا باجا... ننھے نوزائیدہ پرندوں کے بچوں انڈوں کا بیری... گنجوں کا دشمن! غریبوں تنگ دستوں کے ہاں مہمان بھی گھیر گھار کر یہی لاتا ہے۔ آفاقی بلیات ارضی آفات کو سونگھ دیکھ لیتا ہے مگر بتاتا کسی کو نہیں... بس! کائیں کائیں کی رٹ تیز کر لیتا ہے۔''

اب بتاؤ تمہیں یہ سب کچھ میرے ہاں نظر آتا ہے؟ میں تو بس! کسی مراثیوں ڈوموں کی بستی والا نام نہاد ڈرپوک سا کاگا ہوں... جو ان کے ننگ دھڑنگ مدقوق بچوں کی باسی روٹی کے ٹکڑوں پہ نظر رکھتا ہے... اُدھر تو اُسے فضلہ بھی نہیں کہ اصلاً نہیں ہوتا۔''

مگر آپ تو....؟

مَیں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ یاد رکھو کہ اچھائی کی جڑ برائی میں اور نیکی بدی کے باطن سے ہویدا ہوتی ہے۔ یہ فقیر درویش بھگت سنت روگی جوگی.... اُجاڑوں غاروں اور گلیوں بازاروں میں پڑے ہوئے ننگ دھڑنگ مست ملنگ وغیرہ.... ان کا یہی ملامتیوں والا فلسفہ ہوتا ہے کہ اندھیرے سے اُجالا گند سے سوگند دُکھ سے سُکھ.... برائی سے اچھائی پستی سے بلندی نکالو... اسی میں مزہ اور مستی ہے..... اصل چیز تو منزل کو پانا ہے.... وہ ابتداء میں نہیں ملتی انتہا میں ملتی ہے۔ یعنی برے کا اچھا ثابت ہونا کامیابی ہے.... نہ کہ اچھا آخر میں برا ثابت ہو؟ جو ہڑ کا پروردہ کنول چار دن نکال جاتا ہے۔ گلستان میں کھلا ہوا گلاب تو چار پہر کی چوٹ برداشت نہیں کر پاتا۔ کنول کی کلیاں اور اُجلے پھول کبھی پاؤں تلے پڑے دکھائی نہیں دیتے۔ گلاب! گلے گجرے گلدان سے اُتر کر سیدھے کوڑا دان یا زمین پہ پڑتا ہے۔'' اقبالؒ نے اسی کیفیت کو یوں بیان فرمایا۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

وُہ بچہ میری بھید بھری باتیں غور سے سُن رہا تھا۔ یقیناً یہ باتیں اس کے لئے عجیب سی تھیں۔ لیکن میں جانتا تھا یہ بچہ! کوئی عام بچہ نہیں اِک نابغۂ روزگار تھا لیکن اُسے کسی ''دھکے'' ہوئے کے لڑ لگنے کی ضرورت تھی اور شاید وہ دھکا اور سنکا ہُوا مَیں ہی تھا۔'' آخر بند چیز کو کھلنا ہی ہوتا ہے... انتہائی سنجیدگی سے پوچھنے لگا!

بابا! مجھے بتایئے؟ میں اپنے اس کاٹج کا کیا نام رکھوں؟

بن سوچے سمجھے میرے منہ سے ادا ہو گیا.... ویسے تو اس غیر فطری شجری ٹھکانے کا کوئی نام دھرنا ضروری نہیں کہ یہ تمام کچھ عارضی ہی تو ٹھہرا! نام تو اُس کا ہونا چاہیے جس کی کچھ بات ہو ثبات ہو.. یہ تو محض برسات کی نبات! جس کے ہاں رواں موسم کی حیات ہے۔ آندھی ہوا چلی تو یہ ڈگمگ ڈولا...آری کلہاڑی سے چچ چڑ بولا' گرمی سردی ٹکڑ بڑھوتی میں بھنا مسولا۔ پیڑوں درختوں پہ گھونسلے' بجلیوں' موسموں کی چیرہ دستیوں کی زد میں رہتے ہیں۔ انسانوں اور چارپایوں کے لئے زمین' مٹی اور تری کی ضرورت ہوتی ہے۔ پنچھی پرندوں کے رین بسیرے زمین پہ نہیں' پیڑوں درختوں' ٹہن ٹہنیوں' شاخ و برگ پہ ہوتے ہیں۔"

یہ نیم کے درخت کے اُوپر کی بودوباش' تمہاری وقتی مجبوری تھی...اگر اسے ابھی برقرار رکھا جائے تو کچھ حرج بھی نہیں بلکہ مفید ہے لیکن اسے ہمیشہ کے لئے اپنی ضرورت بنالینا مناسب نہ ہوگا...؟" اور اس کا کوئی نام دھرنا تو بالکل ہی بچگانہ سی حرکت ہوگی۔"

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس نام والی بات سے کچھ مطمئن نہیں ہوا۔ اُس کی باڈی لینگو ایج میں تذبذب کی لہریں سی اُبھر رہی تھیں۔" ایسی صورتِ حال دیکھ کر میں نے اُس کا دل رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا:

اچھا! اگر تم اس جھونپڑے کو کوئی نام ہی دینا چاہتے ہو تو میرے ذہن میں ایک نام آیا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم یہی نام ہی رکھو گے... منظور ہو تو بولو؟ ہاں! ایک اور شرط بھی ہے کہ تم اس نام کے بارے کوئی سوال بھی نہیں کرو گے..... جب میں مناسب جانوں گا خود ہی بتا دوں گا!

چند ثانیے وہ مجھے معنی خیز نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر جیسے وہ کسی نتیجے پہ پہنچ پایا تھا...اعتماد بھرے لہجے میں بولا' بابا جی! پلیز! آپ جو بھی نام تجویز کریں گے۔ وہی دُرست ہوگا اور مجھے منظور بھی۔ مگر ایسا ہونا چاہیے کہ کبھی کسی نے سوچا اور سنا نہ ہو۔" میں اُس کی اس بات سے ہرگز نہ چونکا.... میں جانتا تھا کہ وہ اک نابغۂ روزگار بچہ ہے۔ ایسے بچے یا لوگ' جو کسی ناقابلِ فہم بیماری یا کسی مستقل عارضہ میں مبتلا ہوتے ہیں اُن میں ناقابلِ یقین ماورائی' بطونی روحانی صلاحیتیں عود آتی ہیں۔"

میں نے اُسے اپنے بارے میں بتایا کہ میں کسی مُلک میں بھی ہوں وہاں کے کتب خانوں' آرٹ گیلریوں اور خاص طور قبرستانوں' مزار مقابر پہ ضرور حاضری دیتا ہوں۔

ایک بار انگلستان کے شہر بریڈفورڈ کی پبلک لائبریری کے اُردو سیکشن میں کتابیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک کتاب پہ پڑی جس کا نام تھا "گڑیا کی آنکھ سے شہر کا منظر" نام پڑھ کر میرا دماغ سُن ہو گیا۔ میں کتاب کے نام پہ غور کرنے لگا۔ کافی دیر میں کتاب کو گھورتا رہا.... مصنف کون ہے' ناول ہے یا افسانے! مجھے

شاید کچھ غرض نہ تھی مجھے تو کتاب کے نام نے پکڑ لیا تھا۔'' کتاب کو چھوئے بنا میں اُدھر سے نکل آیا۔ اب میرا معمول بن گیا میں ہر روز اُدھر جاتا... سامنے کھڑے ہو کر کتاب کو گھورتا رہتا۔ مگر کبھی اُسے چھونے کی خواہش نہ ہوئی۔ بس! اس کے نام کا مزہ لیتا رہتا۔'' جان جب چھوٹی' جب کوئی اُسے پڑھنے کی خاطر لے گیا۔'' میں اِک عرصہ اس اَچھوتے نام کے حصار سے باہر نہ نکل پایا۔''

میرے اِک عقیدت مند نے مجھے خط بھیجا... لفافے کی پُشت پہ گھر کا پتا لکھا تھا۔ اس کے گھر کا نام'' ناؤ گھر'' تھا۔'' ناؤ گھر'' عجیب سا نام! خوش ہو کر یا خفا ہو کر میں نے اس انوکھے بچے سے تعلقات ہی بگاڑ لیئے کہ اُسے ایسا اَچھوتا انوکھا نام رکھنے سوچنے کی یوں جرأت کیونکر ہوئی جبکہ میرے اپنے عارضی ٹھکانے کی پہچان '' کاجل کوٹھا'' ہے۔ جو میری کتاب سے مستعار ہے... ایسا سیاہ نام سوچنے پہ میں خود سے بھی ناخوش ہوں۔''

بابا! آپ میرے اس نیم کے کانچ کا بھی کوئی ایسا ہی نام رکھ دیں.. جو نہ تو کسی نے رکھا ہو اور نہ سُنا ہو۔؟

میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے پوچھا!... تم کتنا عرصہ اس نیم کے اُوپر جھونپڑے میں رہے؟

وہ جھٹ بولا.... تہتر دن!

یعنی قریب اڑھائی مہینے! تم اس جگہ کا نام'' اڑھائی مہینے کا جھونپڑا'' رکھ سکتے ہو؟ وہ ہکا بکا سا مجھے دیکھنے لگا۔

بچے! مجھے پتا تھا کہ ضرور حیران ہو گے کیونکہ بات ہی حیرانی اور نہ سمجھ میں آنے والی ہے۔''

'' اڑھائی مہینے کا جھونپڑا'' اُس نے زیرِ لب آہستہ سے دُہرایا.... اس کا مطلب؟

اتنی آسانی سے سمجھ میں آنے والا نہیں ہے' میری تو اپنی سمجھ میں اِک زمانے کے بعد جا کر آیا تھا۔''

بس! صرف اتنا جان لو کہ یہ نام تمہارے لئے اجمیر شریف سے بھیجا گیا ہے۔''

اٹکتے اٹکتے کہنے لگا۔ اِس جھونپڑے کے بارے بات تو آپ اور میرے درمیان' ابھی ہوئی ہے یہ اجمیر شریف' درمیان میں کیسے آ گیا۔؟

بات کوئی بھی' جس میں خیر و برکت نکلتی ہو.... مدینہ سے چل کر نجف اشرف... اُدھر سے بُغداد شریف اور وہاں سے اجمیر شریف پہنچ کر تمام ہوتی ہے۔ حقیقت' شریعت' طریقت' معرفت کے تمام تار اِدھر سے ہی ہلائے جاتے ہیں۔''

میں کچھ سمجھا نہیں۔ وہ آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔''

خواجہ غریب نواز کے پاؤں جانب' دائیں طرف قبلہ رُخ' کچھ دور ایک عظیم الشان قائم مسجد اور وسیع و

عریض کھنڈرات ہیں جو کبھی سرائے' بت خانہ' مزارات اور چھوٹے سے دفاعی قلعہ کے طور موجود تھے۔ اس جگہ کا نام اڑھائی دن کا جھونپڑا ہے۔ اس سے وابستہ بہت سی سچی اور خود ساختہ کہانیاں ہیں جو مشہور عام ہیں جبکہ حقیقت' وقت کے سینے میں دفن ہے یا پھر خواجہ غریب نواز جانتے ہیں۔ جن کی بابت کہا جاتا ہے کہ آپ نے بتیس برس' اِدھر نماز پڑھی۔ واللہ اعلم بالثواب.....؟

راجستھان کا انگ انگ عجائب و اَسرار سے بھرا پڑا ہے۔ قدرتِ فطرت جو بھی کہہ لیں' ذرّے ذرّے سے ہویدا ہیں۔ سنتوں' سادھوؤں' جوگیوں' راجوں مہاراجوں... شتربانوں' سانولی سلونی کٹیلی مہلاؤں... پگڑی صدری نوکیلی کھیلی کٹیلی مونچھوں والے مَردوں کی سرزمین! جدھر زندگی اپنے ظاہری باطنی معنوں کے مطابق اُجاگر ہوتی ہے۔ جہاں کے کچے کھرے موسم' بھُربھُرے نیلے تپے سنگلاخ پہاڑ... تا حدِ نظر سُرخ تانبے کی تپش تپاں لیے ریگ زار' سراب' خشک دلدلیں' جانداروں انسانوں کی ہمت' صبر و برداشت' محنت و محبت کے نذرانے خوشی خوشی قبول کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ جدھر کی تہذیب' رسوم روایات' طور و طریق' انداز بود و باش' روزگار و معاش' محبت نفرت' شادی بیاہ' میلے ٹھیلے' رقص و موسیقی غرضیکہ مرنے جینے کے انداز رنگ ڈھنگ نرالے ہیں۔''

راجستھان آنا جانا' میرا لگا رہتا ہے۔ اس معاملہ میں' میری مرضی کو کم' اللہ کے فضل اور خواجہ غریب نواز کے کرم کا زیادہ دخل ہے۔'' ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ میں ظاہری باطنی طور اسی چوکھٹ پہ پڑا رہتا ہوں۔ اک زمانہ تھا کہ میں داتا علی ہجویری کی نوکری میں رہتا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ مجھے اُٹھا کر اجمیر شریف کی راہ پر ڈال دیا گیا۔'' اجمیر شریف میری انتہائی منزل ہوتا۔ مگر ادھر تک پہنچنے اور یہاں سے اِدھر اُدھر آگے پیچھے دائیں بائیں بھی بہت سی نظارتیں حاصل ہوتیں۔ جو خواجہ غریب نواز کے صدقے' میرے لئے فیض بار ہوتیں۔''

مجھے مالکِ ازل و اَبد سے بڑی تیز قوتِ مشاہدہ نصیب ہوئی۔ سفر و حضر' ہر لمحہ ہر پل' میرے لئے تعلیم ہوتا ہے۔ جیسے میں آنکھیں ہی آنکھیں اور کان ہی کان ہوں' یہاں تک کہ میں حالتِ نوم میں بھی دیکھتا اور سنتا رہتا ہوں۔ چل رہا اور کہیں اُڑ رہا ہوتا ہوں۔ مجھے بگولوں جھکڑوں کے بِیر پاؤں اور اُڑانوں پروازوں کے بال و پَر ملے... سوچوں سوبھاؤں تصور و تشکل' تخیل و تحلیل کے سات آسمانوں تک رَسائی نصیب ہوئی۔ عہد بعید ہوں قریب یا عتیق! دُھندلے دُھندلے سُجھائی دیتے ہیں۔ سر' سر پہ سایا کیئے ہوئے... مکان و گھر' دیوار و دَر' زیر و زَبر بحر و بر' شب و سحر' ظہر و عصر سے سلام و کلام.. یکبارگی دیئے' مشعل مشال روشن.. سیاہ سپید نمایاں اور خفی عیاں ہو جاتے ہیں.. شجر و حجر' جواہر و گوہر مروارید و مرجان دیکھے بھالے۔'' صانعِ ازل و اَبد نے اپنی

شانِ کریمی سے کمال قدرتیں ندرتیں کرامتیں اور شفائی حکمتیں پیدا فرما کر انہیں فوقیت و اہمیت عطا فرما دی اور پھر جس پہ چاہا اور جس نے ہمت و محنت کی اُس پہ انہیں آسان فرما دیا۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی عطا والا معاملہ ہے۔''

● اڑھائی دِن کا جھونپڑا......!

خواجہ اجمیریؒ کے پاؤں کی دائیں طرف ایک تنگ سا بازار ہے.... جدھر دکانوں اور انسانوں کی بھرمار ہے۔ لدے وقتوں' جب مَیں اِدھر حاضر ہوتا تھا تب نہ تو اتنی دکانیں تھیں اور نہ ہی ہجوم! چھجّوں چوباروں والے سیدھے سادے مکان اور اکّی دُکّی کوئی دوکان دُھابہ! دائیں بائیں تنگ گلیاں کوچے' جدھر انسانوں سے کہیں زیادہ جانور... یہ الگ بات کہ اُن میں زیادہ ایسے کہ جنہیں دیکھ کے کراہت سی محسوس ہوتی۔ جو ہونی نہیں چاہیے کہ حیات کی خوبصورتی اور مغنے فقط طاؤس و عندلیب' شیر چیتے' سانبھر و غزال' کُنجشک و کوکل' کنول و گلاب' نغمہ و زمزمہ' جھیل و جھرنا' طلوعِ آفتاب قوسِ قزح تک ہی محدود نہیں.... جھینگ و مچھ' اژدر و مار' ممولہ و موش' گدھ و چام چڑک' لگڑ بگھا' بھیاڑ' بندر و بن مانس' بھینسا' سانڈھ' بچھو' بجو' خوک' اود بلا وغیرہ سے بھی بہت آگے اور پیچھے ہے۔''

مَیں ان بازاروں گلیوں میں خوب گھومتا ہوں۔'' اِسی بازار میں دو چار پرانے وقتوں کے اُونچے اُونچے دروازے ہیں۔ پرانے وقتوں کی طرزِ تعمیر' چھوٹی اینٹ' محرابیں قوسیں' طاق' بُرجیاں' پرانی بینڈھ کی چُنائی' روزن اور سب سے اہم اور خوبصورت' قرآنی آیات! اِمتدادِ زمانہ سے ہر کچھ دُھندلا کر رہ گیا۔ مگر اَب بھی چند شکستہ دیواریں' ڈھی ہوئی محرابیں' اُدھڑی پدھڑی اینٹیں.... قدیم اور جدید عمارتوں کے بیچے دکھائی دیتی ہیں۔'' اِن حقائق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے شرمندہ شرمندہ سے مُنہ سر ڈالے جب آگے بڑھا جاتا ہے تو تھوڑی دور دائیں جانب آگے ہٹ کر کچھ ناہموار سیڑھیاں دکھائی دیتی ہیں... سیڑھیوں کا اختتام ایک وسیع و عریض پُر اَسرار سے میدان میں ہوتا ہے۔ اُوپر پہنچو تو سامنے ایک عظیم الشان مگر خستہ حال مسجد کے دَر و دیوار اور مینار دکھائی دیتے ہیں۔''

مسجد کے صدری' بلند و بالا محرابی دَروازوں کے حاشیوں پہ خطِ کوفی میں کندہ قرآنی آیات' اِک پُراثر رُوحانی وجدانی ماحول پیدا کیے ہوئے ہیں۔ سنگِ احمر پہ کندہ کاری کا شاہکار' یہ آیات ایسی واضح روشن اور پُرکشش ہیں کہ مُسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ صدیوں' اپنے

بیگانوں کی ستیزہ کاری کے باوجود بھی ان کی رُوحانی کشش' خوبصورتی اور دلآویزی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔'' مساجد کا اندرونی حِصّہ بھی انتظامیہ کی غفلت' وقت زمانہ کی کُہنگی کے اثرات کا شکار ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن اِک ایسی کیفیت کا حامل بھی ہے جسے اِک عام آدمی بھی محسوس کر سکتا ہے جبکہ خالص آدمی کے لئے تو اِک دَرِ حیرت وَا ہو جاتا ہے۔'' مسجد کے دائیں بائیں کے وسیع برآمدے اور حُجرے' اور سامنے وسیع صحن بھی' اپنے ہیں۔''

مسجد کے رُخ کے سامنے' داخلے کے بڑے دروازے کے دائیں بائیں حُجرے تعمیر ہیں۔ جن کے اندر بہت سے بُت بند ہیں جن کا تعلق خواجہ غریب نواز کی آمد سے پہلے کے دَور سے ہے۔ اب ان حُجروں کو پکّا بنا دیا ہوا ہے۔ جبکہ اُس دَور کے بُت ہنوز اندر موجود ہیں۔'' مسجد کے رُوبرو قبلہ جانب رُخ کر کے کھڑے ہوں تو دائیں جانب ایک پتھریلا ٹیلا دکھائی دیتا ہے... یقیناً یہ کسی زمانہ' اِدھر کے کسی پہاڑ کا حِصّہ رہا ہو گا؟ وقت کی کروٹوں نے پہاڑ کو توڑ کیدو دیا ہوگا... مگر یہ ٹیلا ابھی تک قائم ہے۔ اس ٹیلے کے درمیان ایک پتھریلا دروازہ' دکھائی دیتا ہے جو اندر دیوار چُن کر بند کر دیا ہوا ہے۔'' یہ خاصا دراز دروازہ' دراصل اُس خفیہ سُرنگ کا ہے جسے اس جگہ کی تعمیر کے وقت' کسی عسکری ضرورت کے تحت بنوایا گیا تھا۔ گزرے وقتوں کے حکمران' جب کوئی قلعہ محل یا تہہ خانے' عسکری پڑاؤ چھاونی تعمیر کرواتے تو ایسے خفیہ راستوں کا اہتمام ضرور کرتے جو ضرورت کے وقت اُنہیں فی الفور پناہ یا اُدھر سے نکلنے کا محفوظ راستہ فراہم کر سکتے۔'' ایسی سُرنگیں راستے' دُنیا بھر' خاص طور پہ ہندوستان میں ہر قلعہ' محل میں موجود تھے بلکہ اب بھی کسی نہ کسی حالت میں پائے جاتے ہیں۔'' ایسے بہت سے زمین' جنگل' پہاڑ دریا کے نیچے خفیہ راستے' مَیں نے خود دیکھے بلکہ اُن کے ذریعہ کچھ سفر بھی کیئے۔ ایسے راستے' سُرنگیں مختصر اور طویل ترین بھی ہوتی تھیں... دو چار کوس یا منزل تو معمولی سفر ہوتا... یہ تو پچاس' سو اور کئی کئی سو کوس تک محیط بھی ہوتیں۔ تختِ دہلی' لاہور' آگرہ' جے پور' فتح پور' دراوڑ' منگلا' تارا گڑھ' اجمیر' رہتاس' ملتان' گولکنڈہ' چتوڑ' علیٰ ہٰذا القیاس' اسی نوع کے اور بھی قلعے اور محلات وغیرہ! عوام الناس اور دُشمنوں جاسوسوں کی نظر میں آئے بغیر' ایسے خفیہ راستے' سُرنگیں' کم و بیش ہر اہم جگہوں پہ موجود تھیں اور ابھی بھی ہیں۔'' چونکہ اب ان کی پہلی سی ضرورت اور اہمیت نہیں رہی... اس لئے ایسی جگہیں اب متروک ہو گئی ہیں۔ انہیں' عوام الناس کی حفاظت کے پیشِ نظر معدوم یا بند کر دیا گیا ہے۔''

تازہ ہوا اور سورج کی روشنی' زندگی کا دَم خَم قائم رکھنے کے لیے جُزوِ لاینفک ہیں... زیرِ زمین سُرنگیں' راستے وغیرہ جب تک مُستعمل تھے تازہ ہوا اور ضرورت کے مطابق روشنی کا انتظام رہتا تھا... جب ان کی ضرورت نہ رہی تو یہ سارے انسانی اور قدرتی حیلے وسیلے بھی بند ہو گئے اور یہ قیمتی جگہیں' جنہیں مَعرضِ وُجود

میں لانے کے لئے بیشمار دولت وقت اور انسانی حیوانی محنت و توانائی صرف ہوئی.. مجھن اندھیری قبریں اور حشرات الارض سے بھری غاریں بن کر رہ گئیں۔''

یہ ''اڑھائی دن کا جھونپڑا'' نامی پُرشکوہ تاریخی روحانی اور پُراسراری جگہ ایک ایسی ناقابلِ یقین حقیقت ہے کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی اور ایسی جگہ ہو جس کے بارے میں طرح طرح کی متضاد کہانیاں قصّے مافوق الفطرت باتیں آنکھوں دیکھے اور کانوں سُنے محیّر العقول واقعات کہ جنہیں سُن کر رونگٹے کھڑے ہوجائیں اور دل و دماغ میں سنسناہٹ سی تیرنے لگے۔'' ''اڑھائی دن کا جھونپڑا'' عشاء کی نماز کے بعد مقفّل ہوجاتا ہے۔ اس کی تین اطراف گنجان آبادی اور ایک جانب بازار... اسی بازار سے درگاہ شریف کی جانب کھلنے والے تین چار دروازے بھی ہیں۔ ویگنوں کا اڈا... ہوٹل دکانیں تھیے' ریڑھیاں' حلیم بریانی کباب قورمے سوندھی خوشبو والی روٹیاں...آنند ساگر' رتنا گر' تاراگڑھ اور اجمیر کے مضافات کی جانب جانے والے راہ راستے بھی چونکہ یہیں سے ہی کھلتے ہیں اس کارن' ادھر دن رات گہما گہمی رہتی ہے۔ تعجب ہے کہ یہیں چند قدموں کے فاصلے پہ اک عظیم الشان مسجد! محرابوں دیواروں پہ کندہ فرقان الحمید! صنم کدہ اور طلسم کدہ بھی! مخلوقاتِ ماورائی کا گہوارہ آشرم اجرام فلکی کی رَسدگاہ...زیر زمین قلعۂ دہلی' آگرہ تے پور تک رسائی۔''

میری مُلاقات اک بن رسیدہ صاحبِ نظر و بصر سے ہوئی۔ یُونہی میں نے پُوچھ لیا.. بابا! میں نے کہیں سُنا ہے کہ اِدھر جنّات کے بسیرے بھی ہیں۔ میری سمجھ سے بالا ہے کہ ادھر کیا کچھ نہیں ہے؟ اللہ ہے اُس کے بندے ہیں' مسجد ہے مندر ہے حاملانِ افلاک ہیں عالمانِ اَرضی ہیں۔ سرائے ہے آشرم اور بُت خانہ ہے۔ اِدھر سے زمین پہ حکومت اور آسمان پہ اُڑانیں لی جاتی تھیں۔ اِدھر سے ہندوستان کے دوسرے دارالخلافوں کے لئے سرنگیں استعمال کی جاتی تھیں۔ اِدھر عُلوم ضرب و حرب' مذاہب و مسالک اور دیگر انسانی اور غیر انسانی بِدیا میں تعلیم کی جاتی تھیں۔''

میں شروع ہی رہتا اگر وُہ بزرگ مجھے نہ ٹوکتے۔'' میں کمزور اور نسیان کا مارا ہُوا بوڑھا ہوں۔ میں پہلے جنّوں والے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ جناب آپ نے فرمایا' اِدھر جنّات کے بسیرے ہیں؟ اس جگہ پہ ہی کیا مُوقوف؟ اجمیر شریف تو پُورا جنّات سے بھرا رہتا ہے۔ انسانوں سے کہیں زیادہ دوسری مخلوقات ہوتی ہیں۔ میرے خواجہ کو تو سب ہی مانتے ہیں۔ ہاں! اِس ''اڑھائی دن کے جھونپڑے'' میں اِن کا قیام زیادہ رہتا ہے اور آج سے نہیں...خواجہ جی کی اِدھر آمد سے پیشتر ہی یہ جگہ جنّات کی آماجگاہ تھی۔''

آپ کا ماننا ہے کہ اِس ''اڑھائی دن کے جھونپڑے'' میں شروع سے ہی جنّات کے ڈیرے تھے؟

ہاں! ایسا ہی تھا۔''

اس کی کوئی خاص وجہ؟

اچھا بتاؤ! دریا یا ندی کنارے گھاٹ کہاں ہوتا ہے؟

ظاہر ہے گھاٹ سہولت کی جگہ پہ ہی ہوگا... جدھر کشتی حفاظت سے کنارے لگ سکے... لوگوں کے آنے جانے میں آسانی ہو گھر گاؤں قریب ہو... زمینی سواری دستیاب ہو۔''

تمہارے سوال کا جواب' تمہارے ہی جواب میں موجود ہے۔ اجمیر شریف میں اڑھائی دن کے جھونپڑے لئے یہ قطعہ اجمیر یونہی مخصوص نہیں ہوگیا تھا.... اس کے پیچھے زمین و آسمان' چاند سورج ستاروں' برجوں اور دیگر کائناتی تقویمی اور نجمی اثرات و اسرار کا' بالواسطہ اور مشیتِ ایزدی کا براہ راست معاملہ رہا۔ ادھر خواجہ اجمیر کی صُورت' اک ماہِ کامل نے اپنی ایمانی ضوفشانیوں سے ظلمتوں کو پاش پاش ہونا مقصود تھا۔''

شُنیدن تو بہت کچھ ہے کہ صدیوں پہلے ادھر ایک بہت بڑا مندر تھا' ساتھ آشرم بھی' دُور دراز سے بھگشو' سنت' بھگت ادھر بھگتی اور بدھی مانوں سے بدیا' سکھشا سیکھنے آتے تھے۔ ادھر آشرم میں بلاتفریق ذین و دھرم ہر کوئی بسر بسرام کرتا.... منشوں کے سنگ پشوؤں پنچھروں کو بھی آسرا ملتا۔ شاستروں، پرانوں کی سکھشا کے ساتھ ساتھ' یدھ کام' یعنی جنگ و حرب اور جاسوسی کی تعلیم بھی جاتی تھی۔'' اناساگر' جو ادھر سے بھی زیادہ فاصلے پہ نہ تھا... یہ بھی اسی مندر آشرم کا ایک تیرتھ تھا۔'' سے' اپنی سمجھ کے مطابق بدلا... جب تغیر اپنے تیور بدلتا ہے تو بہت کچھ تہہ و بالا کر دیتا ہے۔''

پرتھوی راج چوہان' قطب الدین ایبک' التمش' غوری اور بھی کچھ بادشاہوں کے نام... کبھی یہ کبھی وہ' کبھی مندر کبھی مسجد.... سچ تو یہ ہے مذاہب' ادوار' تاریخ و تہذیب اور اپنے حسب و نسب کے حوالے سے یہ جگہ' کبھی بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئی اور نہ ہی کوئی اس کے بارے کوئی حتمی رائے دے سکتا ہے۔ تضاد ہی تضاد' اسرار ہی اسرار' اور شاید یہی کچھ اس کا مقدر' آغاز و انجام ہے۔''

یہ بزرگ! جن سے مجھے اُمید تھی کہ یہ میرے پلّے' کچھ ڈالیں گے۔ کچھڑا پکوا کر اس جگہ کی سیڑھیوں پہ بچا کرتے... چپٹا سا تانبے کا دیگچہ! جسے وہ قدرے میز حا سا جھکا کر انگیٹھی پہ رکھتے۔ جس کے پیندے میں ایک آدھ ہی کچا پکا کوئلہ دہکتا ہوتا۔'' سید حبیب اللہ شاہ نامی یہ بزرگ' شاید پچھلی پیڑھی اور اس ''اڑھائی دن کے جھونپڑا'' کے ماضی' حال اور موجودہ حال کے بارے میں اپنی ایک مخصوص ثقہ اور واضح رائے رکھنے والے ایک ''صاحب الرائے'' تھے۔'' بعد میں مجھ پہ کھلا کہ یہ واحد انسان ہیں جو وہ کچھ بھی جانتے ہیں جو موجودہ وقت کوئی بھی نہیں جانتا! اس کا ادراک مجھے شروع کی چند ایک ملاقاتوں میں ہی ہو چکا تھا۔''

مَیں دو روز قبل دہلی' جے پور سے اجمیر پہنچا تھا.. دہلی میں اپنی مصروفیات سمیٹ کر جب جے پور پہنچا تو

کھانے پینے کے سلسلے میں خاصا محتاط تھا... اب ہر چیز کمرشل ہو چکی ہے۔ ہندوستان میں اب ذوز روایتی اور مخصوص کھانے ناپید ہو چکے ہیں۔ نام' شکل' صورت وہی.... مگر ذائقہ اور وہ خاص مہک' خوشبو' لذت ناپید! ہر سالن ایک سا... قورمے' نہاری' بونگ' ہریسے میں کچھ فرق نہیں... کھچڑا' دال حلیم بھی ایک سی... بریانی' یخنی پلاؤ میں صرف زرد رنگ اور لونگ کشمش کی کمی بیشی! کہنے کا مقصد کہ میں کھانے پینے سے بیزار تھا۔ پھلوں' چائے رس یا بسکٹوں پہ گذارہ تھا۔" اجمیر میں بھی یہی حال ہے... ہوٹلوں کے طعام سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ بھنے چنے کھا لیے جائیں۔ ایک آدھ روز تو اسی پرہیزی حالت میں گزر گیا۔ اب پیٹ اور منہ کے پھیکے پن کی وہ حالت تھی۔ جو غالب کی بھی ہوئی ہوگی۔"

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

بازار نکل آیا کہ شاید کچھ کھانے پینے کا موڈ بن جائے؟ توبہ کیجئے! وہی دلی کے مینا بازار' چاوڑی' فیامحل والا ماحول! دیکھتے بھالتے" سونگھتے بیزار ہوتے ہوئے میں بڑھتے بڑھتے دولت باغ' انا ساگر کی جانب کھلنے والے بازار کی راہ پہ آ لگا۔ کچھ دور سامنے" اڑھائی دن کے جھونپڑے" کا پہلا دروازہ نظر آیا۔" اس بازار میں' بڑے گوشت اور مرغ بریانی کے ہوٹل... تنور' مٹھائی' دودھ دہی اور دیگر کھانے پینے کی بے شمار دکانیں' ٹھیئے اور ٹھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ تکے' کباب اور مچھلی فروش بھی ہیں... کوشش کی' کہ کہیں طبیعت مائل ہو تو کچھ پیٹ پوجا کر لوں... پر توبہ کیجئے! کہ کہیں کوئی چیز! کھانا تو درکنار دیکھنے" سونگھنے کو بھی اچھی لگی ہو۔ اسی پیٹ گھسیٹی میں میں" اڑھائی دن کے جھونپڑے" کی سیڑھیوں تک آ لگا...."

ابھی پہلی سیڑھی پہ پاؤں دھرا ہی تھا تو وہ سرمدی آہنگ بلند ہوا جو ہر اس کائنات کا جوہر ہے۔ اللہ برتر و بلند کی بزرگی وحدنیت اور پاکی بیان کرتا ہے... اک خاصا فاصلہ پیدل طے کر کے ادھر تک پہنچا تھا... پیٹ کا خالی گھڑا ابھی گھڑ گھڑ کر رہا تھا... اذان کے مکمل ہونے تک اسی پہلی سیڑھی پہ ہی دم لینے کی خاطر بیٹھ گیا۔ کیا خبر تھی؟ کہ دو تین زینے اوپر پہ اک پیر پیراستہ' کھچڑے کی کھنڈولی دھرے میری راہ دیکھ رہا ہے۔" اس نے اوپر سے ہی مجھے سیڑھی پہ بیٹھنے کا اشارہ دیا... میں نے بھی دم کو دھیرج دینے کی خاطر' اذان کے اختتام تک ہیں' پسر نے پڑ گیا۔" بیٹھے بیٹھے میں نے کانی نظروں سے اس بوڑھے کو دیکھا... جسے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا.. جبکہ اجمیر شریف میں قیام کے دوران' ادھر پہنچنا اور ایک آدھ نماز' یہاں کی مسجد میں ادا کرنا' میرا معمول تھا۔"

آج جمعرات کا روز تھا... بھیڑ معمول سے زیادہ تھی اور بھکاری بھی! اور جمعرات تو ان کے لئے عید کا

دن ہوتی ہے۔" مکمل ہوتی ہوئی اذان کا ارتعاش ابھی کانوں میں گدگدا ہی رہا تھا کہ ایک خونخوار آنکھوں والے پیشہ ور بھکاری نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا... وہ مجھے کوئی قبضہ گروپ کا نووارد بھکاری سمجھتے ہوئے اس جگہ سے نکلنے کے لئے کہہ رہا تھا... اُٹھ بے! کدھر آ ٹپکا ہے... یہ میری جگہ ہے" بلاؤں فخرو کو..؟ میں ہٹ بٹ اُسے تکنے لگا... اُس کا بھی قصور نہ تھا... وہ جگہ کا الاٹی تھا... اذان کے وقفہ میں وہ کہیں موتنے کے لئے اُٹھ گیا تھا۔ اس دوران میں اِدھر دم دُرستی کی خاطر بیٹھ لیا۔ اب وہ اُفتم پُشتم واپس لوٹا تو ایک کالے پیرہن لمبی داڑھی لنوں ڈنڈے انگوٹھیوں منکوں والا بابا دیکھ کر اُس کا بولنا بھڑکنا بنتا تھا۔ "میں معذرت خوانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اُٹھنے کی خاطر ٹانگیں سیدھی کر ہی رہا تھا کہ تین سیڑھیاں اُوپر یہی بزرگ بڑی کرخت آواز میں دہاڑتے ہوئے دو چار نستعلیق سی صلواتیں سنائیں اور پھر بمشکل اُٹھے اور نیچے میرے پاس پہنچے.... میرا ہاتھ تھاما اور اپنے ساتھ اُوپر اپنی ٹھیئے پہ بٹھایا... چائے منگوائی اور بسم اللہ کہہ کے مجھے پینے کی اجازت دی...."

میں نے دیکھا کہ اُنہوں نے اپنے نیچے کے بیٹھنے والی گدی میرے لئے بچھائی ہوئی تھی خود اُکڑوں تھے۔" سامنے دیگچہ انگیٹھی پہ دھرا تھا... ارد گرد ایلومونیم کی پلیٹیں پلاسٹک کے چمچے اور پیپل کے پتوں کے دونے" جنہیں وہ "پارسل" کے لئے استعمال کرتے تھے.... اچانک اُنہوں نے دکانداروں والا آوازہ لگایا! "جھونپڑے کا کھچڑا"... اڑھائی دن کے جھونپڑے کا پاکیزہ کھچڑا.. کھالو.. کھالو! نصیبے جگالو....! ارے! میں تو اُن کی آوازہ سنتا ہی رہ گیا... یہ کیا کہہ رہے ہیں...؟

نمازی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے...." اِدھر چائے عجیب سے ذائقہ والی اور مختصری جیسے اصل چائے سے پہلے نمونے کے طور چکھنے کی غرض سے ملی ہو۔ ایک آدھ چسکی میں ہی اس کا کلیان ہو چکا تھا..... ابھی تک ہمارے مابین کسی گفتگو کا تبادلہ نہ ہوا تھا۔ میں اپنی حیرانی اور اچنبھے سے ہی ابھی باہر نہ نکلا تھا کہ "اڑھائی دن کے جھونپڑے کا پاکیزہ کھچڑا" کے پُراسرار آوازے نے مجھے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ میں اپنے اندر کہیں اُتر چکا تھا.. کچھ واضح دکھائی نہ دے رہا تھا... شاید اسی لئے کہ روشنی سے ایک دم اگر کوئی گھپ اندھیرے میں اُتر جائے تو اُسے کچھ دیر تک کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنے قیاس وہ انداز سے اردگرد کے حساب لگاتا ہے۔ اور کسی کے لیے روشنی میں بھی کچھ نہیں ہوتا.. نہ دین میں نہ دُنیا... نہ کوئی راہ نہ کوئی منزل... دوست نہ کوئی دشمن... گل خانے مے خانے بھی ان کے لئے نہیں ہوتے۔ مقتل اور دار و رسن تو بہت پرے کے مقام ہیں۔ ہجر و وصال کے موسم بھی ان کے اُوپر سے گزر جاتے ہیں..... اور کچھ یوں بھی کہ دُنیا جہان کی محرومیاں کھائیاں کھنڈے کھوبے ٹوبے اندھے کوئیں خشک دلدلیں اپنے منہ کھولے منتظر رہتی ہیں۔ دُنیا کی ہر آئی پائی شر شامت ملی مصیبت بلا برائی آزمائش آ بلا پائی کسی گھر جوائی کی طرح گلے پڑی رہتی ہے۔" کیا کہیے کہ میرا شمار بھی

اتفاق سے موخرالذکر حرماں نصیبوں میں ہوتا ہے۔''

مسجد میں پہنچنے والے نمازیوں کا رش بڑھ گیا تھا۔" بابا نے ایک لونڈے کو اپنی جگہ بٹھایا اور میرا ہاتھ پکڑے اُوپر مسجد کی جانب چڑھ آئے۔ مسجد میں قطار بندی رہی تھی۔ شتابی شتابی وضو کے بعد ہم دونوں ایک صف میں جُڑ کے بیٹھ گئے' پوپلا منہ قریب لاتے ہوئے کہنے لگے...... ''مَیں جانتا ہوں تمہیں بھوک لگی ہے۔ بس! نماز سے فراغت پاتے ہی تمہیں' تمہاری پسند کا بھوجن کھلاؤں گا جو اس جگہ کے جن اور مسجد کے امام صاحب بھی شوق سے کھاتے ہیں۔''

ہر وہ جگہ جو مالک وخالق کی عبادت کے لئے مخصوص ہو وہ اپنی ایک الگ سی حیثیت اور'' شخصیت'' رکھتی ہے۔ اگر ایک علاقہ میں مختلف جگہوں پہ مساجد' مندر گرجے گوردوارے ہیں تو یقیناً وہ الگ الگ تصرفات کے حامل ہوں گے۔ ہر اک کی اپنی اپنی کیفیات اور محسوسیت ہوگی۔'' دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ اپنی پسند کی مسجد ہی میں نماز ادا کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ مسجد اُن کے قریب ہو اور سہولتوں کے ساتھ ساتھ' صاف ستھری بھی ہو۔ اس کا موذن خطیب خوش الحان یا خوش اَدا ہو! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِدھر اُسے روحانی وَجدانی کیفیات اور کوئی خاص سُرور محسوس ہوتا ہو؟ مَیں کسی بھی ایسی جگہ پہ جاؤں تو سب سے پہلے یہی کچھ تلاش کرتا ہوں۔ خاص طور پر مساجد' مزارات' کسی کا گھر مکان یا نشست گاہ وغیرہ... میں کسی گاڑی سواری میں بیٹھتے ہی اُس کی'' شخصیت''۔ بُو خوشبو محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے لئے میں خود کو مجبور پاتا ہوں کہ میرے اندر کی گراریاں' سنسر ریسیور ایلیمنٹ یا کوئی چپس ہی ایسے لگے ہوئے ہیں۔'' یہ الگ بات ہے یہ کبھی کام کرنے لگتے ہیں اور کبھی سُست پڑ جاتے ہیں۔''

نماز کے دوران اور بعد مجھے انتہائی خوشگوار کیفیات کا احساس ہوا۔ میری رُوح شاد کام ہوگئی تھی۔ مسجد سے ہجوم کے نکلنے سے پہلے ہی ہم اپنی سیڑھیوں والی جگہ پہ پہنچ آئے تھے۔ جدھر ایک بیوہ سی انگیٹھی پہ رُنڈوا ساد یگچہ منہ جھاسا رکھا تھا۔'' مَیں نے اک نظر یہ سامانِ خورد ونوش دیکھا... بے قلعی تانبے کا پتیلہ' پلاسٹک اور ایلومینیم کی رکابیاں' پتوں کے دُونے اور گندی سے صافی! میرے مہربان اور میزبان بزرگ نے لونڈے کو دو ٹی چونی پکڑا' وہاں سے ٹہلانے کے بعد پہلا کام'' اڑھائی دن کے جھونپڑے کا تبرکاتی برکاتی کھچڑا کھالو اپنے بھاگ جگالو!'' کا آوازہ لگایا۔'' اب پھر میرے لئے چونکنے کا مقام تھا! الٰہی! یہ اس کی کاروباری عادت ہے یا اس کے آوازے اور کھچڑے میں واقعی کوئی پُراَسراری حقیقت بھی ہے......؟

مَیں اُس کی حرکات' رَوش اور آوازے سے طرح طرح کے گمان نکالنے لگا۔ انسان' تشکک' اور تجسس کے تلارے پہ ترازو ہو تو کبھی بھی دُرست وزن معلوم نہیں کرسکتا اور جیسے سورج اور سورج خان کے گھرانے کی

آگاہی نہ ہو' وہ مشرق اور مشرقی موسیقی کو کیونکر جانے گا؟ میرا دماغ 'لکھنؤ کی بھول بھلیوں کی مانند بند تھا یا پھر ادھر مسجد کے دائیں پہلو پہاڑی کے پیٹ پہ نمایاں' دھنسی ہوئی ناف کی طرح' بند تنگی ذرا' جس کے اندر سے زیرِ زمین کشادہ راستے...... جے پور' تارا گڑھ' دہلی کی راج دھانی کی جانب رواں ہوتے تھے۔ ''شاد رہے نہ وہ شہسوار اور نہ وہ شہ دماغ! جنہوں نے وقت کے بدن اور بطون اور زندگی کی ضرورتوں' تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ہمیں بہت پہلے سجھائی دی اور علم و حکمت کی نت نئی راہیں دکھائیں۔'' میں کچھ ایسی اَلھڑی بلھروی سی سوچوں میں گھرا ہوا تھا اور بھول چکا تھا کہ صبح ناشتے میں ایک عجیب سی ذائقہ والی چائے کا گلفنر اور اسی طرح کے دو راجستھانی بسکٹ کھائے تھے.... جنہیں ہضم ہوئے کئی یگ بیت چکے ہیں اور اب مجھے دوپہر کے کھانے کی اَشد ضرورت ہے۔''

مجھے نہیں معلوم کہ وہ اُسی لونڈے کو گلی کی کسی دکان پہ بھیج چکا ہے۔ اس بزرگ نے دیگچہ سرکا کر نیچے رکھا اور نیم گرم بھوبھل میں سے کسی دبی ہوئی چنگاری کو انگیخت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو چار کوئلے اُوپر دھرے... پھونکنی سے ہوا دے کر اُن کے اُوپر ایک ٹیڑھی میڑھی سی المونیم کی رکابی رکھ دی۔ لونڈہ بھی مکھن مسکہ کی ایک ڈھیلی سی ٹکیہ لیے پہنچ گیا۔ رکابی گرم ہوئی تو اُنہوں نے دیگچے سے کچھ کھچڑا نکال کر بگھار لگا' کسی پڑیا سے دو چار چٹکیاں کوئی مسالہ اُوپر چھڑکتے ہوئے کہنے لگے۔ اگر کھچڑا ہے تو اسے سالن کی طرح کھانا بدذوقی ہے۔ حلیم' کھچڑا' ہریسہ بذاتِ خود روٹی بھی ہیں اور سالن بھی... اس لیے تم اسے اُنگلی یا چمچ سے کھاؤ اور بغلیں بجاؤ کہ ایسا کھاجا تم نے پہلے کبھی نہ کھایا ہوگا اور اگر آئندہ بھی کہیں سے کھاؤ گے تو اسی دیگچے اور انہیں ہاتھوں سے۔ ''ساٹھ برس سے گریوں' گائے کے بچھڑوں کو کھلا رہا ہوں۔ اُنہی کی دُعا برکت سے جو کھچڑا اُن سے بچ رہتا ہے وہ نصیبوں والوں کا رزق بنتا ہے۔'' پہلے کونسی بات تھی جو سمجھ آئی تھی جو یہ بھی پہلے پڑتی۔ میں ابھی بلیوں اور بچھڑوں میں ہی پھنسا ہوا تھا کہ بزرگوار نے ایک گہری رکابی میں بگھار لگا کھچڑا میرے آگے رکھ دیا اور اپنی دھوتی کے پلّو سے ایک ٹیڑھا میڑھا سا چمچ پونچھ کر مجھے تھماتے ہوئے کہا نصیبوں والے ہو جو اِدھر میرے ہاتھ سے مسکے سے بگھار لگا کرشاتی کھچڑا کھا رہے ہو......!

یہ نہیں کہ میں جانتا نہ تھا کہ کھچڑا کسی اُود بلاؤ کا نام ہے یا کانٹوں والے سیہہ کا؟ کھچڑا' نہاری' ہریسہ' بونگ' سری پائے' حلیم' چکڑ چھولے' شب دیگ' گوشتابہ' مزعفر' مٹنجن' بریانی' یخنی پلاؤ' کریلے قیمہ' دھنیہ اور بھنڈی آلو گوشت' مرغ و ماہی' تیتر بٹیر' مرغابی' کونج' ہرن وغیرہ کھانے' کھلانے اور اپنے ہاتھوں پکانے کا تو میں پرانا پاپی ہوں۔ یہ نہیں کہ میرا تعلق کسی نائیوں باورچیوں' اربابِ نشاط و بازار یا چنیوٹ سے ہے یا کہیں گوجرانوالہ گجرات آنا جانا رہتا ہے جبکہ میں کشمیری بٹ خواجہ یا کاشر بھی نہیں..... لیکن پھر بھی میں کھانے پکانے

کا فلاسفر اور سائنس دان ہوں.... یہ ذوق شوق' گہرائی اور صدق مجھ ودیعت ہوا ہے۔"

مٹیالے رنگ کا کھچڑا اُوپر ہلکی سی تہ تری' تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ حلیم' ہریسے' کھچڑے کے علاوہ جو بھی طعام ہیں وہ سب پابند طریق و انتظام ہیں جبکہ یہ تینوں فقیری درویشی لنگر ہیں جن کی معیاری تیاری اور پکائی بھنائی کے لئے کوئی باضابطہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ بعد کے کام پہلے کرلو اور شروع والے آخر میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اجزاء کی کمی بیشی تو کوئی معنٰی نہیں رکھتی۔ کچھ ڈالنا نکالنا بھول بھی جاؤ تو معاف ہے۔" نئی پرانی' مسری کھائی...جلی بھنی نمدارذائقہ گلی بھی چلتی ہیں۔ پکائی' گھوٹ اور مرچ مسالے سب محمود و ایاز ایک دیگ دیگچے میں اک جان ہوجاتے ہیں۔" ان تینوں کی تیاری کے دوران احتیاط' اجزاء کا تناسب' برتن کی صفائی ستھرائی' آنچ کی بیشی کمی وغیرہ فضول سی حرکتیں ہوتی ہیں۔ جن کا نتیجہ کبھی خیر نہیں نکلتا...اللہ توکلی یہیں سیکھی اور برتی جاتی ہے۔"

میرے رُو برو ناک تلے کھچڑے کی رکابی پڑی تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اس میں اناج بھوسی کے تنکے اور دیگر چیزیں جو کھچڑی یا کھچڑے کے بنیادی اجزاء کا کبھی کوئی حصّہ نہیں ہوسکتے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ یہ بھی لگتا تھا کہ اُوپر کھٹن اور کالے زیرے کا بگھار بھی اس کی بساند کا زور توڑنے کی غرض سے لگایا گیا ہے۔ کچھ حرج نہ تھا اگر یہ کوشش کامیاب ہوجاتی پر کیا کیجئے کہ بگھار ایک پتلی سی تہ کے نیچے سے باسی بساند کی لہریں میرے ناہنجار ناک کو ناگواریت کا احساس دلا رہی تھیں۔" یہ تو ہوئیں بشری تقاضوں' ملامتیوں کی دُنیا میں ہی الگ ہوتی ہیں.... جدھر زندگی ہوتی ہے اُدھر مرتے ہیں اور جہاں موت ہوتی ہے تہاں جیتے ہیں۔ عام آدمی کی سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آتا۔ سقراط کو زہر میں تریاق دکھائی دیا.... حلاج کو بند بند کٹوانے میں اپنی جرأت نظر آئی.... یہ مقتل' عقوبت گاہیں' دار و رسن' تلواروں خنجروں کی دھاریں' تپتے ریگزار' آگ کے الاؤ' زہر کے پیالے' جلا وطنیاں' پربتوں سے دَھکے' زندہ درگوریاں' دیواروں میں چنوایاں' بیگ بیڑیاں' کانٹوں کے تاج.... یہ سب کیا ہے؟ وصال' شرمندگی.... فراق' بندگی ہے۔" خوشی' خوبصورتی' خوبی کے نام بدل دیجے جائیں تو ان کے نقیض میں بھی یہی کچھ سما جائے گا۔"

بجلی کی مانند ایک خیال لپکا کہ اسی اجمیر میں' درگاہ کے اندر' کبھی مجھے کراچی والے ایک بزرگ ملے تھے۔ جن کے ہاں مجھے کبھی ان سے' تیری رضا میری تسلیم سیکھنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ انتہائی سخت طبیعت والے جلالی بزرگ تھے۔ میں نوعمر تھا۔ اُن کی سختی کی تاب نہ لا کر وہاں سے بھاگ لیا تھا۔ پھر کبھی لوٹ کر اُدھر نہ گیا۔ اپنے وصال کے بعد وہ مجھے مجذوب فقیر کے رُوپ میں' خواجہ کی ڈیوڑھی میں ملے' اپنے پوٹلے میں سے چنے کی بھنسی' بدبو چھوڑتی ہوئی دال کھانے کو دی۔ تعفن سے دماغ پھٹا جا رہا تھا اور وہ مُصر کہ کھاؤ۔ میں نے دل پہ پتھر دھر کر دال' حلق میں ڈال لی۔ اس کی تفصیل "پیا رنگ' کالا" میں درج ہے۔

یہاں بھی اسی طرح والا معاملہ تھا۔ سمجھ نہ آیا کہ اُدھر دال اور کھچڑا ہی کھلایا جاتا ہے؟ اور وہ بھی بُھسا سڑا ہُوا.... یہ تو بہت بعد کھوپڑی میں سمایا کہ فقیری لائین میں کچھ بھی سیدھا نہیں ہوتا۔ جو ہوتا ہے وہ ہوتا نہیں....اور جو نہیں وُہی ہوتا ہے؟

مجھے متذبذب سا دیکھ کر بزرگ بولے...میاں! بھوک کر رہے ہیں۔ اِک نعمتِ خداوندی سامنے دھری ہے کیا سوچ رہے ہو؟ بگھار لگا یا' ٹھنڈا ہو جائے گا تو خاک مزہ آئے گا؟ اب کھچڑا دیکھنے سونگھنے کی چیز نہیں بلکہ منہ میں ڈالنے کا رہ گیا تھا۔ بسم اللہ پڑھی اور چمچی تمیز سے منہ میں رکھا! آگے کچھ کہنے لکھنے کا یارا نہیں کہ یہ نعمت کیا تھی....ویسے بھی کھچڑا' اپنا جواب نہیں رکھتا.... سے کی ہنڈیا میں آنچ کی ساجھی' صحیح نمی ہو اور گھوٹا درست لگا ہو....چانول اناج کا تناسب اور نیم بھنے کھڑے مسالے' دَم پہ ڈلے ہوں.... کچے ادرک' بریاں پیاز کے لچھے' ہینگ اجوائن کا چھینٹا اور بادیہ خطائی کے پسے برادہ کا بگھار! صبح دم' نرم پیٹ کھانے والے چہرے پہ کمال کا نکھار لاتا ہے...کھچڑی میں چانول' دال زیرا محض نمک اور روغنِ زردہ کا بگھار ہوتا ہے...کھچڑے میں.... نیم ثابت مسالے اور مکئی کے آٹے کی گھلاوٹ شامل ہوتی ہے۔ کھچڑی' بیمار کھاتے ہیں اور کھچڑا' صحت مندوں کا کھاجا ہے۔''

وہ مجھے مزہ لیتے ہوئے دیکھ کر بولے! خوب کھاؤ...میرا کھچڑا نصیبوں والے کھاتے ہیں مگر ہوتا یہ بزبچوں' میمنوں اور باگز بلوں کی جوٹھ ہے۔ میرے ہاتھ میں پکڑا چمچ' کانپنے لگا۔ کچھ پلے نہ پڑا تو دیدے پھاڑ انہیں تکنے لگا۔'' کھچڑے نے جہاں میرے چودہ طبق کر دیے وُہیں لگا جیسے میرے اندر روشنیاں سی پھوٹنے لگی ہوں۔ ذائقہ لذت مزہ تو ایسی چیزیں ہیں جنہیں الفاظ و بیان سے بتایا جا سکتا ہے....مگر اس کھچڑے کے کھانے سے جو حظ و کیفیت حاصل ہوئی اُس کے لئے الفاظ ناکافی تھے۔ میرے پکانے کھانے کی ساری سائینس اور سمجھ اس کے آگے پانی بھرتے نظر آئی۔'' وہ تین رکابیاں' بغیر روٹی نان' کھا چکا تو کہنے لگے۔ عشاء کے بعد' پیچھے والی پہلی تنگ گلی میں چلے آیئو! چند دوکانیں آگے پھر دائیں طرف ایک اور گلی ملے گی...سامنے موڑ مڑتے ہی'' اڑھائی دن کے جھونپڑے کا لنگر خانہ'' کا بڑا سا بورڈ دکھائی دے گا۔ اس کے نیچے بڑا سا دروازہ اور اندر وسیع سا صحن....وہیں ملاقات ہوگی۔''

کھچڑا تو چکی کی پَٹی کی طرح چڑھ گیا تھا.... معدہ کا تو معلوم نہیں البتہ دماغ سست ہو گیا۔ بمشکل اپنے ٹھکانے پہ پہنچا اور لمبا پڑ گیا۔ یوں لگا جیسے جسم تو موجود ہے مگر جسم کے اندر جو چیز موجود ہوتی ہے وہ اُدھر کہیں سیڑھیوں کے اُوپر' اڑھائی دن کے جھونپڑے میں رہ گئی ہے۔'' میں واضح طور پہ محسوس کر رہا تھا....اُوپر جھونپڑے کی جانب جا رہا ہوں...بڑے محرابی دروازے کو پھلانگ کر صحن میں پہنچ گیا ہوں۔ بائیں جانب پرانا

سا سایہ دار درخت دکھائی دیا...اس کے نیچے منہ سر لپیٹے کوئی شخص اُکڑوں سا بیٹھا ہے۔ پاس کچھ مُسافرت کا سامان دھرا ہے لگتا ہے کہیں باہر سے ادھر اجمیر میں زیارت کے لئے پہنچا ہے۔" غیر ارادی طور پر مَیں درخت کی جانب بڑھتا ہوں اور السلام علیکم کہہ کر اس کے قریب بیٹھ جاتا ہوں۔" اُس نے میرے سلام کے جواب میں وعلیکم کہا یا نہیں لیکن وہ مجھے اِدھر بیٹھتے دیکھ کر مُسکرایا ضرور تھا۔ اچھے اور سچے مُسافر کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو؟ کھری اشرفی کی طرح کھنکتی ہوئی مُسکراہٹ ضرور ہوتی ہے۔ یہی مُسکان اس کی پہچان بھی ٹھہرتی ہے۔"

جس طرح غیر ارادی طور پر مَیں اس درخت کے نیچے اس کے قریب آ بیٹھا تھا اسی طرح بے اختیار میرے منہ سے نِکل گیا۔ نیچے سیڑھیوں پہ کھچڑا بڑا سواوی بنتا ہے اگر ضرورت ہو تو مَیں آپ کے لئے لا سکتا ہوں....اُس نے جو جواب دیا وہ مجھے مزید حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھا۔" ہاں بچیا! بلیتوں بچھڑوں کا جوٹھا کھچڑا!! تم نے تو بچیا' آج کھایا ہوگا مَیں تو ہر روز کھاتا ہوں! چند ثانیے تو مَیں سکتے میں رہا۔ آخر گویا ہوا...

بابا! یہ بلیتوں بچھڑوں کا کیا معاملہ ہے؟

دل کرے وہ ہو تو کبھی رات' یہاں رُک کر دیکھ لینا۔"

مَیں ذرا قریب سرکتے ہوئے پوچھنے لگا۔ بابا! آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟

نہیں بچیا! مَیں ادھر' اندر سے ہی ہوں۔"

اِدھر اندر سے.....؟ مَیں مزید حیرت زدہ ہو کر' دہراتا ہوں۔" اُس کے قریب سامان دیکھ کر مزید پوچھتا ہوں لگتا ہے آپ بھی میری طرح زیارت کرنے ادھر آئے ہیں۔؟ یہ سامان تو کسی مُسافر کے پاس ہی ہوتا ہے۔ بستر' تھیلا' لوٹا توشہ دان۔؟

سامان کی طرف دھیان کرتے ہوئے جواب دیا۔ ایک بوڑھے معذور زائر کا سامان ہے جو نماز پڑھنے مسجد گیا ہوا ہے۔ مَیں اِدھر نگران بیٹھا ہوں کوئی چور اُچکا' اُٹھا کر نہ لے جائے۔"

معاً میرے ذہن میں ایک اور سوال اُبھرا۔ "بابا جی! یہ بلیتوں اور بچھڑوں والی بات سمجھ نہیں آئی... ان کا جوٹھا کھچڑا؟

تم نے سیّد صاحب کا کھچڑا کھایا' کیسا پایا؟

زندگی میں کبھی نہ ایسا کھایا اور نہ پکایا!

تم نے غریب نواز کے لنگر کی دیگیں دیکھی ہیں؟

جی! دیکھی بھی ہیں اور بہت کھائی بھی ہیں۔

اور تارا گڑھ والی یقیناً وہ بھی دیکھیں؟ اور کھائی بھی ہوں گی....؟ اُس لنگر کے بارے کیا خیال ہے؟

اس کا سودا اس کھچڑے جیسا ہے یا کچھ فرق ہے۔؟
خواجہ سرکار کا لنگر میٹھا 'متنجن نُما ہوتا ہے جبکہ تاراگڑھ کا لنگر' اک خاص لذت والا 'نمکین مسالے دار ہوتا ہے۔
ایک پُرانا قصہ سنو! اِدھر کے ایک مفلوک الحال' کثیر العیال شخص نے روزی رزق کی خاطر ایک ہوٹل کھول لیا... اُس کے نصیبوں کا دخل کہ کافی محنت کے باوجود بھی اُس کا کام نہ چلا۔ جو کچھ پلّے تھا وہ تو لگا چکا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ دوکان کے برتن بھی بیچ کے کھا گیا۔ ایک وقت آیا کہ اُس کے پاس ایک دیگچہ بچ گیا۔ اُس نے ہوٹل کے بچے ہوئے اناج دالوں مسالوں کو اکٹھا کر کے کھچڑا پکا لیا کہ جو بھی دو چار روپے نکلیں گے اُنھیں لے کر کسی دوسری جگہ کوئی ٹھیلہ چھابہ لگانے کی سوچوں گا۔ تمام دن وہ آوازے لگاتا رہا... مگر معمولی سی ریزگاری کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا.... کھچڑا ویسے کا ویسے ہی دھرا تھا۔ بددل ہو کے کھچڑے کا دیگچہ اِس درخت کے نیچے اسی جگہ رکھ گیا کہ رات کو مسافر یا جانور کھا پی جائیں گے... چلو! انسانوں کے نہ سہی' جانوروں کے ہی کام آ جائے گا۔ ساری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اگلے روز علی الصبح وہ اس نیت سے اِدھر پہنچا کہ خالی دیگچہ بیچ دے گا۔ اس جگہ دیکھا تو دیگچہ غائب تھا۔ کھلکھلا کر ہنسا کہ چلو! یہ قصہ بھی تمام ہُوا۔
کبھی کبھی مایوسی' ایسی صُورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ خد درجہ بیزاری کی بجائے خد درجہ تفنن کا باعث بن جاتی ہے۔" وہ مسواک تراشنے کی خاطر' اِدھر کم سُرنگ کی جانب نکل آیا کہ یہاں کچھ درخت موجود تھے... کیا دیکھتا ہے کہ اُس کا دیگچہ' ایک درخت کے نیچے پڑا ہے اور کچھ کھچڑا تلچھٹ بھی موجود! یوں دیکھ کر اس کی پھر ہنسی نکل گئی.... کہ قدرت بھی غریبوں کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔" واقعی قدرت اور قسمت' انسان کے ساتھ عجیب وغریب رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہے... دکھائی کچھ دیتا ہے۔ ہوتا کچھ اور ہے۔ گمان کچھ.... انجام کچھ اور ظاہر ہوتا ہے؟ کوششیں' قانون اُصول طریقے منطق فلسفہ سب کے سب دھرے پڑے رہ جاتے ہیں تقدیر و تدبیر کی بوالعجیاں اپنے کام دکھا جاتی ہیں۔"
عجیب استہزائیہ خندگی کے ساتھ اُس نے دیگچہ اُٹھایا۔ گھر لا کر دھونے کی غرض سے ہاتھ چلایا تو پیندے میں کھچڑے کی تلچھٹ تلے خالص سونے کی ایک ڈلی نے اپنا آپ دکھایا۔ پہلے تو یقین نہ آیا' جب پرکھ پھوٹ کے بعد حقیقت کھلی کہ واقعی خالص سونا اور سیکڑوں کا ہے تو مارے خوشی' آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔"
یہ سونا کہاں سے آیا۔؟ کس نے دیگچے میں رکھا۔ کیوں رکھا... دیگچہ درخت کے تلے سے پرے پہاڑی تو دے پہ کون لے کر گیا؟؟ مگر کسی سوال کا جواب نہ ملنا تھا نہ ملا۔" رازداری برتی خاموشی اختیار کر لی۔" اب کیا تھا ہر روز بڑے اہتمام سے کھچڑا تیار ہوتا اور عشاء کی نماز کے بعد' احاطے کا بڑا گیٹ بند ہونے سے پہلے.... اِسی

درخت تلے رکھ دیا جاتا...علی الصبح نماز کے وقت سے پہلے دیگچہ دیکھا جاتا کبھی کہیں' کبھی کدھر' بالآخر مل جاتا! حسب سابق کبھی سونے کبھی چاندی کی ڈلی! اور کبھی محض اللہ کا نام!

ہوٹل والے کے ہاں لہر بہر ہوگئی۔ عقلمندی یہ کی کہ سب کچھ راز میں رکھا... کبھی کسی پہ ظاہر نہ کیا کہ اُس کی یہ کایا پلٹ کیسے آئی؟ پھر اچانک اس کے کھچڑا پکانے اور دوسری طرف سونے چاندی کے سلسلے میں کچھ تبدیلیاں واقع ہوگئیں اور دونوں اطراف کبھی کبھی تعطل پیدا ہونے لگا۔ شاید ہوٹل والا لالچ میں پڑ گیا تھا.... اب اس کے ہاں اتنا مال جمع' ہوگیا کہ اُس نے اسی مسجد کے احاطے کی دیوار سے 'جڑا ہوا پرانا مکان خرید لیا۔ اس مکان کے دالان کے دریچوں سے مسجد' صحن' مزارات اور پرانے آشرم کے کمرے' جن میں اُسی دور کے بُت تھے' صاف دکھائی دیتے تھے۔'' چاندنی راتوں اور صاف موسموں میں ایک ایک اینٹ پتھر نمایاں نظر آتے تھے۔ کچھ صرفے سے ہلکی پھلکی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں بھی کروالیں۔

کھچڑا پکتا رہا۔ اِدھر بٹتا رہا... لیکن اُدھر سونا چاندی ملنا بند ہوگیا۔ شاید اس کی وجہ' کھچڑے کا ویسا ہونا نہ تھا جو شروع کے دنوں میں رہا تھا۔ اسی وقت کی رگڑا رگڑی میں اس ہوٹل والے کا انتقال ہوگیا......'' اولاد میں بڑا لڑکا دیندار اور سمجھدار تھا اور سونے چاندی کے راز سے واقف' اس نے اپنے مرحوم والد والا کاروبار' ازسرِنو جاری کرنے کا فیصلہ اور خاص طور پر' اس تبدیلی پہ غور کیا کہ سونے چاندی کے بند ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اپنی سُوجھ بُوجھ سے کام لیتے ہوئے اُس نے وہی معیار واپس لانے کی کوشش' جو کبھی مرحوم والد کے ابتدائی کاروباری وقتوں میں تھا۔ جس کی بدولت' اُن کی مُفلسی' خوشحالی میں بدل گئی تھی۔'' کھچڑا پکانے میں ہی ان کی شُہرت تھی۔ بدرالدین نے اپنے رب سے بزرگوں سے کھچڑے کی تیاری' اجزاء کے پُرانے فارمولے' ازسرِنو ترتیب دیے اور معیار میں کبھی سمجھوتا نہ کرنے کا عہد کرتے ہوئے' کاروباری بسم اللہ شروع کی۔'' مالکِ کُل نے اس کی نیت اور رزق میں برکت ڈالی۔ وہ اعلیٰ معیار کے کھچڑے کا لنگر تیار کرنے لگا۔ سارا دن وہ لنگر کی تیاری میں رہتا اور عشاء کی نماز کے بعد' جب وہ اڑھائی دن کے جھونپڑے میں عوام کا داخلہ بند کردیا جاتا اور پورا احاطہ مقفل ہوجاتا' تو وُہ اپنے 'ملحقہ مکان کی اِدھر کھلنے والی بڑی کھڑکی سے مضبوط رَسے کی مدد سے دیگچہ' احاطہ کے اندر اُتار دیتا۔''

بدرالدین بڑا وجیہہ' دراز قامت' جوان رعنا تھا۔ نیت واطوار کا کھرا' سچا اور خوددار! وُہ جانتا تھا اُس کے مرحوم باپ کی غربت' اسی کھچڑے کی بدولت ختم ہوئی تھی اور اسی جھونپڑے کی نادیدہ' بزرگ ہستیاں' اس کے پکوان سے خوش ہوکے' سونے چاندی کی ڈلیوں سے نوازتی تھیں۔ پھر کوئی ایسی بات ہوئی کہ اُن کی طرف سے یہ سلسلہ رُک گیا... شاید کھچڑے میں کوئی کمی واقع ہوگئی تھی یا وہ بزرگ نادیدہ ہستیاں' کسی اور وجہ سے

ناراض ہو گئیں اور اِدھر پھر وہی بے برکتی اور افلاس نے ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔"

بدرالدین' شادی شدہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ بدنظر اور بُرے خیالات کا تھا۔ خواجہ غریب کا دیوانہ' کوشش کرتا کہ تمام نمازیں' درگاہ شریف کی مسجد میں ادا ہوں' اگر دیر سویر ہو جاتی تو اِدھر جھونپڑے کی مسجد میں چلا جاتا۔ وہ اُس کے گھر کی آنگن کی طرح تھی۔" اُس کے لیٹنے کے کمرے سے تمام جھونپڑا' کسی کھلے منظر کی مانند واضح تھا۔ لگتا کہ اس کا گھر بھی اسی کا حصہ ہے کوئی علیحدہ مکانیت نہیں.... چاندنی راتیں' اک نگار خانہ بن جاتیں جھونپڑے کی مسجد کے در و محراب پہ کندہ' قرآنی آیات' گنبد و مینار' برآمدے' مزارات' آشرم کے 'بت خانے' درخت' راستے' روشیں' غرضیکہ اِدھر کی ہر شے' اپنا ظاہر و باطن' آئینہ کیے' اس پہ آشکار رہتیں.... کبھی کبھی عالم محویت و اثریت میں یہ بھی اُسی ماحول کا حصہ بن جاتا..."

مستقل مزاجی بھی اس کی شخصیت کا اک نمایاں پہلو تھی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے نئے انداز کے کھچڑے کے کاروبار کے ابتدائی مراحل میں آنے والی' مالی پریشانیوں اور ناکامیوں کو خندہ جبین سے برداشت کر گیا... کئی ہفتوں عشروں' بلکہ مہینوں تک اُسے کامیابی نصیب نہ ہوئی... جیب کا مال خرچ ہوا... کچھ اِدھر اُدھر سے پکڑ کر لگا دیا... روز کھچڑے کی دیگ اُترتی... بڑے کا بہترین گوشت' اناج دالیں' خالص گھی' اعلیٰ مسالے پورے اوزان میں... صفائی ستھرائی' چھان پھٹک' دھلائی' چنائی... کسی چیز کی کمی نہ رکھی... مگر دیگ دیگچے خالی ہو جاتے... لگائی رقم بھی واپس نہ ہوتی۔" وہی باپ والا طریقہ' دن بھر بکایا... عشاء کے بعد' جھونپڑے میں تالا لگتے ہی بڑا دیگچہ کھچڑا' پچھلی کھڑکی سے' جھونپڑے میں پہنچا دیا جاتا۔" صبح دیگچہ تو خالی ملتا مگر کوئی سونا چاندی' ہاتھ نہ لگتا۔"

یہ اچھے اور شریر جنوں والے قِصّوں کہانیوں سے تو اجمیر کا بچہ بچہ واقف تھا کہ جھونپڑا' جنات کی بہت بڑی آماجگاہ ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ قدیم زمانے سے یہاں جنات موجود ہیں۔ بلکہ اُن وقتوں سے ہی' ان کے خاندان اور قبیلے اِدھر آباد ہیں جب صدیوں پہلے ایک ہندو جوتشی راجہ نے' دیوتاؤں کے حکم سے اس جگہ پہلا آشرم بنایا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ راجپوت ہندو راجہ' بہت بڑا بُدھی مان اور بِدیا وان تھا۔ اُس کے پاس پُرانے شاستروں اور پُرانوں کی بِدیا اور شکتی تھی۔ اسی طرح کے پُراسرار پرانے عُلوم کا ماہر' ایک مُسلمان اُس کا مِتر تھا۔ ان علمی وجوہات کی بنا پر اُن کی آپس میں خوب بنتی تھی... وہ دونوں اپنے اپنے دھرم پہ رہتے ہوئے اک دُوجے کو بڑا مانتے اور بھروسہ کرتے تھے۔ ساتھ کی رتنا پہاڑی کی ایک خفیہ غار' اُن کی تپسیا' ریاضت عبادت کے لئے مخصوص تھی۔ جس کا محلِ وقوع اور داخلے نکلنے کے راستے سے دو چار' معتقدوں کے علاوہ' کوئی اور واقف نہ تھا۔ اِدھر پہاڑی پہ اُنہوں نے ایک رَسدگاہ بھی تعمیر کروائی لیکن کوئی اینٹ پتھر کا مینار نہ تھا۔ یہ کالے کا ہو کے مضبوط

تخوں سے بلند کیا ہُوا ایک چبوترا سا تھا۔ جس کے ارد گرد اور اُوپر مختلف دھاتوں کے پترے اور ٹکڑے چسپاں تھے۔ کچھ آبدار شیشے آئینے اور صیقل کیے تانبے کے گولے... ایسا پُراسرار عجیب و غریب چوبی مینار نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا...'' اِن دونوں مختلف دھرموں کے بُدھی مانوں نے اپنے گیان دھیان سے معلوم کیا کہ یہ اجمیر گرد و نواح کا قطعۂ اَرض بڑی مہان شکتیوں برکتوں کا حامل ہے۔ اس کے تحت الثرانے سے لے کر تحت الثریا تک اِک خطِ استوا ہے جس میں کوئی قدغن نہیں۔ اس کی وجہ سے عالمان و عارفانِ ارضی و افلاکی اور حاملانِ آتش و عنصر غراء و ہُوا کے ظہور و خروج میں آسانیاں ہیں۔''

کچھ ایسے ہی شرف و تصرف بُودھوں ہندوؤں یہودیوں عیسائیوں اور سکھوں کے مذہبی اور مقدس مقامات میں موجود ہیں۔ آریوں یونانیوں مصریوں آشوریوں فارسیوں نے تو صدیوں پہلے یہ سب کچھ دریافت کر لیا تھا۔'' قطعۂ اَرض پہ جہاں جدھر بھی انسان کو قابلِ ذکر و دید مساجد مقابر معبد مندر گرجے گوردوارے اسٹوپے درگاہیں تیرتھ اور دیگر مذہبی جگہیں ملتی ہیں سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی تصرف و تکبیر تائید و تمہید ضرور ہوگی؟ سنگھٹ پانی اور پُرشوں کا بہاؤ اور رچاؤ جانچ کر اور گیان دھیان کے لئے بَن اور آفاقی کے لئے بھالا بان دیکھ بھال کر ہی برتے جاتے ہیں۔''

خواجہ غریب نواز نے اجمیر کی سرزمین کو اپنی دینی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا... تو یہ یونہی نہیں ہُوا تھا۔ اللہ کا ولی! جدھر قدم دھرتا ہے... شش جہت چودہ طبق اپنے سیاق و سباق ظاہر و باطن محاسن و عیوب اَزل و اَبد آغاز و انجام کے ساتھ روشن ہو جاتے ہیں۔ دین و دُنیا کا کوئی اعلیٰ و ادنیٰ وظیفہ توحید اخلاص تبلیغ اور جہاد کے ظاہری و باطنی مَعنی جانے بغیر خیر و سلامتی سے سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔'' آنا ساگر سے درگاہ شریف اور اُدھر تارا گڑھ کے بیچ کا پہاڑی اور کچھ میدانی طبقاتِ اَرض اِک مخصوص روحانی سعادت و برکت کے سزاوار ہیں۔ یہ تمام کچھ روشن ضمیروں پہ واضح ہیں۔''

خواجہ غریب نواز کے اِدھر تشریف لانے سے پیشتر یہ اڑھائی دن کا جھونپڑا موجود تھا۔'' آشرم اُوشد حالیہ مندر مسجد اور چھاؤنی! اپنے اپنے قیود و حدود میں قائم تھے۔ بلا تشخص و تخصیص ہر کوئی اِدھر کی سہولیات سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ وقت کے حکمرانوں اور سپاہیوں سالاروں کے لئے بھی درجہ بدرجہ قیام و طعام کا انتظام تھا۔ اِدھر ہی سے خفیہ راستے دُوسرے قلعوں چھاؤنیوں کی رَسائی کے لئے موجود تھے۔'' خواجہ غریب نواز کی آمد تک.... کئی بادشاہ حاکم آئے اور صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم حکمرانوں کا اَثر و نفوذ کافی حد تک ختم ہو چکا تھا۔'' یہی موقع کہ خواجہ اجمیریؒ نے اللہ کے اِذن سے اپنا کام شروع کیا اور خدائے برتر کی عظمت و وحدت کا نعرہ بلند کیا۔'' آپ نے اپنے ابتدائی دَور میں تارا گڑھ اور اڑھائی دن کے جھونپڑے کی

مساجد اور عبادت گاہوں میں اِک زمانہ عبادت کی' چلے کیئے ... وعظ و پند کے ذریعے' اسلام کا پرچار کیا۔ اسی طرح آپ لاہور' داتا گنج بخش ہجویریؒ اور اِدھر کے دیگر اولیائے کرام کے مزارات پر بھی تشریف لائے اور اپنے دینی تبلیغی اُمور سرانجام دیئے۔''

درخت کے سائے میں بیٹھا یہ بوڑھا شخص' جس سے میری ملاقات' ایک اتفاق ہی کہی جا سکتی ہے مگر سمجھتا اور جانتا ہوں یہ ''اتفاق'' بھی کہیں اَمر ہوتا ہے اور کوئی بھی اَمر' واقع ہونے کے لئے کسی حُجت کی اوٹ لیتا ہے کہ انسان تو ایک لقمہ' پیٹ میں ڈالنے کے لئے کئی حجتیں تلاش کرتا ہے۔'' بظاہر یہ کسی مسافر کے زادِ راہ کی نگرانی کے لئے اِدھر تشریف فرما تھے جو نماز کے لئے مسجد گیا ہُوا تھا۔ مسجد میں مسافروں کو اپنا سامان لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ''مسلسل بولتے رہنے کی ہمت دیکھ کر مَیں خاصا متاثر اور محظوظ بھی ہُوا۔'' بے شمار انوکھی اور قیمتی معلومات' جن کا علم! کم از کم اس دَور میں کسی زندہ انسان کے پاس ہونا مشکل اَمر تھا.... اس کے لئے مَیں نے اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔''

میری تو جان پہ بن آئی جب دیکھا وہ منظر سے غائب ہے۔ مَیں ابھی اس نظر کے فریب پہ غور ہی کر رہا تھا کہ وُہ مسافر آ پہنچا...کوئی بہار کا رہنے والا سادہ سا مسلمان دکھائی دیتا تھا۔ آتے ہی اُس نے اپنے سامان کا سرسری سا جائزہ لیا' اِک اُچٹتی سی نظر مجھ پہ ڈالی اور اپنا سامان اُٹھا کر جانے کو ہی تھا کہ مَیں نے لجاجت بھرے لہجے میں اُس سے پوچھا۔ السلام علیکم! بھائی تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ مَیں پاکستان کا رہنے والا ہوں۔ اِدھر اجمیر شریف آتا رہتا ہوں۔ آج بھی مَیں اِدھر زیارت کے لئے پہنچا تھا۔ یہیں آپ کے سامان اور بابا جی کے پاس بیٹھا تھا۔ بابا جی نے بتایا کہ آپ نماز پڑھنے گئے ہوئے ہیں لیکن اچانک بابا جی کہیں غائب ہو گئے۔ اتنے میں آپ بھی آن پہنچے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا... بابا! اچانک کدھر غائب ہو گئے؟

وہ مجھے مشتبہ نظروں سے تولتے ہوئے بولا... بھائی! مَیں کسی بابے وابے کو نہیں جانتا...اور نہ ہی مَیں نے اِدھر کسی کو رکھوالی کے لیے بٹھایا تھا۔ مَیں تو خدا کے سپرد کر کے اپنا سامان' اِدھر رکھ گیا تھا کہ اندر مسجد میں قضا نماز ادا کر لوں۔ مجھے وَرطۂ حیرت میں ہکا بکا چھوڑ' یہ جا وہ جا!....مَیں بے سکت و حرکت' جانے کب تک پتھر کا بُت بنا کھڑا رہتا اگر مَیں نے زور سے زانو میں چٹکی نہ کاٹی ہوتی؟ ظاہر ہے ہلکی سی منہ سے ہی نکل گئی اور ساتھ ہی مَیں سراب اور خواب سے باہر تھا....''

نیند' غنودگی اور نشہ کی کیفیت دُور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بہترین کام کرتے ہیں۔ ہوش جو قدرے بحال ہوئے تو بیتی دوپہر کی ایک اِک بات یاد آنے لگی۔ سیڑھیوں پہ بیٹھے بچھڑے والے بابا! اُن کی شفقت' بھید بھری باتیں' بگھار والا کھچڑا کھانا' منفرد ذائقہ کہ جسے کبھی بھلایا نہ جا سکے۔ کھانے کے بعد

اِک عجیب سا سرور... اَنگ اَنگ میں لہرے لیتی ہوئی توانائی مستی! جیسے جنت کا کوئی طعام کھا لیا ہو۔ عشاء کی نماز بعد' پچھلی گلی میں لنگر والے احاطہ میں ملاقات.... جیسے! ایک اِک کر کے ساری گانٹھیں کھل رہی ہوں.... مَیں آہستہ آہستہ' ہوش اور سوچ کی دُنیا میں واپس آ گیا تھا۔''

''مُسکرات'' کی شاید تعریف یہ ہے' بدمستی کی ایسی کیفیت' جس میں انسانی رُوحانی اعلیٰ قدروں کا احساس نہ رہے۔ انسان! چاہے بھی تو خود پہ قابو نہ رکھ سکے.... مستی' بداخلاقی' جنسی رغبت' بے حیائی' بے حسی وغیرہ وغیرہ۔'' کچھ سُرور مستی انبساط' ایسے بھی' جس سے رُوح سرشار... قلب و نظر میں اَفروزگی پیدا ہوتی ہے.... ارد گرد نور چھیلا ہُوا محسوس ہوتا ہے... خیالات میں ہلکے ہلکے اُودے' فاختئی' فالسئی اور کاسنی رنگ ابھرنے لگتے ہیں.... بندہ خود میں ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ مَیں بھی یہی کچھ محسوس کر رہا تھا... پھر اچانک میرا دھیان اِس ''رُویا زیادہ اور کم'' کی جانب چلا گیا... جس میں مَیں نے اچھا خاصا' وقت درخت کے نیچے' اُس بابے کے ساتھ گزارا' جو کسی زائر کے سامان کی نگہداری' کے لئے اُدھر بیٹھا تھا۔'' بابا نے مجھے بڑی پُراسرار اور قیمتی معلومات بہم پہنچائیں' جنہیں جان اور سمجھ کر مَیں خود کو خوش نصیب سمجھنے لگا کہ یہی پانے اور سمجھنے کی لگن' میری طبع اور زندگی کا ماحصل ٹھہرا۔''

طبع طبیعت کی کچھ مزید پرتیں کھلیں تو خیال گزرا کہ بچھڑے والے بابا کا معاملہ اور درخت کے نیچے بیٹھا ہُوا بہاری بابا' کہیں اِسی ''اڑھائی دن کے جھونپڑے'' کے اَسرار کی جزئت تو نہیں؟ بچھڑے والا بابا' جیتی جاگتی حقیقت اور درخت کے نیچے والا بابا! رُویا یا خواب کی درمیانی کیفیت.... یقیناً یہ تمام کچھ مجھے آگاہی دینے کا اہتمام تھا... اور یہ بھی ایک سوال! کہ ایسا کیوں...؟

سوال تو ایک یہ بھی تھا کہ دن کے اُجالے' کھلی آنکھوں کے رُوبرو' بہاری بابا چشم زدن میں کہاں غائب ہو گیا۔؟ ہُوا میں تحلیل ہوتا تو بھی کوئی نشان یا کچھ وقت... زمین میں اُترے یا آسمان کی جانب اُڑے تب بھی کچھ نہ کچھ پتا چلے.... لیکن بہاری بابا' تو پردے پہ فلم کے کٹ ٹو کٹ سین کی طرح' اپنے وجود کی نفی کر گیا.... ایسی حرکت' کوئی غیر مرئی ہستی ہی کر سکتی ہے جسے حاضر و غائب ہونے پہ قدرت حاصل ہو۔''

● میرے دل دے شیشے وچ سجناں پیئی سجدی اے تصویر تیری......!

یہ ایک گیت کا مکھڑا ہے۔ دیگر فلمی گیتوں کی طرح اسے بھی سُن اور محسوس کر کے لطف کشید کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب مَیں نے اسے پہلی بار سنا تو بے حد محظوظ ہُوا بلکہ اپنے ایک تشنہ سوال کا جواب بھی مل گیا۔'' صاف شیشے کے آر پار روشنی اور بینائی تو چلی جاتی ہے۔ آواز ہَوا اور ٹھوس مادی جسم و وجود کا گزر ممکن نہیں۔''

حیران کُن بات کہ انسان کے پاس ایسی صلاحیت موجود ہے کہ شیشے کے آر پار دیکھ تو سکتا ہے مگر گزر نے پر قادر نہیں۔ آخر آنکھ کی بینائی میں وہ کون سی صلاحیت ہے جو راہ کی ٹھوس رُکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی اور آر پار ہو جاتی ہے۔ یا ایسی کیسی خوبی ہے کہ وہ ایک دو فرلانگ تو صاف دیکھ نہیں سکتا... لاکھوں کروڑوں میل دُور چمکتے جھلملاتے ستارے' چاند سورج دیکھ لیتا ہے۔ اس کے ہاں کی خیال و تصور' جیسی سُرعت' دُنیا کی کسی اور شے میں نہیں' حتیٰ کہ جنات بھی بشر کے خیال اور تصور کی قوت و سُرعت کے سامنے عاجز ہیں۔ ہر چند معلوم ہُوا کہ جو عنصر' غیر مرئی ہوتا ہے وہی غیر معمولی بھی ہوتا ہے۔ جنات اور انسان کو یہ غیر مرئی اور غیر معمولی صلاحیتیں ودیعت ہوئیں' تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ دونوں مخلوقات' شانہ بشانہ رہیں۔ آغاز' انجام' حساب و کتاب یکساں ہی ہیں.... بالکل ایسے ہی جیسے گیس' پانی' بجلی' آگ وغیرہ ایک گھر میں ساتھ ساتھ ہی ہوتے ہیں مگر تمام اپنے اپنے کار و ورزدو میں یکسر مختلف' شکل و ہیئت بھی علیحدہ' کوئی دکھائی دیتی ہے اور کوئی محض بجھائی۔''

غور کریں کہ پانی کو ایک ہزار میل دُور پہنچانے کے لئے ایک خاصا وقت درکار ہوگا' گیس کا بھی یہی حال! مگر بجلی.... پہنچانے کے لئے محض چند ساعتیں... بجلی! اللہ کریم کے نورِ جمال کے لاکھویں حصے کی خفیف سی جھلک! جیسے آتش' ستر بار دُھلی' تب اسی کی تیزی تندی' مندی ہوئی۔'' مزید غور فرمائیں تو عقدہ کھلے گا کہ اللہ کریم نے ان بے بہا' تند و تیز' بے پناہ طاقت و حرکت اور منہ زور' لامحدود حجم و وسعت والی' مرئی اور غیر مرئی' عنصرات' اجسام' بحر و بر' آندھیاں بادل' سیلاب و طوفان' زلزلے آتش فشانی وغیرہ' اک کمزور اعضاء و قوا والے بشر' کہیں طور انہیں برداشت سہار سکتا ہے... ان منہ زور خوفناک آفات کو' صرف اللہ کریم کی بخشی ہوئی عقل لیاقت' حکمت و ہمت' تعلیم و تربیت اور صبر و استقلال سے ہی قابو اور پھر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔''

حضرتِ انسان نے تو جنات اور دیگر غیر مرئی کی غیر معمولی صلاحیتوں' طاقتوں اور فہم و فراست سے بھی کام لیا.... صفحۂ ہستی پہ ہنوز ایسے محلات' عبادت گاہیں' آشرم معبد' مقابر اور سیارگاہیں موجود ہیں' جنہیں بمشکل نیچے یا دور سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن اُدھر تک پہنچا نہیں جا سکتا۔ عقابوں اور مار خوروں کے بچے' پانی چھوڑ دیں۔ بادل نیچے رہ جائیں۔ انسانی عقل و بصیرت' چشمِ حیرت بن کر انہیں دیکھتی ہے.... کہ انسان تو وہاں پہنچ نہیں سکتا... ہزاروں لاکھوں ٹن' سنگِ سیاہ' اجز' اینٹیں' پانی چونا اور دیگر تعمیراتی مسالے' قیمتی لکڑی کس وسیلے حیلے سے اُوپر پہنچائے گئے۔ وہ مافوق الفطرت وہمت کون سی مخلوق تھی اگر وہ نہیں تھے تو اور کون تھے؟ یہ ساری تعمیرات تو انسانی ضروریات کے مطابق ہیں۔ جنات' ملائک' بھوت پریت یا دیوتاؤں کو تو شب خوابی کے کمروں' باورچی خانوں' بیت الخلاؤں یا لائبریریوں کی ضرورت نہیں ہوتی... اُوپر پانی اور دیگر رسد کیسے پہنچتے تھے۔

مَیں نے ایسی دُور اُفتادہ بلند و بالا پہاڑوں پہ ایسے مقامات دیکھے ہیں کہ انسان اپنے فطری تقاضوں کے تحت اُدھر قیام پذیر ہو ہی نہیں سکتا اور ایسے تعمیر و تکمیل کے نمونے کہ سوچ سوچ کر دماغ سُن ہو جائے۔ پہاڑ کاٹ کر راہداریاں بنائی گئیں.... دَر و دیوار چھت فرش ایک ہی چٹان سے تراشے گئے۔ محرابیں طاقچے' سلیقے' استراحت کے لئے سنگی پلنگ' پانی کا خفیہ انتظام' پانی کا منبع کدھر ہے۔ بہاؤ میں روانی' موسم کے مطابق سرد گرم پانی...؟ جائیے! ذرا یونان' مصر' عراق' ترکی' کابل' تاشقند بخارا' بھارت' کھٹمنڈو' نیپال' سری لنکا' کشمیر اور شمالی علاقہ جات وغیرہ! اور آگے...فرانس' فلسطین' برازیل' چین' افریقہ امریکہ کے پہاڑ' صحرا' جھیلیں' جزیرے کہ انسان نے بھی جنات سے بڑھ کر کام دکھائے اور جن بھی کبھی کبھی بشر کی سطح پر آ جاتا ہے۔"

اِسی موضوع پہ بات ہو رہی اچانک میرے مُنہ سے نکل گیا۔ دُنیا تو بڑی وسیع ہے۔ ذوقِ آوارگی ہر کسی کا نصیب کہاں؟ وقت' سرمایہ مواقع وسائل کسی کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔ ہم تو چھوٹے سے پاکستان کو ہی ابھی اس حوالہ سے دریافت نہیں کر سکے؟ چار عدد مساجد' باولیاں' غاریں' کنویں' مینار ذخیرے' تین گھاٹ' راہ راستے' تالاب' باغات وغیرہ غیر مرئی قوتوں نے بنائے اور موجود ہیں۔ آج بھی پرانے بزرگ ہیں جو یہ سب کچھ جانتے ہیں.... بہت سی ایجادات' حربی ضربی زرعی آلات' موسیقی کے ساز' سفر کے لئے سواریاں' کشتیاں' طعام' مجاہدات کے آسن' غیبی مخلوقات کی ذہین ہیں.... نیچے سے اُوپر پانی پہنچانے کا فن' پانی سے وزن' علاج' گرمی پیدا کرنے کا ہنر' تعمیراتی فن' پتھر کو موم بنانے کا طریقہ.... شیشے کو آبدار کرنا...اس کے انعکاس سے پیغام رسانی بھی انہوں نے سکھائی۔ آگ کے دُھویں کا استعمال...موسموں کے تغیر و تبدل سے پیش گوئی کرنا... تجراتِ شناسی کہاں تک لکھوں! جنات پہلی مخلوق' جو آدم کی تخلیق سے پہلے موجود تھی۔ بنی آدم کم اور بنی جان زیادہ...ملائکہ کے اتالیق' عرش و فرش اِن کے تصرف میں...."

واپس چلتے ہیں اجمیر شریف! مَیں اپنے ہوٹل میں بستر پہ لیٹا' نیم نومی حالت میں' اُڑھائی دن کے جھونپڑے کی سیڑھیوں پہ بیٹھے کچھوا فروش' بزرگ سے اتفاقیہ ملاقات! بگھار لگے لذیذ کچھوے کی دعوت اور پُراسرار گفتگو پہ غور کر رہا تھا۔ مجھے اچانک یہ بھی یاد آ گیا کہ مجھے اُنہوں نے' آج رات عشاء کے بعد....اُدھر پچھلی گلی میں' لنگر پکانے والی حویلی پہنچنے کا کہا ہُوا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں مَیں مکمل طور پہ اپنے ہوش و حواس میں آ چکا تھا۔ اِک ایک کر کے' دن کے تمام واقعات' میرے دماغ کی سکرین پہ نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ یہیں پہ یہ بھی واضح ہُوا کہ میں عالمِ رویا میں پھر ایک اڑھائی دن کے جھونپڑے کے اندر' بائیں جانب صدیوں پُرانے درخت کے نیچے پہنچ گیا تھا۔ جدھر میرا سامنا ایک بھاری بزرگ سے ہُوا جو کسی نمازی کے سفری سامان کی نگہداری کے لیے اُدھر بیٹھے تھے۔ اُن سے

بہت کچھ کہنے سُننے کو مِلا۔ اُن کی باتوں اور شخصیت کی گھاتوں میں بڑے اُسرار تھے اور اُسرار کی مختصر تعریف یہ ہے کہ آسانی سے عیاں نہیں ہوتے۔ یہیں یہ بھی سمجھ میں آیا' اُنہوں نے سیڑھیوں والے کھجڑا فروش بابا کا ذکر بھی کیا تھا جبکہ اِس کا کوئی محل نہ تھا...... معلوم ہُوا کہ اِن تمام پُراسرار معاملات کی کڑیاں کہیں نہ کہیں آپس میں ملتی ہیں۔ جن سے سرِدست میں لاعلم تھا۔

عشاء کا کیا مذکور؟ ابھی مغرب بھی ایک پَون پہر کی دُوری پہ تھی پھر آگے عشاء کی صُحبت تو شب تار کے شبستان سجنے پہ موقوف ہے۔ جس کے لیے ابھی "کارِجہاں دراز" تھا۔ اِنتظار کی لذت سے مَن نہ بھرے تو کوئی نہ کوئی مصروفیت یا محویت تلاش کر لینی چاہیے۔ مَیں ہوٹل سے نیچے اُتر آیا۔ خواجہ اجمیری کی دَرگاہ کے سامنے کا سیدھا وسیع و عریض بازار' نت نئے شاندار رہائشی ہوٹل' ٹریولنگ ایجنسیاں' مٹھائیوں' تحفے تحائف' لباس کپڑے' جُوتوں اور جیولری کی دوکانیں...... بیچ بازار لنگڑے لُولے' اَندھے خستہ حال' ننگے دھڑنگے' مَرد و زن بچگان...... شور' غوغا' صدائیں' لگتا ہے بازارِ اجمیر نہیں بازارِ مصر لگا ہُوا ہے۔ اِدھر سے گزرنے والا' وقتی طور پہ ہی سہی' خُود کے علاوہ آگا پیچھا' دایاں' بایاں سب کچھ فراموش کر دینے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ "بازار" کی تعریف ہی کچھ یُوں ہے کہ اُدھر سے گزرنے اور رہنے والوں کے حواسِ لطیفہ اور لُطفِ رُوحانیہ کو حواسِ کثیفہ اور نحوستِ شیطانیہ میں منتقل کرنے کا سامان رکھتا ہے۔"

بزرگوں نے بلاضرورت بازاروں میں جانے سے منع فرمایا کہ چہرے کا نُور دُھندلا اور باطن کا سرور پھیکا پڑ جاتا ہے۔ ضرورت کے تحت جانا مقصود ہو تو یُوں سر جھکیو اور نظریں بیو کر چلو جیسے کسی قرض خواہ کی نگاہوں سے بچتے ہوئے قرضدار نکلنے کی کوشش میں ہوتا ہے۔ مَیں بھی اپنی عادت سے مجبور' مُنڈھی مدھم کیے جَل جُل سا' بازار سے گزر رہا تھا۔ اچھی یا بُری عادت کہ مَیں سرِ رُوبرو' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ تو چل سکتا ہوں اور نہ کسی سے گفتگو! چاہتا یُوں ہوں جیسے "حضورِ یار دفترِ جنُوں کی طلب" ہوئی ہو! اور کسی مخاطب سے یُوں بات جیسے قرض کی ادائیگی میں کوئی حُجت پیش ہو رہی ہو؟

سُنا ہے بلکہ مشاہدہ تجربہ بھی کہ جو مرد و عورت' مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بات کرتے ہیں وہ کریک کیریکٹر اور یا پھر پیشہ ور ایکٹر ہوتے ہیں۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ پولیس ملازم' نوسرباز' دو نمبر پیر عامل' کسی رشوت خور محکمے کے کارندے ہوں گے۔ آنکھوں کو تیز تیز گھمانے والی' ٹکٹکی باندھے دیکھنے اور زبان سے زیادہ آنکھوں سے اِفہام و تفہیم کرنے والی مہلائیں...... تو سے فیصد' مشکوک کار و کردار کی حامل ہوتی ہیں۔ کہاں سے کدھر نکل آیا۔ اجمیر شریف' دَرگاہ کے ماتھے والے بازار میں کچھ وقت گزاری کے لیے نکل آیا کہ عشاء کی نماز کے بعد اڑھائی دِن کے جھونپڑے کی بغلی گلی میں لنگر والی حویلی پہنچنا تھا۔ جدھر کھجڑے والے باوا نے بطورِ خاص مجھے مدعو کیا تھا۔

بازار میں کندھے سے کندھا بجڑ رہا تھا...... یہ تو اچھا تھا کہ اس بازار میں گاڑیوں رکشے ٹھیلے والوں کی آمد و رفت پہ پابندی ہے اس کے باوجود پیدل چلنے والوں' آنے جانے والے زائرین' تجاوزات اور ہر نوع کے بھکاری' لولے لنگڑے اپاہج' نابینے' اُدھورے دھڑوں' اعضاء والے دیوزہ گروں کے انبوہ در انبوہ' آہ و زاریاں' آوازے فریادیں وغیرہ کلیجے کاٹ کے رکھ دیتی ہیں۔ خواجہ غریب نواز کی چوکھٹ! ہر کوئی ادھر مانگنے اور اپنی فریادیں دُکھڑے سُنانے پہنچتا ہے۔ خواجہ' سب کی سُنتے ہیں سب کی مرادیں پوری کرتے ہیں...... ادھر سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا ہے۔ مَیں بھی اک بھکاری ہوں...... انہی جیسا بلکہ اِن سے بھی کئی درجہ گیا گزرا! اِن کے اور میرے مابین دو چار ہی تو تضاد ہیں۔ میرے ہاں نالہ و شیون کا فقدان ہے...... مَیں بازاروں کا نہیں' بزرگوں کی درگاہوں کا منگ ہوں...... میری کوئی حاجت یا ضرورت ہوتی ہی نہیں...... اگر بتقاضائے بشریت کوئی سامنے آ بھی جائے تو میرا حاجت روا' خود بخود ہی پوری کر دیتا ہے کہ وُہی میرا جو پان ہے۔

خواجہ کی درگاہ سے زائرین کا کوئی قافلہ باہر نکل رہا تھا...... سرکاری اور درگاہ کے ملازمین' اُن کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ اسی ہٹو بچو میں' مَیں دائیں جانب ایک جُوس لسّی والی دوکان کے سامنے دَم کی دَم رُک گیا۔ مَیں بھی قافلے والے زائرین کو دیکھنے لگا۔ ہندوستان کے کسی دُور دراز پہاڑی علاقے کے مرد و زن! خواجہ سے عقیدت کا نُور' اُن کے چہروں کو روشن چراغ بنائے ہوئے تھا۔ ابھی دیکھا دیکھی میں مگن تھا کہ پیچھے سے میرے شانے کو کسی چیز نے مَس کیا۔ مُڑ کر جو دیکھا' ایک نوجوان! جس کے دونوں بازو' کندھوں سے کٹے ہوئے تھے۔ میری طرف عجوب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دبے دبے الفاظ میں شاید مجھ سے بھیک طلب کی تھی' نہ جانے کیوں؟ مَیں نے رُخ پلٹ کر اُسے بغور دیکھا۔ بیس بائیس برس کا اکہرے بدن والا نوجوان' صاف ستھرے سفید کپڑے' سر پہ سُوتی ٹوپی' جو زیادہ بنگالی اور بہاری پہنتے ہیں۔ پاؤں میں ممبئی کی چپل اور گلے میں لٹکا ہُوا موٹے سوتی کپڑے کا تھیلا! جس میں بھیک دینے والا' خود ہی ڈال دیتا ہوگا کہ اِس کے ہاتھ بازو تو تھے نہیں۔

مَیں ''محوِ تماشا تھا لبِ بام ابھی'' میرے اِس طرح گھورنے سے وہ شاید بدک گیا تھا۔ خشک حلق تر کرتے ہوئے وہ اِدھر سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مَیں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بند مُٹھی نکال کر اُس کے کُھلے ہوئے مُنہ والے تھیلے میں ڈال دی۔ ہر شخص کی باڈی لینگوئج مختلف ہوتی ہے خاص طور پہ وہ لوگ' جو جسمانی' اعصابی' ذہنی' علمی یا مالی طور پہ کمزور یا کسی طرح کے احساسِ محرومی کا شکار ہوتے ہیں۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے جلد از جلد اپنا 'پلّا' پاک کرنا چاہتا ہے۔ شاید مَیں اُس کی توقع یا شخصی حیثیت سے کچھ زیادہ تھا۔ میری دیکھت' خامشی اور بند مُٹھی نے اُسے بوکھلا دیا تھا۔ وُہ چہرے مُہرے اور اپنے جسمانی رویّوں سے بھی بھک منگا یا پیشہ ور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس کے بے داغ اور روشن چراغ چہرے

پہ دھیمے سے دَمکتی ہوئی آنکھیں بڑی جاندار تھیں...... اصل رکھت بخت تو اُدھر ہی ہوتی ہے مگر اس کا ادراک تو کسی کو نہیں ہوتا۔

ہم دونوں ہی اِک دُوجے میں پھنسے دھنسے ہوئے تھے۔ آخر میں نے ہی جمود توڑا۔

''بھائی! مجھے پیاس لگی ہے آؤ' اندر بیٹھ کے جُوس یا لسی پیتے ہیں۔''

ہماری پُشت پہ کولڈ ڈرنکس کی بڑی شاندار دوکان تھی۔ بڑے بڑے شیشے کے لسی سے بھرے ہوئے گلاس' اُوپر تیرتی ہوئی بالائی! پیاس نہ بھی ہو' محض اِک نظر اِدھر دیکھ لینے سے ہی'' پیاس بھڑکی ہے سرِشام سے جلتا ہے بدن'' گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ میری دعوت پہ اُس نے پلٹ کر دوکان کے کونٹر پہ لسی کے لبالب گلاس دھرے دیکھے تو مَیں نے بھی دیکھا کہ اُس کی خاموش بولتی ہوئی آنکھوں میں رضامندی کی اک چمک سی لہرائی ہے۔ مَیں زیرِلب مسکرایا' بڑی رسائی سے اُس کے اُدھورے کندھے پہ ہاکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے' دوکان کے اندر لے آیا جو بھکاریوں کے لیے تو ہرگز نہ تھی۔ ہم دونوں آمنے سامنے ایک دوسرے کا دُھندلا سا آئینہ بنے بیٹھے تھے۔ نیم خامشی' نیم رضامندی' نیم ملاقات بڑی پُراَسرار اور ثمربار ہوتی ہے۔ ابھی تک وہ نوجوہ چُپ شاہ بنا بیٹھا مجھے اجنبی اجنبی نظروں سے دیکھا کیے تھا۔ جبکہ مَیں لگاوٹ سے اُسے دیکھ رہا تھا تا کہ اُس کی اجنبیت ختم ہو۔''

لسی دونوں پی رہا تھا جیسے سقراط نے جُرعہ جُرعہ سَم ہلاہل نوشِ جاں کیا تھا۔ یہ بازاری دہی کی لسی' جس میں بالائی بھی شامل ہوتی ہے بڑی گاڑھی اور بھاری ہوتی ہے لیکن مزیدار اور بے پناہ طاقت والی!

''بھائی! آپ کا نام......؟''

مَیں نے سبز کائی لگے' ٹھہرے ہوئے پانی میں پہلی کنکری پھینکی۔

پتلے پپڑی جمے' نیم گلابی ہونٹ' پیچھے سفید دانت' جن کی دَرزوں میں کتھئی رنگ کا اَستر لگا دکھائی دے رہا تھا...... بمشکل ہلے۔

''میرا نام حسنین علی ہے۔''

مَیں نے چونکتے ہوئے مزید پوچھا۔

''مومن' سادات ہو......؟''

میرا اندازہ درست ثابت ہُوا۔ اُس کے منہ ماتھے کی'' چُپا چُپ'' اور اُنکھڑیوں کے کناروں کی ''آبداری'' نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ یہ نوجوان' نجیب الطرفین سیّد ہے۔

''اِدھر کے ہو یا کہیں باہر سے آئے ہو......؟''

''ممبئی سے آیا ہوں...... کولابہ میں رہتا تھا۔ والدین بہن بھائی دیگری تمام رشتہ دار وُہیں پہ ہیں۔

مَیں اِدھر اکیلا بیوی بچوں کے ہمراہ خواجہ غریب نواز کی چوکھٹ پہ پڑا ہوں۔ میرے بازو کیا کٹے مَیں زندگی اور دُنیا ہی سے کٹ کر رہ گیا۔ مجھے معذور اور بیکار جان کر اپنے پرایوں نے مجھے دھتکار دیا ہوا ہے۔ باپ نے میری ماں کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ سوتیلی ماں اور سگے باپ نے مجھے اور میری بیوی بچوں کو گھر سے نکال دیا۔"

"تمہارے بازو کیسے کٹے' کیا کوئی حادثہ ہُوا......؟"

"مَیں الیکٹریشن کا کام کرتا تھا۔ کام کے دوران مجھے بجلی کا شاٹ پڑ گیا۔ میری گردن' بال' بازو اور سینہ جل کر سوختہ ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے میرے بازو کاٹ دیئے' میرے زانو سے کھال نکال کر میری گردن اور سینے پہ لگا دی گئی۔ مَیں کئی مہینے ہسپتال میں رہا۔ گھر والوں نے جواب دے دیا کہ اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے مزید علاج' دواؤں خوراک اور آرام کی ضرورت تھی۔ بیوی نے اپنے زیورات اور جہیز کا سامان بیچ کر میرا علاج کروایا۔ اب اِک اور پریشانی پیدا ہو گئی۔ میری سوتیلی ماں نے میری بیوی کو منحوس قرار دے کر ساتھ رکھنے سے اِنکار کر دیا۔ میرے اِس حادثہ کو بھی وُہ اِس کی نحوست کہتی تھی۔ دراصل وہ میری شادی' اپنی ایک پولیو زدہ بھانجی سے کروانا چاہتی تھی۔ میرے اِنکار پہ میری اور میری بیوی کی دُشمن ہو چکی تھی۔ دراصل میری نسبت' میری مرحومہ ماں نے اپنی زندگی میں ہی اپنی بھتیجی سے طے کر دی تھی۔ یہ لڑکی یتیم! حافظ' نماز روزہ کی پابند اور حجاب کرتی تھی۔ جبکہ میری سوتیلی ماں' بڑی فیشن ایبل خوبصورت ہے۔ اُسے سیر سپاٹے اور فلمیں دیکھنے کا شوق ہے۔"

وہ اپنی رَوانی میں اپنے سینے کا بُوجھ ہلکا کر رہا تھا۔ جانے کب سے وُہ بھرا پڑا تھا میری صُورت میں اُسے کوئی اپنا سا دکھائی دیا تو وہ اُبل پڑا تھا۔

مَیں نے اُسے سانس دِلانے کی خاطر' ایسے ہی درمیان میں ٹوک کر سوال کر دیا۔

"بیٹے! بھیک مانگنا تو بڑی بُری حرکت ہے' خاص طور پہ سیّد کو تو کسی حالت میں جائز نہیں۔"

اُس کے چہرے پہ کئی رنگ آئے اور گئے۔ بڑے بھاری سے لہجہ میں گویا ہُوا۔

"ابّا! مَیں بھیک مانگنے سے بہتر' مر جانا پسند کرتا ہوں...... مَیں نے اِس سے پیشتر جو بھی کھایا اور بیوی بچوں کو کھلایا وہ ہاتھ پاؤں کی محنت سے کمایا...... اب جب ہاتھ پاؤں ہی نہ رہے تو پاؤں ٹانگوں سے کام لیا۔ ایک اللہ کے بندے نے ایک فیکٹری کے دفتر میں کام دِلوا دیا۔ مَیں آٹھ دس گھنٹے روزانہ' فیکٹری اور دفتر کے اندر' کاغذات پہنچاتا رہتا۔ گلے میں ایک بڑا سا بیگ ہوتا...... جس میں مختلف خانے بنے ہوئے تھے۔ ڈالنے والے ڈال دیتے...... نکالنے والے نکال لیتے۔ اِس میں صرف ٹانگوں کی ضرورت تھی...... کئی ماہ تک یہ کام چلتا رہا...... ایک روز' اُوپر دفتر کی سیڑھیوں سے پتھر کی چکنی سیڑھیوں پہ پاؤں رپٹا۔ مَیں لُڑھکنیاں لیتا ہُوا نیچے

آ گرا۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ ہاتھ ہوتے تو ریلنگ کو پکڑ لیتا...... دو ماہ تک پھر ہسپتال میں پڑا رہا۔ بیوی محلے کے بچوں کو قرآن سیپارہ پڑھا کر مجھے اور بچوں کو پالتی رہی۔'' چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔'' آپ کے اور میرے مطابق تو کسی سید کو کسی بھی صورت اپنی بیوی کی کمائی کھانا بھی پسندیدہ نہیں۔''

زوہانسوسا ہو کر مزید بولا۔

''آپا! میں تو اپنے منہ حلق میں لقمہ یا پانی کا گھونٹ بھی نہیں ڈال سکتا۔ واش روم میں اپنا پانجامہ بھی نیچے نہیں کر سکتا۔ سوتے سمے اپنا تکیہ چادر تک بھی ادھر اُدھر نہیں کر سکتا۔ میں طہارت، غسل، وضو، کنگھی اور دانت مانجھنے کے لیے اپنی بیوی کا محتاج تھا۔ خاوند بیوی کا اور بیوی خاوند کا لباس ہوتے ہیں...... زندگی کی گاڑی کے دو پہیے، شریکِ حیات، نیک میاں بیوی دُنیا کے بعد جنت میں بھی ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے۔ جیسی باتیں سُنی تو بہت سی تھیں پر ان کے حقیقی اور عملی مظاہرے دیکھنے میں تب سمجھ آئے جب اس حادثے اور بعد کے اثرات سے ہو گزرے۔

ہم پہ ایک وقت یوں بھی آیا...... بیوی کسی نسوانی مرض میں مبتلا ہو کر بستر پہ پڑ گئی۔ وہ کوئی حرکت کرنے سے بھی لاچار تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے، ہمارے معصوم چھوٹے بچے دودھ پانی کے لیے بلک رہے تھے۔ ہم انہیں جھوٹ موٹ دلاسہ دینے کے قابل بھی نہ تھے۔ اسی چتا میں ہماری گود والی بچی دم توڑ گئی۔ جسے خیراتی رفاعی ادارہ والوں نے دفنا دیا۔ تب میں نے اپنی بیگم سے کہا، اگر تم چاہو تو میں تمہیں طلاق دے دیتا ہوں...... میں خود تو اپنے آنسو بھی پونچھنے کے قابل نہیں، تمہیں کیسے سہارا دوں گا؟ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اپنی بقایا زندگی اکیلا ہی خواجہ غریب نواز کی چوکھٹ پہ پڑا رہوں گا جدھر لنگر بھی ملے گا اور بیٹھنے لیٹنے کے لیے جگہ بھی...... میری یہ بات سُن کر وہ نہ روئی نہ تلملائی...... کمال تحمل سے کہنے لگی۔ میں نے تم کو اپنا جیون ساتھی مانا ہوا ہے...... سو بندوں میں بیٹھ کر نکاح ہوا ہے۔ دو بچے اللہ نے دیئے...... بہت اچھے دن بسر کیے...... اب اگر آزمائش آ پڑی ہے تو ہم ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیں۔ کیا اندھے نابینے، لُولے لنگڑے اپاہج یا بیمار لوگ ازدواجی بندھنوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے اپنے کرم سے مجھے قرآن کی تلاوت وحلاوت عطا کی۔ اللہ کی کتاب میں کہیں نہیں لکھا کہ مصیبت، پریشانی، بیماری، خستہ حالی میں ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دو۔ مایوسی اور پریشانی میں تم نے ایسا کہہ تو دیا ہے...... آئندہ بھی ایسی نادانی کی بات نہ کرنا...... آپا! اپنی بیوی کی ایسی ہمت اور اللہ پہ تقویٰ دیکھ کر میں نے مایوسی سے توبہ کی اور خدا جس حال میں رکھے...... شکر ادا کرنا اور جینا سیکھ لیا۔''

میں گُنگ مُنگ سا، دونوں بازوؤں سے محروم بیس بائیس سالہ دُبلے پتلے اس نوجوان کی دُکھ بھری

باتیں سُن رہا تھا۔ محسوس ہُوا کہ مَیں اندر باہر سے بُری طرح بھیگ چکا ہوں کہ اَب خُود میں کوئی مزید سوال و جواب کرنے کی سکت نہیں پا رہا...... کچھ اپنے پرائے دُکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سُنو سُناؤ تو ظاہر و باطن اَتھل پتھل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ زبان گنگ' حواس ساکت اور صبر و برداشت کے سارے کے سارے فلسفے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ شاید احساسات کا یہی وہ نمایاں فرق ہے جو انسانوں اور فرشتوں کے مابین واقع ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

ایک طرح سے مَیں بھی اندر باہر سے جامد ہو کر رہ گیا تھا...... سوچنے لگا کہ اللہ خالق و مالک اور انسان کی بنائی ہوئی مشینری میں پھر کیا فرق رہ گیا کہ جب تک کوئی انسان' کارآمد ہے وہ باپ بھائی بیٹا اور دوست ہے اور جب کسی نٹ بولٹ' پن پُرزے کی طرح پُرانا پڑ گیا یا کسی وجہ سے ناکارہ ہو گیا تو وہ وقت حالات کے کباڑیے کے ہاں پھینک دیا جاتا ہے۔ سوچتا ہے کہ بوڑھے' بیمار' حادثے کے شکار یا پیدائشی طور پہ کسی عارضے' جنسی' ذہنی یا جسمانی اَبتلا میں مبتلا افراد کو ایسی بے رحمی سے نظرانداز کیا جا سکتا ہے؟ کیا ہم کسی بھی مقام پہ کسی ذی انسان سے ایسا سلوک روا رکھ سکتے ہیں جیسا ہم پُرانے جُوتوں' استعمال شدہ پُرانے کپڑوں کتابوں تصویروں سے کرتے ہیں۔ درست ہے کہ انسان نسیان تلوّن سے تعبیر ہے۔ اس کے خمیر میں احسان فراموشی' خودغرضی' خود پسندی اور خودلذتی کے خرابے بقدرِ طینت شامل ہیں۔ اس کے باوجود حیوانی جبلت کے مقابل' انسانی خصلت بھی تو بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ اُسے گھاس ڈالتے ہیں یا خود ہی چر لیتے ہیں۔

یونہی بات بڑھانے کی خاطر مَیں نے بن سوچے سمجھے پُوچھ لیا۔

''بُرا نہ مانو تمھیں بھیک دیتے ہوئے بہت دُکھ ہُوا...... سیّد ہو اور چہرے پہ شرافت و نجابت بھی کھنڈی ہوئی ہے...... میرے خیال میں تم ہاتھ بازوؤں کے بغیر بھی حلال کی روزی کما سکتے ہو؟''

پہلی بار مَیں نے اُس کے معصوم چہرے پہ خفیف سی مسکراہٹ کی لہر اُبھرتے ہوئے دیکھی۔

''ابّا! مَیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مَیں غیراللہ سے رزق مانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرے مالک و رازق نے میرے وہ ہاتھ ہی علیحدہ کر دیے جن سے بھیک لینے کا کبھی کوئی امکان ہو سکتا ہو''

مَیں نے اُسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''تم نے بھیک کے لیے میرا کندھا ہلایا۔ مَیں نے خُود تمہارے تھیلے میں بھیک ڈالی۔ تم اُدھر بھکاریوں کے درمیان موجود تھے' یہ لنگر بازار' دھان منڈی تو اِدھر کے بھک منگوں کی ''اوپن کمرشل مارکیٹ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ ٹاپ کلاس ہوٹل' شاپنگ سنٹر' سرکار خواجہ غریب نواز کی پہلی بڑی چوکھٹ بھی اسی طرف نکلتی ہے۔

اجمیر شہر کی سب سے کشادہ خوبصورت اور کاروباری لحاظ سے آسودہ بھی یہی جگہ ہے۔"

"ابا! میں نے آپ کو بھیک کے لیے متوجہ نہیں کیا تھا۔ آپ نے میرے کٹے ہوئے بازو اور گلے کے تھیلے سے شاید یہی اندازہ لگا لیا کہ میں بھکاری ہوں۔ آپ نے مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہیں دیا، میرے تھیلے میں کچھ ڈال دیا...... مجھے پیچھے والی جوس لسی والی دوکان میں کچھ ٹھنڈا پینے کی دعوت دی۔ اب بتایئے! میرا بھکاری ہونا کہاں ثابت ہوتا ہے؟"

اُس کی بات صحیح تھی۔ میں خجل سا کوئی جواب تلاش کر رہا تھا جو اچانک مجھے سوجھ گیا اور میں پوچھ بیٹھا۔

"جب میں نے تمہارے تھیلے میں کچھ روپے ڈالے تو تم نے مجھے یہ کچھ کیوں نہ بتایا جو کہ اب بتا رہے ہو......؟"

"وہی پہلی والی بات کہ ایسا موقع ہی نہ ملا...... اس میں میرے یا آپ کے کسی ارادے کا دخل نہ تھا اتفاقاً ہی ایسا ہُوا۔ دوسری بات کہ آپ نے میرے تھیلے میں چھوٹے بڑے نوٹ کی صورت میں کوئی روپے پیسے نہیں، محض ایک تہہ ہُوا کاغذ ڈالا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کاغذ کو آپ نے کوئی کرنسی نوٹ سمجھ لیا ہو؟ مُٹھی بند تھی، نہ آپ نے دیکھی اور نہ میں نے...... ابا! بند مُٹھی ہو یا مُقدر، دماغ ہو یا رزق! کون جان سکتا ہے کہ اس بندش کے بھیتر کون سی بھاونا چھپی ہوئی ہے......؟"

میں دیدے پھاڑے اُس کی بھید بھری باتوں پہ غور کر رہا تھا۔ یہیں یہ بھی سمجھ میں آیا کہ دانش، دھیان، دھیرج، درجات کے حصول کے لیے عمر تپسیا، تجزیہ مشاہدہ اور کوئی مکتب و معلم بھی ضروری نہیں...... جیسے گُل لالہ گلستانوں میں نہیں پنپتا...... قدرت یہ تمام کچھ منچھ کی گل میں ہی گوندھ دیتی ہے۔ یہی اصل فصل ہوتی اور جو پکنے کے بعد رہتی ہے۔ اُس کی بھکاری نہ ہونے والی بات ہی ہضم نہ ہورہی تھی اُوپر سے میری بند مُٹھی میں بقول اُس کے، محض تہہ کیا ہُوا کاغذ تھا۔ کوئی چھوٹا بڑا کرنسی نوٹ نہ تھا۔ مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "بند مُٹھی، جس میں کوئی کرنسی نوٹ تھا اُس کے تھیلے میں ڈالی تھی۔ مجھے بھی پتا نہ تھا وہ نوٹ، بڑا تھا یا چھوٹا؟"...... اُس نے کیسے کہہ دیا کہ وہ نوٹ نہیں، محض کاغذ کا ٹکڑا ہے...... جبکہ وہ کچھ تھیلے سے نکالنے یا ڈالنے پہ قادر نہ تھا اور نہ ہی وہ بند مُٹھی کے اندر جھانکنے کی قدرت رکھتا تھا۔

وہ شاید میری مشکل سمجھ گیا تھا...... بڑی آنچ سے بولا۔

"ابا! ٹینشن مت لو کبھی کبھی کوئی سیدھی سی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ تھیلے میں ہاتھ ڈال کر نکال لو جو تم نے ڈالا تھا۔ اس تھیلے میں میرا صرف راشن کارڈ ہے اور وہ، جو تم نے ڈالا تھا۔"

کچھ سوچتے ہوئے میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

زندگی میں بہت آگے جا کر جانا کہ آنکھوں کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا

ہے۔ ایسے پیدائشی طور پہ نابینا افراد کی مثال دی جا سکتی ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دُنیا کی کوئی چیز نہیں دیکھی مگر وہ آنکھوں والوں سے زیادہ مطمئن ہیں۔ ایسے ہی تو نہیں ایک اللہ والے نے کہہ دیا تھا ۔

نوں نوں وے وچ لکھ لکھ چشماں' اک کھولاں اِک کجاں خو

مولانا ماہر القادری کی غزل کا شعر ۔

ہر ذرہ دل بن جاتا ہے ہر چیز نظر ہو جاتی ہے
جس سمت وہ نظریں اُٹھتی ہیں کونین اُدھر ہو جاتی ہے

معلوم ہُوا کہ اگر دیکھنا آتا ہو تو ان چندھی چندھی آنکھوں کی محتاجی نہیں رہتی۔ جو منظر کو دو تین بار اُلٹا سیدھا' ٹیڑھا میڑھا اور غیر متوازن دکھاتی ہیں۔ ایسی ہی نام نہاد آنکھوں کی بابت کہا گیا کہ بسا اوقات آنکھوں دیکھی بھی معتبر نہیں ہوتی۔

بادلِ نخواستہ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر تھیلے میں ڈال دیا۔ مراثی کے پڑولے میں دانے' چیل کے گھونسلے میں ماس' ملاّح کے خفتے میں پانی' چور کے دیے میں تیل اور کنجوس کی چٹکی کی بھتھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح بے دست و پا کے تھیلے سے مَیں بلی کہاں سے نکال لاتا؟ میری اُنگلیوں کی پوروں کی آنکھوں کے نیچے پلاسٹک سے منڈھا ہُوا شناختی کارڈ اور ساتھ لگا ہُوا' دُہرا سا کاغذ کا ٹکڑا! نوٹ تھا یا کاغذ یہ دیکھنے کے لیے مَیں نے اسے باہر نکال لیا۔ یہ تو واقعی معمولی کاغذ تھا جو سستے قسم کے بازاری اشتہارات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دماغ پہ زور دیا یہ میری بغلی جیب' جس میں اُوپر کے معمولی روزمرہ کے اخراجات کے لیے کچھ رقم ڈالے رکھتا تھا۔ یہ کاغذ کیسے پہنچ پایا۔ اچانک جیسے بجلی کا کوئی کوندا لپکا...... یاد آیا' جب کھچڑے والے باوا کے پاس سے اُٹھا تو اُس نے عشاء کی نماز کے بعد پچھلی جانب' لنگر والی حویلی میں پہنچنے کا کہا تھا اور ساتھ ہی اپنے چوغے کے خانے سے یہ کاغذ بھی نکال کر مجھے تھمایا تھا۔ جسے مَیں نے لاپروائی سے اپنی جیب میں اڑوس لیا تھا۔ مجھے کیا علم یہ اُس کے کھچڑے کی مشہوری' اشتہار تھا جو اخباری کاغذ پہ پچاس روپلی میں دو ہزار چھپتے ہیں۔

کھول کر پڑھا "اڑھائی دن کے جھونپڑے کا کرشاتی کھچڑا" جو کھائے وہ پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ زیادہ پچھتائے...... چولہے پہ دیگچے کی تصویر اور باوا کا فوٹو بھی تھا۔ خاکستری گھٹیا سے کھابیلے کاغذ پہ گھاس کی دبے دبے تنکے بھی دکھائی دے رہے...... گھٹیا سیاہی سے سنگل پرنٹنگ...... باوا کا فوٹو کسی زندہ انسان کا کم اور چھ ماہ بعد' قبر کشائی والے مُردے کا زیادہ دکھائی دے رہا تھا یا کسی ایسے بے وقوف جن کا' جو اک لمبی قید تنہائی' انسانوں کی جیل میں کاٹ کر واپس کوہ قاف میں پہنچا ہو۔ مَیں خجل خجل سا' اس کاغذ کو دیکھ رہا تھا جس نے مجھے ممبئی کے اس بازو کٹے لونڈے کے سامنے دو کوڑی کا کر دیا۔ اب ایک اور سوال' سنپولیا بن کر میرے ذہن میں کلبلانے لگا کہ اِس کے تو ہاتھ ہی نہیں' جنہیں استعمال کر کے وہ دیکھتا کہ مَیں نے نوٹ ڈالا یا خالی کاغذ......

جبکہ میری مٹھی بھی بند تھی' جو مَیں نے تھیلے کے اندر گہرائی میں کھولی تھی۔ مجھے تو لونڈا بھی کوئی پُراسرار سی ہستی دکھائی دینے لگا تھا۔ تعجب تو اس لیے نہ ہُوا کہ اِس سے پہلے' اجمیر کی درگاہ شریف' تاراگڑھ' ڈھائی روز کا جھونپڑا میں کون ایسا نہ ملا جو پُراسرار نہ تھا۔

یہ سوچ آتے ہی مَیں قدرے محتاط ہو گیا۔ اب مَیں کسی اور نہج پہ سوچنے لگا تھا۔ مَیں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا' بیٹا! مغرب کی اذان کا وقت ہو رہا ہے۔ وضو وغیرہ کرنا ہے' چلتا ہوں پھر ملیں گے۔''

وہ جھٹ بولا۔ ''مَیں نے بھی اُدھر مسجد میں جانا ہے۔ اکٹھے چلتے ہیں۔''

وہ مجھ سے کوئی جواب سُنے بغیر ہی' میرے ساتھ ہو لیا۔

درگاہ کے بڑے دروازہ پہ پہنچے تو اُس سے اجازت چاہتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! مَیں چند منٹوں کے لیے اپنے ہوٹل جاؤں گا۔ انشاء اللہ! نماز کے بعد مسجد میں ملاقات ہو گی۔''

مَیں زبردستی اُس سے جان چھڑا کر بغلی گلی میں گھس گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر خود کو بستر پہ ڈال دیا۔ مجھے دماغ کو کچھ دیر سکون دینے کی ضرورت تھی۔ جب آنکھ کھلی تو مغرب دُور اور عشاء قریب آ چکی تھی۔ طبیعت ہلکی اور دماغ پُرسکون تھا۔ دھیرے دھیرے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے کے تمام سین سامنے آنے لگے۔ یہ بھی روشن ہو گیا کہ مَیں نے عشاء کی نماز کے بعد' اُدھر لنگر حویلی پہنچنا ہے۔ جدھر بظاہر میری کچھڑا دعوت تھی۔ اس کے علاوہ کیا تھا' سرِدست مَیں نہیں جانتا تھا۔

اچھا ہے یا غلط' اگر مجھے نماز کے لیے مسجد جانے کی توفیق مل جائے تو کوشش ہوتی ہے کہ مَیں اِدھر اُس وقت پہنچوں جب نماز شروع ہو چکی ہو اور مجھے آخری صف یا ایسی جگہ ملے' جدھر مَیں دوسروں کی نظر میں نہ آؤں اور نمازی ابھی دُعا مانگ رہے ہوں اور مَیں اُدھر سے رفو چکر ہو لوں۔ مجھے مسجد میں جاتے اور نمازیوں کا سامنا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ چند اور وجوہات بھی ہیں جو دراصل میری کمزوریاں اور کچھ نفسیاتی تحفظات بھی! ایک بڑی وجہ میرا حال حلیہ ہے۔ دراز گیسو' فراخ ریش' سیاہ لباس' موٹی موٹی انگوٹھیاں اور وہ بھی ہر اُنگلی اور انگوٹھے میں...... بڑا سا عصا! باقی رہی سہی کسر میرے لمبے لمبے ابرو...... جو بھی دیکھے ڈر جائے۔ کئی بار ایسا ہُوا مَیں صف میں بیٹھا۔ اردگرد کے نمازیوں نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ کسی کی نظر میں محبت' کوئی تجسس لیے ہوئے۔ کسی کے دیکھنے میں نفرت و وحشت...... ایسا بھی ہُوا کہ پاس سے اُٹھ کر کہیں بیٹھ گیا۔ بچے بالے تو مجھے دیکھتے ہی اُٹھ جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہُوا کہ مجھے دیکھ کر لاحول ولا قوۃ پڑھنی شروع کر دی اور بھی بہت سی وجوہات جو کہنے لکھنے کے قابل نہیں۔ ان سب ''شرانگیزیوں'' سے نمازیوں کو بچانے کی خاطر مَیں مسجد میں کبھی کبھی ہی جاتا ہوں کہ مَیں نے کہیں پڑھا ہے کہ شر سے خود اور دوسروں کو بھی بچاؤ۔''

سب سے پیچھے والی صف اور دیوار کی بغل میں مجھے کنی بھر کنج نظر آئی۔ مَیں اُدھر ہی لپک لیا۔ امام صاحب ابھی سورۃ الفاتحہ کے اختتام تک ہی تھے کہ مَیں نے نیت باندھ لی۔ میرے جیسے اکثر دُنیادار بندوں کی نمازیں' محض نمائشی دکھاوے کی اُٹھک بیٹھک ہوتی ہیں۔ بے سُرور و بے حضور...... شاید ہی سیکڑوں ہزاروں میں کوئی ایک آدھ ایسی پیشانی ہوگی جسے "جبیں سائی" کا قرینہ نصیب ہو یا حضوری کے لمحات میسر آئے ہوں۔ فرض ادا کر لینے کے بعد میری کوشش ہوتی ہے مَیں جلد سے جلد اِدھر سے اُٹھ لوں کہ اردگرد کے نمازی مجھے "خراب" کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اَب جو مَیں بمشکل عصا کے سہارے اُٹھتا ہوں' مُڑ کر کوئی نکلنے کی راہ دیکھتا ہوں تو دیکھا کہ وہ ذاتِ شریف' عین میرے پیچھے کھڑے ہیں۔ اُس نے مجھے سلام کیا تھا۔ اُدھر سے نکلا تو وہ بھی سایہ بنا میرے پیچھے پیچھے تھا۔ بمشکل راہ بناتا ہُوا مسجد سے باہر خواجہ غریب نوازؒ کے مرقد کی قبلہ رُخ دیوار کے پاس ایک خالی جگہ پہ بیٹھ گیا۔ یہاں بھی وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

یونہی بات چلانے کی خاطر مَیں نے پوچھ لیا۔

"بیٹا! گھر بھی گئے تھے یا اِدھر ہی کہیں......؟"

"اَبا! اپنے جھونپڑے تو مَیں رات عشاء کی نماز کے بعد ہی جاتا ہوں کہ اُدھر بھی ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔ آٹھ گھنٹے اِدھر' جوس لسی کی دکان والی نوکری اور کچھ اُدھر......!"

مجھے پھر ایک حیرت کا دورہ پڑا' پوچھ لیا۔

"تم اُدھر لسی جوس کی دکان پہ نوکری کرتے ہو......؟"

"جی اَبا! مَیں اُدھر دکان کے باہر ٹھنڈی میٹھی...... مزیدار لسی اور تازہ جوس کے آوازے لگاتا ہوں۔ اس کام میں ہاتھوں بازوؤں کی ضرورت نہیں۔ اس طرح مالک نے مجھے بھیک مانگنے سے بچا لیا ہُوا ہے۔"

مَیں اپنے دل میں شرمندہ سا' اُس کے چہرے پہ عزم اور عزتِ نفس کے کھلے ہوئے نُور کے مشاہدے میں گم تھا۔ وہ مزید بتانے لگا۔

"اس دکان کا مالک ایک بڑا بھلا ہندو سیٹھ ہے۔ خواجہ غریب نوازؒ کا ماننے والا۔ اُس نے دکان کے تیسرے مالے پہ' اپنے ملازموں کو رہنے کی جگہ بھی دے رکھی ہے۔ میرے ساتھ چونکہ بیوی بچے ہیں' اس خاطر اِدھر نہیں رہتا۔ "اڑھائی دن کے جھونپڑے" کے بازو والی گلی میں لنگر حویلی کی چھت پہ ایک جھونپڑی میں رہتا ہوں۔ بیوی محلّے علاقے کے بچوں کو سیپارہ قرآن پڑھاتی ہے۔ حویلی والے حاجی صاحب کچھڑے والوں نے مہربانی کر کے اُوپر چھت پہ ہمیں رہنے کے لیے جگہ دے رکھی ہے۔ مگر اَبا! چھت والا یہ حصہ اڑھائی دن کے جھونپڑے کی جانب ہے۔ پاؤں پُشت اُدھر نہیں کر سکتے' کہیں ہماری پکڑ نہ ہو جائے۔ رات اُدھر دیکھتے نہیں اور یہ بھی احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ اُدھر کچھ گر نہ پائے۔ اب تو عادت ہو گئی ہے پہلے پہل تو کانوں میں

رُوئی رومال ٹھونس کر سوتے تھے کہ عجیب عجیب سی ڈراؤنی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ چاندنی راتوں میں اُدھر عجیب وغریب تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اب یہ تمام کچھ کم ہی محسوس ہوتا ہے' عادت سی پڑ گئی ہے۔

بھارت کے باشندوں میں ایک خوبی ہے یا خرابی کہ وہ بولتے بہت ہیں۔ کچھ بتانے یا سُنانے لگیں تو کہیں دَم ہی نہیں لیتے۔ خاص طور دہلی' ممبئی' آگرہ' حیدرآباد' لکھنؤ والے! اس مہاراشٹریے کی زبان آگے اگر مَیں پتھر نہ رکھتا تو یہ کب رُکنے والا تھا۔ مَیں اس کی انوکھی' اسرار بھری باتوں کی خشک دلدل میں پھنسنے تک دھنس چکا تھا۔ اب اگر کوشش کر کے خود کو نہ بچاتا تو بچنا ممکن نہ رہتا۔ مَیں نے زبردستی کی کلٹی مارتے ہوئے بات چھوڑی۔

''تم بڑے خوش قسمت ہو۔ غریب نواز کے قدموں اور اڑھائی دن کے جھونپڑے کے ساتھ رہتے ہو۔ تم رزق حلال کماتے ہو۔ تمہاری بیوی' بچوں کو دینی تعلیم دیتی ہے اور پھر تم دونوں اڑھائی دن کے جھونپڑے کے پچھواڑے لنگر کے اہتمام میں معاونت کرتے ہو۔ اس کا صاف صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ تمہارے بازو سلامت ہوتے اور گھر والے غیروں والا سلوک نہ کرتے تو تم اِدھر نہ پہنچتے۔ نہ یہ سب کچھ ملتا جو اِدھر کے رہنے والوں کو بھی نصیب نہیں......'' موضوع کا کانٹا بدلنے کی کوشش میں پُوچھا......!

''کبھی گھر والے' رشتہ دار' دوست یار بھی یاد آتے ہیں یا کہیں اِدھر دیکھنے ملنے کا اتفاق ہُوا؟''

''اَبا! اِدھر خواجہ سرکار کی چوکھٹ پہ پڑ کر' یہ سمجھ میں آیا کہ زندگی اور بندگی کا اصل مقصد کیا ہے۔''

مَیں نے تُرت پوچھا۔

''اچھا! مجھے بھی بتاؤ' مَیں بھی یہی کچھ سمجھنے جاننے کی خاطر' دَر دَر کی خاک چاٹ رہا ہوں کہ زندگی اور بندگی کیا ہیں؟''

عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اَبا! آپ بزرگ ہیں بڑے گُن گیان والے ہیں۔ مَیں آپ کو کیا بتاؤں یا سکھاؤں گا۔ ابھی تک تو مَیں تھوڑا بہت یہی گُن سُن لے سکا ہوں کہ اِدھر اجمیر دھرتی پہ تین طرح کے اَجل مخلوق پائی جاتی ہے۔ اِنس و جان اور جانس!''

اُس نے جو کہنا تھا کہہ دیا مگر مَیں سُن کر کہیں گُم ہو گیا تھا۔ الٰہی! یہ ممبئی کا الیکٹریشن چھوکرا کس دبستانِ علوم و معرفت کی کوڑی لا رہا ہے۔ جب سے اس کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے یہ میرے پہلے والے گمان و قیاس اور اندازہ و رائے کا مسلسل بُطلان کرتا چلا آ رہا ہے۔ پچھلی تمام ہونی اَنہونی باتوں کے قطع نظر اگر اِس کی موجودہ ''اِنس و جان اور جانس'' والی ہی بات کو سامنے رکھا جائے تو اچھے بھلے بندے کی بُدھی بند ہو جاتی ہے۔ اِنس و جان تو سُنا ہُوا تھا۔ یہ جانس والا لفظ مستعمل نہیں۔ چہ جائیکہ اِسے مہاراشٹر کا ایک عام سا لڑکا

استعمال کرے۔ اُدھر لوگوں کی روزمرہ کی بات چیت' بمبیا انداز کی ہوتی ہے۔ عام بازاری گفتگو الفاظ' زبان وبیان میں جوہو'چوپاٹی کے ساحلوں کی ریت کی بھرانڈ ناریل کے چھلکے کی کھرانڈ' آب وہوا کی نمکیلی نمکیلی چپ چپ شامل ہوتی ہے۔ مگر اس نے مخصوص لفظ ولغت استعمال کی' اس کا مطلب تھا کہ اس بچے کے ہاں حرف ولفظ' معنی ومفاہیم' حاجی علی اور ماہیم شریف کے مکتبِ فکر سے نمو حاصل کیے ہوئے ہیں۔

اس سے پیشتر کہ مَیں یہ پوچھتا تم ماہیم شریف اور حاجی علی جاتے رہتے ہو؟ مَیں نے اپنے تجسس کی تکمیل کی خاطر وہی اِنس وجان اور جانس کے متعلق سوال کر دیا۔

''برخوردار! یہ انسان اور جنات تک تو بات سمجھ آتی ہے یہ آگے جانس کی بات' ذرا سمجھاؤ' یہ کون سی مخلوق ہوتی ہے؟''

ٹھوڑی سینے پہ ٹکاتے ہوئے اٹک اٹک کر کہنے لگا۔

''ابّا! میری ایک بار خواجہ حسن نظامی کے عُرس کے موقع پہ اتفاقاً ایک بزرگ سے ملاقات ہوگئی جو لنگر بانٹ رہے تھے۔ پتّوں کے دونوں (رکابیوں) میں کھچڑا اور ساتھ خمیری کشمیری میٹھی روٹیاں' جو خوشبو اور خستگی میں بسکٹوں کی طرح کی تھیں۔ خوب کڑک اور لذت دار' سونف کے بیج اور ناریل کے ٹکڑے نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ جو بھی اس لنگر کو دیکھتا' کوشش کر کے حاصل کرتا بلکہ دوبارہ بھی لینے کی کوشش کرتا ہے۔ مَیں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ بھوک نہ ہونے کے باوجود آگے بڑھ کر لنگر حاصل کر لیا۔ اب مَیں بھیڑ سے نکل کر کہیں بیٹھ کر کھانا چاہتا تھا۔ عُرس مبارک کے دن' کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ کھڑا ہونے کے لیے جگہ نہ تھی۔ بیٹھنے کو کہاں سے ملتی؟ اسی تلاش میں مَیں ذرا دُور نکل آیا۔ ایک شکستہ سی کچّی قبر کے پہلو میں مٹی کی ایک ڈھیری دکھائی دی۔ مَیں اُسی پہ بیٹھ لیا۔

یہ زمانہ میرے اِن بازوؤں کے کٹنے سے ایک عشرہ پہلے کا ہے۔ قبر کے کنارے اپنا سفری بیگ دھرا' وہیں پہ کھچڑے والا دونا اور کڑک روٹیاں بھی رکھیں۔ بسم اللہ پڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک پانی کا خیال آیا۔ دیکھا تو سامنے چوتھی قبر کے پاس ایک دستی پمپ لگا ہوا۔ اپنے بیگ سے پانی کی خالی بوتل نکالی۔ پمپ سے بھری اور چند قدم واپس پلٹا تو ایک ننگی تلوار سی حیرت' مجھے ششدر کرنے کی منتظر تھی۔ میرا سفری بیگ تو وہیں دھرا تھا جبکہ لنگر غائب تھا۔ دو چار منٹ میں یہ تمام واقعہ پیش آیا۔ قبر کے آس پاس کوئی چار پایہ' دو پایہ اور نہ کوئی پنکھ پکھیرو...... خدایا! کھچڑے کا دونا' خستہ روٹیاں کدھر گئیں' کون لے گیا...... صاحبِ مزار اُچک کر قبر میں لے گئے یا کوئی نادیدہ ہستی اُٹھا کر لے گئی؟...... کچھ سمجھ بوجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اسی کشمکش میں مٹی کی ڈھیری پہ بیٹھ گیا' پانی کی بوتل سے چند گھونٹ خشک حلق میں اُنڈیلے اور نصف سے زیادہ پانی بھری بوتل مزار کی پختہ منڈیر پہ رکھ دی' کچھ دیر کی مغزکھپائی کے بعد بھی جب کچھ پلے نہ پڑا تو اُٹھ کھڑا ہوا کہ پھر سے لنگر لیتے ہیں اور

کسی اور جگہ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ بیگ اُٹھا کر جب پانی کی بوتل اُٹھانا چاہی تو وہاں بوتل کی بجائے کچھ پانی کے قطرے اور بوتل کے پیندے کا گیلا سا نشان! مَیں پاؤں سر پہ رکھے اُدھر سے سرپٹ بھاگا...... جیسے بھوت میرے پیچھے لگے ہوں۔ ہانپتا کانپتا' لنگر والی جگہ پہنچا...... لائین لگی تھی' باری آئی تو وہی منحنی سے بزرگ لنگر بانٹ رہے تھے۔

لنگر تقسیم کرنے والا شکل' کاسہ' جھولی یا گلے کی طلب نہیں' صرف اپنی تقسیم پہ نظر رکھتا ہے کہ جو کام اُس کے سپرد کیا گیا ہے وہ صحیح سے کر رہا یا کہ نہیں۔ کئی ضرورتمند یا لالچی لوگ' بار بار اپنا دستِ طلب دراز کرتے ہیں۔ دینے والے دیکھتے پوچھتے نہیں' دے دیتے ہیں۔ شجر کا کام ثمر بار اور مہربار ہوتا ہے' خشم بار ہونا نہیں۔ مجھے خدشہ تھا کہیں وہ مجھے شکل وصورت سے پہچان نہ لیں۔ لیکن اُنہوں نے مجھے نہ صرف پہچان لیا بلکہ دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے بھی...... دو نفروں کا لنگر دیتے ہوئے کہنے لگے۔

''کچھ کھانے پینے لگیں تو پاس پڑوس کو بھی شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کو صلح مارنا کہتے ہیں۔ یہ ہماری تہذیبی اور اسلامی روایات میں شامل ہے۔ یہ دو حصے ہیں' ایک تمہارے لیے اور دوسرا جانس بابا داؤ دی کے لیے......!''

''یہ کون ہیں......؟'' مَیں نے پوچھ لیا۔

''یہ وہی ہوں گے' جنہوں نے تمہارا پہلے والا لنگر اُچکا ہے۔''

''مگر......!''

''اگر مگر مت کرو' جاؤ! مَیں اس وقت زیادہ بات نہیں کر سکتا۔''

مَیں ہکا بکا' دونوں ہاتھوں میں لنگر اُٹھائے واپس' پہلے والی جگہ پہ پہنچا...... دونوں لنگر' قبر کے چبوترے پہ رکھ کر' پھر ہاتھ دھونے کی خاطر پانی کے پمپ تک آیا' ہاتھ دھوئے' منہ پہ چھینٹا لگایا کہ کچھ ہوش وحواس بحال ہوں کہ صبح سے ابھی دوپہر تک سرابوں اور حبابوں کے بھوت تماشے دیکھ رہا تھا۔ گھونٹ دو گھونٹ پانی پیا کہ پیٹ بھر لنگر کھاؤں گا۔ واپس پلٹ کر قبر کے چبوترے پہ دیکھا تو ایک لنگر غائب جبکہ دوسرا موجود! اچنبھا اور اَنوکھ' شاید میرے ہاں ختم ہو چکے تھے یا ایسی بوالعجبیاں' ایسے تواتر سے ظہور پذیر ہو رہی تھیں کہ ان میں تحیر کا عنصر بے اثر ہو کر رہ گیا تھا۔

بھوک کے آگے' تمام اُصول طریقے' قرینے سلیقے' حرام حلال اور ڈر خوف وغیرہ بے وجود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک ہی بات یاد رہتی ہے کہ اس پیٹ والے جہنم کی آگ کیونکر ٹھنڈی کی جائے؟ آؤ نہ تاؤ دیکھا' دونوں ہاتھوں سے کھانے میں جٹ گیا۔ بھوک تھی یا لنگر کی لذت وبرکت کہ کھانے کا مزہ آ گیا۔ کھچڑے والا دونا' اُنگلی سے چاٹ رہا تھا کہ ایک خستہ حال سا بوڑھا' بازو کھجلاتا ہوا' پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھکاری بھی دکھائی

نہ دیتا تھا۔ نہ ہی اُس نے کچھ مانگا۔ بس ٹُک ٹُک دیکھے جا رہا۔ سمجھ نہ آیا کھِسکا ہُوا یا کوئی نشئی! اُس سے جان چھڑانے کی خاطر میں' بچھڑے والا دونا پرے پھینک کر پانی کے پمپ کی جانب چلا گیا کہ ہاتھ مُنہ صاف کرلوں۔ واپس دیکھا تو وہ وہیں بے نیاز سا کھڑا میرا پھینکا ہوا دونا بڑے مزے لے لے کر کھا رہا ہے جیسے دونا' کوزہ مصری کا بنا ہُوا ہو۔ نیم سُوکھے بڑے پتوں سے بنے ہوئے دونے' دراصل چھوت چھات' عُسرت معاشی بدحالی' دھونے' دوبارہ صاف کرنے کے جھنجھٹ سے بچنے کی خاطر' وجود میں آئے۔ بڑ کے بڑے بڑے پتّے' مالوے اور کھتل...... اور بھی ایسے پتّے جو ہلکی سی نمی اور ساخت برقرار رکھنے کی خُوبی رکھتے ہوں دونے بنانے کے کام آتے ہیں۔ خاص طور پہ ہوٹلوں دکانوں' جدھر گرما گرم ناشتہ حلوہ پوری پروسی جاتی ہے اور اُدھر بیٹھ کر کھانے کا اِنتظام بھی ہوتا ہے۔ پکّے برتنوں کی بجائے اِنہی پتّوں کے دونوں اور مٹّی کے کلہڑوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ ذات پات' صفائی ستھرائی اور خرچ خرچا کی بھی بچت رہتی۔ کھایا پیا اور پھینک دیا۔ آسام بنگال اور دیگر بہت سے دین دھرمی تیرتھوں اور علاقوں میں بھوجن پروسنے کے لیے یہی کیلے اور مختلف سبزیوں پھلوں کے خشک وتر پتّے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ حفظانِ صحت' وقت اور اخراجاتی معاملات میں کافی آسودگی رہتی ہے۔ ایک قدم اگر آگے بڑھیں تو یہ بھی کہ اِنہیں کھایا بھی جا سکتا ہے۔ چاولوں کی دو چار ڈشوں سے مَیں بھی واقف ہوں کہ ناریل کے دودھ میں چاول پکائے جاتے ہیں اور کیلے کے پتّوں میں پروسے جاتے ہیں بلکہ پتّوں سمیت کھائے بھی جاتے ہیں۔ مَیں نے کچے بانس کے اندر پکائے ہوئے چاول بھی کھائے' جو بانس سمیت کھائے جاتے ہیں۔ کچا بانس' آگ کی آنچ پہ سبزی کی مانند پک جاتا ہے بالکل سوہانے کی پھلیوں جیسا سواد دیتا ہے۔''

مَیں نے دیکھا وہ دونے کو یُوں کھا رہا تھا جیسے اُلٹے توے کی چپاتی کا لُقمہ تہہ کر کے مُنہ میں ڈالا جاتا ہے۔ یرقان زدہ آنکھیں نکالے وہ مجھے یُوں تک رہا تھا جیسے مَیں اُس کے ہاتھ سے دونے والا لقمہ چھیننے کی سوچ رہا ہوں۔ مَیں نے اُس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''یہ تم دونا کیوں کھا رہے ہو؟ اُدھر سے لنگر لے آؤ' کہو تو مَیں لا دیتا ہوں؟''

اُستاد قمر جلال آبادی نے کیا خُوب کہا ہے اور مَیں نے بھی بار بار برتا ہے ؎

حال دل کیوں نہ کہوں سامنے دیوانوں کے
یہ تو وہ لوگ ہیں اپنوں کے نہ بیگانوں کے

اگر دیوانوں مستانوں میں پاڑی پتّے' پیٹ پاک پلید' قبرستان اور گلستان کا فرق ملحوظ ہو تو دیر و حرم' کدورت و کرم...... مے خانہ و بت خانہ کے سبھی جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اُنس و جان کی غذا' ادا' بود و باش' مونگ و ماش کی مابین' نمایاں افتراق ہوتا ہے۔ اِنسان کے کھانے پینے کی ذیل میں جو کچھ آتا ہے۔ اُن

میں جنات کے قابل بھی کچھ اشیاء ہوتی ہیں۔ مگر جو کچھ جنات کے لیے رغبت ہیں اُن میں اکثر انسان کے لیے کراہت ٹھہرے۔ جنات کی بُنیادی ترکیب و ترتیب کا جُزوِ اعظم آتش ہے اور جُزوِ قلیل' باد و بار جبکہ ہر طرح میں آب' دونوں نایاب......!

انس و جان کے درمیان کی ایک اور بھی مخلوق! جو نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ جس کے وجود کا بُطلان نہیں کیا جا سکتا۔ اس غیر متوازن سی جنس کو جانس' ابلا پری' گھنتال کہا جا سکتا ہے۔ یہ بیک وقت کچھ کمی و بیشی کے ساتھ مادی اور بادی ہوتے ہیں...... یعنی بشر بھی اور جن بھی! بالکل ایسے ہی جیسے مخنث! جو مکمل مرد ہوتے ہیں اور نہ عورت...... اسی طرح جانس بھی جب چاہیں' انسان جیسی ہیئت میں دکھائی دیں' جب چاہیں جنوں کی جون بدل لیں...... لیکن کبھی ہر دو کی حقیقی حالت اختیار کرنے سے عاجز بھی رہتے ہیں۔ منفی رویوں کے حامل بھی اور مثبت مزاج بھی؟ ان کی طبعی عمریں بھی کبھی انسان کے حساب میں اور اکثر جنوں کی طرح ہوتی ہیں۔ سُنا ہوگا کہ فلاں حافظ صاحب' مولانا صاحب اور عالم محدث کے ہاں جنات حصولِ علم کے لیے آتے تھے۔ کئی ایک مدرسوں' مساجد اور مزارات پہ اُن کی مستقل حاضری اور قیام ثابت ہے۔ روزِ اوّل سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اور رہے گا۔ یہ بھی پڑھا' سُنا اور دیکھا ہوگا کہ انسان اور جنات کے درمیان دوستیاں' رشتہ داریاں' پیار و محبت کے تعلقات' عداوت و جدل کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔''

ان کے طبقات' علاقے' شہر' بستیاں' پہاڑ' جنگل اور صحرا' سمندر بھی انسانوں سے سانجھے...... بہت حد تک رہنے سہنے' جینے مرنے اور دیگر معاملاتِ زندگی بھی ملتے جلتے ہیں۔ بس اگر چند تضادات ہیں تو وہ جنس' مخلوق مابعد الطبیعیاتی اور خلقی بُعد' طبعی عمر کی طوالت' اکل و شرب' قوت و قدرت' قیام و سفر' سرعت و سرائیت' ذرک و ذرشتی وغیرہ...... مانس اور جانس؟ جیسے بھلا مانس یعنی شریف انسان...... بد مانس! بھلے مانس کا نقیض' یہ جانس؟ جن و انس کی ایسی ملی جُلی صورت کہ دونوں کی فطری' جبلی' سرشتی خصوصیات اور خصومیات...... کسی نہ کسی حد و انداز' شکل شباہت' کمال و کراہت موجود ہوتی ہیں۔ انسانی جون میں ہو تو تب بھی اور جن کی جون میں ہو تو تب بھی......!

نسان بھی تو ہوتا ہے۔ جنگلی' بر فانی بگڑا ہوا جانور! بن مانس' بد مانس کی طرح! لگتا ہے کسی کمی بیشی کی بنا پہ وہ انسان اور چوپائے کے مابین کی کوئی چیز بن کر رہ گیا ہوگا۔ اسے شاذ ہی کسی نے دیکھا ہو کہ یہ انسانی رسائی والے طبقات سے بہت پرے کہیں انجانے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ ایسے عجیب الخلقت نفوس و عنصر پیدا کرنے کا مقصد' مالک و خالق ہی بہتر جان سکتا ہے کہ وہ حکمت و مصلحت والا ہے۔ انسان' علم و عقل' دانش و بینش' سائنس ٹیکنالوجی کے کیسے بھی ارتقائی مراحل طے کر لے ذوالله سُبحانہ و تعالیٰ کی حکمتوں' قدرتوں کا عشرِ و عشیر بھی سمجھ نہیں سکتا...... لیکن جنہیں وہ عطا کر دے۔''

لنگر بانٹنے والے باوا نے دوبارہ مجھے دو نفروں کا لنگر دیا تھا۔ ظاہر ہے ایک میرے لیے تھا اور دوسرا لنگر اُس کے لیے جس نے پہلے لنگر بھی اُچکے تھے...... یکدم بجلی کی سی چوند نے مجھے دبا کر رکھ دیا۔ جانس بابا داؤدی! لنگر تقسیم کرنے والے بابا نے یہی نام لیا تھا یقیناً یہ بابا داؤدی ہیں جو لنگر کھانے کے بعد چُوم چاٹ کر چنوں کا بنا ہوا دونا بھی کھا گئے...... مَیں نے آنکھیں اُٹھا کر انہیں استعجاب بھری نظروں سے دیکھا۔ انسانی کلبوت میں ہونے کے باوجود لگتا تھا وہ کچھ اس کے علاوہ بھی ہیں جسے مَیں فی الوقت سمجھنے سے قاصر تھا۔

سُنا ہوگا کہ غیر انسانی مخلوق کی پہچان کے لیے کچھ مخصوص نشانیاں بھی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہر کس و ناکس کے لیے پہچاننا آسان نہیں ہوتا۔ ایک واضح نشانی ان کی فراخ پیشانی! جس پہ اک غیر مرئی سی مُہر کا اُبھار ہوتا ہے...... واسطے والے لوگ اس اُبھار کو خوب پہچانتے ہیں۔ دوسری نشانی پُراسراری گول آنکھیں...... جن میں بلا کی چمک اور آشفتگی طرارے مار رہی ہوتی ہے۔ ڈوبتا اُبھرتا خوف کا لہرا اور نہ سمجھ میں آنے والا لوحش! اس بظاہر معمولی مجذوب سے دکھائی دینے والے شخص میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ بھی جن اور انسان کے مابین والی کوئی چیز تھی۔

اِدھر بستی نظام الدین کے صدیوں پرانے تاریخی قبرستان میں ایسی مافوق الفطرت یا ماورائے دَم و وجود' بے شمار ہستیاں موجود ہیں۔ وہ بھی جنہیں جان اور پہچان کر اِدھر ہم نے دفن کیا۔ مزار بنائے بزرگوں نے دیکھا' پڑھا...... جن کے اذکار کتابوں اور سینوں میں محفوظ ہیں اور ایسے بھی جن کے جاننے والوں کے جاننے والوں کو بھی اب کوئی نہیں جانتا...... سب کچھ رزقِ خاک ہو گیا۔ بوسیدہ ژولیدہ قبریں' ٹوٹے پھوٹے کتبے' لوحیں...... جن پہ کندہ حرف و لفظ...... نام ولدیت جنس' سنِ پیدائش و فوتیدگی اور کوئی کلمہ درود...... آیات و کلمات کے علاوہ' مُردے کی سب شناختیں' گردشِ لیل و نہار کے کام آ جاتی ہیں۔ معلوم ہُوا اصل جوہر تو وہ عزت شہرت اعمال اور قیل و قال ہوتے ہیں جنہیں قبر کی مٹی مٹا نہیں سنبھالتی ہے۔

قدرت کے بھید' راز ہی رہیں تو بہتر رہتا ہے۔ طعام' دیگ کے اندر ہی پکے تو مزیدار ہوتا ہے کہ طعام کی تیاری اور برتنے پروسنے اور کھانے میں بھی بھید ہوتے ہیں' اسی طرح پیار محبت' خوبی خوبصورتی بھی سنبھالے کی چیزیں ہیں' جتانے بتانے یا کسی کو دکھانے کی نہیں۔ بھید ہی بھید! بھید ہی بھید...... جتنا کھولو' کھودو گے اتنی رگید ہی رگید......!

مَیں نے اس سیدلڑکے سے سوال کیا تھا کہ تم جن' انس اور جانس کے بارے کیا جانتے ہو؟ اور یہ سوال مجھے اس لیے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی کہ اُس نے میرے ایک سوال پہ جواب دھرا تھا کہ اجمیر شریف میں زیادہ تر تین طرح کی مخلوق دکھائی دیتی ہے۔ مَیں اس کے جواب پہ حیران ہُوا...... اس کی عمر' حالات' تعلیم اور زندگی کا پسِ منظر ایسا نہ تھا کہ وہ ایسے اَنچے جواب کا سزاوار ہوتا...... وہ تو مابعد الطبیعیات اور علوم خفی کے

طالبعلموں کے مطالب کے ہوتے ہیں۔ اب اس کے جواب نے مجھے کچھ سوچنے اور اسے مزید کھودنے پہ مجبور کر دیا۔ اتنی ساری ملاقات اور باہمی افہام و تفہیم سے نہ وہ مطمئن تھا اور نہ میں! ہم دونوں ایسے کھوجی اور ڈوبوں کی مانند تھے جن کا کام کوشش جاری تھی مگر ابھی تک نہ تو صاف ستھرا مطلب کا پانی برآمد ہوا تھا اور نہ کھدائی!

ہم دونوں کی اسی تگ و دو میں مَے کی سوچن خاصی گہری ہو گئی تھی۔ رات اپنے پہلے پہر کا پہلو بدلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ میں نے بدقت اُٹھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! مجھے اب اُدھر اڑھائی ون کے جھونپڑے کی جانب جانا ہے اور اس سے پہلے ہوٹل اپنے کمرے میں پہنچنا ہے کہ رات' کھانے سے پہلے مجھے انجکشن لینا پڑتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ میں اس سے وقتی طور پہ ہی سہی' خلاصی چاہتا تھا۔ گفتگو اَدق اور دماغ بھاری ہو جائے تو بندے کو کچھ فراغت لے لینی چاہیے۔

وہ تو جیسے جواب دینے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اُٹھتے ہوئے شتابی بولا۔

''ابا! آپ ہوٹل سے اُدھر پہنچیے...... میں آپ کو وہیں ملوں گا بلکہ اپنی بیوی بچوں سے بھی ملواؤں گا......'' السلام علیکم' کہہ کر وہ بغلی دروازہ کی جانب بڑھ گیا۔

میں پہلے کی طرح ہونق سا' چھٹی چھٹی آنکھوں سے اس بے بازو کے ''باز بہادر'' کی پھرتیاں ملاحظہ کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ یہ بمبئی کے لونڈے لڑکے واقعی بڑے ''چلتر پھرتر'' ہوتے ہیں۔ بمبئی سے جوہو' چوپاٹی' میرین ڈرائیو' پالی ہل کو خارج کر دیا جائے تو باقی اندھیری کے اندھیرے اور داور' ملاڈ کے بیسنی لڈو رہ جاتے ہیں۔ اس قسم کے لونڈوں' لپانیوں' پارسیوں' اسماعیلی آغا خانیوں' میمنوں' پٹھانوں اور ایرانیوں کو بھی اگر نکال باہر کیا جائے تو باقی پھر سمندر کنارے گھاٹیں' مہراٹھنیں' مہاراشٹر ائیں' مدراسی اور اینگلو انڈین مہلائیں' گوا کے کرسٹن' پنجاب کے سکھ اور یُونے ستارے کے پَوندے رہ جاتے ہیں۔ سمندری گودی کے مزدور' فٹ پاتھوں کے پرانے مکین...... ٹرینیں' ٹرامیں ٹیکسیاں رکشے' فلم اسٹار' قحبہ خانے' اوپر اور زمین نیچے کے جرائم پیشہ پانی اور مچھلی ناریل کی گَنَنڈ' سوگندھ' ناریل اور نمبو پانی' بھیل پوری' پان پوری' دوسا' پاڑ بڑی اور ہری تاڑی...... بمبئی پولیس اور بھی بہت کچھ......؟

اڑھائی دن کے جھونپڑے کے دائیں جانب' بازار سے نکلتی ہوئی تنگ گلی کے آگے کسی ڈسپنسری کا اُردو میں لکھا ہوا بورڈ دکھائی دیا جو خاصا بدخط لکھا تھا۔ اس کے آگے بائیں جانب مڑتے ہی وہ قدیمی حویلی دکھائی دی جس کا جھکا واں صدر چوبی دروازہ دو پٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر صحن میں پتھریلے فرش پہ بڑے بڑے چولہوں پہ جہازی دیگچے چڑھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اِدھر لنگر کا کچھ اچھا چڑھا ہوا تھا۔

اڑھائی دن کے جھونپڑے کی سیڑھیوں والے میرے میزبان کچھوا والے اُدھر کھڑے تیاری میں

مصروف تھے۔ انہی کی دعوت پہ میں اِدھر پہنچا تھا۔ اُنہوں نے شاید اُدھر ہی سے مجھے باہر کھڑا دیکھ لیا تھا...... کاندھے کی صافی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر نکلے۔ بولے۔

''میاں جی! تم کی بڑی پابندی دکھائی۔ سبحان اللہ! ویسے بازار سے گلی میں گھستے ہی مجھے تمہاری خوشبو مل گئی تھی...... اندر آ جاؤ......!''

یہ چھوٹی سی حویلی یا مکان' لگتا تھا انہی کی مصرف میں ہے۔ محض دو اڑھائی بوڑھے بیل جن میں جسامتی اور قامتی تو ہوتی ہوگی ہمت اور کچھ سار سلامتی نہیں ہوتی' آس پاس دکھائی اور دکھائی نہ دینے والے کاموں میں جُتے ہوئے تھے۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق جیسا اکھاڑہ ویسا پہلوان کے مصداق کھچڑا پکانے کے لیے بھی کسی بنچ کھنچے باورچی اور زہند کھوند ہیلے سانڈے چاول اناج دالیں' تیل مسالوں کی ضرورت ہی ہوتی ہے۔ پرانے سیانے کہتے ہیں کہ اگر حلیم' ہریسہ' کھچڑا جیسے پکوان ایجاد نہ ہوتے تو برصغیر میں ہر سال ہزاروں من آؤٹ آف ڈیٹ' سیلن زدہ' بوسیدہ' نسری کھایا اناج چاول دالیں مسالے وغیرہ مرغیوں مچھلیوں اور گائیوں بھینسوں کو چارے میں ڈال کر کھلانے پڑتے۔ ان پکوانوں میں استعمال ہونے والے گوشت مرغی کا بھی یہی حال ہے۔ اللہ اور بندوں کے ہر کام میں پردے ہوتے ہیں۔ اسی سے دُنیا کے معاملات چلتے ہیں۔ تازگی سے بوسیدگی اور بدبو سے خوشبو' تعمیر سے تخریب اور خرابی سے خوبی وغیرہ۔''

کھچڑے کی بیوی کھچڑی ہوتی ہے۔ یہ ویسی ہی ہوتی ہے جیسے ہمارے ہاں کبھی پرانی سگھڑ گھر والیاں پائی جاتی تھیں۔ جنہیں وداع کرتے ہوئے' ماں باپ نصیحت یا وصیت کرتے تھے۔ دیے! میکے میں ڈولی میں جا رہی ہو' سسرال سے مرن منجی پہ نکلنا...... خاوند' شوہر' شریکِ حیات کم اور خصم زیادہ ہوتے تھے۔ بیوی کو پاؤں کی جوتی یا زرخرید لونڈی سمجھنے کا بھی رَواج تھا۔ بیوی بیچاری ساری زندگی اپنے خاوند کا نام یا تو جانتی نہ تھی اور یا پھر وہ مارے شرم وحیا' زبان پہ نہ لا سکتی تھی۔ ''کاکے کا ابا'' سے ہی کام چلتا تھا۔ کھچڑی کی بھی یہی بڑائی کہ وہ اُسے صحیح المعدہ حضرات منہ تک نہیں لگاتے۔ ضعفِ معدہ' پیٹ' جسمانی کمزوری' اعصابی نقاہت' قریب المرگ خواتین وحضرات کے لیے بصد مجبوری' ایک ننھی منی سی پتیلی میں پکائی جاتی ہے۔ دو چمچ دیسی گھی آدھ چھٹانک چاول' مٹھی بھر مونگ' چٹکی بھر نمک اور زیرہ اور کھچڑی تیار...... اکثر مرحومین کے آخری دنوں کی یہ آخری غذا ہوتی ہے جو قبر کے اندر تک پہنچتی ہے۔

کھچڑا اپنے اجزائے ترکیبی' غذائی' شفائی' توانائی اور رسائی کے لحاظ سے ایک منفرد طعام ہے۔ دیگچیوں میں نہیں دیگچوں اور دیگوں میں بااہتمام پکتا ہے بلکہ شب دیگ' نہاری کی طرح...... شب بھر پکائی کے حوالے سے بھی اس کا چرچا رہتا ہے۔ عمارتی تعمیراتی مسالہ جات اور دیگر اینٹ بجری روڑا کے علاوہ ہر وہ سخت نرم' سرد گرم چیز اس میں شامل کی جا سکتی ہے جو پکانے والے کی بلند نگاہی اور زود رسائی میں ہو۔ نون مرچ'

تیل گھی، لہسن پیاز اور ک ہنگ، لونگ زیرہ، ہر یرہ بزیرہ...... یہ تمام کچھ ہو تو بھی ٹھیک نہ ہوں تب بھی حق ہے۔ یہ حلیم اور ہریسہ کی طرح کا واحد حکیمانہ اور غریبانہ پکوان ہے جس میں جو بھی ڈال دیں یا خارج از بحث کر دیں تب بھی پک جاتا ہے اور لطف کی بات کہ لطفیلا ہوتا ہے۔ پیٹ جیب اور نیت نیند میں خلل واقع نہیں کرتا۔

میاں جی نے مجھے چولہوں سے دور ایک کرسی پہ بٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کے لیے چائے بنواتا ہوں۔ آپ تسلی سے بیٹھیے ادھر لنگر کی تیاری دیکھیں...... کچھڑا بھی کھائیں گے اور باتیں بھی ہوں گی۔''

بڑے بڑے دیگچے تھے جو چولہوں پہ پڑے خوب بھاپ نکال رہے تھے۔ معلوم کرنے پہ پتا چلا کہ تین دیگوں میں اناج اُبل رہا ہے اور باقی ایک میں گوشت کو گلاوٹ لگی ہوئی ہے۔ مزید معلوم ہوا کہ کھچڑے میں بھینس، بیل کا گوشت استعمال ہوتا ہے۔ گوشت لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ قاری کو سمجھ آ جائے۔ اگر جانور کی آنتوں بافتوں، پھیپھڑوں، گردوں، کلیجی دل، سری اور دیگر چھیچھڑوں غدودوں کو بھی گوشت کہا جا سکتا ہے تو یہی کچھ تھا جو ادھر دیگوں میں پک رہا تھا۔ میرے ایک استفسار پہ میاں جی نے فرمایا۔ جسم انسان کا ہو یا کسی جانور چوپائے کا، فعال تو یہی چیزیں ہوتی ہیں...... گوشت تو محض ان کا حفاظتی اَستر ہوتا ہے۔ جانور کی اوجڑی کھانے سے معدہ مضبوط ہوتا ہے۔ مغز کھاؤ گے تو دماغ کو طاقت ملے گی...... دل پھیپھڑے گردے، کلیجہ اور تلی...... یہ سب مزیدار غذائیں بھی ہیں اور دوائیں بھی......!

اجمیر شریف میں سحریاں، صبح، دوپہریں شامیں اور راتیں، ایک ہی بھید بھاؤ کی ہوتی ہیں۔ ادھر کوئی ان تبدیلیوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا...... خواجہ کی عقیدت، ادھر کا رُوحانی ماحول، خوشبوئیں، رحمتیں، محبتیں، عبادتیں، دُعائیں، دن رات، نیند آرام، سب کچھ اجمیر کے نام ہوتا ہے۔ ادھر بیٹھے ہوئے میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ ادھر آس پاس کے لوگ ایک دوسرے کے معاملات میں دخیل نہیں ہوتے اور نہ ہی خود آگے بڑھ کر کسی کی مدد کرتے ہیں۔ اس پکائی کے کام میں میاں جی تو ہیڈ باورچی تھے اور دوسرے اڑھائی بوڑھے، آگ دہکانے اور اوپر کی بیکار سی بیگار میں مصروف ادرک کی ہوائیاں زیرے کی صفائی...... گرم پتھرے پہ سوکھے مسالے کی بھنائی...... بھلا یہ بھی کوئی کرنے کے کاج تھے؟

میاں جی چونکہ بیڑی کے رسیا تھے۔ بیڑے کے نلیٹا اور کثیف دھوئیں نے میری مت مار دی ہوئی تھی۔ بیڑی اور گانجے کی بدبو میں بڑی علیحدہ اور منحوس قسم کی کراہت ہوتی ہے۔ جدھر انہیں کوئی استعمال کر رہا ہو ادھر کا تمام ماحول سڑ سا جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی حال تھا...... پر کیا کہیے کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔

رات آہستہ آہستہ بھیگنے لگی تھی...... خدا خدا کر کے کھچڑا دم پہ لگا...... اس دوران خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی دس بار چائے سُرکی ہوگی...... میں پرانا کثرت البول کا مریض دس سے دُگنی بار پیشاب کے لیے اُٹھا ہوں

گا۔ اب میں اس انتظار میں کہ میاں جی مجھ سے وہ بات کریں جس کے لیے انہوں نے مجھے اِدھر عشاء کے بعد پہنچنے کا بطور خاص کہا تھا یا پھر کھچڑے کی دعوت دی تھی۔ اگر کھچڑے کی ہی بات تھی جو کہ انہوں نے مجھے دوپہر بھی کھلایا تھا تو وہ بھی کھلا ہی دیں...... وہی کراچی والوں کی کہاوت کہ "کھچڑا بھی تیار اور گاڑی بھی تیار!" مَیں نے ایسے ہی وقت گزاری کی خاطر پوچھ لیا۔

"میاں جی! جانس تو اِدھر ہوتے ہوں گے......؟"

سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بولے۔

"جا بجا! پر تمہیں ان کے بارے پوچھنے کی ضرورت کیونکر محسوس ہوئی......؟"

"بس! یونہی، مَیں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں......!"

یہ دو تین تو اِدھر ہی تمہارے آس پاس ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دیکھنا چاہتے ہو تو کچھ دیر اور رُکو تو جانس ہی جانس دیکھ لینا۔"

اُن کے جواب سے کیا اخذ کرتا؟...... بس! دَم سادھے گُم سُم ہو کے رہ گیا۔

شب کچھ مزید خنک ہو چکی تھی۔ اچانک بائیں جانب "اڑھائی دِن کے جھونپڑے" کی اَور سے دھیمے دھیمے ٹَل کھڑکنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ ایسے ٹَل، مندروں میں جا بجا لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ پجاری اور اِدھر درشن کے لیے آنے والے اندر داخل ہونے پہ ٹَل کھڑکا کر اپنی حاضری لگواتے ہیں۔ مَیں نے ہندوستان اور افریقہ میں چند ایک ایسے قدیمی مندر بھی دیکھے...... جن کے ٹَل خود بخود بجنے لگتے ہیں یا یُوں کہہ لیں کہ اَن دیکھی شکتیاں انہیں اپنی آمد پہ ہلاتی رہتی ہیں۔ اِدھر سے بھی کچھ ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہلکی اور کبھی بھرپور...... مَیں نے میاں صاحب کی توجہ ان آوازوں کی جانب دلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا اِدھر کوئی مندر ہے...... اگر ہو بھی تو اِس سمے گھنٹے بجانے کا کیا مقصد......؟"

حسبِ معمول وہ لاپروائی سے بولے۔

"حضرت! اِدھر قریب و دُور کوئی مندر نہیں...... گھنٹیوں کی یہ آوازیں بغل میں اڑھائی دِن کے جھونپڑے سے آتی ہیں۔"

"اُدھر کوئی مندر مَیں نے نہیں دیکھا......؟"

"ابھی تو کوئی مندر و ندر نہیں...... لیکن صدیوں پہلے اِدھر ایک بڑا مندر موجود تھا۔ جس کے آثار ابھی بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کا شمار اُس وقت کے چند اہم استھانوں میں ہوتا تھا۔ وقت سانپ کی طرح اپنے رنگ، کینچلی اور رفتار بدلتا ہے...... مقدر، مقصد، مفاد اور منظر بھی اپنے ٹھکانے تبدیل کرتے ہیں۔ لے اور سُر بھلے آگے پیچھے ہو جائیں مگر راگ، ٹھاٹ ایک ہی رہتے ہیں...... کلس ہو یا گنبد سب کا رُخ اُوپر کی ہی جانب!

رام یا رحیم ...... دونوں شروع ''ر'' اور آخر ''م'' سے ہوتے ہیں۔ اذان یا الکھ نرنجن! مقصد دھیان دلانا ہے۔
یہ تو تمہیں پتا ہوگا' ہر آہنگ سرمدی ہوتا ہے۔ ذہا تو سے اُبھرے یا کاجو کاٹھ سے ......!''
میاں جی کی باتوں سے میں تو گھوم کر رہ گیا تھا۔ پچھتا رہا تھا' میں گھنٹوں کی آواز کا پوچھ کیوں بیٹھا۔ بوڑھے' بزرگ بھی تو کسی گنبد' پہاڑ کے دامن' کنویں باولی یا اپنے اندر کی اندھی کوٹھریوں کی مانند ہوتے ہیں۔ سوال کر کے چھیڑ دیں تو دیر تک اپنی دانش' مشاہدوں' تجربوں کا آہنگ دیتے رہتے ہیں۔
ایسے میں جو دیکھا تو بوڑھے مرد و زن بچے' اک قطار میں اندر داخل ہونا شروع ہو گئے اور ان کے آگے وہی بمبئی والا' ہاتھ بازو بریدہ نوجوان! میاں جی نے بسم اللہ کہتے ہوئے لنگر کھولا۔ سب سے پہلے مجھے رکابی دی اور کہا۔
''بسم اللہ کرو' آج کا لنگر تمہارے نام......!''
بمبئی والے لڑکے کو قریب بلا کر کہا۔ ''سید زادے! مہمان کو اذن تناول دو......!''
سید زادہ آگے' میری جانب بڑھا۔ میری رکابی سے دو چار چیچ کھچڑا نکال کر ایک بڑے سے بادیے میں ڈالا اور باقی مجھے کھانے کے لیے دے دیا۔
لنگر کے طلبگاروں کی لائین شاید باہر بڑے بازار تک گئی ہوئی تھی۔ ختم ہونے کو ہی نہ آتی تھی۔ بمبئی والے سید صاحب کا کام محض زبانی کلامی تھا کہ ہاتھ بازوؤں سے تو وہ معذور تھے۔ گاہے گاہے مجھے دیکھ کر مسکرا لیتے۔ لنگر سے تھوڑا تھوڑا لنگر نکال کر جو بادیے میں جمع ہو رہا تھا وہ اب اتنا زیادہ ہو گیا کہ دوسرا برتن آگے کر دیا گیا۔ سمجھ نہ آیا کہ یہ لنگر کس کے لیے نکالا جا رہا ہے؟
اس کارزارِ حیات میں سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ ہر آغاز اپنے جلو میں انجام بھی لیے ہوتا ہے۔ یہ لنگر والا کار بھی اپنے انجام کو پہنچا تو میاں جی اپنے ہاتھ اور ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے میرے پاس بیٹھ گئے۔
''آپ کی مہربانی' باوا صاحب! آپ میری دعوت پہ یہاں تشریف لائے۔ لنگر کی پکائی اور تقسیم دیکھی۔ اگر آپ کو کوئی مجبوری نہ ہو تو آج کی شب اِدھر ہمارے ہاں ہی شب بسری فرمائیں۔ اس کے لیے سید صاحب نے بھی خصوصی طور پہ اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔''
سچی بات تو یہ تھی کہ میں خود یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح میں اڑھائی دن کے جھونپڑے کی قربت میں رات بسر کروں۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ اِدھر رات کو جنات اور اجنہ مختلف شکلوں میں دکھائی دیتے ہیں ...... بڑے بڑے بلّے' بھینے' سانڈ وغیرہ اڑھائی دن کے جھونپڑے کی حدود میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں اور صبح ہوتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ کبھی یہ جانور مسجد اور مزارات کی حدود میں ہوتے ہیں اور کبھی بت خانوں کی جانب ...... بغلی پہاڑی پہ بھی اُترتے چڑھتے رہتے ہیں۔ اِدھر

چھوٹے بڑے دروازوں پہ بھاری تالے پڑے ہوتے ہیں...... لیکن اکثر یہ باہر سیڑھیوں، گلی کوچوں میں بھی اُتر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے لیے نیا تو ہرگز نہ تھا لیکن اس کے باوجود میرے لیے یہ اڑھائی دن کے جھونپڑے والے جنات، جن کے بارے کہا جاتا ہے کہ اُن وقتوں سے ہیں جب اس کی نیو رکھی گئی تھی اور اس کی تعمیر و تزئین میں بھی ان کی شمولیت رہی۔ ان جنات میں مومن بھی ہیں اور مشرک بھی...... ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اِدھر دُنیا بھر سے زیادہ اجنسات بھی موجود ہیں۔ جنہیں حجاب لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے ہی جیسے مخنث عام اِنسانوں کے ساتھ بلا تفریق و تفرد ِمل جُل کر رہتے ہیں۔''

مَیں نے تھوڑا سا ڈرامہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میاں جی! مَیں بوڑھا پردیسی ہوں...... نیند مجھے ساری رات آتی نہیں...... بار بار پیشاب کرنے کی حاجت رہتی ہے۔ رات بڑبڑانے، خراٹے توڑنے کی عادتیں بھی ہیں...... چائے پانی کی طلب بھی ہوتی ہے۔ لکھنا پڑھنا بھی چلتا ہے۔ اِدھر آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوگی۔ اس خاطر، آپ مجھے ہوٹل ہی جانے دیں تو بہتر ہے۔''

مسکراتے ہوئے دُزدیدہ نگاہوں سے تولتے ہوئے گویا ہوئے۔

''جناب! جیسا آپ پسند فرمائیں؟ ویسے آپ کا کیا خیال ہے کہ زبان اگر دل و دماغ سے ہٹ کر کچھ کہے تو اُس میں کچھ زوح ہوگی؟...... آپ کا دل اور دماغ کچھ کہہ رہا ہے اور زبان کچھ اور بیان فرما رہی ہے۔ بتائیں! اِن میں سے کس کی سُنی جائے......؟''

ہلکے سے توقف کے بعد پھر بولے۔

''یاد رہے مَیں نے عرض کی تھی کہ اِدھر اڑھائی دن کے جھونپڑے اور گرد و نواح میں اِنس و جِنّ جان بھی رہتے ہیں اور اِن دونوں سے کچھ کم اجنس بھی رہتے ہیں۔''

مَیں تھوڑا سا ابھی اُن کی اس ذومعنی بات کو پانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اُنہوں نے اِدھر ہی سے ہانک لگائی۔

''سید صاحب! باباجی کے لیے شب بسری کا بندوبست اُوپر، جھونپڑے کی جانب والے کمرے میں کر دیں۔''

قارئین! اِک دم جیسے جھما کہ سا ہوا اور میرے دماغ کی کوئی ''فلڈ لائٹ'' روشن ہوگئی ہو۔

''ارے یہ تو دونوں ''اجنس'' ہیں...... ''مَیں اِن دونوں کے ماتھے اور آنکھیں دیکھ رہا تھا۔

(مسلسل:...... سلسلہ ہائے ''بابا بلیک شیپ'')

# لذت کی لیلا

● **شبِ زندہ دار** اُسے نہیں کہتے جو راتوں کو جاگتا ہے سوتا نہیں
شبِ زندہ دار تو قلبِ زندہ دار کو کہتے ہیں جو ھُو کی حرکت میں رہتا ہے۔
قلب جاری ہونا یہ نہیں پاس بیٹھے ہوؤں کو اللہ ھُو کا آہنگ سُنائی دے۔
یہ تو اندرونِ دریا کے تموّج کی طرح ایک ایسی سرمدی کیفیت جو گُم سُم سناٹا
عالمِ غنود تحیّر و تجلیل، عجز و انکسار اور خود سپردگی لیئے ہوئے ہوتی ہے۔
بے زبانی 'زبان بن جاتی ہے... وقت اور فاصلوں کے حساب کتاب
مذہب و مسلک اور دُنیاوی دکھاوں کے ناپ تول' اچھا بُرا کچھ بھی تو نہیں ہوتا
اگر کچھ ہوتا ہے تو تُو ہی تُو ہوتا ہے......"

ضروری نہیں کہ ٹھوکریں کھا کے ہی ٹھا کر ملتا ہو' سمجھ کے جھکیرے میں
سا جائے یا محنت خدمت کے صلے میں حاصل ہوتا ہو۔ ایسا ہوتا تو نیک
پارسا چلّے کرنے والے ولی قطب ہوتے۔ یہ تو اُس مبدائے فیض کا
فیض و عطا کہ مسِ خام کو کُندن بنا دے یا صدیوں کی تپسیا مجاہدت محنت کو
مٹی کر دے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ اُس منصف سے انصاف کی بجائے
اُس کا فضل و کرم مانگو رحم کے طلبگار رہو... اپنی نکمّی ناکارہ نمائشی عبادتوں
کا بدلہ نہ مانگو کہ نیچے سودے والوں کے ہاں' کھوٹے سکّے نہیں چلتے......

## بھیگت کی بات
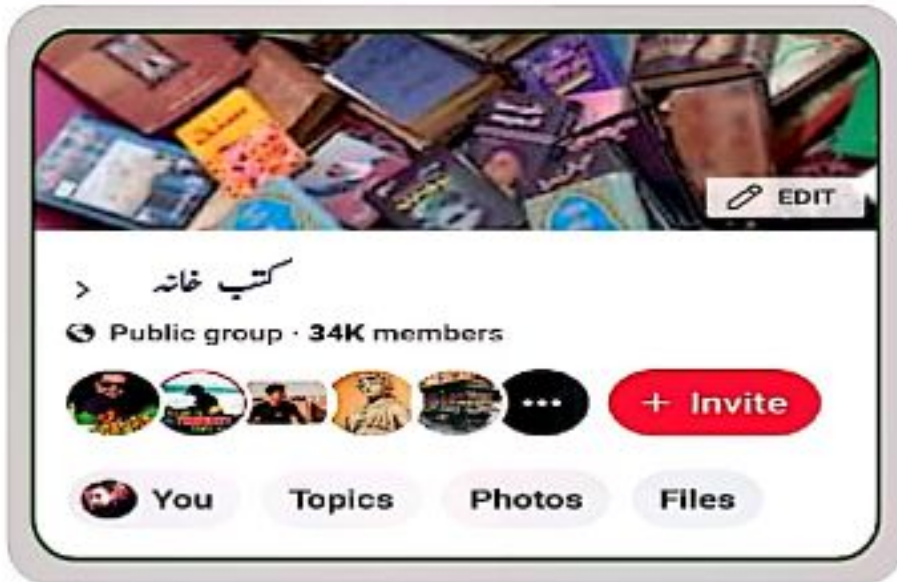
بھیگت بہت ضروری ہوتی ہے ۔
بگل میں اگر بھیگت پوری طرح جذب نہ ہو پائی ہو تو
ظروف اور ظرف دونوں ضعیف اور خفیف ہیں
صوفی کے اندر ایک بھیگت ہی تو ہوتی ہے
جو اسے ضیائی و شفافی بخشتی ہے ۔
اسی طرح خشک بھی خوب بھیگ کر ہی جشن کے رنگ و فن دکھاتی ہے
تخم بھیگ کر ہی شجر بنتا ہے ۔
غم و اندوہ یا مسرت و انبساط میں آنکھ کی پتلی ہی بھیگت ہوتی ہے تو
آنسوؤں میں رسا پیدا ہوتی ہے ۔
گلاوٹ میں تری کی رساوٹ پیدا ہوئے بن نہیں آتی
ناراضی کی نمی ' بیلی کی پتلی ' آٹے کی گندھ ' خوشبو کی سوندھ
ٹانکے میں ٹانک ' دھار میں تار
دوستی میں رواتی
اور
کستوری میں مستوری کی بھیگت پیدا نہ ہو تو
کچھ بات نہیں بنتی ۔ ۔ ۔



www.sangemeel.com